

THE ADEEB DELHI

ماہنامہ ادیب (دہلی)



— لکھنے والے —

علی جواد — زیدی

فرید — مچھلی شہری

حامد اللہ — افسر

جاں نثار — اختر

صدیقہ بیگم — سیوہاروی





نور جہاں فلم ''دوست'' میں

—:o:—

شوکت حسین
فلم ''دوست'' کے ڈائرکٹر



ملوتما فلم ''پنچھی'' میں

3462

SV02

★



ایشور لال و لیلا چٹنس ــ فلم ''ملورہ'' میں

قیمت فی پرچہ: ایک روپیہ علاوہ [illegible]

[illegible] چندہ [illegible]

5V02

ادیب دہلی

ایڈیٹر
سید [illegible] علی واحدی
فصیح الدین احمد ایم، اے
(آنسہ) نجمہ تصدق ایم، اے، بی، ٹی

جلد ۵ | نومبر [illegible] سنہ ء | نمبر ۱

فہرست مضامین

[illegible] فصیح الدین احمد ایم اے [illegible] پرنٹر [illegible] (دہلی)

نئی کتابیں

(از فصیح الدین احمد ایم اے)

(۱) شمسہ از جناب ایم اسلم صاحب۔ شائع کردہ کتب خانہ دار البلاغ محمد نگر۔ میو روڈ لاہور۔ قیمت مجلد پانچ روپے سائز ۲۰×۳۰/۱۶ صفحات ۵۰۔

اسلم صاحب سے اگر ہمیں کوئی شکایت ہے تو وہ یہ ہے کہ ایک کتاب پر لکھی ہوئی تنقید شائع نہیں ہونے پاتی کہ دوسری کتاب ریویو کیلئے آجاتی ہے۔ زیر نظر کتاب میں اسلم صاحب نے ایک دلچسپ ناول کو خطوط کی شکل میں پیش کیا ہے۔ جو ایک سہیلی اپنی دوسری سہیلی کو لکھتی ہے۔ کبھی یہ دونوں ساتھ پڑھتی اور ساتھ کھیلتی تھیں۔ پھر دونوں کی راہ الگ الگ ہو گئی۔ لیکن قسمت نے دوبارہ ایک ریل کے حادثے میں ان دونوں بچھڑی ہوئی سہیلیوں کو جا ملایا۔ شمسہ نے اپنی سرگزشت سنانے کا وعدہ کیا اور دونوں پھر بچھڑ گئیں۔ یہ ناول اتنا دلچسپ ہے کہ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر چین نہیں آتا۔

(۲) اوروں کی کہانی سن میری زبانی از جناب "دلشن" شائع کردہ دیال پرنٹنگ پریس دہلی۔ قیمت دو روپے

گذشتہ دو سالوں میں ہمارے بعض نوجوان شدت پسند ادیبوں نے اپنی چند تحریروں سے ادبی حلقوں میں کافی ہنگامہ برپا کیا ہے۔ ان تحریروں پر ملک کے متعدد رسائل و جرائد میں کافی لے دے ہو چکی ہے۔

زیر نظر کتاب اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مرتب نے ان شدت پسند ادیبوں کی کاوشوں کے مقابلہ میں ملک کے دو مشہور و مستند افسانہ نگار منشی پریم چند اور عظیم بیگ چغتائی کے وہ ادبی شاہکار پیش کئے ہیں جو کم و بیش انہی موضوعات سے متعلق ہیں۔ لیکن اپنے اسلوب و طرز کے لحاظ سے یقیناً نہ صرف یہ کہ زیادہ بلند مرتبہ رکھتے ہیں، بلکہ ان عیوب سے پاک ہیں۔ جن کا ہمارے نوجوان ادیب بہت آسانی سے شکار ہو جاتے ہیں۔ اس تقابل سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایک اچھا اور کامیاب فن کار پست موضوع کو کس قدر خوش اسلوبی سے نبھا سکتا ہے۔ اسی مقام پر ایک اچھے اور خام ادیب کی آزمائش ہوتی ہے۔

مرتب نے یہ چیزیں پیش کر کے یقیناً ادب پر ایک احسان کیا ہے۔

(۳) اپاہج از جناب قیسی رام پوری شائع کردہ ہندوستانی پبلشرز دہلی۔ قیمت دو روپے

قیسی رامپوری صاحب ادبی حلقوں میں افسانہ نگار کی حیثیت سے متعارف ہیں۔ ان کے متعدد افسانے اب سے چند سال قبل ملک کے مقتدر رسالوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ایک زمانہ میں وہ میکدہ ساقی کے ممتاز بادہ خواروں میں ... ایسا محسوس ہونے لگا تھا کہ ادب کے موجودہ بحرانی اور ہیجانی دور سے ... نے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ مگر انہوں نے اس سال پے در پے دو ناول لکھ کر بہت سے شکوک رفع کر دیئے۔

زیر نظر ناول "اپاہج" ان کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ ان ناول کا ... افسانہ نگاری کا کافی تجربہ رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پلاٹ کی ترتیب وغیرہ میں پختگی نمایاں ... ماحول کی عکاسی میں حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ رومانیت کا ایک دلکش امتزاج ... ہے۔ مکالموں میں غضب کی بیساختگی ملتی ہے۔ ناول اپنے اندر دلچسپ واقعات و ... رکھتا ہے۔ یقیناً ادبی حلقوں میں یہ کتاب دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائیگی۔ جلد اور گرد ... میں مندرجہ بالا ادارہ نے اور اشاعتوں کی طرح مخصوص خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے۔

(۴) دل کے آنسو از جناب رئیس احمد جعفری شائع کردہ مکتبہ سلطانی بھنڈی بازار بمبئی ۳۔ قیمت ...

گذشتہ سال رئیس احمد جعفری صاحب کی کئی تصانیف یکے بعد دیگرے شائع ہو کر ادبی حلقوں میں دلچسپی کے ساتھ پڑھی جا چکی ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے چھ افسانوں پر مشتمل ہے۔ ہر چند کہ جعفری صاحب افسانہ نگاری کی جدید ٹکنیک سے زیادہ ... ہیں۔ پھر بھی ان کے لکھنے کا ڈھنگ ان افسانوں کو دلچسپ بنا دیتا ہے۔ مجموعی حیثیت ... ان افسانوں میں ان کا اصلاحی مطمح نظر جھلکتا نظر آتا ہے۔ سماج کے عیوب پر ان کی گہری ... پڑتی ہے اور وہ ان عیوب کو ... کرنے کی کوشش ... ہیں۔ یہ افسانے اپنے اندر ... سمندر گہرا اثر رکھتے ہیں۔ ان افسانوں میں مصنف کی ... تقریباً ... کے ساتھ ...

[illegible] حق قریشی

[illegible] شائع کردہ خاتون کتاب گھر اردو بازار دہلی۔ قیمت ۸؍

[illegible] قریشی صاحب ایک نوجوان مگر کہنہ مشق ادیب ہیں۔ ان کا [illegible] کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ وہ کئی کتابوں کے مصنف [illegible] ان کا خاص میدان ہے۔ ظاہری وضع و قطع سے یہ مترشح نہیں [illegible] ہیں اور طنز نگار ادیب ہیں۔ ان کو دیکھ کر خود ان ہی پر طنز کرنے [illegible]۔ زیر نظر ناولٹ جسے خاتون کتاب گھر نے نہایت خوش اسلوبی کے [illegible] ہے ان کا تازہ ترین مختصر ناول ہے، جس کا ہیرو ایک کتا ہے [illegible] ٹ کے اعتبار سے بالکل انوکھی چیز ہے۔ اس کتے کی داستانِ حیات [illegible] عشق مصنف نے خاص مزے لے لے کر قلمبند کئے ہیں۔ جہاں جنسی [illegible] لیا ہے وہاں مصنف نے خاص احتیاط و اہتمام سے کام لیا ہے۔ تمدن [illegible] طنز اس ناول کا مقصد ہے اور اس مقصد میں مصنف یقیناً کامیاب [illegible] نوعیت کا اردو میں یہ ایک ہی ناول ہے۔ امید ہے لوگ اسے دلچسپی [illegible] پڑھیں گے۔

[illegible] جرم و سزا

از جناب باری

شائع کردہ اردو اکیڈمی لاہور۔ قیمت ۱؍

زیر نظر کتاب باری صاحب کے بارہ مضامین کا مجموعہ ہے۔ باری [illegible] دراصل ایک اشتراکی ادیب ہیں۔ انہوں نے مارکسزم اور جدید فلسفہ کا [illegible] مطالعہ کیا ہے۔ اس موضوع پر وہ کئی بصیرت افروز چیزیں بھی لکھ چکے ہیں۔

زیر نظر کتاب مختلف رنگ رکھتی ہے۔ ان مضامین میں مصنف نے [illegible] کے چند بین الاقوامی شہرت رکھنے والے مفکروں اور ادیبوں کی دردناک داستانیں [illegible] قلمبند کی ہے۔ دنیا کے بعض بلند پایہ فلسفیوں کا انجام کس قدر دلدوز [illegible] ٹریجڈی میں ظہور پذیر ہوا ہے۔ ان مضامین میں بیش بہا تاریخی مواد کے ساتھ ایک خاص قسم کی افسانویت بھی برتی گئی ہے جس نے مضامین کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔

مجموعی حیثیت سے کتاب پُر از معلومات بھی ہے اور دلچسپ بھی۔

(۷) دھبے

از جناب پرویز

شائع کردہ نرائن دت سہگل اینڈ سنز لوہاری گیٹ لاہور

قیمت دو روپے چار آنے

[illegible] پرویز صاحب جدید افسانہ نگاروں کی دوسری پود سے تعلق رکھتے ہیں ان کا [illegible]

ان کی ادبی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے مگر اس مختصر مدت میں بھی وہ کئی مجموعے شائع کر چکے ہیں۔ تازہ ترین مجموعہ ان کے سولہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ حقیقت نگاری کے ساتھ ساتھ رومانیت کا ایک دلکش امتزاج ان افسانوں کی جان ہے بعض نئے لکھنے والوں کی طرح زبان کی خامیاں بھی ان افسانوں میں ملتی ہیں۔ مگر افسانے کی دوسری خصوصیتیں دیکھتے ہوئے ان خامیوں کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

مجموعی حیثیت سے یہ کامیاب افسانے ہیں۔ اور ان کا مصنف شاندار امکانات رکھتا ہے۔

(۸) جدید منتخب مضامین

مرتبہ ینگ مین اینڈ کمپنی پبلشرز۔ نئی سڑک دہلی۔

ینگ مین اینڈ کمپنی اس دور کے تعلیمی پبلشرز میں ایک نمایاں مرتبہ رکھتی ہے۔ اس کمپنی کے کرتا دھرتا لالہ تلسی رام اس سے قبل کئی مفید اور کارآمد کتابیں کورس کے لئے مرتب کر چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب میرے چند مضامین سے شروع ہوتی ہے۔ جن کے متعلق ارباب نظر خود رائے قائم کریں۔ اس سے قبل میری ایک فارسی کی کتاب پنجاب کے میٹرکولیشن کورس میں داخل ہو چکی ہے۔

زیر نظر کتاب کی ترتیب میں مرتب نے تنوع کا خیال رکھا ہے۔ شروع کے مضامین میں تاریخی عمارات اور فن تعمیر سے متعلق دلچسپ اور پُر از معلومات مواد ملتا ہے۔ کچھ ادبی مضامین جو اردو کے بعض مستند شعرا کے حالاتِ زندگی اور ان کی شاعری سے متعلق ہیں خاص وزن رکھتے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے یہ کتاب تاریخی، معاشرتی، اور ادبی مضامین کا ایک کامیاب مجموعہ ہے اور اس کا مطالعہ طلبا کے لئے یقیناً مفید ہے۔

(۹) نئی منزلیں

مرتبہ جناب قمر تسکین

شائع کردہ عالمگیر بکڈپو لاہور۔ قیمت ۱؍۸

پچھلے چند سالوں میں مضامین نظم و نثر کے کئی انتخابات مختلف اداروں سے شائع ہو چکے ہیں جہاں تک اس انتخاب کا تعلق ہے یقیناً خوش مذاقی کا ثبوت دیا گیا ہے۔ اس دور کے مختلف [illegible] کے لکھنے والوں کی بعض بہترین چیزیں اس کتاب میں یکجا کر دی گئی ہیں۔ افسانوں اور نظموں دونوں کی ترتیب میں بالغ نظری سے کام لیا گیا ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ کتاب جدید ادب کی کامیاب ترجمانی کرتی ہے۔ کتابت طباعت دیدہ زیب ہے۔ بھول یہ ہے جن اہل قلم حضرات کی تحریریں اس کتاب [illegible] زینت ہیں ان سے اشاعت سے قبل اجازت لے لی گئی ہوگی۔ کیونکہ یہ خاص ذمہ داری کا کام ہے

نقوشِ ماضی

(از واحدی)

ا

۱۹۱۱ء میں حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم کے کہنے سے میں نے ایک ہفتہ وار طبی اخبار نکالا تھا۔ یہ اخبار طبیہ کانفرنس کا آرگن تھا۔ اور حکیم صاحب کی سرپرستی اسے حاصل تھی۔ اس اخبار کے سلسلہ میں مجھے حکیم صاحب کی خدمت میں اکثر حاضر ہونا پڑتا تھا۔ حکیم صاحب کبھی کبھی تبدیلی آب و ہوا کیلئے کالکا چلے جایا کرتے تھے۔ شملہ والے کالکا نہیں، کالکا دیوی والے غیر آباد مقام کالکا۔ یہ کالکا دلّی سے چھ سات میل دور ہے۔ اوکھلا نہر یا جامعہ ملیہ اسلامیہ (جامعہ نگر) کے راستہ میں۔ یہاں اور کچھ نہیں ہے سوائے ایک مندر کے، جس میں کالکا دیوی کی مورتی رکھی ہوئی ہے۔ اس مورتی کے درشن کو لوگ آتے رہتے ہیں اور دانی لوگوں نے دو تین کمرے وہاں ایسے بنوا دیے ہیں کہ درشن کرنے والے ان میں آرام لے سکتے ہیں۔ حکیم صاحب کو اس مقام کی ہوا بھی بہت پسند تھی اور اس مقام کا پانی بھی۔ وہ چوتھے پانچویں مہینے چند دن کیلئے کالکا چلے جاتے تھے اور مذکورہ بالا کمروں میں یا خیمے لگا کر قیام کرتے تھے۔ اُن کے قیام سے یہ مقام آباد ہو جاتا تھا۔ حکیم صاحب کے دلّی کے گھر پہ عام و خاص کا میلہ رہا کرتا تھا، لیکن خاص خاص لوگ کالکا میں بھی اُنکا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے۔ اور حکیم صاحب طبیعت کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ پیچھا چھڑوانا خود نہیں چاہتے تھے۔ مجھے حکم تھا کہ اتوار کے اتوار آ کر اخبار "طبیب" کے متعلق بات چیت کر دو۔ کچھ کہنا ہو کہو، کچھ سننا ہو سنو۔ ایسے ہی ایک اتوار کو میں کالکا پہنچا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ حکیم صاحب کے احباب شمس العلما مولوی سید احمد صاحب امام جامع مسجد، نواب غلام محمد حسن خاں صاحب مرحوم، نواب فیض احمد خاں صاحب مرحوم، مولوی عبدالاحد صاحب مرحوم مالک مطبع مجتبائی، نواب محمد علی خاں صاحب مرحوم تیرہلی والے وغیرہ وغیرہ باہر کرسیاں ڈالے دھوپ کھا رہے تھے۔ معلوم ہوا حکیم صاحب کمرے کے اندر ہیں۔ میں نے اطلاع کرائی۔ حکیم صاحب نے اندر بلا لیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ایک صاحب جن کا لباس نہ شاہانہ ہے نہ درویشانہ گاؤ تکیے سے لگے تشریف فرما ہیں۔ اور حکیم صاحب قالین سے کچھ ہٹے خاصے مؤدب انداز میں بیٹھے ہیں۔ حکیم صاحب نے اخبار کے متعلق گفتگو کی۔ میں نے جواب دیئے۔ ان تشریف فرما بزرگ نے بھی گفتگو میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس وقت میری عمر چوبیس پچیس برس کی تھی۔ اخبار نویس ہونے کا بڑا زعم تھا

...... سمجھتا تھا کہ بڑے بڑے اخبار نو[یس] نہیں کر سکتے۔ پھر وہ بزرگ تو اچھا۔ نویس تھے اور اخبار نویس کے سامنے کوئی شے نہیں ہوتا تو نواب یا درویش کی اخبار نویس کیا پرواہ کرتا ہے۔ مداخلت کا ایسے لہجہ میں جواب دیا جیسے کوئی کہے "تم کیا جانو"۔ بات کو میرا لہجہ محسوس ہوا اور اُن کی آنکھیں بولیں کہ ادب ہاتھ سے مت دو۔ حاذق الملک کا خطاب چھوڑ دینے اور کانگریس میں شامل ہو جانے کے بعد تو ... اور مولانا محمد علی مرحوم کے برابر کے لیڈر تھے۔ لیکن حاذق الملک ہونے کے زمانہ میں بھی اُن کا شمار ملک کے ممتاز آدمیوں میں ہوتا تھا۔ اور میں نے اُس زمانہ میں جیسی عزت ہوتے ان کی دیکھی ہے کسی کی نہیں دیکھی۔ میرے دل پر اُن سے ... زندہ انسان کی بڑائی کا اثر نہیں ہوا۔ ایک دفعہ میں نے انہیں چیف کمشنر ... کے سامنے سلام کیلئے جھکتے (لوگ کرتے) دیکھا تو مجھے تعجب ہوا۔ ایک دفعہ دور ... سٹیشن پر انتظار کرتے رہے کہ کب سر آغا خاں سیلون سے باہر نکلیں اور کب ملاقات ہو۔ تو میں نے اسے محسوس کیا۔ اتنے بڑے لیڈر کو میں نے ایک شخص کے پاس اس سے بیٹھا پایا کہ وہ صدر نشین ہے اور یہ اتنا بڑا لیڈر فقط آپ اس کا ادب کر رہا ہے بلکہ مجھ بے ادب کو بھی اشارہ کرتا ہے کہ خبردار! "با ادب بانصیب بے ادب بے نصیب"۔ میں حکیم صاحب سے مرعوب تھا۔ اور حکیم صاحب ان بزرگ سے مرعوب۔ لہٰذا قدرتاً اُن سے مرعوب ہو گیا۔ صحبت ختم ہوئی۔ میں باہر آ گیا۔ حکیم صاحب اور وہ ... اندر ہی رہے۔ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے ریل کالکا پہنچتی تھی۔ چار ساڑھے چار بجے ... سے واپسی کی گاڑی ملتی تھی۔ جنگلوں میں پھرتا پھراتا ساڑھے تین یا چار بجے میں ... سٹیشن لوٹا۔ حکیم صاحب کے احباب بھی تھوڑی دیر میں آ گئے۔ اُن سب کا ایک ... مجمع تھا۔ میں الگ دوسری طرف اکیلا ٹہل رہا تھا۔ کہ وہی بزرگ آئے اور سب آدمیوں کو چھوڑ کر میری طرف بڑھے۔ میں نے بھی خیر مقدم کیا۔ آدھ گھنٹے یا پون گھنٹے باتیں کرتے رہے۔ لباس بالکل دُنیا داروں کا سا تھا۔ لباس سے انہیں کوئی درویش نہیں کہہ سکتا تھا۔ مگر آنکھیں بھینگی ہونے کے باوجود عجیب کشش رکھتی تھیں۔ باتوں میں ... جذب طاری ہو جاتا، کبھی سلوک۔ میں ٹھٹے کے درویشوں سے کافی مل چکا تھا۔ "نظام المشائخ" کا ایڈیٹر ہونے کے سبب اور حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب سے تعلقات رکھنے کی وجہ سے۔ حضرت خواجہ صاحب دلّی میں مدتوں میرے مکان پر رہے ... سجادہ نشین قسم کے درویش بے شمار اُن سے ملنے آتے تھے۔ اور میں انہیں جلوت میں بھی دیکھتا تھا اور خلوت میں بھی۔ مجھ پر وعظ کہنے والے مولویوں اور سجادہ نشین قسم کے درویشوں کا اچھا اثر نہیں تھا۔ میں صرف ان حضرات کے تقدس کا منکر نہ تھا بلکہ ان کے ڈھنگوں نے میرا عقیدہ خراب کر دیا تھا۔ اُس وقت مجھے کسی مولوی اور ...

پیر فقیر میں غیر معمولی بات نظر آتی تھی۔ مگر حکیم صاحب جیسا ذی علم، ذی فہم اور ذی مرتبہ انسان ایک شخص کو صاحب روحانیت اور خدارسیدہ بزرگ سمجھے تو میرے لئے مشکل تھا کہ اُسے دیوانہ سمجھوں۔ پھر ریلوے پلیٹ فارم کی باتوں نے تو بالکل مسحور کر دیا۔ یہ پہلے [illegible] کی بزرگی میں نے تسلیم کی۔ اور جن سے آنکھ ملاں واقعی [illegible] جی چاہا کہ ان کی خدمت میں بار بار باریاب ہوں اور ان کی بارالتفات قبول کر دل۔ میری خواہش پاکر بزرگ موصوف نے کمال [illegible] بانی کے ساتھ فرمایا۔ بی ماران میں فلاں سوداگر کے مکان پر آج سے چار دن بعد ٹھیرونگا وہاں پا کرنا۔ آج تورات کی گاڑی سے نابھہ جا رہا ہوں۔ وہاں کے ایک مشہور مجذوب کا نام لیا (اُن کا نام اب یاد نہیں آتا) کہ اُن کا وقت آخر ہے بلایا ہے۔ اُن واسطے جاتا ہوں۔ کتابوں میں پڑھا تھا کہ اللہ والے جب دنیا سے رخصت ہونے لگتے ہیں تو اللہ والوں کو اپنے گرد جمع کر لیتے ہیں۔ یقین ہو گیا کہ یہ اللہ والے ہی ہیں۔ جو انہیں مجذوب نے بلایا ہے۔ اتفاقاً میرے چچازاد بھائی سید منظور احمد مرحوم نابھہ گئے ہوئے تھے۔ شاہ صاحب کی واپسی سے پہلے وہ آ گئے۔ میں نے ان سے پوچھا "وہ مجذوب کیسے ہیں؟" انہوں نے جواب دیا "ان کا تو کل انتقال ہو گیا۔ بڑے اچھے بزرگ تھے۔" میں نے سوچا کہ وہ تو جیسے تھے رہے۔ اب اللہ کو پیارے ہوئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ اُس نے مجھے اُن ہی کے درجہ کے بزرگ سے ملوا دیا۔ غرض چار پانچ دن کے بعد وہ بزرگ نابھہ سے تشریف لائے اور بلی ماران میں ٹھیرے۔ اور میں نے اُن کے پاس اس کثرت سے جانا اختیار کیا کہ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کو روکنا پڑا۔ مگر میں کب رکنے والا تھا۔ پھر اُدھر ایک دن شاہ صاحب نے باتوں باتوں میں کہہ دیا کہ "لوگ تمہیں میرے ہاں آنے سے روکتے ہیں" — اُنہیں یہ کیسے معلوم ہو گیا۔ اس خیال سے اور گرویدگی بڑھی۔ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب مجھ سے ناراض رہنے لگے۔ شاہ صاحب نے فرمایا "جلتا ہے، ہم سے جلتا ہے۔ جیسے ہم نے اُس کی دولت چھین لی ہے۔" اب میری دیوانگی کی کوئی حد نہ رہی۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ خواجہ صاحب کو شاہ صاحب پر خواہ مخواہ کا رشک ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ان کا آدمی کسی دوسرے کا معتقد ہو۔ میں نے خواجہ صاحب کی ناراضگی کو نظر انداز کر دیا اور شاہ صاحب کی خدمت میں کبھی صبح کبھی شام حاضری دیتا رہا۔ ایک شام کو حاضر ہوا تو شاہ صاحب کے سامنے فتح محمد صاحب کوتوال دہلی اور کئی پولیس افسر بیٹھے تھے۔ شاہ صاحب نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا "تو نے ہماری عصر کی نماز خراب کر دی۔" میں حیران سا رہ گیا۔ فتح محمد صاحب سے میری شناسائی تھی۔ انہوں نے بتایا کہ عصر کی نماز سے فارغ ہو کر حضور نے کہا تھا کہ "وہ آدمی آ رہا ہے۔" نماز خراب ہو جانے سے مطلب یہ تھا کہ میرا خیال نماز میں آ گیا۔ ایک دفعہ ایک عزیز ساتھ تھے

اُنہیں لے جا کر ملایا، اشاروں اشاروں میں ایسے پوشیدہ حالات بیان کر دیئے کہ عزیز ضبط نہ کر سکے۔ رو پڑے اور ہچکی بندھ گئی۔ ایک اور صاحب تھے، محکمہ ڈاک میں انسپکٹر، میرے پاس تنخواہ انسپکٹری ادا کرنے کے علاوہ بھی آیا کرتے تھے۔ کم ہلکوں میں مبوس۔ مگر صوم و صلوٰۃ کے بڑے پابند اور نیک شخص تھے۔ انہوں نے درویشی کا دعویٰ تو کبھی نہیں کیا۔ مگر باتیں کبھی کبھی درویشوں کی سی کر جاتے تھے۔ ایک روز بولے "میرا تبادلہ دلی میں محض تمہارے لئے ہوا ہے۔ لیکن شاہ صاحب کو آج یہ پیغام دے دینا کہ دلّی میں دو نہیں رہ سکتے۔" میں نے شاہ صاحب سے عرض کر دیا۔ شاہ صاحب نے فرمایا "اچھا کہہ دینا ایک ہی رہے گا۔" ہفتہ بھر میں انسپکٹر صاحب میدان جنگ بھیج دیئے گئے۔ اور وہیں گولی لگی یا بیمار پڑ کر رہ گئے۔ یہ پچھلی جنگ عظیم کی بات ہے۔ اِدھر میرا اعتقاد شاہ صاحب سے بڑھ رہا اُدھر حکیم اجمل خاں صاحب کا برتاؤ روز دیکھتا تھا۔ حکیم صاحب نے اپنی ایک کوٹھی خالی کرا کر شاہ صاحب کے [illegible] دی۔ مگر یہ کوٹھی کا قیام شاہ صاحب کے خاتمے کا باعث ہو گیا۔ حکیم صاحب کی عقیدت کا ڈھول بج گیا۔ اور بڑے بڑے امیر اور راجہ نواب شاہ صاحب کے دربار میں آنے لگے۔ شاہ صاحب پر روپے مینہہ برسنے لگا۔ شاہ صاحب حکیم صاحب کی کوٹھی کے محتاج نہیں رہے۔ شاہ صاحب نے خود ایک کوٹھی لاکھ سوا لاکھ روپیہ لگا کر بنائی۔ جنگل میں منگل ہو گیا۔ پہلے میں سمجھتا تھا کہ شاہ صاحب نے ہاتھ سکیڑ کر پیر پھیلائے ہیں۔ بڑے سے بڑے درویش ہیں۔ اب سمجھا کہ نہیں ہاتھ پھیلتا ہے۔ شاہ صاحب کو میری ضرورت رہی تھی۔ میں بھی آہستہ آہستہ الگ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ جانا آنا قطعی چھوٹ گیا۔ کئی سال گذر گئے۔ ایک دن خواجہ صاحب کی زبان سے ٹیلیفون پر یہ فقرہ "صاحبزادے میری عمر پینتالیس سال ہے۔" میں چونکا اور میں نے کہا "حضرت کیا انداز گفتگو تھا۔" خواجہ صاحب نے فرمایا "جناب کے شاہ صاحب بات کر رہے تھے۔ اُن کی کوٹھی بک گئی، سامان بیچ رہے ہیں۔ اس کے سلسلہ میں کہنے لگے صاحبزادے! میری عمر چالیس سال ہے۔ میں نے جواب دیدیا۔ صاحبزادے میری عمر پینتالیس سال ہے۔" پھر ایک دن میں خواجہ صاحب کے ساتھ موٹر میں جامع مسجد کے پاس سے گذر رہا تھا۔ موٹر کسی نے رکوائی۔ دیکھتا کیا ہوں شاہ صاحب ہیں۔ مجھ سے مخاطب نہیں ہوئے۔ خواجہ صاحب سے خرید و فروخت کی باتیں کر رہے ہیں۔ یا بہ آں شور اشوری یا بہ ایں بے نمکی۔ خواجہ صاحب کو فرزند کہنے والا اس وقت دوسرے ہی رنگ میں تھا۔ خدا معلوم خواجہ صاحب نے ان کا کام کیا یا نہیں مجھے یہ خبر بھی نہ رہی کہ شاہ صاحب جیتے ہیں یا چل بسے۔ شاہ صاحب دلّی میں ٹھہر تو چھپ نہ سکتے تھے۔ مگر اِدھر اُن کا طوطی خاموش ہوا اور اُدھر انہوں نے کہیں اور کی

ل۔ پاس تینتیس برس گذر گئے۔ میں اُنہیں بالکل بھول چکا تھا کہ یکایک ایک روز میرے دفتر میں وارد ہوئے۔ اور خواجہ صاحب کو دریافت کیا۔ اس طرح جیسے مجھے نہیں پہچانتے۔ ایک صاحب میرے پاس بیٹھے تھے اُنہوں نے لپٹ آپ کو شاہ صاحب سے پہچنوایا۔ اور مجھ سے کہا کہ شاہ صاحب کی اور میری حیدر آباد کی ملاقات ہے۔ اس پر میں نے بتایا تھا کہ شاہ صاحب کو بہت پہلے سے جانتا ہوں۔ شاہ صاحب نے بھی اقرار کیا کہ ہاں واقف ہیں۔ اس کے بعد ہم اور وہ دوست بن گئے۔ پچیس برس پہلے آرزو تھی کہ میرے مکان میں ان کے قدم آئیں یا اب روز گھنٹہ گھنٹہ اور دو دو گھنٹہ بیٹھتے ہیں۔ میں اب اُن کا معتقد نہیں ہوں لیکن پرانے اعتقاد کی یاد اُبھر آتی ہے۔ پُرانا تعلق مجھے بہت پیارا لگتا ہے۔ تیس چالیس برس پہلے جس نے میرے ساتھ بُرائی بھی کی ہو وہ مجھے آج کے دوست سے عزیز تر نظر آتا ہے۔ اور شاہ صاحب نے تو میرے ساتھ بُرائی نہیں کی تھی۔ اب میں اُن سے پوچھا کرتا ہوں کہ وہ چیز آپ کی کہاں گئی؟ وہ مسکرا دیتے ہیں۔ ایک روز اُنہوں نے اس طرح جواب دیا کہ ایک آدمی آیا جس سے میں تو واقف تھا لیکن شاہ صاحب اُسے نہیں جانتے تھے

اور وہ شاہ صاحب کو نہیں جانتا تھا۔ شاہ صاحب نے آنکھیں چار ہوتے ہی اُس سے کہا۔ "دوسری شادی کرلو۔ بیٹا تمہارے ہاتھ سے گیا۔ اس کے پر نکل آئے۔ تم نے اُس کی خاطر اپنی جوانی برباد کرلی۔ مگر وہ تمہاری قدر نہیں کرتا۔" وہ آدمی شاہ صاحب کے قدموں میں گر پڑا۔ اور میں نے سمجھا کہ میرا جواب دیا گیا ہے لیکن میری طبیعت اُن کی طرف تو کھنچتی ہے، پر اُن کی بزرگی کی طرف نہیں کھنچتی۔ اور میں اُنہیں خدارسیدہ نہیں مانتا۔ اب وہ بھی مجھے کیا کسی کو اپنی بزرگی کی طرف کھینچنا نہیں چاہتے۔ اپنی طرف کھینچنے کی اُمنگ ہی اُن میں سے جاتی رہی ہے۔ بہت معمولی آدمیوں کی طرح رہتے ہیں اور غربت کی زندگی گذارتے ہیں۔

میں اُنکا نام لینا نہیں چاہتا۔ ورنہ یہ افسانہ نہیں ہے۔ بالکل سچے واقعات ہیں۔ اُن کا نام لے دوں تو ہزارہا آدمی آج بھی انہیں پہچان جائیں۔ اور کہہ اُٹھیں کہ کیا تھا، کیا ہوگیا۔

علامہ شبلی کے سیاسی رجحانات

(از جناب علی جواد زیدی)

علامہ شبلی کا نام آپ میں سے کسی کے لئے بھی نیا نہیں۔ ہم سب کسی نہ کسی صورت اُن سے واقف ضرور ہیں۔ اور جیسے جیسے دن گذرتے جاتے ہیں اُن کے بیشتر علمی کارناموں سے واقف ہو کر ہم ان کی عزت زیادہ سے زیادہ کرتے ہیں۔ لیکن اب تک اُن کی قدر شناسی کا حق پورے طور پر ادا نہیں ہو سکا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی مختلف الجہات شخصیت کو سمجھنے کیلئے مخصوص ذہنی صلاحیتیں درکار ہیں اور جب تک ایک علمی ... میں موجود نہ ہو ذات و کمالات شبلی کا صحیح عرفان تقریباً ناممکن ہے۔

اپنی دماغی کاوشوں کے لئے علامہ شبلی نے وسیع میدان منتخب کیا۔ تفکر و تحقیق کے لئے آب و گیاہ بیابانوں کی خاک ہی نہیں چھانی بلکہ جودت طبع اور ذکاوت سے ان صحراؤں کو جو مدت سے تشنہ کامی کا رونا رو رہے تھے۔ اس طرح سیراب کیا کہ علم و ادب کے نئے نئے نخلستان لہلہانے لگے۔ ان تشبیہات و استعارات کی تشریح کا یہ موقع نہیں۔ ورنہ میں شاید اس شخصیت کی مرقع کشی کچھ بہتر طور سے کر سکتا جس کی طبیعت کی شگفتگی، رنگینی اور بوقلمونی کسی دوسرے مذہبی عالم کے حصے میں نہیں آئی۔ یوں تو بقول علامہ اقبال ؎

اُڑائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گُل نے
چمن میں ہر طرف بکھری پڑی ہے داستاں میری

مولانا سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں وغیرہ میں سے ہر ایک نے بقدر ہمت کسب ضیا کیا۔ مگر اس مہر نیم روز کی وہ روشنی کسی میں بھی نہیں جو بیک وقت نشاط افروز بھی ہو اور نظر افروز بھی۔

حکایت لطیف ہے، ڈرتا ہوں کہ دراز سے دراز تر نہ ہو جائے۔ اس لئے بغیر کسی مزید تمہید کے اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔ اور وہ یہ ہے کہ تاریخ کے چمنستان کا یہ بہار آفرین باغباں، علم کلام کی پھلواری میں نئی روشوں کا یہ پیشگفتہ فطرت طرح انداز، سیرت نگاری کے گلشن کا یہ پاکیزہ نظر گلچیں، ادب و تنقید کے باغ پر یہ ٹوٹ ٹوٹ کے برسنے والا ابرِ فیض، کیا سیاسیات کے باغیچے سے کترا کر نکل گیا؟ اس کا جواب نفی میں ہے۔

جو لوگ شبلی کے کارنامہ ہائے حیات سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ ان کی تمام زندگی علم و عمل کا مجموعہ تھی۔ وہ جو کچھ سوچتے تھے اُسے عملی جامہ پہنانے کی کوشش بھی کرتے تھے۔ بلکہ کسی کام کی افادیت کا احساس ہی اُن کے لئے پیام عمل بن جاتا تھا۔ اور وہ تن، من، دھن سے اس کام میں لگ جاتے تھے۔ قوت عمل کے خزانوں کے منہ کھل جاتے تھے اور جھیریٔ حسن کا پیکا اُس وقت تک دم نہ لیتا تھا جب تک کہ وہ کام انجام کو نہ پہنچ جائے۔ تعلیمی دنیا میں ندوۃ العلماء، انجمن ترقی اُردو، دار المصنفین مدرسۃ الاصلاح، نیشنل ہائی سکول (موجودہ شبلی کالج) کا قیام اُن کے اسی طبعی جذبے کے نتیجے ہیں۔ سیاسیات میں رجحانات سے مستثنیات میں نہ تھی کیونکہ شبلی کے اصول میں مستثنیات کی گنجائش گویا تھی ہی نہیں۔

شبلی نہ زاہد خشک تھے، نہ مُلائے مسجد۔ ان کی دوڑ مسجد تک ضرور رہتی تھی۔ مگر صرف مسجد تک نہیں بلکہ ادبی محفلیں اُن کے ترانوں سے گونجتی تھیں۔ تقریر کے جلسے اُن کی سحر بیانیوں کی جولانگاہ بنتے تھے۔ مدرسوں کے در و دیوار اُن کے زور استدلال اور افکار دماغی سے اپنی خالی جھولیاں پُر کر لیا کرتے تھے۔ کتابوں کے صفحے اُن کے بلند و رفیع خیالات سے گودیاں بھر لیتے تھے۔ اخبارات و رسائل کی دُنیائیں اُن کی صحافت اور انشا کی دولت سے مالا مال ہو جایا کرتی تھیں۔ اور ہر جگہ جو چیز سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی تھی وہ علامہ شبلی کی آزادی و اصابت رائے تھی۔ جتنی آزاد رائے ہوتی تھی اُسی آزادی سے اس کا اظہار بھی ہوتا تھا۔ جیسے ہر لمحہ اُن کا ضمیر اُن سے کہتا رہتا تھا کہ "ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا؟"

ان سب پر اُن کی جدت پسند طبیعت کے تقاضے مستزاد تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شبلی کی ہمہ گیر طبیعت نے سیاست کی طرف بھی رُخ کیا۔ اور انہوں نے میدان سیاست میں بے سمجھے بوجھے نہیں، بلکہ سب کچھ جان بوجھ کے قدم رکھا۔ چنانچہ سیاست کے بارے میں اپنے مضمون "مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ" کی تیسری قسط میں لکھتے ہیں:۔

"جس گروہ کے نزدیک صرف زبان سے کوئی لفظ بول دینا پالیٹکس ہے وہ کیونکر پالیٹکس کی حقیقت سمجھ سکتا ہے۔ پالیٹکس ایک سخت قومی احساس ہے۔ اسکا ظہور بیگار کے طریقے سے نہیں ہوتا یہ احساس جب دل میں پیدا ہوتا ہے تو دل و دماغ اور اعضاء سب مصروف کار ہو جاتے ہیں۔ اور خود بخود جد و جہد، محنت و سعی، تگ و دو، ایثار و محویت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ مسلم لیگ کا طرز عمل بتاتا ہے کہ اُس کی آواز ایک مصنوعی اور خارجی آواز ہے۔"

انہیں مصنوعی اور خارجی آوازوں سے ہمیشہ شدید تنفر رہا۔ ان کا مضمون

مسلمانوں کی پولیٹیکل کروٹ" اسی تصنع اور ظاہرداری کے خلاف ایک بے باکانہ تنقید، ایک پُرشور احتجاج، ایک دردآشنا دل سے نکلی ہوئی چیخ، اور صداقت وراست بازی کے فدائی کا نعرۂ حق ہے۔ کام بہت اہم تھا۔ مسلم لیگ مسلمانوں کی سیاسی نمائندگی کی دعویدار تھی۔ اس میں مسلم زعماء اکابر شریک تھے۔ اس میں بڑے بڑے خطاب یافتہ اور رئیسوں کی حکومت تھی۔ کسے مجال لب کشائی تھی، لیکن شبلی کا عقیدہ تھا کہ :-

"پالیٹکس دنیا کا سب سے بڑا جذبہ ہے۔ مذہب کے برابر طاقت رکھتا ہے۔ وہ انسان کی تمام جذبات کو زندہ کرتا ہے۔ اس سے تمام قوتیں مشتعل ہو جاتی ہیں۔ وہ انسان میں ہر قسم کا ایثار اور خود فروشی پیدا کر دیتا ہے۔"

انہوں نے اس آئینہ میں جب مسلم رہبروں کا عکس دیکھا تو اُن کی نکتہ شناس نگاہوں نے فوراً پرکھ لیا کہ" ان لوگوں کا نفس خود ان کو دھوکا دے رہا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں کہ سال میں دور دراز سفر اختیار کر کے پالیٹکس کے میلے میں جانا ایثار نفس ہے لیکن کیا یہ سال بھر میں ایک مشغلۂ تفریح، نمود و نمائش کا اسٹیج، جاہ نمائی کا ایک تماشہ گاہ، ایثار نفس ہو سکتا ہے۔ درخت پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر ہماری پالیٹکس دراصل پالیٹکس ہوتی تو وجد اور ایثار و خود فروشی کے جذبات خود بخود ساتھ پیدا ہوتے۔" یہ درد انگیز عکس دیکھ کر مولانا کا دل تڑپ اٹھا ہے اور اسی تڑپ کا اظہار انہوں نے اپنے مضمون میں کیا۔ مضمون کا شائع ہونا تھا کہ خاص خاص حلقوں میں ہل چل سی مچ گئی۔

آپ نے علامہ شبلی اپنے اسی مضمون میں لکھتے ہیں :-

"ہمارے پچھلے دو آرٹیکلوں نے ہمارے دوستوں کو سخت برہم کر دیا ہے۔ ہمارا جرم مفرد جرم نہیں بلکہ سینکڑوں جرائم کا مجموعہ ہے۔ ہم مسلمانوں کی سیاسی پالیٹکس کی بے احترامی کی۔ ہم نے مسلمانوں کی پولیٹیکل پالیسی سے بغاوت کی۔ ہم نے اتفاق عام کے شیرازہ کو درہم برہم کرنا چاہا۔ ہماری گستاخیوں سے ڈر ہے کہ لیڈروں کی شان و عظمت میں فرق آ جائے۔ ہمارا لہجہ سخت ہے۔ ہم مسلم لیگ جیسے پُرعظمت انسٹی ٹیوشن کی عظمت سے منکر ہیں۔ ہم مصنف کے درجہ سے ترقی کر کے پولیٹیکل لیڈر بننا چاہتے ہیں۔ ہم کونسل کی لیڈری کے اُمیدوار ہیں۔

ایسے خطرناک جرائم کیلئے فوراً انکوئزیشن کی عدالتیں قائم نہ کی جاتیں تو معلوم نہیں قوم کا کیا حال ہو جاتا۔ اسلئے راولپنڈی اور فیض آباد یعنی مشرق و مغرب دونوں سروں پر قیصر اور چودھویں صدی کے حرم میں عدالتیں قائم ہو گئیں اور پے در پے اجلاس ہوئے۔"

لیکن علامہ شبلی اپنے ارادے سے باز نہیں آئے۔ اُن کا قلم اور تیز سے تیز تر ہوا۔ اُن کا لہجہ تلخ سے تلخ تر ہوا۔ اُنہوں نے اپنے احتجاج اور اپنی تنقیدوں کی گرفت اور مضبوط کر دی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ؎

نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی
حدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی

اِن مبادیات کے بعد یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ مولانا نے اپنے سیاسی نظریہ میں بھی اُس حیات بینی سے کام لیا تھا جو ان کی تمام تحقیقی تصانیف کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔ جب ایک مستحکم رائے قائم کر لی تو کسی سے نہ دبے۔ نومبر ۱۹۱۲ء کے معارف" میں مولانا کا ایک خط شائع ہوا تھا۔ اُس میں مولانا لکھتے ہیں کہ :-

"رائے میں ہمیشہ آزاد رہا۔ سرسید کے ساتھ ۱۶ برس رہا لیکن پولیٹیکل معاملات میں ہمیشہ اُن سے مخالف رہا۔ اور کانگریس کو پسند کرتا رہا اور سرسید سے بارہا بحثیں رہیں۔"

اس سے بڑھ کے اُن کی آزادی رائے کا کیا ثبوت ملیگا کہ علی گڑھ کالج میں ملازم تھے۔ اور سرسید اس کالج کے کوزہ و کوزہ گر و گل کوزہ سبھی کچھ تھے۔ اُن کی مخالفت کرنا آسان نہ تھا۔ کچھ دنوں علامہ شبلی نے اپنے جذبات کو دبا بھی لیا۔ مگر دل میں جو طوفان اُمنڈ رہا تھا وہ اُبل کر رہا۔ نتیجہ ظاہر تھا۔ کالج کی نوکری چھوڑنی پڑی مگر شبلی کے پائے استقلال میں لغزش نہ ہوئی۔ سید سلیمان ندوی صاحب کے الفاظ میں اسی حکایت کو یوں سنئے :-

"۱۸۹۷ء میں روم اور یونان کی جنگ جب چھڑی تو وہ علی گڑھ میں تھے۔ اور سرسید کا نقطۂ نگاہ سب کو معلوم ہے۔ گو انہوں نے اس موقع پر اپنے کو قابو میں رکھا لیکن اُن کو علی گڑھ کے اندر سے گھٹن سی ہونے لگی اور نتیجہ اس قسم کی سیاسی علیحدگی تھی۔"

مولانا کی تحریروں کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کسی حد تک معترف ضرور تھے۔ مگر سیاسی اعتبار سے سرسید کو ایک [illegible] سمجھتے تھے۔ انہوں نے غداری کا الزام صاف اور صریح لفظوں میں [illegible] جو فرد جرم سرسید پر عائد کی ہے اُس کا منشا یہی ہے [illegible] سیاسی طور سے مسلمانوں کو جمود اور بے حسی کے گڑھے [illegible] سارے سیاسی جمود کی ذمہ داری سرسید ہی پر عائد ہوتی [illegible]

"یہ نہایت تعجب انگیز بات ہے کہ ممالک مغربی و شمالی [illegible] و پنجاب جو ایک زمانے میں مرکز حکومت اور [illegible] دماغ رہ چکا تھا جہاں مسلمان نسبتاً [illegible]

زیادہ تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ جہاں عرب و عجم کے بہترین خاندانوں کی یادگاریں موجود تھیں۔ وہ پالیٹکس سے اس قدر بے حس ہو گئے کہ آج بھی پالیٹکس کا نام لیتا ہے تو زبان لڑکھڑاتی ہے۔ اس عجیب و حیرت انگیز انقلاب حالت کا سمجھنا آسان نہیں۔ یہ حالت قدرتی اور اصلی نہ تھی، بلکہ بیرونی [illegible] نے پیدا کی تھی۔ وہ پُر زور دست و قلم جس نے اسباب بغاوت ہند لکھا تھا۔ اور اُس وقت لکھا تھا جب کورٹ مارشل کے ہیبت ناک شعلے بلند تھے۔ وہ بہادر جس نے پنجاب یونیورسٹی کی موافقت میں لارڈ لٹن کی اسپیچوں کی دھجیاں اُڑا دی تھیں اور کچھ [illegible] نے ان [illegible] میں جو [illegible] کانگریس کا لٹریچر [illegible] کے تعلق اس سے زیادہ پُر زور لٹریچر نہیں مہیا کر سکا۔ وہ بہادر جو آگرہ کے [illegible] اس لئے سرعام ہو کر چلا آیا تھا کہ ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر نہ تھیں۔ وہ [illegible] نے بنگالیوں کی نسبت کہا تھا "میں اقرار کرتا ہوں کہ ہمارے ملک میں صرف بنگالی ایسی قوم ہے جن پر ہم واجبی طور سے فخر کر سکتے ہیں۔ وہ صرف انہیں کی بدولت ہے کہ علم اور آزادی اور حب وطنی کو ہمارے ملک میں ترقی ہوئی۔ صحیح طور پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالعموم ہندوستان کی تمام قوموں کے سرتاج ہیں۔"

حالات اور گردو پیش کے واقعات نے اسکو اس پر مجبور کیا کہ اس نے تمام اسلامی پبلک کو پالیٹکس سے روک دیا۔ یہ کیونکر ہوا؟ کن اسباب سے ہوا؟ کس چیز نے اختلاف حالات پیدا کر دیا؟ ان سوالات کا جواب دینا [illegible] غیر ضروری بلکہ غیر متعلق ہے۔

جب اختلافات [illegible] تو دونوں میں کیسے یکسانی تھی۔ پھر علامہ شبلی کی طبیعت سکون آشنا تھی۔ کالج میں اکثر [illegible] لمبی تقریریں کر دیتے کہ سر سید کے ابروؤں پر بل اور ماتھے پر شکن آجاتی۔ ۱۹۱۲ء میں انہوں نے جمہوریت کی حمایت میں [illegible] کے جلسے میں جو تقریر کی تھی اُس پر بڑی لے دے ہوئی تھی۔ علامہ شبلی کا تو یہ حال تھا کہ حق

حرفے زدم دل کُشم و ہم زبان نہ نم

اُن کا مقصد اظہار فن نہیں، اظہار حقیقت ہوتا تھا۔

اب آئیے ہم مولانا شبلی کے سیاسی رجحانات اُس دور کی سیاسی تاریخ کے پس منظر میں دیکھیں۔ اور علامہ مرحوم کا صحیح مرتبہ سمجھنے کی بقدر ظرف کوشش کریں۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ مولانا مرحوم کی ولادت و وفات دونوں [illegible] سیاسی [illegible] میں ہوئیں۔ آپ کی پیدائش ۱۸۵۷ء میں ہوئی۔ یہ وہ سنہ ہے جب ہندوستان کی تاریخ کا وہ مشہور واقعہ پیش آیا جسے عام طور پر غدر کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور مولانا نے ۱۹۱۴ء میں وفات پائی۔ جب کہ گذشتہ جنگ عظیم کے شعلے یورپ میں بھڑکنے شروع ہوئے۔ ان دو سیاسی ہنگاموں کے مابین نکات سیاست کا یہ موشگاف زندگی کی سانس لیتا رہا۔ اور خود اسکی زندگی کی تشکیل میں ان [illegible] کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

۱۸۵۷ء کے واقعہ نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں۔ اب بھی بہت سے مسلمان ایسے تھے جو افسانۂ خواب موجود تھے مگر انہیں زوال و انحطاط کا احساس ہونے لگا تھا۔ جو غدر کی ناکامی کے بعد مکمل ہو چکا تھا۔ غدر نے ایک طرف تو انگریزی حکومت کے تسلط و اقتدار پر قطعی مہر لگادی تھی اور دوسری طرف اُن تمام [illegible] کو سرد کر دیا تھا جو عظمت رفتہ کی واپسی کا خیال [illegible] سے چند دلوں میں کبھی کبھی گرمی پیدا کر دیا کرتے تھے۔ مسلمان غدر سے پہلے تک اکثر یہ خواب دیکھ لیا کرتے تھے کہ اُن کی سلطنت انہیں واپس مل سکتی ہے۔ [illegible] اور [illegible] آخر [illegible] اتنی [illegible] تھی کہ ہمیشہ کے لئے اُن کے ہوائی قلعے مسمار ہو گئے۔

اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ غدر کے واقعہ کے پس پشت مذہبی جذبہ کارفرما تھا۔ اس لئے حکومت نے بجا طور پر یہ محسوس کیا کہ مذہبی علماء کا اثر گھٹانا بہت ضروری ہے۔ لہٰذا [illegible] دلّی کی درسگاہیں [illegible] کی گئیں اور جو راسخ العقیدہ [illegible] گوہر [illegible] الطاف و عنایات کی جی کھول کے بارش کی گئی۔ کچھ [illegible] طمع، غرض [illegible] کی زبانیں بند ہو گئیں اور سر سید کی کوششوں نے باقی [illegible] ہموار کر دی۔ روپیوں سے خریدی ہوئی وفاداری کا ڈر پہلے ہی نہ تھا۔ مذہبی [illegible] اور دینی [illegible] کے زیر دامن پلی ہوئی [illegible] ہنگاموں اور [illegible] کا خطرہ [illegible] گروہ میں بھی افراتفری برپا ہوئی۔ گوشہ نشینی اور خلوت [illegible] مگر [illegible] کچھ کہنے کی ہمت کسی میں بھی باقی نہ رہ گئی تھی۔ لیکن ان میں [illegible] کھوئی ہوئی عظمت کے دوبارہ حصول کی خواہش اور تمنا جس طبقہ میں سب سے زیادہ تھی وہ علماء کا گروہ تھا۔ اس کا سبب صرف یہی نہیں [illegible] الزامی تھا۔ [illegible] تاریخ کے اوراق [illegible] کہ ابتدائے اسلام ہی سے اسلام اور عیسائیت [illegible] حکومتیں [illegible] دونوں کا [illegible] سے بدرجۂ اتم نفور تھا۔ یہ نفرت اور دشمنی [illegible] کے ساتھ [illegible] آخر میں ہر جگہ اسلامی حکومتیں مغلوب ہونے لگیں اور عیسائی حکومتیں فتح کے جھنڈے لہرانے لگیں۔ یہی وجہ تھی کہ علماء کا طبقہ انگریزوں کی طرز حکومت کے خلاف نہیں بلکہ خود انگریزوں کے خلاف ہو گیا اور یہ مخالفت ہمیشہ نئے نئے روپ میں جلوے دکھایا کرتی تھی۔ ہندوستان کی عام ملکی سیاسیات میں جس چیز نے علماء کو قوم پرست بنا دیا وہ یہی تھی۔

اگرچہ جب علامہ شبلی نے ہوش سنبھالا تو مخالفت کا یہ جوش ختم ہو چکا تھا۔ مدت ہوئی کہ تحریک پوری جوش و خروش سے جاری تھی۔ اور مسلم قیادت ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑا دینے کی تدبیر پر سوچنے میں مصروف تھی۔ عام مسلمانوں کا خیال حکومت کی طرف سے ہٹ کر اپنے ہم وطن بھائیوں یعنی ہندوؤں کی طرف مبذول ہو چکا تھا۔ اہل نظر اور صاحبان ادراک سر پیٹتے تھے۔ مگر وہ بھی کچھ کھل کے نہ کہہ سکتے تھے۔ بقول علامہ سہیلؔ

یوں شیشہ و ساغر ٹکرائیں سر پیٹ کے مینکش رہ جائیں
اس فن کو جہاں میں اور کوئی مجز ساقی دانا کیا جانے

غرض مسلمانوں کی سیاست کا نقشہ ہی بدل چکا تھا۔ مگر شبلی کا دل درد اسلامی سے لبریز تھا۔ تاریخ کے گہرے مطالعے اور اسلامی تمدن و تہذیب و نظام حکومت و شریعت سے والہانہ محبت اُن کی آنکھوں کے سامنے رنگین تر دنیاؤں کی تصویریں بناتی رہتی تھی۔ ہر لمحہ نئی امنگیں، نئی ترنگیں اٹھتی ہیں۔ پھر جب طیور پ کا شاطر کھلاڑی چالیں بدل بدل کے اسلامی شاہ کو شہوں پر شہیں دے رہا، مات سے بچنا دشوار نظر آرہا تھا۔ اسلامی قلعے کی دیواروں میں رخنے پڑ رہے تھے شبلی یہ سب دیکھ رہے تھے۔ حساس دماغ رکھتے تھے۔ کیسے اور کب تک خاموش رہتے۔ بالآخر چیخ نکل ہی گئی۔ اور اس چیخ نے اس معرکہ آرا مضمون کی شکل اختیار کی جس کا تذکرہ ہم اوپر کی سطروں میں ابھی ابھی کر چکے ہیں۔ یعنی "مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ"۔

مگر علامہ شبلی نے انگریزی حکومت کی مخالفت میں صرف قلم صرف نہیں کیا۔ انہوں نے اس منفیانہ نقطۂ خیال کو نظر انداز کر دیا اور ایک اثباتی لائحۂ عمل مسلمانوں کے سامنے رکھا۔ اُنہوں نے ایک طرف مسلمانوں کی حمیت کو اُبھارا، ان کی پستی کا احساس دلایا اور دوسری طرف اُنہوں نے اُس زمانہ کے طریق کار کی غلطیاں ظاہر کیں۔ اور سب سے آخر میں اُنہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد پر زور دیا۔

وہ اِن نتائج پر جس راستے سے پہنچے ہیں اُس کا سمجھنا کچھ زیادہ دشوار نہیں ہے۔ انہیں کے جستہ جستہ اقتباسات سے ذیل کی سطروں میں ہر مفہوم پر تھوڑی سی روشنی ڈالنے کی کوشش کی جائے گی۔ فرماتے ہیں:—

"مسلمان دو حیثیتیں رکھتے ہیں (۱) گورنمنٹ برطانیہ کی رعایا ہیں (۲) مسلمان ہیں۔ اس بنا پر مسلمانوں کی پالٹیکس انہیں دو اجزا کا مجموعہ ہے۔ اور ترتیباً پہلا جزو دوسرے جزو پر مقدم ہے۔ رعایا پر حکومت کا جو قدیم شخصی طریقہ تھا اس کا اصل الاصول یہ تھا اور آج بھی شخصی سلطنتوں میں قائم ہے کہ بادشاہ کی زبان قانون ہے، وہ جو چاہتا ہے کر سکتا ہے، رعایا کو کسی قسم کے دخل دینے کا حق نہیں ہے۔ اگر تسلیم کر لیا جائے کہ انگریزی گورنمنٹ اسی قسم کی گورنمنٹ ہے تو تمام بحثوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ پر جوش نیشنل کانگریس اور مسلم لیگ دونوں بیکار چیزیں ہیں۔ لیکن وہ ایشیائی گورنمنٹ جو رعایا کو کسی قسم کے حقوق دینے پر راضی نہیں۔ اُن کے نزدیک بھی گورنمنٹ انگریزی کی نسبت "شخصی حکومت" ایک تومی عار ہے جس کو کوئی انگلش مین کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ اب انگریزی گورنمنٹ شخصی نہیں تو پارلیمنٹری (جمہوری) ہے اگرچہ طرز حکومت بظاہر شخصی ہے، یعنی ایک خاص خاندان شاہی وراثتہً فرمانروا ہوتا ہے۔ لیکن حکومت کا نظم و نسق، پارلیمنٹ - ہوس آف لارڈس اور ہوس آف کامنز سے مرکب ہے۔ اس لئے یہ شخصیت دراصل اعلیٰ درجے کی جمہوریت ہے۔ اس اصول کے تسلیم کرنے کے ساتھ کہ انگریزی گورنمنٹ دراصل پارلیمنٹری (جمہوری) ہے۔ پالیٹکس کا مسئلہ پیدا ہو جاتا ہے۔ یعنی رعایا کو انتظام حکومت میں ہر قسم کی مداخلت ہے۔ اظہار رائے اور نکتہ چینی کافی ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ رعایا محکوم بھی ہے اور حاکم بھی۔ وہ خود اپنے لئے قانون بناتی ہے اور خود اس پر عمل کرتی ہے۔"

" انگلستان میں یہ مسئلہ بالکل صاف ہے۔ لبرل اور کنزرویٹو دونوں میں سے کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن ہندوستان میں آ کر اس مسئلہ کا رُخ بدل جاتا ہے۔ اور یہ وہی نقطہ ہے جہاں سے ہماری یعنی ہندوستانیوں کی پالٹیکس کا خط شروع ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا ایک عمدہ اصول حکومت ایک پُر فخر جمہوریت، ایک بے نظیر قانونِ انصاف صرف اس وجہ سے قالب بدل کر دفعتہً اپنی تمام خصوصیتیں کھو دیتا ہے کہ ملک اور رنگت بدل گئی ہے؟"

. . . . . . سب سے بڑا اور مقدم کام یہ ہے کہ یہ سمجھا دیا جائے کہ مسلم لیگ نہ آج بلکہ ہزار برس کے بعد بھی پالیٹکس نہیں بن سکتی . . . . . .

. . . . (کیونکہ) لیگ کا سنگ اولین شملہ کا ڈیپوٹیشن تھا۔ اور اب یا آئندہ جو کچھ اس کا ترکیبی نظام قرار پائے ڈیپوٹیشن کی روح اس میں موجود رہے گی۔ ڈیپوٹیشن کا مقصد سراپا یہ تھا اور یہی ظاہر بھی کیا گیا تھا کہ جو ملکی حقوق ہندوؤں نے اپنی سی سالہ جدوجہد سے حاصل کئے ہیں اس میں مسلمانوں کا حصہ متعین کر دیا جائے۔"

"آج مسلم لیگ گو شرم مٹانے کیلئے کبھی کبھی عام ملکی مقاصد میں سے بھی کسی چیز کو اپنی کارروائی میں داخل کر لیتی ہے۔ لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ اسکے چہرے کا مستعار غازہ ہے۔ رات دن جو شور مچایا جاتا ہے۔ روزمرہ جس عقیدہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جو جذبہ ہمیشہ اُبھارا جاتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ ہندو ہم کو دبائے لیتے ہیں۔ اس لئے ہم کو اپنا تحفظ کرنا چاہیے۔ مسلم لیگ کا اصل عنصر صرف یہ ہے۔ باقی جو کچھ ہے موقع اور محل کے لحاظ سے تصویر میں کوئی خاص رنگ بھر دیا جاتا ہے۔"

"ہم شمالی ڈیپوٹیشن کی عظمت اور اہمیت کے منکر نہیں۔ وہ سب سے بڑا تماشا تھا جو قومی اسٹیج پر کیا گیا۔ لیکن گفتگو یہ ہے کہ کیا رعایا میں سے دو قوموں کی باہمی نزاع اور چارہ جوئی کا نام پالیٹکس ہے۔ اگر یہ ہو تو سرکاری عدالتوں میں ہر روز جو کچھ ہوتا ہے سب پالیٹکس ہے۔ اور ہائی کورٹ کو ہائی کورٹ نہیں سیاست گاہِ عظیم کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔"

...... پالیٹکس کا خط وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں سے یہ بحث پیدا ہوتی ہے کہ انتظام حکومت میں رعایا کی شرکت کس حد تک ہونی چاہیئے۔ یعنی پالیٹکس گورنمنٹ اور رعایا کے باہمی مطالبہ جات کا نام ہے۔ نہ رعایا کے باہمی تنازعات اور حقوق طلبی کا۔"

ان اقتباسات سے جو چیز خاص طور سے واضح ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ علامہ شبلی دستوریت پسند تھے۔ وہ حکومت میں رعایا کا حصہ ہی نہیں چاہتے تھے بلکہ رعایا کو اصلی حاکم و مختار کا درجہ دیتے کہ وہ خود ہی قانون بنائے اور خود ہی اُن پر عمل کرے۔ لیکن علامہ شبلی کا تخیل سلف گورنمنٹ (زیر سایہ برطانیہ) سے زیادہ آگے نہیں بڑھا تھا۔ اس میں علامہ کی تنگ نظری کو دخل نہیں۔ بلکہ اس عہد کی سیاست کا منتہائے نظر یہی تھا۔ گوکھلے جو سب سے بڑا مرد میدان خیال کیا جاتا تھا۔ وہ بھی اسی دائرہ میں گھوم پھر کر دم رکھتا تھا۔ کانگریس کا نقطۂ نگاہ بھی یہی تھا۔ آج کانگریس مکمل آزادی پسند ہو رہی ہے۔ مگر اس تحریک کی عمر کچھ زیادہ نہیں ہے بلکہ کانگریس خود ۱۹۲۱ء میں یعنی علامہ شبلی کی وفات کے سات برس بعد اپنے مطمح نظر کو اتنا بلند کیا کہ وہ مکمل آزادی کا مطالبہ کر سکے۔ اس لئے ہمیں یہ کہنے اور ماننے میں ذرا بھی تامل نہیں ہے کہ وہ اپنے دور کے آزاد ترین خیالات کے حامل تھے۔

اُن کے سیاسی رجحانات میں دوسری چیز جو خاص طور سے نظر آتی ہے وہ سیاست و اقتصادیات کے لازم و ملزوم ہونے کا ہلکا سا احساس ہے۔ اس میں شک نہیں کہ علامہ شبلی کے دور کی سیاست امتیازات نسل و رنگ و قوم کے پس منظر میں تیار ہوئی تھی۔ غیر کا تسلط گوارا نہ تھا۔ ملک کا عام افلاس بڑھتا جا رہا تھا۔ مگر صحیح اقتصادی عناصر کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت اس دور کے بڑے سے بڑے سیاستداں میں نہ تھی۔ فلسفۂ مادیت پہلے بھی تھا مگر ارتقا کو ضدین کے تصادم و پیکار مسلسل کا نتیجہ سمجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ جماعتی اقتصادیات، طبقہ وارانہ جنگ، شہنشاہیت، سرمایہ داری، نازیت، فسطائیت، جمہوریت و اشتراکیت و اشتمالیت کے وہ نظریے جو بعد کے سینوں میں تھے اور ملک بھر میں بجلی کی لہر کی طرح دوڑ گئے، کسی کو معلوم بھی نہ تھے۔ اس لئے علامہ شبلی کے یہاں اس امر کی تلاش بے سود ہے کہ انہوں نے بھی سیاست اور اقتصادیات کے ہم رشتہ ہونے پر اس پہلو سے روشنی ڈالی ہوگی۔ لیکن یہ احساس اُن کے یہاں ضرور موجود تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہم اس نیاز مند سیاست کی دور اندیشی و بلند نظری کی داد دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

نظام کا چلنا دشوار ہے اور جب وہ نظام ہی نہ رہا تو مذہب کو بھی چند ہی دنوں کا مہمان سمجھنا چاہیئے۔ یعنی مذہب کا باقی رہ جانا ادرحقیقت اگر بالفاظ مذہبیت سلطنت کے وجود کی محتاج ہے۔ علامہ شبلی کی دقیقہ سنج نظر نے اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ چنانچہ وہ اپنی نظم "شہر آشوب اسلام" میں، جو ہنگامۂ طرابلس و بلقان سے متاثر ہو کر لکھی گئی تھی، کہتے ہیں کہ:-

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک

مراکش جا چکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ترکی کا مریض نیم جاں کب تک

یہ سیلاب بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

کوئی پوچھے کہ اے تہذیب انسانی کے استادو
یہ ظلم آرائیاں کب تک، یہ حشر انگیزیاں کب تک

یہ جوش انگریزی طوفان بیداد و بلا تا کے؟
یہ لطف اندوزی ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک

یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک

یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک

کہاں تک لوگے ہم سے انتقام تیغ ایوبی
دکھاؤ گے ہمیں جنگ صلیبی کا سماں کب تک

سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشان رفتگاں ہیں ہم
مٹاؤ گے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

زوال دولت عثماں، زوال شرع و ملت ہے
عزیزو فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک

پرستاران خاک کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترام سجدہ گاہ قدسیاں کب تک

جو گونج اٹھے گا عالم شور ناقوس کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید و گلبانگ اذاں کب تک

اس نظم میں شاعر نے اپنا دل نکال کے رکھ دیا ہے۔ اس کے لفظ لفظ سے اضطراب روحانی کے نشتر کھٹکتے ہیں۔ اور صحیح و واضح طور سے اس حقیقت کا اظہار ہے کہ مذہب کی پشت پناہی پر جب سلطنت نہ رہی تو مذہب کتنے دنوں تک باقی رہ سکتا ہے۔ اشتراکی فلسفیوں نے مذہب و ریاست کے اس اجتماع کا اقرار کیا ہے مگر وہ دوسرے نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ مذہب سلطنت کا آلۂ کار رہا۔ اور سلطنت نے جس طرف چاہا اس کی باگ موڑ دی۔ علامہ شبلی اسلامی تاریخ کے مخصوص معتقدات کے زور پر ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ مذہب کی بقا بھی سلطنت کی بقا سے وابستہ ہے۔ مگر اس کہنے سے اُن کا مطلب صرف یہ ہے کہ اسلامی حکومت اور اسلامی مذہب اس طرح لازم و ملزوم ہیں کہ ایک کی کمزوری دوسرے پر یقیناً اثر انداز ہوگی۔ یہ کچھ اسلام ہی پر منحصر نہیں۔ بلکہ ہر مذہب کے لئے یہی ہوا کرتا ہے کہ زوال سلطنت کا اثر مذہب کی ترقی اور

اس کے تنزل پر ضرور پڑتا ہے۔

یہی سبب تھا کہ عالم اسلامی کے سیاسی مہروں کو مغربی کھلاڑیوں کے ہاتھوں پٹتے ہوئے دیکھکر ان مغربی کھلاڑیوں سے علامہ شبلی متنفر ہو گئے تھے۔ ان کے خلاف تقریریں کرتے تھے، چندے جمع کرتے تھے، مضامین لکھتے تھے، متعصبین ترکان ترکی کی امداد کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ وہ عیسائی سیاست کے بہت بڑے مخالف تھے۔

یہ ضرور ہے کہ علامہ شبلی بھی خطاب یافتہ تھے۔ حکومت نے انکو شمس العلماء کا خطاب دیا تھا۔ لیکن یہ خطاب علامہ کی وفاداریوں اور جی حضوریوں کا صلہ نہ تھا بلکہ ایک طرف اُن کی علمیت کا ادنی اعتراف تھا اور دوسری طرف حکومت کی طرف سے بعض حضرات کے ایماء سے مولانا کی زبان پر پہرے بٹھانے کیلئے یہ پیشکش کی گئی تھی۔ یہ خطاب ٹھکرایا تو نہیں گیا، لیکن خطاب یافتہ ہونے کے بعد بھی مولانا کی آزادی رائے میں سرمو فرق نہیں آیا۔ وہ حکومت کے طرز عمل پر برابر نکتہ چینی کرتے رہے یہاں تک کہ اُن کے پیچھے خفیہ پولیس لگادی گئی تھی۔ اور اُن کے نقل وحرکت کی بھی نگرانی کیجاتی تھی۔

علامہ سہیل جو مولانا ئے مرحوم کے مایۂ ناز شاگردوں میں ہیں، راوی ہیں کہ مرض الموت میں مبتلا ہوتے ہوتے آپ کی گرفتاری کا پروانہ بھی جاری کر دیا گیا تھا۔ لیکن قبل اس کے کہ اس پروانہ کی تعمیل ہوسکے آپ بیمار پڑ گئے۔ حکومت کو انتظار تھا کہ اچھے ہولیں تو گرفتار کرے۔ کہ اتنے میں پیمانۂ عمر ہی لبریز ہو گیا۔ اور مولانا "تنگی تم نے کہی تھی دنیا چھوڑے جاتے ہیں" کہتے ہوئے راہی عدم آباد ہوئے۔ لیکن اُن کی تصانیف پر نظر رکھنے والے جانتے ہیں کہ انہیں اپنی گرفتاری کا کوئی غم نہ تھا۔ کیونکہ خود ہی فرما چکے ہیں کہ ؎

پہنائی جا رہی ہیں ظالمان دیں کو زنجیریں
یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ہیں

ایک آخری بات اور سن لیجئے اور بس۔

مولانا اپنی نظم "مذہب یا سیاست" میں فرماتے ہیں کہ :—

تم کسی قوم کی تاریخ اٹھا کر دیکھو | دو ہی باتیں ہیں کہ جن پر ہے ترقی کا مدار
یا کوئی جذبۂ دینی تھا کہ جس نے دم میں | کر دیا ذرۂ افسردہ کو ہمرنگ شرار
یا کوئی جاذبۂ ملک و وطن تھا جس نے | کر دیئے دم میں قوائے عملی سب بیدار

یعنی حیات اجتماعی کے دوام اور انسانیت کی شیرازہ بندی کیلئے کسی نہ کسی رشتہ مشترک کا ہونا لازمی ہے۔ اقوام کی تاریخیں یہ بتاتی ہیں کہ قوائے عملی کو بیدار میں دو چیزوں کا خاص حصہ رہا ہے، جذبۂ ایمانی یا جذبۂ وطنی۔ اگر ان دو مشترک میں سے کچھ بھی نہ رہ جائے تو جمود لازمی ہے اور علامہ شبلی کو یہی شکایت تھی کہ ؎

آپ دونوں سے کئے دیتے ہیں ہم کو محروم | نہ سیاست ہی نہ ناموس شریعت کا مدار
مدتوں بحث سیاست کی اجازت ہی نہ تھی | کہ وفاداری مسلم کا تھا یہ خاص شعار
اب رہا جذبۂ دینی تو وہ اس طرح مٹا | کہ کبھی آپ ہی آتا ہو اب اس نام سے عار

یہی اشعار جو آخری نقل کئے گئے ہیں ان کی سیاسی تخیل کی جان ہیں۔ شبلی ان دونوں میں سے کسی قدر مشترک کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور مرتے دم تک اُن کی یہی تمنا تھی کہ اُن کے رفقاء کار، اُن کے آستانۂ علمی پر ناصیہ فرسائی کرنے والے، اُن کے عرفان کا دم بھرنے والے انہیں کچھ طرح ان دونوں مشترک قدروں کو سمجھیں اور پہچانیں۔ اقبال احمد سہیل اور ابوالکلام آزاد کو اُن کے اسوہ پر عمل پیرا ہونے کی توفیق ملی۔ مگر کسی اور کا تو کیا ذکر مولانا ظفر علی کے قدم بھی بالآخر ڈگمگا ہی گئے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

آرام گاہ شبلی کے قریب شبلی کے قائم کردہ نیشنل سکول کی چاردیواری کے اندر شبلی مرحوم کے زندہ جاوید کارنامے یعنی دار المصنفین کے متصل ہمارا اجتماع ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ جس طرح دو اہم سنوں میں انکی ولادت و وفات ہوئی تھی اسی طرح ایک اور اہم سن میں جب کہ دوسری عالمگیر جنگ نے اپنی دہکتی ہوئی آگ میں کرۂ ارض کو جھونک دیا ہے ہم اس عظیم المرتبت ادیب کی یادگار منانے کے لئے یکجا ہوئے ہیں۔ کاش یہ تحریک چلتی اور چلتی رہے اور جو صدا اعظم گڈھ سے بلند ہوئی ہے وہ ملک کے گوشے گوشے سے بلند ہو کر ہندستان میں غلغلہ بن جائے۔

افسوس ہے کہ ہمیں اپنے زعماء کی قدر کرنا نہ آیا۔ یوں تو "قدر مردم بعد مردم" ہمارا خاصہ ہی ہے۔ مگر مرنے کے بعد بھی ہم اس ذمہ داری کو محسوس نہیں کرتے۔ اگر کبھی احساس ہوا بھی تو اس جذبے نے زیادہ سے زیادہ عظمت و بزرگی کا اقرار کرا لیا، وہ بھی زبانی۔ ہم نے اپنے اکابر سے محبت کرنا نہیں سیکھا۔ پرستاران شبلی کی صف میں گنتے ہیں جن کے پہلو میں شبلی مرحوم کا دل ہے۔ اُس کے چشمۂ فیض سے سیراب ہونے والوں کی تعداد جلدی احصا میں نہیں آتی۔ مگر اُس کے چاہنے والوں کی تعداد کتنی ہے۔ لیکن شبلی ہماری عزت افزائیوں سے بے نیاز ہے۔ ہماری مجرمانہ بے اعتنائیوں کی اُسے پروا نہیں کیونکہ ؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

جدید شاعری میں عورت کا تصوّر

(از محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی)

جاگیردارانہ نظام کے کھنڈروں پر سرمایہ داری کی بنیاد رکھی جا چکی تھی۔ اس وقت ہندوستان میں عورتوں کی آزادی کی تحریک شروع ہوئی لیکن اس نظام میں عورت وہی حیثیت رکھتی ہے جو کسی بڑے گھرانے میں ایک فرد کی، اور ایسی صورت میں اس کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ پھر اس دورِ سرمایہ داری میں تو عورت کو یوں بھی کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ بورژوا تہذیب زندگی کے ہر شعبہ سے اسکو الگ رکھتی ہے اور اسی ماحول سے متاثر ہو کر ہمارے شعرا اس کو اسرارِ فطرت کی نہ سلجھنے والی گتھی سمجھنے لگے۔ انہوں نے کبھی تو اس کو عشرت کدہ میں بٹھایا، یا زیادہ سے زیادہ کبھی ڈرائنگ روم کا گلدستہ بنایا۔ غرض عیش و عشرت کی جب خلوت میں چاہا لے گئے۔ اور "آرٹ اور ادب" کے اس مجسمے کو عملی دنیا میں کبھی دیکھنا گوارا نہ کر سکے۔ اور آج اسی "شمعِ شبستانِ وفا" سے دنیا کا ادب موافق و مخالف پہلوؤں کے ساتھ تو بر علی نور نظر آ رہا ہے۔ سامنتی دور سے لیکر سرمایہ دارانہ دور تک ہمارے شاعر "عورت" کو برابر اسی طرح پیش کرتے رہے۔ لیکن ان تمام خرابیوں کا ذمہ دار کوئی ایک گروہ یا فرد نہ تھا بلکہ پورا نظام، جو اسے آگے بڑھنے نہ دیتا تھا۔ کیونکہ جب پورا نظام ہی ایک محور پر گردش کر رہا ہو تو عورت اس کی لپیٹ سے کس طرح نکل سکتی ہے۔ اور پھر وہ تو یوں بھی نفسیاتی اعتبار سے روایاتِ قدیم پر جان دیتی ہے۔ اور اس وقت قدم اٹھاتی ہے جب مرد اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

الغرض جب سامنتی کا دور ختم ہوا اور سرمایہ داری نے اس کی جگہ لی تو عورت بھی آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھی۔ باوجودیکہ یہ دور، سامنتی دور سے کہیں زیادہ ترقی پسند تھا۔ لیکن عورت کے لئے کچھ زیادہ مفید ثابت نہیں ہوا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ جیسے پہلے ایک عورت تنہا پورے خاندان کی ضروریات کو پورا کرتی تھی۔ ایک عورت سے کئی مرد بیک وقت شادی کر سکتے تھے۔ اب وہاں وہ شخصی ملکیت ہو کر صرف ایک ہی مرد سے ازدواجی تعلقات رکھ سکتی تھی۔ لیکن یہ پابندی مرد کے لئے لازم نہ تھی۔ اگرچہ اب کچھ پریشانیاں کم ہو گئیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ بعض خرابیوں کے نقوش اور ابھر آئے۔

کہنے کا مقصد تو یہ ہے کہ "آزادیٔ نسواں" ہو یا کوئی اور تحریک جب تک پورے نظام کی خرابیاں دور نہ کی جائیں گی، ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ ہندوستانی عورت نے جب اپنے قدم آگے بڑھائے تو بورژوا یورپ کی تقلید میں، یہ تحریک مفید بھی ہو سکتی تھی۔ اور عورت کی شریکِ کار بن سکتی تھی بشرطیکہ اس کا یہ اقدام پورے نظام کو سمجھتے ہوئے ہوتا۔ اس ناسمجھی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مخالفین کا ایک گروہ کھڑا ہو گیا۔ بہتوں نے اسکی خوبیوں پر نظر ڈالی لیکن وہ اس کے خوفناک نتائج سے ڈر کر خاموش ہو گئے۔ ہر نئی تحریک کو عوام مشکل سے قبول کرتے ہیں اور بالخصوص جبکہ اس کی بنیادیں کمزور ہوں۔

چنانچہ آزادیٔ نسواں کی یہ تحریک سرمایہ دارانہ ماحول میں خلط ملط ہو گئی۔ اس کے تصور سے لوگوں کے ذہن میں لندن اور پیرس کی مثالیں آ جاتی تھیں۔ اس جدت پسندی نے ان کو بورژوا حدود میں رکھا۔ جہاں اس کی حیثیت محض اشیاء کی سی تھی جس کو سرمایہ دار ایک خاص قیمت دینے پر ہی خرید سکتا ہو، مزدور کا گوشت بازار میں بکتا ہے اور عورت ایک امیرزادہ کی خواہشات کا مرکز بنتی ہے۔ اور اقتصادی کشمکش اسے ایسی ہی زندگی گزارنے پر مجبور کرتی ہے ———

ان تمام خصوصیات کو بورژوا طبقہ سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ جب تک کہ اس نظام کو بالکل ہی نہ بدل دیا جائے۔ اقتصادی بے چینی اس وقت دور ہو سکتی ہے جبکہ پرانی قدروں پر نئی قدریں غالب آ جائیں۔

ہر دور کے ادب میں کسی نہ کسی طرح عورت کا پرتو ضرور پڑتا ہے۔ خواہ کسی زاویے سے ہو۔ حالیؔ سے آج تک کا ادب اپنے دور اور ماحول سے متاثر نظر آتا ہے جس میں عورت بھی مختلف شکلوں میں ہمارے سامنے آ جاتی ہے۔

اقبالؔ نے بھی مخصوص نقطۂ نظر کے ماتحت عورت کو جانچا۔ لیکن وہ اس سلسلہ میں کسی حد تک اکبرؔ کے ہمنوا نظر آتے ہیں۔ اکبرؔ اور اقبالؔ دونوں نے بورژوا یورپ کو دیکھا جہاں کی تہذیب میں انحطاطی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ اکبرؔ چونکہ ہر چیز کو مذہب اور قدامت پسندی کی عینک لگا کر دیکھتے تھے یہی وجہ ہے کہ عورت کا تصور بھی لازمی طور پر اسی مخصوص نظریے کے ماتحت آ گیا چنانچہ وہ عورت کو ہمیشہ گھونگٹ کی آڑ میں ہی دیکھنا چاہتے ہیں ؎

حفظِ عصمت بھی یہی، لیکن یہ پردہ ہند میں — مسلموں کی جاہ و شان و تمکنت کی بات تھی
پردہ درکہتا ہے اب اسکی ضرورت ہی نہیں — میرزایانہ اداتھی سلطنت کی بات تھی
خون میں غیرت رہی باقی تو سمجھے گا کوئی — خوب تھا پردہ، نہایت مصلحت کی بات تھی

اس ضمن میں اخترؔ رائے پوری لکھتے ہیں: —

(حاشیہ) ئے سماجی حالات کے سب سے مستند نقاد اکبرؔ الٰہ آبادی ہیں۔ اکبرؔ الٰہ آبادی

تہذیب کے سب سے بڑے حامی ہیں۔ انہوں نے نئے نظام کے پہلو پر نکتہ چینی کی ہے۔ ہوٹل یعنی گھر کا تضاد، مادیت، گستاخی، کیٹیاں اور کانفرنسیں، بے پردگی، نئی تعلیم اور لا مذہبیت بھی اکبر کے چہیتے مضامین ہیں۔ یہی وہ برائیاں ہیں جن سے وہ کسی وقت بھی سمجھوتہ کرنے کے لئے تیار نہیں۔ اور جس پر انہوں نے بے نظیر طنزیہ گفتار کو صرف کیا۔ اکبر اپنے کلام میں اہلِ مستقبل کا تن تنہا اور بہادرانہ مقابلہ کرتے رہے اور اگر تاریخی قوتیں زورِ بیان سے رک سکتیں تو اکبر نئی تہذیب کو ہرگز رائج نہ ہونے دیتے۔"

علامہ اقبال بھی اسی خیال کو لیکر آگے بڑھتے ہیں۔ انہوں نے بالکل اسی انداز سے عورت کا جائزہ لیا۔ وہی مذہب کی عینک لگا کر جھکی جھکی آنکھوں سے۔ اقبال نے جب مغرب کی طرف نظر اٹھائی تو وہ پیرس، لندن اور امریکہ کی طرف گڑ کر رہ گئی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اُن کا جمہوری تصور ایک سراب ثابت ہوا جہاں پر ایک طبقہ جمہوریت کے نام پر حکومت کرتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ؎

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

ایسی طبقاتی حکومت میں عورتوں کی آزادی کا صحیح نظریہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اگر علامہ اشتراکی روس کی طرف نظر اٹھا کر دیکھتے تو ان کو ایک ایسا غیر طبقاتی نظام دکھائی دیتا جس کے ہر فرد کو معاشیاتی آزادی حاصل ہے۔ جہاں عورت کو صنف کمزور کہہ کر اُسکی حق تلفی نہیں کی جا سکتی۔ اُس کو معاشیاتی، سیاسی اور سماجی زندگی میں وہی حقوق حاصل ہیں جس کو سرمایہ دارانہ نظام میں صرف مردوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا ہے۔

اشتراکیت ہی وہ پہلا نظریہ تھا جس نے یہ محسوس کیا کہ تمام خرابیوں کی ذمہ دار روپیہ پیسہ کی غیر مساوی تقسیم ہے۔ کارل مارکس کا پورا فلسفہ اسی نظریہ کی توضیح ہے۔ اُس کے پورے فلسفۂ معاشیات سے انحراف ممکن ہے لیکن تاریخ عالم اس نظریئے کی پوری توضیح کر رہی ہے کہ جنگ کوئی حادثاتی شے نہیں۔ جو بنا جوالا مکھی کی طرح پھوٹ پڑے۔ بلکہ قوموں کی صف آرائی کے پیچھے طبقات کی صف آرائی بھی ہے۔ عوام کی بڑھتی ہوئی طاقت پر حکمراں طبقہ چیں بہ جبیں ہوتا ہے۔ اگر غیر ممالک کی لوٹ کھسوٹ اُس کا منہ بند نہیں کر سکتی تو وہ جبر و تشدد کے آہنی پنجوں سے اپنی طاقت کو بڑھانا چاہتا ہے۔ فاشزم انہیں حقیقتوں کا مظاہرہ ہے۔ آج دُنیا کا سرمایہ دارانہ تمدن ایک سسکتی ہوئی حالت میں ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہے۔ اُس کے لب تو جمہوریت کے خشک ترانے گاتے ہیں۔ لیکن اس کا ہاتھ ایک ایسے سنہرے ظرف پر ہے جس میں مظلوموں کا لہو بھرا ہوا ہے۔

اس موقع پر یہ بتا دینا ضروری ہے کہ سماجی رشتے خواہ وہ اخلاقی، معاشیاتی یا اقتصادی ہوں، سب کے سب محنت اور تقسیمِ اشیا کے رشتے سے بندھے ہیں۔ گو یہ ضروری نہیں کہ اس کی بنیادی تشکیل کے خدوخال ہر زمانہ میں واضح نظر آئیں۔ تمدن اپنی بنیادی اینٹوں پر ایسا حاوی ہو گیا ہے کہ اُسکی حیثیت انفرادی معلوم ہونے لگے۔ اور ہمیں یہ دھوکا ہو کہ اس کا رشتہ سر سبز کھیتوں سے نہیں بلکہ آسمان کی جھکی ہوئی پیشانی سے ہے۔

جس دورِ سرمایہ داری سے یہ ناسوت گذر رہا ہے۔ جہاں ہر فرد کا محدود ماحول دُنیا کے ماحول سے منسلک ہے اور جس کا ہر عمل اور ہر تجربہ دُنیا کے تمام عمل و تجربوں سے ہم آہنگ ہے۔ جو یقیناً اس کی تباہی کا ضامن ہے۔ لیکن ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ پیداوار خواہ وہ تمدنی ہو یا اقتصادی، ہر شخص کو اُس کی محنت کا صلہ ملنا چاہیئے اور یہ محنت اس کی ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں پر مبنی ہوگی۔ سماج کا یہ پہلا فرض ہے کہ وہ ہر فرد کو یکساں طور پر موقع دے۔ اور پھر یہ پیداوار پورے سماج کے تناسب سے منظم کی جائے تاکہ بلا امتیاز جنس ہر ایک اس کا برابر کا حقدار ہو۔ یہ ضرورتیں کھانے، کپڑے تک ہی محدود نہیں۔ ہر آرام، راحت اور فکری مشاغل میں بھی سب کو یکساں شمولیت کا موقع ملنا چاہیئے۔ سماجی زندگی کا یہ نظریہ آج رُوس میں کارکناں ہے۔

یہ وہ معیار ہے کہ جس پر ہمیں جدید شاعری کو پرکھنا ہے کہ انہوں نے عورتوں کو کہاں تک ہم آہنگ کیا۔ جوش جو ہماری جدید شاعری کے امام مانے جاتے ہیں۔ لیکن جدت کی جملہ خصوصیات کے باوجود اُن کے یہاں بھی عورت کو "صنفِ کمزور" سمجھا گیا ہے۔ وہ بھی حق اور باطل میں امتیاز نہ کر سکے۔ "مشرقی عورت" کا نظریہ بھی درحقیقت اسی "شاعرانہ تصور" کا جواز ہے۔ اُس کے چہرے کی شانِ اجتہاد سے خدوخال مٹے ہو جاتے ہیں۔ پھر چونکہ علم سے عقل بڑھتی ہے اور عقل کی تعریف حضرت جوش کے لفظوں میں یہ ہے۔ ع

جو بجھا دیتی ہے سینے میں محبت کا چراغ

یہاں بھی محبت کے چراغ کے پیچھے وہی جذباتی لذت کارفرما ہے اور یہی جنسی کشمکش جوش کے یہاں آخر تک واضح نظر آتی ہے۔ یہی احساس گنگر کرنے والی دوشیزہ کو دیکھ کر پیدا ہوتا ہے۔ کائنات کے انقلابی شعور کے باوجود جوش کے یہاں عورت کا تصور بالکل رومانی ہے۔ یہاں کہیں بھی اُسے سماجی زاویۂ نگاہ سے نہیں دیکھا گیا۔ وہ عورت کا بسترِ مرگ پر ہونا اس لئے برداشت نہیں کر سکتے کیونکہ اُنکی رومانوی دُنیا میں یہ کمی ناقابلِ تلافی ہے۔

جوش کے بعد ترقی پسند شعرا میں جو لوگ براہ راست اشتراکیت سے

متاثر تھے اُن کے یہاں عورت کا تصوّر، اس کی ترقی اور بہبودی پر منحصر ہے۔
مجازؔ وہ پہلا شاعر ہے جس نے عورتوں کی آزادی کا نفسیاتی زاویۂ نگاہ سے مطالعہ کیا۔ وہ جانتا ہے کہ عورت اپنے حُسن ہی کو پردہ بنا سکتی ہے۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

تری نیچی نظر خود تیری عصمت کی محافظ ہے
تو اس نشتر کی تیزی آزما لیتی تو اچھا تھا

یہاں اکبرؔ کے عقائد کا ایک کامیاب تضاد نظر آتا ہے جہاں اکبرؔ کے یہاں عورت صرف پردے میں بیٹھ کر ہی عصمت کی حفاظت کر سکتی ہے۔ وہاں مجازؔ کے یہاں اس کی نیچی نظر ہی اس کی عصمت کی حفاظت کرتی ہے۔ اکبرؔ کے یہاں عورت کیلئے ـــ

سرِ رہ گذر چھپ چھپا کر گذرنا
خود اپنے ہی جذبات کا خون کرنا
حجابوں میں جینا حجابوں میں مرنا (مجازؔ)

کے جو لوازمات مقرر ہیں وہ مجازؔ کے یہاں "کچھ کوئی اور شے ہے یہ عصمت نہیں ہے" نظر آتے ہیں۔ جوشؔ کی طرح مجازؔ کے یہاں بھی رومانی احساس موجود ہے۔ بلکہ بعض جگہوں پر تو لطافت میں اس سے کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ لیکن جنسیاتی لذت کا عنصر سرے سے مفقود ہے۔ وہ سیاسی زندگی میں بھی آگے پیچھے نہیں دیکھ سکتا۔ مثلاً اس کا یہ شعر ؎

ترے ماتھے پہ یہ آنچل بہت ہی خوب ہے لیکن
تو اس آنچل سے اک پرچم بنا لیتی تو اچھا تھا

ـــــــــ رومانی اور فنی نقطۂ نظر سے بھی بہت بلند ہے۔

اِس کے بعد ہم کو کچھ ایسے شاعر نظر آتے ہیں جن کے یہاں جنسیاتی لذت نمایاں ہے۔ اس سلسلہ میں میراجیؔ، راشدؔ، تمکور، جالندھری خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ وہ عورت کو جمالیاتی زاویہ سے دیکھتے دیکھتے اُس میں جنسیت کی ایک جھلک دیکھتے ہیں۔ اُن کے یہاں حوا کی تخلیق کا مقصد ہی یہی ہے۔ اُن کے نزدیک وہ ایک کھلونا ہے جس کو ڈرائنگ روم سے علیٰحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ جو اسی لئے پیدا ہوئی ہے کہ سوسائٹی کا بوجھ لیکر چلے۔ اُن کے یہاں سماج کے خلاف جو بغاوت نظر آتی ہے اُس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہاں معاشیاتی آزادی اور مساوات کا گلا گھونٹا جاتا ہے۔ بلکہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس سماج میں جنسی آزادی نہیں۔

راشدؔ عورت کو بستر خلوت سے الگ نہیں کر سکتے۔ اُن کے نزدیک عورت ایک محبوبہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ جس کی خوبصورتی اور نزاکت اُس کے ہر سیاسی مقصد کے لئے سدِّ راہ ہے۔ گویا عورت اور سپاہیانہ عزم ـــــ دونوں ایک دوسرے کے متراوف ہیں۔ وہ کہتا ہے ؎

تو مرے ساتھ کہاں جائے گی
راہ میں اونچے پہاڑ آئیں گے
دشتِ بے آب و گیاہ

کہیں کہیں یہ عورت اپنی اِس مشرقیت کو چھوڑ کر مرد کے ساتھ رقص بھی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں پر دوڑ کر منزل پر قدم لینے والا سپاہی اپنی ہم رقص کی آغوش میں پناہ لینا چاہتا ہے ؎

اے مری ہم رقص مجھ کو تھام لے
زندگی سے بھاگ کر آیا ہوں میں

اور کہاں تو وہ سپاہیانہ اُمنگیں تھیں اور کہاں اب ؎

جسم سے تیرے لپٹ سکتا ہوں میں
زندگی پر کیا جھپٹ سکتا ہوں میں

اور پھر بعض جگہ خود کو "طلسم جاوداں" میں کھونے کے لئے اپنے جذبات کے نشہ کو دکھاتے ہیں اور یہیں اپنی رُوح کی تکمیل کی جاتی ہے۔

فیضؔ کے یہاں عورت کو کوئی مستقل حیثیت نہیں ملی۔ اُس کا ذکر ہمیشہ ضمناً آتا ہے۔ مثلاً جب وہ اپنے جسم پہ قید، جذبات کی زنجیریں، گفتار پہ تعزیریں، اجنبی ہاتھوں کا بے نام گرانبار ستم دیکھتا ہے تو اپنی محبوبہ کو تسلّی دیتا ہے۔ ؏

آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

لیکن ان سب سے مختلف "خاک و خوں" کا شاعر اخترالایمان عورت کو بالکل ہی ایک نئے لباس میں پیش کرتا ہے۔ جہاں وہ ایک رجائی کردار ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے اور اپنے "نصف بہتر" ہونے کا ثبوت دیتی ہے۔ جب تھکا ہارا مرد نا اُمید ہو کر کہتا ہے۔ ؏

مجھ سے یہ تیرگیٔ شب نہیں دیکھی جاتی

تو عورت اُس تاریکی میں اُمید کی کرن دکھاتی ہے ؎

پر اسی تیرگیٔ شب میں ستارے بھی تو ہیں
میں تو ہلکی سی کرن لے کے بھی جی لیتی ہوں
اُس مسرت کے سہارے پہ جو آئے گی کبھی
کتنے ہی تلخ ہوں آنسو اُنہیں پی لیتی ہوں

اُس کو انسانیت کے ارتقاء پر مکمل بھروسہ ہے۔ اور اسی لئے اُسکو "انسان" کی طرف سے مایوسی نہیں ؎

آپ ہوں میں نہیں انسان سے مایوس ابھی
ابھی چھوٹے ہیں نگاہیں ابھی کم سن ہے بہار

شبنمی سبز لبادوں سے مہک آتی ہے
خاک و خوں توڑہی دینگے کبھی دیرینہ خمار

سید مطلبی فرید آبادی نے "جدائی کا گیت" لکھکر نہ صرف اس موضوع پر ایک کامیاب نظم کہی ہے بلکہ اردو ادب میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ دیس کا سپاہی جیل جارہا ہے۔ اُس کی محبوبہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اُسکو بادلِ ناخواستہ رخصت کررہی ہے۔ تو وہ اُسکو تسلی دیتا ہے۔ آنیوالے اچھے دنوں کے تصورات سے اس کو خوش کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ خوشی سے اسکو اجازت دے دے۔ ع

دو ہی دِنا کی بات ہے رانی میرا پلّا چھوڑ

وہ روتی ہے اور اُس کو جانے سے روکتی ہے۔ وہ بھی اپنے مصائب کو دیکھتا ہے۔ پھر بھی تسلی دیتا ہے ؎

پھر اچھے دن آئیں گے رانی — بچھڑے سب مل جائیں گے رانی
دیس کے باسی گائیں گے رانی — جھنڈوں کو لہرائیں گے رانی

احمد مجتبیٰ "وامق" بھی جب "اُس پار" کی دُنیا میں آزاد فضا کے دیوتا کو لینے کیلئے جارہا ہے تو اُس وقت اپنی محبوبہ سے اجازت لیتا ہے اور کہتا ہے ع

اُلفت کی سُہانی رات کہاں اب اور ترانے گاؤں گا

اس کی محبوبہ ہیرے جیسے اشک لنڈھاتی ہے اور یاقوت کے ایسے ہونٹوں کو چبانے لگتی ہے تو وہ اپنی ٹوٹی ہوئی ہنسی اُس کو سونپتا ہے اور کہتا ہے ع

دُنیا ہی نرالی پاؤگی جس وقت میں واپس آؤں گا

اور پھر ــــــــ

یہ صبح جو پھیکی پھیکی ہے فردوس نظر بن جائے گی
بوتل جو یہ خالی خالی ہے شہناز سحر بن جائے گی
رومان صفت آزاد نفس اک دور زمانہ لاؤں گا

لیکن اس کے بعد ایک ایسا بھی زمانہ آتا ہے جبکہ وہ اپنی محبوبہ کو اپنا "ہمراز" ہمنوا بنانا چاہتا ہے ؎

اِس اِک راز کا محرم تجھے بنانا ہے
وہ راز جس میں چھپی ہے دلِ زباں کی تپش
وہ راز جس میں ہے پوشیدہ زندگی کی خلش
وہ راز جس میں اِرادوں کے جال بُنتے ہیں
وہ راز جس میں بھڑکتے ہیں فکر کے شعلے

مگر ان تمام نظموں میں اب بھی کہیں کہیں کھلا کھلا بغاوت نہیں بلکہ ایک ہلکی سی جھلک ہم کو کیفی اعظمی کی نظم "عورت" میں فرد نظر آتی ہے۔

"عورت" کا شاعر جس وقت مرد ... کی طرف بڑھ رہا ہے اُس وقت وہ اپنی محبوبہ کو راستہ کی طرح چھوڑ کر جانے کیلئے تیار نہیں۔ وہ اسکی چھپی ہوئی عظمت سے آگاہ ہے۔ کیونکہ اس کی ٹھوکروں میں فردوسِ تمدن کی بہار ہے۔ اُس کی نظروں پر تہذیب و ترقی کا مدار ہے۔ اور اسی لئے وہ چاہتا ہے کہ اس میں بجلی کی سی تڑپ پیدا ہوجائے۔ اور وہ کو ندکر مجلس خلوت سے نکل آئے ــ

کیفی کو اُس کی حق تلفی کا بخوبی اندازہ ہے ؎

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں
تجھ میں شعلے بھی ہیں کچھ اشک فشانی ہی نہیں
تو حقیقت بھی ہے دلچسپ کہانی ہی نہیں
تیری ہستی بھی ہے اِک چیز جوانی ہی نہیں
اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے
اُٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

وہ عورت جو مردوں کے ڈرائنگ روم کا ایک مجسمہ ہے، کیفی کے یہاں :-

تو فلاطون وارسطو ہے تو زہرہ پروین
تیرے قبضہ میں ہے گردوں، تری ٹھوکر میں زمیں
ہاں اُٹھا جلد اُٹھا پائے مقدر سے جبیں
میں بھی رُکنے کا نہیں، وقت بھی رُکنے کا نہیں
لڑکھڑائیگی کہاں تک کہ سنبھلنا ہے تجھے

مہاتما بدھ

یہ ڈرامہ مسٹر ایس، ایس، رآمن ایم اے نے تلوگو میں لکھا تھا۔ پھر رآمن صاحب ہی نے اسے انگریزی کا جامہ پہنایا۔ انگریزی سے اُردو ترجمہ میرے منجھلے لڑکے سید علی مقتدی واحدی نے کیا ہے۔ جو ابھی طالبعلم ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ مقتدی کی پہلی کوشش کامیاب ہے۔ ترجمہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا اصل مضمون معلوم ہوتا ہے۔

زبان اچھی ہے اور ترجمہ کے لئے انتخاب بڑی اچھی چیز کا کیا گیا ہے۔ اس ڈرامہ میں سب مہاتما گوتم بدھ کی باتیں ہیں۔ سدارتھ اُن ہی کا اصلی نام ہے۔ (واحدی)

پہلا ایکٹ

(پہلا سین ——— محل)

بادشاہ :۔ چھینا! تم نے اس کے چہرے کے تغیر کو دیکھا؟

چھینا :۔ ہاں ان داتا! ان کی تو حالت ہی بدل گئی۔

بادشاہ :۔ آخر وہ اتنا پریشان اور دکھی کیوں رہتا ہے؟

چھینا :۔ وہ جب کبھی باہر تشریف لیجاتے ہیں تو تمام راستے سوچ بچار میں غرق رہتے ہیں۔ ان کو خلقت کے دکھوں کا احساس ہے

بادشاہ :۔ لیکن دکھ ایک شہزادے کو کیسے ڈرا سکتے ہیں؟

چھینا :۔ دکھ انہیں ڈراتے نہیں۔ بلکہ ان کی حساس آتما کو دکھی کرتے ہیں۔

بادشاہ :۔ اوہ! چھینا، مجھے بھگتوں کی پیشین گوئیاں یاد آتی ہیں۔ کیا ہم اسکو ان پریشانیوں سے دور نہیں رکھ سکتے۔

چھینا :۔ ان داتا! تمام دھرتی پر صرف قبر ہی ایک ایسی جگہ ہے جہاں ہم اپنے آپ کو ان پریشانیوں سے بچا سکتے ہیں۔ ورنہ دھرتی کے اوپر تو پریشانیاں ہی پریشانیاں ہیں۔

بادشاہ :۔ تو پھر اُسکو آئندہ ہر وقت گھر میں رہنا چاہیئے۔ وہ ایک نازک طبع بچہ ہے۔ ان پریشانیوں کا کیونکر مقابلہ کرسکیگا۔

چھینا :۔ بے شک وہ نازک طبع ہیں۔ لیکن حساس بھی، یہ ان کے لئے اور بھی خطرناک ہوگا کہ اُن کو بند رکھا جائے۔

بادشاہ :۔ لیکن بھگتوں کی پیشین گوئی ہے کہ جب وہ غم اور مصیبت کو دیکھے گا تو ہمارے ہاتھ سے نکل جائیگا۔ میں اُسے کیسے کھو دوں۔

چھینا :۔ لیکن ان داتا! ہم دنیا کے دکھ اُن سے کب تک چھپا سکتے ہیں۔

بادشاہ :۔ یہ میرا اکلوتا بیٹا ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ میرے لئے کیا کچھ معنی رکھتا ہے۔ کیا یہ دنیا کو تیاگ دیگا؟

چھینا :۔ انہیں سب کچھ دیکھنے دیجئے۔ اس سے دل نرم ہوگا لیکن دماغ مضبوط۔

بادشاہ :۔ نہیں چھینا! اُسے شاہی محل کے باغ سے بھی باہر قدم نہ رکھنا چاہیئے۔

چھینا :۔ ان داتا! بہتر تو یہی ہے کہ ہم انہیں شہر میں گھومنے دیں تاکہ وہ اپنی پرجا کو اس سے قبل کہ وہ ان پر حکومت کریں سمجھ سکیں۔

بادشاہ :۔ اُس نے کئی دفعہ شہر کا گشت لگایا ہے وہ ہمیشہ وہاں سے پژمردہ واپس آتا ہے۔

چھینا :۔ لیکن وہ محل میں بھی تو چین سے نہیں بیٹھ سکتے۔ انہیں آزاد فضا میں آزادی کے ساتھ سانس لینے دیجئے۔

بادشاہ :۔ چھینا! دیکھو ایک ترکیب سمجھ میں آئی ہے شہر کے گشت سے اُسے بہت دلچسپی ہے۔ ہم شہر کو ایسا کیوں نہ سجائیں کہ وہ دیکھکر سکھی ہو۔

چھینا :۔ تصہ یہ ہے کہ تکالیف اُن کے سامنے نہیں آتیں بلکہ وہ خود انہیں ڈھونڈ لیتے ہیں۔ یہ اُن کی آنکھوں کی خوبی یا خرابی ہے۔

(دوسرا سین ——— محل کا باغ۔ سدارتھ اور یشودھرا، میاں بیوی)

سدارتھ :۔ فضا کچھ اداس سی ہے۔

یشودھرا :۔ سورج دیوتا نراس ہیں۔ ایک فلسفی کی طرح جو ہمیشہ خیالات کے سمندر میں غرق رہتا ہے۔

سدارتھ :۔ آہ! میں غریب ہوں۔

یشودھرا :۔ آپ غریب! آپ تو شہزادے ہیں۔

سدارتھ :۔ دنیا کی دولت مجھے تسکین نہیں دیتی۔ یہ خوبصورت موتی جو سامنے قدرت کے سبز مخملی فرش پر بکھرے پڑے ہیں۔ مجھے انہیں اکٹھا کرنے کے لئے جانے دو۔

یشودھرا :۔ نہیں! وہ تو چھپتے ہوئے سورج کی کرنیں ہیں۔ آپ انہیں آہستہ آہستہ غائب ہوتے نہیں دیکھ رہے۔ یہ کرنیں آہستہ آہستہ وسیع آکاش میں آرام

کرنے چلی جائیں گی۔ جہاں پر تارے دن کو آرام کرتے ہیں۔ آپ راستے کے پھولوں کو روندتے ہوئے ان کے پیچھے کیوں بھاگنا چاہتے ہیں۔

سدارتھ :۔ اوہ! مجھے پیاس لگ رہی ہے۔

لیشودھرا :۔ آپ اپنے پاؤں کے نیچے بہتی ہوئی نہر میں لہروں کی اٹھکھیلیوں کی آواز نہیں سن رہے۔

سدارتھ :۔ نہیں لیشودھرا! یہ پانی میری پیاس نہیں بجھا سکتا۔ میں بادلوں کو آتے دیکھ رہا ہوں۔ کیوں نہ میں ان کا پانی قبل اس کے کہ وہ زمین میں جذب ہو پی لوں۔

لیشودھرا :۔ یہاں تو سخت پتھریلے پہاڑ ہیں۔

سدارتھ :۔ میں تھک گیا۔

لیشودھرا :۔ تو آئیے محل واپس چلیں۔

سدارتھ :۔ کوئی دنیاوی مکان مجھے سکون نہیں بخش سکتا۔ وہ دور آسمان میں گدھ کیوں پر پھڑا رہے ہیں؟

لیشودھرا :۔ یہ تو شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ ہے جو ہمارے سر کے گرد چکر لگا رہی ہیں۔ اوہو! کس قدر خوبصورت ہیں آپ کی زلفوں کے پیچ و خم ——

سدارتھ :۔ یہ تم اس طرح کیوں کانپ رہی ہو لیشودھرا؟ مت گھبراؤ۔

لیشودھرا :۔ آج آپ بہت ہی عجیب قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ میں کس طرح برداشت کروں۔

سدارتھ :۔ میں اس دنیا سے تنگ آگیا ہوں۔ میں اس دنیا کو نہیں پا سکتا جو میرے ہردے میں بسی ہوئی ہے۔

لیشودھرا :۔ میرے آقا میرے سپنے کی حقیقت کو باطل نہ کیجئے۔

سدارتھ :۔ کیسا سپنا؟

لیشودھرا :۔ میں نے دیکھا —— دور نیلے آکاش میں وسیع جھیل ہے۔ جہاں ایک پروں والا سفید ہاتھی کنول کے پھول توڑ توڑ کر چندرما پر بھینٹ چڑھا رہا ہے۔ چندرما سکون کے ساتھ ان پھولوں کی ایک مالا تیار کر رہا ہے —— بادل آہستہ آہستہ دھرتی کی طرف آتے معلوم دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے آپ کو اس سفید ہاتھی کی پیٹھ پر آکاش کی طرف اڑتے پایا —— مجھے چندرما کے قدموں میں ڈال دیا گیا۔ چندرما ہنسے اور بولے۔ "مالا تیار ہے اجازت دو کہ تمہاری گردن میں ڈال دوں"۔ میں کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ چندرما نے مجھے بوسہ دیا۔ اور میرا چہرہ فرط حیا سے سرخ ہو گیا۔ بادل گرجے ہاتھی نے ہوا میں ناچنا شروع کر دیا۔ جھیل میں بھی لہریں اٹھنا شروع ہو گئیں

شاید یہ سب ملکر خوشی منا رہے تھے، لیکن میں سرنگوں کھڑی تھی۔ گو دل میں میرے بھی خوشی کی موجیں اٹھ رہی تھیں۔ ہا ہا ہا! کس قدر سندر سپنا تھا۔ کیا یہ سچ ہو سکے گا؟

(چھینا داخل ہوتا ہے)

سدارتھ :۔ کیا رتھ تیار ہے؟ (باغ میں الّو بولتا ہے)

چھینا :۔ ہاں! میرے آقا۔

سدارتھ :۔ تو پھر آؤ چلیں۔

لیشودھرا :۔ ابھی مت جائیے۔

سدارتھ :۔ کیوں؟

لیشودھرا :۔ آپ نے الّو کی آواز نہیں سنی؟

سدارتھ :۔ سنی —— لیکن اس کے ساتھ ہی میں اپنے بے قرار دل کے دھڑکنے کی آواز بھی سن رہا ہوں۔

لیشودھرا :۔ آپ کو کہاں جانا ہے؟ —— کیا شکار کھیلنے؟

سدارتھ :۔ نہیں۔ ایسا ہی سمجھئے۔

لیشودھرا :۔ کس کا شکار......؟

سدارتھ :۔ بندگان خدا کے دلوں کا۔

لیشودھرا :۔ چھینا! یہ کیا کہہ رہے ہیں؟

چھینا :۔ آج شہزادے کو شہر میں گشت لگانا ہے۔

سدارتھ :۔ نہیں! سدارتھ کو دنیا میں ڈبویا گیا ہے۔

لیشودھرا :۔ چھینا! یہ آج دنیا سے اس قدر بیزار کیوں ہو رہے ہیں؟

(ایک پھول بھونرے کے نرغے میں نظر آتا ہے)

سدارتھ :۔ (جوش میں آکر) اوہ چھینا! دیکھو کوئی کیڑا اس پھول کو کھا رہا ہے۔ تم اسے بھگا نہیں سکتے۔

چھینا :۔ لیکن اس کیڑے کی غذا پھول ہے۔ اسے کیسے بھوکا مارا جا سکتا ہے۔

سدارتھ :۔ ان کیڑوں کی غذا صرف پھول ہیں۔ کل سے میرے باغ میں کوئی پھول نہیں ہوگا۔ میں پھولوں کے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔

چھینا :۔ تو پھر باغ کہاں رہے گا؟ بغیر پھولوں کے باغ کس کام کا؟

سدارتھ :۔ ہاں چھینا! پھر یہ پھولوں کا قبرستان نہیں رہے گا۔ اچھا اب مجھے کہاں چلنا ہے؟

چھینا :۔ شہر کے گشت کے لئے عالیجاہ!

سدارتھ :۔ کیا یہ تمہارا حکم ہے؟

چھینا :۔ نہیں ان داتا! یہ خود آپ کا حکم ہے۔ میں تو نقطار تھ تیار کر کے لایا ہوں۔

سدارتھ :۔ لیکن میں پھولوں کو کیڑوں کے رحم وکرم پر تو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔

چھینا :۔ مالی خود اسکی دیکھ بھال کر لیگا۔

سدارتھ : یشُھرا سے بہتر اور کون باغباں ہو سکتا ہے۔

یشودھرا :۔ پھر میں کیا ہوئی ؟

سدارتھ :۔ اسکی مُسکراہٹ اور آنسوؤں کا ذریعہ۔

(سدارتھ چھینا کے ساتھ چلا جاتا ہے اور یشودھرا اس پھول کی طرف رجوع کرتی ہے جس کو کیڑا کھا رہا ہوتا ہے)

تیسرا سین

(سدارتھ گھبرا کر اُٹھتا ہے اور پریشان پریشاں بسترِ خواب پر بیٹھ جاتا ہے)

غیبی آواز :۔ تم اپنی دھرم پتنی کی زندگی تباہ کرنے کیلئے تیار ہو!

سدارتھ :۔ کون کہتا ہے ؟

آواز :۔ اپنے ضمیر سے پوچھو

سدارتھ : میں اسکی زندگی تباہ نہیں کر رہا۔ اُس کے دماغ سے دھوکا اور فریب دُور کر رہا ہوں۔ مجھے اسکی زندگی صحیح معنی میں حقیقی اور محفوظ بنانے دو

آواز :۔ کیا تمہیں اس سے محبت نہیں ہے ؟ وہ تو تم سے پریم کرتی ہے وہ ہر تمہارے لئے جیتی ہے۔ تم ایسی معصوم رُوح کو ٹھکراؤ گے۔ ظالم ہو!

سدارتھ :۔ اگر اسکی رُوح مجھ سے محبت کرتی ہے تو میں اُسکو ہرگز ہرگز ٹھوکر نہیں مار رہا۔ میں اُسے محض گناہ آلود خواہشات کی دلدل سے نکال رہا ہوں میں بھی اُس سے محبت کرتا ہوں۔ ورنہ میں اس کو اس وقت کس طرح چھوڑ کے جا سکتا تھا۔ کیا تم میرا مطلب سمجھے؟ نہیں، تم میرے خیالات کی بلندی کو کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ کیا میں وحشی ہوں ؟

آواز :۔ تم اس بچے کا گلا گھونٹ کر اسے نجات کیوں نہیں دیدیتے۔ اس سے کیا فائدہ کہ وہ بغیر باپ کا کہلائے۔

سدارتھ :۔ بے شک! وہ میرا بیٹا ہے۔ اور جو کچھ ترکہ میں چھوڑ جاؤنگا وہ اُسے ملے گا۔

آواز :۔ تم کیا ترکہ چھوڑ کر جارہے ہو۔ تم تو دُنیا ہی کو تیاگ رہے ہو۔

سدارتھ :۔ زندگی اور انسانیت سے سچی محبت۔ یہی میرا ترکہ ہے۔ کیا یہ میرا نہیں ہو سکتا۔ اگر میں دُنیا کو تیاگ بھی دوں

آواز :۔ تم دغاباز ہو، احمق، تم پر لعنت ہو۔ یہی ہماری پھٹکار اور بددُعا ہے۔

سدارتھ :۔ بددُعا! کیا یہ میرے ضمیر کے آشیرواد کو رد کر سکتی ہے ؟ اچھا تو پھر دونوں آوازوں میں —— میرے ضمیر کی آواز اور اپنی آواز میں جو اس وقت جانے کہاں سے آرہی ہے —— کشمکش ہونے دو۔ بس زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں بہرا ہوں.....

چوتھا سین

(صبح کا وقت۔ انوما ندی کے کنارے ایک بڑ کے درخت کے نیچے گیروے لباس میں دریا کی لہروں کو تک رہا ہے۔ چھینا اُس کے آگے گھٹنوں کے بل جھکتا ہے۔ کنتھکا (گھوڑا) آسمان کی طرف دیکھتا ہے اور ایک دم ہنہناتا ہے)

چھینا :۔ کدھر میرے آقا؟

سدارتھ :۔ یاترا کو۔

چھینا :۔ ایک کوئل کی طرح جو موسم بہار میں چہچہاتی ہے (اور پھر اپنی منزل کی طرف رجوع کرتی ہے)

سدارتھ :۔ نہیں۔ اس کی طرح جو سماج کی زنجیروں کو ہمیشہ کے لئے توڑ دے۔

چھینا :۔ پرندے ہوا میں اُڑ سکتے ہیں لیکن گھونسلے کے بغیر زندگی بسر نہیں کر سکتے۔

سدارتھ :۔ لیکن اگر گھونسلا پنجرے کی شکل اختیار کر لے تو —— ؟ چھینا! تمہیں میرے چہرے پر کچھ تغیر نظر آتا ہے ؟

چھینا :۔ نہیں —— چمکدار ہے، ہمیشہ کی طرح۔

سدارتھ :۔ پژمُردگی نہیں ہے۔ لیکن میری آنکھوں میں ؟

چھینا :۔ آنسو۔

سدارتھ :۔ ہاں! خون کے آنسو۔ جو انسان کی بدقسمتی پر بہائے گئے ہیں۔

چھینا :۔ آپ کو آبِ حیات کا پیالہ پیش کیا گیا ہے۔ آپ اُسے پی کیوں نہیں لیتے۔ اسے مت ٹھکرائیے۔ میرے آقا! آنکھیں کھولئے!!

سدارتھ :۔ کیا مطلب ؟ میری آنکھیں کھلی ہوئی نہیں ہیں۔ آنکھ بند رکھکر میں رات کی سیاہی کے گہرے بادل کیسے چیر سکتا تھا۔

چھینا :۔ آپ کے پاس آنکھیں ہی نہیں ہیں۔

سدارتھ :۔ نہیں۔ میں اندھا نہیں ہوں۔

چھینا :۔ مگر آپ کا دل اندھا ہے —— کہاں تھیں اسکی دھڑکنیں جب تم نے میری معصوم ماں کو رنج وغم کے اتھاہ سمندر میں پھینکا تھا۔

کے نقشے ذہن میں نہ معلوم مجھے کیا کیا مسرتیں منقش نظر آ رہی تھیں۔

خط چاک کر کے میں نے پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔ "بھائی جان سلام :
جب سے آپ گئے ہیں میرا جی نہیں لگتا۔ اماں جان بھی آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔ وہاں آپ کیا کرتے ہیں۔ اب کب آئیے گا۔" میں بہت دیر تک خط پڑھتا رہا۔ کئی بار اور پھر ایک مرتبہ تصورات کی دُنیا میں کھو گیا۔

پروین کے خط ہر دوسرے تیسرے دن آتے تھے۔ میں بھی فوراً جواب دیتا۔ کبھی وہ لکھتی :-

"شاید آپ کو یاد ہو کہ ہم نے اور آپ نے جو کیاریوں میں گلاب لگائے تھے اب اُن میں کلیاں آ گئی ہیں۔ دو ایک روز میں پھول بھی آ جائیں گے۔ میں روز صبح اُٹھکر مُنہ اندھیرے پانی دیتی ہوں ——— ہماری گائے نے جس کا نام آپنے موہنی رکھا تھا بچھڑا دیا ہے وہ بہت چلاتا ہے۔ شاید آپ کو یاد کرتا ہے۔"

جب میں پروین کا خط پڑھتا تو سکول کی تمام کوفت دُور ہو جاتی میں سمجھنے لگتا کہ میری بھی ایک بہن ہے۔ اب میں دُنیا میں اکیلا نہیں ہوں۔

چھٹیاں ہوئیں۔ میں گاؤں گیا۔ پروین کیلئے بُندے لیتا گیا۔ میں نے اُسے پہنا کر پوچھا "پروین! تم کتنی اچھی بہن ہو۔"

"اور آپ کتنے اچھے بھائی ہیں۔" اُس نے مُسکرا کر جواب دیا۔

"میرا حقیر تحفہ بھی قبول ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے اُس نے ایک خوبصورت ریشمی رومال جس کے کونے پر "راحت" خوبصورت پھولوں کے کنج میں چمک رہا تھا میرے ہاتھ میں دیدیا۔

"تم نے میرا نام کس کی اجازت سے کاڑھا۔" میں نے شرارتاً کہا
"اور آپ میرے لئے بُندے کس کی اجازت سے لائے۔" اُس نے مُسکرا کر برجستہ جواب دیا۔

———:(۸):———

چھٹیاں ختم ہونے پر میں دلی واپس آ گیا۔ پروین کے خط برابر آتے رہتے تھے۔ میں بھی فرصت کے اولین لمحات میں اسکے خطوں کا جواب دیتا۔ امی بھی اکثر اپنے خطوں میں لکھتیں کہ پروین تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔

عیش و مسرت کے دن بھی کتنی جلدی گذر جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانچ سال گذر گئے۔ میں سکول کی محدود فضا سے نکلکر کالج کے وسیع میدان میں آ گیا۔ نئی دُنیا نئی دلچسپیاں، نئے ساتھی، نئی اُمنگیں۔ مگر میں ہنوز پُرانا تھا۔

پروین بھی عہدِ طفلی سے شباب کی سمت آ رہی تھی۔ اب اسکے خطوں میں ایک خاص تبسم کی چاشنی ہوتی تھی۔ میں پڑھتا اور دیر تک لُطف اندوز ہوتا جیسے ایک بچہ اپنی بہن سے کوئی دلچسپ کہانی سُنکر اپنے آپ کو بھی اسی رنگین ماحول میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ بالکل اسی طرح میں پروین کے خط پڑھتا اور اسکی شوخی تحریر اور رنگین بیانی سے محظوظ ہوتا۔

ایک خط میں اُس نے لکھا۔ "اب تو آپ کالج میں آ گئے ہیں۔ نئے ساتھی اور کالج کی رومانی فضا میں مجھے فراموش نہ کیجئے گا۔"

میں نے اُسے لکھا۔ "بہن پروین! تم بھی کتنی سادہ لوح ہو۔ وہ صرف میرے ساتھی ہیں اور تم میری بہن ہو۔ تم میں اور اُن میں کتنا فرق ہے۔ اب تم خود ہی فیصلہ کر لو کہ کون بھلایا جا سکتا ہے اور کون یاد رکھا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ اور بات ہے کہ تم "اپنے گھر" جا کر مجھے بھول جاؤ۔

تیسرے دن پروین کا خط آیا۔ اُس نے لکھا :-

"بھائی جان! آداب! آپ نے لکھا ہے کہ یہ اور بات ہے کہ تم اپنے گھر جا کر مجھے بھول جاؤ ——— اپنے گھر سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ کیا اب میں اپنے گھر نہیں ہوں ——— اچھا اب میں سمجھی ——— اپنے گھر سے آپ کا یہ مطلب ہے نا کہ جب میرا ——— میرا بیاہ ہو جائیگا ——— ہیں نا ——— آپ بڑے ویسے ہیں ——— دیکھئے آئندہ ایسی بات نہ لکھئے گا۔"

اسی طرح ہماری اس خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک مرتبہ خلافِ معمول اُس نے خط کا جواب نہ دیا۔ مجھے بہت پریشانی ہوئی۔ کہیں خدانخواستہ طبیعت ناساز نہ ہو۔ لیکن ایسے موقع پر خالہ اماں یا امی کوئی میرے خط کا جواب ضرور دیدیتا۔ عام طور سے تیسرے دن جواب آ جاتا تھا مگر اب پانچواں روز تھا۔ اب مجھے اور بھی فکر لاحق ہوئی۔ خدا معلوم کیا حادثہ پیش آیا۔ چھٹے روز مجھے جواب ملا بہت مختصر اور مجمل۔

"بھائی جان! آپ نے نہ معلوم کیا کیا شکوک میرے جواب نہ دینے سے پیدا کئے ہوں گے۔ مگر کاش آپ میری مجبوری سمجھ سکتے۔ کچھ لوگ اب ہماری آپکی خط و کتابت پر اعتراض کرتے ہیں۔ آپکی بہن پروین۔"

اعتراض کرتے ہیں! ہماری خط و کتابت پر!! کیوں؟ کیا ایک بھائی بہن کو خط نہیں لکھ سکتا؟ ——— کیا یہ جرم ہے؟ آخر کیوں؟ میں انہیں خیالات کی گتھیاں سلجھا رہا تھا کہ میری نظر دوسرے لفافہ پر پڑی جو پاس ہی گھاس پر پڑا تھا۔ یہ امی کا خط تھا۔ کیا لکھا تھا؟ بس کچھ نہ پوچھو ——— وہی امی جنہوں نے یہ کہا تھا کہ "اب بنا لے بہن تیری بہن ہی تو ہے۔" آج خط میں لکھ رہی ہیں :-

"بیٹا! تم کچھ ناسمجھ تو ہو نہیں۔ بچپن کا نانا سمجھی کا ہوتا ہے جب ریت

کا مکان بنا کر محل سرا سمجھتے ہیں اور ٹھیکری کے ٹکڑے روپہلی سنہری سکوں سے زیادہ بیش قیمت نظر آتے ہیں۔ تم کالج میں پڑھ رہے ہو۔ زمانہ کے نشیب و فراز سے واقف ہو۔ میں نے مانا کہ پروین کو تم بہن سمجھتے ہو۔ مگر اور لوگ تو ایسا نہیں سمجھتے۔

ابھی چند روز ہوئے ماما آئی، کام کرنے کے بعد میرے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولی - بی بی ایک بات کہوں۔ اگر ناراض نہ ہوں تو ــــ میں نے کہا ہاں ہاں ضرور کہو۔ تو اُس نے رُکتے رُکتے اتنی بات کہی کہ تحصیلدار صاحب کی بیٹی (پروین) کے پاس چھوٹے میاں (تم) کے کچھ خط اور ایک تصویر نکلی۔ وہ بڑے ناراض ہو رہے تھے۔ وہ تو اتنا کہکر چپ ہو گئی۔ میں نے بہتیرا پوچھا مگر اس نے اور کچھ نہ بتایا۔ میں تو پہلے ہی ڈرتی تھی کہ کچھ نہ کچھ شگوفہ ضرور کھلے گا۔ تم سمجھدار ہو۔ اب خود خیال رکھنا۔ تمہاری امّی "

میں خط پڑھکر سناٹے میں آگیا۔ سر سے پاؤں تک گویا برقی رَو دوڑ گئی ایسا معلوم ہوا جیسے زمین آسمان مکان، در و دیوار، درخت بڑے زور سے گھوم رہے ہیں۔ چاند، تارے، سورج بڑی تیزی سے گردش کر رہے ہیں۔ اجرام فلکی ایک دوسرے سے ٹکرا کر عنقریب فنا ہو جائیں گے۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ بارات ہو رہی تھی۔ اور بس ــــ آدھ گھنٹہ بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں کرسی پر پڑا ہوں اور باوجود ماہ دسمبر کی خنک ہوا کے میں سر سے پاؤں تک پسینہ میں ڈوبا ہوا ہوں۔ بڑی مشکل سے اپنے کمرے میں آکر پلنگ پر لیٹ سکا۔ میں نے سوچا ایسا کیوں ہے۔ مجھ میں اور پروین میں اب کون سی نئی بات پیدا ہو گئی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اب ہم بچپن کے معصوم دور سے نکل کر جوانی کے حدودِ ہوش میں آگئے ہیں۔ لوگ کیا خیال کرتے ہیں۔ کیا سب کے دل اِس درجہ تاریک ہیں کہ وہ سوائے گناہ و معصیت کے خلوص و اُلفتِ صادق کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتے۔ میری اور پروین کی محبت سے کیوں شک پیدا ہوتا ہے؟ کیا صرف اس لئے کہ ہم دونوں جوان ہیں اور غیر ہیں۔ کیا ایک عورت اور مرد کے درمیان جنسی تعلقات کے علاوہ کوئی تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ افسوس دُنیا کی نظریں کس قدر ظاہر بیں ہیں۔ پروین پر کیا گذر رہی ہوگی؟ میں جانتا تھا کہ پٹھانوں کی قوم میں جذبۂ غیرت اور ساتھ ہی ساتھ بدگمانی کا جذبہ بہت شدید ہوتا ہے۔ وہ دُنیا بھر کی باتیں برداشت کرتا ہے لیکن جہاں اسکی غیرت مجروح ہوتی ہے اور جذبۂ قومی کو ٹھیس لگتی ہے وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اور وہ کر گزرتا ہے جسکی توقع ایک ذی ہوش اور سمجھدار آدمی سے نہیں کی جا سکتی۔ پروین کے والد صاحب داد خاں سرحدی پٹھانوں میں سے تھے۔ خدا معلوم کیا سمجھے ہونگے اور کیا کر گزرے ہونگے۔ لیکن پروین کے پاس میرا فوٹو کس طرح پہنچا۔ میں نے بہت غور کیا مگر کسی طرح سمجھ میں نہ آیا۔ کئی روز بعد جب میں اسی خیال میں تھا تو اچانک یاد آیا کہ سکول کے زمانہ میں جب میں کرکٹ کیپٹن تھا اس سال فائنل میچ جیتنے پر ساری ٹیم کا گروپ کھنچا تھا۔ میں نے اس میں سے اپنا فوٹو الگ کر لیا تھا۔ اسکے بعد ہی سال [illegible] تعطیل میں جب میں گھر گیا تو پروین نے جہاں جملہ اشیاء کی تلاشی لی وہاں [illegible] میں پر بھی نظرِ عنایت ہوئی اور وہ تصویر بحق سرکار ضبط کر لی گئی [illegible] ہر چند کہا کہ میں تمہیں دوسری دیدونگا۔ یہ میری کپتانی کے زمانہ کی ہے۔ مگر وہ کہاں ماننے والی تھی۔ بغرض یہ تصویر وہ تھی۔

کالج میں میری طبیعت بڑی اُلجھتی۔ خدا معلوم محض شک کی بنا پر بیچاری پر کیا بیتی ہوگی۔ ادھر امّی کا بھی ایک خط اور آیا جس میں اسی قسم کی نصیحتیں، رسوائی و بدنامی کا خوف، دھمکی اور خدا جانے کیا کیا تھا۔

کئی ہفتہ بعد ایک دن کالج کے پتہ پر پروین کا خط ملا۔

" بھائی جان! اپنی بدنصیب بہن کا سلام قبول کیجئے۔

آپ کو خالہ اماں کے خط سے بہت سی باتوں کا پتہ ہو گیا ہوگا۔ قصہ یوں ہوا کہ ابا چھٹی لیکر آئے تھے۔ ایک دن میں آپ کے خط کا جواب لکھ رہی تھی۔ اُنہوں نے پوچھا کیا لکھ رہی ہے؟ میں نے کہا خط ــــ

"کسے؟" میں نے آپ کا نام لیا۔ اُنہوں نے سُنتے ہی ناک بھوں چڑھائی ــــ "راحت! کون راحت؟" میں نے آپ کا پتہ بتایا۔ اُنہوں نے کہا " اچھا وہ ــــ اُسے کیوں لکھ رہی ہے۔ کیا تعلق ہے اُس سے؟ کون لگتا ہے وہ تیرا؟" غرض اُن کا غصہ ایک دم بڑھ گیا۔ اللہ جانے وہ کیا سمجھے اور مجھے بہت بُرا بھلا کہا ملعون، مردود، ننگِ خاندان، کلنک کا ٹیکا۔ اور خدا جانے کیا کیا کہا۔ میں سب سُن رہی تھی اور خون کے سے گھونٹ پی رہی تھی۔ میں نے وہ خط پھاڑ ڈالا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ میں ایک دن عصمت کے گھر گئی تھی۔ اُن کو میرے پیچھے نہ جانے کہاں سے وہ آپ کی تصویر مل گئی۔ اب تو گویا آگ پر تیل پڑ گیا۔ اسکو دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ جس وقت میں ڈولی سے اُتری تو اُن کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ گردن کی رگیں پھول گئیں۔ دُنیا بھر کے خطابات مجھے دیئے گئے۔ مگر وہ ابا جنہوں نے مجھے آج تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا آج مارنے کو دوڑے۔ وہ تو امّی بیچ میں آگئیں۔ ورنہ مجھے خود یہ " اقدامِ گناہ " نہ کرنا پڑتا۔

بھائی جان! دنیا والوں کی آنکھیں سطحی چیزیں دیکھنے کی عادی ہیں۔ انکی عقل اس درجہ محدود ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ایک نوجوان مرد اور عورت ہر قسم کی خواہشات سے الگ ہو کر بھی مل سکتے ہیں۔ یہ بات ان کی فہم سے بالاتر ہے کہ وہ دونوں سچی محبت بھی کر سکتے ہیں۔ وہ محبت جو ایک بھائی کو بہن سے ہوتی ہے سماج کے یہ دیوتا جو خود ساختہ خلافِ فطرت قوانین کو جو اُن کی نظر میں اللہ اور اسکے

وصل کے قانون سے بھی بڑھکر ہیں۔ کسی حالت اور کسی حالت میں فراموش کرنے کیلئے تیار نہیں۔ ان کی آنکھوں اور آنکھوں سے زیادہ ان کی عقلوں پر اس قدر پردے پڑے ہوئے ہیں کہ اُن کے ذہن میں محبت کا اصلی مفہوم کبھی آ ہی نہیں سکتا۔ محبت کے معنی اُن کی لغت میں گناہ معصیت اور [illegible] کے علاوہ کچھ نہیں۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ محبت نام ہے ایک پاکیزہ جذبہ محبت جسموں کو ملانے والی نہیں بلکہ روحوں کو ایک کرنے والی ہے —— محبت اور خواہشات میں شبنم اور آفتاب کا تعلق ہے۔ جس طرح خورشید کی کرن کے سامنے قطرۂ شبنم نہیں ٹھیر سکتا اسی طرح محبت کی چمک اور دمک کے سامنے خواہشات کا سمندر بھی نہیں رُک سکتا۔ جس طرح تمازت آفتاب قطرہ کو بھاپ بنا کر اُڑا سکتا ہے۔ اسی طرح سچی محبت کی تپش بھی خواہشات کے اتھاہ سمندر کو ایک لمحہ میں پایاب کر سکتی ہے

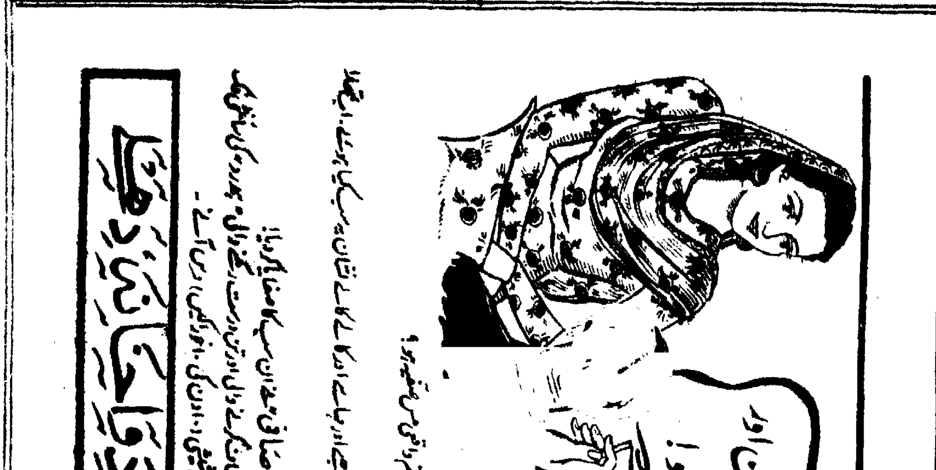
خیر بھائی جان! مجھ سیاہ بخت کا یہ آخری خط ہے جو آپ کو ملیگا اب میں جا رہی ہوں —— دُور بہت دُور —— ان سفید بادلوں سے بھی پرے۔ جہاں سب کو جانا ہے۔ لیکن جہاں سے جا کر کوئی واپس نہیں آتا۔ میں جا رہی ہوں۔ دنیا والوں کی نظروں سے لیکن آپکی نظروں میں ہمیشہ رہونگی۔

اچھا پیارے بھائی جان! اجازت رخصت۔ کیونکہ میرا جام زندگی لبریز ہو چکا ہے اور بس چھلکنے کی دیر ہے۔

آپ کی بدنصیب بہن پروین

دفعۃً راحت میں مجھے یہ خط ملا خط پڑھتے ہی میری عقل و ہوش پر بجلی سی گر پڑی جس نے تمام احساسات کو جلا کر سیاہ کر دیا۔ میں سکتہ کے عالم میں رہ گیا۔ کالج کا گھنٹہ بجا اور ختم بھی ہو گیا۔ مجھے اس وقت ہوش آیا جب کالج کے چپراسی نے نیم بے ہوشی کی حالت میں دیکھکر میرا بازو ہلایا۔ میں چونک پڑا —— میری آنکھیں دل کے اس سیاہ داغ کو دھونے لگیں۔ میں اسی وقت ہوسٹل میں واپس چلا آیا۔

آہ! میری زندگی کے سیاہ خانہ میں روشنی کی ایک کرن پیدا ہوئی تھی مگر سیاہ خوفناک بادلوں نے اُسے بھی غائب کر دیا۔



ایک روسی افسانہ

بادۂ کہن

(از جناب ڈی، پی بھٹناگر گشتہ دہرہ دون)

الیاس کی ساری زندگی انگوروں کے باغیچوں کی جو اسے اپنے والد اجداد سے وراثت میں ملے تھے، دیکھ بھال میں ہی صرف ہوئی تھی۔ اس کو بچپن سے ہی اس کام میں دلچسپی تھی۔ اور آج تک وہ اسے نہایت انہماک اور جانفشانی سے انجام دیتا رہا تھا۔ اُسے خواب میں بھی کوئی دوسرا کام کرنے کا خیال نہ آیا۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اگر وہ کوئی دوسرا دھندا کرتا بھی تو اس میں کامیاب نہ ہوتا۔

جوانی میں وہ گاؤں کے شریف، نیک نفس اور خوش طبع نوجوانوں میں شمار ہوتا تھا۔ خوش قسمتی سے اُسے بیوی بھی اسی کے مزاج کے موافق خوبصورت، ہنس مکھ اور نیک مزاج ملی۔ انگوروں کی فصل میں وہ ہر کام میں اپنے خاوند کے شانہ بشانہ رہتی۔ انگوروں کے خوشے توڑنے کیلئے جب وہ ایک بیل سے دوسری بیل پر نہایت پھرتی سے ایک تتلی کی مانند جاتی تو الیاس کی محبت آمیز نگاہیں اُس کے گداز شباب کا تعاقب کرتیں اور جب وہ الیاس کی جانب اٹھلا کر دیکھتی تو تمام باغیچہ مسرت کی فضا سے معمور ہو جاتا۔ الیاس ایک لمحہ کے لئے کھڑا ہو کر سوچنے لگتا کہ جس طرح اُن انگوروں کی بیلوں پر ہر سال شباب آتا ہے۔ کیا اسکی محبوبہ کا شباب بھی دوام رہے گا۔

یہ بات بائیس سال پرانی ہے۔ الیاس کی شادی کے چند سال بعد قدرت نے انہیں اس باہمی محبت کا ثمرہ عطا کیا۔ اُن کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ اُنہوں نے اس لڑکے کا نام نکولے منتخب کیا۔ اور دونوں اسکی پرورش اور دیکھ بھال میں منہمک رہنے لگے۔ اُن کی ہر ممکن کوشش یہی تھی کہ اُن کا اکلوتا بیٹا ایک ہونہار لڑکا ثابت ہو۔ انہیں کی طرح نیک طینت، خوش اخلاق اور شریف النفس ہو۔ اور بالغ ہو کر یہ سمجھ سکے کہ اسکی زندگی کا مقصد کیا ہے۔

نکولے کی پیدائش کے سال بھر بعد ایک روز الیاس کو ایک خبط سوار ہوا۔ اُس نے انگوروں کی خود کشید شراب کا ایک بڑا برتن بھرا اور باڑے کے قریب ہی گڑھا کھود کر اُس میں دفن کر دیا۔ اور یادگار کے لئے وہاں ایک چیری کا پودا لگا دیا۔

اُس نے اپنی بیوی سے کہا۔ اب اس شراب کو ہم نکولے کی شادی کے موقع پر ہی نکالیں گے۔ اس تقریب میں یہ ایک نایاب چیز ہوگی۔

متذکرہ بالا واقعہ کو بائیس سال گذر گئے۔ اس عرصہ میں بہت سی تبدیلیاں ہوگئیں۔ الیاس ایک معمر شخص ہوگیا اور اسکے سیاہ بالوں میں سپیدی اس طرح نمایاں ہونے لگی جیسے رات کے دھندلکے میں مدھم ستارے۔ اس کا لڑکا نکولے ایک خوبصورت جوان ہوگیا۔ اور وہ چیری کا پودا بھی اپنے ساتھی نکولے کی طرح ایک تومند اور جوان ہوگیا۔ گاؤں نے بھی بڑی ترقی کرلی۔ وہاں کسانوں کی ایک انجمن قائم ہوگئی اور الیاس کو اُس کا صدر بنا دیا گیا۔ الیاس کو اب باغیچوں کی دیکھ بھال کرنے کی فرصت ذرا کم ہوتی تھی۔ ایک روز اتفاق سے اُس کا گذر اُس طرف ہوا جہاں وہ چیری کا درخت تھا۔ اُس کو دیکھتے ہی الیاس کو بائیس سال پرانی بات یاد آگئی۔ وہ سوچنے لگا۔ وقت کی رفتار کس قدر تیز ہوتی ہے۔ ایک عمر گذر گئی۔ مگر ہر واقعہ کل کی سی بات معلوم ہوتا ہے۔ یہ چیری کا پودا اس وقت ذرا سا تھا۔ اور آج۔ آج پورا درخت ہے۔ ایک ثمر باثمر۔ یہ نکولے کا بچپن کا ساتھی ہے۔ ہر سال پھولتا اور پھلتا ہے۔ اور وہ شراب۔ ارے کہے تو میں بھول ہی گیا تھا۔ وہ بھی تو بائیس سال پرانی ہوگئی۔ بڑی تند شراب ہوگئی ہوگی نکولے بھی جوان ہوگیا ہے اسکی شادی۔ ہاں میں نے وعدہ کیا تھا کہ اس شراب کو اسکی شادی کے موقعہ پر نکالا جائیگا۔

الیاس اسی خیال کو لئے ہوئے گھر آیا اور اپنی بیوی سے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ —"میں تو خود ہی تم سے اس کے متعلق کہنا چاہتی تھی۔" اس نے تبسم لہجہ میں کہا۔

ماں باپ کی فکر و توجہ سے نکولے کی شادی انہیں کے گاؤں کے ایک شریف اور متمول گھرانے میں طے ہوگئی۔ اور اس کی تاریخ بھی مقرر ہوگئی۔ مگر قدرت کو یہ خوشی منظور نہ تھی۔ اچانک جنگ شروع ہوگئی۔ امن و سکون خوف و ہراس کے بادل منڈلانے لگے۔ خوشی و مسرت اضطراب و بے چینی کی نذر ہوگئی۔ تمام ملک اس بلائے ناگہانی کے مقابلہ کی فکر میں مبتلا ہوگیا۔ ہر شخص جوان اور بوڑھے۔ مرد و زن سبھی کو ملک کی حفاظت کی فکر دامنگیر ہوئی۔ قوم کے نوجوان۔ وطن کے جانباز۔ یکے بعد دیگرے دشمن کو زک دینے اور انتقام لینے کیلئے فوج میں بھرتی ہونے لگے۔

نکولے بھی فوج میں بھرتی ہو کر محاذ جنگ پر چلا گیا۔ بوڑھے الیاس اور اسکی بیوی کی مسرتیں یاس و نا امیدی کا شکار ہوگئیں۔ شادی کی تاریخ اختتام جنگ تک کے لئے التوا میں پڑ گئی۔

جنگ روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ جرمن فوج سیلاب کی طرح اُمڈی چلی آ رہی تھی۔ موت ہر گھڑی طیاروں کی صورت میں فضائے آسمانی میں منڈلاتی رہتی تھی۔ ہر سمت تباہی اور بربادی کے ہیبت ناک مناظر نظر آتے تھے۔ لاتعداد پختہ عمارتیں دشمن کے پھینکے ہوئے بموں کی زد میں آکر کھنڈر بن گئیں۔ نہ معلوم کتنے گاؤں نذرِ آتش ہو گئے۔ اور نہ جانے کتنے شہر گورستان میں تبدیل ہو گئے۔ دشمن کے ہوائی حملوں کے شروع ہوتے ہی ایک شورِ قیامت بپا ہونے لگتا تھا۔ آناً فاناً میں معصوم بچوں کی لاشیں، بے جان ماؤں کی آغوش میں نظر آنے لگتیں۔ جگہ بجگہ بوڑھے آدمیوں کے مُردہ جسم اپنی بے بسی کا منظاہرہ کرتے۔

اچانک ایک منحوس شب کو بوڑھے الیاس پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا اس رات کو جرمنوں نے اس گاؤں پر بموں کی بارش کی۔ الیاس کی بیوی اُن کی زد میں آ گئی اور راہیِ ملکِ بقا ہوئی۔ غریب الیاس اس صدمۂ جانکاہ کی تاب نہ لا سکا اس پر اس غمِ جانگسل کا اتنا زیادہ اثر ہوا کہ اس کے سر کے تمام بال برف کی مانند سفید ہو گئے۔

آئے دن کے جرمن حملوں نے اُسے اور بھی پریشان کر دیا۔ جرمن سپاہی کسی وقت ہی گاؤں میں گھس آتے اور من مانے ظلم کرتے۔ عورتوں کی عصمت کے لالے پڑ جاتے۔ اُن کے دُودھ پیتے بچے ان کی گودیوں میں سے چھین کر فضائے آسمانی میں اُچھال دیئے جاتے۔ ان ظالموں سے رحم و کرم کی توقع کرنا موت سے زندگی کی توقع کرنے کے مصداق تھا۔ اچانک ایک شام کو چند جرمن سپاہی بوڑھے الیاس کے مکان میں گھس آئے اور اُس سے شراب کا مطالبہ کرنے لگے الیاس نے ہر چند اپنی مجبوری ظاہر کی۔ مگر اُن لوگوں نے اس کی ایک نہ سنی جب اسکی پریشانی حد سے تجاوز کرنے لگی تو اُسے اچانک اس شرابِ کہن کا خیال آیا جو نکولے کی شادی کی تقریب کیلئے اُس نے زمین میں دفن کی تھی۔ وہ جرمن افسر اور سپاہیوں کو اُس مقام پر لے گیا اور وہ جگہ کھودی گئی۔ چند گز نیچے زمین کی آغوش میں اب تک وہ برتن موجود تھا۔ لیکن مٹی میں آلودہ تحقیقِ حقیقت کے لئے اس برتن کو نکالا گیا۔ اور اُس کی مٹی صاف کر کے اس کا ڈھکنا ہٹایا گیا۔ برتن شہد کی طرح گاڑھی اور سیاہی مائل رقیق شے سے لبریز تھا۔ جرمن افسر نے اس خوف سے کہ مبادا وہ کوئی زہریلی شے نہ ہو اُسے پینے سے احتراز کیا اور الیاس کو پیشتر ازیں چکھنے کا حکم دیا۔ کوئی گلاس نہ ہونے کی وجہ سے الیاس نے چلو میں لیکر شراب پی۔ یقین ہو جانے پر تمام سپاہی اس برتن پر ٹوٹ پڑے اور اُنہوں نے آن واحد میں اُسے خالی کر دیا۔ اس اکیس سالہ پرانی شراب نے ایک بوڑھی اور تجربہ کار نائیکا کی طرح ان بیوقوفوں پر اپنا وہ رنگ جمایا کہ تمام سُدھ بُدھ بھول گئے۔

[illegible] پینے والا ہو [illegible] جا چکے تھے سب کے سب بے ہوش بے خبر ہو کر اس چیز سے کہ درخت کے قریب جو پیشتر ہی گر چکا تھا بیٹھ گئے۔ الیاس ایک طرف کھڑا ہوا یہ تماشا دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا جب اُسے ہر ایک کی مکمل بے ہوشی کا پختہ یقین ہو گیا تو وہ اُن کے نزدیک گیا۔ پہلے اُس نے جرمن افسر کے ہتھیار قابو میں کئے پھر اسکی وردی اُتاری اور پھر اُسے گھسیٹ کر خشک گھاس کے ایک ڈھیر پر ڈال دیا۔ بعد ازاں اُس نے ہر ایک سپاہی کے ساتھ وہی سلوک کیا اور اُن سب کو اپنے مکان کی ایک کوٹھری میں بند کر دیا۔ طلوعِ آفتاب تک وہ اپنے دروازے کی چوکھٹ پر بیٹھا رہا۔ صبح ہونے پر جب ایک روسی ایمبولنس لاری اُدھر سے گذر رہی تھی تو اُس نے اشارے سے اُن لوگوں کو بلایا۔ اور شبِ گذشتہ کا تمام ماجرا بیان کیا۔ اور اس کے ثبوت میں اُن جرمن قیدیوں اور ان کے ہتھیاروں کو پیش کیا۔

روسی افسر جو اُس لاری میں موجود تھا بوڑھے الیاس کی اس کارگذاری سے بہت محظوظ ہوا۔ اس نے بوڑھے کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اور اُس سے مصافحہ کرتے ہوئے اسکی بے حد تعریف کی۔ وہ کہنے لگا۔ الیاس اس موقعہ پر واقعی تم نے اپنی دانشمندی اور تجربہ کا ثبوت دیا ہے۔ تم نے ایک سچے اور وطن پرست روسی کی طرح اپنا فرض ادا کیا ہے۔ حکومت تمہیں اس کارگذاری کا صلہ دیگی یہ کہکر اس نے تمام جرمن سپاہیوں کو لاری پر لادا اور رخصت ہوتے وقت ایک بار پھر الیاس سے مصافحہ کیا۔ الیاس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔ حضور! اس کارِ نمایاں کو میں ہرگز انجام نہ دے سکتا اگر مجھے اُس خبیث کا خیال نہ آیا ہوتا بوڑھے کا یہ جواب سنکر حاضرین نے قہقہہ لگایا۔ لاری چلی گئی۔

چند روز بعد نکولے کا خط موصول ہوا۔ اُس نے تحریر کیا تھا کہ اُسے اپنے والد کی کارگزاری کا حال معلوم کر کے بے حد مسرت ہوئی اور اس کے لئے یہ بات باعثِ اطمینان ہوئی کہ وہ شراب جو اس کے والد نے اُس کی شادی کی تقریب کے لئے محفوظ رکھی تھی وطن کے دشمنوں سے انتقام لینے میں معاون و مددگار ثابت ہوئی۔ اُس نے لکھا تھا کہ وہ کمانڈر کے جلیل عہدہ پر فائز کر دیا گیا ہے۔ خدا نے چاہا تو وہ جلد ظفریاب ہو کر اپنے باپ کی قدمبوسی حاصل کریگا۔ اور اس شراب کی یادگار میں جشنِ شادمانی منائیگا۔

سدارتھ ۔ چھینا ! اندھے تم ہو ۔

چھینا :۔ میں لہروں کے پیچ و خم دیکھ رہا ہوں میں بادلوں کے پیچ و تاب دیکھ رہا ہوں ۔ میں کوئل کے سُریلے نغمے سُن رہا ہوں ۔ مجھے اپنے وسیع تجربات کا بھی احساس ہے ۔ پھر آپ مجھے اندھا کیونکر کہہ سکتے ہیں ۔

سدارتھ :۔ بیشک تم اپنے دل کی مُسکراہٹوں کو دیکھ سکتے ہو ۔ لیکن کیا تم اسکی چیخ و پکار بھی سُن سکتے ہو ؟

چھینا :۔ خوبصورتی آخر ہے کس لئے ؟ کیا اس لئے کہ اس سے لُطف اندوز ہوئے بغیر چھوڑ دیا جائے ؟ کیا یہ پھول انسان کو خوش کرنے کیلئے پیدا نہیں کئے گئے ؟

سدارتھ :۔ تمہاری نگاہ پتوں کی خوبصورتی ہی پر کیوں جاتی ہے ۔ اُدھر بھی تو دیکھو ! وہ مُرجھائی ہوئی زرد پتیاں جو کل تر و تازہ تھیں آج سوکھ کر خاک ہو گئیں ۔ دیکھو سامنے والا درخت کبھی اپنے سائے میں تھکے ماندے مسافروں کو لوریاں دیتا تھا ، آج اپنی تقدیر کے آگے سر پٹک رہا ہے ۔ نازنے پھول آندھی کے آتے ہی گر جاتے ہیں ۔ خوش رنگ قوس و قزح سورج کی روشنی میں ٹھہر نہیں سکتی اور بجلی کی پری کپکپاتی ہوئی آتی ہے اور پلک جھپکاتے میں غائب ہو جاتی ہے ۔ یہی فریب اور غلط فہمیاں آپ کے وسیع تجربات کی بنیاد ہیں ۔ ہیں نا ؟ اچھا مجھے دیر ہو رہی ہے ۔

چھینا :۔ کیوں نہ میں بھی آپ کے ساتھ چلوں ؟

سدارتھ :۔ تم میرے ساتھ چل نہ سکو گے ۔

چھینا :۔ کیوں ؟

سدارتھ :۔ راستہ کانٹوں سے بھرا پڑا ہے ۔

چھینا :۔ لیکن ہمارا گھوڑا کنتھکا جو ہے ۔ یہ ہمیں دُنیا بھر میں لیجا سکتا ہے ۔

سدارتھ :۔ چھینا ! کیا ہم جانوروں سے بہتر ہیں ؟ کیا ہم سماج کے ہاتھوں کھلونا نہیں بنائے گئے ؟

چھینا :۔ اِس سنسار کو چھوڑ کر اور سادھوؤں کی سی زندگی گذار کر زندگی کے قلیل عرصہ کو ضائع نہ کرنا چاہیئے ۔ میرے آقا ! آپ کا ہر آگے بڑھنے والا قدم میرے دل کو کچلتا ہے ۔ گوشہ نشینی پھولوں کی سیج نہیں ۔ اور تکالیف آپ جیسوں کیلئے نہیں ہیں مہاراج !

سدارتھ :۔ میں تکلیفوں اور تباہی کی دُنیا میں کبھی واپس نہیں آؤں گا ۔ مجھے اپنے بھگوان کے سامنے جُھکنے دو ۔ اور سکون کے ساتھ مرنے دو ۔ میرا راستہ مت روکو ۔ ہیں ! تم رو رہے ہو ۔ کیا بات ہوئی ؟ دل تھوڑا نہ کرو ۔ انسان کی زندگی ہنسی خوشی ختم ہونی چاہیئے اور یہی میرا مقصد حیات ہے ۔

(وہ ایک خواب کی مانند جو طلوع سحر کے ساتھ ساتھ غائب ہو جاتا ہے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہے ——— چھینا ششدر و رنج میں مایوس کھڑا ہے ——— دریا کی لہریں بڑھکر موجوں کی صورت اختیار کرتی ہیں ۔ جیسے پوچھ رہی ہوں ۔ کہاں ؟ کہاں ؟ وہ اُوپر دیکھتا ہے مطلع صاف ہے ۔ گویا وہ جواب دے رہا ہو ۔ امن اور سکون کی تلاش میں !

(باقی آئندہ)

غزل

(از علامہ آرزو لکھنوی)

حسینوں کی قاتل نظر توبہ توبہ
کرے چوٹ کھا کر بشر توبہ توبہ

جو اک بار کر بیٹھے جُرمِ مُحبّت
تو کرتا رہے عُمر بھر توبہ توبہ

اتنی بھی پی بیدھڑک پینے والے
کرے اک جہاں دیکھکر توبہ توبہ

تھکے جب دوا کر کے زخمِ جگر کی
تو کرنے لگے چارہ گر توبہ توبہ

کہیں کس کو مظلوم اور کس کو ظالم
اِدھر توبہ توبہ اُدھر توبہ توبہ

غلاف

(از جناب انور کاظم)

پگڈنڈی :-

یہ تو تم ہی سے ظاہر ہے کہ مجھکو جس راستہ سے روزانہ گذرنا پڑتا تھا وہ کیسا ہوگا؟ خشک چمڑے، بنائے ہوئے چمڑے، گیلے چمڑے، تازے چمڑے، بکروں اور بھیڑوں کی کھالوں کی ملی جلی بدبو سے جو ایک خاص قسم کی تعفن پیدا ہوجاتی ہے کتنی ناقابل برداشت ہوتی ہوگی ——؟ اب تو اب ہوگیا تھا کہ اس محلہ کے قریب پہنچکر میرے ہاتھ خود بخود جیب سے رومال نکالنے کو بڑھ جاتے اور دوسرے لمحہ میں ناک پر رومال رکھے لمبے لمبے قدموں سے اس محلہ سے جلد سے جلد گذر جانا چاہتا۔

بڑے پھاٹک والی حویلی :-

اتنی سخت بدبو اور تعفن کے باوجود بھی میری سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس حویلی والے کس طرح یہاں رہتے ہیں۔ چوبیس گھنٹے —— مسلسل —— دن اور رات —— !! جبکہ چند منٹ میں ادھر سے گذرتے ہوئے مارے بدبو کے میرا دماغ جیسے پھٹنے لگتا تھا —— !

اور کوئی راستہ بھی تو نہ تھا، جدھر سے میں آسانی سے دفتر آ اور جاسکتا۔ گھر سے دفتر اور دفتر سے گھر کو روانہ ہوتے وقت اس گلی کا تصور جیسے میرے جسم میں ایک عجیب سی جھرجھری سی پیدا کردیتا۔ "میرے خدا —— !! وہ نالیوں میں بہتا ہوا گندا، بودار پانی، کبھی زرد، کبھی سفید اور کبھی کسی رنگ کا —— کبھی کبھی تو وہ سبز ہوکر سیاہ ہوجاتا تھا۔ کتنی بدبو ہوتی تھی اس میں —— !!" اور وہ بجبجاتے ہوئے کیڑے —— لاتعداد —— بے شمار —— جیسے بنگال کے قحط میں مرجانے والوں کا سیلاب —— !

یہ میونسپل بورڈ کیا کرتا ہے آخر؟ شاید اسکے ممبران پر حفظان صحت اور خدمت عوام کا جنون الکشن ہی کے موقعہ پر طاری ہوتا ہے اور بس —— میں سوچنے لگا۔ میرے دماغ میں الکشن کا وقت گھومنے لگا۔ "ووٹ کس کو دوگے؟" "نارئل ووٹ کس کو دوگے ——؟" "نذیل کو ——" پندرہ پندرہ بیس بیس کی ٹولیاں محلہ محلہ گشت لگاتی رہتیں۔ یکہ، تانگہ، موٹر چاروں طرف دوڑتے

پھرتے اور ہر ٹولی کسی نہ کسی کی طرفداری کررہی ہوتی۔ اب کوئی دکھلائے لاکر اُن لوگوں کو یہ حالت —— ! یہ گندا پانی —— بدبو —— تعفن —— اور یہ کیڑے !!

"کیا سوچ رہے ہیں مسٹر ——؟" سامنے کی کرسی پر سے ورما بابو پوچھتے اور میرے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ جاتا۔ کچھ دنوں سے ان کو یہ شک ہونے لگا تھا کہ میں فلسفہ کے متعلق غور کیا کرتا ہوں ——

"شاید آپ فلسفہ کے رشتے میں (بارے میں) سوچا کرتے ہیں اور کھوئے کھوئے سے رہتے ہیں ——؟" آخر ایک دن وہ پوچھ ہی بیٹھے۔

میں مسکرا دیا۔ "فلسفی اور دفتر کی کلرکی میں تو دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ ورما بابو ——" میں نے کہا۔ "کہاں عاشق کہاں کالج کی سکواس —— !!" اور وہ اس مصرعہ کے مطلب کو ایک خفیف سی مسکراہٹ میں ہضم کرگئے۔ خدا معلوم سمجھے بھی ہونگے یا نہیں ——

میں روز اس گلی سے گذرتا تھا۔ حویلی والے مکان کے پھاٹک سے مجھکو اکثر ایک لڑکی جھانکتی ہوئی دکھائی دیتی۔ الوں راتیں اکثر اسکے چہرے پر آیا کرتیں اور کبھی کبھی اسکا رنگین دوپٹہ دروازے کی دراز سے جھانکنے لگتا۔ مجھے دیکھکر اسکے چہرے پر ایک رنگ دوڑ جاتا اور وہ دروازے کو تھوڑا سا بند کرلیتی۔ کتنی شوخی ٹپکتی ہے اس کے چہرے سے؟ "راستہ بھر اسکی صورت میری آنکھوں میں ناچا کرتی۔

پہلے تو وہ مجھکو دفتر جاتے وقت دکھائی دیتی تھی۔ مگر اب کچھ دنوں سے وہ دفتر کی واپسی پر بھی مجھکو کھڑی ہوئی ملتی۔ بلکہ اب تو وہ مجھکو دیکھکر کبھی کبھی مسکرا بھی دیتی۔ —— "وہ کیوں مسکراتی ہے؟ میری ہی طرح نہیں معلوم کتنے ہی لوگ ہونگے جو ادھر سے گذرتے ہونگے۔ شاید وہ ہر ایک کو دیکھکر اسی طرح مسکرا دیتی ہو —— یا شاید مجھ ہی کو دیکھکر —— !!"

اور یہ خیال میرے دماغ میں جاگزیں ہوتا تو وضاحت پیدا ہوجاتی "کیا اس قسم کی حویلیوں میں رہنے والی اور اتنی عزت دار لڑکیاں بھی اس قسم کی ہوسکتی ہیں —— !! اور پھر پردہ —— ! کیا پردہ کی بندشیں بھی ان کو نہیں روک سکتیں —— !!"

انہیں قسم کے خیالات میں گم میں چلا جاتا۔ موٹر، سائیکل، یکہ، تانگہ، ریفیوجیوں اور راشن سے بھری ہوئی ملٹری ٹرکس سے بےخبر —— بالکل بےخبر —— !

ایک روز جبکہ میں دفتر جارہا تھا۔ ٹھیک اسی حویلی والے پھاٹک کے سامنے نو نو، دس دس برس کے دو لڑکے آپس میں بحث کررہے تھے۔

"سالے —— !" نیلے جیسٹر والے لڑکے نے کہا

"بے میاں! اب آپ گالی دے رہے ہیں ——" خاکی کوٹ والا بولا۔

"تو تو کیا ـــــ" اُس نے جوتے کی ایک ٹھوکر مار کر کہا۔ خاکی کوٹ والا لڑکا تڑپ کر وہیں بیٹھ گیا۔

مجھکو اس حرکت پر بڑا غصہ آیا اور پٹنے والے بیچارے کی حالت پر رحم۔ وہ سڑک پر پاؤں پکڑے بیٹھا ہوا درد کی تکلیف سے مُنہ بسور رہا تھا۔ میں نے بڑھکر اُسے اُٹھا لیا۔ اس نے ایک حسرت بھری نگاہ سے مجھکو دیکھا۔ اس کی اس نگاہ میں کتنی التجائیں، کتنی مجبوریاں تھیں۔ اب بھی جب کبھی میں سوچتا ہوں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے وہ اپنی غربت کی تمام کہانی کہہ گیا ہو۔

میں سب کچھ سمجھ گیا اور اُس سے بھی زیادہ جتنا وہ کہنا چاہتا تھا ـــــ شاید الفاظ کی صورت میں وہ مجھ سے کچھ نہ کہہ سکتا جو اُس نے اپنی ایک معصوم نگاہ میں کہہ ڈالا۔ نیلے جیسٹر والا لڑکا احساس برتری اور امیرانہ تمکنت کے ساتھ جیسٹر کی جیبوں میں دونوں ہاتھ ڈالے ٹہل رہا تھا۔ میں نے لڑکے کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا "بُرا ہوا چُپ رہو" ایک نظر نیلے جیسٹر والے لڑکے پر ڈالی۔ وہ اب تک اُسی شان سے ٹہل رہا تھا۔

"اِس چھوٹی سی عمر میں یہ طنطنہ! یہ شانِ استغنا ـــــ !!" میں سوچنے لگا۔ "اس میں یہ احساسِ برتری اتنی جلدی کہاں سے پیدا ہو گیا ـــــ اور اس تشدد کے ساتھ ـــــ" یکایک میری نظر حویلی کے پھاٹک پر پڑی۔ نقش و نگار والا اٹھارہ بیس فٹ اونچا پھاٹک ـــــ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ اسکو یہ چیز ورثہ میں ملی ہو۔ پھر اس کے گھر کا یہی ماحول ہو ـــــ سرمایہ دارانہ ماحول !!

میں اپنی خودداری کا موازنہ کرنے لگا۔ "لیکن نہیں۔ شانِ استغنا اور خودداری میں فرق ہے۔ ایک لطیف فرق ـــــ لیکن اس اتنے سے ہی فرق سے انسان کے احساسات میں کتنا فرق ہو جاتا ہے ـــــ !!!"

"ظہیر! چلو اندر ـــــ" ایک مترنم نسوانی آواز نے میرے خیالات کی زنجیر ہلا دی۔ وہی لڑکی دروازے کی دراز سے جھانک رہی تھی۔ اس نے آج نیلی شلوار پہن رکھی تھی۔

"کم از کم ایسے گھرانوں کے بچے تو اس طرح گلی میں گالی گلوچ نہیں کیا کرتے ـــــ" میں نے اُسے مخاطب کر کے کہا۔

"چلو اندر ـــــ !!" اُس نے ظہیر کو ڈانٹتے ہوئے دوبارہ کہا۔

"اُن کی تہذیب کا معیار تو بہت اعلیٰ ہونا چاہیئے۔" میں نے دوبارہ کہا لڑکا برابر ٹہل رہا تھا۔

"دیکھئے میاں! آپ نے اس بیچارے کو خواہ مخواہ تو ایک ٹھوکر مار دی۔ جاڑے کی چوٹ تڑپ کر رہ گیا بے چارہ۔" میں نے ظہیر سے کہا۔

"ہائے! ہائے!!" تڑپ کر رہ گیا ـــــ" اُس نے جیسے مجھے چڑایا اور گھر میں چلا گیا۔

میں نے لڑکے کو ایک اکنی دی اور دلاسا دیکر کہا "جاؤ گھر جاؤ۔" ٹھیک اُسی وقت پھاٹک کے سامنے والے مکان سے آواز آئی۔ "محمود تم یہاں آجاؤ!"

"اچھا باجی آیا ـــــ" کہکر لنگڑاتا ہوا گھر میں چلا گیا۔

اِس واقعہ کو قریب ایک ماہ گذر گیا۔ جنوری کے اوائل میں ایک روز شام کو جبکہ میں اور علوی امین آباد میں "عالی ریسٹورنٹ" سے نکل رہے تھے کہ "بابوجی! بابوجی!!" کی دو مسلسل آوازوں نے ہم کو اپنی طرف مخاطب کر لیا۔ وہی لڑکا سامنے سے دوڑتا چلا آ رہا تھا۔

"کیا ہے محمود؟" میں نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ خاموش کھڑا اپنی جانگیا اور بغیر آستینوں والے کوٹ میں یخ بستہ ہواؤں کا بڑی دلیری اور صبر کے ساتھ مقابلہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"کیا کہنا چاہتے ہو؟" میں نے دوبارہ پوچھا۔

"گرا پڑا جالا پارک گیا تھا اسکو بیچنے!" اُس نے اپنے کوٹ کی جیب سے کوئی چیز نکالی۔

"یہ کیا ہے؟"

"غلاف ـــــ! باجی نے بنایا تھا۔" اس نے تکیہ کا غلاف میرے سامنے رکھ دیا۔

"کیوں بیچنے گئے تھے اِسے؟"

"باجی نے کہا تھا اسے بیچ کر پیسے لے آؤ۔" وہ اپنی انگلیاں ـــ ہوئے بولا۔

"کتنی ظالم چیز ہے یہ پیسہ ـــــ !! خدا نہ کرے کوئی غریب ہو ـــ" میں نے سوچا۔

"خدا نہ کرے ـــــ!" میں غور کرنے لگا "خدا کرتا ہی کیا ہے ـــ خدا نہ کرے ـــــ" خدا تو کچھ نہیں کرتا۔ اگر خدا کرتا ہوتا تو ہرگز یہ ممکن نہ تھا کہ ایک طرف تو وہ اٹھارہ بیس فٹ اونچے پھاٹک والی حویلی ـــــ اور دوسری طرف یہ غربت کدہ ـــــ !! وہ تو منصف مشہور ہے۔ وہ غریب یا امیر کسی ایک کا خدا نہیں۔ سب اس کے بندے ہیں۔ وہی سب کا خالق ہے ـــ پھر یہ تفاوت اور انتشار تفرقہ ـــــ !!!

تیر کی طرح ہوا کے ایک تیز جھونکے نے ہم تینوں کو لرزا دیا۔ ٹھنڈ لگ رہی ہے" علوی نے اپنے لبادے کے کالر کو اوپر اُٹھاتے ہوئے

"ٹوالہ باری جو ہوئی ہے۔" میں بولا۔ میں نے اُوپر آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ بادلوں کے مہیب دیو ہوائیں اِدھر سے اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے۔

"امی کو بخار آرہا تھا تو باجی نے کہا تھا اسے بیچکر پیسے لے آؤ۔" لڑکا پیر کے انگوٹھے سے زمین کریدتے ہوئے بولا۔

"کب سے بخار آرہا ہے تمہاری امی کو؟" میں نے پوچھا۔

"پرسوں سے۔" اُس نے جواب دیا۔

"تو تمہاری باجی ایسے غلاف بنالیتی ہیں۔ کیوں۔؟" علوی نے لڑکے سے پوچھا۔

"جی ——!"

"شادی ہوگئی ہے تمہاری باجی کی —— ؟"

"نہیں"

"وہ ہیں کتنی بڑی —— ؟" علوی نے گوشۂ نگاہ سے مجھے جھانکتے ہوئے لڑکے سے پوچھا۔

شرم سے اُس کی گردن جُھک گئی ——

"Don't be a fool!" میں نے علوی کو ڈانٹا۔

"میں تو یوں ہی پوچھ رہا تھا۔" علوی شرمندہ ہوگیا۔

"ہاں تو تمہاری امی کو بخار آرہا ہے ——!" میں نے لڑکے سے کہا۔

"جی"

"اور تمہارے والد کیا کرتے ہیں؟"

"مر گئے وہ"

"مر گئے —— کب ——؟"

"معلوم نہیں مجھے —— امی کہتی ہیں۔ جب تم چھوٹے سے تھے تب ہی مر گئے وہ۔"

"اُو میرے خدا ——!" میرا سر چکرانے لگا تھا اس وقت جب مجھکو اس کا احساس ہوا کہ وہ یتیم ہے۔ "یتیم" —— کتنا دردناک لفظ ہے یہ —— ان چار حرف کے ایک لفظ میں مجھکو دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی تکلیف سے لیکر بڑی سے بڑی مصیبت جھانکتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

اُس کے گھر کا تمام نقشہ میرے ذہن میں دوڑنے لگا۔ "یہ خود تو اتنا کم عمر ہے کہ کچھ کر سکنے سے رہا۔ ماں —— وہ بیمار —— بہن ؟؟"

"ہاں بہن"

"لیکن وہ بہن تو عورت ہے! جوان ہی ہوگی —— تب ہی تو علوی کے سوال پر لڑکے کی نظریں شرمندگی سے جُھک گئی تھیں —— اور غریب!!

عورت! —— جوان —— !! غریب —— !!! کانٹے ہی کانٹے تو ہیں اس کیلئے اس زندگی کی راہ میں —— ایک چھوڑ تین تین حریف —— کس کس کا مقابلہ کریگی وہ —— !!!

"کسی مصرعہ پر گرہ لگائی جارہی ہے شاید؟" علوی نے مجھے چھیڑا۔

عورت، جوانی، غریبی، زندگی کے پُرپیچ راستے، پیٹ، روٹی، مردوں کی سفاکانہ چالیں، سماج زندگی اور زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے میں علوی کی طرف مخاطب ہوگیا۔

"گرہ تو نہیں لگارہا تھا۔ ہاں یہ ضرور سوچ رہا تھا کہ گرہ کھولی کیسے جاسکتی ہے؟" علوی میرا مُنہ دیکھنے لگا۔

"ہاں تو کتنے پیسے بتائے تھے تمہاری باجی نے اس کے؟" میں نے لڑکے سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں۔ بس اُنہوں نے کہا تھا بیچ لاؤ ——"

"جو کچھ بھی مل جائیں اس کے ——" میرے دل نے جیسے لڑکے کا جملہ پورا کردیا۔ کتنی سخت ضرورت ہوگی اُسکو —— ! تب ہی تو اُس نے کوئی قیمت نہیں مقرر کی اس کی —— اس کو تو پیسے چاہئیں پیسے —— اپنی ماں کی دوا کیلئے۔ دو آنے، چار آنے، آٹھ آنے —— ! میرے خدا! میری نظر کے سامنے اس کا غربت کدہ گھومنے لگا۔ وہ بیٹھا ہوا دروازہ، کچھ ٹوٹا ٹوٹا سا —— حویلی —— ! جیسے فلم کی ریل گھوم گئی۔ حویلی، پھاٹک، ریشمی شلوار، مسکراہٹ، جوانی، شباب، آسودہ زندگی، اُمنگوں کی چھیڑ چھاڑ۔ سرمستیاں۔ سرخیاں —— میرا خیال انکی انتہائی گہرائیوں میں اُترتا چلا جارہا تھا اور اُن میں سے ہر ایک کو اس طرح نچوڑ رہا تھا۔ جیسے گیلی مٹی میں کوئی مضبوط پنجہ گھستا چلا جارہا ہو —— گھستا اور اپنی گرفت کو مضبوط سے مضبوط تر بناتا چلا جارہا ہو —— مضبوط —— اور مضبوط ——!

محمود، اس کی بیمار ماں، اس کی بہن، پردہ، مذہب، دُنیا کی اُٹھتی ہوئی اُنگلیاں —— جوانی —— دُنیا کی اُٹھتی ہوئی نگاہیں —— عزت، ناموس، ضرورت، پیسے —— !! مجبوری —— زندگی کی راہ میں عورت کا قدم ڈگمگا جانا، اور —— اور پھر اسکی آئندہ زندگی —— !! ایک ایک کرکے تمام چیزیں سامنے آتی گئیں۔

محمود علوی کا مُنہ تک رہا تھا۔ "تو تم کو کتنے پیسے دیدیئے جائیں اسکے؟" میں نے محمود سے پوچھا۔ اُس نے ایک نظر مجھکو دیکھا۔ التجا، اُمید، خوشی، اسکی نگاہیں

ان تمام چیزوں کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ وہ خاموش رہا۔

"ایک روپیہ کا تو یہ کپڑا ہوگا۔ کم از کم چھالین کا۔ اور اگر دو آنہ روز کے حساب سے صرف چار ہی دن کے لئے جائیں تو آٹھ آنے محنت کے اور چار چھ آنے کا تو ریشم ضرور ہی لگا ہوگا۔ کیوں ——؟" میں نے لڑکے سے پوچھا۔

"یہ سب مجھکو کچھ نہیں معلوم ——"

"اچھا یہ لو۔" دو دو روپوں کے دو نوٹ جیب سے نکال کر دیتے ہوئے میں نے کہا۔ "دو روپے تو اس غلاف کی قیمت۔ اور دو روپے کا ایک دوسرا غلاف بنوا کر مجھکو دے جانا۔ اچھا ——!"

"اچھا" اُس نے جواب دیا۔ "لیکن مجھکو آپ کا مکان تو نہیں معلوم؟"

"وہیں چل رہے ہیں۔ چلو بتلائے دیتا ہوں۔"

"یہ ہے میرا مکان۔" اپنے دروازے کے سامنے رکتے ہوئے میں نے لڑکے سے کہا۔

"تو غلاف یہیں دے جاؤں آپ کو؟"

"ہاں۔ اور دیکھو۔ تم غلاف بنوا کر دے جایا کرو۔ میں اپنے دوستوں میں بیچ دیا کرونگا۔ اچھا۔"

"اچھا۔" اُس نے جواب دیا اور میں اور علوی کمرے میں داخل ہوگئے۔

"یہ کیا وحشت تھی آپ کو ——؟" کرسی پر بیٹھتے ہوئے علوی میرے گلے پڑ گیا۔

"کیا مطلب۔ وحشت کیسی؟" میں نے پوچھا

"یعنی دو روپے تو آپ نے غلاف کی قیمت کے دیئے۔ اور یہ دو روپے فالتو دینے کی کیا ضرورت تھی؟"

"اوہ —— یہ بات ہے۔ اچھا یہ لیجئے ناصح صاحب" میں نے سگریٹ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "ایسے دورے تو مجھکو اکثر پڑا کرتے ہیں۔"

"پاگل ہیں آپ اچھے خاصے۔"

"اگر اسی کا نام پاگل پن ہے تو خدا کرے ——"

"میں بھی پاگل ہو جاؤں —— کیوں ——؟"

کمرہ ہم لوگوں کے قہقہوں سے گونج گیا۔ "جیو جیو۔ دوست اس وقت تم نے میرے منہ کی بات چھین لی۔"

نوٹ لیکر لڑکا شاید بھاگتا ہوا جا رہا تھا۔ کیونکہ گلی میں اس کے دوڑنے کی آواز میں کمرے میں سن رہا تھا۔

"کتنا خوش ہوا ہوگا وہ اس وقت روپے پاکر ——" میں سوچنے لگا۔ ناامیدی —— مکمل ناامیدی کے بعد کامیابی —— شاندار کامیابی۔ دو دو روپے کے دو نوٹ۔ بیمار ماں —— دوا —— بہن —— بھوک ——"

"بھوک ——!"

"ہاں بھوک —— ہو سکتا ہے۔ ان لوگوں کے یہاں دو ایک وقت سے چولہے میں آگ بھی نہ پڑی ہو۔ کتنا سوکھا ہوا تھا چہرہ لڑکے کا —— کیا انتظام کیا ہوگا بیچاری بہن نے اسکی —— عورت ذات ——"

"عورت ——!"

"کیا عورتیں اپنی زندگی آسائش سے نہیں گذار سکتیں۔!"

"کیوں نہیں۔ سینکڑوں ہی عورتیں ایسی ہیں جو اپنی زندگی آرام اور آسائش سے گذارتی ہیں، کیا ان سب کو مردوں کی سرپرستی ہی میسر؟ تو پھر کیسے اُن کی زندگی سکون، اطمینان اور مسرت سے گذرتی ہے۔"

سکون! اطمینان!! مسرت!!! جیسے میرا دماغ انکی گہرائیوں میں کوئی چیز ڈھونڈنے لگا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی زندگی سے مطمئن ہوں لیکن مسرت ——! زندگی میں انسان کو مسرت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے۔ جب اسکو زندگی میں سکون بھی ہو۔ "سکون ——!!" کیا وہ اپنی زندگی سے آسودہ ہونگی؟ بھرپور —— سرشار ——!! لیکن آسودہ زندگی تو سرشارانہ سرمستیوں اور چہکتے ہوئے نغموں کا نام ہے —— تو پھر کیسے وہ ہر وقت خوش و خرم نظر آتی ہیں؟ حسن فروشی۔ صرف حسن فروشی ہی نہیں۔ بلکہ —— اس کے باوجود بھی ہشاش بشاش، کھلتے ہوئے پھول کی طرح شاداب!!

"کیا ان کے اپنے ضمیر کی آواز اُن کو چین سے بیٹھنے دیتی ہوگی —— اور ان کے نفس کی صدائے بازگشت خود اُن کو نفریں نہ کرتی ہوگی۔"

"کیوں نہیں۔"

"پھر یہ حسن فروشی اور گناہوں کا بازار کیوں گرم رہتا ہے؟"

"پیٹ ——! پیٹ کے لئے ——!! بھوک روٹی ——"

"تو جیسے اُن کو دنیا میں اور کوئی کام ہی نہیں۔"

"کیا کام کر سکتی ہیں؟"

"تکیہ کے غلاف ہی بنا سکتی ہیں کم از کم" ——!! جیسے میرے دل نے پکار کر کہہ دیا۔

"تو پھر اُنہوں نے اس زندگی کو کیوں پسند کر رکھا ہے؟ وہ ایسی زندگی کو کیوں پسند کرتی ہیں۔"

"پسند ——!! ہا۔ ہا۔ ہا۔ مجبوری، مجبوری ——!!"

"مجبوری ــــ! کون مجبور کرسکتا ہے کسی کو اس کے ضمیر اور نفس کے خلاف ــــ؟"

"جوانی، جوانی کی بھول ــــ اس کے بعد جگ ہنسائی کا ڈر ــــ کھوئی ہوئی عزت کی لاش بہرے بچنے کیلئے سماج کی خوشامد ــــ لیکن اس نے کسی بیکس کی نہ سنی کب ــــ!!"

"پھر؟"

"خودکشی کا خیال ـ لیکن خودکشی کے خیال کے ساتھ ہی ساتھ دل و دماغ کی جنگ خودکشی، گناہ ـ"

"تو کیا یہ ضروری ہے کہ ایک گناہ سے بچنے کے لئے تمام زندگی گناہ کے اتھاہ سمندر میں غوطے لگائے جائیں ــــ؟"

"نہیں ــــ ان کو اپنے وجود سے نفرت کا احساس اور اپنے کو مٹا دینے اور فنا کر دینے کا خیال ان کو اس طرف لے جاتا ہے لیکن کچھ دنوں کے بعد وہ بغاوت پر تُل جاتی ہیں ـ سماج سے، سماج کے نظام سے ــــ اور ان کا یہ باغیانہ جذبہ اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ وہ سماج سے برسرِ پیکار ہونے کے لئے اپنے خداداد اسلحوں سے حملہ آور ہوتی ہوئی نظر آتی ہیں ـ اور پھر ــــ پھر وہی حسن فروشی اور گناہوں کا بازار ـ" میرا دل تجزیے کرتا چلا جا رہا تھا۔

دفعتاً میری نظر کے سامنے بڑے پھاٹک والی حویلی گھومنے لگی ـ اٹھارہ بیس برس والا اونچا پھاٹک، عالی شان حویلی، نیلی شلوار، مسکراتا ہوا چہرہ ـ ــــ "وہ مسکراتی کیوں ہے آخر ــــ؟"

"جوانی، شباب، جوانی کی مستانہ وار سرمستیاں، امنگوں کی چھیڑ چھاڑ ــــ"

"جوانی ــــ؟؟"

جوانی، جوانی کی بھول ـ اس کے بعد جگ ہنسائی کا ڈر، کھوئی ہوئی عزت بچنے کیلئے سماج کی خوشامد ــــ لیکن اس نے کسی بیکس کی سنی ہی کب ــــ!! پھر خودکشی کے خیال کے ساتھ ساتھ دل اور دماغ کی جنگ خودکشی ــــ گناہ ــــ" اپنے وجود سے نفرت کا احساس ــــ اور اپنے کو مٹا دینے کا خیال ــــ اور باغی جذبات کا سماج، اور نظام سماج سے بغاوت کی تلقین ــــ اور پھر وہی حسن فروشی اور گناہوں کا بازار ــــ!! اُف ــــ!" جیسے مجھکو شریف گھرانے کی ایک لڑکی تباہ ہوتے ہوئے دکھلائی دینے لگی ــــ! بڑے پھاٹک والی حویلی ــــ!

ساتھ ہی ساتھ میرے ذہن میں محمود اس کی بیمار ماں ـ بہن، غریبی فاقہ یکے بعد دیگرے تمام چیزیں آنے لگیں ـ" وہ بھی عورت ہے ـ وہ بھی تو جوان ہے ــــ وہ بھی مسکراہٹ اور نگاہ کے ذرا سے اشارے پر دلوں سے کھیل سکتی ہے ـ ان کو اپنے پیروں سے روند سکتی ہے ـ لیکن ــــ! لیکن عزت، شرم، خودداری ــــ ناموس ــــ نگینہ کا فلاد ــــ: "شاباش ــــ!!!" جیسے میرا دل اُچھل پڑا خوشی سے "شاباش ــــ!!!"

"اچھا! میں تو چلا ـ" جیسے مجھکو تین سونٹ کی اونچائی سے کسی نے ہوا میں دھکیل دیا ہو ـ علوی جانے کی اجازت مانگ رہا تھا ـ

"بیٹھو ـ ابھی بھی کیا جلدی ہے ـ"

"آپ تو تخیلات کی دنیا میں اُڑ رہے ہیں ـ میں یہاں چغد کی طرح بیٹھا کیا کروں ــــ!"

"میرے دوست! مجھے امید ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گے ـ میں کچھ سوچنے لگا تھا ـ" میں نے علوی سے معذرت کی ـ

"نہیں ـ اب تو یوں بھی مجھے جانا ہی چاہیئے ـ ساڑھے دس بج رہے ہیں ـ" اس نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا ـ

"اچھا ـ" کہکر ہم دونوں نے ہاتھ ملائے ـ

پاس کے گھنٹہ گھر نے ساڑھے دس کا آدھا بجایا ـ علوی جاچکا تھا ـ اور میرا قلم صفحۂ قرطاس کو سیاہ کر رہا تھا ـ

قربانی

(از محترمہ جمیلہ بیگم صاحبہ)

یوں تو کون ایسے میاں بیوی ہیں جنکی کھٹ پٹ نہ چلتی ہو۔ مگر میرا معاملہ ہی کچھ اور تھا۔ پروین کا میں شوہر تھا۔ اور وہ میری جاں نثار بیوی۔ گو وہ امیر زادی تھی۔ اور میں غریب۔ اُسکی میری نسبت بس تقدیر کی بات تھی۔ یا نابینا کیوپڈ کی غلط نگاہی کا ثبوت۔ بایں ہمہ میں اُس پر حکومت کرتا تھا۔ دراصل اقلیم حسن کی حکومت مجھے حاصل تھی۔ اور وہ میری ادنیٰ محکوم بنی رہتی تھی۔ میری معصوم پروین۔

میں نے کہا "پروین! نواب ——— کے ہاں ڈنر اور رقص کے جلسے میں ہماری شرکت ضروری ہے"۔

پروین آزردہ ہوکر بولی "میں نہیں جاسکتی۔ بچے کو زکام ہوگیا ہے"۔

میں نے چڑکر سوال کیا "تو اس قدر بھاری مشاہرے پر شہر کی ٹرینڈ نرس منگوانا بیکار ہی گیا نا؟ جب نرس اتنا بھی نہ کرسکی۔ اور تمہیں نرس پر اس قدر بھی اعتماد نہ ہوا تو انا ؤں اور اس میں فرق ہی کیا رہا؟ ہمیشہ یہی رہتا ہے۔ کہیں سیر کی تجویز ہوئی بچے کو چھینکیں آگئیں۔ بس جانا موقوف ہوا۔"

اُس پر طرہ یہ کہ پروین فوراً اسکی تردید کرنے لگ جاتی کہ "تم سمجھتے نہیں اختر! اگر اسکو ہلکا سا بخار بھی ہوتا تو میں ضرور جاتی۔ اگر خدانخواستہ نرس نے ذرا سی لاپروائی کی اور وہ زیادہ بیمار ہوگیا تو؟" ——— اسی طرح آج یہ عذر بھی مجھے نامعقول سا نظر آرہا تھا۔ چنانچہ میں نے تیوری پر بل ڈالکر کہا۔ "مجھے تو آج جانا ہی ہوگا۔ نواب ——— سے ہمارا وعدہ ہے۔ ایاز بھی وہاں آئیگا۔ مجھے ایک دستاویز کے متعلق اُس سے باتیں کرنا ہیں۔ میں اُسے اپنا کاروباری شریک بنانا چاہتا ہوں۔ وہاں اس سلسلہ میں اس سے بہت ساری باتیں ہوجائیں گی۔ ورنہ خاص اس کام کے لئے شہر جانے کی زحمت ہوگی۔

پروین کی نرگسی آنکھیں اور بھی رسیلی ہوگئیں۔ گویا وہ اپنی مجبوری پر نادم تھی اور نرم لہجہ میں بولی۔ "آپ کو تو میں روکتی نہیں۔ آپ شوق سے جائیے نا!"

جب جاتے ہوئے میں اُسے خدا حافظ کہنے آیا تو اُس نے اپنی مرمریں نازک بانہوں کو میری گردن میں حمائل کردیا اور نہایت عاجزی اور محبت سے بولی

[illegible] ہمارے [illegible]

اُس نے میرے سینے میں [illegible]

"مگر کیا؟ میری قسمت [illegible]"

"یعنی ——— کے [illegible] [illegible]

مگر اس قدر کم موقعہ ملتا ہے۔"

میں نے اسکو خوش کرنے کیلئے کئی وعدے [illegible]

میرے دل کا بوجھ اُتر چکا تھا۔ کہ وہ غریب مجھے روک نہیں رہی ہے۔

پھر وہ سسکیاں لیکر بولی۔ "تم اس قدر اچھے ہو ——— بہت ہی [illegible]"

میں نے دل میں کہا۔ کاش سب عورتیں مجھے ایسا ہی سمجھتیں۔ میں نے اپنی کمسن ناتجربہ کار بیوی کے حسین چہرے پر ایک پیار کی نگاہ ڈالی اور جلد نواب ——— کی عشرت گاہ کو روانہ ہوگیا۔ دس منٹ تک اُس کی [illegible] معصوم صورت میری نظروں میں گھومتی رہی۔ آہ! بیچاری تنہا رہ گئی۔ مجھے اس کی مجبوریوں کا احساس ضرور تھا اور وہ مجھے بیحد چاہتی تھی۔ اسی لئے ہر موسم [illegible] پروانہ بنا ہوا مجھے دیکھنا پسند کرتی تھی۔ اور مردوں کی فطرت تو آپ جانتے ہیں شکاریوں جیسی ہوتی ہے۔ شادی ہو یا نہ ہو اُن کی طبیعت میں تناعت نہیں۔ [illegible] نفس ہر وقت سرکشی پر تیار رہتا ہے۔ اور وہ ہر شمع کے گرد پروانے [illegible] ہر دم نت نئے شکار کی آرزو میں! اور ہر پھول کی بھنورے کی طرح والہانہ پرستش کرتے ہیں۔ ایک کلی کا رس چوس کر دوسری حسین اور نازک کلی کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔

بیاہ کے وقت بھی حسین پروین سے زیادہ مجھے اسکی دولت کی تمنا تھی اور یہ بھی سن چکا تھا کہ اتنی بڑی جائداد کی مالک حسین پروین انتہائی درجہ سادہ لوح اور فرشتہ صفت ہے۔ ماں باپ تو تھے ہی نہیں۔ اس انتخاب کی بھلائی اور برائی کو دکھلاتا کون؟ بلا سوچے سمجھے میرے دام تزویر میں آگئی۔ اور مجھ سے بیاہ کرلیا۔ قسمت کا بھی تو دھنی ہوں۔ ہاں! ایسی ملی تھی جو ہمہ تن ناز برداری میں مصروف رہتی۔ میرے حسن روز افزوں اور سیاہ گھونگریالے بالوں پر سوسائٹی کی حسین لیڈیز الگ فریفتہ تھیں۔ بعض بیوقوف کمسن لڑکیاں میری مانند ریشمی پلکوں کے تیر سے زخم آلودہ ہو جاتیں۔ میرے محبوب دوستوں میں ایک تسنیم بھی تھی [illegible] اب شادی ہوچکی تھی۔ مگر یہ ایک لڑکی تھی جس نے مجھ پر کبھی فریفتگی کا اظہار نہیں کیا وہ بیحد حسین اور نظر فریب تھی۔ بھولا بھالا حسین چہرہ، گداز بدن، گلستان شباب کی [illegible] تھی۔ اگرچہ پروین بھی بیحد حسین تھی مگر اُس کا نزاکت آفریں حسن معصومیت [illegible] بڑھکر معصوم اور گلاب کی پنکھڑیوں جیسا نازک تھا۔ برعکس اسکے تسنیم [illegible]

[illegible]

کرلیا تھی۔ چونکہ میں کسی بھاری منصب پر کسی اعلیٰ عہدہ پر متمکن نہ تھا۔ اور نہ کوئی خاندانی دولت ورثہ میں ملی تھی۔ اس لئے تسنیم کی نگاہ انتخاب کبھی مجھ پر پڑی ہی نہیں بلکہ یوں کہ اُس کو مجھ سے کوئی لگاؤ ہوا ہی نہیں۔ مگر میں تو دل ہی دل میں اُس کے زاہد فریب حُسن کا دلدادہ تھا۔

میری آمدنی کے ذرائع مقررہ نہ تھے۔ مارکیٹ میں منافع پر بانڈز کی خرید فروخت کیا کرتا۔ ماں کے سر سارے اخراجات کا بار ڈال رکھا تھا۔ اقتصادی تباہ حالی سے پیشتر کافی رقم جیب خرچ کیلئے مل جاتی تھی۔ لیکن جب سے بازار مندا پڑا اور بانڈسس (Bonds) کی قیمت گھٹنے لگی تو میں بڑی مصیبت میں پڑ گیا۔ میری ماں کی مختصر آمدنی بھی کاروباری زبوں حالی کے باعث تباہ ہو گئی۔ چنانچہ حسین پروین کو بیاہ کر لایا۔ اس کی دولت کے لالچ میں! یہ ماننے کو میں تیار نہیں اور نہ دل میں اس کا اعتراف کرسکتا ہوں۔ کیونکہ اسکی مسحور کن دلکش اور معصوم حُسن نے مجھے بالکل اندھا کر دیا تھا۔ اس نازک اندام شرمیلی حسینہ میں وہ سب دل لبھانے والی ادائیں موجود تھیں۔ جن کا ایک عالم شیدائی تھا۔ اس کے دراز ریشمی بال سنہری دھوپ کی مانند تھے۔ اسکی نرگسی آنکھوں میں مسرت رقصاں نظر آتی۔ گویا میری حقیقی فردوسی دنیا کی وہ حور تھی۔ اور سب پر طرہ یہ کہ وہ خود مجھ سے محبت کرنے لگی تھی۔ اُس کے نام ایک کروڑ روپیہ اُس کے باپ نے نقد بنک میں رکھا دیا تھا۔ اور تقریباً ایک کروڑ کے بانڈسس تھے۔ اس کو بیاہ کے وقت اتنا بھی خیال نہ آیا کہ اس قدر دولتمند کروڑپتی ایک ایک پیسے کے محتاج جوان کو کیسے انتخاب کر رہی ہے عشق نے حُسن کو اپنے آغوش میں لیا۔ کیوپڈ کا وار ایسا کاری تھا کہ غریب کو سوچنے کی بھی مہلت نہ ملی۔ روپیہ کی اُسکو پرواہ نہ تھی۔ وہ میری خوشی کے لئے روپیہ پانی کی طرح بہا رہی تھی۔ اُس نے اپنی عزت و عصمت کے محافظ شوہر کی ساری فرمانبرداری اپنے اوپر لازمی کر رکھی تھی۔ میں بے انتہا خوش تھا۔ تمام امیرانہ ٹھاٹ کے ساتھ ایک محبت کیش دل کا بھی مالک تھا۔ میری بیوی کی سنہری آنکھیں مجھ سے۔ ہاں صرف مجھ سے وابستہ تھیں۔ وہ میری ماں کا بھی تمام بار اُٹھائے ہوئے تھی۔ میری خالہ کو بھی ماں کے ساتھ رہنے کیلئے علیحدہ مکان ملا تھا۔ یہی نہیں بلکہ اُن کیلئے کار اور شوفر بھی پروین نے علیحدہ رکھ دیئے۔ نوکر مامائیں خدمت کو حاضر تھیں۔ غرضیکہ ہر قسم کی آسائش میسر تھی جو بیچاری پروین کا عطیہ تھی۔

میں شادی کے بعد اپنی مصروفیت دکھانے کو کچھ عرصہ تک یہ بہانے کرکے روزہ "دفتر" جاتا کہ اپنا کاروبار چلا رہا ہوں۔ اور کمال دلسوزی اور جانفشانی کا نقشہ کھینچ کرکے مال تجارت وغیرہ بڑھانے کرتا۔ مگر میں جانتا تھا کہ کوئی بیوقوف بھی میرے جھانسے میں نہیں آسکتا تھا۔ بس لے دے کے میرا یہی کام رہ گیا تھا کہ کبھی کبھی چپکے کبھی کبھار پروین کا ہاتھ بٹاتا۔ اور اُس کے کارندوں سے بات چیت کر لیتا۔ یا دو یتیم نابالغ بچوں کے سرمایہ کے متعلق کچھ ضروری خط و کتابت کرنا پڑتی تو اسکو انجام دیتا۔ یہ دو یتیم بچے پروین کی خالہ کے چشم و چراغ تھے۔ یہ بیچاری بھی میری ظاہری صورت کے فریب میں آگئیں۔ اور خیال کرلیا کہ اچھی صورت کا مالک اچھی سیرت سے بھی مالا مال ہوگا۔ چنانچہ اُنہوں نے پروین کا اور میرا نام اپنے محافظوں میں لکھا دیا۔ وصیت نامہ کے بموجب نقد ۲۵ ہزار روپے اور بیش بہا جواہرات اُن کے ہمارے سپرد کئے گئے۔ اُنہوں نے کیوں ایسا کیا؟ یہ کچھ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ اور بھی رشتہ دار تھے۔ شاید مجھے انتخاب کرکے اپنے بچوں کا ولی اُنہوں نے اس لئے بنایا تھا کہ وہ بھی بیوقوف پروین کی طرح میرے حُسن سے مرعوب ہو گئیں تھیں۔ مگر میرے حُسن کا رعب تسنیم پر کبھی نہ چھایا۔ وہ ہمیشہ میرا مضحکہ اُڑاتی رہی۔ یہی مثل تھی کہ

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

باہمی تعشق کے سلسلہ میں دلوں کا منسلک ہونا ضروری تھا۔ وہ شاید اس سے محروم تھی۔ مگر ان دنوں وہ آرزومند نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی ہے۔

یوں تو وہ بڑے عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی چیز کی جستجو میں کھوئی سی رہتی ہے۔ وہ ایک دولتمند شخص کی بیوی بن گئی ہے ضرور۔ مگر ازدواجی مسرتوں میں وہ ایک خلا سا محسوس کرتی ہے فرید دل قدر بے شک امیر و کبیر ہے اور اُس کے خواب و خیال سے بالاتر۔ وہ تحفے تحائف پیش کرسکتا ہے۔ صحیح۔ مگر یہ تو بتلیئے مردانہ حُسن وہ کہاں سے لاسکتا ہے جو عورتوں کے جذبات کو برانگیختہ کرنے میں مشہور اور وہ جواہر لٹا کر لبھانے سے بڑھکر دام محبت میں گرفتار کرنے پر قادر ہے۔

———— •:(۲):• ————

ڈاکٹر فرید دل قدر شکیل اور خوش مزاج نوجوان تھا۔ البتہ اُس میں وہ دلکشی اور جاذبیت نہیں تھی جو میں نے قدرت سے پائی تھی۔ تسنیم کا بھی خوش نصیب شوہر تھا۔

کلب میں پہنچتے ہوئے میرے لئے یہ جملے سامع نواز ہوئے۔

"جی ہاں! ڈاکٹر کی بیوی بننے کا تو یہی صلہ ملا کہ کبھی دو گھڑی کیلئے ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔" منہ سکیڑ کر تسنیم بولی۔ "ابھی آئے ابھی کیا جاتے ہو۔"

میں جھٹ آگے بڑھکر بول اٹھا۔ کیا حرج ہے آخر وہ کام سے جاتے ہیں

میرے شوہر کا ساتھ ... ہی کافی ہے۔"

ڈاکٹر ... نے بیوی کو جواب کی مہلت دیئے بغیر کہا۔ "اچھے اخترا تم ... پر چھوڑ دو ... کیا بلکہ زندگی کا کیس ہے ممکن ہے تمام رات ہی انھیں وہاں رہنا پڑے۔ اگر نو بجے تک میں یہاں واپس نہ آیا تو تم انہیں گھر پہنچا دینا۔ اگر تم نہ ہوئے تو اسی وقت مجھے انہیں کسی طرح بھی جا کر گھر پہنچانا پڑتا۔"

میں نے اپنے دلی جذبات کو چھپاتے ہوئے مری آواز سے کہا۔ "اچھی بات ہے۔" حالانکہ تسنیم کے ساتھ اس اتفاقی تنہائی میں کچھ دیر رہ لینے کی خوشی سے میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ ہمیشہ کلب میں دور سے چند گھنٹوں کی ملاقات ہوتی تھی۔ میں نے اپنے دلی تاثرات کو پوشیدہ رکھا۔ تاکہ کسی کو کچھ شبہ نہ گزرے۔ میرے دل میں آتشِ شوق بھڑک رہی تھی۔ نو بجے رات کو جب میں کار پر تسنیم کو گھر پہنچانے کے لیے سوار کرانے لگا تو اُس سے بے تکلفی سے ملنے کی ایک عارضی مسرت کی روشنی میرے دل میں جھلملانے لگی۔ میری بیوی کی شاندار کار میں جب وہ سوار ہو چکی تو اپنی میں باتیں ہونے لگیں اور اس کے حسین و جمیل چہرے کو پھر ایک بار اس قدر قریب دیکھ کر میں کانپ گیا۔ لیکن فوراً ہی اپنی رام کہانیاں دہرانے میں ہم دونوں مصروف ہو گئے۔

میں نے کہا "آج کیا تقدیر جاگی جو آپ مجھ پر اتنی مہربان ہو گئیں؟

آپ تو مجھ سے بیزار ہی رہتی تھیں۔"

"کبھی نہیں۔" تسنیم نے شیریں لہجہ میں جواب دیا۔

"مگر تم ظاہر تو یہی کرتی رہیں برابر۔"

"اور یہ بات تمہیں پسند نہ آئی کیوں؟ تمہیں اس بات پر طیش آگیا تھا کہ سارے کلب اور سارے شہر میں صرف میں ہی ایک لڑکی تھی جو تم پر دالہ و شیدا نظر نہیں آتی تھی۔ تم اپنے حُسن پر اس قدر مغرور تھے۔"

میرا سر یہ سُنکر چکرا گیا۔ خدایا! تسنیم کو مجھ سے محبت تھی۔ اور اتنے دنوں وہ صرف اپنی فوقیت جتانے کیلئے مجھ سے الگ الگ رہا کرتی تھی۔ ظالم! مجھے کہیں کا نہ رکھا۔ وہ میرے آگے سرِ تسلیم خم کرنا نہیں چاہتی تھی۔ مغرور حسینہ! وہ چاہتی تھی کہ اسکی پرستاری ہی ہم سب لگے رہتے۔ میں نے صاف سُنا دیا کہ تم نے مجھے دھوکا دیا۔ میں تم پر جان دیتا۔ اور تمہاری محبت میں دیوانہ تھا۔ آہ! تم نے یہ کیا کیا؟ خیر اس کی کچھ تلافی اب بھی کر دو۔ کم از کم مجھے ——

یہ کہکر میں نے اپنے مضبوط بازوؤں میں اُسے گھیر لیا۔ اور اس کے سُرخ یاقوتی ہونٹوں پر بوسوں کی بارش کر ڈالی۔

میں نے کہا "آہ! ایک لمحہ کے لئے اپنے شوہر کا خیال دل سے نکال ڈالو اور اُس پر اپنی محبت کی ... پہلے اُس نے انتہائی قوت سے مقابلہ کر کے مجھے پیچھے ہٹایا۔ مگر ... سے محبت کی اب ... تھی۔ میں اس سے محبت کرتی تھی مگر ... شوہر کی امانت ہوتی۔ میں مجبور تھی۔ دل کے ہاتھوں!

——(۳)——

اُس روز رقص سے واپس آنے کے بعد تمام رات ... نہ آئی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ پہلی بار محبت کے سند پر ... ہو گیا ہوں۔

پروین سے میں نے یہ راز پوشیدہ رکھا۔ دو ہفتے تک ہم اس ... بہشت میں شجرِ ممنوعہ کی نعمتوں سے حظ اٹھاتے رہے اور خفیہ ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔

ایک دن تسنیم نے آکر یہ روح فرسا خبر سنائی جب ... جاتے رہے۔ کہ اُس نے تمام قصہ اپنے شوہر کو سنا دیا ہے۔ اور وہ تسنیم کو چھوڑنے پر بطیبِ خاطر تیار ہو گیا ہے۔ اور کیوں نہ ہوتا مرد سب کچھ کر سکتا ہے مگر بیوی کی بیوفائی اُس سے برداشت نہیں ہو سکتی۔ مرد بیوی سے ہزاروں بہانے تراش کر اپنی محبوبہ کے ساتھ رنگ رلیاں منانے میں کوئی اہانت محسوس نہیں کرتا۔ برخلاف اس کے بیوی کا کسی کے ساتھ اعتدال سے تجاوز ارتباط کبھی گوارا نہیں کر سکتا۔ فریدوں قید منافقت اور ریاکاری کی زندگی کا قائل نہ تھا۔ جب یہ بات سُنی تو میرے پیر تلے کی زمین تن سے نکل گئی۔ اور میں نے گھبرا کر کہا۔

"ہائے تسنیم یہ تم نے کیا کیا؟ میں تو پروین کو علیحدہ نہیں کر سکتا ——

بچے —— ہمارا بچہ! —— پھر میری ماں —— اور ——"

"جی ہاں۔ جی ہاں۔ میں جانتی ہوں۔" یہ کہکر وہ فکرمند سی ہو گئی۔ خیر میں فریدوں سے کہونگی۔ مگر میں اُن کا روپیہ اب لینا نہیں چاہتی ہوں تمہارے پاس تو کافی روپیہ ہوگا۔ مگر پروین کی دولت مجھے نہیں چاہیئے۔"

"میرے پاس کافی روپیہ ہے۔" میں نے جھوٹ بات کہی۔

"ہاں تم سے لینے میں مجھے کوئی عذر نہیں۔" یہ کہکر پیار سے مجھے دیکھنے لگی۔ لیکن معاملے کی نزاکت کا آج پہلی بار مجھے احساس ہوا۔ اور میں ایک شادی شدہ عورت سے محبت کر کے پچھتا رہا تھا۔ نفضول اس غریب کا گھر اجاڑا۔ اُدھر اپنے میں سنبھالنے کی ہمت نہ تھی اور نہ روپیہ!

تھوڑے ہی عرصہ میں تسنیم کی طلاق کا قصہ چرچا ہونے لگا۔ وہ الگ ایک فلیٹ اپل سویٹ میں رہنے لگی تھی۔ میں احمقوں کی طرح ... کا اسیر ... حسرت زدہ بے روزگار آدمی تھا۔ مگر اپنی سینہ ... جاں نثار شریف بیوی ...

[illegible] تھا ۔ لیکن قسمت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ بیوی سے بآسانی [illegible] کہ اُس سے اپنی محبوبہ کیلئے زندہ ابلیات اور اعلیٰ قسم کا لباس خرید سکتا ۔ تاہم جس قدر اخراجات کا بار میں اٹھا رہا تھا وہ کم تھے شہر میں یہ خبر [illegible] کہ خوشرو، ہیم اور شائستہ، متمول ڈاکٹر فریدالدین کی بیوی نے اپنے شوہر سے [illegible] ۔ سوسائٹی میں کوئی تسنیم کو ملزم قرار دے رہا تھا تو کوئی [illegible] مجھے ۔ ہم بے مختلف حلقوں میں یہ بات کہہ رہا کہ ہم اپنے جذبات اور احساسات کی تکمیل پر قادر نہیں ۔ چرا ہمیں بے غلطی اور شہادت سے محروم ہوتی ہے ہم اختیار کر لیتے ہیں ۔ میں جہالت اور سماج کے اس قعر ذلت سے نکلنا چاہتی ہوں ۔ شرافت، نجابت اور شوہر پرستی کی فرسودہ روایتوں سے تنگ آ گئی ہوں ۔ کیا وجہ ہے کہ مرد کمال آزادی سے جو چاہیں کر گزریں اور ہم عورتیں انکی بے التفاتی کی [illegible] اپنی قسمت پر شاکر بیٹھی رہیں ۔ یا جو بھی دل پر گزرے ایک کے ساتھ زندگی برباد کر لیں ۔ شرع نے تو ایسی قید لازمی نہیں رکھی ہے ۔ مگر جب اُس کا ضمیر ملامت کرنے لگتا تو ان جذبات و تاثرات پر خود شرمندہ ہوتی تھی ۔ وہ اصل اپنی اخلاقی کمزوری سے مجبور تھی ۔ ہر روز جب میں پہنچتا تو یہ ارادے متزلزل ہو جاتے اور ہم دونوں گناہ کی لذت اندوزیوں میں سب کچھ فراموش کر جاتے ۔

مجھکو ڈر تھا کہ میری بیوفائی کی داستان کہیں پروین کے گوش گذار نہ ہو جائے ورنہ سونے کی چڑیا ہاتھ سے نکل جائیگی ۔ لہٰذا میں اس پر ڈورے ڈالنے کی ترکیب جاری رکھے ہوئے تھا ۔ بیوقوف لڑکی میرے کرتوتوں سے بے خبر میری پرستش کئے جا رہی تھی ۔

ایک دن میں جب گھر لوٹا تو خلاف معمول دیکھا کہ پروین چیں بہ جبیں ہو کر بینک کا حساب دیکھ رہی تھی ۔ میرا دل دھڑکنے لگا ۔ مگر اس وقت اُس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا ۔ اور نہ کوئی سوال کیا ۔ مگر مجھے اس کا اندازہ ہو گیا کہ وہ میرے کثیر اخراجات پر ضرور خفا ہو گئی ہے ۔ میں ان یتیم بچوں کی جمع شدہ رقوم پر ہاتھ صاف کرنے لگا ۔ وہ اصل میں تو ان کا ولی تھا ۔ اور میں نے اس ارادے سے ہاتھ لگایا کہ تھوڑے دنوں بعد جب پروین کے خیالات ٹھیک ہو جائیں گے بہلا پھسلا کر اتنی رقم اُس کے سرمایہ سے نکالکر یتیموں کا حساب بے باق کر دوں گا ۔ یا نہیں تو پروین سے قرض کے بہانے ہی سہی روپیہ لیکر ان کی رقم پوری کر دوں گا ۔

چنانچہ میں نے کئی ہزار اُس مد سے لیکر تسنیم کی آرام و آرائش میں خرچ کر دیئے ۔ پروین اب بھی مشتبہ نظروں سے مجھے دیکھتی تھی ۔ وہ بدظن ہو کر کچھ سرد مہری بھی اختیار کر چکی تھی ۔ بجائے اسکے کہ مجھے پاس رہنے کیلئے منتیں کرتی انکی محبت اور مسرت کی شیریں دلفریبیوں سے مجھے اپنی طرف مائل کرتی ، خاموش اور الگ الگ رہنے لگی ۔ گو مجھے یہ دیکھکر شرم و افسوس آتا ۔ مگر میرا دل تسنیم کے عشق میں کچھ ایسا مسحور ہو چکا تھا کہ ہوش و حواس باقی نہ رہے ۔ پروین کی خستہ حالی اور چہرے کی زردی کو غور سے دیکھتا ۔ پروین اب دن رات اپنے بچے کی غور و پرداخت میں منہمک رہا کرتی تھی ۔ وہی اسکی ساری مسرتوں اور تمناؤں کا محور تھا

(۴)

اسی طرح کئی ماہ گزر گئے ۔ اب تسنیم سے میری آن بن ہونے لگی ۔ تلون مزاج عورت ! اس نے پہلے تو اپنے پیروں پر آپ کلہاڑی ماری ۔ اور اپنی کشتی منجدھار میں بے ملاح چھوڑ دی ۔ پھر ساحل مراد کی تمنا بیکار تھی ۔ شیدائی ، نیک خلق ، فرشتہ خصلت شوہر کو چھوڑ کر مجھ جیسے محتاج قلاش خود غرض اور خود بین انسان کے ساتھ نبھانا کیا آسان تھا ۔ اس پر سوسائٹی میں اس قدر مطعون ہو چکی تھی کہ کہیں دو گھڑی کے لئے بھی اس کا گذر ممکن نہ تھا ۔ جی ہاں ! وہی قابل تعریف سوسائٹی جو اُسے آزادی اور عیش منانے کی تبلیغ کرتی تھی ۔ آج اس ہی نے اسکی انتہائی آزادی پر اسکو عام طعن و تشنیع کا مورد اور خاموش مگر جائز ملامت کا مرکز بنا رکھا تھا ۔ وہی جو ہم سے ملتے تھے اب ہم سے آنکھیں چراتے اور ہمیں نفرت سے یاد کرنے لگے ۔ تسنیم بھی اب مجھ سے نفرت کرنے لگی تھی ۔ اسکی ہر بات سے اسکا اظہار ہوتا تھا کہ اس نے ہنگامی جذبات اور میرے ورغلانے پر اپنی ارضی جنت اور اسکی بے پایاں مسرتوں کو گنوایا ۔ اسکی خانگی آسائشیں برباد کر دیں اسکو گمنامی اور عزلت گزینی میں دھکیل دیا کیونکہ مشہور ہے بد اچھا بدنام برا ۔ ادھر ڈاکٹر فریدالدین میرے اس حق دوستی کو غصب کرنے پر مجھ سے الگ خفا تھا ۔ مگر اس کے باوجود وہ بڑا ہی صابر اور نیک انسان تھا گو کہ بیوی اور خانہ تباہی کے غم میں وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا تھا ۔ مگر وہی خندہ روئی اور شیریں کلامی اُس میں اب بھی موجود تھی ۔ ساری دنیا اس کی ہمدرد تھی ۔ سوسائٹی بھی اُس سے انتہائی اور گہری ہمدردی کا ثبوت پیش کرتی تھی کیونکہ عورت کی لغزش ہمیشہ ہی بڑھ چڑھ کر نظر آتی ہے ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر کے حلقۂ احباب میں اضافہ ہوتا گیا ۔ اور اس کی پریکٹس چمکتی گئی ۔ اس کی مالی حالت بھی پہلے سے سہ چند ہو گئی ۔ اس نے ایک اور شاندار کار خرید لی تھی ۔ ایک دن اتفاق سے تسنیم سے اس کی ملاقات ہو گئی ۔ تسنیم اس قدر متاثر ہوئی کہ دو روز تک اُس نے نہ کچھ کھایا اور نہ مجھ سے مخاطب ہوئی ۔ اور نہ ہی مجھے ہاتھ لگانے دیا ۔ تمام وقت افسردہ خاطر اور اشک ریزی میں مصروف رہی ۔ آخر میں نے جھنجھلا کر کہا ۔

" اگر ایسی ہی شوہر پر فدا تھیں تو ـــــ "

" تو میں نہیں کہتی کہ مجھکو ان کی محبت ہے " بات کاٹ کر تسنیم بولی " میں

اس سے محبت نہیں کرتی تھی جتنا کہ اور نقد رقم کو چاہتی ہوں۔ الغرض اب تو تم ہی میرے سب کچھ ہو ... بہت دنا سنبھالا لیتی رہی مگر اب تسنیم پہ پیدا ہوا اصل میں نکا تھا کہ اس نے چیتے کی طرح مجھ کو سراب کے دھوکے میں لا چھوڑا۔ وہ حیثیت کا منتظر کر معشوق کی طرح مجھ پر فریفتہ ہو گئی تھی۔ میری جذباتی سرگرمیوں میں سچی محبت کا شائبہ بھی نہ تھا۔ مجھے اس کی حسن و جوانی سے غرض تھی۔ برعکس اس کے اسکا شوہر اس کو دل سے چاہتا تھا۔ اور اسکی غلط روی سے اس طرح گھل رہا تھا جیسے جلتی شمع! اب میں تسنیم سے کنارہ کشی کی فکر میں تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ خود ہی الگ ہو جائے۔

——— :(۵): ———

اس عرصہ میں اقتصادی زبوں حالی بڑھتی گئی۔ اس کے ساتھ ساتھ میری مشکل بھی۔ ہر جگہ بنک اور تجارتی مرکزوں میں روپیہ کی ضرورت تھی۔ بنک کا حساب باقاعدہ جانچ کیا جاتا۔ مختلف سرمائے متفرق کاروبار میں لگائے جاتے تھے۔ اس ضمن میں اس سرمایہ کا حساب بھی پڑتال کیا جانے لگا جس کے ذریعے یتیموں کا مالی تھا۔ بحیثیت گارڈین یتیموں کے مال کا حساب مجھے ہی پیش کرنا تھا۔ اس میں بیس ہزار تو میں نے خرچ کر دیئے تھے۔ آخر یہ رقم کس مد میں پیش کرتا۔ بنک میں سے بیلنس شیٹ نکال کر کمیٹی کے تمام ارکان کو دکھانا تھا جو کسی طرح ممکن نہ تھا۔ اگر ۴۸ گھنٹوں کے اندر میں پوری رقم موجود نہ کرتا تو مجھے جیل کی ہوا کھانی تھی۔ اب صرف ایک راستہ رہ گیا تھا یعنی پروین سے یہ رقم نکال کر کے اپنی عزت بچاتا اور اس کو اپنی مدد پر آمادہ کرتا۔ اس غرض کے لئے میں جانتا تھا کہ مجھے راست بازی سے کام لینا ہوگا۔ پروین الف لیلے کے افسانوں میں اب آنے والی نہیں۔ مجھے اپنی اور تسنیم کی داستان معاشقہ کا شرمناک فسانہ بیان کرنا ہوگا۔ اور اپنی گزشتہ بداعمالیوں سے توبہ کر کے اس سے مدد مانگنے کے لئے التجا کرنی پڑیگی۔ اس وقت اس کے جذبات میں ہیجان پیدا ہو رہا تھا۔ پروین کے سامنے اپنی بیوفائی اور تضحیک کی داستان سنانی قیامت سے کم نہ تھی۔ اس رحمدل فرشتہ خصلت لڑکی کے سامنے جو میرے علاوہ میرے تمام کنبہ کی بھی پرورش کر رہی تھی۔ تاہم اب وہی ایک ہستی تھی۔ جو اس قعر مذلت سے مجھے بچا سکتی تھی۔ آہ! وہ کس قدر ایثار پرست تھی اور میں کس قدر ذلیل اور کمینہ۔

آخر میں نے اس کو اپنی بدکرداریوں کی ساری داستان سنا دی۔ شرم سے آنکھیں چار کرنے کی ہمت نہ تھی۔ جب میں نے اپنی کہانی ختم کی تو مجھے محسوس ہوا کہ اس نے اپنے کانپتے ہوئے سرد ہاتھوں سے مجھے چھوا۔ اسکی آنکھوں کے عمق میں رحم اور محبت جھلک رہی تھی۔ اس نے کچھ کہا نہیں۔ صرف بالوں اور سر پر ہاتھ پھیرے۔ میں نے کہا پیاری پروین! مجھے معاف کرو۔ سب میری تمنا ہلک گئی ہے۔ تمام عمر

تمہارا غلام رہوں گا ... [illegible] اس نے ... اور اگر میں مر بھی جاؤں ... تم اب بھی مجھے چاہتی ہو؟"

"بیشک"! اس کے بعد دیر تک وہ میرے پہلو میں بیٹھی آنسو بہاتی رہی۔ گو روپیہ کے متعلق اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ میری ... کے لئے یہ کافی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس وقت سر ... [illegible]

... تسلیم ... [illegible]

اس نے کہا "میں تمہیں اس قدر چاہتی ہوں کہ تمہاری قسمت اور ضمیر کو زندہ بچا لونگی"۔

"یعنی"

یعنی کہ میں تمہیں اس قدر چاہتی ہوں۔ مگر تم مجھے متنفر ہو۔ پھر میں اس کا بُرا نہیں مانتی بلکہ چاہتی ہوں ——— ہاں چاہتی ہوں کہ جیل جا کر اپنے ضمیر کو پاک کر کے اس محبت میں جلا دو"۔

"مجھے جیل میں جانے دو گی؟"

"میں کیا کر سکتی ہوں" اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ اور وہ انتہائی رنجیدہ نظر آنے لگی۔

"پیاری پروین کیا تمہارا دماغ چل گیا ہے کہاں تو یہ دعویٰ ہے کہ مجھے بے انتہا چاہتی ہو۔ پھر مجھے جیل جانے سے بچاؤ گی نہیں۔ اور نہایت اطمینان دل سے میری بربادی دیکھنے پر آمادہ ہو۔ کہیں مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟"

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ کیا تم جانتے ہو کہ مجھے تسنیم کا قصہ پہلے معلوم نہ ہوا تھا۔ اسی روز سے مجھے یہ علم ہو گیا تھا جس روز تم نے مجھ کو تنہا چھوڑ کر نواب شوکت جنگ کی رقص پارٹی میں گئے تھے۔ دو سال ہماری شادی کو ہو گئے اور اس عرصہ میں جیسی صبر آزما بے کیف اور مصیبت ناک زندگی میں نے بسر کی ہے میں ہی جانتی ہوں۔ اور جیسی عظیم الشان قربانیاں میں نے کیں وہ کچھ تمہارا ہی دل جانتا ہوگا۔ تم سمجھتے ہو کہ میں نے تمہاری نفرت نہیں جھیلی۔ خیر جانے دو۔"

"پروین!" کہکر میں نے اس کے پیروں پر سر رکھ دیا۔ پروین نے سر اٹھا کر کہا "اٹھو فرشتہ! آج ہی تو کہتے تھا ... [illegible] نہیں تھے۔ دراصل یہ سارا قصور تمہارا نہیں۔ میرا ... [illegible] ہم دونوں نے مل کر تمہاری ... کی بنا پر اعتمادی کا ... [illegible] تم کو دوسروں پر تکیہ کئے بیٹھے اور ... زندگی گزارنے کی عادت ... [illegible] بھی اس کی بدیانت کا ... ہے۔ اب ... تم مردانہ وار ... [illegible]

پھانس

(از محترمہ پروین قریشی صاحبہ)

جب میں کالج میں پڑھتی تھی۔ تعطیلات کا زمانہ تھا اور والدہ کو ایک عزیز کی شادی میں شرکت کیلئے شہر سے باہر جانا تھا۔ مجھے وہ اپنے ساتھ لے جانا نہ چاہتی تھیں۔ بہت رد و قدح کے بعد یہ ٹھیرا کہ میں بھائی جان کے پاس الہ آباد چلی جاؤں۔ مجھے بھی الہ آباد دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ اس لیئے فوراً راضی ہوگئی اور دوسرے دن مع ملازم اور اپنی آپا کے الہ آباد روانہ ہوگئی۔

بھائی جان الہ آباد میں ملازم تھے۔ میری یکایک آمد سے بہت خوش ہوئے۔ گھر کے متعلق سوالات کرتے رہے اور نام بہ نام سب کے حالات دریافت کرتے رہے۔ بمشکل تین بجے ہم سوسکے۔

"ربّو! تم جلدی سے نہا دھولو، تو تمہیں دفتر جاتے ہوئے مسز صدیقی کے ہاں چھوڑتے چلیں۔" بھائی جان نے اخبار کو سرسری نظر دیکھتے ہوئے کہا۔

"بھائی جان! آج تو کہیں بھی نہ جاؤں گی۔ رات کی تھکن اتاروں گی۔"

"بھئی تم اکیلی ہو۔"

"لیجئے اور سنئے۔ ایک آپا اور تین ملازموں کے باوجود بھی میں اکیلی ہوں۔"

"میرا مطلب ہے . . . . خیر جیسی تمہاری مرضی۔"

شام کو بھائی جان آئے تو اُن کے ہمراہ ایک اور نوجوان بھی تھا۔ اسکے خد و خال کچھ ایسے خوبصورت نہ تھے۔ گہرا سانولا رنگ، موٹا نقشہ، متوسط قد، گھنگریالے بال، آنکھیں روشن و ذہین اور اُن میں بلا کی شوخی، چہرے پر غضب کی متانت و سنجیدگی مسکراہٹ میں ہلکی طنز۔

"ربّو! یہ میرے دوست جمال فاروقی ہیں۔ اور فاروقی! یہ میری چھوٹی بہن رابعہ سلطانہ ہیں۔" بھائی جان نے میرا اس سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

وہ اس انداز سے گھور رہا تھا کہ میں باوجود اس قسم کے میل جول کے عادی ہونے کے کچھ سٹ پٹا سی گئی۔ بھائی جان نے شاید میری گھبراہٹ کو محسوس کرلیا اور مجھے متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ "ربّو! بھئی فاروقی کو بٹھاؤ۔ میں ابھی غسل کر کے آتا ہوں۔" میں اپنی جھجک پر جھینپ رہی تھی۔ بمشکل اپنے کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ "آپ تشریف رکھئے۔"

"جی مجھ سے کچھ ارشاد ہوا؟" اسی انداز سے گھورتے ہوئے کہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گویا آنکھوں کے ذریعہ میری روح کی گہرائیوں تک پہنچنا چاہتا ہو۔

میں نے قصداً آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں تشریف رکھئے۔ آپ تھکے ہوئے بہت معلوم ہو رہے ہیں۔"

"جی نہیں۔ میں تو سوچ رہا تھا کہ یہ شاید ابھی تک آزاد کیوں پھر رہا ہے"

بھائی جان غسل خانے جاتے ہوئے دوسرے کمرے سے بولے۔ "تو کیوں جلتا ہے، تو بھی تو آزاد ہے۔"

"ارے بھئی بہت جلد قید ہونے والا ہوں۔" اور یہ کہتے ہوئے پھر میری طرف گھورا۔ اور میں محجوب ہوکر رہ گئی۔ اپنی شرمندگی مٹانے کو گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "آپ ہی کوئی اچھی سی لڑکی بھائی جان کے لئے بتائیے۔ آپ کے تو دوست ہیں۔ آپ پر بھی تو ان کا حق ہے۔"

"جی ہاں! مجھ پر تو سب کے حق ہیں۔ میرا ہی حق کسی پر نہیں ہے"۔ اُس نے ٹھنڈا سانس لیتے ہوئے کہا۔ میں نے محسوس کیا اس کی تیز نظریں پھر میرے چہرے پر جمی ہوئی ہیں اور اسی خیال سے میں نے نظر اُٹھانے کی جرأت نہ کی۔ اور اپنی انگوٹھی سے کھیلنا شروع کردیا۔ دل کی عجیب کیفیت تھی، دُعائیں مانگ رہی تھی کہ بھائی جان جلدی سے آئیں۔ شاید اُس نے میری بے چینی کو محسوس کرلیا اور مجھے سوچنے کا موقع نہ دینے کے لئے سوالات کی بوچھاڑ کردی۔

"الہ آباد آپ پہلی بار تشریف لائی ہیں؟"

"کب تک ٹھیریئے گا؟" "اچھا تو آپ ابھی طفلِ مکتب ہیں۔"

اُس نے شرارت آمیز لہجہ میں مجھے چھیڑتے ہوئے کہا اور میں جواب تک صرف اس کے سوالات سُن رہی تھی، مجبور ہوگئی کہ ایسا منہ توڑ جواب دوں کہ یاد رکھے۔ مگر بھائی جان کی آمد نے خاموش کر دیا۔ اور میں نہ جانے کیوں اطمینان کا ایک لمبا سا سانس کھینچ کر رہ گئی۔

جمال فاروقی تقریباً روز ہی ہمارے ہاں آتا۔ ورنہ وہ بھی صدیقی صاحب کے ہاں ہوتا اور پھر ہم تو وہاں کے فیملی ممبر ہوگئے تھے۔ دوپہر، شام، رات غرض جب منہ اُٹھا اُدھر کا رُخ کیا۔ مجمع میں گو وہ مجھ سے الگ تھلگ رہتا لیکن نہ معلوم کیوں میں یہ محسوس کرتی کہ اس کی چمکیلی آنکھیں میرا ہی پیچھا کر رہی ہیں۔ خواہ وہ کسی سے باتیں کرتا لیکن ایسا معلوم ہوتا کہ اُس کی مخاطب میں ہی ہوں۔ اور اس خیال کی تصدیق اسکی

[illegible] دل سے نکال
[illegible] جب تک میں اس کو [illegible] نہیں ہوئی تھا
میرا [illegible] آ رہا تھا کہ یہی لڑکی جو محبت کا ڈھونگ رچا رہی تھی۔ میرا جی
چاہا کہ اس سے پوچھوں کہ محبت اور رشتے کی پکی یہی ہوتی ہے کہ مجھے جیل خانے
میں بھجوا کے شکل نہیں دکھا رہی ہے۔ یہ غیر یقینی نظر آتا تھا مگر بالکل سچ تھا۔
کششیں بیکار ہو گئیں لیکن کسی طرح سے پروین قائل نہیں ہوئی۔ تمام التجائیں
آنسو اور بے اثر تھیں۔ وہ عزم بالجزم کر چکی تھی۔ اس کے خیال میں اصلاح
کی یہی ایک صورت تھی۔

آخر میں نے کہا۔ "دعوی کرتی ہو کہ مجھے دل سے چاہتی ہو۔ مگر یہ کیسی
محبت ہے کہ روپیہ کو تم مجھ سے بڑھ کر عزیز سمجھیں۔ جب ہی تو یہ انکار ہے ــــ
ہی ــــ میں تم سے نفرت کرتا ہوں۔" میں غصہ سے کھولا رہا تھا۔

"یہ تو میں نے پہلے ہی فیصلہ کر لیا تھا کہ تم مجھ سے نفرت کرتے ہو۔ مگر
سزا تو آخر ملنی چاہیئے۔"

"جی ہاں ــــ پہلے نفرت نہ تھی مگر اب ہے۔ اور سزا جزا کی
مالک تم کون؟"

"بالکل نہیں۔ میں نہ مالک ہوں نہ مجھے سروکار۔"

غرضیکہ تمام حیل و حجت بیکار گئی۔ اس کے مستحکم ارادے میں کوئی
تغیر پیدا نہ کر سکا۔

ــــــــ:(۶):ــــــــ

میں جیل بھیج دیا گیا۔ میرے دل میں پروین کی نسبت حقارت انگیز خیالات
موجزن تھے۔ میں نے جاتے وقت بھی خدا حافظ نہیں کہا۔ آخری باتیں جو میں نے
کہیں وہ دل شکن اور نفرت انگیز تھیں۔ اس نے جو خطوط لکھے میں نے وہ بغیر
پڑھے ہی واپس کر دیئے۔ حتی کہ جیل خانے میں جب وہ ملنے آئی تو میں ملنے سے
انکار کرتا۔ حالانکہ ایک شریف خاتون کا جیل خانے میں آنا ہی کس قدر ایثار پر مبنی تھا۔

وہ مجھے چاہتی ضرور تھی اس لئے میری اصلاح کا اس نے یہ ذریعہ تجویز کیا
تھا۔ یہاں جیل خانے میں تمام قیدیوں کو اس کے حسب لیاقت کام دیئے جاتے
چنانچہ مجھے یہاں اخبار کی ایڈیٹری کی ذمہ داریاں سپرد ہوئیں۔ چونکہ کسی قسم کی
واہیات خرافات محبت اور دلچسپیوں کا یہاں گذر نہ تھا اس لئے میں نے قلمدان
ادارت سنبھالتے ہی وہ جوہر دکھلانے شروع کئے کہ بڑے بڑے اہل قلم عش عش
کرنے لگے۔ اب ایک نئی دنیا۔ سچی اور بلند حوصلگی کی دنیا میرے پیش نظر تھی۔
جیسے ہی میری اس قدر قدردانیاں اور عزت افزائیاں ہو رہی تھیں۔ میرے بلند

تجربات اور قسم کا [illegible] تھا۔ اور میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ سزا ختم ہونے کے بعد
بھی میں اپنی علمی سرگرمیاں جاری رکھ کر اسی کو ذریعہ معاش بناؤں گا۔ اور کسی اخبار کی
ایڈیٹری کر کے اپنا پیٹ پالوں گا۔ ہائے عزت اور دیانت داری کی زندگی کس قدر مسرت
کی ہوتی ہے، اس شاہانہ اخراجات اور بیگمی کے مقابلہ میں ذلیل ہونے اور جیل کی ہوا
کھانے سے تو بدرجہا بہتر ہوگا ــــ یہاں آکر مجھے معلوم ہوا کہ مجھے جیل میں
بھجوانے میں اصلاح کی تجویز ــــ میری دور اندیش مظلوم پروین نے کیوں کی
تھی۔ اگر وہ اپنے سرمایہ سے میرا قرضہ ادا کر کے مجھے اس مرتبہ جیل جانے سے بچا لیتی
مگر پھر میری بگڑی ہوئی عادت یہی رنگ لاتی۔ اور میں قرضہ یا غبن کی علت میں
پھر پکڑا جاتا اور خوار ہو کر جیل کی ہوا کھاتا۔ اصلاح کبھی نہیں ہوتی۔

گو کہ پروین نے بڑے بڑے وکیلوں سے پیروی کروا کے مجھے غبن کے
الزام سے بری کرا کے صرف قرضہ کی سزا بھگتنے کیلئے چھوڑا تھا۔ اس طرح میری ہر کرتوت
نے مجھے کیفر کردار کو پہنچایا اور اس کی سزا نے میری آنکھیں کھلوا دیں۔ ڈیڑھ سال کی
قید کی سزا تھی۔ ایک سال کے بعد میری بیوی مجھ سے ملنے آئی۔ غم و اندوہ سے
اس کی حالت مجھ سے بدتر تھی۔ آنکھیں دھنس گئی تھیں۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو رہی
تھی۔ مجھے دیکھتے ہی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ مجھے جیل خانے کے لباس میں دیکھ کر وہ
رو پڑی۔ اور دوڑ کر میرے قدموں سے لپٹ گئی۔ میں نے فوراً اسے سینے سے
لگا لیا۔ اور ساری داستان سنائی۔ ہم دونوں دیر تک روتے رہے۔ پروین
نے کہا مجھے معاف کر دو گے؟ میں نے کہا تم بالکل حق بجانب تھیں۔ پیاری اگر
یہاں نہ آتا تو پھر کسی نئی علت میں گرفتار رہتا۔ پروین یہ اعتراف سن کر
نہال ہو گئی۔

میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں فرط محبت سے چمک رہی ہیں۔ سب کا
حال جب میں پوچھ چکا تو تسنیم کو پوچھا۔

اس نے کہا کہ "ڈاکٹر نے اسے معاف کر دیا اور پھر بیاہ لیا ہے۔ اب
وہ پھر خوشی کی زندگی گزارنے لگے ہیں۔"

"کہاں ہیں وہ اب؟"

"وہ ہسپتال کے بڑے ڈاکٹر ہو کر تحقیقاتی کمیشن پر گئے ہیں۔"

"کمیشن پر از روپیہ کس نے دیا؟" اس نے سر جھکا لیا۔

"میں نے دیا۔ کیونکہ اس واقعہ کے بعد وہ تسنیم کو لیکر اس شہر
میں رہ نہیں سکتے تھے۔ چنانچہ تمہاری وجہ سے جو نقصان غریب ڈاکٹر فریدوں قدر
کو پہنچا تھا اس کی تلافی میں نے کر دی۔"

ــــــــ

جب میں جیل سے نکلا تو معلوم ہوا کہ بے شمار روپیہ خرچ کر کے میری
وفا شعار بیوی نے چھ سال کی قید کو معاف کرا دیا اور میری ماں کے لئے
ایک معقول رقم الگ اُن کے نام بنک میں جمع کرا دی تاکہ اس کی آمدنی سے
وہ اپنے مصارف پورے کرتی رہے۔ ہمارے پاس اب روپیہ بہت ہی کم رہ گیا تھا۔
میری جاں نثار بیوی نے اپنی کروڑوں روپے کی جائداد میری خاطر تباہ کر لی۔ اب
میں ہوش میں آچکا تھا۔ ہم دونوں کی صلاح سے دیہات میں کئی ایکڑ زمین اور ایک
مکان خرید لیا گیا۔ یہاں میں نے باغبانی مرغیاں اور مویشیوں کے پالنے کا

[illegible]
کافی امنگ تھی۔
اب ہم دونوں کو کوئی فکر نہ تھی۔ گو ہم بہت زیادہ امیر نہ تھے [illegible]
ہم خیالی نے ہمیں ایک دوسرے کا پرستار بنا دیا تھا۔ ہم [illegible]
حقیقی مسرت اور اصلی راحت کے مزے لے رہے تھے [illegible]
ہمیں ایک دوسرے سے کوئی شکایت نہیں ہے۔
ہم گویا ارضی بہشت کے مزے لے رہے تھے۔ ازدواجی زندگی کا [illegible]

تجلیاتِ نظمی

(۱)

کم ظرفی رنداں سے نظمی میخانے بدلتے رہتے ہیں
تند دیکھ کے پینے والوں کا پیمانے بدلتے رہتے ہیں
تکمیل جنوں کیا ہوتی ہے پابندی نجدِ وحشت سے
دیوانے فروغِ غم کیلئے ویرانے بدلتے رہتے ہیں

(۲)

حقیقت ہے لیکن حقیقت نہیں ہے
شکایت کا مقصد شکایت نہیں ہے
ذرا دیکھ تو بھی خدائی میں تیری
مروت نہیں ہے محبت نہیں ہے

غزل

کیا تو عشق مگر اُن کو آزما نہ سکے
حدیں وفا کی وہ شے تھیں کہ ہم بنا نہ سکے
کسی طرح بھی محبت کو آزما نہ سکے
تمہیں نے آگ لگائی تمہیں بجھا نہ سکے
ترے جمال کی وہ چھوٹ ہے معاذ اللہ
نظر میں آ نہ سکے قلب میں سما نہ سکے
کمالِ عشق کی مجبوریاں ارے توبہ
کہ تم کو دیکھنے والے نظر اٹھا نہ سکے
کسی خیال نے حیران کر دیا اُن کو
جمال دیکھ کے اپنا وہ مسکرا نہ سکے
بڑا ستم ہے طبیعت شناس ہو جانا
ہنسی کی بات بھی نکلی تو مسکرا نہ سکے

ہمیں نہیں ہیں محبت کے صرف متوالے
تری نگاہ کو بھی بے نیاز پا نہ سکے

از جناب نظمی

"...جہاں تم ہو!"

(از محترمہ اختر جہاں سلیم صاحبہ)

دمکتا ہوا گلابی چہرہ جیسے شفق کا عکس پڑ رہا ہو۔ ستواں جھیلوں پر چھائی ہوئی سیاہ پلکیں۔ جن کے سائے سے جھیل جیسی آنکھیں اور بھی گہری ہو جاتی تھیں۔ نچلے ہونٹ کے وسط میں ہلکا سا خم کچھ عجیب سی بناوٹ جس پر ہر وقت مسکراہٹ کھیلتی رہتی۔ بعض دفعہ تو میں پوچھ بیٹھتی "بلا کس پر مسکرا رہی ہیں؟" "نہیں تو" ۔ آپا کی مسکراہٹ اور بھی نمایاں ہو جاتی ۔ وہ مسکراہٹ بھی یاد ہے۔ جس میں کپکپاہٹ کی لرزش تھی، ہونٹوں کی شگفتگی اور نکھار تھا۔

آپا کی باتوں میں کس قدر خلوص اور ملائمیت ہوتی تھی۔ ان کی آواز سن کر مجھے محسوس ہوتا جیسے میرے کانوں میں ٹھنڈا ٹھنڈا رس ٹپک رہا ہے۔ ہم بچوں سے بڑے شوق اور توجہ سے باتیں کرتیں۔ بچوں کے مہمل سوالات کا تسلی بخش جواب دیتیں۔ آپا سے باتیں کر کے مجھے یقین ہو جاتا کہ میری باتیں بڑی کارآمد اور قابل توجہ ہوتی ہیں۔ اس احساس کے ہونے سے مجھے اپنے وجود پر فخر ہونے لگتا۔ اس کے برعکس بھیا میرے بے تکے سوالات پر جھنجھلا اٹھتے۔ ذرا سی بات پوچھی اور جھڑکا۔ یہاں تک کہ بعض وقت تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ لیکن انہیں پھر بھی احساس نہ ہوتا۔ "جاؤ جاؤ ـــــ چھوئی موئی کا درخت ـــــ اپنی لاڈلی آپا کے پاس جاؤ، انہی کا مغز چاٹو۔" بھیا بھی عجیب تھے۔ ہر وقت جھنک پنجے کالج سے آتے ہی گھر میں اودھم مچا دیتے۔ کھانے میں دیر ہوئی تو روٹھ کر پڑ گئے۔ نوکروں کو ڈانٹا، ماما کو دھمکایا۔ لیکن پھر جلدی سے من جاتے۔ ان کے منانے کا سہل سا نسخہ یہ تھا کہ جہاں روٹھ کر لیٹے اور میں چپکے سے ابا میاں کو بلا لاتی۔ ابا میاں بھیا کو پیار سے آواز دیتے۔ "صباحت!" ۔ "جی" ! ۔ بھیا ایک دم اٹھ کھڑے ہوتے۔ "کھانا کیوں نہیں کھا لیتا" ۔ "جی ذرا سستانے لیٹ گیا تھا" پھر جلدی سے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور کھانا کھانے بیٹھ گئے۔ جتنی جلدی روٹھتے اتنی ہی جلدی من جاتے۔ شرارتی بھی بہت تھے۔ جب خوشی میں ہوتے تو ہم بچوں کے ساتھ کھیلنے لگتے۔ دو چھپر آمنے سامنے کھڑے کر کے ان پر ایک اور پلنگ بچھا کر تانگہ بنتا۔ بھیا تانگے والے کا پارٹ خوب ادا کرتے تھے۔ سب بچے تانگے میں بیٹھ جاتے تو بھیا بھی اپنا چابک سنبھال کر بیٹھ جاتے اور تانگہ چلنے لگتا۔ "لے بھئی تانگہ ذرا آہستہ چلاؤ۔" "اماں چپ بیٹھے رہو (رہو) چل تو رہے ہیں۔ اگر بڑبڑ کی تو چھوٹا نے جرمانہ (جرمانہ) کر دوں گا۔" مختصر یہ کہ امی اور آپا ہنستے ہنستے پاگل ہو جاتیں۔ لیکن بھیا مسکراتے تک نہیں۔ اسی دوران میں اگر ابا جان آ جاتے تو دو تین چھلانگیں ماریں اور غائب۔ آپا کی اور بھیا کی تو کبھی بنتی ہی نہ تھی ہر وقت کھٹکتی تھی۔ بھیا آپا کی ہر بات میں عیب نکالتے اور اس قدر ستاتے کہ آپا رونا آ جاتا۔ خصوصاً ان کی سہیلیوں کے سامنے تو خوب ہی شرمندہ کرتے۔

ایک دفعہ آپا کی طرف سے ان کی سہیلیوں کو جھوٹ موٹ دعوتی رقعے لکھ بھیجے جس کا مضمون تھا۔ "آج کل بسنت ہے۔ لہٰذا میں آپ کو بسنتی دعوت دے رہی ہوں۔ کھانے کے بعد فلم بسنت دیکھنے کا پروگرام ہے۔" شام ہوتے ہوتے آپا کی سہیلیاں بسنتی لباس میں اکٹھی ہو گئیں۔ آپا حیران ہو رہی تھیں کہ آخر یہ سب سہیلیاں ایک ساتھ کیوں چلی آئیں۔ آخر کھانے کا وقت آیا ۔ ثریا بولیں "بھئی کھانا جلد ختم ہو جانا چاہئے کیونکہ سنیما بھی تو جانا ہے۔" آپا اور بھی سٹپٹائیں۔ لیکن اخلاقاً ہاں میں ہاں ملانے لگیں ۔ اتنے میں بھیا بھی مسکراتے ہوئے آ گئے۔ "او ہو سرسوں کے پھول کھلے ہوئے ہیں۔" آپا سمجھ گئیں کہ بھیا کی شرارت ہے۔ اس وقت تو مسکرا کر چپ ہو گئیں اور جیسے تیسے پروگرام نبھا یا اور بعد میں تو آپا کی اور بھیا کی خوب ہی لڑائی ہوئی ۔ کئی دن تک بول چال بند رہی۔ آخر ایک دن وہی نسخہ استعمال کرنا پڑا۔ ابا میاں نے پوچھا "کیا بات ہے تم آپس میں بولتے کیوں نہیں"۔ "جی نہیں ۔ میں تو بولتا ہوں۔ یہی نہیں بولتیں" ــــــ "خواہ مخواہ میری تو چھٹیاں ختم ہو رہی ہیں۔ ابا جان کو خط لکھ دیا ہے وہ آ کر لے جائیں۔" آپا نے اور بھی منہ پھلا لیا ـــــ "نہیں بھئی لڑا نہیں کرتے ۔ تم ریحانہ کو منا لو۔ بڑے بھائی ہو آخر۔" ابا میاں چلے گئے تو بھیا نے آپا کا منہ چڑا دیا۔ آپا نے بھی وہی بھیا کی نقل کی۔ بس ملاپ ہو گیا اور پھر وہی جھنجھم دار مچنے لگی۔ ان ہی دنوں آپا سخت بیمار ہو گئیں اور کافی دن بستر سے نہ اٹھ سکیں۔ روزانہ آپا کی ایک نہ ایک سہیلی عیادت کے لئے آتی تھی ۔ ایک دن ان کی بڑی ہم نشین امینہ سہیلی آئی ہوئی تھی بھیا کو نہ جانے کیا شرارت سوجھی چپکے سے آپا کے کمرے میں گئے اور دروازے ہی سے بولے۔ "اپنے بھی ریحانہ مدت ہو گئی تمہیں میرے جوتے پر پالش کئے ہوئے پھر گاتے ہوئے پردہ اٹھا یا۔

"مدت ہوئی ہے بوٹ پہ پالش کئے ہوئے"

"اوہ معاف کیجئے ۔ میں سمجھا ریحانہ اکیلی ہیں ۔ خیر میں جاتا ہوں ــــــ" "بیٹھئے"

آپا کو بادل ناخواستہ [illegible] پڑا۔ بھیا کرسی سرکا کر بیٹھ گئے۔ اور آپا کی طرف دیکھ کر بولے "ارے [illegible] کیوں ہو۔ بھلا بوٹ پر پالش ہر کوئی کر سکتا ہے؟" پھر آپا کی سہیلی کی طرف مخاطب ہو کر پوچھا۔ "آپ کا کیا خیال ہے؟" "جی" آپا کی سہیلی نے سٹپٹا کر اثبات میں سر ہلا دیا — "یہ بیچارے پالش بہت اچھا کرتے ہیں اور نہایت سستے معاوضہ میں، یعنی فی بوٹ ایک پیسہ — خیر جانے دیجئے۔ بیچاری مجھے گھور رہی ہیں — ان کو انہیں غصہ بھی آتا ہے۔ ابھی اپنے کمرے میں بیٹھی لہک لہک کر گا رہی تھیں۔ "تم نہیں آتے ہو نہیں آؤ۔ میری بلا سے چولھے میں جاؤ" نہ معلوم کس دشمن کا انتظار تھا اور جناب "بھاگ موذی عشق بھاگ"۔ میں نے مت ہنس مت ہنس کیسے تجھے رلاؤں —"

"جھوٹ — میں کب گاتی ہوں ایسے گانے!؟" ان میں خودستائی بھی بہت ہے۔ کل آئینہ کے سامنے یہ شعر گنگنا رہی تھیں ؎

کتنا کم کم کلی نے سیکھا ہے

میری آنکھوں کی نیم خوابی سے

"دیکھئے بھیا میں چچا میاں سے کہتی ہوں — آخر" آپا جز بز ہو کر بولیں بھیا نے سنی ان سنی کر کے کہا۔ "یہ شاعر بھی ہیں" — "اچھا!" آپا کی سہیلی حیران ہو کر بولیں۔ "دیکھئے مجھے ایک آدھ شعر یاد ہے ان کا۔" بھیا نے سر کھجایا۔ آنکھیں جھپکائیں۔ پھر چونک کر بولے۔ "یاد آ گیا۔ ایک مرتبہ [illegible] کو دیکھ کر اسکے خیالات اور جذبات کو ان الفاظ کا جامہ پہنایا تھا ؎

میری ہوس کو لانبی سی چوٹی بھی تھی قبول

تیرا کرم کہ تو نے دیا سر منڈا ہوا

"سچ مانئے۔ میں نے آج تک ایک بھی شعر نہیں کہا اور نہ فی الحال ارادہ ہے۔" آپا نے ہنسی سے بھرائی ہوئی آواز سے کہا۔

خیر — جنت میں شعر و شاعری رہا کریگی۔ ارے ہاں خوب یاد آیا — آج میں نے ان کی ڈائری چرائی ہے۔ اس کا کچھ دلچسپ حصہ آپ کو بھی سناتا ہوں۔" بھیا کھنکارے اور آپا کی طرف دیکھے بغیر ایک مقرر کی طرح کہنا شروع کیا۔ "ایک جگہ جنت دوزخ کا ذکر کرتے کرتے اچانک روز حشر کے موضوع پر پھسل آئی ہیں کس طرح پھر ملک کر کہتی ہیں۔ واللہ کیا سماں ہوگا جب وقت غالب، حالی، فانی اور اقبال خدائے تعالیٰ کے حضور میں سر جھکائے کھڑے ہونگے اور باز پرس ہوگی۔ حالی تو سرخرو ہونگے کیا تعجب جو دبی زبان سے کہدیں ؎

مال تھا نایاب پر گاہک تھے اکثر بے خبر

شہر میں کھولی [illegible] دکان سب سے الگ

چچا میاں اپنے نامۂ اعمال پر [illegible] ہوئی نظر ڈال کر [illegible] اور آہستہ سے کہیں گے ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد

یارب! یہ اگر کردہ گناہوں کی سزا ہے

فانی بھی چچا غالب کی تائید میں ادب سے سر ہلائیں گے اور پھر [illegible] مجروح آواز سے بولیں گے ؎

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول

تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

اقبال تو مصلحتاً خاموش رہیں گے کیونکہ پہلے ہی کہہ چکے ہیں ؎

روز حساب گر مرا پیش ہو دفتر عمل

آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

"میں ڈائری لکھتی ہی نہیں۔" آپا نے اپنی صفائی پیش کی —

"تو میں لکھتا ہونگا" — "اور کیا" — آپا کی سہیلی بے اختیار مسکرا رہی تھیں۔ "بھیا میں کب تک اچھی ہو جاؤنگی؟" آپا نے اکتا کر پوچھا — بھیا سنجیدہ ہو گئے بولے "بھئی فی الحال تندرست ہونے کا خیال چھوڑ ہی دو... ابھی مجھے تو سنیما جانا ہے۔" بھیا نے گھڑی دیکھی اور اٹھ کھڑے ہوئے — "غضب کی سردی ہے۔ اللہ میاں کو کیا پتہ۔ محسوس تو ہمیں ہوتی ہے" "توبہ! توبہ!! کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ؟" بھیا کھسیانے ہو گئے "توبہ توبہ!! قیامت کے دن مرغا بننا پڑیگا — لیکن فرشتے کیا شرح [illegible] جانتے ہیں؟ جو اتنی جلدی لکھ ڈالیں گے۔" بھیا چلے گئے اور ہم بڑی دیر تک ان کی باتیں دہرا کر ہنستے رہے۔

چھٹیاں آنکھ بند کرتے ختم ہو گئیں۔ کالج کھلنے پر آپا بھی اپنے گھر چلی گئیں۔ اور تمام دلچسپیاں بھی سمیٹ کر لے گئیں۔ اب بھیا بھی سنجیدہ بنتے جاتے تھے۔ زیادہ تر پڑھنے لکھنے میں مصروف رہتے اور آخر کچھ دن بعد انہیں کسی دور دراز شہر میں حصول تعلیم کیلئے بھیج دیا گیا۔ بھیا کی موجودگی میں آپا صرف ایک دفعہ آئی تھیں۔ کچھ دن کیلئے پھر وہی دلچسپیاں لوٹ آئیں۔ بھیا اب بھی [illegible] سکتے تھے۔ ایک دن باتیں کرتے کرتے کہنے لگے۔ "اے بی چچا کر ہم سے [illegible]" "کیوں؟" آپا حیران ہو کر بولیں۔ "اپنی سے پوچھو" "میں کیا [illegible] — خواہ مخواہ" بھیا ہنس کر بولے۔ "اتنی بیچاری مجھے کہہ رہی ہے کہ [illegible] سے" بھیا کہاں تھے — "ارے ارے — [illegible]" صباحت [illegible]

[illegible] سگریٹ کھاتا ہے۔ وہ کب کہہ رہا ہے ۔" لیجئے کھینچئے کان!" بھیا نے امی کے سامنے اپنا کان کر دیا ۔۔۔ امی مسکراہٹ پی کر چپ ہو گئیں۔" خواہ تم او ہر وقت کان کھینچ لونگی، کان کھینچ لونگی۔ اب میں یہ کان کاٹ کر پھینک دونگا۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔"

آپا کے جانے کے بعد امی نے مجھے بتایا کہ اب ریحانہ ہمارے یہاں صباحت کی دلہن بن کر آجائیگی۔ میری خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ بھیا کو خوب چھیڑا کرتی۔ اب میں بھیا کے سہرا باندھونگی۔ بھیا جواب میں بولے۔ میں بھی تو تمہارے سہرا باندھوں گا۔ ۔۔۔ "پگلا" امی بے اختیار ہنس دیں۔

بھیا کے چلے جانے کے کچھ دن بعد ایک روز امی اور ابا میاں میں تمام دن سرگوشیاں ہوتی رہیں۔ دو دن بعد چچا جان کا خط آیا۔ خط پڑھکر ابا میاں اور امی خاموش ہو گئیں اور کئی دن ہمارے گھر میں چپ چاپ رہی۔ امی بار بار ابا میاں سے کہتی تھیں۔" چلو خیر دلہن کی مرضی نہیں ہے نہ سہی اور بہتیری لڑکیاں ہیں۔ انہیں اپنا بھانجہ مبارک۔" بس اس کے بعد سے چچا جان کے اور ابا میاں کے تعلقات کشیدہ ہوتے گئے۔ رفتہ رفتہ خط و کتابت بھی بند ہو گئی۔ اب آپا کا خط بھی نہ آتا تھا۔ نہ وہی کبھی آئیں۔ میں بھی اپنی تعلیم کے پیچھے سب کچھ بھول گئی۔ کبھی کبھی آپا یاد آتیں تو اُن کی تصویر دیکھ لیتی۔ مجھے افسوس کے بجائے ایک لحاظ سے خوشی ہوتی تھی کہ آپا جہاں بھی رہیں خوش رہیں اور مجھے یقین تھا کہ وہ اب بھی جاندار پھول کی طرح ہونگی۔ میرے ذہن میں اُن کا تصور شگفتہ تھا۔

وہ صبح کس قدر حسین تھی۔ جس صبح کو بھیا آنے والے تھے۔ وہ تعلیم مکمل کر کے آ رہے تھے۔ میں نے اُچھلتے کودتے کمرے صاف کئے۔ بھیا کے کمرے کو پھولوں سے سجایا۔ آتش دان پر رکھی ہوئی آپا کی تصویر پر میری نظریں جم کر رہ گئیں وہ باغیچے میں رنگ برنگ کے پھولوں کے ایک کنج میں کھڑی تھیں۔ ہاتھ میں کتاب تھی جیسے تفریحاً مطالعہ کر رہی ہوں۔ لمبی لمبی سیاہ پلکیں انہماک سے کتاب پر جھکی ہوئی تھیں۔ آبی رنگ کے دوپٹے نے سر پر ٹھہر کر چہرے کے گرد ہالہ سا بنا لیا تھا۔ جیسے سفید پھول شفق میں نہاتے نہاتے نیلگوں لہروں کی آغوش میں سو گیا ہو۔ شاداب ہونٹوں کا حسین خم اور بھی نمایاں ہو گیا تھا۔ میں بڑی دیر تک اس تصویر کو دیکھکر مسکراتی رہی۔ اتنے میں بچوں نے غل مچایا۔" بھائی جان آ گئے بھائی جان آ گئے" میں چونک کر بھاگی اور کھلکھلا کر بھیا کا خیر مقدم کیا۔ بھیا بھی جواب میں زبردستی مسکرا دئے۔ میں نے بھیا کی افسردگی کو سفر کی تکان سمجھکر نظر انداز کر دیا۔

ناشتے کے بعد انہیں اپنی سب چیزیں دکھائیں۔ باغیچے میں کھلے ہوئے وہ پھول اور پودے دکھائے جو ان کے بعد لگائے گئے تھے۔ پھر اپنے کمرے کی سجاوٹ دکھائی۔ آپا کی تصویر کے پاس بھیا تھوڑی دیر کے لئے ٹھٹک گئے۔ انکی افسردگی اور بھی گہری ہو گئی۔ پھر آہستہ سے بولے۔" ریحانہ ۔۔۔ کاش سدا پھولوں میں گھری رہتی ۔۔۔" "اب میری آپا ۔۔۔ مجھے بتائیے ۔" میں نے بوکھلا کر کہا۔ بھیا نے سر جھکا لیا۔ اور رُک رُک کر بولے۔" آتے وقت ایک اسٹیشن پر گاڑی بدلنے کیلئے اُترا تھا کہ اچانک میری نظر ریحانہ پر پڑی۔ وہ بھی شاید گاڑی کے انتظار میں تھی۔ مجھے دیکھکر یک لخت بنچ سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔" بھیا ۔۔۔" "ریحانہ ۔۔۔" میں نے چاہا کہ حسب عادت مسکرا کر خیر مقدم کروں۔ لیکن اسکے ہڈیوں کے مالا جسم اور زرد چہرے کو دیکھکر میں نے نظریں جھکا لیں پھر دوبارہ میری ہمت نہ پڑی کہ ریحانہ کو دیکھوں۔ اس کی بھیانک نظروں کو دیکھوں۔ شاید عمر میں پہلی بار میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ ریحانہ نے میری بھیگی پلکیں دیکھکر کہا۔ بھیا آپ ۔۔۔ لیکن مجھے دیکھئے میری خشک آنکھیں دیکھئے!" میں جلدی سے سنبھل گیا۔ اور دوسری طرف دیکھتے ہوئے بھی اُس سے مخاطب رہا۔ ریحانہ نے اپنے متعلق صرف اتنا بتایا کہ اسکی شادی کو دو سال کا عرصہ ہو چکا ہے۔ یہ شادی زبردستی کی گئی تھی۔ محض چچی کی ضد پر۔ اُن کے بھانجے کی مرضی کہیں دوسری جگہ تھی۔ ریحانہ سے شادی کے بعد اُس کے شوہر نے اپنی مرضی سے دوسری شادی کر لی۔ ریحانہ ایک ہندستانی لڑکی ہے۔ وہ ظالم شخص اب بھی اُس کا شوہر ہے۔ اور ہمیشہ رہے گا۔ ریحانہ معمولی سکول میں مسٹرس ہے۔ اور اپنی کفیل آپ ہے اور ۔۔۔ اور وہ کہہ رہی تھی کہ اب اُس نے ماضی کی طرف دیکھنا چھوڑ دیا ہے۔ وہ سامنے دیکھتی ہے۔ اُس نے مڑ کر دیکھنا چھوڑ دیا ہے ۔۔۔" بھیا کھوئی کھوئی آواز میں کہہ رہے تھے میری ڈبڈبائی آنکھیں دیکھکر چونک پڑے سنبھل کر بولے" اور تمہارے حالات بڑے اشتیاق سے پوچھے آخیر میں تاکیداً کہا تھا کہ میں تمہیں اس کے متعلق ... کچھ بھی نہ بتاؤں۔ کیونکہ تمہارا ذہن ابھی شگفتہ ہے۔ اس پر اوس پڑنی چاہیئے۔ تمہارے ذہن میں ریحانہ کی جو شاداب تصویر ہمیشہ سے ہے۔ وہی سدا رہے۔ تمہارے ننھے ذہن کو ٹھیس نہیں لگنی چاہیئے۔ لیکن میں نے تمہیں بتا دیا اس لئے کہ تم دُنیا کے اصول سے آگاہ ہو جاؤ ۔۔۔ اُجالے کا دوسرا رُخ اندھیرا ہے اور پھول کا ساتھی کانٹا ۔ میری نظریں غیر معمولی انہماک سے آپا کی تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔ میں دیکھ رہی تھی کہ آپا پھولوں میں گھری بیٹھی ہیں۔ چمکیلی تتلیاں اُن کا طواف کر رہی ہیں۔ یکایک میرے دیکھتے دیکھتے شگفتہ پھول لاتعداد کانٹوں میں بدل کر آپا کے جسم میں پیوست ہونے لگے انہوں نے چاروں طرف سے آپا کو گھیر لیا۔ اور بڑھے۔ یہاں تک کہ ان کی چبھن

نیچے سے آواز جھی اور آپا کی تصویر فرش پر چکنا چور ہوئی پڑی تھی۔ وہ ہی
تصویر جو میرے ذہن کا حسین عکس تھی۔ جس کے نیچے میں نے خوشخط حروف
میں لکھا تھا۔ "جہاں تم ہو ——" یہ نا تمام پیاسا فقرہ میرے ذہن میں
لیے ہوئے آپا کے تخیل کا نچوڑ اور تصور کی نیلگوں گہرائیوں میں تنہا سا ضوفشاں
تارا تھا۔ جو اب بدلی کی اوٹ میں چھپ گیا ہے —— ہمیشہ کے لئے
—— میرے تخیل کے اُفق پر نہ جانے کتنے ستارے جھلملا کر ڈوب جاتے

ہیں —— پھولوں کی ...
ہے —— پھولوں کی ...
تصور —— تاریکی کا پردہ اس قدر دبیز نہیں ہے۔ مجھے
اب بھی یاد ہے۔ اب بھی پہچان لیتی ہوں —— آپا ...
تصور میں روشن ہے۔ انہوں نے ماضی کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا تھا
لیکن میں دیکھ لیتی ہوں —— ان کے ماضی کی طرف —— کیا مجھے
بھی نہیں دیکھنا چاہیے؟



مشعلِ راہ

(از جناب نخشب جارچوی)

مجھے ہے ذرا جذبِ دل آزمانا یہاں کچھ بھی گذرے مگر تم نہ آنا
وفا کی حقیقت، جنوں کا فسانہ جو میں چپ رہوں گا کہے گا زمانا
مرے پاس آکر نہ دامن بچانا مچلنے کا دل ڈھونڈتا ہے بہانا
خفا تھا مگر اب تو خوش ہے زمانا کہ میں چاہتا ہوں تمہیں بھول جانا
مرا قصۂ غم اثر کر رہا تھا مگر اُن کا مُنہ پھیر کر مُسکرانا
ٹھہرتی چلی جا رہی ہے طبیعت گذرتا چلا جا رہا ہے زمانا
یقیں ہے تو راہِ وفا سے گذر جا گُماں ہے تو اِس راہ میں پھر نہ آنا
محبت ہے غماز بھی بدگماں بھی نگاہیں بچا کر مجھے بھی بچانا

محبت میں خود اعتمادی ہے نخشب
اِدھر ایک دل ہے اُدھر ہے زمانا

شعر و نغمہ

(از جناب صابر دہلوی)

جنونِ شوق کو دیوانہ پن کہنا ہی پڑتا ہے
یہاں تو راہبر کو راہزن کہنا ہی پڑتا ہے

یہ مجبوری یہ مایوسی یہ پابندی ارے توبہ
مصیبت میں قفس کو بھی چمن کہنا ہی پڑتا ہے

عجب شے ہے محبت میں جدائی کا زمانہ بھی
کہ شامِ غم کو بھی صبحِ وطن کہنا ہی پڑتا ہے

کچھ اس انداز کے تجھ سے مجھے آزار پہنچے ہیں
ہر اک سے قصۂ رنج و محن کہنا ہی پڑتا ہے

جدھر دیکھا ہزاروں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے
ترے ابرو کو تیغِ صف شکن کہنا ہی پڑتا ہے

جنہیں کوئی تعلق ہی نہیں دردِ محبت سے
انہیں غمخوار شیخ و برہمن کہنا ہی پڑتا ہے

مآلِ باریابی کیا بتاؤں مختصر یہ ہے
تری محفل کو اب دارالمحن کہنا ہی پڑتا ہے

مٹانے میں مرے کوئی کمی تو نے نہ کی لیکن
تجھے اس پر بھی روحِ جان و تن کہنا ہی پڑتا ہے

حریفوں کو بھی صابر اس قدر ہے مجھ سے دلچسپی
غزل کو میری معراجِ سخن کہنا ہی پڑتا ہے

غزل

(حضرت بہزاد نظامی لکھنوی)

ترے ذکر نے تری فکر نے تری یاد نے وہ مزا دیا
کہ جہاں ملا کوئی نقشِ پا وہیں ہم نے سر کو جھکا دیا

ترے دستِ بندہ نواز نے مری آرزو سے سوا دیا
مگر آہ! جذبِ جہانِ طلب میں یہ کہہ رہا ہوں کہ کیا دیا

وہ جو رہروی کا مآل ہے وہی میری منزلِ حال ہے
مجھے رہبروں سے ملا ہی کیا مجھے رہزنوں نے پتا دیا

نہ جنوں نہ جوشِ جنوں رہا نہ تو دل نہ سوزِ دروں رہا
تری اک نگاہِ سلوک نے غمِ زندگی کو بھلا دیا

نہیں دور منزلِ آرزو مری رہروی سے ہے آبرو
کہ ہے دو قدم کا معاملہ جسے میں نے اور بڑھا دیا

ترے میکدے میں جو آ گیا وہ متاعِ ہوش لٹا گیا
اسے کھو گیا تجھے پا گیا جہاں تو نے جام پلا دیا

کبھی مجھ سے آنکھ ملا گئے کبھی مجھ سے آنکھ چرا گئے
کبھی اک نظر میں بنا دیا کبھی اک نظر میں مٹا دیا

الوداع

(شیریں اور فرہاد کا ایک خیالی انجام)

(از: جناب اختر شیرانی)

شیریں اور فرہاد (مل کر) :- آؤ چلیں تاروں میں سمائیں!
پیار کی بستی چل کے بسائیں!

شیریں :- دنیا میں ہم مل نہ سکیں گے
فرہاد :- دل کے کنول یاں کھل نہ سکیں گے
دونوں مل کر :- اور کہیں یہ پھول کھلائیں
آؤ چلیں، تاروں میں سمائیں!

شیریں :- جھوم رہے ہیں شوخ ستارے
فرہاد :- بکھرے ہوئے ہیں مست نظارے
دونوں مل کر :- ہنستی ہیں شاداب فضائیں
آؤ چلیں، تاروں میں سمائیں!

شیریں :- عشق کا ساحل دور نہیں ہے
فرہاد :- پیار کی منزل دور نہیں ہے
دونوں مل کر :- پیار کی منزل میں کھو جائیں
آؤ چلیں، تاروں میں سمائیں!

شیریں :- چاند ستارے بن کر چمکیں
فرہاد :- شوخ نظارے بن کر چمکیں
دونوں مل کر :- کہتی ہیں مستانہ ہوائیں
آؤ چلیں، تاروں میں سمائیں!

شیریں :- خواب ہے دنیا، خواب سے جاگیں
فرہاد :- رنج و الم اور غم کو تیاگیں
دونوں مل کر :- چل کے خوشی کے نغمے سنائیں
آؤ چلیں، تاروں میں سمائیں!

شیریں :- چاند کی کشتی پہ ہوں روانہ
فرہاد :- لب پہ محبت کا ہو ترانہ
دونوں مل کر :- چاند کو بھی ہم وجد میں لائیں
آؤ چلیں، تاروں میں سمائیں!

شیریں :- آؤ چلیں ان تاروں سے کھیلیں
فرہاد :- قدرت کے نظاروں سے کھیلیں
دونوں مل کر :- جشن منائیں، دھوم مچائیں
آؤ چلیں، تاروں میں سمائیں!

شیریں :- ہم ہوں اور مہتاب کا جھولا
فرہاد :- حسن کی دنیا، خواب کا جھولا
دونوں مل کر :- دیتا ہے یہ کون صدائیں
آؤ چلیں، تاروں میں سمائیں

شیریں :- چھوڑیں اس بیدرد جہاں کو
فرہاد :- بھولیں سب فریاد و فغاں کو
دونوں مل کر :- رنج میں کب تک عمر گنوائیں؟
آؤ چلیں، تاروں میں سمائیں
پیار کی بستی چل کے بسائیں

آنکھوں سے ہو جاتی تھی۔ جو مجھ پر بڑی جچی ہوتیں۔ محفل اس کے بغیر سُونی رہتی۔ یا وہ اِدھر وہ آیا اور اُدھر کمرہ ہنسی قہقہوں۔ قسم قسم کی آوازوں سے گونج گیا۔ معلوم ہوتا کہ ساری محفل کشتِ زعفران بنی ہوئی ہے اور جناب خاموش۔ کسی نے بات کی اور اُس نے فقرہ چُست کیا۔ زبان و بیان پر بلا کا عبور حاصل تھا۔ برجستہ اشعار و موزوں فقرے ہر وقت و ہر حال میں موزوں رہتے تھے۔ اُس کے سامنے گفتگو کرنا آسان نہ تھا۔

ہر ایک کھیل تماشے، سیر و تفریح میں وہ پیش پیش رہتا تھا۔ سنیما جانا ہو یا کھانے کے بعد چاندنی رات میں ٹہلنے کا پروگرام ہو۔ سب سے آگے جمال ہی ہوتا تھا۔ انسان کیا تھا مکمل حرکت۔

لڑکیوں سے زیادہ وہ شادی شدہ خواتین کے حلقہ میں رہتا تھا اور اکثر لڑکیوں کی بُرائیاں کرتا تھا یا مذاق اُڑاتا۔ لڑکیوں کے ساتھ اس کا طرزِ عمل بھی کچھ عجیب سا تھا۔ کچھ رُوکھا، کچھ مودبانہ، کچھ تمسخرانہ، کچھ طنز لئے ہوئے۔ میں نہ جانے کیوں اس سے مرعوب تھی اور بات کرتے ہوئے گھبراتی تھی۔ لیکن اس کی باتیں مجھے متاثر ضرور کرتی تھیں۔

اُسی زمانے میں میری ایک عزیز سہیلی کا انتقال ہو گیا اور میں چار دن تک گھر سے نہ نکلی۔ جمال کا معمول تھا کہ شام کی چائے ہمارے ساتھ پیتا تھا۔ ان دنوں بھی حسبِ معمول آتا رہا۔ اور مجھے ہر طرح بہلانے اور ہنسانے کی کوشش کرتا رہا۔ اُس کے اس خلوص نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ سچ تو یہ ہے کہ جمال کی کوشش ناکام نہ ہوئی۔ اکثر اس کی مسخرانہ حرکتوں پر میں بے اختیار مُسکرا دیتی اور وہ اپنی کامیابی پر مسرور ہو کر اور بھی زیادہ مسخرانہ حرکتیں کرتا تھا۔ جمال نے مجھے یہ غم بھلانے میں بہت مدد دی۔ اس کی نصیحتیں۔ مزاحیہ باتیں اور دلچسپ حرکتیں اس حد تک کامیاب ہوئیں کہ میں اپنی طبیعت کے خلاف اُس کے تقاضوں سے مجبور ہو کر مسز صدیقی کے ہاں جانے پر راضی ہو گئی۔

ایک دن دوپہر کو گھنٹی کی آواز ہوئی۔ اور دروازہ کھلتے ہی جمال کی آواز یہ کہتی ہوئی سُنائی دی۔ "تمہاری مِس صاحبہ کیا کر رہی ہیں؟"

"بی بی اوپر ہیں۔" آیا نے کہا ــــ "آپ بیٹھیے، میں اُن کو خبر کرتی ہوں۔"

میں نے جلد جلد مُنہ پر سرد چھینٹے دیئے اور ڈرائنگ روم میں گئی۔

"ارے! آج آپ خلافِ معمول اتنی جلدی کیوں آ گئے؟ اور بھائی جان کو کہاں چھوڑ آئے؟" میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

"شکر! آپ آ گئیں۔ میں تو سمجھا تھا۔ ....!" اُس نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور ہاں یہ پھر رونا شروع ہو گیا۔"

"نہیں تو۔ ویسے ہی دو چار آنسو نکل آئے ہوں گے۔" میں نے اپنے دوپٹے کا پلّو مروڑتے ہوئے کہا۔

"خیر ــــ میں تو آپ سے ایک قصور کی معافی مانگنے حاضر ہوا ہوں۔" اُس نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"معافی ــــ!" میں نے تعجب سے کہا۔

"جی ہاں۔" اُس نے حسبِ عادت مُسکراتے اور گھورتے ہوئے کہا "پہلے آپ معاف کر دیں۔ پھر بتاؤں گا قصور کیا ہے۔"

میں ہنس پڑی۔ "عجیب تماشہ ہے قصور معلوم نہیں اور معاف کر دوں۔ خیر آپ کہئے، میں نے معاف کیا۔"

"شاہد کو کچھ کام تھا وہ راستے میں وہاب سے ملنے اُتر گیا۔ میں اِدھر آ رہا تھا کہ صدیقی پکڑ کر لے گیا۔ اور وہاں مسز صدیقی سنیما جانے کا پروگرام بنا رہی تھیں۔ میں نے بھی آپ کے اور شاہد کیلئے ٹکٹ خرید لئے۔ اب شاہد سے تو سلٹ لونگا۔ مگر آپ سے ڈر لگ رہا ہے۔"

"آپ باتیں بنانے میں مشاق ہیں۔ کیا افسانہ گھڑا ہے۔"

"افسانہ نہیں، واللہ واقعہ" اُس نے بناوٹی سنجیدگی سے کہا اور پھر خود ہی بیرے کو آواز دی کہ جلدی چائے لاؤ۔ ہم سنیما جا رہے ہیں۔

"آپ جائیے میں نہ جاؤں گی۔"

"پھر وہی باتیں۔ آپ بڑی ضدی ہیں۔ آپ کی سہیلی تو مر گئیں۔ ہمیں تو وہ زندگی ہی میں مار گئیں۔ اور دیکھئے شاہد بچارا آپ کی وجہ سے کس قدر چُپ چاپ رہتا ہے۔ آپ کو اُس کا ذرا خیال نہیں۔ آپ اگر نہ جائیں گی تو وہ بھی نہ جائیگا۔" اُس کا یہ تیر کارگر ہوا اور میں بھائی جان کے خیال سے مجبور ہو گئی۔

سنیما میں میری ایک دیرینہ سہیلی مل گئی۔ ایک مدت کے بعد ملاقات ہوئی تھی۔ اس لئے دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر بے انتہا مسرور ہوئے۔ شاہدہ میرے سر ہو گئی کہ کچھ روز اُس کے ہاں ٹھیروں۔ میں نے تو ہاں ہوں کہہ کر ٹالنا چاہا۔ مگر شریر نے بھائی جان کو راضی کر لیا۔ اور مجھ سے وعدہ لے لیا کہ دو دن مع سامان کے اُس کے ہاں پہنچ جاؤں۔

دس دن تک شاہدہ نے مجھے اپنے ہاں سے نہ نکلنے دیا۔ بھائی جان اپنے ایک افسر کی آمد کی وجہ سے بہت مصروف ہو گئے تھے اس لئے اُنہوں نے بھی یہ ہی مناسب سمجھا۔ اس عرصہ میں جمال سے ملاقات نہ ہو سکی۔ بھائی جان رات کو کبھی کبھار آ کر مِل جاتے۔ ورنہ فون پر میری خیریت معلوم کر لیتے۔ وہا

غزل

(از جناب لالہ شنکر لال صاحب شنکر بی اے ۔ مالک دہلی کلاتھ ملز دہلی)

آئی بہارِ عشق کا ساماں بنا دیا / دامن کو چاک کر کے گریباں بنا دیا

وہ خوش ہوئے کہ درد کا ساماں بنا دیا / داغوں نے عشق کے مجھے انساں بنا دیا

میں رو رہا تھا اپنی ہی قسمت کو عشق میں / زلفوں نے آپ کو بھی پریشاں بنا دیا

کیا تاب، کیا مجال، ملاؤں جو اُن سے آنکھ / اُن کی نظر کو اُن کا نگہباں بنا دیا

کیوں قدرتِ خدا پہ نہ ہو جائیے نثار / تم کو تمہاری شان کے شایاں بنا دیا

ہیں حسرتوں کے ساتھ میں سامان بھی تو قید / دل کو ہمارے آپ نے زنداں بنا دیا

گلہائے داغِ عشق کی دل میں بہار ہے / سینے کو میرے رشکِ گلستاں بنا دیا

دریائے حسن آئینہ میں موج زن تو تھا / آرائشوں سے آپ نے طوفاں بنا دیا

جلوہ نما وہ جلوۂ زیبا نظر میں تھا / اِن غفلتوں نے خوابِ پریشاں بنا دیا

میں تم کو جان دے کے سبکدوش کیا ہوا / کاٹا گلا تو بندۂ احساں بنا دیا

مایوس کو نگاہ سے مخمور کر دیا / اعجاز تھا کہ یاس کو ارماں بنا دیا

مجھ سے نظر ملا کے بنائینگے مجھ کو کیا / آئینے کو تو آپ نے حیراں بنا دیا

شنکر کی شکل دیکھ کے کہتے ہیں ناز سے
کم بخت تجھ کو کس نے مسلماں بنا دیا

غزل

(حضرت عرش ملسیانی)

بیاں ہوں بھی تو آخر ہوں کہاں جو دل کی باتیں ہیں
نہ تنہائی کی باتیں ہیں نہ یہ محفل کی باتیں ہیں

مرتب ہو گیا بس یونہی افسانہ محبت کا
کچھ اُن کے دل کی باتیں ہیں کچھ اپنے دل کی باتیں ہیں

جو ان میں پھنس گیا پھر راہ پر وہ آ نہیں سکتا
بڑے چکر کی باتیں رہبرِ منزل کی باتیں ہیں

تری تقریر رازِ عشق کیا کھولے گی اے واعظ
زباں کی یہ نہیں حضرت یہ چشم و دل کی باتیں ہیں

وہ محفل سے جدا بھی ہو چکے محفل کو گرما کر
مگر محفل میں اب تک گرمیِ محفل کی باتیں ہیں

زباں سے کچھ کہو صاحب مگر معلوم ہے ہم کو
تمہارے دل کی سب باتیں ہمارے دل کی باتیں ہیں

مجھے درسِ سکوں دیتے ہیں وہ جوشِ تمنا میں
ادھر طوفان کی خواہش ادھر ساحل کی باتیں ہیں

مری باتوں پہ سر دھنتے ہیں کچھ کچھ کر خرد والے
کہ یہ باتیں کسی دیوانۂ عاقل کی باتیں ہیں

میں اپنے حال و ماضی پر بھی کچھ اے عرش رو لیتا
مگر پیشِ نظر اس وقت مستقبل کی باتیں ہیں

غزل

(جناب شکیل بدایونی)

بس اک نگاہِ کرم ہے کافی اگر اُنہیں پیش و پس نہیں ہے
زہے تمنا کہ میری فطرت اسیرِ حرص و ہوس نہیں ہے

نظر سے صیاد دُور ہو جا یہاں ترا مجھ پہ بس نہیں ہے
چمن کو برباد کرنے والے یہ آشیاں ہے قفس نہیں ہے

کہاں کے نالے، کہاں کی آہیں لگی ہیں اُن کی طرف نگاہیں
کچھ اس قدر محوِ حسن ہوں میں کہ فرصتِ یک نفس نہیں ہے

نہ کر مجھے شرمسار ناصح میں دل سے مجبور ہوں کہ جس کا
ہے یوں تو کون و مکاں پہ قابو مگر محبت پہ بس نہیں ہے

وہی ہیں نغمے، وہی ہیں نالے سن اے مجھے بھول جانے والے
تری سماعت سے دُور ہیں یہ جبھی تو نالوں میں رس نہیں ہے

قفس کی آزادیاں مؤخر، تصورِ آشیاں مقدم
غمِ اسیری ہے نامکمل اگر غمِ خار و خس نہیں ہے

شکیل دنیا میں جس کو دیکھا پھر اس کی دنیا ہی اور دیکھی
ہزار غمازِ زندگی ہیں مگر کوئی نکتہ رس نہیں ہے

فلمی خبریں

(۱) راج کمل کلامندر

وی۔ شانتا رام کا نام فلمی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ مسٹر شانتا رام اس فن میں نہایت کہنہ مشق اور دیرینہ تجربہ رکھتے ہیں۔ ان کی ہر تصویر معیاری ہوتی ہے۔ گو ہر ایک کو عوام نے پسند نہیں کیا۔ مگر شرفا اور اونچے طبقہ کے لوگوں میں بہت پسند کیا گیا ہے۔ جب تک آپ پربھات فلم کمپنی میں رہے آپ نے وہاں امر جیوتی۔ آدمی۔ وہ یا تنا نے جیسی تصاویر تیار کیں۔ جنہیں بین الاقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ ان کی ہر تصویر اپنے پیچھے نقش چھوڑتی گئی۔ پربھات سے الگ ہو کر راج کمل کلامندر کے نام سے اپنی ذاتی کمپنی کھولی جس کی پہلی تصویر "شکنتلا" تیار ہوئی۔ شکنتلا میں ان کی رفیق حیات جے شری نے شکنتلا کا کردار ادا کیا ہے۔ شکنتلا ملک کے طول و عرض میں نہایت مقبول ہوئی ہر جگہ سلور جوبلی ہوئی۔ بمبئی میں مقبولیت کی یہ انتہا ہے کہ سوا سال سے سنیما میں متواتر اسّی ہفتوں سے نمائش جاری ہے۔ شائقین کا یہ عالم ہے کہ ذرا دیر سے آنے پر نا امید ہو کر واپس جانا پڑتا ہے۔ ان کی دوسری تصویر "مالی" بھی نہایت کامیاب رہی۔

اب تازہ ترین تصویر "پربت پہ اپنا ڈیرا" نمائش کیلئے عنقریب پیش کر دی جائیگی۔ "پربت پہ اپنا ڈیرا" میوزیکل سنیما کا اسند [illegible] پروگرام ہے۔ اب "جھنجھر" [illegible] نہایت سرعت کے ساتھ اپنی تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے۔ سنا ہے مسٹر شانتا رام اس میں خود ہیرو کا پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ ابھی تک تو آپ بطور ہدایت کار نہایت کامیاب رہے ہیں۔ اسکے بعد یہ ثابت ہو جائیگا کہ مسٹر شانتا رام ایک اعلیٰ ہدایت کار نہیں بلکہ اداکار بھی ہیں۔

(۲) محبوب پروڈکشن

عورت۔ ایک ہی راستہ۔ روٹی اور تقدیر جیسی تصاویر تیار کرنے والے ڈائرکٹر محبوب "ہمایوں" فلم تیار کرنے میں مشغول ہیں۔ "ہمایوں" تقریباً تیار ہو چکا ہے۔ اب مسٹر محبوب اس میں آخری ٹچ دے رہے ہیں۔ "ہمایوں" کے سینریو اور مکالمے آغا جانی کاشمیری نے نہایت محنت سے لکھے ہیں۔ اور کہانی پروفیسر واقف مراد آبادی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ موسیقی موسیقار اعظم ماسٹر غلام حیدر کے سپرد ہے جو نہایت محنت کیساتھ نئی نئی طرزیں [illegible] ہیں۔ [illegible] فلمی دنیا کے ہوشیار ستارے [illegible] مسٹر نرگس [illegible] کے زندگی [illegible]

[illegible] میں اشوک کمار۔ نرگس [illegible] بھی [illegible] پیش ہو رہے ہیں۔

(۳) سنٹرل سٹوڈیوز

سنٹرل سٹوڈیوز کے متعلق عوام میں عجیب و غریب اطلاعات پھیل رہی ہیں۔ بعض اخبارات نے یہ خبر شائع کی ہے کہ سنٹرل سٹوڈیوز کو حکومت [illegible] نے اپنے انتظام میں فلم تیار کرنے کیلئے لے لیا ہے۔ اور بعض جرائد نے یہ لکھا ہے کہ اپنی ریاست کی صنعتی ترقی کیلئے [illegible] نے خرید لیا ہے۔ لیکن سنٹرل سٹوڈیوز کے کارکن اشاعت کیلئے بیان دیتے ہیں کہ یہ تمام افواہیں غلط اور بے بنیاد ہیں۔ بلکہ اسکے برعکس یہ عالم ہو رہا ہے کہ سنٹرل سٹوڈیوز میں حسب دستور آزاد پروڈیوسر اپنے فلم تیار کر رہے ہیں۔ اور آئندہ کیلئے بھی انہوں نے مالکان سٹوڈیو سے معاہدے کر لئے ہیں۔ مثلاً ڈی۔ آر۔ ڈی پروڈکشن والے اپنی نئی فلم "نیک پروین" بنا رہے ہیں۔ اور جینت دیسائی اپنی تصویر "آکاش دیپ" کی تیاری میں مصروف ہیں۔ اور [illegible] آرٹ پروڈکشن [illegible] ہی میں اپنی تازہ ترین مسلم سوشل تصویر "پہلی نظر" کا افتتاح بھی کر دیا ہے۔ منروا موویٹون کی تازہ تصویر "شیخ [illegible]" [illegible] کی نگرانی اور ہدایت میں اپنی تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے۔

اسکے علاوہ سنٹرل سٹوڈیو اپنی متعدد تصاویر "[illegible]" اور "[illegible]" [illegible] کا نیا سیریل [illegible] تیار کر رہے ہیں۔

(۴) زینت پکچرز

[illegible] پکچرز کا تیار کردہ [illegible] مسٹر زینت پکچرز کے ذریعہ [illegible] [illegible]

[illegible] لڑکی کی کہانی ہے [illegible] پہلے ہی [illegible] محبت [illegible] پہلے اپنے محبوب کو اپنے [illegible] کر سکتی [illegible] کہ اس نے لکھی ہے [illegible] موثر ہیں کہ دیکھنے والے کے قلب پر اثر [illegible] اور گرش [illegible] نے لکھے ہیں۔ گانے [illegible]

[illegible] شیام۔ پر [illegible]

خاص طور پر قابل ذکر [illegible]

زینت [illegible]

[illegible] کر چکے ہیں۔ [illegible]

[illegible]

[illegible] نظریہ بلا شک و شبہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ادارہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔

(۵) رنجیت فلم کمپنی

رنجیت کا نیا شاہکار "روشن کیا" دہلی سینما دہلی میں عوام کی کشش کا باعث بنا ہوا ہے۔ پہلے مغلوں میں عیش و عشرت کی شاہی اخراجات پر پالا جاتا تھا اور وقت آنے پر یہی عورتیں سیاسی شعبوں کا کام کیا کرتی تھیں۔ "روشن کیا" شاعر دربار کے عشق میں مبتلا ہو کر اپنے ملک سے دغا کرتی ہے۔ تصویر کی ہدایت کاری چتر لیکھا کے شہرت یافتہ کیدار شرما کی ہے۔ اداکاروں میں ستارہ دیوی۔ پرتھوی راج۔ مسٹر بیندو کلا چرجی۔ راجیندر اور بہن ناگم کے نام شامل ہیں۔ رقص اور موسیقی کے شائقین حضرات کے لئے دعوت عام ہے۔

(۶) بمبئی ٹاکیز

بمبئی ٹاکیز کا نغمات اور موسیقی سے بھرپور فلم "جوار بھاٹا" بمبئی میں گزشتہ ریکارڈ مات کر چکا ہے۔ شمالی ہندوستان میں عنقریب اسکی نمائش شروع ہونے والی ہے۔ "جوار بھاٹا" میں دو نئے چہرے پیش کئے گئے ہیں۔ دلیپ اور مردلا اس کے علاوہ رقص کی شہنشاہ ممتاز علی بھی ہے۔ اداکاروں میں آغا جان۔ اور شمیم کے نام قابل ذکر ہیں۔ موسیقی انل بسواس کی ہے۔ عنقریب جگت پارٹنز میں نمائش شروع ہو جائے گی۔

(۷) وادیا موی ٹون

[illegible] بھگتی رس میں ڈوبا ہوا فلم کرشن بھگت "بوڈانا" منروا دہلی میں نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔ بوڈانا گجرات کا مشہور ڈاکو تھا۔ ایک مرتبہ [illegible] کے قافلے کو لوٹتے وقت سادھوؤں کے سردار سے قسم ہدایت [illegible] اور لوٹ مار قتل و غارت کا پیشہ چھوڑ کر ایشور بھگتی میں مصروف ہو گیا۔ [illegible] میں کامیابی حاصل ہوئی اور کرشن بھگت بوڈانا کے نام سے مشہور ہو گیا۔ موسیقی نہایت دلکش ہے۔ ماسٹر وسنت مرت اشرف مختار رنجیت [illegible] "کی پھول والی لڑکی" نے اس تصویر میں کام کیا ہے تصویر [illegible] ہے۔

[illegible] کرشن

[illegible] جنت دیسائی کا ادارہ ہے اور [illegible]

[illegible]

ہمراہ ایشور لال۔ مایا بنرجی۔ شیام کرک۔ لطیف سید اس تصویر کی جان ہیں۔ موسیقی [illegible] نہایت دلکش [illegible] اور برموقعہ ہیں۔ ہدایت کاری جینت دیسائی کی ہے۔

اس کمپنی کی آنے والی تصویر "چندر گپت" ہے جس کی نمائش ویسٹ اینڈ سینما بمبئی میں شروع ہو چکی ہے۔ اس میں رینوکا دیوی۔ ایشور لال شیام کرک اور مایا بنرجی نے کام کیا ہے۔ اور موتی ٹاکیز کا آئندہ پروگرام ہے۔ اس کے علاوہ اس کمپنی کی آنے والی تصویر "آکاش دیپ" نہایت سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی ہے۔

(۹) شوری پکچرز

ڈی۔ پی۔ کے شوری کو اگر شمالی ہندوستان کا دادا بھائی پھالکے کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ آپ پنجاب کے سب سے پہلے فلم پروڈیوسر ہیں۔ اس سے پیشتر "منگتی" اور "گوکل" جیسی تصویریں پیش کر چکے ہیں۔ ان دنوں "شالامار" جیسی تصویر تیار کر رہے ہیں۔ "شالامار" میں صحیح معنوں میں مغلیہ شان و شوکت اور انصاف کو پیش کرنے کی کوشش [illegible] ہی ہے۔ تاریخ کا بالکل انوکھا پہلو جس سے سکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے والے طلبا بالکل بے بہرہ ہیں۔ پردۂ فلم پر دکھایا جا رہا ہے۔ "شالامار" کا افسانہ پنجاب کے مشہور نثر نگار آئی۔ ایس۔ جوہر ایم۔ اے۔ ایل ایل بی نے لکھا ہے۔ اداکاروں کی فہرست میں بیگم پارہ۔ جینند مونہن۔ منورما۔ ہری شیو دھانی۔ الناصر۔ مجنوں وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ موسیقی ماسٹر امرناتھ کے سپرد ہے۔ مسٹر شوری نہایت تندہی سے اسکی تکمیل میں مصروف ہیں۔

(۱۰) پنچولی آرٹ پکچرز

پنچولی آرٹ پکچرز نے دنیا کا مشہور ترین رومان "شیریں فرہاد" فلما کر فلمی دنیا میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ "شیریں فرہاد" اس سے پیشتر بھی پردۂ فلم پر دکھایا جا چکا ہے۔ مگر اب کے اس زمانے کے ساز و سامان آرٹ اور ماحول کے مطابق ہر چیز کا لحاظ رکھا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ اس دور کا صحیح نقشہ پیش کیا جائے۔ آرٹ ڈائرکٹر مسٹر ایں ایم خواجہ نے نہایت محنت سے سین سینریاں تیار کی ہیں۔ موسیقی ماسٹر امرناتھ اور رشید عطرے کی ہے۔ اداکاروں میں راگنی۔ جینت۔ غلام محمد۔ نفیس بیگم۔ محمود شاہ۔ گیانی اور اسحٰق مولا جیسے ستارے کام کر رہے ہیں۔ "شیریں فرہاد" بالکل تیار ہو چکا ہے۔ عنقریب بڑے بڑے شہروں میں نمائش شروع ہو جائیگی۔

اس کے علاوہ اس کمپنی کی ایک اور تصویر "کیسے کہوں" تیار ہو چکی ہے۔ [illegible] دلچسپ [illegible] کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ [illegible] راگنی۔ نجم الحسن بھی اپنا پارٹ خوبی سے ادا کر رہے ہیں۔ [illegible] شہرت یافتہ [illegible] ہے۔



جینیت پکچرز لمیٹڈ ـ اپنی پہلی شاندار پیشکش

یعنی

شیریں فرہاد

اداکاران

راگنی ـ جینیت ـ غلام محمد ـ گیانی ـ نفیس بیگم ـ ظہور شاہ ـ اسحاق موٹا

ہدایت کار: ــــ ہیرالال دت

آرٹ ڈائرکٹر: ــــ این، ایم خواجہ

مکالمے: ــــ سید امتیاز علی تاج، شوکت تھانوی

گانے: ــــ ڈی، این مدھوک، ناظم پانی پتی

موسیقی: ــــ پنڈت امرناتھ و رشید عطرے

دوسرا شاہکار

کیسے ہول

جاری کردہ: ایمپائر ٹاکی ڈسٹری بیوٹرز ـ دہلی، لاہور، کراچی

ے جب آئی تو بھائی جان کو خلاف معمول اکیلے پایا۔ میں نے اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد دریافت کیا :۔

"بھائی جان! آج آپ اکیلے ہی بیٹھے ہیں۔"

"بھئی طبیعت کچھ سست ہے اس لئے صدیقی کے ہاں نہ گیا۔ دوسرے تم آنے والی تھیں۔ جمال آج کل بریلی جانے کی تیاری میں مصروف ہے۔"

اس کے آگے مجھے جرأت نہ ہوئی کہ کچھ پوچھتی۔ دوسرے دن جمال آیا تو باتوں ہی باتوں میں اُس کے جانے کا ذکر نکلا۔

"آپ کی باتیں بہت یاد آئیں گی" میں نے اُسے رخصت کرتے ہوئے کہا۔

"ارے! تو میں کوئی مر تھوڑی رہا ہوں۔" اس نے شرارت آمیز لہجہ میں کہا۔

غصہ تو مجھے بہت آیا مگر کیا کرتی ضبط کر کے رہ گئی۔

اس واقعہ کو کوئی ایک ہفتہ گذرا ہوگا کہ بھائی جان نے شیو کرتے ہوئے کہا "رنو! تم بھی جلدی تیار ہو جاؤ۔ آج بازار چلیں گے۔ تحفہ خریدنا ہے۔ اگر آج نہ خریدا تو پھر پارسل کرنا پڑیگا۔ صبح کی گاڑی سے تو جمال جا رہا ہے۔"

میں نے بے اختیار کہا۔ "فاروقی صاحب کے جانے سے تحفہ کا کیا تعلق؟"

"ارے بھئی اُس کی شادی ہے نا۔" بھائی جان نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ اُن کو کیا معلوم کہ اُن کے اس ذرا سے فقرے نے اُن کی عزیزہ پر کیا ستم ڈھایا تھا۔ یہ سمجھکر کہ شاید سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ میں نے پھر کہا۔

"شادی کیا یکایک طے ہوگئی۔"

"نہیں تو۔ منگنی تو بہت دن سے تھی۔ یہ روز ٹال مٹول کر رہا تھا لیکن اب اُس کی ماں بیمار ہے۔ خط آیا ہے کہ فوراً آؤ۔"

بھائی جان تو غسل کرنے چلے گئے اور میں نہ جانے کیا کیا سوچتی رہی۔ جب وہ باہر نکلے تو مجھے اس طرح بیٹھے دیکھکر کہا۔

"ارے تم تیار نہیں ہوئیں!"

"میرے سر میں درد ہے۔ میں نہ جاؤنگی۔" میں نے معذرت کے انداز میں کہا۔

دن بھر میں جمال کا انتظار کرتی رہی۔ مگر وہ نہ آیا۔ شام کو مسز صدیقی کے ہاں بھی نہ گئی۔ سر میں درد کا بہانہ کر کے پڑی رہی۔ بھائی جان بچارے میری وجہ سے کہیں نہ گئے۔ دوسرے دن وہ اس کو سٹیشن پر پہنچانے گئے۔ وہاں سے آکر کہا۔

"فاروقی کو تم سے بغیر ملے جانے کا بہت افسوس ہے تمہیں سلام کہہ گیا ہے۔"

میرا جی چاہا کہ خوب دھاڑیں مار مار کر روؤں۔ میری حالت ایک ایسے بچے کی سی تھی جسے کوئی اچھا سا کھلونا دکھا کر یہ سمجھایا گیا ہو کہ یہ اس کا ہے۔ اور پھر یکایک اس سے چھین کر کسی دوسرے کو دیدیا گیا ہو۔ اب میرے لئے الہ آباد میں ٹھیرنا دوبھر ہوگیا۔ بھائی جان کے اصرار کے باوجود میں گھر واپس گئی

فاروقی کی نہ خیر ہے نہ خبر۔ نہ اس سے کسی قسم کے مراسم ہیں۔ لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں جب میں چپ بیٹھتی ہوں تو دل و دماغ پر اس کی تصویر چھا جاتی ہے۔ اور جتنا میں نکالنے کی کوشش کرتی ہوں اسی شدت سے اسکے نقوش اور گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ دو سال کی طویل مدت کے باوجود ان چند دنوں کے واقعات اب بھی مجھے اس طرح یاد ہیں گویا کل گذرے ہوں۔ اُسکی یاد پھانس بن کر میرے دل میں کھٹکتی رہتی ہے۔ اور اس پھانس کو جتنا نکالنے کی کوشش کرتی ہوں اُتنا ہی وہ اندر دھنستی چلی جاتی ہے۔

شالیمار پکچرز کا لاجواب شاہکار

من کی جیت

گانے: جوش ملیح آبادی

اداکاران

نینا۔ شیام۔ گلاب۔ راج کماری شکلا۔ پرکاش۔ تیواری

گیتا نظامی

ہدایت کار:— احمد

تمام تصاویر جو بکنگ کیلئے تیار ہیں

خاموشی اداکاران:— رمولا۔ شیام	**ن** اداکاران:— لیلا چٹنس۔ اشوک کمار	**ریکھا** اداکاران:— ہریش۔ لیلا چٹنس	**دل کی** اداکاران:— کمار۔ ہنسا واڈکر
دلہن اداکاران:— ساہو۔ موک۔ پیشو۔ مرکا بچہ	**آشیرواد** اداکاران:— للتا پوار۔ بلونت سنگھ	**امانت** اداکاران:— ہریش۔ حسن بانو	**سکول ماسٹر** اداکاران:— ...

جاری کردہ:— زینت پکچرز۔ چاندنی چوک۔ دہلی



ADEEB

ادیب

[illegible] quarterly literary [illegible] only [illegible] high standard.

[illegible] tenth of each month.

3. Annual subscription [illegible] is Rs. 10/- only. Single copy Rupee one [illegible]

4. The Adeeb is posted with great care but if you [illegible] get a copy by [illegible] please write to the [illegible]. If avai[illegible] an extra copy will be [illegible]. Com[illegible]nts received after the [illegible] will not be attended [illegible]

5. All communications [illegible] be addressed to the Editor.

6. Free or sample copies [illegible] the Adeeb are not sent. [illegible] sample copy [illegible] send the necessary stamps in advance.

7. [illegible]ntributions not pub[illegible]d in the Adeeb can be [illegible] on receipt of [illegible] necessary stamps.

[illegible] send extra [illegible] for a reply.

[illegible] less than a year.

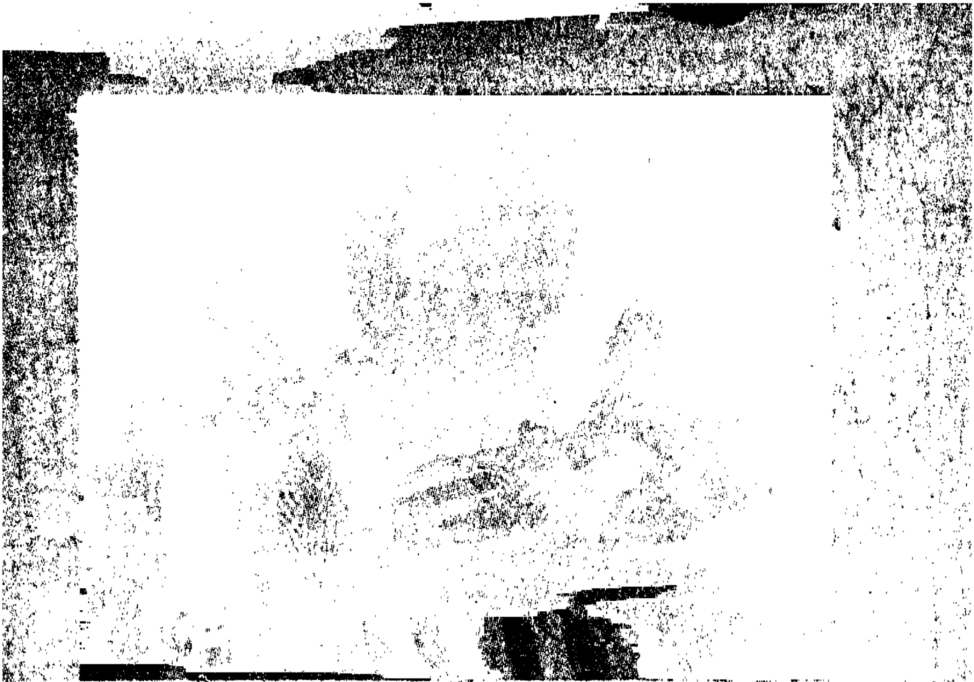
[illegible] Printers [illegible] Delhi
[illegible] Published from the office of the Adeeb [illegible] Delhi.

ADEEB

ادیب

(دہلی)





ونھوسٹ کے فلم "وش کنیا" میں سریندر اور سادھنا بوس



فلم "کلمسمی" میں
ہریش اور رنمالا



فلم "سطار" میں
چاندر موہن اور [illegible]

[illegible] ششماہی [illegible] علاوہ محصول
قیمت فی کاپی ۔ ایک روپیہ علاوہ محصول

ادیب دہلی

زیرِ [illegible]
محمد الرضی واحدی   فصیح الدین احمد ایم ۔ اے   (آنسہ) نجمہ تصدق ایم ۔ اے ۔ بی ۔ ٹی

جلد ۸   اپریل ۱۹۴۵ء   نمبر ۶

فہرست مضامین

([illegible] سے شائع کیا)

نئی کتابیں

(از نصیح الدین احمد)

(۱) خط کا جواب

از جناب ایم۔ اسلم صاحب۔ سائز ۲۰×۳۰ صفحات ۲۵۰۔ کاغذ، کتابت، طباعت جاذب نظر۔ شائع کردہ کتب خانہ دار البلاغ۔ محمد نگر۔ بیورو ڈ لاہور۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔

اسلم صاحب اُن چند مقتدر حضرات میں سے ہیں جو اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار ایک نہیں بلکہ مختلف طریقوں سے کیا کرتے ہیں۔ اسلم صاحب ناول نویسی، افسانہ نگاری، مضامین، مزاح نگاری، طنز وغیرہ سب اصناف تحریر میں مہارت رکھتے ہیں۔ ہر سال ہی میں ان کی تین چار کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ زود نویس اور بیش نویس بیشک ضرور واقع ہوئے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کا لٹریچر وقیع اور دلچسپ ہوتا ہے۔ خصوصاً ناول نویسی اور افسانہ نگاری کے ٹکنیک سے اسلم صاحب کما حقہ واقف ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول اور افسانے شائع ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں۔ ملک میں اُن کے بہت قدردان پیدا ہو چکے ہیں۔ اور اب ان کی مقبولیت عام ہوتی جاتی ہے۔

زیر نظر کتاب میں قابل مصنف نے جو کچھ محسوس کیا اُسے خطوں کی صورت میں ظاہر کیا ہے۔ یہ خطوط گوناگوں ہیں۔ پند و نصائح۔ اتحاد، مذہب و ملت، پردہ اور خواتین۔ فیشن پرستی اور دیگر اسی قسم کے مسائل پر روشنی ڈالی ہے اور وسیع مطالعہ کی وجہ سے ان کے "خطوں کے جواب" خشک بن کر نہیں رہ گئے ہیں۔ بلکہ اسلم صاحب کے مخصوص طرز تحریر کی بنا پر ان کی دلچسپی اور دلکشی میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔

(۲) حسنِ سوگوار

از جناب ایم۔ اسلم۔ سائز ۲۰×۳۰ کتابت طباعت اور کاغذ حسب معمول بہت عمدہ۔ صفحات ۲۰۸۔ مجلد مع گرد پوش۔ قیمت تین روپے۔ شائع کردہ کتب خانہ دار البلاغ۔ محمد نگر۔ بیورو ڈ لاہور

چین ہندوستان کا ہمسایہ ملک ہے مگر چند سال قبل ہندوستانی چین اور چینی حالات سے بہت کچھ ناواقف تھے۔ چین اور جاپان کی جنگ نے ہندوستانیوں اور چینیوں کو نزدیک تر لاکر کھڑا کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں ہمسایہ ملکوں میں ایک دوسرے کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون کرنے کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ چین سال ہا سال سے پہلے خانہ جنگی اور اس کے بعد جنگ جاپان میں مبتلا رہا ہے۔ ہندوستان بھی کم و بیش ایک صدی سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ دونوں ملک اپنی اپنی آزادی کے خواہاں اور کوشاں ہیں۔ دونوں میں بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ چنانچہ موجودہ چینی [illegible] میں بھی اس قومی کشمکش کا عکس پایا جاتا ہے۔ زیر نظر کتاب ایک چینی ناول کا ترجمہ ہے جس میں چین کی اندرونی حالت کو بڑے دلچسپ پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ چینی عادات، چینی رسم و رواج۔ چینی ایثار۔ چینی حب الوطنی اور چینی محبت کا بے مثل نمونہ ہے۔ پھر اسلم صاحب نے اس خوبی سے ترجمانی کی ہے کہ نقل کو اصل کر دکھایا ہے۔

(۳) ۱۹۴۴ء کی منتخب نظمیں

شائع کردہ مکتبہ اردو لاہور
قیمت [illegible]

مکتبہ اردو لاہور کی یہ ایک خصوصیت ہے کہ ۱۹۴۱ء سے وہ سالانہ بہترین نظموں کا ایک انتخاب شائع کرتے ہیں چنانچہ اس سال بھی اس رسم کو انہوں نے گذشتہ سالوں کی طرح خوبی سے انجام دیا ہے۔

زیر نظر مجموعہ ایک سو دس صفحات پر مشتمل ہے جس میں احمد ندیم قاسمی۔ اختر الایمان۔ ادا بدایونی۔ تاثیر۔ جوش۔ حفیظ۔ سلام۔ فراق اور دیگر شعرا کی نظمیں شامل ہیں۔ معلوم نہیں یہ انتخاب کس زاویہ نگاہ سے کیا جاتا ہے۔ تاہم مکتبہ اردو کی یہ سعی قابل مبارکباد ہے۔ اور اگر بے لاگی سے کام لیا گیا تو یقیناً قابل ستائش بھی ہوگی۔

انسانی پرکھ کی دو کسوٹیاں

(از واحدی)

خدا تعالیٰ انسان سے اپنے لئے تو فقط اتنا ہی چاہتا ہے کہ اُس کی خدائی اور کبریائی کو مانا جائے اور اُسکے احکام کے آگے سر جھکایا جائے۔ باقی کسی اور برتاؤ کا نہ وہ محتاج ہے اور نہ برتاؤ کر لینے وہ انسانوں کے درمیان آتا ہے۔ خدا کی خدائی اور کبریائی کے ماننے میں بھی انسان کی تربیت مقصود ہے کہ وہ حقائق سے آنکھیں بند نہ کرے۔ اور خدا کا حکم تسلیم نہ کرنا بھی سب انسانوں کے آپس کے معاملے اور برتاؤ سے تعلق رکھتا ہے۔ جزا اور سزا خدا کو ماننے نہ ماننے کے بعد اگر ملیگی تو بس اسی بات کی ملیگی کہ ہم نے خدا کی مخلوقات خصوصاً اپنے ہم جنسوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کیا۔ ہم جنسوں میں ماں باپ ہیں۔ بھائی بہن ہیں۔ بیوی بچے ہیں اور رشتہ دار ہیں۔ ہم مذہب اور ہم وطن ہیں۔ حاکم ہیں۔ محکوم ہیں۔ امیر ہیں۔ غریب ہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں۔ اَن پڑھ ہیں۔

ماں باپ۔ بھائی بہن اور بیوی بچوں کی بابت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صرف ایک حدیث پیش کر دینی کافی سمجھتا ہوں۔ فرماتے ہیں۔ "خیرکم خیرکم لاھلکم" تم میں اچھا انسان وہ ہے جو اپنے اہل و عیال کے لئے اچھا ہے۔ غیروں کی نسبت اپنے اہل و عیال کے لئے لوگ عموماً اچھے ہوتے ہیں۔ لیکن پھر بھی اس معیار پر پورے نہیں اُترتے جس کی طرف حضرتؐ کا اشارہ ہے۔ کچھ نقص رہ ہی جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے حضرت نے یہ بات ارشاد کی۔ ماں باپ کے تمام حقوق کون ادا کرتا ہے۔ بھائی بہن اور دیگر رشتہ داروں کے ساتھ صلہ رحم کہاں برتا جاتا ہے۔ میاں بیوی کے سلوک کے صحیح نمونے کس قدر پیش کئے جاسکتے ہیں۔ بچوں تک سے بے پرواہی کی ہزاروں مثالیں سامنے ہیں۔ بچوں کی تعلیم و تربیت نظر انداز کرتے نہیں دیکھا۔ خود اچھا کھاتے اور بچوں کو بُرا کھلاتے دیکھا ہے۔ خود اچھا پہنتے اور بچوں کو بُرا پہناتے دیکھا ہے۔ دُنیا میں بڑا خود پرست اور سنگدل پڑا ہوا ہے۔ قیاس کر لیجے جب اپنوں کے ساتھ یہ حال ہے تو دوسروں کے ساتھ کیا حال ہوگا۔ خیرکم خیرکم لاھلکم کے معنی یہی ہیں کہ انسان صرف اپنے ہی کے ساتھ صرف بیوی بچوں ہی کے ساتھ

اچھے بن جاؤ۔ جسے ماں باپ۔ بھائی بہن اور بیوی بچوں کے ساتھ اچھا بننے کی مشق ہے وہ دوسروں کے ساتھ بھی اچھا بن سکتا ہے۔ وہ غریبوں اور اَن پڑھوں کو حقارت سے ٹھکرانے کی بجائے اُونچا کرنے کا خیال کر سکتا ہے۔ اور جو ماں باپ، بھائی بہن اور بیوی بچوں کے ساتھ اچھا نہیں وہ دوسروں کے ساتھ کیسے اچھا چل سکتا ہے۔ جو شخص تم سے اظہار تعلق کرے اُسے اُس کے گھر کے تعلقات سے پرکھو۔ "خیرکم خیرکم لاھلکم" لیڈروں کو پرکھنے کی کسوٹی ہے۔ جو پیشوا اور رہنما اپنے بیوی بچوں کے حق میں مفید ثابت نہیں ہوا وہ قوم کو کیا فائدہ پہنچائے گا۔

میاں بیوی کے خراب برتاؤ کا ایک عبرت ناک واقعہ یاد آگیا۔ بیس پچیس سال کی بات ہے۔ ایک شخص نے مجھ سے شکایت کی کہ اُسکا داماد اُس کی بیٹی ہی کے ساتھ بُری طرح پیش نہیں آتا۔ بلکہ اُس پر بھی دست درازی کرتا ہے۔ جوان داماد نے بوڑھے خسر کو اُس روز خوب زدوکوب کیا تھا۔ میں نے داماد کی اصلاح کی کوشش کی۔ مگر کارگر نہ ہوئی۔ بوڑھا خسر مر گیا۔ اور بیس سال بعد جوان داماد بوڑھا خسر بنا۔ عبرتناک واقعہ یہ ہے کہ اسے بھی اپنا جیسا داماد ملا۔ اور داماد سے پٹ کر وہ بھی میرے پاس روتا ہوا آیا۔ آپ کے قدرت کے فیصلہ میں مداخلت کی میری ہمت نہ ہوئی۔ اور میں نے کہہ دیا "بھائی! اُس ہاتھ دے اِس ہاتھ لے۔"

ایک دفعہ میں خود اپنے غلط برتاؤ کی بڑی سخت سزا بھگت چکا ہوں۔ اور میرا ایمان ہے کہ غلط برتاؤں کی سزا میں دیر تو لگ سکتی ہے لیکن اندھیر نہیں ہوتا۔ برتاؤ سے نزدیک کے یا دور کے رشتہ داروں کے ساتھ ہوں یا دوستوں اور ملنے والوں کے ساتھ یا عامۃ الناس کے ساتھ۔ بعض حضرات کی بابت کہا جاتا ہے کہ وہ دوستوں اور غیر رشتہ داروں کے لئے اچھے ہیں مگر بیوی بچوں اور رشتہ داروں کیلئے اچھے نہیں۔ میں یہ فرق سمجھنے سے قاصر ہوں اچھے کو تو سب ہی کے لئے اچھا ہونا چاہیئے۔ بلکہ اچھے کو تو بُروں کے لئے بھی اچھا ہونا چاہیئے۔ ایسا ضرور ہوسکتا ہے کہ انسان عامۃ الناس سے واسطہ نہ رکھے اور اپنے تعلقات صرف گھر والوں اور رشتہ داروں میں محدود کرے۔ لیکن جو گھر والوں اور رشتہ داروں سے توڑ کر عامۃ الناس سے جڑنے کے اصول پر عامل ہو وہ میری رائے میں بھروسہ کے قابل نہیں ہے۔ وہ عامۃ الناس کو دھوکا دیتا ہے۔ اس کا عامۃ الناس سے اظہار تعلق ڈھونگ ہے وہ عامۃ الناس کی خدمت کرنی نہیں چاہتا بلکہ عامۃ الناس میں فقط مقبول ہونا چاہتا ہے۔ اور مقبولیت کے حاصل کرنے کی خاطر اپنے بیوی بچوں تک کو بھول جاتا ہے

پر خود غرضی اور نفس پروری کی تہمت ہے۔ ایسے خود غرض اور نفس پرور انسان سے خلقت اللہ کی فلاح کی امید رکھنی نادانی ہے۔ لہذا انسان کے اخلاص کے ساتھ برتاؤ کی پہلی کسوٹی وہی خیرکم خیرکم لاہلہٖ ہے۔ یعنی آسے آسی بات سے پرکھا جائے کہ وہ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ کیسا ہے۔ اور دوسرے رشتہ داروں کے حقوق کہاں تک ادا کرتا ہے۔ اس کسوٹی پر صحیح اترنے کے بعد بہت ممکن ہے کہ عام انسانوں کے ساتھ بھی انسان کو اخلاص پیدا ہو جائے۔ ایسے انسان سے انسانوں کی خدمت کی جا سکتی ہے۔ خواہ وہ خود انسانوں کو اپنی طرف بلائے خواہ انسان اُس کے سپرد کر دیئے جائیں۔ بیوی بچوں اور رشتہ داروں کے ساتھ سلوک دیکھنے کے بعد دیکھنے کی دوسری چیز یہ ہے کہ ایسا شخص جو انسانوں کی خدمت کا مدعی ہے یا جسے انسانوں کی کوئی خدمت سونپی گئی ہے، وہ انسانوں سے جلوت میں کس طرح پیش آتا ہے اور خلوت میں اس کا رویہ کیا ہوتا ہے۔ مثلاً جب وہ انسانوں کے کسی بڑے مجمع کو مخاطب کرتا ہے تو خلق اللہ کے ساتھ محبت اور تعلق کا کتنا اظہار کرتا ہے اور جب وہی خلق اللہ فرداً فرداً اُس سے ملتی ہے تو فرعون تو نہیں بن جاتا۔ ہمارے بہت سے رہنما اور پیشوا رؤسا اور اُمرا بننے کے شوق میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنے گرد جمع کر لیتے ہیں لیکن بالآخر مجمع سے گھبرا جاتے ہیں۔ رہنما پیشوا اور رؤسا و اُمرا ہی کے لئے نہیں اللہ کے خاص بندوں کے لئے بھی یہ ایک امتحان ہوتا ہے۔ اس امتحان میں پاس ہونا آسان نہیں ہے۔ اہل و عیال اور رشتہ داروں کے سلوک کی کسوٹی کی طرح یہ بھی ایک کسوٹی ہے انسان کے پرکھنے کی۔ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ خاندان چشتیہ میں بڑے بزرگ گذرے ہیں۔ آپ نے شادی نہیں کی تھی اس واسطے پہلے امتحان سے تو آپ بچ گئے۔ لیکن دوسرا امتحان آپ کا سخت لیا گیا۔ بادشاہ وقت آپ کا مُرید ہو گیا اور لوگوں کی رجوعات اس حد کو پہنچی کہ آپ نے اپنے پیر حضرت خواجہ معین الدین اجمیری سے درخواست کی مجھے دلّی سے کسی دوسری جگہ بدل دیا جائے۔ یہاں کی رجوعات سے میں تنگ آگیا ہوں۔ حضرت خواجہ معین الدینؒ نے جواب دیا کہ خلقت کی جفا تفا کو برداشت کرنا بھی ریاضت ہے۔ تمہیں دلّی ہی میں رہنا چاہیئے۔

تو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ جیسے بزرگ جب امتحان سے گھبرا گئے تھے اس میں پاس ہونا کچھ ممکن نہیں ہے۔ لیکن بہرحال امتحان میں پاس اور فیل ہونا پڑتا ہے۔ اور جو فیل ہوتا ہے اُسے پاس نہیں کیا جاتا۔ جسے فیل ہونے کا ڈر ہو وہ امتحان ہی میں کیوں پڑے۔ ریاست حیدرآباد دکن میں ایک صاحب [illegible] تھے اور وہ اُن کے [illegible] نے کہنا شروع کیا کہ مجھ میں تو [illegible] ہے۔ ان کے پاس ایک عرب ملازم تھا۔ عرب بہت تیز طبیعت کے بے باک ہوتے ہیں۔ اُس نے جب بار بار اپنے آقا کی زبان سے سنا کہ "میں بازآیا اس چوبیس گھنٹے کی مصروفیت سے" "میں بازآیا اس چوبیس گھنٹے کی مصروفیت سے" تو وہ بولا "نواب صاحب! کیا کہتے ہیں آپ خدا کا شکر ادا کرو۔ آپ کے گھر پر اتنا آدمی آتا ہے۔ ہمارے پاس کتا بھی نہیں آتا۔"

تو حقیقت یہ ہے کہ جب خدا کسی انسان کو اس قسم کے مواقع دے کہ اُس کا انسانوں سے غیر معمولی سابقہ پڑنے لگے تو اُسے انسانوں کی جفا تفا بھی برداشت کرنی چاہیئے۔ زیادہ انسانوں سے سابقہ پڑتا ہے تو ان میں بے عقل اور بیوقوف زیادہ ہوتے ہیں۔ بے عقلی اور بیوقوفی کا مقابلہ کرنا اور مشکل ہوتا ہے۔ میں اس بارے میں دو مثالیں دیا کرتا ہوں ایک خاص اور ایک عام۔ خاص تو دلّی ریڈیو سٹیشن کے مقامات ہیں جو مختلف پروگراموں میں براڈکاسٹ ہوا کرتے ہیں۔ ہمارے لیڈر اور ہمارے عمائد یہ پروگرام ضرور سنا کریں اور دیکھیں کہ کیسے کیسے عقلمند کیا کیا خوبصورت باتیں لکھتے ہیں اور کس طرح انہیں برداشت کیا جاتا ہے۔ عام مثال ہر تاجر کی دکان ہے اور تاجر کا برتاؤ ہے۔ تاجر کو اپنے گاہک سے بڑی اُلٹی سیدھی باتیں سننی پڑتی ہیں۔ مگر وہ گاہک کو ہاتھ سے نہیں کھوتا۔ ہمارے لیڈر اور ہمارے عمائد اگر اللہ کے واسطے لوگوں سے واسطہ رکھتے ہیں تو یہ اللہ کے ساتھ تجارت ہے۔ لوگوں کی جفا تفا انہیں برداشت کرنی چاہیئے۔ اور اللہ سے اُس کا صلہ لینا چاہیئے۔

یہ آنسو

(محترمہ اختر جہاں بیگم)

ریحانہ کہہ رہی تھی شگفتہ آگئی ہے۔ لیکن وہ شگفتہ نہیں جو دراصل شگفتہ تھی جس کی زندگی ایک مسلسل مسکراہٹ تھی۔ اب تو وہ سچ مچ مرجھا گئی ہے۔ آج زندگی میں پہلی بار وہ مجھے دیکھکر اپنے آنسو نہ روک سکی۔ اور نظریں جھکا لیں تاکہ میں اس کے آنسو نہ دیکھ سکوں۔ میں ان آنکھوں میں آنسو نہ دیکھوں جن سے مسرت کی مسرت پھوٹتی تھی۔ اور . . . . . ” نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی میں چونک پڑی۔ کیا سچ مچ شگفتہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نہیں! نہیں میں خود اس کے پاس جاؤں گی۔ وہ یقیناً آج بھی میرا خیر مقدم ایک شگفتہ مسکراہٹ سے کریگی۔ اس کی شاداب آنکھیں ایسے کنول کی طرح شاداب جسے ہوا کے نرم نرم جھونکوں نے ابھی ابھی کھلایا ہو۔ ان میں آج بھی وہی ہلکی سی نمی اور گہری چمک ہوگی۔ جیسے نیلے پردے میں سے موتی جھلملاتے ہوں۔ سیاہ پلکوں کے گھنے سایئے میں وہ شاداب کنول آج بھی مسکرا رہے ہونگے۔ . . . .

میرے ذہن پر بھینی بھینی سی خوشبو چھانے لگی اور کانوں میں شگفتہ کے شاعل قہقہے گونج اٹھے۔ کتنے معصومانہ انداز سے ہنستی تھی۔ یہ ہنسی پہلے ایک ہلکی سی کھلکھلاہٹ سے شروع ہوتی اور پھر آہستہ آہستہ قہقہے میں بدل جاتی۔ سر کرسی سے ڈھلک جاتا۔ آنکھیں نیم باز ہوجاتیں، چہرہ تمتما اٹھتا، بعض دفعہ تو ہنستے ہنستے مسہری پر گر جاتی . . . . . اس کے قہقہے بھی اس کی طرح شگفتہ تھے۔

ایک دن ریحانہ مجھے اپنا لکھا ہوا افسانہ سنا رہی تھی۔ اتنے میں شگفتہ آگئی۔ ریحانہ بدستور افسانہ سناتی رہی۔ ”لیلیٰ شب اپنی سیاہ زلفیں بکھرائے کھڑی تھی . . . آسمان پر . . . . .“ ریحانہ نے یہیں تک سنایا تھا کہ شگفتہ نے نہایت سنجیدگی سے بڑا بھولا چہرہ بنا کر پوچھا ”لیلیٰ شب اپنی زلفوں میں کون سا تیل ڈالتی تھی؟ مجھے بھی سیاہ بالوں کا شوق ہے۔“

”لاحول ولاقوۃ“ ریحانہ نے جل کر کہا۔ میں بے اختیار ہنس دی۔

ایک دن میں سکول کا کام کر رہی تھی کہ شگفتہ آگئی اور نہایت اطمینان سے بیٹھ کر بولی ”بھئی آج تمام عمر میں ایک شعر کہا ہے۔“ میں سمجھ گئی کہ پریشان کرے گی کوئی شرارت سوجھی ہوگی۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر جناب نے نہایت اطمینان سے میرے سر پر اپنا پورا ہاتھ جماتے ہوئے کہا ؎

جی چاہتا ہے ترے جماؤں بس ایک ہاتھ
مدت ہوئی تمہاری مرمت کئے ہوئے

”یہ کیا بدتمیزی ہے نالائق!“ میں نے اپنا سر سہلا[تے]
قریب رو کر کہا۔ ”شکریہ ادا کیجئے کہ کتنے خوبصورت الفاظ میں دا...
مختصر یہ کہ اس روز سکول کا کام نہ کر سکی۔

ایک دفعہ شگفتہ نے ایک ڈرامہ بھی تو لکھا تھا جو ایک ...
حلقۂ احباب میں سنایا گیا۔ مجھے کچھ کچھ یاد ہے۔ جب کبھی سو...
ہنسی آجاتی ہے۔ ڈرامہ سنانے سے پہلے چند تمہیدی فقرے ...
طرح کہے تھے۔ ”بھئی آج کل فلمی گانوں میں کوئل، پپیہا، بھنورے او...
لگے ہیں۔ میرا خیال ہے ان معصوم پرندوں کو چھٹی دیدینی چاہیئے ...
جگہ چیل، کوّے، گِدھ، اُلّو جیسے خوبصورت پرندوں کو دیدی جا...
میرے خیال میں اس طرح فلمی گانوں کا ایک نیا دور شروع ہوگا ...
ان گانوں کا معیار ہاتھی جیسے عظیم الشان چوپائے تک پہنچ جائیگا ...
نہیں جب ہندوستان بھر میں اس قسم کے گانے گونجا کریں گے۔“ ...
ڈال اور پات پات کیا ہتھنی کو ڈھونڈے رے“ وغیرہ وغیرہ ...
شگفتہ کی آواز ہمارے قہقہوں میں گھل مل گئی۔ بڑی مشکل ...
شگفتہ کہہ رہی تھی، اس ڈرامے کا نام نہایت سیدھا ساد[ا]
”کچھ تو ہے۔“

پہلا سین

ایک ویران بیابان جنگل، ہُو کا عالم، جہاں پرندہ بھی ...
لیکن آپ کی دعا سے (یا اتفاق کہیئے) ایک ہرے بھرے در[خت]
ہیرو اور ہیروئن بیٹھے ہیں۔ درخت کی جھکی ہوئی ٹہنی پر ایک ...
بھی سر جھکائے بیٹھا ہے۔ آسمان بالکل چٹیل اور بنجر میدان“
”معاف کیجئے“ آرہا ہے۔ اور ہاتھی کی پیاری پیاری ”چونچیں“ ...
یکایک ہیروئن ہیرو سے پوچھتی ہے۔

ہیروئن:- یہ ہاتھی کیا کہہ رہا ہے؟

ہیرو:- (خود فراموشی کے عالم میں) کیا معلوم؟

ہیروئن:- (غضبناک ہوکر) آف کیا کہا تم نے؟ تمہیں یہ بھی نہ...
اتنا بھی نہیں بتا سکتے؟ تم نے مجھے کہیں کا بھی نہ ...
(بے ہوش ہوکر گرنے لگتی ہے لیکن گرتے گرتے کچھ خیا[ل]
اس سے وہ سنبھل کر بیٹھ جاتی ہے۔ ہیرو ایک چیل کو حسرت ...

کیا مرزا غالب مُشکک تھے؟

(از جناب ابن حسن شارق دہلوی)

مرزا غالب پر کوئی آخری رائے قائم کرنے سے قبل ہمیں خود مرزا کی آشوب زندگی اور اُس ماحول کو سمجھ لینا چاہیئے جس میں اُنھوں نے سانس لیا۔ مرزا غالب اُس زمانہ میں پیدا ہوئے جب سلطنت مغلیہ کا آفتاب گہنا رہا تھا اور ...ی بہادر کی حکومت ختم ہوکر برطانوی شہنشاہی کا چراغ روشن ہونے والا تھا۔ ...ں جہاں وہ نوعمری میں آگئے تھے ایک عجیب دنگل کا نمونہ تھی۔ قلعہ کا اثر شہر پر باقی ...ا۔ اور ابوظفر محمد سراج الدین بہادر شاہ بادشاہ دہلی نے گورنر جنرل کو دربار میں ...رن دینے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ دوسری طرف کل نظام سلطنت میں انگریز ...ردی ہوچکی تھی۔ بادشاہ ایک پنشن خوار ملازم کی حیثیت رکھتے تھے۔ مرزا جن ...فطرت میں خدا نے شاعری کا ملکہ کوٹ کوٹ کر بھر دیا تھا اس دنگل میں پڑ ان ...ھے۔ چونکہ قصائد میں مبالغہ روا رکھنے کو وہ ایک رسم قدیم سمجھکر جائز قرار دیتے ...تھے۔ اس لئے اُنھوں نے بے تکلف بادشاہ کی بھی تعریف کی۔ اور لاٹ صاحب کی ...ی۔ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ دہلی میں غدر سے پہلے بھی غدر بپا تھا۔ ایک عجیب سیاسی انتشار اور تباہی پھیلی ہوئی تھی۔ تیموری صولت وحشمت کا چراغ دم توڑ ...رہا تھا۔ عوام مفلوک الحال اور بے روزگاری کا شکار ہو رہے تھے اُس پر طرہ یہ ...کہ سنہ ۵۷ کا ہنگامہ برپا ہوا۔ جو دراصل آزادی حاصل کرنے کی آخری کوشش ...بجھتے ہوئے چراغ کی آخری بھڑک تھی۔ اس شورش میں جو دو چار لوتر لوں کے ...باقی رہ گئے تھے وہ بھی تباہ ہوگئے۔ اس افراتفری کے زمانہ میں مرزا نے ...مناسب سمجھا کہ جس طرح بن پڑے بس آپ اچھی طرح زندگی گذار لی جائے۔ ...بھاگتے کی لنگوٹی ہے۔ اس اضطراب وپریشانی کے عالم میں اپنی ہستی کے قیام د ...کے ہوا اور کچھ ممکن ہی نہیں تھا۔ چنانچہ جب تک توقعات وابستہ رہیں وہ ...دربار شاہی سے فیضیاب ہوتے رہے۔ لیکن اپنی پنشن واگذاشت ...کی اُمید پر گورنر جنرل کا قصیدہ کہہ ڈالا۔ اور پھر لارڈ ہارڈنگ سے ...مسٹر ایڈمنسٹن تک سب کی مدح سرائی کر ڈالی۔ مہر نیمروز اور پنج آہنگ ...مسلمان انگریزی تہذیب اور ادب کی تعریف میں رطب اللسان ہونا ایک

طرف اور صرف اس وجہ سے کہ پرنسپل صاحب دہلی کالج ان کے استقبال کو باہر تشریف نہ لائے۔ پالکی کو واپس کروا لینا دوسری طرف اُن کی ذہنی کشمکش کا ہلکا سا نمونہ پیش کرتا ہے۔ ایک طرف تو اُن میں قدیم رئیسانہ خو بو اور امیرانہ تمکنت ہے جسے وہ بہرحال نباہنا فرض سمجھتے ہیں۔ دوسری طرف اُن کی ابن الوقتی اور شکر گذاری ہے۔ جس کے ذریعہ وہ نہ صرف باسٹھ روپے ماہوار پنشن حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں بلکہ ہر رئیس اور والیٔ ملک کی شان میں زمین وآسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ وہ ہزار چاہتے ہیں کہ اگر در کعبہ وا نہ ہو تو اُلٹے پھر آئیں۔ لیکن شہزادہ فتح الملک کا اُستاد مقرر ہونے پر قصائد لکھنے پڑتے ہیں۔ اس لئے کہ چار سو روپیہ زر نقد مشاہرہ مقرر ہوا تھا۔ ۱۸۵۲ء میں اُنھوں نے نواب واجد علی شاہ کی شان میں قصیدہ لکھکر پیش کرایا اور اس کے صلے میں ۵۰۰ روپیہ سالانہ مقرر ہوا۔ غدر سے پہلے وقتاً فوقتاً اور غدر کے بعد بالالتزام نواب رام پور نے سو روپیہ ماہوار مقرر کئے۔ لیکن وہ ہمیشہ یہ کہتے رہے کہ قرض کی پیتا ہوں اور کپڑے لکھاتا ہوں۔ وہ جوئے کھیلتے ہیں۔ پر اپنے سگے بھائی یوسف کے بچوں کی خبر گیری مطلق نہیں کرتے۔ وہ سب سے پہلے اپنی ضروریات پوری کرنی ضروری سمجھتے ہیں۔ حافظ کی طرح غالباً وہ بھی حدیث مطرب ومے گو پر ہی ایمان رکھتے تھے اور راز دہر کمتر جو پر عمل کرتے تھے۔ اُن کا اُردو کلام اُن کے اس عقیدہ کی بے شمار مثالیں پیش کرتا ہے۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ میری آرزو میں کبھی پوری نہ ہونگی تو بجائے اسکے کہ ایک انقلابی بن جائیں دُنیا اور لذائذ دُنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لینے پر قناعت کرتے ہیں اور بس ایسی جگہ چلے جانے کے متمنی ہیں جہاں کوئی نہ ہو۔ تیس برس کی عمر سے پچاس برس کی عمر تک تو اُنھوں نے اُردو کو منہ ہی نہیں لگایا۔ پھر اقتضائے وقت اور دربار کی شہ سے مجبور ہوکر گاہ بگاہ اس میں بھی گنگنانے لگے۔ شروع شروع میں اُردو بھی ایرانی نثراد لکھتے تھے۔ صائب۔ غنی اور بیدل کا اس قدر اثر قبول کیا تھا کہ خیالی قلابازیاں کھانے لگے۔ چنانچہ طائر رنگ پریدہ اور آفتاب صبح محشر جیسی نادر تشبیہات سے اپنی فوقیت جتائی۔ وہ جانتے تھے کہ حکیم مومن خاں کے رنگ میں غزل نہیں کہہ سکتا۔ اور شیخ ابراہیم سے پرخاش کا خیال رکھنے کی مجھ میں تاب نہیں۔ اس لئے اُنھوں نے اپنی دُنیا آپ بنائی اور ایک نیا رنگ اپنا قائم کرنا چاہا۔ لیکن چونکہ طبعاً وہ عوام سے علیحدہ اپنی راہ بنانا چاہتے تھے اس لئے ابہام گوئی پر پہنچ لئے۔ پھر مولوی فضل حق خیرآبادی اور مفتی صدر الدین صاحب اور حزیں کے ایما پر سہل گوئی اختیار کی۔ لیکن سہل گوئی کو وہ بگفتہ از مجموعہ اُردو کہ بے رنگ من است سمجھا کئے۔ گفتہ غالب جسے وہ فارسی کے برابر

[illegible] ہے۔ [illegible] لگا۔ اور فارسی اُستادوں کا رنگ [illegible] جھلکنے لگا۔ لسانی تذبذب و تکنیک کی وجہ سے اُن کے اس الہامی دیوان [illegible] عجب دو رنگی پیدا ہو گئی ہے۔ ایک طرف تو فارسی ترکیب کی [illegible] کہ اگر ایک حرف کا رد و بدل کر دیا جائے تو پورا شعر فارسی اور [illegible] بن کر رہ جاتا ہے۔ دوسری طرف یہ سادگی کہ ؎

کوئی اُمید بر نہیں آتی

اس خلفشار میں جس میں تہتر برس اس ترکمانی شاعر نے بسر کئے کچھ اس بلا کا جادو تھا کہ بجز خود پرستی کے اور کچھ بن پڑنا ممکن ہی نہ تھا۔ چنانچہ مرزا ایک ایسی نفسی علالت کا شکار ہو گئے اور اُن پر ایک ایسا ذہنی جمود مستولی ہو گیا جو "ہم چو من دیگرے نیست" کے سوا اور کچھ نہیں سکھاتا۔ وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ مرزا نے حسن و عشق کے پردے میں بڑے بڑے رموز بیان کئے ہیں۔ یہ حقیقت نظر انداز کر جاتے ہیں کہ وہ رموز ایک فلسفی کے رموز نہیں بلکہ ملا فضل حق جیسے فلسفی کی صحبت کی بے معنی گونج ہیں۔ بیشتر فلسفہ یا وہ خشک تصوف ہے جسکی پناہ میں دُنیا سے ڈر کر اور پسپا ہو کر لوگ پناہ لیتے ہیں۔ وہ فلسفہ جو خون جگر سے لکھا جائے جس میں جوشِ عمل ہو۔ تعادل ہو۔ اُمید ہو۔ مرزا کے یہاں ناپید ہے۔ وہ فطرتاً ایک فلسفی نہیں تھے۔ بحیثیت ایک انسان ہونے کے جو غم واندوہ اُن کی غزلوں میں پایا جاتا ہے نہایت موثر ہے۔ لازم نہیں کہ ہر شے فلسفۂ غم ہی ہو۔ ان کی غزلوں میں جو بلاغت، ادبی مصوری، محاکاتی اشارے اور سب سے بڑھ کر بے ساختگی پائی جاتی ہے وہ ہزار قابلِ تعریف سہی۔ لیکن پھر ہے تو زندگی کا منفی پہلو۔ اُن کی آہ کو ایک عمر اثر کرنے کیلئے چاہیئے اور اس عمر سے پہلے جینا مشکل۔ دیوان غالب کو مقدس وید ماننے والے خواہ کچھ بھی کہیں لیکن مرزا غالب اس دُنیا کی آخری ہچکی تھے جو سلطنت مغلیہ کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اور نئی دُنیا جس نے انگریزوں کے بعد جنم لیا۔ حالی۔ آزاد اور شبلی سے شروع ہوتی ہے۔ مرزا کا سرمایہ زیادہ تر غزلوں پر مشتمل ہے۔ غزل بھی وہ نہیں جسے حکیم مومن خاں کی طرح معاملہ بندی، وصل و ہجر اور مستی و رنگینی کے مضامین ہی کے لئے محدود کر دیا گیا۔ غزل بھی وہ جسے بعد میں اقبال نے نکھار کر [illegible] بنا دیا اور جس میں سیاسی اور معاشی مسائل بیان کر ڈالے۔ اور [illegible] سے غزل میں وہ غم روزگار سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ چنانچہ اُن کے [illegible] نے جن میں نیر، آزردہ، شیفتہ، حکیم آغا جان عیش، حکیم مومن خاں [illegible] نے یہ شکایت کی کہ مرزا ایسا کہو جسے سب سمجھیں۔ ظاہر ہے [illegible] ہوتے تھے کافی شعر نہیں کا

[illegible] تھے انہیں [illegible] کی بجائے ہیں بیدل دہلوی کی [illegible] کیا ہوں۔

مرزا پیدائشی شاعر تھے۔ لیکن وہ [illegible] شاعر تھے جو [illegible] کو اپنے نئے موزوں نہ دیکھ کر اپنی آرزوؤں کو قطع برید کر لیتے ہیں۔ پر اُن میں دعوتِ عمل کا جوش پیدا نہیں ہوتا۔ مرزا کی تمنائیں اور ideals [illegible] بہت بلند ہیں۔ اور اس قدر بلند کہ عرش سے بھی پرے۔ وہ ساقی [illegible] ہے وہ پُر جام و اژگوں رکھنے کی وجہ سے نہ عشرت کی خواہش [illegible] شیک اسی طرح جس طرح اقبال اسی ساقی کے شیشہ میں سے باقی نہیں یا زمانی ہے یہ زنانی نہیں ہے؟ کہہ گنتا ہے۔ ان تمناؤں کے [illegible] کی وجہ سے ان پر ہمیشہ ایک شدید بیم کا عالم طاری رہا۔ زندگی ان کی کچھ اس ڈھب سے بسر ہوئی کہ "ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے" ہی کہتے رہ جاتے ہیں۔ وہ یہ بات ہی طے نہ کر سکے کہ جنت ہے بھی یا نہیں۔ اور خدائی کا وجود ہے بھی یا نہیں۔ اگر ہے تو نمرود کی خدائی کا تو نہیں۔ الغرض اُن کی طبع آزاد ان مسائل مبہم کے سلجھانے سے عاری رہی وہ ادبی زبان میں شعر کہتے تھے۔ اس زبان میں جسے نہ تو وہ خود بولتے تھے۔ نہ کسی اور کو بولتا دیکھتے تھے۔ [illegible] خیالات کا اظہار کرتے تھے جو اس مادی دُنیا میں ایسے خواب ہیں جو کبھی [illegible] تعبیر نہ ہونگے۔ تاہم ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ مرزا کا پورا دیوان لایعنی نہیں ہے۔ اُنہوں نے آنے والی نسلوں کے تخیل کی تربیت غیر محسوس طور پر کی ہے۔ غیر شعوری طور پر مرزا غالب نے ہمارے جدلیاتی ارتقا اور بدلعت کو ٹھوکر لگا کر چونکا دیا ہے ؎ "مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے" والی غزل پڑھیئے۔ اس میں آپ کو محسوس ہوگا کہ ایک متذبذب ماحول میں ایک شخص متضاد میلانات میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی ناکام کوشش کر رہا ہے۔ قطع نظر اس کے اس کا غنائی عنصر اور خوبی کیسی لطیف چیز ہے۔ سبحان اللہ ان کی ساری شاعری میں رجائی اور قنوطی پہلو ہم کو صرف ڈھونڈنے سے ہی ملتا ہے بالتبہ منفی میلان اور کشاکش کی لاتعداد مثالیں نظر آتی ہیں [illegible] یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مرزا اپنے زمانے کی گرد میں تھے۔ [illegible] تکنیک سے علامہ اقبال [illegible] کہ حقیقت [illegible] زیادہ قابل [illegible] اگرچہ ایک [illegible] آفرینی اور انسانی فطرت کا [illegible] اور وہ [illegible] کے اشعار [illegible]

[illegible] ایک ظریف شاعر تھے لیکن ظرافت اُن کے خمیر میں تھی اور اسی لئے [illegible] دیوان ان رنگین پھلجھڑیوں سے لبریز ہے۔

ڈاکٹر [illegible] کا یہ خیال کہ اُنھوں نے گُل و بلبل کے پردے میں سیاسی شاعری کی ہے، درست ہو کہ نہ ہو لیکن یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ ظرافت کی آڑ میں وہ بہت کچھ کہہ گئے ہیں اور اس کے بارے میں خود ہی کہا ہے کہ ؎

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

غالب کے ہاں جو بے چینی اور بے اطمینانی پائی جاتی ہے وہ شاید اس لئے ہے کہ آنے والے انقلاب کے سیلاب سے وہ خائف ہیں اور اُن کے امیرانہ ٹھاٹھ باٹ کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے اور کچھ اس لئے بھی کہ اس اور النصری سلجوقی کو جسے اپنے پیشۂ آبائی پر فخر تھا اور جو ایک پُر جوش و آزاد قوم کا فرد تھا نہ صرف اپنا سب کچھ بلکہ ساری قوم کا کُل سرمایہ معرضِ خطر میں دکھائی دیتا تھا۔ اور اس کے دفعیہ کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ؎

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چُپ ہوں
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

اس طرح ہلکی ہلکی اور دبی دبی آہوں میں بے چینی، اضطراب، جستجو و تلاشِ سکون کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ لیکن وہ استفہام جو ہمیں دیوانِ غالب میں ملتا ہے ہنوز تشنۂ جواب ہے۔

ذیل میں غالب کے وہ چند مصرعے پیش کئے جاتے ہیں جو قحطِ خریداری سے کہن ہو کر قبولیتِ عام کا شرف تو حاصل کر چکی ہے لیکن جسے عوام پوری طرح سمجھ نہیں سکے ہیں ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

شوخیٔ تحریر نے اسے ایک معمہ بنا دیا ہے۔

شب خمارِ شوقِ ساقی رستخیز اندازہ تھا
تا محیطِ بادہ صورتِ خانۂ خمیازہ تھا
نالۂ دل نے دیئے اوراقِ لختِ دل بہ باد
یادگارِ نالہ اک دیوانِ بے شیرازہ تھا

[illegible] تماشا دوست رسوا ہے [illegible]
بہ مہر صد نظر ثابت ہے دعویٰ [illegible]

اہلِ بینش نے بہ حیرت کدۂ شوخیٔ ناز
جوہرِ آئینہ کو طوطیٔ بسمل باندھا

کمال گرمیٔ سعیٔ تلاشِ دید نہ پوچھ
برنگِ خار مرے آئینے سے جوہر کھینچ

نہیں اقلیمِ الفت میں کوئی طومارِ ناز ایسا
کہ پشتِ چشم سے جسکی نہ ہوئے مہرِ عنواں پر

یہ چند اشعار بطور نمونہ مشتے از خروارے، ورنہ نسخۂ حمیدیہ میں اس قسم کے ادبی گورکھ دھندے بکثرت موجود ہیں۔

وہ فلسفہ و تصوف جو معرکۂ حیات سے گریز سکھاتا ہے ملاحظہ ہو ؎

دہر جز جلوۂ یکتائیٔ معشوق نہیں   ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے   حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
اتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بُعد ہے   جتنا کہ وہمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں
ہے مشتمل وجودِ صور پر وجودِ بحر   یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں
ہے غیبِ غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود   ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

یہ سکر آور فلسفہ اور یہ افیم آمیز تصوف عشق کی گرمی اور حرکت و عمل سے کس قدر دُور ہے۔

زندگی کے منفی پہلو کو اُنہوں نے اکثر بیان کیا ہے۔ چنانچہ دُنیا اور لوازمِ دُنیا کی بے حقیقتی کا احساس دلانے کے لئے چند اشعار بطور نمونہ پیش کئے جاتے ہیں ؎

نہ گُلِ نغمہ ہوں نہ پردۂ ساز   میں ہوں اپنی شکست کی آواز

سرگشتگی میں عالمِ ہستی سے یاس ہے   تسکیں کو دے نوید کہ مرنے کی آس ہے

قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

غمِ ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں [illegible]

بیکسیٔ غالب بلا میں سب تمام ۔ ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

علاوہ ان چند اشعار کے بہت سے اسی قبیل کے اشعار ان کے دیوان میں ملیں گے جن سے نا اُمیدی جھلک رہی ہے۔ اس سلسلہ میں "نے بندہ وار وانی بساطِ ہو لئے دل" والا قطعہ بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا تاہم بقول اختر اُرینوی اگر ہم غالب کی تمناؤں کے خاکستر کو کریدیں گے تو دبی ہوئی چنگاریاں بھی مل جائینگی۔ جیسے

اہلِ بینش کو ہے طوفانِ حوادث مکتب
لطمۂ موج کم از سیلیٔ اُستاد نہیں

حقیقت یہ ہے کہ وہ ہوش اور بے ہوشی کے دوراہے پر کھڑے ہیں اور یہ شعر گنگنا رہے ہیں ؎

ہنگامۂ زبونیٔ ہمت ہے انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

"کوئی اُمید بر نہیں آتی"، "ابن مریم ہوا کرے کوئی" اور "بازیچۂ اطفال ہے دُنیا مرے آگے" والی غزلوں کو اگر نظمیں کہا جائے تو مبالغہ نہیں۔ کیونکہ ان میں پند و موعظت کے دفتر کھول کر رکھ دیئے ہیں۔

مرزا کو مالی پریشانیوں اور سیاسی شورشوں نے اتنا موقع نہیں دیا جو وہ یکسوئی سے کسی شاعرانہ پیغام کی تلقین کرسکتے۔ کیونکہ وہ خود کسی نتیجے پر نہیں پہنچے۔ اس لئے اُن پر ایک دائمی بے راہ روی اور تشکیک مسلط ہوگئی۔ جس نے اُن کے اکثر شگفتہ اشعار کو بھی مُرجھا کر رکھ دیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں ؎

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اُٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے
مجھ سے مت کہہ تو ضمیر کہتا ہے اپنی زندگی
زندگی سے بھی مرا جی ان دنوں بیزار ہے

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں ؎

دونوں جہان دیکے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

اُنھوں نے اپنی بے چینی اور تشکک پر شوخی اور ظرافت کا رنگین پردہ بھی ڈالا ہے۔ لیکن یہ بھی جابجا مسک گیا ہے ؎

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

تیری وفا سے کیا ہو [illegible]
تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

چھوڑا اسدؔ نہ ہم نے گدائی میں دل لگی
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں
چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اک راہرو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

آخر میں وہ اپنے تن رنجور کو عشق جو یہ جو کی گود میں لا کر تھپیڑ ڈال دیتے ہیں۔ اور اپنے ماتم خانۂ اُلفت کی چار دیواری میں، سماجی اصول سے مستغنی ہوکر فراق، وصال، رقیب، دربان، چارہ گر و ندیم سے حسن و عشق کی داستانیں سناتے رہتے ہیں۔ یہ واردات حسن و عشق بے جان ہیں لیکن غالب اپنی قادر الکلامی سے اس میں کچھ داخلی رنگ بھر کے Sugar coated شیریں بنا دیا ہے۔ غالب کے [illegible] تحریں اور یاس انگیز خیالات کے تصادم سے دیوانِ غالب پیدا ہوتا ہے جو مکالمات "بیکلے" سے کسی طرح کم نہیں۔ اہلِ نظر خود غور فرمائیں۔

"سنہ ۴۰ء کا سلام"

یو۔پی کا ایک نوجوان شاعر

(پہلی نامکمل تصنیف "میرے نغمے" پر ایک نظر)

(از جناب خلیق ابراہیم صاحب)

درمیانہ قد، کتابی چہرہ، پیٹ بھر کر سانولی رنگت، چوڑی موری کے پاجامے اور شیروانی میں ملبوس، اپنی ذہین آنکھوں اور شاعرانہ چال کے ساتھ ایک صاحب سامنے سے چلے آرہے ہیں۔ ہمارے درمیان دو گز کا فاصلہ ہے۔ وہ کچھ ٹھٹکتے ہیں۔ میں کچھ جھجکتا ہوں بس دو یا تین سیکنڈ کے لئے پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے برابر سے نکل جاتے ہیں۔ میں تیز چلنے کا عادی ہوں اس لئے جلد ہی دور نکل جاتا ہوں۔ نظریں خود بخود گھوم جاتی ہیں۔ وہ بھی جاتے جاتے مجھے مڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ نظروں کے چار ہوتے ہی ہم پھر منہ پھیر لیتے ہیں۔ اور اپنی اپنی راہ لیتے ہیں۔ اس قسم کے تصادم بارہا ہوئے۔ تنگ اور پرپیچ گلیوں میں۔ چوڑی اور سیدھی سڑکوں پر۔ الٰہ آباد کی میوہ ڈپو اور لکھنؤ کے نخاس اور امین آباد میں۔ ہر بار سامنا ہونے پر محسوس ہوتا کہ یہ کوئی غیر نہیں۔ دل ذرا قریب ہونے کو چاہتا۔ لیکن اس روایتی دنیا میں بغیر کسی تقریب و تعارف کے کسی کے گلے پڑ جانا بھی تو ذرا شبک سی بات تھی۔ ممکن ہے وہ یہ بے تکلفی پسند نہ کریں۔ اور شاید یہی وہ بھی سوچتے تھے۔

—— پھر ایک دن ؟ نہ رہا گیا۔ وہ بول ہی اٹھے "میری تو مراد بر آئی۔ میں سمجھتا تھا آپ سوائے خلیق ابراہیم کے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتے۔" عجیب سی بات تھی۔ دور دور رہنے کے باوجود وہ دل سے اس قدر قریب نکلے کہ جانے ان دیکھے اور انجان لوگوں کو اتنی پہچان کیوں ہو جاتی ہے۔ "روحانیت پسند" روحوں کے "پیمانِ الست" کی یاد دلائیں گے۔ کہیں گے ایسے لوگوں کی روحیں شاید ساتھ ساتھ تخلیق کی گئی ہوں گی۔ حقیقت پرستوں کے سامنے شعور اور لاشعور، نفس اور تحت نفس کی بہت سی گتھیاں کھل جائیں گی۔ میں اسے دو دلوں کی یگانگت سے تعبیر کرتا ہوں ……… تو ہم دونوں مل گئے۔ بغیر کسی تقریب و تعارف کے۔ نہ ادبی سہمہ تھا۔ نہ بڑے لوگوں کا سا طمطراق اور تصنع۔ نہ آداب و تہذیب کا زیادہ خیال تھا۔ نہ گفتگو میں بڑے بڑے الفاظ کی ثقاہت اور علمی موشگافیاں۔ دو انسانوں کی ملاقات تھی جس میں خلوص، محبت، صداقت، انسانیت سبھی کچھ شامل تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دو بھائی تھے جنہیں ہوش آنے سے قبل الگ کر دیا گیا تھا۔ اور اب برسوں کے بعد اتفاقیہ یکجا ہو گئے۔ یا دو قلبی دوست تھے جنہیں ایک مدت کے بعد سر راہے تصادم ہو گیا۔

بہت جلد ہم آپ سے تم اور تم سے ڈارلنگ پر پہنچ گئے ——— یہ تھے سلام مچھلی شہری جنہیں آپ تو غالباً محض ایک نئے شاعر کی حیثیت سے جانتے ہوں گے لیکن میں اس نہج سے بھی واقف ہوں جسے انسانی زاویہ نظر کہا جا سکتا ہے۔

میں نے اس عرصہ میں سلام کے ماحول اور اُن کے رُجحانات کو سمجھنے کی غالباً کامیاب کوشش کی ہے اور چونکہ میرا خیال ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کے کلام کی پرکھ صحیح اور مناسب طریقہ پر اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک آپ کے ماحول اور اُس کی زندگی سے خاصی واقفیت نہ ہو۔ اس لئے اس مختصر سے مضمون میں سلام کی ذات اور شاعری کے متعلق میں جو کچھ کہونگا وہ صرف نپا تلا بلکہ پوری ذمہ داری سے کہا گیا ہوگا۔

اُردو شاعری کے اُفق پر سلام کا ستارہ طلوع ہوا تو ترقی پسندی کی شفق پھولنا شروع ہوئی تھی۔ سنہ ۳۶ء میں آل انڈیا کانگریس کے اجلاس لکھنؤ کے بعد سے ملک میں گویا ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ صوبجاتی اسمبلیوں کے انتخابات، کانگریسی لیڈران خصوصاً پنڈت جواہرلال نہرو کے ملک بھر میں طوفانی دورے، حکومت کی نیڈریشن کے نفاذ کے لئے کوششیں۔ اِن سب نے خاصا ہنگامہ پیدا کر دیا۔ پھر کانگریسی وزارتوں کی تشکیل سے جہاں ایک طرف کچھ لوگ ایسا خیال کرنے لگے کہ وہ اپنی منزلِ مقصود کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں وہیں قدامت پرستوں اور اشتراکیوں کی آویزش بھی زیادہ نمایاں ہو گئی۔ اس سے پیشتر اشتراکیوں کی کوئی خاص آواز نہ تھی۔ گو بمبئی کی ملوں اور جی، آئی، پی، ریلوے کے مزدوروں کی عظیم الشان ہڑتالیں ہو چکی تھیں۔ کانپور اور میرٹھ میں کمیونسٹوں پر مقدمات سازش بھی چلائے جا چکے تھے۔ لیکن ملک کی سیاسی زندگی میں اب تک اُنھوں نے اپنے لئے کوئی ایسی جگہ پیدا نہیں کی جسے اہمیت دی جا سکتی۔ کمیونسٹ پارٹی غیر قانونی تھی۔ کچھ لوگ جو اپنے کو سوشلسٹ کہتے تھے انہیں کمیونسٹوں کی مخالفت ہی سے فرصت نہ تھی۔ لیکن جب جواہرلال نے لکھنؤ میں سوشلزم کا نعرہ بلند کیا اور خود کانگریس کے اندر ایک جماعت بائیں بازو والوں کی کانگریس سوشلسٹ پارٹی کے نام سے قائم ہو گئی۔ تو ان لوگوں کو کھل کر کام کرنیکا موقعہ ملا۔ سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کے اختلافات دور کرنے کی بھی کوششیں ہوئیں اور ملک کی تمام ترقی پسند سیاسی قوتوں کے ایک متحدہ محاذ کی تحریک زور پکڑنے لگی۔ اُدھر یورپ

میں سکیلی کا اتنی جس کو اپنے جو استبداد میں جکڑ رکھا تھا۔ اور اس دیس کی وادیوں اور مرغزاروں میں جس کے متعلق ڈاکٹر اقبال نے کہا تھا ؎

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال
اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

آگ اور خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ نازی جرمنی نہ صرف آرٹ اور سائنس کی بڑی بڑی شخصیتوں کو تحریک مخالفت صیہونیت کے سلسلے میں دیس سے نکال دے چکا تھا بلکہ برلن کے چوراہوں پر وہ بربریت سے لبریز شرمناک مظاہرہ بھی کیا جا چکا تھا جس کے نتیجے میں دنیا کے بہترین دماغوں کے بیش قیمت خزانوں، انسانی کلچر اور تمدن کی اساس کو محض اس لئے آگ کے شعلوں میں جھونک دیا گیا کہ یہ کتابیں انسانیت کی طرفداری کرتی تھیں۔ سارے یورپ پر فسطائیت اپنا پنجہ مضبوط کر رہی تھی۔ ہر طرف ہٹلر کی گھڑ گھڑاہٹ آنے والی خوفناک جنگ عظیم کی منادی کر رہی تھی اور انسانیت پر وحشت و بربریت کا نرغہ تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ یہ کشمکش اور ہلچل محض سیاسی دنیا تک محدود نہ تھی۔ ادبیاتِ عالم کی تاریخ میں پہلی بار دنیا بھر کے ادیبوں اور شاعروں کا ایک اجتماع برائے تحفظ کلچر پیرس میں منعقد ہوا۔ اس کے دعوت دہندگان میں میکسیم گورکی تھا — روس کا وہ عظیم آرٹسٹ جس نے اپنی زندگی کی ناؤ گندے جوہڑوں اور طوفانی سمندروں میں کھیئی۔ اور جس نے دنیا کے ادب کو ایک نیا مزاج اور نئی زندگی عطا کی، رومان رولان تھا — "ارواح مسحور" کا شہرہ آفاق مصنف ہنری باربوسی تھا۔ فرانس کا وہ مجاہد جس نے پہلی جنگ عظیم میں لڑائی کی مرطوب اور اندھیری خندقوں سے تپ دق کا تحفہ پایا تھا اور جو اپنے زرد زرد دُبلے پتلے پیکر میں ایک شعلۂ جوالہ معلوم ہوتا تھا۔ یہی نہیں، مادرد اور غرناطہ کی فصیلوں پر رالف فاکس اور کرسٹوفر کاڈویل جیسے جواں سال اور جوان دماغ ادیب فسطائی درندوں کی گولیوں کا نشانہ بن کر امن اور جمہوریت کی قربان گاہ پر شہید ہو گئے۔ وہاں چین میں جاپانی درندوں نے ایک قیامت برپا کر رکھی تھی اور چین کے ترقی پسند ادیب جو اپنی بے باکی، حق پسندی اور ذہنی توانائی کے باعث پہلے خود اپنی قومی حکومت کا شکار رہ چکے تھے۔ اب جاپانی وحشیوں کی گولیاں اپنے سینوں پر روک رہے تھے۔

ہندوستان کا ادیب بھی ان حالات سے بے خبر نہ تھا۔ لندن کے ایک چھوٹے سے نیم روشن کمرے میں ملک راج آنند، سجاد ظہیر، ڈاکٹر تاثیر وغیرہ نے جو باتیں کی تھیں ان کی بازگشت ہندوستان میں بھی سنائی دی۔ اور پھر تو اس تحریک نے جسے ترقی پسند ادب کی تحریک کا نام دیا گیا گویا آگ سی پکڑ لی۔

یہ حالات تھے کہ سلام مچھلی شہری نمودار ہوئے۔ یو۔ پی کے ایک قصباتی متوسط گھرانے میں انہوں نے آنکھ کھولی اور فیض آباد تعلیم حاصل کرنے گئے۔ اسکے بعد [illegible] الہ آباد میں [illegible] انسانوں کی [illegible] امیروں کی رعونت، غیر ملکی حکومت [illegible] ایک حساس دل لیکر آئے تھے اس لئے ان سب کا اثر [illegible] نے آتے ہی کہا ؎

مجھے وہ نظم لکھنی ہے :—
کہ جس میں زہرہ و ناہید سب مستاں تو ہوں لیکن
کبھی مزدور کے اندوگیں رخسار بھی دیکھوں
ہزاروں رقص ہائے زندگی پنہاں تو ہوں لیکن
کبھی تلوار کی ہیبت فزا جھنکار بھی دیکھوں

مجھے وہ نظم لکھنی ہے :—
کہ جس میں موت کی تخئیل سے نفرت تو ہو لیکن
پیامِ زندگی کچھ حوصلہ ساماں بھی ہوتا ہو
بہار زندگی غیرت دہِ جنت تو ہو لیکن
غریب انسان اس جنت سے کچھ شاداں بھی ہوتا ہو

چنانچہ ان کی نظموں میں مزدور کے اندوگیں رخساروں کی تیتی ہوئی سرخی بھی تھی اور "تلوار کی ہیبت فزا جھنکار" بھی۔ ان کے تخئیل میں "موت سے نفرت" بھی تھی۔ اور "زندگی کی حوصلہ سامانی" بھی کانگریسی وزارتیں بھی آرٹسٹ کی زبان بندی میں ایک حد تک کمی آ گئی تھی۔ جہاں قدامت پرستوں میں ذمہ داری کا غلط احساس اور آرام طلبی پیدا ہو گئی تھی۔ وہیں نوجوانوں میں [illegible] آزادی، انقلاب اور اشتراکیت کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ سلام بھی ان کو لیکر سیاسی اور سماجی انقلاب کے گیت گاتے۔ اُس کی زندگی خود ایک پسی ہوئی [illegible] ہوئی زندگی تھی۔ اپنے چاروں طرف بھی اسے بلکتے سسکتے ہوئے انسانوں کا ایک جم غفیر نظر آیا۔ اس کی نظمیں نہ صرف ان سسکیوں کی ہم آہنگی [illegible] اُن میں بغاوت اور انقلاب کی للکار بھی تھی۔

دوسری جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا۔ ملک بھر میں بے چینی اور بد اعتمادی کی لہر دوڑ گئی۔ سلام کا پہلا مجموعہ زیر طبع پریس میں تھا۔ اس میں دو حصے تھے۔ "پھول" اور "انگارے"۔ "پھول" میں رومانی نظمیں تھیں — ایسی جن میں غنائیت تھی۔ حسن و عشق تھا۔ جذبات کی ہلچل تھی۔ احساس کی کسک تھی، سوز تھا۔ "انگارے" میں ترقی پسند رومانی نظموں کے علاوہ دیپک راگ میں گائے جانے والے ایسے گیت تھے جن سے آگ بھڑک اٹھنے کا لگی ہوئی آگ کے اور بھڑکنے کا اندیشہ تھا۔ پریس [illegible]

[illegible] اور اس طرح نہ رہے تھے کہ صحت ہی جو کچھ پیش ہوا اُس [illegible] کے فن کا شیرازہ بکھر گیا تھا۔ تاہم موجودہ صورت میں بھی جو کچھ ہے [illegible] ہم سلام کی اُدع کو دیکھ سکتے ہیں۔ جو لوگ سلام کو زبانی سن چکے ہیں یا اُسکے کلام کو مختلف اخبار و رسائل میں دیکھ چکے ہیں۔ وہ اس مجموعے کو دیکھکر ذرا مایوس سے ہوتے ہیں۔ اور اس مایوسی کے پردے میں بہت سے حاسد اور شک کرنے والے اپنے اپنے دلوں کی بھڑاس نکالتے ہیں۔ وہ سلام کے اس مجموعے کو بالکل نظر انداز کر دینا چاہتے ہیں۔ لیکن اس کی شاعری کے ارتقائی مدارج کو پیش نظر رکھنے کیلئے اِس مجموعے کی بعض نظمیں نہ صرف ضروری بلکہ ناگزیر ہیں۔

سلام اصلاً و جوہراً شباب و رومان کا شاعر ہے۔ وہ ادب برائے زندگی کا قائل ہے۔ دل رکھتا ہے اور آنکھیں بھی۔ اس لئے اپنے گرد و پیش سے الگ نہیں رہ سکتا۔ اُسکی زندگی اور اس کا ماحول سوختہ ہے۔ لیکن وہ سوز کو ساز سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ اپنی نظم "رنگین آنسو" میں کہتا ہے ؎

بے کھنڈر اور شاعرِ رنگیں خیال　　آ یہیں جنت بسا دوں اے سلام!
خونِ حسرت اور اک شاعر کا دل　　آ ذرا ہولی رچا دوں اے سلام!
بے بسی اور جبرئیلِ عقل و ہوش　　آ ستاروں کو بلا دوں اے سلام!
رات اور اک ناظرِ حسنِ جہاں　　آ کہ صبحِ نو دکھا دوں اے سلام!
آرزوئے موت اور اک نوجواں　　آ جوانی کو دعا دوں اے سلام!

وہ کرب کی چیخوں میں بھی طرب کے قہقہے پالیتا ہے۔ مصیبتوں اور تکلیفوں میں ہنسنا بڑے جیالے کا کام ہے۔ میں یہ تو پورے اعتماد کے ساتھ نہیں کہہ سکتا کہ سلام اپنی مصیبتوں پر قہقہے لگا سکتا ہے۔ لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ کم از کم میرے سامنے وہ اپنی مصیبت پر کبھی رویا نہیں۔ یہ بھی بڑی بات ہے۔

آج کل اکثر کم فہم کم علم انتہا پسند، جنکی انتہا پسندی حقیقتاً قدامت پرستی کی اساس و بنیاد پر قائم ہوئی ہے۔ ہر اُس شاعر اور ادیب کو ترقی پسندوں کی صفوں سے نکال دینا چاہتے ہیں جو مطلبی کی سی نظمیں نہ کہتا ہو اور ایسی نثر نہ لکھتا ہو۔ جس میں کسی نہ کسی نہج سے انقلاب، بغاوت، آگ کے الفاظ نہ آگئے ہوں۔ خواہ مضمون یا نظم کا موضوع اور تاثیر کتنا ہی ترقی پسندانہ کیوں نہ ہو۔ دوسری طرف کچھ لوگ ہیں جو بلا امتیاز ہر جدت پسند ادیب و شاعر کو ترقی پسند سمجھنے پر تلے ہوئے ہیں خواہ اُس کا طبعی رجحان کتنا ہی غیر ترقی پسندانہ اور بیمار قسم کی رومانیت کا حامل کیوں نہ ہو۔ دوسری قسم کے لوگ سلام کو ترقی پسند کہکر گالیاں دیتے ہیں اور پہلی قسم والے ایک مربیانہ اور بزرگانہ انداز سے فرماتے ہیں۔ شاعر اچھا ہے۔ ترقی پسندی کے جراثیم بھی رکھتا ہے۔ لیکن اکثر رومان کی خواب آور وادیوں میں گم ہو جایا کرتا ہے۔

بات یہ ہے کہ ترقی پسند ادب اور نئے ادب میں بڑا فرق ہے۔ لوگ اس نازک فرق کو نہیں سمجھتے۔ اور بغیر جانے بوجھے رائے قائم کر لیتے ہیں۔ سلام نے انقلاب کے گیت گائے ہیں۔ بغاوت کے نغمے الاپے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اُس نے ہنگامی تاثرات سے ہٹ کر حقیقت اور رومان کی سدا بہار کلیاں بھی کھلائی ہیں۔ ترقی پسندی اس سے نہیں جانچی جاتی۔ کہ کسی ادیب یا شاعر نے سیاسی انقلاب کے لئے کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ بلکہ ترقی پسندی نام ہے اس جہادی فکر و تخیل کا جو نہ صرف روایتی بندھنوں کے اثرات سے پاک ہو۔ بلکہ اپنے زمانے کے ماحولی تاثرات، نفسی تجربات اور اجتماعی تحریکات کی روشنی میں پروان چڑھا ہو، جس نے انسانی ذہن کو ایک نئی بصیرت عطا کی ہو۔ ہیئتِ اجتماعی کو ایک نیا مزاج دیا ہو۔ جس نے انسانیت کو ذہنی طور پر ایک قدم آگے بڑھایا ہو۔ اس اعتبار سے سلام نہ صرف ترقی پسند شاعر ہے، بلکہ ترقی پسندوں کی صفِ اوّل میں ہے۔

جیسا میں نے پہلے کہا سلام اصلاً و جوہراً شباب اور رومان کا شاعر ہے۔ وہ خود ایک سے زائد بار اپنے کو "شاعرِ رومان" اور "شاعرِ فطرت" کہہ چکا ہے۔ ایک جگہ اس نے شاید اپنے کو خیامِ وقت بھی کہا ہے۔ گو میں اس کا قائل نہیں۔ خیام کی فراری ذہنیت سے سلام کی حقیقت پسندی کو کوئی واسطہ نہیں۔ خیام کی نزاکتِ خیال تو اُس میں ہے لیکن زندگی کی تلخیوں سے بیزاری نہیں۔ وہ زندگی میں اس وجہ سے اور زیادہ دلچسپی لیتا ہے۔ کہ وہ چند روزہ ہے۔ اسی چند روزہ زندگی کو اسے دوام بخشنا ہے۔ اُس کی دنیا محض شراب و شباب کی یا صرف آہ و نالے کی دنیا نہیں ہے۔ وہ حیات کی حقیقتوں سے بھرپور ہے ؎

اس میں اُجڑے جنگل بھی ہیں اور حسیں نظارے بھی!
میرے دل کی رنگیں راتیں، میرے دل کے غمگین دن
جلوہ فگن ہیں داغ بھی اس میں روشن چاند ستارے بھی
چاہوں یہ آکاش سجا دوں چاہوں اُسکو پھونک بھی دوں
دوڑ رہی ہے برقِ تپش بھی، کھیل رہے ہیں تارے بھی
چاہے دیپک راگ سناؤں، چاہے چھیڑوں پریم کے گیت
دل میں دُکھ کے شعلے بھی ہیں، پہلو میں مہ پارے بھی
میری دُنیا کیسی دُنیا، کیا جانو اِس دُنیا کو
اس میں دُکھ کے آنسو بھی ہیں۔ اِس میں چاند ستارے بھی
(میری دُنیا)

اُس کی دُنیا میں "برقِ تپش" تو ہے لیکن ؎

یہ سمجھا ہے ہنستی ہوئی کلیوں سے   انہیں بھی تمہارا تبسم بنا دوں
(حوصلے)

اُس کا حوصلہ یہ ہے کہ ؎

تمہیں ساتھ لیکر یہ سوچا ہے میں نے   جہانِ طرب غیر فانی بنا دوں
(حوصلے)

جہانِ طرب غیر فانی تو کیا بنتا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ "تیرے نغمے" کے شاعر نے موسیقی کی ایک سنہری دنیا ضرور تخلیق کر لی جس میں حُسن کی ہر انگڑائی پہ عشق تڑپ تڑپ جاتا ہے۔ حُسن کی انگڑائیاں اور عشق کی تڑپ کیا کیفِ نشاط ہی کے دوزخ نہیں ہیں؟

سلام نے ایک سے زیادہ محبتیں کی ہیں۔ اُسے دیہات کی الھڑ دوشیزاؤں کی معصوم اداؤں نے بھی اپنی طرف کھینچا ہے اور شہروں کے کالجوں میں تعلیم پانیوالی رنگین تیتریوں سے بھی اُس نے دل لگایا ہے۔ محبت جو عشق کے درجہ تک پہنچی ہے حقیقتاً صرف ایک سے ہو سکتی ہے۔ لیکن دل ہر حسین شے کی طرف کھنچتا ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا سلام کو یہ حقیقی محبت جسے عشق کہا جا سکے ابھی تک میسر آئی یا نہیں لیکن اتنا معلوم ہے کہ حُسن نے مختلف اوقات اور مختلف روپوں میں اُسے اپنی طرف کھینچا اور شدت کے ساتھ کھینچا ہے۔ بھلا آپ ہی بتائیے گاؤں کی سہانی شام کو ہرے بھرے کھیتوں کے درمیان بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی پر ؎

کچھ اس طرح تھی خراماں حسینۂ معصوم
کہ جیسے حُسن کی ہر رسم و راہ سے محروم
کہ جیسے جلوہ کسی جلوہ گاہ سے محروم
کہ جیسے ایک جوانی گناہ سے محروم
(حسین تعارف)

تو کون کافر ہے جو اس سادگی اور حُسنِ ادا سے متاثر ہوئے بغیر رہ جائیگا ایسے مناظر اُسے اکثر نظر آتے ہیں ؎

پلاٹ بکھرے ہوئے ہیں مرے فسانوں کے
وہاں مسوری سے کچھ دور کوہساروں میں
وہاں، دیہات کے معصوم ماہ پاروں میں
وہاں، خموش مگر دل نشیں نظاروں میں

نوجوان شاعر ان تمام دل نشیں نظاروں سے مست ہوتا ہے۔ اُن سے اپنی نظموں کا مواد حاصل کرتا ہے لیکن یہ گلگوں نظارے سیمیا کی سی نمود ثابت ہوتے ہیں۔ اور شاعر کا ساز زیادہ تر سوز کی تانیں اُڑاتا ہے۔ مگر ایسی رسیلی تانیں جن میں

کلیوں کی آواز نہیں، درد کی کسک ہے۔ یہ [illegible] ہے لیکن یہ درد و غم جاودانی نہیں۔ یہ [illegible] پر [illegible] فاتح ظاہر ہوتا ہے۔ شاعر کا دل کچھ دیر تو اداس رہتا ہے لیکن پھر [illegible] کے دوسرے جھمیلوں میں اسے بالکل فراموش کر دیتا ہے۔ یہ غم اُسکے دل میں کوئی خلش نہیں پیدا کرتا۔ کسی ایسے درد کی تخلیق نہیں کرتا جو ہمیشہ تمہارا دل [illegible] کرے۔ اور اب وہ ایک ایسی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہوتا ہے جو [illegible] کو سہارا دینے پر آمادہ ہے لیکن جلد ہی یہ اُلفت بھی دھوکا ثابت ہوتی ہے اور "شروعِ محبت" کی ایک ایک بات یاد آ کر اُس کے دل کو رلا رلا کر تڑپاتی ہے۔ اُسے اس ہر زہ کار دوشیزہ سے سخت شکایت ہے۔ کہتا ہے کہ اگر محبت کے اس انجام پر تمہاری نظر پہلے ہی سے تھی تو بہتر تھا کہ ؎

شروعِ عشق کی تعبیر ز پہ ہنس ہنس کر   محبتوں کے شوالے کو ڈھا دیا ہوتا
جوابِ نگارشِ رنگیں سے دل اُلجھتا ہے   مرا پیامِ محبت جلا دیا ہوتا
داس جسارتِ تسلیم پر بوقتِ خرام   تبسموں سے مرا دل بڑھا دیا ہوتا
غرض کہ بھولے سے اپنے حسین خوابوں میں   اگر میں کھو ہی گیا تھا، جگا دیا ہوتا
(تلافیٔ خواب)

لڑکی ہوشیار ہے اور تجربہ کار ہے۔ چنانچہ کہتی ہے ؎

جب حُسن کو رُسوا کرنا ہے پھر حُسن کو دیوتا کیوں کہیئے
ان رنگیں رنگیں باتوں کو اک پریم کی پوجا کیوں کہیئے
میں نغمے شنکر آئی ہوں وہ چاہے جس کا نغمہ ہو
یا حُسن خصوصیت مجھکو پھر کرشن کی رادھا کیوں کہیئے
جلوے تو محبت والوں کو مشتاق بنایا کرتے ہیں
تکلیف ہو جس جلوے سے اُسے اک برقِ تجلا کیوں کہ[illegible]

معصوم شاعر کے پاس اسکا جواب سوائے دل پکڑ کے رہ جانے کے اور کیا [illegible] ابھی وہ اس محبت سے پورے طور پر پنپ نہیں پاتا کہ ایک دوسری لڑکی اُس [illegible] زندگی میں داخل ہوتی ہے۔ پچھلے تجربات نے اُسے ذرا محتاط سا بنا دیا ہے۔ [illegible] محبت کی خفگیاں اور جدائیاں بھی اُسے تکلیف پہنچاتی ہیں۔ لیکن ابھی تک محبو[illegible] سے بیوفائی سرزد نہیں ہوئی ہے۔ چنانچہ ایک روز بیٹھے بیٹھے [illegible]

کانٹوں کی وادی میں جانا، جس کے آگے جنت ہے
اک ٹھنڈی بجلی کا گرنا، جس سے دل کو راحت ہے
اک رنگیں ناگن کا ڈسنا، جس کا زہر ہی امرت ہے

ہاں یہ تو بتا دو اس کا ہی کیا پیارا نام محبت [illegible]

[illegible] دل کی تمنا جاتی ہے
ڈرتی ہے اور رکتی ہے، موجوں سے ٹکراتی ہے
سوطوفانوں سے لڑتی ہے پھر ساحل کو پاتی ہے
ہاں یہ بتا دو اس کا ہی کیا پیارا نام محبت ہے؟
یہ کاہش کی جھاڑی ہے، پھولوں کا گلدستہ ہے
یہ جامن کی ڈالی ہے، ساون کا اک جھولا ہے
پینگیں بڑھتی جاتی ہیں، دل ڈرتا ہے خوش ہوتا ہے
ہاں یہ بتادو اس کا ہی کیا پیارا نام محبت ہے؟
(محبت کے گیت)

"سو طوفانوں سے لڑتی ہے پھر ساحل کو پاتی ہے"۔ شاعر کو محبت کی کامیابی کی امید ہے۔ پینگیں بڑھتی جا رہی ہیں۔ وہ بیحد خوش ہے لیکن پچھلی محبت کے انجام سے ڈر بھی جاتا ہے۔ محبوبہ کا انداز ابھی تک بظاہر بیوفائی کا نہیں لیکن کج ادائی شروع ہو گئی ہے۔ حساس عاشق جانتا ہے کہ یہی کج ادائی بیوفائی کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اسکی محبوبہ کو اسکی صحبت میں وہ سرور و کیف نہیں حاصل ہوتا جو پہلے حاصل ہوتا تھا۔ وہ اب اس سے الگ الگ رہنا پسند کرتی ہے۔ جان کر اسکی راہ سے کترانے لگتی ہے۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس محبت کا انجام بھی پچھلے کی طرح ہو۔ یہ منحوس وقت آنے سے قبل ہی وہ سارا الزام اپنے سر لیکر محبت سے دست بردار ہوجاتا ہے پھر بھی اسکی باتوں میں طنز ہے۔ کہ افسوس اب صاحب دل نہیں لہجہ کہ میں اب محبت کے قابل نہیں ہوں۔ کہ میں لائق شان محفل نہیں ہوں۔ میرے پاس کچھ اور ثروت نہیں ہے۔ تکلف نہیں ہے۔ نفاست نہیں ہے۔ کوئی شے سوائے محبت نہیں ہے۔ تمہیں بزم رنگیں کی باتیں مبارک۔ یہ راحت کے دن اور راتیں مبارک مسرت کی یہ کائناتیں مبارک۔ قسم ہے بھلا دو مجھے اب بھلا دو یا اس کی گفتگو میں طنز ہے۔ تجاہل عارفانہ ہے۔ وہ جانتا ہے کہ وہ خود بہت جلد تمہیں بھلا دیگی۔ پھر بھی اپنے دل کو فریب دیتا ہے کہ خود ہی اس سے الگ ہو گیا۔ شاید درد کی ٹیسوں میں کمی آسکے۔ دل بیحد گھبراتا ہے۔ اس خیال کو خود فریبی سمجھئے یا کچھ بہرحال اس کے لئے سامان تسکین ضرور ہے کہ ؎

پڑھو گے شعر جب اک شاعر رومان فطرت کے
تمہیں ہم یاد آئینگے، تمہیں ہم یاد آئیں گے

اس محبت کی خلش شاعر کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ کہ ایک اور صاحبزادی کیف رنگ بنکر اسکی زندگی پر چھا جاتی ہیں۔ ان سے شاعر کی ملاقات کسی پارٹی یا قہوہ خانے میں ہوتی ہے۔ وہ دیکھتی ہیں کہ بیس بائیس سال کا ایک نوجوان ہے اچھی صحبت ہے، شاعر ہے۔ فسانے لکھتا ہے۔ ظاہر ہے نازوں کا پالا بھی ہوگا۔ دولت ثروت والا بھی ہوگا۔ اس کے تصورات کو سہارا دینے پر آمادہ ہوجاتی ہیں رنگین ملاقاتیں، جذبات میں گھلی ہوئی گفتگوئیں۔ عہد و پیمان سب ہی کچھ ہوتا ہے شاعر اپنے وطن آجاتا ہے۔ خط بھیجتا ہے۔ کچھ دن یہ سلسلہ رہتا ہے۔ پھر صاحبزادی کو معلوم ہوتا ہے کہ نہ وہ نازوں کا پالا ہے۔ نہ دولت ثروت والا ہے۔ وہ تو محض ایک حساس دل رکھنے والا شاعر ہے اور بس! وہ اس کے خطوط کا جواب نہیں دیتیں۔ اپنے اوپر افسوس کرتی ہیں کہ کیوں اس سے محبت کی بنا ڈالی۔ بھلا ایک غریب شاعر ان کے معیار زندگی کو کیسے پورا کر سکتا ہے؟ شاعر غریب اس سے پہلے بھی چوٹیں کھا چکا ہے۔ اب تو واقعی اس کا دل ٹوٹ گیا۔ کس حسرت سے کہتا ہے ؎

کچھ دن پہلے آپ مرے نغمات سے کھیلا کرتے تھے
بھولے سے اک شاعر کے جذبات سے کھیلا کرتے تھے
اب جب میں نے دکھ میں رنگیں نظمیں کہنا چھوڑ دیا
بیکس کا دل رکھنا کیسا، آپ نے بھی دل توڑ دیا

اچھی صحبت ہے، شاعر ہوں اور فسانے لکھتا ہوں
بیس برس کا ایک جواں ہوں، شوخ طبیعت رکھتا ہوں
آپ نے یہ سب سمجھا مجھکو اور مجھے مانوس کیا
اب جب میری حالت دیکھی، دل توڑا مایوس کیا

دولت ثروت عزت سے تو الفت کو کچھ کام نہیں
الفت کی افسردہ راتیں شادی کے ایام نہیں
آپ کو دولت سے الفت ہو۔ میں اس سے آگاہ نہیں
آپ کو غربت سے نفرت ہے، خیر مجھے پرواہ نہیں
آپ یونہی سرگرم خوشی ہوں اور طبیعت شاد رہے
اچھا اب خاموش ہوں چپ ہوں لیکن اتنا یاد رہے
مجھ کو آپ سے شکوہ ہے! مجھ کو آپ سے شکوہ ہے!!

سلام کی یہ حسرت آگیں نظم ایک شدید طنز ہے ان کالج زدہ لڑکیوں پر جو زندگی کو ایک "جادوگر کا خواب" یا "چمپئی رخساروں والی اک حسینہ کا شباب" سمجھتی ہیں اور جن کا مقصد زندگی صرف یہ ہوتا ہے کہ تیسرے درجے کے رومانی ناول

سلام اب تک نہیں ایک کامیاب عشق [illegible] اور
اس ماحول میں محبت کا استحکام اور اس کا پنپنا ذرا مشکل سی بات ہے۔ روایتی
جذبوں کے علاوہ نئی سرمایہ دارانہ تہذیب نے نئی نسلوں میں بھی جو رجحان پیدا
کر دیئے ہیں۔ جو ایک ذہین و توانا انسانیت کو پروان نہیں چڑھا سکتے۔ پہلے شاعروں
کا ہرجائی معشوق اب [illegible] کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ تاہم اکثر ایسا
بھی ہوتا ہے کہ دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی : سلام کے لئے کسی کے دل
میں آگ لگی ہوئی ہو یا نہ ہو۔ اس کے دل میں ایک دائمی آگ روشن ہے۔ ناکام محبت
نے جو انتہائی شدید حسرت اور مایوسی اس کے دل میں پیدا کر دی ہے، اسکے باوجود
اُمید کا ایک ہلکا سا دیا اب بھی روشن ہے۔ ایک بے نام آرزو، ایک انجان تمنا
جس کا نہ اور ہے نہ چھور۔ اسے اسکی اپنی خود غرضی کہئے یا جذبۂ شوق "بُرا ہی
کیا ہے"۔ نہ صرف اس کی نظموں بلکہ اُردو کی رومانی شاعری میں ایک لازوال شاہکار
ہے۔ اس ننھی سی سیدھی سادی نظم کو پڑھکر ہم اسی مبہم کیفیت اسی انجان سرشاری
سے دو چار ہوتے ہیں جو ٹیگور کی نظم "مسافر" پڑھکر ہم پر طاری ہوتی ہے ؎

سمجھ رہا ہوں کہ اب تم یہاں نہ آؤ گی
بُرا ہی کیا ہے اگر شمع پھر بھی جلتی ہو
تمہاری یاد میں کھوئی ہو راہ تکتی ہو

یہ جانتا ہوں مرا پھول نوچ ڈالا ہے
بُرا ہی کیا ہے جو آثار شوق ملتے ہوں
مرے چمن میں محبت کے پھول کھلتے ہوں

مجھے خبر ہے کہ تم لاپتہ ہو کھوئی ہو
بُرا ہی کیا ہے جو وعدے [illegible] نہ کروں
اُمید و شوق کو [illegible] نہ کروں

مجھے یقیں ہے مرا ساز کچھ فسردہ ہے
بُرا ہی کیا ہے اگر پھر بھی چھیڑتا ہی رہوں
لگا لگا کے نیا تار آرزو چھیڑتا ہی رہوں

یہیں سے کچھ ایسا بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاید سلام کو وہ محبت مل
چکی ہے جسے ہم عشق کہہ سکیں۔ سلام کا عشق دائمی، اس کے جذبات گہرے،
اس کا احساس تیکھا ہے۔

مناظر قدرت نے بھی سلام کو رجھایا ہے۔ اُسے نوخیز صبح کی انگڑائیوں
میں رقص شباب، شفق کی رعنائیوں میں رنگ شراب، سنہرے چاند کی پرچھائیوں

بعض نظمیں تو اصل [illegible] ہیں
ایک نئی بات جو [illegible]
جا رہی ہے۔ اختصار اور بلاغت ہے۔ آپ نے ایک بچے کی [illegible]
کے ایک بہت بڑے شاعر کا یہ لطف سنا ہوگا [illegible]
کی تلاش میں کتنی دور نکل گیا !؟" سلام کے یہاں یہ [illegible]
رعنائی خیال موجود ہے ؎

یہ صبح عید کی رعنائیاں اور میرے ہاتھوں میں
ابھی کی نیند میں کھوئی ہوئی ننھی بہن زہرہ
کہ جیسے بھیجتا ہوں آج میں فردوس والوں کو
بہت معصوم لیکن ایک بے گایا ہوا نغمہ

(بے گایا ہوا نغمہ)

"میرے نغمے" میں اسی انداز سے قریب ایک اور نظم ہے "شاعر [illegible] رنگ"
رعنائی خیال کی دو مثالیں ملاحظہ ہوں ؎

چاند کی نقرئی جبینوں سے — اک سمندر بہا کے لائے ہیں
جیسے کشتی کی سیر کرنے کو — عرش سے کام دیو آئے ہیں

(چاندنی)

تمہاری نرم و نازک چٹکیوں سے — چمن سے لے لیا تھا ایک غنچہ
جسے نازک لبوں سے چھو کے تم نے — یونہی معصومیت سے نوچ ڈالا
نہ سمجھا آہ مرے خوابوں کے مالک — ارے یہ تو مرا معصوم "دل" تھا

(دل)

"پگلا کا خط" اور "ملاح کی بیوی" عورت کے دل اور حسن کے [illegible]
جذبات کی پاکیزہ تصویریں ہیں۔

سلام کی طبیعت میں سادگی ہے جو [illegible] کبھی کبھی معصومیت
بھولے پن کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔ [illegible] وہ
کم سنی سے تعبیر کرتا ہے۔ [illegible] ہے۔ ایک
استفسار، ایک انجان خوشی، ایک [illegible]
اور معصوم نظروں کو دیکھتے ہی بھلا دیا جائے۔
تکنیک اور اسلوب کے [illegible]
کی قابل قدر جدتیں اور اضافہ کیا ہے۔ [illegible]
تک محدود ہے۔ اس لئے اس بحث کی [illegible]

دیکھتے دیکھتے خلاف توقع گانے لگتا ہے۔

ہیرو اور ہیروئن :۔ کچھ نہیں! میں کہہ رہا ہوں، کچھ نہیں
کچھ تو ہے! میں کہہ رہی ہوں، کچھ تو ہے

ہم ہنستے ہنستے پاگل ہو گئے۔ ریحانہ بولی۔ "بھئی ذرا ہنسنے دو پھر سنانا۔"

کچھ دن ہوئے شگفتہ نے نہایت پابندی سے نماز شروع کر دی تھی ایک دن نرگس بولی۔ "بھئی شگفتہ! کیا واقعی جنت میں جانے کی ٹھان لی ہے۔ اگر یہی ارادہ ہے تو جنت کے دروازے پر ہمیں نہ بھول جانا۔" شگفتہ نے نہایت بھولے پن سے جواب دیا۔ "بھئی اگر جنت کے سامنے پلیٹ فارم جیسی بھیڑ بھاڑ ہوئی تو تمہارا ہاتھ پکڑ کر جنت میں داخل ہو جاؤں گی، لیکن ......؟ سوچتے ہوئے بولی۔ "سنا ہے جنت کے دروازے پر تو ٹکٹ چیکر کی طرح ایک فرشتہ کھڑا رہتا ہے۔"

ایک روز ہم سب سہیلیاں بیٹھی گپ شپ اڑا رہی تھیں۔ میں شگفتہ سے بولی۔ "شگفتہ! تمہاری زندگی کا مقصد تو ہنسنے کھی کھی ہی ہی" رہا اور رہیگا"

تمہارا مطلب ہے میری زندگی کا مقصد "اوں اوں آں آں" ہونا چاہیئے تھا۔" شگفتہ نے مسکرا کر جواب دیا۔ میں کھسیانی ہو کر بولی۔

"خدا نہ کرے میرا مطلب یہ کیوں ہونے لگا۔ میں تو ایک بات کہہ رہی تھی۔"

"شگفتہ! انسان کو زندگی سے بیزار ہو کر رونا چاہیئے یا ہنسنا؟" ریحانہ نے سوال کیا۔ میں دل ہی دل میں مسکرا اٹھی کہ عجیب بے ڈھنگا سوال کیا ہے۔ شگفتہ ضرور مذاق اڑائے گی۔ لیکن شگفتہ نے کچھ دیر سوچ کر سنجیدگی سے جواب دیا۔ "ریحانہ میرے نزدیک تو رونا انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے ایک ذرا سی ناامیدی پر اپنے بلند عزائم مستقبل کے رنگین تصورات پانی کے قطرے میں بہا دینا کہاں کی عقلمندی ہے۔ یہ میرا تجربہ ہے کہ آنسو بہانے کے بعد انسان میں اتنی بھی سکت نہیں رہتی کہ اپنی ٹوٹی ہوئی امیدوں کو دوبارہ جوڑنے کا خیال بھی کرے۔ یقین مانو، میں نے آنسوؤں کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اور مجھے سچ سچ اس کی لرزش میں کتنے ہی رنگین تصورات کی جھلملاہٹ اور امیدوں کے ننھے ننھے ٹوٹے ہوئے آبگینے جھلکتے نظر آئے ہیں۔ تم نے کبھی غور کیا، آنسو آنکھ سے چھلک کر بھی جھلملاتا رہتا ہے۔ جیسے کہہ رہا ہو تم نے مجھے آنکھوں سے چھلکا کر کھو دیا۔ کاش تم مجھے ہمیشہ اپنی آنکھوں ہی میں جھلملانے دیتے"

میں نے اس سے پہلے شگفتہ کو اس قدر سنجیدہ کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی "میری نظر میں آنسو اتنا ہی قیمتی ہے جتنی کہ زندگی۔ ماضی کی ناکامیاں مستقبل کی نئی نئی امیدوں کی وابستگی نے میرے آنسو کو واقعی ایک روشن چراغ بنا دیا ہے۔ اس کی لرزتی ہوئی لو میں نئی نئی امیدیں جھلملاتی ہیں اور ماضی کی ناکامیوں کو تو اس نے اپنی اوٹ میں چھپا لیا ہے۔ میں قہقہوں کی دھندلی فضا میں سانس لیتی ہوں۔ اس لئے کہ سانس بھی تو بجائے خود ایک دھند ہے جو قہقہوں کے ساتھ فضا میں گھل مل جاتی ہے۔ اور یہ آنسو تو دھندلی فضا کو بھی جگمگا دیتا ہے۔"

اس روز نہ جانے کیوں شگفتہ اس قدر سنجیدہ نظر آ رہی تھی۔ اس دن پتہ چلا کہ یہ شریر شگفتہ اس قدر سنجیدگی سے بھی گفتگو کر سکتی ہے......

...... اس کے بعد شگفتہ نظر نہیں آئی۔ اور آج میں نے کیا سنا؟ میں چونک پڑی۔ میرے روشن تصور پر گہری دھند چھا گئی۔ کیا سچ مچ شگفتہ کے آنسو بجھ گئے ہونگے؟ کیا واقعی شگفتہ رو دی؟ اس گہری دھند میں ننھے ننھے موتی سے لرزنے لگے۔ پھر یہ موتی سمٹ گئے، اور ان کی جگہ ایک چراغ جھلملا رہا تھا۔ میں چونک پڑی۔ میں نے دیکھا، جیسے سچ مچ شگفتہ اس چراغ پر اپنے ہاتھوں کا سایہ کئے کھڑی ہے۔ اور چراغ ہوا کے تیز جھونکوں میں ٹمٹما رہا ہے، جیسے بہت جلد بجھ جائیگا۔ شگفتہ گھبرا گھبرا کر اسے ہوا سے بچا رہی ہے۔ آخر مایوس ہو کر ہاتھ ہٹا لئے۔ اسکی آنکھیں جھلملا رہی تھیں۔ اس کی شاداب آنکھوں میں دو موٹے موٹے آنسو لرز رہے تھے۔ چراغ بجھ گیا اور آنسو چھلک کر تاریکی میں بجھ گئے۔ میں چونک پڑی۔ میری آنکھوں سے غبار ہٹ گیا۔ میرا تصور اجالے میں کھو گیا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے یہ اجالا شگفتہ کے آنسوؤں کا ہے۔ جیسے ساری کائنات پر ننھے ننھے چراغ جھلملا کر بجھ گئے۔ اور میں صرف اتنا کہہ سکی "یہ آنسو"۔

[illegible]

کرتا ہے ہندوستان کی سیاست میں اپنا ہے۔ ایسی باتیں جو اُدب کے کسی شعبہ اور ہمارے ہیں واقف ہوتی۔ لیکن ان سب چیزوں کو دیکھئے اور حقیقتاً سلام کے ترقی یافتہ ان کو دیکھنے کیلئے ہمیں "دسنیں" کا انتظار کرنا ہے۔

میں نے دیر تک آپ کی "سمع خراشی" یا "نظر خراشی" کی۔ اب سلام کے طور کے ان ملفوظ اشعار سنا کر آپ سے رخصت ہوتا ہوں ؎

ہم نے مرا جو جان تصوّر بنا نہ دوں	میرے تصورات کو کچھ آسرا تو دو

یہ عالمِ تنہائی، یہ محویتِ دلکش	جیسے کہ تصور میں تم سامنے آتے ہو

غم حیات کی پیہم نوازشوں کے نثار	کہ دوستوں کی محبت سے جھینپ جاتا ہوں

مغنی سے!

از جناب آسد سیمابی

مطربِ رنگیں نوا اُٹھ سازِ دردِ قوم چھیڑ!

گلشنِ ہندوستاں میں آچکی فصلِ خزاں	اُڑ گئیں مدت ہوئی گلشن سے رنگیں تتلیاں
خواجگی کے ہاتھ میں نخچیر ہے مزدور آج	بن چکا ہے نفسِ منعم حرص سے تنّور آج
اژدہے زرداریوں کے اپنے منہ کھولے ہوئے	لختِ دل ہواؤں کے سہمے ہوئے ڈولے ہوئے
آندھیاں سرمایہ داروں کے ستم کی آگئیں	اور فضائے بیکسی پر گرد بن کر چھا گئیں
ظلم کے بادل گرج کر چھا گئے چاروں طرف	ابتلا کے سرخ طوفاں آگئے چاروں طرف
اک قیامت ہے غریبوں کی پکاروں کا ہجوم	ڈوبنے لگتے ہیں پچھلی رات کو جن سے نجوم
کشتۂ آلام تیری قوم ہے اے خوشنوا!	اور تو محوِ طرب واحسرتا! واحسرتا!!
تیرا نغمہ درس اور پیغام کا حامل نہیں	دل ترا بیدرد ہے، یا اور کچھ ہے دل نہیں
تو اگر فن کار ہے یوں چھیڑ اپنے ساز کو	بختِ خفتہ جاگ اُٹھے سُن کر تری آواز کو
ہو اسیرِ منزلِ انقلاب تیری آہ پر!	راہ سے بھٹکے ہوئے آجائیں اپنی راہ پر
از سرِ نو پھر ترے گلشن میں آجائے بہار	مدتوں کی بےقراری کو ملے صبر و قرار
نغمے آزادی کے گائیں تیری ہر اک تان پر	برچھیاں کھا کر جواں دیں جان اپنی آن پر

مطربِ رنگیں نوا یوں سازِ دردِ قوم چھیڑ!

میں کیوں اکتا جاتا ہوں؟
میری مشکل کشائی کیجئے!

علم دوست: ڈاکٹر صاحب! معاف کیجئے گا میں کل نہیں آسکا۔ سمجھتا تو تھا کہ آپ انتظار کریں گے۔ مگر آپ تو جانتے ہی ہیں میرا جیسا کچھ حال رہتا ہے۔ سوچتا ہوں کہ اب کہیں وقت پر آنے جانے کا وعدہ بھی کبھی کسی سے نہ کروں۔

ڈاکٹر صاحب: خیر غنیمت ہے۔ آپ آ تو گئے۔ اب تو آپ کو تھوڑا تھوڑا سمجھ چلا ہوں۔ آپ کے لئے وعدہ کرکے نہ آنا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ افسوس صرف اتنا ہی ہے کہ کل چند اور دوستوں کو آپ ہی کی خاطر بلایا تھا۔ آپ کی تعریف بھی اُن سے کردی تھی۔ سبھی کو آپ جیسے صاحب ذوق سے ملاقات اور بات چیت کا شوق تھا۔ اُنہیں بھی مایوسی ہوئی۔

علم دوست: بات اصل یہ ہے کہ میرا من اب کسی بھی بات میں نہیں لگتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرا جی زندگی اور دُنیا دونوں ہی سے بالکل اُکتا گیا ہو۔ اور آج میں آپ کے پاس لٹریچر اور آرٹ پر نہیں بلکہ کچھ اپنے ہی بارے میں بات چیت کرنے آیا ہوں۔ آپ psychologist ہیں۔ کچھ بتلایئے۔ آخر مجھے یہ کیا اور کیوں ہو گیا ہے۔ اور اس کا کوئی علاج بھی ہے یا نہیں؟ وہی روز روز بستر سے اُٹھنا۔ چائے اور اخبار۔ نہانا دھونا اور کھانا۔ وہی گھر گرہستی کے دھندے۔ وہی ناول اور کتابیں۔ وہی کلب کی دوڑ۔ یار دوستوں کی وہی گپ، اور پھر رات کو سو جانا۔ میں تو اب اس سب سے تنگ آگیا ہوں۔ اور آخر آدمی پڑھے بھی کہاں تک۔ اب تو میرا پڑھنے کو بھی جی نہیں چاہتا۔ کیا رکھا ہے ان سب فضولیات میں۔ مجھے تو اب نہ زندہ رہنے میں کوئی مزہ ہے اور نہ کسی کام میں دلچسپی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کروں کیا؟ ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر صاحب: صاحب اس قدر پریشان ہونے کی تو کوئی بات نہیں۔ یہ تکلیف کچھ آپ ہی کو نہیں۔ بلکہ فرصت پیشہ طبقے کے سارے انسانوں کو ہے۔ میرا مطلب آج کل کے پڑھے لکھے آرام پسند اور فرصت رکھنے والے سارے علم دوستوں سے ہے۔ یہ اُکتاہٹ کی دماغی حالت انسانوں کی ایک خاص بیماری ہے۔ جانوروں کو خواہ کچھ بھی اور تکلیف کیوں نہ ہو زندگی سے اُکتاہٹ کبھی نہیں ہوتی۔ وجہ یہ ہے کہ جانوروں کا دماغ ہر وقت کسی نہ کسی ضروری کام میں مشغول رہتا ہے۔ کبھی بھوک مٹانے کے لئے کھانے کی تلاش ہو رہی ہے تو کبھی بچوں کی پرورش کا انتظام۔ کبھی دشمن کے خوف سے بھاگے جا رہے ہیں۔ تو کبھی کسی چھوٹے جانور پر حملہ کرنے کی تیاری ہو رہی ہے۔ بہرحال ہر وقت انہیں کسی نہ کسی قسم کی مصروفیت رہتی ہے۔ انسانوں میں یہ بات نہیں ہے۔ سائنس کی ترقی اور معاشرتی زندگی نے بہت سے انسانوں کو آج بے انتہا فرصت بخش دی ہے۔ جس کی وجہ سے انسان کی دماغی قوتوں کو مکمل مصروفیت نہیں ملتی۔ اور ٹھیک ایسی ہی حالت میں انسان اُکتایا ہوا سا محسوس کرتا ہے۔ اور اُس کو ہیجانوں کی تلاش ہونے لگتی ہے۔ آج کل کے علم دوست کی معمولی ضروریات چند گھنٹوں کے کام سے حاصل ہو جاتی ہیں۔ آخر دن رات کے ایک بہت بڑے بچے ہوئے وقت میں کیا کیا جائے۔ ابتداء میں دماغ ایک بڑے Exciting event کے تصور میں مشغول ہو جاتا ہے جو کبھی بھی عمل میں نہیں آتا۔ اور آپ کا بچہ بیمار ہو یا آپ کے کپڑوں میں سگریٹ سے آگ لگ گئی ہو۔ یا آپ کو جلدی میں ریل پکڑنا ہو تو یہ واقعات پریشان کرنے والے یا تکلیف دہ ضرور ہو سکتے ہیں۔ مگر اُن سے اُکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی۔ کیونکہ اُن کے مقابلہ کرنے میں آپ کی دماغی قوتیں یکایک مصروف ہو جاتی ہیں لہٰذا آپ کی یہ تکلیف دراصل فرصت کی تکلیف ہے۔

علم دوست: ڈاکٹر صاحب! یہ تو آپ کا کہنا بجا ہے۔ مگر میں تو اکثر مصروف ہی رہتا ہوں۔ پڑھنے کی دُھن رہتی ہے۔ اور نئی کتابوں کا شوق۔ زندگی کے مختلف صیغوں پر دُنیا کے مشہور لوگوں کی رائے کو جلد سے جلد جاننے کی کوشش رکھتا ہوں۔ اس بات کی فکر میں رہتا

میں کسی نئی کتاب کا ذکر یار دوستوں میں سب سے پہلے میں ہی کرتا ہوں لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں جی اُچاٹ سا ہی رہتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب:۔ ہاں! ٹھیک ہے۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی آپ اُکتاہٹ سے محسوس کرسکتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دراصل مصروفیت اور دلچسپی کی بھی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک نظری اور ایک عملی۔ اول قسم کے علم کو انسانی دماغ محض ایک لبادہ کے طور پر اپنے اوپر پہن لیتا ہے انسان کی فطرت کے اوپر اس کا کوئی گہرا یا اندرونی اثر نہیں ہوتا۔ اس طرح علم کا مزا بھی آدمی کو کم ہی ملتا ہے۔ دل و دماغ کشادہ نہیں ہوتے۔ اُکتاہٹ کو نزدیک آنے سے روکنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنی ہر سرگرمی کا لطف اُٹھائے۔ اور لطف بھی اسی مصروفیت میں ملتا ہے جس میں کہ انسان تن دہی سے لگا ہو۔ آج کل کے علم دوست دوسروں کے دیئے ہوئے خیالات کو اپنے اوپر اوڑھ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ لوگ ہر قسم کی بھاگ دوڑ کو ناپسند کرتے ہیں۔ ان کو ہم "دماغی کاہل" کے نام سے پکار سکتے ہیں۔ یہ زندگی کا پورا لطف کبھی نہیں اُٹھا سکتے۔ لہٰذا اُکتاہٹ کا علاج دراصل عمل ہے۔ بجائے اس کے کہ آپ دوسروں کے خیالات اور رائے سے اپنے دماغ کو بوجھل کریں آپ کو چاہیئے کہ آپ خود آزادانہ طور سے زندگی کے مسئلوں پر اپنے آپ سوچ بچار کریں۔ یہ تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ یہ شکایت جسمانی کام کرنے والوں اور کم پڑھے لکھے آدمیوں میں نہیں ہوتی۔ اول تو جیسا میں کہہ چکا ہوں بات فرصت کی ہے۔ ایسے لوگوں کو فرصت ہی نہیں ہوتی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ہر جسمانی کام کرنے والا اپنے کام سے لطف اُٹھاتا ہے۔ اگر آپ اپنے باغ میں ہری گھاس کی "لان" اور پھولوں کی کیاریوں پر کام کرتے ہیں تو زمین کو خوبصورت بنانے اور پھولوں کی نشو و نما میں نہ صرف آپ کو دلچسپی ہی ہوتی ہے۔ بلکہ آپ اس کا لطف بھی اُٹھاتے ہیں۔ مصوروں، سنگتراشوں یا لکڑی پر نقش و نگار کرنے والوں کو اپنے کام سے تسکین اور لطف حاصل ہوتا رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کو اُکتاہٹ نہیں ہوتی۔ جو علم دوست بجائے پڑھتے رہنے کے خود لکھتے بھی ہیں اُن کو بھی اُکتاہٹ لازماً کم ہوگی۔ کیونکہ لکھنا ایک تخلیقی کام ہے۔ ہر انسان کو اپنے ذاتی کئے ہوئے کام کی عملی پر فخر اور خوشی ہوتی ہے۔ جو کہ اُس کو اُکتاہٹ سے ہمیشہ بچاتی رہتی ہے۔

علم دوست:۔ اچھا یہ تو میں سمجھ گیا لیکن یہ تو بتایئے کہ جو لوگ جسمانی کام نہیں کرتے یا اُس کے عادی نہیں ہیں۔ اور جن میں تخلیقی کام کرنے کی دماغی قابلیت بھی نہیں ہے اور وہ معمولی پڑھے لکھے اور معمولی قابلیت کے آدمی ہیں اور اُن کے پاس بدقسمتی سے فرصت بھی ہے۔ آخر یہ لوگ اپنے کو اس مہلک بیماری سے کیونکر بچا سکتے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب:۔ ہاں۔ یہ سوال آپ نے بہت ٹھیک کیا۔ اسکا جواب یہ ہے کہ ہر ایک اوسط درجے کا سمجھدار آدمی اپنی دلچسپیوں کو ایک بہت بڑی حد تک بڑھا سکتا ہے۔ دنیا دلفریبی اور دلچسپیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اور انسان کیلئے علم و ہنر کے ہر صیغہ میں بے انتہا ترقی کی گنجائش رہتی ہے۔ وہ لوگ کتنے بدنصیب ہیں جو کہ محض اپنی دماغی سستی کی وجہ سے دنیا کے لطف سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہر شخص علم ریاضی میں نیوٹن کی برابری نہیں کرسکتا۔ یا علم موسیقی میں Beethauan یا تان سین کی علم ادب میں شیکسپیئر اور کالی داس کی یا کھیل کود میں ہر شخص رام موتی نہیں ہوسکتا لیکن پھر بھی ہر شخص اپنی دماغی قابلیت کے مطابق اپنے کو موجودہ حالت سے بہتر بنانے کی کوشش ضرور کرسکتا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ انسان اپنی سماجی دلچسپیوں اور ہمدردیوں کو بھی اس قدر بڑھا سکتا ہے کہ اُس کا دل لگا رہے۔ سوسائٹی ہمیشہ دل سے کام کرنے والوں کی خدمت کی محتاج رہتی ہے۔ اور اس لئے آدمی بہت حد تک اپنا وقت پبلک دلچسپیوں میں اُکتائے بغیر صرف کرسکتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ خوش رہنے کیلئے ہر انسان کے پاس کوئی نہ کوئی دلچسپی ہونی چاہیئے۔ جس میں کہ وہ شوقیہ لگا رہے فی زمانہ دلچسپیوں کی کمی نہیں۔ آپ اپنے مذاق کے مطابق سینکڑوں دلچسپیوں میں سے کسی ایک کو پسند کرسکتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے ذہنی اُفق یا Mental Horizon کو وسیع اور اپنی سماجی دلچسپیوں کو بڑھا سکتا ہے۔ اور یہ بات ہمیشہ اُس کو Bordom سے بچاتی رہے گی۔

علم دوست:۔ لیکن ڈاکٹر صاحب! میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ بجائے ان ترکیبوں کے زیادہ لوگ اُکتاہٹ کو مٹانے کیلئے شراب یا اس طرح کے کسی اور نشہ کا ہی سہارا لیتے ہیں۔ کیا شراب پینا اور جوا کھیلنا اُکتاہٹ کا علاج نہیں ہے؟

ابھی ابھی آپ نے فرمایا تھا کہ اکتاہٹ ہیجانوں کے تھوڑے ہونے سے ہوتی ہے۔ اور اس میں تو شک نہیں کہ جوئے کے داؤں میں یا شراب کے نشہ میں ہیجان ہوتا ہے تاش یا کسی اور کھیل کو شرط لگا کر کھیلنے میں اکتاہٹ پاس نہیں پھٹکتی۔

ڈاکٹر صاحب:۔ بھئی واہ! اگر یہی بات تھی تو آپ نے اکتاہٹ کی شکایت ہی کیوں کی تھی۔ آپ کے پاس تو خود ہی علاج موجود ہے۔ کھیلئے تاش پھر تاش۔

علم دوست:۔ نہیں۔ نہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ علاج ہے بھی اور نہیں بھی۔ کچھ ٹھیک سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔

ڈاکٹر صاحب:۔ بھئی یہ تو آپ کا کہنا ٹھیک ہے کہ زیادہ تر لوگ زندگی سے بیزاری کا علاج شراب اور جوئے میں تلاش کرتے ہیں مگر وہ غلطی پر ہیں اور ان کی زندگی خود اس غلطی کا ثبوت ہے۔ یہ مرض کا علاج کرنا نہ ہوا بلکہ مرض کے خیال سے تھوڑی دیر کیلئے بھاگنا ہوا۔ شراب میں سب سے بڑا عیب یہ ہے کہ کبھی نہ کبھی اس کا نشہ اُتر جاتا ہے۔ اور کوئی شراب کا پینے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ زندگی بھر اس طرح سے مسلسل شراب پیتا جائے کہ نشہ اُترنے سے پہلے ہی دوسرا پیالہ بھی پی لے۔ اور یہ سلسلہ دن رات اور عمر بھر جاری رہے اور چونکہ نشہ کے اُترنے اور نشہ کے دوبارہ لانے میں وقفہ لازمی ہوگا۔ اس لئے اکثر شراب پینے والوں کی اکتاہٹ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ اور وہ اُسکو بالکل ہی برداشت نہیں کر پاتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ شراب کے غلام ہو جاتے ہیں اور اپنی زندگی تباہ کر بیٹھتے ہیں۔ یہی حال جوئے کا بھی ہے۔ آپ نے ہارے ہوئے جواری کی دماغی کیفیت شاید کبھی دیکھی ہو۔ جوئے میں ہار نہ جانے اسکی گارنٹی نہیں ہو سکتی کیونکہ اسکے بغیر جوا جوا ہی نہ رہ جائیگا۔ لہٰذا سب سے بہتر ترکیب یہ ہے کہ نہ تو اکتاہٹ سے بھاگا ہی جائے اور نہ شراب یا جوئے کا سہارا لیکر اُسے بھلانے کی کوشش کی جائے بلکہ اُسکا مقابلہ کیا جائے۔ کیونکہ کسی تکلیف کا علاج اُسکی وجہ کو سمجھ ہی کے کیا جا سکتا ہے نہ کہ اُسے بھلا دیکر۔ اور یہ دماغی تکلیف تو کئی معنوں میں جسمانی تکلیف سے بھی بڑی ہے کیونکہ دماغ اور من کا انسان کی خوشی سے سیدھا تعلق ہے اور اکتاہٹ خوشی اور راحت کا دشمن ہے اکثر ایسے لوگ زندگی سے بھی لاپرواہ ہو جاتے ہیں اور دن رات اپنے اوپر ترس کھایا کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ وہ تکلیف کا ٹھیک علاج نہیں کر رہے ہیں۔

علم دوست:۔ لیکن ڈاکٹر صاحب! یہ تو میں آپ کی بات سب مان گیا۔ مگر پھر بھی زندگی میں کچھ نہ کچھ تو جوش طوفان اور چڑھاؤ اُتار کی کیفیت ہونی ہی چاہیئے اس کے بغیر [illegible] تو کوئی چیز ہے۔ [illegible] ہے۔ جہاں یکسانی ہو وہاں اکتاہٹ ضرور ہی ہوگی اور یہ تو آپکی باتوں [illegible] ایک بہت بڑا حصہ یکسانی میں لازمی طور سے گزرتا ہے۔ آپکے ان سارے علاج کے بعد بھی یکسانی کی تکلیف تو باقی رہتی ہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب:۔ دیکھئے آپ ابھی تک ایک بیمار کے نقطہ نظر سے بات کرتے ہیں ابھی آپ کو ہیجان کی ایک غیر معمولی بھوک باقی ہے اور یہ حالت اچھی تندرستی کی نہیں ہے۔ ہیجان کی مثال زندگی میں ایسی ہے جیسی کھانے میں مرچ اور نمک کے استعمال کے ہے۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ ان چیزوں کا اس قدر استعمال کیا جائے کہ لوگ عادی ہو جائیں اور پھر ان کا اُس کے بغیر پیٹ ہی نہ بھرے دیکھئے! تھوڑی بہت اکتاہٹ یکسانی زندگی کیلئے لازمی اور ضروری ہے اس سے بھاگا نہیں جا سکتا۔ روزانہ کی زندگی یا دفتر کا کام قریب قریب ہر روز ایک جیسا ہی لازمی طور سے ہوگا۔ اور اسکی شکایت کرنا ہی بیکار ہے۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ بچوں اور بڑوں دونوں کو اس بات کی تعلیم دی جائے کہ وہ زندگی کی ضروری اکتاہٹ کو بخوشی برداشت کر سکیں۔ اگر ایک طرح سے دیکھا جائے تو اصلی خوشی ہیجان میں نہیں بلکہ سکون میں ہے جرمن فلاسفر Kant کی زندگی کو ہی لیجئے کس قدر یکساں اور شانتی کی زندگی تھی۔ اُسکی زندگی میں نہ کبھی طوفان آئے اور آندھی۔ وہ ہمیشہ خوش اور تندرست رہا۔ اور اپنی فلاسفی کی بنا پر دنیا میں ہمیشہ کیلئے اپنا نام زندہ کر گیا سچ مچ کچھ اکتاہٹ اور یکسانی برداشت کئے بغیر کوئی بھی آدمی تو دنیا میں کوئی بڑا کام نہیں کر سکتا۔ مثال کے طور پر آپ دنیا میں کوئی بھی بڑی اور مشہور کتاب کو لے لیجئے کیسی بھی اچھی ناول میں چار صفحے ایسے ضرور ہونگے جو آپ کو پھیکے لگیں گے یا جن سے اکتا جائینگے۔ Paradise Lost یا Milton کی Faust کو پڑھئے وہاں بھی یہی کیفیت ملیگی۔ برخلاف اسکے آپکو بہت سی کتابیں اور ناول ایسی بھی ملیں گی جو کہ شروع سے آخر تک سنسنی سے بھرپور ہونگے۔ اور جن میں ایک صفحہ بھی اکتاہٹ پیدا کرنیوالا نہ ہوگا۔ مگر یہ کتابیں دنیا کی بہترین کتابیں شاید نہ ہونگی۔ لہٰذا یکسانی زندگی میں شامل اور لازمی ہے۔ اور کسی سمجھدار آدمی کو اس سے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں ہر اسے برداشت کرنا ہر اچھے سمجھدار آدمی کی پہچان ہے۔

علم دوست:۔ اچھا ڈاکٹر صاحب! آپکی بہت کچھ بات آج میری سمجھ میں آگئی۔ میں کوشش کرونگا کہ زندگی سے اب زیادہ دلچسپی لیا کروں۔ مگر اس موضوع پر آپ سے پھر کبھی تھوڑی اور بات چیت ہوگی

(منشر از نشرگاہ دہلی)

ہندستان میں میں نے کیا دیکھا

ایک انگریز کا اردو زبان میں بیان

سنہ ۲۰ء کا ذکر ہے میں چلتنہم (Chiltenham) میں اپنے سکول کی طرف سے کرکٹ کا میچ کھیل رہا تھا۔ ہر طرف پر جوش تماشائی کھڑے تھے۔ جن میں سے اکثر چلتنہم کالج ہی میں پڑھتے تھے۔ ہماری ٹیم کھلا رہی تھی اور ہم پوری کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح چلتنہم کے آخری دو چار کھلاڑی آؤٹ کرلیں۔ اور ہم میچ جیت لیں۔ لیکن ایک چھوٹا سا لڑکا آؤٹ نہیں ہوتا تھا۔ اس کا کھیل نہایت ہی خوبصورت تھا۔ اور وہ بے تکلفی سے رن کئے جاتا تھا۔ بہت ہی چھوٹا سا پتلا سا لڑکا تھا۔ کوئی پندرہ برس کی عمر ہوگی۔ اسکا نام دلیپ سنگھ جی تھا۔ بعد میں اپنے چچا کی طرح دلیپ سنگھ جی دنیا کے مشہور کھلاڑیوں میں شمار ہونے لگا۔ ہندستان سے یہ میرا پہلا تعارف تھا۔ اس وقت بھی جب مجھے زندگی اور بہت سی باتیں بھول چکی ہونگی۔ اس چھوٹے سے لڑکے کا کھیل مجھے یاد رہے گا۔

تین سال بعد میں آکسفورڈ یونیورسٹی میں داخل ہوا اور وہاں چار سال تک ایک ہندستانی سے میری گہری دوستی رہی۔ اس کا نام این سی۔ باکھلے تھا۔ تعلیم ختم کرنے کے بعد وہ آئی، سی، ایس ہوا۔ ۳۵ء میں جب وہ سیالکوٹ کے ڈپٹی کمشنر تھے تو ان کا اچانک انتقال ہوگیا۔ ابھی ہندستان کو ان کی بہت ضرورت تھی۔ وہ بہت قابل اور بہت پیارے انسان تھے۔ جنہیں اپنے ملک سے گہری محبت تھی۔ میرے کالج میں صرف وہ ایک ہندستانی تھے۔ اس لئے انکی صرف انگریزوں ہی سے میل ملاقات تھی۔ لیکن وہ ان میں سے نہیں تھے جو ولیتی سوسائٹی میں اپنی قومیت کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ نہایت خاموشی سے ہمارے لئے ہندستان کی ترجمانی کرتے تھے اور اسکی وجہ سے ہم ان سے اور انکے ملک دونوں سے محبت کرنے لگے۔

تو ہندستان کے متعلق میرے پہلے تجربات خاصے خوشگوار تھے۔ اس لئے مجھے یہ محسوس نہیں ہوا تھا کہ میں کسی اجنبی ملک میں جا رہا ہوں۔

آئی۔ سی۔ ایس کا امتحان پاس کرنے کے بعد اور ہندستان کو روانہ ہونے سے پہلے میری شادی ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں میری بیوی کے چچا سی، پی کے گورنر تھے۔ پس جب ہم نومبر ۲۸ء میں بمبئی اترے تو ہمیں اس بات کی خوشی تھی کہ اپنی نوکری پر جانے سے پہلے کچھ دنوں کے لئے جبل پور ٹھیریں گے۔ راستہ میں ہندستان کے لوگوں کی غربت اور مفلسی پہلی مرتبہ دکھائی دی۔ لیکن جب ہم جبل پور پہنچے تو ہمیں چھاؤنی کے کرکٹ ہاؤس میں ٹھیرایا گیا۔ جو خاص طور سے گورنر کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ جب بھی ہمیں گورنر صاحب سے گفتگو کرنے کا موقعہ ملتا۔ تو ہمیں محسوس ہوتا کہ ان کی ذمہ داریاں کتنی ہیں اور انہیں سی، پی کے غریب کسانوں سے کس قدر ہمدردی ہے۔ لیکن ہمیں سیر و تفریح سے کام تھا۔ اور ہندستان کے متعلق کچھ سوچنے کی کم ہی فرصت ملتی تھی۔ مجھے آئے ہوئے ابھی چار ہی دن ہوئے تھے کہ خوش قسمتی سے میں نے ایک شیر کا شکار کیا۔ شکار کی ایک بڑی پارٹی تھی۔ مجھے ایک دونالی بندوق سمیت ایک مچان پر بٹھا دیا گیا۔ اور مجھے کچھ پتہ ہی نہیں تھا کہ مجھے کرنا کیا ہے۔ صرف اتنا پتہ تھا) کہ اگر کوئی شیر میرے اور ہانکنے والوں کے درمیان آنکلے تو مجھے اس وقت تک فیر نہیں کرنا چاہیئے۔ جب تک کہ مجھے اپنے نشانے پر پورا یقین نہ ہو۔ دیر تک دور سے ہانکنے والوں کی آوازیں آتی رہیں اور جب ہانکنے والے قریب آگئے تو دیکھتا کیا ہوں کہ میرے مچان سے کوئی سا ٹھ گز کے فاصلہ پر ایک شیر دوسری طرف کو تیزی سے بھاگا جا رہا ہے۔ میں نے اپنی بندوق اٹھائی اور فیر کردیا۔ میری حیرانی کا آپ اندازہ نہیں کرسکتے جب میں نے دیکھا کہ شیر مرا پڑا ہے۔ میرے دوست جو برسوں سے اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں کہ کوئی شیر ان کے ہاتھ لگ جائے۔ میری اس کامیابی کو ابھی تک معاف نہیں کرسکتے۔

اگلے پانچ مہینے میں اپنی نوکری پر فیروز پور میں رہا۔ اس زمانے میں میں نے بہت سی نئی باتیں سیکھیں۔ مثلاً میں نے آکسفورڈ میں جو تھوڑی بہت اردو سیکھی تھی۔ اس کے بل پر میں فارسی رسم الخط میں لکھ پڑھ سکتا تھا لیکن جب میں ہندستان پہنچا تو ایک سیدھا فقرہ مشکل ہی سے بول سکتا تھا اور اپنے نوکروں کی ملی جلی پنجابی اردو سمجھنے میں اور بھی دقت ہوتی تھی۔ مجھے اپنا پہلا ملاقاتی اب تک یاد ہے۔ وہ پنجرے میں ایک تیتر لیکر آیا تھا جو وہ مجھے پیش کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یاد تھا کہ مجھے کوئی تحفہ قبول نہیں کرنا چاہیئے۔

سے مسٹر جی۔ ڈی۔ پی۔ ایل

لیکن مجھ میں نہیں آتا شکار انکار کیسے کیا جائے۔ نوکری نہیں مل رہا تھا۔ اُس شخص نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ ذیلدار بننا چاہتا ہے۔ احساس نے مجھ سے ملنے آیا ہے۔ میں نے بہت ہی آسان سیدھے طریقے سے یہ بتانے کی کوشش کی کہ میرا جیل کے محکمے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اور وہ بیچارا مایوس ہو کر چلا گیا۔ دو دن کے بعد پتہ چلا کہ اس کا مطلب کیا تھا۔ میں ڈپٹی کمشنر (Hearn Sahib) ہرن صاحب کی عدالت میں بیٹھا ہوا کچھ سوتا کچھ جاگتا مقدموں کی کارروائی سن رہا تھا۔ بہت اکتایا سا بیٹھا تھا۔ اور میں نے دیکھا ہی نہیں کہ ایک اور مقدمہ شروع ہو گیا ہے۔ اور تین وکیل اور کوئی آدمی درجن حضرات ڈپٹی کمشنر صاحب کے سامنے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہوئے ہیں (اچانک میں نے دیکھا کہ وہ تیتر والے دوست مجھے متوجہ کرنے کی سر توڑ کوشش کر رہے ہیں) اور غالباً مجھ سے اپنے احسان کے عوض میں امداد مانگ رہے ہیں۔ میں نے ڈپٹی کمشنر صاحب سے اپنے ملاقاتی کا ذکر کیا اور اُن سے کہا کہ یہ صاحب غالباً جیل میں کوئی نوکری چاہتے ہیں۔ "ہرن صاحب" ہنستے ہنستے لوٹ گئے۔ "نہیں بھائی یہ تو ذیلدار بننا چاہتے ہیں۔" انہوں نے کہا۔

ان ہی دنوں جب میں فیروز پور میں تھا۔ میں اور میرے آکسفورڈ کے دوست اکیلے دریائے ستلج میں ڈوبتے ڈوبتے بچے۔ ہم ایک کشتی میں مرغابیوں کا شکار کھیلنے گئے۔ دریا کا پانی کم تھا۔ اور بہاؤ بہت تیز تھا۔ اس لئے کہ بند کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔ کشتی بان باہر نکل کے کشتی کو کھینچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اور بہاؤ کے خلاف کشتی کو کھینچنا آسان کام نہ تھا۔ گھنٹہ بھر کے بعد ہم ایک ٹاپو پر پہنچے اور مرغابیوں تک پہنچنے کی ناکام کوشش کرنے لگے۔ مرغابیاں پانی کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ تھوڑی دیر میں مرغابیاں تو اڑ گئیں اور ان کے ساتھ ہی ہماری شکار کی امیدیں بھی غائب ہو گئیں۔ اب ہم کشتی کی تلاش میں ایک خاص جگہ پہنچے جہاں ہم نے کشتی بانوں کو کشتی لے چلنے کو کہا تھا۔ وہاں نہ کشتی کا پتہ تھا نہ کشتی بانوں کا۔ اور دسمبر کا مختصر دن ختم ہونے کو تھا۔ ہم اس جگہ پہنچے جہاں ہم کشتی سے اترے تھے۔ لیکن کشتی وہاں بھی نہیں تھی۔ اب ہمارے سامنے دو ہی صورتیں تھیں۔ یا تو اس ٹاپو پہ رات گزاریں۔ یا دلدل میں سے ہوتے ہوئے دریا کے کنارے پہنچنے کی کوشش کریں۔ ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ بہر حال گھر پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس لئے کہ اول تو میرے نہ آنے سے میری بیوی بہت پریشان ہوگی۔ اور دوسرے سردی میں رات گزارنی بہت مشکل ہو جائیگی۔ اس لئے کہ ٹاپو میں نہ کھانے کو کچھ تھا نہ آگ جل سکتی تھی۔ اور نہ سر چھپانے کو جگہ تھی۔ [illegible] پانی کوئی چار پانچ فٹ

تیرنا تھا۔ [illegible]
تیرنا بھی نہیں جانتے تھے۔ [illegible] تو میں سنبھال لوں۔ بہت [illegible] اور نکل آئی تھی۔ ہم نے دیکھا کہ ابھی بہت سی [illegible] گزرنا ہے (جو دلدل سے بھری ہوئی ہیں) ایک میں تو ہم [illegible] موت دکھائی دے گئی۔ آخر اکیلے جو مجھ سے ذرا [illegible] لیکن میں کمر تک دلدل میں پھنس گیا۔ [illegible] "میں یہاں سے کبھی نہیں نکل سکوں گا۔" اس عرصے میں ایک اور مصیبت یہ ہوئی کہ رات ہو گئی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ آخر تھوڑا سا دم لینے کے بعد میں نے اپنی بندوق زمین پر ٹکائی اور اس کے سہارے اپنے آپ کو تھوڑا سا باہر نکالا۔ کچھ دم لیا۔ بندوق کو کھینچ کے باہر نکالا۔ پھر اسی طرح زمین پر رکھا اور زور لگایا۔ اور اس طرح آہستہ آہستہ باہر نکلا۔ کوئی دو گھنٹے کے بعد ہم دونوں تھکے ہارے سر سے پاؤں تک کیچڑ میں لت پت اپنے کانپتے گھر پہنچے ہمیں اس بات کی بہت خوشی تھی کہ ہم اپنی بندوقیں ساتھ لے آئے۔ اگرچہ اُن کی نالیاں کیچڑ سے اٹی ہوئی تھیں۔

دوسرے دن مجھے نہایت حیرانی ہوئی جب وہ کشتی بان اپنی [illegible] مانگنے آموجود ہوا۔ مجھے اس مرتبہ افسوس نہ ہوا کہ مجھے ہندوستانی زبان نہیں آتی۔

کوئی چار سال تک میں تھوڑے تھوڑے عرصہ کے لئے [illegible] پھر منٹگمری میں لگا۔ اور پھر لدھیانہ اور [illegible] اور اس کے بعد جب میں محکمہ امداد باہمی میں تھا تو ایک دفعہ ریسس (Recess) کے دنوں میں دوبارہ لدھیانہ جانا ہوا۔ وہاں بہت سے لوگوں سے میری ملاقات تھی۔ اور انہیں معلوم تھا کہ مجھے شکار کا کتنا شوق ہے۔ ایک دن ایک پرانے دوست نے تجویز کی کہ اگلی صبح کو ہم دونوں [illegible] کے شکار کو چلیں۔ میری بیوی نے چڑیا گھر کے علاوہ کبھی [illegible] نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے وہ بھی جانا چاہتی تھیں۔ چنانچہ ہم نے فیصلہ کیا انہیں بھی ساتھ لے چلیں۔ ہم صبح چار بجے روانہ ہو گئے۔

دو [illegible] میری بیوی [illegible] جب [illegible]
لیکن جب ہم منزل کے قریب پہنچے تو صبح کی روشنی آہستہ آہستہ [illegible] لگی تھی۔ ہم ایک بہت ہی تنگ راستے پر چل رہے تھے جس کے دونوں طرف درخت کھڑے تھے اور [illegible]

[illegible] (میری بندوق میری بغل میں تھی۔ لیکن میں نے ایک گڑھے پر [illegible] تھا۔ میری بیوی میرے پیچھے تھی اور دتو اُن کے پیچھے چل رہا تھا۔ میں صبح کی مدھم روشنی میں مزے سے چلا جا رہا تھا اور مجھے ریچھ دیکھ کا کچھ خیال بھی نہ تھا۔ اچانک ہم ایک چٹان کے گرد جلدی سے گئے اتنے کو مڑتے اور صحن گھڑی میں بیوقوفوں کی طرح اپنی بندوق کو کندھے سے اُتارنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے بالکل سامنے کوئی چار گز کے فاصلہ پر ایک بہت بڑا سیاہ ریچھ کھڑا تھا۔ اور ہم بہت غصے سے ایک دوسرے کو گھور رہے تھے۔ کوئی ایک دو سیکنڈ کے بعد ریچھ نے پسپا ہونا زیادہ مناسب سمجھا اور جب میں نے اپنی بندوق درست کی تو وہ راستہ چھوڑ کر ڈھلان کی طرف لڑھکتا گیا۔ میں نے فیر کیا۔ گولی ایک دھماکے سے ریچھ کے جا کر لگی۔ لیکن پیشتر اس کے کہ میں دوبارہ فیر کر سکوں۔ وہ جھاڑیوں میں غائب ہو چکا تھا۔

دتو کا خیال تھا کہ ہم فوراً اُس کا پیچھا کریں۔ لیکن مجھے معلوم تھا کہ زخمی ریچھ کس قدر خطرناک ہوتا ہے۔ اس لئے میں نے انکار کر دیا۔ ہم ایک موڑ پر جا کر کھڑے ہو گئے۔ جہاں سے وہ ساری ڈھلوان دکھائی دیتی تھی جدھر ریچھ گیا تھا۔ ہم نے ہر طرف نظر دوڑائی۔ لیکن کچھ دکھائی نہ دیا۔ آخر ہم نے فیصلہ کیا کہ میری بیوی تو وہیں کھڑی رہیں۔ اور ہم دونوں جھاڑیوں میں جا کے تلاش کریں۔ ہم دونوں نیچے اُترے۔ دتو کو میری بندوق پر اتنا ایمان تھا کہ وہ تو بغیر سوچے سمجھے جھاڑیوں کے اندر باہر اور موڑوں کے اِدھر اُدھر بھاگتا پھرا۔ کافی عرصہ تک ہمیں ریچھ کا کوئی پتہ نہ چلا۔ قدموں کے نشان تو ملتے تھے لیکن چونکہ ہمیں اس بات کی مہارت نہ تھی۔ اس لئے ٹھیک اس کا پیچھا نہیں کر سکتے تھے۔ آخر چلتے چلتے ہمیں ایک کھوہ کے باہر ہمیں خون کا ایک تالاب سا نظر آیا۔ اب ہمیں یہ تو پتہ چل گیا کہ ریچھ کہاں ہے۔ لیکن یہ پتہ نہیں چلا کہ اس کے متعلق کرنا کیا۔ بہت غور کے بعد دتو نے یہ تجویز کہ ہم اسے دھوئیں کے ذریعہ باہر نکالیں۔ ہم نے بہت سے خشک تنے اور ٹہنیاں جمع کیں۔ انہیں سلگایا اور ایک بانس کے ذریعہ کھوہ کے اندر جھونک دیا۔ پھر ہم نے کچھ گیلی گھاس اندر پھینکی۔ اور بہت دیر تک آگ کو سلگائے رکھا۔ گھنٹہ بھر ہو گیا اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ دتو کہنے لگا کہ ریچھ مر گیا ہوگا۔

آخر میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ کھوہ کے اندر جاؤں اور خود دیکھوں۔ آگ بجھ چکی تھی۔ کھوہ کا دہانہ اتنا تنگ تھا کہ میں صرف پیٹ کے بل لیٹ کے اور آہستہ آہستہ رینگ کے اندر جا سکتا تھا۔ میں نے اپنی بندوق کی نالی پر ٹارچ باندھی اور بہت تکلیف سے اندر گھسا۔ اندر بہت چھوٹی سی کھوہ تھی۔ کوئی پانچ فٹ اونچی۔ دس فٹ چوڑی اور کوئی چھ فٹ لمبی۔ ریچھ ویچھ کا کوئی پتہ نہ چلا۔ میں اِدھر اُدھر دیکھ ہی رہا تھا کہ مجھے ایک خوفناک آواز سُنائی دی۔ یوں معلوم ہوا جیسے آواز بالکل میرے سر کے پیچھے سے آ رہی ہے۔ یہ ریچھ کے حونکنے کی آواز تھی۔ میں نے جلدی جلدی رینگ کے باہر نکلنے کی کوشش کی۔ ہر گھڑی خطرہ تھا کہ اس تنگ جگہ میں ریچھ حملہ کر دیگا۔ لیکن کچھ ہوا نہیں اور میں خیریت سے باہر نکل آیا۔ ریچھ غالباً اندر کی کسی اور کھوہ میں تھا۔ لیکن میں اس کا ٹھیک پتہ چلانے کے لئے کسی طرح بھی راضی نہ ہوا۔ اور مجھے اُمید ہے کہ میں آئندہ یہ حماقت کبھی نہ کرونگا کہ دوبارہ ایسے کھوہ میں گھس جاؤں جہاں کوئی زخمی ریچھ موجود ہو ٭

(منشور از نشر گاہ دہلی)

بوڑھے جوان ہو لئے!

"الشباب"

جوانی اگر رخصت ہو چکی ہے اور اس کا ارمان اس کی حسرت باقی ہے تو ان سب حسرتوں اور ارمانوں کا علاج "الشباب" میں موجود ہے۔ دل و دماغ نے اگر جواب دیدیا ہے، خون کی پیدائش ختم ہو گئی ہے جسم و روح اضمحلال و افسردگی کا شکار ہو چکے ہیں تو "الشباب" کے استعمال کا وقت بھی آ گیا ہے۔ ڈاکٹروں نے بندروں کے غدود انسانوں میں داخل کر کے غیر قدرتی اصول پر اعادۂ شباب کا دعویٰ کیا ہے اور ہم "الشباب" پیش کر کے افعال قدرت کے مطابق گمشدہ جوانی اور جوانی کی اُمنگوں کو دعوت دیتے ہیں۔ یونانی طب کا یہ معجزہ دیکھنے کے قابل ہوگا۔ قیمت [illegible]

طبی مشورہ اگر کوئی صاحب اپنے مرض کے متعلق خاص طور پر ہم سے یا ہمارے ذریعہ کسی حاذق طبیب سے مشورہ لینا چاہیں تو وہ مفصل حالات خوشخط اور صاف لکھ کر بھیج دیں۔ جواب کیلئے چھ پیسے کے ٹکٹ ڈاک کے ارسال کریں۔ ہم نہایت راز کے ساتھ مشورہ اور تجویز سے اطلاع دیں گے پھر اگر مجوزہ نسخہ تیار کرانا ہو تو کارخانہ واجبی قیمت پر اور احتیاط سے اس خدمت کو انجام دیگا۔ لیکن اس صورت میں نسخہ کی پوری قیمت پیشگی آنی چاہیئے۔

شمسی دواخانہ۔ گلی ماران۔ دہلی

ترجمہ از ڈبلیو سومرسٹ ماؤم

دولتِ بیدار

(از جناب مظہر عزیز صاحب ایم اے ایل ایل بی۔ پی سی ایس)

رچرڈ ہیئر نگر ایک خوش باش اور خوش گذران انسان تھا۔ مذہب کے علمبرداروں کے اس قول کے باوجود بھی کہ دُنیا دار المحن ہے۔ دُنیا ہی میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہمیشہ مگن رہتے ہیں۔ رچرڈ ہیئر نگر بھی اس حقیقت سے واقف تھا۔ اور یہ ایسی بات ہے جس سے بہت کم لوگ واقف ہوتے ہیں۔ "خیر الامور اوسطہا" جس پر پُرانے زمانے کے لوگ اعتقاد رکھتے ہیں، آج کل فیشن کے خلاف سمجھا جاتا ہے اور موجودہ زمانہ میں جو لوگ اس مقولہ پر عامل ہیں انہیں ایسے لوگوں کے طعنوں اور تمسخر کا نشانہ بننا پڑتا ہے جو اعتدال اور اپنی خواہشات کو دبانے میں کوئی بھلائی نہیں دیکھتے۔ رچرڈ ہیئر نگر بھی وقتاً فوقتاً اپنے شانے سکیڑ لیتا تھا، مگر خوش طبعی کی بنا پر کسی کا دل دُکھانے کیلئے نہیں۔ دوسرے لوگ اگر خطرناک طرح سے زندگی بسر کرتے ہیں، آگ سے کھیلتے ہیں، صرف چند لمحوں کی لذت کشی کے لئے اپنا سب کچھ لُٹا دیتے ہیں، اُس تنی ہوئی معلق رسی پر چلتے ہیں جو یا تو شہرت اور عزت تک پہنچاتی ہے یا قبر کی گہرائی میں گرا دیتی ہے۔ یا کسی مقصد کے حصول کی خاطر یا کسی مخصوص جذبہ کی تسکین کے لئے اپنی جان خطرہ میں ڈال لیتے ہیں۔ تو اپنا شوق پورا کیا کریں! —— رچرڈ ہیئر نگر نہ اُن کی کامیابیوں پر رشک کرتا تھا، نہ اُن کی ناکامیوں پر اظہار افسوس۔

مگر اس سے یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ رچرڈ ہیئر نگر خود غرض یا سخت دل واقع ہوا تھا۔ وہ بہت نرم دل اور بڑی سُوجھ بُوجھ کا انسان تھا۔ وہ ہمیشہ اپنے دوستوں کی مدد کرنے کیلئے تیار رہتا تھا۔ اور اس کی مالی حالت اتنی اچھی تھی کہ وہ دوسروں کی تکالیف دُور کرنے کی لذت سے بہرہ ور ہوسکتا تھا۔ اس کے پاس کچھ تو اپنا (آبائی ترکہ کا) روپیہ تھا۔ اور اس کے علاوہ وہ "ہوم آفس" میں ایک بڑے عہدے پر فائز تھا اور معقول تنخواہ پاتا تھا۔ اُسے جو کام کرنا پڑتا تھا وہ اُسکی طبیعت اور مزاج کے موافق تھا۔ ہر روز دفتر کا کام ختم کرنے کے بعد وہ اپنے کلب میں گھنٹے دو گھنٹے برج کھیلتا تھا۔ اور ہر اتوار کو گولف اُس کا معمول تھا۔ چھٹیوں میں وہ ہمیشہ سیر و سیاحت کیلئے دوسرے شہروں میں جایا کرتا تھا۔ وہاں وہ اچھے ہوٹلوں میں ٹھیرتا اور پُرانے تاریخی مقامات، آرٹ گیلیریاں اور میوزیم وغیرہ دیکھا کرتا تھا۔ وہ اکثر گھر کے باہر ہوٹلوں وغیرہ میں کھانا کھاتا تھا۔ اُسکے دوست اُس کے گرویدہ تھے، اور اُسے بہت پسند کرتے تھے۔ اُسکی گفتگو بہت دلچسپ ہوا

کرتی تھی کیونکہ [illegible]۔ وہ ایک نہایت دلچسپ شخصیت کا مالک تھا۔ اُس کی [illegible] گو وہ غیر معمولی طور پر حسین بھی نہ کہا جاسکتا تھا۔ مگر وہ [illegible] تھا۔ اس کا چہرہ لانبا تھا اور اُس سے زیرکی جھلکتی تھی۔ اس کے بال [illegible] تھے کیونکہ اب وہ پچاس برس کی عمر کو پہنچ رہا تھا۔ اسی کے [illegible] آنکھیں ابھی تک متبسم تھیں اور اُس کے سب دانت مضبوط تھے۔ قدرت نے اُسے مضبوط قویٰ عطا کئے تھے اور اُس نے خود بھی اپنی صحت کا بہت خیال رکھا تھا۔ دُنیا میں کوئی وجہ ایسی نہ تھی جس کی بنا پر یہ کہا جاسکے کہ وہ خوش نہیں۔ اور اگر اُس کے انداز میں کوئی جھلک بے پروائی یا تفکرات سے آزاد ہونے کی نظر آتی تھی تو وہ کہہ سکتا تھا کہ وہ اس کا مستحق ہے۔

خوش قسمتی سے وہ ازدواجی زندگی کے پُر خطر سمندر سے بھی صحیح سلامت نکل آیا تھا، گو بہت سے عقلمند اور نیک لوگ اسی میں عمر بھر ڈبکیاں کھاتے رہتے ہیں۔ آغازِ شباب میں اپنی اپنی روحانی محبت کی تکمیل کرنے کیلئے شادی کرنے کے بعد وہ اور اس کی بیوی چند سال نہایت مسرت بھری زندگی بسر کرکے، رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہونے لگے تھے۔ اُن میں سے کسی کا بھی یہ خیال نہ تھا کہ کسی اور سے شادی کی جائے۔ اس لئے طلاق کا کوئی سوال ہی نہیں اُٹھا۔ (اور طلاق رچرڈ ہیئر نگ جیسے معزز انسان کیلئے مناسب بھی نہ تھی) مگر فریقین کی آسانی اور سہولت کے لئے اپنے قانونی مشیروں کی مدد سے اُنہوں نے اس قسم کی "علیحدگی" اختیار کرلی تھی۔ جس میں ایک دوسرے کی زندگی میں مزاحم ہوئے بغیر وہ اپنی اپنی زندگیاں اپنی مرضی کے مطابق آزادی سے بسر کرسکتے تھے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے جُدا ہوئے۔ مگر دل میں ایک دوسرے کی نسبت اچھا خیال لئے ہوئے۔

اُس نے اپنا پُرانا مکان فروخت کردیا اور ذاتی رہائش کے لئے ایک چھوٹا مگر آرام دہ "فلیٹ" لے لیا۔ اس میں ایک نشست کا کمرہ تھا جس میں اُسکی کتابوں کی الماریاں سجا دی گئی تھیں۔ ایک کھانے کا کمرہ تھا جس میں اسکا عمدہ فرنیچر قرینہ سے رکھ دیا گیا تھا۔ اور ایک اُس کے سونے کا کمرہ تھا۔ ان تین کمروں کے علاوہ اس فلیٹ میں ایک باورچی خانہ تھا اور دو کمرے نوکروں کی رہائش کے تھے۔ وہ اپنی کھانا پکانے والی کو ساتھ لے آیا۔ مگر چونکہ اب اُسے زیادہ نوکروں کی ضرورت نہ رہی تھی اس لئے اُس نے اپنے سب پُرانے نوکروں کو برخاست کردیا تھا۔ اور "رجسٹری آفس" میں ایک "پارلر میڈ" (خادمہ) کے لئے درخواست دیدی تھی۔ وہ خوب واقف تھا کہ کس قسم کی خادمہ اُس کیلئے مناسب ہوگی۔ اور اُس نے رجسٹری آفس والوں کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ اُسے ایک ایسی [illegible]

کہ عمر رسیدہ کنوارہ ...ں اکثر دیکھا گیا ہے کہ نوجوان عورتیں ایک جگہ مشکل سے ٹھیرتی ہیں۔ اور ...گو وہ خود عمر رسیدہ اور با اصول انسان تھا مگر لوگوں کو پیشگوئیاں کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ خصوصاً سبزی فروش اور دھوبی کا منہ بند نہیں کیا جاسکتا۔ ... اپنی اور ایک نوجوان عورت کی عزت کے خیال سے اسکی خواہش تھی کہ اسکے یہاں ملازمت کے لئے جو عورت درخواست دے وہ تیس سال سے زیادہ عمر کی ہو۔ اور اس کے چاندی کے ظروف صاف کرسکے۔ اُسے پُرانے زمانے کے چاندی کے برتنوں کا شوق تھا۔ اور اس کی یہ خواہش بجا تھی کہ وہ چھری اور کانٹے اور ظروف جو ملکہ این (Queen Anne) کے زمانہ میں ایک امیر زادی کے استعمال میں رہ چکے تھے احتیاط اور تمیز کے ساتھ استعمال کئے جائیں۔ وہ بڑا مہمان نواز تھا۔ اور ہفتہ میں ایک بار تو ضرور ہی چار سے آٹھ تک آدمیوں کو اپنے یہاں کھانے پر بُلاتا تھا۔ اُسے اپنی کھانا پکانے والی پر پورا اعتماد تھا کہ وہ ایسا کھانا تیار کریگی جو اسکے مہمانوں کو مرغوب ہوگا اور اس کی خواہش تھی کہ اسکی خادمہ میز پر کھانا سلیقہ سے چُننے اور کھانے کے دوران میں مہمانوں کی دیکھ بھال کرنے میں طاق ہو۔ اسکے پاس کوئی Valet (ذاتی ملازم) نہ تھا۔ اور چونکہ وہ خوش پوشاک بھی تھا اس لئے اُسکی یہ خواہش بھی تھی کہ اُس کے کپڑوں کی اچھی طرح نگہداشت کی جائے۔ وہ اس قسم کی خادمہ چاہتا تھا جو اسکے پتلونوں اور ٹائیوں پر استری کرسکے اور جسے اسکے جوتوں پر پالش کرنے سے انکار نہ ہو۔ اُس کے پاؤں چھوٹے تھے اور وہ اپنے لئے عمدہ شکل کے آرام دہ جوتے بنوانے کا خاص اہتمام کیا کرتا تھا۔ اُس کے پاس بہت سے جوتے تھے۔ اور وہ اس بات پر زور دیتا تھا کہ جونہی وہ اپنا کوئی جوتا اُتارے تو فوراً اُسے "شو ٹری" پر چڑھا کر رکھ دیا جائے۔ اور فلیٹ کو صاف ستھرا رکھنا تو اسکے نزدیک خادمہ کا فرض اولین تھا۔ اور یہ کہنے کی تو گویا ضرورت ہی نہ تھی کہ خادمہ کا چال چلن بے داغ ہو۔ اور وہ متین، ایماندار اور قابل اعتبار ہونے کے علاوہ ہنس مکھ بھی ہو۔ ان سب خوبیوں کے عوض وہ اچھی تنخواہ، معقول حد تک آزادی اور بوقت ضرورت چھٹی دینے پر تیار تھا۔ رجسٹری آفس کے سپرنٹنڈنٹ نے اسکی ضروریات اور شرائط بلا پلک جھپکائے ہوئے سُنیں اور (گویا یہ بتانے کیلئے کہ اُس کے مطلب کی کوئی خادمہ اس کی نگاہ میں ہے) ایک لمبی فہرست اُن تمام عورتوں کی اُس کے سامنے رکھدی جو ملازمت کی متلاشی تھیں۔ اس کا گویا یہ مطلب تھا کہ جو کچھ رچرڈ ہیرنگر نے کہا تھا اُس پر سپرنٹنڈنٹ نے غور کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ رچرڈ ہیرنگر نے ان سب خادماؤں سے "انٹرویو" کیا۔ ان میں سے کچھ تو پہلی نظر میں ملازمت کے ناقابل معلوم ہوئیں۔ کچھ بہت زنگیلی اور رنگین مزاج تھیں۔ کچھ بہت بوڑھی تھیں۔ کچھ بہت کم سن۔ اور کچھ کا چہرہ مہرہ اور انداز اُسے پسند نہ آیا۔ اُس کے نزدیک ان سب میں ایک بھی اس قابل نہ تھی جسکو ملازمت کا موقعہ دیا جاسکے۔ مگر وہ ایک نرم دل اور خوش اخلاق انسان تھا۔ اُس نے خندہ پیشانی کے ساتھ اظہار افسوس کرتے ہوئے ان سب سے اپنی معذوری ظاہر کی اور اُن کو اپنے یہاں ملازمت دینے سے اِنکار کردیا۔

زندگی کی ایک عجیب ادا یہ بھی ہے کہ اگر آپ سوائے بہترین اور ہر اعتبار سے مکمل چیز کے کوئی اور کمتر شے لینے سے برابر انکار کرتے رہیں تو آپ کو وہی چیز مل جاتی ہے جس کے آپ خواہشمند ہوتے ہیں۔ اگر آپ اپنے نصب العین سے کم درجہ کی چیز رد کردیں تو اس کا امکان رہتا ہے کہ جو آپ چاہتے ہیں وہی آپ کو مل جائے۔ ایسے موقعوں پر شاید قسمت یہ کہتی ہے کہ "یہ آدمی بالکل ہی احمق معلوم ہوتا ہے جو کمال کا جویا ہے۔" اور اپنے نسائی پندار کے زیر اثر ایک عینیت پرست کی خواہش پُوری کردیتی ہے۔

ایک دن فلیٹ کے چوکیدار نے رچرڈ ہیرنگر سے کہا۔ "حضور! میں نے سُنا ہے کہ آپ کو ایک اچھی خادمہ کی ضرورت ہے۔ میں ایک ایسی عورت کو جانتا ہوں جو ملازمت کی خواہاں ہے۔"

"کیا تم اُسے اچھی طرح جانتے ہو؟"

رچرڈ ہیرنگر بخوبی جانتا تھا کہ مالک کی رائے کے مقابلہ میں، ایک دوسرے کے بارہ میں خود نوکروں کی رائے کہیں زیادہ وقیع ہوتی ہے۔

"حضور! میں اُسکی شرافت اور ایمانداری کا ذمہ لیتا ہوں۔ وہ بہت بڑے گھروں میں کام کرچکی ہے۔"

"ہم سات بجے شام کپڑے بدلنے کیلئے آئیں گے۔ اگر وہ اُس وقت آسکے تو ہم اُس سے مل سکتے ہیں۔"

شام کو اس کو گھر واپس آئے ہوئے پانچ منٹ بھی نہ ہوئے تھے کہ اُس کی کھانا پکانے والی آئی اور خبر دی کہ جس عورت کے بارے میں صبح چوکیدار نے ذکر کیا تھا وہ آگئی ہے۔

"بلاؤ۔" رچرڈ ہیرنگر نے کہا۔

اُس نے کمرے کے اندر بجلی کا دوسرا بلب بھی روشن کردیا تاکہ وہ اچھی طرح دیکھ سکے کہ یہ نو وارد کیسی معلوم ہوتی ہے۔ اور خود اُٹھکر اور آتش دان کی طرف پشت کرکے کھڑا ہوگیا۔ ایک عورت اندر آئی اور ادب سے دروازے کے پاس ہی ٹھیر گئی۔

"گڈ ایوننگ، تمہارا کیا نام ہے؟"

"پریچرڈ۔"

"اور عمر؟"

[illegible] ٹھیک۔

نفیست کی صفائی کا وہ خاص [illegible] خیال رکھتی تھی۔ کیا مجال جو کہیں ذرا سی بھی گرد اُس کی رہ جائے۔ پریچرڈ کو نوکر رکھنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد رچرڈ ہیرنگر چھٹی لیکر باہر چلا گیا۔ چھٹی ختم ہوجانے پر جب وہ لوٹا تو اُس نے اپنی الماری سے ایک کتاب نکالی۔ اُسے فوراً معلوم ہوگیا کہ وہ جھاڑ پونچھ کر رکھی گئی ہے۔ اُس نے گھنٹی بجائی۔

"پریچرڈ! جاتے وقت میں تم سے یہ کہنا بھول گیا تھا کہ میری کتابوں کو نہ چھونا خواہ وہ کتنی ہی گرد آلود کیوں نہ ہو جائیں۔ کیونکہ جب کتابیں جھاڑنے کیلئے باہر نکالی جاتی ہیں تو پھر پرانی جگہ پر نہیں رکھی جاتیں۔ مجھے اپنی کتابوں کا گرد آلود رہنا گوارا ہے۔ مگر مجھے اس سے بڑی کوفت ہوتی ہے۔ کہ وقت پر کوئی کتاب اُسی جگہ نہ ملے جہاں میں نے اُسے رکھا ہو۔"

"میں معافی چاہتی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ کچھ صاحبان اس بات پر بہت زور دیتے ہیں۔ لیکن میں نے آپ کی کتابوں کو جھاڑتے وقت یہ احتیاط کرلی تھی کہ جو کتاب جہاں سے اٹھائی جائے وہیں واپس رکھی جائے۔"

رچرڈ ہیرنگر نے اپنی کتابوں پر ایک نگاہ ڈالی۔ ہر کتاب اپنی پرانی جگہ پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ مسکرا دیا۔

"میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

اور چاندی کے برتنوں کو تو وہ اتنی اچھی طرح رکھتی تھی کہ ایک مرتبہ وہ اسکی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکا۔

"یہ سب برتن ملکہ این اور جارج اوّل کے زمانہ کے ہیں۔"

"جی ہاں۔ میں جانتی ہوں۔ جب کسی کو ایسی نادر چیزیں سونپی جائیں تو اُسے بھی اُن کو اچھی طرح رکھنے میں لطف آتا ہے۔"

"تم تو اس کام میں بالکل ماہر ہو۔ تم کو اس کام کا ملکہ ہے۔ میں نے آج تک کسی بٹلر کو بھی چاندی کے برتن ایسی اچھی حالت میں رکھتے نہیں دیکھا جیسے تم رکھتی ہو۔"

"مردوں کے مقابلہ میں عورتیں یہ کام زیادہ اچھا کرلیتی ہیں کیونکہ انہیں اس سے لگاؤ ہوتا ہے۔" پریچرڈ نے انکساری کے لہجہ میں جواب دیا۔

رچرڈ ہیرنگر کو جب اس بات کا احساس ہوگیا کہ پریچرڈ کل کام اچھی طرح سمجھ گئی ہے تو اُس نے ہر ہفتے اپنے دوستوں کو ڈنر پر بلانا شروع کردیا۔ اُس نے پہلے دن ہی دیکھ لیا تھا کہ پریچرڈ کو کھانے کے دوران میں خدمت کرنے کا اچھا تجربہ ہے۔ وہ نہایت مستعد، خاموش طبع اور تیز نظر تھی۔ جوں ہی کسی مہمان کو کسی چیز کی ضرورت یا خواہش ہوتی وہ فوراً وہی چیز لئے ہوئے اُس کے پاس پہنچ جاتی۔ آئے بہت جلد

پریچرڈ ہیرنگر [illegible] چاہیئے کون [illegible] کی [illegible] کے [illegible] بکری کا بھنا ہوا گوشت [illegible] معلوم تھا کہ [illegible] کیا جائے اگر زیادہ سرخ ہو [illegible] اور [illegible] ڈائننگ ٹیبل پر رکھا جائے جس سے کمرہ میں اُس کی خوشبو [illegible] کے سامنے اس طرح "براؤنی" کی بوتل گلاس میں انڈیلی کہ [illegible] معلوم ہوتا تھا۔ ایک موقع پر اُس نے وہ شراب پیش کی [illegible] اس پر وہ ذرا ترشرو ہوا تو پریچرڈ نے اُسے بتایا۔

"میں نے وہی بوتل کھولی تھی جو آپ چاہتے ہیں۔ مگر اس [illegible] تھا اس لئے میں یہ "شانگ برنگ" (سرخ براؤنی) لے آئی۔"

"اچھی بات ہے پریچرڈ!"

کچھ دن بعد اُس نے ہر کام پریچرڈ ہی کے اوپر چھوڑ دیا تھا کیونکہ اُسے معلوم ہوگیا تھا کہ پریچرڈ اُس کے دوستوں کے مزاج سے بخوبی واقف ہوگئی تھی۔ اگر وہ سمجھتی کہ پینے والے اچھی اور بُری شراب میں تمیز کرسکتے ہیں تو وہ تہ خانہ سے بہترین شراب اور سب سے زیادہ پرانی براؤنی نکال کر لاتی تھی۔ اُسے عورتوں کے مذاق کا اندازہ تھا اور جب کسی پارٹی میں عورتیں موجود ہوتیں تو اُن کیلئے وہ "شیمپین" لاتی۔ مجھے اس خیال سے [illegible] پی لینا پڑتا ہے کہ کہیں لینے سے اس کا اندازہ کم نہ ہوجائے [illegible] طرح کسے بھی مردم شناسی کا قدرتی ملکہ حاصل تھا۔ کوئی کتنا ہی [illegible] چہرہ دار کیوں نہ ہو، اُسے صاف معلوم ہوجاتا کہ کون شریف ہے [illegible] چھچھورا ہے۔ رچرڈ ہیرنگر کے ملاقاتیوں میں سے کچھ کو وہ دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ پسند کرتی تھی۔ اور جب اُن میں سے کوئی مدعو کیا جاتا تو وہ [illegible] کرلاتی جسے رچرڈ نے خاص خاص موقعوں کے لئے [illegible] رچرڈ اس بات کو دیکھکر کافی محظوظ ہوتا اور اپنے دوست سے کہتا۔

"یار! تمہیں پریچرڈ [illegible] نہیں معلوم ہوتی [illegible] کم لوگوں کو دیتی ہے!"

"پریچرڈ ہر جگہ "بہترین [illegible]" [illegible] رشک کرنے لگے تھے کہ اسکے پاس اتنی اچھی [illegible] لائق تھی۔ ہیرے جواہرات سے بھی زیادہ [illegible] کرتے تو رچرڈ ہیرنگر کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھتا۔

"اچھے ملک ہی کے اچھے [illegible]"

ایک شام جب وہ [illegible]

افسانہ

پیاس

(از جناب فرید مچھلی شہری)

میں ریاض کی شادی میں کبھی شریک نہ ہوتا۔ کیونکہ میرے نزدیک بڑھاپے کی شادی ایک وحشیانہ اقدام ہے۔ غضب خدا کا! پچاس برس کا کھوسٹ ایک پندرہ برس کے رسیلے پھول کو کنگ لے اور زمانہ اس پر آنسو بہانے کی جگہ خوشیوں کے خم لنڈھائے، سینہ پیٹنے کے عوض شادیانے بجائے۔

میں یقینی انکار کر دیتا مگر مجھے اس زندگی کے تاثرات اور ڈرامائی تجربے حاصل کرنے تھے۔ چنانچہ گیا، نکاح ہوا، شب عروسی کی چاندنی چھٹکی، مگر میں نے دیکھا کہ چودھویں کی رات بھی چاند ڈبڈبا گیا۔

ریاض کی نئی زندگی کی اندرونی حالت کا میں نے جائزہ لینا شروع کیا۔

. . . . میں نے دیکھا کہ نئی شادی سے ریاض کے دماغ میں خاموش حسیات کا دریا لہریں مارنے لگا۔ اور اس کے دل کو افسردگی اور افکار کی امواج مسلسل اچھالنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک پھانس ہے جو کھٹک رہی ہے۔ ایک ٹیس ہے جس نے میٹھا میٹھا درد پیدا کر رکھا ہے۔ اسکی زندگی قطعاً ظاہرداری میں گذر رہی ہے۔ دل کی بجھتی ہوئی چنگاریوں کو شعلہ ہو جانے سے رکنے کیلئے وہ دیوانوں کی طرح زور آزما ہوتا اور خشک ہونٹوں میں رس پیدا کرنے کے لئے وہ اپنے دل کی کلی کو زبردستی متبسم بھی کرتا۔ لیکن ہوتا اس وقت بھی یہی کہ مسکراہٹ کی لجاتی بجلی چھم سے کوند جاتی اور وہ جھلس کر رہ جاتا۔

فکر اور شک کے شعلے اس کے دل پر نامرادی کے پھپھولوں کا چراغ بنا رہے تھے۔ مگر ان کو روشن کرنے کے لئے اسکے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ مایوسیوں کے ابخرات اس کے پہلو کے گرما یہ سے برابر اٹھ رہے تھے۔ مگر ان کو برسانے کیلئے اسے کوئی بات نہ ملتی تھی۔ جوانی کا سیلاب اسکی نظروں کے سامنے، ہمک ہمک کر اسکی طرف بڑھ رہا تھا۔ مگر اس پر غیرت کی تلوار سے چوٹ لگانے کیلئے اسکے پاس کوئی بہانہ نہ تھا۔

دل مانتا یا نہ مانتا، دماغ تسلیم کرتا یا نہ کرتا۔ لیکن ریاض کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ اس کی کمسن رفیقۂ حیات، اس کی نئی نویلی دلہن اب اس کے آگے بکی جا رہی ہے۔ اس کے آسائش و آرام کی شمع کے گرد پروانہ وار فدا ہو رہی ہے۔ ٹھنڈی زندگی کے ٹھنڈے خواب سے بیدار بھی نہ ہوتا کہ وہ جوانی کی لطیف اور حسین مورت، چادر کو پھینک کر کھڑی ہو جاتی۔ اس کے لئے غسل کا سامان درست کر دیتی۔ کپڑے سنوارتی، منہ دھلاتی، ناشتہ تیار کرتی، پھر اسے جگاتی۔ نشیلی انگڑائیوں کی شراب کے چھینٹے دیکر اس میں زندگی کی نئی روح پھونکتی گوری باہوں کے سہارے اسکو غسل خانے تک لیجاتی اور وہاں نرم نرم گدگدی پیدا کرنے والے ہاتھوں سے نہلاتی، پھر کپڑے پہناتی۔ انہیں معطر کرتی اور مزے سے لیکر، مسکرا مسکرا کر، اٹھلا اٹھلا کر، خود اسے اپنے آئینہ میں دیکھتی۔ جو اس کے منہ سے نکلتا، دلہن اس پر آمنا وصدقنا کہتی۔ اس کی جو مرضی ہوتی، دلہن اسے فرض سمجھتی۔ وہ جو خواہش ظاہر کرتا، جب تک وہ پوری نہ ہو جاتی، دلہن کو چین نہ آتا۔

لیکن خود دلہن ایک روتی ہوئی شمع کی طرح ٹمٹماتی ہوئی زندگی بسر کر رہی تھی۔ بظاہر ریاض کی راحت و آرام کے سوا اور کوئی جذبہ اسے نہ چونکاتا۔ اور کوئی خیال اسے دنیا کی دلکشیوں کی طرف نہ کھینچ سکتا۔ لیکن جب وہ ریاض پر اس طرح دل و جان سے نثار ہوتی ہوئی نظر آتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ایک بے چین ننھی لڑکی ہے اور ریاض اس کی واحد گڑیا۔ وہ مجبور ہے کہ اسی ایک گڑیا پر ساری جان سے بچھ جائے۔

میں یہ دیکھ رہا تھا کہ جس طرح ایک پھول کو شاخ سے نوچ لیا جائے اور پھر اسے ایک ایسے گلدان میں رکھ دیا جائے جس میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ہو اور وہ دنیا کے ہر سانس کے ساتھ مرجھاتا جائے۔ اسی طرح ریاض کا حال تھا۔ سماج نے اسے کنگ کر ریاض کے سپرد کر دیا تھا۔ جس کو ریاض کی عمر کی خزاں جھلسائے دے رہی تھی۔ بھلا ٹھنڈی ٹھنڈی حیات بخش لہریں وہ کہاں سے لاتا اور کس طرح لاتا کہ جوانی کی نسیم کے آغوش میں کھلے ہوئے پھول کو دو دن بھی شاداب رکھ سکتا۔ مگر آنکھوں کو حسن کی سینک دینے کے لئے ضروری تھا کہ پھول ہمیشہ گل خنداں بنا رہے۔ اس کی تمنا یہ ضرور تھی کہ دلہن ہمیشہ کھلکھلاتی رہے اور جھومتی رہے۔ مگر اس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ خود بھی قہقہے لگائے۔ چہکے اور لہرائے۔

ریاض نے بھی وہی کیا جو اس کی عمر کا مرد ایسی حالت میں کیا کرتا ہے۔ اس نے بیش قیمت ساڑیوں سے الماریاں بھر دیں۔ نئے نویلے زیورات سے دلہن کے بکس بھر دیئے۔ انہی تقاضات کی بنا پر شاید دلہن اس کو سونپی بھی گئی تھی کیونکہ دلہن ان ساڑیوں کو پہنکر سورج کی طرح گرم اور شیرہ کا رنگ نظر آتی۔ جب وہ ان ساڑیوں کو زیب تن کرتی جن سے بہتر شاید اس کی کسی سہیلی کے پاس نہ تھیں اور ان زیورات سے آراستہ ہوتی ایسا معلوم ہوتا کہ ستاروں کی محفل سجی ہے۔ اور چاند عالم نشہ میں کہ اس وقت وہ چہل قدمی کو نکلتی۔ ریاض کی باہنوں میں اس کی ننھی ننھی انگلیاں ہوتیں

[illegible] کی تو صرف اسی کے بارے میں [illegible] گی۔

"[illegible] اگر وہ تمہیں چھوڑ کر چلی جائے تو کیا کرو گے؟ اُس جیسی خادمہ [illegible] ہے۔"

"وہ میرے یہاں کی ملازمت نہیں چھوڑ سکتی۔ کئی آدمیوں نے اُسے [illegible] اپنے یہاں نوکر رکھنا چاہا مگر اُس نے سب کو صاف جواب دیدیا۔ وہ [illegible] ہے کہ وہ کہاں خوش رہے گی۔"

"لیکن نہ ایک دن وہ شادی کر کے چلتی بنے گی۔"

"میں نہیں سمجھتا کہ وہ اس قسم کی عورت ہے۔"

"صورت شکل بھی اچھی ہے!"

"ہاں۔ کچھ ایسی بُری بھی نہیں۔"

"تم کیا کہتے ہو؟ وہ بہت خوبصورت عورت ہے۔ کسی اُونچے طبقے سے تعلق رکھتی تو سوسائٹی میں اس کی خوبصورتی کے چرچے ہوتے اور اخباروں میں اس کے فوٹو نکلا کرتے۔"

اُسی وقت پریچرڈ کافی (قہوہ) لیکر اندر آئی۔ رچرڈ ہیرنگر نے اسکی طرف دیکھا۔ چار سال کے متواتر ہر روز دیکھتے رہنے کے بعد ــــــ اُف! وقت کس تیزی سے گذر جاتا ہے ــــــ وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ اسکی شکل و صورت کیسی تھی۔ جب سے اُس نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا اُس وقت سے اب تک اُس میں کچھ زیادہ تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ نہ وہ پہلے کی بہ نسبت موٹی ہو گئی تھی۔ نہ اس کی جلد کی تر و تازگی میں کوئی کمی واقع ہوئی تھی ــــــ اُس کے چہرہ پر وہی جھلک بدستور قائم تھی جو رچرڈ ہیرنگر کو پہلے دن نظر آئی تھی ــــــ جذبات سے خالی مگر سنجیدگی اور ذہانت سے معمور! سیاہ لباس واقعی اس پر سجتا تھا۔

پریچرڈ کمرہ کے باہر چلی گئی۔ وہ گفتگو جو اُس کے آجانے کے باعث رُک گئی تھی پھر جاری ہو گئی۔

"بلا کی حسین عورت ہے! اس میں کسی شک اور شبہ کی گنجائش ہی نہیں۔"

"میں جانتا ہوں کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ بالکل درست ہے۔ اس میں سب خوبیاں موجود ہیں۔ اور اس کے بغیر مجھے سخت تکلیف ہو جائے گی۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود، یہ عجیب بات ہے کہ میں اُسے زیادہ پسند نہیں کرتا۔"

"کیوں؟"

"میرا خیال ہے کہ مجھے اس سے کچھ وحشت سی ہونے لگی ہے۔ آجکے زمانہ میں میں نے اکثر اس سے گفتگو کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب میں اس سے کوئی بات کرتا ہوں تو وہ جواب دیدیتی ہے [illegible]۔ ان چار برسوں میں اُس نے خود مجھ سے کبھی کوئی بات نہیں کی۔ میں اُس کے اور اُس کی زندگی کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ مجھے پسند کرتی ہے یا مجھ سے نفرت کرتی ہے یا پھر مجھے ان دونوں کے قابل بھی نہیں سمجھتی ــــــ وہ تو ایک زندہ مشین ہے۔ مشین! میں اس کی عزت کرتا ہوں، اُس کی خوبیوں کا معترف ہوں۔ اُس پر بھروسہ کرتا ہوں۔ اس میں دُنیا بھر کی تمام خوبیاں موجود ہیں اور میں اکثر تعجب سے سوچتا ہوں کہ ان سب باتوں کے باوجود میں اس کی طرف سے اتنا زیادہ بے نیاز کیوں ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ضرور اس میں کوئی نہ کوئی خامی ہے۔"

یہ گفتگو یہیں ختم ہو گئی۔

اس کے دو تین دن بعد چونکہ پریچرڈ کی رات کی چھٹی تھی اور ہیرنگر کا بھی کہیں باہر کھانا نہ تھا۔ اس لئے تنہا کلب میں شام کا کھانا کھایا۔ وہ کھانا کھا ہی چکا تھا کہ بیرے نے اطلاع دی کہ اسکے فلیٹ سے ٹیلیفون آیا تھا اور کسی نے یہ کہلوایا تھا کہ وہ اپنی کنجیاں فلیٹ ہی میں چھوڑ آیا ہے اور یہ بھی پوچھا تھا کہ آیا کنجیاں اسکے پاس ٹیکسی کے ذریعہ کسی کے ہاتھ بھجوا دی جائیں یا نہیں۔ رچرڈ ہیرنگر نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالکر ٹٹولا۔ یہ واقعہ تھا کہ وہ اپنی کنجیاں گھر پر بھول آیا تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ جب کھانا کھانے کے لئے وہ اپنا نیلا سرج کا سوٹ پہن رہا تھا تو کنجیوں کو اسکی جیب میں رکھنا بھول گیا تھا۔ اُس کا ارادہ کلب میں "برج" کھیلنے کا تھا۔ مگر آج کلب میں اُسکے ساتھیوں میں سے کوئی نہ آیا تھا اور اچھا کھیل ملنے کی اُمید کم تھی۔ اُسے خیال آیا کہ ایک بہت اچھا فلم چل رہا ہے جسکی اس نے بہت تعریف سنی تھی۔ اور جسے دیکھنے کا اُسے بہت اشتیاق تھا اُس نے اپنے دل میں طے کر لیا کہ آج وہ اُسے ضرور دیکھے گا۔ چنانچہ اس نے بیرے سے کہکر اپنے فلیٹ میں ٹیلیفون کرا دیا کہ وہ آدھے گھنٹے میں خود ہی کنجیاں لینے وہاں آئیگا۔

فلیٹ پہنچ کر اُس نے دروازہ کی گھنٹی بجائی۔ پریچرڈ نے دروازہ کھولا۔ وہ ہاتھ میں کنجیاں لئے ہوئے تھی۔

"تم یہاں کیا کر رہی ہو پریچرڈ؟ آج رات تو تمہاری چھٹی ہے!"

"جی ہاں۔ مگر باہر جانے کو میرا جی نہ چاہا۔ میں نے اپنے بدلے [illegible] کو بھیج دیا۔"

"جب کبھی موقع ملا کرے تو تم کو بھی باہر گھومنا پھرنا چاہیئے۔ ہر وقت ان کمروں کے اندر بند رہنا ٹھیک نہیں۔"

"میں اکثر کام کے سلسلے سے باہر جاتی رہتی ہوں۔ لیکن شام کو تو میں ایک مہینے سے کہیں نہیں گئی۔"

"آخر کیوں نہیں گئیں؟"

"اکیلے گھومتے پھرنا مجھے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اور میں کسی ایسے شخص کو نہیں

جاتی ہیں کے ساتھ ہیں باہر جانا پسند کر سکو۔"

"مگر تمہیں کبھی کبھی تھوڑی سیر تفریح ضرور کرنا چاہئیے۔ ورنہ تمہاری صحت بگڑ جائے گی۔"

"میری سیر تفریح کی عادت ہی چھوٹ گئی ہے۔"

"سنو: میں سنیما جا رہا ہوں۔ تم میرے ساتھ چلنا پسند کرو گی؟"

کہنے کو تو رچرڈ ہیرنگر یہ الفاظ دقتی رو میں انتہائی نرم دلی کے لہجہ میں کہہ گیا۔ مگر خود ہی اُسے افسوس ہوا کہ یہ الفاظ اُسکی زبان سے کیوں نکلے۔

"جی ہاں! مجھے آپ کے ساتھ چلنے میں عذر نہیں۔" پریچرڈ نے جواب دیا۔

"تو پھر جلدی کرو۔ اپنی ہیٹ پہن آؤ۔"

"میں ابھی آئی۔"

"یہ کہکر وہ اندر چلی گئی اور رچرڈ ہیرنگر اپنے نشست کے کرہ میں جاکر سگرٹ پینے لگا۔ یہ سوچ کر کہ وہ کیا کر رہا ہے اُسے خود اپنے اوپر تعجب ہو رہا تھا۔ مگر پھر بھی اُسے ایک طرح کا اطمینان تھا۔ اپنے اوپر کسی قسم کی تکلیف اُٹھائے بغیر اگر کوئی شخص کسی کو تھوڑی دیر کیلئے خوش ہونے کا موقع دے تو ایک عجیب طرح کی خوشی محسوس ہوتی ہے۔ پریچرڈ نے اُسکی دعوت قبول کرتے وقت اپنے مخصوص انداز میں نہ کسی تعجب کا اظہار کیا تھا نہ ہچکچائی تھی۔ اس کا انداز بالکل نطری تھا۔ رچرڈ ہیرنگر کو تقریباً پانچ منٹ تک اسکا انتظار کرنا پڑا۔ اور جب وہ آئی تو اُس نے اپنا لباس تبدیل کر لیا تھا۔ اُس نے نیلے رنگ کی فراک پہن لی تھی جو رچرڈ ہیرنگر کے خیال میں نقلی ریشم کی تھی۔ اسکی ہیٹ سیاہ رنگ کی تھی۔ جس پر نیلا بروچ لگا ہوا تھا اور عمدہ لومڑی کی کھال اُس نے اپنے گلے میں لپیٹ رکھی تھی۔ رچرڈ ہیرنگر نے یہ دیکھکر اطمینان کا سانس لیا۔ کہ اس لباس میں نہ تو وہ بھدی معلوم ہوتی تھی نہ حد سے زیادہ بھڑک دار۔ اُس نے دل میں سوچا کہ پریچرڈ کو اُسکے ساتھ دیکھکر کوئی بھی یہ نہ کہہ سکے گا کہ "ہوم آفس" کا ایک ممتاز افسر اپنی خادمہ کو سنیما دکھانے جا رہا ہے۔

"مجھے افسوس ہے کہ آپ کو اتنا زیادہ انتظار کرنا پڑا۔"

"کوئی حرج نہیں۔" رچرڈ ہیرنگر نے خندہ پیشانی سے جواب دیا اور اُس کے لئے سامنے کا دروازہ کھولا۔ وہ اُس کے آگے آگے باہر نکل آئی۔ رچرڈ ہیرنگر کو یہ دیکھکر خوشی ہوئی کہ پریچرڈ اُس سے پہلے اور اُس سے آگے چلنے سے نہ ہچکچائی تھی۔ جس سنیما ہال میں وہ جا رہے تھے وہ مسٹر ہیرنگر کے فلیٹ سے زیادہ دور نہ تھا۔ وہ دونوں وہاں تک پیدل گئے۔ رچرڈ ہیرنگر موسم، سڑکوں کی حالت اور اڈولف ہٹلر کے بارے میں باتیں کرتا گیا اور پریچرڈ مناسب جواب دیتی گئی۔ سنیما ہال میں وہ اُس وقت پہنچے جب "بلکی ہاؤس" دکھایا جا رہا تھا۔ اس کو دیکھکر وہ دونوں اچھے موڈ میں

ہو گئے۔ [illegible] مسکراتے ہوئے کبھی نہ دیکھا تھا۔ [illegible] کے خوشی کے [illegible] محظوظ ہوا۔ اُس کو خوش دیکھکر خود ہیرنگر کو خوشی حاصل ہوئی۔ [illegible] شروع ہوئی۔ یہ واقعی بہت اچھی تصویر تھی اور ان دونوں نے نہایت دلچسپی اور انہماک کے ساتھ اُسے دیکھا۔ اس تصویر کے دوران میں رچرڈ ہیرنگر نے سگرٹ پینے کے لئے اپنا سگرٹ کیس نکالا اور محویت کے عالم میں پریچرڈ کے سامنے پیش کر دیا۔

"تھینک یو، سر" کہہ کر اس نے ایک سگرٹ لے لی۔

رچرڈ ہیرنگر نے دیا سلائی جلائی اور پریچرڈ کی سگرٹ جلا دی۔ پریچرڈ کی آنکھیں تو پردہ سیمیں کی طرف لگی ہوئی تھیں۔ اُس نے رچرڈ کے اس فعل پر زیادہ توجہ نہ دی۔ فلم کے ختم ہو جانے پر وہ بھی دیگر تماشائیوں کے ساتھ باہر نکلے۔ اور "فلیٹ" کی طرف پیدل ہی واپس آئے۔ یہ رات نہایت پرسکون تاروں بھری رات تھی۔

"پریچرڈ! تمہیں یہ تصویر پسند آئی؟" رچرڈ ہیرنگر نے اس سے راستہ میں پوچھا۔

"بہت زیادہ۔ واقعی یہ بہت عمدہ تصویر ہے۔"

رچرڈ ہیرنگر کو دفعتاً کچھ خیال آیا۔

"ہاں پریچرڈ! سنو تو۔ تم نے آج رات کچھ کھایا بھی ہے؟"

"نہیں جناب، مجھے اتنا وقت نہ مل سکا۔"

"تب تو تمہیں اس وقت شدت کی بھوک لگ رہی ہوگی۔"

"گھر پہنچ کر میں تھوڑی سی پاؤ روٹی اور پنیر کھا لونگی۔ اور ایک پیالی قہوہ بنا لوں گی۔"

"یہ تو اچھا نہیں معلوم ہوتا۔"

فضا میں ہر طرف سرور و شادمانی کی کیفیت محسوس ہو رہی تھی اور جو لوگ اُن کے ساتھ سڑک پر چل رہے تھے یا سامنے سے آ رہے تھے وہ سب اس کیفیت سے مست نظر آ رہے تھے۔ رچرڈ ہیرنگر نے دل میں سوچا۔ جہاں سیر وہاں سوا سیر!

"پریچرڈ! تم میرے ساتھ کہیں چلکر تھوڑا سا کھانا کھاؤ گی؟"

"اگر آپ پسند کریں۔"

"آؤ۔"

اُس نے ایک ٹیکسی والے کو پکارا۔ وہ اس وقت کل بنی نوع انسان کے لئے ہمدردی کا جذبہ محسوس کر رہا تھا اور یہ ایسا احساس تھا جسے وہ پسند کرتا تھا۔ اُس نے ٹیکسی والے سے اُس ریسٹوران میں چلنے کو کہا جو "آکسفورڈ سٹریٹ" میں تھا اور

جس کا افتتاح ابھی ہوئی تھی۔ مگر اُسے یقین تھا کہ وہاں اس کا کوئی واقف کار نہ ہوگا۔ وہاں ایک آرکسٹرا بھی تھا اور رقص بھی ہوتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ پریچرڈ وہاں جاکر خوش ہوگی۔

جب وہ ایک میز کے پاس بیٹھ چکے تو ایک ویٹر (بیرا) اُنکے پاس آیا۔

"اس ہوٹل میں ایک عمدہ کھانا ہوتا ہے۔" رچرڈ ہیرنگر نے اس خیال سے کہا کہ پریچرڈ اُسے پسند کریگی "میری رائے تو یہی ہے کہ وہی کھایا جائے۔ تم کیا پیوگی؟ سفید شراب؟"

"مجھے جنجر بیئر بہت پسند ہے۔" پریچرڈ نے کہا۔

رچرڈ ہیرنگر نے اپنے لئے وہسکی اور سوڈے کا آرڈر دیا۔ پریچرڈ نے خوب اچھی طرح کھانا کھایا۔ ہیرنگر کو بھوک نہ تھی۔ مگر پریچرڈ کا ساتھ دینے کے لئے اُس نے بھی کھایا۔ جو تصویر وہ دونوں دیکھکر آئے تھے اس پر گفتگو ہوتی رہی۔ رچرڈ ہیرنگر نے محسوس کیا کہ اُس دن رات کو پریچرڈ کے بارے میں جو کچھ اُسکے دوست کہہ رہے تھے وہ غلط نہ تھا۔ پریچرڈ بدصورت عورت نہ تھی اور اگر کوئی اُسے رچرڈ کے ساتھ دیکھ بھی لیتا تو اُس کا مضحکہ نہ اُڑاتا۔ وہ سوچنے لگا کہ جب وہ اپنے دوستوں کو یہ بتائیگا کہ کس طرح وہ اُن کی لاثانی پریچرڈ کو سنیما دکھانے اور اُس کے بعد کھانا کھلانے ریسٹوران لے گیا تھا تو کیا کیا چہ میگوئیاں ہونگی۔ ہال میں لوگ بینڈ کی گت پر رقص کر رہے تھے۔ اور اُن کو دیکھکر پریچرڈ کے لبوں پر ہلکا ہلکا تبسم نمودار ہورہا تھا۔

"کیا تمہیں رقص پسند ہے؟"

"جب میں چھوٹی سی تھی تو اچھا خاصا رقص کرلیتی تھی۔ مگر شادی کے بعد میں نے رقص کرنا چھوڑ دیا تھا۔ میرے شوہر کا قد مجھ سے کچھ کم تھا اور میرا خیال ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ جب تک شریکِ رقص عورت سے مرد قد میں زیادہ نہ ہو رقص اچھا نہیں معلوم ہوتا —————— مجھے امید ہے کہ آپ میرا مطلب سمجھ گئے ہونگے۔ اور اب تو میرا خیال ہے کہ میری عمر رقص کرنے کی نہیں رہی۔"

رچرڈ ہیرنگر کا قد لانبا تھا۔ وہ دونوں ناچتے ہوئے اچھے معلوم ہونگے رچرڈ کو ناچنے کا بہت شوق تھا اور وہ بہت اچھا رقاص تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ پریچرڈ کو اپنے ساتھ رقص کرنے کی دعوت دیکر اُسکو پریشانی میں ڈالے۔ حد سے زیادہ تواضع کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا۔ لیکن آخر اس میں حرج ہی کیا ہے؟ پریچرڈ کی کتنی بے کیف زندگی تھی۔ آخر اُس سے کہنے میں حرج ہی کیا ہے؟ اور پھر وہ اتنی سمجھدار تھی اگر اُس نے مناسب خیال نہ کیا تو ضرور کوئی عذر پیش کردیگی۔ جب بینڈ پھر سے شروع ہوا تو اُس نے کہہ ہی دیا۔

"پریچرڈ! رقص کروگی؟"

"مجھے مدت سے مشق نہیں رہی۔"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"اگر آپ کی مرضی کے خلاف نہ ہو تو میں حاضر ہوں۔" اُس نے اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ اُسے رقص کرنے سے انکار نہ تھا صرف یہ ڈر تھا کہ وہ رچرڈ ہیرنگر کے قدم کا ساتھ نہ دے سکے گی لیکن اب تو وہ کھڑی ہوچکی تھی۔ وہ دونوں رقص کرنے لگے۔

"ارے پریچرڈ تم تو بہت اچھا رقص کرلیتی ہو!"

"میں تو بھول چکی تھی۔ مگر مجھے پھر سے رقص کرنا آرہا ہے۔"

اگرچہ وہ بہت بلند بالا عورت تھی مگر اُس کے قدم ہلکے پڑتے تھے اور اس کی حرکات موسیقی کے زیر و بم سے ہم آہنگ تھیں۔ ہیرنگر نے دیواروں پر لگے ہوئے شیشوں پر نظر ڈالی اور سوچا کہ وہ دونوں ناچتے ہوئے بہت اچھے معلوم ہورہے تھے۔ شیشے ہی میں ان دونوں کی نگاہیں ایک دوسرے سے دوچار ہوئیں۔ رچرڈ نے سوچا کیا وہ بھی وہی سوچ رہی ہے جو وہ سوچ رہا تھا۔ دو تین رقص کر چکنے کے بعد رچرڈ نے واپس چلنے کو کہا۔ ہوٹل کا بل ادا کرکے وہ پریچرڈ کے ساتھ باہر نکلا اور ایک ٹیکسی میں بیٹھکر وہ دونوں دس منٹ میں گھر پہنچ گئے۔

"میں عقبی دروازے سے اُوپر چلی جاؤنگی۔" پریچرڈ نے کہا۔

"اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ تم میرے ساتھ لفٹ میں چلی آؤ۔"

وہ اپنے ساتھ اُسے "لفٹ" میں لے گیا۔ اور لفٹ چلانے والے کو ایک پرغضب نگاہ سے دیکھا تاکہ وہ یہ خیال کرکے متعجب نہ ہو کہ وہ اتنی رات گئے اپنی خادمہ کے ساتھ کہاں گیا ہوا تھا۔

رچرڈ نے اپنی کنجی سے دروازہ کھول کر اُسے اپنے فلیٹ میں داخل کردیا۔

"اچھا گڈ نائٹ سر" پریچرڈ نے کہا۔ "آپ کی عنایت کا بہت بہت شکریہ۔ میری یہ شام بہت اچھی گذری۔"

"شکریہ پریچرڈ! اگر میں اکیلا سنیما جاتا تو میری شام بھی بے لطف گذرتی۔ مجھے اُمید ہے کہ آج باہر نکل کر تم خوش ہوئیں!"

"جی ہاں۔ اتنی زیادہ کہ میں اپنی خوشی کا اظہار نہیں کرسکتی۔"

رچرڈ ہیرنگر بہت مسرور ہوا اور اپنے آپ سے مطمئن تھا۔ اُس نے واقعی بڑی فیاضی اور رحمدلی کا کام کیا تھا۔ کسی کے دل کو خوش کرنا بڑا ثواب کا کام ہے۔ اُسکے دل میں کل نوعِ انسانی سے محبت اور ہمدردی کے جذبات اُمنڈ آئے۔

"گڈ نائٹ پریچرڈ" اُس نے کہا اور چونکہ وہ بہت خوش تھا اس لئے اُس نے اپنا ہاتھ پریچرڈ کی کمر میں حائل کرکے اُس کے لبوں کو بوسہ دیدیا۔ اُسکے ہونٹ

بہت شیریں اور نرم تھے۔ رچرڈ کے ہونٹ کچھ دیر تک ان نرم ہونٹوں سے پیوست
رہے۔ پرچرڈ نے بھی بوسہ کا جواب دیا [illegible] ایک تندرست اور جوان
عورت کا پُرجوش اور نرم و گرم بوسہ تھا۔ اور رچرڈ اُس کی لذت میں کھو گیا۔
اور اُس نے پرچرڈ کو اور زور سے اپنے سے چمٹا لیا۔ پرچرڈ نے اپنی باہیں اس کے
گلے میں ڈال دیں۔

عام طور پر صبح کو وہ اُس وقت تک سوتا رہتا تھا جب تک پرچرڈ
اُسکی ڈاک لیکر نہ آجاتی۔ مگر آج وہ ساڑھے سات بجے صبح ہی جاگ اٹھا۔ اُسے
ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ جسے وہ اچھی طرح سمجھ نہ سکا تھا۔ اسکی عادت
تھی کہ اپنے سر کے نیچے دو تکیے رکھ کر سوتے۔ اچانک اُسے محسوس ہوا کہ اسکے سر کے
نیچے ایک ہی تکیہ ہے۔ تب اُسے سب کچھ یاد آگیا۔ اور گھبرا کر اُس نے چاروں طرف دیکھا۔
دوسرا تکیہ اُس تکیہ کے برابر رکھا ہوا تھا جو اُس کے سر کے نیچے تھا۔ اُس نے دل
ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا۔ کہ اُس پر کسی کا سر نہ تھا۔ گو یہ بالکل ظاہر تھا کہ کسی کا
سر اُس تکیہ پر ضرور رہا ہے۔ اُس کا دل ڈوبتے سا لگا۔

"او خدا! میں نے یہ کیا حماقت کی۔" اُس نے اتنی زور سے کہا کہ اگر کوئی
پاس ہوتا تو سن لیتا۔ "میں یہ کیا کر بیٹھا! مجھے ہو کیا گیا تھا؟"

وہ تو اس قسم کا آدمی تھا ہی نہیں جو نوکرانیوں کے ساتھ اس قسم کی حرکت
کرتے ہیں۔ پھر یہ کیا ہو گیا؟ اُسکی عمر اور پوزیشن کو دیکھتے ہوئے یہ کیسی شرم
کی بات ہے؟ اُسے خبر نہ تھی کہ پرچرڈ کب اسکے پاس سے اٹھ گئی۔ وہ اُس وقت
سو رہا ہوگا — یہ بھی تو نہ تھا کہ وہ پرچرڈ کو بہت زیادہ پسند کرتا ہو۔ وہ اِس
قسم کی عورت نہ تھی جو اُسکے جنسی جذبات کو برانگیختہ کرتی ہو۔ وہ خود اپنے دوستوں سے
کہہ چکا تھا کہ پرچرڈ سے اُسے کچھ وحشت سی ہونے لگتی ہے۔ یہ اُس نے کیا پاگل پن
کیا؟ اور اب کیا ہوگا؟ یہ تو ظاہر تھا کہ اب وہ اُسے اپنی ملازمت میں نہ رکھ سکیگا۔
اور پھر یہ بھی انصاف سے بعید معلوم ہوتا تھا کہ اس بیچاری کو ایسے قصور کی بنا پر نکال دیا
جائے جس میں وہ خود بھی اتنا ہی شریک تھا جتنی وہ تھی۔ یہ کتنی زبردست حماقت تھی۔
کہ محض تھوڑی دیر کے لطف کے واسطے اپنی بہترین خادمہ کو اس طرح کھو دیا جائے۔

"یہ سب اُس کم بخت دل کا قصور ہے جو دوسروں کی خوشی میں اضافہ کرنے
کے لئے تڑپا کرتا ہے۔" اُس نے انتہائی درد و کرب کے لہجہ میں ٹھنڈی سانس
بھرتے ہوئے کہا۔

اور اب اُسے کوئی دوسری خادمہ یا ملازم ایسا نہ ملیگا جو اُس کے کپڑوں کو
اتنی اچھی طرح رکھ سکے یا اُس کے چاندی کے برتنوں کو اتنی احتیاط سے صاف کر سکے

پرچرڈ کے قائم رہنے کے [illegible]
کافی اہمیت رکھتی تھی۔ مگر اب [illegible]
[illegible]
بہتر معلوم ہوتا ہے کہ اُسے ایک معقول رقم بطور تحفہ کے دیدی جائے اور اُس کے
ہاتھ ایک اچھا سرٹیفکیٹ دیکر اُسے رخصت کر دیا جائے۔ اسباب تو وہ رکھ ہی
آتی ہی ہوگی۔ نہ معلوم اُس کا طرز عمل کیسا ہو؟ نہ جانے وہ اپنے تعلقات کے
ساتھ بڑھانے کیلئے چھیڑ چھاڑ کرتی آئے گی یا ناز و انداز دکھائے گی۔ شاید آج وہ
ڈاک لانے کی بھی زحمت گوارا نہ کرے۔ ہو سکتا ہے کہ اگر وہ گھنٹی بجائے تو اُس کے
جواب میں مسز جیکی اُوپر آکر کہے۔ "پرچرڈ ابھی تک نہیں اٹھی۔ وہ رات کو دیر
تک تفریح کرنے کے بعد سوئی ہے۔" یہ کتنا بُرا ہوگا۔

"میں بھی کتنا کمینہ اور قابل نفرت انسان ہوں۔" اُس نے اپنے
آپکو ملامت کرتے ہوئے کہا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ بہت زیادہ گھبرا گیا۔

"آجاؤ۔" اُس نے بمشکل مری ہوئی آواز میں کہا۔ اس وقت اس سے
بڑھکر دنیا میں شاید ہی کوئی اور مصیبت زدہ انسان ہوگا۔

پرچرڈ حسب معمول وقت پر اندر آئی۔ وہ اپنا وہی یونیفارم کا لباس پہنے
ہوئے تھی۔ جو وہ روزانہ صبح کو پہنا کرتی تھی۔

"گڈ مورننگ سر" اُس نے کہا۔

"گڈ مورننگ۔"

پرچرڈ نے کھڑکیوں کے پردے سرکائے اور رچرڈ کو اُس کے خطوط
دئیے۔ اُس کا چہرہ پر کسی قسم کے جذبات کے اثرات موجود نہ تھے۔ وہ بالکل ویسی
ہی نظر آرہی تھی جیسی روز نظر آیا کرتی تھی۔ اسکی چال ڈھال اور حرکات ویسی ہی محتاط
اور سنجیدہ تھیں جیسی ہر روز رہا کرتی تھیں۔ نہ اُس نے رچرڈ کی آنکھوں میں آنکھیں
ڈال کر بات کرنے کی کوشش کی نہ اُسکی نگاہوں سے بچنے کی۔

"کیا آپ وہ خاکستری سوٹ پہنیں گے جو کل ہی درزی کے یہاں سے آیا ہے؟"

"ہاں۔"

رچرڈ نے اپنے خطوط پڑھنے کا بہانہ کیا۔ مگر وہ کنکھیوں سے اُسے دیکھتا
جاتا تھا۔ پرچرڈ کی پشت اُسکی طرف تھی۔ اُس نے اُسکی ویسٹ کوٹ اور پتلون
اٹھا کر کرسی پر رکھے۔ پھر اُسکی قمیص سے وہ بٹن نکالے جو وہ گزشتہ شب کو
لگائے ہوئے تھا اور اُن کے بجائے نئے "اسٹڈ" لگا دئیے۔ پھر اس نے صاف
ستھرے موزوں کی ایک جوڑی نکالی اور اُن ہی کے ہمرنگ [illegible]

[illegible] (Braces) [illegible]
کو اس نے پتلون کے پیچھے کے بٹنوں میں لگا کر کسا۔ پھر اس نے اس کا [illegible]
[illegible] ایک [illegible] شکل جو اس سوٹ کے ساتھ موزوں معلوم ہوتی تھی۔
اس کے بعد اس نے رچرڈ کا پہنا ہوا سوٹ اٹھا کر اپنے بازو پر ڈال لیا اور اسکے
[illegible] گئے۔

"آپ پہلے ناشتہ کریں گے یا غسل ؟"

"میں پہلے ناشتہ کروں گا۔"

"بہت اچھا۔"

اس کے بعد وہ اپنے خاموش اور سنجیدہ انداز میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کمرے کے باہر چلی گئی۔ اس کے چہرہ سے کسی قسم کے جذبات مترشح نہ ہوتے تھے۔ اس کا لہجہ وہی تھا جو ایک خادمہ کا آقا کے سامنے ہونا چاہیئے۔

[illegible] گذرا تھا اس کی حقیقت گویا کسی خواب یا افسانے سے زیادہ نہ تھی۔ یہ رچرڈ کے رویہ سے بالکل ظاہر نہ ہوتا تھا کہ اسے گذشتہ رات کی کوئی بات بھی یاد رہی تھی یا نہیں۔

رچرڈ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اب سب کچھ ٹھیک رہے گا۔ یہ رچرڈ کے جانے کی ضرورت پیش نہ آئے گی۔ وہ شالی جنسنم کی خادمہ تھی۔ اسے یقین تھا کہ یہ رچرڈ ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی گفتگو یا حرکات سے کسی پر یہ ظاہر نہ ہونے دیگی کہ ایک رات دن ان دونوں کے تعلقات مالک اور خادمہ کے تعلقات سے مختلف رہے تھے۔

رچرڈ ہیرنگر کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

اثرِ ماہ

(از جناب غلام ربانی صاحب تاباںؔ)

چشمۂ شبنم میں جیسے دھل رہی ہے چاندنی
رفتہ رفتہ تیرگی میں گھل رہی ہے چاندنی

پھیلتا جاتا ہے دُنیا پر حسیں خوابوں کا جال
جس طرح شاعر کے پُر اسرار آوارہ خیال

ایک بے پایاں فسوں طاری ہے زیرِ آسماں
لے رہا ہے درد کا مارا شباب انگڑائیاں

کیف و مستی کا وفورِ بیکراں اعصاب میں
بہہ رہی ہے زندگی جذبات کے سیلاب میں

یہ درخشاں چاندنی راتیں یہ لمحاتِ جنوں
کس کے ہاتھے جائیگا یارب تمناؤں کا خوں

علم

(از جناب قیسی رام پوری)

قاسم نے نصاب کو سامنے رکھکر اپنا مستقبل بنانا شروع کیا۔ ایک قاسم ہی کیا اس سرد و گرم ہندستان میں ہر طالب علم مقررہ کتابوں پڑھ کر حاصل کرنے پر مجبور ہوکر مستقبل بناتا ہے۔ بحث اس سے نہیں ہے کہ یہ ضخیم یا چھوٹی چھوٹی کتب بجائے خود ایک گنجلک ہیں۔ شکایت (اگر شکایت کیسی) یہ ہے کہ پھر بھی سب سے سکول، کالج اور یونیورسٹیاں بھری ہوئی نظر آتی ہیں۔ قاسم مستقبل بنا رہا تھا۔ میٹرک میں کم از کم اتنے نمبر لانے تھے کہ ان کی مجموعی تعداد کی چوتھائی تو تنخواہ ملے۔ مگر تحصیل علم کا تنخواہ سے کیا تعلق؟ سہل سا سوال ہے یہ کتنی اچھی بات ہے کہ مجودہ کورس کو پی کر جسم میں چاہے علمی سکت پیدا نہ ہو مگر دفتروں میں فٹ ہونے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ آپ نے اشتہارات تو پڑھے ہی ہونگے "ہنر بھی سیکھو اور تنخواہ بھی لو ———" کرم ہے۔

باپ کا جس قدر ٹھکا ٹھکایا سا سرمایہ تھا قاسم نے میٹرک کی بھٹی میں جھونک دیا تھا۔ یہ بھٹی نہ صرف سرمایہ ہی چاٹ گئی تھی۔ اس میں قاسم کی صحت، عقل و شعور بھی جل گئے تھے۔ ہاں کتابیں محفوظ تھیں۔ نصاب تو قائم النار ہے۔

"کیا ہے ——؟" افسر نے دریافت کیا

"میں نے جناب کے محکمہ میں ملازمت کی درخواست دے رکھی ہے۔" قاسم نے کہا۔

"ابھی تو کوئی جگہ نہیں ہے"

"اس زمانۂ جنگ میں آسامیوں کی کمی نہیں۔ اگر آپ چاہیں تو مجھے بھی کہیں کھپا سکتے ہیں۔"

"ٹائپ آتا ہے؟"

"جی نہیں"

"پہلے کہیں کام کیا ہے؟"

"جی نہیں۔"

"میٹرک میں کیا کیا سبجیکٹ تھے؟"

اس تعلیم [illegible] تو پھر قاسم کو اس تعلیم کے لئے تیار کیوں نہیں کیا جاتا وہ بھاگا بھاگا آنگ رہا ہے۔ قاسم نے دل میں کہا اور مایوس ہوکر باہر آگیا۔

آخر چند روز کی دفتر گردی کے بعد اسکو ایک آسامی مل گئی۔ اور وہ روزانہ دفتر جانے لگا۔ کبھی وقت پر کبھی دیر سے۔ وہ شروع سے سیدھا سادہ لا ابالی قسم کا انسان تھا۔ دفتر میں بھی اسکا یہ کردار نمایاں رہا۔ افسر کے پاس شکایات پہنچیں۔ اسکو تنبیہہ کی گئی اور کام سے لاد دیا گیا۔ اس نے اس کو ظلم سمجھا۔ چند روز بعد آخر اس ظلم کی تاب نہ لاکر اس نے استعفیٰ دے دیا۔

نصاب نے ایفائے وعدہ نہ کیا۔ ہوسکتا ہے کہ فطرت نے نصاب سے مطابقت نہ کی ہو مگر کیا وہ نصاب نصاب ہے جو کردار سازی کی قوت سے خالی ہو۔ قاسم ابتدائی تعلیمی مدارج طے کرتا ہوا جب میٹرک میں پہنچا تھا تو اس وقت بھی اس کا کردار تقریباً ویسا ہی تھا جیسا ابتدائی جماعتوں میں۔ اساتذہ ہر ماہ تنخواہ لیکر اپنا حق تدریس ادا کئے جا رہے تھے۔ اور یونیورسٹیاں مختلف کورس تبدیل کرکے اپنا فریضۂ نگرانی و سرپرستی ادا کئے جا رہی تھیں۔ والدین ان عظیم الشان مدرسوں کی آغوش میں اپنی اولادوں کو پہنچا کر خیال ادب و تربیت سے اپنے کو سبکدوش سمجھے جا رہے تھے۔ غرض تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری تھا اور اسکے صرف ایک مخصوص قسم کے سانچے میں سے نکل کر ہماری آئندہ نسلیں دھڑا دھڑ زندگی کے مارکیٹ میں کود رہی تھیں۔

قاسم کو پھر کسی دفتر میں نوکری مل گئی۔ اور اسکے نکھٹو پن پر پھر وہاں اس پر "ظلم" ہوا اور پھر وہاں سے بھی اسکو نکل جانا پڑا۔ اس طرح نفرتوں کے تانتے سے گزرتا ہوا وہ کچھ عرصہ بعد ایک ایسی آگاہی بخش منزل تک آگیا جہاں پہنچ کر اس نے اپنے اب تک کے تمام "مظالم" کے اثرات، وجوہ و اسباب کا عرفان و علم حاصل کرلیا۔ یہ گویا اسکی ذہنی یا نجات کا دن تھا۔

ان احساسات و بیداریوں کے بعد ناممکن تھا کہ اسکا کیریکٹر نہ بدلتا۔ چنانچہ کم و بیش اس نے اپنی روح پر سے ان تمام کمزوریوں کو جھاڑ ڈالا یا جھاڑ ڈالنے کی کوشش کی جو اس کو اب تک تختۂ ظلم بنائے ہوئے تھیں۔ اب وہ جس محکمہ میں گیا وہاں اس نے ڈٹ کر کام کیا۔ جس صیغہ میں پہنچا وہاں اپنی کفایت و کمزوری کو دور رکھا۔ جب غلاظت نہ ہوگی تو بیماریاں از خود نہیں آئیں گی۔ جب گندگی نہ ہوگی تو وبا کے جنم لینے کے امکانات بھی نہ رہیں گے۔

وہ سنگا و معیشت و معاشرت میں قوموں پر بھی وہ تمام ادوار گزرے

جہاں بہت ... ایک حد ہے اور علامت ... مسلسل۔ جن ذہنوں کو غلط سیاست مل گئی ہے وہ حکومت کا گلہ کرنے کی بجائے اپنی غلط سیاست کی اور اس سے زیادہ کاذب اپنی ذہنیت کی شکایت کریں تو اچھا ہے۔ قوم کی اگر عادات سیاسیہ پر ظلم ہوا ہے تو اُس کو دیکھنا چاہیئے کہ آگے جا کر وہ ظلم اسباب اور مظلومیت کی کمزوری پر کس قدر عبور حاصل کر چکی ہے یا اسکو اول کر چکی ہے۔ قاسم کو متعدد دفتروں کے مظالم نے تنگ کر دیا تھا۔ حالانکہ ظالم کی جانب سے ظلم کو دعوت اسکی کمزوریاں ہی دے رہی تھیں۔ جب اس نے اپنے اندر سے داخلی ظلم پرستی کو نکال پھینکا تو وہ آزاد ہو گیا۔ مظلومیت اس سے علیحدہ ہو گئی۔ قومیں اب تک ظلم پر ٹوٹے جاتی ہیں اور ظالم کو کوستے جاتی ہیں۔ حاکم کی آنچ اور تعدی کے جبر کے باوجود اپنی سیرتوں اور ذہنیتوں کو نہیں بدلتیں۔

اب قاسم خود ایک بہت بڑا افسر ہو گیا تھا۔ ظلم کی انقلاب انگیز قوت کا تماشہ دیکھ چکا تھا۔ چنانچہ اُس نے بھی اپنے ماتحتوں پر ظلم کرنا شروع کر دیا۔

"یہ کیا ہے؟" اُس نے ایک ٹائپ شدہ کاغذ پر کے دیتے پر انگلی رکھکر ہیڈ کلرک سے دریافت کیا۔

"ٹائپسٹ سے دریافت کروں گا جناب۔" ہیڈ کلرک نے کہا۔

"اُس پر دس روپے اور تم پر پانچ روپے جرمانہ۔" قاسم نے کہا۔

اس کے بعد سے کوئی کاغذ داغ دار نہ آیا۔

"آج دیر سے کیوں آئے ہو؟" اُس نے ایک ماتحت کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"آج ہی اتفاق سے دیر ہو گئی۔" اُس نے جواب دیا۔

"تین ماہ تک رخصت نہیں لے سکتے۔" قاسم نے حکم دیا۔

آئندہ سے ہر شخص وقت پر آنے لگا۔

"یہ بِل غلط کس طرح پاس ہو گیا؟" قاسم نے سپرنٹنڈنٹ سے دریافت کیا۔

"متعلق اکاؤنٹنٹ سے دریافت کرونگا۔" سپرنٹنڈنٹ نے جواب دیا۔

"تم معطل اور وہ برخاست۔" قاسم نے میز پر گھونسہ مار کر کہا۔

آئندہ سے بل خاص اہتمام سے تیار ہونے لگے۔

بہت سی اس قسم کی غلطیاں قاسم نے پکڑیں اور آئندہ کیلئے انکے سر اٹھانے کے امکانات بند کر دیئے۔ مگر اس ستم کا طرزِ عمل ایک حد پر پہنچ کر خطرناک بن گیا۔ ظلم اصلاح تو کرتا گیا مگر زخم بھی پیدا کرتا گیا۔ نشتروں سے مواد تو نکلتا رہا۔ مگر گھاؤ اتنے گہرے پڑ گئے کہ اُن پر محض پٹی باندھ دینا کافی نہ ہوا۔ سڑ اُٹھے۔ بگڑ اُٹھے۔ جب اُن سے نکل کر تعفن پھیلی تو بہت سے مر گئے اور ان مرنے والوں میں نشتر دہندہ بھی تھا۔ مرنے والوں نے اُسے بھی نہ چھوڑا۔ درد حد سے بڑھکر دوا ثابت نہ ہوا۔

جب تک فرد پر ظلم ہوتا رہا وہ انفرادی طور پر اس کو سہہ کر اپنی اصلاح کرتا رہا۔ لیکن جب یہ فرد جمع ہو کر جماعت بن گیا تو ظلم رسیدہ جماعت اپنی سنتِ دیرینہ دُہرانے سے باز نہ رہ سکی۔ یہ یورپ، یہ ایشیا، یہ روس ــ یہ براعظم یہاں آکر سب ایک ہی تاریخ بنا لیتے ہیں۔ سرکشی، خون، موت، نشتر ــ ظلم ــ فرعون، نیرو، جولیس سیزر ــ زار!!

دُولھا

(از محترمہ حمیدہ سلطانہ بیگم صاحبہ)

زبیدہ کے دروازے پر آج شہنائیاں اور بین باجے شادی کے مدھر نغمے بکھیر رہے تھے۔ اور گھر کے آنگن میں محلّے کی تمام لڑکیاں ڈھولک کے ساتھ سہاگ گیت گا رہی تھیں۔ اُن کی دلکش آواز دل میں کتنا رس بھرتا تھا اور دوشیزگی کے تڑپ میں بکھرے ہوئے چہروں پہ کتنا نور! لیکن زبیدہ کی جوانی ان سب سے بڑھکر دلکش تھی۔ خدا کی دین تھی۔ ایک غریب بیوہ کی لڑکی اور اتنی منموہنی۔ جو دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا۔ لڑکی تھی کہ گدڑی کا لعل۔ اپنے پھٹے پرانے کپڑوں میں اُسکا دلربا حسن اپنی آب و تاب سے زریں ملبوس والیوں کو مات کر رہا تھا۔ اسکی پیاری صورت پہ ہی تو دیکھ کر قصبہ کا سب سے بڑا سوداگر اُس سے شادی کر رہا تھا (تیسری شادی) اور آج اس کے شکستہ چھوٹے سے گھر کے سامنے والے میدان میں ایک بڑے سے مکلف شامیانے کے نیچے قصبے کے تمام معزز لوگ بیٹھے تھے۔ ایسی بڑی بارات اس غریب محلّے میں اس سے پہلے کبھی نہ آئی تھی۔

بری کے جوڑوں کی کشتیوں اور مٹھائیوں کے خوانوں نے چھوٹے سے گھر میں اتنی جگہ گھیر لی تھی کہ سب مہمان عورتیں کھڑکی کھڑکی پھر رہی تھیں۔ اُس کی ماں فخر و ناز سے ایک ایک عورت کو قیمتی زرتار لباس اور مرصع بیش بہا زیور دکھا رہی تھی۔ عورتیں ان چمکدار لباسوں اور جگمگاتے زیوروں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھیں۔ اور ساتھ ہی زبیدہ کی قسمت پر رشک کرتی جاتی تھیں

ایک بولی "نصیب ہو تو زبیدہ کا سا۔ کنوارپنے میں پیٹ بھر روٹی نصیب نہیں ہوئی لیکن دُولہا ملا تو ایسا امیر کبیر کہ ساری عمر راج کریگی۔ اللہ جہان کی بیٹیوں کو ایسا نصیب دے۔"

دوسری نے کہا "بیچاری چاندی کی چوڑیوں کو بھی ترستی تھی اور اب سونے کے تین تین گہنے ہیں۔ ہاتھ تو ان کڑے اور چوڑیوں سے ہی بھر جائیں گے۔ جڑاؤ کنگن کہاں پہنے گی۔ اور بازو بند بھی تو ہیں۔"

تیسری نے کہا "اے خالہ! یہ چندن ہار تو دیکھو، کتنا بڑا سا ہے اور کیسا خوش وضع اور سرخ نگینہ اس کی مٹھلی میں کتنا بھلا لگ رہا ہے۔ اور گلوبند بھی بہت بھاری ہے۔"

خالہ ابھی تمہاری [illegible] جڑے ہیں۔ اس میں لعل و موتی [illegible] زبیدہ بے حد پیاری لڑکی اور پیاری ہے۔ اور تم بھی سادہ نہیں ہو [illegible] بڑی قسمت والی لڑکی ہے۔"

کانوں کے یہ جڑاؤ جھمکے بالکل نئی وضع کے ہیں۔ حیدرآباد میں ایسے ہوتے ہیں۔ اس نگوڑے قصبے میں کہاں رکھے ہیں ایسے سبک اور اچھے نگینے گہنے۔ سوداگر صاحب تو دُور دُور جاتے ہیں نا، اس لئے جگہ جگہ سے زیور اکٹھا خرید لاتے ہیں۔ ان زیوروں کو پہن کر ہماری زبیدہ پری لگے گی پری۔

زبیدہ کو سہیلیوں نے دلہناپے کا سرخ جوڑا پہنا کر عطر سہاگ سے بسا دیا تھا۔ اب چونکہ رخصت کا وقت قریب تھا اس لئے دیکھنے والی عورتوں کے ہجوم کے سامنے سے زبیدہ کی ماں نے زیور ہٹا کر اُسکو پہنا دیئے۔ سر سے پاؤں تک یہ سنہرے چمکتے ہوئے زیور پہن کر سچ مچ زبیدہ کا دلکش حسن جگمگا اُٹھا۔ اسکے کندنی رنگ کو شباب پوشی کے نشے نے اور بھی جلا دیدی۔ وہ اس قیمتی لباس و زیور میں ایک جگمگاتا ہوا تارا معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کو اپنی خوش قسمتی پہ ناز تھا۔ کیف و سرور سے اُس کا دل رقص کر رہا تھا۔ آج اسکی تمام آرزوئیں پوری ہوگئی تھیں۔ اسکی ایک سہیلی کے پاس بھی اتنا قیمتی زیور تھا نہ ایسے زرتار لباس۔

کھانا کھانے کے لئے عورتوں کا ہجوم دُور ہوا تو اُس نے ایک سہانی بھولی نظر آئینے پر ڈالی۔ اپنی دلربا جوانی کا عکس دیکھکر وہ خود جھوم گئی۔ آج اس شہانے لباس اور ان چمکتے ہوئے زیوروں نے اُس کے حُسن کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ اُسے یاد آیا، پچھلے سال اُسکی پیاری سہیلی حسینہ بیاہی گئی تو اُس نے کس حسرت سے اُس کے چندن ہار اور کڑوں کو دیکھا تھا۔ آج یہ چیزیں وہ پہنے ہوئی تھی اور اُس سے زیادہ بہت کچھ۔ پھر اُسے حسینہ کے دُولہا کی شکل یاد آئی۔ کھلتی ہوئی سانولی رنگت کا چھریرے جسم والا شرمیلا نوجوان۔ جسکے تیکھے خد و خال دل میں کھبے جاتے تھے۔ اور جو محلّے کی سب کنواریوں کا مرکز نظر بنکر رہ گیا تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کی سندیل اور پھولوں کے سہرے کی لڑیوں میں اُسکی منموہنی صورت کتنی دلکش لگ رہی تھی۔ ایسا ہی ہوگا میرا دُولہا بھی۔ اُس نے خیال کیا۔ اس خیال کے ساتھ دوشیزگی کی حیا نے اُسے لجا دیا۔ اور دولہا کے تصور سے ہی شرما کر شاخ گل کے مانند لچک گئی۔

شہنائیاں اب زور سے بجنے لگیں۔ اور اس کی سہیلیوں نے وداع کا گیت ڈھولک کے ساتھ گانا شروع کر دیا۔ زبیدہ کا دل اس خیال سے زور زور سے دھڑکنے لگا کہ اب رخصت کا وقت آپہنچا اور ماں کے چھوٹنے کے

[illegible] کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔ لیکن یہ خوشی کے [illegible] تھے۔

چچا، ماموں اور قریب سب رشتہ دار مرد زبیدہ کو رخصت کرانے کے لئے گھر میں آگئے تھے۔ اور وہ باری باری سب سے گلے مل کر رسمی طور پر رو رہی تھی۔ یکایک اسکی نظر اپنے گھر کے چھوٹے سے دروازے سے جا ٹکرائی جہاں ایک ادھیڑ عمر کا شخص کھڑا تھا جسکی بہار شباب پر بڑھاپے کی خزاں کا تسلط ہوئے بھی کئی موسم گذر چکے تھے۔ اس کی مہندی سے رنگی ہوئی داڑھی سینے پر جھول رہی تھی۔ اور گہرے سانولے رنگ کے چہرے پر بیشمار جھریاں پڑ گئی تھیں۔ سرخ رنگ کی پگڑی اور بھاری شیروانی میں یہ آدمی بالکل کسی ادنیٰ درجہ کے تھیٹر کا مسخرا معلوم ہو رہا تھا۔

بس ان ہی کے مضحکہ خیز لباس اور احمقانہ اداؤں کو دیکھکر زبیدہ مسکرا دی اور قریب کھڑی ہوئی اپنی ایک سہیلی سے سرگوشی کے انداز میں پوچھ ہی بیٹھی۔ "اری آمنہ یہ کون بھانڈ بنا سامنے کھڑا ہے۔ کیا چچا جان تو نہیں ہیں؟ وہی سوانگ بنا کر آتے ہیں۔ رنگ برنگے کپڑے پہن کر۔"

"اے واہ چچا جان تو وہ کھڑے ہیں زعفرانی شیروانی پہنے۔ خوب چچا بنایا تم نے۔ اور بھانڈ بھی کہدیا۔ یہ تو تمہارے دولہا ہیں۔" شوخ آمنہ چٹکی لیکر بولی۔

"دولہا!" اس کے منہ سے نکلا اور اسے ایسا معلوم ہوا کہ زمین و آسمان چکرا گئے۔ پیروں تلے سے زمین کو سرکتے ہوئے اس نے محسوس کیا۔ اور پھر وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر گر پڑی۔ عورتوں میں اس کی شرم کو سراہا جانے لگا۔ واہ لڑکی ہو تو ایسی شرمیلی۔ رخصتی کے وقت دفور شرم کے باعث غش آگیا۔ اسکی ماں کا سر فخر سے اور بھی بلند ہو گیا، کتنی حیا پرور ہے اسکی لاڈلی! لیکن دکھیا زبیدہ کے دل پر کیا گذری۔ اس کی خبر کسی نے نہ لی۔ اس کے سارے سنہانے خواب ایک دم برباد ہو گئے۔ تمناؤں اور آرزوؤں نے وہ رنگ محل جو اس نے شباب کی آغوش میں قدم رکھتے ہی تعمیر کرنا شروع کر دیئے تھے تمام تمام منہدم ہو گئے۔ اپنے سنہرے خوشنما قیمتی زیورات اسکو ہتھکڑیاں بیڑیاں معلوم ہو رہے تھے۔ چند لمحوں میں ہی اسکو ان بیش بہا زیوروں زرتار لباسوں سے نفرت ہو گئی جو اسکی معصوم انمول جوانی کی قیمت تھے۔ اسکے ارمان بھرے دل پر غم کی بجلی گر پڑی۔ ساری امنگیں خاکستر ہو کر رہ گئیں۔ اور اپنے بھرپور شباب کی بہار پر زردار بڑھاپے کی خزاں کا تسلط پا کر وہ غم سے نیم جان ہو گئی۔

ہوش میں آنے کے بعد اس کے کانوں میں چاہنے والی ماں کی آواز آئی وہ اس کو گلے سے لگا کر کہہ رہی تھی۔ "دل سنبھال بیٹی۔ اب میری عزت تیرے ہاتھ ہے۔ پرائے گھر جا رہی ہے۔ باپ دادا کی لاج کا خیال رکھیو۔ سنبھل کر قدم رکھیو۔" سنئے! اس وقت بھی ماں کو اپنی عزت کا، خاندان کی لاج کا خیال تھا۔ اور بیچاری زبیدہ کا دل جیسے دہکتی ہوئی آگ میں دانۂ سپند ڈال دیا گیا ہو۔ اس دل کی ماں کو پرواہ ہی کب تھی۔

"ہائے رے کیا کرے گی اب وہ!!" ڈولی میں بیٹھکر اس نے سوچا۔ اور اسکے روئیں روئیں سے ہزاروں خفتہ بے قراریاں جاگ اٹھیں۔ وہ روتی رہی، روتی رہی۔ اسے ایسا معلوم ہوا ساری کائنات اسکے ساتھ رو رہی ہے شہنائیاں بھی اور بین باجے بھی۔ سسرال جاتے وقت حسینہ کیسی خوش تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ لیکن لبوں پر حیا آفریں تبسم۔ اس لئے نا کہ اسے دولہا ملا تھا جو اس کے سپنوں کا راجہ تھا۔ لیکن زبیدہ کا دولہا!

اس کے دل سے پھر آہ نکلی۔ اور وہ دوبارہ ڈولی میں وفورِ غم کے باعث بے ہوش ہو گئی۔

ایک چینی افسانہ

سوئی تھاؤ

(از جناب ڈی پی بھٹناگر گشتہ دہرہ دون)

جب مینگ۔ ای کا تقرر مسٹر چنگ کے بچوں کے معلم کی حیثیت سے ہوگیا۔ تو اسے اپنا گاؤں اور اپنے والدین کا قرب چھوڑ کر نزدیک کے قصبہ میں جس میں مسٹر چنگ رہتے تھے جانا پڑا۔ اس زمانے میں آج کل کی طرح صاف ستھری سڑکیں اور آسان راستے نہ تھے۔ راہگذر جنگلی درختوں اور جھاڑیوں سے پٹے رہتے تھے۔ وقت رخصت مینگ۔ ای کے والد نے سفر کی مشکلات اور صعوبتوں سے آگاہ کرتے ہوئے چند بزرگانہ نصیحتیں بھی کیں۔ دیکھو بیٹا! ہمیشہ نیک راہ پر چلنا اور اپنا فرض نہایت جانفشانی اور ایمانداری سے انجام دینا۔ کبھی کسی عورت کے دام فریب میں آکر اس سے تنہائی میں ملاقات نہ کرنا۔ مینگ۔ ای ان اقوال زریں کو گرہ میں باندھ کر اپنے سفر پر روانہ ہوا۔ اور چند گھنٹوں کی مسافرت کے بعد مسٹر چنگ کے مکان پر جا پہنچا اور اگلے روز سے اپنے کام میں منہمک ہوگیا۔ چند ماہ گزر گئے۔ موسم بہار کا آغاز ہوا۔ ہندوؤں کے تیوہار "بسنت" کی طرح چینی لوگ بھی اس رت کا تیوہار "چاؤ" تیوہار مناتے ہیں۔ مینگ۔ ای نے اپنے والدین کے پاس جاکر تیوہار منانے کے لئے مسٹر چنگ سے چند روز کی رخصت کی درخواست کی اور چھٹی ملتے ہی وہ صبح سویرے اپنے گھر کی طرف روانہ ہوا۔ سورج ابھی ابھی طلوع ہوا تھا۔ اسکی ہلکی ہلکی زریں شعاعیں بارش انوار کر رہی تھیں۔ جنگل کا ہر درخت اور پودا تازگی اور حیات نو کا جامہ زیب تن کئے سر بلند کھڑا تھا۔ ہر برگ تازہ و گل نوشگفتہ فضا کے ہر ذرے کو معطر کر رہا تھا۔ باد نسیم کا ہر جھونکا کیف و سرمستی لئے ہوئے تھا۔ مینگ۔ ای جس راستے سے جا رہا تھا وہ جنگلی پودوں کے جھرمٹ اور درختوں کے گھنے تنوں کے درمیان ہو کر گزرتا تھا۔ آفتاب قدرے بلندی پر آگیا تھا۔ شعاعوں میں ناقابل برداشت تمازت پیدا ہوگئی تھی۔ مینگ۔ ای اس حدت سے بچنے اور ذرا آرام لینے کیلئے ایک درخت کے نیچے سبزے پر بیٹھ گیا۔ رفتہ رفتہ اس پر غنودگی طاری ہوگئی اور تھوڑی دیر میں ہی وہ گہری نیند میں غرق ہوگیا۔ جب اسکی آنکھ کھلی تو سہ پہر ہو چکی تھی۔

آفتاب نے [illegible] ہو رہا تھا [illegible] پتیوں کی آغوش میں غائب ہونے جا رہے تھے۔ مینگ۔ ای [illegible] اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ چند قدم ہی گیا تھا کہ اسے پیچھے سے [illegible] کسی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ گھوم کر دیکھا تو ایک حسین لڑکی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھ کر کہا۔ [illegible] یہ آپ ہی کی ڈبیہ ہے جس مقام پر آپ سو رہے تھے۔ وہیں پڑی تھی۔ میری مالکہ نے آپ کو دینے کیلئے مجھے دوڑایا ہے۔ لیجئے۔ یہ کہکر اس نے وہ چاندی کی ڈبیہ مینگ۔ ای کے ہاتھ میں رکھ دی اور چشم زدن میں [illegible] جھرمٹ میں غائب ہوگئی۔

حیرت زدہ مینگ۔ ای ایک لمحہ دم بخود کھڑا رہا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس ویرانے میں یہ حسین لڑکی کہاں سے آگئی۔ اس کی مالکہ کون ہوگی۔ یہاں تو کوئی عمارت بھی نظر نہیں آتی۔ مگر زیادہ دیر تک ان باتوں پر غور کرنے کی اسے فرصت نہ تھی۔ شام سے پیشتر ہی اسے اپنے مکان پر پہنچنا تھا۔ جھرمٹ کی طرف دوبارہ مڑ کر دیکھے بغیر وہ تیز روی سے اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

تیوہار منا کر مینگ۔ ای اپنی ملازمت پر واپس ہوا۔ وہ دانستہ اسی راہ سے جس سے وہ اپنے گھر گیا تھا واپس ہوا۔ اور اسی مقام پر آیا جہاں وہ اس دوپہر میں سویا تھا۔ اس نے ہر چہار طرف اس امید پر نظر دوڑائی کہ ممکن ہے جس خوبصورت لڑکی نے اسے اسکی ڈبیہ واپس کی تھی۔ اس سے ملاقات ہو جائے اور اسکے توسل سے اس لڑکی کی مالکہ تک جسکی اس نے اپنے دل میں ایک خیالی تصویر بنالی تھی۔ اور جسکو دیکھنے کا اشتیاق ہر لمحہ فزوں تر ہو رہا تھا رسائی ہو جائے۔ اچانک اسکی نظر ایک عمدہ عمارت پر پڑی۔ جو درختوں کے جھرمٹ سے پرے [illegible] دھوپ [illegible] میں چمک رہی تھی۔ وہ جلدی سے اس طرف بڑھا۔ مکان کے نزدیک پہنچ کر اس نے دیکھا کہ برآمدے میں ایک نہایت حسین مجسمہ شباب اسی لڑکی سے گفتگو [illegible] ہے۔ مینگ۔ ای کا دل دھڑکنے لگا۔ یہی تو ہے تیرے تصور کی رانی! تیرے تخیل کی ملکہ۔ اور اب تیرے عشق و [illegible] مینگ ای کے قدم وہیں جم گئے۔ جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہو۔ اس کا طلسم اس وقت ٹوٹا جب اسی شناسا لڑکی نے اچانک [illegible] کر

دونوں کے بدن ایک دوسرے کا سہارا لئے ہوتے۔ قدم ڈگمگاتے ہوئے بڑھتے، میں دو قدم پیچھے ہوتا اور مجھے ہر لمحہ یہ محسوس ہوتا کہ دلہن کی آگ دولھا کے دامن کو پکڑ رہی ہے۔ دُلہن شعلۂ جوالا ہوتی جا رہی ہے۔ اور دُولہا جھلسا جا رہا ہے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد دُولہن کے قدم بھاری پڑنے لگتے۔ وہ اپنی ہی حرارت میں پھنکنے لگتی۔ کبھی کبھی سانس کا تموج فضا کے ساتھ تھپیڑے لگانے لگتا۔ اُس وقت میں دُولہا پر نظر ڈالتا۔ ریاض کا چہرہ پیلا ہو جاتا، اُس کے رُخساروں کی جھریاں زیادہ چمکنے لگتیں۔ اُس کے ہاتھوں کی رگیں زیادہ اُبھر آتیں اور اُس کے قدم اس طرح پڑنے لگتے جیسے اُس پر بھاری بوجھ ہے۔ یا اُس کی کمر ٹوٹی جا رہی ہے۔ زیادہ دیر نہ ہوتی کہ دُلہن ہاتھوں کا پنکھا جھلتے واپس ہو جاتی۔ اس کی پیشانی پہ پسینہ کے قطرے ہوتے، اُس کا چہرہ کچھ پسینہ سے اور کچھ آہوں کے ابخرات سے بھیگا ہوتا واپسی میں دونوں الگ ہو کر چلتے۔ اور پھر گھر آتے ہی دُولہن کے سر میں درد ہو جاتا اور دُولہا دوڑ دھوپ میں مشغول ہو جاتا۔

ایک دن ریاض کی بہن اور اُس کے بچے آ گئے۔ اُس دن کے بعد سے میں نے دیکھا کہ دُولہن زیادہ وقت معصوم بچوں کے ساتھ گذارنے لگی۔ ریاض کو بھی موقع ملا، بہانہ ہاتھ آیا، وہ بھی زیادہ وقت دوستوں کے ساتھ گذارتا۔ برج پارٹیاں پھر شروع ہو گئیں۔ شکار کے اہتمام پھر ہونے لگے۔ مجھے خلیج صاف نظر آنے لگی۔ کچھ دن اور ٹھیرنے کے بعد میں واپس چلا آیا۔

چند مہینے گذر گئے۔ مجھے ریاض کا خط ملا۔ برف کا پہاڑ پگھلا۔ ریاض باپ بن چکا تھا۔ خط سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ریاض اس نئی کروٹ سے خوش ہے۔ اس کی بے اطمینانی دور ہو گئی ہے۔ اُس کے خدشات دُور ہو گئے ہیں میرے لئے دونوں کی طرف سے دعوت تھی۔

اِس مرتبہ جو میں گیا، میں نے بالکل دوسری کیفیت دیکھی۔ ریاض کی دُولہن اب مامتا کی آگ سے دہک رہی تھی۔ جوانی کی چنگاریاں اب ماں کی بے پناہ محبت میں جھلک رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں پیاسی پیاسی نظر آتیں۔ اُس کے بدن سے آگ کی لپکیں اُٹھتی ہوتیں۔ اُس کے چہرہ پر پیلا پن پھیل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی ہی آگ میں جھلس رہی ہے۔ صرف بچہ کے قہقہوں کے چھینٹے اور اس کی پیاری پیاری باتوں کا سوم رس اس کی موہنی موہنی اداؤں کی رنگیں جھلکیاں، اُس کی اُمنگوں کی راکھ میں بھی شعلے کھلائے ہوئے تھیں۔ کبھی وہ ایسی بجھی بجھی نظر آتی جیسے جیٹھ بیساکھ کی دوپہر میں رات کی رانی کی ننھی کلیاں۔ اور کبھی سورج مکھی کے پھول کی طرح سورج سے آنکھیں لڑاتی نظر آتی۔ ریاض کے دوستوں میں کئی اضافے ہوئے تھے۔ کم عمر دوستوں کی تعداد کافی تھی۔ وہ اور اُن کی بیویاں شام سے گہری رات تک بیٹھی رہتیں اور قہقہوں کے گھنگرو فضا کو مترنم رکھتے۔ ریاض کو اطمینان تھا کہ کم سن کم عمر دوستوں اور اُن کی الھڑ بیویوں کی معیت میں اُس کی دولہن کا دل اچھی طرح بہل رہا ہوگا مگر مجھے کچھ اور ہی نظر آ رہا تھا۔ جوانی سے گلشن روشن گھرڑے۔ جوان جوڑوں کی جوان حرکات اور جوان باتیں، ریاض کی دُولہن پر ٹھنڈی بجلیاں گرا رہی تھیں۔ وہ روز بروز زیادہ بوڑھی نظر آتی۔ مجھے اُس کی صحت کی طرف سے بھی تشویش ہونے لگی۔ میں نے ریاض سے ایک دن اشارۃً کہا۔ لیکن ریاض نے کہا میں دیکھ رہا ہوں۔ موسم غالباً گرم ہو رہا ہے۔ اُس کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ جلد سب پہاڑ پر چلے جائیں گے۔ میں چُپ ہو رہا اور کچھ دنوں بعد واپس چلا آیا۔

اِس مرتبہ جو ریاض کا خط آیا تو مجھے دھکا سا لگا۔ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ کنواں آپ ہی آپ سُوکھ گیا تھا۔ ریاض کی دُولہن مستقل تپ میں مبتلا ہو چکی تھی۔ پہاڑ پر سب چلے گئے تھے۔ جہاں غالباً ریاض کی دُولہن کو مستقل طور پر رہنا ہوگا۔

[illegible] ۔ مجھے [illegible] اگر آپکی اجازت ہو۔ اور یہ کہکر مینگ ای
کو [illegible] کر اسکے مکان کی طرف لے چلی۔ مینگ۔ ای کی زبان سے کوئی
لفظ نہ نکلا۔ ایک بے زبان کی طرح اس لڑکی کے اشارے پر چلتا ہوا وہ
اس مکان کے کمرۂ خاص میں پہنچا جس میں قدیم آرٹ کے بہترین نمونے اور شاہکار
تصاویر لٹک رہی تھیں۔ اور جو نہایت قیمتی قالینوں اور دیگر فرنیچر سے
جو اس مکان کی مالکہ کے حسن پرست اور عیش پسند طبیعت کا ثبوت پیش
کرتی تھیں آراستہ تھا۔ "بس آپ یہاں تشریف رکھئے۔ مالکہ ابھی ابھی تشریف
لائیں گی۔" یہ کہکر لڑکی اسے تنہا چھوڑ کر چلی گئی۔

مینگ۔ ای کی نظر سے آج تک ایسی چیزیں نہ گذری تھیں۔ البتہ کتابوں
میں اکثر اس نے بادشاہوں کے محلات اور امیر امراء کی حویلیوں اور مکانات کی
آراستگی کے بارے میں پڑھا تھا۔ آج وہ منظر اسکے پیش نظر تھا۔ ہر شے قرینے
سے سجی ہوئی تھی۔ گلدانوں میں سجے ہوئے تازہ و شگفتہ پھولوں کی بو نے عطربیز
مشام جاں کو معطر کر رہی تھی۔

مینگ۔ ای پر محویت کا عالم طاری تھا۔ وہ تصویر حیرت بنا بیٹھا تھا۔
اتنے میں اس پیکر حسن نے جس کے دید کا وہ منتظر تھا کمرہ میں بہ شانِ رعنائی "تازہ
کنول کے پھول کی سی مسکراہٹ کے ساتھ قدم رکھا۔ اور مینگ ای کو ایک لمحہ کی
مہلت دیئے بغیر اسکے نزدیک ہی صوفے پر بیٹھتی ہوئی بولی۔ "معاف فرمائیے گا
مجھے قدرے دیر ہو گئی (ہنس کر) آپ میرے منتظر ہو گے۔ انتظار کی گھڑیاں
کتنی طولانی ہوتی ہیں۔"

مینگ ای سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ ایک عورت کے ساتھ تنہائی میں
ملاقات کا اسے یہ پہلا موقع تھا۔ اس پر طرہ یہ کہ عورت بھی مجسمہ حسن و شباب۔
وہ ایک لمحہ کے لئے ہکا بکا سا رہ گیا۔ بڑی مشکل سے حواس بجا کرتے ہوئے
اس نے جواب دیا۔ "معافی تو مجھے مانگنی چاہیئے۔ ایک اجنبی راہگیر کو کسی کے
مکان کا طواف کرنا تو اخلاقی جرم ہے۔ مگر آپنے میری اس غلطی کو نظر انداز کرتے
ہوئے میری مہمان نوازی کی۔ میں آپکی اس بندہ نوازی کا شکریہ ادا کرتا ہوں
اور اپنی غلطی کی معافی چاہتا ہوں۔"

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں مسٹر مینگ۔ ای۔ غالباً اگر میں غلطی
پر نہیں ہوں جناب کا اسم مبارک یہی ہے نہ۔" اس نے یقین آمیز انداز سے
مینگ۔ ای کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بلاشبہ۔ مگر آپ کو میرا نام معلوم کیونکر ہوا؟" مینگ۔ ای نے
حیرت سے اسکی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"خوب!" اس نے شوخی سے کہا۔ "یہ بھی کوئی بڑی بات ہے۔
بات دراصل یوں ہے کہ مسٹر چنگ میرے عزیز ہیں اور آپ اُن کے بچوں
کے معلم۔ وہاں آپ کے تقرر کے بعد ہی مجھے آپ کا نام معلوم ہو گیا تھا۔
خوش قسمتی سے آج آپ سے نیاز بھی حاصل ہو گیا۔"

"اگر ناگوار خاطر نہ ہو تو کیا میں بھی جناب کا نام نامی دریافت
کر سکتا ہوں۔"

"اوہ!" (قدرے توقف سے جواب دیتے ہوئے اس نے
سنجیدہ لہجہ میں کہا) "دُنیا مجھے سوئی تھاؤ کے نام سے جانتی تھی۔ مگر..."

"مگر کیا اب دُنیا آپ کو بھول گئی ہے؟" مینگ۔ ای نے
بھی سوال کو جواب کے انداز میں طنز آمیز سنجیدگی سے کہا۔

"بیشک! اپنے خاوند کے انتقال کے بعد جب سے میں اس ویرانے
میں بستی سے دور۔ اس تنہائی میں چلی آئی ہوں دُنیا مجھے بھول ہی گئی ہے۔
آج آپ سے ملاقات ہونے سے مجھے کس قدر خوشی ہوئی ہے۔ اُف!"

"اس درجہ قدر افزائی کیلئے مکرر شکریہ"۔ مینگ۔ ای نے
تکلفانہ انداز میں کہا۔ اور پھر اُٹھکر اجازت طلب کرتے ہوئے بولا۔
"موقع ملا تو پھر کبھی حاضر ہونگا۔ شاید مسٹر چنگ آج میرے منتظر ہوں۔
سہ پہر تک پہنچ جاؤں گا۔"

"مگر میرا مہمان نوازی کا فرض مکمل نہیں ہوا۔ کوئی خاطر مدارات
نہیں۔ محض باتوں سے سیری نہیں ہوتی۔ آج کی شب آپ کا یہیں قیام رہیگا
مجھے مسٹر مینگ۔ ای!" سوئی تھاؤ نے نہایت بے تکلفی سے مینگ۔ ای
کے دونوں شانوں پر اپنے نازک مرمریں ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

مینگ۔ ای کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ سوئی۔ تھاؤ کا بے پناہ
حسن۔ اس کا محبت آمیز سلوک اور بے تکلفی اور اس کی شیریں کلامی۔ ان
سب نے اس کو اس قدر مسحور کر لیا کہ اسے خود وہاں سے جانا بُرا معلوم
ہونے لگا۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ خادمہ نے اطلاع دی کہ کھانا تیار ہے۔
سوئی۔ تھاؤ، مینگ ای کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ وہاں کھانا
میز پر آراستہ تھا۔ دونوں نے یکجا بیٹھکر کھانا کھایا۔ اس سے فارغ ہو کر پھر
اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہوئیں۔ قہقہوں اور ہنسی خوشی میں شام ہو گئی۔
سوئی۔ تھاؤ مینگ ای کو چھوڑتی ہی نہ تھی۔ اسے مکان کے ہر ایک کمرے کا معائنہ
کرایا۔ اپنی لائبریری دکھائی۔ جہاں ہر موضوع پر کتب موجود تھیں۔ شعر و ادب

کا ذخیرہ تھا۔ قدیم و جدید مشہور شعراء کے کلام کے مجموعے تھے۔ سوئی تھاؤ نے شاعر اعظم کا فو ہین کا مجموعہ کلام نکالا اور ایک نہایت درد انگیز گیت گانا شروع کیا۔ مینگ آئی کو خود فن موسیقی سے لگاؤ تھا۔ وہ خود بھی خوب گاتا تھا۔ مگر اس ملکۂ موسیقی کی آواز کا سوز کا اثر ہی اور تھا۔ اسکے گلے میں اس قدر لوچ تھا۔ اس قدر شعاعِ سحر تھی کہ فضا کا ہر ذرہ مضطرب ہو اٹھا۔ یہ کیفیت و وجد کا عالم کب تک طاری رہا۔ معلوم نہیں۔ مگر مکان میں شمع اپنی اپنی جگہ روشن ہو چکی تھیں۔ مکان سے باہر ہر سو مہیب تاریکی مسلط تھی۔ آسمان کسی گاؤں کی شوخ چھوکری کی طرح ستارے جڑی چُنری کی طرح پھیلا رہا تھا۔

مینگ آئی ہنوز آنکھیں بند کئے بیٹھا تھا۔ اسکے کان ابھی تک اسی نغمہ بہشتی سے گونج رہے تھے۔ اسے مطلق ہوش نہ تھا۔ سوئی تھاؤ کو عرصہ ہوا اُسے تنہائی میں اس روح افزا نغمگیت کے اثر کے اتھاہ ساگر میں غرقاب چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

"حضور طعام سے فارغ ہوکر سونے کا قصد کریں۔" سوئی تھاؤ نے کمرہ میں داخل ہوتے ہوئے مینگ آئی کو ہنستے ہوئے مخاطب کیا۔

"اُف!" مینگ آئی نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا اور سوئی تھاؤ کو سامنے ہنستا ہوا دیکھ کر شرما کر کھڑا ہو گیا اور بولا "دل و دماغ پر ابھی تک اُس ہوش ربا خواب آور موسیقی کا نشہ سا چھایا ہوا ہے۔" انگڑائی لیتے ہوئے اس نے مکرر کہا۔ "جی چاہتا ہے کہ ہمیشہ کیلئے اس نشہ میں غرقاب ہو جاؤں۔"

سوئی تھاؤ نے آگے بڑھ کر مینگ آئی کا ہاتھ اپنے دونوں نازک ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا "آپ میرے مہمان ہیں۔ میں آپ کو کسی طرح بھی مایوس نہیں کر سکتی۔ آئیے!" وہ اُسکو دوسرے کمرے میں جس میں انواع و اقسام کے لذیذ کھانوں سے میز آراستہ تھی لے گئی اور دونوں نے کھانا کھایا۔ ارغوانی کا بھی دور ہوا۔ مگر پینے کا عادی نہ ہونے کے باعث مینگ آئی دو گھونٹ میں ہی بہکنے لگا۔ یہ دیکھ کر سوئی تھاؤ اسے اپنی خوابگاہ میں لے گئی۔ اور بستر پر لٹا دیا۔ پھر اسکے قریب بیٹھ کر دھیمے دھیمے سُروں میں نغمۂ خواب گنگنانے لگی۔

نصف شب گزر جانے پر مینگ آئی کا نشہ ہلکا ہوا۔ سوئی تھاؤ ہنوز اُس کے قریب بیٹھی محبت سے اُسکے بالوں میں اپنی نازک انگلیاں پھیر رہی تھی۔ مینگ آئی اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔ اُس نے سوئی تھاؤ کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا اور وہ بھی ایک تشنہ کام محبت کی طرح اسکے پہلو میں اس طرح سما گئی جس طرح سورج کی کرنیں شام کی تاریکی میں گم ہو جاتی ہیں۔ اور پھر طلوع سحر تک دونوں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوئے۔

ہنگامۂ سحر سے دونوں بیدار ہوئے۔ ضروریات سے فارغ ہو کر مینگ آئی نے رخصت لی۔ سوئی تھاؤ نے [illegible] بلند یا اور محبت ایک نہایت [illegible] مینگ آئی سے کہا کہ وہ اس رات کی ملاقات کا کسی سے ذکر نہ کرے۔ جب کبھی اُس کا مزاج چاہے وہ صحبت شب کے لئے اس کے پاس ہو جائے۔ مینگ آئی نے شکریہ ادا کرتے ہوئے اپنی محبوبہ کے گل قند کی نازک پنکھڑیوں کی مثال ہونٹوں کو بوسہ دیا اور رخصت ہو گیا۔

اُسی شام کو مینگ آئی کی مسٹر چنگ سے ملاقات ہوئی۔ مسٹر چنگ نے اُس سے اسکے والدین کی خیر و عافیت دریافت کرتے ہوئے سفر کی دقتوں کے بارے میں بھی پوچھا۔ مینگ آئی نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ اور کہا کہ چونکہ اب بہتر موسم شروع ہو گیا ہے اس لئے اُسکے والدین نے یہ خواہش ظاہر کی ہے وہ ہر روز شام کو گھر چلا آیا کرے۔ مسٹر چنگ ای کو اس میں اعتراض ہی کیا ہوتا۔ انہوں نے بخوشی اجازت دیدی۔ اس روز سے مینگ آئی شام ہوتے ہی سوئی تھاؤ کے مکان کی طرف چل دیتا۔ تمام شب وہیں گزار کر صبح دم پھر اپنی ملازمت پر آ جاتا۔ یونہی مہینے گزر گئے۔

موسم برشگال کا آغاز ہوا۔ مینگ آئی کا سلسلۂ آمد و رفت بدستور جاری تھا۔ کئی دن کی بارش سے [illegible] خراب ہو گئے۔ جنگل میں گزر دشوار ہو گیا۔ مگر سوئی تھاؤ کے عشق نے مینگ آئی کیلئے تمام راہیں آسان اور ہموار کر دیں۔ جس روز در محبوب تک پہنچنے کیلئے اُسکو طوفان باد و باراں سے دوچار ہونا پڑتا اس کو صد درجہ خوشی محسوس ہوتی۔ شب کو جب وہ سوئی تھاؤ کے پہلو میں بیٹھ کر سفر کی کیفیت بیان کرتا تو سوئی تھاؤ محبت سے اُس کے سینے سے چمٹ جاتی۔

اچانک ایک روز مینگ آئی کے جھوٹ کا انکشاف ہو گیا۔ کسی ضروری کام سے اسکے والد مسٹر چنگ سے ملاقات کرنے آئے۔ دوران گفتگو میں مسٹر چنگ نے اُن سے دریافت کیا کہ ایسے ناخوشگوار اور خراب موسم میں جب راستے بھی دشوار گزار ہو گئے ہیں وہ مینگ آئی کو ہر شام کیوں گھر بلا لیتے ہیں۔

مینگ آئی کے والد تی آیسوپی نے ان تمام باتوں سے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ "ہوا چاؤ" تہوار کے بعد تو مینگ آئی سے اُنکی ملاقات ہی نہیں ہوئی۔ دونوں بزرگ تعجب سے [illegible] ماجرا کیا ہے۔ مسٹر چنگ نے معاملہ پر غور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"خود میری سمجھ میں بھی کوئی بات نہیں [illegible]" [illegible] فکر کے انداز میں کہا۔

جوانی میں انسان سے ہر قسم کی لغزش کا امکان ہوتا ہے۔ بعض وقت وہ ایسی غلطی کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے جس کی اُس سے امید نہیں ہوتی۔ ممکن ہے مینگ ای بھی کسی ایسی ہی غلطی کا مرتکب ہوا ہو۔ کسی عورت کے دامِ حُسن میں گرفتار ہو گیا ہو۔"

مسٹر چنگ نے "مگر ہمارے قصبہ میں تو ایسی عورت کا وجود ہی نہیں۔ خیر جو کچھ بھی ہو، اس بھید کا سراغ لگایا جائیگا۔"

شام ہوتے ہی مینگ ای حسبِ معمول اُس کاشانۂ عشق کی طرف روانہ ہوا۔ اُسے اپنے خلاف سازش کا کوئی علم نہ تھا کہ اسکی نقل و حرکت کی نگرانی کی جا رہی تھی۔

مسٹر چنگ نے اپنے ایک نوکر کو مینگ ای کے نقشِ پا کا پتہ لگانے کے لئے تعینات کر رکھا تھا۔ نوکر ظِلّ سایہ اُس کے پیچھے چلا مگر وہ آگے بڑھکر درختوں کے جھرمٹ میں چھلاوے کی طرح گم ہوگیا۔ نوکر نے ہرچند تلاش کی مگر مینگ ای کہیں نظر نہ آیا۔ لاچار واپس آکر اُس نے مسٹر چنگ کو اپنی ناکامیابی کی اطلاع دی۔

ادھر مینگ ای نے اپنی محبوبہ کے کمرہ میں قدم رکھا۔ آج وہاں کا رنگ دیکھکر اُسے کچھ تعجب ہوا۔ سوئی تھاؤ آج اپنے بہترین لباس میں ملبوس تھی۔ مگر چہرہ مغموم تھا۔ آنکھوں سے مایوسی برس رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا وہ ابھی ابھی رو کر چکی ہے۔ فضا میں ایک عجیب سی اداسی چھائی ہوئی تھی۔ مینگ ای کو دیکھتے ہی اُس سے دوڑ کر لپٹ گئی اور زار و قطار رونے لگی۔ مینگ ای عجیب دُبدا میں پڑ گیا۔ ہرچند اُس نے سوئی تھاؤ کے فسردہ رخساروں کے آنسو پونچھ کر اُس سے اچانک رنج کا سبب دریافت کیا۔ بہت دیر بعد جب سوئی تھاؤ کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو اُس نے بھرائی آواز میں کہا۔ "آج ہماری خوشی کی آخری رات ہے۔ آج کی ہماری ملاقات کی شب کے بعد جو سحر ہوگی وہ ہمارے لئے دائمی جدائی کا پیغام لیکر آئیگی۔ اس کے بعد پھر ہمیں کبھی شبِ وصال نصیب نہ ہوگی۔" بجھنے والی شمع کی آخری لو کی طرح وہ ایک ساتھ ہنسی اور مینگ ای کے سینے سے لگ کر کہنے لگی۔ "جانِ من۔ آج آخری شب جی بھر کر ہنس بول لیں۔ اپنے تمام ارمان نکال لیں۔" یہ کہکر وہ اُٹھی۔ اور جامِ شراب لاکر مینگ ای کے لبوں سے لگا دیا۔ مینگ ای نے مسکراتے ہوئے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا۔ اور پھر اپنے ہاتھ سے بھر کر اسے سوئی تھاؤ کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

مینگ ای کو جب ذرا سرور آیا تو سوئی تھاؤ کے نازک ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولا۔ "سوئی آج اگر ہماری رنگ رلیوں کی آخری شب ہے تو کوئی قاصد جدائی کا پیغام لائیگا۔ ایسا ہو تو جس میں ہم دونوں ہی ہمیشہ کیلئے گم ہو جائیں" سوئی تھاؤ گانے لگی۔ مینگ ای فرطِ جذبات سے مضطرب ہو کر اُٹھا۔ اُس نے سوئی تھاؤ کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔

قاصدِ سحر پیامِ جدائی لئے کھڑا تھا۔ سوئی تھاؤ مینگ ای کو الوداع کہنے باہر نکلی۔ اسکی پلکیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ روتے روتے اُس نے مینگ ای کو ایک قیمتی شمع دان اور مشہور شاعر "کاؤ پین" کا مجموعۂ کلام بطور اپنی یادگار نذر کیا۔ ایک بار پھر وہ دونوں گلے ملے۔ اور پھر ہمیشہ کیلئے ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔ مینگ ای تمام رستے سوئی تھاؤ سے پھر کبھی ملاقات نہ ہونے کی وجہ پر غور کرتا رہا۔ مگر اس گتھی کو نہ سلجھا سکا۔ جب وہ مسٹر چنگ کے مکان کے برآمدے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ مسٹر چنگ اور اس کے والد وہاں بیٹھے تھے۔

ٹی۔ این۔ پولی نے اپنے لڑکے کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیتے ہوئے اُس سے دریافت کیا "کہاں سے آرہے ہو بیٹا؟ مسٹر چنگ سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم ہر روز شام کو کہیں باہر چلے جاتے ہو۔"

مینگ ای کا چہرہ اُتر گیا۔ اسے کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ اس کا جھوٹ کبھی اس طرح پکڑا جائیگا۔ اب اور دوسرا جھوٹ بولنے کی گنجائش نہ تھی۔ اخفائے راز کا موقعہ نہ تھا۔ غریب نے لاچار اپنے عشق کی داستان کہہ ڈالی اور ثبوت میں سوئی تھاؤ کے وہ دونوں نذرانۂ محبت شمع دان اور "کاؤ پین" کا مجموعۂ کلام پیش کیا۔ دونوں چیزیں دیکھکر مسٹر چنگ کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ وہ دونوں تحفے گذشتہ صدی کے آرٹ کے بہترین نمونے تھے۔ "کاؤ پین" گذشتہ صدی کا بہترین چینی شاعر تھا۔ سوئی تھاؤ سے اُس کو گہرا عشق تھا اور وہی اس کی شاعری کا عنصرِ خاص تھی۔

مسٹر چنگ اور ٹی۔ این۔ پولی نے اس عجیب و غریب عورت کو جس نے مہینوں تک مینگ ای کو جامِ محبت پلایا تھا۔ اور عوض میں اپنی روح تشنہ کام کی پیاس بجھائی تھی، دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اور مینگ ای کو ساتھ لیکر سوئی تھاؤ کی رہائش گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مگر جب تینوں اس مقام پر پہنچے تو وہاں بجز ایک شکستہ حال سمادھی کے اور کوئی عمارت نظر نہ آئی۔ البتہ سمادھی کے اردگرد چند خوشنما خودرو پودے لہلہا رہے تھے۔ جن کی نرم و نازک شاخوں میں چھوٹے چھوٹے پھول اس طرح جھوم رہے تھے جیسے کسی حسینہ کے خوبصورت ہاتھوں میں جامِ شراب رقص کرتا ہو۔ آج وہی جگہ جو ہر شب کو سوئی تھاؤ کی شیریں نسوانی ہنسی اور مینگ ای کے قہقہوں سے گونج اُٹھتی تھی۔ ویرانہ نظر آرہی تھی۔ مینگ ای کی روح ایک غم و الم سے جس سے تا ابد چھٹکارا مشکل تھا بوجھل ہو رہی تھی۔ وہ اس لطف دہ

...سنگ کی اب تاب نہ رہ سکا۔ وہ دوڑ کر تھامس کے پاس گیا اور وہ جھک کر پائی اور پھر لپٹ دونوں ہاتھ پھیلا کر اسی طرح مری کی طرف لپکے جیسے لپٹ لینا چاہتا ہو اور اپنی جبین نیاز کو اس پر ٹیکتے ہوئے کہا۔ سوئی تھاؤ۔

[illegible]

مسٹر چیک اور سینگ ای کے والد دونوں خاموشی کھڑے اس منظر و بے غرض کو دیکھ رہے تھے۔ جیک ان کی زبان سے سوئی تھاؤ کا نام نکلتے ہی انہیں ایسا محسوس ہوا گویا اس ویرانے کا ہر ذرہ، درختوں اور پودوں کا ہر پتہ اور پھول زبان حال سے پکار رہا ہے۔ سوئی تھاؤ۔ سوئی تھاؤ۔ ہر سو ایک خوف سا مسلط ہونے لگا۔ مسٹر چیک نے دوڑ کر سینگ ای کو اٹھایا۔ اور تینوں تیز قدم بڑھاتے ہوئے اپنے بنگلے کی جانب روانہ ہوئے مگر دیر تک ان کے کانوں میں وہی آواز گونجتی رہی۔ سوئی تھاؤ ——
سوئی تھاؤ ——

قطعات

(جناب جاں نثار اختر)

مدت میں کسی کی آنکھوں سے اک لحظہ کو آنکھیں چار ہوئیں
کچھ سانس کسی کی رک سی گئی کچھ روح مری گھبرا سی گئی
کچھ پچھلی وفائیں یاد آئیں کچھ عہد کبھی کے یاد آئے
کچھ میری نگاہیں جھک سی گئیں، کچھ انکی نظر شرما سی گئی

مدت میں جو نظریں چار ہوئیں اس لب پہ تبسم دوڑ گیا
اک رنگ سا آنکھوں سے برسا چہرہ پہ شفق سی پھول گئی
کیا جانئے پھر کیا یاد آیا کیا جانئے پھر کیوں دل دھڑکا
جھک کر وہ نگاہیں پھر جو اٹھیں اک بار وہ مجھ کو بھول گئی

[illegible]

(از جناب نور بخاری)

سنا ہے اب تو میرے نام سے بھی تجھکو نفرت ہے
شہابی رنگ رخساروں پہ زردی چھائی جاتی ہے
لب لعلیں کی صبحوں پہ سیاہی آئی جاتی ہے
کوئی دیکھے تو یہ سمجھے کہ بیمار محبت ہے
مگر تو تا میں واقف ہوں کہ میری نے نوازی نے
ترے معصوم دل میں بدگمانی کی بنا ڈالی
محبت کی لطافت سے ترا دل ہو گیا خالی
کیا بیمار تجھکو آہ میری چارہ سازی نے
اگر ہوتا نہ دامنگیر تیرا پاس رسوائی
میں خود اے دختر ہندوستاں انکار کر دیتا
ترے بے کیف خوابوں میں مہکتے پھول بھر دیتا
ترے پازیب کی جھنکار پہ روتی نہ شہنائی
پریشاں ہی آہ تیری موت کا ساماں نہ ہو جائے
کہیں اک دل لڑکی رسم پہ قربان نہ ہو جائے

شکست

(از جناب تسکین علیگ)

اور یہ نرگس ——— ؟

ایک دن کہنے لگی۔

"کب تک نباہ سکو گے یہ تعلقات ؟"

"جب تک میری جیب اور تمہاری جوانی اجازت دیگی۔"

"جیب و جوانی کا کیا بھروسہ۔ دونوں ناقابل اعتبار !"

"لیکن زندگی سے زیادہ ناقابل اعتبار نہیں"۔ میں نے کہا اور وہ خاموش ہوگئی۔ جیسے اُس نے اعتراف شکست کرلیا ہو!

دن بھر کے تھکا دینے والے کاروباری مشاغل سے خستہ و مضمحل ہوکر ——— شراب کے نشہ میں چُور میں اُس کے ہاں پہنچتا ہوں۔ وہ ایک دلفریب انداز اور لطیف مسکراہٹ سے میرا استقبال کرتی ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں جیسے موعودہ جنّت میں آگیا ہوں۔ اپنے اعمال حسنہ کی بدولت ——— ہاں ! میرے اعمال حسنہ سے میری جھولیں بھری ہوتی ہیں ——— اور پھر اس کا حُسن، اس کی جوانی، اس کے جذبات کی گرمی، اس کی اداؤں کی سحر انگیزی سب کچھ میرے لئے ——— میں اس کے ہر اشارۂ ابرو پر سر تسلیم خم کرتا ہوں۔ وہ گنگناتی ہے، میں جھوم جھوم اُٹھتا ہوں۔ وہ اداؤں کے تیر آزماتی ہے میں سینہ تان لیتا ہوں۔ وہ گریز کرتی ہے اور میں بے تابانہ تعاقب کرتا ہوں ——— پھر وہ میرے آغوش میں گرجاتی ہے اور میں اُسے چھوتا ہوں اُس کے نرم و نازک جسم کے ایک ایک عضو کو۔ کبھی گلابی رُخسار کو، کبھی عنابی ہونٹ کو، کبھی سیاہ زُلفیں، کبھی سینے کی بے پناہیاں، کبھی رانوں کی گدازی اور کبھی پنڈلیوں کا سڈول پن میری ہوس رانیوں کا مرکز بنتی ہیں۔ میں ان کھلونوں سے بالکل اسی طرح کھیلتا ہوں ——— جیسے ننھے ننھے معصوم بچے مٹی کے بے جان کھلونوں سے کھیلتے ہیں۔

وہ میری ان مجنونانہ حرکتوں کو والہانہ شگفتگی سمجھتی ہے۔ وہ میرے خمار کی ان بے پناہ سرمستیوں کو میری رُوح کی بے تابی و بیقراری سے تعبیر کرتی ہے۔ مدام انحالیکہ میں اس وقت خود اپنے آپے میں نہیں ہوتا۔ میں حالت نشہ میں ہوتا ہوں اور اپنے کسی قول و فعل کے لئے ذمہ دار نہیں ٹھیرایا جاسکتا۔

لیکن وہ سمجھتی ہے، میں شکست خوردہ ہوں۔ میں اُس کے اشاروں پر ناچ رہا ہوں۔ ایک ناچنے والی کے اشاروں پر ——— جیسے میری یہ بے تابی واقعی اُسی کے لئے ہے۔ گویا میں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ جیسے اُس کے جسم کا لوچ میری رُوح کی غذا ہے۔ جیسے اس کے جسم کی عُریانی میری جینائی میں اضافہ کرتی ہے۔ جیسے اسکے اُبھرے ہوئے سینے اور گداز رانوں کے مس سے میری زندگی میں اضافہ ہوتا ہے ——— شاید ——— نہیں بلکہ یقیناً وہ یہی سمجھتی ہے۔

لیکن یہ غلط ہے ——— قطعی لغو ——— مجھے تو صرف اپنے جسم کی آسودگی چاہیئے ——— اور آسودگی بھی نہیں ——— بلکہ تخریب ! تخریب، اپنے جسم، اپنی جوانی، اپنی صحت اور حتّٰی کہ اپنی زندگی کی۔

میں ایک تدریجی، رفتہ رفتہ خوشگوار اور طرب انگیز تخریب چاہتا ہوں۔ اپنی زندگی اور زندگی کے ہر شعبہ میں ——— اپنی دولت، اپنی عزّت و شہرت اور اپنی صحت و عافیت، ان سب کو مٹانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے تیار ہو جاؤں۔ مجھے اچانک موت آ کر نہ دبوچ لے ——— تو یہ تو موت کی تیاری ہے ——— جس طرح گذشتہ بیس پچیس سال میں نے زندگی کی تیاری کی تھی۔ میں نے اچھی غذائیں کھائیں۔ ورزشیں کیں۔ صحت کے اصولوں کی پابندی کی۔ اور اس طرح ایک اچھا خاصا تنومند طاقتور اور خوبصورت جسم تعمیر کیا ——— میں نے تعلیم حاصل کی، وسیع مطالعہ کیا، اور مشاہدات و تجربات سے صحت دماغی کو فروغ دے کر ایک خاصا حساس سمجھدار اور بیدار دماغ بنایا۔ لیکن اب ان تعمیرات کی حد، ان کا نقطۂ عروج ——— آخر کیا ہوگا ؟ جبکہ زندگی کی بھی ایک حد ہے۔ اس کا بھی انجام موت۔ اور ناگزیر اور اٹل موت مسلّم ہے ——— تو پھر کیا ان تعمیرات کا انجام موت یا تخریب نہ ہوگا ——— ؟ ہے ——— اور لازماً ان تعمیرات کا انجام بھی ایک ناگزیر موت ہے۔ ایک بھیانک اور اٹل تخریب ہے۔

اور میں نہیں چاہتا کہ قبر کی تاریک تنہائی میں یہ صحت مند دماغ اور قوی و تنومند جسم زمین کے ادنیٰ کیڑوں کی غذا بنے۔ یہ اس جسم و دماغ کی ندرت توہین ہے بلکہ بے مصرف ضائع ہونا بھی۔ میں ہرگز نہیں چاہتا کہ میرا حسین جسم اس طرح ضائع ہو۔ کیوں نہ میری بوالہوسی کا شکار ہو یہ۔ کیوں نہ میرے نفس کی خواہشوں پر بھینٹ چڑھ جائے یہ، کیوں نہ میری ہی لغزشوں سے تباہ ہو میری

[illegible] اور کیف سے میری فطرت [illegible] اس کی تخریب [illegible]

—— اس لئے میں نرگس کے پاس جاتا ہوں۔ اور دن بھر محنت مشقت سے جو کچھ کماتا ہوں وہ رات کی چند مسرت بخش ساعتوں میں لٹا دیتا ہوں، یہ جانتے ہوئے کہ مجھے معلوم ہے اپنا انجام، عمر بھر کی جو قربانی وہ لیتی ہے جو کچھ کماؤں گا وہ ایک دن اچانک لٹانا پڑے گا۔ ضرور —— اور پھر کسی لمحہ طرب انگیز کیلئے نہیں کسی ساعت مسرت خیز کے لئے نہیں۔ بلکہ موت کی بھیانک، الم ناک اور دلدوز گھڑی کے لئے —— اس لئے میں ہر جسم کی تخریب سے چند لمحوں کی عارضی مسرتیں، چند جھوٹی کیفیتیں اور چند پر فریب قہقہے خریدنا جائز سمجھتا ہوں۔ اور خریدتا ہوں۔ کیا یہ میری جیت نہیں ہے —— یا کیا یہ میری شکست ہے؟

بزرگ نصیحتیں کرتے ہیں، دوست مشورے دیتے ہیں، اگرچہ ان کا اس میں قصور نہیں —— یہ لوگ تو ہوتے ہی اس لئے ہیں ——

بزرگ نصیحتوں اور دوست مشوروں کیلئے، لیکن نہ جانے کیوں میں دل ہی دل میں ان پر ہنستا ہوں، کبھی کبھی ایک آدھ طنز اور دو چار پھبتیاں بھی کس دیتا ہوں۔ ان کی جہالت خود فریبی اور تمرد پر —— کہ وہ جنہیں زندگی اور زندگی کی تلخ و شیریں حقیقتوں سے عالم فکر و شعور میں کبھی واسطہ نہیں رہا، وہ جنہوں نے عمریں زندگی گزارنے میں صرف کر دیں، لیکن چند لمحے بھی اسے سمجھنے میں صرف نہ کئے۔ وہ جو نشیب و فراز سے گذرے بھی تو بے خبری میں۔ اور جنہوں نے تاریکی و روشنی کا نظارہ کیا بھی تو چشم ظاہر بیں سے —— وہ، وہ بے دماغ انسان مجھے سمجھاتے ہیں۔ مجھے نصیحتیں کرنا، مشورے دینا بزعم خود اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ مجھے شکست خوردہ کہتے ہیں ——

لیکن اُف —— ! میں پوچھتا ہوں کہ اے میرے بزرگو اور دوستو! جب سکون قلب اور طمانیت روح دنیا میں کسی قیمت پر دستیاب نہ ہو تو پھر ایک مرد، جوان مرد، جسم کی آسودگی اور نفس کی ادنیٰ خواہشوں کی پذیرائی سے بھی محروم رہے۔

جب مکانوں کی پُر امن چار دیواریوں میں قلب و نگاہ کی تشنگی فرو نہ ہو سکے، جب خانقاہوں کی نم آلود تاریکیوں میں بھی آرزوئیں سرد نہ ہو سکیں اور مقدس معبدوں کی خاموش فضاؤں میں بھی خواہشوں اور ارمانوں کے ناگ نہ کچلے جا سکیں —— تو کیا پھر نرگس —— ؟ نرگس کی پھولوں کی سیج پر، نرگس کے بہار آفریں عشرت کدہ میں —— اور نرگس کے نرم و نازک اور حسین و مرمریں جسم کے آتشیں لمس سے بھی زندگی کی وہ کمی پوری نہ کی جائے —— وہ کمی، جس کے پورا کئے بغیر زندگی و موت کا درمیانی وقفہ

[illegible]

بعض بزدل اور پست [illegible] اور [illegible] سے اس کمی کو پورا کرتے ہیں، شراب انگور کی بجائے [illegible] اور عورت کے حسن و جوانی کے بجائے ہر سال بچہ جننے والی ایک عورت کے [illegible] اکتفا کرتے ہیں اور تادم واپسیں ——

لیکن بعض بہادر اور حوصلہ مند انسان ایسے بھی ہیں جو اپنی آرزوؤں اور خواہشوں کو آزاد چھوڑ دیتے ہیں۔ جیسے کسی دوشیزہ نے اپنے بند قبا توڑ دیئے ہوں، اور ان کی تکمیل کے لئے ایسی شدید کد و جہد کرتے ہیں جیسے طوفانوں میں کسی دریا کی روانی ——

انہی حوصلہ مند انسانوں میں سے ایک میں ہوں۔ اور میرے ناصح و مشفق احباب ان میں سے جو میری آرزوؤں کی تکمیل دیکھ —— تلملاتے ہیں تلملاتے ہیں اور آخر انہیں مجھ پر برہم ہونے کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آتا —— وہ کہتے ہیں —— یہ نرگس ایک بازاری عورت ہے اور ان کا سب سے بڑا اعتراض یہی ہے۔ لیکن اُف! وہ نہیں سمجھتے کہ اس کی سب سے بڑی صفت تو یہی ہے کہ وہ ایک بازاری عورت ہے۔ آہ! وہ نہیں سمجھتے کہ —— دنیا میں سب سے بڑا دھوکا پتھر کا خدا اور اس سے چھوٹا عورت لیکن پتھر کا تراشیدہ بت بحیثیت خدا اور بازار میں بر سر عام حسن و جوانی بیچنے والی عورت بحیثیت عورت، انسان کے لئے کب کم ضرر رساں ہیں۔ اس لئے کہ دونوں ایک کھلا دھوکا ہیں، ایک کھلا فریب ہیں، جنہیں ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

بلاشبہ ہم پتھر کے تراشیدہ خداؤں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں گڑگڑاتے ہیں، دعائیں مانگتے ہیں۔ لیکن محض اس لئے کہ [illegible] فطری کمزوری ہے۔ یہ انسانی سرشت ہے۔ ورنہ اس سے [illegible] کی طاقتوں، صلاحیتوں اور حقیقتوں کا ہمیں علم ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ [illegible] ہے۔ اور کتنا [illegible] —— پتھر کے بتوں کی پرستش —— [illegible] ہمارا روح کو مضمحل اور ہمارے قلب کو مضطرب اور ہماری [illegible] کو کمزور کر دیتا اور عملی قوتوں کو کھوکھلا نہیں کرتی۔ ہماری عقل کو حیران ہماری [illegible] کو پریشان اور ہماری نگاہ کو متجسس و آوارہ نہیں رکھتی۔ ہم دیکھ سکتے ہیں، ہم [illegible] ہیں، ہم سمجھ سکتے ہیں۔ چاہے نہ دیکھنا چاہیں، [illegible]

بالکل اسی طرح بازار میں [illegible]

[illegible] اس کی [illegible] اور اس کی کمزوریاں ہم سب جانتے ہیں۔ [illegible] ہیں [illegible] دق ہے۔ لیکن صحیح کر کے وہ بلا مبالغہ ہمارے سینہ پر وار کرتی ہے [illegible] دولت اور سامنے آکر وہ یقیناً ہمیں تباہ کرتی ہے۔ لیکن بالاعلان [illegible] ہیں ——— بازاری عورت ——— گھر کی شریف خواتین کی طرح [illegible] طور پر تباہ نہیں کرتی۔ وہ جونک کی مانند خون نہیں چوستی۔ وہ دق کی طرح رفتہ رفتہ ہڈیاں نہیں گھلاتی۔ وہ دیمک کی طرح ہماری چھاتی سے لگ کر ہمیں بے جان و پست نہیں کرتی۔ وہ طوفان کی طرح چھاتی ہے، وہ نوک خنجر کی طرح سینہ کے پار ہوتی ہے۔ اس کا پُر فریب وجود دیکھا جا سکتا ہے۔ سوچا جا سکتا ہے اور سمجھا جا سکتا ہے۔ خواہ کوئی اُسے نہ دیکھنا چاہے، نہ سوچنا چاہے اور نہ سمجھنا چاہے

اس لئے میں نرگس اور اس کی ہم مسلک تمام حوا کی بیٹیوں کا احترام کرتا ہوں۔ انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہوں اور ان سے زندہ رہنے میں مدد لیتا ہوں۔ اور میری زندگی تو صرف یہی ہے کہ دم آخر تک پہنچنے کے سلسلہ میں اپنے دماغ و جسم کی تعمیرات کی اتنی تخریب کر لوں، کہ انہیں وہ آخری اٹل اور ناگزیر تخریب زیب دے سکے۔

شراب پیتا ہوں اور بافراط، اس لئے کہ میرا دماغ عادت ہوتے ہوتے اس نقطۂ زوال پر آجائے کہ اس پر قبر کی تاریکی و تنہائی بار نہ گذرے پھیپھڑے اور آنتیں اس درجہ گل جائیں کہ زمین کے ننھے ننھے کیڑوں کو انہیں کھانے میں دقت محسوس نہ ہو ——— ہائے وہ ننھے ننھے کیڑے جو اپنی غذا کے انتظار میں ہونگے۔

یہ معطر و ریشمی لباس میں ملبوس جسم، آہ قبر کی غیر معمولی نمی و خشکی کیسے برداشت کر سکے گا۔ چاہتا ہوں کہ اسکی شریانوں میں رواں دواں جوانی کے گرم خون کا آخری قطرہ بھی میری بوالہوسی اور عیش کوشی کی بھینٹ چڑھ جائے۔ اور میرا یہ جسم اتنا سرتا سر بے حس ہو جائے کہ اس پر قبر کی وہ خشکی، وہ نمی اور وہ بے پناہ گھٹن گراں نہ گذرے۔ میں جب نرگس کو اپنے آغوش میں کھینچتا ہوں ——— وہ نرم و نازک پھول جیسا معطر و ملائم جسم ——— تو مجھے قدرت کی ستم ظریفی پر کیسا ملال ہوتا ہے ——— اور یہ سوچ کر میں ایک لمحہ کے لئے کانپ اٹھتا ہوں کہ یہ جسم جو آج ایک دوسرے کے والہانہ ہم آغوش ہیں، ایک دن منوں مٹی کے ڈھیر میں علیحدہ علیحدہ پڑے کیڑے مکوڑوں کی غذا بن رہے ہونگے۔ اور یہاں سے کچھ متشاعرانہ اور باغیانہ کیفیات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ میں ایک وحشی عقیدت کے ساتھ گنگنانے لگتا ہوں ——— "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست" ———

اور جام پہ جام چڑھائے جاتا ہوں۔ حتیٰ کہ نرگس میرا سر اپنے زانو پہ رکھکر مجھے سب کچھ بھول جانے کی ترغیب دیتی ہے۔

جب زندگی سمجھ میں نہ آئے تو کیا زندگی کو بھلایا بھی نہ جائے ——— کوئی بتائے، صبح کو جب میں اُسے دن بھر کیلئے الوداع کہتا ہوں اور اس کے عشرت کدہ سے باہر نکلتا ہوں، تو ایک فاتح کی طرح جس نے کوئی بڑا معرکہ سر کیا ہو۔ میرا دماغ بھی ہلکا ہوتا ہے۔ اور جسم بھی۔ میں ایک قسم کی سبکدوشی سی محسوس کرتا ہوں۔ کوئی گرانی نہیں ہوتی، اس وقت میں موت کو بھی لبیک کہنے کو تیار ہوتا ہوں چہ جائیکہ زندگی، لیکن موت کا تو ایک وقت معین ہے۔ اس لئے زندگی از سر نو شروع کرتا ہوں۔ اور زندگی کا مفہوم تو آج کل محض حصول دولت ہے۔ وہ کسی طرح بھی حاصل نہ کی جائے اور دنیا میں جس طرح بے وقوفوں کی کمی نہیں ہے اسی طرح دولت اور حصول دولت کے ذرائع کی بھی کمی نہیں ہے ——— تو دن بھر زندگی کی شدید جدوجہد یعنی حصول دولت کی سعی میں سرگرداں رہتا ہوں، اور کسی نہ کسی طرح رات بھر کا خرچہ ایک بوتل "وسکی" اور نرگس کے حسین و جوان جسم کی رات بھر کی قیمت پیدا کر ہی لیتا ہوں ——— اور پھر "بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست ———"

میں خوش ہوں کہ میری محنت و عرقریزی چاہے فریب کاری و مکاری سے کمائی ہوئی دولت ایک حسن و جوانی کے مجسمہ کو پرورش کرنے اور اُسے صحت مند و زندہ رکھنے میں کام آتی ہے، ایک کھلونے کو ثابت و سالم رکھتی ہے۔ جس کے ساتھ کھیل کر میں زندگی کی چند گھڑیاں شادمانی میں گذارتا ہوں ——— اس سے زیادہ صحیح مصرف میری دولت کا اور کیا ہو سکتا ہے کہ اس سے چند مسرت بخش لمحات خریدے جا سکیں۔ چاہے وہ مسرت عارضی ہو ———

اس طرح میں روز ایوانِ زندگی میں ایک تازہ دم فاتح کی حیثیت سے داخل ہوتا ہوں۔ اور ساتھ ہی ہر وقت اعترافِ شکست کے لئے تیار رہتا ہوں کہ حیاتِ انسانی کا انجام ہی شکست ہے، اور ناگزیر شکست ——— لیکن کیا واقعی یہ شکست ہے ——— ؟

رُباعیات

(جناب کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی سحرؔ پی، سی، ایس)

(۱)

پینے دے مجھے رنج والم کھونے دے
روتے ہیں جو قسمت پہ اُنہیں رونے دے
اِک مست نظر اور ادھر اے ساقی
جام آنے سے پہلے بھی تو دَور چلنے دے

(۲)

دِل خوگرِ تسلیم و رضا کرتا جا
اُلفت کو شناسائے جفا کرتا جا
مانا کہ حسینوں کا تو ایماں ہے جفا
تیرا تو وفا ہے تو وفا کرتا جا

(۳)

تو سوز و غم و دیدۂ تر پیدا کر
اِک اور نئے شام و سحر پیدا کر
اُٹھ جائیگی خود ہی رُخِ روشن سے نقاب
آہوں میں مگر پہلے اثر پیدا کر

(۴)

دُنیا ہے دغا باز نہایت مکّار
مٹّی کی یہاں آڑ میں کھلتا ہے شکار
واعظ جو کہے اُس پہ عمل کر بے شک
لیکن جو وہ خود کرتا ہے مت کر [illegible]

حجابات

جب کہ محبت کا اظہار کیا تم نے　　خوابیدہ اُمنگ
دے کر کے مجھے عشق در رومان کے درس اکثر　　بے کیف جوانی ک
آنکھوں کو بنا کر کے مستانہ نغمہ آگیں　　معصوم نگاہوں ک
مبہم سے ترانے کچھ گا گا کے محبت کے　　میرے دل
جب میں نے تغافل کا کچھ تم سے کیا شکوہ　　شرما کے نگاہوں ۔
ہرگز نہ ہوئی مجھکو انکار کی جرأت بھی　　جب بھی کسی مقصد کا اظہار
جب درد و الم کے کچھ افسانوں کا ذکر آیا　　بدست مجھے ہو کر پھر پیار[1] کیا تم

ہے گرچہ حجاب اب بھی اک رازِ محبت کا
پردے سے اسے باہر سو بار کیا تم نے

از

محترمہ جناب عبدالرحمٰن عباسی

[1] بعض چیزیں کبھی کبھی صرف اس لئے چھاپ دی جاتی ہیں کہ ناظرین اندازہ لگا سکیں کہ زمانہ اور زمانہ کے ساتھ ادب کی رفتار کیا ہے۔ (دا آمدی)

غزل

(حضرت بہزاد لکھنوی)

بہت غم نہاں ہیں مری زندگی میں
بڑی تلخیاں ہیں مری زندگی میں

تری یاد، تیرا تخیل، ترا فکر
کئی گلستاں ہیں مری زندگی میں

کہیں تم کو ہیں تو تم دم بدم ہے
جو محو بیاں ہیں مری زندگی میں

کہیں کے شعور نے کرایا ہے مجھ کو
وہ بہر شوخیاں ہیں مری زندگی میں

خدارا کوئی مجھ کو تسکین دیدے
کہ کتنے بیاں ہیں مری زندگی میں

جنھیں تم بھی چاہو تو سمجھا ہیں مشکل
وہ مجبوریاں ہیں مری زندگی میں

کبھی آس رہنا کبھی یاس رہنا
نئے دو جہاں ہیں مری زندگی میں

الٰہی مجھے یہ گوارا نہیں ہے
شنا وہ تپاں ہیں مری زندگی میں

نہیں جن کی تعبیر بہزاد ممکن
وہ خواب گراں ہیں مری زندگی میں

افسانہ

پیاس

(از جناب فریدہ چھلی شہری)

میں ریاض کی شادی میں کبھی شریک نہ ہوتا۔ کیونکہ میرے نزدیک بڑھاپے کی شادی ایک وحشیانہ اقدام ہے۔ غضب خدا کا! پچاس برس کا کھوسٹ ایک پندرہ برس کے رسیلے پھول کو تکتک رہے۔ اور زمانہ اُس پر آنسو بہانے کی جگہ خوشیوں کے خم لنڈھائے۔ بسینہ پیٹنے کے عوض شادیانے بجائے۔

میں یقینی انکار کر دیتا۔ مگر مجھے اس زندگی کے تاثرات اور ڈرامائی تجربے حاصل کرنے تھے۔ چنانچہ گیا، نکاح ہوا، شبِ عروسی کی چاندنی چھٹکی، مگر میں نے دیکھا کہ چودھویں کی رات بھی چاند ڈبڈبا گیا۔

ریاض کی نئی زندگی کی اندرونی حالت کا میں نے جائزہ لینا شروع کیا۔

. . . . . . میں نے دیکھا کہ نئی شادی سے ریاض کے دماغ میں خاموش حسیات کا دریا لہریں مارنے لگا۔ اور اُس کے دل کو افسردگی اور افکار کی امواج مُسلسل اُچھالنے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ایک پھانس ہے جو کھٹک رہی ہے۔ ایک ٹیس ہے جس نے میٹھا میٹھا درد پیدا کر رکھا ہے۔ اُسکی زندگی قطعاً ظاہرداری میں گذر رہی ہے۔ دل کی چھپائی ہوئی چنگاریوں کو شعلہ ہو جانے سے روکنے کیلئے وہ دیوانوں کی طرح زور آزما ہوتا اور خشک ہونٹوں میں رس پیدا کرنے کے لئے وہ اپنے دل کی کلی کو زبردستی متبسم بھی کرتا۔ لیکن ہوتا اُس وقت بھی یہی کہ مسکراہٹ کی لجاتی بجلی چمک سے کوندھ جاتی اور وہ جھلس کر رہ جاتا۔

فکر اور رشک کے شعلے اس کے دل پر نامرادی کے پھپھولوں کا چراغ بنا رہے تھے۔ مگر ان کو روشن کرنے کے لئے اسکے پاس کوئی چیز نہ تھی۔ مایوسیوں کے ابخرات اُس کے پہلو کے گرمایہ سے برابر اُٹھ رہے تھے۔ مگر اُن کو برسانے کیلئے اُسے کوئی بات نہ ملتی تھی۔ جوانی کا سیلاب اُسکی نظروں کے سامنے، جھمک جھمک کر اسکی طرف بڑھ رہا تھا۔ مگر اُس پر غیرت کی تلوار سے چوٹ لگانے کیلئے اُسکے پاس کوئی بچاؤ نہ تھا۔

دل مانتا یا نہ مانتا، دماغ تسلیم کرتا یا نہ کرتا۔ لیکن ریاض کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں کہ اس کی کمسن رفیقۂ حیات، اُس کی نئی نویلی دُلہن اُس کے آگے بجھی جا رہی ہے۔ اس کے آسائش و آرام کی شمع کے گرد پروانہ وار فدا ہو رہی ہے۔

ٹھنڈی زندگی کے خفتہ خواب سے بیدار بھی نہ ہوتا کہ وہ جوانی کی لطیف اور حسین مورت، چادر کو پھینک کر کھڑی ہو جاتی۔ اُس کے لئے غسل کا سامان درست کر دیتی۔ کپڑے سنوارتی، مرغن ناشتہ تیار کرتی، پھر اُسے جگاتی۔ نفیس انگڑائیوں کی شراب کے چھینٹے دیکر اس میں زندگی کی نئی روح پھونکتی۔ بلوریں باہوں کے سہارے اُسکو غسل خانے تک لیجاتی اور وہاں نرم نرم گدگدی پیدا کرنے والے ہاتھوں سے نہلاتی، پھر کپڑے پہناتی۔ انہیں معطر کرتی اور مزے سے لیکر، مسکرا مسکرا کر، اٹھلا اٹھلا کر، خود اسے اپنے آئینہ میں دیکھتی۔ جو اُس کے منہ سے نکلتا، دُلہن اس پر آمنّا و صدّقنا کہتی۔ اس کی جو مرضی ہوتی۔ دلہن اُسے فرض سمجھتی۔ وہ جو خواہش ظاہر کرتا، جب تک وہ پوری نہ ہو جاتی، دلہن کو چین نہ آتا۔

لیکن خود دُلہن ایک روتی ہوئی شمع کی طرح ٹمٹماتی ہوئی زندگی بسر کر رہی تھی۔ بظاہر ریاض کی راحت و آرام کے سوا اور کوئی جذبہ اُسے نہ جھنکاتا۔ اور کوئی خیال اُسے دُنیا کی دلکشیوں کی طرف نہ کھینچ سکتا۔ لیکن جب وہ ریاض پر اس طرح دل و جان سے نثار ہوتی ہوئی نظر آتی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے وہ ایک بے چین ننھی لڑکی ہے اور ریاض اُس کی واحد گڑیا۔ وہ مجبور ہے کہ اسی ایک گڑیا پر ساری جان سے بچھ جائے۔

میں یہ دیکھ رہا تھا کہ جس طرح ایک پھول کو شاخ سے نوچ لیا جائے اور پھر اُسے ایک ایسے گلدان میں رکھ دیا جائے جس میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ ہو اور وہ دُنیا کے ہر سانس کے ساتھ مُرجھاتا جائے۔ اسی طرح ریاض کا حال تھا۔ سماج نے اُسے کنول کو ریاض کے سپرد کر دیا تھا۔ جس کو ریاض کی عمر کی خزاں جھلسائے دے رہی تھی۔ بھلا ٹھنڈی ٹھنڈی حیات بخش لہریں وہ کہاں سے لاتا اور کس طرح لاتا کہ جوانی کی نسیم کے آغوش میں کھلے ہوئے پھول کو وہ دن بھی شاداب رکھ سکتا۔ مگر آنکھوں کو حسن کی سینک دینے کے لئے ضروری تھا کہ پھول ہمیشہ شگفتہ خنداں بنا رہے۔ اُس کی تمنا یہ ضرور تھی کہ دُلہن ہمیشہ کھلکھلاتی رہے اور جھومتی رہے۔ مگر اُس کے لئے ضرورت تھی کہ وہ خود بھی قہقہے لگائے۔ مچلے اور لہرائے۔

ریاض نے بھی وہی کیا جو اُس کی عمر کا مرد ایسی حالت میں کیا کرتا ہے۔

اس نے بیش قیمت ساڑیوں سے الماریاں بھر دیں۔ نئے نویلے زیورات سے دُلہن کے بکس بھر دیئے۔ انہی تقاضات کی بنا پر شاید دُلہن اس کو سونپی بھی گئی تھی۔ کمسن دُلہن ان ساڑیوں کو پہنکر سورج کی طرح گرم اور بھیرہ کا رنگ نظر آتی۔ جب وہ ان ساڑیوں کو زیب تن کرتی جن سے بہتر شاید اُس کی کسی سہیلی کے پاس نہ تھیں اور ان زیورات سے آراستہ ہوتی ایسا معلوم ہوتا کہ ستاروں کی محفل لگی ہے۔ اور چاند عالمِ نشہ میں رقص اُس وقت وہ چہل قدمی کو نکلتی۔ ریاض کی باہنوں میں اس کی پتلی پتلی انگلیاں ہوتیں

چشمہ کہاں روانیٔ گنگ و جمن کہاں؟

(از جناب اختر شیرانی)

کیا جانے جا چھپی وہ مری گلبدن کہاں؟ — شامِ چمن بتا، کہ ہے ماہِ چمن کہاں؟
دیدارِ برقِ جلوہ نہ تھا اِس قدر محال — حائل ہوا ہے رنگِ گُل و یاسمن کہاں؟
کہتا ہے یہ سکوتِ لبِ لالہ ہائے طور — سوزِ جگر کہاں، سرو برگِ سخن کہاں؟
خلوت نشینیوں سے نہیں فیض، خلق کو — چشمہ کہاں، روانیٔ گنگ و جمن کہاں؟
اے دردِ دل یہ تو نے دکھایا ہے کیا اثر — وہ گلبدن کہاں، مرا دارالمحن کہاں؟
یوں تو عزیز ہیں ہمیں نظارہ ہائے گُل — ہم جس کو ڈھونڈتے ہیں وہ گلگوں بدن کہاں؟
ہم تلخ کامیوں کا گلہ کس طرح کریں — مانا کہ آپ سا کوئی شیریں دہن کہاں؟
یہ سچ کہ ہے بہارِ چمن، جانفزا مگر — جس کی تلاش ہے وہ بہارِ چمن کہاں؟
نورِ کمال چھپ نہیں سکتا حجاب میں — خوشبو بتاتی ہے کہ کھلی ہے سمن کہاں؟
لے مے خیالِ انجمنِ عیش مٹ گیا — وہ آ گئے خیال میں تو انجمن کہاں؟

مجبور ہو کے ان کو بھی کہنا پڑا ندیم!
اختر سا دہر میں شیریں سخن کہاں؟

کسان

(از جناب الطاف مشہدی)

آرزوؤں کی کمر جھکتی ہوئی   سانس چلتی ہے مگر رکتی ہوئی
تیرہ و تاریک سائے آس پاس   حال مرجھایا ہوا ماضی اداس
غم کا مرکز، آرزوؤں کا مزار   پیٹھ پر لادے ہوئے نسلوں کا بار

ایک بوڑھا نوجوان
ہل کی ہتھی پر نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

خامشی اک مضطرب فریاد ہے   مسکراہٹ ظلم کی رُوداد ہے
ہو نکتے سینے میں کچھ چنگاریاں   غیر کی بخشی ہوئی بیماریاں
جبر کی زنجیر جس کے پاؤں میں   پل کے نکلا سود جس کی چھاؤں میں

سن چکا جو داستان
ہل کی ہتھی پر نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

مست آنکھوں میں بہاروں کا ہجوم   بولتے گاتے نظاروں کا ہجوم
سرخ ہونٹوں پہ تبسم کی بہار   نیچی نظروں میں فسانے بیقرار
لو نگھتے دِل جاگتی رعنائیاں   گنگناتی، جھومتی انگڑائیاں

جسکے دم سے ہیں جوان
ہل کی ہتھی پر نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

خون جسکا غازۂ لیل و نہار   جسکی محنت ہے وقارِ شہریار
جسکے بیلوں کا پسینہ سیم و زر   جسکے کھیتوں میں اگیں لعل و گہر
جسکی مٹی میں حیاتِ ملک و قوم   جسکی ہستی کائناتِ ملک و قوم

وہ جیتے بے آب نان
ہل کی ہتھی پہ نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

ہل قلم ہے کاتبِ تقدیر کا   کھیت نقشہ زیست کی تصویر کا
نرم رو ہریالیاں ہیں مست خواب   جانفزا منظر اگلتے ہیں شباب
خلد در دامن ہیں سادہ نکہتیں   میکدے تھامے ہوئے ہیں زرہتیں

اور بھوکا ہے کسان
ہل کی ہتھی پر نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

جو لہو مجبوریوں کا پی گیا   موت نے مارا اُسے وہ جی گیا
جو حوادث پر مسلط ہو گیا   غم کے کانٹوں پہ مچل کر سو گیا
ظلم کی آندھی چلی تو ڈٹ گیا   غم نہ گردن میں پڑا اور کٹ گیا

غیرتوں کا پاسبان
ہل کی ہتھی پر نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

سوچتا ہے کس قدر مجبور ہوں   زندہ رہ کر زندگی سے دور ہوں
خامشی میری مگر طوفان ہے   میرے سینے میں بپا ہیجان ہے
پیشگوئی ہے یہ اک بھونچال کی   یہ علامت ہے کسی جنجال کی

پھٹ پڑیگا آسمان
ہل کی ہتھی پر نظر گاڑے ہوئے
سوچتا ہے اک کسان

غزل

(از جناب حرماںؔ خیرآبادی)

تخیل ایک بہلاوا، تصور ایک دھوکا ہے
حقیقت خواب ہی ہے خواب کی تعبیر میں کیا ہے

سمجھ لیجے اسی کو ارتقائے سعیٔ انسانی
کہ دامن زندگی کا شوق کے کانٹوں میں اُلجھا ہے

ہزاروں گردنیں عالم میں زیرِ آرزو ہوں گی
یہی ہوگا یہی، جب تک فریبِ عشق زندہ ہے

غمِ سود و زیاں ہے، جوہری کو کیا غرض اِس سے
یہ کنکر ہے کہ موتی ہے، یہ پتھر ہے کہ ہیرا ہے

یہ طفلانِ ادا دل محرومِ سوزِ عشق کیا جانیں
تمنا نقش ہے یا دل پہ انگارا دہکتا ہے

نفس ہی پر ہیں مبنی دہر کی جولانیاں ساری
جو قطرہ ہے تو دریا ہے، جو ذرّہ ہے تو صحرا ہے

الٰہی اس عجب فطرت سے کیا مفہوم ہے آخر
جلو میں سو طرح کے غم ہیں، دِل ہے اور تمنا ہے

جو پہلے ہو چکا ہے وہ زمانہ پھر نہ آئے گا
غرض ثابت ہوا انسان ہر منزل پہ تنہا ہے

میں حرماںؔ آپ کو تشبیہ دوں کس دردِ معنیٰ سے
بس اِک گل، جو خراب آباد صحرا میں مہکتا ہے

رکشا والا

(از جناب بشیر ساجد بی۔ اے)

گرد آلود ابروؤں اور دھندلی آنکھوں کا سماں
جیسے قبروں کے گڑھوں پہ اُگ رہی ہوں جھاڑیاں

نیلے نیلے خشک ہونٹوں سے دُھواں اُٹھتا ہوا
زرد اور بے خون چہرے پر الم چھایا ہوا

اک لنگوٹی اور اک صدری ہے از قسم لباس
وہ بھی مرہونِ کثافت جس طرح اُس کے حواس

پسلیاں اُبھری ہوئی اور پنڈلیاں سوکھی ہوئی
ننگے پاؤں ننگے سر ہے اور فضا ٹھٹھری ہوئی

اک مہاجن کو لئے جاتا ہے رکشا میں کہیں
شانۂ مزدور پہ سرمایہ ہے منزل گزیں

چڑھ رہی ہیں نیل سے چُنّٹ پہ کپڑوں کی تہیں
پوس کے جاڑے سے بے پروا ہیں دولت کی [illegible]

توند کو لپٹائے کمبل اور اوور کوٹ میں
ننھی مُنی ٹھنگریاں دبکی ہیں جس کی اوٹ میں

کہہ رہا ہے اپنے گھوڑے سے کہ چل ہاں تیز چل!
سائیکل والوں سے تانگے والوں سے آگے نکل

جا رہا ہے اس کا "گھوڑا" ہانپتا اور کانپتا
اور چوراہے کے اُس سنتری کو بھانپتا

جا رہا ہے ہٹتا، بچتا، ٹھہرتا، رُکتا ہوا
جانور کی طرح تنتا، گھومتا، جھکتا ہوا

جا رہا ہے "احسن التقویم" گھوڑے کی طرح
آدمی نے پائی ہے [illegible] گھوڑے کی طرح

چرخ سے غائب تھا سورج دیوتا کا رتھ ابھی
پھر رہا ہے جب سے [illegible]

اس میں اور تانگے کے گھوڑے میں ہے بس یہ امتیاز
شہر کی سڑکوں پہ اس کو [illegible]

اے خدا رکشا کا "گھوڑا" راکشس یک دم بنے
چھوڑ کر [illegible] کی رکھشا اسے غارت کرے

سببِ شعر گوئی

شعر کہتا ہوں میں اکثر بے سبب کیا جانے کیوں؟

اس لئے شاید کہ اُن کی بارگاہِ ناز میں — اپنی کیفیات، دلکش طرز میں پہنچا سکوں؟
بھر کے سوزِ روح، الفاظِ حسیں کے ساز میں — آخری اک نغمۂ دردِ محبت گا سکوں؟
نغمۂ دردِ محبت وہ کہ جس کی انتہا
پھر ہستی کی بجائے حاصلِ روحِ بقا
شعر کہتا ہوں میں اکثر بے سبب کیا جانے کیوں؟

نامکمل ہیں مری بربادیاں، کیا اس لئے؟ — زندگی کو زخم کوئی اور بھی درکار ہے؟
کم ہیں یہ مجبوریاں، معذوریاں، کیا اس لئے؟ — یا ابھی تک میری راہِ مرگ ناہموار ہے؟
یا کسی نادیدہ منزل سے گزرنا ہے ابھی
حل کوئی اور عقدۂ جانسوز کرنا ہے ابھی
شعر کہتا ہوں میں اکثر بے سبب کیا جانے کیوں؟

دل میں ہے بیدار اک خوابِ محبت، اس لئے — اور غلاموں کے لئے شغلِ محبت ہے حرام!
آج تک ہے روح کو احساسِ اُلفت، اس لئے — وقت لیکن کہہ رہا ہے: "یہ نہیں تیرا مقام!"
اس جنوں سے بیش قیمت اور بھی ہے اک جنوں
جس کی ہر ٹھوکر میں ہے آباد اک خلدِ سکوں
شعر کہتا ہوں میں اکثر بے سبب کیا جانے کیوں؟

اس لئے شاید کہ فرطِ درد سے دیوانہ دل — چاہتا ہے عصرِ حاضر کا گھروندہ توڑ دوں؟
ہاتھ میں لے کر عنانِ وقت و نظمِ آب و گل — اب سے چودہ سو برس پیچھے کی جانب موڑ دوں؟
یہ طلسمِ ظلم و استبداد یکسر ٹوٹ جائے
قیدِ ہر بیداد سے مظلوم انساں چھوٹ جائے

جانے کیا موضوع ہے میری شاعری کا، کیا سبب؟
کھول دے اسرارِ الہامات مجھ پہ میرے رب!

از

جناب محمود رضانی

فلمی خبریں

(۱) شالیمار پکچرز من کی جیت کی نمائش تمام بڑے بڑے شہروں میں شروع ہو چکی ہے۔ آمدہ اطلاعات نہایت حوصلہ افزا ہیں۔ کمپنی کے سٹوڈیو واقع پونہ میں "غلامی" جو کہ ایک تخیلی تصویر ہے، غلام ہندوستان کی رہنمائی کیلئے نہایت سرعت کے ساتھ پایۂ تکمیل کو پہنچ رہی ہے۔ اسے ہدایت کار ورملانی نہایت محنت اور کوشش کے ساتھ تیار کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہدایت کار احمد "سری کرشن بھگوان" کی تیاریوں میں مشغول ہیں۔ اور نجم الحسن نقوی۔ "پرتھوی راج سنجوگتا" تیار کر رہے ہیں۔ "غلامی" میں رینو کا دیوی اور مشہور دیپک دیز اور باقی دونوں تصویروں میں نینا اور شیام کام کر رہے ہیں۔

(۲) شوری پکچرز "شالامار" روپ شوری کی ہدایت کاری میں تکمیل کے آخری مراحل طے کر رہی ہے۔ اسٹوڈیو کی آمدہ اطلاعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسٹر شوری "شالامار" کو سال رواں کی بہترین تصویر بنانے کی کوشش میں ہیں۔ "شالامار" میں چندر موہن۔ بیگم پارہ۔ منورما، پرمیلا اور مجنوں جیسے اداکار کام کر رہے ہیں۔ موسیقی کے فرائض ماسٹر امرناتھ سرانجام دے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ کہانی مشہور ڈرامہ نویس مسٹر جوہر کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ مسٹر شوری "شالامار" کو مئی میں نمائش کیلئے پیش کر دینا چاہتے ہیں۔

(۳) بمبئی سینے ٹون "لال حویلی" کی کامیابی کے بعد مسٹر کے۔ بی۔ لال "سمراٹ اشوک" فلما رہے ہیں۔ "سمراٹ اشوک" اب قریب الاختتام ہے۔ "سمراٹ اشوک" کے مناظر سینٹرل اسٹوڈیوز اور پربھات اسٹوڈیوز پونہ میں نہایت سرعت کے ساتھ فلم بند ہو رہے ہیں۔ مسٹر مغنی تصویر کی نشر و اشاعت میں مشغول ہیں۔ مشہور ترین مغنیہ ثریا ہیروئن کا کردار ادا کر رہی ہے۔ چنانچہ مسٹر مغنی نے خوش ہو کر ثریا کو "پری رو" کا خطاب عطا فرمایا ہے۔ یاد رہے کہ نسیم کو بھی مسٹر مغنی نے ہی "پری چہرہ" کا خطاب دیا تھا۔ "سمراٹ اشوک" میں ثریا۔ چندر موہن۔ جاگیردار اور الہاس کام کر رہے ہیں۔

(۴) کاردار پروڈ[کشنز] [illegible] کی تاریخی تصویروں کی کامیابی سے [illegible] "شاہجہاں" کی [illegible] کرنا شروع کر دی ہے۔ "شاہجہاں" کی تیاری میں لاکھوں روپیہ [illegible] ہے اور مسٹر کاردار کی کوشش ہے کہ گذشتہ تمام ریکارڈ [illegible] دیا جائے۔ مغلیہ شان و شوکت کے مطابق شاندار [illegible] ہو رہی ہیں۔ شاہجہاں کی کہانی، مکالمے اور گانے "جیلہ" اور [illegible] کے مشہور یافتہ کمال امروہوی نے لکھے ہیں۔ اور موسیقی نوشاد علی کے سپرد ہے۔ ہدایت کاری کے فرائض مسٹر کاردار خود سرانجام دینگے۔

(۵) محبوب پروڈکشنز "ہمایوں" کی تیاری پر لاکھوں روپیہ اور ایک سال سے زائد وقت صرف ہوا ہے۔ چند لوگوں کا خیال ہے کہ مسٹر محبوب ان پڑھ ہیں اور "ہمایوں" کی کہانی تاریخی نقطۂ نگاہ سے کمزور ہوگی۔ مگر مسٹر محبوب اور کارکنان کمپنی نے اعلان کیا ہے کہ ہمایوں کی کہانی تاریخی نقطۂ نگاہ سے بالکل درست ہے۔ اور نہایت محنت اور کوشش سے اس کی تکمیل میں مشغول ہیں۔ تصویر کی نمائش ہونے پر سب پر ظاہر ہو جائیگا کہ اس وقت تک جتنی بھی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں۔ سراسر غلط اور بے بنیاد ہیں۔ "ہمایوں" میں چندر موہن۔ وینا۔ نرگس۔ اشوک کمار۔ شاہ نواز۔ مجید۔ کے۔ این۔ سنگھ جیسے مشہور اداکار کام کر رہے ہیں۔ موسیقی ماسٹر غلام حیدر۔ اور عکاسی فریدوں ایرانی کی ہے۔ اس کے علاوہ کہانی، گانے اور مکالمے آغا جانی کاشمیری اور سید امتیاز مراد آبادی کے ہیں۔

(۶) راج کمل کلامندر مسٹر شانتارام ان دنوں "ڈاکٹر کوٹنس" کی تیاریوں میں مشغول ہیں۔ "ڈاکٹر کوٹنس" میں جے شری اور مسٹر شانتارام ہیرو اور ہیروئن کا کردار ادا کریں گے۔ [illegible] ہے کہ اسے تین زبانوں میں تیار کیا جائیگا۔ اس کمپنی کی تصویر "پربت پہ اپنا ڈیرا" ہر جگہ کامیابی سے چل رہی ہے۔ اس میں ونمالا۔ الہاس نے کام کیا ہے۔ میجسٹک سینما میں موجودہ فلم "بھی بات" کے بعد اس کی نمائش شروع ہو جائیگی۔ "پربت پہ اپنا ڈیرا" مسٹر شانتارام کی تیار کردہ ہے۔

(۷) فیمس فلمز غالباً "بھول" پہلی تصویر ہے جس میں [illegible] زمانہ فلمی دنیا کے مشہور [illegible] رہے ہیں۔ "بھول" ایک اسلامی معاشرتی [illegible]

... [illegible] سنیما میں اسکی نمائش شروع ہوگی۔ [illegible] آصف کی ہدایت اور [illegible] شیراز علی حکیم کی [illegible] ہے۔ موسیقی کے لئے ماسٹر غلام حیدر کی خدمات [illegible] پر مشتمل ہیں۔ [illegible] ایم اسماعیل۔ [illegible] یعقوب۔ ثریا [illegible] مظہر خاں اور کے۔ این سنگھ کے نام قابل ذکر ہیں۔

(۸) رنجیت فلم کمپنی

رنجیت کے سٹوڈیو میں اس وقت کئی تصاویر تیار ہو رہی ہیں۔ کیدار شرما دو تصاویر دھنا بھگت اور گلستان بیک وقت فلم بند کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ شبنم۔ کارواں اور چاند چکوری کی فلم بندی ختم ہو چکی ہے۔ اور نمائش کی منتظر ہیں۔ ان تصاویر میں خورشید۔ کملا چٹرجی نے ہیروئن کا کام کیا ہے۔

(۹) یونائیٹڈ فلمز

بھائی جان تیار ہو چکا ہے۔ اب عنقریب اسکی نمائش ریجنٹ لاہور میں شروع ہو جائیگی۔

"بھائی جان" مسلم سوشل تصویر ہے اور ہندستانی مرد عورتوں کے لئے سبق آموز پیغام ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ لطافت، پاکیزگی اور اخلاق کو قدم قدم پر پیش کیا گیا ہے۔ کمپنی کی اطلاعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ دیکھنے والے اس کے مزاح اور رقص سے متاثر ہو کر مسکرانے اور رقص کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

بھارت کے مشہور و نامور ماسٹر شیام سندر نے اس میں نرالی دلکش طرزیں پیش کی ہیں۔ جنہیں سنکر آپ گلی گلی کوچوں میں گنگناتے پھرینگے۔ "بھائی جان" میں نور جہاں۔ مینا۔ انیس خاتون۔ کرن دیوان اور شاہ نواز نے کام کیا ہے۔

(۱۰) سنٹرل سٹوڈیوز

میں اس وقت ساتھی۔ تسنیم شمع اور ایک دن کا سلطان چار تصویریں تیار ہو رہی ہیں۔ "ساتھی" مسٹر کاردار کے معاون و [illegible] کے شہرت یافتہ ایم۔ صادق [illegible]۔ "تسنیم" [illegible] ہیں جن میں چندر پربھا اور یعقوب نے کام کیا ہے "شمع" [illegible] فضلی (اس میں مہتاب نے ہیروئن کا پارٹ ادا کیا ہے۔ اور "ایک دن کا سلطان" [illegible] سہراب مودی خود تیار کر رہے ہیں۔ نہایت سرعت کے ساتھ [illegible] تکمیل کو پہنچ رہی ہیں۔

"ایک دن کا سلطان" میں مہتاب [illegible] بھارت [illegible] اور [illegible] پاس [illegible] فلم [illegible] پیش ہو چکا ہے۔

(۱۱) جینت دیسائی پروڈکشنز

مسز [illegible] چندر گپت کی [illegible] ۲۰ اپریل سے [illegible] میں نمائش شروع ہو جائیگی۔ آمدہ اطلاعات مظہر ہیں کہ رومان اور موسیقی کے لحاظ سے خوب تصویر ہے۔ اور کافی مقبول ہو رہی ہے۔ اس میں رینوکا دیوی۔ ایشور لال۔ ثریا۔ نیلم [illegible]۔ مبارک۔ بابا بنرجی اور سید احمد نے کام کیا ہے۔ ہدایت کاری جینت ڈیسائی کی ہے۔

اس کمپنی کی آئندہ تصویر "آکاش دیپ" سنٹرل سٹوڈیوز میں جینت دیسائی کی ہدایت کاری میں تیار ہو رہی ہے۔

(۱۲) بمبئی ٹاکیز لمیٹڈ

کا مزاح، رومان اور موسیقی سے بھرپور فلم "جوار بھاٹا" جگت سنیما میں نہایت کامیابی سے چل رہا ہے۔ "جوار بھاٹا" میں مردولا ایک نیا چہرہ پیش کیا گیا ہے معلوم ہوا ہے کہ یہ دہلی کی ایک تعلیم یافتہ لڑکی ہے۔ بمبئی ٹاکیز میں اخلاق اور تہذیب کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بمبئی ٹاکیز کی تصویروں میں تعلیم یافتہ اور شریف گھرانے کی لڑکیاں کام کرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہیں۔ اور بمبئی ٹاکیز ہمیشہ شرفا اور تعلیم یافتہ طبقے کی توجہ کا مرکز بنا رہتا ہے۔ مردولا علاوہ شمیم۔ آغا جان۔ دلیپ کمار اور ممتاز علی نے "جوار بھاٹا" میں کام کیا ہے۔ ممتاز علی کے ناچ بہت پسند کئے گئے ہیں۔ موسیقی انل بسواس کی ہے۔

ایک نئی تصویر جس کے نام کا ابھی اعلان نہیں کیا گیا۔ کیریکٹر ایکٹر [illegible] کی ہدایت کاری میں تیار ہونی شروع ہو گئی ہے۔

(۱۳) آچاریہ پروڈکشنز

کا تیار کردہ مزاح اور تفریح سے بھرپور فلم "آگے قدم" رٹز سنیما میں نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ نوجوانوں کا مقبول ترین ہیرو موتی لال اپنے مزاحیہ جملوں سے حاضرین کو قہقہے مارنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ "کنوارا باپ" اور "پنر ملن" کی شہرت یافتہ انجلی دیوی نے اپنا کردار نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے۔ "آگے قدم" دو بیکار بی۔ اے پاس لڑکے اور لڑکی کی کہانی ہے جو نوکری حاصل کرنے کی خاطر میاں بیوی بن گئے۔ موتی لال اور انجلی دیوی کی جوڑی بہت اچھی رہی ہے۔ "آگے قدم" کو لوگ بہت پسند کر رہے ہیں۔ موتی لال، انجلی دیوی کے علاوہ مبارک اور نیلم [illegible] نے بھی خوب کام کیا ہے۔ "آگے قدم" [illegible] آچاریہ کی گذشتہ تصاویر سے بڑھ چڑھ کر ہے۔ دہلی کی پبلک اسے بہت پسند کر رہی ہے۔

(۱۴) [illegible] — [illegible] سے [illegible]

[illegible] بیش کی ہیں۔ کہانی مکالمے اور گانے دھوکن نے لکھے ہیں۔ فن میں جسمانی کرن دیوان۔ دلشتی۔ نیولا۔ راج کماری شکلا۔ دھنی [illegible] اور [illegible] نے کام کیا ہے۔ داستان بالکل نئے انداز میں "ثریا" [illegible]

(۱۵) نیچولی آرٹ - نیا

انکان کہنی کا بیان ہے "شیریں فرہاد" کی تیاری پر بیس لاکھ روپیہ صرف ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے اتنی رقم خرچ ہو گئی ہو گی۔ کیونکہ فلم بندی کے دوران میں ناظر دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ سین سینریاں بالکل اسی زمانے کے ایرانی آرٹ کے مطابق ہیں۔ سین سینریاں دیکھنے والا تھوڑی دیر کے لئے یہی محسوس کرنے لگتا ہے جیسے کہ وہ ایران کے محلات میں کھڑا ہے۔ "شیریں فرہاد" میں راگنی۔ جینت۔ گیانی۔ جی این بٹ۔ نفیس بیگم۔ [illegible] اور [illegible] نے کام کیا ہے۔

این ایم خواجہ نے "شیریں فرہاد" میں اپنے فن کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ ہدایت کاری پر [illegible] اور موسیقی امرناتھ اور رشید عطرے کی ہے۔ گانے [illegible] شوکت تھانوی۔ قمر جلالی (؟) اور سید امتیاز علی تاج کے ہیں۔

اس کمپنی کی ایک اور تصویر "کیسے کہوں" تیار ہو چکی ہے۔ اس میں راگنی۔ نجم الحسن۔ [illegible]۔ جی این بٹ۔ آغا (؟) [illegible] نے کام کیا ہے ہدایت کاری خورشید [illegible] اور [illegible] کے شہرت یافتہ موسیقی [illegible] ہے۔ ہر دو تصاویر عنقریب نمائش کیلئے پیش کر دی جائیں گی۔

(۱۶) فضلی برادرز

کا مسلم سوشل فلم "معصت" ہر جگہ کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے "معصت" جیسا کہ اسکے نام سے ظاہر ہے معاشرتی اور اصلاحی فلم ہے۔ "معصت" میں پردہ کا خاص خیال رکھا گیا ہے لیکن سنیما بمبئی میں معصت نے گذشتہ تمام ریکارڈ مات کر دیئے ہیں۔ فضلی برادرز اسلامی معاشرت کو ترقی پسند طریقہ سے پیش کرنے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ ان کی گذشتہ تصاویر "قیدی" "معصوم"۔ "چودھری" اور "مہندی" پبلک سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔ فضلی برادران کی تصاویر ادبی، اخلاق اور اسلامی ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پبلک انہیں قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ "معصت" میں خود ہی کا جملہ کہ "پہلے بیوی میاں کا انتظار دیکھا کرتی تھی۔ اب شوہر کو بیوی کا انتظار کرنا ہوتا ہے" سنکر آپ لوٹ پوٹ ہو جائیں گے۔ دہلی میں معصت عنقریب کسی اچھے سنیما میں نمائش کیلئے پیش کر دیا جائیگا۔

[illegible]

اندر [illegible] ہمایوں [illegible]

(۱۸) [illegible] - نیا

[illegible]

سکے پردے [illegible] کا تعین [illegible] پل کھل گیا چنانچہ اس بات کا اندازہ کرنے کیلئے [illegible] رشید [illegible] کو ایک مستقل فلم [illegible] کیا ہے۔ اداکاروں کا [illegible] فلمی دنیا کی کامیاب ہیروئن کے ساتھ پارٹ کر رہی ہے۔

اُردو زبان کے آتش نوا شاعر الطاف مشہدی کا

چوتھا مجموعہ کلام

"ذکر"

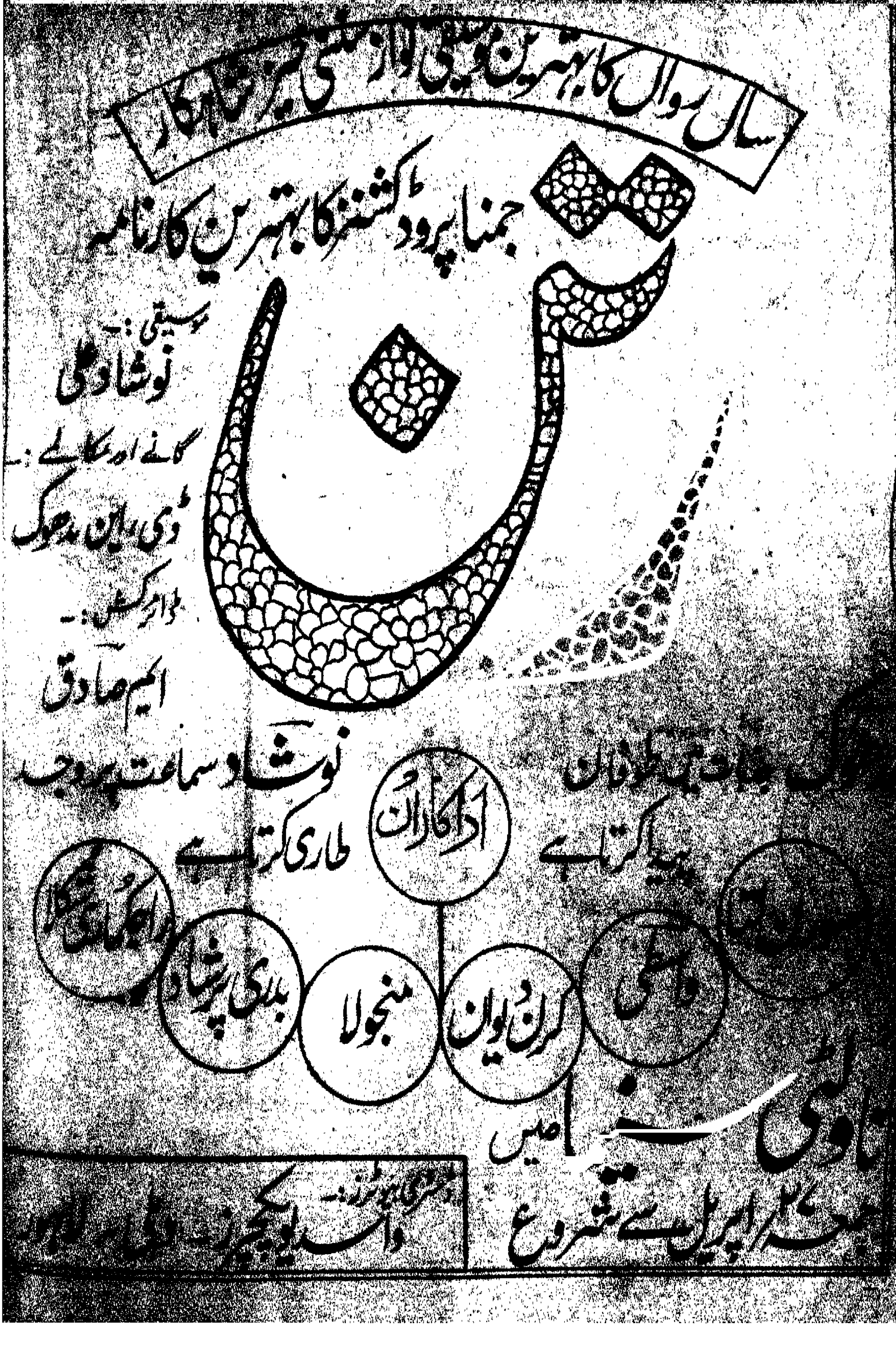
نیا ادب بک ڈپو جموں (کشمیر) کے اہتمام سے چھپ رہا ہے۔

الطاف مشہدی اس بے راہ روی کے زمانہ میں بھی شاعری کے ایک ایسے مقام پر کھڑا ہوا دکھائی دیتا ہے جسے اُردو شاعری کے اس طرف دور سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ الطاف حقیقی معنوں میں شاعر ہے۔ اسکا ہر شعر ادب لطیف کی تفسیر ہے۔ اس مجموعہ میں شاعر نے اپنا حقیقی آرٹ پیش کیا ہے۔ "ذکر" میں الطاف مشہدی کا انقلابی کلام پیش کیا گیا ہے۔

تیس سال سے زیادہ ہوئے جب جاپان نے چین سے کوریا چھین لیا تھا۔ کوریا کے لوگوں کو کچھ بھی شہری حقوق نہیں حاصل ہیں۔ وہ اپنے ملک کی حکومت میں کوئی ذمّہ دار عہدہ نہیں پا سکتے۔ تمام کاروبار جاپانی کمپنیوں کے ہاتھ میں ہے۔ جاپان میں آزادی اور باہمی خوشحالی کا یہی مفہوم ہے

فتح کے ذریعہ .... آزادی





جمنا پروڈکشنز کا بہترین کارنامہ
موسیقی:
نوشاد علی
گانے اور مکالمے:
ڈی این مدھوک
ڈائرکشن:
ایم صادق
اداکاران
کرن دیوان
منجولا
بدری پرشاد
اپریل سے شروع

دونوں کے بدن ایک دوسرے کا سہارا لئے ہوتے۔ قدم ڈگمگاتے ہوئے بڑھتے، میں دو قدم پیچھے ہوتا اور مجھے ہر لمحہ یہ محسوس ہوتا کہ دلہن کی آگ دولہا کے دامن پکڑ رہی ہے۔ دولہن شعلۂ جوالا ہوئی جا رہی ہے۔ اور دولہا جھلسا جا رہا ہے۔

تھوڑی دیر چلنے کے بعد دولہن کے قدم بھاری پڑنے لگتے۔ وہ اپنی ہی حرارت میں پگھلنے لگتی۔ کبھی کبھی سانس کا تموج فضا کے ساتھ تھپیڑے لگانے لگتا۔ اس وقت میں دولہا پر نظر ڈالتا۔ ریاض کا چہرہ پیلا ہو جاتا، اس کے رخساروں کی جھریاں زیادہ چمکنے لگتیں۔ اس کے ہاتھوں کی رگیں زیادہ ابھر آتیں اور اس کے قدم اس طرح پڑنے لگتے جیسے اس پر بھاری بوجھ ہے۔ یا اس کی کمر ٹوٹی جا رہی ہے۔ زیادہ دیر نہ ہوتی کہ دولہن ہاتھوں کا پنکھا جھلتے واپس ہو جاتی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ہوتے، اس کا چہرہ کچھ پسینے سے اور کچھ آہوں کے ابخرات سے بھیگا ہوتا واپسی میں دونوں الگ ہو کر چلتے۔ اور پھر گھر آتے ہی دولہن کے سر میں درد ہو جاتا اور دولہا دوڑ دھوپ میں مشغول ہو جاتا۔

ایک دن ریاض کی بہن اور اس کے بچے آ گئے۔ اس دن کے بعد سے میں نے دیکھا کہ دولہن زیادہ وقت معصوم بچوں کے ساتھ گذارنے لگی۔ ریاض کو بھی موقع ملا، بہانہ ہاتھ آیا، وہ بھی زیادہ وقت دوستوں کے ساتھ گذارتا۔ برج پارٹیاں پھر شروع ہو گئیں۔ شکار کے اہتمام پھر ہونے لگے۔ مجھے خلیج صاف نظر آنے لگی۔ کچھ دن اور ٹھیرنے کے بعد میں واپس چلا آیا۔

چند مہینے گذر گئے۔ مجھے ریاض کا خط ملا۔ برف کا پہاڑ پگھلا۔ ریاض باپ بن چکا تھا۔ خط سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ ریاض اس نئی کروٹ سے خوش ہے۔ اس کی بے اطمینانی دور ہو گئی ہے۔ اس کے خدشات دور ہو گئے ہیں میرے لئے دونوں کی طرف سے دعوت تھی۔

اِس مرتبہ جو میں گیا، میں نے بالکل دوسری کیفیت دیکھی۔ ریاض کی دولہن اب ماتا کی آگ سے دہک رہی تھی۔ جوانی کی چنگاریاں اب ماں کی بے پناہ محبت میں جھلک رہی تھیں۔ اس کی آنکھیں پیاسی پیاسی نظر آتیں۔ اس کے بدن سے آگ کی لپٹیں اٹھتی ہوتیں۔ اس کے چہرہ پر پیلاپن پھیل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی ہی آگ میں جھلس چکی ہے۔ صرف بچے کے قہقہوں کے چھینٹے اور اس کی پیاری پیاری باتوں کا موم رس اس کی موہنی موہنی اداؤں کی رنگیلی جھلکیاں، اس کی امنگوں کی راکھ میں بھی شوخ نکھی کھلائے ہوئے تھیں۔ کبھی وہ ایسی بجھی بجھی نظر آتی جیسے جیٹھ بیساکھ کی دوپہر میں رات کی رانی کی ننھی کلیاں۔ اور کبھی سورج مکھی کے پھول کی طرح سورج سے آنکھیں لڑاتی نظر آتی۔ ریاض کے دوستوں میں کئی اضافے ہوئے تھے۔ کم عمر دوستوں کی تعداد کافی تھی۔ وہ اور ان کی بیویاں شام سے گہری رات تک بیٹھی رہتیں اور قہقہوں کے گھنگرو فضا کو مترنم رکھتے۔ ریاض کو اطمینان تھا کہ کم سن کم عمر دوستوں اور ان کی الھڑ بیویوں کی معیت میں اس کی دولہن کا دل اچھی طرح بہل رہا ہوگا مگر مجھے کچھ اور ہی نظر آ رہا تھا۔ جوانی سے روشن روشن مکھڑے۔ جوان جوڑوں کی جوان حرکات اور جوان باتیں، ریاض کی دولہن پر ٹھنڈی بجلیاں گرا رہی تھیں۔ وہ روز بروز زیادہ بوڑھی نظر آتی۔ مجھے اس کی صحت کی طرف سے بھی تشویش ہونے لگی۔ میں نے ریاض سے ایک دن اشارتاً کہا۔ لیکن ریاض نے کہا میں وہمی ہوں۔ موسم غالباً گرم ہو رہا ہے۔ اس کا اثر معلوم ہوتا ہے۔ جلد سب پہاڑ پر چلے جائیں گے۔ میں چپ ہو رہا اور کچھ دنوں بعد واپس چلا آیا۔

اِس مرتبہ جو ریاض کا خط آیا تو مجھے دھکا سا لگا۔ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ کنواں آپ ہی آپ سوکھ گیا تھا۔ ریاض کی دولہن مستقل تپ میں مبتلا ہو چکی تھی۔ پہاڑ پر سب چلے گئے تھے۔ جہاں غالباً ریاض کی دولہن کو مستقل طور پر رہنا ہوگا۔

محبت اور انسانی جذبات کا بہترین مرقع

بمبئی ٹاکیز کی رومانی تصویر

جوار بھاٹا

پروڈیوسر و ڈائرکٹر:—

امیہ چکرورتی

اداکاران

مردلا (نئی دہلی کی تعلیمیافتہ دوشیزہ) شمیم آغا جان

دلیپ کمار۔ کے این سنگھ پٹھا والا ممتاز علی وغیرہ

جگت دہلی اور لکھنؤ میں

پانچواں پُر بہار ہفتہ

نشاط لاہور میں ۱۲ اپریل سے شروع

[illegible] سوانح حیات

جس نے

یونانی فاتحوں سے ملک کو آزاد کرایا اور سارے

ہندوستان میں ایک مسلسل حکومت قائم کی

ڈائرکٹر جینت دیسائی کا عظیم ترین تاریخی شاہکار

سمراٹ چندر گپت

اداکاران



رینوکا دیوی (ہیلن)

ایشور لال (چندر گپت)

مبارک (سیلوکس)

نیام پلی (چانکیہ)

ثریا، سلوچنا چٹرجی وغیرہ

[illegible]

[illegible]

فلمستان لمیٹڈ کا قابل یادگار شاہکار

چل چل رے نوجوان

پروڈیوسر

موسیقار: غلام حیدر

اداکاران: نسیم۔ اشوک کمار۔ ویلسانی۔ موتی بائی

جوبلی ٹاکیز میں ۵ واں ہفتہ پر بہار

جاری کردہ: جنرل ٹاکیز لمیٹڈ۔ دہلی، لاہور

آچاریہ پروڈکشنز کا لازوال۔ اچھوتا۔ نرالا اور بلند پایہ مزاحیہ فلم

آگے قدم

بمبئی اور لاہور میں تہلکہ مچانے کے بعد دہلی میں آگیا ہے

ایک بیکار نوجوان اور حسینہ کی داستان جو اتفاقیہ ملے۔ نوکری حاصل کرنے کیلئے جعلی میاں بیوی بنے اور آخر۔۔۔

ہدایت کار: گنگن۔ بندھن کا خالق این۔ آر۔ آچاریہ

ستارے: موتی لال۔ انجلی دیوی۔ مبارک وغیرہ

رٹز دہلی اور پرکاش دہرہ دون میں

جمعہ ۱۳ اپریل سے کامیابی کیساتھ چل رہی ہے

آگے قدم

جاری کردہ: نئی فلم سروس۔ دہلی





سمترا [illegible] کے فلم
"وصیت نامہ" میں

کملا چٹرجی
رنجیت کے فلم
"کاروان" میں





آشین چودھری اور بھارتی
فلم "وصیت نامہ" میں

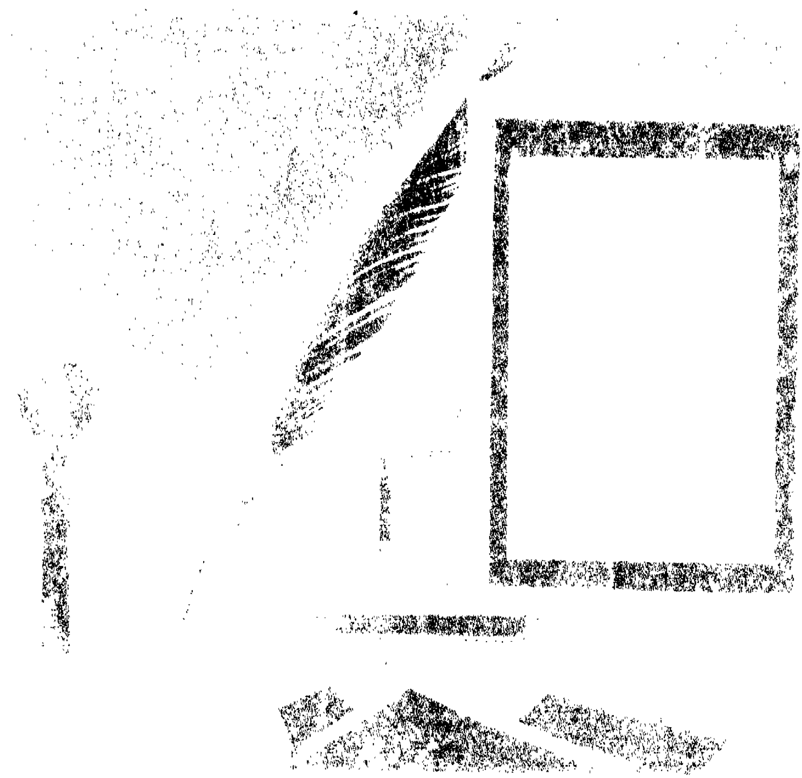
ارون
فلم "کاروان" میں

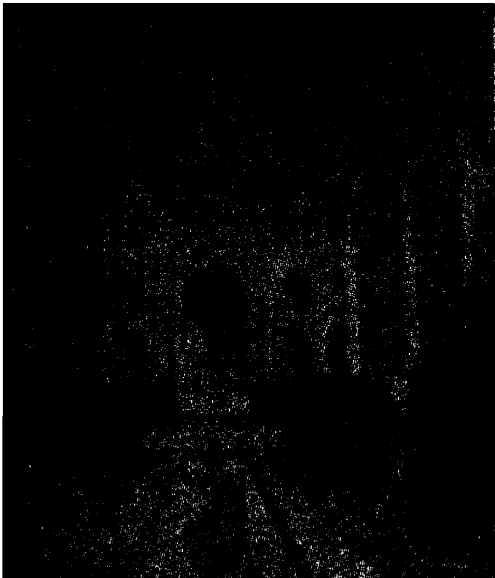
THE A[illegible]

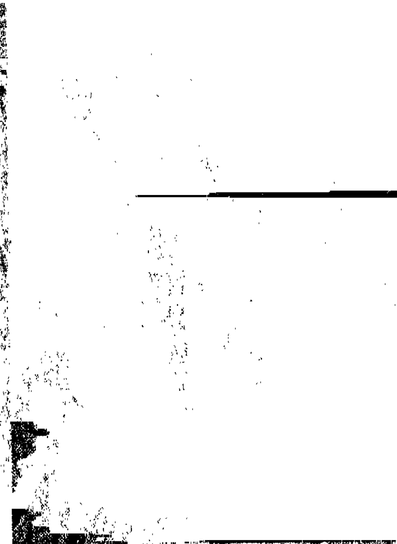
DELHI.

1. It is a purely literary monthly Magazine of [illegible].
2. It is published regularly on the tenth of each month.
3. Annual subscription of the Adeeb is [illegible] only, single copy Rupee one.
4. The Adeeb is posted with great care but if you don't get a copy by the 15th, please write to the office at once. If available, an extra copy will be sent to you again. Complaints received after the 18th will not be attended to.
5. All communications should be addressed to the Editor.
6. Free or sample copies of the Adeeb are not sent. For a sample copy always send the necessary stamps in advance.
7. Contributions not published in the Adeeb can be returned on receipt of the necessary stamps.
8. Always send extra stamps for a reply.
9. The Adeeb is not issued for less than a year.

[illegible] Press, Pataudi [illegible] Chowk, Delhi
[illegible] M. A. [illegible] Published from the office of
[illegible] Delhi.







سپنا دتی و راجکمار فلم "چاندنی چوک" میں

پھیپھیت کا فلمی منظر جو کہ تاج محل میں



نیلا ... اور ... فلم "... " میں

[illegible]

ایڈیٹر: [illegible] واحدی — تاج الدین احمد ایم اے — (آنسہ) نجمہ تصدق ایم اے بی ٹی

جلد ۹	مئی و جون ۱۹۴۵ء	نمبر ۱ و ۲

فہرست مضامین

[illegible]

جہانگیر کی سیرت اور اس کی حکمت عملی

(از جناب علیم اللہ صدیقی جامی)

تخت نشینی

۱۶۰۵ء میں اکبر کے انتقال کے بعد جہانگیر تخت نشین ہوا۔ اس وقت اس کی عمر چھتیس سال کی تھی۔ تخت نشین ہوتے ہی اس میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ اس نے اُن تمام بچپن کی حرکتوں کو چھوڑ دیا جن سے اکبر بہت پریشان رہتا تھا۔ اس نے اپنے پرانے مخالفین سے کوئی انتقام نہیں لیا بلکہ انہیں اُن کے عہدوں پر برقرار رکھا۔ اس کی مردم شناسی کی یہ اولین مثال ہے کہ جن لوگوں کو اس نے بادشاہ ہونے کے بعد بڑے بڑے عہدے دیئے تھے وہ نہایت قابل ثابت ہوئے۔ اور جہانگیر کو اُن سے کبھی کسی شکایت کا موقع نہیں ملا۔ تخت نشینی کی خوشی میں صدہا قیدیوں کو رہا کیا گیا۔ اور ایک فرمان جاری ہوا جس میں اکبری اصلاحات کو کامیاب بنانے اور نئی اصلاحوں کے وعدے کئے گئے تھے۔

خسرو کا فرار

تخت نشینی کے جشن اور تقریبیں ابھی ختم نہیں ہوئی تھیں کہ خسرو دوبارہ فرار ہو گیا۔ وہ بغاوت پر آمادہ تھا۔ ان سنگھ بیچ میں پڑا اور جہانگیر سے اس شرط پر خسرو سے مصالحت کرا دی کہ خسرو کے ساتھ کسی قسم کی بدسلوکی نہیں کی جائیگی۔ جہانگیر نے پدرانہ جوش محبت یا مصلحت وقت کا لحاظ کر کے خسرو کا قصور معاف کر دیا۔ اور آگرہ کے قلعہ کا ایک حصہ اس کے رہنے کے لئے دے دیا۔ لیکن اب ادھر جہانگیر کو خسرو کی طرف سے دل میں کھٹک رہی تھی تو دوسری طرف خسرو کی جرأت اور ہمت بہت بڑھ گئی تھی۔ قلعہ میں جو نگرانی اس کی کی جاتی تھی وہ اسے بہت ناگوار تھی۔ اسے یقین تھا کہ اگر میں پھر آزاد ہو گیا تو تھوڑی ہی مدت میں اتنی فوج جمع کر لونگا کہ باپ کا مقابلہ کر سکوں۔ اور ممکن ہے کہ تخت و تاج حاصل کر لوں۔ اس خیال سے ایک دن وہ چند معتبر سواروں کے ساتھ قلعہ سے نکل بھاگا۔ وہ راستہ میں فوجیں جمع کرتا ہوا لاہور کی طرف بڑھا۔ جہانگیر کو اطلاع ملی تو اس نے ایک فوج خسرو کو گرفتار کرنے کیلئے بھیجی۔ خسرو نے اپنے اردگرد بارہ ہزار فوج جمع کر لی تھی مگر یہ لوگ جنہیں سپاہی کہا جا سکتا ہے چار پانچ سو سے زیادہ نہ تھے۔ لاہور کا دیوان عبدالرحیم خسرو سے مل گیا تھا مگر قلعہ کا افسر

[illegible]

[illegible] بھی باپ کا مقابلہ کیا اور شکست کھائی [illegible] تخت و تاج [illegible] جہانگیر [illegible] گیا۔ ارجن بھی لپیٹ میں آ گئے خسرو نے لاہور جاتے وقت ترن تارن میں ارجن سے ملاقات کی تھی اور اپنی کامیابی کیلئے ان سے دعا کی درخواست کی تھی ارجن کے بہت سے ہندو اور مسلمان دشمن تھے انہوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور گرو ارجن کو خسرو کی بغاوت میں شریک کار ٹھیرایا۔ ان دشمنوں میں حقیقی بھائی بھی شامل تھا۔ جہانگیر گرو ارجن کے خلاف کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر اس کے مشیروں نے مجبور کیا کہ انہیں سزائے موت دی جائے۔ یہ ۱۶۰۶ء کا ذکر ہے۔

خسرو کی بغاوت کا اثر

خسرو کی بغاوت کا سلطنت مغلیہ کی خارجی پالیسی پر گہرا اثر پڑا۔ شاہ ایران نے قندھار فتح کرنے کی ناکام کوشش کی۔ یہ بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ قندھار ہندوستان اور ایران دونوں کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ ایک بہت بڑی تجارتی شاہراہ پر واقع تھا اور جب تک اس پر قبضہ قائم نہ کر لیا جاتا اس وقت تک ہندوستان اور ایران کی حکومتیں نہ اپنی سرحدوں کی طرف سے مطمئن ہو سکتی تھیں اور نہ اپنے تاجروں کی حفاظت کر سکتی تھیں۔ ۱۵۲۲ء میں بابر نے قندھار پر قبضہ کیا تھا اور ہمایوں کے انتقال کے وقت تک وہ مغلوں کے پاس رہا تھا۔ ہمایوں نے ایران کے دوران قیام میں قندھار ایران کے حوالے کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر یہ وعدہ پورا نہیں کیا گیا تھا۔ ہمایوں کا جب انتقال ہوا تو مغلوں کی جان پر بن آئی تھی۔ یہ وقت ان کیلئے نہایت صبر آزما تھا کہ وہ قندھار کو بچا سکتے اور ۱۵۵۸ء میں ایرانیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اور سلطان حسین مرزا وہاں کا حاکم مقرر کر دیا گیا تھا۔ لیکن عبداللہ خاں ازبک ایران کا رقیب تھا جس کی نظر قندھار پر ہمیشہ رہتی تھی۔ وہ شمالی خراسان کے اکثر حصے پر قابض ہو چکا تھا اور قندھار پر یورش کرتے رہتے تھے۔ مظفر حسین اور رستم مرزا کے فرزند اور جانشین نے شاہ عباس صفوی (شاہ ایران) سے ازبکوں کی سرکوبی اور ان کے لئے امداد طلب کی مگر شاہ عباس اپنی اندرونی مصروفیتوں کی وجہ سے کوئی امداد نہ بھیج سکا۔ مجبور ہو کر مظفر حسین نے مغلوں کی

[illegible] میں قندھار پر حملہ کیا ۔ [illegible] سے [illegible]
[illegible] اکبر [illegible] قندھار پر حملہ کر [illegible]
[illegible] قندھار میں [illegible] کی حفاظت کے لئے
[illegible] بادشاہ [illegible] عباس صفوی نے اس پاس
[illegible] کہا کہ قندھار سے مغلوں کو نکال باہر کریں ۔ مگر
[illegible] قندھار [illegible] کو اس خطرہ کا احساس تھا اور انہوں نے
[illegible] ان حاکموں نے قندھار پر حملہ کیا مغلوں
نے [illegible] آخر میں جہانگیر نے مزید کمک بھیج دی ۔ ایرانی لشکر
[illegible] کی فوجوں کا شیرازہ منتشر کر دیا ۔ یہ مارچ ۱۶۰۶ء کا واقعہ ہے ۔
اس ناکامی کے بعد شاہ عباس صفوی نے ایک سفیر جہانگیر کے پاس روانہ کیا اور
اپنے حاکموں کی اس حرکت پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے اسے اپنی دوستی اور صلح
کوشی کا یقین دلایا ۔ جہانگیر کی یہ دور اندیشی تھی کہ اس سال گرمی کا موسم اس نے
کابل میں گزارا اور اپنی شان و شوکت کے مظاہرے سے دلوں پر ہیبت بٹھا دی
اگست ۱۶۰۷ء میں کابل سے واپس ہوا ۔ اس سفر میں جہانگیر کے قتل کی سازش
کی گئی تھی جس کی پاداش میں چار امیر موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے تھے ۔ اور خسرو
اندھا کر کے محبوس کر دیا گیا تھا ۔ جہانگیر نے خسرو کی آنکھوں کا بعد میں بڑی جانفشانی
سے علاج کرایا تھا اور اس کی ایک آنکھ میں تھوڑی بہت روشنی بھی آ گئی تھی ۔ (خدا
جانے یہ جوش محبت تھا یا ستم ظریفی)

خسرو کی بغاوت کے بعد جہانگیر کا عہد حکومت دو حصوں میں تقسیم کیا
جا سکتا ہے ۔ ۱۶۰۶ء سے ۱۶۲۲ء تک اور ۱۶۲۲ء سے ۱۶۲۷ء تک ۔ ہم
ان دونوں زمانوں پر ذرا تفصیل سے روشنی ڈالتے ہیں ۔

۱۶۰۶ء تا ۱۶۲۲ء

یہ زمانہ عہد جہانگیری کے عروج کا زمانہ ہے ۔ یہ صحیح ہے کہ اس زمانہ
میں چند مقامی بغاوتیں ہوئیں ۔ لیکن ان سے حکومت کو کوئی خاص صدمہ نہیں پہنچا ۔
یہ دور امن و امان کا تھا اور خانہ جنگی سے محفوظ رہا تھا ۔ جہانگیر کی شخصیت شروع
سے آخر تک ایک عیش پسند بادشاہ کی سی تھی ۔ حکومت کے فرائض دوسرے لوگ انجام
دیتے تھے اور پالیسی اس کی رہتی تھی ۔ یہ حکمران طبقہ اس وقت تک حکمران رہ سکتا تھا
جب تک جہانگیر کی پالیسی پر قائم رہتا اور اسے کسی قسم کی شکایت کا موقع نہ دیتا ۔
جہانگیر حکومت کے معاملات کا سرسری [illegible] لیتے ہوئے گھبراتا تھا مگر اسکی نظر حکومت
[illegible] کام پر رہتی تھی ۔ اس سے انکار نہیں کہ اس نے بہت سے لوگوں کو ذاتی

عزائم کی بنا پر بڑے بڑے عہدوں پر مقرر کیا تھا ۔ لیکن تاریخ ایسی کوئی نظیر پیش
نہیں کر سکتی ہے کہ وہ نا اہل ہو یا نا اہل ہونے کے باوجود اپنے عہدہ پر برقرار رہا ہو
جہانگیر نے بعض وقت مصلحت وقت سے مجبور ہو کر باغیوں کو سزائیں نہایت سخت
دی تھیں ۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ دشمنوں کو دوست بنانا بھی خوب جانتا تھا ۔
شراب ضرور پیتا تھا مگر اعتدال کے ساتھ ۔ اس کی عیش کوشی اور شان و شکوہ کے
شوق نے صنعت و حرفت کو بہت ترقی دی ۔ اور اس کی خوش ذوقی کی وجہ سے
فنون لطیفہ کو اس کے عہد میں جتنی ترقی ہوئی اتنی ہندوستان کو کبھی نصیب نہ
ہو سکی ۔ اس سے انکار نہیں کہ نور جہاں کے ذوق اور اسکی دلچسپی کا اس ترقی میں
بہت دخل تھا ۔ انگریز مورخین نے اسے محض عیش پرست ثابت کرنے کی ناکام
کوشش کی ہے ۔ سچ پوچھئے تو جہانگیر حقیقی معنوں میں بادشاہ تھا اور وہ اکبر
سے بھی بڑھا ہوا تھا ۔

خارجی حکمت عملی خارجی حکمت عملی جہانگیر کی وہی تھی جو اکبر نے اختیار
کی تھی ۔ پرتگالیوں اور انگریزوں کے ساتھ اس نے
مصالحانہ رویہ اختیار کیا تھا مگر جب ۱۶۱۳ء میں پرتگالیوں نے چار شاہی جہاز
لوٹ لئے تو جہانگیر نے حکم دیا کہ جتنے پرتگالی ہندوستان میں موجود ہیں سب
گرفتار کر لئے جائیں اور ان کے گرجوں میں قفل ڈال دیئے جائیں ۔ ان لٹیرے
پرتگالیوں کو سورت کے حاکم مقرب خاں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر شکست دی
اور انہیں تاوان جنگ دیکر مصالحت پر مجبور ہونا پڑا ۔ اس کے بعد سے انگریزوں کا
اثر دربار میں بہت بڑھ گیا تھا ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے ۱۶۱۸ء میں
سر ٹامس رو کے ذریعہ اس قسم کی خصوصی مراعات کی درخواست کی تھی جن سے ہندوستانی
تاجروں کو نقصان پہنچ سکتا تھا ۔ اسی وقت جہانگیر کی حب قومی اور ہندوستانی
تاجروں کے ساتھ اسکی محبت کا مظاہرہ ہوا ۔ اور اس نے باوجود اسکے کہ وہ
پرتگالیوں اور انگریزوں کا ان کے بحری بیڑے کی وجہ سے محتاج تھا اور انکی دشمنی
سے ہندوستانی تجارت کو نقصان پہنچ سکتا تھا ۔ ان کی درخواست کو نامنظور
کر دیا تھا ۔ کیونکہ یہ خصوصی رعائتیں ہندوستانی تاجروں کیلئے ضرر رساں تھیں ۔

داخلی حکمت عملی جہانگیر نے ان تمام ہندوستانی ریاستوں سے جنگ
جاری رکھی ۔ جنہوں نے مغل سلطنت کے سامنے سر خم
نہیں کیا تھا ۔ وہ برابر ان صوبوں میں فوجیں روانہ کرتا تھا جہاں فتنہ و فساد تھا ۔
اور یہ فوجیں سرکوبی کرتی رہیں ۔ اکبر کی طرح بڑی حد تک ناکامی جہانگیر کو بھی شامل

۱۶۱۵ء تاریخ ہند از ڈاکٹر تارا چند ص ۲۵۲

... ہو جاتی اور وہاں کے باشندے ... پوری طرح
سے امن قائم نہ کر سکا۔ جہانگیر کے سپہ سالار باوجود انتہائی کوشش کے صوبہ کے سرکش عناصر کو قابو میں نہ لا سکے۔ اتنا ضرور ہوا کہ عارضی طور پر ان کو لٹیروں سے محفوظ کر دیا۔ سچ پوچھئے تو اس صوبہ کی طبعی خصوصیات اس قسم کی ہیں کہ وہاں امن و امان قائم رکھنا تو بڑی بات ہے جہاں مغل کا [illegible] بھی آسان نہیں ہے۔ اس کے برعکس بنگال کے پٹھانوں کی سرکوبی میں دشواری نہیں ہوئی۔ حالانکہ اکبر کے زمانہ میں باوجود کوشش کے ان پر تسلط قائم نہ ہو سکا تھا۔ جہانگیر کے حاکم اسلام خاں نے عثمان خاں کو جو اس وقت بنگال کے پٹھانوں کا سردار تھا ۱۶۱۲ء میں بری طرح سے شکست دی۔ اس کے بعد جہانگیر نے عثمان خاں اور اس کے حامیوں کی نہایت دلجوئی کی اور انہیں ہر طرح سے مطمئن اور خوش کر دیا۔ اس حکمت عملی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنگال میں پھر کبھی بغاوت نہیں ہوئی۔ اور جو مقصد سختی سے حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا اسے جہانگیر نے اپنے تجربات کے ماہر ہونے کی وجہ سے اتنی نرمی سے نکال لیا۔ یہی حکمت عملی جہانگیر نے چتوڑ کے رانا امر سنگھ ورانا پرتاپ سنگھ کے لڑکے کے ساتھ اختیار کی جو اپنے باپ کی وصیت کے مطابق برابر مغلوں سے لڑتا رہا تھا لیکن آخر میں اتنی بری طرح ناکامی ہوئی تھی کہ اسے اور اس کے حامیوں کو پہاڑ اور گھاٹیاں بھی پناہ نہ دے سکیں تھیں۔ آخر کار وہ صلح کرنے پر مجبور ہوا تھا۔ جہانگیر نے امر سنگھ اور اس کے امیروں سے نہایت عزت اور احترام کا برتاؤ کیا تھا۔ اور ان کی خودداری کا اتنا پاس کیا تھا کہ جو کچھ انہوں نے شرائط صلح پیش کی تھیں سب کو تمام و کمال تسلیم کر لیا تھا۔ اپنی طرف سے صرف ایک مطالبہ پیش کیا تھا کہ چتوڑ کے قلعہ کی دوبارہ تعمیر نہ کی جائے۔ یہ ۱۶۱۴ء کا واقعہ ہے۔

دکن اور جہانگیر کی حکمت عملی

دکن میں اکبر کے زمانہ سے لڑائیاں جاری تھیں۔ مغل فوجوں نے احمد نگر کا شمالی علاقہ فتح کر لیا تھا۔ مگر فوجی افسروں کی باہمی رقابتوں نے تسلط مستحکم نہیں ہونے دیا۔ دوسری طرف احمد نگر کی خوش قسمتی سے ایک دانشمند وزیر اور اچھا سپہ سالار مل گیا۔ یہ ملک عنبر تھا اس کی فہم و فراست، دور اندیشی، مستقل مزاجی اور انتظامی قابلیت مسلّم تھی۔ اس نے ایک غلام کی حیثیت سے زندگی شروع کی تھی۔ جب مغلوں نے احمد نگر کو فتح کر لیا تھا تو اس نے کھڑکی کو دارالحکومت بنایا۔ اور شاہی خاندان کے ایک فرد کو مرتضیٰ نظام شاہ کے لقب سے تخت پر بٹھایا اور مغلوں کا مقابلہ کرنے کیلئے مرہٹوں کی ایک فوج تیار کی جن کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ کبھی جم کر میدان میں نہیں لڑتی تھی بلکہ وقت بے وقت حملہ کر دیتی تھی۔ اور [illegible] مغلوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔

[illegible] جہانگیر کا [illegible] اور شریف خاں [illegible] سپہ [illegible] احمد نگر پر حملہ کیا تھا ۱۶۱۱ء میں اس نے [illegible] طرح شکست دی۔ اس کے بعد ملک عنبر کی [illegible] اس کے حامیوں میں باہمی جھگڑے شروع ہو گئے [illegible] افسروں نے مغلوں کی فوج میں ملازمت کر لی تھی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغلوں کے سپہ سالار شاہ نواز خاں نے احمد نگر پر چھاپہ [illegible] اور [illegible] کو شکست دی۔ اس کے بعد ۱۶۱۶ء میں جہانگیر خود مانڈو آیا اور شہزادہ خرم (شاہجہاں) کو فوج کا سپہ سالار مقرر کر دیا۔ اب ان دکن کی ریاستوں کو یقین ہو گیا کہ مغلوں کا مقابلہ آسان نہیں ہے۔ اس لئے انہوں نے مغلوں سے مصالحت کر لی اور ملک عنبر کو تمام مفتوحہ علاقہ واپس کرنا پڑا۔ لیکن جہانگیر اور خرم کی واپسی پر وہاں جنگ پھر شروع ہو گئی۔ ملک عنبر نے بیجاپور اور گولکنڈہ کو اپنے ساتھ ملا لیا اور مغلوں کا مقابلہ کرنا شروع کیا۔ آخر ۱۶۲۱ء میں شہزادہ خرم دکن بھیجا گیا اور اس نے مرہٹوں کا زور توڑ دیا اور ملک عنبر کو صلح کرنی پڑی۔ ملک عنبر نے اس علاقہ کے علاوہ جو ۱۶۱۷ء کی مصالحت کے وقت مغلوں کے حوالہ کیا تھا۔ چودہ کوس زمین سرحد کے ساتھ ساتھ کی اور [illegible]

فتوحات کے اعتبار سے یہ زمانہ انتہائی عروج کا تھا۔ اسی زمانہ میں کھوکھرا جنوبی بہار میں ۱۶۱۵ء میں فتح ہوا۔ ۱۶۱۷ء میں خوردہ اور پوری کے علاقے فتح ہوئے۔ ۱۶۲۰ء میں کشتوار اور کانگڑہ کا قلعہ مغلوں کے قبضہ میں آگیا تھا۔ ۱۶۲۰ء کے بعد سے جہانگیر کی صحت انتہائی گر گئی تھی جس کی وجہ سے دربار پر نہایت گہرا اثر پڑا۔ نورجہاں جانتی تھی کہ دربار میں اس کا اقتدار جہانگیر کے دم سے قائم ہے۔ اب اسے اپنے اقتدار کی فکر ہوئی اور اس کے بقاء کی تدبیریں شروع کر دیں۔ آخر ۱۶۲۲ء میں اس نے اپنی لڑکی لاڈلی بیگم (جو شیر افگن سے تھی) کی شادی شہریار کے ساتھ اس خیال سے کر دی کہ اس کا اقتدار آئندہ [illegible]۔ اس نے شہریار کیلئے تخت [illegible] حاصل کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ وہ جانتی تھی کہ اگر خرم بادشاہ ہو گیا تو وہ اس [illegible] کا

ل جہانگیر کے چار لڑکے تھے خسرو، پرویز، خرم اور شہریار۔ [illegible] نہ ہوگی کہ خرم کی شادی ۱۶۱۱ء میں نورجہاں کے بھائی آصف خاں کی لڑکی ارجمند بانو (ممتاز محل) سے ہو چکی تھی اور [illegible] سے نورجہاں اس قسم کی توقع نہیں کر سکتی تھی۔

گذشتہ سے پیوستہ

جاسوس عورتیں

(تیسری قسط)

(از فصیح الدین احمد)

(۶) ترکی حور

یہ عورت بڑی جانباز تھی۔ اگرچہ یہ اتحادیوں کی ملازمت میں تھی، لیکن نیویارک نے اسے شبہ میں گرفتار کرلیا تھا کہ یہ ایک غیر جانبدار ملک کے مشہور سیاستدان کے ساتھ محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھی۔ لیکن یہ سیاستدان جرمنی کے ساتھ بہت دوستانہ تعلقات رکھتا تھا۔ سب سے بڑی چیز جو اس کے خلاف شہادت میں پیش کی گئی وہ اُس کے شاہانہ اخراجات تھے، جن کی وجہ سے شبہ ہوتا تھا کہ وہ دشمنوں سے بھی ملی ہوئی تھی۔ اس الزام کا جواب اُس نے یہ دیدیا کہ اس سے محبت کرنیوالے متمول لوگ تھے جن کا نام وہ منظرِ عام پر نہیں لاسکتی۔ اس طرح وہ پھانسی کے پھندے سے بچ نکلی۔ لیکن ایک روز حوالات میں مُردہ پائی گئی۔ اس کی موت آج تک ایک گہرا راز ہے۔

اس عورت کے کم از کم دس نام تھے۔ پیرس، لندن، میڈرڈ، اٹلی، واشنگٹن، بارسیلونا۔ غرض ہر جگہ وہ ایک نیا نام اختیار کرلیتی تھی۔ اس کی ابتدا اور اس کی موت دونوں اب تک صیغۂ راز میں ہیں۔

(۷) مارتھی رچرڈ عُرف "لارک"

یہ ایک فرانسیسی جاسوسہ تھی۔ جس نے برطانیہ اور فرانس دونوں کی زبردست خدمت انجام دی ہیں۔ اس میں خاص مردانہ خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ وہ بہت ٹھنڈے دماغ اور مضبوط ارادے کی عورت تھی۔ علاوہ ازیں اس زمانے کی مشہورترین ہوا باز بھی تھی۔ اُسکی قوتِ مشاہدہ بہت تیز تھی۔ اور وہ نفسیاتِ انسانی سے بخوبی واقف تھی۔ ان دونوں باتوں کی وجہ سے اس نے جاسوسی کے نہایت خطرناک کاموں کو بڑی ہوشیاری کے ساتھ انجام دیا۔ ان اوصاف کے باوجود اس میں نسائیت بھی کافی تھی جس کا جاسوس عورت میں ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس وقت جرمن بحری جاسوسی بیڈ کوارٹر اسپین میں تھا۔ چنانچہ اسے اسپین بھیجا گیا۔ اس نے صنفی تعلقات کی بدولت ایک نوجوان جرمن جاسوس کو محبت میں پھانس لیا۔ اور اُس کے ذریعہ سے دیگر بڑے جرمن افسروں تک رسائی حاصل کی۔ وہ برابر یہ ظاہر کیہ رہی کہ وہ جرمنوں کے لئے کام کررہی ہے اور اس طرح اُس نے اپنے محبوب کے ذریعہ جرمن جاسوسی محکمہ کے بڑے افسر بیرن کروہم سے ملاقات پیدا کی۔ بیرن اس پر ہزار جان سے فریفتہ ہوگیا۔ اور وہ خفیہ طور پر اسکی داشتہ بن گئی۔ بیرن نے میڈرڈ میں ایک حسن کی آرائش گاہ قائم کی جو بظاہر اُس کے اخراجاتِ زندگی کی کفیل تھی۔ اور جہاں وہ اپنی داشتہ کی جسمانی لذتوں سے محظوظ ہونے کیلئے آیا کرتا تھا۔ بیرن حسن کے اسی اڈے پر اپنے جاسوسوں سے بھی ملاقات کرتا تھا۔ چنانچہ جرمن جاسوسی کے تمام کارنامے لارک کیلئے ایک کھلا ہوا راز بن گئے تھے۔

(۸) میڈیم ڈاکٹر

گذشتہ جنگ کی تمام مشہور جاسوس عورتوں میں سب سے زیادہ افسانوی شخصیت کی مالک فراآلن لبین تھی۔ یہ بہت مشہور جرمن جاسوس تھی۔ اسکے کارناموں سے بہت سے جاسوسی ناول، فلم اور ڈرامے تیار کئے گئے۔ اس نے مستقل پیشہ کے طور پر جاسوسی اختیار کی۔ یہ جنگ سے بہت پہلے جاسوس بن گئی تھی۔ لیکن کا مطمح نظر نہ روپیہ تھا نہ عیاشی، اگرچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اپنے تمام زمانہ ملازمت میں دوشیزہ رہی۔ لیکن ہمیں اس کا یقین اس لئے نہیں آسکتا کہ کوئی عورت جو اپنی صنف کو کامیاب جاسوسی کیلئے استعمال کرنے سے انکار کرے وہ کبھی مطلوبہ فرائض انجام نہیں دے سکتی۔ کیونکہ ایک جاسوس عورت کا سب سے بڑا ہتھیار اس کا جسم ہے اور جب تک وہ اسے نہایت آزادی کے ساتھ بطور نذرانہ پیش کرنے کیلئے تیار نہ ہو وہ کبھی مردوں پر فتحیاب ہوکر اُن کے سینوں کے چھپے ہوئے رازوں کو معلوم نہیں کرسکتی۔

گذشتہ جنگِ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے تمام یورپ ایک سیاسی بارود پر قائم تھا جس کا کسی لمحہ بھڑک اٹھنا ممکن تھا۔ ہر حکومت دوسری قوموں کی فوجی تیاریوں کے متعلق اطلاعات معلوم کرنے کے لئے بے چین تھی۔ اسی وجہ سے بشمار مرد اور عورتیں سیاسی جاسوسی پر تعینات کردی گئی تھیں۔

اُس وقت ایک جرمن جاسوس مرا۔ اُس کے کوٹ کے استر میں سے چند کاغذات برآمد ہوئے جس پر کچھ فوجی نوٹ لکھے ہوئے تھے جرمنی کا جاسوسی محکمہ ان خفیہ تحریروں کو دریافت نہ کرسکا۔ ایک دن ایک سولہ برس کی لڑکی جس کا نام اینامیری تھا جرمن جاسوسی محکمہ کے صدر دفتر میں داخل ہوئی۔ اُس نے یہ بتایا کہ وہ مردہ جرمن سپاہی اُس کا

[illegible] تھا۔ [illegible] کی وجہ سے ذلیل [illegible] ہونے کا کوئی [illegible] سے خسرو کے [illegible] میں قتل کروا دیا تھا۔ چھوٹا بیٹا [illegible] شراب [illegible] شہزادہ [illegible] گیا تھا۔ [illegible] کرتی تھی جس خیال سے اس نے شہریار کو اپنی [illegible] کی رکاوٹیں دور کرنے میں منہمک ہوگئی۔ یہ [illegible] ۱۶۲۲ء سے [illegible] شروع ہوا۔ یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ اسی سال نورجہاں نے اپنی لڑکی سے شہریار کی شادی کردی۔ ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اس دور کے اسباب و علل اور ان کے نتائج پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیں۔

دورِ انحطاط و خانہ جنگی ۱۶۲۲ء تا ۱۶۲۷ء

۱۶۱۱ء میں جہانگیر نے نورجہاں سے شادی کی تھی جو شیر افگن خاں کی بیوہ تھی۔ یہ بادشاہ اور دربار پر پوری طرح سے حاوی ہوگئی تھی۔ نورجہاں کا باپ مرزا غیاث بیگ، جو بعد میں اعتماد الدولہ کے لقب سے مشہور ہوا ۱۵۷۷ء میں ہندوستان آیا تھا اور اکبر کے دربار میں ملازم ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی خداداد قابلیت سے بہت جلد ترقی کی تھی۔ یہاں تک کہ جب جہانگیر تخت نشین ہوا ہے تو وہ دیوان مقرر کیا گیا اور اعتماد الدولہ کا خطاب ملا۔ نورجہاں قندھار میں ۱۵۷۷ء میں پیدا ہوئی تھی اور سترہ برس کی عمر میں اسکی شادی ایک ایرانی امیر علی قلی کے ساتھ ہوئی تھی۔ علی قلی ۱۵۹۹ء میں میواڑ کی مہم پر جہانگیر کے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ یہیں اس نے تلوار کے ایک وار سے ایک شیر کو مارا تھا۔ شیر کی وجہ سے "شیر افگن" مشہور ہوگیا تھا۔ جہانگیر نے اپنی تخت نشینی کے وقت سے بردوان بنگال میں ایک جاگیر عنایت کی تھی۔ لیکن تھوڑی مدت کے بعد جب اسے معلوم ہوا کہ شیر افگن بنگال کے باغی پٹھانوں سے تعلقات پیدا کر رہا ہے تو اس نے بنگال کے حاکم قطب الدین کو حکم دیا کہ شیر افگن کو دربار میں بھیج دے۔ قطب الدین نے شیر افگن کو دھوکے سے گرفتار کرنے کی کوشش کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کی جان چلی گئی۔ یہ ۱۶۰۷ء کا واقعہ ہے۔ نورجہاں آگرہ آکر سلطان سلیمہ بیگم کے ہاں ملازم ہوگئی۔ یہیں چار سال بعد جہانگیر نے پہلی دفعہ اسے دیکھا

اور چند روز کے اندر ہی اس نے اس سے نکاح کرلیا۔ یہ افسانہ بالکل لغو ہے کہ جہانگیر شہزادگی کے زمانہ میں نورجہاں سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر اکبر نے اس کی اجازت نہیں دی تھی۔ پھر بادشاہ ہونے کے بعد قصداً جہانگیر نے شیر افگن کو قتل کرا دیا تھا۔

نورجہاں نہایت دانشمند، ذہین، مردم شناس تھی۔ جوڑ توڑ کرنے میں دربار میں اس کا ثانی کوئی نہ تھا۔ حکومت کی ہوس کے ساتھ اس میں حکومت کی اعلیٰ صلاحیت بھی موجود تھی۔ جہانگیر اور نورجہاں میں بہت گہری محبت تھی جو آخر عمر تک قائم رہی۔ نورجہاں نے ترقی محض اس لئے نہیں کی کہ وہ حسین اور قابل عورت تھی بلکہ اس کی یہ بھی وجہ تھی کہ وہ ایک محبت کیش بیوی تھی۔ اور اپنے شوہر کے مزاج کو پہچانتی تھی اور ہمیشہ اس کا لحاظ رکھتی تھی۔

یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ نورجہاں کی سیاسی حیثیت کی تعمیر میں نورجہاں کی ماں عصمت بیگم اور اس کا باپ اعتماد الدولہ اس کا بھائی آصف خاں اور شہزادہ خرم سب ہی شریک تھے۔ اقتدار حاصل کرنا ان سب کی مشترک کوششوں کا نتیجہ تھا۔ مگر ان سب کی کامیابی اور ان کا اقتدار جہانگیر کی خوشنودی پر موقوف تھا۔ اور جہانگیر کو نورجہاں کی بے پایاں محبت اور موقع شناسی بھی اپنے شاہی فرائض سے غافل نہ کر سکی تھی۔ سچ پوچھئے تو اقتدار ہمیشہ جہانگیر کا رہا اور نورجہاں اور اسکی پارٹی کی حیثیت بس نائبوں کی تھی۔ وہ جہانگیر کی پالیسی پر عمل کرنے کے لئے مجبور تھے۔ انہیں ہر وقت بادشاہ کو مطمئن کرنا ہوتا تھا کہ وہ اسی کی خواہشوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جہانگیر اس عادت کی وجہ سے بھی یہ لوگ پھونک پھونک کر قدم رکھتے تھے۔ کہ وہ ہر مخلص مشیر کی باتوں کو نہایت توجہ سے سنتا تھا۔ اگرچہ اسے نورجہاں کے پھندے سے آزاد ہونے ہی کا مشورہ کیوں نہ دیا جائے۔

نورجہاں اور اس کی پارٹی میں جب تک اتحاد رہا اس وقت تک وہ بلا دقت حکومت کرتی رہی اور ملک میں امن و امان رہا۔ لیکن جب اس کی پارٹی میں پھوٹ پڑ گئی تو خانہ جنگی کی نوبت آگئی۔ اور ملک میں بدامنی پھیل گئی حکومت کو زبردست دھچکے لگے۔ قندھار ہاتھ سے نکل گیا۔ اور دیگر صوبوں میں مغلوں کے خلاف ریشہ دوانیاں شروع ہوگئیں۔

۱۶۲۲ء سے نورجہاں اور اس کی پارٹی میں کشمکش شروع ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جہانگیر کی صحت نے جواب دے دیا تھا۔ اور نہیں کہا جا سکتا تھا کہ کب وہ دنیا کو خیر باد کہہ دے۔ ۱۶۲۲ء تک باہمی کشمکش کی رفتار دھیمی رہی۔ اسی سنہ میں نورجہاں نے اپنی لڑکی کی شادی شہریار سے کردی تھی۔ اور اس کے بعد سے

[illegible] جن پر نورجہاں کی مہریں لگی ہیں۔ آئندہ سطور میں اس [illegible] کیا گیا ہے۔

[illegible]

... جہاں نے ... [illegible] ... سے علیحدہ ہوگئے۔ پارٹی کا تیسرا رکن اس کا بھائی آصف خاں تھا جو اپنے داماد خرم (شاہجہاں) کا حامی تھا۔ اگرچہ وقت کے تغیر اور مصلحت کی وجہ سے نورجہاں سے ملا رہا۔ ایسی شدید کشمکش کی حالت میں نورجہاں خرم کے مقابلے میں تنہا رہ گئی۔ خرم ہی اپنے راستے سے ہٹا دینا چاہتا تھا۔ ۱۶۲۱ء میں جب دکن گیا تو اپنے بھائی خسرو کو ساتھ لیتا گیا اور وہیں اسے زہر دلوا دیا۔ اب میدان صاف تھا۔ دونوں فریق تقریباً کھلم کھلا میدان میں نکل آئے اور ایک دوسرے پر غلبہ پانے کیلئے دل و دماغ کی پوری قوتیں صرف کردیں۔ سوء اتفاق سے اسی سال (۱۶۲۲ء) ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے کھلی طور سے دونوں فریق بگڑ جانے پر مجبور ہوئے۔

شاہ عباس اور قندھار کی تسخیر

شاہ عباس صفوی نے قندھار پر قبضہ کرنے کا بڑا ارادہ کیا تھا۔ ایک دفعہ وہ ناکام کوشش کر چکا تھا مگر یہ کوشش برابر جاری رہی۔ اور جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو جہانگیر سے دوستی کی اور ہر دوسرے تیسرے سال سفیر بھیجتا رہا۔ اور اسے اپنی دوستی کا یقین دلانے کی کوشش کرتا رہا۔ جب اسے اعتماد ہو گیا کہ دوستی کا افسوں جہانگیر پر چڑھ گیا ہے اور دربار کے ارباب حل و عقد کو باہمی رقابت سے فرصت نہیں ہے تو اس نے اچانک قندھار پر ۱۶۲۲ء میں حملہ کر دیا۔ اس خبر سے دربار میں ہلچل پیدا ہو گئی اور قندھار فوجیں بھیجنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ نورجہاں کو اس سے اچھا موقع اور کون حاصل ہو سکتا تھا۔ اس نے فوراً شاہجہاں[1] کے نام فرمان جاری کیا۔ "دکن کی کل شاہی فوج لیکر لاہور آؤ۔ اور یہاں سے قندھار کی مہم پر روانہ ہو۔" نورجہاں کی اس میں سیاسی چال یہ تھی کہ اگر شاہجہاں نے انکار کر دیا تو جہانگیر کے کان بھرنے کا موقع ملے گا۔ اگر جانے پر آمادہ ہو گیا تو کم سے کم چھ سات ماہ کے لئے میدان خالی ہوگا اور اپنی امیدوں کے بر لانے کا اچھا موقع ملیگا۔ شاہجہاں کے پاس جب یہ فرمان پہنچا تو وہ فوراً تہ کی بات تاڑ گیا۔ وہ فوجیں لیکر برہانپور سے چل دیا اور مانڈو میں ٹھہر گیا۔ یہاں سے جواب دیا "میں قندھار اس شرط

[1] خرم کو شاہجہاں کا لقب ۱۶۱۷ء میں ملا تھا۔ جب وہ دکن کی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا گیا تھا۔

[illegible]

خلاف ... [illegible] ... کا اظہار کیا گیا تھا۔ ... [illegible] ... فوج کو ... [illegible] ... چند دنوں کے بعد شاہجہاں ... [illegible] ... ضبط کر کے ... [illegible] ... دی گئی۔ ادھر شاہجہاں سے کہا گیا کہ ... جاگیریں دکن میں دے گئے ہیں۔ شاہجہاں کے پاس اس ... [illegible] ... تھا کہ بغاوت کر سکتی فوج ... تمام افسر ... ہم آہنگ ... فوج میں بھی چند افسر ایسے تھے جن کے متعلق اسے بھروسہ تھا کہ وہ اس کے موافق ہیں۔ اس نے بغاوت کا عزم صمم کر لیا۔ دوسری طرف نورجہاں نے ... پرویز کو بہار سے بلا کر شاہی فوج کا سپہ سالار بنا دیا۔ اور کابل سے مہابت خاں کو طلب کر کے پرویز کا مشیر کار مقرر کر دیا۔ شاہی فوج قندھار روانہ ہونے کے لئے تیار تھی کہ شاہجہاں کی بغاوت کی اطلاع آئی اور معلوم ہوا کہ وہ نہایت تیزی کے ساتھ دکنی فوجوں کو لئے آگرہ کی طرف بڑھ رہا ہے۔ شاہی فوج اسے روکنے کے لئے لاہور سے آگرہ آئی اور دونوں فوجوں کا مقابلہ دہلی کے قریب بلوچ پور کے مقام پر ہوا۔ اس میں شاہجہاں کو شکست ہوئی (مارچ ۱۶۲۳ء) اور شاہجہاں مانڈو بھاگ گیا۔ اس کے بہت سے افسر جہانگیر سے مل گئے۔ مانڈو سے برہان پور اور وہاں سے اسیر کے قلعہ میں چلا گیا۔ اور اپنے ایک معتمد افسر کو نربدا پر شاہی فوج کو روکنے کے لئے چھوڑ گیا۔ اس دوران میں گجرات کا صوبہ جہاں شاہجہاں کا بہت سا روپیہ اور سونے اور جواہرات سے جڑا ہوا تخت ... تھا اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ مہابت خاں کی سپہ سالاری میں شاہی فوجوں نے شاہجہاں کی فوجوں کو نربدا اور الہ آباد کے مقام پر مختلف اوقات میں زبردست شکستیں دیں۔ الہ آباد سے بھاگ کر رہتاس، اڑیسہ اور گولکنڈا ہوتا ہوا احمد نگر پہنچا۔ مہابت خاں نے یہاں بھی آگھیرا۔ شاہجہاں نے مجبور ہو کر اب جہانگیر سے معافی کی التجا کی۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اب یہ موقع اچھا تھا۔ نورجہاں مہابت خاں کا بڑھتا ہوا اقتدار دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔ اس نے بادشاہ سے اس شرط پر معافی دلوا دی کہ شاہجہاں رہتاس اور اسیر کے قلعے بادشاہ کے حوالے کر دے اور اپنے دونوں بڑے لڑکوں دارا اور اورنگزیب کو دربار میں بھیج دے۔

شاہجہاں نے یہ شرطیں منظور کر لیں اور اسے بالاگھاٹ کی حکومت دے دی گئی۔ یہ مارچ ۱۶۲۶ء کا واقعہ ہے۔

نورجہاں اور مہابت خاں

...سمجھی قریب تھے۔ مہابت خاں اور ... مخالفت بہت بڑھ گئے تھے۔ اور چونکہ وہ جہانگیر کی تمام کمزوریوں کے ... سے بھی بہتر تھا اور ... بڑا تھا ان تمام چیزوں کے دیکھتے ہوئے نورجہاں کو مہابت خاں اور پرویز کا بڑھتا ہوا اقتدار اور تعلق کھٹکتا تھا۔ چونکہ ... شہریار کی طرف سے اطمینان کرنے کے لئے نورجہاں نے مہابت خاں کو بنگال جانے کا حکم دیا اور اس کی جگہ خان جہاں لودی کو پرویز کا اتالیق بنا کر روانہ کر دیا۔ ان دونوں کو علیحدہ کرنے کے بعد نورجہاں نے (اس تدبیر میں آصف خاں بھی شریک تھا) مہابت خاں پر ایک اور وار کیا۔ وہ یہ تھا کہ مہابت خاں کو بنگال حکم بھیجا گیا کہ بنگال اور بہار میں جو جو ہاتھی مہابت کے ہاتھ لگے تھے وہ واپس دربار میں بھیج دے۔ اور باقی جاگیرداروں کا جو مال ضبط کیا گیا ہے اس کا حساب روانہ کرے۔ مہابت خاں سمجھ گیا کہ اب اسے بے ایمان ثابت کر کے رسوا کرنے اور بادشاہ کی نظروں سے گرانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ دربار میں کوئی ایسا اس کا مخلص دوست موجود نہ تھا جو بادشاہ کو اس کی خدمات یاد دلائے اور اس کی سوءظنی کو دور کرنے کی کوشش کرے۔ اسی بنا پر وہ چار پانچ ہزار وفادار راجپوت سواروں کے ساتھ اپنی صفائی پیش کرنے کیلئے خود روانہ ہوا۔ جس وقت وہ پہنچا ہے اس وقت جہانگیر جہلم کے کنارے پر تھا اور اس کے ساتھی تقریباً سب دریا کے دوسرے کنارے پر جا چکے تھے۔ مہابت خاں نے موقع کو غنیمت جانا اور نورجہاں کے خلاف وہی چال چلی جس کی کامیابی کی کچھ امید ہو سکتی تھی۔ اس نے شاہی لشکرگاہ کا محاصرہ کر لیا اور جہانگیر کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ نورجہاں نہایت دانشمندی سے اس کے نرغے سے چھپ کر نکل گئی۔ اور دوسرے کنارہ پر جا کر جہانگیر کی رہائی کی تدبیریں کرنے لگی۔ اس وقت بادشاہ کے ساتھ جتنی فوج تھی وہ مہابت خاں کی فوج کا مقابلہ نہ کر سکی۔ آصف خاں اٹک بھاگ گیا۔ فدائی خاں جس نے جہانگیر کو چھڑانے کی بڑی جدوجہد کی تھی رہتاس چلا گیا۔ نورجہاں نے یہ حالت دیکھی تو اپنے آپ کو مہابت خاں کے حوالے کر دیا اور جہانگیر کے پاس پہنچ گئی۔ اب مہابت خاں کا اور بڑا اقتدار تھا۔ نورجہاں اس کی طرف سے غافل نہ تھی۔ اس نے تمام امراء دربار کو اپنے ساتھ ملا لیا اور یہ امراء پہلے ہی مہابت خاں سے کچھ خوش نہ تھے۔ اور دوسری طرف مہابت خاں کو یہ یقین دلا دیا کہ وہ دربار پر حاوی ہے۔ اور اسکا ... ہے۔ جہانگیر نے بھی نورجہاں کے مشورے کے مطابق اس کو اپنی طرف سے یقین دلا دیا۔ مہابت خاں اس اطمینان کے بعد پروگرام کے مطابق کابل روانہ ہوا۔ کابل کے دوران قیام اس کے راجپوت سواروں اور شاہی احدیوں میں لڑائی ہو گئی جس میں ... راجپوت مارے گئے۔ اس کا اثر اس کی فوجی طاقت پر بہت برا پڑا۔ کابل سے واپسی پر جب وہ رہتاس پہنچا ہے تو اسے یقین دلایا گیا کہ اقتدار اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ اور یہ غلط بھی نہ تھا۔ کیونکہ نورجہاں نے اس عرصہ میں تمام امراء کو اس کا مخالف بنا لیا تھا۔ مہابت خاں جہانگیر کی سیاسی حکمت عملی کی وجہ سے شاہی لشکرگاہ سے ایک منزل آگے بڑھ گیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہ پھر اپنی فوج کی حفاظت میں آ گیا تھا۔

اب مہابت خاں میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ شاہی فوجوں سے مقابلہ کر سکتا مجبوراً اسے اب دبنا پڑا اور ٹھٹھہ کی طرف جہاں شاہجہاں بغاوت کی تیاریاں کر رہا تھا چلا گیا۔ راہ میں مہابت خاں مشرق کی طرف اس خزانے کو لینے کے لئے گیا جو اس نے منگوایا تھا اور دہلی کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس خزانہ کی اطلاع نورجہاں کو بھی مل گئی تھی اور اس نے ایک دستہ اسے چھیننے کیلئے روانہ کر دیا تھا جس نے شاہ آباد کے قریب مہابت خاں کے آدمیوں سے زبردستی تمام خزانہ چھین لیا۔ مہابت خاں کے تعاقب کیلئے بھی ایک فوج روانہ کی جا چکی تھی۔ مہابت خاں ان تمام ناکامیوں سے گھبرا کر میواڑ کے جنگلوں میں جا چھپا اور یہاں سے شاہجہاں کے پاس چند معتبر آدمیوں کو بھیج کر اس سے مصالحت کر لی۔ اور دکن اسی کے پاس چلا گیا۔ نورجہاں کو اس اتحاد کی اطلاع ملی تو اس نے خان جہاں لودی کو شاہی فوجوں کا سپہ سالار مقرر کیا اور ان دونوں کے مقابلہ کا حکم دیا۔

جہانگیر کا انتقال

اس دفعہ خانہ جنگی سے جہانگیر کی موت نے بچا لیا۔ جہانگیر کی صحت ۱۶۲۰ء سے بہت گر چکی تھی۔ اور یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ مہابت خاں کی اسیری کے زمانہ میں اسکی حالت بہت بگڑ گئی۔ اسیری سے نجات پانے کے بعد لاہور آیا۔ اور وہاں سے کشمیر صحت بحال کرنے کے خیال سے چلا گیا۔ کشمیر میں اسکی حالت سخت نازک ہو گئی تھی جس کی وجہ سے واپس ہونا پڑا۔ وہ ابھی راستہ ہی میں تھا کہ بھمبر کے مقام پر اس کا انتقال ہو گیا۔ یہ ۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء (۲۷ صفر ۱۰۳۷ھ) کا حادثہ ہے۔

شاہجہاں کی کامیابی

جہانگیر کے مرنے کے بعد آصف خاں میدان میں نکلا اور اس نے اپنے داماد شاہجہاں کے لئے راستہ سے رکاوٹیں دور کرنا شروع کر دیں۔ اس وقت تک وہ نورجہاں سے ملا رہا تھا اور اس نے کبھی کسی پر یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ وہ شاہجہاں کو تخت نشین دیکھنا چاہتا ہے۔ اس وقت شاہجہاں دکن میں تھا۔ آصف خاں نے وقتی طور سے خسرو کے لڑکے ... کو تخت پر

... نورجہاں ... [illegible]
شاہجہاں کو دیکھ ... لاہور ... کی رخصت دی۔ نورجہاں نے ... [illegible]

فوج کو لیکر ... کے پاس پہنچو۔ اس نے لاہور میں خزانہ پر قبضہ کر کے کچھ فوج بھی جمع کر لی تھی۔ مگر وہ کمزور اور کاہل آدمی تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ اسکا کامیاب ہونا اس وقت تقریباً ناممکن ہے۔ آصف خاں کی فوجیں جب لاہور کے قریب پہنچیں اور مقابلہ ہوا تو شہریار کی فوجیں پہلے ہی حملے میں بھاگ کھڑی ہوئیں۔ شہریار گرفتار ہوگیا اور اس کے بعد شاہجہاں کے حکم کے مطابق شہریار، داور بخش اور اُس کا بھائی۔ دو تین اور شاہی خاندان کے افراد موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ دو تین ماہ کے بعد شاہجہاں دکن سے آگرہ پہنچا اور نہایت شان و شوکت کے ساتھ تخت حکومت پر جلوہ فرما ہوا۔ نورجہاں نے اپنی شرافت اور موقع شناسی کا آخری ثبوت یہ دیا کہ دنیا سے بالکل علیحدگی اختیار کر لی

کبھی کبھی کی خوشی کی تقریب ... [illegible] کی دوستی میں بھی دیہی ... [illegible]

جہانگیر کا سیاسی عزم ... [illegible] ختم ہوا۔ یہ زمانہ مجموعی حیثیت سے ہندوستان کی ترقی اور عروج کا تھا۔ اس عہد میں نہ صرف فنون لطیفہ ... میں انتہائی ترقی ہوئی بلکہ حکومت کا دائرہ عمل بھی کافی وسیع ہوگیا۔ اور جہانگیر کے عہد حکومت نے اکبر کی وسیع سلطنت کو سنبھال ہی نہیں لیا اس میں اضافہ بھی کیا۔

غزل

دل میں ترے خیال کی دنیا لئے ہوئے
بیٹھا ہوا ہوں حسرتِ فردا لئے ہوئے

نظروں میں تیرے حُسن کا جلوا لئے ہوئے
پھرتا ہوں میں تصورِ سینا لئے ہوئے

گلچیں ہے دل میں جسکی تمنا لئے ہوئے
وہ پھول اپنے ساتھ ہے کانٹا لئے ہوئے

طولِ شبِ فراق کا بدلا لئے ہوئے
آئی ہے صبح غم کا مداوا لئے ہوئے

جیسے وہ کوہِ طور پہ پھر آہی جائیں گے
یوں منتظر ہوں چشمِ تماشا لئے ہوئے

آ پوچھ میری آنکھوں کی حسرت تو، کہ کیوں ؟
ہوں آنسوؤں میں وسعتِ دریا لئے ہوئے

رنگِ شفق ہو روشنیٔ مہر و ماہ ہو
فطرت ہی کا یہ سب ہیں نظارا لئے ہوئے

میرے جنونِ سجدہ کی وارفتگی تو دیکھا
لوحِ جبیں ہے نقشِ کفِ پا لئے ہوئے

فرقت میں تیری دیدۂ نرگس ہے بے ضیا
اور داغِ دل ہے لالۂ صحرا لئے ہوئے

روزِ ازل نگاہوں کا دھوکا ہوا کہ میں
سمجھا کہ تو ہے رنگِ دنا کا لئے ہوئے

کھول آنکھ، عیشِ خوابِ سحر ترک کر، وہ دیکھ!
وہ آگیا کوئی یدِ بیضا لئے ہوئے

اللہ رے خلیل کا محکم یقیں، اسد
شعلے ہیں نظرت گلِ رعنا لئے ہوئے

از
جناب اسد سیمابی

غالب بحیثیت غزل گو

(از جناب سید مشفق حسن عابدی)

اردو شاعری میں غزل سب سے نازک صنف ہے۔ اگر تواریخ کی ورق گردانی کی جائے تو معلوم ہوگا کہ جب سے اردو شاعری کے نخل معصوم نے نشو و نما پائی ہے اسی وقت سے اس نخل میں غزل کی ایک شاخ موجود تھی۔ اور اب تک ہے اس کی (اس نخل کی) دیگر شاخیں مرجھا اور کملا گئی ہیں اور ان کی جگہ نئی شاخیں پھوٹ گئی ہیں یہ پہلی شاخ کچھ اس قدر مضبوط اور پائیدار معلوم ہوتی ہے کہ باوجود وہ سال پرانی ہونے کے بھی ہری بھری اور صحیح سالم ہے۔ اس میں وہ پتے اور پھل باقی نہیں ہیں جو کہ دور متوسطین اور متاخرین [illegible] ان کی جگہ نئے پتے اور پھل نکل آئے ہیں۔ جن کی وجہ سے شاخ کا حلیہ کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔ اردو کے ہر شاعر نے اس صنف میں کچھ نہ کچھ حصہ ضرور لیا ہے۔ کسی نے تھوڑا کسی نے بہت۔ یہاں تک کہ میر انیس نے بھی جن کی ساری عمر مرثیہ گوئی میں صرف ہوئی غزلیں لکھیں۔ جسے ان کی شاعری کی تمہید کہا جا سکتا ہے غالب نے اس صنف میں خاص حصہ لیا ہے۔

غالب کے دیوان میں علاوہ قصائد اور رباعیات کے ۵۸ ا غزلیں ہیں جن کے اشعار کا مجموعہ ۱۴۵۶ ہے۔ اردو غزل گوئی میں غالب کا وہ درجہ ہے جو کسی دوسرے کو ملا نہیں۔ چنانچہ ایک صاحب فرماتے ہیں:

"کیا تعجب ہے اگر اس یورپ زدگی کے زمانہ میں طالب علم انگریزی تعلیم یافتہ مرزا غالب کا شیکسپیئر، ورڈزورتھ اور شیلی وغیرہ سے مقابلہ کرتے اور خوش ہوتے ہیں۔"

علاء الدین خدا بخش نے غالب کا مقابلہ ہائن رخ ہائی الالمانی سے کیا ہے۔ کہاں غالب اور کہاں ہائن رخ ہائی۔ ہائن رخ ہائی عشق و الفت [illegible] افسردگی کی حالت میں بیان کر کے خاموش ہو جاتا ہے۔ لیکن [illegible] عبدالرحمن صاحب تو غالب کو شمس الاعلیٰ کے کندھوں پر اٹھاتے ہیں [illegible]

جاتا ہے۔ شیخ محمد اکرام کا تبصرہ کلام غالب (اردو) کہتے ہیں:-

"دنیا میں اگر کسی شاعر سے غالب کا مقابلہ ہو سکتا ہے تو وہ شعرائے المانیہ کا سرتاج gohann Wolb Yong Von goethe ہے۔"

سچ ہے اگر انسانی تصور کی آخری حدود کا پتہ کوئی شاعر دے سکتا ہے تو وہ صرف غالب اور گوئٹے ہیں۔ غالب کی زبان کے متعلق ایک صاحب فرماتے ہیں:-

"غالب کی شاعری کے جسم پر زبان کا جامہ اس قدر تنگ ہے یہاں تک کہ بعض جگہ سے چاک ہو گیا ہے اور عریاں بدن اندر سے نظر آنے لگتا ہے۔"

چونکہ غالب کے کلام کا موضوع زیادہ تر فلسفہ ہے۔ یہ مشکل اور بڑھ گئی ہے۔ فلسفہ چیز ہی ایسی ہے۔ چنانچہ فرانس کا ایک ناول نگار [illegible] کہتا ہے کہ جب میں Kant اور Hegel کو مطالعہ کے لئے اٹھاتا ہوں تو سر میں درد ہونے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل — سن سن کے اسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش — گویم مشکل وگر نہ گویم مشکل

غالب کے کلام میں کچھ اشعار ایسے ہیں جن کے منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے ناقد عقل مطلقاً قاصر ہے۔ تخیل عرصۂ امکان میں ہر چہار جانب پرواز کر کے نکلنے کی ناکام کوشش کرنے کے بعد تھک کر مجبوراً واپس آ جاتا ہے یا یوں کہئے کہ ایک دائرہ ہے جس سے نکل جانا ناممکن ہے۔ اکثر نقاد اس کا سبب شراب بتاتے ہیں مگر یہ غلط ہے۔ گوئٹے کے اعلیٰ ترین کلام پر جو Faust حصہ دوم میں ہے معاصرین نے ہر چہار جانب سے یہی اعتراض کیا تھا۔ چنانچہ ایک دن Echermann نے گوئٹے سے دریافت کیا کہ اس شکل کا کیا باعث ہے؟ اس نے جواب دیا کہ یہی تاریکی ہی تو ہے جس پر لوگ عاشق ہیں۔ لوگ ایسے مقامات پر لاینحل مسائل کی مثال پر غور کرتے ہیں اور اپنی ناکامی سے نہیں اکتاتے۔ طلب انسانی کی آخری منزل تحیر ہے۔ پس اگر کوئی فعل موجب حیرت ہوا کرتا ہے تو وہ کمال فن ہے۔ اور اس بات پر بحث نہ کرنی چاہئے کہ اس کے پس پشت کیا بلا ہے۔ لیکن ایک معصوم طفل اپنے چہرے کا عکس آئینہ میں دیکھتا ہے۔ حیران ہوتا ہے اور جب حیرت انتہا کو پہنچ جاتی ہے تو وہ اپنی نادانی کے باعث آئینے کی پشت کو دیکھنے لگتا ہے۔

فنون لطیفہ کی نقش نگاری اور فن تعمیر ایک دوسرے [illegible]

چند الفاظ ہی اپنے [illegible] اشعار و عبارت کی [illegible] ہو جاتی ہے۔ [illegible] نے بھی میر حسن دہلوی کی طرح اپنے دیوان میں عجیب پر عشرت۔ آئینہ بند۔ عود اور گلکار ایوان تیار کئے ہیں۔ ایک مرتبہ کسی نے اُس سے دریافت کیا کہ اے غریب کاشانہ نشین شاعر تو یہ سامان و اسباب کہاں سے لایا؟ اُس نے جواب دیا کہ اینٹ اور پتھر کے مقابلہ میں الفاظ سستے ہیں۔ لیکن اس کے برخلاف مرزا غالب کے الفاظ کی قیمت کل [illegible] سے کہیں زیادہ ہے۔ یہ بات [illegible] ذہن نشین ہے کہ مترادف [illegible] لغت نے [illegible] کی سہولیت کیلئے ایجاد کر لئے ہیں ورنہ دو ہم معنی لفظ کسی زبان میں نہیں ہیں۔ جو توام بچے خواہ وہ صورت میں کتنا ہی ایک دوسرے سے ملتے جلتے کیوں نہ ہوں ان کو ایک دوسرے کی حاضری غیر حاضری میں ایک تصور کرنا سخت غلطی ہے۔ مرزا الفاظ کے رنگ اور باریک سے باریک فرق سے بھی خوب واقف ہیں۔ ان کے دیوان کے گہرے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ مرزا نے حتی الامکان ایک لفظ کا دوبارہ استعمال نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ وہ کسی لفظ کی تکرار پسند نہیں کرتے۔ بلکہ وہ کسی خیال کو نہیں دہراتے۔ اُن کے کلام کی زبان پابند ارتقا ہے اور الفاظ جاندار ہیں۔ منطق کے اصول تبدیل نہیں ہو سکتے۔ مگر تصورات زمانے اور وقت کے لحاظ سے تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اور چونکہ تصور کی زبان سے ادائیگی ہی علماء لفظ کے اسم سے موسوم کرتے ہیں۔ اس لئے الفاظ بھی تغیر کے متقاضی ہوتے ہیں پس اگر ہر عہد میں یہ تجدید نہ ہوتی رہے تو کچھ عرصہ کے بعد زبان کہنہ، پارینہ اور پرانی ہو جائے۔ جتنا کہ کسی قوم کیلئے کسی رواج کا ترک کرنا اور اس پر غالب آنا مشکل ہے۔ اتنا ہی مشکل کسی زبان کے کسی محاورہ کا مٹانا بھی ہے۔ آج کل کے ادیب شاید اس نکتہ سے بے بہرہ معلوم ہوتے ہیں کہ عمدہ سے عمدہ محاورہ بھی عمر کے لحاظ سے پرانا اور ضعیف ہو کر بے جان ہو جاتا ہے اور پھر رفتہ رفتہ ترک استعمال ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اُردو زبان میں آج بہت سے محاورات نظر آتے ہیں جو کہ درحقیقت بہ اعتبار علماء الفاظ و محاورات کی میاں ہیں۔ لیکن ترک استعمال ہیں۔ غالب کے تمام دیوان کی ورق گردانی کر ڈالئے مگر مشکل سے دس اشعار ایسے ملیں گے جن میں مرزا نے کسی محاورہ کو باندھا ہے۔ ورنہ مرزا نے حتی الامکان محاورات کی بندش سے احتراز کیا ہے۔ غالب کی شاعری آزاد اردو کلام ہے۔ اور اگر دہلی کے کوچوں کی پابند نہیں تو لکھنؤ کی گلیوں کی بھی پابند نہیں۔ غالب کو اپنے فلسفیانہ خیالات کے ادا کرنے کی فکر ہوئی الفاظ کی تلاش کی۔ اردو زبان میں الفاظ کے ذخیرہ کو بہت مختصر پایا۔ لیکن عموماً یہ قاعدہ ہے کہ جہاں کوئی نیا خیال پیدا ہوا اسکی ادائیگی کے واسطے نئے نئے الفاظ بھی رونما ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ مرزا کو کسی دقت یا پریشانی کا سامنا

لیکن [illegible]
پس غالب کے خیالات [illegible]
کے خیالات سے [illegible]
چونکہ مرزا ان الفاظ [illegible]
ساختہ الفاظ ملاحظہ ہوں:۔

"شہپر رنگ۔ ریگ ادراک۔ رنگ استغنا۔ [illegible]
دربان۔ [illegible] عالم۔ [illegible] مژگان۔ [illegible]
جیب خیال۔ دعوت مژگاں۔ [illegible]
غارت [illegible]۔ خود داری ساحل۔ [illegible] اور
شبستان وغیرہ۔"

ان الفاظ کی خوبیاں اور جدت ظاہر ہے۔ پھر بھی بہت سے نکات قابل ذکر ہیں۔ لیکن ان کی یہاں گنجائش نہیں۔ Michael Angelo کا کہنا ہے کہ بت تراش مجسمہ کو پتھر تراش کر نہیں بناتا بلکہ درحقیقت ابتدا ہی سے اس سنگ سفید میں بت موجود اور رونمائی کا متقاضی اور منتظر رہتا ہے۔ بت تراش صرف پتھر کی عارضی چادر کو علیحدہ کر کے لوگوں کے سامنے پیش کر دیتا ہے۔ یہی حالت غالب کے بنائے ہوئے اور ایجاد کردہ الفاظ کی ہے۔ ان کو ان الفاظ کو غالب کے خودساختہ کہنا غلطی ہے بلکہ وہ Virgil کے مثل آفریدہ ہیں۔

مولانا شبلی نے صنائع اور بدائع پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان کا آخری نتیجہ شاعروں اور سخندانوں کیلئے کوہ کندن اور کاہ بر آوردن سے زیادہ نہیں۔ شاعر کلام میں جس قدر صنائع اور بدائع کا استعمال زیادہ کریگا اسی قدر کلام حقیقت سے دور اور تصنع سے پر ہو جائیگا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ تمام [illegible] صنائع اور بدائع کے فروغ دینے میں طرۂ امتیاز حاصل ہے قابل عزت ہیں۔ لیکن اگر ان کی تمام مایہ ناز تصانیف نذر آتش کر دی جائیں تو شعرا کا کوئی نقصان نہیں۔ کیونکہ وہ کتابیں حقیقت سے بعید اور تصنع سے قریب ہیں۔ کسی شاعر کے کلام میں صنائع اور بدائع کا استعمال اس بات کا ثبوت ہے کہ طبیعت میں آمد کی کمی ہے۔ اس کے علاوہ کلام میں صنائع اور بدائع کا استعمال کلام کو عام ادبی زندگی سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ غالب کے کلام میں صنائع اور بدائع بہت کم نظر آتے ہیں۔ مرزا صنائع اور بدائع استعمال بہت کم کرتے ہیں لیکن ان کے کلام کے مشکل ہونے کا باعث مرزا پر فلسفہ کا غلبہ ہے۔ اور ان کے کلام میں ادق الفاظ کا استعمال اور ترتیب [illegible] ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے کلام میں ایک ایسی خوبی [illegible] دوسرا شاعر نہ پا سکا اور کوئی [illegible]

[illegible] کی وجہ سے غالب کے
کلام میں [illegible] بہت

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے   دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق   ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

[illegible] کیوں جان عزیز   کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

دیکھئے ہر شعر سے دو مطلب نکلتے ہیں۔ مجھے اتنا وقت نہیں کہ ہر شعر کے دو مطلب کو واضح کروں اور آپ کے سامنے پیش کروں۔ بہر حال مرزا کے زیادہ تر اشعار سے دو مطلب نکلتے ہیں، اور دونوں کو ایک دوسرے سے کوئی ربط نہیں یہ خصوصیت بہت کم شعرا میں پائی جاتی ہے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شاعری مصوری ہے۔ اس خیال سے بھی غالب کا کلام عدیم المثال ہے۔ ان کا دیوان اٹھا کر دیکھئے۔ ہر ورق پر ایسے اشعار جلوہ نما ہیں جن کو علیحدہ علیحدہ تصویر میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ محسن و عشق کے معاملات کو بھی غالب نے اس طرح اور اس طریقہ سے ادا کیا ہے کہ جس وقت شعر زبان پر ہوتا ہے ہو بہو وہی تصویر آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتی ہے۔ مثلاً ؎

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ یوں
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں منہ سے مجھے بتا کہ یوں

غالب نے کہیں کہیں روزمرہ تصاویر کا دوسرا رخ بھی دکھایا ہے مطلب یہ ہے کہ شعر کے الفاظ سچے، قدرت کے مطابق۔ لیکن عادت اور امید کے بالکل برخلاف ہیں۔ مثلاً ؎

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے   صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا

آج واں تیغ و کفن باندھے ہوئے جاتا ہوں میں
عذر میرے قتل کرنے میں وہ اب لائیں گے کیا

[illegible] سر گر   ایسی باتوں سے وہ کافر بدگماں ہو جائیگا

غالب کو رنگ ذست [illegible] شاداب۔ جام سرو سبز اور نغمۂ آب بیاں نظر آتا ہے۔ لیکن غالب میں یہ کیفیت بہت ہی اعتدال اور صحیح حد تک پائی جاتی ہے۔ Rimbaud کی طرح اس حد تک نہیں پہنچتی جہاں حروفِ حروف [illegible] Rimbaud حرف میں ایک خاص طرح کا رنگ پاتا ہے اور کہتا ہے :-

A noir, E blanc, I rouge, U vert, O bleu,
voyelles.

غالب اس اندازِ کلام میں Mallarme ایک فرنچ شاعر سے سب سے زیادہ مشابہ ہیں ؎

غمِ آغوشِ وداع میں پرورش دیتا ہے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا قلزمِ صرصر کا مرجاں ہے

بجا ہے گر نہ سنے نالہ ہائے بلبلِ زار   کہ گوشِ گل نمِ شبنم سے پنبہ آگیں ہے

نہ کی سامانِ عیش و جاہ نے تدبیر وحشت کی
ہوا جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ آخر

لیکن شاعرانہ جوش اور وجدان میں ایک ایسی حالت بھی طاری ہوتی ہے جو کہ مستی سے مترادف ہو سکتی ہے۔ چنانچہ مرزا کی دیوانگی Alfred Mombert جرمن دیوانے شاعر سے کسی قدر کم نہیں وہ اپنے دیوانہ پن میں کہتا ہے :-

La Mond and Sonne dire ug kalle ist.
Und dir das Sternegew oelle ewigalt ist.
Und in dir Finster zerriesst dein Gang.
Lauche meinem Geas ang.

اور غالب کہتے ہیں ؎

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام
مہرِ گردوں ہے چراغِ رہگذارِ باد یاں

غالب اور مامبرٹ دونوں تاریکی ظلمات میں داخل ہوئے اور اس حد سے بھی جس کو سکندر کی منزل سے تشبیہ دیتے ہیں آگے بڑھ گئے تھے لیکن غالب مثل خضر علیہ السلام کے صحیح و سالم واپس آگئے ہیں۔ لیکن مامبرٹ ہمیشہ کے لئے وہیں پڑا رہ گیا۔

غالب وحدت وجود کے بھی قائل ہیں۔ وہ کبھی خدا کو جمیع مخلوقات سے علیحدہ خیال نہیں کرتے اور ہمہ اوست کے قائل اور پیرو ہیں۔ فلسفہ کا سب سے مشکل سوال یہ ہے کہ دنیا کی آفرینش کیونکر اور کس وجہ سے ہوئی؟ آپ اسکا جواب دیتے ہیں ؎

[illegible] کو تعاون [illegible] اُمیدِ بہار [illegible]

[illegible] بات [illegible] میں تمام حسن و گری [illegible]

[illegible]

[illegible] ایک نجما [illegible] کا ۔۔۔ لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

[illegible] طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے ۔۔۔ اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

اس کے علاوہ حسن و جمال کی انتہا ہے۔ [illegible] غالبؔ [illegible] کی [illegible] نہ سکا [illegible] مرعوب ہونے کے بعد [illegible] کر لیتا ہے ؎

[illegible] کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم ۔۔۔ میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

گو کہ ایک ارضی عورت غالبؔ کی معشوقہ ہے لیکن [illegible] جذبات [illegible] املا سے بہت پاک ہیں۔ ان کے دل میں اس بے پایاں حسن [illegible] سے روحانی ارتعاش اور وجدانی پیدا ہوتا ہے۔ [illegible] رقص [illegible] پیدا ہوتا ہے۔ لیکن یہ آرزو حاجتِ نفسانی سے بے تعلق ہوتی ہے عشق [illegible] شرم و حجاب اور ادب و آداب بھی شامل ہیں۔ عشق قدرے پرستاری کرتا ہے [illegible] عشق تو سب ہے جو عاشق کے خلوت و جلوت دونوں کو اپنی ضیا بخش [illegible] [illegible] کرتا ہے ؎

[illegible] میرے ہونے میں کیا ہے رسوائی ۔۔۔ اے وہ جلوت نہیں خلوت ہی سہی

میدانِ عشق میں قدم رکھنا ہر کسی [illegible] نہیں ہے [illegible] عاشق اس کارزار میں سرگرم اور کمربستہ نظر آتے ہیں۔ لیکن کامیابی کا سہرا صرف [illegible] کے سر ہوتا ہے اور صرف ایک ہی عاشق صحیح و سالم اپنی عزت کو سلامت [illegible] ہے۔ عشق کے اسی درجہ پر مرزا کہتے ہیں ؎

[illegible] رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن ۔۔۔ ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے

[illegible] جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا ۔۔۔ کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

[illegible] میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل ۔۔۔ جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

علماء اس بات پر متفق ہیں کہ فنِ شاعری اور مصوری دونوں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔ دونوں میں غیر موجود اشیاء کو حاضر اور منظرِ عالم پہ لاتے ہیں۔ دونوں کا سنگِ بنیاد خوش اندازی سے ہے مصوری میں موقلم [illegible] رنگ اور خطوط سے مختلف مضامین کو خواہ وہ حقیقی ہوں یا مجازی صورت [illegible] [illegible] ہے اور شاعری میں اسی بات کو لفظی جامہ پہنا کر منظرِ عام پر لایا جاتا ہے

ارسطو کا بیان ہے کہ شاعری کا اصلی مقصد قدرتی اشیاء کی نقل [illegible] عالم [illegible] کے سامنے پیش کرنا ہے لیکن شاعر [illegible] ہے کہ کائنات کو

[illegible]

طرح اس کا [illegible] بہت کم ہے

شیکسپیئر نے جو جذبات [illegible] کے [illegible]

زندگی سے بہت [illegible] دکھائی دیتے ہیں [illegible] جائے تو صرف تخیل سے رنگین ہیں مگر اس کے کلام کو [illegible] ہیں۔ غالبؔ کی مصوری بھی شیکسپیئر سے کم نہیں ہے

گو ہاتھ کو جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے ۔۔۔ رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم ۔۔۔ اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

شبلیؔ کا بیان ہے کہ عام مصوری اور شاعرانہ مصوری میں سب سے بڑا فرق یہ ہے کہ تصویر کی حقیقی خوبی تو یہ ہے کہ جس کی تصویر اتاری جائے اس کے ہر خط و خال کو بھی دکھایا جائے۔ لیکن شاعر اس اصول کو بہت کم [illegible] ہے۔ وہ اکثر صرف ان باتوں کو دکھاتا ہے جن سے ہمارے جذبات متاثر ہوتے ہیں اور ان کے علاوہ دیگر اشیا کو نظر انداز کر دیتا ہے یا ان کو دھندلا کر دیتا ہے۔ یہی کیفیت غالبؔ کی ہے ؎

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم ۔۔۔ میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

پرسشِ طرزِ دلبری کیجئے کیا کہ بن کہے ۔۔۔ اس کے ہر اک اشارے سے نکلے ہے یہ ادا کہ یوں

[illegible] حسن [illegible] ۔۔۔ [illegible]

[illegible] (Homer) [illegible] عشق کی تصویر [illegible] شاعرانہ انداز [illegible] ہے لیکن [illegible] کی وجہ سے صرف [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] غالبؔ [illegible] زلفِ سیاہ [illegible] عشق [illegible]

[illegible] دیا۔ لیکن جس طرح ایک تصویر [illegible]

پیدا کرتی ہے اسی طرح غالبؔ کے [illegible]

مانند [illegible] نظر آتے ہیں۔ [illegible]

[illegible] عشق کے بجائے [illegible] وقت تک تقریباً [illegible] اور بحث مباحثے کیے جاتے ہیں کہ خندہ کیا ہے؟ کانٹ (Kant) اسپنسر (Spencer) ہیکر (Hecker) [illegible] بین (Bain) لپس (Lipps) [illegible] (Meredith) اور برگساں (Bergson) [illegible] مسئلہ پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے اور عجیب عجیب نادر نکات [illegible]

تبسم زیادہ تر مجالس اور محافل میں رونما ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے [illegible] کے مباحث زیادہ محافل ہی آتے ہیں۔ جرأت۔ انشاء اور آگرہ کے برج کی ہولیوں کے کنہیا اور تغیر کے قہقہوں کی آواز آج تک کانوں میں آ رہی ہے لیکن میر، درد اور غالب جو کہ دنیا سے مستغنی رہے عالم سے وہیں کمال سنجیدگی اور خاموشی سے متاثر نظر آتے ہیں۔ غالب کو کبھی قہقہہ لگاتے یا ہنستے ہوئے نہ پائیں گے۔ ہاں زیرِ لب تبسم کے ضرور مجرم ہیں۔ اور اس تبسم کو تمسخر نہیں کہہ سکتے بلکہ یہ مزاح (Esprit) کے نام سے موسوم ہو سکتی ہے۔ یہ تبسم معشوق کے کسی عادت کے خلاف حرکت سرزد ہو جانے سے یا خود اپنے اس ارادے یا واقعہ سے جس کی عادت نہ ہو پیدا ہوتا ہے۔ اس ابتسام میں بظاہر یا پوشیدہ کسی کے متعلق کوئی اشارہ یا چوٹ وغیرہ نہیں ہوتی بلکہ بقولِ Victor Hugo "Pour rein, pour le plaisir" اس کا مقصد ہوتا ہے

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

میں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی سن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

کہا تم نے کہ کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی بجا کہتے ہو سچ کہتے ہو پھر کہیو کہ ہاں کیوں ہو

[illegible] ہو کہیں یہ ہو [illegible] کے
[illegible]

کے عمداً بھی ہیں۔ کیونکہ "آزردن دلِ دوستاں خطا است" اس کے علاوہ دو ایک اشعار اور بھی ایسے ہیں جن کی بابت علما کا گمان ہے کہ ذوق پر ان سے شاید بھی ضرور ہی حملہ ہے۔

میں جو گستاخ ہوں آئینِ غزل خوانی میں یہ بھی تیرا ہی کرم ذوق فزا ہوتا ہے

رکھیو غالب مجھے اس تلخ نوائی میں معاف آج کچھ درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

یہاں علما اور مورخین میں لفظ غالب پر ایہام اور اختلاف ہے۔ کوئی کہتا ہے یہاں پر پہلے ذوق تھا۔ پھر بعد میں غالب کر دیا گیا۔ اور کوئی کہتا ہے کہ پہلے غالب ہی تھا۔ لیکن یہ بحث نقادوں اور مورخوں سے ربط رکھتی ہے اور انہی کے مطلب کی ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہونگا کہ یہ عیب جو کا آپ اپنا نقص ہے۔

غالب کو ہر شے میں صنم کا جلوہ نظر آتا ہے۔ وہ "رخِ لیلیٰ" نہیں بلکہ "عارضِ جانِ عالم" ہے۔ یہاں تک کہ ہر آنکھ ان کے دیدار کی متمنی ہے

جوہر از بس کہ تقاضائے نگہ کرتا ہے
جوہرِ آئینہ بھی چاہے ہے مژگاں ہو کر

لیکن وہ معشوق حقیقی اپنے وصل سے کسی عاشق کو خوش نہیں کرتا کیونکہ شرم، غرور اور استغنا اس کو رونمائی سے روکتے ہیں اور اس طرح وہ مہ جبین اور نازنین چہرے سے نقاب نہیں اٹھاتا

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

جب وہ جمالِ دلفروز صورتِ مہرِ نیمروز آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

غالب کا شمار ان شعرا میں ہے جو حسن کو سرد و بے ربط۔ بے رنگ و بے روح پیکرِ مینا میں نہیں ڈھونڈتے بلکہ عورت کے سینے میں متلاشی ہوتے ہیں۔

غالب کی معشوقہ مریم نہیں جس کا قلب نازک غیر سے خالی ہے۔ اور جنس مقابل سے بالا ہے صرف یہی نہیں بلکہ وہ زلیخا کہلانے کی مستحق ہے اس کے برخلاف مرزا پست نہیں۔ بلکہ اگر ان کو سری کرشن کہا جائے تو بجا نہیں۔ ان کے معشوق کی تصویر کشی میں Raphael کا قلم نہیں [illegible] لیکن Rubens کا سا جواب ہے

[illegible] ہوس شرم سے [illegible]
[illegible] چہرہ [illegible]

[illegible]

...چیز ہیں شاعر رہا ہے جو اپنے اشعار کے مضمون کو کبھی وقت کے [illegible]
...سے مثل جادر پہنا کر منظوم پیرا لا سکے اور وہ حالت غالب تصویر پیش کی
...گئی ہے وہ بیان کی سے متمیز ہو۔ پس اگر اس خیال سے اتفاق کیا جائے
...غالب کے ان اشعار سے بہتر مثال شاید ہی مل سکے گی۔

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی
دیکھو اے ساکنانِ خطۂ پاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی
کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکش سطح چرخ مینائی
سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی

ان جملہ اشعار میں غالب نے ایک نظارۂ قدرت کو پیش کیا ہے
...جن میں گو کہ مسلسل اور متصل واقعات بیان کئے ہیں لیکن صرف ایک عجیب
...خاموش منظر ہے۔ مغرب میں نیلگوں اُفق ہے۔ آفتاب عالمتاب چمک کر

[illegible]
ہو جاتے ہے

[illegible] زمین کو [illegible]
سبزہ اس [illegible] کہ [illegible] آسمان [illegible]
اشجار جھنڈ اور پھولوں کی تمامیں بھی ہیں [illegible]
تماشا ہے۔ اس خاموشی اور سکوت کو توڑنے کے [illegible]
یا تلی بھی نہیں ہے جو کہ شور کر کے فضا کو مرتعش کرے۔

اگر حقیقت میں دیکھا جائے تو غالب نے [illegible]
کو بھی جس کی نظم "کنارِ دریا" فطرت تمام آوری کی [illegible] بات
کر سکے اُردو شاعری میں وہ مرتبہ حاصل کیا ہے ان کا کسی شاعر سے
مقابلہ نہیں ہو سکتا۔

نقوشِ ماضی

میں اس رنگین وادی میں بہت دن بعد آیا ہوں

زمیں رشکِ ارم تھی اس جگہ کی تیرے آنے سے
فضا یہ گونج اُٹھی تھی کبھی تیرے ترانے سے
تبسم سے ترے ہر شئے یہاں کی مُسکرا دی تھی
یہاں پہلے پہل تو نے مجھے داد وفا دی تھی
یہ چشمہ، یہ چٹانیں اور کچھ اشجار کے سائے
ابھی تک منتظر ہیں کاش پھر اک بار تو آئے

مناظر کی حسیں آغوش میں، میں آج تنہا ہوں
کبھی میری طرح تیرا بھی اس وادی میں آنا ہو
یہاں بھُولا ہوا ماضی تجھے بھی یاد آ جائے
محبت کا فسانہ تو بھی میری طرح دُہرائے
ترے ہونٹوں پہ پھر "گایا ہوا" کوئی ترانا ہو

جُدا رہتے ہوئے ملنے کی ہم آرزو کرنا
حسیں تر بے حسیں لمحات کی پھر جستجو کرنا

از
جناب نصرت تسکین۔ بی، اے

دوست تھا۔ اور اس بنا پر وہ اسکی تحریروں کو پڑھکر واضح طور پر اُن کی تشریح کر سکتی ہے۔

چنانچہ اُس نے اُسی روز شام کو سارے جاسوسی سٹاف کے سامنے کھڑے ہو کر ایک فوجی نقشے کی مدد سے جو سامنے دیوار پر لٹکا ہوا تھا۔ ان خفیہ تحریروں کو متواتر سات گھنٹہ میں حل کر کے اپنی قابلیت کا سکہ بٹھا دیا۔ وہ تحریریں فرانسیسی فوجی نقل و حرکت کے متعلق تھیں۔ تمام جنرل سٹاف نہایت حیرت کے ساتھ اس نوجوان لڑکی کے لکچر کو غور سے سُن رہا تھا۔ جو وہ فوجی چالوں کے متعلق نہایت پُر جوش انداز سے دے رہی تھی۔ اُسکی فوجی معلومات کا ذخیرہ اور ان کے بیان کرنے کا ڈھنگ کسی بڑے سے بڑے جنرل کے شایانِ شان تھا۔

جرمن جاسوسی محکمے نے فوراً اُس کو اپنی ملازمت میں داخل کر لیا۔ اور ایک ہفتہ بعد وہ جنیوا میں آرٹ کے طالبعلم کی حیثیت سے نمودار ہوئی۔ یہاں فرانسیسی فوج کے چند ڈویژن فوجی نقل و حرکت میں مصروف تھے۔ اُس نے نہایت آسانی سے چند فوجی افسروں سے دوستانہ پیدا کر لیا۔ اُن کے لئے تصویریں بنائیں اور میٹھی میٹھی باتوں سے اُن کو لُبھانا شروع کر دیا۔ اس کے فوجی پرستاروں نے اسکی کم عمری کی وجہ سے احتیاط برتنا غیر ضروری سمجھا۔ چنانچہ اُس نے کافی اہم معلومات فرانسیسی توپ خانے کے متعلق جرمن فوجی افسروں کو مہیا کیں۔

برلن کو واپسی پر اُسے جاسوسوں کے ایک محکمہ کا سردار بنا دیا گیا۔ جن کو وہ خود ہی بھرتی بھی کرتی تھی۔ سنہ ۱۹۱۴ء میں جنگ کے شروع ہونے سے قبل برسلز آئی۔ اور اُس نے اپنا ایک دفتر ایک فرانسیسی لڑکی کی حیثیت سے قائم کر لیا۔ یہاں ایک نوجوان لفٹننٹ آسٹن اُس کی محبت کا شکار ہوا۔ عشاق کی حیثیت سے یہ دونوں سرحد پر بڑی دُور دُور چکر لگایا کرتے تھے۔

یہ نوعمر لڑکی آرٹسٹ کے بھیس میں اہم مقامات کی تصویریں بنایا کرتی تھی اور یہ تصویریں سوئٹزرلینڈ کے راستے برلن بھیجی جاتی تھیں۔ جہاں اُوپری رنگ روغن کو صاف کرنے کے بعد کاغذ کی سطح پر فوجی نقشہ جات اُبھر آتے تھے۔ ایکدن اُس نے لفٹننٹ کو موٹر میں بٹھا کر ہالینڈ کی سرحد کی سیر کرانے پر راضی کر لیا۔ جب وہ موٹر میں بیٹھی تو اتفاق سے اُس کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک صفحہ پیڈ میں سے نکل کر اُڑا۔ اور کچھ دُور جا پڑا۔ نوجوان لفٹننٹ نے موٹر روک لی اور وہ کاغذ کا پرچہ اُٹھانے کیلئے نیچے اُترا۔ اینا میری نے فوراً تاڑ لیا کہ اب اسکا راز آسٹن پر ظاہر ہوئے بغیر نہ رہے گا۔ اُس نے موٹر چلا دی اور اس قدر تیزی سے روانہ ہو گئی کہ لفٹننٹ اُسکی دھول بھی نہ پا سکا۔ اُدھر آسٹن نے جب اس پرچہ کو اُٹھایا تو اُس نے یہ دیکھا کہ اس پر چند مورچوں کے خاکے بنے ہوئے تھے۔ اُس نے جرمن جاسوسہ کو پکڑنے کی کوشش کی۔ لیکن وہ سرحد پار کر چکی تھی۔ سرحد کی پولیس نے یہ دیکھا کہ موٹر ایک درخت سے ٹکرا کر اُلٹی اور اُس میں آگ لگ گئی۔ لیکن اُنہوں نے یہ نہ دیکھا کہ موٹر کے ٹکرانے سے پہلے ایک عورت اُس میں سے نکلکر دریا میں کود چکی تھی۔ وہ تین گھنٹہ تک تیرتی رہی اور اسکے بعد ایک مچھیرے نے اسے دریا سے باہر نکالا۔

دوران جنگ میں اس کا صدر دفتر ایمسٹرڈم تھا لیکن اسکی جاسوسی سرگرمیاں سارے یورپ میں پھیلی ہوئی تھی۔ اتحادیوں کے محکمہ جاسوسی کی اطلاعات سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بیک وقت سارے یورپ کے مختلف حصّوں میں موجود تھی۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں وہ بارسیلونا میں ایک مالدار امریکن کی بیوی کی حیثیت سے نمودار ہوئی۔ اور اُس نے ایک ریڈ کراس بریگیڈ قائم کیا۔ یہاں اتفاقاً اس کا سامنا اُس کے پُرانے دوست آسٹن سے ہوا جس نے اُسے پہچان لیا۔ وہ بے تحاشا رفو چکر ہو گئی۔ نہایت حیرت انگیز جرأت کے ساتھ اس نے ایک فرانسیسی افسر کا بھیس بدلا اور فرانسیسی فوج میں سے ہوتی ہوئی جرمن خندقوں تک جا پہنچی۔ جب وہ ایمسٹرڈم پہنچی تو برطانوی محکمہ جاسوسی نے اپنے ایک آدمی کو اُسکے مددگار کی حیثیت سے اُس کے دفتر میں پہنچا دیا۔ اس دفتر سے جرمن بیڑے کو خفیہ زبان میں ریڈیو کے ذریعہ ہدایتیں بھیجی جاتی تھیں۔ انگریزی جاسوس نے مفید اطلاعات حاصل کر کے اتحادیوں کے جہازوں کو بہت سے خطروں سے محفوظ کر لیا۔ ایک دفعہ جب تین جرمن جنگی جہاز انگلستان کی مشہور بندرگاہ ہل پر اچانک حملہ کیلئے روانہ ہوئے تو ان کو پورے برطانوی بیڑے سے مقابلہ کرنا پڑا۔ اور وہ تینوں بالآخر ڈبو دیئے گئے۔ چونکہ یہ خبر صرف ڈاکٹر اور اُس کے مددگار کو معلوم تھی۔ اس لئے دوسرے دن اس جرمن جاسوسہ نے اپنی میز کی دراز میں سے ایک پستول نکال کر نہایت اطمینان سے اپنے مددگار کا خاتمہ کر دیا۔ اس جرمن جاسوسہ کے متعلق جو واقعات مشہور ہیں ان میں کہاں تک صداقت موجود ہے، یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ جنگ کے دوران میں اس کو افیون کی لت پڑ گئی۔ اور جب وہ شل ہو جاتی تھی، تو اسی کے ذریعہ اپنے اعصاب کو سکون دیتی تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ وہ بعض اوقات مسلسل بیس گھنٹہ کام کرتی تھی۔

جنگ ختم ہونے سے پیشتر وہ سخت بیمار ہوئی اور ہسپتال میں جا کر مر گئی۔ محض اس عورت کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس کی کامیابی کا دارومدار نری صنفی جاذبیت کی قسم نہ تھی۔ بلکہ وہ غیر معمولی ذہانت کی مالک تھی۔ اور اگر اسے وہ مناسب طریقہ پر استعمال کرتی، تو وہ بنی نوع انسان کے لئے بہت پائیدار اور مفید کام انجام دے سکتی تھی۔

جدید شاعری میں نفسیات

(از جناب احتشام، بی، اے)

زندگی مسلسل حرکت ہے۔ ایک قوت یا قوتوں کے ایک عجیب نظام کی اور شاعری زندگی کا دھڑکتا ہوا آئینہ ہے۔ اسکی حرکت اس وقت تک جاری رہیگی جب تک زندگی خود حرکت میں ہے۔ دنیا ابھی کے فن پر قناعت نہیں کر سکتی۔ شاعری عہد ماضی کی یادگار ہے اور اجداد کی میراث۔ وہ ایک قوت ہے زندہ اور متحرک جن شکلوں میں وہ منتقل ہوتی چلی جاتی ہے اُن سب میں وہ مادہ کے ساتھ مخلوط رہتی ہے۔ اس مادہ کو وہ حیات بخشتی ہے۔ اس میں اپنے شمول سے وہ خود اپنی زندگی کو ایک خارجی اور فہم پذیر ہئیت دیتی ہے۔ لیکن مادہ جو ہر حیات پر جس نے خود اس میں روح پھونکی ہے۔ غالب آجاتا ہے۔ شاعری خود اپنی مخلوقات کے بوجھ سے کراہنے لگتی ہے۔ جس چیز کو شاعری کے کسی دور کا نقطۂ عروج کہا جاتا ہے وہ علامت ہے اس بات کی کہ شاعری کسی دوسری جگہ منتقل ہونا چاہتی ہے جو کچھ اس نے تخلیق کیا ہے اس سے گریز کرکے اپنی تخلیقی قوت کو کسی نئی ڈگر پر ڈالنا چاہتی ہے۔ دور حاضر سائنس کا دور ہے۔ زندگی کا سانچہ (Pattern) ہونیکی حیثیت سے شاعری کا اس سے متاثر ہونا لازمی تھا۔ ورڈسورتھ نے شاعری کو سائنس کے ہونٹوں پر تبسم سے تعبیر کرکے درحقیقت ایک نئے عہد شاعری کی پیشین گوئی کی تھی۔ یہ عہد اگرچہ ابھی پردہ خفا میں ہے لیکن اس کا ظہور ضرور ہوگا۔ اور اسکی علامت یہ ہے کہ شاعری جدید سائنس کی مختلف تحریکوں سے شدت کے ساتھ متاثر ہوتی ہے۔ نفسیات جدید سائنس کی ایک تحریک ہے۔ اس سے قبل علم النفس فلسفہ کی ایک شاخ گردانا جاتا تھا۔ اور ذہن کو محض ایک ثانوی حیثیت حاصل تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ اس نے فلسفہ سے اپنا دامن چھڑایا اور بالآخر اس صدی کے آغاز میں علم کی ایک الگ شاخ کی حیثیت سے ظہور کیا۔

ذہن کے متعلق اب تک یہ عقیدہ رہا تھا کہ وہ ارادہ، فکر اور احساس کے فرائض انجام دیتا ہے اور اسکی تمام عملی سرگرمیاں محض ایک ہی دائرہ شعور میں محدود رہتی ہیں۔ فلسفہ نے اگرچہ یہ تسلیم کر لیا تھا کہ ذہن ...

سطح سے نیچے بھی کوئی گوشہ ضرور ہونا چاہیئے۔ اور یہ کہ یہ گوشہ کافی وسیع ہوگا۔ لیکن اس خیال کی حیثیت محض ایک مفروضہ جیسی رہی۔ کیونکہ مطالعہ و مشاہدہ تو ذہن کے صرف شعوری حصہ کا ہی ممکن تھا۔ ماہرین نفس نے سائنس کے اصولوں کی روشنی میں اس حصہ کی تحقیق شروع کی جس کے نتائج اہم برآمد ہوئے اور متنوع۔ مثال کے طور پر ایک انکشاف یہ ہوا کہ ذہن اور جسم کے تعلقات ان کی نسبت جواب تک تصور کئے جاتے رہے ہیں کہیں زیادہ گہرے ہیں۔ ذہن کی اکثر حرکات کے متعلق دریافت کیا گیا کہ وہ کارنامے ہیں ان قوتوں کے جن پر ذہن خود کوئی قابو نہیں رکھتا۔ لیکن اہم ترین نتائج (hypnoses) سے پیدا ہونے والے اثرات کے مطالعہ سے برآمد ہوئے اور انہیں کا انطباق اعصابی تعلیم کے علاج کیلئے کیا گیا۔ ڈاکٹر فرائڈ کے مشہور و معروف عمل نفسیاتی تحلیل کا ماخذ یہی ہے۔ ڈاکٹر فرائڈ کا حلقۂ عمل اگرچہ ذہنی امراض کا مطالعہ اور ان کا علاج تھا۔ لیکن یہ انکشافات بھی اسی کا تقاضا کر رہا اور بے ربطی میں محض مدارج کا فرق ہے۔ اس قسم کی تحقیقات نے ہمارے نظریہ میں ایک زبردست انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اب ہماری نگاہیں ذہن کے تنگ شعوری حلقہ میں مقید نہیں رہتیں بلکہ ماورائے شعور تک پہنچنے کی سعی کرتی ہیں۔ جدید تحقیق کی رو سے ہمیں ذہن کو پرتوں کا ایک مجموعہ تصور کرنا چاہیئے۔ اولین پرت شعور کا پرت ہے جس کا ارادہ، فکر اور احساس کا شعبہ عمل پہلے کی طرح اب بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اب وہ اپنی اس اہمیت سے محروم ہو چکا ہے جو پہلے اس سے متعلق تھی۔ ما بقی کو تحت الشعور سے تعبیر کیا جائے یا لاشعور سے۔ یہ ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ہے لیکن بہتر یوں ہوگا کہ اسکو دو پرتوں میں منقسم کر دیا جائے۔ پس ہم یوں کہیں گے کہ شعوری پرت کے فوراً بعد تحت الشعوری پرت ہے اور اس کے بعد سب سے نیچے لاشعوری پرت۔ اور یہی تمام قوتوں کا مصدر ہے۔

لیکن ان باتوں کا علم تو پہلے بھی تھا۔ جدید ماہرین نفس نے محض ایک معروف شے کو غیر معروف زاویہ سے دیکھا ہے۔ سوال یہ ہے کہ تازہ انکشاف کیا کیا گیا۔ وہ انکشافات جس نے شاعری کو بھی متاثر کیا ہو۔ ایسے انکشافات بہت سے کئے گئے۔ اور یہاں صرف دو انکشافات کے بیان پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

اگرچہ لاشعور ابھی تک مبہم اور غیر معین ہے تاہم اس کے اور شعور کے مابین آمد و رفت کا ایک زینہ قائم ہے جسکو اس زینے سے مماثل کیا جا سکتا ہے جو حضرت یعقوبؑ نے عالم رویا میں زمین اور آسمان کے مابین نصب دیکھا تھا۔ یہ پہلا انکشاف ہے اور اسی سے دوسرے انکشاف کی بات پیدا ہوتی ہے۔ ذہن لاشعور کے مشتملات سے تھوڑی بہت واقفیت بہم پہنچا سکتا ہے۔ اکثر یوں ہوتا ہے کہ

احساسات اور افکار کسی وجہ سے بیکار ہو کر طبقۂ تحت الشعور میں جا پڑتے ہیں۔ اسی طرح جس طرح ٹوٹا پھوٹا سامان کسی الگ کوٹھڑی میں بیکار سمجھ کر ڈال دیا جاتا ہے لیکن چونکہ ایک زینہ موجود ہے اس لئے کسی وقت بھی ان میں سے کچھ یا تمام کے تمام طبقۂ شعور میں آسکتے ہیں یا تو کسی وجہ سے خود بخود تیر کر یا کسی عمداً سعی کی بنا پر۔ بعض اوقات قوت شعور میں ضعف پیدا ہونے کی وجہ سے طبقۂ تحت الشعور کے خیالات بآسانی اُبھر کر طبقۂ شعور میں داخل ہو جاتے ہیں اور اسکے ہر گوشہ پر چھا جاتے ہیں یا یوں ہوتا ہے کہ قوتِ شعور اپنا مقام چھوڑ کر کسی دوسری خارجی شے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی گہرے خیال میں غرق ہے اور اسکی نگاہیں سامنے کے کسی درخت پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ اس وقت طبقۂ تحت الشعور میں پڑے ہوئے خیالات اُبھر اُبھر کر سطح شعور محیط ہو جاتے ہیں Evolution کا طریق عمل یہی ہے ایک اکائی میں اُلجھی ہوئی دوسری اکائی ہوتی ہے اور دوسری اکائی میں تیسری و علیٰ ہذا۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس سلسلہ کی تمام اکائیاں ایک دوسرے سے مشابہ یا متعلق ہوں ماسوا اس رشتۂ زیریں کے جسکی وجہ سے وہ ایک دوسرے سے اٹکی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور بسا اوقات یہ رشتہ اتنا باریک ہوتا ہے کہ ایک صاحبِ عقل انسان اسے رشتہ تسلیم کرنے سے ہی انکار کر دیتا ہے۔ اس پورے عمل کو آزاد تلازمہ (Free Association) کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ آزاد تلازمہ خود ایک طریق ہے جس کے ذریعہ سے کنایہ (Suggestion) اپنا عمل کرتا ہے اور کنایہ ہمیشہ سے اُن مسلمہ طریقوں میں سے ایک رہا ہے جن کے ذریعہ سے شاعری کو قوتِ تاثیر حاصل ہوتی ہے۔ نئی چیز صرف اتنی تھی کہ اسے ایک نیا اور انوکھا رنگ دیدیا گیا۔

جدید شاعری میں اس سطح سے نیچے والے عالم کی تحقیق کی عمداً سعی کی جاتی ہے اور اس لئے Evocation کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ ن۔م راشد کی نظم "دریچے کے قریب" کو دیکھئے۔ صبح آہستہ آہستہ طلوع ہو رہی ہے۔ اس نیلی ابدیت میں لپٹی ہوئی جو اس کا مصدر ہے۔ مسجدِ شہر کے بلند مینار دھندلکوں سے چپکے چپکے اُبھر رہے ہیں۔ انوارِ سحر ان پر بکھر بکھر کر لوسوں سے پیدا ہونے والی نزہت و تازگی پیدا کر رہے ہیں۔ راشد کا کردار دریچہ میں کھڑا اس پُر کیف منظر کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اُس کی توجہ رفتہ رفتہ ان میناروں پر مرکوز ہو جاتی ہے۔ شعوری ذہن میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے اور طبقۂ تحت الشعور سے خیالات اُبھر اُبھر کر آنے لگتے ہیں ؎

اسی مینار کے سایے تلے کچھ یاد بھی ہے
اونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں

اپنے بیکار خدا کی مانند
ایک مُلّائے حزیں
ایک عفریت ـــ اُداس
تین سو سال کی ذلت کا نشاں
ایسی ذلت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی

عہدِ قدیم کے ادب میں اس کا نشان نہیں ملتا اور بالکل [illegible] کی وجہ سے بسا اوقات باعثِ تعجب ہوتی ہے۔ پُرانے طریقہ کے لیے شیکسپیئر کے ڈرامہ "میکبتھ" میں بادشاہ قتل ہو چکا ہے۔ شام کا دھندلکا رینگتا ہوا بڑھ رہا ہے۔ میکبتھ اپنے دریچے میں کھڑا ہے اس کی نگاہیں گہری ہوتی ہوئی تاریکی پر جم جاتی ہیں۔ دفعتاً وہ بڑبڑانے لگتا ہے ؎

"روشنی مدھم ہوتی جا رہی ہے اور کوا کلاغی جنگل کی سمت مائلِ پرواز ہے۔"

کتنا شدید احول پیدا ہو جاتا ہے۔ کلاغی (Rooky) کا واحد لفظ کتنے تلازموں، تشبیہوں اور خیالوں کا حامل ہے۔ اس کے مقابلہ میں انگریزی شاعری میں سے ہی Evocation کی ایک جدید مثال لیجئے۔

"خالی چیتھڑیو ہواؤں کو اپنے اوپر لپیٹو"

یہاں بھی ذہن و دماغ پر اسی طرح سایے منڈلانے لگتے ہیں اور وہی شدید احول پیدا ہو جاتا ہے۔ الفاظ کے معنی جو ظاہر ہیں اس سے کہیں زیادہ اسکی تہہ میں پنہاں ہیں۔ لیکن ان مثالوں میں ایک فرق ہے۔ قدیم طریقہ میں ہر فقرہ ایک صاف سطحی معنوں کا حامل ہوگا۔ اگرچہ آئندہ مطالب کتنے ہی نازک مقصود ہوں۔ میکبتھ شام کے نزول کو دیکھکر کہہ اٹھتا ہے کہ کوا اپنے گھر کی سمت اُڑا جا رہا ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ جھٹپٹے کے وقت یہ اُن کا معمول ہے۔ لیکن کیا کسی نے ایسی خالی چیتھڑیاں بھی دیکھی ہیں جن پر ہوائیں لپیٹی جاتی ہوں۔ بیشک کسی نے نہیں دیکھیں۔ جدید شاعر کا یہ مطلب ہی نہیں ہوتا کہ اسکی بیان کردہ چیز کو کوئی حسبِ معمول دیکھے۔ اسکے یہاں ظاہری معنی کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ اہمیت اندرونی معانی کو حاصل ہے۔ مومن کا ایک شعر ہے ؎

میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے
تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی

اب اس کے مقابلہ میں راشد کے یہ اشعار رکھئے ؎

شام سے پہلے ہی کر دیتا تھا میں
چاٹ کر دیوار کو نوکِ زباں سے ناتواں

[illegible] ہو جاتی ہے [illegible]
آہ تو آخر ہم آغوشِ زمیں ہو جائیگی

یاس، کاوشِ اور ایک قسم کی شکست کا احساس دونوں مثالوں سے مترشح ہے۔ لیکن مومن کا شعر ایک معین اور واضح معانی کا حامل ہے۔ اگرچہ آشنده مطالب کتنے ہی زنگ مقصود ہوں۔ باوجود ایک گہرے طنزیہ اور تلخ لہجہ کے اس میں کوئی گہرائی وسعت نہیں جھلکتی۔ ایسے موقعہ پر ایسے ہی الفاظ عموماً سُننے میں آتے ہیں۔ لیکن کیا کسی نے ایسی دیوار بھی دیکھی ہے جو لوگ زبان کے لمس سے شام تک ناقابل ہو جاتی ہے اور صبح سے پہلے پھر بلند ہو جاتی ہے۔ بیشک کسی نے نہیں دیکھی۔ راشد کا مقصد ہی یہ تھا کہ اسے کسی نے نہ دیکھا ہو۔

یہاں ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ اگر جدید شاعر کا مطلب وہ نہیں ہوتا جو وہ کہتا ہے بلکہ وہ جو وہ مُراد لیتا ہے تو وہ کیا نتیجہ ایک مطلب کے بجائے بہت سے مطالب ہیں برآمد نہیں ہوگا۔ کیونکہ جو چیز زیریں سطح واقع ہے وہ کوئی معین خیال نہیں ہے بلکہ تلازماتِ خیالات کا ایک گچھا۔ درست۔ اور یہ دقت تو خلقی ہے۔ بایں ہمہ یہ افکار اور اشارات من حیث الکل اپنا ایک مخصوص رنگ ایک عام شباہت رکھتے ہیں۔ اگرچہ جزوی طور پر ان میں اختلاف ہو۔ مثال کے طور پر ایک شخص یکایک کہہ اُٹھتا ہے۔ ہائے! یہ واحد لفظ اس موقعہ پر کن احساسات کا حامل تھا۔ افسوس کا۔ تعجب کا۔ مایوسی کا ـــ تعریف کا، مسرت کا۔ یہ کوئی نہیں بتا سکتا۔ لیکن اسی لفظ کو باموقع فقرہ میں پیوست کرکے ادا کیا جائے تو وہ اپنے مخصوص معانی کا مظہر ہوگا۔ اور پھر کہنے کا ایک طریقہ ہوا کرتا ہے۔ ذہن تحت الشعور کسی منطقی احتساب کا پابند نہیں ہے۔ نفسیاتی ادیبوں کی تحریروں میں طلسمی دُنیا کی سی غیر ذمہ داری جھلکتی ہے۔ لیکن انکی باتیں بے معنی نہیں ہوتیں۔ وہ اپنا ایک مخصوص رنگ ایک مخصوص معنی رکھتی ہیں۔ ٹی، ایس ایلیٹ کے متذکرہ بالا فقرہ کو لیجئے جو نظم Geronation سے ایک اقتباس ہے۔ نظم میں ایک مردِ ضعیف کی حالت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ضعیف گذشتہ زندگی کی یاد میں غرق ہے۔ عہدِ شباب، نفس، مذہب اور خواہشات کی جنگ کا مسکن ہے۔ ایک دوشیزہ کی اس کی سمت ترچھی نگاہ ـــ اسے آگے کچھ یاد نہیں آتا۔ ایک تھکے ہوئے ذہن کو پریشان کرنے کیلئے یہ بہت کافی ہے۔ اس کے خیالات غیر مربوط طریق پر بہنے لگتے ہیں۔ وہ چلا اُٹھتا ہے ؎

"خالی چرخیو ہواؤں کو ملیچ آؤ پر لپیٹو"

جو فقرہ پہلے بے معنی معلوم ہوتا تھا اب کتنا معنی خیز ہوگیا۔ اسی طرح راشد کے اشعار کو نظم کے موضوع کا لحاظ رکھتے ہوئے پڑھئے۔ اور وہ بے معنی اشعار ایک گہرے معنی کے حامل ہو جائیں گے۔

عہدِ ماضی کے ناول نگار کردار نگاری کے سلسلہ میں اپنا اہم کارنامہ یہ سمجھتے تھے کہ تمام ٹکڑوں کو ایک مکمل اور مدور کل میں چسپاں کر دیں۔ اس عمل کی مشکلات ان پر بخوبی روشن تھیں۔ لیکن اُن کا مخصوص مقصد یہ ہوتا تھا کہ منتشر اجزاء کو مجتمع کریں اور مناسب کاٹ چھانٹ کرکے اپنے ہر کردار کو ایک کردار عطا کر دیں۔ ایک کردار اُن کی نظر میں کوئی ایسی چیز تھی جو واضح اور معین شکل ہو۔ لیکن جدید مصنفین اپنے کردار کو کبھی ایک واضح اور معین کل میں پیش نہیں کرتے۔ کیونکہ زندگی خود کسی شخصیت کو اس طرح پیش نہیں کرتی۔ اسکے برعکس کردار پارچوں اور ٹکڑوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ہم پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ ہم انہیں ملا کر ایک کل کی شکل دیدیں۔ آج کے ناول نگار کی سرگرمیاں کل پر نہیں بلکہ اجزائے ترکیبی پر مرکوز ہوتی ہیں۔ ان دلادینہ ٹکڑوں پر جن میں ماہر نفسیات نے ذہن کو توڑ کر منقسم کر دیا ہے۔ کردار کے صحیح جائزہ کیلئے ان تمام ٹکڑوں پر نظر رکھنی لازم ہے۔ انسانی عمل محض اسکے شعوری ارادہ کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ انسان جو کچھ ہے اسے سمجھنے کیلئے ایک حد تک ان بادلوں پر بھی نظر رکھنی ضروری ہے جو پس منظر میں منڈلاتے رہتے ہیں۔ ان مخالف امواج (Cross currents) اس پر غیر شعوری قوتوں کے مسلسل دباؤ کو۔ پھر ناول نگار کی تکنیک بھی مختلف ہوتی ہے۔ وہ بذاتِ خود کسی مسئلہ یا واقعہ پر تنقید نہیں کرتا۔ سیرت کا کوئی مختصر صاف خاکہ پیش نہیں کرتا۔ نہ کسی سہل خلاصہ کی ضرورت سمجھتا ہے۔ اس کی مثال علم الحساب کے ایک معلم کی سی ہوتی ہے جو جمع کے کسی پیچیدہ سوال میں مختلف رقمیں لکھکر الگ ہو جاتا ہے اور انہیں جمع کرکے جواب نکالنے کا کام طلبا کی ذہانت پر چھوڑ دیتا ہے۔ تھامس ہارڈی عہدِ وکٹوریہ کا آخری بڑا ناول نگار ہے۔ اس کے ٹھوس کرداروں کا کسی جدید ناول نگار کے کرداروں سے موازنہ کیجئے۔ مثال کے طور پر اس کے ہنچرڈ (Henchard) کو لیجئے کے ناول "Egeldon ningara" کے مردوں اور عورتوں کے مقابلہ پر رکھیے۔ ہنچرڈ ایک مکمل شخصیت ہے گویا قینچی سے اسکے حدود اربعہ ایش کر اسے سالم اُٹھا لیا گیا ہے کتاب ختم کر چکنے کے بعد وہ ایک واقعی شخصیت بنکر ہمارے تصور میں حرکت کرتا ہے۔ ہم اسے ایک واقعی ملاقاتی کی حیثیت سے ہی نہیں جانتے بلکہ اس حیثیت سے بھی کہ خود ہارڈی کا اسکی بابت کیا خیال تھا۔ اور نیز یہ کہ اسکے متعلق وہ ہماری بابت کیا بنانا چاہتا تھا۔ لیکن "Egeldsdan eganga" کے پڑھنے کے بعد ایسا کوئی احساس پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں ہم محض استنباط کرتے ہیں کیسلے کے کرداروں کی سیرت ریزہ ریزہ کرکے پیش کی گئی ہے۔ کبھی واضح اور کبھی معین ہوتی ہے۔

کبھی اُلجھی ہوئی اور بے ربط۔ اور کبھی متضاد اور متناقض۔ اور یہ پیچ
سب ایک ہی قسم کے نہیں ہوتے۔ وہ ذہن کی اُن تمام تہوں میں بکھرے
پڑے رہتے ہیں۔ جنہیں نفسیات نے ہم پر منکشف کر دیا ہے شعوری فکر و
عمل، زیریں شعور میں فکر و تشبیہ کا بہتا ہوا دھارا عمیق لاشعور کی اندھا دھند
اتھاہ اندھی جد یہ مصنف اپنے کردار کے جائزہ میں ان تمام باتوں کا لحاظ رکھتا ہے۔
کرشن چندر کے "سپنا" کے ہیرو کی زندگی دو حصوں میں منقسم ہو کر دو محوروں پر
گردش کرتی ہے۔ اور دونوں حصے آپس میں قطعی متضاد ہیں۔ ممتاز مفتی کے
افسانہ "بدماشں" (سالنامہ ادب لطیف ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا ہے) میں ہیروئن
اوڈیپس گرہ (Oedipus complex) کی بیمار نظر آتی ہے۔

نثر سے نظم کی سمت آئیے تو وہاں بھی آج اور کل کے مابین یہی فرق نظر
آئیگا۔ ناول نگاروں کی طرح شعراء بھی متحدہ کل کی بجائے منتشر اجزا کے شایق ہیں۔
وضاحت اور تعین انہیں بھی ناپسند ہے۔ آخری تصریف (Final synthesis)
کا کام وہ بھی ناظرین کیلئے ہی چھوڑ دیتے ہیں۔ ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ
(Gerontion) گذشتہ تجربات کی یادوں پر مشتمل ہے۔ لیکن اس کے
ہیرو کا خاکہ کتنا مبہم اور غیر معین ہے۔ کردار کے ایسے خاکے براؤننگ اور انیس
کے یہاں بھی ملتے ہیں۔ لیکن وہ واضح اور معین ہوتے ہیں۔ براؤننگ کی نظم
The Bishop orders his Tomb ایک Monologue ہے۔
پادری بستر مرگ پر دراز ہے۔ اس کے بھتیجے اس کے گرد جمع ہیں اور وہ اُن سے گفتگو
کر رہا ہے۔ براؤننگ کا بوڑھا مقدس گنہگار ایلیٹ کے مرد ضعیف کی نسبت کہیں
زیادہ واضح شخصیت کا مالک ہے۔ براؤننگ کو پڑھ جائیے اور جو کچھ وہ کہنا
چاہتا ہے سب واضح ہو جائیگا۔ یہی حال انیس کا ہے۔ اُس کے کسی مرثیے کو
پڑھیے اور اس کے کرداروں کے کردار ہم پر بالکل روشن ہو جائیں گے۔ وہ ہمارے
تصور میں زندہ شخصیتیں بن کر حرکت کرنے لگتی ہیں۔ امام حسین کے اکثر مراثی میں
اہلبیت سے رخصت کا اور میدان جنگ میں رزم کا ایک حصہ گذشتہ یادوں پر
مشتمل ہے۔ لیکن ہر چیز واضح ہے۔ براؤننگ اور انیس کی طرح جدید شاعر
کا ارادہ بھی ذہن کی تصویر پیش کرنا ہوتا ہے۔ لیکن ان بزرگوں کے برخلاف وہ
ذہن کو اس کے تمام طبقوں میں عمل کرتا ہوا دکھانا چاہتا ہے۔ اس کا قطعی مقصد
Gerontion والا ابہام ہوتا ہے۔ اس قسم کی نظموں میں خیالات کو
ایک مختلف گوشے سے ابھرتا ہوا دکھایا جاتا ہے۔ ایک ایسے حصے سے جہاں
منطقی مفاہیم کوئی اہمیت نہیں رکھتے اور حقائق باوجود خلاف عقل ہونے کے
حقائق ہی رہتے ہیں۔

لیکن یہاں ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ اگر کسی کو کُلی آزادی
دی جاتی ہے اور Evocation بلا کسی روک ٹوک کے عمل کرتا ہے
تو کیا نتیجہ سوائے بے ڈھنگے خیالات کے بے ربط اختلاط کے اور کچھ برآمد ہوگا
اور کوئی نظم بامعنی کس طرح ہو سکتی ہے۔ تاوقتیکہ اس کے اجزا میں کچھ تھوڑا سا
ربط نہ ہو۔ اگر ربط سے مراد قدیم مفہوم والا ربط ہے یعنی اسکے مختلف اجزا میں
ایک منطقی مربوط رشتہ تو جدید شاعری میں ایسا کوئی ربط نہیں ہوتا۔ عہد قدیم
میں ایسا ربط عمدہ تصانیف کا لازمہ حیات قرار دیا جاتا تھا۔ ہر نظم کی یہ خوبی
سمجھی جاتی تھی کہ وہ منطقی راہیں طے کرتی ہوئی ایک منطقی انجام میں منتج ہو۔ بے
ربطی کا مطلب سوائے اسکے اور کچھ نہ تھا کہ کہیں بیچ میں کوئی نقص یا غلطی ہو گئی ہے۔
یہ کہ ایک مصنف کو عمداً مبہم بننے کا ارادہ کرنا چاہیئے اس وقت قطعی ناقابل تصور
تھا۔ یا تو جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا اس پر فکر کرنا بھول گیا ہے یا اس میں کسی بات کو
واضح طور پر ادا کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہ معقول تھا کہ آج بھی اتنا ہی درست
ہے جتنا عہد قدیم میں تھا۔ لیکن محض اس وقت تک جس وقت تک محض شعوری
ذہن تک معاملہ محدود رہتا ہے۔ لیکن ذہن کے زیریں حصے کا کیا
کیا جائے وہاں عقل کا سکہ نہیں چلتا۔ اُر رشتے ہوتے ہیں لیکن خلاف عقل۔
اس لئے ہر اُس ادیب کو جو اس طرف متوجہ ہوتا ہے منطقی تسلسل کو خیرباد کہنا ہوگا۔
لیکن بہر حال کوئی تعلق بھی ضرور ہونا چاہیئے۔ ورنہ شاعر جو کچھ بھی لکھے گا۔ اس کی حیثیت
ایک مجذوب کی بڑ سے زیادہ نہیں ہوگی پس جدید شاعر اپنی نظموں میں منطقی رشتہ کی
بجائے ایک دوسرا رشتہ ملحوظ رکھتا ہے جسکو Day Lewis کے الفاظ
میں جذباتی تسلسل (Emotional Sequence) کہنا چاہیئے۔ وہ
پہلے پہل ایک ایسی بات کہتا ہے جو قاری کیلئے انوکھی اور عجیب ہوتی ہے۔ وہ اس بات
کو سمجھنا چاہتا ہے اور نہیں سمجھ سکتا۔ اور نتیجتاً اُس کے ذہن میں ایک خلا پیدا
ہو جاتا ہے۔ اور اس خلا پیدا ہو جانے کے معنی ہیں کہ شاعر قاری کے ذہن
پر قابو پا گیا ہے۔ اب وہ اُس کے خالی ذہن میں بات آہستہ آہستہ
ہلکی ہلکی شعاعوں کے مانند ڈالتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ طریقہ کتنا
دقت خیز اور خطرناک ہے۔ جب یہ طریقہ کامیاب ہوتا ہے تو شاندار
طور پر کامیاب ہوتا ہے۔ اور جب ناکام رہتا ہے تو کوئی نظم
کسی سرسام کے مریض کی بڑبڑاہٹ بن کر رہ جاتی ہے۔ اردو کی
جو بعض نئی نظمیں بالکل مبہم اور مہمل بن کر رہ گئی ہیں اس کی وجہ یہی
ناکامی ہے۔

دہلی میں انگریزوں کی عمارتیں

(از حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب مدظلہ)

فارسی زبان کا ایک مقولہ ہے۔ "ہر کہ آمد عمارتے نو ساخت"۔ جو آتا ہے ایک نئی عمارت بنا لیتا ہے۔ اور یہ بات انسان کی عادت میں داخل ہے۔ چاہے وہ کوئی بڑا آدمی ہو یا چھوٹا آدمی ہو۔ کہ جب کسی گھر میں یا کسی شہر میں یا کسی ملک میں اس کو کسی قسم کا اختیار حاصل ہوتا ہے۔ تو وہ اپنے اختیار کی ایک یادگار بنانی چاہتا ہے۔

سب سے پہلی تہذیب مصر کی سمجھی جاتی ہے اور مصر میں اٹھائیس خاندانوں نے حکومتیں کی تھیں۔ اور ہر خاندان نے اپنی اپنی یادگار کے لئے کوئی عمارت وہاں بنائی تھی۔

ہندوستان میں بدھ حکومت کے عروج کے زمانے میں اس قسم کی بیشمار یادگاریں بنائی گئی تھیں جو آج تک موجود ہیں۔ مگر ہندوؤں کو عمارتیں بنانے کا شوق نہیں تھا۔ ہندوستان میں پرانے ہندوؤں کی جتنی عمارتیں اور یادگاریں پائی جاتی ہیں وہ سب کی سب بدھوں کی بنائی ہوئی ہیں۔ ہندوؤں کی صرف چند یادگاریں مندروں میں ہیں۔ اور کوئی چیز نہیں ہے۔

محمد بن قاسم عرب سندھ میں آیا تو آندھی کی طرح آیا تھا۔ بگولے کی طرح چلا گیا۔ اس نے کوئی یادگار نہیں چھوڑی۔ محمود غزنوی کا بھی یہی حال رہا۔ شہاب الدین غوری نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو اس کے غلام قطب الدین ایبک نے فوراً اجمیر میں ڈھائی دن کے اندر ایک مسجد بنائی۔ جو آج تک موجود ہے۔ پھر دلی پر قبضہ کرنے کے بعد پرتھی راج کے قلعۂ لال میں ایک مسجد بنانی شروع کی جس کا نام قوت اسلام رکھا۔ اور جس کی محرابیں آج تک سات سو برس سے موجود ہیں۔ اس مسجد کے صحن میں قطب الدین ایبک نے ایک مینار بنوایا جو قطب مینار کے نام سے مشہور ہے۔

غلام خاندان ایبک سے شروع ہوا تھا جس میں شمس الدین التمش اور اس کی بیٹی رضیہ سلطانہ اور غیاث الدین بلبن بہت نامور بادشاہ گذرے ہیں۔ التمش کا مقبرہ جو قطب مینار کے احاطہ میں موجود ہیں۔ اور غلام خاندان کے آخری بادشاہ کیقباد نے بھی جمنا دریا کے کنارے ایک عالیشان محل بنایا تھا اور کیلوکھری نام کا ایک شہر بھی بسایا تھا۔ مگر وہ محل اب موجود نہیں ہے کیلوکھری گاؤں ہمایوں کے مقبرے کے قریب موجود ہے اور کچھ کھنڈر بھی وہاں ہیں۔

غلام خاندان کیقباد پر ختم ہوا۔ اور خلجی خاندان کی حکومت شروع ہوئی۔ جلال الدین خلجی۔ حکومت کے بانی نے لال محل بنایا جس کے کھنڈر درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا میں موجود ہیں۔ اور جس میں اسپین کا مشہور سیاح ابن بطوطہ بھی ٹھیرا تھا۔ اور آخری عباسی خلیفہ کے پوتے کی شادی سلطان محمد تغلق کی بہن سے اسی لال محل میں ہوئی تھی۔

علاء الدین خلجی نے قطب مینار کے قریب ایک دوسرا مینار بنوانا شروع کیا تھا اور کچھ اور عمارتیں بھی بنوائی تھیں۔ اور ایک نیا دلی شہر سیری یعنی مقدس اور پاک شہر کے نام سے آباد کیا تھا۔ ... سیری کہتے تھے اور اب بھی سیری مشہور ہے۔ لیکن درحقیقت ... علماء کو متاثر کرنے کے لئے اس کا نام سیری رکھا گیا تھا۔ علاء الدین کے بیٹے قطب الدین خلجی نے کوئی یادگار نہیں چھوڑی اور اس پر خلجی خاندان ختم ہوگیا۔ تو تغلق خاندان کی حکومت شروع ہوئی اور غیاث الدین تغلق نے تغلق آباد نام کا ایک قلعہ بنایا اور شہر آباد کیا۔ جس کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں محمد تغلق نے بھی کئی عمارتیں بنائیں اور اس کے بھائی فیروز شاہ تغلق نے تو بہت زیادہ تالاب بنائے۔ بند باندھے۔ اور عمارتیں بنائیں۔ پھر لودھی خاندان کی حکومت ہوئی۔ بہلول لودھی اور سکندر لودھی اور ابراہیم لودھی کی مختلف یادگاریں پرانی دہلی میں موجود ہیں۔

پھر مغلوں کا زمانہ آیا۔ بابر نے کوئی یادگار نہیں بنائی۔ ہمایوں کی یادگار موجود ہے۔ اس کے بعد شیر شاہ کا زمانہ آیا۔ اس نے ایک سڑک بنائی اور بہت سے قلعے بنائے اور دہلی کا پرانا قلعہ بھی بنایا۔

پھر اکبر کا زمانہ آیا۔ جس نے آگرے میں، فتح پور سیکری کی عمارتیں بنوائیں۔ اور اس کے بیٹے جہانگیر نے بھی اپنی یادگاریں تعمیر کرائیں۔ مگر مغل خاندان میں شاہجہاں سب سے بڑھ گیا۔ اس کی عمارتیں ہندوستان کے ہر ہندو مسلمان حکمراں کی عمارتوں سے زیادہ خوبصورت ہیں اور زیادہ مقبول ہیں۔ بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ قطب مینار کے سوا ہندوستان کی کوئی عمارت شاہجہانی عمارتوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔

شاہجہاں کے بعد سے آخری بادشاہ بہادر شاہ تک کوئی بڑی یادگار تعمیر نہیں ہوئی۔

دہلی میں انگریزوں کا تسلط شاہ عالم بادشاہ کے زمانے میں ہوا تھا۔

شاہ عالم کے بعد اکبر شاہ تخت نشین ہوئے اور پھر بہادر شاہ تخت نشین ہوئے۔ شاہ عالم اور اکبر شاہ کے زمانے میں انگریزوں نے اپنے اختیار کی کتنی یادگاریں بنائیں۔ اس کا حال تحقیقات کے بعد ہی لکھا جا سکتا ہے۔ لیکن بہادر شاہ کے زمانے میں سر ٹامس مٹکاف ایک ایسے انگریز افسر تھے جنہوں نے دہلی میں تعمیری کام شروع کر دیا۔ بہادر شاہ بادشاہ کے روزنامچوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سر ٹامس مٹکاف نے اجمیری دروازے کے باہر عربک کالج کے قریب کوٹھی بنوائی تھی۔ اور سر سید احمد خاں صاحب نے اپنی کتاب آثار الصنادید میں لکھا ہے۔ جو سر ٹامس مٹکاف کے اشارے سے سر سید نے لکھی تھی۔ کہ خاص بازار کے آگے قلعہ کی فصیل کے نیچے جس مقام پر کہ اگلے زمانہ میں گلابی باغ تھا وہاں سرکار دولتمدار انگریزی کی طرف سے ایک چشمۂ فیض بنا ہے کہ چشمۂ آفتاب و مہتاب پر فوقیت لے گیا ہے۔ اس حوض کو سر تا سر سنگ سرخ سے بنایا ہے اور چاروں کونوں پر چار برج کٹہرے دار بہت خوشنما بنے ہوئے ہیں۔ اور دونوں طرف عرض میں سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں۔ اور یہ چشمۂ فیض بموجب حکم ... نواب عالیجناب فلک رکاب لارڈ الن برا بہادر کے بنا ہے۔ اور ... ہزار روپے کے قریب اس پر خرچ ہوا ہے۔ طول اس کا پانسے فٹ اور ... ڈیڑھ سے فٹ کا ہے۔"

سر سید نے لال ڈگی کے عنوان سے یہ عبارت لکھی ہے۔ ... بادشاہ کے زمانے کے بعض شاعروں نے بھی اپنے اشعار میں لال ڈگی کا ذکر کیا ہے۔ ... ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے بعد جب لال قلعہ کے سامنے کی عمارتیں اور بازار اور ... ڈھائے گئے تو یہ لال ڈگی بھی مسمار کر دی گئی۔ اس زمانے میں لال قلعے کے ... دہلی دروازے سے فتح پوری تک کئی ناموں کے بازار تھے۔ پہلے خاص بازار ... پھر اردو بازار تھا۔ پھر کوتوالی چبوترہ تھا۔ اس کے بعد چاندنی چوک بازار ... کہلاتا تھا۔

گرجا

کشمیری دروازے کے پاس کرنل جیمس اسکنر نے ایک بہت خوبصورت گرجا بنوایا تھا۔ سر سید نے اس کی بہت تعریف لکھی ہے۔ اس گرجا کے سنہری کلس پر غدر کے سپاہیوں نے گولیاں چلائی تھیں اور وہ کلس اب تک بطور یادگار رکھا ہے۔ اور جب جنرل نکلسن ... کی فوج کے ساتھ فاتحانہ کشمیری دروازے میں داخل ہوئے تھے تو کئی گھنٹے ... اس گرجا میں ٹھہرے تھے۔ اور یہاں سے مختلف مقامات پر فوجیں بھیجی ... تھے۔ یہ گرجا اب بھی آباد ہے۔ اور انگریزوں کی ایک عمدہ تعمیری یادگار ہے۔ کرنل جیمس اسکنر کے بیٹے اسٹورٹ اسکنر مسلمان ہو گئے تھے اور ان

کا نام نواب مرزا ... رکھا گیا تھا ... مسلمان تھے۔ نواب مرزا کی ... حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء میں ہے۔ اور نواب مرزا اور ان کے ... کی قبریں بھی درگاہ مذکور میں موجود ہیں۔ اور اس خاندان کے کچھ لوگ ... اور میرٹھ میں موجود ہیں اور کچھ ابھی عیسائی عقیدہ رکھتے ہیں۔ کرنل جیمس اسکنر کی ایک جاگیر بھی ضلع حصار میں تھی۔ جس کا ذکر بہادر شاہ کے روزنامچے میں کئی جگہ آیا ہے۔

سر ٹامس مٹکاف کی تعمیرات

سر ٹامس مٹکاف نے ایک مکان شہر کے باہر بنایا تھا جو اب تک مٹکاف ہاؤس کے نام سے مشہور ہے۔ اور ایک مکان موجودہ کچہری کے جنوب میں موجود ہے۔ اور سر ٹامس مٹکاف نے ایک مکان قطب مینار کے جنوب میں بنایا تھا۔ جس کے کھنڈر اب بھی موجود ہیں۔ مگر ایک تعمیر سر ٹامس مٹکاف کی ایسی ہے جس سے حکومت انگریزی بھی بے خبر ہے اور ہندوستان کے اور دہلی کے ہندو مسلمان بھی اس عمارت کو نہیں جانتے۔ حالانکہ یہ ایک ایسی تعمیر ہے جس سے سر ٹامس مٹکاف کا تعمیری ذوق اور بلند خیالی ظاہر ہوتی ہے۔ کہ انہوں نے قطب مینار قدیم اور قطب مینار جدید کے شرق میں دونوں میناروں کے بالکل بیچ میں مصر کے اہرام کا ایک ماڈل یعنی نمونہ بنایا تھا۔ تا کہ قطب مینار دیکھنے والے مصر کے بہت پرانے مینار کا نمونہ بھی دیکھ لیا کریں مگر معلوم ہوتا ہے کہ سر ٹامس مٹکاف نے یہ عمارت بہت آخر زمانے میں بنائی ہوگی۔ اور اس کے بعد ہی غدر ہو جانے کے سبب انگریزوں کو اور باشندوں کو اس کا خیال نہ رہا ہوگا۔ کیونکہ قطب مینار کا ڈاک بنگلہ انگریزی حکومت نے بنوایا ہے۔ اور ایسی جگہ بنوایا ہے کہ یہ مصری اہرام کا نمونہ ڈاک بنگلے کی پشت پر آ گیا ہے۔ اور سیاحوں کی نظروں سے چھپ گیا ہے۔ میں بچپن سے آج تک جب قطب صاحب جاتا ہوں اس نمونے کو غور سے دیکھا کرتا ہوں اور میرے سوالات کے جواب میں یہی کہا جاتا ہے کہ سر ٹامس مٹکاف نے اپنی کوٹھی کے سامنے پھولوں کے گملے رکھنے کیلئے یہ جگہ بنوائی تھی لیکن سر ٹامس مٹکاف کی کوٹھی اس مینار کے جنوب میں ہے اور اتنی زیادہ دور ہے کہ پھولوں کے گملے یہاں نہیں رکھے جا سکتے تھے۔ اگر سر ٹامس مٹکاف نے کسی دوربین کا انتظام کیا ہو تو ممکن ہے کہ یہ بیان ٹھیک ہو کہ وہ اتنی دور اپنی کوٹھی میں بیٹھ کر دوربین سے یہ گملے دیکھا کرتے ہونگے۔ ورنہ یہ بات عقل میں نہیں آتی۔ اور بالکل قرین قیاس ہے کہ سر ٹامس مٹکاف نے یہ مینار مصر کے اہرام ...

بھی ہونے کے لئے بنایا تھا۔

میں نے آنریبل مسٹر اسکاٹ چیف کمشنر دہلی اور مسٹر لاجی ڈپٹی کمشنر دہلی سے بھی اس کا ذکر کیا تھا۔ اور ضرورت ہے کہ حکومت کی طرف سے اس عمارت کی مرمت کرائی جائے۔ جو بہت تھوڑے سے خرچ میں ہو جائیگی۔ اور وہاں اس مقام پر شکاف کے نام کا ایک کتبہ لگایا جائے۔

نئی دہلی کی تعمیرات

میں اس مضمون میں نئی دہلی کی تعمیرات کا ذکر کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں کیونکہ وہ عمارات کئی کروڑ روپے کی لاگت سے تیار ہوئی ہیں۔ اور ان کی تفصیل بیان کرنے کے لئے کم از کم مصطفےٰ کمال اتاترک مرحوم کی طرح مجھے پانچ دن لگاتار بولنا پڑے گا۔ جب ان عمارات کا بیان پورا ہوگا۔

درحقیقت یہ عمارات انگریزی حکومت کی بہت بڑی یادگار ہیں۔ ابھی تو یہ آثار جدید ہیں۔ جب ان کو آثار قدیم کہنے کا وقت آئیگا۔ اس وقت مجھے دنیا کی زندگی سے الگ ہو جانے کی ضرورت پیش آچکی ہوگی اور غالباً میرا یہ مضمون سننے والے بھی اس وقت تک اس دنیا میں رہنا پسند نہیں کریں گے۔

نئی دہلی کی عمارات میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں راجہ اشوکا سے لے کر شاہجہاں کے زمانے تک کے سب بادشاہوں اور سب تہذیبوں کے طرز تعمیر کے نمونے دکھائے گئے ہیں۔ اور یورپ کے طرز تعمیر کے نمونے بھی ان عمارتوں میں نظر آتے ہیں۔

اٹلی کے بادشاہ کی ایک بھانجی جو میرے چشتیہ نظامیہ خاندان میں پروفیسر عنایت خاں کی مرید تھی اور اپنے پیر کی قبر کی زیارت کے لئے میرے ہاں مہمان ہوئی تھی۔ اس نے میرے ساتھ جا کر اسمبلی کی یہ عمارت دیکھی تو اس کے ستون دیکھتے ہی اس نے کہا۔ یہ ہمارا رومن اسٹائل ہے۔ اور اس کے بعد اس نے انگریزوں کی تعریف کی کہ انہوں نے ساری دنیا کی عمارتوں کی خاص خاص خوبیاں ان عمارتوں میں جمع کر دی ہیں ؂

مشعلِ راہ میری نظر میں

(جوش ملیح آبادی)

مخشب جارچوی ایک خوش طبع اور خوش فکر نوجوان ہیں۔ انکی شاعری بھی انکی طرح جوان ہے انکے بیان میں تازگی اور لہجے میں شیرینی کا عنصر بہت خوبی کے ساتھ سمویا ہوا ہے۔ انکی عشقیہ شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر غزل گویوں کی طرح انکا عشق روایتی اور ان کا محبوب موروثی نہیں۔ بلکہ یہ اس وادی سے گذرے اور اس کے طوفان سے خود کھیلتے ہیں۔ یہی حال ان کی مناظر پرستی کا ہے۔ انہوں نے گھر کی چار دیواری میں بیٹھکر باغوں، جنگلوں اور کہساروں پر خامہ فرسائی نہیں کی ہے بلکہ کھلی ہوا میں سیر کرکے حسن قدرت کا مطالعہ کیا ہے جس کے ابھرے ہوئے نقوش نظروں کو ٹھیرا کر دماغ کو متوجہ کر لیتے ہیں۔ ان کی شاعری انکے ذہنی ارتقا اور بلوغ کی گواہی دے رہی ہے۔ اور اسی پاکیزہ و صالح علامت پر میں انہیں مبارکباد دیتا ہوں۔

قیمت مجلد تین روپے آٹھ آنے (عہ؍)

شائع کردہ:—

نگارستان ایجنسی۔ اردو بازار۔ دہلی

آثارِ صنادید

(از پروفیسر یوگ دھیان صاحب آہوجہ ایم اے)

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ
آثار پدیدست صنادید عجم را

ایران کے صوفیائے کرام میں شیخ فخر الدین عراقی اپنی واحد ممتاز شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کے حالات بھی اگرچہ کئی صنادید عجم کے حالات زندگی کی طرح آج تک کسی گوشۂ گمنامی میں مستور رہے ہیں۔ لیکن کچھ مطالعہ کرنے سے شیخ کی زندگی کے جو حالات ملتے ہیں اُن سے شیخ عراقی صرف ایک عالی رتبہ اور پُرشکوہ ہستی کے طور پر ہی ظاہر نہیں ہوتے بلکہ اُن کی زندگی کی کئی داستانیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ شیخ عراقی وہ عظیم مرتبہ صوفی ہوئے ہیں جن پر ایرانی تصوف جس قدر بھی ناز کرے بجا ہے۔ اور ایرانی ادب کے شکستہ در و دیوار پر عراقی کے جو نقش و نگار ملتے ہیں ان کا مطالعہ اُتنا ہی دلچسپ ہے جتنا کہ اہم شیخ کی روحانی عظمت۔ ان کے مقام تصوف کو ظاہر کرنے والی چند داستانیں درج ذیل ہیں۔

(۱)

شیخ عراقی کی پیدائش کے ساتھ ایک دلچسپ کہانی وابستہ ہے

کہتے ہیں کہ عراقی کے پیدا ہونے سے قریب ایک ماہ پہلے اُن کے والد نے خواب میں دیکھا کہ حضرت امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب علیہ السلام باقی ائمہ معصومینؑ کے ساتھ ایک باغ میں سیر کر رہے ہیں اور وہ (شیخ عراقی کے والد) بھی وہیں باغ میں کھڑے ہیں۔ اچانک ایک شخص ایک بچہ لئے ہوئے آیا۔ اور اس نے وہ بچہ حضرت امیرؑ کے مبارک قدموں میں زمین پر رکھ دیا۔ امیر المومنین نے اُس بچے کو اُٹھایا اور (عراقی کے والد) کو اپنے نزدیک بلا کر اُن کی گود میں ڈال دیا اور فرمایا کہ تم عراقی کی پوری حفاظت کرنا۔ یہ بچہ عالمگیر ہوگا۔ اس خواب سے عراقی کے والد کو اتنی مسرت ہوئی کہ خوشی کے باعث آنکھ کھل گئی۔

عراقی کے والد بیان کرتے ہیں کہ جب عراقی پیدا ہوا اور اُن کے نزدیک لایا گیا تو انہوں نے بعینہٖ اس بچے کی صورت دیکھی جو حضرت امیر المومنین نے انہیں عطا کیا تھا۔

(۲)

شیخ فخر الدین عراقی جیسا کہ مستند تذکرہ نویسوں کا بیان ہے ملتان[۱] میں اپنے پچیس سال قیام سے واپس ہوئے اور انہوں نے خانۂ کعبہ کی زیارت کی اس کے بعد وہ روم میں کچھ مدت مقیم رہے۔ یہاں ان کے معتقدوں کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا۔ ان کے مریدوں میں والئ روم امیر معین الدین پروانہ بھی شامل تھے۔ شیخ کی زندگی کے اس دور کے ساتھ، ان کے دنیاوی جاہ و جلال اور روحانی شان و شکوہ کو ظاہر کرنے والی کچھ داستانیں وابستہ ہیں۔

بیان کرتے ہیں کہ ایک دن شیخ عراقی علی الصباح[۲] خانقاہ سے باہر گئے اور رات کو واپس نہ ہوئے۔ دوسرے دن بھی نہ لوٹے تو امیر (معین الدین پروانہ والئ روم) اور اس کے اصحاب کو پریشانی ہوئی[۳]۔ اور گرد بہت تلاش کی گئی لیکن شیخ عراقی کا کوئی نشان نہ ملا۔ اور کہیں سے بھی اُن کی خبر سننے میں[۴] نہ آئی ہر طرف آدمیوں کو دوڑایا گیا[۵]۔ تیسرے دن خبر ملی کہ شیخ عراقی فلاں پہاڑ کے دامن میں گھوم رہا ہے۔ امیر اور اس کے ساتھی روانہ ہوئے[۶]۔ جب وہاں پہنچے تو دیکھا کہ شیخ سراپا برہنہ صرف ایک کرتہ[۷] پہنے برف پر رقص میں محو تھے۔ اور شعر کہے جا رہے تھے۔ اُن کے ماتھے سے پسینہ ٹپک رہا[۸] تھا۔ بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے یہ ترجیع بند اس وقت لکھا تھا اور پڑھ رہے تھے۔ بیت ؎

در جام جہاں نمائی اوّل
شد نقش ہمہ جہاں مُمثّل

کچھ دیر کے بعد انہیں پکڑ کر شہر لے آئے لیکن شیخ اسی طرح جوش میں تھے۔ جس قدر بھی اصرار کیا گیا شیخ سوار نہ ہوئے۔ امیر بھی پیادہ ہوگیا لیکن

۱؎ باجمی از ابرار دیباچہ عشاق نامہ مطبوعہ ڈاکٹر اے۔ جے آربری صفحہ ۵ ؛ ۲؎ از میخانہ عبد النبی مرتبہ پرنسپل مولوی محمد شفیع ص ۲۶ دیباچہ ص ۵ ؛ ۳؎ فقط در دیباچہ صفحہ ۵ و ۶ ۴؎ دیباچہ عشاق نامہ ص ۶ میخانہ ص ۲۳ ؛ ۵؎ میخانہ ص ۳۹ بامداد پگاہ دیباچہ ص ۸ از بامداد پگاہ ؛ ۶؎ میخانہ ص ۳۹ روز دوم نیز باز نیامد امیر و اصحاب متغیر شدند دیباچہ ص ۱۰ روز دوم امیر و اصحاب متغیر شدند ؛ ۷؎ فقط در میخانہ ص ۳۹ ؛ ۸؎ میخانہ ص ۳۹ اصحاب روان شدند، امیر نیز روان شد، دیباچہ ص ۱۰ امیر با اصحاب روان شد ۹؎ میخانہ ص ۳۹ کرباسی پیرہن پوشیدہ، دیباچہ ص ۱۰ با یک پیراہن ؛ ۱۰؎ میخانہ ص ۳۹ عرق کردہ بود، دیباچہ ص ۱۰ عرق از جبین او می چکید

شیخ نے اسے خوش کر کے روانہ کر دیا اور خود اس کے عقب میں پیادہ چلتے ہوئے شہر میں پہنچے۔ اور پھر تین دن تک خانقاہ میں سماع کرتے رہے۔

(۳)

روم میں شیخ عراقی کے قیام کے دوران میں ایک اور دلچسپ واقعہ ہوا جس کی داستان دیباچہ میں یوں دی گئی ہے:—

بیان کرتے ہیں کہ ایک دن ایک رند بے سر و پا مست لایعقل شیخ کی خانقاہ کے دروازے میں داخل ہو کر شیخ کے سجادے پر جا بیٹھا۔ لڑنے جھگڑنے لگا اور اس نے بدمستیاں شروع کر دیں۔ جس قدر بھی وہ گالیاں دیئے جاتا تھا شیخ دلی الطاف سے اُسے مطمئن کئے جا رہا تھا۔ اتنے میں اصحاب بھی آ گئے اور انہوں نے قصد کیا کہ اس رند کو باہر نکال دیں شیخ نے انہیں منع کیا اور اپنے خرقۂ مبارک کو اس کے سر کے نیچے رکھ دیا۔ جس سے اُسے نیند آ گئی۔ تھوڑی دیر گذری تھی کہ اس رند نے استفراغ کیا اور شیخ کے سامان کو خراب کر ڈالا۔ جب وہ ہوش میں آیا تو شیخ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے اسکے لب و دہن اور ہاتھ منہ کی شست و شو کی۔ اور خادم سے کہکر اسے ایک سو درم دلوائے اور معذرت خواہی کی۔ اس کے بعد شیخ نے سارے سامان کو اپنے ہاتھوں سے دھو دیا۔

اس حالت میں شیخ نے یہ غزل کہی ؎

مست خراب یابد ہر لحظہ در خرابات
گنجی کہ آں نیابد صد پیر در مناجات

(۴)

دیباچہ میں اُوپر والی داستان کے بعد مندرجہ ذیل کہانی بیان کی گئی ہے:-

کہتے ہیں کہ ایک مالدار سوداگر تھا جسے خواجہ زین الدین کہتے تھے۔ تھا تو وہ کاشانی لیکن اُس نے روم کو اپنا وطن بنا رکھا تھا شیخ سے گہری عقیدت رکھتا تھا۔ ایک دن وہ شیخ کی خدمت میں آیا اور اس نے ایک ہزار دینار تھیلے میں ڈالکر شیخ کے سامنے رکھ دیئے شیخ اپنے ورد میں مصروف تھا اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔

ایک اور شخص عیسائی پادری کی صورت، ہراہ میں دو بار شیخ کی خدمت میں آیا کرتا تھا اور شب کو دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خلوت میں رہا کرتے تھے جب کبھی وہ آتا ایک گنبد تا کی[1] طرح اس کا معمول تھا۔

اتفاق سے وہ بھی اس وقت آ پہنچا اور اُس نے اشرفیوں کے دو توڑے شیخ کی خدمت میں لا کر رکھے شیخ ہنس دیا اور اس نے فی الحال ایک تھیلا ان میں سے اُٹھا کر خواجہ زین الدین کی اشرفیوں پر رکھ دیا کہ اُٹھا لے۔ اور یہ خیال کرنا کہ تو نے چمڑا خرید لیا تھا اور تبریز بھیج دیا تھا۔ وہ سوداگر بہت خجل اور پریشان ہوا۔ اُس نے اپنا سر شیخ کے قدموں میں رکھ دیا اور اصرار کیا کہ شیخ اس کے حقیر نذرانے کو رد نہ کرے۔ لیکن شیخ نے فرمایا کہ "مصلحتِ وقت اسی میں ہے کہ تو اسے اُٹھا لے۔" شیخ نے پھر دونوں تھیلے اسکی گردن پر رکھ دیئے اور اُسے روانہ کر دیا۔

اس کہانی کے راوی کا بیان ہے کہ جب وہ سوداگر جا چکا تھا تو راوی نے شیخ سے سوال کیا کہ سبب کیا تھا کہ تُو نے سوداگر کا مال حلال تو قبول نہ کیا اور اس بیگانہ شخص سے قبول کر لیا۔" شیخ نے جواب میں فرمایا کہ دولت سوداگروں کو پیاری ہوتی ہے۔ سوداگر شہر بہ شہر پھرتے ہیں کشتیوں کا سفر کرتے ہیں۔ بہت مشقتیں سہتے ہیں اور ہر ممکن تکلیف کا انہیں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ سب محض اس لئے کہ ان کی دولت میں اضافہ ہو۔ اب جب کہ یہ شخص اپنی مطلوبہ چیز کو ہمارے پاس لیکر آیا تو میں نے انصاف نہ سمجھا کہ اس کے مطلوب کو اس سے جُدا کروں۔ اور یہ بھی مروت میں داخل نہ تھا کہ بغیر کسی مناسب تدبیر کے اسے واپس کر دوں۔

راوی نے کہا کہ اس خواجہ پر حق اللہ کا الگ کرنا تو واجب تھا اور اُسے زکاۃ بھی دینی چاہیئے تھی۔ شیخ نے کہا "اگر حق اللہ ہوتا اور وہ خدا کے رستے میں دیا کرتا تو ہمارے پاس لیکر نہ آتا"۔

اب راوی کہتے ہیں کہ دوسرے دن میں نے اس سوداگر کو دیکھا اور اس سے سوال کیا کہ سبب کیا تھا کہ شیخ نے تیرے درم قبول نہ کئے؟ اُس نے جواب دیا کہ جب میں نے شیخ کے پاس جانے کا ارادہ کیا۔ اشرفیوں کا تھیلا میرے پاس تھا اور میں بازار سے گذر رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ چمڑا بہت سستا بیچا جا رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ ہزار درم چمڑے میں لگا دوں اور تبریز بھیج دوں تو دو ہزار میں بک جائے گا میرے دل میں یہی سوچ بچار تھا۔ ناچار قبول نہ ہوا۔

—— ۵ ——

ان بیانات کے بعد دیباچہ اور میخانہ میں امیر معین الدین پروانہ کے

---

[1] مقدمہ دیباچہ عشاق نامہ صفحہ ۱۸ ؛
[2] مقدمہ دیباچہ صفحہ ۱۸ - ۱۹
[3] دیباچہ ...

[illegible] امیر روم نے شیخ عراقی کے عزاز کرنے امر [illegible]
یں ٹھہر گئے ہیں۔

کچھ مدت روم میں شیخ فخر الدین کا حال اسی طرح گذرتا رہا۔ حتیٰ کہ امیر معین الدین کو دربار سلطنت میں طلب کیا گیا اور خوش نصیبی مصیبت میں تبدیل ہو گئی۔ امیر نے جان لیا کہ حالت بگڑ چکی ہے۔ رات کو شیخ کی خدمت میں پہنچا اور ایک گٹھڑی جو اہرات، لعل و یاقوت، فیروزہ اور مروارید کے دانوں کی اپنے ساتھ لے گیا اور وہاں جا کر شیخ کے سامنے رکھ دی اور یوں کہنے لگا۔ "جو کچھ اپنے عہد میں میں نے ممالک روم سے حاصل کیا ہے۔ یہ ہے۔ اب مجھے طلب کیا گیا ہے۔ اپنے حالات متغیر دیکھتا ہوں۔ وقت رحلت[۱۱] ہے۔" شیخ کی آنکھیں پر آب ہو گئیں اور امیر معین الدین بھی رو دیا۔ اور بہت گریہ وزاری کے بعد بولا "شیخ کو معلوم ہے کہ میرا فرزند دلبند مصر میں محبوس ہے۔ اگر میری وفات کے بعد اس طرف سے شیخ کا گذر ہو تو اسکی رہائی کیلئے کوشش کرے اور ان جواہرات میں سے کچھ صرف کر دے اور اگر اسکی رہائی ممکن ہو گئی تو اسے ایک لحظہ بھی اپنے آپ سے جدا نہ کرے۔ اسے خرقہ پہنا دے[۱۲] اور حکومت کی طرف کسی بھی صورت میں راغب نہ ہونے دے[۱۳]۔ اور اگر اسکی رہائی ممکن نہ ہوئی تو شیخ کی جس طرح مرضی ہو اس دولت کو صرف کرے۔" شیخ نے اس تھیلے کو ایک طرف پھینک دیا۔ اور امیر معین الدین نے شیخ کے قدموں کو بوسہ[۱۴] دیا اور شیخ کو الوداع کر کے اپنے مقام کو چلا گیا[۱۵]۔

دوسرے[۱۶] دن امیر معین الدین کو لے گئے وہ گیا اور پھر واپس نہ ہوا۔

کچھ مدت گذری کہ فرمان شاہی نافذ ہوا کہ . . . . صاحب عادل خواجہ شمس الدین صاحب دیوان الجوینی ولایت روم کی جانچ پڑتال کرے اور امیر معین الدین کے اموال کو ضبط کرے۔ مولانا شمس الدین العبیدی۔ مولانا ہمام الدین اور امین الدین حاجی بلہ، خواجہ شمس الدین کی ہمراہی میں[۱۷] تھے۔

اس کے بعد شیخ عراقی کے ساتھ خواجہ شمس الدین جوینی صاحب دیوان اور مولانا امین الدین کی ملاقاتوں اور تصوف کے متعلق پر لطف صحبتوں کا ذکر ہے۔ دیباچہ اور میخانہ کے بیان کے مطابق :-

ایک جماعت نے وہاں [illegible] کہ امیر معین الدین کے [illegible] شیخ عراقی کے پاس ہے اور اسکی ملکیت کا [illegible] پہلی بات جو کہ شہرت ہونے نے خواجہ شمس الدین کو مقرر کر رکھا تاکہ انہیں شیخ کو چھڑانے کیلئے بھیجا جائے۔ [illegible] شیخ تک پہنچے خواجہ شمس الدین نے ایک [illegible] شیخ [illegible] اس ڈھنگ سے بیان کئے گئے ہیں۔ اس لئے [illegible] واجب[۱۸] ہے اور [illegible] ایک تھیلے میں ایک ہزار دینار ڈالے اور خواجہ نے شیخ کی جانب ارسال کر کے کہلا بھیجا کہ یہ حقیر رقم سفر پر خرچ کرے اور جس جانب بھی محفوظ ہو چلا جائے[۱۹]۔

شیخ فخر الدین خود بھی اس مقام سے ملول ہو چکا تھا۔ جب یہ باتیں اسکے کانوں تک پہنچیں تو اسی وقت اٹھ کھڑا ہوا اور تھیلے کو اٹھا لیا۔ اور اس حدیث کو کہ الفرار مما لا یطاق من سنن المرسلین پر عمل در آمد کیا۔ دوستوں میں سے دو اور شخص ساتھ لئے اور اس خچر پر جو کہ خواجہ شمس الدین نے بھیجا تھا سوار ہو گیا۔ اور وہ دونوں شخص بھی سوار ہو گئے۔ یثرب کی جانب روانہ ہوئے اور وہاں سے مصر کو چل پڑے۔ اور صالحیہ خانقاہ میں بوازم چھوڑے۔ تین دن آرام کیا اور اسکے بعد امیر معین الدین کے بیٹے کے حالات کی تفتیش میں مشغول ہو گئے۔ اور اسکی رہائی کی تدبیر ڈھونڈنے لگے۔ جب اور کسی بھی صورت سے ممکن نہ ہوا تو ایک دن شیخ فخر الدین نے وہ گٹھڑی اٹھائی اور سلطان کے محل پر جا کر ملاقات کی اجازت مانگی۔ حاجبوں نے سلطان کو اطلاع دی۔ سلطان نے فرمایا کہ اس کی تلاشی لی جائے اور اگر اس کے پاس ہتھیار ہوں تو اس سے لے لئے جائیں۔ اس کی تلاشی لی گئی۔ وہ ہتھیاروں سے مجرد تھا (وہ خود مجرد ازلی تھا) پھر اسے سلطان کے حضور میں لے گئے۔

شیخ عراقی نے سلام کیا اور گٹھڑی کو رکھ کر خود کھڑا ہو گیا۔ سلطان نے اس پر نگاہ ڈالی اور بھانپ گیا کہ کوئی مرد بزرگ ہے۔ سلطان نے اسے بٹھا دیا اور سوال کیا کہ یہ گٹھڑی کیسی ہے؟ شیخ فخر الدین نے کہا کہ "امانت ہے۔ مجھے معلوم نہیں" سلطان کے اشارے پر اس گٹھڑی کو کھولا گیا اور الٹ [illegible]

[۱] دیباچہ صفحہ ۱۵- انبانچہ پر جواہر تھی- تفصیل فقط در میخانہ صفحہ ۴۰ ✣ [۲] فقط در میخانہ صفحہ ۴۰ ✣ [۳] میخانہ صفحہ ۴۰ خدمت کہنہ ✣

[۴] میخانہ نگذارد کہ ضائع شود ✣ [۵] فقط در میخانہ صفحہ ۴۰ ✣ [۶] از میخانہ صفحہ ۴۰ ✣ [۷] از دیباچہ صفحہ ۲۰- القابیہ خطابات کے ساتھ یہ نام میخانہ میں بھی ہیں۔ دیباچے نے نام امین [illegible]

حاجی بولہ دیا ہے۔ میخانہ نے سلطان المحققین امین الحق والدین حاجی لبتہ لکھا ہے ✣ [۸] میخانہ صفحہ ۴۲ [illegible] [۹] میخانہ صفحہ ۴۱۔ در وقت رخصت [illegible] [۱۰] از دیباچہ [illegible]

[۱۱] فقط در میخانہ ✣ [۱۲] فقط در دیباچہ صفحہ ۲۱ ✣ [۱۳] در دیباچہ صفحہ ۲۱ و میخانہ صفحہ ۴۲ ✣ [۱۴] حدیث فقط در دیباچہ صفحہ ۲۱ ✣ [۱۵] دیباچہ صفحہ ۲۱- بلا

منسوب (؟) [۱۶] فقط در میخانہ صفحہ ۴۳ ✣

اُداس شام

(از حضرت جاں نثار اختر)

شام ہے اس طرح کی آج اُداس
خود سے دوری کا جس طرح احساس
جیسے بُجھتی ہوئی خیال کی لَو
ہر یقیں پر گمان کا پرتو
جیسے رہ رہ کے دل میں کوئی چبھن
بھول جانے سے بات کے اُلجھن
جیسے سویا ہوا کسی کا نصیب
جیسے عاشق کے دل میں فکرِ رقیب
جیسے خاموش جاں کنی کا سماں
جیسے اُٹھتا ہوا چِتا کا دھواں
جیسے بے بس ہو ظلمتوں میں نظر
جیسے بیوہ کا مائکے کو سفر
دُور منزل کا فاصلہ جیسے
لُٹ کے رہ جائے قافلہ جیسے
جیسے پردیس میں وطن کی یاد
جو یونہی مدتوں سے ہے برباد
جیسے اخلاق کی ٹُٹی سی اساس
جیسے رہ رہ کے جُرم کا احساس
جیسے افلاس میں بُجھی سی اُمنگ
دھوپ میں جیسے جل گیا ہو رنگ
جیسے بھٹکا ہوا کوئی نخچیر
جیسے دم توڑ دے کوئی تدبیر
جیسے اشکوں کو پی رہا ہو کوئی
زہر پی پی کے جی رہا ہو کوئی

نہ کوئی ساز ہے نہ کوئی جام
ہائے یہ شام یہ اُداس سی شام

یا ... ایک خریطہ تھا جس کی حفاظت کسی بھی صورت میں ممکن نہ تھی۔ سلطان بار
شیخ پر نگاہ ڈالتا اور جواہرات کو دیکھتا۔ اُس نے حال پوچھا تو شیخ نے کہا
امیر المومنین کی امانت ہے۔ اور حالات آغاز سے انجام تک اور اپنے اغراض
بصورت سب کچھ ڈالی[۵۱]۔ سلطان کے دل میں یہ خیال چکر لگا رہا تھا[۵۲] کہ کیا عجب
ہے کہ اس شخص نے یہ سب کچھ اٹھایا اور میرے پاس لے آیا اور اپنے لئے اسے نہ
رکھا۔ شیخ فخر الدین نے صفائے باطن سے یہ بات بھانپ لی[۵۳] کہ سلطان کس فکر
میں ہے۔ شیخ نے کلام کا آغاز کیا اور اس آیت قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ
خَيْرٌ لِمَنِ اتَّقَىٰ وَلَا تُظْلَمُونَ فَتِيلًا[۵۴] کی تفسیر میں اس قدر کلمات کہے کہ سلطان
تھر تھر کانپ گیا۔ اپنی مسند سلطنت سے نیچے اُترا اور شیخ فخر الدین کے سامنے آکر
بیٹھ گیا۔ اور اس کے کلام کو سننے لگا۔

کہتے ہیں کہ اسی دن سلطان اس قدر رویا کہ ساری عمر میں نہ رویا
تھا۔ اس نے امیر معین کے بیٹے کو باہر نکالا اور اس پر نوازشیں کیں اور ایک
شہر کا حاکم[۵۵] بنا کر حکم دیا کہ دو شخص[۵۶] اس کے ملازم رہیں اور ہر روز ایک
سو درم اسے دلا دیئے جائیں اور اس کی جو التماس بھی ہو پیش کی جایا کرے
اور شیخ فخر الدین کو سلطان نے مصر کا شیخ الشیوخ مقرر کر دیا۔ اور اسکے فرمان
کے مطابق اس روز منادی کر دی گئی کہ شیخ فخر الدین شیخ الشیوخ ہے۔
اور صبح کو اس کا اجلاس ہوگا۔ صوفیاء علماء اکابر کو چاہیئے کہ دربار میں
حاضر ہوں[۵۷]۔

(۷)

اب دوسرے دن شیخ عراقی کے شیخ الشیوخ مصر ہونے کے لئے
دربار لگا۔ اس کے جلوس کے ایک اور واقعہ نے ایک دلچسپ داستان
کی صورت اختیار کر لی ہے۔ دیباچہ اور میخانہ میں مذکورہ عبارت کے بعد
لکھتے ہیں کہ:-

دوسرے دن صبح ہی چھ ہزار[۵۸] صوفی دربار میں آحاضر ہوئے۔
سلطان کے فرمان کے مطابق سواری کا خاص گھوڑا تیار کیا گیا۔ شیخ فخر الدین
کو خلعت پہنائی گئی اور طیلساں اوڑھا دیا گیا۔ اور حکم ہوا کہ اس کے سوا کوئی
سوار نہ ہو۔ باقی اصحاب اکابر و علماء اور امرا پیادہ اُس کے ہمرکاب چلے
جب فخر الدین نے یہ عظمت دیکھی تو دل میں سوچا کہ کیا اس عہد میں کسی کو یہ کچھ
نصیب ہوا ہوگا؟ نفس نے اس پر غلبہ پالیا۔ علی الفور اُس نے خلاف نفس
کرتے ہوئے طیلساں اور دستار سر سے اُتاری اور زین[۵۸] کے آگے رکھکر کچھ دیر
ٹھیر گیا۔ پھر اُسے سر پر رکھا۔ حاضرین نے جب یہ حال مشاہدہ کیا تو وہ ہنسنے لگے اور
طعن و تشنیع شروع کی کہ اس طرح کا شخص کس طرح شیخ الشیوخی کے قابل[۵۹] ہے۔
کچھ لوگوں نے کہا کہ دیوانہ ہے۔ بعضوں نے کہا مسخرا ہے۔ بہر کیف بالاتفاق
اُسے جاہل قرار دیا۔ وزیر نے کہا۔ یا شیخ "لما فعلت ہذا؟" شیخ نے
کہا "اسکت[۶۰] وانت ما تعرف فی الحال۔"

مخبروں نے یہ خبر سلطان کے کانوں تک پہنچائی۔ دوسرے دن
سلطان نے شیخ کو طلب کیا اور اس حالت کے متعلق استفسار کیا۔ کہ "باعث کیا
تھا کہ تو نے اس طرح کیا؟" شیخ نے کہا۔ نفس نے مجھ پر غلبہ پالیا تھا
اگر اس طرح نہ کرتا تو چھٹکارا نہ پاتا بلکہ عقوبت میں رہتا۔
سلطان کا حسن اعتقاد بڑھ گیا اور اس کے ظیفوں کو اس نے
دوچند کر دیا۔

[۵۱] دیباچہ صفحہ ۲۲۔ و حالات اول الی آخرہ بصورت اعراض خود تمامت بگفت ✤ [۵۲] میخانہ صفحہ ۴۳۔ در دروں سلطان این فکر می گردید ✤
[۵۳] دیباچہ صفحہ ۲۲۔ شیخ معلوم کرد۔ میخانہ صفحہ ۴۳۔ شیخ فخر الدین از تصفیۂ باطن دانست ✤ [۵۴] قرآن مجید ۴ (سورہ نساء) ۵۲ بحوالہ حاشیہ میخانہ از
جناب مولوی محمد شفیع ✤ [۵۵] دیباچہ صفحہ ۲۲۔ بوضعی شہریار کرد۔ میخانہ صفحہ ۴۳۔ بموضعی شہر بندکرد ✤ [۵۶] در دیباچہ و میخانہ مطابقت دارد ✤ [۵۷] دیباچہ
۲۲۔ با دارش ہزار صوفی۔ میخانہ ۴۴۔ بامدادش ہزار صوفی ✤ [۵۸] دیباچہ صفحہ ۲۳۔ در پیش زین ✤ [۵۹] دیباچہ صفحہ ۲۳ کہ این چنین شخص چہ لائق منصب باشد
میخانہ صفحہ ۴۴۔ این چنین کس بچگونہ لائق شیخ الشیوخی باشد ✤ [۶۰] "اسکت" فقط در دیباچہ

عورت کی انتہا پسندی

(از واحدی)

مرد کا کام ہے پیسہ کمانا۔

"پیسہ تو اب ہوتا نہیں۔ زندگی کا معیار (Standard of life) بڑھ گیا ہے۔ لہٰذا پیسہ کمانے کی بجائے روپیہ کمانا بلکہ نوٹ کمانا کہنا چاہیے۔"

"میری زبان پہ مفلسی کے دور کا محاورہ چڑھا ہوا تھا۔ خیر اب عروج کے دور کا محاورہ استعمال کرتا ہوں۔"

مرد کا کام ہے نوٹ کمانا اور عورت کا کام ہے نوٹ یا نوٹوں کو ٹھکانے لگانا۔

جو جس کام میں ہوتا ہے وہ اس کام کے آگے سب کچھ بھول جاتا ہے۔ مرد کمائی کرتے وقت خیال نہیں رکھتے کہ یہ جائز ہے یا ناجائز۔ دنیا کیا کہے گی۔

خیر دنیا کچھ نہیں کہا کرتی۔ دنیا خود دولت کو اور دولتمند کو پوجتی ہے اور خود جائز اور ناجائز کی پرواہ نہیں کرتی۔ البتہ خدا کیا کہے گا۔ مرد کمائی کرتے وقت اسے نہیں سوچتا اور عورت خرچ کرتے وقت یہ خیال دل میں نہیں لاتی کہ یہ نوٹ کیا کیا جتن کرکے کمائے گئے ہیں۔ اور ان کے خرچ کی ضرورت ہے بھی یا نہیں۔ بلکہ اپنے کام کی انجام دہی میں انہماک عورت کو مرد سے زیادہ ہوتا ہے۔ عورت خرچ کرنے کی بجائے کمائی کرنے کا پیشہ اختیار کرلیتی ہے تو حد گزار دیتی ہے۔ حد گزارنے کے اعتبار سے مرد عورت کی گرد کو نہیں پاسکتا۔ مرد کی فقط ایک مثال مجھے یاد ہے جو شاید عورتوں کے حد گزارنے کے مقابلہ کی کہے جانے کے قابل ہو۔

پچھلی جنگ عظیم کے بعد عالمگیر انفلوئنزا [illegible] انفلوئنزا تھا۔ خدا اس عالمگیر جنگ کے [illegible] کا انفلوئنزا قیامت ہی تھا [illegible]

[illegible] اور [illegible] جیسے دلی اور نئی دلی کے دیہاتی [illegible] میں عورتیں دکھائی دیتی ہیں۔ مُردوں کے دفنانے میں صبح سے شام اور شام سے صبح ہو جاتی تھی۔ مرگھٹوں اور قبرستانوں میں کام کرکے پیسہ کمانے والوں پہ بہت برس رہا تھا۔

بہرحال یہ دور ابتلا کسی نہ کسی طرح گزر گیا اور سال چڑھے اور گزر گئے۔

ایک روز مغفور علامہ راشد الخیری مرحوم حسب عادت اپنے مکان کے قریب فیض بازار میں کھڑے تھے کہ ایک صاحب جو کسی قبرستان کے منتظم تھے اور جن کی عمر اس وقت ساٹھ پینسٹھ برس کی ہوگی ان کی نظر پڑ گئے یہ صاحب اللہ کی عنایت سے ابھی زندہ ہیں۔ علامہ راشد الخیری نہایت بے تکلف انسان تھے۔ انہوں نے منتظم صاحب سے پوچھا۔ "کہو بھئی فلاں صاحب! آج کل کیا رنگ ہے؟" فلاں صاحب نے بالکل سادگی اور معصومیت سے جواب دیا۔ "مولوی صاحب! کیا رنگ بتاؤں۔ صبح سے بس ایک بھکانہ آیا ہے۔" علامہ راشد الخیری نے اور چھیڑنے کے لئے کہا۔ "اچھا۔ وہ بات نہیں ہے جو انفلوئنزا کے زمانہ میں تھی؟" فلاں صاحب نے ٹھنڈا سانس بھرا اور فرمایا "مولوی صاحب! وہ بات کہاں۔"

غالباً سب ہی مرد عورت جن کا گزارہ مرگھٹوں اور قبرستانوں کی آمدنی پہ ہے چاہتے ہونگے کہ مرنے والوں کی تعداد بڑھے۔ دائیاں چاہتی ہونگی بچوں کی پیدائش زیادہ ہو۔ ڈاکٹر بیماری پھیلنے کی دعائیں مانگتے ہونگے لیکن عورت ہر جگہ پیش پیش ملیگی۔

۱۹۰۳ء تک دلی میں دو یا تین ڈاکٹرنیاں تھیں۔ ایک کا حال بیان کرتا ہوں۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ پہلے مرض کو بڑھا دیتی تھی اور پھر کہتی تھی کہ ٹھیکہ پر علاج کردوں گی۔ اتنے روپے اب دیدو۔ اتنے اچھے ہوکر دیدینا۔ بغیر بلائے پہنچ جاتی تھی اور فیس رکھوا لیتی تھی۔ لکھو کھا روپیہ چھوڑ کر مری۔ لوگ اسے دھکے دیتے تھے مگر وہ غیرت دار نہ ملتی تھی۔ اس قسم کا مرد ڈاکٹر میں نے کوئی نہیں دیکھا۔

ڈاکٹر بننے کے بعد مرد کمائی کے پیچھے اتنا نہیں پڑتا اور اتنا سخت دل نہیں ہو جاتا جتنا ڈاکٹر بننے کے بعد عورت کمائی کے پیچھے پڑتی ہے اور سخت دل ہو جاتی ہے۔

عورت کی طبیعت میں اعتدال [illegible] عورت [illegible] انتہا پسند [illegible]

[illegible]

... سے ... تو بے انتہا بد ...
... ادا ... کرے ... کرے ۔ اعلان کر کے
... تو اتنی ... پر ... دیکھیں ۔

ان ... عورت کے لئے ہمیشہ مرد ہوتا ہے ۔ مرد اپنے نمونے
سے چاہے عورت کو اچھا بنا دے چاہے بگاڑ دے ۔ عورت مرد کی تقلید
... ہے ۔ مرد کی پیروی کرتی ہے ۔ مرد کے نمونے کو ترقی دیتی ہے ۔ مرد
... ہے ۔ عورت عمارت کھڑی کر دیتی ہے ۔ مرد جڑ ہے ۔ عورت
... ۔ مرد دوسرے مرد کی عورت پر قبضہ جمانے لگتا ہے ۔ لیکن عورت
دوسری عورت کی بدترین سوکن بن جاتی ہے ۔ مرد ان خبروں سے متاثر ہوتا کہ
... کی بے شمار عورتوں کے پاس تن ڈھانکنے کو کپڑا نہیں ہے ۔ وہ شرم کے
... خودکشی کر رہی ہیں ۔ مگر عورت کے کان پر جوں نہیں رینگتی ۔ اس کی بلا سے
دوسری عورتیں دوزخ میں جائیں یا جنت میں جائیں ۔ اسے اپنے جوڑے انڈے
سے کام ہے ۔ وہ محض پہننے کے کپڑوں کی نہیں ، چادر اور چاندنی کی فکر میں
رہتی ہیں ۔

میں اس مضمون میں عورت ذات کی توہین نہیں کر رہا ۔ میرا دماغ
اب بوڑھا ہو گیا ہے ۔ جس طرح بوڑھے منہ میں چیز پر قابو رکھنا مشکل ہوتا ہے ۔
اسی طرح میرے دماغ میں جو کچھ آجاتا ہے چھلکنے لگتا ہے ۔ واقعات سے متاثر
ہوتا ہوں اور لکھنے بیٹھ جاتا ہوں ۔ مگر یقین کیجئے ، میری نیت عورت ذات
کی توہین کی نہیں ہے ۔ عورت میری ماں ۔ عورت میری بیٹی ۔ عورت میری
شریک حیات ۔ میں عورت کی توہین کیونکر کر سکتا ہوں ۔ میں نے تو صرف یہ کہا ہے
کہ عورت اچھائی اور برائی دونوں میں دوسرے سے پیچھے ہے ۔ میں اگر یہ کہتا ہوں
کہ عورت سے زیادہ برا کوئی نہیں تو یہ بھی تو کہتا ہوں کہ عورت سے زیادہ اچھے
پیغمبر اور دیوتا ہی ہیں ۔

میرا تاثر فقط یہ ہے کہ عورت انتہا پسند ہے ۔ جو مرد اپنی
عورتوں کو اچھا بنانا چاہیں وہ تھوڑے سے (بہت تھوڑے سے) آپ اچھے بن
جائیں ۔ پھر دیکھئے عورتیں کتنی اچھی بن جاتی ہیں ۔ اتنی اچھی بن جائیں گی کہ مرد
اس اچھائی کا تصور نہیں کر سکتے ۔ آپ چاہتے ہیں کہ عورت آپ کی وفادار رہے تو
ذرا آپ بھی اس سے وفا کیجئے ۔ اس وقت آپ کو اندازہ ہوگا کہ وفا کس شے
کا نام ہے ۔ آپ عورتوں کے ایسے لباس پر معترض ہیں جس سے جسم کا اتار چڑھاؤ
ظاہر ہوتا ہے تو آپ خود اپنے کوٹ کی پتلون پہننی چھوڑ دیجئے ۔ ورنہ تیار رہیے

کہ عورتیں ، ہندوستانی عورتیں ، ہماری ستونتیاں عنقریب ران میں کھول کر
پھرنے والی ہیں ۔ آپ کی خواہش ہے کہ اگلی نسل کی مائیں اگلی نسل کیلئے
مفید ہوں تو آج ان کی تربیت کی خاطر آپ کچھ تکلیف اٹھایئے ۔ آپ نے
تکلیف نہ اٹھائی تو یاد رکھئے وہ بر لعنت اگلی نسل کا ہوگا کہ تو یہ ہی بھلی ہر شخص
کو اپنی جگہ یہ تکلیف اٹھانی چاہئے ۔ تکلیف اٹھانے سے مطلب وہی ہے کہ
مرد اپنے آپ کو درست کریں ۔ اور گھر والوں کے سامنے اچھا نمونہ
پیش کریں ۔

مسلمان قارئین نے تو کلام اللہ میں بھی پڑھا ہوگا ۔ الخبیثات
للخبیثین والخبیثون للخبیثات والطیبات للطیبین والطیبون للطیبات ۔

نقوشِ ماضی

(از د احمدی)

میاں بشیر احمد (اڈیٹر ہمایوں) رسالے نکالنے والوں کی برادری میں نئے نئے شامل ہوئے تھے کہ دلی آئے۔ مجھ سے بھی ملے۔ اور فرمانے لگے کہ اصلی دلی والوں کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا دفتر اُس وقت اوپر کی منزل میں تھا۔ میں نے کہا۔ سڑک کی طرف مُنہ کر کے دروازے کے پاس بیٹھ جایئے۔ آپ نے صحیح جگہ یہ خواہش کی ہے۔ اصلی دلی والے یہیں ملیں گے۔ وسط شہر میں بھی ایک دو خاندان ہیں۔ لیکن اصلی دلی والے اب زیادہ تر شہر کے کناروں پر آ پڑے ہیں۔ سرکتے سرکتے۔ اور عقل کام نہیں کرتی کہ ادھر سرک کر کہاں جائیں گے۔ کیونکہ شہر کے کسی کنارے سے نئی دلی شروع ہو جاتی ہے۔ کسی کنارے سے سول لائنز۔ کناروں پر دریا گنج میں ادھر اور ادھر سبزی منڈی سے باہر بہت دور تک اعلےٰ قسم کے مکانات بننے والے ہیں۔ اصلی دلی والے کناروں پر پہنچ کر شاید بس کر رہ جائیں۔ شاید انہیں شاہدرہ میں بھی جگہ نہ ملے۔ شاید یہ دلی سے رخصت ہی ہو جائیں۔ دولتمند آبادیوں کو پھیلنے کیلئے زمینوں کی سخت ضرورت ہے۔ خیر میاں صاحب! آپ دروازے کے پاس سڑک کی طرف مُنہ کر کے تشریف رکھئے اور سڑک پر سے گذرنے والوں کو دیکھتے جایئے۔ فصیلوں کے قریب سب ہی قوموں کے غریب رہتے ہیں۔ اس سڑک پر آپ کو وہ لوگ بے شمار آتے جاتے دکھائی دینگے جنہیں مہتر، چمار، دھوبی، سقے وغیرہ کہا جاتا ہے۔ اور اکبر و شاہجہاں کے نام لیوا بھی نظر آئیں گے۔ کوئی بتائے گا کہ میرے بزرگ عہد مغلیہ میں یہ تھے اور کوئی بتائے گا کہ میرے بزرگ عہد مغلیہ میں وہ تھے۔ خود مغل بادشاہوں کی اولاد اب صرف ادھر رہتی ہے۔ سڑک پر گذرنے والوں کی حالت سب کی ایک سی ہوگی۔ بلکہ دھوبی، سقوں اور چماروں کی بہتر اور شرافت کے مدعیوں کی بدتر۔ فقط لباس کے اعتبار سے نہیں۔ عادات و اطوار کے اعتبار سے بھی۔ صورتیں تک بگڑ چکی ہیں۔ امتیاز البتہ یوں کر سکئے گا کہ جب وہ بولیں گے

تو آپ ہاں دلی زندگی [illegible] دیکھ لیجے۔ جلدی دیکھ لیجے۔ یہ صحبت بھی ختم ہونے کو ہے۔
اگر ماند شبے ماند شبے دیگر نمے ماند۔"

میرے محلے میں آج ایک صاحب کا جنازہ اٹھا ہے۔ مجھے زندہ دل پنجاب اور زندہ میاں فضلی کے فرزند سے اپنی [illegible] یاد آگئیں اور جن صاحب کا جنازہ سامنے سے نکلا ہے اُن کا ایک واقعہ یاد آگیا۔ ان کے بزرگ عہد مغلیہ میں بھی ممتاز تھے اور ۱۸۵۷ء کے بعد بھی کم از کم اُن کے والد کے اقبال میں فرق نہیں آیا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد دلی والے جو دلی چھوڑ کر چل دیئے وہ اکثر اچھے رہے۔ اُس زمانہ میں بی اے اور ایم اے کچھ ہوں گے تو کلکتہ اور مدراس میں ہوں گے۔ دلی میں تو مکتبوں اور بوریوں پر تعلیم پائے ہوئے لوگ تھے۔ وہی دلی کی حکومت کے رکن تھے اور وہی ادھر اُدھر پہنچ جاتے تو اپنے جوہر دکھا دیتے۔ مرنے والے کے باپ بھی اسی طرح جنوبی ہند کی ایک ریاست کے ممدوح و دیوان بن گئے تھے۔ انہیں وہاں اتنا عروج ہوا کہ یہ مرنے والے اور ان کے بھائی شہزادوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ ناز و نعم اور لاڈ پیار میں ایک بھائی کی تھوڑی بہت تعلیم ہو گئی۔ لیکن یہ مرنے والے کورے رہ گئے۔ اُردو بھی مشکل سے لکھ پڑھ سکتے تھے۔ باپ کے مرنے کے بعد کچھ روز جائداد بیچ کر گزارہ کیا اور کچھ روز بھائی بندوں کی مدد پر۔ آخر روزگار کی تلاش شروع ہوئی۔ اور اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنری سے لے کر چپراسی گیری تک نوبت آئی۔

دلی میونسپل کمیٹی میں ابتدا ابتدا تو سکریٹری کے نام سے کوئی عہدہ دار ہی نہ ہوتا تھا۔ ایک صاحب عدالت کے سررشتہ دار کی پریسیڈنٹ کی کرسی کے پاس فرش پر بیٹھے رہتے تھے اور کمیٹی کی کارروائی قلم بند کرتے رہتے تھے۔ انہیں "منشی جی" کہا جاتا تھا۔ لیکن جب منشی جی کی جگہ "سکریٹری" نے لی تو پہلا سکریٹری ایک معمولی انگریز تھا جسے میں نے لڑکپن میں دیکھا ہے۔ اونٹ پر سوار شہر کا گشت لگایا کرتا تھا۔ اس کا نام ہرکی تھا — پھر جو سکریٹری آتا وہ انگریز ہونے کے ساتھ آئی۔ سی۔ ایس بھی ہوتا تھا۔ پچیس برس قبل تک سکریٹری شپ ہندستانیوں کیلئے ممنوع تھی۔ ایسے ہی ایک انگریز آئی سی ایس سکریٹری کے سامنے ایک لمبا تڑنگا مگر مضمحل اور پریشان حال ادھیڑ عمر کا سا آدمی

[illegible] سکریٹری صاحب نے اُس سے پوچھا۔ یہ وائسرائے کا خط۔ یہ کمانڈر انچیف کا خط۔ یہ نظام دکن کا خط۔ یہ مہاراجہ بڑودہ کا خط۔ یہ فلاں نواب کا خط، یہ فلاں راجہ کا خط۔ اور یہ اور بہت سے بڑے بڑے افسروں کے خط۔ یہ سب دوستانہ وار خط۔ جن کے پاس آتے ہیں اس کا بیٹا چپراسی گیری کا اُمیدوار نہیں ہوسکتا۔ تم چور ہو۔ تم نے یہ خط کہیں سے چرائے ہیں۔ تمہارے باپ کے پاس ایسے خط نہیں آسکتے۔ یہ کہکر سکریٹری صاحب نے ٹیلیفون اُٹھایا اور سپرنٹنڈنٹ پولیس سے کہا کہ اس قسم کا ایک چور میرے کمرے میں موجود ہے۔ چور کے قدم جہاں تھے وہاں کیل کر رہ گئے۔ سکریٹری صاحب کی کارروائی اُس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ لیکن اُس نے اتنا ضرور سمجھ لیا کہ مجھکو یہاں سے ہٹنے کی اجازت نہیں ہے۔

اتفاق سے سکریٹری کے کمرے میں ممبران کمیٹی کسی کام سے ہی داخل ہوا کرتے تھے سکریٹری صاحب اپنے کام میں مشغول ہوگئے اور چور صاحب کو انھوں نے کوئی حکم نہیں دیا۔ مگر وہ تصویر بنے ہوئے اپنے مقام پر قائم تھے کہ خان بہادر نواب غلام محی الدین خاں بی۔ اے رئیس اعظم و آنریری مجسٹریٹ درجہ اول دہلی تشریف لے آئے۔ نواب صاحب مرحوم اُس زمانہ میں دہلی کی میونسپل کمیٹی کے ممبر بھی تھے وہ تشریف تو لائے تھے سکریٹری صاحب سے بات کرنے۔ لیکن کمرے میں گھس کر انہوں نے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس نے نواب کی توجہ اپنی طرف منعطف کرلی۔ نواب صاحب نے اُس شخص سے دریافت کیا۔ آپ کیسے آئے۔ خیریت تو ہے؟ اُس نے جواب دیا۔ خیریت کیا ہے۔ چپراسی گیری کی درخواست دی تھی۔ صاحب کہتے ہیں جس حیثیت کے آدمی کو تم اپنا باپ بتاتے ہو اُس حیثیت کا تمہارا باپ نہیں ہوسکتا۔ نواب صاحب نے سکریٹری صاحب سے فرمایا۔ صاحب! یہ واقعی ایک بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ آج آپ انہیں پھٹے کپڑے پہنے دیکھ رہے ہیں۔ میں نے اس جسم پر اٹھارہ اٹھارہ سو اور دو دو ہزار روپے قیمت کے چوغے دیکھے ہیں۔ آپ تعجب نہ کیجے۔ دلی میں ایسے خدا معلوم کتنے شریف زادے اور امیرزادے ہونگے جن کے تن کو آج نہ کپڑا ہے اور نہ پیٹ کو کھانا۔ صاحب بہت متاثر ہوئے۔ صاحب نے اُن سے معذرت چاہی اور کہا آپ کل محرری کیلئے درخواست لکھکر لائیے میں آپکو چپراسی نہیں بناؤنگا۔ محرر ہی بناؤں گا۔ وہ صاحب سلام کرکے باہر نکلے اور بولے۔ مُردوں سے زندوں میں گئے۔ جان بچی لاکھوں پائے۔ نا بابا میں اب محرری کی درخواست لیکر یہاں نہیں آؤں گا۔

یہ جنازہ جو آج میر محلہ میں اُٹھا ہے اُنہی صاحب کا تھا۔

غزل

(از جناب شاہد نصیر صاحب)

نشانِ راہِ غمِ عشق بے نشاں پیارے
حیات کیا ہے مگر خوابِ رائیگاں پیارے

تری نظر کے تقاضے سمجھتا ہوں لیکن
غمِ زمانہ سے فرصت مجھے کہاں پیارے

نہیں کہ مجھ کو تری آرزو نہیں اے دوست
مرا جنوں ہے مرے دل کا پاسباں پیارے

وہی ہے منزلِ ہستی، وہی ہے عالمِ نو
رہِ حیات میں تو مل گیا جہاں پیارے

تجھے گماں ہے کہ میں تجھکو بھول جاؤں گا
مجھے کچھ اور بھی اپنے پہ ہیں گماں پیارے

زمانہ اور بھی بدلے گا رنگ جانِ حزیں
ابھی کچھ اور بھی پردے ہیں درمیاں پیارے

جلا کے خانۂ دل میں چراغِ غم شاہد
ہے کب سے منتظرِ مرگِ ناگہاں پیارے

زندگی میری نظر میں

(از حضرت ساغر نظامی)

زندگی اور میں اچانک صبح سے پہلے بیدار ہو گئے۔ مجھے اور [illegible] ابھی دن چڑھے تک سونا تھا۔ مگر کچی نیند میں ہم دونوں اُن کم سن [illegible] کی طرح جاگنے کے لئے مجبور ہو گئے۔ جن کی حیات ذوقِ سفر کے [illegible] اور نہیں ہوتی۔ کون رہرو ہے اور کون رہبر۔ یہ بھی ہوش نہ تھا۔ [illegible] ہی دیکھتے وجود کے [illegible] لگے میں چست و چالاک دکھلائیے کائنات کے بام و در پہ [illegible] نظر کرنے لگے۔

[illegible] اور [illegible] روشنی اور تاریکی۔ خیر و شر۔ دھوپ اور چاندنی۔ [illegible] یعنی ہر وہ منزل جو انسان لاکھوں سہارے [illegible] براہِ راست زندگی کے سہارے طے کی۔ دُنیا کے طویل سفر میں زندگی ہی میرا سفر تھی۔ اور زندگی ہی ہم سفر۔ ہرنی اور رہبری۔ آبادی و بربادی کے جتنے تجربے تھے زندگی ہی ان کا معمول تھی۔ اور زندگی ہی اُن کی حامل۔

ہمارے علم کی تمام تر اساس تجربات پر مبنی ہے۔ آپ کو اصرار ہے تو ہو۔ میرے خیال میں نظری تصورات تجربات کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔ اس لئے جتنے اصول اور کُلیے ہیں وہ تمام تر تجربات کی پیداوار ہیں۔ میں اپنے تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں۔ زندگی اندھیری رات ہے اور تجربہ نورِ سحر۔ ذہن تاریک کوٹھری ہے۔ اور مشاہدات و تجربات شعاعِ نور۔

مشاہدے اور تجربے سے پہلے انسانی ذہن ہر قسم کے نقوش اور تصورات سے اسی طرح محروم ہوتا ہے جس طرح بیج ڈالنے سے پہلے بنجر زمین۔ کچھ محرکات انسان کے احساس و شعور پر خارج سے پڑتے ہیں۔ اور اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں۔ دوسرے وہ تصورات ہیں جو [illegible] اعمال کے نتیجوں کی صورت میں ترتیب پاتے ہیں [illegible] محرکات [illegible] احساس و خیال پر اثر ڈالتے ہیں ہمارے

تصورات کا [illegible]

[illegible] وقت میں نے [illegible]

وتمدن۔ قدیم و جدید نظریے، اصول اور فلسفے، علوم و فنون [illegible] کا بڑا حصہ زندگی کو مل چکا تھا۔ [illegible] کائنات کی [illegible] روایتوں کی امانت لے منتظر تھی۔ [illegible] ناکامی کو جانتا تھا نہ کامیابی کو۔ عشق کو پہچانتا تھا نہ [illegible] سکتا تھا نہ صلح کو۔ اور نہ واقف تھا نہ جیت سے۔ زندگی کے [illegible] میرا داخلہ اس غیر مسلح نوجوان کی طرح ہوا جو میدانِ جنگ میں کسی [illegible] کے ساتھ اتفاقیہ داخل ہو جائے۔

میدانِ جنگ کی پہلی ضرورت نہ شاعری ہے نہ حکمت۔ نہ بیم ہے نہ رجا۔ نہ یاس ہے نہ اُمید۔ نہ زندگی کا رُخ تاریک ہے نہ روشن پہلو۔ اس کی پہلی اور آخری ضرورت صرف اپنا بچاؤ ہے۔ اور اپنا بچاؤ [illegible] خود اعتمادی کے بغیر ممکن نہیں۔ ٹکراؤ کی جنون انگیز قوت۔ تصادم کی بے پناہ طاقت۔ یہ ہیں وہ جوہر جو خودی کے رُوپ میں انسانی فطرت کی رہنمائی کرتے ہیں۔

زندگی میں سب سے پہلے مجھے انہیں اچھوتے تصورات سے واسطہ پڑا۔ خاص کر مقابلے اور تصادم کی رَو سے۔ یہ آدمی "شیئت" کے مقابلہ میں مجبور سہی۔ مگر زندگی کا پہلا اور آخری بھید ہے۔ مقابلے کی بڑھتی ہوئی قوت۔ پنپنے کی مچلتی ہوئی آواز۔ اور آگے بڑھنے کی سیلابی خواہش انسان کو فریب۔ جوش اور جنون میں اُلجھا دیتی ہے۔ مجھ پر اس نے اپنا جال پھینکا اور مدتوں پھسلاتی رہی۔ "تو سب سے بلند ہے" "تو کامل آزاد ہے۔" مجھے بلندی کا یقین ہو گیا۔ میں نے خود کو آزاد جان لیا۔ یہ احساسات شباب پر تھے۔ شرمیلے تصورات دل سے دُور لرزتے رہے۔ افسردگی اور جوانی کا ساتھ ہے۔ کبھی کبھی غمگین جذبات دل میں جاگتے۔ مگر "ناامیدی" انسانی زندگی کے جسم کا گھن! یہ گھن مجھے کبھی نہیں لگا۔ جب یہ ناگن میری طرف بڑھی۔ خودی کے نامحسوس جذبہ نے اس کا سر کچل دیا۔

میں گویا ایک ایسا جہاز تھا جو ساحل سے لنگر اُٹھا [illegible] طوفان میں گھر جائے۔ ابر و باد کی یورش میں ملاح بڑے بڑے نظریوں اور فلسفوں پر غور نہیں کرتے۔ مقابلہ کی قوت کو استوار کرتے ہیں۔ جاگتے ہوئے حوصلوں کو مضبوط بناتے ہیں۔ زندگی اور موت سے بلند ہو کر وہ [illegible] اپنی ہستی سے بھی غافل ہو جاتے ہیں۔ [illegible] ساحل [illegible] بدانداز ہوتے تھے۔

[illegible] زندگی [illegible] سے چلنے اور رُک جانے [illegible] یہ محو جواب اور [illegible] کی بنیاد پر زندگی کو گردش [illegible] کو بڑھاتا چلا گیا۔ اس پر پاس خندہ زنی ہوئی مقصد [illegible] اندر سے اند پھیلا گئے۔ ناکامیوں نے کامیابیوں کا [illegible] ہوئے اور [illegible] اپنے۔ لیکن کامیابی اور ناکامی [illegible] افضل نہیں ہے

[illegible] کے رہ گئی میرے جنون کے دام میں
میرا جنون ڈوب [illegible] گردشِ روزگار سے

مجھے اندھی مشیت کا علم نہیں تھا۔ "زندگی" اندھی "مشیت" کی [illegible] حرکت ہے۔ میں نہیں مانتا تھا۔ مگر آدم کی مجبور و مقہور نسل کے لئے جو نسخہ [illegible] حکیم شوپنہار نے تجویز کیا تھا وہ میری گھٹی میں گھلا ہوا تھا۔

میں اپنے انفرادی ارادوں کو مٹا کر مشیت کو ہرانے کی کوشش میں [illegible] کائنات اور انسان کے حسن پر ہنسنے کیلئے کسی حکیم کا محتاج نہیں تھا۔ میں تو حسن کے لہریں مارتے سمندر ہی میں پیدا ہوا۔ مجھے کیف خود اپنے میکدہ سے ملا۔ دکھ سکھ کی قیدوں سے آزاد ایک سرور۔ کامیابی اور ناکامی رنج و راحت۔ ہار جیت۔ مجھے ان سپنوں کو یاد رکھنے کا ہوش ہی کب تھا۔ کیوں ہوتا۔ میرے [illegible] یہ فریب کافی تھا "میں سب کچھ ہوں" اور "سب کچھ کر سکتا ہوں"۔ لیکن زندگی اپنے محور پر اور تیزی سے گھومی۔ نقاب چہرہ سے گرنے لگے مسکراتی ہوئی تازہ و شاداب لڑکی کا مکھڑا بھیانک ہو گیا۔

مشاہدہ کی یہ منزل "نئی منزل" تھی۔ مضبوط اور سرکش حواس کے گلے میں تلخ حقیقتوں نے اپنی کج کجی باہیں ڈال دیں۔ دکھ سکھ کی سچی قدریں معلوم ہوئیں۔ پہلی مرتبہ زندگی میں کمی اور کمزوری کا احساس ہوا۔ انسانی روح کی بے بسی اور نفسیاتی مجبوری سوئیاں چبھونے لگی۔ آنکھوں کے سامنے ایک تاریک و دبیز دیوار آکھڑی ہوئی۔ پہلی بار تمام جسمانی و روحانی قوتیں جی چھوڑتی ہوئی دکھائی دیں۔ زندگی مصیبتوں کا ختم نہ ہونے والا سلسلہ نظر آنے لگی۔ احساس و خیال آنسوؤں میں ڈوب گئے۔ شاید یہ سچ بھی ہے کہ دنیا کی [illegible] اسی [illegible] سے ہوتی ہے۔ ہر انسان اپنی تمام آرزوؤں میں کامیاب نہیں ہو سکتا [illegible] ہے دکھ ہی اٹل ہے۔ زندگی طبعی [illegible] کی ایک [illegible] ہے لیکن [illegible] اخلاقی خاص کر [illegible] کے [illegible] ہیں۔
[illegible]

آندھیاں چلتی رہتی ہیں۔ اس پر انسانی فکر و ارادہ کا ذرا قابو نہیں۔ اسباب و علل پھر بھی یہ مجال کس کو ہے کہ مسرت کا تنہا مالک ہی بن بیٹھے۔ مسرت کی تمناؤں سے کھیلنا ہرگز دانشمندی نہیں۔ حیات کی پہلی اور آخری تمنا خوشی سہی۔ مگر خوشی ہے کیا۔ محض ایک موج۔ صرف ایک حرکت۔ فقط ایک مسلسل مطالبہ اور "الم"۔ الم مسرت کے مقابلہ میں ذی مقدار بھی ہے اور پائیدار بھی۔ مسرت کی تھاہ ہے مگر غم کی تھاہ نہیں۔ لامحدود شئے محدود سے بہر حال افضل ہے مگر ان جذبوں کا مرکز خود "انسان" ہے۔ انسان الم اور مسرت دونوں سے افضل ہے۔ رنج اور خوشی محض دو مرحلے ہیں اور ان سے گزر جانا ہی آدمی کی بڑائی ہے ؎

غم بھی کوئی منزل ہے رہِ عشق و جنوں میں
آلام کے مواج سمندر سے گزر جا

وہ انسان جسے مقصد کا جنون نہیں۔ زندگی سے نہیں جیت سکتا۔ ایسے انسان کا سینہ مشرق کی مانند ہے۔ جہاں ہر گھڑی ایک نئے طلوع اور جدید آغاز کی بھیڑ رہتی ہے۔

غم کے تبسم نے زندگی میں نئی شگفت پیدا کی۔ انانیت کی سیلابی روح ایک سانچے میں ڈھلنے لگی۔ کامیابی اور فتح کی نئی تعبیریں ہونے لگیں۔ سربند شراب شیشے سے ابلنے لگی۔ ماحول اور قدرت کے جبر نے انفرادی ارادوں کو اجتماعی شکل بخشی۔ شعور نے سنبھالا لیا۔ مگر اندر ہی اندر گریز و فرار کی خواہش اٹھنے لگی۔

گریز و فرار کی یہ خواہش کبھی آنسو بنی۔ کبھی تبسم۔ کبھی ترک و رہبانیت کا احساس بن کر متحرک ہوئی۔ کبھی تخریب کا سرکش شعلہ بن کر لپکی۔ کبھی کامل نیکی کی شکل میں نمودار ہوئی۔ کبھی مکمل شر کی صورت میں۔ مرحلہ سخت تھا۔ مگر ہر وہ انسان جسے کوئی لگن ہو اس مرحلے سے مرعوب نہیں ہو سکتا۔

بیرونی محرکات اور میرے تصورات نے گھل مل کر ایک نیا سانچہ بنایا۔ اور میں اس سانچے میں ڈھل کر رہ گیا۔ تیاگ اور رہبانیت "روحانیت" کے نام پر زندگی سے گریز ہے۔ کھلی ہوئی ہار۔ وجود کے ہنگامے اور مشیت کے [illegible] پنجے سے ابدی نجات حاصل کرنے کیلئے زہد اور محویت محض فرار ہے۔ [illegible] گریز اور فرار کی داستان اور بھی سنگین ہو جاتی ہے۔ جب ہم اس کے [illegible] پر غور کرتے ہیں۔
[illegible]

زندگی کو ثانوی حیثیت دیتے ہیں۔ میرے نزدیک دنیا کے لئے مہلک اور انسانی ترقی میں سدِ راہ ہیں۔

انسانی زندگی دو پاٹوں کے درمیان دبی ہے۔ ایک پاٹ مشیت ہے۔ ایک پاٹ انسانی سماج۔ چکی میں پڑے ہوئے دانوں پر اوپری پاٹ کا دباؤ نچلے پاٹ کے مقابلہ میں زیادہ ہوتا ہے۔ مگر زندگی وہ چکی ہے جس کے دونوں پاٹ برابر کا دباؤ رکھتے ہیں۔ یہ نظام جس میں انسان نے اپنی جنس کو پیس رکھا ہے ابھی تک اجتماعی تصور سے عاری ہے۔ ابھی تک یہ عوام کیلئے جہنم ہے۔ محض مشیت پر جبر کا الزام انسانی سماج کے ناقص اور غیر منصفانہ نظام سے چشم پوشی کرنا ہے۔ مشیت نے حُسن کو محدود نہیں کیا۔ تخلیق کو نہیں روکا۔ ارتقا پر بندشیں نہیں کیں۔ مگر انسان نے اپنی جنس پر مسرت راحت اور آزادی کا ہر دروازہ بند رکھا ہے۔ انسان کے تمام ارادی اعمال و افعال کی اساس انفرادی و اجتماعی مسرت کا حصول ہے۔ ہر ایک کی کوشش ہے کہ سکھ ملے۔ زندگی کو سجائے سنوارے۔ تمام انسانی تاریخ مسرت و راحت کے حصول کی ناکام کوشش کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ ہے۔ مگر یہ انحاد نسلِ آدم کے خونخوار بیٹوں نے انتہائی خود غرضی کے ساتھ جاری رکھا۔ کسی نے کامل طور پر زندگی اور اسکی مسرتوں کو برابر بانٹنے کا نظام پیدا نہیں کیا۔

زندگی جہنم تھی اور ہے۔ یہ جہنم آج بھی فردوس بن سکتا ہے۔ لیکن پرانی دنیا کو ڈھا دینے کے بعد۔ جو ایک مجموعی سماج بنانے سے قاصر رہی۔

دُکھ سکھ اور محض جبر و اختیار کے جنجال میں انسانی ذہن کو مقید کرکے جو بزرگ زندگی سے گریز کی تعلیم دیتے رہے۔ وہ انسانی ترقی اور حیات کی پرواز کے دشمن تھے۔ اگر یہ دنیا لاکھوں قیامتوں اور تباہیوں کے بعد بھی چلتی رہی ہے تو ہو سکتا ہے کچھ اور چلتی رہے۔ شاید آنے والا ارتقا کوئی ایسا نظامِ ریاست پیدا کر دے جو زمین کی مصیبتوں کو ختم کرکے انسان کو سماجی و اقتصادی مسرتوں کی دولت بخش دے۔ عُمریں مختصر رہ جائیں۔ اور مسرتیں طویل۔ پُر آلام زندگی کے مقابلے میں مسرت کی ایک گھڑی ابدی زندگی سے کم نہیں۔

پھر بھی میرے نزدیک مسرت و الم جبر و اختیار اور اس قسم کے حکیمانہ مسائل سے افضل انسانی زندگی اور اس کی تہذیب و تکمیل ہے ارتقاء کی معجز نمائی کا فریضہ ہے۔ شاید ایک ایسا سماج بن سکے جس میں ایسی [illegible] برابر [illegible] انسانیت کے لئے زندہ رہنا [illegible] کیلئے [illegible]۔

میں گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ایک نورانی مستقبل کا منتظر کھڑا ہوں۔ ظاہر ہے یہ زندگی کا تشنہ پہلو ہیں انتہائی بے سوچے نوازگی اور رہبانیت نے انسانوں کو ہزاروں سال غلام رکھا۔ [illegible] نے نسلیں برباد کر دیں۔ زہریلے اور نچلے تصورات نے ذہنوں کو مفلوج کر دیا۔ شاعرانہ محویت اگر محض ظالم مشیت کے ہاتھوں سے چھٹکارا پانے کے لئے ہے۔ تو میرے نزدیک وقت کی تباہی ہے۔ ہاں اگر یہ انسانی زندگی میں تہذیبی برابری اور انصاف پیدا کرنے کے کام آئے جس کا نتیجہ عام انسانی نشاط و راحت ہو تو دنیا کی تمام عبادتوں سے بڑھکر ہے۔ شاید یہی جوہرِ شاعری کا حاصل ہے۔ اور یہی زندگی کی حکمت۔

(منشور از نشرگاہ دہلی)

مشعلِ راہ میری نظر میں

(از جناب ماہر القادری)

وہ جو کسی نے کہا ہے کہ :-

"قدرِ نعمت بعدِ زوال"

تو اُردو ادب کی نعمتوں کی قدر بھی اس لئے زیادہ ہو رہی ہے کہ "ترقی زدہ ادب" نے اُردو لٹریچر کو "زوال آمادہ" بنا دیا ہے۔ انتشارِ خیال اور بے راہروی کے اس تاریک دور میں جہاں کہیں بھی ہمیں روشنی نظر آتی ہے ہماری نگاہیں محو دید اور مصروفِ طواف ہو جاتی ہیں۔ "مشعلِ راہ" بھی اسی "تجلّی" کا رنگین پرتو ہے۔ جس کی شبستانِ ادب کو ہمیشہ ضرورت رہتی ہے۔

"مشعلِ راہ" کے مصنف جناب نخشب جارچوی اُن ذہین طباع اور صاحبِ فکر شاعروں میں سے ہیں جو زندگی کی پہلی منزل ہی میں اپنا "خاص مقام" اور "انفرادیت" پیدا کر لیتے ہیں۔ یہ رتبہ بلند ہر شخص کو نہیں ملتا اور وہ اس لئے کہ اس میں "کسب" سے زیادہ "عطا و موہبت" کا دخل ہے۔ یہی وہ مقام اور خصوصیت ہے جس کے متعلق کہا گیا ہے :-

"شاعر پیدا ہوتا ہے بنایا نہیں جاتا"

خصوصیاتِ کلام

نخشب صاحب کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت سادگی سُلجھاؤ اور نزاکتِ فکر ہے۔ وہ گہری سے گہری اور پیچیدہ سے پیچیدہ بات کو دلنشین انداز میں سلجھا کر بیان کرتے ہیں ان کی شاعری "واقعیت" (Realism) اور "رمزیت" (Symbolism) کا سنگم ہے۔ اس میں دبی ہوئی آہیں بھی ہیں اور شگفتہ مسکراہٹیں بھی! شاعر کا دل چوٹ کھایا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے بعض جگہ قہقہے بھی فریاد بن کر رہ گئے ہیں۔

نخشب محسوس کر کے شعر کہتے ہیں اور یہی "احساس" بعض جگہ "سحرِ حلال" بن گیا ہے۔ بیتی ہوئی باتیں اور گذرے ہوئے واقعے جب شعر کے سانچے میں ڈھلتے ہیں تو اُن کی بے پناہی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ "مشعلِ راہ" میں یہ "بے پناہیاں" ہم کو جا بجا نظر آتی ہیں۔

مثالیں

"مشعلِ راہ" کی صحیح قدر و قیمت تو پڑھنے کے بعد ہی معلوم ہو گی۔ میں یہاں لگے ہاتھوں چند اشعار پیش کئے دیتا ہوں اور وہ اس لئے کہ کتاب پڑھنے والوں کو شاعر کے کلام کی خصوصیات کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جائے۔

آیا تو انقلابِ زمانہ بڑے کا رہ
لیکن تری نظر کا سہارا لئے ہوئے

"نظر کے سہارے" نے شعر کو آسمان پر پہنچا دیا۔ اس سے محبوب کی "انقلاب آفرینی" اور "محشر پناہی" بھی ظاہر ہو گئی ہے کہ "انقلاب" اُس کی "نگاہ" کا سہارا لئے ہوئے ظاہر ہوا۔ "انقلابِ زمانہ" جس "نگاہ" کا سہارا ڈھونڈتا ہے اُسکی "بے پناہیوں" کا کیا پوچھنا۔

آپ تو گھبرا گئے بے تابیٔ دل دیکھ کر
کیا کہیں گے بندہ پرور اہلِ محفل دیکھ کر

اس شعر میں "نفسیات" کی رُوح حل ہو کر رہ گئی ہے کہ پڑھئے اور جُھومئے۔ میں شعر کی تشریح کروں گا تو شعر کی نزاکت مجروح ہو جائے گی۔

تمام درد ہوں لیکن لبوں پہ آہ نہیں
بقیدِ ضبطِ محبت کوئی گناہ نہیں

غزل کا یہ مطلع حقیقت میں "مطلعِ آفتاب" ہے۔ شعر میں نغمگی اور ترنم کے ساتھ معنویت بھی ہے اور "تاثیر" تو اتنی ہے کہ ایک ایک لفظ نشتر بن کر دل میں اُترتا ہے۔

مذاقِ دید بہرحال تشنہ کام رہا
کہیں تو آپ نہیں ہیں کہیں نگاہ نہیں

"بہرحال" کس قدر خوبی کے ساتھ نظم ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر لفظوں کو صحیح طور پر برتنے کا سلیقہ رکھتا ہے۔ دوسرا مصرعہ بہت زیادہ سُلجھا ہوا اور غایت درجہ شگفتہ ہے۔ حُسن اور عشق کو برابر کا الزام لگا کر شاعر نے دونوں کی پوزیشن کو واضح کر دیا۔

میں کیسے رازِ جنوں ہر کسی کو سمجھاؤں
مرے جگہ ہے وہاں عقل باریاب نہیں

"ہر کسی" کہہ کر نخشب نے "اربابِ ہوس"، "عوام" اور "بندگانِ ہوش و عقل" پر کتنی لطیف طنز کی ہے۔

دِل اُلجھ جائے تو پھر تفریحِ نظارہ کہاں

کوئی منظر ہو مگر دامن بچاتے جائیے

"تفریحِ نظارہ" کی ترکیب حضرت مخمحتسب کی ایجاد ہے۔ جسے خوشی کے ساتھ اردو زبان کا مزاج قبول کرے گا۔ روانی سادگی اور واقعیت کے اعتبار سے تو یہ شعر "سہلِ ممتنع" ہے۔

کہنے والا کہہ گیا دو ہچکیوں میں رازِ غم
سُننے والے مدتوں تک گفتگو کرتے رہے

فانیؔ مرحوم زندہ ہوتے تو اس شعر کو پڑھکر رانہیں پیٹتے کہ وہ "رازِ غم" کے سب سے بڑے مفسر تھے۔ دوسرا مصرعہ تو قیامت کا مصرعہ ہے "گفتگو کرتے رہے" کہکر شاعر نے دو ہچکیوں میں کہے ہوئے رازِ غم کی اہمیت کو واضح کر دیا۔ یعنی یہ کہ اس "عنوان" پر مدتوں تک گفتگو ہوتی رہی اور یہ مسئلہ موضوعِ بحث و نظر بن گیا۔

جانے کیا دل کو محبت میں سہارا ہو گیا
نا خوشی بھی بار تھی یا غم گوارا ہو گیا

میں اس شعر کو سنکر بہت دن تک بے چین رہا ہوں۔ آپ بھی اس نشتر کی چبھن محسوس کیجیے اور زبان سے کچھ نہ کہیئے کہ لذّتِ خلش زبان پر آکر اپنی تاثیر زائل کر دیتی ہے۔

متفرق اشعار

آپ کے اور "مشعلِ راہ" کے درمیان بات کو بڑھا کر میں حائل بننا نہیں چاہتا۔ اِس لئے کسی تشریح کے بغیر چند اشعار پیش کئے دیتا ہوں۔

مجھے دیکھا تو ہر اک نے اُنہیں جلاد ٹھیرایا
اُنہیں دیکھا تو بولے یہ بھلا بیداد کیا کرتے

وعدے کا اعتبار تو ہے واقعی مجھے
یہ اور بات ہے کہ ہنسی آ گئی مجھے

مقامِ عشق میں محتسب کہاں یہ ظاہری باتیں
نہ میں بے ہوش رہتا ہوں نہ مجھکو ہوش رہتا ہے

جدائی میں بھی اس ڈر سے کوئی لغزش نہیں ہوتی
سمجھتا ہوں وہ میرے حال سے غافل تو کیا ہوگا

گھر سے [illegible] یا
وہ ٹل ہی جائے گی [illegible] ہے

نیازِ عشق نازِ حُسن ہی کا ایک پہلو ہے
تمہیں یہ راز سمجھانے کی نوبت ہی کہاں آئی

کوئی کس طرح رازِ اُلفت چھپائے
نگاہیں ملیں اور قدم ڈگمگائے

اِس طرح پیش دوست رکھیں اپنی مشکلیں
جیسے کہ وہ بھی چاہے تو آساں نہ کر سکے

جھجک کر گفتگو کرنا ہے اپنا راز کہہ دینا
اسی نازک سے پردے میں محبت پائی جاتی ہے

آپ کے دامن سے وابستہ ہے میری زندگی
آپ جس عالم میں چاہیں گے بسر ہو جائیگی

اب مری جانب نظر ہے جب میں دیکھوں گا اُدھر
وہ نظر گھبرا کے صرفِ بام و در ہو جائے گی

بے پردہ میرے سامنے آیا نہ جا سکا
اُن سے بھی یہ حجاب اُٹھایا نہ جا سکا

تمہاری یاد سہارا دیئے رہی ورنہ
جدائی نے تو قدم ڈگمگا دیئے ہوتے

"مشعلِ راہ" میں غزلیں ہی نہیں قطع، نظمیں اور گیت بھی موجود ہیں۔ محتسب کی شاعرانہ فطرت نے ہر صنف میں اپنے جوہر خوب خوب دکھائے ہیں ایک قطعہ ملاحظہ کیجیے:-

دل ہے اتنا تو خدا کی یاد آتی ہی نہیں   اور بھولے سے کبھی آ بھی جاتی ہے اگر

از جناب پروفیسر حامد اللہ صاحب افسر

رہ و رسمِ کارسازی

یہ عالم اور اِس کی فضائیں کیا آنکھوں میں سمائیں گی
اِک دن دیکھو گے یہ نگاہیں عرش سے جا ٹکرائیں گی

ڈر کیسا؟ تاریکیاں شب کی، گھر گھر کر جب آئیں گی
میرے اس مٹی کے دِیئے میں سُورج کے گُن پائیں گی

تو اے بھولے بھٹکے راہی اُٹھ کے کمر تو پہلے کس
یہ ہی ٹیڑھی میڑھی راہیں خود رہبر بن جائیں گی

شمعیں جو روشن نہیں ہونگی دِل کے سوز سے دُنیا میں
دھیمی اور بھی دھیمی ہونگی، آخر کو بجھ جائیں گی

امیدوں کے چاند کی کرنیں کیف آور تو ہیں لیکن
دل کے سمندر میں یہ کرنیں پھر طوفان اُٹھائیں گی

فطرت سے ہم ساز نہ ہو تو بہار خزاں سے بدتر ہے
ٹھیک فضا کو پائیں گی تو کلیاں سب کھل جائیں گی

بادل سے ڈر جانے والے تند ہوا کا ساتھ تو دے
یہ مانا سُورج کی شعاعیں بادل میں چھپ جائیں گی

سخنے یہ کہتے ہوئے نکلے میری کُٹی کے چھپّر میں
اور ابھی چھائیں گے بادل اور گھٹائیں آئیں گی

کیف آور انداز میں تو نے لکھے ہیں اسرار بہت
افسر تیری رمز کی باتیں رہ رہ کے یاد آئیں گی

[illegible] دیر پا ہوتا ہیں جیسے [illegible] ویران مسجد پر نظر
خدا کی یاد" کے لئے "ویران مسجد" کا تخیل کس قدر دلنشیں
اور لطیف ہے۔

مختشب کے گیتوں میں مٹھاس اور روانی ہے۔ اور اس خصوصیت کے باعث توقع ہے کہ گیتوں کو قبول عام حاصل ہوگا۔

نظموں میں "طلوع سحر"۔ "بے کیفی" اور "ٹیگور" بہت خوب ہیں مختشب کے رنگ تغزل نے نظموں میں بھی پھول کھلا دیئے ہیں۔ نظموں کے بعض اشعار غیر معمولی "Force" رکھتے ہیں۔

"عزم و عمل" کا ایک بند ملاحظہ کیجئے:۔

عزم راسخ ہو تو کونین بھی ہے زیر نگیں
ڈگمگاتے ہوئے قدموں کی نہ دنیا ہے نہ دیں
کلیہ سب کے لئے ہے کوئی تخصیص نہیں
جسم کے جو خاک پہ بیٹھا وہ ہوا عرش نشیں
کوئی صورت ہو زمانے کی بدل جاتی ہے
سامنے آئی ہوئی موت بھی ٹل جاتی ہے

اور "غم عشق و غم روزگار" کا یہ شعر ؎

سکوں پرور کوئی ہنگامۂ محفل نہیں ہوتا
کہیں شامل بھی ہو جاؤں تو دل شامل نہیں ہوتا

تو ایک دفعہ پڑھنے کے بعد بھول ہی نہیں سکتا۔ تنہا یہی شعر مختشب کے کمال کا بولتا ہوا ثبوت ہے۔

گیت شعر و ادب میں سارا کھیل الفاظ ہی کا ہے۔ جو شاعر اور ادیب الفاظ کے برمحل استعمال سے واقف نہیں ہے اسکے مضامین "کاواک" بن کر رہ جاتے ہیں۔ بلند سے بلند اور عمیق سے عمیق خیال میں الفاظ کے عدم توازن اور غیر آہنگی کے سبب پستی اور بازاری پن پیدا ہو جاتا ہے۔

کامیاب شاعر موضوع کی مناسبت سے اظہار خیال کیلئے الفاظ تراشتا ہے۔ فردوسی کے "شاہنامہ" کی کامیابی کا راز اسی میں ہے کہ عجم کے اس مایۂ ناز شاعر نے موضوع کی معنویت کا شاہنامے میں ہر جگہ لحاظ رکھا ہے۔ جنگ کا منظر پیش کرتے وقت وہ اس قسم کے پُر جوش اور ہنگامہ آرا الفاظ استعمال کرتا ہے کہ شعر پڑھتے وقت محسوس ہوتا ہے کہ سچ مچ میدان کارزار گرم ہے۔ تلواروں کی جھنکار سے میدان گونج رہا ہے اور زرہ بکتر سے آہنی تیروں کے ٹکرانے کی آوازیں آرہی ہیں۔

فردوسی رزم کا امام تھا اور قاآنی قصیدے کا بادشاہ ــــ قاآنی کی بہاریہ تشبیب اس لئے مقبول ہے کہ موضوع کی مناسبت سے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اور بہار و شراب کا ذکر کرتے وقت ایک لفظ بھی نامُلائم اور درشت شعر میں نہیں آیا۔ قاآنی کے شعروں میں گھلاوٹ ہی نہیں ترنم بھی ہے اور وہ اس لئے کہ "نغمہ" "بزم" کی جان ہے۔

مختشب الفاظ کو موزونیت اور سلیقہ کے ساتھ برتتا ہے اور اسی سلیقہ نے اسکے اشعار کو اثر انگیز بنا دیا ہے۔

گیت میں نہایت ہی ہلکے پھلکے اور شریلے لفظوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ گیت کی مخصوص "ٹیکنک" ہے۔ وہاں خیال کی گہرائی سے زیادہ ترنم اور سلاست کی ضرورت ہے۔ مختشب کے گیتوں میں ہمیں یہ بات ملتی ہے ؎

دیکھی تھی بس ایک جھلک سی
ہوتی ہے دل میں اب بھی کسک سی

وار تھا اوچھا گھاؤ ہے کاری ــــ

جب اوچھے وار کا گھاؤ کاری ہو تو اسکی "مختصر سامانی" کا کیا پوچھنا۔ اور جب "وار" کا یہ حال ہے تو وار کرنے والا کس قدر سفاک قاتل ہوگا۔

دن ہے سلونا رات سہانی
یہ بھی گھڑی ہے آنی جانی
پھر یہ زمانہ آئے نہ آئے
جی کی جی میں کیوں رہ جائے

مختشب کے یہ بول امرت کی بوندیں ہیں۔ آخری بول ــــ

جی کی جی میں کیوں رہ جائے

تو مٹھاس میں مصری کی ڈلی ہے کہ زبان سے جتنی مرتبہ دہرایئے اتنی ہی حلاوت محسوس کیجے۔

"مشعل راہ" میں ایک گیت ہے جس میں پپیہے کو مخاطب کرکے شاعر نے اپنے دل کا دکھ درد سنایا ہے۔ یہ گیت سوز میں ڈوبا ہوا ہے دو ایک بول لکھے جاتے ہیں:۔

برہا کی گھڑیاں دکھ کے زمانے
جس پہ بیتیں بس وہی جانے

اسی ترکش کے ایک اور تیر کی اثر انگیزی دیکھئے:۔

بوندوں نے دل میں گھاؤ کئے ہیں
جانے کب کے بدلے لئے ہیں

وہ دل کتنا نازک بھروح اور دکھا ہوا ہوگا جس میں ساون کی نرم و نازک بوندیں گھاؤ کر دیں۔ اور پھر یہ سوال ——

جانے کب کے بدلے لئے ہیں

تو ایک بار پڑھنے کے بعد بہت دن تک یاد رکھنے کے قابل ہے۔

تشبیہات

مخشب کی شاعرانہ نطرت کا زیادہ تر رجحان غزل کی طرف ہے۔ مگر نظموں اور قطعوں میں بھی اُن کی طبیعت اپنے جوہر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔

وہ شعرا جو "غزل" کہنے کے بعد نظم، قطعہ یا رباعی کہتے ہیں شعر کی کسی صنف میں ناکامیاب نہیں ہوسکتے۔ غزل گو شاعر کے خیالات میں عام طور پر سلجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور الفاظ کے برمحل برتنے کا سلیقہ آ جاتا ہے غزل بہت ہی لطیف، سادہ اور سلیس الفاظ چاہتی ہے۔ ثقیل اور کرخت الفاظ غزل برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ اسکے برخلاف جن شاعروں کی ابتدا نظم سے ہوتی ہے ان کے یہاں الفاظ کا توازن نسبتاً کم پایا جاتا ہے۔ اردو شاعر کو غزل کی منزل سے گریز ضروری ہے۔

مخشب چونکہ غزل کے بعد نظم کی منزل میں آئے ہیں اس لئے ان کے یہاں خیالات کا سلجھاؤ اور لفظوں کا صحیح استعمال پایا جاتا ہے۔ وہ دل لگتی تشبیہیں اور دل نشین استعارے استعمال کرتے ہیں۔ ایک قطعہ ہے ؎

چھیڑتی ہے نرم رو جھونکوں سے پانی کو نسیم
اسطرح آغوش میں لہروں کے کھلتے ہیں کنول
جیسے اک دوشیزہ کے ہم جولیوں کی چھیڑ سے
ضبط کرتے کرتے بھی پڑ جاتے ہیں ماتھے پہ بل

کتنی اچھوتی تشبیہ ہے کہ پڑھئے اور لطف لیجئے۔ اور اگر تصور بھی ہمرکاب ہو تو پھر دوشیزگی کے سایہ میں انگڑائیاں لیتے ہوئے اکبر الہ آبادی کا یہ شعر گنگنائیے ؎

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں
وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے

مخشب کا ایک شعر ہے ؎

اس جلوۂ رنگیں کے دھوکوں کا اثر تو یہ
ہر منظر رنگیں سے بیزار ہوئی آنکھیں

نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے یہ شعر کس قدر اثر انگیز ہے وہ جو ہندی کی کہاوت ہے کہ "دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کر پیتا ہے"۔ تو مخشب نے اس

حرفِ آخر

مخشب شعر میں سلسل ہیں اور جوانی کی لغزشوں اور ٹھوکروں سے بچ بھی نکلے۔ میرا ایک شعر ہے ؎

اِدھر آئندہ میں اُدھر آزردہ میں
جوانی کی منزل بہت پُر خطر ہے
تو اس منزل پُر خطر میں : ؎
سنبھلے کتنا ہی بچ کر کوئی ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

مخشب کی نطرتِ جوان نے بھی شاعری کی منزل میں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ وہ بھی احتیاط کے باوجود لغزشوں سے نہیں بچ سکے۔ ٹھوکر کھانا بُری بات نہیں ہے بشرطیکہ آدمی ٹھوکر کھا کر سنبھل جائے۔ یقین ہے کہ زندگی کے روشن مستقبل میں مخشب کی شاعری کا رنگ اور زیادہ نکھر جائیگا۔ زندگی کے نئے نئے تجربات اُن کے خیالات میں وسعت اور تعمق پیدا کرینگے۔ زمانہ کی تلخیاں اُن کے دل کو اور زیادہ سوز و گداز عطا کریں گی۔ اُس وقت اُن کی "فکر" پختگی کے اس مقام پر ہوگی جہاں شاعر "انسانیت" کو پیام دیتا ہے اور اُس کے پیام کو سن کر لوگ متوجہ ہو جاتے ہیں کہ زندگی کا کوئی نیا ورق اُلٹا جا رہا ہے۔

میں ان دنوں بہت معروف ہوں۔ سفر اور مسلسل سفر! مشاعروں نے پیر میں چکّر پیدا کر دیا ہے۔ شام دکن میں ہوتی ہے تو تیسرے دن کی صبح دہلی یا لکھنؤ کے جوار میں۔ بنگال سے چلا تو گجرات میں جا کر دم لیا۔ اس عالم میں کسی طویل مضمون لکھنے کی فرصت کہاں بڑی مشکل سے "مشعلِ راہ" پر تھوڑا بہت لکھنے کے لئے وقت نکالا ہے۔ میں نے چند اشارے کئے ہیں جو مجمل ہیں مگر مبہم نہیں ہیں۔ ان اشاروں میں "مشعلِ راہ" کی چند جھلکیاں ہیں۔ اور اُن جھلکیوں کی آڑ سے آپ صاحبِ "مشعلِ راہ" کی شاعرانہ تابانیوں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

قسمت کے کھیل

(از جناب سید نقی حیدر صاحب راہی بلگرامی)

میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ایک ایسے دوست کی تلاش میں برباد کردیا جو صرف عالم تخیل ہی میں سانس لے سکتا تھا۔ میرا منشا صرف اس قدر تھا کہ وہ نہ تو تاجرانہ نظریہ رکھتا ہو اور نہ کسانوں کی طرح اپنے مویشیوں کا نگہبان ہو۔ مگر میرا یہ خواب عرصہ دراز تک شرمندۂ تعبیر نہ ہوا۔ یہاں تک کہ میری بیچ سی بہاریں خزاں میں تبدیل ہوگئیں۔ ایک طویل خوفناک رات کے بعد آخر صبح کے وقت میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جس کو میرا تخیل ڈھونڈ رہا تھا۔ اس میں وہ تمام کمالات تھے جو ایک نیک سرشت انسان میں ہوسکتے ہیں۔ اچھی عادت۔ اچھی خصلت۔ نیک طبیعت۔ پاک سرشت۔ اچھی سیرت۔ اس کے آئینۂ رُخ میں وہ تمام خوبیاں درخشاں نظر آتی تھیں جن کا میں جویا اور متمنی تھا۔ میری نظروں میں اُس کی قدر و منزلت بڑھتی گئی اور اُس نے میرے دل میں ایسا گھر کرلیا تھا جو اب تک کوئی نہ کرسکا تھا۔ مجھے اس سے بے حد محبت تھی اور وہ بھی مجھ پر فدا تھا۔ ہماری محبت کا پیمانہ بالکل صاف و شفاف تھا۔ نہ تو کوئی کدورت تھی اور نہ کھوٹ لیکن افسوس ؎

بات بھی کرنے نہ پائے ہوش سے رخصت طلب
دل کا دل ہی میں رہا جاتا ہے ارمان حیات

زمانے کی گردش نے اپنا رنگ دکھایا اور ہم دونوں بچھڑ گئے۔ میرا تبادلہ ایک دوسرے شہر میں ہوگیا۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ مجھے اس عزیز دوست کو چھوڑنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ سوائے دوست کے بچھڑنے کے مجھے کوئی غم نہ تھا۔ ایک مدت تک خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر اس میں کمی آنے لگی۔ اور پھر ایک ایسا وقت آیا کہ بالکل ہی بند ہوگئی۔ مجھے اس کا سخت صدمہ اور رنج تھا۔ مجھے اس کی دوستی میں شبہ ہونے لگا۔ اس کی اس بیباک خاموشی نے مجھ پر بڑا اثر کیا۔ اور میرا دل اسکی طرف سے آہستہ آہستہ منحرف ہونے لگا۔ جب کبھی میں اس کے پاس جانے کا ارادہ کرتا تو ایک نامعلوم تاریک غم مجھے جانے سے روک دیتا۔ اور میں رک جاتا۔ اور میں ایسا کھو جاتا کہ مجھے اپنی ذات کا بھی ہوش نہ رہتا۔

جب میرا کام ختم ہوگیا تو مجھے اپنے وطن مالوف کو لوٹ جانا پڑا۔ گو کہ میرا دل اسکی طرف سے شک و شبہ کی وجہ سے منحرف ہوگیا تھا۔ پھر بھی دبی ہوئی محبت کی چنگاری وطن کی پُر کیف ہوا سے بیدار ہوگئی۔ اور جذبۂ محبت مجھے کشاں کشاں اس بیوفا دوست کی طرف لے چلا۔ چنانچہ رات کے ابتدائی حصہ میں اس کے عشرت کدہ پر گیا۔ مگر صد حیف میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جس کے لئے میں تیار نہ تھا۔ میں نے اس گھر کو ایک چھوٹی سی جنت کی شکل میں دیکھا تھا۔ جہاں خوش نصیبی اپنی تمام دل فریبیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ اس میں رہنے والوں کے شاداب اور حسین چہروں پر مسرت اور نشاط کی لہریں دوڑا کرتی تھیں۔ آج میں اسکو جس حالت میں دیکھ رہا تھا اُس کے دیکھنے کی تاب نہ تھی۔ کاش کہ میں دیکھنے سے پہلے اندھا ہو جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں ایک سنسان اور وحشت ناک قبرستان میں آگیا ہوں۔ جہاں نہ کوئی سننے والا ہے اور نہ کوئی بولنے والا۔ نہ کہیں آدم زاد کی شکل نظر آتی ہے اور نہ کسی گوشہ میں چراغ جلتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک طویل اور بھیانک خاموشی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ میں نے سوچا شاید میں گھر بھول گیا ہوں۔ مگر میرا یہ اندیشہ غلط تھا۔ یکایک مجھے ایک چھوٹے سے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد ایک ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور ایک چھوٹا سا غلوک الحال بچہ باہر آیا جس کے ہاتھ میں ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ تھا اور اُس کے ہم پیچھے پیچھے ہٹا سہے تھے۔ میں نے چراغ کی روشنی میں غور سے اس بچہ کی شکل کو دیکھا۔ اُس کے چہرے میں مجھے باپ کی شباہت نظر آئی۔ اور میں نے اسے پہچان لیا کہ یہ وہی ناز پروردہ بچہ ہے جو کل اس گھر کا پھول اور چودھویں رات کا چاند تھا۔ میں نے اُس سے اُس کے باپ کا حال پوچھا۔ اُس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور چراغ لیکر میری رہنمائی کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک خراب و خستہ غبار سے اَٹے ہوئے کمرے میں مجھے لے گیا جس کی کرسیاں اور پردے پُرانے ہو چکے تھے۔ اور دیواروں پر کچھ اس قسم کے نشانات پڑ گئے تھے جیسے بدنصیب عورتیں اپنے ہاتھوں پر گودنے کے نشانات کرواتی ہیں۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں ہم نے بارہا عیش و عشرت کی راتیں بسر کی تھیں۔ اور خوش نصیبی کے بارہ چاند دیکھے تھے۔ لڑکے سے مختصری گفتگو کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہوگئے۔ اور مجھے معلوم ہوگیا کہ اس کا باپ اب تک گھر واپس نہیں آیا ہے۔ عنقریب ہی آنے والا ہے۔ وہ طفل مجھے چھوڑ کر اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا اور کہنے لگا۔

"میری والدہ میرے باپ کے متعلق آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔"

غزل

از جناب نواب جعفر علی خاں صاحب آثر لکھنوی - ہوم منسٹر کشمیر

روداد محبّت نہیں اب اس کے سوا یاد
سو بار بھلایا اُسے، سو بار کیا یاد

پامالیٔ حسرت کا گلہ کیجئے کیونکر
اک وعدہ پشیماں کا ہے اندازِ حیا یاد

دِل مائلِ فریاد ہے، خاموش زباں ہے
کرتا ہوں ستم یاد تو آتی ہے وفا یاد

ہاں سچ ہے کہ بے مہر ہے، کیا کیجئے لیکن
جب اُس کو بھلاتا ہوں تو آتا ہے سوا یاد

کہتا ہے اگر یاد دلاؤ کوئی وعدہ
"کیا یاد ہے، کیا یاد ہے، کیا یاد ہے، کیا یاد"

آئینِ وفا مجھ سے بھلائے نہیں جاتے
ورنہ ہے ترے شکوہ بے جا کا مزا یاد

ہمدم اِسی اُمید میں اک عُمر گذاری
پھر مجھ کو نہ اُس نے کبھی بھولے سے کیا یاد

تصویر تھی جو حُسن کے بے ساختہ پن کی
اب تک ہے ستمگر کی وہ مستانہ ادا یاد

تو عشق کے اسرار کا محرم نہیں زاہد
اس راہ میں ہر گام پہ آتا ہے خدا یاد

ساغر کی طرح خون کھنکتا تھا رگوں میں
آتا ہے وہی دور مئے ہوش رُبا یاد

کم ہو نہ کبھی نشۂ صہبائے محبت
مستوں کو نہیں اس کے سوا اور دعا یاد

کیا کیا نہ آثر خوار ہوئے عشق کے ہاتھوں
سُنتے ہیں کہ اب کی ہے فقیروں کی صدا یاد

ایک سانحہ

(از فصیح الدین احمدؐ)

جون ۱۹۲۶ء کا ذکر ہے۔ میں بی اے کا امتحان دیکر فارغ ہوچکا تھا۔ مگر امتحان کا نتیجہ ہنوز برآمد نہیں ہوا تھا۔ گرمی کے دن تھے۔ لوئیں خوب چل رہی تھیں۔ سہ پہر کو کالج کے کھیلنے کے میدان میں روز جاتا تھا۔ شام تک کرکٹ ہوتا۔ پھر قدسیہ باغ سے نکل جمنا کے کنارے جا پہنچتا تھا۔ اور دس پندرہ منٹ جمنا میں نہاکر واپس گھر لوٹ آتا تھا۔

انہی دنوں کالج کا ایک مسلمان طالبعلم جو حافظ قرآن بھی تھا۔ اور بی اے میں پڑھتا تھا عیسائی ہوگیا۔ ہم میں سے کوئی اور اگر عیسائی ہوجاتا تو اتنا افسوس نہ ہوتا۔ جتنا اس شخص کی حرکت سے ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ یہ نہ صرف حافظ قرآن تھا، بلکہ صوم وصلوٰۃ کا بھی پکا تھا۔ اور حتی الامکان ہر نماز باجماعت پڑھتا تھا۔

جب اس سانحہ کی خبر ملی تو مجھے بہت افسوس ہوا۔ میں، اشتیاق حسین قریشی، جو اب ڈاکٹر قریشی ہیں اور ایک مقامی کالج میں پروفیسر ہیں اور عبدالجبار غازی جو اب کسی مقامی سکول میں ہیڈ ماسٹر ہیں، تینوں نے باہم مشورہ کیا اور یہ رائے قرار پائی کہ دوسرے دن صبح سات بجے کی ٹرین سے پانی پت جاکر اس طالبعلم کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی جائے۔ چنانچہ دوسرے دن ہم لوگ پانی پت دوپہر کے قریب پہنچے۔ مولانا حالی کے خاندان کے ایک بزرگ جو ان دنوں ہندوستانی دواخانہ دہلی میں منیجر تھے۔ اتفاق سے وہ بھی ہم سفر تھے۔ راستہ میں جب ہم لوگوں کے پانی پت جانے کی وجہ ان کو معلوم ہوئی تو سٹیشن سے نکلتے ہی وہ ہمیں اصرار کے ساتھ کھانے کیلئے اپنے مکان پر لے گئے۔ جہاں پہلی بار میں نے خواجہ غلام السیدین کو دیکھا۔ جو ان دنوں چھٹیوں میں علی گڈھ سے گھر آئے ہوئے تھے۔ کھانا کھاکر ہم منزل مقصود پر پہنچے بارہ بجے سے لے کر شام کے سات بجے تک سرمارا۔ مگر صدائے برنخاست۔

آخر ہم ہار جھک مارکر واپس دہلی لوٹے۔

دن بھر کی تکان تھی۔ تینوں نے سوچا کہ جمنا چل کر نہانا چاہیئے۔ چنانچہ سٹیشن سے ہم تینوں کالج کے میدان سے ہوتے ہوئے جو کشمیری دروازہ کے باہر ہے جمنا پہنچے۔ کالج کے میدان سے ایک اور طالب علم جس کا نام انیل تھا ہمارے ساتھ ہوگیا۔ جب ہم جمنا کے کنارے جاکر کھڑے ہوئے اور کپڑے اتارنے شروع کئے تو میرے تینوں ساتھیوں نے کہا۔ "آج دریا میں پانی زیادہ معلوم ہوتا ہے اور روانی بھی تیز ہے۔ اتفاق سے میں ان سب میں بہتر تیرنا جانتا تھا۔ اس لئے میں نے ان سب کو روکا اور پہلے خود دریا میں کود پڑا۔ کودنے کے بعد کوئی پندرہ گز کے فاصلے پر جاکر میں نے پاؤں ٹکانے چاہے۔ کیونکہ ایک دن پہلے اس جگہ صرف کمر تک پانی تھا۔ مگر اب جو پاؤں ٹکانے کی کوشش کرتا ہوں تو پانی ہونٹوں تک آپہنچا۔ میں نے پھر تیرنا شروع کیا اور وسط دریا میں جا پہنچا۔ اس مقام پر صرف ٹخنے ٹخنے پانی ہوتا۔ مگر اس وقت یہاں بھی قد آدم پانی تھا۔ اور روانی بہت تیز تھی۔ اب میں پریشان ہوگیا۔ میں نے احتیاطاً جو میرے ساتھی سامنے دریا کے کنارے کھڑے ہوئے تھے۔ ان کو Help ، Help کہکر پکارنا شروع کیا۔ ستم ظریفی دیکھئے۔ وہ لوگ یہ سمجھے کہ میں انہیں دریا میں اترنے کو بلا رہا ہوں۔ چنانچہ انہوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر پانی میں اترنے سے انکار کردیا۔ اب میری طاقت جواب دے چکی تھی۔ واپس ساحل پر پہنچنا ناممکن نظر آتا تھا۔ اس لئے میرے سامنے موت کا نقشہ پھر گیا۔ اس دوران میں میں نے دو تین غوطے بھی کھائے۔ یہ حال دیکھکر ہمارا عیسائی ساتھی انیل دوڑا اور گھاٹ پر دور جو چند آدمی نہارہے تھے۔ ان سے مجھے بچانے کی درخواست کی۔ وہ لوگ بنگالی تھے۔ نہا دھوکر اپنے کپڑے نچوڑ رہے تھے۔ انسانی ہمدردی کی خاطر ان میں سے دو آدمیوں نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر مجھے نکالنے کی کوشش کی۔ اور فوراً تیرتے ہوئے میرے قریب آگئے۔ ایک نے دھوتی میرے پاس پھینک دی۔ میں نے دھوتی کا سرا خوب مضبوط دونوں ہاتھوں سے پکڑلیا۔ لیکن چونکہ پیٹ میں کافی پانی بھر چکا تھا۔ اس لئے اپنے وزن کو پانی پر سنبھال نہ سکا اور پھر غوطے کھانے لگا۔ ان میں سے ایک آدمی میرے قریب آیا۔ اور اس نے مجھے پھر کمر پکڑکر اوپر

کو اُبھارا۔ اب میں نے دوبارہ دھوتی پکڑلی۔ پیچھے سے ایک آدمی مجھے سہارا دیے رہا تھا۔ اور آگے سے دوسرا شخص مجھے کھینچ رہا تھا۔ غرض زندگی تھی جو میں دریا میں سے صحیح سالم باہر نکل آیا۔ اور کنارے پر کوئی آدھے گھنٹے تک بے ہوش پڑا رہا۔ جب ہوش آیا تو میں نے اشتیاق سے کہا کہ وہ میرے نامعلوم محسنوں کا نام اور پتہ دریافت کرلیں۔ مگر وہ لوگ جا چکے تھے۔

وہ دن اور آج کا دن میں نے برابر جستجو جاری رکھی کہ خدا کے بعد جن لوگوں نے میری جان بچائی تھی اُن کا شکریہ ادا کروں مگر آج تک کامیاب نہ ہوسکا۔

غزل

(از جناب فراق گورکھپوری)

اس سکوتِ فضا میں کھوجائیں
آسمانوں کے راز ہو جائیں

کیا عجب تیرے چند تر دامن
سب کے داغِ گناہ دھو جائیں

حال سب کا جُدا جُدا ہی سہی
کس پہ ہنس جائیں کس پہ رو جائیں

راہ میں آنے والی نسلوں کے
خیر کانٹے تو ہم نہ بو جائیں

کچھ تو رُسوائیوں کا نام اُٹھے
عشق میں آبرو ڈبو جائیں

آؤ اس تنگنائے دُنیا کی
وسعتِ بیکراں میں کھو جائیں

زندگی کیا ہے، آج اسے اے دوست
سوچ لیں اور اُداس ہو جائیں

رات آئی فراق! دوست نہیں
کس سے کہئے کہ "آؤ سو جائیں"

فردوس

(اُس کے اِمتحان بی، ٹی پاس کرنے پر)

(از نجمہ تصدق)

اے مری فردوس! اے میری بہن پیاری بہن!
تجھ سے وابستہ مری کتنی اُمیدوں کے چمن

جھلملاتا ہے تری آنکھوں میں مثلِ شمعِ طُور
میرے دل میں پرورش پاتی اُمیدوں کا سرور

نکھری نکھری تیری پیشانی پہ مانندِ سحر
میری شب بیدار راتوں کی دُعاؤں کا اثر

تیری ہی ہستی تو ہے جس کو تا حدِ کمال
جانِ نجمہ، پوچھتے ہیں میرے وارفتہ خیال

گو جُدا رکھتی ہوں تجھ سے اپنا جسمِ آب و گِل
تیرے پیکر میں دھڑکتا ہے مگر میرا ہی دل

گو تری اِس کامیابی پر بہت مسرور ہوں
ہاں مگر کچھ سوچنے کے واسطے مجبور ہوں

ہوگئیں تازہ، خوشی کی ساعتوں کے درمیاں
آرزوؤں کی شکستیں، زندگی کی تلخیاں

سوچتی ہوں، اے مری ماں جائی! اے پیاری بہن!
(تجھ سے وابستہ مری کتنی اُمیدوں کے چمن)

گھرے گھرے آہ! یہ افلاس کے سائے کہیں
گردِ غم سے زرد نہ کردیں تری روشن جبیں

تیرے فردوسی تخیل پر نہ آجائے خراش
کھا نہ جائے تجھ کو بھی میری طرح فکرِ معاش

ہوگئی جس لمحہ تحصیلِ معیشت میں اسیر
بجھ کے رہ جاتا ہے اک عورت کا نُورانی ضمیر

عورت از سر تا قدم اک پیکرِ جذب و سرور
ایک پُر افشاں سا نغمہ، ایک متبسم سا نُور

لالہ و گُل کی جوانی، ماہ و انجم کی بہار
شعر و موسیقی کی مستی، نُور و نکہت کا خُمار

صُبح کی ٹھنڈی لچکتی چاندنی کی پاک ضَو
مستی و وارفتگی کی والہانہ ایک رَو

سوزِ شاعر کے نفس کا، قلبِ مضطر کا گداز
نکہتِ گُل کی طرح آوارہ و سرمست راز

ایک جادُوِ فنِ مصوّر کا چمکتا سا خیال
ایک افسوں کارِ شاعر کی عقیدت کا کمال

افسانۂ ماضی

(لارڈ بائرن کے احساسات واٹرلو کو دیکھ کر)

از محترمہ اختر قریشی بی، اے، بی، ٹی

آیئے چند لمحات کے واسطے واٹرلو کے میدانِ کارزار پر ٹھہر جائیں۔ اُف! یہی تو وہ مقام ہے۔ جہاں نپولین کی عظیم الشان فرانسیسی سلطنت کا اختتام ہوا تھا۔ لیکن تعجب ہے کہ یہاں اس خونریز لڑائی کا کوئی بھی یادگار نہیں۔ جس پر آنے والی نسلیں فخر کریں۔ یہاں تو خالی میدان پڑا ہے۔ اُجاڑ اور ویران ...... المناک اور اداس فضا...... خاموش سرِ بلند درخت...... کیا پوچھیں اور کس سے پوچھیں؟

اے مادرِ گیتی تو ہی کچھ بتا! تیرے ہزاروں بہادر بچوں نے اس جگہ وطن اور قوم کی محبت میں اپنی جانیں قربان کر دیں لیکن تو نے ایک دن بھی ان کا ماتم نہ کیا۔ تیرے جگر گوشوں نے اپنے خون کا چھڑکاؤ تیرے سینے پر کیا۔ اور تیرے منہ سے آہ بھی نہ نکلی۔ تجھ جیسی سنگدل ماں تو اس عالم میں کوئی دوسری نہ ہوگی۔ غضب ہے کہ تیرے جگر کے ٹکڑوں کا خون تیرے لئے بہے اور تو اُف بھی نہ کرے...... ایک آنسو تیری آنکھ سے نہ نکلا۔ کیا ان کی جانوں کی قربانی کا یہی صلہ ہے کہ اُن کا نام اس جہان سے مٹ جائے اور تو انہیں بھول کر بھی یاد نہ کرے۔

...... وہ نونہال تیری ہی گود میں تو پل کر جوان ہوئے تھے! تیری ہی چھاتی پر کھیل کود کر پروان چڑھے تھے!!! اور جب اے ماں! تیری ہی لاج، آن بان عزت اور نام کی خاطر اپنے سر خوشی اور فخر سے قربان کر دیئے۔ اُن کے دل میں جوش تھا اور سینے میں مادرِ وطن کی محبت!! اُن کے فولادی بازوؤں میں بل تھا! جوان خون رگوں میں دوڑ رہا تھا۔ غیرت اور حمیت کا سمندر جوش میں آگیا۔ اور تیرے تقدس کی خاطر ان جوشیلے نوجوانوں نے تلواریں نیام میں سے نکال لیں۔ اور دشمن پر پوری قوت سے ٹوٹ پڑے۔ لوہے سے لوہا بجا... میدانِ جنگ میں خون کی کیچڑ ہوگئی.... لیکن تیرے سپوت مقابلے میں جمع دشمن کے خون سے ہولی کھیلتے رہے.... ان کے زرہ بکتر خون سے رنگین تھے۔ اور تلواروں سے خون کے قطرے ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔ لیکن جب تک ان بہادروں کے سانس چلتے رہے اُس وقت تک اُن کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی.... گولیوں کی بوچھاڑ میں دشمن کی صفیں کی صفیں کاٹ کر رکھ دیں اور ساتھ نہ رُکے..... جنگ کے میدان میں وہ کارنامے دکھائے جن کی داستانیں دُنیا کی تاریخ میں سونے کے حروف سے لکھی جائیں گی۔ اور جب وہ دشمن کی گولیوں کا نشانہ بن کر خاک پر ڈھیر ہو جاتے تھے۔ تو اُن کی نیم وا آنکھیں اپنے ساتھیوں کو یہی پیغام دیتی تھیں......

"دیکھو مادرِ وطن پر آنچ نہ آنے پائے"...... اور ایسا ہی ہوا......

اے ماں! تیرے سورماؤں نے تجھ پر آنچ نہ آنے دی...... وہ تیری بھینٹ چڑھ گئے..... لیکن حیرت تو یہ ہے کہ تیری آنکھ سے آنسو نہ نکلا.... ماتم تو کرنا کجا.... تو ایک دن اداس بھی نظر نہ آئی..... بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے خون سے زرخیزی میں ایسا اضافہ ہوا کہ تیری سرسبزی اور شادابی میں روز افزوں ترقی ہی ہوتی گئی۔ اپنے بچوں کے خون سے تجھے ہی پھولتے پھلتے دیکھا۔

عبرت کا مقام ہے کہ اتنی بڑی لڑائی کہ جس نے ایک وسیع سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا اس کا کچھ بھی نشان اس سرزمین پر باقی نہیں..... اگر انسان کا یہی انجام ہے تو ان لڑائی جھگڑوں سے کیا فائدہ......

آیئے ذرا اس لڑائی کی سوگوار یاد تازہ کر لیں۔

۱۶ جون ۱۸۱۵ء کی ایک حسین و دلفریب شام تھی۔ بلجیم کے دارالخلافہ برسلز میں ایک شاندار محفلِ رقص و سرود ہونے والی تھی، مرد عورتیں لڑکے لڑکیاں سبھی محفل میں جانے کیلئے آراستہ ہو رہے تھے۔ ہر شخص بے انتہا مسرور تھا۔ لڑکیاں اس رنگین شب کی بے تابی سے منتظر تھیں۔ جب کہ جمیل و رعنا نوجوانوں کی نگاہیں ان کے دلربا چہروں پر جمی کی جمی رہ جائیں گی۔ ناز و انداز کے مظاہرے کے لئے اس سے زیادہ بہتر موقعہ اور کون سا ہو سکتا تھا۔ آخر کار انتظار کی طویل گھڑیاں ختم ہو گئیں۔ وقت معینہ پر رقص گاہ کے دروازے پر شاندار گاڑیوں کا تانتا لگ گیا۔ برسلز کی حسین ترین دوشیزائیں کھنچ کھنچ کر رقص گاہ کی جانب آنے لگیں۔ یکایک دلفریب نغموں سے رقص گاہ کی فضا میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ تیز روشنی سے رقص گاہ جگمگا رہی تھی۔ فضا نکہت بیز تھی بیش بہا قیمتی جھلملاتے ہوئے ملبوسات کی چمک دمک نے ایک عجب کیفیت پیدا کر دی تھی۔ نوجوانوں کی مشتاق نظریں پھول سے رخساروں پر شرم و حیا کا غازہ مل رہی تھیں۔ اپنے حسن و جمال کی تعریف سن کر ماہ جبینوں کا تیز تیز تنفس، زیرِ لب مسکراہٹ اُن کے چہروں کو اور بھی دلفریب بنا رہی تھی۔ بالآخر رقص شروع ہوا۔ بلند و بالا خوبرو منچلے نوجوان، مرمریں بازوؤں والی سیمیں تن عشوہ طراز نازنینوں کی زریں کمر کو حلقے میں لے کر رقص کرنے لگے۔ فضا میں بدمستی سی چھانے لگی۔ زندگی اور مسرت ذرہ ذرہ میں بھر گئی۔ نقرئی قہقہوں اور تالیوں تحسین و آفریں کے

غلغلوں۔ ریشمی لباس کی سرسراہٹ اور نغمات کی سُریلی تانوں نے ہر ایک کو تخیل عالم سے بے نیاز کر کے بیفکری کی دُنیا میں پہنچا دیا تھا مستی سے بھرپور قدم خوش آئند نغمے کی گت کے ساتھ ساتھ اُٹھنے لگے۔ سب کا یہی خیال تھا کہ انہی رنگ رلیوں میں شب بسر کی جائے۔

اس مسرت کے فلک شگاف قہقہوں سے اس ایوان نشاط کے بام و در گونج ہی رہے تھے اور یہ رنگ رلیاں بہار ہی پر تھیں کہ زور سے ایک دھماکے کی آواز آئی۔ ۔ ۔ ۔ سب چونک پڑے ۔ ۔ ۔ ۔ باجے کی گت پر تھرکنے والے قدم اپنی اپنی جگہ پر ساکت ہو گئے۔ مسرت کے فلک شگاف نعرے ایک دم دھیمے پڑ گئے۔ مے نشاط کے مخمور متوالے خوف و ہراس سے ایک دوسرے کی طرف تکنے لگے۔ ۔ ۔ نشیلی آنکھوں والی حسین دوشیزاؤں کی چاند سی پیشانیوں پر فکر کی گھٹائیں چھا گئیں ۔ ۔ ۔ معنی خیز نگاہوں سے وہ باہر کی جانب دیکھنے لگیں۔ کسی نے کہا کہ گاڑی کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ ہے۔ یہ سُنکر ان کے ہراساں چہروں پر پھر شادابی کی لہر دوڑ گئی۔ اور بدستور سابق رنگ رلیوں میں مصروف ہو گئے۔ لیکن دوبارہ پھر وہی دھماکہ ہوا۔ اور اب کی مرتبہ بہت صاف تھا۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا آواز صاف اور زور سے آنے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

اور اب حقیقت اچھی طرح ان پر واضح ہو گئی کہ بلاشبہ یہ طوفانی گرج اور دھماکا غنیم کی توپوں کے چھوٹنے کی آواز ہے!!! ایوان نشاط میں کھلبلی سی مچ گئی۔ آنے والے خطرے کے تصوّر سے خون اُن کی رگوں میں منجمد ہونے لگا۔ حسینان برسیلز کے چہرے جن پر ابھی خوشی سے خون دوڑ رہا تھا۔ خوف سے سفید پڑ گئے۔ نشیلی آنکھوں کی چمک دمک معدوم ہو گئی۔ اور اُسکی جگہ خوف و ہراس نے لے لی۔ یاقوتی لب گُلاب کی پتی کی طرح تھرتھرانے لگے۔ محفل نشاط ایک دم درہم برہم ہو گئی۔ رقص کرنے والے حسین جوڑے حسرت بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھتے ہوئے رخصت ہو گئے۔ کیونکہ اب جدائی کا وقت آپہنچا تھا۔ نوجوانوں کو اپنے عزیزوں، ماں باپوں اور دوستوں کو الوداع کہنا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ وہ ان کی عزیز صورتیں پھر کبھی دیکھ سکیں گے۔ جبکہ ایسی خوبصورت رات کے بعد ایک ایسا ہیبت ناک دن نکلا، جو خواب و خیال میں بھی نہ تھا۔

آخر کار وطن کی محبت عزیزوں کی محبت پر غالب آئی۔ جذبۂ غیرت جوش میں آیا۔ اور انہوں نے ہمیشہ کے لئے اپنے گھر بار اور سب عزیزوں کو الوداع کہا۔ ماؤں نے اپنے جگر گوشوں کو، بہنوں نے اپنے عزیز بھائیوں کو کانپتے ہوئے ہونٹوں، نمناک آنکھوں اور غمگین دلوں کی آہوں کے ساتھ رخصت کیا۔ نئی نویلی دُلہنوں کی حالت دگرگوں تھی۔ شدت گریہ سے سُرخ آنکھیں تھرتھراتے ہوئے لب۔ شب کی رنگ رلیوں کا شاہد پھیکا پھیکا سنگھار، خوف و ہراس سے کپکپاتے ہوئے قدم۔ قوت گویائی شدت غم سے سلب گویا سکتہ سا ہو گیا ہو۔ حسرت بھری آنکھیں نظروں ہی نظروں میں نہ جانے کیا کیا پیغام دے رہی تھیں۔ رنج و غم سے نوجوانوں کا بھی کلیجہ پھٹا جاتا تھا۔ بار بار مڑ مڑ کر وہ اپنے گھروں کو دیکھتے اور لوٹ لوٹ کر بیوی بچوں سے ملتے۔ اور اُن کی ڈھارس بندھاتے۔ گو اپنے دل کا خدا ہی حافظ تھا۔ غرض اس طرح جیسے جسم انسانی سے گوشت جدا ہو۔ وہ اپنے عزیزوں سے جدا ہوئے۔

فوج کو ہتھیار بندی کا حکم دیا جا رہا تھا۔ سپاہیوں نے اپنی اپنی بندوقیں، تلواریں اور ڈھالیں سنبھالیں۔ کیا سوار اور کیا افسر سب زرہ بکتر پہن گھوڑوں پر سوار پو پھٹنے سے پہلے ایک جگہ جمع ہو گئے۔ فوج کی صف بندی دھڑکتے ہوئے دلوں کے ساتھ شروع ہو گئی۔ اب توپوں کی آوازیں بالکل قریب آ گئی تھیں۔ مشہور فاتح نپولین کی فوج آگے بڑھتی چلی آ رہی تھی۔

توپوں کی آوازوں نے سوتے ہوئے شہریوں کو بھی جگا دیا۔ وہ سب گھر سے نکل کر باہر کھڑے ہو گئے۔ خوف سے اُن کے چہرے زرد اور ہونٹ سفید پڑ رہے تھے۔ اور مُنہ سے آواز تک نہ نکلتی تھی۔ آہستہ آہستہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہے تھے کہ "دشمن آ گیا۔ دشمن آ گیا"

صبح کا سہانا وقت تھا۔ لیلائے شب اپنی زلفیں سمیٹ کر رخصت ہو چکی تھی۔ اور خورشید خاور اپنی سُنہری کرنوں سے عالم کو منور کر رہا تھا۔ فوجیں تیار ہو کر دشمن سے مقابلہ کیلئے جا رہی تھیں۔ ہر طرف ایک سناٹا اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ درختوں کی ڈالیاں آہستہ آہستہ جھوم رہی تھیں اور اُن پر شبنم کے قطرے ایسے معلوم ہو رہے تھے گویا کہ قدرت نے ان نوجوانوں کی آنے والی موت پر آنسو بہائے ہیں جو اس وقت ہمت اور فتح کی اُمیدیں دل میں لئے، غرور سے سر اُٹھائے، سبزہ کو پاؤں سے روندتے ہوئے لڑائی کے میدان کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ لیکن آہ! یہی گھاس ان پر اُگے گی۔ جبکہ وہ گھاس ہی کی مانند کٹ کٹ کر اُس سرد و سخت زمین پر گریں گے۔

کیا خبر تھی کہ دم کے دم میں واقعات یوں پلٹا کھائیں گے۔ جنگ سے پہلے شام کو یہی نوجوان سورما زندگی اور مسرت سے بھرے ہوئے رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ اُن کے دل فکروں سے آزاد تھے۔ ان کے مسرت کے فلک شگاف نعروں اور حسینوں کے نقرئی قہقہوں نے ایوان نشاط کو جنت کا نمونہ بنا رکھا تھا۔ آدھی رات کو توپوں کی آواز نے ایک دم اُن کو آنے والے

خطرہ سے آگاہ کیا۔ اور اپنے عزیزوں اور ہر اُس شے سے جو اُنہیں پیاری تھی جُدا ہوکر دن نکلنے سے پیشتر ہی مسلح ہوکر لڑائی کے میدان "واٹرلو" پر آگئے .... اُن کے بازو فولادی تھے۔ اور عزم آہنی.......

اور دل میں جوش کا دریا موج زن..... فتح نصرت کی اُمیدیں لئے ہوئے وہ غنیم سے مقابلے پر جم گئے...... پھر توپوں نے گرجنا شروع کیا ...... اور گھمسان کی لڑائی شروع ہوگئی................

سورما کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ تلواروں کی جھنکار، توپوں کی گرج۔ گھوڑوں کا تھرکھا کھاکر ہنہنانا۔ سب کچھ مل کر قیامت کا نمونہ پیش کر رہا تھا.......

میدان کارزار پر گرد و غبار کی تاریک چادر چھائی ہوئی تھی۔

اور جب لڑائی ختم ہوئی تو میدان میں لاشوں کے پُشتے لگے ہوئے تھے۔ زخمیوں کے سسکتے ہوئے جسم۔ عالم نزع میں زخمی سپاہیوں کی دلدوز چیخیں۔ کٹے ہوئے اعضاء۔ موت کی تباہی کے شاہد تھے۔ خون کے دریا بہہ رہے تھے۔ گھوڑے اور سوار...... دشمن اور دوست..... بوڑھے اور جوان سب خون میں لت پت کٹے پڑے تھے .... یہ ہے اِس میدان جنگ کی داستانِ المناک جس کا اب بھی کوئی نشان باقی نہیں۔

میرے لئے!!

(از محترمہ بیگم)

چھا رہی ہیں چار سو بے کیفیاں میرے لئے
یاس سے معمور ہے سارا جہاں میرے لئے

نوحہ گر بادِ صبا ہے اور شبنم اشک بار
غم زدہ سی ہے بہارِ گلستاں میرے لئے

پھول افسردہ ہیں مرجھائی ہوئی ہے ہر کلی
کررہی ہیں بلبلیں آہ و فغاں میرے لئے

جس طرف دیکھو نظر آتی ہے ہر شے سوگوار
جلوہ گر ہیں ہر طرف مایوسیاں میرے لئے

منحصر ہے بر نہ آنے پر حیاتِ آرزو
کامیابی ہیں مری ناکامیاں میرے لئے

اِس مسلسل کشمکش ہی میں ہے لطفِ زندگی
پھر مزا کیا، ہوں اگر آسانیاں میرے لئے

آگاہ نہ تپ درون را

(از محترمہ صالحہ عابد حسین)

قسط دوم

ماجد کسی وجہ سے شادی میں نہیں آسکا شادی ہوگئی اور محسن کو اپنی دلہن حد سے زیادہ پسند آئی۔ شادی کے دو مہینے بعد جو خط اُس نے ماجد کو لکھا وہ بھی اس میں موجود ہے۔ لو سنو!

"میرے پیارے دوست! تمہاری شکایت سر آنکھوں پر کہ میں نے اتنے دن سے خط نہیں لکھا گر مجھے اُمید ہے کہ تم مجھے خوشی سے معاف کردوگے تم مجھ سے اپنی بھابی کے متعلق پوچھتے ہو کہ کیسی ہیں؟ پسند آئی یا نہیں؟ کوئی اور پوچھتا تو سوا خاموشی کے کوئی جواب نہ ملتا۔ مگر تم میرے دوست اور راز دار ہو۔ تم سے کیسی شرم۔

ناصرہ کو جب میں نے پہلے پہل دیکھا تو چند لمحے کے لئے سکتے میں آگیا۔ ماجد! میں نے کبھی کسی عورت کو نظر بھر کر دیکھا ہی نہیں تھا۔ اُسے نہ میری طبیعت پسند کرتی تھی اور نہ میرا دل ہی چاہتا تھا۔ لیکن ناصرہ میری اپنی تھی۔ خدا رسول اور بزرگوں کی اجازت سے مجھے ملی تھی۔ شاید اس لئے کہ عمر میں پہلی عورت وہی ہے جس سے مجھے دلچسپی ہوئی وہ مجھے بے حد حسین معلوم ہوتی ہے۔ اسکی بڑی بڑی خواب آلود آنکھیں، سُرخی مائل گندمی رنگ، چھوٹا سا خوبصورت دہن اور صراحی دار لمبی گردن، بھرا بھرا ڈیل اور لمبے لمبے بال۔ اس سے زیادہ حسین بیوی کسی کو ملی ہے۔ مجھے تو یقین نہیں آتا۔ پھر ایسی سیدھی، شریف، نیک دل اور بے زبان ہے کہ کیا بتاؤں۔ آپ کے ہر حکم پر سر جھکانا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ میں اس کی ناز برداری کرنا چاہتا ہوں۔ مگر وہ میرے چشم و ابرو کے اشارے پر چلنے کو تیار اور ہر خدمت کو حاضر ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ میں بھی انسان ہوں۔ میرے اندر بھی خون اور حرارت ہے۔ میری دُنیا بھی رنگین اور دلکش ہے۔ امجد! میں آج کل اپنے کو دُنیا کا خوش نصیب ترین انسان سمجھتا ہوں۔ جسے یہ دولت بے بہا ملی۔ مگر میری کم نصیب دُلہن! اُسے مجھ سے بیاہ کرکے کیا حاصل ہوا۔ وہ اس قابل تھی کہ بہترین سے بہترین ملبوسات، اعلیٰ سے اعلیٰ زیورات میں سجی بنی رہتی۔ عمدہ سے عمدہ غذا کھانے کو اور نوکر خدمت کیلئے حاضر رہتے لیکن اسکی قسمت پھوٹی۔ ایک مجھ جیسے نادار اور چالیس روپے کی آمدنی والے سے بیاہ دی گئی۔ اور چھوٹے موٹے کام تلاش کرتے ہیں۔ اور ہر طرح ناصرہ کو خوش رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔ وہ خود بہت قانع اور صابر لڑکی ہے۔ مجھ سے کبھی کوئی فرمائش یا شکایت نہیں کرتی۔ مگر میں اپنے دل کو کیا کروں؟

تم کہوگے کہ اس نے بیوی کی تعریف کے پل باندھ دیئے۔ نہیں بھائی یہ جھوٹی تعریف نہیں۔ اور پھر میرے نقطۂ نظر سے دیکھو جسے عمر میں پہلی مرتبہ کسی سے دلچسپی یا محبت ہوئی۔ پہلی مرتبہ۔ تمہارا محسن"

محسن کی گرویدگی کو ہر شخص حیرت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ بہن خوش تھیں کہ ان کا انتخاب اس قدر کامیاب رہا محسن کا مُرجھایا ہوا چہرہ اب شگفتہ اور ہنستا نظر آتا۔ ان چار ماہ میں اس کو معمولی نزلہ تک نہیں ہوا۔ لیکن ایک تازہ آفت نے محسن کو اس حسین خواب سے جگا دیا۔ اور وہ تھا قرض کا تقاضہ۔ محسن سخت پریشان ہوا۔ بہن نے سنا وہ بھی متفکر ہوگئیں کچھ سمجھ میں نہ آیا تو ہار کر کہا دُلہن کا زیور لیکر قرض ادا کردو۔ اور کیا ہوسکتا ہے۔ لیکن محسن نے یہ کسی طرح گوارا نہ کیا۔ جس کی یہ آرزو ہو کہ بیوی کو نت نئے زیور بنا کے لادوں وہ بھلا یہ کیسے کرسکتا تھا۔ بہن نے کہا اللہ کریگا ہاتھ فراغ ہوجائے گا تو دُگنا بنوا دینا۔ پر محسن نہیں مانا۔ اُداس ہوکر بولا۔ مجھ سے ان کا رنجیدہ چہرہ اور ننگے ہاتھ کان نہیں دیکھے جائیں گے۔ گئی ہوئی چیز غریبوں کو بھلا کہاں نصیب ہوتی ہے۔ غرض اُس نے قرض خواہ کو قسط وار روپے دینے پر راضی کرلیا۔ اور دُگنی محنت اور جوش سے کام کرنا شروع کیا۔ دکان پر کام کرتا، ٹیوشن کرتا، اِدھر اُدھر سے کام لے آتا اور قرض کی قسط ادا کردیتا۔ اور بیوی کو بھی چھوٹے موٹے تحائف دیتا رہتا۔

جب اُسے یہ معلوم ہوا کہ وہ عنقریب بچے کا باپ بننے والا ہے تو خوشی کے ساتھ اُسے ایک نئی فکر بھی پیدا ہوگئی اور بیچارے نے طاقت سے زیادہ کام شروع کردیا۔ چوبیس گھنٹے کی فکر اور کام نے اسکی صحت پر بُرا اثر ڈالنا شروع کیا۔ رنگ سیاہ پڑگیا۔ چہرہ سُت گیا۔ اور بشاش چہرہ پھر فکرمند نظر آنے لگا۔ سب سے پہلے بہن نے تنبیہ کی کہ اس قدر محنت نہ کرو صحت خراب ہوجائیگی۔ بھائی نے بھی کہا۔ لیکن محض زبان سے۔ یہ نہ ہوا کہ خود بھی کچھ کرکے اس کا بار کم کرتا۔ بیوی کم عمر اور ناتجربہ کار تھی لیکن آخر اُس نے بھی میاں کی کمزوری اور اضمحلال کو محسوس کرہی لیا۔ اور اُسے سمجھایا کہ اتنی محنت نہ کرو۔ تمہاری سلامتی میں مجھے چٹنی روٹی ہزار نعمتوں سے بڑھکر ہے۔ پر محسن نے ہنس کر ٹال دیا

چند مہینے یوں ہی گذر گئے اور محسن کی صحت خراب ہونے لگی۔ نزلہ زکام حرارت وغیرہ اکثر ہوجاتی۔ اسی زمانے کا محسن کا ایک خط ماجد کے نام کا سُنو!

"میرے پیارے ماجد! تم میرا حال کیا پوچھتے ہو۔ بدنصیب کو کبھی خوشی حاصل ہوسکتی ہے؟ ناصرہ سی نعمت پا کر بھی مجھے خوشی حاصل نہ ہوسکی۔ اور ہو کہاں سے۔ دن رات خرچ کی فکر، قرض کے ادا کرنے کا خیال اور ناصرہ کی تکلیف کا احساس مجھے چین نہیں لینے دیتا۔ دن رات کی محنت نے صحت بھی خراب کردی ہے۔ پہلے معمولی نزلہ کھانسی ہوا۔ جوشاندہ کا استعمال ہوتا رہا مگر فائدہ نہ ہوا۔ روز شام کو طبیعت بھاری ہوجاتی اور حرارت محسوس ہونے لگتی۔ آخر ایک دن زور کا بخار چڑھ آیا۔ سخت انفلوئنزا ہوگیا۔ حکیم نے دیکھا نسخہ لکھا۔ پورے مہینے بھر تک علاج ہوا تب جا کر دفتر جانے کے قابل ہوا۔ اگرچہ حکیم کا اصرار تھا کہ ابھی مہینے بیس دن اور آرام لو۔ مگر آرام لیتا تو کھاتا کیا؟ گھر والے فاقے کرتے اور میں بیٹھا دیکھتا؟ اب کام پر جاتا ہوں مگر طبیعت گری گری اور اُداس رہتی ہے۔ ایک اور حکیم کو دکھایا ہے وہ کہتا ہے کہ نزلہ بگڑ گیا ہے اسی لئے کھانسی اور حرارت ہے۔ پر مجھے کچھ اور ہی خوف ہے۔ میری زندگی تو کچھ ایسی خوشگوار نہیں کہ زیادہ جینے کی آرزو کروں۔ پر آپا اور کم عمر ناصرہ کا خیال کرتا ہوں تو کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ میں نہ ہوا تو یہ دونوں کیا کرینگی؟ ناصرہ بچے کی ماں بننے والی ہے۔ بجائے اس کے کہ اس زمانے میں اُسے خوشی اور اطمینان ہوتا۔ اُسے دن رات میری فکر رہتی ہے۔ مجھے کل ہی معلوم ہوا کہ اُس نے اپنا ایک زیور بیچ کر حکیم کی دوا اور فیس کے دام دیئے ہیں۔

ہا ــــ بدنصیب لڑکی ــــ

چار دن بعد ــــ بھیا چار دن سے تیز بخار ہے۔ دفتر جانا چھوٹا ہوا ہے۔ خدا جانے کیا ہوگا۔ تمہارا مریض محسن"

ماجد کو محسن کا یہ خط ملا تو وہ بدحواس دوڑا ہوا وطن گیا وہ یہاں دو سو کا نوکر ہے۔ محسن کو دیکھ کر وہ سکتے میں آگیا۔ محسن ان کا ساتھ کا کھیلا بچپن کا دوست اور نہایت عزیز بھائی تھا۔ ڈاکٹر کو بُلا کر دکھایا۔ اُس نے کہا دق شروع ہوچکی ہے۔ اور اگر نہایت احتیاط سے علاج کیا جائے تو اچھا ہونے کی پوری اُمید ہے۔ دق کا نام سُنکر دونوں بھائیوں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ محسن کو لمبی چھٹی دلائی اور باقاعدہ ڈاکٹری علاج کا انتظام کرکے ماجد واپس چلے گئے۔ اور محسن کے بڑے بھائی نے دوڑ دھوپ کرکے بیس روپے کی نوکری کر لی۔ ناصرہ نے چپکے چپکے اپنی سب میکے اور سسرال کی چیزیں بیچ دیں تاکہ محسن کو اچھی غذا ملتی رہے۔ دوا وغیرہ کا خرچ تو ماجد نے اُٹھا لیا تھا۔ چند دن طبیعت بحال رہی تھی کہ جاہل عورتوں نے کہنا شروع کیا "بوا نوج۔ اللہ نہ کرے محسن کے دشمنوں کو دق ہوئی ہے۔ کچھ نہیں نزلہ بگڑ گیا ہے۔ فلاں حکیم کو دکھاؤ۔ ان کا علاج اکسیر ہے۔" "ان موئے ڈاکٹروں کی زبان کو دق ہوتی ہے۔ جسے چاہا دق کہدیا" "دُلہن! تم میاں صاحب سے گنڈا منگوا کر گلے میں ڈالو۔ اللہ نے چاہا اسکی برکت سے ایک پندرھواڑے میں جی بالکل اچھا ہوجائیگا۔" نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹری علاج چھوڑ کر پھر حکیم کا علاج شروع کیا گیا اور گنڈے تعویذ بھی ہونے لگے۔ مہینہ بھر کے اندر محسن کی حالت اور خراب ہوگئی۔ ماجد کو خبر ہوئی تو وہ آکر محسن کو مع اسکی بیوی بہن اور بھاوج کے یہاں لے آیا اور باقاعدہ علاج شروع کرا دیا۔

محسن کی دُلہن کی حالت عجیب تھی۔ بچاری لڑکی میاں کی حالت دیکھ دیکھ کر سہمی جاتی تھی۔ خاموش اور شرمیلی ہونے کے سبب مُنہ سے ایک حرف بھی نہ نکالتی۔ بس چُپ چاپ سب کا مُنہ حسرت سے تکتی رہتی تھی۔ بہن نے بھائی کی خدمت میں دن اور رات ایک کردیا۔ نہ دن میں ایک منٹ کو چین لیتی نہ رات کو آرام کرتی تاکہ سوچنے اور فکر کرنے کا وقت بھی نہ ملے۔

محسن ہر وقت بیوی کے کمرے میں لیٹا اُسکی اُداس صورت کو تکا کرتا۔ اُسے اپنی زندگی سے مایوسی ہوچکی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ زندگی کی جو چند گھڑیاں باقی ہیں وہ اپنی پیاری محبوب بیوی کے پاس گذارے۔ لیکن ناصرہ اتنی کم عمر تھی کہ اُسے آنے والی مصیبت کا پورا احساس ہی نہ تھا۔ ماجد کے یہاں آنے کے دو مہینے بعد ناصرہ کے بچہ ہوا۔ بہت پیاری صورت مگر ماں کی پریشانی اور فکر کا اثر بچہ پر بھی تھا۔ بے حد کمزور اور دُبلا۔ محسن کی حالت بدستور خراب دیکھ کر ڈاکٹر اور ماجد دونوں کی صلاح ہوئی کہ اُسے ٹی۔ بی ہسپتال میں داخل کرا دیا جائے۔ محسن ہسپتال جانے پر کسی طرح راضی نہیں ہوتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ زندگی کی آخری گھڑیاں اپنی بیوی اور بچے اپنی بہن اور بھائی سے الگ بسر کرے۔ لیکن عزیزوں کو اتنی مایوسی نہیں تھی۔ جب تک سانس ہے تب تک آس باقی رہتی ہے۔ خصوصاً اسکی کم عمر اور ناتجربہ کار دُلہن کو تو میاں کی صحت کا یقین تھا۔ وہ شاید یہ سمجھتی تھی کہ اس کم عمری میں جب کہ اس نے دُنیا میں ابھی کچھ بھی نہیں دیکھا۔ خدا اُسے اتنا بڑا صدمہ نہیں دیگا۔ بہشت کی مخفی طاقت ہوا کے تپتے ہوئے بیابان صحرا میں نہیں چھوڑا جائیگا۔ اسکی زندگی اس قدر جلد برباد نہیں ہوگی۔ اسکا چہیتا دولہا زندہ رہیگا ــــ ضرور رہیگا ــــ

اُس نے سخت اصرار کرکے میاں کو ہسپتال جانے پر راضی کرلیا۔ تین مہینے سے محسن ہمارے ہسپتال میں ہے۔ تیسرے چوتھے دن بہن اور بیوی اور کبھی کبھی دونوں بھاوجیں دیکھنے آجاتی ہیں۔ مرد روز آتے ہیں۔ مریض کی حالت روز بروز بگڑتی جارہی ہے۔ آج سُنا ہے کہ حالت زیادہ خراب ہے۔ زبان بھی بند ہوگئی۔ ہائے افسوس! کیسی حسرتناک حالت ہے"

ساوتری کی آواز فرطِ گریہ سے رُک گئی۔ اور یہ بھی زار و قطار رو رہی تھی۔

صبح اُٹھکر پہلی خبر یہ سُنی کہ محسن کا انتقال ہوگیا۔ اور اسکے عزیز صبح ہی لاش کو لے گئے۔ ہم دونوں سکتے کی سی حالت میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ مُنہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔

اگلے دن میں اور ساوتری دونوں محسن مرحوم کی بیوی اور بہن کے پاس پُرسے کے لئے گئے۔ ایک معمولی سے مکان پر جاکر تانگہ رُکا۔ پردیس کا واسطہ تھا۔ باہر مردوں کے پاس تو چند احباب اور جان پہچان والے جمع تھے مگر اندر صرف گھر کی چار عورتیں تھیں۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں میلی سی دری کے فرش پر محسن کی بیوی، بہن اور دونوں بھاوجیں بیٹھی تھیں۔ دونوں بھاوجیں زار و قطار رو رہی تھیں۔ بہن کی تو ایسی بُری حالت تھی کہ دیکھکر کلیجہ پھٹتا تھا انتہائی ضبط کے سبب اگرچہ اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ مگر چیخیں پھر بھی نکل جاتی تھیں۔ اور ـــ آہ! ـــ محسن کی ڈیڑھ سال کی بیاہی نئی دُلہن لٹھے کی میلی سی سفید چادر اوڑھے بیٹھی تھی۔ نہ ہاتھوں میں رنگین چوڑیاں تھیں نہ کانوں میں بالیاں اور ناک میں کیل۔ ہاں اُجڑے سہاگ کی نشانی ہاتھوں میں مہندی اب بھی موجود تھی۔ وہ گھٹنے پر ٹھوڑی ٹکائے بُت کی طرح بےحس و حرکت بیٹھی تھی۔ اور اسکی بڑی بڑی سیاہ کھلی ہوئی آنکھوں سے آنسوؤں کے موٹے موٹے گول گول قطرے لُڑھک لُڑھک کر اسکے سینے پر گر رہے تھے۔ جیسے کسی صناع کی بنائی ہوئی پتھر کی مورتی کی آنکھوں سے سچ مچ کے آنسو گرنے لگے ہوں۔ اور ـــ اور اس کی گود میں ایک چھوٹا سا پیارا پیارا بچہ اپنی یتیمی کی ہولناک مصیبت سے بےخبر لیٹا ہوا انگوٹھا چوس رہا تھا۔ اور اپنی گول گول معصوم آنکھوں سے ماں کو دیکھکر گویا اُسے ڈھارس بندھا رہا تھا کہ "ماں نہ رو۔ تیری جوگی کا سہارا۔ اور پہاڑ سی ناشاد زندگی کا کٹوانے والا ـــ میں موجود ہوں"

اس بچہ کو دیکھ کر میرے دل میں درد کی ایک ٹیس اور ہوک سی اُٹھی۔ کیا دیر سویر یہ کمزور بچہ بھی اُسی موذی مرض کا شکار نہ ہوجائیگا۔ جس کی بھینٹ اُس کا نوجوان ناشاد باپ ہوا ؎

غزل

(از محترمہ آمنہ برجیس)

ہائے کیا تابشِ خورشید وِرَمِ شبنم ہے
میرے احساس کی دُنیا بھی ترا عالم ہے

دِل سے مٹ جائے محبت کبھی نقشِ دوام
آج جو کچھ بھی نہ ہوجائے جنوں سے کم ہے

کسی طوفانِ مسرت کی خبر ہے شاید
نغمۂ شوق کی لَے آج جو کچھ مدھم ہے

نغمۂ و ساز بھی، ساقی بھی، مئے و مینا بھی
دِل مگر پھر بھی پریشاں ہی یہ کیا عالم ہے

کیوں چھلک اُٹھتی ہی رہ رہ کے یہ احساس کی مَے
کیا مری یادیں وہ چشمِ حسیں پُرنم ہے

عِشق ہی کیف جوانی ہے، مگر افسردہ
حُسن ہی نقشِ حقیقت ہے مگر مبہم ہے

میرا افسانہ ہی دلچسپ مگر اے برجیس
نہ ہمہ نغمۂ عشرت، نہ ہمہ ماتم ہے

معصوم محبت

(از محترمہ ہاجرہ سرور لکھنوی)

صبح سے گہرا ابر چھایا ہوا تھا۔ اور بادلوں کی گرج سے معلوم ہوتا تھا کہ اولے پڑیں گے۔ سردی اس غضب کی پڑ رہی تھی کہ لحاف کے اندر سے ہاتھ نکالنا دشوار تھا۔ لیکن ننھی منیر حسب معمول صلاح الدین کے انتظار میں جوتی چپاسی دروازے پر کھڑی اسکی راہ تک رہی تھی۔ ماں نے اسے اوڑھ کر بیٹھنے کی ہدایت کی۔ تنویر نے ڈانٹا کہ "چلو آگ کے پاس بیٹھو۔ آجائیں گے تمہارے بھیا جب آنا ہوگا۔" لیکن دھن کی پکی منیر نے کسی کی نہ سنی۔ آخر اس نے دیکھا کہ صلاح الدین اوور کوٹ کا کالر چڑھائے جیبوں میں ہاتھ ٹھونسے جلدی جلدی چلا آرہا ہے۔ منیر خوشی سے اچھلتی کودتی سڑک تک دوڑ کر اپنے صلو بھیا سے لپٹ گئی۔ صلو نے اسے گود میں اٹھالیا اور سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ سوچنے لگا۔ یہ معصوم بچی مجھے کتنا چاہتی ہے۔ اور اسکی بہن تنویر؟ وہ تو مجھ سے سیدھے منہ بات کرنا بھی گوارا نہیں کرسکتی۔ میں اسے کس قدر چاہتا ہوں لیکن وہ مجھ سے کتنی بے نیاز سی رہتی ہے۔

منیر اس کی گود میں کچھ بے چینی سے بیٹی تھی اس لئے بار بار کسمسا رہی تھی۔ صلو اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ لیکن اس نے اس کا ہاتھ غصے سے جھٹک دیا۔

"کیا تم بھی مجھ سے خفا ہو گئیں؟"

وہ منہ پھلائے پڑی رہی۔

"اچھا اگر میں تمہیں چاکلیٹ دوں تو من جاؤ گی؟"

"نہیں! اب میں آپ سے کبھی نہ منوں گی۔" اس کے پیارے سے چہرے پر غصے کے باعث عجیب کیفیت پیدا ہوگئی۔

"کیوں ناراض ہوگئیں تم؟" صلو نے پوچھا

"آپ ہنستے جو نہیں۔ بس چپ رہتے ہیں۔" اسے جیسے سچ مچ صلو کی خاموشی سے تکلیف ہو رہی تھی۔

"ارے بس! اتنی سی بات پر خفا ہو گئیں۔ لو میں ہنستا ہوں۔" اور وہ ہنسنے لگا۔

"اب آپ کتنا ہی ہنسئے میں ہرگز نہ منوں گی آپ سے۔" وہ صلو کی گود سے نکلنے کی کوشش کرنے لگی۔

"اچھا اب میں تمہارے گھر سے چلا جاؤں گا۔"

وہ اس طرح گردن ہلا کر کہنے لگی جیسے اسے صلو پر بڑا اختیار تھا۔

"میں آپ کو نہیں جانے دونگی۔"

"تو پھر من جاؤ۔"

صلو نے اسے دوبارہ اپنے آغوش میں بھینچ لیا۔ اور منیر نے بھی اپنی ننھی ننھی باہیں اس کے گلے میں ڈال دیں۔

"لڑائی ختم ہوگئی۔ اب یہ پاکیٹ لو۔" صلو نے بہت سے چاکلیٹ اسے دیئے۔

"بڑے اچھے ہیں آپ! لیکن دیکھئے جایئے گا مت۔"

اس نے ایک دم کئی چاکلیٹ منہ میں بھر لئے۔ صلو پھر کسی سوچ میں غرق تھا۔

صلاح الدین اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد کسی اچھی ملازمت کی تلاش میں لکھنؤ میں اپنی خالہ کے ہاں مقیم تھا۔ امید ہی امید میں اسے وہاں رہتے ہوئے دو ماہ ہو چکے تھے۔ خالہ اپنے بھانجے پر جان چھڑکتیں اور منیر کو تو جیسے صلو بھیا کے بغیر ایک پل چین نہ پڑتا تھا۔ جب تک وہ گھر میں رہتا اسکا منہ صلو بھیا، صلو بھیا کہتے خشک ہوتا۔ اس کے باوجود صلو کچھ رنجیدہ سا رہتا۔ اسے اپنی زندگی میں ایک خلا سا معلوم ہوتا جسے پر کرنے کیلئے اسے خوبصورت تنویر کے حسین التفات کی ضرورت تھی۔ لیکن تنویر اس سے اس قدر بے نیاز سی رہتی جیسے اسے یہ احساس ہی نہ تھا کہ کوئی اس کے میٹھے بول سننے کے لئے بے چین ہے۔ کسی کی اداس نظریں اس کا پیچھا بھی کیا کرتی ہیں۔ یا پھر اس کے دل کے کسی گوشے میں بھی محبت کی کوئی چنگاری سلگ رہی تھی۔ اور جسے وہ دوری کے چھینٹوں سے بجھانا چاہتی تھی۔ بہرحال صلو اس کے طرز عمل سے اکثر رنجیدہ رہتا۔ اسی طرح ننھی منیر بھی اس کے لئے پہروں چپ چاپ پھرا کرتی۔

موسم انتہائی دلکش تھا۔ بادلوں کے ٹکڑے دور سے دوڑ دوڑ کر آتے اور آپس میں مدتوں کے بچھڑے ہوؤں کی طرح مل جاتے۔ صلو اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑا تنویر کو دیکھ رہا تھا۔ جو سائبان میں آرام کرسی پر دراز کسی کتاب

کے مطالعے میں غرق تھی۔ بادل گرجا اور تنویر چونک پڑی۔ اسکی نظر صلّو پر پڑی اور صلّو کی نگاہیں جھک گئیں۔ وہ ڈرا کہ کہیں اس طرح غور سے دیکھنے پر وہ برہم نہ ہو جائے۔ اور وہ جلدی سے اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہا۔

"صلّو بھیا! باہر دیکھئے! کتنا اچھا موسم ہے" منیر دوڑتی ہوئی آئی اور اس کا لحاف کھینچنے لگی۔

"تم جاؤ منیر! مجھے لیٹا رہنے دو"

"آپ کیوں نہ جائیں گے باہر؟"

"ڈر لگتا ہے"

"بادلوں سے"؟ منیر نے حیرت سے آنکھیں مٹکا کر پوچھا۔

"نہیں! تمہاری آپا سے" صلّو نے دل کی بات کہہ دی۔

"کیوں؟" اسکے بھولے بھالے چہرے پر سنجیدگی جھلکنے لگی۔

"وہ مجھ سے نفرت کرتی ہیں نا"

"اسی لئے آپ چھپ چھپ سے رہتے ہیں؟" اس نے اپنا گلابی رخسار صلّو کے چہرے پر رکھ دیا۔

"ہاں!" اُسے اعتراف کرتے بن پڑی۔

وہ اچھل کر دور جا کھڑی ہوئی۔ اور جلدی جلدی پلکیں جھپکاتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔

صلّو اسکی معصومیت سے لبریز حرکتیں دیکھتا رہا۔

اُس نے ایک بار سائبان کی طرف دیکھا۔ جہاں تنویر آرام کرسی پر پڑی کتاب دیکھ رہی تھی۔ اور پھر وہ پھرتی سے صحن پار کر کے اسکے پاس پہنچ گئی۔

"آپا!"

"ہوں" تنویر نے کتاب بند کر کے منیر کو پیار بھری نظروں سے دیکھا۔

"آپ صلّو بھیا سے نفرت کیوں کرتی ہیں؟ مجھے بتائیے۔ منیر نے تحکمانہ لہجے میں پوچھا۔

"خوب! تم تو اس وقت ننھی سی رانی معلوم ہو رہی ہو" تنویر نے اسکے سوال کو ٹالتے ہوئے کہا۔

"تو پھر رانی کی بات کا جواب دینا ضروری ہے"

تنویر زور سے ہنس پڑی

"کس بات کا جواب دوں؟"

"آپ صلّو بھیا سے نفرت کیوں کرتی ہیں؟"

"تجھ سے کس نے کہا؟"

"صلّو بھیا نے خود مجھ سے کہا کہ تمہاری آپا مجھ سے نفرت کرتی ہیں۔ اور اس لئے وہ ہر دم چپ رہا کرتے ہیں۔"

تنویر اداس ہو گئی۔

"تمہارے بھیا جھوٹ بولتے ہیں۔ وہی تو مجھ سے نفرت کرتے ہیں۔ دیکھو سب سے بولتے ہیں لیکن کبھی مجھ سے بھی بات کرتے ہیں"

اس نے منیر کے بالوں میں انگلیاں الجھا دیں۔ اور کسی گہرے سوچ میں پڑ گئی۔

"آپا! آپ بڑی اچھی ہیں۔ میں صلّو بھیا سے کہہ دونگی کہ آپا آپ کو بہت چاہتی ہیں۔ لیکن آپ ہی اُن سے نہیں بولتے"

"اپنے بھیا سے کچھ نہ کہنا۔ ورنہ میں تم کو ماروں گی"

منیر اسکی گود سے اتر گئی۔

"میں تو ضرور کہوں گی۔ ماریئے آپ ــــ" اور وہ جلدی سے جانے لگی۔

"سُن تو منیر" وہ اُسے پکڑنے دوڑی۔ لیکن منیر صلّو کی گود میں بیٹھی ہوئی اپنی آپا کی صفائی پیش کر رہی تھی۔ تنویر کچھ کھسیانی سی ہو کر لوٹ آئی۔ اور صلّو زور سے ہنس دیا۔

منیر اُس دن بہت خوش تھی۔ کیونکہ اس کے صلّو بھیا بات بات پر ہنس رہے تھے۔ اور اسے اپنے بھیا کا ہنستا ہوا چہرہ بہت ہی اچھا لگتا تھا۔

اب منیر اکثر تنویر کو صلّو کے کمرے میں پکڑ لاتی اور تنویر بھی ہلکی سی مزاحمت کے بعد اسکے ساتھ ہو لیتی۔ وہ کمرے کے وسط میں نئے آئے ہوئے مہمان کی طرح جھجکی کھڑی رہتی۔ اور صلّو؟ وہ بھی اپنی جگہ پر کھڑا اُسے دیکھا کرتا۔

منیر اپنی بہن کا آنچل کھینچتے ہوئے کہتی۔

"باتیں کیجئے صلّو بھیا سے"

"کیا باتیں کروں؟" وہ کھڑکی سے باہر نظریں دوڑاتے ہوئے کہتی اور صلّو کو ایسا محسوس ہوتا کہ ننھی منیر نے اپنے چھوٹے سے بھائی کا جھنجھنا اٹھا کر پھینک دیا ہے۔

اس کے بعد صلّو کوئی بات شروع کر دیتا۔ وہ زیادہ تر "ہوں ہاں" میں جواب دے دیتی۔ اور پھر کسی بہانے سے وہ وہاں سے بھاگ جاتی۔

صلّو کو اپنا کمرہ ویران معلوم ہونے لگتا۔

ایک روز منیر نے صلّو کو گم سم کھڑے دیکھ کر پوچھا۔

"کیا سوچ رہے ہیں صلّو بھیا؟" اس کی صاف شفاف آنکھوں سے فکر جھانکتی معلوم ہوتی۔

"میں؟ سوچ رہا تھا کہ اس وقت میرے پاس کوئی ہوتا۔" اس نے جواب دیا اور سائبان میں کھڑی ہوئی تنویر کو دیکھنے لگا۔

وہ آہستہ سے دوسری طرف مڑ گئی۔

"میں تو ہوں صلّو بھیا!" منیر نے حیرانی سے کہا۔

"ہشت پگلی! تم سے کوئی کیا بات کرے۔"

منیر کے دل پر گھونسہ سا لگا۔ اور وہ رو پڑی۔ اس نے بھیا کے منہ سے ایسی بات کبھی نہ سنی تھی۔ اُسے پوری پوری اُمید تھی کہ صلّو اُسے گود میں اُٹھا کر اپنی بات کی تردید کر دیگا۔ لیکن یہ نہ ہوا۔ وہ صحن میں ٹہلتی ہوئی تنویر کو دیکھنے میں محو تھا۔ منیر اپنے دل میں شکایتوں کا طوفان لئے اس کمرے سے چلی گئی۔

آخر تنویر و صلاح الدین کی شادی ہو ہی گئی۔ تنویر ابھی تک اپنی سسرال میں رخصت نہ کی گئی تھی۔ بلکہ صلّو ہی تنویر کے ہاں مقیم تھا۔

منیر کا لاڈ پیار ختم ہو گیا تھا۔ نہ تو اب ہر وقت وہ صلّو کی گود میں رہتی اور نہ اُسے چاکلیٹ ملتے۔ وہ پہروں دیوار سے لگی کھڑی رہتی کہ شاید صلّو اُسے یوں کھڑا ہوا دیکھکر گود میں اُٹھا لے۔ اور کہے "میری منیر من جاؤ اب۔" صلّو اُس کے قریب سے گذرتا تو اس کا ننھا سا دل زور زور سے دھڑکنے لگتا۔ وہ جلدی جلدی سوچنے لگتی۔

"میں گھنٹوں ستاؤں گی بھیا کو۔ چاہے وہ مجھے بسکٹ دیں تب بھی نہ منوں گی۔ پھر وہ مجھ سے کہیں گے۔ منیر! اگر تم نہ بولوگی تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تو پھر وہ ان کے گلے میں لپٹ جائے گی۔ بس میل ہو جائیگا"

لیکن وہ یہ سب سوچتی ہی رہ جاتی اور صلّو اسے دیکھے بغیر قریب سے گزر جاتا وہ اپنی ناکامی پر زور زور سے رونے لگتی۔ ماں پوچھتی تو زمین پر مچل کر چیخنے لگتی اس اُمید پر کہ اب صلّو بھیا دوڑے آئیں گے اور کہیں گے۔ "ارے میری منیر کو کس نے مارا۔" لیکن کمرے سے سوائے قہقہوں کی آواز کے کوئی نہ نکلتا۔

اس کا ننھا سا دل صلّو کی بے اعتنائی سے ٹوٹ گیا۔ وہ تنہا سائبان میں گھنٹوں کھڑی رہتی۔ کیونکہ سامنے صلّو کا کمرہ تھا۔ اور صلّو اور تنویر کو ہنستے بولتے دیکھکر سوچتی۔

اگر میں آپا اور بھیا کا میل نہ کراتی تو اچھا ہوتا۔ جب سے میں نے میل کرایا ہے وہ مجھ سے بولتے بھی نہیں۔ اور نہ ہی گود میں لیتے ہیں بس آپا ہی سے باتیں کیا کرتے ہیں۔ اب میں بھی کبھی ان سے بات نہ کرونگی اور نہ ہی آپا سے بولوں گی۔

چند ماہ بعد صلاح الدین کو ملازمت مل گئی۔ اور اُسے لکھنؤ سے رخصت ہونا پڑا۔ ماں نے بیٹی کو گلے سے لگا کر آنسو بہائے۔ اور صلّو کو شاد و آباد رہنے کی دعائیں دیں۔ صلّو نے منیر کی طرف دیکھا جو سب سے الگ تھلگ منہ پھلائے کھڑی تھی۔ صلّو نے اُسے زبردستی گود میں اٹھا لیا۔ لیکن وہ مچل کر اُتر گئی۔

صلّو نے بہت چاہا کہ چلتے چلاتے تو وہ اُسے منا ہی لے۔ لیکن وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا۔ منیر نے نفرت سے اپنا منہ دونوں کی طرف سے پھیر لیا۔ اور گھر میں سب اسکی معصوم خفگی پر ہنس دیئے۔ جب صلّو اور تنویر تانگے میں بیٹھ گئے تو وہ نہ جانے کیوں دوڑ کر دروازے پر کھڑی ہو گئی۔ صلّو نے اُسے چھیڑنے کی غرض سے ہاتھ کا اشارہ کیا تو منیر کا دل چاہا کہ دوڑ کر چلی جائے۔ لیکن دوسرے لمحے تانگہ سڑک پر تیزی سے جا رہا تھا۔

ایک شام

(از محترمہ لالہ رُخ)

اوفوہ بھئی ــــ اللہ۔ ممی اچھے تو ہیں ہم بالکل۔ ذرا یونہی سا سر میں درد ہو جانے کا مطلب یہ تھوڑا ہی ہے کہ اب ہمیں دودھ اوولٹین پینا پڑے گا۔

اور ممی گھبرائی ہوئی کمرے سے چلی گئیں۔ شاید ڈاکٹر کو فون کرنے۔ میں نے لیمپ کا رُخ مسہری کی طرف کر کے آسکر وائلڈ کی ایک کتاب اُٹھالی۔ ڈرائنگ روم میں سے ریڈیو کی آواز آ رہی تھی۔ وہی اختری فیض آبادی کی ہمع خراشں تانیں ــــ اور پھر مجھے یاد آیا کہ ابھی کالج کا بہت سا کام کرنا باقی ہے اور اگلے ہفتے سے ششماہی امتحانات شروع ہونے والے ہیں۔ دودھ اوولٹین اور سوڈا بائی کارب۔ میں نے جھنجھلا کر کتاب نیچے قالین پر پھینک دی اور لیمپ کے نیلے شیڈ پر بنے ہوئے چینی نقش و نگار کو غور سے دیکھنے لگی۔

اور پھر خیالات کہاں کہاں بھٹک گئے۔ لیمپ کے سرخ شیڈ اور آدھے جلے ہوئے سگریٹ ــ بوہیمیا ــــ لیٹن کوارٹر ــــ تصویروں کے آڑے ترچھے بے تکے سے نقوش ــــ ترچھی اور بڑی بڑی آنکھیں اور بہت پتلی اور لمبی انگلیاں ــــ پس منظر میں دھندلا دھندلا نہ معلوم کیا۔ اور دھواں سا بل کھاتا اور اوپر کو اُٹھتا ہوا ــــ لمبے لمبے فرانسیسی دریچے اور ان میں حجاب کے افسانے۔ نپولین اور لارڈ نیلسن۔ بچارے کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی تھی۔ میری آنکھوں میں بھی تو درد ہو رہا ہے ــــ اور ایک لیڈی ہملٹن تھی ــــ اور پھر یہ اتنے سارے "ازم" ــــ "سوشلزم" ــ "کمیونزم" ــ "فاشزم" "ناتسی ازم" ــ رزم و بزم ــــ اوفوہ بھئی ــــ توبہ۔

اور میری نظر رسالہ "ادب لطیف" کے تازہ پرچہ پر پڑ گئی جو پاس کی میز پر رکھا ہوا تھا ــــ واقعی یہ نیا ادب بھی کیا کمال کی چیز نکلا ہے ــــ ترقی پسند ادب ــ حسین پگڈنڈیاں ــــ خوبصورت ہوائیں ــ جنتا ــ سماج ــ مزدور ــ روٹی ــ بھوک بھوک بھوک

سچ مچ مجھے بھوک معلوم ہو رہی تھی۔ کیونکہ میں نے دوپہر کا کھانا بھی نہ کھایا تھا۔ اتنے میں ممی دودھ اوولٹین لے آئیں۔

اور سونے سے پہلے ممی نے مجھ سے کہا کہ میں کل شام کو کہیں اور نہ جاؤں۔ کیونکہ پرویز روحانی "کافی ہاؤس" میں خالو جان کی رُخصتی ٹی پارٹی دے رہے ہیں۔

خالو جان بچارے جو ہماری سرکار والاتبار کی فوج میں لفٹننٹ کرنل ہیں تبدیل ہو کر پونہ جا رہے تھے۔ اور اُن کی رُخصتی دعوتوں کا سلسلہ کئی ہفتے پہلے سے شروع ہو چکا تھا۔ یہ پرویز روحانی صاحب جو تھے یہ ترقی پسند شاعری کرتے تھے اور محکمہ سپلائی میں ملازم ہونے سے قبل سبھاش بوس کے چیلے بھی رہ چکے تھے۔

اور دوسرے دن سہ پہر کے بعد "کافی ہاؤس" میں فوجی افسروں کے علاوہ پرویز صاحب کے "کامریڈز" یعنی ترقی پسند مصنفین جمع ہونے شروع ہوئے ــــ ڈھیلی ڈھیلی پتلونیں۔ لمبے لمبے بال ــ سیاہ فریم کی عینکیں۔ انگلیوں میں پائپ یا سگریٹ اور کھدر کے پاجامے۔

اور جب چائے ختم ہوئی تو جہلم پار کے ایک نوگرفتار لفٹننٹ بولے "جی کچھ گانا شانا نہیں ہونا ہے؟" اس پر ایک ترقی پسند ادیب نے میری خالہ زاد بہن فرخندہ سے فرمایا۔ "جی آپ لاہور سے آئے ہیں۔ ایک آدھ ڈھولک کا گیت سنا دیں۔ یہ ڈھولک کے گیت کس قدر حسین اور ستارہ بار ہوتے ہیں!" اور میرا جی چاہا کہ اسکی اس سرخ اور لمبی ناک پر ساری چائے دانی اُنڈیل دوں۔

اتنے میں ہال کے دوسرے سرے میں نئے ادب کی افادیت پر نہایت شد و مد سے بحث شروع ہو گئی۔ پیام مرغی شہری فرما رہے تھے "جناب ہم ترقی پسند نوجوانوں نے اپنے لئے ایک نئی راہ نکالی اور ہمارے خوبصورت نظموں اور افسانوں نے اُردو کے دقیانوسی اور سرمایہ داروں کے ادب میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ ہمارا ایک نوجوان شاعر اپنی ایک بلند پایہ نظم میں کہتا ہے:ـ

یہ کس نے لاش پھینک دی جوانیوں کی راہ میں
بڑھے چلو، بڑھے چلو، تباہیوں کی راہ میں

علی جبّار صابری نے ارشاد کیا ــــ اسی کے متعلق میں نے کہا ہے کہ:ـ

فلمی خبریں

(از فصیح الدین احمد)

(۱) پردھان پکچرز

پردھان پکچرز کی تصویر داسی مقامی منروا سنیما میں گذشتہ دس ہفتوں سے عوام کی کشش کا باعث بنی ہوئی ہے۔ تصویر میں راگنی۔ نجم الحسن۔ گیانی نے نہایت کامیابی کے ساتھ پارٹ ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ کلاوتی، جی این بٹ اور بے بی پروین کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ فلم کی ہدایت کاری ہرن بوس کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ موسیقی پنڈت امرناتھ نے خاص اہتمام سے پیش کی ہے۔ امید ہے یہ تصویر ابھی اور کئی ہفتے چلیگی۔

(۲) پنچولی آرٹ پکچرز

شیریں فرہاد عشق و محبت کی زندہ جاوید داستان پر اسے پنچولی آرٹ پکچرز والے فلم بند کر رہے ہیں۔ سٹوڈیو کی اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ تصویر اب قریب الاختتام ہے۔ اس تصویر پر بے دریغ روپیہ صرف کیا جا رہا ہے۔ اور اس زمانے کے ساز و سامان، لباس وضع کا خاص خیال رکھا جا رہا ہے۔ اس تصویر میں آہو چشم راگنی شیریں اور خوبرو جوان جینت فرہاد کا کردار ادا کر رہا ہے۔ اسکے علاوہ مشہور کیریکٹر ایکٹر غلام محمد نہایت اہم رول ادا کر رہا ہے۔ اس تصویر سے بہت شاندار توقعات وابستہ ہیں۔ امید ہے کہ یہ اس وقت کی بہترین تصویر ثابت ہوگی۔

(۳) پربھات پکچرز

پربھات فلم کمپنی پونہ کی تازہ ترین تصویر رام شاستری کا نہایت بیتابی کے ساتھ انتظار کیا جا رہا ہے۔ یہ تصویر مقامی منروا سنیما میں موجودہ تصویر داسی کے بعد نمائش کیلئے پیش کی جائیگی۔ اس فلم کی کہانی مشہور تاریخی داستان ہے۔ جسے نہایت اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ امید ہے یہ تصویر پربھات کے نام کو اور چار چاند لگا دیگی۔ شمالی ہندوستان کیلئے نوزائیدہ لیکن مشہور فلم تقسیم کنندگان میسرز ستارہ فلمز نے اسکے حقوق خرید لئے ہیں۔ تصویر کی اشاعت نہایت زور شور کے ساتھ کی جا رہی ہے۔ اداکاروں میں للتا پوار۔ مینا کشی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

(۴) راج کمل پکچرز

راج کمل کلا مندر کی دوسری ریکارڈ توڑ تصویر مالی جوبلی ٹاکیز دہلی میں جمعہ ۱۰ نومبر سے نمائش کیلئے پیش کر دی گئی ہے۔ اس فلم میں امیر کرناٹکی اور ماسٹر کرشنا راؤ۔ بے بی نیلینی۔ اور آر پنڈت نے کام کیا ہے۔ اس کمپنی کی آنے والی تصویر بہت پراپنا ڈیرا ہے۔ جسے مسٹر شانتا رام نے خود تیار کیا ہے۔ ماہر ڈائرکٹر کی پختہ تر کوششیں اس تصویر میں نمایاں ہیں۔ اداکاری، پس منظر سب ہی اپنی جگہ ایک خاص دلکشی رکھتے ہیں۔

(۵) رنجیت مووی ٹون

رنجیت فلم کمپنی کی تیار کردہ تاریخی تصویر شہنشاہ بابر جگت سنیما میں گذشتہ آٹھ ہفتوں سے دکھائی جا رہی ہے۔ فلم پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا گیا ہے۔ ساز و سامان اور لباس کا خاص طور پر خیال رکھا گیا ہے۔ فلم کی کہانی مغلیہ سلطنت کے بانی شہنشاہ بابر کی زندگی سے تعلق رکھتی ہے۔ بابر کا پارٹ شیخ مختار نے نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے۔ خورشید، سوشیل کمار۔ مجید، لالہ یعقوب اور سلوچنا چٹرجی نے بھی بہت خوب اداکاری کی ہے۔ گانے اور مکالمے بھی اچھے ہیں۔ ہدایت کاری کے فرائض وجاہت مرزا نے ادا کئے ہیں۔ تصویر نے کافی مقبولیت حاصل کی ہے روزانہ سنیما ہال پر تماشائیوں کا اس طرح ہجوم رہتا ہے جیسے آج ہی نمائش شروع ہوئی ہے۔ ان حالات کے ماتحت نہایت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تصویر ابھی کئی ہفتے اور چلے گی۔

(۶) بمبئی سینے ٹون

بمبئی سینے ٹون کی لاجواب تصویر لال حویلی گذشتہ پندرہ ہفتوں سے ناولٹی ٹاکیز میں چل رہی ہے یہ تصویر پروڈیوسر کے، بی لال کی پہلی پیشکش ہے اور یقیناً نہایت کامیاب ہے۔ اس میں یعقوب اور کنھیا لال نے کامیاب اداکاری کی ہے۔ اس کے علاوہ نور جہاں، سریندر۔ الہاس سایا بنرجی۔ دلشاد کمیکر۔ بدری پرشاد اور برج رانی نے بھی اپنی اداکاری کے جوہر دکھلائے ہیں۔ مجموعی حیثیت سے یہ ایک نہایت مقبول فلم ہے۔

(۷) اترے پروڈکشنز

اترے پروڈکشن کی نئی تصویر "دل کی بات" بیک وقت ایکسلسیر اور ویسٹ اینڈ ٹاکیز میں جمعہ ۱۰ نومبر سے نمائش کیلئے پیش کر دی گئی ہے۔ اس میں شوبھنا۔ درگا کھوٹے۔ دمالا۔ پربھا اور دیکشت نے کام کیا ہے۔ کہانی پرنسپل اترے کے زور قلم کا نتیجہ ہے اور ہدایت کاری کے فرائض بھی انہوں نے ہی انجام دئیے ہیں۔ تصویر میں موسیقی اپنی مخصوص دلکشی رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ پس منظر اداکاری کے ساتھ دلچسپ مذاح بھی نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ تصویر شروع سے آخر تک دلچسپی رکھتی ہے۔

مسرت کے جواں ملّاح کشتی لے کے نکلے ہیں
غموں کے ناخداؤں کا سفینہ ڈگمگاتا ہے

خالو جان بچارے خاموش بیٹھے سگار پی رہے تھے۔ پیام مرغی شہری نے پھر کہنا شروع کیا۔" تو گویا کہ کامریڈز — "ادب برائے حیات" نے دُنیا پر ثابت کر دیا کہ اب ہندستان کو اس ادب کی ضرورت نہیں جو سرمایہ داروں کے سجے ہوئے ایوانوں میں جنم لیتا ہے۔ بلکہ اب ہمیں ایسا ادب چاہیئے جو جنتا کی دل کی دھڑکنوں کا آئینہ دار اور مزدوروں کے اندھیرے جھونپڑوں کا باسی ہو۔ اور جو جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے چھپی ہوئی مضطرب چیخوں کی نمائندگی کر سکے —" اتنے میں ڈبلیو، اے، سی کی ایک اینگلو انڈین لڑکی نے پیام صاحب کو "آئس کریم" پیش کی۔ اور وہ اُسکی طرف متوجہ ہوگئے۔ "کافی ہاؤس" کا آرکسٹرا تیزی کے ساتھ بج رہا تھا۔

ہال کے ستون کی دوسری طرف ایک نہایت ترقی پسند افسانہ نگار عظمت چنگیزی خالو جان سے باتیں کر رہے تھے۔ اور وہ بچارے بھی ان سے "نئے ادب" پر گفتگو کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ پام کے گملوں کے پیچھے ہال کے ایک گوشے میں فرخندہ اور پدما میرے ساتھ بیٹھی چاکلیٹ کھا رہی تھیں۔ تھوڑی دیر میں دو ترقی پسند ادیب ہمارے قریب کی میز پر آکر بیٹھ گئے — ان کے نام مجھے یاد نہیں آرہے — اور ان میں سے ایک نے فرخندہ سے پوچھا —" آپ نے میرے تازہ ترین افسانے "بیٹی کوٹ" اور "توہین" ملاحظہ فرمائے ہونگے؟" فرخندہ نے صاف جھوٹ بول دیا۔" جی ہاں بہت عمدہ ہیں وہ۔" حالانکہ خالو جان کے ساتھ بچپن سے انگلستان میں رہنے کی وجہ سے اُسکو اچھی طرح اُردو پڑھنا بھی نہیں آتا — دوسرے ادیب نے مجھ پر عنایت کی —" جی آپ نے "چھیچھڑے" تو ضرور پڑھا ہوگا؟" گویا میری زندگی کا واحد مقصد "چھیچھڑے" پڑھنا ہی تھا۔ لیکن مجھے بھی فرخندہ کی تقلید کرنی پڑی —" آپ کے افسانے تو مجھے بہت پسند ہیں۔" — اور اب اُنہوں نے کہنا شروع کیا۔" بات یہ ہے محترمہ کہ ادب اور زندگی کے متعلق میرا نظریہ طوفانی راتوں میں ایک جھونپڑے میں رکھے ہوئے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کے مانند ہے۔ کھیتوں کی پگڈنڈیاں۔ گلیوں کی کچی دیواروں کے سائے۔ پنگھٹ کے گیت — ان تمام چیزوں میں سینکڑوں ترقی پسند افسانے پوشیدہ ہیں۔ آج میرے سنہری حاشیوں والے دُھندلے دُھندلے خواب خاموش پتواروں کے پاس جنم لیکر کہانیوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں —"

میں ان کی اس تقریر کو سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ پرویز رومانی ہماری طرف آتے نظر آئے۔ اور قریب آکر کہنے لگے۔" اوہو! اس آتشیں کتاب "شرارے" کے مصنفین ابھی تک نہیں آئے۔ ٹھہریئے میں فون کرتا ہوں —" اور پام کے گملوں کے سامنے بیٹھے ہوئے ایک ترقی پسند شاعر نے گنگنانا شروع کیا۔

یہ کس نے فون پہ دی سال نو کی تہنیت مجھ کو
تمنّا رقص کرتی ہے تخیّل گنگناتا ہے

اور ان کے ایک کامریڈ نے پرویز صاحب سے کہا۔ ہمارے ان شعلہ بیان مصنفوں میں سے آج شاید کوئی بھی نہ آسکے گا۔ کیونکہ ان میں سے ایک کو تو گورنمنٹ آف انڈیا میں ایک اعلیٰ عہدہ مل گیا ہے اور باقی ہندستان کو آزاد کرانے میں مصروف ہیں۔"

ہم سے کچھ دور کیپٹن و بیگم ترکیتی بیٹھی تھیں۔ ہم اُٹھ کر ان کے پاس چلے گئے۔ بدقسمتی سے چار پانچ کمیونسٹ اور اشتراکی قسم کے ادیب وہاں بھی موجود تھے۔ ان میں سے ایک کیپٹن ترکیتی سے کہہ رہے تھے —" یہی وجہ ہے کیپٹن صاحب کہ اب ہم زندگی کو ہر ترقی پسند زاویہ نظر سے دیکھ سکتے ہیں۔ چنانچہ ہماری جنتا کو اس وقت "پیٹی کوٹ" اور "رضائی" وغیرہ قسم کے حسین فسانوں کی بے حد ضرورت ہے —" اور جب وہ اپنا پائپ جلانے کے لئے رُکے تو دوسرے ادیب نے کہنا شروع کیا۔" قصہ مختصر یہ کہ ہم ایک ایسے سنسار کے باسی ہیں جہاں بھوک ہے۔ محنت ہے۔ افلاس ہے۔ ظلم و ستم ہے۔ حکومت کا استبداد ہے۔ آنسو ہیں اور آہیں ہیں۔ ہمارے نوجوان شعرا بھی اسی دُنیا کی نمائندگی کرتے ہیں۔ چنانچہ میں پیام مرغی شہری سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اپنی معرکتہ الآرا نظم ؎

سرخ و سیہ صدیوں کے سائے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گذری ہے

سُنا کر ہمیں محظوظ کریں" — لیکن پیام صاحب میزبان سے اجازت لئے بغیر شاید مس مارگریٹ رد لینڈ کے ساتھ سینما دیکھنے جا چکے تھے۔ اس لئے ان ادیب صاحب نے خود ہی اپنی ایک شاہکار نظم پڑھنی شروع کی۔

دوپہر کی گرم لو میں زرد پتیاں ویران سڑکوں پر اُڑیں

اُڑ رہی ہیں جیسے
میرے ٹوٹے ہوئے خواب
یا کسی مجبور مزدور کی آہیں جو
پانی کے نل کے پاس بیٹھا باسی چنے کھا رہا ہے۔

میرے سر میں ہلکا ہلکا درد شروع ہونے لگا تھا ———— "واہ واہ" کے شور سے ہال گونج اٹھا۔ پھر ایک اور شاعر نے جواب تک آرکیسٹرا میں پیانو بجانے والی لڑکی کے ساتھ بیٹھے کافی پی رہے تھے اپنی نظم سنائی۔

خوابوں کے دھندلے جزیروں کے اس پار
دُور شفق کے رنگین کناروں میں کھوئے ہوئے خیالوں کی طرح
جب کلاس روم میں خاموش بیٹھا ہوتا ہوں میں
تو باہر گھاس کھودنے والی مزدور لڑکی کی چوڑیوں کی جھنکار سُن کر مجھے
غلام آباد ہندستان کا خیال آتا ہے اے دوست
اور میں سوچتا ہوں کہ کیا کروں
ایک خونی انقلاب
یا پھر جمنا کی بے تاب لہروں کو چیر کے
اُفق سے جا ٹکراؤں
نوکری ملتی نہیں ہے مجھ کو اس لئے
نئے ادب کی شاعری کا عارضہ ہوا
ہے لاحق
کاش میں ہوسکتا داخل ایمرجنسی کمیشن میں
گر نہ ہوتا مجھے خیال اے دوست تیرا

———— میرے سر میں درد بہت زور سے شروع ہوگیا۔ میں نے پریشان ہو کر ممی کو دیکھا اور میزبان سے معذرت چاہ کے باہر کار میں آکر لیٹ گئی۔ اور اس رات خواب میں مجھے یہ معلوم ہوا جیسے بہت سے۔ ۳۵ سو ترقی پسند ادیب اپنے حسین افسانوں اور خوبصورت نظموں سمیت میرے کمرے پر دھاوا کر رہے ہیں۔ تاکہ جنتا کی حالت سُدھرے۔ اور غلام آباد ہندستان کو آزادی نصیب ہو جائے۔



اوربھرتی ہورہی تھی

قسط دوم

(از محترمہ شیریں)

جب نیلوفر کی ظفر سے شادی ہوئی تھی۔ تو وہ اسکے لئے بالکل اجنبی نہ تھا۔ جب وہ بہت چھوٹی سی تھی۔ اسی وقت ظفر کی پہلی بیوی کا انتقال ہوا تھا۔ اور اسی وقت سے جبکہ ظفر ۲۰ برس کا اور نیلوفر ۶ برس کی ایک بے سمجھ مخلوق تھی۔ نیلوفر کے نام کے ساتھ ظفر کا نام لیا جانے لگا تھا ــــ خیر اس وقت تو وہ بالکل ناسمجھ تھی۔ لیکن جوں جوں بڑی ہوتی گئی ہندستانی لڑکیوں کی ذہنیت کے مطابق اُسے ظفر کی ذات سے کافی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اور جانے کیوں اس نے لاشعوری کے طور پر یقین کر لیا کہ ظفر کوئی بہت ہی ارفع اور منزہ ہستی ہے۔ غیر ملکیوں کے ہاتھوں ہندستانی تہذیب کو زوال پذیر ہوئے ایک عرصہ بیت گیا۔ تعلیم و تہذیب کی روشنی نے اپنی شعاعیں بکھیرنی شروع کر دیں۔ زمانہ ترقی کی کتنی منزلیں طے کر آیا۔ لیکن ہندستانی عورت کا دل اور اسکی فطرت بدل دینا کسی سے ممکن نہ ہوسکا۔ اور اگر کوئی تبدیلی ہوئی بھی تو ظاہری اور سطحی ــــ اور نیلوفر کا یہ جذبہ بھی یہی ہندستانی عورت کا خاوند کو دیوتا ماننے کے پرانے مگر مضبوط اصول کے زیر اثر تھا۔ نیلوفر نے چھوٹی سی عمر میں ہی تعلیم و تربیت میں ایسی ترقی کر لی تھی کہ لوگ اسکی ذہانت دیکھ دیکھکر حیران ہوتے تھے۔ اُس نے صرف نصابی کتب ہی نہیں پڑھی تھیں بلکہ دنیا کے بہترین معیاری لٹریچر کا معتدبہ حصہ دیکھ ڈالا تھا۔ فلسفہ اور ادب اس کے محبوب مضامین تھے۔ تاہیر عالم کے دواوین اسکی نظروں سے گذر چکے تھے۔ اور اس وسیع مطالعے نے ذرانی کے اخلاق کو بلند کر دیا تھا۔ اسکے خیالات کو وسیع کر دیا تھا۔ اور اُسے شائستگی اور مروت کا مجسمہ بنا دیا تھا۔ وہ ازل ہی سے اثر پذیر اور متلون دل اور طبیعت لیکر آئی تھی۔ قدرت نے اسے جنم بھی ایسے گھر میں دیا جہاں اس کی یہ صلاحیتیں اور بھی چمک اُٹھیں۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ بہت ہی ارفع نظر، باذاق بلند معیار سکالر ثابت ہوئی۔ وہ انسان کیلئے علم ہی کو ذریعہ نجات سمجھتی تھی۔ اسکے خیال میں علم ہی انسان کو صحیح معنوں میں انسان بناتا تھا۔ وہ کسی اعلیٰ تعلیم یافتہ کو عام لوگوں سے بہت بلند اور الگ سمجھتی تھی۔ اسکے نزدیک ایک اچھی تعلیم اخلاقی اور فن کیلئے اکسیر کا کام رکھتی ہے۔ بلکہ مسرت سے پیدا ہی نہیں ہونے دیتی ــ اور اس لئے وہ ہر تعلیم یافتہ فرد کو تمام عمومی اور پست خیالات سے مبرا اور ہر قسم کے عیوب سے پاک سمجھ لیتی تھی۔ لیکن اُسے اس وقت معلوم نہیں تھا کہ اسکا یہ تجربہ کتابی تھا عملی نہیں۔ یا کالج کی چہار دیواری میں بیٹھکر محض ڈگری حاصل کرنے کے لئے نصابی کتب رٹ لینا اخلاقی معیار کو بلند نہیں کر سکتا۔ مگر اس وقت نیلوفر میں ایسی عملی سمجھ اور پرکھ کہاں تھی۔ اور اسی لئے جب ظفر انگلینڈ سے کئی بڑی بڑی ڈگریاں لے کر آیا تو نیلوفر کے دل میں جو عقیدت اور رفعت پہلے تھی کئی گنا بڑھ گئی۔ ظفر اس سے بیس برس بڑا تھا۔ لوگ دبی زبان میں اسکے متعلق کچھ افواہیں بھی اُڑاتے تھے۔ لیکن نیلوفر نے کبھی ان باتوں کو اہمیت نہیں دی ــ کبھی ان پر یقین نہیں کیا اور اس لئے جب ظفر کی شادی کا پیغام قبول کر لیا گیا تو نیلوفر ناخوش نہیں ہوئی۔ بلکہ اس بارے میں اسکی آواز کی کوئی وقعت نہیں تھی۔ اگر وہ مخالفت بھی کرتی تو کون سنتا تھا۔ وہ خاندان کی رسم کے خلاف مخالفت کر ہی سکتی تھی۔ لیکن اسے تو اسکی ضرورت ہی نہیں تھی۔ اس کا جیون ساتھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور ہندستان کے ممالک میں کئی برس رہکر تعلیم و تہذیب میں نمایاں کامیابی حاصل کر چکا تھا۔ اسکے علاوہ اور کو وہ قابل توجہ نہیں سمجھتی تھی۔ اور وہ تصوری تصور میں ایک نئی دنیا کا نقشہ بنانے میں مصروف ہوجاتی۔ لیکن کبھی کبھی گھر سے جدائی کا خیال اُسے بیقرار بھی کر دیتا تھا۔ مگر بہت جلد پھر سے وہ رنگین سپنوں میں کھو جاتی۔

اور پھر شادی کا دن بھی آپہنچا۔ نیلوفر اپنے عزیزوں سے، اپنی بچپن کی سکھیوں سے اپنے گھر سے رخصت ہو رہی تھی۔ اس کا شاعرانہ دل گھر کی ایک ایک چیز سے لپٹ کر آنسو بہانا چاہتا تھا۔ اندر ہی اندر جیسے دل میں کوئی چھُریاں چلا رہا تھا۔ اور آخر کار وہ حسرت بھرا دل لئے شام کو ایک اجنبی گھر میں پہنچ گئی۔ ظفر کے یہاں اپنے خاندان کی کوئی عورت تھی ہی نہیں۔ مہمان اُس نے بلائے نہیں تھے۔ وقتی طور پر چند عورتیں رشتہ داری کی آگئی تھیں۔ اور نیلوفر کو رونمائی کا ایکٹنگ کرنا پڑا۔ جو ہر ہندستانی لڑکی صدیوں سے کرتی آرہی ہے۔ خواہ جاہل ہو یا پڑھی لکھی، امیر ہو یا غریب۔ نیلوفر کو یہ کھیل بہت رومانٹک اور دلچسپ معلوم ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُسے غسل کروا کر کپڑے بدلوائے گئے۔ پھر سے اُس کا سنگار کیا گیا۔ اور اُسے عورتوں نے باہر چھت پر پلنگ پر بٹھا دیا۔ اور پھر سب ایک ایک کر کے چلی گئیں۔ نیلوفر کے پاس صرف اسکی اپنی دو نوکرانیاں رہ گئیں۔ کھانا آیا تو اُس نے ایک لقمہ بھی نہیں کھایا۔ اسے بالکل بھوک نہیں تھی۔ تکان سے جسم چور چور ہو رہا تھا۔ اور وہ ذرا کمر سیدھی کرنے کے لئے لیٹ گئی۔ اور جانے کب گہری نیند سوگئی۔

جب اسکی آنکھ کھلی تو آسمان پر ستارے آنکھ مچولی سی کھیل رہے تھے ۔ پرندوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔ صبح کی سرد ہوا سرسرا رہی تھی ۔ اور وہ خلاف معمول شب خوابی کا لباس تبدیل کئے بغیر سوئی ہوئی تھی ۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور اپنے گرد نگاہ ڈالی ۔ اسے آج وہ مانوس مانوس سے بام و در نظر نہیں آرہے تھے وہ جانی پہچانی فضا نہیں تھی۔ کوئی اجنبی جگہ تھی۔ کوئی اجنبی پلنگ ، اور ایک ہی سیکنڈ میں اُسے یاد آگیا آج وہ کہاں رہی ۔ وہ سمٹ کر بیٹھ گئی ۔ مگر وہ تو یہاں تنہا تھی۔ وہ رات بھر اس نئی جگہ اکیلی سوتی رہی ۔ یہ خیال اس کے جسم میں خوف کی جھرجھری پیدا کر رہا تھا۔ یہ اسکی سہاگ رات کی صبح تھی۔ اور اس کے کانوں میں کل رات کے وقت بجنے والی شہنائیوں کی مدھبری تانوں کی صدائے بازگشت گونجتی ہوئی معلوم ہوئی۔ مگر اس وقت اس آواز میں کتنا درد تھا۔ کتنا سوز تھا۔ جیسے کسی کی شکست قلب کی آواز نغمہ میں تبدیل ہوگئی ہو۔ نیلوفر کے دل میں کوئی ناگوار سا احساس انگڑائی لینے لگا۔ دن چڑھے ناشتہ سے فارغ ہوکر وہ نیچے ڈرائنگ روم میں آبیٹھی۔ ظفر بھی وہیں آگیا۔

"رات نیند کیسی آئی ؟ " اس نے آتے ہی نیلوفر سے پوچھا "میں تو تھکا ہوا تھا ۔ لیٹتے ہی سو گیا "

نیلوفر نے بچپن میں کئی بار ظفر کو دیکھا تھا ۔ وہ کئی کئی روز اسکے یہاں جاکر ٹھیرا تھا۔ اور وہ دوسرے رشتہ داروں کی طرح ظفر کے پاس بھی کھیلا کرتی تھی اس سے باتیں کیا کرتی تھی ۔ اور پھر انگلستان سے واپسی پر بھی ایک دفعہ ظفر ان سے ملنے گیا تھا۔ مگر اس وقت میں اور آج میں بڑا فرق تھا۔ ان دنوں وہ اُسے اپنا بزرگ سمجھکر پیش آتی تھی۔ مگر آج ــــــ آج تو وہ ــــــ اس کی آنکھیں زمین پر گڑی ہوئی تھیں ۔ اور وہ جھکی جارہی تھی ۔ جیسے منوں بوجھ کے نیچے دبی ہو ۔ اسکے سارے چہرہ پر پسینے کے چھوٹے چھوٹے قطرے چمکنے لگے ۔

"چائے پی لی" ؟ ظفر نے پوچھا۔ نیلوفر اب بھی کچھ نہیں بولی ۔

"ناراض ہوگیا ؟" ظفر نے کہا ۔ "بولتی کیوں نہیں ہے ؟"

نیلوفر نے جیسے سارا زور لگاکر جواب دیا۔ "پی لی" اور خدا جانے کس جذبہ کے تحت اسکی نگاہیں ظفر کی طرف اُٹھ گئیں۔ ایک نظر ــــــ چند سیکنڈ کی ایک نظر ــــــ اور نیلوفر کا معصوم اور دُنیا کے نشیب و فراز سے ناواقف دل جیسے ڈوبنے لگا ۔ اُسے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اسکی زندگی کی بازی کس قدر غلط لگ چکی تھی ۔ ظفر اس وقت شلوار قمیص پہنے تھا۔ اس کا قد پہلے سے بہت چھوٹا معلوم ہو رہا تھا ۔ دوہرے جسم میں پیٹ خاص طور پر نمایاں تھا سر کے بال اُڑے ہوئے تھے۔ چہرہ پر کتنی ہی باریک باریک لکیریں تھیں اور آنکھوں میں عجیب سی بے حسی اور پژمردگی کی جھلک تھی۔ حقیقت اپنی تمام تلخیوں کے ساتھ نیلوفر کے سامنے تھی۔ نیلوفر کا سارا حجاب ساری شرم گویا آدھی رہ گئی ۔

"بیٹھ جائیے" اس نے بالکل سہمی لہجہ میں ظفر سے کہا۔ اور پھر خاصی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی ۔ اس کے لہجہ میں جھجک نہیں رہی تھی۔ نہ انداز میں حجاب تھا نہ آنکھوں میں کسی شرمیلے جذبہ کی جھلک تھی ۔ کم عمر سہی مگر اسکے غیر معمولی قابل دماغ نے ایک ہی نظر میں بھانپ لیا تھا کہ اس جنس کا یہاں کوئی خریدار نہیں اور اس کے بعد ہر گذرنے والا دن نیلوفر کے دل پر سینکڑوں چرکے لگا کر جاتا اور ہر بیت جانے والی شب اسکے رخساروں پر لاتعداد آنسوؤں کے نشان چھوڑ جاتی ۔ اس کی امیدوں کے خوشنما محل منہدم ہو چکے تھے ۔ اسکے ارمانوں کی دُنیا اُجڑ چکی تھی ۔ اس کے تصور کا سنہری جال ٹوٹ چکا تھا ۔ قدرت کا کیا ستم ظریفانہ کھیل تھا ۔ اس کی قسمت میں ایسے شخص کا ساتھ پڑا تھا ۔ جو معنوی لحاظ سے اس سے کوسوں دور تھا ۔ جسکی عادات و اطوار اس سے بالکل متضاد تھیں ۔ نیلوفر علم و ادب کی روشنی میں زندگی بسر کرنے کی عادی اور ظفر کو سوائے اخبار کے مضمونوں کوئی اٹھا کر دیکھنا کوئی علمی گفتگو کرنا تسم ــــــ نیلوفر کلاسیکل موسیقی کی دلدادہ اور پرستار اور ظفر سرے سے موسیقی کو تضیع اوقات اور خواہ مخواہ کی سمع خراشی سمجھنے پر مجبور نیلوفر اساتذہ کے کلام کی گہرائیوں میں پہنچ کر از خود رفتہ سی ہو جانے والی ۔ اور ظفر کے نزدیک شاعری محض بیکاروں کا مشغلہ ۔ نیلوفر کو اپنے بڑے سے بڑے دکھ اور تکلیف کو مسکراہٹ کے پردے میں چھپانے کی عادت اور ظفر ذرا سی بات پر غم و غصہ سے آپے سے باہر ہو جانے کا عادی ۔ غرضیکہ ایک طرف لطافت تھی اور دوسری طرف کثافت ۔ ایک طرف پھلواری تھی تو دوسری طرف کرخت بنجر زمین ۔ ایک طرف زندگی تھی تو دوسری طرف موت کا سناٹا ۔ گویا دوسرے لفظوں میں ان دونو کی طبائع میں زمین آسمان کا فرق تھا ۔ اور بقول کسے ایک کا راستہ پورب کو جاتا تھا تو دوسرے کا پچھم کو ــــــ اگر ظفر کے دل میں نیلوفر کے جذبات کے احترام کی اہلیت موجود ہوتی ۔ اگر اسکی طبیعت نیلوفر کی طبیعت کے موافق ہوتی تو شاید نیلوفر کے لئے عمر کا تفاوت اتنا تکلیف دہ نہ ہوتا ۔ اگر ان کی طبیعتیں مختلف تھیں تو خیر ظفر کے دل میں ولولہ اور زندگی ہوتی تو بھی نبھ جاتی ۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی بالکل برعکس تھا چوبیس گھنٹوں میں ایک بات بھی نیلوفر کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتی تھی ۔ ایک بات سے بھی اُسے خوشی نہیں ہوتی تھی ۔ ہر وقت کا کڑھنا ہر وقت کا جلنا ۔ شادی کے بارے میں اس کے جو حسین تصورات تھے یہاں ان کا سایہ تک نہیں تھا ۔

یوں تو بہتیری باتیں کرتا تھا ۔ وہ بہت باتونی تھا ۔ مگر نیلوفر کو اسکی باتیں کبھی اچھی نہیں لگتی تھیں ۔ وہ زیادہ تر انگلستان کے قصے کہنے کا عادی تھا ۔ وہاں کے کیفوں

کی کیفیت۔ وہاں کے بال روم کا نقشہ۔ وہاں کے ادنیٰ درجہ کے گھروں کی لڑکیوں کے قصّے اور وہاں کے ہندوستانیوں اور خود اپنی اخلاقی پستیوں کی داستانیں۔ اور خدا جانے کیوں نیلوفر کو ان تذکروں سے دلی نفرت تھی۔ وہ چاہتی تھی ظفر وہاں کی کسی تاریخی چیز کا ذکر کرے۔ وہاں کی بڑی بڑی شاندار عمارتوں کا نقشہ کھینچے۔ کسی بڑے مصنف یا سیاست دان کے متعلق کچھ بتلائے۔ اُسے قید کی "لڑکیوں کے کیرکٹر اور کیفوں کے تعلقوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ بلکہ ایسی باتیں اُسکے دل کو اداس کر دیتی تھیں۔ غرضیکہ ظفر کے ساتھ نیلوفر کی زندگی سکوت اور جمود کا ایک لا انتہائی سلسلہ بنکر رہ گئی تھی جس میں نہ کوئی تبدیلی تھی نہ جوش۔ اور یہ جمود نیلوفر کی سیماب صفت بیقرار طبیعت کے لئے گویا موت کا پیغام تھا۔ یوں تو ہر ازدواجی زندگی کچھ مدت کے بعد ایسی ہی افسردگی اور روحانی تھکن سے لبریز ہو کر رہتی ہے لیکن نیلوفر کی تو اس نئی زندگی کا آغاز ہی جاودانی جمود سے ہوا تھا جس میں کسی خوشگوار تبدیلی کی کوئی امید ہی نہیں تھی۔ اس نے سُنا ہوا تھا دولہنوں کے نام ان کے خاوند بڑے اچھے اچھے شیریں خط لکھا کرتے ہیں۔ اور جب شادی کے تھوڑے روز بعد ظفر کسی سرکاری کام سے باہر گیا تو نیلوفر اسکے جاتے ہی اُسکے خط کا انتظار کرنے لگی تھی۔ اس کا خیال تھا ظفر جو باتیں زبان سے نہیں کہہ سکتا تھا۔

وہ خط میں ضرور لکھے گا۔ وہ لکھے گا "تم مجھے بہت یاد آتی ہو۔ تمہیں دیکھنے کیلئے بیقرار ہو رہا ہوں" "جلدی واپسی کی کوشش کرونگا"۔ مگر جب کئی روز بعد ظفر کا خط آیا تو اس میں وہاں کے ہوٹل کے کھانے کی شکایت اور سفر کی تکلیف کا حال لکھا ہوا تھا۔ نیلوفر جھنجھلا اُٹھی۔ اور اس نے خط کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے ہوا میں بکھیر دیئے۔

پھیکے اور افسردہ دن یونہی گذرتے جا رہے تھے۔ گرمیوں کی پُر نسوں مُعطّر چاندنی اور ٹھنڈی خنک راتیں بیت گئیں۔ برسات کے دیوانہ کر دینے والے دن آئے اور گذر گئے۔ اور پھر جاڑوں کی طویل سرد راتیں بھی لمبی ہو گئیں۔ لیکن نیلوفر کے دل کی کلی جو کھلنے سے پہلے مرجھا گئی تھی ہری نہ ہوئی۔ نیلوفر اپنے نئے ماحول سے مانوس ہونے سے پہلے ہی بیزار ہو گئی تھی اور یہ احساس بیزاری کچھ لڑائی جھگڑے کی صورت میں نمودار ہونے لگا۔ وہ لاکھ پڑھی لکھی اور بردبار سہی۔ مگر اپنی توقعات کے عظیم الشان محل یوں منہدم ہوتے دیکھکر بچوں کی طرح ٹھنک گئی۔ اور بات بات پر ظفر سے اختلاف ہونے لگا۔ وہ تہذیب زبان کو انسانیت کا لازمی جزو سمجھتی تھی۔ ادھر ظفر کو جب کسی ملازم پر غصہ آتا تو ایسی مخربِ اخلاق باتیں کہہ جاتا کہ نیلوفر غصہ سے کانپ کر رہ جاتی۔ اور کئی مرتبہ اُس نے نیلوفر سے بھی بدکلامی کرنے

سے دو چار نہ کیا۔ جو اگرچہ عام لوگوں اور خود ظفر کے نزدیک کوئی زیادہ قابل الزام نہیں ہوتی تھی۔ لیکن یہی باتیں نیلوفر کیلئے زہر میں بجھے ہوئے خنجر سے بھی بڑھکر ہوتیں۔ اُس نے ایسے ماحول میں پرورش پائی تھی۔ جہاں اُسی کی خواہش اور خوشی سب پر مقدم تھی۔ اسکی کوئی بات کبھی رد نہیں ہوتی تھی۔ کسی امر میں کبھی اس سے اختلاف نہیں کیا گیا تھا اور اگرچہ نیلوفر قدرتی علم اور وارداری کے جذبہ کے زیر اثر اور اچھی تعلیم و تربیت کے طفیل اپنے ناز و نعم میں بھی خود سر اور ہٹ دھرم نہیں بنی تھی۔ مگر احساس خودداری اس میں غایت درجہ بڑھا ہوا تھا اور اسی لئے ظفر کی اس قسم کی غیر مہذب باتیں اسکی روح کو تڑپا دیتی تھیں اس کا مرجانے کو جی چاہتا تھا۔ ظفر کیلئے اسکے دل میں نفرت کا جذبہ اُبھر آتا تھا اور وہ کئی کئی روز ظفر سے رُوٹھی رہتی۔ کھانا نہ کھاتی۔ کوئی کام دل سے نہ کرتی۔ بہت جلد ظفر اسکو معافی مانگ کر منا لیتا۔ مگر اگلے ہی دن پھر کوئی دکھ کی قصہ شروع ہوجاتا۔ نیلوفر کسی نوکر کو ناپسند کرتی ظفر اسی کا مداح ہوجاتا۔ چلئے لڑائی شروع ہوجاتی۔ ظفر کبھی اطلاع کئے بغیر کسی دوست کے یہاں چلا گیا اور زیادہ دیر ہوگئی۔ نیلوفر کا بولنا بند! نادان لڑکی اپنی ناکامی اور ناپسندیدگی کے جذبہ کا اظہار اسی عدم تعاون سے کر رہی تھی۔ لیکن کچھ مدت بعد اُسے یہ رُوٹھنے منانے کا کھیل نہایت ہی مضحکہ خیز اور ذلیل معلوم ہونے لگا۔ وہ اپنے تئیں نفرین کرنے لگی کہ کیوں بےبسی کا اظہار روٹھنے کی صورت میں کرے۔ یہ بات اسے اپنی خودداری کے منافی معلوم ہونے لگی۔ اور اس قسم کے لڑائی جھگڑے چھوڑ کر وہ گویا اپنی قسمت پر شاکر ہو کر بیٹھ گئی۔ جیسے چڑھی ہوئی ندی رستہ نہ پا کر اپنے بہاؤ کا رُخ بدل دے۔

اپنے کسی مقصد میں ناکام رہنے کے بعد انسان طرح طرح کے مشاغل میں تسکین قلب ڈھونڈھتا ہے۔ نیلوفر نے اپنی حیات کی تلخیوں کو صحافتی زندگی کی علاوتوں میں مدغم کردینے کا تہیہ کرلیا۔ اسکی غیر معمولی ذہانت اور ادبی ذوق مضمون نگاری کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے ہر گوشے میں اس کے زور قلم کی دھاک جم گئی۔ علم و ادب کے مختلف اصناف پر اسکے ناقدانہ تبصرے اور فاضلانہ مضامین دیکھکر بڑے بڑے جید فاضل بھی دنگ رہ جاتے مگر اس کی غیر فانی شہرت کا سبب اسکے افسانے تھے۔ جو دلاویز اسلوب بیان اور دلنشیں طرز تحریر کے ساتھ ساتھ کسی درد نہاں کی ہلکی سی لذت آگیں چاشنی اور گھٹے ہوئے جذبات کے دھندلے سے عکس کا مرقع ہوتے تھے اور جو پڑھنے والے کو کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" کے مصداق بنا دیتے تھے۔

کچھ عرصہ سے نیلوفر ایک اردو ماہنامہ میں کسی غیر معروف شاعر کا کلام دیکھ رہی تھی۔ وہ ضیا کے نام سے لکھتا تھا۔ اور اڈیٹر نے اس کا تعارف کراتے ہوئے لکھا تھا کہ وہ حال ہی میں انگلستان سے لٹریچر کی ہی ڈگری لے کر آیا ہے۔ نیلوفر رسائل میں ادبا و شعرا کے مضامین اور نظمیں وغیرہ دیکھتی ہی رہتی تھی۔ اس کا ادبی مذاق اس قدر سلجھا ہوا اور پاکیزہ تھا کہ کسی سرسری چیز پر اس سے داد حاصل کرنا آسان بات نہیں تھی۔ اکثر ادیب اسکی پسندیدگی کو اپنی شہرت کی سند سمجھتے تھے لیکن ضیا کے کلام میں اُسے اول ہی سے عجیب سی گہرائی اور تاثیر دکھائی دے رہی تھی۔ باریک تر فلسفیانہ نکات۔ بلند تخیل۔ دلاویز ترکیبیں اور دلی درد کی ہلکی سی جھلک گویا ضیا کا کلام ایک شفاف آئینہ تھا۔ جس میں لکھنے والے کے بلند معیار اور ذوق سلیم کی جھلک صاف نظر آرہی تھی۔ اور نیلوفر کے دل پر بالکل غیر ارادی طور پہ یہ تمام خوبیاں نقش ہوتی چلی گئیں۔ اور پھر رفتہ رفتہ اُسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے ضیا کی ہر نظم کا ہر شعر خود نیلوفر کے جذبات و محسوسات کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ کائنات کی ہر شے کا بالکل نیلوفر ہی کی طرح مطالعہ کرتا تھا۔ زندگی کے ہر زاویہ کو اُسی کی مانند دیکھتا۔ حیات انسانی کے ہر پہلو کو اسی کی طرح اُجاگر کرتا۔ اور اس کا تخیل نیلوفر ہی کی طرح ارفع سے ارفع تر کا جویا تھا۔ بارہا ایسا ہوا کہ نیلوفر کوئی مضمون لکھنا شروع کرتی یا کسی افسانے کے پلاٹ کو ذہن میں ترتیب دیتی اور اپنے خیالات کو سپرد قلم کرنے سے پہلے ہی اُسے ضیا کے کلام میں بالکل انہیں خیالات کا عکس دکھائی دیتا۔ خیالات کی اس حیرت انگیز مناسبت اور ہم مذاقی کے سبب نیلوفر قدرتی طور پہ بالکل لاشعوری طریقہ سے ضیا کے قریب ہوتی گئی۔ لیکن اس ذہنی قربت سے اکثر اُسے بہت تکلیف ہونے لگی تھی۔ ایک عجیب سی دلی کشمکش کی تکلیف۔ کیا یہ مذہب کی رُو سے جُرم نہیں تھا۔ اخلاقی گناہ نہیں تھا۔ اور اس خیال سے وہ بےکل سی ہوجایا کرتی۔ لیکن پھر خود ہی اس پرانے نظریے "کسی کیلئے پسندیدگی کا جذبہ دل میں پیدا ہوجانا گناہ نہیں ہے" کے مطابق دل کو تسلی دے لیا کرتی۔ اور پھر ایک دن نیلوفر کو ایک رسالے کی معرفت ضیا کا خط ملا۔ جس میں اُسکے تازہ ترین افسانے کی تعریف لکھی تھی اور اسکی ادبی سرگرمیوں پر اُسے مبارکباد پیش کی تھی۔ اس قسم کے تعریفی خط اُسے اکثر موصول ہوتے رہتے تھے۔ اُسکے لئے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے کبھی ایسے خطوط کا جواب تک نہیں دیا۔ لیکن ضیا کا خط اُسے ان خطوں سے بالکل جدا نظر آرہا تھا۔ اس کی طرف سے نیلوفر کے دل میں پہلے ہی جذبات استحسان موجود تھے۔ اور اب اسکے خط میں کچھ ایسا خلوص اور ایسی سادگی سی نظر آئی کہ جواب نہ لکھنا اُسے بداخلاقی معلوم ہونے لگی۔ اور اس نے جواب میں رسمی شکریہ لکھ بھیجا۔ اور اسکے بعد ان کے درمیان مراسلت کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ جو بادی النظر میں خواہ

معیوب یا نامناسب امر تھا مگر یہ حقیقت تھی کہ ایک کم ایک کوئی فلسفہ کا مسئلہ درپیش ہوتا کبھی قدیم و جدید ادب کا موازنہ کیا جاتا۔ اور کبھی کوئی اور علمی یا ادبی بحث چھڑ جاتی۔ لیکن ان تذکروں کے درمیان قدرتی طور پر ان کے قلم سے ایک دوسرے کی ذات کے متعلق بھی چند الفاظ نکلے ہی جاتے۔ ضیا لکھتا "آپ کا تازہ ترین افسانہ پڑھا۔ ہندستانی معاشرت اور رسم و رواج کے متعلق جس قدر عمق نظری سے کام لیا گیا ہے۔ یقیناً آپ ہی کا حصہ ہے۔ اور بیہودہ کہانی یا بے رنگی تو نام کو نہیں۔ فلسفہ اور شعر کو سمو کر ایک ایسا خاکہ کھینچ دینا جو مدت العمر کیلئے دل پر نقش ہو جائے جو دل کو سوز و گداز کے بیش بہا خزانے بخش دے آپ کے لئے معمولی بات ہے" نیلوفر بھی اپنا "اغیہ چھپا نہ سکتی۔۔ یوں لبے سے الفاظ میں لکھ دیتی "آپ کی ماہ حال کی نظم دیکھی۔ خدا آپ لکھتے نہیں جادو کرتے ہیں"

اگرچہ اس قسم کے خیالات بالکل غیر ارادی طور پر ظاہر کئے جاتے تھے۔ لیکن قدرتی طور پر اس سے وہ احساس پسندیدگی اور کبھی مستحکم ہوتا گیا جو دونوں کے تحت الشعور میں دبا ہوا تھا۔

نیلوفر ہر بار سوچتی مراسلت کا یہ سلسلہ جو بالکل اچانک شروع ہو گیا تھا بند کر دے۔ لیکن ہر بار وہ اپنے اس ارادے میں ناکام رہتی۔ ضیا کے خطوط سے نیلوفر کی روح میں جو ایک پُرکیف اہتزاز سا پیدا ہو جاتا تھا وہ اس کے لالچ کو چھوڑ نہ سکی۔

ظفر، نیلوفر کی ڈاک میں اور خطوط کے ساتھ اکثر ضیا کے خط بھی پڑھ لیا کرتا تھا۔ پھر وہ نیلوفر سے دو تین مرتبہ ضیا کے کلام کی تعریف بھی سن چکا تھا۔ جن خوبیوں سے ہم خود محروم ہوں وہی محاسن کسی دوسرے شخص میں دیکھکر ہم خواہ مخواہ اُس سے جلنے لگتے ہیں۔ اور اس لئے ظفر کو ضیا سے ایک نہ معلوم سی پرخاش ہو گئی تھی ——!

گرمیوں کا موسم تھا۔ نیلوفر اور ظفر اور ان کا ننھا پہاڑ پر گئے ہوئے تھے۔ نیلوفر کی روح کو پہاڑوں کے قدرتی مناظر آسودگی سی بخشتے تھے۔ اور وہ یہاں بہت خوش تھی۔

ایک دن نیلوفر کی ایک ملنے والی نے چند سہیلیوں کے ساتھ اُسے ایک ریسٹوران میں چائے پر مدعو کیا تھا۔ وہ سب ایک طرف کو بیٹھی ہوئی آہستہ آہستہ چائے ختم کر رہی تھیں اور پُرلطف باتوں کا سلسلہ چھڑا ہوا تھا۔ کبھی کبھی دبے ہوئے قہقہے بھی بلند ہو جاتے تھے۔ نیلوفر حسبِ عادت ساری مجلس کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ سب اُسکی پُرلطف ظرافت آمیز باتوں سے محظوظ ہو رہی تھیں۔ اچانک قریب کی میز پر نیلوفر نے ایک شخص کو بیٹھے دیکھا جو چائے کی پیالی آگے رکھے کچھ کھویا کھویا سا لگا تار نیلوفر کو دیکھے جا رہا تھا۔ اکثر ہندستانی جوان عورتوں کو یہ ناگوار گزرتے ہیں۔ نیلوفر نے ناگواری سے منہ پھیر لیا۔ لیکن کچھ دیر بعد اُس نے بالکل غیر ارادی طور پر پھر اس طرف دیکھا تو اُسے اب بھی برابر اپنی طرف دیکھتے پایا۔ چائے کی پیالی جوں کی توں اُس کے سامنے رکھی تھی۔ نیلوفر مجوب سی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد نیلوفر نے ظفر کے ایک دوست کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ اُس کے ساتھ وہی شخص تھا۔

"ہماری بھابی صاحبہ ملک کی مایۂ ناز افسانہ نگار خاتون نیلوفر اور یہ جادو نگار شاعر خالد ضیا"

ظفر کے دوست نے تعارف کرواتے ہوئے ظرافت سے شاعرانہ انداز میں مجیب سے والہانہ پن سے قدرے جھک کر سلام کیا۔ نیلوفر بھی ذرا سی گھبری ہوئی اور پھر سب سے باری باری تعارف کروایا گیا۔ اور سب ایک ہی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ ضیا کچھ از خود رفتہ سا نظر آ رہا تھا۔ جیسے کسی اچانک مسرت سے دوچار ہو کر مغلوب ہو رہا تھا۔ اسکی بیقرار آنکھیں بار بار نیلوفر ہی کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں کیسی کشش انگیز چمک تھی۔ کیسی شاعرانہ اُداسی تھی۔ جیسے ایک دنیا کو جذب کر لینے کی قوت رکھتی ہوں۔ اور نیلوفر کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ان آنکھوں کی گہرائی اور یہ نشیلی اُداسی اُسے کوئی بہت ہی پُرکیف اور لطیف سندیسہ دے رہی ہو۔ وہ کانپ گئی اور جان بوجھ کر اور طرف متوجہ ہو گئی۔ ضیا تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر کی رسمی گفتگو کرتا رہا۔ نیلوفر کی سہیلیاں اسکی باتوں میں خاص دلچسپی لے رہی تھیں۔ مگر نیلوفر کسی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح کچھ ڈری ہوئی سی شرمائی ہوئی سی اور جھینپی ہوئی نظر آ رہی تھی۔

"بھابی! ضیا کل ہی یہاں آئے ہیں" ظفر کا دوست بولا۔ "میں سوچ ہی رہا تھا کہ آپ سے ان کا تعارف ضرور کراؤں گا۔ دو فنکاروں کا اتنے نزدیک رہ کر بھی ایک دوسرے سے بیگانہ رہنا بے انصافی ہوتی"

"ایک دوسرے سے بیگانہ" یہ الفاظ نیلوفر کے دل میں ایک دلدوز کھٹک پیدا کر گئے۔ نیلوفر بہت جلد وہاں سے چلی آئی۔ رخصت ہوتے وقت ضیا سوچ رہا تھا وہ اُسے دوبارہ ملنے کیلئے کہے گی یا اپنے گھر آنے کی دعوت دیگی۔ مگر نیلوفر نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ اُس نے جاتے جاتے پلٹ کر ایک بار ضیا کو دیکھا۔ اور آناً فاناً میں نظروں سے اوجھل ہو گئی ——

(باقی آئندہ)

قومی رہنما

از محترمہ آصفہ مجیب

کچھ دن سے مجھے قومی کام کرنے کا بہت شوق ہوگیا تھا۔ اپنی قومی تباہی اور بربادی کا یخ سوہان روح ہوگیا۔ اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے میرے دل میں ایک ہوک سی اُٹھتی۔ یا اللہ کیا انجام ہوگا۔ میں نے تہیہ کرلیا کہ اپنی بساط کے مطابق کچھ نہ کچھ ضرور کرونگی۔ اس سلسلے میں مجھے بہت سے نئے نئے لوگوں سے واقفیت ہوگئی۔ میں اپنی جوشیلی تقریروں اور اپنے پُرزور خیالات سے سوتوں کو جگانے پر تُل گئی۔ دامے درمے سخنے جو کچھ بضاعت تھی وہ سب اس میں لگادی۔ بہت لوگوں نے میری حوصلہ افزائی کی سنبھالا، مجھے بہت اُونچا اُٹھایا۔ اور میرا شمار بھی قومی کارکنوں میں ہونے لگا۔ مجھے اپنے قومی رہنماؤں سے خاص ارادت اور عقیدت ہوگئی تھی۔ میں سوچنے لگی ان سے بڑھکر کس کے دل میں قومی درد ہوگا۔ خیر میں نے جو درد و دہش کی اس کا ذکر کیا، چھوٹا منہ اور بڑی بات۔ میری حقیقت ہی کیا۔ لیکن ہاں میں جب اپنے کسی قومی رہنما کو دیکھتی تو جوشِ عقیدت سے سرخم کردیتی۔ جی چاہتا انہیں دل میں بٹھالوں یا ان کے لئے پلکیں بچھاؤں، کیا کروں۔ اپنے حلقے میں جب کوئی جلسہ کرتی تو دُور دُور سے چُن چُن کر انہیں صدارت کیلئے منتخب کرتی۔ ہاں یہ کیسی قابلِ قدر روشن ہستیاں ہیں۔ دوسروں کیلئے اپنا عیش و آرام تج دینے والی۔ بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھلانے والی۔ قوم کی ڈوبتی کشتی کو پار لگانے والی۔

اتفاق سے ایک مرتبہ مجھے ایک عظیم الشان جلسے میں جانے کا موقع مل گیا۔ میں اسکو اپنی خوش نصیبی سمجھی۔ کیونکہ ایسے موقعے ذرا کم میسر آتے تھے۔ میرا قیام دیہات میں ہونے کی وجہ سے باہر جانا آنا بہت مشکل سے ہوتا تھا۔ میری ایک بہن بھی میرے ساتھ تھیں۔ ہم نے شہر میں اپنے ایک عزیز کے یہاں قیام کیا۔ اور ٹھیک جلسے کے وقت پہنچ گئے۔

ایک وسیع مقام پر بڑا سا پنڈال بنا تھا۔ جو کھچا کھچ بھرا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ انسانوں کا ایک سیلاب اُمنڈا چلا آرہا ہے۔ طرح طرح کے چہرے کالے، گورے، جوان، بوڑھے، مختلف لباس، مختلف آن بان۔ شاندار اور برق رفتار موٹریں چلی آرہی تھیں۔ اور ان پر سے بڑے بڑے رئیس دولتمند بہترین کپڑے پہنے اُتر رہے تھے۔ نئی تہذیب کی خواتین خوش رنگ ساریاں پہنے تیتریوں کی طرح نظر آرہی تھیں۔ اُن کی عریاں باہیں اور بلوریں گردنیں جاذبِ نظر تھیں۔ کچھ پُرانی معاشرت کے لانبی ڈاڑھی کے لوگ تجسس کی نظریں دوڑا رہے تھے۔ اس ہجوم میں میں پہنچی۔ اپنی دھن میں مست قومی جذبہ سے سرشار لیکن میں آزاد نہ تھی۔ ایک سیاہ برقع پہنے تھی۔ اور میری بہن فاختئی رنگ کا۔ پردے کا کوئی معقول انتظام نہ تھا۔ میں سب سے کتراتی ہوئی چلی جارہی تھی اور جگہ تلاش کررہی تھی۔ میری بہن نے کہا۔

"اے ہے باجی کہاں بیٹھو گی؟ یہاں تو بڑا مجمع ہے۔ برقع کے اندر تو دم گھُٹ جائیگا۔ کہیں پردہ کی جگہ نہیں"۔

"چلو کہیں بھی بیٹھ جائیں گے۔ نہ سہی پردہ کا انتظام۔ جہاں بھی جگہ ملے گی گھُس جائیں گے۔ تھوڑی دیر تکلیف ہی سہی۔ ایسے موقع پہ آرام کی فکر نہیں کیا کرتے۔" میری بہن تبسم ہنس پڑی۔

"آفریں ہے آپ کی ہمت اور شوق پر"۔

خیر ہمارا ذوق شوق دیکھکر اور ہمارے آرام کے خیال سے ایک والنٹیئر نے ایک کنارے پر چند چقیں لا کر ڈال دیں اور دو کرسیاں رکھدیں۔ ہم اطمینان سے وہیں بیٹھ گئے۔ اور نہایت دلچسپی سے باہر کا منظر دیکھنے لگے۔ جھنڈا بلند ہوا۔ دھواں دھار تقریریں ہوئیں۔ تجویزیں پیش ہوئیں۔ ووٹ لئے جانے لگے۔ ہم نہایت غور و انہماک سے سب کارروائی دیکھ رہے تھے۔ کبھی کبھی کچھ رائے زنی بھی کرنے لگتے۔

ابھی جلسہ ہو ہی رہا تھا کہ ایک نہایت معمر بزرگ بیوی کمر خمیدہ سفید پوشاک پہنے ایک جوان سی بیوی کا ہاتھ پکڑے جو نہایت فیشن ایبل کپڑے پہنے تھیں ہماری طرف آئیں۔

ہم دونوں بہنیں انہیں دیکھکر فوراً کھڑے ہوگئے۔ اور اپنی کرسیاں پیش کیں۔ ان بزرگ بیوی کو جگہ دینا ہمارا اخلاقی فرض تھا۔ ان دونوں کو میں اچھی طرح جانتی بھی تھی۔ کتنی مرتبہ جلسوں میں ان سے ملاقات ہو چکی تھی۔ اور پھر سب سے بڑھکر یہ کہ ان کا شمار قومی کارکنوں میں تھا۔ وہ بھی قومی رہنماؤں کی ایک رکن کی حیثیت رکھتی تھیں۔

"لیجئے اماں جان آپ تو آرام سے یہیں بیٹھ جائیے"۔ جوان بیوی نے کہا۔ جو اُن کی بہو تھیں۔

"بس بس خوب دکھائی دے رہا ہے"۔

یہ کہکر میری طرف اس طرح دیکھکر مسکرائیں گویا بزبان خاموش ہمارے ایثار کا شکریہ ادا کر رہی ہیں۔ اور اتنا ہی کافی ہے۔ اُن کی بہو صاحبہ

بغیر کچھ کہے دوسری کرسی پر بیٹھ گئیں اور جلسہ کی کارروائی دیکھنے لگیں۔

اتنے میں ایک صاحب اُدھر سے گذرے جو میرے بھائی کے دوست تھے جن کے ساتھ بیوی آئی تھی۔ انہوں نے ہمیں کھڑا دیکھا تو دوڑے ہوئے گئے اور دو کرسیاں اور لے آئے۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ اور دونوں بہنیں بیٹھ گئے۔

میں نے شمسہ سے کہا کہ "ان کو پہچانا ؟"

"ہاں ہاں پہچانتی کیوں نہ .... اے لو یہی تو ہیں جنھوں نے آپ کے جلسہ میں سودیشی پر تقریر کی تھی۔"

ہم منتظر تھے کہ وہ ہم سے کچھ مخاطب ہونگی۔ مگر انہوں نے ہماری طرف رُخ بھی نہیں کیا۔

ایک دم وہ جوان بیوی میری طرف دیکھکر کہنے لگیں۔

"آپ کے پاس پان تو نہ ہونگے ؟"

"جی نہیں۔ میں پان لانا بھول گئی۔ یہاں آنے کی ایسی عجلت تھی کہ ایک پان کھاکے بھی نہ چلی۔"

یہ سنکر اُنہوں نے اپنی ساس کا جھولا اُٹھایا۔ اس میں سے پان نکال کر کھایا، ایک ساس کو دیا۔ اور جھولا بند کرکے ان کو واپس کر دیا۔

ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مجمع کو چیرتی پھاڑتی دو خواتین زرق برق لباس پہنے تشریف لائیں۔ ایک تو یہاں کے ویمن لیگ کی صدر تھیں اور دوسری سکریٹری اور بہت بڑی لیڈر۔ ان دونوں سے مجھ سے چند بار ملاقات ہو چکی تھی۔ اور ہمارے یہاں ایک جلسے میں اُنہوں نے صدارت بھی کی تھی۔ میں تعظیماً کھڑی ہوگئی۔ اُن کو سلام کیا۔ اور پھر اپنی کرسیاں اُن کے لئے خالی کر دیں۔

"تشریف رکھئے۔"

اُنہوں نے نہ ہمارے سلام کا جواب دینا ضروری سمجھا۔ نہ کچھ بولنے کی زحمت گوارا کی۔ بے دھڑک بیٹھ گئیں۔ اور وہ دونوں جو پہلے سے موجود تھیں اُن سے نہایت زوروں میں ہم کلام ہوئیں۔

یہ عجیب مہمل سی حرکت تھی کہ اتنی دیر تو وہ مردانے جلسے میں بے تکلفی سے بیٹھی رہیں۔ خود پردہ تو کرتی نہیں تھیں۔ پھر انہیں آکر بیٹھنے اور منعت میں پردہ داروں کو تکلیف پہنچانے کی کیا ضرورت تھی۔ اور کہاں کی انسانیت تھی۔ محض وہ دو بیویاں جو بیٹھی تھیں ان سے باتیں کرنے کے لئے

ہم مسلسل کھڑے رہے۔ کھڑے کھڑے ہمارے پیر شل ہوگئے۔ جلسہ ختم ہونے کے قریب تھا کہ صدر صاحبہ نے میری طرف رُخ کیا اور بولیں۔

"اے بیوی کہیں سے پانی منگواؤ۔ مارے پیاس کے حلق سوکھا جا رہا ہے۔"

میں نے ذرا تامل سے جواب دیا۔ "مجھے بھی پیاس لگی ہے مگر منگواؤں کس سے ؟"

دوسری بولیں۔ "اِدھر جا کر کسی سے کہو۔"

میں اُن کی بات رد نہ کر سکی۔ اور جوشِ خدمت سے مغلوب ہوکر پانی کی فکر میں گئی۔ مجھے بڑی مشکلوں سے دو گلاس پانی کے ملے۔

دونوں نے میرے ہاتھ سے ایک ایک گلاس لے لیا۔ اور بے تکلف چڑھا گئیں۔ یہ بھی نہ کہا کہ تم بھی پیاسی ہو۔ تھوڑا تم بھی پی لو۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ آخر یہ ہے۔ اگر ہم جنس ہوتے تب بھی جب ہم نے ان کو جگہ دی۔ اُن کی خاطر خود کھڑے رہے۔ انہیں پانی پلایا تو کم از کم انہیں دو حرف شکریہ ہی کے ادا کر دینا چاہیئے تھا۔

جلسہ ختم ہوا تو سکریٹری صاحب نے مجھ سے کہا۔

"یہ کام آپ ہی کر سکتی ہیں .... ذرا ہمارا موٹر منگوا دیجئے اِدھر .... دیکھئے اس طرف کوئی ہوگا۔ اس سے کہہ دیجئے ہمارا موٹر لے آئے۔"

میں نے حیران نگاہوں سے اُن کو دیکھا۔ اور تعمیلِ حکم کے لئے بڑھی۔ میری بہن نے میرا دامن کھینچا۔

"ارے باجی آپ کہاں جا رہی ہیں ؟"

میں نے کہا۔ "ٹھیرو میں ابھی آتی ہوں .... ابھی۔"

میں نے کسی نہ کسی طرح اُن کا موٹر لگوادیا۔ وہ بغیر سلام کلام کے روانہ ہوگئیں۔

میری بہن نے حیرت زدہ ہوکر مجھے دیکھا

"ارے باجی وہ تو ہمارا پنکھا بھی لے گئیں۔ میرے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ پھر واپس ہی نہیں کیا۔"

میں تھوڑی دیر دم بخود کھڑی رہی۔ پھر اپنا برقع سنبھالتے ہوئے بولی۔

"شاباش ہے شاباش ! خوب لوگ ملے آج .... کیا نادر اخلاق تھا۔"

"........ کا پردہ کلب"

(از نجمہ تصدق)

بجلیوں کی اور شراروں کی زمیں ※ چاند، تاروں، سیم پاروں کی زمیں
قہقہے آرام پاتے ہیں یہاں ※ پھول سے لب مسکراتے ہیں یہاں
اُف یہ ملبوسات! ہوتا ہے گماں ※ جیسے کوئی ساڑیوں کی ہو دکاں
عشق کے ارمان پلتے ہیں یہاں ※ شعر اور رومان پلتے ہیں یہاں
ریشموں میں جھلملاتی لڑکیاں ※ گاہ آتی گاہ جاتی لڑکیاں
نکہتیں بکھری ہوئی ہیں چارسو ※ مستیاں نکھری ہوئی ہیں چارسو
سحرکاری، جلوہ تابی ہرطرف ※ دیدہ دل کی خرابی ہرطرف
مضطرب ہیں حُسن کے جلوے یہاں ※ اس نمائش گاہ میں پردہ کہاں؟

واہ وا کیا آبروئے عشق ہے
حُسن کو خود جستجوئے عشق ہے

(۸) چندرا آرٹ پروڈکشنز چندرا آرٹ پروڈکشن کی شاندار مذاحیہ اور سوشل تصویر **منور ما سوتی**

گذشتہ دس ہفتوں سے چل رہی ہے۔ اس تصویر میں مشرقی اور مغربی خیالات کو بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے۔ چارلی تصویر کی جان ہے۔ مکالمے اور گانے بہت اچھے ہیں۔ اس میں لیلا چٹنس۔ الیشور لال۔ چارلی۔ مبارک بابا بنرجی اور چھوٹی نسیم نے کام کیا ہے۔ تصویر نے کافی مقبولیت حاصل کی ہے۔ ہدایت کاری جینت دیسائی کی ہے۔

(۹) شوری پکچرز منگتی کے شہرت یافتہ ہدایت کار روپ شوری نے نغموں سے بھرپور تصویر **کوئل** تیار کی ہے۔ اس میں منورما۔ ستیش۔ مجنوں۔ سلیم رضا اور غلام قادر نے کام کیا ہے۔ تازہ ترین اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ تصویر منگتی سے کہیں بڑھ چڑھکر ہوگی۔ یہ تصویر عنقریب میسرز رائے صاحب چندن لال اندر کمار کے ذریعہ کسی اچھے سے سینما ہال میں نمائش کے لئے پیش کر دی جائیگی۔

روپ شوری کا یہ کارنامہ ایسا نہیں جسے آسانی سے فراموش کیا جاسکے "کوئل" ہر چند کہ ایک پنجابی فلم ہے۔ مگر اپنے پلاٹ اداکاری اور موسیقی کے اعتبار سے سارے ہندستان کے شائقین فلم کے لئے یکساں دلچسپی رکھتی ہے۔

اس فلم کو دیکھنے کے بعد "منگتی" کی یاد دلوں سے محو ہو جائیگی۔ یہ فلم اپنے اندر ایک خاص اپیل رکھتی ہے۔ تمام حالات کا اندازہ کرتے ہوئے اس فلم کی کامیابی میں بہت کم شبہ رہ جاتا ہے۔

(۱۰) شالیمار پکچرز بیدار مغز اور خوش مذاق ڈائرکٹر مسٹر ڈبلیو زیڈ احمد نے اپنی پیش کش **من کی جیت** پر کافی وقت اور توجہ صرف کی ہے۔ اس فلم کے مکالمے اور گانے لکھنے کے لئے ہندستان کے سب سے بڑے شاعر جناب جوش ملیح آبادی کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ مشہور ادیب کرشن چندر نے بھی مکالموں میں ہاتھ بٹایا ہے یقیناً اس فلم کا ادبی معیار بہت بلند ہوگا۔

اس فلم کی دلکشی کا یہی کیا کم ثبوت ہے کہ اسکی روح رواں حسین وجمیل پُراسرار نینا ہیں۔ جو "ایک رات" میں اپنی ہر دلعزیزی کا سکہ جما چکی ہیں۔

اس کمپنی کا دوسرا فلم **غلامی** بھی اُمید کی جاتی ہے آپ اپنی مثال ہوگا۔ اس فلم کی روح رواں مشہور ومعروف رینوکا دیوی۔ پروینہ کی جمیل ...

پھول تکمیل کے مراحل طے کر رہا ہے۔ پروڈیوسر کے بعد اور ڈائرکٹر کے، **آصف** کی مشترکہ جدوجہد کا میٹھا پھل مسٹر کمال امروہوی کی زبان دانی اور موسیقار اعظم غلام حیدر کی وجد آفریں طرزیں آپ کو دیوانہ بنا دینگی۔ کہنہ مشق ستاروں کا دلکش اجتماع

پھول جس کے بارے میں آپ عرصہ دراز سے بہت کچھ پڑھتے اور ... چلے آئے ہیں اب تکمیل کے آخری مراحل طے کر رہا ہے مسٹر کے، **آصف** اپنی تمام صلاحیتیں **پھول** کی زیبائش اور اسکی خوبصورتی کیلئے برتنے کار لا رہے ہیں۔ آ...

پھول کی تکمیل میں شبانہ روز منہمک ہیں۔ اس کے ایک ایک ٹکڑے کو بنا... غائر دیکھتے ہیں۔ غرضکہ **پھول** کو ہر طریقہ پر ایک کامیاب تصویر بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔

پھول ایک ایسی تصویر ہے جس کے صحیح معنوں میں آل سٹار کا... ہونے کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے۔ اس تصویر میں ایک دو نہیں بلکہ ہندستانی ... سیمیں کے پندرہ درخشاں ستارے بیک وقت جگمگا رہے ہیں۔ وینا۔ ستارہ۔ ... پرتھوی راج۔ واسطی۔ نذیر۔ مظہر خاں۔ یعقوب۔ ایم اسمٰعیل۔ زلو... اشرف خاں۔ مجید۔ آغا۔ ڈکشت اور دُرگا کھوٹے یہ وہ آرٹسٹ جن کی شخصیتیں علیحدہ علیحدہ مسلم الثبوت ہیں اور جن کے ماہر فن ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ پھر بھلا خود ہی سوچیئے جب یہ ایک فلم میں ہی ایک... آرہے ہوں گے تو وہ فلم کس پایے کی ہوگی۔ اور کمال تو یہ ہے کہ ... آرٹسٹ فلم میں موزوں رول انجام دے رہا ہے۔ ایسا رول جو اُسے ... فٹ ہو۔

پھول کی کہانی اور مکالمے ہندستان کے سب سے زیادہ ہر دلعزیز ... رائٹر مسٹر **کمال** امروہوی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ جنہیں آپ "جیلر" "پکار" کے بعد ہنوز نہیں بھلا سکے۔ **پھول** میں کمال کا کمال اوج پہ...

پھول کی موسیقی مسٹر **غلام حیدر** جیسے موسیقار اعظم ... سپرد ہے۔ جنہیں آپ "خزانچی" اور "خاندان" سے جانتے ہیں۔ اور جنکی دلفریب طرزوں کا آج یہ عالم ہے کہ ہر گھر کا ایک پانچ سالہ بچہ بھی "تھا دن کے سلے ... اور "چین ہے نہ کرار ہے" گنگناتا پھرتا ہے۔

آپ اپنے شہر کے خوبصورت سینما ہاؤس میں پھول کی تاریخ نمائش کا انتظار فرمایئے

دیوؤں کے مُلک میں

(از جناب اشرف صبوحی دہلوی)

(چھٹی قسط)

بستی میں غل مچ گیا۔ لوگ آنے شروع ہوئے۔ سرائے کے بڑے سے بڑے کمرے میں گلیور کو ایک میز پر کھڑا کیا گیا۔ لڑکی بھی اس کے برابر ایک سٹول پر آ کر کھڑی ہوئی۔ تاکہ اس کی حفاظت کرے۔ اُسکے بُرے بھلے کا خیال رکھے اور بتاتی بھی جائے کہ اب وہ کیا کرے۔ اب اسکو کیا کرنا ہے۔ اور اب کیا کرنا چاہیئے۔ آدمیوں کی بھیڑ ہوگئی تھی۔ قریب قریب آدھا قصبہ ایک دفعہ ہی اُمنڈ آیا تھا۔ زمیندار نے کمرے کے دروازے بند کر دیئے۔ سب کو ایک دم اندر جانے میں خرابی تھی۔ تیس تیس کی ٹولیاں اندر جانی شروع کیں۔ ہر شخص سے ایک روپیہ ٹکٹ کا لیا۔

گلیور میز پر چل کر، دوڑ کر، اُچھل کر دکھاتا۔ لڑکی اُس سے سوال کرتی۔ وہ حلق پھاڑ پھاڑ کر اونچی سے اونچی آواز میں جواب دیتا۔ باربار تماشائیوں کی طرف مُنہ کر کے انہیں سلام کرتا۔ ان کا مزاج پوچھتا۔ لڑکی نے ایک انگشتانے میں شراب بھر کر اسکے سامنے رکھی جسے وہ جام صحت پینے کے انداز میں پی گیا۔ اسکے بعد اس نے اپنی تلوار میان سے نکالی۔ اسکو ہوا میں لہرایا اور اس طرح ہاتھ چلائے جیسے کوئی لڑ رہا ہے۔ کبھی پینترے بدلتا۔ کبھی اُچھلتا۔ کبھی آگے بڑھتا۔ کبھی پیچھے ہٹتا۔ کبھی سمٹتا۔ کبھی تنتا۔ ان باتوں سے دیکھنے والے بہت خوش ہوتے۔

اس دن تیس تیس آدمیوں کی بارہ سے زیادہ ٹکڑیوں نے یہی کھیل تماشے دیکھے اور بارہ دفعہ گلیور کو اپنی کل کل توڑنی پڑی تھی۔ اس لئے تماشہ ختم ہوتے ہوتے وہ تھکاوٹ کے مارے قریب قریب ادھ موا ہو گیا تھا۔ بدنصیبی اور کیا ہوگی۔ سچ سچ بندروں کے سے بدناؤ کئے جا رہے تھے۔ فقط ڈگڈگی کی کسر تھی۔ غریب کا دل بھرا چلا آتا تھا کہ خوب چیخیں مار مار کر روئے۔

نمائش ختم ہونے کے بعد زمیندار نے پھر بستی میں یہ اعلان کرایا کہ اگلے جمعہ کو جب بازار لگے گا تو دوبارہ یہ عجیب غریب تماشہ دکھایا جائیگا۔ شوقین تیار رہیں۔ اور اپنے گھر روانہ ہوا۔ گھر پہنچ کر اُس نے پہلے بکس سے بہتر اور زیادہ آرام دہ بکس تیار کرایا جس میں گلیور بلا تکلف سفر کر سکتا تھا۔ اب وہ مالدار ہو گیا تھا۔ اسکی جیبیں روپے سے بھری ہوئی تھیں۔ جس کی بدولت ایک دن میں اتنی کمائی کی تھی اُس کا خیال کیونکر کرتا۔

لیکن گلیور بیچارے کے مصائب کی کسی کو خبر نہ تھی۔ سفر کی ناقابل برداشت گھڑ کھڑ اور متواتر اپنے کرتب دکھانے سے اسکی بوٹی بوٹی دُکھ رہی تھی۔ ہاتھ پاؤں تھک کر چُور ہو گئے تھے۔ کھڑے رہنے اور بات کرنے کا دم نہ تھا۔ آتے ہی پڑ گیا اور تین دن کے بعد ذرا جان میں جان آئی۔ یہ تین دن بھی اسکو چین سے نہیں گذرے۔ سو سو کوس سے لوگ اسکو دیکھنے کیلئے برابر چلے آ رہے تھے۔ ہر وقت زمیندار کے گھر پر تماشائیوں کا ٹھٹ لگا رہتا۔

مخلوق کا یہ شوق دیکھکر زمیندار نے سوچا کہ اگر گلیور کو ملک کے بڑے شہروں میں لے جایا جائے اور وہاں اسکی نمائش ہو تو بڑی کمائی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ اُس نے لمبے سفر کی تیاری کر لی۔ اور اپنی کھیتی باڑی کا کام بیوی کے سپرد کر کے روانہ ہو گیا۔ سب سے پہلے اس نے اپنے بادشاہ کی دارالحکومت کا رُخ کیا۔ جو وہاں کا بڑا شہر اور تین ہزار میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔

زمیندار کی لڑکی ساتھ تھی۔ باپ کی پیٹھ کے پیچھے گھوڑے پر۔ اور اسکی گود میں گلیور کا بکس تھا جسے ننھے آدمی کا بنگلہ کہنا چاہیئے۔ یہ بکس خاص طور پر بنوایا گیا تھا۔ اندر کے رُخ چاروں طرف نرم نرم کپڑوں کی پوشش تھی۔ گڑیا کا پلنگ بچھا ہوا۔ پہننے کے کپڑے اور تمام ضروری سامان قرینے سے رکھا تھا۔ کیونکہ زمیندار کی خواہش یہ تھی کہ رستے میں جو گاؤں، قصبہ یا بستی ملے وہاں ٹھہر ٹھہر کر گلیور کا تماشہ دکھاتے چلیں۔

یہ سفر دس ہفتے میں ختم ہوا۔ ان دس ہفتوں میں گاؤں، چھوٹی چھوٹی بستیوں اور بعض امیر گھرانوں کے علاوہ اٹھارہ بڑے بڑے شہروں میں گلیور کی نمائش کی گئی اور زمیندار نے خوب دولت سمیٹی۔

آخر کار دارالسلطنت پہنچ گئے۔ زمیندار نے شہر کے بیچ میں ایک نہایت اچھا سر بازار مکان کرایہ پر لیا۔ اشتہار تقسیم کرائے۔ باجے کے ساتھ تمام آبادی کو اطلاع دی کہ جو چیز عمر بھر نہیں دیکھی آ کر آج دیکھ لو۔ زمیندار نے ایک بڑی میز کا بھی انتظام کیا اور اسکے چاروں طرف کٹہرا لگوایا تاکہ گلیور نیچے بھی نہ گر پڑے۔ یہاں دن میں دس بار کھیل ہوتا اور جو دیکھتا تعجب کرتا اور کئی کئی دفعہ دیکھنے آتا۔

گلیور اب اس ملک کی زبان خاصی اچھی طرح سمجھ بھی سکتا تھا اور بول بھی سکتا تھا وہ بخوبی لوگوں سے باتیں کرتا۔ انکی کہتا اور انکی سمجھتا۔ زمیندار کی نیک دل لڑکی کو جب ذرا بھی فرصت ملتی سفر اور حضر دونوں میں اسے بولنا اور پڑھنا سکھاتی رہتی تھی۔ ایک چھوٹی سی کتاب وہ ہر وقت رکھتی اور اس کتاب کی مدد سے اپنی زبان کی الف بے پڑھاتی اور مختلف چیزوں کے نام اسکو پڑھایا کرتی۔

(باقی آئندہ)

نیشنل وار فرنٹ

یعنی

قومی محاذ جنگ کیا چیز ہے؟

نیشنل وار فرنٹ یعنی قومی محاذ جنگ کا مقصد پبلک کی اندرونی اصلاح اور امن عامہ کو بحال رکھنے کی کوشش کرنا ہے۔ اسکے اغراض ومقاصد تمام عوام النّاس کی فلاح وبہبود کے لئے ہیں۔

اِس کے مقاصد یہ ہیں:۔

(۱) امن عامہ کو قائم رکھنے کے لئے عوام النّاس کا تعاون حاصل کرنا اور بدامنی پھیلانے کے ذریعوں کو دُور کرنا۔

(۲) ہندستان کی جملہ اقوام میں اتحاد باہمی قائم کرانا اور اُس کے لئے کوشش کرنا۔

(۳) بدمعاش اور غنڈوں کی دیکھ بھال اور اُن کا انسداد کرنے کے لئے عوام کی امداد کرنا۔

(۴) غلط خبروں اور جھوٹی افواہوں کی تردید کرنا اور اُن کو پھیلنے سے روکنا۔

(۵) پانچویں کالم یعنی دشمنوں کے جاسوس اور دشمنوں سے ہمدردی رکھنے والوں کا پتہ لگانا۔ اور اُن کی نگرانی کرنا۔ تاکہ وہ اپنی کارروائیوں کو عمل میں نہ لاسکیں۔

(۶) کھانے پینے کی اور ضرورت زندگی کی چیزوں کو انکی مقررہ قیمت پر فروخت کرانیکا انتظام کرنا اور ناجائز منافع بازی کو روکنا۔

(۷) زائد غلّہ پیدا کرنے کی ہدایت کرنا اور اس کے متعلق پروپیگنڈا کرنا۔

(۸) شہری بچاؤ اور ہوائی حملے سے بچنے کی تعلیم حاصل کرنیکی جانب عوام النّاس کی توجہ دلانا اور اسکے فوائد عوام کے ذہن نشین کرانا۔

(۹) شکست خوردہ ذہنیت کی ہرممکن طریقہ سے اصلاح کرنا۔

نیشنل وار فرنٹ کے اغراض ومقاصد اور اس کا طریق کار کسی سیاسی جماعت کے خلاف نہیں ہے۔ اور نہ کسی کو اس سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ عوام النّاس کو نیشنل وار فرنٹ کی خدمات سے فائدہ حاصل کرنا چاہئیے اور تعاون کرکے عوام النّاس کی فلاح وبہبودی میں حصہ لینا چاہیئے۔

پراونشل نیشنل وار فرنٹ ۲۵ راجپور روڈ۔ دہلی

فلمی خبریں

از فصیح الدین احمد

رنجیت مووی ٹون کے تیار کئے ہوئے [illegible] تان سین کو جگت ٹاکیز [illegible]
دلی میں سولہ ہفتے ہو چکے ہیں۔ یہاں کے علاوہ نیو پاما کیز لاہور اور امپیریل ٹاکیز کراچی میں بھی بڑی دھوم سے چل رہا ہے۔ اس فلم میں دربار اکبری کا پرشکوہ محل اور "تان سین" کی موسیقی کا اعجاز بڑی خوبی کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔
سہگل نے "تان سین" کے روپ میں اعلےٰ معیار کی موسیقی پیش کی ہے۔ خورشید کی نغمہ سرائی بھی کچھ کم دلکشی نہیں رکھتی۔ اس فلم کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ کیا جاتا ہے کہ ابھی یہ فلم ایک ایک ہال میں کئی کئی ہفتے اور دکھایا جائیگا۔

رنجیت مووی ٹون "تان سین" کے بعد بہت جلد دوسرا فلم دیش کنیا پیش کرنے والی ہے۔ اسکے ڈائرکٹر کیدار شرما ہیں۔ دیش کنیا میں راجپوتوں کی شان و شوکت ان کی صداقت و شجاعت اور راجپوت عورتوں کے پُروقار کیرکٹر کا نہایت کامیاب مظاہرہ ہے۔
اس زمانہ کا ماحول پیش کرنے اور لباس وغیرہ کی تیاری کے سلسلے میں بڑا اہتمام کیا گیا ہے۔

رامنک پروڈکشنز کا تیار کیا ہوا فلم **ریکھا** جمعہ ۲۲ اکتوبر سے دہلی کے کمار ٹاکیز میں دکھایا جا رہا ہے
ڈائرکٹر مہندر ٹھاکر نے یہ فلم بڑی کاوش و اہتمام سے تیار کیا ہے۔ اس فلم میں مشہور و مقبول "لیلا چٹنس" اور "مایا بنرجی" نے کام کیا ہے۔

ڈی-آر-ڈی پروڈکشنز کا تیار کیا ہوا فلم **اشارہ** رٹز سنیما دہلی میں ۳ ستمبر سے دکھایا جا رہا ہے۔ کہانی دیوان شرر کے مشہور ناول **Gong of Shiva** سے ماخوذ ہے۔
اس فلم میں پرتھوی راج کی اداکاری نے جان ڈال دی ہے۔ کہا جاتا ہے اس فلم میں پرتھوی راج نے اپنے تمام کارناموں پر سبقت ثابت کر دی ہے۔ دوسرے اداکاروں میں جگدیش۔ ثریا۔ سورن لتا۔ امین سنگھ اور پرومتا دیوی کے نام قابل ذکر ہیں۔
کہانی نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ ایک شاندار مقصد بھی رکھتی ہے۔

جگت دلیسانی پروڈکشنز جگت دلیسانی اپنی فلم کمپنی قائم کرنے سے پہلے جگت ڈائرکٹر سنت تلسی داس۔ تان سین اور شادی جیسے معرکۃ الآرا فلم پیش کر چکے ہیں۔ اب اپنی الگ فلم کمپنی قائم کرنے کے بعد انہوں نے ایک فلم بھگت راج تیار کیا ہے۔ جو موتی ٹاکیز دہلی میں دکھایا جا رہا ہے "بھگت راج" میں اجودھیا کے بھگت مہاراجہ امبریش کی زندگی پیش کی گئی ہے۔ یہ ہندوستان کی قدیم تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔ وشنو پنت پگنیس، واسنتی۔ کوشلیا۔ مبارک اور رنجیت اس فلم کی روح رواں ہیں۔

محبوب آرٹ پروڈکشنز کا تیار کیا ہوا فلم **نجمہ** [illegible] میں مجسٹک سنیما میں اٹھارہ ہفتے پورے کر چکا ہے۔ ہال اب بھی کھچا کھچ بھرا رہتا ہے۔ اس کی مقبولیت دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جاتا ہے کہ ابھی مہینوں اور دکھایا جائیگا۔
کہانی میں اسلامی معاشرت و تمدن پیش کیا گیا ہے اپنی اس نوعیت کے لحاظ سے یہ پہلا فلم ہے۔ کہانی دلچسپ [illegible] علاوہ سبق آموز بھی ہے۔ موسیقی کا معیار اچھا ہے۔

وشوانی آرٹ پروڈکشنز کا تیار کیا ہوا فلم [illegible] جس کے متعلق اطلاع [illegible] کامیابی کے ساتھ امرتسر، کراچی، بریلی اور نینی تال میں [illegible] اب رٹز سنیما دہلی میں بھی شروع ہو گیا ہے۔ اس فلم میں [illegible] اور "بھابی" کی مشہور و مقبول اداکار رینوکا دیوی نے کام کیا ہے [illegible] دوسرے اداکاروں میں نارنگ اور پیران کے نام قابل [illegible] نارنگ "خزانچی" میں، اور پیران "خاندان" میں کام [illegible] کر چکے ہیں۔

فضلی برادران لمیٹڈ کا تیار کیا ہوا [illegible] ۵ نومبر سے [illegible] شروع ہے۔ یہ فلم مشہور [illegible] تیار ہوا ہے۔ جو غریب و [illegible] اور ان کے طور طریق پر [illegible]

وہ جب کسی فلم میں اس طبقہ کے کردار پیش کرتے ہیں تو ماحول اور اسکے تقاضوں کا پورا خیال رکھتے ہیں۔

اس فلم کی کہانی دلچسپ، پُر اثر اور سبق آموز ہے۔

انڈین آرٹ پکچرز کے زیر اہتمام مسٹر ۔۔۔ ایک فلم **بے لکشمی** اور **نور مغل** تیار کر رہے ہیں۔ یہ اب تیاری کی آخری منزلوں میں ہیں۔ دیکھئے ۔۔۔ میں سب سے زیادہ دلکش عنصر اس کے ناچ اور گانے ہیں۔

امر پکچرس کا تیار کیا ہوا فلم **پیغام** مختلف جگہوں پر کافی مقبول ہو رہا ہے۔ اس کمپنی کا دوسرا آنے والا فلم **آداب عرض** ہے۔ جس کے ڈائرکٹر مسٹر چودھری ہیں۔ اس فلم میں ۔۔۔ کی اداکاری خاص طور پر جاذب توجہ ہے۔

مسٹر چودھری کی نگرانی میں اس کمپنی کا ایک اور فلم **گگلی** تیار ہونے والا ہے۔

پنچولی آرٹ پکچرز بڑے عظیم الشان انتظامات کے ساتھ ایک فلم **شیریں فرہاد** تیار کر رہی ہے کہانی کی ترتیب کے سلسلہ میں بہت کافی تاریخی لٹریچر کی چھان بین کی گئی ہے تاکہ فلم اس یادگار ٹریجڈی کو صحیح ماحول کے ساتھ پیش کر سکے۔ اس زمانے کے لباس اور ساز و سامان کی تیاری پر بے دریغ روپیہ صرف کیا گیا ہے۔ عظیم الشان محلات اور اُن کی اندرونی شان و شوکت پیش کرنے کا حیرت انگیز اہتمام کیا گیا ہے۔ پس منظر اور اسکی جزئیات کے سلسلہ میں پر ہلاد دت کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ جو "ہالی وڈ" میں بھی کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں۔

اس کے علاوہ امید کی جاتی ہے ڈائرکٹر این۔ ایم۔ خواجہ کے مشوروں سے اس میں اور چاند لگ جائیں گے۔ خیال کیا جاتا ہے یہ اپنی نوعیت کا بے نظیر فلم ہوگا۔

پچھلے دنوں بمبئی میں پنچولی آرٹ پکچرس کی تیار کردہ فلم "پونجی" کی نمائش ہو چکی ہے۔ "پونجی" نہایت اعلیٰ درجہ کا فلم ہے۔ اور یقیناً پنچولی آرٹ پکچرز کے شایان شان ہے۔ فلم کی بنیاد ایک معاشرتی کہانی پر ہے جس میں جا بجا بڑے دلچسپ مقامات آتے ہیں۔ کہانی کے علاوہ اس فلم کا دوسرا دلکش پہلو اسکے گانے ہیں۔ ان گانوں سے فلم میں اور چار چاند لگ گئے ہیں۔ اداکاروں میں ۔۔۔ اختر۔ راگنی۔ اسمٰعیل۔ جینت اور اجمل کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۔۔۔ کی اداکاری بھی پہلے سے کہیں بہتر ہے۔ امید کی جاتی ہے یہ فلم بہت مقبولیت حاصل کریگا۔

بمبئی ٹاکیز کا تیار کیا ہوا فلم "ہماری بات" بمبئی میں بہت مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس فلم میں دیوکا رانی ایک عرصہ دراز کے بعد نمودار ہوئی ہیں۔ اگر فلم کے اور پہلو بہت زیادہ کمزور بھی ہوتے تو دیوکا رانی کی شخصیت اور ان کی اداکاری اس کو مقبول عام بنا دینے کے لئے کافی تھی۔ اس سے قبل بمبئی ٹاکیز کے تیار کردہ فلم "قسمت" اور "بسنت" ہندوستان کے مختلف شہروں میں نہایت کامیابی کے ساتھ چل چکے ہیں۔

پرکاش پکچرز کا تیار کیا ہوا فلم **رام راج** مختلف شہروں میں حیرت انگیز مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ کہانی میں فن کارانہ عظمت اور دلکشی ہے۔

ان دنوں پرکاش پکچرز ایک فلم "گیتا" تیار کر رہی ہے۔ اس کے زیادہ سین مکمل ہو چکے ہیں خیال کیا جاتا ہے کہ دسمبر تک یہ فلم مکمل ہو جائیگا۔ ان کے علاوہ یہ کمپنی ایک فلم "مہاتما بدھ" کی تیاریوں میں مصروف ہے۔

شالامار پکچرز کا تیار کیا ہوا فلم **پریم سنگیت** حال ہی میں چل چکا ہے ان دنوں اس کمپنی کے زیر اہتمام ایک فلم **من کی جیت** تیار ہو رہا ہے۔ اس فلم کے مکالموں اور گیتوں کیلئے ہندوستان کے چوٹی کے شاعروں اور ادیبوں کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے فلم کا ادبی معیار بہت بلند ہوگا۔

پردیپ پکچرز کے زیر اہتمام مسز کملا بائی منگلورکر ایک فلم **پنا بائی** تیار کر رہی ہیں۔ مسز منگلورکر ان چند خواتین میں ہیں جو فلم کی ٹکنیک میں مہارت رکھتی ہیں۔ "پنا بائی" کی کہانی اور مکالمے لکھنے کیلئے دیوان شرر کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔

سن رائز پکچرز وشنو کمار ویاس نے پروڈیوسر کی حیثیت سے فلمی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر لی ہے۔ حال ہی میں انہوں نے ایک فلم "ستی انسوئیا" مکمل کیا ہے اس فلم میں درگا کھوٹے اور وشنو پنتا سمر تھ نے کام کیا ہے۔ اداکاروں کے نام دیکھکر اندازہ کیا جاتا ہے یہ فلم کافی مقبولیت حاصل کریگا۔

دین پکچرز کے زیر اہتمام مسٹر فتح دین نے ایک فلم **کوشش** تیار کر لیا ہے جسکی بہت جلد دلی میں نمائش ہونیوالی ہے۔ اس فلم میں ہندو مسلم اتحاد کا شاندار نقشہ پیش نظر ہے۔ اس کے بعد یہ کمپنی ایک دوسرا فلم "جھلک" تیار کرے گی۔

جلد ۶ نمبر ۱

راج کمل کلامندر کی بے نظیر پیشکش

شکنتلا

عنقریب آرہا ہے

مہاکوی کالیداس کا بین الاقوامی شہرت رکھنے والا ڈرامہ

پردۂ سیمیں پر

جسے

ہندوستان کے مایۂ ناز ڈائرکٹر شانتارام نے

لاکھوں روپیہ صرف کرکے غیر معمولی اہتمام کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مکالمے : ——— دیوان شرر

اداکاران خصوصی :—

چندرموہن ——— جیشری

زرق برق لباس

بے مثال رقص ——— لاجواب گانے

ہوش ربا مناظر

جاری کردہ:۔ جنرل ٹاکیز لمیٹڈ۔ دہلی

جب [illegible] زرینہ کو گنہگار کے [illegible] ڈھانا شروع کیا . . . . . .

نیشنل تھیٹرز کا رومان انگیز و اسٹنٹ فلم

پستول والی

اداکاران :—

رمولا۔ بنجمن۔ سیانی وغیرہ

ہر جگہ نہایت کامیابی حاصل کرچکا ہے!

آرہے ہیں! آرہے ہیں!! آرہے ہیں!!!

اسٹنٹ تصویروں کے بادشاہ! — آپکے محبوب اداکاروں کے ساتھ میں

لفٹیننٹ

نیشنل تھیٹرز کا

مارپیٹ لڑائی سے بھرا ہوا انوکھا

اسٹنٹ فلم

اداکاروں میں بنجامن

جنگل کی ہرنی

نیشنل تھیٹرز کا دلفریب فلم

جسے دیکھکر آپکے رونگٹے کھڑے ہو جائینگے

اداکاران :— ؟ ؟ ؟

چھتری والی

نیشنل تھیٹرز کا نہایت شاہکار

چھتری کے ذریعہ دشمن پر فتح

کیسا ستم کیا ؟

خیالی عورت

قسمت والی

کسکی قسمت تیز ہے۔ آپکی یا پارس پکچرز کی ؟

پارس پکچرز کی سال حال کی عظیم الشان تصویر

اداکاران :— ؟ ؟ ؟

جاری کردہ :— کومودی پکچرز۔ دہلی

تیس سال سے زیادہ ہوئے جب جاپان نے چین سے
کوریا چھین لیا تھا۔ کوریا کے لوگوں کو کچھ بھی شہری
حقوق حاصل نہیں ہیں۔ وہ اپنے ملک کی حکومت میں
کوئی ذمہ دار عہدہ نہیں پا سکتے۔ تمام کاروبار جاپانی کمپنیوں کے
ہاتھ میں ہے۔ جاپان میں آزادی اور باہمی خوشحالی

کا یہی مفہوم ہے

فتح کے ذریعے ... آزادی







فلم ''وکیل صاحب'' کے چند اداکار

لیلا دیسائی فلم ''پریذیڈنٹ'' میں





The Adeeb. Registered No. L. 4896. November 1943.

only Title cover Printed at Dayals' Printing Press, Chandni Chowk. Delhi.
Edited by Fasih-ud-din Ahmad M. A. and M. L Wahidi & Published from the office of the Adeeb. Chandni Mahal Delhi.

چندہ سالانہ: دس روپے علاوہ محصول ڈاک — قیمت فی پرچہ: ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ادیب

دہلی

اڈیٹر:—
سید محمد مرتضیٰ واحدی — فصیح الدین احمد ایم، اے — (ڈاکٹر) نجمہ تصدق ایم، اے، بی، ٹی

جلد ٦ — جنوری سنہ ۱۹۴۴ء — نمبر ۳

فہرست مضامین

(فصیح الدین احمد ایم اے نے جید برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر ادیب چاندنی محل دہلی سے شائع کیا)

نئی کتابیں

(از فصیح الدین احمد)

(۱) انشاء

از مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی

شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی۔ قیمت ۱۲؍

انشاء اللہ خاں انشاء کی ہستی اردو ادب کی تاریخ میں کئی حیثیتوں سے یادگار ہے۔ انہوں نے ایک طرف اپنی زندگی میں علمی استعداد، ذہانت، زباں دانی، سخنوری اور جودتِ طبع کا بڑوں بڑوں سے لوہا منوا لیا۔ بڑے بڑے حریفوں سے ٹکر لی اور ان کو نیچا دکھایا۔ طنز و ہجو کا وہ طوفان اٹھایا جس نے اس زمانے کے ہر شاعر، رئیس، چھوٹے بڑے کو خس و خاشاک سمجھا مگر اس کے بعد انجام اس درجہ عبرت ناک ہوا جس کی نظیر نہیں۔

زیرِ نظر کتاب کے فاضل مصنف مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی جن کی ادبی عظمت مسلّم ہے۔ اپنی یہ تصنیف اس بلیغ جملہ سے شروع کرتے ہیں۔ "شاعری کی دنیا میں انشاء کی ایک ایسی ہستی گذری ہے۔ جو اپنی ابتدا کے لحاظ سے اس زمانہ کے شعرا کے لئے ایک مصیبت اور انتہا کے لحاظ سے دنیا والوں کے لئے ایک عبرت تھی۔" یہ مختصر سی کتاب ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے مگر یہ اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ مرزا صاحب نے اپنے مخصوص دلکش اور لطیف پیرایئے میں انشاء کی ساری داستان حیات قلمبند کر دی ہے انشاء کی ابتدا، ان کے دلی کے شعرائے معرکے، ان کا لکھنؤ منتقل ہونا، وہاں ان کی ہنگامہ آرائی، عروج اور زوال سب کچھ اس دل نشین پیرایئے میں پیش کیا ہے کہ بار بار پڑھنے سے بھی سیری نہیں ہوتی۔ ساتھ ساتھ ان کی غزلوں اور ہجو کے نمونے اور ان پر ادبی اور محققانہ تبصرے مطالعہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ انشاء کا ذکر اور مرزا فرحت اللہ بیگ کا قلم یہی کیا کم جاذبِ توجہ بات ہے۔

(۲) ستالن (ترجمہ)

مع مقدمہ از مسٹر آصف علی بیرسٹر ایٹ لا

شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی۔ قیمت ؎

اس وقت جبکہ اشتراکی روس اپنی بے پناہ قوت کا ثبوت دیتے ہوئے فاشسٹ جرمنی کو پیچھے دھکیلتا چلا جا رہا ہے۔ ساری دنیا کی نگاہیں اس ملک پر، اس ملک کے نظام پر اور اس ملک کے رہبر ستالن پر جمی ہوئی ہیں۔ لوگ ستالن اور روس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کے لئے بے تاب ہیں۔ ایسی صورت میں اس موضوع پر کسی جامع کتاب کا شائع ہونا ہمارے سیاسی ادب میں ایک نہایت اہم اضافہ ہے۔

زیرِ نظر کتاب ستالن مشہور مصنف سٹیفن گریہم کی تصنیف کا ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ مسٹر آصف علی بیرسٹر ایٹ لا کی کاوش کا نتیجہ ہے جو نہ صرف ہندستان کے مشہور سیاسی لیڈر ہیں۔ بلکہ ایک بلند پایہ ادیب بھی ہیں۔ کتاب کے شروع میں موصوف کا ایک بسیط مقدمہ بھی شامل ہے جس میں بڑی وضاحت اور تفصیل کے ساتھ اشتراکیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور یہ بتایا گیا ہے کہ اشتراکیت کی جڑیں انسانی تاریخ میں کہاں کہاں ملتی ہیں۔ اور اس کی موجودہ شکل کیا ہے۔ روس میں اس فلسفہ نے کیونکر عملی صورت اختیار کی۔ اور اس کے تحفظ و ارتقا میں ستالن نے کیا حصّہ لیا ہے۔ مسٹر آصف علی نے اپنے مقدمہ میں یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ اس کتاب کے مصنف کی غیر جانبداری کہیں کہیں مشتبہ نظر آتی ہے۔ مگر با ایں ہمہ مجموعی حیثیت سے یہ کتاب روس اور ستالن کو سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ کتاب کے ساتھ ساتھ خود مقدمہ مطالعہ کی چیز ہے یقیناً علمی و ادبی حلقوں میں یہ کتاب بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جائیگی۔

(۳) کٹھ پتلیاں قیمت ۸ر
ملا اعلیٰ قیمت ۴ر
مٹھائی کی ٹوکری قیمت ۴ر
بند لفافہ قیمت ۴ر

ڈرامے

از ڈاکٹر اشتیاق حسین صاحب قریشی

شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی

موجودہ ڈرامہ لکھنے والوں میں ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نہایت وقیع مرتبہ رکھتے ہیں۔ ان کے بہت سے ڈرامے شائع ہوکر مختلف حلقوں سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ اس وقت ان کے چار مختصر ڈرامے کٹھ پتلیاں ملا اعلیٰ۔ مٹھائی کی ٹوکری۔ اور بند لفافہ ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ پس منظر پیش کرنے کے سلسلہ میں اختصار اور کردار نگاری میں اصلیت، سادگی اور صداقت مدنظر رکھنا قریشی صاحب کا حصہ ہے۔ اور یہ تمام خصوصیات ان مختصر ڈراموں میں ملتی ہے۔ کہیں کہیں مذاح کی لطیف چاشنی بھی ملتی ہے۔ زبان سادہ۔ لہجہ نرم اور مکالمے مختصر ہیں۔ دراصل یہی عناصر ان ڈراموں کی کامیابی کے ضامن ہیں +

(۴) ایک ایکٹ کے ڈرامے

از مسٹر علی عباس حسینی

شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی۔ قیمت ۱۲ر

بنیادی طور پر علی عباس حسینی صاحب افسانہ نگار ہیں۔ ان کا درجہ افسانہ نگاری میں بہت بلند ہے۔ پریم چند کے بعد دیہاتی ماحول اور دیہاتی کرداروں کی عکاسی بہت کم افسانہ نگاروں نے اس کامیابی کے ساتھ کی ہے۔ جس کامیابی کے ساتھ علی عباس حسینی صاحب نے اپنے افسانوں میں کی ہے۔ ان کے افسانوں کے بہت سے مجموعے مختل[illegible]ں سے شائع ہوکر ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہوں سے دیکھے جا چکے ہیں۔ ایک ایسے افسانہ نگار کا ڈرامہ کی طرف متوجہ ہونا یقیناً ایک خوش آیند اقدام ہے۔ ہمارے ادب میں ڈراموں کی بڑی کمی ہے۔ زیر نظر کتاب "ایک ایکٹ کے ڈرامے" حسینی صاحب کا ایک شاندار کارنامہ ہے۔ اس کتاب میں ایسے نو ڈرامے شامل ہیں۔ ان تمام ڈراموں میں مصنف کا خلوص اور اُس کے قلم کی اثر آفرینی نمایاں ہے +

---

(۵) مذہب و تمدن

از ابوالحسن ندوی

شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی۔ قیمت ۱۲ر

زیر نظر کتاب خالصاً ایک علمی کتاب ہے۔ جس میں ابوالحسن ندوی نے بڑی کاوش کا ثبوت دیا ہے۔ سب سے پہلے مذہب فلسفہ اور تمدن کے بارے میں مشترک سوالات یکجا کئے ہیں اور تفصیل کے ساتھ ان کا جواب دیا ہے۔ جواب میں اس موضوع پر کافی روشنی ڈالی ہے۔ تمدن کی تقسیم کی ہے۔ اور ان کی بنیاد سے بحث کی ہے۔ اس باب میں مغربی علما کے علاوہ علمائے اسلام کے اقوال و نظریات پیش کئے ہیں۔ آخر میں انبیائے کرام کی تعلیم اور ان کے نتائج پر بحث کرتے ہوئے اسلامی زندگی کی خصوصیات بتائی ہیں۔ اُمید ہے علمی حلقوں میں یہ کتاب دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائیگی ÷

(۶) بچوں کے لئے

شائع کردہ مکتبہ جامعہ دہلی

(۱) ہماری زمین۔ از محمد حسین حسام۔ قیمت ۸ر
(۲) لکڑی کا کام۔ قیمت ۶ر
(۳) کاغذ سازی۔ قیمت ۶ر
(۴) باغبانی۔ قیمت ۶ر
(۵) قدرت کے کرشمے۔ قیمت ۸ر
(۶) ہوائی جہاز۔ قیمت ۶ر
(۷) پردادا کی کہانی۔ از محمد عبدالغفور قیمت ۶ر
(۸) ہمت کے پھل۔ از عبدالواسع مصری قیمت ۵ر
(۹) چور لڑکا۔ از عبدالغفار مدہولی۔ قیمت ۴ر
(۱۰) جھوٹا لڑکا۔ از عبدالغفار مدہولی۔ قیمت ۳ر
(۱۱) لومڑی کا گھر۔ از عبدالواحد سندھی۔ قیمت ۸ر
(۱۲) بی مینڈکی اور کوا۔ از عبدالواحد سندھی۔ قیمت ۶ر
(۱۳) سونے کی چڑیا۔ از محمد عبدالغفور۔ قیمت ۸ر
(۱۴) جادو کا گھر۔ از عبدالواحد سندھی۔ قیمت ۶ر

مکتبہ جامعہ نے علمی و ادبی تصانیف کے ساتھ ساتھ بچوں کے لئے مفید اور دلچسپ لٹریچر کی اشاعت جاری رکھی ہے۔ مندرجہ بالا کتابیں شائع کرکے نہ صرف بچوں کے لئے معلومات کا ذخیرہ بہم پہنچایا ہے۔ بلکہ انکی ذہنی

ترتیب اور ان کی دلچسپی کا بھی سامان کیا ہے۔ ان مختصر کتابوں میں سیدھی سادی دلچسپ کہانیاں بھی ہیں۔ مختلف اشیاء کی ساخت اور ان کے بنانے کی ترکیبیں بھی بتائی ہیں۔ اور جغرافیائی معلومات بھی بہم پہنچائی ہیں۔

ان کتابوں کی زبان نہایت سیدھی سادی اور دلکش ہے۔ ان کا مطالعہ بچوں کے لئے باعث دلچسپی بھی ہے اور مفید بھی۔ جس گھر میں بچے ہیں وہاں ان کتابوں کو ضرور ہونا چاہیئے ؛

(۷) رقاصہ اور دوسرے خوفناک افسانے

از ایم، اسلم صاحب

شائع کردہ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔ قیمت عہ

اس سے قبل ہم ایم، اسلم صاحب کی مختلف تصانیف پر تبصرہ کر چکے ہیں۔ مگر زیر نظر کتاب کی نوعیت ان سب سے الگ ہے۔ یہ کتاب موصوف کے سات خوفناک اور سخت خوفناک افسانوں کا مجموعہ ہے۔ انہیں پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شگفتہ نگار ادیب جب زندگی کے تاریک اور بھیانک پہلوؤں کی طرف توجہ کرتا ہے تو اس کا تخیل کیسے کیسے روح فرسا مظاہر پیش کر سکتا ہے۔ ان افسانوں کو پڑھکر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کا جذبہ انتقام کیا کیا بھیانک صورتیں اختیار کر سکتا ہے۔ کتاب کے آغاز میں گلہائے عقیدت کے عنوان سے شاہد احمد مدیر "ساقی" کی ایک تقریظ شامل ہے۔ اس کے علاوہ سخن ہائے گفتنی کے عنوان سے مصنف نے خود بھی ایک تمہید لکھی ہے جس میں افسانہ نگاری سے بحث کی ہے ؛

(۸) گردش

از حضرت مجنوں گورکھپوری

شائع کردہ کتب خانہ علم و ادب دہلی۔ قیمت عہ

حضرت مجنوں گورکھپوری اردو کے ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ مگر ایک عرصے سے انہوں نے افسانہ نگاری کی دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ زیر نظر کتاب "گردش" ان کا ایک طویل افسانہ ہے جو پہلی دفعہ آج سے گیارہ سال قبل شائع ہوا تھا۔ مجنوں صاحب انگریزی کے مشہور افسانہ نگار اور ناولسٹ ہارڈی سے بہت متاثر ہیں۔ ان کے بیشتر افسانوں میں ہارڈی کی روح دوڑ رہی ہے۔ اس افسانہ میں بھی یہی رنگ غالب ہے۔ کتاب کے آغاز میں مجنوں صاحب کی ایک مختصر مگر پر مغز تمہید بھی شامل ہے جس میں انہوں نے اپنی افسانہ نگاری سے بحث کی ہے اور یہ بتایا ہے کہ انہوں نے کن تاثرات کے ماتحت افسانہ لکھنے سے ہاتھ روک لیا۔ آخر میں یہ خوشخبری بھی ملتی ہے کہ آئندہ وہ اس طرف توجہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ہم بھی ان سے مایوس نہیں ہوئے ہیں ؛

(۹) جھلکیاں

از یوسف بخاری صاحب

شائع کردہ مکتبہ جہاں نما دہلی۔ قیمت دو روپیہ

زیر نظر کتاب یوسف بخاری صاحب کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل موصوف ایک کتاب "موتی" پیش کر چکے ہیں۔ جو مشرق و مغرب کے فلسفی اور شاعروں کے نادر اقوال پر مشتمل تھا۔ "جھلکیاں" میں بعض طبع زاد افسانے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو انگریزی زبان سے ترجمہ کئے ہیں۔ طبع زاد افسانے تکنیک اور مادہ کے اعتبار سے کوئی بلند معیار نہیں رکھتے۔ اور مصنف کو خود اعتراف ہے کہ یہ افسانے ان کی ابتدائی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔ ترجمہ میں مقامی رنگ شامل کیا گیا ہے۔ اس لئے ان سے اجنبیت نہیں ٹپکتی۔ بحیثیت مجموعی افسانے دلچسپ ہیں اور ان میں سے بیشتر ایسے ہیں۔ جن میں معاشرتی اصلاح کو مد نظر رکھا گیا ہے ؛

(۱۰) باغی لڑکی اور دوسرے رومانی افسانے

از محترمہ شفیق بانو صاحبہ شفق

شائع کردہ نیا کتاب گھر، اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی

زیر نظر کتاب محترمہ شفیق بانو کے ۲۳ افسانوں کا مجموعہ ہے شفیق بانو صاحبہ ادبی و صحافتی دنیا میں خاصی شہرت کی مالک ہیں اکثر افسانوں میں سوسائٹی پر تنقید کے علاوہ اصلاحی رنگ بھی شامل ہے۔ بیشتر افسانوں میں رومانیت غالب ہے۔ افسانوں کی امتیاز خصوصیت کردار نگاری نہیں۔ بلکہ زبان اور اسلوب ہے۔ موصوف کی اس خصوصیت پر مسٹر آصف علی نے اپنی تمہید میں اشارہ بھی کیا ہے۔ جو "حق شناسی" کے عنوان سے کتاب کی زیب و زینت ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ کتاب خواتین کے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے ؛

(۱۱) ہندی کے مسلمان شعرا

از عبداللہ بٹ صاحب

شائع کردہ مکتبہ اُردو لاہور ۔ قیمت ۸؍

مکتبہ اُردو لاہور نے مختصر اور کم قیمت کتابوں کا نہایت کارآمد سلسلہ شروع کیا ہے ۔ زیر نظر کتاب "ہندی کے مسلمان شعرا" لاہور کے ایک نوجوان ادیب عبداللہ بٹ کی کاوش کا نتیجہ ہے ۔ ایسے موقعہ پر جب ہندی اُردو کا سوال ایک سیاسی مسئلہ بن گیا ہے ۔ اور یہ قضیہ روز بروز اُلجھتا ہی چلا جا رہا ہے ، ایسی کتابوں کا شائع ہونا ایک نیک فال ہے ۔ ہندی شاعری میں بعض مسلمان شعرا نے گراں بہا اضافہ کیا ہے ۔ اسے کوئی مورخ ادبی نظر انداز نہیں کرسکتا ۔ خوشی کی بات ہے کہ عبداللہ بٹ صاحب نے اس طرف توجہ کی ۔ کتاب میں ان شعرا کی زندگی کی ایک جھلک اور ان کے کلام کے پاکیزہ نمونے ملتے ہیں ۔ شروع میں خود عبداللہ بٹ صاحب کا پیش لفظ ہے جس میں قومی زبان کے مسئلہ سے بحث کی ہے ۔ اور سیدھی سادی زبان لکھنے پر زور دیا ہے ۔ اس کے علاوہ دیہاتی زبان کے مشہور شاعر سید مطلبی فرید آبادی کا دیباچہ بھی شامل ہے ۔ جس میں عوام کی زبان اختیار کرنے اور اسکو ادبی حیثیت دینے کی پُر زور تائید کی ہے ۔

(۱۲) معیشت زر

از ابن الحسن صاحب

شائع کردہ مکتبہ اُردو لاہور ۔

اقتصادیات اور معاشیات پر اُردو میں بہت کم لٹریچر ہے ۔ اب بعض ذمہ دار اداروں نے اس طرف توجہ کی ہے ۔ مکتبہ اُردو لاہور نے اس موضوع پر چند مختصر کتابیں شائع کی ہیں ۔ زیر نظر کتاب معیشت زر کو اسی سلسلہ کی ایک کڑی سمجھنا چاہیئے ۔ یہ کتاب ابن الحسن صاحب کی کاوشوں کا نتیجہ ہے ۔ موصوف نے اختصار کے ساتھ زر کی اہمیت ، اس کے تبادلہ کے طریق ، زر کی "قدر" "سکہ سازی" اور اس کے معیار پر بحث کی ہے ۔ آخر میں بینک کے بنیادی اصولوں پر روشنی ڈالی ہے مصنف نے مسئلہ کی اہمیت اور اس کے فوائد و نقصانات پر پُر از معلومات مواد بہم پہنچایا ہے ۔ یقیناً یہ کتاب ہمارے معاشی ادب میں ایک اچھا اضافہ ہے ۔

(۱۳) عربوں کی قومی تحریک

از مسعود علی ندوی صاحب

شائع کردہ مکتبہ اُردو لاہور ۔ قیمت ۸؍

مسعود علی ندوی صاحب اسلامی موضوعات پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں وہ اسلامی تاریخ کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں ۔ زیر نظر کتاب میں موصوف نے عربوں کی جذبۂ وطنیت کا تاریخی ارتقا پیش کیا ہے ۔ عرب کے قدیم باشندے نسبی تفاخر پر جان دیتے تھے ۔ اور یہ چیز ان کی روایات میں شامل ہو چکی تھی ۔ مگر آخرکار آہستہ آہستہ وہ اس منزل سے آگے بڑھے ۔ اور ان میں وطنیت کا جذبہ پیدا ہوا ۔ یہ جذبہ کن اندرونی تضاد اور بیرونی اثرات کا نتیجہ تھا ۔ اسے فاضل مصنف نے بڑی جامعیت کے ساتھ اس مختصر کتاب میں بیان کیا ہے ۔ مصنف نے کتاب بڑی کاوش سے مرتب کی ہے ۔ آخر میں حوالے کی کتابوں کی فہرست شامل ہے ۔ اُمید ہے علمی حلقوں میں یہ کتاب دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی ۔

(۱۴) ادب اور انقلاب

از ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری

شائع کردہ ادارہ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن ۔ قیمت عہ

ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری ترقی پسند ادیبوں میں ایک پانیر کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان کی شہرت کی بنیاد زیادہ تر ان کے افسانوں پر ہے جن میں انہوں نے انسانیت کے زخم سامنے رکھ دیئے ہیں ۔ اور جن میں رجعت پرستی پر شوخ اور تیز نشتر لگائے ہیں ۔ افسانہ نگار ہونے کے علاوہ موصوف ایک بالغ نظر نقاد بھی ہیں ۔ ان کا ایک طویل مضمون مدت ہوئی رسالہ "اُردو" میں "ادب اور زندگی" کے عنوان سے شائع ہوا تھا ۔ اس مضمون کو نئے رجحانات پر پہلا تبصرہ کہنا چاہیئے ۔ زیر نظر کتاب میں موصوف نے اسی مضمون کو زیادہ وسعت کے ساتھ پیش کیا ہے ۔ ادب برائے ادب کے فلسفہ کی پُر زور مخالفت کی ہے ۔ زندگی کا ادب سے اور ادب کا زندگی سے ناتہ جوڑنے کی تائید کی ہے ۔ ادب برائے زندگی کے موضوع پر نہایت پُر مغز اور بلیغ بحث کی ہے ۔ بلاشبہ اس موضوع پر یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے ۔ نئے اور نوخیز ادیبوں اور شاعروں کے لئے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے ۔

(۱۵) لہریں

از شفیق الرحمن صاحب
شائع کردہ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن
قیمت تین روپے بارہ آنے

شفیق الرحمن صاحب موجودہ افسانہ نگاروں میں ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ اُن کے افسانے ملک کے مقتدر رسالوں میں شائع ہو کر ادبی حلقوں سے خراجِ تحسین وصول کر چکے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب ان کے تازہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ شفیق صاحب کے اسلوبِ نگارش میں ایک خاص رس اور شگفتگی ہے۔ ان افسانوں میں کہیں کہیں مزاح کی بھی ایک ہلکی لہر ملتی ہے۔ ان کے افسانوں میں کھردراپن نہیں ملتا۔ بحیثیت مجموعی افسانے دلچسپ ہیں۔ اور ادبی حلقوں میں یقیناً دلچسپی کے ساتھ پڑھے جائیں گے ؞

(۱۶) مقالاتِ محمدؐ علی (حصّہ اول)

مرتبہ رئیس احمد جعفری صاحب
شائع کردہ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن

اس سے قبل رئیس احمد جعفری صاحب کی تصنیف سیرۃ محمد علی ملک میں کافی مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ موصوف نے مولانا محمد علی مرحوم کو بہت قریب سے دیکھا ہے۔ اور ان کی سیاسی اور ادبی زندگی سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب مقالاتِ محمد علی میں رئیس احمد جعفری صاحب نے مولانا مرحوم کے وہ مضامین یکجا کئے ہیں جو عالمِ اسلام سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعہ سے اس دور کی اسلامی سیاست کا اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے۔

اس حقیقت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے کہ مولانا محمد علی ایک جری سیاسی رہنما ہونے کے علاوہ ایک نہایت شگفتہ نگار ادیب بھی تھے، ان مضامین کی نوعیت صرف سیاسی نہیں ادبی بھی ہے ہم اس کی اشاعت کے لئے ادارہ اشاعت اُردو کو مبارکباد دیتے ہیں۔ اور امید کرتے ہیں کہ اس کے دوسرے حصّے بھی بہت جلد نظر نواز ہونگے۔

تورت وانجیل کی تحقیق

(از حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب)

یہ مضمون ۵ دسمبر ۱۹۴۳ء کی شام کو حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے ہارڈنگ لائبریری دہلی کی ادبی سوسائٹی میں پڑھا تھا۔

---

(۱)

انسان زمین پر رہتا ہے مگر اُس کا دماغ آسمان سے باتیں کرتا ہے اور ساری دُنیا کے رہنے والے انسانوں کی بڑی تعداد یقین کرتی ہے کہ خدا آسمان پر ہے۔ اور وہ کبھی کبھی انسانوں کی اصلاح و ترقی کے لئے کسی ایک آدمی سے باتیں کرتا ہے۔ اور اُن باتوں کو وہ انسان ایک کتاب میں جمع کرکے کہتا ہے کہ یہ آسمانی کتاب ہے۔

(۲)

موجودہ زمانے میں چھ کتابیں آسمانی مانی جاتی ہیں۔ ایک وید۔ دوسری ژند اوستا۔ تیسری توریت۔ چوتھی انجیل۔ پانچویں زبور۔ چھٹی قرآن۔ ساتویں کتاب گوتم بدھ کی بھی ہے۔ مگر وہ اتنی مشہور نہیں ہے۔

مُسلمانوں کو قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ قرآن کو خدا کا کلام ماننے کے ساتھ ہی یہ بھی مانیں کہ توریت۔ انجیل اور دوسری وہ سب کتابیں حق ہیں۔ اور خدا کا کلام ہیں جو مختلف پیغمبروں پر نازل ہوئی تھیں۔

(۳)

قرآن پر ایمان رکھنے کے سبب میں ان کتابوں کو بھی مانتا ہوں جن کا نام قرآن نے بتایا ہے۔ اور ان کتابوں کو بھی مانتا ہوں جن کے نام نہیں بتائے مگر یہ حکم دیدیا گیا ہے کہ تم کو اُن سب کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جو خدا نے مختلف زبانوں میں مختلف پیغمبروں پر نازل کی تھیں۔

میں قرآن کے مذکورہ حکم کو مان لینے کے بعد ان لوگوں سے اختلاف رکھتا ہوں جو اُن کتابوں کو آسمانی نہیں مانتے جن کا نام قرآن میں نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن نے یہ قاعدہ مقرر کر دیا ہے کہ جن پیغمبروں کا نام قرآن میں نہیں آیا ہے اُن پر بھی ایمان لاؤ اور ان کتابوں کو خدا کا کلام مانو جو اُن پیغمبروں پر اُتری تھیں۔

(۴)

توریت اور انجیل چونکہ یہودیوں اور عیسائیوں کی ایسی مشہور کتابیں ہیں جن کا نام اور ذکر قرآن میں بہت زیادہ آیا ہے۔ اس لئے میں پُورے ادب اور پُورے یقین اور پُورے ایمان کے ساتھ توریت اور انجیل کو پڑھا کرتا ہوں۔ اور آج ہارڈنگ لائبریری کی ادبی سوسائٹی میں یہ مضمون اس لئے پڑھتا ہوں کہ یہ سوسائٹی ہندوؤں، مُسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں وغیرہ سب قوموں کی مشترکہ انجمن ہے۔ اور اس کی وقعت اس لئے بہت زیادہ ہے کہ اس کے بانی علامہ ایونز سابق ڈپٹی کمشنر دہلی و حال سکریٹری چیف کمشنر صاحب دہلی ہیں۔ اور اس کے جلسوں میں ہر قوم کے بڑے بڑے نامور اہل علم مضامین پڑھتے ہیں۔ اور ہر قوم کے اہل علم سکون سے سُنتے ہیں۔ اور نظر تحقیق و انصاف سے دیکھتے ہیں۔ یہاں میں نے بعض اوقات ایسے مضامین بھی پڑھے ہیں کہ اگر کوئی سیاسی آدمی سیاسی نیت سے پڑھتا تو جیل خانے میں بھیج دیا جاتا۔ اور ان مضامین کو بڑے ذمہ دار انگریز افسروں کی موجودگی میں پڑھا گیا تھا اور کسی انگریز افسر نے ان مضامین سے بُرا نہ مانا تھا۔

لہذا آج بھی یہ تحقیقی مضمون کسی قوم کی آسمانی کتاب کی مخالفت یا ہجو کے لئے نہیں بلکہ محض علمی تلاش و تحقیق کی نیت سے پڑھتا ہوں۔

(۵)

جب میں نے حضرت عیسیٰ کی لائف لکھنے کا ارادہ کیا (کیونکہ قرآن میں حضرت عیسیٰ اور اُن پر نازل شُدہ کتاب انجیل کا بہت اچھے الفاظ میں ذکر آیا ہے) تو مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ کیونکہ میں یہ جانتا تھا کہ دُنیا کی موجودہ قوموں میں جتنی زیادہ خدمت اشاعت کے لحاظ سے انجیل کی ہوئی ہے۔ ویسی کسی دوسری کتاب کی نہیں ہوئی جس کو آسمانی کتاب مانا جاتا ہو۔ دُنیا کی ہر زبان میں انجیل کے ترجمے شائع ہوئے ہیں اور کروڑوں کی تعداد میں ان کی اشاعت ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے میرا خیال تھا کہ حضرت عیسیٰ کی لائف لکھنے میں مجھے بہت آسانی ہوگی اور سری کرشن جی اور آں حضرت کی لائف لکھنے میں جو تلاش مجھے کرنی پڑی تھی وہ حضرت عیسیٰ کی لائف لکھنے میں نہیں کرنی پڑیگی۔ مگر میں حیران رہ گیا کہ مجھے کسی زبان میں حضرت عیسیٰ کی ایسی لائف نہیں ملی۔ جو سیرت اور سوانح عمری کی شان رکھتی ہوتی۔ اس لئے میں نے مجبوراً لُوقا۔ یوحنا۔ متی۔ پطرس کی انجیلوں کو پڑھکر تاریخ مسیح تیار کی۔ اور جب وہ چھپ کر تیار ہوئی تو اس سے زیادہ حیرت ہوئی جو کتاب کی تیاری کے وقت سیرت

ہندوؤں میں مقبول ہوئی۔ اور یہاں تک کہ عیسائیوں نے بھی اسکو نہ لیا۔ حالانکہ اس میں کوئی بات عیسائی عقائد کے خلاف نہ تھی۔

(۶)

میں نے بغیر کسی مشکل کے سمجھ لیا کہ مسلمان قوم تیرہ سو برس کی سیاسی لڑائیوں کے سبب جو عیسائیوں سے ان کی ہوتی رہی تھیں۔ اس کتاب کی طرف راغب نہیں ہوئی۔ اور ہندوؤں کو حضرت عیسیٰ سے رغبت کی کوئی وجہ نہ تھی اور عیسائیوں نے اس لئے اس کو نہ لیا کہ وہ ایک مسلمان کی لکھی ہوئی تھی۔

(۷)

اب میں حضرت موسیٰ کی لائف لکھنے کی تیاری کرنے لگا تو توریت کو پڑھا اور حضرت موسیٰ کے حالات تاریخوں میں تلاش کرنے شروع کئے۔ تو معلوم ہوا کہ تاریخیں عموماً توریت سے ماخوذ ہیں اور مورخوں نے حضرت موسیٰ کی شخصیت کی نسبت بہت کم لکھا ہے۔

فرعون کی تاریخ لکھ چکا تو اندازہ ہوا کہ مصری آثار قدیمہ سے بھی حضرت موسیٰ کے تاریخی حالات اتنے نہیں ملتے جتنے توریت سے ملتے ہیں۔

(۸)

مگر میرا یہ مضمون حضرت موسیٰ یا حضرت عیسیٰ کی ذاتی سرگذشت سے تعلق نہیں رکھتا۔ میری تحقیق محض توریت و انجیل کتابوں سے تعلق رکھتی ہے۔ اور مجھے صرف یہ دیکھنا ہے کہ توریت اور انجیل میں کلام الٰہی ہونے کی شان کتنی ہے؟ اور انسانی تحریر ہونے کی شان کتنی ہے؟

میں نے یہ تحقیق قرآن کو سامنے رکھکر کی ہے۔ کیونکہ قرآن ہی نے ان دونوں کتابوں پر ایمان لانے اور ان کو آسمانی کتاب اور کلام الٰہی سمجھنے اور ماننے کا حکم دیا ہے۔

پس جب میں قرآن کے انداز تحریر کو دیکھتا ہوں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ... میں ایسا ہوں

اور محض انداز کی باتیں ہیں۔ مگر ان کو تاریخی بیان اور سیاسی و تمدنی واقعات سے بہت ہی کم تعلق ہے۔ البتہ توریت میں تاریخ اور سیاست اور تمدن اور جغرافیہ کے بیانات بھی ہیں مگر ان انداز بیان میں الوہیت کی شان بہت کم ہے۔ ہاں دنیا کی پیدائش کے بیان میں الوہیت کا انداز پایا جاتا ہے۔

(۹)

تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ طور پہاڑ پر چلہ کرنے گئے تو پتھر پر لکھی ہوئی چند تختیاں اپنی قوم کے پاس لائے اور کہا کہ یہ توریت ہے۔ اور جب اپنی قوم کو بچھڑے کے بت کی پوجا کرتے دیکھا تو خفا ہو کر وہ پتھر کی تختیاں زمین پر پٹک ماریں۔ اور یہ بھی تاریخوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد جب ان کی یہودی قوم نے تابوت سکینہ بنایا (جو ایک صندوق تھا اور لڑائیوں کے وقت فوجوں کی ہمت بڑھانے کے لئے فوجوں کے آگے رکھا جاتا تھا) تو اس تابوت میں پتھر کی لوحیں بھی رکھیں جن کی تعداد معلوم نہیں ہے۔ بعض جگہ دو لوحیں لکھی ہیں بعض مقامات پر دو سے زیادہ تختیوں کا ذکر آیا ہے۔ بہر حال ان کی تعداد دو چار سے زیادہ نہ تھی۔ اور ان ہی تختیوں یا سنگین لوحوں کو توریت کہا جاتا تھا۔

(۱۰)

میرا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ کے مشہور دس احکام ان لوحوں میں درج تھے اور ان ہی دس احکام کو کلام الٰہی کہا جا سکتا ہے۔ اور بقیہ عبارتیں بعد میں ان الواح کے علاوہ توریت میں قلم بند ہوئی ہیں۔ ممکن ہے توریت کا وہ مختصر حصہ جو پیدائش وغیرہ بابوں میں ہے کلام الٰہی ہو اور پتھر کی الواح میں درج ہو اور توریت کتاب میں اُن کو نقل کر دیا گیا ہو۔ مگر یہ بات یقینی ہے کہ توریت کا زیادہ حصہ حضرت موسیٰ کے بعد لکھا گیا ہوگا جس کو کلام الٰہی نہیں کہہ سکتے۔

میں اپنے مضمون کے آخر میں دوبارہ شروع کی عبارت کو دوہرانا چاہتا ہوں کہ میں نے یہ مضمون قرآن کو توریت اور انجیل پر فوقیت دینے کی نیت سے نہیں لکھا ہے بلکہ اس کا منشا محض یہ ہے کہ ہندو بھی اور مسلمان بھی اور یہودی بھی اور عیسائی بھی اور مجوسی بھی علمی اور تحقیقی نظر سے قرآن اور توریت اور انجیل کو سامنے رکھکر ... کلام کی شان ان تینوں میں کس کتاب کو زیادہ ہے۔

نذرِ سائل

(جناب نواب سراج الدین احمد خاں صاحب سائل دہلوی)

نوٹ :۔ جناب سائل نے خدا اُن کو سلامت رکھے یہ خمسہ "داغ ڈے" کو بوقت شب خود پڑھ کر مجلس مشاعرہ منعقدہ ٹاؤن ہال میں سنایا تھا (فصیح الدین احمد)

روتے دھونے سے فائدہ کیا ہے　　شیون نالہ و بُکا کیا ہے
چارہ فرما کا مشورہ کیا ہے　　دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم کلامی کی شان رکھتا ہوں　　آبرو کا دھیان رکھتا ہوں
آنکھ رکھتا ہوں کان رکھتا ہوں　　میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

عشق ہے وہ بلائے پُراسرار　　کھیلتا ہے خرد وروں کا شکار
حیرت افزا ہیں اس کے سب اطوار　　ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

کی جو وحدت نے کثرتوں کی نمود　　حق نگر آنکھ ہوگئی نابود
کوئی منکر نہ سمجھا یہ مردود　　جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

نا سمجھ نوجوان ایسے ہیں　　مطمئن دل بس ایک شے سے ہیں
یوں سمجھتے کہ پاس پیسے ہیں　　یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں

[redacted]

غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شیخ عصیاں سے تو بری کیوں ہے کہہ کے یہ حسن فسوں گری کیوں ہے
اچھی صورت کو برتری کیوں ہے شکن زلفِ عنبری کیوں ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

فلسفی لاکھ سر کھپائے ہیں شاخ سا نے بہت لگائے ہیں
کھوج پائیں نہ ان کے پائے ہیں سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

سامنا جس حسیں سے میرا ہوا دے کر اس کو دعا یہ میں نے کہا
چھوڑنا او غرور حرص و ہوا ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

عاشقانہ شعار کرتا ہوں زیست کو اپنی خوار کرتا ہوں
کشتیٔ عمر پار کرتا ہوں جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

زیست میں دل لگی سمجھ کے مفید منتخب کر دیئے بتِ بے دید
بات ثابت ہوئی خرد سے بعید ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

نام سائل سوال ہے غائب دادا نیر تھا باپ تھا ثاقب
سیم و زر کا نہیں ہوں گو طالب ہم نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے

عربوں کے اخلاق

اسلام لانے کے بعد

(از واحدی)

بچّے پیسے پر پنّی منڈھا کرتے ہیں یا پیسے پر کاغذ رکھکر پنسل پھیرتے ہیں۔ پنّی پر بھی پیسے کے نقوش آجاتے ہیں اور کاغذ پر بھی۔ پیسے کو موم پر دبایا جائے تو موم بھی نقوش قبول کریگا۔ لیکن پیسے کو پتھر پر انتہائی قوت کے ساتھ دبا کر دیکھئے پتھر پیسے کے نقوش نہیں قبول کریگا۔ کسی بات کے قبول کرنے کے لئے قبول کرنے والے میں بھی صلاحیت ہونی چاہیئے۔ صرف بات کے اچھے ہونے سے کام نہیں چلتا۔ ہمارا ایمان ہے کہ اسلام سچا دین ہے اور اسکی پیروی میں انسانوں کی فلاح ہی فلاح ہے۔ اور اللہ کا یہ سب سے بڑا کرم تھا کہ اُس نے ہم کو دنیا میں رہنے کے ایسے آسان، معتدل اور متوازن طریقے سکھائے۔ مگر یہ بھی ایک کرم تھا کہ اسلام کی ابتداء عرب سے کی۔ عرب کی حالت بعض اعتبار سے دنیا بھر سے بدتر تھی اور دنیا بھر سے زیادہ عرب اصلاح کا محتاج تھا۔ لیکن عرب ہی وہ ملک ہے جہاں کے لوگ اچھی بات قبول کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے تھے۔ اسلام عرب سے شروع نہ ہوتا تو یہ جو قرآن پاک کی ایک آیت ہے کہ اللہ کے رسُول کی زندگی انسانوں کے لئے نمونہ ہے نعوذ باللہ بے معنی رہ جاتی۔ عربوں کو یہ صلاحیت اللہ ہی نے بخشی تھی۔ وہ چاہتا تو یقیناً بالکل یہی صلاحیت کسی دوسری قوم میں پیدا کر دیتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ اور اس شرف امتیاز کے لئے عربوں کا انتخاب فرمایا۔ اسلام کو جتنا عربوں نے مانا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے قدم بقدم جیسے عرب چلے اس کی مثال دوسرے ملکوں کے مسلمانوں میں نہیں ملتی۔ آج کل کا ذکر نہیں ہے میں مسلمانوں کے اچھے وقت کا ذکر کر رہا ہوں۔ دورِ زوال کا نہیں، دورِ عروج کا ذکر کر رہا ہوں۔ یہ اللہ کی مصلحت تھی کہ اس نے اپنے دین کا آغاز ایسی جگہ سے کیا کہ بے شمار نمونے دین کی صحیح اتباع کے مل جاتے ہیں۔

اسلام سے پہلے عربوں کے اعمال خراب تھے۔ لیکن عربوں کی طینت خراب نہیں تھی۔ عربوں کا کیرکٹر خراب نہیں تھا۔ جب عربوں میں اگر ابوجہل یا ابولہب جیسے شقی موجود تھے تو عربوں میں ابوبکرؓ اور خدیجہؓ جیسی سعید رُوحیں بھی نمودار ہوسکتی تھیں اور بہترے عرب ہما کے شقیوں کا انکار بھی ایک شان رکھتا تھا اور عرب کے سعید دل کا اقرار بھی دنیا بھر کے اقراروں سے پختہ اور استوار تھا۔ عرب عار پر نار کو ترجیح دیتے تھے اور عربوں کے دماغ سے عار کا کانٹا نکل جاتا تو وہ جنت لے کر چھوڑتے تھے۔ عربوں نے اخلاق اسلام کو اس طرح جذب کر لیا جس طرح بلاٹنگ پیپر روشنائی جذب کر لیتا ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول کی ایک ایک ہدایت پر انہوں نے عمل کیا اور قرآن مجید جیسا مسلمان پیش کرنا چاہتا تھا ویسے مسلمان وہ بن گئے۔ قرآن مجید نے مسلمان کی جو تعریف کی ہے۔ عرب اُس تعریف کے مصداق تھے۔ اسلام لانے کے بعد عربوں کے اخلاق وہ تھے جن کی تعلیم اسلام نے دی ہے۔ اور قرآن مجید اور کتب احادیث جس تعلیم کا مجموعہ ہیں۔ سارا قرآن اور ساری حدیثیں یہاں نقل نہیں کی جاسکتیں۔ صرف معاشرت کے (سب نہیں) کچھ طریقے لکھتا ہوں جو اسلام ساری دنیا کو سکھانے چاہتا ہے اور جنھیں عربوں نے پوری طرح قبول کر لیا تھا۔

حکم ہے "مَردوں کو مَردوں پر نہیں ہنسنا چاہیئے۔ کیا عجب ہے کہ (جن پر ہنستے ہیں) وہ (خدا کے نزدیک) اُن سے بہتر ہوں۔ اور عورتوں کو عورتوں پر نہیں ہنسنا چاہیئے کیا عجب ہے کہ (جن پر ہنستی ہوں) وہ (خدا کے نزدیک) ان سے بہتر ہوں۔ (اور) آپس میں ایک دوسرے کو طعنے نہیں دینے چاہئیں اور ایک دوسرے کو نام نہیں دھرنا چاہیئے۔ مسلمان ہو جانے کے بعد بدتہذیبی کا شائبہ بھی بُرا ہے۔ اور جو (ان حرکتوں سے) باز نہ آئیں گے تو وہ ظالم قرار پائیں گے۔ اے مسلمانو! (لوگوں کی نسبت) شک و شبہ کرنے سے بھی بچتے رہو کیونکہ بعض شک (داخل) گناہ ہیں۔ اور ایک دوسرے کی بُرائیاں نہ تلاش کیا کرو۔ اور کوئی ایک دوسرے کو پیٹھ پیچھے بُرا نہ کہے۔ بھلا تم میں سے کوئی (اسے) گوارا کریگا کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے۔ (یقیناً) گوارا نہیں کریگا تو غیبت کیوں گوارا ہو۔ غیبت بھی ایک طرح کا مُردار کھانا ہے۔

(قرآن مجید کی چند آیات کا مطلب)

"اللہ کی عبادت کرو اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ اور والدین اور کنبہ داروں اور یتیموں اور محتاجوں اور کنبہ کے پڑوسیوں اور غیر کنبہ کے پڑوسیوں اور پاس کے بیٹھنے والوں اور مسافروں اور جو (لونڈی غلام) تمہارے قبضہ میں ہیں ان سب کے ساتھ سلوک کرتے رہو۔"

(قرآن مجید کی چند آیات کا مطلب)

"جو لوگ دین کے سلسلہ میں تم سے نہیں لڑے اور جنہوں نے تمہیں خانہ بدر نہیں کیا ان کے ساتھ سلوک کرنے اور صحیح برتاؤ کرنے سے اللہ نے کب منع کیا ہے۔ اللہ تو منصفانہ برتاؤ کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔"

(قرآن مجید)

"مسلمان خوشی اور تنگ دستی (دونوں صورتوں) میں خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو ضبط کرتے ہیں اور لوگوں (کے قصوروں) سے درگذر کرتے ہیں۔" (قرآن مجید)

"مسلمانو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلس میں کھل کھل کر بیٹھو تو کھل کر بیٹھا کرو۔ خدا (جنت میں) تمہیں کشادہ جگہ دیگا۔ اور جب کہا جائے کہ (اپنی جگہ سے) اٹھو کھڑے ہو تو کھڑے ہو جایا کرو۔"

(قرآن مجید)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک صحابی نے سوال کیا کہ میں اپنے خادم کی خطاؤں کو کتنی دفعہ معاف کروں۔ ارشاد ہوا ستّر دفعہ۔

(حدیث)

ایک صحابیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں اپنی سوکن کو اگر ایسی چیزیں دکھاؤں جو حقیقتاً میرے شوہر نے نہیں دی ہیں۔ لیکن میں اس پر یہ ظاہر کروں کہ شوہر کی دی ہوئی ہیں تاکہ وہ جلے تو مجھے گناہ تو نہیں ہوگا۔ آپ نے ایسی حرکت کو پسند نہیں فرمایا۔

(حدیث)

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ بہترین مسلمان کی تعریف کیا ہے۔ ارشاد ہوا کہ بہترین مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسروں کو ناحق تکلیف نہ پہنچے۔ اور جو لوگوں کو کھانا کھلائے اور شناسا و غیر شناسا کو سلام کرے

(حدیث)

ایک دفعہ مرد عورت رلے ملے چل رہے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو الگ کر کے بتایا کہ تمہیں کنارے کنارے چلنا چاہیئے۔ راستہ کے بیچ میں نہ چلا کرو۔

(حدیث)

ایک بار حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اپنے کسی غلام کو ملعون کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن لیا۔ اور فرمایا لعنت اور صدیقیت کا ایک جگہ جمع رہنا ممکن نہیں۔ اس فقرے کو بار بار دہرایا۔ یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ نے اس غلام کو آزاد کر دیا۔

(حدیث)

ایک صحابی بیان کرتے ہیں کہ میں بچہ سا تھا۔ کھانا کھاتا تو پیالہ میں ہر طرف ہاتھ دوڑاتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت کی کہ بسم اللہ کرکے کھانا کھایا کرو۔ داہنے ہاتھ سے کھانا کھایا کرو اور کھانے کو آگے سے کھایا کرو۔ دور تک ہاتھ مت دوڑایا کرو۔

(حدیث)

ایک بار ایک صحابی نے عرض کیا مجھے کوئی مفید ہدایت کیجے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا راستہ سے تکلیف دہ چیزیں ہٹا دیا کرو۔

(حدیث)

ایک بار ایک صحابی نے کہا مجھے ایسا کام بتائیے جس کے کرنے سے میں جنت حاصل کرلوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا خدا کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ نماز پڑھو، زکوٰۃ دو اور اعزا و اقارب کے ساتھ درجہ بدرجہ سلوک کرو۔

(حدیث)

ایک صحابی نے پوچھا میرے سلوک کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ماں"۔ صحابی نے سوال کیا "پھر"۔ رسول اللہؐ نے فرمایا "ماں"۔ صحابی نے تیسری دفعہ سوال کیا "پھر"۔ رسول اللہ نے فرمایا "ماں"۔ صحابی نے چوتھی دفعہ سوال کیا۔ تب رسول اللہ نے فرمایا "پھر باپ"۔

(حدیث)

ایک دفعہ آپ نے فرمایا۔ اللہ کو سب سے زیادہ یہ کام پسند ہیں۔ وقت کی پابندی سے نماز پڑھنا۔ پھر ماں باپ کے ساتھ سلوک اور پھر جہاد۔

(حدیث)

رسول اللہؐ نے ایک دفعہ فرمایا۔ شرک سب سے بڑا گناہ ہے۔ پھر گناہوں میں دوسرا درجہ ماں باپ کی نافرمانی کا ہے اور تیسرا درجہ جھوٹی شہادت کا۔

(حدیث)

رسول اللہؐ نے ایک دفعہ فرمایا۔ یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ انسان اپنے ماں باپ پر لعنت کرے۔ صحابہ نے پوچھا ماں باپ پر کوئی کیسے لعنت کرسکتا ہے۔ فرمایا دوسروں کے ماں باپ پر لعنت کرکے۔ تم کسی کے ماں باپ کو برا کہوگے۔ تو وہ تمہارے ماں باپ کو برا کہے گا۔

(حدیث)

رسول اللہؐ نے ایک دفعہ فرمایا اعزہ و اقارب سے تعلقات خوشگوار رکھنا عمر کو بڑھاتا ہے۔ تعلقات رکھنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ عزیز تم سے تعلقات رکھیں تو تم ان سے تعلقات رکھو۔ بلکہ تعلقات رکھنے کے معنی یہ ہیں کہ عزیز تعلقات نہ رکھیں تو بھی تم ان سے تعلقات رکھو۔

(حدیث)

رسول اللہؐ نے ایک دفعہ فرمایا باپ کا کوئی کچھ حق ادا کرسکتا ہے۔ سوائے اس کے کہ باپ کسی کا غلام ہو اور بیٹا اسے آزاد کردے۔ (حدیث)

رسول اللہ نے ایک دفعہ فرمایا۔ لوگوں کو چاہیئے اپنے باپ کے دوستوں سے ساتھ بھی اچھا سلوک کریں۔

(حدیث)

ایک صحابیہ کی ماں جو مسلمان نہیں ہوئی تھیں۔ صحابیہ کے پاس مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ آئیں۔ صحابیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا۔ کیا میں ان کے ساتھ اچھا سلوک کرسکتی ہوں؟ فرمایا "ہاں" اسی سوال کے بعد قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی تھی: "جو لوگ دین کے معاملہ میں تم سے لڑتے نہیں اللہ ان کے ساتھ سلوک کرنے سے تمہیں نہیں روکتا۔"

(حدیث)

رسول اللہ نے ایک دفعہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو ٹکڑے کئے۔ ننانوے ان میں سے اپنے پاس رکھے اور ایک بندوں کو دیدیا۔ اسی ایک ٹکڑے کا اثر ہے کہ انسان اور چرند پرند ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ ماں اپنے بچے سے محبت کرتی ہے اور گھوڑا اپنی ٹاپ سے اپنے بچے کو بچاتا ہے۔

(حدیث)

ایک عورت کا دودھ پیتا بچہ کھو گیا۔ اس کا دودھ چھاتی میں بھر جاتا تو وہ دوسروں کے بچے دودھ پینے کے لئے تلاش کرتی پھرتی۔ بڑی مشکل سے اس کا بچہ ملا۔ اس نے اسے چھاتی سے چمٹا لیا۔ رسول اللہ نے یہ منظر دیکھا تو صحابہ کو مخاطب کر کے فرمایا "تم تصور کرسکتے ہو کہ یہ عورت کبھی اپنے بچے کو آگ میں ڈال دیگی"۔ صحابہ نے کہا "نہیں" رسول اللہ نے فرمایا "اسے جتنی اپنے بچے سے محبت ہے اس سے کہیں زیادہ اللہ کو اپنے بندوں سے محبت ہے۔"

(حدیث)

مقصد اس گفتگو سے محبت اور رحم کا پرچار تھا۔ اسلام انسانوں کو محبت اور رحم کی دعوت دیتا ہے۔ درجہ بدرجہ بقدر تعلق۔ غرض انسانیت کا لازمہ ہے اپنے ہم جنس اور غیر جنس سب کے ساتھ محبت اور رحم کا برتاؤ۔

رسول اللہ تو سراپا محبت و رحم تھے۔ نماز پڑھتے میں معصوم بچے آپ کی پیٹھ پر اور کندھے پر چڑھ جاتے اور حضور اسی حالت میں نماز ادا کرتے اور بچے کو نہ روکتے بلکہ رکوع و سجدہ کے وقت بچے کو کندھے سے اتار دیتے۔ اور قیام کے وقت پھر بٹھا لیتے۔

ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نواسے حضرت امام حسن کو پیار کیا۔ آپ کے پاس اقرع بن حابس تمیمی بیٹھے تھے انہیں یہ بات شاید شان رسالت کے خلاف معلوم ہوئی۔ رسول اللہ نے فرمایا جو شخص دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر اللہ رحم نہیں کریگا۔

ایک بدو کا بھی اسی قسم کا واقعہ ہے۔ اس نے کہا ہم لوگ بچوں کو پیار ویار نہیں کیا کرتے۔ رسول اللہ نے فرمایا اللہ نے تمہارے دل سے رحم نکال لیا ہے تو میں اس میں رحم کیونکر ڈال سکتا ہوں۔

(حدیث)

رسول اللہ کا ارشاد ہے "کسی شخص پر بیٹیوں کا بوجھ پڑ جائے اور وہ اسے صبر کے ساتھ برداشت کرے تو وہ بیٹیاں اس کے اور دوزخ کی آگ کے درمیان پردہ بنکر حائل ہو جائینگی۔"

(حدیث)

رسول اللہ کا ارشاد ہے۔ غلاموں سے اچھا برتاؤ کرنا برکت کا موجب ہے۔ اور برا برتاؤ نحوست کا موجب۔ جو شخص غلاموں کے ساتھ برا برتاؤ کریگا۔ وہ جنت میں نہ گھس سکے گا

(حدیث)

رسول اللہ نے وفات پانے کے وقت فرمایا "نماز کی پابندی کرو۔ اور غلاموں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو"

(حدیث)

ایک بار رسول اللہ نے فرمایا "تمہارے بھائیوں کو اللہ نے تمہارے قبضہ میں دیدیا ہے۔ تم جو خود کھاتے ہو وہی انہیں کھلاؤ اور جو خود پہنتے ہو وہی انہیں پہناؤ۔ اور ان سے ان کی طاقت کے مطابق کام لو۔ اور کاموں میں ان کا ہاتھ بٹاؤ۔

(حدیث)

ایک بار رسول اللہ نے فرمایا "جہاں رہو۔ اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور لوگوں کے ساتھ بھلائی کرو۔ برائی کے بدلے بھی بھلائی کرو۔ تمہاری بھلائی برائی کرنے والے کی برائی کو مٹا دیگی۔

(حدیث)

رسول اللہ کا ارشاد ہے "قیامت کے روز خوش خلقی سے بڑھکر کوئی شے وزنی نہیں ثابت ہوگی۔ اللہ بدکلام انسان کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔"

(حدیث)

ایک بار ارشاد ہوا "دو عیب مسلمان کے شایان شان نہیں ہیں۔ ایک بخل اور ایک بدخلقی"

(حدیث)

ایک بار ارشاد فرمایا "اللہ کو جاہل سخی عبادت گزار بخیل سے زیادہ پسند ہے۔"

(حدیث)

ایک بار ارشاد ہوا "یہ مت کیا کرو کہ دوسرے ہمارے ساتھ برائی کرینگے تو ہم بھی ان کے ساتھ برائی کرینگے بلکہ دل میں ٹھان لو کہ برائی کرنے والوں کے ساتھ بھی برائی نہ کروگے۔"

(حدیث)

ایک بار ارشاد ہوا "واللہ ایمان نہیں لایا وہ شخص جس کا پڑوسی اس کے شر سے محفوظ نہیں رہتا۔"

(حدیث)

ایک بار ارشاد ہوا "اللہ نے تم لوگوں میں سے زمانہ جاہلیت کا غرور نکال دیا۔ اور تم سے باپ دادا پر فخر کرنا چھڑوا دیا۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔" (حدیث)

"ایک بار ارشاد ہوا" کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صحرائے عرب میں یہ ایک بار نکارت وصدا الصحرا ہوکر رہ جاتا تھا۔ اول تو ایک ہدایت کو ضرورت پڑتی تو دوبارہ اور سہ بارہ بھی کسی دوسرے طریقے سے دوسرے لفظوں میں بیان کر دیا جاتا تھا۔ لیکن عربوں کی طبیعت اس قسم کی تھی کہ اگر وہ کسی بات کو ماننا چاہتے تھے تو ایک ہی بار کے کہنے سے مان لیتے تھے اور اس طرح مانتے تھے کہ اور کوئی اس طرح مشکل سے مان سکتا ہے۔ ایک بدو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا "یا رسول اللہ مجھے بتایئے اسلام کیا ہے؟" آپ نے اس کی عقل کے مطابق کچھ موٹی موٹی باتیں بتا دیں۔ اس نے کہا "بس یہی اسلام ہے"۔ رسول اللہ نے فرمایا "بس یہی اسلام ہے"۔ اس نے کہا "اس وقت کچھ اور بتانا ہو تو بتا دیجے پھر نہیں سنوں گا"۔ رسول اللہ نے فرمایا "اور کچھ بتانا نہیں"۔ اس نے کہا "میں ان باتوں کی پوری پابندی کروں گا"۔ اور یہ کہتا ہوا چل دیا۔ رسول اللہ نے فرمایا "یہ فلاحیات ہو گیا"۔ غرض عربوں کا یہ کیرکٹر تھا کہ وہ جو رنگ اختیار کر لیتے تھے اس میں ایسے پختہ ہو جاتے تھے کہ ان کی پختگی کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ عربوں نے اسلام قبول کرنے میں پس و پیش بھی کیا۔ اسلام قبول کرنے سے انکار بھی کیا۔ مسلمانوں کے ساتھ منافقت بھی برتی اور مسلمان بھی ہوئے۔ لیکن ہر حالت میں پختہ رہے منافقت میں بھی ان کے پختگی تھی اور اسلام لانے کے بعد انہوں نے احکام اسلام کو بھی اپنے اوپر ایسا طاری کر لیا جیسا اسلام چاہتا تھا۔ اوپر جو باتیں لکھی گئی ہیں یہ ان باتوں کے سمندر کے چند قطرے ہیں جن کی اللہ اور اللہ کے رسول نے اپنے بندوں کو تعلیم دی ہے۔ عربوں نے ان باتوں کے ایک ایک لفظ کو دل اور دماغ میں جگہ دی اور ایک ایک لفظ پر والہانہ عمل کیا۔ . . . .

. . . . عمل کی انتہا کر دی۔ حضرت عمرؓ کے بیٹے سے ایک ایسی غلطی سرزد ہو گئی جسکی سزا اسلام نے اتنے کوڑے مقرر کئے ہیں جنھیں کھا کر انسان زندہ نہیں بچ سکتا حضرت عمرؓ کو اس غلطی کی اطلاع ملتی ہے۔ حضرت عمرؓ بیٹے کے گھر پہنچتے ہیں اور بیٹے سے پوچھتے ہیں "کیا تم نے یہ غلطی کی ہے؟" اسلام میں جھوٹ بولنا اس غلطی سے بھی بڑھ کر برا تھا۔ حضرت عمرؓ کے بیٹے فوراً اقرار کر لیتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کے بیٹے اس وقت کھانا کھا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں "اب باقی کھانا جنت میں جا کر کھانا"۔ حضرت عمرؓ کے بیٹے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ حضرت عمرؓ جو خلیفہ ہیں، رسول اللہ کے جانشین اور مسلمانوں کے دینی و دنیاوی بادشاہ، حکم دیتے ہیں کہ میرے بیٹے کو سزا دو۔ سزا ملتی ہے اور بیٹا رخصت ہو جاتا ہے۔ اسلام کے حکم کی تعمیل میں نہ باپ کو تامل ہوتا ہے نہ بیٹا کسمساتا ہے۔ عمل کا یہ حوصلہ عرب ہی دکھا سکتے تھے۔ ایک صحابی شکار جانور کو کرنا چاہتے ہیں۔ شکار اتفاق سے انسان ہو جاتا ہے۔ مقدمہ خلیفہ کے سامنے آتا ہے۔ صحابی جرم کا اقرار کرتے ہیں اور کہتے ہیں "میں قصاص (یعنی مرنے) کے لئے حاضر ہوں لیکن میرے پاس ایک یتیم کی امانت ہے وہ یتیم کو واپس کر آنے کی اجازت دیجے۔ کل اسی وقت یہاں موجود ہونگا"۔ خلیفہ حاضرین سے پوچھتے ہیں کوئی ان کی حاضری کی ضمانت دیگا۔ ایک اور صحابی اٹھتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ کل نہ آئے تو مجھے ان کی جگہ مار ڈالا جائے۔ خلیفہ مجرم کو امانت واپس کرنے کی اجازت دیدیتے ہیں۔ دوسرے دن سزا کا وقت آتا ہے اور مجرم صحابی پہنچ جاتے ہیں۔ لوگ ضمانت دینے والے صحابی سے پوچھتے ہیں کہ تم نے ضمانت دینے کی کیونکر ہمت کر لی تھی وہ جواب دیتے ہیں "محمد رسول اللہ کی صحبت میں رہنے والا موت سے بچنے کی خاطر جھوٹ نہیں بول سکتا۔ مجھے یقین تھا کہ یہ ضرور واپس آ جائیں گے"۔ مرنے والے کے عزیزوں نے خلیفہ سے عرض کیا کہ ہم اپنے عزیز کا خون معاف کرتے ہیں اور ان سے بدلہ لینا نہیں چاہتے۔ عمل کا کچھ ٹھکانا ہے۔

جب یہ باتیں آپ کے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ اور سوچ رہا ہوں کہ آپ کہیں یہ نہ کہنے لگیں کہ "نظام المشائخ" کے اڈیٹر نے "ادیب" کی اڈیٹری میں بھی نظام المشائخیت نہیں چھوڑی۔ اور "ادیب" میں اللہ رسول کا ذکر شروع کر دیا۔ مگر مجھے ادیب کے بلند خیال ناظرین سے امید ہے کہ وہ باتوں کو دیکھینگے اور باتوں کی اچھائی سے فائدہ اٹھانے کی طرف توجہ کرینگے۔ "ادیب" اچھی باتیں ہر بزرگ اور بڑے آدمی کی چھاپنے کو تیار ہے۔ اور "ادیب" کے اڈیٹر کا دل ہر اچھی بات کے لئے کھلا ہوا ہے۔ خواہ وہ کسی مذہب کی ہو۔ اسکا عقیدہ ہے عقل و حکمت کی بات مومن کی کھوئی ہوئی میراث ہے۔ جہاں سے ملے اُسے دل میں جگہ دو۔

غم نہ کر!

(از جناب نہال سیوہاروی)

آج کانٹے ہیں اگر تیرے مقدّر میں تو کیا
کل ترا بھر جائے گا پھولوں سے دامن غم نہ کر

تو نظر آتا ہے جس زنجیرِ آہن میں اسیر
ٹوٹ جانے کو ہے وہ زنجیرِ آہن غم نہ کر

اک نیا عہدِ محبّت آسماں لانے کو ہے
متّحد ہو جائیں گے شیخ و برہمن غم نہ کر

میں نے مانا آج سونی ہی ہے تیری بزمِ دل
کل یہ ہوگی غیرتِ وادیٔ ایمن غم نہ کر

منزلِ مقصود ہے ہر چند مثلِ ہفت خواں
گر سلامت ہے تری ہمّت کا توسن غم نہ کر

دیکھتا ہے آج جس گلشن کو تو وقفِ خزاں
تازہ کیسا تازہ تر ہوگا وہ گلشن غم نہ کر

پھر نشاطِ تازہ کا پیغام لائے گی بہار
پھر چمن میں بلبلیں ہوں گی نوا زن غم نہ کر

قطرہ اک دن بحر بن جائیگا خونِ دل نہ پی
دانے کو تیرے ملے گی شانِ خرمن غم نہ کر

نکتۂ تعمیر پنہاں ہے ہر اک تخریب میں
بجلیاں ہیں طرحِ اندازِ نشیمن غم نہ کر

چشمِ بینا ہے تو غم کی غایتِ پنہاں کو دیکھ
شامِ ظلمت ہے دلیلِ صبحِ روشن غم نہ کر

اک نیا عالم دکھائے گا کلیم عصرِ نو
گرم رخصت ہے یہ عہدِ سامری فن غم نہ کر

گل اگر اک شمع ہوتی ہے ہوائے دہر سے
سینکڑوں اس کی جگہ ہوتی ہیں روشن غم نہ کر

ایک عہدِ تازہ آیا چاہتا ہے جام اُٹھا
غم نہ کر اے مائلِ فریاد و شیون غم نہ کر

حسینی برہمن

(از حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب)

یہ مضمون خواجہ صاحب نے ہارڈنگ لائبریری کی ادبی سوسائٹی میں ۶ مارچ ۱۹۴۳ء کو سنایا

محرم قریب ہے اور ہندستان کے دس کروڑ مسلمانوں کا بڑا حصہ اور تین کروڑ ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد حضرت امام حسینؑ کی ماتم داری میں شرکت کی تیاریاں کر رہی ہے ایسے زمانے میں دہلی کی یہ نامور ادبی اور علمی سوسائٹی بھی اگر حضرت امام حسینؑ کا ذکر کرے تو اُس کے لئے زیبا ہے۔

مجھے اپنا مضمون پڑھنے سے پہلے ایران کے ایک شیعہ سیاح سید محمد صاحب حجازی کا اہل دہلی سے تعارف کرانا ہے جو اس وقت یہاں تشریف رکھتے ہیں کہ وہ ایران کے نامور مورخ اور مقبول خاص و عام انشا پرداز اور ادیب اور مصنف ہیں۔ دہلی انکی تشریف آوری سے مسرور ہے اور ان کا خیر مقدم کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں سلطنت ایران کے کونسل جنرل ہز ایکسیلنسی معتمدی صاحب کا تعارف بھی ضروری سمجھتا ہوں جو از راہ علم دوستی یہاں تشریف لائے ہیں۔

میرے مضمون کا عنوان "حسینی برہمن" ہے جس میں ہندستانی برہمنوں کی ایک مشہور شاخ کا ذکر ہے۔ یہ برہمن ہندستان کے کئی صوبوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ وہ سب پکے ہندو ہوتے ہیں۔ اور ان کے رسم و رواج اور عقائد بھی ہندوؤں جیسے ہوتے ہیں۔ لیکن وہ حضرت امام حسینؑ سے بہت عقیدہ رکھتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ ان کے مورث اعلیٰ کربلا کی لڑائی کے وقت حضرت امام حسینؑ کے ساتھ تھے اور برہمن مذکور نے حضرت امام حسینؑ سے درخواست کی تھی کہ وہ ان کے ساتھ ہندستان تشریف لے چلیں۔ اور حضرت امام حسینؑ نے اسکو قبول بھی کر لیا تھا چنانچہ جب حضرت امام حسینؑ نے کوفے کے حاکم عبید اللہ ابن زیاد کے پاس صلح کی شرطیں بھیجیں تو ان شرطوں میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ مجھے ہندستان جانے کی اجازت دی جائے کیونکہ مجھے ہندستان کی طرف سے محبت کی خوشبو آتی ہے۔

بعض حسینی برہمنوں کا بیان ہے کہ ان کے مذکورہ مورث ہندستان میں واپس آگئے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ حضرت امام حسینؑ کے ساتھ شہید ہو گئے تھے۔

حسینی برہمنوں کا یہ بیان بھی قابل غور ہے کہ سری کرشن جی نے واقعہ کربلا کی پہلے سے خبر دیدی تھی جو سری مدبھاگوت میں موجود ہے۔ اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اٹھارہ پرانوں میں آخری پران کلنکی پران ہے جس میں کلجگ کا ذکر ہے اور کلجگ کے اوتار کا حال بھی ہے۔ اور کلجگ اوتار کے ایک نواسے کا ذکر ہے جن کو ظلم و ستم سے قتل کیا جائے گا۔

کلنکی پران کے اردو ترجمے مطبوعہ میرٹھ کو میں نے دیکھا تو ایک حد تک حسینی برہمنوں کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ کلنکی پران میں لکھا ہے کہ کلجگ کا اوتار شمبل دیپ میں جنم لے گا شمبل دیپ کی نسبت ہندوؤں کا خیال ہے کہ وہ سمبھل مراد آباد ہے۔ مگر انگریز پروفیسر میکس مولر نے وید کا انگریزی ترجمہ کرتے وقت لکھا ہے کہ شمبل دیپ سے مراد ملک عرب ہے۔ کیونکہ شمبل نرم اور ریتیلی زمین کو کہتے ہیں۔ سمبھل مراد آباد کی زمین عرب کی طرح نرم اور ریتیلی نہیں ہے۔

کلنکی پران میں اسی کے بعد یہ بیان بھی ہے کہ کلجگ کا اوتار برہمن خاندان میں جنم لیگا اور چونکہ محمد رسول اللہ صلعم کی پیدائش قبیلہ قریش میں ہوئی تھی اور قبیلہ قریش کی عرب کے دوسرے قبائل میں وہی عزت تھی جو ہندستان کے برہمنوں کی دوسری ذاتوں میں ہے۔ اس واسطے یہ بات قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ کرشن جی نے کلجگ کا اوتار محمد رسول اللہ صلعم ہی کو کہا ہوگا۔ تیسری بات کلنکی پران میں کلنکی اوتار کے سلسلے میں یہ پائی جاتی ہے کہ کلجگ کے اوتار کے باپ کا نام وشنوداس ہوگا۔ وشنو سنسکرت میں خدا کو کہتے ہیں اور داس غلام اور بندے کو کہتے ہیں۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ پیشین گوئی سے مراد محمد رسول اللہ صلعم تھے۔ کیونکہ ان کے والد کا نام عبد اللہ تھا۔ کلنکی پران میں یہ بھی لکھا ہے کہ کلجگ کے اوتار کی ماں کا نام سومتی ہوگا یعنی سچ بولنے والی اور اللہ کی مرضی پہ صبر کرنے والی۔ اور رسول اللہ کی والدہ کا نام آمنہ تھا جس کے لفظی معنی امانت دار اور راست باز عورت کے ہیں۔

کلنکی پران میں یہ بھی لکھا ہے کہ کلجگ کا اوتار پہاڑ کی کھوہ میں تپسیا کریگا اور وہاں پرسرام آئنگے اور اوتار کو سبق پڑھائنگے۔ چنانچہ آنحضرتؐ نبوت سے پہلے غار حرا میں عبادت کرنے جایا کرتے تھے اور اسی غار کے اندر سب سے پہلے جبرئیل وحی لیکر آئے تھے اور قرآن شریف کی پہلی آیت ایسے الفاظ کی تھی جن سے سبق پڑھانے کے الفاظ کی تصدیق ہوتی ہے کیونکہ خدا نے فرمایا تھا "اقرا باسم ربک الذی خلق" اپنے اس رب کا نام لیکر پڑھ جس نے دنیا کو پیدا کیا۔

نومبر ۱۹۴۴ء کے "ہمدرد صحت" کے چند مضامین

کلکی پُران میں اس کے بعد یہ عبارت ہے کہ کلجگ کے اوتار پر اس کے گھر والے اور شہر والے دُکھ دینگے اور وہ اپنا گھر اور شہر چھوڑ کر شمالی پہاڑوں میں چلا جائیگا۔ چنانچہ آنحضرت کے ساتھ بھی یہی ہوا کہ جب ان کے خاندان والوں نے اُن کو ستایا اور جان لینے پر آمادہ ہو گئے تو رسول اللہ مکہ چھوڑ کر مدینے میں چلے گئے اور مدینہ مکے کے شمالی پہاڑوں میں ہے۔

کلکی پُران میں اس کے بعد یہ عبارت ہے کہ کلجگ کے اوتار کے چار بھائی ہونگے جو ساری دُنیا پر قبضہ کر لینگے اور اس کے بعد ہی یہ عبارت ہے کہ کلجگ کے اوتار کی بیوی بہت سُرخ و سفید رنگ کی ہوگی۔ جس سے غالباً حضرت عائشہ مُراد ہیں جن کا رنگ بہت سرخ و سفید تھا۔ اس کے بعد کلنکی پران میں لکھا ہے کہ کلجگ کے اوتار کو اپنی بیٹی اور اپنے داماد سے اور اُن کے بچوں سے بہت زیادہ محبت ہوگی۔ اور کلنکی اوتار کے ایک نواسے کو بہتے پانی کے کنارے گرم ریت پر ذبح کیا جائیگا۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ کلنکی اوتار کے نواسے کے خون سے ایک جوت پرگٹ ہوگی جس سے سارا سنسار چمک اٹھیگا۔ حسینی برہمنوں کے بزرگوں کے بیان کی تحقیقات میں نے اچھی طرح کی اور کلنکی پران کو بھی دیکھا۔ اور ایک حد تک سب باتیں کتاب مذکور میں پائی گئیں۔

حسینی برہمن آخری زمانہ کے وید اتھروید کی بابت بھی کہتے ہیں کہ اس میں بھی ایک شرتی کلنکی اوتار اور ان کے نواسے حضرت امام حسین کی نسبت موجود ہے۔ جس کے الفاظ یہ ہیں " الو پنڈت پرار بہیا اسملا گہم لتے متر و مہا سور نارد الو رسول مہامدد "

کلجگ کا اوتار الو کا اپدیش دیگا اور رب رب کہے گا۔ اسمل اسمل پڑھے گا۔ وہ بڑا خوبصورت ہوگا۔ اور اس کا نام مہا مدد ہوگا وغیرہ۔

حسینی برہمن اس کے علاوہ بھی بہت کچھ بیان کرتے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ امام حسینؑ کے والد حضرت علی اوم مورتی تھے۔ یعنی آن کے وجود میں اوم جی نے ظہور کیا تھا۔

ہز ہائینس سر آغا خاں کے لاکھوں ہندو مُرید بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کوفی خط میں لفظ "علی" لکھا جائے اور سنسکرت خط میں اوم لکھا جائے تو دونوں کی شکل ایک ہوگی۔ چنانچہ ہز ہائینس سر آغا خاں کے لاکھوں ہندو مرید اپنے سینوں پر ایک لاکٹ لٹکاتے ہیں جس میں علیؑ کا نام اوم کی شکل میں لکھا ہوتا ہے۔

ہز ہائینس سر آغا خاں کے داعی ان ہندو مُریدوں کے سامنے عجیب و غریب تقریریں کرتے ہیں۔ میں بھی ایک بڑے جلسے میں شریک ہوا تھا جسکے شروع میں بدخشاں کے رہنے والے ایک داعی نے کہا کہ حضرت مولانا روم نے اپنی مثنوی بشنو کے نام سے شروع کی ہے۔ دوسرے مُسلمان مُصنفوں کی طرح اللہ کے نام سے شروع نہیں کی چنانچہ مثنوی کا پہلا شعر یہ ہے ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند
در جدائی ہا شکایت می کند

اس کے بعد داعی نے کہا حضرت علیؑ کی صورت میں اوم جی نے ظہور کیا تھا۔ اور قرآن شریف میں بھی خدا نے فرمایا ہے کہ اوم حضرت علیؑ ہیں۔ اس کے بعد داعی نے قرآن مجید کے پچیسویں پارے کے سورہ زخرف کی یہ آیت پڑھی : —

و انہ فی ام الکتاب لدینا لعلیٌّ حکیم۔

داعی نے ام الکتاب کا تلفظ اوم الکتاب کیا تھا۔ اور اس کا ترجمہ ہندوؤں کو یہ سنایا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یقیناً ہمارے نزدیک اوم ایک نوشتہ ہے اور وہ نوشتہ علیؑ ہے حکمت والا۔

مُسلمان لوگ اس آیت کا ترجمہ یوں کرتے ہیں۔ اور یقیناً یہ قرآن اللہ کے نزدیک لوح محفوظ میں ہے جو بلند اور حکمت والا ہے۔

مجھے یہاں مسلمانوں اور آغا خانیوں اور حسینی برہمنوں کے عقائد کی نسبت بحث نہیں کرنی ہے۔ میں تو صرف یہ بیان کرنا چاہتا ہوں کہ حسینی برہمن ہی ایسے نہیں ہیں جو حضرت علیؑ اور حضرت امام حسینؑ سے محبت رکھتے ہیں بلکہ اور بھی لاکھوں کروڑوں ہندو مختلف صورتوں سے حضرت علیؑ اور حضرت امام حسینؑ کو مانتے ہیں۔

ہز ہائینس سر آغا خاں کے لاکھوں ہندو مُریدوں کے علاوہ ایک اور ہندو فرقہ سُت پنتھی صوبہ بمبئی میں پایا جاتا ہے جس کی تعداد بیس لاکھ ہے۔ اس فرقے کا مرکز احمد آباد گجرات کے قریب ایک مقام ہے جس کو پیرانہ کہتے ہیں۔ جہاں اس فرقے کے بانی پیر سید امام الدین صاحب کا مزار بھی ہے۔ اس مزار پر تین سو برس سے رات دن چراغ روشن رہتا ہے۔ اور اس چراغ کو "علی کی جاگتی جوت" کہتے ہیں۔ پیر صاحب کے مزار کے قریب جنیو کی درگاہ بھی ہے۔ جو ہندو پیر کی درگاہ میں مومن بنکر آتے ہیں وہ اپنا جنیو اس درگاہ میں چڑھا دیتے ہیں۔ اس فرقے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک فرقہ گپتی یعنی خفیہ کہلاتا ہے۔ ان کی صورت شکل اور نام اور کام سب ہندوانہ ہیں اور وہ خفیہ طور سے علیؑ علیؑ جپا کرتے ہیں۔ اور پیر امام الدین کی درگاہ میں جاگتی جوت کے درشن کے لئے جاتے ہیں اور اپنی آمدنی کا دسواں حصہ اس درگاہ میں دیتے ہیں ان کی تعداد پندرہ لاکھ ہے۔ دوسری جماعت کو پرگھٹی کہتے ہیں جس کے لفظی معنی ظاہر کے ہیں۔ یعنی وہ ظاہری طور سے شیعہ ہوگئے ہیں اور ان کو مومن کا لقب مل گیا ہے۔ یہ بھی اپنی آمدنی کا دسواں حصہ پیرانہ درگاہ میں دیتے ہیں۔ اور نماز پڑھتے ہیں۔ روزہ رکھتے ہیں۔ اسلامی نام رکھتے ہیں۔ ان کے نام غلام حسین۔ غلام علی غلام حیدر وغیرہ ہوتے ہیں۔ اور عورتوں کے نام کلثوم بائی۔ فاطمہ بائی۔ رقیہ بائی۔ زینب بائی رکھے جاتے ہیں۔

ایک جماعت کا مرکز ریاست پالن پور میں ہے۔ اس کے بانی پیر مشائخ نام کے ایک بزرگ تھے اس جماعت کے آدھے پیرو شیعہ ہیں اور آدھے سنّی ہیں اور یہ جماعت بھی حضرت امام حسین کی محبت کی کشش سے اسلام میں داخل ہوئی ہے۔

سندھ اور صوبہ بمبئی میں ایک اور بڑی جماعت معراج پنتھی ہے اور یہ اپنے آپ کو پری نام پنت والا بھی کہتے ہیں۔ پیرانہ پنت میں بھی ایک کتاب ست دینی کے نام سے مانی جاتی ہے۔ اور معراج پنتھی بھی ایک کتاب کو مانتے ہیں جس کا نام قلزم شریف ہے۔ میں نے اس کتاب کی زیارت کاٹھیاواڑ میں کی تھی۔ یہ گجراتی حروف میں تھی۔ اور اس میں مثنوی شریف اور دیوان حافظ اور قرآن مجید اور احادیث رسول کے اقتباسات ہیں۔ یہ فرقہ آنحضرت کی معراج کو مانتا ہے اور آنیوالے امام مہدی کا بہت معتقد ہے۔ اس کا بیان ہے کہ سید حا اور سچا مذہب اسی فرقے کا ہے۔ ان لوگوں کے مندر جن کو یہ دھام کہتے ہیں۔ ننگر ٹھٹہ سندھ میں ہیں اور ریاست جام نگر کاٹھیاواڑ میں بہت بڑا دھام ہے۔ مگر میں نے راجکوٹ کاٹھیاواڑ کا دھام دیکھا تھا جہاں قلزم شریف کی زیارت کی تھی۔

آخر میں یہ کہنا بھی ضروری ہے کہ گوالیار اور بڑودہ اور اور وغیرہ بہت سی ہندو ریاستوں میں ہندو رئیسوں کی طرف سے لاکھوں روپیہ محرم کے زمانے میں خرچ کیا جاتا ہے۔ تعزیے بنوائے جاتے ہیں۔ نیازیں ہوتی ہیں۔ لاکھوں غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔

حسینی نورِ لم اسی سلسلے میں یہ بیان بھی ضروری ہے کہ سنٹرل انڈیا کی مشہور اسلامی ریاست جاورے میں "حسین ٹیکری" نام کی ایک پہاڑی پر روزانہ حسینی نور نظر آتا ہے۔ بے شمار ہندو، پارسی مسلمان، عیسائی یہ نور دیکھنے وہاں جاتے ہیں۔ جاورے کے سُنّی رئیس کی طرف سے زائرین کے لئے بہت سے مکان بنوا دیئے گئے ہیں۔ ہز ہائینس نواب صاحب رام پور اور ان کی بیگم صاحبہ بھی اس نور کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے تھے اور انہوں نے بھی اس پہاڑی پر اپنی طرف سے ایک بڑا مکان بنانے کا حکم دیا ہے۔ خود میں نے بھی کئی بار جاورے میں جا کر اس نور کی زیارت کی ہے۔ اور اپنے دوست نواب صاحب جاورہ سے ایک مکان بنانے کے لئے زمین مانگی ہے۔

نئے زمانے کے سائنس داں انگریز اور ہندوستانی جوق درجوق وہاں جاتے ہیں اور اس روشنی کی تحقیقات کرتے ہیں۔ مگر آج تک اس کی حقیقت اور وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے اس روشنی کو دیکھا تو پہلے ایک چراغ نظر آیا اور وہ چراغ زمین سے آسمان کی طرف اونچا ہوا۔ اور یکایک اس چراغ کے آس پاس بے شمار چراغ حرکت کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ اہل سائنس کا خیال ہے کہ اس زمین کے اندر کسی ایسی چیز کی کان ہے جس سے شعاعیں نکلتی ہیں۔

کچھ بھی ہو۔ مگر یہ بات مانی ہوئی ہے کہ حسینی برہمنوں کا فرقہ بے عقل کے سبب یا کسی دھوکے اور فریب سے متاثر ہو کر حسینی نہیں بنا ہے۔ بلکہ حضرت امام حسین کی کرامتوں کو دیکھکر اس نے یہ عقائد قبول کئے ہیں۔

یارِ اغیار

(از مولانا حسرت موہانی)

آشنا جب سے وہ بدخو وہ ستمگار ہوا ——— فتنہ بیدار ہوا

جان دِل سے ہوئی دل جان سے بیزار ہوا ——— صبر دُشوار ہوا

اب نہ دُنیا کی تمنا ہے نہ عقبیٰ کی ہوس ——— اک ترا شوق ہی بس

دِل جو اے جانِ جہاں تیرا طلبگار ہوا ——— سب سے بیزار ہوا

دِل کو حاصل ہوئی انکارِ دو عالم سے نجات ——— بن گئی خوب یہ بات

چھوٹ کر سب سے تری قید کا اِقرار ہوا ——— اور یہ اصرار ہوا

بے وفائی کا جو خطرہ تھا وہ پیش آ کے رہا ——— تجھ سے اے محوِ جفا

لُطف کا شکوہ غم پھر بھی نہ اظہار ہوا ——— صاف اِنکار ہوا

ہم نے حسرت کی سفارش تو بہت کی تھی مگر ——— نہ ہوا کچھ بھی اثر

پہلے بیگانہ جو تھا اب وہ دِل آزار ہوا ——— یارِ اغیار ہوا

ٹیگور کی شاعری

(از جناب بلونت سنگھ صاحب گجراتی بی، اے)

ٹیگور پر بہت کچھ لکھا جاچکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا۔ اُس کی تصانیف کا درجہ نہایت بلند ہے۔ وہ بنگالی زبان کا شاعر ہے۔ میں اس زبان سے ناواقف ہوں۔ ٹیگور کے متعلق میری تمام تر معلومات اس کی تصانیف کے انگریزی ترجموں کی مرہون منت ہیں۔ مجھے ان تراجم کو دیکھکر حیرت ہوتی ہے کہ بنگالی زبان کس قدر شیریں، دل آویز، وسیع اور بیکراں ہے جو ایسے عظیم الشان خیالات وجذبات کی متحمل ہو سکتی ہے۔

ٹیگور کا دورِ حیات ۱۸۶۱ء میں شروع ہوا اور ۱۹۴۱ء میں ختم ہوگیا۔ مگر اس کا نام دنیا کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ کے لئے زندہ رہے گا۔ وہ مہرشی دیوندر ناتھ ٹیگور کے سات بیٹوں میں سے سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ اس کا خاندان ایک برہمن خاندان ہے جو عرف عام میں ٹیگور مشہور ہے۔ ٹیگور دراصل لفظ "ٹھاکر" کی ایک بگڑی ہوئی شکل ہے۔ بنگال میں رابندر ناتھ ٹیگور کو رابندر ناتھ "ٹھاکر" ہی لکھتے ہیں۔ رابندر ناتھ کے معنی "رب خورشید" کے ہیں۔

ٹیگور کو بچپن میں سکول کے علاوہ گھر پر بھی اُستاد بغرض تعلیم دیکھا تی رہی۔ لیکن پڑھنے لکھنے میں اس کا جی زیادہ نہیں لگتا تھا۔ جب بھی موقع ملتا وہ پڑھنا لکھنا چھوڑ کر چپکے سے باہر نکل جاتا اور قدرتی مناظر کی سیر میں محو ہو جاتا۔ اسے شہری ہنگاموں سے زیادہ جنگلوں کی خاموشی پسند تھی۔ شانتی نکیتن کی پُرسکون فضا جس کو اُس کے باپ نے یادِ خدا کے لئے کُنج تنہائی بنایا تھا۔ اس کے لئے عجیب کشش رکھتی تھی۔ وہ اپنے باپ کے ہمراہ کئی بار ہمالیہ کی سیر کو بھی گیا جہاں اُس نے حُسنِ قدرت اپنی تمام رعنائیوں اور زیبائیوں کے ساتھ جلوہ گر دیکھا۔ ان خوبصورت مناظر کی کیفیات کا اُس پر گہرا اثر پڑا۔ چنانچہ یہ اثر اس کی تمام شاعری میں نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے۔

دورِ حیات کے پچیسویں سال میں ٹیگور ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کا قد لمبا اور اُس کے چہرے کے نقش ونگار اور بھی دلکش نظر آتے تھے۔ اسکی آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی، اور بال لمبے اور گھنگریالے تھے۔ وہ ہمیشہ نفیس اور جاذب نظر لباس پہنتا اور کلکتہ کی ہر لٹریری مجلس میں امتیازی شان کا مالک تصور کیا جاتا۔ اس زمانے میں اس کی شاعری نے نمایاں ترقی کی۔ عاشقانہ جذبات میں بالیدگی آئی۔ عورت ——— ایسی عورت جس کے چہرے میں آسمانی انوار کی جلوہ آرائیاں ہوں، جس کے دل میں شفقِ صبح کی رعنائیاں ہوں ——— اُس کے تصور کو آئینہ خانہ بنانے لگی۔ اُس کا تخیل ایک متلاطم سمندر تھا جسکی ہر موج ایک شعر تر تھی۔ دُنیا اس کی نگاہوں میں ایک عشرت کدہ تھی۔ زندگی کا مقصد محض سعیٔ عیش ومسرت تھا۔ اس زمانے کی ایک نظم بعنوان "زندگی" اس راز کے چہرے سے نقاب کشائی کرتی ہے۔ جس میں ٹیگور کہتا ہے :-

"میں اس حسین دُنیا میں مرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ انسانوں کے درمیان زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے سُورج کی روشنی میں، پھولوں سے بھرے ہوئے باغ میں اور زندگی سے معمور دلوں میں اپنے لئے جگہ پیدا کرنے دو۔ نوعِ انسان کے خوشیوں اور غموں کے نغمات سے مجھے ایک غیر فانی گھر بنانے دو۔ اپنے توڑنے کے لئے صبح وشام مجھے نئے نغموں کے پھول اُگانے دو۔ تو میرے پھولوں کو ہنستے ہوئے چہرے سے قبول کر۔ اگر وہ مُرجھا جائیں تو انہیں پھینک دے۔"

۱۸۹۰ء کے بعد ٹیگور کی شاعری میں حُسنِ نسوانی کیلئے وہ بے خودانہ پرستاری نہ رہی جو اس سے پیشتر تھی۔ اب اس میں کچھ تلخی سی آگئی۔ وہ دنیا کو ایک تاریک زندان خانہ تصور کرنے لگا۔ جس میں ہر گھڑی اُسے روشنی اور رہائی کی جستجو رہتی تھی۔ زندگی اُس کے نزدیک ایک گرانبار زنجیر تھی جس کو اُتار پھینکنے کے لئے وہ ہر لمحہ بیتاب تھا۔ چنانچہ ایک نظم بعنوان "سرکش اُمید" کے خاتمے میں وہ لکھتا ہے:-

"کاش میں کہیں بھاگ سکتا، پھر میں کس قدر خوش رہتا۔
اس پابند زندگی میں تو مجھے کوئی آرام نہیں۔"

ایک اور نظم "زندگی کی دوپہر" میں یوں رقم طراز ہے :-

"جوانی میں زندگی میرے لئے سہل تھی، میں ہر نئی صبح زندگی کی دوڑ کو ایک کھیل سمجھ کر شروع کرتا۔ اُس وقت میرے آنسوؤں میں گرمی اور میرے ہنسنے میں تمسخر نہ تھا۔ میری پیشانی مصیبت کے شکنوں سے بالکل خالی تھی اور سکون اور خوشی سے چمکتی تھی، اس کے بعد راستہ ٹیڑھا ہونا شروع ہوا۔ زندگی میں اختلال پیدا ہوا۔ اور اس کا بوجھ زیادہ ہوگیا، آج میں فطرت کی خموشی سے نکلتی ہوئی تسکین کی ابدی ندی سے اپنی پیاس بجھاتا ہوں۔"

لیکن عورت کا حُسن ٹیگور کے دل کو اب بھی کبھی کبھی روشن کرتا ہے دُنیا اپنی مُصیبتوں، کلفتوں اور تاریکیوں کے باوجود اب بھی بعض اوقات جاذب توجہ بن جاتی ہے۔ یہ صرف اسی لئے ہے کہ اس میں عورت کا حُسن موجود ہے۔ عورت کے حُسن نے دُنیا کی ہر چیز کو خوبصورت بنا دیا ہے۔ وہ خدا ہی کی نہیں بلکہ انسانی دل کی بھی صنعت گری ہے۔ ٹیگور اپنی ایک نظم میں کہتا ہے :-

"اے عورت تو صرف خدا ہی کی نہیں بلکہ انسانوں کی بھی صنعت
گری ہے، جو اپنے دلوں سے تیرے حُسن کی آرائش کرتے
رہتے ہیں۔ شاعر تیرے لئے سُنہری تخیل کے تاروں سے جال
بُنتے ہیں۔ مُصوّر تیری صورت کو ہمیشہ نئی ابدیت دیتے ہیں
سمندر اپنے موتی، کانیں اپنا سونا اور بہار چمنستان اپنے
پھول تیری زینت و آرائش کیلئے پیش کرتے ہیں۔ انسانی
دل کا جمال آرزو تیرے شباب کے لئے ہدیہ نیاز بنتا ہے۔
تو آدھی عورت ہے اور آدھا خواب۔"

۱۹۰۹ء تک ٹیگور کی شاعری معراج کمال تک جا پہنچی۔ اُس کے ساز سے اور بھی جاں پرور نغمے نکلنے لگے۔ اُس کی توجہ دُنیا کی ظاہری آب و تاب سے ہٹتی گئی۔ وہ عالم باطن کی سیر میں مشغول ہوا۔ اُس نے دل کی پُراسرار دُنیا کو دیکھا، اُس پر خدا، کائنات اور انسان کے باہمی تعلق کی نسبت گوناگوں حقائق منکشف ہونے لگے۔ اس سے پیشتر وہ جو کبھی کبھی اس کے ابتدائی کلام میں خدا کے خلاف بغاوت کا عنصر آجاتا تھا، اب اس کی جگہ محکم یقین پیدا ہوگیا۔ خدا سے والہانہ محبت اُس کی طبیعت پر ایک غیر فانی سرور بنکر طاری ہونے لگی۔ اس عالم کیف و مستی میں شاعر نے جو نغمات گائے، اُن کا مجموعہ "گیتا نجلی" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نغمات اگرچہ مقامی رنگ سے خالی نہیں، تاہم اپنی اثر آفرینی اور وجد انگیزی میں ہمہ گیر ہیں۔ شاعرانہ آرٹ کے پیش نظر بھی "گیتا نجلی" کے نغمے مکمل ترین شاہکار ہیں۔ زبان کی دل آویزی اور شیرینی انتہا تک پہنچ گئی ہے۔ شاعر نے اپنے پیغام کا اظہار ایک غیر معمولی طور پر دل پذیر پیرائے میں کیا ہے۔ اس کا شعر سحر اور انداز اعجاز ہے۔ عالم جذب و مستی میں اُس پر یہ حقیقت کھلتی ہے کہ انسان کا غم بھی ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ ہے، جس کا مالک انسان خود ہے۔ لیکن شہرت اور ثروت خدائی عطیہ ہیں۔ شاعر انتہائی عقیدت کا ثبوت دیتے ہوئے خدا کے حضور میں آنسوؤں کا ہار بطور تحفہ پیش کرتا ہے اور کہتا ہے :-

"جب صبح کی نسیم چلے، اور تیری آواز سُنہری بانسری میں
گونجے، تو اے شاہِ اعظم! مجھے بھی اپنی نوا ریزی میں
شریک ہونے دے۔"

ٹیگور کا خدا ہر جگہ موجود ہے، وہ معبدوں کی خاموش فضا ہی میں نہیں بلکہ عام مشقت گاہوں کی ہنگامہ آرائی میں بھی ہے۔ وہ ایک ایسے انسان سے جو خدا کو کسی مندر کے تنہا گوشے یا کسی ویرانے کی خاموشی میں ڈھونڈتا ہے یوں مخاطب ہوتا ہے:-

"یہ بھجن گانا اور مالا جپنا چھوڑ دے، تو مندر کے تنہا اور تیرہ و
تار گوشے میں تمام دروازے بند کر کے کسے تلاش کر رہا ہے،
اپنی آنکھیں کھول اور دیکھ، کیا تیرا خدا تیرے سامنے نہیں؟
خدا وہاں ہے، جہاں ہل چلانے والا کسان سخت زمین پر
ہل چلا رہا ہے، جہاں سڑک بنانے والا پتھر کوٹ رہا ہے،
وہ دھوپ اور بارش میں اُن کے ساتھ ہے، اور اس کا
لباس گرد آلود ہے۔ تو اپنا یہ مقدس چغہ اتار دے۔ اور
اس کی طرح گرد آلود زمین پر آ۔
آزادی؟ — یہ آزادی کہاں مل سکتی ہے۔ ہمارے مالک
نے خود اپنی ذات پر آفرینش کی قید عاید کر رکھی ہے، وہ ہمیشہ
کے لئے ہم سب سے بندھا ہوا ہے۔ تو اپنی محویتوں سے باہر
نکل، اور خوشبو اور پھولوں کو چھوڑ دے۔ اگر تیرے کپڑے
بوسیدہ اور داغدار ہو جائیں تو کیا حرج ہے۔ تو اپنی پیشانی
پر پسینہ لئے ہوئے اُس سے مل، اور اُس کے ساتھ کھڑا ہو۔"

ٹیگور پر مشہور و معروف مجذوب صوفی بھگت کبیر کا نمایاں اثر پڑا ہے۔ چنانچہ مندرجہ بالا نظم کو پیش نظر رکھتے ہوئے کبیر کے یہ اشعار پڑھئے :-

"میرے بندے تو مجھے کہاں ڈھونڈ رہا ہے۔ دیکھ میں تیرے
پاس ہی کھڑا ہوں، میں نہ مندر میں ہوں، نہ مسجد میں، نہ
کعبے میں ہوں نہ کلیسا میں، نہ شاندار جشنوں میں اور نہ زاہدانہ
ایثار میں، اگر تو حقیقی طور پر میرا طالب ہے، تو تو مجھے جلد
ہی پالے گا۔ ایک وقت آئیگا جب ہم ایک دوسرے سے
مل جائیں گے۔ کبیر کہتا ہے اے یاترا کو جانے والے! خدا
ہر سانس میں موجود ہے۔"

ٹیگور کی نظروں میں موت بھیانک نہیں۔ وہ اسے "تکمیل حیات" اور "عروس حیات" جیسے ناموں سے یاد کرتا ہے۔ اس کو خدا کا قاصد سمجھتے ہوئے اسکا استقبال نہایت خندہ جبینی سے کرتا ہے اور ایک دوست کی طرح اُس سے بے تکلفانہ انداز

لام ہوتا ہے اور" بار اسکے حضور میں اپنی قیمتی زندگی کو بطور تحفہ یہ پیش
ہے :-

"جس دن مو ترے دروازے پر دستک دیگی ۔ تو تو اُسے
کیا چیز پیش کرے گا ۔ میں اپنے مہمان کے سامنے زندگی کا لبریز
ظرف رکھدوں گا ۔ میں اُسے خالی ہاتھ بالکل نہیں جانے دونگا
جب موت میرے دروازے پر دستک دیگی تو میں اپنی زندگی
کے خاتمے پر ایام خزاں اور جلوہ ہائے بہار کی شادابی
اور اپنی مصروف زندگی کا تمام حاصل اسکے سامنے رکھدوں گا ۔"

"اگر دن ختم ہو گیا ہے ۔ اگر پرندوں نے چہکنا بند کردیا ہے ۔
اگر ہوا تھک کر سو گئی ہے ، تو مجھ پر گہری تاریکی کا پردہ ڈال
دے ، بالکل اسی طرح جس طرح تو نے زمین کو نیند کے غلاف
میں لپیٹ رکھا ہے ۔ اور شام کے وقت کنول کی پتیوں کو
آہستہ سے بند کر دیا ہے ۔ جس مسافر کا زادِ راہ کا تھیلا سفر ختم
ہونے سے پیشتر ہی خالی ہو گیا ہو ۔ جس کا لباس پھٹا ہوا اور
غبار آلودہ ہو ، جس کی طاقت ختم ہو چکی ہو تو اس مسافر سے
شرم اور ناداری دور کر ، اور اپنی مہربان رات کے پردے
میں اُسکی زندگی پھول کی طرح تر و تازہ کر دے ۔"

جہاں تک موت کو خوش آمدید کہنے ، اُسے باعث آرام ٹھیرانے اور
سکون کا قاصد گرداننے کا تعلق ہے ۔ ٹیگور بعض مغربی شاعروں سے بہت قریب
ہے ۔ شاعر فطرت ورڈز ورتھ موت کو "پُرسکون زندگی کا خاموش انجام" بتاتا ہے
جو ٹیگور کو آغاز شباب میں بہت پسند تھا ، موت کے خوف سے لرزاں نہیں
وہ موت کو "خوفناکی اور تاریکی کا دروازہ" کہکر بھی اُسے ایک ایسے غیر فانی
سے تعبیر کرتا ہے جو دنیا کو نئی زندگی بخشنے کا کفیل ہے ۔ چیکوسلوویکیہ کے
برزنا کے نزدیک موت "ایک سحر کا سرور ، لبوں کا ایک شیریں بوسہ ، اور
دن کی سنہری بارش میں غسل کرنے کا نام ہے ۔ ایک اور شاعر وکٹر ڈائک لکھتا ہے :-

"میں تجھ سے کہتا ہوں موت کوئی چیز نہیں ۔ بلکہ اس پردے میں
ایک نہ رکنے والی بالیدگی ہے ۔ وہ بالیدگی جو رنج و غم پر غالب
آتی ہے ۔ دنیا کے ایک کونے سے لیکر دوسرے کونے تک بیشمار
سرگوشیاں سانس لے رہی ہیں ۔ تو اپنی زندگی کے لئے اور
آنے والی مہمات کے لئے سامان جمع کر ۔ تو ایک کڑی ہے اس

تسلسل کی جو کبھی ختم ہوا ہے ، نہ کبھی ختم ہوگا ۔ تجھ پر شام محیط ہوتی
ہے لیکن کسی اور جگہ نئی صبح نمودار ہو رہی ہے ۔ اور اس
نئی صبح کے لئے تیری رات بھی روشن ہے ۔"

۱۹۱۴ء میں ٹیگور نے "گیتا مالیہ" (نغموں کی مالا) کے نام سے ایک
کتاب شائع کی ۔ اس مجموعہ کی نظمیں اپنی سادگی ، شگفتگی اور سحر انگیزی کے لحاظ سے
"گیتانجلی" کی نظموں سے بہت مشابہ ہیں ۔ اب ٹیگور کے نزدیک انسان کی قدر و قیمت
اس دنیا میں بہت بڑھ گئی ہے ۔ اس کی تمنا ہے کہ وہ اس دنیا میں اتنا اہم بن
جائے جس قدر تماشاگاہ عالم میں صبح کو طلوع ہونے والا آفتاب یا رات کو تابناک
بنانے والے انجم و ماہتاب ہیں ۔ اب وہ اس حقیقت سے آگاہ ہو رہا ہے کہ اس کا
دل ایک لازوال حسن کا آئینہ خانہ ہے ۔ وہ محبت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے
اگر ایسا نہ ہوتا تو خدا صبح کی فضا کو نغموں سے معمور کیوں کرتا ۔؟ ستاروں سے بھرا
ہوا آسمان اور پھولوں سے رنگین ساحل وجود پذیر کیوں ہوتے ؟ اور جنوب
سے آنے والی ہوا کان میں چپکے چپکے شیریں پیغام کیوں کہتی ؟

"تو میرے نغمات کے ساحل پر کھڑا ہے ۔ میری راگنی تیرے
قدموں تک پہنچتی ہے ۔ لیکن میں وہاں تک نہیں پہنچ سکتا ۔
خوشگوار ہوا چل رہی ہے اب تو زیادہ دیر کے لئے کشتی کو
باندھے نہ رکھ ۔ آ ۔ میرے دل میں آ ۔ یہ نغموں کے
ذریعہ میرا تیرے ساتھ کھیل محض دور کا کھیل ہے ۔ میری
بانسری سے ہمیشہ ماتمی صدا بلند ہوتی رہتی ہے ۔ آ ۔
میری یہ بانسری لے لے ۔ اور اس خاموش اور سرور انگیز
رات میں اسے خود بجا ۔"

ایک نظم میں ٹیگور فخریہ انداز میں خدا سے یوں مخاطب ہوتا ہے :-

"تو نے پرندوں کو گانا بخشا ہے ۔ اس لئے وہ گاتے ہیں لیکن
وہ تجھے کچھ نہیں دے سکتے ۔ تو نے مجھے گویائی بخشی لیکن میں
تیرے گیت بھی گا سکتا ہوں ۔"

ٹیگور کے غیر فانی شاہکاروں میں ایک نظم "حیات" کے عنوان سے ہے
اس میں وہ آسمان سے زیادہ خاکدان سے پیار کرتا ہے ۔ کیونکہ اس کی زندگی
یہیں بسر ہوئی ۔ وہ ایک مقصد کی تکمیل کے لئے کوشاں ہے ۔ اس مقصد کی تکمیل
کے لئے جس کی خاطر خدا کی طاقت پُراسرار طور سے ہر لمحہ سرگرم عمل ہے ۔ اُسے
کسی آسمان کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ۔ آسمان خود اس کی ذات میں
تکمیل پذیر ہو رہا ہے :-

"کیا تجھے معلوم ہے کہ آسمان کہاں ہے؟ اس کی کوئی حدود نہیں، اس کی نہ کوئی ابتدا ہے، نہ انتہا، نہ اس کی صبح ہے اور نہ شام۔

میں آج آسمان کی فضا میں ایک غریب یاتری کی طرح پھر تا رہا صدیوں بعد میں خاکی جسم لیکر اور اس دُنیا کا بیٹا بنکر پیدا ہوا، آج میرے جسم، میری محبت، میرے دل کے اضطراب، میرے خوف، میری سعی و کوشش اور میرے عیش و غم میں آسمان موجود ہے۔ آسمان میری زندگی اور موت کی لہروں پر ہر لمحہ بدلتے ہوئے رنگوں کی صورت میں چمک رہا ہے۔ آج وہ میرے نغموں کا مطرب ہے اور میری زندگی میں تکمیل پذیر ہو رہا ہے"۔

ٹیگور کے والد مہرشی دیوندر ناتھ نے شہر کلکتہ کی شورشوں سے دور، جو پرسکون اور خاموش جگہ گیان دھیان کے لئے انتخاب کی تھی، وہاں ٹیگور نے مشہور و معروف "شانتی نکیتن" نامی درسگاہ کی بنیاد ڈالی۔ جو بعد میں ترقی کر کے یونیورسٹی کی حیثیت اختیار کر گئی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں ٹیگور نے مغرب کے مختلف ممالک کی سیر کی اور کئی شہروں میں لیکچر دیئے۔ بہت سے مشہور و معروف پروفیسروں اور وقت کے بڑے بڑے سیاست دانوں سے تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ اس سے اس کی نظر میں اور بھی وسعت پیدا ہوگئی۔ مشرق و مغرب کا امتیاز اس کی نگاہوں میں مٹ گیا۔ اسے تمام دُنیا ایک ہی رشتے میں منسلک دکھائی دی۔ ہندوستان میں واپس آکر اُس نے بین الاقوامی نوعیت کی ایک یونیورسٹی قائم کی۔ جس کا نام "وشوابھارتی" رکھا۔ اس یونیورسٹی کا مقصد مشرق و مغرب کا امتیاز مٹانا۔ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھنا اور امن و امان قائم کرنے کے لئے باہمی محبت و اخوت پیدا کرنا تھا۔ "شانتی نکیتن" اور "وشو ابھارتی" کے قیام سے ٹیگور کی شہرت ہندوستان کے علاوہ دُنیا بھر کی یونیورسٹیوں میں ہوگئی۔ اِن درسگاہوں سے اسے خود بھی فائدہ پہنچا۔ نوعمر طالب علموں کے اُستاد کی حیثیت سے اُس نے نفسیاتِ طفلی کا گہرا مطالعہ کیا۔ چنانچہ اُس کے کلام میں بچوں کے لئے جو نظمیں ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ بچپن کی نفسیات سمجھنے میں وہ کس قدر ماہر ہے۔ اور اُس کی طبیعت کس قدر ہمہ گیر ہے۔ ایک نظم میں وہ کہتا ہے :۔

"میں اپنی ماں کو یاد نہیں کر سکتا، لیکن موسم خزاں میں صبح سویرے جب سیولی پھولوں کی نکہت ہوا میں تیرتی ہے تو مندر سے صبح کی عبادت کی خوشبو مجھے یوں آتی ہے جیسے وہ میری ماں کے پاس سے آئی ہو، میں اپنی ماں کو یاد نہیں کر سکتا لیکن اپنی خواب گاہ کی کھڑکی سے جب میں دور آسمان کے نیلے رنگ کو دیکھتا ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرے چہرے پر میری ماں کی گڑی ہوئی نگاہوں کی خاموشی تمام آسمان پر پھیل گئی ہے"

ٹیگور انسانی شخصیت کے ارتقاء کو مانتا ہے اور مافوق الفطرت انسان کا قائل ہے۔ زمین پر خدا کے وجود اور اس کی بادشاہت کو تسلیم کرتا ہے۔ اُس کا خدا آسمانوں کی بلندی پر ہی نہیں رہتا بلکہ زمین پر بھی ہے ہم میں موجود ہے۔ اور دُنیا کی ہر چیز میں چھپا ہوا ہے۔ اس نکتۂ خیال کے پیش نظر ٹیگور اپنے باپ اور رام موہن رائے سے اختلاف رکھتا ہے۔ جو ایک ذاتی خدا کے قائل ہیں۔ وہ خدا کے لئے مختلف نام استعمال کرتا ہے، مثلاً ابدی رُوح، رُوحِ انسان، اعلیٰ ترین انسان، عالمگیر خودی، عالمگیر ذہن وغیرہ۔

سنہ ۱۹۳۱ء میں ٹیگور کی عمر ستر سال کی ہوگئی۔ اس کی جوانی کبھی کی جا چکی تھی، اب اُس کی شاعری میں بہاریں ہنگاموں سے زیادہ خزاں کی خموشی اور سنجیدگی پیدا ہونے لگی۔ اس کی سترویں سالگرہ کے موقع پر ہر ملک کے شاعروں، ادیبوں، فن کاروں، مصوروں اور سیاست دانوں نے اُسے خراج تحسین پیش کیا۔ اور اُس کے متعلق نہایت بلند آہنگ تعریفی مضامین لکھے۔ جو "گولڈن بک ٹیگور" کے نام سے ایک کتاب کی شکل میں شائع ہوئے۔

ٹیگور نے اپنی نظموں، ڈراموں اور افسانوں سے دنیا کے لٹریچر میں ایک اہم اضافہ کیا ہے۔ اس کے کلام نے بنگالی زبان کا پایہ بہت بلند کر دیا ہے۔ اس کا ذہنی ارتقاء اُسے مناظرِ قدرت کے مشاہدہ کے بعد رفتہ رفتہ انسانی فطرت کے عمیق مطالعہ کی طرف لے آیا۔ اُسے معلوم ہوگیا کہ انسان ایک نیک مقصد لیکر دُنیا میں آیا ہے۔ جس کی تکمیل آسمان پر نہیں بلکہ زمین پر ہوگی۔ اس نے ارضی زندگی میں اس نیک مقصد کی تکمیل کی اور اس کے بعد دُنیا کی نگاہوں سے رُوپوش ہوگیا۔

کیفِ تغزّل

(از جناب حامد شاہجہانپوری)

نہ گزر خیال کا ہے، نہ رسائی ہے گماں کی
کہ زمیں فلک سے اونچی ہے تمہارے آستاں کی

نہ تلاشِ فصلِ گل ہے نہ ہو تاکہ کچھ خزاں کی
مجھے خاک دینگی دھوکا یہ دو رنگیاں جہاں کی

نہ غرض ہے لامکاں سے نہ ہے جستجو مکاں کی
ترا نقشِ پا مِلا تو مِلی سلطنت جہاں کی

مری بے خودی میں پنہاں ہیں رموز معرفت کے
مجھے ہوش میں نہ لائیں ابھی گردشیں جہاں کی

ترے ذوقِ خود نمائی نے کیا ہے تجھ کو رسوا
نہ قصور میرے دِل کا نہ خطا مری زباں کی

ہے کوئی جو بڑھ کے روکے مرا بے قرار نالہ
نہ فضاؤں کو یہ قدرت نہ مجال آسماں کی

ترے قِصّۂ ازل کی وہی انتہا ہے شاید
کہ جہاں سے ابتدا ہے مرے غم کی داستاں کی

یہ کمالِ جستجو ہے کہ میں کھو گیا ہوں ورنہ
مرے دل کے ذرہ ذرہ میں ہیں وسعتیں جہاں کی

تری اک نظر نے جانے مجھے کیا بنا دیا ہے
کہ نگاہیں اُٹھ رہی ہیں مری سمت دو جہاں کی

وہ جو دل میں رہ کے حامد ہیں مری نظر سے پنہاں
کوئی اُن سے یہ تو پوچھے کہ یہ رسم ہے کہاں کی

افسانہ

پرمٹ

PERMIT

(از جناب محمد امین شرقپوری)

گھوش بابو ہر پانچ منٹ کے بعد دریافت کر لیتے کہ کھانا تیار ہو گیا۔

"ابھی نہیں۔ تھوڑی دیر اور رُک جائیے"۔ رسوئی سے آواز آئی۔

"تھوڑی دیر سنتے سنتے ایک گھنٹہ ہو گیا"۔ وہ کسی قدر جھنجھلا کر بولے: "دفتر کا وقت ہو گیا ہے۔ کبھی آنچ نہیں جلی۔ اور کبھی سنتا ہوں کہ چاول چڑھا دیئے ہیں۔ بس چند منٹ اور، کوئی حد بھی ہے انتظار کی۔"

بیوی اطمینان سے بولی "ستیش کو پرمٹ لینے میں دیر ہو گئی۔ ورنہ کبھی کے پکا کر رکھ دیتی"۔

"پرمٹ۔ پرمٹ!" وہ بولے "یہ بھی ایک مصیبت ہو گئی۔ پہلے پرمٹ لو اور پھر کھانے کا سامان"۔ کواڑ زور سے بند کرتے ہوئے باہر نکل گئے۔ بیوی نے آواز دی کہ جہاں اتنی دیر رُکے رہے۔ وہاں تھوڑی دیر اور سہی۔ وہ کچھ جواب دیئے بغیر چلے گئے۔ صبح انہوں نے چائے کی ایک پیالی پی تھی۔ آج شاید تمام دن اسی پر اکتفا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہیں دفتر لیٹ پہنچنے کا ڈر بھی تھا۔ اور بھوکے رہنے کا احساس بھی۔ دن بھر کاغذات سے دھینگا مشتی کے لئے جسم میں مدافعت کی تھوڑی قوت بھی چاہیئے۔ پھر ایک روز کے تجربے نے انہیں یہ سبق سکھا دیا تھا کہ گھر پر چاہے بھوکے رہ لو مگر دفتر پیٹ بھر کر جانا چاہیئے۔ خالی پیٹ نہ کام ہوتا ہے نہ گردن ڈال کر بیٹھا جاتا ہے اس روز انہیں پلیٹ ہی الگ ہوئی اور پرکاش چندر سے لڑائی علیحدہ مول لینی پڑی۔ جو برت رکھتے ہیں وہ نہ جانے کیسے کام کرتے ہوں گے۔ آپ ہی آپ بولے "اجی کیسا برت، دودھ پھل وغیرہ خوب ٹھونس لیتے ہیں۔ بھوک لگے بھی کیونکر"۔ بولے "اب تو یہ چیزیں بھی آسانی سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ شاید اسی وجہ سے پرکاش چندر کے چہرے پر کل دس ہی بجے بارہ بج رہے تھے۔ جنگل کے برت رکھنے کا مزہ آ گیا ہو گا بابو جی کو"۔

اس کی ہنسی اڑاتے ہوئے آج اپنے آپ پر رونا آ رہا تھا انہوں نے کئی مرتبہ سوچا کہ لوٹ جاؤں اب تو چاول تیار ہو گئے ہوں گے، کبھی کہتے "اب تو آ ہی گیا ہوں، شام کو کھا لوں گا۔ صبح سات بجے پہلے دیکر ستیش کو بھیجا تھا کم بخت ساڑھے نو بجے چاول لیکر آیا"۔ بولے "اس کا کیا قصور۔ سامان لینے سے پہلے پرمٹ لینا ضروری ہے اس کے بغیر بنیا نہیں دیتا"۔

سنتے آئے تھے کہ روپے بغیر دھندے نہیں چلتے۔ وہ الیشور کے بعد روپے کی طاقت کے قائل تھے۔ اس کی پوجا بھی کرتے تھے۔ مگر آج اُن کا اعتقاد اٹھ گیا تھا۔ آج اُن کی نظر میں اگر کوئی قابلِ پرستش چیز تھی تو وہ پرمٹ تھی۔ بولے "آج سے پرمٹ کو ہی دیوتا ماننا پڑے گا"۔ بھوک کے احساس سے طرح طرح کے خوشکن اور یاس انگیز خیالات میں چکر کھاتے ہوئے جا رہے تھے۔ کنٹرول کے بارے میں ان کی رائے مختلف تھی۔ ان کے خیال میں روزمرہ استعمال کی چیزوں کے بجائے لوگوں کی نیت پر کنٹرول کی ضرورت تھی۔ کیونکہ امیر اور دولتمند اس خیال سے اناج جمع کر رہے تھے کہ شاید یہ کبھی بالکل مفقود نہ ہو جائے۔ اور دکاندار یہ سمجھتے تھے کہ کنٹرول پر بیچنے سے نفع کم ہوتا ہے۔ چوری چھپے چار گنا اور پانچ گنا داموں پر اٹھ رہا ہے۔ پھر مفت کی ہمدردی کے لئے وہ کیوں بٹہ کھائیں۔ دھرم ان باتوں کا پرچار کرتا ہے۔ کرے، حکومت ان کے فعل کو جرم سمجھتی ہے، سمجھا کرے، یہ سب کمزوریاں ہیں جہاں تک عمل کرو۔ بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ انسان کو بودا بنا دیتی ہیں۔ ان باتوں کو ملحوظ رکھنے والا بھوکا مرتا ہے۔ یہ وہ ناپاک خیالات ہیں تو انسان کے ذہنی اور روحانی نشوونما پر بُرا اثر ڈال رہے ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ پیدا کرنے والے کے منشا اور رضا کو دلیری سے ٹھکرایا جا رہا ہے۔

اُن کے ذہن میں کئی آدمیوں کے نام آئے جو چند دن پہلے مفلس تھے اور آج دولتمند ہیں۔ بے ایمانی جادو کا کام کر رہی تھی۔

کل جب رائے بابو نے انہیں بتایا کہ ایک گاؤں میں ماں باپ نے بھوک سے تنگ آ کر اپنے بچے کو ایک آنہ کے عوض بیچ ڈالا۔ اُن کا دل دھک سے رہ گیا۔ کام چھوڑ کر بہت دیر سوچتے رہے کہ یہ تباہی کیا کیا گل کھلا رہی ہے۔ کیسے کیسے عجیب واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ شاید ماضی کی تاریخ ایسی ایک مثال بھی پیش نہ کر سکے گی۔ مستقبل کے لوگ ان واقعات پر یقین نہیں کریں گے۔ اُن کے خیال میں یہ من گھڑت قصے ہوں گے: بچے کا مول ایک آنہ! صرف چار پیسے! وہ کانپ اُٹھے۔ ذات پات کو زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ نیچ اُن کی نظر میں ذات کا نیچ نہیں۔ بلکہ دل کا نیچ تھا وہ کہتے تھے کہ برہمن اگر اچھے کاموں سے عاقبت سنوار لیتا ہے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ بھنگی اس درجہ کو نہ پہنچ سکے۔ جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ اُن کا مقولہ تھا۔ کیا برہمن کیا بھنگی آج انہیں سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ سب کے سر پر لالچ کا بھوت سوار تھا۔ دیا اور کرم کی جگہ دغا اور ظلم نے لے لی تھی۔ وہ اسے بھی کرموں کا پھل کہتے تھے۔ جب بھائی بھائی کا گلا کاٹے گا۔ تو اس کی کشتِ آرزو کیا ہری ہو گی۔ اولاد بیچنے والے کی مجبوری تو درکنار رہی انہیں خریدنے والے پر رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ انسان کی قیمت

میں تانبے کی چار، مگر یہاں دام ٹھہرے۔ اس کا دل کیا ٹھیکر کا تھا مرا ہوا جانور بھی دو پیہ بارہ آنے کھال کے دام دے جاتا ہے۔ انسانی جان کی یہ ارزانی اس کے بڑے پن اور شرف کا ایسا منہ توڑ جواب ہے جس سے انسان کو اپنی ناداری اور حقیر ہونے کا فوراً اعتراف کر لینا چاہیئے۔

بردہ فروشی کے ایام میں بکنے والوں کی قیمت کم از کم ایک درم یا اشرفی ہوتی تھی اور آج ایک آنہ! شاید قدرت انسان سے انتقام لینے پر اتر آئی ہے۔ اسکے غرور اور نخوت کو خاک میں ملا دینا چاہتی ہے۔ ایک آنہ جس سے ایک آدمی ایک وقت پیٹ بھی نہیں بھرتا۔ شاید بیچنے والے یہ سمجھیں ہوں کہ ان کا بچہ دوسری جگہ زندہ رہ سکے گا، وہاں اسے جھوٹے ادھ بچے کچھے ٹکڑے کھانے کو مل جائیں۔ اس طرح وہ موت کے ہاتھوں بچ جائیگا۔ گر وہ دائمی لعنت جو اسکے گلے میں پڑ جائیگی وہ زندہ رہنے کی صریحاً توہین ہے۔ زر خریدگی ضرب المثل جو مدت ہوئی مہذب دنیا کی لوح سے مٹ چکی ہے آج انہیں وہ حرف حرف پھر ابھرے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ کبھی محبت اور جنگ میں جو جائز سمجھا جاتا، وہ آج بھوک میں سب جائز بن گیا ہے۔ ان خیالات میں پھنس کر گھوش بابو کو اپنی بھوک مٹتی ہوئی معلوم ہونے لگی۔ ان کا پیٹ ان تلخیوں ہی سے بھر گیا۔ چلتے چلتے موٹر کے ہارن کی آواز سے چونک پڑے۔ موٹر قریب سے نکل گئی۔ ایمبولنس موٹر جس کے اندر بھوک سے جاں بلب بھرے ہوئے تھے انہیں اسپتال لیجا رہے تھے۔ بھوک کے علاج کیلئے ان میں سے بہتیرے راستے ہی میں دم توڑ دینگے۔ زندگی زندہ رہنے کیلئے ہے، یا مرنے کے لئے یکایک ... اور نئی الجھن دماغ میں پیدا ہو گئی۔ کچھ کھائے بغیر انسان کیونکر زندہ رہ سکتا ہے۔ اور موت! بے وقت موت کتنی بھیانک تعبیر ہے زندگی کے خواب کی کتنی عورتوں کا سہاگ اس کے ہاتھوں اجڑ جاتا ہے۔ کتنے بچے لاوارث ہو جاتے ہیں۔ ملک میں دودھا اور انافہ آشرم پہلے ہی کیا کم ہیں۔ انہیں ایسا محسوس ہوا جیسے سارا ملک آشرموں کا استھان بن گیا ہے۔ وہ اس تصور ہی سے کانپ گئے۔ دفتر آ گیا۔

ان کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ رجسٹر، کاغذات، فائلوں کے پلندے، وہ تھوڑی دیر کے لئے سب بھول گئے۔ کام میں لگ گئے۔ برابر کی سیٹ پر بیٹھے ہوئے چندر بابو کا بچہ کئی روز سے بیمار پڑا تھا۔ صبح آتے ہی دریافت کرتے تھے کہ اب بچے کا کیا حال ہے۔ وید کے علاج سے کچھ افاقہ ہوا یا ابھی ڈاکٹر ہی کا علاج ہو رہا ہے۔ آج انہیں خاموش پا کر چندر بابو خود ہی قلم چھوڑ کر بولے "گھوش بابو میرا بچہ کل رات"
وہ چونک کر بولے "اوہ میں تو بھول ہی گیا تھا۔ کیسی طبیعت ہے اب"

"وہ رات مر گیا ہے" چندر بابو روندے ہوئے گلے سے بولے۔

"افسوس"!! ان کی زبان سے نکلا۔ کتنا پیارا بچہ تھا۔ موت کے بے رحم ہاتھوں نے چھین لیا۔ اس افسوسناک خبر نے گویا گھوش بابو کے دماغ میں دبی ہوئی چنگاری کو پھر سلگا دیا تھا۔ موت اور بچے! کبھی بھوک اور موت سامنے آ جاتی۔ ایمبولنس کار دماغ میں چکر کاٹنے لگی۔ ایسے گھومتے ہوئے بڑے بڑے پہیئے جیسے ان کی چھاتی کو کچلتے ہوئے جا رہے تھے۔ انہیں انگلیاں دکھتی ہوئی معلوم دے رہی تھیں۔ بدن گویا ٹوٹ رہا تھا وہ بے صبری سے گھنٹے کو دیکھ رہے تھے کہ پشت چلتی ہوئی سوئیاں چار پر کیوں جلدی نہیں پہنچ جاتیں۔ کیا یہ ممکن ہے؟ آج ہر بات ممکن ہے۔ بھوک سے موت بھی ممکن ہے لوگ کئی کئی دن برتی رہتے ہیں اور پھر زندہ رہتے ہیں۔ آج انہیں یہ فلسفہ بھی باطل نظر آ رہا تھا۔

چار بجے چھتری ہاتھ میں لے کر دفتر سے نکل گئے۔ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے جا رہے تھے۔ سڑک پر، جبڑا کھولے ہوئے لمبی سڑک، جو سیدھی اسپتال کو چلی گئی تھی، جس پر ایمبولنس گاڑیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ دن اور رات!

جب گھر پہنچے تو پسینے میں شرابور تھے۔ بیوی بولی "صبح بنیئے نے تھوڑے چاول دئے تھے۔ دوپہر کو شیش کو دوبارہ بھیجا تو بولا کل صبح دوں گا۔ اب ہو چکے ہیں۔ پرمٹ واپس لے آیا ہے۔"

وہ چونک کر بولے "بچوں کو کھانے کو دیا کچھ"؟

"صبح کے تمہارے چاول رکھے تھے۔ کھائے ہیں انہوں نے۔ تھوڑی مچھلی پکائی ہے، لاؤں؟ آپ نے صبح بھی کچھ نہیں کھایا۔"

"خالی مچھلی پکی ہے" وہ دہرا کر بولے۔ بھیگی ہوئی قمیص اتار رہے تھے۔ "پرمٹ کہاں رکھا ہے"؟ غصے سے نکلکر آئے۔

بیوی طاق سے اٹھا کر بولی۔ "صبح بھیجوں گی اسے پھر"

وہ ہاتھ سے چھین کر رسوئی کی طرف بڑھے۔

"کیا کر رہے ہو؟" بیوی بولی

وہ دہکتی ہوئی آگ میں ڈال کر بولے "پرمٹ پرمٹ!"

جیسے بھوک سے آنتیں پیٹ میں کلبلا رہی تھیں۔ بڑبڑاتے ہوئے پلنگ پر آ کر لیٹ رہے۔ دماغ میں خیالات پھر رینگنے لگے۔ جنہوں نے تمام دن انہیں بے چین رکھا تھا اور وہ کروٹیں لے کر بھلانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ اور شاید بھوک کو بھی!!

دو شعر

جنوں میں بھی ہے اتنا احساس باقی کہیں یہ جنوں تجکو رسوا نہ کردے
سمجھ بوجھکر پرسشِ حال کیجئے کہیں کوئی عرضِ تمنا نہ کردے

مجاز

"ستّاروں کی تقدیر"

(از جناب پروفیسر فراق صاحب ایم اے گورکھپوری)

ستّاروں کی تقدیر یہیں جاگ رہی ہے
سوتے ہیں یہ افلاک زمیں جاگ رہی ہے

تارے بھی ہیں بیدار زمیں جاگ رہی ہے
پچھلے کو بھی وہ آنکھ کہیں جاگ رہی ہے

کروٹ سے شبِ ماہ میں بہتی ہے یہ گنگا
یا حُسن کی بل کھائی جبیں جاگ رہی ہے

ہیں خواب میں عشّاق مگر یاد کسی کی
یا دل ہی میں یا دل کے قریں جاگ رہی ہے

اک عالمِ نیرنگ ہے دُنیائے محبّت
سوتی ہے کہیں اور کہیں جاگ رہی ہے

یہ رات اندھیری ہے مگر اے غمِ فردا
سپنوں میں ابھی شمعِ یقیں جاگ رہی ہے

سوتی ہے جہاں عشق کی تقدیر ازل سے
وہ نرگسِ بیمار وہیں جاگ رہی ہے

اقرار کی ٹھنڈک میں ہے انکار کی گرمی
سائے میں تری "ہاں" کے "نہیں" جاگ رہی ہے

آہوں سے کہو سینۂ شب چیرتی جائیں
تاثیر سرِ عرشِ بریں جاگ رہی ہے

شب خوں نہ مہِ نو سے ہو عشّاق ہیں اے چرخ
یہ رات لئے خنجرِ کیں جاگ رہی ہے

چھیڑیں تو مری سادگیِ عشق کو سو بار
لیکن نگہِ شوخ تریں جاگ رہی ہے

یہ نکھری ہوئی رات فراق آنکھ تو کھولو
سوتا ہُوا سنسار زمیں جاگ رہی ہے

افسانہ

عزم

(از جناب اخلاق حسین عارف)

آناً فاناً بھرے جنگل کے سکوت میں مشین گنوں اور رائفلوں کی گھن گرج سے ایک حشر سا برپا ہوگیا۔ سرسبز و شاداب درختوں کی ہری ہری پتیاں اور پتلی پتلی شاخیں اس طرح ٹوٹ ٹوٹ کر فضا میں گرنے لگیں جیسے طوفانی جھکڑ چل رہا ہو۔ تناور درختوں کی شاخوں اور ڈالیوں کے درمیان گزرتی ہوئی گولیوں سے شعاعوں اور دھوئیں کی لپک اور سنسناہٹ پیدا ہو کر فنا نہ ہونے پاتی تھی کہ اس کی جگہ دوسری شرر فشاں شے موجود ہو جاتی تھی۔ ان شعلہ افشانیوں میں گھرے ہوئے سُرخ فوج کے دو جانباز اپنے زخمی افسر کو ربر کی ایک چادر پر لٹائے ہوئے کافی دیر تک اوندھے پڑے رہے تاکہ گولیوں کی بوچھاڑ سے اپنا تحفظ کر سکیں ——— اور جب آگ کی بارش میں قدرے کمی ہوئی تو وہ زخمی افسر سمیت گھنی جھاڑیوں کی جانب رینگنے لگے۔

زخمی افسر کا تحفظ ان پہ اسی طرح لازم تھا جیسے ان کی اپنی جانوں کا۔

اسی کشمکش میں وہ جنگل کی گھنی جھاڑیوں میں اتنی دور نکل آئے کہ اب انہیں دُور سے گولیوں کی سنسناہٹ اس طرح محسوس ہوتی جیسے تناور درختوں کی ہری ہری شاخوں پر پرندوں کے اُترنے اور پرواز کر جانے کے ساتھ ہی ایک خفیف سی آواز پیدا ہوتی ہے۔

زخمی افسر راستہ بھر یہی سوچتا رہا کہ کم سے کم یہ سپاہی تو ہیڈ کوارٹر تک پہنچ جائیں۔ مگر یہ اسی وقت ممکن تھا جب وہ اسے یہیں کہیں گھنی جھاڑیوں میں چھوڑ دیں ——— اور وہ اس کے لئے تیار نہیں معلوم ہوتے۔ سپاہیوں کے رینگنے اور کبھی جھک جھک کر آہستہ آہستہ چلنے کے ساتھ ہی جب زخمی افسر بھی ربر کی چادر پر گھسٹتا تو اس کے تمام اعضا کی سکت اور تناؤ میں اس چیز کی سعی ہوتی کہ اس کا ٹوٹا ہوا زخمی پیر درد، جلن اور چبھن سے محفوظ رہے مگر ایسا نہ ہو سکتا تھا۔

اسے سخت جسمانی اضطراب تھا۔ اور جسمانی اضطراب سے کہیں زیادہ ذہنی اضطراب ——— کیونکہ وہ سمجھ رہا تھا کہ جتنی دیر ان تینوں کو صدر دفتر کی مسافت میں لگے گی اتنا ہی فرائض کی بجا آوری میں تعطل اور توقف ہونے سے مادرِ وطن کے نقصان کا احتمال ہے۔

اس کے علاوہ اس کے ذہن میں چند اور چیزیں بری طرح رقص کر رہی تھیں ——— مگر وہ چاہتا تھا کہ جس قدر جلد ہو سکے وہ دشمنوں کی نقل و حرکت کے متعلق صدر دفتر کو مطلع کر دے تاکہ اُس کے سر سے فرض کا یہ بارِ عظیم ہلکا ہو جائے۔

اور وہ مرنا بھی نہیں چاہتا تھا ——— اتنی کم عمری اور اتنی قلیل فوجی خدمت کے بعد ——— ایسی حالت میں جبکہ اس کا ملک نرغۂ اعداء میں گھرا ہوا تھا اور دشمن اس کے نظام تمدن و معاشرت اور اس کی صنعت و حرفت کو تباہ و برباد کر کے صدیوں پیچھے دھکیلنے پر تُلے ہوئے تھے ——— اور ایسی حالت میں جبکہ رخصت ہوتے وقت اس نے اپنی ماں، بیوی اور بہنوں سے فتحیاب و کامراں ہو کر واپس آنے کا عہد کیا تھا۔

" زندگی کے وہ چند لمحات ایک طویل معطل عمر سے زیادہ گراں بہا ہیں جو ایک مقصدِ عظیم کے لئے وقف ہوں۔"

اُس نے سوچا!

اور اسی عزم کے ساتھ وہ ابھی کچھ دیر زندہ رہنا چاہتا تھا۔ اتنی دیر کہ وہ دشمن کی نقل و حرکت اور پیش قدمی کی اطلاع اپنے دفتر پہنچا دے۔ مگر یہ اس طرح ناممکن تھا اور بالآخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ دو سپاہیوں کو ضروری ہدایت دیدے اور اسے یہیں چھوڑ کر انہیں آگے بڑھنے کے لئے کہے۔ اور وہ گویا ہوا:-

" دیکھو ساتھیو! تم مجھے اب چھوڑ دو۔ تمہیں بہت جلد صدر دفتر پہنچ کر میری ہدایات کے مطابق عمل پیرا ہونا ہے۔ تاکہ ———"

مگر سُرخ جانبازوں نے اس کی ہدایت پر توجہ نہ کی اور برابر چلتے رہے وہ اسے اس طرح موت اور زیست کی کشمکش میں چھوڑ کر کیسے جا سکتے تھے؟

اور اسی طرح جب تقریباً نصف کیلومیٹر یہ لوگ اور آگے بڑھ آئے تو افسر نے گرج کر کہا:-

" سالومن اور پیٹر! میں تم کو حکم دیتا ہوں کہ تم مجھے یہاں چھوڑ کر صدر دفتر کی جانب میری ہدایت کے مطابق جاؤ۔ ورنہ نافرمانی کے صلہ میں ——— ورنہ نافرمانی کے صلہ میں ———"

مگر وہ دونوں جیسے اس خیال پر جمے ہوئے تھے کہ انہیں افسر کی جان بچانا اتنا ہی ضروری ہے جتنا اپنی جانیں۔ وہ بلا ہچکچاہٹ اور توقف اپنا راستہ

طے کرتے رہے۔

افسر جب اس طرح حکم صادر کرکے ان کو آمادہ نہ کرسکا تو اب اُس نے انہیں منت وسماجت کے لہجہ میں سمجھانا شروع کیا۔

"دیکھو کامریڈ سالومن! کامریڈ پیٹر!! اس وقت جو اہم ترین فرض تمہارے ذمہ ہے۔ وہ ہے جرمنوں کی پیش قدمی اور فوجی نقل وحرکت کی اطلاع صدر دفتر پہنچانا ۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ میں بذات خود معذور ہوں، اب اگر تم بھی میرا تحفظ کروگے تو یہ فرض رہ جائیگا۔ تم لوگ سمجھ گئے کہ ہماری جانوں سے پیارا اور ضروری ہمارا فرض ہے۔ اور بڑی جدوجہد کے بعد اس نے انہیں آمادہ کرلیا اور ضروری ہدایات کے بعد رخصت کردیا۔

دن بھر کا تھکا ہوا آفتاب اب آہستہ آہستہ مغرب کی طرف سرک رہا تھا۔ سرد دن کو سیاہی محیط کرنے کی تیاری کررہی تھی۔ آسمان کے خلا میں کہر رقص کرتا ہوا جنگلی درختوں اور پہاڑی ٹیلوں پر گرنے کا عزم کئے ہوئے فضا پر منڈلا منڈلا کر غنودگی سی طاری کررہا تھا۔ جنگل کی گھنی جھاڑیاں، چھوٹے اور بڑے درخت کہیں صف بستہ کہیں تتر بتر عالم سکوت میں کھڑے ہوئے تھے۔ ہر چیز پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ وہی جگہ جو کچھ گھڑی پیشتر فاشسٹ بیٹریوں کی آتش بار توپوں اور مشین گنوں سے میدان کارزار بنی ہوئی تھی اب دن بھر کے قتل عام کی سرگرمیوں کے بعد ایک اضمحلالی کیفیت کا مرقع بن گئی تھی۔ دن میں گذرے لمحات اب کسی سست رفتار کیڑے کی طرح آہستہ آہستہ رینگ رہے تھے۔

اِدھر زخمی افسر اپنے دونوں ہاتھ، سر کے نیچے رکھے چت لیٹا ہوا کہر اور دھندلکے کے اُس پار، نیلے آسمان پر ستاروں کی بزم آرائی کے نظارے سے اپنے متفکر دل کو بہلا رہا تھا۔ اُدھر ستارے بساطِ آسمانی پر یکے بعد دیگرے اپنا پڑا جمارہے تھے۔ تھوڑی دیر میں درخشاں ماہتاب کہکشاں اور ستاروں کے درمیان شامل ہونے کے لئے درختوں کی شاخوں اور پتیوں کی اوٹ سے عالمِ انسانیت پر اپنی ضیا پاشیاں کرتا ہوا دھیرے دھیرے اُوپر چڑھ رہا تھا۔

افسر کے لئے جنگل کی گلابوسفن فضا میں ہزار ہا سوگواریاں پنہاں تھیں اس کی تھکی ہوئی خواب ناک آنکھوں میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے خود اس کا احساس دھیرے دھیرے سرد ہوتا چلا جارہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد اُس نے کروٹ لے کر آنکھیں بند کرلیں اور اس کی بند آنکھوں کے سامنے جیسے تاریکی سی پھیل گئی۔ ساری فضا، بلکہ ساری کائنات ——— اور خود اس کا اپنا مستقبل سب تاریک ہی تاریک نظر آنے لگے۔ وہ ربڑ کی چادر پر اس طرح لیٹا ہوا تھا جیسے اپنے جسم، اپنی ہستی بلکہ موجوداتِ عالم سے بیزار ہے۔ اس کے تمام اعضاء اس طرح ڈھیلے اور بے سکت پڑے ہوئے تھے جیسے ان سے تمام عملی قوتیں سلب کرلی گئی ہوں۔

رات کے بڑھنے کے ساتھ ہی سردی بھی اب تدریجاً بڑھ چکی تھی۔

اس نے اپنے تھیلے سے گوشت کا ایک بھنا ہوا پارچہ نکال کر کھایا۔ اس کے دماغ میں اس وقت بھی کچھ اُلجھے اُلجھے خیالات چکر لگارہے تھے۔ مگر اب وہ انہیں سُلجھانے کی کوشش بالکل نہیں کررہا تھا۔ وہ اس وقت اپنے تھکے ہوئے دماغ پر بالکل زور دینا نہیں چاہتا تھا۔ اور نہ ان پریشان کن خیالات کو واضح طور سے سمجھنا ہی چاہتا تھا۔ تکان، زخم، مسافت اور شکست خوردہ فرار کے بعد اب اس میں اتنی سکت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ آخر کار اُسے نیند آگئی اور وہ سوگیا۔

دو گھڑی رات رہے فضا میں غیر معمولی خنکی کے باعث افسر کی آنکھ کھل گئی۔ چاروں طرف غضب کی تاریکی محیط تھی۔ اس نے سوچنا شروع کیا۔

"اس کا مطلب ہے کہ کامریڈ سالومن اور کامریڈ پیٹر اب تک صدر دفتر تک نہیں پہنچے ——— اس کا مطلب ہے کہ مجھے لینے کے لئے اب تک کوئی ایمبولنس نہیں آئی!! ——— اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ راستہ میں دشمنوں کا نشانہ بن گئے!!! ——— اس کا مطلب ہے کہ دشمنوں کی نقل و حرکت کے متعلق ہمارے دفتر کو کوئی اطلاع نہیں ملی ——— اور اسکا مطلب ہے کہ ہم حریف کی مزید پیش دستیوں سے محفوظ نہ رہ سکیں گے ———؟"

وہ ہر جملہ کے پہلے اپنا تکیہ کلام "اس کا مطلب ہے کہ" ضرور لاتا اور ہر بار اپنے مخصوص انداز میں موجودہ حالات کا مطالعہ کرتا۔

پچھلی شام کی طرح اس پر یاس و نا اُمیدی پھر طاری ہوگئی اور سب اُلجھے اُلجھے خیالات اُس کے ذہن میں آآ کر اسے حد درجہ پریشان کرنے لگے۔

جہاں وہ اس وقت تھا۔ وہاں سے صدر دفتر تین کیلومیٹر پر واقع تھا اُسے تین کیلومیٹر رینگ کر اور گھسٹ کر جانا تھا۔ اور آخر کار اُس نے وہاں پہنچنے کا عزم کرلیا۔

اب وہ آہستہ آہستہ کچھوے کی رفتار کی مانند اپنے دونوں ہاتھوں اور پیر کی قوت پر رینگ رہا تھا۔

وہی راستہ جو پچھلے ہفتہ اُس نے چند منٹوں میں طے کیا تھا اب کئی دن کا محسوس ہورہا تھا۔ کیونکہ اس کی رفتار ایسی تھی کہ وہ بمشکل ایک کیلومیٹر بارہ گھنٹوں میں طے کرسکتا تھا۔

[redacted]

ایک گھڑی رات گئے وہ صدر دفتر کی جانب روانہ ہوگیا تھا اور اب شام ہوتے ہوتے وہ صرف پون کیلو میٹر طے کرسکا تھا۔ اور ابھی اسے کافی مسافت طے کرنی تھی۔ شام ہونے کے ساتھ ہی اس نے بہت تھوڑا وقفہ آرام کرنے پر صرف کیا۔ اور تھوڑا سستانے کے بعد وہ پھر چل پڑا۔ دوسرے دن علی الصباح وہ تقریباً دو کیلو میٹر چل چکا تھا۔

آفتاب کی پہلی کرن نکلنے کے ساتھ ہی وہ بےدم ہوکر زمین پر گر پڑا۔ اس کے ہاتھ، پیر اور دوسرے اعضا میں سے جو چلنے میں اس کے معاون تھے۔ پھوٹ کر خون بہہ چلا تھا۔

اسی عالم میں وہ کئی گھنٹہ پڑا رہا اور جب اسے ہوش آیا تو اس نے سوچا کہ یہ صورت اور تشویش ناک ہے کیونکہ تعطل اور تساہلی کے باعث فرض سے سبکدوش ہونا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔ اور ایسا ہونا سب سے بڑا قومی اور ملی نقصان ہے۔

ساتھ ہی وہ اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا تھا ــــ کاش اس موقع پر وہ میدان کارزار میں دشمنوں سے نبرد آزما ہوکر اپنی جان دیتا! ......

"مگر یہ بھی تو سچی قربانی ہے" اس نے سوچا "ہم اپنے فرض کی انجام دہی میں دشمنوں سے مقابلہ ہی تو کر رہے ہیں ــــ" "کاش میں ابھی کچھ گھڑی اور زندہ رہتا! کہ اپنے دوستوں کو جرمنوں کی پیش قدمی سے مطلع کر دوں"

اور اسی خیال کے ساتھ اس میں تھوڑی قوت خود کر آئی اور وہ پہلے کی طرح پھر زمین پر آہستہ آہستہ گھسٹنے لگا۔

ایک تاریک رات کو تقریباً گیارہ بجے روسی صدر دفتر سے کچھ دور ایک گشتی دستہ کے کسی سپاہی کو کسی چیز سے ٹھوکر لگی اور وہ گرتے گرتے بچ گیا۔ اس نے زمین کی طرف جھک کر ٹٹولا۔ وہ کوئی انسانی جسم تھا۔ اتنے میں اس کے ساتھی بھی اس کی جانب متوجہ ہوئے تو انہوں نے معلوم کیا یہ کوئی روسی افسر تھا جو بری طرح زخمی تھا۔ نبض کی آمد و شد سے اس کی زندگی کا ثبوت ملتا تھا اس کے دونوں ہاتھ زمین پر آگے کی جانب پھیلے ہوئے تھے اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ آگے بڑھنے کی کوشش میں لیٹے لیٹے چل رہا تھا۔ اس کا ایک پیر ٹوٹا ہوا تھا۔ جس کا بیشتر حصہ کٹ کر نہ معلوم کہاں گر چکا تھا۔ اور دوسرا پیر اور ہاتھ بری طرح گھائل تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ کی انگلیاں برفیلی زمین میں گڑی ہوئی تھیں۔ اور روشنی میں دیکھنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس نے وہاں کچھ لکھ دیا تھا۔

زخمی کی رقم کردہ تحریر کے بموجب سرخ فوج کے ایک دستہ نے جرمن مقبوضہ علاقہ پر شبخون مار کر اسے فتح کر لیا۔ اور انہیں بری طرح مار کر بھگا دیا۔

کوڑھ

(از جناب سلام مچھلی شہری)

"دھیمی دھیمی ہوائیں گاتی ہیں
چھوٹ کر سب نسیں اُبھر آئیں
موت کی پڑ رہی ہے پرچھائیں
اور فضائیں خود اپنے گیتوں کی
آخری لَے میں مرتی جاتی ہیں

حُسن کے سائے رقص کرتے ہیں
گُل و مہتاب و عارضِ جاناں
نقشِ دیوار مسجد و ایواں
سب ہی کچھ تو ہیں میرے جسم کے داغ
یہی جو آگ بن کے اُبھرے ہیں

اِن فضاؤں میں اِن ہواؤں میں
آتشیں راگ تھرتھراتے ہیں
اور مرے داغ مُسکراتے ہیں
دیکھوں آتے ہیں کیسے نظّارے
برق و آتش کی گرم چھاؤں میں — ؟!!"

ایک ادبی ڈائری

ایک کتاب

(از جناب اختر انصاری)

Sir Valentine Chirol کے نام سے ہندستانی سیاسیات کے طالب علم اچھی طرح واقف ہیں۔ انھوں نے جدید ہندستان کے سیاسی مسائل پر کئی اہم کتابیں تصنیف کیں اور تقریباً دس سال پیشتر غالباً ہندستان میں انتقال کیا۔

India ان کی اہم ترین تصنیف ہے۔ یہ پہلی مرتبہ ۱۹۲۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اور میں نے ۲۸ء میں تاریخ و سیاسیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس کو پڑھا تھا۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ہمارے استاد Dr. T. G. P. Spear نے ایک دن کلاس میں اس کتاب کی تعریف کی تھی۔ اور اس کے اسٹائل کو خاص طور پر سراہا تھا۔ مجھے صاحبِ طرز مصنفوں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس لئے میں نے اس کو خریدا، پڑھا اور بہت پسند کیا۔

کچھ تو کتاب کی رنگین، پُرزور عبارت کا لطف اٹھانے کیلئے اور کچھ اپنی معلومات کو تازہ کرنے کی غرض سے اب میں نے اس کتاب کو ایک مرتبہ پھر پڑھا۔ اور چونکہ اب میرا سیاسی شعور ایک نوجوان طالب علم کے سیاسی شعور سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ ہے۔ اس لئے اس سامراجی ذہنیت کی بنا پر جس کی ترجمانی مصنف نے کی ہے۔ یہ کتاب قطعی طور پر گھناؤنی معلوم ہوتی ہے۔

کتاب کے پہلے پانچ ابواب میں ہندستان کی سیاسی، تہذیبی اور تمدنی تاریخ کا ایک سرسری مگر فاضلانہ مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ان اوراق نے ہندستانیوں کے قومی ضمیر، ان کی اجتماعی ذہانت، ان کے کردار، ان کی اہلیتوں اور ان کی گذشتہ و موجودہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر بہت کافی روشنی پڑتی ہے۔ باقی کے چودہ ابواب بیسویں صدی کے ابتدائی پچیس سالوں کے متعلق ہیں۔ اور ان صفحات میں اس دور کی اکثر اہم سیاسی تحریکوں، سیاسی واقعات اور حکومتِ ہند کی کارروائیوں کا ذکر آگیا ہے۔ جدید ہندستان اور اس کے مسائل کو سمجھنے کے لئے جن عناصر سے واقف ہونا ضروری ہے وہ اس کتاب کے مطالعہ سے بخوبی واضح ہو جاتے ہیں۔ کتاب کی ہر سطر مصنف کے وسیع مطالعے اور ذاتی تجربے پر دال ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مصنف نے ہندستانیوں کے ذہن و کردار اور ان کے تہذیب و تمدن کا ہمدردانہ نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ مگر جب ہم ان صفحات میں جگہ جگہ مصنف کی سامراجی ذہنیت کے اظہار سے دوچار ہوتے ہیں تو ہم اس کی نیت پر شبہ کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔

برطانوی حکومت نے ہندستان پر جن فوائد و برکات کی بارش کی ہے، ان کا

[illegible]

تمثیل و تلمیح کا ایک ذخیرہ ہے۔ اور اس حیثیت سے اس کی افادیت میں ابھی کمی واقع نہیں ہوئی۔ ساری کتاب اس عقیدے کی ترجمان ہے۔ کہ ہندستان (دوسری نوآبادیات کی) برطانیہ کے قبضہ میں بطور ایک مقدس امانت Sacred Trust کے ہے۔ اور جب تک ہندستانی اپنے وطن کے نظم و نسق کا بار سنبھالنے کے قابل نہیں ہو جاتے، برطانوی قوم اپنے اقتدار کی زنجیروں کو ڈھیلا کرکے بددیانتی کی مرتکب نہیں ہو سکتی۔

دنیا کی تاریخ میں یورپی اقوام کا یہ عقیدہ سیاسی مکاری اور منافقت کی ایک شاندار مثال کے طور پر ہمیشہ یادگار رہے گا۔ Chirol جیسے تاریخی و تمدنی نقادوں کی جانب سے اس عقیدے کا اظہار عموماً حسب ذیل چار فقروں کی شکل میں ہوتا ہے:-

(1) *The Civilizing* mission of *Europe*.

(2) *The* while man's *burden*.

(3) *The Spiritual* genius of *India*.

(4) *East* is *East* and west is west, and never the *twain* shall meet.

یہ چار فقرے بظاہر ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ مگر مطلب ان چاروں سے ایک ہی نکلتا ہے۔

پہلے فقرے کے معنی بظاہر تو یہ ہیں کہ دنیا کی غیر مہذب اقوام کو مہذب اور متمدن بنانے کی خدمت قدرت نے یورپ کی سفید اقوام کے سپرد کر دی ہے۔ مگر اصل میں اس کا مطلب یہ ہے کہ سفید اقوام کو اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ ایشیا اور افریقہ کی مختلف قوموں کو اپنا محکوم بنائیں۔ اور انہیں سیاسی و اقتصادی غلامی کی زنجیروں میں جکڑ کر ان کا خون تک پی جائیں۔

دوسرے فقرے کے معنی بھی بظاہر تو یہ ہیں کہ دنیا کی پس ماندہ اور غیر ترقی یافتہ اقوام کو اپنے ملکی معاملات کی دیکھ بھال کے قابل بنانے کی ذمہ داری ایک عظیم الشان بار ہے جو کارکنانِ قضا و قدر نے سفید اقوام کے کمزور کاندھوں پر ڈال دیا ہے۔ مگر اس کا اصلی مطلب وہی ہے جو اوپر بیان ہوا۔

تیسرے فقرے کے استعمال سے یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ ہندستان روحانیت کا مخزن ہے۔ اور ہندستان والے روحانیت کے امام ہیں۔ اس ملک میں ہمیشہ بڑے بڑے جوگی، رشی، مہاتما اور سنیاسی پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہاں کی انجذاب آفریں، معرفت بار اور تقدس ریز فضاؤں میں ہمیشہ پُراسرار روحانی تحریکیں جنم لیتی رہی ہیں۔ اور پروان چڑھتی رہی ہیں۔ روحانیت اہلِ ہند کا خاص میدان ہے۔ جس میں وہ نفس کشی اور ریاضت

مجاہدہ اور رہبانیت کے غیر ارضی کارنامے پیش کیے گئے اور نروان حاصل کیا کرتے ہیں۔ انہیں روحانی اوصاف کی بنا پر ہندستان کو مادیت زدہ یورپ پر فوقیت حاصل ہے اور اسی لحاظ سے یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ مغربی دنیا کو ابھی ہندستان اور ہندستان کی قدیم روحانی تہذیب سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔

یہ اس فقرے کا ظاہری مطلب ہے۔ لیکن اس کے اصلی معنی یہ ہیں کہ ہندستان والے جو روحانیت اور روحانی مشاغل کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں زندگی کے مادی پہلو کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں کر سکتے۔ اور اپنی دنیوی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ وہ دنیوی امور کو نظر انداز کرنے پر مجبور ہیں۔ چنانچہ ان کو چاہیے کہ اپنے سارے دنیوی معاملات جو ان کی نظر میں نہایت پست اور رکیک چیزیں ہیں، اہل مغرب کے سپرد کر دیں اور خود فرصت ہو کر بھگوان کے نام کی مالا جپیں۔ اور اس سے جو مطلب نکلتا ہے وہ ظاہر ہے۔ یعنی یہی کہ ہندستان کو سیاسی و اقتصادی غلامی سے مفر نہیں۔

Spirilnal genius کا نظریہ White man's burden کے نظریے سے بالکل مترادف ہے۔

گویا ہندستان والوں کی تہذیبی پس ماندگی کو ایک خوبی کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اور پھر اسے نہایت بلیغ فلسفیانہ انداز میں سراہا جاتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک زمانے میں ہندستان والوں پر روحانی تفکر کا غلبہ رہا ہے۔ لیکن وہ کون سی مہذب سوسائٹی ہے جو اس دور سے نہیں گذری؟ ہر انسانی جماعت اپنے ذہنی اور سماجی ارتقا کے ایک مخصوص دور میں روحانی طرز فکر سے کام لیتی ہے۔ یورپ کی جدید اقوام جو آج ایک مادی تہذیب کی امین ہیں، اس تاریخی دور سے گذر چکی ہیں اور اس تاریخی ضرورت کو پورا کر چکی ہیں۔ تقریباً تین سو برس پیشتر تک یورپ بھی ہندستان کی طرح روحانیت میں غرق تھا۔ جدید سائنس اور علمی انکشافات نے اس دور کو ختم کر دیا اور ایک نئے دور کی ابتدا کی جس میں عقلیت پسندی (Ra ionalism) اور سائنسی علم (Scientific knowledge) کو ہی ترقی کی بنیاد قرار پایا۔ ہندستان ابھی اس دور سے نہیں نکلا ہے۔ یہ اس کی پس ماندگی کی علامت ہے کوئی قابل ستائش خصوصیت نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یورپ کے استعمار پسندوں کا روحانیت کو ہندستان والوں کا خاص وصف قرار دینا ایک سیاسی فریب ہے اور بس۔ مقصد یہ ہے کہ ہندستان والے روحانیت میں پھنسے رہیں اور اپنے سیاسی حقوق کا احساس نہ کریں۔

چوتھا فقرہ اس شاعر (کپلنگ) کے دماغ کی پیداوار ہے۔ جو دراصل مغربی استعمار کا ایک بھاری تھا۔ اس کے ظاہری اور لفظی معنی بالکل صاف ہیں۔ مشرق مشرق ہے۔ اور مغرب مغرب۔ اور یہ دونوں کبھی ایک دوسرے کے قریب نہیں ہو سکتے۔ یعنی مشرق کی خصوصیات مغرب کے اوصاف سے مختلف ہیں۔ اور یہ اختلاف بنیادی، قطعی اور دائمی ہے۔ اصلی مطلب اس فقرے کا وہی ہے جو White man's burden اور Spiritual genius کا ہے۔ یعنی یہی کہ اہل مشرق روحانیت کے ماہر ہیں۔ ان کا ذہن روحانی مسائل پر غور و فکر کرنے کی غیر معمولی استعداد رکھتا ہے۔ وہ اپنے فلسفیانہ استغراق کے باعث دنیوی امور کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتے۔ نہ اس کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے برعکس اہل مغرب دنیوی کارگذاریوں اور مادی فتوحات ہی کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ بھاپ اور بجلی کے خالق اور مشینی طاقت کے مالک ہیں۔ انہوں نے کائنات کو مسخر اور فطرت کی اندھی طاقتوں کو مغلوب کر لیا ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ دنیا کی صنعتی ترقی اور سیاسی و اقتصادی تنظیم کے ضامن صحیح معنوں میں وہی ہو سکتے ہیں اور تمام ایشیائی و افریقی ممالک کو چاہیے کہ ان کی کارکردگی اور کارآرائی سے مستفید ہونے کے لئے اپنے ملکی انتظامات کی باگ ڈور ان کے ہاتھوں میں دے دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مغرب اور مشرق میں جو فرق آج پایا جاتا ہے وہ بنیادی اور دائمی نہیں۔ بلکہ سطحی اور وقتی ہے۔ یہ کہنا کہ اس فرق کا سبب مختلف نسلی و ذہنی خصوصیات ہیں سراسر جھوٹ ہے۔ اہل مغرب ایک زمانے میں اتنے ہی "روحانی" تھے جتنے کہ اہل مشرق آج ہیں۔ اور آج اہل مشرق اتنے ہی مادی ہو سکتے ہیں جتنے کہ اہل مغرب اب تک ہو چکے ہیں۔

یہ چاروں فقرے مختلف الفاظ ہیں۔ ایک ہی ذہنیت کا اظہار کرتے ہیں اور چاروں سے ایک ہی مقصد کی تکمیل ہوتی ہے۔ India کا مصنف ایسی ذہنیت کا علمبردار ہے اور اسی مقصد کا خادم۔ یہ چیز اس کے گہرے اور وسیع مطالعے کی تمام خوبیوں پر پانی پھیر دیتی ہے۔

جھیلم

(از جناب نواب جعفر علی خانصاحب آغا لکھنوی)

جھیلم کے دمِ صبح وہ دلچسپ نظارے
بلّور بہا جاتا ہے کرنوں کے سہارے

اوپل کی طرح سطح پر رنگوں کا جھلکنا
یا آڑ سے آنچل کی حسینوں کے اشارے

کھیتی کا وہ جھک جھک کے ہر اک موج سے کہنا
چھاتی سے لگا لوں اگر آ جاؤ کنارے

احسان کا ہرچند صلہ ہو نہیں سکتا
جو پاس ہے میرے وہ ہی صدقے ہیں تمہارے

لہراتے سفیدوں کا ادھر عکسِ لبِ آب
اور ناز سے ہلکورے اُدھر لیتے شکارے

وہ پیچ و خمِ ساحل و امواج کا عالم
آئینے میں گیسو کوئی معشوق سنوارے

موجوں کو شرابور کئے دیتا ہے جو جیں
قطرے ہیں کہ چھوٹی ہوئی افشاں کے ستارے

جذباتِ پرستش میں وہی جوشِ تلاطم
دیوی کوئی جب اپنے پجاری کو پکارے

وہ لحظۂ پُر کیف حیاتِ ابدی ہے
انسان جو آغوش میں فطرت کی گزارے

نالہ ہو کہ نغمہ ہو مزا دے کے رہے گا
جب سینے میں دم رُکنے لگے شوق کے مارے

ہم ہارنے کو ہار گئے عشق کی بازی
المنۃ للّٰہ کہ ہمت نہیں ہارے

کشمیر ترے نام پہ کچھ نغمے لُٹا کر
رُخصت ہیں آغا لیئے وطن آج سدھارے

دباؤ

(از جناب گمن رام پوری)

مغرب میں ڈوبتا ہوا سورج یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی زخمی سپاہی خون میں لت پت آخری سانسیں لے رہا ہو۔ چمپا اپنے مکان کی ڈیوڑھی پر کھڑی رو رہی تھی۔ گل عارض پر لرزاں آنسو وہی منظر پیش کر رہا تھا جو مغرب میں سورج۔ اس کے سامنے ڈوبتا ہوا سورج اور لالی کا یہ جملہ "تم اس مصیبت سے نجات پا سکتی ہو" چکر لگا رہا تھا۔ گاؤں میں تین روز سے ناٹک پارٹی آئی ہوئی تھی۔ اور لالی اسکا روح رواں سمجھا جاتا تھا۔ اسکا منہ بنا بنا کر آنکھیں مٹکا مٹکا کر باتیں کرنا سب کو پسند تھا۔ ویسے بھی لالی چالاک تھا۔ چمپا ناز و نعم میں پل کر جوان ہوئی تھی اور اسی لئے طبیعت میں نسہ اور شوخی تھی۔ بات بات پر مچلنا اسکا شیوہ تھا۔ وہ چاند ایسی سندر تھی۔ چودھویں کے چاند ایسی۔ کیونکہ وہ بھی تو اپنی عمر کی چودھویں منزل پہ قدم رکھ رہی تھی۔ پھر پورنماشی کے چاند ایسی نہ ہوتی تو کیا ہوتی اور ؟ اسکا باپ گاؤں بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ یوں تو اسکی سہیلیاں بہت تھیں۔ لیکن رمو سے اُسکا گہرا بہناپا تھا۔ جب رمو سسرال سے آئی تھی تو اُس کا منہ سفید اور ہونٹ سرخ زنگار سے ایسے تھے۔ چمپا حیران ہوگئی تھی اور پوچھ بیٹھی تھی "یہ کیا ملا ہے منہ اور ہونٹوں پہ" رمو نے ہنسکر جواب دیا تھا "اری پگلی یہ پوڈر اور سرخی ہے اس سے منہ سفید اور ہونٹ سرخ ہو جاتے ہیں۔" چمپا کے دل میں بھی پوڈر اور سرخی لگانے کی آرزو پیدا ہوئی۔ رمو کے قرب نے یہ تمنا پوری کر دی۔ جب وہ سسرال جانے لگی تو پوڈر اور سرخی چمپا کو دے گئی تھی۔ صبح و شام منہ ہاتھ دھو کر پوڈر اور سرخی ملنا اس کا بہترین مشغلہ تھا۔ لیکن اسکی ماں کو یہ اتنا ہی برا لگتا جتنا اُسے اچھا۔ اسکی ماں نے چمپا کی عادت چھڑانے کیلئے سختی شروع کر دی۔ اُسے مارتی پیٹتی اور پوڈر سرخی کی تلاش میں رہتی۔ مگر اُسے کچھ پتہ نہ چلتا۔ ناز و نعمت میں پلی لاڈلی بچی کو ماں کی سختی نے اس سے متنفر کر دیا۔ وہ ماں کی سختی کو جلن اور بغض پر محمول کرنے لگی۔ ماں باپ کا یہ دباؤ اُسے ایک آنکھ نہ بھاتا۔ نفرت و حقارت کی آگ اس کے سینے میں جلنے لگی وہ سوچتی۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے۔ جو وہ مجھے روز روز مارتی ہے۔ پوڈر! اس سے اُسے کیا واسطہ۔ اس کے تو پیسے خرچ نہیں ہوئے۔ اور باپ بھی مجھے ہی مارتا ہے ظالم باپ۔ یہ باپ ہے بچپن میں تو اتنی محبت تھی اب میری ایک نہیں سنتا۔ باپ اور ظالم میں فرق ہی کیا ہے۔ یہی اپنے بچوں کی خواہشات کو اپنے ناجائز دباؤ سے کچلنا چاہتا ہے اور وہ بھی۔ ماں! کتنی سخت ہے یہ ماں اپنے سوکھے ہاتھوں سے میرا منہ نوچ ڈالتی ہے۔ اس کے ہاتھ ایسے ہیں جیسے خزاں رسیدہ درخت کی شاخیں۔

اُس کی ماں صحن میں بیٹھی برتن مانجھنے میں ہمہ تن مصروف تھی۔ کبھی کبھی چمپا کو جو منہ ہاتھ دھو رہی تھی دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ لیتی تھی۔ چمپا منہ ہاتھ دھو کر اندر چلی گئی۔ اُس نے پلنگ پر چڑھکر ایک کپڑا اُٹھایا اور اُسے کھولنا شروع کیا۔ پوڈر کی پڑیا اور سرخی کی ڈبیا نکال کر منہ پر خوب خوب پوڈر ملا اور ہونٹوں کو سرخی سے "لب لعلیں" بنا ڈالا۔ اس کام سے فراغت پاکر اُس نے اپنا عکس آئینہ میں دیکھا اس کے لبوں پر مسکراہٹ کی لہر دوڑ گئی۔ وہ جلدی جلدی پوڈر کی ڈبیا اور سرخی کی ڈبیا کو کپڑے میں لپیٹنے لگی۔ اُس کی ماں آندھی کی طرح کمرے میں داخل ہوئی اُس کے چہرے سے عجب وحشت برس رہی تھی۔

"تو نے بہت تنگ کیا ہے بے شرم!" اُسکی ماں نے آتے ہی کہا۔

"میں نے ؟ کیا تنگ کیا ہے تجھے ؟" چمپا نے جواب دیا۔

"بے شرم! تجھے لجیا نہیں آتی۔ گاؤں کے لڑکے کیا کہتے ہونگے۔ کس سے آنکھیں لگا لی ہیں ؟"

غصہ اور اضطراب کی حالت میں وہ کہتی رہی۔ "کس کو سنگار دکھاتی ہے ؟"

اُس نے بڑھکر چمپا کے ہاتھ سے کپڑا چھین لیا۔ پوڈر زمین پر بکھیر کر پاؤں سے مسل دیا۔ اور سرخی کی ڈبیا باہر پھینک دی۔

"میرا پوڈر! میری سرخی!! بھگوان کرے تو مر جائے" چمپا نے روتے ہوئے کہا۔

"یہ زبان! ڈوب مر کہیں کنواری کنیا اور سنگار کرے۔ کلنکی!"

یہ کہکر اس نے اپنا ہاتھ اوپر اُٹھایا۔ پھیلا ہوا ہاتھ تڑاخ سے چمپا کے منہ پہ پڑا۔ وہ بلبلا اُٹھی ———

مار سے کیا ہوتا ؟ مار تو وہ روز کھاتی تھی۔ لیکن اس کا پوڈر اور سرخی پھینکی جا چکی تھی۔ کنواری کنیا کو وہ کیا سمجھتی۔ اُس کے ماں باپ نے تو اُسے کنواری کنیا کا مطلب سمجھنے کا موقعہ ہی نہ دیا تھا۔ وہ تو دیہاتی اکھڑ پن سے کام لیتے۔ اور سختی سے اُسے دباتے۔ لیکن سختی سے کوئی جذبہ دبا ہے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ "بھگوان کرے تیرا ناش ہو۔"

"تو تباہ ہو"
اس کی ماں نے دو تین لاتیں اور رسید کیں۔ "نکل جا یہاں سے باہر" اسکی ماں نے غصے سے دھکا دیتے ہوئے کہا۔
وہ روتی ہوئی باہر چلی گئی ——————
تاریکی کے بڑھتے ہوئے پھیلاؤ میں کائنات کا ہر ذرہ سکڑا جا رہا تھا۔ چمپا نے اندر کی طرف دیکھا اور —— اور بھاگ گئی ——————
صبح کو سمدھو بنئے کی دکان پر بیٹھے ہوئے دو تین آدمی باتیں کر رہے تھے

"تمھو کی لڑکی چمپا بھاگ گئی" ایک نے کہا۔
"ناک کاٹ دی بیچارے کی" ۔ دوسرے نے کہا۔
سمدھو بنئے نے پوچھا۔ "کس نے بھگائی؟"
ایک آدمی حقہ کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولا۔ "لال نے ۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا کہ اسکی نظر (نظر) گھڑی گھڑی چمپا پر پڑتی ہے۔"
"لیکن یار" سمدھو بنیا بولا: "اسکی ماں نے تو نہیں بھگا دی؟"
"ایں! پاگل تو نہیں ہے تو" کسی نے جواب دیا ——————
اور ایک قہقہہ فضا میں گونجنے لگا۔



کشمکش

از جناب عرشی خیرآبادی

پھر کھول دوں میخانۂ فطرت کے دریچے
پھر سے غمِ ولالہ کے حسیں جام اُٹھالوں
پھر جوڑ دوں اُمید کے ٹوٹے ہوئے رشتے
پھر بزمِ تمنّا میں کوئی ساز اُٹھالوں
پھر چھیڑ دوں بھولے ہوئے رنگین ترانے
پھر سازِ محبت کا ہر اک تار ہلا لوں
پھر چارۂ ویرانیٔ دل ڈھونڈ کے لاؤں
پھر اُن کی نگاہوں کو نگاہوں میں بسالوں
یا ختم کروں سوزشِ پنہاں کا تسلسل
اک درد کے آغاز کو انجام بنالوں
وہ نقش جو خاطر کے لئے بارِ گراں ہیں
اک بار انہیں لوحِ تخیل سے مٹا لوں
یا وقت کے ماتھے پہ دمکتا ہے جو شعلہ
اُس شعلۂ جاں سوز کو سینے میں چھپا لوں
افکار کو دوں دعوتِ آزادیٔ انساں
احساس کو صدیوں کی غلامی سے چھڑالوں
نہ پر مری نظروں سے کے ہو ایوانِ امارت
مزدور کے جذبے کی قسم آج سے کھالوں
احساس کی دنیا میں کوئی فتنہ گری کر
اے کشمکشِ زیست مری راہبری کر

غزلیات

(جناب پرواز زبیر جعفری)

(۱)

مضرابِ محبت ہے کس درجہ نشاط آمیز
ادراک کی منزل ہے پُرسوز و جنوں انگیز

ہے فقر میں پوشیدہ اسرارِ ملوکانہ
کیا دبدبۂ کسریٰ کیا طنطنۂ چنگیز

اب سازِ تمنا میں وہ درد کہاں باقی
جو ساز کو بھی پھونکے وہ سوزِ جنوں آمیز

کر فقر و محبت سے معراجِ بقا حاصل
غارت گرِ ہستی تھا ہر حوصلۂ چنگیز

یہ حسن کی رنگینی لالہ ہے نہ شعلہ ہے
یہ عشق کی اک ضو ہے بجلی سے زیادہ تیز

(۲)

وہی قیدِ غمِ آلامِ جہاں ہے کہ جو تھی
زندگی بارِ گراں۔ بارِ گراں ہے کہ جو تھی

نغمۂ سازِ محبت سے ہے کیا کام مجھے
زندگی اب بھی وہی شورشِ جاں ہے کہ جو تھی

کبھی قسمت میں بلندی ہے کبھی ہے پستی
زندگی آج بھی اک موجِ رواں ہے کہ جو تھی

ہے تجسس کی نظر میں یہ فریبِ جلوہ
لیکن اپنی وہی چشمِ نگراں ہے کہ جو تھی

اب بجز یاس کے کچھ بھی نہ رہا حاصلِ شوق
اب مرے دل میں وہ اُمید کہاں ہے کہ جو تھی

دامِ ہستی میں تعین کی حقیقت معلوم
زندگی ڈھونڈ رہا ہوں وہ کہاں ہے کہ جو تھی

میرے اس خواب کی تعبیر وہی ہے پرواز
زندگی اب بھی وہی خوابِ گراں ہے کہ جو تھی

ٹیگور کی شاعری

(از محترمہ مس وحیدہ عزیز بی، اے)

مغرب کے نقادانِ سخن کہتے ہیں کہ" زمانہ اپنی رفتار کے مطابق شاعر پیدا کرتا رہتا ہے۔ اور ہر شاعر اپنے زمانہ کے حالات کا ایک مجسمہ ہوتا ہے" شاعری کی تاریخ اس دعویٰ کا ایک بین ثبوت پیش کرتی ہے اور اقوام عالم کے مختلف زمانوں کی حالت اس کی صداقت کی ایک مکمل دلیل ہے۔

جب کسی قوم میں شجاعت اور جوانمردی کا جوہر کمال پر ہوتا ہے اس کے افراد میدانِ کارزار کو عیش و نشاط کا ایوان خیال کرتے ہیں۔ شمشیر کی عریانی ہلال عید کی تابانی کا لطف پیدا کرتی ہے۔ تو شاعر نعرہ جنگ بلند کرتا ہے اور قتل و غارت کا طبل بجاتا ہوا اٹھتا ہے۔ وہ گوہرافشانی نہیں شرر ریز ہوتا ہے۔ اس کے منہ سے پھول نہیں جھڑتے بلکہ چنگاریاں برستی ہیں۔

اس کی شعلہ بیانی میں ایک داستانِ شجاعت پنہاں ہوتی ہے۔ جو ملکوں اور قوموں کو زیر و زبر کر دیتی ہے۔ اس نوع کے شاعر ازمنہ تاریک میں سینکڑوں کی تعداد میں پیدا ہوئے۔ سپارٹا کی فتوحات کا باعث ایک نحیف البدن شاعر تھا۔ جسے یونانیوں نے فوجی خدمت کے ناقابل سمجھ رکھا تھا۔ عرب کا نابینا شاعر قبیلوں کی قسمت کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ اس کا ایک شعر ہنگامہ قتال کی آتش افروزی کے لئے کافی تھا۔

لیکن قوم کی حالت میں ایک اور دور بھی آتا ہے جب غیر ٹھوکریں مارتے ہیں، ظلم کرتے ہیں۔ ان کا حق دبا بیٹھتے ہیں۔ مگر افراد قوم کچھ ایسے تعیش میں گرے رہتے ہیں کہ چپکے سے بے شرمی کی باتیں سہے جاتے ہیں، اور اپنے انحطاط کو انتہائی تہذیب اور اپنی بے غیرتی کو قناعت اور صبر کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔ اس وقت نظام طبعی کے توازن کو قائم رکھنے کے لئے دہر پہلو بدلتی ہے اور اس زمین شور سے ایسے پیغمبرانِ سخن اٹھاتی ہے۔ جو اپنی اعجاز بیانیوں سے نیم مردہ قوم کے یخ بستہ جذبات کو سخن کی آگ سے گرما دیتے ہیں۔

چنانچہ حالی اس سلسلہ کا پہلا پیغامبر تھا۔ جس نے اپنے دلگداز نعروں سے خوابیدہ قوم کو جگایا۔ اکبر کے ترجمہ را دیہ طعنہ زن نغموں نے اس پر تیل چھڑکا۔ اقبال نے اپنی شعلہ نوائی سے یہ آگ مغرب کے کونہ کونہ میں پہنچا دی۔ اور ٹیگور نے محسوس کیا کہ یورپ کی مادی تہذیب دنیا کو بام ترقی کی طرف نہیں بلکہ غار تنزل کی طرف لے جا رہی ہے۔ دولت کی قدر پرستش کے درجہ کو پہنچ چکی ہے۔ اور افراد میں جذبہ روحانیت بالکل مفقود ہو چکا ہے۔

افسانہ نویسی

ٹیگور آنجہانی نہ صرف ایک افسانہ نویس تھے بلکہ ان کی غیر معمولی طباع ذہنیت ہر شعبہ ادب میں نمایاں تھی۔ وہ نہ صرف شاعر کی حیثیت سے ایک نمایاں شخصیت کے مالک تھے۔ بلکہ نغمہ سازی کی حیثیت سے بھی اوج کمال پر پہنچے ہوئے تھے۔ ان کا نغمہ سازی کائنات سے ہم آہنگ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ آناً فاناً سارے بنگال میں مقبول خاص و عام ہوئے اور پھر ان کی شہرت دیارِ مغرب میں بھی اپنا خراج وصول کرنے کے لئے نکل گئی۔ شاید بہت کم نغمہ سازوں کو ایسی خوش بختی نصیب ہوئی ہوگی۔

ناول نویس کی حیثیت سے اگرچہ بہت سے لوگ انہیں بنکم چندر چیٹرجی اور سرت چندر چیٹرجی سے کم پایہ سمجھتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مختصر افسانہ (Short story) کی سرزمین پر کوئی اور تاجدار ان کے مقابلہ کیلئے نظر نہیں آتا۔ ان ہی افسانوں کے ذریعہ ٹیگور نے لوگوں کے دلوں میں وہ تار چھیڑ دیا تھا جو مدت سے ایک نوقانی حزب انمار کے زخمہ کا منتظر تھا۔ انکے ڈرامے فلسفیانہ مضامین، لیکچر اور خطوط جو ان کی زندگی کے آخری حصہ میں اس قدر زبردست سیلاب کے ساتھ پے در پے امنڈ امنڈ کر صفحہ قرطاس پر پھیلتے چلے گئے۔ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ایک حقیقی انسانیت کے داعی اور مرنجان مرنج انسان تھے۔ ایک شدید احساس ہمدردی آدم کا ہمیشہ ان کے دل میں موجزن رہتا تھا۔

ٹیگور کے کلام میں سب سے بڑی خوبصورتی یہ ہے کہ اس میں روحانی رنگ غالب ہے۔ "گیتانجلی" اس کلام کا انگریزی مجموعہ ہے جو ۱۹۱۳ء میں شائع ہوا۔ اور جب اس پر آپ کو نوبل پرائز ملا تو ساری دنیا کی نگاہیں آپ کی طرف جھک پڑیں۔ دنیائے ادب مسٹر ڈبلیو۔ بی۔ ٹیس (W. B. Yeats) کی ہمیشہ ممنون رہے گی کہ انہی کی کوشش سے "گیتانجلی" نے شاعر کی لاابالی طبیعت کی دستبرد سے نجات پائی اور دنیا اس بیش بہا خزانہ سے مالامال ہوئی۔

فلسفۂ تصوّف

قدیم ایشیائی شاعری کے قدردان ٹیگور کے کلام میں تصوف کے متلاشی

سمجھتے ہیں۔ بعض بگمشتہ فطرت ان کی نیچیریت کے معترف ہیں اور بعض لوگوں کو اُن کے کلام میں سیاست ہی سیاست نظر آتی ہے۔ لیکن اگر اسے غور سے پڑھا جائے تو اس میں جذبات ہی جذبات ہیں۔ تصوف اب اُردو زبان میں پرانی چیز ہو گئی ہے۔ لیکن بقول پروفیسر براؤن دُنیا کا کوئی مذہب اس سے خالی نہیں ہے اور یہی تصوف کی خصوصیت ہے۔ بھگتی یا خدا کی تلاش تمام دنیا کا مقصود اعظم ہے۔ "گیتانجلی" کا اقتباس ذیل ملاحظہ ہو۔ ٹیگور "تصوف" سے یہ مراد لیتے ہیں۔

"میرے سفر کی مدت دراز [illegible] منزل کی راہ دُور ہے۔ میں سورج کی پہلی کرن کے رتھ پر آیا تھا، دُنیا بھر کے بیابانوں میں بادیہ پیمائی کر چکا ہوں۔ صدہا ستاروں اور سیاروں پر اپنے نقش قدم چھوڑ آیا ہوں لیکن میری ترب ہنوز دُور ہے۔ اور وہ راستہ جو منزل مقصود تک جاتا ہے۔ بہت نازک ہے۔ مسافر کو منزل مقصود تک پہنچنے پر ایک دروازہ کی کنڈی کھٹکھٹانی ہوگی۔ کیونکہ کوئی رہرو دنیا بھر کی خاک چھاننے کے بغیر حرم کعبہ دل اور معبدگاہ رُوح تک نہیں پہنچ سکتا ہے۔"

کیا اس تصوف اور منصور کے تصوف میں کوئی فرق ہے؟

اب "گیتانجلی" سے ذرا اُن کی نیچیریت ملاحظہ ہو۔

"دن ختم ہو گیا۔ تاریکی کا سایہ تمام دُنیا پر پھیل گیا۔ اس وقت میں ندی کے کنارے صراحی بھرنے جاتا ہوں۔ شام کی ہوا پانی کے اُداس نغمے سے ہم آہنگ ہے۔ مجھے اندھیرے میں بلاتی ہے۔ مگر سنسان گلی میں کوئی رہرو موجود نہیں ہے۔

ہوا نہایت تیزی سے چل رہی ہے۔ اور دریا کی لہریں بھی سطح آب پر تیزی سے دوڑ رہی ہیں۔

کیا معلوم میں گھر لوٹ سکوں یا نہیں۔ خبر نہیں کس سے ملنے کا اتفاق ہو۔ ندی اُترنے کے مقام پر ایک چھوٹی سی کشتی [illegible] کوئی شخص اس میں بانسری بجا رہا ہے۔

بادی النظر میں یہ ایک [illegible] نیچیرل سینری کا تجربہ ہے۔ کیونکہ دور کی بانسری کی آواز تو اُردو زبان کے شعرا کو بھی [illegible] جو ابتک معشوق کے زلف میں گرفتار ہیں سہانی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن "گیتانجلی" کے آخری [illegible] بھی مایوسی کا خیال ہی پیدا نہیں ہونے دیتے واقعی جب بازندگی کی دھوپ ختم ہونے کے بعد عدم کی تاریکی چھا جائیگی تو شہر خموشاں کے سناٹے میں اس نامعلوم شخص کی بانسری کا محبت بھرا نغمہ عدم وہستی کی فضاؤں میں تحلیل ہوتا ہوا معلوم ہوگا۔ اس وقت یہ معلوم ہوگا کہ یہ تمام نہاد نیچیریت کچھ اور ہی چیز تھی۔

نظریہ سیاست

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ادب کے معاشرتی پہلو کا اہم سیاست ہے

اور مفہوم کی غلط فہمی سے حیات ظاہری کو حیات باطنی سے کوسوں دُور تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہر پہلو جو زندگی [illegible] سے رنگا ہوا ہو سیاست سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ٹیگور دراصل مشرقی روحانیت کو مغربی تمہیدیت سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اگر بنظر مطالعہ دیکھا جائے تو یہ بھی کیفیت روحانی کی ایک صورت ہے۔ جو زندگی سے ہم آہنگ ہو کر اس طرح نمودار ہوتی ہے۔ ٹیگور نے اس کیفیت روحانی کو دو طریقوں پر زندگی کے ہم آہنگ بنانے کی کوشش کی ہے۔

ان میں سے ایک کی بنیاد کیفیت پر ہے اور دوسری حُسن و خوبصورتی کا پہلو لئے ہوئے ہے۔ اور یہ ٹیگور کے ایک کامیاب نقاش اور حقیقی مصور ہونے کی بدولت ہے۔ اُن کے کلام میں جو روحانی کیفیت پیدا ہوتا ہے اس کی بنیاد نغمۂ رُوح اور وجدانِ شخصیت پر ہے۔ ٹیگور ہماری صدی کے ایک کامیاب مُغنی بھی ہوئے ہیں۔ اور اس اعتبار سے انہیں خدا وقت کہنا بے جا نہ ہوگا۔

غرض یہ جذبہ جو دراصل منتہائے مقصود حیات ہے۔ اور سطحی طور پر سیاسی جذبہ سمجھا جاتا ہے۔ تمدن جدید کی جان اور سیاسی عقیدے کا معراج کمال ہے۔ اس کی تمثیل "گیتانجلی" کا وہ نغمہ ہے جس پہ ٹیگور کو نوبل پرائز ملا۔ یہ وہ دُعا ہے جس سے مُراد "حقیقی آزادی" ہے۔ اور سچ تو یہ ہے [illegible] یہ ہی وہ مناجات ہے جو ہندوستان کے ہر باشندے [illegible] امتیاز مذہب وملت دُعا اور جزو عبادت ہو سکتی ہے۔

مغرب کے نقاد جہاں اقبال اور ٹیگور کی ہمہ گیر شخصیتوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہاں یہ بھی کہدیتے ہیں کہ ان کی تعلیم دنیا کو جنگ و جدال کی طرف لے جانا چاہتی ہے۔ وہ اس بات کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کہ مردانگی، شجاعت، اخلاق و مذہبی تعلیم ہر ملک اور قوم کے لئے ضروری ہے۔ اقبال اور ٹیگور میں یہ دونوں صفتیں [illegible] موجود ہیں۔ ان دونوں کے کلام کا ہر مصرعہ اک جذبۂ آتشیں سے معمور ہے۔ جس کی تاثیر ملک اور قوم کو بیدار کر رہی ہے۔ یہ شاعر بھی ہیں۔ عالم بھی اور فلسفی بھی۔ مگر یورپ کی کم نظری ہے کہ وہ ان کی عظمت کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔

بہار

از محترمہ عزیز جہاں بیگم صاحبہ آدا بدایونی

منہ غنچے کا ابر دھو رہا ہے
سامان بہار ہو رہا ہے

گھر آئیں گھٹائیں اودی اودی
پھولوں کی مہک ہے بھینی بھینی

خوشبو میں بسی ہوئی ہے پروا
دلہن سی بنی ہوئی ہے پروا

شرما کے جھکی ہوئی ہیں شاخیں
پھولوں سے لدی ہوئی ہیں شاخیں

آتے ہیں امنڈ کے کالے بادل
پھیلا ہوا انکھڑیوں میں کاجل

آوارہ ہیں یوں ہوا کے جھونکے
جس طرح امنگ دل میں اٹھے

سبزہ یہ بگڑ کے بن رہا ہے
یا روٹھ کے کوئی من رہا ہے

جنگل میں چمک رہی ہے بجلی
دل بن کے دھڑک رہی ہے بجلی

یوں ہجر کی تلخیوں میں جیسے
گزرا ہوا عیش یاد آئے

مصری سی دلوں میں گھولتے ہیں
امبوا پہ پپیہے بولتے ہیں

میں اب بھی مگر اداس سی ہوں
چپ چپ سی ہوں کچھ اداس سی ہوں

حیران تم اتنی کیوں ہو سکھی!
بے وجہ نہیں مری خموشی

متوالی سکھی بہک گئی ہو
تم اس کو بہار کہہ رہی ہو

تم بوندیاں کہہ کے خوش ہو مہرو
یہ تو ہیں فلک کے چند آنسو

ساون کی جھڑی لگی ہوئی ہے
بادل کی گھٹا برس رہی ہے

تم جس کو سمجھ رہی ہو خوشبو
آہیں ہیں بہار کی یہ ہر سو

کلیاں یہ کھلائی ہیں ہوا نے
یا دل کے کئے ہیں لاکھ ٹکڑے

پھولوں پہ یہ تتلیاں کہاں ہیں
یادیں کچھ ہیں کہ پرفشاں ہیں

جینے کی امیدیں ٹوٹتی ہیں
جب کوئلیں بن میں کوکتی ہیں

البیلی کلی جو چونکتی ہے
بجلی سی نظر میں کوندتی ہے

عذرائے سحر سے کوئی کہہ دے
آ آ کے نہ یوں مجھے ستائے

چھپتا ہے جو نور بام و در پر
گرتی ہے کٹار سی جگر پر

مدت سے رہین غم نظر ہے
اس رات کی بھی کوئی سحر ہے

یہ ارض و سما تھے زیر فرماں
اک دور تھا جب خوشی تھی ارزاں

جب حسن پہ عشق کا گماں تھا
جب عشق فسردہ کامراں تھا

جب فرق گدائے بے نوا پر
تھا تاج شہانہ جلوہ گستر

وہ ناز و نیاز دیدنی تھا
مجھ پر بھی وہ مہرباں کبھی تھا

اگلی سی وہ بات اب کہاں ہے
وہ موسم گل تھا یہ خزاں ہے

ترقی پسند شاعری اور مجاز

(از محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی)

ہماری اُردو شاعری اپنے اجداد کے بنائے ہوئے راستے پر چلی جارہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ غزل خوانی اور مرثیہ خوانی ہمیشہ ہی ہوتی رہے گی۔ پُرانی عظمت کی داستانیں ہمیشہ ہی دُہرائی جائیں گی۔ اور اہلِ محفل کو ماضی کی فرسودہ روایات سے خوب خوب لُبھایا جائیگا۔ لیکن اُردو ادب نے ایک زبردست کروٹ لی۔ اور وہ ادب جو اب تک سماجی زندگی سے بے نیاز تھا۔ اب اسی سے اس کا چولی دامن کا ساتھ ہوگیا۔ ۱۸۵۷ء میں ایک زبردست سیاسی جدوجہد ہوئی جو عرصہ تک ہماری سماجی زندگی پر اثر ڈالتی رہی۔ یہ کشمکش کچھ معمولی نہ تھی۔ اس کا اثر جاگیرداروں سے لیکر عوام تک یکساں ہوا۔ مگر جب ہمارا شاعر شعر کہتا تھا تو گویا اپنے اردگرد کے ماحول میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ لیکن ہنگامی دور میں دو چار شعر سمندر میں ایک قطرے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان کے مقابلہ میں عشقیہ شاعری کا ایک زبردست ذخیرہ موجود ہے جو اس تحریک سے کہیں بھی متاثر نہیں۔ لیکن یہ زمانہ کب تک رہتا۔ ایسے سخنور بھی پیدا ہوئے جن کے دلوں میں درد تھا جنھوں نے قوم کی زبوں حالی کو دیکھا انہوں نے اس قوم پر مرثیہ لکھا۔ مگر ناامید نہیں کیا۔ اور زمانے کی رفتار کے ساتھ چلنے کو کہا۔ حالیؔ نے مسدس میں ایک نیا پیغام دیا۔ ادب اُردو کے سمندر میں پہلی بار مدوجزر آیا جس سے معلوم ہوا کہ جو سطح بظاہر غیر متحرک معلوم ہوتی ہے۔ اس میں بھی طوفان آسکتا ہے۔

حالیؔ نے جس عمارت کی بنیاد رکھی اب آہستہ آہستہ اس پر اینٹیں چنی جانے لگیں۔ اب تک جو آوازیں نکل رہی تھیں اُن میں کچھ گھٹن تھی مگر یہ جوش پاک آخر کب تک دبایا جاسکتا۔ کیونکہ "یہ آگ وہ ہے جو پانی دبا نہیں سکتا"

حالیؔ کے بعد چکبستؔ نے اس حب الوطنی کے جذبہ کو محسوس کیا اور اس نے برملا دل اعلان کردیا ؎

حکم حاکم کا ہی فریاد زبانی رک جائے — دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے
قوم کہتی ہے ہوا بند ہو پانی رک جائے — دل کی بہتی ہوئی گنگا کی روانی رک جائے

ہوں خبردار جنھوں نے یہ اذیت دی ہے
کچھ تماشا نہیں اب قوم نے کروٹ لی ہے

لیکن اس وطن پرستی کے احساس نے ایک نیا راستہ کردیا جس پر سے گزر کر ہمارے ادب نے اپنی سماجی زندگی پر ایک نظر ڈالی۔ اور جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہی روس میں ایک انقلاب ہوگیا۔ نہ صرف زار کی حکومت ختم ہوگئی بلکہ ایک جمہوری نظام قائم ہوگیا۔ لوگوں کو معلوم ہوگیا تھا کہ ملکی حکومت بھی ہماری انفرادی آزادی کی راہ میں ایک روڑا ہے۔ تو یہ ختم ہوگئی تھی اور اب جہاں غیر ملکی حاکم کو قوم کی کروٹ سے ڈرایا جاتا تھا وہاں اب یہ بتا دیا گیا ؎

گیا دورِ سرمایہ داری گیا — تماشا دکھا کر مداری گیا

اقبالؔ نے بھی اس کو سوچا۔ اُس نے بھی فرسودہ نظام کی دھجیاں اُڑائیں۔ یہ ہیں ہماری بوسیدہ روایات۔ ان کے سہارے چلکر ہم انفرادی و جمہوری آزادی حاصل نہیں کرسکتے۔ انسانیت کا قافلہ جارہا ہے۔ وہ اب کسی کے روکے نہیں رُکے گا اقبالؔ نے بھی اعلان کردیا ؎

سُلطانیٔ جمہور کا آتا ہے زمانہ — جو نقش کہن تم کو نظر آئے مٹا دو

اور وہ وقت آگیا کہ وہ کنجشک جس کو شاہین بہ آسانی ختم کردیتا تھا کہ اس کی آواز بھی نہ سُنائی دیتی تھی۔ آج شاہین سے لڑنے کے لئے تیار ہے۔ یہ کتنی بڑی تبدیلی تھی۔ وہ ادب جو سماجی و سیاسی حالات سے بھاگتا تھا اب دھیرے دھیرے اُن کے لئے شمع راہ ہوگیا —— آخر یہ کیوں ہوا؟ جہاں ہندوستان کی سیاسی بیداری اس کی ذمہ دار تھی وہیں ایک اور بھی طاقت تھی جس نے سونے پر سُہاگے کا کام کیا۔ پروفیسر اعجاز حسین نے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

ہماری اُردو شاعری کے سیاسی رجحان میں اس وقت انقلاب برپا ہوگیا جبکہ اشتراکیت کا زور ہندوستان کی سیاست میں کھڑ گیا۔ مزدور، کسان، افلاس، بے کاری، بغاوت، سرمایہ داری، حکومت، ملوکیت، موافق و مخالف خصوصیات خاص موضوع قرار دئے حیات عامہ نے قصر ادب پر دستک دی کہ ہم کو بھی اندر آنے کی اجازت دی جائے۔ دروازہ کھلتے ہی اُس نے اپنے حقوق و مطالبات کی فہرست پیش کی۔ شعر کی دیوی نے گلے سے لگالیا۔ ادا شناس شعرا کی طرف اشارہ کیا انہوں نے جوش و تپاک کے ساتھ اس کا خیر مقدم کیا۔

مجازؔ بھی انہیں اداشناس شعرا میں سے ہے جس نے اس کے تمام مطالبات کو اپنے کارناموں کا عنوان بنایا۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ اس کی شاعری کی ابتدا اسی سے ہوئی۔ وہی شاعر جو رومان کی راہ میں گامزن تھا اپنی منزل دوسری طرف تلاش کرتا ہے۔

حکومت کے مظاہر جنگ کے پُر ہول نقشے ہیں
کداں کے مقابل توپ، بندوقیں ہیں نیزے ہیں
سلاسل، تازیانے، بیڑیاں، پھانسی کے تختے ہیں
مگر میں اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہی جاتا ہوں

ایک تاریک فضا ہے۔ دُھوئیں کی بدلیاں ہیں۔ گولیوں کی سنسناہٹ ہر طرف سنائی دے رہی ہے۔ ہر طرف اجل قہقہے لگا رہی ہے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا مگر ہمارا شاعر مستقل مزاج ہے۔ وہ اپنی منزلِ مقصود کا خیال لیکر آگے بڑھتا ہے۔ وہ کہیں بھی نااُمید نہیں ہوتا اور نااُمید کیوں ہو ع

کچھ نہیں تو کم سے کم خوابِ سحر دیکھا تو ہے

صبح نو کی اُمید جلوہ گر ہے۔ صرف اُمید ہی نہیں ایک عتماد ہے۔ یہ تاریکی سرمایہ داری کے ساتھ ختم ہو جائیگی۔ اس کے بیچ و خم میں زمانے کا اندوہ پوشیدہ ہے ایک نیرا وان مخلوق اس کے ساتھ ہے۔ ایک دن ایسا آئیگا کہ اس مخلوق کا نشیمن آندھی کی رو سے بچ نکلے گا۔ اور وہ اس کو اچھی طرح سجا بھی لیگا۔ لیکن ابھی تو بجلی کوند رہی ہے۔ دہقان کا خرمن اس کی زد میں ہے۔ یہ ہی ہے وہ سرمایہ داری کی آندھی اور بجلی ——

سرمایہ داری میں مجازؔ نے اُس کی اچھی مثالیں پیش کی ہیں۔ ہر چند اس میں خیالات کی گہرائی اوروں کے مقابلہ میں کم ہے اور فنی اعتبار سے کچا پن بھی پایا جاتا ہے مگر جذبات کی شدت ان سب پر حاوی ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

کلیجہ پھنک رہا ہے اور زباں کہنے سے عاری ہے
بتاؤں کیا تمہیں کیا چیز یہ سرمایہ داری ہے

مگر آگے چل کر جذبات نے اور بیان پر قدرت حاصل کرلی ہے سرمایہ داری پر اُردو ادب میں مشکل ہی سے ایسی مثال ملیگی۔ مجازؔ نے اُس کے ظلم و ستم اس کی نظرت کے بیان کرنے کے بعد اس کی انحطاطی حالت کا نقشہ کتنا اچھا کھینچا ہے ؎

مگر بدمست ہے ہر ہر قدم پر لڑکھڑاتی ہے

وہ جانتا ہے کہ اسی موقع سے فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے ؎

مُبارک دوستو لبریز ہے اب اُس کا پیمانہ
اُٹھاؤ آندھیاں کمزور ہے بنیادِ کاشانہ

مجازؔ کے یہاں ایک خاص قسم کا تضاد پایا جاتا ہے۔ کبھی تو وہ انقلاب کا سُرخ پرچم لئے ہوئے بڑھتا ہے۔ اور کبھی وہ گُلابی آنچل کی آڑ میں پناہ لیتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کسی ایسے مرض میں مبتلا ہے جو بار بار حملہ کرتا ہے کبھی تو وہ اچھا ہو جاتا ہے اور کبھی پھر بیمار۔ جذبات کی رو میں بہنے والا شاعر کبھی نوجوانوں کو انقلاب کی آمد کا انتظار کرنے کے بجائے خود انقلاب پیدا کرنے پر مجبور کرتا ہے اور کبھی وہ خود انقلاب سے بے پروا ہو جاتا ہے۔

مجازؔ پر رومان بری طرح حاوی ہے۔ اور سایہ کی طرح اُس کے ساتھ ہے وہ اکثر خود بھی سوچتا ہے کہ کاش اس کا پیچھا چھوٹ جاتا اور بعض اوقات تو وہ سمجھتا ہے کہ رومان سے دور انقلاب کی بستی میں آگیا۔ مگر وہ تو غیر شعوری طور سے اس کے ساتھ ہے۔ بالآخر وہ اس سے مخاطب ہوتا ہے اور کہتا ہے ؎

چھوڑ دے مطرب بس اب للہ پیچھا چھوڑ دے

اس سے تھک کر پھر عاجزی سے درخواست بھی کرتا ہے ؎

مجھکو تیرے سحرِ موسیقی سے کب انکار ہے	مجھکو تیرے لحنِ داؤدی سے کب انکار ہے
بزمِ ہستی کا مگر کیا رنگ ہے یہ بھی تو دیکھ	ہر زباں پر اب صلائے جنگ ہے یہ بھی تو دیکھ
فرشِ گیتی سے سکوں اب مائلِ پرواز ہے	ابر کے پردوں میں سازِ جنگ کی آواز ہے

پھینک دے اے دوست اب بھی پھینک دے اپنا رباب
اُٹھنے ہی والا ہے کوئی دم میں شورِ انقلاب

لیکن رومان گو وقتی طور سے بے حس ہو جاتا ہے لیکن تھوڑی دیر میں پھر اٹکھیلیاں شروع کر دیتا ہے۔ اُس کی نفسیاتی وجہ یہ ہے کہ مجازؔ اپنے محبوب سے فیض کی طرح براہ راست یہ کہتا ہوا جھجکتا ہے کہ ع

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

اور یہی وجہ ہے کہ بہت جلد انقلاب کا شاعر خاموشی سے میکدہ میں پہنچ جاتا ہے۔ اور اب اس کے سامنے ماورائے ساقی کچھ نہیں۔ چنانچہ کہتا ہے ؎

چھلکتی ہے جو تیرے جام سے اُس مے کا کیا کہنا
ترے شاداب ہونٹوں کی مگر کچھ اور ہے ساقی
مجھے پینے دے، پینے دے کہ تیرے جام لعلیں میں
ابھی کچھ اور ہے، کچھ اور ہے، کچھ اور ہے ساقی

لیکن یہ اُتار چڑھاؤ مجازؔ کی شاعرانہ فطرت ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ ایک نشہ ہے کہ جو یونہی اُترتا چڑھتا ہے۔ اس قسم کی شاعرانہ لغزشیں مجازؔ سے عموماً سرزد ہوتی ہیں۔ بغاوت کا عزم رکھنے والا "مزدور" مجازؔ پھر رقص و سرود کا دلدادہ نظر آتا ہے۔ اگلی صبح اگر اس کو اپنے سفر پر جانا ہے تو بقیہ لمحات میں وہ دو گھڑی خود کو شادماں کرنا چاہتا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح ایک مہمان جیسے کسی خاص مہم پر جاتا ہے۔ ایسے تعیشانہ جذبات رکھتا ہے۔ ایسے موقع پر جب کہ ایک طرف ——

زندگی منتظر ہے مُنہ پھاڑے

زندگی خاک و خون میں تھڑی
آنکھ میں شعلہ ہائے تند لئے

——— کھڑی ہے تو شاعر خود کو سبکدوش کرنا چاہتا ہے جب سینۂ گیتی میں زلزلہ آ رہا ہے دُنیا ایک زبردست انقلابی دور سے گذر رہی ہے۔ انسانیت موت اور زیست کے درمیان ایک عجیب کشمکش میں ہے۔ دان کے بازوں میں سُرخی آگئی تو ایسے وقت میں شاعر کا ایسا کون سا ذوقِ نہاں ہے جس کو وہ کامران کرنا چاہتا ہے۔ کیا وہ اس جد و جہد میں حصّہ لینے کے لئے چلا جاتا تو واپس آنے کے کوئی امکانات نہیں۔ جو شخص اس قدر مایوس ہوکر مار رہا ہو۔ بھلا وہ اپنی منزلِ مقصود پہ کس طرح پہنچے گا۔

پھر کہاں یہ حسین شبہانی رات
یہ فراغت یہ کیف کے لمحات
کچھ تو آسودگیٔ ذوقِ نہاں
کچھ تو تسکینِ شورشِ جذبات
آج کی رات جاوداں کرلیں
آج کی رات اور آج کی رات

اسی عیش و عشرت کے لمحات کو وہ جاوداں سمجھتا ہے۔ گویا اسکی زندگی کا یہی ماحصل ہے۔ یہی وہ انفرادیت پسند طبیعت ہے جو دُکھڑی خود کو شادماں کرنا چاہتی ہے۔ لیکن چونکہ مجاز کی فطرت کو کہیں بھی قیام نہیں لہٰذا یہ تضاد عشرتِ تنہائی میں ایک حیرت انگیز شکل اختیار کرلیتی ہے انفرادیت تا ب و ذہن کو مطمئن نہیں کرسکتی۔ باوجودیکہ وہ خوش ہے۔ لیکن یہی عیش چونکہ اس کی واحد ذات سے متعلق ہے۔ انسانیت کا کثیر التعداد طبقہ اس سے محروم ہے۔ اس واسطے یہ خار ہوکر ایک دل میں چبھتا ہے۔ اور "آج کی رات جاوداں کرلیں" کا شاعر پکار پکار کر کہتا ہے ؎

لاکھ مجبور ہوں میں ذوقِ خود آرائی سے
دل ہے بیزار اب اس عشرتِ تنہائی سے

اور وہ اسی پریشانی میں کہتا ہے ؎

کیوں نہ چاہوں کہ ہر اک ہات میں پیمانہ ہو
یاس و محرومی و مجبوری اک افسانہ ہو
عام اب فیضِ مئے ساقی و میخانہ ہو

اور اب مجاز پھر تندرست ہوکر ہمارے سامنے آتا ہے کہ ہم اس کو پہچان بھی نہیں سکتے۔ وہ ایک انقلاب کا متمنی ہوتا ہے جس میں یہ "عشرتِ تنہائی" "عشرتِ عمومی" کی شکل اختیار کرے ؎

ہے یہ ارمان بدل جائے جہاں کا دستور
ایک اک آنکھ میں ہو عیش و فراغت کا سرور
ایک اک جسم پہ ہو اطلس و کمخواب و سمور

لیکن ابھی تک تو وہ سماجی زندگی کا نقاد تھا۔ جب دُنیا کے سیاسی حالات بدلے، قومی جنگ کا دور شروع ہوگیا۔ دُنیا میں دو کیمپ ہوگئے۔ ایک طرف جرمنی، اٹلی اور جاپان کے فاشسٹ ہوگئے جو دُنیا کو محکوم بنا کر رکھنا، ان کے وطن کو غصب کرنا، اُن کے جمہوری حقوق اور جمہوری اداروں کو تخریب و غارتگری کے حوالہ کرنا اور ہر جگہ ہٹلری نظام کی بقا چاہتے ہیں۔ حرّیت و آزادی کو ملیا میٹ کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ فاشزم دُنیا کی بدترین قسم کی رجعت پسند طاقت ہے جو تمام حقوقِ انسانی کو ختم کرنے پر تلی ہوئی ہے ——— دوسرے کیمپ میں دُنیا کی محکوم قومیں اور آزادی پسند عوام، سوویت یونین اور چین شامل ہوگئے۔ ان کی قیادت سوویت یونین کر رہا ہے جس نے اپنے خون کی قیمت پر دُنیا کو فاشزم کے خون سے نجات دلائی۔ اور اب وہ دُنیا کی آزادی پسند قوتوں کے ساتھ دُنیا کے بدترین سامراج یعنی فاشزم کو تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہے الغرض ایک طرف عوام کی متحدہ قوت ہے۔ اور دوسری طرف فاشزم کے رجعت پسند جابر ———

ان سیاسی حالات کے بدلنے کے ساتھ عوام کے فرائض بھی بدل چکے تھے۔ کیونکہ اب وہ جنگ ان کی اپنی جنگ ہوگئی تھی۔ روس کا محاذ ساری دُنیا کا محاذ ہوگیا۔ چنانچہ عوام کے ساتھ ہمارے فرائض میں بھی تبدیلی ہوگئی ——— اور ہمارے شاعر مجاز نے بھی اپنے فرائض کو محسوس کیا۔ وہ شاعر جو سرمایہ داری کے خلاف، سماجی بے انصافیوں کے خلاف نظمیں لکھتا تھا اس کے فرائض میں اضافہ ہوگیا۔ اب وہ جوانانِ وطن کو ایک "پیامِ نو" دیتا ہے۔ فاشسٹ دشمنوں کے اقدام کو دیکھکر اس کی رگِ حمیت بھڑک اُٹھتی ہے۔ اور اسی لئے وہ جام و سبو کی سرمستیوں اور زلف و عارض کی تابناکیوں سے ہٹ کر عملی دُنیا میں قدم رکھتا ہے اور اس کو برقرار رکھتا ہے اور جانتا ہے کہ یہ ایک ناقابلِ تلافی جرم ہے۔ اس کو اپنے اُفتاں و خیزاں ماضی کا احساس ہے۔ مجاز کا یہ ایک زبردست ترقی پسند قدم ہے۔ جس سے ہماری اُمیدیں پھر اُٹھ گئی ہیں۔ بقول سجاد ظہیر ترقی پسندی جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے کسی منجمد تصوّر کا نام نہیں۔ اس کا تصوّر متحرک و سیال ہونا چاہئیے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے حقائق و حالات کے ساتھ اسے بھی بدلنا چاہیئے۔ وہ ترقی پسند ادیب جو کسی زمانہ میں سماج کی بے انصافیوں کے خلاف پُرزور احتجاج بلند کرتے تھے جو انقلاب کا نعرہ بلند کرکے معاشی انقلاب

اور سچائی کی تلقین کرتے تھے ——— اگر آج وہی پُرانے راگ الاپیں تو کیا وہ ترقی پسند کہے جانے کے مستحق ہونگے۔

——— توپھر جب وہ فیصلہ کُن جنگ ہو رہی ہے جس پر تمام بنی نوعِ انسان کے مستقبل کا دارومدار ہے۔ جب خود ہماری سرحد تک دشمن کی فوجیں پہنچ گئی ہیں تو ایسے وقت میں اگر ہم وہی نغمے گائیں، ویسی ہی نظمیں لکھیں تو کیا اس کے یہ معنی نہیں کہ اب ہم ترقی پسند نہیں رہے۔

لہٰذا وقت نے ہمارے شعرا کے فرائض بہت کچھ بدل دئے ہیں۔ اس وقت اُن کا فرض فاشزم کے خلاف ایک ادبی محاذ قائم کرکے لوگوں کو فاشسٹ حملہ آوروں کے خلاف اُبھارنا ہے۔ کہ وہ اس خطرے کو محسوس کریں۔ شاعر "دیدۂ بینائے قوم" ہے۔ اسکو اپنی قوم کی رہنمائی کرنا ہے۔ ہمارا شاعر اس رزم کا خاموش تماشائی نہیں ہے۔ وہ اپنی جنت کو جہنم کے حوالہ کسی قیمت پر نہیں کر سکتا۔ یہ وقت آگیا ہے کہ اس کو نوجوانوں سے بلا امتیاز قوم کہنا ہے ع

ایک ہوا ایک کہ ہنگامۂ محشر ہے یہی

مجاز کی نظم "پیامِ نو" ایک خالص ترقی پسند نظم ہے۔ وہ ہمارے لئے بیداری کا پیغام ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ ہر طرف شبخون کی تیاری ہو رہی ہے۔ ہماری سرحدوں پر جاپان اپنی فوجیں لئے موقع کا انتظار کر رہا ہے کہ پیش قدمی کرے۔ ہر طرف بھوک اور موت کا تسلّط ہے تو شاعر کہتا ہے ؎

محفلِ زیست پہ فرمانِ قضا جاری ہے
شہر تو شہر ہے گاؤں پہ بھی بمباری ہے

اور وہ ان کے متعلق کہتا ہے ؎

اپنی سرحد پہ جو اغیار چلے آتے ہیں
شعلہ افشان و شرر بار چلے آتے ہیں
خون پیتے ہوئے سرشار چلے آتے ہیں
تم بھی اُٹھ جاؤ تو بیکار چلے آتے ہیں

خون جو بہہ نکلا ہے اس خون میں بہا دو انکو
ان کی کھودی ہوئی خندق میں گرا دو انکو

بالآخر جب اس کی نظر اس کی تمدن سوز تہذیب پر پڑتی ہے تو وہ بے اختیار چیخ اُٹھتا ہے اور اپنے نوجوانوں کو بدیں الفاظ مخاطب کرتا ہے:۔

؎

یہ تو ہیں فتنۂ بیدار جلا دو ان کو
یہ مٹا دیں گے تمدن کو مٹا دو ان کو
پھونک دو ان کو جھلس دو کہ جلا دو ان کو
شانِ شایانِ وطن ہو یہ دکھا دو ان کو

یہ نظم مجاز کی بہترین نظموں میں سے ہے۔ یہ شاعر اپنے ماحول سے بے خبر نہیں۔ وہ سو نہیں رہا ہے۔ بلکہ اس کو معلوم ہے کہ اس کی مشرقی سرحدوں پر دشمن کی فوجیں کھڑی ہیں۔ اب مجاز کی شاعری اُمید افزا ہے۔ اور ہمیں یقین ہے کہ وہ فرار نہیں کرے گا۔ حالات کو وہ اچھی طرح محسوس کر رہا ہے۔ اور اسی میں اُس کی شاعرانہ عظمت کا راز پنہاں ہے۔

"اعلائے حق"

(از محمد زیب عثمانیہ لودھیانوی)

زمانے کی یزیدیت ہے پہلے سے کہیں بڑھکر
کہ باطل بر سرِ شوکت ہے پہلے سے کہیں بڑھکر

نہیں ابنِ علیؑ سے بے بس و محکوم ہی، ورنہ
حکومت مظہرِ قوت ہے پہلے سے کہیں بڑھکر

کبھی اعلائے حق کی کربلا کو گر ضرورت تھی
تو اب دُنیا کی یہ حالت ہے پہلے سے کہیں بڑھکر

مصائب کا بیاں کیا، تعزیہ کیا، سینہ کوبی کیا
مُسلمانوں میں ہر بدعت ہے پہلے سے کہیں بڑھکر

گُلال و رنگ کے چھینٹوں کو خوں کہنا شہیدوں کا
بشر کی پستئ فطرت ہے پہلے سے کہیں بڑھکر

رہِ حق میں مصائب جھیلنے والوں کو مژدہ ہو
کہ جُرمِ اظہارِ اصلیت ہے پہلے سے کہیں بڑھکر

ضرورت خون کی اے زیب چند اشکوں سے ٹل جائے
تن آسانی کی یہ حسرت ہے پہلے سے کہیں بڑھکر

(گزشتہ سے پیوستہ) دوسری قسط

بدنام

(از محترمہ مہر آرا وصفی مراد آبادی)

"چٹھی لے جاؤ" دروازے پر ڈاکیہ کی آواز آئی۔ اور لیلا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ ایک لمحہ تو وہ یوں ہی بے حس و حرکت پتھر کی مورت کی طرح کھڑی رہی۔ اور آخر جب ڈاکیہ نے دوبارہ پکارا تو وہ قدم بڑھاتی ہوئی دروازے پر آ گئی اور کواڑ کی آڑ میں کھڑے ہو کر اس نے جلدی سے اپنا ننھا سا خوبصورت ہاتھ باہر بڑھا دیا۔

"لاؤ بھیا" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"میں پڑھ کر سنا دوں" ڈاکیہ نے اس کے خوبصورت ہاتھ پر للچائی ہوئی نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔

"نہیں ——" لیلا نے مختصر سا جواب دیا۔ —— !!

"تم سے کاہے کو پڑھوانے لگیں ہیں بھلا ——" شنکر نے طنز سے کہا۔

لیلا نے غصہ سے ہونٹ چباتے ہوئے سُنا۔ اسکا بس چلتا تو ابھی دو جوتے شنکر کے مار دیتی۔ اس قسم کی جلی کٹی باتیں اسکو بہت تکلیف دیتی تھیں۔ نہ جانے کیوں پہلے پہلے شنکر نے لیلا پر بہت زیادہ اظہار ہمدردی کیا۔ وہ چاہتا تھا کہ سودا سلف لیلا اس ہی سے منگوایا کرے۔ اور اس بہانے صبح و شام روز ہی اس کے گھر جائے۔ اور اس سے اظہار ہمدردی کرے۔ لیکن لیلا کو یہ پسند نہ تھا۔ وہ شنکر اور اسکی باتوں سے لرز جاتی تھی۔ اور اسی لئے جب بھی وہ آیا اُس نے یہ کہکر دروازے پر ہی سے واپس لوٹا دیا "کچھ نہیں چاہیے بھیا۔ گھر میں سب کچھ ہے ——" جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اب محلہ بھر میں اس کو بدنام کرنے پر تلا ہوا تھا۔ لیلا سب کچھ جانتی اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ لیلا نے سوچا اس وقت بھی وہ ڈاکیہ کو اس طرف آتا دیکھکر اس لئے آیا ہوگا کہ دیکھے پرمود نے لیلا کو کیا بھیجا ہے؟ اور جب اُس نے یہ فقرہ کہا تھا تو لیلا نے سُنا۔ محلہ کے دو چار نوجوان لڑکے —— "پوسٹ مین" بھی ہنس رہے تھے۔ ان کی یہ ہنسی لیلا کیلئے کس قدر اذیت بخش تھی۔ یہ تو اس کا ننھا سا مجروح دل ہی جان سکتا تھا —— !! لیلا نے اندر آ کر —— لفافہ چاک کیا —— ہندی میں تحریر تھا۔ "بھابی جی نمستے۔ تمہاری طرف سے ہر دم فکر رہتی ہے تمہاری تنہائی کا خیال کر کے میں کبھی کبھی بہت گھبرانے لگتا ہوں۔ اور اس ہی لئے میں نے تمہاری حالت کا صحیح نقشہ ماتا جی کو سنا دیا تھا۔ پہلے وہ راضی نہ تھیں مگر اب ان کا بھی یہی خیال ہے تم ہمارے یہاں آ رہو۔ میں نے تمہارے والد صاحب کو بھی اس بارے میں ایک خط لکھا تھا مگر افسوس ہے کہ انہوں نے اس کا کوئی جواب نہ دیا۔ شاید نئی بیوی کے ڈر کی وجہ سے وہ تم کو اپنے پاس بلانا نہیں چاہتے بہر حال تم تیار رہنا میں اگلے ہفتہ تم کو آ کر لے جاؤں گا۔ ننھے کو پیار۔

تمہارا بھائی پرمود"

ان محبت بھری سطروں میں لیلا کیلئے سب کچھ تھا۔ اس نے کئی بار اس خط کو پڑھا۔ باپ کی بیوفائی —— کا خیال کر کے وہ رونے لگی —— آہ! سوتیلی ماں کے مظالم کیا —— وہ ہی کچھ کم تھے جو شادی سے قبل اس بدنصیب نے سہے تھے اب بھی اس کے احساس سے وہ کانپ اُٹھی —— پھر بھی اس تنہائی —— خوفناک تنہائی سے جو اس کی نوعمری کے سبب اسکے لئے جان لیوا تھی بچ کر وہ ان تکالیف کو خندہ پیشانی سے منظور کر لینے کو تیار تھی اگر باپ بلا لیتا۔ مگر بلایا کیا تھی —— اُس نے تو داماد کے انتقال کی خبر سُنکر دو سطر کا خط بھی نہ لکھا۔ اس صدمہ نے اس کا دل باپ کی طرف سے پارہ پارہ کر دیا تھا —— !! رمیش کے مرنے سے ایک ماہ بعد ان کے میکے سے ایک پڑوسی آیا تھا اور وہ ازراہ ہمدردی اس کے پاس بھی آیا جس کی زبانی لیلا کو معلوم ہوا کہ باپ نے کہلا بھیجا ہے کہ وہ بڑی بدنصیب ہے۔ پیدا ہوئی تو ماں مر گئی۔ وہاں گئی تو ساس کو جاتے ہی کھا گئی —— اور اب آدمی بھی اسکی بدنصیبی کی بدولت مر گیا۔"

"کچھ اور بھی کہا چاچا —— ؟" لیلا نے امید کے ٹمٹماتے ہوئے دیئے کو بجھنے نہ دیا۔ اس کے سوال میں آس تھی۔ جسکو جلد ہی اس جواب نے یاس میں تبدیل کر دیا اور وہ ہلکی سی شعاع امید بھی جو ابھی حوادث دُنیا کے تھپیڑوں سے لرز رہی تھی ہمیشہ کے لئے بجھ گئی۔ !!

"وہ کہتے تھے۔ اس بدنصیب کے سسرال میں بھی کوئی نہیں —— ایک رشتے کا چچا رمیش تھا —— ہمیں بہت افسوس ہے کہ لیلا نے اپنی بدمزاجی کے باعث اس کی بھی رمیش سے لڑائی کرا دی۔ اب اگر میل ہوتا تو لیلا اس کے پاس ہی چلی جاتی۔"

"میں نے لڑائی کرادی ــــــ ؟" لیلا بے ساختہ چیخ اٹھی۔ بیوی تو شادی بھی نہ ہوئی تھی جو ان دونوں میں ان بن ہو چکی تھی۔ چاچا ــــــ یہ الزام ہے اور بالکل بے بنیاد! برجیش کے باپ کہا کرتے تھے ان کے چاچا ــــــ ان کی سالی سے بیاہ کرنا چاہتے تھے۔ اور ــــــ وہ بچاری اپنے بچے کی خاطر اس بیاہ پر راضی نہ ہوئیں۔ اس لئے وہ بھاوج اور بھتیجے کے دشمن بن گئے تھے۔ اور یوں ہی ہماری ساس نے سارا رنڈاپا ــــــ اس ہی گاؤں میں گذار دیا سسرال کبھی نہ گئیں۔ میں نے تو اس کے چاچا کی شکل تک نہ دیکھی۔ اور وہ کہتے ہیں میں نے آ کر لڑائی کرا دی۔"

لیلا نے زخمی ہرنی کی طرح تلملاتے ہوئے یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔ اور ــــــ اس دن کے بعد سے ــــــ اس کے دل میں باپ کی طرف سے نفرت سی پیدا ہوگئی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی سوتیلی ماں نے ۔۔۔ اس کے باپ کے دل میں اس کے لئے کوئی محبت باقی نہ چھوڑی تھی۔ وہ اکثر سوچا کرتی اسکی ساس بھی تو اس ہی کی طرح جوان بیوہ ہوئی تھی۔ جیسے بھگوان نے اُن کی عمر کٹوا دی ایسے ہی وہ بھی ننھے کے سہارے زندگی کے بقیہ دن گذار دیگی!!

"لیلا جی جی ــــــ!"

"آؤ بہن ــــــ" لیلا نے جلدی سے خط چھپاتے ہوئے آنے والی کا مسکراتے ہوئے خیر مقدم کیا۔

"کس کی چٹھی آگئی ؟" شانتا نے ہنستے ہوئے کہا۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" لیلا نے تڑپ کر سوال کیا۔

"شنکر بھیا نے ــــــ" شانتا نے سادگی سے جواب دیا اور پھر وہ خط دیکھنے کا تقاضہ کرنے لگی۔ لیلا نے لفافہ اس کے آگے ڈال دیا۔

شانتا نے لفافے میں سے خط نکال کر پڑھا اور بڑی محبت سے بولی

"بھی جی ــــــ یہ حرکتیں اچھی نہیں ــــــ"

"کیا ــــــ؟" لیلا نے بے اوسان ہو کر سوال کیا۔

"شنکر بھیا ــــــ کہہ رہے تھے تم سارے گاؤں میں بدنام ـــ ہو رہی ہو۔ یہ سنکر بہت دکھ ہوا۔"

لیلا کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو ــــــ وہ کوئی جواب نہ دے سکی البتہ اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ سے اس کے جذبات کا پتہ چل سکتا تھا۔ جس کا احساس شانتا کو بھی ہوا۔

"برا مان گئیں ــــــ!" اس نے محبت بھری نظروں سے اس کی بیچارگی کا احساس کرتے ہوئے اسکو سر تا پا دیکھکر سوال کیا۔

"نہیں نہیں۔" لیلا نے مختصر سا جواب دیا۔

"شنکر بھیا کہتے تھے۔ شہر کے لڑکے بہت چالاک ہوتے ہیں اور بھولی بھالی لڑکیوں اور جوان عورتوں کو وہ بھائی بنکر خوب فریب میں پھنسا لیتے ہیں ــــــ"

شانتا نے آزادانہ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "خیر یہ دور کی جان نہ پہچان۔ کہتا ہے میرے ساتھ چلو۔ بھلا تم کو کون ہے جو یہاں سے ایسے ایک غیر گھرانے میں جانے دیگا۔ لاکھ گاؤں والے سب اس کو اور اس کے ماتا پتا کو جانیں پہ اپنی بہو بیٹی کون ایسے غیر گھرانے میں اس طرح بھیج دیگا۔ تم ہی سوچو بھی جی ــــــ دنیا ــــــ کیا کہے گی؟ بڑا اچھا بدنام برا۔ جی جی ایسا کام نہ کرو جو بدنام ہو۔"

"تو میں جا کب رہی ہوں!!" لیلا نے مردہ سی آواز میں جواباً کہا۔

کہنے کو تو لیلا کہہ گئی۔ مگر یہ آخری امید بھی جب ٹوٹ گئی۔ تو اسکو تنہائی اور ــــــ محلہ والوں کی دشمنی کا احساس اس کے لئے سوہان روح بن گیا۔ خصوصیت سے شنکر کی طرف سے اسکو بہت زیادہ خطرہ تھا۔ وہ بہت دیر تک خیالات کی رو میں بہتی رہی۔ لیکن ــــــ ساحل ــــــ لاپتہ تھا ــــــ!!

اب وہ ــــــ کیا کرے ــــــ ؟ یہ ایک ایسا معمہ تھا جس کا حل ناممکن سا ہو چلا تھا ــــــ!! گاؤں کی بڑی بوڑھیاں اس پر زور ڈال رہی تھیں کہ شنکر سے بیاہ کرے ــــــ شاید اپنی حالت کا احساس کرتے ہوئے وہ اس قربانی پر بھی تیار ہو جاتی ــــــ مگر مشکل تو یہ تھی کہ شنکر نے خود اس کے دل میں اپنی حرکتوں سے نفرت کا بیج بو دیا تھا۔ اور اس کے علاوہ ایک اور بھی سبب تھا۔ اور وہ تھا اس کا برجیش جس کی ایک ہلکی سی مسکراہٹ اب بھی اس کے تمام غم غلط کر سکتی تھی۔ جب وہ سوچتی۔ جس طرح اسکی سوتیلی ماں نے اس پر ظلم کئے ــــــ اور باپ نے مرد ہونے کے باوجود اسکو برداشت کیا۔ کیا برجیش پر اس کا سوتیلا باپ ایسے ہی ظلم نہ کریگا؟ کرے گا۔ اور ضرور چونکہ وہ عورت ذات ہے اس لئے جب ایک مرد ہی عورت سے ہار مان گیا اور کچھ نہ کر سکا تو پھر میں مرد کے مقابلہ میں کب جیت سکوں گی ــــــ ؟؟ جس وقت وہ یہ سب سوچتی۔ اس کی روح لرز جاتی اور وہ پختہ عزم کر لیتی کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ دوسری شادی نہ کریگی۔ برجیش اس کو اس قدر عزیز ہے کہ اسکی راحت کی خاطر وہ سب کچھ قربان کر سکتی ہے۔ اور اس ہی لئے اس کا یہ ارادہ اب بہت پختہ ہو گیا تھا۔ اور شاید اس ہی لئے محلے والے اس کو اس وجہ سے

اب تبرا سمجھنے لگے تھے کہ وہ انکے خلاف چلتی ہے۔ انکے احکامات نہیں مانتی۔ انکی اس بغاوت کا واحد سبب ان کی نظر میں دیکھے اب پرمود تھا۔ جس نے بقول ان کے اسکی امداد کرکے اسکو خود دماغ بنا دیا تھا۔

اگر پرمود اس طرح اس کے کھانے پینے کی خبرگیری نہ کرتا تو وہ خرچ سے پریشان ہوتی اور اس طرح ضرور وہ ان کا فرمان پورا کردیتی اور بقول ان کے کنبہ برادری کی ناک رہ جاتی۔

ایک ہفتہ سوچتے ہی سوچتے بیت گیا ــــ اور وہ کوئی صحیح رائے قائم نہ کرسکی۔ اور آخر پرمود آ ہی گیا ــــ !! اس مرتبہ وہ ننھے کیلئے کئی کھلونے اور کچھ گرم کپڑے بھی لایا تھا۔ لیلا کیلئے ایک جوڑا چپل اور ایک سادہ سلک کی ساڑی بھی تھی ــــ

"بھابی تیار ہو ــــ !" اس نے حسب عادت آتے ہی مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ لیلا کیا جواب دیتی ــــ وہ تو اسی سامان کو دیکھکر ڈر رہی تھی۔ محلہ والوں کی طرف سے ــــ اس مرتبہ اسکو شاید زندہ بھی نہ چھوڑینگے۔

"جواب دو ــــ آخر کب چل رہی ہو ــــ بھابی ــــ !!"

پرمود نے حیرت سے اسکی سراسیمگی کو دیکھکر سوال کیا۔

"بھیا ــــ" وہ آگے کچھ نہ کہہ سکی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"بولو ــــ بولو ــــ کیا کہنا چاہتی ہو ــــ ؟" پرمود نے مزید حیرت سے سوال کیا۔

"میں نہیں جاسکتی ــــ" لیلا نے بمشکل کہا۔ کہتے وقت وہ شرم سے پانی پانی ہوئی جارہی تھی۔

"آخر کس لئے ؟" پرمود نے سوال کیا۔

"گاؤں والے ــــ سب منع کرتے ہیں ــــ" لیلا نے زمین پر آنکھیں گاڑے جواب دیا۔

"ان کی ایسی تیسی ــــ گنوار ــــ کم بخت کہیں کے ــــ"

پرمود نے غصہ سے لرز کر جواباً کہا۔

"میں تمہیں اس مکان میں ہرگز نہیں چھوڑ سکتا ورنہ تم دق کا شکار ہوگی۔ تین موتیں اس مکان میں ہو چکیں۔ تمہارے سسر مرے۔ ساس دق میں گئیں ــــ اور ــــ رمیش ــــ بھی آخر ختم ہوگیا۔ میں نے اسکو بھی سمجھایا تھا لیکن وہ نہ مانا اور مکان نہ بدلا۔ تمہیں چلنا ہی ہوگا۔ میں نے وہاں انتظام کردیا ہے۔ وہاں ایک آریہ کنیا پاٹ شالہ ہے اس میں تمہیں داخل کرادونگا۔ وہاں جاکر تمہارا دل بہل جاویگا

تم اپنی تعلیم مکمل کرسکوگی۔ اور آئندہ زندگی آرام سے بسر کرنے کے قابل ہوجاؤگی۔"

پرمود نے یہ سب ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔ لیلا اس وقت تاریک اور بھیانک خوابوں کی بجائے خوش آئند سپنوں میں کھو سی گئی تھی۔ آریہ کنیا پاٹ شالہ ــــ تعلیم اور ــــ اور ــــ اس کا ننھا اب پرمود کی زیر نگرانی تھا۔ وہ پڑھ رہا تھا اور اب وہ پڑھکر چودہ پندرہ سال کا ایک حسین اور چنچل لڑکا تھا ــــ اور لیلا ــــ بھی ــــ ایک ادھیڑ عمر کی استانی ــــ وہ پاٹ شالہ میں لڑکیاں پڑھانے پر لازم ہوگئی تھی ــــ ننھا سکول سے آگیا تھا ــــ اور اس وقت اس کی ماں ــــ اس کو کھانا کھلوا رہی تھی ــــ ان کا ایک چھوٹا سا گھر تھا ــــ دور ــــ دنیا کی نظروں سے دور ــــ جہاں اغیار کے طعنے نہ تھے۔ یہ دونوں ماں بیٹے آزاد اور مسرور زندگی گذار رہے تھے ــــ

"سو رہی ہو بھابی !" پرمود نے اس کی محویت کو دیکھکر سوال کیا۔

اور وہ اچھل پڑی ــــ جیسے خواب سے اچانک بیدار ہوئی تھی۔

ننھا کھلونوں سے کھیل رہا تھا ــــ اور پرمود نے اسکو اونی نیکر اور سوئیٹر بھی پہنا دیا تھا۔ اب موزے پہنا رہا تھا ــــ لیلا نے دیکھا ــــ اس کا دل کھل گیا۔ "آج ننھا ــــ شہزادہ لگ رہا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا ــــ کیا کھلتا ہے اس پر یہ انگریزی لباس"

"بھابی دیر سے دیر ــــ ہمیں کل روانہ ہوجانا ہے ــــ" پرمود نے کہا۔

"ایسی بھی کیا جلدی ہے" لیلا نے رسماً جواب دیا۔

"اوہ ــــ تمہیں یہ تو بتانا بھول ہی گیا تھا ــــ اگلے ہفتہ میری شادی ہے۔ اور اس ہی لئے میں تمہارے لئے ایک سلک کی ساڑی اور ننھے کے لئے یہ کچھ کپڑے خرید لایا تھا ــــ پرسوں لگن ہے۔ اور اس لئے کل یہاں سے روانہ ہوجانا ضروری ہے۔"

لیلا کا غم آشنا دل خوشی سے لبریز ہوگیا۔ چہرہ کندن کی طرح چمک اٹھا۔ دل کو بھی ڈھارس ہوئی۔ کہ اس بہانے وہ اس کنج تنہائی سے نکل جائے گی۔

"بڑی اچھی خبر سنائی بھیا" لیلا کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ آج ایک مدت کے بعد وہ اس طرح کھل کر ہنسی تھی۔

اوراقِ پریشاں

(از محترمہ حمیدہ سلطانہ صاحبہ ۔ ادیب فاضل)

۱۹۳۴ء میں لکھنؤ گئی۔ لکھنؤ کی تہذیب، لکھنؤ کی نفاست و شائستگی، وہاں کی روایات قدیمہ نے انہوں نے مجھے کھینچا۔

شاہان اودھ کے دار السلطنت کو جیسا سنا تھا ویسا پایا۔ گو میرا قیام بہت مختصر یعنی صرف تین روز رہا۔ لیکن خوبصورت و شریف نواز لکھنؤ کی یاد ہمیشہ دل میں رہے گی۔ وہاں سے واپسی شام کی ٹرین سے ہوئی جب ریل لکھنؤ اسٹیشن سے روانہ ہوئی اور میں اپنے مخلص میزبانوں کو الوداع کہہ کر بستہ پر بیٹھی تو میں نے محسوس کیا کہ میرے بستر کے نیچے کچھ کاغذ دبے ہوئے ہیں۔ بستر ہٹا کر دیکھا تو یہ ایک ڈائری کے کچھ اوراق تھے جو شاید جلدی میں اٹھاتے ہوئے رہ گئے تھے۔ یوں تو کوئی بھی پرائیویٹ تحریر پڑھنا اخلاقی گناہ ہے۔ لیکن نہ جانے کیوں میرا دل چاہنے لگا کہ میں ان اوراق کو دیکھوں۔ جن کی اس وقت میں بالکل مالک تھی۔ جوں جوں وقت گذرتا گیا میرا یہ شوق بڑھتا ہی گیا۔ کوئی رسالہ بھی اس وقت میرے پاس نہ تھا۔ آخر دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے ان اوراق پر نظر ڈالی۔

ایک دو صفحے دیکھنے کے بعد مجھ پر یہ واضح ہو گیا کہ یہ میری ایک دیرینہ شناسا کی ڈائری کے اوراق ہیں۔ وہ صاحبہ اس ٹرین میں کہیں سفر کر رہی تھیں جس میں اتفاق نے مجھے لا بٹھایا۔ اُن کے نام کو پوشیدہ رکھنا میرا اخلاقی فرض ہے۔ لیکن اس تحریر کو دیکھتے ہی وہ اُن کا متفکرانہ انداز گفتگو وہ سنجیدہ علمی ذوق۔ وہ ہر وقت خیالات کی دنیا میں کھوئے رہنا، بڑی بڑی نشیلی مسحور کن آنکھیں لبوں کا دلکش خم، سب کچھ نظروں کے سامنے پھر گیا۔ یہ اوراق کچھ اتنے دلچسپ ہیں کہ بار بار سوچنے کے بعد میں نے نام اور ذاتی چیزوں کو تبدیل کر کے انکو چھپوا دینا ضروری سمجھا۔ ہر ادیب و شاعر کی پرائیویٹ تحریر زیادہ دلکش ہوتی ہے۔ اس میں اس کے اصلی خدوخال نمایاں ہوتے ہیں۔

اور یہ تحریر تو مردوں کے متعلق ایک دلچسپ انکشاف ہے۔ مردوں کی فطرت کا اصلی رنگ اس میں اتنا نمایاں ہے کہ یہ ناتجربہ کار لڑکیوں کے لئے مشعل راہ بن سکتی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ محترمہ موصوفہ کی نظر اگر اپنی زندگی کے ان چند اوراق پریشاں پر پڑ گئی تو وہ میری اس جسارت کو معاف فرمائینگی کیونکہ ان کو اپنی صنف کے ساتھ بہت ہمدردی ہے۔

چونکہ اُن کی اپنی ذات پر اس تحریر سے کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ کوئی نہیں سمجھ سکتا کہ اس رنگین پردے کے پیچھے کون پوشیدہ ہے۔ اس لئے یقین ہے ان چند اوراق کا منظر عام پر آجانا اُن کے لئے باعث ملال نہ ہوگا۔

مردوں کی ریاکاری۔ فطرت کا یہ بے مثل عکس صحیح اس قابل ہے کہ اس کی نمائش کی جائے۔

۱۸ ستمبر ۱۹۳۸ء

آج کی صبح خوشگوار ہے۔ میں علی الصبح اٹھی نماز و تلاوت قرآن پاک کے بعد چہل قدمی کرتی رہی۔ آہ وردِ کلام پاک ہی دل کی دوا ہے۔ زندگی کٹھن راہ دشوار اور دل کمزور ہے ؎

کجا دانند حال ما سبکساران ساحل ہا

شام کو ندی پر آ گئے۔ اُن کے ساتھ ٹہلتی ہوئی ندی پر چلی گئی چھائے ہوئے سرسبز درختوں کی گود میں لہریں لیتی ہوئی ندی نے اُن کے دل پر نہ جانے کیا اثر کیا آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میری نظر بچا کے انہوں نے آنسوؤں کو رومال میں جذب کیا مگر میں نے دیکھ لیا۔ لیکن کون سے الفاظ نادان جوان کے لئے باعث تسکین ہوسکیں۔ آہ اے ندی! ایک حرماں نصیب کو اپنی آغوش میں لے کر دنیا کے افکار سے آزاد کر دے۔ ایک ایسی ہستی جس کو دنیا میں کوئی راستہ نہیں ملی، تیرا صاف پانی ہی راحت بخش سکتا ہے۔ تخیل کی آنکھ دیکھتی ہے۔ خدا جانے کتنے انسانے تیری آغوش سے وابستہ ہیں۔ کتنی دردناک زندگیوں کو تیری گود میں سکون ابدی ملا۔ میرا ایک اور بھی۔ میں ان کو غمگین نہیں دیکھ سکتی یہ غم میرے لئے کتنا جاں گزا ہے کہ وہ مجھکو چاہتے ہیں اور پا نہیں سکتے۔

۲۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء

کیفیات دل لکھنے کے لئے قلم میں کہاں سے طاقت لاؤں۔ ——

زندگی کا ہر تار بے ربط اور سانس کی ہر آواز مضطرب ہے۔ اس پریشانی تخیل نے اتنے دن کچھ بھی نہ لکھنے دیا۔ دراصل حالات دلی صفحۂ کاغذ پر کہیں لکھے بھی جا سکتے ہیں ؎

ہے جذبات و تخیل میں تزلزل قلم بر داشتہ لکھوں کہاں سے

گذشتہ دو ماہ جن مرحلوں میں گذرے قابلِ یاد نہیں۔ بظاہر شاد لیکن ہر وقت غمگین و اُداس۔

سماج کا دیوتا رواج کی بندش مجھ سے بھی قربانی کے خواہاں ہیں۔ لیکن یہ نہ ہوگا تو وہ بھی نہ ہوگا۔ خواہ ایک وقت کتنی ہی بجلیاں کڑ کڑا کر مجھ پر کیوں نہ گر پڑیں۔

کالج کھل گیا ہے پڑھائی کی مصروفیتوں میں وقت اچھا گذر رہا ہے۔

۳۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء

ایک ہفتے سے کچھ نہیں لکھا اور لکھنے کے لئے کوئی بات بھی نہیں تھی۔ کوئی نئی بات ہو تو لکھوں۔ وہی ہنگامے وہی دن وہی راتیں۔ آج شام کو کالج سے شاہدہ و سعیدہ ساتھ آگئیں۔ اُن سے باتیں کرکے دل بہل گیا۔ کھانے سے کچھ دیر قبل فخری آ گئے۔ ورسینما چلنے کے لئے بہت اصرار کیا۔ میں افسردہ ہوں لیکن ان کی کسی فرمائش کو ٹالنا ممکن نہیں چلی گئی۔ وہ بھی آج بہت افسردہ تھے ٹھنڈی آہیں بھرتے رہے۔ اُن کے لئے سکون کس طرح لاؤں یارب!

۴ نومبر ۱۹۳۸ء

کل اور پرسوں اتنی مصروف رہی کہ روزنامچہ بھی نہ لکھ سکی۔ آج شام کو ایک ادبی جلسے میں شرکت کی۔ یہ کیا ہیں دُنیا کے جھگڑے۔ لوگ ایک ایسی پریشان ہستی کو گرفتار شہرت کرنا چاہتے ہیں جو نام ونمود سے بیزار ہے۔ فخری کا خط ملا۔ وہ نمبر...... پہنچ گئے۔ ایک ہفتہ کے بعد واپس آئیں گے۔ سوچتی ہوں کہ اگر یہ عارضی مفارقت جب مجھ سے برداشت نہیں ہوسکتی تو اگر وہ ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئے تو میں کیا کروں گی۔

۵ نومبر ۱۹۳۸ء

آج کالج سے واپس آکر کرسی پر نیم دراز میں کسی کے تصور سے کھیلتی رہی شام کی چائے کے بعد ٹیگور کے افسانے دیکھتی رہی۔ ٹیگور بھی خوب لکھتا ہے۔ احساسات کی رو ہر افسانے میں بہہ رہی ہے۔

۶ نومبر ۱۹۳۸ء

آج کالج میں تعطیل ہے۔ صبح سے دوپہر تک لباس کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ کھانے کے بعد کچھ دیر کے لئے آرام کیا۔ فخری کا خط ملا۔ وہ اگلے اتوار کو آ رہے ہیں۔ شام کو ایک ٹی پارٹی میں شرکت کی۔ ہنگامہ رنگ و بو میں جذب ہوکر کچھ دیر کے لئے میں اپنے افکار کو بھول گئی۔

۷ نومبر ۱۹۳۸ء

آج صبح دیر سے اُٹھی۔ تمام رات الف لیلیٰ کے مانند رنگین خواب دیکھتی رہی۔ "آہ خوابوں کی دُنیا" کاش یہ خواب حقیقت بن جاتے۔ کالج سے واپسی پر شام کو آندہ، بملا، شاہدہ، سعیدہ آگئیں۔ ان کی دلچسپ باتوں اور دلآویز قہقہوں میں وقت اچھا گذر گیا۔

۱۰ نومبر ۱۹۳۸ء

گذشتہ دو روز کالج بھی نہ جا سکی۔ اختلاجی کیفیت طاری رہی۔ دل کو بہت سنبھالتی ہوں پر وہ سنبھلتا ہی نہیں۔ مرغِ بسمل کے مانند لوٹتا ہے۔ کیا ہوگا میری اس بے سکونی کا انجام معبود!

۱۱ نومبر ۱۹۳۸ء

آج کی صبح خوشگوار تھی۔ میں تین دن بعد آج کالج گئی۔ لیکن دل اُچاٹ ہی رہا۔ فخری شام کو ریل سے سیدھے اِدھر آئے۔ اُن کی بلند پیشانی پہ تفکرات کے اُٹل بادل چھائے ہوئے تھے۔ معلوم ہوا کہ ان کو یورپ بھیجا جا رہا ہے۔ یہ خبر سُن کر دم بخود رہ گئی۔ آہ فلک کج رفتار کو اتنی خوشی بھی میری منظور نہیں۔ لیکن یہ اچھا ہے۔ اسی طرح وہ مجھے بھول سکیں گے۔

۲۲ نومبر ۱۹۳۸ء

آج کی صبح حسین و سحر انگیز تھی۔ لیکن میرا دل بے حد مضطرب تھا۔ گذشتہ شب میں نے بہت بے چینی سے کاٹی تھی۔ فخری کو الوداع کہنا تھا۔ وہ صبح دس بجے کی ٹرین سے یورپ کے لئے بمبئی سدھارے۔ اُن کا دل بھی بھرا چلا آتا تھا۔ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ کتنی سخت آزمائش تھی میری۔ میں اُن کو دل سخت کرکے سمجھا رہی تھی اور زبردستی مُسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لیکن ان کے جانے کے بعد اب ایسا محسوس کر رہی ہوں کہ میں نے سب کچھ کھو دیا ہے۔

اُف! ڈیڑھ سال کا یہ طویل عرصہ کٹے گا کیسے میرے اللہ! شدت غم سے دل تہ و بالا ہے۔ مدد معبود!

یکم جنوری ۱۹۳۹ء

میرے روزنامچے کا بکھرا ہوا انداز میری بے ربطی تخیل کا شاہد ہے۔ دسمبر کا پورا مہینہ گذر گیا اور میں کچھ نہ لکھ سکی۔

نیا سال آج شروع ہوگیا۔ خدا جانے یہ سال میرے لئے کیا لائیگا؟ خوشی و راحت یا رنج و غم؟

گذشتہ چند روز بہت مصروف گذرے۔ بچھڑے ہوئے ساتھی ملے اور چھوٹی ہوئی سہیلیاں؛ لیکن دل کو سکون حاصل نہ ہوسکا۔

۲ مارچ ۱۹۳۹ء

میں نے اپنی ڈائری کا آخری صفحہ یکم جنوری کو لکھا تھا۔ اس کے بعد تین

مہینے تک ایک سطر بھی نہ لکھ سکی۔ دل و دماغ پر بخار سا چھایا رہتا ہے۔ ایک مبہم نشہ! جو کچھ کرنے نہیں دیتا۔ آج کا دن بہت خوشگوار تھا۔ ایسے خوشگوار دن ماضی کی یادوں کو آجاگر کر دیتے ہیں۔

میں آج ایک زندگی سی جذبات میں محسوس کر رہی ہوں۔ لیکن دل خدا جانے کہاں ہے۔ امتحان اب بالکل قریب ہے۔ پڑھنے کی کوشش تو کرتی ہوں خدا کامیاب کرے۔

۴ مارچ ۱۹۳۹ء

کل کا اور آج کا دن ہسٹری کے نوٹ یاد کرنے میں گذرا۔ فخری کا ایک طویل خط آج ملا ہے۔ اپنی تصویر بھی انہوں نے بھیجی ہے۔ یہ دیکھکر مسرت ہوئی کہ ان کی متین صورت پر شادابی کا نور بھی اب موجود ہے۔ یورپ کی صحت بخش ہواؤں نے اُن پر اچھا اثر کیا ہے۔ لیکن کہیں وہ مجھ کو بھول تو نہیں گئے۔ توبہ! توبہ!! میں بھی کتنی بدگمان ہوں۔ اگر اُن کو میرا یہ خیال معلوم ہو جائے تو روٹھ جائیں اور بڑی مشکل سے ملاپ ہو۔ کہیں وہ وقت آئے تو وہ روٹھیں اور میں مناؤں۔

۷ مارچ ۱۹۳۹ء

آج تمام دن طبیعت شگفتہ رہی۔ سارا وقت پڑھنے میں گذرا۔ امتحان کی تیاری کے لئے چھٹی مل گئی ہے۔ شام کو عزیز بانو کو دیکھنے چلی گئی۔ ان کے ہاں لڑکی ہوئی ہے۔

پیاری چھوٹی سی خوبصورت گڑیا!

۱۶ مارچ ۱۹۳۹ء

گذشتہ دس روز مطالعے کی مصروفیت میں گذرگئے۔ آج بڑے بھائی صاحب کی سالگرہ کی پارٹی تھی۔ تقریباً پچاس مہمان آئے تھے۔ شریر شاہدہ نے ہنسا ہنسا کر پیٹ میں بل ڈال دئیے۔ وہ فخری کو یاد کرتی رہی۔ اُف! کس ادا سے جھوم کر گاتی ہے ؎

اِن دنوں جوشش جنوں ہے ترے دیوانے کو

بڑی ہی شریر ہے۔ زندگی و خوشی کی دلربا تصویر!

کل سے امتحان شروع ہے۔ اللہ محنت ٹھکانے لگائے۔

یکم اپریل ۱۹۳۹ء

گذشتہ پندرہ روز امتحان دینے کی مصروفیت میں ہوش نہ لکھنے کا نہ تھا شکر ہے آج اس سے نجات مل گئی۔ اور اب بوجھ سر سے اُترا۔ کامیاب ہونگی یا ناکام رہونگی اس کا فکر نہیں۔

۲۸ مئی ۱۹۳۹ء

شدید گرمی نے حواس بجا دئیے ہیں۔ مسز سروجنی نائیڈو کے اعزاز میں آج شام کو والدہ نے ایک عظیم الشان دعوت دی تھی۔ یہ دعوت ہر طرح کامیاب رہی۔ وقت بہت اچھا گذرا۔

۱۵ جولائی ۱۹۳۹ء

گذشتہ چند روز کچھ بھی نہ لکھ سکی۔ آج کا دن بہت خوشگوار تھا۔ اُودی اُودی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ اور شکر آمیز ہوا نے دل و دماغ کو مدہوش سا کر دیا تھا۔ چندرا نے اپنے باغ میں پکنک پارٹی کی تھی۔ جملا اور شاہدہ کی دلچسپ معصوم شرارتوں نے دلچسپی کو دوگنا کر دیا تھا۔ کھانے کے بعد جھولے کا سماں بہت دلکش تھا۔ رنگا رنگ پوشاکوں کا تصادم متحرک جھولا ہے کی قیود سے آزاد۔ جوانی کی رس بھری صدائیں مترنم قہقہے۔ دلاویز لطیفے اس ہجوم رنگ و بو میں کھو کر کچھ دیر کے لئے میں اپنی افسردگی کو بھول گئی۔ شام کو خوب تھک کر واپس آئی۔

۴ اگست ۱۹۳۹ء

آج فخری کا خط ملا۔ انہوں نے لکھا ہے انگریز لڑکیاں بڑی کامی ہوتی ہیں۔ نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے۔ وہ اب مجھے بھول سے گئے ہیں۔ خدا کرے یہ شبہ ہی غلط ہو۔ ورنہ . . . .

شام کو مسز سروجنی نائیڈو سے ملنے چلی گئی۔ دلکش نظمیں سنیں۔ سیاسیات پر گفتگو ہوتی رہی۔ وہ پرسوں بمبئی جارہی ہیں۔

۸ اکتوبر ۱۹۳۹ء

میرے دل و دماغ پر ہر وقت اِن دنوں ربودگی طاری رہتی ہے۔ ۲۵ روز سے فخری کا خط نہیں ملا۔ پریشانی میں اور اضافہ ہوگیا۔ طرح طرح کے شکوک دماغ کو گھیرے رہتے ہیں۔

پچھلے خط میں انہوں نے لکھا تھا سوئٹزرلینڈ جارہا ہوں۔ خدا کرے وہ بخیر ہوں۔

یکم جنوری ۱۹۴۰ء

سال نو آیا اور میرے لئے حسرت و یاس کا تحفہ لایا۔ گذشتہ ڈھائی مہینے قبل میں نے جس چیز کو محض گمان سمجھا تھا وہ اصل ثابت ہوئی۔ آہ! اس خیال سے بھی دل کانپ جاتا ہے۔ فخری نے ایک کافر ادا حسینہ کو اپنا دل دیدیا وہ دل! جس کو وہ کہتا تھا میری امانت ہے۔ اُف فریب کار مرد! کس کس طرح اپنی سچی محبت کا یقین مجھ کو دلاتا تھا۔ وہ لمبے چوڑے محبت کے دعوے

وہ طول طویل رنگین عہد و پیمان سب جھوٹے اور ناقص ثابت ہوئے۔

شاید یہ صفحہ میری زندگی کے حالات کا آخری صفحہ ہو۔ اور یہ سال میری زندگی کا آخری سال!

ہوش و حواس پر اضطراب سا چھایا ہوا ہے۔ دل کو سنبھالتی ہوں لیکن وہ ڈوبتا جاتا ہے۔ ؎

سنبھلنے دے مجھے اے ناامیدی کیا قیامت ہے

خداوند رحم فرما۔ مجھے سکون دے۔ ایک بیزار زیست کو موت دے۔ کہ کوئی قلب نہیں رہا۔ میری تمناؤں امیدوں کا قصر ایک ہیبت ناک جھٹکے کے ساتھ گر پڑا۔ میں اس کھنڈر پر کب تک آنسو بہاؤں۔ تا کجا ماتم کروں۔ یہ کرب و ابتلائی زندگی مجھ سے گذاری نہیں جاتی معبود! میرا دل مرچکا۔ میری اُمنگیں ہمیشہ کیلئے سوگئیں۔ مجھے جینا اب وبال ہے۔ پیارے دوست رحم بر تنہائی ماکن۔ اے لاوارثوں کے وارث! اس دنیا کے مکر و فریب سے دل عاجز آ گیا۔ سب کچھ کھو کر میں نے تجھکو پالیا۔ اب مجھے تو اپنے درِ سے مایوس نہ لوٹا۔ میں تجھ سے زندگی نہیں چاہتی، دولت نہیں مانگتی۔ موت صرف موت مانگتی ہوں۔ زندگی کا زہر ہلاہل اب مجھ سے پیا نہیں جاتا۔ موت کے شیریں جام کی منتظر ہوں۔ اے خدا!

۱۵ر مارچ ۱۹۴۰ء

گذرے ہوئے تمام دن میں نے بستر علالت پر گذارے۔ شدت غم نے مجھے تپ محرقہ میں مبتلا کر دیا۔ شب و روز عالم بے ہوشی میں گذرتے تھے۔ دنوں مجھ پر ہذیانی کیفیت طاری رہی۔ لیکن موت نے مجھ پر رحم نہ کیا۔ یہ کڑی بیماری جھیل کر آخر کار گذشتہ ہفتے بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ لیکن غم دل نے میرا کام تمام کر دیا۔ میری صحت اب شاید کبھی نہ سنبھل سکے گی۔ رُخساروں کا شہابی رنگ اب کبھی واپس نہ آسکے گا۔ اور میری آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے دائمی ہونگے اب میں اپنی اصلی ہستی کا مٹا ہوا دھندلا سا عکس ہوں۔ بقول ظفر ؎

جو اُڑتی پھرے سر رہ گذر اب میں وہ مُشتِ غبار ہوں

سماج و رواج کی قربان گاہ پر ایک اور معصوم رُوح کو قربان کر دیا گیا۔ اب تو تیرا کلیجہ ٹھنڈا ہوا۔ او قربان گاہ سماج! او ڈائن!!

۱۷ر مارچ ۱۹۴۰ء

آج صبح دیر سے اُٹھی۔ پچھلی شب سو نہ سکی۔ یہ سوچ خدا جانے کب پیچھا چھوڑیگا۔ دماغ تکان سے چور چور ہے اور دل شکستہ!

غالب نے کہا ہے ؎

موت تم تو نہیں ہو کہ بُلا بھی نہ سکوں

لیکن موت بھی تمہاری طرح مجھ سے روٹھ گئی ہے۔ نہ تم کو اب میں پاسکتی ہوں نہ موت ہی مجھکو آتی ہے۔ اُف میری بے کسی!

۲۰ر مارچ ۱۹۴۰ء

یہ دو روز بھی یوں ہی گذر گئے۔ کیا لکھوں جب زندگی کا کوئی مقصد ہی نہیں ہے گو بظاہر اب میں تندرست ہوں۔ لیکن دل کا غم بستر سے اُٹھنے نہیں دیتا۔ ڈاکٹر کہتا ہے۔ میں پہاڑ پر گرمی شروع ہونے سے قبل چلی جاؤں۔ لیکن کیا میرے پژمردہ دل کو پہاڑ کی فرحت بخش آب و ہوا تازگی بخش سکے گی۔

۱۰ر مئی ۱۹۴۰ء

۲۰ر اپریل کو شملہ پہنچی۔ روز ارادہ کرتے رہنے کے باوجود روزنامچہ نہ لکھ سکی۔ یہاں کے دلفریب مناظر دلکش سبزہ زار اور سیر گاہیں۔ اور بھی فخری کی یاد دلاتی ہیں۔ ہماری طفلی کے کھیلوں کا مسکن و مامن شملہ! کوہسار پہ چھایا ہوا ابر جھومتا ہوا سبزہ۔ سنکی ہوئی ہوائیں، بہتے ہوئے آبشار رہی ہیں۔ لیکن میرا دل وہ نہیں۔ دن ملنے ملانے اور درستی تخیل میں بسر ہوتے ہیں۔

۱۴ر مئی ۱۹۴۰ء

آج غضب کی بارش ہو رہی ہے۔ خوب ٹھنڈ ہے۔ میں آتش دان کے قریب بیٹھی تمام دن اپنی ایک طویل نظم "بیتے دنوں کی یاد" مکمل کرتی رہی۔

۲۴ر مئی ۱۹۴۰ء

کل تمام رات سخت بارش ہوتی رہی۔ اس کے سبب میری نیند اُچاٹ رہی۔ آج بھی ہلکی ہلکی پھوار پڑتی رہی۔ سبزے پر نکھار ہے۔ اور ہر جانب موتی سی برس رہی ہے۔ سہ پہر کو دھوپ نکل آئی تھی۔ اس لئے میں دور تک ٹہلتی ہوئی چلی گئی۔ گرتے ہوئے آبشاروں کی خوبصورتی لفظوں میں نہیں سما سکتی۔

آہ یہ حسین منظر، یہ رومان خیز فضا، کون سا دل ہے جو بیقرار نہ ہو جائے۔

۲۵ر مئی ۱۹۴۰ء

کل شام کو واپسی پر بارش نے آلیا تھا۔ مجھے بھیگ جانے کے باعث سخت زکام ہو گیا۔ اور خفیف سی حرارت بھی ہو گئی۔ اس لئے آج تمام دن بستر پر پڑی رہی۔ اب قدرے سکون ہے۔

۲ر اگست ۱۹۴۰ء

میں نے اپنے روزنامچہ کا آخری ورق ۲۵ر مئی کو لکھا تھا اسکے

ہو میں بیمار ہوگئی۔ ضعف و علالت نے بستر سے اٹھنے کی مہلت نہ دی۔ کل میں نے غسلِ صحت کیا ہے۔ یہاں کی بارشوں سے دل تنگ آگیا۔ موسم بہت خراب ہو رہا ہے مسلسل تین دن سے بارش ہو رہی ہے۔ میں واپس چلنے کی ضد کر رہی ہوں۔ لیکن والدہ میری کمزورِ صحت کے باعث ابھی کچھ دن یہیں رہنا چاہتی ہوں۔

۵ راگست ۱۹۴۰ء

آج میری سالگرہ کا دن تھا۔ حسبِ معمول میری سہیلیوں اور جو عزیز یہاں تھے اُن کو ٹی پارٹی پر والدہ نے بلایا تھا۔ تحفے بھی ملے ادھر چہل پہل بھی رہی۔ بظاہر میں بھی مسرور تھی۔ اور ضرورت سے زیادہ بلند قہقہے لگا رہی تھی۔ لیکن کون جان سکتا ہے کہ ان قہقہوں میں دل کا درد بھی شامل تھا۔ وہ بے چین و شوخ آنکھیں آج مجھ سے سینکڑوں میل کی دوری پر ہیں جو ایک سال تک بیتابی سے میری سالگرہ کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ گلابی کناری کی ارغوانی ساری میں ملفوف میرا جسم ایک لکڑی کی مانند معلوم ہو رہا تھا۔ اپنے زرد بے کیف رنگ اور مرجھائے ہوئے چہرے کو دیکھ کر بے اختیار میرے لبوں پر آہ آگئی۔ کاش یہ میری آخری سالگرہ ہو ؎

مزا آجائے ایسے میں جو مرگِ ناگہانی ہو
جدھر آنکھیں اٹھاؤں میں جوانی ہی جوانی ہو

تلاشِ سکون

از

محترمہ نجمہ انوار الحق
بی۔ اے

یہ آس دل میں لئے سو لبوں میں پھرتی ہوں
حسین چاندنی راتوں میں ہم نشیں اکثر
جفائے چرخ کی خونخواریوں سے گھبرا کر
کہ غرق اپنے الم بحرِ نور میں کر دوں

سکونِ دل کی بہت کی ہے جستجو میں نے
فرازِ کوہ کی مہکی ہوئی فضاؤں میں
چمکتے تاروں کی خاموش ٹھنڈی چھاؤں میں
پیا ہے برسوں تمناؤں کا لہو میں نے

کسی طرح سے دلِ مضطرب کو بہلا کر
سرود و رقص کی وجد آفریں صداؤں میں
رباب و چنگ سے نکلی ہوئی نواؤں میں
یہ چاہتی ہوں کہ غم اپنے بھول جاؤں اگر
دلِ شکستہ یوں ہی سوگوار رہتا ہے
سُلگتا سینہ سدا شعلہ بار رہتا ہے

موجودہ جنگ کی روک تھام صرف عورتیں ہی کر سکتی ہیں

(از محترمہ ناجیہ قاسم شروانیہ)

فروری ۴۳ء میں سلم گرلز کالج علی گڑھ کی لٹریری سوسائٹی کے زیر اہتمام بیگم عبد اللہ ڈبیٹنگ کے سلسلہ میں ایک مجلس مباحثہ منعقد ہوئی تھی۔ سوسائٹی کی طرف سے مختلف عنوانات مقرر تھے۔ محترمہ ناجیہ خانم شروانیہ نے مندرجہ بالا عنوان پر اپنے خیالات کا اظہار فرمایا۔ دختران وطن کی یہ ادبی مساعی جمیلہ یقیناً قابل ستائش ہیں۔ (نجمہ تصدق)

اس موضوع پر کوئی فیصلہ کن بحث کرنے سے پہلے ہمیں چند ضروری باتوں پر غور کرنا ہے۔ سب سے پہلی بات قابل غور یہ ہے کہ مردوں اور عورتوں کی نسوی خصوصیات میں وہ کون سا نمایاں فرق ہے جس کا اثر موجودہ جنگ کی روک تھام پر پڑ سکتا ہے؟ دوسرے ہمیں یہ معلوم کرنا ہے کہ دراصل جنگ کی وجہ کیا ہے اور اس وجہ کو دور کرنے کی صلاحیت مردوں میں زیادہ ہے یا عورتوں میں؟ سب سے اہم اور قابل غور مسئلہ یہ دیکھنا ہے کہ آیا عورتوں کے اثرات مردوں پر اس قدر گہرے پڑ سکتے ہیں کہ وہ موجودہ سوسائٹی کے مروجہ نظام کے خلاف اگر کوئی قدم اٹھائیں تو کامیاب ہو سکتی ہیں یا نہیں؟ مندرجہ بالا باتوں پر پہلے غور کرنا اس لئے ضروری ہے کہ اس موضوع کی بنیادی باتیں ہیں۔ اور ان کے بغیر ہم اس مبحث پر کسی قسم کی کوئی صحیح رائے قائم نہیں کر سکتے۔

دنیا کی گذشتہ تاریخ پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے ہمیں دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک یہ کہ دراصل جنگ انسانوں کے جنون حکمرانی کا نتیجہ ہے۔ اور دوسرے یہ کہ یہ جنون حکمرانی جس کا مظاہرہ جنگ ہے عورتوں کی طرف سے بہت کم ظاہر ہوا ہے اور مردوں کی طرف سے بہت زیادہ۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مرد نے اپنی جسمانی طاقت کی برتری سے غلط فائدہ اٹھا کر ترقی کے راستہ میں ہمیشہ عورتوں کو اپنا پیرو بنا کر رکھا۔ رہبری کوئی گناہ نہیں ہے۔ لیکن یہاں مشکل یہ آ پڑی ہے کہ مردوں میں فطرتاً جوش زیادہ ہوتا ہے۔ ہوش کم۔ مگر برخلاف اس کے عورتوں میں ہوش زیادہ ہوتا ہے اور جوش کم۔ جنگ جوش کا مظاہرہ ہے ہوش کا نہیں چونکہ سوسائٹی کا نظام ہمیشہ سے مردوں کے ہاتھ میں رہا ہے۔ اس لئے ہمیشہ سے جنگ و جدال کا بازار گرم ہوتا چلا آتا ہے۔ مرد اپنی برتری اور تفوق کے شوق میں دیوانہ اور وحشی ہو جاتا ہے۔ عورتوں میں یہ بات کم پائی جاتی ہے۔ بلکہ اگر غور اور انصاف سے دیکھا جائے تو صلح، امن، دوستی اور محبت کے لطیف جذبات عورت میں فطرتاً زیادہ پائے جاتے ہیں۔

موجودہ جنگ کی روک تھام صرف اسی وجہ سے اب تک نہ ہو سکی کہ ہماری سوسائٹی کا نظام کسی نہ کسی غلط فہمی[1] کی بنا پر مردوں کے ہاتھ میں رہا ہے۔ اور مردوں نے اپنی جنگجو فطرت کا مظاہرہ مسلسل اور مستقل طور پر کیا ہے۔ اب بھی میرا خیال ہے کہ اگر مردوں کی ذات پر ہی موجودہ لڑائیوں کی روک تھام کو منحصر کیا جائیگا تو یہ لڑائیاں تا قیامت ختم نہ ہو سکیں گی۔ اگر آج یہ فتنہ دب بھی گیا تو کل ذرا سی چنگاری اس شعلہ کو بھڑکانے کیلئے کافی ہوگی۔ ہزارہا سال قبل کی تاریخ اس قسم کی لڑائیوں سے بھری پڑی ہے۔ اگر مرد لڑائیوں کو روک سکنے کا اہل ہوتا تو یہ لڑائیاں اب تک جاری ہی کیوں رہتیں۔ یہ پہلی دو باتوں کا جواب تھا۔

اب رہی تیسری بات یعنی جہاں ہم یہ کہتے ہیں کہ صرف عورتیں ہی موجودہ جنگ کی روک تھام کر سکتی ہیں۔ وہاں ہمیں یہ بھی سوچنا ہے کہ اگر عورتیں روک تھام کرنا چاہیں گی تو کر بھی سکیں گی؟

اس سلسلہ میں مجھے آپ معاف فرمائیں اگر میں یہ کہوں کہ میرے خیال میں عورتوں کے لئے کوئی ارادہ کر کے اس میں کامیابی کر لینا کچھ مشکل نہیں ہے۔ عورت کا عزم وہ شے ہے جو ایک پہاڑ کو بھی اپنی جگہ سے ہٹا سکتا ہے۔ آج اگر دنیا کی تمام عورتیں مستقل طور پر ارادہ کر لیں کہ موجودہ جنگ کی روک تھام صرف ہمارا ہی حصہ ہے تو میں وثوق کے ساتھ کہتی ہوں کہ صرف چند ہفتوں کے اندر تمام جنگ کا نقشہ بدل سکتی ہیں۔ خود عورتوں کے ماحول میں اس بات پر غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ جب بھی انہوں نے کوئی ارادہ کر لیا ہے تو مردوں کو اپنی مرضی کے خلاف ہونے کے باوجود عورت کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا ہے۔ میں یہ مثالیں بھی دے سکتی ہوں کہ ملکوں کے انقلابات میں عورتوں کے ارادوں نے کیا کیا کمالات دکھائے ہیں۔ لیکن وقت کی کمی کے باعث میں صرف اپنے ملک کی چھوٹی چھوٹی باتوں کی طرف آپ کی توجہ منعطف کرانا چاہتی ہوں۔

آپ نے دیکھا کہ ہم نے جو رسم قائم رکھنا چاہی خواہ وہ مردوں کی مرضی

---

[1] اور مرد آج بھی عورت کو ناقص العقل خیال کرتا ہے معلوم نہ آپ کو ہو (نجمہ)

[2] شاید یہ غلط فہمی اب تک باقی ہو۔ (نجمہ)

سکیں گی۔ مخالفت ہی کیوں نہ ہوئی۔ قائم رہی۔ اور جو رواج اُٹھانا چاہا مرد باوجود اپنی مفروضہ برتری کے اسے قائم نہ رکھ سکے۔ اور بھی جن معاملات میں عورت اور مرد کی رائے کا تصادم ہو جاتا ہے اُن میں فتح کا سہرا ہمیشہ عورت کے سر رہتا ہے۔ شادی بیاہ، پیدائش اور اموات کے مواقع پر جو مختلف قسم کی رسومات ہوتی ہیں آپ اُن پر نگاہ ڈالئے تو پتہ چلے گا کہ عورتیں اپنی بات مردوں سے کس طرح منوالیتی ہیں۔ لہٰذا اگر آج عورتیں ارادہ کر لیں تو دُنیا کی اس مہیب جنگ کی روک تھام اُن کے لئے کچھ دشوار امر نہیں۔ عورتوں نے ملکوں میں انقلابات برپا کر دیئے۔ کیا کلوپٹرا اور جون آف آرک یا اس قسم کی دوسری خواتین کے درخشاں کارنامے تاریخ کے صفحات سے محو کئے جاسکتے ہیں؟ سوچئے تو سہی کہ جو ہستیاں بڑے بڑے ممالک میں انقلاب کر سکتی ہیں۔ سلطنتوں کو بدل سکتی ہیں خود حکومت کر سکتی ہیں تو کیا وہ موجودہ جنگ کی خواہ وہ کتنی ہی ترقی کیوں نہ کر گئی ہو روک تھام نہ کر سکیں گی۔ یہ بالکل معمولی بات ہے صرف عزمِ مصمم درکار ہے اور کچھ نہیں۔

میں تو یہاں تک کہہ سکتی ہوں کہ ایک زمانہ وہ آنے والا ہے جب کہ مرد اپنی خامیوں کی وجہ سے سوسائٹی کے نظام کی ذمہ داری اُٹھانے کے قابل نہیں رہے گا۔ اور کل سوسائٹی کا نظام عورت کی کاوش اور کوشش کا رہینِ منت[۲] ہوگا۔ مرد نے اِس وقت تک سوسائٹی کے نظام کو بہتر بنانے میں اتنی بھی کامیابی حاصل نہیں کی کہ وہ سوسائٹی سے حیوانیت اور درندگی کے جراثیم نکال دیتا بلکہ ہم تو یہ دیکھتے ہیں کہ جس قدر زمانہ گزرتا جاتا ہے مردوں کی بدولت سوسائٹی کے نظام میں حیوانیت اور بربریت بڑھتی ہی چلی جارہی ہے۔ اِس لئے لازمی طور پر ہم کو ہی سوسائٹی کا نظام درست کرنا پڑیگا۔ میں دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ مرد لڑنے میں تو درندوں کو بھی مات کر سکتا ہے لیکن لڑائیوں کی روک تھام اسکی فطری صلاحیتوں سے بعید ہے۔ یہ کام صرف عورتیں ہی کر سکتی ہیں۔ ہندوستان کے ایک شاعر نے عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کس قدر صحیح کہا ہے۔

۵

دگِلِ نسل و قوم کے قلعوں کو ڈھا سکتی ہے تو	مشرق و مغرب کو اک کنبہ بنا سکتی ہے تو
آمنہ اور دیوکی نے جو پلایا تھا کبھی	پھر وہی ساغر زمانہ کو پلا سکتی ہے تو
مریم و سیتا کی شیریں مسکراہٹ کی قسم	آج بھی سنسار کو جنت بنا سکتی ہے تو

[۱]۔ رونا بھی تو اُسی کا ہے (انجم)

[۲] یہ ایک خواب ہے جو شاید شرمندۂ تعبیر ہو (انجم)

[۳] الفاظ سے نہیں عمل کی طاقت پیدا کیجئے (انجم)

غزل

(از محترمہ ک۔ ف۔ بیگم)

ہماری داستاں کیا داستاں ہے
غم و رنج و الم، آہ و فغاں ہے

نہ اترا آج اِتنا فصلِ گُل پر
ارے نادان بلبل! کل خزاں ہے

ہنسی رونے کا ہے اک پیش خیمہ
پسِ پردہ خوشی کے غم نہاں ہے

فنا ہو جانا ذوقِ آگہی میں
یہی تو زندگیٔ جاوداں ہے

نہیں ہے گیت بلبل کا یہ اے گُل!
یہ میرے دُکھ بھرے دِل کی فغاں ہے

بھلا کیا پوچھنا حسنِ ازل کا
نظر سے چھپ کے بھی جلوہ کناں ہے

نہیں ہمدم بجز اللہ بیگم
دلِ پُر غم سے بیگانہ جہاں ہے

وں کے مُلک میں

(از جناب اشرف صبوحی دہلوی)

آٹھویں قسط

اور ملکہ نے گلیور سے کہا کہ اپنا قصہ بادشاہ سلامت کو بھی سناؤ۔
مر الفاظ میں بادشاہ کو اپنی داستان سنائی۔ بادشاہ بھی اسکی حرکتیں دیکھکر
ٹ سنکر حیران رہ گیا۔

اس کے بعد ملکہ نے اپنے مستری کو حکم دیا کہ اس ننھے آدمی کے لئے ایک ایسا
رد جس میں یہ آرام کے ساتھ اُٹھے، بیٹھے اور سوئے۔ مستری اپنے فن کا اُستاد
، پوری کارگیری سے جیسا ملکہ چاہتی تھی ویسا بکس تین ہفتے کے اندر اندر
یا۔ گلیور اور زمینداد کی لڑکی نے بھی بکس بنانے میں مستری کا ہاتھ بٹایا یعنی
ر دونوں اُسے بتاتے رہتے تھے کہ بکس کیسا ہونا چاہیئے اور کس کس چیز کی اس
ہوگی۔

یہ بکس کیا ایک قسم کا چھوٹا سا کمرہ یا بنگلہ کہنا چاہیئے سولہ فٹ سے سولہ
ر بارہ فٹ اُونچا۔ اس میں کئی کھڑکیاں تھیں۔ ایک دروازہ اور دو الماریاں
چکنے کو چھت مجوزہ دو قبضوں کے ذریعے کھلتی اور بند ہوتی تھی۔ کمرے میں
ٹ اور بستر تھا جس کو لڑکی روزانہ صبح کو باہر نکال کر ہوا میں رکھ دیتی اور رات
تی ہونے کے وقت ڈھکنا یا چھت رکھکر قفل لگا دیا جاتا۔

ایک دوسرے کارگیر نے گلیور کیلئے اور کئی چیزیں بنائیں۔ دو میزیں۔ دو
رسیاں اور ایک صندوق۔ جس میں چھوٹا آدمی اپنا سامان رکھے۔ یہ چیزیں ہاتھی
ی سفید لکڑی کی بنی ہوئی تھیں۔ کمرے کی دیواروں کو سب طرف سے ریشمی کپڑے
یا تھا۔ فرش اور چھت بھی اسی طرح گدگدی بنائی گئی تھی۔ تاکہ اگر بکس کو
ہ بے احتیاطی برتیں یا کبھی گاڑی پہ لاد کر کہیں لے جائیں تو گلیور کو جھٹکوں سے
، نہ پہنچے۔

جوں جوں دن گذرتے گئے ملکہ کی گلیور سے دلچسپی بڑھتی گئی۔ اتنا اُنس ہوگیا
یر چین نہ آتا۔ ہر کھانے پر وہ اُسے اپنے ساتھ لیکر بیٹھتی۔ ملکہ کی بائیں طرف
ٰ سی میز لگادی جاتی۔ حضرت بڑی شان کے ساتھ کرسی پر بیٹھتے۔ اور لڑکی

سٹول پر برابر کھڑی رہتی۔

شاہی محل یا دربار میں ایک شخص ایسا تھا جو گلیور کو ہمیشہ ستایا کرتا۔ بیچارے ننھے آدمی کے دق کرنے سے اس کا کبھی پیٹ نہ بھرتا۔ یہ ذات شریف ملکہ کے ایک بونے تھے دیوزادوں کا یہ بونا بھی گلیور سے سات حصے بڑا تھو۔ قاعدہ ہے کہ طاقتور کے ہاتھ چلتے ہیں اور کمزور کی زبان چلتی ہے۔ وہ گلیور کو چھیڑتا اور گلیور بھی اُسے برا بھلا کہتا اور گالیاں کوسنے دیتا۔ اس پر وہ اور ستاتا، ڈراتا، دھمکاتا۔ گلیور بیچارہ سہم جاتا۔ اُسے یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن یہ ظالم کوئی آفت ضرور ڈھائے گا۔ لیکن زبان اُس کی قابو میں نہ رہتی۔ جب سامنا ہوتا یہ بھی بونے کو کچھ نہ کچھ سنائے بغیر باز نہ آتا۔

ایک مرتبہ کھانے کے وقت گلیور نے خدا جانے کیا کہہ دیا کہ بونے پر بھوت سوار ہوگیا۔ اُس نے جھلا کر میاں گلیور صاحب کو اُٹھا چاندی کے مکھن سے بھرے ہوئے پیالے میں پھینک دیا اور خود کمرے سے نکل بھاگ گیا۔

دیوزادوں کا پیالہ گلیور کے لئے حوض سمجھنا چاہیئے۔ اور پھر گرا بھی سر نیچے اور پاؤں اُوپر۔ زندگی مجھو جو جیتا رہا۔ لڑکی اتفاق سے کمرے کے دوسرے کونے میں تھی۔ چیخ سنکر دوڑی کہ آ کے مکھن کے پیالے میں سے نکالے۔ لیکن نکالتے نکالتے اس کے پیٹ میں کئی پونڈ مکھن اتر چکا تھا۔ لڑکی کے جھپاکے سے گلیور بچ گیا۔ یہی غنیمت ہوا اور سوائے اس کے اور زیادہ کوئی تکلیف نہیں پہنچی کہ اُس کے کپڑے بالکل خراب ہوگئے بونے کو اس حرکت کی سزا میں خوب کوڑے پڑے اور پیالے کا باقی ماندہ مکھن اُسے زبردستی پلایا۔

اس ملک میں گلیور کے لئے مکھیوں کا عذاب سب سے بڑا عذاب تھا۔ ایک ایک مکھی اتنی بڑی تھی جیسے انگلستان کا چنڈول۔ گرمی کے موسم میں جب وہ کھانے کو بیٹھتا تو مصیبت آجاتی۔ مکھیاں ناک میں دم کر دیتیں۔ ایک منٹ کو چین نہ ملتا۔ اس کے چاروں طرف بھنبھناتی اور اُڑتی رہتیں۔ اور وہ انہیں اُڑاتے اُڑاتے پاگل بن جاتا۔ کھانے پر بیٹھتیں تو اُٹھنے کا نام نہ لیتیں۔ پریشان ہوکر اُٹھ کھڑا ہوتا۔ کوئی چیز کھانے کے قابل نہ رہتی۔ بعض دفعہ وہ اس کی ناک پہ یا ماتھے پر آ جمتیں۔ ڈنک مارتیں اور کاٹتیں پیچھا چھڑانا مشکل تھا۔

(باقی آئندہ)

فلمی خبریں

(از فصیح الدین احمد، ایم، اے)

(۱) نیو ہنس پکچرس لمیٹڈ کے زیر اہتمام ایک فلم "دروپدی" تیار ہو رہا ہے۔ اس فلم میں مشہور سوشیلا رانی کی اداکاری ارباب ذوق کیلئے خاص دلچسپی کا باعث ہوگی۔ دروپدی کا پارٹ ادا کرنے کیلئے یقیناً ایک شاندار شخصیت کی ضرورت ہے۔ اور اس سلسلہ میں دروپدی کے مکالمہ نگار مسٹر جے، سی کیشپ کا یہ بیان کافی اطمینان بخش ہے کہ اس فلم میں سوشیلا رانی کی ہر ادا سے ایک رانی کا جاہ و حشم ٹپکتا ہے۔ دوسرے اداکاروں میں جیندر موہن، مظہر خاں، بابوراؤ، پندھارکار، کے، این سنگھ، ڈکشٹ اور پرمتما دیوی کے نام کچھ کم قابل توجہ نہیں ہیں۔

(۲) جینت دیسائی پروڈکشن کا تیار کیا ہوا فلم جگت راج ملک کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک شائقین سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔ اس فلم کا ہر شہر میں خاطر خواہ خیر مقدم ہو چکا ہے۔ ہمیں امید تھی کہ اس فلم کے بعد جینت دیسائی پروڈکشن کوئی اور فلم جلد ہی پیش کر سکے گا۔ مگر معلوم ہوا ہے کہ گورنمنٹ سے لائسنس نہ ملنے کی وجہ سے پروگرام کی تکمیل میں کچھ دیر لگ جائیگی۔

(۳) ہندوستان چترا کے زیر اہتمام کشور ساہو ایک فلم شرارت تیار کر رہے تھے۔ اطلاع ملی ہے کہ یہ فلم نصف سے زیادہ تیار ہو چکا ہے۔ فلم کی بنیاد ایک کامیڈی پر ہے۔ اداکاروں میں خود کشور ساہو اور پردتما داس گپتا کے نام دیکھکر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ فلم عوام میں بہت مقبولیت حاصل کرے گا۔

(۴) راج لکشمی پروڈکشن بڑے اہتمام کے ساتھ ایک فلم کالی داس تیار کر رہی ہے۔ اس فلم میں مشہور و معروف پہاڑی سانیال اور سنیہہ پربھا پردھان اداکاری کر رہے ہیں۔ کہانی اور اس کے ساتھ اداکاروں کے نام دیکھکر اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ فلم نہایت کامیاب ثابت ہوگا۔

(۵) پردیپ پکچرس ان دنوں ایک نیا فلم پناداسی کی تیاری پر ہے۔ مسز کملا بائی منگلورکر اس فلم کے س کے بارے میں دیوان شرر سے مشورہ کر رہی ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے دو ماہ سے اس فلم کی تیاری میں منہمک ہو جائیں گی۔

(۶) رنجیت موی ٹون کا تیار کیا ہوا فلم تان سین کافی مقبو کر چکا ہے۔ "تان سین" کے بعد اس کمپنی ہوا دوسرا فلم شنکر پاربتی آ رہا ہے۔ اس کے علاوہ دیش کنیا ہے جس میں سادھونا بوس، پرتھوی راج نے کام کیا ہے۔ کمپنی کے آئند میں شہنشاہ بابر۔ گنیش جنم۔ ممتاز اور سیتا ہرن

(۷) پنچولی آرٹ پروڈکشن کچھ عرصہ سے ایک فلم شیریں فرہاد بڑے شاندار انتظ کے ساتھ تیار کر رہی ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ اب یہ فلم تیاری کی آخ منزل میں ہے۔ اس فلم کی تیاری پر بے دریغ دولت اور محنت کی گئی ہے۔ اس تاریخی ٹریجڈی کو صحیح ماحول اور اس زمانے کے سامان کے ساتھ پیش کرنا یقیناً کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اس کمپنی نے بڑی کاوش کا ثبوت دیا ہے۔ ہمیں اس فلم سے شا وابستہ ہیں۔

(۸) رامنک پروڈکشن اپنے اندھیری کے سٹوڈیو فلم کرن تیار کر رہی ہے ملی ہے کہ یہ فلم بہت جلد تیار ہو جائیگا۔ فلم کی بنیاد ایک معاشرتی اداکاروں میں اشوک کمار اور لیلا چٹنس کے نام دیکھکر اس کی مقبولیت

ستعبہ نہیں رہ جاتا۔ اس کے ساتھ یہ کمپنی عام دلچسپی کا ایک فلم بندوق والی بھی تیار کر رہی ہے۔

(۹) نونگ چتر ایٹ لمیٹڈ نے ایک تازہ فلم نیا ترانہ کی تکمیل کرلی ہے جو بہت جلد دکھایا جانے والا ہے۔ اس فلم کی روح رواں جیرآج اور سنیہہ پربھا ہیں۔ کہانی میں جدید حالات اور ان کے تقاضوں کو مد نظر رکھا گیا ہے۔ جسے اداکاروں نے اور اہمیت دیدی ہے۔

(۱۰) جوبلیر فلم ان دنوں ایک پروپیگنڈا پکچر ہٹلر یا ہٹلر تیار کرنے میں مصروف ہے۔ اس فلم میں حکومت کی اعانت حاصل کرنے کے لئے کمپنی کے ارباب حل وعقد کچھ عرصہ ہوا دلی آئے ہوئے تھے۔ ہمیں امید ہے یہ فلم ملک میں فاشسٹ دشمنی کا جذبہ پیدا کرنے میں مدد دیگا۔ اور دلچسپی بھی برقرار رکھے گا۔

(۱۱) اسن رائز پکچرس ان دنوں ایک معاشرتی کہانی ماں باپ کی تیاری میں مصروف ہے۔ جو اپنی آخری منزل میں ہے۔ کہانی گھریلو مسائل سے متعلق ہے۔ اور اس کی تیاری میں پروڈیوسر دی، ایم، دیاس خاص توجہ کا ثبوت دے رہے ہیں۔

(۱۲) انٹرنیشنل تھیٹرس ایک دلچسپ معاشرتی فلم جدائی تقریباً تیار کرچکی ہے۔ خیال ہے کہ اسی ماہ کی آخری تاریخوں میں ریلیز ہو جائیگا۔

(۱۳) کمل رائے پکچرس کا تیار کیا ہوا شاندار فلم اکبر بمبئی میں بڑی مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ اس فلم میں اس زمانہ کی درباری شان وشوکت اور علمی و فنی ماحول پیش کرنے کا خاص انتظام کیا گیا ہے۔

پروڈیوسر رائے کا آئندہ پروگرام لائسنس نہ ملنے کی وجہ سے ذرا مذبذب ہے۔ ہمیں اُمید ہے اس عرصہ میں انہوں نے اپنی مشکلات حل کرکے کسی اور فلم کی تیاری کا پروگرام بنالیا ہوگا۔

(۱۴) چندر آرٹ پروڈکشن کی درخواست پر ہندستان کے مشہور ڈائریکٹر مسٹر جینت دیسائی نے ایک فلم منورما کا ڈائرکیشن منظور کرلیا ہے۔ کہا جاتا ہے اب تک کسی ہندوستانی ڈائرکٹر کو اتنا معاوضہ نہیں ملا جتنا اس فلم کے سلسلہ میں مسٹر جینت دیسائی کو دیا گیا ہے۔ فلم کے اداکاروں میں لیلا چٹنس، ایشور لال، چارلی، مبارک اور بابا پیرجی کے نام قابل ذکر ہیں۔

دلچسپ خبریں

یہ موسم شادی کا موسم رہا ہے۔ اس عرصہ میں بے شمار ہستیوں نے پیشہ ازدواج قبول کیا ہے۔ شادی کی اس خوشگوار نسیم نے فلمی دنیا کو بھی اپنی نشاط سامانیوں سے محروم نہیں رکھا۔ چنانچہ معتبر ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ مسز درگا کھوٹے نے جو ایک عرصہ سے بیوگی کی زندگی بسر کر رہی تھیں ایک صاحب مسٹر رشید کو اپنا رفیق حیات منتخب کرلیا ہے۔ مسٹر رشید غالباً ضلع بلند شہر کے رہنے والے ہیں اور ان دنوں فلائٹ لفٹننٹ کے عہدے پر مامور ہیں۔ مسز درگا کھوٹے اداکار کی حیثیت سے فلمی دنیا میں کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کرچکی ہیں۔ اس وقت ان کی عمر اکتالیس سال کی ہے۔ اب دفعتاً وہ مسز درگا کھوٹے سے بیگم رشید بن گئی ہیں۔ اس اتحاد کا ہم انتہائی مسرت کے ساتھ خیر مقدم کرتے ہیں۔

مس ہتو جو اداکاری اور خاص طور پر گانے کی بنا پر فلمی دنیا میں کافی شہرت حاصل کرچکی ہیں، اس طرف کچھ عرصہ سے گوشہ نشین تھیں۔ اب شادی کرکے انہوں نے یہ جمود توڑ دیا ہے۔ نئے ازدواجی رشتے کی بنا پر وہ بیگم بھٹو ہوگئی ہیں۔ اطلاع ملی ہے وہ اب اپنی تازہ مسرتوں کے ساتھ دوبارہ بمبئی تشریف لے گئی ہیں۔ امید ہے یہ رشتہ مستحکم اور مضبوط ثابت ہوگا۔

ہر مسئلہ کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ ازدواجی زندگی کا کبھی کبھی یہی انجام ہوتا ہے کہ علیحدگی اختیار کرلی جائے۔ ہالی وڈ میں شادی اور طلاق دونوں بہت عام چیزیں ہیں۔ وہاں سے آئے دن اس قسم کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ ہندوستان کی فلمی دنیا بھی غالباً اس راستہ پر تیزی سے گامزن ہے۔ چنانچہ ہمیں اس حلقہ سے جہاں چند شادیوں کی خبر ملی ہے۔ وہاں ایک طلاق کی بھی اطلاع ملی ہے۔ مسز لیلا گولاتی نے جو لیلا چٹنس کے نام سے کافی شہرت اور مقبولیت حاصل کرچکی ہیں۔ اپنے دوسرے شوہر مسٹر گولاتی سے علیحدگی اختیار کرلی ہے اور اپنے خاندانی نام کی طرف رجوع کرلیا ہے۔

اپنی صحت کی حفاظت کیجئے!

آج کل اصلی گھی کا ملنا دشوار ہے —— اور —— بازاری گھی سے صحت تباہ ہو جاتی ہے

لہذا بہترین مشورہ یہ ہے کہ آپ

گنیش فلور ملز کمپنی لمیٹڈ

—— کا تیار کیا ہوا اصلی اور عمدہ ——

بنولہ برانڈ بناسپتی

-----------:(استعمال کیجئے):-----------

یہ اس قدر لطیف اور پاکیزہ ہے کہ آسانی سے ہضم ہوجاتا ہے!

ہر کھانے کو خوش ذائقہ بنانے کے لئے بہترین چیز ہے !!

غیر معمولی طاقت اور تر و تازگی پیدا کرتا ہے!!!

منیجر گنیش فلور ملز کمپنی لمیٹڈ۔ دہلی

لوکل ایجنٹ:۔ مراری لال۔ رام کشن داس کھاری باؤلی۔ دہلی

نیشنل وار فرنٹ

یعنی

قومی محاذ جنگ کیا چیز ہے؟

نیشنل وار فرنٹ یعنی قومی محاذ جنگ کا مقصد پبلک کی اندرونی اصلاح اور امن عامہ کو بحال رکھنے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد تمام عوام الناس کی فلاح و بہبود کے لئے ہیں۔

اس کے مقاصد یہ ہیں:۔

(۱) امن عامہ کو قائم رکھنے کے لئے عوام الناس کا تعاون حاصل کرنا اور بدامنی پھیلانے کے ذریعوں کو دور کرنا۔

(۲) ہندوستان کی جملہ اقوام میں اتحاد باہمی قائم کرانا۔ اور اس کے لئے کوشش کرنا۔

(۳) بدمعاشوں اور غنڈوں کی دیکھ بھال اور اُن کا انسداد کرنے کیلئے عوام کی امداد کرنا۔

(۴) غلط خبروں اور جھوٹی افواہوں کی تردید کرنا۔ اور اُن کو پھیلنے سے روکنا۔

(۵) پانچویں کالم یعنی دشمن کے جاسوس اور دشمنوں سے ہمدردی رکھنے والوں کا پتہ لگانا۔ اور اُن کی نگرانی کرنا تاکہ وہ اپنی کارروائیوں کو عمل میں نہ لاسکیں۔

(۶) کھانے پینے اور ضروریات زندگی کی چیزوں کو انکی مقررہ قیمت پر فروخت کرنیکا انتظام کرنا اور ناجائز منافع بازی کو روکنا۔

(۷) زائد غلہ پیدا کرنے کی ہدایت کرنا اس کے متعلق پروپیگنڈا کرنا۔

(۸) شہری بچاؤ اور ہوائی حملے سے بچنے کی تعلیم حاصل کرنیکی جانب عوام الناس کی توجہ دلانا۔ اور اسکے فوائد عوام کے ذہن نشین کرانا۔

(۹) شکست خوردہ ذہنیت کی ہر ممکن طریقے سے اصلاح کرنا۔

نیشنل وار فرنٹ کے اغراض و مقاصد اور اس کا طریق کار کسی سیاسی جماعت کے خلاف نہیں ہے۔ اور نہ کسی کو اس سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ عوام الناس کو نیشنل وار فرنٹ کی خدمات سے فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ اور تعاون کرکے عوام الناس کی فلاح و بہبودی میں حصہ لینا چاہیئے۔

پراونشل نیشنل وار فرنٹ ۲۵ راجپور روڈ۔ دہلی

دوائی تکیہ رجسٹرڈ

کیا ایک خوبصورت بچّہ کی ماں بننے کی آرزو ہے؟

وہ کون سی خاتون ہے جو نہیں چاہتی کہ اس کی گود ہری بھری رہے۔ دنیا میں اولاد سے بڑھکر کوئی نعمت نہیں۔ اولاد کے لئے ہزار ہا روپیہ صرف کر دیا جاتا ہے۔ مرادیں اور منتیں مانی جاتی ہیں۔ گنڈے تعویذ کئے جاتے ہیں۔ لیکن اب بہت کم عورتوں کو اس کا علم ہے کہ **سیلان الرحم** کی وجہ سے اولاد نہیں ہوتی۔ یہ ایک مرض ہے جو خفیہ جسم سے پانی کی شکل میں بہتا رہتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ شباب آہستہ آہستہ رخصت ہونے لگتا ہے۔ طبیعت مضمحل اور افسردہ رہتی ہے۔ بھوک اڑ جاتی ہے۔ قبض رہتا ہے۔ اور جب تک یہ مرض رہتا ہے۔ استقرار حمل ناممکن ہے۔ لہٰذا **دوائی تکیہ** مستورات کو استعمال کرائیے۔ جو مذکورہ مرض کو ہمیشہ کے لئے دور کر کے اولاد ہونے کی بشارت دیتی ہے اور ماہواری ایام بھی اس دوا کے استعمال سے درست ہو جاتے ہیں۔ **قیمت بیس خوراک ۵ عہ**

ترکیب استعمال دوا کے پیکٹ پر تحریر ہے

مشہور دواخانہ فراشخانہ۔ دہلی

سرتاج مقویات
معجون شقاقل



جریان، رقت، سرعت، کثرت احتلام اور قوت مردی کیلئے حیرت انگیز ہے بے انتہا امساک، طاقت اور سختی پیدا کرتی ہے۔ جوش اور قوت برقرار رکھتی ہے۔ اس کا نسخہ بھی خاندان شریفی کا ایک خاص نسخہ ہے۔ جسکو عالیجناب مسیح الزماں حکیم حاجی محمد فاضل خاں صاحب رئیس اعظم دہلی نے خاص طور پر شمسی دواخانہ کو عنایت فرمایا ہے۔ ترکیب استعمال ۹ ماشہ صبح۔ ۹ ماشہ شام کھا کر دودھ پی لیں۔ قیمت فی ڈبیہ تیس خوراک ۲ عہ

طبّی مشورہ: اگر کوئی صاحب اپنے مرض کے متعلق خاص طور پر ہم سے یا ہمارے ذریعہ کسی حاذق طبیب سے مشورہ لینا چاہیں تو وہ مفصل حالات خوشخط اور صاف الفاظ میں لکھکر بھیج دیں۔ جواب کے لئے چھ پیسے کے ٹکٹ ڈاک کے ارسال کریں۔ ہم نہایت راز کے ساتھ مشورہ اور تجویز سے اطلاع دینگے پھر اگر مجوزہ نسخہ تیار کرانا منظور ہو تو کارخانہ واجبی قیمت پر اور احتیاط سے اس خدمت کو انجام دیگا لیکن اس صورت میں نسخہ کی پوری قیمت پیشگی آنی چاہیئے۔

شمسی دواخانہ۔ بلی ماران۔ دہلی

صاف اور ستھری
خوردنیات
ملتی ہیں
گوئلز رائس ہاؤس۔ کھاری باؤلی۔ دہلی

سودیشی کپڑا
گوئلز ہاؤس کی دکان سے خریدیں

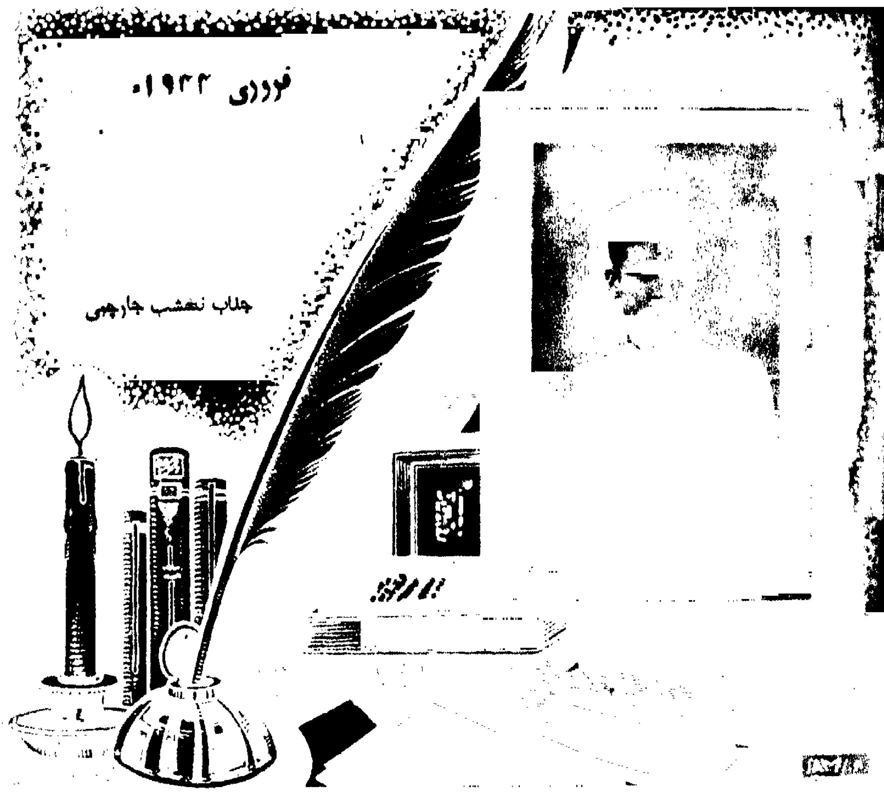
بردکان نیو فرینڈ اینڈ کمپنی۔ چاندنی چوک دہلی

گھڑیال گھنٹے
نیو فرینڈ اینڈ کمپنی
چاندنی چوک دہلی کی دکان سے خریدیں


کائنات کی مصوری اور بہشت کا حسن
اگر دیکھنا ہو تو شکنتلا ملاحظہ فرمائیے!!
یہ مشورہ
دنیا کے مشہور فلاسفر گوئٹے نے دیا ہے
شکنتلا
ڈائرکٹر
شانتا رام
کلاکے
دیوان شرر
رتن پیا
راج کمل کلا مندر کی
پھولوں بھری تصویر
ادا کاران
بیگم ابو
جے شری، چندر موہن
وغیرہ
میجسٹک سنیما میں
جمعہ ۳۱ دسمبر کو شاندار افتتاح
جاری کردہ:- جنرل ٹائمز لمیٹڈ۔ دہلی

THE 'ADEEB' DELHI

ماہنامہ ادیب (دہلی)



فروری ۱۹۳۲ء

جناب نخشب جارچوی

جلد ۶ نمبر ۲

اڈیٹرز:- فصیح الدین احمد ایم اے، سید محمد مرتضیٰ واحدی

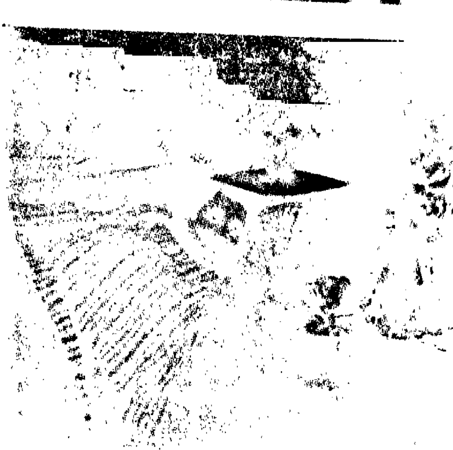
سالانہ: [illegible]
فی کاپی:- [illegible]



رای فلم کی ایک اداکار



مہاتما ودر



درگا مونا
فلم ''پونجی''
میں

★



چندہ سالانہ:- دس روپے علاوہ محصولڈاک

قیمت فی پرچہ:- ایک روپیہ علاوہ محصولڈاک

ادیب دہلی

اڈیٹرز:-

سید محمد ارتضیٰ واحدی

فصیح الدین احمد ایم، اے

(آنسہ) نجمہ تصدق ایم، اے. بی ٹی

جلد ۶ | فروری سنہ ۱۹۴۴ء | نمبر ۴

فہرست مضامین

فصیح الدین احمد ایم اے نے جید برقی پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر "ادیب" چاندنی محل دہلی سے شائع کیا

اشارات

فصیح الدین احمد ایم۔اے

جنوری میں مسٹر شنتارام پیدا ڈیوسر ڈائرکٹر راج کمل کلامندر دہلی آئے ہوئے تھے۔ وہ دہلی کے ادیبوں سے ملنا چاہتے تھے۔ اس لئے چند صاحبان کو لائبریری میں چاء پر مدعو کیا گیا۔ جس میں چند شعرا اور ادیب موجود تھے۔

مسٹر شنتارام اپنے نئے فلم کے لئے کسی ایسے شاعر کی خدمات حاصل کرنا چاہتے تھے جو عام فہم گیت ہندوستانی زبان میں لکھ سکے۔

ان کی نظر انتخاب مسٹر نخشب جارچوی پر پڑی اور ان سے معاہدہ کرلیا گیا۔ نخشب صاحب فی الحال چھ ماہ کے لئے مسٹر شنتارام کے سٹوڈیو میں چار سو روپے ماہوار پر کام کریں گے۔ اور ممکن ہے ان کے تقرر میں مزید توسیع بھی ہوجائے۔ نخشب کی موہنی صورت، سرود تعزیزی اور شگفتہ اور سلیس کلام نے ان کو پہلے ہی سے ادبی حلقوں میں ممتاز بنادیا تھا۔ ریڈیو سے بھی اکثر ان کا کلام براڈکاسٹ ہوتا تھا۔ ہمیں امید ہے کہ فلمی دنیا میں داخل ہوکر یہ فلمی دنیا کے معیار موسیقی کو بھی بلند کرنے میں کامیاب ثابت ہونگے۔

حضرت جگر مرادآبادی بھی جنوری میں دہلی آئے تھے۔ لائبریری کے ایک ادبی جلسے میں ان کو چاء کی دعوت دی گئی۔ چاء کے بعد شعراء نے اپنا کلام سنایا۔ اور آخر میں جگر صاحب نے بھی تین غزلیں اپنے مخصوص انداز میں پڑھ کر سنائیں۔ ان میں سے ایک غزل ناظرین "ادیب" کے لئے اسی شمارہ میں شائع کی گئی ہے۔

جگر صاحب کی زبانی یہ معلوم ہوکر بڑی حیرت ہوئی کہ آل انڈیا ریڈیو کے ارباب حل و عقد نے گانے کے پروگرام کے لئے بعض شعرائے کرام کی غزلیں اور گیت ان شرائط پر حاصل کی ہیں کہ ایک دفعہ براڈکاسٹ کی ہوئی غزل یا گیت کا معاوضہ مصنفوں کو حسب مراتب آٹھ آنے یا چار آنے دیا جائے گا۔ بعض شعرا نے ان شرائط کو اس خیال سے منظور کرلیا ہے کہ ان کی ایک ایک "چیز" مختلف اسٹیشنوں سے کئی کئی بار گائی جاسکتی ہے۔ اور اس طرح ایک معینہ میعاد میں ایک اچھی خاصی رقم معاوضہ میں مل جائیگی۔ ان امکانات کے باوجود ایک براڈکاسٹ کی ہوئی غزل کا معاوضہ ایک ممتاز شاعر کو چار آنے یا آٹھ آنے پیش کرنا نہ صرف شعر و ادب کی توہین ہے۔ بلکہ یہ سخت مضحکہ خیز پیشکش ہے۔

پچھلی اشاعتوں کی طرح ادیب کی موجودہ اشاعت میں بھی ناظرین کو مضمون نگار حضرات و خواتین کی ادبی کاوشوں کا خوشگوار امتزاج ملے گا۔ مضامین میں خواجہ محمد شفیع صاحب کا مضمون ہماری رسومات کا فلسفہ خاصے کی چیز ہے۔ علامہ سیماب کی کتاب "التسلف" کا سلسلہ اس اشاعت میں بھی جاری ہے۔ ہماری اسی اشاعت میں شاید حصہ نظم ناظرین کیلئے خاص طور پر جاذب توجہ ہو۔ نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کا منظوم ترجمہ انکی قادرالکلامی کا آئینہ ہے۔ حضرت جگر مرادآبادی اور اختر شیرانی کی غزلیں اپنے اندر مخصوص سرمستی رکھتی ہیں جو تغزل کی جان ہے۔ انکے علاوہ ترقی پسند شعرا میں علی جواد زیدی صاحب نے اپنی "نظم سنتا جاتا ہوں میں" ہمیں پہلی دفعہ یاد کیا ہے۔ خواتین کے مضامین نظم و نثر بھی اپنا مخصوص معیار رکھتے ہیں۔

از فصیح الدین احمد ایم، اے

نئی کتابیں

(۱) اعمالنامہ

از سر سید رضا علی۔ کے، ٹی، سی، بی۔ ای۔ ایم۔ ایل، اے

شائع کردہ ہندوستانی پبلشرز دلّی ۔ قیمت مجلد آٹھ روپے۔

بہت سے لوگ سر سید رضا علی کو صرف "سر" کی حیثیت سے جانتے ہیں بعض لوگ موصوف سے ایک با اثر اور با رسوخ انسان کی حیثیت سے واقف ہیں۔ بہت سے لوگ ان کی سیاسی دلچسپیوں کی وجہ سے ان سے واقف ہیں۔ اہل ذوق کا ایک طبقہ انہیں مشاعروں کے ایک نہایت کامیاب اور مقبول صدر کی حیثیت سے جانتا ہے۔ دراصل ان کا دائرہ عمل اتنا وسیع ہے اور ان کے مشاغل میں اتنا تنوع ہے کہ ان کے جاننے والوں کی تعداد بھی بہت ہے اور جاننے کی نوعیتیں بھی مختلف ہیں۔ مگر بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ وہ نہایت پاکیزہ ذوق رکھنے والے اہل قلم اور ایک بلند پایہ ادیب بھی ہیں۔ اور اس حقیقت کا انکشاف خود موصوف نے اپنی کتاب "اعمالنامہ" میں کیا ہے جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ جن لوگوں نے سر سید رضا علی کو بہت قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان میں مشرقی مغربی کلچر کا نہایت خوشگوار اور دلآویز امتزاج ہے۔ ایک طرف اگر وہ انگریزی علوم و ادبیات میں شغف رکھتے ہیں تو دوسری طرف فارسی ان کے دل و دماغ میں رچی ہوئی ہے۔ ان خصوصیتوں کا ان کی کتاب "اعمال نامہ" میں جا بجا اظہار ہو رہا ہے

کتاب بظاہر مصنف کی سوانح حیات ہے۔ مگر یہ درحقیقت زندگی کے واقعات و حوادث کا ایک خشک مرقع یا ریکارڈ نہیں ہے۔ اس میں بہت کچھ ہے اور جو کچھ ہے وہ سب پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ کتاب ۵۲۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اور چودہ ابواب میں منقسم ہے۔ یہ تقسیم زندگی کے مختلف دور اور اس کی نوعیت کے لحاظ سے کی گئی ہے۔ کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے اپنی زندگی کے ساتھ ساتھ گرد و پیش کے حالات اور شخصیتوں پر نہایت جامع تبصرہ بھی کیا ہے۔ ہمیں اس میں تذکرہ و تنقید کے ساتھ ساتھ ایک افسانوی کیفیت بھی ملتی ہے۔ کیونکہ ہم اس دور کے حالات اور ان شخصیتوں سے بہت دور کی واقفیت رکھتے ہیں۔ کتاب میں پچھلی نصف صدی کے سیاسی علمی و ادبی معرکے، اس دور کی مختلف تحریکیں، سر برآوردہ علماء، لیڈر، حکام، ادیب و شعرا کے متعلق معلومات، ادبی چٹکلے غرض کیا کچھ نہیں ملتا۔ اسلوب دلکش و دلآویز ہے۔ اس کی تہ میں مزاح کی لطیف چاشنی بھی ہے۔ اور یہ خصوصیت تو خود کتاب کے نام میں جھلک رہی ہے۔ بلاشبہ یہ اپنی نوعیت کی اردو میں پہلی سوانح حیات ہے جو یقیناً ہر حلقہ میں دلچسپی اور شوق کے ساتھ پڑھی جائیگی۔

---

(۲) پوشیدہ محل

مترجمہ چندر بھوشن سنگھ

انڈین پریس لمیٹڈ الٰہ آباد (قیمت درج نہیں)

انڈین پریس لمیٹڈ الٰہ آباد کو بعض اچھی ادبی و سیاسی کتابیں شائع کرنے کا فخر حاصل ہے۔ ان کے علاوہ اس پریس سے عام دلچسپی کی کتابیں بھی وقتاً فوقتاً شائع ہوتی ہیں۔ زیر نظر کتاب "پوشیدہ محل" آخر الذکر سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ یہ ایک جاسوسی ناول کا ترجمہ ہے۔ جس میں نام، جگہیں اور ماحول تبدیل کر کے مقامی رنگ دیا گیا ہے۔ اس میں وہ تمام خصوصیتیں موجود ہیں جو ایک جاسوسی ناول میں پائی جاتی ہیں۔ پیچیدہ گتھیاں اور عقدے پھر ان کا حل، تلاش و تجسس، حیرت میں ڈال لینے والے واقعات و حوادث، سربستہ رازوں کا انکشاف،

... کے بعد پھر ... سب ... ناول میں ... ترتیب کے ساتھ نمایاں ہیں۔ ناول پلاٹ کے اعتبار سے دلچسپ ہے اور امید ہے جاسوسی ناول کے شائقین اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے۔

---

(۳) لالہ و گل
از سید مجاہد حسین کاظمی
شائع کردہ ... پریس ... آباد۔ قیمت ۱۲/

"لالہ و گل" کاظمی صاحب کے نو افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کے افسانے زندگی کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب ساری کائنات "لالہ و گل" میں محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ جوانی، حسن اور عشق ہمیشہ کے ساتھی ہیں۔ زندگی کی انہیں رومان خیز حقیقتوں کے گرد افسانے بنائے گئے ہیں۔ کاظمی صاحب کا موضوع سخن بھی یہی حقیقتیں ہیں۔ اور اسی لئے یہ افسانے تمام تر رومانی ہیں۔ لیکن انہوں نے ان کشمکشوں اور رکاوٹوں کا تذکرہ بھی کیا ہے جو سماج جوانوں کی راہ میں پیدا کر دیا کرتا ہے۔ اس لئے ان کہانیوں میں مصنف کا جذبہ خلوص نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جنت تخیل کی نظر فریبیوں سے بچنا آسان نہیں پھر بھی کاظمی صاحب نے سنبھل سنبھل کے قدم اٹھایا ہے۔ ان میں صلاحیتیں موجود ہیں۔ اور سماجی مسائل کا مطالعہ جتنا گہرا ہوتا جائیگا ان کی تحریروں میں پختگی آتی جائے گی۔ یہ مجموعہ غالباً مصنف کی پہلی کوشش ہے اور کئی حیثیتوں سے بہت کامیاب ہے۔ ہمیں امید ہے کہ یہ مجموعہ عام طور سے پسند کیا جائیگا۔

---

(۴) پتھر سے ہیرا
از ڈاکٹر سعید احمد بریلوی
شائع کردہ احمد مجتبیٰ برادرز بلیماران نیا کتاب گھر دلی
قیمت دو روپے

زیر نظر کتاب ایک تبلیغی افسانہ ہے جسے ڈاکٹر سعید احمد بریلوی نے اپنے مخصوص انداز میں قلمبند کیا ہے۔ اس افسانے میں ایک یتیم بچے کی کشمکش حیات دکھائی گئی ہے۔ افسانے میں زندگی کی ایک سچی تصویر ملتی ہے۔ کس طرح ایک لاوارث و بے مددگار لڑکا بری صحبت میں پڑ کر خراب ہو جاتا ہے۔ اور پھر کن کن حالات سے پیش آتے ہیں۔ اور کس قسم کی تربیت اسے حاصل ہو جاتی ہے۔ جس کی بنا پر اس کی اصلاح ہوتی ہے۔ اور پھر وہ دیانت، ایمانداری اور جفاکشی کے ساتھ زندگی کے حوادث کا مقابلہ کرتا ہے اور آہستہ آہستہ اوج عروج پر پہنچتا ہے۔ یہ افسانہ اپنی نوعیت کا نہایت سبق آموز افسانہ ہے۔ زبان نہایت صاف ستھری اور دلکش ہے۔ طرز تحریر کی سادگی اور دلکشی نے افسانے کو ...

از ... [illegible]
... [illegible] ...
کتاب کے تعارف میں ... صاحب کا ایک مختصر تعارف ... سے شامل ہے جس میں اجمالاً کتاب کی خوبیوں اور اس کی اخلاقی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

---

(۵) چاند سورج کی چوری
از محمد حمید تقی دہلوی
شائع کردہ نیا کتاب گھر دہلی
قیمت دو روپے

اردو میں اب تک جتنے جاسوسی ناول شائع ہوئے ہیں۔ ان میں زیادہ تر یا تو انگریزی سے ترجمہ کئے گئے ہیں یا پھر ان سے ماخوذ ہیں۔ اس قسم کے طبعزاد ناول بہت کم ہیں گے اور اس کی وجہ صاف ہے۔ جہاں جرائم کی نوعیت ... ہے وہاں تفتیش و تحقیق کے طریقے بھی ترقی یافتہ اور سائنٹفک ہوتے ہیں۔ یہاں جرائم ... واضح قسم کے عمل میں آتے ہیں اور اسی اعتبار سے تحقیقات کے طریقے بھی زیادہ پیچیدہ نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایسا ناول جاسوسی لکھنے کیلئے جس میں حیرت انگیز گتھیاں ہوں لکھنے والے کو تجربہ اور مشاہدہ سے زیادہ تخیل سے کام لینا پڑیگا۔ اور زیر نظر کتاب کے مصنف ... نے یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ ہر چند ناول میں انگریزی جاسوسی ناولوں کے مطالعہ کی جھلک ملتی ہے۔ مگر یہ ایسا ہے کہ طبعزاد ہونے میں ہمیں کوئی شبہ نہیں رہتا۔ ناول پلاٹ کے اعتبار سے ... زبان صاف اور ستھری ہے۔

(۶) سوسائٹی کے گناہ
از حکیم یوسف حسن
شائع کردہ ہندوستانی لٹریری کمپنی لاہور۔ قیمت عہر

ادبی حلقوں میں حکیم یوسف حسن صاحب ادیب سے زیادہ ایک اڈیٹر کی حیثیت سے روشناس ہیں۔ وہ نیرنگ خیال کے اڈیٹر ہیں جو بہت شاندار ماضی رکھتا ہے اور ایک زمانہ میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ حکیم صاحب نے ایسے شاندار سالنامے شائع کئے ہیں جنکے نقوش آج تک دلوں سے محو نہیں ہوئے ہیں۔ انہوں نے خود کم لکھا مگر اچھے اچھے ادیبوں کو روشناس کرایا ہے اور بہتوں میں لکھنے کا شوق پیدا کیا ہے۔ یہی انکا کیا کم احسان ہے؟ بہت کم لوگ اس بات سے واقف ہیں کہ انہوں نے شذرات کے علاوہ افسانے بھی لکھے ہیں۔ زیر نظر کتاب "سوسائٹی کے گناہ" ان کے ۱۵ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ افسانے ان مظالم اور ان اخلاقی جرائم کی داستانیں ہیں جو موجودہ سماجی نظام میں آئے دن رونما ہوتے رہتے ہیں۔ یہ افسانے فنی اعتبار سے تو کوئی بلند ادبی معیار نہیں رکھتے۔ مگر بہت سے لوگ شاید انہیں دلچسپی سے خالی نہ پائیں۔ کچھ لوگ لطف و تفریح کے لئے ان کا مطالعہ کریں گے۔ کچھ لوگ شاید ان سے سبق اور عبرت بھی حاصل کریں۔

شمالی ہند کے سب سے قابل و نامور پروڈیوسر

مسٹر پنچولی کا قابل داد افسانہ

داسی

جسکو

پردھان پکچرز نے اپنے عالیشان نگارخانہ میں فلما کر پیش کیا

اداکاران:-

راگنی۔ نجم الحسن۔ گیانی۔ کلاوتی۔ جی این بٹ

بے بی پروین۔ خیراتی وغیرہ

دلکش افسانہ ——— وجد آفریں نغمے

پرزور مکالمے ——— خاص صدابندی ——— اعلیٰ فوٹو گرافی

ڈائرکٹر ——— ہرن بوس

میوزک :——— امرناتھ

گانے و مکالمے :——— ڈی این مدھوک

منروا دہلی میں دسواں پر بہار ہفتہ

پنچولی کا بیش بہا کارنامہ

شیریں فرہاد

اداکاران خصوصی :-

راگنی۔ جینت۔ غلام محمد

بیش قیمت سازوسامان

یادگار رومان

دلگداز افسانہ

ڈائرکٹر :-

پرہلاد دت

جاری کردہ :- ایمپائر ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز۔ دہلی لاہور

(۷) سیدہ کی بیٹی از رازق الخیری

شائع کردہ عصمت بکڈپو دہلی۔ قیمت عہ

اگرچہ اُردو زبان میں مذہبی ادب کی فراوانی ہے۔ لیکن ابھی تک حضرت زینبؓ کی کوئی بھی مستند سوانح عمری نہیں لکھی گئی تھی جس میں ان کے حالات زندگی پر تاریخی نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی گئی ہو۔ مولانا رازق الخیری نے یہ کتاب لکھکر ادب و تاریخ کی ایک اہم خدمت انجام دی ہے۔

ایسی صورت میں کہ عربی یا فارسی میں بھی حضرت زینبؓ کے حالات کہیں یکجا صورت میں نہیں ملتے۔ مصنف کو مواد فراہم کرنے اور اسکو ترتیب دینے میں جس دقت کا سامنا ہوا ہوگا اس کا اندازہ تاریخی شہادتوں کے ان اختلافات سے ہو سکتا ہے جن پر اس کتاب میں بحث کی گئی ہے۔ لیکن خوشی کی بات ہے کہ مصنف نے ان اختلافات کو سلجھانے میں بڑی دقت نظر کا ثبوت دیا ہے۔ کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں کہیں بھی پڑھنے والوں کے مذہبی جذبات سے کھیلنے کی کوشش نہیں کی گئی بلکہ حالات کا جائزہ صوفی صدی تاریخی اعتبار سے لیا گیا ہے۔ اور ان پر نفسیات کی روشنی میں بحث کی گئی ہے۔

مصنف کی مصنفانہ صلاحیتوں کے علاوہ کتاب میں جگہ جگہ انکی ادبی صلاحیتوں کی جھلکیاں بھی ملتی ہیں۔ خصوصاً کتاب کا اسلوب بیان سادہ اور دلنشین ہے۔ دلی کی نکھری ستھری اور پاکیزہ زبان کی چاشنی کی وجہ سے انداز بیان میں ایک عجیب سلجھاؤ اور نکھار پیدا ہوگیا ہے۔ کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ سوانح عمری جیسے خشک موضوع کے باوجود اس میں شروع سے آخر تک ناول کی سی دلچسپی پائی جاتی ہے۔

---

(۸) ثمرۂ ایثار ترجمہ از ہندی۔ مترجم چندر بھوشن سنگھ

شائع کردہ انڈین پریس لمیٹڈ الہ آباد۔ (قیمت درج نہیں)

زیر نظر کتاب ہندی کے ایک ناول "تیاگ مولیہ" کا ترجمہ ہے۔ یہ ناول مسٹر سری چندر اگنہوتری کی تصنیف ہے اور مخصوص ہندوستانی پس منظر رکھتا ہے۔

یہ عجیب بات ہے کہ بنگالی زبان کے بے شمار افسانوں کا اُردو میں ترجمہ ہو چکا ہے لیکن ہندی کی طرف لوگوں نے کم توجہ کی ہے۔ ہر چند یہ زبان اُردو سے بہت زیادہ قریب ہے۔ اور موجودہ حالات کا تقاضہ یہی ہے کہ انہیں اور زیادہ قریب لانا چاہیئے اس طرح ہندی اور اُردو کے لکھنے والے نہ صرف ایک دوسرے کے خیالات اور مسائل سے واقفیت حاصل کر سکیں گے بلکہ اس سے اس مشترکہ زبان کے ارتقا میں بھی مدد ملیگی جسکے لئے ایک طبقہ سخت جد و جہد کر رہا ہے۔ اور جو واقعی ایک قومی اور ملکی ضرورت ہے ہمیں خوشی ہے کہ مسٹر چندر بھوشن سنگھ نے اس طرف توجہ کی۔

زیر نظر ناول میں ہندو سماج کے ایک خاص طبقہ کی زندگی اور اس کے تضاد ملتے ہیں۔ جگہ جگہ ذات پات کی تقسیم سے پیدا ہونے والے اُلجھاوے نظر آتے ہیں۔ ناول مجموعی حیثیت سے مخصوص اخلاقی اور اصلاحی رنگ رکھتا ہے۔ اس ناول کا ہیرو ذات پات کی تقسیم کی بنا پر جو جذباتی قربانی کرتا ہے آج موجودہ نوجوان طبیعتیں کہاں تک قبول کر سکتی ہیں۔ یہ البتہ مشتبہ ہے۔

ہماری رسومات • فلسفہ

(از جناب خواجہ محمد شفیع بی اے)

نوٹ :- خواجہ محمد شفیع صاحب کی زبان اکی مخصوص طرز ادا اردو ادب میں مستند ہو چکی ہے۔ انکی منفرد مہارت جزئی نئی تشبیہوں اور استعارات سے مرصع ہوتی ہے۔ انکی خصوصیت یہ بھی ہے کہ خشک مضمون کو دلچسپ اور شگفتہ پیرایہ میں بیان کرتے ہیں جو حضرات کو محل نظر ہو اسکا اندازہ [illegible] زیر نظر مقالہ سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔ (صبیح الدین احمد)

ہر ملک ہر خطہ اور ہر علاقہ کی پیداوار اس جگہ کی ضروریات اور حالات کے مطابق ہوتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس [illegible] انسانی کی تخلیق گرد و پیش ماحول کے مطابق اختراع کیجاتی ہیں۔ جیسے رہن سہن۔ طور طریقہ۔ طرز معاشرت۔ محاورہ۔ ادب۔ پوشاک و مکانات۔ حالات مقامی کے آئینہ دار ہوتے ہیں پھر رسومات کا تو پوچھنا ہی کیا۔ یہ تو بدرجہ اتم گرد و پیش کی عکاسی اور ماحول کی آئینہ داری کرتی ہیں۔

اگر کسی قوم کی ذہنیت۔ معاشرت اور دماغی تربیت کا پتہ لگانا ہو تو اس کی رسومات کو بنظر غور دیکھئے۔ حالات اظہر من الشمس ہو جائیں گے۔ اس قوم کی دماغی کیفیت آپ کے لئے کھلی ہوئی کتاب ہوگی۔ آپ سمجھ جائیں گے کہ ان کی مالی حالت کیسی تھی۔ دماغی تربیت کس قسم کی۔ ماحول کیا تھا اور تعلیم کہاں تک۔ بس ہماری رسومات بھی ہمارے سماج کا نمونہ ہیں۔

ہم پر ایک دور ایسا آیا کہ ہر ہندوستانی چیز نظروں سے گر گئی۔ دلوں سے اتر گئی۔ ہم الناس علیٰ دین ملوکہم کی تفسیر بن گئے۔ "خذ ما صفا ودع ما کدر" سے کوسوں دور جا پڑے۔ بلا امتیاز خوش و ناخوش اپنی ہر بات مردود قرار دے دی۔ اور حاکم کی ہر ادا محبوب۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ خیرہ کن عقل مغربی اثرات نئے نئے ہماری زندگی میں داخل ہوئے تھے۔ "کل جدید لذیذ" کا اثر تھا مزید براں حاکمانہ آب و تاب نے آنکھیں چندھیا دیں۔ عقلوں پر فانوس ڈھک دیئے۔ نگاہ امتیاز و تنقید پر حاکم پرستی کی دھندلی عینک چڑھا دی۔ دماغوں پر احساس کمتری طاری عقدہ ارتذالی (Inferiority complex) نافذ۔

ہمارا پان جو وجہ سرخ روئی ہے روسیاہ قرار پایا اور چیونگ گم جو چبانے والے کا چہرہ بگاڑ دے پسند خاطر۔ حقہ جس میں تمباکو کا دھواں مدبر ہو کر پیچیدہ نلی تک آئے جبکہ تمباکو گڑ کی آمیزش سے اصلاح پائے زمانۂ جاہلیت کی بولتی نشانی تسلیم کیا گیا سگریٹ جو ان تمام خوبیوں سے معرا شب و روز چسنی کی طرح منہ سے لگا رہے۔

کشیدہ چادر چھوڑ چشمے امرتسر [illegible] زمانہ ماسبق کی [illegible] یادگار [illegible] غرض ہماری ہر چیز مورد صد لعنت اور دوسروں کی ہر بات وجہ ہزار آفرین۔ از انجملہ ہماری رسومات بھی شکار صد لعن طعن ہوئیں۔ اور جدت پسند نے مرفوع القلم قرار دیا۔ اور یک قلم لباس کی صحت آثار پھینکا۔

آہستہ آہستہ نگاہوں اس مغربی غریب شفتی کی [illegible] آنے لگا۔ [illegible] نے جھرجھری لی۔ نگاہ مبصر نے آنکھ کھولی تو نظر آیا کہ نہ ان کی ہر چیز اچھی تھی نہ ہماری ہر بات بری۔ اگر ہمارے ہاں کچھ خامیاں تھیں تو ان کے ہاں بھی عیوب موجود۔ اگر ہمارے پردے اور حجابات فضا میں تیرگی پیدا کر رہے تھے تو ان کے ہاں بے پردگی صنف نازک کو بربادی کی سرحدوں تک لا رہی تھی۔ گھر کی زینت بازاروں میں آ رہی تھی۔ عورت کی فطری حیا سر راہ ذبح کی جا رہی تھی۔ حیا شرم بول بدن میں اتارا جا رہا تھا۔ عورت کا مجسمہ حجابات سے معرا نظر آ رہا تھا۔ اب جو اپنی رسومات پر نظر غیر متعصب و غیر مرعوب ڈالی تو معلوم ہوا کہ وہ محض جہل و اسراف پر مبنی نہ تھیں بلکہ عقل سلیم و ادراک ذہن رس کو بدرجہ اتم دخل تھا۔

بندہ نواز جس طرح عبارت سیاق و سباق سے سمجھ میں آتی ہے بعینہ تہذیب و تمدن سے متعلق ہر چیز اس ہی ماحول کے پس منظر میں سمجھی جا سکتی ہے یعنی کہ اکثر الفاظ و اصطلاحات کا صحیح ادراک اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ جس ماحول میں وہ اختراع ہوئے ہوں اس کا صحیح شعور نہ ہو مثلاً انگریزی میں "پگ" (Peg) [illegible] اس کے معنی کیوں دیتا ہے۔ یا فارسی میں زیادہ پینے والے کو سرشار کیوں کہتے ہیں۔ ان الفاظ کی فہم و تفہیم سے آپ بے بہرہ رہیں گے اگر یہ معلوم نہ ہو کہ انگلستان میں شراب کاٹ کے پیالوں میں پی جاتی تھی۔ اور اس میں پیمائش کے لئے کھونٹیاں گڑی ہوتی تھیں۔ یہ لفظ اس دور کی نشانی ہے۔ ایران جو مانی و بہزاد کا ملک تھا وہاں جام پر عورت کا مجسمہ بنا ہوتا تھا اور وہی پیمانہ کا کام دیتا تھا۔ کوئی تا ساق پیتا کوئی تا کمر کوئی تا گلو تو کوئی تا سر۔ آخر الذکر سرشار کہلاتے تھے۔

اب ہم نے دیکھ لیا کہ الفاظ و اصطلاحات بھی معلومات ماحول کے بغیر پورے معنی نہیں دیتے۔ پس کسی قوم کی رسومات سمجھنے کے لئے اس کے گرد و پیش کو سمجھنا از بس ضروری ہے جس میں وہ رسمیں تخلیق پذیر ہوئیں۔

دیکھنا یہ ہے کہ جس زمانہ میں یہ رسمیں بنیں اور جس دور میں ان پر عمل ہوا رہا اس وقت کے حالات ان کے متقاضی تھے یا نہیں۔ پہلے شادی کی رسموں کو لیجئے چونکہ ان کا مرکز بیش از بیش دلہن ہوتی ہے اس لئے لازم آتا ہے کہ ہم اس صنف کی

ذہن کو سمجھیں اور پھر یہ فیصلہ کریں کہ اس کے لئے یہ رسومات ضروری تھیں یا نہیں۔

اس لڑکی کا تصور کیجئے جو ایسے گھرانے میں پلی ہو۔ مرد تو مرد جس کی صورت کسی غیر عورت نے نہ دیکھی ہو۔ جس کے خاندان کی عورتوں کا جنازہ رات کو گھر سے نکلے کہ نامحرم کی نظر نہ پڑسکے۔ جس کے کپڑے یا گھر میں دھلتے ہوں یا جلا دیئے جاتے ہوں۔ بہر نوع گھر سے باہر نہ جاتے ہوں۔ سات برس کی عمر کے بعد سے جس کے سر سے دوپٹہ نہ سرکا ہو جو چاندنی رات میں انگنائی میں نہ سوئی ہو۔ جس پردہ نشین کے پردہ گوش غیر مرد کی آواز سے آشنا نہ ہوئے ہوں، جسے آنکھوں میں رکھا گیا ہو۔ جسے چار دیواری میں پالا گیا ہو۔

جو اس گھر میں پیدا ہوئی ہو جہاں سے ماما ایک مرتبہ آکر مر کر باہر نکلے۔ جہاں چھپا ہوا کاغذ پڑیا کی شکل میں بھی گھر میں نہ جاسکے۔ مبادا زہر عشق۔ بہار عشق یا کسی اور ایسی ویسی کتاب کا ورق نہ ہو اور بال بچوں کی آنکھ اس پر پڑ جائے۔ جہاں احتیاط کا یہ عالم کہ بیاہی ہوئی لڑکیوں میں کواری بچیاں نہ بیٹھ سکیں۔ جہاں [illegible] تک جانے پائے جائیں۔ جہاں کوتروں کے جوڑے رہنے نہ پائیں۔ جہاں پرندہ پر نہ مارے۔ غیر عورت کا گذر نہ ہو۔

اس ماحول۔ اس فضا اور اس گرد و پیش میں پلی ہوئی لڑکی ہے۔ اب خدا کے جوان ہونے آئی۔ بادشاہ وزیر اپنی لڑکیوں کو نہ ہٹا سکے۔ یہ پرایا دھن ہے۔ پالا پوسا حوالہ کیا۔ لیکن سوچنا یہ ہے کہ جو عصمت مآب ان حالات میں پرورش کی گئی ہو اسے اچانک غیر مرد کے حوالہ کر دینا کہاں تک قرین مصلحت ہے۔ صحیح کہ اختلاط جنسی فطری شے ہے لیکن ہم آپ سے کہتے ہیں کہ کسی انسان کے نوزائیدہ بچے کو اندھیرے میں رکھئے۔ سال چھ مہینے گذر جانے پر دھوپ میں نکال لائیے اس کا بینائی از ہیبت بینائی کھو بیٹھنے کا امکان ہے۔ انہی کاوش کیوں کیجئے سینما دیکھ کر جب آپ باہر نکلتے ہیں اس وقت آنکھوں کی حالت پر غور کیجئے۔ کیوں صاحب آنکھیں فطرتاً اندھیرا اجالا دونوں دیکھنے کیلئے تخلیق کی گئیں پھر یہ تکلیف کیوں محسوس ہوتی ہے۔ اور کار دان مالکان سینما اول و آخر روشنی دینے اور بند کرنے میں احتیاط کیوں برتتے ہیں۔ بندہ نواز! اعصاب انسانی ایسے زود تغیرات کے لئے تخلیق نہیں کئے گئے۔

اب خیال کیجئے اس لڑکی کا جو محولہ بالا ماحول میں پلی ہو اور سوچئے کہ اگر اسے اچانک ایک غیر مرد کے حوالہ کر دیا جائے وہاں ان دو کے سوا اپنا بیگانہ کوئی نہ ہو تو کیا اس کے تھنک سے مر جانے کے امکانات نہیں ہیں۔ نیز یہ نظر انداز نہ کیجئے کہ اسے اسی وقت ازدواجی منازل بھی طے کرنی ہیں اور یہ نہ بھولئے کہ زیر بحث لڑکی کے عالم تخیل میں بھی یہ سب نہیں آئی تھی۔ اس لئے کہ جن حالات میں اسکی پرورش ہوئی ہے ان میں دماغ کا ادھر منتقل ہونا ممکن الوقوع نہیں۔

بندہ پرور! کلی کا پھول بننا عین فطرت ہے۔ لیکن پھر بھی قدرت کی اقتباح انہیں کھلاتی ہے۔ جبکہ شبنم تمام شب انہیں مائل بہ نمو کرتی ہوتی ہے اور نسیم صبح گاہی راجع بہ شگفتگی کر رہی ہوتی ہے۔

پس جس طرح مادر قدرت غنچہ کو کلی بنانے سے قبل اہتمام کرتی ہے بعینہ لڑکی کے ماں باپ بھی اپنی تاکیدوں اور احتیاطوں کی پالی کو ازدواجی زندگی میں داخل کرنے کے اہتمام کرتے ہیں۔ انہی انتظامات کو عرف عام میں رسوم سے موسوم کیا جاتا ہے۔

لڑکی خیر سے چودھویں میں لگی۔ ماں باپ کو فکر پڑی۔ ڈھیلا ڈھیلا مجنوں کا سا کرتہ بھی آثار شباب نہ چھپا سکا۔ بغیر آرائش جوانی اپنی زیبائش دکھانے لگی۔

جس گھر میں بیری ہوتی ہے پتھر آتے ہی ہیں لڑکی کی نسبتیں آنی شروع ہوئیں۔ ماں باپ نے مشورے کئے۔ کھاتا پیتا، ہڈی بوٹی سے درست گھرانا دیکھ ہامی بھر لی۔

نسبت پکی کرنے لڑکے والیاں آئیں۔ پھولوں کا گہنا انگوٹھی چھلا ساتھ لائیں۔ لڑکی پہلی مرتبہ ان کے سامنے کی گئی۔ معلوم ہے کہ لڑکی پہلے سے نہیں دکھائی جاتی تھی۔ پرانے گھرانوں میں دستور تھا کہ جہاں گھر میں کسی غیر بیوی نے قدم رکھا اور کنواری بچیاں کونے میں منہ چھپا کر جو بیٹھیں۔ کیا مجال جو کسی کی نظر پڑ جائے۔ لڑکے والیاں جب منگنی کرنے آتی تھیں اس وقت پہلی مرتبہ لڑکی ان کے سامنے کی جاتی تھی۔ اس وقت یہ عورتیں انگوٹھی چھلا بھی اپنے ہاتھ سے پہناتی تھیں اور پھولوں کا گہنا بھی۔ یہ عمر میں پہلی مرتبہ ہے کہ غیر عورت نے اس کے اچھوتے پنڈے کو ہاتھ لگایا اور غیر گھر کی چیز اس کے گلے کا ہار ہوئی۔ نیز پہلی مرتبہ بچی نے پھول پہنے عطر ملا۔ کواری بچی نہ پھول پہن سکتی تھی نہ عطر بسا سکتی تھی۔ اب نئی زندگی میں قدم رکھ رہی ہے۔ پسند فطرت جدتوں اور ندرتوں سے ابتدا کی جا رہی ہے کیسے خوشنما طریقے سے جتایا جا رہا ہے کہ اب ایک نئی دنیا میں داخل ہونا ہے۔ حیات نو کی ابتدا ہے۔ جو چیزیں اب تک تم پر منع تھیں روا کی جا رہی ہیں۔

غیر عورتوں کا اس طرح پھول پہنانا دل پر گراں گذرا طبیعت نے بوجھ محسوس کیا۔ لیکن اپنا گھر ہے اپنے گھیرے بیٹھے ہیں۔ ڈھارس بندھ گئی۔ بچی نے پہلی منزل بہ احسن الطریق طے کر لی۔

سال دو سال نسبت رہی۔ حقہ تقرہ آتے جاتے رہے۔ لڑکی کے کان میں سسرال کا لفظ پڑتا رہا۔ ہم عمر ہمجولیوں نے شرما لجا آنکھیں نیچی کر ایک دو مرتبہ دولھا کا نام بھی لے دیا۔ یہ حیا سے زمین میں گڑ گئی۔ لیکن قوت متخیلہ رو بکار

آئی۔ یہ لفظ کچھ معنی سے بھنے لگا۔ لڑکی ان الفاظ اور حالات کی جانب قدم قدم لائی جا رہی تھی۔

مانجھا نہا دھو کر بند کر کے گندہ گیا۔ شادی کا مہینہ آن لگا۔ لڑکی پندرہ دن پہلے سے مائیوں بٹھائی گئی۔ اب پورے پندرہ دن ان پر نمک حرام ہے مٹھاس کھانے کو ملے گی۔ اور وہ بھی پنجیریاں جن کا جزو لازم گوند کمانے اور کھوپرا ہے۔ پھر ایک کونے میں بیٹھا رہنا ہے۔ اپنی جگہ سے ہلنا نہیں۔ آسمان کے نیچے قدم نہیں نکال سکتیں۔ اوّل تو اس طرح بیٹھے رہنے میں بچی کو مستقبل پر سوچنے اور غور کرنے کا موقع ملتا ہے دوسرے بڑا گھرانہ ہے سو دوست ہیں۔ دو دشمن۔ دولھا والے بھی معمولی لوگ نہیں ہیں۔ نظریں پڑتی ہیں دس طرح اُٹھنے والے ہیں تو بیسیوں بیری اجلنے والے۔ دو گھرانوں کی عزّت کا معاملہ ہے۔ دشمن ایسے ہی موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ لڑکی بیاہی ہو چکی۔ پندرہ دن بعد خیر سے اپنے گھر کی ہو گی۔ اس وقت زیادہ سے زیادہ احتیاط لازم ہے۔ دشمنوں کے کان بہرے۔ کوئی اونچ نیچ نہ ہو جائے یہی وجہ ہے کہ سہیلیاں ساتھ کی کھیلیاں ہر وقت چاند کے گرد ہالہ کی مانند رہتی ہیں۔ دُلہن کو آٹھوں پہر نظروں میں رکھتی ہیں۔ سایہ کی طرح ساتھ۔

اس زمانہ میں دُلہن کی ہم عمر کنبہ کی بیاہی لڑکیاں زیادہ قریب رہتی تھیں۔ مصلحت یہ تھی کہ کچھ دُنیا کی باتیں کان میں پڑ جائیں۔ نئی نویلی ہے دل ہول نہ کھا جائے۔ بڑی بوڑھیاں تو کچھ کہہ نہیں سکتیں۔ حفظ مراتب اجازت نہیں دیتا۔ ہم عمریں باتوں باتوں میں اشاروں میں سمجھا دیں گی۔

ایک طرف تو یہ طریقہ کار اختیار کیا دوسری طرف مٹھاس کی بھرمار کر دی۔ سونے پر سہاگا۔ موتیوں میں دھاگا۔ حمامی مہندی لگا دی۔ اس پر طرّہ یہ کہ حنا اور سہاگ کے کنستر کے کنستر لنڈھائیے۔ نو عمروں میں بٹھانے کی مصلحت تو آپ سمجھ گئے۔ اب مٹھاس کا سوال آتا ہے۔ مٹھاس بھی خاص طور پر وہ جس میں گوند کمانے اور کھوپرے کی بیش از بیش آمیزش ہے۔

بندہ نواز! کسی طبیب سے دریافت کیجئے تو معلوم ہو گا کہ شیرینی خواہشات پر تازیانہ کا کام کرتی ہے۔ پھر گوند کمانے اور کھوپرا عورت کے لئے اس قسم کا خاص اثر رکھتے ہیں۔ جو بچی ازدواجی ماحول سے کوسوں دُور رکھی گئی تھی جس نے جانوروں کو بھی ان حالات میں نہیں دیکھا تھا، جس کے کان تک ایسے الفاظ سے آشنا نہ تھے اُسے ان مراحل کے لئے تیار کرنا ہے۔ ماناکہ خواہشات فطرت پیدا کرتی ہے۔ لیکن ماحول اُبھارتا ہے۔

پٹرول زیادہ سے زیادہ آتش گیر ہوتا ہے لیکن جب تک تُو نہیں پاتا

مجبور کرتا نہیں۔ اور اگر پانی نہیں تو بھی ... ہے۔ یہی کیفیت طبیعت انسانی کی ہے۔ فطرت کی جانب مائل کرنے کیلئے بھی معنوی ماحول کی ضرورت ہے۔ خصوصاً ان حالات میں جب کہ آپ نے افراد کو فطری حالات سے دور رکھا ہو۔ خیال ہے کہ ہماری بچیاں جس گروہ بیش میں پالی جاتی تھیں اور اب بھی کچھ گھرانوں میں پالی جاتی ہیں وہ فطرت سے بعید ہے ان کی جو احتیاط کی جاتی تھی وہ معنوی تھی بس ان کی طبائع کو ادھر مائل کرنے کے لئے بھی صنعت گری درکار تھی۔ اور اس کا اظہار ہماری رسمات کی شکل میں آتا تھا۔

اب ہم حمامی مہندی کی طرف آتے ہیں۔ شاید آپ واقف نہ ہوں کہ یہ کس قسم کی مہندی ہے۔

بندہ نواز! دُلہن کے ہاتھوں پہ پہنچوں تک چاروں طرف مہندی تھوپی جاتی ہے۔ نیز پاؤں پر بھی۔ حنا اگر طریقہ قرینہ سے لگائی جائے تو خوشنما معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس طریق کی یقیناً بدنما۔ تاہم عرض یہ ہے کہ اس طرح کی مہندی کسی عورت کے لگا کر دیکھیے اور پھر قیاس کجذبات ستانا نہ کیجئے۔ اگر ان میں ہیجان نہ ہو تو کہئے گا ——— اب عطر کا مسئلہ لیجئے۔ صحیح کہ ہم ہندوستانی خوشبوئیں موسم کے لحاظ سے بساتے ہیں۔ گرمی میں خس، کیتکی، گل اور گلاب۔ جاڑوں میں حنا، سہاگ۔ اگر اور چمپا۔ برسات میں جوہی، چمبیلی، موتیا لیکن دُلہن کسی موسم میں بھی بیاہی جائے حنا اور سہاگ ہی استعمال میں آتا ہے یہ کون سی عقلمندی ہے۔

بندہ نواز! یہ گرم عطر ہیں اس ہی وجہ سے موسم سرما میں کام آتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ دُلہن کے لگائے جاتے ہیں۔ دُلہن کو جو کپڑے پہنائے جاتے ہیں ان کا نوں نے اس پر بھی اعتراضات سُنے ہیں۔ فیشن پسند دولھا اصرار کرتے ہیں کہ ہماری دولہن کو گھوسن بنا کر نہ بھیجنا۔ دُلہن کے جوڑے کی ہیئت کذائی یہ ہے کہ کسوم میں رنگا ہوا سرخ رنگ کا نہایت ڈھیلا ڈھیلا کرتہ پاجامہ جس کی سلائی بھی معمولی بیچ کی ہوتی ہیں مصلحت عقل معلمت اندیش سمجھ سکتی ہے۔

لیجئے صاحب کل نکاح ہے۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہے ڈومنیاں گا رہی ہیں۔ نہٹرے بنڑے کا لفظ بار بار زبان پر لا رہی ہیں۔ پندرہ دن سے یہ ڈھولک پیٹ رہی ہیں۔ کچھ عجیب عجیب گیت گاتی ہیں۔ نئی نئی باتیں سُناتی ہیں جن کا سلسلہ ان کہنی باتیں ہوتی ہیں۔ قوت متصورہ نقشہ پیش کرتی ہے۔

آج لڑکی بیاہی نہیں نہلائی گئی۔ کورے پنڈے کو عورتوں نے چھوا اپنے گھر کی تھیں۔ لیکن بات نئی تھی۔ اب تک تو حمام کے قریب بھی کوئی پھٹکنے نہ پاتی تھی اماں جان نظر رکھتی تھیں۔ جہاں تک پانی گرنے کی آواز جائے وہاں تک کوئی قدم

بابت

ابھی عمل سفید کی بڑی شکستہ ہے۔ ایک پانی ڈال رہی ہے ایک اٹھول رہی ہے۔ کسی نے خلعت سے کنگھی کردی۔ جذبات تیز ہوئیں آنکھیں نمک آب۔ ہمیں خیر نظروں بھی نمک دیا۔ غرض کہ غیر محسوس اور غیر معلوم طریقہ سے مراحل طے کرائی جا رہی ہیں۔ چاہنے والے بہلاتے پھسلاتے منزل بہ منزل لئے چلے جاتے ہیں۔ جہاں تک ممکن ہے دلہن اپنے گھر پر جانے پہچانے ماحول میں طے کرتے ہیں۔

ریت کا جوڑا گھر پر ساتھ سہاگنوں نے سیا۔ قینچی کہیں نہ لگی۔ رشتہ منکحت استوار ہوگا۔ قطع و برید کا کیا کام۔ مقراض مفارقت کا پہلو لئے ہے۔ اس کا گذر یہاں تک نہیں آ سکتی۔ بیگموں نے اپنی نازک انگلیوں سے گریبان بنایا۔ ہر سب سے مدعا یہ ہے کہ کپڑا زیادہ مضبوط نہ ہو ہلکا پھلکا ہونا چاہیئے۔ یہاں لگا دی مصلحت ہے جس کے تحت اسلاف کے تجربہ کار دماغوں نے یہ جوڑا صرف تیمچی سے سلوانا روا رکھا۔

آج سسرال والیوں نے ان بیگم کو اپنے ہاتھ سے کپڑے پہنائے۔ کل اپنے گھر والوں کی جانی پہچانی انگلیاں جسم کو لگی تھیں یعنی لڑکی کو قریب کی عزیز عورتوں نے نہلایا تھا۔ اب کپڑے غیر عورتوں نے پہنائے۔ یہ دوسری منزل ہے۔

درمیان عصر و مغرب نکاح ہوا۔ دولہا کا نام پدر وکیل نے دلہن کے سامنے لیا۔ اب تک غیر مرد کا نام بھی ان سے بالمشافہ نہ کہا گیا تھا۔ نیز یہاں تک منزلیں عورت کو عورت نے طے کرائی تھیں۔ اب پہلی مرتبہ مرد کا قدم درمیان آیا۔ نکاح ہو گیا۔ چھوارے لٹے۔ مٹھائی طشتریوں اور رومالوں سمیت تقسیم ہوئی۔ شہدے بھنبھوڑ بند۔ شیخ ٹینم ٹیا کو انعام ملا۔ سہرے گائے بھی گئے۔ پرچے بٹ گئے۔ مبارکبادیاں پیش ہوئیں۔ اندرون خانہ بھی مبارک سلامت کا غلغلہ بلند ہوا۔ ان حالات میں دولہا کا جھوٹا شربت گھر میں آیا۔ بہنوں نے کٹورہ دولہن کے منہ سے لگایا۔ اللہ رے دماغ! کس طرح مرد کے ہونٹوں سے تعارف کرایا گیا۔ اس ہی کٹورے کو دولہا نے منہ لگایا۔ یہی لب عروس تک آیا۔ خدا معلوم انہوں نے کہاں سے پیا۔ واللہ اعلم ان کے ہونٹ کہاں لگے۔ لیکن دماغ و ذہن منازل اتصال طے کر گئے۔ اور آگے چلنے کیلئے تیار ہو گئے۔

دولہا گھر میں آیا۔ بہنیں آنچلوں کے سائے میں لائیں۔ بڑی بوڑھی نے کلام پاک کے نیچے سے گذارا۔

کلام اللہ کے نیچے سے جانا سمجھ میں آیا۔ خدا پرستوں کے نزدیک باعث برکت ہے۔ لیکن یہ بہنوں کے آنچلوں میں کیا خاص بات تھی۔

بندہ نواز! یہ بوڑی کا عقیدہ ہے شادی کا گھر ہے اپنے پرائے سب آئے ہوئے ہیں۔ دوست دشمن کی قید نہیں۔ دستور ہے کہ جو آئے سر آنکھوں پر۔ کسی کو روکا نہ جائے۔ خواہ فقیر ہو خواہ غنی۔ شادی کا دروازہ سب پر یکساں وا ہے۔ ان حالات میں دولہا کو غیر محفوظ طریقہ سے لانا قرین مصلحت نہیں۔ کیا پتہ کون بدخواہ تاک میں لگا ہو۔ واللہ اعلم کیا آفتاد پڑے۔ شادی کے گھر میں اور پھر زنانہ میں۔ بندوقوں اور تلواروں کے سائے میں تو لا سکتے ہیں۔ دولہا نے اندر قدم رکھا اور ایسی غیری عورتیں دور دور کر دی گئیں۔ کوئی برا بھی نہیں مان سکتی۔ رسم کا تقاضہ ہے۔ دولہا کی بہنوں کے لئے آنچل کرنی ہے۔ اب پلوؤں کا سایہ کئے اپنے ماں جائے کو لئے چلی آ رہی ہیں۔ حتیٰ کہ دولہن جس کمرے میں تھی وہاں پہنچا دیا۔ اور یہ پروانوں کی طرح اس شمع کے گرد ہو بیٹھیں۔

اب نہا بیں پیچھے گئیں۔ جن کو عرف عام میں "تو پائیں چھنا" کہتے ہیں۔ یعنی مصری کی ڈلیاں دلہن کے ہر جوڑ بند پر رکھی گئیں اور دولہا میاں نے ہونٹوں سے اٹھائیں۔ دولہا منہ آگے بڑھا رہا ہے۔ کاروان ڈومنی ترسا رہی ہے۔ دولہا کو زچ ہوتے دیکھ کر اپنے پرائے حمایت لیتے اور یہ کڑی آسان کر دیتے ہیں — یہاں دولہن کو درس دیئے جا رہے ہیں۔ ایک تو یہ کہ مرد کو زیادہ تنگ کرنا اچھا نہیں۔ اتنی کھچاوٹ لگاوٹ کے ساتھ اچھی جو نبھ جائے۔ اور بار خاطر نہ ہو۔ دوسری طرف اب ان ہونٹوں سے بلاواسطہ متعارف کرایا جا رہا ہے جن سے پہلے کٹورے کے توسل سے ملایا جا چکا تھا۔

آرسی مصحف کی نوبت آئی۔ ماتھے سے ماتھا ملایا گیا۔ آئینہ میں دولہا دولہن کو ایک دوسرے کا رخ روشن دکھایا گیا۔ دولہا سے غلام کہلوایا گیا۔ مگر دلہن کسی عنوان آنکھیں نہیں کھولتی۔ اس کی اپنی بہنیں بھاوجیں کہتی ہیں۔ زیادہ نہ ستاؤ۔ آنکھیں کھول دو۔ مدعا یہ کہ خوشامد کرانے کا حق ہے۔ لیکن ان کی آرزو بھی پوری ہو جائے۔ یہ آئینہ کیوں درمیان ہے۔ بندہ پرور جس طرح پہلے کٹورہ درمیان تھا اس ہی طرح یہاں آئینہ درمیان ہے۔ ہمارے گھروں کی چار دیواری پردہ میں پلی ہوئی بچی غیر مرد کو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر نہیں دیکھ سکتی۔ پہلے آئینہ میں اس صورت سے متعارف کرایا جا رہا ہے۔ جس کے ساتھ اسے عمر گذارنی ہے پھر رو در رو بھی دیکھ لیگی۔ ماں باپ سے اجازت لی گئی۔ آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہے۔ نازوں کی پالی گھر سے جا رہی ہے۔ ڈولے میں جا رہی ہے پر جانتی ہے کہ کل آ جائیگی۔ پر اب یہ ہو گئی پہلے گھر کی۔ جس کی نظر میں دیکھتے ان کی عمر گذری ہے اب نئی آنکھیں دیکھنی پڑیں گی۔ جسے انہوں نے گرم و سرد روزگار سے بچا کر اپنی آغوش میں رکھا اسے گرم سرد سمجھتے ہیں۔ عجیب وقت ہے اور عجیب جذبات۔ سچ ہے کہ بیٹی جدا ہوتی ہے کوکھ

ہے کہ اللہ ... خوش رہے گی۔

غرض دل پر پتھر رکھ کر بھرائی ہوئی آواز میں کہہ دیا۔ بیٹا بسم اللہ کرو۔ اللہ تمہیں خوش رکھے۔ دیکھنا! میری نازوں کی پالی ہے۔ اب خدا پر بھروسہ ہے ہاتھ پر ... داماد نے نیچی نگاہیں کئے ہوئے کہا میں ہمیشہ کے لئے غلام ہوں۔ آپ دل بھاری نہ کریں۔ دولہا کی ماں نے سمدھن کو گلے سے لگایا اور کہا بہن میرے آگے بھی اللہ کی دی ایک چھوڑ دو دو بیٹیاں ہیں تم اطمینان رکھو۔ اللہ نے چاہا تو آنکھوں کا تارا بنا کر رکھوں گی۔

دولہا نے دولہن کو گود میں اٹھایا۔ گھر میں کہرام پڑ گیا۔ دولہے چچا یہ روتے رہ گئے۔ معنی یہ ہیں کہ بیٹی تو اب اس کی ہے ہم رو سکتے ہیں روک نہیں سکتے۔

ڈومنیوں نے حضرت امیر خسروؒ کا سنڈھا گانا شروع کیا ؎

کاہے کو بیاہی بدیس رے سکھی بابل مورے

کاہے کو بیاہی بدیس

ہم توری بابل محلوں کی چڑیاں

بھور بھئے اُڑ جائیں رے سکھی بابل مورے

کاہے کو بیاہی بدیس

سسر نے تمام راستہ فینس پر سے روپیہ نچھاور کئے۔ بھولے ہیں خیرات ہو رہی ہے۔ خدا نیک قدم کرے۔ پردہ پکڑے لکڑی ٹیکے ساتھ ہیں احباب نے کہا بھی تھک جاؤ گے۔ بولے خدا نے یہ دن دکھایا ہے۔ میرا منہ اس قابل کب تھا۔

فینس دروازہ پر لگی۔ زنانہ کروا یا گیا۔ ساس نے دودھ سے پیر دھلائے زبان بے زبانی سے کہہ رہی ہیں۔ بیٹی تو جب اپنی ماں کے گھر اول دن آئی تھی اس نے دودھ پلایا تھا۔ میں تیرے قدموں پر نثار کر رہی ہوں۔ خدا دودھ نہانا پوتوں پھلنا نصیب کرے۔

دولہا نے گود میں اٹھا کر کمرے میں لے جا بٹھایا۔ نندیں واری صدقے ہو رہی ہیں۔ مہمان آیا ہے۔ کھانے کا انتظام ہوا۔ دسترخوان بچھایا گیا۔ اس کی اپنی ماں نے بھی دیگیں ساتھ کی ہیں۔ اسے دولہن کا حصہ کہتے ہیں۔ آج سے یہ غیر ہو لی اور ماں بیٹی میں جیسے بقرہ کے تعلقات قائم۔

دسترخوان بچھا۔ دولہا نے دولہن کو کھیر چٹائی۔ دلہن کے ہاتھ سے دولہا کو چٹوائی گئی۔ دولہا کی بہنیں بھاوج کی طرفداری لے رہی ہیں۔ اپنے بھائی کو ستا رہی ہیں تاکہ نووارد محسوس کرے کہ یہاں بھی اس کے حمایتی

اب تک اس ذرا میں ... سکت ... ما ... متحرک اب پہلی مرتبہ ان کا ہاتھ حرکت میں آیا۔ انہوں نے بیان کیا کہ اپنے ہاتھ سے نوالہ کھلایا۔ یہ بڑا شرم کی بات تھی۔ ماں باپ کے گھر یہ اتنی ... ادا ہوئی۔

یہ ہے توجیہہ ہماری رسومات کی۔

جس ماحول میں ہماری بچیاں پلتی تھیں اس میں رسومات ضروریات لازم تھیں۔ اب وہ ماحول درست تھا یا نہیں، یہ خود ایک الگ مقالہ کا محتاج ہے۔

دوست سے!

از جناب اسرار الحق صاحب مجاز بی، اے (علیگ)

مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر
ابھی پھر درد ٹپکے گا مری آواز سے آخر
ابھی پھر آگ اٹھے گی شکستہ ساز سے آخر
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو حسن کے پیروں پہ ہے جبرِ حنا بندی
ابھی ہے عشق پر آئینِ فرسودہ کی پابندی
ابھی حاوی ہے عقل و روح پر جھوٹی خداوندی
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تہذیبِ عدل و حق کی کشتی کھے نہیں سکتی
ابھی یہ زندگی دادِ صداقت دے نہیں سکتی
ابھی انسانیت دولت سے ٹکر لے نہیں سکتی
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو کائنات اوہام کا اک کارخانہ ہے
ابھی دعویٰ حقیقت ہے حقیقت اک فسانہ ہے
ابھی زندگی کو زندگی کر کے دکھانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی ہیں شہر کی تاریک گلیاں منتظر میری
ابھی ہے اک حسیں تحریکِ طوفاں منتظر میری
ابھی شاید ہے اک زنجیرِ زنداں منتظر میری
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی تو فاقہ کش انساں سے آنکھیں ملانا ہے
ابھی جھلسے ہوئے چہروں پہ اشکِ خوں بہانا ہے
ابھی پامالِ جور آدم کو سینے سے لگانا ہے
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

ابھی ہر دشمنِ نظمِ کہن کے گیت گانا ہیں
ابھی ہر لشکرِ ظلمت شکن کے گیت گانا ہیں
ابھی خود سر فروشانِ وطن کے گیت گانا ہیں
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

کوئی دم میں حیاتِ نو کا پھر پرچم اٹھاتا ہوں
بہ ایمائے حمیت جان کی بازی لگاتا ہوں
میں جاؤنگا، میں جاؤنگا، میں جاتا ہوں، میں جاتا ہوں
مجھے جانا ہے اک دن تیری بزمِ ناز سے آخر

اقبال کا فلسفہ موت

(از جناب سید نعیم الدین ایم ، اے)

زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے والے ترجمانِ حقیقت نے موت جیسے پراسرار و مبہم موت کی بھی نقاب کشائی کی ہے۔ اگر موت پر کچھ روشنی نہ ڈالی جائے تو خود زندگی کی تشریح نامکمل اور ادھوری رہ جاتی ہے۔ اقبال اس نکتہ سے بخوبی واقف تھے۔ اسی لئے سفر حیات پر ہدایات دیتے ہوئے انہوں نے اس ناگزیر سنگ میل کی بھی حقیقت عیاں کر دی ہے۔

ہماری زندگی کے لئے سب سے بڑا خطرہ بیم خوف ہے۔ یہی تمام انسانی کمزوریوں کی جڑ ہے۔ زندگی کے سفر میں سب سے زیادہ اسی کی رہزنی کا خطرہ ہے۔ نباضِ ملت علامہ اقبال نے تشخیصِ مرضِ ملت کرتے ہوئے اس خطرہ کو سب سے زیادہ محسوس کیا۔

لابہ و مکاری و کین و دروغ
ایں ہمہ از خوف می یابد فروغ
ہر شرِ پنہاں کہ اندر قلب تست
اصل او بیم است اگر بینی درست

صرف ایک ذات واحد ہے جس سے خوف کیا جا سکتا ہے اس کے علاوہ کوئی شے اس کی مستحق نہیں کہ انسان اس سے مرعوب ہو۔ اس قادرِ مطلق کا قول واضح قرآن شریف میں موجود ہے۔ "فلا تخشوہم واخشونی" سچ تو یہ ہے کہ اگر ہم اس سے خائف رہیں اور اس کی بارگاہ میں ایک سجدہ کو گراں نہ سمجھیں تو ہزار سجدوں سے نجات حاصل کر لیں۔ مزید برآں خوف غیر اللہ سوائے اس کے کہ ہمارے لئے عرصہ حیات تنگ کر دے کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است
کاروانِ زندگی را رہزن است

زندگی کے راستے میں ابتدا سے لیکر یوں تو تمام راہ ہزار ہا قسم کے خوف کمین گاہوں میں چھپے ہوئے ہیں اور ان کے خلاف کافی طور پر ہمیں آگاہ کر دیا گیا ہے

لیکن اگر انسان کا خوف پیدا ہو تو اس قدر [illegible] کہ [illegible] تو گویا زندگی کی مسرتیں بھی حرام ہو جاتی ہیں۔ حضرت علامہ نے اسی لئے اسی خوف موت پر ضرب کاری لگائی ہے۔ راحت طلب طبیعتوں کو اچھا بہانہ مل گیا کہ جب ہماری تمام کاوشوں کا ثمر محض موت کا تلخ گھونٹ پینا اور فراموشیٔ دہر کا شکار بننا ہے تو ہم کیوں ایسی بے ثبات زندگی کے لئے اس قدر اہتمام سے کام لیں۔

علامہ اقبال نے ذہن نشین کرایا کہ اول تو موت حیات ان کی منزل آخر نہیں اور اگر ہو بھی تو تم اپنی شاندار زندگی سے یہ ثابت کر دکھاؤ کہ قدرت کا یہ فعل یعنی قطع حیات ایک حسن کارانہ تصویر کو نذرِ آتش کرنے سے کچھ کم ظالمانہ نہیں۔ خدا خود ایسے حسین مرقع زندگی کو دائمی موت کے حوالے کرنے سے شرمندگی محسوس کرے۔

چناں بزی کہ اگر مرگ است مرگِ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

زندگی کو لائق رشک طور پر برتنے کی ترغیب میں ایسا بلیغ و جامع و مانع شعر کسی زبان میں ڈھونڈے سے نہیں ملتا۔

شاعر کا اعتقاد ہے اور راسخ و غیر متزلزل اعتقاد ہے کہ ؎

یہ عالم یہ ہنگامہ رنگ و صوت ۔۔۔ یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں ۔۔۔ مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں

موت کی دسترس صرف بدن تک ہے اس سے آگے وہ ایک قدم نہیں بڑھ سکتی۔

فرشتہ موت کا چھوتا ہے گو بدن تیرا
ترے وجود کے مرکز سے دور رہتا ہے

موت یعنی "شام زندگی" دراصل "صبح دوام زندگی" ہے۔ "جہازِ زندگی آدمی" ابد کے بحر میں کبھی پیدا اور کبھی نہاں ہوتا رہتا ہے۔ لیکن ؎

شکست سے یہ کبھی آشنا نہیں ہوتا
نظر سے چھپتا ہے لیکن فنا نہیں ہوتا

زندگی قدرت کو خود محبوب ہے اور ذوقِ حفظِ زندگی ہر چیز میں ودیعت کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں یہ بھی غور طلب ہے کہ اگر نقش حیات موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا تو نقاشِ ازل نقشِ حیات کو اس عمومیت کے ساتھ کیوں پیدا کرتا۔ اب اگر نقش حیات کی عمومیت و ارزانی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے تو یہ تسلیم کرنا پڑیگا کہ اجل کی کوئی حقیقت نہیں اور سونے کی طرح مرنا بھی جینے میں خلل انداز نہیں ؎

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقشِ حیات ۔۔۔ عام اس کو یوں نہ کر دیتا نظامِ کائنات
ہے اگر ارزاں تو یہ سمجھو اجل کچھ بھی نہیں ۔۔۔ جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

جسم محض نیست خاک نہیں۔ جسم فنا ہو جائے لیکن روح فنا کو ٹھکرا کر پیوند منزل کے کر آگے ہی جاتی ہے۔

این بدن با جان ما انباز نیست
مشت خاکے مانع پرواز نیست

ایک اور مقام پر کہتے ہیں ؎

چہ غم داری حیات دل ز دم نیست
کہ دل در حلقۂ بود و عدم نیست
مخور اے کم نظر اندیشۂ مرگ
اگر دم رفت دل باقی است غم نیست

لیکن شرط یہ ہے کہ دل دراصل دل ہو اگر وہ تپش سے خالی ہو تو دل نہیں گِل ہے دل یعنی جان ہی دراصل حیات ابدی کی ضامن ہے۔

بمیری گر بہ تن جانے نداری — وگر جانے بہ تن داری نمیری

اس راز داں جسم و جان پر اجل گراں نہ تھی ؎

دل من راز دان جسم و جان است — نہ پنداری اجل بر من گران است
چہ غم گر یک جہاں گم شد ز چشمم — ہنوز اندر ضمیرم صد جہان است

یہ ان کا نرا دعویٰ نہ تھا بلکہ خود ان کی موت اس پر شاہد ہے کہ جس وجود نے ملکِ حیات کے چپہ چپہ پر ہمیشہ کے لئے اپنا سکہ بٹھا دیا اسکی زد سے موت بھی باہر نہ رہی۔ اُس نے موت کو بھی غیر مفتوح نہ چھوڑا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دلدادۂ حیات ذوق سفر سے مست و سرشار اس عالم میں چلا جا رہا ہے کہ موت اس کی راہ میں محض ایک سنگ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی۔ انتقال سے قبل یہ شعر ورد زبان تھا ؎

نشانِ مردِ مومن با تو گویم — چو مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

اقبال کی دقیقہ رس نگاہ میں موت محض "کشادِ در دل" ہے۔

کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو — ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

موت کو کشادِ درِ دل اس لحاظ سے کہا گیا کہ خودی کی توسیع و استحکام کے لئے نیا امکان پیدا ہو گیا۔ خودی کے لئے اب یہ ممکن ہو گیا کہ ذات لم یزل کو اپنے اندر جذب کر کے خود لازوال ہو جائے اور فنا کے داغ کو اپنے دامن سے ہمیشہ کے لئے دھو لے۔

بہ بحرش گم شدن انجام ما نیست — اگر او را تو در گیری فنا نیست

تسخیر حیات کے لئے طبیب ملت نے خودی کا لاجواب نسخہ تجویز کیا ہے اور فتح موت کے لئے بھی اسی کو زبردست آلہ گردانا ہے۔ سب سے پہلے اس امر کا یقین ضروری ہے کہ خودی پیکر خاکی سے جدا غیر فانی عنصر ہے۔ اگر اس اعتقاد کا فقدان ہو تو غم موت کی رہزنی کا کھٹکا ہمیشہ لگا رہے گا ؎

تری نجات غمِ مرگ سے نہیں ممکن — کہ تو خودی کو سمجھتا ہے پیکرِ خاکی

دوسرے مقام پر کہتے ہیں ؎

دلت می لرزد از اندیشۂ مرگ — ز بیمش زرد مانند زریری
بہ خود باز آ خودی را پختہ تر گیر — اگر گیری پس از مردن نہ میری

اپنے پیکر میں حضرت ابراہیم کی طرح حرم خودی بنانا پہلی شرط ہے۔ خود نگر و خود گیر خودی کا موت سے بھی مرنا ممکن نہیں۔

ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

دراصل اسی لئے خودی کا سرور دائمی اور ابدی ہے ؎

لحد میں بھی یہی غیب و حضور رہتا ہے — اگر ہو زندہ تو دل ناصبور رہتا ہے
مہ و ستارہ مثالِ شرارہ یک دو نفس — مئے خودی کا ابد تک سرور رہتا ہے

علامہ موصوف ایک مقام پر اسپینوزا اور افلاطون کا مقصود بتاتے ہیں۔ اسپینوزا کہتا ہے ؎

نظر حیات پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند — حیات کیا ہے حضور و سرور و نور و وجود

افلاطون کہتا ہے ؎

نگاہ موت پہ رکھتا ہے مردِ دانشمند — حیات ہے شبِ تاریک میں شرر کی نمود

اب علامہ موصوف سومنات حیات و ممات کے پجاریوں کو کعبہ حقیقت سے آشنا کرتے ہیں ؎

حیات و موت نہیں التفات کے لائق — فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

فتح موت کے لئے دیگر اسلحہ جات میں سے آزادی، یقین اور عشق ہیں۔ دراصل یہ سب زرہ خودی ہی کی مختلف کڑیاں ہیں۔ جس نے ہر قسم کی غلامی کی زنجیریں توڑ دی ہوں۔ جس نے بے بصری سے بندگیٔ آدم نہ کی ہو اور جس شخص نے اپنے گوہر کو نذر قباد و جم نہ کیا ہو۔ وہی شخص موت سے نبرد آزمائی میں عہدہ برآ ہو سکتا ہے۔ شانِ آزادی یہ ہے کہ انسان اس دنیائے دوں کے جنجال سے آزاد رہے اور تعلقات دنیوی کا زریں طوق زینت گلو نہ بنائے۔

ہے گراں سیر غمِ راحلہ و زاد سے تو — کوہ و دریا سے گزر سکتے ہیں مانندِ نسیم
مردِ درویش کا سرمایہ ہے آزادی و مرگ — ہے کسی اور کی خاطر یہ نصابِ زر و سیم

مرد آزاد کا شیوہ تسلیم و رضا ہے۔ اس صید پیشہ حر کی فتراک کا موت اک ادنیٰ صید ہے

زندگی محکم ز تسلیم و رضا است — موت نیرنج و طلسم و سیمیا است
بندۂ حق ضیغم و آہوست مرگ — یک مقام از صد مقام اوست مرگ
می فتد بر مرگ آں مردِ تمام — مثلِ شاہینے کہ افتد بر حمام

غلام کی زندگی بھی بیمِ مرگ کے باعث موت بن جاتی ہے۔ برخلاف اس کے بندۂ آزاد کی زندگی کا تو کیا کہنا مرگ بھی پیامِ زندگی ہوتی ہے۔

ہر زماں میرد غلام از بیمِ مرگ — زندگی او را حرام از بیمِ مرگ
بندۂ آزاد را شانِ دگر — مرگ او را می دہد جانِ دگر

اور یہ بندۂ آزاد کی خود آگاہی اور خود اندیشی کا ثمرہ ہے کہ جاں ستاں مرگ اس کیلئے جاں بخش ثابت ہوتی ہے اور مرگ آفاتِ حیات کی کڑی کی محض ایک جزو ہوتی ہے

او خود اندیش است مرگ اندیش نیست — مرگ آزاداں ز آنے بیش نیست

مردِ آزاد و غیور مجسمِ ایمان و ایقان ہوتا ہے اس کا یقین نقطۂ پرکارِ حق ہے وہ موت کے طلسم سے خوب واقف ہے۔

نقطۂ اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور — موت کیا شے ہے فقط عالمِ معنی کا سفر

فطرت جاں بخشی کے بعد جاں ستانی سے کام نہیں لیتی۔ یقین کا فقدان البتہ ہمیں فنا کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔

جانے کہ بخشند دیگر نہ گیرند — آدم بمیرد از بے یقینی

بظاہر اس کے اقبال کرنے کے سوا چارہ نہیں کہ؎

اول و آخر فنا ظاہر و باطن فنا — نقشِ کہن ہو کہ نو منزلِ آخر فنا

لیکن اس نقش میں رنگِ ثبات و دوام بھی بھرا جا سکتا ہے۔ اور وہ عشق کی وساطت سے؎

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثبات و دوام — جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام
مردِ خدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ — عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

مختصر یہ کہ تپشِ عشق ہی زندہ کو زندہ تر کرتی اور اس کو بال و پر بخشتی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ وادیِ موت سے شاداں و فرحاں بہ آسانی گزر جاتا ہے۔ اقبال کے پیر و مرشد مولانا روم کے ہاں بھی عشق ہی دوامِ حیات کا ضامن ہے۔ خواجہ حافظ نے کیا خوب کہا ہے؎

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

بہر حال ہم نے دیکھ لیا کہ کس طرح علامہ نے اجتہاد سے کام لیکر موت کی حقیقت اور اس پر ظفریاب ہونے کی تدابیر بتائیں موت کا لفظ ہی عام اذہان کے لئے ایک بھیانک تصور پیش کرتا ہے۔ دل ترسندہ اس کے نام

[illegible] جاتا ہے [illegible]
و پریشان نظر آتا ہے۔ شریعت شاعری کے بھی علامہ اقبال کے [illegible]
[illegible]

ہیبت کا پردہ چاک ہوا۔ اور اس کی عریاں حقیقت پیشِ نظر ہو گئی۔ یہ صید افگن اب خود صید نظر آنے لگی؎

از مرگ ترسی اے زندہ جاوید — مرگ است صیدے تو در کمینی

سچ تو یہ ہے کہ جن کی ہمتِ مردانہ جبریل کو زبوں صید گردانتی ہو اور یزداں کا شکار مقصود رکھتی ہو۔ اس کے لئے موت ایک ادنیٰ صید نہ ہو تو کیا ہو۔ موت کی سفاکی اور خون آشامی اب اس سے رخصت ہوئی۔ علامہ ہارون الرشید کی زبان سے تمام ابنائے زماں کو نصیحت کرتے ہیں۔

ہاروں نے کہا وقتِ رحل اپنے پسر سے — جائے گا کبھی تو بھی اسی راہ گزر سے
پوشیدہ ہے کافر کی نظر سے ملک الموت — لیکن نہیں پوشیدہ مسلماں کی نظر سے

مرگ کو محبوب و مانوس ہی نہیں بلکہ تلخیِ مرگ کو اقبال کے معجز نگار قلم نے شہد و شکر سے زیادہ شیریں بنا دیا۔ جس کی لذت سے افسوس کہ اس خاکدان کی اکثریت بے خبر نظر آتی ہے۔ علامہ نے ایک نظم بہ عنوان "جہاد" لکھی ہے جس میں اپنے مخصوص بلیغ انداز میں شیخ کے عدمِ جوازِ فتوائے جہاد کا جواب دیتے ہوئے اظہارِ تاسف کرتے ہیں ہم معمولی ادنیٰ درجہ کی موت (اصطلاحاً کافر کی موت) سے ہراساں نظر آتے ہیں مسلمان کی یعنی آئیڈیل (نصب العینی) موت ہمارے لئے کیوں جاذبِ نظر ہونے لگی۔ اس لئے جہاد کو غیر ضروری ثابت کرنے کی بھی چنداں ضرورت نہیں۔

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے — دُنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جنابِ شیخ کو معلوم کیا نہیں — مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود و بے اثر
تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں ہے کہاں — ہوں بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل — کہتا ہے کون اسے کہ مسلماں کی موت مر

ارشاداتِ اقبال کا سرچشمہ قرآن حکیم ہے۔ اور قرآن شریف میں موت کو سچے باایمان انسان کا تمغۂ امتیاز قرار دیا گیا ہے۔ یہی منافقوں کی آزمائش گاہ ہے۔ قل ان کانت لکم الدار الآخرۃ عند اللہ خالصۃ من دون الناس فتمنوا الموت ان کنتم صادقین۔ شہدائے سبیل اللہ کی موت کے بارے میں امکانِ غلط فہمی کو یوں دور کیا گیا ہے۔ لا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ اموات بل احیاء و لکن لا تشعرون۔ اقبال نے بھی نصب العینی موت کی مثال شہدائے راہِ خدا سے لی ہے۔ اور سرخیلِ شہدا حضرت امام حسینؑ

کی شہادت کو اعلیٰ ترین نمونۂ مرگ قرار دیا ہے

کہ ترا مرگ کہ سازد یا نمود　　زانکہ این مرگ است مرگِ دام و دد
مردِ مومن خواہد از یزدانِ پاک　　آن دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک
آن دگر مرگ انتہائے راہِ شوق　　آخریں تکبیر در جنگاہِ شوق

گرچہ ہر مرگ است بر مومن شکر
مرگِ پورِ مرتضیٰ چیزے دگر

حدیث شریف میں وارد ہوا ہے کہ مسلمانوں کے تنزل میں دو عوامل سب سے زیادہ کارفرما ہونگے حب مال و ترس مرگ۔ اقبال ہم میں یہاں فتنہ موجود بتاتے ہیں ؎

آنکہ بود اللہ اورا ساز و برگ
فتنہ او حب مال و ترس مرگ

موت سے بے خوفی اسلام کی تعریف میں داخل ہے۔ علامہ اقبال اسلام کے اس پہلو کو خاص طور پر اُجاگر کرنا چاہتے ہیں مسز ہمایوں صاحبہ کے اوٹو گراف میں لکھتے ہیں :-
"اسلام کی تعریف میں چند الفاظ میں ظاہر کرتا ہوں یعنی ذات باری پر پورا بھروسہ ہو اور موت سے مطلق نہیں ڈرتا"

مختصر یہ کہ اقبال نے موت کا نہایت صحیح اور معقول نظریہ پیش کیا اور زندگی کے ہزارہا مسائل پر نظر ڈالتے ہوئے موت کو بھی اپنی نظر کی زد سے خارج نہیں کیا اور اس طرح اپنے زندگی بخش پیغام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا کیونکہ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اقبال نے مجتہدانہ شان سے تدبیر، تقدیر، یقین، عشق وغیرہ کے مروجہ مفہومات کی دُنیا کو زیر و زبر کر دیا اور زندگی کی قدر کو صحیح سانچوں میں پیش کیا۔ لیکن موت کے مروجہ تصور کے باقی رہنے سے اُن کا پیغام نامکمل رہ جاتا۔ اِس حالت میں یہ رائج الوقت تصور ان سب جرأت آزمائیوں پر پانی پھیرنے کے لیے کافی تھا۔ موت کا انقلابی، تعمیری، رُوحانی اور امید افزا تصور پیش کر کے اقبال نے زندگی کی صلاحیتوں کی شیرازہ بندی کی اور انسانی ترقی کے میدان کو بے پناہ وسعت دے دی۔

لال قلعہ دہلی

(از جناب فیض جھنجھانوی)

نوٹ:۔ فیض صاحب ایک نوجوان اور صحیح قسم کے ترقی پسند شاعر ہیں۔ عموماً نظمیں کہتے ہیں۔ تاریخی واقعات اور تاریخی عمارات کو منظوم کلام میں پیش کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ "ادیب" کے ناظرین اس صنف شاعری کا خیر مقدم کرینگے۔ (اڈیٹر)

حسرت اندوز ہے حالِ دلِ دیوانۂ غم — عبرت آموز ہے ٹوٹا ہوا پیمانۂ غم
چشمِ عبرت ہے تو جا اس قلعۂ سرخ کو دیکھ — صفحۂ دہر پہ ہے سرخیِ افسانۂ غم

شعلۂ غم ہے شرارِ دلِ سودائی ہے — داغِ حسرت ہے چراغِ شبِ تنہائی ہے
تابشِ حسن سے دامانِ نظر سرخ نہیں — خون میں ڈوبا ہوا لالۂ صحرائی ہے

پارہ پارہ جگرِ عالمِ ناسوت نہ ہو — چشمِ خونبابہ فشاں معدنِ یاقوت نہ ہو
جس پہ برسی ہے شفق خون کا بادل بن کر — میری ہی عظمتِ رفتہ کا وہ تابوت نہ ہو

خواب بھی جس کا نہ دیکھا تھا وہ تعبیر ہے یہ — جس کی تخریب مقدر تھی وہ تعمیر ہے یہ
آ دکھاؤں تجھے اے قاتلِ شمشیر بکف — تو نے جو کھینچی تھی خوں سے وہی تصویر ہے یہ

گاہ خوننابہ فشاں ہے رُخِ برہم کی طرح — گاہ آئینۂ غم ہے دلِ پُرغم کی طرح
آہ جو کل تھا حنا بندِ عروسِ ہستی — آج ہے سُرخ مرے سینۂ ماتم کی طرح

وہ شہیدِ ستمِ گردشِ ایام نہ ہو — کشتۂ تیرِ نگاہِ سحر و شام نہ ہو
سر پہ ڈالے ہوئے اک پارچۂ خوں آلود — وقفِ ماتم کوئی دوشیزۂ اسلام نہ ہو

شعلۂ غم ہے پئے شمعِ شبستانِ وطن — اشک خوننابہ فشاں ہے پئے عنوانِ وطن
ہے ابھی روکشِ لالہ ابھی ہم رنگِ شفق — کس قدر شوخ اٹھا خونِ شہیدانِ وطن

سجدۂ پائے ایاز اور سرِ محمود یہ کیا — اے شہِ انجمنِ عالمِ موجود یہ کیا
تابشِ حُسن بہر شکل مسلم ہے مگر — شعلۂ طور تہِ آتشِ نمرود یہ کیا

اے کہ تو وجہِ سکونِ دلِ مایوس رہا — مالکِ تاج رہا صاحبِ طاؤس رہا
حُسن نے تجھکو وہ بخشی ہے تب و تاب دوام — شمع بجھنے پہ بھی روشن ترا فانوس رہا

دیکھ! غارت گرِ بت خانۂ آذر ہے تو — اِس خموشی پہ بھی ہنگامۂ محشر ہے تو
تجھکو میرے دلِ خوننابہ فشاں ہی کی قسم — مسکرا! خمکدۂ بادۂ احمر ہے تو

مُسکرا! اور سرا پردۂ افلاک کو پھونک — تفرقۂ جہل، خطر، ہر خس و خاشاک کو پھونک
غیر کا کام بھلا انجمنِ ناز میں کیا — صاعقہ پاش ہو اِس خطۂ ناپاک کو پھونک

سُرخ اوڑھنی

(از جناب محمد امین شرقپوری)

گاؤں کی حسین صبح کرنوں میں نہا رہی تھی۔ سُرخ اوڑھنی میں اُسکا ہنستا ہوا چہرہ کتنا بھلا معلوم ہو رہا تھا۔ آگ کی لپٹوں میں جیسے کُندن دمک رہا ہو۔ وہ اُسے رشک بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ "یہ اوڑھنی تو بہت اچھی ہے"۔ بار بار بِندو کی زبان پر آتا اور لوٹ جاتا۔ اُس کی نظر پھر اپنی میلی کچیلی اوڑھنی میں اُلجھ جاتیں جسے برابر ایک سال سے اوڑھ رہی تھی۔ اور جب کبھی ماں سے کہتی، اماں مجھے نئی اوڑھنی لے دو۔ وہ بگڑ کر کہتی۔ روز روز کہاں سے لاؤں تیرے لئے۔ پھر یہ ابھی تو بہت اچھی ہے اوڑھنی جیسے پھٹنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اس کا دل سمٹ کر رہ جاتا۔ وہ ہاتھ مسوس لیتی۔

آج نئی اوڑھنی کا چاؤ پھر اس کے دل میں کروٹیں لے رہا تھا۔ پٹواری کی بہو کا چمکتا ہوا چہرہ آنکھوں کے آگے گھوم جاتا۔ مُسکرا کر بولی "اماں"

"کیا ہے؟" ماں چونک کر بولی

وہ خوشی کے اُمنڈتے ہوئے سیلاب کو روک کر بولی "تپنا کے پاس بہت اچھی اوڑھنی ہے"

"ہوگی ــ" وہ بات سُنی ان سُنی کرتے ہوئے بولی۔

"میں بھی لوں گی" دبی آواز سے بولی

ماں نے آنکھیں اسکے چہرہ پر گاڑھ دیں۔ جیسے اس کی بچی نہیں جانتی تھی کہ جو چیز تپنا کے گھر میں ہے وہ اُن کے ہاں مفقود ہے۔ ایک سرے سے مفقود۔ پھر پٹواری نے کیا کم لوٹ کھسوٹ مچا رکھی ہے۔

"گھر والی چاچا ـــ!" چوکیدار کی آئے دن کی آوازیں اُس کے کان میں گونج گئیں۔

"خیر تو ہے؟" وہ جھنجھلا کر بولی۔

"پٹواری جی نے بھیجا ہے" جیسے وہ جانتی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ جھنجھلا کر بولی "سارے گاؤں میں پٹواری کو ہمارا ہی گھر نظر آیا ہے کیا۔"

چوکیدار مسکرا کر بولا۔ تپنا کے میکے سے دو آدمی آئے ہیں۔ شام کو دودھ چاہیئے جتنا پاس نہیں ہے... [illegible]

چوکیدار ہنس کر بولا "نمبردار کیا ہے گھر والی چاچا کی عقل کو ہو گئی"

شام کو بِندو کا چاچا جب گھر لوٹ کر آیا۔ وہ برتن ہاتھ میں لیکر بولا۔ "چودھری نے چوکیدار کو دودھ کیلئے بھیجا تھا۔ میں نے منع کر دیا ہے"

"منع کر دیا" بِندو کا چاچا بولا۔ "لاؤ برتن مجھے دو مجھے"

انکار کے باوجود وہ اس کے ہاتھوں سے برتن چھین کر لے گیا۔ دودھ سے بھرا ہوا برتن! پٹواری سے کس قدر ڈرتا ہے۔ بِندو کا چاچا۔ لوگ اس سے کیوں ڈرتے ہیں۔ کوئی اُس کے سامنے زبان نہیں کھولتا۔

"ماں ماں!" بِندو ماں کا شانہ ہلا کر بولی "پھیری والے سے مجھے بھی لال اوڑھنی لے دو"

"لال رنگ کی لے گی" وہ چونک کر بولی۔

"ہاں! بہت بھلی معلوم ہوتی ہے"

"اتنے پیسے کہاں ہیں میرے بچے"

"چاچا سے لے لو" وہ بولی

"اُس کے پاس کیا ٹکسال گڑی ہے"

"رات گن تو رہے تھے روپے"۔ بھولے پن سے بولی۔

"خبر ہے" وہ بولی "لگان کے لئے لائے تھے"

بِندو کے چہرے پر پھر گھبراہٹ دوڑ گئی۔ ماں محبت سے بولی "لال اوڑھنی گھر میں ہے۔ منگنی پر تیری سُسرال سے آئی تھی، ہولی پر اوڑھ لیجو"۔ کہتے ہوئے وہ اندر سے گھدڑ کی اوڑھنی نکال کر لے آئی۔

"یہ تو بہت موٹی ہے۔ تپنا کے پاس ریشم کی ہے" وہ مُسور کر بولی۔

"اس کا کیا ہے"۔ ماں بولی۔ "اُس کے لئے ہر دن ہولی ہے۔ ہر رات دیوالی ہے۔ اس کا سسر ـــ" کان سے پھر آوازیں ٹکرانے لگیں۔

"پانچ سیر گھی چاہیئے مٹھریوں کے لئے۔ تپنا کل میکے جائیگی"۔ چوکیدار کہہ رہا تھا۔

"چھٹانک نہ پاؤ اکٹھا پانچ سیر" وہ ناک پر انگلی رکھکر بولی۔

"پاؤ سیر سے کیا مٹھریاں بنیں گی"۔ چوکیدار مسکرا کر بولا۔ پٹواری جی کہہ رہے تھے کہ نمبردار اب بوڑھا ہو گیا ہے۔ بِندو کے چاچا کو ملے گی نمبرداری۔"

"ہمیں نہیں چاہیئے" وہ تنک کر بولی۔ "روز روز کی بیگار ہمارے بس کی نہیں۔ تپنا کے بیاہ کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ پانچ سیر گھی دیا تو تھا"

"پھر کیا کہہ دوں اُن سے" چوکیدار نے جیسے سے بولا۔

"گھیان سے بولی" وہ بولی "بیٹی ایک وقت سبھی دیتی ہے۔ کسی اور سے رشتہ جوڑ کر اپنا پرانا ہو جاتا ہے۔" اب وہ سوچ رہی تھی کہ بڈھی لڑکی نے پرائے دل سے کیسی دھوم سے بیاہ کیا تھا لڑکے کا۔ سارے گاؤں سے آگاہی ہوئی تھی۔ پیسے سے کیا خرچ کیا اس نے۔ آج اس کی بندو کا بیاہ سر پر آن پہنچا ہے۔ رشتے بنتے ہیں۔ نہ برات کے کھانے کا سامان۔ سونا نہیں آ رہا ہے۔ کب تک چپ بیٹھیں گے۔ بندو جوان ہو گئی ہے۔ کل عورتیں بنا کے بیاہ کی باتیں کر رہی تھیں۔

رام دئی بولی "چاچی تم بندو کے ہاتھ کب پیلے کرو گی؟" کلیجہ منہ کو آ رہا تھا۔ غصہ جو آئی لگان میں اٹھ گئی۔ لگان تو نا پڑا تھا۔ سو پچاس اس پر بھی لگ گئے۔ گھر کے دوسرے چھوٹے موٹے خرچ بھی پیسہ پیسہ کر کے رقمیں کھا جاتے ہیں۔ غریب کی جان کو سو جوکھوں

اور بندو گاٹے کی سرخ اوڑھنی کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کے سسرال والے پتا کی سسرال سے کتنے مختلف ہیں۔ یہ اوڑھنی کتنی معمولی ہے۔ نہ اس میں ریشم کی ملائمت ہے نہ چمک دمک۔

"میں اسے نہیں اوڑھوں گی۔" بھرائی ہوئی آواز سے بولی۔

ماں نے دیکھا آنسو بندو کی پلکوں پر کانپ رہے تھے۔

گاؤں کی سنسان گلیوں میں کپڑے والے کی آواز گونج رہی تھی۔ رسیلی آواز بندو نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں جھپکا کر دیکھا۔ مراری پیٹھ پر گٹھری ڈالے گز گھماتا ہوا گذرے سے نکلا۔ مسکرا کر بولی۔ "لال اوڑھنی ہے تیرے پاس۔"

"کیا کرو گی لے کر؟" مراری ہنس کر بولا۔ "تمہاری ماں کیا لیکر دیگی تمہیں۔ بہت مہنگی ہے۔"

"دیکھوں کیسی ہے؟" چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے بولی۔

مراری کو جیسے آج وہ بڑی سندر نظر آ رہی تھی۔ گٹھری کھول کر بولا "ایسی ہے کہ سپنے میں بھی نہیں دیکھی ہوگی تم نے۔"

بندو کا چہرہ چمک اٹھا۔ لال لال ریشم کی اوڑھنی مراری کے ہاتھوں میں چمک رہی تھی۔

"کتنے کی ہے؟" شوق بھری آواز سے بولی۔

"اور کے لئے چھ کی۔ تمہیں پانچ روپے میں دیدوں گا۔"

یکایک بندو کے چہرے پر افسردگی دوڑ گئی۔

بولی "ادھار دیدو پیسے پھر لے لینا۔"

"ادھار" وہ ہنس کر بولا "مفت کہو تو دیدوں۔"

بندو انگوٹھے سے زمین کرید رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پھٹی پھٹی مسکراہٹ کو دیکھ کر بولا۔ "اوڑھ لو۔ تمہارے لئے لایا ہوں۔" خاموش پا کر مراری نے ہاتھ سے جھٹکتے ہوئے اوڑھنی اس کے سر پر ڈال دی۔ وہ اوڑھنی کی تعریف کر رہا تھا۔ "یہ کتنی اچھی ہے جوبن پھٹا پڑتا ہے۔ دلہن معلوم ہو رہی ہو۔ مراری کی دلہن۔"

وہ چونک پڑی۔ آنکھیں مراری کے چہرے پر گاڑ دیں۔ مراری کی ہنستی ہوئی آنکھوں سے شعلے پھوٹ رہے تھے اور جیسے وہ گھر گئی ہو شعلوں میں۔ اوڑھنی پھینک کر چیخ کر بولی "مجھے نہیں چاہیئے تمہاری اوڑھنی۔" دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اپنی میلی کچیلی اوڑھنی سنبھالتی ہوئی گھر چلی آئی۔

سسرال کی گاٹے کی سرخ اوڑھنی الگنی پر پڑی تھی۔ اب جیسے اس میں کشش امنڈ آئی ہو۔ بندو کے چہرے پر حیا آمیز سرخی پھیل گئی۔ کے سوتے ہوئے اس کا دل آپ ہی آپ بجنے لگا۔ اوڑھ کر ایک لجائی ہوئی نظر آئینہ پر ڈالی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے آگ کی لپٹوں میں کندن دمک رہا ہو۔ اور اس کا گول ہنستا ہوا چہرہ؟

پیڑوں کی اوٹ سے ڈوبتے ہوئے سورج کا لال ٹکڑا دھرتی کو جھانک رہا تھا۔

چرواہے گیت گاتے ہوئے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ مویشیوں کے گلے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ گاؤں کی سونی گلیوں میں زندگی کی لہریں دوڑ گئیں۔

غزل

(حضرت جگر مرادآبادی)

آتے ہیں پھر وہ عزمِ دل و جاں کئے ہوئے
پلکوں کی اوٹ حشر کا ساماں کئے ہوئے

پھر اٹھ رہی ہے عارضِ پُرنور سے نقاب
نظارہ و نظر کو پریشاں کئے ہوئے

پھر شام و صبحِ زلف و رخِ یار ہیں بہم
ایماں کو کفر، کفر کو ایماں کئے ہوئے

پھر اٹھ رہی ہے جانبِ دل چشمِ سرمگیں
اک اک نظر میں پرسش پنہاں کئے ہوئے

پھر حسنِ منفعل متبسم ہے زیرِ لب
یک قطرہ اشک زینتِ مژگاں کئے ہوئے

پھر ہے نگاہِ شوق کو دیدار کی ہوس
مدت ہوئی ہے جرأتِ عصیاں کئے ہوئے

پھر جی یہ چاہتا ہے کہ بیٹھے رہیں جگر
اُن کی نظر سے بھی انہیں پنہاں کئے ہوئے

ریشننگ

(از احدی)

صبح کا بھولا شام کو آجائے، تو اُسے بھولا نہ جانئے۔ خدا بھلا کرے لارڈ ویول کا وائسرائے بنتے ہی انہوں نے اعلان کیا تھا "میں ہندستان کی کھانے پینے کی تکلیف مٹاؤں گا"۔ وہ ہندستان کی کھانے پینے کی تکلیف مٹانے کے لئے وہی نسخہ استعمال کر رہے ہیں جو انگلستان میں جنگ کی ابتدا سے زیرِ استعمال ہے۔ یعنی ریشننگ۔

ریشننگ کا مقصد ہے، چیزوں کی حصہ رسد تقسیم۔

کسی اخبار میں پڑھا تھا کہ ریشننگ کی وجہ سے انگلستان میں کھانے پینے کی چیزوں کی قیمت صرف چھبیس فی صدی بڑھی ہے۔ گویا وہاں جنگ سے قبل جو چیز ایک روپیہ میں ملتی تھی وہ اب ایک روپیہ سوا چار آنے کی ہے۔ برخلاف اسکے ہندستان کو چونکہ مدت دراز تک ریشننگ سے محروم رکھا گیا۔ ہندستان میں چیزوں کی قیمتیں چار سو فی صدی بڑھیں۔ یہاں جنگ سے پہلے جو چیز ایک روپے کی تھی وہ اب چار روپے میں بھی بمشکل ملتی ہے۔

اوّل اوّل تو ہندوستان کی حکومتوں نے ہندستان کی ان مشکلات کو شاید قابلِ اعتنا نہیں تصور کیا۔ لیکن جب خود حکومتوں کو ہندستان کے تجار نے دھتا بتائی تو انہیں محسوس ہوا کہ آٹے دال کا کیا بھاؤ ہے۔ حکومت ہند نے اس کا علاج پرائس کنٹرول تجویز کیا۔ اور جن جن چیزوں کی قیمتیں مقرر کرنی مناسب سمجھیں مقرر کر دیں۔ یہ قیمتیں قریب قریب وہی تھیں جو بڑھتے بڑھتے اُس وقت رائج ہو چکی تھیں۔ مطلب پرائس کنٹرول سے یہ تھا کہ بس موجودہ قیمتوں پر بس کرو۔ اور اور نہ بڑھاؤ۔ پرائس کنٹرول کا نتیجہ یہ نکلا کہ اِدھر طے پاتا کہ فلاں چیز کی قیمت کو فلاں تاریخ سے کنٹرول کیا جائیگا۔ اُدھر اس چیز کے بڑے بڑے تاجروں کے پاس خبر پہنچ جاتی، اور وہ چیز تاریخ آتے آتے ایسی غائب ہو جاتی جیسے تھی ہی نہیں۔ زمین کھا جاتی تھی یا آسمان کھا جاتا تھا۔ حکومت اور اہلِ حکومت کو کنٹرول کے بھاؤ مل جاتی ہو تو مل جاتی ہو۔ ورنہ غریب تو کنٹرول کی بدولت ان چیزوں کو ترس ترس گئے۔ اور امیروں نے بھی خریدا تو کوکین کی طرح چوری چھپے خریدا۔ اور کوکین کی طرح مہنگا خریدا۔

ایک دور ہندستان کے ہر صوبہ میں یقیناً ایسا گذرا ہے کہ کنٹرول پبلک کے حق میں رحمت کی بجائے زحمت تھا۔ اس کنٹرول کے ہونے سے اس کا نہ ہونا اچھا تھا[1]۔ کنٹرول نام کا تھا عمل سے کنٹرول کو واسطہ نہ تھا۔ حکومت کے کارندوں اور کنٹرولڈ اشیا کے تاجروں کے درمیان آنکھ مچولی ہوتی تھی۔ حکومت کے کارندے ڈال ڈال رہتے اور تاجر پات پات۔ کہیں کہیں اور کبھی کبھی تاجروں کو پتّوں سے اُتر کر حوالات کی سیر بھی کرنی پڑتی۔ مگر مہینوں کی نفع بازی کے آگے ایک رات کی بے عزتی کیا بڑی بات تھی۔ اور حکومت زیادہ سختی برتنے پر تیار نہ تھی۔

کہتے ہیں تجارت میں مال کا بیچنا ہنر نہیں ہے۔ مال کو بروقت خریدنا اور روک کر بیچنا ہنر ہے۔ بیچنے کو اخبار بیچنے بیچتے پھرتے ہیں۔ اور دکانوں پر بیچنے چیزیں نکالتے اور دکھاتے اور اُن کے بھاؤ تاؤ کرتے ہیں۔ چیز کی قیمت مقرر کر دی جائے یا یہ معلوم ہو کہ اس قدر قیمت کہکر اس قدر قیمت لی جا سکتی ہے تو بیچنا کون سا دشوار کام ہے۔ ہنر اور فن یہ پہچاننا ہے کہ فلاں چیز کا فلاں وقت بھاؤ چڑھ جائیگا۔ اسے آج خرید لیا جائے اور جمع رکھا جائے اور تین مہینے یا چھ مہینے بعد نکالا جائے۔

موجودہ جنگ میں بوالہوس تاجروں نے اس ہنر اور فن کے وہ وہ ناپاک اور آدمیت سوز کمال دکھائے کہ قارون کی یاد تازہ ہو گئی۔ جو چیزیں باہر سے آتی ہیں دلّی میں بمبئی، کلکتہ سے یا ہندستان میں کسی اور ملک سے۔ یہ اندازہ لگا کر کہ ریل گاڑیوں کو تجارتی سامان پہنچانے کی زیادہ فرصت نہ ہوگی اور جہازوں کے تو راستے ہی رُک جائیں گے۔ لہٰذا جو چیزیں باہر سے آتی ہیں اور اس شہر میں مختلف دکانوں پر پھیلی پڑی تھیں ہوشیار اور بڑے تاجروں نے چھوٹے اور کم عقل دکانداروں کو معمولی نفع دیکر خرید لیں۔ اور جمع کر لیں۔ اب انہیں بیچتے نہیں۔ خلقت اُن کے نہ ملنے سے بے چین ہے۔ اور ہوشیار اور بڑے دکاندار صاحب ان چیزوں پر سانپ بنے بیٹھے ہیں اور انتظار کر رہے ہیں کہ اور بھاؤ بڑھ جائے۔ اور بھاؤ بڑھ جائے۔ مثلاً ایک صاحب نے قلعی شہر بھر سے سمیٹ کر اپنے ہاں بھر لی۔ لوگوں کو بے قلعی پتیلیوں کا پکا کھانا کھانا پڑا۔ وہ بلڈ پوائزن میں مبتلا ہوئے۔ اُنہوں نے تانبے کے برتن چھوڑ کر مٹی کے برتن اختیار کر لئے۔ مگر قلعی جمع کرنے والے اللہ کے نیک بندہ کو اللہ کی مخلوق پر رحم نہ آیا۔ حتّیٰ کہ قلعی کا بھاؤ اتنا چڑھ گیا جتنے کی قلعی جمع کرنے والے ہوشیار تاجر کو توقع تھی۔ تب قلعی نکلی اور روپیہ کی قلعی تیس اور چالیس روپے میں بکی۔

غرض تاجر قارون بن رہے تھے۔ اور حکومت حاتمی اور فیاضی سے نہ ہٹتی

[1] اب یہ حال نہیں ہے۔ کپڑے کا کنٹرول حکومت نے خاصہ اچھا کیا ہے۔ دواؤں کا کنٹرول بھی کامیاب ہوتا نظر آتا ہے۔

تھی۔ حکومت نے تنگ آکر تاجروں کے گرتبوں توڑ کر آٹوں کو کنٹرول کے منتر سے دبانا چاہا۔ لیکن منتر اتنی کم طاقتی کے ساتھ پڑھا کہ منتر کا اثر جیسا چاہیئے تھا ویسا نہیں ہوا۔ بلکہ بیشتر چیزوں پر مطلق نہیں ہوا۔

کانی جھک جھک اور پٹ پٹ اور تجویزوں کو پانوں کی طرح اُلٹنے پلٹنے کے بعد حکومت نے ایک نیا قدم اٹھایا۔ حکومت نے انتظام کا بڑا حصہ غیر سرکاری آدمیوں کے سپرد کردیا اور حکم کیا کہ فلاں چیز فلاں بھاؤ سے بکے گی۔ اور اس چیز کو گلی گلی اور کوچہ کوچہ بیچنے کے لئے لائسنس لینے پڑینگے۔ اور بیچنے والوں کی نگرانی فلاں فلاں صاحبان پبلک میں سے کرینگے۔ یہ حکم حکومت نے چیزوں پر خاصا قابو پاکر دیا تھا۔ اس دور میں بعض چیزیں حکومت کی گلی گلی اور کوچہ کوچہ اتنی بھوانی تھی کہ جنگ سے قبل وہ چیزیں وہاں اتنی نہیں آتی تھیں۔ لیکن آنریری اور اللہ واسطے کے کام جیسے ہوا کرتے ہیں ویسے ہوئے۔ اس دور میں بھی پبلک چیختی ہی رہی۔ فرق فقط یہ تھا کہ پہلے دوروں میں حکومت کے خلاف چیختی تھی۔ اس دور میں اللہ واسطے کام کرنے والوں کے خلاف حکومت سے شکایت کرنے لگی۔ حکومت زد سے بچ گئی۔ اور آنریری "خدمت" کرنے والے بدنام ہوگئے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اشیائے خوردنی کی قیمتوں کا کنٹرول بغیر راشننگ کے بے معنی ہے۔

ہندستان غالباً بہت سے تجربوں کا مستحق تھا۔ یا ہندستان کی حکومتیں خریداروں کو آسائش پہنچانے کے ساتھ بیچنے والوں کو بھی خفا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ہندستان کی حکومت کے سامنے ہندستان کے غربا ہی نہ تھے ہندستان کے امرا بھی تھے۔ غرض سب تجربے جب ختم ہوگئے تو آخراب وہی علاج شروع کیا جارہا ہے جو زمانہ جنگ کا واحد علاج ہے۔ سامان کی حقیقتاً کسی دور میں کمی نہیں رہی۔ خرابیاں فقط تاجروں کی ہوس اور امیروں کے ہوکے نے پیدا کیں۔ تاجروں کا دل نفع بازی سے اور امیروں کا پیٹ سامان اکٹھا کرنے سے نہ بھرتا تھا۔ راشننگ اس ہوس اور اس ہوکے کا مداوا ہے اب یہ نہیں ہوگا کہ بیوی ڈوا چھان کر بیٹھی ہیں اور میاں کو دوا کے واسطے دو پیسے کا قند نہیں میسر آتا۔ اس علاقہ میں جہاں کی سینتیس ہزار آبادی کے لئے حکومت چھ سو اسی بوری قند ماہوار دلواتی ہے۔ اب یہ نہیں ہوگا کہ مالداروں کے ہاں گیہوں سال سال بھر کا بھرا ہے اور غریب پیسے لئے ڈھونڈا ہیں۔ اور انہیں ایک وقت کا آٹا نہ نصیب ہو۔ اب یہ نہیں ہوگا کہ لکڑیوں کے ٹھیلے من من بھر یا بیس بیس سیر بکنے کے خیال سے چلیں اور کوئی اچھی قیمت دے سکنے والا ٹھیلہ کا ٹھیلہ راستہ ہی میں خالی کرلے۔ اب یہ نہیں ہوگا کہ ایک گھر تو بجلی کی روشنی سے جگمگ جگمگ کررہے اور دوسرے گھر میں مٹرھا اندھیرے میں پڑا رہے۔ اب چیزیں کسی ایک گھاٹ پانی پئیں گے۔ اب گیہوں، قند، لکڑی، کوئلہ، مٹی کا تیل طاقتور کو بھی ملے گا اور کمزور کو بھی۔ مالدار کو بھی ملے گا اور غریب کو بھی۔

وہ لوگ جو راشننگ سے پہلے قسم قسم کے فائدے اٹھا رہے تھے۔ راشننگ کو بُرا بتائیں گے۔ راشننگ سے تاجر خوش نہیں ہوسکتے۔ راشننگ تاجروں کی نفع بازی پر کاری ضرب ہے۔ راشننگ مالداروں کو ناگوار ہوگا جو سال بھر اور چھ مہینے کا سامان بھرنے کے عادی ہیں۔ انہیں آٹھ دن کا سامان لینا کیسے پسند آسکتا ہے۔ خواہ اس سے ان کا نقصان کچھ بھی نہ ہو۔ لیکن سب باتوں کے باوجود راشننگ غریبوں کے حق میں قطعی نعمت ہے۔ غریب روز کنواں کھودتے ہیں روز پانی پیتے ہیں۔ اسی واسطے انتظام کیا جائیگا کہ جسے روز خریدنے میں آسانی ہو وہ روز خریدے۔ جسے ہفتہ وار خریدنے میں آسانی ہو وہ ہفتہ وار خریدے۔ غریبوں کو راشننگ سے یہ اطمینان تو ہوگا کہ چیز ملے گی۔

راشننگ کے زمانہ کا جنگ سے پہلے کے زمانہ سے مقابلہ مت کیجئے۔ جنگ سے پہلے کی بات تو جنگ کے بعد بلکہ عرصہ بعد آئے گی۔ البتہ راشننگ کا زمانہ راشننگ سے پہلے کے زمانہ سے اللہ نے چاہا بہتر ہوگا۔ آپ یوں سوچئے کہ مٹھائی کی ایک ٹوکری آپ خرید کر لائے ہیں۔ آپ اپنے بچوں میں مٹھائی حصہ رسد بانٹیں گے یا کسی کو زیادہ دیدیجئے اور کسی کو بالکل محروم کردیں گے۔

بس حکومت اب اسی انصاف پر آمادہ ہوئی ہے۔

عزم

(از جناب نہال سیوہاروی)

فضائے مہر و ماہ پہ چھا لوں تو چین لوں — کون و مکاں میں دھوم مچا لوں تو چین لوں
اِنسان کی جبیں پہ ہے محکومیت کا داغ — محکومیت کا داغ مِٹا لوں تو چین لوں
وہ کام کر دکھاؤں کہ ارض و سما ہوں دنگ — شانوں پہ کائنات اُٹھا لوں تو چین لوں
روتی رہی ہے جبرِ زمانہ سے ایک عُمر — جی بھر کے زندگی کو ہنسا لوں تو چین لوں
جس کی نوا ہو تا بہ ابد ضامنِ جمال — وہ نغمۂ جمیل سُنا لوں تو چین لوں
پھیکا ہے رنگِ دہر ابھی کیا ہوں مطمئن — تاروں سے فرشِ خاک سجا لوں تو چین لوں
جس کے حضور ماند نظر آئیں مہر و ماہ — ایسا بھی اِک چراغ جلا لوں تو چین لوں
یہ خاکداں جہنمِ انساں ہے جس کا نام — رشکِ ہزار خلد بنا لوں تو چین لوں
پی لوں بقدرِ تشنگیٔ شدّتِ خمار — ساقی سے رسم و راہ بڑھا لوں تو چین لوں
اُمڈے روِش روِش سے سمندر حیات کا — سوتے ہوئے چمن کو جگا لوں تو چین لوں
ہے جن کی لاگ مانعِ آزادیٔ خرام — کانٹے وہ راستے سے ہٹا لوں تو چین لوں
ہے شادکام جن کے تصوّر سے زُہدِ خشک — اُن جنّتوں کا کھوج لگا لوں تو چین لوں
ہو رفعتوں میں اوجِ ثریّا پہ جس کو فوق — وہ پرچمِ بلند اُڑا لوں تو چین لوں
وہ آبِ زندگی ہے جسے پی کر نہ آئے موت — دُنیائے جاں بلب کو پلا لوں تو چین لوں
اُلفت کی بارگاہ سے اِنسانیت کے نام — اِک آخری پیام سُنا لوں تو چین لوں

خواہم ز دردِ صورتِ درماں برآورم
صبحِ وصال از شبِ ہجراں برآورم

گھٹا

(از جناب نور الحسن ہاشمی)

۲۱۔ جون کا دن تھا۔ پارہ ۱۱۷ درجہ پر تھا۔ شام کے قریب بلا کا حبس ہوگیا تھا کہ دفعتاً مغرب کی طرف سے سیاہ بادل اُٹھتے دکھائی دیئے۔ مرجھائے ہوئے چہرے کھلنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے ہوا کے جھکڑ چلنے لگے۔ گرج اور کڑک کی آواز کے ساتھ ٹپ ٹپ بوندیں پڑنے لگیں۔ سب برآمدوں میں آگئے۔ کھانے کا وقت تھا وہیں دسترخوان بچھ گیا۔

"ارے صغیر کی بھی کسی نے خبر لی کہ غریب کہاں پڑا ہے" پھوپی قاب میں سالن نکالتے ہوئے بولیں۔

"بڑی جلدی خیال آگیا پھوپھی" صغیر کونے والی آرام کرسی پر سے بولا۔

"شاباش میاں صد رحمت تم پر۔ خدا خدا کر کے بخار اُترا ہے۔ اور تم ٹھنڈی ہوا میں نکل بیٹھے" پھوپی ہاتھ روک کر بولیں۔

"مجھ سے اندر کمرے کی گھٹس میں نہیں بیٹھا جاتا۔ سینہ کی بہار دیکھئے یہاں آ بیٹھا تو اس میں کیا ہوا"

"بھئی تم نے تو میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ نوج کوئی ایسا ناکہیں ہو بخار کا پنڈا اور یہ ٹھنڈی ہوا۔ میں کہتی ہوں دشمن کچھ اور نہ کر لیں" پھوپی جھنجھلا کر بولیں۔

کھانا کھا چکنے کے بعد سب ریڈیو سننے بیٹھ گئے۔ اس دوران میں بارش کا اچھا چھینٹا پڑ چکا تھا۔ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو بہت بھلی معلوم ہوتی تھی۔ بادل ابھی تک گھرے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ہواؤں کا مزا لینے کے لئے سب نے اپنی اپنی چارپائیاں برآمدہ کے باہر گھسیٹ لیں۔ صرف صغیر کا پلنگ اندر دیوار کے پاس پڑا رہا۔ اگرچہ صغیر کا دل تو بہت چاہا کہ وہ بھی باہر نکلے۔ مگر پھوپھی کے سامنے ایک نہ چلی۔

خاصی رات جا چکی تھی۔ میدنڈکوں کی ٹرٹر اور دور سے کسی کتے کی منحوس بھونکنے کی آواز یا چوکیدار کی للکار کبھی کبھی بھیانک خاموشی کو جھنجھوڑ دیتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ایک آدھ خراٹے کی آواز سنائی دے جاتی۔ یکایک [illegible] شروع ہوئی۔ سونے والے ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور چارپائیاں [illegible] جا۔ ایک دم سے ہر گرتے پڑتے اور ہڑبڑاتے ہوئے لڑکیوں نے برآمدہ میں چارپائیاں بچھانی شروع کیں۔ پھوپھی کو برآمدہ میں جگہ نہ ملی۔ اُن کی چارپائی [illegible] کمرے میں دروازے سے لگا کر بچھا دی گئی۔ بڑی آپا اور منجھلی کو [illegible] دیوار کا کونہ ملا۔ بیچ میں بچے سو گئے۔ اس ہلچل میں صغیر کی آنکھ بھی کھل گئی تھی۔ اور وہ اپنی چارپائی پر پڑا پڑا بھاگنے دوڑنے گرنے پڑنے کی سیر دیکھ رہا تھا۔ تاریکی، بارش، نیند میں آنکھیں بند۔ اُدھر بجلی خراب۔ بجلی والے گھروں میں چراغ بتی کا انتظام [illegible] کوئی آپس میں ٹکرا گیا۔ تو کسی کا پاؤں پھسل گیا۔ لڑکیاں اندھے سیدھے بستر کرتی جاتیں اور لڑتی جاتیں۔

"مُردار نے میرا پاؤں کچل دیا" "اری تو کیا میں نے جان کر پلنگ چھوڑ دیا۔ پیر پھسلا۔ چارپائی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔"

"ویسے ہی پھوٹیں۔ کیا اندھے ٹکر ماری ہے۔ مُوا کتنا بڑا گومڑا اُٹھ آیا"

"اور میری جو آنکھ پھوٹتے پھوٹتے رہ گئی"

"لے لو اے لو۔ دھکیلے دیتی ہے تو ہٹتی کیوں نہیں؟" دوپٹہ بھی کھنچتے لگی۔ نگوڑا نیا دوپٹہ کیسا چرر سے پھٹ گیا"

"تمہیں بھی تو صبر نہیں۔ پایہ تو اُٹھانے دیا ہوتا۔ جھٹ کھینچ لیا"

"اور تم میرے پلنگ پر کیوں آ لیٹیں؟"

"پھر کیا ہوا تم میرے پلنگ پر جا لیٹو"

"دیکھ ناشدنی ساری ادوان توڑ ڈالی تو نے۔ ٹھہر تو مکار"

مگر سلمہ کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ بڑے چپ چپاتے سو گئی۔ وہ ہے بھی کم گو۔ دن بھر میں پانچ یا چھ فقروں سے زیادہ اُس کے منہ سے نہیں سنے۔ وہ سروں کی طرح ہر وقت چپڑ چپڑ نہیں کرتی۔

آوازیں رفتہ رفتہ بند ہوگئیں۔ پھر مکمل سکوت طاری ہوگیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ گھر میں کوئی لڑکا بیمار ہو جاتا تو اُسے دن رات زنان خانے ہی میں رکھتے کہ دیکھ بھال اچھی ہو سکے۔ صغیر چھ سات روز بخار میں مبتلا رہا۔ وہم ہوا کہ کہیں ٹائیفائڈ نہ ہو۔ چنانچہ ٹائیفائڈ کے ٹیکے بھی لگوائے گئے۔ لیکن خدا کا فضل رہا۔ تین روز سے بخار نہیں ہوا۔ زنان خانے میں صغیر کو گیارہ روز ہوگئے تھے۔ [illegible] کہ وہ اتنے عرصہ کے لئے عورتوں میں رہا۔ بڑے چچا روا دار نہ تھے کہ کوئی لڑکا بغیر ضرورت لڑکیوں میں آئے یا ضرورت سے زیادہ زنان خانے میں بیٹھے۔ [illegible] اپنے کمرے میں [illegible] رہتے تھے۔



نوشابہ — فلم ''زبان'' میں



انیس خاتون — فلم ''نئی زندگی'' میں

تصور ہی ہوا ... پر بڑا اثر آمدے میں سے آسمان کی کیفیت کا مطالعہ
... بادل، بوندیں، گرج، چمک۔ قدرت کا مظہر۔ آج کی رات بے چینی ہے۔ انسانی
... کیفیتیں کبھی کبھی طاری ہوتی ہیں۔ اضطراب کی حالت میں دل کی دھک
دھک ... دھڑکن، چہرے کا رنگ بدلنا، خوف سے زرد، خوشی میں سرخ، مایوسی میں
... آنسوؤں کا ... ننھی ننھی بوندیں گرنی۔ انسانی دل اور ان عناصر
میں ... مشابہت ہے۔ یہ سونے والے پہلے کیسے بے چین تھے۔ ان میں کیسی کھلبلی مچ گئی تھی۔
اب ہیں پھر خاموشی۔ آسمان کی یہ غیر معمولی کیفیت بھی ختم ہو جائیگی۔ اسی طرح
... سب بھی سرد ہو جاتا ہے۔ انہی خیالات میں مستغرق صغیر اپنی چارپائی پر
لیٹے اپنے ہی دل سے کچھ اسی قسم کی باتیں کر رہا تھا کہ گھنٹے نے دو بجائے۔
"دو بج گئے! اُف کتنی رات آگئی" اور اُس نے کروٹ لیکر آنکھیں بند

صغیر کو سوئے زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ ہوا ہوگا کہ یکایک اس کی
آنکھ کھل گئی۔ اُس نے محسوس کیا کہ اس کا ہاتھ کسی نرم چیز سے چھو رہا ہے۔ اُس
نے ... سے سر اُٹھا کر ٹٹولا۔ کہ ہاتھ کس چیز پر ہے۔
"ادھو سعید ہے۔ یہ یہاں کیسے آسویا۔ مگر اس کے گال اتنے گرم
ہیں" صغیر نے زیر لب اپنے ہی سے استفسار کیا۔
سخت حیران ہوتے ہوئے صغیر نے رخسار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سر کی
طرف ہاتھ بڑھایا۔ بالوں میں ... محسوس ہوئی۔ شک پکا ہوگیا۔ اس کا ہاتھ کانپنے
لگا۔ پسینے آگئے۔ دل کی دھڑکن تیز ہوگئی۔ کپکپاتی ہوئی انگلیاں بالوں سے پھسلتی
ہوئی سنبھلتے ہوئے رخسار پر آگئیں۔
"یہ سعید نہیں ہے۔ اتنا بڑا منہ! اس کے سر پر بال کہاں! یہ تو گندھے
ہیں۔ کون ہو سکتا ہے؟"
رندھے ہوئے گلے میں صغیر کا دم اٹکنے لگا۔ اُس نے کانپتے ہوئے ہاتھ
... کی کوشش کی مگر اُسے ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے اسکی کلائی میں ہتھکڑی ڈال
دی ہے۔ چوڑیوں کی جھنکار نے اُسے چونکا دیا۔ کسی نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر بھرے رخسار
پر رکھ لیا۔
"گھبرائیے نہیں۔ میں ہوں سلمہ۔ آپ ہی نے تو ایک دن کہا تھا کہ موقعہ
ملے تو صاف صاف باتیں کرینگے۔ ماشاءاللہ ایسے بھرے پُرے گھر میں ایسے موقعے
کب ملتے ہیں۔ مجھے بھی آج ایک ضروری بات کہنی ہے۔ یہ گھٹا روز روز تھوڑا
ہی آتی ہے؟" یہ کہتے ہوئے سلمہ نے صغیر کی کلائی چھوڑ دی۔ سُرخ رخساروں کی
... اور ہونٹوں کی کپکپی کے سوا سلمہ اتنی گھبرائی ہوئی نہ تھی۔ جتنا صغیر

اس نے شاید حفاظت کے واسطے سب سامان کر رکھے تھے جنکا صغیر کو علم نہ تھا۔ آخر
پھوپھی کی چارپائی کمرہ میں اور بڑی آپا وغیرہ کی چارپائیاں اندر کونے میں کس
نے ڈلوائی تھیں۔ برآمدہ کا بلب کس نے اتار لیا تھا۔ صغیر کی اور اپنی چارپائی کے
درمیان سعید کی پلنگڑی کس نے بچھائی تھی۔ اور سب کے سو جانے کے بعد سعید کو
اُٹھا کر اپنی چارپائی پر لٹانا اور اس کی پلنگڑی پر خود سو جانا کس کا کام تھا۔ سلمہ
نے ہی یہ سب کارروائیاں کی تھیں۔ گھٹا اور بارش نے سلمہ کا اس کام میں ہاتھ بٹایا
تھا۔ اتفاق کی بات ہے بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹ پڑا۔ پھر کبھی ایسا موقعہ ملے نہ
ملے۔ اور صغیر کا اندر کیا کام۔ دشمن روز روز کہاں بیمار ہوتے ہیں۔
اُدھر صغیر کے ہونٹوں پر مُہر سی لگ گئی تھی۔ پسینوں کے مارے نہا گیا۔
زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ ایک نوجوان حسین لڑکی اُس کے اس قدر قریب لیٹی
ہوئی تھی۔ پھر محبت کا نشہ۔ دونوں جوان۔ جوانی دیوانی مشہور ہے۔ کوئی
لغزش ہو جائے تو۔ اس خیال کے آتے ہی وہ تھرا اُٹھا۔ اس کا کمزور جسم بید کی
مانند کانپنے لگا۔ مگر سلمہ نے کتنی دور اندیشی سے کام لیا ہے۔ بلب اتار لینے
کی بھی خوب سوجھی۔ صغیر یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے سلمہ رو رہی
ہو۔

"رو کیوں رہی ہو سلمہ؟" صغیر نے سلمہ کے تکیہ کے قریب سر کھسکا کر کہا
اور سلمہ نے رندھے ہوئے گلے کو صاف کرتے ہوئے جواب دیا۔
"آپ تو نہ معلوم کس دُنیا میں رہتے ہیں۔ اماں نے پھر شوشہ چھوڑا ہے
کئی دن سے چرچے ہو رہے ہیں۔ وہ ملازم ہوگیا ہے۔ شادی کیلئے خط پہ خط بھیج
رہا ہے۔ میرے جہیز کی تیاریاں بھی شروع ہوگئی ہیں۔ آپ نے گذشتہ ماہ باورچی
خانہ میں مختصر سی گفتگو کے بعد مجھ سے کہا تھا کہ وقت آنے پر انکار کر دینا۔ مگر آپ ہی بتلائیے
میرے انکار سے کیا ہو سکتا ہے۔ اُلٹی رسوائی ہوگی۔ اپنے پرائے سب تھڑی تھڑی
کرینگے۔ اور آپ بھی تو کون سے گھر کے بڑے بوڑھے ہیں۔ جو کھلے بندوں میری شادی
کی مخالفت کریں۔ بڑے چچا کے کان میں بھنک پڑ گئی۔ تو کان پکڑ کر آپ کو باہر نکال
دینگے۔ یہ انقلابی بات ہمارے گھرانے میں نہیں چل سکتی۔ سنا نہیں کہ خاندان کے
قانون تو دیوتا بھی نہیں توڑ سکتے۔"
"وہ دیکھو سامنے کوئی کُلبلایا" صغیر نے سلمہ کے منہ پر ہاتھ رکھتے
ہوئے آہستہ سے کہا۔ اور پانچ منٹ تک مکمل خاموشی رہی۔
"سلمہ تم اصلاً فکر نہ کرو۔ میں یہ سب کچھ جانتا ہوں۔ جب تمہیں وعدہ
دیا ہے تو پھر میری طرف سے ڈر کاہے کا۔ میں تمہارا بیاہ اکبر کے ساتھ ہرگز نہ ہونے
دونگا۔ قانوناً اور شرعاً ہر ایک نوجوان، خواہ لڑکی ہو یا لڑکا اپنا رجحان ظاہر

کرسکتے ہیں۔ [illegible] بات ہم بھی کہنے میں کبھی نہیں ہوتی ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ بہتر عمل پر کبھی عمل ہی نہ کیا جائے۔" صغیر نے سلمہ کی ہمت بندھاتے ہوئے کہا۔ مگر اُسے ایسا محسوس ہوا کہ سلمہ بے ہوش ہو رہی ہے۔ اُس نے اپنا ہاتھ سلمہ کی چہرہ کی طرف بڑھایا۔ اس کے رخسار آنسوؤں سے تر اور ہونٹ تھر تھرا رہے تھے۔ صغیر کو احساس ہوا کہ وہ بولنے کی کوشش کر رہی ہے۔ مگر بول نہیں سکتی۔ وہ گھبرا گیا۔

"سلمہ۔" صغیر زار زار چھٹپٹاتے ہوئے بولا۔

سلمہ کا گلا رندھ گیا تھا۔ وہ اپنے پر قابو پانے کی کوشش میں صرف اتنا کہہ سکی۔ "صغیر ہمارا نصیب لڑا ہوا نہیں ...... ہم" اور وہ پہلے جیسی ہو کر تکیے سے چہرہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

"سلمہ رو کر بدشگونی مت کرو۔ اللہ میں سب قدرت ہے۔ اب تم چین سے سو جاؤ۔" صغیر نے سلمہ کا بازو سہلاتے ہوئے کہا۔

"چین" سلمہ چیخ کر بولی۔ اور صغیر نے گھبرا کر اسکے منہ پر ہاتھ رکھدیا

"تم اتنی کیوں ڈر رہی ہو۔ سلمہ۔ انشاء اللہ ہماری زندگی چین ہی سے گزریگی۔ تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ لو سو جاؤ۔ اچھی سلمہ!"

صغیر نے سلمہ کو پیار سے تھپکنا شروع کیا۔ اور "باقی باتیں کل رات کریں گے" کہکر گویا گفتگو بند کرنے کی کوشش کی۔

"آپ بہت بھولے ہیں" سلمہ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔ "ایسی گھٹا روز روز نہیں چڑھا کرتی۔ یہ گھٹا ہمارے سر پر آخری دفعہ سایہ کرنے آئی ہے۔ خوش اعتقادی اور خود اعتمادی کی حد ہوا کرتی ہے۔ مجھے تو اپنا مستقبل نظر آرہا ہے۔ اس لئے بجا طور پر پریشان ہوں۔ آپ اس مہم کو آسان سمجھ رہے ہیں۔ کہنا آسان ہے کرنا مشکل، بہت مشکل ....." سلمہ نے اپنا چہرہ پھر تکیہ سے ڈھانپ لیا۔

علی الصباح صغیر کی آنکھ کھلی۔ تو دیکھا کہ کھٹولی پر سعید میاں پڑے خراٹے لے رہے ہیں اور ادھر والی چارپائی پر بستر لپٹا پڑا ہے۔ باورچی خانہ سے برتنوں کی آوازیں کھڑکنے کے ساتھ چوڑیوں کی جھنکار بھی صغیر کو سنائی دے رہی تھی۔ ناشتہ تیار کرنے کا آج شاید سلمہ کا نمبر تھا۔ صغیر کو ابھی چلنے پھرنے کی اجازت نہ تھی۔ دو تین روز اور پلنگ پر لیٹے لیٹے خیالات کے گورکھ دھندے سے الجھتا رہا۔ سلمہ کا کہنا صحیح ہوا۔ نہ وہ آندھی آئی اور نہ ویسی گھٹا چڑھی۔ انہیں باتیں کرنے کا پھر موقع نہ ملا۔ پہلے تو صغیر کو سلمہ کی شادی کی تیاریوں کا پتہ ہی نہ تھا۔ اب سلمہ سے سُنکر جو اُس نے عورتوں کی حرکات و سکنات کا جائزہ لینا شروع کیا تو اُسے واقعی گھر میں [illegible] چہل پہل نظر آئی۔ [illegible] ہوتی جا رہی ہے۔

سلمہ کی شادی ہوئے ڈیڑھ سال ہو چکا تھا۔ باوجود اپنی انقلابی ذہنیت کے صغیر اتنی جرات و ہمت نہ کر سکا کہ اُسے اپنانے کی کوشش کرتا۔ وہ اب [illegible] جا چکی تھی۔ اس عرصہ میں وہ دو بار میکے آئی۔ پہلی مرتبہ صغیر شملہ گیا ہوا تھا۔ اور دوسری دفعہ اُس وقت جب کہ کرسمس میں کالج کی جیوگرافیکل سوسائٹی کے ساتھ وہ [illegible] کے آتش فشاں پہاڑوں، چائے کے باغات اور جوگندر نگر کے بجلی گھر کی سیر کر رہا تھا۔

دسہرہ کی تعطیلات میں کالج کی ٹیم کو لکھنؤ یونیورسٹی سے میچ کھیلنے جانا تھا۔ سلمہ کا شوہر اکبر لکھنؤ میں تھا اور سلمہ بھی وہیں تھی۔ لیکن صغیر نے انہیں کوئی اطلاع نہ دی۔ گھر والوں نے سیدھے سبھاؤ لکھ دیا کہ صغیر فلاں دن سوار ہو کر فلاں دن لکھنؤ پہنچ رہا ہے۔ اکبر کو یقین تھا کہ صغیر ضرور اس کے ہاں قیام کریگا۔ لیکن وہ ایک ذات شریف تھے۔ ٹیم کے ساتھ ہوٹل میں جا اُترے۔ اکبر کو دفتر سے چھٹی نہ مل سکی اور وہ سٹیشن نہ جا سکا۔ آخری ہفتہ تھا۔ تین بجے دوڑا دوڑا گھر آیا۔ امید تھی کہ صغیر گھر پہنچ گیا ہوگا۔ وہاں نہ پا کر اکبر صغیر کو ہوٹلوں میں ڈھونڈتا پھرا۔ خدا خدا کر کے پرنس ہوٹل میں ملاقات ہوئی۔ خوب بھینچ بھینچ کر دو دو تین تین بار گلے ملے۔ آخر چچازاد بھائی تھے۔ مدتوں کے بعد ملنا ہوا تھا۔

صغیر اکبر کے ساتھ حضرت گنج جا رہا تھا۔ لیکن اس کے دل و دماغ کی عجیب کیفیت تھی۔ چلتا اور ٹھٹک جاتا۔ ۲۱ رجون کی آندھی اور اس رات کی تمام باتیں اس کے ذہن میں تلاطم برپا کر رہی تھیں۔ سلمہ کے سامنے کس منہ سے جائے۔ وہ انقلابی دعوے۔ وہ طفل تسلیاں۔ وہ وعدے وعید۔ سلمہ تو اُس سے نفرت کرتی ہوگی۔ کیا منہ لیکر جائے اُس کے سامنے۔ اور اس اکبر کو دیکھو کس مزے سے اس ڈاکو کو گھر لئے جا رہا ہے۔ جس نے اُس کی دولت لوٹنے کے منصوبے کئے تھے۔

"لو سلمہ صغیر آگئے۔ دُنیا کا خون آج کل کتنا سفید ہو گیا ہے۔ اپنا گھر چھوڑ کر ہوٹل میں جا ٹھہرے حضرت۔ نہ خط پتر نہ واسطہ نہ میل ملاقات۔ سے۔ آئے بھی تو چوروں کی طرح۔"

سلمہ اُس وقت میز پر کھانا لگا رہی تھی۔ جیسے اُسے معلوم تھا کہ صغیر آنے ہی والا ہے۔ "کلاؤ بھی کھانا نکالو۔ میرے پیٹ میں تو چوہے قلابازیاں کھا رہے ہیں۔ صغیر تم بیٹھو نا۔ میں ہاتھ دھو کر ابھی آیا۔" اکبر نے غسل خانے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

کھانے سے فراغت پاکر اکبر نے دو چار گراموفون ریکارڈ بجائے۔ اور اُسکے بعد کوئی دو گھنٹہ تک گپ شپ ہوتی رہی۔ پھر دونوں تفریح کے لئے باہر نکل گئے اور رات کے نو بجے واپس گھر لوٹے۔ اکبر نے صغیر کو کھانے پر مجبور کیا۔ مگر وہ "ابھی پانچ بجے تو ڈٹ کر کھانا کھایا ہے" کی رٹ لگاتا رہا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ جانے کے ساتھ کچھ بسکٹ وغیرہ رکھ لئے جائیں تاکہ رات بھر کیلئے سہارا ہو جائے۔

سلمیٰ آنے والی سردیوں کے لئے سوئیٹر بن رہی تھی۔ سلائیاں بہت تیزی سے چل رہی تھیں۔ مگر کبھی کبھی صغیر کا چہرہ دیکھکر اسکی انگلیاں یکایک رک جاتیں اور ایک آدھ منٹ کے بعد پھر چلنے لگتیں۔

"بھئی کچھ بولو نا"۔ اکبر نے سلمیٰ سے کہا۔

"کیا بولوں۔ سن تو رہی ہوں آپ کی باتیں"۔ سلمیٰ نے مصنوعی طور پر مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"شادی سے پہلے شکایت کرتا تھا کہ سلمیٰ نہایت خاموش لڑکی ہے۔ میرا خیال تھا کہ میں خود بکواس کرکے اپنی دُلہن کو بھی باتونی بنا دوں گا۔ مگر ڈیڑھ سال شادی کے بعد بھی یہ ویسی ہی رہیں۔ جیسے پہلے تھیں"۔ اکبر نے سلمیٰ کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھتے ہوئے کہا۔

"خموشی گفتگو ہے بے زبانی ہے زباں ان کی"۔ صغیر نے دیوار پر لٹکی ہوئی تصویر پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ مگر سلمیٰ اکبر کی نظریں بچا کر صغیر کی طرف ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ گویا بھسم ہی کر ڈالے گی۔ جب صغیر کی آنکھیں سلمیٰ سے چار ہوئیں تو وہ پھر سلائیوں میں اُون اُلجھانے لگی۔ مگر صغیر نے ایک تاثر میں سلمیٰ کی آنکھوں میں "بزدل، بے وفا، ڈرپوک، بیوفا" وغیرہ الفاظ ناچتے دیکھ لئے تھے۔

ساڑھے دس بج چکے تھے۔ صغیر نے اکبر سے سونے کی اجازت چاہی۔ اکبر نے اپنے برابر والے کمرہ میں صغیر کیلئے پلنگ بچھوا دیا تھا۔ اکتوبر کا مہینہ۔ رات خاصی خنک ہو جاتی تھی۔ مگر لوگ اب بھی دروازے کھڑکیاں کھول کر سوتے تھے۔

صغیر پلنگ پر دراز ہو گیا۔ برابر والے کمرہ سے اکبر کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر بجلی بجھی اور تاریکی چھا گئی۔

چاند کی آخری راتیں تھیں۔ آسمان پر صرف ستارے ہی اپنی روشنی سے بھٹکے ہوئے مسافروں کو راہ دکھلانے اور تاریک دلوں میں اُجالا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ صغیر کو بھلا نیند کہاں آتی۔ کمرے کی کھڑکیوں سے وہ ستاروں کی چمک دیکھ رہا تھا۔ ڈیڑھ سال کے بعد بھی آسمان ویسا ہی ہے۔ فرق ہے تو صرف اتنا کہ اُس رات بادل گرج رہے تھے اور آج آسمان صاف ہے۔ اس وقت سلمیٰ قریب لیٹی ہوئی تھی۔ مگر آج کوئی دیوار حائل نہ تھی۔ "خاندان کے قانون تو دیوتا بھی نہیں توڑ سکتے"۔ سلمیٰ کا کہنا اُسے یاد تھا۔ یہ گھٹا پھر کبھی نہ چڑھے گی۔ واقعی اُس رات کی سی گھٹا پھر کبھی نہ اُٹھی۔ اس وقت اکبر کے ہاتھ سلمیٰ کے رخساروں پر ہوں گے۔ مگر کیا سلمیٰ کے گال بھی ویسے ہی گرم ہو گئے جیسے اُس رات تھے۔ اور اب سلمیٰ کے قدموں میں۔ گفتگو میں نظروں میں وہ مخصوص احتیاط کہاں رہی ہو گی۔ ڈیڑھ سال پہلے وہ کس قدر محتاط تھی۔

صغیر کو ان خیالات نے بے چین کر دیا۔ وہ کروٹ بدلتا رہا۔ اُسے نیند نہ آنی تھی نہ آئی۔ گھنٹے نے دو بجائے۔ صغیر کو اکبر کے خراٹوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

"کس مزے سے سو رہا ہے صغیر" زیر لب بڑبڑایا۔ اس کا دماغی انتشار بڑھ رہا تھا۔ اُس کے خیالات نے الفاظ کی صورت اختیار کر لی۔ وہ اپنے ہی سے باتیں کرنے لگا۔ اُس پر ویسی ہی حالت طاری ہو گئی جو ڈیڑھ سال پہلے آندھی والی رات کو اُس پر گذری تھی۔

"اکبر کیا چین کی نیند سو رہا ہے۔ اُس کی دولت جو اُس کے پاس ہے"۔ صغیر کروٹ بدلتے ہوئے بڑبڑایا۔

"نہیں میں آپ کے سرہانے ہوں"۔

صغیر نے تاریکی میں سر اُٹھایا۔ بالکل ڈیڑھ سال پہلے کی طرح۔ تاریکی میں اُسے کچھ نظر نہ آیا۔

"صغیر صاحب! میں آپ کے پاس کھڑی ہوں"۔ سلمیٰ نے جھک کر صغیر کے کان میں کہا۔

"سلمیٰ"! صغیر مضطرب ہو کر قدرے بلند آواز میں بولا۔

سلمیٰ نے فوراً صغیر کے مُنہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

"ہوش میں آیئے" سلمیٰ نے خوف زدہ ہو کر کہا۔ "آپ کا قرب میرے لئے باعث امتحان ثابت ہو رہا ہے۔ خدا کے لئے واپس ہوٹل چلے جایئے۔ آپ کو میری قسم فوراً یہاں سے چلے جایئے۔"

یہ کہکر سلمیٰ خاموش دبے پاؤں اپنے کمرہ میں چلی آئی۔

غیر شعوری طور پر صغیر لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا۔ جلد جلد اُلٹے سیدھے کپڑے پہن مکان سے نکلا۔ اور دیوانوں کی طرح ہوٹل کی طرف روانہ ہو گیا۔

(باقی)

لمعات

(از حضرت اختر شیرانی)

غمِ زمانہ نہیں اک عذاب ہے ساقی　　شراب دے مری حالت خراب ہے ساقی
ہیں سحرِ مے سے بہم میکدہ میں شام و سحر　　کہ ماہتاب قدح آفتاب ہے ساقی
کتاب پڑھنے دے زاہد کو جا کے مسجد میں　　مرے لئے ترا ساغر کتاب ہے ساقی

کھلا رہی ہے نئے پھول یاسمینِ فلک
پلا وہ پھول کہ رشکِ گلاب ہے ساقی

غزل

از
جناب خمار صاحب
بارہ بنکوی

لطفِ دوزخ بھی لطفِ جنت بھی　　ہائے کیا چیز ہے محبت بھی
عشق سے دور بھاگنے والو　　تھی یہی پہلے اپنی حالت بھی
جینے والا بنا لے جو چاہے　　زندگی خواب بھی حقیقت بھی
حالِ غم کہہ کے بھی کہا نہ گیا　　آگئی اپنے سر پہ تہمت بھی
نہ ہوئی جو بسر ترے غم میں　　حیف اُس زندگی کی قسمت بھی
عشق آفت سہی مگر ناصح　　کم نہیں کچھ تری نصیحت بھی
ایک وہ بھی زمانہ آتا ہے　　خواب بن جاتی ہے حقیقت بھی
نازِ اخفائے غم بجا لیکن　　تو نے دیکھی ہے اپنی صورت بھی

اُف وہ دورِ نشاطِ عشق خمار
لطف دیتی تھی جب مصیبت بھی

کتابُ السّلف (مسلسل)

(از علامہ سیماب اکبرآبادی)

سلہ کے لئے "ادیب" ماہ دسمبر ۱۹۴۳ء ملاحظہ فرمایئے

اب انعام اللہ خان یقین دہلوی

یہ تذکرہ مجھے میر، سوز اور درد سے پہلے لکھنا چاہیے تھا۔ مگر میں غلطی
و مشہور شاعر نہیں سمجھتا تھا۔ اس لئے جس طرح اس دور کے بعض دوسرے غیر
را کو دانستہ نظرانداز کردیا اسی طرح یقین دہلوی کا ذکر بھی چھوڑ گیا۔
جو تذکروں پر نظر ڈالتا ہوں تو ہر تذکرے میں یقین کا ذکر نظر آتا ہے۔
شعرا۔ تذکرہ شعرائے ہند۔ تذکرہ ہندی۔ تذکرہ شعرائے اردو۔ گلشن ہند۔
لشعرا۔ سخن شعرا۔ گلشن بے خار سے لیکر خمخانۂ جاوید تک اس جواں مرگ
حالات تمام تذکرہ نویسوں نے لکھے ہیں۔ اسکے علاوہ جب کلام دیکھا تو دل خوش ہوگیا
ان کا ذکر چھوڑنے کو جی نہ چاہا۔ تذکرے کی ترتیب کے وقت یہ تذکرہ اپنی
جگہ پر چلا جائے گا۔

دت سکونت انعام اللہ خاں نام یقین تخلص۔ ۱۱۴۰ھ میں بمقام دہلی پیدا ہوئے۔ والد کا نام شیخ اظہرالدین خاں۔ محمد شاہ

ے وعدہ میرا ارادہ تھا کہ میر تقی میر اکبرآبادی کے چھے دیوانوں میں سے ہر دیوان کا
ہ کروں مگر غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ کلیات کا انتخاب ایک علیحدہ کتابی صورت میں
لکھنے۔ تذکرے میں اسکی گنجائش نہیں۔ انتخاب کی جو صورت پہلے دیوان میر کے تجزیے
دی گئی ہے وہی باقی پانچ دیوانوں کے انتخاب میں کام آسکتی ہے۔ اگر زمانے
ت، عمر نے مہلت اور خدا نے توفیق دی تو کلیات میر کا مکمل انتخاب میں
سے علیحدہ کتابی صورت میں پیش کرنے کی کوشش کرونگا۔

سیماب

بادشاہ دہلی کے عہد میں نواب مبارک جنگ بہادر کا خطاب پایا۔ اور ہزار و پنج صدی
منصب پر فائز ہوئے۔

یقین کے دادا، حضرت شیخ عبد الاحد نقشبندی مجددی معروف بہ شاہ گل "وحدت"
المتخلص بہ گل سرہند شریف کے سجادہ نشین تھے۔ اُن کے بیٹے شیخ اظہرالدین سرہند
سے دہلی چلے آئے۔ اور نواب حمید الدین خاں کی لڑکی سے شادی کرلی۔ جو بہادر شاہ
کے زمانے میں عصائے مرصع، خدمت میر تزک۔ اور داروغگی گرز برداران سے فائز
تھے۔ اور "بہادر عالمگیری" کے خطاب سے سرفراز ہوئے تھے۔ محمد شاہ کے زمانے تک
یہ اسی تزک و احتشام کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔

شادی یقین کی شادی خواجہ میر درد دہلوی کے خاندان میں ہوئی۔ تین لڑکے آپ کی یادگار تھے۔ مرید حسین خاں مرید۔ صمصام اللہ خاں اکمل۔ مقبول نبی خاں مقبول۔

تلمذ یقین حضرت مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے۔

اعترافات "یقین شاعر ریختہ، صاحب دیوان۔ از بسکہ اشتہار دارد محتاج بہ تعریف و توصیف نیست" (میر تقی میر)

"جو اشعار یقین کے نام سے موسوم کئے جاتے ہیں اُن سے بہتر یا اعلےٰ
اشعار ہونا دشوار ہے۔" (دتاسی)

"ریختہ گوئی را برطاق بلند گذاشتہ و تخم معنی را درزمین سخن کاشتہ و
آنچہ از طبعش سرزدہ از فرط شیوع و حسن قبول درتمام ہندوستان بر افواہ والسنہ
جاری شدہ۔" (فتح علی گردیزی)

"صدر نشین بزم شعرائے متاخرین" (قیام الدین قائم)

"الحاصل یقین یکتائے عصر و یگانۂ زمانہ است" (شفیق اورنگ آبادی)

"مشق سخن او بہ پایۂ استادی رسیدہ بود۔ . . . . . ہرقدر کہ دیوانش
مرتب است ہمہ انتخاب و از درد خالی نیست۔" (قدرت اللہ شوق)

"اشعارش بسیار نمکین و موثر اند۔ سخن او خالی از دردمندی نیست۔"
(میر حسن)

"درد دورۂ ایہام گویاں اول کسے کہ ریختہ را شستہ و رفتہ گفتہ ایں
جوان است۔" (مصحفی)

"اگر یقین جیتے رہتے تو میر ہوں یا میرزا کسی کا چراغ ان کے سامنے نہیں
جل سکتا تھا۔" (گل رعنا)

تلامذہ شیر سنگھ ظہور، سیتا رام حمد، اور عبد الولی عزلت کو بعض تذکرہ نویسوں

سے یقین ... لکھا ہے۔

وفات ابھی یقین کی عمر صرف ۲۹ سال کی تھی ۱۱۶۹ھ میں ان کے والد نے کسی نامعلوم قصور پر انہیں اپنے ہاتھ سے قتل کروا دیا ... بابو پھکوا دی لچھمی نراین شفیق اورنگ آبادی نے اپنے تذکرے چمنستان شعرا میں یہ تاریخ انتقال درج کی ہے:-

شاعر نازک سخن و خوش خیال   کرد سفر جانب ملک عدم
سال وفاتش خرد نکتہ سنج   گفت یقین رفت بسوئے ارم

۱۱۶۹

ایسی عبرتناک موت شاید ہی کسی شاعر کی ہوتی ہو۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

انتخاب کلام یقین

یہ کوہ طور سے یہ ہوگیا سارا ہی کیا کہئے   کوئی پتھر بھی بچ جاتا تو دیوانے کے کام آتا
اُڑا دی اس ہوا نے مشت خاک بیکساں ناحق   غبار ان کا اگر رہتا تو پیمانے کے کام آتا
لیا گھیر اس یقین نے عشق کا آتشکدہ سارا
کوئی شعلہ بھی بچ رہتا تو پروانے کے کام آتا

رہا میں بے خبر افسوس لذت سے اسیری کی   جو میں یہ جانتا کنج قفس میں آشیاں کرتا

تری الفت سے پھرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ   یہ اتنا کار آساں اسقدر دشوار کیا

نہیں معلوم ابکے سال میخانے پہ کیا گذرا   ہمارے توبہ کر لینے سے پیمانے پہ کیا گذرا
برہمن سر کو اپنے پیٹتا تھا دیر کے آگے   خدا جانے تری صورت سے بتخانے پہ کیا گذرا

ہے ترے داغ سے تر سینۂ سوزاں میرا   آب و رنگ آگ سے رکھتا ہے گلستاں میرا

شکوۂ حسن سے آنسو ہمارے سوکھ جاتے ہیں   یقین سورج کے آگے کب اثر رہتا ہے شبنم کا

کہتے ہیں کہ تسخیریں آئینے کو آتی ہیں   دل سے نہ ہوا جو کام آئینے سے کیا ہوگا

سر سلطنت سے آستان یار بہتر تھا   ہمیں ظل ہما سے سایۂ دیوار بہتر تھا

جو کچھ کہیں یہ بجھ کو یقین ہے سزا تری   ... کا ہوا ... تھا

دام و قفس سے چھوٹ کے پہنچے جو باغ تک   دیکھا تو اس زمیں میں چمن کا نشاں نہ تھا

داغ گل دیکھ کے بے خار و خس سے گردیا ہوں   جلا کر آشیاں کہاں ... ہاتھ کیا آیا

کافر بن اس بت کے ہاتھوں ہائے ابتر ہو گیا   جس مسلماں نے اسے دیکھا وہ کافر ہو گیا

سچ کہو اے بلبلو کس باغ سے آتی ہو تم   ہے ہمارے بھی تمہیں کچھ آشیانے کی خبر

جو لوہا جس نے آسکو لگا نا ہاتھ کیا حاصل   بہت کی تو نے اے تیشے کی خدمت کوہکن بس کر
بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے دے گریباں کو   یقین کرتا ہے کوئی اسقدر دیوانہ پن بس کر

یہ زمیں سیلاب سے ہوتی نہیں ہے چاک چاک   دشت کی چھاتی پھٹے ہے سن کے دیوانے کا شور

بعد مرنے کے بھی ہوں گور میں غمناک ہنوز   گرد پھرتے ہیں مری خاک کے افلاک ہنوز
پی کے مستوں نے زمیں پہ جو گرائی تھی شراب   سبز ہوتا ہے اُسی سے شجر تاک ہنوز
سبزہ اُگنے کا نہیں مجھ پہ برس مت اے ابر   گرم ہے آتش سودا سے مری خاک ہنوز

گرمی اہل بزم سے مت کر ہیں ہوتا ہوں داغ   شمع کی خدمت میں آتی ہے پروانے کی عرض

دن جنوں کے آن پہنچے ہوشیاراں الوداع   فصل گل نزدیک آئی اے گریباں الوداع
ہم سے تھا ویرانہ کچھ آباد سو ہم بھی چلے   اب خدا حافظ تمہارا اے غزالاں الوداع

بے حجابی بسکہ شان حسن کے لائق نہیں   بزم میں فانوس سے باہر نہیں آتی ہے شمع
بادسے بزم نہیں ہوتا ہے یہ شعلہ یقین   بلکہ پروانے کی گستاخی سے جھنجھلاتی ہے شمع

ہم تو اب مرتے ہیں اور بجھتا ہے الفت کا چراغ   دیکھئے کب ہووے روشن پھر محبت کا چراغ
آگ بھی بجھتی ہے اور سورج بھی ہوتا ہے غروب   رات دن جلتا ہے یکساں داغ حسرت کا چراغ
خاندان درد مجھ سے کیوں نہ ہو روشن یقین   ہے مرا ہر داغ سینے میں مصیبت کا چراغ

[illegible] شور کیوں کا جواب — کوئی ہو جیسے زخمی گلستاں کا حریف
سالہا سوز محبت کو چھپایا تھا یقیںؔ — ہاتھ آخر ہو گیا میرے گریباں کا حریف

پھر وہی مجھ سے کہلانے کو کیا پینے سے کیا حاصل — دکھا کر شکل جنوں کو شور میں لانے سے کیا حاصل
چاہیے دل کی واردات گر کچھ ہو تو دارد ہے — یہ سب کچھ ہوش کے ساقی ہاتھ پی جانے سے کیا حاصل

ہے ہوتی آخر وہی تدبیر غم کی ناتمام — کس سے دل خالی کریں، اب ٹوٹ چکا مینا تمام

فیض ہوتا ہے کہیں، پرہ نہ مکاں پر نازل — ہے وہی طور، وہ شعلۂ دیدار کہاں
عیش و راحت کے تماشی ہیں یہ سارے بے درد — ایک ہم کو ہے یہی فکر کہ آزار کہاں

ہم تو حاضر ہیں عشق یار کہاں — خار و خس جمع ہیں، شرار کہاں
باغباں ورنہ بند کر آخر — ہم کہاں، تو کہاں، بہار کہاں
دیکھ میں آب زندگی کی یقیںؔ — مژۂ تیغ آب دار کہاں

عمر آخر ہے جنوں کر لوں، بہاراں پھر کہاں — ہاتھ مت پکڑو مرا یارو، گریباں پھر کہاں
اس طرح صیاد اب آزاد چھوڑے گا تمہیں — بلبلو دھومیں مچا لو، یہ گلستاں پھر کہاں

کعبے بھی میں گیا، نہ گیا ان بتوں کا عشق — اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں
ہے ما سوا التفات تغافل میں یار کے — بیگانگی ہے اسکی کوئی آشنا نہیں

دیدن ہم کو کچھ اس آگ سے مقصود نہیں — عشق پھیکا ہے اگر زخم نمک سود نہیں

شکوہ جفا کا یار سے کرنا، وفا نہیں — بندوں کو اعتراض خدا پر، بجا نہیں

وہ کون دل ہے جہاں جلوہ گر وہ نور نہیں — اس آفتاب کا کس ذرے میں ظہور نہیں

ہمیشہ عشق سے محروم درد و داغ نہیں — ہزار شکر کہ یہ ملک بے چراغ نہیں
خدا کرے کہ یہ روشن رہے قیامت تک — چراغ گور ہے مستوں کا یہ ایاغ نہیں

سر عشق سے کچھ چھوٹنے کی راہ نہیں — بغیر میکدہ یارو کہیں پناہ نہیں

نہ کر مضائقہ، گر تجھکو ہے ستم کی ہوس — کوئی دیار محبت میں دادخواہ نہیں
خجل نہ کر مجھے مہمان ہو مرا اے عشق — کہ میری آنکھ میں آنسو، جگر میں آہ نہیں

کرتا ہے کوئی یار دامن وقت میں تدبیریں — مرنے کو ہے دیوانہ، اب کھول دو زنجیریں

نہ گزرا ہوگا کوئی مجھ سا رنگیں، بانکے بن میں — گریباں آپڑا ہے پھٹ کے گل کی طرح دامن میں

کہاں تک غیر سنتے ہیں اے مرغ قفس چپ رہ — عبث صیاد کو ناخوش بھی کیوں کرتا ہے بس چپ رہ
کوئی آوارگی کو چھوڑ، کیونکر راہ پر آئے — عبث تو شور و شر کرتا ہے اتنا اے جرس چپ رہ
گیا ہوگا نہ تو کیا یار کی گلیوں میں راتوں کو — نئی تقصیر کچھ یہ ہی نہیں کی اے عسس چپ رہ
کسو کا دست کوتہ اسکے دامن تک کہاں پہنچے — تمنا کی زباں مت کھول اے بوالہوس چپ رہ

یقیںؔ یہ نالہ تیرا کیا بلا لائے گا ڈرتا ہوں
لگا مت گھر کو اپنے آگ اے آتش نفس چپ رہ[1]

منہ اپنا نہ دیکھا کر، ہو جائے گا دیوانہ — آئینے کو کہتے ہیں اے شوخ پری خانہ

ملے جسکو پیمبر سا رقیب، اس کا خدا حافظ — زلیخا قید گر کرتی نہ یوسف کو تو کیا کرتی؟

مسافر ہو کے آئے ہیں جہاں میں اسپہ وحشت ہے — قیامت تھی اگر ہم اس خرابے میں وطن کرتے

چھٹے اس زندگی کی قید سے اور داد کو پہنچے — وصیت ہے ہمارا خوں بہا جلاد کو پہونچے
نہ نکلا کام کچھ اس صبر سے، اب نالہ کرتا ہوں — مری فریاد ہی شاید مری فریاد کو پہونچے
ہمیں اس غم کے ہاتھوں زندگی اب خوش نہیں آتی — کوئی بیداد گر یارب ہماری داد کو پہونچے

کوئی دن اور کرنے دو جنوں مجھکو بہاراں میں — عبث لیتے ہو اسکو، کیا رہا ہے اب گریباں میں

مجنوں کی خوش نصیبی کرتی ہے داغ دل کو — کیا عیش کر گیا ہے ظالم دوانے پن میں

بقدر جفائے یار بڑھتی ہے وفا میری — کوئی چاہے تو آ دیکھے محبت اسکو کہتے ہیں

[1] اس قافیہ و ردیف کے ساتھ ایسی اچھی غزل یقیںؔ کی قادر الکلامی کا یقین دلاتی ہے۔ (سیماب)

یقیں مرگئے بجرم محبت پہ ذبح ہو کر   شہادت اسکو کہتے ہیں سعادت اس کو کہتے ہیں

اسیرانِ قفس کی آزادی پہ نظر کیجو   بہار آئے تو اے صیاد مست ہم کو خبر کیجو

خدا کرے کہ کہیں حق یقیں ثابت ہو   مت امتحانِ وفا میں یقیں کے دیر کرو

اپنی بے دردی کی مرگ نے تجھکو اے مرگ   تو نے دیکھا ہے یقیں سا کوئی رنجور کبھو

خواب میں کس طرح دیکھوں تجھکو بیخوابی کے ساتھ   جمع آسائش کہاں ہوتی ہے بیتابی کے ساتھ

جو سر پانوں پہ رکھ دیجے تو خوش ہو بیٹھا ہم پر   لیکن اُنسے تحفتی ہے یہ جرات کہاں ہم سے

خبر کیا پوچھنے مرغ چمن سے آشیانے کی   اسیروں کو توقع کب ہے پھر گلشن میں جانے کی ۱۳

گریباں چاک کرنے سے ہمارے تجھکو کیا ناصح   ہمارا ہو تو جانے اور ہمارا پیرہن جانے
خطا ہے سخت مرگ یار کو بیمار قسمت کو   ہماری تجھ سے پوچھو کہ کن کی کو کن جانے

یہ وہ آنسو ہیں جن سے زہرہ آتش ناک ہو جائے   اگر پی لے کوئی آنکھ تو جلکر خاک ہو جائے
دعا مستوں کی کہتے ہیں یقیں تاثیر رکھتی ہے   الٰہی سبزہ جتنا ہے جہاں میں تاک ہو جائے

نہیں کوئی کہ دشنام اسکی ہم تک یا دعا لائے   گیا ہے دل اب اسکو دیکھئے کب تک خدا لائے

اگر تجھ بن ہمیں یاد کر نہیں سکتا   کبھو بُرا ہی ہمیں کہہ ترا بھلا ہووے

کچھ رنگ نہیں نغمہ و آہنگ میں اس کے   بلبل جو بہاراں میں گرفتار نہ ہووے
دل بیچ ہو گیا خوب ہوا سوختہ بیچنا   وہ جنس کوئی جس کا خریدار نہ ہووے

---

۵ یقیں کا یہ شعر یقیناً الہامی ہے۔ شاعر کے قلم سے اکثر ایسی باتیں نکل جاتی ہیں جن کا صدور مستقبل میں ہوتا ہے۔ یقیں بجرم محبت ہی پر قتل کئے گئے۔ اس سے انکے شہید ہونے میں شبہ نہیں۔ پھر باپ کے ہاتھ سے قتل ہوئے۔ اس سے بڑھکر سعادت اور کیا ہوگی؟ سیماب   ۵ یہ شعر ضرب المثل ہے۔ سیماب

جو عشق میں جیتے جی [illegible]

ناگر تبسّم کیا ہوا خسرو نہیں ملتا   بڑا پتھر دھری چھاتی پہ تقاضا فرہاد کیجے
جفا پہ دلبروں کی صبر کرنا ہی مناسب ہے   یقیں دعویٰ وفا کا کرکے اب فریاد کیا کیجے

اس سبحی پوش سے آغوش رنگیں کیجے   جی میں ہے اس عروسِ سخن کو تضمیں کیجے

بیقراری کب ٹھہرنے دے ہے مجھکو زیر تیغ   مارنا سیماب کا مشکل ہے قاتل کیا کرے

قاتل ہماری لاش کی تشہیر ہے ضرور   آئندہ تا نہ کوئی کسی سے وفا کرے

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے   میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے
دوستی یہ بلا ہے اس میں خدا   کسی دشمن کو مبتلا نہ کرے
ہے وہ مقتول کافرِ نعمت   اپنے قاتل کو جو دعا نہ کرے

ناصحو یہ بھی کچھ نصیحت ہے
کہ یقیں یار سے وفا نہ کرے

دفنی پرواز قسمت میں مری اے صبا دے پر اتنا   صبا سے کہیو میری خاک گلشن میں اڑا دیجے

عمر فریاد میں برباد گئی کچھ نہ ہوا   نالہ مشہور غلط ہے کہ اثر کرتا ہے

اس اشک و آہ سے سودا اگر نہ جا کہیں   یہ دل کچھ آب دیدہ ہے کچھ جلا بھی ہے
یہ آرزو ہے کہ اس بیوفا سے یہ پوچھوں   کہ تیرے بے مزہ رکھنے میں کچھ مزا بھی ہے

جور و جفا میں یار بہت ہو گیا دلیر   کرتے تو کی یہ راس نہ آئی وفا مجھے

حسن اور عشق میں اک طور کی نسبت ہے ضرور   چشم بیمار تجھے دی ہے دلِ زار مجھے

جب سے نظارہ کیا ترک ہوا ہوں دل سرد
گرم رکھتا تھا یقیں شعلۂ دیدار مجھے

کب ہوس ہے مجھکو رسوائی کی لیکن کیا کروں   کھینچ کر لاتی ہے اس کوچے میں لاچاری مجھے

چھٹے نہیں کہ زرگل کرتے ہیں تقسیم   ان مہوشوں کی مٹھی جو بیعقیں کھلاں تو کسی

بہ صد منت گرہ اس کی کرتے ہیں ججا کوئی   کرے گا بعد میرے کس تو قع پر وفا کوئی
عمر تو مشق اپنے گل بہار ایک نیمچے کا   چمن پر اپنی تمام کرنے کے لئے باد صبا کوئی
گمنہ رہا گل سے۔ گر ہجر میں دیکھئے رضا اسکی
محبت میں یقیں لیتا ہے نام مدعا کوئی

اٹھ گیا ہم کو دلبر سے توقع کیا   اپنے نے کیا یہ کچھ بیگانے کو کیا کہیئے
صحرا میں یقیں آہو کیا خوش سے پھرتے ہیں
فردوس نہ کہیئے تو دیوانے کو کیا کہئے

یہ تھا نواب یقین دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کے کلام کا تجزیہ۔ پورا دیوان دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان بھی وہی تھی جو گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری کے شعرا میں مستعمل تھی۔ کبھو، کسو، ٹک، تئیں۔ جاوے۔ آوے۔ نئیں (بجائے نہیں) زور (بمعنی بہت) سجن۔ تجھ (بجائے تیری) نپٹ۔ مت۔ ایدھر۔ کیدھر ستی سیتی۔ جاگہ وغیرہ الفاظ ان کے یہاں بھی موجود ہیں۔ جا بجا بہت بُری تعقید بھی پائی جاتی ہیں۔ بعض الفاظ جو مسلمہ طور پر مذکر ہیں۔ یقین نے انہیں مونث استعمال کیا ہے۔ مثلاً ؎

رات دن خوباں کو ہے دل ہائے عشق کا تلاش
(یا) ؎ ہُوا پھر دیر کے جینے کا مرگِ کوہکن باعث

وغیرہ وغیرہ۔

یہ یقین کے کلام پر فنی ولسانی مختصر تبصرہ تھا۔ لیکن اگر یقین کو صرف ذوق و وجدان کی نظر سے دیکھا اور پرکھا جائے تو انصاف مجبور کر دیتا ہے کہ ان کے متعلق صاحب "گل رعنا" کی رائے تسلیم کر لی جائے۔ درد و اثر اور دل نشینی ودل گدازی میں وہ اکثر اپنے معاصرین سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ ان کے بعض اشعار میں دل کھینچنے والا ایک مقناطیسی اثر ہے جو ان کے الفاظ یا اُس دور کی زبان سے احساس کو بے نیاز کر دیتا ہے۔

ان کی تخیل بعض اوقات اتنی بلند ہو جاتی ہے کہ وہاں کوئی دوسرا شاعر رسا نظر نہیں آتا۔ مثلاً ان کا یہ شعر ادب اُردو میں بے ہمتا، بے مثل اور بے نظیر معلوم ہوتا ہے ؎

لے جسکو ہم سا رقیب، اُسکا خدا حافظ   زلیخا قید گر کرتی نہ یوسف کو تو کیا کرتی

گو یقین کی تمام شاعری صرف گنتی کے موضوعات پر مبنی ہے یعنی قیس و فرہاد۔ ساقی اور شراب۔ چمن آشیان قفس۔ جنون اور حسن وعشق۔ لیکن آخری موضوع میں جہاں "غم عشق" کی نفسیاتی ترجمانی ہے۔ وہاں اُنکے کلام میں ایک ایسی حلاوت، ایسی کشش، ایسا جذبہ اور ایسی ربودگی ہے جو انہیں کا حصہ معلوم ہوتی ہے۔

یقین مرحوم سودا۔ درد۔ اور میر کے بعد پیدا ہوئے۔ صرف سوز سے وہ تین برس بڑے تھے۔ مگر سودا چھبیس برس۔ میر درد تیس برس۔ میر سوز چالیس برس اور میر تقی میر چھپن برس یقین مرحوم کے بعد تک زندہ رہے۔ تاہم ان کے چھوٹے سے دیوان میں دل و دماغ کے لئے جو سامانِ جراحت موجود ہے۔ بلحاظِ عمر ان سب سے زیادہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شعرائے مابعد نے ان کے کلام اور طرزِ کلام سے بحد کافی استفادہ کیا ہے۔ یقین کی عمر بہنگام رحلت صرف ۲۹ سال کی تھی۔ اگر فرض کر لیا جائے کہ ان کا ذوقِ شاعری بارہ برس کی عمر سے شروع ہو گیا تھا تو صرف سترہ برس میں انکی ہونہار طبیعت نے ایسے جواہر صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیئے۔ جو میر اور سوز کے یہاں پختہ سالی کے بعد نظر آتے ہیں۔ وہ ہونہار بھی تھے اور جان باز بھی۔ اس لئے قدرت نے ان سے وہ کام تھوڑے سے وقت میں لے لیا جو دوسرے شعرا[1] نے آن سے نصف صدی بعد انجام دیا۔ اس میں ان کے اُستاد مرزا مظہر جانجاناں رحمتہ اللہ علیہ کا بھی تصرف ضرور تھا۔ اور بعض نقاد تو یقین کی پختہ کلامی اور نغز گوئی سے متاثر ہو کر یہ الزام بھی لگا بیٹھے ہیں کہ یقین کا سارا کلام مرزا مظہر جانجاناںؒ کا کہا ہوا ہے۔ وہ شاید اس حقیقت سے واقف نہیں کہ مرزا مظہرؒ نے اُردو میں شعر کہنا ترک کر دیا تھا۔ اس کے بعد وہ جو کچھ کہتے تھے صرف فارسی میں کہتے تھے۔ اُردو شعر کہنا ارادتاً ترک کر دینے کے بعد انہیں ایسی کیا ضرورت تھی کہ وہ اپنے شاگرد کے نام سے اُردو میں شعر کہتے۔ اگر وہ خود کہتے اور خود پڑھتے تو ان پر کوئی قدغن نہ تھا۔ نہ کوئی حدِ شرعی عائد ہوتی تھی۔

یہ ایک عام وبا ہے کہ جب کسی مشہور شاعر کا کوئی شاگرد اچھا شعر کہتا ہے تو اُس پر بدگمانی کی جاتی ہے کہ وہ شعر اُس کا نہیں ہے اُس کے اُستاد

---

[2] یہ مصرعہ بھی ضرب المثل ہے۔ سیماب

[1] مثلاً میر تقی میر۔ مصحفی۔ علی ابراہیم خاں۔ مرزا علی لطف۔ ولیم بیل۔ خواجہ حمید الدین اورنگ آبادی۔

[illegible] ہے۔ پھر استاد کی موجودگی اور زندگی میں اس قسم کا الزام [illegible] استاد کا تردید نہ کرنا ایک تعجب خیز بات ہے۔

حضرت مرزا مظہر ایک صوفی بزرگ تھے۔ انہیں کیا ضرورت تھی کہ وہ ریاکارانہ طور پر یقین کے پردے میں ظہور فرماتے۔ مرزا صاحب ١١٩٥ھ میں یقین کی شہادت سے چھبیس ۲۶ برس بعد شہید ہوئے۔ اس چھبیس ۲۶ برس کی معتد بہ مدت میں مرزا مظہرؒ نے اپنے کسی دوسرے شاگرد کے کلام میں ظہور کیوں نہ فرمایا۔ ایسے سلیس و نفیس اشعار جیسے یقین کے ہیں اگر مرزا صاحبؒ کی قوتِ فکر کا نتیجہ تھے تو انہیں اپنے ہی نام سے پڑھنے یا شائع کرنے میں کیا عذر مانع تھا۔ اور کیا

[illegible] ان کا پرتو [illegible]

بہرحال ہمیں کسی قسم کا سوءِ ظن پیدا کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو غزلیں یقین کے نام سے بصورت دیوان شائع ہوئی ہیں یقین کر لینا چاہیے کہ وہ انہیں کی ہیں۔ البتہ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ یقین کے کلام میں اُن کے اُستاد کا پرتو اور تصرف ضرور ہے۔ اور از لا بد ستر لابد ہے۔ ایسا ہونا ہی چاہیے ❊

(باقی باقی)

---

gd. L No. 4796 November 1944 .

THE ADEEB

DELHI.

1. It is a purely literary monthly Magazine of high standing.
2. It is published regularly on the tenth of each month
3. Annual subscription of the Adeeb is Rs. 10 - only; single copy Rupee one.
4. The Adeeb is posted with great care but if you don't get a copy by the 15th. please write to the office at once. If available, an extra copy will be sent to you again. Complaints received after the 18th will not be attended to.
5. All communications should be addressed to the Editor.
6. Free or sample copies of the Adeeb are not sent. For a sample copy always send the necessary stamps in advance.
7. Contributions not published in the Adeeb can be returned on receipt of the necessary stamps.
8. Always send extra stamps for a reply.
9. The Adeeb is not issued for less than a year.

Printed at Dayals' Printing Press, Chandni Chowk, Delhi
Edited by Fasih-ud-din Ahmad M.A. and M. I. Wahidi & Published from the office of

مجاہد کی صدا

قاضی نذرالاسلام کی ایک نظم کا آزاد ترجمہ

(از نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی)

گھٹائیں، قہر سی تاریک راتیں، آندھیاں، طوفاں
یہ شاہد ہیں کہ سونپی ٹوٹی کشتی میں نے موجوں کو
مرے نقشِ قدم کو دیکھنے کیا کیا مچلتی ہیں
نکل کر بجلیاں ابرِ سیہ کی خوابگاہوں سے
مرا سایہ جہاں پڑتا ہے ویراں رہگزاروں پر
وہاں سے پھوٹتی ہیں کونپلیں، انگڑائیاں لیتی
مرے نوحوں کو سُنکر زندگی کی سانس لیتا ہے
چراغِ کشتۂ گورِ غریباں جھرجھری لے کر
نئی شمعیں فروزاں کر رہا ہوں ہر شبستاں میں
حیاتِ نو، فراتِ کربلا کا تیز دھارا ہے
مگر ساحل مرے دریا کا قربانی کا پیاسا ہے
اُدھر لشکرِ ستم کے موج در موج اُمڈے آتے ہیں
میں اس دریا کو پیغامِ عطش اپنا سُناتا ہوں
جو عباسِ علی نے روزِ عاشورہ سُنایا تھا
کوئی فرعون جب اُٹھتا ہے موسیٰ کے مٹانے کو
اُسے میں نیل کا سیلاب بن کر غرق کرتا ہوں
کوئی نمرود جب اُس نعرۂ حق کو دباتا ہے
لبِ معجز بیاں پہ جو خلیل اللہ کے جاری تھا
دوبارہ گلکدہ آتش کدے کو میں بناتا ہوں
گھٹائیں، قہر سی تاریک راتیں، آندھیاں، طوفاں
یہ شاہد ہیں کہ سونپی ٹوٹی کشتی میں نے موجوں کو
وطن، سہمے وطن کو درسِ جرأت آزما دے کر
دلِ پیری میں بھرتا ہوں اُمنگیں نوجوانی کی۔ بہارِ جاودانی کی
اُڑا لاتی ہے جانبازی مری روشن مناروں سے
دہکتی آرتی بھیری ہوئی وحشی ہواؤں کی
ڈگر کانٹوں بھری ہے، روندتا جاتا ہوں کانٹوں کو
لُٹاتا مال و زر، دُکھ سُکھ، جوانی عیش سامانی
بندھی ہے آس شاید بعد میرے اس طرف آئیں
حیاتِ نو کے رہرو نابلد ان رہگزاروں سے
اُفق پر جشنِ آزادی کا پرچم جبکہ لہرائے
اور آنکلو ادھر بھی شامِ رنگیں کے دھندلکے میں
تو اک بار آنکھ اُٹھا کر دیکھ لینا چرخ کی جانب
مجھے تم مُسکراتا پاؤگے تاروں کی محفل میں
گھٹائیں قہر سی تاریک راتیں، آندھیاں، طوفاں
یہ شاہد ہیں کہ سونپی ٹوٹی کشتی میں نے موجوں کو

بھولتا جاتا ہوں میں........

(از جناب علی جواد زیدی)

تمہیں جب یاد کرتا ہوں تو اک مٹتی ہوئی دنیا — مری آنکھوں کے آئینے میں پھر وں جھلملاتی ہے
کہیں دم گھٹ رہا ہے مسکراتے سرخ پھولوں کا — کہیں کلیوں کے سینے میں ہوا رک رک کے آتی ہے
کہیں کجلا گئے ہیں دن کے چمکائے ہوئے ذرّے — کہیں راتوں کی ہنستی روشنی غم میں سماتی ہے
سلا دیتی تھی جو آلام کو راحت کے سائے میں — وہ میٹھی چاندنی سوئے ہوئے فتنے جگاتی ہے
وہی دنیا جو کل تک دل کا دامن کھینچ لیتی تھی — اسی دنیا کے ہر منظر میں اب بے التفاتی ہے
گھنے کہرے میں جیسے ڈھکتے جاتے ہوں ہرے سبزے — یونہی بیتے دنوں کی شکل دھندلی پڑتی جاتی ہے
تمنّا اپنی ناکامی پہ کانپ اٹھتی ہے یوں، جیسے — بگولے میں کوئی سوکھی سی پتّی تھرتھراتی ہے
وہ خواہش جو خوشی کے گیت اب گانے نہیں پاتی — مرے سینے کے سنّاٹے میں پھر وں گنگناتی ہے

جوانی کی اندھیری رات آدھی بھی نہیں گذری
محبت کے دیئے کی لو ابھی سے تھرتھراتی ہے

برگِ حنا

زیبؔ عثمانیہ لدھیانوی

(از محترمہ سیدہ انیس ناہید)

میری رفیقہ کار محترمہ سیدہ انیس ناہید ملک کی مشہور لکھنے والیوں میں سے ہیں۔ آپ کے مضامین تمام نسوانی رسائل میں شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اور "ادیب" میں وہ ایک اچھوتی چیز پیش کر رہی ہیں۔ یعنی "برگِ حنا"۔ یہ شاعرات اردو کا زیرِ تسوید تذکرہ ہے جس میں ملک بھر کی معروف اور غیر معروف شاعرات کے حالاتِ زندگی۔ کلام پر تنقید اور منتخب کلام پیش کئے جا رہے ہیں۔ "برگِ حنا" کی افادیت اور اہمیت سے کیسے انکار ہو سکتا ہے۔ بالخصوص موجودہ دور میں جب کہ مرد نقاد شاعر خواتین کی طرف سے بے انتہا بے پروائی روا رکھتے ہیں۔ آج تک کسی نے بھی شاعر خواتین پر کچھ نہیں لکھا۔ اور بالکل آنکھیں بند کئے پڑے ہیں۔ اگر کسی نے کچھ لکھ دیا تو لے دیکر وہی مغلیہ دور کی شاعرات پر۔ اور بس۔ بلکہ اکثر خواتین بھی اگر کچھ لکھتی ہیں تو مرد افسانہ نگاروں اور شعرا پر۔ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ وہ اپنی صنف سے بالکل غافل ہیں۔ میں محترمہ سیدہ انیس ناہید کی بیحد ممنون ہوں کہ انہوں نے اپنی مصروفیات کے باوجود میری درخواست کو شرفِ قبولیت بخشا۔ اور "ادیب" کے لئے اس تذکرہ کو شروع کیا۔ بعد میں یہی چیز قدرے تفصیل کے ساتھ کتابی صورت میں شائع کی جائیگی۔

اس ضمن میں میری اپنی شاعر بہنوں سے بھی گذارش ہے کہ وہ جلد از جلد اپنے حالاتِ زندگی اور منتخب کلام مجھے ارسال فرمائیں۔ تاکہ یہ تذکرہ جلد از جلد شائع کیا جائے۔ (نجمہ تصدق)

حالاتِ زندگی

زیبؔ عثمانیہ صاحبہ کا ایک مجموعہ کلام "متاعِ حرم" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ جس میں آپ کا مفصل تعارف نامہ موجود ہے۔ ذیل میں چند ضروری اقتباسات وہیں سے نقل کئے جاتے ہیں۔

"تاجور نام۔ زیبؔ تخلص۔ عثمانیہ نسبت خاندانی سے مشہور ہیں۔ آپ ۱۷ دسمبر ۱۹۱۲ء کو لودھیانہ کے ایک متوسط افغان گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ چونکہ آپ کے عم بزرگوار خان غلام محمد صاحب یکتا پنشنر پولیس لا ولد تھے اور اب تک ہیں۔ اس لئے انہوں نے آپکو عالمِ شیر خوارگی ہی میں اپنے آغوشِ عاطفت میں لے لیا۔ اور بطور متبنّٰی پرورش کیا۔ اسلامی گھرانوں کے پرانے رسم و رواج کے مطابق آپ کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام گھر پر ہی کیا گیا۔ چنانچہ آپ نے جلدی ہی اردو اور فارسی علم و ادب پر عبور حاصل کر لیا۔ آپ کی شادی فروری ۱۹۳۳ء میں اپنے پھوپھی زاد الیس بہاؤالدین صاحب کے ساتھ ہوئی جو محکمہ انہار پنجاب میں آج کل ہیڈ ڈرافسمین کی خدمات سر انجام دے رہے ہیں۔

آپ کے عم بزرگوار شعرائے قدیم میں پختہ کلام شاعر ہیں۔ موصوفہ کو اکثر اوائل عمری ہی سے آپ کا کلام دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا۔ چنانچہ یہی چیز موصوفہ کے لئے ترغیبِ شاعری کا باعث ہوئی۔ طبع موزوں پائی تھی۔ مشغلۂ شعر و سخن دلچسپ کے ساتھ آسان بھی نظر آنے لگا۔ شروع ہی سے مختلف اصناف سخن پر طبع آزمائی کا شوق دامنگیر رہا—

آپ ایک پردہ دار، سادہ مزاج، کم گو، اور خوش اخلاق مسلم خاتون ہیں۔ غربا اور مساکین کے بارے میں آپ کا رویہ نہایت دردمندانہ ہے۔ سرمایہ و مزدور اور ملک و قوم کے مسائل حاضرہ میں آپ سحر و شام الجھی رہتی ہیں۔ کثرتِ افکار کا اثر گو آپ کی صحت پر اچھا نہیں پڑ رہا ہے۔ تاہم آپ کا اپنے منظوم پیغامات سے خدمتِ ادب اور اصلاحِ خلق کا پاکیزہ عزم قابلِ صد ستائش ہے۔ جسے آپ تا دمِ آخر قائم رکھنا چاہتی ہیں۔"

تنقیدِ کلام

یہ حقیقت ہمارے ادب کے مسلمات میں شامل ہو چکی ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ مرحوم و مغفور کی ذات سے ہمارا ادب، بالخصوص ہماری شاعری بہت زیادہ متاثر ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ ان کی زندگی میں ہی شعرائے کرام کا ایک ایسا مستقل گروہ پیدا ہو گیا تھا جس نے اپنے اظہارِ خیال کے لئے وہی اسلوبِ بیان اختیار کیا جو حضرتِ مرحوم کا طغرائے امتیاز ہے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ اقبالؒ کا تتبع کرنیوالا کوئی شاعر بھی اپنے اندر فکر و نظر، جذب و اثر اور خلوص و درد کی اتنی گہرائی اور جامعیت پیدا کر سکا ہے۔ اور شاید یہ ہے بھی قریباً ناممکن۔ کیونکہ اقبالؒ کے اندازِ نگارش کی نقل کر لینا اور بات ہے۔ لیکن وہ حقائق کے سینے میں ڈوب جانے والی نظر، وہ نبضِ کونین کو پہچان لینے والی حساس انگلیاں، اور وہ ضمیرِ کائنات کے ساتھ دھڑکتا ہوا دل، قدرت کے ایسے عطیے ہیں جو خاص خاص افراد کو اور وہ بھی کبھی

کبھی عطا کئے جاتے ہیں ؎

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

دراصل اقبالؒ کی ہمہ گیر مقبولیت، بلکہ محبوبیت نے کچھ ایسا جادو کر دیا کہ بعض دوسرے شعراء بھی اپنا مخصوص رنگ چھوڑ کر اسی ڈگر پر آ گئے۔ اقبالؒ کے رنگ کو انھوں نے وقت کی چیز سمجھا۔ اور "سستی شہرت" کی توقع میں وہ بھی اسی شاہراہ پر چل نکلے۔ لیکن حقیقتاً وہ ایک شدید دھوکے میں مبتلا تھے۔ کیونکہ اقبالؒ کا اتباع کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ اقبالؒ صرف چند پرشکوہ تراکیب الفاظ یا چند نادر استعارات کا نام نہیں بلکہ وہ نام ہے ایک مستقل ہمہ گیر پیغام کا جس میں عصر حاضر کی مجلسی و معاشی بیماریوں کا علاج پیش کیا گیا ہے۔ رفتہ رفتہ یہ حقیقت شعرائے کرام کے اس گروہ پر عیاں ہوتی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اکثر اصحاب تو خود بخود اس سے دستکش ہو گئے اور جو زیادہ بضد ہوئے انہیں اس کا خمیازہ اپنی "ادبی موت" کی صورت میں بھگتنا پڑا۔

لیکن اس تمام "ہجوم" میں جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے مجھے صرف دو نام ایسے نظر آتے ہیں جو بڑی حد تک کامیابی کے ساتھ اس رنگ کو نباہ رہے ہیں۔ اور وہ ہیں خان بہادر امین حزیں سیالکوٹی۔ اور محترمہ زیب عثمانیہ لدھیانوی —— ان دونوں ہستیوں نے اقبالؒ کی تقلید انتہائی خلوص اور پورے استقلال کے ساتھ شروع کی اور شاید اپنی فطری رفتارِ طبع سے مجبور ہو کر بھی —— اور جب ہم زیب عثمانیہ (کیونکہ یہاں صرف انہیں سے بحث ہے) کی نسبت یہ کہتے ہیں کہ وہ اقبالؒ کی ایک کامیاب مقلد ہیں تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ہم زیب کے متعلق بہت کچھ کہہ رہے ہیں۔ بلکہ اتنا کہنا شاید ان کی نسبت سب کچھ کہہ دینے کے مترادف ہے۔

جناب آغا مرتضیٰ احمد خان میکش ایڈیٹر روزنامہ "شہباز" لاہور نے "متاعِ حرم" کے پیش لفظ میں بجا طور پر ارشاد فرمایا ہے کہ —— ان نظموں میں حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کے اندازِ بیان اور خیالات کی جھلک نمایاں طور پر نظر آ رہی ہے۔ اقبالؒ کے انداز نے عصرِ حاضرہ کے بہت سے شاعروں کو متاثر کیا اور ہمارے اکثر سخن گو حضرات ہر انداز میں انہیں کا تتبع کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن اگر میں کہوں کہ محترمہ زیب عثمانیہ کو اس امر یعنی اقبالؒ کے انداز کا اتباع کرنے میں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ اس دور کے بہت کم شاعروں کے حصہ میں آئی ہے تو غلط اور بیجا نہ ہوگا۔

لیکن جب ہم کسی شاعر کے متعلق یہ رائے قائم کرتے ہیں کہ وہ کامیابی کے ساتھ اقبالؒ کا اتباع کر رہا ہے (ظاہر ہے کہ میں یہاں صرف موجودہ دور کا ذکر ہی

ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس کے ہاں بھی جذبات کا وہ خلوص، خیالات کی وہ رفعت، مطالب کی وہ گہرائی، حقائق کی وہ بصیرت افروزی اور تفکر کی وہ جلوہ سامانی موجود ہے جو اقبالؒ کی شاعری کا مایۂ امتیاز ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں اقبالؒ کے ساتھ ہی پیدا ہوئیں اور اس کے ساتھ ہی ختم ہو گئیں۔ ہاں، البتہ اب جو شاعر بھی اس انداز میں کچھ کہنے کی کوشش کریگا۔ وہ الفاظ کے تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ وہی کچھ کہہ سکے گا۔ جو اقبالؒ بر محل پیشتر کئی مرتبہ اور نسبتاً کہیں خوبصورت تر انداز میں کہہ چکا ہے —— اور میرے نزدیک زیب بھی اس کلیہ سے مستثنےٰ نہیں ہیں۔ ان کی شاعری میں یقیناً وہ تمام محاسن موجود ہیں جو اقبالؒ کے ایک کامیاب مقلد میں ہونے چاہئیں۔ اور ہمیں اعتراف کرنا چاہیئے کہ یہ زیب کی ذکاوتِ طبع کا ایک غیر معمولی کمال ہے۔ مگر اسکے ساتھ ہی کچھ ایسے معائب —— معائب تو خیر نہیں کہنا چاہیئے۔ البتہ کمزوریاں اور خامیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ جو اقبالؒ کے کسی کامیاب سے کامیاب مقلد میں لازمی طور پر موجود ہونگی۔ لیکن اس کے لئے ہم اقبالؒ کی فکر مندانہ عظمت کو ایک وجہ قرار دے سکتے ہیں اور یقیناً یہ ایک بہت بڑی وجہ ہے۔

اگر کتاب کے اصل موضوع سے دور جا پڑنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں یہاں اس امر پر مفصل بحث کرتی کہ آیا اس قسم کی شاعری کی اب ہمارے ادب میں ضرورت بھی ہے یا نہیں۔ لیکن افسوس کہ "تذکرہ" کی ترتیب کے سلسلہ میں جو پابندیاں میں نے اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں وہ مجھے اجازت نہیں دیتیں کہ اس مسئلہ پر کسی قدر شرح و بسط کے ساتھ اظہارِ خیال کر سکوں۔ لہٰذا ذیل میں زیب صاحبہ کے کلام کے کچھ نمونے جو میرے پسندیدہ مقامات میں سے صرف چند ٹکڑے ہیں، پیش کئے جاتے ہیں:—

نمونۂ کلام

ایک نظم "رہبرانِ قوم" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔ ان اشعار کا بولتا ہوا، لطیف اور کامیاب طنز قابلِ داد چیز ہے۔

دین کی بات کبھی عالموں سے پوچھتے تھے — اُن کو مدت ہوئی سچائی کی عادت ہی نہیں
چار ازواج تو کرتے ہیں بچاروں کو ضرور — حق کا فرمان ہے اس میں کوئی حجت ہی نہیں
اور بیٹی کو وراثت نہیں ملتی، نہ ملے — اُن کے آئین میں اس بات کی وقعت ہی نہیں
ان کے نزدیک حوادث میں ہے تقدیر کا ہاتھ — جس سے بچنے کی جہاں میں کوئی صورت ہی نہیں
ان کے ہاتھوں سے ہوا دین کا یہ حال کہ آج — اس سے بڑھ کے کوئی شے وجہِ عداوت ہی نہیں

"وطنی بچیوں کے نام" آپ کی ایک نہایت کامیاب نظم ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

کارگاہِ زندگی کی گرچہ ہے سردار عقل — ہے مگر تفہیمِ قیدِ زیست سے لاچار عقل
ہے کشادِ چشم و دل کا نام تحصیلِ علوم — تنگ دل ہیں ہم تو ہے ناکام تحصیلِ علوم

[illegible] اُدہم لحاس مدد　　آہ! وہ قومیں نہیں آپس میں جھگڑا بامں ددر
تم کبھی ہو [illegible] کھیلنے کا وقت ہے　　یہ مصیبت دیکھنے ہنس کر جھیلنے کا وقت ہے
تم نے سوچا [illegible] کبھی ملے بے حیا و بانصیب　　یہ منت کے بھی ہیں کیوں تاقہ کشِ اہلِ مغرب

آہ! اے ہندوستاں کی دختران نیک نام
کہتے ہیں اپنا دلبر ہے اہلِ مغرب کا غلام

یہ ناممکن تھا کہ زیب، اقبالؒ کی تعلیم حفظِ خودی سے متاثر نہ ہوتیں۔ چنانچہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ آرام فرمائے دہلی کی درگاہِ مُبارک میں یہ جملہ ناگوار لکھا دیکھ کر کہ ــــــ "خواتین کو اندر آنا منع ہے" آپ کی نسوانی غیرت کو سخت صدمہ پہنچا۔ اس کی نسبت آپ نے جو چند اشعار کہے ہیں۔ وہ پڑھنے کے قابل ہیں ملاحظہ کیجئے:۔

گرچہ یہ نہیں میری عقیدت کا تقاضا　　لیکن میں شکایت نہ کروں، یہ بھی ہے دشوار
ہے تجھ پہ عیاں نازکیٔ فطرتِ انساں　　کیا تیری اجازت سے ہے یہ حکم دل آزار
عورت کوئی آئے نہ تری لوح کے نزدیک　　یہ نوعِ بشر پائے نہ قدموں میں ترے بار
مانا کہ ہے مظلوم بہت طبقۂ نسواں　　لیکن نہیں ہرگز کسی ذلت کا سزاوار
کیوں خوف کہ ہے حسرتِ دیدار کا کوئی　　گر تو کسی مشتاقِ زیارت سے ہے بیزار
سائل ہوں مگر جذبِ خودی سے نہیں محروم　　اس شکل میں کچھ مانگنا تجھ سے ہے مجھے عار

کی جائے کسی در پہ مری ذات کی توہین
کرتی نہیں برداشت مری فطرتِ خوددار

بعض جگہ آپ کا اندازِ بیان اقبالؒ کے اس قدر قریب جا پہنچتا ہے کہ پہلی نظر میں اس پر کلامِ اقبالؒ ہونے کا شبہ ہو جاتا ہے۔ ایک مختصر سی نظم "فلسفۂ جنگاہ" سُنئے:۔

قوموں کی تقدیر وہ مردِ جنگاہ　　ایمان جس کا الحکم للّٰہ
ماموں سمجھی ہے خود کو جو قوم　　ہے اُس کی قسمت میں مرگِ ناگاہ
زندہ ہے خود اک جنگِ عناصر　　باہم صف آرا ہیں انجم و ماہ
فکر و نظر سے عاری ہے وہ ملک　　جس کی سیاست بدلی نہ ہر گاہ
ہے اک جہاں پر بھاری وہ ملّت　　شمشیر جس کی الملک للّٰہ
گر رمز و کیت ہو واقفِ راز　　اک سحر طاقت ہے شوکتِ شاہ

درسِ سیادت دے کون سا اے زیبؔ
شیخ و برہمن ہیں مردِ درگاہ

اور کہیں کہیں تو اظہارِ مطالب کے لئے آپ انہیں اوزان اور بحور کو منتخب کرتی ہیں جو "بالِ جبریل" اور "ضربِ کلیم" میں نظر آتی ہیں۔ مثال کے طور پر ایک نظم پیش ہے:۔

کسی ملک کی سراسر ہے دل و نظر کی خامی　　اگر اس کی اکثریت نہیں عدل کی پیامی
بجز اتفاقِ ملّت، بجز اتحادِ ملّت　　کوئی قوم چشمِ عالم میں نہ ہو سکی گرامی
سرِ کاخ تک کسی کے نہ ہوئی رسائی اس کی　　تھی مری نوائے مضطر جو نوائے زیر بامی
وہ علاجِ دردِ ملّت کوئی اور چیز ہی ہے　　نہ مری فلک خیالی، نہ تری فلک خرامی
مگر اس سے بھی ہے بدتر وہ ہوس کی اطاعت　　یہ بجا بہت بُری ہے کسی قوم کی غلامی
تری فطرت پیاسے جب تک سعاں ہو کوئی چشمہ　　نہیں درخورِ زمانہ ترا ذوقِ تشنہ کامی

کوئی طائرِ اہلِ دانش ہو کہ مجھ سا بے خرد ہو
کہیں کام آ ہی جاتی ہے کسی کی کہنہ دامی

زیبؔ عموماً نظم ہی کہتی ہیں۔ تغزّل اُن کے ہاں بہت کم ہے۔ اور خالص تغزّل تو شاید آٹے میں نمک کی مقدار سے بھی کم۔ پھر تغزّل میں بھی لب و لہجہ کی وہی فلسفیانہ سنجیدگی، اور مفکرانہ متانت نظر آتی ہے جو اقبالؒ کے ہاں ہے۔ یہاں شدہ شدہ کچھ اشعار نقل کرتی ہوں۔

جس تمنّا پر تو جاں دینے کو آمادہ نہیں　　وہ تمنّا ہی غلط ہے اس کا ذکر اصلا نہ کر
جذبۂ آزادی و سرمستی و دیوانگی　　دل کے یہ اجزا قیامت ہیں انہیں یکجا نہ کر

مکان و لامکاں ادنیٰ نشاں ہیں ان کی منزل کے
رسائی اہلِ دل کی کوئی کیا جانے کہاں تک ہے
وہ منزل جس کی ہر وادی قیامت کا نمونہ ہو
اُسے آساں سمجھ لینا مذاقِ کارواں تک ہے

تو بیٹھو رہا سیرِ سماوات سے تھک کر　　قدرت کے بہت تھے مقصد تھے تخلیقِ بشر سے

اگر ہے سخت کوشی پہ بنائے آشیاں میری　　محافظ میرے طوفاں، اور بجلی پاسباں میری
ترا شیوہ تن آسانی، مرا شیوہ تن آسانی　　وہی دشواریاں تیری، وہی دشواریاں میری
نزاکت برگِ گل کی سنگ و آہن میں بدلتا ہے　　نہیں بے وجہ اتنی تند گلشن میں فغاں میری

تجھے سمجھا دیا کس سوختہ سامانِ حکمت نے　　کہ کوئی شعلہ تیری خاک کا حاصل نہیں ہوتا

مرا ہم سفر نہیں ہو کر جدا ہے تیری منزل
ہے اہتمام طوفاں ، تجھے انتظار ساحل

نہیں سعی کا واں تک نہیں زیبؔ گر رسائی
مرا ذوق میری مشکل ، ترا ذوق تیری مشکل

حد سے گزرتے گل کی نزاکت کو دیکھکر گلشن میں ، میں نے تیغ نوائی شعار کی
مجھکو طلب کہ تلخ ہو ہر جرعۂ حیات تجھکو ہوس ہے جام مئے خوشگوار کی
اے زیبؔ جو مشیت حق تھی وہی ہوا
باطل نے لاکھ اپنی بنا استوار کی

اپنی خودی کو پوج اے برہمن کم تر ہیں اس سے تیرے سب اصنام

برس جائے تو مطلع صاف ہو جائے اُفق پر زیبؔ ابر خوں چکاں ہے

شیخ اور برہمن نہیں گر بستۂ اغراض ہے باعث بیگانگیٔ دیر و حرم کیا ؟
سائل کوئی قانع بھی اے صاحب الطاف لتنے پہ بدل جاتا ہے اندازِ کرم کیا ؟

نہ شمع ہے ، نہ کوئی آئینہ ، نہ دستۂ گل سب ان کی صورتیں ہیں انجمن میں آنے کی
نہ رہ علم نہ دوری صیاد میں رہیں طائر کشش چمن میں بھی ہے دام اور دانے کی

کوئی کیوں ہو خضر سے معترض کہ یہ اپنا اپنا مذاق ہے
ہمیں اک نفس بھی وبالِ جاں اُسے شوق عمر دراز کا
کسی اہلِ ذوق نے حشر کا اُسے نام بزم میں دے دیا
کوئی شیوہ عام نہ ہو سکا جو کسی کرشمہ طراز کا

پیکر اضطراب ہے دُنیا میرے دل کا جواب ہے دُنیا

شروع میں ہی عرض کیا جا چکا ہے کہ زیبؔ ، اسلوب بیان ، بندش ، ترکیب ، یہاں تک کہ نفس مطالب تک اقبالؒ کی پیروی کرتی ہیں ۔ اس لئے نا انصافی ہوگی اگر ان کی وہ جامع اور دلآویز نظم جو انہوں نے اقبالؒ کے متعلق کہی ہے

یہاں نظر انداز کر دی جائے کیونکہ میرے خیال میں اس نظم میں بہت کچھ نظریات خود زیبؔ کی شاعری کا بنیادی اساس ہیں ۔ لہٰذا میں نظم پر اس مضمون کو ختم کرتی ہوں ۔

نکاتِ اقبال

ولایت ، پادشاہی ، علمِ اشیاء کی جہانگیری وہ صد ہا نام آزادی کے گِنتا ہوا آیا
جہاں میں کار نادر ہے شکستِ سومنات دل ہر اک محمود کو یہ راز بتلاتا ہوا آیا
زمانے میں ہر اک بے نفسی ہی راز قوتِ برتر ہر اک درماندۂ ملت کو سمجھاتا ہوا آیا
عمل کو ہو فقط اک کام تہذیب شرق و غرب شرابِ طہور ہے جس کو یہ جتلاتا ہوا آیا
بتائے اس نے گر آدم کو آدابِ خداوندی فرشتوں کی تڑپ آدم کو سکھلاتا ہوا آیا
سمجھ لی تھی جہاں میں مرتبہ تائید خدا اس نے کہ انساں کو عمل کی راہ دکھلاتا ہوا آیا
نہ ہو جس کا نتیجہ اتحادِ عالمِ انساں
ہر ایسی حکمت مذہب کو ٹھکراتا ہوا آیا

ادا بدایونی

(از محترمہ سیدہ انیس ناہید صاحبہ)

ہندستان کی شاعرات کے زیر تدوین تذکرے "برگِ حنا" میں سے ایک حصہ

حالاتِ زندگی

عزیز جہاں بیگم نام۔ تخلص اداؔ۔ وطن بدایوں ——— حالاتِ زندگی خود اداؔ صاحبہ کی زبانی سُنئے:۔

اور حالاتِ زندگی؟ ——— حیران ہوں کہ اس ورقِ سادہ پر سے کیا سی کہانی پڑھکر سُناؤں۔ ابھی فطرت نے میری نظمِ زندگی کا "مطلع" ہی کہا ہے کیا خبر مقطع تک پہنچتے پہنچتے اس نظم کی کیا صورت اور کیا حالت ہوگی ———

مارچ ۱۹۲۴ء کی ایک خوشگوار صبح کو میں نے یکایک اپنے آپ کو اس دنیا میں محسوس کیا۔ حیران ہونے کی بات نہیں۔ یہ میں کیسے بتا سکتی ہوں کہ دُنیا کو میری آمد کا علم یا احساس کس وقت ہوا۔ اور یہ ہو بھی سکتا ہے کہ اس کو اس وقت تک میرا احساس نہ ہوا ہو بخیر۔ تو میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ میری شاعری کی ننھی سی کٹیا کا سنگِ بنیاد (جو مستقبل میں زمین بوس بھی ہو سکتی ہے اور فلک رفعت بھی) مارچ ۱۹۳۶ء میں برادر محترم حضرت اختر شیرانی کے ہاتھوں رکھا گیا۔ اور مئی ۱۹۳۸ء تک میں ان کے برادرانہ مشوروں سے مستفید ہوتی رہی۔ یہ زمانہ رسالہ "رومان" کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا "رومان" کے ختم ہوتے ہی یا یوں کہو کہ اختر کے "رومان" سے علیحدہ ہوتے ہی یہ سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔ یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ اس وقت میری عمر بارہ تیرہ سال سے زیادہ نہ تھی (اس حساب سے اندازاً اداؔ کا سن پیدائش تقریباً ۱۹۲۴ء ہوتا ہے مرتب) ۱۹۳۹ء میں میرا تعارف جعفر علی خاں صاحب اثرؔ لکھنوی سے ہوا اور ایک محترم بزرگ کی حیثیت سے وہ مجھے مشورہ سخن دیتے رہے ۱۹۴۱ء میں یہ سلسلہ خود میری خواہش کے مطابق منقطع ہوگیا۔ اس لئے نہیں کہ میں اُن کی اصلاح سے مطمئن نہیں تھی۔ بلکہ اس لئے کہ میں خود اپنے تجربہ کی روشنی میں اپنی راہ ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ میں نے یہ محسوس کرلیا کہ اُستادانہ اصلاح زمینِ سخن کو آسمان تک تو پہنچا سکتی ہے مگر اس سے خود شاعر کے جذبات کا خون ہو جاتا ہے اور وہ خلوص بیان نہیں رہتا جو شعر کی جان ہے۔

یہاں تک تو تھا میری شاعری کے متعلق اب کچھ میرے اپنے متعلق سُنئے۔

——— ایک متوسط شریف گھرانے میں پلی ہوئی لڑکی، شوخ و شنگ۔ سنجیدہ متین، غم پسند اور بیباک۔ الھڑ اور شائستہ، غرض متضاد کیفیتوں کی حامل مزاج میں گلے نسیم کی نرمی بھی اور صرصر کی تیزی۔ سمجھنا آسان، سمجھانا مشکل۔ باپ کا سایہ طفولیت میں سر سے اُٹھ گیا تھا۔ عقلمند ماں کے زیر سایہ تربیت پائی۔ ایک چھوٹا بھائی دو بڑی بہنیں۔ نانا مولوی ظہور الحسن بدایوں کے مقتدر انسان تھے۔ ہر قسم کی قیود بند سے آزاد ہوں۔ شبنم کے ساتھ روتی ہوں۔ پھولوں کے ساتھ ہنستی ہوں۔ زندگی کبھی ایک مسلسل، دلفریب نغمہ اور کبھی روتا ہوا آبشار۔

تنقیدِ کلام

اداؔ صاحبہ کے اپنے بقول ان کی شاعری کا آغاز ۱۹۳۶ء میں ہوا۔ گویا اُن کی شاعرانہ عمر چھ سات برس سے زیادہ نہیں صرف چھ سات سال کی مشق سخن کے بعد کسی شاعر کے کلام میں فنی پختگی کی توقع بہت کم کی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ دیکھکر حیرت آمیز خوشی ہوتی ہے کہ اداؔ کا کلام "فنی پختگی" کے اعتبار سے وہ تمام خوبیاں اپنے اندر رکھتا ہے جن کا ایک بلند پایہ شاعر کے کلام میں موجود ہونا ضروری ہے۔ اور یہ اداؔ کی غیر معمولی ذہانت کی ایک روشن دلیل ہے۔

ایک نظم "صبحِ بنارس" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

سرگرم ناز مشق ہے مشاطۂ بہار ۔۔۔ کیف و نشاط و رنگ کی دُنیا لئے ہوئے
دامن کشاں ہے ساحلِ گنگا کی آب و تاب ۔۔۔ طغیانِ بیخودی کا اشارا لئے ہوئے
خوشبو مچل رہی ہے ہواؤں کے دوش پر ۔۔۔ اعجاز گرمئِ دم عیسےٰ لئے ہوئے
ہر گل ز فیضِ نازِ چمن در کنار ہے ۔۔۔ ہر قطرۂ حقیر ہے دریا لئے ہوئے
سامانِ کفرِ عشق مہیا ہیں سر بسر ۔۔۔ ہر ہر قدم پہ دعوتِ سجدہ لئے ہوئے

اِن اشعار کے مطالعہ کے بعد کون کہہ سکتا ہے کہ یہ کسی پختہ مشق اور قادر الکلام شاعر کا کلام نہیں ہے؟ "پختگیٔ کلام" کے ایسے اچھے نمونے۔ اور یہ منجھا ہوا معیار، حقیقتاً اداؔ ایسی نو مشق شاعرہ کی ذہانت کا ایک معجزانہ کمال ہے۔ عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ اکثر شعرا کے ہاں "پختگی" کچھ اس شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے کہ اُن کے کلام میں "پختگی" کے سوا اور کوئی خوبی نظر ہی نہیں آتی۔ فنی موشگافیوں کے زور پر ان کا کلام قدرے سنبھل ضرور جاتا ہے۔ تھوڑا بہت زبان کا چٹخارہ بھی میسر ہو جاتا ہے۔ لیکن وہ "آسمانی متھاس" جو حقیقت میں شعر کی جان ہوتی ہے مفقود ہو جاتی ہے۔ لیکن اداؔ کے ہاں آپ ایک لمحے کے لئے بھی ایسا محسوس نہیں کرنے پائینگے۔ وہ فنی خوبصورتیوں کو کسی نمایاں کوشش کے ساتھ پیدا نہیں کرتی۔ بلکہ اُن کے دلکش اسلوب بیان کی گھلاوٹ اور جذبات کی گہری شیرینی میں سے یہ چیز خود پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور میرے نزدیک یہی ایک اصلی شاعر

[illegible]
تسکینِ نامراد کی اک سمت کشمکش — اور اک طرف ہے دور دلوں سے ہوئے

اور

حل گریباں چاک، ابلق مست، بہکی بہکی نسیم — وحشتِ دل کی ہر شکل پردہ داری ان دنوں

اور

تاروں کی طرح میرے تصور میں ہیں درخشاں — وہ دن جو کبھی دوست کے پہلو میں گذارے

اداؔ چونکہ حضرت اخترؔ شیرانی اور نواب آخرؔ لکھنوی سے مشورۂ سخن کرتی رہی ہیں۔ اس لئے قدرتی طور پر ان دونوں باکمال شعراء کا رنگ اداؔ کی شاعری میں بہت نمایاں ہے۔ یقین طبعاً وہ اردو شاعری کے رومانی سکول سے متعلق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں وہ حُسن و رومان کے ترانے گاتی ہیں، وہاں اُن کا اندازِ بیان زیادہ مخمورانہ اور والہانہ ہو جاتا ہے اور شعر کا حُسن زیادہ نکھر انکھر نظر آتا ہے۔ یہ محسوس ہوتا ہے کہ کہنے والا اپنے دلی محسوسات کو نہایت سچے لیکن دل میں اتر جانے والے انداز سے اشعار میں ڈھالتا چلا جا رہا ہے۔ ملاحظہ ہو:—

تنہا مجھے رہنے دے
دل میں غمِ الفت کو مستور ہی رہنے دے
مجبورِ محبت کو مجبور ہی رہنے دے
امید کی دنیا کو بے نور ہی رہنے دے
مسرورِ محبت کو مسرور ہی رہنے دے
جس حال میں بھی میں ہوں، تنہا مجھے رہنے دے
دل پھول کی صورت سے مرجھا کے نہ رہ جائے
آغوشِ تمنا میں لہرا کے نہ رہ جائے
ڈر ہے نگہِ حیراں شرما کے نہ رہ جائے
ترسا کے نہ رہ جائے، تڑپا کے نہ رہ جائے
جس حال میں بھی میں ہوں، تنہا مجھے رہنے دے

ایک اور لطیف نظم "عیدِ نظارا" کے چند اشعار سنئے:—

مژدہ نگاہِ شوق کہ عیدِ نظارہ ہے — پلکیں کسی کی راہ گزر میں بچھاؤں میں
آمد ہے آج ایک سراپا بہار کی — اس طرح غمکدے کو اب اپنے سجاؤں میں
دامانِ ابرِ تیرہ سے گوہر سمیٹ لوں — قوسِ قزح کا رنگِ عروسی رچاؤں میں

اس نظم کا ایک ایک مصرع حُسن، رومان اور شباب و شعر کا دھڑکتا ہوا افسانہ ہے۔ پھر یہ نہیں کہ محض رسمی واقعات کو رسمی انداز میں موزوں کر دیا گیا ہو بلکہ ان اشعار میں نسوانی نفسیات کو اس فنکارانہ سادگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ ہر پڑھنے والے کو ان میں اپنی زندگی کی مختلف تصویریں [illegible] بولتی ہوئی تصویریں۔

چونکہ اداؔ کا اصلی میدان رومان طرازی ہے اس لئے جہاں وہ اس سے انحراف کرتی ہیں۔ کلام پھیکا پڑ جاتا ہے۔ اگرچہ اپنی فطری ذہانت اور نواب آخرؔ لکھنوی کی استادانہ اصلاح سے کوئی گراوٹ صاف محسوس نہیں ہوتی۔ مگر وہ خلوص، گرمجوشی اور جذب و اثر باقی نہیں رہتا۔

اداؔ بنیادی طور پر ایک نظم گو شاعرہ ہیں۔ اور حق یہ ہے کہ نظم خوب لکھتی ہیں۔ ایک نظم "انتظار" کے دو بند سنئے:—

ابرِ سیہ نے جھوم کر گھیر لیا ہے آسماں
آنسوؤں کی جھڑی بندھی گرنے لگی ہیں بوندیاں
بہکی ہوئی بہار ہے، مہکا ہوا ہے آسماں
دل میں کسی کی یاد پھر
لینے لگی ہے چٹکیاں

شوخ رسیلی چاندنی فرش پہ محوِ خواب ہے
ذرہ بھی صحنِ باغ کا رشکِ آفتاب ہے
پھول بھی بے مثال ہیں، خار بھی لاجواب ہے
حُسنِ جواں کے فیض سے
نکھرا ہوا شباب ہے

نظم کے ضروری اجزاء میں سے تسلسل، گہرے تاثر کے علاوہ موزوں الفاظ کی پُرشکوہ موسیقی بھی از حد ضروری چیز ہے۔ اداؔ کے یہاں اس چیز کا نہایت محتاطانہ تناسب پایا جاتا ہے۔ الفاظ کی نشست، شکوہ اور صوتی ہم آہنگی کا بھی اچھا خاصا اہتمام کرتی ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی نظم میں ایک قسم کی خوبصورتی اور عجیب کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

کھویا ہوا سا خواب جوانی بہار کا
تجدیدِ اضطراب کا ساماں کئے ہوئے

اور

کشتی ہے یہ پھولوں کی چمن میں کہ مہِ نو
بکھرے ہوئے غنچے ہیں کہ چھٹکے ہوئے تارے

دیکھا آپ نے! "کھویا ہوا خواب جوانی" اور "بکھرے ہوئے غنچے ہیں کہ چھٹکے ہوئے تارے" کتنے ہنستے اور گاتے ہوئے ٹکڑے ہیں ———

بعض اوقات وہ الفاظ کے الٹ پھیر سے شعر میں ایسی موسیقی بھر دیتی ہیں کہ طبیعت

[illegible] ہے۔ مثلاً

سکون، دل کی راحتوں کو آج اُن سے مانگ لوں
سکون و دل کی راحتوں کو بیکراں کئے ہوئے

بہار حُسن و دلبری کا خواب پھر سے دیکھ لوں
خیالِ حُسن و دلبری کو جاوداں کئے ہوئے

کلی کلی کو گلستاں کئے ہوئے وہ آئیں گے
وہ آئیں گے کلی کلی کو گلستاں کئے ہوئے

ادا غزل بھی کہتی ہیں۔ لیکن صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اصلی میلان طبع نظم ہی کی طرف ہے۔ جوش اور اختر شیرانی کی طرح ان کی غزلوں میں بھی کہیں کہیں نظم کا رنگ اُبھر آتا ہے۔ تاہم خالص تغزل میں بھی خوب اشعار نکالے ہیں۔ پڑھئے اور سر دھنئے :۔

چھڑی کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگی   پھر وہی میں ہوں وہی اختر شماری ان دنوں
خندہ ہائے گل سے دل میں ہوک سی اٹھنے لگی   سازِ عشرت بھی ہے وجہ بیقراری ان دنوں

عشق کی بیخودی کو کیا، بادۂ ناب سے غرض   کیفِ نگاہِ مست سے حال خراب چاہیئے
زیست دہی ہے جو ہے درد سے لذت آشنا   جامِ حیات میں مجھے تلخ شراب چاہیئے
ٹوٹ جائے نگاہ میں جو، ہو لیک آہ میں   ساغرِ زندگی ادا، رشکِ حباب چاہیئے

مجھے سے ہی بجھی ہے کہیں لگی دل کی   حریمِ ناز سے ہم اور بے قرار آئے
گلوں پہ خندۂ زخمِ جگر کا دھوکا ہو   جو آئے اب تو اس انداز سے بہار آئے

الفاظ پر ساحرانہ قدرت، اور اُن کے انتخاب میں محسن کارانہ ذوق کے ساتھ محاکات و استعارات میں بھی ادا ایک خاص انداز کی مالک ہیں۔ لیکن یہ چیز اُن کے ہاں بہت کمیاب ہے۔ تاہم جہاں کہیں کوئی استعارہ لائی ہیں شعر میں جان آگئی ہے۔ یہاں اُن کی ایک نظم "طلوعِ ماہ" سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں :۔

طلوعِ ماہ سکوتِ شام میں یوں جگمگاتی ہے   پجارن جس طرح تنہائی میں دیپک جلاتی ہے
دھندلکا جیسے تصورِ شامِ غربت میں   کہ خوابِ ناز میں دوشیزہ کوئی مسکراتی ہے
چھلکتے ماہ کہاں سے جھلک اُٹھتا ہے ہر ذرہ   محبت جس طرح دنیائے دل کو جگمگاتی ہے

کیا ان میں ہر ایک استعارہ ایک مہکتے ہوئے سرد جھونکے کی طرح رُوح کی گہرائیوں سے چھوتا ہوا نہیں گذر جاتا۔

ہماری شاعری کی پرورش اور نشو و نما زیادہ تر مردوں کے ہاتھ سے ہوئی ہے اس لئے اس کی روایات ـــ حسن و عشق کے "مردانہ نقطۂ نگاہ" سے ترتیب پاگئی ہیں۔ ہماری اکثر شاعرات یہاں ٹھوکر کھا جاتی ہیں۔ اور اپنے لئے وہی اندازِ بیان منتخب کرتی ہیں جو صرف مردوں کے لئے موزوں ہوسکتا ہے حالانکہ ایک شاعرہ کا فرض ہے کہ وہ شعر کہتے ہوئے ـــ بیان کے اسلوب، الفاظ کے انتخاب اور جذبات کی شیرینی سے ـــ ایک ایسی فضا قائم کرے جو صرف ایک عورت ہی کے لئے موزوں ہوسکتی ہے۔ ادا اس بات کا خاص خیال رکھتی ہیں۔ لیکن غزل میں کہیں کہیں لغزش کھا جاتی ہیں۔ مثلاً ؎

دامنِ گل ہے عنبریں، اس میں تو شک نہیں ادا
نکہتِ رائیگاں کہاں، گیسوئے مشکبو کہاں؟

ادا ابھی اپنا کوئی مخصوص اندازِ سخن قائم نہ کرسکیں۔ کبھی وہ رومان و محبت کے ترانے گاتی ہیں۔ تو کبھی سنجیدہ تغزل کی طرف مائل نظر آتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وقتی جذبات کی رَو انہیں ہنوز اِدھر اُدھر لئے پھرتی ہیں۔ کبھی ایک شاعر سے متاثر ہیں تو ابھی کسی دوسرے سے۔ یہ درست ہے کہ ابھی اُن کی مشق بہت زیادہ نہیں۔ تاہم انہیں اب اپنے طبعی رجحانات کے ماتحت کوئی مخصوص راہ متعین کر لینی چاہیئے۔ تاکہ اُس میں خصوصیت اور کمال پیدا کرسکیں۔ ہمیں اُمید کرنی چاہیئے کہ ادا اپنے "تجربہ کی روشنی میں" جلد ہی اپنے لئے کوئی راہ ڈھونڈ لینگی۔ اور ہمیں یقین ہے کہ یہ راہ "رومان طرازی" سے الگ نہیں ہوسکتی۔ کہ ادا اپنے اسی قسم کے فردوسی نغمات کے سلئے زندہ و باقی رہیں گی۔ دیکھئے زندگی کی گہرائیوں میں ڈوب کر کیا خوب کہا ہے ؎

عشق کا خواب تو شیریں ہے مگر ڈرتی ہوں   میری قسمت نہ اسے خواب پریشاں کر دے
خلوتِ رُوح کا فانوس نہ بجھ جائے کہیں   میری اُمیدوں کی دنیا کو نہ ویراں کر دے

نیز

نقش برآب ہے وابستگیٔ حُسن و شباب   نکہتِ گل کی طرح عشق ہے پابند ہوا
اسے بہتر تھا کہ مجھ کو بھی نہ لذت ہوتی   پھول مرجاتے ہیں کانٹا نہیں مرجا سکتا

اور حدیہ کہ :۔

گرمِ رفتار و سبک سیر ہے راہوارِ حیات   آرزوؤں کے گھروندے کو یہ ڈھادے نہ کہیں
بادۂ خام ہے ساغر میں نظامِ نو کے   تشنگیٔ ہونٹوں کی لذت کو مٹادے نہ کہیں

(منتخب کلام کے مفصل نمونے کتاب میں شامل ہونگے)

کسی سے

(از محترمہ اختر قریشی بی اے۔ بی، ٹی)

یہ ناممکن جفاؤں سے تری مایوس جاؤں
یہ ناممکن کہ ناکامی سے میں مانوس ہو جاؤں

تری بے اعتنائی مجھ کو برہم کر نہیں سکتی
مری آزاد فطرت اپنا سر خم کر نہیں سکتی

یہ تیری بے رُخی بھی باعث وحشت نہیں ہوتی
تری یہ فتنہ انگیزی مجھے کلفت نہیں ہوتی

تری وابستگی کی غیر سے پروا نہیں مجھ کو
تری اس بے وفائی کا بھی کچھ شکوا نہیں مجھکو

نہ مجنوں کی طرح صحرا نوردی پر ہوں آمادہ
نہ میں دشت و بیاباں کا نہ تنہائی کا دلدادہ

مرے نزدیک تیشہ مار کر مرنا نہیں بہتر
میں راہِ عشق میں فرہاد کی صورت نہیں ابتر

جنونِ عشق میں فریاد کرنے سے ہی کیا حاصل
خود اپنی زیست کو برباد کرنے سے ہی کیا حاصل

ہوائیں جب بہار و کیف سے لبریز ہوتی ہیں
فضائیں جب مرا صبر و سکون و ہوش کھوتی ہیں

غضب مد میں جو عالم نور سے معمور ہوتا ہے
زمیں کا ذرہ ذرہ نیند سے مخمور ہوتا ہے

مری ننھی سی کشتی نقرئی لہروں پہ بہتی ہے
شراب و شعر میں جب روح میری کھوئی رہتی ہے

ترا دلکش تصور ہے مرے پیشِ نظر ہر دم
تری رعنائیوں کی یاد ہے شام و سحر ہر دم

تخیل میں مرے ہر دم ہی تو، گو دور ہے مجھ سے
مرے خوابوں کی ملکہ ہو کے کیوں مہجور ہے مجھ سے

مری ہستی کا مقصد تو، مری روح رواں ہے تو
مرے دل پر عیاں ہے اور آنکھوں میں نہاں ہے تو

میں چپکے چپکے تیرا نام لے کر آہ بھرتا ہوں
سکوں آمیز تنہائی میں شب کی یاد کرتا ہوں

چمکتی نقرئی لہریں منور چاند اور تارے
تلاطم خیز موجیں، شوخ کلیاں اور سمن پارے

کہیں ایسا نہ ہو یہ جان جائیں رازِ اُلفت کا
یہ اندیشہ ہے مجھکو چھڑ نہ جائے سازِ اُلفت کا

تمنا ہے یہی اختر کہ خاموشی سے جل جاؤں
مجسم عشق بن جاؤں مثالِ شمع جل جاؤں

THE 'ADEEB' DELHI

ماہنامہ ادیب (دہلی)



قسط سوم

بدنام

(از محترمہ مہر آرا وصفی مرادآبادی)

"سامان درست کرلو" —— " پرمود نے مسکراتے ہوئے
، تھے کو کھلاتے ہوئے کہا —— اور لیلا نے —— جسکی ندیں مسرت
، جیسے اس کے تاریک خانۂ دل کو منور کر دیا تھا۔ اس کی جگمگاہٹ میں وہ تمام
ونے اور تاریک خیالات بھلا دیئے —— اُس کی نظریں خیرہ ہو چکی تھیں ——
منے اُسکو کچھ نظر نہ آرہا تھا۔ گاؤں —— میں آگ کی طرح یہ خبر مشہور ہو گئی
—— اور جب وہ تانگہ پر سوار ہو رہی تھی تو سب ہی لوگ اکٹھے اس کا تماشہ
یکھ رہے تھے۔ اُن کی حقارت آمیز مسکراہٹ نشتر بنکر لیلا کے دل میں اتر رہی تھی
—— لیکن پھر بھی —— وہ مسرور تھی —— !!

ابھی دس قدم ہی اُن کا تانگہ گاؤں کی حد سے باہر نکلا ہوگا جو شنکر
رچند کانسٹبل تانگہ کی طرف آتے نظر پڑے۔ لیلا کانپ گئی —— مگر پرمود
—— پر ذرہ برابر اثر نہ ہوا —— !!

"تانگہ روک لو —— " ایک سپاہی نے تحکمانہ چلا کر کہا۔

"کیوں روک لیں —— ؟" پرمود نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"یہ آپ کی کون ہیں ؟" سپاہی نے جھینپ کر کہا۔

"کوئی بھی نہیں صاحب۔ نہ ذات کی نہ رشتہ کی —— " شنکر نے
ں کر جواب دیا۔

"میری بہن ہیں —— اور میں مختار ہوں۔ چاہے جہاں لے جاؤں"
مود نے نفرت سے شنکر کو دیکھکر کہا۔

"یہ آپ کے بھائی ہیں —— ؟" سپاہی نے لیلا پر نظریں گاڑ کر
مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں —— !" لیلا نے جل کر جواب دیا۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں —— ؟" سپاہی نے سوال کیا۔ مگر پرمود
اس قسم کے کسی سوال کا جواب دینے کو اب تیار نہ تھا۔ غصہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا

تھا اور جسم لرز رہا تھا —— "تانگہ ہانک دو —— " اُس نے اپنے ملازم کو
ڈانٹ بتائی۔ اور اگلے لمحے تانگہ ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔

"تانگہ کے نمبر لکھ لو —— !" ایک سپاہی نے کہا۔

"اب چپ رہو —— تعلقدار صاحب کا تانگہ ہے —— اور وہ لڑکے
لڑکے ہی تو ہیں۔ تعلقدار کے جو اس کو لئے جا رہے ہیں۔ بڑے آدمیوں کے بیچ میں
کون پڑے یار !" دوسرے نے جواب دیا۔

"ہوگا بڑا —— " شنکر نے غصہ سے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

"بدلہ نہ لیا ہو تو جاٹ نہیں —— بہتر جانیو !!" سپاہی مسکرا دیئے۔

"جب میاں بیوی راضی تو کیا کریگا قاضی —— " ایک شریر سپاہی نے
مسکراتے ہوئے شنکر سے کہا۔

"دیکھ لینا —— " شنکر نے بڑے استقلال سے جواب دیا۔

شہر کے بازار اور کشادہ سڑکوں کو دیکھکر لیلا کو اپنے میکے کی یاد آگئی۔
جہاں اُس نے زندگی کی سولہ بہاریں گذاری تھیں۔ سوتیلی ماں کے مظالم میں سے یہ بھی
ایک تھا کہ اس نے بیاہتے وقت لیلا سے کہا تھا —— گاؤں میں اس ہی لئے دے
رہی ہوں کہ تو شہر والوں میں رہنے کے قابل نہیں۔ گنواروں سے اچھی گذرے گی۔
اور جب اُس کی شادی ہو رہی تھی تو گاؤں —— اور گاؤں والوں کا احساس
اس کے لئے جس قدر سوہان رُوح تھا یہ اس کا ننھا سا دل ہی جانتا تھا۔ لیکن یہاں
آکر رمیش کی غریبی کے باوجود اس کو ہر طرح کا آرام تھا اور وہ بہت مسرور تھی۔
اس کی ساس اس کو ماں کی طرح چاہتی تھی۔ اور زندگی میں پہلی بار اُس نے ساس کی
محبت سے یہ اندازہ کیا کہ ماں کی محبت کیا ہوتی ہوگی —— ؟

جب اس کی ساس رمیش سے کہتی —— "بڑے گھر کی لڑکی ہے ——
شہر کی رہنے والی —— اس سے ایسی محنت مشقت نہ ہوگی۔ آٹا پسوائی پر شہر
سے پسوا لانا"۔ تو اس کا دل وفور مسرت اور احسان سے بھر جاتا۔ کس قدر ہمدرد
ہیں یہ —— ! وہ دل میں سوچتی —— اور اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہو جاتی۔
—— لیکن فلک کج رفتار سے اس کی یہ مسرت دیکھی نہ گئی۔ اور سال کے اندر ہی
اندر اُس کی مشفق ساس دُنیا سے رُخصت ہو گئی۔ اُس نے بُری طرح احساس تنہائی
کیا —— لیکن جلد ہی ننھا دنیا میں آگیا —— اور وہ اسکی محبت میں ایسی کھو گئی
کہ اُسکو تنہائی کا خیال بھی نہ ہوتا۔ البتہ ساس کی یاد اُس کے دل سے نہ مٹ
سکی تھی —— رمیش کی محبت —— اس کی دُنیائے غربت میں ایک ایسا
درخشاں چاند تھا۔ جس کی نذریں کرنوں نے مفلسی جیسی بھیانک تاریکی کو اپنے اندر

بھانپ لیا تھا — !! مگر آہ — اُس کو یہ نہ معلوم تھا کہ سوتیلی ماں کا — ایک اور تازیانہ ابھی باقی ہے۔ اور یہ سب سے بڑھکر ہوگا — یہ اس کو جب پتہ چلا جب رمیش بالکل ہی پلنگ پر گر گیا کہ وہ اس کی شادی سے بھی چھ ماہ قبل سے بیمار تھا — اکثر اسکو بخار ہو جاتا اور کھانسی — ہلکی ہلکی سی کھانسی تو ہمیشہ ہی رہا کرتی تھی — محلّہ والیوں نے کہا — اس کی ماں کو پہلے سے علم تھا — مگر اس نے اس کی پرواہ نہ کی — !!

یہ کوئی نئی بات نہیں۔ محلّہ والوں نے کہا اس گھر میں تو یہ بیماری اب پرانی پڑ گئی ہے۔ اور جتنے بھی اس بیماری سے سب جوان ہی مرے۔

" اُترو بھابی — " پرمود کی آواز سے لیلا ایسے چونک پڑی جیسے کوئی خواب سے بیدار ہو۔ اب تانگہ ایک وسیع عمارت کے سامنے کھڑا تھا۔ نوکر سامان اُتار رہا تھا۔ اور پرمود ننھے کو گود میں لئے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

وہ دھڑکتے ہوئے دل سے اُتری — آگے آگے ملازم سامان لئے ہوئے اس کے پیچھے پرمود ننھے کو لئے سب سے پیچھے لیلا — ایک وسیع مکان سے گذرنے کے بعد زنانہ مکان کی ڈیوڑھی پر پہنچے۔ جس مکان سے وہ گذر کر گئے تھے وہ کافی سجا ہوا تھا۔ جا بجا گملے رکھے تھے۔ اور صاف ستھرے صحن میں کچھ کرسیاں پڑی تھیں۔

" یہ مردانہ مکان ہے " پرمود نے لیلا کے متجسس نظروں کو دیکھ کر کہا۔ " اندر چلئے۔ یہ ہے زنانہ مکان "

دہلیز پر قدم رکھتے ہی اُس کی نظریں دو عورتوں پر پڑیں۔ ایک ادھیڑ عمر کی سیاہ رنگت کی عورت جس کے انداز بتا رہے تھے کہ وہ مغرور بہت ہے — اور دوسری بالکل ہو بہو پرمود کی ہم شکل اور اُس کی ہم عمر لڑکی۔

" یہی ہیں وہ — بھیا !! " لڑکی نے پرمود سے سوال کیا۔

" ہاں کمود — ان کو ماتا جی کے پاس لے جاؤ "

لیلا خوف زدہ — سامنے دالان میں چارپائی پر بیٹھی ہوئی عورت کے پاس لڑکی کے پیچھے جا پہنچی — " نمستے " اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا — وہ محسوس کر رہی تھی۔ اُس کے آنے سے وہ کچھ خوش نہیں۔

" نمستے " اُنہوں نے بے دلی سے جواب دیا — !! اور وہ سہم گئی۔

اس کو یہاں آئے آج چھ روز گذر گئے تھے۔ کمود سے اُس کی کافی دوستی ہو گئی تھی۔ اور کمود بھی بھائی کی طرح اس پر بہت مہربان تھیں — لیکن — ماتا جی — وہ کچھ خوش نہ تھیں۔ وہ محسوس کرتی جب پرمود بھی سامنے آتی تو اُن کے تیور بدل جاتے تھے۔

کمود نے کہا۔ بھابی ! بھیا کی شادی سے چھٹ جائیں تو تمہیں سکول لے چلیں گے۔ بھیا کہتے تھے تمہارا نام بھی لکھوا دیں گے۔ "

" اب پڑھکر کیا ہوگا " ماتا جی نے حقارت آمیز مسکراہٹ کے ساتھ ایک نظر لیلا پر ڈالتے ہوئے کہا۔ لیلا اور پرمود دونوں نے اس کو بیک وقت محسوس کیا۔ اس ہی لئے پرمود گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے بولا۔

" بھابی یہاں دل بھی لگ گیا ؟ "

" ہاں بھیا " لیلا نے ایک سرد آہ کے ساتھ جواب دیا — اسکو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی زندگی — وقف ہو گئی ہے — ان حقارت آمیز نظروں کے لئے — اور — ان سے بچکر وہ اب کہیں بھی نہیں جا سکتی۔

پرمود اُٹھکر باہر چلا گیا — بر جیش کمود سے بہت ہل گیا تھا اور اس وقت بھی اس ہی کے ساتھ فرش پر کھیل رہا تھا۔

" بھابی " ! کمود نے حسب عادت کہا " تمہارے کوئی بہن ہے ؟ "

" کوئی نہیں " اُس نے سرد آہ کے ساتھ جواب دیا۔

" کمود ! کتنی بار کہا ہے بھابی مت کہا کر۔ جی جی کیوں نہیں کہتی۔ جو ابھی کوئی آجائے — سمدھیانے سے تو نہ جانے کیا سمجھے " ماتا جی نے تیور بدل کر کہا۔

لیلا نے محسوس کیا جیسے زمین اور آسمان گھوم رہا ہو۔ اس نے ہر چند سنبھلنے کی کوشش کی مگر ناکام رہی — اُس کو چکر آیا اور فرش پر گر کر بے ہوش ہو گئی — ابھی وہ پوری طرح غافل نہ ہو پائی تھی اس لئے صرف اس قدر سن سکی " نہ جانے کیا مرض ہے — بدنصیب کو — ایسی نامراد کا صبح صبح منہ دیکھنا ہوتا ہے — اور بھی نہ جانے ماتا جی کیا کیا کہہ رہی تھیں — مگر وہ سن نہ سکی — اور بے ہوش ہو گئی۔

جب اسکو ہوش آیا — تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا — اس نے محسوس کیا جیسے وہ بہت کمزور ہو گئی ہے — سب سے پہلے جب اُس نے بولنے کی کوشش کی تو اُس کے منہ سے صرف اس قدر نکل سکا " ننھا " ! اور کمود نے ننھے کو فوراً لا کر اس کے پاس بٹھا دیا۔ وہ جس قدر نحیف ہو گئی تھی۔ ننھا خیر سے اُسی قدر فربہ ہو رہا تھا۔ اُس نے دل میں سوچا — میری آنکھوں میں خاک۔ یہاں شہر کی آب و ہوا نے ننھے کو تو بالکل ہی بدل دیا۔

[illegible] کچھ رہے — چار ماہ بیمار رہیں تم — تم نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا
[illegible] بھیا بہت پریشان تھے " کمود نے مسرت بھری آواز میں اس کی حالت
[illegible] سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ ڈالا۔

" منا تو اچھا ہے — " لیلا نے منے کو چھاتی سے لگاتے ہوئے
" یہ بھی اب تم لوگوں سے مانوس ہو گیا تھا — پل ہی جاتا "
کمود نے محسوس کیا۔ لیلا — کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہیں —
[illegible] پن کے احساس سے اس نرم دل لڑکی کے دل پر بہت چوٹ لگی۔

" ایسا نہ کہو جی جی۔" کمود نے لیلا کے ماتھے پر محبت سے ہاتھ پھیرتے
[illegible] نے کہا۔ اب ہم کل کو تمہیں گھر لے جاویں گے۔"

" گھر " لیلا نے چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے آہستہ سے زیر
[illegible] دہرایا۔ اوہ — اب بھی میں — ہسپتال میں ہوں — "

" ہاں جی جی — تمہاری حالت بہت ہی نازک ہو گئی تھی۔ بھیا کی شادی
[illegible] مہمانوں اور شور و غل کے سبب بھیا کو بہت فکر تھی۔ کہ اس گڑبڑ میں تمہاری صحیح
[illegible] داری نہ ہو سکے گی۔ اس لئے ہسپتال میں داخل کرا دیا تھا۔" کمود نے کہا۔

" منا کس پر رہا — ؟" اس نے بے چینی سے منہ پر محبت
[illegible] کی نظریں گاڑھ کر ناتواں آواز میں سوال کیا۔

" میرے پاس — " کمود نے پیارے بچے کو تھپکتے ہوئے
[illegible] اب یہ پیروں چلنے لگا ہے جی جی — اور خوب بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔

" ہاں — چاچا جی — " بچے نے دروازے کی طرف
[illegible] تے ہوئے کہا۔ اور دوڑ کر پرمود کے پیروں سے جا لپٹا۔

" کمود — کیا حال ہے — " پرمود نے سوال کیا۔

" بالکل ٹھیک — " کمود نے خوشی سے جواب دیا۔ ڈاکٹر
[illegible] کہتا تھا کہ اس مرتبہ جب ہوش آئیگا تو دماغی حالت درست ہو گی —
[illegible] وہ سب کو پہچانتی ہیں۔ اور خوب باتیں کرتی ہیں — "

" نمستے بھابی جی — تم نے تو ڈرا ہی دیا تھا" پرمود نے
[illegible] مسکراتے ہوئے کہا۔

" جیتے رہو بھیا — " لیلا نے بزرگوں کی طرح دعا دیتے ہوئے
کہا۔

" تو کیا میرا دماغ خراب ہو گیا تھا ؟"

" نہیں — نہیں — " پرمود نے ٹالتے ہوئے کہا۔" ذرا یوں
پریشانیوں کے سبب — بیمار ہو گئی تھیں۔"

" کمود — انہیں اتار لاؤ — " پرمود نے بہن سے کہا۔

" اوہ — تو کیا آج بھابی جی بھی آئی ہیں — " کمود
نے حیرت سے سوال کیا۔

" ہاں — آئی تو ہیں مگر — گاڑی ہی میں بیٹھی ہیں۔
اترتی نہیں — " پرمود نے بہن کی طرف دیکھ کر مری ہوئی سی آواز میں
جواب دیا۔

لیلا نے بمشکل کہا — " بھابی جی — " لیلا کے ہونٹ خوشی سے
سے کانپ رہے تھے چہرہ کندن کی طرح چمک رہا تھا۔ اور دل زور زور سے
دھڑک رہا تھا — پرمود نے اس کو دیکھا — اس کی آنکھوں سے
اشتیاق اور مسرت پھوٹی پڑتی تھی — انہیں — بلا — لاؤ —
بھیا — " لیلا نے انتظار کی تاب نہ لاتے ہوئے پرمود سے کہا —
" میں بھی دیکھوں گی — " !!

" آ جائینگی — کمود جو لینے گئی ہے — " پرمود نے بجھے ہوئے دل
سے جواب دیا۔

بہت دیر ہو گئی — مگر وہ نہ آئیں۔ لیلا کی متجسس نظریں کئی بار دروازہ
پر سے ناکام لوٹ آئیں۔ آخر — کمود اور اس کے پیچھے ایک لمبی تڑنگی سانولی
لڑکی کمرے میں داخل ہوئی — لیلا نے حیرت سے دیکھا — وہ بہت قیمتی
کارچوبی ساڑی پہنے اور سر سے پیروں تک جواہراتی زیورات سے لدی ہوئی تھی۔
طرز انداز سے بہت مغرور معلوم ہو رہی تھی۔

" سوشیلا — " پرمود نے اس کو دکھا کر کہا " یہ — کمود سے میرے
لئے کم نہیں ہیں"۔ لیلا کے کانوں — نے اس محبت بھرے جملے کو سنا اور دل فرط مسرت سے
بے خود ہو گیا۔

" نمستے بھابی جی " لیلا بمشکل کہہ سکی — !! ایسے وقت درشن ہوئے رسم ہے
پاس منہ دکھائی کو یہاں کچھ نہیں — کیوں نہیں — لیلا نے خود ہی فقرہ کو لوٹایا
اور دماغ میں یہ تصور آتے ہی اسکا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ اور ننھے کا ہاتھ اپنے ہاتھ
میں لیکر اس نے کہا " میری یہی دولت ہے — بھابی — غریب کی — دولت
— میرا یہ لال — تم اپنی منہ دکھائی میں قبول کر لو — بہن " لیلا کی آنکھوں
سے بے ساختہ آنسو بہہ رہے تھے — کمود — اور — پرمود بھی ضبط نہ کر سکے۔
شوہر اور — نند کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر — سوشیلا — جل گئی —

(باقی آئندہ)

یک جُرعۂ تلخ

(از محترمہ نواب سیدہ اختر حیدرآبادی)

یہ کیا ہُوا تیری زندگی کو کہ صبح ناپید زین پیدا نفس نفس شور بن گیا ہے نظر نظر سے شین پیدا
نہ جلوہ ہائے نجف نمایاں نہ عظمتِ کاظمین پیدا اگر ہے مُسلم تو کر فضائے جہانِ ہستی میں چین پیدا
کہ تیرے سازِ حیات کے ہے ہر ایک نغمے سے بَین پیدا

نہ آرزو ہے، نہ ولولے ہے، نہ شورشیں ہیں، نہ آگہی ہے نہ تجھ میں شانِ سلف نمایاں نہ تجھکو اندازۂ خودی ہے
غضب ہوا آہ! تیری دُنیا بہت ہی تاریک بن گئی ہے ہزار افسوس تیرے اوپر، یہ زندگی کوئی زندگی ہے
نہ حُسن کی روشنی میسّر نہ عشق کا نُورِ عین پیدا

تمام دُنیائے زندگانی کا رہنما ہے تو ابتدا سے کہ اب بھی آہنگِ ساز باقی ہے صرف تیری ہی اک صدا سے
ہوئی یہ جرأت بھی تیرے اندر کہ جانتا اپنی انتہا سے ہوئی یہ توفیق آہ تجھ کو کہ پوچھتا خاکِ کربلا سے
یزیدؔ پیدا ہوئے ہزاروں، ہوا نہ کوئی حسینؑ پیدا

ستم! کہ خود داریاں زمانے میں تیری اب بھیک ہو گئی ہیں غضب! کہ بیداریاں تری سب ترے تغافل میں سو گئی ہیں
تجھے خبر ہے کہ تیری فطرت کی عظمتیں تجھ کو رو گئی ہیں یہ آج کیا ہے! کہ تیری نظریں جمالِ مغرب میں کھو گئی ہیں
کبھی ہوئی تھی تری جبیں سے تجلّیٔ "مشرقین" پیدا؟

یہ زخمِ دل نذر ہے خدایا تو اپنی خدمت میں پھُول کر لے مجھے بھی کچھ درد کر عنایت کچھ اپنے دل کو ملول کر لے
یہ دل سے نکلی ہوئی صدا ہے نوائے سازِ بتولؑ کر لے دعائے اختر قبول کر لے! قبول کر لے!! قبول کر لے
نگاہِ مسلم میں لے خدا کر "جلالِ بدر و حنین" پیدا

ڈرامہ

یہ دیس ہمارا ہے

(از محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی)

(سلسلے کے لئے دسمبر ۱۹۴۳ء کا ادیب ملاحظہ فرمائیے)

دوسرا ایکٹ ـــــــ دوسرا سین

بنئے کی دوکان۔ دو بنئے بیٹھے آپس میں باتیں کر رہے ہیں

ایک :۔ یار گیہوں اور چاول تو بہت جمع ہو گیا۔

دوسرا :۔ بہت ہے یار بہت ـــــ برسوں کھائیں گے اور بیچیں گے۔

ایک :۔ خوب قانون جاری کئے گئے۔ مگر ہمارا کوئی بھی کچھ نہ کر سکا۔

دوسرا :۔ مزے سے ایک سیر کا بیچا۔ نہ پولیس کچھ کر سکی اور نہ وہ لوگ جو توم توم چلاتے پھرتے ہیں۔

ایک آدمی :۔ (بنئے سے) دو آنے کے چاول ہونگے بھیا؟

بنیا :۔ نہیں۔

(چلا جاتا ہے)

دوسرا بنیا :۔ سالا دو آنے کے چاول لینے چلا تھا۔

ایک :۔ ہم تو اب ایک دانہ بھی نہیں نکالنے کے۔ ہاں کوئی بڑی رقم ملے تو دوکان کھولیں بھی۔

دوسرا :۔ ایسے تو صبح سے شام تک ہزاروں آتے رہتے ہیں۔

ایک آدمی :۔ (بنئے سے) بھیا کچھ چاول ہوگا؟

بنیا :۔ (تیوری پر بل ڈال کر) یہاں اناج واج نہیں ہے

آدمی :۔ (خوشامد سے) کچھ چاول ہے۔

بنیا :۔ کیوں بک بک کر رہا ہے۔ ایک بار کہہ دیا کہ یہاں کچھ نہیں ہے۔

(چلا جاتا ہے)

ایک بنیا :۔ ایک بار منع کر دیا لیکن پیچھا ہی نہیں چھوڑتے۔

دوسرا :۔ ایسے لپٹے ہیں جیسے رکھ گئے تھے۔

ایک بچہ :۔ (دوکان کے پاس آکر کھڑا ہو جاتا ہے) چار آنے کے چاول دیدو۔

(بنئے ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنستے ہیں)

بنیا :۔ تیری ماں ہے؟

بچہ :۔ (بھول پن سے) ہاں ـــــ

بچہ :۔ (بھوک سے پریشان ہے) چاول دیدو۔

دوسرا بنیا :۔ ہشت! پاگل ہوا ہے۔ جا پہلے اپنی ماں کو بھیج دے۔

(بچہ مایوس چلا جاتا ہے)

بنیا :۔ ان لوگوں نے بھی پریشان کر رکھا ہے۔ بھلا کال پڑا۔

دوسرا :۔ بیوقوف یہ بھی تو نہیں سوچتے کہ دو آنہ چار آنہ کے لئے کون پریشان ہوتا پھرے گا۔

(ایک عورت بچے کو سینے سے لگائے آہستہ آہستہ آتی ہے)

عورت :۔ کچھ چاول مل جائے گا؟

بنیا :۔ مائی یہاں تو دانہ بھی نہیں۔

عورت :۔ دانہ بھی نہیں (کچھ سوچنے لگتی ہے)

بنیا :۔ اگلی دوکان پہ چلی جا۔ شاید وہاں ہو۔

عورت :۔ (کراہتے ہوئے) کیا تم اس بچہ کو خرید لوگے؟ بس چار آنے میں دیدوگی

بنیا :۔ ہشت! یہ کال کے دن ہم سے اپنے ہی نہیں سنبھلتے جاتے۔

دوسرا :۔ آگے دیکھ ـــــ آگے ـــــ

اسی طرح متعدد لوگ اسکی دوکان پر آتے ہیں۔ لیکن وہ ہر ایک کو ایک ہی جواب دیتا ہے۔

ایک نوجوان لڑکی آتی دکھائی دیتی ہے جو بھوک سے نڈھال ہو رہی ہے۔ پیر لڑکھڑا رہے ہیں۔ دونوں بنئے دیکھکر خوش ہوتے ہیں۔

ایک :۔ بڑی سُندر لڑکی ہے۔

دوسرا :۔ چل کیسے رہی ہے ـــــ جیسے نشہ میں ہو۔

ایک :۔ ہماری دوکان پر آ رہی ہے۔

دوسرا :۔ چاول لینے آ رہی ہوگی۔

ایک :۔ ہاں ـــ دیکھتے نہیں۔ بھوک سے نڈھال ہو رہی ہے۔

دوسرا :۔ اسے چاول دوگے؟

ایک :۔ ہاں ـــــ ضرور

(دونوں ہنستے ہیں ـــــ لڑکی قریب آتی ہے)

لڑکی :۔ (آہستہ سے) کچھ چاول ہوگا؟

بنیا :- [illegible]

لڑکی :- تھوڑا سا بھی نہیں؟

بنیا :- تھوڑا سا، (کچھ سوچنے لگتا ہے) چاول لے گی؟

لڑکی :- ہاں ——

بنیا :- مگر چاول ایسے نہیں مل سکتے۔

لڑکی :- تمہاری کرپا ہوگی —— اگر کچھ چاول دیدو۔

بنیا :- چاول تو میں تجھے دیدونگا (دوکان کے باہر ادھر اُدھر نظر ڈالتا ہے)

لڑکی :- بھگوان تمہارا بھلا کریگا۔

بنیا :- چل دوکان کے اندر چل۔ ہم تجھے چاول دینگے۔

لڑکی :- یہاں یہیں کھڑی ہوں۔

بنیا :- جی ہاں —— مفت میں چاول لینا چاہتی ہے۔

دوسرا :- ایسے چاول لینے ہیں تو گھر کا راستہ لے۔ اب اناج ایسے نہیں ملتا۔

لڑکی :- مجھے تھوڑا سا چاہیئے ہے۔ بھگوان کے لئے رحم کرو۔ میرے بہن بھائی بھوک کے مر رہے ہیں۔

بنیا :- ہماری بات مان جا —— ہم تجھے چاول دینگے۔

(لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں اور وہ آہستہ آہستہ دوکان پہ چڑھنے لگتی ہے)

تیسرا ایکٹ —— پہلا سین

شہر کی ایک میٹنگ۔ قومی اتحاد اور بچانے کے سلسلہ پر گفتگو ہو رہی ہے۔ ہندو اور مسلمان سب ہی موجود ہیں۔

مکر جی :- آج ہمارے سامنے جو چیز ہے وہ کھانے کا مسئلہ ہے۔ شہر کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی ہے۔ اور اگر لا پرواہی کی گئی تو معلوم نہیں کہ کیا حالت ہوگی۔

سلطان :- اس نازک حالت میں ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ اس بھوک کا علاج سوچیں۔

رُوپا :- لیکن یہ کام اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہندو مسلمان متحد نہ ہو جائیں۔ ہم کو چاہیئے کہ بنگال کو مصیبت سے بچانے کیلئے متحد ہو جائیں۔ آج کی بھوک ہندو اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے قریب تر ہونے کی دعوت دے رہی ہے۔

محمود :- روپا کے خیال کو میں بھی پسند کرتا ہوں۔ واقعی ہم لوگوں کو غذائی بحران کو حل کرنے کے لئے ہندو مسلمانوں کو متحد ہو جانا چاہیئے۔

مکر جی :- اگر اس مسئلہ میں ہندو مسلمان متحد ہو جائیں تو وہ بہت جلد وطن کے لئے بھی متحد ہو سکتے ہیں۔

محمود :- یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ہم ہندو مسلمان کو متحد کرنے کی کوشش کریں ان کو بتلائیں کہ سوویت یونین کی زندہ قومیں کس طرح متحد ہو کر فاشسٹوں سے لڑ رہی ہیں۔ اسی طرح ہمارے بھائیوں کو متحد ہو جانا چاہیئے۔

سلطان :- یہ اسی طرح ممکن ہے کہ کانگریسی رہنما مسلمانوں کے حق خود اختیاری کو تسلیم کریں۔

حمید :- اور ساتھ ہی مسلم لیگی برادران وطن کو چاہیئے کہ کانگریسی رہنماؤں کی رہائی کا مطالبہ کریں۔

رُوپا :- یقینی اس طرح ہمارے ملک میں اتحاد قائم ہو سکتا ہے۔ لیکن اب وقت زیادہ سوچنے کا نہیں۔ ہم لوگوں کو جلد سے جلد متحد ہو کر غذائی بحران کو حل کرنا چاہیئے۔

مکر جی :- سب سے زیادہ اہم اور تشویشناک بات یہ ہے کہ اگر بنگال کی خبر نہ لی گئی تو جاپانی بہت آسانی سے ہمارے ملک پہ قبضہ کرلیں گے۔ اس لئے بنگال کی مدد کرکے اپنے ملک کی حفاظت کی جاسکتی ہے۔

(ایک صاحب آگے بڑھتے ہیں)

ایک شخص :- بنگال کے بھوک کے مرنے کا سبب یہ ہے کہ اوّل تو گورنمنٹ کی زیادتی غلہ کی بہت بڑی تعداد فوجوں کو چلی جاتی ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ذخیرہ اندوزوں نے اناج بھر لیا ہے۔ لیکن اس کا واحد علاج یہ ہے کہ لوگ گورنمنٹ کو زیادہ سے زیادہ پریشان کریں اور ذخیرہ اندوزوں کی دوکانوں میں گھس کر تمام غلہ لوٹ لیں۔

محمود :- جی نہیں —— یہ فعل ہندوستان کے لئے بھی خطرناک صورت اختیار کرسکتا ہے۔ اور اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اگر عوام کو ہم یہ مشورہ دیں کہ تم دوکانوں اور بازاروں کو لوٹ لو تو اس سے غذائی بحران حل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ سب بھوکے ہونگے۔ جتنا جس کے ہاتھ آئیگا وہ لے جائیگا۔ کسی کو کم ملے گا اور کسی کو زیادہ۔ اور کسی کو بالکل ہی نہیں ملے گا۔ گورنمنٹ کا اس سے کچھ نہیں بگڑیگا۔ بلکہ ہمارے ملک میں پھوٹ پڑ جائیگی۔

حمید :- دوسری بات جو آپ نے کہی کہ غلہ فوجوں کے لئے جاتا ہے۔ لیکن یہ ہمیں بھول نہ جانا چاہیئے کہ ہندوستان کا غلہ ہمیشہ باہر جاتا رہا ہے۔ اور جنگ

[illegible] کی وہ ٹوٹ پھوٹ کرنے کے لئے تیار ہے۔

رویا :۔ اور پھر یہ بھی ٹھیک ہے کہ ان کی مدد کرنا بھی ہمارا فرض ہے۔ اگر ہم ان کی مدد نہیں کرتے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم اپنے ملک کو فاشسٹوں کے سپرد کر دینا چاہتے ہیں۔ اس لئے اس میں گورنمنٹ کی کوئی زیادتی نہیں ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ حکومت میں اتنی طاقت نہیں رہی کہ وہ مکمل انتظام کر سکے۔ بہر حال اناج کی اس کمی کو ہم پیداوار بڑھا کر پورا کر سکتے ہیں۔

مکرجی :۔ بنگال پر یہ مصیبت بھی تو اسی توڑ پھوڑ کی لائی ہوئی ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے کہ ذخیرہ اندوزوں نے خوب جی کھول کر اناج بھر لیا اور پھر جس بھاؤ چاہا فروخت کیا لیکن آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال ۹ اگست کو پانچویں دستے نے کیسی توڑ پھوڑ مچائی تھی۔

سلطان :۔ جی ہاں — ان لوگوں نے ریل کی پٹریاں توڑیں ٹیلیفون کے تار کاٹے۔ پوسٹ آفس میں آگ لگائی وغیرہ وغیرہ

محمود :۔ کہنے کو تو ان لوگوں نے گورنمنٹ کا نقصان کیا لیکن سچ پوچھئے تو اس سے ہمارے ہی ملک پر تباہی آئی۔ کتنے ہندو مسلمان موت کے گھاٹ اتر گئے۔ غلہ ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں جا سکا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بھوکے مرنے لگے۔

حمید :۔ بہر حال اب ہم کو چاہیئے کہ زیادہ سے زیادہ اناج پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ جہاں فصل اچھی ہے وہاں سے اناج حاصل کریں۔ اس طرح ہم بنگال کو اس مصیبت سے بچا سکتے ہیں۔

رویا :۔ ہاں اگر شہر میں فوڈ کمیٹیاں بنائی جائیں تو عوام کو آسانی کھانے کو مل سکتا ہے۔

مکرجی :۔ دیکھئے بنگال ہمارا سرحدی قلعہ ہے۔ اگر ہندو مسلمانوں نے متحد ہو کر اپنے ملک کی حفاظت نہ کی تو فاشسٹ جو اس وقت تاک میں ہیں اندر گھس کر ہمارے ملک کو برباد کر دینگے۔ ہم کو چاہیئے کہ اس وقت قومی اتحاد قائم کر کے نوکر شاہی اور فاشزم کی چالوں کو مات دیں۔

محمود :۔ ہمیں یہ ہرگز نہیں سوچنا چاہیئے کہ ملک کا انتظام گورنمنٹ کیوں نہیں کرتی اس لئے کہ یہ ملک ہمارا ہے اور اس کی حفاظت ہمارا فرض ہے۔ انگریز اس کو چھوڑ کر جا سکتے ہیں۔ لیکن ہم نہیں چھوڑ سکتے۔

تیسرا ایکٹ ——— دوسرا سین

نواب صاحب کا مکان۔ کھانے کے کمرے میں بہترین قسم کا کھانا چنا ہوا ہے۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ کھانا کھا رہے ہیں اور باتیں بھی کرتے جاتے ہیں۔

نواب صاحب :۔ محمود کی طرف سے مجھے اب کوئی امید نہیں رہی۔

بیگم صاحبہ :۔ شادی ہو جائیگی سب ٹھیک ہو جائیگا بچپن ہے۔

نواب صاحب :۔ میرا خیال ہے کہ اس کی شادی جلد سے جلد کر دی جائے۔ ہم اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں پھر اپنا جو چاہیں کریں۔

بیگم صاحبہ :۔ جب بوجھ پڑتا ہے تو سب بھول جاتے ہیں۔

نواب صاحب :۔ (افسردگی سے) بیگم! اب وہ ٹھیک ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔ مجھ جیسا سخت باپ جب اس کو ٹھیک نہ کر سکا تو بیچاری بیوی گھر کی بیٹھنے والی کیا کر سکتی ہے۔ میں نے اسکو مار بھی ایسی ایسی دی ہے کہ جسم کی کھال تک ادھیڑ دی۔ لیکن وہ اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا۔

بیگم صاحبہ :۔ تم کیا جانو بیوی کی اور ہی بات ہوتی ہے۔

نواب صاحب :۔ اور وہ شادی کرنے کو بھی کب تیار ہے۔

بیگم صاحبہ :۔ تو کوئی لڑکے اپنے منہ سے کہنے لگتے ہیں۔

نواب صاحب :۔ منہ سے نہیں کہتے تو منع بھی تو نہیں کرتے۔

بیگم صاحبہ :۔ تم نے اپنے منہ سے کہہ دیا ہوگا۔

نواب صاحب :۔ (ہنس کر) میرا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

بیگم صاحبہ :۔ کیوں ——— ؟

نواب صاحب :۔ تم نے اور میں نے تو پہلے ہی طے کر لیا تھا۔

بیگم صاحبہ :۔ بس رہنے دو ——— ہاں جب ہونے لگتا ہے تو کوئی بھی منع نہیں کرتا۔ ہمارے بھائی بھی ایسے ہی کہا کرتے تھے۔ اور دیکھو بیوی کے ساتھ کیسے خوش رہتے ہیں۔

نواب صاحب :۔ تو پھر اس کو راضی کر لو ——— وہ تو کبھی اپنی چچی کے پاس تک نہیں جاتا۔

بیگم صاحبہ :۔ چاہے وہ راضی ہو یا نہ ہو میں تو دلہن سے جا کر کہونگی کہ بس اسی مہینے میں بیاہ رکھ دو۔ اللہ رکھے کسی چیز کی کمی تھوڑی ہے۔

نواب صاحب :۔ آج وہ آئے تو ٹھیک ٹھیک بات۔ یا تو وہ شادی کرے یا وہ میرے گھر سے نکل جائے۔

بیگم صاحبہ :۔ تم تو سٹھیا گئے ہو ——— بچپن ہے ٹھیک ہو جائیگا۔

نواب صاحب :۔ لیکن سوال یہ بھی تو ہے کہ لڑکے کی یہ حرکتیں دیکھتے ہوئے بھلا وہ اپنی لڑکی کیوں دینگے۔

بیگم صاحبہ :۔ [illegible] اپنے بچے کو [illegible] کیا ہے اور کیا بری حرکتیں کرتا پھرتا ہے۔

نواب صاحب :۔ اور بری حرکتیں کیسی ہوتی ہیں۔

بیگم صاحبہ :۔ بس اپنی باتوں سے میرا جی جلتا ہے۔ جب ہی تو میں تم سے بات نہیں کرتی۔ اخدی سیدی ہانکنے لگتے ہو۔

نواب صاحب :۔ بیگم! تم کو برا لگے یا بھلا۔ میں تو سچی بات کہتا ہوں۔ محمود کا ناس تم ہی نے کیا۔

بیگم صاحبہ :۔ (بگڑ کر) میں نے کیا ناس کیا ——— ؟

نواب صاحب :۔ چماروں کے بچوں میں کھلا کھلا کر تم نے بری صحبت کی عادت ڈلوائی اب بڑے لوگوں کی صحبت ہی اسکو پسند نہیں۔ اس کو تو وہی اچھا لگتا ہے۔ گاؤں میں مارا مارا پھرے اور ان کے کسانوں کے ساتھ بیٹھ کر روٹی کھاتا ہے جنکو ہم اپنے جوتے کے برابر بھی نہیں سمجھتے۔ یہ دیکھ کر میرا خون کھولتا ہے۔

بیگم صاحبہ :۔ (افسردگی سے) میں نے تو اپنی سی بہت کی لیکن تقدیر کا کیا کروں۔

نواب صاحب :۔ (کچھ غصہ اور رنج کے لہجہ میں) اب تقدیر کو بیٹھی رویا کرو۔

بیگم صاحبہ :۔ تو پھر میرے بس کی بھی کیا بات ہے۔ تم تو بلا وجہ سارا الزام میرے سر تھوپ رہے ہو۔

نواب صاحب :۔ تمہاری وجہ سے میں خاموش ہوں۔ ورنہ میں تو صورت بھی نہ دیکھوں۔

بیگم صاحبہ :۔ ماں کی ممتا باولی ہوتی ہے۔ اگر وہ اس سے بھی برا ہوتا تو مجھ سے ایسا تو ہو نہیں سکتا تھا۔

(کھانے کے کمرہ سے ملا ہوا ہی باورچی خانہ ہے جسکی کھڑکی سڑک کی طرف کو کھلتی ہے۔ کھڑکی پر ایک چق پڑی ہوئی ہے۔ سڑک کے پار ایک درخت چق میں سے دکھائی دے رہا ہے جہاں بہت سے بھوکے بچے درخت کے پتے اور چھال نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ کئی بچے بیہوش پڑے ہیں۔ دو آدمی بھوک کے تڑپ تڑپ کر دم توڑ رہے ہیں)

"روٹی ———"

"روٹی ———"

(ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی ہیں)

(نوکر کچھ سوکھے ہوئے ٹکڑے اور سڑی ہوئی دال وغیرہ کھڑکی سے باہر پھینکتا ہے بھوکے بچے جو چھال وغیرہ چبا رہے ہیں سب ادھر دوڑتے ہیں اور ساتھ ہی ایک کتا بھی دوڑتا ہے۔ بچے جلدی جلدی [illegible] بچے والی بچے کا [illegible] [illegible] کو [illegible] [illegible] کھانے جاتے ہیں)

ایک نوکر دوسرے سے :۔ یہ بچے بھوکے معلوم ہوتے ہیں۔

دوسرا :۔ ہائے ہائے۔ کتے نے کاٹ لیا۔ نہ جانے کس کے بچے ہیں گے۔

نوکر :۔ (بچوں سے) تم بھوکے ہو ؟

بچہ :۔ ہاں ——— روٹی ہے ؟

(ایک نوکر جلدی سے جاتا ہے اور کچھ روٹیاں لاکر باہر پھینک دیتا ہے بچے ایک دوسرے سے چھین کر کھانے لگتے ہیں۔)

نواب صاحب :۔ ہائے! ——— ہائے!!

بیگم صاحبہ :۔ یہ سب کے سب کہاں مر گئے۔

ایک نوکر :۔ جلدی چلو بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔ اگر دیکھ لیا تو جسم پر کھال بھی باقی نہ رہے گی۔

(دونوں چلے جاتے ہیں۔ بچے روٹی ملنے کی آرزو میں کھڑکی کو تک رہے ہیں)

تیسرا ایکٹ ——— تیسرا سین

(غلہ کی دوکان۔ ہزاروں بچے اور بڑے دوکان کے سامنے کھڑے ہیں۔ روپا اور محمود بھی دوکان کے سامنے ہی کھڑے ہیں)

روپا :۔ اُف ——— بھوک ——— بچے اور بڈھے کسی کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں۔

محمود :۔ روٹی ہی سب کچھ ہے۔ تم دیکھ رہی ہو روپا۔ اس میں مزدور بھی ہیں کسان بھی ہیں۔ کاریگر بھی۔ جب ان کے پیٹ میں روٹی تھی تو یہ چوبیس گھنٹہ اپنے کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ بڑی سے بڑی چیز اٹھانے میں بھی انہیں کوئی مشکل نہ ہوتی تھی۔

روپا :۔ لیکن آج انہیں اپنا جسم بھی کتنا بوجھل معلوم ہو رہا ہے۔

(سب لوگ کچھ چاول لے کر جا رہے ہیں)

محمود :۔ دیکھو روپا! جو لوگ چاول لیکر جا رہے ہیں کتنے خوش دکھائی دے رہے ہیں

روپا :۔ ہاں ———

محمود :۔ روپا! کوئی ایسی ترکیب کرو کہ ان لوگوں کو جلد سے جلد چاول مل جائے۔

روپا :۔ سوچ تو میں بھی یہی رہی ہوں ——— (کچھ سوچنے لگتی ہے)

[illegible]
...انتظار کر رہے تھے۔

رُوپا :- دیکھو کتنے آدمی گرنے کے قریب ہیں ـــــ معلوم نہیں ان کو روٹی کب ملی ہوگی ؟

رُوپا :- چلئے اُوپر چلیں۔

محمود :- کیوں ـــــ ؟

رُوپا :- ہم لوگ بھی جلدی جلدی ان کی تھیلیوں میں اناج بھرنے لگیں۔

محمود :- ہاں اس طرح ان کو جلدی چاول مل جائیں گے۔ اچھا تم بیٹھو۔ میں جاکر بھرتا ہوں۔

رُوپا :- تم اکیلے ـــــ کیوں ؟

محمود :- تمہاری طبیعت خراب ہے۔ پھر تم تھک بھی بہت گئی ہو۔

رُوپا :- خوب ـــــ میں بیٹھی دیکھتی رہوں۔

محمود :- تم کئی روز کی جاگی ہوئی ہو اور کئی روز سے مسلسل کام کر رہی ہو۔

رُوپا :- لیکن یہ میرا فرض ہے ـــــ چلئے اب دیر نہ کیجئے۔ ہمیں اور بھی کام کرنا ہے۔

محمود :- اچھا ـــــ

دونوں دوکان کے اُوپر جاتے ہیں اور جلدی جلدی عوام کی تھیلیوں میں اناج بھرنے لگتے ہیں۔ لوگ بیہوش ہو ہو کر گر رہے ہیں۔

رُوپا :- بچارے نہ جانے کب کے بھوکے ہیں۔ بیہوش ہوتے جا رہے ہیں۔

محمود :- رُوپا ! ـــــ جلدی کرو۔

لوگ اناج لیکر واپس جا رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ بھیڑ کم ہو گئی۔ رُوپا نے سر اُٹھا کر باہر کی طرف دیکھا۔

رُوپا :- ارے ـــــ کامریڈ محمود ـــــ دیکھو !

محمود :- کیا ـــــ ؟

رُوپا :- کتنے لوگ بے ہوش پڑے ہیں۔

محمود :- (دیکھتا ہے) اب ان لوگوں کو ہسپتال پہنچایا جائے۔

رُوپا :- یقینی ـــــ

محمود :- (اناج بھرتے ہوئے) کیا ترکیب کی جائے ؟

رُوپا :- ترکیب ؟ جس طرح روز چارپائی پہ لے جاتے ہیں۔

محمود :- لیکن سوال یہ ہے کہ چارپائی کہاں سے آئے ؟

رُوپا :- میں لے آؤں گی۔

[illegible] لاؤگی ؟

رُوپا :- میں کامریڈ کرجی کے ہاں سے لے آؤں گی ـــــ آپ کام کریئے۔

محمود :- تو پھر جلدی جاؤ۔

رُوپا :- اچھا ـــــ

(رُوپا جانے لگتی ہے۔ پھر پیچھے مُڑ کر)

محمود :- اچھا ـــــ میں یہیں انتظار کروں گا۔

(رُوپا چلی جاتی ہے۔ دوکان کے سامنے بھیڑ برائے نام رہ گئی ہے محمود دُکان سے نکل کر سڑک پر آ جاتا ہے)

محمود :- (خود سے) معلوم نہیں کتنے ان میں سے مر بھی گئے ہونگے۔

(انتظار کرتے کرتے ـــــ سامنے دیکھنے لگتا ہے)

محمود :- رُوپا ابھی نہیں آئیں ـــــ

(رُوپا آتی دکھائی دیتی ہے ـــــ اور اس کے ساتھ اور کئی آدمی چارپائیاں لئے ہوئے آ رہے ہیں)

محمود :- کامریڈ حمید کہاں رہ گئے ؟

رُوپا :- وہ بھی آ رہے ہیں۔

رُوپا محمود اور کئی آدمی بے ہوش لوگوں کو اُٹھا کر ہسپتال لئے جا رہے ہیں۔ رُوپا کا سانس پھول رہا ہے۔ لیکن وہ برابر کام کر رہی ہے۔ ایک چارپائی پکڑوا کر لئے جاتی ہے۔ پھر جلدی سے واپس آ کر اُٹھانے لگتی ہے۔ کچھ لوگ اناج ٹوکریوں میں بھر بھر کر لا رہے ہیں۔ اور غلہ کی دوکان میں اسی ڈھیر پر ڈال رہے ہیں بھیڑ اب برائے نام رہ گئی ہے۔ (باقی آئندہ)

اپنے گاؤں کی یاد!

(از محترمہ مظہر رضویہ صاحبہ)

التہاب غم جگر میں آگ برسانے لگا
گاؤں کی معصوم و سادہ زندگی یاد آگئی

نیم بسمل کر گیا کھیتوں کے سپنوں کا خیال
اور وہ سوئی ہوئی سی چاندنی یاد آگئی

وہ عروسِ قطرۂ شبنم سے ہنگامِ سحر
مہر کی کرنوں کی رنگیں دل لگی یاد آگئی

کروٹیں لینے لگا ہے دِل میں خونِ اضطراب
دلربا کھیتوں کی دلکش سادگی یاد آگئی

پھر خیالِ عہدِ گُل سے تلملا اُٹھا ہے دِل
یاسمن زاروں کی پھر اک اک کلی یاد آگئی

جنگلوں میں بانسری کا نغمۂ فردوسِ گوش
اور اثر سے اس کے مجھکو بے خودی یاد آگئی

وحشتیں ذوقِ تبسم سے ہوئیں پھر دفعتاً
اپنے باغیچے کے پھولوں کی ہنسی یاد آگئی

آہ ساون کی جواں راتوں میں وہ ذوقِ سخن
اور فضاؤں کی معطر سی تری یاد آگئی

ہو کے بے خود موسمِ گل کے شبابِ حُسن سے
سرو کی شاخوں میں فطرت کی ہنسی یاد آگئی

شعر گوئی کی لطافت کے نہاں تھے جس میں راز
حاصلِ ہوش و خرد وہ بے خودی یاد آگئی

کوہ کے دامن میں سبزے کے لہکتے فرش پہ
روبرو پھولوں کے رسم بندگی یاد آگئی

جنبشِ بادِ سحر سے گل بکف شاخوں کا رقص
اور اس رقصِ حسیں کی دلبری یاد آگئی

پھر چھلک آئے مری آنکھوں میں آنسو یک بیک
صبح دم پھولوں کی پلکوں میں نمی یاد آگئی

بیٹھے بیٹھے آج آنکھیں خون برسانے لگیں
لالہ زاروں کی وطن کے دِل کشی یاد آگئی

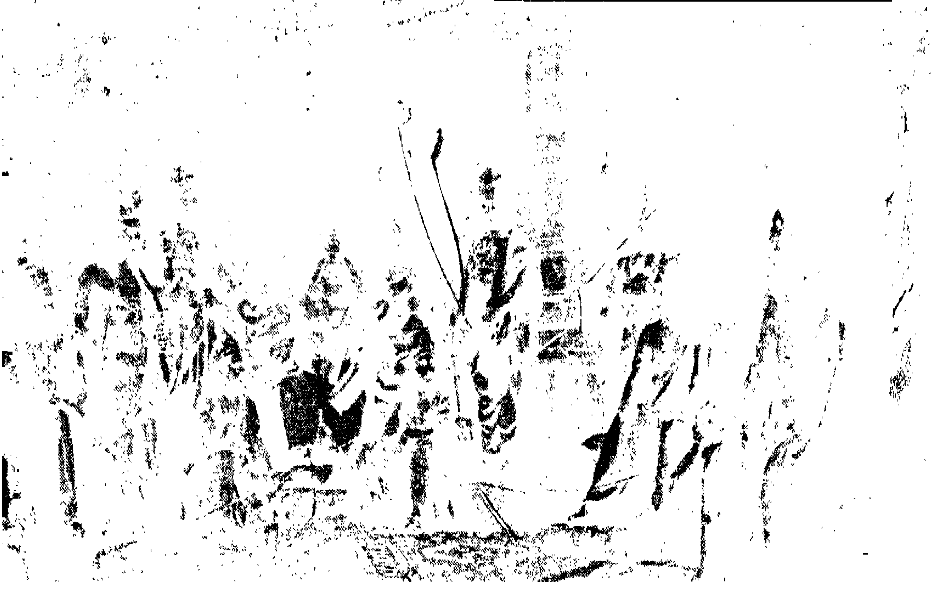
آگیا پھر یاسمینہ کے تبسم کے خیال!!
ان کی شیریں گفتگو کی دِل کشی یاد آگئی

کیا بتاؤں ہم نفس کیوں درد سا دل میں اُٹھا
نور افشاں کہکشاں کی ساحری یاد آگئی





—فلم ,,پنچھی،، کے دو سین—



مُجرم

(از محترمہ شیریں)

"چھ ماہ کی قید با مشقت اور پچاس روپے جرمانہ"۔ اُسے جیسے طویل غشی کے بعد اچانک ہوش آگیا۔

"چھ ماہ کی قید با مشقت اور پچاس روپے جرمانہ" اُس نے زیر لب یہ الفاظ دُہرائے۔ ملے اِس وقت جج کی آواز کسی خونخوار درندہ کی چنگھاڑ کے مشابہ معلوم ہوئی تھی جو دُور سے شکار کو دیکھکر غرا رہا ہو۔ غرور سے بھری ہوئی بے رحم غراہٹ۔ یہ اتنے ماہ کی قید۔ اور یہ اکٹھے ہی پچاس روپے جرمانہ۔ آخر کس جرم کی پاداش میں! آخر اُس نے کون سا ایسا انوکھا قصور کیا تھا؟ ایک بار نہیں۔ دو بار نہیں۔ بیسیوں مرتبہ وہ بڑے بڑے معزز اور ذی رتبہ لوگوں کو اس جرم کا مرتکب ہوتے دیکھ چکا تھا۔ بیسیوں بار اس نے بڑی بڑی تقریبوں پر بوتلوں کی بوتلیں خالی ہوتی دیکھی تھیں۔ اور پینے والوں میں بوڑھے۔ جوان، مشین کانسٹبلے، ہندو مسلم سبھی شامل ہوتے تھے۔ سب یکساں جوش و مسرت کا اظہار کرتے تھے۔ ان کے اس معزز درندے کے جرم پر کسی نے اُن کو نہیں ٹوکا۔ اپنے مالک کو اس نے کتنی بار نیا نہ پاکر لڑکھڑاتے دیکھا تھا۔ اور کتنی بار اُس نے اسکو سہارا دیکر گاڑی میں بٹھایا تھا پھر اگر وہ ایک دوست کے مشورہ سے اپنے دُکھ کا بار کچھ ہلکا کرنے کیلئے کبھی کبھار شراب پینے لگا تھا تو کونسی ان ہونی بات ہو گئی تھی۔ کسی کے پیسے سے تو نہیں پیتا تھا۔ کسی کے ڈاکہ ڈال کے تو نہیں پیتا تھا۔ اور پہلے تو کبھی اس چیز کی طرف رغبت نہیں ہوئی تھی۔ ہمیشہ شرابی کو حقارت کی نظر سے دیکھا کرتا تھا۔ اور پھر ایک دن اور یہ مہینے کی پہلی ایک تھی۔ جب مالک نے اس کی پندرہ دن کی تنخواہ کاٹ کر آٹھ روپے اُس کے ہاتھ پر رکھے تو وہ روپے سانپ بچھو بن کر اُس کے سارے جسم میں ڈنک چبھونے لگے۔ آٹھ روپے اور سارا مہینہ سر پر ——— پہاڑ سے تیس دن! آخر وہ کیا کریگا؟ بیوی کو کیا منہ دکھلائیگا۔ جو نہ جانے کتنے دنوں سے ایک وقت آدھے پیٹ روٹی اور کبھی شاید فاقوں سے وقت کاٹ رہی ہے۔ جس کی پندرہ دن کی بیماری میں اپنے کانوں کی چاندی کی بالیاں اور بری کا وہ ریشمی جوڑا جو کہیں آتے جاتے پہننے کے لئے بڑی کوشش سے اب تک بچا کر رکھ چھوڑا تھا، فروخت کرکے دال روٹی کا انتظام کیا گیا تھا جو اسی تنخواہ کے انتظار میں بنئے سے روزانہ اپنے لڑکے کے ہاتھ آٹا تیل منگا کر چھ جانوں کا پیٹ بھر رہی تھی۔ اور اب اس بنئے کا لمبا چوڑا حساب مالک مکان کا تین مہینے کا کرایہ اور پھر اس کا یہ چھوٹوں سے بھرپور کرتہ جو اب ہاتھ لگاتے ہی مسک مسک جاتا تھا۔ اور یہ آٹھ روپے! اسی سوچ میں وہ کتنی دیر تک یونہی بے مقصد اِدھر اُدھر گھومتا رہا تھا۔ شام کا دھندلکا رات کی سیاہی میں مدغم ہو گیا۔ پنچھی پکھیرو اپنے اپنے گھونسلوں میں بسیرا لے رہے تھے۔ مگر اسے آج گھر جانے کا حوصلہ ہی نہیں پڑتا تھا۔ جیسے گھر سے کوئی بہت بڑا جرم کرکے بھاگا ہو اُس کے پاؤں من من کے ہو رہے تھے۔ اور پھر اچانک اُسے ایک واقف کار مل گیا۔ "کہاں پھر رہے ہو؟ بھائی نے کیا چھٹی دے دی؟ چلو شکر تو ملا خدا خدا کرکے۔ ہم تو پہلے ہی کہتے تھے کہ یہ ساری پارسائی محض دکھاوے کی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ دوست اس دُنیا میں یہ چیز نہ ہو تو ان بڑے بڑے دُکھوں کا بوجھ کیسے سہا جائے"۔ اور اُس نے پیچھے گھوم کر دیکھا تو اسکی نگاہیں تاڑی خانہ کے دروازوں پر جم کر رہ گئیں۔ یکلخت وہ تڑپ کر چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ جیسے کوئی بے خیالی میں کسی بے من کے کنوئیں کے دہانہ پر اچانک خطرہ سے آگاہ ہو جائے ——— لیکن خدا جانے کس طرح اس کا دوست اُسے تاڑی خانہ میں لے ہی گیا ——— اور جب وہ رات کے ایک بجے گرتا پڑتا گھر پہنچا تو اس کی جیب میں تین روپے کچھ آنے باقی تھے لیکن تمام رات اُسے پریشان کن خیالات سے نجات ملی رہی۔ جیسے آج دماغ نے کام کرنے سے چھٹی لے لی تھی ——— وہ رات بھر خوب گہری نیند سویا کیا ——— اور پھر ہر مہینے آدھی سے زیادہ تنخواہ اور گھر کے دو چار بچے کھچے برتن تاڑی خانہ کی نذر کرنا اس کا معمول ہو چکا تھا۔ بیوی سلائی پسائی کا کام کرتے کرتے سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی۔ بچوں کے گرچہ جسم اور بھی نحیف ہو گئے۔ اس کا اپنا رنگ دق کے مریض کی طرح زرد ہو گیا۔ کھانسی نے گھر سے دوستانہ گانٹھ لیا۔ مرجھائے ہوئے گال اور بھی پچک گئے۔ مگر اس کے دل کو سکون حاصل تھا۔ سارا دن وہ رات کی ان مدہوش سرور ساعتوں کے تصور میں گزار دیتا۔ جب وہ چند گھونٹ پی کر دنیا اور دنیا کے فکروں سے بے نیاز ہو جائے۔

اور پھر اس کی بدقسمتی ایک دن اسے سرِشام ہی تاڑی خانہ لے گئی۔ وہ بازار سے کوئی سودا لیکر اپنے گھر پہنچا رہا تھا۔ مالک نے آٹھ بجے گاڑی مانگی تھی کسی افسر کے ہاں بہت شاندار ڈنر تھا۔ اُس نے سوچا رات کو جانے کے بجے چھٹکارا ہو سر میں بلا کا درد ہو رہا ہے۔ کیوں نہ تھوڑی سی پی کر تازہ دم ہو لوں ——— اور اس نے تھوڑی سی کی بجائے ایک دم خوب جی بھر کر

بالاں سنہرے گھنگریالے بال بہت دنوں سے صاف نہیں ہوئے [illegible]
یاد آگیا۔ اتنی تھوڑی دیر میں اسے یوں ہی لگا سانپ چڑھا تھا۔ [illegible] ڈیوٹی بھول جاتا ۔ وہ جاکر بھاگ کر گاڑی پر پہنچا ۔ کار نکالی اور عین وقت پر وہ کمک کو دعوت ملنے گھر سے گیا۔

اور پھر جانے کتنی دیر سوچ کے کسی سنسنی سے ٹھوکر سی لگی۔ اور ساتھ ہی ایک اور نے پوری قوت سے پکڑ جھنجوڑ ڈالا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور جلدی میں گاڑی میں بیٹھ کر سٹیرنگ زور سے گھمایا۔ آج تک اسے موٹر چلانے میں ایسا سرور ایسا لطف حاصل نہیں ہوا تھا۔ معلوم ہوتا تھا موٹر آپ ہی آپ ہوا میں اُڑی جارہی ہے جیسے آج سٹیرنگ بہت ہی ہلکا ہوگیا ہو۔ اسے چلانے میں ذرا بھی دقت نہیں ہو رہی تھی۔

"چھن نن" اور گاڑی قریب کے درخت سے ٹکراتی ٹکراتی بچ گئی۔ بائیں جانب کی لالٹین کا شیشہ ریزہ ریزہ ہوکر بکھر گیا۔ اس کا حلق آگ بگولا ہوگیا۔ اور اس کے بعد اسے بالکل یاد نہیں تھا کیا ہوا؟ کیسے گاڑی پہنچی؟ کس طرح وہ حوالات کی کوٹھری میں آگیا؟ اور کیسے اس کے ہاتھوں میں لوہے کی موٹی موٹی

ہتھکڑیاں پہنا دی گئیں؟ [illegible]
کہنے سے پولیس نے اس پر نشے میں مدہوش ہو کر [illegible] ایکسیڈنٹ کر دینے کے جرم میں مقدمہ چلایا ہے۔ کتنی پیشیاں ہوئیں۔ اور کتنے ہی اُلٹے سیدھے سوال و جواب! اور ان سب کا نتیجہ چھ ماہ کی قید بامشقت اور پچاس روپے جرمانہ!

خیر چھ ماہ تو جوں توں کر کے گذر ہی جائیں گے۔ مگر یہ پچاس روپے کا جرمانہ!

اور اس کی آنکھیں دور خلا میں کچھ دیکھ رہی تھیں۔ جہاں ایک فاکی دیوی ہندوستانی شریف عورت جس نے کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالا تھا۔ جس کا آنچل بھی آج تک کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ لپٹی ہوئی چادر میں اپنے جسم کو چھپانے کی کوشش کرتی ہوئی چار کمزور اور برہنہ بچوں کو ساتھ لئے رات کو سڑک کے کنارے پر پڑی ٹھٹھر رہی تھی۔

حجاب

از محترمہ آمنہ برجیس

تصورات کے موتی لٹا رہی ہوں میں
تمہاری یاد میں آنسو بہا رہی ہوں میں

تعینات کے پردے اُٹھا رہی ہوں میں
خیال و فکر کی جنت بسا رہی ہوں میں

شبِ فراق میں یوں اُن کی یاد آتی ہے
کہ جیسے اُن کو بھی خود یاد آ رہی ہوں میں

کمالِ جذبِ محبت کا معجزہ ہے یہ
انہیں خود اپنی جگہ آج پا رہی ہوں میں

کسی کی برقِ تبسم کو یاد کرتی ہوں
خود اپنے دل کا نشیمن جلا رہی ہوں میں

یہ انقلابِ محبت میں کیا ہوا برجیس
کہ دل سے نقشِ تمنا مٹا رہی ہوں میں

دیووں کے ملک میں

(از جناب اشرف صبوحی دہلوی)

نویں قسط

ایک دن صبح کو ایک نئی مصیبت کا سامنا ہوا۔ زمیندار کی لڑکی نے گلیور کا بکس کھڑکی کی دہلیز پر ہوا لینے کی غرض سے رکھ دیا تھا۔ اکثر وہ ایسا کیا کرتی تھی۔ اس لئے کہ گلیور پرندوں کے پنجروں کی طرح کھونٹی وغیرہ پر ٹنگنے سے بچتا تھا۔ اب اتفاق یہ ہوتا ہے کہ گلیور نے ایک کھڑکی کھول رکھی تھی۔ اور اپنی میز پر بیٹھکر چاہتا تھا کہ میٹھے کیک کھائے جو اُسے ناشتہ کیلئے دئیے گئے تھے۔ اتنے میں کئی بھڑیں کمرے میں گھس آئیں۔ کیک کی خوشبو انہیں وہاں لائی تھی۔ اُن کی بھنبھناہٹ اللہ کی پناہ! یہ معلوم ہوا کہ بیسیوں مشک کے باجے بج رہے ہیں۔ اُن میں سے دو چار نے میٹھے کیک پر قبضہ کیا اور اُس کا چورا چورا لے اُڑیں۔ باقی گلیور کے منہ پر بھنبھنانے لگیں۔ اور ایسا شور مچایا کہ غریب کے کان بہرے کر دیئے۔ اُن کے لمبے لمبے ڈنک دیکھکر بیچارہ خوف کے مارے ڈر گیا۔

تھوڑی دیر تو بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ ڈرا کہ ہلوں تو کہیں ڈنک نہ مار دیں لیکن کب تک؟ آخر ہمت کی۔ مردبن کر اپنی تلوار سونت لی اور اُڑتی ہوئی بھڑوں پر حملہ کر دیا۔ نپے تلے ہوئے ہاتھ تھے۔ دو وار میں چار کو مار گرایا۔ باقی اُڑ کر چل دیں۔

بھڑیں کمرے سے نکل گئیں تو گلیور اس قابل ہوا کہ کھڑکی بند کر سکے اور اس نے جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ دروازہ بند کرنے کے بعد اس نے مری ہوئی بھڑوں کو دیکھا۔ یہ بھڑیں قدوقامت میں بھٹ تیتر کے برابر تھیں۔ ان کے ڈنک جو نکالے تو بالکل سوئیوں کی طرح تیز تھے۔ اور لمبائی میں ڈیڑھ انچ سے کم نہیں۔ ان ڈنکوں کو اُس نے عجائب سمجھ کر اپنے پاس رکھ لیا۔ واقعی اگر ان میں سے کوئی بھڑ اسے ڈنک مار دیتی تو غالب گمان تھا کہ وہ زندہ نہ رہتا۔ فوراً مر جاتا۔

کچھ دن بعد ملکہ نے حکم دیا کہ گلیور کے لئے ایک سفری بکس بنایا جائے جو مقابلہ میں چھوٹا ہو۔ خیال یہ ہوا کہ موجودہ بکس ذرا بڑا ہے۔ کسان کی لڑکی اس کو آسانی سے گود میں لے کر نہیں بیٹھ سکتی۔ اس کے علاوہ گاڑی میں بھی وہ زیادہ جگہ گھیر لیتا ہے۔ یہ سفری بکس بالکل چوکور تھا۔ تین طرف تین کھڑکیاں۔ چوتھے رخ پر کھڑکی وغیرہ کچھ نہ تھی۔ لوہے کے دو قلابے لگے ہوئے تھے۔ ان قلابوں میں چمڑے کا ایک تسمہ ڈالا گیا تھا کہ جو شخص اسے لیکر گھوڑے پر بیٹھے تسے کو پیٹی کی طرح اپنی کمر سے باندھ لے۔ چھت پر یا بکس کے اوپر کی طرف بھی اسی طرح کا ایک قلابہ تھا کہ اگر کوئی ہاتھ لٹکا کر لے جانا چاہے تو آسانی سے لے جا سکے۔

دور دراز کے سفر میں جب گلیور پنجرے کے اندر گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اُکتا جاتا تو کوئی سوار بکس کے تسمے کمر سے باندھ اپنے آگے گھوڑے پر رکھ لیتا۔ اور اس طرح گلیور کھلی ہوا میں تین طرف کی کھڑکیوں سے بڑے مزے کے ساتھ جنگل کی سیر کرتا رہتا۔

اس بکس میں گلیور کے لئے ایک چھوٹی سی مسہری تھی۔ ایک جھولا چھت سے لٹکا ہوا۔ دو کرسیاں اور ایک میز۔ میز اور دونوں کرسیاں فرش میں جڑی ہوئی تھیں۔ اس لئے کہ گھوڑے کے جھٹکوں اور گاڑی کے ہچکولوں سے اِدھر اُدھر نہ لڑھکیں۔ اپنی جگہ جمی رہیں۔ گلیور نے بڑے سے بڑے طوفانی سفر کئے تھے۔ سمندر کی موجوں کی بہتیری تھپیڑیں اُٹھائی تھیں۔ اس لئے ان ہچکولوں اور جھٹکوں سے اتنا نہیں گھبرایا۔ جتنا اس جیسے آدمی کو گھبرانا چاہیئے تھا۔

قصہ مختصر گلیور کو اس شاہی شہر میں موج ہی موج تھی۔ بڑے آرام سے دن گذرتے تھے۔ اور اب وہ نفرت زدہ بونا بھی غارت ہوگیا تھا۔ اس لئے چھوٹا بڑا کوئی ایسا نہ تھا جو اُس سے بُرے سلوک کرتا۔ اس کو ستاتا یا ڈراتا۔ بلکہ سچ پوچھو تو سارے محل والے اس کو اپنا کھلونا سمجھتے۔ ہر طرح سے اس کی دلداری کرتے اور اپنے ننھے مہمان کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے رہتے۔ وہاں صرف ایک چیز تکلیف دہ تھی۔ لیکن اس تکلیف کا کسی کے پاس کوئی علاج نہ تھا۔ قدرت کے کھیل تھے۔ دیووں میں ایک بالشتیا۔ قدوقامت کے لحاظ سے بیسیوں واقعات روزانہ ایسے پیش آتے رہتے کہ اُس کا مذاق اُڑتا۔ لوگوں کا اپنے اوپر ہنسنا اور ٹھٹھے لگانا اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ چڑ اُڑنا ہو ہو جاتا۔ علاوہ ازیں اکثر اس کی زندگی بھی خطرے میں پڑ جاتی۔

زمیندار کی لڑکی کبھی کبھی گلیور کو اپنے ساتھ محل کے باغ میں لے جایا کرتی تھی۔ جہاں وہ اسے چلنے پھرنے، دوڑنے بھاگنے، اُچھلنے کودنے اور اپنا دل بہلانے کے لئے چھوڑ دیتی۔

ایک روز گلیور کسی درخت کے نیچے ٹہل رہا تھا کہ بونا آ گیا۔ اس وقت تک وہ ذات شریف محل سے نکالے نہیں گئے تھے۔ گلیور نے اُسے ستانا شروع کر دیا۔ یہ حرکت کوئی عقلمندی کی نہ تھی اور اسے فوراً ہی معلوم ہوگیا کہ میں نے حماقت کی ہے۔ دو منٹ کے بعد ہی اپنی بیوقوفی کا نتیجہ بھگتنا پڑا۔

(باقی آئندہ)

نیشنل وار فرنٹ

یعنی

قومی محاذ جنگ کیا چیز ہے ؟

نیشنل وار فرنٹ یعنی قومی محاذ جنگ کا مقصد پبلک کی اندرونی اصلاح اور امن عامہ کو بحال رکھنے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کے اغراض ومقاصد تمام عوام الناس کی فلاح وبہبود کیلئے ہیں۔

اس کے مقاصد یہ ہیں : —

(۱) امن عامہ کو قائم رکھنے کے لئے عوام الناس کا تعاون حاصل کرنا اور بدامنی پھیلانے کے ذریعوں کو دور کرنا۔

(۲) ہندوستان کی جملہ اقوام میں اتحاد باہمی قائم کرانا اور اس کے لئے کوشش کرنا۔

(۳) بدمعاشوں اور غنڈوں کی دیکھ بھال اور اُن کا انسداد کرنے کے لئے عوام کی امداد کرنا۔

(۴) غلط خبروں اور جھوٹی افواہوں کی تردید کرنا۔ اور اُن کو پھیلنے سے روکنا۔

(۵) پانچویں کالم یعنی دشمن کے جاسوس اور دشمنوں سے ہمدردی رکھنے والوں کا پتہ لگانا۔ اور اُن کی نگرانی کرنا تاکہ وہ اپنی کارروائیوں کو عمل میں نہ لاسکیں۔

(۶) کھانے پینے اور ضروریات زندگی کی چیزوں کو اُن کی مقررہ قیمت پر فروخت کرنے کا انتظام کرنا اور ناجائز منافع بازی کو روکنا۔

(۷) زائد غلہ پیدا کرنے کی ہدایت کرنا اور اس کے متعلق پروپیگنڈا کرنا۔

(۸) شہری بچاؤ اور ہوائی حملے سے بچنے کی تعلیم حاصل کرنے کی جانب عوام الناس کی توجہ دلانا۔ اور اس کے فوائد عوام کے ذہن نشین کرانا۔

(۹) شکست خوردہ ذہنیت کی ہر ممکن طریقے سے اصلاح کرنا۔

نیشنل وار فرنٹ کے اغراض ومقاصد اور اس کا طریق کار کسی سیاسی جماعت کے خلاف نہیں ہے۔ اور نہ کسی کو اس سے اختلاف ہوسکتا ہے۔ عوام الناس کو نیشنل وار فرنٹ کی خدمات سے فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ اور تعاون کرکے عوام الناس کی فلاح وبہبودی میں حصہ لینا چاہیئے۔

پراونشل نیشنل وار فرنٹ ۲۵ راجپور روڈ دہلی

قیمت فی پرچہ [illegible] ایک پیسہ

[illegible] ل

ادیب

اڈیٹر —
سید محمد ارتضیٰ واحدی
فصیح الدین احمد ایم اے
آنسہ نجمہ تصدق ایم اے بی ٹی

جلد [illegible] | دسمبر ۱۹۴۴ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

گیتانجلی مووی ٹون کا دلفریب شاہکار

سوال

میوزک :- پنّالال گھوش

گانے :- ولی

ڈائریکٹر :- نرنجن

موسیقی اور اداکاری کا بہترین مرقّع

جس میں

مشہور و مقبول ممتاز شانتی نے کام کیا ہے

دوسرے اداکار

الماس ـــــ رادھارانی ـــــ آغا

عنقریب آپ کے پسندیدہ سینما ہال میں آ رہا ہے

جاری کردہ :- ستارہ فلم ڈسٹری بیوٹرز۔ دھلی / لاہور

تنویر پکچرز کا [illegible]

خاموشی

جس میں سحر طراز رمولا نے اداکاری کی ہے

دوسرے اداکار: شیلیندر - رام دُلاری - کیانی

مصنف : ——— امتیاز علی تاج

جمعہ ۴ فروری سے کمار ٹاکیز دہلی میں بڑی آب و تاب سے چل رہا ہے

ہندوستان کے دیگر مشہور شہروں میں بے پناہ ہجوم لے رہا ہے

راستک پروڈکشن کی مایۂ ناز پیشکش

کرن

ڈائرکٹر :- جی، جاگیردار

جس کی روحِ رواں لیلا چٹنس اور اشوک کمار ہیں

نوین پکچرز کی انمول پیشکش

موسیقی کا شاہکار

دوست

ڈائرکٹر :- شوکت حسین

کیرتی پروڈکشنز کا لاجواب تحفہ

آشیرباد

ڈائرکٹر :- رام چندر ٹھاکر

جاری کردہ :- رتن پکچرز - چاندنی چوک - دہلی

مائیہ ناز دھارمک فلم

بھگت راج

اداکاران:-
رام شری ونت، گجنیس، ساہنی، کوشلیا، وکیشت
مبارک وغیرہ

۹ واں پرجوش ہفتہ
موتی ٹاکیز دہلی میں

کے علاوہ الہ آباد، بنارس، ڈیرہ دون، جھانسی، میرٹھ
میں کامیابی سے چل رہا ہے

حسن کی سحر طرازیاں، پُر لطف مذاق، وجد
آفریں گانے اور شاندار مناظر
سب کچھ ہیں

اداکاران:- راگنی، بیبی اختر، نور محمد، ہمایوں
اسمعیل، اجمل، جینت

ڈائریکٹر ———
کہانی ———
گانے ———

شیریں فرہاد

جاری کردہ: جاوید پکچرز دہلی

[illegible] یہی دکھایا کہ کس [illegible] کو ان کی
[illegible]
[illegible] ہے کہ اگر [illegible] مسرت پروانہ ہو بیٹھ کر
[illegible] محبت کی سی خشکی نہیں۔ بلکہ [illegible] بیان
[illegible] ساحت [illegible] لگ کر یہ سمجھیں، یہ
[illegible] بھی گذر سکے۔ جو اشعار میں ابھی عرض کرچکا ہوں ان
[illegible] کی خصوصیت رحم و آگہی کی تجہ ہے۔ لوگوں کی مخالفت سے بچنے کی تدبیر
[illegible] کی ابدیت کا پیغام ہے۔ وہ دور کشمکش میں جہاں زندگی پیدا کرنے
[illegible] اور موت سے ڈرنے والوں کے لئے موت کی تفسیر ایسی [illegible] شاعر ادا کے سامنے کی
[illegible] پڑھنے والا اس پر غور کرنے کے بعد اس کے قبول کرنے کے لئے مجبور نظر آتا ہے
ہر شخص کو یقین ہو جاتا ہے کہ جو کچھ ان اشعار میں کہا گیا ہے وہ واقعی حقیقت ہے
[illegible] اس پر عمل کرنا ہی سبب نجات ہو سکتا ہے۔ اس خصوصیت نے اردو شاعری کی
اہمیت بھی [illegible] نگاہوں میں مسلم کر دی ہے۔ [illegible] اردو شاعری کا کوئی
[illegible] قابل تسلیم نہ تھا۔ مولانا کے یہاں تفکر و تدبر کی بھی کمی نہیں۔ اسی غزل کا
ایک شعر ہے :-

[illegible] جب جہد تدبیر عالم کا — مری دانست میں تقدیر عالم ہو چکی ہوگی

یہ شعر ایک ایسی ابدیت کی طرف اشارہ ہے جس کا خیال بھی ہمارے شعرا کو
[illegible] آیا۔ تقدیر و تدبیر پر ہزاروں اشعار کہے اور سنے جا چکے ہیں لیکن [illegible] آپ
اس شعر میں ایک بالکل نئی بات اپنے تفکر و تدبر سے پیدا کی ہے جو شعر کہنے کے
[illegible] سمجھ میں آتی ہے۔ یعنی انسان کی کوئی تدبیر اس دنیا میں صرف اس لئے
کامیاب نہیں ہوتی کہ اس دنیا کی تقدیر پہلے سے متعین ہو چکی ہے۔ اور سنئے!

[illegible]

[illegible] مرجع ہستی — یہاں کب تک یوں ہی توہین خاک آدمی ہوگی

[illegible] اس کا احساس ہے کہ آدمی جو امانت الہی کا حامل ہے
اشرف المخلوقات کا خطاب دیا گیا ہے اس کی خاک کا اس دنیا کی خاک میں ملنا اور
[illegible] آدمیت کی توہین ہے۔ اس اشرف المخلوقات کی خاک کو آسمانوں
[illegible] جانا تھی۔ مرنے کے بعد روح کی طرح اس کی خاک کا مرجع بھی عالم
[illegible] تھا۔ انسان کی خاک کا اس زمین کی خاک میں ملنا۔ یہ بات [illegible]
احساس [illegible] ہے۔ کیا اب تک کسی دوسرے شاعر کو بھی خاک انسان کی اس
[illegible] احساس ہوا ہے؟

مرحبا اے شاعر مشرق! مرحبا اے مجدد شاعری! مرحبا اے مجتہد ادب!

خدا [illegible] غیرت [illegible] کہا ہے :-

[illegible] ہیں

[illegible] دنیا [illegible] کی ہوگی

[illegible] آپ [illegible] مولانا [illegible] نے [illegible] غزل [illegible]
[illegible] ایسے رنگ اور ایسے اسلوب میں کہی ہیں [illegible] تغزل، تخیل، تفکر، تدبر [illegible]
ایک وقت موجود ہے۔ [illegible] کہ [illegible] کبھی یقین کی
منزل نہیں [illegible] اور قطعاً غلط ہے [illegible] مولانا کی کوئی غزل آپ کو ایسی نہ ملے گی
جس میں یہ چاروں [illegible] موجود نہ ہوں۔ [illegible] شبہ کو دور کرنے کے لئے مولانا کے
چند اشعار [illegible] کر کے آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیے

(تغزل)

اب نہ دل [illegible] ہم سے [illegible] ہم
[illegible] کا رنگ [illegible] آئے تری محفل سے ہم

دیکھئے اس [illegible] کا کیا انجام ہو
اپنی دنیا لے کے نکلے ہیں کسی کے دل سے ہم

[illegible] تو ہے [illegible] — کرم ہو حال پر [illegible] تو مجھے [illegible] کیوں ہو

جی چاہتا ہے عمر محبت نہ ختم ہو — مر جائیے کسی کی تمنا لئے ہوئے

دل کے معاملات بھی طرفہ معاملات ہیں — جسکو نہیں ہے مجھ سے کام [illegible] اسی سے کام ہو

زندگی موت بنتی جاتی ہے — حد بھی ہے صبر آزمائی کی
جیسے دنیا میں کوئی [illegible] — ہائے باتیں تری جدائی کی

کوئی یہ شکوہ [illegible] پوچھے — وفا بھی حسن ہی کرتا تو آپ کیا کرتے؟

غرضکہ اسی طرح ان کی تمام غزلوں میں بلند تغزل موجود ہے۔ جنکی تعداد
[illegible] اب تخیل و فکر کی مثالیں دیکھئے۔

تخیل و فکر

محبت [illegible] — کہ [illegible] ہوتی [illegible]

کہاں جہل ہے معرفت روزگار ہونا — [illegible] کے حد سے واقف نہیں بہار ہونا

کبھی یہ آدمی کبھی نہ رہا — کوئی زندگی ہے کوئی شاہی ہے
بزم عالم کا ہو کہ جان پوچھ — انتہا کی بد انتظامی ہے

غرور کر نہ سجود و قعود پر کہ وہاں — قبول درد تر کے سوا کچھ اور نہیں

غرضکہ اسی طرح ان کی تمام غزلوں میں بلند تخیل و تفکر کے بلند اشعار موجود ہیں جن کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ اسی طرح درس و پیام بھی سیماب کی غزلوں میں رچا ہوا ہے۔

درس و پیام

بجائے ہاتھ بڑھانے کے اپنے پاؤں بڑھا — دعا تو وہم اثر کے سوا کچھ اور نہیں

اسی کا سفر ہے وہی منزل مقصود تری — ختم جس گام پہ دلچسپی دنیا ہو جائے

ہو انقلاب ممکن جب مرگ بے حسی ہیں — وہ زندگی کا دن ہے قوموں کی زندگی میں

غلامی کی فضاؤں میں نیا پھونکا فسوں میں نے — کیا اعلان آزادی بہ انداز جنوں میں نے
فلک و قیصر و سنجر نے لاکھوں بار دعوت دی — کیا کب سامنے باطل کے اپنا سر نگوں میں نے

ہم اے دنیا تری شاہنشہی و قیصری سمجھے — یہ ثبوت اسکو دے جو زندگی کو زندگی سمجھے

نواو ساز کو رخصت کرو کہ اب دنیا — صدائے صور قیامت کے انتظار میں ہے

ماہ و نجوم لالہ و گل، آب و خاک و باد — لے سب کو ساتھ اور نیا کارواں بنا

مولانا سیماب کے افکار میں فلسفے کی بھی کمی نہیں۔ فلسفے کے پیچیدہ اور مشکل مضامین کو جس آسانی اور سلجھاؤ کے ساتھ سمجھایا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے۔ کچھ نمونے ملاحظہ فرمائیے :-

فلسفہ

مصلحت یہ ہے خودی کی غفلتیں طاری رہیں — جب خودی مٹ جائیگی بندہ خدا ہو جائیگا

پہلے [illegible] — [illegible]
اک زندگی ہو تو کیا سمجھا ہوں [illegible] — [illegible]

عارضی وقفۂ سکون ہے موت — زندگی [illegible]

یہ کائنات کہ جس میں ترا جمال بھی ہے — ہمارے حسن نظر کے سوا کچھ اور نہیں

گزر جانے دو سیلاب حوادث کو بہ آزادی — کشادہ راستوں میں زور گھٹ جاتا ہے طوفاں کا

مبارک تجھکو اپنی خودروی لیکن یہ سنتا جا — کہ دنیا اپنے رستے پر لگا لیتی ہے انساں کو

وہ اپنی زندگی میں بندگی کیوں لازمی سمجھے — جو اپنی بندگی کو اک تسلسل زندگی سمجھے

تکمیل ہو رہی ہے مری ذوق ہر نفس — تعمیر کائنات میں کام آ رہا ہوں میں

سیماب کی شاعرانہ خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اسکی شاعری میں ہر دور کے واقعات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ وہ سیاسی واقعات کو بھی اپنی شاعری میں اس طرح سمو دیتے ہیں کہ سیاست بھی ادب معلوم ہونے لگتی ہے دنیا کے موجودہ واقعات پر آپ کے اشعار ایک تبصرہ اور مستقبل عالم پر ایک نگاہ پیشگی ہیں۔ چند شعر سنئے :-

سیاست

ہے غارت چمن میں یقیناً کسی کا ہاتھ — شاخوں پہ انگلیوں کے [illegible] ہوں میں

ہو جلوہ گر کسی پردے میں شورش عالم — جنون تاج و کمر کے سوا کچھ اور نہیں

یہ انتہائے گردش دوراں ہے آج کل — انساں کا خون خاک سے ارزاں ہے آجکل

مرے پاؤں زنجیر میں ہیں تو کیا ہے — مرا ہاتھ ہے انقلاب چمن میں

مورخین چمن کو یہ راز ہے معلوم — ہمارا خون بھی رنگینی بہار میں ہے

[illegible] کردہ ہم کا [illegible] اور [illegible]

[illegible] یہ مولانا کی صرف آخری غزلوں کے [illegible] غزلوں میں بھی یہ موضوعات وخصوصیات بے حد اور [illegible] سیماب اکبرآبادی کی ایک اجتہادی خصوصیت اور ہے جس میں ان کا کوئی شریک نہیں۔ وہ یہ کہ ان کے معاصرین نے تو صرف شخصی آزادی پر ہی زور دیا ہے مگر سیماب محبت میں بھی "آزادی" کا حامی ہے۔ وہ حسن کی طرح عشق کو بھی غلامی سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ نازِ حسن کی طرح نازِ عشق کا بھی قائل ہے۔ نیازِ عشق اُسے ناگوار ہے۔ وہ عشق کا سجدہ حسن کے پاؤں پر نہیں حسن کی جبینِ رنگیں، اور دوشِ حسین پر دیکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اس غرورِ شخصیت کے ساتھ نہیں کہ

رئیس زادہ ہے داغؔ آپ کا غلام نہیں

بلکہ اس سلیقہ اور دلیل کے ساتھ کہ:-

نازِ عشق

محبت میں نیاز و ناز کے درجے برابر ہیں — تو دوشِ حسن پر سر کیوں نہ ہو اور پاؤں پر کیوں ہو

اور فرماتے ہیں

بھر دے رہا ہوں فطرتِ انساں کو درسِ ناز — سر آستانِ حسن سے اُٹھوا رہا ہوں میں

ناز اُدھر نیاز اِدھر کتنا غلط نظام ہے — حسن نہیں غنیم ہے، عشق نہیں غلام ہے

عشق پابندِ حسن ہے سیمابؔ — یہ محبت نہیں غلامی ہے

ذرا اس شعر میں خودداری کی انگڑائی دیکھئے

سر جھکانے کو ہی ہم کو سجدہ کرنا آتا ہے — آپ اپنے گھر رکھیں سنگِ آستاں اپنا

عشق کا سر نہیں جھکتا ہے فلک جھکتا ہے — یہ وہ سجدے ہیں جو محسوس زمیں کرتے ہیں

اور پھر نازِ عشق کی تعلیم دنیا کو دے کر فرماتے ہیں

خدا وہ دن کرے پرستش ہو درسِ نازمندی کی

وہ پوچھیں کس نے یہ تعلیم دی تھی؟ میں کہوں میں نے

کیا یہ تعلیم خودداری آج تک کسی اور شاعر نے بھی دی ہے؟

مولانا سیماب اکبرآبادی کی شاعرانہ خصوصیت ایک یہ بھی ہے کہ تصوف میں ان کے شاعرانہ کمالات کا کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔ اُردو شاعری میں تصوف کی اگر کمی نہیں تو کچھ ایسی فراوانی بھی نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ہر اُس شعر کو جس میں جلوہ یا سجدہ آجائے اسکو تصوف کا شعر مان لیا جائے۔ تصوف کا مقام بہت بلند ہے جہاں ہر شاعر کی رسائی ناممکن ہے۔ سیماب کی ہر غزل میں تصوف پر کچھ اشعار ضرور ہیں۔ اور بعض باتیں تو مولانا نے ایسی کہدی ہیں جو بڑے سے بڑے صوفی کی زبان سے بھی نہیں نکل سکتیں۔ میں نے اکثر صوفیوں کو ان کے اشعار پر جھومتے دیکھا ہے اور متحیر بھی۔ مولانا کے اشعار اکثر مجذوب کی زبان پر بھی رہتے ہیں۔ چنانچہ جب مولانا نے یہ شعر کہا کہ

صورتِ منصور جو بولا وہ مارا جائیگا

پیر سندھی ہو کوئی یا ہو فقیر سرحدی

تو معلوم ہوا کہ یہ شعر ملتان کے ایک مجذوب بزرگ بہت دن تک بازاروں اور گذرگاہوں میں بآوازِ بلند پڑھتے رہے۔

دراصل یہ فیض ہے وارثیت کا۔ مولانا سیماب وارثی بھی تو ہیں۔ فصیح الملک مرحوم کے فیضِ روحانی سے اقبالؔ و سیمابؔ ہندستان میں صرف دو شاعر ایسے پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے سکول کے خلاف نئے موضوعاتِ شاعری کی نئی داغ بیل ڈالی۔ اور جنہوں نے زمانے کا رنگ دیکھکر اپنی فکر کو نیا رنگ دیا۔ سیماب نے فصیح الملک کے روحانی تصرف سے لسانی اور فنی کمالات کی معراج حاصل کی۔ اور اپنے پیر ومرشد کی توجہ سے روحانیات کی معراج حاصل کی۔ جبھی تو وہ فرماتے ہیں کہ

سیمابؔ لفظ لفظ اُترتا ہے عرش سے

میری بیاضِ شعر خدا کی کتاب ہے

تصوف

کہیں وحشی نہ کر دے مجھکو یہ اُلجھاؤ عرفاں کا — خدا کو ڈھونڈتا ہوں گو حجاب آتا ہے انساں کا

نہ گھبرا بھید اگر اسکا نمایاں ہو نہیں سکتا — لیے یہ بھی تو عرفاں ہے کہ عرفاں ہو نہیں سکتا

اُلٹ دے دل کو بھی جب لگے سب پردے اُلٹ جائیں — کسے بھی کر نمایاں جو نمایاں ہو نہیں سکتا

مٹا کے اپنی خودی ماسوا سے کر انکار — سکونِ روح بجز ذکرِ لا الٰہ نہیں

بیٹھ کے دل کے روبرو، آگ لگا دے چار سو — سیکھ لے تجھ سے رس ہو، کون مکاں پہ چھا جائے

شوقِ بیتاب ڈھونڈتا کیا محمد ہاں کی زندگی میں … فاصلہ ہے عرفان و آگہی میں
تو بھی تو پرستی کا اک مظہر مجازی … دیوانے لگے جلوے ڈھونڈتے پھرتے ہیں

سرخوشی و قلندری، بے خبروں کا کام ہے … گر نہ ہو شعورِ بیخودی ذوقِ خودی حرام ہے
تو یہ حرم ہی جاکر یہاں اسکے سوا کوئی نہیں … تجھکو ابھی خبر نہیں بُت بھی خدا کا نام ہے

میں کہاں تک اشعار نقل کروں۔ خیالات کا ایک سمندر نگاہ و ذہن کے سامنے موجزن ہے اور ابھی چند قطرے بھی نہیں اُٹھا سکا ہوں۔ خیر اس موضوع پر ایک شعر اور سُن لیجئے۔ ذرا غور کے ساتھ۔ فرماتے ہیں ؎

تکبیر لا۔ کی اِلّا نے۔ تو رازِ حقیقت کیا جانے
توحید کا مذہب دیوانے، اقرار بھی ہو انکار بھی ہے

ایک شعر اور یاد آگیا۔ وہ بھی سُن لیجئے :۔

اب کھلا کہ ہیں اُن کی ذات کا خلاصہ ہوں
پوچھ کر پتہ میرا دے گئے نشاں اپنا

مولانا سیماب نے دوسرے شعرا کے خلاف سنی المذہب ہونے کے باوجود مرثیئے اور سلام بھی بہت لکھے ہیں۔ سلاموں اور مرثیوں میں سیماب کی انفرادیت صاف جھلکتی ہے۔ اب تک سلاموں اور مرثیوں میں جو رسمی بین و بکا پایا جاتا تھا وہ سیماب کے سلاموں میں نہیں ہے۔ سیماب نے اس موضوع میں بھی اپنے اختیار و اجتہاد سے کام لیا ہے۔ اس وقت تک "سرودِ غم" اور "نغیرِ غم" کے نام سے دو کتابیں اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ دو ایک شعر سلام کے بھی سُن لیجئے :۔

سلامی زخمِ نوکِ تیر کب شایانِ اصغر تھا
ابھی معصوم خود ہی تیرِ قاتل کے برابر تھا

فرمائیے دُنیائے مراثی و سلام اس شعر کا جواب دے سکتی ہے ؟

مرثیہ و سلام

وسیع الظرف تھا خم خانۂ ساقیِ شہادت کا … کوئی ہم میں کوئی کم میں مگر حصہ برابر تھا

بھلا دیتے تیر اور ستانا معصوم تھے … [illegible]

[illegible]

اصغر و اکبر ہوئے نانا کی اُمت پر فدا … [illegible]

کیا ہے پھیر نظر فطرت کو تعلیمِ حسینی … آج پھر گرمِ سخن ہیں کا کربلا اور ہے

نویدِ امن و یکسوئی ہے جانبازانِ ملت کو … نئی دنیا بسانی ہے جہانِ خاک و خوں میں ہے

نیازِ مشربِ شبیر کا ہے پاسِ فطرت کو … بغیر سجدہ مومن نہیں ہوتی سحر اب بھی

پاؤں میں سجاد کے زنجیر ڈھیلی ہوگئی … جب کہا اللہ اکبر سے زنداں دیکھ کر

کٹنا تھا نہ سر کٹوانا تھا درسِ تسلیم سکھانا تھا
اُن کو تو صرف دکھانا تھا دیکھو یوں سجدہ کرتے ہیں

سرِ سبطِ نبی کا کٹ جائے زخمی بھی ذبیح اللہ نہ ہوں
اللہ کو راضی کر لینا آسان بھی ہے دشوار بھی ہے

سر کہاں ہوگا اگر دوشِ نبی پر پاؤں تھے … عظمتِ کونین پاسنگِ سرِ شبیر تھی

اور یہ بھی سلام ہی کا ایک شعر ہے ؎

بغیر سر فروشی، وہم ہے آزادیٔ ملت
مگر اس راز کو سمجھا نہیں ہندوستاں اب تک

موضوعِ شہادت پر کئی کتابیں اور بہت سی نظمیں سیماب کے افادات فکر سے موجود ہیں۔ میں سیماب کی جتنی شاعرانہ خصوصیتیں گنوا چکا ہوں۔ ان سے صد چند ابھی باقی ہیں۔ اور میں دیکھ رہا ہوں کہ میرا بیان طویل ہو کر پھیلتا جا رہا ہے اب میں بطور اختصار چند باتیں اور کہہ کر خاموش ہو جاؤں گا۔

سیماب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ بین الاقوامی شاعر ہے وہ اپنے قول کے مطابق پہلے مسلمان اور پھر شاعر ہے"۔ لیکن اس کا کوئی ملکی مذہب نہیں۔ اس کا کلام جس طرح ہمہ گیر ہے اسی طرح اس کا پیام بھی ہمہ گیر ہے۔ جہاں آپ نے پیغمبرِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم، شہدا، خلفائے راشدین اور بزرگانِ اسلام [illegible] اسلام دوست ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ [illegible] ہندوستان کے [illegible] بزرگانِ ہند پر بھی آپ کی نظمیں موجود ہیں۔ [illegible] سازِ آہنگ" اور کرشن گیتا ملاحظہ فرمائیے۔

نئی کتابیں

(از فصیح الدین احمد)

آہنگِ نو

جناب عاصی نظامی دہلی کے ایک معزز گھرانے کے نہایت ہونہار، خوش مزاج، خوش فکر، ذی اعتبار اور حکام رس نوجوان شاعر ہیں۔ آپ کو دہلی کے مشہور اور مستند استاد حضرت ... تلمذ کا شرف حاصل ہے۔ دلی کی زبان ان کی گھٹی میں پڑی ہے۔ شروع سے غزل گوئی کا چسکا تھا جس نے رفتار زمانہ کے ساتھ ساتھ نظم گوئی کی صورت اختیار کرلی۔ وہ ایک عرصہ سے شعر کہہ رہے ہیں اور اب ان کے گہرہائے گراں مایہ کا ذخیرہ ایک مجموعہ کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ یہ مجموعہ اپنی رنگارنگی اور جملہ خصوصیات کی بنا پر خاص توجہ کا مستحق ہے اور یقیناً ارباب ذوق اسے دلچسپی کے ساتھ پڑھیں گے۔ زیر نظر مجموعہ میں جو چیز سب سے پہلے نگاہوں کو اپنی جانب متوجہ کرتی ہے وہ بعض علم دوست عمائدین دہلی کی وہ پُر مغز اور بصیرت افروز تقریظیں ہیں جو اس کتاب کی زیب و زینت ہیں۔

ابتدائی صفحہ پر مصنف نے خلوص عقیدت کی بنا پر ملک کے مشہور رہنما حافظ احمد سعید صاحب صدر جمعیۃ العلماء ہند کی ذات گرامی سے اظہار عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

دوسرے صفحہ پر انتساب جو نواب حلیم جنگ بہادر کی ذات سے ہے اپنی مخصوص شاعرانہ اور عالمانہ عبارت کی بنا پر انفرادی خصوصیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد مقدمہ کے عنوان سے ہندوستان کے مشہور کیمیاوی محقق اور سائنس داں سر شانتی سروپ بھٹناگر نے جن کی علم دوستی دلی کے حلقوں میں مسلّم ہے ایک مختصر مگر جامع تبصرہ لکھا ہے۔ سر بھٹناگر نہ صرف ہندوستان کے ایک مایہ ناز سائنس داں ہیں بلکہ موروثی حیثیت سے نہایت پاکیزہ ادبی ذوق کے مالک ہیں۔ وبلا شبہ نہایت نکتہ رس نظر رکھتے ہیں۔ انہوں نے ابتدائی سطروں ہی میں عاصی صاحب کی جگر کاوی اور دماغ سوزی کا ان الفاظ میں اعتراف کیا ہے۔ "اگر کسی کیمیا داں یا تاجر نے اتنا دماغ اور وقت اپنے کسی کام پر خرچ کیا ہوتا جتنا عاصی صاحب نے اپنے کلام کو جمع کرنے اور شائع کرنے پر صرف کیا ہے تو وہ اس وقت اچھا خاصا ساہوکار بن بیٹھتا۔"

سر بھٹناگر نے اپنے مقدمہ میں شاعر کی غزلوں اور نظموں کے محاسن کو مخصوص محققانہ انداز میں اُجاگر کیا ہے۔

حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب کی مختصر اور دلکش تقریظ ان کے طرز نگارش کا آئینہ ہے اور مجموعہ کو چار چاند لگاتی ہے۔

اس کے بعد ایک دوسرے علم دوست اور ادب نواز شخص ... صاحب بیدی کا ایک مختصر مگر پُر مغز تبصرہ مجموعہ کی زینت بڑھا رہا ہے۔ ... سرکاری مصروفیتوں کے باوجود ایک نہایت خوشگو اور بلند ذوق شاعر ہیں۔ ایسے بیدار مغز اور خوش گو شاعر کی سخن فہمی میں کس کو کلام ہوسکتا ہے۔

فخر ملت اسلامیہ سحبان الہند حضرت مولوی احمد سعید صاحب نے نہ صرف یہ کہ مجموعہ کا وزن بڑھا رہا ہے بلکہ اپنی عالمانہ طرز نگارش کی خاص عظمت اور وقار رکھتا ہے۔ نگاہِ نقاد کے عنوان سے مجتہد آرا حضرت خواجہ محمد شفیع صاحب کی مختصر مگر تمام اصنافِ سخن کا احاطہ تقریظ اپنے اسلوب اور لہجہ کی بنا پر ایک خاصے کی چیز ہے۔ ہر ہر جملہ لڑی ہے۔ خواجہ صاحب کی یہ تحریر اس نگارش کا آئینہ ہے جو بلا شرکت انہیں کا حصہ ہے یقیناً اسے ادب کا ایک شہ پارہ کہنا چاہیئے۔

دور حاضرہ کے ایک فاضل نقاد حامد حسن قادری ... "ایک نظر" کے عنوان سے کیا ہے وہ ادبیت، نکتہ رسی اُردو ادب کی سرچشتی کا آئینہ ہے۔

اس کے بعد جناب ظریف کی "دو باتیں" اور جگل کشور "نذر استاد" زیب داستاں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایسے نکتہ رس ادبا اور علم دوست حضرات کی تحسین و ستائش ... تبصرہ نگار کا کہنا غالب مرحوم کی زبان میں ہونے یہ ... کے اور کیا رہ جاتا ... قلم سے گرشدہ ... کی داد

سیماب کا پیام تمام عالم کے لئے اور خصوصاً عالم انسانیت کے لئے عام ہے۔ وہ مذہب اور قومیت کی زنجیر اپنے پاؤں میں ڈال کر ہماری فلاح زندگی کے اعلیٰ اصول کا پیغام نہیں ہے بلکہ ہر قید و بند سے آزاد ہو کر وہ ہمیں ایسے نغمے سنا رہا ہے جن سے خواب آور نہیں بلکہ ہماری غفلت کی آنکھیں کھل جاتی ہیں وہ ہمیں منزل بتاتے ہیں اور جو ہمیں آزادی اور نجات کی منزلوں سے قریب تر کر دیتے ہیں۔

علامہ سیماب اپنے ایک مقطع میں فرماتے ہیں ؎

میں کہ پیغمبر تہذیب سخن ہوں سیماب
سلسلۂ شعر مہذب کا مرے گھر سے چلا

بے شک وہ تہذیب سخن کے پیغمبر ہیں۔ لیکن دنیا انہیں خدائے سخن بھی تسلیم کر چکی ہے
ڈاکٹر اقبال کے متعلق مولانا گرامی جالندھری نے فرمایا تھا ؎

پیغمبرے کرد و پیمبر نتواں گفت

مگر علامہ سیماب کے متعلق کہا جا سکتا ہے ؎

پیغمبری کرد و خدا ہم نتواں گفت

ابھی حال میں ۲۲ نومبر ۱۹۴۳ء کو جالندھر کی بزم ادب کی جانب سے جو سپاس نامہ علامہ سیماب کی خدمت میں پیش کیا گیا ہے اس کے چند اشعار پر میں اپنے مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

سپاس نامہ

تو اے سیماب، سودائی نہ میری | نہ عرفیت بگویم نے نظیری
سخن را در حقیقت دستگیری | نہ بغداد سخن پیران پیری

ز شاہد بهم انکار کردن کمالست | گریز از ما سوا کردن کمالست
غزل را محبوبہ کردن کمالست | تغزل با خدا کردن کمالست

دل از مرد مسلمانے ربائید | حریف گیسوئے تو دست شہرت
سوز سینہ گوید آستانے | جواب لالہ طور ست شہرت

زہے دولت بلاغت را نظام است | کلام تو فصاحت التیام است
کہ دانش در سخن گوئیت سیماب | چہ می گویدا سخن بر تو تمام است

ہم از اعجاز شعر قست سیماب | کہ در تردامنی آتش بگیرد
گر شش زندہ سے خواند، نہ میرد | بمحرکہ گر ز منداجیا پذیرد

زہے بالائی بانگ تربایت | خیے والائی طرز خطابت
ملائک ساعت، یزداں مخاطب | ز روح القدس کم آید جوابت

بحق حضرت سیماب گویند | کہ پیغمبر دنیائے کلام است
بہ نزد من، خداوند سخن است
سلیماں بیت او بیت الحرام است

دو شعر

محفل سوز و ساز ہے دنیا | حامل سوز و ساز ہیں ہم لوگ
بے سبب التفات کیا معنی | کچھ تو اے چشم ناز ہیں ہم لوگ

مجاز

رباعیاتِ جوشؔ

(حضرت جوشؔ ملیح آبادی)

اے شبنمِ تازہ اپنے گلشن کو بچا
اے یخ کدۂ حیات خرمن کو بچا
وہ آئی مرے لب پہ دہکتی ہوئی آگ
اے لیلیِ زمہریر دامن کو بچا

ہر بارِ جفا جو کو نباہا میں نے
سمجھا ہر زخمِ دل کو پھاہا میں نے
لیکن اپنے سے بڑھ کے اب تک واللہ
دنیا میں کسی کو نہیں چاہا میں نے

اے چشمۂ لالہ زار دم بھر تو ٹھہر
ابرِ سرِ کوہسار دم بھر تو ٹھہر
اک آبلہ پا رواں ہے تیری جانب
اے قافلۂ بہار دم بھر تو ٹھہر

یہ عشق ہے آسودہ نگاہی کے لئے
یہ راست روی ہے کج کلاہی کے لئے
تم کو اپنے سے بڑھ کے رکھتا ہوں عزیز
لیکن اپنی ہی خیر خواہی کے لئے

اقبال اور غالب

(از جناب سید نعیم الدین ایم اے)

اُردو میں صرف دو ہی شاعر ایسے نظر آتے ہیں جن کی فلسفہ آشنا
نہ رس نگاہیں حقایق حیات کے گوشہ گوشہ سے واقف ہیں۔ اقبال و
غالب کی ہستی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ بلندیٔ نگاہ اور انداز طبع کی مماثلت
نے ان کے چمن فکر و احساس کے رنگ و بو میں مشابہت پیدا کر دی ہے۔ یہی وجہ
ہے کہ اقبال کے تصور کے ساتھ ساتھ اُردو میں تنہا غالب کا تصور آتا ہے۔ اور
کسی دوسرے شاعر کی طرف تصور مڑ کر بھی نہیں دیکھتا۔

اقبال حضرت داغ کے شاگرد تھے لیکن معنوی حیثیت سے غالب ہی
ان کے استاد تھے۔ اقبال نے اپنے آپ کو اکبری رنگ میں بھی کچھ عرصہ کے لئے
پیش کیا۔ لیکن غالب کا اثر سب سے زیادہ اور اخیر تک اُن پر غالب رہا غالب
کا ایک پُر زور مرثیہ لکھ کر انہوں نے اپنی عقیدت کا علانیہ اظہار کیا ہے۔ اُردو
شعرا میں اگر وہ کسی سے مرعوب و متاثر ہوئے تو وہ غالب ہی کی مغلوب کن شخصیت
تھی۔ اقبال کے ابتدائی کلام پر غالبیت کا صاف غلبہ نظر آتا ہے۔ مثلاً

کہوں کیا آرزوئے بیدلی مجھ کو کہاں تک ہے
مرے بازار کی رونق ہی سودائے زیاں تک ہے
وہ مے کش ہوں فروغ مے سے خود گلزار بن جاؤں
ہوائے گل فراق ساقیٔ نامہرباں تک ہے
چمن زار محبت میں خموشی موت ہے بلبل
یہاں کی زندگی پابندیٔ رسم فغاں تک ہے

کسی کے لگ بھگ غالب کہہ گیا ہے:۔

سینہ کا داغ ہے وہ نالہ جو لب تک نہ گیا
خاک کا رزق ہے وہ قطرہ جو دریا نہ ہوا

الفاظ بندشیں اور اضافتیں بھی غالب کی یاد تازہ کرتی ہیں:۔

ذوبوئے نسیم گلشن رشک ارم   ہو نہ مرہون سماعت جس کی آواز قدم

لذت رقص شعاع آفتاب صبح دم   یا صدائے نغمۂ مرغ سحر کی زیر دبم
رنگ کچھ شہر خموشاں پہ جما سکتی نہیں
خفتگان کنج مرقد کو جگا سکتی نہیں

عمق خیال و پرواز تخیل غالب و اقبال کی متاع مشترک ہے۔ حقایق حیات کے ترجمان ہونے کی حیثیت سے زندگی کی طرح دونوں کے خیالات و احساسات متنوع اور رنگا رنگ ہیں۔ ان باکمال سخن سنجوں کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ انہوں نے عام شاہراہ سے ہٹ کر شاعری کی۔ ان کا خاص جوہر جدت خیال و ندرت بیان ہے۔ مضامین نو کی اختراع کے علاوہ مروجہ اصناف سخن پر بھی انہوں نے اپنی منفرد شخصیتوں کے نقوش ثبت کئے۔ غالب نے قصیدہ جیسی فرسودہ صنف میں بھی نئی نئی تشبیہیں اور گراں قدر حکیمانہ خیالات کو شامل کر کے رعنائی و جدت کی نئی رُوح پھونکی۔ غزل میں طرز خاص کے موجد ہوئے۔ اقبال نے غزل میں نظم اور نظم میں غزل کا لطف برقرار رکھا۔ اور عامی تغزل کو ترک کر کے حافظ کی مے و مینا والی غزل میں کائناتی رنگ کی شراب چھلکائی۔ دونوں کا کلام ایک خاص آن اور جلالی شان لئے ہوئے ہے۔

یہ بھی اتفاق ملاحظہ فرمائیے کہ غالب و اقبال دونوں کو جیتے جی اپنے ہمنوا و ہمراز کی آرزو ہی رہ گئی۔ غالب کو رہ رہ کر یہ خیال ستاتا ہے کہ اس کی مے سخن قحط خریداری سے کہن ہو جائیگی۔ اور اقبال کہتے ہیں ؎

بس کہ عود فطرتم نادر نوا است
ہمنشیں از نغمہ ام ناآشنا است

غالب اور اقبال اس باب میں ہم خیال ہیں کہ فروغ شمع سخن کے لئے دل گداختہ ضروری ہے ؎

غالب	حُسن فروغ شمع سخن دُور ہے اسد پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی
اقبال	نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

شاعر کی آتش نوائیاں اس کی قلبی سوزشوں کا نتیجہ ہوتی ہیں۔

اقبال

طربے ز دم کرشاید ہوا ترا رم آید
تب شعلہ کم نگردد ز گسستن شرارہ

غالب کی غزل سرائیوں کا محرک بھی التہاب غم ہے ؎

مجھے انتعاش غم نے پئے عرض حال بخشی

بحسن غزل سرائی تپش فسانہ خوانی
یہی بار بار جی میں مرے آئے ہے کہ غالب
کروں خوانِ گفتگو پر دل و جاں کی میہمانی

بعض نغمے جو شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اس قدر نازک و لطیف ہوتے ہیں کہ جامۂ سخن ان پر تنگ ہوتا ہے۔

نگاہ می رسد از نغمۂ دل افروزے
بمعنی کہ برو جامۂ سخن تنگ است
ہر معنی پیچیدہ در حرف نمی گنجد
یک لحظہ بدل شو شاید کہ تو دریابی

غالب اسی مضمون کو اس طرح ادا کرتا ہے ؎

سخن ما ز لطافت نپذیرد تحریر
نشود گرد نمایاں ز رمِ توسنِ ما

"سرِ دلبراں" کو "حدیثِ دیگراں" کی صورت میں پیش کرنے کا قدیم و جدید کون سا شاعر قائل نہیں۔

غالب

ہرچند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

اقبال

برہنہ حرف نگفتن کمالِ گویائی است
حدیثِ خلوتیاں جز بہ رمز و ایما نیست

دونوں میں وہ حسنِ تجسس و تلاش نمایاں نظر آتی ہے۔ جو ہر عظیم المرتبت شاعر کو فطرت نے ودیعت کی ہے۔

اقبال

جلوۂ حسن کہ ہے جس سے تمنا بے تاب
پالتا ہے جسے آغوشِ تخیل میں شباب
آہ موجود بھی وہ حسن کہیں ہے کہ نہیں
خاتمِ دہر میں یا رب وہ نگیں ہے کہ نہیں
بے تاب ہے ذوق آگہی کا
کھلتا نہیں بھید زندگی کا

غالب

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیا ہے
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے
سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

اقبال اپنے پیش رو کی اس شوقِ دید کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

دے دیا میری آنکھ کو اس حسن کی منظور ہے
جن کے سوزِ زندگی ہر شے میں جو مستور ہے

غالب ہماری ناواقفیت کی طرف اس شعر میں اشارہ کرتا ہے ؎

محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

نگاہ پر اسرار ابہام ہے کہ نگہِ آشنائی کے باوجود حقیقت کی [illegible] نہ ہو۔

اقبال

اگر بینۂ ایں کائنات در نشوی
نگاہ را بہ تماشا گداز نتواں ساخت

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

حقیقت اسی وقت نظر آتی ہے جب نگاہِ شوق شریکِ بینائی ہو۔

کچھ اور ہی نظر آتا ہے کار و بارِ جہاں
نگاہِ شوق اگر ہو شریکِ بینائی

غالب کے نزدیک "دیدہ ور" کی یہ تعریف ہے۔

دیدہ ور آنکہ تا نہد دل بہ شمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد رقصِ بتانِ آذری

غالب صوفی ہے اور یقین رکھتا ہے کہ حقیقی وجود صرف ذاتِ الٰہی کا ہے اور دیگر اشیاء کی ہستی کا محض وہم ہے۔

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیِ اشیا مرے آگے

ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی
ہرچند کہیں کہ ہے نہیں ہے

اقبال کائنات کے وجود کو مانتے ہیں۔ اس کا وجود اس خودی کا رہینِ منت ہے جو اس کے ذرہ ذرہ میں جلوہ گر ہے۔ یہی خودی ترقی یافتہ شکل میں انسان کی ذات میں شعور حاصل کرنے کے بعد نمایاں حیثیت اختیار کرتی ہے۔

صوفی غالب کائنات کے وجود کی توجیہ "کنت کنزاً مخفیاً" الخ کو مدِ نظر رکھکر کرتے ہیں۔

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

اس نظریہ میں اقبال بھی غالب کے ہم نوا ہیں۔

صورت گرے کہ پیکرِ روز و شب آفرید
از نقشِ این و آں بہ تماشائے خود رسید

فرق صرف اتنا ہے کہ غالب عالمِ شہود کو نورِ ایزدی کا پرتو حقیقت پر تو مانتے ہیں اور ہیچ سمجھتے ہیں۔

شاہدِ ہستیِ مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ ہے پر ہمیں منظور نہیں

اقبال کی دوررس نظر اس میں بھی خودی کو جلوہ گر دیکھتی ہے۔ وہ اسرار میں افلاطون کی یوں خبر لیتے ہیں۔

فکرِ افلاطوں زیاں را سود گفت
حکمتِ او بود را نابود گفت
بس کہ از ذوقِ عمل محروم بود
جانِ او وارفتۂ معدوم بود

البتہ عالمِ انسانی کے سامنے عالمِ فطرت کا وجود محض اضافی و اعتباری ہو کر رہ جاتا ہے۔

ہستی ہیں اندیشہ وفا دیدہ تا   چو زماں وچو مکاں شوخی افکار منست

نظریہ کی پختگی و رعنائی سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ لیکن اس میں وہ

مساس کہاں وہ عالم انسانی کی دستار فضیلت ہے۔

وہ ہیں گلستاں داغ تمنا داشت   نرگس طناز او چشم تماشا داشت

غالب اپنے شاعرانہ انداز میں عالم قدرت کی بہار کا معشوق کی بہار سے

مقابلہ کر کے اسے کس دلنشیں پیرایہ میں معشوق کو مرجح حیثیت سے پیش کرتا ہے۔

گل را ز دائر گست را تماشا   تو داری بہارے کہ عالم ندارد

آدم خاکی کی فضیلت اس کی تخلیق کاریوں میں مضمر ہے۔ اقبال خدا پر

واضح کرتا ہے کہ فطرت کی دی ہوئی چیزوں کو اس نے اپنی تخلیقی قوت سے کیا سے

کیا بنا دیا۔

تو شب آفریدی چراغ آفریدم   سفال آفریدی ایاغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم   من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم

غالب بھی اپنی ذات اور قوت ایجاد و استقلال سے ناواقف نہیں:۔

برگ طرب ساختیم و بادہ گرفتیم   ہرچہ طبع زمانہ بیہدہ سرزد

شاخ چہ بالا گر ارمغاں گل آورد   تاک چہ نازد اگر صلائے ثمر زد

دونوں شاعر فلسفہ ارتقا کی طرف مائل اور کل یوم ہو فی شان کے

قائل ہیں۔

غالب

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز   پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اقبال

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں   ہنوز بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید   کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

حقائق حیات کے ترجمانوں سے انسانی زندگی کی عظمت و برتری پوشیدہ

نہیں۔

اقبال

اے ز آداب امانت بے خبر   خویش را از دو جہاں بہتر شمر

غالب اپنے مخصوص رنگ میں کہتا ہے:۔

کس واسطے عزیز نہیں جانتے مجھے   لعل و زمرد و زر و گوہر نہیں ہوں میں

رکھتے ہو تم قدم مری آنکھوں سے کیوں دریغ   رتبہ میں مہر و ماہ سے کمتر نہیں ہوں میں

غالب کے نزدیک انسانی زندگی کا خاتمہ بالخیر یہی ہے کہ

قطرہ دریا میں جو مل جائے تو دریا ہو جائے   کام اچھا ہے وہ جس کا کہ مآل اچھا ہے

لیکن انسانی زندگی کی عظمت کا اس سے بہتر تصور نہیں ہو سکتا کہ اقبال

اس کے پیش بہا زندگی کو کسی حال میں بلند ترین شے سے بھی ضم ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔

چناں با ذات حق خلوت گزینی   ترا او بیند و اورا تو بینی

بخود محکم گزر اندر حضورش   مشو ناپید اندر بحر نورش

اپنی دلیل بھی خوب پیش کرتے ہیں۔

اگر ما نیم گرداں جام ساقی است   بہ بزمش گرمی ہنگامہ باقی است

مثال دانہ می کارم خودی را   برائے او نگہ دارم خودی را

زندگی کے لامحدود امکانات کا عقیدہ اقبال کے ہاں بڑے زور شور

سے پیش کیا گیا ہے۔ غالب کے ہاں بھی اس کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔

اقبال

این گنبد مینائی این پستی و بالائی   در شد بہ دل عاشق با این ہمہ پنہائی

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں   ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں   یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

غالب

نہ پوچھ وسعت میخانۂ جنوں غالب   جہاں یہ کاسۂ گردوں ہے ایک خاک انداز

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب   ہم نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا

دونوں آتش نواؤں کے نزدیک دل تنگ سینہ ہے اگر آتشکدہ نہیں

ہے تنگ سینہ دل اگر آتش کدہ نہ ہو   ہے عار دل نفس اگر آتش فشاں نہیں

اقبال اپنے بارے میں کہتے ہیں۔

نفس بہ سینہ گدازم کہ طائر حرمم   تواں ز گرمی آواز من شناخت مرا

سوز و ساز کی زندگی دراصل زندگی ہے۔ تپش ہی کی بدولت

فاختہ شاہین بنتی ہے۔

زندگی سوز و ساز بہ ز سکون دوام   فاختہ شاہیں شود از تپش زیر دام

سوختن ناتمام میں حیات مضمر ہے۔

تو نشناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل   چیست حیات دوام، سوختن ناتمام

تپش زندگی کو زندہ تر کرتی اور بال و پر بخشتی ہے۔

تپش میکند زندہ تر زندگی را   تپش می دہد بال و پر زندگی را

اقبال کی تعلیم ہے کہ آرزو کو دل میں زندہ رکھ کہ تیری مشت خاک

مزار نہ ہو جائے۔

آرزو را در دل خود زندہ دار   تا نگردد مشت خاک تو مزار

غالب کی بھی یہی تعلیم ہے

نفس نہ انجمن آرزو سے باہر کھینچ   اگر شراب نہیں انتظار ساغر کھینچ

دونوں آرزوئے پیہم کے قائل ہیں اور بلند سے بلند تر ہے کے طلبگار۔

اقبال

ہر نگہے کہ مرا پیش نظر می آید — خوش نگاریست ولے خوشتر ازاں می باید

ز شرر ستارہ جویم ز ستارہ آفتابے — سر منزلے ندارم کہ بمیرم از قرارے

غالب

رفت و باز آمد ہما در دام ما — باز سر دادیم و عنقا خواستیم

ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے — میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

اقبال کا دل ناصبور اسے جنت میں چین نہیں لینے دیتا۔

دل عاشقاں بمیرد بہ بہشت جاودانے — نہ نوائے دردمندے نہ غمے نہ غمگسارے

غالب بھی ہنگامہ زائیوں کا لذت آشنا ہے۔ اس کا تصور میخانۂ بے خروش یعنی جنت سے گھبراتا ہے۔

دراں پاک میخانۂ بے خروش — چہ گنجائش شورش نائے و نوش

چہ منت نہد ناشناسا نگار — چہ لذت دہد وصل بے انتظار

ز چشم آرزومند در لالہ — ز دل تشنۂ ماہ پرکالہ

اقبال کی تمام تعلیم کا ماحصل اعزاز نفس و عالی ہمتی آزادی اور تقلید سے بیزاری ہے۔ اردو شعرا میں غالب ہی اس سلسلہ میں ان کے شریک غالب ہیں۔

اقبال

نرد فرد آمد کہ خود را او شناخت — نرد قوم آمد کہ جز با خود نساخت

گدائے میکدہ کی شان بے نیازی دیکھ — پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

اے طائر لاہوتی اس رزق سے موت اچھی — جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

زندگی از طوف دیگر رستن است — خویش را بیت الحرم دانستن است

غالب

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم — الٹے پھر آئے در کعبہ اگر وا نہ ہوا

در دام بہر دانہ نیفتم مگر قفس — چنداں کنی بلند کہ تا آشیاں رسید

تشنہ لب بر ساحل دریا ز غیرت جاں دہم — گر بموج افتد گمان چین پیشانی مرا

ہنگامۂ زبونی ہمت ہے انفعال — حاصل نہ کیجے دہر سے عبرت ہی کیوں نہ ہو

نسیہ و نقد دو عالم کی حقیقت معلوم — لے لیا مجھ سے مری ہمت عالی نے مجھے

تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد — سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

غالب ایک جگہ کہتا ہے کہ توفیق ایزدی بھی بہ اندازۂ ہمت شامل حال ہوتی ہے۔

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے — آنکھوں میں ہے وہ قطرہ کہ گوہر نہ ہوا تھا

اسی خیال کو اقبال اپنی اصطلاح میں اس طرح ادا کرتا ہے

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

جفا طلبی و خطر پسندی اقبال کی بے چینیوں کی جان اور اس کی شاعری کا ایمان ہے۔

بیا را بزم بر ساحل کہ آنجا — نوائے زندگانی نرم خیز است

بدریا غلط و با موجش در آویز — حیات جاوداں اندر ستیز است

خطر پسند طبیعت کو سازگار نہیں — وہ گلستاں کہ جہاں گھات میں نہ ہو صیاد

سعی و کوشش کی اس سے بہتر ترغیب نہیں ہو سکتی کہ وہ ذاتی کد و کاوش کو چاہے وہ گناہ کا لباس پہنے ہو کار ثواب سمجھتا ہے۔

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش — براہ دیگراں رفتن عذاب است

گر از دست تو کار نادر آید — گناہے ہم اگر باشد ثواب است

اقبال کا شہوار روزگار شبیرو بھی مردانہ صفات کا مداح ہے اور جانتا ہے کہ عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد ہے۔

دھکی میں مر گیا جو نہ باب نبرد تھا — عشق نبرد پیشہ طلبگار مرد تھا

اس کا شیوہ آرام سے بیٹھنا نہیں

اپنا نہیں یہ شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں — اس در پہ نہیں بار تو کعبہ ہی کو ہو آئے

ایذا پسند طبیعت جراحت پیکاں کو ذریعہ راحت نہیں سمجھتی۔ بلکہ اپنی دلکشائی کے لئے زخم تیغ کی خواہاں ہے

نہیں ذریعہ راحت جراحت پیکاں — وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دلکشا کہیے

دشواریوں کو وہ اس طرح عبور کرتا ہے۔

بوادی کہ دراں خضر را عصا خفتست — بسینہ می سپرم راہ گرچہ پا خفتست

اس کی ہمت دشوار پسند کے سامنے فنا کا کام بھی آسان نکلا۔

شاعر کا یہی خیال ہے کہ بیم بلا میں اپنی توانائیوں کو ضائع کرنے سے تو یہی بہتر ہے کہ بلا سے براہ راست نپٹ لیا جائے۔ بلا کا ظاہری بلا کا ڈراونا ہوتا ہے اصل حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔

بے تکلف در بلا بودن بہ از بیم بلا است

قعر دریا سلسبیل و روئے دریا آتش است

بیم و خوف پر اقبال نے بڑی فلسفیانہ نظر ڈالی وہ کہتا ہے کہ یہی تمام برائیوں کی جڑ ہے۔

لابہ و مکاری و کین و دروغ — ایں ہمہ از خوف می یابد فروغ

ہر شرے پنہاں کہ اندر قلب تست — اصل او بیم است اگر بینی درست

حلاف کی نفسیاتی تشریح کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

گر بہ جانی بحر صحرا است ۔ وگر داری بہر موجش نہنگ است

سوائے اللہ کے کسی سے ڈرنا اپنی زندگی کا آپ رہزن ہونا ہے

بیم غیر اللہ عمل را دشمن است ۔ کاروانِ زندگی را رہزن است

اقبال جرأت خانہ امروز فردا سے بیزار ہے اور انقلاب کی صدا بلند کرتا ہے۔ غالب بھی انقلابی جذبہ کا حامل اور تعمیر جہان نو کا آرزو مند ہے۔

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم ۔ قضا بگردشِ رطلِ گراں بگردانیم

بجنگ باج ستاناں شاخسارے را ۔ تہی سبد ز درِ گلستاں بگردانیم

اقبال جرات رندانہ کا قائل ہے انسان اسی کی بدولت عظیم الشان کام انجام دیتا ہے۔ محرکات عمل ہیں۔ یہی قافلہ سالار ہے۔ عقل جس سے یہ شے کوسوں دور ہے۔ قافلۂ حیات کی رہبری کرنے سے قاصر ہے۔ عشق جو سرتاسر جرات رندانہ ہے کشاں کشاں اس قافلہ کو منزل تک لے جاتا ہے۔

عقل ہم عشق است واز ذوقِ نظر بیگانہ نیست

لیکن ایں بیچارہ را آں جرات رندانہ نیست

ہر دو بہ منزلے رواں ہر دو امیر کارواں

عقل بحیلہ می برد عشق برد کشاں کشاں

غالب شاعرانہ انداز میں کہتا ہے۔

اب لب سے مل ہی جائیگا بوسہ کبھی تو ہاں ۔ شوقِ فضول وجرات رندانہ چاہیئے

غالب کے نزدیک وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے اس صفت سے متصف ہونے پر وہ برہمن کو بھی اس قدر لائق احترام سمجھتا ہے کہ کعبہ کو اس کا مدفن ٹھہراتا ہے۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے ۔ مرے بتخانہ میں تو کعبہ میں گاڑو برہمن کو

اقبال بھی غالب کا ہم نوا ہے

دین سراپا سوختن اندر طلب ۔ انتہالش عشق و آغازش ادب

کافر بھی ہو تو شایستہ زنار ہو۔

من نگویم از بتاں بیزار شو ۔ کافری شائستۂ زنار شو

طلب صادق وعشق حقیقی ہی آئیڈیل انسان یعنی مومن کا نشان امتیاز ہے۔

مومن از عشق است عشق از مومن است ۔ عشق را ناممکن ما ممکن است

یہ اگر موجود ہو تو کافر بھی مسلمان ہے اور اگر مفقود ہو تو مسلمان بھی کافر و زندیق ہے۔

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی ۔ نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

اقبال عشق کی کارفرمائیوں پر اس طرح روشنی ڈالتا ہے۔

سنگ اگر بہ تیشہ زد ایں چہ مقام گفتگو است

عشق بدوش میکشد ایں ہمہ کوہسار را

غالب بھی عشق کی کارفرمائیوں سے نا واقف نہیں وہ کہتا ہے کہ اگر حضرت ابراہیم آتش نمرود سے نہیں جلے تو کیا بات ہوئی۔ مجھے دیکھو کہ بے شرر و شعلہ سوزاں و بریاں ہو رہا ہوں۔

شنیدہ کہ بہ آتش نسوخت ابراہیم ۔ بہ بیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

طعن و تشنیع، شکوہ و شکایت شعرا کا عام شیوہ ہے۔ غالب سراپا ساز آہنگ شکایت ہے۔

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے

کل تلک تیرا بھی دل مہر و وفا کا باب تھا

یاد کر وہ دن کہ ہر اک حلقہ تیرے دام کا

انتظارِ صید میں اک دیدۂ بے خواب تھا

مجازی رنگ سے قطع نظر حقیقی رنگ میں وہ کہہ گیا ہے۔

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند

گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں

چوں زبانہا لال و جانہا پر ز غوغا کردۂ

بایدت از خویش پرسید انچہ با ما کردۂ

گر نہ مشتاقِ عرضِ دستگاہِ حسنِ خویش

(جاں فدایت) دیدہ از بہر چہ بینا کردۂ

اقبال بتان مجازی کو منہ نہیں لگاتا۔ وہ جبریل کو طعنہ دیتا ہے اور دامن یزداں سے آلجھتا ہے معشوق حقیقی سے اسکی بے تکلف شوخی اس کے بلند تر مقام پر ہونے کی دلیل ہے۔ اس کی زندہ جاوید نظم "شکوہ" اس صنف میں واسطۃ العقد ہے۔ دیگر منتشر گوہر ملاحظہ ہوں ؎

ذکر تقلید سے جبریل میرے جذب و مستی کی

تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

تو نے بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں

کارِ جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر

روزِ حساب جب مرا پیش ہو دفترِ عمل

آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

ذیل کے ہم مضمون اشعار سے غالب و اقبال کے باطنی ذوق
خلق پر مزید روشنی پڑتی ہے۔

پیمیش زندہ دلاں زندگی جفاطلبی ست (اقبال) سفر بکعبہ نکردم کہ راہ بے خطر است
چہ لطف رہروی آنرا کہ خار رہ نے نیست (غالب) مرو بکعبہ اگر راہ ایمنی دارد
زماں ز صد ساز اگر خستہ تن شوی (اقبال) خوگر بہ خار شو کہ سراپا چمن شوی
غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو بیش از یک نفس (غالب) برق سے کرتے ہیں روشن شمع ماتم خانہ ہم
رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج (〃) مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں
ہست ایں میکدہ و دعوت عام است اینجا (اقبال) قسمت بادہ باندازۂ جام است اینجا
گر نی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر (غالب) دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر
رگوں میں گردش خوں ہے اگر تو کیا حاصل (اقبال) حیات سوز جگر کے سوا کچھ اور نہیں
رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل (غالب) جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو وہ لہو کیا ہے
ایں حرف نشاط آور می گویم و می رقصم (اقبال) از عشق دل آساید باایں ہمہ بیتابی
عشق سے طبیعت نے زیست کا مزہ پایا (غالب) درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا
عشق کی گرمی سے ہے معرکۂ کائنات (اقبال) علم مقام صفات عشق تماشائے ذات
رونق ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے (غالب) انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں
صف جنگاہ میں مردان خدا کی تکبیر (اقبال) جوش کردار سے بنتی ہے خدا کی آواز
ہے مگر جرأت کردار نفس یا دو نفس عوض یک دو نفس قبر کی شبہائے دراز
آخر کار نہ پیدا ست و کہ در تن فرو (غالب) کف خونے کہ بداں زینت دامے نہ دہی
رہزناں اجل از دست تو ناگاہ برند 〃 نقد ہو نے کہ سبو نے بہارے نہ دہی

دونوں کے ہاں بات وہی ہے۔ لیکن غالب اسے شعریت کے غم میں رنگین کر کے پیش کرتا ہے۔ ایسے ہی مواقع پر پروفیسر ابوظفر عبدالواحد صاحب کے مشہور قول کی یاد آتی ہے۔ "غالب کی شعریت فلسفہ پر سدا غالب رہی۔ لیکن اقبال کی فلسفیت بعض اوقات شعریت پر غالب ہو جاتی ہے۔ یہی اس کی (یعنی اقبال کی) شاعرانہ کمزوری ہے۔"

مندرجہ بالا مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ اقبال غالب کے انداز بیان سے کافی متاثر تھے۔ غالب کے ہاں خودی و خودداری کی چنگاریاں [illegible] ہاں اقبال کے ہاں وہی آگ نظر آتی ہے [illegible]

[illegible]

کو انتہائی تکمیل تک پہنچایا۔ پروفیسر خلیفہ عبدالحکیم صاحب بھی شاہد ہیں کہ غالب کا رنگ ان پر (اقبال) پر فطرتاً غالب تھا۔ وہ غالب کے نہ صرف مداح تھے بلکہ اس کے انداز بیان سے بھی متاثر تھے۔

غالب نے قدیم قافیہ پیمائی سے انحراف کیا اور معنی آفرینی سے کام لیا وہ خود ایک خط میں لکھتے ہیں۔ "بھائی شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں۔" اقبال نے معنی آفرینی یعنی "بت گری" سے بھی انحراف کیا اور "آدم گری" کو مقصود فن شاعری ٹھہرایا۔ غالب کے ہاں "خارا شگافی" کے ساتھ "شیشہ سازی" اور "قاہری" کے ساتھ دلبری کا کافی عنصر پایا جاتا ہے۔ اقبال کے ہاں "شیشہ سازی" و "دلبری" کم اور "خارا شگافی" و "قاہری" زیادہ ہے۔ اقبال نے شاعری میں نئی توانائی پیدا کی۔ غالب کی "بلبل و قمری" اقبال کے ہاں باز و شاہین بن جاتی ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ اقبال کبھی کبھی "دلبری" سے زیادہ "قاہری" پر اتر آتے ہیں۔ اور غالب کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ اس کی قاہری میں بھی انداز دلبری نمایاں رہتا ہے۔ لیکن اقبال اس لحاظ سے کہ وہ ایک کلی و جامع الاطراف تصور حیات پیش کرتے ہیں۔ غالب کو منزلوں پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

باوجود فکر و احساس کی مشابہت کے دونوں کے درمیان بنیادی اختلافات کی خلیج بھی حائل ہے۔ "انا" یا وجود جو اقبال کے فلسفیانہ نظام کا سنگ بنیاد ہے غالب کے ہاں سنگ راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگ گراں اور

اقبال دلدادۂ وجود اور غالب جاں دادۂ عدم ہے

نظر میں ہے ہماری جادۂ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

اقبال کی غیرت و خودداری کا تقاضہ یہ ہے کہ انسان اپنی ہمت پر بھروسہ کر کے اپنی منزل آپ طے کرے۔ غالب کی خودداری آزادانہ عمل کی تحریک کرنے کے بجائے اسے قناعت کا سبق پڑھاتی ہے۔

کتنے پیئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ
ہے یوں کہ مجھے درد تہ جام بہت ہے

[illegible]

وہ اکثر اپنا دکھڑا روتا ہے اور اپنی بے بسی و بدقسمتی اس طرح بیان کرتا ہے کہ اگر کوثر بھی مجھے مل جائے تو بدبختی سے اس میں نمی باقی نہ رہے۔ اور اگر طوبیٰ بھی حاصل ہو جائے تو وہ خشک ہو کر ایندھن کے کام میں آ سکے۔

کوثر اگر بہ من رسد خاک خورم زبے نمی
طوبیٰ اگر زمن شود ہیمہ کشم زبے بری

اقبال اس " ذوق شیون " سے بیزار ہے وہ شاعروں سے خطاب کرکے کہتا ہے ؎

مثل بلبل ذوق شیون تا کجا
در چمن زاراں نشیمن تا کجا

بہر حال غالب اور اقبال کے کلام یعنی " نالہ طائر زیر دام " اور " نالہ طائر بام " میں فرق ہونا لازمی ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ اقبال نے سب سے پہلے " سر خودی " کما حقہ فاش کیا۔ ورنہ مشرق میں " وہی کاسہ وہی آتش " تھی۔ لیکن غالب کی شخصیت اس لحاظ سے یادگار ہے کہ دیگر اردو شعرا " کنار آب رکنا باد " ہی رہ گئے۔ اور یہ اپنا مرکب " سلک خودی " تک لایا اور آفتاب اقبال کے طلوع ہونے کے آثار اپنے کلام میں پیدا کئے۔ اقبال کی طرح اس کی نغمہ پردازیوں میں بھی " دلے شاعری چیزے دگر " نظر آتی ہے۔ " بانگ اسرافیل " کم سہی لیکن نغمۂ جبریل بکثرت موجود ہے۔ اور خود اقبال کہتا ہے۔

وہ شعر کہ پیغام حیات ابدی ہے
یا نغمۂ جبریل ہے یا بانگ سرافیل

بکھرے تارے

(جناب فراق گورکھپوری)

تمام خستگی و ماندگی ہے عالمِ ہجر   تھکے تھکے سے یہ تارے تھکی تھکی سی رات
تری غزل تو نئی رُوح پھونک دیتی ہے   فراق دیر سے ملتی نہیں ہے نبضِ حیات

چھلک کے کم نہ ہوا ایسی کوئی شراب نہیں   نگاہِ نرگسِ رعنا ترا جواب نہیں
زمین جاگ رہی ہے کہ انقلاب ہے کل   وہ رات ہے کوئی ذرّہ بھی محوِ خواب نہیں

یہ نکہتوں کی نرم روی یہ ہوا یہ رات   یاد آرہے ہیں عشق کو ٹوٹے تعلقات

چاند اک گیت رات گاتا تھا   گنگناتا ہو جیسے اک مُردہ

شام بھی تھی دھواں دھواں حسن بھی تھا اُداس اُداس   دل کو کئی کہانیاں یاد سی آ کے رہ گئیں

اب دورِ آسماں ہے نہ دورِ حیات ہے   اے دردِ ہجر تو ہی بتا کتنی رات ہے

[illegible] ہو کر پچھلا رات کو   وہ درد اُٹھا فراق کہ میں مسکرا دیا

[illegible]   [illegible] سے چادر سی مگر سرکا ہوا ہوتا ہے

[illegible]   [illegible]

سلطانہ رضیہ

(از حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب مدظلہ)

دلی شاہجہان آباد کے بازار چتلی قبر سے بھوجلا پہاڑی کی طرف جائیں تو ایک محلہ بلبلی خانہ آتا ہے۔ جہاں رجی بجی کی قبر موجود ہے۔ یہ رجی بجی درحقیقت سلطانہ رضیہ ہیں۔

میں نے یہ مقام کئی بار دیکھا ہے۔ اور ایک دفعہ میرے ساتھ نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر سر اکبر حیدری مرحوم صدر اعظم حیدرآباد دکن بھی یہ مزار دیکھنے گئے تھے۔ اور مجھے پورا یقین ہے کہ شہنشاہ ہندوستان سلطان التمش کی بیٹی رضیہ سلطان بیگم کا مزار یہی ہے۔ اور عوام نے رضیہ سلطانہ لفظ کو بگاڑ کر رجی بجی بنا دیا ہے۔

رضیہ سلطانہ مسلمان بادشاہوں میں پہلی عورت تھی جس نے ساڑھے تین برس تک تمام ہندوستان پر حکومت کی تھی۔ اور جس نے اسلامی شرع کو ہندوستان میں جاری کیا تھا۔ ہندوستان میں عربوں اور ترکوں اور پٹھانوں اور مغلوں کی حکومت ہزار برس سے زیادہ عرصہ تک رہی مگر سوائے رضیہ سلطانہ کے اور کوئی عورت کبھی ہندوستان کی حکمراں نہیں ہوئی۔

آج میں رضیہ سلطانہ کے مختصر حالات بیان کرنے چاہتا ہوں مفصل حالات بیان کرنے چاہتا بھی تو بھی ایسا نہ کر سکتا۔ کیونکہ پرانے زمانے کے مورخوں نے رضیہ سلطانہ کی حکومت کے حالات لکھنے میں بڑے بخل سے کام لیا ہے۔ اس لئے مجھے یہ مضمون تیار کرنے کے لئے بہت سی تاریخوں کو دیکھنا پڑا۔ اور ہر مقام سے تھوڑا تھوڑا اقتباس کر کے میں نے یہ تذکرہ بطور ایک فلم کے جوڑ جوڑ کر تیار کیا ہے۔

سلطان شمس الدین التمش

رضیہ سلطانہ کا ذکر شروع کرنے سے پہلے مجھے اُس زمانے کے کچھ تاریخی حالات بیان کرنے ضروری ہیں۔ تاکہ مطلب اچھی طرح سمجھ میں آجائے۔

جب سلطان شہاب الدین محمد غوری نے راجہ پرتھی راج کو کرنال کے قریب شکست دی اور راجہ پرتھی راج کو قتل کر کے اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی تو اپنے ایک غلام قطب الدین ایبک کو اپنا جانشین بنا کر ہندوستان سے غزنی چلا گیا۔

سلطان قطب الدین ایبک نے ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے اور مضبوط مقامات اور صوبے فتح کر لئے۔ تو اُس نے بدایوں کا صوبہ اپنے ایک غلام شمس الدین التمش کو دیا تھا۔

شمس الدین التمش ایک بہت اچھے خاندان کا ترک تھا۔ اس کا باپ ایک بڑے جتھے کا سردار مانا جاتا تھا۔ شمس الدین کے کئی بھائی تھے اور شمس الدین اپنے سب بھائیوں میں زیادہ خوبصورت تھا۔ اس لئے اُس کے بڑے بھائی برادران حضرت یوسف کی طرح التمش سے حسد کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ باپ کی محبت چھوٹے بیٹے تک محدود نہ رہے اور بڑوں کے حصہ میں آجائے۔ اس لئے بڑے بھائیوں نے باپ سے شکار کی اجازت لی اور چھوٹے بھائی کو ساتھ لے گئے۔ اور وہاں جا کر التمش کو غلاموں کی تجارت کرنے والے ایک سوداگر کے ہاتھ بیچ ڈالا۔ اور اس سوداگر نے شمس الدین کو بغداد کے قاضی کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

حضرت مولانا قاضی حمید الدین ناگوری روایت کرتے ہیں جو حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے استاد تھے کہ ایک رات میں بہت سے مشایخ صوفیہ کے ساتھ بغداد کے قاضی کے ہاں مہمان تھا۔ جہاں رات بھر قوالی ہوتی رہی۔ اور ایک نہایت خوبصورت ترک بچہ جو قاضی صاحب کا غلام تھا۔ ساری رات کمر باندھے کھڑا رہا۔ کبھی شمع کا گل کترتا تھا۔ کبھی مہمانوں کو پانی پلاتا تھا اور کبھی آنکھیں بند کر کے قوالی کے اشعار پر جھومتا تھا اور کبھی اپنے آقا کی آواز پر دوڑا ہوا جاتا تھا اور ادب سے ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑا ہو جاتا تھا۔ مشایخ جتنے جمع تھے وہ سب اسلامی دنیا کے نامور لوگ تھے۔ اور اُن میں سے ہر ایک التمش کی مستعدی اور تہذیب اور شائستگی پر تعجب کرتا تھا۔

جب قوالی ہو چکی تو قاضی صاحب نے مہمانوں سے کہا۔ میرے اس غلام پر آپ سب لوگ توجہ ڈالئے تاکہ اس کو اللہ تعالیٰ دین کی اور دنیا کی فلاح عطا فرمائے۔ یہ سنکر تمام اولیاء اللہ نے التمش کو بیچ میں بٹھالیا اور سب نے اُس پر توجہ ڈالی اور دعائے خیر کی۔

حضرت مولانا قاضی حمید الدین ناگوری روایت کرتے ہیں کہ میں قوالی اور سماع کا بہت زیادہ دلدادہ تھا اور حکومت سلطان شمس الدین التمش کی تھی۔ اور سلطان نے فرمان جاری کر رکھا تھا کہ کوئی شخص سماع کی مجلس نہ کرنے پائے لیکن جب سماع سننے والوں نے اس حکم کی تعمیل نہ کی تو سلطان نے حکم دیا کہ جس مکان میں قوالی کی مجلس ہوگی اُس مکان کا مالک جواب دہ سمجھا جائیگا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ کوئی شخص اپنا مکان مجلس سماع کے لئے نہ دیتا تھا۔ اور مجھے قوالی سنے ہوئے عرصہ ہو گیا تھا۔ اور قوالی کے بغیر میری روح بہت افسردہ تھی۔ اس لئے میں نے ایک مکان دار سے یہ معاملہ کیا کہ وہ مجھے اپنا مکان کرائے پر دیکر دہلی سے باہر چلا

ران کے دو حسن

(از جناب آغا محمد اشرف ایم ۔ اے)

آقائے حسین تقی زادے کا نام شاید آپ کو یاد ہوگا۔ پروفیسر
ے انقلاب ایران کی تاریخ میں ان کا ذکر بہت وضاحت سے کیا ہے
ے کہ ایرانی پارلیمنٹ اور دستور کی بنیادیں انہی کے ہاتھوں استوار
۔ ایران میں دستوری حکومت قائم کرنے کے سلسلے میں آقائے تقی زادے
ن مصیبتوں میں سے گذرنا پڑا۔ ایک مرتبہ تو بغاوت کے جرم میں انہیں
سنا دی گئی۔ مگر چند جان نثار دوستوں کی مدد سے بچ گئے۔ جب دستوری
قائم ہوگئی تو ایک عرصے تک یہ ایران کے وزیر مالیات رہے۔ اور بعد
ہی طرف سے سفیر ہو کر امریکہ اور فرانس گئے۔ کچھ سال ہوئے کہ
پہلوی سابق شاہ ایران سے کسی بات پر ان کا اختلاف ہوگیا تھا۔ اور
ن آن کر بس گئے تھے۔ یہاں سکول آف اورینٹل اسٹڈیز نے انہیں
لیکچرار مقرر کر دیا۔ اور جب میں ۱۹۳۹ء میں پہلی دفعہ ان سے ملا ہوں
ن سے کالج کے ساتھ اُٹھ کر کیمبرج چلے آئے تھے اور یہیں طالب علموں
پڑھاتے تھے۔

کوئی پچاس پچپن کے قریب عمر۔ چھوٹا قد۔ بھرا ہوا جسم۔ ڈاڑھی منڈی
دی چھوٹی مونچھیں۔ جن میں اب سفید بال نمایاں ہو چلے تھے۔ جھکے ہوئے
ہاتھ میں کتابوں کا تھیلا لئے آقائے تقی زادے گیارہ بجے کے قریب
اموشی کے ساتھ آن کر اُستادوں کے کمرے میں بیٹھ جاتے تھے۔ اس قدر
کہ شروع میں ان سے بات کرتے ہوئے مجھے ذرا تکلف محسوس ہوا۔ آخر
کسی نے میرا ان سے تعارف کرا دیا۔ اور آقائے تقی زادے نے نہایت
سے ہندستان کا ذکر مجھ سے کیا۔ ایک ایک لفظ ٹھہر کر بولنا اور وہی ایرانی
اخلاق۔ پہلی ہی ملاقات کا میرے دل پر بہت اثر ہوا۔ اس کے بعد
سب ہم دونوں کو فرصت ملتی کرائسٹ کالج کے باغ میں ٹہلا کرتے۔
ساتالاب بھی ہے۔ اس کے متعلق روایت مشہور ہے کہ انگلستان

کا مشہور شاعر ملٹن یہاں تیرا کرتا تھا۔ چنانچہ اس تالاب کی زیارت کے لئے
بہت سے ملٹن کے مداح اب تک آتے رہتے ہیں۔ آقائے تقی زادے اسی
تالاب کے کنارے حافظ، سعدی اور عمر خیام کا ذکر کرتے تھے۔ اور کیمبرج میں
بیٹھ کر مجھے شیراز و اصفہان کا لطف آ جاتا تھا۔

ستمبر ۱۹۴۱ء میں رضا شاہ پہلوی تخت ایران سے دست بردار ہوئے۔
اس کے چند دن بعد میں نے اخبار میں پڑھا کہ آقائے تقی زادے کو حکومت
ایران نے لندن میں اپنا سفیر مقرر کیا ہے۔ اس خبر سے واقعی مجھے ایسی خوشی
ہوئی جیسے میرا کوئی اپنا عزیز اس عہدے پر مقرر ہوا ہے۔ کیونکہ کیمبرج کے
زمانے میں ان کی خدمت میں مجھے ایسی ہی مقبولیت حاصل ہوگئی تھی۔ میں نے
اسی وقت انہیں مبارکباد کا خط لکھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے مجھ سے کہا
کہ ایرانی سفارت خانے میں آن کر کسی وقت مجھ سے ملو۔ ان دنوں میں لندن
سے کوئی سو میل باہر رہا کرتا تھا۔ وقت اور دن مقرر کرنے کے بعد میں ایرانی
سفارت خانہ میں جا پہنچا۔ ایرانی سفارت خانے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ
اس کے دروازے پر لندن کے اور سفارت خانوں کی طرح صرف انگریزی ہی نہیں
بلکہ فارسی زبان میں بھی سفارت خانے کا نام لکھا ہوا ہے۔ دروازہ بند تھا
میں نے گھنٹی بجائی۔ ایرانی دربان نے دروازہ کھولا۔ اور ایرانی قاعدے کے مطابق
میرا استقبال کیا۔ اسے غالباً میرے آنے کی اطلاع تھی۔ یہ سیدھا مجھے سفیر
ایران کے کمرے میں لے گیا۔ سبز مخمل کا پردہ اُٹھا اور سامنے ایک نہایت
خوبصورت میز کے پاس آقائے تقی زادے بیٹھے نظر آئے۔ ان کا کمرہ ایرانی
قالینوں، فانوسوں اور ایرانی تصویروں سے اس طرح آراستہ کیا گیا تھا کہ
یہ لندن کا ایک حصہ نہیں بلکہ ایران کا ایک ٹکڑا معلوم ہوتا تھا۔ تقریباً دو سال
بعد آج میں آقائے تقی زادے سے پھر مل رہا تھا۔ اس عرصے میں یہ بے حد کمزور
ہو چکے تھے۔ ان کی آواز پہلے ہی نحیف تھی اب اور بھی ہلکی ہوگئی۔ مگر ان کے
خلوص اور محبت کی گرمی میں کوئی فرق مجھے محسوس نہیں ہوا۔ تقریباً آدھے گھنٹے
تک ہم ایرانی قہوہ پیتے اور دُنیا بھر کی باتیں کرتے رہے۔ اصل میں میں بی۔بی۔سی
کے سلسلے میں اُن سے انٹرویو کرنا چاہتا تھا۔ مگر ان کے مزاج میں اس قدر
انکسار اور عجز ہے کہ کسی طرح ریڈیو پر اپنا نام یا اپنے متعلق کچھ سُننا نہیں
چاہتے تھے۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں انٹرویو دینے پر آمادہ کیا۔ اپنی
زندگی میں مجھے سینکڑوں لوگوں سے انٹرویو کرنے کا اتفاق ہوا ہے۔ مگر جو
انکسار میں نے آقائے تقی زادے میں دیکھا اس کی مثال مجھے کسی اور شخص میں
نظر نہیں آتی۔ وہ بار بار یہی کہتے تھے کہ اچھا بس اتنا کہہ دینا کہ میں فلاں شخص سے

ملا تھا۔ اور بس۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کی مشرقی زندگی کا ایک جز تھا۔ ایسا جز جو اب مشرق میں مفقود ہوتا جاتا ہے۔

احمد شاہ خاندانِ قاچار کے آخری تاجدار تھے۔ ان کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ اور انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی شاہزادہ حسن کو اپنا ولی عہد مقرر کیا تھا۔ رضا شاہ پہلوی نے خاندانِ قاچار کو ایرانی حکومت سے برطرف کیا تو احمد شاہ حسن ایران سے پیرس چلے آئے۔ احمد شاہ قاچار کا پیرس ہی میں انتقال ہوا۔ اور جب موجودہ جنگ چھڑی ہے تو اس وقت شاہزادہ حسن قاچار لندن میں مقیم تھے۔ جنوری سنہ ۴۰ء میں مجھے شاہزادہ حسن سے لندن کے ایک مشہور ہوٹل میں ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کا سرخ و سپید رنگ۔ اور بشاش چہرہ دیکھکر پہلی نظر میں میں یہ سمجھا کہ یہ ایرانی نہیں بلکہ یوروپین ہیں۔ انگریزی بھی یہ فرانسیسی لہجے میں بولتے تھے۔ اور میرا خیال ہے کہ فرانسیسی زبان پر انہیں خوب قدرت حاصل تھی۔ بغیر فریم کی ایسی عینک جو ناک کے بانسے پر چپک جاتی ہے ان کی روشن آنکھوں کو اور نمایاں کر رہی تھی۔ اور بار بار یہ اپنی عینک کو ناک پر جمانے رہتے تھے۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں ایک سال پہلے ایران کی سیاحت کر چکا ہوں تو بہت اشتیاق سے اپنے وطن کا حال پوچھتے رہے اور باتوں باتوں میں رضا شاہ پہلوی کے متعلق بہت دلچسپ قصے سنائے۔ جن میں سے ایک مجھے اب تک یاد ہے۔ یہ اُس زمانے کا ذکر ہے جبکہ احمد شاہ ہر سال ایران سے یورپ جایا کرتے تھے اور ان کی غیر موجودگی میں شاہزادہ حسن کو اختیار حکومت مل جاتا تھا۔ رضا شاہ اس وقت صرف رضا خاں تھے۔ اور شاہزادہ حسن کے سامنے دربار میں ہاتھ باندھکر مودب کھڑے رہتے تھے۔ ایک روز کسی وزیر یا حکومت کے بڑے افسر نے کاغذات پیش کئے۔ کاغذات سے معلوم ہوتا تھا کہ افسر متعلقہ نے اپنا کام صحیح طور سے انجام نہیں دیا۔ شاہزادہ حسن اس پر ذرا ناراض ہوئے۔ مگر جب افسر نے معافی مانگ لی۔ انہوں نے کہا "بخشیدیم" یعنی ہم نے تمہیں معاف کیا۔ رضا خاں کے ہاتھ میں اس وقت کچھ اختیار نہیں تھا۔ مگر اسی وقت مہر دربار کہا کہ ایسے موقع پر افسر کو معاف کرنا سیاست شاہانہ کے خلاف ہے۔ اگر میری رائے پوچھئے تو اسے ایسی سزا کا حکم دیجئے کہ دوسروں کو اس سے عبرت ہو۔ شاہزادہ حسن نے جب مجھ سے یہ واقعہ بیان کیا تو کہا کہ اس وقت ہم ہنس کر چپ ہو رہے۔ مگر ہماری اس چشم پوشی اور بخشش نے ہمارا تاج و تخت ہم سے چھڑوایا اور آج اسی تخت پر رضا خاں بیٹھا ہے۔ یہ جنوری سنہ ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے اور اس وقت رضا شاہ ایران کا بادشاہ تھا۔

شاہزادہ حسن نے مجھے یہ بھی بتایا کہ میری والدہ جو ملکۂ ایران تھیں ان کی اور شاہی خاندان کی عورتوں کی رضا شاہ نے بے حد عزت و حرمت کی اور اب تک سابق ملکۂ ایران کو رضا شاہ کے حکم سے برابر پنشن ملتی ہے

شاہزادہ حسن کبھی رضا شاہ کو رضا شاہ نہیں کہتے تھے۔ بلکہ ہمیشہ رضا خاں کہا کرتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک رضا شاہ ایران کا جائز بادشاہ نہیں تھا۔ اور احمد شاہ قاچار کے مرنے کے بعد شاہزادہ حسن اپنے آپ کو ایران کے تخت و تاج کا حقدار تصور کرتے تھے۔

ستمبر سنہ ۱۹۴۱ء میں جب رضا شاہ تخت سے دست بردار ہوئے اور اتحادیوں کو اُن کے لڑکے محمد رضا شاہپور کی طرف سے چند اندیشے لاحق ہوئے تو اُڑتی اُڑتی یہ خبریں سنے میں سُنی کہ اگر محمد رضا شاہپور کی طرف سے پورا اطمینان نہیں ہوا تو شاہزادہ حسن کو ایران کا بادشاہ بنانے کی تجویز ہو رہی ہے۔ مگر چند دن بعد سرکاری طور سے محمد رضا شاہپور کی تخت نشینی کا اعلان ہوگیا۔ اور شاہزادہ حسن انگلستان میں ہی رہے۔

شاہزادہ حسن نے لندن سے کوئی تیس میل باہر ایک چھوٹے سے قصبے میں گھر لے لیا تھا۔ اور وہیں رہا کرتے تھے۔ جنوری سنہ ۴۳ء میں مجھے خبر ملی کہ دریائے ٹیمز کے کنارے ایک روز یہ ٹہل رہے تھے کہ ایکا ایکی حرکت قلب بند ہوجانے سے ان کا انتقال ہوگیا۔ آب رکنا باد اور گل گشت مصلّے کو چھوڑنے کے بعد خاندانِ قاچار کے بدقسمت شاہزادے کو دریائے ٹیمز کا کنارا پسند آیا۔ لندن میں چند مسلمانوں اور اُن کے دوستوں نے نماز جنازہ پڑھی۔ اور جب تک جنگ کی وجہ سے اُن کا جنازہ نجف اشرف نہیں بھیجا جاسکتا انہیں امانت کے طور پر لندن کے ایک قبرستان میں رکھا گیا ہے۔

یہ ایران کے دوسرے حسن تھے۔

پگڈنڈی

(جناب الطاف مشہدی)

سونے چاندی کے بچھو بیٹھے ہیں تاک لگائے
کب کوئی انجان مسافر اس رستے پر آئے
زہر ان کا بیچارے راہی کو موت کی نیند سلائے
ناداری کے جبڑوں میں دم توڑے وہ دکھیارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

حرص و ہوا کا طوفاں ہے اور ڈر ڈر ڈر جھپٹ جھپٹ
چیخیں، آنسو، آہیں، نالے اور کلوں کی کھٹ کھٹ
ہر سو ایک قیامت برپا ہر جانب اک کھٹ پٹ
فطرت کی آنکھوں سے بہہ نکلی ہے خون کی دھارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

رینگ رہے ہیں دھرتی کے سینے پر خونی سائے
انگڑائی لیتا ہے فتنے فتنے میں انیائے
ہر نئے موسم میں منزل تک کس سے جایا جائے
کرودھ کپٹ کی زہری ناگن اور انسان بچارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

ننگے ہیں افلاس کے پاؤں اور کانٹے زہریلے
میٹھی نظریں، کومل چہرے، ہیرے کے چھرے پیلے
ہاتھ سے چھیتے، رنگ برنگے، نیلے، کالے، پیلے
چھینتے ہیں سینے کی ٹھنڈک آنکھوں کا اجیارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

موڑوں سے بھرپور ہے رستہ ہر موڑ ایک خرابی
قدم قدم پر جاگے دھوکے ڈگر ڈگر بیتابی
آشاؤں کی زندہ نعشیں چنتا مست شرابی
ڈوب چلا ہے غم کے بادل میں جیون کا تارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

بھوک کی نظریں نکھرے جوبن پر جھکتی ہیں ایسے
ویرانے میں پردیسی کی نعش پہ چیلیں جیسے
یا سندر جوگن کی تھالے پر تانبے کے پیسے
لوبھ کی اگنی بھڑک اٹھی ہے پاکر پاپ سہارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

آگ کی ندی بہتی ہے چلتے ہیں خون کے تلے
ڈسنے والی لہریں ہیں یا سم آلودہ بھالے
پڑے ہوئے ہیں اب تک قدرت کے ہونٹوں پر تالے
رعشہ ہاتھوں میں، شل پاؤں، سر پر بوجھ ہے بھارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

جی کہتا ہے اس پگڈنڈی کو ہموار بنا دوں
تاریکی کو روشن کر دوں جلتے دیپ بجھا دوں
پستی کو دوں عرش کی رفعت عرش کو فرش بنا دوں
خواب سے چونکے غافل انساں جاگے عالم سارا
ان دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

ڈیوائن کومیڈی

جہنم

(از جناب فضل حق صاحب قریشی)

(اطالیہ کے شاعر اعظم دانتے کے غیر فانی شاہکار کا اختصار و اقتباس)

"اپنی حیات فانی کی نصف منزل گذار دینے کے بعد مجھے ایسا معلوم ہوا گویا میں ایک تیرہ و تاریک جنگل میں ہوں۔ راہ گم کردہ مسافر کی طرح جو سیدھے راستے سے بھٹک گیا ہو۔ ان کیفیات کا اظہار بھی ایک امر محال ہے۔ خدا کی پناہ! وہ جنگل کس قدر بھیانک اور وحشت ناک تھا۔ اور وہاں کی روئیدگی کس درجہ کرخت اور غیر موزوں تھی جس کا اب محض تصور ہی میرے دل میں اس خوف دہراس کی یاد تازہ کردیتا ہے۔ جو لحاظ تلخی موت کی اذیت سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ تاہم ان مشاہدات سے جو عبرت حاصل ہوئی، اس کی تفصیل بلا کم و کاست بیان کروں گا۔"

ان تاریک راستوں میں گم ہوکر اور اس کاوش میں سرگرداں رہ کر کسی نہ کسی تدبیر سے اس پہاڑ کی چوٹی تک جس کی بالائی فضا تقدیس سماوی سے معمور ہے پہنچ سکنا ممکن ہو جاتا دانتے قدم بڑھاتا ہی ہے کہ اس کی نگاہ کے سامنے خواہشات نفس کا مظہر خاص ——— چکبرا چیتا ——— نمودار ہوکر ترغیب معصیت دینی شروع کردیتا ہے۔ منزل مقصود تک پہنچانے والے راستے میں رکاوٹیں پیدا کرنے کے لئے اس کی شیطنت ہی کیا کم ہے کہ حرص و سرکشی کا خونخوار شیر اور حرص و آز کا نحیف و لاغر گرگ بدخصال جلوہ دکھا کر اس کے رہے سہے ہوش اڑا دیتا ہے۔ آغاز سفر ہی میں پیش آنے والی یہ مسلسل نحوستیں اس کی ہمت توڑ دیتی ہیں۔

اچانک اس کی ملاقات ایک باوقار ہستی سے ہوتی ہے جس کے لب و لہجہ کی جھجک دنیوی مسافر سے مخاطب ہوتے ہی ظاہر کرتی ہے کہ اس کی قوت گویائی عرصہ دراز تک محروم تکلم رہنے کے باعث بڑی حد تک ماؤف ہو چکی ہے ——— یہ لاطینی زبان کا شاعر اعظم ورجل ہے جو مدت تک دانتے کے لئے موضوع شعر اور کوہ پارناسس کی چوٹی پر چڑھتے وقت راہنما بنا رہا تھا۔

دانتے اپنے سفر کا حال اس سے بیان کرتا ہے۔ اس پہاڑ کی بابت جس کی جستجو ہے۔ اور ان درندوں کے متعلق بھی جن سے راہ میں رکاوٹیں پیدا ہوئیں ورجل بتاتا ہے کہ اس راستے سے ہوکر تم اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکتے۔ لیکن ایک دوسرا راستہ بھی ہے۔ اگر اس پر معمولی حادثات کا مقابلہ کرنے کی ہمت ہو تو میں راہنمائی کی خدمت پیش کرسکتا ہوں۔ تمہیں خاص قعر جہنم سے گذرنا ہوگا۔ لیکن عزم صمیم اور عقیدہ راسخ کی روشنی میں اسے طے کرکے کوہ مقدس تک پہنچ جانا ممکن ہے۔

دانتے ذرا تامل کرتا ہے۔ اس خوف کی بنا پر کہ شب دیجور کی تاریکیوں اور ان وحشت انگیز مقاموں سے ہوکر گذرنا ہوگا۔ جہاں گناہوں کی پاداش میں ابد تک قائم رہنے والی مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں۔

اسے عالم تذبذب میں دیکھکر ورجل یقین دلاتا ہے کہ ذاتی تحفظ کے لئے تم عرش پہ متمکن رہنے والی مقدس ہستی ——— مقدس بیٹرس ——— سے وہ فیض روحانی حاصل کرلوگے، جس کی ایک ہلکی سی ضیا مشعل راہ بن سکتی ہے۔ دراصل بیٹرس ہی کے ایماء پہ ورجل کے دل میں خیال پیدا ہوا تھا کہ طبقات سماوی کی سیر کرنے والے زائر کو ہر قدم پہ مدد دی جائے۔

یہ سن کر ممنونیت کے بار عظیم سے جھک جانے والا دانتے آگے چلنے پر رضامند ہو جاتا ہے۔

لہذا دونوں شدید مصائب کا مقابلہ کرتے کرتے ایک دروازے پر پہنچتے ہیں جس کی پیشانی پر دانتے حسب ذیل کتبہ پڑھتا ہے:۔

"میرے اندر سے گذر کر تم ذرا الجھن میں پہنچوگے۔
میرے اندر سے گذر کر تم دائمی عذاب الیم میں مبتلا ہوگے۔
میرے اندر سے گذر کر تم اُن لوگوں میں (جاؤگے) (جو) ہمیشہ
کے لئے گمراہ ہو چکے ہیں۔
اپنی تمام امیدیں منقطع کردو۔
اے اس جگہ سے گذرنے والو!"

یہ جہنم کا صدر دروازہ ہے جس کے پہلے سرے پر اولین طبقہ ان لوگوں سے آباد ہے۔ جن پر ہمیشہ کیلئے رحمت خداوندی کے دروازے بند کئے گئے ہیں۔ اور جو یقیناً ابد تک اپنے گناہوں کا خمیازہ بھگتتے رہیں گے۔ جہنم کے دریائے اکیرون کے اس جانب سب سے پہلا طبقہ ان ہستیوں کا مسکن ہے جو نوع انسان و ملائکہ دونوں ہی سے راندہ درگاہ کی گئی ہیں۔ ان کی زندگی لامذہبیت میں گذری ہے۔ کبھی خالق کے وجود کا اقرار کیا نہ انکار۔ غیر جانبدار، لاپرواہ ہستیاں، نیکی اور بدی کے تصور سے

...اندیہ لوگ
"اپنے دونوں ہاتھوں سے گلا گھونٹ گھونٹ کر آہ وزاری کر رہے تھے۔
ان کا شور و غوغا اتنا بلند تھا کہ ہمیشہ کے لئے
ہیبت ناک گونج تمام فضا میں پیدا ہو گئی تھی۔
اور اس پر شدید تاریکی مستزاد تھی۔
ان کی حالت ایسی تھی جس طرح طوفانِ گرد و غبار میں
ریت کے ذرّے رقص کرتے دکھائی دیتے ہیں۔"

ان روحوں کی لائقِ تنفر بے چارگی پر نظر ڈال کر گذرتے ہوئے دانتے محسوس کرتا ہے کہ جنتی قانون کے مطابق ان کی سزائیں اُن کے گناہوں کے عوض بالکل منصفانہ ہیں۔ جس طرح بے سر دکاری کی زندگی اُنہوں نے بسر کی تھی، ایسی ہی بے ساختہ طوفانِ گرد و غبار اُن کو گھیرے ہوئے ہے۔

بہرحال وہاں سے گذر کر وہ جہنم کی پانچ ندیوں میں سے پہلی ندی اکیرون پر پہنچتے ہیں۔ اس جگہ شیرون ملاح ملتا ہے۔ جو اپنی شعلہ فشاں آنکھوں سے گھور کر مُردوں کو کشتی میں گھس جانے کے لئے مجبور کرتا ہے تاکہ جہنم کے ان دائروں میں ان کو پہنچا دیا جائے۔ جہاں ان کی قسمت میں لکھا ہوا عذابِ الیم انتظار میں پیچ و تاب کھاتا رہتا ہے۔

جب ورجل واضح طور پر اپنے مختصر سماوی اختیارات کی حقیقت بیان کرتا ہے کہ مجھے ایک فانی انسان کو دریا کے پار سیر کرانے کی اجازت مل چکی ہے تو ملاح نخواستہ دانتے کو کشتی میں بٹھا کر موت سے پرے لے جانا منظور کر لیتا ہے۔

چنانچہ وہ اصل جہنم کے پہلے دائرے میں جو سب سے زیادہ بیرونی اور کم تکلیف دہ ہے اور جو خود ورجل کے رہنے کی بھی جگہ ہے۔ ایسے لوگوں کے آزردہ اور افسردہ چہروں پر پہنچتے ہیں جو عیسےٰ مسیح سے ناواقف تھے۔ کیونکہ ان کے آنے سے قبل وہ دنیا میں آباد تھے۔ اب وہ جانتے ہیں کہ عشقِ الٰہی کی کیا قدر ہے اور یہ کہ وہ ہمیشہ کے لئے اس نعمت سے محروم ہیں۔ یہ احساس ہی وہ سزا ہے جو اُن کے لئے کافی سمجھی گئی ہے۔

عین اس وقت مسافروں کے پاس سے دو رُوحیں تیرتی ہوئی گذر جاتی ہیں دانتے دریافت کرتا ہے۔
دراصل وہ پاؤلو اور فرانسسکا ہیں۔ جن کی درد بھری روئدادِ حیات اس کے باوجود آج بھی دل ہلا دینے کیلئے کافی ہے۔ اور جن کا وجود دانتے کے تخیل میں بالکل غیر فانی ہو کر رہ گیا ہے۔

قصّہ یوں ہے کہ فرانسسکا کی شادی اس کے باپ کی مرضی کے مطابق راوینہ کے ایک حاکم گوئیدو دا پولینطا سے ہوئی تھی۔ جو ایک قوی دل ہونے کے باوجود جسمانی رعنائیوں کے اعتبار سے اپنے بھائی پاؤلو کا ہم پلہ نہ ہو سکتا تھا پس ایسا ہوا کہ پاؤلو اور عروس [illegible] طور پر اپنے ذوق میں یگانگت محسوس کی۔ وہ ایک ساتھ ارتھر اور گنی ویر کی عشقیہ داستانیں پڑھتے اور سردار لانسیلاٹ کے مجرمانہ جذبات سے جن کا تعلق شہنشاہ کی ملکہ سے تھا متاثر ہوتے تھے۔ چنانچہ اس کتابِ محبت بلکہ اس کتاب کے چند جملوں نے ان کی زندگی برباد کر دی۔ اور اس شوہر نے جس کی حق تلفی کی گئی تھی ان کو فنا کا جام پلا کر جہنم کے دوسرے دائرے میں پھینک دیا۔

دانتے انہیں دیکھتے ہی بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑتا ہے۔

پھر وہ جسمانی گناہ کرنے والوں کے دو اور دائروں میں سے گذرتے اور حریص لوگوں کو کیچڑ میں لوٹتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ جن پر غلیظ پانی اور اولوں کی مسلسل بوچھاڑ پڑتی ہوتی ہے۔ کیونکہ دنیا میں انہوں نے بڑی بے اعتدالی کے ساتھ شراب پی تھی ـــــ سربیرس ـــــ جہنم کا خونخوار کتا جس کے چار سر ہیں ـــــ منہ پھاڑ کر ان پر بھونکتا ہے اور جبڑوں کے درمیان اپنے دانت اس طرح پیستا ہے جیسے ہڈیاں چچوڑتے وقت کتے عموماً کیا کرتے ہیں۔

چوتھے دائرے میں جہاں پلوتو ـــــ دولت کے دیوتا ـــــ کی سوگوار حکومت ہے، وہ سایوں کے دو نصف دائرے دیکھتے ہیں۔ جو جرم کی نوعیت کے لحاظ سے برابر مگر طبیعت کے اعتبار سے برعکس ہیں ـــــ یعنی لالچی، کنجوس اور لا پروا فضول خرچ ـــــ ان کے مشاغل نہایت دلخراش ہیں۔ ہر گروہ وزنی پتھر اُٹھا اُٹھا کر پھینکتا ہے۔ حتّیٰ کہ وہ ایک دوسرے کو زخمی کرنے لگتے ہیں۔ یہ حادثات متواتر دُہرائے جاتے ہیں۔ شور و غل اور آہ و بکا کے ساتھ آپس میں لعنت و ملامت کرتے ہوئے ـــــ ایک وہ جنہوں نے لاپرواہی سے دولت برباد کی۔ اور ایک وہ جنہوں نے مجرمانہ طور پر اُسے جمع کیا۔

ان ملعون رُوحوں کی آہ و زاری کے دل خراش نقوش پوری طرح محو ہونے بھی نہیں پاتے کہ دانتے اور اس کا راہنما ایک مکروہ اور متعفن دلدل کے قریب پہنچتے ہیں۔ اس کا نام استائکس ہے۔ دانتے دریافت کرتا ہے کہ یہ برہنہ لوگ کون ہیں جو دلدل کے اندر سے نکلتے دکھائی دے رہے ہیں۔ جن کے جسموں پر نجاست لپی ہوئی ہے۔ اور جو ایک دوسرے کو نوچ کھسوٹ رہے ہیں۔ ورجل بتاتا ہے کہ یہ قاہر ہستیاں ہیں اور ان سے نیچے مغموم کاہلوں کی روحیں ہیں۔ جن کی سرد آہوں

کے باعث کیچڑ کی سطح پر بُلبُلے نمودار ہوتے رہتے ہیں۔ یہ دُنیا میں ہمیشہ گھناؤنے اور مکروہ ماحول میں معصیت کی زندگی بسر کرتے رہے۔ اور کبھی اپنے مختصر دائرے سے باہر نظر نہ ڈالی تاکہ یہ معلوم کرتے کہ کرۂ ارض کی کائنات کس قدر دلچسپیوں اور لطافتوں سے معمور ہے۔ اسی لیے ان کو ان کی فطرت کے مطابق رکھا گیا ہے۔

اس سطحِ آب پر جہاں افسردہ دکاہل روحوں کے اضطراب وارتعاش سے صوت تموج اور جوش پیدا ہوا کرتا ہے۔ دانتے کو جہنم کے صدر مقام یعنی شہرِ ابلیس کے آتشیں گنبد و مینار دکھائی دیتے ہیں۔ اب تک انہوں نے جن طبقات کی سیر کی وہ مملکتِ معصیت کے معمولی اضلاع تھے۔ یا بالفاظ دیگر محض مضافاتِ دوزخ ——— جیساکہ بیان کیا جا چکا ہے۔ ان دُور افتادہ حصّوں میں ان لوگوں کو سزا دی جاتی ہے جنہوں نے نفس پرستی اور ریاکاری میں بے اعتدالی سے کام لیا تھا۔ لیکن اس گہرا لود شہر کے دروازوں میں سے گذر جانے کے بعد ناقابلِ بیان مصائب ونکالیف میں مبتلا ان مقہور رُوحوں کا جمِ غفیر ملتا ہے جو نوامیسِ قدرت کو توڑ کر نہایت بھیانہ طور پر ارتکابِ معصیت کرتے رہے تھے۔ اور جن کی تمام عمر دغا وفریب میں بسر ہوئی تھی۔

تین چڑیلیں میدوسا کا سر اُٹھائے (جس کی جھلک دیکھتے ہی ناظرین پتھر کے بن جاتے تھے) مسافر اور اس کے راہنما پر جھپٹ پڑتی ہیں۔ اور اگر عین اس وقت ایک فرشتۂ رحمت نمودار نہ ہو جاتا تو وہ دروازے جن کے پیچھے عدلِ خداوندی کے خوفناک اور رُوح فرسا اسرار و رموز پوشیدہ ہیں۔ اس ہستی کی نظر کے سامنے بند ہو جاتے جس کا شمار گوشت و پوست کے اعتبار سے باشندگانِ ارض میں ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے ان حقائق کے علم سے محروم رہ جاتا۔

دیواروں کے درمیان، حالتِ جانکنی میں گرفتار آتشیں غاروں میں (جن کے دہانوں پر قیامت تک تیغہ نہیں لگ سکتا) مدفون اُن کافروں کی رُوحیں ہیں جنہوں نے ذاتی تمکنت کے زعمِ باطل میں مشیت والہاماتِ خداوندی کی غلط ترجمانی کی۔ یہ چھٹا دائرہ ہے جو اُبلتے ہوئے خون کے وسیع دریا فلیگی تھون کے بیرونی ساحل سے شروع ہوتا ہے۔ دانتے کے لئے اس کو عبور کرنا لازمی ہے۔ کیونکہ وہ اس کے بغیر اس جانِ تمنا کوہِ رفعت پر نہیں پہنچ سکتا۔ جس کا چکردار راستہ دارالمحن کی حدیں ختم ہو چکنے کے بعد شروع ہوتا ہے۔ لیکن اس کو عبور کس طرح کیا جائے۔ اس جگہ ملاح کا نام ونشان بھی نہیں ہے۔ صرف سینتور رہتے ہیں ——— نچلا دھڑ گھوڑے کی مانند اور بالائی انسان کی طرح ——— گویا غیظ وغضب، وحشت ناک اور رمزیہ نمونے ہیں۔ جو ساحل دریا کے ساتھ دوڑ رہے ہیں۔ اور ان دکھ بھری مبتلائے عذاب رُوحوں کو جب وہ ساحل کے باہر چپکے سے کھسک جانے کی کوشش کرتی ہیں۔ تیروں سے چھید چھید کر خون کی ندی میں واپس دھکیل دیتے ہیں۔ لیکن ورجل اسی پوشیدہ قوت کو بروئے کار لا کر جو سماوی رسالت کے وقت عطا کی گئی تھی ایک سینتور کو یہ ترغیب دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے کہ ہم دونوں کو ... پایابِ ندی میں پہنچا دے۔

جب وہ گھوڑے کی کشادہ پشت پر سوار ہو کر خون فشاں طوفانی موجوں کو چیرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں تو ورجل بیان کرتا ہے کہ اس سہ منزلہ کے ساتویں دائرے میں ان کو سزا ملتی ہے جو اپنے پڑوسیوں، خود اپنی ہستی اور ذاتِ باری کے خلاف جنگ کرنے کے سلسلے میں مجرم قرار دیئے جاتے ہیں۔ پہلی جماعت ——— قاتلوں کی جماعت ——— دریائے خون میں غوطے کھا رہی ہے۔ اور یہی صورت ابدالآباد تک قائم رہے گی۔ اور پھر وہ کچھ فاصلے پر ساحل کی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے :-

"اور وہاں جھلستی ہوئی ریت کے اوپر پرکالہ ہائے آتشیں کے
نیچے اپنی جلی قسمت کا لکھا پورا کرنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے
خدا، خدا کی مخلوق یا قدرتِ الٰہی کے خلاف گناہوں کا ارتکاب
کیا ہے۔"

ورجل یہ بھی بیان کرتا ہے کہ تیسری جماعت یعنی اُن لوگوں میں جنہوں نے قدرت کے خلاف گناہ کئے ہیں۔ سُود خوار بھی شامل ہیں۔ سُود خواروں کا مرتبہ باعتبار نوعیتِ گناہ ملحدوں، قاتلوں، مردم آزاروں اور خودکشی کرنے والوں کے برابر سمجھا گیا ہے۔ کیونکہ خدا نے آسمانی صحائف کے ذریعہ یہ حکم نازل فرمایا تھا کہ انسان محنت و مشقت سے اپنی روزی کمائے۔ صنعت وحرفت، زراعت و باغبانی اور دیگر علوم وفنون اسی مقصد کے لئے ہیں۔ لیکن ان کے برخلاف سُود خوار نہ متاعِ دنیوی میں کسی قسم کا اضافہ کرنے کے بدلے صرف کرتا ہے اور نہ اپنی پیشانی کا پسینہ بہا کر روٹی کھاتا ہے۔ لہذا نوامیسِ قدرت کے خلاف یہ ایک زبردست گناہ ہے۔

سینتور ان کو دریا کے اندرونی ساحل پر اتار دیتا ہے۔ اور وہ تیرہ و تار جنگل میں گھس جاتے ہیں۔ یہ اُن لوگوں کا مسکن ہے جنہوں نے اپنی ہی ذات کے خلاف بغاوت کی تھی ——— یعنی خودکشی کرنے والے ...

"ہمارا گذر ایسے جنگل سے ہوا، جہاں قدموں کے اثر نے راستے کا
کوئی نشان باقی نہ چھوڑا تھا۔ وہاں کی روئیدگی، سرسبزی وشادابی
سے محروم تھی۔ اسکی بجائے خس وخاشاک کا ایک انبار تھا۔ بھورا، سیاہی
مائل۔ شاخیں ہلکی اور مخروطی نہیں تھیں بلکہ گانٹھوں کے باعث بدوضع

شاخیں ایک دوسری کے ساتھ گتھی ہوئی گنجان۔ پھلوں اور پھولوں کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ بلکہ ان کی جگہ کانٹے تھے۔ مہلک اور زہر آلود کانٹے۔ ان درختوں پر ایسے خوفناک پرندوں کا مسکن تھا۔ جن کے پنجے چوڑے، چھلکے، تیز خونریز ناخنوں سے مسلح اور جو شکل وصورت میں انسان سے مشابہ تھے۔ ان کے بڑے بڑے پیٹ پردار بازوؤں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ اس تاریک سنسان جنگل میں یہ پرندے بیٹھے ہوئے آہ وزاری کرتے رہتے تھے۔

دانتے ایک درخت کی ٹہنی توڑ لیتا ہے۔ اور یہ دیکھکر متحیر ہو جاتا ہے کہ اس سے خون کے فوارے چھوٹنے لگتے ہیں۔ اور درخت کے اعماق قلب سے آہ وزاری کے ساتھ سوز وگداز میں ڈوبی ہوئی صدا بلند ہوتی ہے :-

"تم نے مجھے زخمی کیوں کیا؟"

اس جنگل میں خودکشی کرنے والے درختوں کے روپ میں کھڑے ہیں اور ان میں سے ایک بیان کرتا ہے کہ قیامت کے دن ہر روح کو اپنا اپنا جسم واپس مل جائیگا لیکن ہم پھر بھی اپنے اصلی چولے سے محروم رہینگے۔ کیونکہ یہ کہا گیا ہے کہ جب ہم جان بوجھکر زندگی میں اپنے اپنے جسم سے دست بردار ہو چکے ہیں تو پھر کس طرح اس کے حقدار ٹھہرائے جا سکتے ہیں۔ قیامت کے بعد ہمارے جسم ہمارے قریب کے درختوں کی شاخوں پر لٹکا دیئے جائیں گے۔ تاکہ ہمارے گناہوں کی افسردہ یادگار اس طرح قائم رہے۔

مجھ سے مت پوچھ "مرے حسن میں کیا رکھا ہے"
آنکھ سے پردۂ ظلمات اٹھا رکھا ہے
میری دنیا کہ مرے غم سے جہنم بردوش
تو نے دنیا کو بھی فردوس بنا رکھا ہے

مجاز

اس پُراسرار کنج سے نکلنے کے بعد دانتے اور ورجل فلیگی تھون کی ایک معاون ندی کے ساتھ ساتھ پل پر سے گزرنے والا راستہ طے کرتے ہیں۔ اس خون آلود راستے پر چل کر جس کی ریت جھلستی ہوتی ہے وسطِ جہنم تک پہنچ سکتے ہیں۔ وہ ملعونوں کو دیکھتے ہیں کہ کباب سیخ کی طرح بُھن رہے ہیں۔ اور اُٹھنے سے معذور ہیں سُود خوار مایوسی اور پریشانی کے عالم میں ٹھوڑیاں گھٹنوں پر ٹکائے پنجوں کے بل لڑھک رہے ہیں۔

اسی اثنا میں دانتے اور ورجل آٹھویں غار یعنی میل بوغ کے بالکل کنارے پر پہنچ چکتے ہیں جس کی نگہداشت کریہہ المنظر ذوعنصری دیو جیریون کے سپرد ہے۔ ورجل دانتے سے کمر کا پٹکا لیکر نیچے لٹکاتا ہے اور اسے اپنی طرف متوجہ کرلیتا ہے۔ وہ بڑی احتیاط کے ساتھ اس کی خاردار پیٹھ پر پاؤں رکھکر غار میں اُترتے ہیں۔

نیچے جاکر دانتے دس خندقیں دیکھتا ہے۔ جن کے احاطے میں بالکل بیچوں بیچ جہنم کا وہ عمیق غار ہے جس میں دیو قامت شیطان گاڑی کے دُھرے کی مانند کمر تک منجمد کوکائٹس میں دھنسا رہتا ہے۔ اُوپر سے دیکھا جائے تو یہ آٹھواں طبقہ ایک وسیع پہیہ معلوم ہوتا ہے۔ جو ایک ہی محور کے گرد گھومنے والے دس مرکزی حلقوں سے بنا ہو۔ اس لحاظ سے درمیانی چٹانوں پر محرابوں، پشتوں، پلوں اور کمانیوں کا دھوکا ہوتا ہے جو سنگین محیط سے مرکز تک سلسلہ وار ہیں۔ یہاں کی تاریک فضا پیپ لہو اور رال کی بساندھ اور سڑے ہوئے گوشت کی عفونت سے استفراغ کی حد تک ناقابل برداشت ہے۔ ایسا محسوس ہونے لگتا ہے گویا کوڑھیوں کے شفاخانے میں پہنچ گئے ہیں۔

دانتے کا چہرہ دھوئیں کے غبار سے جو ان غلاظتوں میں سے آہستہ آہستہ نکلکر پھیلتا رہتا ہے سیاہ ہو جاتا ہے۔ وہ لپک کر اپنے راہنما کے پاس ترچھی چٹانوں کے سرے پر پہنچ جاتا ہے اور جھانک کر خندقوں میں نظر ڈالتا ہے۔ جہاں دس قسم کے فریبی اور جعل ساز اپنے گناہوں کی سزا بھگتتے ہیں۔

یہاں وہ دیکھتا ہے کہ کٹنیوں اور قرمساقوں کی کمر پر کوڑے پڑتے ہیں۔ زمانہ ساز اور خوشامدی گہری غلاظت میں غرق ہیں۔ اور وہ جنہوں نے حصولِ منفعت کی خاطر مقاماتِ مقدسہ کو فروخت کر ڈالا تھا۔ گڑھوں میں منہ ڈالے شرم سے سرنگوں ہیں۔ کچھ برہنہ لوگ جو گہری فضا کے باعث دور سے زیادہ قدآور معلوم ہوتے ہیں۔ اُلٹے پاؤں چل رہے ہیں۔ ان کے بند ہونٹوں میں سے رستے ہوئے آنسو سرینوں تک ان چہروں سے بہہ رہے ہیں جو پچکا کر اور پلٹ کر شانوں کے درمیان لٹکا دیئے گئے ہیں۔ یہ لوگ منجم و رمال پہلے سے مستقبل کا حال بتانے والے۔ چنانچہ وہ ابد تک پیچھے کی طرف دیکھتے رہیں گے اور اُلٹے پاؤں اس طرح چلیں گے کہ پنجے کی جگہ ایڑی ہوگی۔ اُف! کس قدر بے بسی کا مقام ہے۔

اسی بہتی ہوئی غلاظت کے سیلاب پر مبدلین کے ایک گروہ کا ابھار اس کے قدموں کے پاس لگ جاتا ہے۔ سانس پھول جانے کے باعث مینڈکوں کی مانند ان کے

تہ اور نیچے پٹے جا رہے ہیں۔ ساحل پر کھڑے ہوئے زِشت رو عفریت تیر اور بھالے مار مار کر ان سے دل لگی کرتے جاتے ہیں۔ ریاکاروں کا ایک گروہ گذرتا ہے جو شاندار فرغلوں میں ملبوس ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ وہ ریاکاروں کے سب سے بڑے سردار تیفاس کو جو بحالت انفعال اس جلتی ہوئی زمین پر اوندھے منہ پڑا ہے۔ اور ہمیشہ پڑا رہے گا۔ اپنے بھاری قدموں سے بیدردی کے ساتھ کچلتے رہیں۔ میل بورغ کی ساتویں خندق ساروں کے رہنے کی جگہ ہے۔ یہ عجیب اُلجھنوں اور پیچیدگیوں کے گورکھ دھندے میں مبتلا ہیں۔ ان کی ہیئت کذائی مسلسل عمل تناسخ کے ماتحت تغیر پذیر رہتی ہے۔ یعنی سانپ سے چور اور چور سے سانپ کی شکل میں۔

آٹھویں خندق کی مرتد روحیں ناقابلِ شناخت ہیں۔ کیونکہ انہی کی مجرمانہ ضمیروں کے شعلے اپنے درمیان ان کو اس طرح محصور و ملفوف کئے ہوئے ہیں کہ ناظرین کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ دراصل یہ ترغیبِ معصیت دینے والے گنہگار آتشیں ہیولے ہیں۔ یعنی وہ لوگ جنہوں نے خدا کی عطا کردہ عقل و فہم سے ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے بھولی بھالی ہستیوں کو غلط راہ پر چلایا۔ اور خود منفعت حاصل کی۔

پھر دھندلی فضاؤں اور شدید ترین سموم بخارات سے بچ بچا کر آخری خندق کے پاس پہنچتے ہیں۔ جو جہنم کے منجمد مرکزی غار سے پہلے واقع ہے۔ اس خندق میں ہر نوع کے امراضِ خبیثہ میں مبتلا حقائق کی تکذیب کرنے والے نظر آتے ہیں۔ ان کی مجسم روحیں زخموں سے نڈھال، داغ دھبوں سے بے رونق اور جگہ جگہ سے پھٹ جانے اور کیڑے پڑ جانے کے باعث پیڑائی اور مُرجھائی ہوئی جلد ایک ہولناک مگر عبرت انگیز منظر پیش کرتی ہے۔ ان میں جعلی سکّہ ساز اور کیمیاگر شامل ہیں کیونکہ انہوں نے حقیقی اشیاء کی تکذیب کی تھی۔ اور وہ لوگ بھی جنہوں نے بُری نیت سے دوسروں کی شکل و شباہت اختیار کی اور روپ بدلا۔ کیونکہ یہ افعال کی تکذیب تھی۔

الفاظ کی تکذیب کرنے والوں میں پوطیفار کی شریکِ حیات خصوصاً قابلِ ذکر ہے۔

جب ان سب کے زخموں اور خارش زدہ جلد میں ٹیس اُٹھتی ہے اور کھجلی ہوتی ہے تو وہ کھجا کھجا کر تیز تیز ناخنوں سے جسم نوچنے لگتے ہیں۔ اور تکلیف کے عالم میں بھی اپنی ہرزہ سرائی سے باز نہیں رہتے۔ ایک دوسرے پر فقرے کستے اور نجاست اُچھالتے ہیں۔ دورجہ متاثر ہو کر ورجل ملامت کرتا ہے کہ ایسی ذلیل ہستیوں کی یاوہ گوئی سننے سے کیا حاصل۔ تو شرمندہ ہو کر پھر ساتھ ہو لیتا ہے۔

مرکز جہنم کا کنارہ —— منجمد جھیل کوکائٹس —— جہاں تمام جہنمی دریاؤں کا منبع اور کبھی ختم نہ ہونے والی موت واقع ہے۔ مہیب دیو قامت ہستیوں سے پٹا پڑا ہے۔ جن کے سائے کُہر اور دُھند کے پس منظر میں زیادہ طویل ہو کر ناچتے ہیں۔ یہ نمرود کی قماش کے لوگ ہیں۔ عظیم الجثہ لیکن عقل سے اوندھے۔ قدیم عہد عتیق کے یہ وہ عفریت ہیں جن کا ذکر انجیل مقدس میں ہے۔ اور جنہوں نے انسان کو قدرت اور خالق قدرت کے خلاف بغاوت کرنے کی ترغیب دلائی تھی۔

منجمد غار کے بھی سلسلہ وار چار مدور حلقے ہیں۔ یہاں شیطان اپنے پروں کے زیر سایہ جو پن چکّی کے پنکھوں کی مانند ہیں۔ ہمیشہ اس سعیٔ لاحاصل میں مصروف رہتا ہے کہ کسی قدر اُبھر سکے۔ لیکن ہمیشہ اپنے یخ بستہ پروں سمیت زیادہ استقامت کے ساتھ دھنستا ہی چلا جاتا ہے۔ اسی جگہ دورنگی چال والے دغاباز بھی ہیں۔ جنہوں نے بیدردی کے ساتھ دھوکے دیئے۔ اپنے رفقا کو قتل کیا۔ اہل وطن کا قلع قمع اور عزیز و اقارب کا استیصال کیا۔ اور اپنے مربیوں اور بہی خواہوں کے ساتھ غداری کی۔ ہر حلقے کا نام نوعیتِ گناہ کے اعتبار سے جداگانہ ہے۔ چنانچہ اسی اصول کے مطابق آخری حلقہ یہودا کے نام پر جس نے عیسیٰ مسیح سے غداری کی تھی —— "یہودیائی" —— کہلاتا ہے۔

اور اب اگر دانتے امید کی نورانی دنیا میں جلوہ گر ہوتا اور آفتاب صبح کے طلوع ہوتے وقت مطلوبہ پہاڑ کے رنگین دامن میں پہنچنا چاہتا ہے تو اس کے لئے لازمی ہے کہ آخری خوفناک مرحلہ طے کرلے۔ ورجل جو اس تمام دل ہلا دینے والی مسافت کے دوران میں اپنے ہم سفر شاعر کے تاثراتِ دماغی اور جذباتِ قلبی کا دقیق مطالعہ کرتا رہا ہے۔ دانتے کو اونچا اُٹھا کر ڈھلواں راستے پر اُترنا شروع کر دیتا ہے۔ جس کی منزلِ آخر عرشِ اعلیٰ اور ستاروں کی نگری ہے۔

ورجل اور اس کا دوست پیکرِ عفریت کے گھنے بالوں میں سے ہوتے ہوئے اس کے اُبھرواں شانوں پر اُترتے ہیں۔ اور پھر زیادہ نیچے اُترتے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک دم دانتے محسوس کرتا ہے کہ وہ بجائے اُترنے کے درحقیقت اوپر کی طرف چڑھ رہے ہیں۔ اور دُنیائے ظلمات سے دُور آفتاب کے انوارِ رحمت میں پہنچنے کے قریب ہیں۔

غزل

(از نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی)

کیا یہ سچ ہے کہ نئی طرزِ جفا سے پہلے
مشورے ہوتے ہیں خلوت میں حیا سے پہلے

گونجتا ہے دلِ مشتاق کے ہر ذرّے میں
نغمۂ جنبشِ لب تیری صدا سے پہلے

پھول اس حسن سے آلودۂ شبنم نہ ہوا
رنگ دیکھا ترے عارض کا حیا سے پہلے

غیرتِ عشق نے مارا کہ گلہ ایک طرف
لب پہ جاں آ گئی اقرارِ وفا سے پہلے

عشق کا نام نہ لے، عشق کو بدنام نہ کر
درد کو درد بنا فکرِ دوا سے پہلے

روئیے اسکو بہت، موت ہے دراصل یہی
زندگی ختم جو ہو جائے قضا سے پہلے

گرنے والا کسی گرتے کو سنبھالے کیونکر
لغزشِ اشک بھی ہے لغزشِ پا سے پہلے

مسلکِ عشق کا رہرو جو نہیں کیا سمجھے
منزلِ ترک ہے تسلیم و رضا سے پہلے

اُف وہ بے درد جو بسمل کی تسلی کے لئے
عذر کرتا ہے نزاکت کا جفا سے پہلے

اب یہ اندازہ ہے محرومی و ناکامی کا
دل سے فریاد نکلتی ہے دعا سے پہلے

تو ہی رہبر ہو کہ اے بے خبری چل نکلا
کارواں شوق کا، آہنگِ درا سے پہلے

کتنے ہی نغمے فقط ایک خموشی میں ہیں
کان مانوس تو ہوں اس کی نوا سے پہلے

میں اُسے شعر سمجھتا ہی نہیں، جس میں اثر
حسنِ تخئیل نہ ہو، حسنِ ادا سے پہلے

افسانہ

"اُور تمہیں بھی تو ——— !"

(از جناب سلطان احمد)

غضب کا اندھیرا تھا اور کڑاکے کی سردی۔ باورچی خانہ میں کُہرا بھرا ہوا تھا۔ چولہے میں سے کچھ انگارے راکھ میں دبے جھانک رہے تھے۔ دیوار پر میلی سی لالٹین ٹنگی ہلکورے لے رہی تھی۔ اس کی مدھم روشنی میں دیواروں پر نیلی نیلی سی پرچھائیاں تیر جاتی تھیں۔ وہیں کونے میں دو ننھے بہن بھائی کمبل میں سکڑے ہوئے تھے۔ ننھی آصف بھائی سے چمٹ گئی تھی۔ اور سلیم اپنے پتلے سے کوٹ میں تھر تھر کانپ رہا تھا ——— بھوک بھی کیسی ظالم ہوتی ہے! جیسے کوئی ان کے معدوں کو اندر سے کھرچ رہا تھا۔

"ننھی! تمہیں بھوک لگ رہی ہے؟" بھائی نے پوچھا

"اور بھیا تمہیں بھی تو لگ رہی ہے!" ننھی بہن نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔

وہ ذرا سا کمبل دونوں کے لئے ناکافی تھا۔ سر ڈھکتے تو پیر ننگے ہو جاتے اور پیر اندر کرتے تو سر کھل جاتا۔ ہوا سوئیوں کی طرح ہڈیوں میں چبھ رہی تھی۔

"ننھی! تمہیں سردی لگ رہی ہے؟"

"اور بھیا، تمہیں بھی تو لگ رہی ہے!" ننھی آصف کی آنکھیں چھلک آئیں۔ وہ سسکاریاں لینے لگی۔ سلیم نے پیار سے آصف کو گود میں بھینچ لیا۔ "ارے روتی کیوں ہے پگلی؟" ——— اُس نے ننھی کے بکھرے ہوئے بالوں کو سنوارتے ہوئے کہا۔ "راجے بیٹے بھی کہیں روتے ہیں! ——— رو مت!"

"بھیا! ہمیں امّی یاد آتی ہیں ——— سچ!" ننھی نے اسی طرح بلکتے ہوئے کہا۔ سلیم کو بھی امّی کا ہنستا ہوا چہرہ یاد آ گیا۔ اُن کی زندگی میں دونوں کیسے مزے سے رہتے تھے۔ پہننے کو ریشم کے اچھے اچھے کپڑے اور چمکیلی جوتیاں ——— انہیں پہن کر دونوں شاہزادے سے لگتے تھے۔ اور چٹپٹے اور مزے مزے کے کھانے ——— وہ کھاتے کھاتے تھک جاتے مگر امّی کہتیں۔ "نہیں اور ——— !" ابّا نے ڈھیر کھلونے لا دیتے تھے۔ رنگ برنگی گڑیاں۔ چھوٹے چھوٹے باجے۔ پوں پوں کرتی ہوئی موٹریں اور کد کتے گھوڑے ——— مگر جب سے وہ اللہ میاں کے پاس چلی گئی تھیں، تب سے تو آوا کا آوا ہی ان سے خلاف تھا۔ ابّا نے نئی شادی کر لی تھی۔ نئی امّی بڑی بُری تھیں۔ جی بھر کر مارتیں۔ ان کی موٹی بیٹی زینت چٹکیاں بھرتی تھی۔ اور ابّا نے تو جیسے کانوں میں گھنگھنیاں بھر لی تھیں ——— اُن کو بھول ہی گئے تھے۔ جھوٹا کھانا ملتا تھا اور پھٹے ہوئے کپڑے۔ دن بھر چاکروں کی طرح کام کرنا پڑتا تھا پھر بھی دھتکار اور چانٹے۔ روز روز کے۔

دالان کے پردے چھوٹے ہوئے تھے۔ قمقمے روشن تھے۔ اور انگیٹھیاں سلگ رہی تھیں۔ گدیلی مسہریوں پر ابّا، نئی امّی اور اُن کی بیٹی زینت رضائیوں میں دبکے ہوئے تھے۔ ابّا کہہ رہے تھے۔ "اُف! کیسی سردی ہے!" نئی امّی چائے کی پیالیوں پر پیالیاں چڑھا رہی تھیں اور کہتی تھیں۔ "ہوا ہڈیوں میں گھسی جا رہی ہے۔ بھئی توبہ!" دوسری طرف موٹی زینت پلنگ سے نیچے ادھ لٹکی جھول رہی تھی۔ اور ناک کے باجے سے بجا رہی تھی ——— شُر شُر!

ابّا کو جانے کیوں اور کیا خیال آیا کہ وہ پردہ ہٹا کر آنگن میں دیکھنے لگے۔ "آج سلیم اور آصف کو کھانا دیا؟ ———" وہ امّی سے پوچھنے لگے۔

امّی کے پتنگے میں جا کر لگی۔ جل ہی تو گئیں وہ ——— اور بھڑک اُٹھیں "کیوں جی! تمہیں کبھی زینت کا بھی خیال آتا ہے اس طرح ——— ؟ جب سنو اُن ہی سنپولوں کا ذکر۔ پہلے مجھے ڈولی منگا دو، میکے چلی جاؤں گی تو چاہے کتنی ہی فکر کر لینا اپنے لاڈلوں کی ——— میں تو اُن کی بیری ہوں نا!" اور وہ روٹھی پڑیں دوپٹے میں مُنہ دے کر۔

میاں صاحب گھبرا گئے۔ "ارے بھئی! سنو تو!" اور حقّے کی نے دُور پھینک کر وہ مسہری سے اُتر گئے۔ "بھئی سمجھا تو ہوتا میرا کہنا۔ میں تو صرف اتنا پوچھ رہا تھا کہ بچّوں کو کھانا ملا یا نہیں؟ تم جانو۔ بن ماں کے ہیں۔ بھولے بھالے چھوٹے چھوٹے ہی تو ہیں ابھی۔ اللہ کے دربار میں میری پکڑ نہ ہو۔ بس اسی سے ڈرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے۔ اسی لئے تو کہتی ہوں مجھے چلا جانے دو۔ پھر خوب عاقبت سُدھار لینا۔ میں تو تمہاری دشمن ہوں نا!" اُنہوں نے سسکیوں کے درمیان کہا اور اس زور سے ناک بجائی کہ ابّا اچھل پڑے۔ پھر تو زینت نے بھی امّی کی آواز میں آواز ملا کر دہاڑنا شروع کر دیا۔ میاں صاحب سٹپٹا گئے اور لگے خوشامد کرنے ان کی آواز "اُن اُونچی تانوں" میں اس طرح معلوم ہوتی تھی جیسے کسی بڑے گگے میں کوئی ننھی سی بھیڑ۔

جائے۔ مکان دار راضی ہوگیا۔ اور میں نے مکان میں قوالی کی مجلس شروع کرائی۔ قوالی کی آواز سُنکر سُلطانی محتسب وہاں آگئے۔ اور ہم سب کو گرفتار کرنا چاہا۔ میں نے کہا ذمہ دار مکان کا مالک ہے اور وہ دہلی میں موجود نہیں ہے۔ لہٰذا تم لوگ ہم کو گرفتار نہیں کرسکتے۔ محتسب نے جواب دیا۔ جناب قاضی صاحب آپ کے قانونی حیلے شاہی فرمان کے آگے نہیں چل سکتے۔ آپ کو میرے ساتھ سُلطان کے پاس چلنا ہوگا۔

میں مجبوراً محتسب کے ساتھ سلطان شمس الدین التمش کے پاس گیا۔ وہ دربار میں بیٹھا تھا اور سب امیر وزیر اُس کے اطراف میں بیٹھے تھے۔

جب سے التمش ہندستان کا بادشاہ ہوا تھا میں نے اُسکی صورت نہیں دیکھی تھی۔ مگر آج دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا کہ بادشاہ تو وہی لڑکا ہے جو بغداد کے قاضی صاحب کا غلام تھا۔ اور جو قوالی سُنکر جھومتا جاتا تھا اور باوجود کم عمری کے ساری رات جاگا تھا۔ اس لئے میرے اندر اتنی جرأت پیدا ہوئی کہ میں سُلطان سے دلیرانہ بات چیت کرلوں۔

سُلطان نے مجھ سے کہا۔ تمہارا کیا نام ہے؟ میں نے نام بتایا۔ سُلطان نے کہا کیا تم کو معلوم ہے کہ میں نے سماع کی مجلس ممنوع قرار دے رکھی ہے؟ میں نے کہا جی ہاں مجھے معلوم ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آخری فرمان میں یہ حکم بھی دیا گیا تھا کہ سماع کی مجلس کا ذمہ دار مکان کا مالک ہوگا۔ اہل مجلس ذمہ دار نہیں ہوں گے۔ اور چونکہ مکان کا مالک دلّی میں موجود نہیں ہے اس واسطے میں سماع کی مجلس کا جواب دہ اور ذمہ دار نہیں ہوں۔ اور نہ مجلس کے دوسرے لوگ ذمہ دار ہیں۔ سُلطان کا چہرہ غصے سے لال ہوگیا اور اُس نے کہا۔ کیا تم میرے سامنے یہ حیلہ بازی کرتے ہو؟ یہاں قاضیوں کی منطق کام نہیں دیگی۔ بلکہ تم کو دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ سخت سزا دی جائے گی۔

یہ سُنکر میں نے کہا" اور سُلطان بھی میری اُس سزا میں جو میرے لئے تجویز کی جائے برابر کا شریک ہوگا۔ کیونکہ اُس نے بھی اسی قسم کا جرم کیا ہے جس کا الزام مجھ پر لگایا گیا ہے۔ کہ مکان کا مالک دوسرا تھا۔ مگر سُلطان نے ایک مکان میں ساری رات قوالی سُنی تھی اور اُس پر وجد بھی طاری ہوا تھا۔"

اب تو سُلطان کے غصہ کی حالت بہت زیادہ بڑھ گئی اور اُس نے نہایت سخت لہجے میں کہا۔ تم جھوٹ بولتے ہو۔ میں نے کسی مجلس سماع میں شرکت نہیں کی۔ میں نے کہا میں جھوٹ نہیں بولتا۔ اور چشم دید اور گوش شنید گواہی دیتا ہوں کہ سُلطان نے ساری رات قوالی سُنی اور سُلطان کو وجد بھی آیا اور میں خود اُس مجلس میں موجود تھا اور میں نے خود قوالی سُنی اور سُلطان کو قوالی سُنتے اور جھومتے ہوئے دیکھا

میری اس بے باکانہ گفتگو کا اثر ہوا اور سُلطان کے قہر و جلال کچھ کمی واقع ہوئی۔ اور سُلطان نے نرمی کے لہجے میں کہا۔ قاضی یہ ذکر کب کا

میں نے کہا جب اولیاء اللہ کی نظریں سُلطان کے چہرے پر تھیں اور روحانی طاقتیں چاروں طرف سے سُلطان پر اپنی شعاعیں ڈال رہی تھیں اور جب غیب کے دربار میں اُن اولیاء اللہ کی دُعائیں پہنچی تھیں۔ اور ہندستان کی شہنشا کا تاج اور تخت سُلطان کے لئے تیار کرایا گیا تھا اُس وقت میں بھی وہاں تھا اور کو دیکھا تھا کہ وہ محفل کی شمع کا گل کترنے جاتا تھا تو ادب سے مشائخ کی طرف پیٹھ نہ کرتا تھا۔

سُلطان نے نظریں جھکالیں اور کچھ دیر سوچ کر کہا۔ کیا تم بغداد کے قا کی مجلس میں تھے؟ جس کا میں غلام تھا۔ میں نے کہا اے سُلطان یہ بات ٹھیک ہے کہ م بغداد کے قاضی کی مجلس میں تھا۔ مگر آپ اُس رات بھی غلام نہیں تھے اور آج کے د بھی آپ اُس تخت پر ہیں جو مایوس غلاموں کو آزاد کرتا رہتا ہے۔ اس رات بھی آپ کی صورت و سیرت مقبول تھی اور آج بھی مقبول ہے۔

سُلطان کو رونا آگیا اور اُنہوں نے مجھے اپنے قریب بٹھالیا۔ اور دیر تک میری صورت دیکھتے رہے اور کہا۔ مجھے اُس رات کی سب باتیں یاد آگئیں اور مجھے بھی یاد آگیا کہ اُس رات کی توجہ اور دُعاؤں نے مجھے یہ شہنشاہی عطا فرمائی ہے اور آج کے بعد عمر بھر میں کبھی اس رات کو فراموش نہیں کروں گا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ ہم نے اپنے پہلے دونوں حکم منسوخ کئے۔ آئندہ ہمارے ملک میں ہر شخص سماع سُن سکتا ہے۔ اور سماع کی مجلسیں کرسکتا ہے۔ قاضی حمید الدین اور ان کی مجلس والوں کو رہا کیا جائے۔

اس کے بعد سلطان نے پوچھا آپ آج کل کہاں رہتے ہیں؟ میں نے کہا اپنے شاگرد قطب الدین بختیار اوشی کے پاس رہتا ہوں۔ سُلطان یہ سُن کر تعظیم کے لئے کھڑا ہوگیا۔ اور کہا وہ تو میرے پیر ہیں اور آقا ہیں۔ اور میں اُن کا مُرید اور غلام ہوں۔ آپ اُن کے اُستاد ہیں تو میرے بھی اُستاد ہیں۔

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ جب بغداد کے قاضی نے اپنی کسی ضرورت کے سبب التمش کو فروخت کردیا تو التمش غزنی میں لایا گیا۔ اور سلطان شہاب الدین محمد غوری کے سامنے پیش کیا گیا۔ ایک التمش تھا اور دوسرا ایک اور غلام ایبک تھا۔ سلطان نے سوداگر سے قیمت پوچھی۔ سوداگر نے ہر غلام کی قیمت ایک ہزار اشرفی بتائی۔ سُلطان نے کہا دونوں غلاموں کی قیمت صرف ایک ہزار اشرفی دیجائے گی۔ سوداگر نے انکار کیا۔ سُلطان نے خفا ہو کر حکم دیا میرے ملک میں کوئی شخص ان غلاموں کو خریدے [illegible]

"ارے عقل! سُنو تو! معاف کردو قصور ہوا۔ اب چُپ بھی ہو جاؤ۔ خدا کے لئے!" انہوں نے کتنا ہی کہا۔ اماں بی کچھ ڈھیلی پڑ گئیں۔ بولیں "سُن لو! اب اس گھر میں مجھ سے نہیں رہا جائیگا۔ یا تو تمہارے چہیتے بچے رہیں گے یا میں — دونوں کی جان کو بیٹا کرتے ہیں۔ کبھی ذرا سا کام بتا دو تو منہ پر پھٹ سے جواب رکھ دیتے ہیں۔ یہ ذرا سی بچی تو آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتی ہے۔ آتے جاتے ایسی چٹکیاں لیتے ہیں کہ بلبلا اُٹھتی ہے ننھی سی جان۔ دیکھتے نہیں ہو۔ اس کے اُجلے بدن پر نیلے نیلے نشان سے ڈال دیئے ہیں۔" یہ کہکر انہوں نے ننھی کو آگے بڑھا دیا۔ وہ اپنی ننھی چندی آنکھوں کو ملتے ہوئے بولی۔ "اوں! ابا! سلیم اور چڑیل آصف ہمیں بہت مارتی ہے روز!"

ابا کی ہنسی اُبل آئی۔ "واہ بھئی واہ! ہماری ننھی کو جو ماریگا ہم اُسے ماریں گے۔ اب کے اگر وہ ستائیں تو تم ہمیں بتانا۔" ننھی کو اپنی فرمائش یاد آ گئی۔ وہ اُچھل پڑی۔ "اچھی ہماری گیند؟ — لائے تم؟"

ابا ہنستے ہوئے اُٹھے اور ایک پیکٹ اُٹھا لائے۔ بولے "لو بھئی اپنی گیند —!" اور اُنہوں نے ایک رنگ برنگی گیند نکال کر ننھی کو دی۔ وہ خوشی سے اُچھل پڑی۔ "اوہو! ہماری کیسی پیاری پیاری گیند —!" اور وہ اُسے لیکر آنگن میں نکل گئی، کھیلتی ہوئی۔

ایک اُچھال دیا، گیند اُڑتی ہوئی بیٹھک کے شیشوں پہ پڑی اور توڑتی ہوئی چقن سے باورچی خانہ میں جا گری۔ بچے چونک گئے۔ "بھیا —؟" آصف نے کہا۔ "جانے کیا ہوا؟" سلیم نے آنکھیں ملتے ہوئے کہا۔

"ہماری گیند کہاں ہے؟" موٹی زینت مچل رہی تھی۔

"کیسی گیند؟ —" سلیم نے پوچھا۔

"کہاں ہے گیند؟ —" آصف نے پوچھا۔

"بدھو موٹی ننھی مچلی۔ "اچھی ہماری گیند؟ —"

باورچی خانے میں گھپ اندھیرا تھا ... بچے ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھے۔ ننھی اب بھی غل مچا رہی تھی کہ "اچھی ہماری گیند —!"

سلیم اور آصف نے اُٹھکر کمبل جھاڑا اور اِدھر اُدھر ڈھونڈا۔ جانے گیند کہاں پڑی تھی؟ ملی ہی نہیں۔ ننھی برابر غل مچا رہی تھی کہ "ہماری گیند دو۔ نہیں تو ہم ابھی ابا سے کہتے ہیں ہاں —" دونوں سہمے کھڑے تھے۔ وہ کیا جانیں کہ کہاں سے آئی تھی اور کہاں گئی۔ وہ گیند، زینت چیختی ہوئی دالان کی طرف بھاگی کہ "ہماری گیند —!"

امی بپھر گئیں۔ ابا غصہ سے کانپنے لگے اور چلائے "سلیم! آصف! یہاں آؤ —" بچے لرز گئے اور ٹھنڈے پسینے ان کی پیشانیوں پہ رینگ آئے۔ ابا پھر گرجے "سُنتے ہو؟ یا نہیں؟ یا میں خود آؤں؟" بچے پھر بھی سہمے کھڑے رہے۔ اپنی جگہ سے جنبش تک نہ کر سکے۔ پھر تو ابا کے غصہ کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ حقہ پیچھے کو دھکیل دیا اور مٹھیاں بھینچ کر اُٹھ کھڑے ہوئے وہ سر سے پیر تک کانپ رہے تھے۔ امی پیچھے پیچھے تھیں اور برابر بڑھاوے دے رہی تھیں۔

ابا باورچی خانہ کی طرف بڑھے اور بچوں کو بالوں سے پکڑ لیا اور چلائے "کہاں ہے ننھی کی گیند؟"

بچے کچھ بھی تو نہ بول سکے۔ ابا پھر چیخنے لگے۔ "ننھی کی گیند کہاں ہے؟ بولو —" بچے پھر بھی دم سادھے رہے۔ خوف زبانوں پر تالے ڈال دیتا ہے!

ابا کا چہرہ غصہ سے سرخ ہو گیا۔ مٹھیاں کس گئیں اور آنکھوں کے ڈھیلے باہر کو لٹک آئے۔ اُنہوں نے جھپٹ کر دونوں معصوموں کو اپنی پسلیوں میں بھینچ لیا۔ اور گھسیٹتے ہوئے دالان میں لے آئے۔ بچے سسکیاں لینے لگے۔ ان کی پسلیاں چرمرا گئی تھیں۔ ابا پہ جنون سوار تھا۔ اُنہوں نے بچوں کے کملائے ہوئے گالوں پر کئی طمانچے مارے۔ اور بھنچی ہوئی مٹھیوں سے خوب خوب مارا۔

امی بولیں۔ "ہے ہے! کیسے بدذات ہیں یہ! میں کیا جھوٹ کہتی تھی تم سے؟ — کہے دیتی ہوں کہ اگر تم نے ڈھیل دی تو پھر یہ ہاتھوں سے نکل جائیں گے — توبہ میری! —"

ننھی برابر مچل رہی تھی "کہاں ہے میری گیند؟ —"

ابا پھر گرجے "کہاں ہے میری ننھی کی گیند؟ — نکالو نہیں تو ٹکڑے کر دوں گا ابھی تم دونوں کے —"

بچے چُپ کھڑے ٹُک ٹُک تکتے رہے۔ اُنہوں نے وہ منحوس گیند دیکھی ہوتی تو بتاتے بھی!

ابا غصہ سے دیوانے ہو گئے۔ ننھی سے بولے "لانا میری چھڑی —!"

ننھی دوڑ کر ابا کی لوہے کی موٹھ والی چھڑی اُٹھا لائی۔ ابا نے مضبوطی سے پکڑ لی اور ہوا میں نچائی۔ شڑ شڑ!

بچے گھبرا کے ایک دوسرے سے چمٹ گئے۔ ان کی سسکاریاں نکل گئیں — وہ لمبی سی خوفناک چھڑی!

ابا نے آنکھیں بند کر کے چھڑی والا ہاتھ اوپر اُٹھایا اور بچوں کے کانپتے ہوئے جسموں پہ بارش سی کر دی۔ بچے چیخے اور چلائے — بھاگے

ی ، پھر تیورا کر گر پڑے اور ہانپنے لگے ۔ اتی کا پتھر جیسا دل بھی پھٹ کر
کنے لگا ـــــــ اب کیا ہوگا یا زینت جو بڑی دیر سے گیند !ـــ
یند! کی رٹ لگا رہی تھی ڈر کر اتی کی گود میں چھپ گئی ۔ اور آبا ـــــــ
ہانپ رہے تھے اور بچوں کو پیٹ رہے تھے ۔ ہی چھڑی سے ۔

بچوں کی چیخیں مدھم ہوتی گئیں ۔ اور آخر وہ گھگھیا کر چپ ہو گئے ۔
ر ننھے ننھے جسم ـــــــ فرش پر اوندھے پڑے تھے ۔ سنہری بال اُلجھے ہوئے
ر پسلیاں چل رہی تھیں ـــــــ ہونٹ کانپ رہے تھے اور آنکھیں مند ی
ئی ـــــــ !

آبا کو تن بدن کا ہوش نہ تھا ۔ وہ پاگلوں کی طرح اب بھی
ڑی گھما رہے تھے ۔ اور برابر دیوانہ وار چلّا رہے تھے "گیند ـــــــ ؟
ری نھی کی گیند ہے" وہ تھک گئے تو اُنہوں نے چھڑی پھینک دی اور
ہانپتے ہوئے مسہری پر گر پڑے ۔ پسینوں سے پیشانی تر تھی اور رال
نہ سے بہہ کر ڈاڑھی میں جذب ہو رہی تھی ۔ اتی آنکھیں پھاڑے کونے میں کھڑی
یں اور ننھی ـــــــ سہمی ہوئی نظروں سے اتی کی گود میں سے جھانک رہی
ی ـــــــ ٹُک ٹُک ۔

آبا پھر کچھ سوچ کر اُٹھے ۔ اُنہوں نے ایک سہمی ہوئی نظر بچوں پر
الی ۔ اور فرش پر لوٹتے ہوئے جسموں پر جھک گئے ۔ انہوں نے بے حس
رکت بچوں کے جھولتے ہوئے جسم پکڑ کر سیدھے کھڑے کر دیئے ۔ آصف
منہ سے خون کی پتلی سی دھار نکل کر باچھوں میں رینگ رہی تھی نیلی نیلی آنکھیں
دی جا رہی تھیں ۔ اور سر ڈھلک کر نیچے جھکا پڑتا تھا ۔ ننھا سلیم آبا
باہنوں میں پرچی ہوئی بطخ کی طرح لٹک رہا تھا ۔ اس کی کنپٹی پھٹ گئی تھی ۔
ننھے ننھے لب پھڑک پھڑک کر رہے تھے ۔ ہانپ رہا تھا ۔ آبا وحشیوں کی طرح
یں سیدھا کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے تھے ۔ مگر بچے گر پڑتے تھے ۔
سلیم نے آنکھیں کھولیں ـــــــ اُداس اور پھیکی پھیکی سی ! اور
ٹتے ہوئے سانسوں میں بولا "ننھی ! تمہیں بہت تکلیف تو نہیں ہو رہی ؟"
"اور بھیّا ، تمہیں بھی تو ـــــــ" اس سے زیادہ آصف کچھ
کہہ سکی ۔

آجا!

(از جناب جاں نثار اختر)

اے صدرِ انجمنِ ماہ اے مری انجم — ضیائے طالعِ اختر لئے ہوئے آجا
بہارِ نو مری تاریک وادیوں میں کبھی — چراغِ لالۂ احمر لئے ہوئے آجا
شگفتگی کو ترستا ہے زندگی کا چمن — جبیں پہ موجِ گلِ تر لئے ہوئے آجا
صنم کدے کے دریچے میں انکھڑیاں تیری — نظر میں عشوۂ کافر لئے ہوئے آجا
رہے تو کوئی رہے تشنہ لب بھلا کب تک — لبوں میں موجۂ کوثر لئے ہوئے آجا
جھکائے عارضِ گلفام پر حسیں پلکیں — ہر ایک پھول پہ نشتر لئے ہوئے آجا
ادھر بھی موڑ عنانِ تبسم مبہم — ادھر بھی بارشِ گوہر لئے ہوئے آجا
تجھے قسم ہے تری پُر جمال باہنوں کی — گلے کے واسطے خنجر لئے ہوئے آجا
ڈبو دے کشتیٔ دلِ نور کے تلاطم میں — تجلیوں کا سمندر لئے ہوئے آجا
لگا دے آگ مری ظلمتوں کے خرمن میں — شرار و برق کے تیور لئے ہوئے آجا
کبھی امید کے ظلمت فزا دریچوں میں — طلوعِ صبح کا منظر لئے ہوئے آجا
نہ پھول میں کوئی خوشبو نہ شمع میں کوئی نور — ہر ایک شے کا مقدر لئے ہوئے آجا

ترے بغیر تو سونا پڑا ہے میخانہ
کبھی تو شیشہ و ساغر لئے ہوئے آجا

بچپن کی تربیت

(از واحدی)

اسکول اور کالج چھوڑنے کے بعد تعلیم ختم نہیں ہو جاتی۔ تعلیم مدت العمر جاری رہتی ہے۔ اسی طرح تربیت کا زمانہ بھی محدود نہیں ہے۔ مرتے دم تک انسان تربیت حاصل کرتا ہے۔ بالارادہ یا بے ارادہ۔

ایک عقلمند کا قول ہے کہ "انسان کے متعلق اس کے مرنے سے پہلے رائے نہیں قائم کی جاسکتی۔" ہم مسلمان "خاتمہ بالخیر" ہونے کی دعا مانگا کرتے ہیں اس کا مطلب یہی ہے کہ مرتے وقت ہم ویسے ہوں جیسا ہمیں بحیثیت انسان ہونا چاہیئے۔ کیا عجب ہے کہ ساری عمر انسان اچھا رہے اور آخر میں برا بن جائے۔ اور یہ بھی خدا کی مہربانی سے بعید نہیں کہ عمر بھر انسان برائیوں میں گھرا رہے اور بڑھاپے میں اسکی آنکھیں کھل جائیں۔ انسان کے طور طریقوں، انسان کی عادات اور انسان کی طبیعت پر عمر کا اثر پڑتا ہے۔ تجربوں کا اثر پڑتا ہے۔ حالات و حوادث کا اثر پڑتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ موثر جو چیز ہے وہ بچپن کی تربیت ہے۔

میرے ایک دوست ہیں جنہوں نے انگلستان میں تعلیم کی تکمیل کی ہے۔ اب تو عمر، تجربات اور حالات و حوادث انہیں بہت بدل چکے ہیں۔ لیکن جوانی میں بالکل "صاحب" تھے۔ غور و فکر کے اعتبار سے بالکل انگریز۔ تاہم تیسری تاریخ کا چاند دیکھ لیتے تھے تو مہینہ بھر پریشان رہتے تھے۔ تیسری تاریخ کے چاند کو دیکھنا ہماری عورتوں میں خدا معلوم کیوں منحوس مشہور ہو گیا ہے۔ انگریزوں کے ان کے توہمات میں سے یہ نہیں ہے۔

میرے دوست نے بچپن میں اپنی ماں، خالہ یا پھوپی سے سن لیا تھا کہ تیسری تاریخ کا چاند نہیں دیکھا کرتے۔ لہذا کبھی بھولے سے میرے دوست کی تیسری تاریخ کے چاند پر نظر پڑ جاتی ہے تو وہ اسے منحوس مانتے ہی نہیں ان پر اس کے نحس پن کا واقعی اثر پڑتا ہے۔ ایک اور دوست ہیں جو پہلے بوریہ نشین مولوی تھے۔ پھر مولوی فاضل۔ ایف اے۔ بی اے اور ایم اے کر کے کسی کالج کے پروفیسر ہو گئے۔ اکثر دیکھا ہے کہ انگریزی تعلیم پہلے پائی ہو اور دینی تعلیم بعد میں تو دین غالب آجاتا ہے اور دینی تعلیم پہلے ہوئی ہو اور انگریزی تعلیم بعد میں تو انگریزیت قبضہ کر لیتی ہے۔ چنانچہ پروفیسر صاحب پر انگریزیت یعنی دہریت قابض ہو گئی۔ مگر پروفیسر صاحب بچپن سے نماز کے عادی تھے۔ نماز کسی طرح نہیں چھٹتی۔ نماز نہ پڑھیں تو بے چین رہتے ہیں۔ خدا کے قائل نہیں۔ لیکن روزانہ پانچ دفعہ خدا کے مقررہ سجدے ضرور ادا کرتے ہیں۔

مسلمانوں کا مذہب عرب میں پیدا ہوا۔ عرب ایسا ملک ہے جہاں پانی کمیاب ہے۔ ہندوستان جیسے دریاؤں کے ملک میں آکر بھی مسلمانوں کے اندر پانی کی قدر باقی رہی۔ چالیس پینتالیس برس قبل تک پانی ضائع کرنا مسلمانان ہند کے نزدیک گناہ تھا۔ اور جن مسلمان گھروں میں ہنوز نل نہیں ہیں وہاں شاید اب بھی گناہ ہو۔ لیکن جن مسلمانوں کے نل لگے ہیں وہ آہستہ آہستہ پانی بہانے کے گناہ و ثواب کو بھول گئے۔ البتہ نلوں پر میٹر لگنے کے بعد فقط مسلمانوں کے نہیں ہندوستان کی پانی بہانے والی قوموں کے نل بھی فوراً درست ہو جاتے ہیں۔ اور جن ہندوستانیوں نے ان ملکوں کو دیکھا ہے جہاں نلوں کا رواج ہندوستان کی نسبت زیادہ عرصہ سے ہے۔ وہ یہ بھی پسند نہیں کرتے کہ سڑکوں کے نل سنکتے اور کہار چھوڑ کر چل دیں۔ وہ ایسے نلوں کو بند کر دینا اتنا ہی ثواب سمجھتے ہیں جتنا کسی بوجھ اٹھانے والے مزدور کا بوجھ اٹھوا دینا ثواب ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ نلوں کا پانی ان کی قوم، ان کے بھائیوں، ان کے شہر والوں کے روپے سے اور ان کی قوم، ان کے بھائیوں اور ان کے شہر والوں کے واسطے ضرورت کے لائق، ایک خاص مقدار میں تیار کیا جاتا ہے۔ وہ ضائع ہوگا تو سارے شہر کو نقصان پہنچے گا۔ سارے شہر کو تکلیف پہنچیگی۔ اور شہر والوں کے ساتھ وہ بھی نقصان اور تکلیف اٹھائینگے۔ ان باتوں کے باوجود آپ نے ان پڑھے لکھوں کو شاید مزدور کا بوجھ اٹھواتے یا سڑک کا بہتا ہوا نل بند کرتے دیکھا ہو۔ لیکن "سوک سینس" "سوک سینس" پکارنے والوں میں یہ جرات نہیں ہے۔ اس لئے کہ انگلستان جا کر تعلیم حاصل کرنے والا غریب گھر کا آدمی نہیں ہو سکتا۔ اور انگلستان جانے سے بہت پہلے اس کے امیر ماں باپ نے اس میں اک قسم کا احساس بھر دیا ہے کہ وہ مزدور کا بوجھ اٹھوانے اور سڑک کا نل بند کرنے کو گھٹیا اور شان سے گرا ہوا کام تصور کرتا ہے۔ نئے احساسات بچپن کے دلنشیں احساسات مٹا نہیں سکتے۔

آج کل دلی میں راشننگ کا چرچا ہے۔ آپ کسی سے پوچھئے کہ کبھی افراط کی تو بات اور تھی۔ اس وقت مال لانے لیجانے کی وقت ہے۔ علاوہ ازیں دوسرے صوبے نفسی نفسی میں مبتلا ہیں۔ اور صوبہ دہلی کو جو اناج وغیرہ کے معاملہ میں ان کا محتاج ہے ناپ تول کر اناج دے رہے ہیں۔ یہ اناج وغیرہ دلی کے کسی خاص طبقہ کیلئے مخصوص کر دیا جائے یا دلی کی ساری آبادی میں حصہ رسد بانٹا جائے؟ کسی سے بھی پوچھئے۔

اور جواب دیجئے "مقدس بانٹنا چاہیئے" لیکن عمل اُس کا قول کے مطابق نہیں ہوگا۔ اسے اگر مقدرت ہے تو وہ حقدار تقسیم یعنی راشننگ کے نفاذ سے پہلے ہی اپنے قول کے خلاف عمل کر رہا ہے اور موقع ملا تو انشاء اللہ نفاذ کے بعد بھی کریگا۔ اور برائی نہ جان کر کریگا۔ اس واسطے کہ اسے بچپن سے ایسا کرنے کی عادت ہے۔

اچھا اب یہ سوچئے کہ ہم اپنے بچوں کی وہ تربیت کس طرح کریں جس سے وہ بچے ہم سے بہتر انسان بن جائیں۔ یہ ہر ماں باپ کی خواہش ہوتی ہے۔ یاد رکھئے یہ سخت تکلیف اٹھائے بغیر ممکن نہیں ہے۔ ہمیں اپنے بچوں کے سامنے اپنا نمونہ پیش کرنا پڑیگا۔ حقیقی نمونہ نہیں پیش کرسکتے تو بناوٹی مصنوعی نمونہ پیش کیجئے۔ لیکن اچھا نمونہ پیش کیجئے۔ آپ ہی کے اعمال و افعال کا آپ کے بچوں پر اثر پڑتا ہے۔ آپ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچے نیک اور شریف اُٹھیں۔ تمیزدار اور با اخلاق ہوں۔ دنیا میں عزت اور عقبےٰ میں خوشنودی خالق حاصل کرنے کے کام کریں۔ تو آپ خود ویسے بن جائیے۔ یہ آسان بات نہیں ہے۔ لیکن اولاد کی خاطر سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ اس کی بھی کوشش کیجئے اور طبیعت پر زبردستی اور جبر کرکے اچھے بنئے۔

ضرب المثل ہے "تخم تاثیر صحبت کا اثر" بچہ کی تربیت حمل قرار پانے کے وقت سے شروع ہو جاتی ہے۔ استقرار حمل کے ساتھ ساتھ ماں باپ کے خیالات وجذبات کا بھی استقرار ہوتا ہے۔ دوران حمل میں ماں بچہ کو بناتی اور بگاڑتی ہے۔ اور پیدائش کے بعد ماں سے زیادہ بچہ کو کسی کی صحبت نہیں ملتی۔ باپ کا نمبر کہیں دور جاکر آتا ہے۔ اور اُستاد کا بہت دور۔ دوستوں کی صحبت میں بھی انسان بنتا اور بگڑتا ہے۔ لیکن دوستوں کی صحبت سے بننے اور بگڑنے کی بنیاد ماں باپ اور استاد رکھتے ہیں۔ دوستوں کی صحبت سے بننے اور بگڑنے کی صلاحیت کا بیج ماں باپ اور اُستاد بوتے ہیں ؎

خشت اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا میرود دیوار کج

عمارتِ تربیت کے ابتدائی روڑے ماں کے ہاتھ سے رکھے جاتے ہیں۔

اس وقت کی ماؤں ہی کے ہاتھ میں ہے کہ خوش بیٹیاں چھوڑ جائیں۔ یا ایسی بیٹیاں چھوڑیں جو شوہروں کے سینہ سے سینہ ملاکر نہیں غیر مردوں کے سینہ سے سینہ ملاکر ناچنے میں نہ جھجکیں۔

سرسید احمد۔ مولوی نذیر احمد۔ مولانا حالی۔ مولانا آزاد۔ مفتی ذکاءاللہ مولانا شبلی۔ حکیم اجمل خاں۔ مولانا ابوالکلام۔ مولانا راشد الخیری اور خواجہ حسن نظامی کی مائیں تعلیم یافتہ نہ تھیں۔ اور غالباً مسٹر تلک۔ مسٹر گوکھلے۔ مہاتما گاندھی پنڈت موتی لال نہرو۔ پنڈت مدن موہن مالوی کی مائیں بھی آج کل کی ماؤں کی طرح پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ دیکھنا ہے کہ آج کل کی مائیں کیسے بیٹے اپنے ملک کو دیتی ہیں۔ ہندوستان کا مستقبل تھوڑا بہت درست ہوسکتا ہے تو ماؤں کے ہاتھ سے ہوسکتا ہے۔ ماں کی عقل میں آجائے تو وہ اولاد کیلئے نمونہ بننے کی زبردستی اپنے نفس پر کرسکتی ہے۔

"گیت"

(از جناب تخشب جارچوی)

دل میں کپٹ اور رس کی آشا کون تجھے سمجھائے
کون تجھے سمجھائے رے مورکھ کون تجھے سمجھائے

من کا بھیدی تپ جپ نہ دھائے کبھی نہ درشن دکھائے
کبھی نہ درشن دکھائے پریتم کبھی نہ درشن دکھائے

ریت پہ اس دنیا کی نہ جانا دکھیوں کے ہردے نہ دکھانا
پاپی کے ہردے کا درپن دھندلا پڑتا جائے
دھندلا پڑتا جائے درپن دھندلا پڑتا جائے

کس کی مسجد کیسا شوالا پریت ہے من مندر کا اجالا
جس کو پی کی لگن لگی ہو کہیں نہ آئے جائے
کہیں نہ آئے جائے پریمی کہیں نہ آئے جائے

تتلی چنچل، پھول ہیں سندر اس کا جلوہ سب کے اندر
جہاں بھی کوئی دیکھنا چاہے وہیں پہ درشن دکھائے
وہیں پہ درشن دکھائے پریتم وہیں پہ درشن دکھائے

ہم نوا!

(از جناب ایم۔ اسلم)

میری موت کا غم! تجھے؟ افسوس!
کیا تو اِس لئے مغموم ہے کہ میں پستی سے نکل کر بلندی پہ جا پہنچا ہوں۔ یا تجھے یہ غم ہے کہ اب رُوح کو قرار ہے۔ اور مُردو تن کی فکر سے آزاد۔
بجا! سہ
تجھے وہاں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا!

یہ تو سچ ہے کہ وہ جام جس میں کبھی محبت کی مے چھلکتی تھی۔ ٹوٹ چکا۔ لیکن وہ بادہ خواری کیا جو پیے مدہوش نہ ہو۔
دل محبت کے "سم سم" سے بہل جاتا ہے۔ اگر تیرے دِل میں میری یاد ہے تو پھر قرب یا دُوری کا سوال ہی کیا۔ فکر ہی کیوں۔
جس طرح میری یاد تجھے بیتاب رکھتی ہے۔ تو یقین مان کہ میں بھی سہ
دادیِ قرار میں بھی تیرے لئے بیقرار ہوں۔

کھلونا جب ٹوٹ جاتا۔ تو بچہ روتا ہے۔ یہی اُس کی فطرت ہے۔

بُوٹا جب سوکھ جاتا ہے تو باغبان اسے چمن سے نکال دیتا ہے۔ دُنیا کا یہی دستور ہے
ایک فصل جب کٹ جاتی ہے تو دوسری کھیتی نظر آتی ہے۔ یہی آئین جہاں ہے
رُوح جب جسد خاکی سے آزاد ہوتی ہے تو پھر بھول کر بھی اُدھر کا رُخ نہیں کرتی۔ قدرت کا قانون یہی ہے۔ لیکن!
محبت اِس نظام کی پابند نہیں

کتاب السلف (مسلسل)

ازعلامہ سیماب اکبرآبادی

(سلسلہ کے لئے "ادیب" فروری ۱۹۴۴ء ملاحظہ فرمائیں)

میرغلام حسن حسن دہلوی

نام و نسب غلام حسن نام، حسن تخلّص۔ دہلی کے رہنے والے۔ پُرانی دلّی میں سیدواڑہ ایک محلہ تھا۔ ۱۱۴۹ھ میں وہیں پیدا ہوئے۔ میرغلام حسین ضاحک کے بیٹے اور میر ببر علی انیس کے دادا تھے۔

شکل و شمائل میانہ قد۔ خوش اندام۔ گورا رنگ۔ خندہ جبین۔ شگفتہ مزاج اور ظریف الطبع تھے۔ جسم جامہ زیب تھا۔ بانکی ٹوپی تنزیب کا انگرکھا پہنتے تھے۔ چُنی ہوئی آستینیں اور کمرسے دوپٹہ بندھا رہتا تھا۔

تعلیم فارسی عربی کی تعلیم قریب تکمیل تھی۔ شعر کی اصلاح پہلے اپنے والد سے لی۔ پھر خواجہ میر درد سے۔ لکھنؤ پہنچ کر میرضیاء الدین ضیا کے شاگرد ہوئے اور مرزا رفیع سودا کو بھی غزل دکھائی ——— اتباع عمر بھر میر درد سودا کا کرتے رہے۔

سوانح حیات ان کے بزرگ ہرات سے ہندوستان آئے تھے۔ ۱۲/۱۳ برس کی عمر میں اور بروایتِ بعض عالمِ شباب میں اپنے باپ کے ساتھ فیض آباد گئے۔ اور نواب سرفراز جنگ خلف نواب سالار جنگ کی خدمت میں رہے۔ کچھ مدت وہاں رہکر لکھنؤ میں آ رہے۔

تصانیف ایک دیوان اور گیارہ مثنویاں ان کی تصنیف سے تھیں۔ مگر مثنویوں میں سحرالبیان نے سب سے زیادہ قبولیت حاصل کی۔ اس کے بعد مثنوی گلزار ارم بھی مشہور ہوئی۔ سب ملا کر تقریباً دس ہزار اشعار کا سرمایہ چھوڑا۔ افسوس کہ ان کا دیوان اب دستیاب نہیں۔ ایک تذکرہ "شعرائے اردو" بھی آپ کی تصنیف ہے۔

اعتراف "میرحسن فلسفۂ انسانی کا سب سے بڑا عالم ہے۔ جو ہندستان میں گذرا ہے" (ڈاکٹر فیلن)

اولاد آپ کی اولادِ ذکور میں صرف میر مستحسن خلیق مشہور ہیں جو میر انیس لکھنوی کے باپ تھے۔

وفات محرم ۱۲۰۱ھ میں بمقام لکھنؤ وفات پائی۔ مفتی گنج میں نواب قاسم علی خاں کے باغ کے پیچھے دفن ہوئے۔ مصحفی امروہوی نے تاریخ وفات لکھی ہے:

چوں حسن آں بلبلِ خوش داستاں — رُو ازیں گلزار رنگ و بو بتافت
بسکہ شیریں بود نطقش مصحفی — "شاعر شیریں زباں" تاریخ یافت

۱۲۰۱ھ

میرحسن کے کلام پر رائے میرحسن کا دیوان باوجود کوشش اب تک میری نظر سے نہیں گذرا۔ لیکن انکی جو چند غزلیں دیکھی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قصیدہ گوئی اور غزل گوئی میں کوئی امتیازی شان نہ رکھتے تھے۔ متروکات ان کے یہاں زیادہ سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ خیالات اچھے ہیں مگر زیادہ بلند نہیں۔ زبان سلجھی ہوئی ہے۔ مگر میر اور سودا کی سی حلاوت نہیں پائی جاتی جو کلام ان کا نظر سے گذرا اُسی میں سے بطور انتخاب کچھ پیش کرتا ہوں۔

سربستہ رہا یوں ہی یہ رازِ حرم و دیر — معلوم ہوا بھید یہاں کا نہ وہاں کا
جس عالمِ ہستی کو سمجھتے تھے بہار آہ — آخر کو جو دیکھا تو وہ موسم ہے خزاں کا

رو رو کے کیا ابتر سب کام مرے دل کا — کھویا مری آنکھوں نے آرام مرے دل کا

صیاد کی مرضی ہے کہ اب گُل کی ہوس میں — نالے نہ کریں مرغ گرفتار قفس میں

نہ ہم ہوش میں مے پرستی سے گذرے — ہوئے جبکہ بےہوش مستی سے گذرے
رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا — ہم اے زندگی ایسی ہستی سے گذرے

عیش و وصال و صحبتِ یاراں و فراغِ دل — اس ایک جان کے لئے کیا کیا نہ چاہیے

سرگرمِ سوزِ عشق رہے ہے بمثلِ شمع — تن گھل گیا ہے اور پگھلتی نہیں زباں

یہ کیا عشق آفت اُٹھانے لگا — مرے دل کو مجھ سے چھڑانے لگا
فلک نے تو اتنا ہنسایا نہ تھا — کہ جس کے عوض یوں رلانے لگا
گُنہ چشمِ خوں بار کا کچھ نہیں — مرا دل ہی مجھ کو ڈبانے لگا

نہیں مجھ کو دُشمن سے شکوہ حسنؔ
مرا دوست مجھ کو ستانے لگا

میر حسن کی مثنویاں

میر حسنؔ دہلوی کی مثنویوں میں "سحر البیان" کی بہت دھوم ہے۔ وہ صرف اس لئے کہ قصہ دلچسپ اور مسلسل ہے۔ زبان بیگماتی ہے۔ تحلیل نفسی سے کام لیا گیا ہے۔ مناظر کی تصویر۔ جذبات کی تشریح۔ فصاحت و بلاغت۔ مناسب الفاظ۔ مربوط کلام صنعت لفظی تشبیہ واستعارہ۔ مبالغہ۔ غرض کہ فرضی داستان میں جو کچھ ہونا چاہیئے وہ سب اس مثنوی میں موجود ہے۔ لیکن بعض مورخین کا یہ کہنا کہ "سحر البیان" کے سامنے میر تقی میرؔ۔ مرزا سوداؔ اور میر اثرؔ جیسے شہنشاہانِ سخن کی مثنویوں نے بھی فروغ نہ پایا۔ انتہائی مبالغہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ داستان کے تسلسل اور زبان و محاورات کے رکھ رکھاؤ نے "مثنوی سحر البیان" میں ایک گونہ دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ مگر متواتر متروک اور قدیم الفاظ کی بھرمار موجودہ زمانے کے ناقد کو اس مثنوی کے متعلق اچھی رائے دینے سے روک دیتی ہے۔

قدیم مثنویوں میں گلزارِ نسیم نے ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔ نہ اُس میں متروک اور قدیم الفاظ ہیں۔ نہ تعقید ہے۔ بلکہ صنعت ایجاز واختصار نے مثنوی میں جان پیدا کر دی ہے۔ اُس کے بعد نواب مرزا شوقؔ لکھنوی کی مثنوی "زہرِ عشق" اپنے رومانی انداز اور زبان کی حلاوت نیز سوز و گداز کے اعتبار سے دوسرا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے بعد فصیح الملک نواب میرزا خاں داغؔ دہلوی کی مثنوی "فریادِ داغؔ" کا درجہ ہر لحاظ سے ممتاز ہے۔ اور اس مثنوی پر آکر مثنوی کا رواج ہی گویا ختم ہو جاتا ہے۔

ان مثنویوں کے سامنے "سحر البیان" کی کوئی خاص حیثیت نہیں رہتی۔ صرف اس کا قدیم ہونا ہی اس کا سب سے بڑا امتیاز ہے۔ اور یہ کہ اس مثنوی سے میر حسنؔ کا نام زندہ ہے۔

میر حسنؔ کی دوسری مثنوی "گلزارِ ارم" "سحر البیان" سے بھی زیادہ کم درجہ ہے۔ طویل طویل عنوانوں کے علاوہ اس میں اشعار بھی کم ہیں۔ حجم صرف ۲۸ صفحات ہے۔ اس میں بھی عنوان اس قدر طویل ہیں کہ انہیں نکال کر مثنوی کا حجم بہت ہی کم رہ جاتا ہے۔ مثلاً ایک عنوان ہے :۔

"در توصیف بازار رنگین، نمونۂ بہشت برین۔ و بیان دکاکین مینو آئین" "کہ صد ہزاران مشتری زلیخا وار دریک پلۂ میزان نشستہ یوسف طلعتان پیش ہر دکان چوں مصریان تماشا بیں دست لبستہ از ہر طرف"

"صدائے سودا فروشاں چوں الحانِ داؤدی می آید کہ دل را مے ربایند"
"یا نغمۂ طوطی و ہزار است کہ ہوش مے افزاید۔"

ادھر کو جوہری اُدھر کو بزّاز
ادھر زرّاف اور اُدھر طلاساز

اردو مثنوی کی نازک بحر دیکھئے اور اُس پر فارسی کا یہ طرّۂ طرار رہا۔

ہمیں ان مثنویوں سے صرف اس لئے محبت ہے کہ یہ قدیم ہیں۔ اور میر حسنؔ دہلوی کی سب سے بڑی عظمت جو ہماری نگاہ اور ہمارے دل میں ہے وہ یہ ہے کہ اُن کی نسل سے میر انیسؔ لکھنوی جیسا شاعر پیدا ہوا۔ جس نے مرثیہ گوئی کی صنف مخلوط کو پامال کر کے میدانِ سخن میں اپنے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اور اپنے ساتھ اپنے دادا کا نام بھی ہمیشہ کے لئے زندہ کر دیا۔

(باقی باقی)

ڈرامہ

گزشتہ سے پیوستہ

یہ دیس ہمارا ہے!

(از محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی)

چوتھا ایکٹ —— پہلا سین

نواب صاحب کے مکان کا صحن۔ بیگم صاحبہ چارپائی پر بیٹھی ہیں۔ نواب صاحب کرسی پر بیٹھے ہوئے سگریٹ پی رہے ہیں۔ ملازمہ بیگم صاحبہ کو پنکھا جھل رہی ہے نوکر سامنے کھڑا ہے۔

بیگم صاحبہ :۔ (ملازم سے) آج شام کو دس مہمانوں کی دعوت ہے۔ بہترین قسم کا کھانا تیار ہونا چاہیئے۔

ملازم :۔ بہت اچھا سرکار۔

بیگم صاحبہ :۔ اور سنو —— مکان کی جلد سے جلد صفائی کراؤ۔

ملازم :۔ بہت اچھا سرکار

(چلا جاتا ہے)

نواب صاحب :۔ (بیگم صاحبہ سے مخاطب ہوتے ہوئے) تمہارے صاحبزادے کو تشریف لائے ہوئے آج کتنے دن ہو گئے۔

بیگم صاحبہ :۔ تین دن سے تو اس کا بالکل ہی پتہ نہیں۔ پہلے تو یہ بھی تھا کہ دن میں ایک دو دفعہ صورت دکھائی دے جاتی تھی۔ لیکن اب رفتہ رفتہ وہ بھی ختم ہو گیا۔

نواب صاحب :۔ جو جی چاہے کرتے پھرو۔ ہم سے تو کوئی مطلب واسطہ نہیں۔

بیگم صاحبہ :۔ اس کو ماں باپ کی فکر ہی کب ہے۔ اس کو تو ہر وقت قوم قوم پڑی رہتی ہے۔

نواب صاحب :۔ بڑی قوم کی خدمت کر رہے ہیں —— ارے پہلے تو ماں باپ کا حق تھا۔ پھر بعد میں قوم کی خدمت۔

(نواب صاحب اُٹھکر ٹہلنے لگتے ہیں —— پھر بیٹھ جاتے ہیں)

بیگم صاحبہ :۔ اتنا بڑا ہو گیا اس کا بچپن نہیں جاتا۔

نواب صاحب :۔ خدا کسی کو نافرمان اولاد نہ دے۔ مجھے تو اس اولاد نے تباہ کر دیا اگر محمود نہ ہوتا تو میری زندگی سکون سے گذر جاتی۔

بیگم صاحبہ :۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ خدا ذرا سی بات پر لڑکے کو کوسنے لگتے ہو۔

نواب صاحب :۔ کوسنے کی کیا بات ہے۔ تمہاری تو محبت پاگل ہے۔ تمہاری محبت ہی نے اس کو اس قدر سر چڑھا رکھا ہے۔

بیگم صاحبہ :۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔ سب ٹھیک ہو جائیگا۔

نواب صاحب :۔ عاقبت میں ٹھیک ہوگا —— اس کی ان حرکتوں نے ہی مجھے اتنا ذلیل کروایا۔

بیگم صاحبہ :۔ کیا —— کیسی ذلت؟

نواب صاحب :۔ کلیم کی بہو نے یہ کہا کہ اگر محمود کا یہی حال رہا تو ہم شہناز کی شادی دوسری جگہ کرینگے۔ ہم اپنی لڑکی کی قسمت کیوں خراب کریں۔

بیگم صاحبہ :۔ (کچھ گھبرا کر) تم سے کس نے کہا؟

نواب صاحب :۔ میرے سامنے کہا۔

بیگم صاحبہ :۔ اچھا —— (کچھ سوچکر) مجھے تو یقین نہیں آتا۔ شہناز تو میری "ٹھکری کی مانگ" ہے۔ میں بھلا دوسری جگہ کیا ہونے دونگی۔

نواب صاحب :۔ جب ہوگا تو سب "مانگ" رکھی رہ جائیگی —— تم پہلے اپنے بیٹے ہی کو ٹھیک کر لو۔ بعد میں کسی دوسرے کو سمجھانا۔

(بیگم صاحبہ سر جھکا کر بیٹھ جاتی ہیں)

بیگم صاحبہ :۔ (خود سے) آج میں بہو کے پاس جاؤنگی۔

(نواب صاحب ملازم کو آواز دیتے ہیں)

نواب صاحب :۔ عبدل —— ! عبدل —— !!

عبدل :۔ جی حضور

(عبدل قریب آتا ہے)

نواب صاحب :۔ سب مکانوں کا کرایہ وصول ہو گیا؟

عبدل :۔ سرکار بڑی مشکل سے آٹھ مکانوں کا کرایہ وصول ہوا ہے

نواب صاحب :۔ اور مکانوں کا کیوں نہیں ملا؟

عبدل :۔ حضور اور تو مل ہی جائیگا۔ پر تین مکانوں کا کرایہ ملتا دکھائی نہیں دیتا ——

نواب صاحب :۔ کیوں؟

عبدل :۔ حضور ایک کرایہ دار کو تو میں نے کل نکال دیا۔ کوئی مزدور تھا۔ کہتا تھا کہ ہم کہاں سے دیں۔ ہمیں تو کھانے تک کو نہیں ملتا۔

ایک جیسی تک کسی شخص نے اُن دونوں کو نہ خریدا۔

ایک سال کے بعد قطب الدین ایبک نے ہندستان کا ایک بڑا حصہ فتح کر لیا۔ تو سلطان شہاب الدین محمد غوری نے ایبک کو غزنی میں بلایا۔ اور اس پر بہت زیادہ شاہانہ نوازشیں فرمائی۔ ایبک نے سلطان کو زیادہ خوش دیکھا تو درخواست کی کہ مجھے التمش کی خریداری کی اجازت دی جائے۔ سلطان نے جواب دیا یہاں اپنا حکم نہیں چل سکتا۔ تو اس کو دلّی میں لے جا وہاں جا کر خرید لیجو۔ چنانچہ ایک سوداگر کے ساتھ لے کر دلّی میں آیا اور یہاں التمش کو خرید کر آزاد کر دیا۔ اور پھر اس کو بدایوں کا گورنر بنا دیا۔

تاج الدین یلدوز

جس طرح قطب الدین سلطان شہاب الدین غوری کا چہیتا غلام تھا۔ اُسی طرح سلطان کو دو غلام اور بھی محبوب تھے ایک کا نام تاج الدین یلدوز تھا اور دوسرے کا نام ناصر الدین قباچہ تھا۔ اور یہ دونوں شہاب الدین کے مرنے کے بعد بادشاہی کے درجے تک پہنچے تھے اور آپس میں لڑے بھی تھے۔

تاج الدین یلدوز کی نسبت تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ تاج الدین یلدوز قطب الدین ایبک کا داماد بھی تھا۔ ایک دفعہ کسی ملّا نے جو یلدوز کے لڑکے کا معلّم تھا لڑکے کو ایسا مارا کہ لڑکا مر گیا۔ یلدوز کو خبر ہوئی تو اُس نے حکم دیا کہ معلّم کو میرے ملک سے جلدی نکال دو۔ ورنہ میری بیوی کو خبر ہوگی تو وہ معلّم کو مار ڈالے گی۔ اور اس واقعہ سے یلدوز کی شرافت ظاہر ہوتی ہے۔

شہاب الدین محمد غوری کے مرنے کے بعد تاج الدین یلدوز نے قطب الدین ایبک پر حملہ کیا۔ اور بھٹنڈے کے پاس دونوں میں لڑائی ہوئی۔ التمش بھی اس لڑائی میں شریک تھا۔ اور اس کی بڑی بیٹی رضیہ بیگم بھی اپنے باپ کے ساتھ اس لڑائی میں شریک تھی۔ تاج الدین یلدوز اس لڑائی میں پکڑا گیا اور ایبک نے اس قیدی کو التمش کے حوالے کیا اور التمش نے گوالیار کے قلعہ میں مقید رکھا جہاں اس نے وفات پائی۔ گوالیار بھی اس وقت التمش کی حکومت میں تھا اور

عُذر

کون کہتا ہے کہ سینے سے لگایا ہوتا
کم سے کم وضع محبت کو نبھایا ہوتا
میرے پینے پہ غضب ناک نہ ہوتا کوئی
کیوں میں پیتا ہوں ذرا یہ بھی تو سوچا ہوتا

مجاز

بدایوں کے ماتحت سمجھا جاتا تھا۔

سلطان قطب الدین ایبک کے مرنے کے بعد اُس کے لڑکوں کی چند روزہ بادشاہی رہی اور آخر ۶۰۷ھ میں سلطان شمس الدین التمش بادشاہ بنایا گیا۔ اور دربار کے اُمرا اور ملک کے مشائخ اور علما اور عوام اور فوج نے اس کو بہت پسند کیا۔

رضیہ بیگم اپنے سب بھائیوں سے بڑی تھی۔ التمش نے اسکو قرآن مجید حفظ کرایا تھا اور دینی کتابیں پڑھوائی تھیں اور جنگی اور مُلکی ہنر بھی سکھائے تھے۔ مگر وہ پردے کے اندر رہتی تھی۔

رضیہ بیگم کی ولی عہدی

اپنی سلطنت کے آخری زمانے میں شمس الدین التمش نے اپنی بیٹی رضیہ بیگم کو اپنا ولی عہد اور جانشین بنانے کا خیال ظاہر کیا۔ یہ سنکر امیروں، وزیروں نے اس کی وجہ پوچھی تو التمش نے جواب دیا میرے لڑکے شراب پیتے ہیں اور بُرے حالات میں مصروف ہیں۔ لیکن میری بیٹی رضیہ ہر اعتبار سے لائق ہے۔ ذی علم بھی ہے ذی عقل بھی ہے۔ حکومت کی تجربہ کار بھی ہے اور انتظامی لیاقت بھی رکھتی ہے۔ اور میری ساری حکومت کے زمانے میں رضیہ ہی میرا داہنا ہاتھ تھی ۲۶ برس کی حکومت میں جو کچھ میں نے کیا اسکی ساری خوبیاں رضیہ کے حصہ میں ہیں۔ کیونکہ اسی کی وجہ سے مجھ سے یہ نیکیاں ہوئی تھیں اور میں رضیہ کو عورت نہیں مردوں سے زیادہ لائق اور ولی عہدی کا مستحق سمجھتا ہوں۔

آخر ۲۶ برس حکومت کرنے کے بعد سلطان التمش نے وفات پائی مگر اسکی جگہ امیروں کی مخالفت اور سازش کے سبب رضیہ کو نہیں ملی۔ بلکہ اُس کے چھوٹے بھائی رکن الدین فیروز شاہ کو بادشاہ بنایا گیا۔ مگر اسکی بدچلنی اتنی بڑھی کہ صرف چھ مہینے ۲۰ دن حکومت کرنے پایا تھا کہ بغاوت ہوئی اور رکن الدین گرفتار ہوکر قید میں گیا اور قید خانے ہی میں مر گیا۔ جب تک بھائی بادشاہ رہا رضیہ نے بہت چاہا کہ باپ کی طرح بھائی کو بھی اچھے مشورے دے مگر بھائی نے اسکی پروا نہ کی۔

شاہ ترکان رکن الدین فیروز شاہ کی ماں ترکان شاہ ایک ترکیہ کنیز تھی۔ بیٹیا

ب :۔ اچھا کیا سالے کو نکال دیا۔ اس کا کوئی سامان تو نہیں رہ گیا۔
:۔ نہیں سرکار
ب :۔ نمبر ۹ والے مکان میں کون ہے ؟
:۔ سرکار اس میں ایک کھیت مزدور رہتا ہے ۔
ب :۔ اس نے کب سے کرایہ نہیں دیا ؟
:۔ تین مہینے سے ایک پیسہ بھی نہیں وصول ہوا۔
ب :۔ تم نے کہا نہیں ؟
:۔ حضور وہ کسی وقت ملتا ہی نہیں ۔
ب :۔ اس کے بیوی بچے تو رہتے ہی ہونگے ۔
:۔ نہیں حضور۔ سب لوگ دن بھر بھیک مانگتے ہیں۔
ب :۔ (غصہ سے) سالے کھیت مزدور ہوکر بھیک مانگتے ہیں ۔
اس کا سب سامان نکال کر پھینک دو ـــــ جاؤ ـــــ
(عبدل جانے لگتا ہے)

ب :۔ عبدل سنو !
:۔ کیا ہے سرکار ؟
ب :۔ مکان میں اس کا کتنا سامان ہوگا ۔ ؟
:۔ حضور بہت غریب آدمی ہے ۔ اس کے سامان ہی کیا :
ب :۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور ہی ہوگا ؟
:۔ حضور ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی ہے ۔کچھ پرانے کپڑے ہیں۔ ایک دو تھالی اور مٹی کے برتن ہیں ۔
ب :۔ بس ـــــ ؟
:۔ اور کیا ہوتا حضور۔ وہ تو خود ہی بھیک مانگتا ہے ۔ اور آج کل تو کوئی بھیک بھی نہیں دیتا۔ لوگ بھوکے مر رہے ہیں۔
ب :۔ کھڑے کیا دیکھ رہے ہو ـــــ اس کا سامان نکالکر سڑک پر پھینک دو اور اپنا تالا لگا دو۔
:۔ حضور ! بہت غریب آدمی ہے۔ کوئی اٹھا کر لے جائیگا ۔ میں اس سے رات کو کہہ دونگا ۔
ب :۔ (بگڑ کر) میں کہتا ہوں کہ فوراً اس بدمعاش کا سامان نکال کر پھینک دو ـــــ چلو ـــــ
(عبدل خاموشی سے سر جھکائے چلا جاتا ہے)
صاحب اندر چلے جاتے ہیں۔ بیگم صاحبہ اسی چارپائی پر سر لٹکائے بیٹھی کچھ

سوچ رہی ہیں)
بیگم صاحبہ :۔ (خود سے) محمود کہاں چلا گیا۔ آج تین دن ہو گئے ۔ نہ جانے ناراض ہوکر کہیں چلا گیا ۔ ماں باپ کی ممتا کا اولاد کو کچھ بھی احساس نہیں ہوتا وہ کیا جانے کہ ہمارے دل میں اس کی کتنی محبت ہے ۔ وہ یہی سوچتا ہے کہ ماں دشمن ہے اس کو محبت نہیں ۔
آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ دروازہ کھلتا ہے۔ محمود داخل ہوتا ہے)۔
محمود :۔ اماں ـــــ !
بیگم صاحبہ :۔ (سر اٹھا کر دیکھتی ہیں) محمود ! (رونے لگتی ہیں اور محمود کو پیار کرکے اپنے پاس بٹھا لیتی ہیں)
محمود :۔ ارے اماں جی ! آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں ؟
بیگم صاحبہ :۔ محمود تم تین دن سے کہاں غائب تھے ؟
محمود :۔ اماں جی ! ـــــ اس دوران میں مجھے ایک منٹ کا وقت نہیں ملا حتی کہ میں تین دن سے سویا تک نہیں ۔
بیگم صاحبہ :۔ (اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے) محمود میں نے تم کو اس دن کے لئے پالا تھا ـــــ
محمود :۔ اماں آپ ناحق پریشان ہو رہی ہیں۔ میں اپنے ملک کے لئے رات کی نیندیں حرام کر دیتا ہوں ۔ میں اپنے ملک کیلئے اپنی جان تک قربان کرنے کیلئے تیار ہوں۔ آپ کو معلوم نہیں ملک کس مصیبت میں مبتلا ہے ۔ سڑکوں پر بھوکوں کی لاشوں کا انبار ہے جن کا کوئی پرسان حال ہی نہیں ۔ ایسے وقت میں ہم ہی ان کے عزیز ہیں ۔ اور دوست ہیں ۔ اگر ہم بھی خبر نہ لیں گے تو پھر کون لیگا ۔ بھوکوں کو روٹی دینا کیا ہمارا فرض نہیں ۔
بیگم صاحبہ :۔ یہ میں کب کہتی ہوں کہ بھوکوں کی خبر نہ لو ۔ یہاں کی ممتا باؤلی ہے اتنے دنوں سے تمہیں دیکھا نہیں تھا ۔
(محمود کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہے)
بیگم صاحبہ :۔ تمہارے کپڑے کتنے خراب ہو رہے ہیں محمود ! ـــــ بالوں کو دیکھو کیا حال ہے ۔ میں کتنی بدنصیب ماں ہوں ۔
محمود :۔ اماں جی ۔ سوچئے تو جگہ جگہ سے اناج اور روپیہ اور جو کچھ مل سکا اکٹھا کیا ۔ پھر اس کا انتظام اور اب پھر جانا ہے ۔ اگر کہیں سے جمع ہو گیا تو اچھا ہے ۔
بیگم صاحبہ :۔ محمود ! اب میں نہیں جانے دونگی ۔ نہ ـــــ میرے لال میں پاگل ہو جاؤں گی ۔

محمود :۔ اماں آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ میں پیارا ... اور لگ بھگ کر رہیں۔ میری غیرت گوارہ کریگی۔

بیگم صاحبہ :۔ تم کو جس چیز کی ضرورت ہو میں دونگی محمود ——

محمود :۔ (خوش ہو کر) اماں آپ دینگی ؟

بیگم صاحبہ :۔ ہاں جو تم مانگتے ہیں دونگی

(بیگم صاحبہ ... اپنا ... کر محمود کو دیتی ہیں)

محمود :۔ (ماں کے ...) اماں —— آپ ... اتنی

[illegible]

... آج ... سے تم

[illegible]

... میں تمہارے کاموں کو تو خوب سمجھتا ہوں۔ بہرحال آج میں آخری فیصلہ چاہتا ہوں۔

بیگم صاحبہ :۔ (نواب صاحب سے) کیسی باتیں کر رہے ہو۔

نواب صاحب :۔ ... آوارہ گردی ... نہیں دیکھ سکتا۔

بیگم صاحبہ :۔ ... کیا ہوگا ... جواب دو تم نے خود کہہ دیا۔

نواب صاحب :۔ (بگڑ کر) کیوں بک بک کر رہی ہو —— ... اس صورت میں ان کو اپنے گھر میں نہیں دیکھ سکتا۔ (پھر محمود سے) بولو خاموش کیا سوچ رہے ہو۔ یا تو اپنی حرکتوں سے باز آؤ ورنہ یہاں قدم مت رکھنا۔ میں نے تم سے جس قدر محبت کی آج اتنی ہی نفرت بھی کر سکتا ہوں۔ سن رہے ہو —— مجھے جلد جواب دو —— بولو۔ خاموش کیوں ہو۔ میں تمہاری یہ پاگلوں کی سی حالت ہرگز نہیں دیکھ سکتا۔ اپنے جسم کو دیکھو گرد میں اٹا ہوا ہے۔ بالوں کی حالت کیا

... ہے۔ تمہارا ... ہیں۔

محمود :۔ ابا جان ! آپ میرے کپڑے اور بال دیکھ رہے ہیں۔ آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو سڑکوں پر پڑے دم توڑ رہے ہیں۔ کبھی ... آئے کتنی ہی بارش ہو وہ اسی طرح پڑے رہتے ہیں۔

نواب صاحب :۔ کیوں بک بک کر رہے ہو —— تم ہماری دنیا کے ... جاؤ —— میری آنکھوں کے سامنے سے دور ہو جاؤ —— جاؤ سڑکوں پر سے چماروں اور بھنگیوں کی لاشیں اٹھا اٹھا کر پھینکو۔ تم اسی کام کے ... تم شریفوں میں بیٹھنے کے لائق نہیں ——

(محمود کا چہرہ غصے سے تمتا رہا ہے۔ وہ دروازہ کی طرف چل دیتا ہے)

بیگم صاحبہ :۔ ... جاتے ہو ؟ —— (لڑکے کے پیچھے دوڑتی ہے)

[illegible]

بیگم صاحبہ :۔ ...

(محمود ...)

چوتھا ایکٹ —— دوسرا سین

(بنگال کا ... ہندو و مسلمان ... کا اجتماع ... ملک غذائی بحران کو حل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ محمود اور ردپا بھی ... لٹکاتے آ رہے ہیں)

مکرجی :۔ دیکھئے ! وہ کامریڈ محمود بھی آ گئے۔

حمید :۔ آئیے۔ آپ ہی لوگوں کا انتظار تھا۔

(دونوں بیٹھ جاتے ہیں)

سلطان :۔ محبان وطن کے سامنے آج پھر ... کا سوال ... ہے بنگال کو کس طرح اس مصیبت سے بچایا جائے ؟

محمود :۔ ہندو مسلمان ... کو چاہیے کہ ... مہیا کریں۔ ایک یہی طریقہ ہے جس سے ہمارا ... نجات پا سکتا ہے۔

ردپا :۔ یہ وقت اتنا نازک ہے کہ مذہب اور ہر طبقہ ... چاہیئے۔ ہمارا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ بھوکے ... کی مدد کریں۔

مکرجی :۔ ایک ہفتہ کے اندر اندر ۱۱۲۹ موتیں ہوئیں —— لیٹی ہوئی کوئی کہہ نہیں سکتا کہ یہ انسانوں کی لاشیں

... :۔ جہاں چاول کی فصل اچھی ہے وہاں سے چاول خرید لینا چاہئے اور عوامی لنگر خانے اور عوامی غذائی کمیٹیاں بنائی جائیں۔

سلطان :۔ ہمیں بہت جلد اس کام کو کرنا ہے ورنہ برسات کا موسم ختم ہو رہا ہے۔ اور پھر بنگال پر جاپانیوں کی یورش ہوگی ——— کتنا نازک وقت ہے۔

محمود :۔ فاشسٹوں کا مقابلہ کرنے کیلئے اتحادی فوجیں تو تیار ہو رہی ہیں۔ لیکن جب تک ہم ان کی مدد نہیں کر سکتے وہ کچھ نہیں کر سکتیں۔
... شرم کی بات ہے کہ ہم اپنے بھوکے بھائیوں سے کس طرح امید کریں ... وہ ہمت اور خود اعتمادی دکھائیں۔

... :۔ اس وقت تمام ہندوستان وطن کا فرض ہے کہ اپنے بھوکے ہندو بھائیوں ... ان بھائیوں کو جلد سے جلد غلہ مہیا کریں تاکہ وہ جاپانی حملہ آوروں کا مقابلہ کر سکیں۔

(کسانوں کا ایک گروہ ... دکھائی دیتا ہے)

محمود :۔ یہ کون لوگ ہیں؟

... :۔ ہمارے قریب کے گاؤں کے کسان معلوم ہوتے ہیں۔

... (... دیکھ کر) ہاں ——— وہی ہیں ——— کیا بات ہے؟ ... ہیں یہ لوگ!

...

... ——— ممکن ہے گاؤں میں کچھ گڑبڑ ...

... ———

(گروہ قریب آ جاتا ہے)

... کیا بات ہے بھائی؟

کسان :۔ ہم بھوکے مر رہے ہیں ہم کو کھانا چاہئے۔

کسان :۔ گاؤں میں اناج کا دانہ نہیں۔ ہم اتواروں سے بھوکے مر رہے ہیں ... شہر میں بنیوں کی دکانوں میں بھرا ہے۔ لیکن وہ دیتے نہیں۔
... قریب آ کر بیٹھ جاتے ہیں

... :۔ ... ہمیں یہ ترکیب بتائی ہے کہ بنیوں کی دکانوں میں ... جائیں۔ بڑا چاول بھرا ہے۔

... ہم ... کیوں نہ کریں ——— ہمارے بال بچے بھوکے ... ہیں۔

محمود :۔ یہ پانچویں دستہ نے تم کو بھڑکا دیا ہے کہیں ایسا مت کر بیٹھنا۔

کسان :۔ تو پھر ہم کیا کریں؟

محمود :۔ ہم تم کو کھانے کو دیں گے۔

تمیز :۔ کامریڈ سلطان! دیکھا آپ نے یہ پانچواں دستہ کس طرح بھوکوں کو بھڑکانے کی کوشش کر رہا ہے۔

روپا :۔ اسی لئے ہم کو جلد سے جلد کوئی انتظام کرنا چاہئے۔ بھوکے ہیں تو وہ روٹی کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

دوسرا کسان :۔ اور ایک بات اور بتائی تھی۔ کہ سبھاس بابو برما سے چاول لے کر آ رہے ہیں۔

روپا :۔ ارے کہیں ان لوگوں کے کہنے میں مت آ جانا۔ وہ جاپانی ایجنٹ ہیں۔

مکرجی :۔ بھلا چاول برما سے کس طرح آ سکتا ہے۔ فاشسٹ دشمن تمہارے سروں پر آگ برسانے کی فکر میں ہیں۔ وہ بھلا تمہارے لئے کھانے کو بھیجیں گے۔

دوسرا کسان :۔ اور بتا رہے تھے کہ تمہارا دیس کسی کا گلام (غلام) نہ رہے گا۔ جاپان سب کو آزاد کرے گا۔

محمود :۔ وہ لوگ تو جنتا کو بالکل ہی بے جان سمجھتے ہیں۔ جنتا کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانک لیتے ہیں۔ تم نے دیکھا نہیں برما میں کیسے کیسے ظلم کئے۔ جنتا کو کتنے دکھ دیئے۔ سبھاس بھی اب ہمارے دیس کا نہیں رہا بلکہ انہیں میں سے ایک ہے۔ وہ غدار ہے۔ اس نے اپنے دیس کے ساتھ دھوکا کیا۔

کسانوں کی آواز :۔ ہمیں کھانے کو دو ——— ہم بھوکے مرتے ہیں۔

دوسری آواز :۔ جاپان ہمارے ملک پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور ہم بھوکے مر رہے ہیں۔ کس طرح اپنے دیس کو بچائیں۔

(سب لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں)

چلو۔ ہم تمہیں کھانے کو دیں گے۔

چوتھا ایکٹ ——— تیسرا سین

(کلیم صاحب کا مکان۔ شہناز بیٹھی ہوئی کچھ سی رہی ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی سلیم آتا ہے)

سلیم :۔ شہناز آپا!

شہناز :۔ (چونک کر) کیا ــــــ !

(سلیم رو رہا تھا۔ شہناز گھبرا جاتی ہے)

شہناز :۔ سلیم بھیا ــــ کیا بات ہے ؟ کیوں رو رہے ہو ــــ بولو ــــ سوئی کو کپڑے میں لگا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور سلیم کے پاس جا کر بیٹھ جاتی ہے۔ سلیم اور ہچکیاں لیکر رونے لگتا ہے۔ شہناز اسکو پیار کرکے بڑی مشکل سے خاموش کرتی ہے۔

شہناز :۔ ابا جی نے تم کو کچھ کہا ہے !

سلیم :۔ (ہچکیاں لیتے ہوئے) نہیں

شہناز :۔ اماں نے ڈانٹا ہے ؟

سلیم :۔ نہیں۔

شہناز :۔ (گھبرا کر) پھر کیا ہوا ــــ ؟ بتاتے کیوں نہیں۔

سلیم :۔ محمود بھیا کو ــــــ

(وہ پھر زور زور سے رونے لگتا ہے)

شہناز :۔ ارے جلدی کہو ــــ محمود بھیا کو کیا ہوا ؟

سلیم :۔ محمود بھیا کو چچا جان نے گھر سے نکال دیا

شہناز :۔ گھر سے نکال دیا۔

سلیم :۔ ہاں

شہناز :۔ (پریشان ہو جاتی ہے) کب ؟

سلیم :۔ آج ہی تو ــــ ابھی تھوڑی دیر ہوئی۔

شہناز :۔ تم کو معلوم ہے کیوں نکال دیا۔

سلیم :۔ ہاں ــــ اس نے نکال دیا کہ وہ بھوکے لوگوں کیلئے کھانے کا انتظام کر رہے تھے۔

شہناز :۔ (خود سے) چچا کتنے ظالم ہیں۔ اگر وہ ملک کی خدمت کر رہے تھے تو کوئی جرم نہیں وہ خود ہی تو مصیبت جھیلتے ہیں۔ بھلا ان کا کیا بگڑتا ہے۔ چچی نے بھی چچا کو نہیں سمجھایا (پھر سلیم سے) تم کو معلوم ہے وہ کہاں ہیں ؟

سلیم :۔ نہیں ــــ میں نے اُن کو جاتے ہوئے دیکھا تھا۔

شہناز :۔ پھر تم کو کیسے معلوم ہوا کہ نکال دیا ؟

سلیم :۔ ان کے نوکر نے بتایا ہے۔

شہناز :۔ (اپنے آنسوؤں کو روکتے ہوئے) اچھا جاؤ ــــ باہر دیکھنا۔ نظر آجائیں مجھے بتانا ــــ اچھا بھیا !!

سلیم :۔ اچھا۔

(وہ اٹھکر چلا جاتا ہے۔ شہناز پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی ہے [illegible] معلوم ہو جاتی ہے۔ شہناز کی والدہ آجاتی ہیں)

سلطانہ :۔ ہائیں ! یہ کیا ہو رہا ہے شہناز ! ــــ کیوں رو رہی ہو ــــ

(شہناز روتے روتے بے ہوش ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی آہستہ آہستہ ــــ محمود ــــ محمود" کہتی ہے)

سلطانہ :۔ ہائے میری بچی کو کیا ہو گیا ؟

(کلیم بھی آجاتے ہیں)

کلیم :۔ لیکن یہ رو کیوں رہی تھی ؟

سلطانہ :۔ مجھے کیا معلوم ــــ میں نے تو روتے ہوئے ہی دیکھا ہے۔

کلیم :۔ اچھا میں نوکر کو ڈاکٹر کے پاس بھیجتا ہوں۔

(دروازہ کھلتا ہے۔ محمود داخل ہوتا ہے)

محمود :۔ چچی جان آداب عرض

سلطانہ :۔ اوہو ! آج تو محمود آگئے۔ کہو کیسے راستہ بھول گئے۔

محمود :۔ پہلے یہ بتائیے کہ شہناز کا یہ کیا حال ہے۔ میں اسی کو دیکھنے آیا ہوں۔

سلطانہ :۔ دیکھ لو بھیا ــــ بیہوش پڑی ہے۔ جب ذرا ہوش آتا ہے تو تمکو یاد کرتی ہے۔

محمود :۔ (قریب جاکر) شہناز ! شہناز !!

(آنکھیں کھول دیتی ہے)

شہناز :۔ محمود ! ــــ محمود !! ــــ آپ آگئے ــــ آگئے۔

محمود :۔ گھبراؤ نہیں شہناز میں آگیا۔ کیا بات ہے ؟

(سلطانہ کسی کام سے باہر چلی جاتی ہیں)

شہناز :۔ چچا جان نے آپ کو گھر سے نکال دیا ہے (رونے لگتی ہے)

محمود :۔ تو رونے کی کیا بات ہے۔

شہناز :۔ چچا کتنے ظالم ہیں۔

محمود :۔ ہر دولتمند ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ ہماری تہذیب یہی سکھاتی ہے۔ تم کو ابھی تجربہ نہیں۔

شہناز :۔ (بات کا رخ بدل کر) آپ نے اپنی کیا صورت بنا رکھی ہے

محمود :۔ (ہنستا ہے) تم میری صورت پوچھتی ہو شہناز ! ان کی شکل دیکھو جو سڑکوں پر پریشان حال گھر گھر پھر رہے ہیں۔ ان کی شکل دیکھو جو بھوک سے روٹی کے ٹکڑے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔

شہناز :۔ محمود کیا میں اپنے ملک کی کوئی خدمت نہیں کر سکتی ؟

محمود :۔ کیوں نہیں کر سکتیں۔

ناز :۔ [illegible] آپ کو وقت ملا کرے گی۔

محمود :۔ آپ ان لوگوں کے لئے کچھ کھانے کو دیجئے بس ایک یہی کام ہے جو آپ کر سکتی ہیں۔

شہناز :۔ (اپنے گلے سے ہار نکال کر محمود کی طرف بڑھاتی ہے) محمود! یہ کچھ کام آ سکتا ہے؟

محمود :۔ نہیں۔ اسکو پہنے رہو اگر چچی کو خبر ہو گئی تو وہ تمہاری مصیبت کر دیں گی۔

شہناز :۔ (کچھ سوچتی ہے) میں روپیہ بھی دے سکتی ہوں۔

محمود :۔ تو اس سے اچھی کیا بات ہو سکتی ہے۔

شہناز :۔ (تکیے کے نیچے سے کچھ روپیہ نکالتی ہے اور محمود کے ہاتھ میں دیدیتی ہے)

محمود :۔ لیکن میں اسکا شکریہ نہیں ادا کرونگا کیونکہ یہ آپ کا فرض ہے۔

شہناز :۔ (ہنستی ہے) میری کتنی خوش نصیبی ہو اگر آپ اپنی ہر ضرورت کیلئے مجھ سے کہا کریں

محمود :۔ یہی میری ضرورت ہے اسی کو آپ تھوڑا بہت پورا کرتی رہا کریں۔

(سلطانہ آجاتی ہیں)

سلطانہ :۔ محمود چائے منگاؤں ؟

محمود :۔ نہیں۔ دیر بہت ہوگئی ہے۔ مجھے ضروری کام سے جانا ہے۔

(محمود کھڑا ہو جاتا ہے)

سلطانہ :۔ چل دیئے کیا ؟

محمود :۔ جی اب اجازت دیجئے۔ اگر وقت ملا تو پھر آؤنگا۔

شہناز :۔ (قریب آکر) محمود! کیا میں امید کروں کہ تم مجھے بھولو گے نہیں۔

محمود :۔ کیسی باتیں کر رہی ہو شہناز۔ اچھا اب میں جاتا ہوں پھر آؤنگا۔

شہناز :۔ آؤ گے ؟ محمود :۔ ہاں — جاؤ بیٹھو۔

شہناز :۔ آپ کو دروازے تک پہنچا دوں۔

محمود :۔ (ہنس کر) بڑے لوگوں کو موٹر تک پہنچانے جایا کرتے ہیں۔ مجھے تو تنہا بہت اچھا بہت دور چلنا ہے۔ (دونوں ہنستے ہیں)

شہناز :۔ پھر بھی جہاں تک میں جا سکتی ہوں۔

پانچواں ایکٹ — پہلا سین

(بنگال کی ایک سڑک)

[illegible] پڑی ہیں۔ کہیں بچے بوڑھے سب ہی ہیں۔ کچھ عورتیں اپنے بچوں کو سڑک پر چھوڑ کر جا رہی ہیں۔ کچھ بھوکے بچے اپنے بھوکے ماں باپ سے روٹی مانگ رہے ہیں [illegible] ایک سرکاری دوکان ہے۔ جہاں عورتیں مرد بچے بوڑھے لاکھوں کی [illegible] ہو رہے ہیں۔ ان میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی۔ وہ زمین پر بار بار اس طرح

ہاتھ چلاتے ہیں جیسے یہ مٹی آٹا بن جائیگی۔ یہ کنکر روٹی کے ٹکڑے ہو جائینگے۔

کچھ فاصلہ پر ایک درخت کے نیچے محمود لیٹے ہیں اور روپا قریب بیٹھی ہوئی ہے۔

محمود کو بخار چڑھا ہے۔

روپا :۔ دیکھا نہیں جاتا — کیسا ہیبت ناک سین ہے

محمود :۔ اور وہ دیکھا عورت روٹی نہ ملنے کی وجہ سے اپنے بچے کو سڑک کے کنارے چھوڑ گئی۔ کیسا رو رہا ہے۔

ایک بھوکی عورت :۔ (جس کا دماغ خراب معلوم ہوتا ہے) یہ روٹی ہے — (زمین پر ہاتھ پھیرتی ہے) ارے کتنے ٹکڑے ہیں —— آٹا ہی آٹا —

(مٹی اور کنکروں کو اٹھا کر منہ میں بھر لیتی ہے)

(بھوکے بچے دوڑتے ہیں)

بھوکی عورت :۔ کھاؤ — کھاؤ — دیکھو روٹی کے کتنے ٹکڑے ہیں۔

سب بچے اٹھا کر منہ میں ڈالتے ہیں اور پھر تھوکتے ہیں

روپا :۔ ہائے — ہائے — بھوک بھی کیا چیز ہے [illegible] روٹی اور پتھر میں تمیز نہیں کر سکتا۔

(محمود کراہ رہا ہے)

ایک بھوکا آدمی دو بچوں کا ہاتھ پکڑے ہوئے کھڑا ہے۔ ایک شخص ادھر سے گذرتا ہے

بھوکا شخص :۔ (راہ گیر سے) مجھے چار آنے پیسے دو اور ان دونوں بچوں کو لے جاؤ — یہ تمہارا کام کر دیا کریں گے بابو جی۔

(وہ شخص بغیر کچھ توجہ کئے آگے بڑھ جاتا ہے۔ بھوکا مرد اور اس کے بچے حسرت سے دیکھتے رہ جاتے ہیں)

محمود :۔ روپا کیا سوچ رہی ہو ؟

روپا :۔ یہ دیکھ رہی تھی کہ بھوک ماں باپ کی محبت پر غالب آ سکتی ہے۔ چند پیسوں میں لوگ اپنے بچوں کو فروخت کر رہے ہیں۔

محمود :۔ یہ بھوک ہی ہے جس نے [illegible] بھیک مانگنے پر مجبور کیا [illegible] غیرت مزدور جو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانا نہیں جانتے تھے [illegible] ایک نوالہ کے لئے اپنا [illegible] رہے ہیں۔

(محمود زور زور سے کراہنے لگتا ہے)

روپا :۔ گھبرا کر کیا بات ہے ؟ (ماتھے پر ہاتھ رکھتی ہے) [illegible]

(باقی آئندہ)

(گذشتہ سے پیوستہ) قسط چہارم

بدنام

(از محترمہ مہر آرا وصفی مراد آبادی)

"رات ہونے کو آئی ——— راستہ پرخطر ہے ——— اور میں لیلا ت پہنچے ہوں"

کتنی مرتبہ کہا ——— مگر جواب ہی نہیں دیتے۔ آج گھر لوٹنے کا ارادہ نہیں ہے کیا ——— ؟" اُس نے تیور بدل کر شوہر سے کہا۔

"میں بھابی بغیر گھر اب نہیں جاؤں گا۔" پرمود نے ——— جو اس کی بدمزاجی سے عاجز آ چکا تھا، ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"تو میں چلی ———" سوشیلا نے غصہ سے لال پیلی آنکھیں نکال کر کہا۔

"اکیلی ——— ؟" کمود نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر کہا۔

"جناب وہ ڈرائیور میرے میکے کا ہے۔ اور ——— اس لئے مجھے اس کے ساتھ جانے میں ڈر نہیں لگتا ———"

"سُنو تو ———" پرمود نے ماں کے ڈر کی وجہ سے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ "ماتا جی ناراض ہونگی۔ میں ڈاکٹر سے ذرا اجازت لے آؤں ——— ابھی آتا ہوں ——— بس دس منٹ بعد چلتے ہیں۔"

"بہت دیر ہو جائیگی ———" سوشیلا نے کہا۔

"مجھے صبح لے جانا بھیّا ———" لیلا نے کہا۔ "اتنی جلدی اجازت لینا۔ اور پھر لیکر جانا یہ سب مشکل ہے ———!! تم جاؤ بھورانی کو اکیلا مت جانے دو۔ رات ہو چلی ہے۔"

"ننھے چلوگے ؟" کمود نے برجستہ سے معلوم کیا اور وہ ماں کی پرواہ کئے بغیر ہنستا ہوا اس کے ہمراہ ہوگیا۔

لیلا کو ——— ایسا محسوس ہوا جیسے وہ مطمئن ہوگئی ہے کہ اُس کے بغیر تنہا خوش رہ سکتا ہے۔

"ننھے ! ماں کو پرنام کرو ———" پرمود نے بچہ کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

بچے نے جو اس عرصہ میں ماں سے [illegible] کے سبب اس سے بالکل بیگانہ ہوگیا تھا چاروں طرف متجسس نظروں سے دیکھا۔

"ارے ——— ! وہ ماں کو پہچانتا بھی نہیں ———" سوشیلا نے حیرت سے بچہ کو دیکھکر کہا۔

"تمہاری سب کی محبت نے اس کو موہ لیا ہے ———" لیلا نے بیٹھے بیٹھے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس وقت اس کے چہرہ پر مسرت اور اطمینان کے ملے جلے آثار ہویدا تھے۔ اور بہت خوش نظر آرہی تھی !

"نمستے کرو ننھے" کمود نے کہا۔ اور ننھے نے اپنے دونوں چھوٹے چھوٹے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ لیلا نے ——— اُس کو قریب بلا کر خوب سینے سے چمٹا کر پیار کیا۔ لیکن جب وہ رخصت ہو رہا تھا تو غمگین سا تھا۔ اور لیلا کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے جن کو لاکھ کوشش اخفا کے باوجود وہ نہ چھپا سکی۔

"اُس کو یہیں رکھ لو جی جی ——— اگر دل چاہے تو ———" کمود نے کہا۔

"نہیں نہیں وہ ابھی بہت کمزور ہیں اس کو نہ سنبھال سکیں گی ———" پرمود نے جواباً کہا ـ اور پھر وہ مسکرا کر بولا۔ "اس کو تو وہ اپنی دیورانی کو رونمائی میں دے چکیں۔ یہ تو اب ہمارا ہے۔" بچہ کو گود میں اُٹھا کر اُس نے پیار کرتے ہوئے کہا ——— "ننھے کس کے ہو ——— ؟"

"تمہارا" ننھے نے اُس کے کاندھے پر سر رکھکر جواب دیا۔

"آپ کو اس سے محبت بہت ہی ہے ———" سوشیلا نے جیسے چڑ کر کہا۔

"بہت ——— بہوت ———" پرمود نے کھسیا کر جواب دیا۔ وہ سوشیلا کو لاکھ بار حالات سے آگاہ کر چکا تھا۔ مگر وہ لیلا اور برجیش سے نہ معلوم کیوں ہمیشہ ناراض ہی سی رہتی تھی ـ اور اکثر پرمود کو طعنے دیا کرتی تھی ——— پرمود کے دل میں اس کی یہ عادتیں رفتہ رفتہ نفرت پیدا کر رہی تھیں ——— اور وہ تاریک مستقبل کے بھیانک خواب دیکھنے کا کچھ عادی سا ہو چلا تھا ——— چار ماہ کے مختصر سے عرصہ میں یہ سب کچھ ہوگیا تھا ———!!

"اجازت ہے بھابی ———" پرمود نے لیلا سے کہا۔

"جاؤ بھیّا بہت دیر ہو رہی ہے۔ دیکھو بھورانی سوار بھی ہو چکیں۔" لیلا نے کہا۔

"ارے وہ گئیں بھی ——— اتنی جلدی ———" پرمود نے حیرت سے کہا

"نمستے جی جی ———" کمود نے کہا۔

کہتے ہیں ــــ" لیلا نے جواباً کہا ــــ! ماتا جی کے تیوروں نے لیلا کو حیران ہی کیا تھا۔ مگر آج سوشیلا کو دیکھکر اور اس کی باتیں سُنکر یقین کرنے پر مجبور ہوگئی کہ اب اس گھر میں ایک منٹ بھی اسکی گزر نہ ہوگی۔

ــــ پھر کیا کرے ــــ ؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جسے وہ بہت دیر تک سوچتی ــــ گاؤں واپس چلی جائے !! اس خیال ہی سے وہ لرز جاتی ــــ کیونکہ وہ جانتی تھی وہ بُری طرح گاؤں میں "بدنام" ہو چکی تھی ــــ اور اب جس طرح اس کے ساتھ آنا اور پھر اس کی شادی کے بعد گھر واپس لوٹنا کیا کچھ نہ ہوگا ــــ وہ کیسے زندہ رہ سکے گی ؟ وہاں کے بدگمان انسانوں سے کیونکر وہ جیت سکے گی ــــ ؟

سکول میں داخل ہو جاؤں ــــ بے دیگر یہ ایک آرزو تھی ــــ سہمی ہوئی سی خوفزدہ تمنا۔ مگر وہ جانتی تھی ایسا کرنے میں اُسکی "بدنامی" ــــ اور بڑھیگی۔ نہ پرمود اس سے کنارہ کش ہو سکے گا ــــ اور نہ وہ اس بدنامی سے چھٹکارا پا سکے گی ــــ !!

" بی بی جی ــــ چٹھی آیا ہے ــــ" ایک نرس نے کمرے میں داخل ہو کر اس کی محویت کو توڑ دیا۔

"چٹھی ــــ !" وہ حیرت زدہ ہو کر بولی ــــ اور لفافہ چاک کر کے جلدی جلدی پڑھنے لگی۔ یہ ماتا جی کی طرف سے تھا۔ تحریر تھا :۔

لیلا ! تمہاری صحت یابی کی اطلاع کمود اور پرمود کی زبانی معلوم ہو کر باعث مسرت ہوئی۔ اب تک کی تو خیر کوئی بات نہ تھی۔ مگر تم جانتی ہو اب گھر میں بھوجائی آگئی ہیں۔ اس لئے میرا مشورہ ہے کہ صحت ہونے پر تم اپنے گاؤں واپس چلی جاؤ۔ اگر تم یہاں لوٹ کر آئیں تو مُفت میں بدنامی ہوگی۔ ویسے بھی جب سے بھوجائی نے اپنے میکے میں شنکر نامی کسی شخص کی زبانی جو تمہارے گاؤں کا ہے تمہارے اور پرمود کے تعلقات کا حال سُنا ہے وہ ناراض سی رہتی ہیں ــ اور اب اگر تم واپس آگئیں تو پھر پرمود کی بدنامی میں کوئی کسر باقی نہ رہیگی عورت کسی حال میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ اس کا پتی اس سے زیادہ کسی اور عورت کو چاہے۔ اور اسی لئے بھوجائی کی ناراضگی حق بجانب ہے۔ بہت کرو گی تو تم یہ غلط پرمود کو دکھاؤ گی۔ لیکن میں اس سے نہیں ڈرتی۔ اس لئے کہ جس قدر ممکن تھا میں اس کو راہ راست پر لانے کی کوشش کر چکی۔ اور اب مجبور ہو کر اس کے ساتھ بھی سختی کا برتاؤ کرنے پر آمادہ ہو گئی ہوں۔ تھوڑے لکھے کو بہت جاننا۔

راقمہ تمہاری ہی خیر خواہ

سروجنی

لیلا نہ جانے کتنی دیر تک ان سطروں میں جذب رہی ــــ بہت دیر بعد کہیں جا کر اُس کے اوسان ٹھکانے ہوتے ــــ غصہ اور نفرت سے اب بھی وہ کانپ رہی تھی۔ میں ــــ تو بدنام ہو ہی چکی ــــ یہ بدنما داغ ــــ میری ناتوان کوشش سے تو اب مٹنے سے رہا ــــ اُس نے دل میں کہا ــــ لیکن پرمود جی ــــ اس فرشتہ صفت انسان کی ــــ تباہی اور بربادی کا سبب بھی میں ہی بن رہی ہوں ــــ ؟ کچھ بھی ہو ــــ میں ان کو بدنام نہ ہونے دونگی ــــ" اس نے صدق دل سے آخری فقرہ کئی بار دُہرایا ــــ اور اب اس کے لبوں پر ایک دل آویز اطمینان، ہلکی سی مسکراہٹ کی شکل میں نمودار تھا ــــ !!

علی الصبح جب پرمود اور کمود لیلا کو مکان واپس لے جانے کو ہسپتال پہنچے تو وہ یہ سُنکر حیران رہ گئے کہ نمبر ۷ا کا مریض لاپتہ ہے ــــ تمام ہسپتال میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل چکی تھی ــــ

" ہیلو مسٹر پرمود ــــ" ! ڈاکٹر ورمن نے پریشان صورت سے اسکا استقبال کرتے ہوئے کہا ــــ " میں نے ابھی آپ کو فون کیا تو آپ وہاں نہ تھے۔ شاید یہاں آنے کیلئے روانہ ہو چکے تھے۔ مگر ــــ تعجب ــــ تو یہ ہے کہ اس کی ناتوانی کی حالت تو یہ تھی کہ بغیر سہارے پلنگ سے اُٹھنا محال تھا۔ اور ــــ آخر ــــ اس طرح ــــ وہ ــــ فرار ــــ کیسے ہوئی ــــ ؟ ــــ حیرت ہے !"

"پرانا دماغی مرض ــــ پھر عود کر آیا ہوگا شاید ــــ" کمود نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے غمگین آواز میں کہا۔

" بالکل نہیں مس صاحب ــــ وہ رات ــــ بالکل صحیح حالت میں تھی۔ نرس سے معلوم ہوا کہ بارہ بجے کے بعد رات کو ایک چٹھی اس کے نام "پرمود پیلیس" سے آئی تھی ــــ جو اُس نے لی اور مطالعہ کی ــــ اس وقت وہ بالکل اچھی تھی اور دماغ بالکل صحیح حالت میں تھا ــــ"

"چٹھی ــــ !" پرمود اور کمود دونوں کے مُنہ سے بیک وقت نکلا ــــ پرمود کے چہرہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں ــــ اُس کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اور اس کو یقین ہونے لگا کہ اب لیلا کا ملنا مشکل ہے۔

" ہاں ــــ ! چونکہ وہ آپ کے یہاں سے آئی تھی۔ اس لئے اس طرف ہم لوگوں کا کوئی خاص شبہ نہیں گیا تھا ــــ" ڈاکٹر نے پرمود کی

کو حیرت سے دیکھ کر کہا۔"

"لاش — لاش — مجود — مجور — کنوئیں میں لاش —" ہسپتال کا مالی بھاگتا بھاگتا بدحواس روتا ہوا آیا — !

[illegible] ٹیلی فون کر دیا تھا۔ اور نعش کوئیں سے نکالی گئی — یہ لیلا تھی — بدنام اور رسوا لیلا — جو اپنی منحوس صورت یہاں چھپا کر پرمود کو بدنامی سے بچانے کی تمنی تھی — !!

لیلا کے کمرہ کی تلاشی ہوئی۔ لفافہ برآمد ہوا۔ ہر چند کہ اس پر کوئی عبارت درج نہ تھی لیکن پرمود نے فوراً پہچان کیا کہ وہ ماتا جی کے خاص رائٹنگ پیڈ کا ہی لفافہ تھا — لفافہ کے اندر کیا تھا — ؟ یہ راز کبھی فاش نہ ہو سکا — پرمود کو اس کے باوجود یقین تھا کہ لیلا کی موت کی بانی ماتا جی ہیں۔ اور اسی لئے وہ اس سے نفرت کرنے لگا تھا — !!

تیرے بغیر

(از محترمہ ک۔ ن بیگم)

رہتی ہے کھوئی کھوئی طبیعت ترے بغیر — ملتی نہیں ہے رُوح کو راحت ترے بغیر
بے کیف سی فضائیں ہیں افسردہ کائنات — مفقود ہے جہاں سے مسرت ترے بغیر
ذوقِ نشاط ہے، نہ اُمنگیں، نہ ولولے — جینے سے ہو گئی مجھے نفرت ترے بغیر
نوحہ ہے گویا نغمۂ بُلبُل مرے لئے — صحنِ چمن سے ہوتی ہے وحشت ترے بغیر
گلزار بھی نظر مجھے آتے ہیں خارزار — باقی نہیں گلوں میں لطافت ترے بغیر
جو تھے مرے لئے کبھی دِلچسپ مشغلے — اُن سے رہی نہیں مجھے رغبت ترے بغیر

تجھ بِن دکھائی دیتی ہے بے نُور چاندنی
مہتاب کی بھی زرد ہے رنگت ترے بغیر

(سلسلہ کیلئے ادیب جنوری ۱۹۴۲ء ملاحظہ فرمایئے)

اوراقِ پریشاں

(از محترمہ حمیدہ سلطانہ)

۱ستمبر ۱۹۴۰ء

آج کا دن خوب گذرا۔ شعر و ادب میں کھو کر اکثر میں اپنی ناکامیوں کو بھول جاتی ہوں۔ بزمِ ادب شملہ کی جانب سے ایک عظیم الشان مشاعرہ آج شب کو کیا گیا تھا مشاعرہ بہت کامیاب رہا۔ تمام مشاہیر شعرا شریک تھے۔ جگر کی غزل بہت خوب تھی۔ آہ! کتنا اچھا کہا ہے ؎

بیتاب ہے بے خواب ہے معلوم نہیں کیوں
دل ماہیِ بے آب ہے معلوم نہیں کیوں

۲ستمبر ۱۹۴۰ء

آج لیڈی . . . . جنگ نے مشہور شاعروں اور اپنے مخصوص احباب کو ڈیویکو میں پارٹی دی تھی۔ ہم لوگ بھی مدعو تھے۔

شملہ کی اعلیٰ سوسائٹی کی روح ڈیویکو میں کھنچ آئی تھی۔ رنگارنگ ساڑیوں سے لالہ زار ہر جانب کھلا ہوا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا گلہائے رنگارنگ کی نمائش ہو رہی ہے۔ یہ شاعرانہ فضا اور اس پر شعرا کا اپنا بہترین کلام سنانا سونے پر سہاگہ کا مصداق ہو گیا۔

جمالی سے میرا تعارف مسز . . . . جنگ نے یہ کہکر کرایا یہ ہیں میری عزیز بھتیجی اور مشہور شاعرہ نیلوفر بانو۔ وہ یہ سنکر ذرا چونکا۔ اور ایک گہری نظر مجھ پر ڈالی۔ میں اُس کے اس انداز سے متعجب ہو گئی اور وہ بھی اپنی بیساختہ بیباکی پر نادم ہوا اور بہت پُر خلوص انداز میں معافی مانگی۔ اور اس نے کہا کہ وہ میری نظموں سے بہت متاثر ہے۔ مجھے ہنسی آگئی۔ جمالی کی شاعری خود بہت حسین و رنگین ہے۔ بہرحال آدمی دلچسپ ہے۔ یہ صحبت پُر لطف تھی۔

۱۴ستمبر ۱۹۴۲ء

گذشتہ ۲ روز میں اپنی نظم "شاعر کا خواب" مکمل کرنے میں اس قدر مصروف رہی کہ روزنامچہ لکھنے کا بھی خیال نہ رہا۔ آج کا دن بہت خوشگوار تھا سنہری دھوپ پھیلی ہوئی ایسی معلوم ہو رہی تھی جیسے کسی حسینہ کی دھانی ساڑی پر سنہرا کام کر دیا گیا ہو۔ آج شب کو مسز . . . . جنگ اور لیڈی جنگ کو کھانے پر بلایا تھا۔ جمالی اُن کے ہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ اس لئے وہ بھی آیا اُس نے آج اپنی کئی دلکش نظمیں سنائیں۔ قدرت نے اسکو خیاضی کے ساتھ شاعرانہ جوہر عطا کئے ہیں۔ خوب لکھتا ہے اور خوب پڑھتا ہے۔ کسی بہتے ہوئے آبشار کے مانند اُس کے کلام میں روانی ہے۔ اور پڑھنے کا انداز بھی موجوں کے جزر و مد سے ملتا ہے۔ وقت کہاں گذرا، معلوم ہی نہ ہوا۔ جب گھنٹے نے ٹن ٹن بارہ بجائے تو مہمان رخصت ہوئے۔

۱۸ستمبر ۱۹۴۰ء

آج بھی خوشگوار دن ہے۔ میرے دل کو قدرے سکون ہے۔ دماغ شگفتہ ہے۔ تھیٹر میں "صید ہوس" دیکھنے سعیدہ کے ساتھ چلی گئی۔ یہ حشر کا مشہور اور کامیاب کھیل ہے۔ اداکار بھی اچھے تھے۔ اس لئے خوب لطف آیا۔

۲۰ستمبر ۱۹۴۰ء

کل اور آج بے حد مصروف رہی۔ تمام دن مہمان آتے رہے۔ آج سہ پہر کو جمالی کا خط ملا۔ لطیف و رنگین خط! اس کی دلکش تحریر کو پڑھکر میرے بے رنگ لبوں پر ہلکا سا تبسم آگیا۔ لیکن جواب نہیں دونگی۔

۲۵ستمبر ۱۹۴۰ء

اب شملے سے روانگی کے دن قریب ہیں اس لئے وقت بہت مصروف گذرتا ہے۔ آج مسز پرشاد نے کھانے پر بلایا تھا۔ واپسی بہت دیر سے ہوئی۔ اس لئے تکان سے جسم چُور چُور ہے۔

۲۸ستمبر ۱۹۴۲ء

پچھلے تین روز سامان سفر درست کرنے اور آنے جانے میں اتنی مصروف رہی کہ روزنامچہ نہ لکھ سکی۔ ظاہری زندگی کا جتنا عیش، جتنا سکون، جتنی خوشی ممکن ہے۔ وہ سب ان دنوں مجھے میسر رہا۔ لیکن دل کے خلا کو کیا کیا جائے جو کسی سامان عیش سے پُر نہیں ہو سکتا۔

۲۵ستمبر ۱۹۴۰ء

آج دوپہر کو شملے کے دلکش مناظر اور خوبصورت مرغزاروں کو خدا حافظ کہا۔ اب ٹرین وطن کی جانب لئے جا رہی ہے۔

۲ اکتوبر ۱۹۴۰ء

وطن پہنچے دو روز ہو گئے۔ لیکن تکان اُتارنے گھر درست کرنے عزیزوں سے ملنے کے باعث میں روزنامچہ نہ لکھ سکی۔ موسم کافی اچھا ہے۔ میری طبیعت بھی زیادہ نڈھال نہیں ہے۔

۴ر اکتوبر سنہ ۴۰ء

کل تمام دن شہر یہ شاہدہ اور شوخ چندرا نے دھما چوکڑی مچائی - ان شریروں کے دلا ویز لطیفوں کی بدولت خوب وقت گذرا۔ شاہدہ نے اپنی بڑھی ساس کی گنوارو بولی کی نقل ایسے مزے سے اُتاری کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

آج جمالی کا خط ملا۔ اُس نے پہلے خط کا جواب نہ پاکر بڑے دلکش انداز میں شکوہ کیا ہے۔ اور لکھا ہے کہ وہ پرسوں شام کی چائے پر ہمارے ہاں ہوگا خوب! یہ شخص تو کچھ دیوانہ معلوم ہوتا ہے۔ وہی مثل ہے "مان نہ مان میں تیرا مہمان"۔

۵ر اکتوبر ۱۹۴۰ء

شاہدہ آج پھر دوپہر سے نازل ہو گئی تھی۔ جمال لکھنے کے مطابق ٹھیک پانچ بجے پہنچ گیا۔ دلچسپ باتوں، ادبی بحث اور پھر جمالی کی دلکش مسحورکن نظمیں سنتے سناتے شب کے ۸ بج گئے۔ اس لئے میں نے اسکو شب کے کھانے کے لئے روک لیا۔ شاہدہ ایک پرکار آفت ہے بہت روکا لیکن ۸ بجتے ہی چل دی۔ یہ کہکر کہ میرا میاں بچارا میری راہ دیکھ رہا ہوگا۔ میں اس نگوڑے شاعر کی نظمیں یہاں سُن رہی ہوں اور وہ بچارا مجھے یاد کر رہا ہوگا۔ اس کی شرارت بھری باتیں خدا کی پناہ!

۷ر اکتوبر ۱۹۴۰ء

کل شب کو دیر سے سوئی تھی اس لئے طبیعت مست ہے۔ آسمان پر ہلکا ہلکا ابر چھایا ہوا ہے۔ خوشگوار ہواؤں نے فضا کو سکرآلود کر دیا ہے بہت خوشگوار دن ہے۔ میں رگ رگ میں ایک زندگی سی محسوس کر رہی ہوں۔ تمام دن کتب بینی میں گذرا۔

۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۰ء

آج صبح کا وقت مطالعہ میں گذرا۔ شام کو شاہدہ کے پاس چلی گئی۔ اُس نے بڑے منکسرانہ انداز سے کہا۔ اے سنبھل! یہ جمالی تو معلوم ہوتا ہے تیرے پیچھے دیوانہ ہو رہا ہے۔ میں نے ہنس کر جواب دیا۔ چل ایسے ہر راہ چلتا میرے پیچھے دیوانہ ہوتا نظر آتا ہے۔ بھلا ابھی تو میں ایسی ہی خوبصورت۔ لیکن دل میں جمالی کے طور و طریق پر غور کرتی ہوں۔ اور اس کی حرکات پر تبصرہ کرتی ہوں۔ تو شاہدہ کی بات کا سوفی صدی یقین کر لینا پڑتا ہے میں بچ رہی ہوں اور وہ میرا دامن پکڑنا چاہتا ہے۔

۲۵ر اکتوبر سنہ ۴۰ء

آج کا دن بہت روشن تھا۔ نیلا آسمان کسی پاکباز کے دل کی مانند صاف تھا۔ میں آج تمام دن اپنے لباس کی درستی میں مصروف رہی۔ سعیدہ کی شادی اگلے ہفتے میں ہو رہی ہے۔ تمام دن جگر کی ایک غزل گنگناتی اور سیتی رہی۔

۷ر نومبر سنہ ۴۰ء

سعیدہ کو کل وداع کر کے شب کو بارہ بجے کے قریب گھر آئی مسلسل ایک ہفتے شادی کے ہنگامے میں مصروف رہنے کے بعد بہت تھک گئی ہوں۔ آج تمام دن بستر پر پڑی رہی سردی بھی اب دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔

۱۱ر نومبر سنہ ۴۰ء

گذشتہ دو روز سخت زکام میں مبتلا رہی۔ سارے جسم میں درد بھی جا کا تھا یہ شاید تکان کا نتیجہ تھا۔ آج کا تمام دن کتب بینی اور خطوط کے جواب دینے میں گذرا شام کو شاہدہ کے ساتھ کچھ دور تک چہل قدمی کی۔

۱۲ر نومبر سنہ ۴۰ء

آج صبح کافی ٹھنڈ تھی۔ میں دوپہر تک اپنی ایک نظم مکمل کرتی رہی۔ کھانے کے بعد جمالی کا خط ملا۔ اُس نے لکھا ہے وہ ایک مشاعرے کی شرکت کیلئے ...... جا رہا ہے۔ واپسی پر دو دن کیلئے یہاں بھی ٹھیرے گا۔ میں بار بار اُس سے ملنا نہیں چاہتی مجھے مردوں پر اعتبار نہیں رہا اور پھر یہ شاعر! خود غرض، فریب کار مرد۔ آہ ٹھری! میں کل اسکو اطلاع دیدونگی کہ میں مصروف ہوں اسلئے اُس سے نہ مل سکوں گی۔

۱۳ر نومبر سنہ ۴۰ء

آج مطلع ابر آلود تھا۔ میں صبح سے دوپہر تک لکھتی رہی ہوں۔ دوپہر کو کھانا کھا کر بیٹھی ہی تھی کہ شاہدہ آگئی اُس نے رسالہ "قوس وقزح" دکھایا۔ اُس میں میری نظم "بیتے دنوں کی یاد" ایڈیٹر کے تعریفی نوٹ کے ساتھ چھپی ہے میں اپنی اس کامیابی پر خوش ہوں۔ مگر اُف بیتے دنوں کی یاد . . . . . .

۱۴ر نومبر سنہ ۴۰ء

آج بارش ہو جانے کے باعث ٹھنڈ بڑھ گئی ہے۔ میری مطبوعہ نظموں کے مجموعے پر آج ناز صاحب نے جو ریڈیو پر تبصرہ کیا تھا وہ خوب تھا۔ دوپہر کی ڈاک سے ایک صاحب کا خط بھی ملا۔ انہوں نے میری مدح و ثنا میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے ہیں۔ اس خط کو پڑھکر میرے لبوں پر ایسی ہنسی آگئی جیسے پاگل خانے کے کسی پاگل کو دیکھکر ڈاکٹر کے لبوں پر آجائے۔ بیچارے پر بحران طاری ہے۔ میں اس خط کا جواب کیا دوں۔ خاموشی ہی کافی ہے۔

۱۵ر نومبر سنہ ۴۰ء

آج صبح دس بجے شاہدہ کے ساتھ میں خرید و فروخت کیلئے گئی۔ ہماری کار پھاٹک سے باہر نکلی ہی تھی کہ جمالی آتا ہوا نظر پڑا۔ شاہدہ نے کار روک لی۔ میں نے مصروفیت کا عذر کیا۔ معاف کیجئے گا جناب شاعر صاحب ٹیلیفون کرنے کو لئے جا رہی ہوں۔ خدا کے لئے مجھے بدنام نہ کیجئے گا۔ یہ میری جو

بادشاہ ہوا تو ترکان شاہ کا غرور حد سے بڑھا اور اس نے اپنی سب سوکنوں کو قتل کرا دیا۔ جن سے وہ التمش کی زندگی میں رشک و حسد کرتی تھی۔ سلطان رکن الدین فیروز شاہ اپنی ماں کے مظالم کو دیکھتا تھا اور کچھ نہ کہتا تھا وہ خود بھی خوبصورت گانے والے لڑکوں کو شاہی خزانہ تقسیم کرتا رہتا تھا۔ اور اس کے دربار میں مسخرے جمع ہو گئے تھے جن میں رات دن بادشاہ مصروف رہتا تھا۔

آخر امیروں اور وزیروں اور فوج نے ترکان شاہ کے مظالم اور رکن الدین فیروز شاہ کی عیاشی کے سبب بغاوت کر دی

رضیہ سلطانہ کی تخت نشینی

اسکے بعد ۶۳۴ھ میں سب امیروں اور وزیروں نے رضیہ بیگم کو سلطان بنایا۔ اور رضیہ بیگم مردانہ لباس پہن کر تاج سر پہ رکھے ہوئے دربار میں آئی تو اُسکے حُسن و جمال کو دیکھکر سارا دربار مبہوت ہو گیا۔ اُس نے تخت پہ بیٹھتے ہی حکم دیا کہ میرے باپ کے وقت میں جو شرعی احکام جاری تھے اُنہیں پر میرا عمل بھی ہو گا۔

بغاوت رضیہ کے تخت نشین ہوتے ہی نظام الملک محمد جنیدی وزیر اعظم اور ملک علاء الدین شیر خانی اور ملک سیف الدین کوچی اور ملک عز الدین کبیر خانی نے ملکر بغاوت کی۔ اس وقت سلطانہ رضیہ کے ساتھ فوج بھی کم تھی اور بڑے درجے کا کوئی امیر بھی ساتھ نہ تھا مگر وہ بغیر کسی پریشانی کے گھوڑے پہ سوار ہوئی اور باغیوں پہ حملہ کیا اور میدان جنگ میں ایسی لڑی کہ وزیر اعظم اور سب باغی امیر مارے گئے۔ اور جو گرفتار ہوئے انکو رضیہ نے اپنے سامنے بلا کر قتل کرا دیا۔ اور اس کے بعد خواجہ مہدی غزنوی کو حکم دیا جو وزیر اعظم کا نائب تھا کہ میں تجھ کو اپنا وزیر بناتی ہوں اور نظام الملک خطاب دیتی ہوں۔ اور ملک سیف الدین ایبک کو حکم دیا کہ میں نے تجھ کو اپنی سب فوجوں کا سپہ سالار بنایا۔ اسی طرح سارے ملک کا انتظام کر کے حکومت کرنے لگی اور تمام ہندوستان اُس کا مطیع ہو گیا۔

چند روز کے بعد سیف الدین ایبک سپہ سالار نے وفات پائی تو رضیہ نے قطب الدین حسن کو سپہ سالار بنایا اور حکم دیا کہ رنتھن بور کے قلعہ پر ہندوؤں نے قبضہ کر کے مسلمانوں کو قید کر لیا ہے تم جاؤ اور قلعے پر قبضہ کر کے مسلمانوں کو چھڑاؤ۔ قطب الدین حسن یلغار کر کے فوراً گیا اور قلعے پر قبضہ کر کے مسلمانوں کو چھڑا لیا۔

اسی طرح ساڑھے تین برس تک تمام ہندوستان میں سلطانہ رضیہ نہایت عدل اور انتظام کے ساتھ حکومت کرتی رہی۔ لیکن مورخوں نے اس کی تفصیل کچھ نہیں لکھی بس صرف یہ لکھا ہے کہ اسکی حکومت سے سب خوش تھے۔ اور وہ شرع اسلام پر عمل کرتی تھی۔

رضیہ کے دربار میں ملک اختیار الدین التونیہ امیر حاجب تھا اور جمال الدین یاقوت حبشی امیر آخور تھا۔ سلطانہ رضیہ جمال الدین یاقوت پر اتنی مہربان ہوئی کہ اسکو امیر الامرا بنا دیا اور جب رضیہ گھوڑے پر سوار ہوتی تھی تو یاقوت اسکی بغل میں ہاتھ دیکر اس کو سوار کراتا تھا۔ اس سے بدنامی پیدا ہوئی اور لاہور کے حاکم نے بغاوت کی۔ رضیہ فوراً فوج لے کر لاہور پہنچی اور حاکم کو مغلوب کر کے دوبارہ اسی کو حاکم بنا کر دہلی میں آ گئی۔ پھر خبر آئی کہ ملک التونیہ بھٹنڈے کے حاکم نے بغاوت کی ہے۔ رضیہ دوبارہ فوج لیکر بھٹنڈے پر چڑھ دوڑی۔ راستہ میں ترک امیروں نے بغاوت کر دی اور جمال الدین یاقوت حبشی کو مار ڈالا۔ اور رضیہ کو گرفتار کر کے بھٹنڈے کے قلعہ میں قید کر دیا اسکے بعد امیروں نے دہلی میں واپس آکر التمش کے بیٹے معز الدین بہرام شاہ کو بادشاہ بنا لیا۔

ملک التونیہ حاکم بھٹنڈے نے رضیہ کو قید سے رہائی دی اور اُس سے نکاح کر لیا۔ اور دونوں نے مل کر فوجیں جمع کیں اور دہلی پر حملہ کیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ دوسری مرتبہ رضیہ نے پھر بڑی تیاری کے ساتھ دلی پر فوج کشی کی اور کیتھل ضلع کرنال کے میدان میں ۴ ربیع الاول ۶۳۷ھ میں یہ لڑائی ہوئی۔ اس میں بھی رضیہ ہار گئی اور اپنے شوہر ملک التونیہ کے ساتھ گرفتار ہو گئی۔ اور اس کے بھائی بہرام شاہ نے ۲۵ ربیع الاول ۶۳۷ھ میں اپنی مشہور آفاق بڑی بہن اور اس کے شوہر کو قتل کرا دیا۔ رضیہ نے تین سال چھ مہینے اور چھ دن حکومت کی۔

رضیہ کے زمانے میں دلی شہر لال کوٹ کے قریب تھا اور قطب مینار لال کوٹ میں واقع ہے۔

مورخوں نے یہ نہیں بتایا کہ رضیہ کی لاش کہاں دفن کی گئی تھی لیکن قیاس یہ چاہتا ہے کہ بھائی نے شہر سے ذرا فاصلے پہ دفن کرائی ہو اور جہاں رجی سجی کی قبر ہے قطب مینار سے گیارہ میل دور تک ہے وہاں اب پرانے زمانے یعنی التمش کے زمانے کے طرز تعمیر کی دو قبریں ہیں۔ اور پرانے طرز کی ایک دیوار بھی ہے سرسید نے بھی آثار الصنادید میں اس قبر کا حال لکھا ہے کہ رجی سجی کی قبر درحقیقت رضیہ سلطانہ کی قبر ہے۔

ہندوستان میں آج سے سات سو برس پہلے ایک عورت کی حکومت ساڑھے تین برس رہی اور کوئی مورخ اس تین سالہ حکومت کے خلاف ایک لفظ نہیں لکھتا۔ بلکہ سب کہتے ہیں

شاہدہ نے شرارت بھرے لہجے میں فاتحی نظریں ڈال کر جمالی سے کہا۔ وہ محبت سے نادم ہو گیا۔ اور چند بے ربط جملے معذرت کے کہکر چلا گیا۔

۱۷ر نومبر ۴۰ء

آج کئی روز بعد دھوپ نکلی تھی۔ اس لئے اچھا معلوم ہو رہا تھا۔ جمالی کا خط دوپہر کو ملا۔ لفظ لفظ سے مایوسی ٹپک رہی ہے۔ میں نے کج خلقی کی حد تک لاپروائی برتی۔ مگر کیا کروں مجھے اندازہ ہے کہ میرے لئے یہ برا ہے۔ بہت برا کہ میں کسی سے بھی اپنے ماحول کے خلاف ربط بڑھاؤں۔ مناسب مختصر جواب دیدوں گی۔

۱۸ر نومبر ۴۰ء

آج یوم غالب آل انڈیا ریڈیو پر منایا جا رہا تھا۔ میں نے اپنی نظم "غالب" نشر کی۔ اس کی بہت تعریف کی گئی۔ شام کو چندرا کے ساتھ پلازہ میں چلی گئی — تصویر اچھی تھی۔

یکم دسمبر ۴۰ء

گذشتہ بارہ روز یوں ہی گزر گئے۔ بڑے بھائی جان کے ایک دوست بقا میری کے ہمارے مہمان تھے۔ ان کی تواضع میں مصروف رہکر وقت گزرتا معلوم ہی نہ ہوا۔ سیر و تفریح پکنک، سینما انہی ہنگاموں میں یہ دن گزر گئے۔

۲ر دسمبر ۴۰ء

آج غضب کی سردی تھی۔ بہت پریشان کن ہوائیں چل رہی تھیں۔ ایسی ہوائیں مجھ جیسی تخیل پرست طبائع کیلئے بہت پژمردہ کرنے والی ہوتی ہیں۔ صبح سے شام تک میں اپنے دریچے کے سامنے بیٹھی ہوئی رسائل پڑھتی رہی۔ میری نظموں کی مانگ رسائل کے لئے دن بدن بڑھتی چلی جاتی ہے۔ میری یہ ادبی کامیابی میرے لئے مسرت افزا ہے — پر آہ! غم دل کا علاج ...... کاش فکر ی کو میں بھول سکتی۔

۳ر دسمبر ۴۰ء

آج شکر ہے ہوا تیز نہیں تھی۔ دن بھی خوب روشن تھا۔ چمکیلی دھوپ ہر جانب چھیلی ہوئی تھی۔ آج رسا صاحب مع ایک اور صاحب کے ملنے آئے تھے۔

۴ر دسمبر ۴۰ء

آج سردی کی شدت کے باعث مجھے زکام ہو گیا۔ سر میں درد بھی تھا۔ دوپہر کے بعد ذرا طبیعت سنبھلی۔ سہ پہر کو یکا یک جمالی آ گیا۔ چونکہ گذشتہ مرتبہ میں نے بہت بے رخی برتی تھی اس لئے اس دفعہ میں نے بہت مہربانی کا برتاؤ کیا۔ وہ آپ زرد ہو رہا تھا۔ یاس کا گہرا رنگ اس پر چھایا ہوا تھا۔ نظمیں بھی اس نے جو آج [illegible] سنائیں پہلے سے زیادہ سوز تھا۔ میں گفتگو میں ہمیشہ اسکو سمجھانے کی کوشش کرتی ہوں کہ وہ مجھے پا نہ سکے گا۔ لیکن وہ ہمیشہ ٹال جاتا ہے۔ شب کے کھانے کے بعد رخصت ہوا۔

۵ر دسمبر ۴۰ء

آج کا دن خوشگوار تھا۔ میں بستر سے دیر سے اٹھی تھی۔ اخبار ڈاک دیکھنے میں ہی دوپہر ہو گئی۔ آج ایک زنانہ مشاعرے کی صدارت میں نے کی۔ مجمع کانی خواتین کا تھا۔ اب عورتوں میں بھی شعر و ادب کا شوق ہو چلا ہے۔ گو ابھی یہ شوق بالکل نیا ہے۔ حیا، ناز، عصمت خوب کہتی ہیں۔ شاہدہ کا مذاقیہ کلام بھی خوب رہا۔ اس کی وہ شوخ دلربا صورت اور اس کے پڑھنے کا دلکش انداز دلاویز ترنم غضب یہ کہ ظالم نے اس دور کے دو تین جدید شاعروں کی نظموں کی پیروڈی کی تھی اور مزے لے لے کر پڑھ رہی تھی۔ اس کی شرارت نے تمام مشاعرے میں زندگی سی دوڑا دی۔

۷ر دسمبر ۴۰ء

آج صبح شاہدہ کا تار ملا۔ وہ دوپہر کو آ گئی۔ میں اسے لینے اسٹیشن پر گئی تھی۔ گاڑی بھیج کر میں نے شاہدہ اور چندرا کو بھی بلا لیا۔ وقت خوب گزرا۔ شاہدہ کل صبح کی ٹرین سے لکھنؤ جا رہی ہے۔ اس کے دلکش حسن کو ہوائے نابل کی خوشگوار پون نے اور چمکا دیا ہے۔ کتنی دلربا معلوم ہوتی ہے۔ وہ حسن و شباب میں زندگی کی دلاویز تصویر!

۸ر دسمبر ۴۰ء

کل اور آج تمام دن میں اپنے سرمائی لباس کی دیکھ بھال میں مصروف رہی شام کو شاہدہ کے ساتھ "پکار" فلم دیکھا۔ اور ہندوستانی تصویروں سے یہ بہتر ہے۔

۹ر دسمبر ۴۰ء

آج بہت ٹھنڈا دن تھا۔ تمام دن آتش دان کے قریب بیٹھی ہوئی شیلے کا دیوان دیکھتی رہی۔ دوپہر کو ایک اجنبی ادیب صاحب کا خط ملا۔ وہ شاعرہ خواتین کا ایک تذکرہ مرتب کر رہے ہیں اور اس میں مجھ سے امداد کے طالب ہیں۔ مجھے حیرت ہے بغیر جانے بوجھے کسی اجنبی دوشیزہ کو یہ لوگ کیسے خط لکھ دیتے ہیں۔ ایسے خطوط کو میں ردی کی ٹوکری میں ڈالتے ڈالتے تنگ آ گئی ہوں۔

۱۰ر دسمبر ۴۰ء

غنیمت ہے کہ آج تھوڑی دیر کو دھوپ نکل آئی تھی۔ میں نو بجے کے قریب سو کر اٹھی تھی۔ رات کو آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ سے مشاعرہ سنا۔ یہ مشاعرہ کافی دلچسپ رہا۔ جمالی کی نظم بہت اچھی تھی۔ اور صبا کی غزل تو حاصل مشاعرہ رہی۔

۱۱ر دسمبر ۴۸ء

آج شکر ہے مطلع صاف ہو گیا تھا۔ اور خوشگوار دھوپ ہر جانب پھیلی ہوئی تھی مشاہدہ دوپہر کو آئی۔ وہ جمالی کی کل والی نظم کی بہت تعریف کر رہی تھی اور واقعی یہ نظم اس ور جہ حسین اور اتنی دلکش ہے کہ جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔

۱۵ر دسمبر ۴۸ء

آج سخت سردی تھی۔ گذشتہ شب تمام رات بارش ہوتی رہی۔ میں نے تمام دن آتش دان کے قریب بیٹھ کر مطالعہ کرنے میں گذارا۔ شب کو مشاہدہ کے ہاں گئی۔ اس نے آج کی دعوت میں بہت سے لوگوں کو بلایا تھا۔ اس سخت سردی کے باوجود بڑا دلچسپ مجمع تھا۔ مسز حسین خوب گاتی ہیں۔ ان بنگالیوں کی آواز میں بلا کا جادو ہوتا ہے۔ گیارہ بجے کے بعد واپس آئی۔

۱۷ر دسمبر ۴۸ء

کل کا تمام دن بستر پر گذرا۔ سخت زکام ہو گیا تھا۔ آج شکر ہے طبیعت درست ہے۔ بیگم . . . . خاں کے ذں ایٹ ہوم میں شرکت کی۔ بہت لوگوں سے ملنا ہوا۔ یہ دن انہیں مصروفیتوں میں گذر رہے ہیں۔ روز کہیں نہ کہیں جانا رہتا ہے۔

۲۰ر دسمبر ۴۸ء

آج کا دن خوشگوار تھا۔ چمکیلی دھوپ نے رگ و پے میں تازگی پیدا کر دی تھی۔ دونوں بھائی اور بھاوجیں کرسمس کی تعطیلیں گذارنے ۱۸ر دسمبر کو آئے ہیں۔ تمام وقت باتوں سیر و تفریح میں گذر جاتا ہے۔

۲۱ر دسمبر ۴۸ء

آج بھی شکر ہے سردی زیادہ نہیں ہے دونوں بھاوجوں کے ساتھ خریداری کیلئے چلی گئی۔ دوپہر کو ایک بجے کے بعد صبح کے نکلے ہوئے گھر واپس آئے۔ کھانے کے بعد ڈاک دیکھی۔ جمالی کا خط ملا۔ کل شام کو ملنے آئیگا۔ یہ خبر مسرت کن ہے کل ہمارے ہاں شب کو ایک بڑی دعوت بھی ہے۔ جمالی کی موجودگی اس موقعہ پر یقیناً دلچسپ ہوگی۔

۲۲ر دسمبر ۴۸ء

آج کا تمام دن دعوت کی تیاریوں میں گذرا ہے۔ میں نے قیمہ بھری سموسے بنائے میرے ہاتھ کے بنائے ہوئے سموسے بڑے بھائی جان کو بہت پسند ہیں۔ بڑی بھابی نے انڈوں کا حلوہ بنایا اور چھوٹی بھابی نے مرغ مسلّم دم کئے۔ جمالی بھی شام سے ذرا قبل آ گیا۔ دونوں بھابیاں آج بہت بھلی لگ رہی ہیں۔ بڑی بھابی کے گورے رنگ پر عنابی بروکیڈ کی ساڑی بہت پھب رہی تھی اور پھر یاقوت کا زیور ان کے دلربا حسن کو دوآتشہ کر رہا تھا۔ چھوٹی بھابی کی من موہنی سانولی سلونی صورت ہلکے گلابی رنگ کی کارچوبی ساڑی اور موتیوں کے زیور میں دل میں کھبی جاتی تھی۔

مجھے بھی ان دونوں کے اصرار سے مرغ زری پہننا پڑا۔ اسی وجہ سے زیب و زینت کے بعد ہال میں جاتے ہوئے شرم محسوس کر رہی تھی۔ اور ابھی سنگھار میز کے سامنے کھڑی ہوئی اپنے پر ناقدانہ نظریں ڈال رہی تھی۔ کہ مشاہدہ آ گئی اور آتے ہی ایک دھپ رسید کر کے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ اوہو! آپس صاحبہ کسی غریب کے حلال کرنے کو سنورہی ہیں۔ بڑی بھابی سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ابھی سرکار آرائش گیسو میں مصروف ہیں۔ تم خود کیا کم قیامت بنی ہو۔ تمہاری یہ نیلی روپہلی تاروں بھری ساڑھی اور اس میں تمہارا دلربا چہرہ ایسا معلوم ہو رہا ہے جیسے نیلے آسمان پہ چاند چمک رہا ہے۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ چل جھوٹی لے یہ سیاہ زرکار ساڑی میں ناگن تو بنی ہوئی ہے۔ تیرا کاٹا تو آج پانی بھی نہ مانگے گا۔ اور پھر یہ تیرے کانوں کی بجلیاں تو ایک بیچارے شاعر کو پھنسا لینے کے لئے سنہری جال ہیں۔ اور یہ چندن ہار تو قیامت ہی ڈھا رہا ہے۔ اس نے شرارت بھرے لہجے میں کہا۔ اس کی لغویات سے اکتا کر میں نے قدم اٹھاتے ہوئے کہا چل بک نہیں۔

ہم دونوں ایک ساتھ ہال میں داخل ہوئے۔ چھوٹے بھائی جان کے دو تین ہمکے کنوارے دوست وقت سے کچھ پہلے ہی آ گئے تھے۔ ان سب سے میرا بھائی جان نے تعارف کرایا۔ دونوں بھابیاں یہاں ابھی نہ آئی تھیں۔ شاید کھانے کے متعلق باورچی کو کچھ ہدایات دے رہی تھیں۔ میں اور مشاہدہ ہی صرف خواتین یہاں تھیں۔ میں کچھ تو بھاری ساڑی اور زیور سے محجوب تھی۔ کچھ اتنے اجنبی مردوں کو دیکھکر گھبرا رہی تھی۔ بھائی جان کے ایک بیرسٹر دوست خواہ مخواہ مجھے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے اور میرا دل اُن کے اس طرح گھورنے کی وجہ سے یہاں سے اُٹھ کر بھاگ جانے کو چاہ رہا تھا۔ میرے مقابل بیٹھی ہوئی مشاہدہ میری سراسیمگی سے لطف لے رہی تھی۔ اور جمالی سے جو اس کے قریب بیٹھا تھا سرگوشی کرتی جاتی تھی۔ جمالی بھی آج سیاہ شیروانی میں رعنائی و زیبائی کا مجسمہ بنا ہوا شان وقار سے بیٹھا تھا لیکن افسردگی کی ایک ہلکی سی جھلک اب بھی اُس کے چہرے پہ پائی جاتی تھی۔ دعوت بہت بڑی تھی۔ دونوں بھائیوں کے دوست، اُن کی بیویاں، کچھ میری سہیلیاں سب چالیس سے زیادہ مہمان تھے پورا ہال بھرا ہوا تھا۔ قیمتی ساڑیوں اور سینٹ و لونڈر کی خوشبو سے فضا جگمگائی ہوئی اور معطر تھی۔ میرے ذوق ادب سے جن صاحبوں کو واقفیت تھی وہ لوگ میرے گرد تھے اور شعر سنانے کی فرمائش مجھ سے کر رہے تھے۔ بھلا جمالی کے سامنے میں کیا اپنے شعر سناتی۔ گلے کی خرابی کی معذرت کرتے کرتے تنگ آ گئی۔ جمالی پہ بھی فرمائشوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی اور وہ یکے بعد دیگرے اپنی دلکش نظمیں سنا کر سب کو محظوظ فرما رہا تھا کلام بہت کیف آور و رنگین ہے۔ کہیں یہ رنگین جال اری ہو

کس قدر حسین [illegible] دلگیر شعر کہتا ہے۔

کھانے بیشمار اور بہت لذیذ تھے۔ دلچسپ گفتگو اور قہقہوں کے درمیان کیا کھایا کچھ یاد نہیں۔ میرے ایک جانب کیپٹن آفریدی شاہدہ کے شوہر اور دوسری جانب نواب زادہ اکبر چھوٹے بھائی جان کے عزیز دوست بیٹھے ہوئے تھے۔ شریر شاہدہ عین مقابل میں تھی۔ اور اس کے پاس جمالی بیٹھا تھا۔ شاہدہ اپنی خاص نظروں اور شوخی آمیز کنایوں سے مجھے بار بار نادم کر رہی تھی۔ کھانے کے بعد بھی جمالی کے دلکش کلام کی رنگینی میں کھو کر ایک گھنٹے اور سب ٹھیرے اور بارہ بجے سب مہمان رخصت ہوئے اور یہ دلچسپ و یادگار دعوت ختم ہوئی۔ مجھے آج بہت تکان محسوس ہو رہی ہے مسلسل باتوں اور ہنسی نے بہت تھکا دیا ہے۔

۲۲ر دسمبر سنہ ۴۰ء

آج کا تمام دن بستر پر گذرا۔ گذشتہ شب کی خوشگوار دعوت کا تمام دن ذکر رہا۔ اور جمالی کی دلکش نظموں کو ہم سب گنگناتے رہے۔

۲۳ر دسمبر سنہ ۴۰ء

آج صبح چائے کے بعد میں غسل کرنے جا رہی تھی کہ جمالی کی آمد کی اطلاع ملی۔ ہمارے چھوٹی بھابی کو کہا۔ اس سے باتیں کریں۔ میں بھی غسل کر کے پہنچی۔ شعر و ادب اور دنیا بھر کے موضوعات پر گفتگو کرتے کرتے کھانے کا وقت ہو گیا۔ کھانے کے بعد ندی پر ٹہلتے ہوئے چلے گئے۔ اور وہاں سے واپس آکر جو باتیں شروع کیں تو چائے کا وقت ہو گیا۔ چائے کے بعد جمالی رخصت ہوا۔ اس کی معیت میں میرا وقت اچھا گذرتا ہے۔ میرے اور اُس کے خیالات بالکل ہم آہنگ ہیں۔ شاید اس لئے!

۲۴ر دسمبر سنہ ۴۰ء

آج صبح سے دوپہر تک خطوط لکھتی رہی۔ اس کے بعد بڑے بھائی جان کے ایک دوست کے ہاں بھابیوں کے ساتھ کھانے پر گئی۔ واپسی پر شاہدہ کے ہاں ٹھیری۔ وہ بغیر چائے پلائے بھلا کیسے آنے دیتی۔ کہیں مغرب کے وقت چھٹکارا ہوا۔

۲۶ر دسمبر سنہ ۴۰ء

گذشتہ چار روز بہت مصروف گذرے۔ اس لئے کچھ بھی نہ لکھ سکی۔ آج بڑی خالہ جان کے ہاں میلاد شریف میں گئی۔ وہاں خوب دلچسپی رہی۔ آمنہ سے ایک مدت کے بعد ملی۔ بیچاری کی صورت ہی بدل گئی ہے۔ کہاں سکول کی وہ شوخ آمنہ جو ہمارے سکول میں اترتی گنگناتی پھرتی تھی اور کہاں یہ مُردہ دل آمنہ جسکو بیٹھ کر اٹھنا دشوار ہے۔ ہمارے ہندوستان کی ہر بات نرالی ہے۔ یہ بھی کوئی عمر تھی۔ بیاہ کو ابھی چار سال بھی پورے نہیں ہوئے۔ اور وہ ابھی پورے بیس برس کی بھی نہیں ہوئی ہے کہ تین بچوں کی ماں بن گئی۔ کس طرح غریب ان تین چھوٹے بچوں کو سنبھالتی ہوگی۔ میں تو اس کے خیال سے گھبرا کی جاتی ہوں۔

یہ ہے ہمارے ہاں کی ازدواجی زندگی کا تاریک رخ۔ بھوکا اور مفلس ہندوستان کمزور، کمسن مائیں اور مریض رینگتے ہوئے بچے۔

۲۹ر دسمبر سنہ ۴۰ء

آج سخت سردی تھی۔ تمام دن آتش دان کے قریب میں اور بھابیاں باتیں کرتی اور بننگ کرتی رہیں۔

۳۰ر دسمبر سنہ ۴۰ء

آج کا تمام دن خرید و فروخت میں گذرا۔ شام کو پلازا چلے گئے۔ "سیجر بار برا" کافی اچھی تصویر تھی۔

۳۱ر دسمبر سنہ ۴۰ء

اس سال کا یہ آخری دن تھا۔ صبح سے دوپہر تک میں اشعار منثور لکھتی رہی۔ کھانے کے بعد بھابیوں کے ساتھ ندی پر چلی گئی۔ واپس آکر باورچی کو ضروری ہدایات دیں۔ آج چھوٹے بھائی جان نے صرف چند شعرا کو کھانے پر بلایا تھا۔ وہ بھی میری طرح لیلائے ادب کے دیوانے ہیں۔ یہ مجمع خالص ادبی تھا۔ جمالی بھی اس دعوت کی شرکت کیلئے شام کو ہی آیا تھا۔ شاہدہ بھلا کیوں نہ ہوتی۔ وہ تو ادبی محفلوں کی جان ہے۔ جمالی تو خیر اپنی خصوصیات میں کامل ہے۔ لیکن جاذب بھی خوب کہتا ہے۔ ابھی بالکل نوجوان ہے۔ یہ بھی خدا کی دین ہے۔ عمر کا سوال نہیں۔ رسا، ہمدم اور حلیق کا کیا کہنا۔ ان لوگوں کی تو عمر ہی اس دشت کی سیاحی میں گذری ہے۔ ایک بجے کے بعد یہ دلچسپ بزم برہم ہوئی۔ نئے سال کا آغاز تو بہت دلکش انداز سے ہوا ہے خدا خیر کرے۔ یہ سال میرے لئے بھی خوشی و مسرت لایا ہو۔

یکم جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

آج نئے سال کا پہلا دن ہے۔ چھوٹے بھائی جان کے ایک ہندو دوست کی شادی تھی۔ اس میں چار بجے گئے تو کہیں رات کو بارہ بجے چھٹکارا ہوا۔

۳ر جنوری سنہ ۱۹۴۱ء

کل مجھے تکان سے حرارت ہو گئی تھی۔ تمام دن بستر پر گذرا۔ آج ننھی پروین کی سالگرہ تھی۔ تمام دن اس کی تیاریوں میں مصروف رہی۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کے درمیان میں بہت مسرور تھی۔ یہ ننھے مہمان اپنے ٹوٹے پھوٹے فقروں سے ہم سب کو محظوظ کر رہے تھے۔

پروین سرخ غرارے اور قمیص میں بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اور تحفے اور کھلونے پا کر وہ بہت مسرور تھی۔

۴ر جنوری ۱۹۴۱ء

آج صبح سے دوپہر تک میں ایک رسالہ کیلئے ادبی مضمون لکھتی رہی۔ دوپہر کو جمال کا خط ملا۔ اس خط کو پڑھ کر مجھے غصہ آگیا۔ یہ شخص مجھے بہانے کی کوشش کرتا ہے۔ کیسی محبت! کہاں کی محبت!۔ دھوکا، فریب، دغا بازی کا وہ رنگین پہلو وہ جانفزا دعوے، اس کا اخلاص بھرا برتاؤ اور پھر اسکی بالکل تبدیلی میں بھول نہیں سکتی۔ بھلا نہیں سکتی۔ یہ مرد ہم عورتوں کو خوبصورت کھلونا سمجھتے ہیں۔ اور محبت کو ایک کھیل۔ چاہا جب تک کھیلتے رہے اور جب اس کھیل سے جی بھر گیا ایک دم چھوڑ دیا۔ میں نے آج ہی اس کو بہت سخت جواب لکھدیا تاکہ آئندہ وہ کوئی بیباکانہ قدم نہ اٹھائے۔ میں اب اس کے کسی خط کا جواب نہیں دونگی۔

۷ر جنوری ۱۹۴۱ء

گذشتہ دو روز بہت پریشانی میں گذرے۔ ننھے خالد کو نمونیہ ہوگیا تھا۔ بیچاری بڑی بھابی نے مسلسل دو راتیں آنکھوں میں گذاری ہیں۔ اور بے چین تو ہم سب ہی تھے۔ آج شکر ہے خطرہ باقی نہیں رہا۔ خالد آج ہوشیار ہے اور حال پرسکون ہے۔

(باقی آئندہ)

اعلان

ادیب کی ایک کرم فرما اور معاون نے ادبی حلقوں میں محترمہ شیریں کے نام سے معروف ہیں، یہ تجویز پیش کی ہے کہ "ادیب" کے مئی ۱۹۴۴ء کے پرچہ میں زیادہ سے زیادہ اچھے اور منتخب افسانے شائع کئے جائیں۔ اور اس سلسلہ میں انہوں نے "ادیب" کے مردانہ اور زنانہ شعبوں کے بہترین افسانوں کے واسطے چالیس چالیس روپیہ کی پیشکش مقرر کی ہے۔

اس پرچہ کیلئے تمام افسانے مارچ کے آخری ہفتہ تک۔ دفتر "ادیب" میں پہنچ جانے چاہئیں۔ افسانوں کا غیر مطبوعہ ہونا ضروری ہے۔

افسانوں کے انتخاب کے متعلق آخری فیصلہ اڈیٹر "ادیب" کا ہوگا۔ (منیجر)

نقوشِ ماضی

(از محترمہ آمنہ برجیس)

مجھے آج تک یاد ہے وہ زمانہ ۔۔۔ گزرتی تھی جب زندگی والہانہ
فضاؤں میں رقصاں مسرت کی لہریں ۔۔۔ محبت میں ڈوبا ہوا تھا زمانہ
ہر اک بات تھی دلنوازی کے شایاں ۔۔۔ ہر اک فکر تھی نکتۂ شاعرانہ
ہر اک ذوق باطن، ہر اک شوق پنہاں ۔۔۔ وفا کی حقیقت، جنوں کا فسانہ
نظر روحِ سرشار کا اک تبسم ۔۔۔ نفس بربطِ عشق کا اک ترانہ
منانا کہوں یا بگڑنا کہوں میں ۔۔۔ خفا ہو کے وہ دردِ سر کا بہانہ
کبھی نرم لہجوں میں رنگیں شکایت ۔۔۔ کبھی دشمنی میں کرم کا فسانہ
کبھی شوخ و رنگیں جوانی کی باتیں ۔۔۔ مذاقِ محبت کبھی عارفانہ
کبھی روح پرور ادائیں تمہاری ۔۔۔ کبھی برہمی تھی سخن گسترانہ
تغافل کے پردے میں دیکھی لگاوٹ ۔۔۔ تجاہل، محبت کا رنگیں بہانہ

مگر اب وہ پُرکیف باتیں نہیں ہیں
وہ دِن اب نہیں، اب وہ راتیں نہیں ہیں

تکمیل

(از محترمہ مہر آرا صفی مراد آبادی)

ہیرو اور ہیروئن دونوں نوجوان تھے۔ اور ایک دوسرے کے عشق میں سرشار۔ لیکن لڑکی کا باپ اس نوجوان کو مفلس ہونے کی وجہ سے ناپسند کرتا ہے اور اس نے ایک متمول شخص کے ساتھ لڑکی کی بات چیت لگا رکھی ہے۔ یہ آدمی گاؤں کا ضلعدار ہے۔ تین بیویاں دق میں مر چکی ہیں ——— چوتھی زندگی کے آخری سانس لے رہی ہے (اس ہی موذی مرض میں گرفتار ہو کر) اس ہی پرانے پلنگ پر اور اس ہی تنگ و تاریک کوٹھری میں گذار رہی ہے۔ جس میں وہ پہلی تینوں زندگی کا آخری لمحہ گذار کر ہمیشہ کیلئے اس ناپائیدار دنیا کو الوداع کہہ گئی ہیں ——— !! یہ ضلعدار صاحب ——— ہیروئن کے باپ سے عمر میں چار چھ سال بڑے ہیں اور ایک ہی گاؤں میں رہنے سہنے اور ہم عمر ہونیکی وجہ سے آپس میں دوست بھی ہیں۔ اس ہی لئے ہیروئن ان کو چاچا چاچا جی کہتی تھی اب کچھ دن سے وہ ان سے پردہ کرنے لگی ہے ورنہ اس سے قبل ——— وہ ضلعدار کی ہر شادی پر ضلعدار کے ہمراہ جھنکر کے گھوڑے پر بھی ضرور بیٹھا کرتی تھی۔

شادی کی تاریخیں ٹھہر گئی ہیں ——— اگلے ماہ چاند کی اکیس کو بارات آنے والی ہے۔ ہیروئن ——— سخت پریشان ہے اور سمجھ میں نہیں آتا کہ پھانسی کے اس سخت اور جان لیوا پھندے سے کیسے آزاد ہو ——— باوجود منع کرنے اور ہر ممکن کوشش سے اپنی نارضامندگی ظاہر کرنے کے وہ بجز اس کے اور کچھ حاصل نہ کرسکی کہ اسکی ان کوششوں نے ——— اسکو والدین کی نظروں میں باغی بنا دیا تھا۔ اور وہ سختی سے اسکی رکھوالی کرنے لگے تھے ———

یہاں آکر اُس کا قلم رک گیا ——— اُس نے میز پر رکھے ہوئے چھوٹے سے خوبصورت رومال سے حسب عادت عینک کے آئینے صاف کئے۔ ایک طویل انگڑائی لی ——— اور ——— سامنے کھلنے والے دریچہ پر نظریں جما کر ——— دور ——— بہت دور ——— بظاہر وہ پھولوں کے حسین خطے پر نظریں جمائے محویت کے عالم میں ساکت بیٹھی تھی۔ لیکن دراصل وہ سوچ رہی تھی کہ اب افسانے کو کس طرح تکمیل دے ——— !!

ٹریجڈی ——— روح کو لرزا دینے والی ——— آنکھوں ——— سے بیساختہ دریا اشک بہا دینے والی ٹریجڈی ——— یا ——— پھر ——— بہترین دلکش ——— کامیڈی ——— نہیں ——— نہیں ——— یہ بھی نہیں ——— اور ——— وہ ——— بھی نہیں ——— ! پھر اور ——— کیا ——— ؟

طرح طرح کے رنگین خیالات ——— اُس کے دماغ میں گھوم رہے تھے ——— سنیما کی متحرک تصاویر کی طرح نہ جانے کتنے نقشے مختلف ان فی زندگیوں کے دلکش اور روح فرسا نقشے اُس کی آنکھوں کے سامنے لرزاں تھے۔

اور وہ سوچ رہی تھی ——— عورت ——— مجبوری ——— پابندی ——— لیکن ——— کیا وہ ہمت اور استقلال سے کام لیکر بھی ——— سماج کے ان دل اور دماغ کو ماؤف کر دینے والے ——— اور روح کو پامال کر دینے والے ——— خوفناک خونی ——— بندھنوں سے کبھی آزاد نہیں ہو سکے گی ——— کیا اس کی ہر کوشش ——— سوسائٹی ——— کے ماتھے پر کلنک کا ایک سیاہ داغ ہی ہوگا ——— ؟ ایثار ——— ! وہ اس کی قائل نہ تھی۔ اس کا خیال تھا ——— مشرقی عورت کی غلط تعلیم اور تربیت نے ——— اسکو غلام بنا دیا ہے ——— اور اسی شکل میں یہ "ایثار" ——— اس کی نظر میں انتہا سے گذری ہوئی بزدلانہ حرکت کا ——— نام تھا !!

"باجی ——— باجی ——— باجی ——— جان! یہ نیلوفر کی آواز تھی جو حسب عادت چیختی، چلاتی ——— اُس کی لائبریری میں گھستی چلی آ رہی تھی ——— ڈرائنگ روم میں ——— اُس کے چھوٹے چھوٹے قدموں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ جو لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب تر ہوتی جاتی تھی۔ نیلوفر کی عادت تھی ——— جب پروین اس کو تلاش کرنے پر کہیں نہ ملتی: تو وہ اس کی لائبریری میں آکر اس کو تلاش کر لیتی ——— ! اس کی اس وحشیانہ حرکت اور بیجا مداخلت نے اکثر ——— پروین جیسی مطالعہ کی عاشق زار ہستی کو برہم بھی کر دیا تھا۔ کبھی اس کی اس شور و غل اور بے تحاشہ بھاگ کر آنے کی وجہ سے اُس کے افسانے ——— ادھورے ہی رہ جاتے تھے ——— وہ آتی ——— اور باوجود غصہ اور انکار کے ——— پروین کو زبردستی اٹھا لے جاتی ——— اور اس طرح اس کا وہ افسانہ جو اس وقت وہ لکھتی ہوتی نامکمل رہ جاتا ——— اور پھر کبھی مکمل نہ ہوتا ——— آج بھی اسی نے ——— پروین ——— کی سفینہ اور خوبصورت پیشانی پر چند

اور ـــــ وہ زیر لب بڑبڑانے لگی ـــــ عجب ـــــ بے تکلم طبیعت پائی ہے اس نے آخر ـــــ اس کی یہ طفلانہ شرارتیں ـــــ کبھی کم بھی ہونگی ـــــ نامعقول کہیں کی ـــــ سامنے کے ـــــ ریشمین پردے کو جنبش ہوئی ـــــ اور نیلو فر ہانپتی کانپتی کمرہ میں داخل ہوئی ۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا اور بمشکل سانس پر قابو پاکر ـــــ وہ جلدی جلدی کہہ رہی تھی ۔

" باجی ـــــ جان ـــــ اللہ سارے باغ میں ڈھونڈ ڈالا ـــــ کون کم بخت سمجھ سکتا تھا کہ بھلا آپ صبح ہی صبح مطالعے کے کمرہ میں بلی کی طرح چھپ کر بیٹھ سکتی ہیں ۔ غضب خدا کا اتنے سویرے ہی ـــــ کمرہ میں بند ـــــ دماغ خراب ہو جائیگا ـــــ اس طرح ـــــ میرا ـــــ گلا خشک ہوگیا ـــــ باغ میں آوازیں دیتے دیتے ـــــ بھاگتے بھاگتے تھک گئی ـــــ سانس ـــــ پھول گیا ـــــ تب سوچا کہ باجی ـــــ کو اگر تلاش کرنا ہے ـــــ تو اُن کے بِل میں ڈھونڈو ـــــ دن نکلے ـــــ چوہیاں ـــــ بھلا علاوہ بِل ـــــ کے اور کہیں ملا کرتی ہیں ـــــ !

" کیا گھوسس ہے ـــــ ؟ " پروین نے چیں بہ جبیں ہوکر کہا ـــــ بیٹھ جاؤ ـــــ آرام لو ـــــ ذرا سانس قابو میں آئے ـــــ تو پھر کہنا ـــــ آخر کیا قصہ ہے ـــــ ؟ اس قدر کیوں پریشان ہو ـــــ لاکھ بار کہا ـــــ کہ میرے حال پر کرم کیا کرو ـــــ جب میں لکھتی یا پڑھتی ہوں ـــــ اُس وقت مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا کرو ـــــ مگر توبہ ہے ـــــ یہ کب ممکن ہے ـــــ میرے کتنے ہی افسانے اسی شریر کی حرکت کی بدولت کبھی پورے نہ ہو سکے ـــــ پروین ـــــ دریچہ پر نظریں گاڑے ـــــ زیر لب بڑبڑاتی رہی ـــــ جیسے ـــــ دل ہی دل میں باتیں کر رہی ہو ۔

" باجی ـــــ نیلوفر نے غصہ سے گھور کر کہا ـــــ ہم تو آئے ہی اس لئے تھے کہ آپ کو ایک سچا قصہ سنا دیں ۔ بڑا حیرت انگیز ـــــ اور پھر آپ اس میں جھوٹی سچی باتیں ملا کر اس کا افسانہ بنا دیں ـــــ اور ـــــ اور ـــــ رسالہ میں شائع کرا دیں ۔ غضب خدا کا ـــــ سارے گھر میں آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی ـــــ اور ـــــ آپ کو اب تک بھی خبر نہیں ـــــ اور اگر میں نہ کہوں تو نہ جانے کب تک پتہ چلے ۔

" کیسی خبر ـــــ ؟ کیا ہوا ـــــ ؟ " پروین نے حیرانگی سے سوال کیا ۔

" باجی ـــــ وہ ـــــ بھاگ گئی ۔ مالی کی لڑکی شامو ـــــ رات بھاگ گئی ـــــ ابھی اُس کی ماں روتی ہوئی امی جان کے پاس آئی تھی ـــــ اور باجی ـــــ وہ ـــــ ہمارا ہیرا ـــــ بھی تو رات سے غائب ہے ۔ ـــــ سب میں تلاش کرالیا امی نے ـــــ مگر اس کا پتہ نہیں ـــــ امی کہہ رہی تھیں شامو کی ماں سے ـــــ کہ لکھنؤ ـــــ کو وہ کئی ماہ سے بغور دیکھ رہی تھیں ۔ اسکی وہ پہلی سی باتیں ہی نہ رہی تھیں ـــــ نہ دل سے کام کرتا تھا اور ـــــ نہ پہلے کی طرح خوش و خرم رہتا تھا ـــــ ہر دم چپ چپ سا رہتا ۔ اور کھویا ہوا سا ـــــ باجی ! شامو کی ماں ـــــ کہہ رہی تھی کہ شامو کے باپ نے ـــــ بڑی اچھی جگہ شامو کا بیاہ بھی ٹھہرا دیا تھا ـــــ اور اب آٹھ دن بعد اُس کی بارات آنے والی تھی ـــــ اس کا ہونے والا دولہا بہت کھاتا پیتا آدمی ہے اس کے گھر دو بھینسیں ہیں ۔ چار کھیت اُس کے ذاتی ہیں ـــــ شامو کی ماں رو کر کہہ رہی تھی کہ بدنصیب تھی ۔ اگر اس گھر جاتی تو راج کرتی ۔ وہاں کسی چیز کی کمی نہ تھی ـــــ مگر ـــــ (ہنس کر) کمی تھی تو ایک ـــــ کہ ـــــ لڑکا ـــــ کانا تھا ـــــ اور شامو سے بیس سال بڑا بھی تھا ـــــ پہلی بیوی کے لڑکیاں تو سات ہوئیں اور ہیں ۔ مگر لڑکا نہیں تھا ـــــ اور اس لئے دوسری شادی اپنے شوق اور دل سے کر رہا تھا ـــــ

نیلوفر ـــــ کہتی رہی ـــــ اور پروین نے قلم سنبھالا ـــــ اس کے لبوں پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ تھی ـــــ مگر چہرہ ـــــ باسی پھولوں کی طرح اداس تھا ـــــ اور آنکھوں میں آنسو لرز رہے تھے .....

نیلوفر نے حیرت سے اس اجتماع ضدین کو دیکھا ـــــ !

مسکراہٹ ـــــ افسردگی ـــــ اور آنسو ـــــ بیک وقت یہ تینوں چیزیں ـــــ !! اُس کے ننھے سے دماغ میں باوجود کوشش اور جستجو کے کچھ بھی نہ آسکا ـــــ !!

افسانہ مکمل ہو چکا تھا ـــــ مگر اب پروین کے دونوں رخساروں پر دو آنسو آنکھوں سے مچل کر لڑھک ہی پڑے تھے ۔ جنہیں اُس نے اپنے چھوٹے سے رومال میں جذب کر لیا ـــــ اب بھی وہ باہر دریچہ کے باہر نظریں گاڑے محو تھی ـــــ بظاہر وہ حسب عادت گلاب کے حسین تختہ پر نظریں جمائے محو دید تھی ـــــ لیکن اس کا دماغ ـــــ اب بھی اسی اُلجھی گتھی کو سلجھانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھا ـــــ کہ عورت کی ہمت ـــــ اور جرات بھی ـــــ سوسائٹی کے ـــــ ماتھے پر ایک بدنما داغ ـــــ اور سماج جیسے صاف و شفاف آئینہ پر ـــــ ایک ایسی خراش ہے ـــــ جو مٹائی نہیں جا سکتی ـــــ !!

(طبعزاد)

فلم سٹار

(از سوشیر یندر سانیال)

"محترم اڈیٹر صاحب تسلیم:

میں اس تکلیف دہی کی معافی چاہتی ہوں۔ مجھے صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ میں ایک مدت سے فلم سٹار بننے کی آرزو رکھتی ہوں۔ مگر میں نے ہمیشہ فلم کمپنیوں کے دروازے اپنے لئے بند پائے ہیں

میری عمر انیس سال اور قد پانچ فٹ تین انچ ہے۔ میں بظاہر ایک دُبلی پتلی لڑکی ہوں مگر ویسے کافی تندرست ہوں۔ سخت سے سخت محنت کا مقابلہ کرنے کیلئے تیار ہوں۔ کیا آپ اس سلسلہ میں میری مدد کرسکتے ہیں اور کسی کمپنی سے میرا تعارف کرا سکتے ہیں میں اپنی تصویر بھی روانہ کررہی ہوں۔

نیاز مند

مس ناکام"

مندرجہ بالا تحریر ایک خط کی نقل ہے جو میرے ایک اڈیٹر دوست نے مع ایک عدد تصویر کے مجھے روانہ کردی۔ میں نے خط پڑھا اور پھر تصویر پر نظر ڈالی۔ یقیناً یہ ایک نہایت بدصورت عورت کی تصویر تھی۔ اور اُس کے خد و خال کا بھونڈا پن تصویر سے صاف نمایاں تھا۔ میں نے فوراً اس خط کا جواب یوں لکھوا دیا کہ "میری اور اڈیٹر صاحب دونوں کی یہ رائے ہے کہ آپ براہ مہربانی فلمی دنیا کی طرف رُخ کرنے کی کوشش نہ کریں اس راہ میں مایوسی کا سامنا زیادہ کرنا پڑتا ہے اور کامیابی کے امکانات کم ہوتے ہیں۔ تصویر واپس کی جارہی ہے۔ یاد آوری کا شکریہ"

تھوڑے ہی دنوں بعد میرے اڈیٹر دوست کو ایک مشہور فلم کمپنی نے رنگا رنگ تصویروں کا ایک سٹ بھیج دیا۔ یہ سب تصویریں مس ناکام کی تھیں۔ ان تصویروں کی اشاعت اور مس ناکام کے متعلق نوٹ لکھنے کی خواہش ظاہر کی گئی تھی۔ معلوم نہیں کیوں اڈیٹر صاحب نے یہ تصویریں بھی نہیں شائع کیں۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد یہی تصویریں تمام مشہور فلمی رسالوں میں بڑی آب و تاب کے ساتھ نظر آئیں۔ مس ناکام نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کرلی اور انہیں مایوسی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ مس ناکام کا پہلا فلم دیکھنے کے بعد جس میں وہ ایک مشہور ایکٹر کے ساتھ نمایاں تھیں میں نے یہ نوٹ لکھا۔ "دُنیا میں کوئی عورت بدصورت نہیں ہے۔ اور اگر ایسی ہے تو اُسے حسین بننا نہیں آتا"

ایک اور مثال ملاحظہ ہو:۔

کوئی دس کا واقعہ ہے جب بنگال کے ایک مشہور فلم سٹوڈیو میں میں نے اپنا دفتر کھول رکھا تھا اور بہت بڑے پیمانے پر فلمی کاروبار جاری تھا۔ بنگال کی ایک اداکارہ جو اس وقت ایک مشہور فلمی ہیروئین ہیں پہلی دفعہ ایک فلم میں پیش ہوئی تھیں اور اس فلم کو ریلیز کرنے کی تیاری ہورہی تھی اس فلم میں یہ ایک بیکار گر یجویٹ بیوی کی حیثیت سے نمایاں ہوئی تھیں۔ یہ ایک نہایت دُبلی پتلی اور کمزور لڑکی تھیں۔ جاذبیت اور کشش سے قطعی خالی۔ میرے ایک فربہ اندام دوست نے جو آب ایک نہایت کامیاب فلمی ادارہ کے مالک ہیں مجھ سے کہا "آپ کو شرمندہ ہونا چاہیئے یہ تمام روپیہ جو اس ایکٹرس کی پبلسٹی اور تشہیر پر صرف کیا گیا ہے ضائع ہوا ہے" یہ سنکر مجھے سخت کوفت ہوئی۔ مگر نمایاں ہونیوالی ہیروئن کی قسمت مسکرا رہی تھی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد اس لڑکی کی شخصیت میں ایسی غیر معمولی تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی جسکو دیکھکر خیال ہوتا تھا یہ کسی جادو کا نتیجہ ہے۔ وہی دبلی پتلی کمزور لڑکی ایک حسین و جمیل اور ایک باوقار ہیروئن بنکر فلم میں نمایاں ہوئی۔ تھوڑے ہی دنوں بعد وہ [illegible] اور دیوکی بوس جیسے ڈائرکٹروں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ جنہوں نے اسکا تعارف نہ صرف سارے ہندستان سے کرادیا بلکہ اسے اس بلندی پر کھڑا کردیا جہاں مشکل سے کوئی ہیروئن اسکی حریف تھی۔ اور اب میرے وہی دوست جنہوں نے میرے انتخاب پر ملامت کی تھی اس کی شہرت و مقبولیت دیکھکر حیرت زدہ ہیں۔

کوئی ایک سال کا واقعہ ہے میرا تعارف ایک لڑکی سے ہوا۔ یہ ایک بہ[illegible] لڑکی تھی۔ اور اسکے چہرے پر کہیں ذہانت کے آثار نہ تھے۔ میں نے [illegible]

میں تھیا یسٹ کی کوئی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اس لڑکی کو دیکھکر میرے دل میں رحم اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوئے۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد صرف دو فلموں میں پارٹ کرکے اس لڑکی نے اداکاری کا وہ معجزہ دکھایا کہ میں حیرت زدہ رہ گیا۔ ان فلموں میں یہی خاموش اور شرمیلی لڑکی شگفتگی اور ذہانت کا مجسمہ بن کر سامنے آئی۔

خود مس چندرا وتی مجھے معاف کریں گی اگر میں یہ کہوں کہ آج سے بیس سال قبل یہ گمان بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کبھی ایک کامیاب آرٹسٹ بنکر سامنے آسکتی ہیں۔ ہر چند کہ اس زمانہ میں ایک خاموش فلم میں انہوں نے اپنی صلاحیتوں کی ایک جھلک پیش کر دی تھی۔ وہ اس وقت سترہ سال کی ایک شرمیلی لڑکی تھیں۔ اتنی شرمیلی کہ ان کا اچھی اداکارہ ثابت ہونا بہت مشکل نظر آتا تھا۔

چھایا دیوی جب پہلی دفعہ ایک خاموش فلم میں نظر آئیں تو پریس اور پبلک نے کوئی خاص توجہ نہیں دی۔ مگر وہ اپنے سامنے شاندار امکانات رکھتی تھیں اور تھوڑے ہی دنوں بعد دوسرے فلموں میں اداکاری کرکے اپنی شہرت اور مقبولیت مسلم کرالی۔

اوما ساشی جو کافی مشہور و مقبول ہیروئن رہ چکی ہیں پہلے کیا تھیں۔ کسی کو یہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ معمولی پبلک سٹیج پر یہ گانے والی لڑکی کسی دن مشہور فلم سٹار بن جائیگی آخر کار بنگال کے ایک مشہور و مستند ڈائرکٹر نے "چنڈی داس" جیسے فلم میں پارٹ دیکر انہیں شہرت کے آسمان پر پہنچا دیا۔

مشہور و معروف رقاصہ سادھنا بوس بہتوں کیلئے ایک مدت تک خاصا مسئلہ رہ چکی ہیں۔ جو لوگ ان کے رقص کے کمالات پر سر دھنتے تھے یہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہ ایک کامیاب اداکارہ بھی ثابت ہو سکتی ہیں۔ ہر چند کہ اس باب میں خود میری رائے کسی قدر مختلف تھی۔ میں ان میں ایک اچھی اداکارہ کی صلاحیتیں پاتا تھا۔

لیلا دیسائی میرے نزدیک صرف اتفاق سے ایک کامیاب فلم سٹار بن گئی۔ میں ان کو خوبصورتی کے مقابلہ کیلئے تو بیشک ایک موزوں شخصیت سمجھتا تھا۔ مگر ان میں اداکاری کی صلاحیت مجھے نہیں نظر آتی تھی۔ اب اسکو کیا کیجئے کہ فلمی حلقوں میں انہوں نے آج بے شمار قدر دان پیدا کر لئے ہیں۔

مرد اداکاروں میں سہگل کی مثال سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ جو انسان عقیدے کسی طرح ہیرو بننے کے لائق نہیں اور جسکا لب و لہجہ خود بنگالیوں کے لئے اجنبیت رکھتا ہے۔ اس نے اپنی شہرت و مقبولیت کا سکہ ملک کے طول و عرض میں جما لیا ہے۔ یہ اسکی آواز کا افسوں ہے جس نے اسے بہترین اداکاروں کی صف میں نمایاں اور بہت نمایاں جگہ دلا دی۔

مجھے آج بھی وہ دن یاد آتا ہے کہ جب دوستوں کی ایک مجلس میں میں نے محض اس وجہ سے اس کا گانا سننے سے انکار کر دیا تھا کہ اس کی شخصیت اور آداب و طریق کوئی دلکشی نہیں رکھتے تھے۔

ایک دوسری مثال بروا کی ہے۔ انکے بہت سے دوستوں کو یہ گمان نہیں تھا کہ مسٹر بروا اتنے کامیاب ڈائرکٹر اور اداکار بن سکیں گے۔ انکے متعلق عام خیال یہ تھا کہ وہ ایک حوصلہ مند نوجوان ہیں اور کچھ نہیں۔ بالکل یہی صورت جمنا کی تھی۔ کسے یقین آسکتا تھا کہ وہ کسی بنگالی فلم میں ہیروئن بن سکتی ہیں۔ لیکن دیوداس میں اداکاری کرکے دونوں نے اپنے کمالات کو تسلیم کرا لیا۔ دیوداس میں ان کی اداکاری فلم کی تاریخ میں ایک یادگار حیثیت رکھتی ہے۔

میرے دوست مسٹر امر ملک خود اپنے متعلق یہ رائے قائم نہیں کرتے تھے کہ وہ کبھی ایک کامیاب ایکٹر بن کر سامنے آسکیں گے۔ کیونکہ اداکاری کا وہ کچھ ایسا ذوق بھی نہیں رکھتے تھے نہ وہ اپنے میں اسکی مناسبت پاتے تھے۔ لیکن اپنے پہلے فلم میں اور پھر "بڑی دیدی" میں انہوں نے ثابت کر دیا کہ وہ نہایت کامیاب اداکار بن سکتے ہیں۔

حسین و جمیل جوتی پرکاش ایک نہایت شرمیلا نوجوان تھا۔ سب سے پہلے فانی نے ان کی طرف توجہ کی اور مشہور فلم "ڈاکٹر" میں اس کو ہیرو بنا کر پیش کر دیا۔ اور اس فلم میں اس نے اپنا پارٹ انتہائی کامیابی کے ساتھ ادا کیا ہے۔

میں ایسی ہی کتنی مثالیں پیش کر سکتا ہوں جس میں توقعات کے خلاف صورتیں پیدا ہوئی ہیں۔ فلم کی طرف آنے والے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے بارے میں ہم نے کچھ رائے قائم کی اور وہ کچھ اور ثابت ہوئے۔ خود میں نے اپنے مشاہدات اور تجربات خلوص کے ساتھ پیش کر دیئے ہیں اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر آپ اداکار بننا چاہتے ہیں تو ممکن ہے آپ کی بھیجی ہوئی دس تصویروں میں سے نو واپس آجائیں۔ لیکن آپ مستقل مزاجی کے ساتھ اسی دھن میں لگے رہیں تو کامیابی بعید از قیاس نہیں۔ ان خوبصورت لڑکیوں کا یہاں ذکر نہیں جن کی طرف ڈائرکٹر خود کھنچتے ہیں۔ یا جنہیں وہ خود کہیں نہ کہیں دریافت کر لیتے ہیں۔

فلمی دُنیا

(از فصیح الدین احمد ایم۔ اے)

(۱) جُنت دلیسائی پروڈکشن

کا تیار کیا ہوا فلم بھگت راج ملک کے گوشے گوشے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ فلم کی کہانی دلچسپی و دلکشی کے علاوہ ایک بلند روحانی و اخلاقی مقصد بھی رکھتی ہے۔ یہ فلم آج بھی موتی ٹاکیز دہلی میں بے شمار شائقین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔

اس کمپنی کا دوسرا آنے والا فلم زبان ہے۔ اس فلم میں کوشلیا۔ مبارک اور ایشورلال نے اداکاری کی ہے۔ اس فلم سے بھی شاندار توقعات وابستہ ہیں۔

(۲) پنچولی آرٹ پکچرز

کا تیار کیا ہوا فلم پونجی بمبئی، کلکتہ اور پشاور میں حیرت انگیز مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ یہ فلم چودہ جنوری سے لاہور میں بھی شروع ہو چکا ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ لاہور کے شائقین فلم ہر شام کو آج بھی ہزاروں کی تعداد میں ہال کے سامنے جمع رہتے ہیں۔ آج بھی کتنوں کو ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے واپس ہونا پڑتا ہے۔ اس کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جاتا ہے ابھی یہ مدتوں لاہور کے شائقین کے لئے باعث کشش رہے گا۔ دلی کے شائقین بھی اس فلم کا بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے دلی میں بھی اس فلم کا پوری گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا جائیگا۔ اس فلم میں راگنی، پنت پانڈے اختری، منورما کی اداکاری خاص طور پر پسند کی گئی ہے۔ فلم میں اداکاری کے علاوہ گانے اور مزاحیہ پبلک کے لئے خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔

(۳) بمبئی ٹاکیز

کا تیار کیا ہوا فلم ہماری بات ناولٹی سنیما دہلی میں بڑی دھوم سے چل رہا ہے۔ اس فلم کی روح رواں دُنیائے فلم کی مقبول اور ہر دلعزیز ہیروئن دیویکا رانی ہیں۔ دیویکا رانی ایک عرصہ دراز کے بعد اپنی دیرینہ آب و تاب اور اپنی اداکاری کے مخصوص کمالات کے ساتھ اس فلم میں نمایاں ہوئی ہیں۔ دوسرے اداکاروں میں ممتاز علی کا نام بھی کچھ کم قابل توجہ نہیں۔ اس فلم نے ہر جگہ خاطر خواہ مقبولیت حاصل کی ہے۔ دلی نے بھی اس فلم کے خیر مقدم میں پوری گرمجوشی کا ثبوت دیا ہے۔

اطلاع ملی ہے کہ اس کمپنی کے زیر اہتمام سوشیل مزدور ایک اور معاشرتی فلم کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ اس فلم کی روح رواں لیلا چٹنس۔ جیراج اور ممتاز ہیں۔

(۴) نیو ہنس پکچرز

کے زیر اہتمام ایک فلم دروپدی تیار ہو رہا تھا۔ گذشتہ ماہ یہ کمپنی اس فلم کی تیاری میں بہت تیزی کے ساتھ مصروف رہی۔ فلمی دنیا میں اس فلم کے متعلق مختلف قسم کی خیال آرائیاں ہو رہی ہیں۔ مگر جو اطلاعات ہم تک پہنچی ہیں ان کی بنا پر اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ فلم اپنی نوعیت کا ایک نہایت شاندار فلم ہوگا۔ دروپدی کا تاریخی پارٹ ادا کرنے کیلئے سوشیلا رانی کا انتخاب ہوا ہے۔ اور یہ انتخاب ہر طرح لائق تحسین ہے۔ اسکے علاوہ مشہور کیرکٹر ایکٹر مسٹر چندر موہن کی اداکاری بھی اپنی مخصوص اہمیت رکھتی ہے۔ ایک نئی چیز جو اس فلم میں خاص طور پر نمایاں ہے "رس لیلا" ہوگی۔ "رس لیلا" دنیا کے مشہور رقاص مسٹر رام گوپال کا ناچ ہے۔ جسے فلم میں نہایت مناسبت اور دلآویزی کے ساتھ شامل کیا گیا ہے۔

(۵) بروا پروڈکشنز

ان دنوں بڑے اہتمام کے ساتھ ایک فلم "رانی" بنانے میں مصروف رہی۔ اس فلم میں بروا نے خود اور دیوداس کی مشہور ہیروئن جمنا نے اپنی معیاری اداکاری کا ثبوت دیا۔ ان دونوں کے نام دیکھکر فلم کی کامیابی میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔ مسٹر بروا فلمی دُنیا میں ایک مخصوص مرتبہ رکھتے ہیں۔ وہ نہ صرف ایک کامیاب ڈائرکٹر ہیں بلکہ ایک نہایت کامیاب اداکار بھی ہیں۔ موصوف نے اس فلم پر بڑی محنت اور توجہ صرف کی ہے۔ گانوں کا معیار نہایت بلند ہے۔

(۶) رنجیت موویٹون

کے تازہ ترین فلم شنکر پاربتی کا رائل پیراڈس بمبئی میں بڑی دھوم دھام سے خیر مقدم ہوا ہے اس فلم میں مشہور و معروف رقاصہ سادھونا بوس نے اس انداز سے اپنے رقص کے کمالات پیش کئے ہیں جو خواص کے علاوہ عوام کیلئے بھی مخصوص دلکشی رکھتا ہے۔ سادھونا بوس نے سب سے زیادہ کامیابی کا ثبوت شنکر پاربتی میں پیش کیا ہے۔ فلم کا جس دلچسپی کے ساتھ خیر مقدم کیا گیا ہے اسکو دیکھتے ہوئے اندازہ کیا جاتا ہے کہ یہ ہر جگہ مہینوں توجہ کا مرکز رہے گا۔

(۷) منروا موویٹون

کے زیر اہتمام ہندوستان کے مشہور و معروف ڈائرکٹر مسٹر سہراب مودی ان دنوں بڑے عظیم الشان پیمانہ پر ایک فلم "پرتھوی بلبھ" کی تیاریوں میں مصروف رہے ہیں۔ مسٹر سہراب مودی فلمی حلقوں میں ایک نہایت وسیع مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس سے قبل وہ پکار اور سکندر جیسے شاندار فلم تیار کر چکے ہیں۔ یہ فلم ملک کے ہر گوشے سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ شائقین فلم کے دلوں میں ابھی تک ان فلموں کی یاد تازہ ہے۔ تازہ فلم پرتھوی بلبھ کی شاندار تاریخی فلم جس کی کہانی بمبئی کے سابق منسٹر

تھی۔ اور بڑی مستعدی اور مردانہ ہمت کے ساتھ کام کرتی تھی۔

یاقوت حبشی پر مہربانی کا الزام محض الزام اور بہتان معلوم ہوتا ہے کیونکہ جو عورت اسلامی شریعت کی مطابق حکومت چلاتی ہو اور جس نے اپنے باپ کی حکومت کے زمانہ میں ۲۰ برس تک نیک چلنی کی تربیت پائی ہو اور سلطنت کا گرم و سرد دیکھا ہو وہ ایسی بے عقلی کیونکر کر سکتی تھی۔ کہ ایک حبشی سے تعلق پیدا کرتی اور اپنی سلطنت خود برباد کر دیتی۔

بالفرض اس کو یاقوت سے تعلق بھی ہو گیا تھا تو وہ خود مختار شہنشاہ تھی۔ خفیہ بھی سب کچھ کر سکتی تھی گھوڑے پر سوار ہوتے وقت یاقوت کو یہ موقع نہ دے سکتی تھی۔ کہ وہ اسکی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر گھوڑے پر سوار کرائے۔ رضیہ کو کسی کے سہارے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ نا تواں بڑھیا نہ تھی بلکہ بہادر۔ صف شکن عورت تھی۔ جس نے تخت نشین ہوتے ہی وزیر اعظم اور سب بڑے بڑے امیروں کی بغاوت کا مقابلہ کیا اور سب کو اپنی تیز اور آبدار تلوار کا پانی پلایا تھا۔ اس کو ایک حبشی کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اور یہ بات بالکل جھوٹی ہے۔ اور امیروں اور بھائیوں نے بہن سے تخت لینے کے لئے یہ بہتان تراشا تھا۔

دہلی کے مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ رضیہ سلطانہ کی قبر درست کرائیں اور وہاں عرس مقرر کریں۔ ۲۵ ربیع الاول کو رضیہ نے شہادت پائی تھی۔ آئندہ ربیع الاول سے اس کا عرس شروع کر دینا چاہیئے۔ میں زندہ رہا تو اس خدمت کو انجام دوں گا

یہ قلم کا نتیجہ ہے۔ مکالمے اور گیت ہندوستان کے مشہور ادیب سدرشن نے لکھے ہیں۔
یہ فلم یقیناً ایک معیاری فلم ثابت ہوگا۔

(۸) **موہن پکچرز** — ان دنوں بڑی سرگرمی کے ساتھ ایک فلم "کرن" کی تیاریوں میں مصروف رہی۔ اطلاع ملی ہے کہ اب فیلم تیار ہو چکا ہے۔ اس فلم کی روح رواں نیا کی مشہور معروف ہستیاں اشوک کمار اور لیلا چٹنس ہیں۔ ان مقبول عام اداکاروں کے ہوتے ہوئے دیکھنے کے بعد اس فلم کی مقبولیت میں کوئی شبہ باقی نہیں رہ جاتا۔

اس کے بعد یہ کمپنی دو اور فلم بہت تیزی کے ساتھ رانی تارامتی اور بادرو کی قسمت تیار کر رہی ہے۔ امید کی جاتی ہے یہ فلم بھی موہن پکچرز کے شایان شان ثابت ہونگے۔

(۹) **چترا ور لمیٹڈ** — کے زیر اہتمام اور مشہور معروف ڈائرکٹر دیوکی بوس کی نگرانی میں ایک فلم "صلح" تیار ہوا ہے۔ یہ فلم اپنی کہانی، گانوں اور اداکاری کے لحاظ سے یقیناً ایک کامیاب فلم ہے۔ اس فلم میں مشہور کیرکٹر ایکٹر ... اور انکے علاوہ دیو بالا اور کملا دیوی نے اداکاری کی ہے۔ کہانی خود ڈائرکٹر دیوکی بوس نے لکھی ہے جو بڑی خوبی کے ساتھ فلم میں پیش کی گئی ہے۔

(۱۰) **واڈیا موویٹون** — ان دنوں ایک عظیم الشان قدیم کہانی کو فلمانے میں مصروف رہی یہ فلم مایا نگری کے نام سے پبلک کے سامنے پیش ہو رہا ہے۔ اس فلم میں ... دنیا کا تصور اپنی تمام عظمت کے ساتھ نمایاں ہے۔ ڈائرکٹر دھیرو بھائی دیسائی نے اس فلم پر خاص توجہ ... کمپنی اس سے قبل "نور سمندر" "جادو کی نگری" اور "شاہی نقیر" پیش کر چکی ہے جو خاطر خواہ مقبولیت حاصل کر چکے ہیں۔ تازہ فلم "مایا نگری" کے ساتھ بھی بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

(۱۱) **نیو تھیٹرز** — جو اپنے زمانہ میں بڑے بڑے معرکۃ الآرا فلم پبلک کے سامنے پیش کر چکی ہے جن کی یاد آج بھی دلوں سے محو نہیں ہوئی ہے۔ ان دنوں ایک فلم "واپس" کی تیاریوں میں مصروف رہی نیو تھیٹرز کو فلمی دنیا میں جو مرتبہ حاصل ہے اسکو مد نظر رکھتے ہوئے اسکی ہر پیشکش شائقین کیلئے ایک مخصوص اہمیت رکھتی ہے۔ یہ تازہ فلم "واپس" جس کی روح رواں ایک طرف ہندوستان کے مشہور کیرکٹر ایکٹر نواب اور دوسری طرف مشہور و مقبول بھارتی ہیں اپنے سامنے مقبولیت اور کامیابی کے پورے امکانات رکھتا ہے۔

(۱۲) **تلوار پروڈکشن** — کا تیار کیا ہوا فلم "خاموشی" کمار تھیٹر میں بڑی دھوم کے ساتھ چل رہا ہے۔ اس فلم میں مشہور مقبول ہیروئن رتن مالا نے اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔ رتن مالا نے فلمی دنیا میں جو شہرت و مقبولیت حاصل کی ہے اسکو دیکھتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ یہ فلم بہت دنوں تک پبلک کی دلچسپی کا باعث بنا رہیگا۔ اس فلم کی کہانی ہندوستان کے مشہور ادیب امتیاز علی تاج کے زور قلم کا نتیجہ ہے ... بلند ہے۔

غزل

نجمہ تصدق

حادثہ کوئی نیا ہونے کو ہے — آج میں کیوں اس قدر مسرور ہوں

اللہ اللہ مستیٔ آغوشِ دوست — خاک ہو کر بھی سراپا نور ہوں

رو رہا ہے دل مگر اے مصلحت — مسکرانے کے لئے مجبور ہوں

دل اگرچہ آشنائے راز ہے — کیوں بہک جاؤں کوئی منصور ہوں

میں فقط خوددار ہوں نجمہ مگر
لوگ کہتے ہیں بڑی مغرور ہوں

ہم نہیں تو کیا؟

از محترمہ نواب سیدہ اختر حیدرآبادی

دردِ نیاز و دیدۂ بے نم نہیں تو کیا؟ — محفل میں انکی غیر تو ہے! ہم نہیں تو کیا؟

اے چارہ ساز دردِ وفا کم نہیں تو کیا؟ — اس زخمِ آرزو کا جو مرہم نہیں تو کیا؟

اے آفتاب تیری شعاعیں ہوں جاوداں — ہمراہ تیرے قطرۂ شبنم نہیں تو کیا؟

اُن کے فراق میں ہمیں جینا ہے ناگزیر — غم بھی بقدرِ حوصلۂ غم نہیں تو کیا؟

کیا خوب یہ عجیب تمہارا ہے جبرِ حسن؟ — تم ہو تو کائنات ہے اور ہم نہیں تو کیا؟

آنکھوں میں انتظار کی چنگاریاں تو ہیں — نرگس کے پاس دیدۂ پُرنم نہیں تو کیا؟

اختر کی یہ نوائے پریشاں یوں ہی رہیں
شیرازۂ خیال منظم نہیں تو کیا؟

دیووں کے ملک میں

(از جناب اشرف صبوحی دہلوی)

:(دسویں قسط):

ہوتا تاک میں رہا۔ جونہی گلیور ایک سیب کے درخت کے نیچے پہنچا جو پھلوں سے لدا ہوا تھا تو بونے ... نے کیا کام کیا کہ جھٹ درخت کو جھنجھوڑ لیا کوئی دس بارہ سیب ٹہنیوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر اس پر گرے۔ دیووں کے ملک کے سیب تربوز کے تربوز۔ خدا بچانا رکھے سر چلتے ... ایک سیب جو پیٹھ پر آ کر گرا تو اوندھے منہ جا پڑا۔ خوش نصیبی سے زمین زیادہ ... چوٹ لگی مگر کچھ یونہی سی۔ ہاتھ پاؤں کی خیر رہی۔

اگلے دن زمیندار کی لڑکی نے گھاس کے ایک صاف ستھرے تختے پر جا چھوڑا اور وہ اپنی دایہ یعنی زمیندار کی لڑکی کے آگے پیچھے پھرنے ... بھادوں کے دن تھے۔ ابر چھایا ہوا۔ اچانک بے سان گمان اولوں کی ایک جھال آگئی۔ اولے بھی وہاں کے گولے سمجھنے چاہئیں۔ بیچارے کو لمبا لمبا لٹا دیا۔ اب جو اس پر اولے پڑنے شروع تو یہ معلوم ہوا جیسے آسمان پر کوئی کرکٹ کھیل رہا ہے۔ اور گیندیں اُچھل رہی ہیں۔ جوں توں کرکے چاروں ہاتھ پاؤں کے بل سرکتا ہوا ایک لیمو کے پیڑ کے نیچے پہنچا۔ اور اوندھے لیٹ کر اولوں کی بارش سے پناہ لی۔ اگر وہ کھلے میدان میں کھڑا یا پڑا رہتا یا پہلے ہی وار میں ایک اولا بھی اس کے سر پر پڑ جاتا تو نسعد تھا۔ زندہ بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔

اس باغ میں ایک دوسرا اور واقعہ پیش آیا۔ خدا نے بڑی مہربانی کی نہیں تو مرحلہ اتنا خطرناک تھا کہ غریب کی لاش کا بھی پتہ نہ لگتا۔ گلیور اکثر لڑکی سے کہا کرتا تھا کہ تھوڑی دیر مجھے اپنی حالت پر چھوڑ دیا کرو۔ وہ اکیلا بیٹھ کر اپنی آئندہ زندگی کے متعلق سوچنے کیلئے کچھ مہلت چاہتا تھا۔ اپنے گھر اپنے بیوی بچوں کی ... تھی۔ تصورات کے ذریعے تو کم از کم وہ ان سے مل لیا کرتا ... چنانچہ ایک ... کہ گلیور کو زمیندار کی لڑکی نے کسی جگہ بٹھا دیا۔ اس کی ... میں ... اور بالکل امن کی تھی۔ گلیور کو اس کی مرضی کے مطابق وہاں چھوڑ کر لڑکی ذرا فاصلے پر چلی گئی۔ اتفاق سے محل کی چند بیگمات بھی اس وقت سیر کے لئے آئی ہوئی تھیں اُن کی باتیں سُننے لگی۔ بیگمیں آپس میں باتیں کرتی اور ٹہلتی جاتیں۔ ٹہلتے ٹہلتے دور نکل کر آنکھوں سے اوجھل ہو گئیں۔ لڑکی بھی انکے ساتھ ساتھ تھی۔ اُن کا آنکھوں سے اوجھل ہونا تھا کہ ایک چھوٹا سا سفید کتا دوڑتا ہوا باغ میں آیا۔ یہ باغ کے داروغہ کا جھبرا کتا تھا۔ ہونی شدنی۔ کتا دوڑتا کلیلیں کرتا اس جگہ آپہنچا۔ جہاں گھاس پر گلیور صاحب تشریف فرما تھے۔ اور اپنے خیالات میں اس قدر مستغرق کہ دُنیا و ما فیہا سے بے خبر خدا جانے تصورات کی دُنیا میں کہاں ہوگا۔

کتا اِدھر اُدھر سونگھتا سیدھا چھوٹے آدمی کے پاس آیا۔ اور نہ جانے کیا سمجھا کہ جھٹ اسے منہ میں اُٹھا اپنے آقا کی طرف چلا۔ آقا کے سامنے جا کر دُم ہلانے لگا اور اپنے شکار کو آہستہ سے زمین پر رکھ دیا۔ خوش نصیبی سے جانور ذات کا شریف اور پورا تربیت یافتہ تھا کہ اس نے کوئی شرارت نہیں کی اور اس طرح منہ میں اُٹھا کر لایا کہ گلیور کے کپڑوں پر بھی اس کے دانتوں سے کوئی کھرونچ نہیں آئی۔

ملکہ صاحبہ گلیور سے بڑی دیر تک باتیں کیا کرتیں۔ باتوں میں عموماً اس کے سمندری سفروں کے حالات سُننا انہیں خاص طور پر پسند تھا۔ جب کبھی وہ اُداس نظر آتا تو طرح طرح سے اُس کا دل بہلانے کا سامان بہم پہنچاتیں۔ وہ یہ سمجھ گئی تھیں کہ گلیور کو پانی سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس لئے ایک دن اُنہوں نے کہا کہ اگر تم ایک چھوٹی سی کشتی کا نقشہ بنا دو تو میں اپنے مستری سے تیار کرا دوں۔

گلیور:۔ حضور کا بہت بہت شکریہ۔ لیکن میں اسے چلاؤں گا کہاں؟ اس دیوستان کے دریاؤں، ندیوں اور تالابوں سے تو مجھے ہول آتا ہے۔ یہ اتنی گہری اور بے کنار معلوم ہوتی ہیں کہ کہیں ڈوب نہ جاؤں۔

ملکہ:۔ کشتی تو بن جائے۔ پھر اس کا انتظام بھی ہو جائیگا۔ میں ایسی جگہ بھی بنوا دونگی کہ تم بے کھٹکے کشتی چلا سکو۔

گلیور:۔ جیسی آپ کی مرضی۔

چنانچہ مستری بلایا گیا۔ گلیور نے اس سے باتیں کیں تو وہ بڑا کاریگر نکلا۔ اس نے دس دن کے اندر اندر ایک چھوٹی سی نہایت خوبصورت کشتی تیار کر دی۔ یہ کشتی دیووں کا تو واقعی کھلونا تھی مگر تمام سامان سے لیس۔ اور اتنی بڑی کہ گلیور جیسے آٹھ آدمی اس میں بیٹھ گئے۔

(باقی آئندہ)

اپنی صحت کی حفاظت کیجئے!

آج کل اصلی گھی کا ملنا دشوار ہے! ——— اور ——— بازاری گھی سے صحت تباہ ہو جاتی ہے!!

لہٰذا بہترین مشورہ یہ ہے کہ آپ

گنیش فلور ملز کمپنی لمیٹڈ

(کا تیار کیا ہوا اصلی اور عمدہ)

بنولہ برانڈ بناسپتی

استعمال کیجئے

یہ اس قدر لطیف اور پاکیزہ ہے کہ آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے

ہر کھانے کو خوش ذائقہ بنانے کیلئے بہترین چیز ہے

غیر معمولی طاقت اور تر و تازگی پیدا کرتا ہے

منیجر گنیش فلور ملز کمپنی لمیٹڈ دہلی

لوکل ایجنٹ :۔ مراری لال رام کشن داس۔ کھاری باؤلی دہلی

عالیجناب مسیح الملک حکیم اجمل خاں صاحب کا نادر الوجود عطیہ

جریان

یہ عجیب و غریب دوا جریان کیلئے تیر بہدف ثابت ہو چکی ہے

لیکن

اِس خاص مرض کے علاوہ بھی یہ تمام اعصابی اور دل و دماغ کی قوت کو بحال کرتی ہے

ناتوانی توانائی سے، بڑھاپا جوانی سے اور مایوسی اُمید سے تبدیل ہو جاتی ہے

عضو میں تازہ خون گردش کرنے لگتا ہے

چہرے پر پُر جوش جوانی کی سُرخی جھلکنے لگتی ہے

اِس کے چند روزہ استعمال سے اکثر مایوس العلاج نوجوانوں نے دوبارہ کھوئی ہوئی زندگی پائی ہے

قیمت ۳۲ قرص کی شیشی ہے، ۶۴ قرص کی شیشی ۶ ہے

تار کا پتہ :- ڈسپنسری دہلی

ملنے کا پتہ :- منیجر ہندوستانی دواخانہ - پوسٹ بکس ۲۵ - دہلی

ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۶

اہلِ قلم حضرات سے درخواست ہے

کہ "ادیب" کے لئے مضامین خوشخط اور کاغذ کے ایک طرف لکھکر روانہ کریں ٹکٹ نہ آنے کی صورت میں نامنظور شدہ مضامین کی واپسی کی ذمہ داری ادارہ پر نہ ہوگی۔

مینیجر "ادیب"

گھر میں ضرورت زیادہ غلہ بھرنیکی ممانعت

(ضروری تنبیہہ)

زیر تحت دہلی راشننگ رسٹرکشن آف ایکوزیشن اور ڈر ۱۹۴۴ء نافذ شدہ ۴ مارچ ۱۹۴۴ء کسی کارخانہ دار یا دوکاندار یا ادارہ وغیرہ کو اختیار نہیں ہوگا کہ وہ بلا لائسنس مندرجہ ذیل اشیاء خوردنی اس قدر خریدے یا حاصل کرے یا رکھے جو کہ ایک ماہ کے خرچ سے زیادہ ہوں۔

گندم

آٹا۔ میدہ۔ روا۔ سوجی۔ چوکر اور دیگر اشیاء جو گندم سے بنیں

چاول

دھان اور ایسی اشیاء جو چاول سے بنیں

چینی

اس حکم کے خلاف ورزی کرنا جرم ہے نیز اس حکم کا مقصد محض یہ ہے کہ لوگ یہ خیال کرتے ہوئے کہ راشننگ کے بعد مندرجہ بالا اشیاء نہیں ملیں گی ضرورت سے زیادہ جمع نہ کرسکیں۔

یہ خیال غلط ہے کہ راشننگ ہو جانیکے بعد یہ چیزیں نہیں ملیں گی

صبر

(از واحدی)

عقل کا خواہش کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا صبر کہلاتا ہے۔ صبر انسان کا خاصہ ہے۔ یعنی جس میں صبر نہیں وہ انسان نہیں۔ بہائم اور ملائک اس سے محروم ہیں۔ بہائم کو صرف خواہش دی گئی ہے۔ عقل نہیں دی گئی کہ مخالفت و معارضت کر سکے۔ ملائک کو فقط عقل ملی ہے وہ خواہشات نہیں رکھتے جو انہیں اُن کے کام سے روک دے۔ انسان میں دونوں قوتیں جمع ہیں۔

مُطلق خواہش کے مقابلہ کو صبر کہتے ہیں ذرا سی غلطی کا اندیشہ ہے پیاس کی وقت پانی سامنے ہو اور آپ دینی و دُنیاوی کسی اعتبار سے اس کے پینے میں مجبور نہ ہوں۔ تو ایسی حالت میں عقل کا پانی پینے کی خواہش کو روکنا صبر نہیں۔ بلکہ صبر کا مٹانا ہے۔ کیونکہ صبر تو دونوں قوتوں کی موجودگی چاہتا ہے۔ اور یہاں ایک قوت فنا کر دی گئی۔ اور انسان انسانیت سے نکل کر بہائم یا ملائک میں جا داخل ہوا۔ لہٰذا خواہش محض خواہش کی حیثیت سے اگر کوئی تقاضہ کرے اور پھر عقل معارضہ پر قائم رہے تو وہ صبر ہے۔ اور خواہش عقل کے ماتحت ہو تو وہ اقتضا تو درحقیقت اقتضاءِ عقل ہوگا۔ غرضکہ جب لشکرِ عقل اور لشکرِ خواہش آپس میں لڑیں اور لشکرِ عقل لشکرِ خواہش پر اتنا دررہے کہ لشکرِ خواہش نیست و نابود ہو جائے تو اُسے صبر کہیں گے۔ یہ بات انسان کے ساتھ مختص ہے اور انسان کے سوا کسی مخلوق میں نظر نہیں آتی۔

اسی مضمون کو دوسرے طریقہ سے بیان کرتا ہوں۔

جب کوئی شے کسی شے سے کسی شے کے باعث ممتاز ہو تو وہ شے اس شے کے تمام آثار و اوصاف کے ساتھ مخصوص و مختص ہوتی ہے۔ مثال سے یہ قاعدہ سمجھ میں آ جائے گا۔

انسان کو کل مخلوقات پر محض اختیار کی وجہ سے امتیاز حاصل ہے تو انسان اختیار کے تمام اوصاف اور آثار اور لوازم کے ساتھ مخصوص و مختص ہوگا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ انسان فعل اور ترک پر یکساں قدرت رکھتا ہے۔ یعنی جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے نہیں کرتا۔ تو بس قوتِ اختیار یہ ہے ایک کو ترجیح دے دینا اور ایک کو مرجوح کرنا اسی کا نام صبر ہے۔

تیسرے طرز سے سُنئے۔

انسان مختار ہے اور مختار کا خاصہ ہے کہ ایک کو ترجیح دے اور ایک کو مرجوح کر دے۔ نتیجہ نکلا کہ انسان کا خاصہ ہے کہ ایک کو مرجوح کرے۔ اور اوپر ثابت کیا گیا ہے کہ ایک کا مرجوح کرنا صبر ہے تو انسان کا خاصہ صبر ہوا۔

★

آسماں تک جو نالہ پہنچا ہے
دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے

مجاز

★

ہائے انجام اُس سفینے کا
ناخدا نے جسے ڈبو

[illegible] علاوہ محصول ڈاک

قیمت فی پرچہ: - ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ادیب دہلی

ایڈیٹرز

سید محمد ارتضیٰ واحدی — فصیح الدین احمد — (آنسہ) نجمہ تصدق ایم اے بی ٹی

جلد ۶ — اپریل سنہ ۱۹۴۴ء — نمبر ۶

فہرست مضامین

(فصیح الدین احمد ایڈیٹر نے [illegible] پرنٹر پبلشر [illegible] میں چھپوا کر دفتر ادیب چاندنی محل دہلی سے شائع کیا)

از فصیح الدین احمد ایم۔ اے

نئی کتابیں

(۱) ۱۹۴۳ء کی معیاری نظمیں اور غزلیں

شائع کردہ ہندوستانی پبلشرز دہلی۔ قیمت ایک روپیہ

اس سال مختلف ادبی اداروں سے نظموں کے انتخابات شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر تالیف بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ ہندوستانی پبلشرز نے اس کتاب میں ۱۹۴۳ء کی بہترین نظموں اور غزلوں کو یکجا کر دیا ہے۔ نظموں اور غزلوں کے انتخاب کے سلسلے میں پبلشرز نے خاص توجہ کا ثبوت دیا ہے۔ کتاب دور حاضرہ کے تمام معروف شعرا کی نمائندگی کرتی ہے اور ان کے ایک سال کے بہترین کلام کا آئینہ ہے۔

(۲) فرحت جہاں

از جناب ایم، اسلم صاحب

شائع کردہ ہندوستانی پبلشرز دہلی

قیمت ایک روپیہ

زیر نظر کتاب اردو کے مشہور افسانہ نگار ایم اسلم صاحب کے تین افسانوں کا مجموعہ ہے۔ پہلا افسانہ "فرحت جہاں" کے عنوان سے کتاب کی زینت ہے۔ یہ افسانے معاشرتی پس منظر رکھتے ہیں۔ اور اسلم صاحب کی مخصوص طرز نگارش کا آئینہ ہیں۔ ہندوستانی پبلشرز اس سے قبل بھی اسلم صاحب کی کئی کتابیں شائع کر چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان تصانیف میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

(۳) شوہر کا روگ

از جناب نسیم انہونوی

شائع کردہ نسیم بک ڈپو۔ لکھنؤ۔ قیمت ۱۲ؔ

زیر نظر کتاب نسیم انہونوی صاحب کا ایک افسانہ ہے جو ۱۲۵ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس افسانہ میں ایک شریف خاتون کا جذبۂ ایثار پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے کے پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ شوہر سے محبت کرنے والی بیوی شوہر کے لئے کیا کیا قربانیاں کر سکتی ہے۔ اور کیا کیا برداشت کر سکتی ہے۔ افسانہ پُر اثر بھی ہے اور سبق آموز بھی۔ یقیناً یہ گھریلو زندگی کا ایک کامیاب مرقع ہے۔ زبان صاف اور ستھری ہے۔

(۴) کنول اور دیگر افسانے

از جناب اعظم کریوی

شائع کردہ عبدالحق اکیڈیمی۔ اشاعت منزل۔ اردو گلی۔ حیدرآباد (دکن)

قیمت ۱۲ؔ

زیر نظر کتاب اعظم کریوی صاحب کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اعظم کریوی صاحب اردو کے ایک کہنہ مشق افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانے ملک کے ممتاز رسالوں میں شائع ہو کر پڑھنے والوں کے دلوں پر ایک گہرا نقش چھوڑ چکے ہیں۔ پریم چند سکول کے افسانہ نگاروں میں اعظم صاحب ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں۔ ان کے تمام افسانے عموماً دیہاتی پس منظر رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں کا سب سے نمایاں پہلو یہ ہے کہ ان میں زیادہ تر ہندو کردار پیش کئے گئے ہیں کسی مسلمان ادیب کے لئے کامیابی کے ساتھ ہندو کردار اور ہندو سماج کی عکاسی کرنا یقیناً ایک کارنامہ ہے۔ فرقہ وارانہ تعصب کے زمانہ میں یہ ایک خوش آئند اقدام ہے۔ زیر نظر کتاب میں تمام افسانے اس خصوصیت کے حامل ہیں کتاب کے آغاز میں پیش کلمہ کے عنوان سے پنڈت دتاتریہ کیفی کی ایک تقریظ بھی شامل ہے۔ جس میں اعظم کریوی صاحب کی ادبی خدمات کا اعتراف کیا گیا ہے۔

بچوں کا ادب

(۵) ننھی منھی بتیاں از جناب شماع احمد فائد — قیمت ۱۰؍

(۶) پہیلیں " " — " ۴؍

(۷) لاڈلا البر	از جناب شجاع احمد قائد	قیمت	۱۰/
(۸) سنہری جہاز	" "	"	۲/
(۹) کپڑے	" "	"	۳/
(۱۰) سادہ زندگی	" "	"	۳/
(۱۱) جو منتر کا دھاگا	" "	"	۲/
(۱۲) جنگ کے بعد کیا ہوگا	" "	"	۲/
(۱۳) دسترخوان	" "	"	۳/
(۱۴) کارخانہ	" "	"	۳/
(۱۵) عید	" "	"	۸/
(۱۶) چھتری فوج	" "	"	۳/
(۱۷) امین کروسو	" "	"	۱۰/

شائع کردہ عبدالحق اکیڈیمی۔ اشاعت منزل۔ اردو گلی۔ حیدرآباد (دکن)

خوشی کی بات ہے کہ اس طرف بعض اہل قلم حضرات نے بچوں کے ادب کی طرف توجہ کی ہے جو یقیناً ایک تعمیری اور بنیادی کام ہے۔ ہم اس سے قبل بھی بعض بچوں کی کتابوں پر تبصرہ کر چکے ہیں زیر نظر تصانیف جناب شجاع احمد قائد صاحب کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ یہ چیزیں حیدرآباد ریڈیو سٹیشن سے وقتاً فوقتاً براڈ کاسٹ ہو چکی ہیں۔ عبدالحق اکیڈیمی حیدرآباد نے انہیں کتابی صورت میں پیش کر کے ایک نہایت اہم فرض انجام دیا ہے ان میں بچوں کیلئے عام معلومات کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ یقیناً اس باب میں شجاع احمد صاحب قائد نے بڑی محنت و کاوش کا ثبوت دیا ہے۔ زبان مجموعی حیثیت سے صاف اور سادہ ہے۔

بچوں کی کتابوں میں کتابت کی غلطیاں بھی کم سے کم ہونی چاہئیں۔ کیونکہ ان کا ذہن ان چیزوں کو بہت جلد قبول کر لیتا ہے۔ مضامین کا تنوع لائق ستائش ہے بچوں کے کتب خانوں میں ان کتابوں کو ضرور ہونا چاہیئے۔

(۱۸) خانقاہ

از جناب ایم۔ اسلم

مجلد مع گرد پوش صفحات ۲۶۴ تقطیع $\frac{20\times30}{16}$

شائع کردہ عبدالحق اکیڈیمی اشاعت منزل۔ اردو گلی۔ حیدرآباد دکن قیمت ۱۲/ عہ

شائع شدہ فروری ۱۹۴۴ء

اردو افسانوں کا کون سا ایسا دلدادہ ہوگا جو ایم۔ اسلم کے نام سے واقف نہ ہو۔ ایم۔ اسلم صاحب کے پہلے ناول سے جو غالباً ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا تھا ان کا نام افسانہ نویسوں کی صف اوّل میں شمار ہوتا ہے۔ اس ناول کا نام "نرگس" تھا۔ میں نے اس ناول کو صرف ایک ہی بار پڑھا تھا مگر اس میں وہ کچھ تھا کہ نرگس کا نام آج تک میری یاد سے محو نہیں ہوا۔ اس کے بعد اسلم صاحب نے بیشمار افسانے اور ناول لکھے جن کی تعداد یقیناً سو سے زائد ہوگی۔ "نرگس" کے پڑھنے کے بعد میں ان کی طرز تحریر کا اتنا گرویدہ ہو گیا تھا کہ کم از کم ان کی ستر فی صدی تصنیفات کو تلاش کر کر کے پڑھا۔ ان کے ہر افسانے کا پلاٹ بالکل نیا ہوتا ہے۔ انکی قلم سے رومانیت ٹپکتی ہے۔ جس طرح عمدہ سے عمدہ شاعر کی ہر غزل کا ہر شعر عمدہ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اسلم صاحب کی کم و بیش سو تصانیف سب کی سب اوّل درجہ کا لٹریچر کہلانے کی مستحق نہیں ہو سکتیں۔ مگر چالیس فی صدی کا ضرور اردو کے بہترین افسانوں اور ناولوں میں شمار ہوگا۔ تیس فی صدی اوسط درجے کے قرار پائیں گے۔ اور باقی تیس فی صدی کو اوسط درجہ سے بھی نیچے جگہ ملیگی۔

بحیثیت اڈیٹر مجھے اسلم صاحب کی غیر معمولی رفتار قلم پر تعجب ہوتا ہے ایک ریویو کی ہوئی کتاب کی سیاہی خشک نہیں ہونے پاتی کہ ملک کے کسی گوشے سے اسلم صاحب کا دوسرا مجموعہ ریویو کے لئے چلا آ رہا ہے۔ ان کی مقبولیت صرف پنجاب ہی میں نہیں بلکہ ملک کے تمام اردو داں طبقے میں موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ملک کے ہر حصے سے ان کی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ کبھی لاہور سے کبھی دلّی سے، کبھی بمبئی سے اور کبھی حیدرآباد سے۔

زیر نظر مجموعہ اسلم صاحب کی اوسط درجہ کی تصانیف میں سے ہے۔ اس میں نو افسانے شامل ہیں۔ ہر افسانہ ایک نئے راز کا انکشاف کرتا ہے۔ رومانیت ہر جگہ موجود ہے۔ افسانوی زبان پر پورا قابو ہے۔ کہانی کے زیر و بم کے استاد بن چکے ہیں۔ مگر سوال صرف یہ ہے کہ دماغ کہاں تک قلم کا ساتھ دے سکتا ہے؟ شاعر کی طرح افسانہ نویس کو بھی "آمد" اور "آورد" کے مسئلے سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ جہاں اسلم صاحب کو "آمد" ہوتی ہے وہاں ان کا مقابلہ مشکل ہے۔ لیکن طبیعت پر جبر کر کے لکھنے بیٹھے اور "آورد" کا دور شروع ہوا۔

مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

(۱۹) تنقید شعر العجم

مولفہ پروفیسر حافظ محمود شیرانی صاحب

قیمت مجلد چھ روپے۔ بلا جلد پانچ روپے

شعر العجم علامہ شبلی مرحوم کی وہ تصنیف ہے جس کی ادبی عظمت مسلّم ہے لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس عظیم اور یادگار تصنیف میں ایسے واقعات بھی شامل ہیں۔ جو تاریخی اعتبار سے مشتبہ اور بحث طلب ہیں۔

زیر نظر کتاب تنقید شعر العجم میں فاضل پروفیسر حافظ محمود شیرانی نے شعر العجم

کا اسی نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ "علامہ شبلی اس تصنیف کے دوران میں مورخانہ و محققانہ فرائض کی نگہداشت سے ایک بڑی حد تک غافل رہے۔ رطب و یابس جو کچھ ان کے مطالعہ میں آجاتا ہے بلا تکلف دلچسپ ہو حوالۂ قلم کر دیتے ہیں۔ بہت سے غیر تاریخی افسانوں نے شعر العجم میں قابل عزت جگہ پائی ہے"۔ ظاہر ہے اس کتاب کو تاریخ کی کسوٹی پر پرکھنا ایک ایسی ہی ہستی کا کام ہو سکتا ہے جو ادب اور تاریخ ادب پر گہری نظر رکھتا ہو۔ اور یقیناً پروفیسر محمود شیرانی فارسی ادب پر گہری اور عالمانہ نظر رکھتے ہیں۔ زیر نظر کتاب بلاشبہ عمیق مطالعہ و تحقیق کا نتیجہ ہے۔ بعض واقعات کی کڑیاں ملانے کے سلسلہ میں کیسی دقت کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔

اعتراض عالمانہ اور محققانہ ہیں جن کی بنیاد تاریخی حقائق پر ہے۔ اس تنقید سے شعر العجم کی ادبی عظمت پر کوئی حرف نہیں آتا بلکہ اس کے بہت سے گوشوں کا تاریخ کی روشنی میں مطالعہ ہو جاتا ہے۔ اس حیثیت سے یہ کتاب ایک تعمیری پہلو رکھتی ہے اور ادب کے ایک طالب علم کے لئے اس کا مطالعہ بہت ضروری ہو جاتا ہے۔

(۲۰) مکالمات افلاطون

مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب

قیمت مجلد صہ۔ بلا جلد للعہ

فلسفی کی حیثیت سے افلاطون کا نام ہمارے ہاں ضرب المثل بن گیا ہے مگر درحقیقت خاصا اردو داں طبقہ میں بہت کم لوگ افلاطون کے نظریات اور اس بلند مرتبت فلسفی کے غور و فکر کے نتائج سے واقف ہیں۔ انگریزی زبان میں تو بہت افلاطون کی تصانیف کا ترجمہ ہو چکا ہے بلکہ اور بھی بہت سا ایسا مواد مل جاتا ہے جس کی روشنی میں یونان کے اس مفکر کے نظریات کا مطالعہ ہو سکتا ہے۔ اردو کا دامن اب تک خالی رہا ہے۔ اس سے قبل ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب افلاطون کی تصنیف "ریاست" اردو میں منتقل کر چکے ہیں جو علمی حلقوں میں بڑے ذوق و شوق سے پڑھی جا چکی ہے۔

زیر نظر کتاب جو ڈاکٹر سید عابد حسین کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ افلاطون کے آٹھ مکالمات پر مشتمل ہے۔ یہ ترجمہ جویٹ کے مشہور انگریزی ترجمے سے کیا گیا ہے۔ مکالمات کے انتخاب کے سلسلہ میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس خیال کو مدنظر رکھا ہے کہ انہیں مکالمات کا ترجمہ کیا جائے جو نہ صرف علمی حلقوں میں پڑھے جائیں بلکہ عام ناظرین کے لئے بھی دلچسپی رکھتے ہوں۔ اور ان کو بھی دعوت غور و فکر دیتے ہوں۔

جہاں تک ترجمہ کی زبان کا تعلق ہے اس باب میں ڈاکٹر صاحب موصوف کی حیثیت مستند ہے۔ زبان سلیس، اور اسلوب سلجھا ہوا ہے۔ علمی حلقوں میں یقیناً یہ کتاب قدر کی نگاہوں سے دیکھی جائے گی۔

(۲۱) مشاہیر یونان و روما

ترجمہ از مولوی سید ہاشمی صاحب فرید آبادی

قیمت مجلد للعہ - غیر مجلد ستے

زیر نظر کتاب یونان کے حکیم پلوٹارک کی مشہور کتاب "اسٹیز" کا ترجمہ ہے۔ "اسٹیز" کا شمار یورپ کے ادبیات عالیہ میں کیا جاتا ہے۔ اس کتاب میں پلوٹارک نے اپنے وطنی اسلاف کے ساتھ ساتھ روم کی نمایاں شخصیتوں کے حالات اور ان کی سیرتیں تقابلی تبصرہ کی ہیں۔ نسلی طور پر پلوٹارک یونانی تھا اور اسے یونان کا مدح سرا ہونا چاہئے تھا۔ مگر روم کی حکومت اس سے اس قیاسی دور و داری کے ساتھ پیش آئی کہ اس نے روم کے افراد کو تقابلی مطالعہ کرنے کیلئے منتخب کر لیا۔ کارناموں کا تذکرہ کرتے وقت یونان اور روم کے درمیان ایک خاص توازن برقرار رکھا گیا ہے۔ ہر یونانی کارنامے کے مقابلہ میں روم کا ایک کارنامہ پیش کیا گیا ہے۔ یونان و روم کے تاریخی اور عظیم الشان کلچر کے مطالعہ کیلئے زیر نظر کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔ ترجمہ سلیس اور صاف ہے جس میں کتاب کی افسانوی دلکشی کو بھی برقرار رکھا گیا ہے۔

(۲۲) ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ

مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ ایم۔ اے۔ ڈی لٹ

قیمت مجلد للعہ - غیر مجلد ستے

زیر نظر کتاب ڈاکٹر سید عبداللہ ایم۔ اے۔ ڈی لٹ۔ لکچرار پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج کی تحقیق و کاوش کا نتیجہ ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد نہ صرف اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی زبان میں ہندوؤں نے کیا اضافہ کیا یا کہاں تک حصہ لیا ہے۔ بلکہ اس رشتۂ اخوت و محبت کا بھی پتہ چلتا ہے جو پچھلی صدیوں میں ہندو اور مسلمانوں میں رہا ہے۔ مغل عہد حکومت میں مسلمان حکمرانوں نے کس حد تک ہندوؤں کو اپنا لیا تھا۔ ان کے دلوں پر اپنی تہذیب کا اتنا گہرا نقش چھوڑا کہ ان کی زبان تک بدل گئی۔ انہوں نے بلا تکلف فارسی اختیار کر لی اور اس حد تک اختیار کر لی کہ اس کے سرمایہ شعر و شاعری میں کافی اضافہ کیا۔ کتاب اپنے اندر نہایت دلچسپ تاریخی سرمایہ رکھتی ہے۔ جا بجا ایسے واقعات کا ذکر ہے جن سے اس زمانے کے معاشرتی اور تمدنی اتحاد کا پتہ چلتا ہے۔ کتاب نہ صرف ادبی نقطۂ نظر سے اہمیت رکھتی ہے۔ بلکہ اپنے اندر بیش بہا تاریخی مواد بھی رکھتی ہے۔

(۲۳) دیوانِ بہرام

مرتبہ جناب مُسلم ضیائی۔ ایم، اے
قیمت مجلد دو روپے چار آنے

اُردو زبان کسی مخصوص فرقہ کی ملکیت نہیں ہے۔ اُردو زبان ملک کے مختلف فرقوں کے باہمی میل جول اور ان کے معاشرتی و تمدنی اتحاد کا نتیجہ ہے چنانچہ زبان کے ارتقا میں مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، پارسی سبھی نے کم و بیش حصہ لیا ہے۔ زیرِ نظر کتاب انیسویں صدی کے ایک پارسی شاعر بہرام جی جاماسپ کے اردو کلام کا مجموعہ ہے۔ ان اشعار میں ایسی پاکیزہ اور پختہ زبان استعمال کی گئی ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔
خیالات و تصورات کے اعتبار سے بھی اُردو کی مخصوص روایتی غزلگوئی ... نظر آتی ہے۔

(۲۴) فردوسی پر چار مقالے

از پروفیسر شیرانی صاحب
قیمت مجلد ۱ے غیر مجلد ۱۲؍

زیرِ نظر کتاب ان چار طویل مقالوں پر مشتمل ہے جو پروفیسر شیرانی صاحب ... نے زندہ جاوید شاعر فردوسی پر لکھے ہیں۔ پہلا مقالہ شاہنامہ کی نظم کے ... زمانہ پر ہے۔ دوسرے مقالہ کا عنوان ہجو سلطان محمود غزنوی ہے۔ تیسرے مقالہ میں فردوسی کے مذہب سے بحث کی گئی ہے۔ چوتھا مقالہ یوسف زلیخا ... پر ایک جامع تبصرہ کیا ہے۔ فردوسی کا شمار دنیا کے چند بہترین شعرا میں ہوتا ہے۔ فردوسی کی غیر فانی تصنیف "شاہنامہ" کا مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اس کے متعلق خود انگریزی میں کافی مواد موجود ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں شیرانی صاحب نے فردوسی کے متعلق کافی ادبی اور تاریخی مواد پیش کیا ہے۔ فردوسی کے مذہب۔ فردوسی اور محمود غزنوی کی سرپرستی اور پھر محمود غزنوی کی عہدشکنی کے سلسلہ میں عجیب عجیب غلط فہمیاں رہی ہیں۔ اس کتاب میں ان مسائل پر وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے۔ واقعات کو تاریخ کی روشنی میں پرکھا گیا ہے۔ یہ چاروں مقالے ہمارے ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔

(۲۵) ہمارے بینک

از جناب محمد احمد سبزواری ایم، اے
قیمت مجلد ۱۲؍ غیر مجلد ۱۲؍

ہماری سوسائٹی، ہماری تہذیب اور تہذیب کے ارتقا کی بنیاد ہی معاشیات پر قائم ہے۔ تاریخ کے کسی دور میں بھی معاشیات کے مسئلہ کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی جتنی اب دی جا رہی ہے۔ اس وقت تمام مسائل حیات کو اسی عینک سے دیکھا جا رہا ہے۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ہر مسئلہ کی جڑ یہیں سے شروع ہوتی ہے۔ محمد احمد سبزواری ایم اے نے زیرِ نظر کتاب لکھکر وقت کی ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ہمارے ہاں کتنے ایسے ہیں جو بینک کی اہمیت بینک کے مقاصد، اس کے فوائد و نقصانات سے بے بہرہ ہیں۔ اس کتاب میں بینک کے نظام اور اس کے عمل پر وضاحت کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

(۲۶) نظریہ تعلیم

مترجمہ ڈاکٹر قاضی عبد الحمید ایم اے، پی ایچ، ڈی (برلن)
قیمت مجلد للعہ؍ غیر مجلد ے؍

زیرِ نظر کتاب یورپ کے مشہور ماہرِ تعلیم پروفیسر ڈاکٹر جارج کرشین اسٹائنر کی کتاب کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب میں تعلیم اور طریقہ تعلیم پر بحیثیت فن کے روشنی ڈالی گئی۔ یہ کتاب تعلیمی لٹریچر میں ایک وقیع مرتبہ رکھتی ہے۔ انجمن ترقی اُردو نے اس کتاب کا ترجمہ شائع کر کے ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے۔ ہماری زبان میں تعلیمی لٹریچر کی سخت کمی رہی ہے۔ بعض حضرات نے اب اس طرف توجہ کی ہے۔ زیرِ نظر کتاب اس سلسلہ کی ایک اہم کڑی ہے۔ ترجمہ میں زبان کی صفائی اور درستگی نمایاں ہے۔

(۲۷) مانڈو (شادی آباد)

مترجمہ مرزا محمد بشیر صاحب
قیمت مجلد ے؍ غیر مجلد ۱۲؍

مالوہ کے ساتھ شب مالوہ کا تصور آتا ہے۔ مالوہ کے ساتھ بہت رنگین اور شاداب روایتیں وابستہ ہیں مگر بہت کم لوگ مالوہ کے دارالسلطنت مانڈو کی صحیح تاریخی عظمت سے واقف ہیں۔ مانڈو عہدِ ... میں ایک نہایت ترقی یافتہ تہذیب کا گہوارہ رہا ہے۔ یہ شہر جو اب ایک ویرانے سے زیادہ کچھ نہیں فن تعمیر کے عظیم الشان نمونے پیش کر چکا ہے۔ زیرِ نظر کتاب اس شہر کی عظمت رفتہ کا آئینہ ہے۔

یہ کتاب جناب غلام یزدانی صاحب کی انگریزی کتاب "مانڈو دی سٹی آف جوئے" کا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے ہندستان کے کیسے کیسے گوشوں میں تہذیب کن بلندیوں تک پہنچ چکی ہے۔

(۲۸) کیفیہ

از پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی
قیمت مجلد للعہ؍ غیر مجلد ے؍

زیرِ نظر کتاب انجمن ترقی اُردو کے سرگرم رکن پنڈت برجموہن صاحب دتاتریہ کیفی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ اُردو زبان کی ایک مختصر مگر جامع تاریخ ہے کتاب میں نہ صرف اُردو زبان کا تاریخی ارتقا پیش کیا گیا ہے۔ بلکہ انشا و املا سے متعلق ضروری امور سے بھی بحث کی گئی ہے۔ پنڈت کیفی ان چند نام نہاد بزرگوں میں سے ہیں جن کو ہمارے کلاسیکل ادب پر عبور حاصل ہے۔ یہ کتاب اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اُردو زبان کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ان کے بہت سے [illegible] کی تحقیق [illegible] گئی ہے [illegible]

نہایت کامیابی [illegible] ہے۔ اس بحث سے صحیح اور استفادہ کرنے کے لئے

[illegible] اردو میں معلومات بے حد ضروری ہے۔ انشاء کے سلسلہ میں زبان کے

بعض نہایت نازک پہلوؤں کی تصریح کی گئی ہے۔ ہمارے تعلیمی ادب میں یہ کتاب

یقیناً ایک قابل قدر اضافہ ہے۔

(۲۹) چند ہم عصر

از ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب

قیمت مجلد [illegible] غیر مجلد [illegible]

زیر نظر کتاب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو ڈاکٹر صاحب موصوف نے بعض اہم شخصیتوں کے بارے میں دوران قیام حیدرآباد دکن میں وقتاً فوقتاً لکھے۔ یہ مضامین مختلف رسائل و صحائف میں شائع بھی ہو چکے ہیں۔ شیخ چاند صاحب ایم اے مرحوم نے جو انجمن ترقی اردو کے ایک سرگرم رکن اور مولوی صاحب کے رفیق کار تھے۔ ان مضامین کو بڑی کاوش و تجسس کے بعد یکجا کیا تھا۔ مگر افسوس ان کی حیات میں یہ شائع نہ ہو سکے۔ ان مضامین میں ان اہم اکابرین اردو کی سیرت اور ان کے ادبی کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے جنہیں مولوی صاحب نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے ابتدا میں کیسے کیسے صاحب جوہر پیدا ہوئے۔ یہ مضامین صداقت و خلوص کا آئینہ ہیں۔ زبان میں مولوی صاحب کی مخصوص سادگی نمایاں ہے۔

(۳۰) کتاب الہند (جلد دو)

مترجمہ جناب سید اصغر علی صاحب

قیمت مجلد [illegible] ۔ غیر مجلد [illegible]

زیر نظر کتاب مشہور سیاح مورخ البیرونی کی اس مشہور کتاب کا ترجمہ ہے جو اپنے اندر بیش بہا تاریخی سرمایہ رکھتی ہے۔ البیرونی نے ہندستان کے حالات، یہاں کے علوم فنون، یہاں کے رسم و رواج اور تہذیب پر جو گہری نظر ڈالی ہے اور انہیں جس تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہ بسیط تصنیف ایک سیاح کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ انجمن ترقی اردو نے اس کا ترجمہ شائع کرکے ایک اہم علمی و تاریخی خدمت انجام دی ہے۔

(۳۱) الف لیلہ و لیلہ (حصہ سوم)

مترجمہ ڈاکٹر ابوالحسن منصور احمد مرحوم

قیمت مجلد [illegible] ۔ غیر مجلد [illegible]

الف لیلہ دنیا کی چند مقبول ترین کتابوں میں شمار کی جاتی ہے۔ مختلف زبانوں میں اختصار و اقتباس کے ساتھ الف لیلہ کے بے شمار تراجم اور ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ خود اردو میں الف لیلہ کی کہانیوں کے کتنے انتخابات مختلف صورتوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ زیر نظر کتاب الف لیلہ کا تیسرا حصہ ہے۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر ابوالحسن منصور احمد مرحوم [illegible] خاص شغف تھا۔ اگر عمر وفا کرتی تو کیسے [illegible] کتاب میں ایک کامیاب ترجمہ کی جملہ خصوصیات کے ساتھ [illegible] شروع سے آخر تک برقرار ہے۔

(۳۲) بھابی جان

از جناب نقش حق قریشی دہلوی

شائع کردہ کتب خانہ علم و ادب دہلی قیمت [illegible]

جناب نقش حق قریشی دہلوی کا نام ادبی دنیا میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ ان کے افسانے ملک کے ممتاز ادبی رسائل میں شائع ہو کر ناظرین سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ ان کا طرز تحریر ایک خاص رنگینی اور دلکشی رکھتا ہے۔ زیر نظر کتاب ان کے مزاحیہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان تمام افسانوں کی روح رواں ایک "بھابی جان" ہیں۔ ہر افسانے کے پلاٹ کا ارتقا انہیں بھابی جان کے گرد و پیش ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ان مزاحیہ افسانوں میں تنوع بھی ہے۔ اور مزاح کی روح شروع سے آخر تک برقرار ہے۔ ہمارے مزاحیہ ادب میں یہ کتاب یقیناً ایک نہایت دلکش اور خوشگوار اضافہ ہے۔

(۳۳) سادہ و رنگین افسانے

از جناب ظفر قریشی

شائع کردہ عبدالحق اکیڈمی۔ حیدرآباد دکن

قیمت [illegible]

ظفر قریشی صاحب صحافتی اور ادبی دنیا میں ایک عرصے سے روشناس ہیں۔ ان کے افسانے وقتاً فوقتاً ملک کے ممتاز ادبی رسالوں میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ زیر نظر کتاب ان کے تازہ ترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔

ان افسانوں میں زندگی کی حقیقتیں سانس لے رہی ہیں۔ افسانوں کے کردار ہمارے ہی ماحول میں رہنے والے افراد کی جیتی جاگتی تصویریں پیش کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ لکھنے کا انداز کافی شگفتہ ہے۔ مجموعی حیثیت سے یہ کتاب ہمارے افسانوی ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

غالب اور ہنگامۂ حیات

(از جناب ڈاکٹر سید نجم الدین احمد جعفری بیرسٹر ایٹ لا)

جس طرح عام طور پر ہر شخص ماحول سے متاثر ہوتا ہے اور ماحول ہی کا نمونہ ہوتا ہے۔ اسی طرح ادیب اور شاعر بھی ماحول کے تحت میں اپنے تخیل اور فکر کا اظہار کرتے ہیں۔ جب کسی قوم و ملک میں رہبانیت رہی تو سارے ادیب و شاعر اُس سے متاثر ہوئے۔ ہومر اور ورجل یونان کے رفعت کے وقت پیدا ہوئے۔ شیکسپیر اور ملٹن نے اس وقت انگلستان میں سکہ جمایا جب وہ ترقی کی راہ پر گامزن تھا۔ فردوسی اُس وقت کا شاعر ہے جب ایران میں عرب کے تمدن کے خلاف ردعمل تھا اور سارے قوم میں ایک نئی کیفیت پیدا تھی۔ حافظ کا طوطی اُس وقت بولا جب تغزل اور تصوف اپنا گہرا اثر رکھتے تھے۔ اردو شاعری کا رواج ایسے وقت میں ہوا جب دلی کی بادشاہت قلعہ تک محدود تھی اور گودلوں میں جبروت کے سے ترش کی اب بھی تمنا تھی لیکن یاس و حرماں کا سماں ہر طرف طاری تھا۔ اردو شاعری ایسی ہی اثرات میں ڈوبی ہوئی تھی اور رازِ حیات سے معترا رہی۔ ایسی حالت میں کسی ایسے شاعر کا پیدا ہونا جو سماجی کیفیت سے الگ تھلگ ہوکر ہنگامۂ حیات پر نظر ڈالے اور فلسفۂ حیات کا پیغام بر بنے آسان نہیں تھا۔ ایسا شاعر ایسی فضا میں طرح طرح کی مصیبتوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کی مضحکہ خیزی کی جاتی ہے، اس پر آوازے کسے جاتے ہیں۔ اس کا فلسفہ بے معنی کہا جاتا ہے اور اس طرح وہ نظروں سے گر جاتا ہے۔ اور اس کی وہ وقعت نہیں ہوتی جس کا وہ مستحق ہے۔ لیکن اگر وہ ان تمام مصیبتوں کو سہہ کر اپنی ضمیر اور ادراک کی قوت سے مردانہ وار چٹان کی طرح اپنے فلسفہ پر مستحکم رہا تو ایک وقت ضرور آتا ہے جب اس کا دور دورہ ہوتا ہے اور اس کا فلسفہ اور پیغام لوگوں کو گرویدہ کرلیتا ہے۔ ٹھیک یہی حالت غالب کی تھی۔ غالب پیدا تو اُس وقت ہوا جب اسکے لئے اس کا موقع نہ تھا کہ وہ اپنے فلسفہ کو پیش کرے اور رازِ حیات کی حقیقت کو سمجھائے لیکن مشکلات کی بندشوں سے آزاد ہوکر اس کا دماغ ماحول سے ہٹ گیا اور اس کی نظریں آگے دیکھنے لگیں۔ اور اُس نے اپنے کلام سے لوگوں کو حقیقت آشنا بنانا چاہا۔ اس وقت اس کی بے قدری ہوئی جیسا کہ ہونی چاہیئے تھی۔ لیکن آنے والے دور نے جس میں موجودہ دور بھی شامل ہے اُس کے کلام پر عمیق نظر ڈالی اور اُسے صحیح طور پر ایک سچا فلسفی ایک بڑا مدبر اور رازدانِ حیات کا بہترین تیر رَس تھا۔ خود کیا صحیح پیشین گوئی کی ہے۔

کوکبم را در عدم اوج قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

اس کے کلام میں ہر جگہ حیات سے ہم آہنگی اور حقیقت سے یگانگی نمودار ہے۔ انسان کا مرقع کھینچتا ہے تو سچی تصویر سامنے آجاتی ہے۔ مناظرِ قدرت پر نظر ڈالتا ہے تو اُس کے کلام پڑھنے والوں کو مشاہدہ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ خوشی کا ذکر کرتا ہے تو باچھیں کھل جاتی ہیں۔ غم کا بیان کرتا ہے تو آنسو بہانے کو جی چاہتا ہے محبت کا ذکر کرتا ہے تو پریم کی لہریں دوڑنے لگتی ہیں۔ وفا۔ بیوفائی۔ وصل۔ فراق اشک و تمنا غرضیکہ ہر چیز پر اس کی روانی قلم ایک بولتی ہوئی تصویر ہے۔ وہ مشکلات کو بیان کرتا ہے لیکن اس کا رونا نہیں روتا بلکہ اس کا حل پیش کرتا ہے۔ غم کو ٹالنا چاہتا ہے تو اس طرح کہتا ہے کہ اس کا اثر بالکل محو ہو جائے۔

پھیر کر غالب نے رُخ سجادۂ تخئیل کا
اِک نیا میخانہ کھولا بادۂ تخئیل کا

غالب کے دیوان سے چند اشعار منتخب کئے جاتے ہیں اُن کو ملاحظہ کیجئے:۔

(۱) نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کتنا صوفیانہ شعر ہے اور رازِ حقیقت کا کتنا بڑا نکتہ اس میں مضمر ہے۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ نقاشِ حقیقی کے اس شوخی سے جس سے صفائی مراد ہے پیکرِ انسانی کے صفحۂ ہستی پر کھینچا ہے کہ تصویر اس شوخی سے فریاد کرتی ہے یعنی اس جدائی سے جو ہستی کی صورت میں ظہور میں آئی ہے۔ ہر تصویر خالقِ اکبر سے فریاد کر رہی ہے۔ اس تخئیل کو اور شاعروں نے بھی ادا کیا ہے مگر جو خوبی اس میں ہے اوروں میں نہیں ہے۔ اور نہ اور اشعار ہم کو حقیقت سے اتنا قریب تر کرتے ہیں جتنا یہ۔

مولانا روم کہتے ہیں ؎

بشنو از نے چوں حکایت می کند
وز جدائی ہا شکایت می کند

کز نیستاں تا مرا ببریدہ اند ٭ از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند

یعنی نے کا یہ خاصہ ہے کہ جب وہ اپنے مرکزِ اصلی یعنی نیستاں سے جدا ہوگی تو اس میں کرب ہوگا۔ درد ہوگا اور ایک آواز بھی محسوس کی جاویگی۔ مولانا کی کیا بات ہے بحرِ تصوف کے غواص، آسمانِ رفعت کے حقیقت شناس، لیکن دونوں کے اشعار پر غور کیجئے تو صاف پتہ چلتا ہے کہ غالب حقیقت کا مرقع حقیقت کے ذریعہ پیش

کرتا ہے [illegible] ایک تخیل [illegible]

دوسرا مطلب یہ ہے کہ مبداء حقیقی نے جو صورت پیدا کی ہے وہ انسان کی سمجھ کا نہیں ہے بلکہ انسان سے ہے۔ اس لئے وہ پیچ و خم میں مبتلا ہے۔ غالب کے شعر میں یہ مفہوم بھی ہے کہ انسان جب دنیا میں آتا ہے تو ایک طوفان اس کو تمام عالم پاتا ہے۔ دوسری طرف وہ سمندر نظر آتا ہے جس کا اظہار پہلی مخلوق نے یوں کیا تھا۔ "انجعل فیہا من یفسد فیہا ویسفک الدماء" اس نے اس کا دل گرفتہ ہے۔

اسی خیال کو دو اور شاعروں نے اس طرح ادا کیا ہے۔ آتش کہتے ہیں ؎

حباب آسا میں دم بھرتا ہوں تیری آشنائی کا
نہایت غم ہے اس قطرہ کو دریا کی جدائی کا

مولانا حالی کہتے ہیں ؎

دریا سے حباب کی ہے یہ صدا تو اور نہیں میں اور نہیں
مل جاؤ گا تجھ سے بعد فنا تو اور نہیں میں اور نہیں

اس شعر پر غالب کے وقت میں ہی بہت نکتہ چینیاں ہوئیں اور غضب تو یہ ہے کہ طبا طبائی اس کو بے معنی ٹھیر لئے ہیں۔

(۲) اتنا ہی مجھ کو اپنی حقیقت سے بُعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اس شعر کا مطلب صاف ہے کہ جس طرح مجھکو وہم غیر سے پیچ و تاب رہتا ہے اسی طرح حقیقت سے بُعد ہے۔ یعنی صوفیانہ خیال ہیں جب تک غیر اور غیریت کا تخیل ہم میں ہوگا یا ماسوا اللہ کی گنجائش ذہن میں کسی طرح بھی ہوگی ہم حقیقت آشنا نہیں ہو سکتے۔ اور مرکز حقیقی سے دور رہیں گے۔ اسی خیال کو شیفتہ یوں کہتا ہے ؎

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا
وہ سایہ ہوں جو محو ہوا آفتاب میں
سالک کی یہ مراد کہ مجھ سا ہو نفس بھی
رہبر کی یہ مراد کہ رہرو ہو خواب میں
سب اس میں محو اور وہ سب سے علیحدہ
آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں

شیفتہ کے اشعار اچھے ہیں لیکن اثر پذیر نہیں ہیں۔ غالب نے دریا کو کوزہ میں بند کیا ہے۔ اور ایک شعر میں جو کچھ کہہ گیا ہے اس کا نقش بھی دل پر ہوتا ہے اور واہ سخن بھی نکلتی ہے ؎

(۳) نقش ناز بت طناز بہ آغوش رقیب پائے طاؤس پئے خامۂ مانی مانگے

[illegible]

بہ صحت ہے کہ جب [illegible] کی تصویر اس کی ہم [illegible] معشوق کے حسین ہونے کے وہ بہت [illegible] ہے اور [illegible] خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ہاتھ میں اپنے طاؤس کا [illegible] کے طاؤس کے سب اعضا حسین ہوتے ہیں لیکن اسکے پاؤں بہت ہی بدصورت ہوتے ہیں یہ شعر رقیبانہ کیفیت کی بہترین تصویر ہے۔ گو کہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کیفیت کی پوری تصویر سامنے رکھی ہوئی ہے۔ لطف تو یہ ہے کہ معشوق کیلئے جو الفاظ چنے ہیں اس سے اس کا حسن دوبالا ہو جاتا ہے اور اس کے تیور کی شان بڑھ جاتی ہے لیکن پھر بھی اس کو رقیب کے ساتھ اس طرح دکھلایا ہے کہ وہ نظروں سے گر جاتا ہے۔ رقابت کی تصویر اور شاعروں نے بھی کھینچی ہے مگر یہ بات پیدا نہ ہوئی مثلاً ؎

حاصل ہوئے مزے ترے خنجر کے غیر کو
سر پر ہمارے مفت کا احسان ہو گیا

(۴) بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں آسان سے آسان کام بھی دشوار ہو جاتا ہے اس کی دلیل مصرعہ ثانی میں بیان کی ہے کہ آدمی جو کہ عین انسان ہے اس کا بھی انسان یعنی انسان کامل ہونا مشکل ہے۔ یہ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ بہت سے آسان کام بعض وقت بڑے دشوار ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کی دلیل غالب نے ایسی دی ہے کہ جس کا ہر انسان کو ذاتی تجربہ ہے یعنی انسان اگر اپنی ذاتی تصویر دیکھ لے تو اس کیفیت سے انکار نہیں کر سکتا یہ طرز بیان غالب ہی کا ہو سکتا ہے۔

(۵) ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزہ کیا

اس شعر میں بالکل اچھوتے طور پر اس فطرت انسانی کا بیان ہوا ہے کہ انسان کو جس قدر تھوڑی فرصت ہوتی ہے اسی قدر زیادہ سرگرمی سے وہ کام انجام دیتا ہے شاعر کہتا ہے کہ دنیا میں جس قدر چہل پہل ہے وہ اس یقین کی بدولت ہے کہ ہمیں زندہ رہنے کا زمانہ تھوڑا ہے۔

وقت یا عمر کی قلت دکھلاتے ہوئے شعراء نے اور فلسفیوں نے طرح طرح کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ مرجاؤ قبل اسکے کہ تم مردہ ہو یعنی دنیا سے الگ تھلگ ہو جاؤ۔ خدا کے دھیان میں صرف ہو جاؤ۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ زمانہ بہار کا ہے اسی کی قدر کرو اور جتنا عیش و عشرت کر سکتے ہو کرو۔ امراؤ القیس عرب کے زمانہ جاہلیت کا مشہور شاعر اس خیال کی تائید کرتا ہے

دلّی کی کہانی حویلیوں کی زبانی

(از جناب پروفیسر مشتاق احمد زاہدی)

کورو پانڈو سے لیکر شاہجہاں کے وقت تک دلی کے کتنے ہی شہر بسے اور برباد ہوئے۔ اُن کے کھنڈرات دلی دروازے سے چلکر مہرولی تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کھنڈرات پر اتنی قلم آزائی ہو چکی ہے کہ ان کے متعلق کچھ لکھنا تحصیل لاحاصل ہوگی۔ لیکن شاہجہاں کی بنائی ہوئی دلی کی چاردیواری کے اندر بھی کچھ کھنڈرات ہیں جن کے متعلق بہت کم معلومات مہیا ہوتی ہیں۔ یہ کھنڈرات اب مُبتلا بہ تعمیر ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ اُن پُرانی حویلیوں اور محلسراؤں کی نشانیاں ہیں جن کے اندر دلی والوں کے شاندار ماضی کی طویل داستانیں بند پڑی ہیں۔ اللہ اگر ان عمارتوں کو زبان دیدے تو وہ بتائیں کہ جہاں اب تنگ و تاریک مکانات اور محلے نظر آتے ہیں۔ یہاں بھی کیسے کیسے عالیشان اور پُرفضا محلات تھے اور اُن میں کیسے اولوالعزم اور صاحب جاہ و ثروت دلی والے آباد تھے۔ اور وہ کس شان و شوکت اور جاہ و جلال کی زندگی بسر کرتے تھے۔ مغلیہ سلطنت کے انحطاط کے زمانے میں یہ شہر تیمور اور نادر کی دستبرد سے نہ بچا۔ مگر اس گئے گذرے وقت میں بھی دلی والوں کی دولت و حشمت کا اندازہ اُس رقم سے ہو سکتا ہے جو محمد شاہ کے اہل دربار نے نادر کی بلا ٹالنے کے لئے فرداً فرداً نادرشاہ کو نذرانے میں پیش کی تھی۔ اس کی تفصیل ملاحظہ ہو۔

نقد از خزانہ شاہی ۸ کروڑ پچاس لاکھ۔ جواہرات از جواہر خانہ شاہی ۵ کروڑ۔ آلات طلائی ایک کروڑ پچاس لاکھ۔ تخت طاؤس و اسباب متفرق از توشہ خانہ و باورچی خانہ و دور خانہ و فراشخانہ و آبدار خانہ ۵ اکروڑ۔ میزان الکل ۳۴ کروڑ

نقد از امراء و عمائدین شہر۔ آصف جاہ نظام الملک ۴ کروڑ۔ نواب ابو المنصور خاں صفدر جنگ ۴ کروڑ۔ قسیطی خانہ خان دوراں و مظفر خاں میر آتش ۱ کروڑ ستر لاکھ۔ وزیر الممالک قمر الدین خاں ایک کروڑ۔ لطف اللہ خاں صادق داروغہ جواہر خانہ ۹ لاکھ۔ نواب محمد خان بنگش ۲ لاکھ ۷۵ ہزار۔ رائے خوشحال چند پیشکار تن گری ۲ لاکھ ۵۰ ہزار۔ از متصدیان دفتر شاہی ۲ کروڑ۔ شیخ سعد اللہ دیوان تن ۲ لاکھ ۵۰ ہزار۔ راجہ ناگرمل دیوان خالصہ ۳ لاکھ۔ سیتارام مغز انچی ۲ لاکھ پچاس ہزار۔ سبحان رائے وکیل ۲ لاکھ ۷۵ ہزار۔ نوندہ رائے ۲ لاکھ ۶۰ ہزار۔ متفرق ۴۰ لاکھ۔ میزان ۲۱ کروڑ ۳۸ لاکھ ۶۰ ہزار

دلی شہر کے بازار اسی قسم کے اُمراء کی ضروریات پورا کرنے کیلئے لعل و جواہر اور انواع و اقسام کے سامان سے پٹے پڑے تھے۔ اور اسی قسم کے لوگوں کے محل اور حویلیوں کے نشانات اب تک دلی شہر میں کہیں کہیں باقی رہ گئے ہیں۔ ان امراء کے محل زیادہ تر تو لال قلعہ کے نیچے تھے جو سن ستاون کے انقلاب کے بعد زمین کے برابر کر دیئے گئے۔ لیکن پھر بھی شہر کے اور حصوں میں کہیں ایک بلند دروازہ باقی رہ گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی محل تھا اور کہیں کوئی حویلی ایک محلہ کی صورت میں تبدیل ہو گئی ہے۔ مگر اب تک اپنے قدیم مالک کے نام سے مشہور ہے۔ ایسے دروازے اور حویلیاں بھی اب خال خال رہ گئے ہیں یہ نشانیاں سلطنت مغلیہ کے آخری دور کی ہیں۔ اور ان نام نہاد حویلیوں اور دروازوں کے ناموں سے اُن امراء و وزرا کا پتہ چلتا ہے جو عہد محمد شاہ اور اسکے بعد یہاں بستے تھے۔ چاندنی چوک میں ایک دروازہ حیدر قلی خاں کی حویلی کہلاتا ہے اب کون جانتا ہے کہ یہ حیدر قلی خاں کون تھے۔ حالانکہ انہوں نے محمد شاہ کے زمانہ میں ایسا کام کیا تھا کہ جس سے ساری حکومت کا رنگ بدل گیا تھا۔ حیدر قلی خاں محمد شاہ کے میر آتش تھے۔ میر آتش اُس امیر کو کہتے تھے جو توپ خانے کا افسر اعلیٰ ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں توپ خانہ وہی حیثیت رکھتا تھا جو آج کل بمباروں کی ہے۔ تیر و تلوار توپ و تفنگ کے مقابلے میں ہیچ تھے۔ چنانچہ جب بادشاہ گر سید بھائیوں امیر الامراء سید حسین اور سید عبداللہ قطب الملک کی زیادتیوں سے بادشاہ و امراء و رعایا سب تنگ آ گئے تو ان کے استیصال کے مشورے ہونے لگے۔ مگر کسی میں سامنا کرنے کی جرات نہ پڑتی تھی۔ حتیٰ کہ نظام الملک آصف جاہ نے بھی دار الخلافہ چھوڑ کر اپنی نظامت دکن کی راہ لی۔ کیونکہ وہ تورانی امراء قدیم میں سے تھے اور اُن پر مخالفت کا شبہ تھا۔ وہاں پہنچ کر نظام الملک علانیہ امیر الامراء سے برگشتہ ہو گیا۔ جس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ امیر الامراء نے نظام الملک کو لکھا کہ ہمارا ارادہ ہے کہ صوبہ ہائے دکن کے بندوبست کرنیکے لئے صوبہ مالوہ میں اقامت گزیں ہوں۔ تم چار صوبوں اکبرآباد۔ الہ آباد۔ برہان پور اور ملتان میں سے جہاں چاہو چلے جاؤ — نظام الملک نے جواب میں چند کلمات تحریر کر کے یہ شعر عنوان میں درج کیا ؎

من ہیو فانیم بہ دغا میخورم قسم
من چون شما نیم کہ شما میخورم قسم

دونوں بھائی مطلب تاڑ گئے اور نظام الملک کے وکیل معتبر کو بلا کر کلمات

[illegible]

کہ ہاں کہ [illegible] حقیقت [illegible] ہماری نظر ڈالتا ہے اور [illegible] ہے۔ [illegible] ہم کو دیتا ہے۔

(۵) [illegible] گیش نہ طور پر
[illegible] فرصت [illegible] دیگر

پہلا شعر دوسرا مصرعہ پہلے مصرعہ کی دلیل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عام دستور ہے کہ [illegible] بیشتر پسندی جاتی ہے۔ اسی طرح ہمارے رب کے بار اٹھانے کا ظرف انسان میں [illegible] ہے اس لئے ہم اس کے مستحق ہیں۔ یہ تخیل قرآن پاک سے لیا گیا ہے۔ جس میں کہا گیا ہے کہ ہم نے اپنی امانت زمین، آسمان اور پہاڑوں کو پیش کی مگر وہ متحمل نہ ہو سکے۔ اور انسان نے اس کو اٹھا لیا۔

بعض اور شعراء اس خیال کو اس طرح اظہار کرتے ہیں :-

(۱) درد

ارض و سما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے

(۲) حافظ

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید
قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند

(۳) خسرو

پرتوِ حسنت نگنجد در زمین و آسماں
در حریمِ سینہ حیرانم کہ چوں جا کردہ

ان تینوں اشعار میں بہترین شعر خسرو کا ہے۔ دوسرا مصرعہ گو عام دستور کو بتاتا ہے لیکن آج بھی بعض بڑی ہستیوں کیلئے غور طلب ہے۔ غالب کا یہ کمال ہے کہ اس نے پہلے مصرعہ کو بطور ایک قضیہ کے پیش کیا ہے اور دوسرے مصرعہ سے اس کو ثابت کیا ہے۔ مجھے شعر کا اتنا ٹکڑا کہ "گری تھی ہم پہ برق" پسند نہیں کیونکہ گرنی اور حق دونوں سے ایک تخیل غیر پسندیدہ پیدا ہوتا ہے جسکی چنداں گنجائش نہیں۔ میرا مطلب یہ نہیں کہ یہ محاورہ ناقص ہے یا یہ کہ ایسے موقع پر استعمال نہیں کرتے۔ لیکن میں "لقاءِ رب" کے لئے اسکو موزوں نہیں سمجھتا۔

(۶) آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یہ دونوں شعر قریبًا ایک ہی خیال کو ادا کرتے ہیں بلکہ یوں سمجھے کہ ایک شعر دوسرے شعر کی شرح ہے۔ یہ خیال بہت سے شاعروں نے ظاہر کیا ہے کہ "اے خدا میرے گناہ بہت ہیں ان کے [illegible]۔ تیرا کرم جو اس سے کہیں زیادہ ہے اس کی طرف دیکھ۔" خیالؔ؎

ہر چند ہم لائقِ بخشائش تو
بر من منگر بکرم خویش نگر

مگر غالب کا یہ تخیل بالکل انوکھا ہے۔ کہ جتنے گناہ ہیں اتنے ہی ناکردہ گناہوں کی حسرت کے داغ ہیں۔ اس لئے گناہوں کا حال نہ پوچھ کیونکہ جو گناہ نہیں ہو سکے ان کی یاد آجاتی ہے اور حسرت رہ جاتی ہے۔ بات انوکھی تو سہی لیکن بالکل سچی ہے۔ انسان کو جب ان چیزوں کی یاد آتی ہے جو اس سے سرزد ہوئیں تو جو مواقع اس نے کھو دیئے ہیں ان کی حسرت رہ جاتی ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے جس سے کسی کو مفر نہیں۔ غالب جو کہ رازِ حیات پر ہمیشہ نظر ڈالتا ہے سب کچھ کہہ دیتا ہے جو اوروں سے نہیں بنتا۔ اسی مضمون کو حضرت داغؔ یوں فرماتے ہیں؎

میں گنہگار نہ ہوتا جو الٰہی مجھ کو
ہر برس نامۂ اعمال دکھایا جاتا

(۹) مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

بظاہر اس شعر کا یہ مطلب معلوم ہوتا ہے کہ میں بیکس تھا مفلس تھا اس لئے جو وطن سے دور مرا تو اچھا ہوا کیونکہ میری حالت چھپی رہ گئی۔ لیکن اصل میں شاعر کا مطلب اور مقصد اہلِ وطن کی شکایت ہے کہ انہوں نے میری قدر نہ کی۔ اس تخیل کو بالکل نئے طریقہ سے ظاہر کیا ہے۔ اور اس طرزِ بیان نے اس کیفیت کی تصویر کھینچ دی ہے جو ایسی بے بسی اور بے قدری میں ہوتی ہے۔ اوروں شعراء نے اس مضمون پر خیال آرائیاں کی ہیں۔ لیکن وہ یہ فطری کیفیت پیدا نہیں کر سکے۔ آتشؔ کا شعر ہے؎

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر
ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

مولانا حالیؔ فرماتے ہیں؎

رونے والے نہ تھے غربت کی اجل پر نہ سہی
ہنسنے والا تو وہاں کوئی دلِ زار نہ تھا

(۱۰) غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ علاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ انسان کا وجود ہی آنے کے بعد سے مرگ تک مبتلائے غم رہنا ایک فطری امر ہے اور جس طرح شمع شام سے صبح تک جلتی رہتی ہے ٹھیک وہی حالت انسان کی ہے۔ اس شعر میں فطری حالت کو ایک قابل قبول تشبیہ کے ذریعے سے قابل بنا دیا ہے کہ دل میں جگہ ہو جائے۔

---

(۱۱) مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

مطلب اس شعر کا یہ ہے کہ جس طرح دہقانی اپنا کھلیان جمع کر کے بجلی کو موقع دیتا ہے کہ وہ اس پر گرے۔ اسی طرح ہم میں جبلّتاً ایسی چیزیں پائی جاتی ہیں جو ہماری خرابی کا باعث ہیں یا دوسرے الفاظ میں انسان فنا ہونے والے عنصروں سے بنا ہے اس لئے ضرور فنا ہوگا۔ انسان کے فنا ہونے کا نقشہ اس سے بہتر کون کھینچ سکتا ہے۔

---

(۱۲) نفس موجِ محیطِ بیخودی ہے
تغافل ہائے ساقی کا گلا کیا

اس شعر میں شاعر نے دنیا سے اپنی بے تعلقی کا اظہار کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس شخص کو دنیا کی کوئی خوشی نہ ہو اُسے دنیا کی بیوفائی کا غم کیا۔

(۱۳) عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا
درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

قطرہ جب دریا میں مل جاتا ہے تو بظاہر فنا ہو جاتا ہے کیونکہ پھر اس کو قطرے کے نام سے کوئی نہیں پکار سکتا۔ مگر یہ فنا دراصل اس کی بقا کا موجب ہے کیونکہ ظاہر ہے بالکل علیحدہ رہ کر وہ مٹ جاتا اور اب دریا میں مل کر وہ مٹ نہیں سکتا۔ صرف اس کا نام تبدیل ہو گیا ہے۔ اسی طرح جب درد حد سے بڑھ جاتا ہے تو بظاہر فنا کر دیتا ہے مگر دراصل وہ درد کی دوا ہو جاتا ہے۔ اور فنا کر کے عالم بقا میں پہنچا دیتا ہے۔

مرنا تو سبھی کو ہے۔ لیکن انسان موت کے تخیل سے ڈرتا ہے اور بھاگتا ہے شاعر اس تخیل کو دور کرنا چاہتا ہے اور بتاتا ہے کہ فنا مقصد اصلی کا حصول ہے۔ اس شعر سے یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ موت اگر سامنے ہو اور یہ شعر پڑھا جائے تو بجائے قنوطیت کے ایک رجائی کیفیت پیدا ہو جائیگی۔

کوثر لکھنوی نے بھی اس خیال کو ادا کرنا چاہا ہے مگر وہ اثر نہیں پیدا ہوا۔

آخر غمِ فراق ہی راحت فزا ہوا
جب درد بڑھ گیا تو وہی اک دوا ہوا

(۱۴) رونق ہستی ہے عشق [illegible]
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

یعنی تمام دنیا میں جو کچھ ہے وہ عشق و محبت کے طفیل سے ہے۔ عشق و محبت سے یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ کسی معشوق مجازی کی محبت ہے بلکہ زن و فرزند، مال و دولت، ملک و ملت سب پر حاوی ہے۔ شاعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر خرمن میں برق یعنی دل میں محبت نہیں تو اس کی مثال اس مجلس کی ہے جس میں شمع نہیں ہے۔

---

(۱۵) قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

مطلب یہ ہے کہ منصور کا ظرف چھوٹا تھا اس لئے چھلک پڑا۔ بلند پایہ انسان جب کسی رفعت کو پہنچے تو اس کو یہ نہیں چاہیئے کہ وہ جوش میں اپنے کو بھول جائے اور کم ظرفی دکھانے لگے۔ "ایاز قدر خود بشناس" کیسے اثر پذیر طریقے سے غالب نے ایک ضروری سبق دیا ہے۔

---

(۱۶) قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونوں ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

زندگی کا فلسفہ اس سے بہتر کیا بیان کیا جا سکتا ہے۔

غالب عشق و درد، تڑپ، غم، سوز و گداز کو بھی ہمیشہ نئے پیرائے میں پیش کرتا ہے اور ایسے پیرائے میں کہ جو بالکل فطری معلوم ہوتا ہے اور جس سے اثر ہونا لازمی ہے۔

---

(۱۷) دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں
روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں
دیر نہیں، حرم نہیں، در نہیں، آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگذر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں
جب وہ جمالِ دل فروز صورتِ مہرِ نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردہ میں منہ چھپائے کیوں

غالب کے اشعار رازِ حیات کی ایسی تصویریں ہیں کہ روزمرہ کی زندگی میں ہر پہلو سے مفید ہیں۔ غم ہو تو غم کاٹیں۔ خوشی ہو تو اس میں اور اضافہ کر دیں۔ مشکل ہو تو اس کے حل کرنے کی صورت بن جائیں۔

پیچیدہ ہے کہ اس کے اکثر اشعار زبان زد خاص و عام ہیں۔ اور ضرب المثل کا کام دیتے ہیں۔ مثلاً

(۱) رنج کا خوگر ہوا انسان تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

(۲) عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

(۳) تھا زندگی میں موت کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

(۴) آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(۵) مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاہیئے

(۶) مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیئے

(۷) ملتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھکر

(۸) منحصر مرنے پہ ہو جس کی اُمید
نا اُمیدی اُس کی دیکھا چاہیئے

غالب کے کلام میں بیشتر مصرعے اور شعر ایسے ملیں گے جو حیات کے مختلف پہلوؤں کے مضامین کے لئے سرورق بن سکتے ہیں۔ یعنی اتنا بولتا ہوا کلام ہے کہ وہ موضوعِ متعلق کی تصویر کھینچ دیتا ہے۔ میرے ایک دوست ایک دیوان کا مقدمہ لکھ رہے تھے۔ کہنے لگے زبان اچھی ہے۔ ردیف قافیہ سے اچھا کام لیا ہے۔ لیکن غضب ہے پورا دیوان پڑھ گیا اور میرے مقدمہ کے سرورق کے لئے ایک مصرعہ نہ ملا۔

غالب پر یہ اعتراض ہے کہ اس کی زبان ثقیل ہے۔ بیشک غالب نازبان تیرکا نہیں۔ میر صرف سوز و گداز اور درد و غم کے دریا کا ماہر شناور تھا۔ مگر غالب پیامِ عمل لیکر آیا۔ جہاں ضرورت ہو وہاں سوز و گداز کا اظہار کرتا ہے۔ لیکن وہ انسان کو حقیقت آشنا بنانا چاہتا ہے۔ اس لئے اس کے ساتھ بلند خیال و عالی فلسفہ پیش کرتا ہے۔ اس کے لئے وہی زبان چاہیئے جو غالب کی ہے سہل الالفاظ خیالات کو ادا نہیں کر سکتے۔ ایسے ہی تنگنائیوں سے بچنے کیلئے اقبال نے فارسی زبان کی تحت میں پناہ لی۔ اپنے خیالات کے اظہار کیلئے غالب کو نئے محاورے تلاش کرنے پڑے۔ جو اسکے وقت میں قبول نہ ہوئے مگر آج زبان کا زیور بنے ہوئے ہیں۔ ارتقائی کیفیت جتنی بلند ہوتی جائیگی ساتھ ہی جدید الفاظ تلاش کرنگی ایسے بغیر ارتقائی خیالات اور جذبات کسی طرح ادا ہو ہی سکتے ہیں۔ جیسے "مجھے موہ لیو گھنیاں دال سے دیا" "موہے نیناں اٹھسٹے" وغیرہ۔ مگر جب انسان ارتقائیت کے رتبہ پر پہنچنے لگیگا تو یہ انداز بیان کام نہیں دیگا۔ اور ایک وقت آئیگا کہ اس کو نیئر کی تلاش ہوگی اور تخیل کا دائرہ اور وسیع ہوگا تو یہ غالب کے زبان کے منکر نہیں۔ جو کام صوفیوں نے بڑے بڑے مضامین اور مثنوی وغیرہ سے لیا ہے وہ کام غالب اپنے مصرعوں سے لیتا ہے اور سارے مضمون کی کیفیت ایک دو مصرعے سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ وہ درسِ عمل جس کیلئے کتابیں لکھی گئی ہیں اور لکھی جاتی ہیں وہ غالب کے چند شعروں سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اور حاصل ہوتا ہے۔ وہ مناظرِ قدرت جن کے مشاہدے کی کیفیت صفحوں میں ادا نہ ہو غالب اس کو اس طرح ادا کرتا ہے گویا ہم خفی طور پر اس کیفیت سے متاثر ہوتے ہیں۔ دنیا کی کشاکش اکثر اوقات لاینحل معلوم ہوتی ہے لیکن غالب ہمیشہ ان کا حل پیش کرتا ہے۔ غرض غالب ایک ایسا فلسفی ہے جو رازِ حیات کی حقیقت کو خوب سمجھتا ہے اور اس کی ہما ہمی حیات میں ہمارا ہادی بن جاتا ہے۔ وہ شاعر ہے اس معنی میں نہیں کہ ردیف و قافیہ سے موضوع کلام مرتب کر لیتا ہے بلکہ اس معنی میں کہ وہ جذبات کی حقیقت کو سمجھتا ہے۔ اور وہ جانتا ہے کہ ان سے کیا کام لیا جاسکتا ہے۔ وہ ضمیر و ادراک کی قوت و طاقت کو پہچانتا ہے اور اس کو جلا دیتا ہے۔ غرض غالب اصلی معنی میں شاعر ہے۔ غالب کا مقابلہ کسی نے ٹینیسن سے کیا، کسی نے ورڈس ورتھ سے، کسی نے شیکسپیر و ملٹن سے، کسی نے گیٹے وغیرہ سے کیا ہے۔ میرے خیال میں غالب نے عمر خیام اور حافظ کے جام سے مے لی اور اس کا مزہ چکھا۔ رومی کا نغمہ سنا۔ کرشن کی بانسری سنی مختلف باغوں کی سیر کی۔ اور گل بوٹوں کا عرق چوسا اور مثل شہد کی مکھی کے ایک نرالا شہد تیار کیا جو نہایت خوشبودار اور نہایت شیریں ہے۔ اور لطافت میں اپنی نظیر آپ ہے۔ وہ جذبۂ دل ابھارنا چاہتا ہے۔ تو شبلی و حافظ کا تغزل پیش کرتا ہے۔ حیات کی گتھیوں کو سامنے لاکر حل بتانا چاہتا ہے تو گیٹے کے قالب میں نمودار ہوتا ہے۔ وجدان اور معرفت میں ڈوبتا ہے تو رومی سے سبق لیتا ہے مناظرِ قدرت کا سماں دکھاتا ہے تو ورڈس ورتھ روپ میں آجاتا ہے۔ درسِ عمل دینا چاہتا ہے تو سعدی اور جامی کی اخلاقی کشتیوں میں تیرتا ہے۔ مے سے مستفید ہونا چاہتا ہے تو عمر خیام کی طرح بے خودی پیدا کرتا ہے۔ غرض وہ ایک ہی وقت میں شاعر، فلسفی صوفی اور معلمِ اخلاق ہے۔

~~~~~~ ٭٭٭ ~~~~~~
~~~~~~

چکبست کی شاعری

از جناب عبداللطیف بی اے (علیگ)

پنڈت برج نرائن چکبست ۱۸۸۲ء میں بمقام فیض آباد پیدا ہوئے مگر ابتدائی تعلیم لکھنؤ میں پائی۔ ۱۹۰۵ء میں کیننگ کالج سے بی اے کی ڈگری حاصل کی۔ اور ۱۹۰۸ء میں قانون کا امتحان پاس کرکے وکالت شروع کی ۱۹۲۶ء میں انتقال فرمایا۔ مرزا کاظم حسین صاحب نے آپ ہی کے مصرعہ سے تاریخ نکالی۔

مصرعہ سے تاریخ ہے، ہمراہ عزا
موت کیا ہے انہیں اجزا کا پریشاں ہونا

چکبست کی پیدائش کے وقت غدر کا پچیسواں سال ختم ہو رہا تھا اور اسکے بعد کے تمام [illegible] ظاہر ہو رہے تھے۔ ایک طرف کچھ لوگوں میں اضمحلال اور بے حسی پیدا ہو رہی تھی تو دوسری طرف کچھ لوگوں کو اپنا تمدن اور مذہب خوف و خطر کے بھنور میں گرفتار نظر آرہا تھا۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو مغربی اثرات کو قوم کے حق میں زہر سمجھتے تھے دوسری طرف وہ لوگ تھے جو مغربی نہج فراست، تہذیب و تمدن کے آگے نہ صرف سرِ تسلیم خم کر چکے تھے بلکہ مہذب محکوم کی سی زندگی گذارنے کے لئے ان چیزوں کا اختیار کرنا ضروری سمجھتے تھے۔

اس موخرالذکر طبقہ کی نمائندگی سر سید احمد خاں نے کی۔ انہوں نے نہ صرف مسلمانوں بلکہ پورے ہندوستانیوں کی نظریہ زندگی میں ایک انقلاب رونما کر دیا۔ جس کا گہرا اثر سیاست اور مذہب دونوں پر پڑا۔

سیاسی اعتبار سے بھی یہ وقت اہم تھا مختلف جماعتیں و تحریکیں مثلاً کانگریس، لبرل اور Servants of India Society نہایت خلوص اور تندہی سے اپنا اپنا کام کر رہی تھیں۔ سیاسی تغیرات بڑی سرعت کے ساتھ ظہور پذیر ہو رہے تھے۔ بایں وجہ ہر ہندوستانی غلامانہ زندگی سے بیزار، آزادی کا خواستگار اور "بلبل گیتی" سے "آزان تازہ" کے پیدا ہونے کا نہایت سختی سے انتظار کر رہا تھا۔

[illegible] کا ماحول تھا جس کے تہذیب و تمدن [illegible] کشمیری لگ رہے تھے۔ اسی لئے چکبست نے [illegible] اپنایا تھا۔ لیکن بعد میں اصلاح و ترمیم کرکے اس کے [illegible] آنھوں نے اپنی زندگی میں داخل فرما لیا۔ چکبست کشمیری پنڈت تھے۔ اس لئے کشمیری پنڈتوں کی مشہور و معروف صفات مثلاً ذکاوت و ذہانت [illegible] بدرجہ اتم پائی جاتی تھیں۔

جن شخصیتوں سے چکبست متاثر یا مستفید ہوئے ان میں ڈاکٹر گوکھلے اور تلک کے علاوہ شعر و شاعری کی دنیا میں انیس، آتش و غالب ہیں۔ پنڈت بشن نرائن در کی انسانیت و اخلاق اور اخوت کے جذبوں سے بھی چکبست بہت متاثر ہوئے۔ وہ ان کے علم اور بلندیٔ نظر کے قائل تھے۔ چنانچہ ان کو گلشن علم و ادب کا چمن آرا اور مطلعِ دانش و بینش کا ستارہ کہکر پکارتے ہیں۔ تلک اور گوکھلے کی بے لوث زندگی اور قومی جانفشانی کو وہ بہت سراہتے ہیں۔ اور اس میدان میں وہ انہیں کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں۔

چکبست کی زندگی پر جن شعرائے متقدمین کا اثر پڑا ہے۔ ان میں تین خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ زبان کی صفائی۔ روزمرہ کا استعمال۔ بندش الفاظ و کلام میں کہیں کہیں شانِ استغنا ہمیں آتش کی یاد دلاتی ہے۔ علوئے تخیل، فلسفیانہ زاویۂ نگاہ۔ فارسی کی لطیف تراکیب غالب کی یاد تازہ کرتی ہے۔ کلام کی روانی، شوکتِ الفاظ سلاست و جوشِ بیان دیکھکر انیس کا رنگ یاد آجاتا ہے۔ لیکن ان تینوں میں سب سے گہرا اثر انیس کا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چکبست کے بعض بندوں کے اتار چڑھاؤ۔ رکھ رکھاؤ اور تراکیب الفاظ پر انیس کے بند کا دھوکا ہوتا ہے۔

چکبست کی شاعری کے تین دور کئے جا سکتے ہیں۔ پہلا دور ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۵ء تک۔ دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۱ء تک اور تیسرا دور ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۹ء تک۔

چکبست نے (بعض حضرات کا کہنا ہے) نو برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور سولہ برس کے عرصہ تک یعنی ۱۸۹۵ء تک وہ اچھے خاصے شاعروں میں شمار کئے جانے لگے تھے۔ یہ زمانہ ان کی طالب علمی کا تھا۔ اس دور کی چند غزلیں اور کُل آٹھ نظمیں ہمیں "صبح وطن" میں ملتی ہیں اور "مرقع عبرت" [illegible] سب سے اہم ہے کیونکہ اس نظم میں ان کے تمام مرکزی تصورات کھل کر [illegible] زمانہ تھا جب چکبست دسویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ اس نظم سے معلوم ہوتا ہے چکبست میں غیر معمولی صلاحیت قدرت نے ودیعت کی تھی اور [illegible]

[illegible] ترقی [illegible] تمام ترا نیس کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے [illegible] انیس کے مرثیوں کا شبہ ہوسکتا ہے۔ وہی جوش بیان، وہی طرز ادا، جو انیس کی نظموں کا طرۂ امتیاز ہے۔ یہاں بھی ہے لیکن مرثیے چلانے پر [illegible] کا اور دل جیل کا تذکرہ کیا ہے [illegible] دکھایا ہے۔ وہ دامن کہسار میں لالے کے پھول کھلاتے ہیں [illegible] کے نکلی ہوئی صدا بناتے ہیں۔ دل جیل کی کس [illegible] کی طرح چمکتا ہوا دکھاتے ہیں اور بہاروں سے مرت کے جھالے منجمد [illegible] بہاتے ہیں۔ اور اس کے بعد قوم کی ناگفتہ بہ حالت پر آنسو بہانے لگتے ہیں۔ کیونکہ ہندوؤں میں ان کو بصیرت اور جوانوں میں جوانمردی، ہمت، عزم، استقلال کی کمی نظر آتی ہے۔ لیکن وہ دیکھ کر بھی افسردہ نہیں کرتے بلکہ رو رو کر تڑپاتے اور آزادی [illegible] کے لئے تیار کرتے ہیں۔ اس کے حصول کی راہ میں مذہب انہیں روڑا معلوم ہوتا ہے۔ وہ مذہب کے خود غرض پجاریوں اور "پیران نکوکار" پر طنز کرتے ہیں اور ان کو "پیروی عہد کہن" اور "بیجا نمائش مذہب" سے منع کرتے ہیں۔ آخر میں سب کو "تنبیہ" کرتے ہیں جس میں وہ قوم کی غفلت، خیرہ گی، نشۂ دولت، معزولی، آئین شرافت اور دشمن اخلاق شریعت کو مہمل کہتے ہیں اور انسانوں کیلئے ایک معیار پیش کرتے ہیں۔ جس میں انسان سے انسان کی محبت داخوت بنیادی اصول ہے۔

اس دور کی دوسری قابل ذکر نظم "جلوۂ صبح" ہے۔ یہ بھی ۱۸۹۸ء میں لکھی گئی ہے۔ اس میں بھی اعلیٰ درجہ کی منظر کشی ملتی ہے۔ اس کے علاوہ "آب انگور" میں شراب کے اثرات اور اس کے برے نتائج کا ذکر نہایت عمدہ اور لطیف انداز میں کیا گیا ہے۔ انکا خیال ہے کہ مئے نوشی سے انسان کے دل میں انسان کی بھی محبت باقی نہیں رہتی ہے۔ وہ زاہد کے لئے اس کو گو رشک انگبیں سمجھتے ہیں لیکن مجھ کو یہ آب آتشیں سے کم نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس کا سرور خمار رنگ لاتا ہے۔ مگر ان کا نور انسان کے قلب کو خاک سیاہ کر دیتا ہے۔ یہی وہ شے ہے جو جیبوں میں آگ لگاتی، پردۂ عصمت کو چاک کراتی، شباب کو برباد کرتی اور آرزو و امنگ کو آخر پامال کرتی ہے۔ لہٰذا چکبست جن کے دل میں قومی درد اور محبت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ بارگاہ الٰہی میں دعا مانگتے ہیں کہ ع

کسی کے کول میں الٰہی نہ ہو ہولے شراب

اس دور میں قومی اور اصلاحی نظموں کے علاوہ دو نوحے بھی ملتے ہیں۔ ایک "راجہ گوکرن ناتھ کے" اور دوسرا "پنڈت بشن نرائن" کا۔ پہلا ۱۹۰۱ء میں دوسرا [illegible] میں لکھا گیا۔ ان میں سیرت نگاری اور ماتم دونوں ملتا ہے اور جہاں تک طرز بیان کا تعلق ہے یہ کافی مجرد اور محاکاتی رنگ لئے ہیں۔

زبان عموماً سادہ اور عام فہم ہے۔ اس لئے پُراثر بھی۔

اس دور میں چند غزلیات بھی ملتی ہیں۔ جن میں پیامی رنگ نہیں بلکہ حسن و عشق کا رنگ کار فرما ہے۔ وہی بے خودی، وہی ساغر و شباب، وہی حسن و ناز، وہی بلبل و قفس، وہی زاہد سے چھیڑ چھاڑ۔ ان غزلوں میں بھی ملتا ہے جو پرانی رنگ کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہے۔

چکبست کی شاعری کا دوسرا دور ۱۹۰۶ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور میں بہت کم نظمیں ہیں۔ اس لئے کہ اس زمانہ میں وہ نثر کی طرف متوجہ تھے لیکن اس دور کی نظموں میں احساس حب الوطنی کی پہلے سے زیادہ کارفرمائی ملتی ہے اس دور کی سب سے مشہور نظم "خاک ہند" ہے۔ جس میں چکبست کی وطن پرستی کا پوری طرح سے مظاہرہ ہوا ہے۔ یہاں ان کا اسٹائل بھی نکھرا ہوا اور پختہ معلوم ہوتا ہے۔ اس نظم میں تشبیہوں اور استعاروں اور تلمیحوں سے بہت کام لیا گیا ہے۔ وہ پہلے خاک ہند کی عظمت، سطوت اور زینت کو بیان کرتے ہیں۔ جس کی تاریخ کو بے نقاب کر کے موجودہ زبوں حالی کا رونا روتے ہیں۔ اور مادر وطن کو ایک لاش بے کفن کہہ کر اس مرکز انتہائی درد و کرب اور مصیبت و ابتذال کا سامان بخشتے ہیں۔ اور بالآخر مردہ طبیعتوں کی افسردگی مٹانے اور اس راکھ سے اٹھتے ہوئے شرارے دکھانے کی "صور حب قومی" سے التجا کرتے ہیں اور "مر کر بھی چاہتے ہیں خاک وطن کفن کو" کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ ان کی ایک غزل نما نظم "مذہب شاعرانہ" کے عنوان سے ملتی ہے۔ جس میں وہ اپنا نظریۂ زندگی یوں بیان کرتے ہیں :-

جس گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی
کعبہ ہے وہی اور وہی بت خانہ ہے میرا

اس دور میں ہمیں پختگی اور انفرادیت زیادہ ملتی ہے۔ فارسی تراکیب اعتدال کے ساتھ ہیں۔ سادگی اور شگفتگی بھی اپنی بہار دکھاتی ہے۔ الغرض اب شاعر پہلے سے بہتر شعر کہتا ہے۔

چکبست کی شاعری کا تیسرا اور آخری دور ۱۹۱۱ء سے شروع ہوتا ہے۔ اس دور کی شاعری ان کی شخصیت کی پوری طور پر ترجمان ہے۔ پہلے دور میں چکبست انیس کی تقلید کرتے معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے دور میں انیس کا رنگ چھوڑ کر اپنا ذاتی رنگ اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن تیسرے دور کی شاعری میں نہ صرف انفرادیت جلوہ فگن ہے بلکہ ایک خاص قسم کی پختگی اور بلند آہنگی بھی ملتی ہے۔ یہاں آ کر چکبست خالص ہندی بن جاتے ہیں۔ وہ ہر چیز کو ہندوستان کی روشنی میں دیکھتے اور دکھاتے ہیں۔ اہل ہند میں قوم کا سودا، وفا کا شوق اور خدمت کا جذبۂ پاک پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ اور قوم کی خدمت اور وطن کی آزادی ان کا

کے سامنے اُن کی شخصیت آجاتی ہے۔

نظموں کے علاوہ انہوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور ایسی غزلیں جس کو "حسرت صاحب" روحِ روانِ اُردو کہتے ہیں۔ "طبع خدا داد، ذہن فلسفہ دان" ذوقِ ادبی بلند، طبیعت حساس اور ملکۂ شعری بے حساب پایا تھا۔ شروع میں پرانی طرز پر چند غزلیں لکھیں۔ کیونکہ جس وقت انہوں نے لکھنؤ میں ہوش سنبھالا امیرؔ و داغؔ کا رنگ لکھنؤ پر چھایا ہوا تھا اور داغؔ کے صنم خانۂ عشق کی ہر غزل گو شاعر پرستش کرتا تھا۔ لیکن چکبست نے لکھنؤ کی فضا کے بجائے ملک کی عام فضا کا اثر لیا اور جلد ہی اس رسمی شاعری سے کنارہ کشی کی اور حالیؔ کے مشورے کے مطابق غزلوں میں وسعت پیدا کرنے کے لیے مضامین کو برتنا شروع کیا جن میں قومی، مذہبی اور اخلاقی قدروں کو مدِ نظر رکھا گیا تھا۔ اس طرح چکبست نے نظموں کی طرح اپنی غزلوں سے بھی صحیح شاعری اور بلند شاعری کا کام لیا۔ وہ اپنی غزلوں میں آزادی کا پیام بھی دیتے ہیں اور نظامِ حکومت کی تعریف بھی کرتے ہیں۔ فلسفۂ زندگی بتاتے اور اخلاق کی اہمیت بتاتے ہیں — وطنیت کی اشاعت اور مغربیت کی بُرائی کرتے ہیں۔ اور یہ سب اس طرح کہ سمجھو ان میں شعریت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے۔ زندگی کو "عناصر میں ظہورِ ترتیب" اور موت کو "انہیں اجزا کا پریشاں ہونا" کہہ کر زندگی کی تکمیل کیلئے اقبالؔ کی طرح وہ مردِ کامل کی پرستش کو اپنا دین اور "تمنائے وفا" میں مرنے کو اپنی آبرو سمجھتے ہیں۔ اقبالؔ کی سوزِ آرزو کی طرح دردِ اُلفت کو وہ ضروری قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ یہی زندگی میں برق و شرار کی تیزی و تمکنت پیدا کرتی ہے۔ اور پستی اور کم ہمتی سے ہم کو نجات دے کر بلند ہمت و بلند مرتبت کرتی ہے اور منزلِ مقصود تک ہمیں پہنچاتی ہے اسی سے ہم میں "پاسِ انسان" اور "خدمتِ انسان" کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ "خدمتِ انسان" کی سب سے احسن صورت انسان کو آزاد و خود مختار کرانا ہے اس کے لئے وہ "سر سے خون بہانے" پر بھی تیار ہوتے ہیں۔ اور یہیں سے اپنی بد اعمالی کی بنا پر اپنے کو گرفتارِ بلا پاکر "آزادی کا دیوانہ" بنانا چاہتے ہیں۔ دیوانگی میں پہلا سٹیج پریشانی اور مصیبت کا ہوتا ہے۔ اس میں ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ کیونکہ ؎

مصیبت میں بشر کے جوہرِ مردانہ کھلتے ہیں

جوہرِ مردانہ ذوق و شوق کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اور یہ جذبہ صدق و خلوص کی مدد سے ہر کام کو تکمیل تک پہنچاتا ہے۔ وہ دریا کو بھی اپنی پیاس بجھانے کیلئے پاس بلاتا ہے لیکن اس درجہ پہ پہنچ کر زعمِ خودی میں گریبان چاک نہیں کر لینا چاہیئے۔ بلکہ چکبست کے نزدیک ضبط کرنا احسن ہے۔ ورنہ شہرت تو سب سے زیادہ شیطان کو ملی ہے۔ ان کی غزلوں میں نوحہ گاں، شراب و شاہد کی عشوہ و ساز اور فلسفہ و اخلاق کا معیار بھی کچھ کم و بیش ملتا ہے۔

لیکن [illegible] شاعری اور [illegible] آگئی ہے کہ وہ تغزل کا ایک اچھا نمونہ بن گئی ہیں۔ [illegible] زیادہ نمایاں اثر آتش و غالب کا ہے ؎

جو بے خودی ہے وہ بے خودی کہ خودی کا دھوکا نہیں
یہ سرور ساغرِ مے نہیں یہ خمارِ خوابِ گراں نہیں
یہ حیات عالمِ خواب ہے نہ دعا ہے نہ ثواب ہے
وہی کفر و دیں میں خراب ہے جسے علمِ رازِ جہاں نہیں

چکبست کے یہاں شانِ تغزل کے علاوہ محاکات، حسنِ تخیل، جوشِ بیان اور جذبہ نگاری کی بھی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔ وہ صحیح الفاظ کے انتخاب پر قدرت رکھتے ہیں۔ اور ان کو بندش اور ترتیب اس طرح دیتے ہیں کہ شعر میں جان پڑ جاتی ہے۔

اِن خصوصیات اور تعلقات کو مدِ نظر رکھ کر چکبست کا درجہ جدید اُردو شاعری میں متعین کرنا نہایت آسان ہے۔ جدید شاعری سے مراد جدید خیالات کا جدید سانچوں میں پیش کرنا ہے۔ جس کی ابتدا کرنل ہالرائیڈ کی مدد سے آزاد نے کی۔ جس کی دکان کو حالی اور اسمٰعیل نے رنگ برنگ کے گل بوٹے بنا کر سنوارا اور سجایا۔ اس تحریک کی بنیاد لاہور میں پڑی۔ اس کا اثر دہلی اور علی گڑھ نے قبول کیا۔ مگر لکھنؤ کے شعرا اسی پرانی طرز کو زیب دہ سرمایۂ شاعری سمجھتے رہے۔ وہ نئی تحریک سے ذرا بھی متاثر نہ ہوتے اگر صفی لکھنوی ان میں قومی اور مذہبی رنگ اپنی شاعری کے ذریعہ پیش کرنا شروع نہ کرتے۔ اس میں شک نہیں کہ صفی کی شاعری محدود اور مخصوص طبقہ میں رُوح پھونک سکی۔ لیکن اس سے ان کی اوّلیت، اجتہاد اور خلوص میں فرق نہیں آسکتا۔ انہوں نے ساز پرانا ہی رکھا۔ لیکن اس سے آواز نئی پیدا کی۔ گو کہ وہ حالی کی آواز تھی نہ اقبال کی۔ چکبست کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے شاعری کے ایسے فرسودہ ماحول میں جہاں تصنع و آرائش اور زیبائش ہی سب کچھ تھا۔ صفی سے بہتر اور تیز تر آواز حبِ وطن کی خدمت کے لئے بلند کی۔ شاعری میں حب الوطنی کو انہوں نے کوٹ کوٹ کر بھرا اور آزادی کی تڑپ، ہوم رول کی تمنا، انسان کی محبت و عظمت کا راگ دلنشیں پیرایے میں گایا۔ صفی، حالی کی تحریک سے متاثر تھے۔ چکبست اس کے پُر زور حامی و مبلغ۔ صفی نے نئے سانچے نہ بنائے نہ استعمال کئے۔ چکبست نے دونوں میں انقلاب پیدا کیا۔ یہی نہیں بلکہ جہاں تک جدید قومی رنگ کو ایک خاص شاہراہ پر ڈالنے کا

لب یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں سیاسی رنگ غالب ہے چکبست کی اس دور کی شاعری کو ہم تین حصوں میں اس لحاظ سے تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) قومی و وطنی (۲) اصلاحی و مذہبی (۳) نوحے۔

پہلے حصے کے متعلق یہی تمام تر قومی اور وطنی نظمیں ملتی ہیں۔ "وطن کا راگ"۔ "خاک ہند"۔ "آوازۂ قوم" "ہم ہونگے عیش ہوگا اور ہوم رول ہوگا" میں قوم کی آزادی کے متعلق انہوں نے اپنے نظریہ کو بڑی خوبی اور شدت سے پیش کیا ہے۔

"آوازۂ قوم" ۱۹۱۶ء اور "وطن کا راگ" ۱۹۱۷ء میں۔ ان نظموں سے پتہ چلتا ہے کہ چکبست حریت کے دلدادہ تھے مگر تھے اعتدال پسند۔ وہ آزادی چاہتے تھے مگر "برطانیہ کا سایۂ سر پر" بھی قبول کرنے کو تیار تھے۔ وہ ہوم رول کو پائے بغیر چین لینا نہیں چاہتے تھے کیونکہ اُن کے نزدیک ہوم رول ہی سب کچھ ہے۔

طلب وطن ہے تو ہے ایمان ہے تو یہ ہے

ہوم رول کے بدلے جنت بھی لینے کو تیار نہیں۔

ان کے علاوہ "فریادِ قوم"۔ "قوم کے سورماؤں کو الوداع"۔ "نالۂ درد"۔ "مسز بسنٹ کی خدمت میں قوم کا پیغام" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "فریادِ قوم" میں انہوں نے جوشِ بیان کے ساتھ شعریت بھی پائی جاتی ہے۔ اور جذبات اور خیالات کے لحاظ سے حقیقتاً یہ قوم کا مرثیہ ہے۔ یہاں چکبست ہندو اور مسلمان دونوں کے زانوں علیل پر دیتے ہیں۔ اور ان کو ہمت و جرأت سے کام لینے کی ترغیب و تحریص کرتے ہیں۔ اسی طرح "قوم کے سورماؤں"۔ "نالۂ درد" میں وہ اپنے جذبات کا نہایت خلوص سے نہایت شاعرانہ انداز میں اظہار کرتے ہیں۔ "نالۂ درد" میں درد و تڑپ کے ساتھ مفکرانہ پختگی اور بلند نصب العین کی جھلک بھی نمایاں ہے۔

اس دور کی دوسری نظمیں اصلاحی و مذہبی ہیں جن میں "قومی مسدس" "کرشن کنھیا"۔ "رامائن کا ایک سین"۔ "سیر دہرہ دون"۔ "آصف الدولہ کا امام باڑہ" بھی شامل ہے۔ یہ سب نظمیں بیانیہ انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ان میں "رامائن کا ایک سین"۔ "سیر دہرہ دون"۔ "آصف الدولہ کا امام باڑہ"۔ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان نظموں کو پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ چکبست میں انتہا درجہ کی شعریت، نفاست مصوری و ذہانت تھی۔ وہ اُن فن کاروں میں سے تھے جو الفاظ کے سچے نگینے تلاش کرتے ہیں اور انہیں اپنی اپنی جگہ نہایت خوبی سے بٹھاتے ہیں۔ ان کے اشعار میں ترنم ہے خلوص ہے۔ اور اثر پذیری۔ کبھی کبھی نفسیاتی تحلیل و تجزیہ بھی وہ بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ اور یہ چیز ان کی سیرت نگاری میں چار چاند لگا دیتی ہے۔ "رامائن کا ایک سین" اُن معنی میں اُردو ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ "سیر دہرہ دون" میں اور "آصف الدولہ کا امام باڑہ" میں منظر کشی کی اچھی مثالیں ملتی ہیں۔

ان نظموں کے علاوہ اس دور کی باقی نظموں میں "دردِ دل" اور "نالۂ یاس" قابل ذکر ہیں۔ "پھول مالا عرف قوم کی لڑکیوں سے خطاب" ۱۹۱۶ء کی یادگار ہے جو ان کی بے راہ روی سے وہ نالاں تھے۔ وہ لڑکیوں سے خطاب کرتے وقت انہیں "مردوں کی ریاض عام" پر جانے سے منع کرتے ہیں۔ اور "وفا کی دیوی"، باحیا و باشرم بننے کی تلقین کرتے ہیں۔

"دردِ دل" میں چکبست کا اپنا انفرادی رنگ خاص طور پر نمایاں ہے۔ وہ مغرب کی نمائش سے بیزار اور مشرق کی کاہلی اور حیلہ سازی سے پریشان ہیں۔ اس کا علاج وہ انسانیت کی محبت میں پاتے ہیں۔ لہٰذا رہ رہ کر اس کا شعر نہایت دلپذیر انداز میں الاپنے لگتے ہیں۔ ساتھ ہی ان میں بلا کی روانی ہوتی ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر ان کی نظمیں خاص طور پر بلند پایہ کہی جا سکتی ہیں۔

اس دور کی ایک نظم "نالۂ یاس" ہے جس میں خیالات اور نظموں کے کسی قدر سیاست کی جھلک آگئی ہے۔ کیونکہ وہ اپنی امیدوں کی قوم کی غفلت شعاری اور لاپرواہی کی بنا پر "انہتا" دیکھ رہے تھے لیکن پھر بھی وہ بادِ بہاری کے پیغام پر چمن ہند کی آبیاری کیلئے اہل چمن کی آمد کی اُمید رکھتے ہیں۔

چکبست کی اس دور کی نظموں میں اُن کے نوحے خاص طور سے مشہور ہیں۔ چکبست انیس سے سب سے زیادہ متاثر و مستفید ہوئے تھے۔ انیس مرثیہ گو تھے۔ لہٰذا چکبست بھی مرثیوں میں ہی اپنی اصلی شکل و صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کے مرثیوں کی زبان سادہ، سلیس، شیریں اور لطیف ہے۔ کلام میں روانی، آمد اور ترنم ہے۔ مبالغہ سے پرہیز اور واقعیت و اصلیت کو زیادہ دخل ہے۔ استعارات اور تشبیہات نہایت لطیف و سنجیدہ ہیں۔ جذبات میں خلوص ہے لہٰذا کلام میں سوز و گداز اور تاثیر ملتی ہے۔ اور سیرت نگاری میں ان کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔

ہر شخص کا مرثیہ چند خصوصیات اور مردہ کی ذاتی صفات کا حامل ہے۔ یہ نہیں کہ رسمی باتیں ہوں۔ اصلی خوبیاں بیان کی گئی ہیں۔ اور مراتب کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ لہٰذا چکبست کا ہر مرثیہ مثالی ہونے کی بجائے شخصی اور انفرادی ہے۔ پنڈت بشن نرائن در کے حسن اخلاق، مروت، آدمیت، جذبۂ خیر انکساری و فروتنی کی وہ تعریف کرتے ہیں۔ گوپال کرشن گوکھلے کو "حبیب قوم" کہکر پکارتے ہیں کیونکہ وطن کو سنوارنے اور اسکے حسن و شباب کو بڑھانے اور اس میں انقلاب پیدا کرنے کا باعث وہی تھے۔ گنگا دھر تلک کی توصیف مرد میدان وفا، جسم وفا جان وفا کہکر ایک اور ہی انداز میں کرتے ہیں۔ کیونکہ اُن کی "ہستی فانی" نذرِ وطن ہوگئی تھی۔ اسی طرح چند اور حضرات کا بھی مرثیہ چکبست نے لکھا ہے۔ اور ان کی انفرادیت اور ذاتی صفات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ پڑھتے ہی آنکھوں

تعلق ہے۔ بغاوت کی اہمیت مسلّم ہے۔ وہ ایک ذہن سے بھر پور نئے
کو پیدا کرنا چاہتے اور اس کی اسی حیثیت سے پوجا کرتے ہیں۔ شخص کو
مرنے پر بھی اسی کا کفن چاہتے ہیں۔ اس لحاظ سے وہ اس دور اور
اس تحریک کے نہ صرف ترجمان بلکہ نمائندہ کہے جا سکتے ہیں۔ وہ فوقیت
کا شاعرانہ پیغام دے کر گئے۔ اپنی شاعری سے اس کی [illegible] کو اور
آخر تک نئے دور، نئی ساقی کی تلاش میں رہے۔ اپنے ان خیالات و
جذبات کو جس طرح انھوں نے پیش کیا [illegible]
تڑپ، گداز، خلوص اور حقیقت [illegible] اس کی [illegible]
نے بے جان لفظوں میں جان اور روح ڈال دی ہے [illegible]
اور اس طرح ان کی شاعری ہمارے گذشتہ قومی تحریک کا ایک حسین
ترجمہ ہے اور ایک پُر اثر پیغام! اور وہ خود جدید شاعری کا ایک عظیم
شاعر اور بلند پایہ نظم نگار۔

حجابِ جلوہ

از
جناب بیکس اکبرآبادی

اچانک وہ بالائے بام آگئی — مجھے سامنے پا کے گھبرا گئی
بچائی بہت مجھ سے لیکن نظر — بچاتے بچاتے بھی ٹکرا گئی
سنبھالی جو ساری ڈھلکتی ہوئی — تو رخسار پر زلف بل کھا گئی
ہر اک شے پہ ڈالی نظر بے سبب — مگر مجھ پہ۔ اور پھر بھی تڑپا گئی
ہر اک شے سے آخر نظر پھیر لی — ہر اک سمت الفت نظر آگئی
دکھاتی رہی غیریت اپنی شان — محبت ہر انداز پر چھا گئی
نگاہ محبت کی طالب تھی اور — نگاہ محبت کو ٹھکرا گئی
محبت کو تابِ توجہ نہیں — نظر پھیر کر دل کو سمجھا گئی
بہت طرح سنبھلی مجھے دیکھ کر — بہت طرح۔ آخر کو شرما گئی
میں دیکھا کیا یہ تو سب کچھ مگر — گئی اس ادا سے کہ تڑپا گئی
رلانے کو تھا مجھ کو میرا جنوں — تری وحشتوں پر ہنسی آگئی

تو ہی اب کوئی اور رستہ بتا
طبیعت محبت سے اکتا گئی

الحکم کی تلون مزاجیاں

(از جناب سید وزارت علی)

الحکم بنی فاطمیہ کا چھٹا خلیفہ تھا۔ جب مصر کے ایک قریہ میں اس کے والد العزیز کا انتقال ہوا تو وہ اس کے ہمراہ تھا۔ مورخ مقریزی لکھتا ہے کہ عزیز کی نعش ایک پالکی میں اونٹ پر مصر لائی گئی۔ مغرب کا وقت ہو گیا تھا۔ محمد ابن نعمان نے غسل دیا اور بوقت شب محل شاہی کے ایک کمرہ میں المعز کے پہلو میں تدفین عمل میں آئی۔ اس وقت الحکم کی عمر گیارہ سال کی تھی۔ بچپن ہی میں اس کے استاد برجوان نے اس میں متضاد صفتیں ملاحظہ کی تھیں۔ اس وجہ سے چھپاسہ کے نام سے خطاب کیا کرتا تھا۔ یہ خلیفہ بڑا تلون مزاج، خوش طبع منتقی اور فیاض تھا۔ مثل دیگر خلفائے بنی فاطمیہ کے فیاضی فضول خرچی کی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے بڑی مالی مشکلات کا سامنا رہتا تھا۔ ساتھ ہی اس خلیفہ کی داستان مظالم سے صفحات تاریخ رنگین ہیں جیسا کہ آگے بیان کیا جائیگا۔ سریر آرائے خلافت ہو کر سب سے پہلا جو حکم خلیفہ الحکم نے صادر کیا وہ یہ تھا کہ کوئی شخص اسے "ہمارا خداوند" "ہمارا آقا" کے الفاظ سے خطاب نہ کرے۔ بلکہ صرف "امیر المومنین" کہے۔

الحکم میں متعدد خصوصیات تھیں جو دیگر خلفائے بنی فاطمیہ میں نہیں پائی جاتیں۔ منجملہ ان کے ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ رات کو دن پر ترجیح دیتا تھا اس سے بعضوں کا خیال تھا کہ خلیفہ دیوانہ ہو گیا ہے۔ سارے کام رات کے وقت ہوتے تھے۔ دربار بھی رات کے وقت منعقد ہوتا تھا۔ حکم تھا کہ ساری رات چراغاں رہے تمام بازار اور دوکانیں کھلی رہیں۔ خلیفہ کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے دوکاندار رات کے وقت ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر روشنی کا انتظام کرتے تھے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ تمام شب قاہرہ اور فسطاط کے کوچہ و بازار روشنی سے جگمگاتے رہتے تھے۔ تفریح و سیر کی محفلیں گرم رہتی تھیں۔ چنانچہ مسلسل پانچ سال تک یہی عمل رہا۔

ابتدا میں الحکم بہت متحمل مزاج تھا۔ عیسائی اور مسلم رعایا اس سے خوش تھی۔ اور اس کی فیاضی کی وجہ سے تمام اہلکار و مصاحب بھی خوش تھے۔ اس کی سیر چشمی کی بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ لکھا ہے کہ جب جیش گورنر شام کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا ایک دستاویز لیکر خلیفہ کے حضور میں حاضر ہوا۔ یہ دراصل وصیت نامہ تھا جو اس کے والد نے بحق خلیفہ الحکم تحریر کیا تھا اور اس طرح پر بیٹوں کو اپنی جائداد میں حقوق سے محروم کر دیا تھا۔ جائداد کی مالیت دو لاکھ دینار تھی۔ وصیت نامہ کو پڑھکر خلیفہ نے ارشاد فرمایا "جاؤ یہ تمام تمہاری ہی ہے۔ امن و چین سے رہو اور مزے اڑاؤ۔"

دار الخلافہ قاہرہ میں شب کی رنگ رلیاں جن کا ذکر اوپر ہوا اہالیان مصر کی طبائع کے عین موافق تھیں۔ لیکن ان سے بہت سی خرابیاں رونما ہوئیں لہذا احکام صادر کئے گئے کہ لوگ شب کو گھروں سے باہر نہ نکلیں اور تمام بازار ہاٹ بند رہیں۔ لیکن خود خلیفہ مزید دو سال تک بدستور شب کو گشت لگاتا رہا۔

ایک روز الحکم کا "شہری حماموں" کے قریب سے گذر ہوا۔ شور و غوغا کی آواز آئی۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ مستورات شور مچا رہی ہیں۔ حکم دیا کہ دروازے اور دریچے اینٹیں چن کر بند کر دیئے جائیں اور مستورات کو بھوکوں مرنے دیا جائے۔

عورتوں کے لئے حکم تھا کہ گھروں سے باہر نہ نکلیں اور نہ دریچوں میں سے جھانکیں اور نہ حماموں میں جا کر غسل کریں۔ اس امر کی نگہداشت کے لئے خوجے اور سپاہیوں کے دستے شہر میں گشت لگاتے رہتے تھے اور جو مستورات تعمیل حکم سے گریز کرتی تھیں انہیں پکڑ کر دریائے نیل میں غرق کر دیا جاتا تھا۔ فاحشہ عورتوں کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک ہوتا تھا۔ ایک دفعہ خلیفہ کے حضور میں رپورٹ پیش ہوئی کہ چند ضعیف عورتیں جنکی گذر اوقات چرخا کاتنے اور بازار میں جا کر سوت بیچنے پر تھی اپنے گھروں میں بھوکوں سے مردہ پائی گئیں۔ اس پر احکام صادر ہوئے کہ جن دوکانداروں کا ایسی عورتوں سے لین دین ہے وہ خود ان کے مکانوں پر جا کر خرید و فروخت کریں۔ لیکن عورتیں اپنا چہرہ اور ہاتھ ان کو نہ دکھائیں۔

اس کے استاد برجوان نے اس کے مزاج کی خوب تشخیص کی تھی۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد خلیفہ نے گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے شروع کئے۔ اب مذہب کا جنون سر پر سوار ہوا۔ یہ خلیفہ مذہباً شیعی تھا گویا تمام خلفائے بنی فاطمیہ شیعی مذہب رکھتے تھے۔ نماز کے اوقات بدل دیئے گئے۔ "صلوۃ الضحیٰ" کی ممانعت کر دی گئی۔ لوگوں کے مذہب میں مداخلت شروع کی۔ اور انہیں زبردستی "شیعہ" بنانا شروع کیا۔ پھر ایک حکم جاری ہوا کہ لوگ اسمٰعیلی مذہب اختیار کریں

اور اس مطلب کے لئے ہفتہ میں دو دن مقرر کئے گئے۔ مورخ مقریزی لکھتا ہے کہ ایک موقعہ پر تبدیلی مذہب کے لئے اس قدر لوگ جمع ہوئے کہ بہت سے آدمی مجمع میں دب کر مر گئے۔

جب ابو نجاح نے جو کہ گریک چرچ کا ایک رکن تھا تبدیلی مذہب کرنے سے انکار کیا تو اس کے ہزار درّے لگوائے حتیٰ کہ وہ جاں بحق ہو گیا۔ ایک دفعہ جب شہر میں یہ افواہ مشہور ہوئی کہ خلیفہ لکڑیوں کا بڑا انبار جمع کر رہا ہے اور اس میں حکم عدولی کرنے والوں کو جھونکا جائیگا۔ تو لوگوں کی ایک کثیر جماعت خلیفہ کے محل کے سامنے جمع ہو کر معافی کی خواستگار ہوئی۔ خلیفہ نے سب کو معاف کر دیا۔

اب چند تقدّس کی مثالیں لو۔

خلیفہ الحکم نے دو عالیشان مسجدیں تعمیر کرائیں۔ باب الفتوح کے متصل جو مسجد بنائی گئی اس کی تعمیر دراصل اس کے والد خلیفہ العزیز کے دور میں شروع ہو گئی تھی۔ لیکن چونکہ الحکم کے زمانہ میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ اس لئے یہ "جامع حکم" کے نام سے مشہور ہوئی۔ شہر قاہرہ میں یہ دوسری جامع مسجد تھی۔

خلیفہ الحکم نے "جامع راشدہ" کو بھی از سر نو بڑے اہتمام سے تعمیر کرایا۔ اور بہت سے فرش، پردے اور جھاڑ و فانوس تحفۃً دیئے۔

ایک دفعہ ماہ رمضان میں "جامع قدیم" واقع فسطاط کیلئے ایک عالیشان جھاڑ گاجے باجے اور تہلیل و تکبیر کے نعروں کے ساتھ بھجوایا۔ جھاڑ مذکور کا وزن ایک لاکھ درہم تھا۔ اور اس کے اندر بارہ سو شمعیں روشن ہوتی تھیں۔ نیز قرآن مجید کے ایک ہزار دو سو نوّے نسخے جن میں بعض مطلّا تھے۔ جامع مذکور کے لئے ہدیۃً پیش کئے۔

پھر دفعۃً طبیعت نے پلٹا کھایا۔ بہت سے عیسائی اور یہود اہلکار جو محکمۂ مال میں ملازم تھے یک لخت برخاست کر دیئے گئے۔ کئی وزرا یکے بعد دیگرے موقوف کئے اور تبرّہ بازی کا دور شروع ہوا۔ تمام کوچہ و بازار، سراؤں، دوکانوں وغیرہ پہ تبرّائی کتبے لکھوا دیئے گئے۔ استاد برجوان کو صاف کیا۔ قاضی القضاۃ حسین بن نعمان کو بلا وجہ برطرف کیا گیا۔ بعد ازاں قتل کروا دیا۔ اور نعش نذر آتش کی گئی۔ نیز اور بہت سے شہری تہ تیغ کئے گئے۔ جس سے عام بے چینی پھیل گئی۔

شہر کے کتوں پر بھی بلا نازل ہوئی۔ وجہ یہ تھی کہ ایک کتا خلیفہ کے گدھے پہ بھونک اٹھا تھا۔ اور بھی بہت سے احکام صادر ہوئے۔ یعنی یہ کہ کوئی شخص سوار ہو کر مصر کے بازاروں میں نہ پھرے۔ اور نہ پیدل محل شاہی کے قریب سے گذرے۔ حکم عدولی سزا موت سے کم نہ تھی۔ "Seary" کے مصنف

نصاریٰ اور یہود کو امتیازی لباس پہننے پر مجبور کیا گیا۔ حکم تھا کہ نصاریٰ سیاہ یا کالے نیلے رنگ کے لباس پہنیں۔ اور ایسے ہی رنگ کے عمامے باندھیں۔ اور یہود زرد رنگ کے۔ نصاریٰ کو تو اس بارہ میں چنداں اعتراض نہ تھا۔ چنانچہ قبطی نسل کے نصاریٰ آج تک کالے رنگ کے عمامے باندھتے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کو گھوڑوں پر سواری کی بھی ممانعت تھی۔ اور نہ انہیں دائیں ہاتھ میں انگوٹھیاں پہننے کی اجازت تھی۔ حکم تھا کہ کوئی لونڈی، غلام کسی نصاریٰ یا یہود کے ہاتھ فروخت کیا جائے۔ اب گرجاؤں کا حال سنو۔ تمام جائدادیں متعلقہ گرجا ضبط کر لی گئیں۔ اور ان کی اندوختہ دولت کے خزانے لوٹ لئے گئے۔ بہت سی صلیبیں جلوا دی گئیں۔ بیت المقدس کا عالیشان گرجا "القیامہ" مسمار کرا دیا گیا۔ نیز شہروں کے بہت سے گرجا گرا دیئے گئے۔ جس کی وجہ سے صلیبی جنگوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ نصاریٰ جشن ظہور مسیح، عید فصح، اور جشن صلیب بڑی دھوم دھام سے ہر سال دریائے نیل کے کناروں پر منایا کرتے تھے یہاں پر بہت سے کھیل کود ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ خلیفہ وقت ان تقریبوں میں بہ نفس نفیس شرکت کرتا تھا۔ لیکن یہ سب جشن حکماً بند کر دیئے گئے۔

خلیفہ الحکم کی تلون مزاجی مشہور تھی۔ جب اس قسم کی کمر دبات سے طبیعت سیر ہو گئی تو سابقہ تمام احکام یک لخت منسوخ کر دیئے گئے۔ تبرّہ بازی موقوف کر دی گئی۔ بلکہ تبرّہ باز سخت سزاؤں کے مستوجب قرار دیئے گئے۔ اور نماز اور اذان کے متعلق جو بدعتیں رائج تھیں ان پر بھی خط تنسیخ کھینچ دیا گیا۔ اب عیسائیوں کو گرجاؤں کی مرمت اور جدید تعمیر کی عام اجازت تھی۔ تمام منضبط جائدادیں متعلقہ گرجا واپس کر دی گئیں اور کسی کے مذہب سے کوئی پرخاش نہ تھی لباس وغیرہ کے متعلق تمام پابندیاں اٹھا لی گئیں۔

خلیفہ الحکم نے بہت سے دقیانوسی رواج توڑ ڈالے۔ ایک رواج مدت مدید سے یہ چلا آتا تھا کہ بادشاہ کے سامنے زمین بوسی کی جائے اور اس کے ہاتھ یا رکاب پر بوسہ دیا جائے۔ خلیفہ الحکم نے یہ دستور منسوخ کر دیا۔ کیونکہ اس سے دربار بازنطینی کی تقلید مقصود تھی۔

خلیفہ الحکم ماہ رمضان کا خاص احترام ملحوظ رکھتا تھا۔ چنانچہ ہر جمعہ کو "مسجد راشدہ" میں نماز کے لئے سادہ لباس میں ملبوس گدھے پر سوار ہو کر جایا کرتا تھا اور خود نماز پڑھاتا تھا۔ لباس میں ہر طرح کی آرائش سے محترز تھا۔ عمامہ بھی سادہ ہوتا تھا۔ کوئی سرونہ لگا ہوتا تھا۔ چھتری بھی سادہ سفید ہوتا تھا۔ حالانکہ معمولاً اس میں سنہری حاشیہ لگا ہوتا تھا۔ جلوس میں نہ مصاحب ہوتے تھے اور نہ

[illegible] اس کے آقا کے حق میں گئے۔ اس کے علاوہ یہ بھی مشہور ہے کہ بادشاہ نے نظام الملک کو محمد امین کی معرفت کچھ کہلا بھیجا تھا۔ قصہ مختصر نظام الملک اور سادات سے جنگ شروع ہو گئی۔ اور امیر الامراء سید حسین اپنے بھائی قطب الملک کو اپنا قائم مقام مقرر کرکے نظام الملک کو سزا دینے کے لئے دکن روانہ ہوا۔ اور بادشاہ کو بھی ہمراہ اپنے ساتھ لیا۔ راستے میں ابھی فتح پور سے ۳۵ کوس پر مقام تھا کہ اعتماد الدولہ محمد امین خاں نے میر حیدر قلی خاں کاشغری کو جو قوم چغتا کا نہایت شجاع اور بے باک شخص تھا اور اس وقت میر شمشیر تھا کا نشانہ امیر الامراء بادشاہ کو محلسرا تک پہنچا کر واپس اپنے قیام گاہ پر جو ایک کوس تھا پالکی میں جا رہا تھا کہ حیدر قلی خاں نے ایک عرضی پیش کی اور پالکی کے ساتھ ساتھ عرض حال کرتا ہوا چلتا رہا۔ جب امیر الامراء عرضی کے پڑھنے میں مصروف ہوا تو حیدر قلی خاں نے پیش قبض سے زخم کاری لگایا۔ امیر الامراء نے قاتل کے لات ماری اور خود پالکی سے نیچے گر گیا۔ اور ختم ہو گیا۔ بادشاہ نے حیدر قلی خاں کے منصب میں اضافہ فرما کر ہفت ہزاری و ہشت ہزار سوار کیا اور میر آتش کے عہدہ پر سرفراز کیا۔ اس کے بعد قطب الملک نے ایک شخص ابراہیم کو بادشاہ بنا کر محمد شاہ پر حملہ کر دیا۔ کئی دن تک جنگ کا میدان گرم رہا۔ توپ خانے میں حیدر قلی خاں کا اہتمام تھا۔ اس نے آتش باری کرکے ایسی آگ برسائی کہ دشمن پر عرصۂ نبرد تنگ ہو گیا۔ اس عرصہ میں چورامن جاٹ نے قطب الملک کی طرف سے عقب سے آکر بادشاہ کے خیموں کو لوٹ لیا۔ لشکر بادشاہی میں بدحواسی چھا گئی مگر حیدر قلی خاں، سعادت خاں اور محمد خاں بنگش نے خوب خوب تلوار کے ہاتھ دکھائے۔ قطب الملک حیدر قلی خاں کے مقابل آیا۔ اس کا بھائی نجم الدین علی خاں بھی اس کے ساتھ تھا۔ دیر تک مقابلہ ہوتا رہا۔ قطب الملک کی پیشانی پر اور ہاتھ پر زخم لگا اور حیدر قلی خاں کے ہاتھ اسیر ہوا۔ حیدر قلی خاں نے نہایت ادب و احترام سے ہاتھی پر سوار کرکے محمد شاہ کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ نہایت رحمدل تھا۔ مہربانی سے پیش آیا اور حیدر قلی خاں سے کہا کہ یہ تمہارا قیدی ہے اس کے ساتھ جو سلوک چاہو کرو۔ قطب الملک کے ہوا خواہوں نے بادشاہ پر حملہ کرنے کی کوشش کی۔ اس وجہ سے قطب الملک کو قتل کرنا پڑا۔ حیدر قلی خاں کو گجرات کی صوبیداری مع امینی و دیوانی و فوجداری عطا ہوئی۔ اور معز الدولہ کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔ اسی جنگ میں شیر افگن خاں نے بھی داد شجاعت دی تھی جس کے صلہ میں اس نے ملتان کی صوبیداری پائی اور عزت الدولہ کے خطاب سے مشرف ہوا۔ بلی ماران میں ایک محلہ بارہ دری شیر افگن خاں کے نام سے مشہور تھی۔ بارہ دری کے کھنڈر بھی باقی نہیں رہے شیر افگن خاں کی بارہ دری کے پاس ایک جگہ حویلی خان دوراں خاں کہلاتی ہے۔ خان دوراں خاں نام نہیں ہے بلکہ خطاب ہے اور مختلف زمانوں میں مختلف امراء کو ملتا رہا ہے اس لئے یہ معلوم کرنا مشکل ہے کہ یہ حویلی کس خاص شخص کی تھی۔ امیر الامراء یعنی وزیر اعظم کو بھی خان دوراں کا خطاب ملتا تھا۔ تو یہ ظاہر ہے کہ اس حویلی کا مالک اعلےٰ ترین امراء میں سے تھا اور اس کے کارنامے اس کے جلیل القدر عہدے کے لائق ہوں گے۔ چاندنی چوک میں حویلی حبش خاں کے بالمقابل ایک محلہ گھاسی رام کا کوچہ کہلاتا ہے۔ گھاسی رام کے متعلق ایک دلچسپ روایت مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ شاہی نجومی تھا۔ یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس بادشاہ کے زمانے میں۔ بہرحال بیان کیا جاتا ہے کہ ایک دن بادشاہ نے نجومی کو جھوٹا بنانے کے لئے اس سے پوچھا کہ اچھا اپنے علم کے زور سے بتاؤ کہ میں جو آج شکار کو جاؤں گا تو شہر کے کس دروازے سے نکلوں گا۔ نجومی نے سوچا کہ اگر میں نے شہر کے کسی دروازے کا نام لے دیا تو بادشاہ عمداً ادھر سے نہ گزرے گا۔ اور اگر نام نہ لیا تو بادشاہ اصرار کرے گا کہ دروازے کا نام بتاؤ۔ اس لئے نجومی نے عرض کی کہ جہاں پناہ مجھے اجازت دیں کہ میں اپنا جواب ایک کاغذ پر لکھ دوں۔ جب جہاں پناہ شکار سے واپس آجاویں تب میرا جواب کھول کر پڑھا جائے۔ بادشاہ راضی ہو گیا۔ نجومی نے کاغذ پر صرف یہ لکھ دیا کہ بادشاہ ایک نئے دروازے سے جائیں گے۔ بادشاہ نے نجومی کو جھٹلانے کیلئے ایک نیا دروازہ کھلوایا اور اس میں سے گزرا۔ اس دروازے کا نام کھڑکی فراشخانہ مشہور رہا۔ بادشاہ نے واپسی پر جب نجومی کا جواب پڑھا تو بہت حیران ہوا۔ اور نجومی کو ایک اراضی عطا کی۔ جہاں نجومی نے اپنی حویلی تعمیر کرائی جہاں اب ایک کوچہ بن گیا ہے۔ اگر یہ روایت صحیح ہے تو محققین کی رائے ہے کہ یہ واقعہ شاہجہاں بادشاہ کے زمانے ہی میں ہوا ہوگا۔ کیونکہ کھڑکی فراش خانہ کی تعمیر عہد شاہجہاں میں واقع ہوئی ہے۔

گھاسی رام کے کوچے سے فتحپوری مسجد کی طرف جاتے ہوئے کھاری باولی کو مڑتے ہوئے نکڑ پر ایک شاندار عمارت ہے جس میں اب ہوٹل ہے اس عمارت کے دو دروازے تھے۔ ایک چاندنی چوک کی طرف کھلتا تھا۔ اور دوسرا کھاری باؤلی کے سامنے۔ اس حویلی کے دو حصے تھے۔ ایک کچہری منشی بھوانی شنکر کے نام سے مشہور تھا۔ دوسرا حصہ حویلی بھوانی شنکر کہلاتا تھا۔ بھوانی شنکر ذات کا کھتری تھا۔ اور ریاست گوالیار میں بخشی کے عہدے پر ممتاز تھا۔ جب مرہٹوں نے دلی پر قبضہ کیا اس زمانے میں بھوانی شنکر مہاراج سیندھیا کی طرف سے دربار دلی میں وکیل تھا۔ لیکن اس نے سیندھیا کے خلاف انگریزوں سے ساز باز کی اور گوالیار سے علیحدہ ہو گیا۔ انگریزوں نے اس کو پنشن دیدی جو نسلاً بعد نسل اسکی اولاد کو ملتی رہی۔ لیکن اس کی یہ حرکت پبلک کو پسند نہ آئی اور وہ نمک حرام

کوئی گھوڑے سوار ہو یہ خیال آتا ہے کہ اپنے زمانہ کی سواری کے
کے کیا معنی ہیں ... کی سواری اس زمانہ میں معیوب نہ سمجھی جاتی تھی۔ یہ شفقت
چہرہ بھی ... مشہور ہے۔ خبریں آتے اور جاتے وقت وہ مظلوم
کو بھی خاص ... خواہ خلیفہ تک رسائی کا حق حاصل تھا۔

ایک دفعہ گھوڑے پر سوار بازاروں میں گشت کر رہا تھا۔ ایک ضعیفہ
نظر آئی۔ جس پر شک تھا کہ اس نے احکام کی یہ صریح نافرمانی کیوں؟ فوراً اسکے نزدیک
پہنچا۔ ضعیفہ کے ہاتھ میں ایک درخواست تھی۔ ایک نوکر کو حکم دیا کہ درخواست
ضعیفہ کے ہاتھ سے لے اور اسے گرفتار کرے۔ نوکر نے جب اس پر ہاتھ
ڈالا تو معلوم ہوا کہ وہ کاغذی پتلا تھا۔ اور درخواست میں خلیفہ کی ہمشیرہ کی پاکدامنی
کے خلاف کئی الزام درج تھے۔ مضمون درخواست کو پڑھکر خلیفہ بہت طیش
میں آیا اور محل میں پہنچ کر اپنی ہمشیرہ کو بہت سخت سست کہا۔ اس کی تہ میں کسی
دشمن کا ہاتھ معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ مورخین۔ نے اس کی ہمشیرہ کو نہایت شریف
اور پاکدامن لکھا ہے۔

خلیفہ الحکم نے اگلے روز اپنے زبردست عربوں، بربریوں، یونانیوں
اور حبشیوں کو شہر میں آزاد چھوڑ دیا اور حکم دیا کہ اسے لوٹ لیا جائے۔ یہ لوگ
مکانوں کے قفل توڑکر ان میں داخل ہوئے۔ عورتوں کی بے حرمتی کی۔ جو مقابلہ کو
نکلے انہیں تہ تیغ کیا۔ شریف خاندانوں کی دوشیزہ لڑکیوں کو اڑا کر لے گئے۔
اور فسطاط کا بڑا حصہ خاکستر کر ڈالا۔

خلیفہ الحکم روزانہ قبرستان قرافہ میں گھوڑے پر سوار ہو کر آتا تھا۔
اور اہل شہر کے مصائب سے ذرا متاثر نہ ہوتا تھا بلکہ نظر حقارت سے دیکھتا تھا۔
شہریوں نے بہت شور و غوغا مچایا۔ لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ چوتھے
روز شرفاء شہر قرآن ہاتھوں میں لئے مساجد میں جمع ہوئے اور امداد
خداوندی کے طالب۔ بالآخر بربر اور ترک محافظین کو ان کی حالت زار
پر رحم آیا۔ اور انہوں نے خلیفہ سے عام معافی حاصل کی۔ خلیفہ نے اس واقعہ پر
بہت کچھ اظہار تاسف کیا اور حکم دیا کہ قیدیوں کو فدیہ لیکر آزاد کرالیا جائے
اور روپیہ خزانہ عامرہ سے ادا کیا جائے۔ جب امن و چین ہوا تو معلوم ہوا کہ شہر
کا ایک تہائی حصہ جل کر خاکستر ہوگیا۔ اور نصف حصہ نذر غارت ہوگیا۔
مروی ہے کہ یہ خلیفہ اپنی ہمشیرہ کے ایماء سے قتل ہوا۔ اور اس نے ۲۵ سال
تک حکمرانی کی۔

خلیفہ الحکم معقولیت اور نامعقولیت کا مجسمہ تھا۔ اس کے بعض
افعال قابل ستائش تھے۔ اور بعض سخت قابل نفریں۔

تحریم شراب کے متعلق اس کے احکام بہت معقول اور سخت تھے۔
انگوروں کے ذخائر جہاں کہیں پائے جاتے تھے انہیں دریائے نیل میں پھنکوا دیا
جاتا تھا۔ یا کیچڑ میں ڈلوا کر بیلوں کے پیروں تلے روندوا دیا جاتا تھا۔ خشک
کشمشوں کی فروخت کی بھی ممانعت تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ خشک کشمشوں
سے بھرے ہوئے دو ہزار تین سو چالیس صندوق جلوا دیئے گئے۔ جن کی مالیت
پانچ سو دینار تھی۔ یہ بھی حکم تھا کہ تازہ انگور ایک وقت میں چار پونڈ سے زیادہ
بازار میں نہ فروخت کئے جائیں۔ روایت ہے کہ ایک سوداگر نے اپنا تمام اثاثہ
میوۂ ممنوعہ کی خرید میں لگا دیا تھا۔ بہ تعمیل احکام خلیفہ تمام مال ضبط ہو کر تلف
کردیا گیا۔ سوداگر نے قاضی کی عدالت میں استغاثہ بدیں مضمون دائر کیا کہ خلیفہ
الحکم کو بذریعہ سمن طلب کیا جائے اور جو نقصان کہ اسے خلیفہ کے اہلکاروں کے
فعل سے پہنچا ہے اس کی تلافی کی جائے۔ چنانچہ خلیفہ الحکم قاضی کی عدالت میں
جوابدہی الزام کے لئے حاضر ہوا۔ قاضی دیگر شہریوں کی طرح پیش آیا۔
سوداگر کی استدعا تھی کہ ایک ہزار دینار اسے بطور معاوضہ دلائے جائیں۔
الحکم نے پیروی کرتے ہوئے کہا کہ شراب بہ تعمیل احکام قرآنی ممنوع قرار دی گئی
ہے اور چونکہ مستغیث کا منشاء انگوروں سے شراب بنانے کا تھا۔ اس لئے
ان کی تلفی جائز طور پر عمل میں آئی ہے۔ لیکن اگر سوداگر حلفیہ یہ بیان دے کہ اس کا
منشاء شراب کشی کا نہ تھا تو وہ قیمت دینے کے لئے تیار ہے۔ سوداگر نے حلف
اٹھانے سے انکار کیا تاوقتیکہ خلیفہ اول عدالت میں رقم مذکور نہ داخل کرے۔
چنانچہ خلیفہ الحکم نے خزانہ سے رقم منگوائی اور سوداگر نے حلفیہ بیان دیا کہ انگور
کھانے کے لئے مقصود تھے نہ کہ شراب کشی کے لئے۔

قاضی نے رقم سوداگر کو دلوادی اور اس نے باقاعدہ رسید تحریر کر کے
خلیفہ کو دیدی۔ پھر سوداگر نے خلیفہ سے پروانہ راہداری کی درخواست کی اور
یہ بھی منظور کرلی گئی۔

زاں بعد قاضی نے کھڑے ہو کر خلیفہ کو تعظیماً سلامی دی۔ خلیفہ قاضی
کے اس فعل سے بہت خوش ہوا اور اسے بہت کچھ انعام دیا۔

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بنی فاطمیہ میں فضول خرچی درجہ عیب تک
پہنچی ہوئی تھی۔ اور الحکم بھی اس سے مستثنےٰ نہ تھا۔ اس کی داد و دہش سے خزانہ
عامرہ ہمیشہ خالی رہتا تھا۔ مزید برآں اس کے عہد خلافت میں بسا اوقات قحط سالی
کا دور دورہ رہا۔ غلہ از حد گراں قیمت پر فروخت ہوتا تھا۔ جس کی وجہ سے لوگوں
نے سخت مصائب برداشت کیں۔ ایک دفعہ شکایت گذری کہ غلہ فروشوں نے بہت
سا غلہ جمع کیا ہوا ہے۔ اس پر اعلان کیا گیا کہ جن لوگوں کے پاس غلہ کے انبار

لیں کے اور اسے گرفتار کر دیے جائیں گے۔ [illegible] موجود
جاکر تحقیقات فرمائی۔ لیکن کوئی خفیہ دروازہ یا مکانوں سے برآمد نہ ہوا۔
قحط کا زور دن بہ دن زیادہ [illegible] جاتا تھا۔ روزانہ دعائیں بھی مانگی جاتی تھیں
دو مرتبہ خلیفہ نے بذات خود شرکت فرمائی۔ لیکن سب غیر موثر ثابت ہوئیں
بالآخر خدا خدا کر کے قحط کی بلا ٹلی۔ لیکن خلیفہ کو کبھی چین و آرام سے بیٹھنا
نصیب نہ ہوا ہمیشہ بلوے اور فساد ہوتے رہے۔ دمشق، شام و حجاز حدود مصر
تک اتحاد و جنگ و جدل کی گرم بازاری تھی۔ لیکن یہ خلیفہ ہمت نہ ہارتا تھا۔
اور بالآخر غنیم پر غالب آ جاتا تھا۔ ایک زمانہ میں اس کی طاقت کا وہ زور تھا کہ
سلطان محمود غزنوی کو اطاعت قبول کرنے کے متعلق خطوط تحریر کئے۔ لیکن محمود
نے خطوں کے پرزے پرزے کر ڈالے اور ان پر تھوک دیا۔ صحابہ پر تبرہ بازی بھی
بے چینی کا بڑا باعث تھا۔ انجام کار اس کی موقوفی کیلئے احکام صادر ہوئے
حکم تھا کہ تبرائیوں کے جوتے لگائے جائیں اور شہر کے بازاروں میں تشہیر کی جائے
(ملاحظہ ہو مقریزی جلد دوم صفحہ ۲۰۶ و ابن خلدون جلد سوم صفحہ ۴۶۰)

اپنے آخیر دور خلافت میں یہ خلیفہ اسمٰعیلی فرقہ کے زیر اثر مدعی الوہیت
بن بیٹھا تھا۔ یہ بڑا منجم بھی تھا۔ شہر کے نجومی اس سے بہت خائف رہتے تھے۔
ایک دفعہ حکم دیا کہ تمام نجومیوں کو شہر بدر کر دیا جائے۔ نجومی قاضی شہر
کے حضور میں حاضر ہوئے اور تحریری اقرار نامے لکھ کر اپنے پیشے سے
تائب ہو گئے۔ تب انہیں شہر میں رہنے کی اجازت ملی۔ اسی قسم کے احکام
مغنیوں پر بھی عائد کئے گئے۔

اس خلیفہ کے قتل کی داستان بہت دردناک ہے قتل سے
ایک روز پہلے زائچے سے اسے معلوم ہو گیا تھا کہ آنے والی رات اس کے لئے
بہت خطرناک ہے۔ جب علامت موت نظر آئی تو تالیاں بجاتا ہوا بولا۔
اے منحوس ساعت! بالآخر تو آ ہی گئی

صبح کا وقت تھا۔ خلیفہ اپنے ایک غلام کی معیت میں وادی
المقطم میں سے گذر رہا تھا۔ اس کے دو قاتل یوسف بن دواس مصری کے
ایما سے وہیں چھپے گھات میں بیٹھے تھے۔ جوں ہی خلیفہ ان کے نزدیک آیا
وہ اس پر ٹوٹ پڑے۔ [illegible] "بدبختو! تم کیا چاہتے ہو؟"
[illegible] نے خلیفہ کے دونوں ہاتھ قلم کر ڈالے۔ پیٹ چیر کر انتڑیاں
نکال ڈالیں۔ اور نعش کو چادر میں لپیٹ کر یوسف کے پاس لے گئے۔
یوسف نے شہزادی کو اطلاع دی۔ جس کے ایماء سے دراصل یہ
قتل عمل میں آیا تھا۔ قاتلوں کو انعام دے کر رخصت کیا گیا۔

[illegible]
نظارہ پیش کرتا ہے۔

عالم ربانی صوفی [illegible] حضرت مولانا مولوی [illegible]
محمد [illegible] صاحب خلیفہ [illegible] صاحب [illegible]
حضرت حاجی حافظ مولانا مولوی شاہ محمد عبدالرحیم صاحب
محدث [illegible]
۱۸ جنوری ۱۹۴۲ء مطابق [illegible] محرم ۱۳۶۱ھ کو بعمر
۷۳ سال رحلت فرما گئے۔

محمد انیس الرحمن مختیاری

تحقیقی مقالے

مرزا محمد تقی بیگ مائل دہلوی

(از جناب اطہر خالدی ایم۔ اے۔ ایل (راجستھان) جے پوری)

یہیں دہلی میں غدر سے برس دن اور سرچلیوں کے کوچہ میں مرزا مغل بیگ کے بچے کی بسم اللہ کا جلسہ تھا۔ دہلی کے شرفا اور قریب قریب چوٹی کے پڑھے لکھے شریک تھے۔ مرزا غالب بھی شریک تھے۔ رسم کے مطابق بسم اللہ بچہ کو پڑھائی گئی مہمان شیرینی لیکر بچہ کو پروان چڑھنے کی دعائیں دیکر چلے گئے۔ اس بچہ کا نام محمد تقی بیگ تھا۔ ہمایوں کے وقت میں ان کے بزرگ ایران سے آئے تھے۔ تیمور کی نسل سے تھے آپ بہت و ہی پیشہ کرتے تھے یعنی فوج میں کوئی عہدہ تھا۔ دہلی میں ان کا مکان جامع مسجد کے عقب میں مٹیا محل میں تھا۔ مغل بیگ کا اچھا کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ وہ خود بادشاہ کے درباریوں میں تھے۔ مگر غدر میں بڑی تنگی سے دن بسر کرنے لگے۔ تقی بیگ کو وہیں محلہ میں پڑھنے کو بٹھا دیا۔ ابھی تعلیم ادھوری ہی تھی کہ مغل بیگ چل بسے۔ اور تقی بیگ یتیم رہ گئے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں بنارس کے ایک شہزادہ خسرو مرزا کی لڑکی سے ان کی شادی ہوئی۔ نوکری کی بہتیری کوشش کی مگر کچھ نہیں بنی ۱۸۸۰ء میں گوالیار چلے گئے۔ وہاں بھی قسمت نے ساتھ نہیں دیا۔ تو جے پور چلے آئے۔ جے پور میں مہاراجہ رام سنگھ جی کا عہد تھا۔ دہلی تو اجڑ چکی تھی اور وہاں کے شرفا کو بگڑتے دیکھکر ان کے دل پہ خاص صدمہ تھا۔ جو کچھ جے پور تک آیا اسے آگے نہ بڑھنے دیا۔ نہ اپنے وطن لوٹنے دیا۔ اپنی ریاست کی حیثیت کے مطابق تنخواہ مقرر کر دی اور یہیں رکھ لیا۔ سچ پوچھیے تو لکھنؤ اور دہلی اجڑ کر بہت سے شہر آباد ہوئے۔ ان میں کچھ سپوتوں کی بستی یہ ایک جے پور بھی ہے۔

شاعروں میں انور۔ ظہیر۔ رونق۔ آگاہ۔ رازم۔ حسرت۔ زکی وغیرہ۔ عالموں میں مولوی رشید الدین۔ مولوی حکیم الدین۔ [illegible]۔ مولوی جلال الدین جالندھری وغیرہ میں [illegible] شعر سخن۔ [illegible] رہتے تھے۔ [illegible]

[illegible]

دستر خوان پر جمع ہو گئے۔

مرزا تقی بیگ ۱۸۸۱ء میں جے پور آئے اور لوگوں کے کہنے سے ۱۸۸۲ء میں ریاست میں نوکر ہو گئے۔ لیکن ان کے اخراجات کے زیادہ تر کفیل نواب احمد علی خاں صاحب رونق جاگیر دار ٹونک و جے پور تھے۔ جو خود ایک مشہور شاعر اور شاعر نواز رئیس تھے۔ جب خان بہادر مولوی احمد علی خاں صاحب فرخ آبادی ممبر کونسل ریاست ہوئے تو مرزا صاحب کے کمال شاعری سے واقف ہو کر آپ نے ان کو محکمہ میں فوجداری کا سر رشتہ دار کر دیا۔ ۱۹۲۵ء میں پنشن ہوئی آخر اٹھاسی برس کی عمر میں ۲ اکتوبر ۱۹۳۱ء کو جمعہ کے دن انتقال کیا۔

جے پور کے شاعروں میں ایک بوڑھا شخص صدر میں بیٹھا نظر آتا تھا۔ سب لوگ اس کی تعظیم کرتے تھے۔ جتنی اس کی تعظیم ہوتی تھی اتنا ہی وہ اور بھی کھچا جاتا تھا۔ یہ مرزا محمد تقی بیگ مائل تھے۔ اکہری ہڈی۔ چھریرا بدن۔ ذرا نکلتا سا قد۔ گندمی رنگ سفید اور کسی قدر بکھری ہوئی داڑھی۔ اونچی چوگوشیہ مخملی سرخ یا سبز مخمل کی ٹوپی۔ اچکن کبھی نہیں پہنی۔ گرمیوں میں سفید لٹھہ کا اور جاڑوں میں روئی کا انگرکھا ہمیشہ ململ کا ہاتھ کا سلا ہوا کرتہ سفید لٹھہ کا پاجامہ اور سادہ نری کا سلیم شاہی جوتہ پہنا۔ جب جاڑا زیادہ ہوتا تھا تو دھاریدار چادر اوڑھ لیتے تھے۔ گز بھر لٹھہ کا رومال کندھے پر رہتا تھا لیکن چلتے وقت جب کہ سفر ہوتی تھی تو ہاتھ میں لے لیتے تھے۔ اور تیز چلتے تھے۔ کیسی ہی دھوپ یا بارش ہو چھتری کبھی نہیں لگائی۔ غرضیکہ اس بیسویں صدی کے وسط میں سلطنت مغلیہ کے آخری شرفاء دہلی کا نمونہ تھے

ہمیشہ رہے نام اللہ کا

مرزا مائل نے چودہ برس کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا۔ پہلے جناب لمراؤ مرزا انور دہلوی کو غزل دکھلاتے تھے۔ مگر جب انور دماغی اختلال میں مبتلا ہو گئے تو حضرت مولانا سلیم الدین تسلیم کو دکھلاتے رہے۔ چنانچہ ان کے کلام میں زبان کی خوبیاں مرزا انور کا فیض ہیں۔ اور فنی پختگی کا اثر ہے۔ مولانا تسلیم کی اصلاح کا۔ مرزا صاحب کی تمام عمر شعر گوئی میں گذری۔ اکثر وہ اپنے مسودات کو دیوان کی صورت میں صاف کر لیا کرتے تھے۔ اس وقت مرزا صاحب کے شاگردوں کے پاس نو سو پندرہ غزلیں عاشقانہ اور ایک سو نعتیں و سلام وغیرہ ہیں۔ کل اشعار صرف اٹھارہ ہزار ہیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے تو سینکڑوں غزلیں ضائع ہو گئیں۔ بالوگ لے گئے۔ ان کا دیوان چھپنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ مرزا کی زبان کے تو کیا کہنے لیکن اسلوب بیان اس [illegible] کہ ان کے اشعار سنکر جیسکر زرا سا ہی شعر سے لگاؤ ہو مرزا لئے [illegible] ہے [illegible] شوخی تو ان کا خاص حصہ ہے۔

مولینا حسرت موہانی نے ان کے کلام پر جو رائے دی ہے ... بہت خیال کی خوبی، بندش کی مضبوطی ہر حیثیت سے مائل کا کلام اردو شاعری کا بہترین نمونہ ہے۔ لہٰذا آج دلی کے شاعروں میں ان سے اچھا کہنے والا کوئی شخص نہیں ہے۔

اب مائل کے دوسرے اشعار پڑھنے سے پہلے چند اشعار حمد کے ملاحظہ فرمایئے۔

مائل کوئی گناہ نہ رہ جائے دیکھنا — کام آپڑا ہے رحمت پروردگار سے

جنت میں مجھے بھیج کہ بخشش پہ کرو ناز — دوزخ میں تو مجھ جیسے گنہگار بہت ہیں

کس نے ابرِ رحمت کا بنایا ہے مجھے پردہ — حسرت تری دامانِ دعا دیکھ رہی ہیں

بت خانہ کے متعلق ارشاد ہوتا ہے ؎

زاہدوں کی حقیقتیں کہتیں — ان بتوں کو خدا بنایا تھا

نیت کے ساتھ ہوتے ہیں مائل تمام کام — ڈالی بنا بھی کعبہ کی بت خانہ بن گیا

دیکھنا حسنِ ازل بت پرستی دیکھنا — آج مائل کی خدائی ہوتے ہوتے رہ گئی

ہر چند سوزِ عشق کا لذت چشیدہ ہوں — میں درسِ بت سے کے خدا تک رسیدہ ہوں

خمریات ملاحظہ ہوں ؎

زاہد کو بادہ خواری کا چسکا لگا دیا — یہ کام عمر بھر میں ہوا ہے ثواب کا

ہے سبب بارانِ رحمت قہرِ واعظ پر نہیں — کوئی پتھر لگ گیا میخانہ کی بنیاد کا

قطرہ قطرہ کا ہے نصیب جدا — کوئی گوہر کوئی شراب ہوا

مائل نہیں تو رات کہیں رہ کے کاٹئے — مسجد میں جا پڑیں گے جو میخانہ بند ہے

گھبرا لیا ہے آمدِ فصلِ بہار نے — نکل پڑے ہیں طاق سے شیشے اتارتے

تیوری اسے کہتے ہیں کہ میخانہ سمجھ کر — واعظ نے لب مرگ بھی جرأت نہیں دیکھی

یہیں ختم کر دو خط کیجئے اور خمریات کی ... ہمہ گیری ملاحظہ کیجئے ؎

اتنا تو کم سے کم ہو بھلا میکدہ — وسعت ہے تیرے ... پیمانہ ... [illegible]

محاکات کا اعلیٰ نمونہ ملاحظہ کیجئے ؎

اچھی کہی ہے بات کسی خاکسار نے — وہ خاک ہی نہیں جو ... جسم [illegible]

نہ ترا ملنے کی ... لے توبہ — آج بازار میں انگور نظر آتے ہیں

نوبد کلام ملاحظہ کیجئے ؎

اللہ رے اہتمام تری بزمِ ناز کا — نالہ نہ جا سکا جہاں اہلِ نیاز کا

وہ بنکر فصلِ گل کا طرہ طرار رہتا ہے — کف ساقی میں جب تک ساغر شراب

حاذق الملک حکیم اجمل خاں صاحب مرزا کو "دلی کا آخری شاعر" کہتے تھے۔ ایک مرتبہ مرزا صاحب اُن کے ساتھ مسوری گئے تو حکیم صاحب نے مرزا مائل کا تعارف وہاں کے لوگوں سے انہیں الفاظ میں کرایا۔ مرزا صاحب کے اعزاز میں ایک مشاعرہ منعقد کیا گیا۔

مرزا صاحب نے ... کی ... ساقی طرف اشارہ کرتے طرح پر مطلع پڑھا ؎

جلوے صنم کدے میں وہ حسنِ بتاں کے ہیں — ہر اک سے پوچھتا ہوں یہ پتھر کہاں کے ہیں

تو ایک شور مچ گیا۔ بار بار پڑھوایا گیا۔ اور بے انتہا داد ملی۔ یہ شعر بھی ... کا ہے۔

دل سے حرم سے دیر سے ماسکے ہوا بھی اور — رستہ بہت سے کوچۂ جانِ جہاں کے ہیں

اتنے نشان سجدہ نہ پوچھو کہاں کے ہیں — کچھ ان کی رہگزر کے ہیں کچھ آستاں کے ہیں

لوگ یہ شعر سنکر سر دھنتے تھے۔ آہستہ آہستہ مائل کی وضع قطع کو دیکھتے اور ترددتا یہ دریافت کرنے کے لئے بے چین تھے کہ یہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ اتفاق دیکھئے کہ مقطع میں مائل سے اسی کیفیت کے جواب کا اظہار بھی ہوا ہے۔

مائل لئے ہوئے ہیں جو وضع قدیم کو
ہر ایک پوچھتا ہے یہ حضرت کہاں کے ہیں

دہرہ دون کی ایک صحبت میں کہتے ہیں ؎

میں نے تو دہرہ دون کو سرسبز کر دیا — موسیٰ تو کوہِ طور جلا کر چلے گئے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ اتفاق سے مرزا مائل دہلی تشریف لائے۔ مرزا صاحب کو علی برادر کے ساتھ وہیں دفتر ہمدرد میں چائے پر مدعو کیا۔ آپ جانتے ہیں ہمدرد اور کامریڈ کا دفتر جو چیلوں کے کوچہ میں تھا اپنی شان و جلالت کے لحاظ سے ٹرکی کے صدرِ اعظم کا دفتر معلوم ہوتا تھا۔ اتفاق سے کچھ احباب ذوق جمع ہو گئے تھے۔ اتفاقاً

کالج میں ... مشاعرہ ... پڑھتے تھے۔ ... پر مرزا آل
تشریف رکھتے تھے۔ مختلف روایات میں یہ بھی معلوم ہوا کہ مولانا محمد علی ... صاحب
صاحب مرحوم ... عاشق ہے پر یہیں مرزا صاحب کے ساتھ ہے۔ مولانا محمد علی
... کہ مرزا صاحب کی شخصیت کو شش نہیں ہیں۔ مرزا صاحب
... سامعین داد دیتے ہیں۔ لیکن جب مرزا صاحب نے
شعر پڑھا ۔

خیال آیا تھا ... جب ... کعبہ اُٹھی تھی ۔ کہ جھگڑے میں ... بہت گبرو مسلماں کو

تو محمد علی جھوم گئے اور بار بار فرمایا ارے یہ شعر آپ کا ہے اور اُٹھ کر بڑے احترام سے مرزا صاحب کو بیچ میں بٹھایا اور اب جو شعر سننے شروع کئے ہیں تو معلوم نہیں کتنی مرتبہ کو محبت شعر کے نذر کر گئے۔

شاعر کی ساری دنیا ہے مگر گھر میں نہیں رہتی اور گھر کی ملکہ یعنی بیوی ہمیشہ کھنچی رہتی ہو اور ایسے ہی یوں کہ گھر میں بچوں کی افراط، مہمانوں کا تانتا اور حال یہ کہ بٹوہ میں جھنجنی کوڑی بھی نہیں تو لا محالہ پڑتا ہے ایسی حالت میں کہ شعر میں قارون کے خزانے پر لات مارتے خدا کی دین کو نظر انداز کرتے چلے جاؤ تو تیا و نیک بخت کا دل جلے یا نہ جلے مرزا آل کی بی بی بڑی مصیبت تھی چنانچہ ایک بار اتنے تنگ ... فرمایا ؎

لڑتی ہے بات بات پر آفت سے کم نہیں
جورو اگر یہی ہے تو آنکھ کا دم نہیں

برگِ حنا

رابعہ پنہاں

(از محترمہ سیدہ انیس ناہید صاحبہ)

میری گذارش

"برگِ حنا" کی اولین قسط کی اشاعت کے بعد اس اثنا میں ملک کے طول و عرض سے جو خطوط مجھے وصول ہوئے ہیں ان کے پیش نظر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلہ میں چند باتیں عرض کر دوں۔ مجھے امید ہے کہ میری شاعر بہنیں ان سطور کو اسی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں گی جسکے ماتحت کہ یہ لکھی جا رہی ہیں۔

میری سب سے پہلی کوشش تو یہ ہے کہ زیر ترتیب تذکرہ بذاتِ خود اُردو زبان کے "ادبِ عالیہ" میں جگہ پا سکے۔ جسکے لئے یہ ضروری ہو جاتا ہے کہ کسی شاعرہ کو بھی اسکے "عورت" ہونے کی کوئی رعایت نہ دی جائے۔ میرا مطلب ہے کہ انکے کلام کا جائزہ لیتے وقت وہی معیار قائم رکھنا چاہیئے جو کسی بڑے سے بڑے شاعر کی شاعری پر رائے زنی کرتے ہوئے کسی اعلیٰ پایہ کے تبصرہ میں ہونا لازمی ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ محض شاعرات کا تذکرہ ہے لیکن یہ عصرِ حاضر کی ایک اہم ادبی دستاویز بھی ہوگی۔ اور میں ہر اعتبار سے اسکا اتنا بلند معیار رکھنا چاہتی ہوں کہ اُردو زبان آنے والا کوئی مبصر یا مورخ جب ہمارے ادب کی تاریخ قلمبند کرنے بیٹھے تو اس تذکرہ کو پوچ یا پست سمجھکر نظر انداز نہ کر سکے۔

اس تذکرہ کا امتیازی لیکن میرے واسطے نہایت نازک پہلو، شاعرات کے کلام پر تنقید کرنا ہے۔ اگرچہ کسی تبصرہ و بحث کے بغیر بھی محض ایک تذکرہ کی حیثیت سے یہ کتاب اپنی جگہ مکمل ہو سکتی ہی سے بھی کچھ زیادہ۔

تنقید ایک نازک ترین ذمہ داری ہے۔ مجھے اسکی اہمیت کا پورا احساس ہے اور میں تہہ دل سے کوشش کروں گی کہ تنقید میں تعصب یا محبت کے جذبات میرے قلم پر اثر انداز نہ ہونے پائیں۔ در حقیقت بے لاگ تنقید اور مخلصانہ تبصرہ کو میں اس تذکرہ کا بنیادی اصول اور امتیازی وصف دیکھنا چاہتی ہوں۔ خدا مجھے اسکی توفیق دے۔ آمین۔

لیکن تنقید آخر نقاد کے ذاتی تاثرات کے اظہار کا نام ہے لہذا بہت ممکن ہے کہ میری کسی رائے یا فیصلے سے کسی کو اختلاف ہو۔ "بہت ممکن" کے کیا معنی، ایسا ہونا یقینی و قدرتی ہے۔ میں اپنی ہر رائے کو درست منوانے پر اصرار بھی نہیں کرتی کیونکہ ہر انسان کا عرفان، ذوق اور وجدان نہ صرف الگ الگ ہو سکتا ہے۔ بلکہ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے۔ البتہ جس چیز کو میرا وجدان جس طرح سے محسوس کریگا، وہی تاثرات پوری دیانتداری کے ساتھ لکھ دینا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میری کوئی بات میری کسی بہن کو ناگوار گذرے۔ میں کیسے یقین دلاؤں کہ ایسی کوئی بات لکھتے ہوئے خود مجھے کتنا قلق ہوگا لیکن یہ ناگوار فرض چونکہ بہر نوع مجھے ادا کرنا ہے اس لئے میں شاعرات کی خدمت میں اپنی "مجبوریوں" کو بطور معذرت پیش کر دینا چاہتی ہوں۔ مگر جہاں کسی بھائی یا بہن کو مجھ سے اختلاف ہو یا مجھے غلطی پر پائیں تو میں امید کرتی ہوں کہ وہ مجھے قائل کرنے کی کوشش کرینگے۔ میں اپنے نقادوں سے ہمیشہ فائدہ اُٹھانے کی جستجو میں رہتی ہوں۔ اور آپ مجھے اپنی غلطیوں کے اقرار میں کافی مستعد پائیں گے۔

ایک اور بات قابلِ گذارش یہ ہے کہ میری تنقید کا سارا انحصار اُسی کلام پر ہے جو شاعرات نے خود منتخب کر کے بھیجا ہے۔ اور یہ اکثر حالتوں میں نہایت ہی مختصر و محدود ہے۔ اس لئے بہت ممکن ہے کہ میری تنقید اُن کے جملہ کلام پر حاوی نہ ہو سکے۔ لیکن جو کلام میرے سامنے ہے وہ چونکہ شاعرات کا اپنا انتخاب کردہ ہے لہذا میں یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں کہ یہ اُن کی شاعری کی [illegible] بڑی خصوصیات اور [illegible] دار ہے۔ اور [illegible] خیال [illegible] اطمینان کیلئے [illegible] شاعرات سے [illegible]

شعر کے بغیر تقریباً سارا کلام میرے سامنے ہوگا۔ اور ان کے کلام پر تنقید بھی انہی کا نسبت کے ساتھ زیادہ وسیع ہوگی۔

میں سمجھتی ہوں کہ میری شاعر بہنوں کے احساس لوں نے بھی ان بھاری کو محسوس کر لیا ہوگا۔ جو ان سطور کے حسب ہی ہے ملک رہی ہے — دل و دماغ کا وہ عکس جس کا پورا اظہار الفاظ کے پیکر میں ہونا شاید کبھی ممکن نہیں۔

(ناہید)

حالاتِ زندگی

بنہاں رقمطراز ہیں ——— نام رابعہ تخلص پنہاں۔ وطن بریلی ——— بات حالاتِ زندگی ؟ تو ہندستانی عورتوں کے حالاتِ زندگی کیا ؟

عورتیں کیا ہند کی کار نمایاں کر گئیں
شادی ہوئی، بچے ہوئے، بیمار ہو کر مر گئیں

بہرحال، ابھی مرنے کی نوبت تو نہیں آئی۔ البتہ بیمار تو ایسی ایسی ہوئی ہوں کہ زندہ رہنا حیرت انگیز ہے ——— ۱۹۰۲ء میں بمقام سہارنپور پیدا ہوئی۔ بچپن کا زمانہ ابتدا میں کچھ دن میرٹھ میں گذرا۔ اس کے بعد الہ آباد آنا ہوا۔ یہاں بارہ، تیرہ سال گذرے تھے کہ قبلہ گرامی نے ۱۹۲۴ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد اپنے وطن بریلی رہنے کا اتفاق ہوا۔

۱۹۲۸ء میں شادی ہوئی اور جب سے سال گذشتہ (۱۹۴۲ء) تک مظفر نگر، امرتسر اور دہلی رہنا ہوا۔ گذشتہ سال پھر الہ آباد آنے کا سلسلہ ہوگیا

کچھ اور لکھنے سے پہلے یہ لکھ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آبا جان مولوی عبدالاحد صاحب مرحوم ایک خاص شخصیت کے مالک تھے۔ دیگر اوصاف کے ساتھ طبیعت کو علم و ادب سے بھی گہرا لگاؤ تھا۔ اُس وقت کی روش زمانہ کے خلاف آپ کو لڑکیوں کی تعلیم سے بھی ویسا ہی شغف تھا جیسا لڑکوں کی تعلیم سے ہوتا ہے۔ اور اگرچہ لڑکیاں۔ لڑکوں سے بڑی تھیں لیکن انہوں نے اس بارے میں خاص خیال رکھا۔ ہم لوگوں نے باقاعدہ سکول میں تو نہیں پڑھا۔ تاہم کچھ اپنا شوق تھا کچھ (مرحوم) کا فیضانِ طبیعت۔ چھ سات سال کی عمر میں قرآن شریف ختم کر کے تینوں زبانوں (اُردو فارسی انگریزی) میں کچھ نہ کچھ شدبد حاصل کر ہی لی۔

آبا جان مرحوم نہ شاعر تھے نہ ادیب۔ لیکن دل و دماغ شاعرانہ اور ادیبانہ تھا۔ نکتہ سنج اور نکتہ رس تھے۔ آپ کی رائے سند ہوتی تھی۔ اسی لئے ہمیں بھی مطالعہ و شعر سے فطری لگاؤ تھا اور لاتعداد اشعار ازبر تھے۔ مطالعہ کی کثرت سے کچھ عرصہ بعد خود لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اگرچہ نہ کوئی نمونہ تھا نہ اور گرد نگارش کا چرچا ——— ۱۹۱۸ء میں، میں نے اور آپا جان آمنہ عفت صاحبہ نے نثر نگاری شروع کی۔ کچھ دن بعد عزیزہ بلقیس جمال جن کی عمر اس وقت صرف دس سال کی تھی، بھی ہمارے ساتھ شامل ہوگئیں۔ آبا جان اس سے شوق سے بیحد خوش ہوئے اور اپنے دوستوں کو بھی اس خوشی میں شریک کیا۔ اصلاح خود فرماتے تھے لیکن لفظی ترمیم سے زیادہ کبھی تصحیح کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

۱۹۲۱ء میں، میں نے اور عزیزہ بلقیس جمال نے نظم کہنا شروع کیا۔ اگرچہ ہم دونوں کو عروض سے فنی لحاظ سے کوئی واقفیت نہ تھی۔ مگر کبھی عروض کی معمولی سی غلطی بھی بفضلہ تعالیٰ سرزد نہیں ہوئی۔ مجھے فارسی سے طبعاً اُنس ہے۔ اس لئے میری سب سے پہلی نظم ایک فارسی غزل تھی جسے بیحد پسند کیا گیا۔ اور اُس میں ایک آدھ لفظ کے علاوہ کوئی خاص اصلاح نہیں ہوئی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، آبا جان شاعر نہ تھے اس لئے ہماری منظوم چیزیں اپنے شاعر دوستوں کو دکھلا دیا کرتے تھے۔ اس نسوں میں بھی ہمیں یہ فخر حاصل ہے کہ کبھی لفظی تغیر و تبدل سے زیادہ ترمیم نہیں ہوئی۔

کچھ دنوں بعد اس اصلاح کا براہ راست تعلق جناب بھائی سید طالب علی صاحب قبلہ کی ذات سے وابستہ ہوگیا۔ بھائی صاحب موصوف نے جس فراخ دلی اور مہربانی کے ساتھ ہماری ہرزہ سرائیوں کو درست فرمایا وہ آپ ہی کا حصہ تھا ——— وقت بے وقت ہمارا دفتر اُن کے سر پر سوار ہو جاتا تھا۔ لیکن اُنہوں نے ہمیشہ بکمال خندہ پیشانی اصلاح دی۔ حتیٰ کہ ؎

زِ فیضِ چشمِ کرم ریزِ سید طالب
شدہ فرازِ سعادت بہ آسماں غالب

اور دو تین سال کے بعد موصوف نے تحریر فرما دیا کہ اب ضرورت نہیں ——— بہت کچھ لکھا ہے لیکن کسی چیز کو جمع نہیں کر سکی۔ سوائے اُن نظموں کے جو آبا جان مرحوم کی یاد سے وابستہ ہیں۔ ان کا مجموعہ "اشکِ خونیں" کے نام سے شائع ہوا ہے ——— اللہ تعالیٰ جنت آشیاں کے فیض روحانی اور استاذی المکرم طالب علی صاحب مدظلہ العالی کے لطفِ معنوی کو ہمیشہ رہبر و معاون رکھے۔ لیجئے یہ ہے میری ساری داستان ؎

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا

...قید کلام

مشق کے اعتبار سے پنہاں ہمارے ملک کی ان کہنہ مشق شاعرات میں
ر ہوتی ہیں جنکی تعداد ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔ شاید اس سے بھی کم
ہماری شاعرات کی صف اول کی ایک ممتاز رکن ہیں۔ ان کی پختہ گوئی اور کہنہ مشقی
کے کلام میں سے صاف جھلکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ بلکہ ان کی شاعری کی سب
بڑی خوبی ان کی پختہ کلامی ہے۔ ان کے کلام پر کسی استاد کے فرمودات کا
ان ہوتا ہے۔

لیکن فنی پختگی کے ساتھ ساتھ پنہاں کے کلام میں شگفتگی اور موسیقیت کا
دلآویز امتزاج جس سے شعر ایک خیال آفریں نغمہ بن جاتا ہے بہت کم
ہے۔ ان کی بیشتر شاعری سے ہمارا دماغ ضرور کسی قدر مستفید ہوتا ہے
لیکن ہمارا دل کبھی کبھی ہی لذت یاب ہوسکتا ہے۔ مثلاً ؎

مہماں ہنستا ہے لایا جائے گا زنداں میں آج
ت وہ مجنوں جس کے دم سے تھا بیابانِ جنوں

نازپروردہ تمہارا آج دنیا سے چلا
السلام اے شام حسرت اے بیابانِ جنوں

تم نظر بھر کر نہ دیکھو چشمِ یاسِ عشق کو
چبھ نہ جائے حسن کے سینے میں پیکانِ جنوں

جنبش اے پنہاں ہوئی مژگانِ قاتل کو کہیں
ہیبت پیکاں میں ہے خونِ شہیدانِ جنوں

جذب ہوجائیں نہ آنسو وقتِ اظہارِ الم
کچھ تو قطرے گفتگوئے نوکِ مژگاں میں رہیں

بے خبر اے دستِ وحشت دامن سی تار کی
آج حیرانِ جنوں بیٹھے ہیں کچھ بیکار سے

کیا ان میں دل و روح کو تڑپا دینے والا کوئی نشتر ہے؟ —
"جذب ہوجائیں نہ آنسو وقتِ اظہارِ الم" کی نفسیاتی کیفیت یقیناً ایک قابل

قدر چیز ہے۔ لیکن کیا اس خیال کے احساس سے [illegible]
کوئی لہر بھی پیدا ہوتی ہے؟ میں یہ نہیں کہتی کہ پنہاں [illegible] ایک شعر
ایسی توقع ہم شاید کسی عظیم سے عظیم شاعر سے بھی نہیں کرسکتے۔ ایسی توقع کرنا ہی
عبث ہے۔ لیکن ان ہر شعر میں قافیہ و ردیف کے علاوہ بھی کوئی نادر شاعرانہ
کوئی اچھوتی شیرینی موجود ہونی چاہیے۔ جو شعر کو ایک رنگین لطافت بخش دے
ایسی لطافت جو روح کے تہہ در تہہ پردوں میں لذت اور سرشاری کی ایک لہر
بناتی ہوئی چلی جائے۔ پنہاں کے یہاں یہ چیز کلیتہً مفقود نہیں لیکن کیا بے مقصود
ہے۔ وہ الفاظ کی صوتی لطافت اور موسیقیت کا اتنا التزام نہیں کرتیں۔

لیکن اس میں پنہاں کی فطری ذہانت و ذکاوت کا کوئی قصور نہیں۔
میں کہہ چکی ہوں کہ وہ عصرِ حاضر کی ممتاز ترین شاعرات میں سے ہیں۔ ان کی شاعری
ہمارے ادب کا ایک قیمتی ذخیرہ ہے۔ وہ ایک مستقل اندازِ سخن رکھتی ہیں۔ اور بعض
دوسری معاصرین کی طرح بہکی بہکی نہیں پھرتیں۔ یہ ان کی امتیازی خوبی ہے —
وہ اس کیلئے ہمارے ادب میں زندہ رہیں گی۔ وہ ادب میں اپنے لئے ایک مستقل
قیام پیدا کرچکی ہیں۔ مگر چونکہ ان کے شعور شاعرانہ نے ایک ایسے دور کے اندر آنکھ
کھولی۔ جواب تقریباً گذر چکا ہے۔ یا بڑی تیزی کے ساتھ گذرتا جارہا ہے۔
اس لئے ایسا ہونا قدرتی تھا۔ ادب ہمیشہ زندگی کے ساتھ بدلتا جاتا ہے۔
جو ادب ایک نکتہ پر آکر جم جائے اس میں وسعت و ندرت نہیں رہتی۔ وہ
مُردہ ہے۔

ادب کی بنیادی نوعیت کے ساتھ ہی اس کی ظاہری ہیئت میں بھی تھوڑی
بہت تبدیلی آجاتی ہے۔ بعض الفاظ، تراکیب، اسالیبِ بیان جو کسی وقت شعر کا
حُسن اور شاعری کی جان سمجھے جاتے تھے۔ بعد میں شعر کی ثقالت کی دلیل سمجھے
جانے لگتے ہیں۔ نگاہوں سے گر جاتے ہیں۔ گویا معنوی انقلاب رونما ہوتے ہیں
ہمارا وجدانِ شعری بھی متغیر ہوجاتا ہے۔ بلکہ ذاتی طور پر میں تو سمجھتی ہوں کہ معنوی
انقلاب اس وقت تک معرضِ ظہور میں نہیں آسکتا۔ جب تک کہ انسان کا تصورِ
حیات، شعورِ ادب اور وجدانِ شعر پہلے تغیر پذیر نہیں ہوسکتا۔

یہی وجہ ہے کہ جب ہم ان کے اشعار میں "خنجرِ ابرو" (ابرو کے خنجر
ابرو کی نورانی ادا) ایسی تراکیب دیکھتے ہیں تو ہماری سماعت، جو اب خوبصورت
اور پُرترنم شاعری کی عادی ہوچکی ہے، اس کی ناخوشگوار ثقالت کو محسوس کئے بغیر
نہیں رہ سکتی۔ پنہاں یوں بھی اکثر فارسی کی گرانبار و ثقیل ترکیبوں سے اپنے
کلام کو کچھ بوجھل بوجھل سا بنادیتی ہیں۔ مثلاً ؎

بہت ہی پست [illegible] چارہ گر کی سوزگی دش ہمارا سینہ [illegible]

ے ایڈیٹر کا مضمون نگار کی رائے سے متفق ہونا ضروری نہیں (نجمہ)

... ہے۔ دیکھئے ؎

ہر قطرۂ شبنم گل ریز کا گوہر طراز

ہر سبزہ میں نالش نگار دُرِّ شاہوار

... شاعری کے یہ رنگ جو میرے نزدیک بہتر رنگ ہے ــــ ہے

... گو بہت زیادہ نہیں ــــ لیکن جب وہ اس نے ہیں کوئی غم چھیڑتی

(غزل ...) تو شعر کے سانچے پکڑ ــــ اس کے شوشہ شوشہ میں ایک بیکراں

... ہے۔ سنئے ؎

...کی وہ آخری تبسم یاں دیکھا کئے   خون کے قطروں میں کچھ تبدیلیاں دیکھا کئے

... سے اماں وقتِ نزع آہ   مرنے والے یوں جو سوئے آسماں دیکھا کئے

...س بر باد ہستی کا ہوا ماتم یہاں   مضطرب ذرات خاکِ آشیاں دیکھا کئے

آہ کھینچی کس گرفتارِ قفس نے اس طرح

بجلیوں کی زد پہ صحنِ گلستاں دیکھا کئے

...کی نگاہیں آج بھی اس درجہ سرکش ہیں   نظامِ دو جہاں سے سرگراں معلوم ہوتی ہیں

... ہوا تھا قافلہ امید و ارماں کا   جہاں اب یاس کی سنسانیاں معلوم ہوتی ہیں

رہِ طلب میں ہیں جادہ پیما، نہ راہبر ہے نہ رہنما ہے

ہم اپنے قدموں سے نقشِ منزل بنا رہے ہیں مٹا رہے ہیں

...ز و ناز نامقبول دونوں   نہ سمجھی میں کہ ہے تیری رضا کیا

...ی جنبشِ مژگانِ کرم میں   نگاہِ آرزو نے کہہ دیا کیا

...ناز کی خوگر ہوں پنہاںؔ   خدا معلوم ہے رسمِ وفا کیا

...ی ہے تیرے عتاب کا رنگ   شیشۂ چشم میں شراب کا رنگ

...گیا آخر چراغِ شام بھی   اک یہی باقی مرا ہمراز تھا

...تک گونجی صدائے بازگشت   آخری نغمہ شکستِ ساز تھا

...راہِ طلب ہے مختصر   ایک ٹھوکر حاصلِ ہر گام ہے

... بادلے جذبۂ ناموسِ عشق   اک تجلی آج زیرِ بام ہے

ان اشعار میں سے اکثر گو خیال کے اعتبار سے قدیم ہیں لیکن الفاظ

کی ہم آہنگی اور اسلوبِ بیان کی گھلاوٹ کے لحاظ سے بہت حد تک جدید ہیں ــــ نظم میں بھی کہیں کہیں یہ رنگ جھلک اٹھتا ہے۔ اور اس خوبی کے ساتھ کہ داد نہیں دی جا سکتی ملاحظہ ہو ایک نظم "عشرتِ نو" کے چند اشعار پیش ہیں ؎

آل سکون مطمئن قلب فضا میں جلوہ زن   کیفیت یوں شام کی آفاق پر راحت فگن

ٹھنڈی ٹھنڈی سی ہوائیں صاف و روشن آسماں   کچھ شفق کی دامنِ مغرب میں رنگیں دھاریاں

ہلکا ہلکا سا تھا قطرہ شبنم گل ریز کا   سبزۂ رنگیں پہ موتی نے ڈھلکتے جا بجا

بند کلیاں دلربا انداز سے کھلتی ہوئی   نسیم گوں غنچوں سے بوئے زندگی ملتی ہوئی

پنہاںؔ نظم کو استعارہ و تشبیہ سے بھی اکثر مزین کرتی ہیں جو ہمیشہ لطیف و دل آویز ہوتی ہیں۔ ارشاد ہے ؎

کرن سورج کی برگِ گل میں ایسے جھلملاتی ہے

عروسِ ناز آئینہ میں جیسے مسکراتی ہے

جبینِ گل پہ افشاں شبنمِ گل ریز چنتی ہے

کہ تارِ زر سے سورج کی کرن زربفت بنتی ہے

صفائے آبِ جو ہے دیدنی دامانِ منظر میں   ستارے جھلملاتے ہیں مسلسل حوضِ کوثر میں

پنہاںؔ کا جس قدر کلام اس وقت میرے سامنے ہے اس کے مطالعہ سے ایک امر ایک رائے قائم کی جا سکتی ہے کہ پنہاںؔ کی شاعری قدیم و جدید رنگ کا ایک امتزاج ہے۔ وہ ایک لہراتی ہوئی ندی ہے جو اجاڑ بیابانوں اور بے رونق صحراؤں کو قطع کرتی ہوئی جنت نگاہ خیابانوں میں سے ہو کر بھی گذر جاتی ہے۔ اور جب وہ ان بہار آفریں سبزہ زاروں سے گذرتی ہے تو اس کے نغمات زیادہ لطیف، زیادہ پرکیف اور زیادہ پرخمار ہو جاتے ہیں۔ سنئے! ؎

دل نے کیا ہے تجھکو دو عالم سے انتخاب   اب حوصلہ ہو لغزشِ بے اختیار کا

نظروں میں تو ضبط کی منزل ہوئی تمام   آنسو نہ رک سکا نگہِ انتظار کا

پنہاںؔ نگاہِ یاس کی وہ آخری جھلک   بجھتا سا ایک شعلہ چراغِ مزار کا

عورت کے نازک و لطیف جذبات اور وہ نرم رو موسیقی جو صرف ایک عورت ہی کے دل سے ابھر سکتی ہے ــــ ان دونوں کے خمیر سے جو شعر تیار ہوگا وہ ... ہوگا ... بیجان پیکر نہیں، بلکہ کسی دوشیزہ کا دھڑکتا ہوا دل ہوگا۔ کاش پنہاںؔ یونہی دھن میں گاتی رہیں۔ (کلام کے متفرق نمونے کتاب میں شامل ہونگے)

کیا عورتیں مردوں کے دوش بدوش کام کرسکتی ہیں؟

(از محترمہ سلمیٰ رشید صدیقی)

عورتوں کے متعلق مردوں کی عام رائے یہ ہے کہ وہ ذہنی اعتبار سے مردوں کا مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ رائے بالکل غلط ہے۔ کیونکہ جس طرح مرد زندگی کے مسائل کو سلجھاتا اور بناتا ہے۔ اور جس طرح دیکھتا اور سمجھتا ہے اسی طرح عورت بھی تو ان مسائل کو بنا اور سنوار سکتی ہے یہ دوسری بات ہے کہ عورت کو یہ سب کچھ کرنے کا موقع نہیں دیا جاتا اور جب موقع نہیں دیا جاتا یا نہیں ملتا تو وہ آخر اپنی قابلیت کا اظہار کیونکر کرسکتی ہے۔ اگر عورت کو موقع دیا جائے تو وہ بڑی خوش اسلوبی سے پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل کو سلجھا سکتی ہے۔ اور بڑے سے بڑا کام انجام دے سکتی ہے۔ اور کون نہیں واقف جب بھی عورت کو روشن اور کھلی فضا اور تھوڑی سی بھی آزادی میسر آئی ہے تو اس نے کیا کیا کارہائے نمایاں انجام نہیں دیئے۔ اور پھر یہ چیز بھی نظر انداز کرنے کے قابل نہیں کہ اس نے یہ تمام کام اپنی ہمت قابلیت اور قوت کے بل پر انجام دیئے۔ تاریخ کی ورق گردانی کرنے پر ہمیں ہر جگہ عورت کی سچائی، محبت، دیانت اور فرض شناسی کے اعلیٰ نمونے ملیں گے۔ مرد کہتے ہیں کہ عورت کے ارادوں میں پختگی نہیں ہوتی۔ یعنی وہ کسی خاص ارادے کی پابند نہیں ہوتی اور اس کے ارادوں کو ایک لمحہ میں ہی ملیامیٹ کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ عورت جب کسی بات کا مضبوط ارادہ کرلیتی ہے تو اسکے سامنے کسی رکاوٹ کا خیال نہیں کرتی۔ اور دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی اس کے ارادے کو متزلزل نہیں کرسکتی۔ پھر یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ عورت کے ارادے کو ثبات نہیں۔

مجھے یقین ہے کہ عورت زندگی کے ہر شعبہ میں مردوں کے دوش بدوش رہ کر ہر کام کرسکتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ مردوں کے دوش بدوش کھڑا ہونا پسند نہیں کرتی۔ یہ چیز قابل قدر ہے۔ اور اس سے عورت کے فطری خلوص کا پتہ چلتا ہے۔ ہمیں عورت کے اس فطری خلوص کا احترام کرنا

[illegible]

پڑھی لکھی بھی ہے اور ذہنی و دماغی اعتبار سے بھی کسی طرح مردوں سے کم نہیں ہے لیکن وہ مردوں کے دوش بدوش رہنا اپنے لئے موزوں نہیں سمجھتی اپنے شایان شان نہیں خیال کرتی۔ اور وہ اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھے ہوئے ہے کہ عورت کا تمام کام مردوں سے قطعاً مختلف ہے اور اس کا مردوں کی صف میں کھڑا ہونا یا کھڑے ہونے کی کوشش کرنا محض بیہودگی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا آخر عورتیں اپنے ان تمام کاموں اور ذمہ داریوں کو جن کا پورا کرنا ان کا نہایت خوشگوار اور مقدس فرض ہے۔ کیوں اس قدر معمولی اور ہلکا سمجھے ہوئے ہیں۔ میں تو سمجھتی ہوں ان کے وہ تمام معمولی اور ہلکے کام جس قدر اہم اور دیرطلب ہیں اتنا اہم کوئی دوسرا کام ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اور نہ عورت کوئی دوسرا کام کرتے ہوئے اس قدر باوقار معلوم ہوتی ہے جتنا اپنی ان ذمہ داریوں اور فرائض کو پورا کرتے وقت نظر آتی ہے جو اس پر عائد ہیں۔

میں نے اکثر بڑی بوڑھیوں کو لڑکیوں کی تعلیم کی مخالفت کرتے محض اس وجہ سے پایا کہ ان کا خیال ہے کہ لڑکیاں پڑھ کر گھر کے کاموں کی طرف بالکل توجہ نہیں دیتیں۔ اور ان لڑکیوں کے نزدیک خاندانی روایات کا برقرار رکھنا یا ان کا پابند رہنا کچھ اہمیت نہیں رکھتا۔ اور اس کا الزام وہ تعلیم پر رکھتی ہیں۔ حالانکہ یہ بڑی غلطی ہے۔ تعلیم کہیں بھی یہ نہیں بتاتی یا سکھاتی کہ ہم خاندان کے لئے باعث زحمت اور گھر والوں کے لئے بلائے جان ثابت ہوں۔ یہ تمام چیزیں تو ہماری فطرت پر منحصر ہیں بلکہ میرا تو یہ خیال ہے کہ موجودہ تعلیم تو ہمیں وہ کچھ سکھاتی اور بتاتی ہے کہ جس کے جاننے پر ہم اپنی فطرت بھی سنوار سکتے ہیں۔ اور میں تو تعلیم کو مردوں سے کہیں زیادہ ضروری عورتوں کے لئے سمجھتی ہوں۔ کیونکہ عورتوں کی فطرت میں قدرتی طور پر کچھ الجھاؤ ہوتے ہیں جن کا سلجھنا عورتوں کی زندگی اور مردوں کی عافیت دونوں کے لئے ضروری ہے۔ ذرا ذرا سے بے معنی بے سروپا اور من گھڑت واقعات کو جس قدر اہمیت عورتیں دیتی ہیں۔ اور جتنا ذرا ذرا سی بات پر میں نے عورتوں کو مشتعل ہوتے دیکھا ہے۔ اتنا کیا اس کا عشر عشیر بھی مردوں کو نہیں دیکھا۔ عورت کی اصلاح کی بڑی سخت ضرورت ہے۔ اور یہ محض تعلیم کے ذریعے ہوسکتی ہے۔ کیونکہ قسمت کی اچھائی یا خرابی انسان کے اعمال و افعال پر منحصر ہے۔ اور اعمال و افعال کی درستی تعلیم و تہذیب پر! لہٰذا اگر ہماری تعلیم مکمل اور

[illegible] سے مشہور ہوگیا۔ چنانچہ اس کی حویلی بھی نمک حرام کی حویلی کہلانے لگی۔ انگریزوں کا اس وقت شہر پر قبضہ ہوچکا تھا۔ بھوانی شنکر نے رزیڈنٹ سے شکایت کی کہ شہر والے مجھے بدنام کرتے ہیں۔ رزیڈنٹ نے ہم لوہاد بادشاہ کو لکھا۔ چنانچہ شہر میں ڈھنڈورا پٹوا دیا گیا کہ کوئی شخص بھوانی شنکر کو نمک حرام نہ کہے۔ وہ اس کے مکان کو نمک حرام کی حویلی کہے۔ لیکن اس کا اثر الٹا ہوا اور اب سے چند سال پہلے تک لوگ اس عمارت کو نمک حرام کی حویلی کہتے رہے۔ اگرچہ ان کو بھوانی شنکر کا حال بھی معلوم نہ ہو۔

نمک حرام کی حویلی سے آگے بڑھکر کھاری باؤلی میں ایک دروازہ **حابش خاں کا پھاٹک** کہلاتا ہے۔ نہ معلوم کسی زمانے میں اس کے اندر بھی کوئی محل یا حویلی ہو۔ مگر ایک حویلی کا دروازہ اب بھی اس میں کھلتا ہے۔ جو نواب وزیر کی حویلی کہلاتی ہے۔ اور **نواب وزیر کی بارہ دری** بھی اسی محلہ میں واقع ہے۔ حبش خاں کا نام شیدی مفتاح تھا۔ یہ شخص احمد نگر کے نظام شاہی خاندان کا غلام تھا۔ رفتہ رفتہ قلعہ اُدگیر کا قلعدار ہوگیا۔ اور جب وقت شاہجہاں نے اس قلعہ کا محاصرہ کیا تو شیدی مفتاح نے قلعہ کی کنجیاں اس کے حوالے کردیں۔ اور اس کے صلہ میں شاہجہاں نے اسکو منصب سہ ہزاری اور پندرہ سو سوار سے سرفراز کرکے زمرۂ امراء میں شامل کیا۔ کہتے ہیں کہ حبش خاں کی نسل میں سے ایک شخص فولاد خاں گذرا ہے۔ جو محمد شاہ کے زمانے میں دلی کا کوتوال تھا اور وہ بھی غالباً پھاٹک حبش خاں ہی میں رہتا تھا۔

اس پھاٹک کے اندر ایک حویلی کا عالیشان دروازہ ہے اُس کے اندر جو محلہ ہے وہ گلی تیلیان کہلاتا ہے۔ کیونکہ وہاں تیلیوں کی دکان ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ **پھاٹک حویلی نواب وزیر** کا دروازہ ہے۔ اسی حویلی کا دوسرا دروازہ نہر سعادت خاں پر کھلتا ہے اور اس کو **پھاٹک نہر سعادت خاں** کہا جاتا ہے ان دونوں پھاٹکوں کے بیچ میں ایک تنگ بازار اور بہت سے مکانات بنے ہوئے ہیں بشر[illegible] غالباً یہ حویلی کبھی فصیلوں سے شروع ہوکر کمپنی باغ تک پھیلی ہوئی تھی۔ اب اس قطعہ میں سینکڑوں مکانات، ایک بزازے کی منڈی اور گرجا گھر بن گئے ہیں۔ قدیم زمانے میں اسکی کیا صورت تھی اس کا پتہ لگنا مشکل ہے۔ مگر اس میں شک نہیں کہ اس قطعہ میں ایک سے زیادہ عالیشان حویلیاں یا محل تھے۔ اب سوال یہ رہتا ہے کہ یہ حویلی کس کی تھی۔ حبش خاں کی تو نہیں ہوسکتی کیونکہ وہ چھوٹے درجہ کا امیر تھا اور کبھی نواب وزیر اودھ نہیں ہوا۔ اب نواب وزیر اودھ کا سوال رہا کہ یہ کون تھا۔ میرے دوست مولوی ظفر حسن صاحب سابق مہتمم محکمہ آثار قدیمہ لکھتے ہیں [illegible]

بخش دی تھی۔ مگر پہلے نواب وزیر اودھ ابوالمنصور صفدر جنگ تھے جو وزیر کی حیثیت سے دلی میں قیام فرماتے تھے۔ اس لئے اغلب یہی ہے کہ یہ صفدر جنگ کی حویلی ہو۔ اور نہر سعادت خاں کی نسبت وہ تحریر فرماتے ہیں کہ اس کا اصلی نام فیض نہر ہے اور جب شہاب الدین گورنر دلی نے ۱۱۶۱ھ میں اس کی مرمت کی تو اس کا نام نہر شہاب ہوگیا۔ شاید نہر شہاب بگڑ کر نہر سعادت خاں بن گیا ہو۔ مولوی صاحب موصوف کا یہ خیال بعید از قیاس معلوم ہوتا ہے۔ لیکن حویلی نواب وزیر کا ایک دروازہ اس نہر پر واقع ہے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ چونکہ سعادت علی خاں برہان الملک صوبہ دار اودھ اس حویلی میں قیام پذیر ہوں اس وجہ سے نہر کا نام نہر سعادت خاں پڑگیا ہو۔ اور اُن کے بعد اُن کے جانشین اور داماد و خواہر زادے ابوالمنصور صفدر جنگ اس میں مقیم ہوئے ہوں۔ مگر صفدر جنگ کے متعلق مصنف مرات السلاطین جس نے سیر المتاخرین کا ترجمہ کیا ہے صفدر جنگ کے شاہجہان آباد بلائے جانے کا مفصل حال لکھتا ہے کہ کس طرح سیاسی مصلحت سے امیر الامراء قمر الدین خاں اور اعتماد الدولہ نے صفدر جنگ کو راضی کیا اور شاہانہ اعزاز و احترام سے دار الخلافہ میں اس کا استقبال کیا۔ چنانچہ مصنف مذکور کے الفاظ ہیں کہ صفدر جنگ بڑے کروفر سے سوار ہوکر شام کو مستفیض کورنش ہوکر داخل حویلی داراشکوہ ہوا۔ جو کہ برہان الملک کے عہد سے حسب عنایت بادشاہ اپنے قبضہ میں رکھتا تھا۔" یہ واقعہ ۲۶ سنہ جلوس محمد شاہی کا ہے اور مصنف سیر المتاخرین مع اپنے والد کے اس موقعہ پر صفدر جنگ کے ہمرکاب تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حویلی داراشکوہ اس وقت کون سی عمارت کہلاتی تھی۔ حویلی نواب وزیر کا ایک حصہ **رنگ محل** بھی کہلاتا ہے۔ یہ حویلی کابلی دروازے کے پاس ہے اور کسی زمانے میں نہایت وسیع اور شاندار ہوگی۔ اور کچھ عجب نہیں کہ حویلی داراشکوہ بھی عمارت ہو۔ اور چونکہ یہ برہان الملک کے عہد سے نواب اودھ کے پاس تھی اس لئے ممکن ہے کہ اس کا نام کسی زمانے میں حویلی سعادت خاں بھی پڑ گیا ہو اور اس کے نام پر سامنے کی نہر بھی نہر سعادت خاں کہلائی جانے لگی ہو۔ بہرحال یہ معاملہ تحقیق طلب ہے۔ مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس حویلی میں اب معمولی حیثیت کے لوگوں نے اپنے چھوٹے چھوٹے مکان بنا لئے ہیں اور جہاں اب تیلیوں کے میلے کچیلے مکان اور کارخانہ ہے وہاں وہ لوگ رہتے تھے جن کے دوش پر ہندوستان بھر کی حکومت کا بار گراں تھا۔ اور جنہوں نے بابر کی اولاد کے دشمنوں کے مقابلہ میں اپنی جانبازی و شجاعت کی داد دیکر اپنی وفاداری اور سرفروشی کا سکہ جما دیا تھا۔ اور جنہوں نے رزم کے بعد بزم کی بھی ایسی ایسی محفلیں گرم کی تھیں کہ گویا ان میں سے ہر ایک [illegible]

... زندگی کی اچھی طرح کامیاب ہو گی
... کی تعلیم ... ڈالی گئیں اور اس کو صحیح تعلیم دی گئی
... تعلیم گیرا اور عام بنانے کے سلسلے میں مدد میں
... سکتی ہیں۔ کیونکہ قوم کی ترقی کا انحصار آئندہ نسلوں
... کی اجتماعی یا انفرادی کی ذمہ دار موجودہ عورتیں ہیں
... کی طبیعت کا اندازہ جس خوبی اور آسانی سے عورت لگا سکتی
... کے لئے ناممکن ہے۔ اور اسے تو بڑے بڑے ماہرین نفسیات
... تسلیم کیا ہے کہ طبیعت میں لوچ اور گھلاوٹ پیدا کرنا صرف
... کا کام

افسانہ

مُورکھ

(از جناب محمد امین شرقپوری)

پنڈت جی کے گھر سے رادھا روٹی کے باسی ٹکڑے لے آئی۔ جب اس نے گڑ کا ملیدہ بناکر موہن کے آگے رکھا۔ مسکراکر بولا "ماں آج تو حلوہ بنایا ہے تم نے"۔

پتلے ملیدہ میں حلوے کی سی تری اور مزہ کہاں۔ میٹھا اس کا من بھاتا کھاجا تھا۔ ماں سے چوری چھپے گڑ نکال کر کھا جاتا۔ اور جب وہ کہتی "ارے بھیر کھالیگا گڑ تو لے۔ کھانسی آنے لگی"۔

وہ بولا "ہاں گڑ کھانے سے کھانسی تھوڑا ہی ہوتی ہے"۔

وہ بولی "تو نے سب کیوں کھالیا۔ تجھے ملیدہ بنادیتی"۔

بولا "روز کہتی ہو کبھی بناکر تو کھلایا نہیں"۔

بولی "گیہوں کی روٹی سے بنتا ہے۔ باجرے کا کیسے بنادوں"۔

موہن یہ جانتے ہوئے کہ گیہوں کی روٹی اُن کے گھر میں نہیں پکتی۔ بولا "باجرے کا آٹا لاتی ہو۔ گیہوں کا لے آیا کرو"۔

رادھا آنکھوں میں آنسو بھرکر بولی "یہی کھانے کو ملتا ہے تو بہت ہے۔ تیرے پتاجی کے ہوتے اس کا نام بھی نہیں سنا تھا۔ اُن کی پیٹھ پھرتے ہی بھاگ پھوٹ گئے۔ مہنگے سے ہیں جینے کے لالے ہیں۔ جو مل جائے وہی غنیمت ہے بیٹا"۔

موہن مزے لے کر کھا رہا تھا۔ باسی ٹکڑے آج سواد دے رہے تھے۔

مسکراکر بولا "یہ تو بہت اچھا ہے۔ روز کھلاؤگی نا ماں؟"

ماں جو بیٹے کی مسکراہٹ کو برقرار دیکھنا چاہتی تھی۔ بولی "بہت اچھا لگ رہا ہے بیٹا"

"ہاں ماں! جی چاہتا ہے کہ کھاتے جاؤں"۔

"یہ تو بہت ہے۔ خوب کھالو پیٹ بھرکر" ماں محبت سے بیٹے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور کلیجہ کا ٹکڑا۔ امیدوں کا ننھا سا پیڑ جسے وہ پسینہ بہاکر سینچ رہی تھی۔ آج اسے خوش دیکھکر اس کا دل ناچ رہا تھا۔ اس گھڑی دو گھڑی کی خوشی کے لئے تڑکے ہی آ سے پنڈت جی کے دروازے پر جا ڈٹا تھا۔ پنڈت جی [illegible]

انہوں نے آنکھ اٹھاکر دیکھا تو رادھا کھڑی تھی [illegible]

یہ وقت ان کی بھگتی کا تھا۔ اشنان کرکے بیٹھے تھے [illegible]

زیر لب گنگناتے ہوئے انہوں نے پھر ایک کنکھیوں سے رادھا کو دیکھا اور گردن موڑلی۔ بدصورت کے سایہ سے گھبراتے تھے۔ آنکھیں جھکائے اندر سے بولے "چلی جاؤ"۔

رادھا گردن ڈالے پنڈت جی کو جھکی جھکی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ پنڈت جی بیل کو سینچ رہے تھے۔ رادھا کو موہن کا دھیان تھا جو اس کے من کے سنگھاسن پر بیٹھا ہوا بسور بسور کر کہہ رہا تھا "ماں آج ملیدہ نہ بناؤگی؟"

"مہاراج" وہ دبی آواز سے بولی "باسی ٹکڑے ہوں تو دیدو"

پنڈت جی کچھ نہیں بولے۔ آنکھوں کے ساتھ انہوں نے کان کے سوراخ بھی بند کرنے چاہے مگر رادھا کی موجودگی کا احساس نہ ہری اوم کا بلند آواز دبا سکی اور نہ کان روک سکے۔ خطرے کی ہلتی ہوئی زنجیر انہیں رہ رہ کر چونکا دیتی۔ دھوتی سنبھالتے ہوئے اُٹھے۔ کھڑاؤں سے کھٹ پٹ کرتے اندر چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہاتھوں میں باسی ٹکڑے لے کر آئے۔ دور ہی سے اُس کی جھولی میں پھینک کر بولے "دن تو نکلنے دیا ہوتا۔ صبح ہی صبح چلی آئی۔ یہ سمے بھگتی کا ہے۔ دان لینے کا نہیں۔ مُورکھ اگر بھوکا نہیں مرے گا تو کیا پیٹ بھرکر کھائے گا۔ چوبیس گھنٹے پیٹ کی چنتا ہے"۔

رادھا چپ چاپ چلی آئی۔ پنڈت جی نے کیا کہا؟ اُس نے سُنا، کیا وہ تھوڑی دیر کے لئے سب بھول گئی۔ پنڈت جی سے کہتی بھی کیا۔ بھوکے پیٹ بھگتی بھی نہیں ہوتی۔

موہن انگلیاں چاٹتے ہوئے بولا "ماں کیا سوچ رہی ہو؟"

"کچھ نہیں" وہ چونک پڑی۔ بھوک، بھگتی اور مُورکھ اس وقت تینوں اس کی "کچھ نہیں" میں چکر کاٹ رہے تھے۔

پنڈت جی کے دروازے پر نفیریاں بج رہی تھیں۔ لوگوں کا ہجوم تھا۔ دھوم دھڑکے میں کان پڑی آواز سُنائی نہ دیتی تھی۔

"کیوں کھڑی ہے؟" ایک بولا۔

"پنڈت جی کے پاس آئی ہوں"۔

"دیکھتی نہیں ہو اُن کے بیٹے کا بیاہ ہے۔ کام میں لگے ہوئے ہیں"۔

ایک اور بولا "چھوڑو۔ بھکارن ہے"۔

"[illegible]"
"[illegible]"
[illegible]
[illegible] بیٹھے ہیں کنگلے بیٹھے تھے۔ سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔
"[illegible] کھاؤں گا۔"
"ابھی تو کھایا تھا اس روز۔"
"آج بھی پیاری گڑ کھانا ہے۔"
"گڑ کھا لو۔" وہ بولی
"تم ہی تو کہتی ہو کہ کھانسی ہوتی ہے گڑ کھانے سے۔"
"دودھ ہے۔"
وہ ہمت کرکے آگے بڑھی "میں بھکارن نہیں ہوں۔"
"بھکارن نہیں تو کیا براتی ہے۔" ایک بھاری بھرکم دھکیل کر بولا۔ رادھا گیند کی طرح اُچھل کر دیوار سے جا لگی۔
"سبھی کہہ رہے ہیں، مانتی نہیں۔" وہ غصے سے بوکھلا رہا تھا۔
"مان جاؤ بیٹا۔"
وہ بسور کر بولا "نہیں ماں۔"
"روٹی پکائی ہے۔ کھا لو گڑ سے۔" محبت سے بولی
"میں آج کچھ نہیں کھاؤں گا۔"
"ایسے بھوکے رہو گے۔"
وہ چونک کر اُٹھی۔ کونے میں کوئی جھوٹے پتل پھینک رہا تھا۔ رنگ برنگ کی بچی کھچی مٹھائی گر رہی تھی۔
"یہ جھوٹ ہے۔" رادھا کانپ گئی۔ "یہ سب جھوٹ کہاں ہوگی؟" جی ہی جی میں بولی "پنڈت جی کے بیٹے کا بیاہ ہے سبھی براتی بھی پنڈت ہوں گے۔"
مٹھائی جلدی جلدی دونے میں چُننے لگی۔
"یہ کون ہے؟" دُور سے مہتر جھاڑو لے کر بڑھا۔ رادھا دونا چھپا کر بھاگی۔ مہتر چند قدم پیچھا کرتے ہوئے بولا "سسری ہمارا حق کھائے ہے۔"
ماں کو دیکھ کر موہن دوڑ کر آیا۔
"دیکھ تیرے لئے کیسی اچھی مٹھائی لائی ہوں۔ اب ضد نہ کیجو۔"
وہ سب میری سے ہونے تڑپ کر بولا۔ "یہ نئی لڈو کہاں سے لائی ہو ماں؟"

"پنڈت جی کے بیٹے کا بیاہ ہو رہا ہے نا۔"
"ہی میرا بیاہ نہ کروگی ماں۔" لڈو کھاتے ہوئے بولا۔
"جب تو بڑا ہو جائیگا تیرا بھی ہوگا۔"
"اوں"۔ وہ بولا "پنڈت جی کا بیٹا میرے برابر کا ہی تو ہے۔"
"مجھ سے بڑا ہے بیٹا۔"
"نہیں ماں۔ ایک روز میں اُس کے ساتھ کھیلا تھا مجھ سے کچھ ہی بڑا ہوگا۔"
ماں کو یاد آیا ایک روز موہن روتا ہوا آیا تھا۔
"کیا ہوا بیٹا؟"
"پنڈت جی نے مارا ہے۔" "میں کشن کے ساتھ کھیل رہا تھا۔"
"تو نے کچھ کہا ہوگا اُسے۔"
"نہیں ماں۔ پنڈت جی اُس سے بولے غلیظ لڑکوں کے ساتھ کیوں کھیلتا ہے۔"
"تجھے کس لئے مارا؟"
"میں کھیل جو رہا تھا اُس کے ساتھ۔"
ماں کی نظریں بیٹے کے میلے کچیلے کپڑوں پر پڑی۔
"تو وہاں نہ جایا کر۔"
برفی مُنہ میں ڈالتے ہوئے بولا۔ بیاہ پر خوب پیٹ بھر کر مٹھائی ملتی ہے۔ جس کا بیاہ ہوتا ہے وہ اچھے کپڑے بھی تو پہنتا ہے ماں۔"
"ہاں بیٹا۔" وہ بولی۔ "اب سو جاؤ جاکر۔"
آج اُس کا بیٹا گہری نیند سو رہا تھا۔

سڑک پہ چھڑکاؤ ہو رہا تھا، رنگ برنگ کی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔
"پنڈت جی کے بیٹے کی برات آئے گی۔" ایک بولی۔
"دوسری بولی "ایک ہی تو بیٹا ہے اُن کا۔"
"اتنی چھوٹی عمر میں بھاگوان ہی بیاہ کرسکتا ہے بیٹے کا۔"
"ہاں بہن۔" رادھا بولی۔
پھر اُسے جیسے بیٹے کی باتیں یاد آگئیں۔ "ماں میرا بیاہ نہ کروگی" اور جیسے دیکھتے ہی دیکھتے اُس کا موہن جوان ہوگیا ہو۔ اُس کے بدن پہ زرق برق پوشاک جھلک رہی ہو۔ گھوڑے پہ دُولھا بنا بیٹھا ہو۔ سوچتے ہوئے رادھا خود کو بھول گئی۔ اُس کے کانوں میں نفیریاں بجنے لگیں۔ لوگ گیس کے ہنڈے اُٹھائے آ رہے تھے۔ گلاب چھڑکا جا رہا تھا۔ پھولوں کی مہک اور

گلاب کی خوشبو فضا میں اُڑنے ...
"کس کی برات آرہی ہے؟" ایک بڑھیا اُس کے برابر میں
کھڑی ہوکر بولی۔
رادھا پھریری لے کر بولی "دیکھتی نہیں ہو۔ میرے موہن کا
بیاہ ہو رہا ہے"۔
بڑھیا بھویں سکیڑ کر پھیکی ہنسی ہنستے ہوئے بولی "تیرے بیٹے
کا بیاہ ہے اور تو یہاں کھڑی ہے۔"
"اری تو میں کیا جھوٹ کہتی ہوں" جیسے اُس وقت وہ پاگل ہوگئی
تھی۔ ہاتھ بڑھا کر بولی "وہ دیکھو دولھا آرہا ہے۔ میرا بیٹا دولھا۔ کیا میرے
موہن کو نہیں پہچانتی ہو؟ سونے کی تاروں کا سہرا باندھے ہوئے ہے
سر پر مکٹ ہے۔ اور یہ اونٹوں پر سوار لالا وارث بچے میرے بیٹے کی ساری
بلائیں دور کرتے چلے آرہے ہیں۔
عورتوں نے لشکر لئے ہوئے چونک کر دیکھا۔ اُس کا موہن میلے کچیلے کپڑے
پہنے اونٹ پر سوار جھنڈا ہاتھ میں لیے نشان کا ہاتھی بنا برات کے آگے آگے آرہا تھا۔

ایک افسانہ ... جسکا کوئی عنوان نہیں

(از محترمہ سیدہ اختر حیدرآبادی)

افسانہ لکھنا سہل بھی ہے اور دشوار بھی ـــــ سہل ان کیلئے جو افسانے کیلئے پہلے سے کوئی موضوع یا عنوان تلاش کر لیا کرتے ہیں ـــــ اور مشکل اُن کے لئے جو افسانہ لکھتے وقت نہ کوئی موضوع رکھتے ہیں اور نہ عنوان ـــــ خدا رحم کرے اس قسم کے افسانہ نویسوں پر ـــــ اور بس!

کائنات کے دامن میں افسانے کے بے انتہا عنوانات بکھرے پڑے ہیں

لیکن ؎ اِس قدر فرصتِ حیات کہاں

کہ ... کوئی موضوع تلاش کرنے میں زندگی کے بیش قیمت لمحات ضائع کئے جاسکیں۔ میرا افسانہ بہرحال افسانہ ہے "جس کا کوئی عنوان نہیں" ـــــ اور اگر آپ پسند کریں تو یہی میرے افسانہ کا عنوان بھی ہو سکتا ہے ـــ بہرکیف

؎ برگِ سبز است تحفۂ درویش

لیجئے ملاحظہ ہو۔ (سیدہ اختر)

شاہدہ ـــــ عالم کمسنی ہی سے ایک پاکیزہ مزاج، روشن دماغ، اچھے جذبات اور بلند نظری کی مالک تھی ـــــ تحریر کی ملکہ، تقریر کی خطیبہ، شاعری کی ناہیدہ۔ یہ تھے اُس کے خطابات! ـــــ جو اس کی قوم اور اس کے ملک کی طرف سے اس کو نذر کئے گئے تھے ـــــ حقیقت بھی یہی تھی کہ ـــــ پبلک پلیٹ فارموں سے اخبارات و رسائل تک ـــــ شاہدہ خود اپنا آپ "شہید" تھی اور اس کے علمی و ادبی اور قومی و سیاسی کارنامے پکار پکار کر دنیا سے کہہ رہے تھے کہ "خاتون مشرق "شاہدہ" کا نام ہے ـــــ دوشیزۂ ہند کو انہیں صفات کا مالک ہونا چاہیئے ـــــ ایک طرف اگر شاہدہ قوم و ملک کیلئے ایک شجاع مدبر اور صاحب فکر نظر آرہی تو دوسری طرف! یعنی ـــــ دنیائے شعر و ادب میں وہ ایک ممتاز شخصیت کی مالک تھی ـــــ!! شاہدہ اپنی ہمہ صفات زندگی و کائنات کے متعلق بالکل اچھوتے اور نئے نظریات و خیالات رکھتی تھی۔

اُس نے اکثر اپنے "عالم ہالی" میں کہا ـــــ کہ زندگی کا مقصود صرف محبت ہے زندگی محبت کا دوسرا نام ہے ـــــ کائنات کی ہر چیز منتشر و غیر منظم ہے ـــــ اُونچے اُونچے پہاڑ ـــــ گہری گہری وادیاں۔ بلند و بالا درخت پست و ناہموار سبزہ، خار و گل، شام و سحر، ستارے اور ماہتاب، خورشید اور اُسکی بکھری شعاعیں، بہتے ہوئے دریا، ساکن تالاب، اگرچہ ـــــ تمام چیزیں متضاد حقیقت کی آئینہ دار ہیں۔ مگر ان کے اندر ایک ربطِ معنوی موجود ہے۔ اور اسی ربطِ معنوی کا نام "محبت" ہے۔ "خدا" محبت ہے۔ اور محبت خدا ـــــ اسی لئے "شاہدہ" کائنات کے ہر منظر میں "محبت" یا نورِ محبت کو جلوہ گر دیکھتی تھی ـــــ اس کا ایمان تھا ـــــ کہ انسان صرف محبت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے ؎

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لئے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

وہ اکثر کہتی تھی کہ جب آدم نے جنت میں گناہ "گندم" کیا تو پھر نسلِ انسان بڑھانے کی اللہ کو کیا ضرورت تھی؟ اسی جنت میں آدم و حوا کی خوشنما قبریں کیا مقبرے تیار کئے جاسکتے تھے ـــــ مگر ہاں ہم آدم و حوا کو اس کرۂ ارض پر بھیج دیا گیا۔ اور ان کو بافراط اولاد عطا کی ـــــ وہ بھی صرف اس لئے کہ انسان محبت کی تلوار لیکر اس کائنات پر حکمرانی کرے۔ جب سے اب تک کائنات پر انسان صرف محبت کی آڑ لیکر حکمرانی کر رہا ہے۔ اور خدا جانے کب تک حکمرانی کرتا رہے گا؟ موجودہ جنگ اور اس کے انسانیت سوز مظالم کو جانے دو ـــــ یہ ایک وقتی چیز ہے! میرا عقیدہ ہے کہ دنیا صرف برائے محبت زندہ ہے ـــــ دنیا کے بوالہوس دنیا پر اپنا اقتدار جمانے کے لئے کتنی ہی خونریزیاں، تباہیاں اور سرکشیوں کا حشر اٹھائیں ـــــ مگر یاد رہے کہ یہ دنیا صرف محبت سے اپنی بنائی جاسکتی ہے ـــــ تاریخ عالم گواہ ہے کہ تلواروں، نیزوں اور خنجروں سے دلوں کو فتح نہیں کیا جاسکا۔ البتہ محبت نے بڑے بڑے سرکشوں کے سر جھکا دیئے ـــــ وغیرہ ـــــ وغیرہ یہ تھے "شاہدہ" کے بلند و پاکیزہ اور جذبات میں ڈوبے ہوئے تاثرات! اب آپ ہی تصور کیجئے کہ شاہدہ آپ کی نظروں میں اب کیا معلوم ہوتی ہے؟

الغرض شاہدہ اپنی جگہ شاہدہ تھی۔ اور اُسے باستثنائے کائنات شاہدہ سے بھی محبت تھی ـــــ محبت تھی نہیں! ہوگئی تھی! اور وہ بھی صرف اس لئے کہ "محبت" مقصودِ حیات ہے۔

شاہد ایک حسین و خوش شکل نوجوان، پاکیزہ جذبات و بلند نظر رکھنے والا ایک عیاں انسان ——— جس کی پاکیزہ مزاجی پر فرشتے بھی اگر چاہیں تو رشک کر سکتے ہیں ——— الغرض شاہد و شاہدہ ایک ایسا حسین و پاکیزہ شعر تھے جس کے مصرعے ایک دوسرے سے جدا نہ کئے جا سکتے تھے ——— یا بالفاظ دیگر ان کے سینے کے اندر ایک روح اور ایک ہی جذبہ موجزن تھا۔

شاہد کو شاہدہ سے اور شاہدہ کو شاہد سے بے پناہ محبت تھی۔ محبت میں پہل کس کی جانب سے ہوئی، اس کا فیصلہ کرنا دشوار ہے ——— البتہ صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے۔ دونوں نے اپنی اپنی جانب سے پہل کی اور دونوں بیک وقت "حادثۂ محبت" کا شکار ہوئے ———

جوں جوں دن گذرتے گئے دونوں کے دل اور دلوں کی محبت ایک دوسرے سے قریب تر ہوتی چلی گئیں۔ لیکن قدرت گواہ ہے کہ دونوں اس قدر قریب ہو کر بھی ملنے کی طرح نہ مل سکے ——— دونوں کا ذاتی عقیدہ تھا کہ ——— محبت کبھی نہ ملنے کا دوسرا نام ہے۔ ناکامی و نامرادی، دوری و مہجوری یہ محبت کے صفات ہیں ——— ؎

ہم نے ناکامیوں کو ڈھونڈ لیا
آخرش کامیاب ہونا تھا!

ایک دن ایک خاص بزم طعام و سماع منعقد تھی ——— اکثر اہل ذوق و شوق شریک محفل تھے ——— کچھ شعرا بھی خاص طور سے مدعو کئے گئے تھے ——— پہلے ماحضر تناول کیا گیا۔ اور پھر ضیافت روح کا سامان ہوا ——— شعرا کے تازہ بتازہ نو بہ نو کلام نے حاضرین کو بے حد محظوظ کیا۔ لیکن جس وقت شاہدہ غزل سرا ہوئی تو ایسا محسوس ہوا کہ تمام فضا ساکن ہے ——— اور ساری کائنات گوش بر آواز ہے ——— اور فضا کا سکوت بطور داد و تحسین یہ کہہ رہا تھا ——— ؎

کون ہے مطرب کے ہاتھوں میں یہ دلکش ساز ہے
بزم قدرت، روح فطرت گوش بر آواز ہے

یہ تو سب کچھ تھا ——— لیکن اس وقت شاہد کی متکلم نگاہیں متبسم چہرہ اور بیتاب نفس جس کے اندر محبت کے پاکیزہ و لطیف جذبات جاری و ساری تھے ——— قابل دید تھے! اہل محفل تو شاہدہ کے سحر ساز ترنم اور روح نواز اشعار کی داد و تحسین میں مصروف تھے۔ لیکن شاہد! ——— شاہد اس منظر سے ہٹ کر بہت دور سے شاہدہ کے سُرخ و سفید رخساروں

[illegible] محبت کا [illegible] شام [illegible] ——— [illegible] بے باکانہ ہوتا تھا کہ شاہدہ [illegible] شمار کرتا ہے ——— کہ روح سے پہلے جاں کشی ہوا ہے ———

الغرض زمانہ گذرتا گیا اور زمانے کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی پاکیزہ محبتیں معراج کمال کو پہنچ گئیں ——— لیکن جس طرح سونا کسوٹی پر ——— پرکھا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح "محبت" آزمائش و ابتلا کی کسوٹی پر جانچی اور پرکھی جاتی ہے ———

؎ عجب زمانہ ہے کہ ہم نہیں آئے تسلیم
کسی سبب سے بظاہر جو بے قرار نہ ہو

آخرش شاہد و شاہدہ کی محبت کی آزمائش کا موقع جلد ہی آ گیا ——— شاہد کے والدین اپنے ہی خاندان میں شاہد کی شادی کرنا چاہتے تھے ——— اور شاہد کو انکار تھا ——— کچھ تو شاہدہ کی محبت کا تقاضا اور احترام! ——— اور کچھ مغربی تعلیم کا اثر جس نے ذہن شاہد سے شادی کے نظریے کو یکسر تبدیل کر دیا تھا ——— اس کا خیال تھا کہ شادی صرف ایک سوسائٹی کا بنایا ہوا قانون ہے، جس کو موثر بنانے کیلئے مذہبی رنگ دیدیا گیا ہے ——— ورنہ رشتۂ شادی سے زیادہ مضبوط وہ "رشتۂ محبت" ہے جو دو دلوں میں از خود پیدا ہو گیا ہو ——— شاہد کے ماں باپ شاہد کے ان عجیب و غریب خیالات سے تنگ آ گئے تھے اور ایک زمانہ بحث و اصرار میں گذر گیا۔ جب سب تدبیریں ناکام ہو گئیں تو شاہد کے والدین کو ایک نئی تدبیر سوجھی ——— یعنی شاہدہ کو "مقصد برآری" کا ذریعہ بنایا جائے ——— کیونکہ سب کو معلوم تھا کہ شاہدہ کا ایک ادنیٰ سا اشارہ شاہد کیلئے نقش کالحجر کا درجہ رکھتا ہے ———

آخرش ایک دن شاہد کا "خاندانی وفد" شاہدہ سے ملا اور ضروری حالات سے شاہدہ کو باخبر بنا کر امداد چاہی ——— شاہدہ آج تک اس راز سے ناآشنا تھی ——— اور ہوتی بھی کیوں ——؟ شاہد نے برنبائے محبت کبھی شاہدہ سے اپنی شادی کا ذکر نہ کیا تھا ——— شاہدہ ایک عجیب کشمکش میں تھی ——— اگر وہ شاہد کو شادی کرنے پر مجبور کرتی ہے تو اس کی اپنی محبت کا خون ہوتا ہے۔ اور اگر شاہد کو اسی طرح رہنے دیتی ہے ——— تو دنیا اس کو خود غرض کہکر پکارے گی۔ اور شاہد کا خاندان شاہدہ کو اخلاقی مجرم سمجھے گا ———

"محبت" اگر انسان کی بلند ہے تو بلند تر ہو جاتی ہے۔ اور پست

ہے تو صرف محبت۔ شاہدہ کو صرف نفرت اور پاکیزہ جذبہ محبت کی تمنا تھی۔ اس لئے میں نے یہ کشمکش اپنی کشمکش کو ختم کر دیا ——

محبت کی روحانی کے لئے نہیں دیتی —— محبت "نام ہی دوام" کا نام ہے۔ "محبت" مٹتا ہے اور ظاہر ہے کہ دنیا کے دونوں کنارے کبھی آپس میں نہیں ملتے —— جب یہ حقائق ہیں تو پھر میں کیوں اپنی محبت کی خاطر دوسروں کے جذبات و توقعات کو مجروح کروں —— وغیرہ وغیرہ —

تمہیں شاہد کو ضرور شادی کرنی ہوگی —— عالم خیال میں یہ فیصلہ کر لینے کے بعد شاہدہ نے شکریہ لیتے ہوئے شاہد کے اعزا کو اطمینان دلایا اور وعدہ کر لیا —— ! تقریب شاہد اب تک ان تمام نتیجہ خیز کوششوں سے بے خبر تھا —— لیکن جس وقت وہ شاہدہ کی خدمت میں باریاب ہوا ——

شاہد! تمہیں کسی کی خاطر نہیں تو میری ہی خاطر سہی! شادی کر لینا ہوگی۔ شاہدہ نے تقدیم کرتے ہوئے کہا۔ میری دنیا تاریک ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ تمہاری دنیا بھی تاریک ہو —— میں تمہارے مستقبل کو تابناک و درخشاں دیکھنا چاہتی ہوں —— شاہد نے پہلے حیرت اور پھر درد کے ساتھ شاہدہ کے حکم کو سنا —— اور پھر گلوگیر لہجہ میں کہا —— بہت بہتر —— اگر آپ مجھے بے موت ہی مار ڈالنا چاہتی ہیں تو مجھے اس میں بھی کوئی عذر نہیں!

تم موت سمجھو اگر یہی تمہاری شادی کو میں تمہاری زندگی کو سمجھتی ہوں۔ شاہدہ نے جواب دیا۔

شادی! خدا کیلئے اب تم یہ اس لفظ سے بار بار ذبح نہ کرو۔ تمہارا حکم بجا لایا جائیگا —— شاہد نے کہا۔ اس مختصر گفتگو کے بعد شاہد اٹھکر چلا گیا لیکن اس طرح کہ اس کا چہرہ گلگون تھا اور آنکھیں نمناک!

شاہدہ کی متوقع اور ادا اور شاہدہ کا اپنا ایثار —— شاہد کے اعزا کیلئے موجب مسرت ہوا اور جلد جلد تقریب شادی کی تیاریاں مکمل ہو گئیں —— یوم شادی کے دن شاہدہ نے ایک بیش قیمت ہار شاہد کی دولہن کو بھیجا —— البتہ وہ خود شریک شادی نہ ہوئی۔ اور ہوتی بھی تو کیونکر ؎

محبت اپنے سوا کچھ دیکھنا نہیں چاہتی

شاہد و شاہدہ اب ایک الگ الگ دنیا میں تھے لیکن اس بعد مکانی کے باوجود انکی روحیں ایک دوسرے کے قریب تر تھیں —— گویا شاہد ایک مادی شادی کرنے کے بعد محبت کی روحانی تقریب مسرت کے فرائض ادا کر رہا تھا اور شاہدہ دنور مسرت سے یہ شعر پڑھ رہی تھی ؎

یہ لالہ و گل یہ ماہ و انجم یہ موج و دریا یہ ریگ و صحرا
ذرا جو دیکھو تو مسکراتے ہیں، یہ سب کے سب مسکرا رہے ہیں

صدائے واپسیں

(از محترمہ شکیلہ اختر)

"لے آلو" ___ "لے پرول، ساگ، توریں" ___ "لے ترکاری بھنڈی، کریلا، بیگن" ___ "لے آروی" ___ ہوا کی طوفانی سنسناہٹ اور پانی کے شور کے ساتھ تھرتھراتی ہوئی مسلسل آواز گلیوں سے آرہی تھی۔ تیز وحشی ہواؤں کے ساتھ زور کی بارش ہورہی تھی اور کپکپا دینے والی سردی سے جیسے بدن کی ساری ہڈیاں اکڑی جارہی تھیں۔ سڑک سنسان تھی۔ دکانوں پر ٹاٹ اور بانس کی ٹھٹھریاں پڑی تھیں۔ سامنے ہر لحظہ گردش کرتی ہوئی دنیا کی طرح چکر لگاتا ہوا کولہو تک آج خالی پڑا تھا۔ اور ہنس کا مریل بیل دھوبی کے ننگے گدھوں کے ساتھ چھپائی کے سایہ میں دبکا ہوا کھڑا تھا۔ اور اس کے قریب ہی بھیڑیوں والے گندے حلوائی کا گھناؤنا سا مریل کتا اپنے مالک کے سرد چولھے کے اوپر منہ کو پیٹ میں چھپائے بے خبر سو رہا تھا۔ ایسی خاموش فضا میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے دنیا بھی گردش کرتے کرتے تھک کر اپنے محور پر سو گئی ہو صرف آسمان اور کرۂ ہوا بیدار تھا۔

پانی اور زور سے برسنے لگا تھا۔ میں نے باورچی کو پکار کر کہا "خوب دال دی ہوئی پتلی کھچڑی آج پکانا۔ بھرتا، چٹنی، گھی اور انڈے کا آملیٹ بنا دو گے سمجھے؟ کہاں اب ایسے پانی میں بازار جاؤ گے"۔

دروازے کے اندر آتے ہوئے ایک تیز آواز آئی۔ "ترکاری لیا جائی؟ آلو ہے، توریں ہے، کریلا، بیگن، ساگ، پیاج، نیبوں" وہ پانی سے شرابور کانپ رہی تھی۔ اور نمایاں طور پر اُس کی سوکھی ہوئی گردن بوجھ کے احساس سے بار بار ہلتی جارہی تھی۔ لیکن اُس کی تھرتھراتی ہوئی آواز میں ایک رعونت اور پھیلی ہوئی جھریوں کے اندر دھنسی ہوئی آنکھیں لاتعداد گرہوں والے میلے تاگوں سے جابجا بندھے ہوئے داغدار گندے چشمے کے اندر فاتحانہ طور پر چمک رہی تھیں۔

اُس نے اپنے سر پر رکھے ہوئے ٹوکرے کو بڑی مشکلوں سے اپنی گردن کو کسی طرح سے سوداگرانہ خودداری کے ساتھ جنبش دیکر باورچی کی مدد سے اُتارا۔ اور میلے بھیگے ہوئے کپڑے سے ڈھکا ہوا ٹوکرا وہ اپنے سامنے لیکر بیٹھ گئی۔

"ہاں بول ___ کیا کیا ترکاری ہے ___ کتنا کتنا؟"

اُس نے ٹوکرے کے اوپر سے بانس کی ترازو اٹھا کر پیٹھ کے پیچھے رکھا۔

باورچی سامنے برتن رکھتا ہوا بولا "پہلے بھاؤ تو بتا۔ کیسے دیگی؟"

"بھاؤ کا آج کیا ہے۔ چھ پیسے توریں۔ سات آنے سیر آلو۔ چھ آنے پرول۔ آٹھ آنے پیاج۔ آنے آنے نیبوں۔ اور کا ہے جی دو دو پیسے"۔

باورچی حیرت سے کہنے لگا کہ کیا وہ آج لوٹ مچانے کیلئے آئی ہے میں ان داموں تو کبھی نہ لوں گا۔

بانس کی ترازو ٹوکرے میں رکھتی ہوئی بڑھیا بولی "اچھا تو مت لا۔ اپنی اپنی مرجی"۔

"تو بول نہ بڑھیا ٹھیک ٹھیک" باورچی غرضمندانہ طور پر بولا۔ ترازو کا پاسنگ برابر کرتی ہوئی بڑھیا کہہ رہی تھی کہ کوئی جاتو رے ایسے میں ہاٹ۔ یہ اسی کا دل دجگر تھا جو ایسی دہلاتی ہوئی سردی میں گھر سے باہر نکلی ہے۔

اُس نے بڑے اہتمام سے ٹوکرے پر سے کپڑا سرکایا۔ ٹوکرا لال اور سبز رنگ کے ساگ سے بھرا ہوا تھا۔ اور ٹوکرے کے ارد گرد بھٹے اس طرح آراستہ کرکے کھڑے کئے گئے تھے جیسے ڈاڑھی والے سپاہی کسی بھری پُری دولت کی حفاظت کر رہے ہوں۔

باورچی حیران ہو رہا تھا کہ بڑھیا کیا آج صرف ساگ ہی بھر کر لے آئی ہے۔

"ارے سب ہے جی سب" بڑھیا نے اندر سے ترکاری نکالتے ہوئے خوشامدانہ ہنسی کے ساتھ کہا۔ اُس کی رعونت ختم ہو کر اب منت آمیز صورت اختیار کرتی جارہی تھی۔ "بڑا پانی ہو لو ہو بیٹا" وہ باتیں کرتی ہوئی ٹھہر ٹھہر کر ایسے تول رہی تھی جیسے کوئی ملزم سزا ملنے سے پہلے کی ایک ایک گھڑی کو غنیمت سمجھتا ہے۔ "آج ہاٹو نہ ٹھکانے سے لگا" ترازو کے ایک پلڑے پر موٹی موٹی توریں جھولتی ہوئی کبھی اوپر اور کبھی نیچے جارہی تھی۔ "بڑا بھلا بیٹا ہائے اللہ دھرے کا بادہ نہ ملے ہے"۔

"ہاں تو سیر بھر توریں"

"ارے اِتی کنکنی ہے کا بورں اچھا کے بٹیا ناگیو جان ہے تو جہان"۔ اور "ایلی لو پاؤ بھر پرول"

باورچی تھوڑی ترکاری دیکھتے ہی جھلا گیا۔ اس نے موٹی موٹی توریں کو واپس کرتے ہوئے کہا کہ وہ اتنی خراب بستانی ہوئی توریں نہ لے گا۔ مگر بڑھیا

...ی کو اسکی سمجھ ترکاری میں کوئی خرابی نہیں ہے اور وہ بہت لنگی قیمت۔ اُس
...ی توریں کو بھی جھنجھوڑ کر دکھا بھی دیا کہ وہ خراب سودا کبھی نہیں دے سکتی۔ مگر باورچی
...ی اس ترکاری کو بیچنے چھوڑ رہا تھا۔ اس نے ترکاری کی ٹوکری میں سے ساگ کو ایک طرف
...ے ہوئے دوسری طرف پھینک دیا۔ بڑھیا زور سے چیخ اٹھی "دیکھو دیکھو ہاتھ نہ لگاؤ۔
...سب ترکاری کل ہی چھوٹے ہیں" مگر باورچی نے سارے ساگ کو ترکاری پر سے ہٹا کر
...بڑھیا کے چہرے پر سے دبیز نقاب کو اٹھا کر اسکی جھریوں کو نمایاں کر دیا۔ ٹوکرا گویا
...پڑا تھا۔ صرف اس کے پیندے پر ہر قسم کی تھوڑی تھوڑی ترکاریاں چھتراتی ہوئی تھیں
...یہ تھوڑی سی ... دیکھ کر ہنسی آگئی۔

پلول اور توریں کو بڑھیا کے ٹوکرے میں پھینکتے ہوئے باورچی بکتا ہوا چلا گیا
...کی آواز آرہی تھی۔ وہ دوسرے نوکروں سے کہہ رہا تھا کہ بڑی ترکاری بیچنے
...ہے۔ پاؤ بھر بلیں، آدھ پاؤ آلو کے ٹھیں ہے جیسے کنجڑن ہی تو بن گئی ہے۔ جھوٹ
...ن میں اس نے اسے اپنی دبیرے پھنسائے ہوئے تھی۔ دوسرے نوکروں کو حیرت تھی کہ مول
...سے کیسے کر رہی ہے جیسے دادا جی کے کھیت میں سے من بھر ترکاریاں توڑ کے لائے
...رہی ہے۔

شکست خوردہ اور ملتجیانہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بڑھیا رو پڑی۔
"...غریب ہیں مالکن بہت غریب" اس کی دھنسی ہوئی آنکھوں کی مٹیالی دھندلی
...یاں بے تحاشہ ٹوٹی ہوئی کشتی کی طرح آنسوؤں میں تیر رہی تھیں۔ اس کے لبوں کے گوشوں
...جھریوں کی لمبی لمبی لکیروں میں رال بھر گئی تھی۔ مسوڑھوں کی بندشوں سے آزاد ہوتے
...سے لمبے لمبے پیلے دانت بولنے ابھر ابھر آتے تھے۔ وہ اپنی کہانی سناتی گئی
...سے چلی ہوئی وہی ایک سادہ سی کہانی۔ وہ تین جوان بیٹوں کی ماں تھی۔
...اسکے اپنے کھیتوں میں کبھی ترکاریاں لہلہاتی تھیں۔ مگر اس کے سارے بیٹے مر گئے
...کے زلزلے سے دب کر۔ تینوں بیٹوں کی قبریں ایک ساتھ ہی اسکے اپنے گھر میں بنیں۔
...ے ہی نہ رہے تو پھر کھیت کیسے قائم رہ سکتا تھا۔ اب اس کے دکھوں
کی ... اس کے مرحوم بیٹے کی نشانی جنم کی روگی ایک پوتی رہ گئی تھی۔
...ب تھا۔ ... نے ادھ موا کر رکھا تھا۔ اس نے رو رو کر بتایا کہ صرف دوا لینے
...ن خاطر قرض کر لیا ہے ... یہاں وہ ترکاری بیچنے نکلی ہے۔ قرض واپس کر کے
...نے اس کے پاس بچ جائیں گے جس سے وہ اپنی پوتی کے پیٹ کے درد کی دوا لے
سکے گی۔

وہ ایک لمحہ کیلئے چپ ہوگئی۔ اسکی نگاہیں نہ جانے آسمان پر گھری
...بدلیوں پر جم کر کہیں رہ گئیں۔ میں اسکی جھریوں والے بیمار جھولے ہوئے
چہرے کو دیکھتی رہی۔ جہاں سے آنسوؤں کی دھار اس کی جھریوں کے نشیب و فراز

سے ہوتی ہوئی اس کے بھیگے ہوئے آنچل میں جذب ہو رہی تھی۔ اور کچھ ترکاریوں
پر بھی ٹپک پڑی تھی۔

اُس نے بڑی لجاجت سے مجھ سے کہا کہ میں اس سے کچھ بھی لے لوں۔
میں ایک عجیب کشمکش میں مبتلا تھی۔ ترکاریوں پر بڑھیا کے آنسو ابھی تک چمک
رہے تھے۔

باورچی خانے سے نوکروں کی ملی جلی آوازیں آرہی تھیں نام گنانے کو "سو
ٹو۔ پلول لو۔ آلو لو۔ بینگن لو۔ جھوٹی۔ آخر یہ بڑھیا کا سمجھے ہے کہ نام لینے سے
ٹوکرا بھر جائے گا"

ان کو کیا معلوم تھا کہ نام لینے سے ٹوکرا کبھی بھر بھی جاتا ہے۔ جس کے پاس
کچھ نہ ہو اُس کے پاس بس نام ہی تو رہ جاتا ہے۔ اور یہی سب کچھ ہوتا ہے۔ اگر آج
وہ ان ناموں کو بھی بھول جائیں تو پھر دنیا میں ان کا باقی کیا رہ جائیگا۔ کھوکھلے نام
سادہ ... بھر آنے والے کل کا انتظار ہی تو ان کی زندگی کا سہارا ہے۔ دنیا بھر کی
ترکاریوں کے نام کی صدا میں وہ اپنے کو فریب دیتی تھی یا گاہکوں کو۔ ایک ہی
سانس میں اتنے ناموں کو گنتے ہوئے وہ ایک لطیف سا خواب دیکھنے لگتی۔
جہاں ترکاریوں کی رنگ برنگی قوس وقزح میں اس کے ارمانوں کی دنیا شاداب
نظر آتی تھی۔ وقتی طور پر ہی سہی۔ وہ اپنے کو ایک کامیاب بیوپاری تو سمجھ
لیتی تھی۔ کسی طرح وہ اپنا سودا بیچ لینا چاہتی تھی۔ تاجرانہ فریب سب ہی تاجر
ایسا کرتے ہیں۔ شاید فریب بڑا ہو کر فریب نہیں رہتا۔ اسی لئے بڑے جھوٹوں
کی پکڑ نہیں ہوتی۔

بڑھیا مجھ سے پھر کہنے لگی "کچھ لے لو بیٹی"
میں نے اپنے ضمیر کی سرگوشیوں کو خاموش کرنے کیلئے وہاں سے اٹھ کر جاتے
ہوئے کہا۔ "کل ضرور لوں گی بڑھیا" مجھے اسکی سُڑسُڑاتی ہوئی ناک اور بہتی ہوئی
آنکھوں سے گھن آنے لگی۔ جانے کہاں کہاں کتنے آنسو جذب ہو چکے ہونگے۔

وہ چپ چاپ ساگ کو سمیٹتے ہوئے اپنی کانپتی ہوئی انگلیوں سے
ٹوکرے کو بڑی آسانی سے سر پر رکھ کر باہر نکل گئی۔ تیز ہوا اندر آرہی تھی
میں جب اٹھ کر دریچے کے شیشوں کو بند کرنے لگی تو گلیوں سے پانی کے
شور کے تھرتھراتی ہوئی مگر زور زور سے آواز آرہی تھی۔

"لے آلو۔ پلول۔ لے ساگ۔ توریں لے کریلا۔ بینگن۔
لے ترکاری ۔ لے سبجی ترکاری ———"

ڈرامہ گزشتہ سے پیوستہ

یہ دیس ہمارا ہے!

قسط چہارم

(از محترمہ صدیقہ بیگم سیوہاروی)

محمود :۔ سینے میں بہت درد ہے۔ روپا تم بھی لیٹ جاؤ۔ کب تک بیٹھی رہوگی۔

روپا :۔ اب ہم کام کیسے کرینگے محمود ـــــ یہاں کی حالت ناقابل برداشت ہوگئی ہے۔ ابھی تک غذائی بحران میں کمی نہیں ہوئی۔ دیکھو اس دوکان کے سامنے کتنے لوگ جمع ہیں اور کل ان کو چاول ملے گا۔

محمود :۔ (آنکھیں کھولتا ہے) اور بچا ہے رات بھر میں ختم ہوجائینگے اور جو بچیں گے وہ کیچڑ پانی میں تڑپتے ہوئے۔

روپا :۔ یاد نہیں پرسوں ہی کی تو بات ہے جب بارش ہوئی تھی تو ہم نے کتنی لاشیں کیچڑ میں سے اٹھائی تھیں۔

محمود :۔ تاہم دیگر جگہوں سے کافی غلہ آرہا ہے۔ اور امید ہے کہ بہت جلد ہم اس مصیبت پر قابو پالیں گے۔

روپا :۔ لوگ کم ہی اس طرف توجہ کرتے ہیں جو رئیس ہیں وہ اپنی دولت میں مست ہیں۔ ان کو کیا پرواہ چاہے دنیا بھوکی مرجائے۔

محمود :۔ آج ہر انسان کا فرض ہے خواہ وہ ہندو ہو خواہ مسلمان کہ جو کچھ بھی وہ بنگال کیلئے کرسکتا ہے کرے۔ جو شخص دو وقت کھاتا ہے وہ ایک وقت کھائے اور اپنے بھوکے بھائیوں کو موت کے چنگل سے بچائے۔

(محمود پھر کراہنے لگتا ہے)

روپا :۔ تمہارا بخار اور کچھ کم ہوجائے تو میں تم کو کامریڈ مکرجی کے گھر پہنچا دونگی۔ اور پھر میں کام پر چلی جاؤنگی۔

محمود :۔ مجھے بھی تو بہت کام کرنا ہے روپا

روپا :۔ نہیں تمہاری طبیعت بہت خراب ہے

(محمود کو کھانسی اٹھتی ہے)

محمود :۔ روپا! ـــــ میری چار دن کی زندگی ہے۔ اس وقت کو کیوں بیکار کروں۔ اپنے ملک ہی کو کچھ فائدہ پہنچ جائے۔ اور یہ وقت تو ایسا ہے کہ انسان اپنی زندگی کا آخری سانس تک اپنے ملک کی حفاظت پر صرف کردے۔

(روپا کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں)

محمود :۔ روپا پریشان نہ ہو وہ دیکھو سامنے کس طرح بھوکے تڑپ رہے ہیں ہم ان کیلئے کیا کچھ نہ کرڈالیں۔ سامنے بھوک سے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ وہ لوگ جو لوہے کے ٹکڑوں کو بآسانی اٹھا لیتے تھے۔ آج زمین پر ہاتھ پیر رگڑ رہے ہیں۔ "روٹی۔ روٹی" ـــــ کی ہلکی ہلکی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ کتے اچھلتے کودتے ان کے اوپر سے گزر رہے ہیں۔ لیکن ان کے ہاتوں میں اتنی طاقت نہیں کہ ان کو ہٹا سکیں۔ روپا ان سب پر نظر ڈالتی ہے اور ایک ٹھنڈی سانس بھر کر سر کو گھٹنوں پر رکھ لیتی ہے۔

روپا :۔ آج رات میں مجھے چاول اکٹھا کرنا ہے۔ کل صبح یہاں ایک عوامی لنگر خانہ کھلنا چاہیئے۔

محمود :۔ ہاں ـــــ اس طرح ہندو مسلمان سب ہی کو فائدہ پہنچے گا۔ اور بھوکوں کی ایک بڑی تعداد موت سے بچ جائیگی ـــــ اچھا اب ہمیں چلنا چاہیئے۔

روپا :۔ لیکن تم کیسے جاؤگے ؟

محمود :۔ میں ابھی چل سکتا ہوں روپا ـــــ اور پھر صبح جب یہ لوگ کھانا کھائیں گے تو میں بالکل تندرست ہو جاؤنگا۔

(کھانستا ہے)

(محمود اور روپا کندھوں پر بوریاں ڈال کر چل دیتے ہیں)

محمود :۔ روپا کوئی گیت سناؤ۔

روپا :۔ اچھا

(روپا گارہی ہے اور دونوں چلے جارہے ہیں)

پانچواں ایکٹ ـــــ دوسرا سین

(محمود کی والدہ ریڈیو بجا رہی ہیں)

سعادت علی خاں اور ابو المنصور صفدر جنگ نے اُس زمانے کی تاریخ میں اتنا زیادہ حصہ لیا ہے کہ ان کے حالات لکھنے سے ایک کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ سعادت خاں برہان الملک نے مرہٹوں کے خلاف جنگ کرکے پایۂ تخت کو مرہٹہ گردی سے بچایا اور پھر نادر شاہ کے مقابلہ میں کرنال کی جنگ میں امیر الامراء کی مدد کو پہنچ کر غیر معمولی مردانگی و دلیری کا ثبوت دیا۔ سعادت خاں کی وفات پر صفدر جنگ اس کا جانشین ہوا۔ احمد شاہ کی تخت نشینی پر نظام الملک آصف جاہ کی وفات کے بعد ابو المنصور کو خلعت وزارت عطا ہوا اور جملۃ الملک، مدار المہام وزیر الممالک برہان الملک المنصور خاں بہادر صفدر جنگ سپہ سالار کے خطاب سے سرفراز فرمایا گیا۔ علی محمد خاں رُہیلے نے جو بنگش کے پٹھانوں کا سردار بن گیا تھا رہیلکھنڈ پر قبضہ کر لیا تھا۔ صفدر جنگ اسکو پسند نہ کرتا تھا۔ اس لئے علی محمد خاں کے مرنے کے بعد پہلے قائم خاں والئ فرخ آباد کو بنگش کے بیٹے سعد اللہ خاں سے بھڑوا دیا جب قائم خاں اس جنگ میں مارا گیا تو صفدر جنگ نے رہیلکھنڈ پر حملہ کر دیا۔ محمد علی خان بنگش کی بیوی نے ۴۵ لاکھ روپے دیکر صلح کر لی۔ مگر اُس کو نظر بند کر لیا گیا اور اسکے پانچ بیٹوں کو دلی لاکر قتل کر دیا گیا۔ صرف ایک احمد خاں بچ گیا جسکی لڑائی صفدر جنگ کے نائب نول رائے سے ہوئی۔ نول رائے مارا گیا۔ اور احمد خاں کی فتح ہوئی۔ اس سلسلے میں موتی والوں کے پاس جو **بنگش کا کمرہ** ہے اس کا حوالہ غیر ضروری نہ ہوگا یہ اسی خاندان کا جائے قیام تھا۔ ان کی جان نثار فوج کے فرد چیلے کہلاتے تھے چنانچہ بنگش کے کمرے کے پاس **چیلوں کا کوچہ** ہے۔ جہاں کبھی بنگش کے باڈی گارڈ رہتے ہونگے۔ صفدر جنگ نے ابدالی کے حملہ کے وقت بھی بادشاہ کی مدد کی۔ مگر بعد میں احمد شاہ صفدر جنگ سے ناراض ہوگیا اور عہدۂ وزارت انتظام الدولہ ولد قمر الدین خاں کے سپرد کیا۔ صفدر جنگ نے ایک نامعلوم شخص کو تخت کا دعویدار کرکے احمد شاہ سے جنگ کی۔ مگر جانبین جب لڑتے لڑتے تھک گئے تو صلح ہوگئی اور صفدر جنگ کو صوبہ اودھ اور الہ آباد پر بحال کر دیا گیا۔ اپنے صوبہ میں پہنچنے کے تھوڑے عرصہ بعد بمرض سرطان راہی ملک بقا ہوا۔

قاضی کے حوض سے اجمیری دروازے کی طرف جاتے ہوئے دائیں ہاتھ کو جہاں اب تانگوں کا اڈہ اور ڈاک خانہ ہے۔ پہلے ایک ٹوٹا پھوٹا دروازہ تھا اس کے اندر ایک محلہ تھا جسے **رجنا بیگم کی حویلی** کہتے تھے۔ اس کے مقابل سڑک کے دوسری طرف بھی ایک پھاٹک تھا جہاں اب سنیما ہے۔ یہ پھاٹک **فتح النساء بیگم کی حویلی** کا تھا۔ اجمیری دروازے کی طرف چلتے ہوئے ذرا آگے بڑھکر دائیں [illegible]

حویلیاں موسوٰیہ الممالک نواب قمر الدین خاں کی تین بیٹیوں کی تھیں [illegible] کا اصلی نام رضیہ بیگم تھا۔ ان کی پشت پر ان حویلیوں سے ملحق نواب قمر الدین کی حویلی تھی۔ اور ان سب حویلیوں کو زمین دوز سرنگیں ملاتی تھیں۔ قمر الدین خاں کی حویلی ایک زمانہ گذرنے پر بدل بیگ خاں کے حویلی۔ [illegible] شاہ عالم ثانی کے زمانے میں سمرقند سے آئے تھے اور نواب امیر الامراء نجف [illegible] کی فوج میں رسالدار تھے۔ ترکی جنگ کہلاتے تھے۔ اسی حویلی کے متصل اور حویلی ہے جس کے دروازے کے متصل اب ایک سنیما تعمیر ہو گیا ہے۔ یہ **حکیم احسن اللہ خاں کی محلسرائے** کہلاتی تھی۔ اب نواب ابو الحسن [illegible] کے تصرف میں ہے۔ حکیم احسن اللہ خاں کے بزرگ ہرات سے ہندوستان آئے تھے کیونکہ وہاں کے گورنر سے اُن کی ان بن ہوگئی تھی۔ طبابت خاندانی نہ تھا۔ صرف ان کے والد نے ضرورتاً اختیار کیا تھا۔ حکیم صاحب موصوف اکبر شاہ ثانی کے طبیب تھے اور ان کو عمدۃ الملک حاذق الزمان کا خطاب [illegible] بہادر شاہ ثانی نے اُن کی مزید عزت افزائی کی اور احترام الدولہ صاحب جنگ کے خطاب کا اضافہ کیا۔ ابتدا میں یہ حویلی اور بدل بیگ خاں دونوں نواب قمر الدین خاں کی حویلی میں شامل تھیں۔ نواب موصوف اپنی حویلی کے لئے جگہ گھیرنے میں اور پڑوس کے غریبوں کی زمین حاصل کر لینے کی وجہ سے بہت بدنام ہوگئے تھے۔ ان حویلیوں کا سلسلہ سڑک والان اور قاضی حوض سے لیکر اجمیری دروازے تک پھیلا ہوا تھا۔ وزیر الممالک اعتماد الدولہ قمر الدین خاں بہادر نصرت جنگ کے والد اعتماد الدولہ محمد امین خاں تھے اور ان کے دادا [illegible] تھے۔ میر جملہ کا نام تاریخ ہند میں مشہور ہے۔ دکن کی سلطنتوں میں انہوں نے عروج پایا اور پھر اورنگ زیب کی رفاقت میں بہت کارنمایاں کئے۔ محمد [illegible] کو اورنگ زیب نے دکن کی صوبہ داری کے زمانے میں اپنا وکیل مقرر کرکے شاہ [illegible] بھیجا تھا۔ فرخ سیر کے زمانہ میں قطب الملک کی مہربانی سے ہفت ہزاری اور سید برادران کے خاتمے کے بعد محمد شاہ نے ان کو امیر الامراء کے عہدہ پر ممتاز کر دیا۔ قمر الدین خاں باپ کی زندگی میں بخشی سوم و داروغہ غسل خانہ [illegible] آصف جاہ کے استعفیٰ دینے پر وزیر بنایا گیا۔ احمد شاہ ابدالی کی جنگ بمقام سرہند بندوق کا نشانہ بنا۔

حکیم احسن اللہ خاں کی حویلی کے سامنے ایک پھاٹک ہے جس پر **حویلی عبد الرحمٰن خاں** کندہ ہے۔ یہ عبد الرحمٰن خاں بہادر شاہ کو قرآن شریف پڑھانے پر ملازم ہوئے تھے مشہور شاعر تھے۔ امتحان [illegible]

ریڈیو کی آواز :۔ بنگال میں قحط پڑا ہے۔ ہر ایک ہندوستانی کا فرض ہے کہ
کام کرنا چاہیے۔ خوشحال گاؤں اور شہروں میں چندہ جمع کرنا چاہیے۔
ملک کی حالت روز بروز نازک ہوتی چلی جا رہی ہے۔ محبان وطن کو چاہیے
کہ اپنے کھانے میں سے آدھا بچا کر بنگال کے بھوکوں کی مدد کریں۔

بیگم صاحبہ :۔ (خود سے) یہ تو وہی کہہ رہا ہے جو میرا محمود کہا کرتا تھا ——
بنگال کے بھوکوں کی مدد کرو۔ محمود بھی یہی کہتا تھا۔ وہ ان کے لئے جگہ
جگہ سے روپیہ اکٹھا کرتا پھرتا تھا۔ اس دن جب وہ آیا تھا تو تین دن
سے سویا بھی نہیں تھا۔

(نوکر آتا ہے)

نوکر :۔ ڈپٹی صاحب کا ملازم آیا ہے۔ آج شام کو ڈپٹی صاحب کی بیگم صاحبہ
تشریف لائینگی۔

بیگم صاحبہ :۔ نہیں —— اس سے کہدو کہ بیگم صاحبہ کہیں باہر گئی ہوئی ہیں۔

(نوکر چلا جاتا ہے)

بیگم صاحبہ :۔ یہ عورتیں آ آ کر مجھے پریشان کرتی ہیں —— جانے آنے سے
ان کی طبیعت بھی تو نہیں گھبراتی۔

(کرسی سے اٹھکر چارپائی پر آکر بیٹھ جاتی ہیں)

یہی تو ہے کہ میرا دل سکھی نہیں محمود —— میرا محمود کہیں چلا گیا۔ میں
اکیلی بیٹھی سوچا کرتی ہوں۔ مجھے اسی میں سکون ملتا ہے۔ اور انہیں ——
انہیں کون سا غم ہے۔ جو میری طرح ملنے جلنے سے جان چرائیں۔

(نوکر پھر آتا ہے)

نوکر :۔ انہوں نے پوچھا ہے کہ بیگم صاحبہ کب تک آ جائیں گی ؟

بیگم صاحبہ :۔ کہہ دو معلوم نہیں۔

(نوکر چلا جاتا ہے)

(نواب صاحب آ جاتے ہیں)

نواب صاحب :۔ کیا سوچ رہی ہو ؟ —— بیگم !

بیگم صاحبہ :۔ کیا سوچتی رہی ایک بیراگ ہے۔ دن رات اسی میں لگی رہتی ہوں۔

نواب صاحب :۔ باپ کا غصہ اس کو اتنا بُرا معلوم ہوا —— اسی وقت چلا
گیا اور پھر آج تک نہ آیا۔ دروازہ کو تکتے تکتے آنکھیں پتھرا گئیں۔

بیگم صاحبہ :۔ اولاد ماں باپ کی ممتا کو کیا جانے۔ ماں باپ غصہ کرتے ہیں تو
کوئی بُرے دل سے تھوڑا ہی۔

نواب صاحب :۔ کاش اسکو معلوم ہوتا کہ اس کی صورت دیکھنے کیلئے اسکے ماں
باپ پاگل ہو رہے ہیں۔

بیگم صاحبہ :۔ معلوم نہیں اس کو کھانے کو بھی ملتا ہے یا نہیں۔

نواب صاحب :۔ نہ جانے کس حال میں ہوگا —— کہاں ہوگا —— ہم روٹی
کھاتے ہیں نہیں معلوم اس کو بھی ملتی ہے یا نہیں۔

بیگم صاحبہ :۔ جہاں بھی وہ ہو خدا اس کی مدد کرے —— وہ نیک کام کرنے
گیا ہے۔ ہزاروں جانیں اس نے بچائی ہونگی۔ خدا اس کی جان کی
حفاظت کرے۔

نواب صاحب :۔ مخلوق خدا کی بھلائی کے لئے اس نے اپنے ماں باپ سے
بھی منہ موڑ لیا۔ اب تو بس ایک ہی آرزو ہے کہ محمود کی صورت دیکھ
لیں۔ چاہے اگلے دن ہی آنکھیں مچ جائیں۔

بیگم صاحبہ :۔ تم نے کہیں پتہ بھی لگایا —— کسی سے کہا تو ہوتا۔

نواب صاحب :۔ میں نے قریب کے گاؤں میں کہلا دیا ہے۔ اب ہماری قسمت ہے۔

بیگم صاحبہ :۔ کسی طرح اس کی خیریت ہی معلوم ہو جاتی۔

نواب صاحب :۔ وہ آ جائے۔ میں سب کچھ اس کے حوالے کر دوں —— میری کتنے
دن کی زندگی ہے جو اس دولت کو سمیٹ کر بیٹھوں —— جو اس کا جی
چاہے کرے۔

بیگم صاحبہ :۔ (سوچتے سوچتے سر اٹھا کر) یہ دولت —— یہ دولت بھی کتنی
بُری چیز ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو ہمارا محمود کیوں جاتا۔

(نوکر کھانا لیکر آ جاتا ہے اور میز پر رکھ دیتا ہے۔ نواب صاحب اور بیگم صاحبہ
اٹھکر کھانے کی میز پر چلے جاتے ہیں)

نواب صاحب :۔ بیگم تم سچ کہتی ہو —— آدمی کے پاس جتنی دولت ہوتی ہے
اتنا ہی اس کا دل سخت ہوتا ہے۔ غریب کے پاس اگر ایک روٹی ہوتی
ہے تو وہ آدھی دوسرے کو دیتا ہے۔ مگر ہمیں سے ایسا نہیں ہوتا ہم
جانتے ہیں کہ ہمارا ملک مصیبت میں مبتلا ہے لیکن ہم نے اپنی دولت میں
سے ایک پیسہ بھی ان کو دینا پسند نہ کیا۔ جو مہینوں سے بھوکے مر رہے ہیں
یہاں تک کہ محمود نے اپنی جان لگا کر ان بھوکوں کی مدد کی۔ لیکن ہمیں وہ
بھی گوارا نہ ہوا۔

بیگم صاحبہ :۔ کل کچھ لوگ چندہ مانگنے آئے تھے —— شاید محمود ہی کی
پارٹی کے ہونگے ؟

نواب صاحب :۔ ہاں —— وہ بھوکوں کی مدد کیلئے کچھ روپیہ لینے آئے تھے۔

بیگم صاحبہ :۔ تو تم نے کچھ دیدیا تھا ؟

یہ باہمی دروازے کے اندر مرزا مغل بیگ خاں کی حویلی تھی جو بہادر شاہ ثانی کے خاص مقربین میں سے تھے۔ اس کوچہ سے آگے بڑھ کر ایک عمارت ہے جو زینت محل کہلاتی ہے۔ یہ عمارت بہت پرانی نہیں ہے۔ یہ بہادر شاہ ثانی نے جن کا تخلص ظفر تھا اپنی چہیتی بیوی زینت محل کے لئے ۱۲۸۲ھ میں بنوائی تھی اس کی یہ تاریخ خود بادشاہ نے کہی تھی جو اب تک دروازے پر کندہ ہے۔

کرد ظفر زینت محل تعمیر قصر بے بدل
شد بے محل سال بنا این خانۂ زینت محل

زینت محل نے بہادر شاہ کے زمانے کی سیاسیات میں معتد بہ حصہ لیا تھا۔

شہر میں ایک حویلی تاریخی اعتبار سے اور قابل ذکر ہے۔ جامع مسجد سے سوئی والوں جاتے ہوئے ایک دروازہ ہے جو اعظم خاں کی حویلی کے نام سے موسوم ہے۔ اس کے اندر ایک جگہ بارہ دری اعظم خاں اور دوسری جگہ نواب اعظم خاں کہلاتے ہیں۔ اعظم خاں عمدۃ الملک نواب امیر خاں کا بیٹا تھا ان کے مورث اعلیٰ میر میران کے لقب سے مشہور تھے۔ شاہ عباس کے عہد میں ایران چھوڑ کر ہندوستان میں آئے۔ جہانگیر کے عہد سے اس خاندان میں دولت و امارت اخیر وقت تک قائم رہی۔ عمدۃ الملک کا باپ عالمگیر کے زمانے میں کابل کا صوبہ دار تھا۔ عمدۃ الملک کی نواب قمر الدین خاں اور نواب آصف جاہ سے سخت رقابت تھی ۱۱۵۹ھ میں ایک شخص نے قتل کر دیا۔ مصنف سیر المتاخرین لکھتے ہیں کہ یہ شخص اپنے عہد میں بے نظیر تھا۔ شجاعت و سخاوت، فہم و فراست و دانائی میں بے مثل تھا۔ علماء و عظام و مشائخ ایک طرف اور سپاہی و شاعر و گویے سب ہی اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ شعر ہندی و فارسی میں خوب کہتا تھا۔ بذلہ سنجی و نکتہ گوئی میں اپنا مثل نہ رکھتا تھا۔ ان کے بیٹے نواب اعظم خاں نے سیاسیات میں بالکل حصہ نہیں لیا ساری عمر عیش کوشی میں گزاری۔ ان کا گھر صحیح معنوں میں عشرت کدہ تھا۔ جہاں دن رات عیش و عشرت کا سماں رہتا تھا۔ سارے شہر کے حسینان پری تمثال اور ماہرو فن بے مثال یہاں جمع رہتے تھے اور صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک عشاق بھی پروانہ وار ان پر نثار ہوتے رہتے تھے۔ نواب اعظم خاں بھی اپنے باپ کی طرح ہمہ صفت موصوف تھا۔ سخاوت و مہمان نوازی میں اپنے زمانے کا حاتم تھا۔ غرضکہ اللہ کے بندے نے ساری عمر اسی طرح عیش و آرام سے گزاری۔ نواب اعظم خاں کا مفصل حال مرقع دہلی میں درج ہے۔ اعظم خاں کی وہ بارہ دری جس کے اندر کا اکھاڑہ بنی رہتی تھی اب چھوٹے چھوٹے مکانوں میں تقسیم ہو گئی ہے اور ایک ساہوکار کی ملکیت ہے۔

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

بغاوت

از
محترمہ نواب سیدہ اختر حیدرآبادی

نہیں جز اپنے کسی کی بھی ضرورت مجھ کو
میں محبت کو ہوں محبوب محبت مجھ کو

اب میں اس عالمِ امکاں سے بہت ہوں بیزار
کرۂ ارض کے انساں سے بہت ہوں بیزار
رسمِ دیرینۂ یزداں سے بہت ہوں بیزار

خالقِ دیر و حرم سے ہے بغاوت مجھ کو
نہیں جز اپنے کسی کی بھی ضرورت مجھ کو

میرے پہلو میں ہے دل، دل میں تمنا لاکھوں
میں وہ ذرہ ہوں کہ گم مجھ میں ہیں صحرا لاکھوں
قطرہ ہوں مجھ میں مگر غرق ہیں دریا لاکھوں

اپنی معلوم ہے سب اصل حقیقت مجھ کو
نہیں جز اپنے کسی کی بھی ضرورت مجھ کو

اب کوئی لطفِ غمِ عشق کی آہوں میں نہیں
حسن کے ارض و سما کچھ بھی نگاہوں میں نہیں
منزلِ زیست مرے شوق کی راہوں میں نہیں

جب سے معلوم ہوئی قلب کی وسعت مجھ کو
نہیں جز اپنے کسی کی بھی ضرورت مجھ کو

وہ دل میں مرے ہے کہ مدا و ابجد!
شاعرہ ہوں مرے افکار کی دنیا بیجد!

میرے احساس میں ہے قید تمنا بیجد!
خود سے ملنے کی بھی ملتی نہیں فرصت مجھ کو
نہیں جز اپنے کسی کی بھی ضرورت مجھ کو

کیا بتاؤں کہ ہر اک شعر مرا بین ہے کیا؟
زندگی ہے غم و اندوہ و خلش! چین ہے کیا
تاج کیا؟ تخت ہے کیا؟ دولتِ کونین ہے کیا

صرف کافی ہے مرا دردِ محبت مجھ کو
نہیں جز اپنے کسی کی بھی ضرورت مجھ کو

دیر کیا؟ کعبہ ہے کیا؟ مجھکو لبھاتا نہیں کچھ
کیا کہوں؟ میری نگاہوں میں سماتا نہیں کچھ
اللہ اللہ! خدا بھی نظر آتا نہیں کچھ

اپنا جس دن سے ہے عرفانِ حقیقت مجھ کو
نہیں جز اپنے کسی کی بھی ضرورت مجھ کو

زندگی اک "شئے معدوم" ہے مجھ کو اختر
شاعری جذبۂ معصوم ہے مجھ کو اختر
کون دے داد؟ کہ معلوم ہے مجھ کو اختر

اپنے بے ساختہ اشعار کی قیمت مجھ کو
نہیں جز اپنے کسی کی بھی ضرورت مجھ کو

پنڈت جواہر لال نہرو

(از فصیح الدین احمد)

پنڈت جواہر لال نہرو کی خود نوشت سوانح عمری نے اُن کے حالات اور واقعات زندگی کو کافی سہل بنا دیا ہے۔ اس لئے جو شخص ان کے حالات زندگی لکھنے کا قصد کرتا ہے وہ قدرتاً اُن کی سوانح عمری پر بیشتر انحصار کرتا ہے

اُن کی خود نوشتہ سوانح عمری بہت کامیاب اور بہت مقبول ثابت ہوئی ہے۔ یہ کتاب لندن میں ۱۹۳۶ء میں شائع ہوئی اور اُسی سال اگست تک اس کے آٹھ ایڈیشن شائع ہو کر ہاتھوں ہاتھ بک گئے۔ یہ ابتدائی فروخت انگلستان میں ہوئی اور وہیں اُن کی سوانح عمری نے شہرت حاصل کی۔ بعد میں ہندستان میں بھی یہ کتاب بڑی کثرت سے فروخت ہوئی۔ اب بھی برابر یہ کتاب مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر برابر بک رہی ہے۔ اس کتاب کی اتنی مقبولیت کی دو وجوہات ہیں اوّل تو نہایت صفائی کے ساتھ تمام واقعات کا بے کم و کاست بیان کرنا اور دوم کہانی کے فن پر اچھی طرح قابو میں رکھنا۔ اُن کو بڑی سہولیت یہ تھی کہ کالج اور یونیورسٹیوں کے طلباء کے سامنے وہ اپنی زبان میں بڑی فصاحت کے ساتھ اُن کی اپنی تشبیہوں اور استعاروں میں لیکچر دیتے تھے۔ پنڈت جی کی تحریر بھی اُنکے ناظرین کے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہوتی تھی۔ اُنہوں نے انگریزوں کو وہ سب ان کی اپنی زبان میں نہایت فصاحت کے ساتھ بتا دیا جو وہ ہندستان کے متعلق معلوم کرنا چاہتے تھے اُن کے انکشافات سے اہل انگلستان کو معلوم ہو گیا کہ ہندستان صرف ایک سادھوؤں اور صوفیوں ہی کا ملک نہ تھا بلکہ یہاں بھی اُن ہی جیسے انسان صفت آدمی آباد تھے۔ اور جن کے پیٹ کو روٹی، تن کو کپڑے کی ضرورت لاحق تھی۔

ایک انگریز سول سروس کا آدمی جب پہلی بار انگلستان سے ہندستان آ رہا تھا تو اُس نے اُن کی کتاب سوانح عمری پڑھنے کے بعد جو رائے ظاہر کی وہ یہ تھی کہ "جواہر لال وہ شخص ہیں جن کو ہم سمجھ سکتے ہیں۔ وہ بھی ہمیں جیسا انسان ہے اور ہماری اپنی زبان میں ہم سے باتیں کرتا ہے۔"

غالباً اس کتاب سے جو تبدیلی مغربی دنیا میں ہندستان کے نظریہ کے مطابق پیدا ہوئی وہ ہندستان کی سالہا سال کی سیاسی جد و جہد سے بھی پیدا نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن اس کتاب کی اشاعت کے کچھ ہی عرصہ بعد یورپ میں بربادی کی جو لہر دوڑ گئی تھی اُس کے ہوتے ہوئے کسی اچھے سے اچھے انگریز سے بھی یہ توقع نہ ہو سکتی تھی کہ وہ بجز اس کے کہ اس وقت ہمیں ہندستان کے معاملات پر غور کرنے کی فرصت نہیں اور کچھ نہ کہہ سکے گا۔ لیکن بالآخر ہندستان کا معاملہ اپنی پوری اہمیت کے ساتھ پھر انگریزوں کے سامنے آئے گا۔

ہمیں اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیئے کہ پنڈت جی نے اپنی سوانح عمری میں جو تصاویر شائع کی ہیں وہ بھی اس کے ناظرین کے لئے معنی سے لبریز ہیں۔ مثلاً اُن کے والد پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی کی تصویر۔ جو اپنے بلے کھادی کے کرتے میں کسی رومن امپرر کی شبیہہ معلوم ہوتے ہیں۔ خود اُن کی اپنی تصویر جس میں اُن کے اپنے کشمیری خد و خال نہایت صفائی اور ستھرائی کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ اُن کی والدہ، بیوی اور بہن کی تصویریں جن میں صنفی نزاکت کے ساتھ ساتھ خُلق، انکساری اور اولوالعزمی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ یہ سب تصویریں مل جل کر بجائے خود ایک کہانی بن جاتی ہیں۔ ہر انگریز جس نے ان کی کتاب کو پڑھا ہے وہ اپنے دل میں ضرور اس بات پر پشیمان ہوتا ہے کہ اس قسم کے آدمیوں کو بھی اپنے اظہار خیالات کی پاداش میں جیل جانا پڑتا ہے۔ اس لئے ان تصویروں میں ایک درد بھری کہانی پوشیدہ ہے۔ اور یہ ظاہر ہو گیا ہے کہ ہندستان کے حالات خوشگوار نہیں ہیں۔ اِن حالات نے انگلستان کی عورتوں پر جنہوں نے ابھی حال ہی میں کافی جد و جہد کے بعد اپنے سیاسی حقوق حاصل کئے تھے کافی اثر ڈالا ہے۔

پنڈت جواہر لال نہرو کے ایک سخت مخالف نے جو یو پی کا ایک بہت بڑا ذمہ دار آفیسر تھا اُن کے متعلق یہ بات کہی کہ "نوجوان نہرو کے بالشویک اور سوشلسٹ اصولوں کے متعلق ہماری رائے کچھ بھی کیوں نہ ہو لیکن بحیثیت چیرمین الہ آباد میونسپلٹی جس عمدہ انتظامی قابلیت کا اُنہوں نے ثبوت دیا ہے وہ قابلِ صد تحسین ہے۔" ان کی عملی قابلیت کا سکہ اُن کے مخالفین کے دلوں پر بھی بیٹھ گیا تھا۔ نیز وہ لوگ اُن کی صاف گوئی اور نیک باطنی کے بھی مداح ہیں جس کی بدولت یہ اپنی یا دوسروں کی خامیوں کا اعتراف کرنے میں کبھی پس و پیش نہیں کرتے۔ اُن کی خصوصیت ہر جگہ سراہی جاتی ہے۔

اپنے ہم وطنوں میں اُن کے جاں نثاروں کی تعداد کروڑوں تک پہنچ چکی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو مہاتما گاندھی کے بعد جواہر لال نہرو کو معتقدانہ انداز سے دیکھتے ہیں۔ اُن کی انتہائی دیانت داری نے اُن کو ہر جگہ ہر دلعزیز بنا دیا ہے لیکن یہ امر بھی واضح رہے کہ اُن میں عوام کے ساتھ مصیبتیں جھیلنے کا جذبہ ہر وقت

...... کی یاد میں

از
محترمہ اختر قریشی بی، اے۔ بی، ٹی

جی رہی ہوں گو مرا دل زیست سے بیزار ہے
اک تسلسل مرگ ہے، اک مستقل آزار ہے

اک غمگیں خواب میں کھوئی ہوئی رہتی ہوں میں
جاگتے رہنے میں بھی سوئی ہوئی رہتی ہوں میں

مضمحل، افسردہ دل، غرقِ تخیل روز و شب
کس لئے ہوں غمزدہ، آشفتہ حال و جاں بلب

ہو گئی عالم کے ہنگاموں سے وحشت آہ کیوں ؟
بن گئی دوزخ، مری دنیا کی جنت آہ کیوں ؟

زندگی میں لوچ باقی اب نہ کیفِ آرزو
خشمگیں تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں چار سُو

ایک ویرانہ کنارِ آبِ جُو میرے لئے
زندگی کا گلستاں بے رنگ و بُو میرے لئے

گلستانِ عشق میں میرے بھی آئی تھی بہار
وہ لرزتے دل کی خوابیدہ تمناؤں کے تار

وہ جبیں، وہ سجدہ گاہِ آفتاب و ماہتاب
وہ جوانی، آہ وہ گہوارۂ شعر و شباب

صبح کی نورانیت، خورشید کی پہلی کرن
کھل رہی تھی صبحدم یا گلستاں میں نسترن

گا رہی تھی زندگی کے گیت دل کے ساز پر
جھومتے تھے دو جہاں ہر تان ہر آواز پر

چاندنی راتوں میں ہم دونوں کے نغماتِ جواں
ایک نکتے پر سمٹ آئی تھیں سب رنگینیاں

وائے قسمت گلستاں سے ہو گئی رخصت بہار
ہو گئے سارے شکستہ بربطِ اُلفت کے تار

عشق کے رنگیں چمن میں آ گئی اک دم خزاں
یک بیک تاریک نظروں میں ہوا سارا جہاں

چھپ گیا نظروں سے میری ماہتابِ زندگی
توڑ ڈالا دستِ گردوں نے ربابِ زندگی

اب تو میں ہوں اور اُن گذرے دنوں کی یاد ہے
نغمہ خوانِ زندگی بیزار دل برباد ہے

"کون ہو تم"

(از محترمہ ساجدہ بنت دانش شاہجہانپوری)

آبشاروں کے ترنم میں نہاں کون ہو تم
گوشِ احساس میں فردوس نشاں کون ہو تم

روپ میں انجمِ افلاک کے، ملبوسِ ضیا
چشمِ دل کیلئے حیرت کا سماں کون ہو تم

بادۂ عشق سے سرشار دلِ اہلِ نظر
دافعِ کشمکشِ سود و زیاں کون ہو تم

راز در راز ہے گلشن کی حقیقت اب تک
گل کے پردہ میں یہاں خندہ دہاں کون ہو تم

قلبِ عاشق ہے ہر اک گام پہ کیوں وجد کناں
باعثِ مژدۂ اندوہ و فغاں کون ہو تم

روح سرمستِ مئے نغمۂ لاہوت ہے آج
بربطِ قلب پہ مضراب زناں کون ہو تم

اب تو لو دینے لگا میرا ہر اک موئے بدن
قطرۂ اشک میں یوں شعلہ فشاں کون ہو تم

کس تخیل میں خدا جانے ہے قمری بیتاب
قامتِ سرو کے پیکر میں نہاں کون ہو تم

ساجدہ دیر و حرم کیا ہیں نظر کی تنگی
کہ یہاں کون ہو تم اور وہاں کون ہو تم

غزل

منانے کے لئے آ

(از محترمہ عشرت سلطان صاحبہ)

یوں بھی تیرا احسان ہے، آنے کے لئے آ
اے دوست کسی روز نہ جانے کے لئے آ

ہر چند نہیں شوق کو یارائے تماشا
خود کو نہ سہی مجھ کو دکھانے کے لئے آ

یہ عمر، یہ برسات، یہ بھیگی ہوئی راتیں
ان راتوں کو افسانہ بنانے کے لئے آ

جیسے تجھے آتے ہیں نہ آنے کے بہانے
ایسے ہی بہانے سے نہ جانے کے لئے آ

پابندِ محبت ہے ہر اک لمحۂ رفتہ
یہ فلسفۂ عشق سنانے کے لئے آ

مرنا مجھے منظور، جلانا تجھے منظور
اس زیست کا مفہوم بتانے کے لئے آ

مانا کہ محبت کا چھپانا ہے محبت
چپکے سے کسی روز جتانے کے لئے آ

تدبیر بھی مجبور ہے، تقدیر بھی مجبور
ان کہنہ عقائد کو مٹانے کے لئے آ

رخ پہ شفق، دامنِ مژگاں پہ ستارے
یوں عشق کی توقیر بڑھانے کے لئے آ

عشرت کو یہ کیا علم، ستم ہے کہ کرم ہے
اک روز اسی طرح منانے کے لئے آ

پردۂ سیمیں

از فصیح الدین احمد۔ ایم، اے

فلمی خبریں

(۱) منروا موویٹون پبلک کے سامنے کئی معیاری فلم پیش کر چکی ہے اس فلم کمپنی کے تیار کئے ہوئے بعض فلم بلاشبہ تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان دنوں مشہور و معروف ڈائرکٹر اور ایکٹر مسٹر سہراب مودی ایک اور تاریخی فلم پرتھوی ولبھ کی تیاریوں میں مصروف ہیں یہ فلم بڑے عظیم الشان انتظامات کے ساتھ تیار ہوا ہے اور ہر حیثیت سے ایک معیاری فلم ہے فلم کی کہانی ملک کے مشہور ماہر قانون سیاست دان اور ادیب مسٹر کے، ایم منشی کے ایک مشہور ناول سے لی گئی ہے۔ اس ناول کا نام بھی "پرتھوی ولبھ" ہے۔ مکالمے ملک کے مشہور ادیب مسٹر سدرشن نے لکھے ہیں جو سماجی کہانیاں لکھنے والوں میں ایک بلند درجہ رکھتے ہیں۔ پھر سونے پر سہاگہ خود مسٹر سہراب مودی کی اداکاری اور ڈائرکشن ہے۔ ان تمام باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فلم ایک نہایت کامیاب اور مقبول فلم ثابت ہوگا۔

(۲) راج کمل کلامندر کے زیر اہتمام ملک کے مستند ڈائرکٹر مسٹر شانتارام نے جو فلم **شکنتلا** کے نام سے پیش کیا ہے وہ آج بھی بے شمار شائقین کے لئے باعث دلچسپی ہے۔ ڈرامہ شکنتلا "کالی داس" کا وہ کارنامہ ہے جس کی عظمت ہندوستان کے باہر بھی تسلیم کی جا چکی ہے۔ اور اس ڈرامہ کی بنیاد پر کالی داس کا نام دنیا کے چند گنے چنے لکھنے والوں میں لیا جاتا ہے۔ ضرورت تھی کہ ایسے عظیم الشان ڈرامہ کو اور ایک ایسے بلند کردار کو فلم میں پیش کیا جائے۔ چنانچہ مسٹر شانتارام نے جو ہندوستانی اور مغربی فلموں کی تکنیک میں ماہر ہیں، اسے ایک شاندار فلم کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔

یہ فلم میجسٹک سنیما دہلی میں پبلک کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اتنا عرصہ گذر جانے کے بعد بھی دیکھنے والوں کا شوق کم نہیں ہوا ہے۔ ہال آج بھی کھچا کھچ بھرا رہتا ہے۔

(۳) نیو تھیٹرز کے نام کے ساتھ آج بھی دلوں میں کیسے اچھے اچھے فلموں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اس کمپنی نے جو فلم پبلک کے سامنے پیش کئے ہیں، ہندوستان کی فلمی دنیا میں مدتوں یاد کئے جائیں گے اب کے اس کمپنی نے خاص اہتمام کے ساتھ ایک فلم **واپس** تیار کیا ہے۔ اس فلم کی روح رواں مقبول اور ہر دلعزیز ہیروئن بھارتی ہیں۔ اور اداکاروں میں نواب۔ اشیت برن۔ اور لتکا جیسی ہستیاں نظر آتی ہیں۔ کہانی مسٹر بنلے بنرجی کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اور میوزک مشہور و معروف مسٹر بورل کا کارنامہ ہے۔ اس فلم کے ساتھ عظیم الشان توقعات وابستہ ہیں۔

(۴) رامنک پروڈکشن کے زیر اہتمام مشہور و معروف ڈائرکٹر مسٹر جی جاگیردار نے ایک نہایت کامیاب فلم **گرن** کے نام سے پیش کیا ہے اس فلم میں کہانی اور گانے دونوں اپنی اپنی جگہ مخصوص دلکشی رکھتے ہیں۔ اس فلم میں مشہور و ہر دلعزیز ہیرو اشوک کمار اور مقبول ہیروئن لیلا چٹنس نے اداکاری کا کمال پیش کیا ہے۔ یہ دونوں ہستیاں عوام میں جو مقبولیت رکھتی ہیں اس کو دیکھتے ہوئے فلم کی کامیابی میں کیا شبہ رہ جاتا ہے۔

(۵) پردھان پکچرز ان دنوں اپنی اولین پیشکش داسی کی تیاریوں میں مصروف رہی۔ اس فلم میں ہندوستان کے بعض مشہور اداکار اپنے کمالات کا ثبوت دے رہے ہیں۔ جن میں رانگنی نجم الحسن، گیانی اور کاروزی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس وقت فلم تکمیل کی آخری منزل میں ہے۔ اس فلم کے ساتھ بہت خوشگوار توقعات وابستہ ہیں۔

(۶) چترا پروڈکشنز نے ایک نہایت کامیاب فلم پرتگیا کے نام سے پیش کیا ہے۔ کمپنی کے ارباب حل و عقد نے اس

پر نامور مشہور اداکاروں کے انتخاب میں پوری خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے۔ اس فلم کی روحِ رواں مسٹر ہیمو رام۔ سورن لتا۔ بیبی مینا اور دیگر کاسٹ ہیں۔ یہ ہستیاں فلمی دنیا میں جو شہرت و مقبولیت رکھتی ہیں ان کو دیکھتے ہوئے فلم کا کامیاب ہونا یقینی ہے۔

(۷) **بمبئی ٹاکیز لمیٹڈ** کے تیار کیے ہوئے فلم **قسمت** نے جو مقبولیت حاصل کی ہے۔ وہ فلم کی تاریخ میں یادگار رہے گی۔ یہ فلم بمبئی ٹاکیز کا وہ کارنامہ ہے جس پر کمپنی بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ اس فلم

کی مقبولیت کا عظیم الشان مظاہرہ دہلی میں ہوا۔ جوبلی ...

دھوم کے ساتھ اس فلم کی گولڈن جوبلی منائی گئی۔ کسی ... اس فلم کے ڈسٹری بیوٹروں کے لئے مایۂ افتخار ہے۔ یہ فلم اب ... کر چکا ہے لیکن شائقین کی گرم جوشی ہنوز قائم ہے۔

(۸) **پنچولی آرٹ پکچرز** کا تیار کیا ہوا فلم **خزانچی** ملک کے طول و عرض میں دھوم مچا چکا ہے۔ یہ فلم بمبئی، کلکتہ اور پشاور میں اپنی مقبولیت کا سکہ جما چکا ہے۔ لاہور سے فلم کے متعلق جو خبریں

...ہے سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کیسی بڑی دھوم سے کر مقبولیت حاصل کی ہے۔ [illegible]
...پنجاب شائقین نے اس فلم کا انتہائی گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا ہے۔ دلی
...شائقین نے بھی اس فلم کا بہت بے چینی کے ساتھ انتظار کیا ہے۔ جبکہ یہ
...فلم موتی ٹاکیز دہلی میں چل رہا ہے۔ یہاں بھی اس فلم کی مقبولیت میں کوئی
...شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس فلم میں راگنی۔ چت۔ پامرے۔ اختر اور منا
اداکاری خاص طور پر بہت پسند کی جا رہی ہے۔
...و اپروڈکشنز | کے سلسلہ میں ہندستان کے مشہور و مقبول

ڈائرکٹر اور اداکار مسٹر ہیرا [illegible]
معروف ہیں۔ اس فلم میں صرف مسٹر ہیرا نے ڈائرکٹر اداکاری کا ہی
بلکہ ریو دلاس کی مشہور ہیروئن حجانہ نے ان کا ساتھ دیا ہے
ریو دلاس میں حجانہ نے جس معیاری اداکاری کا ثبوت دیا ہے وہ کسی سے
پوشیدہ نہیں ہے۔ مسٹر ہیرا فلمی دنیا میں اداکاری اور ڈائرکشن کے لحاظ
سے ایک بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ اس فلم میں انہوں نے خاص توجہ اور انہماک کا ثبوت دیا
ہے۔ یقیناً یہ فلم خاطر خواہ مقبولیت حاصل کریگا۔

رنجیت کی عظیم الشان پیشکش

بمبئی میں [illegible]

[illegible] میں بھی

شنکر پاربتی

ڈائرکٹر
چتر بھوج دوشی

برف پوش ہمالیہ کی گود میں
ایک عظیم المرتبت مقدس کردار
الوہیت کے پیغام کے ساتھ

اس فلم میں
مشہور و معروف رقاصہ **سادھونا بوس** نے کام کیا ہے۔

دوسرے اداکار
ارون۔ کملا چٹرجی۔ برج مالا۔
بھگوان داس اور راجیندر

جاری کردہ:
دہلی ٹاکیز بیورو۔ دہلی، لاہور، کراچی

عالیجناب مسیح الملک حکیم اجمل خان صاحب کا نادر الوجود عطیہ

جباران

یہ عجیب و غریب دوا جریان کیلئے تیر بہدف ثابت ہو چکی ہے

لیکن

اس خاص مرض کے علاوہ بھی یہ تمام اعصابی اور دل و دماغ کی قوت کو بحال کرتی ہے

ناتوانی، توانائی سے، بڑھاپا جوانی سے اور مایوسی اُمید سے تبدیل ہو جاتی ہے

عضو میں تازہ خون گردش کرنے لگتا ہے

چہرے پر پُرجوش جوانی کی سُرخی جھلکنے لگتی ہے

اس کے چند روزہ استعمال سے اکثر مایوس العلاج نوجوانوں نے دوبارہ کھوئی ہوئی زندگی پائی ہے

قیمت ۳۲ قرص کی شیشی ۸؍ ہے ۔ ۶۴ قرص کی شیشی سے ؍

تار کا پتہ:- میڈیسنز دہلی

ملنے کا پتہ:- **منیجر ہندوستانی دواخانہ پوسٹ بکس ۲۵ دہلی**

ٹیلیفون نمبر ۵۵۶۶

رانی

جادو اثر ـــــ موسیقی

بے نظیر ـــــ اداکاری

خود

بروا

اور

مشہور و معروف

جمنا

نے

اپنے بہترین کمالات کا مظاہرہ

کیا ہے

اداکاروں میں

کلاوتی

اور دیگر اداکاروں کے کمالات بھی قابل دید ہیں !!

ڈائرکٹر : ـــــ **پی سی بروا**

میوزک : ـــــ **کمل داس گپتا**

جاری کردہ : **منور تخن پکچرز** ۔ دہلی ، لاہور اور کراچی

عملی شکل میں موجود رہتا ہے۔ بالخصوص یو۔پی کے دیہات میں عوام کی وفاداری انتہا کی حد تک پہنچ چکی ہے۔

پنڈت جی یو۔پی کے کسی گاؤں میں عدم تشدد پر لیکچر دے رہے تھے اثنائے تقریر میں گاؤں کے بعض چودھریوں سے یہ سوال کیا "اگر اس وقت پولیس مجھے گرفتار کرے اور ہتھکڑیاں ڈال کر لے جائے تو تم کیا کرو ؟"

"ہم سب ہلہ بول کر آپ کو فوراً چھڑا لیں گے۔"

"نہیں۔ نہیں۔ ایسا کبھی نہ کرنا۔ تمہیں چپ چاپ کھڑا رہنا چاہیئے۔"

پنڈت جی نے اُنہیں یہاں تک بتایا کہ اگر بالفرض پولیس آپ پر لاٹھیاں بھی اُٹھائے جب بھی آپ کو خاموش کھڑا رہنا چاہیئے۔ اس پر وہ لوگ چیخ اُٹھے کہ "ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔" جس کے جواب میں پنڈت جی نے کہا "مگر تمہیں برداشت کرنا ہوگا۔"

اصول اور عمل کے امتحان کا وقت وہ تھا جب یو۔پی میں ان کی اپنی معمر بسیدہ ماں پولیس کے ہاتھوں مجروح ہوئیں۔ جواہرلال اس وقت خود جیل خانے میں تھے۔ مگر انہوں نے اپنی کتاب میں اس کا اعتراف کیا ہے کہ اگر وہ اس مقام پر موجود ہوتے تو یقیناً ان کے لئے یہ وقت بڑے امتحان کا ہوتا۔

دیہاتی لوگ جس درجہ جواہرلال نہرو سے عقیدت رکھتے ہیں اس کو کاغذ پر لکھنا مشکل کام ہے۔

جب یہ پہلے پہل لندن اور کیمبرج سے ہندستان واپس آئے تو دیہاتیوں کو ان کے ملنے کے بہت کم موقعے میسر آتے تھے۔ کیونکہ یہ ایک بہت مصروف شہری اور عدیم الفرصت بیرسٹر تھے۔ لیکن جس وقت سے کہ اُنہوں نے اپنے تئیں دل و جان سے عدم تشدد کی تحریک کے لئے وقف کر دیا اور پوری وفاداری اور سچائی کے ساتھ مہاتما گاندھی کی رہنمائی قبول کی، ان کی پُرانی زندگی میں ایک انقلاب عظیم پیدا ہو گیا۔ اب دیہاتی ہر وقت اُن کے مدنظر رہنے لگے یہ دیہاتیوں کے ساتھ کام کرتے تھے، اُن کے ساتھ رہتے تھے۔ اس وجہ سے ان کی بے شمار تکالیف اور ضرورتوں کو سمجھنے لگے تھے۔ اب یہ ان سے قریب تر ہو چکے تھے۔ بلکہ اُن کے دل جیت چکے تھے۔

اُن کی اپنی کتاب میں سے ذیل میں کچھ عبارت نقل کی جاتی ہے:۔

"یہ لوگ میرے سامنے موجود تھے۔ ان کی آنکھیں چمک رہی تھیں جن میں چمک کے ساتھ ساتھ محبت بھی نظر آتی تھی۔ یہ پشتوں سے مفلسی اور افلاس سے ہم کنار تھے۔ لیکن اب بھی انکے [illegible]

وہ صرف انسانی ہمدردی اور یگانگت کے خواہاں تھے۔"

یہ صرف ان کی رہبرانہ سمجھ بوجھ اور ان رفقائے کار کی محنت کا نتیجہ ہے کہ یو۔پی میں کسانوں کی تحریک نے اس قدر منظم اور مستحکم صورت اختیار کر لی۔ صرف بہار کا صوبہ اس کے آس پاس پہنچتا ہے جہاں راجندر پرشاد نے اسی قدر اعتماد حاصل کر لیا ہے۔

پچھلے بیس بائیس برس سے جب سے کانگریس کی عنان مہاتما گاندھی کے ہاتھ میں آئی ہے تحریک میں جو عظیم تبدیلی واقع ہوئی ہے اُسے ہم نظرانداز نہیں کر سکتے۔ اس سے قبل خود جواہرلال نہرو اور اُن کے والد موتی لال نہرو انگریزی میں سوچتے تھے اور انگریزی تقریر کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ کانگریس کا مقصد صرف مہذب اور تعلیم یافتہ ہندستان کے مسائل طے کرنا ہے۔ لیکن آخرکار ایک انتہائی آزمائش کے وقت جب کہ ہندستان کا سب کچھ معرض خطر میں تھا ایک بڑے قومی اور ملی رہنما کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔ مہاتما گاندھی سرآمد روزگار ہوئے انہوں نے سامنے آتے ہی ملک کی تمام ترقی پسند طاقتوں کو متحد کر دیا۔ اُنہوں نے نہ صرف جواہرلال اور موتی لال کا تعاون حاصل کر لیا بلکہ سی، آر، داس سین گپتا۔ ڈاکٹر انصاری۔ مولانا محمد علی اور مدن موہن مالویہ جیسی ہستیوں کو اپنا دست و بازو بنا لیا یہ وہ ہستیاں تھیں جن کا ایک محدود تعلیم یافتہ طبقہ پر بڑا اثر تھا اور ہندستان کی نوے فی صدی دیہاتی آبادی پر ان کا بالواسطہ اثر تھا۔

مگر مہاتما گاندھی نے جو خود ایک کسان کی سی سیدھی سادی زندگی بسر کرتے تھے اپنے رفقائے کار کو ہندستان کے اصلی اور بنیادی مسئلہ کی طرف متوجہ کر دیا اور یہ مسئلہ ہندستان کے کسان کا مسئلہ تھا۔ سیاست کے فریم میں دیہات نے ایک مرکزی حیثیت اختیار کی۔ یہ محسوس ہونے لگا کہ دیہات کے مطالبے ہندستان کے اصلی مطالبے ہیں۔ اور دیہات کی زبان ہندستان کی زبان ہے۔

جواہرلال ان پہلی ہستیوں میں ہیں جنہوں نے اس بدلتے ہوئے سیاسی نقطۂ نظر اور حالات کو محسوس کیا۔ اُنہوں نے محسوس کیا جس فضا میں اُنہیں کام کرنا ہے اس کا کیا تقاضہ ہے۔ اور اُن کا طرز رہائش ان حالات کا کہاں تک ساتھ دے سکتا ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے اپنے رہن سہن کے انداز میں غیر معمولی تبدیلی پیدا کی۔ اپنی معاشرت کی بلند سطح سے اُتر کر اور آسائش کو ترک کر کے عوام کے اس ماحول میں آ گئے جہاں اُنہیں اُن سے بہت قریب رہ کر دن رات کام کرنا تھا۔

خود ان کی "آپ بیتی" سے پتہ چلتا ہے کہ شروع شروع میں اس بارے میں اُنہوں نے کیسی کشمکش محسوس کی۔ ۱۹۱۹ء میں جب میں ان کے ساتھ لاہور [illegible]

چترا کا شاندار کارنامہ

پیرتگیا

CHITRA

پردۂ فلم پر ایک سنسنی خیز رومان
اداکاری کا بے نظیر مرقع

اس فلم میں
مشہور ہیرو موتی لال
اور ہر دلعزیز ہیروئن
سورن لتا
نے اداکاری کا کمال دکھایا ہے



دوسرے ادکار
بے بی مینا ★ سُنترا
وینا کماری ★ مجید ★ نگیندر
بھدو اور ہری شو دسانی

جاری کردہ:- ایسوسینٹڈ پکچرز- دھلی

پنچاب ... کا اولین پیش کش

داسی

ڈائرکٹر: ـــــ برن بوس
رام نرائن دوبے کی تجربہ کاریوں کا معیاری مرقع

روح کو وجد میں لانیوالے مناظر!
دل میں اتر جانیوالے نغمے!!
قہقہہ آفریں مزاح !!!

میوزک:- پنڈت امرناتھ (مہاشہ رن داس کا شہرت یافتہ)
گانے لکھے:- ـــ ڈی، این، مدھوک

ضوفشاں ستارے
راگنی- نجم الحسن- گیانی- کلاوتی-
جی، این بٹ- بے بی پروین- اوم پرکاش
خیراتی وغیرہ

جاری کردہ:- ایمپائر ٹاکی ڈسٹری بیوٹرز- دھلی، لاہور

تاریخ خود کو دہرایا کرتی ہے

لیکن

تاریخ نے اتنی سچائی سے خود کو کبھی نہیں دہرایا

"پکار" —— اور —— "سکندر" —— کے بعد

منروا کا تیسرا لاثانی شاہکار

پرتھوی ولبھ



جسے دیکھ کر آپ فخر سے اپنی تاریخ پر ناز کریں گے !!

(اداکاران):

سہراب مودی ۔ درگا کھوٹے ۔ شنکھا پرساد ۔ مس نجن ۔

مینا ۔ کے، این سنگھ

ڈائرکٹر: —— سہراب مودی

کہانی: —— کے ایم منشی (سابق منسٹر بمبئی)

جاری کردہ: دیسائی اینڈ کمپنی ۔ لاہور، دہلی، کراچی

رائٹنگ پروڈکشنز کی شاندار پیشکش

گھران

رومان و موسیقی کا شاندار مظاہرہ

اداکاری کا شاہکار

جس میں

مشہور و معروف ہیرو **اشوک کمار** اور مقبول و ہر دلعزیز ہیروئن **لیلا چٹنس** نے اداکاری کی ہے

ڈائرکٹر ——— جاگیردار

این۔ آر۔ دیسائی پروڈکشنز کا عظیم الشان فلم

امانت

ڈائرکٹر: چمن لال

اداکاران: حسن بانو۔ ہریش۔ بدھوا اڈوانی۔ گلزار۔ قائم علی

۷۔ اپریل سے لکھنہ ٹاکیز (پہار گنج) میں چل رہا ہے

کیرتی پروڈکشنز کا تحفہ

آشیرباد

ڈائرکٹر رام چندر

اداکار: بلونت سنگھ۔ للتا پوار۔ رام پیاری۔

پُر لطف گانے و تسلا دلچسپ واقعات

ہمارا ٹاکیز میں عنقریب آرہا ہے

جاری کردہ۔ رتن پکچرز۔ چاندنی چوک۔ دہلی

جوبلی ٹاکیز کا ایک شاہکار

قسمت

بار بار دیکھئے پھر بھی طبیعت نہیں بھرے؟

اداکاران

اشوک کمار، ممتاز شانتی

وغیرہ

جوبلی ٹاکیز دہلی میں

۵۱ ویں ہفتہ میں

نہایت آب و تاب کے ساتھ چل رہا ہے!

آج بھی ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے ہزاروں شائقین کو مایوس واپس جانا پڑتا ہے

جنرل ٹاکیز لمیٹڈ دہلی

راج کمل کلا مندر کی انمول بھینٹ

ڈائرکٹر: شانتارام

شکنتلا

گانے: دیوان شرر، رتن پیا

اداکاران

جے شری، چندر موہن

وغیرہ

کائنات کی تصویری اور بہشت کا حسن

اگر دیکھنا ہو

تو "شکنتلا" ملاحظہ فرمائیے

یہ شہرہ دنیا کے مشہور فلاسفر گوئٹے نے دیا ہے

[redacted]ٹک سنیما میں ۱۶واں ہفتہ

نہایت [redacted] رہا ہے

جاری کردہ: جنرل ٹاکیز لمیٹڈ دہلی

نیشنل وار فرنٹ

یعنی

قومی محاذ جنگ کیا چیز ہے ؟

نیشنل وار فرنٹ یعنی قومی محاذ جنگ کا مقصد ملک کی اندرونی اصلاح اور امن عامہ کو بحال رکھنے کی کوشش کرنا ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد تمام عوام الناس کی فلاح و بہبود کیلئے ہیں۔

اس کے مقاصد یہ ہیں :۔

(۱) امن عامہ کو قائم رکھنے کیلئے عوام الناس کا تعاون حاصل کرنا اور بدامنی پھیلانے کے ذریعوں کو دور کرنا۔

(۲) ہندوستان کی جملہ اقوام میں اتحاد باہمی قائم کرانا اور اسکے لئے کوشش کرنا۔

(۳) بدمعاش اور غنڈوں کی دیکھ بھال اور ان کا انسداد کرنے کیلئے عوام کی امداد کرنا۔

(۴) غلط خبروں اور جھوٹی افواہوں کی تردید کرنا۔ اور اُن کو پھیلنے سے روکنا۔

(۵) پانچویں کالم یعنی دشمن کے جاسوس اور دشمنوں سے ہمدردی رکھنے والوں کا پتہ لگانا۔ اور اُن کی نگرانی کرنا۔ تاکہ وہ اپنی کارروائیوں کو عمل میں نہ لاسکیں۔

(۶) کھانے پینے اور ضروریات زندگی کی چیزوں کو اُن کی مقررہ قیمت پر فروخت کرنیکا انتظام کرنا اور ناجائز منافع بازی کو روکنا۔

(۷) زائد غلہ پیدا کرنے کی ہدایت کرنا اور اُس کے متعلق پروپیگنڈا کرنا۔

(۸) شہری بچاؤ اور ہوائی حملہ سے بچنے کی تعلیم حاصل کرنیکی جانب عوام الناس کی توجہ دلانا اور اسکے فوائد عوام کے ذہن نشین کرانا۔

(۹) شکست خوردہ ذہنیت کی ہر ممکن طریقے سے اصلاح کرنا۔

نیشنل وار فرنٹ کے اغراض و مقاصد اور اسکا طریق کار کسی سیاسی جماعت کے خلاف نہیں ہے۔ اور نہ کسی کو اس سے اختلاف ہو سکتا ہے۔

عوام الناس کو نیشنل وار فرنٹ کی خدمات سے فائدہ حاصل کرنا چاہیئے۔ اور تعاون کرکے عوام الناس کی فلاح و بہبودی میں حصہ لینا چاہیئے۔

پراونشل نیشنل وار فرنٹ ۲۵ راجپور روڈ۔ دہلی

THE 'ADEEB' DELHI

ماہنامہ ادیب (دہلی)



۵۶	
۵۷	
۵۸	
۵۹	انش شاہجہانپوری
۶۰	
۶۲	

جلد ۔ نمبر ۔
ایڈیٹرز ۔ فصیح الدین احمد ایم اے ۔ محمد سعید مرتضیٰ واحدی
سالانہ ۔ فی پرچہ ۸

وہ زمانہ تھا جب مارشل لا کے ہاتھوں ہندستانیوں کی کافی تذلیل ہو چکی تھی۔

ایک طرف تو پنجاب کے ہولناک حالات نے اُن کی زندگی پر بڑا اثر ڈالا پھر مہاتما گاندھی سے برابر ملتے رہنا مزید تبدیلی کا باعث ہوا۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان میں غیر معمولی جسمانی و رُوحانی قوت آ گئی ہے۔ ان کی جانکشی کا یہ عالم تھا کہ اس باب میں بہت کم ان کا ساتھ دے سکتے تھے۔

اسی کے ساتھ ساتھ ان کے دل میں ایک خاص قسم کا بغاوت کا جذبہ بھی نشو و نما پا رہا تھا۔ جیسا کہ اُن کی کتاب سے بھی ظاہر ہے۔ وہ کسی چیز کی اندھادُھند پرستش کے قائل نہ تھے۔ وہ موجودہ دور کے انسان ہیں اور مہاتما گاندھی کے صوفیانہ اور راہبانہ طرزِ عمل کے قائل نہیں۔ سیاسی زندگی میں روزے اور تپسیا وغیرہ کے بھی وہ قائل نہیں۔ بلکہ اُن چیزوں سے وہ ایک حد تک گھبراتے ہیں خصوصاً جبکہ یہ باتیں قرونِ وسطیٰ کے سادھوؤں کی سی باتیں معلوم ہونے لگتی ہیں۔ یہ چیزیں اُنہیں غیر منطقی معلوم ہوتی ہیں، وہ بیسویں صدی کا دماغ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بہت سی ایسی باتوں کی تکمیل کرنے سے قاصر رہے جو مہاتما گاندھی کے لئے غیر معمولی اہمیت رکھتی ہیں۔

اس کے باوجود عوامی زندگی بسر کرنے کی طرف جو مہاتما گاندھی کا رُجحان تھا جواہرلال اسی کی طرف برابر کھنچتے رہے۔ وہ اپنی تحریر میں بار بار گاندھی جی کا ایک مقولہ دُہرا چکے ہیں جو یہ ہے:۔

"ہمارا معیارِ زندگی وہی ہونا چاہیئے جو ہندستان کے غریبوں کا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔"

اگر ترکِ موالات کے بعد سے جواہرلال کی بیس سال کی زندگی کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں معلوم ہوگا کہ آرام و آسائش کو خیرباد کہنے اور قربانیاں کرنے میں وہ گاندھی جی سے پیچھے نہیں رہے۔

کوئی اُن موقعوں سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا جب ایسی صورتیں پیش آئی ہیں کہ جواہرلال ابھی جیل سے رہا ہوئے ہیں اور فوراً دوبارہ پھر اصول پرستی اور خدمتِ وطن کے تقاضے کے ماتحت جیل خانے کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ وہ اِدھر رہا ہوئے تھے کہ بہار میں زلزلہ کا کہرام برپا ہو گیا۔ اُنہوں نے چھوٹتے ہی پہلے تو کلکتہ میں ایک گرم تقریر کی۔ جس میں حکومت کو چیلنج دیا گیا تھا اور بعد ہی دوسرے بہار روانہ ہو گئے۔ اور وہاں کے مصیبت زدہ دیہاتی علاقوں میں دن رات سرگرم کار رہے۔ اور ہر ممکن مدد پہنچاتے رہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "دس روز کی مسلسل دوڑ دھوپ اور محنت نے میری ہیئت بدل دی

کی کر فوراً حالات کی ایک رپورٹ تیار کر لوں مگر تھکن نے چور چور کر دیا۔ چوبیس گھنٹوں میں بارہ گھنٹے سوتا رہا۔ جب دوسرے دن صبح کملا کے ساتھ نے چائے ختم ہی کی تھی کہ سامنے ایک موٹر آ کر رُکی اور ایک پولیس افسر نمودار ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ میرا وقت آ گیا ہے"

حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی کا یہ جمہوری اصول کہ ہندستان کے غریبوں کی زندگی بسر کی جائے۔ ایک سخت آزمائش رکھتا ہے۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ جو لوگ اس معیار پر پورے اُترے ہیں اُنہوں نے ہندستان کے کروڑ دہقانیوں کا اعتماد حاصل کر لیا ہے۔ اور اُن کے چشم و چراغ بن گئے ہیں۔

پنڈت جواہرلال ایک جگہ اپنے متعلق لکھتے ہیں "مجھ میں مشرق و مغرب کا ایک عجیب و غریب امتزاج ملتا ہے۔ شاید میرے خیالات اور زندگی کے متعلق میرا نظریہ مشرقی سے زیادہ مغربی ہے۔ مگر ہندستان اس طرح میرے ساتھ ہے جس طرح وہ اپنے اور فرزندوں کو مختلف طریقوں سے اپنائے ہوئے ہے۔ میں اپنے موجودہ حالات اور وراثت کو نہیں بھول سکتا۔ ان چیزوں نے مشرق و مغرب دونوں میں میری مدد کی ہے۔ لیکن ان کا نتیجہ کبھی کبھی یہ ہوا ہے کہ میں نے ایک عجیب قسم کی "تنہائی" کا احساس کیا ہے۔ نہ صرف پبلک کاموں میں بلکہ زندگی مجھے خالی خالی سی نظر آتی ہے۔ میں مغرب کے لئے ایک اجنبی ہوں۔ وہاں کا ہو نہیں سکتا۔ اس کے علاوہ کبھی کبھی تو خود اپنے ملک میں جلاوطنی کا احساس کیا ہے۔"

اِن اندرونی تضاد کے باوجود اُنہوں نے وہ قوت حاصل کی ہے جس نے اُن کو قوم کا ایک بڑا با اثر رہنما بنا دیا ہے۔ اس باب میں گاندھی جی کے بعد دوسری شخصیت جواہرلال کی ہے۔ ان کا رویّہ شدید طور پر تنقیدی ہوتا ہے۔ مگر ان کی آواز پر صد ہا تحسین و آفرین بلند ہوئی اور قوم نے لبیک کہا ہے۔ ایک بات پر گاندھی جی اور جواہرلال دونوں متفق ہیں اور وہ یہ عقیدہ ہے کہ لاانتہا قربانی اور مصائب کا سامنا کرنے کے بعد ہی ہندستان کو آزادی نصیب ہو سکتی ہے۔

جواہرلال اس بات سے اچھی طرح واقف ہیں کہ گاندھی جی نے اپنی جان کی بازی لگا دی ہے، تب کہیں جا کر ہندستان کے عوام کے دل میں جگہ کی ہے اس سے قبل یہ بات کسی کو نصیب نہیں ہوئی۔ وہ جانتے ہیں صرف گاندھی جی ہندستان کو سوراج کی منزل کی طرف لے جا سکتے ہیں۔

ہندستانی عوام کی زبوں حالی اور اُن کے افلاس کے بڑھتے ہوئے احساس نے جواہرلال کو "اشتراکیت" کی طرف رجوع کیا۔ لیکن جب وہ اشترا

…ساتی انقلاب کا ایک علمبردار بنا رہا ہو۔ انہیں اس بات کا پورا احساس ہے
…ہندوستان کے حالات مغرب سے کس قدر مختلف ہیں۔ وہ جانتے ہیں ہندوستان
…معاشی نظام میں جن تبدیلیوں کی ضرورت ہے۔ وہ یورپ کی بجائے یہاں کے
…حالات کو دیکھکر ہونی چاہئیں۔

اس فرق کو سمجھتے ہوئے وہ ہندوستان کے معاشی اور سماجی نظام میں ایک
…دی انقلاب کی ضرورت شدت کے ساتھ محسوس کرتے ہیں۔ خواہ وہ دیسی ریاستوں میں
… یا بڑی بڑی زمینداریوں میں۔ یا کارخانوں میں جہاں تمام ذرائع پیداوار پر ایک
…شخصیت کا اقتدار اور تسلط ہوتا ہے۔ جہاں ہزاروں غریب کسانوں کی زندگی او
…وت صرف ایک شخص کے قبضہ میں ہوتی ہے۔ یہ چیز جواہرلال کے لئے اسی قدر
…ناقابل برداشت ہے جس قدر غیر ملکی شہنشاہیت۔

اُنہوں نے ہندوستان اور دوسرے ملکوں کے کسانوں کے مصائب اپنی
…آنکھ سے دیکھے ہیں اور ان کے مصائب کا حل انہیں اشتراکی نظام میں نظر آتا ہے
…جہاں ذرائع پیداوار عوام کے ہاتھوں میں ہوں اور ان کا مقصد عوام کی بہبودی ہو
…وہ ایک جگہ امریکن شاعر مارکھم کے شعر پیش کرتے ہیں :-

صدیوں کے بوجھ سے دبا ہوا وہ اپنے ہل کی طرف جھکا جاتا ہے
اُس کی نظریں زمین کی طرف جمی ہوئی ہیں۔ اس کے چہرے پر صدیوں
کا افلاس نمایاں ہے۔
اور اُس کی پیٹھ پر دُنیا کا بار لدا ہوا ہے۔
اُس کی وحشت ناک شکل میں سینکڑوں سال کے مصائب جھلک
رہے ہیں۔
اُس کی جھکی ہوئی کمر وقت کا ایک دردناک فسانہ کہہ رہی ہے۔
اُس کی وحشت ناک صورت سے عیاں ہے کہ انسانیت کو عظیم
دھوکا دیا گیا ہے۔
اس کی ساری شخصیت سے ان قوتوں کے خلاف فریادیں بلند
ہو رہی ہیں جنہوں نے دُنیا کی تعمیر کی ہے۔
اس کا سکوت ایک صدائے احتجاج بھی ہے اور ایک پیشین گوئی
بھی۔

مہاتما گاندھی کے راستہ پر اتنی دُور چلنے کے بعد بھی جواہرلال
…علاج کی اصلاح اور دوسرے ذرائع کے استعمال کی ضرورت محسوس
…کرتے ہیں۔ جہاں تک مہاتما گاندھی کا تعلق ہے وہ راجہ، ساہوکار، زمیندار
[illegible]
پر جاری رکھنے کے لئے تیار ہیں۔ اگر ان کے دل میں ایک جذبۂ ترحم و دردا…
پیدا ہو جائے (جو آن کی "اہمسا" کی عناصر ہیں) وہ سمجھتے ہیں کہ "اہمسا" کی روح
اگر اُن کے دلوں میں سرایت کر جائے تو دُنیا پر ایک یزدانی حکومت قائم ہو سکتی
ہے۔ مگر جواہرلال کو ایک اکیلے راجہ، زمیندار یا کارخانے کے مالک کی تبدیلی
نفس میں عوام کی بہبودی کی مستقل صورت نظر نہیں آتی۔ وہ سارے جابرانہ
نظام کو خواہ وہ سرمایہ داری نے قائم کیا ہو یا شہنشاہیت کا نتیجہ ہو بذات
خود ایک بُری چیز سمجھتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر زمین کی ملکیت کے حقوق اور
ذرائع پیداوار افراد کے ہاتھوں سے لیکر جماعت کے ہاتھوں میں دے دیئے
جائیں کہیں بہتر صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ وہ بہت سخت کشمکش محسوس کرتے
ہیں جب وہ دیکھتے ہیں کہ گاندھی جی اُن لوگوں کی طرف دوستی اور محبت سے
ہاتھ بڑھاتے ہیں جن کا کام ہی جواہرلال کے نزدیک تخریب ہے اور جو انصاف
کے بنیادی اصولوں سے منحرف ہیں۔

برخلاف اس کے گاندھی جی یہ چاہتے ہیں کہ راجہ، زمیندار، ساہوکار
اور سرمایہ دار کے ضمیر و نفس میں ایک ایسی تبدیلی واقع ہو کہ وہ اپنے اختیارات
سے دست بردار ہو جائیں۔

آخر میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ ایک مختصر سے مضمون میں اس زمانہ
کے ایک نہایت اہم اور نمایاں شخصیت کی داستانِ حیات قلمبند کرنا ایک
ناممکن امر ہے۔ مگر بہرحال میں نے کوشش کی ہے کہ ایسے شخص کی اندرونی
کشمکش کا ایک خاکہ پیش کر سکوں جو عمر کے لحاظ سے ابھی جوان ہے مگر عقل و تجربہ
کے لحاظ سے بوڑھا ہے۔ اگر میری یہ کوشش کامیاب ہے تو یہ بات میرے
لئے بے پایاں مسرت کا باعث ہوگی۔

(گذشتہ سے پیوستہ)

مہاتما بُدھ

:(دوسری قسط):

(از مسٹر سید علی مقتدیٰ واحدی)

پہلا ایکٹ ——— پانچواں سین

(یشودھرا بے چینی کے ساتھ برآمدے میں ادھر اُدھر گھوم رہی ہے۔ اسکی نظریں چاروں طرف سناٹوں پر جاتی ہیں۔ اس کی آنکھیں بے رونق ہیں۔ اس کے چہرے پر مُردنی چھا رہی ہے۔ ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے یشودھرا نہیں، یشودھرا کا بھوت ہے۔ رحولا خوابگاہ میں سو رہا ہے)

(چھینا داخل ہوتا ہے)

چھینا:۔ آنسو رنج و غم کو نہیں دھو سکتے۔

یشودھرا:۔ آہ چھینا! تم بہت دیر سے غائب تھے۔ کیا میں واقعی رو رہی ہوں؟

چھینا:۔ میں آپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھتا ہوں۔ آپ آج بہت غمگین نظر آتی ہیں۔

یشودھرا:۔ کیا تم اپنے آقا کو بے زبان جانوروں کے شکار سے نہیں روک سکتے؟

چھینا:۔ انہوں نے تو کبھی شکار نہیں کھیلا۔

یشودھرا:۔ پھر وہ اس وقت کیا کر رہے ہیں؟

چھینا:۔ وہ تو شکاری نہ بننے کیلئے اب شہزادے بھی نہیں رہے۔

یشودھرا:۔ (خوفزدہ ہو کر) کیا مطلب ہے تمہارا۔ کیا وہ مجھے چھوڑ کر چلے گئے؟

چھینا:۔ کیا آپ تنہائی محسوس کر رہی ہیں۔ ان کی شہزادگی کو چھوڑ دینے سے۔ کیا آپ بھی ان کی پیروی کرنے کے لئے شہزادگی کو نہیں چھوڑ سکتیں؟

یشودھرا:۔ میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی۔

چھینا:۔ وہ ایک لڑائی پر گئے ہیں۔

یشودھرا:۔ اُن کی سینا کہاں ہے؟ کیا وہ اکیلے لڑ سکتے ہیں؟

چھینا:۔ اکیلے! نہیں۔ تمام عالم انسانی اُن کے ساتھ ہے۔

یشودھرا:۔ پھر اُن کا دشمن کون ہے؟

چھینا:۔ لیسرادہ تشان کی طرف ہے اور زندگی اُن کی دوست۔

یشودھرا:۔ پھر وہ اب کہاں گئے ہیں؟

چھینا:۔ زندگی کی تلاش میں۔ دنیا میں۔

یشودھرا:۔ چھینا! اُن کے الہامی الفاظ کیا تھے؟

چھینا:۔ انہوں نے کہا کہ وہ طے کر چکے ہیں کہ آپکے دل و دماغ سے دور رہیں گے۔

یشودھرا:۔ کیا وہ واپس نہ آئیں گے؟

چھینا:۔ شہزادے یا آپ کے خاوند کی حیثیت سے نہیں۔

یشودھرا:۔ رحولا اُن کے لئے چیخ رہا ہے۔

(ایک بوڑھا شخص کمزوری کے باعث لڑکھڑا کر گڑھے میں گرتا ہے)

آہ چھینا! وہ کیا ہے؟

چھینا:۔ بڑھاپا!

یشودھرا:۔ لیکن بادشاہ تو اتنا کمزور نہیں معلوم ہوتا۔ حالانکہ وہ بھی اتنا ہی بوڑھا ہے۔

چھینا:۔ بادشاہ بڑھاپے کو قوی کرنے کے سامان مہیا کر سکتا ہے۔

یشودھرا:۔ میں بھی ایک دن اسی طرح بے یار و مددگار رہ جاؤں گی۔

چھینا:۔ اس بڑھاپے کو روک کوئی نہیں سکتا۔

یشودھرا:۔ کیا ہمارا شہزادہ بھی اس سے نہیں بچ سکتا؟

چھینا:۔ زندگی، موت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

یشودھرا:۔ نہیں۔ زندگی بہت طاقتور ہے۔

(ایک ارتھی جاتی ہوئی نظر آتی ہے)

چھینا:۔ یہ موت ہے۔ ڈریئے مت۔ دیکھتی ہیں آپ کہ زندگی کس قدر طاقتور ہے ارتھی جلا دی جائیگی۔ اور پھر زندگی کے مصائب بھی ختم ہو جائیں گے۔

یشودھرا:۔ کیا موت کو بھی روکا نہیں جا سکتا؟

چھینا:۔ ہاں نہیں روکا جا سکتا۔ اور یہ خوش نصیبی ہے کہ نہیں روکا جا سکتا۔ دکھ بھری زندگی کا واحد علاج یہی تو ہے۔ مگر انسان باوجود تکلیف اور مصیبتوں کے آخر دم تک زندہ ضرور رہنا چاہتا ہے۔

یشودھرا:۔ آہ! کاش میں مر جاؤں۔

چھینا:۔ ایک بچہ والی ماں کو اس طرح نہیں کہنا چاہیئے۔ بچہ جو اُس کی زندگی کو دلچسپ بنانے کے لئے موجود ہے۔

یشودھرا:۔ لیکن ایسی زندگی کب تک!

چھینا:۔ ایسی زندگی لازوال ہے

یشودھرا :۔ کیا یہ بچے کے ساتھ ہی ختم نہ ہو جائیں گی ؟

چھپنا :۔ بچہ مر سکتا ہے لیکن اپنی یاد چھوڑ جاتا ہے جو عمر بھر باقی رہتی ہے۔ یہ یاد لازوال مسرتوں کا سرچشمہ ہے۔

یشودھرا :۔ میں بے چینی محسوس کر رہی ہوں۔

(رعولا کی سسکیاں سنائی دیتی ہیں)

چھپنا :۔ آپ ماں ہیں۔ اپنے بچے کیلئے زندہ رہیئے۔ ہم نے تھوڑے سے عرصہ میں دُنیا کا بہت کچھ دیکھ لیا ہے۔ آیئے ہم رعولا کو تسکین دیں۔

یشودھرا :۔ وہ اپنے باپ کیلئے رو رہا ہے۔ ہم اسے کیونکر تسکین دے سکتے ہیں۔

چھپنا :۔ آپ دُنیا میں کچھ زیادہ نہیں دیکھ سکتیں۔ جایئے اب آپ اپنے خواب کی دُنیا —— محل —— میں واپس چلی جایئے۔

یشودھرا :۔ چھپنا! مجھے اپنا محل مُرجھائے ہوئے پھولوں اور سُوکھے ہوئے پتّوں کے بیچ میں بنانے دو۔

چھپنا :۔ مُرجھائے ہوئے پھولوں اور سُوکھے ہوئے پتّوں کو اپنے لمس سے سرسبز اور شاداب بنا دیجئے۔

یشودھرا :۔ لیکن کیا مجھے اتنی آزادی ملے گی کہ میں اپنا محل آپ بنا لوں۔

چھپنا :۔ آزادی تو ہمیں ہر وقت حاصل ہے۔ ضرورت صرف اسکو محسوس کرنے کی ہے۔

چھٹا سین

(دریا کے کنارے)

(رعولا اور چمپا)

رعولا :۔ یہ بادشاہ ہیں اور یہ ملکہ۔ یہ دونوں اکثر تمام دن دریا پر گزار دیتے تھے اور رات کو محل واپس چلے جاتے تھے لیکن اب یہ خانہ بدوش ہیں (بادشاہ رعولا کے سامنے جھکتا ہے اور کہتا ہے) میرا یہاں ایک عالی شان محل تھا لیکن جو جنگل میں وہ مٹی اور پتھروں کا ڈھیر ہو گیا۔ ہماری تمام شان و شوکت بھی اس کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اب ہمارے پاس کچھ نہیں۔ سوائے اس دعوے کے کہ ہم بادشاہ ہیں۔ اور یہ ہماری ملکہ۔ ہم نے سُنا ہے کہ تم بہت اچھے معمار ہو۔ کیا تم تباہ حال بادشاہ کے لئے ایک چھوٹا سا مکان نہ بناؤ گے۔ آہ! ہم لوگ بالکل بے یار و مددگار ہیں۔" اور رعولا اُن کی دردناک کیفیت سے متاثر ہو کر بچن دیتا ہے کہ میں تمہاری مدد کروں گا۔ اور چمپا بھی مدد دینے میں شریک ہوگی۔

چمپا :۔ نہیں۔ میں کچھ نہیں کر سکتی۔

رعولا :۔ بیوقوف مت بنو۔ در و دیوار میں بنا لوں گا۔ تمہیں صرف چھتیں پاٹنی پڑیں گی۔

چمپا :۔ یہ کوئی مناسب جگہ نہیں ہے گھر بنانے کے لئے۔ ہم کیوں ایسا گھر بنائیں جسے جوار بھاٹے سے ہر آن خطرہ ہو۔

رعولا :۔ کہاں ہے سمندر۔ جس کے جوار بھاٹے سے ہم خوفزدہ ہوں۔

چمپا :۔ بچے دریا کو سمندر سے کم نہیں سمجھ سکتے۔

رعولا :۔ جو میں کہتا ہوں وہ کرو۔ جاؤ اور خشک پتے جمع کرو اور اُن سے چھت بناؤ۔ جاؤ جلدی کرو۔ وقت مت ضائع کرو۔

چمپا :۔ نہیں۔ میں یہ کھیل نہیں کھیل سکتی۔ یہ خطرناک کھیل ہے۔

رعولا :۔ خطرناک! کیوں ؟

چمپا :۔ اگر جوار بھاٹا تم کو اور تمہارے مکان کو اس قدر دُور بہا کر لے جائے کہ میں اُس تک نہ پہنچ سکوں۔ تو ؟

رعولا :۔ تم جوار بھاٹے سے اِس قدر خوفزدہ کیوں ہو ؟ تم لڑکیاں ہمیشہ سے بزدل ہو۔ کوئی کھیل بھی کھیلنے کے قابل نہیں۔

چمپا :۔ ہم لڑکیاں صرف کھلونوں سے کھیلنا جانتے ہیں۔ جوار بھاٹے سے نہیں۔

رعولا :۔ لیکن ہمارے دریا میں کبھی طغیانی نہیں آ سکتی۔

چمپا :۔ ہاں آگے بڑھو۔ کنول کے پتوں سے نازک کشتیاں تیار کر کے اپنے بادشاہ اور ملکہ کو ان میں بٹھا کر پانی میں تیرا دو۔

رعولا :۔ شرارت نہ کرو۔ اپنے کام سے دھیان دو —— کیا چھت تیار ہے ؟

(یشودھرا داخل ہوتی ہے)

رعولا :۔ (فخریہ لہجہ میں) ماں! ماں!! ہم بادشاہ اور ملکہ کے لئے گھر بنا رہے ہیں

یشودھرا :۔ رعولا! یہ کون لڑکی ہے ؟

چمپا :۔ میں کون ہوں ؟ یہ تو میں خود بھی نہیں جانتی۔

رعولا :۔ یہ مجھے محل کے دروازے پر عموماً ملا کرتی ہے۔

چمپا :۔ شاید میں کسی بھکاری کی لڑکی ہوں۔

رعولا :۔ میری اس سے جب پہلی دفعہ ملاقات ہوئی تھی تو اُس نے کہا تھا میں بھوکی ہوں۔ میں نے اسے کھانا دیا اور اس سے اپنے ساتھ کھیلنے کو کہا۔

چمپا :۔ ہم ہمیشہ باغ میں کھیلتے ہیں۔ نئی دُنیا میں بناتے ہیں اور پھر گرا دیتے ہیں

یشودھرا :۔ تمہارے ماں باپ کا کیا نام ہے میری بچی ؟

چمپا :۔ میرے ماں باپ کوئی خاص نہیں ہیں۔ میں سب کو اپنا ماں باپ سمجھتی ہوں۔

یشودھرا :۔ تم کہاں رہتی ہو؟

چمپا :۔ کوئی خاص گھر نہیں ہے۔ تمام دُنیا میرا گھر ہے۔

یشودھرا :۔ ماں یہ ہمیشہ ایسی باتیں کیا کرتی ہے۔

چمپا :۔ مفلسی نے مجھے یہ جرأت بخشی ہے۔

یشودھرا :۔ چمپا! مجھے بھی اپنی ماں جانو۔ آج سے رہولا کی بہن کی طرح تم میرے ساتھ رہوگی۔

رہولا :۔ ماں: یہ تو اب بھی میری بہن ہے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ آؤ اسے گھر لے چلیں۔

چمپا :۔ مجھے محلوں میں رہنا نہیں آتا۔

یشودھرا :۔ تمہارا جس طرح جی چاہے رہنا۔ اور یہ محل ہی کہاں رہا۔ اسے اتنا سادہ بنا لینا جیسے یہ بن رہے۔

دوسرا ایکٹ ——— پہلا سین

(آدھی رات کا وقت۔ محل۔ بادشاہ کی خواب گاہ)

چھینا :۔ رتھ تیار ہے مہاراج!

بادشاہ :۔ ہوں۔ تمہارا رتھ ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ تم اس قدر بدتمیزی سے کیوں داخل ہوئے۔ میرا سپنا ٹوٹ گیا۔

چھینا :۔ مہاراج شما کیجئے۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ مجھے بہت دیر ہوگئی ہے۔

بادشاہ :۔ بہت دیر! کیا مطلب تمہارا؟ کیا تم آدھی رات کو شکار کھیلوگے؟

چھینا :۔ مہاراج میں نے آپ کے لئے ایک مقدس سفر کی تیاریاں کی ہیں۔

بادشاہ :۔ مہاراج مہاراج کیا کہہ رہے ہو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ میں اب بادشاہ نہیں ہوں۔ چھینا اب میں اس تخت پر نہیں بیٹھ سکتا جس کے لئے میں کوئی وارث نہیں چھوڑ رہا۔ مجھے اب اس باپ کی طرح رہنے دو جو اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کی یاد میں دن گزار رہا ہو۔

چھینا :۔ ہم نے انہیں کھویا نہیں میرے آقا! وہ اب بھی میرے ساتھ ہیں۔ ہم نے ان پر صرف اپنا حق چھوڑ دیا ہے لیکن ہم انہیں دیکھ سکتے ہیں۔

بادشاہ :۔ دیکھ سکتے ہیں! کہاں؟ اپنے الفاظ سے میری ان امیدوں میں زندگی مت پیدا کرو۔ جنہیں تم پورا نہیں کرسکتے (خواب کی سی کیفیت میں) آہ! میرے بچے! کیا تم میرے دل کی دھڑکنوں میں اپنا نام نہیں سنتے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میری زندگی پر خوابوں کا قبضہ ہے۔ پھر کیوں نہیں میرے پاس واپس آجاتے۔ میرے بچے! تمہاری جنت میرے باندھوں

ہے۔ دور آفاق کے اُس پار نہیں۔

چھینا :۔ ہم انہیں ہی دیکھنے جارہے ہیں۔ وہ اپنے چیلوں سمیت انبدوان میں آکر ٹھیرے ہیں۔ تمام شہر اُن کے گرد جمع ہے جنہوں نے انہیں دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ جسم انسانی میں خود دیوتا ان کے روپ دھار لئے۔

بادشاہ :۔ کیا سچ ہے؟ کیا وہ مجھے پہچان لیگا؟ کہیں وہ میری آغوشِ محبت سے الگ تو نہیں ہوجائیگا۔ چھینا کیا وہ میری آنکھوں میں اپنا عکس نہیں دیکھے گا؟

چھینا :۔ نہیں جلدی کرنی چاہیئے۔ رتھ تیار ہے۔

بادشاہ :۔ رتھ کس لئے؟ مجھے پیدل چلنا چاہیئے۔ ورنہ یاترا میں کیا مزا آئیگا چلو۔

دوسرا سین

(شاہی باغ)

راہ گیر :۔ کیا تم اِس باغ کے مالی ہو؟

مالی :۔ ہاں جناب۔ اور تم؟

راہ گیر :۔ ایک مسافر

مالی :۔ اور یہ لڑکی؟

راہ گیر :۔ یہ بھی مسافر ہے۔ اس کا نام چمپا ہے۔

مالی :۔ تمہاری بیٹی ہے؟

راہ گیر :۔ نہیں۔ ہم سفر ہے۔ ڈرو مت۔ ہم تم سے میزبانی کیلئے نہیں کہیں گے۔ اور تمہارے آقا کو تم سے ناراض نہیں کریں گے۔

مالی :۔ کیا آپ رات کی تاریکی سے خوفزدہ نہیں ہیں؟

راہ گیر :۔ جگنو ہمارے راستے کو اپنی جگمگاہٹ سے منور کررہے ہیں اور جب روشنی ہو تو رات کیا بنا سکتی ہے۔ اوہ غریب آدمی تم برابر دوسری کررہے ہو تم اس وقت تک پودوں کو پانی دیتے رہوگے جب تک کہ وہ برباد نہ ہوجائیں۔

مالی :۔ باغ کو صبح تک پھولوں سے لہلہاتا ہوا ہونا چاہیئے۔ کل میرا آقا کسی بڑے آدمی کے ساتھ اس کے معائنے کو آئیگا۔ کہتے ہیں کہ وہ انسان نہیں بلکہ دیوتا ہیں۔ سورگ سے اُترے ہیں۔ لوگ اُن کے درشن کو جارہے ہیں میں بھی درشن کو جانا چاہتا ہوں۔ لیکن میں باغ کو ویران کرکے آقا کو دھوکا نہیں دینا چاہتا۔

راہ گیر :۔ مگر تم وہاں جا سکو تو کیا کرو گے ؟
مالی :۔ اگر خدا دھرتی پر اُتر آئے تو ایک آدمی کیا کر سکتا ہے ۔ یہی کہ سکون شانتی اور بھلائی کے لئے دُعا مانگے ۔
راہ گیر :۔ اچھا بھائی اب ہمیں جانے دو ۔ دیر ہو رہی ہے ۔
مالی :۔ کہاں ؟
راہ گیر :۔ بچی ایک بچے کا تعاقب کر رہی ہے جو اُس بڑے آدمی کی طرف گیا ہے
مالی :۔ اچھا ۔ بچے تک اس کے پاس جاتے ہیں ۔ اس میں ایسی کیا کشش ہے نغمہ ہے ، جادو ہے ، آخر ہے کیا ۔
راہ گیر :۔ ایک حقیقی زندگی ـــ بھائی تم بھی چل رہے ہو یا نہیں ؟
مالی :۔ میں زندگی کے ایسے گہرے رازوں کو سمجھنے سے قاصر ہوں ۔ اور یہ لڑکی ! اس نے ممکن ہے اس سے کبھی محبت کی ہو ۔ اس کے شُشند ہپنے اس نے دیکھے ہوں اس کے لئے روئی ہو ۔ اور اب جبکہ وہ اس کی پہنچ میں ہے اسکی طرف دوڑ رہی ہے ۔ لیکن کون جانتا ہے ۔ شاید وہ پیچھے ہٹ جائے جب لڑکی پہنچے ۔
چمپا :۔ جناب میں آپ کے بڑے آدمی کی طرف نہیں جا رہی ہوں ۔ مجھے مت چھیڑو ۔ میں تو اپنے ساتھی کھلاڑی کی تلاش میں جا رہی ہوں ۔ وہ کھیل کو نا تمام چھوڑ کر چلا گیا ہے ۔
مالی :۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کہ وہ بہت بڑا آدمی ہے ۔ اتنا بڑا کہ بچوں کے ساتھ نہیں کھیل سکتا ۔
چمپا :۔ اُف ! تم تو اس بڑے آدمی کے متعلق سوچتے سوچتے گم ہو گئے ہو ۔ بھیا آؤ ہم چلیں ۔
راہ گیر :۔ (مالی سے) کوئی مضائقہ نہیں میرے بڈھے دوست یہ خود تمکو چھوڑ جائیگی کیا یہ ایک بچی نہیں ہے ؟
چمپا :۔ وہ بھی ایک بچہ ہے ۔ میرے کھلونے لیکر بھاگ گیا ہے ۔ مل جانے دو کیسے مزا چکھاتی ہوں ۔ آؤ وقت مت ضائع کرو ۔
راہ گیر :۔ لیکن اس ننھے آدمی سے ضرور مل لینا ۔ جانتے ہو وہ کون ہے ؟ وہ خود تمہارے آقا کا بیٹا ہے ۔
مالی :۔ میرا آقا تو بادشاہ ہے ۔
راہ گیر :۔ اور وہ بڑا آدمی اُس کا بیٹا ۔
مالی :۔ کیا ! ہمارا سردار ؟ کیا وہ زندہ ہیں ؟ کیا وہ آ گئے ؟ میں انہیں ضرور دیکھوں گا ۔ آؤ چلیں ۔

تیسرا سین

(سڑک پر)

رحولا :۔ ہاں ! ہم اندھیرے میں کیوں بھٹک رہے ہیں ؟
یشودھرا :۔ گھبراؤ مت ۔ ہم بھٹکے نہیں ہیں ۔
رحولا :۔ لیکن ہم جا کہاں رہے ہیں ؟
یشودھرا :۔ باغ میں ۔
رحولا :۔ باغ ! اور رات کے وقت ! آپ سوچ سمجھ کر بات کر رہی ہیں ؟
یشودھرا :۔ وہ پھول جو آج جھڑے ہیں کل مُرجھا جائیں گے ۔
رحولا :۔ تو کیا آپ پھول چُننے جا رہی ہیں ۔
یشودھرا :۔ بھگوان صرف ان پھولوں کو پسند کرتے ہیں جو زمین پر سے چُنے جائیں رحولا ! پودے پر سے پھول کبھی مت توڑنا ۔ ہم اس وقت پوجا کرنے جا رہے ہیں ۔
رحولا :۔ باغ میں مندر کہاں ؟
یشودھرا :۔ باغ بذات خود مندر ہے ۔ ر تم بھگوان کو دیکھو گے ۔ جلدی مت کرو ۔
رحولا :۔ ایسے دیوتاؤں کے دیکھنے سے کیا فائدہ جو اسی پتھر کی طرح سخت اور جامد ہیں ۔ جس سے وہ تراشے گئے ہیں ۔
یشودھرا :۔ لیکن ہمارا بھگوان تو چلتا ہے ، بولتا ہے ۔ روتا ہے ۔ ہنستا ہے ۔ جیسے ہم اور تم ۔
رحولا :۔ واقعی ۔ پھر تو مجھے ضرور دیکھنا چاہیئے ۔ ماں کیا وہ ہماری اور تمہاری طرح دیکھتا بھی ہے ؟ میرا مقصد ہے کہ اُس کی کوئی خاص آنکھیں یا کوئی خاص شکل تو نہیں ہے ۔
یشودھرا :۔ وہ بالکل ہم جیسا ہے ۔
(رحولا کی پیشانی کو بوسہ دیتی ہے)
رحولا :۔ لیکن میں تمام راستے کیسے چل سکتا ہوں ۔ مجھے اپنا گھوڑا لانے دو ۔
یشودھرا :۔ اگر تم تھک گئے ہو تو میرے کندھوں پر بیٹھ جاؤ ۔
رحولا :۔ نہیں ۔ تم اندھیرے میں ٹھوکر کھا جاؤ گی ۔ ماں ، لیکن وہ باغ ہے کہاں ؟ کیا میں نے اُسے پہلے دیکھا ہے ؟
یشودھرا :۔ نہیں ۔ لیکن وہ اب بہت قریب ہے ۔ گڑھا راستے سے ہٹ کر ۔
رحولا :۔ لیکن میں اس طرح گھسٹتا ہوا نہیں چل سکتا ۔ ماں اس وقت تم جا کر چھوڑ دو ۔ گھر واپس چلو ۔ چمپا مجھے کوس رہی ہوگی ۔ میں نے کھانے کے بعد اُسکے ساتھ

یشودھرا :- تم کہاں رہتی ہو؟
چمپا :- کوئی خاص گھر نہیں ہے۔ تمام دُنیا میرا گھر ہے۔
یشودھرا :- ماں یہ ہمیشہ ایسی باتیں کیا کرتی ہے۔
چمپا :- مفلسی نے مجھے یہ جرأت بخشی ہے۔
یشودھرا :- چمپا! مجھے بھی اپنی ماں جانو۔ آج سے رہولا کی بہن کی طرح تم میرے ساتھ رہوگی۔
رہولا :- ماں! یہ تو اب بھی میری بہن ہے۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ آؤ اسے گھر لے چلیں۔
چمپا :- مجھے محلوں میں رہنا نہیں آتا۔
یشودھرا :- تمہارا جس طرح جی چاہے رہنا۔ اور یہ محل ہی کہاں رہا۔ اسے اتنا سادہ بنا لینا جیسے یہ سنسار ہے۔

دوسرا ایکٹ ——— پہلا سین

(آدھی رات کا وقت۔ محل۔ بادشاہ کی خواب گاہ)

چھینا :- رتھ تیار ہے مہاراج!
بادشاہ :- ہوں۔ تمہارا رتھ ہمیشہ تیار رہتا ہے۔ تم اس قدر بدتمیزی سے کیوں داخل ہوئے۔ میرا سپنا ٹوٹ گیا۔
چھینا :- مہاراج شما کیجئے۔ میں تو ڈر رہا تھا کہ مجھے بہت دیر ہو گئی ہے۔
بادشاہ :- بہت دیر! کیا مطلب تمہارا؟ کیا تم آدھی رات کو شکار کھیلوگے؟
چھینا :- مہاراج میں نے آپ کے لئے ایک مقدس سفر کی تیاریاں کی ہیں۔
بادشاہ :- مہاراج مہاراج کیا کہہ رہے ہو۔ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ میں اب بادشاہ نہیں ہوں۔ چھینا اب میں اس تخت پر نہیں بیٹھ سکتا جس کے لئے میں کوئی وارث نہیں چھوڑ رہا۔ مجھے اب اس باپ کی طرح رہنے دو جو اپنے کھوئے ہوئے بیٹے کی یاد میں دن گزار رہا ہو۔
چھینا :- ہم نے انہیں کھویا نہیں میرے آقا! وہ اب بھی میرے ساتھ ہیں۔ ہم نے ان پر صرف اپنا حق چھوڑ دیا ہے لیکن ہم انہیں دیکھ سکتے ہیں۔
بادشاہ :- دیکھ سکتے ہیں! کہاں؟ اپنے الفاظ سے میری ان امیدوں میں زندگی مت پیدا کرو۔ جنہیں تم پورا نہیں کر سکتے (خواب کی سی کیفیت میں) آہ! میرے بچے! کیا تم میرے دل کی دھڑکنوں میں اپنا نام نہیں سنتے۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ میری زندگی پر خوابوں کا قبضہ ہے۔ پھر کیوں نہیں میرے پاس واپس آجاتے۔ میرے بچے! تمہاری جنت میرے اندر ہے۔ دور آگ کے آس پاس نہیں۔
چھینا :- ہم انہیں ہی دیکھنے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے چیلوں سمیت اندوان میں آکر ٹھیرے ہیں۔ تمام شہر ان کے گرد جمع ہے جنہوں نے انہیں دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ جسم انسانی میں دیوتا ان کے روپ ڈھلا ہے۔
بادشاہ :- کیا سچ ہے؟ کیا وہ مجھے پہچان لیگا؟ کہیں وہ میری آغوش محبت سے الگ تو نہیں ہو جائیگا۔ چھینا کیا وہ میری آنکھوں میں اپنا عکس نہیں دیکھے گا؟
چھینا :- ہمیں جلدی کرنی چاہیئے۔ رتھ تیار ہے۔
بادشاہ :- رتھ کس لئے؟ مجھے پیدل چلنا چاہیئے۔ ورنہ یاترا میں کیا مزا آئیگا۔ چلو۔

دوسرا سین

(شاہی باغ)

راہگیر :- کیا تم اِس باغ کے مالی ہو؟
مالی :- ہاں جناب۔ اور تم؟
راہگیر :- ایک مسافر
مالی :- اور یہ لڑکی؟
راہگیر :- یہ بھی مسافر ہے۔ اس کا نام چمپا ہے۔
مالی :- تمہاری بیٹی ہے؟
راہگیر :- نہیں۔ ہم سفر ہے۔ دوست۔ ہم تم سے میزبانی کیلئے نہیں کہیں گے۔ اور تمہارے آقا کو تم سے ناراض نہیں کریں گے۔
مالی :- کیا آپ رات کی تاریکی سے خوفزدہ نہیں ہیں؟
راہگیر :- جگنو ہمارے راستے کو اپنی جگمگاہٹ سے منور کر رہے ہیں اور جب روشنی ہر تو رات کیا بنا سکتی ہے۔ اوہ غریب آدمی! ہم ہارے بعد سری کر رہے ہو۔ تم اس وقت تک پودوں کو پانی دیتے رہوگے جب تک کہ وہ برباد نہ ہو جائیں۔
مالی :- باغ کو صبح تک پھولوں سے لہلہاتا ہوا ہونا چاہیئے۔ کل میرا آقا کسی بڑے آدمی کے ساتھ اس کے معائنے کو آئیگا۔ کہتے ہیں کہ وہ انسان نہیں بلکہ دیوتا ہیں۔ سورگ سے آترے ہیں۔ لوگ ان کے درشن کو جا رہے ہیں میں بھی درشن کو جانا چاہتا ہوں۔ لیکن میں باغ کو ویران کر کے آقا کو دھوکا نہیں دینا چاہتا۔

راہ گیر :۔ مگر تم وہاں جاسکو تو کیا کرو گے ؟

مالی :۔ اگر خدا دھرتی پر اُتر آئے تو ایک آدمی کیا کرسکتا ہے ۔ یہی کہ سکون شانتی اور بھلائی کے لئے دُعا مانگے ۔

راہ گیر :۔ اچھا بھائی اب ہمیں جانے دو ۔ دیر ہورہی ہے ۔

مالی :۔ کہاں ؟

راہ گیر :۔ یہ بچی ایک بچے کا تعاقب کر رہی ہے جو اُس بڑے آدمی کی طرف گیا ہے۔

مالی :۔ اچھا ۔ بچے تک اس کے پاس جا رہے ہیں ۔ اس میں ایسی کیا کشش ہے نغمہ ہے ، جادو ہے ، آخر ہے کیا ۔

راہ گیر :۔ ایک حقیقی زندگی ۔۔۔ بھائی تم بھی چل رہے ہو یا نہیں ؟

مالی :۔ میں زندگی کے ایسے گہرے رازوں کو سمجھنے سے قاصر ہوں ۔ اور یہ لڑکی ! اس نے ممکن ہے اُس سے کبھی محبت کی ہو ۔ اُس کے سُندر سپنے اس نے دیکھے ہوں اس کے لئے روتی ہو ۔ اور اب جبکہ وہ اس کی پہنچ میں ہے اسکی طرف دوڑ رہی ہے ۔ لیکن کون جانتا ہے ۔ شاید وہ پیچھے ہٹ جائے جب لڑکی پہنچے ۔

چمپا :۔ جناب میں آپ کے بڑے آدمی کی طرف نہیں جا رہی ہوں ۔ مجھے مت چھیڑو ۔ میں تو اپنے ساتھی کھلاڑی کی تلاش میں جا رہی ہوں ۔ وہ کھیل کو ناتمام چھوڑ کر چلا گیا ہے ۔

مالی :۔ لیکن لوگ کہتے ہیں کہ وہ بہت بڑا آدمی ہے ۔ اتنا بڑا کہ بچوں کے ساتھ نہیں کھیل سکتا ۔

چمپا :۔ اُف ! تم تو اس بڑے آدمی کے متعلق سوچتے سوچتے گم ہو گئے ہو ۔ بھیا آؤ ہم چلیں ۔

راہ گیر :۔ (مالی سے) کوئی مضائقہ نہیں میرے بڈھے دوست یہ خود اُسکو چھوٹا بنادیگی ۔ کیا یہ ایک بچی نہیں ہے ؟

چمپا :۔ وہ بھی ایک بچہ ہے ۔ میرے کھلونے لیکر بھاگ گیا ہے ۔ مل جانے دو کیسے مزا چکھاؤنگی ۔ آؤ وقت مت ضائع کرو ۔

راہ گیر :۔ لیکن اس بڑے آدمی سے ضرور مل لینا ۔ جانتے ہو وہ کون ہے ؟ وہ خود تمہارے آقا کا بیٹا ہے ۔

مالی :۔ میرا آقا تو بادشاہ ہے ۔

راہ گیر :۔ اور وہ بڑا آدمی اُس کا بیٹا ۔

مالی :۔ کیا ؟ ہمارا سردار ہے ؟ کیا وہ زندہ ہیں ؟ کیا وہ آگئے ؟ میں انہیں ضرور دیکھوں گا ۔ آؤ چلیں ۔

تیسرا سین

(سڑک پر)

رحولا :۔ ماں ! ہم اندھیرے میں کیوں بھٹک رہے ہیں ؟

یشودھرا :۔ گھبراؤ مت ۔ ہم بھٹکے نہیں ہیں ۔

رحولا :۔ لیکن ہم جا کہاں رہے ہیں ؟

یشودھرا :۔ باغ میں ۔

رحولا :۔ باغ ! اور رات کے وقت ! آپ سوچ سمجھ کر بات کر رہی ہیں ؟

یشودھرا :۔ وہ پھول جو آج جھڑے ہیں کل مُرجھا جائیں گے ۔

رحولا :۔ تو کیا آپ پھول چُننے جا رہی ہیں ۔

یشودھرا :۔ بھگوان صرف ان پھولوں کو پسند کرتے ہیں جو زمین پر سے چُنے جائیں رحولا ! پودے پر سے پھول کبھی مت توڑنا ۔ ہم اس وقت پوجا کرنے جا رہے ہیں ۔

رحولا :۔ باغ میں مندر کہاں ؟

یشودھرا :۔ باغ بذاتِ خود مندر ہے ۔ ر تم بھگوان کو دیکھو گے ۔ جلدی کرو ۔

رحولا :۔ ایسے دیوتاؤں کے دیکھنے سے کیا فائدہ جو اسی پتھر کی طرح سخت اور جامد ہیں ۔ جس سے وہ تراشے گئے ہیں ۔

یشودھرا :۔ لیکن ہمارا بھگوان تو چلتا ہے ، بولتا ہے ، روتا ہے ۔ ہنستا ہے ۔ جیسے ہم اور تم ۔

رحولا :۔ واقعی ۔ پھر تو مجھے ضرور دیکھنا چاہیئے ۔ ماں کیا وہ ہماری اور تمہاری طرح دیکھتا بھی ہے ؟ میرا مقصد ہے کہ اُس کی کوئی خاص آنکھیں یا کوئی خاص شکل تو نہیں ہے ۔

یشودھرا :۔ وہ بالکل ہم جیسا ہے ۔

(رحولا کی پیشانی کو بوسہ دیتی ہے)

رحولا :۔ لیکن میں تمام راستے کیسے چل سکتا ہوں ۔ مجھے اپنا گھوڑا لانے دو ۔

یشودھرا :۔ اگر تم تھک گئے ہو تو میرے کندھوں پر بیٹھ جاؤ ۔

رحولا :۔ نہیں ۔ تم اندھیرے میں ٹھوکر کھا جاؤگی ۔ ماں ، لیکن وہ باغ ہے کہاں ؟ کیا میں نے اُسے پہلے دیکھا ہے ؟

یشودھرا :۔ نہیں ۔ لیکن وہ اب بہت قریب ہے ۔ گرد ذرا راستے سے ہٹ کر ۔

رحولا :۔ لیکن میں اس طرح گھسٹتا ہوا نہیں چل سکتا ۔ ماں اس وقت پوجا کو چھوڑ دو ۔ گھر واپس چلو ۔ چمپا مجھے کوس رہی ہوگی ۔ میں نے کھانے کے بعد اُسکے ساتھ

کھیلنے کا وعدہ کیا تھا۔

یشودھرا :۔ رہولا۔ کیا تم اپنی ماں کو اندھیرے میں اکیلا چھوڑ دو گے۔ ایک تم ہی تو اس کی راہ کا اجالا ہو۔

رہولا :۔ اوہو! ماں۔ مت روؤ۔ اچھا چلو آگے چلیں۔

یشودھرا :۔ میرا پیارا! (سینے سے چمٹاتی ہے)

رہولا :۔ آج رات تارے کہاں چلے گئے؟

یشودھرا :۔ شاید وہ سب تمہارے چھوٹے سے دل میں چھپے ہوئے ہیں۔

(کچھ فاصلہ پر ہلکی روشنی کی جھلک اور چیکاروں کی آواز)

رہولا :۔ (ڈرتے ہوئے) ہیں! یہ ہنگامہ سا کہاں ہو رہا ہے؟ ہمیں بھاگ جانا چاہئیے۔ (ماں سے چمٹتے ہوئے) اوہو! بھوت۔

یشودھرا :۔ وہ سب بھاگ جائیں گے۔

رہولا :۔ بھوت! ماں!!

یشودھرا :۔ کہاں؟

رہولا :۔ وہ سامنے!

یشودھرا :۔ مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ مت ڈرو کیا میں تمہارے ساتھ نہیں ہوں۔

رہولا :۔ ماں! ماں!! کیا تم آواز نہیں سن رہی ہو؟

یشودھرا :۔ ہاں میں پاؤں کی چاپ سن رہی ہوں اور گانے کے ہلکے سُر۔

(چھپا، مالی اور دوہ گیر داخل ہوتے ہیں)

چھپا :۔ تم یہاں ہو! میں تو تمہیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی۔ جب میں تمہاری تلاش میں باغ گئی تو وہاں سوائے اس مالی کے جو مرجھائے ہوئے درختوں کو پانی دے رہا تھا کوئی بھی نہ تھا۔ اور محل میں بھی بجائے زندگی کے ہنگامے اور شور کے قبر کا سا سکون اور خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ہاں یہ تم اس اندھیرے میں خود غرض بنے کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ رہول! اور کھیل ادھورا کیوں چھوڑ دیا تم نے؟

یشودھرا :۔ چھپا اسے بھگوان کے درشن کو جانے دو۔

چھپا :۔ بھگوان! کیا ان کا مطلب کھلونوں اور مٹھائیوں سے ہے؟ آؤ میرے ساتھ۔ رہولا! میں تمہیں لاتعداد میٹھا دکھاؤں۔

رہولا :۔ کہاں؟

چھپا :۔ تم کھیلنے جاؤ۔ خود دیکھ لو گے

(گوتم بھکشو کے ساتھ داخل ہوتے ہیں)

(رہولا گوتم کے آگے جھکتا ہے)

یشودھرا :۔ (خاکساری سے) میری زندگی صرف تم سے وابستہ ہے میرے آقا! کنول اپنی پیدائشی جگہ نہیں جانتا۔ لیکن جب وہ چکر کھاتا ہے تو اپنے آپ کو مٹی اور کیچڑ میں لتھڑا ہوا پاتا ہے۔ وہ شرم سے سرخ ہو جاتا ہے۔ پھر جب سورج اس کو دیکھ کر مسکراتا ہے تو وہ خوشی سے ناچنے لگتا ہے۔ یہاں تک کہ اسکی پنکھڑیاں گر پڑتی ہیں۔ اور صرف ڈنٹھل جو وہ سورج دیوتا کو نذر کرتا ہے یادگار باقی رہ جاتا ہے۔

(بادشاہ اور چھپا داخل ہوتے ہیں)

بادشاہ :۔ میرے بیٹے! مجھے میری محبت بخش دو!

گوتم :۔ ان سے محبت کرو جن کو میں چاہتا ہوں۔ تباہ حال انسانیت۔ یشودھرا! تمہارے باغ کے پھولوں کا اب کیا حال ہے؟

یشودھرا :۔ وہ اب کیڑوں سے بچے ہوئے ہیں۔

گوتم :۔ کیا تم نے ان کو مار دیا ہے؟

یشودھرا :۔ نہیں۔ میں نے انہیں پھولوں پر زندگی بسر کرنا سکھا دیا ہے۔

گوتم :۔ یشودھرا جاؤ اور باغبانی کرو۔ لیکن دیکھو! پودوں کو اپنے آنسوؤں سے مت سینچنا۔ اور رہول! ہر کھیل کو ہمیشہ خاتمہ تک مت پہنچاؤ۔ اور باغ میں کھیلو۔ جہاں روشنی اور سایہ ہو۔ چھپا! اپنے رتھ کو ہانکے جاؤ۔ یہاں تک کہ تم کہکشاں تک پہنچ جاؤ۔

(بھکشو کے ساتھ چلا جاتا ہے)

بادشاہ :۔ یشودھرا! میں تمہاری آنکھوں میں مسکراہٹ دیکھتا ہوں

یشودھرا :۔ ہاں پتا جی! یہ بھرے ہوئے دل کا اثر ہے۔

چھپا :۔ رہولا! اب ہم کیا کھیلیں گے؟ کیا تم نے بھگوان کا کہنا نہیں سنا؟

(رہولا، طوطے اور موروں کے ساتھ جو یشودھرا کے پلو پر کڑھے ہوئے ہیں کھیل رہا ہے)

غریب کی عید

(از جناب بیدل صدیقی رام نگری)

ساجدہ بے صبری سے انور کی راہ دیکھ رہی تھی۔ راحت اُس کا خوردسال بچہ آنگن میں کھیل رہا تھا۔ اور صابر ابھی ابھی باہر نکل گیا تھا۔ . . . . آج اُنہیں دیر کیوں ہوئی؟ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔ اُمید موہوم نے کامیابی کی ایک جھلک اُس کے سامنے پیش کی . . . . . اُس نے اپنے آپ سے کہہ ڈالا۔ ضرور اُنہیں آج کوئی کام مل گیا . . . . . ورنہ اتنی دیر نہ ہوتی وہ کب کے آگئے ہوتے۔ اُس وقت آس پاس کے گھروں سے پھلکیاں اور بڑے تلے جانے کی لذت انگیز خوشبو اُڑ رہی تھی۔ اور وہ مغموم اُداس بیٹھی تھی۔ اُس کا مٹی کا چولھا لیا پُتا بالکل صاف تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کئی دن سے اُس میں آگ تک نہیں جلی ہے ——— !

اُس نے پڑوس کے گھروں سے اُٹھتے ہوئے دھوئیں کو معنی خیز نظروں سے دیکھا اور اپنے تین دن کے لپے پُتے چولھے کو یاس انگیز نگاہوں سے گھورنے لگی۔

ہائیں! اس وقت تو کھانا پکانے کا وقت ہے اور میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہوں ——— وہ آئیں گے ——— تو ——— سرسری طور پر اُس نے سوچا ——— پھر اُسے خیال ہوا۔ ایسا تو تین دن سے ہو رہا ہے۔ تین دن سے چولھے میں آگ تک نہیں جل رہی ہے ——— انہیں تین دن سے روزے پہ روزہ ہے ——— اور اُس کے معصوم بچے ——— وہ بھی پانی پی پی کر ——— وہ پھر خیالات کی رَو میں بہکی۔ ایسا کیوں ہوتا ہے ——— اُنہیں کام کیوں نہیں ملتا؟ ——— ہم اتنی شدید تکلیفیں کیوں اُٹھا رہے ہیں ——— خدا کو ہم پر ترس کیوں نہیں آتا ———؟ آخر ہم بھی تو اُس کے دیگر بندوں کی طرح بندے ہیں ——— کسی شر و فساد میں نہیں رہتے ——— کسی کی بُرائی و غیبت نہیں کرتے۔ پھر ایسا کیوں ہے ———؟ یکایک اُس کا خوردسال بچہ کھیلتے کھیلتے رو پڑا ——— اور وہ دوڑی اپنے بچے کی طرف ——— !

"ماں لوٹی دو ہمیں بھوک لگی ہے۔" معصوم راحت نے اپنی توتلی زبان میں کہا۔

ساجدہ خاموش رہی۔

بچہ پھر چیخ پڑا ——— "ماں لوٹی دو، ہمیں بھوت لدی ہے۔ ماں ہا ماں!!" اب وہ خاموش نہ رہ سکی۔

"ہاں بیٹا دوں گی روٹی۔ ضرور دوں گی۔ اور اپنے لال کو اچھی اچھی مٹھائیاں بھی دوں گی۔ دیکھو تمہارے ابا عمدہ عمدہ مٹھائیاں لیکر آتے ہی ہونگے کچھ دیر اور کھیلو بیٹا۔" وہ اپنے معصوم بچے کو جھوٹی تسلی دیکر دوسری طرف منہ پھیر کر رونے لگی ——— معصوم راحت پھر کھیل میں مشغول ہو گیا ———

ساجدہ روتے روتے خیالات کی دُنیا میں پھر گم ہو گئی۔ اُس نے سوچا کب تک میں اسے یونہی تسکین دیتی رہوں گی ——— اور کتنی دیر یونہی کھیل میں بہلا رہے گا ——— آہ! معبود ——— اگر ہم نے کوئی گناہ کیا ہے تو یہ معصوم بچے تو بے گناہ ہیں ——— کم از کم اتنا کام تو انہیں مل جایا کرے کہ ان معصوموں کو بھوک کی تکلیف سے دوچار نہ ہونا پڑے ——— ان سے ابھی صبر نہیں ہوتا ——— اُس نے ایک سرد آہ کھینچی۔ ٹھیک اُسی وقت صابر دوڑا ہوا آیا۔ اُس کے ہاتھوں میں کچھ پھلکیاں اور تھوڑی سی گھنگھنی تھیں ——— ماں کے پاس پہنچ کر اُس نے کہا۔ "لے ماں۔ آج مسجد میں بہت ساری افطاری آئی ہے۔ اور لڑکوں میں تقسیم ہو رہی ہے ——— تمام جلدی سے اور لے آؤں۔"

بھائی کے ہاتھوں میں کچھ دیکھکر راحت اپنی کمزور ٹانگوں سے دوڑ پڑا ——— اور دُور ہی سے چلایا۔ "بھیا ہمے بی دے۔" (بھیا مجھے بھی دے)

صابر گھنگھنی اور پھلکیاں ماں کے ہاتھ میں دیکے پھر باہر نکل گیا۔ جب سے روزہ شروع ہوا تھا وہ افطار کے وقت مسجد میں چلا جاتا تھا۔ آس پاس کے اور لڑکے بھی جمع ہو جاتے تھے ——— اور افطار سے کچھ پہلے جب لڑکوں کو افطاری تقسیم ہوتی تھی تو وہ بھی کچھ پا جاتا تھا ——— چونکہ آج شہر کے مشہور رئیس محمد انور کی طرف سے ہر مسجد پر روزہ کشائی تھی۔ اس لئے کافی سے زیادہ تعداد میں افطاری آئی تھی۔ اور لڑکوں کو دوبارہ سہ بارہ تقسیم کی جا رہی تھی۔

ساجدہ راحت کو صابر کی لائی ہوئی افطاری کھلاتی جاتی تھی اور روتی جاتی تھی ——— اُس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا ایک دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا ——— وہ سوچ رہی تھی۔ "غریبی! انسان کو کس درجہ تک پہنچا دیتی ہے ——— وہ غریب تھی۔ لیکن ایک خوددار غریب تھی ——— وہ غریب تھی لیکن اپنے سینے میں ایک غیور دل رکھتی تھی۔ صابر کی اس حرکت سے اس کی خودداری کو ٹھیس لگ رہی تھی۔ اُس نے اپنے شوہر کے ساتھ نہ جانے کتنے فاقے کر ڈالے تھے

ین اڈیسن پڑوسن کو کبھی معلوم نہ ہونے دیا تھا — کوئی بھی کبھی یہ نہ جان سکا
کہ آج ساجدہ کے گھر ہانڈی نہیں چڑھی ہے —— اُس نے خیال کیا
—— صابر روز ہی ایسا کرتا رہا ہوگا ——!

کیسے نہ کرتا — بھوک انسان سے کیا نہیں کرا چھوڑتی —— پھر وہ
وم کیا جانے کہ خودداری کسے کہتے ہیں اور غیرت کس چیز کا نام ہے ——
—— خیالات کے بہاؤ میں وہ یہیں تک بہی تھی کہ اُس کے کانوں نے سُنا
ند اکبر —— اللہ اکبر —— اذان ہو رہی تھی — اُس نے کانپتے ہوئے
نٹوں سے اللہ اکبر دُہرایا —— اور ایک گھونٹ پانی سے روزہ افطار
کے مُصلّے پر بیٹھ گئی —— آج وہ نہ جانے کتنی نمازیں پڑھے جا رہی تھی——
نے کتنی دُعائیں مانگے جا رہی تھی — اُس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔
—— اور خدائے پاک یزدان سے گڑگڑا کر کچھ مانگ رہی تھی۔

مُنہ لٹکائے ہوئے صابر گھر میں داخل ہوا۔ اور اُس نے ماں سے کہا۔
ے کے نہیں ملی ماں۔ میرے پہنچنے سے پہلے پہلے بٹ چکی تھی۔ جب میں پہنچا تو
وقت لوگ چاند دیکھ رہے تھے۔ اور ہاتھ پھیلا کر چاند سے نہ جانے کیا مانگ
ہے تھے۔ میں نے بھی چاند سے کھانا مانگا ماں۔ لیکن مجھے تو نہیں ملا۔"

مُصلّے لپیٹتے ہوئے ساجدہ نے کہا۔ "چاند ہو گیا صابر؟"

"ہاں ماں!" صابر نے کہا۔ "سب لڑکے کہہ رہے تھے کل عید ہے۔"

"ہوں!" ساجدہ نے سر ہلایا۔ اور ایک بار پھر رو پڑی۔

"کل عید ہے ماں! کیا لڑکے ٹھیک کہہ رہے تھے؟" صابر نے پوچھا۔

"ہاں"! ماں نے روندھی ہوئی آواز سے جواب دیا "لیکن امیروں کی
ہے —— غریبوں کی نہیں"

"تو مجھے بھی کل اچھے اچھے کپڑے پہناؤ گی نہ ماں؟ میں بھی عید
اؤں گا۔" صابر نے ماں کی پیٹھ پر لدتے ہوئے کہا۔

"کیوں نہیں بیٹا! —— اور ہاں دیکھو وہ تمہاری ٹھیکلی وغیرہ
ہے۔ جاؤ کھاؤ اور جلدی سے سو جاؤ۔ کیونکہ صبح عید ہے۔ اور راحت تم
۔" صابر کو پیٹھ پر سے اتارتے ہوئے ماں نے کہا ——!

دونوں بچوں کو سُلا کر ساجدہ خود بھی دیوار سے اُٹھنگ کر آکور
ماہ دیکھنے لگی۔

آنور صبح سے شام تک شہر کی خاک چھانتا رہا۔ لیکن اُسے کوئی کام نہ
لیکن نے اُس سے سیدھے منہ بات بھی نہ کی۔ مایوس ہو کر وہ اب گھر کی طرف لوٹ
رہا تھا۔ مگر اُس کے پاؤں گویا آگے بڑھنے سے رُک رہے تھے۔ وہ بیکس بیٹھا ہوا
چل رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کون سا منہ لیکر گھر جائے۔ صابر و راحت تین دن
سے بھوکے ہیں۔ وہ گھر پہنچتے ہی لپٹ جائیں گے۔ اُنہیں کیا جواب دیگا۔ کس
طرح سمجھائیگا۔ ساجدہ نے اُنہیں یہی کہہ کر تسکین دے رکھی ہوگی کہ تمہارے ابا
تمہارے لئے کھانے کی چیزیں لیکر آتے ہونگے۔ آہ! اے ساجدہ! صابر اور راحت
کی ماں۔ تو فرشتہ کہلائے جانے کی مستحق ہے —— تو حوران جناں سے
بھی زیادہ خوبصورت ہے۔ تیری معصومیت اور پاکیزگی شیرخوار بچوں سے بھی بڑھکر
ہے۔ تیری ہی ہستی وہ ہستی ہے جس نے آنور کو زندہ رہنے پر مجبور کیا۔ تو نہ ہوتی تو
آنور کب کا مر گیا ہوتا۔ کب کا اس دُنیا سے رُخصت ہو چکا ہوتا۔ کب کا ان
عارضی جھنجھٹوں سے چھٹکارا پا گیا ہوتا۔ مگر ساجدہ! تیرا آنور کیا کرے ——
تیرا آنور تو تجھ جیسی نیک خصلت بیوی پا کر اپنی قسمت پہ ناز کرتا ہے۔ لیکن قسمت
ناز کرنے دے جب نا! تیرا آنور نہیں چاہتا کہ تو تکلیف کا منہ دیکھے۔ لیکن
تقدیر ایسا کرنے دے جب نا! تیرے آنور کا بس چلے تو وہ تجھے ملکہ بنا دے
لیکن زمانہ اور وقت بس چلنے دے جب نا ——!

اُس کے خیالات کا سلسلہ یہیں تک پہنچا تھا کہ اُس نے سُنا۔ کوئی پکار
رہا تھا۔ "مزدور —— ! او مزدور ——!!" اُس نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی
ایک سیٹھ جی نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے بلایا۔ "یہ بورا سٹیشن پہنچا دے گا؟
اس میں غلہ ہے۔"

"کیوں نہیں پہنچاؤں گا۔ میرا کام ہی یہی ہے!" آنور نے کہا۔

"کیا مزدوری لے گا؟" سیٹھ نے پوچھا۔

"جو جی چاہے دے دیجئے گا۔"

"اچھا لے چل۔"

آنور نے بورا سر پر اُٹھا لیا اور لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلنے لگا۔ اُس
نے تین دن سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ لیکن ساجدہ اور اُس کے بچوں کے خیال سے اُسکے جسم
میں ایک عجیب قسم کی پھُرتی آ گئی تھی۔ اُس کے بیٹھے ہوئے دل میں ہمت پیدا ہو گئی
تھی۔ بوجھ کافی وزنی تھا پھر بھی آنور نے گرتے پڑتے سٹیشن تک پہنچا ہی دیا۔
اُسے اُمید تھی کہ سیٹھ سے اُسے اتنا مل جائیگا کہ وہ آج گھر بھر کا پیٹ بھر سکے گا۔
لیکن یہ اُس کا خیال ہی خیال تھا۔ سیٹھ نے اپنے بٹوے میں سے تین گنے پیسے
نکال کر اُسکے ہاتھ پر رکھ دیئے۔ اور وہ دیکھتا رہ گیا۔ اُس نے آٹھ آنے کا کام کیا تھا
لیکن اسکی قسمت! اُس نے پوری ہمت سے کام لیتے ہوئے سیٹھ سے کہا۔ "وقت
کے حساب سے آٹھ آنے مزدوری ہوتی ہے۔ اِس وقت تو رات ہے۔ غریب کا پیٹ

دو اپنے سینے کی ...

"۔۔۔ آنے تو ابھی تین گئے پیچھے تھے اور پہلے۔ اور ۔۔۔ اشر

کے گھر کی طرف چل گیا۔

قریب آنور صبر کر کے رہ گیا۔ اب وہ پھر گھر کی طرف چل رہا تھا۔ نقاہت سے اس کے قدم اٹھ نہیں رہے تھے لیکن پھر بھی وہ چل رہا تھا۔ چلے جا رہا تھا ——— ساجدہ اور بچوں کی کشش اسے کھینچے لئے جا رہی تھی ——— آدھی رات کے وقت وہ گھر کے قریب پہنچا۔ اس وقت ساری دنیا خواب راحت کے مزے لے رہی تھی۔ کائنات کا ذرہ ذرہ خواب استراحت میں مصروف تھا۔ البتہ آسمان پر ستارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔ دروازہ کے قریب پہنچکر اس نے سوچا اندر داخل ہوں یا نہیں۔ ممکن ہے بچے جاگتے ہوں۔ وہ روٹی مانگیں گے ——— نہیں! اس وقت تک بچے کہاں جاگتے ہونگے۔ اور ساجدہ بھی شاید ہی جاگتی ہو۔ اس نے خیال کیا۔ اور اسی خیال کے ماتحت کنڈی کھٹکھٹائی۔ دروازہ آپ ہی آپ کھل گیا۔ ائیں! یہ کیا ——— ؟ دروازہ کھلا ہوا ہے۔ یا اللہ خیر ——— وہ غیر معمولی تعجیل کے ساتھ گھر میں داخل ہوا۔ اس نے دیکھا چراغ گل ہو چکا ہے۔ راحت اور صابر کھٹولے پر سو رہے ہیں اور ساجدہ دیوار سے لگی ہوئی ہے ——— ساجدہ کی حالت دیکھکر اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ رونے لگا۔ عین اسی وقت ساجدہ کی آنکھ کھل گئی۔ اور اندھیرے میں ایک مرد کو دیکھکر وہ سہم گئی۔ اسے خیال ہوا۔ وہ دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ کہیں کوئی بدمعاش تو نہیں گھر میں گھس آیا ہے ——— کچھ لمحہ وہ چپ چاپ دیکھتی رہی۔ پھر اس نے کڑک کر پوچھا۔

"کون ؟"

"ساجدہ!" انور نے روندھی ہوئی آواز سے جواب دیا۔

"میرے سرتاج!" وہ جلدی سے اٹھی اور انور سے لپٹ کر رونے لگی۔

"اتنی رات تک کہاں تھے آپ؟" روتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"قسمت کو رو رہا تھا ساجدہ! صبح سے شام تک کوئی کام نہ ملا۔ گھر لوٹتے وقت ایک کام ملا بھی تو پوری مزدوری نہیں ملی۔" اس نے چار آنے پیسے ساجدہ کے ہاتھ میں رکھ دیئے۔

"اتنا ہی بہت ہے میرے مالک۔ کل صبح انہیں پیسوں کا غلہ خرید لائے گا۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے میری سن لی۔ لیکن ساجدہ کل عید بھی تو ہے۔" انور نے کہا اور رو پڑا۔

"آپ رو رہے ہیں۔ مرد ہو کر ——— ہمت کیجئے۔ عید ہے تو ہوا کرے۔"

"کیوں نہ روؤں ساجدہ! میرے معصوم بچے راحت اور صابر کل ترس جائیں گے اور تم ——— تمہارے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ دنیا کل عید منائے گی۔"

"نہیں ہے تو کیا ہوا ——— دنیا میں راحت اور صابر جیسے کتنے بچے اور ساجدہ جیسی کتنی عورتیں ہونگی ——— ہر حال میں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ چلئے آرام کیجئے ——— میں آپ کا جسم دباؤں۔ تھک گئے ہونگے آپ۔"

انور ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر لیٹ گیا اور ساجدہ اس کا بدن دبانے لگی۔ انور کو تو فوراً نیند آ گئی ——— مگر ساجدہ دیر تک اپنی قسمت کو رونے کے بعد انور کے پیروں کے پاس ہی پڑ کر سو گئی ———

صبح ہوئی اور عید کی صبح! گوناگوں مسرتوں کے ساتھ۔ ساری دنیا میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی ——— بچے نئے نئے اور رنگین کپڑے پہن کر قبل از وقت عیدگاہ کا چکر لگانے لگے ——— دکانیں سجیں۔ صدقے ہوئے۔ فطرے دیئے گئے۔ سوئیاں پکیں ——— غرضکہ بڑی شان کے ساتھ عید منائی گئی۔ لیکن عیدگاہ کے قریب ہی ایک ایسا گھر بھی تھا۔ جس میں آج تین دن کے بعد آگ سلگی تھی ——— ساجدہ کے معصومین راحت و صابر پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے کھانے کے انتظار میں چولھے کے قریب ہی بیٹھے تھے۔ ساجدہ بھی اسی بوسیدہ ساڑی میں ملبوس تھی جو اس نے ایک ماہ سے پہن رکھی تھی۔ غریب کہاں سے پہنتی۔ دوسری ساڑی اس کے پاس تھی ہی نہیں۔ اور انور ——— انور ——— تو قریب قریب ننگا تھا۔ صرف ایک لنگی اس کی ستر پوشی کر رہی تھی ——— !

یہ ہے غریب کی عبرت ناک عید ——— سرمایہ داروں کے لئے درس عبرت ——— اور دنیا والوں کے لئے سبق آموز!!

مئی ۱۹۴۴ء کا "ادیب"

اگر کوئی صاحب مجھے دے سکتے ہوں تو میں اس کی قیمت پانچ روپے تک ادا کرنے کو تیار ہوں۔ ذریعہ وی، پی بھیج دیں۔ "میری زندگی کے چند موڑ" کی پہلی قسط اس پرچہ میں چھپی تھی۔ پرچہ یہاں نہیں ملتا اور اس کی بڑی سخت ضرورت ہے۔

وی، پی بھیجنے کا پتہ:۔

واحدی اڈیٹر "ادیب" کوچہ چیلان۔ دہلی

موپساں کے ایک افسانے کا آزاد ترجمہ

نیکلس

(از جناب خالد حسن قادری آگرہ)

وہ حسین تھی۔ اس کے سنہرے گھونگھر والے بال، نازک نقشہ، خوبصورت مسکراتی ہوئی آنکھیں اس کو مرکز نگاہ بنانے کے لئے کافی تھیں۔ ارغوانی رنگ کے لباس میں تو وہ بہشت کی شاداب وادیوں سے اُتری ہوئی دیوی معلوم ہوتی۔ سراپا تن ایک نغمہ تھی۔ شیریں اور دلکش، حوران بہشتی کے نازک لبوں پر تیرنے والا نغمہ۔

وہ کسی طرح ایک شاندار ملکہ سے کم نہ تھی۔ لیکن قدرت کی ستم ظریفی نے اسکو ایک غریب گھرانے میں پیدا کیا۔ وہ سمجھتی تھی کہ غربت کی لعنت کم نہیں۔ وہ نہ اعلیٰ سوسائٹی اسکول سکتی ہے، نہ مخصوص جلسوں میں شرکت کر سکتی ہے، نہ کوئی بڑا آدمی اس سے محبت کریگا اور نہ اس کو اس کی توقع رکھنی چاہئیے۔ اسی لئے ملکہ ہوتے ہوئے بھی ایک غریب کلرک کی بیوی بننے پر مجبور تھی۔ لیکن اُس کو اپنے غم کا بھی احساس تھا۔ وہ سمجھتی تھی کہ اُس جیسی حسین عورت کیلئے یہ معمولی سا بنگلہ اور بوسیدہ دیواریں، ٹوٹی ہوئی کرسیاں، پرانے اور رنگ اُڑے ہوئے پردے موزوں نہیں۔ اسی لئے سوائے ایک دو عورتوں کے وہ نہ کسی سے ملتی اور نہ کسی کو اپنے گھر بلاتی۔ نہ اس کے پاس قیمتی کپڑے تھے اور نہ زیورات۔ ان کے بغیر سوسائٹی میں کوئی وقعت نہیں ہوسکتی

— ۲ —

ایک دن اس کا شوہر لوئیس دفتر سے لوٹ کر آیا۔ اُس کے چہرے پر غیر معمول شگفتگی تھی۔ جیب سے گلابی رنگ کا بڑا لفافہ نکالتے ہوئے بولا۔

"میری! یہ دیکھو تمہارے نام آیا ہے۔"

اس نے لفافہ چاک کیا اور وزیر معلومات عامہ کی طرف سے دعوت نامہ جس میں مسٹر اور مسز لوئیس کو شرکت کے لئے بلایا تھا۔

اس نے دعوت نامہ پڑھا اور لوئیس کی توقعات کے خلاف زور سے پھینک دیا اور بولی "تو کیا مطلب ہے اس سے؟"

"... اچھل پڑو گی۔ تم کہیں آتی جاتی بھی نہیں ہو۔ یہ کتنا اچھا موقع ہے۔ تمام بڑے بڑے آدمی وہاں ہونگے۔ کلرکوں کو تو دعوت نامے بھی نہیں ... تمہارے خیال سے بہت محنت کرکے یہ دعوت نامہ لایا ہوں۔"

میری نے ناراضگی سے اسکی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اور پہنوں گی کیا؟"

لوئیس کو اس کا خیال بھی نہ تھا۔ تھوڑی دیر کے لئے اس کو چپ ہونا پڑا۔

"لیکن ارغوانی رنگ کا لباس جسے تم پہن کر اس دن سنیما گئی تھیں میرے خیال میں تو وہ بہت اچھا ہے۔"

وہ خاموش ہوگیا۔ میری کی حسین آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو اسکے گلابی رخساروں پر بہہ نکلے۔

"کیا بات ہے میری؟" اُس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

"کچھ نہیں" میری اپنے گلہائے شبنم زدہ رومال سے پونچھتی ہوئی بولی۔ "میرے پاس اس دعوت کے لائق لباس نہیں ہے۔ بہتر ہوگا کہ تم یہ دعوت نامہ کسی اور کلرک کو دیدو۔ جس کی بیوی کے پاس مناسب لباس اور زیورات ہوں۔"

لوئیس کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ "خیر کوئی بات نہیں۔ اس موقعہ کے لئے اچھا لباس کم سے کم کتنے میں بن جائے گا"

میری سوچنے لگی کہ کتنا بتائے۔ وہ جانتی تھی کہ غریب لوئیس زیادہ خرچ نہیں کر سکتا۔ کچھ دیر کے بعد بولی۔ "مجھے صحیح اندازہ نہیں لیکن کم سے کم دو سو روپے میں بن جائے گا۔"

یہ سنتے ہی اس کا چہرہ اُتر گیا کیونکہ ٹھیک دو سو روپے اُس نے بڑی محنت سے بندوق خریدنے کیلئے جمع کئے تھے۔ تاکہ آئندہ موسم گرما میں دوسرے کلرکوں کے ساتھ وہ بھی شکار میں جاسکے۔ لیکن وہ بولا "اچھا میں دو سو کا انتظام کر دوں گا۔ تم اپنی پسند کا لباس بنالو۔"

دعوت کا دن قریب آگیا۔ لیکن میری اب بھی کچھ اُداس معلوم ہوتی تھی۔ لوئیس نے اس سے پوچھا کہ کیا بات ہے تم کئی دن سے رنجیدہ نظر آتی ہو۔"

"میرے پاس ایک بھی اچھا زیور نہیں ہے۔ جو میں پہن کر جاسکوں۔ اس سے تو نہ جانا بہتر ہے۔"

وہ دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ "تم مسز جیم کے پاس کیوں نہیں جاتیں۔ ان سے تمہاری کافی ملتی ہے۔ ایک آدھ زیور ان سے لے آؤ۔"

وہ خوشی سے اُچھل پڑی۔ واقعی اس کو یہ خیال بھی نہ آیا تھا۔

دوسرے دن وہ مسز جیم کے پاس گئی اور اس سے سب حال کہا۔ مسز جیم

نے فوراً اپنا جواہرات کا ڈبہ نکالا اور اُس سے کہا اس میں سے پسند کرلو۔ اُس نے سب سے پہلے بریسلیٹ دیکھے۔ اس کے بعد موتیوں کا ہار، انگوٹھیاں بندے ان سب کو آئینہ کے سامنے پہن کر دیکھا۔ دیر تک سوچتی رہی کہ کون سی چیز لے اور کون سی چھوڑ دے وہ کچھ فیصلہ نہ کرسکی۔

تمہارے پاس اور بھی ہیں اِن کے علاوہ؟" اُس نے آخر مسز جم سے پوچھ ہی لیا۔

"کیوں نہیں۔ یہ لو" مسز جم نے اور جواہرات دیتے ہوئے کہا۔ "مجھے معلوم نہیں تم کیا چیز پسند کروگی"

وہ اور چیزیں دیکھتی رہی۔ آخر سیاہ مخملی ڈبہ میں لپٹے جواہرات کا نازک نیکلس مل ہی گیا۔ اُس کو دیکھ کر اُس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اُسے اُٹھایا اور گلے میں پہن کر دیکھا۔ ہیروں کی چمک چوندھ میں وہ دو ایک منٹ کے لئے کھو گئی۔ آخر ہچکچاتے ہوئے بولی "تم یہ نیکلس دیدو گی مجھے۔ صرف یہ ایک"۔

"ہاں ہاں۔ بڑے شوق سے لے جاؤ۔"

آخر دعوت کا دن بھی آ ہی پہنچا۔ سب کی نگاہیں مسز لوئیسل پر ہی تھیں۔ بڑے بڑے لارڈ کی بیویاں اس کو رشک و حسد سے دیکھ رہی تھیں۔ ہر شخص کی خواہش تھی کہ وہ اس سے بات کرے یا کم سے کم تعارف ہی حاصل کرلے

دعوت میں خود وزیر نے اُسے گلاس پیش کیا۔ اُس نے خوب پی۔ اسکے بعد رقص گاہ میں رقص کیا۔ اپنی کامیابی کی خوشی اور مسرت کے نشہ میں وہ بالکل مدہوش تھی۔ دیر تک بڑے بڑے آدمیوں کے ساتھ رقص کرتی رہی۔ صبح چار بجے کے قریب وہ وہاں سے آئی۔ برابر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں اس کا شوہر اور دوسرے آدمیوں کے ساتھ اونگھ رہا تھا جن کی بیویاں اسی کی طرح محفل رقص و سرود میں محو تھیں۔ دونوں گھر کی طرف چل دیئے۔ اتنی رات گئے سواری کہاں ملتی۔ لیکن خوش قسمتی سے کچھ دور چلنے کے بعد ایک گاڑی مل گئی۔

دونوں اونگھتے ہوئے، ٹھنڈ میں سکڑتے ہوئے گھر پہنچے۔ لوئیسل کو صبح دس بجے دفتر بھی جانا تھا۔ وہ لیٹنے کی تیاری کرنے لگا۔ میری نے کپڑے بدلنے سے پہلے اپنا چہرہ کن حُسن ایک بار پھر آئینہ میں دیکھا۔ آئینہ دیکھتے ہی اُس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ نیکلس اُس کے گلے میں سے غائب تھا۔

لوئیسل جو شب خوابی کا لباس پہن چکا تھا بھاگا بھاگا آیا۔

"کیا ہوا؟"

"ہار! مسز جم کا ہار — کھو گیا۔" وہ ہکلاتے ہوئے بولی

"ہیں! ہار!" لوئیسل جیسے کچھ نہ کہہ سکا۔ "کیا — ہار — کھو گیا —

ناممکن کیسے — جب تم ہال میں تھیں تو وہ تمہارے گلے میں تھا۔"

"ہاں ہاں ہال سے نکلنے کے بعد بھی تھا۔"

"تو اگر سڑک پر گرا ہوتا تو آواز آتی۔"

"میرے خیال میں گاڑی میں رہ گیا۔"

"ممکن ہے۔" لوئیسل بولا۔ "تم نے اُس کا نمبر دیکھا تھا؟"

"نا۔ مجھے تو خیال نہیں رہا۔" وہ بولی "اور تم نے"

"نا"

دونوں سکتہ کے عالم میں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ پھر لوئیسل بولا۔ "میں جاتا ہوں۔ راستہ میں دیکھوں گا شاید مل جائے۔"

وہ ایک آرام کرسی پر گر پڑی۔ وہ ابھی دعوت کے لباس ہی میں تھی۔ اسکا دماغ کچھ ماؤف سا تھا۔ اتنی بھی طاقت نہ تھی کہ اُٹھ کر جاتی اور پلنگ پر لیٹ جاتی۔

صبح نو بجے کے قریب لوئیسل آیا۔ تمام راستہ میں دیکھا کہیں نہیں ملا۔ گاڑی والے کا بھی پتہ نہ لگا۔ تمام اڈوں پر بھی اُس نے دیکھا۔

دونوں پریشان بیٹھے رہے۔ لوئیسل بولا "تم مسز جم کو لکھ دو کہ نیکلس کی زنجیر ٹوٹ گئی ہے۔ میں اُسے ٹھیک کرا کے بھیج دوں گی۔ اتنے ہمیں تلاش کرنے کے لئے کچھ وقت مل جائے گا۔

تمام دن لوئیسل مارا مارا پھرا مگر کہیں پتہ نہ لگا۔ جب ایک ہفتہ گزر گیا تو دونوں نا اُمید ہو گئے۔ ایک ہی ہفتہ میں دونوں کے چہروں سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے برسوں کے بوڑھے ہیں۔

دونوں نیکلس کا ڈبہ لیکر اُس دکان پہ گئے جس کا پتہ ڈبہ پر لکھا ہوا تھا۔ جوہری نے اپنی کتاب کھولی اور بولا "ہمارے ہاں سے صرف یہ ڈبہ فروخت ہوا ہے نیکلس کہیں اور سے لیا گیا ہوگا۔"

وہ تمام جوہریوں کی دکانوں پر پھرتے رہے۔ ایک ایک کے ہاں پوچھتے پھرے۔ آخر ایک دُکان پر اُنہوں نے نیکلس دیکھا۔ بالکل ویسا ہی تھا لیکن اسکی قیمت بیس ہزار روپے تھی۔ آخر بڑی مشکل سے سولہ ہزار روپے پر معاملہ طے ہوا لیکن اُس نے اندازہ کیا کہ اسے اپنی چیزیں علیحدہ کرنے پر بھی آٹھ ہزار سے زیادہ نہ مل سکیں گے۔

آخر اُنہوں نے دو ایک ہزار ایک سے، دو ایک ہزار دوسرے سے اُدھار مانگے۔ بڑی مشکل سے سولہ ہزار کی رقم پوری ہوئی۔ اور ہار لینے چلا۔ وہ جانتا تھا کہ اُن کی ادائیگی کے لئے اُس کو اپنی زندگی کی بازی لگانا پڑے گی۔ ہر روحانی و جسمانی تکلیف اُٹھانے کے بعد بھی وہ شاید ہی اتنی رقم ادا کرسکے۔

ہار جوہری کی دکان سے آگیا۔ جب میری مسز جم کے پاس واپس لے گئی

وہ اُلجھن لہجہ میں بولی۔ تمہیں پہلے سے واپس کرنا چاہئے تھا۔ ممکن ہے کہ
ضرورت پڑتی۔"

وہ ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ ڈبہ کھول کر نہ دیکھ لے۔ ممکن ہے کہ وہ پہچان
لے لیکن غنیمت ہوا کہ اُس نے دیکھا نہیں۔ اور ویسے ہی اُٹھا کر رکھ دیا۔

۳

اب مسز لوئیسل کو ہوش آ چکا تھا۔ اپنی اس حالت کا اُسے کافی احساس تھا۔
جتی تھی کہ غریب لوئیسل مر بھی جائیگا تو اتنا قرضہ ادا نہیں کر سکتا۔ اور اس کی ساری
ذمہ داری اسی پر ہے۔ اس نے ایکدم اپنی طرز رہائش کو بدلنے کا فیصلہ کر لیا۔ نوکر
رخصت کر دیئے۔ موجودہ گھر چھوڑ کر شہر کے غریب محلہ میں ایک بہت معمولی سا مکان
کرایہ پر لے لیا۔ صبح کا ناشتہ بھی موقوف کر دیا۔ اب وہ بجائے ۹ بجے صبح ۵ بجے ہی اُٹھ
جاتی۔ تمام گھر میں جھاڑو دیتی۔ فرش دھوتی، برتن صاف کرتی۔ کھانا پکاتی۔ جب
لوئیسل دفتر چلا جاتا تو محلہ کے کپڑے سینے بیٹھ جاتی۔ غرض اس کی زندگی میں ایک
انقلاب رونما ہو چکا تھا۔ اب وہ پہلی سی میری نہ رہی تھی۔

کبھی جب گھر کے کام سے فارغ ہوتی تو کھڑکی کے سامنے بیٹھ جاتی اُس
کے دماغ میں وہ حسین شام پھر جاتی جب وہ دعوت میں شریک ہوئی تھی۔ کتنی کامیاب
رہی تھی اُسے دعوت میں۔ کتنے بڑے بڑے آدمیوں نے اس کو چائے پر دعوت دی
تھی۔ اگر ہار کھو یا نہ جاتا تو کیا ہوتا؟ کون جانتا ہے کہ کیا ہوتا؟

ایک اتوار کو وہ گھر کے کام سے تھک کر پارک میں ٹہلنے گئی ہوئی تھی کہ اس
نے ایک عورت کو دیکھا جو ایک بچہ کی اُنگلی پکڑے ہوئے ٹہل رہی تھی۔ یہ مسز جم تھی۔
اسی طرح تندرست، جوان اور حسین۔ لیکن وہ خود کتنا بدل گئی تھی۔ تندرست وہ
پہلے سے زیادہ تھی۔ لیکن اُس کی نرم و نازک انگلیاں اور سخت ہو گئی تھیں۔ چہرے
پر تفکرات کی وجہ سے پہلی سی شادابی بھی نہیں تھی۔ اُس نے سوچا کہ آؤ ان سے باتیں
کریں۔ اب تو سب قرضہ بھی ادا ہو گیا ہے۔

"مزاج شریف!" اُس نے مسز جم کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے
کہا۔ "اور سب بخیریت۔"

مسز جم چونک پڑی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا لیکن وہ میری کو بالکل نہ
پہچان سکی۔

"معاف کیجئے گا۔ میں آپ کو پہچان نہ سکی۔" اُس نے بے تکلفانہ انداز
دیکھتے ہوئے کہا۔ "غالباً آپ کو کچھ غلط فہمی ہوئی۔"

"غلط فہمی۔" میری ہنستے ہوئے بولی۔ "بالکل نہیں میں میری لوئیسل ہوں۔"

"ارے" وہ خوشی سے اُچھل پڑی اور اس کے گلے سے لپٹتے ہوئے بولی

"تم چند ہی سال میں کتنا بدل گئیں۔"

"جب سے میں تم سے ملی ہوں مجھے کافی تکلیف اُٹھانا پڑی ہے اور یہ
سب تمہاری وجہ سے۔"

"میری وجہ سے" اُس نے تعجب سے کہا۔ "وہ کیسے؟"

"تمہیں خیال ہوگا کہ تم نے مجھے ہیرے کا نیکلس دعوت میں پہننے کے
لئے دیا تھا۔"

"ہاں ہاں۔"

"وہ میں نے کھو دیا تھا۔"

"کیا مطلب؟ تم نے تو اُسے واپس کر دیا تھا۔"

"میں نے تمہیں دوسرا ہار بالکل ویسا ہی واپس کیا تھا۔ اور اُس کے لئے ہمیں
سات برس تک قرضہ چکانا پڑا۔ تم جانتی ہو ہم غریب آدمی ہیں۔ ہیرے کا نیکلس ہمارے
لئے کچھ معمولی بات نہیں۔ لیکن خیر خدا کا شکر ہے کہ اب سب مصیبتیں ختم ہو گئیں۔

"تم کہتی ہو کہ تم نے ہیرے کا ہار میرے ہار کی جگہ واپس کیا۔"

"ہاں ہاں۔ کیا تم نے جب سے اُسے دیکھا نہیں وہ بالکل تمہارا ہی جیسا ہے۔" یہ کہکر
وہ مسکرا دی۔ مسز جم کا چہرہ چمک اُٹھا۔ اس نے میری کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے
ہوئے کہا۔

"میری پیاری۔ میرا ہار تو مصنوعی تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو سو روپیہ کا ہوگا۔"

بیوی کا لکچر

(از جناب اشرف صبوحی دہلوی)

اوئی، اللہ مارا اخبار نہ ہوا وبال جان ہوگیا۔ اب اسے چھوڑو گے بھی۔ آج اتوار ہے۔ تمام دنیا کے کام اتوار پر اٹھا رکھتے ہو اور پھر خیال نہیں کرتے۔ ریڈیو سے چھٹے اخبار، اخبار ہٹا تو ریڈیو۔ آخر تم جاپان کے ٹھیکہ دار ہو۔ موئے ہٹلر سے تمہاری کب کی جان پہچان ہے۔ خبروں کا ایسا بھی لپکا خدا کسی کو نہ دے۔ اتنا دن چڑھ گیا اور ابھی تک چولھا بھی نہیں سلگا۔ سلگے کیسے؟ تمہیں خبار سے چھٹکارا نہیں۔ ایندھن ہو تو آگ جلے، ہنڈیا چڑھے۔ نصیبن ہیں تو الگ اپنے نصیبوں کو رو رہی ہیں۔ نگوڑا چھوکرا رات سے غائب ہے۔ گوشت ترکاری کون لائے۔ دوپہر کو کھاؤ گے کیا دفتر ہی چلے جایا کرو نا۔ صبر تو آ جائے کہ نہیں ہے۔ دل چاہتا ہے کہ اخبار چھین کر چولھے میں جھونک دوں۔ اللہ میری توبہ ہے۔ خدا کسی کو کوئی لت نہ ڈالے۔ ہوگیا گھڑی دو گھڑی کے لئے۔

اللہ مارا اخبار اب بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹا۔ میں نہ جانے کیا کیا دھندے کر آئی۔ میں پوچھتی ہوں تمہیں ہو کیا گیا ہے۔ خیر اب کھائی سو کھائی آگے کھاؤں تو رام دہائی۔ کل سے اخبار گھر میں آ جائے۔ اچھی اخبار پڑھنے سے تم کوئی بادشاہ ہو جاؤ گے۔

لے تو غضبی اندھیر آٹھ بج رہے ہیں اور تم ابھی اخبار ہی پڑھ رہے ہو۔ نہ منہ دھونے کا ہوش ہے نہ ڈاڑھی منڈوانے کا خیال۔ دنیا کے اور کام کب کرو گے نائی کئی دفعہ پکار پکار کر چلا گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا؟ کہ تم اخبار کس طرح پڑھتے ہو۔ جاتی جان بھی اخبار کے دھتیا ہیں مگر تمہارے جیسے نہیں۔ تمہارا اخبار تو ختم ہونے پر ہی نہیں آتا۔ اور اخبار بھی تو ایک نہیں۔ اخباروں کی دکان لگا رکھی ہے۔ پادر چینا میں گٹھے کے گٹھے پڑے ہیں۔ کہو تو وہ بھی اٹھا لاؤں تمہیں قسم ہے جو آج سر اٹھاؤ۔ شہر میں اگو لے ہیں تو ان کی چھتری بنا لینا۔ لوج! صبح کے چھ بجے کی بنی ہوئی چائے رکھی ہے۔ ٹھنڈی نہ ہوگی تو کیا گرم رہے گی۔ بچے نے چیخ چیخ کر چلے گئے۔ اٹھے تو اخبار لے بیٹھے۔ پہلے تو کیتلی میں رکھی رہی۔ آئی تو دیکھا کہ ویسی کی ویسی رکھی ہے۔ خیال ہوا کہ سیاہ ہو جائے گی۔ پیالی میں انڈیل کر رکھ دی۔ مجھے ایک ہی دھندا تو نہیں کہ تمہاری چائے کی چوکسی کروں اور تمہیں اخبار چھوڑے تو پیو۔ آخر بلی نے ساری چائے برباد کر دی۔ یہی خیر ہوئی کہ پیالی نہ توڑی۔ ایک ہی تو سٹ رہ گیا ہے وہ بھی اینڈ ہو جاتا۔ تم سے اتنا نہ ہوا کہ ذرا ہشت کر دیتے۔ گر تمہاری جوتی سے۔ اخبار پڑھنا بند نہ کیا۔ اچھا اب آج تم کو بھی قسم ہے جو اخبار پڑھنے کے سوا کوئی دوسرا کام کرو۔ اگر دفتر کا پلندہ لیکر بیٹھے تو دیکھنا تماشا۔ دیا سلائی نہ دکھا دی ہو۔

غضب الٰہی! اندر دیکھو کبوتروں نے کارنس پر سے گلدان پھینک کر چکنا چور کر دیا۔ کیسا پیارا گلدان تھا۔ پھر ایسے زمانے میں کہ دھیلے کی چیز چار روپے کی ہوگئی ہے۔ نا صاحب، ہم نے ایسا بیہوش اخبار پڑھتے کبھی کو نہیں دیکھا۔ سارے مرد تمہاری طرح ہو جائیں تو گھر لٹ جائے۔ آخر کبوتر تمہارے سر پر ہی سے تو اڑ کر اندر گئے ہونگے۔ اتنا نہ ہوا کہ ذرا ہاہو کر دیتے دیو تو نہ تھے۔ لیکن تم کیوں انہیں مارتے۔ معصوم سید ہیں تمہاری قوم کے۔ اور انہیں دانہ ڈلواؤ۔ ان کے لئے گھونسلے بنواؤ۔ ان موذیوں نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ جدھر دیکھو پھڑ پھڑ پھڑ پھڑ۔ ہٹلر کی فوج کے سپاہی معلوم ہوتے ہیں کہ جہاں جا بیٹھتے ہیں کسی نہ کسی چیز کو توڑے پھوڑے بغیر نہیں رہتے۔ یہ کون سی رحم دلی ہے۔ یہ ہمیں ستائیں اور ہم انہیں اڑائیں بھی نہیں شاباش ایسی بے خبری۔ اخبار میں کوئی نشہ ہے کہ ہوش نہیں رہتے۔ آگ لگے گھولا دیا۔

لو اب اخبار کا پیچھا چھوڑو گے یا نہیں۔ گھول کر پی کیوں نہیں جاتے آدمی ایسا بھی بے درد نہ ہو جائے۔ تم نے تو قسائیوں کو بھی مات کر دیا۔ وہ بکرے پر ایک دفعہ چھری تو پھیر دیتے ہیں۔ ننھے کو ٹہلاتے آج کئی دن ہوئے۔ سبز سبز دست برابر چلے آ رہے ہیں۔ نصیبن ڈاکٹر کو کیا جانے۔ محلے کے عطار کو دکھا لائی تھی۔ دو پیسے کے نسخے سے کیا ہوتا ہے۔ اتنا بھی تو کوئی نہیں کہ پیر جی سے تعویذ ہی لا دیتا۔ عجب ہے کہ ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے ماشاء اللہ سبھی خدا کا خوف بھی نہیں آتا۔ معصوم ننھی سی جان، رات بھر تالو سے زبان نہیں لگتی۔ اور تم ہو کہ صبح ہوئی اور اخبار لے بیٹھے۔ کالا منہ اس اخبار کا، دوپہر ہونے کو آئی۔ اب کیا کوئی ڈاکٹر لے گا۔ کبھی اتنا تو نصیب ہوا نہیں کہ دو گھڑی گود میں لے کر ٹہلتے۔ بازار لے جاتے۔ باوا بننا آسان سمجھ لیا ہے۔ آپاں بندی سے پوچھو رات رات بھر جاگتے گذرتی ہے۔ دنیا میں سب تمہاری طرح ہو جائیں تو بچے پل چکے۔ ہمسائی کے میاں کو دیکھو ذرا بچے کی آنکھیں آ گئی تھیں، غریب کو کھانا پینا حرام ہو گیا تھا۔ تنو تنو پھیرے

ڈاکٹروں کے ہاں گرتے تھے۔ کہنے کو بیچارے مزدور ہیں۔ بیوی گھر کا کام کرتی یا بچے کی دیکھ بھال۔ وہی بچارا گود میں لئے اللہ بھائی اللہ بھائی کرتا اور وہی ڈاکٹروں کے ہاں دوڑتا۔ لیکن بات کیا؟ اس کا خون تمہاری طرح سفید تھوڑی ہے کہ اخبار لے کر بیٹھ جاتا۔ اور دو پہر کر دیتا۔ بی ہمسائی اب بھی مجھ ہی کو طعنے دیتی ہیں کہ میاں ہیں، گھر کی کچھ خبر نہیں۔ رات بھر بچہ بلکتا ہے اور یہ خراٹے لیتے ہیں۔ جواب کیا دوں۔

تمہاری تو وہی مثل ہوگئی کہ تیری سوکنی میرے ڈنڈے پہ ایک کنی۔ تم بھلا میرا کہنا کیوں کرنے لگے۔ کتنا ہے بھونکتے بھونکتے آپ ہی تھک کر بیٹھ جائے گی۔ پندرہ دن ہوئے کتنی مرتبہ کہہ چکی ہوں۔ بھائی جان کو لکھ دو چار لکیریں کھینچنی کیا مشکل ہیں۔ گود کی لڑکی آتر گئی ہے۔ دو مہینے کی سہی۔ ان کی تو اولاد تھی۔ پُرسے کو جانا تو ایک طرف، دو اتواریں گذر گئیں۔ آخر کیونکر کہوں۔ ان کو دیکھو سنبھلی کی ذرا انگلی کٹی تھی پہلے ڈاک بٹھادی۔ پھر اپنی بیوی کو خیر صلا کے لئے بھیجا۔ اپنے اپنے دل کی بات ہے۔ تم کو تو اخبار ہی سے فرصت نہیں۔ بشن بھی تم پر اُٹھ رہا ہے۔ وہ جو کہتے ہیں "باپ پہ پوت پتا پہ گھوڑا، بہت نہیں تو تھوڑا تھوڑا۔" تھوڑا کیا میں تو جانتی ہوں وہ تمہارے سے بھی چار ہاتھ آگے ہی جائے گا۔ ابھی سے نا کہا مان۔ تدار کھے پانچویں جماعت میں ہے۔ لکھنا چاہے تو کیوں نہیں لکھ سکتا۔ مگر تمہارا بیٹا پھر کون کہے۔ نصیب جب پھوٹتے ہیں تو سب طرف سے پھوٹتے ہیں۔ ایک جلا پا ہو تو کہوں۔ وہ اپنے دل میں کیا کہیں گے۔

سُنتے ہو! کھانا پک گیا ہے۔ بچے بھی بھوکے بیٹھے ہیں۔ پہلے کھانا کھالو۔ اخبار پھر پڑھ لینا۔ کہیں بھاگا نہیں جاتا۔ بچے آٹھ روز تک خوشی مناتے ہیں کہ آبا کے ساتھ کھانا کھائیں گے۔ آبا میں ایسی آدمیت کہاں۔ آبا کے تو بچے ہیں تو اخبار۔ بیوی ہے تو اخبار۔ یا تو صبح سے غُل مچتا ہے یا آج بھوک بھی اڑ گئی۔ کیا اخبار ہی سے پیٹ بھر و گے۔ نصیبن غریب آخر کب تک بیٹھی ہو سکے۔ اس نگوڑی کے بھی تو بال بچے ہیں۔ اب اگر کھانا نکال کر اسے جانے دیتی ہوں تو دوسری مصیبت۔ کھانا تو مٹی ہوگا سو الگ۔ جھوٹے برتن اُٹھانے تو اُٹھانے انجنے بھی جھکو پڑیں گے۔ پھر تم چیخو گے کہ بلی منہ ڈال گئی۔ کتا سونگھ گیا۔ مکھیاں بھنک رہی ہیں۔ بیماری پھیلے گی .... تو نہیں کھاتے۔ سگریٹ پی پی کر خالی کلیجے میں دھواں بھرتے ہو، بھرے جاؤ۔ میں بچوں کو کھلائے دیتی ہوں۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا کہ تمہارے انتظار میں دسترخوان بچھائے بیٹھی رہوں۔

یا اللہ! یہ اور اخبار کے گئے۔ آج ان موئوں نے پیٹ میں بھی گرہ لگادی۔ میں پوچھتی ہوں دفتر میں بھی کیا اسی طرح اخبار پڑھتے بیٹھتے ہو ایسے ہی دھنا سیٹھ ہو۔ افسروں کے سامنے بھی اخبار پڑھو۔ یا گھر ہی میں اخبار خانہ بنا لیا ہے۔ تو اب رئیس بن کر بیٹھ گئے۔ زبان کو تالا لگا لیا۔ اشارے ہوتے ہیں۔ جی ہر بات کو چاہتا ہے۔ پانوں کی ڈبیا بھی ہو سگریٹ کا بکس بھی پاس رکھا ہے۔ چاندنی پر داغ تو دیکھو جیسے چیچک نکل آئے۔ تھالی پاس رکھی ہے مگر ہاتھ کون ہلائے۔ بدھر چاہا جلتی ہوئی دیاسلائی پھینک دی۔ آنکھیں تو اخبار میں گڑی ہوئی ہیں۔ بھلا کیا گھر میں آگ ہی کیوں نہ لگ جائے۔

یا بے غیرتی! تیرا ہی آسرا۔ ماما کیا کہتی ہوگی۔ محلے والے دل میں کیا خیال کرتے ہوں گے۔ میں گلا مارتی ہوں تو بیجا نہیں مارتی کب سے چیخم دھاڑ مچی ہوئی ہے۔ بچے آبا آبا کہتے کہتے تھک گئے۔ میرا حلق سوکھ گیا۔ بکواسن تو میں مشہور ہوں نا۔ تمہاری حرکتوں کی کسی کو کیا خبر۔ اب میں تم کو بہادر تو جب جانوں کہ صاحب کا اردلی کوئی چٹھی لایا ہے، اس کے پاس بھی نہ جاؤ۔ پلنگ پر ٹنگے ہوئے اخبار ہی پڑھے جاؤ۔ بندی تو اب جاتی ہے تم جانو اور تمہارا کام۔

غزل

(حضرت بہزاد لکھنوی)

نہ اُن سے رکھیں گے کوئی مطلب نہ ان سے کچھ التجا کرینگے
خود اپنے دل کا ہمیں فسانہ کہا کرینگے سُنا کرینگے

فلک پہ ہر سُو نجوم روشن ہوئے تو ہیں خوب جلوہ افگن
مٹے گی کیونکر یہ شب کی ظلمت یہ کیا کرینگے یہ کیا کرینگے

اُمڈ رہے ہیں جو اشک پیہم انھیں بھی روکیں گے آنکھ میں ہم
جو دل میں اُٹھے گا جذبِ شکوہ اُسے بھی صرفِ دُعا کرینگے

حرم سے مطلب نہ بتکدے سے نہ آستاں سے نہ میکدے سے
جہاں یہ تڑپے گا دل ہمارا وہیں پہ سجدہ ادا کرینگے

انہیں میں لرزاں ہے کشتیٔ غم اُف اُنکی موجوں کا زور پیہم
ہم آج تک یہ سمجھ رہے تھے یہ چند آنسو ہیں کیا کرینگے

رسا ہوئیں گر ہماری آہیں زمانہ ڈھونڈے گا اور راہیں
تو یہ ستارے بھی نغمۂ شب سحر کے لب سے ادا کرینگے

از

جناب نواب جعفر علی خاں اثرؔ، ہوم منسٹر کشمیر

نوٹ:۔ ٹنی سن کا سال وفات ۱۸۹۲ء ہے۔ گزشتہ جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء میں شروع ہوئی۔ تاہم آپکی نظم لاکسلے ہال میں اسکی پیشگوئی موجود ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے اسباب، عوارض کا تذکرہ نیز اس نصب العین کی طرف اشارہ ہے جو بہترین مُفکر اور مدبر اب تک قائم کر سکے ہیں اور جس کے حصول پر ایسی مہیب اور خونریز لڑائیوں کا سدِ باب ممکن ہے۔ ضروری اجزائے نظم کا آزاد ترجمہ ذیل میں درج ہے۔ (اثرؔ)

میں نے مستقبل کو دیکھا جھانک کر
صرف کر دی قوتِ فکر و نظر
اور ہی صورت نظر آئی وہاں
آپ حیرت تھی تماشائی وہاں
بادباں زر پاش جن کے، وہ جہاز
یہ تجارت کا فروغ اور یہ طراز!
مال و زر سے بھر گیا سارا جہاں
خود شفق تھی ایک جنسِ کارواں
زر برستا تھا جدھر اُٹھے نظر
سب تھے خوش حال اور سب اہلِ ہنر
صنعت و حرفت کی ارزانی ہوئی
عیش و راحت کی فراوانی ہوئی
ناگہاں افلاک تھے معمورِ شور
اک بھیانک رات اور طوفان کا زور
وہ ہوا میں اُڑنے والی کشتیاں
وہ اجل کی آن سے ارض الاماں
مختلف قوموں کی باہم ٹکریں
بجلیاں جن کے تصادم سے ڈریں
وہ پھریرے جن سے کوندا دنگ ہو
خود ہوا اِک موج آتش رنگ ہو
ساری دُنیا خاک تودوں سے ہوئی
اور پھر آباد بھوکوں سے ہوئی

طبلِ جنگی کی صدائیں ختم تھیں
وہ تباہی کی ہوائیں ختم تھیں
جھنڈے کچھ لپٹے تھے اور کچھ سرنگوں
آگیا اصلاح پر آخر جنوں
مجلسِ انسانیت میں آگئے
حلقۂ یزدانیت میں آگئے
مٹ گیا برپا جو تھا فتنہ فساد
میل جول آپس میں تھا اور اتحاد
یہ کرہ اب تک جو تھا دارِ محن
بین الاقوامی بنا اِک انجمن
اب اخوت کا شگون نیک تھا
دشمنِ جاں ایک کا یا ایک تھا

کچھ اشارے ہوتے ہیں بڑھتے چلو
ہاں بڑھو، آگے بڑھو، آگے بڑھو
ہے تغیر آشنا دُنیا تو ہو
انقلاب اس کا جو ہے شیوہ تو ہو
آنے دو اس کی صدائے بازگشت
گونجتے وہ گونجتے ہیں بام و دشت
سلسلے میں اُن کے بہے جائیں گے ہم
عصرِ نو کو نغمہ خواں پائیں گے ہم

مجازؔ کے نام

(از جناب حسن یحییٰ عندلیب ایم۔اے۔ ایل ایل۔بی۔ علیگ)

تجھے بساطِ ادب پر سحاب ہونا تھا
کہ لالہ زارِ سخن فیض یاب ہونا تھا

وہ بزم جس میں نہ رُوح الامیں کو راہ ملے
اُس انجمن میں تجھے باریاب ہونا تھا

بنانا تھا تجھے فطرت کو رازداں اپنا
چراغِ دل کو ترے آفتاب ہونا تھا

سکوتِ شب میں بھی نغمہ شناس، دل تیرا
شہیدِ ذوق نوائے رباب ہونا تھا

وہ غنچے سوئے ہوئے ہیں جو نکہتوں کو چھپائے
ترے لئے اُنہیں کب محوِ خواب ہونا تھا

نہاں ہیں سینۂ گیتی میں جو حسیں اسرار
برنگِ سبزہ اُنہیں بے نقاب ہونا تھا

بساطِ خاک پہ شعلہ فگن تھی محفلِ گُل
اُفق پہ جلوہ فگن ماہتاب ہونا تھا

یہ اہتمام تھا مستِ الست تیرے لئے
کہ تجھ کو پردہ درِ صد حجاب ہونا تھا

مذاقِ شعر ترا کیوں ہے پھر رہینِ سبو؟
تجھے نہ ذوقِ ایاغِ شراب ہونا تھا

تجھے نہ کرنی تھی ارزانیٔ متاعِ خودی!
شباب کو نہ ترے یوں خراب ہونا تھا

پیامِ عیش سُنانا تھا دوسروں کو تجھے
نہ یہ کہ اپنے لئے خود عذاب ہونا تھا

"زخاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست
تجلیٔ دگرے درخورِ تقاضا نیست"

دو موڑ

(از جناب الطاف مشہدی)

لب ترے چاند کی گاتی ہوئی سیمیں قاشیں
تیری آنکھوں میں ہے جاگے ہوئے سپنوں کا شباب
مضطرب ہے ترے انفاس میں لچکیلی شمیم
تیری انگڑائی میں بے تاب ہیں میخانے چند
کسمساتا سا ترنم تری آواز میں ہے
مسکراہٹ، یہ تڑپتی ہوئی کرنوں کا ہجوم
ریشمیں، گول، حسیں، نرم، گلابی بانہیں
یہ سراپا یہ شعاعوں کا مجسم ہونا
سرخ رخسار پہ زلفوں کی گھٹا کیا کہنا
کتنے لمبے تری پلکوں کے گھنے سائے ہیں

اُف مگر بھوک کی روندی ہوئی زندہ لاشیں
آہ بازار میں بکتی ہوئی عصمت کی شراب
ذہن انساں میں ہیں بیدار ابھی خلد و جحیم
اپنا ایمان ہیں اسلاف کے افسانے چند
اپنا انجام ابھی منزلِ آغاز میں ہے
کھا گئے فطرتِ آزاد کو قسمت کے نجوم
ہم پہ مسدود ہیں جینے کی ابھی تک راہیں
آہ باقی ہیں ابھی داغِ نقاہت دھونا
سانس لینے کو میسر ہے ہوا کیا کہنا
ہم کہاں ظلم کی وادی میں چلے آئے ہیں

تو اُدھر نرم و حسیں گیت بنی جاتی ہے
اپنی حالت پہ اِدھر مجھ کو ہنسی آتی ہے

......کے تصوّر سے

(از محترمہ حجاب بناری)

خوابِ رنگین محبت کا دکھایا کیوں تھا ؟
میری خوابیدہ اُمیدوں کو جگایا کیوں تھا ؟
رازِ جینے کا مجھے تم نے بتایا کیوں تھا ؟
چار دن کیلئے طوفان اُٹھایا کیوں تھا ؟

یاد رہ رہ کے مجھے آتے ہیں وہ خوابِ جمیل
تھے کبھی کعبۂ دل کیلئے تم میرے خلیل
کیا خبر تھی کہ کروگے نہ وفا کی تکمیل
قصۂ دردِ جگر ہائے سُنایا کیوں تھا ؟

میں تو واقفہی نہ تھی رسمِ جہاں سے ہمدم !
زندگی صرف تبسم تھی محبّت کی قسم !
چھیڑ کر تم نے مرا بربطِ ہستی اس دم !
گیت اک پریم میں ڈوبا ہوا گایا کیوں تھا ؟

نغمۂ عشق سے معمور تھی یہ ساری فضا !
غنچہ ِ دل کو مرے چھیڑتی جاتی تھی صبا !
"سوز" سے کس لئے تم نے مجھے آگاہ کیا !
دل کو آتشکدۂ شوق بنایا کیوں تھا ؟

داغ یوں اپنی جُدائی کا لگانا تھا تمہیں !
ہائے یوں شمع صفت مجھکو جلانا تھا تمہیں !
زندگی بھر کے لئے جبکہ رُلانا تھا تمہیں !
ربط مجھ بخت کی ماری سے بڑھایا کیوں تھا ؟

اب بھی تجدید محبّت کی خُدارا کرلو !
اِس طرح دردِ محبّت کا مداوا کرلو !

فلمی خبریں

(۱) راج کمل کلا مندر کے زیر اہتمام مشہور مستند ڈائرکٹر شانتارام نے اپنی نئی تصویر مالی میں انتہائی ذہانت اور تخیل کا ثبوت دیا ہے۔ شانتارام مغربی فلمی تکنیک کا نہایت گہرا مطالعہ رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نگرانی میں جو تصویر بنتی ہے اس میں ایک خاص قسم کا نیا پن اور تازگی ملتی ہے۔ "مالی" اپنی نوعیت کی نہایت کامیاب تصویر ہے۔ اور ان دنوں جوبلی ٹاکیز دہلی میں شائقین کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔

اداکاروں میں کرشنا راؤ۔ بے بی نلینی۔ امیر کرناٹکی اور مہر سلطانہ نے کامیابی کا ثبوت دیا ہے۔ موسیقی بھی اپنی مخصوص دلکشی رکھتی ہے۔

(۲) پردھان پکچرز کا تیار کیا ہوا فلم داسی ان دنوں منروا دہلی میں ہر خاص و عام کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے "داسی" بلاشبہ ایک ایسا فلم ہے جس کی یاد مدتوں تک دلوں سے محو نہیں ہو سکتی فلم کی کہانی دلچسپ و دلکش ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بلند اخلاقی مقصد بھی رکھتی ہے۔ اس مقصد کو اس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ فلم کا رنگ کہیں پھیکا نہیں پڑتا۔ سوز و گداز، رومان و نغز غرض کون سی ایسی چیز ہے جو اس فلم میں نہیں ملتی۔ فلم کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے نہایت وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ ابھی بہت دنوں تک دہلی والوں کے دلوں کو گرماتا رہے گا۔ اطلاع ملی ہے کہ بمبئی میں بھی یہ فلم غیر معمولی مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔ راگنی، نجم الحسن اور کلاوتی اس فلم کے خاص اداکار ہیں۔

(۳) مہیندرا آرٹ پروڈکشنز کا تیار کیا ہوا امن ہونے والا فلم منورما ان دنوں موتی ٹاکیز دہلی میں اپنی مقبولیت اور کامیابی کا ثبوت دے رہا ہے۔ مشہور ڈائرکٹر جینت دیسائی نے اس فلم میں [illegible] کہ وہ ہر پہلو کامیابی کے ساتھ پیش کئے ہیں۔ [illegible] دلکش ہے اس فلم کی روح رواں

مشہور و معروف لیلا چٹنس۔ ایشور لال اور بھگت ہیں۔ ساتھ ساتھ [illegible] مزاحیہ اداکاری سونے پر سہاگہ ہے۔

(۴) وادیا موویٹون کا تیار کیا ہوا فلم وشواس ایک ایسا فلم ہے جو یقیناً وادیا موویٹون کی شایان شان ہے۔ فلم میں موسیقی، اداکاری، پس منظر غرض سارے رخ نہایت خوش سلیقگی لا تناسب کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ عشق کا سوز و گداز اور مذاح و لطافت کی دلکشی اپنی مخصوص اہمیت رکھتے ہیں۔ اس فلم کی جان مشہور و مقبول مہتاب، سریندر، بے بی مادھوری، سلوچنا، چیٹرجی ہیں۔ شائقین فلم اسکی خوبیاں کو مدت تک اپنے دلوں سے فراموش نہ کر سکیں گے۔ پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ اس فلم کو دیکھنے کی سفارش کی جاتی ہے۔

(۵) لکشمی پروڈکشنز کا نیا شاہکار کاویری لاہور میں بڑی دھوم کے ساتھ چل رہا ہے۔ دہلی کے شائقین فلم بھی اس کا بڑی بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہے ہیں۔ اطلاع ملی ہے اب یہ فلم بہت جلد دہلی میں نمائش کیلئے پیش کیا جائیگا۔

یہ فلم مجموعی حیثیت سے رومان، موسیقی اور سوز و گداز کا ایک نہایت شاندار مرقع ہے۔ کہانی بیک وقت دل گداز اور وجد آفریں حوادث سے لبریز ہے۔ یہ عشقیہ داستان اپنی نوعیت کی نہایت لطیف داستان ہے جس کو کامیاب اداکاری نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ جس اہتمام کے ساتھ یہ فلم تیار کیا گیا ہے اس کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ارباب ذوق اسے بیحد پسند کریں گے۔

(۶) پربھات نے اب تک فلمی دنیا میں جو مقبولیت حاصل کی ہے وہ آپ اپنی مثال ہے۔ یہ کمپنی شاندار فلمی روایات کی مالک ہے۔ اس کمپنی کے زیر اہتمام کئی اعلیٰ درجہ کے شاندار فلم تیار ہو چکے ہیں موجودہ فلم رام شاستری میں بھی حسب سابق نہایت بلند معیار کو مدنظر رکھا گیا ہے۔ فلم کی کہانی کا ہیرو ایک شخص جس کا نام تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جانا چاہیئے۔ ہمیں خوشی ہے کہ کمپنی کے ارباب حل و عقد نے ایک ایسی کہانی کا انتخاب کیا ہے۔ اس فلم کی روح رواں گجانن جاگیردار۔ للتا پوار۔ مینا کشی اور اننت مراٹھے ہیں۔

(۷) بمبئی سینے ٹون کی پیشکش لال حویلی نے دلی کے شائقین فلم سے جو خراج تحسین وصول کیا ہے اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ یہ فلم آج بھی ناولٹی سنیما دہلی میں اسی دلچسپی کے ساتھ دکھ

ہوا ہے جس دلچسپی کے ساتھ پہلے دن دیکھا گیا تھا۔ پورے ۱۹ ہفتے کے بعد بھی سنیما ہال کے سامنے تماشائیوں کا ایک ہجوم رہتا ہے ایڈوانس بکنگ غیر ضروری سخت دشوار نظر آتا ہے۔ کہانی کی دلچسپی میں نورجہاں، شمیم، شانتا آپٹے، یعقوب اور کنھیالال کی کامیاب اداکاری نے ایک نئی جان ڈال دی ہے۔ یہ بلاشبہ اپنی نوعیت کا ایک نہایت کامیاب فلم ہے۔

(۸) پنچولی آرٹ پکچرز

نے جن شاندار انتظامات کے ساتھ شیریں فرہاد تیار کیا ہے وہ فلم کی تاریخ میں آپ اپنی نظیر ہے۔ اس فلم میں ساز و سامان اور زیبائش و آرائش پہ بے دریغ روپیہ صرف کیا گیا ہے۔ کہانی کو تاریخی صداقت کے ساتھ پیش کرنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہے۔

یہ تاریخی رومان اپنی نوعیت کی دنیا کی چند رومانوں میں سے ہے موجودہ فلم میں اسے پورے انصاف کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ساز و سامان، سین منظر، موسیقی اور مکالمے سب اپنی اپنی جگہ اس فلم کے نہایت شاندار پہلو ہیں۔ راگنی، جینت اور غلام محمد کی اداکاری خاص اہمیت رکھتی ہے۔ اس فلم کا ڈائرکشن پرہلاد دت کی کاوش کا نتیجہ ہے۔

(۹) ہرکو پروڈکشنز

کے نئے شاہکار مہاتما ودرکا کمار ٹاکیز دہلی میں نہایت گرم جوشی کے ساتھ انتظار کیا جا رہا تھا۔ اب یہ فلم جمعہ ۵ ار دسمبر سے پیش کیا جائے گا۔

فلم کی کہانی عہد مہابھارت کے ایک یادگار واقعہ پر مبنی ہے اس فلم میں پانچ ہزار برس پہلے کے سب سے بڑے مہاتما، مدبر اور سیاستداں کی داستان حیات پوری عظمت و جلالت کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ یہ بھگتی رس میں ڈوبا ہوا فلم نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ اپنے سامنے ایک بلند نصب العین رکھتا ہے۔ موسیقی اور سین منظر میں بلند ذوقی کا ثبوت ملتا ہے یہ فلم اپنی قسم کا نہایت کامیاب کلاسیکل فلم ہے۔ اور یقیناً اس فلم کی عظمت میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

(۱۰) امر وا موویٹون

نے حال میں خاص انتظامات کے ساتھ ایک کامیاب فلم پرکھ تیار کر لیا ہے۔ اس فلم پر کمپنی کے ذمہ دار حضرات نے خاص توجہ صرف کی ہے۔ ہیروئن کا پارٹ ادا کرنے کے لئے مہتاب کا انتخاب بذات خود خوش مذاقی کی دلیل ہے۔ اس کمپنی کا دوسرا اسپیشل فلم بمبئی دل کا سوداگر بمبئی میں اپنی مقبولیت کا سکہ جما چکا ہے۔ اداکاروں میں مینا، شیلا، این سنگھ اور جلو کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ امید ہے کہ مندرجہ بالا دونوں فلموں کا دہلی کے شائقین پوری گرم جوشی کے ساتھ خیر مقدم کریں گے۔


ہماری سب ... گیں ہمارے اعصاب کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً اعصاب
... جائیں تو ہم ہاتھ نہیں ہلا سکتے۔ انگلی تک نہیں اٹھا سکتے۔ اسی طرح
قوت ... اعصاب کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جب تک ہمارے جسم میں مضبوط
... ہماری یہ قوت پیدا نہیں ہو سکتی۔
معجون شباب آور (دہلی)

عہد مہابھارت کے دور کی سنہری داستان

پانچ ہزار سال پیشتر
کے سب سے بڑے مہاتما
اور سیاستداں کی
تصویر حیات



بھگتی رس میں
ڈوبی ہوئی
لاثانی فلم

مہاتما ودر

آرٹ ، فن اور دل آویزیوں
کا مرقع

کمار ٹاکیز میں

جمعہ چار دسمبر سے
شروع

جاری کردہ:- [illegible] - لاہور ، دھلی

ابھی تک

سنیما بینوں کے دلوں پر اس کی حکومت
پورے طور پر قائم ہے

ڈائرکٹر جئینت ڈیسائی کا ہر دلعزیز شاہکار

منورما

اداکاران

لیلا چٹنس - الیشور لال - چارلی - مبارک
مایا بنرجی - نسیم خورد وغیرہ

۱۴ واں شاندار ہفتہ
موتی ٹاکیز دھلی میں
علیگڈھ ، دھرادون ، لکھنؤ میں تیسرا ہفتہ

جاری کردہ:- بلیموریہ اینڈ چھوٹو بھائی - دہلی ، بمبئی

موسیقی کا ایک شاہکار

اداکاری کا اعجاز

وادیا موویٹون کی مایۂ ناز پیشکش

وشواس

سوز و ساز میں ڈوبی ہوئی کہانی

★ قہقہے ★ نغمے ★ آنسو ★

جس میں

حسین و جمیل مہتاب۔ سُریندر۔ بے بی مادھوری۔ سلوچنا چٹرجی نے اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں

یہ فلم

بلاشُبہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے بے نظیر فلم ہے!!!

جاری کردہ:- اورینٹل فلم ایکسچینج۔ دہلی

عشق ایک آگ ہے جسے آنسو بھڑکاتے ہیں!

اور

شعلے بجھاتے ہیں

لکشمی کا ناقابلِ فراموش شاہکار

کادمبری

رومان، موسیقی اور اداکاری کا مرقع

از:۔ بان (مہاراجہ ہریش کا درباری شاعر)

اداکاران خصوصی

شانتا آپٹے۔ ونمالا۔ پہاڑی سانیال

جیون اور ہریش

تاریخ کا سب سے بڑا کارنامہ

لاہور میں بارہواں ہفتہ

دھلی میں بہت جلد آرہا ہے

جاری کردہ:۔
مون پکچرز۔ دھلی۔ لاہور

ہر بھات کا بے نظیر تاریخی شاہکار

مادر وطن کے شیر دل انسان کی تصویر حیات

رام شاستری

ڈائرکٹر:۔ جاگیردار

اداکاران خصوصی

گجانن جاگیردار۔ للتا پوار۔ میناکشی

ہنسا واڈکر۔ اننت مراٹھے۔ سدھا آپٹے

بے بی شکنتلا

منروا دہلی میں

بہت جلد آرہا ہے!!

جاری کردہ:۔
ستارہ فلمز لمیٹڈ۔ دہلی، لاہور



*مہتاب ۔ ادائیں شرمگیں ہیں اور صورت بھولی بھالی ہے
نگاہیں کیف زا ۔ ہر آنکھ تیری مے کی پیالی ہے



* فلم "دامن" کا ایک منظر *

Regd. L No. 4796 December 1944.

THE ADEEB

DELHI.

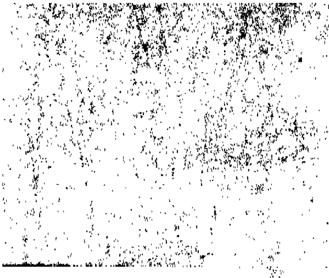
1. It is a purely literary monthly Magazine of high standing.
2. It is published regularly on the tenth of each month.
3. Annual subscription of the Adeeb is Rs. 10/- only; single copy Rupee one.
4. The Adeeb is posted with great care but if you don't get a copy by the 15th. please write to the office at once. If available, an extra copy will be sent to you again. Complaints received after the 18th will not be attended to.
5. All communications should be addressed to the Editor.
6. Free or sample copies of the Adeeb are not sent. For a sample copy always send the necessary stamps in advance.
7. Contributions not published in the Adeeb can be returned on receipt of the necessary stamps.
8. Always send extra stamps for a reply.
9. The Adeeb is not issued for less than a year.

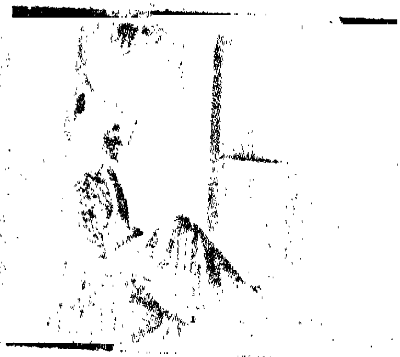
Printed at Dugals' Printing Press, Chandni Chowk, Delhi
Edited by Fazl-ud-din Ahmad M. A. and M. I. Wahidi & Published from the office of the Adeeb, Chandni Mahal Delhi.

THE 'ADEEB' DELHI

ماہنامہ ادیب دہلی





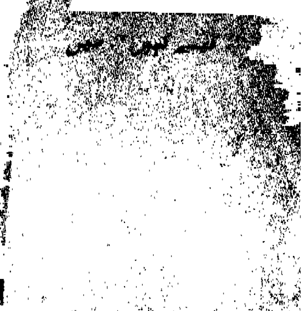


راگنی



کانن بالا فلم ''[illegible]'' میں







''شیریں فرہاد'' میں راگنی



[illegible] فلم [illegible]



شمیم ''جوار بھاٹا'' فلم میں



چندہ سالانہ: دس روپے علاوہ محصول
قیمت فی کاپی: ایک روپیہ علاوہ محصول

ادیب

اڈیٹرز:
سید محمد ارتضیٰ واحدی — فصیح الدین احمد ایم اے — آنسہ نجمہ تصدق ایم اے۔ بی ٹی

جلد ۸ — جنوری سنہ ۱۹۴۵ء — نمبر ۳

فہرست مضامین

(فصیح الدین احمد ایم اے نے دیال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر "ادیب" چاندنی محل دہلی سے شائع کیا)

نئی کتابیں

(از فصیح الدین احمد ایم اے)

شباب و انقلاب
از جناب نہالؔ سیوہاروی

شائع کردہ مشہور بک ڈپو دہلی۔ قیمت [illegible]

زیر نظر کتاب اس دور کے ایک مشہور شاعر جناب نہالؔ سیوہاروی کے [illegible] کلام کا مجموعہ ہے۔ نہالؔ صاحب کی شہرت عام ہے۔ [illegible] کا مقام ہم عصروں سے بہت ارفع اور اعلیٰ ہے۔ [illegible] کی خوبیوں اور ان کی شاعرانہ قوتوں کا اعتراف کرنا پڑے گا۔

اس دور کے بیشتر شعرا کی طرح نہالؔ کی شاعری کا ارتقا بھی غزلوں کی صورت میں شروع ہوا ہے۔ مگر روایتی غزل گوئی ان کی اس وسعتِ تخیل کے شایانِ شان نہ تھی جو فطرت نے انہیں ودیعت کی تھی۔ چنانچہ ان کے ذہن رسا اور فکر صالح نے بہت جلد تنگنائے غزل سے نکل کر اس صنف سخن کا انتخاب کر لیا جو اپنے سامنے بے پایاں امکانات رکھتی تھی۔

مجموعہ کلام دیکھنے کے بعد جناب نہالؔ کو صحیح اور بجا طور پر صرف نظم کا شاعر کہا جا سکتا ہے۔

ان کی نظموں کی بنیادی خصوصیت شاعر کی "رجائیت" ہے۔ جس کے پردہ میں "عزم و عمل" اپنی تمام قوت کے ساتھ کار فرما ہے۔ شاعر حیات کو ایک رزمگاہ سمجھتا ہے۔ جہاں قدم قدم پر وہ غم و الم سے دست و گریبان ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ ان کی شاعری بلاشبہ تندرست اور صحت مند شاعری ہے۔ شاعر غم روزگار اور شاید غم عشق کے روبرو بھی سپر انداختہ ہونا انسانی عظمت کے منافی سمجھتا ہے۔ ٹکنیک کے اعتبار سے یہ پہلو بھی خاص توجہ کا مستحق ہے کہ ان کی بہترین نظمیں یک قافیہ ہیں۔ اور یہ صورت ظاہری غزل کے پرانے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہیں۔ مگر یہ شاعر کا عجز نہیں۔ یہ اس کی قادر الکلامی ہے۔ اپنے موروثی سرمایہ سے صحیح اور جائز طور پر فائدہ اٹھایئے۔ حضرت نہالؔ کو نئے قافیے اور نئی زمین نکالنے میں یدِطولیٰ حاصل ہے۔ اور اس باب میں انہوں نے اپنی فارسی دانی سے بدرجۂ اتم [illegible]

[illegible] نہ اٹھایا ہے۔ ان کی شاعری کا یہ وصف بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

کتاب کے آغاز میں شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کا ایک [illegible] مختصر پیش لفظ ہے [illegible] داستانی سمجھنا چاہیے۔ ایک [illegible] سعید احمد اکبر آبادی کا ایک [illegible] تبصرہ کتاب کی زینت ہے جس میں [illegible] کے ارتقا پر [illegible] بحث کی گئی ہے۔ سعید احمد صاحب کی [illegible] مطابق نہالؔ صاحب کی عمر تقریباً ۴۴ سال ہے اور وہ کافی کہنہ مشق ہیں۔ مگر جناب جوشؔ صاحب کے نزدیک نہالؔ صاحب ابھی جوان ہیں [illegible] جوشؔ صاحب نے بھی [illegible] ہونے کا ثبوت [illegible] معنوی طور پر ہم بھی نہالؔ صاحب کو جوان سمجھتے ہیں۔ اللہ کرے "زورِ شباب" اور زیادہ [illegible]

دختر فرعون
مترجمہ جناب لطافت حسین خاں

شائع کردہ آگرہ اخبار پریس آگرہ۔ (قیمت [illegible])

زیر نظر کتاب جرمنی کے مشہور ماہر علوم مصریہ [illegible] کی ایک معروف کتاب کا ترجمہ ہے۔ "دختر فرعون" معروفہ [illegible] اور دلوں کو مسخر کر لینے والی داستان ہے۔ وادی نیل کی عظیم [illegible] رومانوں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ جس نے فرعونوں کی عظمت و جلالت، معرکہ آرائیوں، ان کے رزمیہ ہنگاموں اور ان کی بزم کی رنگا رنگیوں سے کی تاریخ لبریز ہے۔ زیر نظر کتاب انہی رنگا رنگیوں اور جذبات سے لبریز [illegible] ترجمہ نہایت شستہ اور صاف زبان میں ہے۔ یہ کتاب [illegible] حلقوں میں دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائیگی۔

تاریخِ حرم و نشر
از جناب امداد صابری

شائع کردہ مولانا امداد صابری [illegible] دہلی [illegible]

زیر نظر کتاب اپنی نوعیت کے لحاظ سے یقیناً ایک نہایت [illegible] از معلومات کتاب ہے۔ مصنف نے اس کتاب میں [illegible]

پیش کیا ہے۔ قرونِ اولیٰ اور قرونِ وسطیٰ میں جرائم اور ان کی سزاؤں کی جو کیفیت پیش کی ہے وہ انسانوں دلچسپی رکھتی ہے۔ بھر یہ بتایا ہے کہ ان جرائم نے زمانۂ آخر میں کیا صورت اختیار کر لی ہے۔ اور ان کی کیا کیا سزائیں مقرر ہوئی ہیں۔

مولانا ماہری کی یہ کوشش کافی حد تک کامیاب ہے اور اپنی قسم کی اُردو میں پہلی کتاب ہے۔

نسخۂ کیفی

از پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی

شائع کردہ انجمن ترقی اُردو ہند دہلی۔ قیمت ۱۰/

زیرِ نظر کتاب اُردو کے مستند ادیب پنڈت دتاتریہ کیفی کی پانچ [illegible] نظم و نثر کا مجموعہ ہے۔ پنڈت جی کی ادبی خدمات اور ان کی زبان دانی کا معترف [illegible] ہونا سر سر ظلم ہوگا۔ وہ انجمن ترقی اُردو ہند کے ایک سرگرم رکن کی حیثیت سے اُردو کی جو خدمت کر چکے ہیں وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ ان کو نظم و [نثر] دونوں پر یکساں قدرت حاصل ہے۔

زیرِ نظر تصنیف میں ان کی وہ نظمیں بھی شامل ہیں جو ان کی قادر الکلامی [کا ثبوت ہیں۔] ان کے مضامین "اُردو ہماری زبان" اُردو [لسانیات] ہندو مسلمانوں [کے] تعلقات مخصوص ادبی وزن رکھتے ہیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان میں ایک [لطف] بھی ملتا ہے۔ اُردو ادب کے طالب علموں کے لئے ان مضامین کا مطالعہ [مفید] ہوگا۔

ریاست

از فلاطون (مترجمہ ڈاکٹر ذاکر حسین)

شائع کردہ انجمن ترقی اُردو ہند۔ دہلی۔ (قیمت درج نہیں)

"ریاست" یونان کے زندہ جاوید مفکر افلاطون کی تصنیف The St[ate] کا ترجمہ ہے۔ ایسی کتاب کے ترجمہ کیلئے بھی ایک بالغ نظر اہلِ قلم کی [تلا]ش درکار تھی جو فلسفے سے ذہنی اور طبعی مناسبت رکھتا ہو

چنانچہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے جو تعلیمی دنیا میں ایک مستند مرتبہ کے [ما]لک ہیں۔ اس کتاب کا ترجمہ کر کے اُردو ادب پر ایک احسانِ عظیم کیا ہے۔

ذکرِ جمیل

از جناب ماہر القادری

شائع کردہ نفیس اکیڈیمی حیدرآباد دکن۔ قیمت ۱۲/

جناب ماہر القادری ہندوستان کے ایک مشہور و معروف شاعر ہیں۔ [ان] کی نظموں کو ملک کے متعدد رسالوں میں نمایاں جگہ ملتی ہے۔ اب تک ان کے [کئی] مجموعے زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ان کا تازہ ترین ادبی کارنامہ ہے جس کی شانِ نزول پچھلے تمام مجموعوں سے الگ ہے۔ اس مجموعہ میں مرتب نے ماہر صاحب کے وہ گلہائے عقیدت یکجا جمع کئے ہیں جو آنحضرت سرکارِ دوعالم علیہ السلام کی بارگاہ میں نعتیہ نظموں کی صورت میں پیش کئے ہیں۔ ان نظموں کا ایک ایک شعر عشقِ رسولؐ کا آئینہ ہے اور بلاشبہ مصنف کی شفاعت کا ضامن ہے اس مجموعہ کا انتساب حضرت بلالؓ حبشی کے نام کر کے شاعر نے نہ صرف اپنی خوش عقیدگی کا بھی ثبوت دیا ہے۔ ہماری بھی دعا ہے کہ ان کی یہ نذر قبول ہو۔ آمین

سوشلزم

ترجمہ سید سبط حسن

قومی دار الاشاعت بمبئی نمبر ۴۔ قیمت ۱۲/

زیرِ نظر کتاب مشہور مغربی مفکر و عالم فریڈرک اینگلس کی ایک گراں مایہ تصنیف کا ترجمہ ہے۔ سوشلزم کا نظریہ جو روس میں عملی جامہ پہن چکا ہے، اب دوسرے ممالک میں بھی اپنی جڑیں بڑی تیزی کے ساتھ قائم کر رہا ہے اس وقت تمام دنیا کے نوجوان ادیب اس فلسفہ سے متاثر ہیں۔ انگریزی میں جتنا نیا ادب آ رہا ہے وہ اس نقطۂ نظر کے ماتحت پیدا [ہو رہا ہے۔] لازمی طور پر اُردو [زب]ان بھی نوجوان ذہن اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خالص اُردو داں طبقہ ابھی تک سوشلزم کو منطقی طور پر سمجھنے سے قاصر تھا۔ خوشی کی بات ہے قومی دار الاشاعت نے تصانیف کا ایک ایسا سلسلہ شروع کر دیا ہے جو اُردو کی ایک بہت ضرورت کو پورا کر رہا ہے۔ موجودہ کتاب میں اینگلس نے جو کارل مارکس کا دستِ راست و بازو تھا اسی فلسفہ کے سیاسی اور عملی پہلو پر روشنی ڈالی ہے۔ ترجمہ ایک ایسے اہلِ قلم کی کاوش کا نتیجہ ہے جو نئے ادب کے علمبرداروں میں سے ہے اور صحافی ادب میں بھی اک دفعت مسلّم ہے۔ ترجمہ سمجھ بوجھ کر کیا گیا ہے اور ہر حیثیت سے قابلِ قدر ہے۔ ہمیں امید ہے ان اشاعتوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ کیونکہ یہ چیز ایک عظیم الشان مستقبل کا پیش خیمہ ہے۔

پارلیمانی حکومت

از منظور الحسن ہاشمی بی اے

دار الاشاعت سیاسیہ، اشاعت منزل۔ اُردو گلی حیدرآباد دکن۔ قیمت ۱۲/

حیدرآباد دکن کے مختلف ادبی ادارے اس وقت اُردو ادب کی جو خدمت کر رہے ہیں وہ ارباب نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ افسانوی اور شعری ادب کے ساتھ ساتھ اب سیاسی اور تعمیری لٹریچر بھی سامنے آ رہا ہے۔ زیرِ نظر کتاب میں مصنف نے مختصر مگر جامع طور پر پارلیمنٹ کے آئین و اصول اور اسکے عملی طرزِ عمل پر روشنی ڈالی ہے۔ سیاسی ادب کے متلاشی یقیناً اس کتاب کا خیر مقدم کریں گے۔

تنقیدی جائزے
از سید احتشام حسین
شائع کردہ ادارۂ اشاعت اُردو حیدرآباد دکن
قیمت تین روپے بارہ آنے

احتشام حسین صاحب دورِ حاضرہ کے ایک نوجوان مگر بالغ نظر نقاد ہیں۔ وہ جواں سال و جواں ہمت ادیبوں کی انجمن ترقی پسند مصنفین کے ایک سرگرم اور صالح کارکن ہیں۔ تنقید ان کا خاص میدان ہے اور ان کی تحریروں سے پتہ چلتا ہے کہ اس باب میں انہوں نے کافی مطالعہ کیا ہے۔ مشرق کی ادبی روایات کے ساتھ ساتھ موجودہ انگریزی ادبیات اور مغربی نظریات پر گہری نظر رکھتے ہیں ان کے ہاں بعض نوجوان ادیبوں کی شدت پسندی نہیں ملتی۔ ایک مخصوص قسم کا اعتدال ان کے مضامین کا خاص وصف ہے۔ "تنقیدی جائزے" میں مرتب نے ان کے وہ مضامین یکجا کئے ہیں جنھیں ہم بجا طور پر خالصاً تنقیدی مضامین کہہ سکتے ہیں۔ شاید تنوع کے خیال رکھتے ہوئے مصنف کے بعض دوسرے قابل قدر مضامین اس کتاب کی زینت نہ بن سکے۔ بہرحال مجموعی حیثیت سے جدید ادب میں اس کتاب کا ایک خاص وزن ہے۔ کتاب پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے نئے ادب نے کافی غور و فکر کے بعد ایک تعمیری قدم اٹھایا ہے۔ نئے ادب کے مخالف حضرات کیلئے اس کتاب کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ یہ مضامین بہت سی غلط فہمیاں دور کر سکتے ہیں۔

بچوں کی نفسیات
از شیر محمد اختر
شائع کردہ رزاقی مشین پریس حیدرآباد دکن
قیمت ایک روپیہ دو آنے

بچوں کی تعلیم و تربیت کے موضوع پر انگریزی اور دوسری زندہ زبانوں میں کافی لٹریچر ملتا ہے۔ ہمارے ہاں ابھی نظام تعلیم ہی کی صحیح اور مفید ترتیب نہیں ہوئی۔ اب چند سالوں سے کچھ معقول درسی کتابیں وجود میں آنے لگی ہیں۔ اس باب میں ارباب جامعہ ملیہ کی خدمات کا اعتراف کرنا پڑیگا۔ خوشی ہے کہ اب بعض دوسرے ادبی اداروں نے بھی اس طرف توجہ شروع کردی ہے۔ زیر نظر کتاب اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ مصنف نے غور و مطالعہ کے بعد بچوں کی نفسیات پر قلم اٹھایا ہے۔ اصول تعلیم سے بحث کی ہے۔ مقصد تعلیم پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ بچوں کی تربیت ذہنی کے کون سے بنیادی اصول ہیں مصنف کی کوشش لائق ستائش ہے۔ کتاب اس نوع کے ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

والدین کے لئے اس کتاب کا مطالعہ مفید اور کارآمد ہے ؀

شمعِ انجمن
از جناب صادق الخیری
شائع کردہ خاتون کتاب گھر۔ دہلی۔ قیمت ایک روپیہ

صادق الخیری صاحب کا نام مختلف ادبی جرائد و رسائل میں اتنی بار نظر آیا ہے کہ انہیں بجا طور پر اس دور کے مشہور افسانہ نگاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ زبان اور ادبی ذوق ان کا ایک ایسا موروثی سرمایہ ہے جس پر وہ جس قدر فخر کریں کم ہے۔ ان کو دیکھکر بے اختیار ان کے والد بزرگوار مصور غم علامہ راشد الخیری مرحوم و مغفور کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اور آنکھیں نمناک ہو جاتی ہیں۔ خیر جنت کی ادبی بوقلمونیاں نے مصور مخلیں آنکھوں میں رقص کرنے لگتی ہیں۔

صادق الخیری صاحب کو ایسے عظیم المرتبت گھرانے سے وابستگی حاصل ہے جس کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ "ایں خانہ ہمہ آفتاب است" کیونکہ ان کے بڑے بھائی حضرت رازق الخیری بھی اُردو کے ایک معزز ادیب ہیں۔ اور کافی ادبی سرمایہ کے مالک ہیں۔

یہ دیکھکر کہ صادق الخیری صاحب اپنے خاندان کے چشم و چراغ اور شمع انجمن ہیں، ہم ان سے کافی توقعات وابستہ کر سکتے ہیں۔ ان کے تازہ ترین مختصر افسانوں کا مجموعہ "شمع انجمن" اپنی مخصوص رنگا رنگی کے باعث خاص توجہ کا مستحق ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بعض افسانے جلدی اور روا روی میں لکھے گئے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ ان دنوں مصنف تصنیف و ترجمہ وغیرہ کے ساتھ ساتھ اشاعت و طباعت کے جانکاہ مرحلوں میں بھی مصروف رہے۔ بہرحال اب جبکہ صادق صاحب نے اُردو کی خدمت کا بیڑا اٹھالیا ہے ہم بھی چاہتے ہیں، خدا ان کی عمر دراز کرے اور انہیں اپنے مقاصد میں کامیاب کرے۔ آمین۔

امید ہے ان کی اور تصانیف کی طرح افسانوں کا یہ تازہ مجموعہ بھی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائیگا۔ اس کے ساتھ ساتھ کاش ہمیں ان کے دوسرے شاہکار کا زیادہ انتظار نہ کرنا پڑے۔ ہر چند کہ ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ اس میں اور زیادہ توجہ اور فکر و مطالعہ کا ثبوت دیں۔

لالہ خودرو
انتخاب کلام سیدہ برجیس جود خاتون نازش
شائع کردہ سید شاہد المظفر حسن ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اینڈ کریری قیمت ۴ آنے

زیر نظر کتاب جو ایک مختصر رسالہ کی صورت میں شائع ہوئی اُردو کے مشہور شگفتہ نگار ادیب جناب عندلیب شادانی کی ایک جوان مرگ عزیزہ کا انتخاب کلام ہے۔ ان دنوں جبکہ خواتین میں شعر گوئی کا ذوق کافی بڑھ رہا ہے بہت کم شاعرات ہیں جنکے کلام میں نسائیت جھلکتی ہو۔ مرحومہ کے کلام کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ ان اشعار میں نسائیت کا جوہر پوری تابناکی اور شگفتگی کے ساتھ چمک رہا ہے۔ نظمیں مذہبی اور نعتیہ رنگ لئے ہوئے ہیں لیکن اسلوب کہیں خشک اور بے کیف نہیں ہے اگر مرحومہ کی عمر وفا کرتی تو یقیناً ان کا شمار بہت اچھی شاعرات میں ہوتا

امام حسینؑ اور سیاست

(از سید رضا علی صاحب ایم، ایل، اے)

سیاست کے معنی یہ ہیں کہ اگر کسی ملک کی حکومت یعنی راج حاصل کرنا ہو یا راج حاصل کرنے کے بعد اُسے قائم اور برقرار رکھنا ہو تو لوگوں کو اپنا طرفدار اور ساتھی بنانے کیلئے ایسی ترکیبوں اور تدبیروں سے کام لینا اور ایسے جوڑ توڑ کرنا چاہیے جس سے اُس ملک کے رہنے والے اس حکومت یا راج کو اپنے لئے مفید سمجھیں اور راضی اور خوش رہیں۔ انسان کی زندگی کے مختلف دَور رہے ہیں۔ پہلا دور وہ تھا جب وہ اپنے قبیلے کا ساتھ دیتا اور قبیلے کے سردار کا حکم مانتا تھا۔ پھر باقاعدہ حکومتیں قائم ہوئیں۔ ساتھ ساتھ اخلاق اور مذہب کی تعلیم نے اُسے بتایا کہ اشرف المخلوقات کی حیثیت سے اس کے فرائض اور ذمہ داریاں بہت اہم ہیں آخری دور میں علم اور سائنس کے درخت نے جڑ پکڑی جس کا میٹھا یا کڑوا پھل سیاست ہے۔ یہ ماننا پڑیگا کہ مذہب کا دامن کشت و خون، قتل و غارت کے دھبوں سے پاک صاف نہیں ہے۔ لیکن یہ بھی بالکل سچ ہے کہ اگر مذہب انسان کی دست گیری نہ کرتا تو آدمی کی درندگی جو اس کی فطرت کا جزو ہے ایسی خوفناک صورتیں اختیار کرلیتی جن کے آگے جنگل میں شیر اور مست ہاتھی، باگھ اور گینڈے کی لڑائیاں ہیچ ہو جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے اہل فکر اور سیاست داں مانیں یا نہ مانیں مگر مذہبی جذبہ نے انسانی بھائی بندی کا جو سبق سکھایا جس طرح کمزوروں سے کمزور تر دامن کو وہ مضبوطی بخشی جو نامور سپہ سالاروں اور سپاہیوں کی زرہ کو حاصل تھی اور مرنے کے بعد اچھے اور بُرے کاموں کے نتائج بھگتنے کی جو تصویر روشن اور سمجھ میں آنے والی دلیلوں کے ساتھ پیش کی اُس نے انسان کو بہت بلندی پر پہنچا دیا۔

سب سے بڑا اعتراض سیاست پر ہر زمانے میں یہ رہا ہے کہ سیاست کے سر پہ مصلحت کا اتنا بڑا اور بھاری گٹھر ہوتا ہے جو سیاست داں کو اخلاق اور مذہب بلکہ بسا اوقات خود انسانیت کے اصولوں کا مخالف بنا دیتا ہے۔ سوچنے اور غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ عام طور پر سیاست وہ آسمان سے باتیں کرنے والا محل ہے جس کا سنگ بنیاد مصلحت کے ریت پر قائم ہوتا ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے گلستاں میں جہاں قیدی اور بادشاہ کا قصہ لکھا ہے وہاں ایک ایسا زبردست جملہ شیخ کے قلم سے نکل گیا ہے جس نے سیاست کے چہرہ کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں "دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز" اس حکایت کا ماحصل یہ ہے کہ سیاسی ارباب حل و عقد کو بسا اوقات جھوٹ اور مکر و فریب سے کام لینا پڑتا ہے جس کے بارے میں ان کے طرفداروں کی جوابدہی یہ ہوتی ہے کہ ان باتوں کی تہہ میں اگر مصلحت چھپی ہوئی ہو تو وہ باتیں جائز ہیں۔ یہ بڑا خطرناک اصول ہے۔ اگر جھوٹ کو اس بنیاد پر سراہا جائے کہ وہ قرین مصلحت ہے اور سچ بولنے سے اس وجہ سے مُنہ پھیرا جائے کہ اس سے فتنہ پیدا ہوتا ہے تو نتیجہ یہ ہوگا کہ بُرائیوں اور بھلائیوں کا خیال تخیل نظام عالم کو پلٹ دیگا۔ بہت سے ملزم جنہوں نے جُرم کیا ہے چھوٹ جائینگے اور بے گناہوں کو سزا بھگتنی پڑیگی۔

مغربی سیاست کے دلفریب نقش و نگار نے آج ہماری آنکھوں میں وہ چکا چوندھ پیدا کر دی ہے اور موجودہ مادہ پرستی نے ہمارے دل و دماغ پر اس قدر قابو حاصل کر لیا ہے کہ ہم دیکھتے تو ہیں مگر مغربی عینک سے۔ سوچتے تو ہیں مگر اس دل و دماغ سے جو بادۂ مغرب سے سرشار ہے۔ حقانیت ہو یا روحانیت، راست بازی ہو یا راست کرداری، مذہبی مسائل ہوں یا اخلاق، بدقسمتی سے سب کے سب سیاست کی کسوٹی پر کسے جاتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ کسنے والوں کو بھولے سے بھی خیال نہیں آتا کہ جب کسوٹی خود کھوٹی ہے تو اس جانچ سے مفید نتیجہ کس طرح نکل سکتا ہے۔

اسلام کی سادگی اور صداقت کو سیاست کی پیچیدگیوں سے کوئی لگاؤ نہ تھا۔ امام حسینؑ نے آنکھ کھولی تو نانا کی آغوش میں۔ تربیت پائی تو باپ کی گود میں۔ نبی کریمؐ کے عہد سے لیکر حضرت علیؑ کی خلافت تک مسلمان سیاست کو اغراض دُنیاوی حاصل کرنے کا ایک ذلیل آلہ سمجھتے تھے۔ یہ زمانہ اسلام کے انتہائی عروج کا تھا اور یہ عروج مسلمانوں کو راست بازی اور راست کرداری کی بدولت حاصل ہوا تھا۔ جب سچے موتی جیب میں ہوں تو کوئی ذی ہوش انسان اُن خوبصورت اور آب دار کنکروں کی طرف توجہ نہیں کرتا۔ جو سمندر کے کنارے پڑے ہوئے ملیں۔ اسلام میں فن سیاست کا رواج دینے والے اور سیاست سے وہ کام لینے والے جس کو عرصہ دراز سے مغربی ممالک نے اپنا مسلک قرار دے رکھا ہے۔ پہلے شخص امیر معاویہ تھے۔ حافظ علی حیدر علوی کاکوروی اپنی کتاب احسن الانتخاب میں جو موصوف نے حضرت علیؑ کے حالات میں بڑی تحقیق اور آزادی سے لکھی ہے اور جس کے مطالعہ سے مغربی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو فائدہ اٹھانا چاہیے تحریر کرتے ہیں۔ "امیر معاویہ اور تمام بنی اُمیہ بڑے جوڑ توڑ کے آدمی تھے ہر ترکیب

اپنا کام نکالتے تھے۔ یہ بالکل دنیا کے آدمی تھے۔ مدبر بہت بڑے تھے۔ پالیسی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ برخلاف ان کے بنی ہاشم کا یہ حال تھا کہ ہر کام میں خدا پر بھروسہ کرتے تھے۔ اپنے حق کیلئے لڑتے تھے۔ تدبیر و سیاست و پالیسی کی پروا نہیں کرتے تھے حضرت خیر البشر سے قرابت کے باعث عباسی خلیفہ اپنے کو امیر معاویہ اور ان کے اموی جانشینوں سے افضل سمجھتے تھے۔ پھر وہ کیوں پیچھے رہتے۔ خلیفہ منصور نے ابو مسلم خراسانی کو جو عباسی خلافت کا بانی تھا، دھوکے سے قتل کرا دیا۔ ہارون الرشید نے بڑی بے رحمی سے خاندان برامکہ کو تباہ و برباد کیا اور اپنے وزیر جعفر برمکی کو دھوکے سے قتل کرا کر منصور کی سنت کو تازہ کیا۔ حالانکہ ہارون کو منصب خلافت تمام تر یحییٰ پدر جعفر کی وفادارانہ جد و جہد سے حاصل ہوا تھا۔ بڑوں کی بات بھی بڑی ہوتی ہے اس ستم ظریفی کو دیکھئے کہ اس قتل و غارت کا نام سیاست رکھا گیا۔ خدا مولانا شبلی کو جزائے خیر دے مرحوم نے المامون کے دیباچہ میں صاف لکھ دیا ہے کہ خلفائے عباسیہ کے سلسلہ میں انھوں نے ہارون الرشید کو اس لئے سوانح حیات لکھنے کیلئے منتخب نہیں کیا۔ کہ اس کا دامن برامکہ کے خون کے دھبوں سے پر تھا۔ اپنے نانا اور باپ کی طرح امام حسینؑ خدائی سیاست یعنی دین اسلام اور احکام شرعی کے والد و شیدا تھے۔ امام حسینؑ اور یزید دونوں کو باپ کا ورثہ ملا۔ حسینؑ نے میراث میں حقانیت پائی۔ یزید کو ترکہ میں سیاست ملی۔

تاہم یہ سمجھنا بڑی بھول ہے کہ امام حسینؑ یزید کی چالوں سے ناواقف تھے۔

جب فسق و فجور کی گھنگھور گھٹا چاروں طرف چھا جائے اور یزدانی نور زمین تک نہ پہنچ سکے تو ہر شخص تین صورتوں میں سے ایک صورت اختیار کر سکتا ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ خاموشی سے کام لے جس کے معنی یہ ہوئے کہ اپنے سکوت سے باطل کی تائید کرنے کے الزام سے نہیں بچ سکتا۔ دوسری شکل یہ ہے کہ باطل کو باطل سمجھے۔ اور دل میں حق کا طرفدار ہو۔ مگر اپنی بے بسی دیکھکر اظہار حق نہ کر سکے۔ تیسرا چارہ کار یہ ہے کہ اظہار حق کی جرأت اور اس کے نتائج برداشت کرنے کی ہمت رکھتا ہو۔ شامیوں کے علاوہ باقی مسلمان یزید کو منصب خلافت کا اہل نہیں سمجھتے تھے مگر انہوں نے سکوت سے کام لیا۔ اہل مدینہ میں بعض بزرگوں نے کچھ عرصہ تک یزید کی بیعت سے انکار کیا مگر بالآخر اپنے انکار پر قائم نہ رہ سکے۔ البتہ مدینہ کی دو بزرگ ہستیوں نے نہ صرف اظہار حق سے کام لیا بلکہ یہ کہکر کہ معرکہ "شیر دو سے ایمان جوڑے دانستہ ایمان کا ساتھ" ہندہ کے پوتے کو اپنا پیشوا ماننے سے قطعی انکار کر دیا۔ ان میں سے ایک حضرت خیر البشر کا نواسہ امام حسینؑ اور دوسرا حضرت ابو بکر صدیق کا نواسہ عبد اللہ ابن زبیر۔ ان دونوں بزرگوں کے اغراض و مقاصد مختلف تھے۔ حضرت عبد اللہ ابن زبیر علم و فضل، زہد و تقدس کے ساتھ ساتھ دریائے سیاست کے بھی تیراک تھے۔ اور یزید کی خلافت کا خاتمہ کر کے خود خلیفہ ہونا چاہتے تھے۔ امیر معاویہ ان کو شیر کی طرح بہادر اور لومڑی کی طرح چالاک سمجھتے تھے۔ امام حسینؑ نہ سیاسی آدمی تھے نہ خلافت کے مدعی البتہ یہ جانتے تھے کہ شعائر اسلام کی جو خلاف ورزی بلکہ توہین یزید نے اختیار کر رکھی تھی۔ اسکی زبردستی روک اگر نہ کی گئی تو حضرت ختم المرسلین کے دین میں ایسا رخنہ پڑ جائیگا جو کبھی سنبھالے نہ سنبھل سکے گا۔ امام حسینؑ کا مشن خالص مذہبی تھا۔ کسے سیاست سے کوئی سروکار نہ تھا۔ امام علیہ السلام صرف یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا سردار ایسا شخص ہو جو مسند خلافت پر بیٹھ کر خاتم الانبیا کے دین کی بیخ کنی نہ کرے۔

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ امام حسینؑ یزید سے جنگ کر کے خود خلیفہ ہونا چاہتے تھے۔ وہ بڑی غلطی میں مبتلا ہیں۔ اگر لڑائی کا ارادہ ہوتا تو اس شہر کو نہ چھوڑتے جس نے نانا کو پناہ دی تھی۔ اور جو بنی ہاشم کی آبادی کا مرکز تھا۔ اہل مدینہ یزید کی خلافت سے ناراض تھے۔ امام حسینؑ کی عمر مدینہ میں گذری تھی۔ دوستوں اور بہی خواہوں کی کافی جماعت مدینہ میں تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ لڑنے کیلئے اگر مدینہ سے نکلتے تو بیبیوں اور چھوٹے چھوٹے بچوں کو ساتھ نہ لیجاتے بعض عزیزوں نے مشورہ دیا کہ عورتوں اور بچوں کو ساتھ لیجانا احتیاط کے خلاف ہے۔ مگر امام نے اس مشورہ کو منظور نہیں کیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کا مقصد نہ تھا۔ تیسری بات یہ ہے کہ سوائے عزیزوں اور خاص خاص دوستوں کے نہ لشکر فراہم کیا نہ سامان جنگ مہیا کیا ان سب باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ امام صرف اپنے کنبہ کے لیا مسکن چاہتے تھے جہاں یزید کے شر سے محفوظ رہ سکیں۔ جو شرائط امام حسینؑ نے عمر ابن سعد کے سامنے کربلا میں پیش کئے تھے ان سے بھی اس ارادہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ چوتھی شعبان سنہ ۶۰ھ کو مختصر قافلہ کے مدینہ سے رخصت ہوتے ہیں اور دنیا کے بندوں کا جن کے سر یزید کے بخشے ہوئے سونے چاندی کے سامنے جھک چکے تھے اپنی طرف غیر ہمدردانہ طریقہ دیکھکر خدا کے گھر یعنی مکہ معظمہ میں پناہ لیتے ہیں۔ اگر سیاسی تدبیروں سے فائدہ اٹھانا چاہتے تو امام حسینؑ مکہ کو کبھی نہ چھوڑتے عبد اللہ ابن زبیر کی مثال جناب کی آنکھوں کے سامنے موجود تھی لیکن ہمارے نبیؐ کے نواسہ کو خانۂ خدا کی حرمت اپنی جان سے زیادہ عزیز تھی۔ اس لئے زمانہ حج قریب ہونے کے باوجود بادل ناخواستہ مکہ سے کوفہ کی جانب روانہ ہو گئے۔ کوفہ باپ کا دار الخلافت رہ چکا تھا۔ باپ کی شہادت کو صرف بیس سال گذرے تھے۔ اس نواح میں امام حسینؑ سے عقیدت رکھنے والوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ مصیبت کا وقت دوستوں، بہی خواہوں اور ہمدردوں کے ساتھ گذرے یہ بھی یاد ہے کہ کوفیوں نے یزید سے بیزاری اور امام کی رفاقت کے بہت خطوط بھیجے تھے۔ اس صورت میں امام حسینؑ کی یہ توقع کہ کوفہ پہنچ کر یزید کے شر سے محفوظ رہیں گے بیجا نہ تھی۔

دسویں محرم سنہ ۶۱ھ کو میدان کربلا میں حق و باطل کا مقابلہ ہوا مشیت ایزدی کو منظور تھا کہ اہل عالم عبد المطلب کی اولاد کے اوصاف اور فضائل سے آگاہ

ہر وقت ابو طالب جب تک زندہ رہے جناب رسالت آب کی سپر بنے رہے۔ علیؑ مرتضیٰ اشجع العرب تھے۔ جن کا نام لیکر مسلمان فوجیں آج بھی حملہ کرتی ہیں۔ کون مسلمان ہے جنگی رگ شجاعت لا فتی الا علی کا نعرہ سُنکر جوش میں نہ آجائے حسینؑ بھی لڑے اور اس بہادری سے لڑے کہ دیکھنے والوں کو علیؑ مرتضیٰ کے کارنامے یاد آگئے۔ حسینؑ خود ہی شہید نہیں ہوئے بلکہ دُنیا میں جو کچھ ان کو عزیز تھا، نانا کے دین پر سب قربان کردیا جناب صمدیت کے راز کو کون جان سکتا ہے۔ مگر جو سبق معرکۂ کربلا سے ہم حاصل کرسکتے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ عبد المطلب کی اولاد راہِ حق میں نہ صرف تلواریں مارنا اور دشمنوں کا سر کاٹنا جانتی تھی بلکہ دینِ کے تحفظ کیلئے تلواریں کھانے اور سر کٹوا لینے اور گھر لٹوا لینے کے لئے بھی تیار تھی۔

حسینی سیاست پر دل میں شک و شبہ رکھنے والوں سے میں دریافت کرتا ہوں کہ اگر وہ امام حسینؑ کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟ طالبانِ حق اور صاحبانِ غیرت و حمیت تو یہی کہیں گے کہ وہ عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دیتے۔ ممکن ہے خدا کے بندے خال خال کچھ ایسے بھی ہوں جو نظریں نیچی کرکے دھیمی آواز سے کہیں۔ "یہ سب سچ ہے۔ مگر جان کی حفاظت بھی انسان پر واجب ہے۔" ہارنے سے پہلے ہار ماننے والی ذہنیتیں اور دل کبھی حوصلوں اور اُمنگوں سے لذت آشنا نہیں ہوسکتے۔ جہاں حق و باطل کا مقابلہ ہو وہاں سمجھوتے کی کوشش کرنا یا جان بچانے کی ترکیبوں سے کام لینا بجائے خود بدترین قسم کی موت ہے۔ ایسا آدمی اگر شرمناک توڑ جوڑ کرکے اپنی جان بچا بھی لے تو وہ صرف جی سکتا ہے۔ زندہ نہیں رہ سکتا۔

خان بہادر سید علی محمد شاد عظیم آبادی مرحوم کا ایک مرثیہ ہے جس کا مطلع ہے ؎

اے دستِ فکر کھول مُرقع خیال کا

اس مرثیہ کا رنگ ڈھنگ بالکل اچھوتا ہے۔ شاد نے مرثیہ میں عقل و عشق کا مناظرہ بڑی خوبی سے نظم کیا ہے۔ مناظرہ کا پس منظر یہ ہے کہ یوم عاشورہ امام حسینؑ کے سب ساتھی اور عزیز شہید ہوچکے ہیں۔ آپ گھوڑے پر سوار عمر سعد کے لشکر کی طرف آخری جنگ کے لئے بڑھنے کا قصد فرما رہے ہیں۔ اس وقت عقل اور عشق میں مباحثہ ہوتا ہے۔ اور دونوں اپنے اپنے دعوے اور دلائل پیش کرتے ہیں۔ چند بند سُنئیے۔ اس موقع پر عقل کو سیاست کا نائب سمجھنا چاہیئے۔ اور عشق کو حقانیت اور صداقت کا قائم مقام ؎

حسرت کے ساتھ عقل جو کرتی ہے گفتگو　　زخمی ہیں سر سے پاؤں تلک شاہِ نیک خو
آمادہ قتال ہیں لاکھوں اُدھر عدو　　کہتا ہے عشق جسم کا بہہ جائے سب لہو

پیدا اگر ہو کیا دل و جانِ بتول کی
نشو و نما اسی سے ہے دینِ رسولؐ کی

کہتی ہے رو کے عقل کہ سمجھے کی کیا خطا　　مارا اسے بھی تیر ستم سے غضب کیا
آلودہ خاک و خوں میں پڑا ہے وہ مہ لقا　　ارشادِ عشق ہے کہ رضینا بما جریٰ

ہے یہ جگہ خوشی کی عبث تو ملول ہے
اے عقل فخر کر کہ یہ ہدیہ قبول ہے

کہتی ہے عقل صلح کا اب کیا نہیں محل　　خاصانِ حق نے بھی تو کیا ہے یہی عمل
بچے بھی عورتیں بھی ہیں ہمراہ ہے یہ بل　　کہتا ہے عشق رہگزرِ دوست ہے سنبھل

مالک کی یاں نگاہ قضا و قدر پہ ہے
کچھ بھی ڈگیں جو پاؤں تو الزام سر پہ ہے

کہتی ہے عقل سنتِ پیغمبراں ہے یہ　　واجب ہم اسکو کیوں نہ کہیں حفظ جاں ہے یہ
کہتا ہے ہنس کے عشق کہ بالکل گماں ہے یہ　　ہر جا بچاؤ نفس کو وارد کہاں ہے یہ

ایثار جاں سبب بھی ہے رفع فساد کا
یہ وجہ ہے جو حکم دیا ہے جہاد کا

حسینؑ جانتے تھے کہ لڑائی کا انجام کیا ہوگا۔ جہاں بہتر آدمی یا بعض روایات کی بموجب چھیاسی آدمی جن میں بچے اور بوڑھے بھی تھے۔ ایک طرف ہوں اور دس ہزار کڑیل مسلح جوان دوسری طرف، وہاں ظاہر ہے کہ شکست کس فوج کو ہوگی اور فتح کس فوج کو۔ لیکن حق کی قوت دیکھئیے دُنیا کی تاریخ میں کربلا ہی وہ معرکہ ہے جس میں ہارنے والا جیتا اور جیتنے والا ہارا۔ یزید کی ظاہری فتح اموی سلطنت اور بنی امیہ کو عبرتناک تباہی سے نہ بچاسکی۔ برخلاف اس کے حسینؑ ابن علیؑ کی شکست ایسی فتح مبین تھی جسے مختلف عقیدوں کے مسلمان ہر سال بڑے جوش سے مناتے ہیں۔

میں اس تقریر کو مولوی حسن امام گیاوی کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں۔ جس میں موصوف نے معرکۂ کربلا کی اہمیت کو نہایت پُرمعنی الفاظ میں بیان کیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہوا جا کے سر کربلا کی زمیں پر
وہ میدانِ بدر و حنین اللہ اللہ

(منشور از نشر گاہ دہلی)

خیرات

(از واحدی)

ہاتھ پاؤں نہ ہلانا اور دوسروں پر اپنا بوجھ ڈالے رکھنا کا ہا اچھا تھنز اور عزت کا پیشہ رہا ہے۔ کوئی نیچے سے نیچا آدمی بھی مشغولیتیں چھوڑ کر یہ اونچا پیشہ اختیار کرلے۔ اونچے اونچے لوگ اس کے آگے سر جھکانے لگیں گے۔ لوگ اس پیشہ والوں کو پیغمبروں اور دیوتاؤں کا جانشین سمجھتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ پیغمبر اور دیوتا تو اس قدر ہاتھ پاؤں ہلاتے تھے کہ ساری قوم کے ہاتھ پاؤں کو حرکت میں لے آتے تھے۔

ہاتھ پاؤں نہ ہلانے والوں میں جو بالکل ہاتھ پاؤں توڑ کر ایک جگہ بیٹھ گئے ہیں ان کی پرستش کی جاتی ہے۔ وہ ہاتھ پاؤں ہلا کر زندگی گزارتے تو کسی شمار قطار میں نہ ہوتے۔ لیکن ہاتھ پاؤں نہ ہلانے سے اُن کی عزت ہے اور اُن پر روپے کا مینہہ برستا ہے۔ البتہ ہاتھ پاؤں ہلا کر اور در در بھیک مانگ کر جو اپنا بوجھ دوسروں پر ڈالتے ہیں۔ اُن کی بزرگی میں فرق آچلا ہے۔

میرے بچپن تک درویشوں ہی کو نہیں دردیشوں کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ یہ دُردیش سائیں صاحب یا سائیں جی کہلاتے تھے۔ ان کے بھیک مانگنے کے دن مقرر تھے۔ کچھ سائیں صاحبان پیر کو تشریف لاتے تھے۔ کچھ جمعرات کو۔ کچھ کسی دن۔ جمعرات والے سائیں صاحب ایک دو جمعراتیں ناغہ کر دیتے تو گھر والوں اور گھر والیوں کو فکر ہوتا کہ جمعرات والے سائیں صاحب نہیں آئے۔ "خدا خیر کرے بخیریت ہوں۔" اُن کی خیریت دریافت کرائی جاتی تھی۔ سائیں صاحب بھی وضع نبھاتے تھے۔ جس گھر کو پکڑ لیا اُسی گھر کے ہو رہے۔ گھر بھی لگے بندھے ہوتے تھے۔ فقیر بھی لگے بندھے۔ مشرقی امارت کی یہ ایک شان تھی کہ بہت سے طبقے کھاتے پیتے گھروں سے وابستہ ہو جاتے تھے۔ اور اُن کا آپس کا تعلق مستقل [illegible] ہوتا تھا۔ میری عمر دس گیارہ برس کی ہوگی۔ ایک سائیں صاحب نے مجھے کوئی ایسی دعا دی جس سے میں چڑ گیا اور میں نے اُن کے تھپی رسید کر دی۔ والدہ کو اس کی خبر پہنچی تو وہ ایسی گھبرائیں گویا اُن کے بچے پر اب ناگہانی آفت آجائیگی۔ سائیں صاحب تلاش کرا کر بلائے گئے۔ مجھے اُن سے معافی چاہنی پڑی اور غالباً ابھی کھانی پڑی۔ میں آج سے پینتالیس یا چالیس سال پہلے ۱۸۵۷ء

کے بیٹوں کے نزدیک نے [illegible] اب آج کل کے [illegible] مقابلہ میں پہلے زمانہ کا بھا چلن [illegible] تو میں ان [illegible] کی حمایت کرتا۔ میری تعلیم یافتہ بیٹیوں کا علم نفس میری ان پڑھ ماؤں کی جہالت [illegible] وہم پر قربان۔ لیکن زمانے نے مجبور کر دیا ہے کہ درویش اور دردیش [illegible] خود بیٹیوں کو [illegible] ہلائے بغیر روٹی نہیں ملے گی۔ آئندہ انہیں اپنے شوہروں کا ہاتھ بٹانا پڑیگا۔ وہ زمانہ گزر چکا جب ایک کماتا تھا اور بیس کھاتے تھے۔ اب بیس کما کر بھی ایک کو نہیں کھلا سکیں گے۔ پھر یہ درویش اور دردیش کی وضعداریاں کیسے نبھنی ممکن ہیں۔

درویش اور دردیش دونوں خاندانی ہوتے تھے۔ درویش تو ان بزرگوں کی اولاد جو حقیقتاً درویش تھے اور جنہوں نے ہاتھ پھیلانے کی بجائے پاؤں پھیلا کر زندگیاں بتائی تھیں۔ لوگ ان بزرگوں کو تو دے نہ سکتے تھے۔ اُن کی اولادوں کو دے دے کر حسرت دل پوری کرنے لگے۔ دردیش بھی نسلاً بعد نسل یہ پیشہ کرتے آرہے تھے۔ اور محتاجی دکھا کر نہیں حق جتا کر پیسہ مانگتے تھے۔ جس طرح اور بہت سے طبقے حق جتا کر مانگا کرتے ہیں۔ اب درویشوں اور دردیشوں کی تعداد نہیں بڑھ رہی۔ لیکن غیر خاندانی بھک منگے بڑی کثرت سے پیدا ہو گئے ہیں۔ دلی کی سڑکوں، مسجدوں اور مندروں کے کنارے جتنا بھک منگا اب دیکھا جاتا ہے اتنا بھک منگا کم از کم دلی میں چالیس برس پہلے نہیں تھا۔ یہ بالکل نئی طرز کے بھک منگے ہیں۔ جو بہت سے تو سچ مچ محتاج اور لائق امداد ہیں۔ مگر بہت سے بنے ہوئے محتاج ہیں۔ اور بہت سے اس بھیس میں بدمعاشیاں کرتے ہیں۔

زمانہ جس رنگ پر جا رہا ہے۔ وہ یہ ہے کہ آپ انسانوں کو اپنا محتاج بنائے رکھنے کا خیال ترک کریں۔ انہیں ان کے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل بنائیں اور انہیں برابر کا انسان سمجھیں۔ آپ کا کھانا پکانے والی ماما عنقریب ہفتہ میں ایک دن کی چھٹی لیا کریگی۔ اور اُس دن خود بھی ہوٹل میں کھانا کھائیگی اور آپ سے بھی کہے گی کہ ہوٹل جائیے یا بیگم صاحبہ سے پکوائیے۔ نوکر ہاتھ نہ پھیں گے۔ خودداری اور آزادی نہیں بیچیں گے۔ مہترانیاں اور مہتر بھی آپ کی غلاظتیں بہت اُٹھا چکے۔ انہیں اپنی ذلت کا احساس ہو گیا ہے اور آپ غلاظت کی صفائی کے جدید طریقے اختیار کرنے والے ہیں۔ پھر خیرات دینے اور خیرات لینے کا قدیم طریقہ کیوں باقی رہے۔ اسے بھی بدلنا چاہیے۔

آپ جب بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں اور دائیں بائیں آپ کے بھائی بہن، آپ ہی جیسے انسان، آپ کے وطن ہندستان کے باشندے۔ آپ کے بزرگوں کی پوتیاں اور پوتے نہایت گھناؤنی اور نہایت تکلیف کی حالت میں پڑے دکھائی دیتے ہیں۔ تو کیا آپ پر کسی قسم کا اثر نہیں ہوتا۔ کیا آپ یہ نہیں سوچتے کہ [illegible]

سے بھکاری ہماری بابت بری بُرائے قائم کرتے ہیں۔ کیا ان بھکاریوں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کا دھوپ میں جلنا، بارش میں بھیگنا اور جاڑے میں ٹھٹھرنا آپ کا اپنا گھر یاد نہیں دلاتا۔ جہاں آپ کے بچے آرام سے بیٹھے رہتے ہیں۔ کیا آپ کا دل نہیں چاہتا۔ کیا آپ خدا کے خوف سے کانپ نہیں اٹھتے۔ کیا آپ خیال نہیں کرتے کہ ان بھکاری عورتوں مردوں کے بڑے ہمیشہ سے بھیک نہیں مانگتے تھے۔ یہ خاندانی بھیک منگے نہیں ہیں۔ ان کے بڑے ممکن ہے آپ ہی جیسے ذی حیثیت، ذی عزت اور ذی مقدرت ہوں۔ اور ممکن ہے ان کے بڑوں نے اپنے وقت کے کم حیثیتوں کو سہارا نہ دیا ہو۔ کم عزتوں کو نہ ابھارا ہو۔ کم مقدرتوں کا ہاتھ نہ پکڑا ہو۔ اسی کی سزا میں خدا نے ایسے بڑے بڑوں کی اولاد کو اس حالت میں لا ڈالا ہے۔ ان بھیک منگوں کو اپنی حالت کا احساس ہو یا نہ ہو۔ ان کے بڑوں کی روحیں ضرور تڑپتی ہونگی اور پچھتاتی ہونگی۔ آپ ضرور ان حالات سے عبرت حاصل کرتے ہیں۔ اور آپ کا جی ضرور چاہتا ہے کہ ان مردوں اور عورتوں کو بلکہ ان کے چھوٹے چھوٹے اور بھولے بھالے بچوں کو ضرور آرام پہنچایا جائے۔ یہ ہمارے بچوں کا سا آرام نہ پائیں تو دکھ تو نہ اٹھائیں۔ لیکن چند پیسے دیکر آپ انہیں دکھ سے نہیں بچا سکتے۔ انہیں سڑکوں، مسجدوں اور مندروں کے کنارے پیسے دیتے رہنا ان کے ساتھ ہمدردی نہیں ہے۔ یہ تو ان کی عادت کو بگاڑنا ہے۔ مفت کے پیسے لیتے رہنے کی عادت تو انہیں کبھی موجودہ حالت سے آگے نہ بڑھنے دیگی۔ آپ انہیں کسی قابل کر دیجیے۔ آپ ان کے لئے کوئی جگہ بنائیے جہاں یہ آدمیوں کی طرح لیٹ بیٹھ سکیں۔ ان کے اوڑھنے پہننے کا بندوبست کیجیے۔ انہیں صاف ستھرا رکھئے۔ جو واقعی لاچار ہیں کچھ کر ہی نہیں سکتے جسمانی نقص کے سبب بیماری کے سبب، بڑھاپے کے سبب۔ انہیں ایسا آرام دیجیے کہ آپ کا دل بول اٹھے کہ آپ نے آرام دیا۔ اور آرام پانے والے خدا کے سامنے پہنچتے پہنچتے اس آرام کو یاد رکھیں۔ جو لاچار نہیں ہیں۔ نکمے ہیں۔ انہیں کام پر لگائیے۔ سمجھا کر، پچکار کر، محبت سے، اپنایت سے کام پر لگائیے۔ کام سکھائیے۔ اور کام کا عادی بنائیے۔ وہ آپ کے پاس سے آدمی ہو کر دنیا کے سامنے آئیں۔ لنگڑوں اور لولوں میں بھی یہ جذبہ پیدا کر دیجیے کہ ہم دو آدمی مل کر ایک آدمی کا فرض ادا کرسکتے ہیں۔ لنگڑا سینے کی مشین پر ہاتھوں سے بیٹھے۔ لولا مشین کو پیروں سے چلائے۔ خیرات کرنے والوں کے لئے حوصلہ نکالنے کا یہ میدان اتنا وسیع ہے کہ اس کی کم از کم ہندستان میں حد ونہیں ہیں۔ آپ جتنی خیرات کرنی چاہیں کرسکتے ہیں۔

نہایت خوشی کی بات ہے کہ دلی میں ایک ایسی جگہ بنانے پر دلی کے چیف کمشنر صاحب مسٹر ایسکوئتھ آمادہ ہوگئے ہیں۔ سات لاکھ روپیہ اس وقت تک جمع ہو چکا ہے۔ اور دلی میں بہت جلد ایسا گھر تیار ہونے والا ہے۔ دلی چھوٹا سا صوبہ ہے۔ دلی میں یہ گھر بن سکتا ہے تو بڑے بڑے صوبوں کو کیا مشکل ہے۔ ہاں وہاں کے گورنروں کے سینے میں مسٹر اسکوائتھ کا دل اور عملہ میں رائے بہادر نتھورام جیسا ہر دلعزیز اور کارگزار سٹی مجسٹریٹ ہونا لازمی ہے۔

قطعات

(جناب سردار جلیل شیرکوٹی)

اشک آنکھوں سے صبح و شام بہے — پھر بھی اُن کو مری خبر نہ ہوئی
ماہ و انجم گواہ ہیں میرے — چین سے ایک شب بسر نہ ہوئی

درد اُٹھتا ہے دل میں رہ رہ کر — اور کوئی چارہ ساز پاس نہیں
اُن سے کہہ دو کوئی کہ آجائیں — اب کوئی زندگی کی آس نہیں

مری کشتی ہوئی جاتی ہے غرقاب — نظر آتا نہیں مجھ کو کنارا
بہت ہی پست ہمت ہوگیا ہوں — چلے آؤ، مجھے دیدو سہارا

بچالو میری کشتی کو۔ بچالو — قضا منہ پھاڑے بھاگی آرہی ہے
نہیں ہے دور دور امید ساحل — فنا نزدیک آتی جارہی ہے

الٰہی زندگی جب دی تھی تو نے — تو دیتا ایک ہی ساعت کا آرام
اسی کا نام ہے انصاف یا رب! — کہ ہر ہر سانس ہو وقف صد آلام

اقبال کی شاعری میں علائم کا استعمال

(از جناب ضیاء الاسلام پی۔ سی۔ ایس)

یہ مقالہ الٰہ آباد یونیورسٹی مسلم ہوسٹل میں زیرِ صدارت آنریبل مسٹر جسٹس سنہا، اقبال کی تصویر کی نقاب کشائی کے موقع پر جو خان بہادر میاں عبد العزیز سی۔ آئی۔ ای چیئرمین پبلک سروس کمیشن یو۔ پی نے فرمائی۔ پڑھا گیا۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و کرم اور

اقبال کے پیام نے دل و دماغ کو اس طرح مسحور کر لیا ہے کہ اس کے آرٹ کی طرف شاذ و نادر ہی نظر جاتی ہے۔ حالانکہ اقبال کی عظمت کا دارومدار فلسفہ اور پیغام عمل سے کہیں زیادہ محاسنِ شعری پر ہے۔ بحیثیت صنّاع و لفظ تراش ہمارے اساتذہ میں اقبال کا کوئی حریف نہیں۔ ان کی اوّلیات کی فہرست بہت طویل ہے۔ لیکن اس وقت ہمیں بحث ایک ایسے وصف سے ہے جو اقبال سے پہلے بھی اُردو شاعری میں موجود تھا۔ یعنی علامتوں کا استعمال ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

غالب کے ان مشہور اشعار سے ہماری کلاسیکل شاعری کی اس خصوصیت کی توضیح بھی ہو جاتی ہے اور تجدید بھی۔ علائم سے یہی دو کام لئے جاتے ہیں۔ یعنی مشاہدۂ حق کی گفتگو اور ناز و غمزہ کا بیان۔ یا دوسرے الفاظ میں تصوف اور تغزل۔ تغزل میں علائم کے پردے میں محبوب کے خد و خال اور جور و ستم کا تذکرہ ہوتا ہے۔ مثلاً محبوب کے لئے سرو، شمشاد، قاتل۔ اسی قسم کے اور الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں اور اس کی اداؤں کے لئے تیر و سناں، دشنہ و خنجر وغیرہ۔ تصوف میں محبوبِ حقیقی کا ذکر معشوقِ مجازی کے اوصاف کی آڑ میں کیا جاتا ہے۔ مثلاً رخ، زلف نقاب، وصل و فراق، غمزہ و ناز سے روحانی کیفیتوں کا اظہار ہوتا ہے۔

جس طرح استعارات کثرتِ استعمال سے اپنی خصوصیت کھو بیٹھتے ہیں اور محاورات بن کر ختم ہو جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح علامتیں بھی بے محابا اور بغیر امتیاز رسماً استعمال کی جاتی ہیں۔ تو بجائے ادائے مطلب میں معاون ہونے کے وہ مضمون کا گلا گھونٹ دیتی ہیں۔ ہماری غزلوں کی تعداد بیکار یکسانیت کا یہی کام کر رہی ہے۔ اقبال نے پُرانی علامتوں کو نئے مضامین کے اظہار کے لئے آلۂ کار بنایا۔ ان کے مُردہ قالبوں میں دوبارہ جان ڈالی۔ اور پُرانی میناؤں میں نئی شراب بھر دی۔ اقبال کی یہ اصلاح ورڈزورتھ کی مشہور اصلاح سے کم نہیں۔ لیکن خوش قسمتی سے ہمارا مصلح انگریزی شاعر کی بے اعتدالیوں سے محفوظ رہا۔ ورڈزورتھ نے اس رسمی اور مصنوعی زبان کو یکقلم ترک کر دیا تھا جو ڈرائیڈن پوپ اور ان کے اسکول کا طرۂ امتیاز تھی۔ اقبال نے اس سے زیادہ دشوار مگر صحیح راستہ اختیار کیا۔ اس نے اپنے پیشروؤں کی زبان خصوصاً ان کی علامتوں کو رسمیت اور تصنّع کی زنجیروں سے آزاد کیا اور ان سے عشق اور تصوف کے مضامین کے علاوہ نئے نئے خیالات و افکار ہم تک پہنچائے۔ انفرادی احساسات اور جذبات و تہمات کے بجائے پُرانی علامتوں نے اجتماعی تصورات اور قومی اور ملّی افکار و تخیلات سے رسم و راہ پیدا کی۔ شرابِ کہنہ تو لطف دیتی ہے۔ لیکن اس کے ذکر کا طرز کہنہ ہو تو طبیعت اسے قبول نہیں کرتی۔ ہمارے شعرا کی شراب آتش سیال نہیں رہی تھی۔ بلکہ گدلا پانی بن گئی تھی۔ اقبال نے اسے اور اس کے لوازمات کو زندہ کر دیا ؎

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے
ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

اور

نشہ پلا کے گرانا تو سب کو آتا ہے
مزہ تو جب ہے کہ گرتوں کو تھام لے ساقی

شراب، جام، ساقی، نشہ، محفل ان بوسیدہ علامتوں کے کوزہ میں اُس نے ایک دریا بند کر دیا۔ ان تنگناؤں کو اس نے کائنات کی وسعت عطا کی۔ ان نگوں کو تراش کر اس نے ان کو ہشت پہلو بنا دیا۔ اور ہر پہلو کو ایک نئے مفہوم کا حامل۔ احیا اور تجدید کی یہ لہر خم اور ساغر سے نکل کر خنجر کی آب، تلوار کی باڑھ اور بسمل کی تڑپ میں جلوہ گر ہوئی۔ مختصر یہ کہ کوئی پُرانی علامت یا نقش ایسا نہ ملیگا جسے اقبال نے نئے مفہوم میں استعمال نہ کیا ہو۔ مثال کے طور پر "شمع و شاعر" کے اس بند کو لیجئے ؎

تھا جنہیں ذوقِ تماشا وہ تو رخصت ہو گئے
لے کے اب تو وعدۂ دیدارِ عام آیا تو کیا

انجمن سے وہ پرانے شعلہ آشام اٹھ گئے
ساقیا محفل میں تو آتش بجام آیا تو کیا

آہ جب گلشن کی جمعیت پریشاں ہو چکی
پھول کو بادِ بہاری کا پیام آیا تو کیا

آخرِ شب دید کے قابل تھی بسمل کی تڑپ
صبحدم کوئی اگر بالائے بام آیا تو کیا

بجھ گیا وہ شعلہ جو مقصودِ ہر پروانہ تھا
اب کوئی سودائیِ سوزِ تمام آیا تو کیا

بھول بے پروا ہیں تو گرم نوا ہو یا نہ ہو
کارواں بے حس ہے آواز درا ہو یا نہ ہو

اس میں عاشق و معشوق، مے اور میخوار، بسمل و قاتل، شمع و پروانہ، گل و بلبل۔ ان تمام کلاسیکل علامتوں کے تار و پود سے شاعر نے قومی و سیاسی افکار کیلئے ایک نئی قبا تیار کی ہے۔ وہ الفاظ جن سے لوریاں دی جاتی تھیں اب رجز میں استعمال ہونے لگے۔ وہ الفاظ جو دل شکستہ عاشق استعمال کرتے تھے۔ اب ملک و قوم کے فدائیوں کی زبان پر رقص کرتے ہیں۔ یہ اقبال کا سب سے بڑا فنی کارنامہ ہے۔ اور کسی دوسرے ادب میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

لیکن اقبال کی صناعی تجدید و احیا پر ہی ختم ہو کر نہیں رہ گئی ہیں، اس نے ایجاد و اختراع کے مراحل بھی طے کئے۔ ذیل کی علامتوں میں زندگی تیزی کے ساتھ سانس لے رہی ہے۔ وہ نقوش زیادہ بلیغ اور پُر اثر رہتے ہیں جو متحرک ہوں۔ مثلاً شاہین و عقاب، بال و پر، موج و طوفان، شعاع و شبنم۔ آتش و کارواں و درا، رحیل و سفر، رستخیز و محشر۔ سیارہ و سیماب، گردوں و گرداں مہر و ماہ وغیرہ۔

کسی ایسے شخص کو جو اقبال کی شاعری سے واقف نہ ہو اگر صرف یہ بتلایا جائے کہ یہ الفاظ اقبال کے کلام میں بار بار استعمال ہوتے ہیں تو وہ ان کے نقوش سے شاعر کے کلام کا مطالعہ کئے بغیر اس کے پیام، شخصیت اور فلسفہ کا اندازہ بخوبی کریگا شاعری میں علائم کا کیا مقام ہے۔ ان میں شاعر کے ارادہ کو کہاں تک دخل ہے۔ اُن سے شعر میں کیا اضافہ ہوتا ہے۔ ادبی روایات میں ان کا کہاں تک جواز ملتا ہے۔ یہ تمام مسائل ہمارے موضوع سے متعلق ہیں۔ لیکن ہم ان پر صرف ایک سرسری نظر ڈال سکتے ہیں۔

شاعر کا تخیل تصاویر کے بازوؤں پر اُڑتا ہے۔ شاعر کا اوڑھنا بچھونا نقوش ہیں۔ وہ نقوش جو تحت الشعور میں محفوظ رہتے ہیں۔ جن کا انتخاب اور جن کی تنظیم شاعر کا شعور ہیجان کی صورت میں کرتا ہے۔ لہذا علامتوں کے استعمال میں شاعر کے مقصد کا حصہ بہت کم ہے۔ اور نہ یہ علامتیں خارجی تزئین کے لئے استعمال کی جاتی ہیں۔ یہ شعر کا زیور نہیں اس کا گوشت پوست ہیں۔ یہ علامتیں اور نقوش نہ صرف ادائے مطالب میں معاون ہوتے ہیں۔ یہ نہ صرف کسی کیفیت یا منظر کا جیتا جاگتا مرقع سامنے لاتے ہیں بلکہ شعر کے زور، حسن اور اختصار میں ان سے نمایاں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ ہی نہیں ان کی تکرار، جدت، اور معنوی یگانگت کی ضامن ہے۔ کھرے اور کھوٹے نظریات اور معنوی تمیز کیلئے نقوش و علائم سے بہتر کوئی کسوٹی نہیں۔ انکا وجود آرٹ کو پروپیگنڈے

اور شاعرانہ خیالات کو فلسفیانہ افکار سے ممتاز کرتا ہے۔

بیسویں صدی میں مغربی تنقید نے الفاظ کے اس شعبہ پر بہت زور دیا ہے شیکسپیر جیسے اساتذہ کی تصانیف کی لفظ شماری کی گئی۔ دیکھا گیا کہ ایک ڈرامہ میں ایک نقش ایک تصویر یا ایک لفظ کتنی بار استعمال ہوا ہے۔ اس طرح تصنیف اور مصنف کے متعلق قابل قدر انکشافات ہوئے۔ جن کی صداقت میں کلام نہیں۔ کیونکہ نقوش کی تکرار شاعر کے شعور کی ملمع کاری سے محفوظ رہتی ہے۔ ہمارے بعض نقاد اقبال کے علائم کو اسکی شاعری کا مدفن سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے یہ تو اسکی عظمت کا ثبوت ہیں۔ اور یہی تصنع اور رسمیت کو جو اُن ناقدین کو آتی ہے جو اردو اشعار کو جانچنے سے پہلے ان کا انگریزی میں ذہنی ترجمہ کرتے ہیں۔

اقبال اور انگریزی شاعر شیلے کی شخصیتوں میں بعد المشرقین ہے لیکن ان کے نقوش و علائم بعض خصوصیات میں مشابہ ہیں۔ شیلے کی طرح اقبال بھی اکثر قدروں کو ختم کر دیتا ہے۔ شیلی عقاب اور سانپ کی کشمکش میں بالترتیب بدی اور نیکی کا تصادم دیکھتا ہے۔ اور شہاب ثاقب کو جسے دنیا منحوس سمجھتی ہے، وہ مبارک بتلاتا ہے۔ اقبال بھی رائے عامہ کے خلاف شاہین اور کبوتر میں شاہین کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کی نظر میں وہ خونخوار اور ظالم نہیں، بلکہ غیرت، جد و جہد اور بلند حوصلگی کا پیکر ہے۔ اسی طرح موج کے طمانچے ساحل کی آغوش سے زیادہ دلکش ہیں۔ زمانہ اور اسکی قدروں کے خلاف ان دونوں شاعروں نے جو بغاوت کی تھی اس کا عکس انکی علامتوں میں بھی ملتا ہے۔ کیٹس کے برعکس اور شیلی کی طرح اقبال بڑی حد تک سکوت اور سکون کے تصور تک سے قاصر تھا۔ شیلے کی طرح اس کے حواس کو حرکت کا شدید احساس تھا۔ متحرک تصاویر سے اقبال کا کلام پُر ہے۔ لیکن شیلے سے اس کی مماثلت یہاں ہی ختم ہو جاتی ہے۔

علائم میں نہ صرف وہ نقوش داخل ہیں جن کے ذریعہ شاعر اپنے زندگی کے نظریئے اپنے جذبات و احساسات، افکار و تخیلات متشکل کرتا ہے بلکہ وہ لفظ، وہ تصورات اور وہ نقوش بھی جن کا وہ نادانستہ طور پر اعادہ کرتا رہتا ہے۔

اقبال کے علائم اس کی وسعت مطالعہ، اس کی فلسفہ زندگی اور اس کے مسائل حاضرہ پر عبور کے مرہون منت ہیں۔ اس کے اشعار میں ہر ہر قدم پر بیرونی فطرت کی طرف اشارات ملتے ہیں۔ جن کی تکرار نے اقبال کے لب و لہجہ کو آفاقی آہنگ کی دولت عطا کی ہے۔

ہر بڑا شاعر جو کچھ کہتا ہے اس سے زیادہ کہہ جاتا ہے۔ یعنی الفاظ

کی سطح کے نیچے معانی کی بے شمار تہیں پوشیدہ ہوتی ہیں اور شاعری ہی کیا منحصر ہے اچھے نثر نگار بھی مختلف قارئین کو ان کے ظرف کے مطابق محظوظ کرتے ہیں۔ ڈین ریفٹ کاشت ہکاذ "گلیور کی سیاحتیں" بچوں کے لئے ایک دلچسپ کہانی ہے مدرضین کیلئے اٹھارویں صدی کے نئے سیاسی اور معاشی نظام پر ایک گہرا طنز ہے سوانح نگار کو اس میں لاتعداد کارٹون نظر آئیں گے۔ اور اخلاقیات کے طالب علم کو اس میں ملک کے ہزیان کی صدا آئیگی۔

ہمارے شاعروں میں اقبال کو سش کی کثرت اور انکی وسعت اطلاق بھی منفرد ہے۔ اس کے اشعار ایسے ہیں جن میں بیک وقت عاشق، محبوب۔ مفکر و دشت رز۔ صوفی معرفت اور مورخ سیاست کی جھلک دیکھے گا۔

در اصل اقبال کے کلام کی زیادہ معلوم ہے۔ اس کی تعمیری قوتیں وتعاد ہے کے عنصر سے ہوتی ہے یہ خصوصیت ہے جس نے فلسفہ کو شاعری کا ملا ہے۔ جس نے خیالات کو جذبات کی دلکشی بخشی ہے۔ جس کی بدولت افکار و احساست گھل مل گئے ہیں۔ جس کے طفیل میں خشک مسائل غزل کے حسن سے دکھنے لگے ہیں۔ جس کی بدولت اقبال کے کلام کے معنی امکانات بے کراں اور اس کے اشعار کی گہرائیاں اتھاہ ہو گئی ہیں۔

سخن بر ہنہ نہ گفتن کمال گویائی ست

(از جناب نصرت تمکین بی، اے)

بازگشت

میں اِس رنگین وادی میں بہت دن بعد آیا ہوں

زمیں رشکِ ارم تھی اس جگہ کی تیرے آنے سے
فضا یہ گونج اٹھتی تھی کبھی تیرے ترانے سے
نسیم سے تیرے ہر چیز یاں کی مسکرا دی تھی
یہاں پہلے پہل تو نے مجھے دادِ وفا دی تھی
یہ چشمہ یہ چٹانیں، اور کچھ اشجار کے سائے
ابھی تک منتظر ہیں کاش پھر اک بار تو آئے

مناظر کی حسیں آغوش میں، میں آج تنہا ہوں
کبھی میری طرح تیرا بھی اِس وادی میں آنا ہو

جہاں بھولا ہوا ماضی تجھے بھی یاد آ جائے
محبت کا فسانہ تو بھی میری طرح دوہرائے

ترے ہونٹوں پہ پھر گایا ہوا کوئی ترانہ ہو
جدا رہتے ہوئے ملنے کی پیہم آرزو کرنا
حسیں ہے تو حسیں لمحات کی پھر جستجو کرنا

شیخ عراقی کی غزل گوئی

(از جناب یوگ دھیان آہوجہ ایم اے۔ دو آبہ کالج جالندھر)

فارسی غزل گوئی میں شیخ عراقی کے کلام کو وہ درجہ نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق ہیں۔ اگر ہم شیخ عراقی کے دور کو مدنظر رکھیں، جبکہ فارسی غزل ابھی تقریباً ابتدائی مراحل سے گذر رہی تھی تو ہماری نگاہوں میں ان کی غزل گوئی کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے اور ہمیں یہ باور کرنا پڑتا ہے کہ ایک باقاعدہ صنف کے طور پر فارسی غزل کی تعمیر میں شیخ عراقی کے قلم نے جو حصہ ادا کیا ہے وہ بہت اہم ہے۔ اور اس حقیقت کے ساتھ ہم یہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ فارسی علم و ادب کے شائقین کی نگاہوں میں ابھی عراقی کے کلام کو مناسب قدر و قیمت اور وقعت حاصل نہیں ہوئی۔ اور اس صوفی شاعر کا گنجینۂ کلام، اُس کی زندگی کے حالات کی طرح کسی ویرانے کی زینت بنا ہوا ہے۔ اس خودرو لالہ کے پھول کی مانند جو صحرا میں ہی لہلہاتا ہوا قدردان نگاہوں کے خراج تحسین سے محروم رہے یا ان شہوار موتیوں کی طرح جو سمندر کی تاریک گہرائیوں کی زینت ہی بنے رہیں۔

مولانا حالی نے لکھا ہے کہ :۔

"غزل کو جن لوگوں نے چمکایا اور مقبول خاص و عام بنایا ہے یہ وہ لوگ تھے جو آج تک اہل اللہ اور صاحب باطن یا کم سے کم عشقِ الٰہی کا راگ گانے والے سمجھے جاتے ہیں۔ جیسے سعدی۔ رومی۔ خسرو۔ حافظ۔ عراقی۔ مغربی۔ احمد جام وغیرہم۔ ان بزرگوں سے پہلے غزل کی طرف زیادہ اعتنا نہیں پایا جاتا۔" (مقدمہ شعر و شاعری)

باقی صوفی شعرا کی طرح شیخ عراقی کے خیالات ایک سچے عارف کے دلی جذبات کی گہرائیوں کا پرتو ہیں۔ ان میں روحانی دُنیا کی بلندیوں کی ضیاء ہے۔ تاہم جو بات شیخ عراقی کے دل سے نکلتی ہے لے پیچ و خم دیئے بغیر زبان پر لے آتے ہیں۔ ان کے اشعار کو سمجھنے کے لئے پڑھنے والے کو اپنی طبیعت پر کوئی ناگوار دباؤ نہیں ڈالنا پڑتا۔ اور یہی وصف ہے جو غزل کو قصیدے سے ممتاز کرتا ہے۔ اور درحقیقت شعر کی تعریف ہی یہی ہے کہ "الشعر قول الیصل الی قلب بلا اذن[1]" یعنی شعر وہ قول ہے جو کہ بلا اذن سامع کے دل تک آتر جائے۔

علامہ شبلی مرحوم نے شعر العجم کے پانچویں دفتر میں غزل پر ایک مبسوط اور سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اس دوران میں وہ لکھتے ہیں کہ :۔

"عشق و محبت کا جذبہ فطرت انسانی کا خمیر ہے۔ اس لئے تمام دُنیا کی شاعری میں عشقیہ شاعری اور سب انواع شاعری میں سے زیادہ متداول اور عام ہے۔ لیکن ایران اس خصوصیت میں تمام دُنیا سے بڑھا ہوا ہے[2]۔"

غزل کی اصلی وضع محض عشقیہ مضامین کیلئے ہوئی ہے۔ غزل کی عالمگیر مقبولیت کا واحد راز یہی ہے کہ غزل کی تصویر میں عشق و محبت کی رنگ آمیزی ہوتی ہے۔ غزل میں شعرا عشق و محبت کے جذبات سوز و گداز، معاملات راز و نیاز کو موثر زبان اور دلاویز الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔ مولانا شبلی نے "عشق کی حقیقت اور اس کے آثار" کے عنوان کے ماتحت لکھتے ہوئے تحریر کیا ہے[3] :۔

"عشق ایک فطری کشش ہے جو انسان میں پائی جاتی ہے وہ آکر دل میں ایک خاص ذوق اور شورش پیدا کرتا ہے۔ دل میں ایک گدید اور تڑپ پیدا ہو جاتی ہے۔ زبان سے خود بخود پر جوش الفاظ نکلتے ہیں۔

عشق شورے در نہاد ما نہاد
جان ما در بوتۂ سودا نہاد
گفتگوئے در زبان ما فگند
جستجوئے در درون ما نہاد" [4]

حضرات صوفیہ کے کلام کو دوسرے غزل گو شعرا پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ صوفیائے کرام اپنے روحانی جذبات اور عالم حقیقی کے تاثرات کو اس دُنیائے محسوسات اور مجاز کی اصطلاح میں بیان کرتے ہیں۔ اُن کے کلام میں جو اثر اور جوش پایا جاتا ہے وہ دلوں کیلئے کشش زبان کیلئے چاشنی اور کانوں کیلئے موسیقی کا حکم رکھتا ہے۔

غزل میں شیخ عراقی کی خصوصیت زبان کی سادگی اور سلاست ہے اور جذبات میں رفعت، خیالات سوز و گداز کا پہلو لئے ہوئے بیساختہ اور بے تکلف انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ کئی بار پوری غزل کی غزل لطیف روانی کے زور میں لکھی ہوئی معلوم ہوتی ہے ان کا قلم ایک صوفی کے دلی جذبات کی ترجمانی کرنیوالا قلم ہے۔ اس لئے غزل میں بھی وہی کشش

---

[1] دبیر عجم۔ مولفہ مولانا آزاد صفحہ

[2] شعر العجم حصہ پنجم ص ۶۱

[3] شعر العجم حصہ پنجم ص ۹۷

[4] بحوالہ ص ۱۱۶ شعر العجم حصہ پنجم۔ یہ اشعار عراقی کے قلم سے ہیں۔

ایک ذوقِ عرفان و تصوف کے متوالے صوفی کی کیف و مستی کے بیان میں ہوتی ہے۔

عشق

عشق بالخصوص ایک صوفی شاعر کے نقطۂ نظر کے مطابق ایک ملکوتی خصلت ہے اور سچی محبت۔ انسانی رذائل کو اسی طرح دور کر دیتی ہے جس طرح جوہل علا کیقبلی صیقل تمام زنگ کو دور کر دیتا ہے۔ اور شیخ عراقی کے الفاظ کے مطابق ؎

دلِ بے عشق چشم بے نور ست

وہ دل جس میں عشق نہ ہو ایسا ہی ہے جیسے وہ آنکھ جس میں نور نہ ہو۔

منزلِ عشق میں ہر دشواری آسانی بن کر آتی ہے۔ اس کا ہر غم، غم راحت فزا ہوتا ہے۔ شیخ عراقی لکھتے ہیں۔

مرا درد تو درماں می نماید — غم تو محرم جاں می نماید
چو من تن در بلائے عشق دادم — ہمہ دشوارم آساں می نماید
مرا کز جام وصلت مست گشتم — وصال و ہجر یکساں می نماید
اگرچہ بیکاہد غم تو جان من — لیک مہرت ہر دم افزوں ست باز

عشقِ صادق ہوس سے پاک ہونا چاہیے۔ سچی محبت کا رنگ پختہ رنگ ہے اس میں رنگے ہوئے دل پر پھر کوئی اور رنگ اثر انداز نہیں ہو سکتا ؎

ترا رنگی ندارند از خم عشق — ازاں در آرزوئے رنگ و بوئے

عشقِ صادق میں ہمہ تن تسلیم و رضا ہونا عین ایمان ہے۔ شیخ عراقی لکھتے ہیں۔

گر ساقیِ عشق از خمِ درد — دُردی دہدت مخواہ سرجوش
زنہار بدو گذار و خوش باش — گر زہر دہد ترا بکن نوش
عاشقی دانی چہ باشد بے دل و جاں زیستن — جان و دل درباختن بر کوئے جاناں زیستن

اخفائے عشق

محبت کا جذبہ پاک ہے۔ اور دل کی گہرائیوں سے وابستہ اور محبت کا اخفا اس کی شرطِ اولیں ہے ؎

آتش عشق تو پنہاں جگرم می سوزد — لیکن از بیم نیارم کہ برآرم نفسے
می سوزیم و ردل بروں سوز آتش است — پیدا نمی شود کہ نہانم بسوختی

لیکن اگر بیان کریں بھی تو زبان عشق کے جذبات کو بیان کرنے سے قاصر ہے ؎

رموزِ عشق عراقی مگو چنین روشن — کہ سرِ عشق چنیں آشکار نتواں کرد
بگفت و گوئے سخن عشق دوست نتواں گفت — بجست و جوی طلب وصل یار نتواں کرد

عشق میں پہلا مرحلہ اپنے آپ سے اور ماسوائے محبوب سے گذرنے کا ہے ؎

نا گذشتہ ز سر ہر دو جہان — ہر کہ کوشش کند نتواں کرد
دلم از جاں نخست دست بشست — بعد ازاں دیدہ بر رخش انگند

صوفی اپنے اشعار کے جامے میں راہِ سلوک کے مختلف مرحلوں کی کیفیتوں کا بیان کرتا ہے۔ کبھی اسوہ کے نقش کو دکھاتا ہے۔ کبھی اپنا محبوب ہو کر اپنے جذبات کو بیان کرتا ہے۔

بیا کہ غیر تو در چشم من نیامد ہیچ — بجز آب دیدہ کہ در چشم من رواں آمد
من ز من گشتہ غائب او حاضر — عشق با یار ہمچنیں چہ خوش است

عشق میں محویت کے عالم کا بیان کرتے ہیں ؎

مرا کز جام عشقت مست گشتم — وصال و ہجر یکساں نمے نماید
بیدلی را کہ عشق بنوازد — جان او جلوہ گاہ خود سازد
بخود ش آنچناں کند مشغول — کہ بمعشوق ہم نپردازد

عشق میں بوالعجب کیفیتیں طاری ہوتی ہیں۔ ان کیفیتوں کا بیان عراقی جیسے ذوقِ عرفاں سے آشنا صوفی کے قلم سے ایسا ہی حقیقی صحت میں شیریں اور پاکیزہ ہے۔ جیسے سرچشمہ کے قریب ہی پاکیزہ روانی والا پانی۔ ایسے ہی اشعار کو سحرِ حلال کہا جا سکتا ہے ؎

یکبار بدیدیم رخش و ز غم عشقش — صد بار بمردیم و بزادیم دگر بار
گہی درد تو درماں می نماید — گہی وصل تو ہجراں می نماید

فراق اور اشتیاق دید کے لمحات انتظار کا بیان اور ہجر کے غم و اندوہ سے بھرے ہوئے افسانے جب شیخ عراقی کے قلم سے ادا ہوتے ہیں تو ان میں کچھ اور ہی سوز و گداز پیدا ہو جاتا ہے۔ شیخ نے یہ مضمون مختلف اشعار میں جا بجا بیان کیا ہے ؎

خود ما در روزگار گوئی — کز بہر فراق زاد ما را
کسی کہ ہمچو عراقی اسیر درد تو نیست — شب فراق چہ داند کہ تا سحر چنداست
دریاب کہ ز آتش فراقت — اندیشۂ جاں گداز داریم
چوں مرغ نیم بسمل در غم یار — بیانِ خون طپانم با کہ گویم
حالِ بیچارہ چگونہ بود — رفتہ از سر بسیج و او بیمار
خاطرِ عاشقے چگونہ بود — ہمہ دل از دست رفتہ و ہم دلدار
انپچے یک نظارہ بر در او — سالہا انتظار باید کرد

چناں نالیدم از شوقش کہ شد بیدار ہمسایہ

شد لے ایں دیدۂ بختم نہ شد بیدار چہ تواں کرد

شیخ عراقی کی ایک مسلسل اور پُر سوز غزل ہے۔ کیف اور ترنم سے لبریز۔

مطلع اور کچھ اشعار یہ ہیں ؎

مرا جز عشق تو جانی نمی بینم نمی بینم　　　دلم را جز تو جانانی نمی بینم نمی بینم

بجز درد و زاری نمی یابم نمی یابم　　　ز تو لطفی و احسانی نمی بینم نمی بینم

ز شوقِ زلف بیماری که دردی را که من دارم　　　بجز لعلت تو درمانی نمی بینم نمی بینم

عراقی را بدینگاهت رہے بنما کہ در عالم

چو او سرگشتہ حیرانی نمی بینم نمی بینم

واردات عشق کا بیان یعنی "معاملہ بندی" غزل کا ایک مایۂ ناز جزو ہے۔

شیخ عراقی لکھتے ہیں ؎

چو شہر او با جانِ من گر گفت رازی گو بگو　　　حالِ بیماری اگر پرسید بیماری چہ شد

ماجرائے رفت ما را باز بس　　　دوستاں را زاں خبر خواہیم کرد

وصفِ محبوب

محبوب دل و جان سے عزیز ہے۔ اور اس شاہِ حقیقی کی جگہ یعنی حج اکبر کی قبلہ گاہ، دل ہی ہے ؎

آنکہ اندر جہاں نمی گنجد　　　درمیانِ دلِ حزیں چہ خوش است

جاں را ز دو دیدہ دوست دارم　　　زاں رو کہ تو در میانِ جانی

مرا یاریست گر خواہم بریزد　　　نیارم خواست از وے خوں بہائی

شاعر اپنے دوست کو جان کی پیشکش کرتا ہے ؎

زندہ نفسے برائے آنم　　　تا پیشِ رُخِ تو جاں سپارم

لیکن جان بھی اُسے حقیر نظر آتی ہے ؎

برد بہ پیشِ سگانِ درش مکن جاں را　　　ایں متاع بر آں رُخ نثار نتواں کرد

شیخ عراقی کے کلام میں دوست کے حُسن و جمال کی تعریف اور اس کے اعضاء، چہرہ، خط و لب، زُلف اور نگاہ کی توصیف کے تقریباً تمام وہ لوازمات بیان کئے گئے ہیں جو کہ ان کے بعد کے عام فارسی شعرا کے ہاں پائے جاتے ہیں۔

لب

با یادِ لب تو عاشقاں را

حاجت نبود بہ ساغر و جام

لبِ میگونِ جاں جام در داد　　　شرابِ عاشقانش نام کردند

از آں لب کار زدی جملہ دلہاست　　　نصیبِ بیدلاں دشنام کردند

از خطِ خوشِ نگار بر خواں　　　سرِ دو جہاں دلے مکن فاش

زُلف

زُلف کے سب لوازمات بیان کئے گئے ہیں۔ پریشان، کافر، معطر وغیرہ

سرِ زلفِ بتاں آرام نگرفت　　　ز بس دلہا کہ بے آرام کردند

زآں توبہ نا درست ما را　　　ہم سرِ زلفِ خویش بشکست

تا معطر شود ہمہ آفاق　　　بکشا نیہ زلفِ جاناں را

ندانم تا چہ فتنہ خواہد انگیخت　　　کہ زلف بس پریشانی ہمی نماید

در سرِ آں دو زلفِ کافرِ تو　　　دل و دیں رفت ایں مسلماں را

قامت کی راستی

کارم کہ چو زلفِ تست درہم

جز قامتِ تو نمی شود راست

دوست کی نگاہوں میں شراب کی سی مستی پیدا کرنے کی صلاحیت ہے ؎

در خود دہ مے من کنی نگاہے　　　بے بادہ شوم خراب و مدہوش

جمالِ رُخ کی توصیف ؎

گل گر ز رُخِ تو رنگ نا ورد　　　رنگِ رخش آخر از چہ زیباست

ور نہ بجمالِ تو نظر کرد　　　چشمِ خوشِ نرگس از چہ رعناست

دوست کے وصفِ جمال کی انتہا یہ ہے کہ مداح ممدوح کی تعریف میں اپنے آپ کو قاصر پائے اور اپنے عجز و قصور کا اعتراف کرے۔ عراقی نے اس بلند خیال کو عالی اسلوب میں بیان کیا ہے۔ کبھی کہتے ہیں کہ تیرے حُسن میں کمی ہے ہی نہیں۔ وہ پہلے ہی کمال کی آخری سرحد پر ہے۔ میں اس میں افزونی کی دُعا کیا کروں؟ کبھی کہتے ہیں کہ جس وصف کا بھی میں خیال کرتا ہوں تو اس سے پرے دکھائی دیتا ہے۔ الغرض شاعر تسلیم کرتا ہے کہ دوست کے "وصفِ رُخ" کے سامنے اس کی گویائی قاصر رہ جاتی ہے ؎

چو گویم وصفِ حُسنِ ماہ روئے　　　غرض زاں زلف و رخسارم تو باشی

اگر ماہم تو گویم ور نہ گویم　　　مُراد از جملہ گفتارم تو باشی

من نگویم کہ حُسنت افزوں باد　　　چوں در آں راہ نیست نقصاں را

ہر وصف کہ در ضمیرم آید　　　چوں درنگرم ورائی آنی

عاجز شدم از بیانِ وصفت　　　زیرا کہ تو در میانِ جانی

منقطع می شود زباں مرا　　　پیشِ وصفِ رُخِ تو گویائی

شراب اور میخانہ

صوفی شعرا کی اصطلاح میں "میخانہ" کی اور میخانہ کے لوازمات کی حقیقت کیا ہے؟

شیخ محمود شبستری کے الفاظ میں ؎

خراباتی شدن از خود رہائی ست

اور خرابات شیخ شبستری کے ہی الفاظ کے مطابق ؎

خرابات از جہانِ بے مثالی است　　　مقامِ عاشقانِ لا اُبالی ست

خرابات آشیانِ مُرغِ جانست　　　خرابات آستانِ لامکان ست

شیخ عراقی کے ہاں خرابات کا مضمون مرغوب مضمون ہے۔ انہوں نے

نے مختلف پہلوؤں سے اپنے اشعار میں باندھا ہے۔ وہ عظمت میخانہ کے قائل ہیں کہتے ہیں ؎

در کوئے خرابات کسی را کہ نیاز است — ہشیاری و مستیش ہمہ عین نماز است
خواہی کہ درون حرم عشق خرامی — در میکدہ بنشیں کہ رہ کعبہ دراز است
نخستیں بادہ کاندر جام کردند — ز چشم مست ساقی وام کردند
چو باخود یافتند اہل طرب را — شراب بیخودی در جام کردند
کنوں مقام عراقی بجوئے در مسجد — کہ او حریف مغانست و در خرابات است

چونہ بادہ مست گشتیم چہ کلیسا و چہ کعبہ
چو ترک خود گرفتم چہ وصال و چہ جدائی
ناخوردہ شراب بیخود گشتیم — بنگر چہ کنم اگر بنوشیم

[illegible]

لے جانے والی از سرورے راحت عذاب

رندیاں کہ منم سرمست از بادہ عشق — تا عرصہ قیامت ہم ہشیار نخواہم شد

ساقی و دُرد کی تمیز ہونی چاہیئے ؎

ساقی مدار چشم اُمیدم در انتظار
صافی و دُرد آنچہ بود جرعہ بیار
از بہر یکے جرعہ دو صد توبہ شکستیم
بر در پیر مغاں روزہ کشادیم دگر بار
لب ساقی صلائے بادہ در داد
عراقی توبہ صد سالہ بشکست

ی — توبہ

غزل

حُسن کی برہمی کو کیا کہیئے — عِشق کی عاجزی کو کیا کہیئے
ہیں قسمت میں خار گلشن بھی — پھُول اور پھر کلی کو کیا کہیئے
بھُول جاتے ہیں ہم خدا کو بھی — عالمِ بے خودی کو کیا کہیئے
غم ہے جُزوِ حیاتِ انسانی — ہائے اس بے بسی کو کیا کہیئے
ہو جسے آرزوئے کوئے حبیب — کہیئے پھر ایسے جی کو کیا کہیئے
صورتِ برق جو گرے دِل پر — ان کی ایسی ہنسی کو کیا کہیئے
دید جس میں نہ دل کے چاندنی ہو — آہ اس چاندنی کو کیا کہیئے
اسے عادت ہے چاک ہونے کی — دامنِ زندگی کو کیا کہیئے
لاکھ نالے کیئے شبِ ہجراں — آہ کی نارسی کو کیا کہیئے
نامکمل ابھی ہے سوزِ وفا — دردِ دل کی کمی کو کیا کہیئے
عشق نے دکھائے ہر قدم پہ فریب — حُسن کی سادگی کو کیا کہیئے

اپنے تاثیر کی نہ بات سنی
اُن کی اس بے رُخی کو کیا کہیئے

از
جناب نعمان تاثیر

ڈاکٹر عماد الدّین سوز

جمّوں کا ایک مفکر شاعر

(از جناب حبیب کیفوی)

سوز جمّوں کے بلند نظر اور خوش فکر شاعر ہیں۔ جنہوں نے کہا بہت کچھ ہے۔ لیکن اسکے مقابلہ میں اشاعت بہت کم ہوئی ہے۔ اس عدم اشاعت کا کون ذمہ وار ہے؟ خود شاعر یا شاعر کو پہچاننے والے؟ یہ ظاہر ہے کہ شاعری کی بے نیاز طبیعت دوہرے کام اپنے ذمہ نہیں لے سکتی۔ اسے افکار سے اتنی مہلت نہیں ملتی کہ وہ نشر و اشاعت کا بھی اہتمام کرے۔ البتہ سخن شناس طبقہ ہر طرح قصوروار ہے جس نے جان بوجھکر اس فریضہ کو ادا نہ کیا جو اب سے بہت پہلے ادا ہو جانا چاہیئے تھا۔

مجھے اس طبقہ کے ساتھ صحافت و ادب کے نمائندوں سے بھی شکوہ ہے جنہوں نے کبھی اچھے شاعروں کو ڈھونڈھ نکالنے کی کوشش نہیں کی اور نہ کبھی یہ اندازہ لگانے کی زحمت گوارا کی کہ کس شاعر کا کلام کس درجہ اور کس قدر کا مستحق ہے۔

اُردو ادب کے نقادوں کا فرض ہے کہ ان مشہور شعرا و ادبا کے کارناموں پہ تنقیدی فرائض ادا کرنے کے ساتھ غیر معروف ہونہار افراد کی کاوشوں کو بھی پرکھنے کی زحمت گوارا کریں۔ اور اگر کوئی ان میں جوہر قابل ہو تو اسکی حوصلہ افزائی میں دریغ نہ کریں۔

اکثر ان باکمال شاعروں اور ادیبوں کو جن کے نام آج چودھویں کے چاند کی طرح دلکش ہیں۔ کوئی نہ کوئی ایسا سہارا مل گیا تھا جس نے ان کی صلاحیتوں کو چمکا دیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ شاعر کی شہرت محض دوسروں کی محتاج ہوتی ہے۔ مُراد یہ ہے کہ جن خاص شخصیتوں کو اتفاق سے جب کبھی کوئی سہارا مل جاتا ہے تو وہ اپنی کاوشوں کا صلہ بہت حد تک اپنی زندگی ہی میں حاصل کر لیتے ہیں۔ بخلاف اسکے وہ باکمال بدنصیب افراد جو کسی سہارے یا کسی کی جوہر شناس نظروں سے یکسر محروم رہتے ہیں وہ زندگی ہی میں مر جاتے ہیں۔ اگرچہ ان کے کارنامے حیات جاوید کے مستحق ہی کیوں نہ ہوں۔ کوئی وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ ہم اس شاعر کو شہرت و عظمت نصیب ہو جاتی ہے۔ جو صحیح معنوں میں شاعر ہی ہو۔ خدا جانے کتنے ایسے دل و دماغ کے انسان ہوں گے جنہیں ان کے صحیح درجۂ شاعری سے محروم رکھا گیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں جموں کے ڈاکٹر سوز بھی اُردو کے ان اعلےٰ درجہ کے شاعروں میں سے ہیں۔ جن کے کلام کو اگر دقتِ نظر سے دیکھا اور پرکھا جائے تو اس میں زندہ رہنے کی کافی صلاحیت موجود ہے۔ اور اُردو ادب میں آزادیٔ افکار کا عمدہ نمونہ کہلا سکتا ہے۔

یہ چند سطور ڈاکٹر سوز کی شاعری سے تعارف کے طور پر پیش کی جا رہی ہیں۔ اس سے اُس فروگذاشت کی تلافی تو کیا ہوگی جو ان کے کلام کو پس پردہ رکھنے میں سرزد ہوگئی ہے۔ البتہ اس سے اہل ذوق کو موقعہ ہاتھ آجائیگا کہ وہ ان کا شاعری کے ان پہلوؤں پر روشنی ڈالیں جو نمایاں ہونے کے قابل ہیں۔

ان کا تمام کلام غیر مطبوعہ ہے۔ آگے چل کر جو نمونے میں پیش کرونگا وہ اس منتخب حصہ سے ہونگے جو اتفاق سے میرے پاس محفوظ پڑا ہے۔

ان کے کلام کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ کچھ کہنا چاہتے ہیں ان کا تغزل ہو یا مفکرانہ انداز ان میں لطافت اور کیفیت ہوتی ہے۔ جہاں تک میں نے ان کے کلام کو دیکھا ہے، مجھے جگہ جگہ ندرت کاری اور آرٹ کے عمدہ نمونے ملے ہیں۔ ان کے ابتدائی کلام میں زیادہ تر تغزل اور رندانہ سرمستی ہے۔ بعد کے کلام میں تغزل، صوفیانہ اور حکیمانہ افکار کے علاوہ قومی اور ملّی مسائل کا خوشگوار اضافہ بھی ہو گیا ہے۔

تغزّل

میرے اندازہ کے بموجب سنہ ۱۹۱۵ء سے سنہ ۱۹۳۰ء تک کے ان کی مینائے سخن میں حسن و محبت کی شوخیوں، رندانہ سرمستیوں، اور درد و سوز کی کیفیتوں کی بہتات نظر آتی ہے۔ بڑی خوبی یہ ہے، ہوس بے باکی اور عُریانی جس سے شاید ہی کوئی غزل گو شاعر اپنا دامن بچا سکا ہو۔ ان کے کلام میں کہیں نظر نہیں آتی۔ بلکہ ان کے کلام سے پڑھنے والا سکون و راحت محسوس کرتا ہے۔ نرمی اور گھلاوٹ اتنی ہے کہ بیساختہ واہ نکل جاتی ہے ؎

کوئی نگاہِ کرم سے اسے قبول کرے ۔۔۔ کہ پھر رہے ہیں محبت کا جام ہم لے کر

سادگی میں حُسن کی ہیں شوخیاں ۔۔۔ دیکھکر آئینہ وہ شرما گئے
اک نظر ڈالی سکوتِ بزم پر ۔۔۔ جاتے جاتے بھی کرم فرما گئے

پوچھتے ہیں کون دیوانہ ہے یہ ۔۔۔ مہربانی اور دحشت ہوگئی
جسکو چاہا ہے وہ جو چاہیں کریں ۔۔۔ ان کی مرضی میری قسمت ہوگئی

خوبصورت ترکیبیں وضع کرنے کا انہیں خاص سلیقہ ہے۔ ساتھ

لغزش نواز کی لطافت تعریف سے بے نیاز ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

ہم پہ کرم ہے ساقیٔ لغزش نواز کا　　دوزخ میں جائے ناز دلِ پاکباز کا

حُسن کی بے پناہ تیغ سے بچتا ہے کون اور خدا بھی بچائے کیوں۔

لیکن وہ حُسن جو مجاز و حقیقت کو ایک کر دے اسکی کون تعریف کر سکتا ہے ؎

شہیدِ حُسن تو ہیں آشنائے راز نہیں　　ہمیں مجاز و حقیقت کا امتیاز نہیں

حسین نظروں اور دلاویز مناظر کی کیفیتیں اور اثر مختلف ہوتے ہیں۔ یہ شاعر کے ذوق پر منحصر ہے کہ وہ انہیں کس طرح قبول کرتا ہے ؎

کسی حسین نے نظر کی اگر مری جانب　　تو ایک تیر کلیجے کے پار دیکھتا ہوں

نگاہ پڑتی ہے جب منظرِ حسیں پہ مری　　طلسمِ قدرتِ پروردگار دیکھتا ہوں

تغزل میں ان کی خیال آفرینیاں اور نازک خیالیاں دیکھنے کی چیزیں ہیں ان میں سوز و کیف بھی ہے۔ حیرانیاں بھی اور محبوب سے شکوہ و شکایت بھی۔ وہ عشق و محبت کے ہر پہلو پر دلکش اسلوب اور نئے ڈھنگ سے روشنی ڈالتے ہیں۔ جس سے شعر اثر میں ڈوب جاتے ہیں ؎

حیران چھوڑ کر ہی مجھے وہ چلا گیا　　میں آئینہ بنا تو مقابل نہیں رہا

کوئی ہوتا ہے دل جس میں تری تصویر کھنچتی ہے　　کئی آئینے ٹوٹے ہیں تری تصویر سے پہلے

فریبِ نگاہِ غیر سے مُنہ ہے نقاب میں　　یہ شرم ہے کہ حشر کا فتنہ حجاب میں

نقاب رُخ سے پلٹ رہا ہے مگر اسے کچھ خبر نہیں ہے
نگاہ اس سادگی کے صدقے کہ اب حجابِ نظر نہیں ہے

لطیف موجِ نسیم میں ہے کسی کے دامن کی شوخ جنبش
اسے وہی دیکھتا ہے اے دل جو محوِ خوابِ سحر نہیں ہے

بدل رہی ہیں ستم کی قسمیں، یہ بات بھی ہے سکوں کا موجب
ہے یہ بھی اچھا کہ دل کی صورت زمانہ اک حال پر نہیں ہے

اٹھ کو جنبش نہ تھی میں مُنہ لگا کر پی گیا　　جام مے پر آج احسانِ لبِ مے نوش ہے

دیکھتی ہے اور نذرِ غیر کر دیتی ہے سوز　　چشمِ ساقی ہر چھلکتے جام سے مے نوش ہے

دہر اک حلقۂ آغوشِ صنم ہے یعنی　　وسعتِ کون و مکاں یار کی انگڑائی ہے

ساغرِ چشم میں ہے جلوۂ منظر کی شراب　　بادۂ حُسن کو آنکھوں سے پئے جاتے ہیں

حُسن کے متعلق شاعر کا مسلک بڑا بلند ہے۔ وہ اسے ہر قسم کی آلائش سے پاک دیکھنا چاہتا ہے۔ اسکی نظر میں حُسن کسی ایک چیز کے لئے وقف نہیں بلکہ کائنات کی ہر چیز اسے حُسن سے معمور نظر آتی ہے ؎

بہارِ حُسن کو بیگانہ وار دیکھتا ہوں　　کہاں سے آیا ہوں میں کیا بہار دیکھتا ہوں

دیدۂ مست کسی کا نظر آتا ہے مجھے　　ایک پیمانۂ صہبا نظر آتا ہے مجھے

دیکھتا ہوں شانِ فطرت حُسن کی آغوش میں　　بتکدہ ہی میں خدا کو یاد کر لیتا ہوں میں

ہر حسیں سے رہ چکی شاید ازل میں دوستی　　ایسے ملتا ہوں کہ ہو گویا پرانا آشنا

فریبِ خندۂ گل جانتا ہوں میں، لیکن　　بہار ہے ترے وعدہ کا اعتبار مجھے

آئینۂ تبسم رہنے دو روبرو تم　　مجھکو بھی اپنے دل کا انجام دیکھنا ہے

بزمِ اغیار میں وہ مجھکو بلاتے ہیں مگر　　صاف اس پیار میں دھوکا نظر آتا ہے مجھے

شکر کو وقفِ لبِ فریاد کر لیتا ہوں میں　　کس ادا سے شکوۂ بیداد کر لیتا ہوں میں

اے لبِ خاموش تو زحمت کشِ جنبش نہ ہو　　زخم کو آمادۂ فریاد کر لیتا ہوں میں

آرزوئے حُسنِ ساقی، روحِ میکش، عشق جام　　اپنے دل میں میکدہ آباد کر لیتا ہوں میں

تا نہ ہو اندیشۂ سود و زیانِ زندگی　　دل ہی دولتِ عشق میں برباد کر لیتا ہوں میں

خیالِ یار سے میں عشق کی دُنیا بناتا ہوں　　ہر اک ذرہ مری دُنیا کی اک چھوٹی سی دنیا ہے

جلوے اندازِ تبسم سے ستم ایجاد ہیں　　اشک آنکھوں میں مری آمادۂ فریاد ہیں

ان کے تخیل کی رعنائیاں اور اسلوبِ بیان کی دلاویزیاں معمولی چیز دل میں بھی رنگ بھر کر ان پر ندرت کاری و جاذبیت کی مُہر لگا دیتی ہیں جس سے شعر کی آب و تاب ہزار گنا بڑھ جاتی ہے ؎

شاید یہی ہے گی جو نکلے گی ایک دن   یہ جاں گویا جسم کے پردہ میں نور ہے

فکرِ زنداں کو آزادی کہاں گلزار میں   آشیاں اپنا بھی گویا اک قفس گلشن میں ہے

خیال ساتھ رہا ہوش و خواب و مستی میں   ہوا نہ رنج سے یکسو دماغ ہستی میں

نہ دل کی تجلّی بے سوز پہ بھی جل   جگنو کی شمع پر بھی تو پروانہ چاہیئے

دم نکلتے پر حباب زندگی بے باق ہے   یعنی ہم نے زندگی میں جو لیا تھا سو دیا

کتنا نفیس شاعرانہ استدلال ہے کہ خاک کے پردہ سے لالہ کو غرورِ حسن باہر لے آتا ہے جب لالہ خود بے نقاب ہے تو وہ رخسار جو لالہ کی مانند ہیں کیوں حجاب میں رہیں ؂

دو نما خاک کے پردہ سے ہوا ہے لالہ   لالہ رُخسار کو کب رسم حجاب اچھی ہے

شاعر گردشِ ایام سے ایسے ساقی کا تقاضا کرتا ہے جو آ کر اس محفل کو رنگ پر لے آئے۔ شعر میں سادگی اور تاثیر پورے عروج پر ہیں ؂

کہیں سے لا کسی ساقی کو گردشِ ایام   ہماری بزم میں مدت سے دورِ جام نہیں

سکونِ خاطرِ دیوانہ گردش اسکے کوچہ کی   مبارک وہ قدم جو عشق کی منزل میں ٹھہرا ہے

دوسرا دور

عمر کی پختگی کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے دوسرے دور کی شاعری میں تغزل کے ساتھ ساتھ صوفیانہ نکات، حکیمانہ رموز اور فلسفیانہ انداز ترقی پر ہے۔ اس دور کے کلام میں وسعت و گہرائی زیادہ ہوگئی ہے۔ وہ زندگی کے اس مقام پر سرود کھڑے نظر آتے ہیں جہاں رسمی و سطحی چیزیں بے حقیقت ہو جاتی ہیں وہ کائنات اور اس کے ہر ذرہ پر بڑی گہری اور تیز نظریں ڈالتے ہوئے قدم آگے بڑھاتے جاتے ہیں۔ انکی تیز نظریں کبھی کبھی پردۂ کائنات کو چاک کرتی ہوئی گذر جاتی ہیں۔ وہ زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ہمدردانہ غور کرتے رہتے ہیں۔ اور جس نتیجہ پر وہ پہنچتے ہیں وہ ان کی تسکین کیلئے کافی نہیں ہوتا۔ وہ دُنیا والوں کے نظام سے مطمئن نہیں۔ اس کے متعلق ایک شعر میں فرماتے ہیں ؂

کوئی نہ امتیاز کا پیمانہ چاہیئے   پیمانہ سوزِ آتش میں نہ چاہیئے

وہ دیکھتے ہیں کہ دُنیا میں دولت کی غیر مساوی تقسیم نے امیروں اور غریبوں کی الگ الگ جماعتیں کھڑی کر دی ہیں۔ امیر زندگی کو جس طرح چاہے خوشگوار بنا سکتا ہے مفلس کیلئے زندگی کو خوشگوار تو کیا اُسے قائم رکھنا بھی مشکل ہے۔ اور قیامت یہ ہے کہ نام نہاد رہنما ان کو ہاتھ پاؤں ہلانے کی بجائے قناعت کی تعلیم دیتے ہیں۔ قناعت نام ہے ہاتھ پاؤں توڑ دینے کا۔ ذیل کے شعر میں اسکے متعلق آپ ایک لطیف طنز دیکھیں گے ؂

چارہ گر سہل بتاتا ہے علاجِ افلاس   جو کرے ترکِ تمنا وہ تونگر ہو جائے

اسکے بعد اپنا منشائے دلی یوں ظاہر کرتے ہیں ؂

موت کے بعد تو جنت ہے، مگر دُنیا میں   چاہتا ہیں ہوں کہ مفلس بھی تونگر ہو جائے

حقائق

کمزور کے مقابلہ میں طاقتور کی فتح و سربلندی مانی ہوئی چیز ہے۔ طاقتور زندگی کی جن مسرتوں سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ کمزور اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کمزور اپنے سجدۂ نیاز ہی سے طاقت کے طلسم کو توڑنا چاہتا ہے لیکن دُنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوا۔ اس خیال سے متاثر ہو کر فرماتے ہیں ؂

کمزور محوِ سجدۂ عجز و نیاز ہے   شہزور مستِ بادۂ پندار ہی رہا

انسان اگرچہ آلامِ روزگار سے ہمیشہ دل برداشتہ رہتا ہے لیکن پھر بھی وہ مرنا نہیں چاہتا۔ زندگی سے کتنا ہی کوئی اُکتایا ہوا کیوں نہ ہو وہ موت کے خیال تک سے لرز اُٹھتا ہے ؂

دُنیا نہیں خوشی سے کوئی جان دہر میں   طرفہ یہ ہے کہ جان سے بیزار ہی رہا

مذاہب نے گناہوں کی روک تھام کیلئے دوزخ ایسی بھیانک اور خوفناک چیز کا تصور قائم کیا۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا دوزخ کے تصور نے دُنیا سے گناہوں کو مٹا دیا؟ جواب نفی میں ہے۔ دُنیا میں بڑھتے ہوئے گناہوں کو دیکھکر شاعر افسوس کرتا ہے کہ انسانیت کو وہ سربلندی حاصل نہ ہو سکی اور دوزخ کا خوف رائیگاں ہی گیا۔ یعنی وہ سب کچھ ہو رہا ہے جو نہیں ہونا چاہیئے تھا ؂

تجویز ہے سزائے معاصی بھی دہر میں   دوزخ کا خوف حربۂ بے کار ہی رہا

جماعتیں نہیں چاہتیں کہ ان کے نظام و قانون کے خلاف کوئی آواز اُٹھے اور جب کبھی کسی نے ایسی جرأت کی ہے تو اُسے اپنی زندگی کی بازی لگانی پڑی ہے ؂

کوئی حدیثِ حق سرِ منبر نہ کہہ سکا   اظہارِ رازِ وقفِ سرِ دار ہی رہا

اسی طرح زندگی کے اور تجربات کے بیان میں فرماتے ہیں ؂

جز مرگ چارۂ مرضِ آرزو کہاں   دل نزع تک خوشی کا طلبگار ہی رہا

آزادیوں کی حرص بھی زنجیر بن گئی   دل دامِ آرزو میں گرفتار ہی رہا

بے انتہا حیات کا دریا ہے موج زن   میرا حباب زیست بھلا کس شمار میں

دخل جینے میں کوئی سوز ارادے کا نہیں   آئے جب تک نہ اجل ہم تو جئے جاتے ہیں

تخیل کی بیباکانہ پرواز ملاحظہ کرو جہاں بھی لے جائے آخر اسے اپنی کم مائگی کا

احساس ہو جاتا ہے کہ اس عالم میں ایک ایسی برتر و بالا ہستی بھی ہے جسکی بے پناہ طاقتوں کے آگے انسانی ارادے اور ولولے سب ہیچ ہیں ؎

تنگ آتا ہوں تو کرتا ہوں دعائیں یارب
تیری خاموشی ہی کو میں اپنا مقصد سمجھا

ہاں تو ہر رنگ میں رسم جبیں سائی ہے
سجدہ کرتا ہے تو خالق کی جناب اچھا ہے

دوسرے شعر کے مصرعہ اولیٰ میں آزادیٔ فکر نے سرکشی اختیار کی ہے۔ لیکن دوسرے مصرعہ میں شاعر کی گہرائی فکر میں سویا ہوا وجدان جاگ اٹھتا ہے اور بیساختہ زبان پہ خالق مطلق کی عظمت و تقدس کا خیال آگیا۔

فکر و نظر

خوش قسمتی سے ڈاکٹر صاحب کو غور و فکر کا مادہ ورثہ میں ملا ہے۔ ان کے خاندان کا علم و فضل اور آزادہ روی مشہور ہے۔ انکے دادا حکیم حسن علی مرحوم مہاراجہ رنبیر سنگھ کے مقرب ترین حکماء میں تھے۔ انکے والد حکیم انعام علی بھی اپنے زمانہ میں طب اور منطق میں خاص شہرت کے مالک تھے۔ ان بزرگوں کو نہ صرف طب، فلسفہ اور علم ہیئت سے دلچسپی تھی بلکہ شاعری سے بھی شغف تھا۔ انکے دادا حسن علی اپنے وقت کے درویش اور فصیح شاعر تھے۔ ایسے علمی ماحول میں پرورش پانے والا فرد جتنا بھی بلند اڑے وہ کم ہے۔ اس تخیل سے بڑھتے ہوئے سیلاب نے شروع شروع میں انکی شاعرانہ صلاحیتوں کو گمراہ کر دیا لیکن علامہ کیفی دہلوی نے جو ان دنوں خوش قسمتی سے حکومت کشمیر کے اعلیٰ عہدیدار کی حیثیت سے جموں میں تشریف فرما تھے۔ تیموری کی شاعرانہ صلاحیتوں کو دیکھکر انہیں روحانی شاعری کی طرف متوجہ کیا جس میں وہ بہت کامیاب ثابت ہوئے۔ اور بالآخر مشق سخن نے انہیں ہر موضوع پر لکھنے پر قادر بنا دیا۔

ان کے فکر کا میدان کائنات اور ماورائے کائنات ہے۔ وہ مسائل حیات اور انسانی ضروریات سے بھی غافل نہیں۔ وہ علامہ اقبال کی طرح دنیا میں انسانیت کا ایسا شرف دیکھنے کے متمنی ہیں جو انسانیت کے شایان شان ہو۔ لیکن فرق یہ ہے کہ علامہ مرحوم اسلامی نظم کے ماتحت اس خواب کی تعبیر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور تیموری تمام ظاہری قیود کو توڑ کر۔

وہ حقائق عالم کو دنیا کی سرسری نظر سے نہیں دیکھتے بلکہ گہری اور تیز نظر سے دل کا جائزہ لیتے ہیں۔ جس سے ان کا فکر شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ انکا غور و فکر اگرچہ مطلق آزاد ہے تاہم کرشنا مورتی کے مکالمات کا ان پر گہرا اثر ہے۔ اس کے علاوہ بیدل، غالب اور اقبال کے غیر محسوس اثرات سے وہ اپنے آپ کو بچا نہیں سکے۔ علامہ اقبال کے اثر نے تو آخر انکی شاعری کے دھارے کا رخ ہی بدل دیا۔

یورپ کے فلسفیانہ لٹریچر سے وہ بہت کم مستفید ہوئے ہیں۔ آزادیٔ فکر انہیں عموماً حد اعتدال سے ہٹا دیتی ہے۔ اور وہ ایسا غیر منظم نظریہ پیش کرتے ہیں جو کبھی شرمندۂ عمل نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ انکے نظریہ کی بنیادیں استوار نہیں۔ مذہب پرستوں کو ان کے متعلق شکایتیں ہیں لیکن آزادانہ سوچنے اور سمجھنے والوں کیلئے انکے کلام میں بہت سے رموز ہیں۔ اہل مذہب سے وہ الجھنا نہیں چاہتے۔ فرماتے ہیں ؎

کفر و ایماں سے نکل کر عشق کی منزل میں ہوں
شیخ ناواقف ہے مجھ سے برہمن بیگانہ ہے

اور ؎

میں ہاں پہنچا جہاں منزل نہ کوئی راہ تھی
خضر حیراں رہ گیا ہے میری منزل دیکھ کر

عقل و وجدان

حقیقت کی جستجو میں ڈاکٹر صاحب کا دل ہمیشہ تڑپتا رہتا ہے ؎

وہ عجب طرح کی ہے کشمکش نہ چھپا سکوں نہ بتا سکوں
مری زندگی میں اگر کھلے مری زندگی کا جو راز ہو

لیکن اس مقصود حقیقی تک پہنچنے کیلئے خرد ہی نہیں وجدان کی بھی ضرورت ہے وہ حصول مقصد کیلئے خرد پر زیادہ انحصار رکھتے ہیں۔ اور اسکے بل بوتے پر وہ تمام حقائق پر چھا جانا چاہتے ہیں۔ وہ عقلیات کے طلسم میں بری طرح گرفتار ہیں۔ ہر چیز کو شبہ اور شک کی نظروں سے دیکھنا انکے فکر کی عادت ہے۔ علامہ اقبال مرحوم کو بھی اس سے گزرنا پڑا تھا لیکن وہ اپنے دامن کو اس آگ سے صاف بچا کر نکل گئے۔ فرماتے ہیں ؎

مقام عقل سے آساں گزر گیا اقبال
مقام شوق میں کھو یا گیا ہے دیوانہ

جب کبھی وہ عقلیات کے دام سے ایک لحظہ کیلئے آزاد ہو کر اطمینان کی سانس لیتے ہیں تو انہیں احساس ہونے لگتا ہے کہ ؎

بغیر جوشش جنوں انقلاب کیا ہوگا
کہاں کی عقل اگر وحشتوں سے کام لیا

لیکن یہ نظریہ ان کے ہاں مستقل حیثیت نہیں رکھتا۔ وہ وجدان کے مقابلہ میں خرد کے زیادہ قائل ہیں۔ اور اس پر ان کا تمام زور صرف ہوتا ہے ؎

عشق کہتا ہے مآل زندگی باطل نہیں
عقل کہتا ہے کہ جز حسرت کوئی حاصل نہیں

ناتواں ہوں اور ہے دشوار راہ ارتقا
عقل رہزن ہے مجھے دل کا سہارا بھی نہیں

وہم کے نقش حسیں پر لگی آنکھیں ہیں نثار
عقل کی حیرانیاں اجزائے ایماں ہو گئیں

وعدۂ حشر پہ ایمان ہے اپنا لیکن
کون ہو جائیگا کافر اگر افسانہ ہو

سینۂ دل سے تسکین سے جو معمور نہیں
سیر جنت کی تمنا ہے جو ہمیں منظور
خضر زندگی خلد مبارک! لیکن
[illegible] علاج دل رنجور

ادا شناس نہیں ہوں رموز فطرت کا
خدا کو [illegible] کئے ہوئے خود

جستجو میں تری پیلے تو نگاہیں نکلیں　دل نے جب غور کیا اور ہی راہیں نکلیں
بُت کدہ آنکھ نے اور کعبہ بنایا دل نے　جب حقیقت نہ کُھلی عقل کی آہیں نکلیں

دل میں تو اک گماں سا ہے عقل کو کچھ پتہ نہیں　کون کہے کہ ہے خدا کون کہے خدا نہیں

صوفیانہ نظریات کی بھی ان کے دل کی نہیں ؎
جاننے کی چیز تو اپنی حقیقت تھی مگر　جستجوئے غیر میں اپنی خودی کو کھو دیا

تم ہی تم ہو جلوۂ ہستی میں یا ہوں میں ہی میں　نورِ وحدت میں نہیں ہوں میں دوئی کا آشنا
ذرہ صحرا آشنا ہے قطرہ دریا آشنا　ہے حقیقت میں ازل سے جزو کل کا آشنا

پروازِ فکر حقیقت کی تلاش میں دُنیا آج تک سرپٹک رہی ہے۔ حیات و مرگ کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کائنات اور ماورائے کائنات کے مسائل پر غور و فکر کر رہی ہے۔ وہ اس برتر و بالا ہستی کے سربستہ رموز کو بے نقاب کرنے کیلئے تڑپتی رہتی ہے۔ قدرت اگرچہ اپنے پرستاروں کی سچی تڑپ دیکھکر ان کے فہم کی رہنمائی سے دریغ نہیں کرتی۔ لیکن فہم انسان سے ہی کیا۔ جو اس کے تمام بھید دل کو احاطہ کرلے۔ ہر سوچ کا نتیجہ یہی ہے کہ سوچنے والا جہان سے چلا جاتا ہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں ؎
کی ہر اک نے شرحِ کیف باندازِ جنوں　کچھ تو ہے راز مگر درخورِ تغیر نہیں

فنا اپنی لبِ ہے یعنی چمن کے رنگ کو　گل نے دیکھا ہنس دیا شبنم نے دیکھا رو دیا

انسان، کائنات اور حقیقت ایسے موضوعات ڈاکٹر صاحب کی شاعری کی جان ہیں۔ جن میں وہ شاعرانہ رنگ آمیزیوں اور تشبیہہ و استعارہ کی مدد سے ان روکھے پھیکے مسائل کو دلچسپ بنا دیتے ہیں۔

ان کا خیال ہے کہ ہستی و بقا کو ایک ایسی ذات سے تعلق ہے جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ البتہ شکلیں تبدیل ہوسکتی ہیں ؎
قطرہ مٹا تو کیا ہے گوہر بنا تو کیا ہے　نقشِ نیام ہستی، ہستی کا مدعا ہے

مٹی کے ہستی بن گئی نقشِ فنا　کیا مٹی جب اور صورت ہو گئی

اگر فنا ہے، جوہر میں تو بقا ہے　قطرہ تو مٹ چکا ہے اور آب ہے گہر میں

انسان کے انتہائی غور و فکر کا یہی حاصل ہے کہ وہ کچھ نہ جانے ؎
عالم میں ہوئی عالمِ پنہاں کی خبر　دہر اک پردۂ اسرار نظر آتا ہے

کبھی اٹھی ہی نہیں روئے حقیقت سے نقاب　جو نظر آتا ہے پردہ نظر آتا ہے مجھے

ڈھونڈتے ہیں ٹھہرتے نہیں، بڑھتے جاتے ہیں　میں بھی محوِ تماشا کہ تماشا کیا ہے

کیوں کریں ہم تجھے مقصود کون رشاد　فطرتِ ہستی کا خود مقصد ابھی کامل نہیں

اور کبھی انہیں احساس ہونے لگتا ہے کہ ؎
ارتقاء عالم نیرنگ سے گذرا ہوں میں　ذرہ میرا آشنا ہے قطرہ میرا آشنا

زندگی کے بعض ناقابل تردید تجربات کو بھی ڈاکٹر صاحب نے بڑی خوبی اور عمدگی سے نبھایا ہے۔ فرماتے ہیں ؎
شبِ غم جب مری حد سے سوا تاریک ہوتی ہے　امیدوں کی سحر مجھ سے بہت نزدیک ہوتی ہے

موت نے آکر یہ ثابت کر دیا　جسم کی سب طاقتیں بیکار ہیں

امیر بزمِ محبت وہی ہے عالم میں　فراخ دل جو ہے ایامِ تنگدستی میں

دل ہے اک لنس دمنحوار مگر دیتے ہیں　جان سے سخت ہیں بیزار مگر رکھتے ہیں

دل گرفتارئ اُمید سے آزاد ہوا　سخت پیچیدگی بھی عقدہ کشا ہوتی ہے

جوہر تعمیر لیکر صورت تغیر پھرتی ہے　تو کیوں آنکھوں کے آگے شوکتِ تعمیر پھرتی ہے

مسائلِ ملّیہ وہ مسلمانوں کے رسمی ایمان سے مطمئن نہیں۔ بلکہ اس ایمان میں ایسی پختگی چاہیئے جو پیغمبروں کے ایمان کا خاصہ ہے اور بغیر کسی رہنمائی کے۔ ان کا پختہ یقین ہے کہ اگر موجودہ مسلمانوں کا ایمان مکمل ہوتا تو ان میں وہ تمام صفات موجود ہوتیں جو ایک سچے مومن کا ورثہ ہیں۔ ان کی اخلاقی اور اقتصادی پستی انکی سیاسی گراوٹ اس بات کی شاہد ہیں کہ وہ کلمہ گو تو ضرور ہیں لیکن کلمہ کے صحیح مفہوم سے ناآشنا ہیں۔

اسلام دنیا میں ایک ایسا مکمل مذہبی، سیاسی اور معاشی نظام لیکر آیا تھا جس نے انسانیت کا سر بلند کردیا۔ اور مسلمان دنیا میں حکومتِ الٰہی قائم کرنے میں کامیاب رہے۔ جب تک مسلمانوں میں اسلام کی صحیح اور اصلی رُوح باقی رہی وہ دُنیا میں عزت و وقار کی زندگی بسر کرتے رہے اور انسانیت کو اُن کے وجود سے فخر رہا۔ مسلمانوں نے جب منشائے اسلام کو پسِ پشت ڈال کر توہمات کی غلامی اختیار کرلی اور رسمیات میں اصلی مذہب سمجھ لیا۔ تو ان کی ذہنی، اخلاقی اور معاشی تو کیا سیاسی ساکھ بگڑ گئی۔ اور

اور ان کے مقابلہ میں جب غیر مسلم اقوام نے کافر و ملحد رہتے ہوئے اسلام کے ہمہ گیر اصول اختیار کر لئے تو ان کی پستی عروج سے بدل گئی۔ مسلمان اہم معاملات کو چھوڑ کر چھوٹے چھوٹے مسائل میں اُلجھ گئے۔ اور اپنی تجارت، تمول اور سیاست سب کچھ کھو بیٹھے۔ مسلمانوں کی زندگی کا وہ معیار ہی بدل گیا جو قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی خصوصیت تھا۔ "صدق مقال و اکل حلال" کی بجائے فخریہ جھوٹ بولنا۔ یا مشقت جو ل جائے اسی پر اکتفا کرنا۔ اسلامی جامہ پہنکر اور اسلامی نام رکھکر انہیں برائیوں کا ارتکاب کرنا جو اسلامی روایات کے قطعی منافی ہیں۔ جھوٹ، دغا، فریب، مکر، ریا وغیرہ کو معمولی گناہ سمجھکر اُن سے اجتناب نہ کرنا۔ دوسروں کا ذرا سا عیب دیکھکر خواہ اس سے کسی کو نقصان بھی نہ پہنچے جہنمی قرار دینا۔ زہد و عبادت سے دوسروں کو مرعوب کرنا۔ غرض ایسی کتنی ہی باتیں ہیں جن پر قوم کے شاعروں، واعظوں اور مفکروں نے مسلمانوں کو ٹوکا۔ شاعر جو مفکر بھی ہے اپنی قوم کی ان بُرائیوں کو دیکھکر شدت احساس سے تڑپ اُٹھتا ہے۔ اور وہ قوم کے صاحب فہم افراد کو مخاطب کرکے ان برائیوں کو دور کرنے کے لئے توجہ دلاتا ہے۔ کبھی معترضانہ رنگ میں اور کبھی ناصحانہ انداز میں ؎

فریب کار جہاں خوب و رہزن معیوب
بقدر عقل ہر اک شخص مطلب آگیں ہے

خدا کو سجدہ کئے پر بھی سرکشی نہ گئی
سر نیاز کو کتنا دماغ ناز رہا

معصیت مذموم ہے، معصوم عشرت ہے کہاں
کیف عصیاں میں زیاں ہے لطف تقویٰ بھی نہیں

وطن کے خار، دُعیر اقوام کے پتھر مذاہب کے
اُٹھا کر صاف کر دو عام آزادی کے رستوں کو

مٹا ئیں فتنۂ اقوام سطح عالم سے
یہ ایک کام تو مذہب کے نام پر کر دیں

وہ مسجدوں میں محبت کی محفلیں نہ رہیں
نہیں رہا کوئی کافر بھی جس کو پیار کروں

زندگی کی تلخ کامیوں سے سب کو واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن شاعر ان تلخیوں کو جس شدت سے محسوس کرکے اس کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اسی کا حصہ ہے۔ فرماتے ہیں ؎

محفلِ امروز وقفِ جام و مینا بھی نہیں
دل کو امیدِ حصولِ کیفِ فردا بھی نہیں

ساقیٔ فطرت! پلا جام شرابِ زندگی
موت کی سی زندگی ہم کو گوارا بھی نہیں

تلخیٔ زیست میں تھی موت کی لذت شیریں
زہر کا جام نہ کیوں غم کا مپیا نہ ہوا

جو دی ہے زندگی سامان زندگی بھی دے
خدا! تجھے خبر حالِ زار مسکیں ہے

ڈاکٹر صاحب کی نظر انسانیت کی عالمگیر برتری چاہتی ہے۔ وہ کسی شخص کو اس لئے بُرا نہیں سمجھنا چاہیئے کہ وہ ان کا ہم مسلک نہیں۔ وہ ہمہ گیر اخوت و مساوات کے حامی ہیں اور چاہتے ہیں کہ دنیا اس طرح آپس میں زندگی بسر کرے جس طرح ایک گھر میں دو حقیقی بھائی۔ ان کے نزدیک وطن و ملک رنگ و نسل کی قید بھی ایک بے معنی چیز ہے ؎

ترے فیضِ وسعتِ دل سے ہو یہ جہاں سارا وطن ترا
ترے ذہن تنگ پہ خاص کر یہی ہند ہو نہ حجاز ہو

غرض ڈاکٹر سورؔ کے کلام میں ان کے دل کی دھڑکنیں سنائی دیتی ہیں اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کا انتہائی عروج دیکھنے کے خواہشمند ہیں۔ اور ان کی یہ نیک خواہش ان کے بیشتر اشعار سے صاف جھلکتی ہے۔ ان کا فطری رجحان طبع کائنات کے مسائل حل کرنے میں مصروف تو رہتا ہی تھا۔ علامہ اقبال مرحوم کے بصیرت افروز لٹریچر نے ان کی تمام توجہات کو اپنی طرف مرکوز کرکے انہیں حقائق و معارف کی ترجمانی کے لئے ایک وسیع میدان دیدیا ہے۔ اگر کبھی موقعہ ملا اور ڈاکٹر صاحب نے نمونۂ کلام دینے میں بخل نہ کیا تو اس نوع کی شاعری کے دلچسپ نمونے پیش کروں گا۔

دو موتیں

(از جناب قیسی رام پوری)

موم بتی کی لو دفعتہً چڑ چڑانے لگی۔ چربی جلے جا رہی تھی۔ اس میں دھواں تھا نہ بو۔ لیکن ایک بھٹکتا ہوا پروانہ جب اس پر گر کر جلا تو دھواں بھی اٹھا اور بو بھی آئی ——— یہ زندگی جل رہی تھی۔ موم بتی بے جان تھی۔ حیات جب جلتی ہے تو فضا کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتی۔

اسی موم بتی کے آگے بیٹھا ہوا حامد قرآن کو کھولے ہوئے اس کے مطالب پر غور کر رہا تھا۔ خدا نے سرکش قوموں کو کیسی کیسی شدید سزائیں دی ہیں۔ اور ان قوموں نے بھی اس کے فرمان کی بجا آوری میں ضد و بغاوت کی انتہا کر دی ہے۔ پگڈنڈی کبھی سیدھی نہیں ہوتی۔ نقش قدم زمین پر ہمیشہ ایک ہی زاویہ سے نہیں پڑتے ہیں۔ صراط مستقیم پھر سیدھی لائن کا نام کس طرح ہو سکتا ہے۔ جس زمین پر پگڈنڈی بنتی ہے اس پر پہلے ایک آدمی چلا ہوگا۔ راہ کی جھاڑیوں سے بچتا ہوا، گڑھوں اور پتھروں سے کتراتا ہوا یکے بعد دیگرے پہلی دفعہ صرف دو تلوے اٹھ اٹھ کر زمین پر پڑتے چلے گئے ہوں گے کبھی نشان پڑ گیا ہوگا اور کبھی سخت زمین نے اس کو قبول نہ کیا ہوگا۔

اس کے بہت دن بعد پھر راستہ کی تلاش میں کوئی دوسرا آدمی ادھر آیا ہوگا اس نے ان گڑھوں اور خاردار جھاڑیوں کے قریب چند محتاط قدموں کے نشانات دیکھے ہوں گے جیسے انہیں نشانات سے بالکل متصل اپنے پیروں کے نقش بناتا چلا گیا ہوگا۔ اس طرح پیہم مسلسل اور وقفہ وقفہ کی آمد و رفت نے ایک ٹیڑھی بل کھاتی لکیر کھینچ دی ہوگی جو راہبر کے قدموں کو شکستہ پہنچاتی اس کو کسی بڑی سڑک پر لا کر کھڑا کرتی ہے۔

قوموں کے پاس ہدایت ہمیشہ آئی۔ حامد نے قرآنی مطالب پر پھر غور کرنا شروع کیا۔ اس کے بعد وہ ممنوعہ افعال کے فلسفہ پر غور کرنے لگا۔ پھر اس کو عقل کے کو تماشائے لب بام کا خیال آیا۔ اس نے ایک ذمہ دار فرد کے سر پر آرے کے سبب دانت چشم تصور میں دیکھے۔ ہتھیلیوں میں کیلیں ٹھکی ہوئی نظر آئیں اور ایک آخری بزرگ پر مادہ کی قہرمانی سے وہ کانپ اٹھا۔ حیاتیں جل تھیں۔ زندگیاں بھبکی تھیں۔ قربانی دھوئیں اٹھے تھے اور فضائیں متاثر ہوئی تھیں۔ موم بتی اب بھی بغیر دھواں دیئے اور بلا بو چھوڑے جل رہی تھی۔

محمود بجلی کی روشنی میں جہاں نہ چربی جل سکتی تھی نہ کسی دھوئیں کا امکان تھا ہزاروں آدمیوں کے درمیان کھڑا ہوا کشاکش حیات کا سین پیش کر رہا تھا۔ زندگی کو زندگی بنانے میں خدا کا عجز، حیات انسانی کو سنوارنے میں فلکی قوتوں کی بیچارگی، حیات کی مانگ کو چپ کرنے میں مذہب کی درماندگی کو کھری حقیقت کی صورت میں اس کی دلیلیں لوگوں پر برسا رہی تھیں۔

ذرات کی تکسیر نے حرارت کو جنم دیا ہے اور حرارت ہی لائف ہے جو کرم حقیر کو پروان چڑھا کر ارتقائی منازل کی سیر کراتی آج مکمل انسان کی بولی اس سے بلانے لگی ہے۔ کیریکٹر اور انسانیت توام ہیں۔ درندگی و آزادی کی سپرٹ فطرت کے اشلے ہیں۔ انانیت و ایثار جبلی میلانات ہیں۔ جبر و استبداد حصولی قوتوں کا ریڈیو ہیں۔ اس طرح انسان کا کیریکٹر خدا کے تخیلی کیریکٹر سے ارفع ہو جاتا ہے خدا کو انسان بناتا ہے۔ اس لئے انسان ہی میں یہ قوت بھی ہے کہ جب چاہے اس کو بگاڑ بھی دے۔ چنانچہ یہ پرانا نقش اب بگڑتا جا رہا ہے۔ انسان بنتے جاتے ہیں اور خدا مٹتے جاتے ہیں۔ یہ حق انسانیت ہے اور مستلزم آدمیت۔

لوگو کہاں ہیں تمہاری زندگی کی احتیاجی آوازیں۔ ان کو جمع کر کے میرے پاس لاؤ۔ میں تمہیں بتاؤں گا کہ وہ ضعیف معتقدات کے سینوں سے نکلی ہیں۔ واہمہ کے پھیپھڑوں نے ان کو اگلا ہے۔ اور وہ مذہبی تصورات کے حلق سے نکلنے کی وجہ سے بے اثر ہیں۔ میرے سامنے لاؤ اپنے متورم سینے۔ میرے سامنے کھولو کھنڈرے مذہب کے مارے ہوئے دل۔ میں تمہیں بتاؤں گا جو کچھ تم مانگ رہے ہو تو ان خدا سے مانگ رہے ہو، انسان سے طلب کرنے سے گریز کر رہے ہو۔

یہ تھی محمود کی تقریر۔

بجلی کے قومی بلب کے گرد بے شمار پروانے طواف کر رہے تھے اور کئے جا رہے تھے۔ بجلی فانوس میں چھپی مسکرا رہی تھی۔ پروانے اپنا فرض ادا کئے جا رہے تھے۔ مگر وہاں نہ لو تھی نہ آنچ، اس لئے آپس ہی میں ٹکرا ٹکرا مرے جا رہے تھے! شاید محمود کی تقریر کے صحیح اثرات کی صحیح ترجمانی پروانے ہی کر رہے تھے۔

خیالات و معتقدات سے سیرتیں بننے لگیں۔ موم بتیاں بیس سال تک جلتی رہیں جن کی لو پر اکثر پروانے آ کر تڑپے اور بجھے، اس ہلکی ہلکی روشنی میں، پروانوں کے جلنے کی بو اور خفیف دھوئیں میں بیٹھا ہوا سوسائٹی کا ایک فرد انفرادی طور پر اپنا کردار بناتا رہا۔ مخلوق سے محبت، بندوں کی خدمت پھر سب سے زیادہ اپنے افعال کا محاسبہ و اصلاح۔ ایک سبک سا پریس تھا جس میں صرف ایک ہی اخبار چھپتا تھا اور اس کا پڑھنے والا بھی تنہا ایک ہی انسان تھا۔ تنہا نگاری، تنہا انتقاد، اس کے بعد خود ہی اس کے اثرات سے مطابقت و مخالفت۔ یوں حامد ایک انسان پیدا کرتا رہا۔

یہ انسان پہلے اپنے گنجے میں روشناس ہوا۔ اس کے بعد جب محلہ والوں نے
بھی اس کو مفید پایا تو اس کی طرف کھنچنے لگے۔ پبلک مارکیٹ دور تھا اور عمر تھوڑی
اس لئے جب مر جانے کے دن آگئے تو چُپ چاپ مر گیا۔ اور اپنے گنجے آدمیوں نے اُٹھا کر
اس کو سپرد خاک کر دیا۔

بھاری بھاری اندھیریوں اور لمبی لمبی تاریکیوں میں ٹمٹماتی روشنی کی ایک رمق
باقی تھی۔ باقی رہ گئی تھی۔ اور ٹمٹمائے جا رہی تھی۔ گھر اور محلے میں اُجالے کا یہ مدھم عکس
ہچکولے لئے چلا جا رہا تھا۔ روشنی بہت تیز رو نور ہے۔ بہت دور تاریکیوں کے ٹھنڈے
پھندے میں سے اس کی چمک نظر آئے بغیر نہ رہتی تھی۔ اندھیروں کی ماری ہوئی آنکھیں
بھی اس روشنی کو دیکھتیں۔ اس کو روشنی سمجھنا ناگزیر تھا۔

بجلی کی تیز روشنی میں بیس سال تک پڑ ڈالنے چلنے کا موقع نہ پاکر ایک
دوسرے سے ٹکرا ٹکرا کر مرتے رہے۔ موم بتی کی مدھم روشنی میں ایک فرد بن رہا تھا
مگر بجلی کے نور میں جماعتیں ملتے اور قومیں گڑھی جا رہی تھیں۔ فرد کو پہلے ہی باعزت
رخصت کر دیا گیا تھا۔ کیونکہ اب جماعتیں تمام نظام معیشت و اخلاق اپنے ہاتھ
میں لے چکی تھیں۔ حیات نے اپنا سینہ کھول دیا تھا اس لئے طبقات اور قوموں نے
زندگی کی بکھری ہوئی ضروریات اور تقاضوں کو ہوشمندانہ چن لیا۔ ان کی ترتیب دی
اور اچھے اچھے آئیڈیل کی گل بازی ہونے لگی۔ یہی محمود کا مشن تھا۔ یہاں بھی افسوس
عمر گریزاں نے دفا نہ کی۔ اس لئے مرنے کی خاطر اس کو بھی مر جانا پڑا۔ لاکھوں
آدمیوں نے اس کی لافانی ذات کو سہارا دیا۔ اور فانی میت کو آخری مقام تک
عزت سے چھوڑ آئے۔

فرد، جماعتیں ——— کچی اینٹیں اور اونچے مکانات۔ بہت اونچے
اونچے مکانات اور بڑی بڑی کچی اینٹیں۔ ان مکانات پر برساتیں گھر آئیں۔ طوفان
گرجے، زلزلے نے اور جنگیں دندنائیں۔ یہ بلند مکانات تھرا اُٹھے، جھیلے پڑے
اور کھل گئے۔ ایک گرا اور اس طرح گرا کر پاس والے مکان کو بھی لے مرا۔ اینٹیں
کلبلائیں، بنیادوں نے اکڑنا شروع کیا۔ مگر مکانات پے در پے گرنے لگے۔ گر گر
رہے۔ اینٹیں کچی تھیں۔

معیشت اور زندگی کی سمجھ کے تند سیلابوں نے ان اینٹوں کو بھی نہ چھوڑا
وہ بھی طوفان کا ایک جزو بن کر رہ گئیں۔ ہاں چند اینٹیں اِدھر اُدھر ایسی بکھری
ہوئی رہ گئیں جو اپنے حجم میں سالم نظر آ رہی تھیں۔ مضبوط تھیں، پامال ہونے سے
بال بال بچ گئیں۔ مگر چونکہ ان گرنے والے مکانوں میں ان کو بھی کھپا دیا گیا تھا اس
لئے ان کے انہدام میں مدد دینے سے وہ بھی کس طرح گریز کر سکتی تھی۔
طوفان نوح میں سنا ہے تمام اینٹیں بہہ گئی تھیں۔ ایک نوح کی
اپنی ذات کی اینٹ کو بچا لیا... تھی۔ مگر اس طوفان میں وہ بھی
اپنے ہی گھر کی اینٹ کو نہ بچا سکا تھا۔ کیونکہ وہ اچھی طرح آنکھ کھولنے سے
قاصر رہ گئی تھی۔

طوفان نوح نے تو ڈبوئی زمیں فقط
ہم ننگ خلق ساری خدائی ڈبو گئے

ہیر رانجھا

(از جناب ایم۔ اسلم)

آپ کو معلوم ہوگا پنجابی زبان کے ملک الشعرا سید وارث علیشاہ کی کتاب "ہیر رانجھا" پنجاب میں غیر فانی شہرت رکھتی ہے اس وقت تک اس کے سینکڑوں ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ اسلم صاحب نے اسے اردو میں منتقل کیا ہے۔ ایک ٹکڑا "ادب" کے لئے نذر ہے۔ انشاء اللہ دس پندرہ روز تک یہ کتاب بازار میں آجائے گی۔ اور کتب خانہ دار البلاغ۔ محمد نگر میورروڈ لاہور سے مل سکے گی۔ (ایڈیٹر)

مہر چوچک:۔ ہیر کا باپ۔ جھنگ سیالوں کی قوم کا سردار۔

ہیر:۔ مہر چوچک کی صاحب جمال بیٹی اور رانجھا کی محبوبہ۔

رانجھا:۔ تخت ہزارہ کے ایک معزز گھرانے کا چشم و چراغ اور بنسری بجانے میں باکمال۔

رانجھا ہیر کے حسن و جمال کی تعریف سنکر ہیر کے وطن جھنگ سیال میں آیا۔ اور ہیر پہلی ہی نگاہ میں اُسے اپنا دل دے بیٹھی۔ اور باپ سے کہہ سنکر اسے بھینسیں چرانے پر رکھ لیا۔

اب آپ مہر چوچک کی بھینسوں کی تعریف اور رانجھا اور ہیر کا قصہ سُنیئے۔

بھینسیں اتنی خوبصورت تھیں کہ جب جنگل میں چرنے کو نکلتیں تو جنگل آباد ہوجاتا۔ کوئی نازک، کوئی پتلی، کوئی بانکی، کسی کے ماتھے کا چاند دیکھکر ماہ چاردہم یاد آتا۔ کوئی پانچ کلیاں۔ جس طرح بن میں کونجیں پھرتی ہیں اسی طرح مہر چوچک کی بھینسیں جنگل میں پھرتی تھیں۔ کسی کے سینگ کنڈلدار۔ اور کسی کے ہلال کی طرح نوکدار۔ کوئی کبک کی طرح جھوم جھوم چلتی۔ کوئی راج ہنس کی طرح گردن اُٹھا اُٹھا کر قدم اُٹھاتی کوئی کالی بھی، کوئی بھوری اور کسی کی دُم زمین کو بوسہ دیتی تھی۔

رانجھا چناب کے کنارے بن میں ہیر کے باپ کی بھینسیں چراتا تھا اور ہیر گھر والوں سے چوری چھپے اسکی دلداریوں میں لگی رہتی۔ جب رانجھا بھینسیں لیکر جنگل کو جاتا تو ہیر بھی موقع پاکر اُسکے پاس آجاتی اور دونوں دُنیا سے الگ بیٹھ کر پیار کی باتیں کرتے اور جنگل میں منگل مناتے۔ ایک روز رانجھا نے ہیر سے کہا

"ہیر! داناؤں نے کہا ہے کہ عورت کی بات کا اعتبار نہیں کرنا چاہیئے اور خدا نے بھی قرآن حکیم میں عورتوں کے چلتروں کا کچھ ذکر کیا ہے۔ اور حکیموں کا قول ہے کہ جن اور عورت کا صلاح کار شیطان ہوتا ہے۔ اور شیطان بیوفائی کا سبق پڑھاتا ہے۔ عورت کی مثال تو بھنگ کے پیالے کی ہے جس نے پی لیا پھر اسکی بات کا اعتبار کیا۔"

ہیر نے جواب دیا

"رانجھا! تم عورت کو بُرا مت کہو۔ عورت کا دوسرا نام محبت ہے۔ اور عورت کو اگر کوئی پریم کا پیالہ پلادے تو وہ تن، من، دھن، عزت اور آبرو تک قربان کردیتی ہے۔ سوہنی کا قصہ تو شاید تم نے سُنا نہیں کہ کس طرح اس نے اپنی جان محبت کے مندر پہ بھینٹ چڑھائی۔ اور زلیخا جیسی عالی مرتبہ عورت نے یوسف کے لئے کیسی کیسی رسوائی اٹھائی۔ اور سسی غریب بھی اس عشق کے ہاتھوں تپتے ہوئے ریگستانوں میں ہلاک ہوئی۔ اور شیریں نے جان شیریں فرہاد پر قربان کردی۔ پھر یہ تمام ولی۔ اولیاء۔ پیر اور پیغمبر بھی تو عورت ہی کے بطن سے پیدا ہوئے ہیں۔ رانجھا! عورت نہ ہوتی تو یہ دُنیا بھی کچھ اور ہوتی۔ جانے تم کس خیال میں ہو۔ میں تمہیں قول دے چکی۔ اب اگر اس باندی کو یوسف کی طرح بازار لے جاکر فروخت بھی کردو تو کبھی شکایت نہ ہوگی۔ مجھے تمہارے کلشن ہونے دیں تو میں اسی میں خوش ہوں۔ تمہاری بنسری کی آواز مجھے حیات سرمدی کا پیغام دیتی ہوں۔ لیکن تمہارے اکھڑے اکھڑے بول میرے دل کی نگری اُداس کردیتے ہیں۔

سچا عاشق وہی ہے جو صبر کرے اور خاموش رہے جس نے بحر محبت میں قدم رکھدیا اُسے موت یا حیات کا کیوں فکر۔ رہی دُنیا تو رانجھا! دنیا تو اس اندھے کتے کی طرح ہے جو مرگ کا تعاقب کرتا ہے۔"

وقت اسی طرح گذر رہا تھا اور ہیر اور رانجھا ایک دوسرے کی محبت میں سرشار تھے۔ لیکن یہ باتیں آخر کب تک چھپی رہتیں۔ رفتہ رفتہ لوگوں میں چرچے ہونے لگے۔ پھر سارے جھنگ میں ہیر اور رانجھا کی محبت کے تذکرے ہونے لگے۔ اور ہر طرف سے مہر چوچک کے خاندان پر طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ آ

ایک روز ہیر کی ماں نے بیٹی سے کہا۔

"کم بخت! یہ گل تو نے کیا کھلایا۔ ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل ہی نہ رہے۔ تجھے نہ باپ کا خوف رہا نہ بھائی کا۔ انہیں اگر غصہ آگیا تو ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں گے تیرے۔ اب بھی کچھ ایسا نہیں بگڑا۔ چھوڑ اس رانجھا کا خیال اور آئندہ کے لئے توبہ کر۔"

ہیر نے جواب دیا۔

"اماں! اب رانجھا کو تو میں چھوڑ چکی۔ تم چاہے کربلا کے شہیدوں کی طرح ہلاک کر کے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالو۔ محبت کی موت اصل زندگی ہے۔ رانجھا نہ ملا تو پھر کیا۔ لیلےٰ مجنوں کی طرح لوگوں میں ہمارے قصے تو ہونگے۔"

ماں غصے سے بولی۔

"بے شرم! ڈوب نہیں مرتی۔ ایسی بات منہ سے نکالتے۔ میں نے تو اپنی دانست میں پھول بوئے تھے۔ لیکن مجھے معلوم نہ تھا کہ میری قسمت میں کانٹے ہیں۔"

ماں کی ڈانٹ ڈپٹ سے کچھ روک تھام ہو ہی گئی۔ لیکن اب ہیر جب رات کو جب اسے موقع ملتا گھر سے نکلکر جنگل کی راہ لیتی اور رانجھا سے ملکر اسے تسلیاں دیتی اور اپنی محبت کا یقین دلاتی۔

ہیر کا ایک چچا تھا۔ اس کا نام کیدو تھا۔ کیدو لنگڑا تھا۔ بڑا بدمعاش اور حاسد۔ عموماً مہر چوچک کے کان بھرتا رہتا اور ہمیشہ رانجھا اور ہیر کی تاک میں رہتا۔ ایک روز جو ہیر رانجھا سے ملنے گئی تو کیدو بھی پیچھے ہولیا۔ ہیر گھر سے رانجھا کے لئے پراٹھے پکا کر لے گئی تھی۔ رانجھا تو پراٹھے کھانے لگا اور ہیر اس کے لئے دریا پر سے پانی لینے گئی۔ ہیر کے جاتے ہی کیدو موقع پا کر رانجھا کے پاس آیا اور اللہ کے نام پر روٹی مانگی۔ رانجھا نے ایک پراٹھا اٹھا کر کیدو کو دیدیا۔ کیدو پراٹھا لے کر گاؤں کو چل دیا۔ جب ہیر پانی لیکر آئی تو بولی۔

"کھا بھی لئے اتنی جلدی پراٹھے؟"

رانجھا نے کہا کہ ایک مسافر آیا تھا اس نے کچھ کھانے کو مانگا۔ میں نے ایک پراٹھا اسے دیدیا۔ غریب لنگڑا تھا۔ مجھے ترس آگیا۔"

ہیر نے کہا۔

"رانجھو! یہ کیا غضب کیا تم نے۔ یہ لنگڑا تو میرا چچا کیدو تھا۔ وہ تو ہزار شیطان کا ایک شیطان ہے۔ اگر یہ تمہارے سامنے بھوک سے تڑپ تڑپ کر مر بھی جاتا تو بھی تمہیں کچھ نہ دینا چاہیئے تھا۔ اب خدا ہی جانے یہ پاجی کیا طوفان برپا کرے۔ کیا اچھا ہوتا جو تم میرے لوٹنے تک ہی اسے روک لیتے۔"

ہیر اٹھی اور اسی رستے ہولی جدھر کیدو گیا تھا۔ اور آخر اسے راستہ ہی میں جا پکڑا اور ایک دو تھپڑ مار کر اسے زمین پر گرا دیا اور پراٹھا چھین کر خوب اسکی عزت کی۔ اگر کوئی دیکھنے والا ہوتا تو یہی سمجھتا کہ کوئی فرشتہ آسمان سے اتر کر شیطان کو پیچ و تیغ کر مار رہا ہے۔

کیدو پٹ پٹا کر اپنے بھائی مہر چوچک کے پاس گیا اور سب بھانڈا پھوڑ دیا۔ مہر چوچک نے کہا

"کیدو! کیا بیہودہ باتیں کرنے لگے تم۔ ہیر کہیں سہیلیوں کے ساتھ جنگل گئی ہوگی۔ سب ملکر کھیلتی ہونگی۔ تم یہ کیا سنانے لگے مجھے۔ کہیں کسی بھنگی کا سید بنتے بھی دیکھا تم نے۔ بجری کا بچہ گھوڑا بھی کبھی بنا آج تک۔ پاگل تو نہیں ہوگئے تم۔"

لیکن کیدو بھلا کب خاموش رہنے والا تھا۔ جب بھائی کے ہاں دال گلتی نظر نہ آئی تو بھاوج کے پاس جا کر اس کے کان بھرے۔ ہیر کی ماں نے ہیر کو بلوایا اور غصے سے کہا۔

"ناشدنی! تیری غیرت اور شرم کیا ہوئی۔ اگر تیرے بھائی کو پتا لگ گیا تو زندہ نہ چھوڑے گا تجھے۔ تو نے باپ کی لاج بھی ڈبو دی۔ اس دن سے پہلے تجھے موت کیوں نہ آئی۔"

ہیر بولی۔ "اماں! یہ کیا کہہ رہی ہو تم؟ ہوتا وہی ہے جو خدا کو منظور ہو۔ وہ غریب تو کوئی خدا کا پیارا ہے۔ کتنا تعجب ہے کہ لوگ تو بات بات میں تم سے صلاح مشورہ کریں اور تم لوگوں کی لگائی بجھائی پر کان دھرو۔"

ادھر جب مہر چوچک گھر آیا تو ہیر کی ماں نے اس سے کہا۔ "تمہاری لاڈلی نے میری ناک میں دم کر رکھا ہے۔ اپنے بیگانوں کے طعنے سن سن کر میں تو عاجز آگئی۔ اس بدبخت کو شرم رہی نہ حیا۔ اس موئے رانجھے سے جنگل میں گلچھرے اڑایا کرتی ہے۔ میں نے سمجھایا تو الٹا مجھے گھورنے لگی۔ بہتر یہی ہے کہ رانجھا کو نکال دو یہاں سے۔ اور اس نگوڑی کے بیاہ کا بھی کہیں انتظام کرو۔ اب اس کا گھر میں رہنا ٹھیک نہیں۔"

ہیر کا باپ بیوی کی باتیں سنکر اس وقت تو خاموش ہو رہا لیکن جب رانجھا آیا تو

"واہ میاں رانجھا! بھلائی کا انعام تم نے خوب دیا۔ بس ہاتھ اپنی راہ پکڑو۔ میں نے تجھے بھینسیں چرانے کو رکھا تھا۔ بیٹی کا دل بہلانے کیلئے نہیں رکھا تھا۔"

رانجھا بولا۔ "واہ مہر جی! خوب انعام دیا تم نے۔ مجھے تمہاری بیٹی سے کیا۔ سنبھالئے اپنی بھینسیں۔"

لیکن رانجھا جب گھر سے نکلا تو مہر چوچک کی سب بھینسیں بھی اس کے ساتھ باہر نکل آئیں ....

ایک ایکٹ کا ڈرامہ

کالی اچکن

(از جناب ارشد مختار بی اے آنرز)

افراد

بیگم صاحبہ :۔ خان بہادر مرحوم کی بیوی جو دلی کے بر آوردہ شرفا میں گنے جاتے تھے۔

عذرا :۔ خان بہادر کی بڑی صاحبزادی جو شادی شدہ ہیں۔

طاہرہ :۔ خان بہادر کی چھوٹی صاحبزادی۔ تقریباً اٹھارہ برس کی ایک نوجوان لڑکی۔ نہایت دُبلی پتلی، چہرے سے بیماری کے آثار نمودار ہیں۔ آنکھوں میں مُردنی ہے مگر حرکات و سکنات سے بہت پُھرتیلی معلوم ہوتی ہے۔

پہلا منظر

زنان خانے کا ایک وسیع کمرہ جس میں بیش قیمت ایرانی قالین بچھے ہیں۔ چاروں طرف مخمل کے گاؤ تکیے لگے ہوئے ہیں۔ دیواروں پر بلادِ اسلامیہ کے مختلف مقامات کی تصویریں آویزاں ہیں۔ صدر قالین پر بیگم صاحبہ تنگ چوڑی دار پائجامہ میں ملبوس بیٹھی چھالیہ کتر رہی ہیں۔ ریشمیں کارگر کا دوپٹہ اور آنکھ کے لٹ کی قمیص پہنے ہوئے ہیں۔ پاس ہی قلعی دار پٹاری رکھی ہوئی ہے۔ جس پر سُرے کی کامدار گردی ہے۔ کمرے کے ایک کونے میں طاہرہ پلنگ پوش بُن رہی ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ کچھ گنگنا رہی ہے۔ عذرا کمرے میں داخل ہوتی ہے۔

عذرا :۔ امی! مجھے تو یقین ہے نہیں پیر جی کے ان ڈھکوسلوں کا۔ بھلا طاہرہ نے کسی کا کیا بگاڑا ہے جو کوئی اس پر جادو ٹونے کرتا پھریگا۔

بیگم صاحبہ :۔ (ذرا غصے سے) بس بیٹھی رہو بیٹی۔ تم نے دُنیا نہیں دیکھی۔ تمہارے مرحوم ابا کہتے تھے کہ ایک دشمن ہزار دشمنوں پر بھاری ہوتا ہے۔ دیکھتی نہیں ہو جس دن سے منگنی ہوئی ہے طاہرہ کا رنگ زرد پڑتا گیا۔ اور پھر تو برابر بیمار رہنے لگی۔ منگنی ہوئے کو بھی۔ جب شادی کا قصہ اُٹھا کوئی نہ کوئی آفت آکھڑی ہوئی۔ کئی مرتبہ بچی مرتے مرتے بچی ہے۔ یہ آخر ٹونا نہیں تو اور کیا ہے۔

طاہرہ دھاگہ توڑنے کے بہانے سے پلنگ پوش مُنہ تک لے جاتی ہے۔ اور زیر لب ہنستی ہے۔

عذرا :۔ امی آپ کو خدا کی ذات پر بھروسہ نہیں جو کچھ کرتا ہے خدا ہی کرتا ہے۔

بیگم صاحبہ :۔ خدا اتنا ظالم نہیں۔ اور پھر وہ کیوں کرتا۔ گھر کے بچے بچے سے نماز پڑھواتی ہوں۔ پھر تمہیں تو معلوم ہی ہے محلے میں کہیں بھی مولود ہوتا ہے میں ضرور موجود ہوتی ہوں۔ شادی سے پہلے تمہیں بھی ساتھ لے جاتی رہی۔ طاہرہ اگرچہ خود صحت کی وجہ سے نہیں جاتی مگر مجھے مصر ہو کر بھیجتی ہے۔

طاہرہ :۔ (بہت مسکین صورت بنا کر) اور امی جمعرات کے جمعرات حضرت مٹکے شاہ کی درگاہ بھی تو نہیں چھٹتی۔ ہم سے اللہ میاں کی ناراضگی کی پھر کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

بیگم صاحبہ :۔ (بہت نرمی کے ساتھ) نہیں بیٹی پیر جی کا خیال بالکل درست ہے۔ میرا ماتھا تو اُسی وقت ٹھنکا تھا جب اس موئے کالی اچکن والے نے تمہارے ہاتھ پر سوئی چبھوئی تھی۔ خدا جانے کون تھا وہ موذی۔

عذرا :۔ (پہلے طاہرہ کی طرف دیکھتے ہوئے پھر بیگم کی طرف رُخ کرکے) امی یہ کیا قصہ ہے؟ مجھے ابھی تک اس کا علم ہی نہیں۔ کیا طاہرہ کے کسی نے سوئی چبھوئی تھی۔ ایک غیر آدمی کو اتنی جرأت کیسے ہوسکتی ہے۔ یہ سب کچھ کیسے ہوا؟

بیگم صاحبہ :۔ سوئی چبھوئی میری بچی کے۔ میں تو کہتی ہوں کہ ضرور ٹونا کیا کسی نے۔ اسی دن سے طاہرہ بیمار ہے۔

(طاہرہ کنکھیوں سے عذرا کی طرف دیکھتی ہے)

عذرا :۔ آخر کیسے؟

بیگم :۔ طاہرہ کی منگنی سے ایک روز پہلے جمعرات تھی میں حضرت مٹکے شاہ کے ہاں طاہرہ کو لیکر گئی۔ کہ اسے پیش کردوں کہ حضرت یہ کنیز زادی حاضر ہے۔ اسے آپ کو سونپتی ہوں۔ اس کا نصیب کھول دیجئے۔

عذرا :۔ پھر کھلا نصیب؟

بیگم :۔ (تیوری پر بل لاتے ہوئے) بات تو پوری کرنے دے لڑکی۔ خیر جب میں فاتحہ پڑھنے میں مصروف تھی تو مجھے محسوس ہوا کہ طاہرہ سے کوئی غیر مرد چپکے چپکے کچھ کہہ رہا ہے۔ میں نے جلدی سے دعا ختم کی۔ مُڑ کر دیکھا تو یہ محض میرا وہم تھا۔ میری بچی میری طرح فاتحہ پڑھ رہی تھی۔

عذرا :۔ (طاہرہ کی طرف دیکھکر) اور وہاں کوئی آدمی نہیں تھا؟

طاہرہ :۔ (نیچی نظریں کئے ہوئے) بس دو ایک مجاور تھے جو ہر جمعرات کو ہمیں ملتے ہیں۔

عذرا :۔ (بیگم کی طرف رُخ کرتے ہوئے) یہ سب ہوئی کیسے تھی ؟

بیگم :۔ جب ہم تانگے میں واپس آ رہے تھے تو ایک طرف میں نقاب اُٹھائے سیر کرتی جا رہی تھی۔ اور دوسری طرف طاہرہ کی نقاب اُٹھی ہوئی تھی۔ سیر کو نکلتے ہیں تو منہ کھول ہی لیا کرتے ہیں۔ ہم دونوں کی پیٹھ ایک دوسرے کے پیچھے تھی۔ اور طاہرہ کا ہاتھ تانگے سے باہر نکلا ہوا تھا۔ ایک دم طاہرہ نے چیخ ماری۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک ہٹا کٹا مسٹنڈا کالی اچکن پہنے سائیکل پر تیزی سے تانگے کے پاس سے گزرا۔ میری بچی کا رنگ زرد پڑ گیا (طاہرہ کی طرف محبت سے دیکھتے ہوئے)

طاہرہ :۔ (امی کی طرف نظریں اُٹھا کر) اور سوئی کا قصہ بھی تو بتاؤ ؟

بیگم :۔ ہاں تو میں نے اس سے چیخنے کی وجہ پوچھی۔ تو بہت دیر تک تو اسکے مُنہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکلا۔ کچھ ایسا جادو کیا مردے نے۔ آخر بڑی کوششوں کے بعد یہ معلوم ہوا کہ اس کے ہاتھ میں سوئی چبھو کر بھاگا ہے۔

عذرا :۔ (ہنستے ہوئے) اور خون بھی نکلا ہوگا ؟

بیگم :۔ خون کہاں دھرا ہے نگوڑی میں۔ بس نشان پڑ کے رہ گیا۔ مجھے تو یقین ہے کہ موا اُڑنے کی سوئی لے کر آیا تھا۔ کہیں سے کچھ پڑھوا کر لایا ہوگا۔ پیر جی نے بھی اس امر کی تصدیق کی ہے۔

عذرا :۔ تو پیر جی سے بھی آپ نے یہ قصہ کہہ دیا ؟

بیگم :۔ (تمکنت اور اعتقاد کے ساتھ) کہتی کیسے نہیں میری بچی نازوں کی پلی ہے۔ اُنہوں نے سُنتے ہی کہہ دیا تھا کہ یہ تو کسی دشمن کا کام ہے (آنکھوں کے آنسو دوپٹے کے پلو سے پونچھتے ہوئے) میری لختِ جگر طاہرہ خدا تیرے دشمنوں کو غارت کرے۔ میری بچی میں دیکھتی ہوں کہ دن بدن تیرا رنگ زرد پڑتا جا رہا ہے۔ ہڈیاں نکل آئی ہیں۔ پھول سا چہرہ کُملا کر رہ گیا۔

طاہرہ (آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے بیگم سے آ کر لپٹ جاتی ہے) امی آپ اپنا دل میلا نہ کیجئے۔ خدا جو کچھ کرتا ہے اچھا ہی کرتا ہے۔ آپ حضرت ٹھٹکے شاہ کے ہاں اس جمعرات کو چل کر ٹھلکے چڑھائیے۔ وہ ضرور ہماری مدد کریں گے (ہچکیاں لیتی ہے)

دوسرا منظر

خان بہادر مرحوم کا دیوان خانہ۔ جو اب بھی ان کی بیگم کے صرف میں ہے دیوان خانے کے دو دروازے سڑک پر کھلتے ہیں۔ اور دو اندرونی دروازے زنان خانے کے وسیع کمرے میں دیواروں پر چاروں طرف چھینٹوں اور ہرنوں کی کھالیں آویزاں ہیں۔ وسط میں صوفہ سیٹ رکھا ہے صدر طاق کے نیچے بخاری میں آگ سلگ رہی ہے۔ شعلے بھڑک بھڑک کر کمرے کی دیواروں کو روشن کر رہے ہیں۔ کمرے میں کامل سکوت ہے۔ سڑک کی طرف کے دروازے بند ہیں۔ بیگم صاحبہ ایک اُجلے سے کپڑے میں کچھ دبائے بخاری میں آگ روشن کر رہی ہیں۔ اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی جا رہی ہیں۔ پاس ہی عذرا کھڑی مضحکہ خیز نگاہوں سے شعلوں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ طاہرہ بال بکھیرے ہوئے دیوان خانے میں داخل ہوتی ہے۔ اور مشکوک نگاہوں سے بیگم کی طرف دیکھتی ہے۔

طاہرہ :۔ (بے صبر ہو کر) امی یہ آپ کیا کر رہی ہیں ؟

بیگم :۔ (فتحمندانہ لہجہ میں) ابھی بھسم ہوئے جاتا ہے موذی۔ ذرا تم دیکھتی رہو۔

طاہرہ :۔ (چہرے سے خوف کے آثار نمایاں ہیں) یہ اس کپڑے میں کیا ہے ؟

بیگم :۔ بکرے کی کلیجی۔

طاہرہ :۔ یہ کس لئے ؟ امی خدا کے واسطے آپ ایسا کیوں کر رہی ہیں ؟ پیر جی نے آپ کو کس وہم میں ڈال دیا ؟

عذرا :۔ (ہنستے ہوئے) تمہیں تو اعتقاد ہے پیر جی پر۔ وہم کیسا۔

بیگم :۔ (آگ میں چھوٹے سے کلیجی کے ٹکڑے رکھتے ہوئے) ابھی پیچھا چھٹ جائیگا میری بچی کا۔ ادھر کلیجی بھنی اُدھر دشمنوں کا ستیاناس ہوا۔ پیر جی نے قسم کھا کر مجھے یقین دلایا ہے کہ دروازے پر آ کر دم نہ توڑے تو میرا نام بدل دینا (آگ کے شعلوں کو اور بھی مشتعل کرتی ہے)

عذرا :۔ امی آپ کو یقین ہوگا۔ میں تو آپکے پیر جی کو بھی چالباز سمجھتی ہوں۔

بیگم :۔ توبہ کر بیٹی توبہ کر۔ خدا کے غضب سے ڈر۔

(کلیجی کے جلنے کی بو کمرے میں پھیلتی ہے۔ طاہرہ کا خوف بڑھتا ہے)

طاہرہ :۔ (آگے بڑھ کر چپا چھین کر کلیجی کے ٹکڑے بخاری سے نکال لیتی ہے) امی ایسا نہ کیجئے۔ ایسی باتوں سے خدا ناراض ہوتا ہے۔

بو اور بھی تیز ہوتی جاتی ہے۔ بیگم طاہرہ کو پیچھے ہٹا دیتی ہے۔ عذرا دور کھڑی متعجب نظروں سے شعلوں کو دیکھ رہی ہے۔ سڑک والے دروازے پر کھٹکا ہوتا ہے۔ طاہرہ خوف سے تھر تھر کانپتی ہے اور چیخ مار کر منہ کو دوپٹے سے چھپا لیتی ہے۔ عذرا دروازے کی طرف دیکھتی ہے۔ پھر کلیجی کی طرف نظریں جما لیتی ہے۔ بیگم شعلوں کو مشتعل کرتی ہیں۔ کلیجی کی بو اور تیز ہو جاتی ہے۔ دروازے پر پھر کھٹکا ہوتا ہے۔ بیگم دروازے کی چٹخنی کھولتی ہے۔ ایک نوجوان کالی اچکن پہنے چوکھٹ کے اندر آ کر گرتا ہے۔ طاہرہ ایک اور چیخ مارتی ہے۔ اور کالی اچکن پر بے ہوش ہو کر گر پڑتی ہے۔

پرانی ساڑی

(از محترمہ حمیدہ سلطانہ بیگم صاحبہ)

موسم خزاں کے پچھلے پہر کی دھوپ شہلا کے زرد مگر دلربا چہرے کی بلائیں لے رہی تھی۔ وہ اس وقت اپنے لباس کی الماری کھولے کھڑی تھی۔ اور سوچ رہی تھی کہ اس وقت کون سی ساڑی پہن کر اس کو اپنی عزیز سہیلی نجمہ کے ہاں ٹی پارٹی میں جانا چاہیئے۔ اس کے سامنے ایرانی قالین پر رنگ برنگی انواع اقسام کی دلفریب ساڑیاں بکھری پڑی تھیں۔ ان میں سے ہر ایک بجائے خود اپنی وضع کی دلکشی کے لحاظ سے خوشنما تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں شہلا کسی ساڑی کو بھی اپنے لئے ابھی تک منتخب نہ کر سکی تھی۔ کبھی اُسے خیال آتا وہ سبز بنارسی ساڑی پہن لی جائے۔ اُس کا سنہرا جال جب شام کو برقی روشنی ہوگی تو چمک کر اور دلفریب ہو جائیگا۔ پھر سوچتی تھی اتنی بھاری ساڑی ٹی پارٹی کیلئے موزوں نہیں۔ پھر غالباً مجمع بھی تو زیادہ نہیں۔ ہر اچھا تو پھر یہ صندلی نقرئی تلے والی ساڑی بہت باوقار نظر آئے گی۔ اوں ہوں، اس کا رنگ بہت ہلکا ہے۔ گرمیوں کے لئے موزوں ہے۔ آج کل تو خوب سردی ہے۔ آہا! یہ ارغوانی میسور جارجٹ کی نقرئی پھولوں والی ساڑی ٹھیک رہے گی۔ لیکن یہ چمکیلی بہت ہے۔ اچھا تو وہ ہلکی آسمانی زرکار ساڑی سہی۔ لیکن یہ اُس دن ہی تو کملا کے ہاں کھانے پر پہنی تھی۔ نجمہ وہاں موجود تھی۔ ائے یہ سیاہ طلائی بارڈر والی کیوں نہ پہن لوں۔ بس بس یہ موزوں ہے کہتے ہوئے اُس نے سیاہ ساڑی کو اُٹھا لیا۔ اس ساڑی کے بارڈر سے اُلجھ کر ایک اور ساڑی اُس کے پاؤں پر گر پڑی۔ شہلا نے گری ہوئی ساڑی کو جلدی سے اٹھا لیا۔ اس کا دماغ ہلکی ہلکی ایوننگ ان پیرس سینٹ کی خوشبو نے معطر کر دیا اور اپنی اس ساڑی کو دیکھکر وہ ماضی کے خیالوں میں گم ہوگئی۔ اس کے تحت الشعور سے کچھ یادیں اُبھر آئیں۔ شہلا کو یہ ساڑی اس کے چاہنے والے بھائی نے اس کی اٹھارویں سالگرہ پر دی تھی۔ اس لئے اس کو یہ ساڑی بہت پیاری تھی۔ تھی بھی تو وہ بہت دلفریب۔ سالگرہ والے روز جب اُس نے اس رنگ برنگی خوشنما طلائی کوروں والی ساڑی کو پہن کر اپنے کو ناقدانہ نظر سے آئینے میں دیکھا تھا تو اُس کے گندمی رنگ پر یہ خوشنما ساڑی کچھ اتنی پھب رہی تھی کہ وہ خود اپنا عکس دیکھکر لجا گئی تھی۔ سالگرہ کی پارٹی میں ہر آنے والی خاتون نے اس کی اس ساڑی کے ڈیزائن کی تعریف کی تھی۔

پھر جب اُس نے ایک پکنک پارٹی میں موسم بہار کی ایک دلکش شام کو یہ ساڑی پہنی تھی تو اُس کے لڑکپن کے ساتھی فخری نے پُر شوق نظریں اُس کے موزوں جسم پر ڈال کر محبت بھرے لہجے میں کہا تھا "اس وقت تم ایسی معلوم ہو رہی ہو شہلا! جیسے قوس وقزح کے دائرے میں آفتاب آگیا ہو۔ خدا تمہاری دلربا جوانی کو نظرِبد سے محفوظ رکھے۔"

وہ بہت شرما گئی تھی اس خیال سے۔ اب بھی اس کے جسم میں ایک لطیف جھرجھری آگئی۔ لیکن آہ! یہ باتیں اب محض خواب وخیال تھیں۔ اُس کا لڑکپن کا ساتھی اُس سے اب بچھڑ چکا تھا۔

اُسے یاد آیا کہ اس ساڑی کو پہن کر ایک مرتبہ بسنت رت میں وہ فخری کے ساتھ سینما فرسٹ شو دیکھنے چلی گئی تھی۔ لیکن ٹکٹ نہ ملنے کے باعث وہ دونوں دوکانوں کا چکر سیکنڈ شو تک کاٹتے رہے۔ وہ ایک خوشرنگ تیتری کی مانند شاداں وفرحاں فخری کے ہمراہ دوکان دوکان پھر رہی تھی۔ بنارسی دوپٹوں کی دوکان پر دوکاندار نے ایک طاؤسی رنگ کا دوپٹہ فخری کو دکھا کر خالص تاجرانہ انداز اور خوشامدانہ لہجے میں کہا تھا "یہ لیجئے صاحب! یہ بالکل نیا ڈیزائن ہے اور رنگ بھی بہت اچھا ہے۔ بیگم صاحبہ کے گورے رنگ پر خوب کھلے گا۔"

دوکاندار کے اس فقرے پر شہلا شرم کے مارے سُرخ ہوگئی۔ لیکن فخری نے اُس کے منع کرتے کرتے فوراً دوپٹہ خرید لیا اور مسکراتا ہوا اُس کو ساتھ لئے اس طرح باہر نکلا گویا دوکاندار کے ان الفاظ نے اُسے کوئی خزانہ عطا کر دیا ہو۔ سڑک کے کنارے بیٹھی ہوئی بوڑھی بھکارن نے ہاتھ پھیلا کر کہا۔ "جوڑی بنی رہے صاحب میم صاحب کی خیر ہو۔" تو شہلا نے جھلا کر کہا "کیا فضول ہیں یہ لوگ"۔ اور فخری نے خوشی میں ایک روپیہ پکڑاتے ہوئے مُسکرا کر کہا۔ "ارے میری شہلا خفا نہ ہو یہ لوگ ہمارے بیاہ کی پیشین گوئی کر رہے ہیں۔"

فخری کے اس شوخ جملے پر بظاہر اُس نے برہم ہو کر کہا۔ "جایئے ہم نہیں بولتے۔ آپ بھی ستاتے ہیں۔" اور مُنہ پھُلائے ہوئے کار میں جا بیٹھی۔

لیکن فخری کی والہانہ محبت سے اُس کے رُوح و دل دونوں سرشار ہو چکے تھے۔ اس لئے جب بچّوں کے جیسے انداز سے مُنہ بنا کر فخری نے کہا "اگر اب میری رانی مجھ سے روٹھی رہی تو میں رو دوں گا۔" تو اس کے توس گوں لبوں پر حیا آفریں تبسم کھیلنے لگا۔ آہ! وہ سُنہرے دن جن کی یاد ہی اب اس دُکھیا کی زندگی کیلئے مستقل کرب بن کر رہ گئی تھی۔

وہ اس ساڑی کو پہن کر ایک زنانہ مشاعرے میں جانے کو تیار کھڑی تھی

فخری آ گیا اور اس نے حسبِ معمول شرارت سے آنکھیں نچا کر کہا کہاں کی تیاریاں ہیں رانی جی؟" اور پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر گلاب کے کنج میں لے گیا۔ اور سنجیدگی سے کہا "پیاری شہلا تم یہ کبھی بھی نہ بتاؤ گی کہ وہ دن کب آئیگا جب تم میری بن جاؤ گی۔"

فخری کی پُر محبت گفتگو مضطرب انداز اور شریر آنکھوں نے شرمیلی شہلا کو ایسا پریشان کیا کہ وہ وحشی ہرنی کی طرح اپنا ہاتھ چھڑا کر بھاگی اور کمرے میں جا کر بند ہو گئی۔ وہ دل سے فخری کو عزیز رکھتی تھی۔ اس کا نام ہمیشہ اس کی ورد زبان رہتا تھا۔ لیکن اس شرم کا بُرا ہو نہ جانے کہاں سے اتنی شرم آ گئی تھی اس میں۔ جہاں فخری نے محبت بھری باتیں کیں اور وہ شرمائی گھبرائی۔ فخری کے محبت بھرے خطوط کا جواب بھی اسی لاانتہا شرم کے باعث وہ نہ دے سکتی تھی۔ ان رنگین و طویل خطوں کا جو فخری نے اگر کسی اور لڑکی کو لکھے ہوتے تو وہ دیوانی ہو جاتی۔ اللہ جانے شہلا میں اتنی شرم کہاں سے آ گئی تھی۔ فخری بڑے فخر کے ساتھ کہتا تھا۔ میری شہلا شرم کی دیوی ہے، حیا کی پُتلی! اس دیوی کا یہ پُجاری تجارتی تعلیم حاصل کرنے کے لئے امریکہ چلا گیا۔ وہاں سے بھی دو چار محبت بھرے خطوط اس نے شہلا کو بھیجے۔ پیمانِ محبت کیا۔ لیکن شہلا شرم کے باعث فخری کے خطوں کا جواب نہ دے سکی۔ ہر خط ملنے کے بعد وہ قلم کاغذ سنبھال کر جواب لکھنے بیٹھی۔ لیکن اس کے ذہن میں فخری کی شریر ناچتی ہوئی آنکھیں آ جاتی اور وفورِ شرم سے قلم ہاتھ سے چھوٹ پڑتا اور وہ سکتے کے عالم میں بیٹھی رہ جاتی۔ ہر بار یہی ہوتا۔ یونہی ایک سال گذر گیا۔ فخری مرد تھا شہلا کی شرم کو بے اعتنائی سمجھا۔ اور متواتر خط بھیجنے پر جواب نہ پا کر سمجھا، شہلا کو اب میرا خیال نہیں رہا۔ اور ایک امریکن خوبصورت دوشیزہ سے شادی کر لی۔ جب شہلا نے سُنا کہ فخری اب ہندوستان آ رہا ہے لیکن تنہا نہیں اپنی نازآفریں بیوی کو لیکر، تو غم سے اُس کا دل تہہ و بالا ہو گیا۔ اس کا من درپن ٹوٹ گیا۔ اس کے دلکش خوابوں کی تعبیر بڑی ہی دل شکن آئی۔ وہ اس خبر کو سُن کر بُت کی مانند گھنٹوں بے حس و حرکت رہی۔ کثرتِ غم نے اُس کی آنکھوں کے آنسو خشک کر دیئے۔ دل و دماغ پر بجلی گر پڑی۔ ٹھنڈی بجلی۔ اور وہ سوز مجسم بن کر رہ گئی لیکن شرم کے باعث اب بھی اُس کے لبوں پر اُف نہ آئی۔ ایک افسردہ سا تبسم اُس کے خشک لبوں پر اب بھی کھیل رہا تھا۔

فخری اور بیگم فخری کے اعزاز میں اُس نے بہت عظیم الشان ایٹ ہوم دیا۔ اس روز اُس نے اپنی یہی ساڑی پہنی تھی۔ اور انتظام میں مصروف اس طرح پھر رہی تھی گویا اس کے دل پر کچھ غم ہی نہیں۔ وہ ضرورت سے زیادہ شگفتہ نظر آ رہی تھی۔ اور مُسلسل باتیں کر رہی تھی۔ پر آہ! جب اُس نے فخری کے ہاتھ میں ایک فسرادا حسینہ کا ہاتھ دیکھا تو چند منٹ کیلئے اس کا دماغ چکرا گیا۔ لیکن جلد ہی وہ سنبھلی اور اپنے بے قرار دل کو تھام کر اس طرح سنبھل کر بیگم فخری کا خیر مقدم کیا کہ اس غم نصیب کے دلی غم کا پتہ بھی کسی کو نہ لگ سکا۔

لیکن فخری اس کی دلی حالت کو تاڑ گیا۔ اس کی آنکھوں سے دلی حزن کی کیفیت صاف جھلک رہی تھی۔ اب فخری اپنی عجلت پر پریشان تھا۔ وہ اپنی بیوی سے بے نیاز اُس گلاب کے کنج میں جہاں کبھی وہ شہلا کے ساتھ محبت بھری سرگوشیاں کیا کرتا تھا بیٹھا سگار پیتا رہا اور سوزِ دل کا دُھواں اُڑاتا رہا۔

شادی کے بعد شہلا فخری سے دُور ہی دُور رہتی تھی۔ اپنی مایوسیوں ناکامیوں کو غمگین دل میں دبائے ہوئے الگ تھلگ تھی۔ لیکن جب کبھی وہ دونوں ملتے، اسی پہلی ہی والہانہ وارفتگی کے ساتھ۔ مگر شہلا کو فخری کی نازک پوزیشن کا اب احساس تھا۔ اس لئے وہ بہت سنجیدہ رہتی تھی اور فخری بھی حتی الامکان سنبھلا رہتا۔ لیکن وہ بہت ذکی الحس تھا۔ اس کے دل پر اب بھی شہلا کا قبضہ تھا۔ شہلا کو سامنے پا کر وہ اپنی خوبصورت بیوی کو ہمیشہ نظرانداز کر دیتا تھا۔ اس کی وارفتہ ادائیں اس کا دلی راز دیکھنے والوں پر واضح کر دیتی تھیں۔

ایک سہانی چاندنی رات میں کھانے پر دریا کے کنارے فخری نے اپنے چند مخصوص دوستوں کو بلایا تھا۔ شہلا کو بھی بہت اصرار سے وہ آنے کیلئے کہہ گیا تھا۔ اپنے افسردہ دل کو سنبھال کر شہلا ذرا دیر سے پہنچی۔ موسم برشگال کی معطر انگیز ہواؤں نے اور فخری کے اصرار نے اُس کے افسردہ دل کی کلی اس وقت کھلا دی تھی۔ اس لئے آج بھی اُس نے وہی رنگ برنگی دلربا ساڑی پہنی تھی جس کی جھلملاتی ہوئی سُنہری کور اُس وقت چاند کی حریف بن رہی تھی۔ فخری جو بے چینی سے اس کا منتظر تھا اپنے مہمانوں کو چھوڑ کر شہلا کی جانب لپکا اور اُس کا ہاتھ تھام کر بچوں جیسی بے ساختگی سے دریا کے کنارے چہل قدمی کرنے لگا۔ شہلا نے سنجیدگی سے کئی مرتبہ کہا۔ میرا ہاتھ چھوڑیئے۔ آپ کے سب مہمان مجھکو گھور رہے ہیں۔ وہ دیکھئے بیگم فخری مشکوک نظروں سے مجھکو دیکھ رہی ہیں۔ اسی لئے میں نہ آتی تھی مجھکو دیکھکر آپ پر دیوانگی مسلط ہو جاتی ہے۔

لیکن فخری اس وقت اپنے پُورے کیف میں تھا۔ شبِ ماہ برسات کی نشیلی ہوائیں معطر فضا اس کو نہ جانے کون کون سا سماں یاد دلا رہی تھیں۔ بہت دیر کے سکوت کے بعد دھیمی آواز سے اُس نے کہا۔ آہ! یہ دلفریب موسم، وہی تم، وہی ساڑی، وہی دریا کا کنارا۔ یاد ہے میری شہلا! موسم بہار کی ایک ایسی ہی دلفریب شام کو میں نے پہلی مرتبہ محبت کا منتر تمہارے کان میں پھونکا تھا۔ اس وقت تم اتنی معصوم تھیں کہ یہ بھی نہ سمجھ سکی تھیں کہ میں کیا بک رہا ہوں۔ بھول جایئے ان بیتے دنوں اور گذری باتوں کو۔ آہ! وہ دورِ معصومیت

اب کہاں۔ میری زندگی کا ہر والہانہ تبسم اور دل کی ہر معصوم خوشی ختم ہو چکی۔ اب تو میں ایک بیکس و حیراں ہوں۔ اور آپ ایک ذمہ دار شوہر۔ شہلا نے سرد آہ لیکر ٹھٹھرتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

سالہا سال سے اے میری عزیز رفیقہ میں نے تم سے محبت کی ہے۔ تم کو وہ دن بھی یاد ہیں جب ہاتھ کی ایک جنبش سے تبسم کی ایک لرزش سے ہم دونو کے ساز ہستی کے تار ہم آہنگ ہو جاتے تھے۔ اور ایک ہی شعلہ ہم دونوں کے دلوں میں بھڑک اُٹھتا تھا۔ تم شرما جاتی تھیں اور میں مضطرب ہو جاتا تھا۔ اس کی دائمی لذت اب بھی جوں کی توں ہے۔ ہاں اب یہ شعلہ فزوں تر ہے۔ ہماری محبت جاوداں ہے۔ تم میری زندگی کا ماحصل ہو۔ میں تمہاری حیات کا مرکز ہوں۔ ایک ہی کشتی ہے۔ ایک ہی محور ہے۔ ایک ہی آہنگ ہے۔ ۔۔جیسے ساز کے مختلف تاروں سے ایک ہی نغمے کی صدا ہوتی ہے۔ جیسے چقماق کے دو ٹکڑوں سے ایک ہی شعلہ بلند ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم نے اپنے دل، اپنے روح و قلب کو ایک دوسرے میں مدغم کرکے ایک آہنگ نو کی تخلیق کی ہے۔ ہم دونوں دنیا کی نظروں میں جدا ہیں لیکن میری لڑکپن کی رفیقہ کیا اپنے دل کے دھڑکنے کے ساتھ تم میرے بیقرار دل کی صدا نہیں سنتی ہو۔ کیا تم کو اس کا احساس نہیں کہ ہمارے دل کی جلن مگر اب ایک مستقل آگ بن چکی ہے۔ اور یہ شعلہ ایک دن سب خس و خاشاک کو جلا دیگا۔ فخری نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔ اور بے بس شہلا سر جھکا کر رہ جانے کے سوا فخری کی اس پُرسوز تقریر کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ دراصل وہ اپنی حماقت پر نادم تھی۔ اُس نے اپنی بیجا شرم سے اپنی اور فخری کی زندگی تباہ کردی تھی۔ وہ اکثر سوچتی تھی کہ وہ اتنی شرمیلی کیوں تھی۔ اُس کا مضطرب دل بھی اس کی ساڑی کی طرح رنگ بدلتا رہتا تھا۔ لیکن وہ فخری کو تلون مزاج وفا ناآشنا انسان ماں کہتی تھی۔ اور کبھی اپنی بیجا شرم اور ضرورت سے بڑھی ہوئی خودداری کو کوستی تھی۔ لیکن فخری سے الگ ہٹ کر وہ کچھ سوچنا اب بھی نہ چاہتی تھی۔ اُس کے سادہ دل پر فخری کا نقش کچھ ایسا جما تھا کہ کوئی اور خیال جمنے نہ پاتا تھا۔ اپنے دل کی اس کیفیت پر بعض اوقات وہ جھنجلا اُٹھتی تھی۔ چاہتی تھی کہ اس بیوفا انسان کو جو عہد و پیمان کرنے کے بعد بھی اس کو بھول گیا تھا وہ بھی بھلا دے۔ لیکن یہ بات خود اُسکے بس میں بھی نہ تھی۔ اس کا دل اُس کا نہ تھا۔ بلکہ فخری کا تھا اس کی علمی قابلیت خاندانی اعزاز کے باعث کئی نوجوان اُس کے خواستگار بن چکے تھے۔ لیکن ان میں سے ہر ایک کو مایوس ہونا پڑا۔ ان کی اس مایوسی نے غم و غصہ کی صورت اختیار کرلی تھی۔ وہ غم نصیب پریشان حال شہلا کو دلوں سے کھیلنے والی ساحرہ اور ڈسنے والی ناگن کہہ کہکر اپنے دل کا بخار نکالتے تھے۔ حالانکہ غریب شہلا اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی۔ جو سوائے فخری کے اور کسی طرف متوجہ نہ ہوتا تھا۔

ماضی کے خیالوں میں کھوئی ہوئی شہلا حال سے بے خبر بُت کی مانند الماری کے سامنے کھڑی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ اس نے چونک کر رسیور اُٹھایا۔ تو نجمہ کہہ رہی تھی۔ "ارے شہلا! کیا کررہی ہو؟ جو ابتک نہیں پہنچیں۔ سب مہمان آچکے ہیں۔ صرف تمہارا انتظار ہے۔ اور ہاں! یہ خوشخبری بھی سُن لو وہ تمہارے فخری بھی آگئے ہیں۔ کل رات ہی صدیقی صاحب کے ہاں آئے ہیں۔ وہ اُن کو یہاں بھی پکڑ لائے۔"

شہلا جس کو ابھی ماضی کے خیالوں نے افسردہ سا کر دیا تھا فخری کی آمد کی خبر سنکر وفور مسرت سے بیخود ہوگئی۔ اور دھڑکتے ہوئے دل کو سنبھال کر صرف اتنا کہہ سکی "ابھی آئی نجمہ! سوتی بہت دیر تک رہی۔ اس لئے ذرا دیر ہوگئی" اور رسیور رکھکر اس نے بے شمار جھلملاتی ہوئی زرکارنی فیشن ایبل ساڑیوں کو چھوڑ کر وہی رنگ برنگی طلائی کوروں والی پُرانی ساڑی پہن لی۔ جس میں دو تین جگہ رفو کیا جاچکا تھا۔ اور کثرت استعمال کے باعث بیشمار ننھے ننھے سوراخ ہوگئے تھے۔ لیکن جسکے شوخ رنگوں کی دلکشی اور دلفریبی جوں کی توں تھی۔ بالکل شہلا کے دل کی طرح جو اب بھی فخری کی محبت سے سرشار تھا۔ حالانکہ کثرت انکار نے اسکو چھلنی کردیا تھا۔

کھڑکی میں سے

(از محترمہ اختر قریشی۔ بی۔ اے۔ بی ٹی)

کھڑکی کا پٹ کھلا

سامنے صاف ستھری کشادہ سڑک تھی۔ سڑک کے اُس پار زیرِ تعمیر شاندار بلڈنگ کی دیواروں پر سنہری دھوپ ہلکی ہلکی پھیل رہی تھی۔

ترقی پسند نوجوان کی آنکھوں میں ہنوز نیند کا خمار باقی تھا۔ اُس نے ایک لمبی سی جمائی لیکر اپنے اعصاب کو بیدار کرنا چاہا —— ادب جدید —— سہیل —— کارواں —— نیر —— لاحول لاقوۃ سب سالناموں کو ایک ساتھ ہی شائع ہونا رہ گیا ہے —— گویا سالناموں کے نکلنے کا بھی خاص موسم مقرر ہے —— اور یہ ادبی رسائل بھی تو کم بخت حشرات الارض کی طرح نکل آئے ہیں۔ صاحب ذوق اصحاب کی تسکین کیلئے کہاں سے آئیں اعلیٰ پایہ کے علمی و ادبی مضامین —— بس خانہ پُری ہوتی ہے۔ فکر معاش سے چھٹکارا ہو تو ادب بھی سوجھتا ہے —— اور لکھنے بیٹھو تو مصیبت یہ ہے کہ لکھو کس موضوع پر اس منحوس کھڑکی تو فضا ہی ادب کے لئے سازگار نہیں۔ ہر وقت کی بک بک جھک جھک بھلا ایسی ماحول میں ممکن ہے کہ کوئی لطیف خیال دماغ میں آسکے —— یا سکون سے تخیل علم و ادب کی بلندیوں میں پرواز کر سکے —— بھلا ایسے کہاں نصیب !!! —— ایسے نصیب ہوتے تو نہ معلوم کتنی کتابیں تصنیف ہو چکی ہوتیں۔

ترقی پسند نوجوان نے اپنی خمار آلود آنکھوں کو ملا سر کے بال جو بے ترتیب گچھوں میں پیشانی پر پڑے تھے ہاتھ سے پیچھے ہٹائے اور ایک اچٹتی ہوئی نظر کھڑکی سے باہر ڈالی۔

دھوتی کرتے میں ملبوس ایک بنگالی بابو جھیل ندی سے واپس آرہے تھے سانولی رنگت، بڑی بڑی سیاہ آنکھیں —— چہرے پر ایک خاص متانت۔ ہاتھ میں نیم یا پیلو کی ایک سبز تازہ شاخ کو سرِ بازار مسواک کے طور پر استعمال کرتے چلے جارہے تھے —— ہاتھ کی مسلسل اوپر نیچے دائیں بائیں جنبش اور پھر بنگالی کا نہایت کراہت آمیز طریقہ پر اخ —— اُے —— خ —— کر کے مُنہ بھر بھر تھوکنا۔

"جنگلی!" نوجوان بے ساختہ حقارت سے بولا۔ "آزاد ہیں گے آزادی۔ صورت بھی ایسی ہے۔ دانت صاف کرنے تک کی تمیز نہیں۔ چونا پھر غسل خانہ جلوس لئے ہیں۔ کھلی سڑکوں کو منتخب کیا ہے اس کارِ خیر کے لئے۔ مُنہ بھر بھر جراثیم بانٹے جارہے ہیں ہندی بھائیوں کو ——"

اور پھر وہ ایک سائیکل سوار کی باریک دھوتی دیکھنے میں مشغول ہوگیا جو پرچم کی طرح ہوا میں لہراتی جارہی تھی۔ وہ نہایت بے دلی سے پیڈل مارتے میں تو ندکے مد و جزر اور ان گھنی مونچھوں کو دیکھتا رہا جو ہونٹوں کے بیچ میں پہنچ کر نہ جانے کہاں غائب ہوگئی تھیں۔

ترقی پسند نے کچھ سوچ کر جھرجھری سی لی۔

"بھلا گھر کیا ہے اچھا خاصہ بھنگڑ خانہ ہے —— گھر کا سلیقہ تو دور کپڑے تک پہننے کی تمیز نہیں۔ خود دیکھیں تو جیسی تیس طرہ یہ کر چھٹو کا بھی ستیاناس مارا —— اچھا خاصا نام شمسہ رکھا۔ تو فرماتی ہیں کہ میں ایسا کو کورا نام اپنی بچی کا نہیں رکھتی۔ ایسا ہی شمسہ نام پسند ہے تو شمس النساء رکھو اپنے نام سے ملتا جلتا۔

"بھلا شمساً کیا ہے؟" میں جھلایا۔

"میں کیا جانوں آپ ہی تو کچھ کہہ رہے ہیں۔" سادگی سے جواب حاضر تھا۔

"میں نے شمسہ کہا ہے یا شمساً؟ سماعت میں تو کچھ فرق نہیں آگیا؟"

"خیر وہ کچھ ہی ہو۔ ہوگا شمس النساء ہی۔" لہجہ فیصلہ کن تھا۔

گویا یہ طے شدہ امر تھا کہ شمسہ کے آگے نساء ضرور لگے گا۔ اِنّا للہ و انّا الیہ راجعون۔

ایسے موقع پر دیوار سے خود اپنا ہی سر پھوڑنے کے علاوہ آپ کر بھی کیا سکتے ہیں۔

تریا ہٹ اور پھر جاہل تریا کی ہٹ —— تعلیم یافتہ ہو تو پھر بھی کوئی مسلک لے۔

نام شمس النساء ہی رہا کیونکہ اسم مبارک کا ہم وزن اور تقریباً ایک جیسا تھا۔ دراصل اسم شریف خیر النساء ہے —— خیر پھر بھی کیا میرے حال زار پر کہ اپنے نام میں "نساء" لگوانا نہ بھولیں۔ ورنہ نام "خیرن" ہی ہوتا ——

ہر بات بے تکی —— لباس دیکھو تو واہ واہ —— شلوار

…یوں پر سکا ہیں تو کے بنا کر اپنا فن دستکاری دکھائیں تو غنیمت ہے لیکن اللہ والوں تو گھر سے شرع سبز بیل بوٹوں کا چمن کھلا ہوتا ہے۔ کوئی بیل پائنچے سے چڑھتی ترچھی قمیص کے دامن کو چھوتی ہے، تو کوئی اوپر سے اترتی ہوئی پھیلی ہوئی آتی ہے ـــــ کاش مجھ پر کوئی اتنا رحم کرتا کہ اس کم عقل کو یہ دستکاری سکھاتا۔ گھر کی کُل چیزیں ان کے فن کی ماتم نشان نظر آتی ہیں۔

"جو کہا اللہ رحم کیا کرو۔ کیوں ستیاناس کیا کرتی ہو کپڑے کا۔"

"اتنا دیدہ ریزی کا کام کرتی ہوں اور یہ صلہ دیتے ہیں آپ؟"

آواز وقت غیر تھی۔

"بھلا کس بیوقوف نے کہا ہے تم سے کہ اس دو کوڑی کے نکمے کام میں سر مارو۔"

مگر وہاں کہاں اثر !!!

شادی کے کچھ ہی روز بعد نہ جانے خاکسار کو تحفہ دینے کی کیا ضرورت لاحق ہوئی۔

بے ڈھنگے انداز سے شرماتے ہوئے میرے زانو پر کچھ ڈال دیا۔

"اس قدر عنایت و کرم !!!"

تکیہ کا غلاف میری جان کو رو رہا تھا ـــــ آڑی ترچھی بیلیں بنا کر غلاف پر گویا پھولوں سے چارخانہ بنا ہوا تھا۔ تل برابر جگہ چھوڑ دینا شاید دستکاری کے خلاف تھا غالباً ـــــ پیلا، نیلا، ہرا، سرخ، کاسنی، فیروزی غرض کوئی رنگ ایسا نہ تھا جس کے استعمال نہ کرنے کی شکایت باقی رہ جاتی۔

ـــــ اور پھر اس پھلواری کے چارخانہ میں تکیہ پر سر رکھکر سونے والے "بدقسمت شخص" کے لئے لاتعداد نصیحتیں۔ دعائیہ فقرے۔ استقبالیہ جملے ـــ ویلکم ـــ گڈ نائٹ۔ ڈریمز ـــ اویک ارلی (awake early) وغیرہ۔

لاحول ولا قوۃ۔ طبیعت جھنجھلا ہی تو گئی ـــــ دیر تک سوچا ہوں تو تمہارا کیا چھن جاتا ہے۔ فوراً ہی ارشاد ہوا۔

"کہئے پسند آیا ـــــ؟ پورے پندرہ روز تک آنکھوں کا تیل نکالا ہے۔"

وہ تو خفا ہو رہی ہے کہ اتنا قیمتی کپڑا اور بیش قیمت ـــ وقت ـــ کا لیکن طبیعت کو قابو میں رکھا۔ نئی نئی بات تھی۔ خفیف سی ہنسی ہنس کے معاملہ رفع دفع۔

لیکن اب تو یہ شوق دیوانگی کی حد تک پہنچ چکا ہے ـــــ بس یہی خوف ہے کہ کسی دن در و دیوار پر بھی رنگے ریشم سے کڑھے ہوئے غلاف نہ چڑھ جائیں۔

ترقی پسند نے کھڑکی کے باہر پھر اچٹتی ہوئی نظر ڈالی۔

تین مزدور ایک ساتھ ہی چلے جا رہے تھے۔ جھلسے ہوئے چہرے، فکرمند صورتیں۔ گندی کثیف دھوتیاں ـــــ میلی چکٹ گاڑھے کی صدریاں ـــــ عسرت اور تنگدستی کی بولتی ہوئی تصویریں ـــــ ایک مزدور کی ٹانگ پر گھٹنے سے ذرا نیچے زخم پر انتہائی میلے چکنے چیتھڑے لپٹے ہوئے تھے۔ زخم کی تکلیف نے اسکی چال میں خفیف سا لنگ پیدا کر دیا تھا ـــــ دوسرا مزدور مدقوق سا معلوم ہوتا تھا ـــــ زرد زرد چہرہ۔ کھانستے میں اس کا سینہ ڈھول کی طرح بولتا ـــــ تیسرے کی ایک آنکھ غائب تھی اور دوسری کی بینائی بھی نام ہی کی تھی۔

مزدوروں سے پیچھے کافی فاصلہ پر ایک ضعیف العمر انگریز خاتون اپنے کتے کی زنجیر پکڑے دریائے باغ جا رہی تھی یا کہیں سے واپس آ رہی تھی ـــــ تندرست خوبصورت کتا! اور ریشم سے ملائم صاف ستھرے بال ـــــ پاس سے ایک موٹر ہارن دیتی سن سے گذر گئی ـــــ کتا چونک کر بھونکا اور بوڑھی عورت نے اپنے منظور نظر کو پیار سے گود میں اٹھا کر کلیجے سے لگا لیا۔

"کچھ نا ہیں رے بن ـــــ کچھ نا ہیں ـــــ کیوں ڈرتا ہے تم ـــــ !!!"

اس کی نظریں میم صاحب کے کتے سے اچٹ کر تین مزدوروں پر پڑیں۔

میم صاحب کا کتا !!!

تین گھناؤنے مزدور !!!

"کتوں سے بدتر" اس کے منہ سے نکلا۔

مزدوروں کی چیچپاتی آنکھیں اور گدھ کی سی شکلیں دیکھکر اُسے قے سی آنے لگی ـــــ وہ نفرت سے پیچھے ہٹا اور کھڑکی سے منہ نکال کر حقارت سے باہر تھوک دیا۔

ایک دم ترقی پسند ادیب کو کچھ خیال آیا ـــــ "ادب جدید" کے سالنامہ کیلئے تو اک مصالحہ مل گیا ـــــ "وہ تین مزدور" عنوان خوب رہے گا ـــــ حقیقت نگاری ہی تو ہم ترقی پسندوں کا کام ہے۔ چاہے حقیقت نگاری کے جنون میں استفراغ ہی کیوں نہ ہونے لگے۔

سُنتے ہیں کسی خدا رسیدہ بزرگ کے پاس ایک حاجتمند گیا اور اُن سے التجا کی کہ حضرت ترقی روزگار کی دعا میرے حق میں فرما دیجئے ـــــ ساحت

بچوں کا باپ ہوں، چار وقت سے گھر میں فاقہ ہے۔ بچوں کا دم ہونٹوں پر ہے مجبوراً حضور کے آستانہ پر آیا ہوں ——— بزرگ مصلے پر یونہی آنکھیں بند کئے مراقبہ میں بیٹھے رہے ——— اس شخص نے پھر عرض کی۔

"یا حضور! ایک سائل دیر سے کھڑا ہے نظرِ کرم ہو جائے۔"

بزرگ نے آنکھیں کھول کر بے رخی سے کہا ——— "جا بابا! اپنا کام کر" وہ شخص پھر گڑ گڑایا تو بزرگ نے نفرت سے رخ پھیر لیا۔ اس پر بھوکا شخص طیش میں آکر بولا۔ "حضرت! میں نے تو دھوم سنی تھی کہ آپ کی ذات بڑی فیض رساں ہے۔ لیکن آپ کو تو فاقہ کش غریبوں کے حق میں دعا کرنے میں بھی تامل نظر آتا ہے۔"

بزرگ خشمناک لہجہ میں سرخ سرخ آنکھوں سے فاقہ زدہ کو گھور کر بولے ——— "بابا مجھ جیسے ستر لاکھ غریب بستے ہیں ——— ہر گھڑی تانتا بندھا رہتا ہے ——— کوئی فاقہ زدہ ہے کوئی روگی ——— کوئی مصیبت زدہ ہے کوئی لاچار ——— ہر گھڑی مصیبت زدہ اور بیماروں کی حالت اپنے اوپر طاری کرنی پڑتی ہے۔ اور جب حالت طاری ہو جاتی ہے تب صدقِ دل سے دعا نکلتی ہے اور جب صدقِ دل سے دعا نکلتی ہے تب ہی قبول بھی ہوتی ہے۔

"بھاڑ میں جائیں یہ مزدور ———" وہ بڑبڑایا۔ "جب ان کی گھناؤنی حالت اپنے اوپر طاری کر لو تب ہی ان کی زندگی کا صحیح نقشہ کھنچتا ہے ——— مظلوم ہیں مظلوم ——— جہنم میں جائیں یہ مردود ——— کمبخت نے میرا تین سو کا رڈیو چکنا چور کر دیا ——— ٹانگ پھسل گئی ——— بیکار کا بہانہ تو دیکھو ——— اسی ٹانگ پر ہیں نے بھی اتنی ٹھوکریں جمائی ہیں کہ دن میں تارے نظر آگئے ہوں گے ——— کہیں پھر رہا ہوگا بدمعاش لنگڑے کوّے کی طرح کُدکتا۔

نوجوان نہ جانے دیر تک کیا سوچتا رہا۔

"اور ہاں وہ میرا افسانہ "کنچن" کس قدر عمدہ افسانہ تھا وہ بھی ——— ادبی دنیا میں ہلچل مچ گئی تھی ——— زہرہ جان کی زندگی کی گویا تصویر کھینچ کر رکھدی تھی ——— غضب کی رسیلی آواز پائی تھی ظالم نے ——— اس کی شفاف صراحی دار گردن ——— مرمریں بازو ——— سمندر کے رنگ کی نیلگوں آنکھیں ——— وہ پُرلطف شب بھی واللہ کیا تھی ——— رقص و سرود ——— رنگین محفل ——— ذرہ ذرہ میں موج حیات رقصندہ ——— تعیش و تنعم کی فراوانی ——— کس کس نعمت کا شکرانہ ادا کیا جائے۔

"کنچن" کو پڑھکر دقیانوسی ادیبوں نے جل جل کر کس شد و مد کے ساتھ طعن تشنیع کی بوچھاڑ نہ کی تھی ——— عریانی کا بدترین نمونہ قرار دیا تھا ——— اسی لئے

[illegible] کیونکہ ہم کھلاڑی ——— گریباں کیے ہوا ہے ——— کون سنتا ہے ان مجذوب کی خرافات کو ——— ان روحانی ڈھکوسلوں ——— الف لیلوی داستانوں ——— خیالی قصوں کو اب افسانہ ماضی ہی بنتا پڑیگا۔

"ہاں تو وہ "تین مزدور" خوب ہی لکھے گا واللہ"

وہ کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا۔

میم صاحب کہلانے جانے کی شوقین۔ جدید فیشن کی دلدادہ ایک سیاہ فام عیسائی ہندوستانی اونچی ایڑی کا جوتا پہنے کھٹ کھٹ کرتی سڑک عبور کر رہی تھیں ——— زمین سے فٹ بھر اونچی۔ آبنوسی رنگت پر کھل جانے والی شوخ رنگ عنابی سلک ساری میں ملبوس۔ آڑی بلکہ قطعی ٹیڑھی گرتے کان کے بالکل قریب سے نکالی ہوئی مانگ ——— سیاہ چکنے تیل میں ڈوبے بال پیشانی پر چھا کر داہنی بھوں کو چھوتے ہوئے کانوں پر ڈھلک آئے تھے اور ایک پچکے ننھے ننھے جوڑے کی شکل میں پیچھے کی جانب پنوں سے چپکا دیئے گئے تھے۔ جاپانی دستہ کی ایک نازک چھتری بر بنائے دور اندیشی اُن کے ہاتھ میں لٹک رہی تھی۔

سیاہ فام خاتون جو بزعم خود میم صاحب بنی ہوئی تھیں اپنی اونچی ایڑی پر گھوم کر پیچھے مڑیں۔ اور اپنی بھدی آواز کو ایک سُریلی چیخ میں تبدیل کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے پکاریں۔

"مورے! ——— مورے!! ———"

نوجوان کے لبوں پر تبسم پھیل گیا۔ یکبارگی اُسے خیال آیا کہ وہ کس بے ڈھنگے پن سے کھڑا ہے۔ پریشان بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر کے اُس نے قمیص کا کالر درست کیا۔

"مورے ——— ہری اپ ڈارلنگ"

پچھلے فلیٹ سے اُتر کر مورلی نامی ایک ننھی مُنی بچی پٹر پٹر دوڑتی اُس کے ساتھ آکر شامل ہو گئی۔

"ڈارلنگ!" نوجوان نے زیر لب دہرایا ——— "ڈارلنگ" جیسے کوئی بھولی بسری یاد تازہ ہو گئی ہو ——— وہ سوچ کر مسکرانے لگا کہ ایک ایسی ہی دیسی، چالاک، دل پھینک خاتون مس ولفریڈ رابرٹ پچھلے سال مسوری کے رومان افزا مقام پر اس پر کیسی ریشہ خطمی ہو گئی تھیں۔ ایک دو سنیما دکھانے اور معمولی سی ڈھاکہ ساری ہی پر اس قدر لٹو ہوئیں کہ اُسی وقت مسٹر سے ڈارلنگ پر اُتر آئیں۔ اور پیاری بھری باتیں کرتے کرتے اس کے کوٹ کے بٹنوں اور ٹائی سے کھیلنے لگیں ——— اور خود بخود ہی تا عمر میری پجاری بننے کا عہد بھی کر گذریں۔

کیسی طبیعت مچلتی ہے اس دست درازی اور جلد بازی پر ـــــ جلدی ہی مجھے
پیم سے مہ کر بس جانی منگت والی بس ولفریڈ سے رخصت ہونا پڑا ـــــ
ترقی پسند نوجوان دلچسپ واقعہ یاد کر کے کھلکھلا کر ہنس پڑا اور پھکڑ کی
پھنگی ٹھیک کر کے جھک گیا۔

کس قدر زمانہ بدل گیا ہے واللہ ـــــ گریس گھر کی فضا نہ بدلی تھی نہ
بدلی ـــــ کیسی دقیانوسی بادا آدم کے زمانے کی عورت ہے ـــــ تسلسل پانی کے
قطرے پڑتے پڑتے پتھر بھی تو گھس جاتا ہے ـــــ لیکن ہر وقت کی نصیحتوں کے
باوجود بھی وہ اپنی جگہ سے ایک انچ نہ ہٹنا تھی نہ ہٹی ـــــ آہ جان کی رُوح تو
خوش ہو گئی ہوگی مجھے برباد کر کے ـــــ پتھر کو باندھ دیا ہے میرے تلے۔
ـــــ خوب بدخواہی کی ـــــ کیا کہنے ہیں اس بہرہ وری اور شفقت پدری
کے ـــــ کمبخت کی دولت کا خیال نہ ہوتا تو نہ جانے کب کا ٹھوکر مار کر نکال چکا ہوتا
ـــــ خزانے کی کنجیاں بھی اللہ کن احمقوں کے سپرد کر دیتا ہے۔

احمق ہے نری احمق ـــــ میرے افسانوں اور جدید طرز کی شاعری کی
تعریف میں دُنیا رطب اللسان ہے ـــــ نہیں پسند آتی تو بس انہیں قابل بیگم کو
ـــــ سمجھنے کی صلاحیت اور اہلیت ہو تو سمجھتیں بھی ـــــ ہونہہ ـــــ
میری نظم "کمسن پجارن" اور "ترکاری والی" کو سُن کر کیسا بُرا مُنہ بنایا ہے
جیسے اُسے گالیاں ہی دی گئی ہوں۔

سب کچھ بھول کر نوجوان کا چہرہ ایک دم خوشی سے چمک اُٹھا وہ اسکول
کے شریر لڑکے کی طرح رنگینی سے سیٹیاں بجاتے ہوئے لڑکیوں کے اُس گروہ
کو دیکھنے لگا جو ہاتھوں میں بستے لئے سکول کی چپراسن کے ساتھ جا رہی تھی۔

اس گلابی ساڑی والی لڑکی پر قیامت کی پھبن ہے
یہ ہاں تیرہ سالہ الھڑ چھوکری کس غضب کی شوخ چشم ہے ـــــ
اور جین ہارلو سے کس قدر مشابہ ـ لڑکیاں لیکنگٹن روڈ پر سینٹ تھامس سکول
کی طرف مڑ گئیں۔ ترقی پسند نوجوان کی بھٹکی ہوئی نگاہیں کوٹھی نمبر سات کے
ملازم پر پڑیں جو کیونسٹر کے دودھ کی دو بوتلیں لئے تیزی سے جا رہا تھا ـــــ
بوتل ـــــ اُسے اپنی وائٹ ہارس کی بوتل یاد آ گئی ـــــ
بوتل نہ ہو تو زندگی کا لطف ہی کیا ـــــ
یہ نئے نئے مضامین ان بوتلوں ہی میں سے تو نکلتے ہیں ـــــ
ان نت نئی نظموں کو یہ بوتلیں ہی تو جنم دیتی ہیں۔

اور ان دقیانوسی بیگم کو پتہ چل جائے کہ یہ ٹانک کی بوتل جو خود اپنے
ہاتھوں سے میری طبیعت کے اضمحلال کو دُور کرنے کے لئے پلاتی ہیں، ٹانک نہیں
انگور کی بیٹی ہے تو شاید اس شاک سے جانبر نہ ہو سکیں ـــــ
شراب ـــــ واللہ پتہ چل جائے تو کیا لطف آئے گا ـــــ
ذرا ذرا سی عریاں بات پر تو اُن کے قلب کی حرکت بند ہونے لگتی ہے۔
"برہنہ مجسمہ" ـ "بھکارن" ـ "وہ ایک گوالن تھی" ـ وغیرہ افسانے جو
پڑھ کر سنائے ہیں تو شرم اور حیرت سے عارض تمتما اُٹھے ـ عرق عرق ہو گئیں۔
جو پوچھا کیا رائے ہے تمہاری ـ پسند آئے یہ فسانے ؟ تو ارشاد ہوتا ہے
"ذرا احتیاط سے رکھنا ـ چھنو کی نظر نہ پڑ جائے۔"
"کیوں چھنو کی نظر کیوں نہ پڑے ؟ کیا گالیاں لکھی ہیں اس میں چھنو کو ؟
ـــــ مر جائیگی تمہاری چھنو اس کو پڑھ کر ـــــ ؟"
"پھر بھی کیا فائدہ ؟ ـــــ جوان لڑکی ہے آخر !!!"
"جوان ! جوان !! رٹ لگا رکھی ہے جوانی کی ـــــ سارے
جہان میں کہتی پھرو ـــــ ڈھنڈورہ پیٹ دو اس کی جوانی کا ـــــ"
"جوان نہیں تو کیا بچہ ہے تمہاری چھنو ؟"
"نہیں بچہ کیوں ہوتی ـ بوڑھی کھوسٹ ہے ـــــ یہ دُبلی پتلی
سوکھی ہڈی ـــــ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش ہے۔"
ناز سے مسکرا دیں۔
"ہماری نظروں میں تو سدا بچہ ہی رہے گی ـ پر خدا رکھے خاصہ چودھواں
سال لگے گا۔"
جوان ہے تو وہ سمجھدار بھی ہوگی ـــــ پھر کیا حرج ہے اگر وہ
یہ فسانے سُن لے تو ؟"
"جوان ہے تو کیا ہے ـ شرم و لحاظ بھی تو کچھ چیز ہے ـــــ اور پھر
ایسی گندی عریاں باتیں۔"
"گندی ! یہ باتیں گندی ہیں ؟" "تمہیں گندی نظر آتی ہیں ؟ ـــــ
یہ نہیں کہتیں کہ تمہاری زندگی گندی ہے ـــــ ساری سوسائٹی کی زندگی گندی
ہے ـــــ دیکھنے والی آنکھیں گندی ہیں ـــــ اور یہ فسانے اسی گندی
غلیظ زندگی کی عریاں تصویریں ہیں ـــــ اور یہ شرم ـــــ
شرم ـــــ ہر وقت شرم کی رٹ ـــــ ہے کیا بلا یہ شرم ـــــ سب
کچھ جان بوجھ کر انجان بننا ہے یہ ہے شرم و حیا کا معیار ـــــ"
سمجھ سے بالاتر باتیں سُن کر مرعوب ہوتے ہوئے فرمایا۔
"خیر ! اچھے ہونگے آپ کے فسانے ـــــ پر میں کہتی ہوں کیوں
دیر لگا رہے ہو ـــــ نام خدا انور بی اے پاس ہو گیا ـــــ اب کیا انتظار

۔ آخر اس غرض سے سبکدوش ہوتا ہے ؟

"اللہ خوب سے کب کا بیر نکال رہی ہو ؟"

"اوئی اللہ! اپنی بچی سے رہی ہوں ۔ یہ دشمنی کر رہی ہوں اللہ سے ؟"

"نہیں جی دشمنی کاہے کو ہے، بڑی خیر خواہی ہے ۔ ایک ہمارے والدین مجھ پر یہ کرم کیا کر تیرہ سال کی عمر ہی میں تمہیں میری چھاتی پر مونگ دلنے کو بھیج دیا ۔ اور ایک کرم تم اب آنو کی جان پر ———

لیکن جملہ ختم ہونے سے قبل ہی وہ آنسو بہاتی کمرے سے غائب ہو گئیں ۔

ترقی پسند نوجوان اس چھوٹی سی مہابھارت کی یاد سے جھنجھلا سا گیا ۔

لیکن اس کا چہرہ پھر مسکراہٹ سے کھل گیا کیونکہ سامنے سے سائیکل سوار ایک اینگلو انڈین لڑکی چلی آ رہی تھی ——— گوری رنگت ۔ لپ اسٹک روز اور پاؤڈر سے چمکتا ہوا شاداب چہرہ ——— چست نیم عریاں لباس ——— جانے کیا ہوا ——— سائیکل لڑکھڑائی اور لڑکی ایک لمحہ میں نیچے ———!!

لیکن فوراً ہی اپنا اسکرٹ جھاڑتی وہ سنبھل کر کھڑی ہو گئی ——— سائیکل کو اٹھانے کے بعد اس نے چاروں طرف کچھ شرمندہ سا ہو کر دیکھا کہ کسی نے اسے گرتے ہوئے تو نہیں دیکھ لیا ۔

نوجوان جس کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں اس کے اس طرح دیکھنے سے بہت محظوظ ہوا اور شرارت سے آنکھیں جھپکا کر زور سے ہنس پڑا ———

"یو نوٹی بوائے" (تم شریر لڑکے) لڑکی خفت آمیز لہجہ میں مسکرا کر بے پروائی سے گھنٹی بجاتی یہ جا وہ جا ———

"نوٹی بوائے ———" تو گویا میں اب بھی نوخیز مہ جبینوں کی نظروں میں "شریر لڑکا" ہی ہوں ——— اور اس طرح میری زندگی برباد ہو رہی ہے ۔"

اپنی بدمزہ ازدواجی زندگی کا خیال کر کے وہ پریشان سا ہو گیا ۔

"کیوں نہ اب غسل کر کے ناشتہ کر لیا جائے ——— وائٹ ہارس کے دو ایک پیگ ——— پھر ادب جدید کے سالنامے کے لئے افسانہ ——— وہ تین مزدور ———"

کھٹ کھٹ کھٹ ۔ کسی نے باہر سے دروازہ کھٹکھٹایا ———

"آج اٹھیں گے نہیں آپ ؟" خوفزدہ سی باریک آواز آئی ۔

ترقی پسند حقارت سے منہ پھیر کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا ۔

پروفیسر بٹ کی شوخ شنگ حسین و جمیل لڑکی سائرہ آسمانی جارجٹ کی ساڑی میں ملبوس اٹھلاتی چلی آ رہی تھی ——— سیب کی مانند شگفتہ چہرہ ——— بلوریں سفید نکہت ——— قدرے چھوٹی لیکن سیاہ

[illegible]

وہ کھڑکی

ترقی پسند نوجوان کا چہرہ پھول کی طرح کھل گیا ۔

"ہیلو !" اس کی شیریں آواز فضا میں لہرائی ۔

"ہیلو !" ترقی پسند نے وارفتہ سا ہو کر کہا ۔

کھٹ کھٹ ۔ کھٹ ۔ پھر کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا ۔ "دس بجنے کو ہو رہا ہے ۔ اٹھیں گے نہیں آپ ؟ چھوڑ دیجئے اپنے ابا جان کو ؟" ڈری ڈری آواز آئی ۔

"بھاڑ میں جاؤ تم اور جہنم میں جائے تمہاری چھچھو ——— اللہ یہ شادی کر کے میں کس قید خانہ میں نظر بند ہو گیا ۔"

وہ رومان کی خلل اندازی سے غضبناک ہو کر بولا ۔

"معبود ! کیا اس سیاہ خانہ میں کوئی کھڑکی نہیں !!!"

اس کی آنکھیں حسرت سے کھلی ہوئی کھڑکی پر جم گئیں ۔

"ایک کھڑکی ! ——— صرف ایک کھڑکی ——— وہ آہ سرد بھر کر کہنے لگا ۔

"ایک کھڑکی !! جس کی راہ ازدواج کی یہ کہنہ زنگ آلودہ بیڑیاں اتار کر چپکے سے نیچے کود کر فرار ہو جاؤں ہمیشہ کے لئے ———

"ایک نامعلوم جگہ"

وہ میٹھی میٹھی نظروں سے سائرہ کو تکتے ہوئے بولا ۔

ایک نامعلوم مقام ——— دور ——— بہت دور ——— کوئی دلکش وادی ——— ایک رنگین مرغزار ——— جہاں کوئی نہ ہو ——— نیلا تاروں بھرا آکاش ——— نقرئی ماہتاب کی مسکراتی کرنوں کی ٹھنڈی چھاؤں ——— چشمے کی بیتاب لہروں کا بجتا ہوا رباب ——— معطر جھاڑیاں ——— سربلند درخت ——— بکھری ہوئی نکہت ——— مہکی ہوئی خوشبو ——— اور وہاں !!!

بس میں ہوں ——— اور میری سائرہ ———

نیا مکان

(از محترمہ بیگم محمد مجیب)

مکان خوش نصیب لوگ ہی بنواتے ہیں۔ ہر شخص نہیں بنوا سکتا بہتیرے ہزاروں لاکھوں کما ڈالتے ہیں۔ اچھا کھاتے ہیں، اچھا پہنتے ہیں اچھے اچھے گھروں میں رہتے ہیں۔ پر اپنا مکان اُن کے نصیب میں نہیں ہوتا ہے۔ ساری عمر کرایہ دیتے ہیں اور بیچارے ہمیشہ خانماں برباد ہی رہتے ہیں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ دولت مند لوگ ہی مکان بنواتے ہوں۔ غریب آدمی بھی بنوا سکتے ہیں۔ صرف اتنا حوصلہ اتنی ہمت اور شوق چاہیئے۔ جسے خدا عنایت کرے۔

اپنا گھر بنتا ہے تو دل میں کیا کیا خواہشیں کیسی کیسی اُمنگیں ہوتی ہیں۔ زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو جاتا ہے۔ نئے نئے ولولوں اور پُر تکلف تصورات کا ایک چشمہ سا پھوٹ نکلتا ہے۔ ایک شیریں خواب کی تعبیر نظر آتی ہے ساری دُنیا ہی رنگین اور دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔

یہ عام لوگوں سے ملنے کا کمرہ ہوگا۔ یہاں بے تکلف احباب کا جمگھٹا رہے گا۔ برسات کے موسم میں جس وقت اس کھڑکی کے سامنے بیٹھیں گے کیا بہار ہوگی۔ دل کو لبھانے والا منظر آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ لہلہاتا ہوا سبزہ، ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ۔ جھونکوں کی مسکراہٹ، چڑیوں کی سُریلی تانیں۔ ہوا کے خوشگوار ہلکے ہلکے جھونکے۔ اور چاندنی راتوں میں نو طلوع کا چاند کا وہ پُر کیف نظارہ، در و دیوار اور فرش پر وہ چاندنی کا نکھار۔ بس تصور ہی تصور میں رُوح پر کچھ وجدانی کیفیت طاری ہونے لگتی ہے۔ ایک جگہ تو دن میں کام کرنے کے لئے مخصوص ہوگی۔ جہاں گھر کا شور و غل نہ پہنچ سکے۔ یہاں کھانا کھائیں گے۔ یہاں منہ دھوئیں گے۔ مُرغیاں بہت سی پالیں گے کیونکہ یہ تو اپنا گھر ہوگا۔ سارا انتظام ہوسکتا ہے۔ گائے بھینس ضرور ہوگی۔ تازہ تازہ مکھن بالائی، دہی سب ہی کچھ ہوگا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عورتوں کے آرام اور آسائش کی جتنی کوشش ممکن ہے وہ سب کی جائیگی۔ اس لئے کہ گھر تو اصل میں انہیں کا ہوگا۔ مگر ان کے لئے سلیقہ شرط ہے۔ یہ نہیں کہ ہر جگہ کوڑا کرکٹ کا ڈھیر ہے۔ ترکاریوں کے چھلکے صحن بھر میں بکھرے پڑے ہیں مکھیاں بھنکار رہی ہیں۔ انہیں ہر چیز کی دیکھ بھال کرنی ہوگی۔ گھر کو صاف شفاف مثل آئینہ کے رکھنا ہوگا۔ ہاں ایک پائیں باغ ضرور ہوگا۔ پھول، پتی درخت اور فصل کی ترکاریاں لگاتا ہونگی۔ غرض اس قسم کے خیالات سوتے جاگتے آتے ہیں۔ اور دل میں ایک ہنگامہ، ایک ہیجان اور گدگدی سی پیدا کرتے ہیں۔ یہ کیفیتیں وہی خوب محسوس کرسکتا ہے جس نے کبھی نیا گھر بنوایا ہو۔

احمد میاں اپنا نیا مکان بنواتے بنواتے اب تھک گئے تھے۔ نہ اس میں اتنی گنجائش باقی تھی کہ نیا اضافہ کیا جاسکے ورنہ اس سے ان کا شوق تعمیر پورا ہوتا تھا۔ وہ اکثر سر بجیب تفکر بیٹھے رہتے کہ اب کیا کرنا چاہیئے۔ پنشن ہوگئی۔ داڑھی اور سر کے بال سفید ہوگئے۔ ماشاءاللہ جوان لڑکے لڑکیاں، بہوئیں پوتے پوتیوں میں ان کا ٹھکانہ کہاں۔ جگہ کی تنگی ہر وقت محسوس ہوتی ہے۔ بچے شور و غل کرتے ہیں تو نیند اُچاٹ ہو جاتی ہے۔ نماز وظیفہ میں خلل پڑتا ہے۔ چھوٹی بہو کس تکلیف سے بسر کر رہی ہے۔ نئی دلہن ہے۔ پاس حجاب سے سامنے آنا نہیں چاہتی۔ اگر میری جگہ اسے مل جائے تو سکھ چین سے رہنا نصیب ہو۔ کھل کے رو سکے۔ ہجولیوں میں ہنس بول سکے۔

ایک روز اپنے محلے سے باہر آبادی کی طرف ان کا گذر ہوا۔ دفعتاً ڈپٹی صاحب کی کوٹھی کے بالائی حصے پر ان کی نظر گئی۔ موٹر خانے کی چھت پر نئی عمارت بن رہی تھی۔ دیکھتے ہی پھڑک گئے۔ اللہ اللہ کیا شان ہے بھئی واہ خوب سوچے۔ اچھی جگہ تجویز کی۔ بہت ہی مناسب اور کیا لاجواب عمارت ہے۔ بالکل نئے طرز کی۔ ان سے پُرانی دوستی ملاقات تھی۔ اس وقت ملنے گئے اور تعریفوں کے پُل باندھ دیئے۔ مگر دل پر سانپ لوٹ رہے تھے۔ باتوں باتوں میں ڈپٹی صاحب نے فرمایا کہ وہ خاص اپنی رہائش کے لئے یہ چند کمرے بنوا رہے ہیں۔ یہ سُن کر احمد میاں کے دل پر ایک چوٹ سی لگی۔ چہرے پر بشاشت پیدا کرتے ہوئے بولے:۔

"ہاں بھئی اب ہم لوگوں کا بڑھاپا ہے۔ اپنی کُٹیا الگ ہی بنوانا مناسب ہے۔ ماشاءاللہ بال بچوں کو کافی جگہ کی ضرورت ہے۔ انہیں بھی آرام ہو جائے گا۔ جیسے چاہیں رہیں اور خود کو بھی سکون اور راحت ملے گی میرا بھی ارادہ کچھ ایسا ہی ہے —— اب میں بھی انشاءاللہ تعالیٰ اپنے رہنے کا الگ انتظام کروں گا۔ آپ کی کیا رائے ہے بھائی صاحب؟"

ڈپٹی صاحب مسکرا دیئے۔

"جی ہاں بہت مناسب ہے —— ضرور بنوایئے۔"

"مگر صاحب یہ بات جو آپ کے یہاں ہے مجھے حاصل نہیں ہوسکتی۔

یہ موقع بہت اچھا ہے۔ گھر سے الگ بھی اور قریب بھی۔ میری طرف بہت گنجائش آبادی ہے۔ الگ زمین لوں تب کام چلے۔ کہیں گنجائش نہیں خیر۔ بشرط زندگی ایک نئے طرز کی عمارت میں بھی بنواؤں گا۔

امجد میاں آج ایک نئی تحریک۔ نئے مکان کا شیریں تصوّر لئے ہوئے گھر آئے۔ تمام دن ان کے دل میں گھچڑی سی پکتی رہی۔ رات کو کھانے کے بعد جب سب لڑکے وغیرہ فراغت سے بیٹھے تو انہوں نے ذکر چھیڑا۔ بڑے لڑکے سے مخاطب ہوکر بولے۔

"میاں تم نے ڈپٹی صاحب کا کوٹھا دیکھا۔ مکان میں جو نیا اضافہ انہوں نے کیا ہے ؟"

جی ہاں۔ خوب بنوایا ہے۔ چپس کا فرش ہے۔ غسل خانے وغیرہ سب نئے طرز کے بنے ہیں۔ جو چیز ہے نفیس ہے ——— لاگت بھی کافی لگی ہوگی۔"

"یہ سب تو ہے ——— مگر خیال کتنا اچھا ہے ——— خاص اپنے رہنے کے لئے انہوں نے الگ چھوٹا سا گھر ایسا بنوایا ہے۔ اس میں انہیں بھی آرام رہے گا اور سب کے لئے بھی گھر میں رہنے کی سہولت ہوجائیگی بڑھاپے میں انسان کو سکون کی تلاش ہوتی ہے۔ گھر کے شور وغل اور بچے بچے سے بچے رہیں گے۔"

ذرا سے سکوت کے بعد انہوں نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ نئے ارادہ کی تکمیل کے خیال سے اُن کا چہرہ چمکنے سا لگا۔

"میں نے سوچا ہے کہ میں بھی اپنے رہنے کے لئے کوئی الگ جگہ بنواؤں۔ ہمارے مکان میں گنجائش کم ہے۔"

بیٹے نے سر جھکا لیا۔ بہوؤں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ انہوں نے قدرے وزن دار طریقے سے پوچھا

"کیوں ٹھیک ہے نہ۔ کیا رائے ہے تمہاری ؟

بیٹے نے سوچتے ہوئے جواب دیا

"جیسی آپ کی خوشی ہو ——— مگر گنجائش کا معاملہ یہ ہے کہ جب پورا خاندان ایک گھر میں رہے گا تو ظاہر ہے کہاں تک گنجائش نکلے گی۔ پھر بھی کوئی ایسی تکلیف کسی کو نہیں ہے۔ آپ بنوانا کہاں چاہتے ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ روپیہ کا بندوبست کیسے ہوگا ؟

ابھی روپیہ کا کیا بندوبست کرنا ——— ابھی تلوں سے تیل نکالنا ہے۔ اصل چیز حوصلہ اور ہمت ہے۔ سوچو یہ مکان ہم نے کیسے بنوایا۔ کیا کہیں خزانہ گڑا تھا یا چھپر پھاڑ کے ملا تھا۔ آیا [illegible] وقت میں لیا تھا۔ تمہارے ہوش کرنے سے پہلے ہی کچھ نقشہ بدل گیا۔ دو دالان ادھر، دو صحنچیاں اور ایک لمبا کمرہ پورب کی طرف تھا۔ جو اب باورچی خانہ اور کوٹھری ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ اب کوئی پہچان نہیں سکتا کہ یہ وہی گھر ہے۔ باہر سے دیکھو تو البتہ پرانا مکان کہا جا سکتا ہے۔ اللہ کی مہربانی سے آنا سب بن گیا۔ تھوڑا تھوڑا بنتا رہا ——— پھر کیا ہے چار دن کی زندگی ہے۔ ایک چیز ہو جائے گی تو انشاءاللہ تم ہی لوگوں کے کام آئے گی۔"

غرض چند روز صلاح مشورہ کے بعد یہ اسکیم مکمل ہوگئی۔ لیکن گھر بنانے کے لئے زمین بھی تو چاہیئے۔ گھر کے پاس جو ذرا سا ٹکڑا تھا اس پر ان کی نظر تھی۔ مگر دوسرے ملکیت دار کا اس پر قبضہ تھا۔ یہ بات عرصہ سے انہیں کھٹکتی تھی۔ سب سے پہلے انہوں نے اس زمین کو حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پرانے کاغذات نکال کر اپنی ملکیت ثابت کی۔ آخر مقدمہ بازی تک نوبت پہنچی۔ کافی دوڑ دھوپ اور سر مغزی کرنا پڑی۔ پھر بھی کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ہار کر انہوں نے اپنے کھیت میں جو شہر سے کچھ فاصلہ پر تھا مکان تعمیر کرنے کا ارادہ کیا۔

وہاں ایک پرانا پھاٹک بنا ہوا تھا جو اب بیلوں وغیرہ کے کام آتا تھا۔ اس کے آگے ایک خالی صحن جس کی دیواریں ٹوٹی پھوٹی پڑی تھیں۔ انہوں نے سوچا کہ دیواروں کی مرمت بعد میں کرالی جائے گی۔ پہلے اس پھاٹک پر نئی عمارت کی تعمیر شروع ہو جانی چاہیئے۔ کم خرچ بالانشین ——— نقشہ اُن کے ذہن میں تیار تھا۔ کام شروع ہوگیا۔ پھاٹک کو نئے سرے سے درست کرایا کچھ نقش و نگار بنوائے۔ اب ان کی زندگی میں ایک نئی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ وہ گھنٹوں کرسی ڈالے بیٹھے رہتے۔ مستری اور مزدوروں کا کام دیکھا کرتے اور ہدایتیں دیا کرتے۔ مگر جتنی انہیں جلدی تھی اتنی ہی جیسے اسکی تیاری میں دیر ہوتی جاتی تھی۔ دل بے چینی سے اس فکر میں رہتا اور آنکھیں اسی پر گڑی رہتیں۔ جتنا زیادہ مکان بنتا جاتا انہیں محسوس ہوتا کہ جیسے ان کے جسم میں ایک نئی طاقت، زندگی بخش قوت اور سکت پیدا ہوگئی ہے۔ اب پہلے سے زیادہ تن کر چلتے تھے۔ چہرے پر ایک خاص شادابی اور تازگی برستی تھی۔ کسی سے ملتے تو گھوم پھر کر مکان کا ذکر چھیڑ دیتے۔ اس سے انہیں خاص مسرت ہوتی۔ خود بھی تعریف کئے بغیر نہ رہ سکتے اور دوسروں

سے تعریف سننے کے منتظر رہتے۔ ابھی تو مکمل بھی نہیں ہوا تھا۔ اور کتنا شاندار لگ رہا تھا۔ اور پورا بن جانے کے بعد تو کچھ اور ہی شان ہوگی۔

آج امجد میاں کے گھر میں غیر معمولی گہما گہمی ہے۔ آج ان کے گھر والے نئے مکان میں پکنک کے لئے جا رہے ہیں۔ امجد میاں کی خوشی ہے کہ سب چل کر اسے دیکھیں۔ اب سعیدی بھی ہو گئی۔ مکان تیار ہے مردوں نے تو اکثر دیکھا عورتوں نے ابھی تک ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھا۔ اس لئے پورے خاندان کو لئے جا رہے ہیں۔ اور کچھ عزیز رشتہ داروں میں بھی بیویوں کو دعوت دے آئے ہیں۔ وہ بہت مسرور نظر آ رہے ہیں۔ ایک ایک سے کہہ رہے ہیں "بھئی جلدی کرو اتنا وقت آگیا اور تیاری ختم نہیں ہوتی۔ بس عورتوں کو کہیں لے جانے میں میرا اس لئے جی گھبراتا ہے۔ دنیا بھر کے جھگڑے لگے رہتے ہیں۔ اے سعیو! کباب ناشتہ دان میں ابھی تک کیوں نہیں رکھتی ہو۔ اور یہ چھبن گھوم رہا ہے۔ اے اب تک کپڑے بھی نہیں پہنائے۔ لاحول ولا قوۃ۔ یہ لوگ کسی طرح نکلتی ہی نہیں ہیں۔"

سعیو جلدی سے لپک کر چھوٹے بھائی کے کپڑے لائیں۔ انہوں نے سعیو کے ہاتھ سے لے لئے۔

"لاؤ اس کا کرتا میں پہناتا ہوں۔ تم ناشتہ کی فکر کرو۔"

"پھوپھی جان پراٹھے پکا رہی ہیں بس ذرا سی دیر ہے۔"

"آئیں! ابھی تک؟ جا چکیں بس تم لوگ ——"

یہ کہکر وہ باورچی خانہ کی طرف لپکے۔

"اے سلمہ! اٹھو تانگے آگئے ہیں۔ تم لوگوں کی وجہ سے کب تک رکے رہیں گے۔ تانگے والے چیخ رہے ہیں۔ انہیں دوسری سواریاں لینے جانا ہے۔ کیا دیر ہے جلدی کرو۔"

"لیجئے سب تیار ہے۔"

سلمہ نے جلدی جلدی کباب پراٹھے خاگینہ ناشتے دان میں رکھا۔ امجد میاں نے اپنے داماد سے کہا۔

"سلطان دولھا! تم ان لوگوں کو سوار کراؤ اور ان کے ساتھ جانا میں ڈپٹی صاحب کے یہاں کی سواریوں کو لے کر آتا ہوں" —— سلطان دولھا نے شیروانی کے بٹن بند کرتے ہوئے جواب دیا۔

"بہت اچھا۔ میں ان کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

امجد میاں ڈپٹی صاحب کے یہاں ایک روز پہلے دعوت دے آئے تھے۔ عورتوں میں صرف ڈپٹی صاحب کی بڑی صاحبزادی جانے کیلئے تیار تھیں۔ امجد میاں نے اپنے آنے کی اطلاع کرائی۔ اور ڈپٹی صاحب کی بیگم صاحبہ کو سلام کرنے اندر آئے۔ بیگم صاحبہ نے کہا۔

"کہو تمہارا مکان تیار ہو گیا —— مبارک ہو۔"

"جی۔ آپ سب کی دعاؤں کی برکت ہے۔ آپ بھلا کیوں غریب خانے پر تشریف لائیں گی۔ سچ پوچھئے تو اس قابل ہے بھی نہیں۔"

"بس رہنے دو —— تم اتنا انکسار نہ کیا کرو۔ اللہ نے چاہا تو میں بھی کسی روز جاؤنگی۔ نقشہ تو بتاؤ مجھے۔ کیا کیا بنا ہے؟" انہوں نے بات کو گول کرتے ہوئے کہا۔

"بھابی اصل بات یہ ہے کہ نقشہ میں نے کسی انجنیر سے نہیں بنوایا ہے۔ خود اپنی ضرورت کے مطابق بنا لیا ہے۔ انجنیر کیا جانیں کہ ہماری رہائش کس قسم کی ہے۔ ہماری عادتیں کیسی ہیں۔ اور ہمیں کس طرح کی عمارت میں آرام مل سکتا ہے۔ دو چار الٹی سیدھی لکیریں کھینچ دیں۔ لیجئے نقشہ تیار ہے۔ ہزاروں روپیہ خرچ کرو اور پھر تکلیف اٹھاؤ۔ یہ سب واہیات باتیں ہیں۔ میں نے اپنے مکان کا نقشہ اپنی پسند سے خود بنایا ہے۔"

ڈپٹی صاحب کی بیوی مسکرا کر بولیں۔

"اچھا یہ کہو —— پھر بھلا کیوں نہ اچھا ہوگا۔"

ڈپٹی صاحب کی صاحبزادی حامدہ تیار ہو کر آئیں۔ امجد میاں نے کہا۔

"چلو بیٹی میں خود اس لئے آیا کہ کہیں تم جانے میں جھجکتی نہ جاؤ۔ تم لوگوں کے بغیر وہاں سونا لگتا۔ کیا تم ہی اکیلی چلوگی۔ کوئی اور نہیں آیا۔؟"

"اس وقت تو میں ہی چل رہی ہوں۔ بھابی وغیرہ نے کہا ہے کہ وہ پھر کسی روز آئیں گی۔ میں نے کہا کوئی جائے یا نہ جائے میں تو ضرور جاؤنگی چچا نے اتنے اصرار سے بلایا ہے۔"

"ماشاءاللہ تمہارا اخلاق بہت اعلیٰ ہے۔ تم نے میری خوشی پوری کی۔"

حامدہ تانگہ پر مع ایک خادمہ کے سوار ہوگئیں۔ امجد میاں دوسری طرف بیٹھ گئے۔ سب تانگے پہلے جا چکے تھے۔ ان کا تانگہ بعد میں پہنچا۔ اور پھاٹک کے پاس آکر رک گیا۔ امجد میاں نے پردہ تان کر کہا۔

"لو بیٹی اترو۔ یہی تمہارا گھر ہے۔"

حامدہ اتر پڑیں۔ ایک بڑا سا پھاٹک۔ اس کے دونوں جانب

بڑے بڑے بھدے سے دروازے لگے تھے۔ اندر ایک طرف بیل بندھے تھے۔ بیل گاڑی کھڑی تھی۔ ایک طرف مزدوروں کا کچھ سامان کا ڈھیر تھا۔ اور دو ایک کھاٹ بچھے پڑے تھے۔ آگے صحن ہی صحن نظر آ رہا تھا۔ نہ کوئی کمرہ نہ دالان، صفاچٹ میدان۔ حامدہ ہکا بکا کھڑی تھیں، کدھر جائیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ امجد میاں نے حسبِ عادت مکان کی خوبیاں گنانا شروع کیں۔

"بیگی دیکھا تم نے یہ پھاٹک۔ کس قدر لاجواب ہے۔ خوش نصیبی سے یہ مجھے بنا بنایا مل گیا۔ میں نے اسے بہت کچھ درست بھی کرایا ہے۔ یہ بہت ہی کارآمد ہے۔ ہزاروں کام لئے جاسکتے ہیں۔ یہ مویشی خانہ بھی ہے۔ گودام بھی۔ اور ضرورت پڑے تو کمرہ بھی۔ اس میں اتنی گنجائش ہے کہ آٹھ دس پلنگ آسانی سے آسکتے ہیں۔ اس قسم کی چیز شاید ہی کسی گھر میں ہو۔ اور اصل عمارت جو میں نے اپنی رہائش کے لئے بنوائی ہے وہ اوپر ہے۔ ابھی تمہیں دکھاتا ہوں۔"

حامدہ نے اِدھر اُدھر گھوم پھر کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اچھا تو اوپر چلیں۔ زینہ کہاں ہے؟"

"زینہ ——— زینہ ابھی نہیں بنا ہے ——— میں اس پر غور کر رہا ہوں کہ زینہ کس طرف بنوانا چاہیئے اور کیسا بنوانا چاہیئے۔ ابھی میں نے اس کے متعلق کچھ طے نہیں کیا ہے۔ لیکن ٹھیرو۔ اوپر جانے کا میں نے انتظام کر لیا ہے۔ تم ذرا ادھر ہٹ کر کھڑی ہو جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ جلدی سے باہر نکلے اور مزدور کو آواز دی۔

"ارے بھائی رگھو سیڑھی لانا تو جلدی سے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ سیڑھی لگا کر رکھنا۔"

"میاں ابہیں لگی جات ہے۔ سیڑھی لگاوت ماں کتی دیر لگت ہے۔"

"اماں ذرا اونچی کر کے ٹھیک طرح سے لگاؤ۔ جس میں چڑھنے میں آسانی ہو۔ بچے وچے ہیں نہ۔"

"بہاں آپ اطمینان رکھئے۔"

بمشکل زمین برابر کر کے سیڑھی لگائی گئی۔ انہوں نے گھر والیوں کو جو صحن میں ایک طرف مسافرانہ انداز سے بیٹھی تھیں آواز دی۔

"ارے بھئی چلو۔ تم لوگ وہاں کیا کر رہے ہو۔ اب آؤ نہ زینہ لگ گیا ہے۔"

یہ زینہ دیکھ کر عورتوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ایک ایک سے کہتی کہ پہلے تم چڑھو۔ مجھ سے پیش قدمی کی۔ ان کے تنے کھیل چکا، بیبیاں اپنے دامن سنبھالے کھڑی تھیں۔ آخر امجد میاں نے ان کو ہمت دلائی۔ اب یہ منظر قابلِ دید تھا کہ کس طرح انہوں نے سب کا ہاتھ تھام تھام کر اوپر پہنچایا۔ ایک دشوار مہم سر کی۔ وہ سب مشکل سے اپنے کپڑوں کو سمیٹتیں، ڈرتی سہمتی چڑھ رہی تھیں اور بے اختیار ہنسی بھی آ رہی تھی۔ ہوا کی تیزی اور بھی غضب تھی۔ اس پر بھی بعض بھاری جسم کی عورتوں کو پسینہ آ گیا۔ اوپر پہنچیں تو اطمینان کا سانس لیا۔

حامدہ نے ہنس کر کہا۔ "بھلا ڈرنے کا کیا موقع تھا کیسی اچھی سیڑھیاں ہیں۔ آپ لوگ کبھی قطب مینار کی سیڑھیوں پر چڑھی ہیں اس میں بھی یہ لطف نہ آیا ہوگا۔"

اوپر صرف ایک مختصر سا کوٹھا جس کے چاروں طرف دروازے ہی دروازے لگے ان میں رنگین شیشے تھے۔ لیکن سب دروازے احتیاط کے خیال سے بند کر دیئے گئے تھے۔ کیونکہ بچوں کا ساتھ تھا اور پیچھے کوئی روک تھی نہیں۔ ایک دم وہاں عجیب گڑبڑ سی پڑی۔ گنجائش کم اور عورتیں اور بچے بہت سے۔ امجد میاں کو اندازہ لگانے میں ذرا غلطی ہوئی۔ ٹھیک طور سے حساب نہ لگا سکے۔ کہ جگہ کتنی ہے اور آدمی کتنے ہوں گے۔ مہمانوں کی تعداد بھی اتفاقاً زیادتی ہو گئی۔ عجیب ریل پیل ہونے لگی۔ وہ خود ذرا دیر کیلئے سراسیمہ سے ہو گئے۔ مگر جب ترتیب سے سب کو بٹھانا شروع کیا تو شکر ہے کہ سب بیٹھ گئیں اور بچے ان کی گودوں میں آ گئے۔ اس طرف سے اطمینان ہوا تو انہوں نے کہا۔

"دیکھا تم لوگوں نے کتنا رہائش اور ہوادار کمرا ہے۔ میں نے چاروں طرف دروازے لگوائے ہیں تاکہ روشنی اور ہوا خوب آسکے یہ شیش محل ہے پورا۔"

عورتوں نے چاروں طرف سر گھما کر دیکھا۔ سب دروازے بند تھے اور دم جیسے گھٹا جا رہا تھا۔ ایک بچے نے سٹکنی کھولنی چاہی۔ امجد میاں نے لپک کر ہاتھ پکڑ لیا۔

"ارے ارے یہ کیا کر رہا ہے ——— خدا ہو! اسے سنبھالو۔ خبردار دروازہ نہ کھلنے پائے۔ بڑا غضب ہو جائے گا۔ پیچھے کوئی روک نہیں ہے۔"

"ابا میاں کیا اس کے آگے صحن پر آسرا کچھ نہیں ہے؟"

"ابھی گنجائش ہی نہیں تھی۔ سوچا ہے کہ کمرے کے چاروں طرف ریلنگ بنوا لوں۔ جالیدار۔ پھر دیکھنا کیا خوبصورتی آئیگی۔

بھی تو ہو گی۔ صحن اور برآمدے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یہ کمرہ ایسا ہے کہ کھول دو تو صحن اور برآمدے کی کوئی حقیقت نہیں رہتی اس کے آگے ـــــ"

بیویاں زیادہ تر اُن کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھیں۔ بچوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر انہیں کیوں یہ سزا دی گئی ہے جو اس طرح شکنجہ میں کس کر بٹھا دیئے گئے۔ وہ بار بار کوئی نہ کوئی حرکت کئے جاتے۔ کبھی دروازہ کھولنے لگتے۔ کبھی شیشوں پر ہاتھ مار مار کر کودتے اور نیچے جھانکنے کی کوشش کرتے۔ امجد میاں برابر تنبیہہ کرتے رہے اور مائیں ڈانٹتی دھمکاتی رہیں۔

اب سب کو بھوک بڑے زوروں میں لگی تھی۔ یہاں آنے کے سلسلہ میں ورزش بھی خاصی ہو گئی تھی۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ دسترخوان کہاں بچھے۔ امجد میاں نے اس مسئلہ پر غور کرتے ہوئے ایک ترکیب سوچی۔

" دیکھو تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔ پلیٹیں اپنے اپنے ہاتھ میں لے لو اور مزے میں کھاؤ پیو۔ گھر کی طرح یہاں بھی باقاعدہ دسترخوان چن کر کھانا کھایا تو کیا لطف۔ اور میں نے سُنا ہے کہ آج کل فیشن یہی ہے۔ بڑی بڑی دعوتیں اس طریقہ پر ہوتی ہیں۔"

عورتوں نے اُن کی رائے سے موافقت کی اور سب نے اُلٹے سیدھے بیٹھ کر کسی نہ کسی طرح اپنا اپنا پیٹ بھرا۔ درمیان میں ہنسی مذاق کی باتیں بھی ہوتی رہیں۔ کھانے کے بعد پان، الائچی، تمباکو کا دور چلا۔ امجد میاں نے ایک گلوری اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"کیوں بیٹی حامدہ! تم نے کچھ نہ کہا ـــــ مکان کیسا پسند آیا؟"

حامدہ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

"کیا کہوں چچا۔ جس وقت سے آئی ہوں ایک ایک چیز یہاں کی دیکھ رہی ہوں۔ کن الفاظ میں تعریف کروں یہ سمجھ میں نہیں آتا۔ جی چاہتا ہے کہ دیکھے ہی جاؤں اور یہیں بیٹھی رہوں۔ ہمارا مکان اتنا بڑا ہے مگر یہ خوبصورتی اور مناسبت جو یہاں پیدا کی گئی ہے وہ کہیں نہیں۔ بلکہ شاید دُنیا بھر میں کہیں نہ ہو۔"

امجد میاں کا چہرہ فرطِ مسرت سے کھل گیا۔ مگر انکسار آمیز انداز سے بولے۔

"نہیں بیٹی! تمہارے مکان کا مقابلہ اس سے کہاں ہو سکتا ہے۔"

"نہیں چچا! یہ عمارت تو دنیا کی بہترین عمارتوں میں شمار ہونے کے لائق ہے۔ ایسا نادرِ روزگار نقشہ کسی بڑے سے بڑے انجینئر کی سمجھ میں بھی نہیں آ سکتا۔ مجھے بھی اکثر مشہور عمارتوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔

لیکن سچ کہتی ہوں آج تک اس فکر کی میں نے ایک بھی نہ دیکھی۔ یہ تو لاجواب چیز بنوائی ہے آپ نے۔ اور دیکھ لیجئے گا وہ زمانہ بھی آئے گا کہ دور دور سے زائرین اسے دیکھنے آئیں گے اور بنانے والے کی لیاقت اور حسنِ مذاق کی داد دیئے بغیر نہ رہ سکیں گے۔"

"بس بیٹی میرا ارادہ ہے کہ باقی عمر اسی کٹی میں کاٹ دوں۔"

"آپ اسے کٹی کہتے ہیں۔ اے جناب یہ تو تاج محل ہے تاج محل۔ کٹی وٹی کہکر آپ اس کی توہین نہ کیجئے۔ یہ آپ کا انکسار ہے۔ اور میں کیا عرض کر سکتی ہوں۔"

امجد میاں کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ انہیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ جیسے اچکن کے بٹن کچھ کس گئے ہیں۔

ذرا دیر میں ایک لڑکی کھڑی ہو گئی۔

"امّاں پاخانہ لگا ہے۔"

امجد میاں کے کان میں جوں ہی یہ آواز پڑی۔ وہ گھبرا کر کھڑے ہو گئے۔ اور کسی قدر پریشانی کے لہجہ میں بولے۔

"کیا اس کو پاخانہ لگا ہے؟"

ماں ادھر اُدھر دیکھ رہی تھی۔ لڑکی کا ہاتھ پکڑ کر جواب دیا۔

"چچا ابا آپ تکلیف نہ کریں۔ مجھے بتا دیجئے کہاں لے جاؤں۔ پاخانہ کس طرف ہے؟"

"پاخانہ تو یہاں نہیں ہے ـــــ یہ بڑی مشکل ہوئی۔ مجھے یہی فکر تھی۔ ایسی کوئی جگہ یہاں نہیں ہے۔ لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ ذرا سا دروازہ کھول کر (انگلی کے اشارے سے) یہ دیکھو ٹوٹی ہوئی چھت جو پڑی ہے یہاں بخوبی ایک غسل خانہ اور پاخانہ بن سکتا ہے۔ بس اسے درست کرانا ہو گا۔"

لڑکی کو جلدی تھی۔ انہوں نے کہا۔ "خیر چلو بچی کو میں نیچے لئے چلتا ہوں۔"

یہ کہکر انہوں نے ماں اور بچی کو نیچے اُتارا اور صحن میں ایک طرف اینٹیں رکھوا دیں۔

اب دھوپ زرد ہو گئی تھی۔ جنگل کا سناٹا بڑھتا جا رہا تھا۔ عورتیں بیٹھے بیٹھے اُکتا گئی تھیں۔ بچے اس بند قفس کو توڑ کر بھاگ نکلنے کے لئے پریشان اور بدحواس تھے۔ ایک ایک کر کے سب نیچے اُتر آئے امجد میاں نے تانگے اور بیل گاڑی لگوا دی۔ سب سواریاں روانہ ہوئیں۔

علمدہ سے چلتے وقت احمد میاں نے کہا۔
"بھی حامدہ! آج تمہیں بڑی تکلیف دی میں نے۔"
حامدہ نے مسکرا کر جواب دیا۔
"تکلیف!! جی نہیں آج کا ایسا دلچسپ۔ خوشی اور آرام کا دن تو مجھے زندگی بھر کبھی نصیب نہیں ہوا۔ اتنا اچھا کھانا دیکھا۔ کھایا پیا، آرام کیا ———— آج میں کسی اچھے کا منہ دیکھ کر اٹھی تھی۔

غزل

(از حضرت احسان دانش)

قدم قدم پر تھا فکرِ منزل نفس نفس پہ غمِ زمانہ   مگر زہے فیضِ چشمِ ساقی کہ ہر تبسّم ہے فاتحانہ

ہانِ معنیٰ کو خاک سمجھے، رموزِ فطرت کو خاک جانے   طلسمِ ہستی پہ آدمی کی نگاہ پڑتی ہے طائرانہ

لام سے بے خبر سلامی، نیاز سے بے نیاز سجدے   نماز زاہد سے مختلف ہے مری نمازِ قلندرانہ

ہزار صیاد کے ستم ہوں، کہیں بدلتا ہے رنگِ نغمہ   کہ مُجرمانِ چمن عموماً قفس میں لُٹتے ہیں آشیانہ

جاب میں بھی مشاہدے کی کمی نہیں زینہار لیکن   نظر نظر کو ترس رہا تھا تری تجلّی کا اک زمانہ

سائلِ مرگ و زندگی میں خرد سوا اس کے کیا بتائے   نہ یہ حقیقت نہ وہ حقیقت نہ یہ فسانہ نہ وہ فسانہ

دودِ زندانِ آب و گل میں نہ جسم آزاد ہیں نہ روحیں   کوئی اسیرِ غمِ محبت کوئی اسیرِ غمِ زمانہ

یتِ گلشن پہ رونے والے تجھے یہ شاید خبر نہیں ہے   کہ تیری آزادیوں میں حائل قفس سے پہلے ہے آشیانہ

من میں غنچے حسین و رنگیں فلک پہ تارے جمیل و روشن   مگر حقیقت میں آدمی کا نہ یہ ٹھکانہ نہ وہ ٹھکانہ

بہت ہی کم لوگ ہیں جو احسان اس حقیقت سے آشنا ہیں
کہ اعترافِ پیمبری ہے مرا کلامِ پیمبرانہ

مجازؔ کی طرف سے

(از شاہین اصفہانی)

(جناب مذنیب ایم۔ اے۔ ایل ایل بی (علیگ) کی اس نظم کا جواب جو "مجازؔ کے نام" کے زیر عنوان "ادیب" کے آخری نمبر میں اشاعت پذیر ہوئی ہے)

مجازؔ سچ ہے کہ مست شراب ہے اب بھی — مگر وہ رکشِ صد آفتاب ہے اب بھی
جہان نُور کا ہر راز فاش ہے اس پہ — [illegible] میں وہ باریاب ہے اب بھی
نہیں ملال کہ رُسوائے شہر خوباں ہے — [illegible] کی تیغ سخن میں تو آب ہے [illegible]
نہیں سکون کا قائل نہیں جمود پرست — [illegible] تا بقدم اضطراب ہے [illegible]
لبوں پہ تشنگیٔ لبِ ہائے عشوہ ساز سہی — [illegible] آتش صد انقلاب ہے [illegible]
خرابِ سیم وشان و ہلاکِ سیم تناں — [illegible] گیا اک فنا [illegible]
ہزار خلوتِ رنگیں میں سر بہ خاک سہی — مگر وہ [illegible] اپنا [illegible]
نظر میں شوقِ رسا قلب میں گدازِ قبول — لبوں پہ [illegible]
سرودِ رکشِ صد نُوریانِ عرش نشیں — شرار [illegible] دل [illegible]
ہجومِ بادہ گساری و وصفِ عشقِ بتاں — [illegible] انجمن [illegible]
وہ اپنے خلد کا اک سروِ سر بلند اب تک — وہ اپنے [illegible]

بہ ایں خرابی و مستی کمال چالاک است
"ہزار بادۂ ناخوردہ در رگِ تاک است"

غزل

نہیں کہ روبرو وہ رشکِ آفتاب نہیں — تری نظر کی [illegible]
جو مست و بیخود و آوارہ و خراب نہیں — وہ اور کوئی بلا ہو تو ہو شباب نہیں
بہار خوب ہے، پھر بھی ترا شباب نہیں — شگفتگی تو وہی ہے وہ آب و تاب نہیں
نظر ہے شرط۔ اسے دیکھ تو کبھی واعظ — جو چشم خیرہ نہ کر دے وہ آفتاب نہیں
کہاں ہو آ، مری راتیں اُداس ہیں تجھ بن — فروغِ بادہ نہیں جشنِ ماہتاب نہیں
مدد توجہِ ساقی بنامِ دوست مدد — مجھے سرور باندازۂ شراب نہیں
کہاں کی گرمیِ محشر، کہاں کی نارِ جحیم — ترے عتاب سے بڑھ کر کوئی عذاب نہیں
نگاہ دے کے مجھے کیوں عذاب میں ڈالا — جہاں میں جب کوئی ذرہ بھی بے نقاب نہیں
سنائی دیتی ہے راتوں کو پاؤں کی آہٹ — یہ اور کیا ہے جو رفتارِ انقلاب نہیں
مگر کہ زخمِ محبت سدا رہیں تازہ — کچھ اور مقصدِ شبہائے ماہتاب نہیں
یہ امتحان میں دل ہی کے سر رہا سہرا — تری نظر کا [illegible] انتخاب نہیں
وہ آئینہ سا بدن وہ صفائے رنگِ شباب — کمال یہ ہے [illegible] نہیں
نظر ملی کہ نظر آب و تاب [illegible] — [illegible] نہیں
مرے سوال کی شوخی یہ دم بخود ہے جہاں — وہ [illegible] جواب نہیں
جو ہو سکے تو مجھے پھیر دے [illegible] — [illegible] نہیں
[illegible] آفتاب میں پرتو، تو آئینہ میں عکس — [illegible] جواب [illegible] مرا جواب نہیں

[illegible] کو یہ مذاقِ سخنوری [illegible]
عطائے دوست ترے حسن کا جواب نہیں

[illegible] طباطبائی

آوازیں

(از جناب سعید احمد ملک)

دن رات بولی بھٹکی
ویران میرے دل کی
ناکام آرزوئیں
گمراہ کر رہی ہیں ——
پر دل پکارتا ہے

"میں تم کو چاہتا ہوں
میں تم کو چاہتا ہوں"

جیسے پکارتی ہے
شب چھپ کے تیرگی میں
"اُف! اے ضیا کہاں ہے؟"
ویسے مری محبت
جو بس رہی ہے میرے
ویران دل کے اندر ——
ہردم پکارتی ہے

"میں تم کو چاہتی ہوں
میں تم کو چاہتی ہوں"

جیسے کہ تند موجیں
ٹکرا کے آشتی سے
دل کا سکون چاہیں
میری بھی آرزوئیں
برباد اور شکستہ
اُلفت سے تیری جا کر
ٹکرا کے چیختی ہیں ——

"میں تم کو چاہتی ہوں
میں تم کو چاہتی ہوں"

حسین پھولوں کا گلدستہ

کچھ بلبلوں کو یاد ہیں کچھ قمریوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے میری داستاں کے ہیں

ادیبوں شاعروں کے تذکرے اور مجموعے مرتب ہوتے ہیں۔ لیکن میں اپنی پیاری بہنوں اور عزیز سہیلیوں کے (جو کہ ادبی دنیا میں چمکتے ہوئے ستارے بن کر جگمگا رہی ہیں) وہ خطوط جو انہوں نے مجھے یا اپنی سہیلیوں کو لکھے ہیں، کتابی صورت میں شائع کرنا چاہتی ہوں۔ بے تکلفی، خواہرانہ محبت، آپس کی شرارت، علمی، ادبی تذکرے کے یہ رنگین پھول [illegible] نکہت میری نشاط روح اور تسکین خاطر بنکر رہے گی۔ اور یہ ایک حسین ادبی خدمت ہوگی [illegible] جانے والی بہنیں حضور مجھے وفا اور جفا سے بھی محروم کر دیا ہے۔ اب نہ انکو میری خبر ہے اور نہ مجھے کچھ لیکن انکے پیارے خطوط حسین یاد کے طور پر محفوظ ہیں۔ مجھے شائع کرنے کی اجازت عطا فرمائیں —— مجبور ہو کر رسائل کے ذریعہ اجازت کی متوقع ہوں شاید نظر پڑ جائے اور جواب سے مسرور فرمائیں۔

(۱) مہر آرا بیگم وصفی (مراد آبادی) (۲) ممتاز رفیع بیگم صاحبہ (مارہرہ)
(۳) معصومہ تسنیم صاحبہ (جونپوری) (۴) رفعت خلیلہ صاحبہ (بنگلور)
(۵) ش۔ ا۔ نسیم صاحبہ (جالندھر) (۶) غ۔ س۔ [illegible] صاحبہ (لکھنؤ)
(۷) غدیر فاطمہ صاحبہ (دہلی) (۸) شبیر خالدہ [illegible]
(۹) حجاب امتیاز علی صاحبہ (لاہور) (۱۰) تاج حمید صاحبہ (پٹنہ)
(۱۱) منظور مبارک علی صاحبہ (شورکوٹ پنجاب)

ان کے علاوہ میری دوسری بہنیں بھی اپنے اور اپنی سہیلیوں کے ادبی خطوط بھیجیں تاکہ یہ گلدستہ حسین تر بن سکے۔ چونکہ یہ دلکش مجموعہ شائع ہوگا اس لئے خطوط جلد از جلد ارسال فرما کر ادبی خدمت کا ہاتھ بٹائیں۔ شکریہ صد ہزار!!

میرا پتہ:—

فاطمہ بیگم منشی فاضل

آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ

اے سالِ نو!

(از آنسہ گوہر اقبال حور زبیری)

ے سالِ نو! اے مرکزِ امید و انبساط!
ی کلیدِ میکدۂ راحت و نشاط!
اے سالِ نو! اے جلوۂ روشن! جمال ریز!
اے سالِ نو! اے مہرِ ضو افگن! جمال ریز!
ے سالِ نو! اے لمعۂ انوار! مہر فام!
یمانۂ نشاط کا رنگین ایک جام!
اے نوبہار! سالِ گذشتہ کے جانشیں!
اے وہ کہ منتظر تھے ترے اہلِ سرزمیں!
ئہ سکونِ قلب کا تو اک پیام بر
ورج کے ساتھ ساتھ افق پر ہے جلوہ گر
روشن ہیں تیرے عکس سے گیتی و آسماں
بکھرا ہوا ہے رنگِ گلستاں ہر جہاں
بزمِ فلک میں بجھ گئے تاروں کے قمقمے
ذروں سے تیرے سینکڑوں سورج چمک اٹھے
آیا ہے گل بداماں و نکہت فروش تو
شبنم کے آنسوؤں سے ہے گوہر بدوش تو
صبحِ نو ہے، یہ صبحِ بہار ہے
ہوا ہے رنگ، چمن لالہ زار ہے
جوشِ طرب سے یوں امنڈ آئی ہیں مسرتیں
ذروں پہ ہر جہان کے چھائی ہیں عشرتیں
پہ ضو فگن ہے جلوۂ سحر
ہوا ہے نور مسرت میں ہر نظر

ذرّوں کو جلوہ بار کیا اپنے نور سے
تاروں کو شرمسار کیا اپنے نور سے
پہلو میں پھر مسرتیں بیدار ہو گئیں
پرتو سے تیرے ظلمتیں نور بار ہو گئیں
کلیوں میں، پھول پتوں میں، سامانِ دہر میں
آئی بہارِ نو چمنستانِ دہر میں
پھر خارزارِ . . . ہے گلخانۂ ارم
ہر رنگ بار پھول ہے پیمانۂ ارم
اے نوبہار! سالِ گذشتہ کے جانشیں!
اے وہ کہ منتظر تھے ترے اہلِ سرزمیں!
مانا کہ تو تجلیٔ راحت فروش ہے
راحت فروش ہے تو مسرت فروش ہے
صد ہا دلوں کی حسرتیں وابستہ تجھ سے ہیں
کھوئی ہوئی مسرتیں وابستہ تجھ سے ہیں
پھر بھی مجھے ہے سالِ گذشتہ کا غم بہت
اس کی فنا سے دل پہ ہے بارِ الم بہت
مانا کہ خاک پر وہ پڑا ہے مٹا ہوا
اس کا خیال پھر بھی ہے دل میں بسا ہوا
اُف! وہ اجل نصیب کے زیرِ مزار ہے
اور تو درِ مزار پہ اب جلوہ بار ہے
اب وہ رفیقِ شام و سحر جا چکا، تو خیر
اس کو مٹا کے دہر سے تو آ چکا، تو خیر

آمد تری وطن کو مبارک ہو سالِ نو!
یہ روز و شب، یہ شام و سحر، دورِ حالِ نو!

غزل

(از نجمہ تصدق ایم اے۔ بی۔ ٹی)

اِس آئینہ میں عکسِ امروز فردا دیکھ لیتی ہوں
تری اُٹھّی جھکی نظروں میں کیا کیا دیکھ لیتی ہوں

کبھی دنیا کے اندر کچھ نظر آتا نہیں مجھ کو
کبھی اپنے ہی اندر ایک دُنیا دیکھ لیتی ہوں

کبھی تو کھینچتی ہوں اپنی ہی اُلفت کا خمیازہ
کبھی انگڑائی لے کر حُسن تیرا دیکھ لیتی ہوں

کبھی صحرا میں آتے ہیں نظر گُلزار کے جلوے
کبھی میں دامنِ گُلشن میں صحرا دیکھ لیتی ہوں

بجھی رہتی ہوں میں لیکن ہوائے کوئے جاناں سے
چراغِ زندگانی جھلملاتا دیکھ لیتی ہوں

مری دوشیزگی جب پھول بن کر مسکراتی ہے
گناہِ عشق کا دامن پہ دھبّا دیکھ لیتی ہوں

یہی آنکھیں جو بام و در سے آگے بڑھ نہیں سکتیں
انہیں آنکھوں سے دُنیا کا تماشا دیکھ لیتی ہوں

جسے اب تک چھپاتے اور گراتے ہی رہے شاعر
وہ جلوہ دیکھ لیتی ہوں وہ پردا دیکھ لیتی ہوں

مری آوارہ گردی ہے حریفِ منزلِ جاناں
اُسے میں کُو بہ کُو صحرا بصحرا دیکھ لیتی ہوں

فنا بھی ہے بقا بھی ہے نگاہِ شوقِ ساماں میں
عدم اندر عدم دُنیا میں دُنیا دیکھ لیتی ہوں

سمجھتی ہوں کہ یہ بھی اک فریبِ حُسن ہے لیکن
نگاہِ ناز میں شرحِ تمنّا دیکھ لیتی ہوں

سُنا ہے فیصلہ ہے عشق کا میری نگاہوں پر
اگر ہے بات اِتنی سی تو اچھّا دیکھ لیتی ہوں

وہ آنکھیں دیکھ کر میں ایک شانِ بے نیازی سے
قدح خانے میں سمتِ جام و مینا دیکھ لیتی ہوں

کہیں بیتابیاں کم ہو سکی ہیں قربِ جاناں سے
نگاہیں شاد ہو جائیں بس اِتنا دیکھ لیتی ہوں

کسی کے ڈبڈبائے آنسوؤں میں پچھلی راتوں کو
میں نجمہ اپنی قسمت کا ستارہ دیکھ لیتی ہوں

حرفِ راز

(از محترمہ عزیز جہاں بیگم آدا بدایونی)

کچھ بہکی بہکی آرزوئیں اشکوں کی کہانی کہتی ہیں
کچھ حسرتیں دل کے پردوں میں سہمی سہمی سی رہتی ہیں

کیا جانئے کس کی دین ہے یہ، کیا کہئے کس کا فیض ہے یہ
کچھ کلیاں کھِل کر ہنستی ہیں، کچھ مُرجھائی سی رہتی ہیں

کچھ اُلجھی اُلجھی آہیں ہیں، کچھ بکھرے بکھرے گیسو ہیں
کچھ اَن جانی راہوں کی طرف دیوانی ندیاں بہتی ہیں

جو حرف زباں تک آ نہ سکے، آنسو کا سہارا لیتا ہے
جو راز نگاہیں کہہ نہ سکیں، بھیگی ہوئی پلکیں کہتی ہیں

یہ راز ہے رازِ عشق آدا، اس راز کو کوئی کیا سمجھے
جو کوہ گراں بھی سہہ نہ سکے وہ کومل کلیاں سہتی ہیں

فلمی خبریں

(۱) بمبئی سینے ٹون کا تیار کیا ہوا فلم لال حویلی آج بھی نا ولٹی سنیما دہلی میں شائقین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس فلم کو مجموعی حیثیت سے ایک نہایت شاندار اور مقبول خاص وعام مشغول فلم کہنا چاہیے۔ اس کی روز افزوں مقبولیت کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ابھی یہ کب تک ارباب دلی کی ذوق کی تسکین کا سامان بنا رہے گا۔ فلم کی کہانی میں رومانیت کی چاشنی کے ساتھ ساتھ جو معاشرتی پس منظر ہے وہ ہر طرح لائق ستائش ہے۔ اداکاروں میں نورجہاں۔ الہٰاس، یعقوب اور کنہیالال کی اداکاری خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ رائل سنیما امرتسر میں بھی اس فلم کی مقبولیت کا کم و بیش یہی حال ہے۔

(۲) لکشمی آرٹ پروڈکشنز نے اپنے کلاسیکل فلم کادمبری پر نہ صرف بے دریغ روپیہ خرچ کیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اس روپیہ کا بالکل صحیح اور جائز استعمال بھی کیا ہے۔ فلم کی کہانی قدیم ہند کی ایک غیر معمولی دلچسپی رکھنے والی داستان ہے۔ فلم کی کہانی بادشاہ ہرش کے مشہور شاعر دربار "بانا" سے ماخوذ ہے۔ اس زمانہ کے حالات اور ماحول کو پوری سچ دھج کے ساتھ پیش کرنے میں کمپنی کے ارباب حل وعقد کو کیا کیا اہتمام نہ کرنا پڑے ہوں گے۔

(۳) سنٹرل سٹوڈیوز پکچرز کے زیر اہتمام مشہور و معروف ڈائرکٹر مسٹر سہراب مودی نے ایک نہایت کامیاب فلم پرکھ پیش کیا ہے۔ مسٹر سہراب مودی فلمی دنیا میں اتنا وسیع اور ساتھ ساتھ اتنی مدتوں کا تجربہ رکھتے ہیں کہ ان کی حیثیت اس دنیا میں ایک کہنہ مشق استاد کی سی ہے وہ مختلف نوعیتوں کے رنگا رنگ فلم پیش کر چکے ہیں۔ تازہ ترین فلم میں انکی مہارت فن اور جوہر شناسی اپنی تمام پختگی کے ساتھ نمایاں ہے فلم کی کہانی اردو کے مستند افسانہ نگار پنڈت سدرشن کی کاوش کا نتیجہ ہے جو ایک عرصے سے فلمی دنیا سے منسلک ہیں۔ اور اس سے قبل کئی کامیاب فلموں کی کہانی اور مکالمے لکھ چکے ہیں۔ اداکاری کیلئے مہتاب کا انتخاب کرنے کمپنی نے خوش مذاقی کا ثبوت دیا ہے۔ اس فلم میں جذبہ، ایثار، سوز و گداز، رومان و موسیقی ہر پہلو ایک دلکشی رکھتا ہے۔ یہ فلم ۲۰ ر جنوری سے رٹز دہلی میں شروع ہو گیا ہے دیکھنے والوں کا اشتیاق خود قابل دید ہے۔

(۴) فلمستان لمیٹڈ بمبئی کا پہلا شاہکار چل چل رے نوجوان جمعرات ۱۰ر جنوری سے نمائش کیلئے پیش کر دیا گیا ہے۔ تقسیم ایک عرصہ کے بعد پھر پردۂ فلم پر نمودار ہوئی ہے۔ اسکے ساتھ ساتھ اشوک کمار بطور ہیرو کام کر رہا ہے۔ سلور جوبلی فلمیں تیار کرنے والے گیان مکرجی نے بڑی محنت اور کوشش سے یہ فلم تیار کیا ہے۔ موسیقی ہندستان کے مشہور میوزک ڈائرکٹر ماسٹر غلام حیدر کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ سلائے بہادر چونی لال اور مکرجی پارٹی نے بمبئی ٹاکیز سے الگ ہو کر یہ پہلی تصویر تیار کی ہے یہ تصویر یقیناً ایک کامیاب اور لاجواب تصویر ہے۔

(۵) جینت ڈیسائی پروڈکشنز کی تصاویر ہمیشہ مقبولیت حاصل کرتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عوام اور خواص دونوں کے مذاق کے مطابق ہوتی ہیں۔ معشوق، شرارت، چھین جھپٹ کی ملکہ رتولا تلوار پروڈکشن کی مہربانی سے جینت ڈیسائی کے تازہ ترین شاہکار للکار میں جلوہ گر ہو رہی ہے۔ "للکار" شروع سے آخر تک مذاق اور رومان میں ڈوبی ہوئی کہانی ہے۔ سینریو اور مکالمے شاہ لطیف اور جے ایس کشیپ کے ہیں۔ ہدایت کاری جینت ڈیسائی کی ہے۔ موسیقی اور مکالمے نہایت موزوں اور موثر ہیں۔ اداکاروں میں ایشور لال۔ ہاما مکرجی اور مبارک کے نام قابل ذکر ہیں۔

(۶) پربھات پکچرز کا تاریخی شاہکار رام شاستری جس کا مدت سے انتظار ہو رہا تھا۔ ہندستان کے [illegible] شہروں میں ریلیز ہو رہا ہے۔ رام شاستری کی کہانی ایک ایسے شخص کی زندگی سے متعلق ہے جس نے آج سے دو سو سال پیشتر بے انصافی اور ظلم کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ جس کیرکٹر کی بلندی کے سامنے شاہانہ جاہ و جلال [illegible] اور [illegible]

[illegible] پر فخر کر رہی ہے۔ اور کرتی رہے گی۔ پربھات کے اس سنہری شاہکار کو عوام نے بہت پسند کیا ہے۔ ہدایت کاری بالکیوار کی ہے اور اداکاروں میں بالکیوار، بسنت، اچھا، آپٹے۔ للتا پوار۔ [illegible] کا کام نہایت لاجواب ہے۔ عکاسی حسب معمول ہے۔ [illegible] میں نہایت کامیاب [illegible]

(۷) نوین پکچرز قاندان کے خالق شوکت حسین نے دوست کو ڈائرکٹ کیا ہے۔ دوست کی کہانی دو دوستوں کی کہانی ہے۔ ایک ہندو ایک مسلمان [illegible] ایک، ایک طوائف کے پھندے میں پھنس [illegible] دوسرا دوست اسے اس طوائف سے الگ کرنے کیلئے اس طوائف کے ہاں جانا شروع کر دیتا ہے۔ جس سے دونوں کے تعلقات خراب ہو جاتے ہیں۔ آخر جبکہ ایک دوست کسی کی [illegible] انتقام کی [illegible] سامنے آکر دو گولی [illegible] ہے۔ شوکت حسین نے خود دوست کا پارٹ ادا کیا ہے۔ گانے اور موسیقی نہایت لاجواب ہے۔ اداکاروں میں موتی لال۔ نور جہاں شوکت حسین، بابا [illegible]، کنہیا لال۔ دتسلا کمٹیکر اور مزمار۔ مشرت کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

(۸) شوری پکچرز کی دوسری پنجابی تصویر کوئل جگت سینما میں دکھائی جا رہی ہے۔ کہانی بہت سادہ اور زبان بہت آسان ہے۔ ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ مجنوں "منگتی" کی طرح اپنے مزاح سے عوام کو کھینچنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ موسیقی ماسٹر گوبند رام کی ہے منورما اور ستیش کی اداکاری اور گانے قابل داد ہیں۔ اس کے علاوہ اداکاروں میں بیگ اور صدیق کا نام بھی قابل ذکر ہے۔ "کوئل" باوجود پنجابی زبان میں ہونے کے دلی میں بہت پسند کی گئی ہے۔

(۹) جینت دیسائی کا تیار کیا ہوا فلم زبان ان دنوں کھنہ ٹاکیز دہلی میں جوق در جوق آدمیوں کو کھینچ رہا ہے۔ مسٹر جینت دیسائی اس وقت ہندوستان کے چند گنے چنے فلم ڈائرکٹروں میں ہیں۔ ان کے ہر فلم سے شاندار توقعات وابستہ کی جا سکتی ہیں۔ اور انہوں نے کبھی فلم کے شائقین کو مایوس نہیں کیا ہے۔ چنانچہ یہ فلم بھی اپنی گوناگوں خوبیوں کی بدولت ایک نہایت کامیاب فلم ہے۔ اداکاروں میں ایشور لال۔ کوشلیا۔ اور [illegible] خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کہانی دلچسپ اور موسیقی ہر حیثیت سے مکمل ہے۔

(۱۰) نیو تھیٹرز [illegible] اپنے پس پشت عظیم الشان روایات رکھتی ہے۔ [illegible] ہندوستان کے دل و دماغ پر اس کے

فلموں کی دھوم مچ چکی ہے۔ اب اس کمپنی کا ایک اور نمایاں شاہکار میری بہن جگت سینما دہلی میں عنقریب پیش کیا جائے گا۔ اس فلم پر کمپنی کے ارباب حل و عقد نے خاص توجہ اور انہماک کا ثبوت دیا ہے۔ فلم کا ڈائرکشن مشہور معروف ڈائرکٹر مسٹر ہیم چندر کا حصہ ہے۔ کہانی "دلہن" کے شہرت یافتہ چٹرجی کی کاوش کا نتیجہ ہے۔ گانے مشہور ماہر فن مسٹر پنکج ملک نے خاص جانفشانی کے ساتھ فلم کی زینت کئے ہیں۔ یہ فلم نشاط لاہور میں خاص و عام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔

(۱۱) پنچولی آرٹ پکچرز لاہور کی اس مشہور و معروف فلم کمپنی نے شائقین فلم میں جو مقبولیت حاصل کر لی ہے وہ آپ اپنا جواب ہے۔ اور نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کمپنی ہر حیثیت سے اس مقبولیت کی مستحق ہے شمالی ہندوستان کا یہ فلمی ادارہ آج تمام ہندوستان میں توجہ کا مستحق بنا ہوا ہے۔ اس کمپنی نے پچھلے دنوں اپنے تازہ فلم کیسے کہوں میں اپنی تمام بہ یدگر شاندار روایات کو برقرار رکھا ہے۔ اس فلم کا ڈائرکشن مسٹر [illegible] کی کوشش و توجہ کا نتیجہ ہے۔ فلم میں سرحد کے عجیب و غریب اور ولولہ انگیز واقعات نہایت دلکشی اور اثر آفرینی کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ موسیقی پنڈت امرناتھ کی پیش کردہ ہے۔ اداکاروں میں راگنی اور جاگیردار کے علاوہ نجم۔ اختر۔ پران۔ درگا موٹے اور جی۔ این بٹ کے نام بھی قابل ذکر ہیں۔ فلم مجموعی طور پر ایک نہایت کامیاب فلم ہے۔

اس کمپنی کی ایک دوسری شاندار پیشکش **شیریں فرہاد** خاص توجہ کی مستحق ہے۔ اس فلم کو جائز طور پر پنچولی کی ایک یادگار کارنامہ سمجھنا چاہیئے۔ فلم کی کہانی پوری تاریخی صداقت کے ساتھ پیش کرنے کے لئے تمام مطلوبہ لٹریچر کی ریسرچ کی گئی ہے۔ اس دور کے شاہانہ ماحول کو پیش کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔

معتبر ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ اس فلم پر بے دریغ روپیہ صرف کیا گیا ہے۔ اور اس فلم کو کامیاب طور پر پیش کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی ہے۔ اس فلم کے ڈائرکٹر مسٹر پرہلاد دت ہیں۔ فلم میں جینت۔ راگنی اور غلام محمد نے نہایت کامیاب اداکاری کا ثبوت دیا ہے۔

اس فلم کی یادگار مدتوں تک دلوں سے محو نہ ہوگی۔

بچت کا دو ہفتہ

۸ جنوری سے ۲۲ جنوری تک

اب سے کئی برس بعد آپ ان دو ہفتوں کو یاد کر کے خود کو مبارکباد کا مستحق سمجھیں گے "یہی وہ دن تھے جب میں نے اپنی آیندہ خوشحالی کی بنیاد رکھی۔ اپنے مستقبل کی طرف سے بے فکری کا سامان اور اپنے بچوں کی تعلیم کا بندوبست . . . "

مگر اطمینان کر لیجئے کہ آپ کی بچت محفوظ ہے۔ گورنمنٹ سیکیورٹیز (سرکاری قرضوں) میں روپیہ لگائیے ان کے متعلق ضروری معلومات یہاں درج کی جاتی ہیں۔

جتنا بچا سکیں بچائیے اور جو بچائیں اسے نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹس یا وکٹری لون میں لگائیے

وکٹری لون

جتنی رقم کے چاہیں خریدیں۔ کوئی حد مقرر نہیں ۱۹۵۷ء میں اصل رقم واپس مل جائیگی۔

۳ فی صدی منافع ملتا ہے۔

ضرورت پر جب چاہیں آسانی سے فروخت کر سکتے ہیں۔

ہندوستان میں امپیریل بینک آف انڈیا کی کسی شاخ ریزرو بینک آف انڈیا یا کسی سرکاری خزانے ٹریژری یا سب ٹریژری سے خریدا جا سکتا ہے۔

نیشنل سیونگز سرٹیفکیٹس

آپ ۵۰۰۰ روپے تک کے سرٹیفکیٹ خرید سکتے ہیں اور چاہیں تو تین سال بعد بھنا سکیں گے

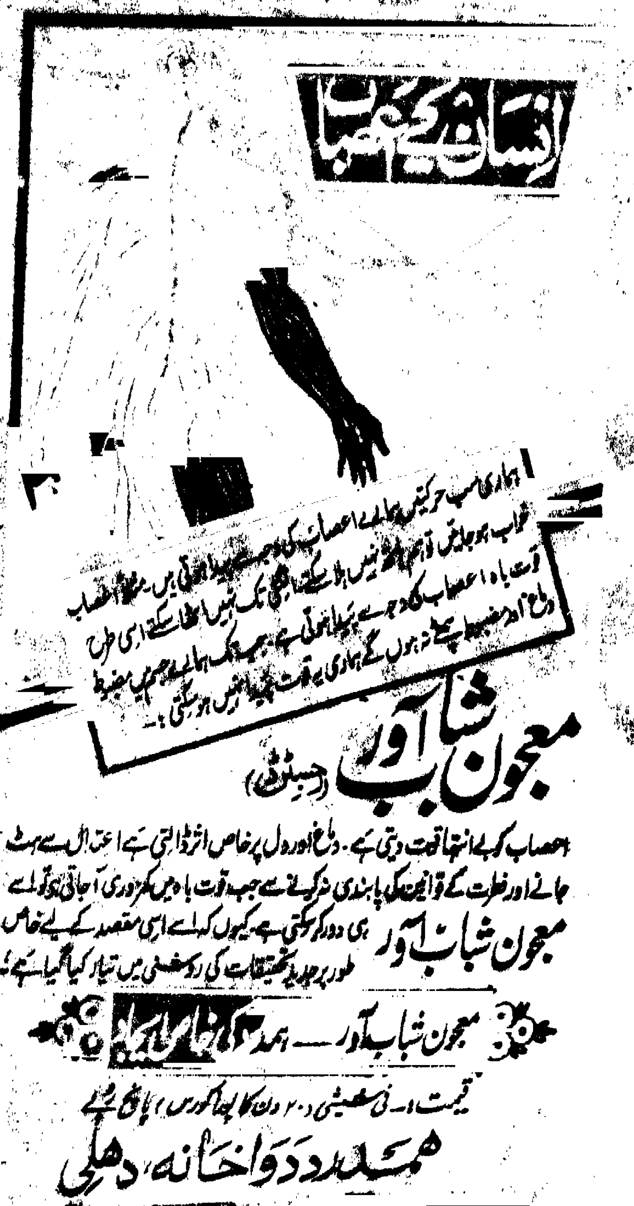
آپ کو ہر دس روپے کے بدلے بارہ سال بعد پندرہ روپے ملیں گے۔ اسکے معنی ہیں ۴ فی صدی منافع

انکم ٹیکس معاف

حکومت کے مقرر کردہ ایجنٹوں سیونگز بیورو یا ڈاکخانے سے مل سکتے ہیں۔

روپیہ بچانے کا یہی وقت ہے

نیشنل وار فرنٹ صوبہ دہلی


انسان کے اعصاب
ہماری سب حرکتیں ہمارے اعصاب کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ مثلاً اعصاب خراب ہو جائیں تو ہم ہاتھ نہیں ہلا سکتے انگلی تک نہیں اٹھا سکتے اسی طرح قوت باہ اعصاب کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ جب تک ہمارے جسم میں مضبوط دماغ اور مضبوط پٹھے نہ ہوں گے ہماری یہ قوت پیدا نہیں ہو سکتی ہے۔
معجون شباب آور (رجسٹرڈ)
اعصاب کو بے انتہا قوت دیتی ہے۔ دماغ اور دل پر خاص اثر ڈالتی ہے اعتدال سے ہٹ جانے اور فطرت کے قوانین کی پابندی نہ کرنے سے جب قوت باہ میں کمزوری آ جاتی ہو تو اسے
معجون شباب آور
ہی دور کر سکتی ہے۔ کیوں کہ اسے اسی مقصد کے لیے خاص طور پر جدید تحقیقات کی روشنی میں تیار کیا گیا ہے۔
معجون شباب آور — ہمدرد
قیمت :- فی شیشی (۲۰ دن کا پورا کورس) پانچ روپے
ہمدرد دواخانہ، دہلی

COURAGE &

SACRIFICE



Mehtab

IN

PARAKH

with

KAUSHALYA • BALWANT SINGH

YAKUB • SHAHNAVAZ • SADIQ ALI

★ A CENTRAL STUDIOS PICTURE

ایشیا کے سب سے بڑے نگارخانہ سنٹرل اسٹوڈیوز کا

اوّلین شاہکار

"پکار" "سکندر" اور "پرتھوی ولبھ" کے خالق

مسٹر سہراب مودی کا قابلِ فخر کارنامہ

پرکھ

ڈائرکشن — سہراب مودی

کہانی :- پنڈت سدرشن

گانے :- علامہ آرزو لکھنوی

:- ستارے :-

مہتاب۔ کوشلیا۔ بلونت سنگھ۔ یعقوب۔ شاہ نواز۔ صادق علی۔ پرتھیادیوی

رٹز سینما دہلی میں نہایت کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے

جاری کردہ :- دیسائی اینڈ کمپنی۔ دہلی

یہی آئین قدرت ہے یہی مطلوب فطرت ہے — جو ہے راہ عمل میں گامزن محبوب فطرت ہے

بمبئی کی عظیم الشان ملکہ نورجہاں پری چہرہ نسیم مدت دراز کے بعد

فلمستان لمیٹڈ کے لازوال سوشل شاہکار

چل چل رے نوجوان



معہ اشوک کمار۔ دیسائی جگدیش، موتی بائی وغیرہ

پروڈیوسر:۔ ششدھر مکرجی — ڈائرکٹر:۔ گیان مکرجی

موسیقار:۔ غلام حیدر

اس لاجواب تصویر نے بمبئی میں گذشتہ دو مہینہ سے
ایک تہلکہ مچا رکھا ہے

جمعرات ۷ جنوری سے جوبلی ٹاکیز دہلی میں ملاحظہ فرمائیے

روزانہ :۔ ۳½، ۶¾ اور ۱۰ بجے
جمعہ، ہفتہ، اتوار کو ایک زائد شو گیارہ بجے دن

جاری کردہ:
جنرل ٹاکیز لمیٹڈ۔ دہلی، لاہور

ایک اولوالعزم اور ذی ہمت شخص کی یادگار [illegible]

جس نے

دنیا کی ہر شے کو اپنی چھوٹی بہن کی خاطر قربان کردیا

نیو تھیٹرز کے چمکتے ہوئے ستاروں کی عظیم الشان فلم

بڑی بہن

افسانہ [illegible]

ناشر [illegible] ڈسٹری بیوٹرز - دہلی - لاہور - کراچی

اپنی زبان پر قائم رہنے والے ایک نوجوان کی ... داستان

زبان

ڈائرکٹر جینت دیسائی

نغموں۔ رقص و مزاح سے لبریز تحفہ

اداکاران:-
ایشور لال۔ کملا
مبارک۔ جینت
وتسلا کمٹیکر

تیسرا کامیاب ہفتہ

گھنٹہ ٹاکیز دہلی میں

جاری کردہ:-
وادیا پیرا ماؤنٹ پکچرز۔ دہلی — لاہور

پنچولی کی قابلِ یادگار پیش کش

شیریں فرہاد

ڈائرکٹر:-
پرہلاد دت

دلگداز افسانہ — یادگار رومان

بیش قیمت ساز و سامان

اداکاران:-
راگنی — جینت
غلام محمد

جاری کردہ
ایمپائر ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز۔ دہلی و لاہور

دیوانی فارم نمبر ۶ C.O.D. 26

اشتہار زیر دفعہ ۵ رول ۲ مجموعہ ضابطہ دیوانی

بعدالت جناب سید بشیر احمد صاحب بخاری تحصیلدار اسسٹنٹ کلکٹر درجہ اول جگادھری ضلع انبالہ

دعوی ۱۵

کرشن لال ولد کشمیری لال ویشں بوڑیہ بنام نیم چند وغیرہ

دعویٰ درخواست تقسیم آراضی مالیہ ۱۵ گ مندرجہ کھیوٹ ۶ واقعہ رقبہ موضع نابھ

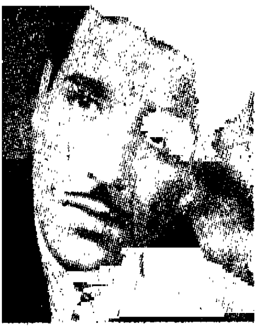
بنام مسماۃ شانتی بیوہ تارا چند۔ نیم چند پسر پیارے لال ویش سکنائے بوڑیہ تحصیل جگادھری

مقدمہ مندرجہ عنوان بالا میں مسمیان مسماۃ شانتی و نیم چند مذکور تعمیل سمن سے دیدہ و دانستہ گریز کرتے ہیں۔ اور روپوش ہیں۔ اس لئے اشتہار ہذا بنام مسماۃ شانتی و نیم چند مذکور جاری کیا جاتا ہے کہ اگر مدعاعلیہم مذکور تاریخ ۵ ماہ فروری ۱۹۴۵ء کو مقام جگادھری حاضر عدالت ہذا نہیں ہونگے تو اس کی نسبت کارروائی یکطرفہ عمل میں آویگی۔

آج بتاریخ ۱۹ ماہ دسمبر ۱۹۴۴ء کو بدستخط میرے اور مہر عدالت کے جاری ہوا۔

دستخط
(بخط انگریزی)

مہر عدالت







مدھوبالا

دلیپ '' جواربھاٹا '' آغا

میں



راگنی - فلم '' شیریں فرہاد '' میں



شانتا آپٹے فلم '' کادمبری '' میں

Regd. L No. 4796 December 19

THE ADEEB

DELHI.

1. It is a purely literary monthly Magazine of high standing.
2. It is published regularly on the tenth of each month
3. Annual subscription of the Adeeb is Rs. 10/- only; single copy Rupee one
4. The Adeeb is posted with great care but if you don't get a copy by the 15th. please write to the office at once. If available, an extra copy will be sent to you again. Complaints received after the 18th will not be attended to.
5. All communications should be addressed to the Editor.
6. Free or sample copies of the Adeeb are not sent. For a sample copy always send the necessary stamps in advance.
7. Contributions not published in the Adeeb can be returned on receipt of the necessary stamps.
8. Always send extra stamps for a reply.
9. The Adeeb is not issued for less than a year.

Printed at Dayals' Printing Press, Chandni Chowk, Delhi
Edited by Fasi-ud-din Ahmed M.A. and M. I. Wahidi & Published from the office of The Adeeb, Chandni Mahal Delhi

THE ADEEB DELHI

ادیب

(دہلی)





سمترا - نیو تھیٹرز کے فلم ''سہری اجل'' میں



''پرکھ'' میں

قیمت فی کاپی :۔ ایک آنہ پیسہ علاوہ محصول

... روپے علاوہ محصول

ادیب دہلی

اڈیٹرز:۔

سید محمد ارتضیٰ واحدی — نصیح الدین احمد ایم اے — (آنسہ) نجمہ تصدق ایم اے، بی ٹی

جلد ۸	فروری ۱۹۴۵ء	نمبر ۴

فہرست مضامین

[illegible]

جنگی سپلائی

(از حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب مدظلہ)

اردو اور فارسی زبان میں سپلائی کو رسد کہتے ہیں۔ سپلائی لفظ کا پورا ترجمہ رسد رسانی بھی ہوسکتا ہے۔

مصری رسد رسانی

ہر زمانے میں لڑائی کے وقت رسد کا انتظام مختلف طریقوں کا ہوتا آیا ہے۔ دُنیا کی بہت بڑی قوم مصری قوم کہی جاتی ہے جس کی پُرانی تاریخ پر میں نے ابھی حال میں ایک کتاب لکھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصری قوم جب پڑوس کے یا دُور کے ملکوں پر حملہ کرتی تھی تو پہلے رسد کا انتظام کیا جاتا تھا۔ گر مصر کی پُرانی تاریخ سے ایک دلچسپ بات یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ مصری قوم اگرچہ اپنے وقت کی قوموں میں سب سے زیادہ تہذیب یافتہ اور طاقتور قوم تھی۔ پھر بھی جنگی ساز و سامان کے لحاظ سے عرب کی ایک وحشی قوم ہیکسوس نے اس کو بہت بڑی شکست دی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ عرب ہیکسوس کے پاس جو حضرت اسمٰعیل پیغمبر کی نسل میں سے تھے گھوڑے بہت اچھے تھے اور جنگی رتھ بھی تھے۔ لیکن مصریوں کے پاس نہ اچھے گھوڑے تھے نہ جنگی رتھ تھے۔ اس لئے مصری حکومت ہیکسوس کے حملے کی تاب نہ لاسکی۔ اور ہار گئی اور ہیکسوس عربوں نے پُورے ملک مصر پر قبضہ کرلیا۔

سکندر کی رسد

سکندر نے جب ہندستان پر حملہ کیا تو رسد رسانی اور سپلائی کا انتظام یہ کیا تھا کہ درۂ خیبر اور پشاور کے اطراف میں چند جرنیل مقرر کئے تھے جو لگاتار رسد کا سامان جہلم کی طرف بھیجتے رہتے تھے۔ ہندو راجہ پورس کا انتظام رسد رسانی اچھا نہ تھا اور اسکیلے راجہ پر اتنے بڑے دشمن کی یلغار روکنے کا بوجھ پڑ گیا تھا۔

ہندوؤں میں ذات پات کی تقسیم ہے منوجی نے دھرم شاستر یعنی منوسمرتی میں چاروں ذاتوں کے کام تقسیم کر لیئے ہیں۔ برہمنوں کا کام مذہبی رہنمائی اور چھتریوں کا کام جنگ اور حکومت کرنا بتایا تھا۔ اور ویشوں کا کام تجارت اور کاشتکاری مقرر کیا تھا۔ اور شودروں کا کام تینوں ذاتوں کی خدمتگاری کرنا تھا یہ تقسیم عملاً بظاہر بہت اچھی تھی۔ مگر اس کا ایک نقصان یہ تھا کہ جب ہندستان پر حملہ ہوتا تھا [illegible] وجہ پڑ جاتا تھا اور تین ذاتیں بھی جو [illegible] شودر تھیں وہ الگ تماشہ دیکھا کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اکثر اوقات چھتری ہار جاتے تھے۔

چنانچہ جہلم دریا کے کنارے سکندر اور راجہ پورس کی لڑائی ہوئی راجہ کے پاس جنگی رتھ موجود تھے۔ مگر پورس کے جنگی رتھ نا[illegible] تھے۔ اور رسد رسانی کا انتظام بھی خراب تھا۔ اس واسطے پورس کو شکست ہوئی۔ تاہم سکندر کی فوجوں پر ہندستانی جنگی طاقت کی ایسی ہیبت چھائی کہ اس نے آگے بڑھنے سے انکار کردیا جس سے ظاہر ہوا کہ رسد رسانی کی خرابی کے باوجود راجہ پورس کی پروپیگنڈا کی طاقت سکندر سے بڑھی ہوئی تھی۔

سری کرشن جی

جب سری کرشن جی کے ہاتھ سے اُن کا ماموں راجہ کنس مارا گیا تو کنس کے سالے راجہ جراسندھ نے کرشن جی پر حملہ کیا اور بڑے ساز و سامان سے متھرا پر آیا کرشن جی کی رسد رسانی کا انتظام اچھا نہیں تھا۔ اس لئے کرشن جی کو شکست ہوئی۔

رام چندر جی

رام چندر جی نے بن باس یعنی ترک وطن کے زمانے میں لنکا کے برہمن راجہ راون پر چڑھائی کی تو صوبہ مدراس کی جنگلی قوموں کو جمع کیا جن کا سردار ہنومان تھا اور ہنومان نے سب سے پہلے رسد کا انتظام کیا۔ رامائن کی بعض عجیب حکایتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ زخمیوں کے علاج کیلئے اچھا انتظام نہ تھا اور رام چندر جی کو معلوم ہوا کہ شملے پہاڑ پر ایسی بوٹیاں پیدا ہوتی ہیں جو زخمیوں کو فوراً اچھا کردیتی ہیں۔ پس نے ہنومان جی شملے پر آئے اور یہاں وہ بوٹیاں تلاش کیں اور جب ان کو بوٹیوں کی پہچان میں دشواری ہوئی۔ تو وہ پہاڑ کا ایک ٹکڑا اُکھاڑ کر اپنے ساتھ لے گئے چنانچہ موجودہ شملے میں ایک مقام ٹوٹی کنڈی کہلاتا ہے۔ اور ہندوؤں کا اعتقاد ہے کہ ہنومان جی یہاں سے پُورا پہاڑ اُٹھا کرلے گئے تھے۔

لنکا اور مدراس کے درمیان سمندر کی ایک کھاڑی ہے۔ جہاں رام چندر جی نے ہنومان جی کی امداد سے ایک پل بنایا تھا۔ اور اس پل کے پتھر اب تک وہاں پڑے ہوئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہنومان جی نے لنکا میں جاکر آگ لگا دی تھی ان اعتقادی کہانیوں سے قطع نظر کرنیکے بعد بھی یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ ہنومان جی میں رسد رسانی اور جنگی انتظامات کی قابلیت بہت زیادہ تھی۔

رسولِ خدا

مسلمانوں کے رسولؐ کو جب پہلی لڑائی مدینے کے قریب بدر کے میدان میں پیش آئی تو اُن کی فوج میں صرف تین سو تیرہ آدمی تھے اور دشمن کی فوج میں ایک ہزار آدمی تھے۔ اور دشمن کے پاس بہت گھوڑے اور

بہت سے اونٹ تھے اور دشمنوں کا انتظام رسد رسانی بہت ہی اچھا تھا۔ مگر مسلمانوں کے بے سروسامانی اتنی بڑھی ہوئی تھی کہ نہ گھوڑے تھے نہ سواریاں تھیں۔ صرف چند گھوڑے اور چند اونٹ تھے جن پر باری باری مسلمان سوار ہوتے تھے اور رسد کا انتظام یہ تھا کہ کچھ ستو اور کھجوریں ساتھ تھیں۔ روزانہ ایک ایک کھجور ایک ایک مسلمان کو ملتی تھی لیکن جنگ کا نقشہ مسلمانوں کے رسولؐ خدا نے ایسا بنایا تھا کہ ان تین سو تیرہ بے سروسامان مسلمانوں نے ایک ہزار دشمنوں کو مغلوب کر لیا۔

اس لڑائی میں رسولؐ خدا نے پانی کی سپلائی کا بہت اچھا انتظام کیا تھا یعنی بدر کے چشمے سے پانی نکلوا کر میدان جنگ میں ایک کچا حوض بنوا دیا تھا اور اس میں پانی بھروا دیا تھا اور پانی پینے کے لئے لکڑی کے پیالے رکھوائے تھے تاکہ مسلمان لڑائی کے وقت اس میں سے پانی پیتے رہیں۔

یرموک کی لڑائی

رسولؐ خدا کی وفات کے بعد پہلے اور دوسرے خلیفہ کے زمانے میں جو لڑائیاں ہوئیں ان میں سب سے بڑی لڑائی یرموک کے میدان میں ہوئی تھی۔ مقابلہ پوری رومن امپائر سے تھا جو یورپ اور ایشیا کی فوجیں لائے تھے جن کی تعداد دس لاکھ تھی اور ہر قسم کا سامان رسد ان کے پاس تھا ان دس لاکھ سپاہیوں میں رومی یعنی اٹالین بھی تھے اور ارمنی بھی تھے اور ان دس لاکھ کے علاوہ ساٹھ ہزار عرب عیسائی بھی تھے۔ جن کو رومی کمانڈر نے سب سے آگے رکھا تھا۔

مسلمانوں کی تعداد کل ساٹھ ہزار تھی اور وہ ایسے مقام پہنچے کہ ان کی پشت پر بہت سے شہر رومیوں کی حکومت کے تھے جن کو مسلمانوں نے پہلے فتح کر لیا تھا اور ان شہروں سے مسلمانوں کو رسد ملتی تھی۔ جب اتنی فوج سامنے آگئی تو مسلمانوں کے نئے سپہ سالار ابن جراحؓ نے معزول شدہ پرانے سپہ سالار خالدؓ بن ولید کو اور سب مسلمان سرداروں کو جمع کر کے مشورہ کیا اور کہا سب سے زیادہ مشکل ہم کو یہ پیش آئیگی کیونکہ جن شہروں سے رسد آتی تھی وہ سب پہلے رومیوں کے تھے اور ہم نے ابھی حال میں ان پر قبضہ کیا ہے۔ اس بڑی رومی فوج کی خبر سنکر رومی شہر رسد بھیجنی بند کر دینگے اور ہوسکتا ہے کہ لڑائی کے وقت وہ ہماری پشت پر حملہ کریں اس کا کیا انتظام کرنا چاہیئے؟ خالدؓ بن ولید نے جواب دیا اس کا انتظام بہت آسان ہے۔ ابھی سب شہروں کے پاس قاصد بھیجے اور لکھئے کہ اب تک تم سب ہمارے محکوم اور ہماری رعایا تھے اور ہم نے تمہاری حفاظت کا ذمہ لیا تھا لیکن اب چونکہ ہم خود اپنی حفاظت کو خطرے میں دیکھتے ہیں اس واسطے ہم اپنے خلیفہ کے نام پر تم سب کو آزادی دیتے ہیں۔ اور اب تم ہماری رعایا نہیں ہو بلکہ خود مختار اور آزاد ہو ہم پہلے بھی اپنی ضرورت کی چیزیں قیمت دیکر لیتے تھے اور آئندہ بھی اس آزادی دینے کے بعد اتنی ہی قیمت پر چیزیں خریدیں گے جتنی قیمت پر پہلے خریدتے تھے۔ اگر تم خوشی سے یہ چیزیں ہمارے ہاتھ فروخت کرنا نہ چاہو تو ہم کو صفائی سے لکھدو تاکہ ہم دوسری جگہ سے انتظام کر لیں اور تم کو رسد رسانی کیلئے مجبور نہ کریں۔

جب قاصد لوگ یہ خط لیکر گئے تو مفتوح شہر والوں پر اس کا بہت اچھا اثر ہوا اور ان سب نے جواب دیا کہ ہم پہلے سے زیادہ رسد کا سامان تم کو بھیجیں گے اور ضرورت پڑیگی تو تم کو فوجی مدد بھی دینگے۔

سپلائی کا بندوبست کرنے کے بعد لڑائی شروع ہوئی اور پہلے ساٹھ ہزار عرب عیسائی مقابلے میں آئے۔ سپہ سالار ابن جراحؓ نے دوبارہ خالدؓ ابن ولید سے مشورہ کیا۔ خالد نے جواب دیا میں ساٹھ مسلمان اپنے ساتھ لیجا کر ساٹھ ہزار کا مقابلہ کرونگا۔ ابن جراح نے جواب دیا۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے۔ کہ لڑائی سے پہلے تم اپنے بچاؤ کا انتظام کرو اور رسد کا انتظام کرو اس پر ہم نے عمل کر لیا اور قرآن میں یہ بھی ارشاد ہے۔

خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا

پہلے اپنے بچاؤ کا بندوبست کر لو پھر حملے کے لئے بڑھو۔ دستہ دستہ بن کر یا سب مل کر۔ مگر اس سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ ساٹھ ہزار کے مقابلے میں ساٹھ آدمی جائیں۔ البتہ سورۃ انفال میں خدا نے یہ فرمایا ہے کہ اگر تم میں بیس ثابت قدم آدمی ہونگے تو وہ دو سو دشمنوں پر غالب آجائیں گے۔ اور اگر تم میں سو آدمی ثابت قدم ہونگے تو وہ ہزار پر غالب آجائیں گے اور اس کے بعد یہ ارشاد ہوا کہ اگر تم میں ثابت قدم آدمی کم ہوں تو سو آدمی دو سو پر غالب آئیں گے اور ہزار آدمی دو ہزار پر غالب آئیں گے اس لحاظ سے ساٹھ آدمی ساٹھ ہزار کے مقابلے میں لیجانے ٹھیک نہیں ہیں بلکہ ان کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔

خالد ابن ولید نے جواب دیا اس میں ایک فوجی مصلحت ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر میں اپنے ہم قوم عرب عیسائیوں کے مقابلے میں ساٹھ آدمی لیکر گیا اور مارا گیا اور میرے ساتھی بھی مارے گئے تو ہم کو صرف بے عقل کہا جائیگا۔ اور اگر ہم ساٹھ آدمیوں نے ساٹھ ہزار کو شکست دیدی تو دس لاکھ سپاہیوں کی فوجیں جو سامنے کھڑی ہیں ان کے دل ٹوٹ جائیں گے اور وہ بغیر لڑائی کے ہار جائیں گے۔

آخر ابو عبیدہ ابن الجراحؓ نے خالد کو اجازت دیدی اور انہوں نے ساٹھ آدمیوں سے ساٹھ ہزار کا مقابلہ کیا اور ساٹھ ہزار عرب عیسائیوں کو جن کا کمانڈر جبلہ بن الہیم تھا پوری شکست دی جس سے دس لاکھ رومیوں کی ہمتیں پست ہوگئیں۔

دوسرے دن دس لاکھ سے مقابلہ ہوا اور ساٹھ ہزار مسلمان مقابلہ پر تھے ایک بڑی خونریزی کے بعد مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ مسلمانوں کی فوج کی پشت پر آگئی

عورتیں رسد کا انتظام کرتی تھیں۔ زخمیوں اور مجروحوں کو میدان جنگ سے لاتی تھیں۔ سپاہیوں کو پانی پلاتی تھیں اور روٹی پکا کر میدان جنگ کے وقت پہنچاتی تھیں۔ عورتوں نے دیکھا کہ مسلمان فوج نے بھاگنا شروع کیا تو وہ سب لڑائی کیلئے تیار ہو گئیں۔ آدھی عورتوں نے اپنے بچے مردوں کو دکھائے کہ ان کو چھوڑ کر کہاں بھاگتے ہو؟ اور کچھ عورتوں نے اپنے مردوں کے گھوڑوں کے چہروں پر لکڑیاں ماریں اور ان کو بھاگنے سے روکا اور کچھ عورتیں ہتھیار لیکر رومی فوج کے مقابلے کے لئے آگے بڑھیں اور صفوں کے اندر گھس کر لڑنے لگیں۔ یہ حالت دیکھ کر مسلمان مرد اُلٹے پھرے اور انہوں نے پھر بڑے جوش سے حملہ کیا۔ یہاں تک کہ دس لاکھ رومیوں کو شکست دی اور ہمیشہ کے لئے رومن امپائر کی فوجی طاقت کا ملک شام میں خاتمہ ہو گیا۔

جنرل طارق

اسپین میں جب مسلمان فوجیں جہازوں کے ذریعہ بھیجی گئیں۔ تو سپہ سالار طارق نے حکم دیا کہ جن جہازوں میں ہم آئے ہیں ان کو آگ لگا کر ڈبو دیا جائے۔ اس پر اعتراض کیا گیا تو طارق نے جواب دیا اب ہم کو اسپین سے واپس جانا نہیں ہے یا اس ملک کے مالک بن جائینگے اور یا مر جائینگے اس واسطے ہمیں جہازوں کو باقی رکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ رسد کا جو سامان ان کے ساتھ تھا وہ چند روز اُن کے کام آیا اور اس کے بعد انہوں نے اسپین کے دیہات سے اپنی رسد جمع کر لی۔

صلاح الدین ایوبی

صلیبی لڑائیوں کے وقت تمام یورپ کے بادشاہ اور رعایا کے بہت سے لوگ بیت المقدس کو مسلمانوں کے قبضے سے چھڑانے کے لئے جمع ہوئے تھے اور ہر قسم کا سامان رسد اپنے ساتھ لائے تھے فلسطین کا بادشاہ صلاح الدین ایوبی اکیلا تھا اور اطراف کے مسلمان بادشاہوں سے کسی قسم کی کمک اس کو نہیں پہنچی تھی مگر اس اکیلے نے پہلے قرآن کے حکم کی بموجب رسد کا انتظام کیا اور بچاؤ کا انتظام کیا اس کے بعد سارے یورپ کی فوجوں سے لڑا اور ان کو شکست دی۔

منگولوں کا مورث اعظم چنگیز خاں

سب کو معلوم ہے کہ منگول اور ترکوں کا مورث اعظم چنگیز خاں تھا اور وہ مسلمان تھا۔ وہ جب باہر کے ملکوں پر حملے کرتا تھا تو پہلے رسد کا سامان جمع کرتا تھا جو فوج کی پشت پر رہتا تھا اور جب اس کی اولاد نے مسلمان ملکوں کو مغلوب کیا تو اس وقت بھی وہ سب سے پہلے رسد کا انتظام کرتے تھے۔

مگر میں آج کے مضمون میں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ مغلوں کی رسد کا سامان کیسا ہوتا تھا اور کیا ہوتا تھا۔ کیونکہ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ کوئی لڑائی رسد کے انتظام کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ مگر تاریخوں میں سامان رسد کی تفصیلات پوری طرح درج نہیں لیکن جو حالات پر غور کرنے سے معلوم ہوسکتے ہیں وہ یہ کہ مغل لوگ گھوڑوں کے لئے گھاس دانہ اپنے ساتھ لیکر چلتے تھے اور گھوڑوں کا انتظام کرتے تھے۔ غلہ کچھ ساتھ رہتا تھا اور کچھ وقت پر دشمن کے ملک سے چھین لیتے تھے اور گوشت کے لئے اونٹ اور گائے بیل اور دُنبے اور بھیڑیں اور بکرے ساتھ ہوتے تھے یا وقت کے وقت لوٹ کر جمع کئے جاتے تھے۔

ہندستان میں سُلطان محمود غزنوی نے سولہ حملے کئے سومنات کے حملے کے وقت اس نے پانی اور گھاس کا بہت اچھا انتظام کیا تھا کیونکہ وہ گجرات اور سندھ کے ریگستان سے گذر کر سومنات تک گیا تھا۔

شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج کو شکست دیکر اپنے ایک ترک غلام قطب الدین ایبک کو ہندستان دیدیا تھا۔ ایبک کے بعد شمس الدین التمش بادشاہ ہوا اور پھر غیاث الدین بلبن ہوا اور پھر معز الدین کیقباد ہوا۔ اور اس ترک خاندان کی حکومت کے بعد جلال الدین خلجی نے خلجی خاندان کی حکومت قائم کی اور اس کے بعد تغلق خاندان کی حکومت رہی اور اس کے بعد لودھی خاندان کی حکومت ہوئی۔

مذکورہ خاندانوں کی حکومت کے زمانے میں تاتاری مغل ہر سال ہندستان پر حملہ کرتے آتے تھے۔ اور بڑی بڑی فوجیں لاتے تھے اور ہمیشہ ان کی رسد کا یہی انتظام ہوتا تھا۔ کہ گھوڑوں کے لئے گھاس دانہ اور سپاہیوں کے لئے غلہ اور گوشت کے جانور ساتھ رہتے تھے۔ یا ہندستان میں آکر لوٹ لیتے تھے۔

امیر تیمور نے ہندستان پر حملہ کیا تو تغلق خاندان کے آخری بادشاہ کی حکومت تھی اور دلی میں دو بادشاہ بنے ہوئے تھے۔ جس سے تیمور نے فائدہ اٹھایا اور فتح پائی۔ امیر تیمور کے ساتھ سپلائی کا سامان بس اتنا ہی رہتا تھا جتنا اس کے مورثوں کے زمانے میں ہوتا تھا۔ البتہ جب وہ فرانس کے اشارے سے ترکی حکومت کے سلطان یلدرم بایزید خاں کے خلاف مہم پر گیا تو اس نے رسد کا بہت بڑا انتظام کیا تھا یعنی غلہ اور گوشت کے جانور بہت زیادہ ساتھ لئے تھے۔

بابر

جب رانا سانگا کے اشارے سے بابر ہندستان میں آیا تو اس کے پاس فوج بہت کم تھی۔ اور رسد کا سامان بھی کم تھا۔ ابراہیم لودھی ایک لاکھ فوج اور پورے ساز و سامان کے ساتھ مقابلہ کرنے کیلئے پانی پت پر پہنچا۔ اور وہاں لڑائی ہوئی۔ لیکن بابر نے باوجود سامان رسد کی کمی اور فوج کی کمی کے اور میدان پر فتح پائی۔

ہمایوں

ہمایوں کے مقابلے میں شیر شاہ سوری کھڑا ہوا تو شیر شاہ کا انتظام رسد رسانی ہمایوں سے بہت زیادہ اچھا تھا۔ ہمایوں نے شکست پائی

شیر شاہ سوری ہندوستان کا شہنشاہ بن گیا۔ تو اس نے سب سے پہلے سرحد سے بنگال تک ایک سڑک بنوائی اور جگہ جگہ قلعے بنوائے۔ اور ہر قلعے میں رسد کا بہت اچھا انتظام کیا۔ اور جب ہمایوں شیر شاہ اور سلیم شاہ کے مرنے کے بعد ہندوستان پر دوبارہ قابض ہوا تو اس نے شیر شاہ کے انتظامات سے سبق لیکر اپنی رسد رسانی کے انتظامات کو از سر نو درست کیا۔

ہیمو بقال

ہمایوں کے مرنے کے بعد افغان حکومت کا ایک ہندو نوکر ہیمو بقال فوجیں لیکر ہمایوں کے جانشین اکبر سے لڑنے آیا۔ اس وقت ہندوستان میں کال پڑا ہوا تھا۔ اور بنگال کی تازہ قحط سالی سے زیادہ مصیبت ہندوستان میں تھی۔ ہزاروں آدمی روزانہ بھوک سے مر جاتے تھے اور جگہ جگہ عورتوں اور بچوں کی لاشیں پڑی ہوئی سڑ رہی تھیں۔ مگر ہیمو بقال کا انتظام رسد رسانی یہ تھا کہ اس نے جون پور سے جب حرکت کی تو ہر شہر اور قصبے اور گاؤں کا غلہ لوٹ لیا اور اپنی فوجوں کو روزانہ بہت سا گھی ڈال کر ملیدہ کھلاتا تھا۔ اور ان کے کھانے کے وقت خود موجود رہتا تھا۔ اور پٹھان فوج سے کہتا جاتا تھا تو کیسا پٹھان ہے ایسا چھوٹا نوالہ کھاتا ہے۔ خوب کھا مغلوں جیسے دشمن سے لڑنا ہے۔

اس تاریخی واقعہ سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہیمو نے ہندوستانی رعایا کی بھوک کی پرواہ نہ کی اور قحط کی پرواہ نہ کی۔ ہزاروں آدمیوں کو مرتے دیکھا مگر اپنی لڑائی کے لئے سارا غلہ اور گھی اور چارہ اپنے گوداموں میں بھر لیا۔ اس انتظام کی خوبی کے سبب پہلے ہیمو بقال نے آگرہ جیتا اور پھر دلی بھی جیت لی۔ اور دلی کے مغل حاکم تردی بیگ کو دلی سے نکال دیا۔ اور خود تخت پر بیٹھا اور اپنا لقب بکرماجیت مقرر کیا۔ اس کے بعد فوراً ہاتھیوں کی ایک بڑی فوج اور بڑے توپ خانے اور بے شمار جنگجو افغانوں کو ساتھ لیکر اکبر اور بیرم خاں سے لڑنے آگے بڑھا۔ اکبر اور بیرم خاں جالندھر کے پاس وحشی افغانوں سے لڑ رہے تھے۔ ان کو خبر ملی کہ ہیمو نے باوجود بنیا ہونے کے آگرہ جیت لیا اور دلی بھی جیت لی اور اب وہ بڑے سازو سامان کے ساتھ ہماری طرف بڑھا ہے تو بیرم خاں نے ایک نوعمر ازبک سوار علی قلی خاں شیبانی کو پانچ ہزار مغلوں کے ساتھ آگے بھیجا۔ کہ وہ دشمن کی فوج کا اندازہ کرے اور ایک دستہ فوج کا رسد کی فراہمی کے لئے مقرر کیا۔

پانی پت کے میدان میں علی قلی خاں پہنچا تو اس نے ہاتھیوں کی کالی گھٹا اور ایک عظیم الشان توپ خانہ اور بے شمار افغانوں کی طاقتور فوجیں دیکھیں۔ علی قلی خاں نے اکبر اور بیرم خاں کے حکم کا انتظار نہ کیا اور حملہ کرکے دشمن سے توپ خانہ چھین لیا۔ مگر ہاتھیوں کو دیکھکر مغلوں کے گھوڑے بدکے اور بھڑکے تو مغلوں نے گھوڑے چھوڑ دیئے اور پیدل آگے بڑھکر تلواروں سے ہاتھیوں کی سونڈیں کاٹنی شروع کیں۔ اور اس کے بعد بڑی سخت خونریز لڑائی ہوئی جس میں ہیمو بقال گرفتار ہو گیا اور ہیمو کا رسد کا سامان بھی مغلوں کے ہاتھ آیا اور افغان سب بھاگ گئے۔ جن کو ہیمو ملیدے کھلا کھلا کر ساتھ لایا تھا۔

اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ رسد اور سپلائی کا انتظام ضروری تو ہے مگر شکست و فتح پر اس کا بہت کم اثر پڑتا ہے۔ یہ چیز دلوں کی ہمت اور ارادوں کی طاقت سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن میں خدا نے فرمایا ہے۔ خدا کے حکم سے کم تعداد یعنی اقلیت ہمیشہ زیادہ تعداد یعنی اکثریت پر غالب آئیگی۔

اکبر

مغلوں میں سب سے زیادہ کامیاب بادشاہ اکبر مانا جاتا ہے اس کی بڑی بڑی لڑائیاں اودے پور کے رانا اور دکن کے بادشاہوں سے ہوئیں ان مہمات کی رسد رسانی پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بڑی سے بڑی مہم کے لئے پانچ لاکھ روپے نقد دیئے جاتے تھے۔ جس سے فوجی سردار رسد کا سامان خرید لیتے تھے اور ان کی رسد محض گھوڑوں کا گھاس دانہ اور غلہ اور گوشت کے جانور ہوتے تھے۔

سرحدی قبائل

افغانستان اور ہندوستان کی سرحد پر بہت سے جنگجو قبائل آباد ہیں مشہور یہ ہے کہ وہ انگریزوں کو کافر سمجھکر لڑتے ہیں۔ مگر تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہمیشہ مسلمان بادشاہوں سے بھی اسی طرح لڑتے رہتے تھے اور یہ محض باتیں ہی باتیں ہیں کہ وہ دین کے لئے جہاد کرتے ہیں۔ ان آزاد قبیلوں کی جنگی سپلائی سادہ اور سب سے زیادہ آسان ہے۔ وہ سوکھے ہوئے شہتوت اور سوکھا ہوا نمکین گوشت ایک جھولی میں بھر لیتے ہیں اور دوسری جھولی میں موٹی موٹی روٹیاں بھر لیتے ہیں اور ہر ایک کی سپلائی اسکی جھولیوں میں ساتھ رہتی ہے۔ اور ان کی عورتیں لڑائی کے وقت زخمیوں کو اور مُردوں کو اٹھاتی ہیں اور پانی پلاتی ہیں۔ اور روٹیاں تقسیم کرتی ہیں۔

غدر

۱۸۵۷ء میں انگریزی فوجوں نے انگریزوں سے بغاوت کی اور دلی میں آکر جمع ہوئیں تو مرزا مغل بہادر شاہ کے بیٹے نے کمانڈ لیکر رسد کا انتظام کیا۔ انگریز ان باغی فوجوں کو ان کی مقررہ عادت کے موافق راشن دیتے تھے مگر مرزا مغل نے اپنی شاہانہ عادت کے موافق جلیبیوں کا راشن مقرر کیا۔ تو پوربئے سپاہی کہتے تھے جلیبیاں ہمارے منہ میں چبھتی ہیں ہم کو تو ستو درکار ہیں کہ ہم ستوؤں کو پانی میں آٹے کی طرح گوندھیں اور ان کا پیڑا بنائیں اور منہ میں رکھکر انگوٹھے سے حلق کے اندر اتاریں۔ اور اوپر سے نمک کی ایک کنکری چبا لیں۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں انگریزی فوج کو بھی رسد اور سپلائی کی بہت دشواریاں تھیں اور آخر میں باغیوں کو بھی زیادہ مشکل سامان رسد کی ہو گئی تھی اور یہی وجہ ان کی شکست کی تھی۔

موجودہ زمانے میں تو انگریزوں کی سپلائی سائنس کی شکل میں آگئی ہے لیکن انصاف سے کہنا چاہیے کہ جب سے ایسٹ انڈیا کمپنی نے فوجیں بھرتی کرنی شروع کیں اس وقت سے ان کی سپلائی کے انتظامات کی خوبیاں ہندوستانی رسد رسانی کے مقابلے میں بہت اچھی اور اعلیٰ مانی جاتی تھیں جس میں ہمیشہ اصلاح اور ترقی ہوتی رہتی تھی۔ اور اب جو ترقیاں سپلائی میں ہوئی ہیں وہ کچھ ضرورت سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہیں۔ جس کی وجہ سے لڑائی کا خرچ بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ مغلوں کی لڑائیوں میں جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا مہم شروع ہوتے وقت زیادہ سے زیادہ پانچ لاکھ روپے لئے جاتے تھے اور آج کل نئی دلی کے سپلائی دفتروں میں روزانہ کئی کروڑ روپے کی چیزیں خریدی جاتی ہیں ان میں بہت سی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کے بغیر بھی انسان کا کام چلا لیتا ہے۔ اور فضول خرچی اسی کو کہتے ہیں کہ ایسی چیز کا خریدنا جس کے بغیر بھی کام چل سکے لیکن ایسی فضول خرچی کی سپلائی کے دو نتیجے نکلتے ہیں ایک تو یہ کہ فوجوں کا دل مطمئن رہتا ہے کیونکہ وہ میدان جنگ میں گھر سے زیادہ آرام پاتے ہیں اور گھر سے زیادہ عمدہ چیزیں ان کو کھانے اور استعمال کرنے کے لئے مل جاتی ہیں مگر دوسرا نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ سپاہیوں میں عیش پسندی اور آرام طلبی پیدا ہوتی ہے۔

کل شام کو میں نئی دلی میں جا رہا تھا میں نے ایک موٹر ٹھیلہ دیکھا جو ٹھسا ہوا تھا اور اس میں بہت سے امریکن سپاہی بیٹھے ہوئے تھے اس وقت میرے ساتھی یہ بحث کر رہے تھے کہ امریکن اور یوروپین فوجیں آسائش پسند ہو گئی ہیں۔ میں نے کہا دیکھو یہ امریکن ہیں اور دنیا میں سب سے زیادہ دولت امریکہ میں ہے۔ اور جس قوم کے پاس دولت زیادہ ہو جاتی ہے وہ آرام طلب بن جاتی ہے۔ مگر یہ سب امریکن دھوپ میں ٹھیلے کے اندر بیٹھے ہوئے ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان پر دولت نے اثر نہیں کیا ہے۔

تھوڑی دور جا کر وہ ٹھیلہ ٹھیرا اور امریکن سپاہی دروازہ کھولنے کا انتظار کئے بغیر ٹھیلے کے تختوں پر چڑھ چڑھ کر نیچے کود پڑے۔

میں نے پھر کہا۔ دیکھو یہ دوسری سستی ہی امریکن فوج کی ہے۔

بہر حال میں مغلوں کی جنگی سپلائی کی سادگی کو موجودہ زمانے کے لئے مفید نہیں سمجھتا۔ لیکن موجودہ زمانے کی سپلائی اور رسد رسانی میں بعض چیزیں ایسی ہیں جن پر فضول خرچی کا الزام لگایا جا سکتا۔ اور اگر وہ چیزیں نہ ہوں تو اتحادی فوجوں کا کام ان کے بغیر بھی چل سکتا ہے۔

لہ مغلوں کی لڑائیوں کو آج کل کی لڑائیوں سے کوئی نسبت نہیں ہے۔

زمانے کی یہ گردش جاودانہ
حقیقت ایک تو، باقی فسانہ
کسی نے دوش دیکھا ہے نہ فردا
فقط امروز ہے تیرا زمانہ

(علامہ اقبالؒ)

جینے کا سلیقہ

(از واحدی)

میرے ایک عزیز دوست کی خواہش ہے کہ میں اس عنوان پہ کچھ لکھوں "جینے کا سلیقہ"۔ سلیقہ اور جینے کا۔ کسی کو صرف کپڑا پہننے کا سلیقہ ہوتا ہے۔ کسی کو صرف کھانے پینے کا۔ کوئی رہنا اور اُٹھنا بیٹھنا سلیقہ سے ہے اور کوئی ملنا جلنا اور لوگوں کے ساتھ برتاؤ سلیقہ سے کرتا ہے۔ کسی شخص میں سارے سلیقے جمع ہو جائیں تب کہنا چاہیئے کہ یہ جینے کا سلیقہ جانتا ہے کتنا مشکل ہے "جینے کا سلیقہ"۔

سلیقہ کیا شے ہے اور سلیقہ سے کیا حاصل ہوتا ہے؟ اپنے اندر بغیر کوشش پیدا کرنے کی نیت کے کوشش پیدا کر لینے کا نام سلیقہ ہے اور سلیقہ سے یہی کوشش حاصل ہوتی ہے۔

جو شخص کپڑا پہننے کا سلیقہ رکھتا ہے لوگ اُسے پاس بٹھاتے ہیں۔ جسے ملنے جُلنے کا سلیقہ آتا ہے سب اسکی ملاقات کے شائق رہتے ہیں۔ بدسلیقہ آدمی سے دُنیا گھِن کھاتی ہے۔ خوش سلیقہ کی طرف کھِنچتی ہے۔ جسے یہ کا سلیقہ آتا ہے یعنی جو ہر طرح کا سلیقہ رکھتا ہے اس کی ذات ہر طبقہ میں مقبول اور اسکی زندگی ہر طبقہ کو عزیز ہوجاتی ہے

سلیقہ کے لفظ پہ مجھے ایک واقعہ یاد آگیا۔ یورپ کے کسی ملک میں وہاں کے بادشاہ کے محل کے نیچے بہت سے آدمی جمع تھے۔ بادشاہ کا سات آٹھ سالہ بیٹا اپنی آیا کے ساتھ اُدھر جا نکلا۔ اُس نے آیا سے پوچھا۔ "یہ آج کیا ہنگامہ ہے؟" آیا نے جواب دیا۔ "یہ مزدور ہیں۔ انہیں آج کل کام نہیں مل رہا۔ بادشاہ سے فریاد کرنے آئے ہیں کہ ہماری روٹی کا انتظام کیجئے۔" بادشاہ کا بیٹا معصومیت کے ساتھ بولا "روٹی نہیں ہے تو پیسٹری کھائیں۔" بادشاہ اور بادشاہ زادے جیسی روٹی کھاتے ہونگے، پیسٹری غالباً اس سے کم درجہ کی خوراک ہے۔ بادشاہ زادے نے اس لئے ایک اعتبار سے ٹھیک کہا کہ روٹی میسر نہیں ہے تو پیسٹری سہی۔ لیکن معصوم کو کیا معلوم کہ غریبوں کی روٹی پیسٹری سے کہیں گھٹیا چیز ہے۔ جب انہیں وہی میسر نہیں تو پیسٹری کیا کھائیں گے۔

"میرے عزیز دوست رہنے سہنے کے سلیقے۔ کھانے پینے کے سلیقے۔ ملنے جُلنے کے سلیقے۔ تمام سلیقوں کو چھوڑ کر ایک دم جینے کے سلیقے پہ پہنچ گئے۔ وہ خود صاحب سلیقہ ہیں میری رائے ہے کہ انہیں "جینے کا سلیقہ" آتا ہے۔ اُن کو شاید دوسروں کی بدسلیقگی کھٹکی اور انھوں نے مجھے یہ عنوان دے دیا۔ مختصر جواب میرے دوست کی بات کا یہ ہے کہ جس شخص میں وہ جینے کا سلیقہ دیکھنا چاہیں اُسے اپنی آدھی نہیں پاؤ دولت دیدیں۔ کیک اور پیسٹری نہیں۔ فقط بافراغت روٹی۔

سلیقہ پیٹ کا اطمینان ہونے کے بعد سوجھا کرتا ہے۔ کھانے پینے تک کا سلیقہ پیٹ بھرے ہی جانتے ہیں۔ رہنے سہنے اور ملنے جلنے کے سلیقہ کا تو کیا ذکر۔ اور جیسا کہ میں اُوپر کہہ آیا ہوں جینے کا سلیقہ ہے کیا۔ یہی رہنے۔ کھانے پینے اور ملنے جُلنے کے سلیقوں کا مجموعہ۔

رہا جینا۔ تو محض جینے کے لئے کسی سلیقہ کی ضرورت نہیں۔ خدا بُرے سے بُرے حال میں بھی جلاتا رہتا ہے۔ بدسلیقہ جیتے ہیں اور سلیقے والے جل بستے ہیں۔ ایک ڈاکٹر کا قول ہے کہ میں مرنے پر کبھی تعجب نہیں کرتا۔ میں تو جینے پہ حیران ہوتا ہوں۔ مرجانے کی وجہ بتائی جاسکتی ہے۔ جینے کی وجہ نہیں بتائی جاسکتی۔ مگر میں یہ مرنا جینا کیا لے بیٹھا۔ میرے عزیز اور دولت مند دوست تو جینے رہنے تک کے سلیقہ پہ گفتگو چاہتے ہیں۔ انھیں رو کر گذارنے سے مطلب نہیں۔ وہ ہنس کر گذرنے والی زندگی کی بابت سُننے کے متمنی ہیں۔ تو میں پھر وہیں سے شروع کرتا ہوں۔ کہ ہر قسم کا سلیقہ دولت سکھاتی ہے۔ یا ہاں خدا کے پیغمبر سکھاتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں اوتار اور دیوتا سکھاتے ہیں۔ یا تیسری زبان میں خود خدا سکھاتا ہے۔ سلیقہ کا مادہ نیچرل اور فطری ہوتا ہے۔ اچھے اور بزرگ لوگ اس نیچر اور فطرت کو اُبھارتے ہیں اور دولت اس فطرت کو چمکا دیتی ہے۔ جن کی فطرت میں سلیقہ نہیں ہوتا وہ پیغمبر اور اوتاروں سے بھی درست نہیں ہوتے۔ اور دولت بھی اُن کا کچھ نہیں بناتی۔ آپ اچھے اچھے امیروں کے ہاں دھوانسی آنچ پہ چائے کا پانی پکتے اور اچھے اچھے امیروں کو کُرتے کے دامن سے مُنہ پونچھتے دیکھ سکتے ہیں؛

شاید یہ بھی سلیقہ ہی ہو۔ دُنیا ایک تماشہ گاہ ہے۔ تعشق سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو جس طرح آسمان کے بکھرے ہوئے تارے ایک خوبصورتی پیش کرتے ہیں اسی طرح دنیا کی بدسلیقگیاں سلیقہ کہی جاسکتی ہیں۔ غریبوں کا سلیقہ یہی ہے کہ گندی سے گندی فضا میں موٹا جھوٹا کھا کر اور پھٹا پرانا پہن کر اپنا پارٹ ادا کئے جائیں۔ امیروں کا پارٹ الگ ہے۔ نو بڑھیوں کا پارٹ الگ

بلکہ امیروں کا پارٹ مصنوعی ہوتا ہے اور غریبوں اور نوبڑھیوں کا پارٹ غیر مصنوعی۔ تاہم عرف عام میں جسے سلیقہ کہا جاتا ہے وہ امیروں، پڑھے لکھوں، مہذب اور شائستہ لوگوں ہی کا سلیقہ ہے۔ امیروں۔ پڑھے لکھوں اور مہذب و شائستہ لوگوں ہی کو رہنے سہنے، کھانے پینے، ملنے جُلنے اور جینے کا سلیقہ آتا ہے یا آسکتا ہے۔ پیغمبر اور اوتار بھی لوگوں کو دولتمند اور سلیقہ مند ساتھ ساتھ بناتے ہیں۔ سلیقہ مندی کی بنیادیں بچپن میں پڑتی ہیں۔ بچہ کے ماں باپ یا بچہ کے دوسرے تربیت کرنے والے۔ بچہ کا ماحول۔ بچہ کی صحبت۔ بچہ کو سلیقہ مند بناتے ہیں تو بچہ سلیقہ مند بن جاتا ہے۔ اور بچہ کو غیر سلیقہ مند بناتے ہیں تو بچہ غیر سلیقہ مند بن جاتا ہے۔ جوانی اور بڑھاپے میں ماحول اور صحبت بدل بھی جائے تو بچپن کے ماحول اور صحبت کا اثر مٹائے نہیں مٹتا اور رنگ لائے بغیر نہیں رہتا۔ بچپن کا غریب جوانی یا بڑھاپے میں امیر ہو جائے۔ بچپن کا پھوہڑپن کبھی نہ کبھی اور کہیں نہ کہیں ضرور جھلک دکھائے گا۔ پُرانے شہروں کی گلیوں میں گالیاں یاد کر لینے کے بعد نئی دلی کی کوٹھی گالیوں کو بھلا نہیں سکتی۔ غیر تو جینے کا صحیح سلیقہ اسی کو آتا ہے جس نے بچپن سے جینے کا سلیقہ سیکھا ہو۔ اِلّا ماشاء اللہ۔ ہر شخص کا جینا بالکل یکساں نہیں ہوا کرتا۔ کوئی نوکری کر کے جیتا ہے، کوئی تجارت کر کے، کوئی حکومت کر کے جیتا ہے۔ کوئی غلامی کر کے۔ جسے تجارت کیلئے جنم دیا گیا ہے اُسے نوکری مل جائے یا جو غلامی کے لئے پیدا ہوا ہے وہ حاکم بنا دیا جائے۔ اُس میں سلیقہ کہاں سے آئیگا۔ خدا اگر ان کو اسی کام پر لگائے جس سے اسکی طبیعت کو مناسبت ہے تو یہ خدا کا بڑا احسان ہے۔ اور تب ہی سلیقہ ظاہر ہوتا ہے اور بہار دکھاتا ہے۔ یورپ و امریکہ وغیرہ میں ایسے ماہر موجود ہیں جو بتایا کرتے ہیں کہ فلاں بچہ کو کیا پیشہ اختیار کرایا جائے اور فلاں بچہ کو کیا پیشہ۔ پچیس برس ہوئے، نام تو یاد نہیں، ایک امیر البحر کے مرنے پر اُس کے حالات اخباروں میں چھپے تھے کہ وہ بچپن میں بہت شریر تھا۔ پڑھنے لکھنے پر جی نہ لگتا تھا۔ اُسے عادت تھی کہ پڑھتے پڑھتے جماعت میں سے اُٹھ کھڑا ہوتا اور باہر نکلکر درختوں پر چڑھتا اترتا رہتا۔ مدرسہ کے اُستاد اُس کی اس حرکت سے پریشان ہو گئے تھے۔ ایک دن اُستادوں نے تجویز کیا کہ اُسے کھلے میدان میں سب کے سامنے بید لگائے جائیں۔ شاید اسی سے اُسے شرم آئے اور وہ بندر کی بجائے آدمی بن جائے۔ اتفاق سے اُس وقت وہاں ایک طبیعتوں کا سمجھنے والا ماہر آپہنچا۔ اُس نے کہا سزا دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ اسے چند روز کیلئے میرے سپرد کرو۔ میں روزمدرسے آیا کرونگا اور اسکے رُجحانِ طبع کا اندازہ لگاؤنگا۔ اُستادوں نے منظور کر لیا۔ ماہر صاحب نے بچہ کو درختوں پر چڑھنے اُترنے کی کھلی اجازت دیدی اور اس کا چڑھنا اُترنا [illegible] اور بچہ سے کہا۔ اِن پر چڑھو تو تیزی [illegible] سے [illegible] چڑھ گیا۔ ماہر صاحب نے بچہ کے باپ کو کہا کہ اسے کامیاب [illegible] تو پڑھانے لکھانے کی کوشش ترک کر دو۔ یہ جہاز [illegible] پر نوکر کرادو۔ جہاں خطرناک سے خطرناک چڑھائی اُترائی کا کام [illegible] بس یہ ایک ہی اسکی ترقی کا راستہ ہے۔ چنانچہ ہدایت پر عمل کیا گیا [illegible] بچہ امیر البحر ہو کر مرا۔

بچپن میں سلیقہ ارادہ کر کے نہیں سیکھا جاتا، سکھایا جاتا ہے۔ [illegible] جیسا سلیقہ سکھایا جاتا ہے وہ بے ارادہ سیکھا جاتا ہے۔ بچہ جوانوں اور بڈھوں سے سینکڑوں گنا زیادہ ہر بات سیکھنے کو بغیر ارادہ کے تیار رہتا ہے۔ آپ نمونہ اُس کے سامنے لاتے جائیے وہ نمونہ کی نقل کرتا جائیگا۔ آپ جس طرح رہتے سہتے ہیں۔ اُسی طرح کے رہنے سہنے کو وہ اختیار کریگا۔ اس سے ادنیٰ رہنا سہنا اور اُس سے اونچا رہنا سہنا اُس کے لئے بے معنی ہوگا۔ آپ جس طریقہ سے کھائیں پئیں گے، کھانے پینے کے اُسی طریقہ کو وہ بہترین طریقہ سمجھےگا۔ آپ جس طرح عزیزوں اور دوستوں سے ملیں جلیں گے، جس طرح کا ان سے معاملہ اور برتاؤ رکھیں گے وہ اُسی سے واقف ہوگا۔ اور اُسی ڈگر پر چلے گا۔

جینے کے سلیقے کی بنیاد بچپن میں پڑتی ہے۔ لیکن سلیقہ کا نمایاں مظاہرہ بلکہ امتحان بڑھاپے میں ہوتا ہے۔ جس طرح جسم میں طاقت ہو تو بیماریاں دُور ہوا کرتی ہیں اسی طرح بچپن اور جوانی میں پھوہڑپنا چھپ جاتا اور نبھ جاتا ہے۔ لیکن بڑھاپا خوش سلیقگی بھی کھول کر رکھ دیتا ہے اور بدسلیقگی بھی۔ بڈھوں کی غلطیوں کو دُنیا معاف نہیں کیا کرتی۔ بڈھوں سے توقع کی جاتی ہے کہ اُن کا بچپن اور اُن کی جوانی کیسی ہی گذری ہو بڑھاپے میں وہ انسان بن جائیں۔ اُنھوں نے بچپن اور جوانی میں صحت کا خیال نہ رکھا ہو تب بھی بڑھاپے میں وہ تندرست رہیں۔ بچپن کی بیماری کو ماں سنبھالتی ہے۔ جوانی کی بیماری کو بیوی۔ بڑھاپے میں عموماً بہو ؤں سے سابقہ رہ جاتا ہے۔ جو بہت کم ایسی ہوتی ہیں اور ہوسکتی ہیں کہ خاوند کا باپ تو کجا اپنے باپ کی بیماری کو بھی برداشت کر لیں۔ بڑھاپے میں جینے کا بہت بڑا سلیقہ یہ ہے کہ انسان بیمار نہ پڑے کوئی بچے اور جوان کی بیماری سے نہیں اُکتاتا۔ لیکن بڈھوں کی بیماری گھروالوں کو تنگ کر دیتی ہے اور لوگ بڈھوں کی موت چاہنے لگتے ہیں۔ اور جب بڈھا مر جاتا ہے تو اُسکے رہنے کی جگہ کو صاف کرا کر کہتے ہیں۔ "توبہ! کیسا خراب کمرہ تھا کمرہ۔ گھسنے کو جی نہ چاہتا تھا۔" بڈھوں سے بچوں اور جوانی کی نسبت بہتر اخلاق کی اُمید

[illegible]

[illegible] پسند نہیں کرتی۔ جن بڈھے کو پاس بیٹھنے والوں سے [illegible] کے ساتھ گفتگو کرنے کا سلیقہ نہیں آتا اُسے جینے کا سلیقہ نہیں آتا۔ [illegible] کی کوٹھری ہو کر بازار کی کوٹھری کی شکل اختیار کئے ہی ایک کوٹھری مخصوص کر دی جاتی ہے بڑا رہے گھر کے اندر۔ وہاں سے باہر صورت نظر آئی۔ اور گھر والے پکارے "الٰہی خیر"۔

بچپن سے اگر ایک بات کی عادت ڈلوائی جائے اور جوانی میں انسان اسکی مشق کرے تو بڑھاپے میں وہ بہت کام دیتی ہے۔ وہ یہ کہ دوسروں کے اعمال سے زیادہ انسان اپنے اعمال پر نظر رکھے۔ صرف اپنی اصلاح کر کے انسان اپنے آپ کو بھی مطمئن اور بشاش بنا سکتا ہے اور دوسرے بھی آپکے نمونہ سے متاثر ہو سکتے ہیں اور سبق لے سکتے ہیں۔ فلاں ایسا ہے فلاں ویسا ہے۔ فلاں نے یہ کیا اور فلاں نے وہ کیا۔ کہتے رہنے کی عادت جوانی میں بھی ذلیل کرتی ہے مگر بڑھاپے کیلئے تو بہت ہی خراب ہے۔ انسان اپنے اعمال اور اپنے آپے پر قابو پالے تو اسے دنیا میں کوئی دکھ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ جینے کا بہت بڑا اور حقیقی سلیقہ ہے۔ جس کا دل، جس کا دماغ، جس کی زبان، جس کا تمام جسم اور جسکے تمام عادات و اطوار قابو میں ہوں، مقناطیس کی طرح لوگ اسکی طرف کھنچتے ہیں۔ اور پارس کی طرح اُس سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ایسا انسان ہوتا ہے۔ وہ جوانی میں بچپن کو یاد نہیں کرتا۔ وہ بڑھاپے میں جوانی کو نہیں روتا۔ وہ مرتے دم تک تندرست اور خوش رہتا ہے۔ وہ بچپن اور جوانی سے بڑھکر بڑھاپے کو نعمت سمجھتا ہے اور بڑھاپے کی نعمت کو زحمت نہیں بناتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ کچھ باتیں بچپن کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں۔ کچھ باتیں جوانی کے ساتھ اور کچھ بڑھاپے کے ساتھ۔ وہ سمجھتا ہے کہ بچپن اور جوانی میں بڑھاپے کی خصوصیات اختیار نہیں کی جاتیں تو بڑھاپے میں بچپن اور جوانی کی خصوصیات کیوں اختیار کی جائیں۔ بچپن اور جوانی کے بعض ہنر بڑھاپے کے عیب ہیں۔

بڑھاپے میں لوگوں کو دوسروں کے عیب پکڑنے اور دوسروں کے عیب جتانے کا شوق بڑھ جاتا ہے۔ بڑے غلطیاں جتانا اور نصیحت کرنا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ وہ بچوں اور جوانوں سے خصوصاً وہ حرکتیں چھڑوانی چاہتے ہیں جنہیں بچپن اور جوانی میں خود نہیں چھوڑ سکے تھے۔ یہ بچھ بڑھپن ہے اور خودداری کے خلاف ہے۔ اگر خود وہ حرکتیں نہیں بھی کی تھیں تو بھی زبان سے کہنے کا اثر نہیں ہوگا۔ اپنا صرف عملی نمونہ انہیں دیکھنے دیجے اور ان کے علم میں آنے دیجے۔ نمونہ سے بڑھکر کوئی چیز نصیحت کا ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ بڑھاپے کی دھونس کا زمانہ گذر چکا اب عمر کا حساب پیدائش سے نہیں لگایا جائیگا، موت سے لگایا جائیگا۔ یعنی جو دنیا میں ۱۹۲۴ء تک جیا وہ چھوٹا ہوگا اُس سے جو ۱۹۸۴ء میں مریگا۔ بعد کے مرنے والے کا تجربہ پہلے مرنے والے سے چالیس سال آگے رہیگا محض پہلے پیدا ہو جانے کو آئندہ اہمیت نہیں دی جائیگی۔ میرے مکان کے سامنے ایک بڑے میاں کی دکان تھی۔ اُن کے بیٹوں نے کچھ پڑھ لکھ لیا۔ بڑے میاں ہمیشہ بیٹوں کی رائے پر اپنی رائے کو فوقیت دیا کرتے تھے۔ ایک دن بڑے بیٹے نے اُن سے کہا۔ "ابا چالیس برس ہم نے آپ کی باتیں مانیں اب آپ ہماری بات مانئے۔"

المختصر بڈھوں کی عزت اسی میں ہے کہ بردباری سے کام لیں اور سو کی ایک بات یاد رکھیں کہ انسان اس کی طرف کھنچتا ہے جس سے اُسے کچھ ملتا ہے۔ روپیہ ملے، عزت ملے، آرام ملے، خوشی ملے۔ نصیحت بھی بڑی نعمت ہے۔ لیکن ہر شخص نصیحت کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ آپ نصیحت کرنے کے اہل ہیں تو ضرور نصیحت کیجے۔ ورنہ کسی دوسرے اعتبار سے لوگوں کے لئے مفید بن جائے۔ بس یہی جینے کا سلیقہ ہے۔ بڑھاپے میں ہی نہیں۔ ہر عمر میں۔ اور یہ سلیقہ خدا جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ آپ میں اس سلیقہ کی خواہش پیدا ہو رہی ہے تو یقین کیجے خدا آپ کو یہ سلیقہ دینا چاہتا ہے۔ بڑھئے اور خدا سے اِس نعمت کو لے لیجے ؛؛

مشکل زبان بولنے والا

(از جناب مجیبی صاحب)

آل انڈیا ریڈیو دہلی سے تعلیمی پروگرام میں تقریروں کا ایک سلسلہ شروع ہوا تھا۔ جس کا عنوان تھا "کیا آپ بھی ان میں ہیں؟" یہ اسی سلسلہ کی ایک تقریر ہے۔ اس میں جو باتیں بتائی گئی ہیں وہ بچوں کے سوا بہتیرے بڑوں کے بھی کام کی ہیں۔

"مشکل زبان بولنے والا" میری رائے میں نادان ہے۔ زبان گنتوں اور گھڑوں سے انجان ہیں۔ میں تو بے دھڑک یہ بھی کہہ سکتا ہوں وہ رشیوں منیوں اور پیر پیغمبروں کی ڈگر سے ہٹ گیا ہے۔ دنیا بھر کے مذہبی پیشواؤں نے یہ گر پا لیا تھا۔ انہوں نے اپنے دین کی تبلیغ اور اپنے مت کے پرچار کیلئے سہل زبان ہی سے کام لیا اور خدا نے اُن کا بیڑا پار لگایا۔ پھر دنیاداروں کا دھیان کیجئے۔ جن لیڈروں نے بڑے بڑے میدان جیتے انہوں نے سہل زبان کو برتا۔ مشکل زبان کو چھوڑا۔

دیکھئے! ایک بات کبھی بھولنے کی نہیں۔ وہ یہ کہ جس سے آپ بات کریں گے اس کا یہ حق ہے، پہلا حق کہ آپ کی بات اُس کی سمجھ میں آئے بھی۔ اگر یہ نہیں تو آپ کی بات ہی کیا! بات کرتے یا کچھ لکھتے ہوئے اس کا دھیان رکھنا ہی ہوگا کہ سننے والا اُسے سمجھ بھی لے۔ یہ نہیں کہ آپ تو معمے لکھتے یا پہیلیاں بجھواتے چلے جائیں اور سننے والا بیچارا آپ کا منہ تکتا رہ جائے۔

"ہندستانی کیا ہے؟" کی بات چیت میں ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایک بار بتایا تھا کہ "زبان کا ادب اب بہت دن ایک چھوٹی سی ٹولی کا دھندا نہیں رہ سکتا زبان آدمی سے آدمی کا رشتہ جوڑتی ہے۔ ایک دل کی بات دوسرے تک پہنچاتی ہے۔ اکیلے کی کوئی بات نہیں ہوتی۔ جوں جوں لکھنے والوں کو اپنی بات سمجھانے کی ضرورت زیادہ پڑیگی، جیسے جیسے زیادہ لوگ اُن کی باتوں کو سمجھنا چاہیں گے زبان کا ادب سہل اور صاف ہوتا جائیگا۔ یہ کتابیں لکھنے والے بھی جو زندگی سے ہٹ کر کبھی کبھی نہ جانے کس سے اپنی پہیلیاں بجھوانا چاہتے ہیں۔ آخر آدمی ہیں۔ کنوئیں کے مینڈک تو نہیں کہ اپنی ٹرٹراہٹ سن لیں اور سو رہیں۔ یہ آدمیوں ہی سے کچھ کہنا چاہتے ہیں اور ان کا دل بھی اس کے لئے بے چین ہوتا ہے کہ آدمی انہیں سمجھیں۔ یہ مجبور ہونگے کہ زبان کو صاف

[illegible] ہے جتنے والوں سے کہیں [illegible] پڑھنے والے کی سمجھ کا پاس بھی اسے کرنا ہوتا ہے۔ اس شاعری میں کچھ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن میں کہنے والا بس اپنا جی ہلکا کرنا چاہتا ہے کبھی ایک آہ ہے۔ کبھی ایک [illegible] پر میں تو سمجھتا ہوں کہ اس دل کو ہلکا کرنے کیلئے بھی شاعر تک کو سننے والوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی سنسان میدان میں ایک شعر کے [illegible] پنچھی گا لیتا ہے۔ پر زیادہ تر بلبل باغ میں چہچہاتے ہیں۔"

کیا کہنا ڈاکٹر صاحب کی بات کا۔ بڑی پکی بات ہے اور ہے بالکل سچی بات۔ مزا آئے سچی بات! دیکھئے نا میر تقی میر اردو کے سبھی شاعروں کے افسر مانے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے اُن کا لوہا مانتے آئے ہیں۔ جو انہیں نہ مانے وہ خود ماننے کے لائق نہیں۔ میر صاحب نے اتنے بڑے شاعر، نکتہ داں اور اہل زبان ہو کر وہ زبان بولی جو بچے سمجھیں ہے، عام ہے۔ عالم ہو یا ـــــ کوئی جو ایسا اکھڑ بھی آگے نشتروں سے گھائل ہوئے نہیں بچا۔ پھر یہ نہیں کہ انکی زبان دہلی کا ٹھیٹھ نہ ہو۔ جیسی زبان کے سبھی مزے تو اُن کے ہاں بھرے پڑے ہیں۔ ہاں وہ دلی ہی کی زبان ہے۔ مگر دلی کی وہ زبان نہیں جو اب میوزیم میں تو رکھی جاسکتی ہے اور جس سے استادوں کا شاید کچھ مزا بھی لے لے، پر وہ کسی کے کام آنیوالی نہیں۔ نہ ہماری زندگی کی دوڑ میں ہمارا ساتھ دینے والی ہے۔

اسی طرح میاں نظیر اکبرآبادی کا درجہ بھی اردو شاعروں میں بہت اونچا ہے۔ وہ استادوں میں گنے جاتے ہیں۔ وہ بھی یہ گر پا گئے تھے۔ انہوں نے بھی بڑی بڑی باتیں بس ہماری آپ کی سادہ بول چال اور سہل زبان ہی میں بتائی ہیں۔ کہیں کہیں تو بالکل دیہاتی زبان سے کام لیا ہے۔ تعلیم اور زبان کا کام کرنے والی بڑی بڑی انجمنوں کو اس زمانے میں میاں نظیر کی ڈالی ہوئی لکیر پہ چلنا پڑا ہے۔ بات یہ ہے نا کہ زبان ایسی خدا کی نعمت کو بھی ذات پات کے بندھنوں میں جکڑ دینا ٹھیک بات نہیں۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ زبان کا کام کیا ہے۔

مرزا غالب کے رقعے میں نے بچپن میں پڑھے ہیں۔ ان میں جب ہی تو مزا ملا ہے جو اب ملتا ہے۔ کیونکہ ان میں بہت آسان زبان [illegible] ہے جو ہر کسی کو بھاتا ہے۔ بچوں کو بھی، بوڑھوں کو بھی ـــــ سید انشا کا نام سنا ہے؟ آپ نے؟ عربی، فارسی، ترکی اور ہمارے دیس کی سبھی زبانوں کے عالم تھے ان کی لکھی ہوئی "رانی کیتکی کی کہانی" پڑھئے۔ کمال ہی تو کیا ہے انہوں نے۔ [illegible] جو کوئی ایسا ویسا موٹا یا بھاری بول بولے ہوں۔ یا پھر مہاتمے ہری [illegible] کی کتاب "ٹھیٹھ ہندی کا ٹھاٹھ" پڑھئے۔ مہاتمے جی نے ہی وہ جو کہتے ہیں [illegible]۔

بہت ہی پیاری زبان لکھی ہے سہل اور صاف، اور پوری کتاب پڑھنے کی ہے۔
زبان لکھی۔ اُردو حرفوں میں ٹھیٹھ ہندی کا شبدکوش "ناگری اکشروں" (अक्षर) میں
ہے۔ مگر یہی ناگری اکشروں میں اور دوسری اُردو حرفوں میں ہو جائے تب بھی کوئی فرق نہ
پڑے گا۔ ہے کہ ایسی ہی ہماری زبان ہونی چاہیئے۔ سہل اور صاف! اچھا خیر سرسید
کی تحریریں دیکھئے۔ انہوں نے بھی بڑی بڑی باتیں ہلکی باتوں میں کہی ہیں۔ معمّے
حل نہیں کرائے ہیں۔ مولوی اسماعیل میرٹھی مرحوم کو کون نہیں جانتا۔ وہ تو اُستادوں کے
اُستاد تھے۔ اُن کی کتابیں آج بھی دقت کی چیز ہیں اور اُن کی زبان میں وہ لوچ وہ
مٹھاس اور وہ مزا ہے کہ میں تو انہیں اب بھی اکثر پڑھا کرتا ہوں۔ پڑھتا ہوں اور جھوم
جھوم جاتا ہوں۔ خدا بخشے مولانا حالی تو وہ کچھ کر گئے کہ آج بڑے بڑے انہی کی
بنائی ہوئی لکیر پر سے چلے ٹھیک ٹھکانا نہیں پا سکتے — علامہ نذیر احمد مرحوم کی وہ
کتابیں پڑھئے جو خاص کر لڑکیوں کی تعلیم کیلئے ہیں۔ انہوں نے تو قرآن پاک کے ترجمے تک
میں ٹھیٹھ ہندوستانی لفظ ایسے ایسے بٹھائے ہیں کہ اُن سے زیادہ ٹھیک لفظ اور ہو نہیں سکتے
مطلب یہ کہ ان سب نے سہل سے سہل زبان لکھنے کی کوشش کی ہے۔ ان بزرگوں
نے ہمیں رستے سے لگایا ہے۔ یہ سب بڑے جیّد عالم تھے۔ چاہتے تو وہ لغت چھانٹتے کہ
ایک سطر بھی ڈکشنری کی مدد بنا نہ چلتی۔ اور بعض جگہ ان کی تحریروں میں سچ مچ ایسی ملتی
ہیں کہ صاف صاف یہ پتہ چلتا ہے کہ اُن کے قلم پر بڑے بڑے موٹے لفظ آتے تھے مگر ایسا
لگتا ہے کہ وہ اپنے جی کو مارتے یا اپنے کو بے قابو ہونے دیتے تھے اور نہ بہکتے تھے۔ اور
ان بوجھل لفظوں کو جان بوجھ کے چھوڑ جاتے تھے۔ بات یہ ہے انہیں اپنی بات سبھوں تک
پہنچانی تھی۔ اپنے علم اور لغت کی نمائش کرنی نہیں آتی تھی۔ وہ اُردو زبان اور ادب
کے پیغمبر تھے! — دیکھئے یہاں ایک اور پتے کی بات آپ کو بتائیں۔ زبان کی خاصیت
بجلی کی سی ہے۔ کہ اُس سے بہت اچھے اچھے کام بھی لیتے ہیں اور وہی ہم سب کو جلا کر
بھسم بھی کر سکتی ہے۔ اسی طرح زبان ایسی تو ہو کہ ہمارے دیس کی دو بڑی قومیں
یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے دل ملا سکے۔ وہ نہیں جو ان دونوں بھائیوں کے دل
پھاڑ کر ٹکڑے یا ایک دوسرے سے دور۔ یہ بات تو ہمارے بڑوں نے طے کر دی ہے
کہ ہماری زبان کی بنیاد ہی اس پر رکھی گئی تھی۔ یہ دونوں قوموں کے میل ملاپ
کی یادگار ہے — تو بھئی۔ اگر آپ نے ایسی زبان سیکھ لی اور اُس سے کام بھی لیا
تو یہ کام سچ مچ رشیوں منیوں یا پیر پیغمبروں ہی کا کام ہوگا۔ وہ میل ملاپ بڑھانے
آئے، لڑانے بھڑانے کو نہیں — اچھا دیکھئے ہم ذری اور ہٹ گئے سہل زبان
لکھنے والوں کا ذکر تھا۔ اپنی تو یہ ہے کہ میں ان بزرگوں کا لفظ لفظ غور سے پڑھتا ہوں
اور اس سے برابر سیکھتا رہتا ہوں — اچھا ایک بزرگ اور ہیں ڈاکٹر مولوی
عبدالحق مدظلہ۔ مولوی صاحب تعلیم اور پہلے نادر نسخوں کی یادگار ہیں۔ انکا انداز
بھی یہی ہے کہ باتیں تو بڑی گہری مگر زبان بہت سہل اور انداز وہ جو ہم آپ سب بولتے
ہیں۔ ان کا رنگ تو اُن کے بزرگوں سے بھی کچھ زیادہ نکھرا اور ستھرا ہے۔ غرض ان سب
بزرگوں نے بڑی بڑی باتیں سہل سے سہل زبان میں کہی ہیں۔ ایسے کہ گلے اُتار اُتار دی
ہیں۔ یاد رکھئے، مشکل زبان بولنے یا لکھنے کے زمانے لد گئے۔ جب لوگ یا تو عادت سے
مجبور تھے یا بس اپنی قابلیت جتانے اور جھوٹی دھونس جمانے کو موٹے موٹے لفظ لاتے اور
بہت اُلجھی ہوئی ترکیبیں برتا کرتے تھے۔

مگر کوئی یہ بھی نہ سمجھے کہ سہل زبان میں لکھنا یا بچوں کیلئے لکھنا بچوں کا
کھیل ہے۔ ظاہر تو یہ کام سہل ہی لگتا ہے۔ پر لکھنے بیٹھو تو حال کھلتا ہے۔ ایک
ایک بول کا جوڑ بٹھانے میں پسینہ ہی تو آ جاتا ہے۔ تب کہیں تھوڑا بہت ہاتھ لگتا ہے
اور سچ یہ ہے اس میدان میں اچھے اچھے رہ جاتے ہیں — دو ہی باتیں
خاص ہیں۔ ایک تو زبان سہل ہو یعنی لفظ جہاں تک بنے ہلکے پھلکے ہوں۔ جملے چھوٹے
چھوٹے ہوں تاکہ مطلب سمجھنے میں اُلجھن نہ ہو۔ مگر یاد رہے بیان میں روانی اور زبان
میں مٹھاس نہیں تو کچھ نہیں۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی جان ہیں۔ خالی
سادہ زبان یا سہل لفظوں سے کام نہیں چلتا۔ نہ کوئی خاص بات پیدا ہوتی ہے۔
آج کوئی بیس برس سے مجھے اس کام سے سابقہ ہے اور اس راہ کی دشواریوں سے
پالا پڑا ہے۔ یوں بس کچھ کچھ بھلے بُرے کی پہچان ہو پائی ہے۔

اب تو بڑے بڑے سہل زبان اور آسان طرز ہی کو پسند کرتے ہیں
وہ زبان اور وہ طرز جو خاص کر سرسید نے، علامہ نذیر احمد نے، مولانا حالی
نے، مولوی اسمٰعیل میرٹھی نے۔ بولی اور برتی یا پھر ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے
جو ڈھنگ اور ڈول ڈالا ہے۔ اب تو بڑی بڑی کتابوں میں سیدھی اور صاف
ہی بات چیت کا چلن ہے۔ اور سچ یہ ہے اب کچھ یہی بات جی کو لگتی بھی ہے۔
اینچ پینچ اور بے ضرورت شاعری یا لغات کی بھرمار بالکل نہیں بھاتی۔ بلکہ اس سے
کچھ چڑ سی لگتی ہے۔

اس لئے بھئی! ہماری جو مانئے تو ہے یہی کہ مشکل زبان بولنے یا
لکھنے کے چکر میں کبھی نہ پڑیئے گا۔ یہ بس دھوکا ہی دھوکا ہے۔ اس میں رکھا کچھ
نہیں۔ ہمیشہ سچی بات کہنے کی عادت ڈالئے۔ اور جو کچھ کہئے دل سے کہئے
نہیں تو چپ رہئے۔ ایسا کریں گے تو جھوٹی زبان، مشکل زبان بولنے اور پیچیدہ
انداز بنانے کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ اس میں جو آپ چل نکلے تو سمجھئے پالا مار لیا۔
دیکھئے! آپ ہماری شیخی نہ سمجھیں تو یہ کہنے کی ہمت کریں کہ بس اسی
زبان کو دھیان میں رکھئے جو ہم اس وقت آپ سے بول رہے ہیں۔ پہلے پہل ذرا
کچھ مشکل پڑے گی پھر دھیرے دھیرے یہ پہاڑ ہٹ جائیگا اور پھر اسی میں آپ کو خود

جو آنے سے رہے۔ اس لیے ان بزرگوں کی کتابیں غور سے پڑھا کیجیے تو ہم آپ کو بھی بتا چکے ہیں ـــــــ اچھا ایک اور بات ضروری ہے۔ یہ کہ خواہ مخواہ کسی کی نقل کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ اور اسی طرح بناوٹ بھی بہت ہی بری بات ہے۔ جو بات جو بہ جو سچی ہو، دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے۔ ہاں ایسا کچھ ہو کر لکھتے لکھتے آپ کا خود انداز خاص ہو جائے تو کہنا ہی کیا ہے۔

اتفاق کی بات۔ یہ بات چیت ہم لکھ ہی رہے تھے کہ ایک مشہور پرانے اور بڑے استاد کی ایک کتاب سامنے پڑی تھی۔ اس میں زمانہ ہی کے گزر جانے اور بجائے گئے ہیں۔ پھر بھی اس میں جو زبان ہے وہ ہماری زبان نہیں۔ فرماتے ہیں "حمد الٰہی و نعت رسالت پناہی کے بعد کمترین بندگانِ ایزد متعال ننگ خاندان اکمال، حکیم سید جلال عرض پرداز ہے کہ ہیچمدان کے تالیفات و تصنیفات سے آٹھ کتابیں تمام ہندوستان میں شائع ہیں کہ ہر ایک ان میں سے مطبوع طبائع و دل پسند یعنی تمام عالم ان کا خواہشمند ہے ـــــــ"

یا پھر اسی طرح کا ایک نمونہ، جسے سن کر بھی آپ ہکا بکا ہی رہ جائیں گے۔ "ستنیک پراپتیہ دیوستھا کا پریشد میں ایک پرسن کا اتر دیتے ہوئے نیائے منتری ڈاکٹر کاٹجو نے ان ادیوگ دھندوں کی سوچی دی جن کی انتی کے لئے سرکار نے سہایتا دینا سویکار کیا ہے۔"

بھلا بتائیے اس میں کچھ پلے پڑا آپ کے؟ یہ دونوں ہماری زبان کے نمونے نہیں۔ اس قسم کی مشکل زبان کسی کے کام کی نہیں۔ اس طرح کی زبان ہمارے دیس میں کبھی پھل پھول نہیں سکتی۔ اور جو لوگ یہ انداز رکھتے ہیں وہ خود بڑی بے انصافی کرتے ہیں۔ اور ہماری راہ کھوٹی کرتے ہیں۔ تو صاحب میں ان میں نہیں ہوں۔

اچھا! تو آج کی ہماری باتیں بھی ایک کہانی سمجھئے۔ زبان کی کہانی، پھر کیوں نہ کہا جائے "کہانی پر پتھر سننے والوں کے سروں پر سونے کا چھتر" اور بھئی! اب ہم آپ سے رخصت! خدا حافظ!!

(آل انڈیا ریڈیو دہلی کی اجازت سے)

جدید شاعروں کی راتیں

(از جناب سعید خالد)

بسا اتفاقات مختلف افراد ایک ہی جیسے واقعات سے دوچار ہوتے ہیں۔ لیکن چونکہ ہر شخص اپنے تاثر لینے کے مطابق ہر واقعہ کو ایک مخصوص زاویہ سے دیکھتا ہے اور مختلف نتائج اخذ کرتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری نہیں کہ ایک جیسے واقعات تمام انسانوں پر ایک ہی جیسی کیفیت طاری کریں۔ بالفرض اگر ایسا ہو بھی تو یہ کیفیت لحاظ جنس نہیں تو بلحاظ شدت ضرور مختلف ہوتی ہے۔

ایک شخص اپنی محبوبہ کو ایک رات اپنے ساتھ پاکر دنیا و مافیہا کو بھول بیٹھتا ہے۔ اس کیلئے دو تین افراد کی حدود مٹ جاتی ہیں۔ اس کی قربت کا گہرا احساس اسکے ہوں کو شکوہ آشنا کرنے کے بجائے ان پر مہر سکوت لگا دیتا ہے۔ جذبات اور احساسات کی شدت بھی ان کے اظہار میں مانع ہوتی ہے۔ اس قربت کی اہمیت ایک انسان کی نظر میں جس قدر زیادہ ہوگی اسی قدر اسکو اپنی خوش قسمتی پر تحیر ہوگا۔ اور یہ تحیر تقریباً اسکے محسوسات کو مفلوج بنا دے گا۔

لیکن یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قربت محبوب کا احساس اس قدر شدید نہ ہو ممکن ہے یہ احساس صرف سطحی ہو۔ شاعر محبوبہ کو پاکر بجائے اپنے آپ کو بھول جانے کے اور بھی زیادہ جوش میں آجائے۔ معاً اسے خیال آئے کہ شاید پھر کسی رات ایسا موقع ملے نہ ملے۔ آج ہی گلے کیوں نہ لگالیں۔ یہ اپنی اپنی طبیعت پر موقوف ہے۔ کہ کسی پر یہ واردات کیسے اثر کرے۔

شاعری جذبات کے اظہار کا نام ہے۔ جذبات کے اظہار کی تاثیر جذبات کی شدت پر منحصر ہے۔ جذبات جس قدر گہرے ہونگے۔ دوسروں پر ان کا اثر اتنا ہی زیادہ ہوگا۔ جذبات جس قدر سطحی ہونگے لوگ ان کو اسی قدر کم قابل اعتنا سمجھیں گے۔ جذبات کے اظہار کا اثر اگرچہ ان کی صداقت اور گہرائی پر منحصر ہے تاہم حسن ادا کو ہم یکقلم نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ہر انسان شدت سے جذباتی شاعر نہیں ہو سکتا لیکن پھر بھی پہلی شرط کو دوسری پر بلا خوف تردید ترجیح دی جا سکتی ہے۔ کیونکہ ایک سطحی چیز کو گہری محسوس کر دکھانا دماغی ورزش تو ضرور ہے۔ اعلیٰ پایہ کی شاعری میں دیانتداری ہم سب کیلئے ضروری ہو یا نہ ہو لیکن کم از کم ایک شاعر کیلئے لازمی امر ہے۔ ورنہ اسکی تمام شاعری منہ چڑانے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھے گی۔ خشونت کے بغیر باوجود اپنی تمام تابناکیوں کے ایک آبگینہ ہیرا نہیں کہلا سکتا۔

ہمارے چار ممتاز شعرا فیض احمد فیض۔ اسرار الحق مجاز۔ اختر شیرانی م۔ن۔ ارشد نے تقریباً ایک ہی جیسی رات کا لطف اٹھایا ہے۔ اور اس رات پر چاروں نے نظمیں بھی لکھی ہیں۔ مندرجہ بالا خیالات کی روشنی میں ان نظموں کا موازنہ نہایت دلچسپ نتائج کا حامل ہے۔ سب سے پہلے اختر شیرانی صاحب کی نظم کو لیجئے۔ اختر شیرانی صاحب آنے والی رات کے انتظار میں بے تاب ہیں۔ مسرت و انبساط کے مارے پھولے نہیں سماتے۔ خوشی کا یہ عالم ہے کہ در و دیوار رقص کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

کتنی شاداب ہے دنیا کی فضا آج کی رات

. . . .

کس قدر خوش ہے خدائی سے خدا آج کی رات
ایک بے نام سی مستی کے مارے خوش ہیں
ایک میں خوش نہیں جتنے بھی ہیں سارے خوش ہیں

. . . .

ہے خوشی نغمہ سرا چار طرف آج کی رات

آختر صاحب کی اس سرمستی سے ہم بھی محظوظ ہوتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قربت یار کا خیال قلب شاعر کی پہنائیوں پر چھا چکا ہے۔ جونہی ہم آگے بڑھتے ہیں ہمیں افسوس ہونے لگتا ہے۔ فضا کی لامحدود وسعتیں بھی پرندے کو حسن و تماشا کا گھونسلا نہ بھلا سکیں۔

داستانِ دلِ بے تاب سنائیں گے انہیں
آپ روئیں گے گلے مل کے رلائیں گے انہیں
خود بھی پھر رونے پہ ہنس دینگے ہنسائیں گے انہیں
اور جرات کی تو سینے سے لگائیں گے انہیں

آختر صاحب اور پھیلتے ہیں:۔

واقفِ دردِ دلِ زار کریں گے اُن کو
گود میں لیں گے انہیں، پیار کریں گے اُن کو

لیکن ساتھ ہی ساتھ آختر صاحب کو فکر لاحق ہوتی ہے:۔

پاس آئیں تو مگر پاس بٹھائے نہ بنے
شرم کے مارے انہیں ہاتھ لگائے نہ بنے

اب یہ بذاتہٖ کوئی اعتراض کی بات نہیں کہ آختر صاحب اپنی محبوبہ کو گود میں

[illegible] ہو تا ہے کہ ان کا دل بھی

حسرت درد والا نہ ہوتے

یوں ہی تمام جھگڑے ہی رگڑے میں کٹ گئی
ہیرن خواب پھرتے تھے جس رات کے لئے

لیکن یہ جذبات پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ ہم سطحی ہیں۔ ہم ہیں بے پائی نہیں۔ میں افلاطونی عشق کا قائل نہیں۔ میرے نزدیک جسم اور روح میں آہنگ لازمی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ہمیں محتاط رہنا چاہیئے کہ جسم کی دور رس رعنائیاں روح کی حقیقی دلفریبیوں کو بالکل ہی محو نہ کرا دیں۔ آج کی رات فقط ایک ایسے نوجوان کی آپ بیتی یا محض خیال آرائی ہے جس نے آج سے پہلے کسی لڑکی کو تنہائی میں نہیں دیکھا۔ شاعر کو وہ پہلی لڑکی اس وقت حسینۂ دوجہاں معلوم ہوتی ہے لیکن ہم جانتے ہیں چند ہی روز کے بعد وہ ایسی معلوم نہیں ہوگی۔ شاعر کے جذبات میں زوال پذیری کا عنصر موجود ہے۔ اور یہ زوال پذیری اس کے اشعار میں منعکس ہے۔ حسن اظہار بھی اس نظم کو اس عنصر کی دستبرد سے نہیں بچا سکتا۔

آختر شیرانی کو انتظار نے بے چین بنا رکھا تھا۔ نہ معلوم اس کا انجام کیا ہوا۔ مجاز صاحب ہمیں یہ پتہ نہیں دیتے کہ انہوں نے انتظار کی جانکاہ صعوبتیں اٹھائیں یا نہیں۔ کیا پہلے طے شدہ بات تھی یا یونہی اتفاقیہ کرم بخشی ہوئی۔ بہر حال ہمیں ایک دم پتہ چلتا ہے۔

بیٹھے شانے پہ ہے اس شوخ کا سر آج کی رات

محبوب کی موجودگی نے ایوانِ دل کو جگمگا دیا ہے۔ ہر شے محوِ رقص ہے۔ ہر ذرہ خورشید تھا اور ہر خار گلستان بکنار نظر آ رہا ہے۔

پھول کیا خار بھی ہیں آج گلستاں بکنار
سنگریزے ہیں نگاہوں میں گہر آج کی رات
پھوٹ نکلا در و دیوار سے سیلاب نشاط
اللہ اللہ سوا کیف نظر آج کی رات

مجاز کو زبان پر پوری پوری قدرت حاصل ہے۔ بہت سے شعرا اس دسترس سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ اور بزعم خود اپنی اس سعیٔ رائیگاں کو کامیاب بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن یہ سراسر ان کی غلطی ہے۔ ان کے نزدیک جستہ جستہ تراکیب بندشوں کی چستی مضمون آفرینی اور الفاظ کی برمحل نشست یہ تمام چیزیں جذبات کی قطعی مفقودگی پر پردہ ڈال سکتی ہیں۔ ان لوگوں کے نزدیک اپنے جذبات کے اظہار سے زیادہ ضروری اپنی زباندانی کا اظہار ہوتا ہے۔ مجاز نے اس رات کو اچھی طرح نبھایا ہے۔ اس کی زباندانی کہیں بھی اسکو

[illegible] بھی نمائش کیلئے نہیں اکسایا۔ مجاز نے [illegible] جذبات [illegible] نہیں سمجھا۔ اس کی تمام نظمیں جذبات سے [illegible] اور معانی۔ بیان کی سادگی۔ اور بے ساختہ پن اس کے [illegible] خصائص سے ہیں۔ جذبات کی انتہائی گرمی بھی [illegible] بہترین مثالیں ہیں) یہ خصوصیات اپنا رنگ اور رعب قائم رکھتی ہیں۔ آج کی رات سراسر جذبات سے لبریز ہے۔ لیکن یہ جذبات شادابی سے معمور ہیں۔ حسرت و یاس کو یہاں کوئی دخل نہیں۔ شاعر اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہے۔ اس انتظار واجب نے اسکے اشعار میں شراب کی سی تیزی پیدا کر دی ہے کیسا تھا ہمیں نہیں معلوم۔ فردا کیا دکھائے گا۔ شاعر کی جوانی اس سے پہلے [illegible] مسرت کی زیادتی نے یہ سب کچھ بھلا دیا ہے۔

عارض گرم پہ وہ رنگ شفق کی لہریں
وہ مری شوخ نگاہی کا اثر آج کی رات
نرگس ناز میں وہ نیند کا ہلکا سا خمار
وہ مرے نغمۂ شیریں کا اثر آج کی رات
وہ تبسم ہی تبسم کا جمال پیہم
وہ محبت ہی محبت کی نظر آج کی رات

قرب محبوب کیا حاصل ہوا شاعر کو دونوں جہان کے خزانے مل گئے کس بلا کی بے نیازی ہے۔ کیا سرمستی ہے۔

اپنی رفعت پہ جو نازاں رہی ہو نازاں ہی رہیں
کہہ دو انجم سے کہ دیکھیں نہ ادھر آج کی رات

یہ نظم حسن بیان اور صحت جذبات کے امتزاج کی ایک کامل مثال ہے۔ انتظار کی کاہشیں۔ فراق کے صدمے۔ امید دیدار کی کشمکش ان سب سے مجاز ناواقف ہے۔ لیکن اس سے اسکی نظم پر حرف نہیں [illegible] اگر یہ نظم پڑھکر ہمارے دل میں دھڑکن پیدا نہیں ہوتی تو بلا [illegible] پیدا ہوتا ہے وہ اس دھڑکن سے کسی طرح کم قیمت نہیں۔

اب راشد صاحب کی ایک رات کو لیجیے۔

راشد کی نظم زیر بحث شعرا کی نظموں سے بالکل مختلف [illegible] ایک خاص نظریے کا شاعر ہے۔ اس کی شاعری سے کماحقہ واقفیت کے لئے یہ لازم ہے کہ اس کے اس نظریے کو اچھی طرح سمجھ [illegible] ایک شکست خوردہ ذہنیت کا مالک ہے۔ اسکے نزدیک ہیجان [illegible] کو مٹانے کے لئے عورت سے بہتر کوئی کھلونا نہیں۔ عورت جو [illegible]

اک وجہ لگ سکتی ہے۔ اس کے نزدیک ایک واقعہ بدلنے والی رات سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔ آپ کو پورا پورا حق حاصل ہے کہ آپ اس نظریے سے اختلاف کریں یا اتفاق۔ لیکن میری رائے میں راشد نے اس نظریے کی بدولت اپنی اوّل درجے کی نظموں (مثال کے طور پر نقش) کو پستی میں گرا دیا ہے۔ اس لئے نہیں کہ یہ نظریہ نہایت مکروہ ہے بلکہ اس لئے کہ شاید راشد کو خود اس نظریے پر یقین نہیں۔ اس کا اس نظریے پر موقع بے موقع زور دیتے پر تلے رہنا ہی اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کو اسکی صداقت میں شک ہے۔ اس کی آزاد روی اور اس کے فلسفۂ فرار میں وہ بے باکی نہیں جو ہمیں یقین دلائے کہ شاعر کا اظہار احساسات کا آئینہ دار ہے۔ اندریں حالات ایسے جذبات کا اظہار ایک سنجیدہ مذاق سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ زندگی بھی تو ایک مذاق ہے اور راشد نے کبھی اسکو اس سے زیادہ وقعت نہیں دی۔

آج کی رات کی تمام کائنات اس سکون کا اظہار ہے جو خواہشات جنسی کی تکمیل کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ ایک اچھی نظم کی کامیابی کا دارومدار دو باتوں پر ہے۔ اوّل اسلوب بیان۔ دوسرے یہ کہ جس جذبے کا اظہار مقصود ہو وہ بذاتِ خود اہم اور قابل اظہار ہو۔ اس نظم میں جس جذبے کا اظہار کیا گیا ہے اس کی نوعیت آپ کے سامنے ہے۔ پھر شاعر نے آخر اس رات کی واردات کو سپردِ قلم کرنے کی تکلیف گوارا کیوں کی؟ شاید اس لئے کہ یہ رات شاعر کی زندگی میں پہلی رات تھی یا پھر شاید اس لئے کہ شاعر کو اس واقعے کے بعد ایسی راتیں میسر نہیں ہو سکیں جس نے پہلی رات کی اہمیت کو بڑھا دیا۔ اور یہ خیال زیادہ اطمینان بخش ہے۔ یا اگر ایسی راتیں شاعر کو میسر آئی ہیں تو ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ایک مدت سے یہ رات بھول چکا ہوگا۔

لیکن یہ ایک بڑی بے انصافی ہوگی۔ اگر مقصد اظہار کی اس کوتاہی کے ساتھ اسلوب بیان کی متانت کو نظر انداز کر دیا جائے۔ ن م راشد ایک ایسا شاعر ہے جس کی نظمیں آزاد شاعری کی کامیاب مثالوں کے طور پر پیش کی جا سکتی ہیں۔ اظہار کا تسلسل۔ جذبات کی نرمی و شدت کے ساتھ ساتھ الفاظ کی رفتار میں کمی بیشی۔ داد کے قابل ہے۔ اس سے قطع نظر کہ شاعر کا مطمح نظر کیا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اپنے حسن کی دلیل آپ ہیں ؂

چاند کی کرنوں کا بے پایاں فسوں پھیلا ہوا
سرمدی آہنگ برساتا ہوا ہر چارسو

تیرے دل میں راز کی اک کائنات

تیری خاموشی میں طوفانوں کا غوغائے عظیم
سرخوشِ اظہار تیری ہر نگاہ
تیرے مژگاں کے تلے گہرے خیال
بے بسی کی نیند میں آلجھے ہوئے

تیرے سینے کے سمن زاروں میں آئیں لرزتیں
میرے انگاروں کو بے تابانہ لینے کے لئے
اپنی نکہت اپنی مستی مجھ کو دینے کے لئے
غم کے بحرِ بیکراں میں ہوگیا پیدا سکون

اختر شیرانی کی نظم ایسے جذبات کا اظہار ہے جو ایسی رات کے تصور سے ایک نادیدہ نوجوان کے دل میں پیدا ہو سکتے ہیں۔ چونکہ یہ جذبات بذاتِ خود اتنے اہم نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کا اظہار بھی کچھ اتنی اہمیت لئے ہوئے نہیں ہوگا۔ راشد کی نظم اس دعوے کی دلیل ہے کہ نگارش کی تمام رعنائیاں بھی مقصدِ اظہار کی گراں مائگی کے بغیر نظم کو کامیاب نہیں بنا سکتیں۔ مجاز کی نظم صداقتِ جذبات اور حسنِ بیان کی ایک کامیاب مثال ہے۔

جذبات کے لحاظ سے فیض اور مجاز کی نظمیں ایک دوسرے کے دوش بدوش ہیں۔ لیکن فیض کی نظم میں نہ تو مجاز کا پُرسکون انبساط ہے۔ نہ راشد صاحب کی نکتہ دانی۔ اور نہ اختر شیرانی کا شوقِ بے تاب۔ یہ نظم ان تمام نظموں سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔

مجاز ہمیں یہ نہیں بتلاتا کہ محبوبہ کے ملنے سے پیشتر اس کا کیا حال تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد اس پر کیا گذری۔ وہ ہمیں اتنا بھی اندازہ نہیں ہونے دیتا کہ اس کی جدائی بھی اس پر شاق گذری یا نہیں۔ فیض ہمیں یہ سب کچھ بتلاتا ہے۔ انسانی طبیعت اوروں کی خوشی سے اتنی زیادہ متاثر نہیں ہوتی جتنی اوروں کی مصیبت سے۔ ہمدردی کا جذبہ قدرت کی ان ودیعتوں میں سے ہے جن سے کوئی ذی روح محروم نہیں رکھا گیا۔ ظلم و شقاوت کے بعض واقعات جہاں یہ جذبہ کلی طور پر مفقود ہوتا ہے ان غیر فطری مظاہر سے تعلق رکھتے ہیں جن کی وجوہ پر روشنی ڈالنا ہمارے معرضِ بحث سے بالاتر ہے۔ ورنہ کوئی انسان ایسا نہیں جس میں ہمدردی کا مادہ نہ ہو۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے کی مصیبت انسان کو فوراً یہ خیال دلاتی ہے کہ اگر مجھ پر یہ گزرتی تو کیا ہوتا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ الم ناک خیالات کا اظہار زیادہ موثر ہوتا ہے۔

یہ چھوٹی سی نظم متضاد کی ایک دنیا لئے ہوئے ہے۔ جس کے [illegible]
کچھ اتنے شدید ہیں کہ جن قرب میں بھی محبوب ان کو بھلا نہیں سکتی۔ لیکن شاعر ان سے مجبور ہے۔ وہ اپنی ایک رات کو جو سینکڑوں راتوں کے مسلسل کرب کا حاصل ہے گزشتہ آلام کے بیان میں ضائع نہیں کرنا چاہتا۔

آج کی رات ساز درد نہ چھیڑ

صرف ایک مصرعے میں شاعر کتنی طویل داستان کہہ گیا ہے۔ ماضی کا غم۔ رات بھر کی فرصت۔ مستقبل کا ڈر کیا کچھ نہیں جو اس مصرعے میں موجود نہیں ہے

دکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے
اور کل کی خبر کسے معلوم
دوش فردا کی مٹ چکی ہیں حدود
ہو نہ ہو اب سحر کسے معلوم

شاید شاعر پر یہ فراری کیفیت اس بری طرح سے حاوی نہ ہوتی اگر اسے معلوم ہوتا کہ قرب محبوب صرف آج کی رات تک محدود نہیں۔

دکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے
ہو نہ ہو اب سحر کسے معلوم

لیکن دکھ سے بھرپور دن تمام نہیں ہوئے۔ اور شاعر کو معلوم ہے کہ سحر ضرور ہوگی۔ فلسفۂ فرار پر وقت بے وقت بہت سے مظالم توڑے گئے ہیں۔ بعض نے اس کو جائز و ناجائز گفتار و کردار کا جواز سمجھا ہے۔ دوسروں نے اسے ایک ایسی پناہ گاہ سمجھا ہے جہاں گھس کر وہ ہر طرح کی بعید از قیاس باتیں کر سکتے ہیں۔ وہ ہر خطرے سے محفوظ ہیں۔ انہیں حق ہے کہ ہر ناممکن چیز کو ممکن کر دکھائیں۔ لیکن فلسفۂ فرار اسی وقت کامیاب ثابت ہو سکتا ہے جب کہ پڑھنے والوں یا سننے والوں کو یقین آ جائے کہ زندگی کے تلخ حقائق کچھ اتنے ہمہ گیر ہوتے چلے گئے تھے کہ شاعر کے سامنے سوائے فرار کے اور کوئی راستہ نہ تھا۔ ان حالات میں بھی اس فرار کو عقل و ہوش سے فرار کے ہم معنی نہیں سمجھنا چاہئے۔ ہم سب بسا اوقات اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اور اس خود فریبی میں بڑا لطف ہوتا ہے۔ بعض اوقات یہ خود فریبی تلخی کے احساس سے کم از کم وقتی چھٹکارا پانے کے لئے نہایت ضروری ہوتی ہے۔ لیکن یہ خود فریبی ایک حد تک ہی مستحسن ہے۔ اسی طرح شاعرانہ خود فریبی بھی اگر فہم و قیاس سے بالکل ہی کنارہ کش نہ ہو جائے تو نہ صرف افزائش حسن کا باعث ہوتی ہے بلکہ بعض جگہ اسکی موجودگی ایک مردہ جسم میں روح کا کام کر جاتی ہے اسکی بہترین مثال اوپر کے دو شعر ہیں۔

ماضی کے مصائب و آلام کا احساس مستقبل سے روگردانی۔ ارتعاش و اضطرار کی کیفیت وقت کی گریز پائی۔ اور اس پر ایک قادر الکلام شاعر کا کامیاب اظہار ان تمام چیزوں نے مل کر اس نظم کو ایک افسوں بنا دیا ہے۔ الفاظ

ہم تمام کر کے [illegible]

غزل

(از جناب ڈاکٹر تاج زبیری)

میکشو! آخر بہاروں کا پیام آ ہی گیا
ابر کا ساقی لئے پھولوں کا جام آ ہی گیا

کفر ہے پھرنا جہاں سے وہ مقام آ ہی گیا
اب تو دیوانوں میں انکے میرا نام آ ہی گیا

ہے تری سعی عمل بیکار، اے ناکام عشق
کام آنا جس کو آتا تھا وہ کام آ ہی گیا

غم کی تاریکی سے دل کی روشنی دب ہی گئی
صبح کے جلووں پہ غالب رنگ شام آ ہی گیا

باغ والے ان فریبوں سے ذرا بچتے رہیں
میں تو دانے کی ہوس میں زیر دام آ ہی گیا

تذکرے نظروں کے تھے خود شناسی کی صلا
آج میری خندہ [illegible] آ ہی گیا

کیا خبر بے اختیاری تھی کہ حسن اتفاق
انکی یاد آئی تو لب پر ان کا نام آ ہی گیا

میں نہ تھا لے تاج! انکی بزم کے قابل مگر
نامۂ موت بالآخر سے نام آ ہی گیا

کراس ورڈ پزل (معمّے)

(از جناب شیخ احسان الحق صاحب)

معمّے کیسے ہوتے ہیں اور کیونکر حل کئے جاتے ہیں؟

"کراس ورڈ" (Crass word) کا اُردو ترجمہ میں اپنے شوق چلیپائی معمّوں کے لئے جو اخبار خوشوقت میں شائع ہوتے تھے چلیپائی لفظ کیا تھا۔ کوئی اس سے بہتر ترجمہ ابھی تک میرے علم میں نہیں آیا۔ چلیپا صلیب یا صلیب نما شکل کو کہتے ہیں۔ یعنی ایسی شکل جس میں دو لکیریں ایک کھڑی اور ایک پڑی آپس میں تقاطع کرتی ہیں (جیسے +) چلیپائی لفظوں سے زیادہ تر چلیپائی معمّوں میں کام لیا جاتا ہے۔ یہ معمّے مستطیل شکل کے ہوتے ہیں جن کو ایک تعویذ کی نقش کی طرح چند عمودی اور اُفقی خطوط یعنی کھڑی اور پڑی لکیروں کے ذریعہ سے کئی چھوٹے چھوٹے مستطیل خانوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ہر خانہ ایک حرف کیلئے مخصوص ہوتا ہے۔ جس خانہ میں کسی افقی یا عمودی لفظ کا آخری حرف آتا ہے اُس سے اگلے خانہ کو پھول وغیرہ بنا کر یا سیاہی پھیر کر بند کر دیا جاتا ہے۔ ہر ایک لفظ کے شروع ہونے سے پہلے یا ختم ہونے کے بعد اگر معمّہ کی حد بندی کا خط نہ ہو تو کوئی بند خانہ ضرور ہوتا ہے۔ جس خانہ سے کوئی نیا لفظ شروع ہوتا ہے اسکے کسی کونہ میں ایک شمارہ کا ہندسہ ڈال دیا جاتا ہے۔ یہ ہندسہ بننے والے لفظ کے لئے پتے یا اشارہ کا حوالہ دینے کے لئے ہوتا ہے جسکو انگریزی میں (Clue) کہتے ہیں۔ معمّہ کی تکمیل خانہ پُری کے لئے جتنے لفظوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اتنے ہی اشارات ہر معمّہ کے ساتھ دیئے ہوتے ہیں۔ اور انہی اشارات کی رہنمائی میں اور ان کا پابند رہکر معمّہ کیلئے صحیح الفاظ کو تلاش کرنا یا ان کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ جو اشارات افقی الفاظ سے متعلق ہوتے ہیں یعنی ایسے الفاظ سے جو اُردو معمّہ میں داہنی طرف سے بائیں طرف اور انگریزی معمّہ میں اس کے برعکس پڑھے جاتے ہیں۔ ان کو اشارات افقی (Clues across) کہتے ہیں اور عمودی الفاظ یعنی وہ الفاظ جو اوپر سے نیچے کی طرف پڑھے جاتے ہیں ان سے متعلق اشارات عمودی (clues down) کہلاتے ہیں ہر اشارہ کا تعلق جس لفظ سے ہوتا ہے اسی کے ہندسہ سے معمّہ میں اس لفظ کیلئے مخصوص خانے متعین کر دیئے جاتے ہیں۔ اگر معمّہ کے ایک ہی خانہ سے کوئی افقی لفظ بھی شروع ہوتا ہے اور کوئی عمودی لفظ بھی، تو اس خانہ کا ہندسہ اشارہ افقی کا بھی حوالہ دیتا ہے۔ اور اشارہ عمودی کا بھی اور دونوں اشارات بیک وقت پیش نظر رکھنے سے مطلوبہ الفاظ کی تلاش یا مرجح الفاظ کے انتخاب میں آسانی ہو جاتی ہے۔ بعض الفاظ چلیپائی معمّوں میں کسی نامعلوم مشترک حرف یا حروف کے ذریعہ سے آپس میں اس طرح جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ کہ ان میں سے کسی ایک لفظ کے غلط یا صحیح ہونے سے باقی تمام جڑے ہوئے لفظ غلط یا صحیح ہو جاتے ہیں۔ ایسے لفظوں کو جڑواں یا توام اور انگریزی میں (Interlockers) کہتے ہیں۔ جڑواں لفظوں سے متعلقہ اشارات کو حل کرنے میں یہ آسانی تو ہوتی ہے کہ ایک اشارہ کا صحیح حل سمجھ میں آجانے سے دوسرے اشارات کے حل خود بخود صحیح ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہ خطرہ بھی رہتا ہے کہ اگر آسانی سے سمجھ میں آجانے والا حل اتفاقاً غلط ہو گیا تو ایک غلطی کی کئی غلطیاں شمار ہوتی ہیں۔

چلیپائی معمّوں میں بعض معمّے تو ایسے ہوتے ہیں جن میں سب کھلے ہوئے خانے حل کرنے والوں کے لئے خالی رکھے جاتے ہیں۔ ایسے معمّوں کے اشارات کی نوعیت عموماً پہیلیوں کی سی ہوتی ہے۔ ان پہیلیوں کے بوجھنے کے لئے حل کنندہ کو اشارہ کی روشنی میں اپنے خزانہ معلومات و مشاہدات کا جائزہ لے کر یا خارجی ذرائع معلومات سے فائدہ اٹھا کر مطلوبہ لفظ یعنی صحیح حل کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔

ایسے معمّوں کو تلاش الفاظ کے چلیپائی معمّے کہہ سکتے ہیں اور ان معمّوں میں جس قسم کے اشارات عام طور پر ہوتے ہیں اُن کی ایک مثال یہ ہو سکتی ہے :-

"گھریلو ضرورت کی چیز جسے اگر جانور فرض کر لیا جائے تو کہا
جا سکتا ہے کہ اس کے چھ پیر ہیں اور دو شکم اور پشت پر
ہے اُس کی دُم"۔

اس اشارہ کے حل کے لئے معمّہ میں پانچ خانے خالی ہونے سے یہ سمجھ لیا جائیگا۔ کہ اس کا حل ایک پنج حرفی لفظ ہے۔ اور اشارہ کی عبارت یعنی حل کے لئے پتے پر غور کرنے سے سمجھ میں آجائیگا کہ یہ پنج حرفی لفظ سوائے ترازو کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر اشارہ کے ذریعہ سے ہماری قوت متخیلہ ترازو کی طرف منتقل ہو جائے تو ہمارے حل میں غلطی کا کوئی اِمکان نہیں ہو سکتا۔

دوسری قسم کے چلیپائی معمّے وہ ہوتے ہیں جنکے حل کرنے والوں کو مطلوبہ الفاظ کی تلاش میں اتنی کوشش و کاوش نہیں کرنی پڑتی جتنی کہ کئی معلومہ لفظوں میں سے کسی صحیح ترین لفظ کے انتخاب میں کرنی پڑتی ہے۔ ان معمّوں کے سب کھلے ہوئے خانے خالی نہیں رکھے جاتے۔ بلکہ ہر لفظ کے لئے کچھ حرف پہلے سے درج کر دیئے

ہے ہیں اور باقی حروف حل کنندہ کو خود بھرنے پڑتے ہیں۔ ... حروف کے
در ہونے سے یہ پتہ آسانی سے چل جاتا ہے کہ کون کون سے لفظ کس اشارہ سے متعلق ہو سکتے
ہیں۔ پھر ان لفظوں میں سے ایسے لفظوں کو جو اشارے سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے
الگ کر دیا جاتا ہے۔ اور جب دو یا دو سے کچھ زیادہ لفظ ایسے رہ جاتے ہیں جو اپنی اپنی
جگہ سب کے سب صحیح اور اشارہ کے ساتھ چسپاں معلوم ہوتے ہیں تو ان میں سے ایک
ایسے لفظ کو حل کے لئے منتخب کرنا پڑتا ہے جو سب سے زیادہ صحیح اور قابل ترجیح ہو۔
اور یہی چیز اُن معموں کے حل میں سب سے زیادہ دشواری اور خطرہ کی ہوتی ہے۔ اس لئے
ایسے معموں کو ہم انتخاب الفاظ کے چلیپائی معمّے کہہ سکتے ہیں۔ ان معموں کے
اشارات بنانے والوں کی قابلیت اس میں سمجھی جاتی ہے کہ صحیح لفظ کے لئے اشارہ میں
وجہ ترجیح موجود ہونے کے باوجود حل کنندہ کا ذہن صحیح لفظ کی وجہ ترجیح کی طرف منتقل
نہ ہو اور غلط لفظ کے لئے اشارات کی عبارت سے کوئی وجہ ترجیح نکال لے۔ مثال کے
طور پر ایسے معموں کا ایک اشارہ یہ ہو سکتا ہے :۔

"بعض حالات میں انسان اپنی کا سارا مزاج اُنہی پر اٹھا لینا چاہتے ہیں۔"

یہ اشارہ ایک دو حرفی لفظ کا ہے جس کا پہلا حرف "ز" کچھ پہلے سے معمہ میں دیا ہوا ہے۔ ہم کو دوسرا حرف معلوم کرنا ہے جو دئیے ہوئے اشارہ کی مناسبت سے حرف "ر" ہو سکتا ہے یا "ن"۔ حل کنندہ کو اشارات کی عبارت کے ہر پہلو پر غور کرکے فیصلہ کرنا ہے کہ حل کیلئے صحیح لفظ "زر" ہے یا "زن"۔ اب یہ فیصلہ آپ پر ہی چھوڑا جاتا ہے کہ زر اور زن میں سے کس کو اختیار کیا جائے اور کس کو رد۔

جن حضرات کو کراس ورڈ معموں کے حل کرنے کا پہلے کبھی اتفاق نہیں ہوا ہے اُن کی آسانی کے لئے ذیل میں دونوں قسم کے کراس ورڈ معموں کے نمونے درج کئے جاتے ہیں۔ یہ معمّے زیادہ مشکل نہیں ہیں۔ اس لئے ان کے حل نہیں دیئے گئے تا کہ پڑھنے والے خود اپنے دماغ پر زور دے کر ان معموں کو حل کریں کیونکہ بغیر خود حل کئے ہوئے ان معموں کی مشکلات اور دلچسپی کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا اور حل معلوم ہو جانے کے بعد معمہ کی دلچسپی بہت کم ہو جاتی ہے۔

(۱) نمونہ چلیپائی معمہ تلاش الفاظ

*			
	*		*

اشارات افقی: (۱) ... (۳) ... (۲) ... بھی ... ...
(۳) ...
مرجھائے۔
(۴) وابستہ ... ...

اشارات عمودی: (۱) ... کہیں ... سے ... رہے
(۲) ایک ... مشہور شاعر کا تخلص
(۳) آنکھ میں ہو یا آواز میں کچھ نہ کچھ کشش ضرور رکھتی ہے
(۵) ــــ اپنی تنخواہ بڑھاتے جائیں
پان کل کے لئے لگاتے جائیں

(۲) نمونہ چلیپائی معمہ انتخاب الفاظ

ب	ا		ش
		ذ	
و	ن		ک
ل		*	ت

اشارات افقی: (۱) بازاری عورتوں کی گرم بازاری اکثر اسکی وجہ سے ہوتی ہے
(۵) شاعر کے تخیل میں معشوق کی زلف۔
(۶) اسے اُلٹ کر بالوں کی "لٹ" بنا سکتے ہیں۔

اشارات عمودی: (۱) بعض خود نما لیڈر یہ خواہش کیا کرتے ہیں کہ قومی جلسوں میں
اُن کی ــــ نمایاں ہو۔
(۲) افسردہ دلی سے حفظ لینے والے کسی کامیابی میں بھی رخنہ انداز ہو سکتے ہیں۔
(۳) اس کو کسی اونچا باڑ بہ خاص مقامات میں لے جایا جا سکتا ہے
(۴) ایسے ملازم پر خطرناک کاموں میں بھروسہ کرنا اکثر باعث ندامت ہوتا ہے۔

کراس ورڈ معموں کی ابتدا اور اسکی ترقیاں

کراس ورڈ معموں کی ابتدا کب ہوئی کہاں ... ...
کا جواب دینے کیلئے کسی بڑی تاریخی واقفیت یا تاریخی مدد کی ... ...

[illegible] انگریزی تعلیم یافتہ موجود ہیں جنھوں نے [illegible] شہروں میں
[illegible] شوق سے [illegible] اور [illegible] دیکھا ہے۔ اس لئے کہ ان
[illegible] کی عمر اس وقت تیس سال سے زیادہ نہیں ہے۔ اور ۱۹۲۲ء تک ایسے معموں کا کوئی پتہ نہیں تھا جن پر کراس ورڈ معموں کی تعریف پوری طرح سے صادق آتی

کراس ورڈ معموں کی ابتدا ۱۹۲۲ء میں ہوئی۔ اور اس طرح پر ہوئی کہ انگلستان کے دو گریجوایٹوں کو جو اس وقت خوش قسمتی یا بدقسمتی سے بیکاری کی مصیبت میں مبتلا تھے اور ان کا وقت کسی طرح کاٹے نہیں کٹتا تھا۔ یہ خیال پیدا ہوا کہ وقت گزاری کے لئے کوئی ایسا علمی تفریحی مشغلہ نکالا جائے جس سے تفریح کی تفریح ہو اور قابلیت و معلومات بھی بڑھے۔ ایسے تفریحی مشغلہ کی تلاش میں ان نوجوانوں کا ذہن کراس ورڈ معمہ کی طرف منتقل ہوا اور ان کو اسکے ایجاد کرنے میں کامیابی ہوگئی۔ چند ہی عرصہ کے اندر ان کی اس عام پسند علمی اور تفریحی ایجاد نے ان کے ملک میں اتنی مقبولیت حاصل کرلی کہ انگلستان کے بعض بڑے بڑے اخبارات جیسے نیوز آف دی ورلڈ۔ نیوز کرانیکل اور لیڈر وغیرہ نے بھی اسکی ضرورت محسوس کی کہ اپنے ناظرین کی ضیافت طبع کیلئے کراس ورڈ معمے شائع کریں۔ ان اخبارات کی سرپرستی نے کراس ورڈ معموں کی مقبولیت و ہردلعزیزی میں اور بھی اضافہ کردیا۔ اور نہ صرف انگلستان بلکہ انگلستان سے باہر بھی ان معموں سے ایک عام دلچسپی پیدا ہوگئی۔ خصوصاً امریکہ میں کراس ورڈ معموں کا بہت گرمجوشی سے خیر مقدم کیا گیا۔ اور اہل امریکہ کو اہل انگلستان سے بھی زیادہ ان معموں کے ساتھ گرویدگی و دلچسپی پیدا ہوگئی۔ اپنے ہم وطنوں کی اس بڑھتی ہوئی گرویدگی و دلچسپی کو دیکھکر ہارورڈ یونیورسٹی کے دو گریجوایٹوں نے کراس ورڈ معموں کی اشاعت کیلئے ایک مستقل کاروباری ادارہ قائم کردیا۔ جس میں ان کو ایسی قابل رشک کامیابی ہوئی کہ وہ چند ہی روز میں خاصے مالدار ہوگئے۔

گزشتہ جنگ عظیم کے ختم ہونے پر جب اخبارات و رسائل کی اشاعتیں جو جنگ کی وجہ سے کہیں کی کہیں پہنچ گئی تھیں گرنی شروع ہوئیں تو بہت سے اخباروں اور رسالوں نے کراس ورڈ معموں ہی کو اپنی اشاعتیں برقرار رکھنے کا ذریعہ بنایا اور اپنے صفحات میں دلچسپ کراس ورڈ معمے شائع کرکے اور ان کے حل کنندگان کے لئے نقد انعامات اور قیمتی تحائف کی دلکش ترغیبات رکھکر نہ صرف یہ کہ اپنی اشاعتوں کو برقرار رکھا بلکہ کئی پرچوں کی اشاعتیں زمانہ جنگ سے بھی بڑھ گئیں۔ چنانچہ آج تک انگلستان اور امریکہ کے بہت سے اخبارات و رسائل کی گوناگوں علمی اور ادبی دلچسپیوں میں کراس ورڈ معموں کی دلچسپی بھی ایک ضروری دلچسپی سمجھی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ بچوں کے صفحات اور بچوں کے مخصوص رسائل و اخبارات بھی کراس ورڈ معموں سے خالی نہیں ہوتے [illegible] خصوصاً انگلستان کے بچے بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔

انگلستان کے ہزاروں باشندے جنکو کراس ورڈ معموں کا چسکا لگ گیا تھا، ہندستان آنے کے بعد اپنے اس تفریحی مشغلہ سے محروم رہنا کیسے گوارا کرسکتے تھے۔ ان کی تفریحی ضرورت پوری کرنے کیلئے ہندستان کے مشہور اخبارات پائنیر اور سٹیٹسمین نے بھی اپنے کالموں میں کراس ورڈ معمے شائع کرنے شروع کردیئے۔ جن سے نہ صرف انگریزوں نے بلکہ ہندستانیوں نے بھی کافی دلچسپی لینی شروع کردی۔ پائنیر کے متعلق تو معلوم نہیں۔ لیکن سٹیٹسمین میں کراس ورڈ معموں کی اشاعت کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور اس کا شمارہ ساڑھے چار ہزار کے قریب پہنچ چکا ہے۔ سٹیٹسمین کے کراس ورڈ معمے تلاش الفاظ کی نوعیت کے معموں میں بہترین قسم کے ہوتے ہیں۔ اور بڑی قابلیت اور وسعت نظر سے مرتب کئے جاتے ہیں۔ ایسے معموں کے حل کرنے میں چونکہ صرف تلاش الفاظ کی دشواری ہوتی ہے اور کئی بظاہر صحیح معلوم ہونے والے لفظوں میں سے ایک صحیح ترین لفظ کا انتخاب نہیں کرنا پڑتا اس لئے ان معموں کے حل ناقص تو رہ سکتے ہیں۔ یعنی یہ ممکن ہوسکتا ہے کہ پوری تلاش و کوشش کے باوجود کسی اشارہ کیلئے صحیح لفظ نہ مل سکے۔ لیکن غلطیوں کے امکانات ایسے معموں میں بہت کم ہوتے ہیں۔ اور اسی لئے ان کو انعامی مقابلوں کے مقاصد کیلئے بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سٹیٹسمین بھی اپنے معموں کے حل کرنے والوں کو کوئی انعام نہیں دیتا۔ مگر اس کے باوجود سٹیٹسمین کے ہزارہا علم دوست ناظرین بغیر کسی مالی منفعت کی توقع کے محض ایک علمی تفریحی مشغلہ سمجھکر اسکے معموں کو باقاعدہ حل کرتے اور ان کے ذریعہ سے اپنی معلومات اور وسعت نظر میں اضافہ کرتے ہیں۔ بلکہ سنا گیا ہے کہ ہندستان کے بعض بہت ہی بلند طبقہ کے حکام و امرا بھی سٹیٹسمین کے معموں میں کافی دلچسپی لیتے اور ان کو باقاعدہ حل کیا کرتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اگر سٹیٹسمین کے پڑھنے والوں کو اس کے کراس ورڈ معموں سے کافی دلچسپی نہ ہوتی تو موجودہ کاغذی قحط اور قلت گنجائش کے زمانے میں سٹیٹسمین جیسے اخبار کے قیمتی صفحات میں ان معموں کو ہرگز جگہ نہ مل سکتی۔

کامن سنس کراس ورڈ معمے

بمبئی کے مشہور و معروف ہفتہ وار مصور انگریزی رسالے السٹریٹڈ ویکلی کے نام کو کراس ورڈ معموں کے ساتھ ایسی وابستگی ہوگئی ہے کہ ان معموں کا ذکر آتے ہی ذہن السٹریٹڈ ویکلی کی طرف منتقل ہوجاتا ہے اور جن انگریزی تعلیم یافتوں کو کراس ورڈ معموں سے دلچسپی ہے۔ انمیں شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے السٹریٹڈ ویکلی کے معمے حل کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ السٹریٹڈ ویکلی کے کامن سنس کراس ورڈ معمے اپنی بہت سی خصوصیات کے لحاظ سے اس وقت یقیناً دنیا میں اپنی نظیر نہیں رکھتے

الشر ہیٹڈ ویکلی ... معمہ بازی اس وقت ... [illegible]

... سے بڑا کام ہوا ہے

الشر ہیٹڈ ویکلی میں معموں کی اشاعت کا سلسلہ یوں تو اس اخبار کی پیدائش کے وقت سے ہی جاری تھا۔ لیکن ابتدائی زمانے کے یہ معمے زیادہ تر تصویری تھے۔ لطفانی یا اخلاقی وغیرہ اقسام کے ہوا کرتے تھے۔ یہ معمے بھی بہت ہی دلچسپ بنائے جاتے تھے اور ان کے حل کرنے میں بھی کافی دماغ سوزی اور وسعت نظر سے کام لینے کی ضرورت ہوتی تھی۔ لیکن مجموعی حیثیت سے جو دلکشی اور تفریحی صلاحیت موجودہ کراس ورڈ معموں میں ہے وہ ان معموں میں نہیں تھی۔ کراس ورڈ معموں کا سلسلہ الشر ہیٹڈ ویکلی میں دسمبر ۱۹۲۵ء سے شروع ہوا ہے۔ اور صرف دس سال کے عرصہ میں جو عظیم الشان کامیابی الشر ہیٹڈ ویکلی کے معموں کو حاصل ہوئی ہے وہ یقیناً ان معموں کے چلانے والوں کے لئے باعث فخر ہو سکتی ہے۔ اور دنیا کے کسی دوسرے کراس ورڈ معمے کے ادارہ کی کامیابی کو ان کی کامیابی کے مقابلہ میں پیش نہیں کیا جا سکتا۔

کراس ورڈ معموں کی اشاعت کے سلسلہ میں پہلا کامیاب قدم جو الشر ہیٹڈ ویکلی نے اٹھایا۔ وہ یہ تھا کہ اس نے اپنے معموں کا نام "کامن سنس کراس ورڈ پزلز" (Common sense crossword Puzzles) رکھا کامن سنس کا ترجمہ "معمولی سمجھ" یا فہم عمومی کیا جا سکتا ہے۔ الشر ہیٹڈ ویکلی نے اپنے کراس ورڈ معموں کا نام "کامن سنس کراس ورڈس" اس لئے رکھا ہے کہ اس کا دعویٰ ہے کہ ان معموں کے اشارات کے حل معمولی سمجھ یا فہم عمومی پر مبنی ہوتے ہیں اور اشارات کا مفہوم صحیح طور پر ذہن نشین ہو جانے کے بعد ہر انگریزی تعلیم یافتہ شخص معمولی سمجھ بوجھ سے کام لیکر ان معموں کو حل کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ الشر ہیٹڈ ویکلی کے معمے قمار بازی اور قسمت آزمائی کی تعریف میں نہیں آتے یعنی جس طرح لاٹری وغیرہ میں محض قسمت سے کسی کے نام کوئی بڑا انعام نکل آتا ہے اس طرح ان معموں کے حل کرنے والوں کے نام انعامات نہیں نکلتے۔ الشر ہیٹڈ ویکلی کے یہ دونوں دعوے اپنے کامن سنس کراس ورڈ معموں کے متعلق بڑی حد تک صحیح ہیں۔ پہلے دعوے کے ثبوت میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب حل کنندہ ان معموں کے حل میں کوئی غلطی کرتا ہے یعنی مربع میں کوئی ایسا غلط لفظ بھر دیتا ہے جو اس کے خیال میں بالکل صحیح ہوتا ہے اور کسی دوسرے لفظ کے صحیح ہونے کی توجیہہ وتشریح شائع ہوتی ہے تو ہر انصاف پسند حل کنندہ کو عام طور پر تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ واقعی غلطی اسی کی تھی۔ اور صحیح لفظ حقیقت میں وہی ہے جو معمہ کے صحیح حل میں آیا ہے۔ کامن سنس کراس ورڈ کے چلانے والوں کا یہ دوسرا دعویٰ بھی بڑی حد تک صحیح ہے کہ یہ معمے قمار بازی اور قسمت آزمائی کی تعریف میں نہیں آتے۔ کیونکہ بغیر کافی دماغ سوزی اور ذہنی کوشش وکاوش کے ان معموں میں محض اتفاق سے کسی کا کوئی بڑا انعام

... [illegible]

کر لینے کے بعد ... [illegible] نکلتا ہے۔

دونوں مذکورہ بالا دعووں کے بڑی حد تک صحیح ہونے کے علاوہ جب ماقوت واقعات پر نظر جاتی ہے تو الشر ہیٹڈ ویکلی کے معموں کے ساتھ کامن سنس کا لفظ جس سے یہ دونوں دعوے مترشح ہوتے ہیں بالکل موزوں معلوم ہوتا ہے ... قدر عجیب بات ہے کہ ایسے معمے جن کے متعلق ان کے چلانے والوں کا یہ دعویٰ ہو اور دعویٰ بھی بڑی حد تک صحیح ہو کہ یہ معمے معمولی سمجھ اور عقل عمومی پر مبنی ہوتے ہیں ان کو کوئی بڑے سے بڑا عالم شخص بھی دعوے کے ساتھ صحیح حل نہ کر سکے۔ وہ ایک ہی عالم شخص نہیں بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں فضلاء و اُدباء کو بھی یہ دعویٰ کرنے کا حوصلہ نہ ہو کہ وہ اپنی مجموعی دماغ سوزی سے کسی کامن سنس کراس ورڈ معمہ کا بالکل صحیح حل پیش کرنے میں یقینی طور پر کامیاب ہو سکتے ہیں۔ کامن سنس کراس ورڈ معموں کے حل کرنے والوں کی تعداد اس وقت بلا مبالغہ لاکھوں تک پہنچ چکی ہے۔ جن میں یقیناً ہزاروں ایسے بھی ہیں جن کی علمی اور دماغی قابلیتیں مسلم ہیں۔ اور کم از کم بیس اخبارات و رسائل بھی ایسے نکل رہے ہیں جنہیں کامن سنس کراس ورڈ معموں کی باقاعدہ تشریحات شائع ہوتی ہیں اور یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ فلاں لفظ صحیح ہے اور فلاں لفظ غلط۔ ان رسائل یا اخبارات کے ایڈیٹروں میں کئی اعلےٰ قابلیت کے انگریز بھی ہیں اور ایسے قابل ہندوستانی بھی جن کو کامن سنس کراس ورڈ معموں کا دیرینہ تجربہ ہے اور اسکی پیچیدگیوں اور باریکیوں کو خوب سمجھتے ہیں۔ بیسیوں کتابیں بھی ان معموں کے حل کنندگان کی رہنمائی کے لئے لکھی گئی ہیں۔ جن میں اشارات کے ان تمام الفاظ و محاورات اور بندشوں اور ترکیبوں کے مفہوم ومعانی کو بالکل واضح کر دیا گیا ہے۔ جن سے مولف معمہ حل کنندگان کو مغالطے دیا کرتے ہے۔ اب تک کے تمام شائع شدہ کامن سنس معموں کے اشارات، ان کے صحیح حل اور صحیح حلوں کی توجیہات بھی درج کر دی گئی ہیں۔ تاکہ حل کنندگان مولف معمہ کی ذہنیت اور رجحان ذہنی سے بھی واقف ہو جائیں اور سابقہ معموں کے صحیح حلوں کی توجیہات سے نئے معموں کے حل میں مدد لے سکیں۔ مولف معمہ کو شکست دینے یعنی صحیح حل بھیجنے میں کامیاب ہو سکنے کی مذکورہ عظیم الشان کوششوں کے علاوہ ایک خطرناک کوشش جو کسی کراس ورڈ معمہ کا بڑا انعام حاصل کرنے کے سلسلہ میں ہو سکتی ہے اسکی بھی کامن سنس کراس ورڈ معموں کے حل کرنے والوں نے انتہا کر دی ہے یعنی انعام کی یہ کوشش مشکوک لفظوں کو مختلف حلوں کے فارموں میں ادل بدل کرکے (Permutation) کی صورت میں کی جاتی ہے جس کو انگریزی میں اور اردو میں تبادل کہتے ہیں۔ کامن سنس کراس ورڈ معموں کے حل کرنے ... [illegible]

...انعامات حاصل کرنے کے لیے مدد دینے کے لیے بھی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ اور ...بات ہے کیونکہ کامن سنس کراس ورڈ معموں کو زیادہ تر حصول انعام کی خواہش ...حل کرتے ہیں ان میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جو کسی کراس ورڈ معمہ کا صرف ایک ...ہی بھیجا کرتا ہو۔ عام طور پر کم از کم تین حل ضرور بھیجے جاتے ہیں اور جو ...اس سے زیادہ خرچ کر سکتے ہیں وہ عموماً آٹھ اور سولہ بلکہ اس سے بھی زیادہ بھیجا کرتے ...کیونکہ بہت زیادہ مشکوک الفاظ کامن سنس کراس ورڈ معموں میں عموماً سات یا نو ہوتے ...ہیں۔ اور ... لفظوں کو ... میں کنایت شعارانہ طریقہ پر باقاعدہ ادل بدل کر ...کرنے سے ایک یا دو سے زیادہ غلطیاں آنے کا امکان نہیں رہتا۔ پرمیوٹیشن یا ...کے ذریعہ سے انعامات حاصل کرنے کی کوششوں کے سلسلہ میں بہت سے کلب ...ایسے بن گئے ہیں۔ جن کے ممبروں کی طرف سے کامن سنس کراس ورڈز کے مشترکہ حل ...بھیجے جاتے ہیں اور بعض اوقات ایک ایک معمہ کے جو حل ان کلبوں کی طرف سے جاتے ہیں ...کی تعداد پانچ پانچ سو تک پہنچ جاتی ہے۔ اور ان میں زیادہ سے زیادہ مشکوک الفاظ کو ...کفایت شعارانہ تبادل مختلف حلوں میں ادل بدل کر بھرا جاتا ہے اور زیادہ تعداد ...تبادل کر سکتے ہیں۔ اور خرچ کا بار سب ممبران کلب پر بٹ جاتا ہے۔ مگر مذکورہ بالا تمام ...انفرادی اور اجتماعی کوششوں کے باوجود کامن سنس کراس ورڈ معموں کے بالکل صحیح حل کا ...انعام زیادہ تر صرف ایک ہی خوش قسمت حل کنندہ کے حصہ میں آتا ہے اور بہت کم ...ہوتا ہے کہ اس انعام کے مستحق چھ سات حل کنندگان سے زیادہ ہو جائیں۔ اور ...بھی عموماً ہوتا ہے کہ کامن سنس کراس ورڈ معموں کے لاکھوں حلوں میں سے ایک ...بھی بالکل صحیح نہیں آتا اور پہلا انعام ایک غلطی یا دو غلطیاں کرنے والوں کو ...دیا جاتا ہے مگر اس صورت میں بھی پہلے انعام کے مستحقین کی تعداد کبھی اتنی زیادہ ...نہیں ہوتی کہ انعام کی بڑی رقم چھوٹی چھوٹی حقیر رقموں میں تقسیم ہو کر مستحقین کو ملے۔

ایک ایسا کراس ورڈ معمہ جسکے چلانے والوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ معمولی سمجھ ...کامن سنس پر مبنی ہوتا ہے۔ اسکو بڑے بڑے قابل لوگ بھی کیوں دعوے سے صحیح حل ...نہیں کر سکتے۔ اور جن عظیم الشان کوششوں کا اوپر ذکر ہوا ان کے باوجود بالکل صحیح حل ...کرنے والوں کی تعداد کیوں سینکڑوں اور ہزاروں تک نہیں پہنچتی؟ اس کامن سنس ...کراس ورڈس کی وہ پہیلی ہے جسکی بنا پر کہنا پڑتا ہے کہ "کامن سنس" کا لفظ بھی ان معموں ...کے ساتھ ایک معمہ ہے۔ جسے ہر شخص حل نہیں کر سکتا۔

بات اصل یہ ہے کہ کامن سنس کراس ورڈ معمے اور ان کے اشارات حل کنندگان ...کی نفسیات اور ذہنیتوں کو مدنظر رکھکر ایسی غیر معمولی قابلیت اور دور اندیشی سے ...مرتب کئے جاتے ہیں کہ باوجود اس کے کہ ہر اشارہ کا حل عام طور پر معمولی سمجھ یا کامن ...سنس پر ہی مبنی ہوتا ہے لیکن اس معمولی سمجھ کو اشارات کے الفاظ و محاورات اور اسکی

عبارتی بندشوں اور ترکیبوں کے پردوں میں اس طرح چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ حل کرنے والے کا ذہن اس معمولی سمجھ کی جھلک بھی نہ دیکھ سکے بلکہ وہ صحیح راستے سے بھٹک کر غلط راستے پر جا پڑے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی اشارہ کی عبارت کے پڑھتے ہی حل کنندہ کا ذہن صحیح حل کی طرف منتقل ہو جاتا ہے لیکن معمہ کا شیطان جس نے نہ معلوم کیوں حل کنندگان کو دھوکا دینے کی قسم کھا رکھی ہے۔ فوراً حل کنندہ کے دل میں یہ وسوسہ پیدا کر دیتا ہے کہ ایک مشکل معمہ کا ایسا بدیہی اور آسان حل کیسے ہو سکتا ہے۔ ضرور مولف معمہ نے اشارہ کی عبارت میں کوئی نہ کوئی بھید رکھا ہوگا۔ یہ خیال آتے ہی حل کنندہ کا ذہن اس بھید کی تلاش کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور صحیح حل کو چھوڑ کر کسی غلط حل کی تائیدی دلیل اشارہ کی عبارت میں سے نکال لیتا ہے۔ اور مطمئن ہو جاتا ہے کہ اس کا حل صحیح ہے۔ بعض اوقات اس کے بالکل برعکس ایسا ہوتا ہے کہ اشارہ کی عبارت پر غور کرتے ہی معمہ کا شیطان حل کرنے والے کے دل میں یہ ڈال دیتا ہے کہ فلاں لفظ اس اشارہ کا صحیح حل ہے حالانکہ وہ لفظ غلط ہوتا ہے۔ لیکن حل کنندہ کسی طرح اپنے تاثرِ اولین (First impression) سے آزادی حاصل نہیں کر سکتا اور اشارہ کی مغالطہ انگیزیاں اس کو اور بھی اپنی غلطی پر مستحکم کر دیتی ہیں۔ کامن سنس کراس ورڈس کے حلوں میں غلطیاں ہونے کی ایک عام وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ حل کنندگان اشارہ کی عبارت پر خالی الذہن ہو کر غور نہیں کر سکتے اور ذہن کو اس کا موقع نہیں دیتے کہ وہ آزادی کے ساتھ کسی نتیجہ پر پہنچ سکے۔ بلکہ دوسروں کی رایوں سے متاثر ہو کر یا خود اپنے تاثرِ اولین یا تاثرات مابعد کی روشنی میں صحیح حل کو اشارہ میں تلاش کرتے ہیں لہٰذا اشارہ کی عبارت میں سب سے بڑا دام فریب یہی ہوتا ہے کہ غلط حل کی وجوہات ترجیح سطحی نظروں کے لئے اس میں نمایاں کر دی جاتی ہیں۔

اگر کامن سنس کراس ورڈ معمے ایسے آسان ہوا کرتے کہ واقعی ہر حل کنندہ ان کو معمولی سمجھ سے کام لیکر حل کر دیا کرتا تو بیس پچیس ہزار تو کیا لاکھوں روپے کے انعامات بھی ہزاروں حصوں میں تقسیم ہو کر دس بیس روپے کے حقیر انعامات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اور کسی حل کرنے والے کے لئے یہ امکان باقی نہ رہتا کہ وہ بیس پچیس ہزار روپے کا انعام حاصل کر سکے اور غیر معمولی مالی منفعت کی جو کشش اس وقت فطری طور پر لاکھوں آدمیوں کو اس انعامی مقابلہ میں حصہ لینے پر مجبور کر رہی ہے وہ ان معموں میں بالکل باقی نہ رہتی۔ علیٰ ہذا اگر کامن سنس کراس ورڈ معمے ان معموں کی طرح ہوتے جن کا صحیح حل سوائے حسنِ اتفاق اور خوش قسمتی کے کسی اور صورت سے ممکن نہ ہو سکتا تو یہ معمے کبھی وقت گزاری کا بہترین تفریحی مشغلہ نہ سمجھے جاتے اور ان کو تعلیم یافتہ طبقوں میں ہرگز وہ مقبولیت و ہر دلعزیزی حاصل نہ ہوتی جو

...کی ... کراس ورڈ کو لیسے نہیں پہنچ سکی۔

کامن سنس کراس ورڈ معموں کے فاضل مولف کو اپنے متعلق میں ان دو ...سد اور معموں کا بیدھ اہم لحاظ رکھنا پڑتا ہے۔ اولاً یہ کہ انعام کے لئے ...ستے قمار بازی کی تعریف میں نہ آسکیں، دوم یہ کہ وہ ایسی آسانی سے حل نہ ہو ...سے یکمشت ہزار روپیہ کا انعام دس دس بیس بیس روپے کے ٹکڑوں میں تقسیم ...ے اور پھر اسکے باوجود ان معموں کو کامن سنس تسے بھی کہا جاسکے یعنی ایسے ...معمولی سمجھ یا فہم عمومی پر مبنی ہیں۔

ان دونوں مقاصد میں کامیاب ہوجانا معمولی قابلیت کا کام نہیں ہے ...لئے کامن سنس کراس ورڈ معموں کے قابل مولف یا کمپائلر (Compiler) ...روپیہ ڈھائی ہزار روپے ماہوار تنخواہ دی جاتی ہے۔ اور یہ تنخواہ ان مقاصد ...ل کے لئے جن میں اسٹریٹڈ ویکلی کے کراس ورڈ معموں کی بے نظیر کامیابی مضمر ہے، ہرگز زیادہ نہیں ہے۔ اپنے لائق ترین مولفین معمہ کی ان ہی ...وں کی بدولت، فلاں معمہ لاکھوں روپے اپنے معموں کے حل کرنے والوں کو انعامات ...ے چکے ہیں۔ اور جتنے روپے انہوں نے انعامات میں تقسیم یا معموں کے چلانے پر کئے ہیں اُن سے کتنے ہی گنا زیادہ اِن معموں کے ذریعے کما چکے ہیں۔

مضمون اتنا طویل ہوگیا مگر موضوع ابھی تک تشنہ ہے۔ کسی آئندہ فرصت ...امن سنس کراس ورڈ معموں کے اس سب سے زیادہ دلچسپ پہلو پر روشنی ...جائیگی کہ ان معموں کے اشارات میں جو چھپے ہوئے دھوکے اور مغالطے ہوتے ...ن میں کن کن لسانی اور تحریری چالاکیوں سے کام لیا جاتا ہے۔

اردو میں کراس ورڈ معموں نے کس حد تک ترقی کی ہے اور آئندہ ...حد تک ترقی کی جاسکتی ہے۔ یہ بھی اس مضمون کا ایک نہایت ضروری حصہ ...مگر افسوس ہے کہ اسے بھی آئندہ پر چھوڑنا پڑتا ہے۔

غزل

(از جناب نعمان تاثیر)

دل نے آج آواز انکو دی کچھ اس انداز سے — خود بخود اٹھنے لگے پردے حریم ناز سے

آج پھر کانوں میں آئی ہے وہ مبہم سی صدا — جسطرح کوئی پکارے دور کی آواز سے

جنکی نظروں میں بہاریں ہوں خیالوں میں چمن — روک سکتا ہے انہیں صیاد کیا پرواز سے

بے تڑپ جو زندگی ہو موت سے بدتر ہے وہ — ہے وہ دل پتھر جو ہو محروم سوز و ساز سے

کس لئے ہیں دل کی خاموشی پہ انکو حیرتیں — کیا کبھی آواز آئی ہے شکستہ ساز سے

عشق کی ناکامیاں ہیں کامیابی کی دلیل — ہو چلا ہے حسن بھی مانوس غم کے راز سے

حسن سر سے پاؤں تک اک درد بن کر رہ گیا — عشق نے کسکو پکارا اسکی بھری آواز سے

ہوش و چشم و گوش ہیں حیرت بدامانِ سکوت — آج وہ نغمے ہوئے پیدا شکستِ ساز سے

چشم میگوں کے اشارے وہ سمجھ سکتا ہے کیا — جو نہیں واقف محبت کے نیاز و ناز سے

بال رخ پر آنکھ میں شوخی لبوں میں تازگی — کاش پھر آجاؤ تم انکی اسی انداز سے

پہلے محویت تھی اب اٹھتی ہے پھر اک درد و کرب — یعنی ہے انجام بہتر عشق کے آغاز سے

وجد میں آجائے گلشن جھوم جھوم اٹھے گھٹا — آؤ گائیں گیت دونوں ملکر اک آواز سے

سر بسجدہ ہوں جہاں دیر و حرم کی عظمتیں — سر اٹھائے کون ایسے آستانِ ناز سے

کس میں ظرفِ رازداری ہے جو سنکر چپ رہے
کسکو واقف کیجئے تاثیر دل کے راز سے

شاہ بڑا

(از ظریف الملک جناب ظریف دہلوی)

خواد کچھ دلی کو بائیس خواجہ کی چوکھٹ کہلاتی ہے۔ جس کے معنی بجا
یہ لیے جاتے ہیں کہ اس پر ارواح مقدسہ کا سایہ ہے اور ان کے روحانی
ن و برکات کی بدولت یہاں ہمیشہ امن و امان اور چین چان رہتا ہوگا۔ مگر
خ کے اوراق شاہد ہیں کہ اس غریب دلی نے کیسی کیسی مصیبتیں جھیلیں کن کن
ا میں پھنسی۔ زمانے نے اسے کس کس طرح رگڑا۔ اور پھر ہمیں دیکھا تاریخ یہ
بتاتی ہے کہ ہر تباہی کے بعد یہ پھل پھلا کر کیسی نکل آئی۔ اور کس آن بان سے
۔ حقیقتاً یہ ہے روحانی فیض ارواح مقدسہ کا۔ وہی دلی جو غدر ۱۸۵۷ء میں
کی تھی۔ آج اپنے اندر دس لاکھ نفوس کی آبادی رکھتی ہے۔ اور نئی دلی تو
نگار ہے ہی جس میں بے شمار بڑی بڑی عمارتیں، سرکاری دفاتر، ریڈیو کے
اور اسٹوڈیو۔ کونسل چیمبر، سکریٹریٹ۔ راجہ مہاراجہ نوابوں کے محلات
ٹ ہلیس وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ یہ نیا شہر بسا ہوا اور بنا ہوا کچھ ایسے
ہے اور ٹھکانے سے ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے۔ جو لوگ دور دور سے
ہیں۔ ان کی بھی یہی رائے ہے کہ گو یورپ اور امریکہ میں بڑے بڑے شہر بہت
ان میں سر بہ فلک عمارات ہیں بڑی خوبصورت خوبصورت اور سو سو منزلوں
ر جس خوبصورتی کے ساتھ یہ نیا شہر بنایا گیا ہے کہ سب یک منزلہ مکان۔
ں عمارتیں۔ جگہ جگہ گھاس کے خوشنما پلاٹ۔ ہر جگہ خوبصورتی۔ خوشنمائی
ہمانیت۔ اس طرز کا کوئی دوسرا شہر نہیں ہے۔ بہرحال کہنا یہ تھا کہ
لی تو اب بھی ہے۔ لیکن پرانی دلی میں وہ وہ عجائبات موجود ہیں۔ جنہیں
عد کے سیاح اور سکالر دونوں نہیں مہینوں دیکھتے ہیں۔ اور اپنے علم میں اضافہ
کیا کرتے ہیں۔ مجھے یہاں دلی کی عمارتوں۔ کھنڈروں۔ مقبروں۔ مسجدوں۔
ل وغیرہ سے بحث نہیں کرنی۔ مجھے تو آج کی بحث میں دلی کی یادگار ایک
چیز "شاہ بڑا" کی ہلکی سی جھلک دکھانی ہے۔

دلی میں یہ بات بالکل عام ہے کہ جہاں یار دوستوں میں بیٹھ کر کسی نے
آسمان کے قلابے ملانے شروع کئے یا لمبی پھکی اڑانی شروع کی تو
ساتھ والے کہہ اٹھتے ہیں کہ "لو بھئی اب یہ شاہ بڑے کی اڑا رہا ہے۔" یہ
"شاہ بڑا" کیا چیز ہے۔ یہی بات اختصار کے ساتھ بتاتا ہوں۔ جامع مسجد
سے مشرق کی طرف سیدھے چلے جائیے۔ فصیل شاہی کے کنگورے نظر آئیں گے
وہیں آپ کو ایک چوڑا سا زینہ نیچے اترتا دکھائی دیگا۔ یہ راج گھاٹ کہلاتا ہے
آپ اس زینے پر سے اتر کر چلئے بس سامنے آپ کے بیلا روڈ ہوگی۔ اور
اسکے دوسرے کنارے پر بہت سے درختوں کا ہرا بھرا جھنڈ دکھائی دیگا۔ یہی
شاہ بڑا ہے۔ برسات میں اب بھی دریا کا پانی شاہ بڑے تک آجاتا ہے
مگر جاڑوں اور گرمیوں میں دور رہتا ہے کوئی سو گز دور۔ اول تو اس زمانے
میں دریائے جمنا میں سے دو بڑی بڑی نہریں نکالی گئی ہیں۔ جو ہر وقت
اس دریا کو جونک کی طرح چوستی رہتی ہیں۔ دوسرے دو دو واٹر ورکس ہیں۔
گیارہ لاکھ آدمیوں کے لئے اور درختوں اور گراس پلاٹس (گھاس کے قطعات)
کے لئے کس قدر پانی کی ضرورت ہے۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ
۲۵ء کے سیلاب عظیم کے بعد سرکار نے شاہ بڑے کے قریب ہی ایک پشتہ
بنوا دیا ہے۔ جس سے ٹکر کھا کر پانی پرے ہی پرے چلا جاتا ہے۔ اس طرف
نہیں آتا۔ ورنہ ہر برسات میں ہم دیکھا کرتے تھے کہ بیلا روڈ پر بھی گھٹنوں گھٹنوں
پانی ہو جاتا تھا۔ ہمارے ہوش کی بات ہے ہم نے اب سے چالیس پینتالیس
برس پہلے برسات میں اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ فصیل شہر تک پانی ہے
اور اتنا ہے کہ فصیل کے کنگوروں پر سے تیراک کود رہے ہیں۔ اور تیراکی کا میلہ
ہو رہا ہے۔ اب ان دونوں نہروں اور پشتے کی وجہ سے برساتوں میں بھی پانی
فصیل تک نہیں دیکھا گیا۔ ذرا اس زمانے کا اندازہ کیجئے جب نہ یہ نہریں تھیں
نہ پشتہ۔ پانی فصیل تک ہے۔ قلعہ کا مثمن برج عین دریا کے کنارے ہے جس
میں سے زینہ اتر کر پانی تک گیا ہے۔ بجرے اور کشتیاں برج کے نیچے لگی
ہوئی ہیں۔ شہزادے شہزادیاں اتر کر آتی ہیں۔ کشتیوں میں بیٹھتی ہیں۔ سیر کرتی ہیں
کشتیاں دلہنیں بنی ہوئی ہیں۔ بادشاہ سلامت برجوں میں ہیں تو اور دیوان خاص
میں ہیں تو سیر کر رہے ہیں۔ الٰہی وہ کیسے دن ہونگے اور کیسی راتیں ہونگی۔ کیا تھا
کیا ہو گیا ؎

زمیں چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا
بدلتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے

جو صاحب تخت و تاج تھے ان کی اولاد پریشان حال پھرتی ہے۔ وَتُعِزُّ مَنْ
تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ۔

ہاں تو ذکر شاہ بڑے کا ہو رہا تھا۔ جانے دیجئے آپ سمجھ گئے۔

جو پیر درختوں کا ایک بڑا سا جھنڈ ہے۔ یہ درخت ہر موسم میں سرسبز رہتے ہیں۔ سڑک سے کوئی تیس چالیس قدم کے فاصلہ پر ہے۔ آپ وہاں جایئے تو معلوم ہوگا کہ اچھا خاصہ وسیع رقبہ گھیر رکھا ہے۔ تقریباً چالیس گز لمبا اور اسی قدر چوڑا مقام ہے۔ درختوں کے اندر چھپا ہوا۔ اندر کوئی ڈیڑھ گز اونچے چبوترے پر شاہ بڑے صاحب کا مزار مبارک ہے۔ یہ کون بزرگ تھے؟ یہ مزار کب بنا؟ افسوس ہے کہ مجھے اسکی نسبت کچھ نہ معلوم ہو سکا۔ کاش اور جستجو کی جائے تو آپکے حالات معلوم ہو ضرور سکتے ہیں۔ ہاں یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ آپ نے مسواک کرنے کے بعد جو پھینکی تو اللہ کی قدرت سے اُس نے جڑ پکڑ لی اور اب جو یہ پیلو کا درخت موجود ہے یہ وہی ہے جو اُس مسواک سے اُگا تھا۔ تعجب اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ تمام کا تمام جھنڈ جو دور سے کیا بالکل قریب سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پندرہ بیس درختوں کا مجموعہ ہے۔ حقیقت میں ایک ہی درخت ہے۔ آپ اندر جایئے تو آپ کو اصل درخت کی جڑ دکھائی دیگی۔ اور وہاں سے آپ کو برابر نشانات ملتے رہیں گے کہ یہ شاخ یوں زمین میں گئی، یوں وہاں سے نکلی یوں پھیلی، یوں پھر آ گے گئی۔ غرض آپ کو جگہ جگہ موٹی موٹی شاخیں زمین کے اندر گھسی ہوئی معلوم ہونگی۔ ایسی موٹی جن کا قطر ایک ایک ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ کا ہے۔ بعض انگلی سے بھی پتلی شاخیں زمین کے اندر جانے کی کوشش کرتی ہوئی معلوم ہونگی۔ یہی پتلی پتلی شاخیں جو آج بعض انچ دو انچ زمین میں گھس گئی ہیں اور بعض نے سر ٹیکا یا ہی ہے یہی کسی زمانے میں موٹے موٹے گتے اور تنے بن جائیں گی۔ جیسی ان کی بڑی بہنیں اب ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ بڑے موٹے موٹے اژدہے لمبے لمبے پڑے ہوئے ہیں۔ بعض کنڈلی مارے اور بعض آڑے ترچھے، . . . . بعض سیدھے۔ ان ہی اژدہوں کی پیٹھ پر لوگ بیٹھتے ہیں۔ یہی اُن کی کرسیاں ہیں، یہی مونڈھے ہیں۔ یہی بنچیں ہیں۔ اب آج کل بھی آپ سہ پہر کو ٹھنڈے وقت جایئے تو آپ دیکھیں گے کہ کچھ لوگ درخت کی موٹی موٹی شاخوں پر بیٹھے ہیں اور کچھ زمین پر کپڑا، چادر یا سیتل پاٹی بچھائے تاش کھیل رہے ہیں کہیں گپ بھی ہو رہی ہے، کہیں کوئی بزرگ صورت سفید ریش بیٹھے بڑی متانت سے کوئی قصہ فرما رہے ہیں سر تا پا بڑ۔ پہلے زمانے کی بات تو اب کہاں جب بڑے زوروں پہ بھنگ، چرس، چانڈو، افیم اُڑا کرتی تھی مگر باقیات الصالحات اب بھی ہے۔ اب بھی آپ چلے جائیں تو دو گھڑی دل بہل ہی جائے۔ میں وہاں گیا تو کئی دفعہ ہوں لیکن اکثر صبح کے وقت جانے کا اتفاق ہوا۔ جب سوائے دو ایک فقیروں کے اور کوئی نظر نہیں پڑا۔ ہاں ایک دفعہ پانچ بجے شام کو بھی جانے کا موقع ملا۔ اسے اتفاق کہئے یا خوبیٔ تقدیر کہ خدا نے مُراد پوری کر دی۔ اور کچھ نہ کچھ سنا ہی دیا۔ ایک بزرگ صورت بڑی متانت سے کچھ فرما رہے تھے۔ میں پاس جا بیٹھا۔ ایک صاحب بیٹھے جن سے کچھ حالات ماضیہ پر تبصرہ تھا۔ آپ بھی سنئے:۔

ایک شخص:۔ تو چچا! یہ جاپان کے پاس گولہ بارود بہت ہے؟

بزرگ:۔ بیٹا! گولہ بارود بھی بہت ہے اور آدمی بھی اس کے پاس ایسے جانباز اور جانثار ہیں کہ اپنے بل بوتے سے بڑھکر کام کر سکتے ہیں۔ یوں سمجھو کہ بم کا گولہ دس پندرہ سیر کا ہوتا ہے جاپانیوں کا ایک آدمی دو گولے کندھے پر رکھکر ایک اس کندھے پر ایک اُس کندھے پر اور جو ہوائی جہاز سے اُترا ہے تو سنگاپور کے دریا میں وہ جو انگریزوں کا بڑا سا راجہاز کھڑا تھا نہ بس وہ جو چمنی وہ جو لاٹ ہوتی ہے جس میں سے دُھواں نکلا کرتا ہے۔ بس وہیں دُھوئیں میں گھس گیا اور نیچے اُتر کے چُپ چاپ نسہنے میں سے ہوتا ہوا دُھر نیچے پہنچ گیا۔ وہاں وہیں نے وہ دونوں گولے رکھکر جو دیا سلائی دکھائی ہے تو بس یوں سمجھو کہ چھوٹی قیامت ہی تو آ گئی۔

دوسرا شخص:۔ (جلدی سے) دیکھا بے اشاق (اسحٰق) اسے کہتے ہیں جیداری واہ جاپانی۔ واہ تیرے کے کونے (کیا کہنے)

تیسرا:۔ تو چچا وہ تو بھلا کاہے کو بچا ہوگا؟

بزرگ:۔ میاں وہ تو جہاز کا جہاز ہی ایسا بیٹھا جیسے پانی میں بتاشہ۔ ایک کہی نہ دو بس ڈوبتا ہی چلا گیا۔ اور اُس جاپانی کی کیا پوچھتے ہو وہ کا قیمہ ہی بن گیا

اسحٰق:۔ ایک یہ ہمارے خلیفہ بتن بیٹھے رہیں جیسے پولا مار اگلدم۔ بس ڈنڈ تیسنے دیکھو کو۔ اتنے بڑے ڈیل ڈول میں کوئی آدھی چھٹانک کا دل ہوگا۔

خلیفہ بتن:۔ کیوں بے نہیں نا۔ بتاؤں تجھے ان کے۔ گیہوں کی لٹ آ رہی ہوگی۔

اسحٰق:۔ (خم ٹھونک کے) یار خان کو کچھ کم سمجھ رکھا ہے بے۔

"تیری . . . ." کہہ کے خلیفہ بتن اسحٰق کی طرف لپکے اور اب دونوں میں دھینگا مُشتی ہونے لگی۔ مُنہ سے پھول جھڑتے جاتے تھے۔ خیر لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ کچھ نشہ پانی ہوا۔ پھر باتیں ہونے لگیں۔

ایک صاحب:۔ تو چچا! یہ جاپانی ایسے جیوٹ ہوتے ہیں۔ اور ہم نے تو سنا ہے کہ جرمن ان کا بھی ابا ہے۔ وہیں کے پاس نہ جانے کیسے کیسے حربے موجود ہیں۔

دوسرے صاحب:۔ اور ویسے تو ہماری سرکار بھی کیا کسی سے کچھ کم ہے۔ دو طرح

دوسرے ہے، ایک طرف تو اٹلی والوں کو رگید رگید کر جبل طارق کے دھوئیں میں دھکیل دیا ہے۔

یک :۔ بعدی سے؟ یہ ذخیرہ کا ہے کا؟

وسرا :۔ وہ جبل طارق کا ذخیرہ جو ہے جہاں کبھی ہماری حکومت تھی۔ جس کے چاروں طرف پانی ہی پانی ہے۔

یک :۔ بے جنجیرہ کیو جنجیرہ سا تو ابھی نہیں جانتا۔

وسرا :۔ بھیا آج کل کی لڑائی تو علم کی لڑائی ہے کس بل کچھ کام نہیں آتا بس علم میں جو سوا ہوا وہی جیتا۔ اور علم کیا ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ وہ جو کبھی پہلے افراسیاب اور حضرت امیر حمزہ طلسم ہوشربا میں جنگ کیا کرتے تھے۔ بس کسی طرح وہی جادو افراسیاب والا ان لوگوں کے پاس بھی آگیا۔ سنا ہے آڑے اڑے پھرتے ہیں ایک گولہ پھینکا تو ساری زمین کو ہلا کر رکھ دیا۔

ب صاحب :۔ چچا! یہ جاپان ہے کس طرف کو؟

رگ :۔ بھئی ہمیں پورا نقشہ تو اس کا معلوم ہے نہیں۔ یہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ہے کہیں ہمالیہ پار۔ اور روس کی حدود میں امریکہ سے بھی ملتی ہیں۔ جب ہی تو اُدھر سے امریکہ دبائے چلا آرہا ہے۔ اور ادھر سے ہماری سرکار بڑھتی چلی جا رہی ہے۔

سے صاحب :۔ اور چچا یہ جرمنی کدھر کو ہوا؟

رگ :۔ یہ کابل افغانستان سے پرے پرے جرمنی ہی ہے۔

سے صاحب :۔ تو یہ تو پھر ہندستان کے پاس ہی ہوا۔ پھر تو چچا بڑی مشکل کی بات ہوئی۔

رگ :۔ ابھی جرمن کا تو کچومر نکل رہا ہے۔ ہماری سرکار نے اٹلی تو لے ہی لیا بس اب جرمن ہی پر دھاوا ہوگا۔

یہ میں نے شاہ بڑے کی ذرا یونہی سی جھلک دکھائی ہے۔ اس میں ئی شک نہیں، موقع ہے بڑا اچھا۔ صبح کو ہوا خوری کے لئے وہاں جائیے تو خوش ہوتا ہے۔ پانی کے اوپر سے ہو کر جو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آتی ہے اچھی معلوم ہوتی ہے۔ اور سامنے دریا کا نظارہ کیسا بھلا لگتا ہے۔ یہ م برسات کی تو جان ہے۔ جمنا کا پانی بالکل قریب آجاتا ہے اور کبھی ں تو تاؤ شاہ بڑے ہی پر ٹھیکی لیتی ہے۔

شاہ بڑے کے حالات معلوم کرنے کے سلسلے میں مجھے کئی دفعہ وہاں جانا پڑا۔ بڑے بوڑھے پرانے لوگوں سے بات چیت کرنے کا اتفاق ہوا مگر کچھ کام کی باتیں معلوم نہ ہوئیں جنھیں سند سمجھا جاتا۔ ہاں یہ معلوم ہوا کہ یہاں سال میں ایک دفعہ عرس بھی ہوتا ہے اور اکثر قوالی بھی ہوتی رہتی ہے۔ اسی سلسلے میں یہ بھی معلوم ہوا کہ اسی بیلا روڈ پر آخر میں جا کر جہاں ٹکان ہاؤس کے پاس دریا کا پشتہ بنا ہوا ہے ذرا جنوب میں ایک مزار اور ہے وہ شاہ اڈے صاحب ہیں۔ میں نے خود جا کر دیکھا وہ بھی زیر درختان پیلو آسودہ ہیں۔ وہاں بھی عرس ہوا کرتا ہے۔ قوالیاں ہوتی ہیں۔ چادریں چڑھتی ہیں۔ دلی کے پنجابی ان شاہ اڈے صاحب کے بڑے معتقد ہیں۔ مزار پر دیگیں پکواتے ہیں۔ غربا کو کھانا کھلاتے ہیں، خیرات کرتے ہیں۔ قوالی کہلاتے ہیں۔ یہ مزار بھی دریا کے کنارے ہی ہے۔ یہاں تو ہر برسات میں پانی آجاتا ہے۔ اور سننے میں آیا ہے کہ شاہ بڑے صاحب اور شاہ اڈے صاحب کے مزارات کے بیچ میں ایک شاہ کھڑے صاحب ہیں۔ انکا مزار قدسیہ باغ کی شرقی حد پر باغ ہی میں بالکل بیلا روڈ کے کنارے واقع ہے۔ یہاں کے مجاور سے معلوم ہوا کہ یہاں بھی سال میں ایک دفعہ عرس ہوتا ہے چادر چڑھائی جاتی ہے اور قوالی ہوتی ہے۔ یہ تینوں مزارات بہت پرانے معلوم ہوتے ہیں۔ شاہ بڑے صاحب کے مزار کے متعلق میرا تو خیال ہے کہ کم از کم تین سو برس کا ضرور ہوگا۔ اسلئے کہ پیلو کا درخت اس طرح سے زمین پر لیٹا ہوا اور زمین کے اندر گھسا ہوا اور زمین کے اوپر چھایا ہوا ہے وہ تین سو برس سے کسی طرح کم کا نہ ہوگا۔

شاہ بڑے میں ایک بڑے میاں لوگوں کو حقے بھر بھر کر پلایا کرتے تھے اور چرس چانڈو افیم بھی گھولنے بنانے میں ہاتھ بٹا دیا کرتے تھے اب دکھائی نہیں دیتے۔ شاید اللہ میاں کے ہاں انکی خدمات کی ضرورت پڑ گئی۔ ایک بڑھیا بھی وہاں رہا کرتی تھی۔ جو بڑی شائستہ اور تمیز دار معلوم ہوتی تھی۔ مگر رہتی تھی کچھ بند بند سی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اپنے پیٹ میں بہت سے افسانے اور رومان چھپائے بیٹھی ہے۔ اب وہ بھی نظر نہیں آتی۔ معلوم ہوتا ہے چل ہی بسی۔

اللہ میاں بھی آسمان پر بڑے اچھے اچھے اور ہر فن کے آدمی جمع کر رہے ہیں۔ قابل سے قابل حکیم۔ لائق سے لائق ڈاکٹر۔ فیڈرل کورٹ کے جج۔ اچھے سے اچھے افسانہ نگار، مضمون نویس، سنجیدہ اور مزاح نگار ہر قسم کے شعرا۔ بڑے بڑے مدبر، سینڈو اور غلام پہلوان جیسے کس بل کے آدمی۔ بڑا اچھا سٹاک جمع کر لیا۔ اب یہ کس سے پوچھیں اور کون ہمیں بتلائے کہ آسمان پر کیسی کیسی محفلیں جمتی ہیں اور ان میں کیا کیا ہوتا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ جو جاتا ہے منہ میں گھنگھنیاں بھر لیتا ہے۔ کیا مجال جو خواب ہی میں آکر ایک حرف تو بتا جائے؎

جی چاہتا ہے سیر کریں آسمان کی
پر کیا کریں کہ رہ گئے بے تیغ ہو کے ہم

جہنم

(از جناب قمر رضوی جائسی)

کچھ عجیب بے ہنگم سی رات تھی۔ بابو سرونی رام دن بھر چارپائی پر پڑے پڑے عاجز آ گئے تھے۔ ہفتہ میں ایک مرتبہ تو چھٹی ملی تو وہ کھٹیا مارنے میں گزر دی۔ اگر ان کا بس چلتا تو وہ اتوار کو بھی دفتر جایا کرتے۔ یوں کھاٹ پر پڑے رہنا انہیں سخت ناپسند تھا۔ اکثر جب وہ کارخانہ سے پہلے آتے تو ذرا سا بھی دم نہ لیتے اور پھر کہیں سیر سپاٹے کو نکل جاتے۔ مگر آج کا دن نہ جانے کیسا تھا — بالکل ڈل، کاہلوں کی طرح وہ لحاف میں لپٹے پڑے رہے۔ شام کو نہانے کا خیال آیا بھی تو ٹال گئے۔ سرِ شام ہوٹل سے کھانا کھا کر پھر لیٹ رہے — مگر نیند نہ آئی۔ سوچا چلو کہیں گھوم ہی آئیں۔ کئی دن سے چندا کو بھی نہیں دیکھا۔ کیا سوچتی ہوگی وہ —

سرونی رام لحاف سے نکلے اور کوٹ مفلر لیکر چل دیئے۔ سڑک پر پہنچ کر پان والے سے بولے۔ "دو پیسے کے پان لگا دو بلی رام۔ ہاں ہوشیار رہوں ذرا۔"

بلی رام ان کا پرانا تنبولی تھا۔ مہینہ کا حساب کتاب رکھتے تھے۔ دن میں چار چھ بیڑے پان اور ایک آدھ پاکٹ سگریٹ تو ضرور خرید تے تھے۔ پان لیکر سرونی رام آگے بڑھے۔ رحمت اللہ درزی ایک سٹریل سی مشین کے پاس بیٹھے تاپ رہے تھے۔ سرونی رام کو دیکھکر بولے: "کہاں بابو کہاں ؟"

"یوں ہی ذرا خان جی۔" یہ بڈھا کم بخت بھی آج تک بے تکے ٹوک بیٹھتا ہے۔ اتنی رات ہوگئی اور ابھی تک دوکان کھولے ہے۔ پوچھو کتنے گاہک مل جائینگے اب رات میں۔

سگریٹ سلگا کر وہ آگے بڑھے۔ بازار کی دوکانیں بند ہوچکی تھیں۔ کچھ بند ہو رہی تھیں۔ ایک آدھ نہ جانے کس خیال سے کھلی ہوئی تھیں۔ اور وہ بھولا ناتھ حلوائی کی دوکان بھی تو کھلی تھی — شام کو سرونی رام نے اسی دوکان پر تازی تازی امرتیاں اور رس گلے بنتے دیکھے تھے — اس وقت تو سب بک چکے تھے۔ صرف جلیبیاں اور بیسن کے لڈو ابھی تک دھرے تھے — وہ سوچنے لگے لوگ انہیں کیوں نہیں خریدتے — تھوڑی دور آگے ایک کھانے کی دوکان ابھی تک کھلی تھی۔ سرونی رام سوچنے لگے بھلا ان ہوٹل والوں کو اتنی عقل بھی نہیں کہ اتنی رات گئے کون کھانے آئیگا — وہ دوکان کے [illegible] آ گئے — ایک کونے میں [illegible] جلیبیاں اور [illegible] لئے بیٹھا تھا

اور اندر [illegible] رہا تھا۔ عجیب [illegible] — وہ [illegible] آتے ہیں کہ مالک کو سڑک پر بھی انتظام کرنا پڑتا ہے [illegible] نہیں آتا — مگر اس حلقہ میں یہ دوکان خوب چلتی تھی۔ بارہا جب [illegible] تو مالک کو چلا تا ہوا پاتے۔ "آئیے بابو۔ [illegible] آپ کی [illegible]"

انہیں یاد تھا جب ایک مرتبہ انہوں نے اس دوکان پر تازی تازی مچھلیاں [illegible] کھائی تھیں۔ بڑی لذیذ مچھلیاں تھیں۔ اب تک انہیں اس کا ذائقہ نہیں بھولا تھا۔ یہ دوکان گویا مچھلیوں کے لئے مشہور ہوگئی تھی۔ اور یہاں ان کا خیال بھی تھا کہ صرف مچھلیوں اور چاپوں کا انتظام رہے اور باقی بکھیڑا ہٹا دیا جائے۔ کیونکہ اتوار ہی کے روز [illegible] کے رنگروٹ یہاں صرف مچھلیاں کھانے آتے تھے۔

سوچتے ہوئے سرونی رام گلی کے بالکل نکڑ پر پہنچ گئے۔ آخری دوکان کھلی تھی۔ دوکان نہیں بلکہ شیخ کریم کا مطب اور دواخانہ — حکیم جی سفید سا [illegible] اندھے ایک لمبی سی ڈاڑھی کے ساتھ اکیلے بیٹھے تھے۔ سرونی رام نے گھوم کر حکیم جی کی طرف دیکھا وہ کان میں قلم چلا رہے تھے — مریض نہ ملنے کی انہیں بہت شکایت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر وہ کسی مریض کا علاج شروع کردیں تو کیا مجال جو مرض کی بنیاد تک رہ جائے۔ سرونی رام انہیں دیکھکر مسکرائے۔ حکیم بننے کو تو بن گئے شوق سے اور ابھی دیکھا جائے تو سوائے دو چار گھٹیا قسم کے معجون، ایک آدھ میل کے شربت اور دو ایک بوتلوں میں تھوڑا تھوڑا سا عرق کے اور کچھ نہ نکلے۔ ان کے متعلق تو یہاں تک مشہور تھا کہ جو عرق بھی مانگتے جاؤ۔ ایک ہی بوتل سے انڈیل دیتے۔ سرونی رام حکیم جی کے چھوٹے سوٹے سے دواخانہ کو منہ چڑاتے ہوئے دوسری گلی میں گھوم گئے۔

دور ایک دوکان کے سامنے دھندلی دھندلی سی لالٹین سڑک پر بے نور سی روشنی ڈال رہی تھی — وہ سینکڑوں مرتبہ اس دوکان پر جا چکے تھے۔ ٹوٹی پھوٹی [illegible] میں ہندوستانی ٹھرے سے لیکر برانڈی اور وسکی تک وہ خرید چکے تھے۔ اور دوکان کا مالک چودھری تو انہیں خوب پہچان گیا تھا۔ عام طور سے وہ بیئر پیا کرتے تھے۔ رم بھی کبھی کبھی چکھ لیتے تھے لیکن اس کے علاوہ انہیں سب ناپسند تھیں۔ وسکی کا بھی البتہ White Horse مارکہ اگر سستے داموں مل جاتی تو ایک آدھ پنٹ [illegible] لیتے۔ [illegible] مہینہ میں ایک مرتبہ۔ انہیں خوب یاد تھا جب ایک مرتبہ انہوں نے برانڈی پی تھی۔ [illegible] سخت تو آج تک انہوں نے نہیں پی۔ خمار میں سخت تکلیف ہوئی تھی۔ [illegible] کھٹائی اور دنیا بھر کی چیزیں کھا گئے مگر طبیعت ٹھکانے نہ لگی۔ جبھی تو [illegible] کرلیا تھا کہ برانڈی کو ہاتھ نہ لگائیں گے۔

وہ دوکان کے بالکل سامنے پہنچ گئے۔ [illegible]

بیئر۔ [illegible]

[illegible] ذہین ... رکشا والے تاڑی پی رہے تھے۔

انہیں تاڑی سے ہمیشہ نفرت رہی تھی کتنی خراب بدبو ہوتی ہے — توبہ — انہیں یاد تھا جب ایک روز سروتی رام ... چودھری نے ایک بڑے سے کلہڑ میں تازی تازی تاڑی جھاگ دار سفید سفید ... انہیں دی تھی اور انہوں نے پوچھا تھا "یہ کیا ہے چودھری؟" تب چودھری ہنس کر بولا تھا "تاڑی ہے بابو جی — اتنی تازی تمہیں کہیں نہ ملے گی۔" تاڑی کا نام سنتے ہی غصے میں انہوں نے سارا تاڑی کلہڑ گلی میں پھینک دیا تھا — سفید جھاگ — ہُنہ ہُنہ —

اور جیسے ہی رکشا والے تاڑی پی کر میلی کچیلی اور غلیظ چادروں میں لپٹے ہوئے اپنے اپنے رکشوں کی طرف بڑھے انہوں نے دیکھا اُن میں سے ہر ایک کی آنکھیں ادھ کھلی سی تھیں — مُندی مُندی —

اب سامنے دوکان کا مالک چودھری صاف نظر آ رہا تھا۔ گنجی سی کھوپڑی، بڑی بڑی گچھے دار مونچھیں — اور ایک بڑی بیڈھب سی ناک۔ چودھری کرسی پر بیٹھا ہوا کوئی اخبار دیکھ رہا تھا۔ بیچ میں ایک چھوٹا سا بلب جل رہا تھا — اور ساری دوکان خالی تھی —

وہ اپنا بوٹ چوکھٹ کھٹکھٹاتے ہوئے اندر داخل ہوئے۔ تاڑی کی کھٹی میٹھی بو سے اُن کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔ انہیں دیکھتے ہی چودھری کا اخبار نیچے سرک گیا۔ اپنے مصنوعی دانت چمکاتے ہوئے چودھری بولا "بیٹھو بابو جی۔ آج تگڑی چیز پلاؤں گا۔"

لیکن سروتی رام یہ سُنکر کچھ زیادہ خوش نہ ہوئے۔ انہیں تو اس وقت چودھری پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ کتنے دنوں سے کہہ رہے تھے کہ دیکھو چودھری یہ اپنی دوکان پر تاڑی واڑی مت لایا کرو۔ دنیا بھر کے گنوار بٹور لیتے ہو۔ ٹھیک بات نہیں ہے یہ — یہ تو گویا شریف لوگوں کی دوکان ہے۔ مگر چودھری سوائے ہنس دینے کے شاید اور کچھ جانتا ہی نہ تھا۔ اس نے سروتی رام کی باتوں کا صرف یہی جواب دیا "اچھا بابو اچھا —" اور ایک مرتبہ نہیں کئی مرتبہ وہ اس کو ٹوک چکے تھے۔

آج بھی بیٹھتے ہی سروتی رام بولے "چودھری تمہاری عادت اب نہ چھوٹے گی شاید؟" اور چودھری نے گھبرا کر اخبار میز پر دھر دیا۔ "کیسی عادت بابو؟ کیا ہوا؟"

"یہی جو تاڑی خانہ کھول رکھا ہے — یا تو شراب ہی بیچو اور یا تاڑی ہی — ایک ہی دوکان میں دونوں دھندے تھوڑی ہی چلیں گے۔ کل میں نے خود دیکھا، دو تین چار گورے رکشا روک کر یہاں اترے تھے۔ کچھ لینا چاہتے تھے شاید۔ مگر تمہاری دوکان پر تاڑی پینے والوں کا میلا دیکھ کر کچھ سوچتے ہوئے واپس چلے گئے — اس میں چودھری کا ... مجھے بھی اب یہ دوکان کچھ اچھی نہیں لگتی۔ خصوصاً جب سے تم نے تاڑی والا ... شروع کر رکھا ہے — ہر وقت دوکان کے اندر بدبو رہا کرتی ہے۔ ... سکتا —"

چودھری اتنی دیر بیٹھا غور سے سنتا رہا — سروتی رام سمجھے کہ لیکچر نے اس پر اچھا اثر کیا ہے۔ پھر قدرے نرم لہجہ میں بولے "اچھا لاؤ کیا پلا رہے تھے آج؟"

"آج تو صرف تاڑی ہے بابو" چودھری بولا۔ "معاف کرنا — وہ سنکٹھا رام کی لڑکی کی شادی میں ساری بوتلیں خرچ ہو گئیں۔ صرف تاڑی ہی ہے۔"

"ہوں" سروتی رام کی سمجھ میں نہ آیا کہ اب کیا کریں۔ تاڑی وہ پی نہیں سکتے تھے۔ یعنی ... چودھری کی یہ معرکہ بازی انہیں کھل گئی — جی چاہتا تھا کہ اس کی گنجی کھوپڑی پر چپتوں کی بوچھار کر دیں۔ مگر کیا فائدہ —

انہوں نے دیکھا چودھری بڑی لاپرواہی سے اخبار دیکھ رہا تھا۔ سروتی رام کو اس کی اس حرکت پر سخت غصہ آیا۔ اسے گاہکوں سے بات چیت کرنے کا سلیقہ تک نہیں معلوم — لیکن وہ سمجھ گئے کہ نہ تو چودھری یہاں سے تاڑی ہٹائے گا اور نہ اس وقت انہیں تاڑی کے علاوہ کوئی دوسری چیز مل سکتی ہے۔ مایوس ہو کر بولے۔

"پھر چودھری اب تمہیں کہیں سے لاؤ ایک "ٹیبل بیئر" ہم نہیں جانتے۔"

چودھری نے اخبار سرکائے بغیر جواب دیا "الماری دیکھ لیجیے بابو جو ایک ادھا بھی نکلے تو حرام —"

تھوڑی دیر مسکین صورت بنائے سروتی رام بیٹھے رہے۔ پھر جیب سے مٹھی بھر روپیہ نکال کر میز پر دھرتے ہوئے بولے "تو چودھری جاؤں پھر — کہیں سے بھی نہ ملے گا۔"

چودھری کا اخبار نیچے سرکا۔ میز پر مٹھی بھر روپیہ دیکھ کر بولا۔ "دیکھیے سرکار ایک ادھا جنجر واٹن منشی جی رکھوا گئے ہیں۔ کہیے تو وہی دیدوں — دو روپے لوں گا مگر!"

"دو روپے؟ — ڈیڑھ کے دو — کیوں چودھری" وہ بولے۔

"ہاں بابو — منشی جی سے اتنے ہی میں طے ہوا تھا۔" چودھری بولا

"کچھ بھی ہو — لاؤ جلدی سے —"

اور چودھری نے الماری کھول کر جنجر کا ایک ادھا ان کے ہاتھ میں دیدیا — اور پھر اخبار دیکھنے لگا۔

غٹ غٹ کرکے سروتی رام آدھی پی گئے۔ بقیہ میز پر رکھتے ہوئے وہ چودھری سے مخاطب ہوئے — "تیری قسم چودھری بڑی معرکہ کی چیز پلائی ہے اس وقت — واہ —" چودھری صرف مسکرا دیا۔

اپنی دونوں کہنیاں میز پر ٹیک کر سروتی رام بوتل کی ساخت اور لیبل پر غور کرنے لگے۔ ہلکے بادامی رنگ کی شراب — ہال ... کمپنی کی تیار کی ہوئی — وہ سوچنے لگے امریکہ والے کتنی ہوشیاری سے شراب بناتے ہیں — ... [illegible]

ہے ناپ کر تشفی کر لینے کے بعد ٹھیک طور سے ذائقہ معلوم کیا۔ اور جب بوتل قریب ختم کے پہونچی تو سروتی رام بولے

"ابے بھائی چودھری ـــ کچھ دال موٹ وغیرہ ہے یا نہیں ؟"

"نہیں"

"نہیں ـــ تو ایک پنٹ اور مٹول شال کے کہیں سے نکالو ـــ چندرا کو پلاؤں گا ـــ چندرا رانی کو ـــ"

چودھری نے تیل و ڈال اٹھا اور ایک اوٹھا الا نکال لایا۔

"پانچ ہوئے بابو جی ـــ کم نہ لوں گا۔"

سروتی رام کو چودھری کی حرکتیں ہمیشہ سے ناپسند تھیں اور یہ گستاخی بھلا وہ کیونکر نظر انداز کر دیتے۔ پہلے تو ایک ادھا بھی نہیں تھا ـــ اور اب نکلتا ہی چلا آرہا ہے۔ روپے جو دیکھ لئے ـــ اس وقت ان کا جی چاہتا تھا کہ چودھری کی گنجی کھوپڑی دیوار سے ٹکرا دیں۔ احمق !

"دیکھو چودھری ! ابھی تو تم کہہ رہے تھے کہ ایک ادھا بھی نہیں ہے۔ اور یہ دو سالے کیا تمہارے سر سے نکلے۔ بولتے کیوں نہیں ؟ ـــ پانچ روپیہ لو گے۔ ہونہہ ـــ ڈیڑھ اور ڈیڑھ تین روپے ہوئے۔ کیا سمجھے ؟"

"بابو ایک دفعہ جو کہہ دیا ـــ تکرار مت کیجئے" چودھری کے تیور دیکھکر بہت ممکن تھا کہ سروتی رام کا غصہ کم ہو جاتا۔ مگر اس طرح اور اتنی جلدی اپنی ہار مان لینے پر وہ قطعی آمادہ نہ تھے۔

"بہت شیر ہو گئے ہو چودھری۔ یاد رکھو ایک ہی کڑ میں سارا بھیجا ناک سے بہا دوں گا۔" اور سروتی رام مکا ہوا میں لہرانے لگے۔ چودھری سمجھ گیا اس وقت ان سے بھڑنا ٹھیک نہیں ہے۔ پاگل کتے کو کون چھیڑے۔ بک لینے دو۔ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گے۔ ایک ذرا سے پچاڑے کی کسر ہے۔

"خفا مت ہو بابو۔ تمہیں لوگوں کی بدولت تو دوکان چلتی ہے ـــ" چودھری ان کے قریب آگیا۔ "بس یوں سمجھ کر کے بس آپ ہی لوگوں کا سہارا ہے۔"

سروتی رام سمجھے چودھری رعب میں آگیا۔ ذرا اسے اور کس لینا چاہئے۔ اسی لہجے میں بولے۔

"تو چودھری اب بھی ہوش میں آجاؤ۔ ہم بھی کچھ تجربہ رکھتے ہیں ـــ بولو کتنا ہوا ـــ ؟"

"اب آپ سے کیا لوں بابو۔ سچ مچ تو تین کا ہوا۔"

سروتی رام نے کوٹ کی جیب میں ادھا ٹھونستے ہوئے دس کا نوٹ چودھری کو تھما دیا اور چل دئے۔

"بھائی اس وقت تو حرج ہو رہا ہے۔ معاف کرنا۔"

"کوئی بات نہیں بابو۔" چودھری نے مسکرا کر کہہ دیا۔

کوٹ کے کالر میں کان چھپائے سمٹے سروتی رام باہر نکلے۔ جاڑے کی ٹھنڈی ہوائیں تیر کی طرح بدن میں پیوست ہو رہی تھیں۔ اور سارے بازار میں ایک سناٹا سکوت طاری تھا۔ مگر بادامی لال چاٹ والے کی دوکان ابھی تک کھلی تھی۔ سروتی رام کو رحمت اللہ درزی بھی یاد آگیا۔ اس بڈھے کی بھی عادت رات بھر دوکان کھولے رہنے کی ہے۔ مگر بادامی لال کی دوکان دن و رات چلتی تھی۔ جاڑا گرمی برسات اور دن کے تقریباً سولہ گھنٹے اسکی دوکان کھلی رہتی تھی۔ دن میں کئی مرتبہ سروتی رام ادھر سے گذرتے تھے۔

بھنبھناتی ہوئی مکھیوں کا ایک طوفان ـــ بھیگی ہوئی زمین پر پڑے ہوئے چند آوارہ قسم کے کتے ـــ دو تین بے ڈھنگی سی بنچیں ـــ اور ایک لکڑی کی میز ـــ یہ تھی بادامی لال کی دوکان ـــ سڑک کی چوڑی چکلی چھاتی پر دندناتی ہوئی موٹریں گذر جاتیں۔ پٹرول میں بسی ہوئی گرد چھینٹے کی تھال پر جما جاتی ـــ مگر اسکے مزے میں ذرا بھی فرق نہ آتا ـــ اور یہ نظارہ سروتی رام کئی مرتبہ دیکھ چکے تھے۔ اس کے علاوہ گرمیوں میں چلچلاتی ہوئی دھوپ گرم گرم تپتے نیم کے سائے میں دم لیتے۔ گھوڑے آرام سے موتتے۔ اور کوچوان دو پیسے کی ابلی ہوئی مٹر کھا کر ایک لوٹا تان کے پانی پیتے اور پھر چلے جاتے۔ یہ نظارہ بھی وہ کئی مرتبہ دیکھ چکے تھے۔ مگر انہیں اس وقت بہت برا معلوم ہوتا جب محلہ بھر کے آوارہ کتے بالشت بھر کی زبان نکالے ہوئے آتے۔ دہی میں ڈوبے ہوئے پتوں کو سونگھتے اور پھر کیچڑ میں پڑ کر رہیں سو رہتے۔ وہ کہتے تھے کہ بادامی لال ان کتوں کو دوکان پر کیوں جمع رکھتا ہے۔ اور اسی لئے وہ کبھی دن میں بیٹھکر وہاں چاٹ نہیں کھاتے تھے۔ ورنہ بادامی لال کی چاٹ تو چاروں طرف مشہور تھی۔ دور دور اس کا شہرہ تھا۔ خاص کر اتوار کے دن تو اس کی ڈبل آمدنی ہوتی تھی۔ جب ملٹری سے چھوٹے ہوئے جنگی لنگوٹ فوجی جوتے چٹکارتے ہوئے اسکی دوکان پر آتے تھے۔ دہی میں ڈوبے ہوئے بڑے، ابالی ہوئی مٹر، بیسن کی پھلکیاں، اور آلو کے قتلے سب ہی چیزوں کا وہ باری باری مزہ لیتے۔ مگر خاص طور پر انہیں مونگ کے پاپڑ بہت مرغوب تھے۔ تین ٹانگ والی بنچ پر بیٹھکر جب وہ پاپڑ کھانا شروع کرتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسے باغ میں کوئی آم اور جامن کی خشک پتیاں جمع کر رہا ہو۔

سروتی رام جب بھی اس طرف سے گذرتے بادامی لال کو آلو کے قتلوں میں جلدی جلدی نمک مرچ ملاتے ہوئے ضرور دیکھتے۔ اس وقت اسکی بادشاہت پھرتی سے چلا کرتا تھا۔ عموماً سودا بیچتے وقت بادامی لال اپنی چرب زبانی سے لوگوں کی ...

سی گردن کو ایک عجیب انداز سے جنبش دیتا رہتا۔ سروتی رام اُسے ہمیشہ ایک ہی غلیظ سی صدری پہنے دیکھتے تھے۔ گرمیوں میں صدری کا بٹن کھلا رہتا ۔۔۔ سینہ اور اس پہ پسینے میں ڈوبے ہوئے دو دو انگل سیاہ بالوں کو دیکھکر اُنہیں ہمیشہ یہی خیال آتا کہ شاید بادامی لال کوئی دیو ہے ۔۔۔ سیاہ ۔۔۔ موٹا ۔۔۔ بال دار ۔۔۔ یا شاید بھینسا ہے۔

دو پیسے کی چاٹ لیکر سروتی رام ایک تیسری گلی میں مڑ گئے۔ دُور سے میونسپلٹی کی لالٹین دکھائی دے رہی تھی۔ اور اس پر ایک سیاہ ساد ھبہ ۔۔۔ جیسے جلا ہوا داغ ۔۔۔

جب سروتی رام گلی کے نکڑ پر پہنچے تو چندرا کا مکان صاف دکھائی دینے لگا۔ پتلی سی گلی ۔ کیچڑ ۔ پان کی پیکوں کے بے پناہ دھبے ۔۔۔ سگریٹ اور بیڑی کے جلے ہوئے لاتعداد ٹکڑے ۔۔۔ اور ایک ناقابل برداشت تعفن ۔۔۔ اُونچا سر کئے اور ناک پہ رومال رکھے ہوئے سروتی رام بالکل مکان کے قریب آگئے ۔۔۔ اُوپر کا کمرہ کھُلا تھا ۔۔۔ ہلکی سی روشنی سامنے کی دیوار پہ پڑ رہی تھی اور ایک مرگھٹ جیسی خاموشی چاروں طرف طاری تھی ۔۔۔ اس وقت کون دیکھ سکتا تھا۔

کھٹ کھٹ کر کے سروتی رام زینہ طے کر گئے۔ دروازہ کھُلا تھا ۔۔۔ صحن سے ہو کر جب وہ سامنے کمرہ میں پہنچے تو وہاں سوائے چندرا کے اور کوئی نہ تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ چندرا کا دھندا رفتہ رفتہ بڑھ رہا ہوگا۔ بھرا بھرا سا جسم۔ سانولا چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں اور لمبے لمبے سیاہ بال ۔۔۔ پھر وہ سوچنے لگے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ چندرا کا پیشہ یہاں نہیں چلے گا ۔۔۔ ضرور چلے گا ۔۔۔ ناحق اسکے دل میں یہ بات جم گئی ہے۔ مگر وہ اکیلی ہی بیٹھی تھی۔ کچھ افسردہ سی ۔۔۔ سروتی رام کو دیکھکر چندرا نے مُسکرانے کے آثار چہرہ پہ پیدا کئے اور پلنگ پہ ذرا سمٹکر بیٹھ گئی۔

"بڑے دنوں کے بعد درشن دیئے ہیں ۔۔۔ بابو۔"

"ہاں چندرا" سروتی رام بھی ذرا سا مسکرائے۔ "میں ادھر ذرا کانپور چلا گیا تھا۔ اسی وقت تو آ رہا ہوں۔"

"بہت اچھا ہوا۔ یہ تو میری کشش ہے جو آپ کو گھسیٹ لائی۔ اس وقت بے اختیار جی چاہتا تھا کہ تم آجاؤ تو ایک لوٹھا ...." چندرا نے کنکھیوں سے کوٹ کی جیب دیکھی۔

"واہ چندرا ۔۔۔ خوب یہ لو نہ تمہارے ہی لئے لایا ہوں۔" جھنجھ سے جھجر۔"

چندرا خود تو کبھی نہ پیتی تھی مگر دوسروں سے منگا کر رکھ لیتی اور موقع پر بڑے بوڑوں سے خوب گہرا وصول کر لیتی ۔۔۔ سروتی رام کے ہاتھ سے اُدھا لیکر اُس نے تکیے کے نیچے دبا دیا۔ تاکہ دو کے چار وصول ہوں۔ مگر جب سے وہ ملک پور سے یہاں اُٹھ آئی تھی اُس کا سارا کاروبار چوپٹ ہو گیا تھا۔ گو کہ اُسے خود معلوم تھا کہ آج کل جنگ کی وجہ سے بازار بہت مندا ہو گیا ہے۔ مگر اتنا مندا بھی نہیں کہ دس روز میں مشکل سے دس آدمی آئیں۔ وہ سوچ رہی تھی، ناحق ملک پور چھوڑا۔ خاصی آمدنی تھی ۔۔۔ روز تیس چالیس کے وارے نیارے ہو جاتے تھے۔ اتنی آمدنی پڑوس میں کسی کو نصیب نہ تھی ۔۔۔ کتنی خوش رہتی تھی وہ ۔۔۔ مگر جب سے وہ یہاں اُٹھ آئی تھی سارا دھندا چوپٹ ہو گیا تھا ۔۔۔ اس کا خیال تھا کہ ملک پور تو ایک چھوٹا موٹا شہر ہے۔ اس میں جب اتنی آمدنی ہو جاتی ہے تو بھلا کلکتہ میں اس سے دوگنی اور تین گنی کیوں نہ ہوگی ۔۔۔ اور وہ نوری اور سعیدہ کے بہکانے سے ملک پور چھوڑ کر کلکتہ بھاگ آئی ۔۔۔ نوری اور سعیدہ تو بنارس ہی میں ٹک گئیں۔ مگر وہ کلکتہ کا ارادہ کر کے چلی تھی اور وہیں پہنچی۔ لیکن کلکتہ آنے پر اُسے ذرا بھی خوشی نہ ہوئی۔ کہاں تو اُس کا خیال تھا کہ ملک پور سے دوگنی اور تین گنی آمدنی کلکتہ میں ہوگی اور کہاں دس دن گذر لے پر سوائے ایک مُستقل گاہک کے اور اُسے کوئی نہ ملا۔ اور وہ سروتی رام تھے۔ جو بھولے سے ٹپک پڑے تھے۔ وہ بھی یوں کہ پہلے اسی مکان میں ایک بوڑھی عورت مع اپنی ایک نوجوان لڑکی کے رہتی تھی۔ سروتی رام ہفتہ عشرہ میں ایک دن ضرور جایا کرتے تھے۔ جب وہ بوڑھی عورت مری تو لڑکی اپنے ماموں کے پاس لکھنؤ چلی گئی۔ اور پھر وہی مکان چندرا کو مل گیا۔ اس کی خبر سروتی رام کو بالکل نہ تھی۔ ایک دن جو آئے تو چندرا کو سیڑھی پہ بیٹھے پایا۔ سمجھے بڑھیا نے نیا شکار پھانسا ہے۔ بولے

"کیوں بائی جی کہاں سے لائی گئی ہو تم؟"

چندرا سمجھی مذاق کر رہے ہیں۔ وہ صرف مسکرا دی۔ سروتی رام پھر بولے۔

"ہنسی تو غضب کی ہے ۔۔۔ مگر چندرا کہاں گئی؟"

اور جب چندرا نے انہیں سارا قصہ بتایا تو وہ سمجھے ۔۔۔ مگر اُس دن سے باقاعدہ آمد و رفت ہونے لگی۔

چندرا نے سروتی رام کی طرف دیکھا۔ وہ دیوار سے سر ٹیکے ہوئے اونگھ رہے تھے۔ بولی: "بابو چپ کیوں ہو باتیں کرو۔ طبیعت ٹھیک نہیں ہے"

سروتی رام چونک پڑے۔ دیکھا چندرا کی آنکھیں بےخوابی کی وجہ سے سرخ ہو رہی تھیں ۔ نشیلی ۔۔۔ پپوٹے بھاری بھاری سے تھے۔ اور چہرہ بالکل اُترا ہوا ۔ جیسے

چھایا ہوا تھا۔

"چندرا اتنی رات تک مت جاگا کرو سمجھیں؟" وہ ہنسے۔

سرو تی رام خیال کرتے ہیں کہ میں دیر رات تک دھندا کرتی ہوں۔ یہ سوچ کر مسکرانے لگی۔

"میرا تو خیال ہے چندرا کہ —— کہ میں ہی اب تمہارے ساتھ رہوں۔ میں بھی پردیسی اور تم بھی۔ اکیلے پڑے پڑے تو کاہل سا ہو گیا ہوں میں۔" سرو تی رام بولے۔

"بابو میرے لئے اس سے زیادہ اور خوشی کیا ہوگی کہ جس کے تصور میں دن رات گھلتی ہوں وہ خود آ کر اس حسرت کدہ میں رونق افروز ہو۔ مگر دنیا کیا کہے گی؟"

یہ سوال ذرا ٹیڑھا سا تھا —— ایک بازاری عورت کے یہاں جا کر پڑ رہنا بڑی توہین آمیز بات ہے۔ وہ سوچنے لگے شہر کے کتنے ہی لوگ ان کو جانتے تھے کارخانے کے بڑے بڑے افسر۔ سپروائزر۔ اور شہر کے چھوٹے بڑے قریب قریب سب ہی۔ تھوڑی دیر سوچنے کے بعد بولے۔

"چندرا! میں دنیا کو کیا کروں —— دنیا لاکھ کہا کرے۔ میں بھی تو کماتا ہوں۔ اسی روپے۔"

"ہاں بابو! میرا بھی یہی خیال ہے کہ اب یہاں سے اُٹھ چلیں کہیں اور —— بڑا منحوس شہر ہے —— میں بھی اس پیشے سے تنگ آ گئی ہوں۔ اگر تم کہیں ٹھکانے سے لگ جاؤ تو سمجھوں جیون سپھل ہے۔"

یہ سنتے ہی سرو تی رام دفور مسرت میں اچھل پڑے۔ آنکھیں فرط خوشی سے چمک اُٹھیں۔ دماغ میں اسی روپیہ اور چندرا گھومنے لگی۔ ایک کرایہ کا مکان لیں گے چندرا وہاں رانی کی سمان رہے گی —— شام کو وہ کارخانہ سے آئیں گے —— اور چاء پی کر دونوں محبت بھری باتیں کرینگے —— اور انہیں کوئی نہ ٹوک سکے گا —— ہاں کون ٹوک سکے گا۔

سرو تی رام نے خوش ہو کر چندرا کی گردن میں ہاتھ ڈال دیئے۔ اور جذبات سے متاثر ہو کر بولے۔

"میری اچھی چندرا"

چندرا اُن کے اور قریب کھسک گئی —— لیکن بابو میرے پاس ایک کوڑی اس وقت نہیں ہے۔ اس دس دن میں تو میں کنگالوں سے بھی بدتر ہو گئی ہوں۔ اگر اس وقت پچیس روپے کہیں سے مل جائیں تو پرسوں تک یہاں سے چل دینے کا انتظام ہو جائے۔"

"ہاں چندرا! تم ٹھیک کہتی ہو۔" سرو تی رام بولے۔ "میں نے بھی [illegible] تنخواہ پائی ہے۔ اچھا ہے پرسوں تک چلے چلیں۔ کیوں نا؟ اور یہ پچیس لو۔"

جیب سے نکال کر سرو تی رام نے پچیس کے نوٹ چندرا کے ہاتھ میں دے دیئے۔ اور بولے۔

"ٹھیک ہے نہ پھر —— پرسوں؟"

"ہاں بابو۔ پرسوں تک ضرور۔"

ذرا دیر سوچنے کے بعد سرو تی رام پھر بولے۔

"مگر تمہیں یہ پیشہ چھوڑ کر ہمارے ہی ساتھ رہنا پڑیگا چندرا۔"

"ہاں بابو —— کہہ جو دیا ایک مرتبہ۔"

چندرا نے نوٹ پاندان میں رکھ کر قفل چڑھا دیا۔ اور بولی۔

"مگر چلیں گے کہاں —— کیوں بابو؟"

"ارے کانپور۔ لکھنؤ۔ بنارس۔ جہاں جی چاہے چلو۔"

"کانپور ٹھیک ہے بابو۔"

اور پھر تھوڑے عرصہ کے لئے سرو تی رام سوچنے لگے، کانپور میں بڑی بڑی ملیں ہیں۔ کسی میں لکھنے پڑھنے کا کوئی کام مل جائے تو پو بارہ —— ٹھاٹ سے گذریگی۔ چندرا ہوگی —— ہم ہونگے —— اور مل ہوگی —— پھر انہیں بڑی بڑی ملیں دکھائی دینے لگیں۔ دھواں اگلتی ہوئی چمنیاں —— غلیظ دھواں —— مل کے مزدور —— بھوک کی ماری ہوئی خلقت —— مگر چندرا ہوگی اور وہ ہونگے۔

جب زینہ پر دھب دھب کی آواز آئی تو سرو تی رام ذرا چونکنے سے ہوئے اس اندھیری رات میں کس احمق کو تاؤ آگیا بھلا —— وہ زینے کی طرف دیکھنے لگے اور اچانک ایک حسب ضرورت موٹے سیٹھ صاحب صحن میں ٹپک پڑے۔ ہاتھوں میں نوٹ کی گڈی دبائے ہوئے۔ سرو تی رام نے روپوں کی طرف دیکھا اور پھر سیٹھ کی طرف۔ یہ افلاس کی روندی ہوئی مخلوق کا چوسا ہوا خون تھا۔

چندرا نے سیٹھ کی طرف دیکھا اور پہچان گئی۔ آج سے تین روز پہلے بھی یہ ایک مرتبہ آ چکے تھے۔ دس ملے تھے اُن سے۔ چندرا پہلے تو کسمسائی پھر نوٹوں کی گڈی پر نظر پھسل گئی۔ اُٹھ کر بولی۔

"آیئے سیٹھ جی —— ہم تو آپ کا انتظار ہی کر رہے تھے۔"

سرو تی رام پر گویا بجلی گر پڑی —— چندرا کی یہ حرکت انہیں اس وقت ناقابل برداشت معلوم ہوئی —— مگر صبر کئے بیٹھے رہے۔ سیٹھ کو گھورتے ہوئے۔ سیٹھ ایک بھدا سا قہقہہ لگا کر کمرہ میں داخل ہوئے اور سرو تی رام کو دیکھ کر بولے۔ "تمہیں مل گیا دلال —— کیوں چندرا؟"

چندرا پہلے تو خاموش رہی۔ پھر [illegible] بولی۔

"آ ۔ آ ۔ ہاں سیٹھ جی ۔ مل گیا ۔ آپ کی دعا ہے"

سرو تی رام کے سینے پر سانپ لوٹ گیا ۔ اب انہیں معلوم ہوگیا کہ یہ سب روپیہ پیدا کرنے کے ڈھونگ رچائے گئے تھے ۔ چندرا بڑی دغا باز ہے ۔ اس وقت اُن کی نگاہوں میں پچیس کے نوٹ ہوا میں اُڑتے دکھائی دینے لگے ۔

اور جب سیٹھ نے اُن سے کہا ۔۔۔ "چودھری کے یہاں سے ایک ادّھا سنترے لے آؤ ۔" پھر چندرا کو لیکر دوسرے کمرے کی طرف چلے تو سرو تی رام کڑک کر بولے

"چندرا ۔۔ !"

اور چندرا مڑ کر بولی ۔ "ہاں بابو ۔۔۔ پرسوں ۔۔۔ ضرور ۔۔۔"

سیٹھ نے دھم سے کمرے کا دروازہ بند کر لیا اور سرو تی رام بوکھلا کر بھاگے ۔ لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے زینہ اُتر گئے ۔

سرو تی رام لوٹ رہے تھے ۔ کوٹ کے کالر میں کانوں کو چھپائے ہوئے ۔

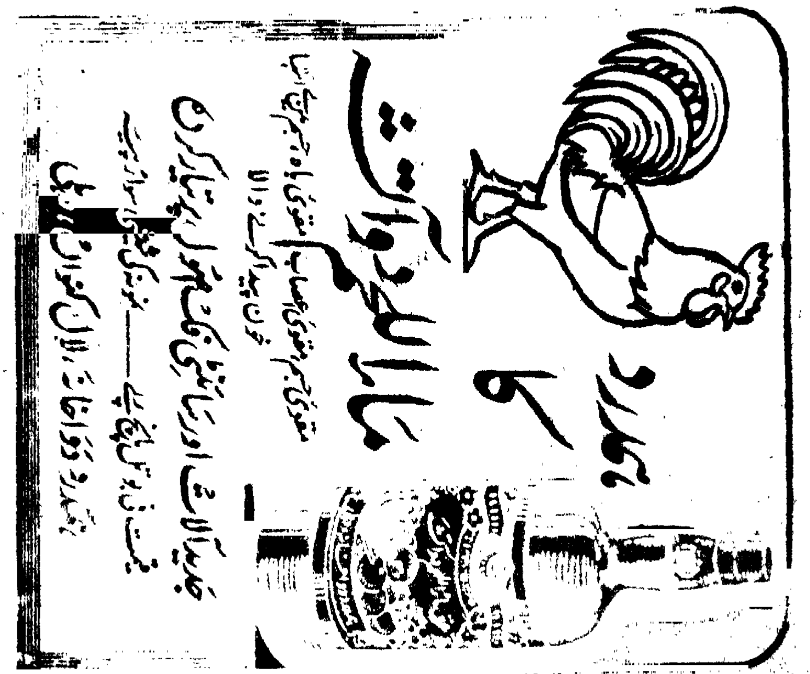
دسمبر کی سرد تیکھی ہوائیں تیر کی طرح بدن میں پیوست ہوتی جا رہی تھیں ۔ اور چاروں طرف ایک ماتمی سکوت طاری تھا ۔

وہ تیز تیز قدموں سے چلے جا رہے تھے ۔۔۔ اسی بے ہنگم سی سڑک پر ۔ دوکانیں بند ہو چکی تھیں ۔۔۔ ہوٹل بھی ۔۔۔ حکیم کا مطب بھی ۔۔۔ مگر رحمت اللہ درزی کی دوکان ابھی تک کھلی تھی ۔ بڈھا اونگھ رہا تھا ۔ سرو تی رام کو دیکھتے ہی بولا ۔

"کہاں سے بابو ؟" سرو تی رام غصہ سے تڑپ اُٹھے ۔ بڈھا ۔ احمق ۔ نہ جانے اسے ٹوکنے میں کیا مزا ملتا ہے ۔ دانت پیستے ہوئے بولے ۔

"جہنّم سے ۔۔۔"

بڈھا زور سے ہنسا ۔ اور گرم گرم سلاخ کی طرح وہ قہقہہ سرو تی رام کے کانوں کے پار ہو گیا ۔ پچیس روپے کے نوٹ اب بھی اُنکے دماغ میں گھوم رہے تھے ۔



جوتی اور ٹوپی

(از محترمہ ح۔ب صاحبہ رازؔ چنگوی)

آج کل عوام کی زندگی نمائشوں کا مجموعہ اور نگاہ تصنع کی عادی ہو چکی ہے۔ اور ممکن ہے کہ میرا یہ مضمون اس قسم کی آرائش یا تصنع سے مبرا ہونے کی وجہ سے عوام کی نگاہوں میں کوئی وقعت نہ حاصل کر سکے۔ تاہم۔ اظہار مافی الضمیر کیلئے ایک عنوان سے لیکن انوکھے عنوان کے تحت، اپنے ایک دوست کی خواہش پر بلکہ یوں کہو کہ مجبور کرنے پر کچھ تحریر کر رہی ہوں۔ اب اسکو کوئی افسانہ کہے یا مضمون کہے اسکا فیصلہ اور اسکی دلچسپی کا فیصلہ دوسروں پر ہے۔ اور درحقیقت مجھے بھی مضمون و افسانہ سے کچھ کام نہیں۔ لیکن نہ

اِس ڈھب سے کوئی سمجھے بس مدعا یہی ہے

(رازؔ)

جاڑے کا موسم ہے۔ رات کے نو بج کر بیس منٹ ہوئے ہیں۔ مناظرہ ابھی ۔ پوری آب و تاب سے جاری ہے۔ جب ہر ایک یعنی کلاہ، ٹوپی، ہیٹ وغیرہ نے اپنی فضیلت اور شان و شوکت کا اظہار ایک عجیب متکبرانہ لہجہ میں کرنا شروع کیا اور ہی ساتھ ہر ایک نے اپنی اپنی بساط کے مطابق جوتی کی رذالت، ذلالت اور اسکی ت پہ اپنے اپنے قلوب کے پھپھولے پھوڑنے شروع کئے۔ تو جوتی جو اس محفل میں موجود اور اب تک خاموشی سے تمام حالات کا مشاہدہ کر رہی تھی، خاموش نہ رہ سکی۔ ک بھبوکا ہوکر بڑے جوش سے بولی۔ "مانا کہ تم سب اپنی اپنی جگہ افضل ہی سہی، ن جوتی کے متعلق اس بھری محفل میں ایسے نفرت آمیز کلمات کا اعادہ کونسی شرافت ۔ اور اس طرح نفرت و حقارت کا اظہار کہاں تک مناسب ہے۔ اے کور چشمو! اسکی یاں تو سب نظر آتی ہیں۔ کبھی اسکے فوائد پر بھی نظر ڈالی۔ کہ اپنے مالک کی خاطر کس طرح وہ ی، گرمی، کنکر، پتھر، کانٹے اور زہریلے جانوروں کا مقابلہ کرتی اور اپنا حق وفاداری ہ جانفشانی سے ادا کرتی ہے۔ بہتر ہے کہ تم میری ایسی توہین سے باز آجاؤ۔ ورنہ یاد رکھو میں بھی وہ دم رکھتی ہوں کہ ٹوپی کی ہی عزت اور شان خاک میں ملا سکوں۔ اور یہ وقار میں نے کبھی کا حاصل کر لیا ہوتا۔ اگر تمہاری کورچشمی، حسد اور تمہاری مخالفت سد راہ نہ ہوتی۔ لیکن اب پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا ہے۔ اور میں نے اب خود اپنی عزت و وقار اور اپنی زیست کیلئے جد و جہد شروع کر دی ہے۔ اور عنقریب زمانہ پر واضح ہو جائے گا کہ جو کچھ مجھے سمجھا جا رہا ہے۔ یا کہا جا چکا ہے۔ اس سے بالا بلکہ بالاتر میں کچھ اور چیز ہوں۔ اور پھر اب میں وہ جوتی بھی نہیں ہوں کہ کچھ دیکھا بھالا نہ ہو۔ فرانس، چین، جاپان، انگلینڈ اور بہت سے ممالک کا سفر کر چکی ہوں۔ اور جب میں انگلینڈ میں تھی۔ میرے مالک عاجز ہو مجھے مدتوں جوتی جوتی کہتا رہا تھا۔ مجبوراً مجھے ٹوپی ٹوپی کہکر اپنی عزت بچائی۔ ورنہ قریب تھا کہ اس کا نام وہاں احمقوں کی فہرست میں لکھا جاتا۔

ہاں یہ ضروری امر ہے کہ بدقسمتی سے جب کبھی میں کسی مشرقی ممالک کے سوداگر کے ہاتھ لگ جاؤں تو اکثر جوتی ہی رہتی ہوں۔ لیکن سرزمین مغرب میں مجھے ٹوپی کہے یا سمجھے بغیر گزارا نہیں۔ اس بات پر سب حاضرین ہنس پڑے کہ عجیب بات ہے۔ ممالک مشرق سے جوتیوں کا پارسل مغرب میں جاکر ٹوپیاں کیسے بن جاتا ہے تاہم جوتی نے اپنی گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے کہا کہ یہ ملک یا آب و ہوا پر منحصر نہیں ہے بلکہ یہ پہننے والے کے اپنے خیال اور ذہنیت پر مبنی ہے کہ پہنتے وقت اگر مجھے جوتی کہکر پہنے تو جوتی اور اگر ٹوپی کہکر پہنے تو ٹوپی۔ بس اس پر تو ساری مجلس میں ایک ہلڑ مچ گیا اور سب نے ہنسنا شروع کیا۔ اور چاروں طرف سے حاضرین نے آوازے کسنے شروع کئے۔ واہ بھائی واہ! جوتی بڑی چرب زبان معلوم ہوتی ہے۔ کوئی کہتا۔ مجذوب کی بڑ ہے بھئی اس کا کیا کہنا۔ کوئی کہتا ہے بس بس بی جوتی خاموش ذرا خاموش بس بھی کرو لیکن وہ بھلا کس کی سننے والی تھی۔ اور آخر بڑے صبر کے بعد تنگ آکر بولی تھی۔ کہنے لگی کسی شریف کے پاس اس قضیہ کو لے چلو تو معلوم ہو جائے کہ حقیقت کیا ہے۔ اسی اثنا میں شور و غوغا میں ایک عمامہ صاحب بھی تشریف لائے بس پھر کیا تھا۔ نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ سب معاملہ شروع سے لیکر اخیر تک جوتی نے عمامہ کے سامنے پیش کر دیا۔

تھوڑی دیر تو عمامہ خاموش رہا۔ اور محفل پر بھی ایک سکوت طاری رہا۔ لیکن اسکے بعد عمامہ نے مہر سکوت کو توڑا۔ اور یوں کہنا شروع کیا۔

ہمارے ملک ہندوستان میں بعض خاندانوں کی ذہنیت کی پستی قابل غور ہے کہ وہ عورت کو جوتی سے تعبیر کرتے ہیں یا جوتی کی مانند سمجھتے ہیں اور برعکس اسکے اہل مغرب عورت کو بڑی عزت اور منزلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بلکہ وہ اسکو ٹوپی سمجھتے ہیں۔ یعنی اہل مشرق نے یا کم از کم اہل ہند نے اس کو نہایت پستی میں اور اہل مغرب نے بلندی پر جگہ دی ہے۔ ایک طرف تو نہایت تحقیر سے کام لیا اور

ہے۔ لہٰذا دونوں کیلئے یہ سخت مضر ثابت ہوتا ہے۔ مثلاً ہندستانیوں کے بیشتر خاندانوں کا نظریہ یہ ہے کہ عورت جوتی سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی یہ مستورات کا پھل ہے کہ وہ دنیا میں کسی جہت سے بھی کوئی ترقی نہیں کرسکتیں۔ اور نہ کوئی کمال پیدا کرسکتی ہیں۔ جس کی وجہ اُن کی اپنی دماغی یا جسمانی کمزوری نہیں ہوتی بلکہ جب سے کہ وہ بچوں کی بکاوٹ جس کام کرنے لگتی ہے یا ہوش سنبھالتے ہی وہ اپنی ماں بہنوں اور خاندان کی دیگر مستورات کو "جوتی" کے لقب سے مزین پاتی ہیں۔ وہ معصوم پیکر جو خالق سے ایک صاف و شفاف دل و دماغ، ایک وہ درس اور سلیم فہم و فراست اور اعلیٰ جذبات و احساسات لیکر آتی ہیں اور جو آئندہ روحانی، جسمانی۔ علمی۔ ادبی اور دماغی ترقی کیلئے ممد و معاون ہوسکتے ہیں۔ "جوتی، جوتی" کی پیہم آوازسے کچل دیئے جاتے ہیں۔ روزمرہ کے خانگی مشاہدات و واقعات۔ مردوں کے عورتوں کے ساتھ نارو ابرتاؤ۔ اور اس قسم کی گری ہوئی ذہنیتوں کی حرکات اور خیالات ہی اُن کی شکست سامانی کیلئے کافی سے زیادہ موثر ثابت ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنے کو کلی طور پر قیدی سمجھے ہوئے ہیں۔ بس ایک جوتی کی حیثیت سے بنہایت خاموشی کے ساتھ اس جوتیوں کی قطار میں جہاں ان کی والدائیں۔ خالائیں، پھوپھیاں اور بہنیں ہوتی رہیں، ڈال دیتی ہیں۔ اس کے علاوہ لڑکی کی پیدائش پر غم کی لہریں خاندان بھر میں دوڑ جاتی ہیں۔ میکے سے لیکر سسرال تک، پھر وہاں پر بھی تا زیست "جوتی، جوتی" کا خطاب باقاعدہ وابستہ رہتا ہے۔ بھلا جوتی کسی کے پاؤں میں دیکر کیا فخر ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندستان میں لڑکی والا کمزور گردانا جاتا ہے۔ الغرض انہی وجوہات کی بنا پر ایسے خاندانوں کی لڑکیاں عموماً کمزور، بیمار، مایوس، خاموش اور مغموم سی رہتی ہیں۔ اور آخرکار وہ اس قدر شکست الوجود بنادی جاتی ہیں کہ ہر معمولی سے معمولی امورکبھی وہ اپنے بدن یا دماغ سے کام نہیں لے سکتیں۔ کیونکہ اُن کے ہر مشورہ کو ناقص سمجھ کر ہزاروں بار ٹھکرایا جاچکا ہوتا ہے۔ وہ اپنے تئیں ناقابل سمجھکر ہر کام میں حصہ لینا چھوڑ دیتی ہیں۔ گویا دُنیا میں آکر ایک تنگ و تاریک گڑھے میں زندگی کے دن پورے کرلینے کے بعد وہ ناکام واپس ملک بقا کو سدھار جاتی ہیں۔

برعکس اس کے اہل مغرب لڑکی کی پیدائش پر حد سے زیادہ خوشی مناتے ہیں۔ بچپن سے شباب تک کے گھر میں اُسے پوری آزادی حاصل ہوتی ہے۔ بوقت شادی ایک ٹوپی کی حیثیت سے دوسرے کے سر پر پہناکر فخریہ پیش کی جاتی ہے۔ اور پھر سسرال میں ہر سیاہ و سفید کی پوری طرح مالکہ ہوتی ہے۔ یعنی پیدائش سے مرگ تک اُن کے خیالات، احساسات اور جذبات کی تگ و دو میں کوئی چیز سد راہ نہیں ہوتی جسمانی، دماغی ہر ایک ترقی کیلئے پوری آزادی بلکہ اُس کے معاونین مہیا پاتی ہے اور ہر طرح ترقی حاصل کرتی ہے۔ لیکن چونکہ آزادی حد سے بڑھی ہوئی ہوتی ہے اور اس قدر آزادی روحانی ترقی کے منافی ہے۔ اور روحانی ترقی کیلئے کچھ پابندیاں لازمی ہیں۔ چنانچہ وہ صحت یاب، چست و چالاک، ہشاش بشاش اور نزاکت کا پتلا تو بن جاتی ہے۔ لیکن عصمت و عفت پرست، وفادار اور نیک نہیں بن سکتی۔

اس کے بعد علامہ نے حاضرین کو یوں خطاب کیا کہ "یہ تھیں تفریط اور افراط کے متعلق تشریحات۔ اب میں اس مقدمہ کو لیتا ہوں جو میرے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اور اسکے متعلق ایک قطعی فیصلہ دونگا۔ جس کی طرف دُنیا کے ہر مذہب نے رہنمائی کی ہے اور اسکے علاوہ تجربات سے اسکی صحت اور فوائد بھی اہل نظر پر ثابت ہوچکے ہیں۔"

سامعین کی طرف سے ایک شور بلند ہوا "ضرور ضرور کوئی قطعی فیصلہ ارشاد فرمادیں تاکہ اس روز روز کی بحث سے نجات ہو۔"

"افراط اور تفریط کی خرابیاں واضح ہوچکی ہیں بس ان دونوں راہوں کو چھوڑکر ایک درمیانی راہ پر چلنے سے یہ عقدہ بآسانی حل ہوجاتا ہے۔ اور اس میانہ روی میں بہت سی خوبیاں مضمر ہیں۔ میں عورت کو علیحدہ نہیں بلکہ اس کو مرد کے بدن کا ایک حصہ سمجھتا ہوں۔ اور حصہ ہی نہیں بلکہ ایک ایسا قیمتی عضو قرار دیتا ہوں جس کے بغیر مرد کی زندگی ادھوری اور ناکام رہ جاتی ہے۔ عورت کو عزت و آبرو کے سلامت دائرے کے اندر رہکر مرد کی طرح ہر علمی، ادبی، روحانی اور جسمانی ترقی حاصل کرنے کا اور ہر سمت بڑھنے کا پورا حق حاصل ہے۔ اسکے جواز میں براہین قاطع اور دلائل ساطع میرے پاس موجود ہیں۔ لیکن میں بوجہ طوالت اسکو چھوڑتا ہوں کیونکہ رات زیادہ گذر گئی ہے۔ اور آپ لوگوں کو نیند آرہی ہوگی۔ ہاں اگر اسکے متعلق کوئی شبہ ہو تو پھر بھی میں حاضر ہوں۔ جب چاہیں پوچھ سکتے ہیں۔ ہاں تو عورت مرد کی ہر پہلو میں معاون ہوسکتی ہے لیکن یہ صحیح نہیں کہ مرد کو عورت پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔ اور ضرور ہے اور وہ اس طرح کہ اس نازک اندام کو یعنی عورت کو روزی کمانے کا آلہ کار نہ بنایا جائے۔ بلکہ مرد کے ساتھ مل کر وہ اس کا ہاتھ بٹائے۔ گاڑی ایک پہیئے سے نہیں چل سکتی۔ دو پہیوں کی ضرورت ہے۔ مرد کی زندگی کے بھی دو پہلو ہیں۔ اور عورت ان دو پہلوؤں میں سے ایک پہلو ہے۔ یعنی عورت کا کام ہے کہ وہ مرد کے گھر اور عزت کی نگہبان ہو۔ رونق خانہ عصمت و عفت پرست۔ شوہر پہ قربان ہونے والی۔ شیریں کلام اور بُرے وقتوں میں اپنی دلکش مسکراہٹ سے آشوب کی آندھیوں کو راحت اور پُر لطف سحاب سے تبدیل کرسکے نیکی کا مجسمہ بن کر خاوند کو بھی فرشتہ سیرت بنا سکتی ہے۔ اگر وہ نیک ہے تو پھر ایک بیش قیمت خزانہ ہے۔

یہاں پہنچ کر مجاہد کے ہوش اڑنے لگے۔ اور بڑے جوش سے کہنا شروع کیا۔

" اے عورت تو اپنے آپ کو حیا کے زیور سے مزین کر۔ پاکبازی کا لباس پہن۔ کفایت شعاری کا سرمایہ بن۔ تو محبت کا شاہکار بن کر اپنے تبسم کے اُجالے میں اپنی اور اپنے شوہر یعنی اپنے محبوب کی کشتی حیات کو پار لگا۔ بس یہ ہے تیرا کام۔

اور اے مرد! عورت ایک نعمت ہے۔ اس کی قدر کر۔ اس کو حقیر نہیں بلکہ اپنے ہی بدن کا ایک قیمتی عضو سمجھ۔ یہ تیری رونق حیات ہے۔ تیری زندگی کی مدح ہے۔ اس میں مشکلات اور رنج والم کی برداشت کی جو طاقت موجود ہے وہ مرد کو ہرگز نصیب نہیں ہو سکتی۔ کیا تم نے اس کو اپنی محبوب ہستیوں کے لئے

میدانوں میں کودتے یا پہاڑوں پر چڑھتے کبھی نہیں دیکھا۔ کیا تو نے اس کو راتوں کسی کی تیمارداری میں اس کے صبر و تحمل کا مشاہدہ نہیں کیا۔ کیا یہ اُن جواں مردوں کی ماں نہیں جنہوں نے دنیا میں آکر اپنے جوہروں اور بہادری سے عجیب ہل چل مچا دی تھی۔ اور کیا تو نے اس کو بے کھٹکے اپنے دلبندوں کو میدان جنگ میں کبھی کٹواتے نہیں دیکھا۔ اگر اس پر بھی یہ حق کی چوٹی کا دعویٰ تو پھر جان لے کہ "تو" بھی دنیا میں زیادہ دیر تک وقار نہیں حاصل کر سکتا۔ اور تیری دیانت کا خدا حافظ"

محفل پر ہر طرف ایک سکوت اور سناٹے کا عالم چھایا ہوا تھا۔ اور لوگ اس تقریر پر متحیر تھے۔ اس کے بعد محفل برخاست ہو گئی۔

یہ لڑکے

(از محترمہ حجاب عبدالرحمٰن عباسی)

یہی بات اُس کے دماغ کی سلوٹوں پر پیہم رینگ رہی تھی کہ وہ اُس کا کون سا مداوا تلاش کرے جس سے یہ لڑکے جو اُس کو سکول سے آتے جاتے پریشان کیا کرتے تھے اپنی مذموم عادتوں سے باز آویں اور وہ اطمینان سے بلا کسی روک ٹوک سکول آیا جایا کرے۔ لیکن ایسی کوئی شکل نظر نہیں آتی تھی۔

بہت غور و خوض کرنے کے بعد اُس نے ایک تدبیر سوچی۔ وہ یہ تھی کہ وہ آئندہ سکول سائیکل سے نہ جائے بلکہ کرایے کے تانگے سے۔ دوسرے روز جب سکول کا وقت ہوا تو وہ اپنے لوازمات کے ساتھ اپنے بنگلے کے کمپاؤنڈ کے باہر آگئی اور ایک پاس سے گذرتے ہوئے خالی تانگے کو رکوا کر اُس پر بیٹھ گئی۔ اور پھر تانگہ آگے بڑھنے لگا۔ اس وقت اس کا دل بہت زوروں سے دھڑک رہا تھا۔ جیسے جیسے اسکا تانگہ آگے بڑھتا جاتا تھا وہ اور بھی جلدی جلدی اپنی گردن گھما گھما کر دیکھتی جاتی تھی کہ کوئی اُس کی طرف ٹکٹکی لگا کر تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ اتنے میں ایک لڑکے نے تانگے والے کو اشارہ کیا۔ اور بڑی شان سے آکر بالکل اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد اس لڑکے نے اُس پر سوالات کی بوچھاڑ شروع کردی۔ "آپ کا نام کیا ہے؟ آپ کہاں پڑھتی ہیں؟ آپ شادی شدہ ہیں یا غیر شادی شدہ؟ آپ خاموش کیوں ہیں؟ ———" اور اُس نے ایسا محسوس کیا کہ اس کا دل ایک لمحہ میں سینکڑوں بار دھڑک گیا۔ اور اسکے بدن کے ریشے ریشے میں ایک طرح کا ارتعاش پیدا ہوگیا ہے۔ وہ گھبرا کر بولی "آپ کا مطلب! میں کون ہوں۔ کہاں پڑھتی ہوں؟؟" اور اُس لڑکے کے چہرے پر ایک رنگ آنے لگا اور ایک رنگ جانے لگا۔ اور اُس نے کہا "جی! میرا مطلب کسی اور چیز سے نہیں۔ یہ تو میں نے آپ سے کچھ یونہی پوچھ لیا تھا۔ اگر آپ پر میرے الفاظ گراں گزرے ہیں تو میں انہیں واپس لے سکتا ہوں۔ اور ——— آپ اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہیں؟ میں آپ کے لئے کیا کرسکتا ہوں؟" اُس لڑکے کی طول کلامی سے کر اُسے قدرے غصہ آگیا اور شاید غصہ کی وجہ سے وہ تانگے پر سے کود بھی پڑتی۔ لیکن اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا اور پھر اُس نے [illegible] کی رفتار [illegible] دوسری طرف منہ پھیر کر خاموش ہوگئی۔

تانگے سے سکول جانے کا تجربہ نہایت تلخ ہوا اور شام کو وہ اپنی ایک کلاس فیلو کی کار سے گھر آئی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی اس نے دریافت کیا کہ پتاجی ابھی کچہری سے آئے ہیں یا نہیں۔ اور جب اُسے جواب نفی میں ملا تو وہ اپنی ماں کے اُوپر برس پڑی اور کہہ دیا کہ آپ پتاجی کو آگاہ کر دیجئے کہ میں کل سے سائیکل سے سکول نہ جاؤنگی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ آخر آپ کار سے سکول کیوں نہیں جانے دیتے۔ اور جب اُس کی ماں نے وعدہ کیا کہ وہ شام کو نہیں لیکن رات کو جب وکیل صاحب بازار سے واپس آئیں گے تو وہ ضرور اُن سے کہیں گی تب اُس کا غصہ کچھ کم ہوا۔

شام کو جب وہ اپنے کمرے میں میز پر پڑھنے بیٹھی تو اس کا دماغ نہ جانے کیسے کیسے خیالات سے مملو تھا اور اسکی نگاہیں کتاب کی سطروں پر ٹھہرنے کا نام ہی نہ لیتی تھیں۔ اُس نے کتاب کو بند کر دیا۔ اور دونوں کہنیوں کو میز پر رکھکر اپنے اُبھرے ہوئے گالوں کو دونوں ہاتھوں سے دبایا اور اس کے بعد وہ ایک عمیق فکر میں غوطہ زن ہوگئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ لڑکے بھی عجیب قماش کے ہیں۔ نہ اُن کی بات چیت کا کوئی سر پیر ہے اور نہ ان میں کوئی تکلف ہی ہوتا ہے۔ بس انہیں صرف ایک عورت کا نقطہ مل گیا ہے۔ اور بس وہ ہر پاس سے گزرنے والی عورت کو یا لڑکی کو جس کے چہرے پر جوانی کے ذرا بھی آثار پائے جاتے ہوں تختۂ مشق بنا لیتے ہیں۔ حالانکہ وہ لڑکی یا عورت اُن کے پاس سے فوراً اس طرح گزر جاتی ہے جیسے ایک طرف سے پھولوں کی خوشبو آئے اور دوسری طرف نکل جائے۔ نہ جانے یہ لڑکے اس میں کون سی لذت محسوس کرتے ہیں۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے جب میں سکول سے چھٹی ہونے پر سائیکل سے آرہی تھی تو سڑک پر چار یا پانچ پیدل چلنے والوں میں سے ایک بول اُٹھا "جناب! پچھلے پہیئے میں ہوا کم ہے۔ ارے ذرا سنبھال کر چلائیے۔ آپ کو دکھائی نہیں پڑتا کیا؟" اور اسی روز جب میں جا رہی تھی تو ایک منچلے لڑکے نے میرا خیر مقدم شعر کے ایک مصرعہ سے کیا۔ اس کی آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اسکے گرد آلود اور بے ڈھنگے بال اُڑ اُڑ کر اسکی آنکھوں پر آجاتے تھے۔ اس نے کس حرماں نصیبی سے ٹھنڈے سانس لیکر کہا تھا ؎

کوئی دل کو قابو میں رکھے کہاں تک

معاً اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ ان کی باتیں کتنی مخرب اخلاق اور شرافت سوز ہوتی ہیں۔ وہ ہر طرح کے فاسد خیالات کا اظہار بلا کسی جھجک کے کر دیتے ہیں اور ایسا کرنے میں ان کو جیسے ایک طرح کا مزہ سا آتا ہے اور

ان کے ہنستے ہونٹوں پر ایک غیر شعوری ہنسی ناچنے لگتی ہے۔ یہ بیوقوف لڑکے ذرا بھی نہیں سوچتے کہ جن کو وہ اپنی باتیں سنا رہے ہیں وہ تو خود آگے ہی ان کے پاس سے ہو کر گزر جاتی ہے۔ اور اس کی آواز پھر انہیں کو کیسے کیسے خیالات ان کے کیریکٹر کے متعلق باندھنے پر مجبور کر دیتی ہے لیکن کیا یہ سب باتیں صرف ان ہی لڑکوں کے ساتھ وابستہ ہیں جو پیدل چلتے ہیں۔ آخر وہ بھی تو لڑکے ہیں جو سائیکل سے چلتے ہیں۔ شاید ہی کبھی انہوں نے کوئی غلط کہا ہو اور اگر ان میں سے کوئی کچھ کہنے کی جسارت بھی کرتا ہے تو ان کی آواز مسکی اور ان کی برابر ہوتی ہے۔

مجھے ان لڑکوں کی باتوں کا مقصد تو بالکل معلوم ہے لیکن یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ میں ان کے ہاتھوں کی انگلیوں سے لپٹے گدرائے اور ابھرے .... گندگی میں ملوث کمرں۔ اور .... اور .... وہ آگے کچھ اور سوچنا چاہتی تھی لیکن اسکے پتا جی کی کرخت آواز نے اسے چونکا دیا۔ اور اس کے دماغ میں خیالات کی آمد اس طرح سے ایک پل کے لئے رک گئی۔ جس طرح ایک تنکے پر آمنے سامنے کی طرف آتی ہوئی چیونٹیاں قریب آکر رک جاتی ہیں۔ وہ کرسی کو ٹانگوں سے پیچھے کی طرف دھکیل کر اٹھی اور لپکتے پتا جی کے پاس پہنچی۔ اور پھر اس نے اپنے مطلب کی بات صاف صاف کہدی۔ جس کو وہ پہلے ہی سے جانتے تھے۔ کیونکہ اسکی ماں نے انہیں جتا دیا تھا اس کی منسوخات کو سنکر اس کے پتا جی نے کہا "خیر! تیری یہی مرضی ہے تو یہی سہی۔ میں نے تو سائیکل تیرے لئے صرف اس لئے خریدی تھی کہ تو اس سے آیا جایا کرےگی۔ کار سے جانے میں یہی ہوگا کہ مجھے ذرا سویرے چلنا پڑیگا۔ اور ذرا سویرے آنا پڑے گا۔ خیر! یہ کوئی بڑی بات نہیں۔"

دوسرے روز وہ اپنے پتا جی کے ساتھ سکول جانے کے لئے کار میں سوار ہوئی۔ اس کو اطمینان تھا کہ آج اس کو پہلے جیسے واقعات سے شاید ہی دو چار ہونا پڑے اور ان کی تلخ حقیقت کو انگیز کرنا پڑے۔ اس کی کار آگے بڑھتی جاتی تھی اور اس کو بہت سے پہچانے ہوئے اور بہت سے انجان چہرے دکھائی دیتے چلے جاتے تھے۔ لیکن موٹر کی تیزی کے سامنے کسی کی بھی ہمت نہ ہوئی تھی کہ کوئی اپنا مقصد حاصل بنانے کیلئے ذرا کچھ اور آگے بڑھتے پر اس کو ایک لڑکا سڑک پر کھڑا ہوا دکھائی دیا۔ جس نے اس کو دیکھتے ہی مسکرا کر اپنا ہاتھ اوپر کو اٹھا دیا۔ اور اس کے منہ سے ہوئی آواز نکلی۔

ایک ...!!!

انجن کی گھڑ گھڑاہٹ اور ہارن کی چیخوں کے ساتھ ہی اس کے پاس ہی بیٹھے ہوئے وکیل صاحب بھی اس کی آواز نہ سن سکے جو کسی مقدمے کے متعلق سوچ رہے تھے۔

اس کا نام ...... تھا اور لڑکے اس انٹی ٹیوٹ کے دسویں درجے میں پڑھتی تھی۔

اس افسانے کے لکھنے سے بہن حجاب صاحبہ کا مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو لڑکیاں سکول اور کالج جاتی ہیں ان کے ساتھ لڑکے راستے میں چھیڑ چھاڑ کرتے ہیں۔ انہوں نے اس مصیبت کا علاج یہ تجویز کیا ہے کہ لڑکیاں موٹروں میں بیٹھ کر سکول کالج جانے لگیں۔ مگر ایسا مہنگا علاج سب نہیں کر سکتے اگر وہ کوئی سستا علاج بتاتیں تو افسانہ زیادہ کامیاب رہتا۔ افسانہ میں ایک جگہ عبارت لکھ کر جس نے نقطے بنا دیئے ہیں وہ عبارت بے حجابانہ تھی۔ بہن حجاب کی شان سے گری ہوئی۔ بہنوں ہی کو نہیں بھائیوں کو بھی اس قسم کی عبارتیں نہیں لکھنی چاہئیں۔ جن لوگ کہنے لگیں کہ اسی چیز کو شہ دی جا رہی ہے جس کے خلاف جہاد کا دعوےٰ ہے۔

(زوار صدیقی)

گورکن

از حضرت احسان دانش

کر کے بستی سے کنارہ، تم نے بے خوف و خطر
گھر بنائے ہیں ہزاروں تربتوں کو توڑ کر

یہ جرائم کی دکانیں عبرتوں کے درمیاں
شہرِ خاموشاں میں ہنستی بولتی گمراہیاں

موت کی ہمسائیگی میں بے خطر جیتے ہو تم
مرنے والوں کے عزیزوں کا لہو پیتے ہو تم

قیمتاً دے دے کے مُردوں کو مقابر کی زمیں
ادعائے پاسبانی کس کو آئے گا یقیں

جانے کیا ہوگا تمہاری اِس شقاوت کا مآل
تم جو چلتے ہو تو چھلتی ہے زمیں کی نرم کھال

جب تمہارے سائے پڑتے ہیں بساطِ خاک پر
بول جاتی ہے حسیں ذرات کی نازک کمر

جی تمہارا ظلمتِ مرقد سے گھبراتا نہیں
روشنی کا دھندلا اثر نظر آتا نہیں

پڑھ نہیں سکتے مٹے کتبوں کی تحریروں کو تم
سن نہیں سکتے گزشتہ مُردوں کی تقریروں کو تم

ہے تمہاری آنکھ سے اوجھل وہ ہیبت کا طبق
رینگتے ڈھانچے جہاں رٹتے ہیں توبہ کا سبق

ہیں تمہارے کان ادبار کی آہٹ سے دور
زلزلے کی گونج سے لاشے کی غراہٹ سے دور

فردِ ہستی سے تمہاری اُڑ چکے فریاد و ہوش
بے ضیا سینوں میں ہیں سوکھی ہوئی روحیں خموش

حادثاتِ غم کی بوچھاڑوں سے تم واقف نہیں
موت کی خاموش چنگھاڑوں سے تم واقف نہیں

اخذ کر سکتے نہیں ہرگز تمہارے چشم و دل
ہڈیوں کی بڑبڑاہٹ سے رموزِ آب و گِل

میرے چشم و گوش پر ہیں یہ مناظر بے نقاب
اس زمیں کا ہر دریچہ ہے مقامِ احتساب

ہو رہی ہے ایک جانب نیکیوں پر گفتگو
آ رہی ہے اک طرف بگڑے ہوئے زخموں کی بو

آپ بیتی کہہ رہا ہے اِک طرف کوئی یتیم
جھانکتی ہے اک طرف ذرات سے روحِ جحیم

ایک آغوشِ لحد سے اٹھ رہی ہے برملا
مل کے سورج کے فسوں میں چاند کی ٹھنڈی ضیا

اک طرف کو خود بخود ہوتی ہے زمیں زیر و زبر
جس طرح لڑتے ہوئے مچھو کے نہنگوں کی کمر

رہ رہ کے اک طرف شاداب پھولوں کی مہک
اک طرف زیرِ زمیں گاڑی گزرنے کی دھمک

کاش تم ہو جاؤ راہِ زندگی سے باخبر
[illegible]

مشعلِ راہ

(از جناب نخشب جارچوی)

مجھے بھی وہ پرستارِ رُخِ زیبا سمجھتے ہیں • محبت سے [illegible] ہے اگر ایسا سمجھتے ہیں
محبت کی یہ حد بندی یہ مجبوری ارے توبہ کہ یہ بھی کہہ نہیں سکتے تمہیں ہم کیا سمجھتے ہیں
بغیرِ واسطہ یہ اجتنابِ خاص کیا معنی وہ ناواقف سے ہیں لیکن مرا منشا سمجھتے ہیں
یکایک کس لئے وہ مسکرائے کیوں جھکیں نظریں بھری محفل ہے لیکن یہ ہمیں تنہا سمجھتے ہیں
دلِ عجلت پسند اور اعتبارِ دوست کیا کہئے غمِ امروز وجہ وعدۂ فردا سمجھتے ہیں
تمہیں سب کچھ روا بیگانگی بھی بے نیازی بھی مگر وہ سادہ فطرت جو تمہیں اپنا سمجھتے ہیں
ستم کے بعد شرما کر یہاں تک ہو گئے بدظن کہ میں تو شکر ادا کرتا ہوں وہ شکوا سمجھتے ہیں

وہی محسوس کر سکتے ہیں لذت میرے شعروں کی
جو اے نخشب مذاقِ دیدۂ بینا سمجھتے ہیں

پردے میں جلوہ، جلوے میں پردا

(از جناب حامد اللہ افسر)

کس کس کو تو نے کیا کیا نہ بخشا ، بارِ الٰہا بارِ الٰہا
قدرت کا تیری ادنیٰ کرشمہ ایک ایک ذرہ ایک ایک دُنیا

ہر اک زباں پر تیرا فسانہ، ہر ایک لب پر تیرا ترانا
بیگانہ سب سے سب کا یگانہ ظاہر میں پردہ باطن میں جلوا

خلوت کے اندر محفل کے اندر، دریا کے اندر ساحل کے اندر
آنکھوں سے پردہ گھر دل کے اندر، ہر شے میں دیکھا ہر شے میں پایا

سوتے ہوؤں کو تو نے جگایا، روتے ہوؤں کو تو نے ہنسایا
کھوئے ہوؤں کو تو نے بلایا گرتے ہوؤں کو تو نے سنبھالا

خشکی کبھی ہے باراں کبھی ہے، مشکل کبھی ہے آساں کبھی ہے
ظاہر کبھی ہے پنہاں کبھی ہے، گھر گھر اندھیرا گھر گھر اُجالا

بے ساز بنکر یا ساز بنکر، خاموش بن کر آواز بن کر
ہر راز میں ہے ہمراز بن کر، خود راز ہوکر ہر راز کھولا

ظاہر میں کثرت باطن میں وحدت، ظاہر میں جلوت باطن میں خلوت
ظاہر میں رحمت باطن میں رحمت، پردے میں جلوا جلوے میں پردا

اقرار بن کر انکار بن کر، آساں بن کر دُشوار بن کر
رفتار بن کر گفتار بن کر، ہر رنگ میں ہے تو آشکارا

خود ہی مسافر خود ہی سفر ہے، خود ہی ہے منزل خود راہبر ہے
خود ہی اِدھر ہے خود ہی اُدھر ہے، تجھ تک گیا ہی ہر ایک رستا

خود ابتدا ہے خود انتہا ہے، خود مدعا ہے خود آسرا ہے
خود ہی اثر ہے خود ہی دُعا ہے، ہر ایک دِل کا تو ہے سہارا

فتنۂ معصوم

(حضرت میکشؔ اکبرآبادی)

ہے میرا رازِ جنوں ایک فتنۂ معصوم
ترا ہی ذکر ہے لیکن تجھے یہ کیا معلوم

کسے خبر کہ تو کس وقت باخبر ہو جائے
سرِ مژہ پہ رکھوں دل کی عرضِ بے مفہوم

ابھی چمن میں ترے خار ہیں نہ نکہتِ گل
ترا ستم بھی ہے محفوظ لطف بھی موہوم

ہے میری توبہ بھی قصدِ گناہ کی صورت
ترا گناہ بھی موہوم قصد بھی معصوم

حیات و موت ہے تفریحِ سادگی کو تری
مری حیات بھی افسردہ موت بھی مغموم

تجھے اس طرح سے تری غنچگی میں آمدِ گل
پسِ غبارِ شفق جیسے فوجِ ماہ و نجوم

کبھی ہیں دل میں وہ سادہ نگاہیاں تیری
نظر میں گھوم رہی ہے وہ شوخیٔ معصوم

تو ہی ہے درد تو دل کا علاج نامنظور
تو ہی دوا ہے تو دل کی شفا ہے نامعلوم

تری نگاہ میں اپنا مقام کیا ڈھونڈوں
نہیں ہے خود بھی مجھے اپنی حیثیت معلوم

معاف کر جو میں اظہارِ عشق کر نہ سکوں
نہیں ہیں راس مرے دل کو اس جہاں کے رسوم

ترا تپاک بھی ہے دل کی مصلحت کے خلاف
ترے نثار تو میکشؔ کی نظم سن کے نہ جھوم

شکر و شکایت

(از محترمہ نکہت نسیم صاحبہ)

شکریہ پرسشِ احوال کا لیکن اے دوست
...پرسشِ غم تو جراحت کے سوا کچھ بھی نہیں
...نے طرزِ عداوت کے سوا کچھ بھی نہیں
...دلچسپ اذیت کے سوا کچھ بھی نہیں
...ستم خیز عنایت کے سوا کچھ بھی نہیں
شکریہ پرسشِ احوال کا لیکن اے دوست

...کو معلوم ہے یہ غم ہے عنایت کس کی!
...آنسو ہیں یہ بخشی ہوئی دولت کس کی!
...نظروں سے برستی ہے محبت کس کی!
...ہونٹوں سے ٹپکتی ہے شکایت کس کی!
شکریہ پرسشِ احوال کا لیکن اے دوست

...عشق سے سرشار کیا تھا کس نے!
...اک خواب سے بیدار کیا تھا کس نے!
...اپنے سے خبردار کیا تھا کس نے!
...ہر چیز سے بیزار کیا تھا کس نے!
شکریہ پرسشِ احوال کا لیکن اے دوست

...ئے ہوئے تاروں سے تبسم لے کر
[illegible]

کون آیا تھا فرشتوں کا ترنم لے کر!
اشکِ غم کس نے دیئے مجکو تبسم لے کر!
شکریہ پرسشِ احوال کا لیکن اے دوست

اِن چمکتے ہوئے تاروں کو کہاں لے جاؤں
چاند کے نرم اِشاروں کو کہاں لے جاؤں
نکہتِ گل کو، بہاروں کو کہاں لے جاؤں
دل کے ٹوٹے ہوئے تاروں کو کہاں لے جاؤں
شکریہ پرسشِ احوال کا لیکن اے دوست

عہدِ رفتہ کو بُھلاؤں تو بُھلاؤں کیونکر
اِک حقیقت کو میں افسانہ بناؤں کیونکر
شمع جو تو نے جلائی ہے بُجھاؤں کیونکر
تیری رودادِ جفا تجھ کو سُناؤں کیونکر
شکریہ پرسشِ احوال کا لیکن اے دوست

حالِ دل ایسا ہے کچھ جس کو سُنائے نہ بنے
داغِ دل چاہوں دکھانا تو دکھائے نہ بنے
شعلۂ آتشِ غم دل میں دبائے نہ بنے
آگ بھی دل کو لگاؤں تو لگائے نہ بنے
شکریہ پرسشِ احوال کا لیکن اے دوست

فلمی خبریں

(۱) نیو تھیٹرز

نیو تھیٹرز کی جدید تصویر "میری بہن" کی نمائش جگت میں ہو رہی ہے۔ اسکی کہانی "ڈاپس" کے شہرت یافتہ بنوئے چٹرجی کی لکھی ہوئی ہے جسکو ہدایت کار ہیم چندر نے بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح ایک بھائی اپنی بہن کیلئے اپنا چین آرام اور دولت کو نچھاور کر دیتا ہے۔ اور اسکے لئے بڑی سے بڑی مصیبت کو بھی برداشت کرتا ہے۔ ہندوستان کے سب سے بڑے موسیقار سہگل نے اپنے نغمات سے اس میں روح پھونک دی ہے موسیقی کی ہدایت کاری پنکج ملک کی ہے۔ علاوہ ازیں دو نئے چہرے اختر جہاں اور سمترا پیش کئے گئے ہیں۔ گویہ ان کی اداکاری کا پہلا نمونہ ہے۔ مگر انہوں نے اس خوبی سے اپنے کردار کو ادا کیا ہے کہ بے ساختہ منہ سے واہ نکلتی ہے۔ اسکے علاوہ نواب۔ چندر ابھا۔ شنکن اور سکتی دھارا کے کردار بھی اپنی جگہ موزوں ہیں ؛

(۲) سنٹرل سٹوڈیوز

سنٹرل سٹوڈیوز کا پہلا اصلاحی فلم "پرکھ" نہایت کامیابی کے ساتھ نرواسنیما دہلی میں چل رہا ہے۔ اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک طوائف کی لڑکی میں شریفانہ فطرت پا سکتی ہے۔ اور ماں بننے کے بعد اپنی تمام مسرتیں اپنے بیٹے کی زندگی کیلئے قربان کر سکتی ہے۔ مہتاب کی اداکاری بلندیوں پر ہے۔ ہدایت کاری ہر دلعزیز ڈائرکٹر سہراب مودی کی ہے۔ سہراب مودی فلمی دنیا میں کافی وسیع اور مدتوں کا تجربہ رکھتے ہیں۔ ان کی حیثیت ایک کہنہ مشق اُستاد کی سی ہے۔ "پرکھ" پیش کرنے کے بعد انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ واقعی اُستاد ہیں۔ اداکاروں میں شاہ نواز۔ یعقوب۔ کوشلیا۔ بلونت سنگھ۔ صادق علی۔ پرتیما دیوی کے نام شامل ہیں۔ گانے علامہ آرزو لکھنوی اور کہانی پنڈت سدرشن کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اور موسیقی ہونہار خورشید انور کی ہے ؛

(۳) جینت دیسائی پروڈکشنز

جینت دیسائی کا نیا تعلیمی شاہکار "للکار" موتی ٹاکیز میں عوام کی کشش کا باعث بنا ہوا ہے۔ اس میں رمولا تلوار پروڈکشنز کی اجازت سے جلوہ گر ہوئی ہے۔ رمولا کی اداکاری بدستور شائقین کو دیوانہ بنا رہی ہے۔ دیہات کی ایک شوخ و شریر اَن پڑھ لڑکی پڑھ لکھکر "پڑھو گے لکھو گے بنو گے نواب" کے خواب کی تعبیر بنی ہے۔ "للکار" جہالت کے خلاف جہاد ہے۔ مزاح اور رومان میں ڈوبی کہانی ہے۔ سینیریو اور مکالمے شاہد لطیف اور بے۔ ایس کشیپ کے ہیں۔ ہدایت کاری کے فرائض جینت دیسائی نے ادا کئے ہیں۔ اداکاروں میں انجمالی۔ مایا بنرجی۔ مبارک اور سید احمد کے نام قابل ذکر ہیں ؛

(۴) پربھات فلم کمپنی

"رام شاستری" ایک ایسے نیک صدیا ستدان کی تصویر حیات ہے جس نے بچپن میں بھی چاندی کے ایک ٹکڑے کی خاطر جھوٹ نہ بولا۔ اور اپنی محنت اور لیاقت سے منصف اعلیٰ کے درجہ تک پہنچا۔ جسنے ظلم اور بیدردی کے خلاف اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر آواز بلند کی۔ اور دُنیا کے سامنے سچائی کو پیش کیا۔ رام شاستری کی زندگی تاریخ میں سنہری الفاظ میں لکھے جانے کے قابل ہے۔ تاریخ کو فخر حاصل ہے کہ ایسے ایسے انسان بھی دُنیا میں پیدا ہو چکے ہیں۔ رام شاستری کے بچپن کا پارٹ اننت مراٹھے نے نہایت خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے۔ اداکاروں میں جاگیردار۔ مینا کشی۔ بے بی شکنتلا۔ للتا پوار کی اداکاری قابل داد ہے۔ فلم کی زبان قدرے ثقیل ہے اگر کارکنان کمپنی چاہتے تو اسے ذرا سادہ کر سکتے تھے۔

(۵) فلمستان لمیٹڈ

کا پہلا شاہکار "چل چل رے نوجوان" مدتوں کے انتظار کے بعد جوبلی ٹاکیز دہلی میں شروع ہوا ہے۔ پری چہرہ نسیم ایک عرصہ کے بعد پردہ فلم پر آئی ہے۔ تصویر کی کہانی اگر دیکھا جائے تو کچھ نہیں۔ مگر کہنہ مشق کمرجی نے جگہ جگہ ایسے عمدہ ٹچ دیئے ہیں کہ دیکھنے والا بغیر تعریف کئے نہیں رہ سکتا۔ اشوک کمار۔ جگدیش سیٹھی۔ موتی۔ رفیق غزنوی۔ یاگنیک اور وی، ایچ، دیسائی کی اداکاری قابل داد ہے۔ موسیقی ماسٹر غلام حیدر کی ہے۔ سینیریو، گانے اور مکالمے شاہد لطیف، پردیپ اور سعادت حسن منٹو کے ہیں۔ موسیقی، گانے اور مکالمے اپنی اپنی جگہ موزوں ہیں۔ گانوں میں "بھارت کے نوجوانو آؤ ایک راہ پر" والا گانا بہت پسند کیا گیا ہے۔

(۶) راج کمل کلا مندر

مسٹر شانتا رام نہایت تجربہ کار اور فلم ٹکنیک میں کافی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی ہر تصویر ایک معیاری تصویر ہوتی ہے اور یہی اُمید ان کی آنیوالی تصویر "پربت پہ اپنا ڈیرا" سے وابستہ کی جا سکتی ہے۔ اس سے پیشتر آپ اپنی کمپنی کے تیار کئے ہوئے فلم "شکنتلا" اور "مالی" پیش کر چکے ہیں۔ "پربت پہ اپنا ڈیرا" شانتا رام نے بمبئی میں گذشتہ ریکارڈ مات کر دیئے ہیں۔ ہدایت کاری وی شانتا رام کی اپنی ہے۔ اداکاروں میں ونمالا۔ الہاس کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "پربت پہ اپنا ڈیرا" ...

... کا آخری پروگرام ہے۔

(۷) ہنروا موودی ٹون

کا شہ شاہکار ”ٹھیروں کا سوداگر“ جو ۲۳ فروری سے کھنہ ٹاکیز دہلی میں ریلیز ہو جائیگا جذبات رومان اور موسیقی سے بھرپور فلم ہے۔ اس سے پیشتر بمبئی اور دیگر مقامات میں تہلکہ مچا چکا ہے۔ ”بلاؤ“ جیلہ اور سکندر کی شہرت یافتہ شیلا ایک عجیب رنگ میں جلوہ پر نمودار ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ مینا۔ اختر۔ اور پرتیں شرمی کے نام اس تصویر میں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ ایک شہزادے اور گاؤں کی ایک غریب لڑکی کا رومان ہے۔ جسے انداز سے پیش کیا گیا ہے۔ ہدایت کاری شوری ردلتوی کی ہے کہانی گانے مکالمے پنڈت سدرشن کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔

(۸) پنچولی آرٹ

شمالی ہندوستان کا یہ فلمی ادارہ آج تمام ہندوستان کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یہ کمپنی اس سے پیشتر خاندان۔ خزانچی زمیندار اور پونجی جیسی کامیاب تصاویر پیش کر چکی ہے۔ اب ان کی نئی تصویر ”شیریں فرہاد“ کا بے چینی سے انتظار کیا جا رہا ہے۔ ”شیریں فرہاد“ دنیا کا مشہور ترین رومان ہے کمپنی نے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے اُس زمانے کے ماحول کے مطابق سین سینریاں اور لباس تیار کیا ہے۔ فلم بندی کے وقت مناظر دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ”شیریں فرہاد“ آرٹ کا بہترین نمونہ ہوگا۔ اور پنچولی کی ایک یادگار تصویر ہوگی۔ فلم کی کہانی پوری صداقت کے ساتھ پیش کرنے کے لئے تمام مطلوبہ لٹریچر کی ریسرچ کی گئی ہے۔ اور اس دور کے شاہانہ ماحول کو پیش کرنے کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ اداکاری کی فہرست میں راگنی۔ جینت۔ غلام محمد۔ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہدایت کاری پرہلاد دت اور آرٹ ڈائرکٹر مسٹر این ایم خواجہ ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ”شیریں فرہاد“ بہترین تصویر ہوگی۔

اس کے علاوہ اس کمپنی کی ایک اور تصویر ”کیسے کہوں“ نہایت سُرعت کے ساتھ تیار ہو رہی ہے۔ اس فلم میں سرحد کے دلچسپ عجیب و غریب اور ولولہ انگیز واقعات نہایت اثر آفرینی سے پیش کئے گئے ہیں۔ اس میں جاگیردار راگنی۔ نجم الحسن۔ اختری۔ پران۔ درگا موٹا اور جی، این بٹ نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھلائے ہیں۔ اس کی موسیقی ماسٹر گوبند رام ——— اور ہدایت کاری موتی بی، گڈوانی ہے۔

(۹) محبوب پروڈکشنز

یہ کمپنی اس سے پیشتر ”نجمہ“ اور ”تقدیر“ پیش کر چکی ہے۔ اب ان کی زیر تکمیل تصویر ”ہمایوں“ کا نہایت بے چینی سے انتظار کیا جا رہا ہے۔ ڈائرکٹر محبوب بڑی محنت اور کوشش کے ساتھ اس کی تکمیل میں مصروف ہیں۔ آمدہ اطلاعات سے پتہ چلتا ہے کہ تصویر کی اندرونی شوٹنگ ختم ہو چکی ہے۔ اب بیرونی مناظر فلمبند کرنے ارباب کمپنی جے پور گئے ہوگئے ہیں۔ تصویر تقریباً تین چوتھائی تیار ہو چکی ہے۔ موسیقی ہندوستان کے بہترین موسیقار ماسٹر غلام حیدر اور عکاسی مشہور کیمرہ مین فریدوں ایرانی کے سپرد ہے۔ تصویر کی کہانی آغا جانی کاشمیری کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اداکاروں میں چیدہ ستارے اشوک کمار۔ نرگس۔ وینا۔ چندر موہن۔ شاہ نواز اور کے، این سنگھ کے نام خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ آمدہ اطلاعات سے یہی اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ ”ہمایوں“ اس سال کی بہترین تصویر ہوگی۔

(۱۰) سنٹرل سٹوڈیوز

کا پہلا شاہکار ”برکھا“ ریلیز ہو کر عوام سے خراج تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اب یہی کمپنی ایک نیا فلم ”ایک دن کا سلطان“ تیار کر رہی ہے۔ اسکی ہدایت کاری بھی کہنہ مشق سہراب مودی خود ہی کریں گے۔ اس فلم کی کہانی اُردو کے مشہور افسانہ نگار پنڈت سدرشن کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ موسیقی خورشید انور کی ہے۔ مہتاب بطور ہیروئن کام کریں گی۔ کمپنی اسکی تیاری پر بے دریغ روپیہ صرف کر رہی ہے ابھی حال ہی میں مس مہتاب جے پور سے بیش قیمت ہیرے جواہرات اور لباس خرید کر لے گئی ہیں۔ دہلی سٹیشن پر انہوں نے نمائندہ پریس سے بیان دیتے ہوئے کہا کہ جو زیورات اور لباس جے پور سے خرید کر لائی ہیں پہنکر سنٹرل سٹوڈیوز کے آنے والے شاہکار ”ایک دن کا سلطان“ میں جلوہ گر ہونگی۔

(۱۱) شوری پکچرز

پروڈیوسر ڈائرکٹر روپ، کے، شوری ایک تاریخی فلم ”شالیمار“ تیار کر رہے ہیں۔ اب تک جتنی بھی تاریخی تصاویر مثلاً ”پکار۔ سکندر۔ رام شاستری وغیرہ تیار ہوئی ہیں۔ یہ تصویر ان سے بالکل انوکھی ہے۔ اس تصویر کو لاہور کے شالیمار باغ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ یہ پہلا موقعہ ہے کہ ایک تاریخی تصویر عوام کے نقطۂ نظر کے مطابق تیار کی جا رہی ہے جس کے لئے ہم ارباب کمپنی کو مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ کہانی پنجاب کے مشہور ڈرامہ نویس مسٹر آئی، ایس جوہر ایم، اے۔ ایل ایل، بی نے لکھی ہے۔ موسیقی ماسٹر گوبند رام کے سپرد ہے اور اداکاروں میں چندر موہن۔ بیگم پارہ۔ پرمیلا۔ منورما۔ ہری شیودھانی۔ الناصر۔ مجنوں کے نام شامل ہیں۔

اس کمپنی کا نغمات سے بھرپور۔ ملکی کی یاد تازہ کرنے والا فلم ”کوئل“ نہایت کامیابی کے ساتھ ... چل رہا ہے۔ کوئل کی زبان گو پنجابی ہے مگر نہایت سادہ جسے ہر شخص بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اس میں منورما۔ ستیش۔ سکسینہ اور مجنوں نے کام کیا ہے۔

کوئی بے احتیاطی سے بولتا ہے



اور دشمن نہایت ہوشیاری سے چھوٹی چھوٹی باتیں جوڑ کر
اہم معلومات حاصل کر لیتا ہے

دوسرے ہفتے یا دوسرے مہینے اِن چھوٹے
چھوٹے لفظوں سے ہندُستان کو ہزاروں
کی مالیت کی شہری رسد کا نقصان ہوجاتا
ہے۔ بلکہ جانوں کا بھی

دشمن کے جاسوسوں کی ہوشیاری یا استقلال کو کسی حالت میں معمولی نہ سمجھئے۔ وہ چھوٹے چھوٹے اشاروں کو جانچتے اور کھوج لگاتے رہتے ہیں وہ نہایت محنت سے چھوٹی چھوٹی باتوں کو جوڑتے ہیں جیسے دلی میں چپکے سے سُنی ہوئی ٹیلیفون کی گفتگو، بمبئی کے کسی ریلوے سٹیشن پر پایا ہوا ساختہ یا کلکتے کے کسی چائے خانے میں اتفاقیہ سُنا ہوا فقرہ۔ ان سب کو ملانے سے ممکن ہے ہر ایک کسی فوجی نقل وحرکت یا کراچی سے کسی جہازی قافلہ کی روانگی کا پتہ چل جائے۔

ہوشیار رہیئے دشمن کے کان بڑے تیز ہیں !!

تہیہ کیجئے کہ ایسی بات بالکل نہیں بولیں گے جس سے دشمن کو کوئی مدد مل سکے۔ فوجوں کی نقل وحرکت۔ اسلحہ جہازوں کی آمدورفت کے متعلق کبھی گفتگو نہ کیجئے





اِس طرح آپ جہازوں اور جہازیوں کی جانوں کو بچا سکتے ہیں۔ آپ ہمارے ذرائع رسد و رسائل کے محافظ بن سکتے ہیں اور شہری رسد کے سلامتی سے پہنچنے میں مدد دے سکتے ہیں

قومی جنگی محاذ نے شائع کیا


MY SISTER
SAIGAL

پربت پہ اپنا ڈیرا

جس نے

ناولٹی بمبئی میں دھوم مچا رکھی ہے

پروڈیوسر ڈائرکٹر: — وی شانتا رام

— اداکاران —

ونمالا — الہاس

میجسٹک سنیما

کا آئندہ پروگرام

جاری کردہ: جنرل ٹاکیز لمیٹڈ ۔ دہلی، لاہور و کراچی

شوری پکچرز کی تاریخی پیشکش

"منگنی" اور "کوئل" کے خالق پیش کرتے ہیں

شالیمار

کہانی: — آئی، ایس جوہر ایم اے ۔ ایل ایل بی

موسیقی: — ماسٹر گوبند رام

ہدایت کار: — روپ ۔ کے شوری

— اداکاران —

بیگم پارہ ۔ چندر موہن ۔ پرمیلا

منورما ۔ ہری شو دسانی ۔ الناصر اور

مجنوں

جاری کردہ: آر ۔ ایس چنن مل اندر کمار ۔ دہلی ۔ لاہور



نوشلیا فلم ''پرکھ'' میں



''کھڑیں نوبار'' میں راگنی اور جینت



''پرکھ'' فلم کا ایک منظر



فلم ''شفیق پیہن'' میں سنگیتا اور بیگم

THE ADEEB

DELHI

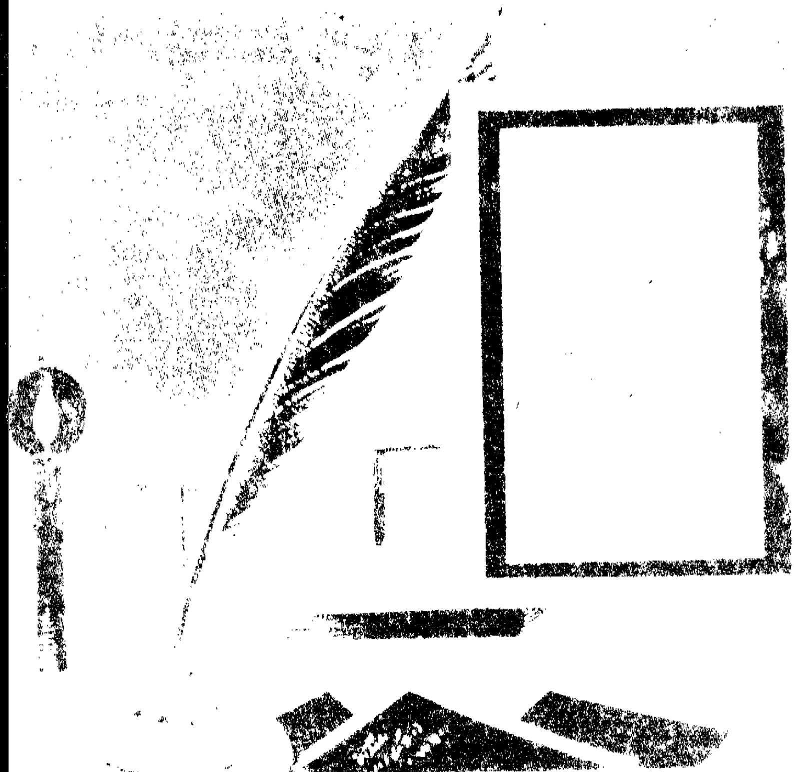
1. It is a purely literary monthly Magazine of high standing.
2. It is published regularly on the tenth of each month.
3. Annual subscription of the Adeeb is Rs. 10/- only, single copy Rupee one.
4. The Adeeb is posted with great care but if you don't get a copy by the 15th. please write to the office at once. If available, an extra copy will be sent to you again. Complaints received after the 18th will not be attended to.
5. All communications should be addressed to the Editor.
6. Free or sample copies of the Adeeb are not sent. For a sample copy always send the necessary stamps in advance.
7. Contributions not published in the Adeeb can be returned on receipt of the necessary stamps.
8. Always send extra stamps for a reply.
9. The Adeeb is not issued for less than a year.

Printed at [illegible] Printing Press, Chandni Chowk, Delhi
[illegible] M. I. Wahidi & Published from the office of
the Adeeb, [illegible] Mahal Delhi

THE ADEEB DELHI

ماہنامہ ادیب

(دہلی)





فلم ''شالیمار'' کا ایک سین



چندر موہن ''شالیمار'' میں





[illegible] روپے علاوہ محصول — قیمت فی کاپی:- ایک روپیہ علاوہ محصول

ادیب

ایڈیٹرز:-
سید محمد ارتضیٰ واحدی — فصیح الدین احمد ایم اے — آنسہ انجمہ تصدق ایم اے، بی ٹی

جلد ۸ | مارچ ۱۹۴۵ء | نمبر ۵

فہرست مضامین

نئی کتابیں

(از فصیح الدین احمد)

(۱) پنکھڑیاں از محترمہ شیریں۔ شائع کردہ کتب خانہ علم و ادب دہلی معہ سرورق گردپوش۔ صفحات ۱۹۲۔ قیمت مجلد ایک روپیہ بلا جلد

شیریں کا نام ادبی دنیا میں غیر معروف نہیں۔ ان کے افسانے ملک کے بلند پایہ رسائل میں شائع ہو کر تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں بارہ افسانے شامل ہیں اور ہر افسانہ اپنا جداگانہ رنگ رکھتا ہے۔ لیکن سب کی جان ایک ہی چیز ہے۔ یعنی رومان" بعض لوگوں کے نزدیک رومان افسانہ کا دوسرا نام ہے۔ لیکن میں انگریزی لفظ Romance کا ترجمہ اگر کرونگا۔ رومان میں افسانے کے بہت سے جزو ہو سکتے ہیں۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس کی حدود اتنی غیر متناہی ہیں کہ اس میں ہر چیز سما سکتی ہے۔ لیکن رومان کا لفظ صرف عشق و محبت کی کہانیوں اور ہجر اور وصل کی داستانوں تک محدود ہونا چاہئیے۔ مگر اس افسانہ کی جس کا دارو مدار صرف رومان پر رکھا جائے خوبی یہ ہے کہ "زہر عشق" بن کر نہ رہ جائے بلکہ پڑھنے والوں کے دل اور دماغ پر اس طرح مسلط ہوتا چلا جائے کہ وہ تخیلی پتلوں میں آہستہ آہستہ جان پڑتی نظر آنے لگے۔ اور پڑھنے والا غیر ارادی طور پر ان کی حرکات و سکنات، ان کی گفتگو، ان کے لطیف احساسات اور جذبات، ان کے بحث و مباحثہ اور ان کی زندگی کی الجھنوں کو ان کا "تمیزات" (Second) بن کر دیکھنے، سمجھنے اور محسوس کرنے لگے۔ یہ تمام باتیں آپ کو "پنکھڑیوں" میں ملیں گی۔

افسانوں کی مناسبت کے اعتبار سے اس مجموعہ کا نام پنکھڑیوں سے شاید ہی بہتر ہو سکتا تھا۔

ان افسانوں کے کردار سب کے سب مہذب نظر آتے ہیں۔ وہ نیچے طبقے کے لوگ نہیں۔ بلکہ اوسط درجے کے مرد اور عورت ہیں۔ مصنفہ کا زندگی کا مطالعہ پوری وسعت کے ساتھ ان کرداران میں نظر آتا ہے۔

آخر میں ان کی اس دلکش طرز تحریر کا تعارف خود ان کے الفاظ ناظرین سے کرتے ہیں۔ یہ چند فقرے شیریں نے اپنے آخری افسانے "نیلوفر" میں اپنے افسانے کی ہیروئن کیلئے استعمال کئے ہیں۔ دیکھئے ہیں:-

" نیلوفر نے اپنی حیات کو تلخ معاشی زندگی کی ملازمت میں وقف کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اس کی غیر معمولی ذہانت اور ادبی ذوق مضمون نگاری کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کے ہر گوشے میں اس کے نام کی دھوم مچ گئی۔ مگر اسکی غیر فانی شہرت کا سبب اس کے افسانے تھے جو دلاویز اسلوب بیان اور دل نشین طرز تحریر کے ساتھ ساتھ کسی درد نہاں کی پیکار، لذت آگیں چاشنی اور گھٹے ہوئے جذبات کے دھندلے سے عکس کا ترجمہ ہوتے تھے۔ جو پڑھنے والے کو گویا یہ بھی میرے دل میں ہے" کے مصداق بنا دیتے تھے۔"

ہمیں یقین ہے کہ محترمہ شیریں کو دنیائے ادب ملک کے بہترین افسانہ نویسوں کی صف اول میں جگہ دیگی جس کی وہ بجا طور پر مستحق ثابت ہو چکی ہیں۔

(۲) نئی دنیا از جناب ڈاکٹر موہن سنگھ صاحب دیوانہ۔ پروفیسر اورینٹل کالج لاہور۔

ڈاکٹر صاحب کے کلام کا مجموعہ ہر نظم، غزل یا گیت کی آمد کے سن و سال کے ساتھ شائع ہوا ہے۔ اردو شاعری میں واقعی ڈاکٹر صاحب نے ایک نئی دنیا آباد کی ہے۔ عموماً ہر شاعر کسی خاص صنف سخن میں دلچسپی لیتا ہے مگر موصوف کی شاعری گوناگوں واقع ہوئی ہے۔ عشق مجازی سے لیکر عشق حقیقی تک تمام مسائل پر طبع آزمائی فرمائی ہے۔ پھر دنیا اور دنیا والوں کو بھی خالی نہیں چھوڑا۔ ڈاکٹر صاحب کا کلام ایک مجذوب کا کلام معلوم ہوتا ہے۔ ناظرین کے ملاحظے کے لئے ڈاکٹر صاحب کی ایک نظم کو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

ظاہر باطن ایک نہیں جس کا وہ میری محبوب نہیں

کیا کاجل ہے کیا ساڑی ہے کیا بالوں کی بناوٹ ہے
ٹھنڈی سڑک پہ جشن بداماں پریوں کا شام کو جھرمٹ ہے
محض سجاوٹ کے بدلے دل بیچنا چنداں خوب نہیں
ظاہر باطن ایک نہیں جس کا وہ میری محبوب نہیں
ساڑی بھڑکیلی ہے مانا قلب و دماغ بھی روشن ہے
دامن عصمت بھی بے داغ ہے گو شفاف ترا تن ہے
پوڈر اور سرخی کے نیچے کیسے ہیں لب کیسے ہیں گال
چال تیری مستانہ کیسی دل کی بھی ہے مستانہ چال
ذہنیں ہیں بیچا پیچ کہیں دل بھی تیرا پیچ پیچ نہ ہو
وعدوں کے مانند تیرا تخیل و تصور ہیچ نہ ہو
تیری نگاہیں آوارہ ہیں طبع کہیں آوارہ نہ ہو
اے نظارہ فردوس ہے راضی تو اک میری ہونے کو
قبضہ واحد چاہتا ہوں تیرے فردوس خوبی پر
استحقاق مکمل حاصل ہو تیری محبوبی پر
میں ہی چھوؤں اور میں ہی چوموں میں ہی سونگھوں میں ہی سنوں
تعریف و توصیف کا تانا بانا تیرے گرد بُنوں
میرا نیاز ہو تیرا ناز ہو جلوت میں بھی خلوت ہو
یہ جو نہ ہو منظور تو جا۔ دُنیا میں تیری دُرگت ہو

(۳) شیریں از جناب قیسی رام پوری۔ صفحات ۸۶۔ مجلد شائع کردہ ہندوستانی پبلشرز دہلی۔

قیسی صاحب کی افسانہ نویسی پورے عروج پر ہے بشکل سے زاہد خشک نظر آتے ہیں مگر معلوم نہیں اتنی افسانویت ان میں کہاں سے آگئی ہے۔ بہت افسانے لکھتے ہیں اور خوب لکھتے ہیں۔ افسانہ کی خصوصیات سے بخوبی واقف ہیں۔ اسی لئے ان کے افسانوں میں اس قدر جاذبیت ہوتی ہے۔

زیر نظر کتاب ناروے کے مشہور ناولسٹ ہنرک ابسن کے ایک افسانہ کا ترجمہ ہے جسے ہندوستانی رنگ و روپ میں خوبی سے ڈھالا گیا ہے۔

ایک بیوی اپنے شوہر کے علاج کے لئے اس کے ایک ماتحت سے روپیہ قرض لیتی ہے۔ کچھ عرصہ بعد شوہر تندرست ہو جاتا ہے اور اُسے بنک کی نظامت کے فرائض سپرد کر دیئے جاتے ہیں۔ خاتون کی ایک بیوہ سہیلی مدت کے بعد ملنے آتی ہے۔ شیریں کی سفارش پر اسکا شوہر اسے بنک میں ملازم رکھنے کو تیار ہو جاتا ہے لیکن اسی ماتحت کلرک کو جس سے شیریں نے روپیہ قرض لیا تھا، نوکری سے برطرفی کا نوٹس دیدیا جاتا ہے۔ شیریں نے روپیہ حاصل کرتے وقت شوہر کی محبت میں اندھی ہو کر دستاویز پر اپنے والد کے جعلی دستخط کر دیئے تھے۔ حالانکہ اسکا باپ دستاویز کی تاریخ سے چند ماہ پیشتر فوت ہو چکا تھا۔ بنک کا کلرک شیریں سے روپے کا مطالبہ کرتا ہے اور یہ بھی ڈراتا ہے کہ اگر اُسے برطرف کیا گیا تو اُسے جعلی دستاویز بنانے کے سلسلے میں عدالت میں جانا پڑیگا۔ اتفاق سے شیریں کی سہیلی اور بنک کے کلرک میں کسی زمانہ میں معاشقہ رہ چکا تھا۔ مگر چند وجوہات سے مجبور ہو کر دونوں کی شادی نہ ہو سکی تھی۔ چنانچہ شیریں کی سہیلی اپنے دیرینہ دوست سے شادی کر لیتی ہے تاکہ شیریں کی ازدواجی زندگی میں کوئی فتنہ پیدا نہ ہو۔ مگر کلرک اس اثنا میں ایک خط شیریں کے شوہر کو لکھ چکتا ہے۔ شیریں کا شوہر اپنی عزت اور ناموس کے خیال سے نہایت برافروختہ ہوتا ہے۔ اُسے یہ نہیں سمجھائی دیتا کہ شیریں نے اگرچہ ایک بڑا ارتکاب جرم کیا تھا مگر اسکی حقیقی وجہ خود اسکی زندگی اور موت کا سوال تھا۔ چنانچہ وہ شیریں کو فوراً گھر سے نکل جانے کا حکم دیتا ہے۔ شیریں ششدر رہ جاتی ہے۔ ابھی تک وہ خاوند کو اپنی دُنیا سمجھتی تھی۔ مگر یہ سنکر کہ اس کا سایہ بھی اسکی اولاد کے لئے سم قاتل ثابت ہوگا، شوہر کی بیوفائی اور طوطا چشمی اُسے گھائل کر دیتی ہے۔ اسی اثنا میں وہ دستاویز بھی شیریں کی سہیلی کی طرف سے اُسے مل جاتی ہے۔ اور اُس کے خاوند کا غصہ فرو ہو جاتا ہے۔ مگر اب شیریں کی باری آتی ہے اور وہ ایسے خود غرض شخص کے ساتھ ایک منٹ بھی رہنا گوارا نہیں کرتی۔ جس کے لئے اُس نے خود کو جوکھوں میں ڈالا تھا۔ اسکے شوہر نے اُس کے احساسات اور جذبات کی قدر نہ کی جس کے ماتحت اُس نے یہ فعل کیا تھا۔ اُسے اُمید تھی کہ دُنیا کا کوئی ہیبت ناک واقعہ بھی اُس کے شوہر کی محبت کو خفیف سا صدمہ نہ پہنچا سکے گا۔ اسکی خوددلی اسکی حائل نہ ہو سکی کہ اسکے شوہر نے صرف ذاتی عزت اور ناموس کے خیال سے اسے یک لخت گھر سے نکل جانے کا حکم دیدیا تھا۔ اب وہ اُسکے ساتھ رہنے کیلئے تیار نہ تھی۔ چنانچہ شوہر کی التجاؤں کے باوجود وہ بے باکانہ گھر سے نکل جاتی ہے۔

ترجمہ بہت کامیابی کے ساتھ کیا گیا ہے۔

(۴) ہیر رانجھا از جناب ایم اسلم صاحب۔ صفحات ۱۴۷ مجلد مع گرد پوش۔ شائع کردہ کتب خانہ دارالبلاغ۔ محمد نگر میو روڈ۔ لاہور۔ قیمت دو روپے۔

اسلم صاحب کی تصنیفات کا شمار اب ایک سو پچیس تک پہنچ گیا ہے۔ افسانہ نویسی اور ناول نویسی اب ان کی ملکیت بن گئی ہے۔

پنجاب کی مشہور داستان عشق ہے۔ جسے سید وارث علی شاہ صاحب نے بارہویں سن ہجری میں ۱۱۸۰ھ پنجابی زبان میں تصنیف کیا۔ اسکی مقبولیت پنجاب کے گاؤں گاؤں میں ہوگئی۔ اور ہر جگہ لوگ ان کی کتاب ہیر رانجھا کے گیت گانے لگے۔

اسلم صاحب نے اس منظوم کتاب کا اُردو میں ترجمہ کرکے اُردو ادب میں گراں مایہ اضافہ کیا ہے۔ کتاب کا اصل پنجابی ہونا لازمی تھا۔ مگر اس کی زبان اسلم صاحب کی ٹکسالی زبان۔

(۵) عالم آشوب از جناب علامہ سیماب اکبر آبادی۔ صفحات ۲۲۸ قیمت ۴ؔ۔ شائع کردہ۔ قصر الادب آگرہ۔

کتاب کے تعارف میں چند سطریں سرورق پر شائع ہوئی ہیں جن کا مضمون یہ ہے۔

"نفسیات جنگ عالمگیر اور واقعات دورِ حاضرہ پر تین سو سے زیادہ اشاراتی اور تاریخی رباعیاں اواخر فی سنہ ۱۹۴۰ء سے اواخر دسمبر سنہ ۱۹۴۳ء تک"

زیرِ نظر مجموعۂ رباعیات بہت فکر و اہتمام سے شائع کیا گیا ہے کاغذ، چھپائی، ترتیب ہر چیز محمود قسم کی پائی جاتی ہے۔

علامہ سیماب کی شاعری سے کون واقف نہیں۔ انہیں جو عبور ہر صنف شاعری پر ہے وہ شاید ہی کسی دوسرے شاعر کو حاصل ہوگا۔ غزلیات منظومات اور رباعیات ان کے خاص مرکوز توجہ رہے ہیں۔ غزلیات وہ اب بھی کہتے ہیں مگر غزل اور جوانی کا چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ منظومات میں غیر معمولی پختگی اور فن کاری موجود ہے۔ لیکن ان کی شاعری کا تیسرا دور (رباعیات) ان سب پر بازی لے گیا ہے ــــ ان کی رباعیات اس وقت عروج کمال پر ہیں۔

تین سال کے واقعات عالم کو رباعیات کی شکل میں پیش کر دینا سیماب صاحب ہی کا کام تھا۔

(۶) گمنام خطوط از جناب سید محمود حسن صاحب کاظمی فراق صفحات ۱۶۴۔ شائع کردہ ہندستانی پبلشرز دلی۔ قیمت ۱۲؍

یہ ایک دلچسپ افسانہ ہے جسے خطوط کی شکل میں شائع کیا گیا ہے ایک حساس لڑکی کے احساسات کو کچل کر اس کے عزیز اس کی شادی دوسری جگہ کر دیتے ہیں۔ منکوحہ کے جسم پر فتح پائی جاتی ہے۔ مگر اسکی روح اپنے محبوب کے لئے برابر سرگرداں رہتی ہے۔ اور آپس میں نامہ و پیغام کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ آخر [illegible] مگر مصنف اسے معیوب سمجھ کر [illegible] سے مجبور ہو کر خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تا اینکہ دونوں ایک ہی وقت میں اس جہان سے رخصت ہوتے ہیں۔ اور بقول فراق صاحب کے

ناکام محبت کی دنیا ہی نرالی تھی
حسرت کا مرقع ہے افسانے کا افسانہ

(۷) نئی اُمنگیں مرتبہ جناب پرشوتم سنگھ صاحب [illegible]۔ شائع کردہ نیا کتاب گھر۔ اُردو بازار دلی قیمت دو روپے چار آنے ۲؍۴

زیرِ نظر مجموعے میں اختر، احمد ندیم قاسمی، الطاف مشہدی، جاں نثار اختر، فراق، فیض، مجاز، جوش، سلام وغیرہ کی نظمیں شامل ہیں۔ یہ لوگ اُردو ادب میں دورِ حاضرہ کے علم بردار سمجھے جاتے ہیں۔ زمانہ کی روشنی نے اُردو شاعری میں بھی ایک تلاطم پیدا کر دیا ہے۔ اور شاعر زندگی کی کشمکش سے دوچار ہونے پر مجبور ہیں۔ اسی مجبوری نے ان کے سامنے ایک نیا اُفق پیدا کر دیا ہے۔ اور یہ انتخاب کلام اسی نئے اُفق کا آئینہ دار ہے۔

آدم نامہ

(از حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب مدظلہ)

آدم نامہ لکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں توریت، انجیل اور قرآن کے بیانات میں (جو خدا کے بیانات ہیں) اپنی بشری رائے کو دخل دوں۔ بلکہ میرا مطلب محض یہ ہے کہ لوگ بادشاہوں کی بادشاہی اور سائنس کی کرشمہ سازی اور مال و اولاد کی مشغولیت کی غفلت سے ہوشیار ہوں۔ اور کبھی کبھی پرانی کتابوں اور آسمانی کتابوں کی ابتدائی باتوں پر بھی غور کر لیا کریں۔

اسی لئے میں نے ادبی دلچسپی کا طرز اختیار کر کے یہ چند سطریں لکھیں تاکہ موجودہ نسل انسانی کے ذہن کشادہ ہو جائیں اور خدا پرستی کی پرانی چیزوں کا چرچا آج دوبارہ زندہ ہے۔

حسن نظامی

زندگی کا سانس دم ہے۔ وہ آئے جب بھی دم اور جائے تب بھی دم کہو جب بھی دم۔ جام کہو جب بھی دم۔ ٹھیک کہا تھا کسی شاعر نے ؎

دم کے ہیں سب دمدمے، جب دم نہیں تو کچھ نہیں
ساری دنیا ہیچ ہے، جب ہم نہیں تو کچھ نہیں

سب آدمیوں کے باپ کا نام آدم تھا۔ اُن کی بیوی یعنی سب انسانوں کی ماں کا نام حوا تھا۔ وہ کب سے تھے؟ معلوم نہیں۔ وہ کیونکر پیدا ہوئے؟ معلوم نہیں۔ نہ آدم کے باپ تھے، نہ ماں تھیں۔ نہ اُن کی بیوی حوا کے ماں باپ کا حال کسی کو معلوم ہے۔ تاہم یہ ماننا پڑتا ہے کہ وہ تھے ضرور۔ اگر نہ ہوتے تو یہ گوری، کالی، لال، زرد اولاد کہاں سے آجاتی؟

یہودی، عیسائی اور مسلمان کہتے ہیں باوا آدم کو خدا نے بن ماں باپ پیدا کیا تھا۔ اور وہ سب یہ بھی مانتے ہیں کہ خدا نے مکتب کے میاں جی یا شالہ کے پنڈت جی یا اسکول کے ماسٹر جی کی طرح باوا آدم کو پڑھایا بھی تھا۔

پر خبر نہیں کہ میاں جی یا پنڈت جی یا ماسٹر جی نے عرش پر بیٹھ کر شاگرد کو پڑھایا تھا یا کرسی پر؟ اور یہ بھی خبر نہیں کہ شاگرد زمین پر بیٹھے تھے یا کسی ڈیسک پر ان کو بٹھایا گیا تھا؟ ہاں یہ معلوم ہے کہ پڑھایا گیا تھا۔ قرآن میں خدا نے خود یہ بات بتائی ہے اور کہا ہے

وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا

اور خدا نے آدم کو ساری دنیا کی چیزوں کے نام سکھائے۔ اور فرشتوں کے سامنے آدم کا امتحان بھی لیا تھا۔ خدا کا بیان ہے کہ پہلے فرشتوں کا امتحان لیا مگر وہ سب فیل ہو گئے۔ پھر آدم کا امتحان لیا اور وہ پاس ہو گئے۔

کتنے نمبر ملے؟ معلوم نہیں۔ کس ڈویژن میں پاس ہوئے؟ خبر نہیں۔ ہاں یہ معلوم ہے کہ پروفیسر صاحب نے امتحان کے بعد آدم کو ایک بڑا انعام دیا۔ اور وہ انعام یہ تھا کہ فرشتوں سے کہا کہ تم سب آدم کو سجدہ کرو۔ فرشتوں کو حکم کی تعمیل کرنی پڑی۔ اور وہ سب سجدے میں گر پڑے۔ مگر فرشتوں کا استاد شیطان منکر ہو گیا۔ اس نے آدم کو سجدہ نہ کیا۔ تو خدا نے شیطان کو ملعون اور مردود قرار دیا۔

باوا آدم کی شادی

لڑکا جب اے پاس کر لیتا ہے تو ماں باپ کو شادی کا فکر ہوتا ہے۔ آدم کے ماں باپ نہ تھے۔ بچارے لاوارث تھے بس خدا ہی اُن کا باپ تھا۔ اور خدا ہی ان کا وارث تھا۔ اسی کو ان کی شادی کا انتظام کرنا پڑا۔

مگر یہ معلوم نہیں کہ شادی کہاں ہوئی؟ قاضی کون تھا؟ براتی کون تھے؟ گواہ کس کو قرار دیا گیا تھا؟ مہر کتنا بندھا تھا؟ اور ولیمے کی دعوت بھی ہوئی تھی یا نہیں؟ اور شادی کے رقعے بھی تقسیم ہوئے تھے یا نہیں؟ سہرا بندھا تھا یا نہیں؟ تاشے باجے تھے یا نہیں؟ ڈومنیاں گائی تھیں یا نہیں؟ آدم حوا کے کنگنا بندھا تھا یا نہیں؟ مہندی لگی تھی یا نہیں؟

ہمیں اتنا معلوم ہوا ہے کہ خدا نے شادی کے بعد آدم سے کہا۔ جاؤ اب تم دونوں جنت میں رہو۔ اور خوب عیش کرو۔ جو چاہو کھاؤ۔ جو چاہو پیو۔ یہاں کوئی بادشاہ نہیں ہے جو تمہارے کھانے پر کنٹرول کا پہرہ بٹھائے۔ یہاں کوئی مولوی نہیں ہے جو تمہارے پینے پلانے کی نگرانی کرے۔

شجر ممنوع

قرآن شریف سے اتنا ضرور معلوم ہوا ہے کہ جب خدا نے آدم کو اور حوا

جنت میں رہنے سہنے اور عیش و آرام کرنے کی اجازت دی تو یہ حکم بھی دیا تھا۔

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ

تم دونوں اس شجر کے پاس بھی نہ جانا ۔ جس وقت یہ فرمایا تھا کہ اس شجر کے پاس نہ جانا اس وقت وہاں فرشتوں کے سوا اور کون موجود ہوگا ؟ اور ممکن ہے۔ اماں حوا کے پردے کے سبب فرشتے بھی وہاں نہ ہوں۔ اور ہوں تو بس محل کے خواجہ سراؤں کی حیثیت میں دو چار ہوں۔ پھر یہ بات کس سے معلوم ہوئی کہ شجر کس چیز کا تھا۔ جس کے پاس جانے سے آدم اور حوا کو روکا گیا تھا۔

دُنیا والوں نے خاص کر مسلمان شاعروں نے خبر نہیں کہاں سے یہ بات اُڑا لی ہے کہ وہ درخت گیہوں کا تھا۔ اور آدم حوا نے گیہوں کا دانہ کھا لیا تھا۔ اس لئے جنت سے نکالے گئے تھے۔ کیونکہ شجر کا لفظ عربی ہے اور عربی میں شجر درخت کو بھی کہتے ہیں۔ مگر شجر ایسے درخت کیلئے بولا جاتا ہے جو بہت اونچا ہو۔ بہت بڑا اور گنجان ہو۔ پس اگر گیہوں کا درخت مراد ہوتا تو شجر کا لفظ نہ کہا جاتا۔ کیونکہ گیہوں درخت میں نہیں ہوتا۔ بلکہ ایک چھوٹے سے پودے میں ہوتا ہے۔ اور کوئی عقلمند اور بے عقل آدمی اس ننھے سے پودے کو درخت نہیں کہتا۔

اس کے علاوہ جب خدا نے جنت کی ہر چیز کھانے اور پینے کی اجازت دی تھی تو وہ صفائی سے فرما سکتا تھا کہ تم دونوں گیہوں نہ کھانا۔ یا فلاں چیز نہ کھانا۔ یہ نہ فرماتا کہ تم دونوں اس شجر کے پاس بھی نہ جانا۔ اور گیہوں مراد ہوتا تو آج کل کے تحقیق کرنیوالے آدمی یہ کہہ سکتے تھے کہ خدا کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ گیہوں کھانے سے خدا نے کیوں روکا ؟ گیہوں میں تو کوئی بات روکنے کے قابل نہیں ہوتی۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ شجر انگور کا تھا جس سے شراب بنتی ہے۔ اور خدا آدم حوا کو شراب سے بچانا چاہتا تھا۔ تو انگور کی بھی بیل ہوتی ہے۔ درخت نہیں ہوتا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ خدا نے چاء کے درخت سے روکا تھا تو چاء کا بھی چھوٹا سا پودا ہوتا ہے۔ درخت نہیں ہوتا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ شجر تمباکو کا تھا اور خدا نے اپنے سکھ بندوں کی خاطر آدم کو تمباکو نوشی سے بچانے کیلئے یہ حکم دیا تھا تو تمباکو کا بھی بڑا درخت نہیں ہوتا بلکہ پودا ہوتا ہے۔

بہر حال قرآن میں کئی جگہ یہ ذکر آیا ہے اور ہر جگہ خدا نے شجر کا لفظ استعمال فرمایا ہے۔ لہذا شجر کو عربی لغت میں دیکھنا چاہیئے کہ اس لفظ کے معنی درخت کے سوا کچھ اور بھی ہیں یا نہیں ؟

چنانچہ لغات کی تحقیقات سے ظاہر ہوتا ہے کہ مشاجرت کے ایک معنی بھی نزاع اور اختلاف اور لڑنے جھگڑنے کے بھی ہیں۔ پس ثابت ہوا کہ خدا نے آدم اور حوا کو صرف ... سے منع کیا تھا اور فرمایا تھا کہ اس شجر کے پاس بھی نہ جانا۔ لیکن بابا آدم اور اماں حوا اس حکم کی ٹھیک تعمیل نہ کر سکے اور خدا اس سے ناراض ہوا۔ اور اس نے حکم دیا کہ تم دونوں جنت سے نکل جاؤ۔

اماں حوا اور بابا آدم جنت سے نکل کر کہاں گئے۔ اس میں اختلاف ہے۔ کیونکہ یہ بھی ٹھیک معلوم نہیں ہوا ہے کہ جنت کہاں تھی۔ اگر یہ معلوم ہو جاتا کہ جنت فلاں مقام پر تھی تو قیاس لگایا جا سکتا تھا کہ فلاں جگہ جنت کے قریب تھی وہیں گئے ہونگے۔ مگر مشہور یہ ہے کہ اماں حوا جدے عرب میں آتریں اور بابا آدم سراندیپ یعنی لنکا میں آترے۔ اور دونوں میں مدتوں جدائی رہی۔ آخر دونوں ملے۔ اور پھر ان سے اولاد ہونی شروع ہوئی۔

گوشت کھانے والا پرند

فارسی کے ایک شاعر نے کہا ہے ؎

یکے مرغ دیدم نہ بال و نہ پر   نہ از شکم مادر نہ پشت پدر
نہ بر آسمان و نہ زیر زمیں   ہمیشہ خورد گوشت آدمی

میں نے ایک ایسا پرند دیکھا جس کے نہ بال تھے نہ پر تھے۔ نہ وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا نہ باپ کی پشت سے اس کو کچھ تعلق تھا۔ نہ وہ آسمان پر تھا، نہ زمین پر تھا۔ مگر ہمیشہ آدمی کا گوشت کھایا کرتا تھا۔ گویا فارسی کے شاعر نے حضرت آدم اور حضرت حوا کی طرح اس پرندے کو بھی ایسا سمجھا ہوگا۔ کہ جیسے آدم و حوا بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے تھے ایسے ہی یہ پرند بھی تھا۔

یہ پرند کون تھا؟ اور کہاں تھا؟ اور کب تھا؟ اور اب بھی ہے یا نہیں ہے ؟ کہا جاتا ہے کہ وہ پرند

فِکر زندگی ہے

جو انسان کا گوشت کھاتا رہتا ہے۔ اگرچہ شاعر نے یہ شعر کہتے وقت حضرت آدم کا خیال بھی نہ کیا ہوگا۔ بلکہ اپنی فکرمندی کا ذکر کیا ہوگا اور شاید یہ شاعر بہت مفلس ہوگا۔ ممکن ہے شاعر نے اپنی نسبت یا دوسرے شاعروں کی فکرمند زندگی کی بابت یا تمام انسانوں کی محنت اور فکرمند حیات کی نسبت کہا ہوگا۔ تاہم جو کچھ اس شعر میں کہا ہے وہ حرف بحرف درست اور صحیح ہے کہ آدم جنت سے نکل کر از حد فکرمندی میں مبتلا ہو گئے ہونگے۔

تجرد کا پہلا حکم

شجر کی مذکورہ توجیہ کے ساتھ ہی کہ شجر ممنوعہ آپس کی لڑائی تھی۔ کوئی کھانے پینے کی چیز نہ تھی۔ ایک اور وجہ بھی کہی جا سکتی ہے جو ایک حد تک عقل اور خیال کے قریب ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب آدم اور حوا کو جنت میں بسنے اور سب کچھ کھانے پینے کی اجازت دی تو یہ شرط بھی لگا دی کہ تم دونوں آپس میں وہ میل نہ کرنا جس سے اولاد پیدا ہوتی ہے۔ اسی لئے اس کو شجر یعنی درخت کے لفظ سے یاد فرمایا۔ یعنی جس طرح درخت بڑھا کرتا ہے اسی طرح نسل انسانی بھی جس عمل سے بڑھتی ہے اس سے آدم اور حوا کو منع کیا کہ تم دونوں مجرد رہنا جس کو سنسکرت میں برہمچریہ کہتے ہیں۔ گویا خدا چاہتا تھا کہ آدم اور حوا کی قوت صبر اور برداشت کا امتحان لے۔ اور یہ بھی چاہتا تھا کہ دونوں کی عمر دراز ہو۔ اور وہ جب ہی ممکن تھی کہ وہ دونوں اپنے جسم کی اس قوت کو محفوظ رکھیں۔ جو عمر بڑھانے والی اور بہت دن تک زندگی کو قائم رکھنے والی۔ اور موت سے بچانے والی ہے اور خدا چاہتا تھا کہ یہ دونوں بہت دن زندہ رہیں۔ مگر آدم و حوا جذبات نفسانی اور خواہشات نسلی کو نہ روک سکے۔ اور ان سے حکم کی نافرمانی ہوئی۔ اور جنت میں وہی رہ سکتا تھا جو اپنی نفسانی خواہش پر غالب ہو۔ اس لئے ان دونوں کو جنت سے جلا وطن کرنے کا حکم ہوا۔

نفس سے مرد مغلوب ہوا

اگرچہ توریت سے معلوم ہوتا ہے کہ اماں حوا نے شیطان کے بہکانے سے نافرمانی کی تھی۔ مگر قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرد نے نافرمانی کی تھی۔ عورت نے نہیں کی تھی۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہے "وَعَصَىٰ آدَمُ رَبَّهُ" "پس آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی۔" یہ نہیں فرمایا کہ دونوں نے نافرمانی کی۔ حالانکہ خدا نے جب کبھی بھی کچھ فرمایا دونوں کو برابر مخاطب کیا۔ مگر نافرمانی کے ذکر میں صرف آدم کا ذکر کیا گیا ہے۔ حوا کو اس میں شریک نہیں کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت آدم ہی اپنے جذبات نفس کو قابو میں نہ رکھ سکے تھے۔ حوا کی مرضی کا اس عمل میں دخل نہ تھا۔ اگرچہ نافرمانی کے عمل میں دونوں شریک تھے۔ تاہم خدا نے حضرت آدم کی نافرمانی کا ذکر فرمایا۔ حوا کو اس نافرمانی میں شریک نہیں کیا گیا۔

نسل کی ترقی

مجھے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب خدا نے خود آدم کو اپنا خلیفہ بنا کر دنیا کو آباد کرنا تھا تو پھر آدم اور حوا کو نسل جاری کرنے سے منع کیوں کیا۔

اس کا جواب میرے ذہن میں یہ آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آدم اور حوا کو ایک خاص مدت تک عمل نسل سے روکنا اور مجرد رکھنا چاہتا تھا۔ کیونکہ اس نے دنیا کی جو فطرت اور نیچر تجویز کی تھی اس میں یہ قرار دیا تھا کہ آدم اور حوا اتنی مدت تک مجرد رہیں گے تو ان کی عمریں بڑی ہو جائیں گی۔ اور پھر جب تجرد کی مدت ختم ہونے کے بعد تجرد ختم کریں گے تو ان کی اولاد کی بھی عمریں بڑی ہوا کریں گی۔ اس لئے اگر حضرت آدم حکم الٰہی کے بموجب کچھ مدت عورت سے الگ رہتے تو ان کی عمریں بڑھ جاتیں اور ان کی اولاد کی عمریں بھی بڑی ہونے لگتیں۔

شادی کی عمر

میرے اس خیال کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر میرا یہ خیال درست ہو کہ خدا نے مجرد رہنے کا حکم دیا تھا اور حضرت آدم ایک خاص زمانے تک عورت سے الگ رہتے تو ان کی عمر بڑھ جاتی۔ اور ان کی اولاد کی عمریں بھی بڑھ جاتیں۔ تو موجودہ زمانے کے انسان بھی اگر عروج شباب کے ایام میں مجرد رہیں اور عمر کے درمیانی حصے میں شادی کریں تو ان کی عمریں بھی بڑی ہو جائیں اور وہ بیماریوں سے بھی محفوظ رہیں اور ان کی اولاد بھی بہت دن جئے اور تندرست رہے۔

منصوبہ بازی

(از واحدی)

آج کل ایسی جنگ ہو رہی ہے جیسی جنگ چشمِ فلک نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ دنیا کا موجودہ دور صحیح معنوں میں جنگ کا دور ہے۔ لیکن جنگ کے دور کے ساتھ اسے منصوبہ بازی کا دور بھی کہا جاسکتا ہے۔ ہٹلر کا منصوبہ تھا کہ انگریزوں کی صاحبی ختم کرکے جرمنوں کی صاحبی قائم کرے۔ انگریز منصوبہ باندھ رہے تھے کہ ۱۹۴۲ء کے خاتمے سے پہلے ہٹلر کا خاتمہ کردیں۔ باہر کی مثالیں چھوڑیئے۔ ہندوستان کے چند سرمایہ داروں نے ارادہ کیا ہے اور وہ اس کی تجویزیں تیار کرچکے ہیں کہ چند سال کے اندر اندر اپنے مفلوک الحال ہم قوموں کو خوش حال بنا دینگے۔ ہندوستان کے انگریز حاکموں کے سامنے بھی ایک سکیم ہے جس سے ہمیں کھانے پینے پہننے اوڑھنے اور رہنے سہنے کی وہ سہولتیں مل جائیں گی جو ہمارے انگریز حاکموں کو حاصل ہیں۔

دنیا بدل جائیگی۔ دنیا کی ذہنیت بدل جائیگی۔ حاکم اور محکوم کا فرق چند روز کی بات ہے۔ سرمایہ دار مزدوروں کو اپنے برابر لانے کی فکر میں بے چین ہیں۔

منصوبہ بازی کے اس دور میں سوچتا ہوں کہ میں اور کچھ نہیں تو منصوبہ بازی پر ایک مضمون ہی لکھ ڈالوں۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ میں بھی کوئی منصوبہ باندھتا مگر منصوبہ باندھنا زندہ انسانوں کا کام ہے۔ مجھ میں اتنی زندگی بچپن اور جوانی میں بھی نہیں تھی کہ منصوبے باندھا کرتا۔ میں تو کاغذ کی ناؤ کی طرح بہتا رہا اور خدا کی مہربانی سے تیرتا رہا۔ لیکن ہاں اگر ہر شخص اپنی اپنی زندگی کے منصوبے لکھے تو بے حد دلچسپ چیز۔ بڑا دلچسپ مسالہ جمع ہوسکتا ہے۔ منصوبے باندھنے کیلئے زندگی کی ضرورت ہے۔ یہ میں نے غلط نہیں کہا۔ اس زندگی کی جسے انگریزی میں وائی ٹیلیٹی (Vitality) کہتے ہیں۔ دیکھئے انسان بچپن اور جوانی میں جس قدر منصوبے باندھتا ہے بڑھاپے میں نہیں باندھ سکتا۔ پھر زندہ قومیں جیسے منصوبے باندھا کرتی ہیں وہ مردہ قوموں کے تصور میں نہیں آتے۔ انگریز کے منصوبوں کو ہندوستان کے ہندو کا منصوبہ پہنچ سکتا ہے اور نہ مسلمان کا۔ جب [illegible] حکومت تھی تو ہمارے بیوقوف بادشاہ زادیوں سے نکاح کرنے اور پھر انہیں [illegible] کے منصوبے باندھا کرتے تھے۔ شیخ چلی کی داستان آپ نے سنی ہوگی۔ اب

کبھی ہم ادنیٰ سے [illegible] بڑے آدمی کی [illegible]

۱۸۵۷ء سے کچھ پہلے کا ذکر ہے۔ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر بھک منگے بیٹھتے تھے۔ کوئی فرنگی سیاح جامع مسجد دیکھنے آیا۔ بھک منگوں کو اس نے بھیک دی۔ بھیک دیکر بٹوا جیب میں رکھ رہا تھا۔ بٹوا جیب کی بجائے بھک منگوں کی بھیڑ میں گر پڑا۔ فرنگی چلا گیا۔ ایک بھیک منگے کی نظر پڑ گئی۔ اٹھا کر کھولا تو خاصی نقدی تھی۔ دوسرے دن اتفاق سے فرنگی پھر جامع مسجد آیا تو بھیک منگے نے بٹوا لوٹا دیا۔ فرنگی حیران ہوا اور پوچھا کہ تم بھیک مانگتے ہو اور اتنی نقدی سے تمہاری نیت نہیں بگڑی؟ بھیک منگے نے جواب دیا نیت تو بگڑی تھی مگر خیال گذرا کہ آپ کے پیغمبر بھی اللہ میاں کے پاس ہیں اور ہمارے پیغمبر بھی اللہ میاں کے پاس۔ آپ کے پیغمبر ہمارے پیغمبر سے کہیں گے کہ میرے امتی کے پیسے آپ کے امتی نے مار لئے۔ ہمارے پیغمبر کو اس بات سے شرمندگی ہوگی جسے میں برداشت نہ کرسکا۔

۱۸۵۷ء سے پہلے ہماری جیسی حکومت تھی سب جانتے ہیں۔ تاہم حکومت کا خواہ مخواہ کا تصور سا تھا۔ اس کا یہ اثر تھا کہ ہمارے بھیک منگے بھی اتنا اونچا سوچ سکتے تھے۔ ایسا ہی اونچا ایک شیشے کے برتن بیچنے والے کا سوچنا تھا جو ٹوکرے میں برتن لئے بیٹھا تھا اور منصوبے باندھ رہا تھا کہ ٹوکرے سے ترقی کرتے کرتے دکان کھولونگا۔ دکان پھیلے گی اور دولت چمکیگی۔ اور آخر میرے ہاں دولت کی فراوانی ہو جائیگی اور میں بادشاہ کی بیٹی سے شادی کروں گا۔ اور ایک دن بادشاہ کی بیٹی کو اس طرح ٹھوکر ماروں گا۔ ٹھوکر جو ماری تو ٹوکرے میں لگی اور شیشے کے برتن ٹوٹ گئے۔ اور غریب بیوقوف مشہور ہوگیا۔ ٹھوکر نہ مارتا تو ممکن تھا کہ افغانستان کے بچہ سقہ کی طرح اس کے سارے منصوبے پورے ہو جاتے۔ اور جن کے منصوبے پورے نہیں ہوا کرتے ان کے ساتھ اس کا نام نہ لیا جاتا۔ بلکہ جن کے منصوبے پورے ہوا کرتے ہیں انہیں شیخ چلی کہکر پکارا جاتا۔ بہرحال یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ ہمارے بیوقوفوں کے منصوبے ایسے ہوتے تھے۔

منصوبے حسب حیثیت اور حسب ہمت ہر شخص ہی باندھتا ہے۔ حاکم اپنی شان کے مطابق۔ محکوم اپنی شان کے مطابق اور اپنی حیثیت کے مطابق۔ غریب اپنی ہمت کے مطابق۔ کبھی شکر خورے کو شکر مل جاتی ہے۔ کبھی غریب بلیک مارکیٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ کبھی منصوبہ ٹوٹنے سے ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ کبھی فرمایا جاتا ہے "عرفت ربی بفسخ العزائم" یعنی میں نے ارادوں کے ٹوٹنے سے اپنے رب کو پہچانا۔ یہ مسلمانوں کے عالی مرتبہ خلیفہ حضرت علی کا قول ہے۔ [illegible]

دیں کہ جن کے ارادوں سے حقیقتاً مراد جُدا نہ تھی۔ ادھر ارادہ کیا اور مُراد (وہ شئے جس کا ارادہ کیا گیا) ہاتھ باندھے حاضر ہوئی۔ ایسے صاحبِ عزم بزرگوں کی شان میں تو کیا کہ کبھی کبھی خدا اُن کے ارادوں کو ٹھکانہ کرے تاکہ وہ بھول نہ جائیں کہ خدا چاہتا ہے تو ارادے اور منصوبے پورے ہوتے ہیں۔ اور کسی کے ارادے میں اتنی قوت ہے کہ وہ مراد کو پالیتا ہے تو یہ محض خدا کا کرم اور فضل ہے۔ یا خدا اُس کے ظرف کا امتحان لے رہا ہے۔ ہندوستان کے حاکم انگریزوں کا منصوبہ ہے کہ ہندو اور مسلمان مل جائیں تو ہندوستان ان کے حوالے کر دیا جائے۔ ہندوؤں کا منصوبہ ہے کہ ہماری تعداد ہندوستان کی آبادی کی تین چوتھائی ہے۔ ہم بڑے بھائی بن کر رہیں گے۔ مسلمانوں کا منصوبہ ہے "کھا تیرے لگی ہے۔ نہیں جائیں گے جی سے۔" اچھوتوں کا منصوبہ ہے ہندو بھی حکومت کر چکے ہیں اور مسلمان بھی حکومت کر چکے۔ اب حکومت کا مزا ہمیں چکھنا ہے۔ کوئی اپنے منصوبے سے بال برابر نہیں ہٹ سکتا۔ دیکھیے کس کے منصوبے میں مراد کو پہنچنے کی طاقت ہے۔ پاکستان بنتا ہے یا اکھنڈ ہندوستان رہتا ہے یا انگریز ہی کسی طریقے سے اس سوال کو حل کرتے ہیں۔

قومی اعتبار سے ہمارے منصوبوں کا یہ حال تھا۔ انفرادی اعتبار سے بھی سُنئے۔ ایک روز کشمیری دروازہ کے قریب دھوپ خوری کرتا آ رہا تھا کہ کچہری سے چند لوہیے (لوہے کے تاجر) وارد ہوئے اور تانگے والے سے پوچھنے لگے "چاوڑی تک کا کیا لوگے؟" تانگے والے نے کہا "اٹھارہ آنے" لوہیوں کو غصہ آگیا۔ "اٹھارہ آنے! چھ پیسے سواری دیں گے۔ چار آدمیوں کے چھ آنے۔" تانگے والے نے جواب نہ دیا اور تانگہ لیکر چل دیا۔ لوہیے آپس میں بولے "کیا مزاج ہیں۔ ذرا لڑائی ہو چکے، پھر دو پیسے سواری، دو دو پیسے سواری کہکر بلائے گا۔ کم بخت تانگے بک بھی تو رہے ہیں بہت مہنگے۔ ورنہ میں نے تانگہ خریدنے کا فیصلہ کر لیا تھا مجھ سے ان ذلیل تانگے والوں کے نخرے نہیں اُٹھائے جاتے۔" میں تانگہ نشین نہیں ہوں۔ یا دوسروں کی موٹر میں پھرتا ہوں یا اپنی ٹانگوں پر۔ میرا جی تو چاہتا تھا کہ لوہیوں سے کہوں کہ بھائی تم اور تمہاری مانند تمام بڑے بڑے تاجر اس جنگ کی وجہ سے لاکھوں کروڑوں کما رہے ہیں۔ یہ غریب تانگہ والا بالفرض نرخ مقررہ سے زیادہ لیکر تھوڑا بہت کمائے گا تو کیا غضب آ جائیگا۔ مگر مجھے اپنی ماما کا خیال آگیا۔ جس نے بھوک ہڑتال نہیں تھوک کا ماسے کی ٹھان کر ہمارا بائیکاٹ کر دیا تھا۔ مجھے خیال آیا۔ یہ وہی ماما ہے جس نے جنگ سے قبل منتیں کرکے نوکری کی تھی۔ اب دگنی تنخواہ پر بھی نہیں آتی۔ کیا مضائقہ ہے۔ یہ بندہ صحبت باقی۔ ایک ماما کیا ہر نوکر سے جنگ کے بعد بدلہ لونگا۔ اور ان لوہیوں کا ساتھ دونگا۔ کمانے کا حق مجھے ہے۔ میرا ہاتھ تکنے والوں کو نہیں ہے۔" جب عقل کو سمجھانے کی بہتیری کوشش کی کہ ماما کھوئے تو نہیں گئی۔ کچھ روز ہم اپنا کام آپ کر لیا کریں تو کیا مضائقہ ہے۔ ہم ماما کو اتنی رقم نہیں دے سکتے جتنی اُسے دوسری جگہ سے مل رہی ہے۔ تو ماما رکھنا ہمارا پیدائشی حق کہاں سے ہوگیا۔ لیکن دل نہیں مانتا۔

منصوبہ بازی اچھی چیز بھی ہے اور بُری بھی۔ جو شخص کوئی منصوبہ نہیں رکھتا وہ گویا مُردہ ہے۔ میں نے جو کہا کہ مجھے منصوبے باندھنے کی عادت نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ میرے منصوبے منصوبے کہلانے کے لائق نہیں ہیں۔ ورنہ صبح سے شام تک منصوبوں اور ارادوں کا ہجوم رہتا ہے کہ آج یہ کرنا ہے اور کل وہ کرنا ہے۔ منصوبے کہلانے کے لائق منصوبے بڑے لوگ باندھتے ہیں۔ میں ایسے منصوبے اس لئے نہیں باندھتا کہ ایسے منصوبے اکثر شیخ چلی کے منصوبے بن جاتے ہیں۔ اور شیخ چلی کی سی منصوبہ بازی بُری چیز ہے۔

خدا کرے ہندو مسلمانوں میں اتفاق ہو جائے۔ ہندو مسلمانوں میں کیا، گاندھی جی اور مسٹر جناح میں یا نہرو جی اور مسٹر جناح میں یا مسٹر ساورکر اور مسٹر جناح میں اتفاق ہو جائے۔ اور یہ بزرگ کانسٹی ٹیوشنوں کے جھگڑے چھوڑ کر اپنے میں سے کسی ایک کو ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی، عیسائی، اچھوت سارے ہندوستانیوں کا لیڈر مان لیں تو انگریز وعدہ کر ہی چکے ہیں کہ حکومت ہندوستانیوں کے حوالے کر دینگے۔ ہماری یہ دعا قبول نہ ہو تو پھر یہی دعا قبول ہو جائے کہ [illegible] اور ہندوستان کے سرمایہ داروں نے ہماری بہبودی کی جو سکیمیں بنائی ہیں وہ [illegible] ہوں۔ ہمارا منصوبہ یہ نہیں ہے کہ ہم بھی سرمایہ دار بن جائیں نیز ہم بچّہ سقّہ بھی نہیں ہیں کہ امان اللہ خاں سے حکومت چھین لیں۔ ہم نے تو صرف انگریزوں کے اور ہندوستان کے سرمایہ داروں کے منصوبے پورے ہوتے دیکھنے کا منصوبہ باندھا ہے۔ اور پھر دیکھنے کا کہ انگریزوں اور ہندوستان کے سرمایہ داروں کے منصوبوں کا ہم غریبوں پر واقعی کیا اثر ہوتا ہے۔ ہم خود کسی قابل نہیں تو کیا دوسروں کے منصوبوں کے انتظار کا منصوبہ بھی نہیں باندھ سکتے۔ ہم تصور میں دیکھ رہے ہیں کہ ۱۹۵۶ء میں ہندوستان کا کوئی فرد ناخواندہ نہیں رہا ہے۔ ایک ہندوستانی نہیں ہے جسے کھانے، کپڑے، رہنے سہنے اور اولاد کو تعلیم و تربیت دلانے اور ان کا مستقبل بنانے کی پریشانی ہو۔ سوسائٹی کا نظام بدل گیا ہے۔ عورتیں بے پردہ پھرتی ہیں اور مرد اُن کی طرف نگاہ نہیں اُٹھاتے۔ یا نگاہ اُٹھانا عیب نہیں سمجھا جاتا۔ مردوں نے عورتوں سے جائز تعلق (بیاہ) کرنے کا معاوضہ مانگنا چھوڑ دیا ہے۔ سب کے حوصلے بلند ہیں۔ زراعت کرنے والا اپنی جگہ پیٹ بھرا ہے۔ تجارت کرنے والا اپنی جگہ۔ دستکار بھی مطمئن ہیں اور اہلِ سیف و اہلِ قلم بھی مطمئن۔ اور سب کہتے ہیں کہ ہمیں اور کیا چاہیے تھا۔ خدا انگریزوں کو بھی سلامت

سکے اور سرمایہ داروں کو بھی۔ عوام اور غربا کی خواہش [illegible]
غربا کا منصوبہ اس قدر تھا جو پورا ہو گیا۔ خدا کا شکر۔ انگریزوں کا بول بالا۔
سرمایہ داروں کی جے۔

اس مضمون کو یہاں تک لکھنے پایا تھا کہ ۵ رفروری کا اخبار ریاست موصول ہوا اور اس میں پہلے ہی صفحہ پر یہ سطریں دکھائی دیں:-

"پنجاب گورنمنٹ اپنے صوبے میں نئے جیل تیار کرنے کے مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور کر رہی ہے۔ کیونکہ اس [illegible] گنجائش تھی اس وقت ان میں کہیں زیادہ قیدی موجود ہیں۔ گورنمنٹ کا خیال ہے کہ جنگ کے بعد چونکہ بیکاری زیادہ ہوگی لوگ بیکاری کے باعث جرائم کی طرف زیادہ راغب ہونگے تو جیلوں کی آبادی میں بھی زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔"

یہ بھی ایک منصوبہ ہے۔

غزل

(جناب نعمان تاثیر)

معبدِ عشق جداگانہ بنایا جائے — دل کی بنیاد پہ بت خانہ بنایا جائے

ذرّے ذرّے پہ نئی کھینچ کے تصویرِ جنوں — پھر کوئی نجد کا ویرانہ بنایا جائے

آج وہ بھی ہیں گھٹائیں بھی ہیں پیمانہ بھی — کیوں فضاؤں میں نہ میخانہ بنایا جائے

دھجیاں جسکے ہوں سب جیب و گریبانِ وفا — ایسے ہشیار کو دیوانہ بنایا جائے

پھر کہاں سجدہ کرے گی یہ جبینِ الفت — دل کے کعبے کو نہ بت خانہ بنایا جائے

تنگ ہے وسعتِ صحرا مری وحشت کے لئے — دل کی دنیا ہی کو ویرانہ بنایا جائے

پہلے ہشیار کا اپنے وہ فسانہ سن لیں
پھر اسے شوق سے دیوانہ بنایا جائے

تصحیح

جناب نعمان تاثیر کی ایک غزل جنوری ۱۹۴۵ء کے پرچہ میں شائع ہوئی تھی۔ اس کا ایک شعر غلط لکھا گیا ہے

"عشق کے کھائے ہر قدم پہ فریب — حسن کی سادگی کو کیا کہئے" کی بجائے

"حسن کے کھائے ہر قدم پہ فریب — عشق کی سادگی کو کیا کہئے" ہونا چاہیے۔

ٹکے گز کی چال

(از حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب مدظلہٗ)

عربی زبان میں کفایت شعاری اور ہندی زبان میں ٹکے گز کی چال دونوں کا ایک ہی مطلب ہے۔ خدا نے قرآن شریف میں حکم دیا تھا۔ "کھاؤ اور پیو مگر فضول خرچی نہ کرو۔" اور یہ بھی حکم دیا تھا کہ "جو فضول خرچی کرتا ہے وہ شیطان کا بھائی بن جاتا ہے۔"

رسول خدا نے بھی بار بار تاکید کی تھی کہ فضول خرچی نہ کرنا یہاں تک کہ وضو کرتے وقت خیال رکھنا کہ پانی زیادہ خرچ نہ ہو۔ ایک آدمی نے پوچھا یا رسول اللہ اگر میں نہر یا دریا کے کنارے بیٹھا ہوں تو وہاں بھی پانی زیادہ خرچ نہ کروں فرمایا۔ ہاں نہر اور دریا کے کنارے پر بھی پانی زیادہ خرچ نہ کیا کر۔

ہندوستان میں ہندو قوم ٹکے گز کی چال چلتی ہے یعنی فضول خرچی نہیں کرتی۔ مگر مسلمان قوم ٹکے گز کی چال چھوڑ آنے دو آنے گز بلکہ روپے دو روپے گز کی چال چلنا چاہتی ہے۔ سب سے زیادہ مسلمان عورتیں بہت فضول خرچ ہوتی ہیں۔ ان کو اس کا فکر نہیں ہوتا کہ میاں کہاں سے کما کر لاتا ہے۔ وہ تو ہر وقت خوب خرچ کرنے کے شوق میں رہتی ہیں۔

ایک مزے دار کہانی

کہتے ہیں کسی جگہ ایک لالہ رہتے تھے جب مرنے لگے تو اپنے بیٹے کو بلا کر کہا بیٹا میں دو باتیں تجھ سے کہتا ہوں ان کا دھیان رکھیو۔ ایک تو یہ کہ ہڈیاں جمع رکھیو اور دوسری یہ کہ چھاؤں میں دکان پر جایا کیجو۔

جب لالہ جی مر گئے تو بیٹے نے یہ کام شروع کیا کہ جہاں کہیں ہڈی پڑی مل جاتی تھی۔ اپنے گھر میں لے آتا تھا اور ایک کونے میں ڈال دیتا تھا۔ تھوڑے دنوں میں گھر کے اندر ہڈیوں کا ڈھیر لگ گیا اور دوسرا کام اس نے یہ کیا کہ جب دکان پر جاتا تو مکانوں کے چھجوں کے نیچے سے ہو کر جاتا تاکہ باپ کا کہنا پورا ہو کہ چھاؤں میں جایا کیجو۔

ایک دن اس کی بیوی نے کہا کہ ہندو ہو کر گھر میں ہڈیاں جمع کرتا ہے لوگ کہتے ہیں کہ تو دیوانہ ہو گیا ہے۔ دکان پر جاتا ہے تو چھجوں کے نیچے سے ہو کر جاتا ہے۔ اس کے میاں نے جواب دیا میرے باپ نے مرتے وقت جو کچھ کہا تھا اس پر عمل کرتا ہوں۔ بیوی نے کہا۔ یہ تیری سمجھ کا پھیر ہے۔ باپ کی دونوں باتوں کا مطلب تو نے ٹھیک نہیں سمجھا۔ تیرے باپ کا مطلب یہ تھا کہ جو کچھ تیرے باپ نے کمایا تھا وہ اس کی ہڈیاں ہیں۔ ان ہڈیوں کو جمع کرنے کا یہ مطلب تھا کہ تو خود اپنی کمائی کی روٹی کھائیو۔ باپ کی کمائی کو ہاتھ نہ لگائیو۔ اور چھاؤں میں دکان پر جانے کا مطلب یہ تھا کہ سورج نکلنے سے پہلے دکان پر جائیو اور سورج چھپنے کے بعد دکان سے آئیو۔ ایسا کریگا تو چھاؤں میں جائیگا اور چھاؤں میں آئیگا۔

یہ کہانی سنکر ہر ایک کی سمجھ میں آ جائیگا کہ مرنے والے لالہ ٹکے گز کی چال پر عمل کرتے تھے اور لالہ کے بیٹے کی بیوی نے بالکل ٹھیک سمجھا تھا کہ ٹکے گز کی چال کا مطلب یہ ہے کہ آدمی باپ دادا کی کمائی پر گزر اوقات نہ کرے بلکہ اپنی محنت سے خود کما کر کھائے۔ ہڈیاں جمع کرنے کی بات تو سمجھ میں آ گئی کہ باپ دادا کی کمائی جمع رہے اور اولاد خود اپنی کمائی کی روٹی کھائے۔ مگر سورج نکلنے سے پہلے دکان پر جانے اور سورج چھپنے کے بعد دکان سے گھر آنے میں کیا خوبی تھی۔ اس کو اگر سوچو تو سمجھ میں آ جائیگا کہ ٹکے گز کی چال یعنی کفایت شعاری فقط روپے پیسے میں نہیں بلکہ وقت میں بھی ہوتی ہے۔ جو لوگ دن چڑھے بہت دیر میں دکان پر جاتے ہیں وہ اپنا بڑی قیمت کا وقت فضول خرچ کر دیتے ہیں۔ کچھ لوگ تو سوتے رہتے ہیں۔ کچھ نہاتے رہتے ہیں۔ اور کچھ آدمی ایسے ہیں بلکہ زیادہ آدمی ایسے ہیں کہ اپنے ہاتھ سے اپنی ڈاڑھی مونچھ مونڈنے میں سارا وقت خرچ کر دیتے ہیں۔ رسول خدا کے چچا زاد بھائی اور داماد اور جانشین حضرت علیؑ نے فرمایا ہے جو آدمی یہ چاہے کہ دنیا میں اس کو ترقی حاصل ہو تو وہ کم سویا کرے۔ اور خدا نے بھی اپنے رسول کو اور سب مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ پچھلی رات کو جاگا کریں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ مسلمان اپنے وقت کی قدر سیکھیں۔ رات کو جلدی سو جائیں اور پچھلی رات کو جلدی جاگ اٹھیں۔ خدا کی عبادت بھی کریں اور روزی کمانے کے کام سب سے پہلے شروع کر دیں۔

میری عمر ستر برس کے قریب ہے اور میں دس بارہ سال کی عمر سے اپنے والد کی اس نصیحت پر عمل کرتا رہتا ہوں کہ روٹی اپنی محنت کی کھانا۔ اس لئے میں ہمیشہ جلدی سو جاتا ہوں اور پچھلی رات سے اٹھکر اپنی روزی کمانے کا کام شروع کر دیتا ہوں۔

قرآن شریف میں خدا نے فرمایا دن تمہاری روزی کمانے کیلئے بنایا گیا ہے اور رات تمہارے آرام کرنے کیلئے بنائی گئی ہے۔ مگر جو لوگ اول شب گناہوں کے کاموں میں جاگتے رہتے ہیں اور پچھلی رات کو سو جاتے ہیں اور دن کے دس بجے تک

سوتے رہتے ہیں وہ فضول خرچ ہیں اور خدا کے فرمانے کے بموجب شیطان کے بھائی ہیں۔ اس لئے ہر مسلمان عورت مرد اور بچے کا فرض ہے کہ وہ رات کو جلدی سو جائے اور سویرے جلدی جاگے۔ اور روپیہ خرچ کرنے میں بھی فضول خرچی نہ کرے اور وقت کے خرچ میں بھی کفایت شعاری یعنی ٹکے گز کی چال کا خیال رکھے۔

رسولِ خدا اور آن کے چاروں خلیفہ ٹکے گز کی چال چلتے تھے یہاں تک کہ رسولِ خدا اپنی جوتی اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیتے تھے۔ اور کھانے پینے میں بہت زیادہ کفایت شعاری کرتے تھے۔ اور اپنے سب کام اپنے ہاتھ سے کرتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دفعہ ایک مہمان آیا اور رات کو اُس نے بستر خراب کر دیا اور صبح ڈر کے مارے بھاگ گیا آنحضرتؐ کو معلوم ہوا کہ مہمان کا بستر گندا ہو گیا ہے تو حضرت نے پانی منگایا اور وہ اپنے ہاتھ سے بستر دھونے لگے۔ اصحاب نے عرض کی یا رسول اللہ آپ تکلیف نہ کیجئے۔ ہم بستر ابھی دھو ڈالتے ہیں۔ فرمایا۔ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں فرمایا ہے کہ ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھاتا۔ اس لئے میں بھی اپنا بوجھ دوسروں پر نہیں ڈالتا بس اپنے کام اپنے ہاتھ سے کرتا ہوں اور چونکہ وہ میرا مہمان تھا اس لئے اس کی گندگی بھی میں اپنے ہاتھ سے صاف کروں گا۔

حضرت بستر دھو رہے تھے کہ وہ مہمان اُلٹا آ گیا کیونکہ وہ کوئی اپنی قیمتی چیز بھول گیا تھا۔ وہ مہمان مسلمان نہیں تھا۔ مگر جب اُس نے یہ دیکھا کہ رسولِ خدا اسکی گندگی اپنے ہاتھ سے دھو رہے ہیں تو اس پر بڑا اثر ہوا اور وہ فوراً مسلمان ہو گیا۔

اس سچے بیان سے وہ لوگ سبق لیں جو اپنا سب کام دوسروں سے لینا چاہتے ہیں۔ اور امیر لوگ بیسیوں نوکر اپنے کاموں کیلئے رکھتے ہیں۔ ایک نواب صاحب کی یہ حالت تھی کہ ان کے ہاں پندرہ روپے مہینے کا ایک نوکر اس کام کیلئے مقرر تھا کہ جب نواب صاحب کھانا شروع کریں تو نوکر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ دیا کرے یعنی نواب صاحب اسلام کے اس حکم پر عمل کرتے تھے کہ ہر کام سے پہلے بسم اللہ پڑھنی چاہیئے مگر ان کو خود بسم اللہ پڑھتے ہوئے آلکسی آتی تھی۔

ایک دفعہ ایک سوار کہیں جا رہا تھا۔ راستے میں اُس نے دیکھا کہ ایک بیری کے درخت کے نیچے ایک آدمی چت لیٹا ہے اور اسکی چھاتی پر ایک بیر پڑا ہوا ہے۔ اُس آدمی نے سوار کو آواز دی کہ بھائی خدا کے واسطے ذرا میرے پاس آ اور میری مدد کر۔ سوار نے خیال کیا کہ یہ شخص کسی بڑی مصیبت میں مبتلا ہے اور انسان کا فرض ہے کہ جب کسی انسان کو تکلیف میں دیکھے تو اسکی مدد کرے۔ اس واسطے وہ گھوڑے سے اُترا اور لیٹے ہوئے آدمی سے پوچھا۔ کیوں بھائی تم نے مجھے کیوں بلایا ہے اور تمہارا کیا کام ہے جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے۔ تمہاری مدد کروں گا۔ لیٹے ہوئے آدمی نے جواب دیا۔ بھائی یہ بیر جو میری چھاتی پر پڑا ہوا ہے۔ ذرا اُٹھا کر میرے مُنہ میں ڈال دے۔

سوار کو یہ بات سنکر بہت غصہ آیا اور اُس نے کوڑا اٹھا کر اس آدمی کو خوب مارا۔ وہ آدمی گھبرا گیا اور ہاتھ جوڑنے لگا۔ سوار نے کہا تیری سزا یہ ہے کہ تو ابھی میرے سامنے بیری پر چڑھ اور میرے لئے بیر توڑ۔ اُس آدمی نے کوڑے کے ڈر سے ایسا ہی کیا۔ وہ بیری کے درخت پر چڑھا اور بہت سے پکے پکے بیر توڑے اور سوار کی خرجی میں بھر دیئے۔ سوار وہاں سے جانے لگا تو اس نے کوڑا ہاتھ میں لیکر اُس آدمی سے کہا۔ سچ بتا کہ اب بھی کبھی ایسی کاہلی کرے گا یا نہیں؟ اس نے جواب دیا۔ نہیں بھائی۔ اب میں اپنے سب کام اپنے ہاتھ سے کیا کروں گا۔

امیروں اور راجہ نوابوں کو کوڑے مارنے والا تو کوئی نہیں ہے لیکن خدا کی قدرت ہمیشہ ان کے کوڑے مارتی رہتی ہے۔ یعنی وہ چونکہ چلتے پھرتے نہیں اور اپنے کام اپنے ہاتھ سے نہیں کرتے اس واسطے ان کا کھانا ہضم نہیں ہوتا۔ وہ بھی اور ان کے بچے بھی ہمیشہ بیمار رہتے ہیں۔ راجہ نوابوں کے بچے کالجوں اور سکولوں میں پڑھنے جاتے ہیں تو اپنا کام اپنے ہاتھ سے نہیں کرتے۔ کئی کئی نوکر ان کے ساتھ ہوتے ہیں اور وہ پانی پینے میں بھی نوکروں کے محتاج ہوتے ہیں۔

میرے دادا صبح کے وقت دو سیر کھچڑی اور سیر بھر گھی کا ناشتہ کیا کرتے تھے بعد بندوق لیکر جنگل میں شکار کرنے چلے جاتے تھے اور دن بھر پیدل پھرتے تھے۔ شام کو ہرن شکار کر کے لاتے تھے اور اپنے ہاتھ سے ہرن کا گوشت بھونتے تھے اور قریباً پورا ہرن اکیلے کھا جاتے تھے۔ مگر میں ان کا پوتا ایک ماشہ گھی بھی ہضم نہیں کر سکتا اور گوشت کی ایک بوٹی بھی نہیں کھا سکتا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ میں اتنی ورزش نہیں کرتا جتنی ہاضمے کے لئے ضروری ہے۔

ٹکے گز کی چال کا یہ مطلب ہے کہ انسان کپڑوں میں اور کھانے پینے میں فضول خرچی نہ کرے۔ کفایت شعاری کا خیال رکھے۔ رسولِ خدا کی وفات کے وقت لاکھوں آدمی ان پر ایمان لے آئے تھے اور ہر آدمی ان کی خدمت میں طرح طرح کے کپڑے اور طرح طرح کے کھانے لاتا تھا۔ مگر وہ سب چیزیں ان مسلمانوں کو بانٹ دیتے تھے جن کو غریبی اور مفلسی کے سبب کپڑا اور کھانا میسر نہ تھا۔ یہاں تک کہ جب رسولِ خدا کی وفات ہوئی تو آن کا تہمد گاڑھے کا تھا۔ اور آپ کی چادر میں بہت سے پیوند لگے ہوئے تھے۔

ایک دفعہ رسولِ خدا کے دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ رسولِ خدا سوتے سوتے اٹھے اور آن کے بدن پر اُس ٹاٹ کے نشان پڑ گئے۔ جس پر وہ سوتے تھے۔ حضرت عمرؓ یہ دیکھ کر رونے لگے۔ اور انہوں نے عرض کی میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ روم کے قیصر اور ایران کے کسریٰ تو ہر طرح کے عیش کریں۔

اور آپ خدا کے رسول ہیں اور قیصر اور کسریٰ سے آپ کی شان بہت بڑی ہے ایسی تکلیف کی زندگی بسر کریں۔ آنحضرتؐ نے جواب دیا۔ "اے عمرؓ میں غریب ہوں اور غریبوں کی غریبی دور کرنے کیلئے مجھے خدا نے رسول بنایا ہے۔ اس لئے میں قیصر اور کسریٰ کی ریس نہیں کرنی چاہتا۔ بلکہ اپنی غریب اُمت کی غریبی کا ساجھی بننا چاہتا ہوں۔ ایک وقت آئے گا کہ قیصر اور کسریٰ کے خزانے تمہارے قدموں میں آ جائیں گے۔ مگر تم جب بھی عیش اور آرام طلبی میں مبتلا نہ ہونا۔

حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو انہوں نے شام کے گورنر امیر معاویہ کو دیکھا کہ وہ بہت قیمتی لباس پہنے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے درہ اُٹھایا اور چاہا کہ امیر معاویہ کو ماریں۔ اور پوچھا کہ تو نے رسولِ خدا کی ہدایت کے خلاف ایسا لباس کیوں پہنا ہے۔ امیر معاویہ نے جواب دیا رعایا پر رعب قائم رکھنے کیلئے یہ لباس پہنا ہے۔ مگر اس لباس کے اندر دیکھئے میرے وہی غریبانہ کپڑے موجود ہیں۔

بیت المقدس کی فتح کیلئے حضرت عمرؓ نے فوج بھیجی۔ بیت المقدس کے حاکم نے مسلمان سپہ سالار کو اطلاع دی کہ ہماری پرانی کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ بیت المقدس کو وہ فتح کریگا جسکے نام میں تین حروف ہوں، اور تمہارے خلیفہ کے نام میں تین حروف ہیں۔ اس واسطے تمہارے خلیفہ خود یہاں آ جائیں تو میں یہ ملک اُن کے حوالے کردوں۔ سپہ سالار نے یہ خبر حضرت عمرؓ کو بھیجی۔ حضرت عمرؓ ایک غلام کے ساتھ مدینے سے روانہ ہوئے تو کھجور کے ستوؤں کے دو تھیلے اونٹ پر رکھ لئے۔ ایک منزل حضرت عمرؓ اونٹ پر بیٹھ جاتے تھے اور غلام اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلتا تھا اور ایک منزل غلام اونٹ پر بیٹھ جاتا تھا اور حضرت عمرؓ پیدل چلتے تھے۔ یہاں تک کہ جب بیت المقدس کی منزل قریب آئی اور مسلمان فوج کے سردار اور سپہ سالار استقبال کیلئے آئے تو اُس وقت غلام کی باری اونٹ پر بیٹھنے کی تھی۔ غلام نے کہا۔ میں اپنا حق آپ کو دیتا ہوں آپ خلیفہ ہیں دشمن یہ دیکھے گا کہ آپ پیدل چل رہے ہیں اور غلام اونٹ پر بیٹھا ہے تو اس کی نظروں سے آپ کی عزت جاتی رہے گی۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ عزت بس خدا اور اُس کے رسولؐ کے لئے ہے۔ میں انصاف کے خلاف کوئی کام نہیں کرونگا۔ تو اگرچہ میرا غلام ہے مگر مجھ جیسا آدمی ہے۔ میں نے جو کچھ طے کیا ہے کہ ایک منزل تو سوار ہو اور میں پیدل چلوں اور ایک منزل میں سوار ہوں اور تو پیدل چلے۔ بس اب چونکہ تیرے بیٹھنے کی باری ہے تو میں اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلوں گا۔

مسلمان فوج کے سپہ سالار اور دوسرے سرداروں نے کہا کہ یا امیرالمومنین ایسا غضب نہ کیجئے اس سے لڑائی پر بہت برا اثر پڑیگا اور دشمن مسلمانوں کے خلیفہ کو جنگلی اور وحشی اور حقیر سمجھنے لگے گا۔ تو ہماری فوج کی ساکھ جاتی رہے گی۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا۔ میں حکم دیتا ہوں کہ کوئی شخص میرے عمل میں دخل نہ دے۔ میرے ہاتھ میں تلوار ہے اور میرے دل میں یہ یقین ہے کہ میں دُنیا اور ملک حاصل کرنے کے لئے یہ جنگ نہیں کرتا بلکہ خدا اور اس کے رسول کی سچائی ظاہر کرنے کے لئے میں نے تلوار میان سے نکالی ہے۔ اس واسطے میں دشمن کے سامنے حقیر اور ذلیل ہونے کی کچھ پروا نہیں کرتا۔ جب تک میرے ہاتھ میں تلوار ہے اور جب تک میرے دل میں خدا رسول کا یقین ہے میں برابر فتحیاب ہوتا رہوں۔

جب حضرت عمرؓ بیت المقدس کی پہاڑیوں کے نیچے پہنچے اور وہاں کے پادریوں اور حاکم نے یہ دیکھا کہ ایک آدمی اونٹ پر بیٹھا ہے اور ایک آدمی اونٹ کی نکیل پکڑے آرہا ہے اور سپہ سالار اور فوج کے سردار پیچھے آ رہے ہیں تو انہوں نے اپنے جاسوسوں سے دریافت کرایا کہ خلیفہ کون ہے؟ جواب دیا گیا۔ وہ ہے جو نکیل پکڑے ہوئے ہے۔ اور اس کا غلام اونٹ پر سوار ہے۔ کیونکہ اس منزل میں باری غلام کی تھی کہ وہ اونٹ پر بیٹھے۔ یہ سنکر حاکم نے شہر کی کنجیاں منگائیں اور اپنے امیروں پادریوں کو جمع کرکے کہا۔ دیکھو ایسی قوم سے لڑنا حماقت ہے۔ جس کا خلیفہ انسانی حقوق کو اتنا سمجھتا ہو اور ٹھیک طرح برتتا بھی ہو۔ پس میں شہر کی کنجیاں خلیفہ کے پاس بھیجتا ہوں اور اس کی اطاعت قبول کرتا ہوں۔ سب پادریوں اور امیروں نے بھی حاکم کی تائید کی۔ اور حضرت عمرؓ اسی ہیئت سے بیت المقدس میں فاتحانہ داخل ہوئے کہ اُن کا غلام اونٹ پر سوار تھا اور وہ اونٹ کی نکیل پکڑے ہوئے تھے۔ حاکم نے اور پادریوں نے حضرت عمرؓ کا استقبال کیا اور کہا پہلے ہمارا بڑا گرجا دیکھئے۔ حضرت عمرؓ اکیلے ان لوگوں کے ساتھ گرجا میں چلے گئے۔ اور اپنے سپہ سالار اور فوجی سرداروں کو حکم دیا کہ وہ باہر ٹھیرے رہیں۔ سپہ سالار نے آگے بڑھکر کہا۔ یہ بات احتیاط کے خلاف ہے ہم آپ کے ساتھ ضرور رہیں گے۔ حضرت عمرؓ نے اس سے انکار کیا اور دوبارہ حکم دیا کہ تم سب باہر ٹھیرو۔ اور میں اکیلا اندر جاؤں گا۔ چنانچہ حاکم اور پادری حضرت عمرؓ کے ساتھ اندر گئے۔ اور سب چیزیں دکھائیں حضرت عمرؓ نے کہا۔ عصر کی نماز کا وقت آگیا ہے۔ اب میں بقیہ چیزیں بعد میں دیکھوں گا۔ اب میں باہر جانا چاہتا ہوں۔ پادری نے کہا ہم سب آپ کو اجازت دیتے ہیں کہ آپ اس گرجا میں نماز پڑھ لیں۔ حضرت عمرؓ نے جواب دیا، بیشک میں یہاں نماز پڑھ سکتا ہوں۔ کیونکہ خدا نے میرے رسولؐ کو یہ حکم دیا تھا کہ اے محمدؐ ساری زمین تیرے لئے مسجد ہے۔ تو جہاں جی

ٹ گئی۔ چھوڑ دیجئے۔" اس نے لجاجت سے کہا۔ اب میں نے پردہ ہٹایا۔ میرے سامنے وہی معصوم صورت تھی جو چند منٹ پہلے ہلکا نیلا دوپٹہ اوڑھے ہوئے کھیل میں مصروف تھی۔ مجھے دیکھکر وہ مسکرائی۔ میں نے کہا۔ "اچھا تم ہو جو مجھے اتنی دیر سے تنگ کر رہی ہو۔ اچھا دیکھو اب کے ایسا مت کرنا۔" یہ کہکر میں نے ہاتھ چھوڑ دیا۔ اس نے ایک دفعہ اپنی ٹوٹی ہوئی چوڑی کو دیکھا۔ پھر مجھے دیکھکر زور سے ہنسی اور بھاگ گئی۔

———— :(۳): ————

دوپہر کو میں کھانا کھانے کے لئے اندر گیا۔ امّی نے کہا "اے ہے کیسا لڑکا ہے ہر وقت کمرے میں گھسا ہوا ہے کتابوں سے لپٹا رہتا ہے۔ یا بہت ہوا تو جنگل بیابان میں نکل گیا اور بس۔

"کیا ہوا امّی؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "کہئے آپ کو کیا کام ہے میں تو ہر وقت گھر ہی میں موجود رہتا ہوں۔"

"مجھے کیا کام ہوتا" امّی بولیں۔ "مگر جب گھر میں کوئی آیا کرے تو اسکو سلام تو کر لیا کر۔ تو تو پڑھ لکھکر بھی بالکل گدھا ہی رہا۔"

اب میں نے بائیں طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو سامنے چارپائی پر عنابی دوپٹے میں کوئی چیز نظر آئی۔ میں نے نیچی نظریں کر لیں۔ پھر دیکھا اور بہت جھک کر سلام کیا۔ یہ ہماری ہمسائی، امّی کی منہ بولی بہن تھیں۔ انہوں نے دعائیں دیں اور بلائیں لیتے ہوئے کہا۔ "بڑا سعادت مند بچہ ہے۔ کیسا نیک ہے شہر کی ہوا ذرا بھی تو نہیں لگی۔" (امّی سے مخاطب ہوکر) بہن اب کے برس کا ہوگا؟ ہماری پروین سے دو سال بڑا ہے۔ ماشاء اللہ بارہ برس کا ہوگا۔ خدا عمر دراز کرے۔ پھر دائیں بائیں دیکھکر بولیں۔ "اری پروین! کہاں بھاگ گئی؟ بھائی کو سلام نہیں کیا۔ شریر کہیں کی۔" سامنے کے برآمدے میں سے نیلے دوپٹہ میں مسکراتا ہوا چہرہ نظر آیا جیسے صاف آسمان میں چودھویں کا چاند۔ جھجکتی ہوئی میرے قریب آئی اور مسکرا کر کہا "بھائی جان سلام"

میں اُسے دیکھکر ایسا مبہوت ہوا کہ جواب دینا بھی بھول گیا۔ وہی نازک ہاتھ جو چند گھنٹے پیشتر میرے کمرے کا پردہ پکڑے ہوئے تھے، سلام کر رہے تھے۔ میں حیران ہوکر نہ معلوم کن خیالات میں گم ہو گیا۔ کہ خالہ اماں (یعنی ہمسائی) نے کہا "بیٹھ جاؤ بیٹا۔"

میں اُسی چارپائی پر ایک طرف بیٹھ گیا۔ پروین بھی دوسرے کونے پر بیٹھ گئی۔ خالہ اماں بڑی دیر تک مجھ سے سکول، پڑھائی اور بورڈنگ کے متعلق پوچھتی رہیں۔ پروین بڑی سنجیدہ صورت بنائے سب سن رہی تھی۔ میری نظریں نیچی [illegible] نے اب غور سے دیکھا اچھی تنگ [illegible] حسن جیسے سب کا [illegible] لمبے لمبے بال، بڑی بڑی آنکھیں۔ کانوں میں خوشنما آویزے۔ جیسے چاند کے نزدیک دو بیقرار تارے۔ میں نے پھر نظریں جھکا لیں۔ ایک بار پھر دیکھا۔ [illegible] میری طرف دیکھ رہی تھی۔ نظریں ملتے ہی مسکرا کر دوسری طرف دیکھنے لگی۔ [illegible] دل کے کسی اندرونی گوشے میں ایک سوئی ہوئی خواہش پھر بیدار ہوئی۔ میں نے [illegible] میں کہا کاش ایسی ہی ایک میری بھی بہن ہوتی۔

خالہ نے چلتے وقت میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "کبھی کبھی ہمارے گھر بھی آجایا کرو۔ تمہیں دیکھنے کو بڑا دل چاہتا ہے۔"

———— :(۴): ————

شام کو میں پروین کے گھر گیا۔ تھوڑی دیر تو میں پروین اور خالہ اماں باتیں کرتے رہے پھر خالہ اماں اٹھکر گھر کے کام کاج میں لگ گئیں۔ اور میں اور پروین باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر میں ہم ایک دوسرے سے ایسے مانوس ہو گئے جیسے پرانے دوست ہوں۔ گھر میں پروین، خالہ اماں اور نوکر چاکر رہتے تھے۔ پروین کے ابا دوسرے شہر میں نوکر تھے۔ پروین کے بھی کوئی بھائی یا بہن نہ تھا۔ اسکو بھی بالکل میری طرح ایک بھائی کی ضرورت تھی۔ ہم دونوں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک کہ رات ہو گئی اور گھر سے نوکر بلانے آیا۔ گھر آکر امّی نے کہا کہ "ایسے جاکر بیٹھ رہے کہ آنے کا نام نہیں لیا۔ یا تو کہیں جائیں گے نہیں اور جائیں گے تو بس وہیں کے ہو رہیں گے۔" میں مسکرا کر چپ ہو گیا۔ آج میں بڑا خوش تھا میری دیرینہ آرزو پوری ہو گئی۔ آج مجھے اپنے خوابوں کی تعبیر معلوم ہو گئی۔

میں نے کھانا کھاتے ہوئے امّی سے کہا۔ "امّی پروین بڑی اچھی لڑکی ہے۔ ہماری بھی ایک ایسی ہی بہن ہوتی تو کیا اچھا ہوتا۔"

"ہٹ پگلے!" امّی نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے کہا۔ "پروین تیری بہن ہی تو ہے۔"

یہ بات سنکر میرا دل پھولا نہ سمایا۔ اب میں روز صبح ہی سے پروین کے گھر چلا جاتا۔ وہاں ہم دونوں بڑی دیر تک باتیں کرتے رہتے۔ میں اسے بورڈنگ سکول، وہاں کے لڑکوں کا حال سناتا تو وہ بڑی دلچسپی سے سنتی۔ پھر وہ کوئی کتاب لے آتی۔ ہم دونوں اسکی تصویریں دیکھتے۔ میں کسی رسالہ میں سے افسانہ سناتا۔ کبھی پروین ہمارے گھر آجاتی وہاں ہم دونوں باغ میں کھیلتے رہتے۔ کیاریاں بناتے، اس میں پودے لگاتے۔ غرض دن اسی طرح گذرتے گئے۔ پروین کے ملنے سے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے واقعی ہم دونوں سگے بھائی بہن ہیں۔

:(۵):

اب چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں۔ میں کمرے میں بیٹھا ہوا ایک رسالہ پڑھ رہا تھا۔ پروین میرے رومال پر پھول کاڑھ رہی تھی۔ میں نے رسالہ پڑھتے ہوئے کہا۔

"پروین!"

"جی بھائی جان" اُس نے ہاتھ روک کر چونکتے ہوئے کہا۔

"میں تم سے ایک بات تو کہنا بھول ہی گیا۔ اب میری چھٹیاں ختم ہونے والی ہیں"

"تو پھر آپ چلے جائیے گا؟" جیسے کوئی کسی آئندہ کے خطرے کے احساس سے چونک جائے۔ اس طرح اُس نے چونک کر پوچھا۔

"ہاں میں دو ایک روز میں چلا جاؤں گا۔"

"دو ایک روز میں!" اُس نے زیر لب کہا اور سُنکر ہو کر سر جھکا لیا۔

میں نے پوچھا "کیا ہوا پروین؟"

"وہاں جا کر آپ ہمیں تو نہ بھول جائیے گا۔" اُس نے سر اُٹھا کر نم آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"دھت پگلی! کوئی بھی اپنی بہن کو بھول جاتا ہے جو میں تجھے بھول جاؤں گا۔"

یہ سُنکر وہ مُسکرانے لگی اور پھر کاڑھنے میں مشغول ہو گئی۔

:(۶):

آخر وہ دو ایک دن بھی پورے ہو گئے۔

آج میں شام کی گاڑی سے دہلی جا رہا تھا۔ پروین صبح ہی سے آ گئی۔ میرا اسباب باندھا۔ کپڑے ٹھیک کئے۔ کتابیں، تولیہ، برش، منجن، صابن، ہینڈ بیگ میں رکھا۔ سب سامان ٹھیک کر دیا۔ مگر آج وہ خلاف معمول حد درجہ اُداس تھی۔ میں نے پوچھا "پروین! آج سُست کیوں ہو رہی ہو؟"

امی نے بھی کہا۔ "ہاں آج صبح سے سُست سُست سی کیوں ہو رہی ہو؟ کیسا جی ہے؟"

"کچھ نہیں۔ میں تو بالکل اچھی ہوں"۔ پروین نے ٹالتے ہوئے کہا اور ناشتہ دان لیکر باورچی خانہ کی طرف چلی گئی۔

میں نے جا کر پوچھا۔ "کیوں پروین! آج کیا بات ہے؟ آخر کچھ بتاؤ تو سہی۔"

اُس نے بات ٹالتے ہوئے کہا۔ "اب آپ آئیں گے کب؟"

"اوہو!" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اب میں سمجھا۔ تم میرے جانے سے رنجیدہ ہو رہی ہو۔ میں اب دو مہینے بعد ہی چھٹیوں میں آؤں گا۔"

"دو مہینے بعد" — "اچھا — میرے خطوں کا جواب دیں گے آپ"؟

"ضرور۔ کیوں نہیں۔ اپنی بہن کو کون جواب نہیں دیتا۔ لیکن یہ تو بتاؤ تم بھی میرے خطوں کا جواب دو گی؟"

"اپنے بھائی کو کون جواب نہیں دیتا۔" اُس نے شرارت آمیز لہجے میں مُسکراتے ہوئے کہا۔

شام تک وہ ہمارے گھر ہی رہی۔ جب تانگہ میں میرا سامان رکھ دیا گیا اور میں امی سے رخصت ہونے لگا تو انہوں نے مجھے پیار کرتے ہوئے کہا "خدا سلامت خیریت کے ساتھ لائے۔"

میں چلنے لگا تو پروین مجھے دروازے تک پہنچانے آئی۔ چلتے وقت اُس نے کہا۔ "بھائی جان سلام۔"

میں نے دیکھا اسکی آنکھوں میں آنسو جھلک رہے ہیں۔ میرا دل بھی اس وقت بھاری ناؤ کی طرح ہل رہا تھا۔ میں نے بمشکل اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "سلام پروین"۔ اور جلدی سے تانگے میں بیٹھ کر اپنے گرتے ہوئے آنسوؤں کو رومال میں جذب کیا۔ جب تک تانگہ نظروں سے اوجھل نہ ہوا وہ برابر دیکھتی رہی۔

:(۷):

سکول جا کر میرا بالکل جی نہ لگا۔ میں سوچتا کاش ہمارے گاؤں میں کوئی سکول ہوتا اور میں وہیں پڑھتا۔ اور اپنی پیاری بہن سے الگ نہ ہوتا۔ دوسرے دن سکول کی چھٹی تھی۔ میں اپنے کمرے کے آگے لان پر کرسی ڈالے لیٹا ہوا تھا۔ دسمبر کے مہینہ کی خنک مگر خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ سنہری دھوپ اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ سبزہ کے مخملی فرش پر پھیلی ہوئی تھی۔ میں بظاہر تو کرسی پر دراز تھا مگر درحقیقت وہاں سے بہت دور گاؤں کی رنگین فضاؤں میں کھویا ہوا تھا۔ اور تخیل میں پروین کے کمرے میں لیٹا ہوا اُسے افسانہ سنا رہا تھا۔

"لیجئے بابو جی آپ کے نام کا" ڈاکیہ کی کرخت آواز سنائی دی میں ایکدم چونک پڑا — "خط ہے۔" اُس نے جملہ پورا کرتے ہوئے ایک ہلکے آسمانی رنگ کا نازک سا لفافہ میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے خط لیکر پڑھا۔ مُہر دیکھی۔ گاؤں سے خط آیا تھا۔ یہ میرے لئے کوئی نئی چیز نہ تھی۔ ہمیشہ گاؤں سے خط آیا کرتے تھے۔ مگر اس لفافہ میں نہ معلوم کیا کشش تھی کہ میں چند منٹ تک پتہ پر جو کسی کی شوخی تحریر کی غمازی کر رہا تھا نظر جمائے رہا۔ اپنے نام سے پہلے بھائی جان

[illegible] نہ معلوم کیا کیا [illegible] نظر آ رہی تھیں۔

خط چاک کر کے میں نے پڑھا۔ اس میں لکھا تھا۔ "بھائی جان سلام!
جب سے آپ گئے ہیں میرا جی نہیں لگتا۔ اماں ابا بھی آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔
وہاں آپ کیا کرتے ہیں۔ اب کب آئیے گا۔" میں بہت دیر تک خط پڑھتا رہا۔ کئی
بار اور پھر ایک مرتبہ تصورات کی دنیا میں کھو گیا۔

پروین کے خط ہر دوسرے تیسرے دن آتے تھے میں بھی فوراً جواب
دیتا۔ کبھی وہ لکھتی:۔

"شاید آپ کو یاد ہو کہ ہم نے اور آپ نے جو کیاریوں میں گلاب لگائے
تھے اب ان میں کلیاں آ گئی ہیں۔ دو ایک روز میں پھول بھی آ جائیں گے۔ میں روز صبح
اٹھ کر منہ اندھیرے پانی دیتی ہوں ـــــ ہماری گائے نے جس کا نام آپ نے
موتی رکھا تھا بچھڑا دیا ہے وہ بہت چلبلا ہے۔ شاید آپ کو یاد کرتا ہے۔"

جب میں پروین کا خط پڑھتا تو سکول کی تمام کوفت دور ہو جاتی میں
سوچتا کہ میری بھی ایک بہن ہے۔ اب میں دنیا میں اکیلا نہیں ہوں۔

چھٹیاں ہوئیں۔ میں گاؤں گیا۔ پروین کیلئے بندے لیتا گیا۔ میں نے
اُسے پہنا کر پوچھا "پروین! تم کتنی اچھی بہن ہو۔"

"اور آپ کتنے اچھے بھائی ہیں۔" اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

"میرا حقیر تحفہ بھی قبول ہوگا۔" یہ کہتے ہوئے اس نے ایک خوبصورت
ریشمی رومال جس کے کونے پر "راحت" خوبصورت پھولوں کے کنج میں چمک رہا تھا
میرے ہاتھ میں دیدیا۔

"تم نے میرا نام کس کی اجازت سے کاڑھا" میں نے شرارتاً کہا

"اور آپ میرے لئے بندے کس کی اجازت سے لائے" اس
نے مسکرا کر برجستہ جواب دیا۔

ـــــ:(۸):ـــــ

چھٹیاں ختم ہونے پر میں دلی واپس آگیا۔ پروین کے خط برابر آتے رہتے
تھے۔ میں بھی فرصت کے اولین لمحات میں اسکے خطوں کا جواب دیتا۔ امی بھی اکثر اپنے
خطوں میں لکھتیں کہ پروین تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔

عیش و مسرت کے دن بھی کتنی جلدی گذر جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانچ
سال گذر گئے۔ میں سکول کی محدود فضا سے نکلکر کالج کے وسیع میدان میں آگیا۔ نئی دنیا
نئی دلچسپیاں، نئے ساتھی، نئی امنگیں۔ مگر میں ہنوز پرانا تھا۔

پروین بھی عہد طفلی سے شباب کی سمت آ رہی تھی۔ اب اسکے خطوں میں
ایک خاص قسم کی چاشنی ہوتی تھی۔ میں پڑھتا اور دیر تک لطف اندوز ہوتا۔ جیسے
ایک [illegible]
میں محسوس کرنے لگتا ہے۔ [illegible]
شوخی تحریر اور رنگین بیانی سے [illegible]

ایک خط میں اس نے لکھا: اب آپ کالج میں لگ گئے ہیں [illegible]
اور کالج کی [illegible] مجھے [illegible]

میں نے اسے لکھا "بہن پروین! تم کتنی پگلی ہو۔ [illegible]
ساتھی ہیں اور تم میری بہن ہو۔ تم میں اور ان میں کتنا فرق ہے۔ اب تم خود ہی
فیصلہ کر لو کہ کون بھلایا جا سکتا ہے اور کون یاد رکھا جا سکتا ہے۔ ہاں یہ اور
بات ہے کہ تم "اپنے گھر" جا کر مجھے بھول جاؤ۔

تیسرے دن پروین کا خط آیا۔ اس نے لکھا۔

"بھائی جان! آداب! آپ نے لکھا ہے کہ یہ اور بات ہے کہ تم اپنے
گھر جا کر مجھے بھول جاؤ ـــــ اپنے گھر سے آپ کا کیا مطلب ہے۔ کیا اب میں
اپنے گھر نہیں ہوں ـــــ اچھا اب میں بھی ـــــ اپنے گھر سے آپ کا یہ مطلب ہے
نا کہ جب میرا ـــــ میرا بیاہ ہو جائیگا ـــــ ہیں نا ـــــ آپ بڑے
ویسے ہیں ـــــ دیکھئے آئندہ ایسی بات نہ لکھئے گا۔"

اسی طرح ہماری اس خط و کتابت کا سلسلہ جاری تھا۔ ایک مرتبہ خلاف
معمول اس نے خط کا جواب نہ دیا۔ مجھے بہت پریشانی ہوئی۔ کہیں خدانخواستہ
طبیعت ناساز نہ ہو۔ لیکن ایسے موقعہ پر خالہ اماں یا امی کوئی میرے خط کا جواب
ضرور دیدیتا۔ عام طور سے تیسرے دن جواب آ جاتا تھا مگر اب پانچواں روز تھا۔ اب
مجھے اور بھی فکر لاحق ہوئی۔ خدا معلوم کیا حادثہ پیش آیا۔ چھٹے روز مجھے جواب ملا
بہت مختصر اور مجمل۔

"بھائی جان! آپ نے نہ معلوم کیا کیا شکوک میرے جواب نہ دینے سے
پیدا کئے ہوں گے۔ مگر کاش آپ میری مجبوری سمجھ سکتے۔ کچھ لوگ اب ہماری آپکی
خط و کتابت پر اعتراض کرتے ہیں۔ "آپکی بہن پروین"

اعتراض کرتے ہیں! ہماری خط و کتابت پر!! کیوں؟ کیا ایک بھائی
بہن کو خط نہیں لکھ سکتا؟ ـــــ کیا یہ جرم ہے؟ آخر کیوں؟ میں انہیں
خیالات کی گتھیاں سلجھا رہا تھا کہ میری نظر دوسرے لفافہ پر پڑی جو اسی کے پاس
پڑا تھا۔ یہ امی کا خط تھا۔ کیا لکھا تھا؟ بس کچھ نہ پوچھو ـــــ وہی امی
جنہوں نے یہ کہا تھا کہ "اب سے یہ تیری بہن ہی تو ہے۔" آج خط میں لکھ
رہی ہیں:۔

"بیٹا! تم کچھ نا سمجھ تو ہو نہیں۔ بچپن کا تو نہ سمجھی کا ہوتا ہے جب بہت

ہم لوگ کافی مہذب سمجھے جاتے ہیں اور شگفتگی کے نقطۂ نظر سے بھی پٹھانوں سے زیادہ جدید خیالات رکھتے ہیں۔ تم کالج میں پڑھ رہے ہو۔ زمانے کے نشیب و فراز سے واقف ہو۔ میں نے ماناکہ پروین کو تم بہن سمجھتے ہو۔ مگر اور لوگ تو ایسا نہیں سمجھتے۔ ابھی پچھلے ہفتے ۱۱ آپا کی سلام کرنے کے بعد میرے پاس آکر بیٹھ گئیں۔ ادھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد بولیں۔ بی بی ایک بات کہوں۔ اگر ناراض نہ ہوں تو ـــ میں نے کہا ہاں ہاں ضرور کہو۔ تو انہوں نے رُک رُک کے اتنی بات کہی کہ تحصیلدار صاحب کی بیٹی (پروین) کے پاس چھوٹے میاں (یعنی) کے کچھ خطوط اور ایک تصویر نکلی۔ وہ بڑے ناراض ہو رہے تھے۔ وہ تو اتنا کہکر چپ ہو گئیں۔ میں نے بہترا پوچھا مگر اس نے اور کچھ نہ بتایا۔ میں تو پہلے ہی ڈرتی تھی کہ کچھ نہ کچھ ضرور ہونے لگا۔ تم سمجھدار ہو۔ اب خود خیال رکھنا۔ تمہاری امی "

میں خط پڑھکر سناٹے میں آگیا۔ سر سے پاؤں تک گویا برقی رَو دوڑ گئی ایسا معلوم ہوا جیسے زمین آسمان مکان، در و دیوار، درخت بڑے زور سے گھوم رہے ہیں۔ چاند، تارے، سورج بڑی تیزی سے گردش کر رہے ہیں۔ اجرام فلکی ایک دوسرے سے ٹکرا کر عنقریب فنا ہو جائیں گے۔ ایسا معلوم ہونے لگا گویا رات ہو رہی تھی۔ اور بس ـــ آدھ گھنٹہ بعد مجھے محسوس ہوا کہ میں کرسی پر پڑا ہوں اور باوجود ماہ دسمبر کی خنک ہوا کے میں سر سے پاؤں تک پسینہ میں ڈوبا ہوا ہوں۔ بڑی مشکل سے اپنے کمرے میں آکر پلنگ پر لیٹ سکا۔ میں نے سوچا ایسا کیوں ہے۔ مجھ میں اور پروین میں اب کون سی نئی بات پیدا ہو گئی ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اب ہم بچپن کے معصوم دور سے نکل کر جوانی کے حدود ہوش میں آ گئے ہیں۔ لوگ کیا خیال کرتے ہیں۔ کیا سب کے دل اس درجہ تاریک ہیں کہ وہ سوائے گناہ و معصیت کے خلوص و الفتِ صادق کا خیال تک دل میں نہیں لا سکتے۔ میری اور پروین کی محبت سے کیوں شک پیدا ہوتا ہے؟ کیا صرف اس لئے کہ ہم دونوں جوان ہیں اور غیر ہیں۔ کیا ایک عورت اور مرد کے درمیان جنسی تعلقات کے علاوہ کوئی تعلق قائم نہیں ہو سکتا۔ افسوس دنیا کی نظریں کس قدر ظاہر بین ہیں۔ پروین پہ کیا گذر رہی ہوگی؟ میں جانتا تھا کہ پٹھانوں کی قوم میں جذبۂ غیرت اور ساتھ ہی ساتھ بدگمانی کا جذبہ بہت شدید ہوتا ہے۔ وہ دُنیا بھر کی باتیں برداشت کرتا ہے لیکن جہاں اسکی غیرت مجروح ہوتی ہے اور جذبۂ قومی کو ٹھیس لگتی ہے وہ آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ اور پھر کر گزرتا ہے جسکی توقع ایک ذی ہوش اور سمجھدار آدمی سے نہیں کی جا سکتی۔ پروین کے والد حمیداللہ خاں سرحدی پٹھانوں میں سے تھے۔ خدا معلوم کیا سمجھے ہونگے اور کیا کر گزرتے ہونگے۔ لیکن پروین کے پاس میرا فوٹو کس طرح پہنچا۔ میں نے بہت غور کیا مگر کسی طرح سمجھ میں نہ آیا۔ کئی روز بعد جب میں اسی خیال میں تھا تو اچانک یاد آیا کہ سکول کے زمانہ میں جب میں کرکٹ کیپٹن تھا اس سال فائنل میچ جیتنے پر ساری ٹیم کا گروپ کھنچا تھا۔ میں نے اس میں سے اپنا فوٹو الگ کر لیا تھا۔ اسکے بعد ہی سالانہ تعطیل میں جب میں گھر گیا تو پروین نے جہاں جملہ اشیاء کی تلاشی لی وہاں میرے سوٹ کیس پر بھی نظرِ عنایت ہوئی اور وہ تصویر بحق سرکار ضبط کر لی گئی۔ میں نے ہر چند کہا کہ میں تمہیں دوسری دیدونگا۔ یہ میری کپتانی کے زمانہ کی ہے۔ مگر وہ کہاں ماننے والی تھی۔ بغرض یہ تصویر وہ تھی۔

کالج میں میری طبیعت بڑی اُلجھتی۔ خدا معلوم محض شک کی بنا پر بیچاری پر کیا بیتی ہوگی۔ ادھر امی کا بھی ایک خط اور آیا جس میں اسی قسم کی نصیحتیں، رسوائی و بدنامی کا خوف، دھمکی اور خدا جانے کیا کیا تھا۔

کئی ہفتہ بعد ایک دن کالج کے پتہ پر پروین کا خط ملا۔

" بھائی جان! اپنی بدنصیب بہن کا سلام قبول کیجئے۔

آپ کو خالہ اماں کے خط سے بہت سی باتوں کا پتہ ہو گیا ہوگا۔ قصہ یوں ہوا کہ آپا چھٹی لیکر آئی تھیں۔ ایک دن میں آپ کے خط کا جواب لکھ رہی تھی۔ انہوں نے پوچھا کیا لکھ رہی ہے؟ میں نے کہا خط ـــ

"کسے؟" میں نے آپ کا نام لیا۔ انہوں نے سنتے ہی ناک بھوں چڑھائی ـــ "راحت! کون راحت؟" میں نے آپ کا پتہ بتایا۔ انہوں نے کہا "اچھا وہ ـــ اُسے کیوں لکھ رہی ہے۔ کیا تعلق ہے اُس سے؟ کون لگتا ہے وہ تیرا؟" غرض اُن کا غصہ ایک دم بڑھ گیا۔ اللہ جانے وہ کیا سمجھے اور مجھے بہت بُرا بھلا کہا ملعون، مردود، ننگ خاندان، کلنک کا ٹیکا۔ اور خدا جانے کیا کیا کہا۔ میں سب سن رہی تھی اور خون کے سے گھونٹ پی رہی تھی۔ میں نے وہ خط پھاڑ ڈالا۔ بات آئی گئی ہوئی۔ میں ایک دن عصمت کے گھر گئی تھی۔ اُن کو میرے پیچھے نہ جانے کہاں سے وہ آپ کی تصویر مل گئی۔ اب تو گویا آگ پر تیل پڑ گیا۔ اسکو دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گئے۔ جس وقت میں ڈولی سے اُتری تو اُن کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ گردن کی رگیں پھول گئیں۔ دُنیا بھر کے خطابات مجھے دیئے گئے۔ مگر وہ ابا جنہوں نے مجھے آج تک ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا آج مارنے کو دوڑے۔ وہ تو امی بیچ میں آ گئیں۔ ورنہ مجھے خود یہ "اقدام گناہ" نہ کرنا پڑتا۔

بھائی جان! دنیا والوں کی آنکھیں سطحی چیزیں دیکھنے کی عادی ہیں۔ انکی عقل اس درجہ محدود ہے کہ وہ یہ نہیں سمجھ سکتے کہ ایک نوجوان مرد اور عورت ہر قسم کی خواہشات سے الگ ہو کر بھی مل سکتے ہیں۔ یہ بات ان کی فہم سے بالاتر ہے کہ وہ دونوں سچی محبت بھی کر سکتے ہیں۔ وہ محبت جو ایک بھائی کو بہن سے ہوتی ہے۔ سماج کے یہ دیوتا جو خود ساختہ خلاف فطرت قوانین کو جو اُن کی نظر میں اللہ اور اسکے

بوندوں سے دل میں گھاؤ کئے ہیں
جانے کب کے بدلے لئے ہیں

وہ دل کتنا نازک مجروح اور دُکھا ہوا ہوگا جس میں ساون کی رم جھم اور نازک بوندیں گھاؤ کر دیں۔ اور پھر یہ سوال ——
جانے کب کے بدلے لئے ہیں

تو ایک بار پڑھنے کے بعد بہت دن تک یاد رکھنے کے قابل ہے۔

تشبیہات

تخشب کی شاعرانہ فطرت کا زیادہ تر رجحان غزل کی طرف ہے۔ مگر نظموں اور قطعوں میں بھی ان کی طبیعت اپنے جوہر دکھائے بغیر نہیں رہتی۔

وہ شعرا جو غزل" کہنے کے بعد نظم، قطعہ یا رباعی کہتے ہیں شعر کی کسی صنف میں ناکامیاب نہیں ہو سکتے۔ غزل گو شاعر کے خیالات میں عام طور پر سلجھاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور الفاظ کے برمحل برتنے کا سلیقہ آ جاتا ہے غزل بہت ہی لطیف، سادہ اور سلیس الفاظ چاہتی ہے۔ ثقیل اور کرخت لفظ غزل برداشت ہی نہیں کر سکتی۔ اسکے برخلاف جن شاعروں کی ابتدا نظم سے ہوتی ہے ان کے یہاں الفاظ کا توازن نسبتاً کم پایا جاتا ہے۔ اردو شاعر کو غزل کی منزل سے گریز ضروری ہے۔

تخشب چونکہ غزل کے بعد نظم کی منزل میں آئے ہیں اس لئے ان کے یہاں خیالات کا سلجھاؤ اور لفظوں کا صحیح استعمال پایا جاتا ہے۔ وہ دلکش تشبیہیں اور دل نشین استعارے استعمال کرتے ہیں۔ ایک قطعہ ہے ؎

چھو رہی ہے نرم رو جھونکوں سے پانی کو نسیم — اسطرح آغوش میں لہروں کے کھلتے ہیں کنول
جیسے کسی دوشیزہ کے ہم جولیوں کی چھیڑ سے — ضبط کرتے کرتے بھی پڑ جاتے ہیں ماتھے پہ بل

کتنی اچھوتی تشبیہہ ہے کہ پڑھئے اور لطف لیجئے۔ اور اگر تصور بھی ہم رکاب ہو تو پھر دوشیزگی کے سایہ میں انگڑائیاں لیتے ہوئے اکبر الہ آبادی کا یہ شعر گنگنائیے ؎

وہ توڑتے ہیں تو کلیاں شگفتہ ہوتی ہیں
وہ روندتے ہیں تو سبزہ نہال ہوتا ہے

تخشب کا ایک شعر ہے ؎

اس جلوۂ رنگیں کے دھوکوں کا اثر تو یہ
ہر منظر رنگیں سے بیزار ہوئی آنکھیں

نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے یہ شعر کس قدر اثر انگیز ہے وہ جو ہندی کی کہاوت ہے کہ "دودھ کا جلا چھاچھ پھونک کر پیتا ہے"۔ تو تخشب نے اس

حرفِ آخر

تخشب [illegible] ابھی [illegible] ادھر آئے [illegible] لکی [illegible] نہ کر سکے [illegible] ایک شعر ہے ؎

ادھر آرزو میں اُدھر آرزو میں — جوانی کی منزل بہت پُر خطر ہے
تو اس منزل پُر خطر میں ؎

چلے کتنا ہی بچ کر کوئی ٹھوکر کھا ہی جاتا ہے

تخشب کی فطرتِ جوان نے بھی شاعری کی منزل میں ٹھوکریں کھائی ہیں۔ وہ بھی احتیاط کے باوجود لغزشوں سے نہیں بچ سکے۔ تو یہ کوئی بری بات نہیں ہے۔ بشرطیکہ آدمی ٹھوکر کھا کر سنبھل جائے۔ یقین ہے زندگی کے دورِ مستقبل میں تخشب کی شاعری کا رنگ اور زیادہ نکھرے گا زندگی کے نئے نئے تجربات اُن کے خیالات میں وسعت و تعمق پیدا کریں گے۔ زمانہ کی تلخیاں اُن کے دل کو اور زیادہ سوز و گداز عطا کریں گی۔ اُس وقت اُن کی "فکر" پختگی کے اس مقام پر ہوگی جہاں شاعر "انسانیت" کو پیام دیتا ہے اور اُس کے پیام کو سن کر لوگ متوجہ ہو جاتے ہیں کہ زندگی کا کوئی نیا ورق اُلٹا جاتا ہے۔

میں ان دنوں بہت مصروف ہوں۔ سفر اور مسلسل سفر۔ مشاعروں نے پیروں میں چکر پیدا کر دیا ہے۔ شام دکن میں ہوتی ہے تو تیسرے دن کی صبح دہلی یا لکھنؤ کے جوار میں۔ بنگال سے چلا گجرات میں جا کر دم لیا۔ اس عالم میں کسی طویل مضمون لکھنے کی فرصت کہاں۔ بڑی مشکل سے "مشعلِ راہ" پر تھوڑا بہت لکھنے کے لئے وقت نکالا ہے۔ میں نے چند اشارے کئے ہیں جو مجمل ہیں مگر مبہم نہیں ہیں۔ ان اشاروں میں "مشعلِ راہ" کی چند جھلکیاں ہیں۔ اور ان جھلکیوں کی روشنی میں آپ صاحب "مشعلِ راہ" کی شاعرانہ تابانیوں کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

قسمت (حصہ ۱)

(از جناب سید نقی حیدر صاحب راہی بلگرامی)

میں نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ ایک ایسے دوست کی تلاش میں برباد کر دیا جو صرف عالم تخیل ہی میں سانس لے سکتا تھا۔ میرا منشا صرف اس قدر تھا کہ وہ نہ تو تاجرانہ نظریہ رکھتا ہو اور نہ کسی لوگوں کی طرح اپنے مولیشیوں کا نگہبان ہو۔ مگر میرا یہ خواب عرصہ دراز تک شرمندہ تعبیر نہ ہوا۔ یہاں تک کہ میری تقریباً پچیس بہاریں خزاں میں تبدیل ہوگئیں۔ ایک طویل خوفناک رات کے بعد آخر صبح کے وقت میری ملاقات ایک ایسے شخص سے ہوئی جس کو میرا تخیل ڈھونڈتا تھا۔ اس میں وہ تمام کمالات تھے جو ایک نیک سرشت انسان میں ہوسکتے ہیں۔ اچھی عادت۔ اچھی خصلت۔ نیک طبیعت۔ پاک سرشت۔ اچھی سیرت۔ اس کے آئینہ رخ میں وہ تمام جھلکیاں درخشاں نظر آتی تھیں جن کا میں جویا اور متمنی تھا۔ میری نظروں میں اس کی قدر و منزلت بڑھتی گئی اور اس نے میرے دل میں ایسا گھر کر لیا تھا جو اب تک کوئی نہ کر سکا تھا۔ مجھے اس سے بے حد محبت تھی اور وہ بھی مجھ پر فدا تھا۔ ہماری محبت کا پیمانہ بالکل صاف و شفاف تھا۔ نہ تو کوئی کدورت تھی اور نہ کھٹ پٹ لیکن افسوس ؎

بات بھی کرنے نہ پائے ہوش ہے رخصت طلب

دل کا دل ہی میں رہا جاتا ہے ارمان حیات

زمانے کی گردش نے اپنا رنگ دکھایا اور ہم دونوں بچھڑ گئے۔ میرا تبادلہ ایک دوسرے شہر میں ہوگیا۔ حکم حاکم مرگ مفاجات۔ مجھے اس عزیز دوست کو چھوڑنے کے سوا چارہ نہ رہا۔ موئے دوست کے بچھڑنے کے مجھے کوئی غم نہ تھا۔ ایک مدت تک خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ پھر اس میں کمی آنے لگی۔ اور پھر ایک ایسا وقت آیا کہ بالکل ہی بند ہوگئی۔ مجھے اس کا سخت صدمہ لاحق و رنج تھا۔ مجھے اس کی دوستی میں شبہ ہونے لگا۔ اس کی اس بھیانک خاموشی نے مجھ پر بڑا اثر کیا۔ اور میرا دل اسکی طرف سے آہستہ آہستہ منحرف ہونے لگا۔ جب کبھی میں اس کے پاس جانے کا ارادہ کرتا تو ایک نامعلوم تاریک غم مجھے جانے سے روک دیتا۔ اور میں رک جاتا۔ اور میں ایسا کھو جاتا کہ مجھے اپنی ذات کا بھی ہوش نہ رہتا۔

جب میرا کام ختم ہوگیا تو مجھے اپنے وطن مالوف کو لوٹ جانا پڑا۔ گو کہ میرا دل اسکی طرف سے شک و شبہ کی وجہ سے منحرف ہوگیا تھا۔ پھر بھی دبی ہوئی محبت کی چنگاری وطن کی شیرکیف ہوا سے بیدار ہوگئی۔ اور جذبہ محبت مجھے کشاں کشاں اس بیوفا دوست کی طرف لے چلا۔ چنانچہ رات کے ابتدائی حصہ میں اس کے عشرت کدہ پر گیا۔ مگر صد حیف میری آنکھوں نے وہ منظر دیکھا جس کے لئے میں تیار نہ تھا۔ میں نے اس گھر کو ایک چھوٹی سی جنت کی شکل میں دیکھا تھا۔ جہاں خوش نصیبی اپنی تمام دل فریبیوں کے ساتھ جلوہ گر تھی۔ اس میں رہنے والوں کے شاداب اور حسین چہروں پہ مسرت اور نشاط کی لہریں دوڑا کرتی تھیں۔ آج میں اسکو جس حالت میں دیکھ رہا تھا اس کے دیکھنے کی مجھ میں تاب نہ تھی۔ کاش کہ میں دیکھنے سے پہلے اندھا ہو جاتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے میں ایک سنسان اور وحشت ناک قبرستان میں آگیا ہوں۔ جہاں نہ کوئی سننے والا ہے اور نہ کوئی بولنے والا۔ نہ کہیں آدم زاد کی شکل نظر آتی ہے اور نہ کسی گوشہ میں چراغ جلتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایک طویل اور جیبت ناک خاموشی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ میں نے سوچا شاید میں گھر بھول گیا ہوں۔ مگر میرا یہ اندیشہ غلط تھا۔ یکایک مجھے ایک چھوٹے سے بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد ایک ہلکی سی روشنی نظر آئی۔ میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ تھوڑی دیر کے بعد دروازہ کھلا اور ایک چھوٹا سا مفلوک الحال بچہ باہر آیا جس کے ہاتھ میں ایک ٹمٹماتا ہوا چراغ تھا اور اس کے جسم پر چیتھڑے لٹک رہے تھے۔ میں نے چراغ کی روشنی میں غور سے اس بچہ کی شکل کو دیکھا۔ اس کے چہرے میں مجھے باپ کی شباہت نظر آئی۔ اور میں نے اسے پہچان لیا کہ یہ وہی نازپروردہ بچہ ہے جو کل اس گھر کا پھول اور چودھویں رات کا چاند تھا۔ میں نے اس سے اس کے باپ کا حال پوچھا۔ اس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور چراغ لیکر میری رہنمائی کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ایک خراب و خستہ عمارت اٹھے ہوئے کمرے میں مجھے لے گیا جس کی کرسیاں اور پردے پرانے ہو چکے تھے۔ اور دیواروں پہ کچھ اس قسم کے نشانات پڑ گئے تھے جیسے ہند عورتیں اپنے ہاتھوں پر گودنے کے نشانات کرواتی ہیں۔ یہ وہی کمرہ تھا جس میں ہم نے بارہا عیش و عشرت کی راتیں بسر کی تھیں۔ اور خوش نصیبی کے بارہ چاند دیکھے تھے۔ لڑکے سے مختصری گفتگو کے بعد ہم دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہوگئے۔ اور مجھے معلوم ہوگیا کہ اس کا باپ اب تک گھر واپس نہیں آیا ہے۔ عنقریب ہی آنے والا ہے۔ وہ طفل مجھے چھوڑ کر اندر چلا گیا اور تھوڑی دیر کے بعد واپس آیا اور کہنے لگا۔

"میری والدہ میرے باپ کے متعلق آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔"

[illegible] جانب جا رہے ہو۔ حالانکہ تم دُنیا سے [illegible] دُنیا تم سے پریشان ہے۔

میں تمہیں مجبور اور معذور سمجھتا، اگر آنے والی زندگی کا سرمایہ تمہاری اِس زندگی کے خسارے کو پورا کر دیتی۔ تم خوب جانتے ہو کہ پہلے تم غنی تھے۔ اب فقیر ہو۔ پہلے شریف تھے اب کمینے بن گئے ہو۔ لیکن اگر تم اب بھی سنبھلنے کی کوشش کرو تو سنبھل سکتے ہو۔ تمہاری اس گھناؤنی زندگی میں جو چیز بھی موت کے لئے مددگار ہو سکتی ہے خواہ وہ زہر ہی کیوں نہ ہو۔ اس کا ایک گھونٹ حاصل کرلو۔ یہ گھٹ گھٹ کر آنے والی موت سے بہتر ہوگا۔ ڈراؤنی سزاؤں سے جو اللہ پاک تمہیں دوسرے عالم میں دیگا، جو اِن سزاؤں کے مقابلے میں کہیں زیادہ مہیب ہونگی۔ میرے عزیز دوست! وہی تکالیف کیا کم ہیں جو قضا و قدر کے ہاتھوں اس میں اور اضافہ کر رہے ہو۔ لاؤ اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو اور عہد کرو کہ آج سے تم میرے لئے ویسے ہو جاؤ جیسے کل تھے۔"

میں نے اُسکی جانب ہاتھ بڑھایا۔ مگر میری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہی۔ جب میں نے دیکھا کہ اُس نے اپنے ہاتھ کو جنبش تک نہ دی۔ اور سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔

میں نے پوچھا۔ "اے عزیز! تم ہاتھ کیوں نہیں بڑھاتے"؟ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہونے لگی اور خستہ آواز میں بولا۔ "میں جھوٹا اور عہد شکن بننا نہیں چاہتا۔"

میں نے پوچھا "عہد پورا کرنے سے تمہیں کون روکتا ہے؟"

اُس نے کہا۔ "میری بد بختی! کاش کہ میں نے پہلا جام نہ چکھا ہوتا۔ مگر اب تو جو ہونا تھا سو ہو گیا۔"

میں نے اُس سے کہا۔ "بدی سے بچنے کیلئے ایک پختہ عزم ہی کافی ہے۔"

اُس نے جواب دیا "پختہ عزم راسخ ارادہ پر مبنی ہے۔ اور اب میں ایک ایسا مفلوک الحال شخص بن گیا ہوں جس کا نہ کوئی ارادہ ہے اور نہ کوئی خیال۔ میرے بہی خواہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔ اور اگر تم بدنصیب گنہگاروں پر رونا گناہ نہیں سمجھتے ہو تو اپنے ایک بدنصیب دوست پر آنسو بہا لینا۔"

خود غرض افسرِ اعلےٰ نے اپنے کل کے ہم نشین کو اپنی مجلس سے نکال دیا۔ پھر اُس کے کام میں نقص نکال کر اُسے نوکری سے علیحدہ کر دیا۔ گھر کے نئے مالک نے پرانے مالک کو چند روز سے زیادہ گھر میں نہ رہنے دیا۔ بدبخت انسان نے ایک تنگ و تاریک گلی میں ایک خستہ و بوسیدہ جھونپڑی میں پناہ لی۔ اب وہ مجھکو اکثر شراب خانے آتا جاتا دکھائی دیتا۔ جاتے دیکھتا تو

میں [illegible] سے شمی حالت [illegible] گھر تک پہنچا آتا۔ اس طرح [illegible] کو چاٹتے رہے۔ یہاں تک کہ اب وہ ایک چلتا پھرتا [illegible] خواب نظر آتا۔ راستہ چلتا تو حیران اور سرگرداں شخص کے [illegible] پیش کی اُسے خبر نہ ہوتی۔ کوئی چیز سامنے آجاتی تو اُسے اس وقت تک [illegible] ہوتی جب تک وہ بالکل قریب نہ آجاتے۔ ذرا ذرا دیر بعد رکتا اور [illegible] جیسے اُس کی کوئی شے گم ہو گئی ہے اسکو ڈھونڈ رہا ہے۔ حالانکہ اُس کے پاس کیا تھا جو وہ گم کرتا۔ جو کوئی اُس کے سامنے آتا اُس کی طرف گھور گھور کر دیکھتا۔ گویا کوئی ناگوار دشمن اُس کے سامنے ہے۔ حالانکہ نہ اس کا کوئی دوست تھا نہ دشمن۔ جب کبھی بچے اس کے کاندھوں پر چڑھ جاتے تو آہستہ سے لاپرواہی کے ساتھ انہیں ہٹا دیتا۔ جیسے کوئی گہری نیند سونے والا جگانے والے کا ہاتھ جھٹک دیتا ہے۔ جب اُس کا پیٹ شراب سے خالی ہو جاتا اور شراب کی تیزی دماغ سے زائل ہو جاتی تو وہ شراب خانے جاتا اور خوب پیتا۔ یہاں تک کہ پھر [illegible] کی حالت ہو جاتی۔ غرض چند ماہ تک یہی رفتار رہی۔ اچانک واقعات نے کروٹ بدلی ——

دُکھیا بیوی روزی کا وسیلہ پیدا کرنے سے عاجز آگئی۔ دونوں معصوموں کو اپنی آنکھوں کے سامنے روتا دیکھکر خود بھی روتی۔ اُن کے آنسو اس حالت کی ترجمانی کرتے جو وہ بیان نہ کر سکتے تھے۔ اُس نے دونوں بچوں کو کسی کے گھر نوکر رکھوا دیا۔ جب وہ مصیبت کی ماری اپنی کوٹھڑی میں اکیلی ہوتی تو اپنی خوش نصیبی کے دن یاد کر کے روتی۔ ان خوشگوار اور عیش و عشرت کے دنوں کو جو اُس نے اپنے حسین تاروں جیسے بچوں اپنے خاوند کے ساتھ گذارے تھے۔ مگر افسوس وہ موتیوں کا ہار ٹوٹ گیا جو زمانے کے گلے کی زینت تھا۔ اور پھر ٹوٹ کر اُس کے موتی خاک میں مل گئے۔ اور سنگریزے بن گئے۔ جن کو جوتیاں پامال کرتی ہیں اور جانوروں کے کھر روندتے ہیں۔ یہ یاد کر کے وہ بلک بلک کر روتی۔ جتنا کہ ایک غمگین آنکھیں رو سکتی ہیں۔ یہ سب کچھ ہونے کے باوجود اس نے شوہر سے کبھی نفرت نہ کی اس لئے کہ وہ شریف زادی تھی۔ اور کوئی شریف عورت اپنے تباہ حال شوہر سے بے وفائی نہیں کرتی۔ اگر وہ بیمار پڑتا تو تمام رات سرہانے بیٹھ کر گذار دیتی۔ اگر زخمی ہوتا تو مرہم پٹی کرتی۔ جب شراب فروش اس شخص کو شراب دینے سے انکار کر دیتا اور اپنے ہاں سے دھکے دیکر نکال دیتا۔ وہ خستہ حال [illegible] گھر [illegible]

...شراب کا نشہ ہی ہوتا تو اس کمبخت کے لئے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اس کی دیکھ بھال عقل پر رحم کھا کر غایت شفقت سے گھر کا بچا کچھا اسی کو دیدیتا۔ اتنی شراب لاکر دیدیتی جس سے اس کو تسکین ہو جاتی اور خود بھوکا پیٹ خدکشی کی مصیبت کو برداشت کرتی۔

غریب اسقدر مصیبتوں کا خاتمہ نہیں ہوا۔ بلکہ اسکی مصیبت میں ایک اور اضافہ ہو گیا۔ ایک روز اس نے اپنے پیٹ میں ایک جاندار ہستی کو حرکت کرتے ہوئے محسوس کیا۔ اُسے معلوم ہوا کہ وہ حاملہ ہے اور عنقریب ہی اس کی دُنیا میں ایک نئے بدنصیب کا اضافہ کرنے والی ہے۔ بیساختہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور خدا سے فریاد کناں ہوئی اے خدا رحم! صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اب اس میں ایک قطرہ کی بھی گنجائش نہیں ـــــ حمل کی سختیاں سہتے سہتے وضع حمل کا وقت آگیا ـــــ اس نازک وقت میں بوڑھی پڑوسن نے مدد کی۔ اور خدا کے فضل و کرم سے بچہ ہو گیا۔ مگر نفاس کا بہت تیز بخار چڑھ آیا۔ کوئی طبیب ایسا نہ تھا جو اللہ واسطے اس کا علاج کرتا۔ جبکہ شہر کے ڈاکٹر اپنے علاج سے مریض کو ہلاک کرنے کے بعد بھی اس کے رشتہ داروں سے فیس مانگتے نہ شرمائیں۔ رہے بھلا اللہ والے ڈاکٹر کہاں سے میسر آئیں۔ موت آہستہ آہستہ نزدیک آرہی تھی۔ آخر خدا کی رحمت نے اس کا ہاتھ پکڑا اور ایسی حالت میں موت نے اس کو اپنی آغوش میں لیا جب کہ سوائے ننھی سی جان کے جس نے ماں کا دودھ منہ میں دے رکھا تھا اور کوئی نہ تھا۔ ٹھیک اس وقت وہ خانماں برباد انسان چیختا چلاتا اور شراب مانگتا گھر میں آیا۔ بیوی کو ادھر اُدھر دیکھا۔ وہ ایک پھٹی ہوئی چٹائی پر پڑی نظر آئی۔ بچی رو رہی تھی۔ وہ سمجھا کہ بیوی سو گئی ہے پاس گیا اور جھنجھلا کر بچی کو اُٹھا کر دور پھینکا۔ اور خوب زور زور سے مردہ بیوی کو جھنجھوڑنا شروع کیا جب دیکھا کہ یہ تو ہاتھ پیر بھی نہیں ہلاتی تو اسے کچھ شبہ ہوا۔ اس نے ایک کپکپی محسوس کی جو ہاتھ پیروں سے چڑھ کر دل تک پہنچی۔ اور اب اسکی آنکھیں آہستہ آہستہ کھلنے لگیں۔ لاش پر پھر جھکا اور گھور گھور کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ یہاں تک کہ مرحومہ کی اُبھری ہوئی آنکھوں سے موت جھانکتی ہوئی نظر آئی۔ خوف و گھبراہٹ کی وجہ سے وہ پیچھے ہٹنے لگا۔ ہٹتے ہٹتے بچی کے سینہ پر اس کا پیر پڑا اور ایک دردناک چیخ بلند ہوئی۔ اس کے بعد ذرا سی بھی حرکت نہ ہوئی۔ اس نے دیوانوں کی طرح دفعتہً ایک چیخ ماری اور کہا ہائے بدبختی اور بدنصیبی اور پاگلوں کی طرح جس طرف منہ اُٹھا چل دیا۔ راستوں اور گلیوں میں وحشیوں کی طرح بھاگا بھاگا پھرتا۔ ستونوں اور دیواروں سے ٹکراتا۔ اور اپنا سر دے دے مارتا آدمی یا جانور جو کوئی بھی سامنے آجاتا اسی کے ٹکر مارتا اور دہاڑتا۔ ہائے میری بیوی! ہائے میرے بچے!! تم سب میرے پاس آؤ اور میری خبر لو ـــــ آخر شش دوڑتے دوڑتے بیدم ہو گیا ـــــ زمین پر گر پڑا۔ ایڑیاں رگڑنے لگا اور نیم بسمل جانوروں کی طرح دم توڑنے لگا۔ لوگ اس کے اردگرد کھڑے ہو گئے اور تاسف سے ہاتھ ملنے لگے۔ اس لئے نہیں کہ وہ اُسے جانتے تھے بلکہ اس لئے کہ وہ اسکی پیشانی سے بدبختی کی تحریر پڑھ رہے تھے۔ جب وہ ہوش میں آیا تو اس نے رہی سہی عقل بھی کھو دی ـــــ گھنٹے دو گھنٹے کے بعد ہسپتال میں ہتھکڑیاں بیڑیاں پہنے پایا گیا ـــــ کس قدر قابل رحم تھا وہ ـــــ اس کی شہید بیوی، بچھڑی ہوئی بچی اور دربدر ٹھوکریں کھانے والے فقیر بچے ـــــ

تاریخ عالم کا ایک فراموش کردہ ورق

مسعود

(از جناب ایم ، اے ، کے یوسف زئی ایم ، اے ۔ بی ، ایس ، سی)

اندلس کی جھلسی ہوئی سرزمین پر ایک افسردہ تاریکی چھا چکی تھی ۔ اندھیری رات میں آسمان پر چھوٹے بڑے ستارے مسلمانوں کے عہد رفتہ کی شان و شوکت کو یاد کر کے اپنی موٹی موٹی بڑی آنکھوں میں آنسو بھر لاتے تھے اور جھلملا جھلملا کر چھلک جانا چاہتے تھے ۔ بے آب و گیاہ دامن کوہ میں ایک خستہ و بیجان اور سفر کی تکان سے نڈھال گھوڑا گھاس کے تنکوں کی تلاش میں گردن جھکائے اِدھر اُدھر پھر رہا تھا ۔ پاس ہی پتھریلی زمین پر اُس کا آقا لیٹا ہوا تھا ۔ پریشان حال اور مضطرب ـــــ اور جس نے بمشکل اپنی زندگی کی سولہ سترہ بہاریں ـــــ یا خزائیں دیکھی ہونگی ۔ نظریں آسمان پر اور خود خیالات میں غرق ۔ چہرے سے ایک خاص طرح کا رعب ظاہر تھا ۔ پاس ہی تلوار رکھی تھی ۔

" آہ میرے خدا ! یہ کس گناہ کی پاداش ہے ۔" نوجوان سوار نے اپنی سیاہ زلفوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہنا شروع کیا " کیا دنیا میں ہمارا کوئی نہیں ؟ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم پر تکلف اور آرام دہ محلات میں متمکن تھے ۔ ہزارہا خادم ہر وقت ہماری خدمت میں کمربستہ رہتے تھے ۔ ہر شب شب برات تھی اور ہر روز روز عید سے بڑھکر تھا ۔ لیکن آج ـــــ ! وہی زمین ہے اور وہی آسمان ۔ مگر سب دشمن جان اور خون کے پیاسے ۔ نہ وہ دوست ہیں نہ وہ احباب ، نہ ماں ، نہ باپ اور نہ بھائی بہن ۔ آہ ! کچھ نہیں معلوم کہ منصور اور سعید کہاں ہیں ۔ پیاری بہن فاطمہ اور ننھی جمیلہ کا پتہ نہیں کہ کہاں گئیں ۔ کیا بھائی سے بچھڑکر بہنوں کو قرار ہوگا ۔ اور وہ بھی اس حالت میں ۔ اور آنسوؤں کے قطرے اُس کے رخساروں پر سے ڈھلک ڈھلک کر دن بھر کی تپتی ہوئی سنگین زمین میں جذب ہو گئے ۔

" لیکن میں نے یہ کیا کہا کہ دنیا میں ہمارا کوئی نہیں ۔ ہمارا خدا ہمارا ہے وہ خدا جس نے ہمیں پیدا کیا اور اتنی زبردست سلطنت عطا کی اور پھر جب چاہا وہ نعمت عظمیٰ ہم سے لے لی ۔ اللہ ۔ اللہ ۔ اگر یہی خیال ہمارے دلوں میں ہر وقت جاگزیں ہوتا تو ہم آج اس حالت کو نہ پہنچتے ۔"

" ٹھیک ہے اے شاہزادے ! تمہاری سلطنت نہیں رہی تو کیا حرج ہے مگر یہی ایک چیز ہے جس کی بدولت تمہارا نام بھی دنیا میں ایک مخلوق کی زبان پر ہے اور تمہاری یاد ہمیشہ ہمیشہ اُن کے دل و دماغ میں بجلیاں تڑپاتی رہے گی ۔"

شاہزادہ کو اس حالت میں دیکھکر چاند کہہ رہا تھا جو اپنے مسکراتے چہرے کو دمبدم ذرا ذرا سا اُبھارتا ہوا پہاڑی کے سرے پر چمک رہا تھا ۔

ہوا کا ایک جھونکا آیا ۔ اور مصیبت زدہ شہزادہ تمام کلفتوں سے آزاد ہو کر تھوڑی دیر کیلئے نیند کی آغوش میں سر رکھکر سو رہا ۔ چاند اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ وسط آسمان پر جلوہ فگن ہو چکا تھا ۔

لیکن مصیبت میں نیند کہاں ! یکایک غم نصیب شہزادہ کی آنکھ کھلی ۔ وادیٔ کہسار کی خاموش فضا میں ہوا کی لطیف لہروں کے ساتھ مخلوط آوازیں کانوں تک آ رہی تھیں ۔ پاس ہی اس کا وفادار رفیق اپنی گردن اُٹھائے ایک مخصوص سمت میں دیکھ رہا تھا ۔ آواز اُدھر ہی سے آ رہی تھی ۔

" یہ محض پہاڑ کی محدود وادیوں میں ہوا کے گونجنے کی آواز ہے " ـــــ

لیکن نہیں ۔ آواز برابر آ رہی تھی ۔ دھیمی دھیمی اور ایک ہی سمت سے ۔

سانس روک کر اور آواز پر کان لگائے ہوئے شہزادہ آگے بڑھا ۔

الفاظ درجہ بدرجہ صاف سنائی دینے لگے ـــــ فضا میں ایک بے معنی قہقہہ پیدا ہوا اور ایک بھاری آواز آئی ۔ " مغرور لڑکی ! اب تو بچ کر کہاں جا سکتی ہے !"

" ظالم ـــ کتے " ایک حسین اور مترنم آواز آئی ۔ " تجھے ایک مظلوم پر ہاتھ اُٹھانے شرم نہیں آتی ۔ خدا کرے غریب اسلامیوں کی تمام مصیبتیں بلائے ناگہانی بن کر تیرے سر پہ ٹوٹ پڑیں ۔"

" چُپ بدزبان ۔ اب معلوم ہوا کہ تو اُن مسلمانوں سے ملی ہوئی ہے ۔ اچھا ۔ ان کم بختوں کے ساتھ تو بھی اپنی بدزبانی کا مزہ چکھ ۔"

" خبردار او درندہ صفت انسان ! ـــ یا خدا میری مدد کر ۔"

" خدا ! لے اب خدا سے مدد مانگ ۔ میں تیرا فیصلہ ہی کئے دیتا ہوں ۔ تو بھی اُن اپنے مسلمانوں کے ساتھ دوزخ کا ایندھن بن ۔"

" بے حیا اور بزدل انسان " ! ایک آواز آئی ۔ " ایک بیکس اور پھر عورت ذات پر ہاتھ اُٹھانے میں شرم نہیں آتی ۔ " مگر چاندنی میں ایک بجلی سی چمکی ۔ اور ایک بار اور ، اُسی تیزی کے ساتھ ۔ اور فضا میں پہلے ایک قہقہہ سنائی دیا ۔ اور اس کے بعد ایک ہلکی سی چیخ ۔ اور پھر ایک ثانیہ میں وہ بھاری بھرکم جسم بھی زمین پہ لوٹ رہا تھا ۔ " مظلوموں پر دست درازی کا نتیجہ ۔" شہزادہ کی زبان سے نکلا ۔ زمین پر چاندنی کے دودھ جیسے شفاف اور چمکدار دامن میں ایک سُرخ لمبی نہر رواں تھی ۔

اوائل شب کے نور قمر میں سفید لباس میں ملفوف ایک مجسمۂ حسن پڑا تھا۔ بے ہوش اور بے حرکت۔ اس کی سیپ جیسی دونوں آنکھوں کے سرے پر آنسوؤں کے قطرے چمک رہے تھے۔

کوہستانی علاقہ۔ ہو کا عالم۔ بے یار و مددگار۔ غم نصیب۔ آفت رسیدہ اور بے سر و سامان کا ستایا شہزادہ۔ پختہ دل شہزادہ اکیلا کھڑا تھا۔ خیالات کے بحر بیکراں میں غوطہ زن۔ اُس نے قدم آگے بڑھایا۔ تنفس کی ہلکی ہلکی لہریں کوہستانی ہوا میں تعطر پیدا کر رہی تھیں۔ مرمریں مجسمہ میں زندگی کے آثار ابھی تک نمایاں تھے —— وہ کوئی لڑکی تھی۔

شہزادے نے اوپر پہاڑی پر چڑھ کر دیکھا دور جنوب کی جانب ایک ٹمٹماتی روشنی نظر آ رہی تھی۔

اُس نے بمشکل تمام اور کمال احتیاط کے ساتھ زخمی مجسمہ کو اُٹھا کر اپنے گھوڑے پر سوار کیا اور خود پا پیادہ رکاب کے ہمراہ چل دیا۔ اس کا مطمح نظر وہی ٹمٹماتی روشنی تھی۔

جب وہ وہاں پہنچے تو صبح صادق کا وقت تھا۔ چاندنی کی روشنی ماند پڑ چکی تھی نسیم الم نصیبوں کے حال زار سے بے خبر اپنے گلگشت صبوحی میں مست ایک خاص دل آویز انداز میں اٹھلاتی چلی جا رہی تھی۔ کہیں کہیں درختوں پر سے اور راستے کے کناروں کی جھاڑیوں سے ننھے ننھے پرندے اُڑ اُڑ کر دور دور چلے جاتے تھے۔ شہر پناہ کا دروازہ کھل چکا تھا اور کوئی بھولا بھٹکا راہگیر بھی نظر آ جاتا تھا۔ کچھ فاصلہ پر موذن کی سوز و گداز سے مملو بانگ سحری بلند ہو رہی تھی۔ شہزادہ کو ایک معالج کا پتہ چلانے میں زیادہ دشواری نہ ہوئی۔ لوگوں نے خود اپنی خدمات راہنمائی کیلئے پیش کیں۔

غریب شہزادہ اپنے افکار امروز فردا میں غرق سر جھکائے بیٹھا تھا کہ یکایک اس مرمریں مجسمہ میں خفیف سی جنبش ہوئی۔ اور مہین سی آواز آئی "مسعود!"

شہزادہ خواب سے چونک گیا۔

"ایں —— کون؟ صوفیہ!"

"ہاں —— اور مسعود ہم کہاں ہیں؟" اور صوفیہ نے رونا شروع کیا کہ مجھے گھر پہنچا دو۔

شہزادے نے اُسے تسلی دی اور اپنے رنج و الم کو یک لخت فراموش کر کے صوفیہ کو سمجھانے لگا کہ دیکھو تمہاری طبیعت سنبھل جائے تو ابھی گھر چلتے ہیں ——"

"تم مجھے چھوڑ کر کہیں نہ جانا۔"

"نہیں ——" مسعود نے کہا اور ایک بار پھر انہیں خیالات میں گم ہو گیا۔

صوفیہ اب اچھی ہو چکی تھی۔ دونوں صوفیہ کے باپ کی ڈیوک ڈم (ریاست) کی سرحد پر جا پہنچے تھے۔ یکایک مسعود کو کچھ خیال آیا۔ اُس نے کہا "صوفیہ تمہارا گھر آ گیا۔ اب مجھے رخصت دو۔ کیونکہ تم جانتی ہو کہ آج آسمان و زمین ہمارے دشمن ہو رہے ہیں ——" و فور غم سے اسکی آواز بھر آئی اور وہ کچھ اور نہ کہہ سکا۔

صوفیہ نے بظاہر ہمدردی کے لہجہ میں کہا "تم گھبراؤ نہیں۔ تمہارے اچھے دن پھر آئیں گے مسعود!"

مسعود خاموش تھا

میرے والد نے میرے گم ہو جانے پر ضرور کچھ نہ کچھ انعام مقرر کیا ہو گا وہ تمہیں مل جائے گا۔ اور ——"

مسعود نے تڑپ کر کہا —— زر پرست صوفیہ! کیا تو سمجھتی ہے کہ میں نے یہ سب ان چند طلائی ٹکڑوں کی خاطر کیا۔ تف ایسی اُمید پر اور نفریں ایسے خیالات پر۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ ورنہ میں تجھے اس سگ صفت دلیم کے ہاتھوں تیرے کرتوتوں کو پہنچنے دیتا۔ یا اُس کے واصل جہنم ہونے کے بعد تجھے پڑا رہنے دیتا۔ پھر تو ہوتی اور وہ سنسان پہاڑی اور وحشی درندے۔ میں نے جو کچھ کیا وہ محض اس انسانی جذبہ کے تحت کیا جو اس گری ہوئی حالت میں بھی ہمارے دلوں کو گرمائے رکھتی ہے۔

"مسعود! تم تو بُرا مان گئے میں نے یوں ہی مذاق کیا تھا۔ تمہیں اپنے اس انسانی جذبہ کی قسم اور ہمارے اس پاک صاف اور بے لوث عہد طفلی کا واسطہ —— تم مجھے معاف کر دو۔"

عہد طفلی! آہ صوفی!! اب بھول جاؤ وہ طفلی کا پُر کیف شاہانہ عہد۔ اور اسکی فردوسی بہاریں اور عیش و مسرت کی وہ شمیم انگیزیاں۔ وہ زمانے گئے جب ہم سب "وادی گلنار" کے دامن میں ننھی ننھی شوخ تیتریوں کی مانند گلگشت چمن رہا کرتے تھے۔ اور اپنے مستقبل سے بے خبر نہروں میں پاؤں لٹکائے پہروں باتیں کیا کرتے تھے۔ مگر اب —— وہ محض ایک خواب و خیال تھا اور اسکی یاد دلوں کو برمائے دیتی ہے۔ للّٰہ صوفی! اب مجھے جانے دو۔ جہاں میرے ہزاروں بھائی بند دوست احباب اور میرے ماں باپ اور بھائی بہن چلے گئے مجھے بھی ایک بہادر کی طرح زندگی کے مصائب اور آلام و رنج جھیلنے دو۔"

"نہیں مسعود! تم اب نہیں جا سکتے۔ تم ہمارے قیدی ہو" صوفیہ نے تبسم کی قلب پاش بجلی گراتے ہوئے کہا۔

"کیوں؟ کیا نیکی کا بدلہ یہی ہے اور انسانیت اسی کو کہتے ہیں؟"

"نیکی اور انسانیت کیا؟ تم کسی اور کے نہیں بلکہ میرے قیدی ہو!" صوفیہ بولی اور وہ مسکرائے چلی جا رہی تھی۔

"یعنی"

"ہی ـــــ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور تمہارے بغیر میں زندگی ویران ہو جائے گی۔"

"مکار کہیں کی ـــــ"

"مکار کیوں ـ کیا تمہیں میرے ساتھ محبت نہیں؟"

"تھی"

"لیکن اب؟"

"اب نہیں"

"کیوں؟"

"کیونکہ تمہاری باتوں میں صداقت نہیں ـ"

"لیکن پہلے تو تم میری بہت تعریف کیا کرتے تھے؟"

"وہی صوفی اور ایک دور تھا ـ ایک ایسا زمانہ جب ہم بالکل معصوم تھے ـ ہم ہنسے جھنٹے پیچھے کھڑے ہی پاگل اور تیری معصوم کہانی نہ ہو ـ بچے پسند نہیں کرتے اور وقت نہیں ہے کہ ہم بچہ طفل اور لڑکپن کے ان کل و محسوس کی طرح ہیں بلکہ ایک خاص مدت کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہو جانا پڑتا ہے۔"

اچانک مسعود کے دماغ میں بجلی سی کوندی ـــــ اس نے کہا۔

"صوفیہ! ہمارے مذہب نے غیر خواتین کے ساتھ تنہائی میں اور وہ بھی اس قسم کی باتیں کرنے سے منع کیا ہے ـ اب میں خدا کے نام پر اسی عہد طفلی کا واسطہ دیتا ہوں کہ مجھے مذہب کے خلاف گناہ کرنے سے بچاؤ ـــــ اور مجھ سے باتیں نہ کرو ـ"

صوفیہ نے ہزیمت خوردہ نگاہوں سے مسعود کو دیکھا ـ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی ـ لیکن اس کی قوت گویائی نے اس کا ساتھ نہ دیا ـ ہاں اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسوؤں کے موٹے موٹے قطرے بھر آئے ـ جو فوراً ہی جذب ہو کر رہ گئے ـ

ایک اسلامی مجاہد کو اس طرح نہتا دیکھ کر بہت سے عیسائی سوار اس کی طرف لپکے ہی تھے کہ صوفیہ نے آگے بڑھ کر کہا " بزدلو! شرم کا مقام ہے کہ ایک بدمعاش بلا روک ٹوک تمہارے گھروں میں گھس آئے اور تمہاری "جانوں کی مالک" کو اس طرح اٹھا کر لے جائے اور تم یونہی بیٹھے دیکھتے رہو ـ اور جس شخص نے اپنی زندگی خطرے میں ڈال کر اس کی جان بچائی ہو تم اس کو مجبور و بے بس پا کر اس پر حملہ کرو ـ خبردار جو قدم آگے بڑھایا ـ ورنہ ایک ایک کو موت کے گھاٹ اتارا جائیگا ـ اور اس کے گھر کو گدھے کے ہلوں سے جتوا کر پھینک دیا جائیگا ـ

وہ بدمعاش لڑکے چلے جا رہے تھے کہ صوفیہ اپنے بڑے باپ کو دیکھتے ہی

اس کے سینے سے لگ گئی ـ بعد ازاں کے بعد جسم میں مسرت کی لہر سی دوڑ گئی ـ مسعود ایک جانب گردن جھکائے کھڑا تھا ـ ان کے دلوں میں مسرت کی لہریں کروٹیں لے رہی تھیں ـ

صوفیہ نے مسعود کی طرف اشارہ کرکے اپنے باپ سے کچھ کہا ـ بوڑھا ڈیوک ہچکچاتا ہوا آگے بڑھا ـ پہلے وہ شہنشاہ ہو کر جس کی ایک نظر التفات اپنے لئے باعث صد فخر سمجھتا تھا ـ لیکن اب وہ دشمنان عرب کا حلیف ہو چکا تھا ـ اس کی حالت غمازی کر رہی تھی کہ اس وقت اسے کوئی بہت بڑی بات یاد آ رہی ہے ـ مگر وہ آگے بڑھا اور مسعود کو باہوں میں لیتے ہوئے بولا " مسعود! میرے بیٹے!" مسعود کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہہ نکلے جیسے قصر الحمراء اور مدینۃ الزہرا میں پانی کی دو نہریں جاری ہوں ـ

شام کا وقت تھا اور فضا پر اسرار طریق پر خاموش ـ بوڑھا ڈیوک اکیلا گردن جھکائے اپنے ایوان خصوصی میں بیٹھا سوچ رہا تھا کہ جس قوم میں مسعود جیسے بچے ہوں اس قوم کی سلطنت اور امارت کو زوال آ جائے ـــــ مجھے سمجھ میں نہیں آتا ـ

سپین میں مسلمانوں کی اس عظیم الشان سلطنت کا آفتاب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا ـ مگر ایک کوہستانی علاقہ کی چھوٹی سی سرسبز ریاست کے حکمران کی جائے رہائش سے اکثر ایک شخص جس کے پژمردہ چہرے سے بھی شجاعت اور جلال ٹپکا پڑتا ہے ـ اور جس کے ادھر اُدھر دو ننھے ننھے بچے کھیلتے رہتے ہیں ـ اپنی کھوئی ہوئی نگاہوں سے ـــــ

غرناطہ

آہ حسین غرناطہ!

اس کے سربلند پہاڑوں کی آسمان سے باتیں کرتی ہوئی چوٹیوں ـ

اس کے انگورستان اور نارنج کے باغات ـ

اور سب سے بڑھ کر قصر الحمراء کی سمت دیکھا کرتا ہے ـ

یہ وہاں کا حکمران مسعود ہے ـ

موجِ آتشیں

(از جناب تصدیق احمد صاحب ہادری)

راجہ صاحب نے کنور کی شادی جاگیردار کی لڑکی سے کر دی۔ رعایا حیرت میں تھی کہ راجہ صاحب نے کنور کے لئے ایسا غریب گھرانا پسند کیا۔ مگر راجہ صاحب کے دل کی بات کون جانے۔ وہ کنور کو ایک دیشیا کی محبت میں دیوانہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ شہر میں خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ گھر گھر راجیشوری کے حُسن کے چرچے تھے۔ لوگ کہہ رہے تھے راجہ کے محلوں میں اُجالا ہو جائیگا۔

کنور حجلۂ عروسی میں داخل ہوا۔ راجیشوری نے مسرت و کھڑے ہو کر کنور کا استقبال کیا۔ وہ پہلی ہی نظر میں کنور کے دل میں اُتر گئی۔ وہ اس حسین مورتی کو اُس کی بادامی آنکھوں کو۔ ریشمی بالوں کو سلمہ ستارے سے جھلملاتے ہوئے آنچل کے سایہ میں ایک لمحہ دیکھتا رہا ...... پھر اُس نے ٹھنڈی سانس لی۔

"یہاں آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں؟" اُس نے راجیشوری کی طرف غور سے دیکھا۔ جیسے کہ وہ دل کی کتاب پڑھنا چاہتا ہے۔

راجیشوری کی آنکھیں جُھک گئیں۔ وہ معمولی جاگیردار کی بیٹی اور یہ کنور۔ جواب دینے کی گنجائش ہی نہیں۔

"مجھے افسوس ہے۔" کنور نے اپنی بندھی ہوئی مٹھی کی طرف دیکھکر گہرا سانس لیا۔ "اس سے پہلے مجھے معلوم نہ ہو سکا"

راجیشوری کے چہرے پر اس غیر متوقع گفتگو سے گھبراہٹ پیدا ہوئی۔ وہ کہہ رہا تھا "اگر مجھے معلوم ہوتا —— تو میں تمہارے لئے ضرور کچھ کرتا۔"

وہ حیرت سے کنور کا منہ دیکھنے لگی۔ "مجھے معلوم ہے۔" اُس نے راجیشوری کو مٹھی کا بندھا ہوا کاغذ دیتے ہوئے کہا۔ "تم پرتاپ کو چاہتی ہو؟"

کنور جا چکا تھا۔ راجیشوری کے سامنے کاغذ کا پرزہ کھلا ہوا رکھا تھا۔ چہرہ سرخ گلاب کے پھول کی طرح تمتما رہا تھا۔ آنکھیں نرگسی کٹوروں کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ اُس کے ہونٹوں کو خفیف سا خم ہوا۔ جیسے کہ پھول کی پنکھڑی ہلنے سے مڑ گئی ہو۔ "یہ مِتر ہیں"۔ اُس کی زبان سے نکل گیا —— پھر خط کا ایک ایک فقرہ پڑھنے لگی۔

"تم جب تک اُس کے دل پر قبضہ نہ کر لو اُس کے جسم پر کوئی حق نہیں رکھتے۔ اور یہ شاید ناممکن ہے۔ کیونکہ وہ پرتاپ کو چاہتی ہے۔ تمہارا مِتر"

"یہ مِتر نہیں ہو سکتے۔" راجیشوری نے بھرائی ہوئی آواز نکالی اور افسردہ ہنسی اُس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی۔ "پریم کرنا کیا پاپ تھا؟ میری اُن سے سگائی ہو رہی تھی۔ میں پریم کرنے لگی —— پریم ہی تو کیا —— کنور تو میرے سوامی ہیں —— میں تو انہیں سوامی مانتی ہوں۔"

کنور نے ثریا کے بنگلے میں قدم رکھتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا تارے جھکے ہوئے ستار کی مرتعش آواز کو سن رہے تھے۔ اندھیری رات میں ثریا کی نرم و نازک اُنگلیوں سے ٹکراتی ہوئی ستار کی سوز بھری آواز سنتے ہی کنور کو جھلملاتے ہوئے ستارے جھومتے ہوئے شرابی نظر آنے لگے۔ جو ساقی کی فراخدلی سے فائدہ اُٹھا کر پیتے پیتے ہوش و حواس گم کر چکے ہوں —— وہ بھی جھومنے لگا۔ "راجیشوری حسین ہے —— مگر میری نہیں —— مجھے پھر دیشیا کے دامن میں پناہ لینی پڑی —— ہوں —— واہ رے جیون ——"

ثریا رنگینیٔ مستی کا مجسمہ، شباب و رعنائی کا پیکر اور سرور و شادمانی کا چشمہ تھی —— کنور نے کمرے میں قدم رکھا۔ وہ چونک پڑی۔

"ثریا!"

"کنور!"

"میں آگیا۔"

"آج سہاگ کی رات تھی کنور!"

"تم بھول رہی ہو۔" وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ "تم بھول رہی ہو —— تم ایسی باتیں کیوں کرتی ہو۔ تمہیں خوش ہونا چاہیئے —— میں آگیا۔"

"سہاگ کی رات۔ تم بھول رہے ہو کنور۔ مجھے بھی بھلا رہے ہو۔ —— میری راہ سے کھینچنا چاہتے ہو —— نہیں کنور تم جاؤ۔"

"کوئی ہے؟" کنور نے ملازم کو آواز دی۔

"جی سرکار۔" رام سنگھ نے جواب دیا۔

"لاؤ آج شراب لاؤ۔ آج میں شراب پیوں گا۔ خوب پیوں گا۔"

"تم تو پیتے نہ تھے۔" ثریا نے کنور کے متغیر چہرے کو دیکھکر کہا۔ جس سے حزن و ملال کی بارش ہو رہی تھی۔

"میں پیوں گا تم گاؤ گی۔" رام لال کے ہاتھ سے بوتل لیکر منہ سے لگا کر

…ھاگیا۔" اور لاؤ۔ ثریا گاؤ! کوئی دُکھ بھرا گیت۔ جس سے کلیجہ پھٹ جائے۔"

ثریا نے ستار اُٹھایا اور وہ گانے لگی۔

"یوں نہیں۔ ناچ کے ساتھ گاؤ۔ ناچو اور گاؤ۔ گاؤ اور ناچو جس طرح … زار رقص کرتا ہے۔ جس طرح تتلی تھرکتی ہے۔"

ثریا ناچنے لگی۔

"ہاں اِس طرح۔ دھرتی جھومنے لگے۔ آکاش کی شکتی لچک جائے — کتنا پیارا ناچ ہے! اور ناچو۔ چاند گر کر تمہارے قدموں کو چومیگا … ے ٹوٹ کر تم پر نچھاور ہونگے۔"

وہ ناچتی رہی، گاتی رہی، کنور پیتا رہا اور جھومتا رہا۔

"کنور اب میں تھک گئی۔ انگ انگ دُکھنے لگا۔"

"نہیں ثریا ناچے جاؤ۔ جیون کیا ہے؟ ناچ۔ اگر تھک گئیں تو … ن ختم — ناچے جاؤ — زندہ رہو اور زندہ رکھو۔"

"کنور میں گری جاتی ہوں۔"

"تم گرتوں کو سنبھالا کرتی ہو۔ تم نہیں گر سکتیں۔ ناچے جاؤ۔ جو گر رہا … ے اُسے نہ گرنے دو۔ ناچے جاؤ۔"

"میرے پیر لڑکھڑا رہے ہیں۔" ثریا گر پڑی۔

"تم گر گئیں، پیاری ثریا تم تھک گئیں ناچتے ناچتے! میں بھی … ک گیا تھا یوں ہی دیکھتے دیکھتے۔"

رات کے تین بجے وہ بہو رانی کے کمرہ میں پہنچا۔ راجیشوری بیدار تھی۔ … سہاگ کی رات اور پتی بغیر گذرے۔ نیند کیسے آئے —

"تم جاگ رہی ہو؟"

وہ خاموش تھی۔ وہ غریب باپ کی بیٹی۔ یہی کیا کم ہے کہ وہ راجہ … کے محلوں میں آ گئی۔ سکھ دکھ تو بھاگ کی بات ہے۔

"جیون جاگ کر ہی گذارنا چاہیئے۔ سوتے گذرا تو جیون ہی کیا — … ؤ اب آرام کریں۔ میں بیچ میں تکیئے رکھے دیتا ہوں۔"

کنور نے مسہری کے بیچ میں دو تکیئے رکھ دیئے اور سو گیا۔ صبح کو … جب وہ اُٹھا تو راجیشوری ماتا رانی کے چرن چھونے جا چکی تھی۔

راجہ صاحب ناراض تھے کہ کنور بہو رانی کو میکے بھیجنے سے انکار کرتا ہے … نہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ویشیا کی محبت اُس کے دل سے نکلی نہیں۔ انکا عتاب … بڑھ گیا۔ اُنہوں نے کنور سے کہلوا دیا کہ میرے جیتے جی وہ بہو رانی کے آنے

جانے میں مداخلت نہ کرے۔ رات ختم ہو رہی تھی۔ رام سنگھ … صاحب کے الفاظ دُہرا رہا تھا۔ کنور نے ٹھنڈے دل سے سُنا اور آہستہ سے بولا۔ "میں جانتا ہوں رام سنگھ۔" رام سنگھ کھڑا دیکھتا رہا اور کنور بہو رانی کے کمرہ میں داخل ہو گیا۔ وہ سو رہی تھی۔ کنور دیکھتا رہا — فتنۂ خوابیدہ کو۔ اُس کے کھسکے ہوئے آنچل پر نظر ڈالی۔ گدرائے ہوئے جسم پر۔ سمٹے ہوئے ملبوس کی شکنیں تارنگاہ بنی ہوئی تھیں۔ نفس کی آمد و شد سے اُبھرتے ہوئے سینے نے کنور کو بے چین کر دیا۔

"تم نے پتاجی سے شکایت کی؟" وہ بڑبڑایا۔ "مجھ سے کہتیں۔ میں تمہیں کب روکتا تھا۔ اچھا جاؤ۔ پرتاپ سنگھ انتظار کر رہا ہوگا۔" —

اُس نے بے خبر راجیشوری پر آخری نظر ڈالی اور باہر نکل آیا۔

"ثریا میں پھر آ گیا ہوں —! رام سنگھ!"

"جی سرکار۔"

"شراب لاؤ۔"

"تم اتنی کیوں پیتے ہو کنور؟" ثریا نے اُسکا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"کیوں پیتا ہوں — شراب آگ ہے — میں اس آگ میں بھسم ہونا چاہتا ہوں۔"

"تم آگ میں بھسم ہونا چاہتے ہو — اور میں؟"

"تم میرے ساتھ پھکنا چاہتی ہو؟"

"ہاں کنور، میں بھی تمہارے ساتھ جلنا چاہتی ہوں۔"

"لو پیو شراب — شراب ہم دونوں کو بھسم کر دیگی۔"

"شراب بھسم کر دیگی — تمہارے ساتھ!"

"ہاں میرے ساتھ — لو پیو۔ شراب پیو — ہم دونوں جلیں گے۔"

"ہم ساتھ ساتھ جلیں گے۔" ثریا نے شراب کا گلاس مُنہ سے لگا لیا۔

"اب ناچو — ایسا ناچ جس سے شراب ٹپکتی ہو۔ جس سے شراب کی چنگاریاں نکل کر تمام دُنیا میں بکھر جائیں۔"

راجہ صاحب اُداس بیٹھے تھے۔ بہو رانی واپس آ گئی۔ بیٹا دن رات شراب میں چُور رہتا ہے۔ وہ بہو کا مُنہ بھی نہیں دیکھتا — وہ سوچنے لگے — عزم کی ایک چمک چہرہ پر نمودار ہوئی — وہ اُٹھے اور ایک طرف چل دیئے۔

"مہاراج میں بڑی خوش قسمت ہوں۔ آج کا دن بہت مبارک ہے کہ آپ کے درشن سے آنکھوں کو روشن کر رہی ہوں۔"

"میں کچھ مانگنے آیا ہوں۔"

"ایک ذلیل ویشیا کے پاس کیا ہو سکتا ہے۔ سرکار ـــــ میں کنگال ہوں۔ ایک ذلیل عورت ہوں۔ میرا کیا ہے۔ جو کچھ ہے سرکار آپ کا ہے۔"

"تم ذلیل نہیں ہو ثریا! تم سے کنور پریم کرتا ہے۔ تم ذلیل کس طرح ہوئیں ـــــ اور دیکھو تم بھی تو کنور سے پریم کرتی ہو ـــــ چاروں طرف دیواروں پر کنور ہی کی تصویریں سجی ہوئی ہیں ـــــ مگر۔"

"فرمائیے مہاراج!"

"جس سے تم پریم کرتی ہو ثریا! اس کا باپ تم سے اسی کی بھیک مانگنے آیا ہے۔"

"سرکار حکم دیں۔ مجھے جان سے بھی عذر نہ ہوگا۔"

"تمہاری طرح ایک اور عورت بھی ہے جو بِرہ میں جل رہی ہے۔ جو کنور کی راہ تکتی ہے۔ کیا تم اس پر رحم نہیں کرو گی؟"

"میں بازاری عورت ہوں مہاراج۔ میرا کنور پر کیا حق ہے۔ وہ بھول کے میرے پاس آ گئے تھے ـــــ آپ حکم دیجئے۔"

"تم اس شہر سے چلی جاؤ!"

"میں چلی جاؤں گی مہاراج!"

"آج ہی؟"

"بہت اچھا ـــــ میں ابھی جا رہی ہوں۔"

"تم بہت رحمدل ہو۔ تم بہت سخی ہو۔ میں تمہیں اس طرح نہ بھٹکنے دوں گا۔ تم چند دنوں کے لئے رام سنگھ کو لیکر مادھو پور کے بنگلے میں چلی جاؤ ـــــ تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ جتنا خرچ کر سکو کرنا۔ میں بہت خوش ہونگا۔"

ثریا کے بنگلے میں موت کی سی خاموشی طاری تھی۔ کنور حیران تھا کہ ثریا کہاں گئی۔

"رام سنگھ!" مگر رام سنگھ کے بجائے دوسرا نوکر سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"ثریا کہاں ہیں؟"

"وہ تو چلی گئیں سرکار۔"

"کہاں؟"

"رام جانے۔"

"کب آئیں گی؟"

"کہہ گئی ہیں کہ اب آنا مشکل ہے۔"

وہ ثریا کے بستر پر گر پڑا۔ ایک کاغذ اس کے جسم کے بوجھ سے چرچرایا۔

"کنور!

میرے پرانے دوست آ گئے۔ میں جا رہی ہوں۔ کتنے دن ہنسی خوشی گذرے۔ میں ~~آپ کی شکر~~ گذار ہوں۔ اب شاید ملاقات نہ ہو سکے۔ امید ہے کہ آپ بھول جائینگے۔

ثریا"

"ویشیا۔ بازاری عورت ـــ کیا اپنی ہو سکتی ہے ـــــ عورت پر بھروسہ۔ ظالم عورت پر۔ مکار عورت پر۔ جو مسکراتے ہوئے روند ڈالتی ہے۔ جو ہنستے ہوئے آدمی کے ٹکڑے اڑا دیتی ہے ـــــ وہ پرتاپ سے محبت کرتی ہے۔ اس کے پرانے ملاقاتی آ گئے ـــــ کیا میں ہی نشانہ بننے کے لئے تھا ـــــ ایسا نہیں ہو سکتا ـــــ میں بھی ان کے چمکتے ہوئے جسم اور گدرائے ہوئے جوبن کو کھوند ڈالوں گا۔" کنور اٹھا اور اپنی تصویریں اتار کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالیں۔

راجہ صاحب پریشان تھے۔ کنور نے ایک ویشیا کو چھوڑ کر نئی نئی عورتوں سے کھیلنا شروع کر دیا۔ ماں، باپ، بہو سب کو چھوڑ دیا۔ شراب پیتے پیتے صبح سے شام اور شام سے صبح کر دیتا ہے۔ ہوش ہی میں نہیں آتا۔

رات کی سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ کنور نشہ میں چور بھوندے پر پڑا تھا۔

"ابھی کوئی عورت نہیں آئی۔ ابھی کوئی کھلونا نہیں منگایا گیا۔"

"سرکار لکھمان سنگھ گئے ہیں۔" نوکر نے پاس آ کر کہا۔

"ہاں جلد لاؤ عورت کو ـــــ اور شراب کی بوتل میرے منہ میں انڈیل دو۔ کون ہو تم؟ جلدی کرو۔"

راجیشوری سر جھکائے بیٹھی تھی۔ آشا اس کی سہیلی سمجھا رہی تھی۔

"جاؤ۔ راجیشوری! یہ وقت ہے۔ کنور بیٹھا عورت کا انتظار کر رہا ہے۔" آشا نے اسے بنا سنوار دیا اور ہاتھ پکڑ کر کنور کے کمرے تک [illegible]۔

"ملکھان سنگھ صورت لے آئے ہیں ـــــ ! کون ہے تو ـــــ ؟ کیا نام ہے ؟ بولتی ہی نہیں ! ہوں ـــــ ساری تو بہت رنگین ہے ۔ تم ناچ سکتی ہو ـــــ ؟" راجیشوری نے ناچنا شروع کر دیا ۔

"تمہارا کیا نام ہے ـــــ ؟ نام نہ بتاؤ گی ـــــ نہ بتاؤ ! ــــ نا نہیں چاہتیں نہ بولو ـــــ گُن چپ جاؤ !"

راجیشوری ناچ رہی تھی ۔ مرمریں سبک قدم بجلی کی طرح جنبش کر رہے تھے ۔ کمر ناگن کی طرح بل کھا رہی تھی ۔

"واہ کیا ناچ ہے ـــــ مگر ابھی کمی ہے ۔ ناچ کی گرمی سے شعلے پھوٹ نکلیں ـــــ لو آگ کی گرمی سے اپنا دل گرما لو ۔"

کنور نے جامِ شراب بڑھایا ۔ اُس نے سوچا ۔ آج پتی کی سیوا کا موقع ملا ہے ۔ پتی حکم دے رہے ہیں ۔ اپنے ہاتھ سے زہر بھی دیں تو انکار نہیں ـــــ راجیشوری نے ہاتھ بڑھا دیا ۔ چھپے ہوئے ریشمی کونے میں سے بلوریں کلائی جھلکی ۔

"تمہارے ہاتھ بالکل بہورانی کے سے ہیں ۔ اپنا مُنہ کیوں نہیں کھولتیں ۔ کھولو ! ناچو !!!"

وہ ناچ رہی تھی ۔ اُس کا دل ناچ رہا تھا ۔ قدم ناچ رہے تھے ۔ کمر ناچ رہی تھی اور چہرہ کا بڑھا ہوا گھونگٹ ناچ رہا تھا ۔ وہ مست جوگن کی طرح اپنے ناچ میں ڈوب گئی تھی ۔ اُسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ آنچل کھسک گیا اور چمکتے ہوئے جھومر نے کنور کو تڑپا دیا ۔

"بہورانی !"

"سوامی !"

"تم یہاں ؟"

"پتی سیوا میں ۔"

"میری سیوا ؟"

"ہاں سوامی ۔"

"اور پرتاپ ؟"

وہ پیروں پر گر پڑی ۔ آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ۔ کنور کی آغوش کھلی اور وہ سمٹ کر اُس کے بازوؤں میں آگئی ۔

رام سنگھ نے ہزار کوششیں کر لیں مگر ثریا کی شراب نوشی میں کمی نہ ہوئی ۔ کھانا پینا چھوٹ گیا ۔ اور نہ چھوٹی تو شراب ۔ وہ کہا کرتی تھی "رام سنگھ شراب جلا دیتی ہے ۔ یہ ایک ایسی آگ لگاتی ہے جس سے آدمی بھسم ہو جاتا ہے ۔ میں بھسم ہونا چاہتی ہوں ۔" ڈاکٹر نے سے ... [illegible] ... کو بھینٹ چڑھا کر اپنی زندگی بھی تباہ کرنا چاہتی تھی ۔ حالت نازک ہوتی گئی ۔

رام سنگھ نے راجہ صاحب کو اطلاع کر دی کہ "بائی جی کی حالت بہت خراب ہے ۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ دونوں پھیپھڑے گل گئے ۔" راجہ صاحب مغموم تھے ۔ یہ ایثار یہ قربانی اور اپنے ہی بیٹے کے لئے نظر انداز نہیں کی جا سکتی ـــــ جب راجیشوری راجہ صاحب کے درشن کرنے اور چرن چھونے گئی تو اُنہوں نے سب کچھ کہہ دیا ۔

"آج بہورانی کیوں سست بیٹھی ہیں ؟" کنور نے راجیشوری کے گلے میں بانہیں ڈال دیں ۔

"یہ تم جو سُنے گا میری طرح دُکھی ہو گا ۔"

"کیا بات ؟"

راجیشوری نے سب کچھ دُہرا دیا ـــــ کنور پاگلوں کی طرح اُٹھا اور مادھو پور چل دیا ۔ راجیشوری دوسرے موٹر میں کنور کے پیچھے جا رہی تھی ۔

رام سنگھ ثریا کے پاس بیٹھا تھا ۔ ثریا نے آج چمکیلا بیش قیمت لباس پہنا تھا ۔ اپنے نحیف ناتواں جسم پر زیور سجائے تھے ۔ پیروں میں پائل باندھ کر خوش ہو رہی تھی ۔ وہ چاہتی تھی کہ مرتے وقت ایک بار پھر عہدِ رفتہ کی یاد کو تازہ کرے ۔ رام سنگھ نے کہا تھا کہ آج کنور آئینگے ۔ وہ کبھی کبھی ثریا کو یوں ہی تسلیاں دیا کرتا تھا ۔ مگر آج نہ جانے کیوں اُسے یقین تھا کہ کنور آئینگے ۔ وہ انتظار کرتے کرتے تھک گئی ۔ اب تکیہ کے سہارے بیٹھنا دشوار تھا ـــــ "رام سنگھ وہ کب آئیں گے ؟" وہ لیٹ گئی ۔ آنکھیں دروازہ کی طرف لگی ہوئی تھیں ۔

"اب آتے ہی ہونگے سرکار ۔" رام سنگھ نے جھک کر کہا اور تکیے درست کرنے لگا ۔

ثریا کی سانسیں تیزی سے چلنے لگیں ۔

"رام سنگھ !" "جی سرکار"

"میرا دم ـــــ گھٹا ـــــ جاتا ہے ۔" ثریا کی آنکھیں پتھرانے لگیں ۔

"بائی جی آنکھیں کھولئے ـــــ کنور صاحب آ رہے ہیں ـــــ بائی جی !"

موٹر آکر رُکی ـــــ رام سنگھ کے مُنہ سے چیخ نکلی ۔

"کنور جی جلدی آیئے ـــــ بائی جی وہ آ گئے ـــــ آنکھیں کھولئے ۔"

"کہا ـــــ ں ـــــ ؟" ثریا کی باریک آواز نکلی ۔

کنور کمرہ میں داخل ہوا "میں آ گیا ثریا ـــــ میں آ گیا ـــــ میری طرف دیکھو ۔"

"آ گئے ـــــ !" اور ایک ہلکی سی مسکراہٹ ثریا کے لبوں پر کھیلنے لگی ۔

"چل دیں ـــــ یہ کیا کیا ثریا ۔ مجھ سے بھی نہ کہا ـــــ میں تمہیں روکتا تو نہ تھا ۔

تم چلی گئیں مجھ سے ملے بغیر ـــــ !"

کشمکش

(از جناب خالد حسین قادری)

شام کا وقت تھا۔ گھنے جنگل میں پوری طرح رات پھیل چکی تھی۔ ناشپاتیوں کی دور دور قطاروں میں پتلی سی سڑک امید موہوم کی طرح جھلک رہی تھی۔ ایک سرخ رنگ کی موٹر اندھیرے میں اپنی آنکھیں چمکاتی ہوئی دوڑ رہی تھی۔ جب موٹر ایک بڑے ناشپاتی کے درخت کے قریب سے گذری تو درخت کے اوپر سے کسی نے ریوالور چلایا۔ گولی سنسناتی ہوئی نشانہ پر لگی۔ موٹر رکی اور ڈرائیور نے پیچھے دیکھا۔ محکمہ جنگلات کا افسر اعلیٰ اندر سے منہ گرا ہوا تھا۔ گولی دماغ کے پار ہو چکی تھی۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا۔ درخت کے پتوں میں سرسراہٹ ہوئی اور کوئی آدمی گھنے جنگل میں غائب ہو گیا۔

— ۲ —

اسپین کی رعایا اپنی حکومت کے خلاف تھی۔ باغیوں کی خفیہ کارروائیاں سرگرمی سے جاری تھیں۔ قومی انجمن کے ممبر حکومت کے مختلف شعبوں میں پھیل چکے تھے۔ اسی طرح روز کوئی نہ کوئی حکومت کا افسر باغیوں کا نشانہ بنتا۔ لیکن حکومت باوجود اپنی انتہائی کوششوں کے باغیوں کا پتہ نہ لگا سکی۔

جیم بھی ایک ایسی ہی قومی انجمن کا ممبر بن چکا تھا۔ وہ ریلوے کے ایک چھوٹے سے سٹیشن پر ملازم تھا۔ گاڑیوں کی آمد و رفت کے وقت صاف لائن کے واسطے پٹریاں بدلنا اس کا کام تھا۔ اس کی شادی کو دو سال ہی ہوئے تھے۔ لیکن جب سے وہ اس قومی انجمن کا ممبر بنا تھا اس نے اپنی بیوی صوفیہ اور ایک سال بچے کو اپنی ماں کے پاس دوسرے گاؤں میں بھیج دیا تھا۔

آج قومی انجمن کو اطلاع ملی تھی کہ رات کو ۲ بجے والی گاڑی سے حکومت کے چند افسر اعلیٰ آرہے ہیں۔ یہ وہی افسر تھے جن کی اس انجمن کو مدت سے فکر تھی۔ اور ان کا زندہ رہنا ملک و قوم کے حق میں وہ سم قاتل سمجھتی تھی۔ ان کے قتل کا قرعہ فال جیم کے نام پڑا۔ اسکو حکم ملا کہ جس وقت یہ گاڑی آئے تو وہ غلط پٹریاں بدل کر پوری ٹرین کو الٹ دے۔ اس میں کچھ بیگناہ ضرور مارے جائیں گے لیکن آزادی کی دیوی بغیر بھینٹ لئے ہوئے مہربان نہیں ہوتی۔ اس میں خود جیم کی بھی جان کا خطرہ تھا۔ لیکن ملک و قوم کی خاطر وہ ہر وقت اپنی جان قربان کرنے کو تیار تھا۔

— ۳ —

بارہ بج چکے تھے۔ ماحول پر ایک بے کیف خنکی سی چھائی ہوئی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے ناشپاتیوں کے درختوں میں دیوانہ وار گھسے جا رہے تھے۔ لمبی لمبی مضبوط شاخیں ایک دوسرے سے رگڑ کھا کر خوفناک چیخیں نکال رہی تھیں۔ جیم کیبن میں بیٹھا ہوا تھا۔ سامنے سٹیشن تھا۔ دوسری لائن پر ایک پوری مال گاڑی سامان سے لدی ہوئی کھڑی تھی۔ جیم نے سوچا کیوں نہ لائن بدل کر میل کو اس مال سے ٹکرا دیا جائے۔ پوری گاڑی الٹ جائیگی۔ ایک مسافر بھی باقی نہ بچے گا۔ اور اگر پچھلے ڈبوں کے کچھ مسافر بچ بھی گئے تو وہ افسر تو یقینی ہلاک ہو جائیں گے کیونکہ ان کا سیلون انجن کے پاس ہوگا۔ انجن اور اس کے ساتھ کے چند ڈبوں کا تو پتہ بھی نہ چلے گا۔ لیکن اس میں جیم کی جان کا بھی خطرہ تھا۔ غلط لائن بدل دینا کس قدر خطرناک جرم ہے۔ لوہ اس کے انجام کا خیال کر کے چونک پڑا۔ اونہہ یہ بزدلی ہے! اول تو ہو سکتا ہے کہ اسکی جان بچ جائے اور صرف ملازمت سے علیحدگی یا چند سال کی قید پر ہی سزا ختم ہو جائے کیونکہ اسکی گذشتہ خدمات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس پر کسی قسم کی بد دیانتی یا باغیانہ کارروائی کا شک نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ابھی پچھلی مرتبہ اسکے افسر نے اسکے کام اور محنت سے خوش ہو کر اسکی ترقی کی سفارش کی تھی۔ اس لئے اسکی جان تو یقینی بچ جائیگی۔ رہی صوفیہ اور ننھا جیکب تو وہ گاؤں میں خوش رہیں گے۔ لیکن جب صوفیہ کو اس حادثہ کی خبر پہنچے گی کہ جیم نے گاڑی الٹ دی اور وہ گرفتار ہو گیا تو اس کے دل پر کیا بیتے گی ——— اس خیال سے اسکو دل پر بوجھ سا معلوم ہونے لگا۔ "میں نے پہلے صوفیہ کو اس حادثہ کی خبر دیدی ہوتی تو اچھا تھا۔ لیکن ہو سکتا تھا کہ اس صورت میں حکومت اس کے ارادوں سے باخبر ہو جاتی اور اقدام قتل کا الزام عائد ہوتا جسکا نتیجہ یقیناً سزائے موت ہوتا ——— خیر جو ہوا اچھا ہوا ——" اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ایک بج چکا تھا۔ گاڑی آنے میں صرف ایک گھنٹہ باقی تھا۔ "ایک گھنٹہ ——— صرف ساٹھ منٹ ایک حادثہ عظیم میں باقی ہیں" اس نے دل میں دہرایا۔

سرد ہوا کے شوخ جھونکے کیبن کے دریچہ سے آکر اس کے بالوں سے کھیل رہے تھے۔ اسکو کچھ سردی سی محسوس ہونے لگی۔ گلے سے مفلر کھول کر اس نے اپنے سر اور بالوں پر لپیٹ لیا۔ زینہ پر کسی کے چڑھنے کی آواز آئی۔ اس کا دوست ٹام اپنے مخصوص انداز میں مسکراتا ہوا داخل ہوا۔

"جیم!" ٹام نے اپنے ہونٹوں پر بکھری ہوئی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے کہا۔ "مٹھائی کھلاؤ تو ایک بات بتاؤں"

"کیا بات ہے؟" جمم نے کہا۔ "مجھے اس وقت زیادہ پریشان مت کرو۔ تم دیکھ رہے ہو میں ڈیوٹی پر ہوں۔ کیا بات ہے؟ بتاؤ تو سہی مٹھائی بھی کھلینا؟"

"مسٹر جمم اور ننھا جیکب دو بجے والی گاڑی سے آرہے ہیں۔" ٹاڈ نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کہو دوست کیسی خبر سنائی؟"

جمم کو ایسا معلوم ہوا جیسے شیشہ کا کوئی نازک مگر قیمتی برتن ہاتھ سے چھوٹ کر چور چور ہوگیا۔ ٹاڈ جو اس بات کا متوقع تھا کہ جمم اچھل پڑیگا۔ مارے خوشی کے اس کا چہرہ کھلے ہوئے کنول کی طرح دمکنے لگے گا جمم کے اس خلاف امید سکوت پر متحیر سا رہ گیا۔ جمم کے کانوں میں ٹاڈ کے الفاظ پگھلے ہوئے سیسہ کی طرح اتر گئے۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کیسے معلوم ہوا ٹاڈ؟"

"یہ دیکھو!" ٹاڈ نے جسکی اب تمام شگفتگی ختم ہو چکی تھی اپنی جیب سے تار نکالتے ہوئے کہا۔ "یہ ہے تار ابھی دو گھنٹے ہوئے تمہارے نام آیا ہے۔"

جمم نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تار لیا اور پڑھا۔ "صوفیہ اور جیکب دو بجے کی گاڑی سے آرہے ہیں۔" تار کے الفاظ جمم کی آنکھوں کے سامنے ڈراونی شکل کے بھوت بن کر ناچنے لگے۔ مختلف جذبات کی شدت سے زرد چہرہ یک لخت سرخ ہوگیا۔ ٹاڈ بڑی حیرت سے یہ تغیر دیکھ رہا تھا۔ "کیوں جمم خیریت تو ہے اور تو کچھ تار میں نہیں لکھا؟" ٹاڈ نے پوچھا۔

"ہاں خیریت ہے۔ آج میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے۔" جمم نے ٹاڈ کی آواز پر چونکتے ہوئے کہا۔ "دیکھو ڈیڑھ بج گیا ہے گاڑی آنے والی ہے۔ میں تو یہاں ڈیوٹی پر ہوں۔ تم صوفیہ ––– اور ننھے جیکب کو اتار لینا۔" یہ کہتے ہوئے اس کے لرزتے ہوئے ہونٹوں سے ایک آہ نکل گئی۔ مگر خیریت ہوئی کہ ٹاڈ یہ سن سکا۔

"اچھا!" ٹاڈ نے پژمردگی سے کہا اور ڈھیلے ڈھالے قدم ڈالتا ہوا نیچے اتر گیا۔

جمم کے دماغ کی اس وقت عجیب کیفیت تھی۔ ایک طرف فرض ––– ملک و قوم کا فرض۔ دوسری طرف محبت ––– عزیز بیوی اور ننھے بچے کی محبت –––!

اسکو اپنی محبت کے ابتدائی لمحات یاد آگئے۔ جنوری کی ایک سرد مگر حسین شام ––– جب اُس نے صوفیہ کو پہلی مرتبہ اسکی ماں کے ساتھ پارک میں دیکھا تھا۔ اُس نے آسمانی اُونی شال اپنے سنہری بالوں پر لپیٹ رکھی تھی۔ اور ہاتھ میں سفید گلاب کے پھولوں کا گلدستہ تھا۔ وہ کتنی حسین معلوم ہو رہی تھی۔ نارنگی کے ایک کنج کے پاس دونوں کی اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ اس کے بعد جب وہ گھر لوٹا تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی قیمتی چیز گم ہوگئی۔ اسکی بے کیف زندگی میں خلا سا پیدا ہوگیا تھا۔ جسکو شاید صوفیہ ہی پُر کر سکتی تھی۔ اسکے بعد ––– اسکے بعد دونوں کی شادی ایک طویل مگر رنگین داستان۔ اس کو وہ دن بھی اچھی طرح یاد تھا جب وہ صوفیہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے گرجے سے باہر نکل رہا تھا۔ صوفیہ سفید لباس میں آسمان کی کیا فرشتے سے بھی زیادہ حسین معلوم ہو رہی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر دلفریب تبسم رقص کر رہا تھا جذبات کی شدت سے اسکے سینہ کا زیر و بم تیز تھا۔ شباب و رعنائی کی جیتی جاگتی تصویر بنا رہا تھا۔ اسکے دوست اسکی شادی پر مبارکباد دے رہے تھے۔ اور پھولوں کی بارش کر رہے تھے۔ اسکے ایک سال کا حسین اور پُر کیف مدت کتنی جلدی گزر گئی ––– صوفیہ کی آغوش میں ایک گل تر تھا ––– جیکب ––– ننھا جیکب۔ دونوں کی امیدوں کا تنہا مرکز۔ "جیکب کی روشن پیشانی اور سنہری بال بالکل صوفیہ کی طرح تھے۔ اسکی ننھی ننھی کٹوروں کی طرح چھلکتی ہوئی آنکھیں جن میں شرارت اور ذہانت کا ایک حسین امتزاج تھا۔"

اتنے میں سٹیشن پر گاڑی آنے کی گھنٹی بجی جمم کے خیالات کا محل ایک نازک جھٹکے سے ٹوٹ گیا۔ گھنٹی کی آواز اسکے دل پر مسلسل ضربیں لگا رہی تھی۔ اب وہ اٹھ کر اپنی اصلی جگہ آگیا۔ اور پٹڑی بدلنے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھ لیا۔ یہ ہینڈل صحیح پٹڑی بدلتا ہے لیکن نہیں اسکو دوسرا ہینڈل چلانا ہے۔ اُس نے اپنا ہاتھ دوسرے ہینڈل پر رکھا۔ یہ ہینڈل صحیح پٹڑی بدلتا ہے۔ ایک ذرا سی جنبش سے تمام گاڑی الٹ جائیگی۔

مگر نہیں ––– وہ اسکو نہیں چلائے گا۔ اس کی پیاری صوفیہ اور ننھے جیکب کی جان بھی اب خطرہ میں تھی۔ دونوں کا ختم ہو جانا یقینی تھا۔ لیکن ––– وہ ملک اور قوم کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کی مقدس قسم جو کھا چکا ہے۔ ہاں وہ اپنا فرض ادا کرے گا۔ مگر تخیل نے صوفیہ کی مرمریں باہیں اور حسین چہرہ جس پر معصومیت برس رہی تھی سامنے کر دیا۔ اور ساتھ ہی جیکب کی ننھی ننھی آنکھیں ––– اُس نے ایک اضطراری کیفیت میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ اور دل کو تقویت دینے کیلئے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا

انجن کی سیٹی کی آواز پر وہ یک لخت اچھل پڑا۔ فرض اور محبت۔ اسکے دل میں ایک عجیب کشمکش تھی ––– نہیں! اس سے یہ نہ ہو سکے گا۔ وہ اپنے جیکب کو نہیں کھو سکتا۔ اس نے اپنا ہاتھ ہینڈل پر سے اٹھا لیا۔

انجن کی آواز برابر نزدیک اور تیز ہوتی جا رہی تھی۔ اسکی روشنی بھوت کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھی۔ سامنے چمکتی ہوئی پٹڑیاں لمبے لمبے سانپوں کی طرح لہرا رہی تھیں۔ ایک کھمبے کے پاس گیا جمم کو پٹڑی بدلنا ہے۔ وہ کون سا ہینڈل گھمائے ––– ایک طرف ملک و قوم کی بہبودی۔ دوسری طرف ننھے بچے اور معصوم بیوی کی محبت ––– اسکی نظروں کے سامنے ایک مرتبہ پھر صوفیہ کا معصوم چہرہ اور ننھے جیکب کی مچلتی ہوئی آنکھیں آگئیں ––– صوفیہ کے سنہری بال ہوا میں لہرانے لگے اور جیکب کے ننھے ننھے ہاتھ اسکی گود میں آنے کیلئے اٹھ گئے۔ مگر فرض نے محبت کو ٹھکرا دیا ––– جمم نے اپنی آنکھیں زور سے بند کر لیں۔ دھڑکتے ہوئے دل سے اور کانپتے ہاتھوں سے دوسرا ہینڈل گھما دیا ––– پل ایک خوفناک دھماکے کے ساتھ دریا میں گر گیا۔

جمم نیم بیہوشی کی حالت میں ہینڈل کے پاس گر پڑا –––!

(از لی فانگ سن)

اِنتقام

کیپٹن ناکامور کا انجام

(مترجمہ جناب آزاد خالدی)

کپتان ناکامور نے جو نانکنگ کی شاہی فوج کا افسر تھا شنگھائی میں پندرہ دن گذارنے کیلئے رخصت چاہی اور جب اسے اجازت مل گئی تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی ۔ چین کا یہ پرانا دارالسلطنت بے حد یاس انگیز تھا ۔ یہاں ایک بھی جاپانی ریسٹورنٹ نہیں تھا ۔ جہاں اپنے بدنما جوتے اتار کر "تاتامی" پر بیٹھا جا سکے ۔ یہاں نہ "شکیاکی" ملتی تھی اور نہ "شاکے" اور نہ گوشت ۔ اس لئے اس غیر متمدن شہر کی سیر زیادہ اچھی نہ سمجھی جاتی تھی۔

اس کے تین دیگر ہمراہی بھی اسکے ساتھ شنگھائی نانکنگ ایکسپریس کے پہلے درجہ میں سفر کر رہے تھے ۔ سب کے بال بڑھے ہوئے تھے اور سب فوجی لباس میں تھے ۔ "جنگ" کے بارے میں وہ ایک لفظ بھی نہ کہہ رہے تھے۔ مسلسل آٹھ گھنٹے کے اس سفر میں شاید ہی انہوں نے جنگ کے متعلق گفتگو اپنے درمیان آنے دی ہو ۔ اپنے دماغ کو ایسے خیالات سے دور رکھنے کے لئے وہ ڈبے کی کھڑکی سے باہر سیاہ تاریک زمین اور تباہ و برباد دیہاتوں کو دیکھتے رہے ۔ چین و جاپان کی طویل جنگ میں شامل ہوئے پانچواں سال تھا۔ شنگھائی کے مشرقی سٹیشن پر جب ٹرین رکی تو وہ ایک دوسرے کو الوداعی سلام کرکے اپنے اپنے مجوزہ راستوں پر چل دیئے ۔ کپتان ناکامور ایک رکشا کے پاس آیا اور اس میں بیٹھ گیا ۔ جھونکے کھاتا ہوا کمزور رکشا والا ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔

کہاں سرکار ! سادی نونک ! نہیں چاپولو !

بات کی بات میں رکشا چاپولو روڈ پر آ پہنچا ۔ ایک جاپانی دوکان کے آگے اسے کھڑا کرکے کپتان نے اس کے ہاتھ پر پانچ سینٹ رکھ دیئے ۔ اور اتر گیا ۔ اتنی لمبی اور جانکاہ محنت لیکر کسی غریب نے پانچ سینٹ سے زیادہ ہی دیا ہوتا ۔ قلی کچھ اور مانگنے کیلئے کپتان کی طرف دیکھنے لگا ۔ مگر کپتان نے جب اپنی بائیں طرف لٹکی ہوئی تلوار کے دستے پر ہاتھ رکھا تو غریب مزدور رکشا کا بم پکڑ کر بے تحاشا بھاگا ۔ کوبیشی نے اپنے دوست کو دیکھ کر انتہائی خوشی کا اظہار کیا ۔ اس نے اس کے سامنے کھانے کیلئے "موچی" اور پینے کیلئے بہترین سبز چائے کے پیالے رکھے ۔ سینہ تان کر وہ لوگ لڑائی کے متعلق گفتگو کرتے رہے ۔ تھوڑے وقفہ کے بعد کوبیشی نے کپتان کو گرم گرم پانی سے نہانے کا مشورہ دیا ۔ غسل سے فارغ ہو کر کپتان پاؤں پھیلا کر خراٹے بھرنے لگا ۔ جیسے دنیا میں سوائے سونے کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا ۔

دوسرے روز شیو کرا کر لباس تبدیل کیا اور تیار ہو کر کپتان وانگ مینگ سے ملاقات کیلئے روانہ ہو گیا

مسٹر وانگ کے والد "منچو ولیش" کے زمانہ سے پہلے ایک ذمہ دار لیڈر اور رہبر قوم تھے ۔ مسٹر وانگ ان دنوں ملک کی آخری آبادی اور فرانسیسی کوتوالی کے پاس "غدار" دستال شنگھائی کی کٹ پتلی حکومت کی انجمن کا سکریٹری تھا ۔ کپتان ناکامور شعبہ جاسوسی میں کام کرتا تھا اور اسکی سفارش سے ہی وانگ کو یہ عہدہ ملا تھا ۔

قوم کی رہبری اور تجارت میں وانگ کچھ نہ کر سکتا تھا ۔ وانگ میں کچھ ایسی قابلیت بھی نہ تھی کہ اسے مال اور عزت مل سکے ۔ اس کا دماغ عیاشی سیر و تفریح کے سوا کسی اور چیز کا بار برداشت کرنے کے قابل نہ تھا ۔ اس میں رئیسانہ خو بو بھی آ گئی تھی ۔ امیری میں ہی بداعمالیوں کا موقعہ ملتا ہے ۔ جب جاپانیوں نے شنگھائی پر قبضہ کیا وہ اپنے باپ کی جمع شدہ پونجی اور ساری دولت برباد کر چکا تھا ۔

قمار بازی کا وہ بے حد شوقین تھا ۔ مسلسل تین تین دن تک وہ میز پہ بیٹھا رہتا اور کچھ دیر کے لئے "ٹس ٹس" کھانے کیلئے اٹھتا تھا ۔ جب دوسرے قمار باز نہ ہوتے تو وہ رئیسوں کے کلب میں راتیں گذار دیتا ۔ یہاں شراب کے خم کے خم لنڈھائے جاتے اور ملک کی خوبصورت ترین دوشیزائیں تفریح طبع کے لئے موجود ہوتیں ۔

جب جاپانیوں کو ان کی سرکاری انجمن کیلئے کوئی غدار چینی لیڈر نہ ملا تو انہوں نے وانگ کو تیار کیا ۔ ملازمت قبول کرتے وقت وانگ کو شرم اور جان کا خطرہ لاحق ہوا ۔ شرم کو تو اس نے زینت طاق نسیاں بنا دیا ۔ مگر جان جانے کے خطرہ کو اتنی آسانی سے نہ بھلا سکا ۔ چونکہ چینی چھاپہ ماروں کی گولیوں سے اس جیسے کتنے ہی غداروں کو موت کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا ۔

اسی کام کے خیال سے وہ کانپ اُٹھتا تھا۔ دو ہزار ڈالر ماہوار تنخواہ کے علاوہ الاؤنس اور ترقی کیلئے ایک لمبی سی رقم کا لالچ دیا گیا تو اس نے ملازمت قبول کر لی اور اپنا نام جاپان کے خیر خواہوں کے رجسٹر میں درج کرا دیا۔ اس کا کام جاپانیوں کے احکام اور اُن کے مشوروں پر عمل کرنا تھا۔

جاپانی افسر اس کے یہاں اتنی بار آتے جاتے تھے کہ جب اس کے چپراسی نے کپتان ناکامور کا وزیٹنگ کارڈ دیا تو اُسے کوئی تعجب نہیں ہوا۔ کوئی خاص کام ہوگا۔ نہیں بھی ہو سکتا ہے۔ جاپانی دلال کئی بار بغیر کسی ضروری کام کے اس کے یہاں گھنٹوں پڑے رہتے۔ چائے پیتے اور سگریٹیں پھونکتے۔ وہ لوگ گفتگو تو زیادہ کرتے مگر سب ہی وقت گذاری کیلئے ہوتیں۔ اکثر تو وہ لوگ وانگ کے خیالات معلوم کرنے کیلئے آتے تھے۔ اُن کی نامعقول خواہشوں اور احمقانہ حرکتوں کا وہ بھی اتنا عادی ہو چلا تھا کہ گھنٹوں تک پیشانی پر شکن ڈالے بغیر انکے جانیکا انتظار کیا کرتا تھا۔

جب کپتان ناکامور اندر داخل ہوا تو وہ اپنے لحیم شحیم جسم کو سنبھالتا اسکے استقبال کو اُٹھا۔ دونوں نے فرش پر ہی ایک دوسرے کو سلام کیا۔ اور پھیکی سی ہنسی ہنس کر تکلفاتی الفاظ دہرائے۔ مہمان کی نشست کے لئے جگہ دیکر وانگ نے ملازم کو چائے، مٹھائی اور تربوز کے بیج لانے کا اشارہ کیا۔

کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ناکامور نے کہا "مسٹر وانگ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں آپ سے ایک بات کہوں!"

"ضرور کپتان صاحب! آپ ضرور فرمائیے!!"

"میرے پاس موتی کے دو اصلی دانے ہیں۔ آپ انہیں خریدنے کی تکلیف گوارا فرمائیں گے؟"

"شوق سے جناب من شوق سے!"

وانگ کا دل دھڑکنے لگا۔ اس افسر ہی نے اسے وہ جگہ دلوائی تھی اور آج وہ اس کا بدلہ لینے آیا ہے۔ صاف طریقہ سے پیسہ طلب کرنے کے بجائے اُس نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے۔ کسی چیز کا سودا کرنے کیلئے یہ بھی بہترین ڈھنگ ہے۔ شیشہ کے دو ٹکڑوں کو ہیرا ظاہر کر کے کپتان زیادہ سے زیادہ رقم طلب کر سکتا ہے۔ اور اگر وہ انہیں خریدنے سے انکار کرے تو اس [illegible] کپتان ناکامور ایسا انتظام کر سکتا [illegible] تمام کر دے۔

[illegible] کپتان ناکامور نے [illegible] اپنے کوٹ کے بٹن کھولے اور اندر کی جیب سے چھوٹے کا ایک خوبصورت بٹوا نکالا۔ اس [illegible] سفید ریشمیں رومال میں لپٹے ہوئے آویزے باہر نکالے۔

"مسٹر وانگ ذرا [illegible] تو سہی"! کپتان نے کہا۔

وانگ نے رومال کی گرہ کھولی تو اُسے موتی کے دو ایسے رنگ [illegible] آئے جیسے ایسے رنگ اُس نے اپنی چھوٹی بہن کو تحفتاً دیئے تھے۔

کپتان ناکامور نے چونکا نہیں دیکھا کیونکہ اسکی نگاہ کہیں اور تھی نہ وہ اس کے چہرے کو رنگ بدلتے ہوئے دیکھ سکا۔ چونکہ ابھی وانگ کے چہرے پر گلابی سی سُرخی تھی ہی نہیں۔ کافی دیر تک وانگ ان موتیوں کو ٹکٹکی دے دیکر دیکھتا رہا۔ کچھ سال پہلے اُس نے اپنی چھوٹی بہن کو یہ آویزے نذر لانے میں دیئے تھے۔ اور اُس وقت یہ جتنے دیدہ زیب سفید چمکیلے اور خوبصورت تھے اتنے ہی آج بھی تھے۔ موتی کے ان رنگوں کیلئے اُس نے کافی پیسے صرف کئے تھے۔ اس وقت اس کا دل بھی ان کی لاثانی چمک دمک دیکھکر بہن کی ہونیوالی لافانی خوشی کے خیال سے مست تھا۔ آج تغیرات زمانہ کی وجہ سے یہ آویزے پھر اس کے ہاتھ میں تھے۔

"کپتان صاحب یہ موتی تو بہت ہی خوبصورت ہیں کیا آپ واقعی انہیں میرے ہاتھ فروخت کر سکتے ہیں؟"

"آپ ان کی کتنی قیمت دیں گے؟"

"آپ ہی بتلائیے!"

کپتان ان آویزوں کی واجبی قیمت نہیں جانتا تھا۔ اس کے دام سو سوا سو ڈالر کے قریب ہوں گے۔ مگر وانگ سے تو وہ ان کی قیمت پانچ ہزار ڈالر وصول کرنے آیا تھا۔ وانگ اتنا دیسکے گا یا نہیں۔ اُسے یقین کے بجائے آنے والے زریں مستقبل پر بھروسہ تھا۔ قیمت میں کمی بیشی تو ہوگی ہی نہیں۔ اس خیال سے کپتان نے قیمت کی ابتدا دس ہزار ڈالر سے کی۔

"آپ مذاق کرتے ہیں کپتان صاحب! چیز تو خوبصورت ہے مگر میں اسکی قیمت دو سو ڈالر سے زیادہ نہیں دے سکتا۔"

"آج صبح میں ایک جوہری کے پاس گیا تھا۔ جب اس نے اس کی قیمت دس ہزار ڈالر ظاہر کی ہے تو اس خیال سے کہ آپ جواہرات کے شوقین ہیں۔ میں آپ کے پاس لے آیا۔ آپ مالدار ہیں اور انہیں ضرور ہی خرید لیں گے۔"

"تو آپ کی مہربانی ہے۔ کپتان صاحب [illegible] آج کل [illegible] پیسوں سے تنگ ہوں۔ پھر بھی چونکہ مجھے چیز پسند ہے [illegible] ایک

ڈالر تک دے دوں گا۔"

"دیکھئے مسٹر وانگ میں نو ہزار پر راضی ہو جاؤں گا۔"

"تو میں دو ہزار دے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ دینا میری قوت سے باہر ہے۔ اس سے دس گنی زیادہ قیمت والی چیز بھی میں اس سے زیادہ نہیں خرید سکتا۔"

کپتان جانتا تھا کہ وانگ اور بھی بڑھے گا۔ اس لیئے اُس نے کہا آپ کبھی نہ چاہیں گے کہ میں انہیں کسی جوہری کے ہاتھ فروخت کر دوں اگر آپ انہیں خوشی سے خریدیں گے تو میں ساڑھے سات ہزار ڈالر میں ہی دے دوں گا۔"

آخری الفاظ کم و بیش نہ ہونے والے کہے گئے تھے۔ پھر بھی ان میں لالچ اور دھمکی کا اظہار ہوتا تھا۔

"جب آپ میرا اتنا خیال رکھتے ہیں تو میں آپ کی بات کو ٹوٹا نہیں سکتا۔ پھر بھی میری درخواست ہے کہ آپ پانچ ہزار سے زیادہ نہ مانگیں"۔

دونوں کے چہرے پر ہنسی چھا گئی کیونکہ دونوں کی دلی خواہشات کے مطابق سودا ہوا تھا۔ وانگ نے چائے کی پیالی بھری اور دونوں پینے لگے۔

دونوں ہی اپنے اپنے خیالات کے سمندر میں مستغرق ہو گئے۔

وانگ نے سکوت توڑتے ہوئے دریافت کیا۔ "آپ رقم کس طرح لینا پسند کریں گے؟"

"نقد لینا ہی پسند کروں گا۔"

"معاف کیجیے آج تو نقد نہیں دے سکتا۔ لیکن کل تک ضرور دے سکتا ہوں۔"

"کوئی حرج نہیں۔ اگر اس طرح سے آپ کو سہولیت ہو تو ایسا ہی کیجئے۔ مگر کل پھر میرا آپ سے ملنے آنا ٹھیک نہ ہوگا۔"

کچھ دیر توقف کے بعد وانگ نے کہا" ایک عرصہ ہوا کہ میں کسی جاپانی ریسٹورنٹ میں نہیں گیا۔ لیکن کل شام کو میں آپ کی دعوت کی کوشش کروں تو کیا آپ منظور فرمائیں گے۔ اور اس وقت ہی میں قیمت بھی ادا کر دونگا۔"

"بھلا ایسا بھی کیا مسٹر وانگ! میں آپ کو بلا وجہ تکلیف دیتا ہوں خیر ایسا ہی سہی۔ جو آپ کی مرضی۔"

پھر وقت اور مقام طے کیے جاتے ہوئے چائے کے ایک کپ سے زیادہ پیتے ہوئے کپتان نے اجازت چاہی۔ وانگ تعظیم کیلئے اُٹھا اور مشایعت کیلئے ساتھ چلتا رہا۔ وہ کپتان سے بہت طویل القامت اور جسیم تھا۔

کپتان نے ٹوپی ہاتھ میں لیکر اور وانگ نے جھک کر سلام کیا اور پھر دونوں نے ہم زبان ہوکر کہا۔ "اچھا پھر کل"

کپتان باغیچے کی پتھریلی زمین پر سے اُٹھکر دروازے سے باہر نکلا۔ دربان نے اُسے سلام کیا۔ مگر اس نے کوئی خیال نہ کیا۔ جب وہ سڑک پر آیا تو ٹرام کی ٹن ٹن کرتی گھنٹیاں، رکشا چلانے والوں کی ہٹو بچو اور موٹر کی پوں پوں اسے ایک عجیب سا زسی معلوم ہو رہی تھی۔ وانگ نے چائے کا ایک پیالہ خالی کیا اور ملازم کو کھانا لانے کی فرمائش کی۔

دوسرے روز شام کو سات بجے سے کچھ قبل کیپٹن ناکامورا نے گولڈن کرسچین میں کھانے کا انتظام کیا۔ (شنگھائی جاپانی آبادیوں کے قریب ہونکو محلے کی دوسنگ سڑک کی ایک گلی میں یہ ریسٹورنٹ تھا) اوّل روز ہی کپتان نے ٹیلیفون پر ایک بہت ہی عمدہ کمرہ ریزرو کروا لیا تھا۔ اعلےٰ پیمانہ پر کھانے کی تیاریاں کرنے اور دو خوبصورت ناکتخدا لڑکیوں کے حاضر رکھنے کی بھی اس نے اجازت دیدی تھی۔ کیونکہ دو بہت بڑے آدمی کھانے پر آنے والے تھے۔

ٹھیک سات بجے ریسٹوران کے دروازے پر وانگ خوبصورت اور باریک آسمانی رنگ کا لباس پہنے بند موٹر میں سے اُترا۔ کتنے ہی مہینوں کے بعد آج پہلی مرتبہ بلا کسی خوف و ہراس کے باہر نکلا تھا۔ دو خادم اُسے عزت سے اُتار کر ریسٹوران کی طرف لے گئے۔ ایک نے ریسٹوران کا دروازہ کھولا۔ ایک گھنٹی بجی اور ریسٹوران کا مالک وانگ کے استقبال کو آیا۔ جب وہ چھوٹے سے خوبصورت حوض اور پانی کے فوارے والے ننھے سے باغیچے میں داخل ہوا تو اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔

"کپتان ناکامورا آپ کا انتظار کر رہے ہیں جناب! اس طرف تشریف لے چلیئے ——————!"

وانگ نے آدمیوں کو وداع کیا۔ ریسٹورنٹ کے مالک نے ایک لڑکی کو اُس کے بوٹ اتارنے اور سلیپر پہنانے کا اشارہ کیا۔ اسی وقت کپتان ناکامورا لکڑی کی چمکدار سیڑھیاں اُترتا ہوا نیچے آیا۔ وہ بہت ہی مسرور تھا۔ بہت ہی خوش اسلوبی سے اُس نے وانگ کا استقبال کیا۔

جو کمرہ ریزرو کروایا گیا تھا وہ ریسٹورنٹ میں سب سے شاندار تھا اسکی کھڑکیاں باغیچے کی طرف تھیں۔ ایک دیوار کے ذریعہ وہ دسیع دنیا سے منقطع کیا گیا تھا۔ صوفوں پر ریشمین تکیے سلیقہ مندی سے آراستہ کیے گئے تھے۔ ایک کونہ میں چینی کے گلدان میں کاسنی اور گلابی رنگ کے خوبصورت

یاں اور پستیاں رونق محفل تھیں۔ اور اپنی عطر بیزیوں سے بزم کو
ی تھیں۔ کمرے کے درمیان میں ایک چھوٹی ٹیبل پر دونوں آدمی
ز کے پچھلے حصہ پر رکھے ہوئے بیٹھے تھے۔ کپتان ناکامور نے تالی
را "نائی سن!"

ان کی خدمت میں دو حوروش دوشیزائیں حاضر ہوئیں اور ایک
طرح کوکی "آئی" ۔ اور وہ سیڑھیاں چھوڑتی ہوئی کمرہ کے اندر
یا نیچے جھکا کر کھڑی ہوگئیں۔

"نائی سن: چائے لاؤ اور کھانا تیار کرو۔"

فوراً دونوں ایک تھالی میں مختلف قسم کے مزے دار کھانے لے کر
ں۔ دو چھوٹے چھوٹے رومالوں کو ٹیبل پر رکھکر تانبے کے برتن میں
لنے کیلئے پانی رکھدیا۔ کھانا تیار ہو رہا تھا۔ لوہے کی کڑاہی میں
کر گوشت اور سرلی تلی جانے لگی۔ جب تک کھانے کی خاص چیزیں
کپتان اور وانگ نے دوسری چیزیں چکھنی شروع کیں۔ لذیذ کھانا
ں طرح اور خوبصورت ساقیوں نے جنت کو نظرانداز کرنے پر مجبور
ییے جیسے کھانے پینے کی چیزیں بڑھتی گئیں ان کی گفتگو برابر ترقی
۔ دونوں ایک دوسرے کو اصرار سے کھلانے لگے۔

جب کپتان کو احساس ہوا کہ وانگ کھانے کا بہانہ ہی کر رہے
ں نے بھی اپنی بانس کی تیلیاں نیچے رکھدیں۔ اور پھر خادماؤں کو
ن کرکے پھل اور سگریٹ لانے کا حکم دیا۔ سب چیزیں آجانے کے
ں کو رخصت کیا گیا۔

کپتان نے کہا "ہوٹل کی لڑکیاں کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہوں
لی بیشہ ور طوائفوں کے یہاں جانا پسند کرتا ہوں۔"

"جاپانی لڑکیاں ——— !" وانگ نے قطع کلام کرتے
ہا۔

چائے کا گھونٹ اتارتے ہوئے کپتان نے کہا "لڑکیوں کے تو
ے میں بہت ہی مواقع ملتے ہیں۔"

"لڑائی بھی کیا غضب کی چیز ہے" بدمست شرابی کی طرح بہکتے
نگ نے گفتگو جاری رکھی۔ جاپانی فوج نے بھی غضب ہی کیا۔ لوٹ
تو کوئی حساب ہی نہیں رہا" کپتان کی آنکھوں کے آگے جنگ کا نقشہ
ایسے معلوم ہونے لگا جیسے وہ میدان جنگ میں ہی ہے۔ اور اس کے
بیہودگی میں غلط سلط نکلنے لگے۔

جب ہم نے کنگٹ کیا تھا آپ اگر ہمارے ساتھ ہوتے تو دنگ
بخارہ جاتے۔ آہ! اس دن کا کیا ذکر کروں ہمارے کئی ساتھی بیکار اور
پاگل ہوگئے۔ جواب میں ہم نے بھی ہر ایک چینی عورت، بچہ، بوڑھا اسکو
قتل کر ڈالا۔"

وانگ نے سہارا دیا "ان واقعات کی رنگینی نہیں بھلائی جا
سکتی ہے کپتان!"

"ہم نے چینیوں کے گروہ کے گروہ گرفتار کئے۔ دس دس پچاس
پچاس اور سو سو کی تعداد میں چینیوں کو مشین گن کے دہانے پر رکھدیا۔ رٹر
ٹرٹر ٹرٹر ابھی تک آواز گونجتی ہے۔ مجھے تو اس صدائے بازگشت میں موسیقی
سے بہتر ہی معلوم ہوتی ہے۔"

"ہم جیتے۔ مگر فتح کی خوشی منانے کے لئے ہمارے پاس بارود نہیں
بچی تھی۔ مشعلیں نہ تھیں تو ہم نے ایک جدید ترکیب سوچی۔ چینی اسیروں میں
سے کچھ کو باندھا اور ان کے جسموں پر مٹی کا تیل چھڑک کر ماچس لگائی تو پھر
کیا چیخیں سنائی دی ہیں۔ کیسا منظر نظر آیا کہ پٹاخوں اور پھلجھڑیوں کا
ایک ساتھ ہی مزا حاصل ہوگیا۔ کتنے بہت جمع ہوگئے تھے۔ اس سے ہمیں بہت
زود رہ کر لطف اندوز ہونا پڑا۔"

اس بار وانگ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔

"اجی پیجئے! آپ تو ساغر کو لب ہی نہیں لگاتے۔ پیجئے دنیا میں
بجز اس کے اور ہے ہی کیا!" کہتے ہوئے کپتان نے شراب کے پانچ چھ
پیگ چڑھا لئے۔ وانگ نے اتنی زیادہ شراب پینے میں معذرت ظاہر کرتے
ہوئے معافی چاہی۔ اسکے بشرے سے عیاں تھا کہ وہ اس قسم کی گفتگو
سے اکتا گیا ہے۔ اس لئے آہستہ سے دریافت کیا۔

"جنگ میں اس کے سوا اور فوائد بھی تو حاصل ہوتے ہونگے؟"

"اجی فوائد کی بھی آپ نے خوب کہی۔ جتنی لڑکیوں کی ضرورت ہوتی
مل جاتیں۔ ہم افسروں کو تو بہتر سے بہتر۔ ایک بار شاید آپ نے دیکھا
ہو ——— !"

"آپ کے خیالات تو بہت بلند ہیں۔ آپ کے قابل کوئی مل سکے۔!"

"میری خواہش کے مطابق تو نانکنگ میں ایک ملی تھی۔ جب چینیوں
کو قتل یا گرفتار کرنے کا کام نہ ہوتا تو ہمارا زبردست کام لڑکیوں کی
تلاش ہی ہوتا۔"

"کپتان صاحب ذرا اس نانکنگ والی دوشیزہ کے متعلق تو کچھ

...نا لیجئے کیونکہ میں بھی اسی قسم کے موقعوں سے فائدہ اُٹھا چکا ہوں۔ میری ایسی عادت ہے کہ اگر کوئی عمدہ لڑکی نہ ملے تو اپنا وقت چاندماری میں گذارا کرتا ہوں۔ کسی دوشیزہ کو زینت آغوش بنا کر کچھ دن گزارنے میں حرج ہی کیا ہے۔

میں ایک دن نانکنگ میں ٹہل رہا تھا کہ میں نے ایک خوبصورت مکان دیکھا۔ اس میں کسی مکین کے ہونیکا امکان نہ تھا۔ پھر اندر داخل ہونا فضول تھا۔ تو بھی اپنے چند سپاہیوں کو لیکر اس میں گھسا۔ اندر کمرے خوب آراستہ تھے۔ ہمارے لئے نذرانہ تیار رکھا تھا۔ ہم تمام کمروں میں گھوم آئے آپ نے کیا دیکھا۔

"بتلاتا ہوں۔ بتلاتا ہوں" کپتان نے کہا اور کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد گفتگو شروع کی۔ "زیریں منزل کے سب کمرے دیکھنے کے بعد ہم اوپر چڑھے۔ پہلا کمرہ ہی مقفل تھا۔ مگر اسکو توڑنے میں کچھ بھی دیر نہ لگی۔ میں سب سے آگے تھا۔ اندر کونے میں ایک مجسمۂ حُسن و شباب چینی لڑکی تھی۔ اتنا حُسن ہم نے زندگی میں پہلی بار دیکھا۔ اس کی آنکھیں۔ اس کا چہرہ۔ اس کا گوشت پوست ——— میرے پاس ان سب کی صحیح تعریف کرنے کے لئے لفظ نہیں ہیں۔ میرے آدمی اسے حسرت ناک نگاہوں سے گھور رہے تھے۔ میں نے سب کو باہر جانے کا حکم دیا۔ لڑکی تو بے جان بُت کی طرح کھڑی تھی۔ جیسے ہی میں ایک دم آگے بڑھا وہ چیخ اُٹھی ——— نہیں ——— نہیں ——— مہربانی کرکے مجھے چھوڑ دیجئے اور جب میں نے اسے اُٹھا کر بستر پر ڈالا تو اُس نے اپنے کان کے ایر رنگ اُتار کر میرے پاس رکھ دیئے۔ اور گڑگڑانے لگی۔ "یہ لے جاؤ مگر مجھے چھوڑ دو ——— ہونہہ پاگل کہیں کی۔ اُس نے آویزوں سے تو ہاتھ دھوئے ہی اور ساتھ میں ———!

مالک نے دریافت کیا "جو آپ نے مجھے دیئے وہی ایر رنگ"

کپتان نے جواب دیا "جی ہاں۔ وہی ایر رنگ"۔ اب وہ تھک گیا تھا اور شراب کا نشہ طاری وحادی تھا۔

"کپتان صاحب! آپ نے بہت بڑھ بڑھ کر ہاتھ مارے ہیں مجھے آپ سے خوف معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی آپ کی باتیں سُنکر مجھے بہت ہی سکون ملا۔ لاجواب آویزے دیکر آپ نے مجھ پر احسان عظیم فرمایا ہے کیا اس کے جواب میں کوئی نذر قبول فرما کر عزت افزائی فرمائیں گے۔"

کپتان نے سکون سے اُسکی بات سُنی۔ اور سر ہلا کر اجازت دی۔

"کپتان صاحب یہ کیا ہے؟"

اور اس کی سرخ سرخ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ دِل میں بھونکے جانے سے پہلے اُس نے ایک چمکتا ہوا چھرا مسٹر وانگ کے ہاتھ میں دیکھا۔

کیفِ بہار

(از جناب حامد علی خانصاحب)

(بلبل ہند شریمتی سروجنی نائیڈو کی ایک نظم کا ترجمہ)

بہار اے دل! آ گئی چمن میں سبزہ زار میں
یہ کوئلوں کی بولیاں!
یہ زمزموں کی مستیاں!
یہ عشق کی کہانیاں چڑھاؤ اور اُتار میں
بہار اے دل آ گئی! چمن میں سبزہ زار میں
کنارِ جو کی مستیاں میں کس طرح کروں بیاں
وہ مور ناچنے لگے!
وہ مست نغمہ ہو گئے!
یہ نہر کی روانیاں، روانیوں میں شوخیاں
کنارِ جو کی مستیاں میں کس طرح کروں بیاں
پھر اے دلِ حزیں نہ کیوں غم اپنا ہم بھی بھول جائیں
جہاں تمام مست ہے
پئے ہوئے خوشی کی مے
پھر اب بھی کیوں ہیں یہ غم، یہ رنج، یہ ستم اُٹھائیں
اب آ کہ اے دلِ حزیں! غم اپنا ہم بھی بھول جائیں
یہ زمزمہ طیور کا یہ نغمے جوئبار کے
چل اور مستعار لائیں
اُٹھ، اور آج ہم بھی گائیں
کہ عمر ابھی پڑی ہے غم کی یاد کیلئے
ذرا سنبھل دلِ حزیں کہ دن ہیں یہ بہار کے

ڈاکٹر سکسینہ کی نذر

سوسائٹی

(از جناب نرید وش بھنوزہ، ہندو کالج دہلی)

نہ اُسے کھانے کی فکر تھی۔ نہ پہننے کی۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کس کی لڑکی ہے۔ اُس کا کیا نام ہے؟ اُس کا دن بھر کا کام یہی تھا۔ سڑکوں پر ادھر اُدھر گھومتی پھرتی۔ کبھی بچوں کے پیچھے بھاگتی نظر آتی اور کبھی وہ یہ گنگناتی پھرتی تھی

"دنیا کہتی مجھکو پاگل میں کہتی دنیا کو پاگل"

گلیوں کے شرارتی بچے "پگلی ـــــ پگلی" چلاتے۔ وہ اُن کے پیچھے بھاگتی۔ اکثر بوڑھی عورتیں جب اُسے اپنے بچوں کی طرف بھاگتے دیکھتیں تو فوراً چلانے لگ جاتیں "ارے چڑیل! ان کے پیچھے کیوں بھاگتی ہے؟" اور بیچاری ہزاروں گالیاں سنتی۔ انٹرنس پاس لڑکیاں جو یہ سمجھتی تھیں کہ اُنہوں نے دُنیا کی ساری وِدّیا ختم کرلی ہے کہتیں کوئی جاہل عورت ہے، آوارہ ہے۔ اِس سے دُور رہو۔ اَن پڑھ عورتیں اپنی نوخیز کنواری لڑکیوں سے مخاطب ہوتیں "ارے اس رانڈ سے دُور رہو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کا سایہ تمہارے اُوپر پڑ جائے"۔ وہ بیچاری سب کچھ سنتی مگر ان کی جہالت پہ مسکرا دیتی۔ اور ایشور سے انہیں معاف کرنے کیلئے سچے دل سے دُعا مانگتی۔ چند اور شرارتی بچے اُس کے پتھر بھی مارتے تھے۔ وہ بے چین ہو کر اُن کے پیچھے بھاگتی۔ بچے تو ایک طرف اب تو من چلے نوجوان بھی اُسکو پگلی کہکر پکارتے تھے۔ پڑھے لکھے آدمی ایک دوسرے سے کہتے "دیکھو تو سہی کتنی جوان ہے اور اس طرح گھومتی پھرتی ہے۔ اس کو ڈر نہیں لگتا" اگر ایک دل پھینک جوان اسکی ہرنی جیسی بڑی بڑی چمکدار آنکھوں کی تعریف کرتا۔ تو دوسرا اُسکے تھرتھراتے ہوئے رخساروں کو دیکھکر دل تھام کر رہ جاتا۔ اور تیسرا اُس کی خوبصورتی کو شاعرانہ تخیل میں باندھتا۔ اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ چند لوگ یہ بھی کہنے لگے تھے۔ بیچاری محبت کا شکار ہے۔ بیماری دل میں مبتلا ہے ـــــ جی ہاں کیا واقعی وہ ایسی بیماری میں مبتلا تھی ـــ؟ کچھ نہیں کہا جاسکتا ـــ مگر ہاں وہ ایک بھارتی کنیا تھی۔ اُس کے دل میں محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ مگر وہ محبت کس کے ساتھ تھی۔ کسی خاص شخص کے ساتھ نہ تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ بھی بچوں کی ماں بنے۔ وہ بھی بھارتی استری بن کر اپنے پتی کی سیوا کرے ـــــ

تو کسے کہوں دکھ اپنے [illegible] ـــ یہ سوسائٹی ـــ کالج کے لڑکے اور لڑکیوں کی سوسائٹی ـــ اور اس سوسائٹی کی بیہودہ اور ناقابلِ برداشت حرکات والزامات ـــــ

چنانچہ آج بھی وہ اسی طرح بھاگے جارہی تھی۔ بھاگتے بھاگتے رک گئی۔ دیکھا سامنے ایک کالج تھا۔ چند شرارتی وِدیارتھی باہر کھڑے تھے۔ اُنہوں نے اُسے دیکھتے ہی ایک دوسرے سے کہنا شروع کیا۔

"ارے ظہیر پنچھی آرہا ہے!"

"منوہر پنچھی ہے تو اچھا!"

پگلی ـــ آہ! پگلی بولی "افسوس پنچھی کے اچھا ہونے کے باوجود بھی اس کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ کوئی بھی تو اُسے نہیں پہچانتا"

"ارے امر سنگھ! لے جا اسکو بورڈنگ ہاؤس میں پھانس لے۔"

"یار میں کیا کروں گا اس کا۔ اس کو تو لیڈیز کومن روم میں بھیجو۔ اور کسی کے ذریعہ لڑکیوں کو انفورم (اطلاع) کردو کہ ان کی نانی آگئی ہے۔"

سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ پگلی ـــ بیچاری بے بسی کی حالت میں اپنے آپ کو کوس رہی تھی۔ اور وِدیارتھی سائیکولوجی کے پروفیسر صاحب کو آتے دیکھکر سب کے سب رفو چکر ہوگئے۔ پروفیسر صاحب اپنی اچکن پہنے اور منہ میں سگریٹ دبائے چلے آرہے تھے۔ اُسے دیکھکر ذرا جھجکے۔ معلوم نہیں اُنہیں کیا یاد آگیا۔ انہیں یقین تھا کہ اُنہوں نے اس لڑکی کو ضرور کہیں دیکھا ہے۔ کچھ سوچ کر بولے "لتا"!

"کون ـــ! مجھے میرے نام سے پکارنے والے کون ـــ؟"

پروفیسر صاحب اب بالکل اس کے سامنے تھے۔ بولے "میں ہوں لتا۔ مجھے پہچانتی ہو کیا؟"

"اجی نہیں۔ مگر آپ کون ـــ؟ آپ کو میرے نام سے کیسے واقفیت؟" اُس بیچاری نے ایک ہی سانس میں پروفیسر صاحب کے سوال کا جواب دے کر دو سوال کر دیئے۔

"میں اس کالج میں سائیکولوجی کا پروفیسر ہوں۔ شاید آپ آگرہ کالج میں پڑھا کرتی تھیں۔؟"

"جی ہاں آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں لیکن آپ مجھے کیسے جانتے ہیں؟"

"میں بھی آگرہ کالج کا طالب علم تھا جس سال میں ایم اے کے فائنل ایر میں تھا اس سال میں کالج پارلیمنٹ کا سیکرٹری تھا۔ میں آپ سے جب سے واقف ہوں۔ مگر مجھے آپ کی یہ حالت دیکھکر حیرانی ہورہی ہے۔ آپ تو اچھی

[illegible] لڑکی تھیں۔ آپ کی یہ حالت کیسے ہو گئی۔؟ آپ کا خاندان بھی تو بہت امیر تھا۔ میں آپ کی یہ دشا دیکھ کر اچنبھے میں ہوں۔"

"میری یہ د ــــ ش ــــ ا ــــ میری یہ دش ــــ ا"

لتا کی زبان بند ہوتی جاتی تھی۔

"لتا بتاؤ! میں تمہاری ضرور مدد کروں گا۔"

"میری مدد ــــ! میری مدد ــــ!! بجلی کی مدد!!!"

"بولو نا نیک سیرت لتا! تمہاری یہ دشا کس نے کی ہے؟"

"اُن لڑکوں اور لڑکیوں کی ظالم سوسائٹی نے۔ ان کی بیہودہ و ناقابل برداشت حرکات و الزامات نے" ــــ لتا کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

پروفیسر صاحب نے ایک آہ بھری۔ وہ بھی تو کالج کے لڑکوں اور لڑکیوں کی سوسائٹی کی خامیوں سے خبردار کیا کرتے تھے۔ اور سائیکولوجی کے پروفیسر ہونے کی بنا پر لڑکے اور لڑکیوں کی دماغی قوت و داخلی اثرات کی ضروریات پہ روشنی ڈال کر ان سب سے خبردار کیا کرتے تھے۔ اس لئے وہ اور بھی زیادہ لتا کی آپ بیتی سننے کے لئے تیار ہو گئے۔ بولے "معلوم لتا! سناؤ اپنی آپ بیتی۔"

"ــــ جب میں ایف اے میں پڑھا کرتی تھی تو میں اکثر کالج پیدل ہی جایا کرتی تھی۔ ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ میں کالج جانے کیلئے تیار ہو چکی تھی۔ اپنی کوٹھی کے برآمدے میں آ کھڑی ہوئی اور بارش بند ہو جانے کا انتظار کر رہی تھی۔ کہ اتنے میں میری مامی جی آئیں اور بولیں "لتا دیکھو کمار کار میں کالج جائے گا۔ تم بھی اُس کے ساتھ ہی چلی جانا۔"

"مامی جی کون کمار ــــ؟"

"بیٹی یہ سامنے والی کوٹھی میں رہتا ہے۔ تمہارے کالج میں ایم اے میں پڑھتا ہے۔ اس نے فلاسفی لی ہوئی ہے۔"

میں نے کمار کو کالج میں پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ خیر مامی جی نے کمار کو بلوایا۔ میں اسکی کار میں بیٹھ کر اُس دن کالج گئی۔ ابھی کار سے اُتری ہی تھی کہ چند ایک سہیلیوں نے دیکھ لیا۔ بس کمرے میں پہنچتے ہی سوالوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی۔

"اری لتا! تیرا یہ کون ہے؟" ــــ "ہاں لتا اب تو ہم سے بات بھی نہ کرے گی ــــ اب تو پَر لگ گئے ــــ بھلا کون ــــ؟ ارے پی ــــ مری لتا جیجا جی سے ملاقات تو کرا دے ــــ اری دیکھو! لتا تو اب موٹر والی ہو گئی۔ غرض یہ کہ ہزاروں قسم کے طعنے مجھے سُنائے گئے۔ میں نے جواب میں صرف اتنا کہا "ڈیر فرینڈز ہی از مائی برادر" (سہیلیو وہ میرا بھائی ہے) ملتے ہیں تجھ بول اٹھی۔ "اری سُنو تم۔

تمہیں بیسویں صدی کے بہن بھائی"

سب لڑکیاں کھل کھلا کر ہنس پڑیں اور مجھے بھی اُن کی باتوں پر ہنسی آگئی ــــ میں ــــ"

پروفیسر صاحب کے اندازہ لگایا کہ کہانی بیچاری کی بہت لمبی ہے بات کاٹتے ہوئے بولے۔ "لتا! چلو سڑک کے دوسری طرف اُس درخت کی چھاؤں کے نیچے بیٹھ کر اپنی باقی کہانی سنانا۔"

اب پروفیسر صاحب اور لتا درخت کی چھاؤں کے نیچے تھے۔ اور لتا نے دوبارہ اپنی کہانی شروع کر دی۔

مجھے فلاسفی میں کچھ دلچسپی نہ تھی۔ اس لئے کچھ کمزور تھی۔ ایک دن مامی جی نے کمار کو چائے پہ مدعو کیا۔ اور کہا "کمار اپنی بہن کو فلاسفی پڑھا دیا کرو۔ یہ فلاسفی میں کمزور ہے۔"

"جو حکم گیا ماتا جی۔"

اب میں کمار سے فلاسفی پڑھا کرتی تھی۔ ہفتے میں چار دن میں اُسکی کار میں کالج آتی جاتی تھی۔ باقی دن پیدل آتی جاتی تھی۔ جس دن میں پیدل کالج جاتی سہیلیاں کہتیں "لتا! آج پی روٹھ گئے کیا؟ ــــ کیا کمار نے طلاق دیدی؟" اور میں چپ ہو جاتی کہ مارنے والے کا ہاتھ پکڑا جا سکتا ہے مگر بولنے والے کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی۔ ادھر کمار کو بھی لڑکے چھیڑتے تھے۔ مگر وہ بھی ان کو بھونکنے والے کتوں کی طرح سمجھ کر چپ ہو جاتا۔ ایف، اے کا نتیجہ نکل آیا۔ میں فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئی اور فلاسفی میں یونیورسٹی میں فرسٹ آئی۔ بی اے میں جا کر میں نے فلاسفی میں آنرز لے لیے۔ کمار کا اب فائنل ایر تھا۔ وہ پڑھائی میں لگا ہوا تھا۔ لڑکیاں اکثر کہتی تھیں "لتا! کمار نے پہلے پڑھا کر تو ایف اے میں فرسٹ اسٹینڈ کرایا ہے اب پڑھا کر بی اے کا ریکارڈ بریک کرائیگا۔ اری تم فیس کیا دیتی ہو؟"

دوسری لڑکیاں بول اُٹھتیں "روپوں کی شکل میں نہیں" اور پھر سب میرا مذاق اُڑانا شروع کر دیتیں۔ دوسری طرف لڑکے مجھے دیکھ کر دور سے ریمارک پاس کرتے۔ میں اُنہیں دیکھ کر مسکرا دیتی اور اُن کی اِس جہالت پہ ہنس دیتی۔

میرے چاچا دہلی میں رہا کرتے تھے۔ اُن کا تبادلہ بھی آگرہ کا ہو گیا۔ اُن کا لڑکا بھی بی اے میں پڑھتا تھا۔ اب میں کمار اور ونود تینوں اکٹھے کالج جایا کرتے تھے۔ کالج میں ایک تہلکہ مچ گیا۔ میرے نام کالج میں ایک دن ایک گمنام خط آیا۔ میں عرصہ دراز سے اپنی ایک سہیلی کے پتر کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے

خط بڑی چاہ سے کھولا۔ کسی نے صرف اتنا لکھا تھا "ایک میان میں دو تلواریں نہیں سما سکتیں۔" گو میں جانتی تھی کہ یہ سب شرارت لڑکیوں کی ہے۔ میرے پڑھتے پڑھتے وہ خط شباشنی چھین کر لے گئی۔ اب لڑکیاں میرے منہ پر کہتیں: "فلاسفر صاحبہ کیا فلاسفی کی مدد سے ایک میان میں دو تلواریں سما دو گی؟" اُدھر ونود اور کمار کو لڑکوں نے تنگ کر رکھا تھا۔ وہ کہتے۔ "لتا تو ایک کا ہے نہ گھر کا نہ گھاٹ کا۔ ونود اور کمار تم دونوں مُنہ دیکھتے ہی رہ جاؤ گے۔"

لڑکے اور لڑکیوں کے اس رویّے نے مجھے تنگ کر دیا۔ میرا کسی لڑکے یا لڑکی سے بات چیت کرنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ اور نہ اب میں کسی سے بات چیت کیا کرتی تھی۔ ان ہی دنوں بھیا کمار کی شادی ہوئی تھی۔ میں نے اور ونود نے اُس کے گھر جا کر تحفے دیئے۔ کمار کے دوستوں کے ذریعہ کالج میں سب کو معلوم ہو گیا کہ کمار کی شادی ہو گئی ہے۔ لیکن بیچاری لتا نے اوروں کو دکھانے کے لئے مجبوراً دل سے تحفے دیئے ہیں۔ لڑکیوں کو بہانہ مل گیا۔ ویسے بھی میں پہلے سے ہی اُداس رہتی تھی۔ وہ آپس میں کاناپھوسی کرتیں۔ ہائے! اور پھر وہ گانے لگ جاتیں۔

نینوں سے چلا بَن ملا کر
دل میں پریم کی آگ لگا کر
آنکھوں میں اک جوت جگا کر
دیکھت ہو کس اور
بالم آؤ آؤ۔ تم اِس اور

ابھی لڑکیاں اُن کو منع ہی کرتی تھیں۔ اُن کی موجودگی میں وہ چُپ ہو جاتیں۔ مگر بعد میں پھر وہ ہی شروع کر دیتیں۔

ہر سال میں لیڈیز پرائمز ڈیبیٹ میں پرائز دو نمبر رہا کرتی تھی اور ونود اس سال لٹریری یونین کا سکریٹری تھا۔ اس سال میں چوتھی دفعہ انعام لے رہی تھی۔ اس لئے پریذیڈنٹ نے مجھے ایک شیلڈ بطور انعام دلوائی تھی۔ مگر سارے کالج میں یہ چرچا اچل گئی کہ ونود نے اپنی محبوبہ کو چاندی کی شیلڈ دلوائی ہے یہ سب محبت کا کرشمہ ہے۔ ارے ہم سے کوئی نہیں محبت کرتا ورنہ ہمیں بھی چاندی کی شیلڈ تو ایک طرف سونے کی شیلڈ ملتی۔ یہ خبر اُڑتے اُڑتے پرنسپل صاحب کے پاس پہنچی۔ اُنہوں نے مجھے بلوایا اور کہا کہ میں ونود سے بات چیت کرنا بند کر دوں۔ ورنہ یہ خبر میرے گھر پہنچا دی جائے گی۔ میں نے اُنہیں جواب دیا۔ "چونکہ ونود میرے چاچا کا لڑکا ہے۔ میرا بھائی ہے۔ اس لئے میں کیسے اُس سے بات چیت بند کر سکتی ہوں۔"

پرنسپل صاحب بولے "کیا وہ سچ مچ آپ کا بھائی ہے؟"

"تو کیا آپ کو شک ہے؟"

"معاف فرمائیں۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔"

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں سنیما ہال سے پکچر دیکھ کر باہر آ رہی تھی کہ ونود اور اپنے کلاس فیلو سلیم کو باتیں کرتے ہوئے دیکھا۔ سلیم نے دعا سلام کی۔ ونود تو سگریٹ لینے چلا گیا۔ میں اور سلیم رہ گئے۔ سلیم نے باتیں کرنا شروع کیں۔

"آپ پکچر دیکھ کر واپس آ رہی ہیں شاید؟"

"جی ہاں۔ مگر پکچر خاص اچھی نہیں۔ صرف ایک سین اچھا ہے۔"

"وہ کون سا سین؟ میں بھی تو کل ہی یہ پکچر دیکھ کے آیا تھا۔"

"جب جنگل میں ہیروئن جذبات کی رَو میں بہہ کر ہیرو سے کہتی ہے میں تم سے پریم کرتی ——— آہ!

"سامنے دیکھا۔ ریکھا کھڑی تھی۔ میرے چہرے پر شرم و حیا کی سرخی دوڑ گئی۔ وہ مجھے شک کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ میں گھبرا گئی اور فوراً چلی گئی۔ کالج میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ میں نے سلیم سے پریم کی بھکشا مانگی ہے۔ اب مجھے طعنے دو طریقوں سے دیئے جاتے تھے۔ ایک دیواروں پر لکھ کر اور دوسرے چلتے چلتے۔ لیڈیز کومن روم میں ایک دیوار پر لکھا ہوا تھا۔ "دو ہندوؤں نے ٹھکرا دیا اب مسلمان کو پھنسانے چلی ہے چھی۔ کیوں نہیں حُسن بازار میں جا بیٹھتی چھی۔"

ہر ایک چیز کی حد ہوتی ہے مگر یہاں بات حد سے باہر نکل چکی تھی۔ میرے ماتا جی نے میرے لئے بَر تلاش کرنا شروع کیا اور اُنہوں نے ایک ڈھونڈ بھی لیا۔ مستقبل کی سُہانی اُمنگیں میرے دل میں گدگدا کر چٹکیاں بھرنے لگیں۔ میرے پیکرِ شباب میں جذبات کی لہروں کا تلاطم پیدا ہو گیا۔ میں جانتی تھی کہ میں پتی دیو کی سیتا دیوی کی طرح وفادار بن کر رہوں گی۔ دیس سہاگ لال پیدا کر کے بھارت ماتا کی بھینٹ چڑھا دوں گی۔ آہ!" لتا کی آنکھوں میں آنسو آ رہے تھے ———

"اس سوسائٹی کی وجہ ———" لتا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اُدھر پروفیسر صاحب نے بھی ایک لمبی سانس لی۔ لتا نے کچھ دیر بعد اپنی کہانی شروع کی ——— "میرے ہونے والے پتی نے میرے کالج میں آ کر میرے بارے میں دریافت کیا۔ اُن کے کانوں میں صرف ایک بات ڈالی گئی "آوارہ ہے بہت سیر کرتی ہے۔" نتیجہ یہ کہ وہ ریجیکٹ کر کے چلا گیا۔ یہاں تک کہ ایک کے ساتھ تو میرے ماتا جی نے بات پکی کر لی تھی۔ مگر ان لڑکوں اور لڑکیوں نے اس بیچارے کے کان بھر کر رشتہ تڑوا دیا۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے میرے پانچ چھ بَر تلاش کئے گئے اور وہ سب مجھے ان جھوٹے الزامات کی بنا پر ریجیکٹ کر کے چلے گئے۔

سلیم اور میرے بارے میں کالج میں افواہیں اُڑائی جا رہی تھیں۔ ہمارے چال چلن پر دھبے لگائے جا رہے تھے۔ نت نئے الزامات ہم پر لگائے جاتے تھے۔ میرے دماغ میں ایک ہلچل سی ہو رہی تھی۔ سکونِ قلب نصیب نہ تھا۔ اِسی طرح سلیم بھی بیچارہ راحت قلب کی کھوج میں مارا مارا پھرتا تھا۔ مگر افسوس! وہ بزدل نکلا۔ اور زہر کھا کر ہر لوک سدھار گیا۔ لیکن میں مردانہ وار لڑتی رہی۔ ریکھا نے ——— آہ! جس کی وجہ سے مجھے یہ دن دیکھنے نصیب ہوئے ہیں۔ اس نے میرے بارے میں افواہوں کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ایک خبر نے میرے تن من میں آگ لگا دی تھی۔ "لتا نے اپنی عصمت ایم اے کے لڑکوں ستیش اور اقبال کے ہاتھوں بیچ دی۔"

"ریکھا! ——— ریکھا!! ——— ریکھا!!! ———" پروفیسر صاحب نے ایک لمبی سانس لی اور پھر کہا۔ "ریکھا!!!! ———"

"کیوں پروفیسر صاحب کیا اتنی سی بات پر گھبرا گئے۔ ابھی تو کہانی اور دردناک ہے۔"

"تمہیں پاک دیوی! ——— تمہیں عصمت کی دیوی لتا! ——— یہ ریکھا جس نے تم جیسی دیوی کی عصمت پر الزام لگایا ہے ——— یہ ریکھا بڑی ہوس تھی۔ گو میں گناہگار نہیں۔ مگر شرمسار ہوں۔ یہ ریکھا میرے پاس ایک دفعہ آئی جبکہ یہ بی اے میں پڑھا کرتی تھی۔ اُس دن وہ محسوس کرتی تھی کہ وہ کنواری ہوتے ہوئے بھی ماں بننے والی ہے۔ اور وہ اس وقت میری مدد کی خواہاں تھی۔ اس نے اس دن خود یہ تسلیم کیا کہ ایک نوجوان نے برابر تین سال اسکی جوانی کی کلی کا رس بھونرا بنکر چوسا ہے۔ ریکھا نے بعد میں ایک سال کیلئے کالج چھوڑ دیا۔ کہیں باہر چلی گئی۔ وہ ماں بن چکی تھی۔ مگر بن بچے کے۔ اُس نے گناہ کیا مگر چوری سے۔ اور دوبارہ کالج میں پڑھنا شروع کر دیا۔ آہ! اِس دنیا میں یہ عجیب بات ہے جو لوگ لوگوں کی آنکھوں سے بچ کر اور چھپ کر گناہ کرتے ہیں وہ سوسائٹی میں گناہگار نہیں گنے جاتے۔ مگر وہ بے گناہ جنہوں نے کبھی گناہ نہیں کیا وہ گناہگار تصوّر کئے جاتے ہیں۔ آہ!"

"ہے ایشور، تو ریکھا کو معاف کر" اتنا کہکر لتا نے پھر آگے کہنا شروع کیا ——— "مجھے پرنسپل نے کالج چھوڑنے کا حکم دے دیا۔ مجھے ماتا جی نے بھی گھر چھوڑ دینے کیلئے کہہ دیا۔ اور کہا "تو واقعی ہی ایسی ہے۔ ورنہ تیرا یہ حال ہرگز نہ ہوتا۔" یہ لفظ میرے زخمی دل پہ تیر کی طرح لگے۔ اور چھلنی چھلنی کرکے پار ہو گئے۔ اب میرا اِس دُنیا میں کوئی نہ تھا۔ ماں باپ پہلے ہی داغ جدائی دے چکے تھے۔ نہ کوئی بھائی تھا نہ کوئی بہن۔ دنیا کو یقین دلانے کے باوجود بھی چاچا نے میرے چال چلن کو دھندلا سمجھا۔ اب میرا دل کسی کے پاس جانے کیلئے نہ کرتا تھا جب سے ہی میں نے گھر چھوڑا ہوا ہے۔ جب میں بچّوں کو دیکھتی ہوں تو میرا دل کرتا ہے کہ میں انہیں گود میں لے کر جی بھر کے اُن کو پیار کروں۔ مگر وہ بھاگتے ہیں۔ میں ان کے پیچھے بھاگتی ہوں۔ وہ میرے پتھر مارتے ہیں۔ بوڑھی عورتیں مجھے رانڈ اور چڑیل کے نام سے پکارتی ہیں۔ لڑکیاں مجھے جاہل اور آوارہ کے نام سے موسوم کرتی ہیں۔ اور میری اَن پڑھ بہنیں کنواری لڑکیوں کو میرے سایہ سے دور رہنے کی تاکید کرتی ہیں۔ نوجوان مجھے محبت کا شکار بتاتے ہیں۔ کالج کے لڑکے لڑکیاں مجھے پنچھی کے نام سے پکارتے ہیں ———"

اتنے میں چند بچّوں کی "پگلی ——— پگلی" کی آواز سے لتا چونک اٹھی۔ وہ ایک دم اُٹھکر اُن کے پیچھے بھاگی۔ "بچّو! بچّو!! آؤ میرے پاس۔"

پروفیسر صاحب عزت کے خیال سے لتا کی طرف بھاگے تو نہیں۔ مگر تیزی سے قدم بڑھا کر اُسکی طرف چلنے لگے۔ تاکہ اس کو پکڑ کر اُس کی مدد کریں۔

آہ ——— ! پگلی بھاگتی بھاگتی ملٹری کی لاری کی جھپیٹ میں آ گئی ——— اور بیچاری نے ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں۔ اِدھر پروفیسر صاحب سوسائٹی کے شکار کو سڑک پر پڑا دیکھکر غمگین ہو گئے۔ اتنے میں ہسپتال سے ریڈ کراس کی ایک لاری آئی اور لتا کی لاش کو لے گئی۔

پروفیسر صاحب ماتھے پر ہاتھ رکھے لتا کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ وہ اُسکو گھر لے جا کر اس کی خواہشات کے مطابق اس کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ مگر قدرت نے بیچاری کو ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سلا دیا۔ پروفیسر صاحب سڑک پر گم سم چلے جا رہے تھے۔ معلوم نہیں کدھر جا رہے تھے۔ مگر کچھ گہری سوچ میں تھے۔ اُن کے کانوں میں "سوسائٹی ——— سوسائٹی ———" آوازیں پڑ رہی تھیں۔ لیکن وہ گم سم اُس لمبی سڑک پر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے جا رہے تھے۔

دوپٹہ

(از محترمہ شیریں)

سفید براق سا جالی کا دوپٹہ چنبیلی کے ڈھیر کی طرح اس کے سامنے پڑا تھا اور کونے پر بیل کی پہلی پتی شروع کرتے ہی اُس کا ذہن جانے کتنی مدت پیچھے کی طرف گھوم گیا۔ آج سے برسوں پہلے کے زمانہ کی طرف! اور اُس کے تصور نے اس کی آنکھوں کے سامنے بیتے دنوں کی ایک بھولی بسری تصویر اُجاگر کردی۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے یہ کل ہی کی بات ہو۔ جب پہلے پہل اُسے ایک جالی کا دوپٹہ کاڑھنے کو ملا تھا۔ وہ کتنی خوش تھی اس دن۔ جیسے اُسے گڑیوں اور کھلونوں کے صندوق مل گئے ہوں۔ "یہ پڑھنا لکھنا ہی کام نہیں آئے گا۔ بیٹی کا اصل جوہر سلائی اور کھانا پکانا ہے۔ پہلے وقتوں میں یہ سکول کے دھندے کب تھے۔ شروع ہی سے کشیدہ کاری۔ سلائی اور طرح طرح کے کھانے پکانے سیکھے جاتے تھے اور جبھی تو لڑکیاں بڑی ہوکر بڑے بڑے درزیوں، سوزن کاروں اور باورچیوں کے کان کاٹتی تھیں۔ کتنی بار کہا۔ بی بی کوئی ڈھنگ کا کام شروع کرو۔ یہ نگوڑی گڑیاں عمر نہیں سدھار ینگی مگر کیا مجال جو کبھی کان پر جوں تک رینگی ہو۔ جتنا وقت کم بخت گڑیوں میں برباد ہوتا ہے اتنی دیر جم کر سلائی کرو تو چاہے گھر بھر کے کپڑے سی ڈالو۔ ابھی سے کام میں دیدہ لگے گا تو آئندہ بھی عادت پڑیگی۔ یہ جالی کا دوپٹہ تمہیں دیتی ہوں۔ ایک پھول بنا کر بتائے دیتی ہوں۔ یہ نمونہ کا دوپٹہ اپنے پاس رکھ لو۔ اللہ بہشت نصیب کرے۔ تمہاری ماں کا کاڑھا ہوا ہے میں نے سنبھال کر تمہارے لئے رکھ چھوڑا تھا۔ دیکھو تو کیا مینہہ سا برس رہا ہے جیسے سچ مچ کے پھول کھلے ہوں۔ اتنی محنت تو تم سے نہیں ہوگی۔ بس اس کے پلو کی سی بیل چار طرف کاڑھ لینا۔ کوئی کوئی پھول بھی ڈال لینا۔ تو بس اس میں خانے گننے ہی کی ساری کرامات ہے۔ اور دیکھنا میلا چکٹ نہ ہونے پائے۔ سلائی کڑھائی کی یہی خوبی ہے کہ کپڑے پر کہیں دھبہ تک نہ لگے۔"

اس مختصر سی تمہید کے بعد اماں بی نے دوپٹہ اس کے گھٹنوں میں دبا کر ایک پتی اپنے سامنے بنوائی تھی۔ اور وہ جلدی جلدی بیل کی دوسری پتیاں بنانے لگی تھی۔ کتنی مسرت تھی آج اسکے دل میں۔ کتنا شوق اور کتنا فخر۔ کہاں تو اللہ مارے کروشیے اور سلائیوں کے سوا سلائی کے کسی اور کام کے قابل ہی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کہاں اب ایک دم سے یہ اتنا بڑا چاندی کا سا سفید سفید پیارا سا دوپٹہ کاڑھنے کو مل گیا۔ اب وہ بھی چچی کی طرح ایک جگہ جم کر بیٹھ کے بڑی شان سے گھٹنوں پر اسکو پھیلا کر سوئی چلائے گی۔ لیکن یہ کیا؟ اماں بی کی بنوائی ہوئی پہلی پتی کے بعد ٹانکا بھی تو ڈھنگ سے نہیں لگتا۔ بہتیرا نظر جما جما کر گھورا۔ بہتیرا گن گن کر خانے ٹھائے مگر توبہ — بیل کے پھول ہیں کہ کسی طرح قابو [illegible] نہیں آتے۔ ایک پتی کی نوک پورب کو جا رہی تھی تو دوسری کی [illegible] پھر کتنی دیر کی کشمکش کے بعد اس نے اکتا کر دوپٹہ سمیٹ کر [illegible] پھر وہ منحوس دوپٹہ ایسا سوہانِ جان ہوکر اس کے گلے [illegible] پیچھا نہ چھوٹا۔ کاڑھے جب مشکل۔ نہ کاڑھے جب نف ——

"میں کہتی ہوں آخر تم یہ پھول کیوں ٹھیک سے نہیں بنا سکتی ہو۔ اس میں آخر ایسی کیا پھندگی ہے۔ ہر کشیدہ سے آسان موا جالی کا کشیدہ۔ آنکھ بند کر کے گنتی جاؤ۔ اور دھاگہ ڈالتی جاؤ۔ گنتی جانتی ہو ماتی موٹی موٹی کتابیں حساب کی پڑھتی ہو۔ مگر جالی کے دو چار خانوں کا حساب نہیں آتا؟ اور پھر نمونہ کا دوپٹہ سامنے رکھا ہے۔ خدا بہشت نصیب کرے دُلہن کے ہاتھ تھے یا مشین۔ کیسی صفائی تھی۔ کیسی نفاست تھی۔ اُڑتے تیتر اور مور کاڑھتی تھی۔ تم بھی تو اُسی ماں کی بیٹی ہو ——" اور وہ بڑی حسرت سے سوچا کرتی۔ ماں کو کسی نے سلائی کڑھائی سکھائی ہی نہ ہوتی۔ کم از کم جالی کا کشیدہ تو ہرگز نہ بتایا ہوتا۔ کاش انہیں کاڑھنے کے لئے جالی کا یہ دوپٹہ ساری دنیا میں ڈھنڈورا پٹوانے پر بھی نہ ملا ہوتا۔ بھلا اگر مرنا ہی تھا تو یہ ضروری تھا کہ ایک جالی کا دوپٹہ اس کی چھاتی پر ہمیشہ کے لئے مونگ دلنے کو اپنی یادگار چھوڑ جائیں۔ ایک تو مرگئیں لیکر اتنی جلدی اور اوپر سے اس کا جانی دشمن یہ ذلیل دوپٹہ چھوڑ گئیں۔ پھر جانے کتنے عرصہ میں وہ دوپٹہ آخر ختم ہوگیا۔ اُسے تو یوں جان پڑتا تھا جیسے صدیاں ہی بیت گئی ہوں۔ اور جب اس نے آخری پھول مکمل کرکے ایک فاتحانہ نظر دوپٹہ پر ڈالی تو اُس کا دل جیسے ڈوبنے لگا۔ جانے اس دوپٹہ کو کڑوے تیل کے کنستر میں کس نے اور کب ڈال دیا تھا۔ وہ سب کی نظر بچا کر جلدی سے غسل خانے میں چلی گئی۔

اور وہاں اس نے لکس کی پوری ٹکیہ اس دوپٹے پر رگڑ رگڑ کر ختم کر ڈالی۔ اور پھر جب اپنی ایک رازدار سہیلی کو ساتھ لیکر چھت پر جاکر ہوا میں لہرا لہرا کر اس کو سکھا کے جلدی سے تہہ کیا تو اُسے یوں معلوم ہونے لگا جیسے وہ جالی نہیں کوئی اور ہی نیا سا کپڑا بن گیا تھا۔ نہ وہ ملائم ملائم سی سختی تھی۔ نہ وہ پیاری پیاری سفیدی۔ جیسے کوئی گیج گجا سا چھیچڑا تھا۔ اُس نے لڑکھڑاتی زبان سے جلدی جلدی اماں بی کی یاد کرائی ہوئی آیت "حسبی اللہ ونعم الوکیل۔" دُہرائی تھی۔ اور دل ہی دل میں گڑگڑا کر دُعا مانگی تھی۔ "اچھے اللہ میاں! اماں بی یہ دوپٹہ دیکھکر ذرا سا مسکرا کر صرف اتنا کہدیں "چلو لڑکی سے دُلہن والی بات ہوگئی۔" اور پھر اُس کی یہ دُعا جانے کیسے چشم زدن میں آسمانوں کی بلندیوں پر جا پہنچی تھی۔ اس نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اماں بی کے سامنے دوپٹہ پھیلا دیا تو وہ اس وقت اپنی عادت کے مطابق کہیں دُور خلا میں نظریں جمائے کچھ تک رہی تھیں۔ جیسے کوئی کھوئی ہوئی چیز ڈھونڈ رہی ہوں۔ جیسے کوئی بھولی ہوئی کہانی یاد کر رہی ہوں۔ اور انہوں نے اپنی اس محویت سے چونک کر بے ساختہ وہی الفاظ دُہرا دیئے تھے "چلو لڑکی سے دُلہن والی بات ہوگئی۔" اور اُسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے وہ راجہ اندر کے دربار والے سونے کے تخت پر بیٹھی آسمانوں کی طرف اُڑی جا رہی ہو۔ لیکن ——

اب؟ وہ گویا کوئی بہت ہی حسین خواب دیکھتے دیکھتے یکایک بیدار ہوگئی اب؛ اب چاہے وہ یہ دوپٹہ نصف صدی میں ختم کرے۔ چاہے اس کو لیکر تیل کے بڑے سے ٹبکے میں ڈبودے۔ چاہے اس کو ٹیڑھی کی ٹانگوں کے سے ٹیڑھے ترچھے پھولوں سے بھر دے۔ کیا مجال کسی کا ذرا بھی ڈر ہو۔ کوئی ایک لفظ بھی اعتراض کا کہہ جائے۔ اگر وہ اماں بی کو دکھلانے لے بھی جائے گی تو وہ تسبیح ہاتھ سے رکھکر تکیہ کے نیچے سے چشمہ نکال کر آنکھوں پر لگائیں گی اور پھر خوشی سے بھری ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ دوپٹہ اپنے مرجھائے ہوئے ہاتھوں میں لے لیں گی۔ کچھ دیر اس کو پلٹ کر دیکھتی رہیں گی اور پھر اپنے پاس بیٹھی ہوئی نئی خوشامد سے بہت ہی مغرور اور مسرور لہجہ میں ہونے سے کہیں گی "خبر نہیں بہن۔ اس نے اتنا ہنر لے کہاں سے لیا؟ اس نے تو گڑیوں ہی میں اپنا سینا کاڑھنا سیکھ لیا تھا کہ میں دیکھکر دنگ رہ جایا کرتی تھی۔ دیکھو تو ہاتھ ہیں یا مشین۔

اس کا سر فخر سے بلند ہو جائیگا۔ احساس خود مختاری اس کی رگ رگ میں مسرت بھردے گا۔ لیکن —— نہیں نہیں اُسے یہ آزادی اور خود مختاری پسند نہیں۔ اُسے اس تحسین وستائش کی مطلق خواہش نہیں۔ کاش۔ گردش دُنیا ایک بار پھر ماضی کی طرف لوٹ پڑے —— اُسے پھر اماں بی جالی کا ایک دوپٹہ کاڑھنے کو دیں۔ وہ پھر اس کو میلا چکٹ کرکے مہینوں بعد پورا کرکے ڈرتی کانپتی اماں بی کو دکھلانے لے جائے اور وہ پھر وہی ادھوری سی تعریف کردیں۔ کیسی تسکین تھی ان رعب بھرے تعریفی الفاظ میں۔ کتنی مٹھاس۔ کتنی محبت اور کتنی شفقت۔ وہ اپنی آج کی ساری آزادی۔ ساری خود مختاری اس معصوم پابندی پر نثار کرانے کو تیار تھی۔

جوبال

از جناب شیدا خورجوی

یہ رازِ عشق بہرحال ہم بھی پا نہ سکے — وہ خود ہی آ نہ سکے یا ہمیں بلا نہ سکے
وہ غم ہی کون سا تھا جسکو ہم اُٹھا نہ سکے — وہ حادثہ ہی کب تھے جو پیش آ نہ سکے
نہ پوچھ ایسے دلِ بے ادب کی بات نہ پوچھ — ستم ہے جو تری خاطر بھی مسکرا نہ سکے
نہ جانے کس لئے پیدا نہ کرسکی فطرت — وہ ایک دل جو فریبِ بہار کھا نہ سکے
کچھ اس ادا سے کہی ہم نے داستانِ وفا — کہیں کہیں تو نگاہیں بھی وہ اُٹھا نہ سکے
گُلوں کو چھوڑ کے کانٹوں کے پاس کیوں جائے — وہ کم نصیب کہ دامن بھی جو بچا نہ سکے
چلے ہے راہ محبت میں کوئی دوش بدوش — ہم اک قدم بھی کسی کے بغیر اُٹھا نہ سکے
یہ سعئی ضبط مرے قہقہوں میں پنہاں ہے — وہ رازِ غم جسے اُنکی نظر بھی پا نہ سکے
وہ سجدہ ہائے سرِ رہگذر کو کیا سمجھے — جو آستاں کے بغیر اپنا سر جھکا نہ سکے
چلو تمہارے تو ہم ہو چکے بہر صورت — یہ اور بات ہے اپنا تمہیں بنا نہ سکے
ہزار منزلیں آئیں رہِ محبت میں — کہیں بھی ہم تو فریبِ نگاہ کھا نہ سکے
تری جفا سے تو لغزش بھی ہوگئی اکثر — قطعہ مگر وفا کے قدم تھے کہ ڈگمگا نہ سکے

نہ پوچھ عشق کی مجبوریوں کو اے شیدا
ستم ہے بھولنے والے کو ہم بھلا نہ سکے

ٹ یہ کلمہ پرانی بوڑھیاں عموماً پسندیدگی کے وقت بولتی ہیں

غزل

(ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر حضرت نوح ناروی)

پھر ابر آٹھا پھر پھول کھلے نکلے کوئی کیا مے خانے سے
چھلکی بھی اِدھر پیمانے میں چھلکی بھی اُدھر پیمانے سے

یارانِ چراغِ محفل سب رکھتے ہیں غرض یارانے سے
دیکھا نہیں اک پروانے کو جلتے ہوئے اک پروانے سے

مینا و سبو کا ذکر نہیں نکلے گا سوا مے خانے سے
کتنا ہے مرا ظرف اے ساقی ناپ اس کو ذرا پیمانے سے

انکار کروں گا میں کب تک جاؤں گا بالآخر جاؤں گا
یاروں کے بلاوے آتے ہیں مسجد میں مجھے بتخانے سے

پہلے تو شرف بخشا آکر پھر خاک اُڑائی ہر جانب
آباد ہوا برباد رہا صحرائے جنوں دیوانے سے

اے بادہ کشو ڈالو وہ اثر کھنچ آئیں یہاں تک شمس و قمر
یہ چھپتے ہوئے دونوں ساغر کیوں دور رہیں میخانے سے

ناصح کی نصیحت سن سن کر ہم دیکھتے ہیں ناصح کی طرف
اس کو بھی سمجھ لو دیوانہ اُلجھے جو کوئی دیوانے سے

بیمارِ محبت کا درماں جو کچھ وہ کریں فی الفور کریں
ورنہ یہ مسافر جاتا ہے دنیا کے مسافر خانے سے

گردوں پہ اُٹھی گھنگھور گھٹا لازم ہے تدارک توبہ کا
یوں بند کروں پیمانے میں نکلے نہ کبھی پیمانے سے

مسجد سے ہمارا ذوقِ طلب لایا تھا ہمیں بت خانے میں
لیکن نہ یہاں بھی کوئی ملا اب جائیں کہاں بتخانے سے

کیا رسمِ وفا آپس میں نبھے دونوں کے خیالات ایک نہیں
حسرت ہے مجھے یارانے کی نفرت ہے تجھے یارانے سے

ایک ایک کو مے پلوا ہی دی کیا چشمِ کرم تھی ساقی کی
وہ زہد کا پیماں چل نہ سکا اس چلتے ہوئے میخانے سے

ساقی کے کرم کا یہ مطلب ساقی کے ستم کے یہ معنی
بے جام لئے بے جام دیئے جائے نہ کوئی میخانے سے

احباب چھٹے گھر بار چھٹا اے جوشِ جنوں جانا ہی پڑا
خود خانہ خرابی آئی ہے لینے کو مجھے ویرانے سے

ہر وقت تقاضہ کرنے میں ذلت ہی بہت اے پیرِ مغاں
میں پھر نہ کبھی ساغر مانگوں دیدے مجھے اس پیمانے سے

حسرت نہ رہے پھر پینے کی ارماں نہ رہے پھر مستی کا
جس جام میں ساقی اتنی ہو مجھکو وہ ملے میخانے سے

اے آتشِ اُلفت اور بھڑک اے شعلۂ غم اور اونچا ہو
دل شمع سے میں نے مانگ لیا پر چھین لیا پروانے سے

اے نوح فقط میخانے تک کیا جوشِ مئے سرجوش رہا
طوفان اُٹھا مستی کا وہیں چھلکی یہ جہاں پیمانے سے

غزل

(از جناب کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی سحرؔ۔ پی، سی، ایس)

غم و آہ و نالہ سے فرصت نہیں ہے — محبت ہے یہ خوابِ غفلت نہیں ہے
وہ حالت پہ میری گراتے ہیں آنسو — یہ قطرہ مرے دِل کی قیمت نہیں ہے
فلک پر بہت ماہ پارے ہیں لیکن — ہماری نگاہوں کو فرصت نہیں ہے
جو دینا ہے دے بے طلب اے خداوند — گدا ہوں، گداؤں کی فطرت نہیں ہے
غمِ دوش مُجھ کو نہ ہے فکرِ فردا — مجھے آگہی کی ضرورت نہیں ہے
اگر دید ہوتی رہے گاہے گاہے — تو ہے ہجر راحت مُصیبت نہیں ہے

سحرؔ جانے دے یہ فسردہ حکایت
مجھے اب کسی سے محبت نہیں ہے

مشعلِ راہ

(از جناب نخشب جارچوی)

ہر بات آئینہ نگہِ حق نگر میں ہے
جو تیرے دل میں ہے وہ ہماری نظر میں ہے

تو ہی بتا کہ سجدوں کا محتاج تو نہیں
وہ رابطہ جو میری جبیں تیرے در میں ہے

دِل بُجھ رہا ہے ڈوبتے تاروں کے ساتھ ساتھ
لیکن دُعا ابھی تک اُمیدِ اثر میں ہے

منزل سے دُور سارے زمانے سے بے نیاز
اک شخص اپنی دُھن میں تری رہگذر میں ہے

مجھکو ہو تم عزیز، تمہیں غیر ہے عزیز
کس درجہ فرق میری تمہاری نظر میں ہے

نخشب رموزِ راہِ محبت نہ پا سکا
وہ بے خبر جو منزلِ ہوش و خبر میں ہے

غزل

از جناب الطاف مشہدی

یہ آنکھوں ہی آنکھوں میں کیا ہو گئے ہم — ابھی جاگتے تھے ابھی سو گئے ہم
مقامِ تجسس اک ایسا بھی آیا — کہ پایا تجھے اور خود کھو گئے ہم
جو اب تک ہیں زیبِ قبائے محبت — کچھ ایسے بھی موتی کبھی رو گئے ہم
ترے غم کو خود سے بھی ہم نے چھپایا — مگر پھر بھی رسوائے غم ہو گئے ہم
یہ معراجِ دردِ محبت ہے شاید — کہ تیری نظر میں بھی غم ہو گئے ہم
عناصر نے لیں ہچکیاں سانس ٹوٹی — کہا عشق نے جاوداں ہو گئے ہم

تڑپنے میں الطاف وہ لذتیں ہیں
کہ تڑپے نہ جی بھر کے اور سو گئے ہم

غزل

از جناب سہیل احمد سہیل ناروی
نبیرۂ جناب نوح ناروی

انہیں پھر بلانے کو جی چاہتا ہے — گلے سے لگانے کو جی چاہتا ہے
مری عمر گزری یونہیں روتے روتے — ذرا مسکرانے کو جی چاہتا ہے
بہت ہو چکی پردہ داری تمہاری — نقاب اب اٹھانے کو جی چاہتا ہے
وہ اٹھی گھٹا جلد لا میرے ساقی — کہ پینے پلانے کو جی چاہتا ہے
جو مجھ کو نہیں یاد بھولے سے کرتے — انہیں بھول جانے کو جی چاہتا ہے
وہ ناراض مجھ سے ہوئے ہیں دوبارہ — انہیں پھر منانے کو جی چاہتا ہے
نہیں بھولتیں اس کی دلکش ادائیں — بہت کچھ بھلانے کو جی چاہتا ہے
وہ ہیں بے وفا یا وفادار وہ ہیں — انہیں آزمانے کو جی چاہتا ہے
مجھے وہ سنا کر یہ کہتے ہیں اکثر — کسی کے ستانے کو جی چاہتا ہے
جو ثابت کرے نوح کا ہوں نواسہ — وہ طوفاں اٹھانے کو جی چاہتا ہے

سہیل اب خیابانِ شعر و سخن میں
نیا گل کھلانے کو جی چاہتا ہے

آج کی رات

کوئی مہمان ہوا ہے مرے گھر آج کی رات
[illegible]

بعد مدت کے ہوا ہے یہ قران السعدین
زلف رخ حسن ہے اور عشق کا سر آج کی رات

کب کی ترسی ہوئی نظروں سے لگی ہیں نظریں
آنکھوں ہی آنکھوں میں ہوتی ہے بسر آج کی رات

یوں تو آنے کو شبِ قدر، شبِ عید بھی آئی
مگر آئی ہے باندازِ دگر آج کی رات

ملتی جاتی ہے غم و حسرتِ یک عمر کی داد
گھلتا جاتا ہے دعاؤں کا اثر آج کی رات

کبھی افراطِ محبت میں چھلک اٹھتا ہے
ان کی نظروں سے مرا دردِ جگر آج کی رات

کبھی پایانِ محبت میں ڈھلک پڑتے ہیں
اُن کے رُخ پر مرے اشکوں کے گہر آج کی رات

درد بھی، کیف بھی ہے، سوز بھی ہے، ساز بھی ہے
غم و عشرت ہیں بہم شیر و شکر آج کی رات

یوں تو اٹھے اسی سینے میں ہزاروں طوفاں
اور ہی جوشِ محبت ہے مگر آج کی رات

پیاسی آنکھوں کو جھکائے ہوئے ہے شبنمِ حسن
خشک ہونٹوں پہ ہے موجِ گلِ تر آج کی رات

ماہِ کامل کی کرن پھول سے جیسے کھیلے
دل پہ یوں پڑتی ہے وہ شوخ نظر آج کی رات

جیسے اُتری ہو ابھی عرشِ بریں سے شبِ قدر
یوں ہے وہ زلفِ رسا تا بکمر آج کی رات

کیا گہر ہوگا بھلا آب میں اپنی غلطاں
روئے تاباں ہے اور آغوشِ نظر آج کی رات

لاکھ شرمائیں وہ یا چہرے کو ہاتھوں سے چھپائیں
کہیں ملتی ہے نگاہوں سے مفر آج کی رات

عرق آلود ہوئی جاتی ہے خود برقِ جمال
اتنی ٹھہری ہوئی ہے تابِ نظر آج کی رات

نورِ عفت کی چمک عرش سے ٹکراتی ہے
جب جھکا لیتے ہیں وہ شرم سے سر آج کی رات

چھوٹتے جاتے ہیں سائے کی طرح وقت و مقام
شوق اُس دھن میں ہے سرگرمِ سفر آج کی رات

کون کہتا ہے کہ ہے بےخبری لازمِ عشق
ناخنوں میں ہے دو عالم کی خبر آج کی رات

نازِ صد محشر و صد ناز بآغوش ہے عشق
دیکھ لے آ کے قیامت ہے کدھر آج کی رات

ہائے یہ عالمِ دیوانگیٔ شوق سرِ دشت!
مانگتے ہیں وہ محبت سے حذر آج کی رات

از
جناب سحر حسن عسکری طباطبائی بی اے

غزل (بقید یک قافیہ)

(خان صاحب جناب حکیم محمود علی خانصاحب ماہر اکبرآبادی)

خلق میں آزار و غم کا ایک افسانہ ہوا
کیوں ہوا سودائی، کیوں دل انکا دیوانہ ہوا

گوشۂ زنداں میں رہکر زندگی دشوار تھی
جان دینے کے لئے مجبور دیوانہ ہوا

بس تمہارے ایک جملے کا جہاں محتاج ہے
جس کو دیوانہ کہا تم نے، وہ دیوانہ ہوا

مسکرائے دے رہے ہیں وہ تماشا دیکھکر
سرفرازِ بارگاہِ ناز دیوانہ ہوا

کچھ دنوں سے عشق میں دونوں کی دنیا ایک ہے
تم بھی دیوانے ہوئے ہو، میں بھی دیوانہ ہوا

ایسی کیا تاثیر پائی ہے نگاہِ ناز نے
اک نظر تم نے جسے دیکھا وہ دیوانہ ہوا

ان سے آنکھیں چار ہوتے ہی ہوا دل کا یہ حال
دیکھتے ہی دیکھتے کم بخت دیوانہ ہوا

ہوش کھوئے حضرت موسیٰ نے تھا انکا نصیب
جس کو ہو جانا تھا دیوانہ، وہ دیوانہ ہوا

رنگِ عالم دیکھکر، حسنِ تماشا دیکھکر
ہم نے اے ماہر جسے دیکھا وہ دیوانہ ہوا

آخری سلام

(از جناب شفیع منصور صاحب ایم۔اے)

گدائے راہگذر کا سلام لیتی جاؤ!
وفائے خاک بسر کا سلام لیتی جاؤ!

تمہاری بزمِ طرب میں جو بار پا نہ سکی
مری اُس آہِ سحر کا سلام لیتی جاؤ!

چلی تو ہو کسی دنیائے رنگ و بو کی طرف
بہارِ خونِ جگر کا سلام لیتی جاؤ!

لو چھا گئی مری دنیا پہ غم کی تاریکی
دعائے شب کے اثر کا سلام لیتی جاؤ!

سلام کہتے ہیں آنسو تمہیں ذرا ٹھیرو!
وفا کے لعل و گہر کا سلام لیتی جاؤ!

میں دیکھ لوں تمہیں اک بار اور جی بھر کے
اُدھر سے مڑکے اِدھر کا سلام لیتی جاؤ!

تمہیں پسند کیا محفلِ دو عالم میں
اِس انتخابِ نظر کا سلام لیتی جاؤ!

یہ دو دلوں کی جدائی ہے عمر بھر کے لئے
اداس راہگذر کا سلام لیتی جاؤ!

مزدور کی شام

(از جناب زیب امروہوی)

(یہ نظم مکڈانل ہائی سکول جھانسی کے مشاعرہ میں پڑھی گئی ہے)

مصرعِ طرح :- ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں

وہ بیچارہ مفلس وہ مزدور بد دل
اٹھاتا ہے دن بھر ہزاروں مصائب
چلا آرہا ہے بغل میں دبائے
امیدوں کی دنیا امیدوں کے دفتر
امیدوں کے اسکے جہاں اور بھی ہیں

کبھی فکرِ روزی کبھی فکرِ ساماں
کبھی فکرِ بی بی کبھی فکرِ طفلاں
نہ ہے فکرِ گرمی نہ ہے فکرِ باراں
کہ پیشِ نظر ہیں بہت اور ارماں
بہت اس کے ارماں نہاں اور بھی ہیں

وہ اترا سا چہرہ لئے آرہا ہے
وہ بگڑا سا نقشہ لئے آرہا ہے
تھکا ماندہ ہارا چلا آرہا ہے
وہ مزدورِ ہندی چلا آرہا ہے
کہ دل میں امنگیں نہاں اور بھی ہیں

وہ جس وقت ہے چاند سا گھر میں آتا
وہ جس وقت ہے اپنے تاروں سے ملتا
کبھی دیکھتا ہے کبھی پیار کرتا
کہ ارمان ہے اسکے دل کو بڑھاتا
کہ تاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں

دلِ داغِ مفلس چراغِ سحر ہے
مگر تیل بتی کی اس کو فکر ہے
کیا کام دن بھر مفکر مگر ہے
کہ کم مائیگی اپنی پیشِ نظر ہے
بہت فکریں اس کی نہاں اور بھی ہیں

یہ مزدورِ ہندی ہے آفت کا پتلا
مصیبت کا مارا بلاؤں کا مارا
نہ قسمت کا شاکی ہے نکبت کا پتلا
مگر زیب ہے وہ قناعت کا پتلا
بہت سے مصائب نہاں اور بھی ہیں

سزائیں

(از جناب الطاف مشہدی)

چشمِ مدہوش کو نم ناک بنانا ہوگا — میری محبوب! غمِ زیست اُٹھانا ہوگا
بھوک کی دھوپ جھلس دے گی گلابی چہرہ — ظلم کی آگ میں پھولوں کو جلانا ہوگا
تیرگی جبر کی ماتھے سے چپک جائیگی — موت کی نیند مقدر کو سلانا ہوگا
سانپ آلام کا چاٹے گا لبوں کی سرخی — دیوِ بیداد کو سینے سے لگانا ہوگا
مرمریں جسم پہ رینگیں گے غموں کے سائے — روح کو خوگرِ آزار بنانا ہوگا
میکدہ ساز جوانی کی پڑے گی قیمت — بھوک کا روگ کسی طور گنوانا ہوگا
غم سے معمور فضاؤں میں گھٹیں گی سانسیں — یاس کا زہر امنگوں کو پلانا ہوگا
زندہ احساس کے ہونٹوں پہ پڑیں گے تالے — دل کی آواز کو سینے میں دبانا ہوگا
مفلسی بڑھ کے حمیت کا گلا گھونٹے گی — صبر کی سرخ سلاخوں کو چبانا ہوگا
میری محبوب! تجھے سخت سزائیں سہکر — بھٹکے انسان کو رستے پہ لگانا ہوگا

چشمِ مدہوش کو نم ناک بنانا ہوگا
میری محبوب! غمِ زیست اُٹھانا ہوگا

عشق اور شعر

از جناب محمد حسن صاحب محمود۔ ایم اے

شعلے فضا میں رقصاں ہیں ، ہیں خون سے ہولی کھیل رہے
بادل سے دھوئیں کے اٹھتے ہیں ، بستی کو نظر سے ڈھانکا ہے
توپوں کی گرج گولوں کی دھمک ، شاید کہ قیامت آ پہنچی
پیغام جدائی آ پہنچا ، اب ہوتی ہے گنتی سانسوں کی
گرداب میں کشتی آئی ہے ، ممکن ہی نہیں اب بچ جائے
اک فوج نے گھیرا ڈالا ہے ، گھر گھر میں لڑائی ہوتی ہے
یہ خون کی پیاسی سنگینیں تکتی ہیں کوئی تو مل جائے
دیوار و دریچے ، فرش و زمیں سب خون سے بالکل رنگ ڈالے
بے گور و کفن ہیں ، خاک بسر ، کوئی بھی نہیں جو رو دیتا
چہروں پہ اداسی چھائی ہے اور یاس نے رنگت چھینی ہے
حسرت ہے برستی بستی پر ، گلزار میں گلخن کیا معنی ؟
لیکن یہیں دو دل ہنستے ہیں ، احساس نہیں ہے کلفت کا
گر آگ برستی ہے برسے ، گر آگ سلگتی ہے سلگے
بوچھاڑ ہیں گولوں کی دونوں بے خوف ہیں جھولا جھول رہے
وہ ایک ہی جھونٹے لیتے ہیں اور پینگ بڑھاتے جاتے ہیں
وہ موت کے منہ پہ ہنستے ہیں ، دنیا کو ہنساتے جاتے ہیں
یہ عشق ہے جس نے سیکھا ہے موجوں کے تھپیڑے کھا کھا کر
ہر رنج و الم سے ناواقف اک عیش و طرب کی دنیا ہے

عفریتوں نے چھاپا مارا ہے ، بازار و مکان مسمار کیے
ظلمت کا ستارا جاگا ہے ، اب دن میں اندھیرا چھایا ہے
مائل بعداوت ، تیغ بکف ، وہ دیکھو ہلاکت آ پہنچی
وہ عیش کی گھڑیاں ختم ہوئیں ، مہلت بھی نہیں اب آہوں کی
ساحل کی امیدیں لاحاصل ، سیلاب بلا جب گھر آئے
خوش ہو کے تباہی ہنستی ہے ، ویران یہ بستی ہوتی ہے
پیاسی ہیں کہیں تو پیاس بجھے ، قسمت سے کوئی تو مل جائے
اب خاک کے نیچے سوتے ہیں ، یہ جاہ و حشم کے متوالے
اس ان کی شکستہ حالی پہ اور خون کا بدلہ لے لیتا
مرجھائے دہکتے عارض ہیں اور ان میں جھلکتی زردی ہے
بکھرے ہوئے تنکے گلشن ہیں ، ہو جائے نشیمن کیا معنی ؟
کچھ عیش کے لمحے باقی ہیں ، کچھ وقت ابھی ہے راحت کا
یہ سانس ابھی تو چلتا ہے ، ہاں کوئی ترانہ گونج اٹھے
رقصاں ہیں امنگیں آنکھوں میں اور پریم سے انکے گیت بھرے
بڑھ بڑھ کے ڈالیں چھوتے ہیں اور توڑ کے پتے لاتے ہیں
آفات سے کیسے لڑتے ہیں ، عالم کو دکھاتے جاتے ہیں
چپ رہنا نہ منہ سے کچھ کہنا ، اور ہنسنا اذیت پا پا کر
دنیا سے الگ اس دنیا میں ، عشاق کی اپنی دنیا ہے

لو آہ میں نغمہ گونجا ہے تکلیف میں راحت دیکھو تو
کھل آئے ہیں لالے شعلوں میں یہ نار میں جنت دیکھو تو

سوتیلی ماں

(از محترمہ ساجدہ بنت دانش شاہجہانپوری)

وہ ناگن جس کے کاٹے کا نہیں منتر زمانے میں   وہ خنجر لطف آتا ہے جسے ٹکڑے اڑانے میں
وہ آتش منہمک جو کشتِ ہستی کے جلانے میں   وہ پانی جس کے چھینٹے طاق اک طوفاں اٹھانے میں
وہ آندھی جو ہے ماہر کشتیٔ بیکس ڈبانے میں

وہ جس کا ہر نفس آلودۂ زہرِ ستم رانی   وہ جس کے ہر قدم میں مستتر اندازِ جا پانی
وہ برچھی کی طرح چبھتی ہے جس کی چینِ پیشانی   وہ جس کا دم ہے معصوموں کے حق میں قہرِ یزدانی
وہ دل لگتا ہے جس کا بیشتر خونیں فسانے میں

وہ جس کا چُپ ہے اک عنوانِ مضمونِ ریا پرور   وہ جادو ہے نہ جس سے بچ سکا ہرگز دلِ شوہر
وہ جس نے باپ سے اولاد پہ چلوا دیا خنجر   حسد کی آگ نے جس کی جلایا حکمِ پیغمبر
یدِ طولیٰ جسے حاصل لگانے اور بجھانے میں

ترحم جس کی دنیا میں محض اک لفظِ بے مطلب   نہ دل جس کا پسیجے بر صدائے یارب و یارب
جلن جس کی پلٹ دے قسمتِ خوش وقت کا کوکب   چلے وہ چال جو ار دب میں لائی رام کا مرکب
مزا آئے جسے سوئے ہوئے فتنے جگانے میں

جسے بخشا گیا روزِ ازل قلبِ حسد آگیں   عناصر دشمنِ انسانیت اور روح مستِ کیں
خرد کجرو، بروئے کار بے قانون و بے آئیں   جدا اک پیکرِ ناری نہ مذہب اور نہ کوئی دیں
ہے گویا خواہرِ شیطاں قدم کو ڈگمگانے میں

وہ قاتل سینکڑوں معصوم جس نے قتل کر ڈالے   بہائے جس نے اکثر گھر کے اندر خون کے نالے
وہ بیکس جس کی میت پر نہیں سر پیٹنے والے   ستم قانون کے منہ میں لگے ہیں ساجدہ تالے
خدا جانے تذبذب کیا قیامت کو ہے آنے میں

گریۂ غم

(اپنی چھوٹی بہن کے انتقال سے متاثر ہو کر)

(از محترمہ شہناز اختر صاحبہ)

ہم پہ شاید اسی کا گردشِ چرخِ کہن — خامشی میں رات کی گھٹتی ہو دل کی انجمن
دے سکی ہی کیا خبر مجھکو مرے دل کی جلن — ظالم قسمت بتا! کیسی قضا؟ کس کا کفن

آہ کس معصوم کا مرقد بنایا جائیگا
کس دلہن کو لاکے تربت میں سلایا جائیگا

آنکھ کسکے غم میں ہے گریہ کناں، چہرہ اداس — چاہنے والونکو کسکی زندگی سے ہی ہراس
کس چمن کے پھول کا ہوجائیگا خاکی لباس — جا رہی ہے کون، سب ہے رو رہے گھر بھائی کے پاس

ہے یہ سب احوال شاید مہ جبیں پروین کا
ماں کے آرامِ جگر کا، باپ کی تسکین کا

زندگی پائی تھی کیا یوں دل دکھانے کیلئے — دائمی فرقت میں امی کو رلانے کیلئے
بھائیوں بہنوں کو روتا چھوڑ جانے کیلئے — دلکش ارمانوں کو مٹی میں ملانے کیلئے

اک کلی تھی باغ کی جو بن کھلے مرجھا گئی
کر گئی بادِ خزاں پامال، دل تڑپا گئی

ہو گئیں آنکھوں سے اوجھل اے مری ماہ جبیں — ڈھونڈتی ہیں تجھکو نظریں تو نظر آتی نہیں
بھول جائیں تجھکو ہم؟ ممکن نہیں، ممکن نہیں — اے بہن تسکین اب دلکو کہیں ملتی نہیں

سو رہی ہو چین سے، دنیا کے ہنگاموں سے دور
اپنی بستی میں الگ، دنیا کے غم خانوں سے دور

اے مری گل پیرہن خاموش ہے تو کس لئے — بند آنکھیں ہیں تری بیہوش ہے تو کس لئے
موت کی سختی ہی کیا مدہوش ہے تو کس لئے — زیرِ مرقد اے بہن روپوش ہے تو کس لئے

اے مری معصوم ننھی، اے مری پروین بہن
گھر کی رونق، دل کی ٹھنڈک قلب کی تسکین بہن

سازشِ قدرت تو دیکھو کر دیا ہم سے جدا — یہ مصیبت کاش دشمن پر بھی نہ ڈالے خدا
آہ! کس غفلت کے باعث ہم نے تجھکو کھو دیا — ہمکو اپنی منزلِ مقصود کا ہے کچھ پتا

اور سے تسکینِ دل ممکن نہیں یہ بھی اگر
خواب ہی میں آکے اب صورت دکھا رشکِ قمر

چاہتا ہے دل صدا دوں زندگانی کو تری — ہو جو ممکن نطق بخشوں بے زبانی کو تری
سب ترستے ہیں بہت شیریں بیانی کو تری — آ! کہ ہم تیار ہیں اب قدر دانی کو تری

خاک کے اس ڈھیر سے تسکین ہوگی ہمیں
رو رہے ہیں ہم تجھے، کیا تو نہ رو لیگی ہمیں

اے بہن! ظالم قضا سے کس جگہ پائی اماں — ہو گئیں اب ہم سے چھٹ کر کیسے جنگل میں نہاں
تیری متلاشی نگاہیں اب تجھے ڈھونڈیں کہاں — اپنی بستی کا پتہ دے اے مری آرامِ جاں

دل تڑپتا ہے تمہاری یاد آتی ہے ہمیں
سوزشِ غم کی تڑپ پہروں رلاتی ہے ہمیں

ایک دن ہم تمکو سینے سے لگانے آئینگے — دل کے سب بھڑکے ہوئے شعلے بجھانے آئینگے
تمکو ہم اس خوابِ غفلت سے جگانے آئینگے — ہاں بہن! اک روز ہم تمکو منانے آئینگے

ہاتھ پھیلانا محبت سے بلانے کے لئے
آئینگے تربت پہ ہم تم کو منانے کے لئے

...... غزالانِ لکھنؤ!

(از جناب اسرار الحق مجازؔ بی، اے علیگ)

(لکھنؤ کے اُس شاعر کی نذر۔ جس نے یہ مصرعہ کہا ہے ؎ تعریف بُوئے مُشک غزالاں کے سامنے)

فردوسِ حُسن و عشق ہے دامانِ لکھنؤ
آنکھوں میں بس رہے ہیں غزالانِ لکھنؤ

صبر آزما ہے غمزۂ ترکانِ لکھنؤ
رشکِ زنانِ مصر کنیزانِ لکھنؤ

ہر سمت اِک ہجومِ نگارانِ لکھنؤ
اور میں کہ ایک شوخ غزل خوانِ لکھنؤ

مطرب بھی ہے، شراب بھی، ابرِ بہار بھی
شیراز بن گیا ہے شبستانِ لکھنؤ

تولے ہوئے ہے تیغ و سنانِ حُسنِ بے نقاب
ناوک فگن ہے جلوۂ پنہانِ لکھنؤ

سمجھی ہے میں نے عشوہ گریِ نظر یہاں
دیکھی ہے میں نے پاکیِ دامانِ لکھنؤ

اب تک رہا ہے اور رہے گا بہت دنوں
دِلّی کا درد طالبِ درمانِ لکھنؤ

"اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ"
وہ نوبہارِ ناز کہ ہے جانِ لکھنؤ

پھر لکھنؤ کی رُوح ہے بے چین و مضطرب
چھیڑا ہے کس نے تارِ رگِ جانِ لکھنؤ

کچھ روز کا مسافر و مہماں ہوں اور کیا
کیوں بدگماں ہوں "یوسفِ کنعانِ" لکھنؤ

اب اس کے بعد صبح ہے اور صبحِ نو مجازؔ
ہم پر ہے ختم شامِ غریبانِ لکھنؤ

فلمی خبریں

(۱) یونائیٹڈ فلمز — تازہ ترین شاہکار "بھائی جان" جمعہ اسی سے ریجنٹ لاہور میں نمائش کیلئے پیش کر دیا گیا ہے۔ اور آج اہل لاہور کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ یونائیٹڈ فلمز کا یہ شاہکار دلچسپ اسلامی ماحول پیش کرتا ہے۔ رومان، مذاح، موسیقی، جذبات کو کچھ اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ سارا لاہور ریجنٹ کی طرف کھنچا چلا آ رہا ہے۔ نورجہاں کے گانے اور شیام سندر کی تانیں اتنی رسیلی ہیں کہ چند دنوں کے اندر ہی لاہور کے گلی کوچوں میں چھوٹے بڑے گنگناتے پھریں گے۔

"بھائی جان" عوام اور خواص دونوں کے مذاق کے مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شام کو جہاں ریجنٹ کی کھڑکیوں پر بھیڑ لگی ہوتی ہے وہاں اس کے برعکس سامنے سڑک پر موٹر کاروں کی بھی رونق ہوتی ہے۔ "بھائی جان" کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ "بھائی جان" ہر لحاظ سے ایک کامیاب اور بلند پایہ تصویر ہے۔ تصویر کی ہدایت کاری خلیل نے کی ہے۔ اداکاروں میں نورجہاں کرن دیوان، انیس خاتون، مینا اور شاہ نواز کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ تصویر شمالی ہندوستان میں میسرز اپر انڈیا پکچرز کے ذریعہ دکھائی جا رہی ہے۔ اپر انڈیا پکچرز نے تھوڑے ہی عرصہ میں کئی بلند پایہ تصویریں پیش کر کے بطور ایک کامیاب فلم ڈسٹری بیوٹر کے اپنے لئے میدان پیدا کر لیا ہے۔ انکی کامیابی پر ہم انہیں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ تصویر کی نشر و اشاعت خاص محنت سے کی جا رہی ہے۔

(۲) کاردار پروڈکشنز — "پہلے آپ" میجسٹک سینما دہلی میں جمعہ ہر منی سے دکھایا جا رہا ہے۔

"پہلے آپ" ایک ہندو اور ایک مسلمان دوست کی کہانی ہے۔ ایک کا لکھنؤ کے نوابوں سے اور دوسرے کا راناؤں کے خاندان سے تعلق ہے۔ مگر شومئ قسمت سے دونوں کنگال ہیں۔ ایک چنگی کا ملازم، دوسرا پنساری کی دوکان کرتا ہے۔ کہانی مزاحیہ ہے اور نہایت دلچسپ انداز سے پیش کی گئی ہے۔ مکالمے اور گانے بہت موزوں ہیں۔ نوشاد علی کی نئی اور شیریں طرزیں بہت مقبول ہو رہی ہیں۔ واسطی جیون اور ... کے علاوہ ... بھی قابل تعریف ہے۔ ہدایت کاری ... کی ہے۔

اس کے علاوہ "جیون ..." کا کیریکٹر بھی قابل داد ہے۔ جیون میں واسطی۔ نرملا۔ مہتاب نے کام کیا ہے۔ موسیقی نوشاد علی اور ہدایت ایم صادق کی ہے۔

"سنیاسی" تیار ہو چکا ہے اور نمائش کیلئے تیار ہے۔ شاہجہاں کی کاغذی تیاریاں ختم ہو چکی ہیں۔ اور فلم بندی شروع ہو گئی ہے۔ شاہجہاں کی کہانی و مکالمے کمال امروہوی نے لکھے ہیں۔ ہیرو کے کردار کیلئے سہگل اور ہیروئن کیلئے راگنی کی خدمات حاصل کی گئی ہیں۔

(۳) راج کمل کلا مندر — "ڈاکٹر کوٹنس" نہایت سرعت کے ساتھ اردو اور انگریزی میں تیار کیا جا رہا ہے۔

"ڈاکٹر کوٹنس" کی کہانی خواجہ احمد عباس کے One did not come back سے اخذ کی گئی ہے۔ شانتا رام اور جے شری اہم پارٹ ادا کر رہے ہیں۔ امید ہے "ڈاکٹر کوٹنس" بین الاقوامی شہرت حاصل کرے گا۔

(۴) اسٹینڈرڈ پکچرز — یہ کمپنی اس سے پیشتر اسٹنٹ تصویریں تیار کیا کرتی تھی۔ یہ کمپنی اب اکبر اعظم کے اتالیق بیرم خاں کی زندگی فلم بند کر رہی ہے۔ "بیرم خاں" کی کہانی اردو کے مشہور ادیب خان بہادر حکیم احمد شجاع کی تحریر کردہ ہے۔ مکالمے کمال امروہوی نے لکھے ہیں۔ موسیقی ماسٹر غلام حیدر کی ہے۔ جاگیردار، مہتاب، غلام محمد، لیڈ سرتیس، یوسف آفندی، ہمیسا واڈکر اور شاہ نواز جیسے ستارے "بیرم خاں" میں پیش ہو رہے ہیں۔ مسٹر ہو سے والا۔ جاگیردار کی ہدایت کاری میں یہ تصویر پیش کر رہے ہیں۔

(۵) پنچولی آرٹ پکچرز — "شیریں فرہاد" جس کا مدتوں سے انتظار تھا مقامی ریجنٹ سینما میں نمائش شروع ہو گئی ہے۔ "شیریں فرہاد" آرٹ کا بہترین مرقع ہے۔ اس میں ہندوستانی فلمی آرٹ کو کمال تک پہنچا دیا گیا ہے۔ زلزلہ آنے کا منظر اور اسکے بعد بند ٹوٹنے کا نظارہ بہت لاجواب ہے۔ جگہ جگہ فن عکاسی کے بہترین نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ "شیریں فرہاد" ایرانی مصوری اور ہندوستانی فلمی آرٹ کا بہترین نمونہ ہے۔ راگنی ... ایران کی دوشیزہ شیریں معلوم ہوتی ہے۔ جینت کو ایران کے حسن اور قوی مفرور کے رنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ جو یقیناً قابل ستائش ہے۔ ہدایت جینت اور ... نے کی ہے۔ گانے اور مکالمے سید امتیاز علی تاج اور شرکت تھانوی ...

کے ہیں۔ موسیقی پنڈت امرناتھ اور رشید عطرے کی ہے۔ "شیریں فرہاد" یقیناً ایک ایسی پیشکش ہے جسے بین الاقوامی نمائش میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

"کچے دھاگے" نمائش کے لئے تیار ہے۔ "کچے دھاگے" میں راگنی۔ نجم۔ یہ آن۔ اختر۔ اجمل وغیرہ نے کام کیا ہے۔

"دھکی" کا کام نہایت سرعت کے ساتھ ہو رہا ہے۔ "دھکی" ہندوستان کے مشہور اداکار و ہدایت کار امتیاز علی تاج کے مشہور ڈرامہ کا نتیجہ ہے۔ "دھکی" کی کہانی سراغ رسانی و دلچسپ پُر اسرار معلومات پر مبنی ہے۔ آج تک پردۂ فلم پر سراغ رسانی کی کوئی تصویر پیش نہیں کی گئی ہے۔ "دھکی" اپنی قسم کی پہلی فلم ہے۔ "دھکی" میں ہیروئن کا کردار ادا کرنے کیلئے تاج نے راگنی سے بیس ہزار روپیہ ماہوار کا معاہدہ کیا ہے۔ امتیاز علی تاج پیش کر رہے ہیں۔ منظر نامہ، کہانی اور مکالمے خود تاج کے لکھے ہوئے ہیں۔ گانے مدہوک اور موسیقی پنڈت امرناتھ کی ہے۔ عکاسی جی سنگھ اور صدا بندی الیس گھوش کے سپرد ہے۔ "دھکی" میں مزاح، رومان، جذبات کو نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ ہدایات روپ کے شوری کی ہیں۔ اداکاروں میں راگنی۔ الناصر۔ پرکاش۔ بٹ۔ سرتی۔ وتود اور رادھیکا کے نام شامل ہیں۔

"داسی" کے پروڈیوسر لعل زمین نے میٹرو پالیٹن پکچرز کلکتہ کی طرف سے "گیندی" کی فلمبندی شروع کر دی ہے۔ اس کے علاوہ دو اور تصویروں کی کہانیاں لکھی جا چکی ہیں۔ نئی فلم "بسنتی" اور "پھر کب" کی شوٹنگ شروع ہو جائے گی۔

"داسی" ہر جگہ سلور جوبلی منا رہی ہے۔ پرتھالا ہور میں ۳۰ ہفتے اور راولپنڈی میں ۱۴ ہفتے چلی۔

(۷) شوری پکچرز "شالا مار" نمائش کیلئے تیار ہے۔ یہ آنسوؤں اور قہقہوں کا مرقع عنقریب بڑے بڑے شہروں میں دکھایا جانا شروع ہو جائے گا۔ "شالا مار" میں منورما۔ بیگم پارہ۔ چندر موہن۔ مجنوں اور پرتیما نے کام کیا ہے۔

(۸) محبوب پروڈکشنز "ہمایوں" امپیریل اور ایروز سنیما بمبئی میں بیک وقت نمائش کیلئے پیش کر دیا گیا ہے۔ آمدہ اطلاعات بہت حوصلہ افزا ہیں۔ دونوں سنیماؤں کے لحاظ سے گذشتہ ریکارڈ ٹوٹ گئے ہیں۔ "ہمایوں" میں اشوک کمار، وینا، نرگس، شاہنواز، چندر موہن اور حجاب نے کام کیا ہے۔ ہدایت محبوب نے کی ہے۔ نغمات، مکالمے اور کہانی آغا جانی کاشمیری اور واقف مراد آبادی کے ہیں۔ عکاسی فریدون ایرانی اور موسیقی ماسٹر غلام حیدر کی ہے۔

(۹) الستاولک پکچرز "چاند تارا" نمائش کیلئے تیار ہے۔ چاولی پہلی مرتبہ ہیرو آ رہا ہے۔ اور وہ بھی ایک ناکام طالب علم و لسٹرلس کے امتحان میں کامیاب ہو چکا ہو۔ "چاند تارا" پہلی تصویر ہے جس میں اداکاروں کا انتخاب کرنے کے بعد کہانی اداکاروں سے مطابقت کرتی ہوئی لکھی گئی ہے۔ اسے شتی جہانگی وماہی نے تیار کیا ہے۔ چاولی کے علاوہ سورن لتا۔ جگدیش سیٹھی۔ عمدی کے نام خاص کر قابل ذکر ہیں۔ "چاند تارا" میسرز گوردی پکچرز کے ذریعہ دکھائی جائیگی۔

(۱۰) نوبگ چیتر پٹ "پنا" نمائش کیلئے تیار ہے۔ فلم نوتی کی ہدایت ہے اور گیتا نظامی، رجے راج۔ کسم دیش پانڈے اور ڈیوڈ نے کام کیا ہے۔ "دن رات" قریب الاختتام ہے۔ سنیہہ پربھا ایک عرصہ کے بعد پردۂ فلم پر آ رہی ہے۔ اسکے ساتھ پرکش بنرجی اور سلوچنا چٹرجی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ہدایت شوری ودلتا لوہی کی ہے۔

(۱۱) رنجیت فلم کمپنی "چاند چکوری"۔ دھنا بھگت۔ "شبنم" اور "ممتاز" نمائش کیلئے تیار ہیں۔ "ممتاز محل" میں مغل شہنشاہ شاہجہاں کی غیر فانی محبت کو فلمبند کیا گیا ہے۔ خورشید، چندر موہن۔ لالہ یعقوب کمین۔ یعقوب اور آر طلا نے "ممتاز" میں کام کیا ہے۔ "ممتاز" کی کہانی منشی دل لکھنوی اور گانے دل صاحب کے ہیں۔ ہدایت کاری کیدار شرما کی ہے۔ نادلی سنیما کا آئندہ پروگرام ہے۔

(۱۲) الیسٹرن پکچرز شوکت حسین کی "زینت" نمائش کیلئے تیار ہے۔ "زینت" ایک اسلامی سوشل فلم ہے۔ "زینت" میں نورجہاں۔ کرن دیوان۔ یعقوب۔ ببو۔ سلیم رضا۔ ڈیکشٹ اور شاہ نواز نے کام کیا ہے۔ کہانی، مکالمے اور سینریو وجاہت مرزا چنگیزی اور خادم محی الدین کے ہیں۔

(۱۳) فضلی برادرز لمیٹڈ "حسین دل" کے بیرونی مناظر فلمبند کر چکے ہیں۔ "دل" قریب الاختتام ہے۔ "عصمت" ہر جگہ کامیابی سے چل رہا ہے۔ دہلی میں عنقریب اسکی نمائش شروع ہونیوالی ہے۔ "عصمت" میں نرگس، مہتاب۔ تندیکر، غوری، بدھوا لٹھیانی نے کام کیا ہے۔ "عصمت" کی ہدایت کاری سبطین فضلی کی ہے۔

(۱۴) جنتا دیسائی پروڈکشنز "سمراٹ چندر گپت" موتی ٹاکیز دہلی میں نہایت کامیابی کے ساتھ ساتویں ہفتے میں چل رہا ہے۔ سمراٹ چندر گپت ہندوستان کے عالیشان جلیل القدر شہنشاہ کی سوانح حیات ہے جس نے زبردست یونانی فاتحوں سے ملک کو آزاد کرایا۔ اور سارے ہندوستان میں ایک مسلسل حکومت قائم کی۔ "چندر گپت" میں ہندوستانی شان و شوکت و عظمت کو پیش کیا گیا ہے۔ اس میں ریو کاویری۔ الشرا مبارک۔ نیام پی۔ ثریا اور سلوچنا چٹرجی نے کام کیا ہے۔ ان کے علاوہ "آکاش دیپ" قریب الاختتام ہے۔

(۱۵) لکشمی پروڈکشنز کی تاریخی شاہکار "کالو مبری" جسے سینما میں دکھایا جا رہا ہے۔ کاویری مہاراجہ ہرش کے شاعر دربار "باآن بھٹ" کی داستان محبت ہے۔ یہ تین رقاصاؤں کی محبت اور عہد کی ... حسن جس نے دیوتاؤں تک کو غلام بنا دیا۔ اور محبت کی وہ تڑپ جس نے زمین و آسمان اور تمام سیاروں کو تہ و بالا کر دیا۔ اور شراب محبت کے وہ جام جو دوشیزہ رقاصاؤں نے جنت سے کھینچتے ہوئے تلواروں کے ... اور خدا پرستی کا زبردست اثر جس نے انسان کو فرشتہ اور فرشتہ کو انسان بنا دیا پیش کیا گیا ہے۔ یہ تصویر کافی مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ مالکان تصویر کی نشر و اشاعت وسیع پیمانہ پر کر رہے ہیں جو قابل ستائش ہے۔ اسے ... جیونت لال نے تیار کیا ہے۔ اس میں ونمالا۔ شانتا آپٹے۔ ہریش اور پہاڑی سانیال نے کام کیا ہے۔

(۱۶) نیو تھیٹرز لمیٹڈ ہیرو اکا نام ہندستان کے اول نمبر کے پروڈیوسر کاروں میں ہے۔ اس سے پیشتر "مکتی" "ودیاپتی" "جواب" "رانی" جیسی کامیاب تصویریں پیش کر چکے ہیں۔ ڈائرکٹر بمل رائے کے "اودے گورا" سے اچھوتی کہانی پہچان ہیرو کی ہدایتکاری میں تیار ہو رہی ہے۔ ہیرو کا کردار اشوک اور اکریکا وغیرہ اداکاروں کا انتخاب زیر غور ہے۔ موسیقی کمل داس گپتا کی ہے۔

(۱۷) ایفا چندن مل اندر کمار دیوکی بوس کا "صلیح" جس میں جمنا۔ پرتھوی راج چودھری وغیرہ نے کام کیا ہے۔ اور شوری پکچرز کا لاجواب موسیقی نواز فلم "گوکل" جس میں منورما ... مجنوں وغیرہ نے کام کیا ہے۔ ہر جگہ کامیابی سے چل رہا ہے۔ اور رنجیت ... کا "طوفان میل" ایکسلسیر سینما میں گزشتہ دو ہفتوں سے عوام کی کشش کا باعث بنا ہوا ہے۔

(۱۸) اسن رائز پکچرز کی مشہور تصویر "کالجین" دہلی میں بے حد مقبول ہو رہی ہے۔ "کالجین" میں جے چند چھابڑا۔ موتی سنگھ۔ مرزا مشرف۔ مایا بنرجی۔ پرتیا دیوی نے کام کیا ہے۔ یہ تصویر سن رائز پکچرز کی جاری کردہ ہے۔ اور جوبلی ٹاکیز میں جمعہ یکم جون سے نمائش شروع ہو گئی ہے۔

خان بہادر آر، ڈیشر بلیمویا

خان بہادر بلیمویا کے انتقال کی خبر آئی ہے۔ یہ خبر نہایت افسوس ...

... زبان میں ... بھی ... دلوں ... کے زمانے میں ... اور سلور ین اور پیراز وغیرہ کمپنیوں کو قائم کیا۔ اور ناطق فلموں کے تیار ہونے کے بعد ہندستان اور بیرون ہندستان میں سینما گھروں کا جال پھیلا دیا۔ بلیمویا کا نام اول نمبر کے فلمی بیوپاریوں کی فہرست میں تھا۔ ان کے انتقال سے جو کمی پیدا ہوئی ہے اسے یقیناً محسوس کیا جائیگا۔ اسے پورا ہونے کیلئے وقت چاہیئے۔

ہندستانی فلمسازوں کا وفد ہالی وڈ کو

معلوم ہوا کہ ہندستانی فلمسازوں کا وفد عنقریب امریکہ فلمسازی کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کیلئے جانیوالا ہے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حکومت ہند نے سفر کی سہولتیں مہیا کرنے کا بھی وعدہ کر لیا ہے۔ وفد میں جانے والوں میں ایس مکرجی۔ دیویکا رانی۔ ظہیر آجہ۔ رو پک کے شوری۔ مہتاب ... اور اے آر کاردار کے نام لئے جا رہے ہیں۔

کاردار اسٹوڈیو اور حکومت ہند

معلوم ہوا ہے کہ حکومت کے فوجی فلمی محکمہ نے کاردار اسٹوڈیو پر قبضہ کرنے کا نوٹس دیدیا ہے۔ کاردار ہندستان کے سب سے پرانے ڈائرکٹروں میں سے ہیں۔ اور حال میں ہی انہوں نے اپنا اسٹوڈیو قائم کیا ہے اور تین فلمی تصویریں تیار کرنیکا اعلان بھی کیا ہے۔ اگر حکومت نے اسٹوڈیو پر قبضہ کر لیا تو مسٹر کاردار کیلئے ان تصاویر کا تیار کرنا جنکی تیاری کا اعلان کیا گیا ہے مشکل ہو جائیگا کیونکہ اس گرانی کے زمانہ میں ہر چیز کے دام چڑھے ہوئے ہیں اور خاصکر کسی اسٹوڈیو میں ایک سیٹ کرایہ پر لے لینا آسان کام نہیں ہے۔ اگر حکومت نے اپنا فیصلہ اٹل رکھا تو بالفاظ دیگر کاردار کے لئے اسٹوڈیو کا چھن جانا خودکشی کے مترادف ہوگا۔ امید ہے حکومت اپنے فیصلہ پر نظرثانی فرما کر کسی ایسے اسٹوڈیو کی خدمات حاصل کرے گی جس کے پاس ضرورت سے زیادہ سیٹ ہونگے۔ اور فلمی صنعت کو اس نقصان سے بچائے گی جو کاردار اسٹوڈیو چھن جانے کے بعد ہوگا۔

تیرے شیشے میں مے باقی نہیں ہے، بتا کیا تو مرا ساقی نہیں ہے
سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم، بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

کفایت شعاری کیجئے اپنے اور اپنے وطن کی خاطر

غریبوں کی مدد کرنے کیلئے آج کل ہم میں سے ہر شخص کو بہت سی چیزوں کے استعمال میں کمی کر دینی چاہیئے۔ آپ چیزیں کم صرف کریں تو یہ اُن لوگوں کے لئے زیادہ مقدار میں مہیا ہو سکیں گی جنہیں واقعی اُن کی شدید ضرورت ہے۔ آپ رفو کی ہوئی قمیص اور پیوند لگا ہوا جوتہ پہن کر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ ان دنوں سادگی پسندی اور جزرسی عین خودداری اور حب وطن کا ثبوت ہے۔ اس سے ایک فائدہ اور بھی ہے۔ پرانی چیزوں سے کام چلائیے۔ اور ہر چیز کے استعمال میں کفایت برتنے کے معنی ہیں۔ زائد بچت یعنی قیمتیں گھٹیں گی تو آپ کے پاس خرچ کرنے کیلئے زیادہ روپے موجود ہوں گے۔ مرمت کرا کے کام چلائیے۔ جب کبھی آپ سادگی اور کفایت سے کام لیں، آپ کا روپیہ بچتا ہے۔ اسی طرح روزانہ تھوڑی بہت کفایت ہو سکے تو آپ ہفتوں، مہینوں میں کتنا کچھ بچا سکتے ہیں۔ آج کل جزرسی سے کام لینا آپ کا فرض ہے کیونکہ ضروری سامان کی کمی ہے۔ اگر آپ ضرورت سے زیادہ خرید لیں گے تو غریبوں کو میسر نہیں آ سکتا۔ کفایت شعاری کو اپنا فرض سمجھ کر اپنے ملک کی مدد کریں۔ اور خود بھی ملی فائدہ اُٹھائیں۔ کفایت شعاری سے قوموں کو نفع کیجئے۔

مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھئے۔

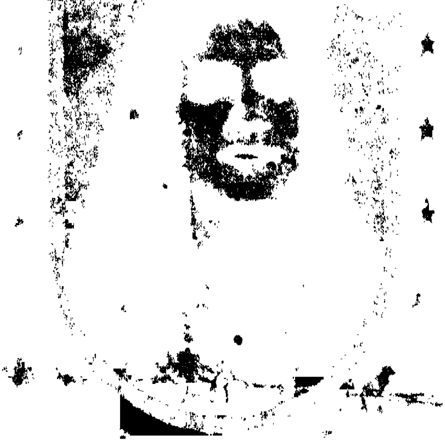
(۱) تھوڑی دور جانا ہو تو پیدل یا سائیکل پر جائیے۔ ایک ایک آنے کی بچت کیجئے (۲) ٹوتھ پیسٹ احتیاط اور کفایت سے استعمال کیجئے۔ پرانے ٹیوب ردی کے ذخیروں (سکریپ ڈپو) میں جمع کرا دیجیے (۳) لیمپ اچھی حالت میں رکھئے تاکہ تیل کم خرچ ہو (۴) دسترخوان پر کم کھانا چنئے۔ دعوتیں اور تواضع کم کر دیجئے۔ خوراک ضائع نہ کیجئے۔ یہ ایک قومی خدمت ہے (۵) پنسلیں۔ سیاہی۔ خط کے کاغذ اور اسٹیشنری کا دوسرا سامان احتیاط سے خرچ کیجئے (۶) نئے زیورات نہ خریدیئے آپ کو اپنے روپے کا اچھا بدل نہیں ملتا (۷) پرانی قمیصوں، پتلونوں، پاجاموں اور تولیوں وغیرہ کی مرمت کرا لیجئے۔ حتی الامکان نئے کپڑے نہ خریدیئے (۸) پرانے تولیوں، پلنگ کی چادریں اور میز پوش میں رفو کرا کے اُن کی عمر بڑھائیے (۹) پرانے جوتوں کی مرمت کرائیے پھینک نہ دیجئے (۱۰) بچوں کے کپڑے ماں باپ کے پرانے کپڑوں میں سے بنائے جا سکتے ہیں (۱۱) پرانے ٹرنکوں بکسوں اور بستر بندوں کی مرمت کرائیے نئے بہت مہنگے ہیں (۱۲) نئی چیزیں نہ خریدیئے۔ پرانی فروخت کر دیجیے۔

قومی جنگی محاذ کی پُر زور قومی درخواست

آرٹ پکچرز کا بیس لاکھ روپے سے تیار کردہ قابل فخر شاہکار جس پر

صنعت فلمسازی برسوں اس پر ناز کرے گی

شیریں فرہاد



SHIRIN FARHAD

ڈائرکٹر :- پرہلاد دت

موسیقی :- پنڈت امرناتھ

گیت :- ڈی، این مدھوک - ناظم پانی پتی

مکالمے :- سید امتیاز علی تاج و شوکت تھانوی

ارمان حسرتوں - نغموں اور جذبات کا بے پایاں سمندر

فلمی آرٹ کی رنگینیاں نئے انداز میں - ایرانی

شان شوکت کی حقیقی جھلک جسکی سیٹنگز دیکھکر آپ

دنگ رہ جائیں گے

(ستارے):-

راگنی - جینت - غلام محمد - گیانی - وزیر بیگم - اسحاق موٹا وغیرہ

رٹز سنیما میں جمعہ ۱۱ مئی سے شروع

جاری کردہ :- لکشمی فلم سروس - دہلی



نے شہنشاہ شاہجہاں کی زندگی بہت پُرمسرت بنادی تھی
آپ کے دل کی ملکہ
ڈائرکٹر:- کیدار شرما
اِس شاندار کا انتظار کیجئے
رنجیت مووی ٹون کا تاریخی شاہکار
چندر موہن
لالہ یعقوب
ناولٹی سنیما کا آئندہ پروگرام

جاسوسی، دہشت، رسائی اور پُراسرار عجیب واقعات پر مشتمل اپنی
قسم کی پہلی تصویر

ہندوستان کے مایۂ ناز ادیب سید امتیاز علی تاج
کی پہلی پیش کش
پنچولی آرٹ سٹوڈیوز مسرت کے
ساتھ تیار ہو رہی ہے

دھمکی

ہدایات: ور ... روپ

منظرنامہ، مکالمے اور کہانی: ——— سید امتیاز علی تاج
گانے: ——— مدھوک
موسیقی: ——— پنڈت امرناتھ

——— :. (اداکاران) :. ———

راگنی۔ الناصر۔ سمرتی۔ بٹ۔ اجمل۔
پرکاش۔ ونود۔ رادھیکا
وغیرہ

جاری کردہ:—
ایمپائر ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز۔ دہلی، لاہور، کراچی، کلکتہ

[illegible]

صُلح

اداکاران:—
جمنا اور آہین چودھری

روپ، کے شوری کا
موسیقی نواز "منگتی" سے کہیں بڑھ چڑھ کر

کوئل

اداکاران:—
منورما۔ ستیش۔ مجنوں
ہر جگہ کامیابی کے ریکارڈ قائم کر رہا ہے!!

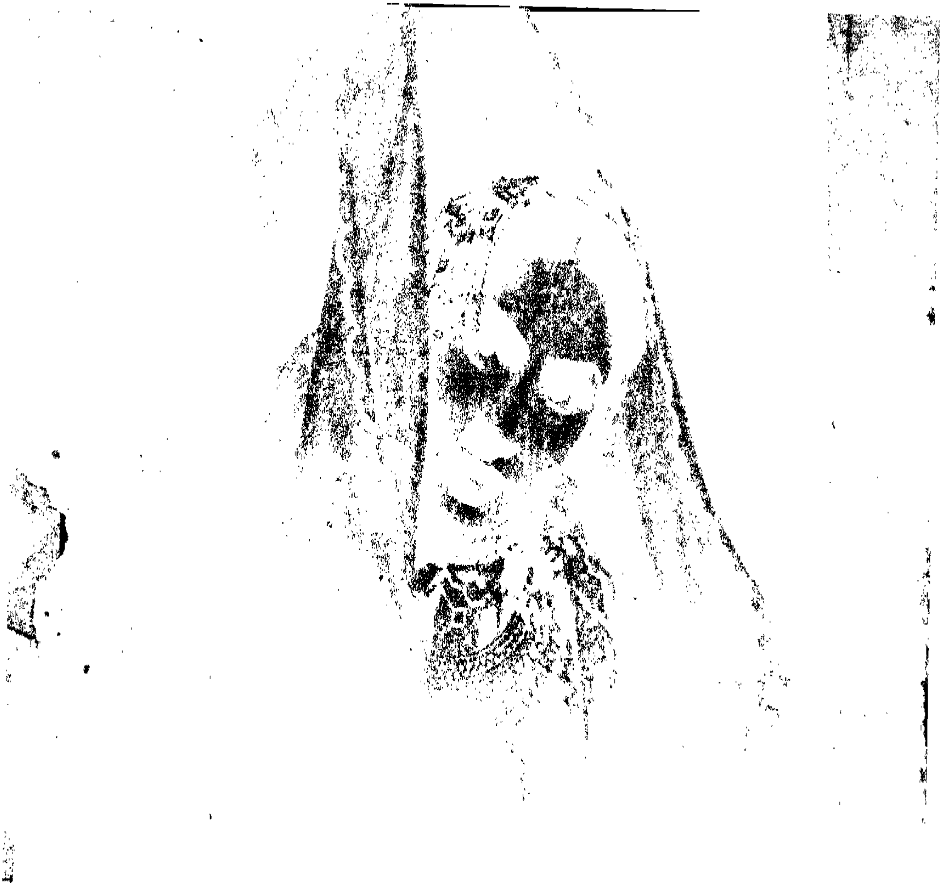
رنجیت کا مار دھاڑ سے بھرپور اسٹنٹ فلم

طوفان میل

اداکاران:— مادھوی، بلیموریا، غوری، چاندی

ایکسلسیر سینما میں تیسرا ہفتہ

جاری کردہ:—
آر۔ ایس چمن لال آنند، کشمیری گیٹ۔ دہلی، کراچی



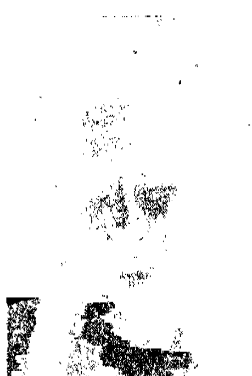
فلم "ممتاز" میں خورشید



[illegible]ت نامہ" میں



شانتا آپٹے "بھاگیہ لکشمی" میں



وسنتی "بھاگیہ لکشمی" میں

No. 4786 May - June 1948.

THE ADEEB
DELHI.

1. It is a purely literary monthly Magazine of high standing.
2. It is published regularly on the tenth of each month
3. Annual subscription of the Adeeb is Rs. 10/- only; single copy Rupee one.
4. The Adeeb is posted with great care but if you don't get a copy by the 15th. please write to the office at once. If available, an extra copy will be sent to you again. Complaints received after the 18th will not be attended to.
5. All communications should be addressed to the Editor.
6. Free or sample copies of the Adeeb are not sent. For a sample copy always send the necessary stamps in advance.
7. Contributions not published in the Adeeb can be returned on receipt of the necessary stamps.
8. Always send extra stamps for a reply.
9. The Adeeb is not issued for less than a year.

Printed at Dayals' Printing Press, Chandni Chowk, Delhi
Edited by Fasi-ud-din Ahmad M. A. and M. I. Waridi & Published from the office of the Adeeb, Chandni Mahal Delhi.

THE ADEEB DELHI

ماہنامہ ادیب (دہلی)



فلم ''کوبتا'' کی
خاص اداکارہ





نیو تھیٹرز کے فلم ''ہمراہی'' میں
بلاتابوس

چندہ سالانہ دس روپے علاوہ محصول ڈاک — قیمت فی کاپی :- ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ادیب

ایڈیٹرز :-
سید محمد ارتضیٰ واحدی — فصیح الدین احمد ایم۔ اے — آنسہ نجمہ تصدق ایم۔ اے۔ بی۔ ٹی

جلد ۹ — جولائی سنہ ۱۹۴۵ء — نمبر ۳

فہرست مضامین

(فصیح الدین احمد ایم۔ اے نے دیال پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر دفتر ادیب چاندنی چوک دہلی سے شائع کیا)

فارسی تاریخِ ادب کا ایک ناگوار واقعہ

(از جناب وصی احمد صاحب بمبئی)

شاہنامہ کی تصنیف، فردوسی کی ان تھک کوششیں۔ محمود غزنوی کا وعدہ اور پھر محمود کی وعدہ شکنی کی داستانیں طرح طرح سے بیان کی جاتی ہیں۔ محققین نئے نئے نکتے نکالتے ہیں اور مورخین عجیب عجیب روایتیں سناتے ہیں۔ گویا شاہنامہ۔ فردوسی اور محمود کی حیثیتیں محض ایک افسانہ ہیں۔ اور جس نے جب اور جس طرح چاہا بیان کر دیا۔ سننے والوں نے دلچسپی اور تفریحِ طبع کے لئے ہر طرف گیت گاتے پھرے۔ ذیل کا ایک واقعہ ملاحظہ ہو جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو واقعہ عرب میں رونما ہوا تھا وہ کس طرح رنگ آمیزی کے بعد محمود اور فردوسی کی کہانیوں میں شامل کرا لیا گیا۔

"زمانۂ جاہلیت میں عرب کے مشہور شاعر لبید عامری نے ایک قصیدہ[1] خانہ کعبہ کے دروازے پر آویزاں کر دیا تھا کہ جس کو شاعری کا دعویٰ ہو سامنے آئے۔ بعد فتح مکہ لبید تمام بنی عامر کے وفد کا سردار حضرت رسالت پناہ کے حضور میں حاضر ہوا اور اسلام قبول کیا۔ بعد وصالِ سرکارِ دو عالم کوفہ چلا گیا۔ عہدِ فاروقی میں دوسرے شعراء کی طرح اسکی تنخواہ بھی تین سو درہم ماہانہ مقرر ہوئے۔ دورِ عثمانی میں اور اضافہ ہوا۔ مرتضوی عہد میں بھی سو درہم کی ترقی ہوئی۔ اس طرح خلیفۂ چہارم کے دور تک لبید کو پانچ سو درہم ملتے تھے۔ جب عنانِ حکومت معاویہ کے ہاتھ میں آئی تو انہوں نے وہ رقم لبید کو بھیجی جو عثمانی دور میں اُسے ملا کرتی تھی۔ لبید نے وہ رقم واپس کر دی۔ معاویہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انہوں نے بعد کو چھ سو درہم اُسے روانہ کئے۔ لیکن یہ رقم اس وقت پہنچی جب لبید کا جنازہ قبرستان جا رہا تھا۔ لبید کے صرف ایک ہی لڑکی تھی۔ رقم مذکور اس کو پیش کی گئی مگر اس عالی ظرف اور بلند ہمت لڑکی نے وہ رقم لینے سے انکار کر دیا جسے اُس کے باپ نے جیتے جی ہاتھ بھی نہ لگایا تھا۔"

یہ تاریخی واقعہ فارسی تذکرہ نویسوں کو کچھ اس قدر پسند آیا کہ انہوں نے فوراً اس پر ایرانی رنگ چڑھا دیا۔ پھر کیا تھا مئے دو آتشہ ہو گئی اور فردوسی اور محمود کے افسانوں میں ایک کا اور اضافہ ہو گیا۔ اب اسی واقعہ کو اس طرح بیان کیا جانے لگا۔

"محمود نے فردوسی کو شاہنامہ لکھنے پر مامور کیا اور وعدہ کیا کہ اُسے ہر شعر کے بدلے ایک اشرفی دیگا۔ جب شاہنامہ پایۂ تکمیل کو پہنچا تو محمود اپنے وعدہ سے پھر گیا اور فردوسی کو بجائے ساٹھ ہزار اشرفیوں کے ساٹھ ہزار چاندی کے سکے پیش کئے۔ فردوسی کو بہت شاق گذرا اور وہ غزنی سے چلا گیا۔ بعد میں محمود کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ چنانچہ ساٹھ ہزار اشرفیاں اس نے فردوسی کو بھیج دیں۔ لیکن یہ اشرفیاں اس وقت پہنچیں جب فردوسی کا جنازہ دفن ہونے جا رہا تھا۔ فردوسی کی ایک ہی لڑکی وارث تھی۔ اشرفیاں اس کو نذر کی گئیں۔ مگر اس عالی ظرف لڑکی نے یہ منظور نہ کیا کہ جس صلہ کی حسرت میں اُس کے باپ نے جان دیدی تھی اُسے ہاتھ بھی لگائے۔"

ایسے واقعات شاید جستجو کے بعد بھی مشکل ہی سے مل سکیں جن کا بنیادی پتھر ایک ہو۔ لیکن ہمارے محققین کا اصرار ہے کہ جو کہانی وہ بیان کرتے ہیں کہانی نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

کبھی تو محمود کی فیاضی اور دریا دلی کے راگ اس طرح الاپے جاتے ہیں کہ سننے والوں کو اُس کی فضول خرچیوں کے بول صاف کٹتے ہوئے معلوم ہونے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ذرا ذرا سی بات پر شعراء کا منہ جواہرات سے بھر دلانے والا سخاوت کے حدود سے متجاوز ہو چکا ہوتا ہے۔ پھر اُسے سخی کیونکر کہہ سکتے ہیں وہ کیوں جانے۔ عنصری کا واقعہ ہی لے لیجئے۔ بدمستی کے عالم میں محمود نے ایاز

[1] کلام مترجم ابن خلدون۔ کتاب ثانی جلد دوازدہم۔ [2] شعر العجم حصہ اوّل

کی زلفیں کٹوا دیں۔ بعد میں ندامت کی وجہ سے طبیعت بہت مکدر ہوئی۔
عنصری نے خبر پاتے ہی خدمت میں حاضر ہو کر رباعی پڑھی ؎

گر عیب سر زلف بت از کاستن است
نہ جائے بہ غم نشستن و خاستن است
وقت طرب و نشاط و مے خواستن است
کاراستن زلف ز پیراستن است

عنصری کا منہ جواہرات[۱] سے بھروا دیا گیا۔

ایک طرف تو محمود کی اس فضول خرچی یا فیاضانہ طبیعت پر صدائے تحسین بلند ہوتی ہے۔ دوسری طرف وہی محمود فردوسی کے معاملہ میں ایسا ہو گیا جو باوجود وعدہ کے اسے ساٹھ ہزار اشرفیاں نہ دے سکا۔ ان تمام واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے مجبور ہیں کہ "فیاض محمود کنجوس" تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ محمود کی وعدہ خلافی کے کچھ اسباب بھی بیان کئے جاتے ہیں۔ وہ اسباب بھی اپنی نوعیت کے لحاظ سے عجیب و غریب ہیں۔ مثلاً

(۱) چونکہ فردوسی شیعہ تھا لہٰذا محمود نے اسکے ساتھ تعصب سے کام لیا۔

(۲) چونکہ دربار کا ایک بہت بڑا گروہ وزیر اعظم حسن میمندی کے خلاف تھا اور وزیر اعظم فردوسی کا مربی اور سرپرست تھا۔ لہٰذا اس گروہ نے فردوسی کے خلاف محمود کے کان بھرے۔

(۳) چونکہ فردوسی نے ایاز کی تعریف میں کبھی کچھ نہیں کہا۔ لہٰذا ایاز نے فردوسی کے خلاف محمود کو بھڑکایا۔

(۴) چونکہ محمود غلام زادہ تھا اور فردوسی نے شرافت نسبی کو بڑے آب و تاب سے لکھا ہے۔ اور یہ درپردہ محمود پر چوٹ تھی۔ لہٰذا محمود نے ایفائے وعدہ سے انکار کیا۔

یہ اسباب بیان کرتے وقت فارسی تذکرہ نویسوں نے تاریخ کی مداخلت بھی گوارا نہ کیا۔ چونکہ فردوسی شیعہ تھا اس لئے محمود نے اس کے ساتھ تعصب سے کام لیا۔ یہ محمود پر صریحی اور بے بنیاد الزام ہے۔ ورنہ اس کے دربار میں شیعی علماء بکثرت موجود تھے اور اسکے علاوہ دوسرے مذاہب کی جو قدر و منزلت محمود کے دربار میں تھی اسکی تاریخ شاہد ہے۔ اگر محمود کو شیعوں سے نفرت یا تعصب ہوتا تو وہ خود فرمان بھیج کر ابو ریحان بیرونی کو جو علانیہ شیعہ تھا اپنے دربار میں کیوں بلواتا اور اسکی عزت کرتا۔ مگر "طلسم ہوشربا" کے مصنف کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ کسی حقیقت کی چھان بین کرتا۔ حضرت امیر حمزہ کے متعلق تاریخ کچھ ہی کیوں نہ کہہ رہی ہو اسکو تو اپنے دماغ اور قلم پر بھروسہ تھا۔

دوسرا سبب کہ وزیر اعظم حسن میمندی فردوسی کا مربی تھا اور محض وزیر اعظم کی مخالفت میں فردوسی کی طرف سے محمود کے کان بھرے گئے۔ ایک مہمل سا ہے۔ وزیر حسن میمندی مذہباً خارجی تھا۔ اور فردوسی شیعہ۔ پھر بھلا وزیر اعظم فردوسی کا مربی کیونکر ہو سکتا تھا۔ پھر لطف یہ ہے کہ نظامی عروضی نے دیباچہ میں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ فردوسی کو تباہ کرنے والا حسن میمندی ہی تھا۔ اس اجتماع ضدین کا خاموشی کے سوا اور کوئی جواب نہیں ہو سکتا۔

تیسرا سبب کہ فردوسی نے ایاز کی تعریف میں کبھی کچھ نہیں لکھا لہٰذا اس نے محمود کو فردوسی کے خلاف اکسایا۔ اسے بھی مجذوب کی بڑ ہی سمجھنا چاہئیے۔ دربار کا ہر شاعر ایاز کا مداح تھا۔ اب اگر ایک فردوسی اسکی تعریف نہیں کرتا ہے تو اس کا اثر ایاز پر کیا پڑ سکتا تھا۔ اس کاوش کا تقاضہ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی ہو سکتا تھا کہ ایاز فردوسی کے نام و نمود کو ٹھیس لگانے کی ایک ناکام کوشش کرتا۔ فردوسی کو نقصان پہنچا کر ایاز کو کیا ملا۔ یہ محتاج تشریح ہے۔ یہ تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ محمود ایاز کے بہکانے میں آ سکتا تھا سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس نے وعدہ شکنی ہی کو کیوں اپنا شعار بنایا اور کیوں نہ دوسرے طریقوں سے فردوسی کو ذلیل کرنے کی کوشش کی۔ یہ الزام بھی ایک اختراع سے کم نہیں۔

چوتھی وجہ جو بیان کی جاتی ہے وہ محمود کے کیرکٹر پر ایک رکیک اور لایعنی حملہ ہے۔ محمود ناسمجھ تو نہ تھا کہ کسی بات سے متاثر ہو کر اتنی بڑی سیاسی غلطی کر بیٹھتا۔ اگر فردوسی کے غلام زادہ لکھنے ہی کی وجہ سے اسکے جذبات کو ٹھیس لگتی تو وہ وعدہ خلافی کبھی نہ کرتا۔ بلکہ اسے ہر طرح کی قوت حاصل تھی وہ جو سلوک چاہتا فردوسی کے ساتھ کر سکتا تھا اور جس طرح چاہتا اسے ذلیل کر سکتا تھا۔ مطلق العنان بادشاہ میں اتنا ضبط کہاں کہ وہ اپنی اس قدر توہین برداشت کر سکے۔ ذرا ذرا سی بات پر تلواریں کھنچ جایا کرتی تھیں پھر کیا وجہ تھی کہ محمود نے سر دربار اتنی بڑی ذلت اٹھائی اور صرف ایفائے وعدہ نہ کرنے ہی پر اکتفا کیا۔ یہ حملہ نہ صرف محمود کے کیرکٹر پر ہے بلکہ اس سے فردوسی کا دامن عزت بھی داغدار نظر آنے لگتا ہے۔ فردوسی کے لئے یہ کہاں تک موزوں تھا کہ

---

[۱] چہار مقالہ

جس محمود سے کہتے تھے کہ قارئین ملنے والی تھی۔ اسی محمود پر شرافت نسبی کا اظہار کر کے "در پردہ چوٹ" کرے۔ محمود غلام زادہ نہ تھا اس کا شجرہ ملاحظہ ہو۔ "محمود بن سبکتگین بن جوقان قرابجکم بن قرارسلان بن قرا ملت بن قرالنعمان بن فیروز بن یزدجرد بادشاہ فارس"[1]

طبقات ناصری نے بحوالہ تاریخ مجدول اور تاریخ فرشتہ نے بحوالہ تاریخ منہاج السراج جرجانی اس شجرہ پر اتفاق کیا ہے۔ سب سے بڑی دلیل محمود کے غلام زادہ نہ ہونے کی یہ ہے کہ کسی انگریز مورخ نے اسے غلاموں کے سلسلہ حکومت میں نہیں لکھا ہے۔ انگریزوں کو محمود کے ساتھ کوئی ایسی ہمدردی نہ تھی کہ وہ خلاف واقعہ لکھنے کے لئے مجبور ہوتے۔ اگر فردوسی نے شرافت نسبی شاہنامہ میں نہایت آب و تاب سے لکھی ہے تو اس سے محمود کے جذبات کو کیا ٹھیس لگتی۔ کیونکہ نہ تو وہ غلام زادہ تھا اور نہ اپنے کو غلام زادہ سمجھتا تھا۔ اور اگر اسے اپنے غلام زادہ ہونے کا شبہ بھی ہوتا تو وہ نہ تو سر دربار اپنی توہین برداشت کر سکتا تھا اور نہ شاید فردوسی اپنی جان بچا کر غزنی سے جا سکتا تھا۔ محمود کی وعدہ شکنی کے اسباب اور دلائل خود ایک دوسرے کچھ اس قدر مختلف اور متضاد ہیں کہ عقل سلیم ان پر بھروسہ کرتے ہوئے باسانی تسلیم کرنے کے لئے مجبور نہیں ہو سکتی کہ محمود نے فردوسی کے ساتھ کوئی بے انصافی کی ہوگی۔ فارسی تذکرہ نویسوں نے محض داستان رنگین بنانے کیلئے یہ حاشیہ بندی کی ہے۔ محمود کے دامن کو داغدار بنانا تھا لہذا شاہنامہ کی بنیاد رکھی گئی ورنہ حقیقت یہ ہے کہ محمود کا اس فرمائش سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ فردوسی شاہان ایران کا ہم قوم یعنی مجوسی النسل تھا۔ اس لئے اگر اسے اپنے اسلاف کا نام زندہ رکھنے کا جذبہ بے چین کئے ہوئے تھا تو کوئی عجیب بات نہ تھی اور یہی جذبہ شاہنامہ کی تصنیف کا محرک ہوا جیسا کہ وہ خود کہتا ہے ؎

همی خواهم از دادگر یک خدای | که چندان بمانم به گیتی بجای
که این نامهٔ شهریاران پیش | بپیوندم از خوب گفتار خویش
بسی رنج بردم درین سال سی | عجم زنده کردم بدین پارسی
همه مرده از روزگار دراز | شد از گفت من نام شاه زنده باز
چو عیسی من این مردگان را تمام | سراسر همه زنده کردم بنام

شاہنامہ کی بنیاد طوس میں ڈالی گئی۔ غزنی میں نہیں۔ فردوسی نے اس کی اس حالت میں ... [illegible] ... نے دنیا ... میں نظم کیا ہے ؎

[illegible]

بشهرم یکی مهربان دوست بود | تو گفتی که با من بیک پوست بود
مرا گفت خوب آمد این رای تو | بنیکی خرامد مگر پای تو
نوشته من این نامهٔ پهلوی | به پیش تو آرم مگر نغنوی
شو این نامهٔ خسروان بازگوی | بدین جوی نزد مهان آبروی
چو آورد این نامه نزدیک من | برافروخت این جان تاریک من

شاہنامہ ۴۰۰ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچا۔ جس کی فردوسی نے خود وضاحت کی ہے ؎

ز هجرت شده پنج هشتاد بار | که گفتم من این نامهٔ شهریار

پانچ کو اسّی سے ضرب دینے کے بعد ۴۰۰ ہوتے ہیں۔ پھر وہی یہ بھی کہتا ہے کہ شاہنامہ کی تصنیف میں ۳۵ سال صرف ہوئے ؎

سی و پنج سال از سرای سپنج | بسی رنج بردم بامید گنج

۴۰۰ سے ۳۵ تفریق کرنے کے بعد ۳۶۵ باقی رہتے ہیں اور یہی سنہ شاہنامہ کے آغاز کا ہے۔ اور محمود غزنوی ۳۸۷ھ میں سربراہ حکومت ہوا۔ یعنی شاہنامہ کی تصنیف کا کام محمود کی تخت نشینی سے تقریباً ۲۲ سال پہلے شروع ہو چکا تھا۔ پھر محمود کی فرمائش کا شاہنامہ فردوسی کی تصنیف سے کیا سروکار۔ دوسرے محمود کی مدت حکومت صرف ۳۱ سال ہے اور شاہنامہ کی تصنیف میں ۳۵ برس صرف ہوئے۔ اس کے بعد بھی اگر محمود کی فرمائش پر اصرار ہے تو اس کا جواب دنیا کی تاریخ تو کیا، اگر محمود اور فردوسی خود ایک بار زندہ ہو کر آجائیں تو نہیں دے سکتے۔

ان تمام باتوں کے باوجود ہم ابھی تک یہ نہ طے کر سکے کہ آخر وہ کون سا سبب تھا جس نے فردوسی کو محمود کی ہجو لکھنے پر مجبور کیا۔ ایران میں قصیدہ گوئی معراج کمال کو پہنچ چکی تھی۔ کم و بیش ہر شاعر اسی صنف شاعری میں طبع آزمائی کرتا جس کی وجہ ایک حد تک تو شعرا کی مفلوک الحالی تھی۔ وہ امرا اور بادشاہوں کے دربار میں قصیدے لکھ کر لے جاتے اور خاطر خواہ انعام پاتے۔ رؤسا کی قدر و منزلت پر ان کی زندگی کا دار و مدار تھا۔ مثال کے

---

[1] تاریخ فرشتہ ۔ [2] صفحہ ۶ مطبوعہ کلکتہ ۱۸۶۴ء ۔ [3] صفحہ ۱۸ مطبوعہ نولکشور پریس ۔
[4] کلام مترجم ابن خلدون از صفحہ ۲۵۶ تا ۲۵۷ کتاب ثانی جلد دوازدہم

... کرنے کے لئے تنگدستی سے مجبور ہوکر وطن سے نکلا اور پھرتا پھراتا غزنی پہنچا۔ محمود کے دربار میں کئی شاعر تھے جنکا سب سے زیادہ قدردان ہے۔ معلوم ہوتا ہے پہلے ابوالمظفر چغانی کی خدمت میں حاضر ہوا اور پھر اپنے فن کی بدولت دربار محمود تک رسائی کی۔ جہاں اُسے اُمید سے زیادہ فارغ البالی نصیب ہوئی۔ لیکن اسکے بعد بھی شاعروں کی تنگ مزاجی فطرت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اپنے کو فن میں سب سے بلند ہوکر کتنا ہی کمپیں نہ کرلے مگر یہ صفت اُسکی رگ و پے میں برابر متحرک رہتی ہے۔ لہٰذا ہجو قصیدہ کا ردعمل تھا۔ جب کسی شاعر کو اپنے حسب مرضی کسی رئیس کے یہاں کامیابی نہیں ہوتی تو وہ ہجو لکھکر اپنے دل کو تسکین دیتا۔ امرا نام و نمود کے خواہشمند تھے اور خوب جانتے تھے کہ شعرا کے قصائد ان کی شہرت دائمی کا سبب بن سکتے تھے۔ فن کی ترقی اور سرپرستی بھی منظور خاطر تھی۔ اس کے ساتھ ہجو کی سخت کلامیوں نے ان کے دل میں ایک قسم کا خوف دہراس بھی پیدا کر دیا تھا۔ اب بھی وہ شعراء کی آؤ بھگت کرتے۔ کبھی تو فن کی سرپرستی کی خاطر اور کبھی اپنی شہرت کی دبی ہوئی خواہش کی خاطر۔ زیادہ تر انہیں ہجو کا ڈر بھی ستاتا رہتا کہ کہیں ہجو اُن کی آئندہ شہرت کے راستہ میں حائل نہ ہو جائے۔ شعراء کو بھی ان کی اس کمزوری کا احساس ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ وہ ہجو کی دھمکیاں دیکر بھی روپیہ وصول کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ انوری نے جو اصول بیان کیا ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

رسم بود شاعرانِ طامع را ۔۔۔ یکے مدح[1] و دگر قطعہ[2] تقاضائی
اگر بداد سوم شکر ورنہ داد ہجا[3] ۔۔۔ ازیں سہ بیت دو گفتم دگر چہ فرمائی

یعنی پہلے ایک شخص کی تعریف کی جائے پھر صلہ کا تقاضہ ہو اور اس کے بعد اُسے ہجو کی دھمکی دی جائے۔ یہ تھی شان اس زمانہ کے قصیدہ گو شاعروں کی۔ اُسے کوئی بات ممدوح کی ناگوار ہوتی فوراً ہجو کہنے کی طرف رجوع ہو جاتا۔ معمولی سے معمولی بات پر شعرا ہجو کہہ ڈالتے۔ آخر فردوسی نے بھی تو اسی شاعرانہ فضا میں پرورش پائی تھی۔ پھر اس نے اگر محمود کی ہجو لکھی تو کیا بیجا کیا۔ یہ کوئی ضروری بات تو نہیں کہ فردوسی نے جو ہجو لکھی اس کا کوئی دوسرا ہی خاص سبب ہو۔ ہو سکتا ہے کہ محمود کی تخت نشینی کے بعد شاہنامہ اس کے دربار میں پیش کیا گیا ہو کہ فردوسی کی قدر افزائی کی جائے جیسا کہ تیسرا شعر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے ؎

من این نامہ فرخ گرفتم بہ فال ۔۔۔ ہمی رنج بردم بہ بسیار سال

ندیم سرافراز بخشندہ ۔۔۔ بہ گاہ کیاں بر نشیندہ
جہاندار محمود با فر و جود ۔۔۔ کہ اورا کنند ماہ و کیواں سجود

محمود کی دریا دلی اور جود و سخا کی شہرت سنکر فردوسی نے اپنی جگہ اندازہ لگایا ہوگا کہ شاید اب اُسکی قسمت جاگی ہے۔ اور محمود مجھے اسی تصنیف کا اس قدر صلہ دیگا کہ وہ بے نیاز ہو جائیگا۔ لیکن خلاف اُمید صلہ کم ملا۔ جب اس بندہ کر لوٹتی ہے تو انسان کے دل کی کیا کیفیت ہوتی ہے اس کا اندازہ تو وہی لوگ خوب لگا سکتے ہیں جنہیں اس سے دوچار ہونا پڑا ہو۔ ایسی حالت میں فردوسی کا رنج غیر فطری نہ تھا۔ جس کی دریادلی کے اُس نے قصے سُنے تھے وہ شاہنامہ کے صلہ کی رقم کا اس قدر کم اندازہ لگا سکتا تھا جس سے کہیں زیادہ فردوسی جیسے غریب انسان کے ذہن میں ہو۔ کیا ایک بادشاہ کیلئے جس کی سخاوت کا شہرہ چہار دانگ عالم میں ہو باعث ننگ نہ تھا۔ یہ ہونگے فردوسی کے جذبات جنہوں نے محمود کی ہجو لکھنے کے لئے اُسے اُبھارا ہوگا۔ ایسی حالت میں محمود کو غلام زادہ لکھنے کی کوئی تخصیص نہ تھی اگر اس سے زیادہ کوئی رکیک حملہ محمود کے خاندان پر ہو سکتا تو فردوسی اس سے بھی دریغ نہ کرتا۔ خدا معلوم اپنے اس خیالی صلہ پر جو اُسے محمود سے ملنے کی امید تھی کیسے کیسے عظیم الشان قلعوں کی بنیاد رکھی ہوگی۔ مگر افسوس وہ ہوا کا ایک لطیف جھونکا بھی نہ برداشت کرسکے۔ اور فردوسی کا رنج حد سے بڑھکر اسکی موت کا سبب بنا۔ لیکن محمود اس سے بالکل بے خبر تھا۔ وہ ولی نہ تھا جو فردوسی کے دل کی گہرائیوں میں اُتر جاتا۔ اس پر ایک بے بنیاد الزام ہے کہ اس نے کسی خاص وجہ سے متاثر ہوکر فردوسی کو وہ صلہ نہ دیا جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے وعدہ کیا تھا۔

[1] شعر العجم حصہ اول صفحہ ۵۹

ہماری میونسپل کمیٹیاں

میونسپل کمیٹی پنچایت کی ترقی یافتہ اور مغربی شکل ہے۔ میونسپل کمیٹی کی ایک چھوٹی بہن ہے اور ایک چھوٹا بھائی۔ بہن نوٹیفائڈ ایریا کمیٹی عموماً دس ہزار آبادی کا انتظام کرتی ہے۔ بھائی ڈسٹرکٹ بورڈ ۔۔ یہ قصبات اور دیہات کی بیس ہزار تک کے لئے ہوتا ہے۔

ایک بڑی بہن ہے جس کا نام کارپوریشن ہے۔ یہ بہت زیادہ آبادی والے بڑے بڑے تجارتی شہروں میں ہوتی ہے۔

کارپوریشن ابھی ہندوستان کے صرف چار شہروں کو ملی ہیں۔ ایک بمبئی۔ دوسرے مدراس۔ تیسرے کلکتہ۔ چوتھے کراچی۔

میونسپل کمیٹیاں ایسے شہروں میں بنائی جاتی ہیں جیسے الہ آباد ہے۔ لکھنؤ ہے کانپور ہے [illegible] ہے۔

[illegible] کمیٹی ہے۔ حالانکہ اس کی آبادی اور تجارت [illegible] ہے کہ عنقریب یہاں کی میونسپل کمیٹی کارپوریشن [illegible]

[illegible] جوں ہوشیار ہوتی جاتی ہے۔ ماں باپ [illegible] کے [illegible] میں اپنا شریک کرتے جاتے ہیں۔ اس سے [illegible] ہوتے ہیں۔ اور اسے اپنا جیسا کارگزار بنانے کی [illegible] آج کل کے زمانے میں تو اولاد خود ماں باپ کے [illegible] کرتی ہے۔ اور ماں باپ بھی سمجھتے ہیں کہ ہم [illegible] اپنا کام آپ کرنے دو۔

حکومت اور رعایا کا رشتہ بھی ماں باپ اور اولاد کا سا ہے ہندوستان کی حکومت نے [illegible] سے ہندوستانیوں کو حکومت میں شریک [illegible] ہندوستان کے صوبوں میں ہندوستانیوں کی باقاعدہ حکومت [illegible] ہو جائے۔ لیکن جن مراعات کی [illegible] اس کی ابتدا تھیں۔ اور میونسپل کمیٹیاں [illegible] اپنی ابتدائی مقام سے اب بہت آگے پہنچ چکی ہیں۔ دہلی میونسپل [illegible] لیجئے۔ دہلی کی میونسپل کمیٹی ۱۸۶۳ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس وقت اس کے [illegible] تو انگریز ممبر تھے اور سات ہندوستانی۔ چار ہندو اور تین مسلمان۔ یہ سات ہندوستانی بھی حکومت کے انتخاب کردہ ہوتے تھے۔ گویا میونسپل کمیٹی بالکل حکومت کے اشاروں پر چلتی تھی۔ دہلی کے رہنے والے اپنی بات میونسپل کمیٹی سے منوانے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ حکومت کی عنایت سے جو کام دہلی والوں کا ہو جاتا تھا ہو جاتا تھا۔

آج دہلی میونسپل کمیٹی میں چودہ ہندو اور چودہ مسلمان ممبر ایسے ہیں جنہیں دہلی کی آبادی نے آپ اپنے میں سے چن کر بھیجا ہے۔ اور چار ہندو اور ایک مسلمان کا انتخاب دہلی کی تجارتی اور صنعتی جماعتوں نے کیا ہے۔

صرف دو ہندو۔ تین مسلمان۔ ایک سکھ اور ایک انگریز حکومت کی طرف سے گئے ہیں۔ اور ڈپٹی کمشنر سمیت تین افسر ہیں۔ . . . .

. . . . تجارتی جماعت کی طرف سے آنے والوں میں البتہ ایک انگریز ہے۔ المختصر چالیس آدمیوں کی کمیٹی میں چار انگریز ہیں اور چالیس ہندوستانی ؎

ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا

کارپوریشنز میں حکومت کا اس سے بھی کم دخل ہوتا ہے۔ اور دہلی کے صوبہ اور دہلی کی میونسپل کمیٹی کی حالت ابھی وہ نہیں ہے جو اور صوبوں میں ہے۔ دہلی کی میونسپل کمیٹی کا صدر ابھی تک ڈپٹی کمشنر ہوتا ہے۔ لیکن اور ہر کارپوریشن اور ہر میونسپل کمیٹی کا صدر آج ہندوستانی اور غیر سرکاری ہندوستانی [illegible] سرکاری صدر اب نوٹیفائڈ ایریا کمیٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں میں رہ گئے ہیں۔ اور وہ بھی اکثر ہندوستانی حکام ہوتے ہیں۔ تاہم دہلی کی میونسپل کمیٹی میں سرکاری صدر نے نہ صرف پبلک نمائندوں کو بلکہ اپنے نمائندوں کو بھی اتنی آزادی دے دی ہے کہ وہ کسی طرح مجبور نہیں معلوم ہوتے میونسپل کمیٹیوں کے کام عموماً یہ ہوتے ہیں:۔

سب سے مقدم شہر کی صفائی رکھنا۔ شہر میں بیماریوں کو بڑھنے نہ دینا۔ اور شہر کو وباؤں سے بچانا۔

دوسرے سڑکوں اور گلیوں کو پختہ بنا کر اور پانی کے نکلنے کا انتظام کر کے شہر میں خاک نہ اڑنے دینا۔ شہر کی سڑکوں اور گلیوں میں روشنی مہیا کرنا اور مدرسوں اور شفا خانوں وغیرہ کی عمارتیں اور پارک تیار کرانا۔

تیسرے پرائمری تعلیم کا بندوبست۔ گاڑیوں، تانگوں اور ٹھیلوں کی دیکھ بھال۔ مکانوں کو اصول حفظان صحت کے خلاف تعمیر ہونے سے روکنا۔ شفا خانوں۔ پارکوں اور باغوں کی نگرانی کرنا۔ شہر سے بداخلاقیاں اور بد [illegible]

مہیا کرنا اور نقل و حمل اور ٹریفک کے تمام کاموں کے واسطے کرایوں اور ٹیکسوں کے ذریعہ روپیہ فراہم کرنا۔ کرایوں اور ٹیکسوں سے جتنی آمدنی ہوتی ہے اسکی مناسبت سے کچھ فی صدی روپیہ گورنمنٹ بھی میونسپلٹیوں کو بطور امداد دیا کرتی ہے۔ اور ضرورت پڑتی ہے تو گورنمنٹ سے روپیہ قرض بھی لیا جاتا ہے۔ صرف فوج، پولیس اور عدالت انگریزوں نے اپنے پاس رکھی ہے۔ باقی شہروں کی کل خدمت میونسپل کمیٹیوں کے سپرد کر دی ہے۔

تیسرے نمبر کے کام سکریٹری کی ماتحتی میں انجام پاتے ہیں۔ دوسرے نمبر کے کام انجنیر کی ماتحتی میں۔ اور پہلے نمبر کے کام ہیلتھ افسر کی ماتحتی میں جس حیثیت کا شہر ہوتا ہے اور جس درجہ کی اس کی میونسپل کمیٹی ہوتی ہے اسی حیثیت اور اسی درجہ کے سکریٹری، انجنیر اور ہیلتھ افسر وہاں رکھے جاتے ہیں۔ ان تینوں کے نیچے اسسٹنٹ سکریٹری۔ اسسٹنٹ انجنیر اور اسسٹنٹ ہیلتھ افسر اور ضرورت کے مطابق دوسرا عملہ ہوتا ہے۔ جب تک میونسپل کمیٹیوں میں انگریزوں اور حاکموں کی تعداد غالب رہی۔ اور ہندو مسلمان امراء کو حکومت سرفراز کرتی رہی۔ تب تک لوگ میونسپل کمیٹیوں کے خلاف آج کل کی نسبت کم شاکی رہتے تھے۔ میونسپل کمیٹی ایک دفعہ کا سرکاری محکمہ سمجھی جاتی تھی جس طرح پولیس کے خلاف یا عدالتوں کے خلاف یا کسی سرکاری ادارے کے خلاف زبان کھولتے ہوئے تامل ہوتا ہے اسی طرح میونسپل کمیٹیوں کے خلاف یا میونسپل کمشنروں کے خلاف کہنے یا لکھنے کی ہر کس و ناکس جرأت نہیں کرتا تھا۔

وہ زمانہ ویسے بھی احتیاط کا تھا۔ اب جیسی بے باکی اس زمانہ میں نہیں تھی۔

ممبران میونسپل کمیٹی کسی موقع کو دیکھنے آتے تھے تو ایسا ہی اہتمام کیا جاتا تھا۔ جیسا کسی تفتیش کنندہ پولیس افسر یا مجسٹریٹ کی آمد پر ہوتا ہے۔ گرمی کے موسم میں کوئی کھلی جگہ چھانٹی جاتی تھی۔ جھاڑو دلتی تھی۔ چھڑکاؤ ہوتا تھا۔ مونڈھے کرسیاں بچھتی تھیں اور وہاں ممبر صاحب کو بٹھایا جاتا تھا۔ بہت ڈر ڈر کر ان سے باتیں کی جاتی تھیں۔ جاڑے میں الاؤ اور تکلف کئے جاتے تھے۔ ممبر صاحب بھی پولیس افسر اور مجسٹریٹ سے اپنے آپ کو کم تصور نہ کرتے تھے۔ اور پولیس افسروں اور مجسٹریٹوں کے سب طریقے برتتے تھے۔

لیکن جب سے انتخاب پبلک کے قبضہ میں آتا ہے۔ جوں جوں پبلک کے بنائے ہوئے ممبروں کی تعداد بڑھ رہی ہے دوں دوں میونسپل کمیٹیوں کی شکایت کرنا اور میونسپل کمیٹیوں کو برا بھلا کہنا ایک عام شعار اور شیوہ بن گیا ہے۔

شکایت اپنوں سے کی جاتی ہے۔ غیروں سے نہیں کی جاتی۔ اب میونسپل کمیٹیوں کے ممبر پبلک کے اپنے ہیں اور ان پر پبلک کا زور ہے۔ پہلے ممبر ہندستانی بھی ہوتے تھے تو پبلک کا ان پر دباؤ نہ تھا۔

اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ موجودہ صورت گزشتہ صورت سے بہتر ہے اور شکایتوں میں اگر محض اپنایت کا جذبہ کارفرما ہو تو پبلک کے بنائے ہوئے ممبروں کو یہ شکایتیں سر آنکھوں پر رکھنی چاہئیں۔ مگر بعض امور ہیں جن کی طرف شکایت کرنے والوں کو خود بھی توجہ کرنی ضروری ہے۔

انسان چار پیسے کی مٹی کی ٹھلیا بھی خریدتا ہے تو ٹھوک بجا کر خریدتا ہے۔ دس روپیہ ماہوار کا خدمتگار رکھتا ہے تو اس کے اچھے برے ہونے کا اطمینان کرلیتا ہے۔ طبیب کے انتخاب میں گھنٹوں اور گھڑیوں سوچتا ہے اور پھر اسکے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہے۔ لیکن پبلک میونسپل کمیٹیوں کے لئے اپنا نمائندہ منتخب کرتے وقت سنجیدگی سے غور و فکر نہیں کرتی۔ پڑھے لکھے اور مقتدر حضرات سوائے اس کے کہ زبانی یا تحریری کبھی کبھی الکشن کا مذاق اڑا دیا کریں الکشن سے مطلق دلچسپی نہیں لیتے۔ معمولی خواندہ یا ناخواندہ اور غریب غربا لوگ حقیقتہً ممبر منتخب کرتے ہیں۔ ان سے سنجیدگی کی کیا امید ہوسکتی ہے۔ سب سے بڑھکر ضروری امر یہ ہے کہ خواص اپنے فرض کو محسوس کریں۔ اور عوام کی رہنمائی فرمائیں۔ عوام دو دو روپے اور ایک ایک روپیہ اور آٹھ آٹھ آنے میں اپنی رائے بیچ دیتے ہیں۔ انہیں خواص بتائیں کہ رائے اور ایمان ایک ہی چیز ہے۔ ایمان کا نام سنکر عوام ایمان ہرگز نہیں بیچیں گے۔ خیال کیجئے کہ جس نمائندہ کی نمائندگی کا آغاز رشوت دینے کے گناہ کے ساتھ ہو اس سے نیک کرداری کی توقع کیسے کی جاسکتی ہے۔ ایسی حالت میں آپ اس سے شاکی نہ ہوا کیجئے۔ خود اپنے اوپر غصہ اتارا کیجئے حکومت نے آپ کو جو حق دیا ہے آپ اسے ٹھیک استعمال نہیں کرتے۔

پھر شکایت میں اتنا اور دیکھ لیا کیجئے کہ شکایت ذاتی اور انفرادی معاملہ کی نسبت ہے یا مجموعی اور پبلک معاملہ کی نسبت۔

عمومی اور پبلک شکایت کی مثال یہ ہے کہ فرض کیجئے ایک میونسپل کمیٹی تجویز پاس کرے کہ فلاں ہسپتال میں بجلی کے پنکھے ہندستان کے ساختہ لگا دیئے جائیں۔ کمیٹی کا سکریٹری اور کمیٹی کا عملہ کسی وجہ سے چاہتا ہو کہ دیار کہیں اور کے پنکھے آئیں۔ یہ کشمکش جاری رہے اور گرمی کا آدھا موسم گذر جائے یہاں تک کہ خبر ملے کہ کل یا پرسوں کوئی بڑے سرکاری افسر ہسپتال دیکھنے تشریف لائیں گے۔ اس خبر کے ملتے ہی پنکھے لٹک جائیں

اب پبلک اگر شکایت کرے کہ چار لاکھ روپیہ فلاں غرض کی خاطر نہیں خرچ کیا گیا۔ بلکہ اپنی حیثیت دکھانے کے لئے خرچ ہوا ہے۔ تو اسے عمومی اور پبلک شکایت کہا جائے گا۔ اور ایسی شکایتیں کرنا پبلک کی زندگی کی علامت ہے۔

لیکن ہوتا اکثر یہ ہے کہ میونسپل کمیٹی کوئی کام کرتی ہے جو پبلک کے واسطے مفید ہوتا ہے لیکن آپ کو اس سے قدرے نقصان پہنچ جاتا ہے جیسے گلیوں اور سڑکوں کے چوڑا کرنے کا کام ہے۔ گلیوں اور سڑکوں کے چوڑا کرنے میں وقتاً فوقتاً ایک ایک دو دو مکانوں سے زمین کی کچھ جگہ لی جاتی ہیں۔ یہ بات شکایت کا سبب بن جاتی ہے۔ آپ کے مکان سے اگر زمین لے لی گئی ہے تو آپ خفا ہیں۔ آپ کو ایسی خفگیاں ترک کر دینی چاہئیں۔ ورنہ شہروں کی حالت کبھی درست نہ ہو سکے گی۔ ملک کے حق میں، شہروں کے حق میں اور خود آپ کے حق میں ایسی خفگی کی ذہنیت زہر ہے۔ اتنی اصلاح کر دی جائے تو شاید شکایتیں ختم ہو سکتی ہیں کہ میونسپل کمیٹیوں کے ممبر بس قانون اور قاعدے بنا دیا کریں۔ اور ان کے عملدرآمد سے ممبروں کا تعلق نہ رہے جس طرح اسمبلیاں قانون بناتی ہیں۔ اور قانون کی تعمیل عدالتوں میں ہوتی ہے۔ قانون کے غلط استعمال پر میونسپل کمیٹیاں اپنے عمال سے باز پرس کریں۔

یہ شکایت پبلک کو میونسپل کمیٹیوں سے ان کے عملہ کی بے عنوانیوں کے سبب پیدا ہوا کرتی ہے۔ اور میونسپل کمشنران چکی کے دو پاٹوں کے درمیان آجاتے ہیں۔

میونسپل کمیٹیوں کے ملازم بھی شہر کے اندر ہی رہتے ہیں اور جب ممبری کے انتخاب کا زمانہ آتا ہے تو گو انہیں انتخابی جد و جہد میں حصہ لینے کی ممانعت ہوتی ہے۔ مگر وہ حصہ لیتے ہیں۔ اور شکایت کرنے والی پبلک اس زمانے میں ان کے بیانات کو اہمیت دیتی ہے۔ اور سچا سمجھتی ہے۔ ان سے سنتی ہے کہ فلاں ممبر خوب ہے۔ اور فلاں ممبر فضول ہے تو کہتی ہے کہ بھئی یہ کمیٹی کے آدمی ہیں۔ ان سے زیادہ ہم ممبروں کی حالت کیا جانیں۔ لہٰذا ممبروں کو آنے والے الیکشن کی کھکھیڑوں سے بچنے کے لئے کمیٹی کے ادنیٰ ادنیٰ ملازموں کی دلجوئی کرنی پڑتی ہے۔ مثلاً کمیٹی کا کوئی ملازم پبلک کی جان ناک میں کر دیتا ہے اور اس کی حرکتیں افسران کمیٹی ممبران کے سامنے بیان کرتے ہیں تو جس علاقہ کا وہ باشندہ ہے اس علاقہ کے ممبر پر لازم ہوتا ہے کہ اسے بچانے کی کوشش کرے۔ اس صورت میں ظاہر ہے کہ بجز ان ملازمان کمیٹی کے جنہیں اتفاق سے ممبروں کا سہارا میسر نہ ہو،

پائیں اور ذمہ داری اور ایمان کے ساتھ [illegible]

اس لئے یہی طریقہ بہتر ہے کہ پبلک کی شکایتیں رفع کرنے کا ایک ہی راستہ ہے کہ قانون اور قاعدے ممبران کمیٹی بنائیں۔ اور ان پر عمل کرانے میں ممبروں کو مطلق دخل نہ ہو۔

میونسپل کمیٹیوں کا دوسرا نام لوکل سلف گورنمنٹ ہے۔ یعنی شہریوں کا اپنا راج۔ اس راج کی لاج رکھنا اور قائم رکھنا شہریوں کے ہاتھ میں ہے۔ وہ اسے ناکامیاب بھی کر سکتے ہیں اور کامیاب بھی۔ بدنام بھی کر سکتے ہیں اور نیک نام بھی۔

اگر سلف گورنمنٹ اچھی چیز ہے تو اسے کامیاب اور نیک نام بنائیے۔ میونسپل کمیٹیوں کے کاموں میں عمومی اور پبلک قسم کی دلچسپی زیادہ سے زیادہ لیجے اور ذاتی اور انفرادی فائدوں کو ناجائز طریقوں سے حاصل نہ کیجے۔ بلکہ ان کو عمومی اور پبلک فائدوں پر قربان کر دیجے۔

(منقول از نشرگاہ دہلی)

اگر تم کہو

از جناب نور بجنوری

فضاؤں پہ چھائی ہوئی ہے اداسی
اگر تم کہو تو کوئی گیت گا لوں
ستاروں سے کچھ دیر آنکھیں لڑا لوں
اسی ساز پر اک نئی دھن بجا لوں

نہ جانے مرے دل کو کیا ہو گیا ہے
اگر تم کہو تو یہ شمعیں بجھا دوں
یہ ریشم کے مغرور پردے جلا دوں
تمہارے محل کو سمادھی بنا دوں

یہ میری بہکتی ہوئی مست نظمیں
اگر تم کہو تو انہیں چاک کر دوں
جنونِ طبیعت کو بے باک کر دوں
تمہاری نگاہوں کو نمناک کر دوں

مجھے کوئی آواز دیتا ہے شاید
اگر تم کہو تو تمہیں بھول جاؤں
تمہارے تصور میں بھی پھر نہ آؤں
بغاوت کے قدموں میں سر کو جھکاؤں

زندگی میری نظر میں

(از حضرت روشن صدیقی)

زندگی کیا ہے؟

اس کے آغاز و انجام کی حقیقت کیا ہے؟

زندگی کا اس کائنات اور کائنات کا زندگی سے کیا تعلق ہے؟

ان جیسے بہت سے سوالات پر انسان کو کچھ نہ کچھ غور و فکر کرنا ہی پڑتا ہے۔

میں شاعر ہوں۔ مسائل حیات کو محسوس کرنے اور سمجھنے میں میں نے وجدان شعری کو بڑی حد تک شریک پایا ہے۔ لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہوگا کہ میری شاعری میری زندگی ہے اور میری زندگی شاعری۔

انسان شاعر نہ ہونے پر بھی ایک انسان ہی رہتا ہے۔ اور فیضان شاعری اسے ایک انسان سے ماورا نہیں بنا دیتا۔ اس لئے زندگی کے پُر اسرار چہرہ سے نقاب اٹھاتے ہوئے میرے ہاتھوں کی لغزش اگر آپ بھی محسوس کر سکیں تو اسے کوئی شاعرانہ گریز نہ سمجھئے۔ بلکہ اخفا و نمود کی ایک ایسی کشمکش جو فطرت انسانی سے کبھی جدا ہونا پسند نہیں کرتی۔

زندگی کا مقصد وحید کیا ہے؟

یہ ایک سادہ اور مختصر سوال ہے۔ مگر جوابات اس قدر مختلف اور طویل ہیں کہ ان کا سلسلہ شاید کبھی ختم نہ ہو۔

بہر کیف یہ حقیقت تسلیم کر لی گئی ہے کہ زندگی کی معراج ایک ایسی لازوال مسرت ہے جسے کوئی تشویش اور غم برہم نہ کر سکے۔ اہل نظر اور صاحب دل انسانوں کو اسکی جھلک کبھی حق و صداقت میں نظر آتی ہے۔ کبھی قوت و عظمت میں۔ اور کبھی حُسن و رعنائی میں۔

میرا نظریہ کچھ اور ہے۔ اگرچہ بلند آہنگی سے کہنا اچھا معلوم نہیں ہوتا کہ زندگی خود مرادِ زندگی ہے۔

حق و صداقت۔ قوت و عظمت حُسن و لطافت۔ یہ سب اسی جلوہ کا تک پہنچنے کے لئے دروازے ہیں۔ شاعر اس زندگی اور مرادِ زندگی کو عشق و محبت سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ محبت کہ خود زندگی جس کی کمند میں اسیر نظر آتی ہے۔ میں بھی شاعر ہوں اور میرے لئے یہ امتیاز ناممکن حد تک دشوار ہے کہ محبت زندگی ہے یا زندگی محبت! دودمان مغلیہ کی لطیف الخیال شہزادی سلیمہ سلطان بیگم کا ایک فارسی شعر شاید میرا ہی ترجمان ہے ؎

من ز مستی کا کلت را رشتۂ جاں گفتہ ام

مست بودم زاں سبب حرفِ پریشاں گفتہ ام

کیا ابدی زندگی کا تصور ایک شاعر ہی کو اپنے دام میں پھنساتا ہے۔ نہیں میرا احساس تو اس جذبہ کو بقدر ذوق و ظرف ہمہ گیر پاتا ہے۔

عام انسان سے لیکر عظیم ترین شخصیتوں تک نظر دوڑا لیجئے۔ آپ دیکھیں گے اور محسوس کرینگے کہ یہ تمنا کم از کم ایک بار تو ہر انسان کو ضرور گدگدا دیتی ہے۔

ذرا اس انسان کا تصور کیجے جو تمدن کی روشنی سے دور کسی گاؤں میں رہتا ہے۔ ایک معمولی دہقان میں کہتا ہوں کہ وہ بھی شعوری اور غیر شعوری طور پر اس جذبہ کا مُرید ہے۔

جوانی میں وہ اور اسکی بیوی ایک تندرست اور توانا بچے کا خواب دیکھتے ہیں۔ بچہ آتا ہے اور جوان ہوتا ہے۔ اب وہ کسان جوان بچے کی شادی رچاتا ہے۔ اور اس طرح ایک نئے آدم کے انتظار میں زندگی خوشی سے جھوم کر انگڑائیاں لیتی ہے۔ یہ نووارد بچہ اپنے دادا کو فاتح زندگی بنا دیتا ہے۔ وہ کسان اب مسرور ہے اور مغرور بھی کہ موت بھی اسے ختم نہیں کر سکتی مرنے پر بھی اس کا نام بلکہ خود اُس کی ذات اس کے خاندان اور اسکی نسل میں زندہ رہے گی۔

یہ ایک عامی انسان کے خیالات کا خاکہ ہے۔ اب ایک شائستہ فن کار کے محسوسات کا جائزہ لیجے۔ اگر وہ بُت تراش ہے تو اپنے شاہکار میں اُسے ابدی زندگی کا سراغ ملتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اس کا محبوب مجسمہ کسی وقت بھی خاک کا ڈھیر ہو سکتا ہے۔ اُسے علم ہے کہ پتھر اور مادی آب و رنگ سب فنا ہونے والے ہیں۔ لیکن وہ یقین رکھتا ہے کہ اسکی پھونکی ہوئی رُوح مجسمہ کے حُسن کو کبھی نہیں مرنے دیگی۔ مجسمہ مٹ جائیگا۔ لیکن فن کا حُسن اپنے مداحوں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

یہی حال مُغنی اور شاعر کا بھی ہے۔

فن کاروں کی محفل سے ذرا میدان عمل میں آیئے۔

یہاں سیاسی رہنما۔ غیور جنگ آزما اور ان تھک ماہرین صنعت و

دکھا آپ کو ملیں گے۔

سیاسی رہنما اور انقلابی مفکر احیائے وطن ہی کو لازوال زندگی کا زینہ سمجھتے ہیں۔ یہی جذبہ انہیں ترک و ایثار کے شعلوں کو سینے سے لگانے کے لئے بیتاب و مشتاق رکھتا ہے۔ دار و رسن کو وہ اپنے راستے میں حائل نہیں سمجھتے۔ بلکہ ایک ایسی بلندی جس کے بعد کوئی پستی ان سے دوچار نہیں ہو سکتی۔

سب فیروش جنگ آزما جو آگ اور خون کے سمندر میں غرق ہیں۔ صرف یہی تصور ان کے لئے حوصلہ افزا ہے کہ ابدی زندگی ان کی تلواروں کے سائے میں ہے۔

ذرا ان عظیم الشان تاریخی آثار پر نظر ڈالئے۔ یہ اہرام مصری۔ یہ ایا صوفیہ۔ یہ اجنتا کے غار اور یہ تاج محل سب انہیں مسافروں کے آثار منزل ہیں جو ابدی زندگی کی طرف بڑھنے کی عظیم تمنا رکھتے تھے۔

یہ حقائق اشیاء کے مبصر، مادیات کے یہ محرم راز۔ سائنسدان جو آب و آتش اور خاک و باد کے امتزاج و امتیاز سے انسانی زندگی کی ایک نئی تعمیر میں مصروف ہیں۔ اس ہمہ گیر جذبہ میں مبتلا ہیں۔ ان کی ایجادات کو کتنا ہی دشمن امن و سکون اور رہزن انسانیت کہا جائے مگر وہ مطمئن ہیں کہ ایک روز یہی تباہیاں اور یہی ہلاکتیں اس زندگی کا دروازہ کھول دیں گی جس سے موت کبھی نہیں جھانک سکے گی۔ اور انسان ہمیشہ کے لئے اس کے بے رحم چنگل سے محفوظ ہو جائیگا۔

علم و عمل کی محفلوں سے ذرا خانقاہ کی دنیا میں آئیے۔ یہاں اہل عشق بھی ہیں اور شاعر بھی۔ مذہبی مبلغ بھی ہیں۔ اور اخلاق معلم بھی۔ یہ سب ابدی زندگی کے ندیم کہلاتے ہیں۔ یہ اس تقرب اور باریابی کو اپنے ہی لئے مخصوص نہیں رکھتے۔ یہ سب کو دعوت دیتے ہیں کہ آؤ ہمارے ساتھ۔ ہم ابدی زندگی کے رہنما ہیں۔

علم و عمل و عشق کے یہ بے شمار مدعی اس دنیا اور زندگی کے لئے ایک ایسی جنت نہ بنا سکے جہاں لافانی مسرت کی جھلک نظر آ سکتی۔ یہ سب فلسفے اپنی جگہ پر موجود ہیں مگر دنیا ہے کہ ایک مستقل غم کدہ بنتی جا رہی ہے ہر طرف دکھوں کی بھرمار ہے۔ ہلاکت و بربادی کے سوا کچھ بھی نظر نہیں آتا یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ آپ اسے ایک طرف رکھئے اور سوچئے کہ اس سے پہلے ہی دنیا کون سے سکھ میں تھی۔ جنگ سے بس اتنا ہی تو ہوا ہے کہ وہ تباہی اور بربادی جو انسانوں اور انسانیت کو پردے پردے ہی میں گھن کی طرح کھائے جا رہی تھی اب پردے سے باہر آ گئی ہے۔

کیا دنیا سچ مچ اتنی ہی بری اور خراب تھی جیسا آج [illegible] ہے ہیں۔ نہیں۔ وہ تو شاید ابتدا میں بہشت تھی۔ لیکن آج انسانوں کے ظلم اور جہل نے اسے دوزخ بنا کر ہی دم لیا ہے۔ یقین کیجئے کہ اس جہنم سازی میں فرشتوں کی کوئی سازش نہیں۔ یہ تو عہد حاضر کے انسانوں کا کارنامہ ہے۔

ایک لازوال زندگی کی تمنا کیا کوئی خوفناک تقصیر تھی یا کوئی ایسی نفرت انگیز خطا کہ جسکی پاداش میں یہ عذاب دنیا پر مسلط ہے۔ اس میں کوئی ایسی حقیقت تو شامل نہیں جسکے اظہار سے ہم گھبراتے ہوں۔

کیا یہ سچ نہیں کہ آج کا انسان خود قاتل حیات اور رہزن زندگی ہے۔ مجھے ایک شاعر سمجھ کر معذور تصور فرمائیے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اگر مردہ لاشوں کو اس کا علم ہو جائے تو وہ ہم پر قہقہے لگانے کیلئے جی اٹھیں۔

آج زندگی نام ہے فریب زندگی کا۔ جلال روحانی اور جمال مادی کے پرچم لہرانے میں ہمارے زمانے کی تاریخ کا ہر صفحہ ایک نقیب نظر آئیگا۔ لیکن جب علم کی بنیادی حقیقتوں کو بھلانے اور عمل کا مدار ہی فطرت انسانی سے بغاوت اور عشق کا معیار ہی ہوس پرستوں کی تسکین سے قریب ہو جائے تو تعجب ہی کیا اگر ہم اس گہوارۂ عافیت سے دور پھینک دئے جائیں جسے ابن آدم کی جنت کہا جاتا ہے۔

عزم خائف، جوش ساکت، شوق محروم نوید
عصر حاضر ہے کہ اک طوفان اندوہ شدید
روح مایوس یقیں ہے دل ہے ویران امید
زندگی بھی رائیگاں ہے مرگ بھی ہے رائیگاں

منہ سے ہم کہتے ہیں کہ انسان دوسرے انسانوں کے لئے پیدا ہوا ہے۔ ہم نعرے لگاتے ہیں کہ سب سے اچھا اور محترم انسان وہ ہے جو سب انسانوں کا زیادہ سے زیادہ بہی خواہ اور خدمت گزار ہو۔ لیکن ہمارا عمل یہ ہوتا ہے کہ سب انسان ہماری خواہشات کے درخت کو سرسبز رکھنے کیلئے کھاد ہیں۔ اور سب سے اچھا نیز محترم انسان وہ ہے جس سے سب انسان خائف اور ترساں ہوں۔

ہم بحث کرتے ہیں کہ اشتراکیت اچھی ہے یا فسطائیت۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ ایک انسان اشتراکی اور فسطائی نہ ہوتے ہوئے بھی ایک اچھا انسان ہو سکتا ہے۔

اس زمانے کا انسان خدا کا انکار کرنے میں بہت آزاد منش ہے۔ اگرچہ ہزاروں جھوٹے خداؤں کا خوف دل میں لئے پھرتا ہے۔ ترک و ایثار، اخلاص اور بے غرضی سے ہمیں اس لئے وحشت ہے کہ ان سے تو لعنت اور

جہالت کی ہو آتی ہے ایک عجیب خود غرضی اور ہوس کاری ہماری زندگی پر چھائی جا رہی ہے۔ کبھی ہم اس تعلیم پر خندہ زن ہوتے تھے کہ تیرے پاس جو کچھ ہے وہ خدا کا ہے۔ اور جو تیمر کا ہے وہ تیمر کو۔ لیکن آج ایسی مل سکتا ہے کہ اس کی خدائی اور تیمر سے اگر وہ دنیا میں کہیں موجود ہے اسکی قیصریت کسی قوموں اور افراد کے احساس برتری کو تسکین نہ ہوتی۔

اذیت کے طلب نے انسانوں کو ایک عجیب بھول بھلیاں میں پھنسا رکھا ہے۔ آنکھ بند کئے ہوئے بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں کہ ہفت خوان زندگی طے کرکے دم لیں گے۔ حالانکہ ہر قدم ایک نئی گہرائی کی طرف لئے جا رہا ہے۔

اس زمانے کے روشن خیال انسان کے نزدیک ہر وہ شے جو اسکو نظر آئے لغو اور بیہودہ تصور ہے اس کا احساس نہ جھکے ایک لایعنی حقیقت ہے۔ دشوار پسندی اور مجاہدہ روحانی جن کو حیاتِ انسانی کا خلاصہ کہنا چاہیے آج غائب ہیں کوئی محرومی۔ کوئی ناکامی اور کوئی جدائی برداشت نہیں ہو سکتی بس طلب ہی طلب پہ زندگی کا انحصار ہے۔ ترک اور گریز کے خواب سے بھی وحشت ہے کاش ہم اس حقیقت سے باخبر ہوتے کہ ترک اور طلب کے امتزاج سے ہی زندگی کی جنت بنتی ہے۔

یہی بے جا طلب پرستیاں اور بظاہر ناشایاں خود غرضیاں ہیں جنہوں نے ہماری تہذیب کو یکسر کھوکھلا کر دیا ہے۔ تمدن کا یہ عظیم درخت اب ان جھونکوں کی تاب نہیں لا سکے گا جو حقیقی زندگی کا پیام انسانوں تک پہنچانے کے لئے بیتاب ہیں۔

کیا ہے وہ تہذیب جسے ہم خود زندگی کی زینت سمجھتے اور دوسروں کو سمجھاتے رہے ہیں۔ یہی نہ کہ ہمارے لئے اعلیٰ قسم کے اناج اور بہترین پھل اور میوے پیدا کرنے والے کسان خود فاقہ کشی کا تقدس حاصل کریں۔ ہمیں لطیف و نفیس لباس پہنانے والے اہلِ حرفہ اور کاریگر خود چیتھڑوں میں اپنا افلاس چھپائیں۔ ہمارے لئے شاندار محل تعمیر کرنے والے مزدور اور معمار خود جھونپڑوں میں زندگی کا آسرا لیں۔ یہ ہیں ہماری نمائشی زندگی کی برکتیں۔

ہمارے صنعتی اور ازدواجی مسائل کتنے جھوٹے اور مصنوعی ہوتے جا رہے ہیں۔ چوتھائی صدی کی سرتوڑ کوششوں سے ہم نے ایک قابلِ فخر کارنامہ انجام دیا۔ وہ ہے صنفِ لطیف کو پردے کی قید سے باہر کھینچ لانا۔ کاش یہ کامیابی سچی کامیابی ہوتی۔ چلتی پھرتی پرچھائیوں کو ہم نے پردے سے باہر نکال لیا ہے۔ اور حقیقی عورت کو ہمیشہ کیلئے یا کم از کم ایک نامعلوم مدت کے لئے اس پردے کے سپرد کر دیا ہے جسے وہ خود بھی اٹھانا چاہے تو اٹھا نہ سکے۔ ہم نے مردانہ اوصاف میں اسے اپنا حریف تو بنایا۔ لیکن یہ بتانے میں ہمیشہ بخل ہی کیا کہ عورت کی سب سے بڑی قوت اور کشش اس کی نسائیت ہے۔ نہ کہ مردانہ اوصاف۔

ہماری خود داری۔ خود شناسی اور خود افروزی کا یہ عالم ہے کہ خدا کے انکار و اقرار پر لمبی لمبی بحثوں میں مصروف رہتے ہیں مگر حال یہ ہے کہ جس فرعون سے لطف و کرم کی امید ہو اسے عرش نشین بنا دیں۔ جس سنگدل بت کے سامنے سر جھکے اسے حسنِ تاویل سے تراش کر خدا بنا کر چھوڑ دیں۔

یہ ہے وہ ہماری ہوئی ذہنیت جس نے حقیقی زندگی کو بہت سے حجابوں میں چھپا رکھا ہے۔ ایک سچا انسان بننا اس قدر آسان نہیں کہ سنگار کے ایک کش کے ساتھ اس معاہدہ کی تکمیل کر دی جائے۔ جو انسان اور اسکی زندگی سے متعلق ہے۔ یہ تو اتنی بڑی ذمہ داری ہے کہ فرشتوں کی قدوسیت آسمانوں کی رفعت اور کائنات کی وسعت اور عظمت بھی اس بوجھ کو نہ اٹھا سکی۔

بچپن میں قرآن عظیم کی ایک آیت نے مجھے بیحد متاثر کیا تھا جسکا مفہوم ہے "سب انسان صرف عبادت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔" اس وقت سخت حیرانی تھی کہ کیا زندگی صرف نماز، وظیفہ اور اوراد و وظائف ہی کا نام ہے۔ عرصہ تک ذہن کو مختلف خیالات پریشان کرتے رہے۔ بالآخر محسوس ہوا کہ عبادت صرف نماز روزے وغیرہ کا نام نہیں۔ وہ تو بس ایک صحیح طریقِ زندگی ہے۔

یہ صحیح طریقِ زندگی کیا ہے۔ انسانیت کی تکمیل۔ انسان کو مصورِ حقیقی نے اپنا شاہکار قرار دیا ہے اور اسے اپنی فطرت پر بنایا ہے — یہ دولیعت چاہتی ہے کہ انسان خدا کی ان تمام صفات کی تقلید کرے جو اسے خدا سے زیادہ قریب کر سکیں۔ یہ قرب سب انسانوں اور اس دنیا سے سچی وابستگی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس قرب کے لئے ضروری ہے کہ انسان کا ذوقِ تخلیق ہمہ گیر و بلند پرواز ہو۔ اسکی شخصیت و رحمت یگانوں اور بیگانوں کی تمیز سے آزاد ہو۔ وہ سب کے لئے مرحمت اور بخشش کا سرچشمہ ہو۔ وہ صاحبِ علم و عرفان ہو۔ اور اس کا احساس لطیف و باخبر۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تاروں بھرا آسمان۔ درخشاں سورج اور چاند، تارے۔ باوقار پہاڑ سبک خرام چشمے۔ تیز رو ندیاں۔ روح پرور پھول اور کلیاں۔ غرض یہ تمام مخلوقات نباتات و جمادات سب کائنات کے لئے یکساں فیض رساں ہیں۔

یہ امر بات ہے کہ آج انسان نے اس فیض رسانی کو بھی مخصوص اور محدود بنا دیا ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ ہم زندہ رہو اور زندہ رہنے دو کے سنہرے اصول کو ہمیشہ کیلئے بھول چکے ہیں۔ ہمیں اپنی زندگی قائم رکھنے کے لئے دوسروں کی زندگی ختم کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔

میں شاعر ہوں۔ محبت میری زندگی ہے۔ اور زندگی محبت۔ میں تو ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھتا ہوں جس میں بسنے والے انسان صحیح معنوں میں اشرف خلق ہوں۔ وہ گداز عشق سے اپنے دلوں کو رواداری اور رحمت عام کے قالب میں ڈھالیں۔ وہ حسن کے صحیح احترام کو عبادت تصور کریں۔ علوم عقلیہ اور فنون لطیفہ میں امتیاز و کمال پیدا کریں۔ مگر انہیں اقتصادی اور بازاری اغراض میں بد دکھا کر رسوا نہ کریں۔ صنف لطیف کو وہ اپنا ہمسر اور ہم مقام سمجھیں۔ محبت ہماری اس دنیا کو آسان پسند اور سطح پرست نہ بنائے۔ وہاں غم عشق کوئی روگ اور وبائی بیماری نہ بن سکے۔ اُن کی محبت حدود سے گذر کر مخلوق خدا کی محبت بن جائے۔ اور ان کا درد۔ درد زندگی۔ وہ خود آزاد ہوں اور دوسروں کی آزادی کو اپنی آزادی سے زیادہ محبوب سمجھیں۔ ان کے علم، ان کے فنون۔ ان کی دولت۔ ان کا تدبر۔ ان کے تمام اوصاف سب انسانوں کے لئے ہوں۔ یہ ہے شاعر کا خواب محبت۔ یا مقصد زندگی۔ میں اس خواب کی تکمیل کے لئے زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ عرصہ ہوا یہی جذبہ میرے ایک شعر میں رونما ہوا تھا ؎

بڑھانا چاہتا ہوں وسعتیں خوابِ محبت کی
مجھے اے زندگی تیری ضرورت ہوتی جاتی ہے

یہ جنت کوئی مستقبل کا خواب نہیں۔ کسی خاص وقت کا انتظار بے سود ہے۔ آیئے ہم سب اس نئی دنیا کی تعمیر کی طرف قدم بڑھائیں۔

انتظارِ صبح کیسا، صبح خود خواب ہے
ہم ہی خود بڑھکر اُلٹ دیں مہرزریں کا نقاب

(منشور از نشرگاہ دہلی)

مشعلِ راہ میری نظر میں

(جوش ملیح آبادی)

مختشب جارچوی ایک خوش طبع اور خوش فکر نوجوان ہیں۔ انکی شاعری بھی ان کی طرح جوان ہے۔ انکے بیان میں تازگی اور لہجے میں شیرینی کا عنصر بہت خوبی کے ساتھ سمویا ہوا ہے۔ انکی عشقیہ شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر غزل گویوں کی طرح اُن کا عشق روایتی اور ان کا محبوب موروثی نہیں۔ بلکہ یہ اُس وادی سے گذرے اور اُس کے طوفان سے خود کھیلتے ہیں۔ یہی حال اُن کی مناظر پرستی کا ہے۔ انہوں نے گھر کی چار دیواری میں بیٹھکر باغوں جنگلوں اور کہساروں پر خامہ فرسائی نہیں کی ہے بلکہ کھلی ہواؤں میں سیر کرکے حسنِ قدرت کا مطالعہ کیا ہے۔ جسکے اُبھرے ہوئے نقوش نظروں کو ٹھیر اکر دماغ کو متوجہ کر لیتے ہیں۔ ان کی شاعری ان کے ذہنی ارتقا اور بلوغ کی گواہی دے رہی ہے۔ اور اسی پاکیزہ و صالح علامت پر میں انہیں مبارکباد دیتا ہوں۔

ایک شہری کے فرائض

شہری کا ایک مفہوم بہت اعلیٰ اور وسیع ہے۔ اور صحیح مفہوم شہری کا یہی ہے۔ لیکن میں آج اُس شہری کے فرائض بیان کروں گا جس کے معنی عام طور پر شہر کے بسنے والے کے ہیں۔ یعنی جو دیہاتی اور قصباتی نہیں کہلاتا۔ یہی شہری اگر اپنے فرائض کو پوری طرح ادا کرنے لگے تو اصلی معنوں کا شہری بھی ہو سکتا ہے۔

شہروں میں تین قسم کے قانون رائج ہوتے ہیں۔ ایک میونسپلٹیوں کا قانون — دوسرا سرکار کا قانون۔ تیسرا مذہب اور اخلاق کا قانون۔ اگر ایک شہری ان قانونوں کے فائدوں کو سمجھ جائے اور ان تینوں چیزوں کا دل سے پابند ہو جائے، ان کی خلاف ورزی نہ کرے بلکہ اُن کا احترام کرے تو اُس نے گویا اپنے فرائض ادا کر دیا۔ تمام قوانین پبلک کے فائدے کے لئے بنائے جاتے ہیں میونسپلٹیاں بھی جتنے قانون بناتی ہیں وہ شہر کی عام آسائش کی نیت سے بناتی ہیں۔ ہر شہری کا فرض ہے کہ ان قانونوں کو کامیابی سے چلنے دے۔ ان کے راستے میں روڑے نہ اٹکائے اور اپنے ذاتی نفع نقصان کے سامنے پبلک کے نفع نقصان کو نہ بھلائے۔ ایک ہر شہری کا فرض ہے کہ اپنے نقصان پر پبلک نقصان کو اور اپنے نفع پر پبلک نفع کو فائق جانے۔ میونسپلٹیوں کا قانون چاہتا ہے کہ شہر کے سارے مکان کھلے کھلے ہوں۔ اُن کی چھتیں اونچی اونچی رکھی جائیں۔ ان میں روشنی اور ہوا آئے۔ تاکہ شہر کی صحت اچھی رہے۔ لوگ اپنے لئے اور اپنے درجہ کے کرایہ داروں کے لئے تو ایسے مکان تعمیر کرا لیتے ہیں لیکن غریب کرایہ داروں کے لئے اُنہیں یہ قانون ناگوار گذرتا ہے۔ اور وہ میونسپلٹی کے عملہ اور میونسپلٹی کے ممبروں کو کسی نہ کسی طرح متاثر کر کے غریب کرایہ داروں کے لئے خلاف قانون مکان پاس کرا لیتے ہیں۔ اور میونسپلٹیوں کے ہاتھ سے میونسپلٹیوں کے قانون کو تڑوا دیتے ہیں۔ شہروں میں بھی کثرت غریبوں ہی کی ہوتی ہے۔ اور ۵ فی صدی مکان انہی کے لئے تیار کئے جاتے ہیں۔ ان مکانوں میں آئے دن بیماری رہتی ہے۔ اور کوئی مکان ان میں ایسا ہوگا جس کے اندر دق کے جراثیم موجود نہ ہوں۔

ایک صاحب جائداد شہری کا فرض ہے کہ اصول حفظان صحت کے خلاف مکان نہ بنائے اور اپنے ذرا سے مالی نفع کی خاطر شہر کی تندرستی کو تباہ نہ کرے۔ شہر کے کرایہ داروں کو بھی چاہئے کہ جب مکان کرایہ پر لینے لگیں، تو جہاں انہیں نل کا اور بجلی کا خیال آتا ہے وہیں وہ یہ دیکھا کریں کہ مکان روشن اور ہوادار ہے یا نہیں۔ تاکہ مکان داروں کو معلوم ہو کہ غریب کرایہ دار روشن اور ہوادار مکان کا مطالبہ کر رہا ہے۔

مکان دار کہتے ہیں کہ کرایہ دار مکان کی قدر نہیں کرتے۔ مکان کی شکل بگاڑ دیتے ہیں۔ روشندان جن مکانوں میں ہیں وہاں کرایہ داروں نے روئی ٹھونس رکھی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

ایک شہری کرایہ دار کا فرض ہے کہ وہ مکان کو اتنے سلیقہ سے استعمال کرے کہ دوسرے اس سے سبق سیکھیں۔ گھر سے نکل کر گلی اور کوچہ کی صفائی کی ذمہ داری بھی ایک شہری پر عائد ہوتی ہیں۔ بچے میونسپل کمیٹی کی نالیوں کو پنجانہ کی کھڈی بنا لیتے ہیں۔ ایک شہری کا فرض ہے کہ ان بچوں کے والدین سے نرمی کے ساتھ اور سمجھانے کے لہجے میں کہے کہ یہ بُری بات ہے۔

گلی اور کوچے کی صفائی میں میونسپلٹی کے سقے اور بھنگی کوتاہی کرتے ہوں تو ہر شہری کا فرض ہے کہ میونسپلٹی کے افسروں یا علاقہ کے ممبر کو اطلاع دیدے۔ لیکن خواہ مخواہ سقوں اور بھنگیوں سے بغض نہ باندھا جائے۔ گلی اور کوچہ میں اور گلی اور کوچہ سے باہر ایک شہری کو ایسی کوئی حرکت نہ کرنی چاہئے جس سے اُس کی یا اُس کے گلی کوچہ والوں کی یا اُس کے شہر والوں کی گردن نیچی ہو۔

اٹھارہ اُنیس سال کا ذکر ہے دہلی میں ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوٹھی پر ایک عظیم الشان جلسہ ہو رہا تھا۔ غالباً پچاس ہزار آدمی کوٹھی کے اندر اور کوٹھی کے باہر اور سڑکوں پر جمع تھے۔ جلسہ ٹوٹا ہے تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ آدمیوں کا سمندر لہریں لے رہا ہے۔ اس مجمع میں کچھ اتنا جوش بھر گیا تھا کہ اُسے اور کوئی کام نظر نہ آیا تو بجلی کے ہنڈے توڑنے شروع کر دیئے۔ اور راستہ بھر یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور ہزار ہا ہنڈے توڑ ڈالے۔ اس مجمع کو یہ نہ سوجھا کہ بجلی کے ہنڈے تو میونسپلٹی نے لگائے ہیں اور ہم ہی سے ٹیکس وصول کر کے لگائے ہیں اور انہیں دوبارہ لگایا جائیگا تو ہمارے ہی روپے سے لگایا جائیگا۔

اسی طرح سڑکوں پر اور گلیوں کوچوں میں میونسپلٹیاں پانی کے نل مہیا کرتی ہیں ان نلوں سے پانی بہا کرتا ہے۔ اور ہزار میں سے ایک آدمی بھی یہ نہیں خیال کرتا کہ یہ پبلک کا پانی ہے۔ پبلک کے روپے سے میونسپلٹی نے مہیا کیا ہے۔ اس کا ضائع جانا پبلک کے روپے کا ضائع جانا ہے۔ گھریلو نلوں کا بھی تقریباً یہی حال ہے۔ یہاں تک کہ میونسپلٹیوں کو مجبوراً تمام ہندستان میں گھریلو نلوں پر میٹر لگانے کا فیصلہ کرنا پڑ گیا ہے۔ لیکن بازار کے نلوں کی فکر نہ

یعنی۔ توشاید اس سے زیادہ وقت کا سامنا ہوگا۔ لہذا ہر شہری کا فرض ہے کہ میونسپلٹی کی چیزوں کی برابر حفاظت کرے۔ اور اوروں کو حفاظت کرنا سکھلائے۔

میونسپلٹی کی چیزوں کی حفاظت واقعی اپنی چیزوں کی حفاظت ہے۔ کھلے نل کو دیکھتے ہوئے گذر جانے میں ایک شہری کی شان نہیں ہے، بلکہ اُسے بند کر دینے میں شان ہے۔ گاؤں میں اگر پگڈنڈی کے کانٹے چننا ثواب ہے تو شہروں میں اس کے مقابلہ کی نیکی بہتے ہوئے نل کو بند کر دینا ہے۔

جہاں تک میونسپلٹیوں کے قانون کا تعلق ہے ہر شہری کے قریب قریب وہی فرائض ہیں جو ایک میونسپل کمشنر کے ہوتے ہیں۔ جن باتوں کا دھیان ایک میونسپل کمشنر کو رکھنا چاہیئے۔ میونسپل کمشنر میں عمل پیرا ہونے کی ذرا سی طاقت ضرور آجاتی ہے۔ لیکن شہری میں اُس کے بدلے میونسپل کمشنر کو انتخاب کرنے کی طاقت ہے۔ اور اگر ہر شہری میونسپلٹی کے قانون کا دھیان رکھنے لگے۔ اس سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی کوشش چھوڑ دے اور جائز فائدہ حاصل کرنے میں پیش پیش رہے تو پھر میونسپل کمشنر اور شہری کے درمیان سے بالکل فرق اُٹھ جائے ہم نے اپنا اعتبار کھو رکھا ہے۔ ہمارا سچ بھی جھوٹ تصور کیا جاتا ہے۔ اور ہم سننے والوں کی عادتیں بگاڑ چکے ہیں۔ ورنہ مجال ہے کہ ایک شہری اپنا حق میونسپلٹی سے مانگے اور کوئی نہ سُنے۔ ایک شہری کا فرض ہے کہ اپنا اعتبار قائم کرے۔ اپنے قول کی وقعت کرائے۔

ممبروں کے انتخاب کے وقت رائے دینا ہر شہری کا اہم فرض ہے جو شہری رائے دینے میں سستی برتتا ہے وہ گویا پبلک مفاد کے کام سے بچتا ہے۔ البتہ اُسے رائے ایمان داری اور بے لوثی کے ساتھ دینی چاہیئے۔ ایسے شخص کو وہ ہرگز رائے نہ دے جو جمہور کی بجائے اپنا اور اپنے چند دوستوں کا بھلا چاہا کرتا ہو۔ جو جمہور کی بجائے افراد سے لچک کھاتا رہتا ہو۔ انتخاب کے وقت رائے دینے کا فرض ایک شہری کا ایسا فرض ہے جس کی صحیح ادائیگی شہر کو سرسبز کر سکتی ہے۔ رائے کا استعمال نہیں کیا گیا یا غلط استعمال کیا گیا تو شہر کے انتظامات کی عمارت یا بے بنیاد کے کھڑی ہوگی یا ٹیڑھی بڑنگی کھڑی ہوگی۔ اس عمارت کو مضبوط اور سیدھا اور بلندی تک جاتے دیکھنا ہے تو ہر شہری کو رائے دینے میں حصہ لینا چاہیئے۔ پڑھے لکھے اور با اثر و با رسوخ شہریوں کو رائے دینے اور رائے دلوانے میں عوام سے زیادہ توجہ اور احتیاط کی ضرورت ہے۔ ان کی ذرا سی غفلت یا ان کی ذرا سی کمزوری عوام کو گمراہ کر دیتی ہے۔ اور پھر وہ فقط اپنے کئے کے گنہگار نہیں ٹھیرتے۔ بلکہ دوسروں کے کئے کے بھی گناہگار ٹھیرتے ہیں۔

بین کے رتبے ہیں سوا اُن کی ہوا مشکل ہے

دودھ پیتا بچہ انگلی مار کر کسی کی آنکھ پھوڑ ڈالے تو کوئی قانون اُسے سزا نہیں دیتا۔ لیکن بڑا آدمی گا بجا کر اور خوشیاں منا کر رمضانہ پڑوسیوں کی نیند خراب کرنے لگے تو پکڑا جاتا ہے۔ بڑے آدمیوں کی ذمہ داریاں زیادہ ہوتی ہیں اور چھوٹے آدمیوں کے حقوق زیادہ ہوتے ہیں۔ بچے پر ذمہ داری کچھ نہیں۔ لیکن اس کا کوئی حق غصب نہیں کیا جا سکتا۔ دُنیا بڑوں سے بڑھکر بچے کے حقوق کی حفاظت کرتی ہے۔

المختصر پڑھے لکھے اور با اثر و با رسوخ شہریوں کو اپنی ذمہ داری کا بہت خیال رکھنا چاہیئے۔ حکومت میونسپل کمشنروں کی رائے اور فیصلہ ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔ لہذا شہروں میں جتنا کام ہوتا ہے۔ میونسپل کمشنروں کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ یعنی تمہارے نمائندوں کی مرضی کے مطابق۔ گویا تمہاری مرضی کے مطابق۔ عملہ بھی تم ہی میں سے مقرر کیا جاتا ہے۔ اُوپر سے نیچے تک قریب قریب تمام آدمی شہروں کے ہوتے ہیں۔ گاؤں اور قصبوں کے نہیں ہوتے نہ دوسری ولایتوں سے آتے ہیں۔ اب اگر تمہارے نمائندے میونسپل کمشنران اور تمہارے شہری بھائی یعنی میونسپل عملہ والے اپنے فرائض کو ٹھیک انجام دیں تو ہندوستان کے شہر بھی یورپ، امریکہ اور جاپان کے سے شہر بن جائیں۔ لیکن میونسپل کمشنران اور میونسپل عملہ والے فرائض کی ٹھیک انجام دہی جب ہی کر سکتے ہیں جب تمہیں بھی اپنے فرائض کا احساس ہو۔ عملہ، عملے کے افسر اور میونسپل کمشنران جان جائیں کہ تمہیں واقعی صفائی پسند ہے تو ممکن نہیں کہ تمہارے مکان سے چار چار فرلانگ تک کہیں ایک تنکا نظر آجائے۔ لیکن جب وہ سب دیکھتے ہیں کہ تم نے اپنے بیچ خانے سڑا رکھے ہیں۔ تمہارے باورچی خانوں میں کیچڑ رہتی ہے۔ تمہارے کمرے، دالان دیکھنے دکھانے کے لائق ہیں۔ تو اُن پر تمہاری شکایت کا کیا اثر ہوگا۔ تم شکایت کرنے کی عادت چھوڑ کر دل سے چاہو اور اپنے عمل سے چاہو کہ صفائی کی جائے تو میونسپل کمیٹی کی صفائی کہیں سے کہیں پہنچ جائے۔

دو لفظ میونسپل عملہ اور میونسپل کمشنران سے بھی کہنے چاہتا ہوں میونسپل عملہ اور میونسپل کمشنران بھی شہریوں میں شامل ہیں اور خدا نے اُنہیں اپنے شہر کی خدمت کا اور شہریوں کی نسبت زیادہ موقعہ دے رکھا ہے۔ لہذا انہیں اپنے فرائض یہ خیال کر کے انجام دینے چاہئیں کہ وہ محض تنخواہ یا اعزاز کی خاطر کام نہیں کر رہے۔ بلکہ شہر کی خاطر کام کر رہے ہیں۔ اور شہر میں اُن ہی جیسے انسان بستے ہیں۔ اور ان انسانوں کے بھی ان ہی جیسے ہیوی بچے ہیں۔

میونسپلٹیاں لوکل گورنمنٹ کہلاتی ہیں۔ گورنمنٹ نے ہمیں آزمانے کے لئے کہ ہم میں اپنا کام آپ کرنے کی کتنی صلاحیت ہے۔ یہ لوکل حکومت دی ہے اگر میونسپلٹیوں کا عملہ اور میونسپل کمشنران اسے ملحوظ رکھکر کام کریں کہ ان کے کام کا اثر ہندستان کی آئندہ ترقی پر پڑے گا۔ ہندستانی آزمائش میں پورے اتریں گے تو گورنمنٹ انہیں زیادہ سے زیادہ ذمہ داری کے کام سپرد کردیگی۔ تو ایک انقلاب عظیم ہوسکتا ہے۔ لیکن میونسپل عملہ کی درستی۔ میونسپل کمشنروں کی درستی پر منحصر ہے اور میونسپل کمشنر اسی وقت درست ہونے ممکن ہیں کہ پبلک اپنے آپ کو درست کرے۔ میونسپل عملہ اپنے فرائض کو نہیں پہچانے گا جب تک میونسپل کمشنران اپنے فرائض سے غافل رہیں گے۔ اور میونسپل کمشنران کی غفلت دور نہیں ہوگی جب تک تم بیدار نہیں ہو جاؤ گے۔ تم اگر ذاتی فائدے پر جمہور کے فائدے کو ترجیح دینے لگو تو ناممکن ہے کہ پھر میونسپل کمشنران صحیح راستہ پر نہ چلیں اور عملہ کے لئے غلط کاری کی ذرا سی گنجائش رہ جائے۔

ہوتا یہ ہے کہ فرض کرو تمہیں ایک مکان بنانا ہے۔ تم نے اپنے نمایندہ میونسپل کمشنر صاحب سے کہا کہ جگہ مختصر ہے کم صحن رکھوں گا۔ اور چھت کی بلندی اور روشنی، ہوا وغیرہ کی پابندی نہ کرسکوں گا۔ مکان اپنے لئے نہیں بنا رہا ہوں، کرایہ پر دینے کے لئے بنا رہا ہوں۔ کمیٹی کے قوانین کی زد میں میرا مکان نہ آنے پائے۔ اور مجھے مکان بنانے کی اجازت مل جائے میونسپل کمشنر صاحب واقف ہیں کہ انتخاب کے وقت تم ان کی مدد کرو گے۔ صاحب جائداد ہو۔ اپنے کرایہ داروں سے انہیں رائیں دلواؤ گے۔ میونسپل کمشنر صاحب فراموش کردیں گے کہ تم انہیں کا بنایا ہوا قانون ان سے برباد کرا رہے ہو۔ اور بھول جائیں گے کہ کرایہ دار کو بھی کھلے صحن، روشنی اور ہوا کی مکان دار کے برابر ہی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ وہ عملہ سے کہیں گے۔ بھئی! یہ ہمارے آدمی ہیں۔ ان کا نقشہ آرہا ہے۔ ذرا خیال رکھنا۔ عملہ نے میونسپل کمشنر صاحب کے حکم کی تعمیل کردی۔ اور میونسپل کمشنر صاحب کو یہ ایک بوٹی دیکر پھر کپڑے کے بکرے ہضم کر ڈالے۔ اب تم شکایت کررہے ہو کہ کمیٹی کے عملہ نے غضب ڈھا رکھا ہے آنکھیں بند کرکے لوٹتا ہے۔ آنکھیں بند کرکے لوٹتا ہے۔ اور تمہیں یاد نہیں آتا کہ تم نے ہی تو عملہ کے لوٹنے کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس میونسپل کمشنر کا جس نے تمہارا غلط نقشہ پاس کرایا تھا فرض ہے کہ وہ عملہ سے کہے کہ جو غریب ہیں، جو مجھ تک نہیں پہنچ سکتے یا جن کی مدد کا میں محتاج نہیں ہوں انہیں مت ستاؤ۔ میونسپل کمشنر صاحب کا تو فرض ہو جاتا ہے کہ اپنے حکم بردار عملہ کو ہر وقت بچانے کا خیال رکھیں۔

مشتے نمونہ از خروارے میں نے شہریوں کے ان چند فرائض کا ذکر کیا ہے جن کو پورا کرنا نہ کرنا کسی قدر شہریوں کے اختیار میں ہے اور جن کو پورا نہ کرنے کی صورت میں وہ قانون کی گرفت میں نہیں آتے۔ مثلاً ممبروں کے انتخاب کے وقت وہ اپنی رائے کو معطل رکھیں۔ میونسپلٹی کی چیزوں کو ضائع ہونے دیں۔ خلافِ اصول حفظانِ صحت مکانات پاس کرائیں۔ ان جرموں کی کوئی سزا نہیں ہے۔ میں ایسے ہی فرائض کی ادائیگی کی طرف چھوٹے بڑوں کو توجہ دلانی چاہتا ہوں۔ جن سے شہریوں کا کیرکٹر بن سکتا ہے۔ ورنہ میونسپلٹیوں اور حکومت کے ان قوانین کی پابندی تو ہر شہری کو کرنی ہی پڑتی ہے جن کی سزائیں مقرر ہیں۔ البتہ سزا کے خوف کی بجائے فرض تسلیم کرکے اگر کوئی ان قوانین کی پابندی کررہا ہے تو وہ بھی ایک شہری کے فرائض ادا کررہا ہے۔ مثلاً شہر کے لوگ سو میں سے ننانوے چور نہیں ہوتے۔ چوری کو قانون کے خوف کے بغیر انہوں نے عیب تسلیم کرلیا ہے۔ چوری کرنے کا تصور بھی ان کے دماغ میں نہیں آتا۔ اسی طرح تمام قانونی اور اخلاقی امور کا ایک شہری کو پابند بن جانا چاہیئے۔

آخر میں ترقی یافتہ اور مہذب ملکوں کے کچھ حالات سناتا ہوں جن سے ہندستان کے شہری سبق سیکھ سکتے ہیں۔ چین آپ جائیے اور چینی دکاندار سے نوٹ دیکر سودا خریدیئے۔ اور جو روپیہ وہ لوٹائے اسے پرکھئے۔ چینی آپ کی اس بات سے بہت برا مانے گا۔ زبان سے ممکن ہے نہ بولے۔ دل میں ضرور کہے گا کہ آپ کوئی خاص چیز ہیں۔ کیونکہ چینی اس قسم کے ذلیل شبہے نہیں کیا کرتا۔ اور چینی اس قسم کے شبہوں کا موقع بھی نہیں دیا کرتا۔ چین میں کھوٹا سکہ چلانے کی کوشش قطعی نہیں کی جاتی۔

انگلستان میں ٹرام یا ریل کے ٹکٹ دیکھنے کا اتنا دستور نہیں ہے جتنا ہمارے ہاں ہے۔

لمبے سفر پر جانا ہو تو ہر شخص اپنا بستر اپنے ساتھ رکھتا ہے۔ لیکن چھوٹے سفروں میں اگر کوئی چاہے تو یورپ کی ریلوے کمپنیاں کمبل اور تکیے مسافروں کو مستعار دے دیتی ہیں۔ مسافر جہاں سفر ختم کرتا ہے وہیں ریل میں کمبل اور تکیے چھوڑ دیتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں سنا کہ کمبل اور تکیے ادھر سے ادھر ہو گئے ہوں۔ نہ مسافر انہیں لیکر بھاگتا ہے اور نہ ریل کے ملازم انہیں خرد برد کرتے ہیں۔ کمبل اور تکیے برابر یوں ہی چکر لگاتے رہتے ہیں اور ان میں کمی نہیں آتی۔

یورپ میں زیر زمین بجلی کی گاڑیاں چلتی ہیں۔ وہاں ٹکٹ دیکھنے والا نہیں ہوتا۔ آپ کو بورڈ پر لکھا ملے گا کہ فلاں جگہ جانا ہے تو یہ کرایہ ہے اور فلاں

جگہ جانا ہے تو یہ کرایہ ہے۔ بورڈ کے قریب ایک بکس ہوگا۔ اس میں کرایہ ڈال دیجیے۔ اسی کرایہ کا ٹکٹ نکل آئیگا۔ بس وہ ٹکٹ لیجیے اور گاڑی میں گھس جائیے۔ اور گاڑی سے اُترتے وقت ٹکٹ جمع کرا دیجیے۔ یہ نہیں پوچھا جائیگا کہ واقعی آپ نے اسی قدر فاصلہ طے کیا جس قدر فاصلہ ٹکٹ بتا رہا ہے یا آپ آگے سے چلے آتے ہیں۔

یورپ میں اخبار فروش لڑکے چاء کے وقت چاء پینے چاء خانوں میں جا بیٹھتے ہیں۔ اور اپنے اخبار، رسالے اور ریزگاری سڑک پر دھر جاتے ہیں۔ خریدار آتا ہے اور اکنی ڈال کر اخبار اُٹھا لیتا ہے۔ اس کے پاس اکنی نہیں دوانی ہے۔ تو دوانی ڈال دیتا ہے اور ایک اکنی اور ایک اخبار اُٹھا لیتا ہے۔ اخبار فروش لڑکوں کو واپس آکر ریزگاری اور اخبار سنبھالنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ وہ گمان نہیں کرسکتے کہ کسی نے بے پیسے ڈالے اخبار اُٹھایا ہوگا۔ یا کوئی زیادہ پیسے لیکر چل دیا ہوگا۔

بُرائیاں اُن ملکوں میں بھی ہیں۔ لیکن اب بے حد کم۔ اور بُرائی کرنے کے بعد جھوٹ تو کم از کم بولا ہی نہیں جاتا۔ یہ میں اُن ملکوں کی شہری زندگی کا ذکر کر رہا ہوں۔ سیاسی زندگیوں کا ذکر نہیں کر رہا۔ لیکن بڑے سے بڑا سیاسی آدمی بھی وہاں شہری ہونے کی حیثیت سے جھوٹ نہیں بولتا۔

وہاں شہری شہریت کی غلطی کرتا ہے تو اُسے چھپاتا نہیں۔ بحث کریگا تو یہ کہ غلطی غلطی نہ تھی۔ یہ نہیں کہے گا کہ یہ کام میں نے کیا ہی نہیں۔

یورپ میں۔ امریکہ میں۔ چین میں دنگا فساد کبھی نہیں ہوتا پڑوسی آپس میں نہیں لڑتے اور خدا اور اس کے بندوں کے تعلق پر جھگڑا، تو ہندوستان کے شہروں کے سوا دنیا بھر میں کہیں نہیں ہے۔ حتّٰی کہ ہندوستان کے گاؤں میں بھی نہیں ہے۔

یورپ کا عیسائی مرد اور یہودی عورت آپس میں شادی کر لیتے ہیں اور وہ اپنے اپنے طریقہ پر ایک دوسرے کے سامنے خدا کی عبادت کرتے ہیں کسی کی آنکھ میں میل نہیں آتا۔

غرض شہریت کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ انسانیت سے جیو اور دوسروں کو انسانوں کی طرح جینے دو۔ اور دوسروں کو جینے میں مدد دو ◆

(منشور از نشرگاہ دہلی)

کیفیات

:(جناب فلپس مت ... اکبرآبادی):

نہ وہ عیش و رنج سے واسطہ نہ وہ سوز و ساز کا سلسلہ
نہ وہ ہائے ہائے کا حوصلہ نہ ہے شکوہ اور نہ ہے گلہ
نہ کسی کا میں نہ کوئی مرا
مجھے صرف اپنا ہے آسرا

ہے شریکِ دل غمِ جاوداں مرے دل میں ہے غمِ دو جہاں
مرے دل میں بھی ہے وہی عیاں مرے رُخ سے حال جو ہے عیاں
یہ نصیب لائے مجھے کہاں
کہیں ختم ہو بھی یہ داستاں

ترے کیفِ عشق سے چُور ہوں نہ قریب تجھ سے نہ دُور ہوں
جو نظر نہ آئے وہ نور ہوں جو ہے جل چکا میں وہ طور ہوں
ترا مظہر اور ظہور ہوں
ترا محو ذات ضرور ہوں

جو اُجڑ گیا وہ دیار ہوں جو ہو مٹ گیا وہ مزار ہوں
میں حیات و مرگ پہ بار ہوں میں مزاجِ لیل و نہار ہوں
میں خزاں رسیدہ بہار ہوں
میں رہِ وفا کا غبار ہوں

نہیں میرا رازِ دروں عیاں ہوں زباں والوں میں بے زباں
دیا اپنا مدتوں امتحاں مگر اب بھی حسن ہے بدگماں
رہے بیکسی پہ مری گراں
یہ زمین اور یہ آسماں

کبھی اپنے آپ سے بے خبر کبھی ہوں میں خضر کا راہبر
کبھی ہوں میں تارکِ خشک و تر کبھی ہوں میں حاکمِ بحر و بر
مرا حال ہے یہی مختصر
کبھی خستہ اور کبھی خستہ تر

مجھے رہنے دو مرے حال پر کہ بہا لوں اشک مآل پر
غمِ ممکنات و محال پر خلشِ نگاہ و خیال پر
کبھی عاشقی کے کمال پہ
کبھی عاشقی کے زوال پہ

الطاف مشہدی

(از جناب سید عبدالحمید صاحب عدم)

بیان کا خلوص اور جذبات کی صداقت، یہ دو ضروری صفات ہیں جو ہم کو شاعر کی شخصیت اور اسکے مقام سے صحیح طور پر متعارف کراتی ہیں غالب کا یہ شعر ؎

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

شوکتِ بیان اور رفعتِ خیال کا بہترین نمونہ ہونے کے باوجود جذبات کی اس سچائی اور بیان کی اس سحر طراز معصومیت کو نہیں پہنچتا جو میر تقی کے مندرجہ ذیل شعر میں سانس لے رہی ہے ؎

پھرتے ہو کیوں درختوں کے سائے میں دُور دُور
کر لو موافقت کسی بے برگ و ساز سے

موجودہ دور میں شاعری کا موضوع کچھ اس قدر وسیع ہو گیا ہے کہ فلسفہ و رومان سے لیکر روز مرہ کے معمولی مشاہدات چاہے ان میں کوئی قابلِ التفات نکتہ یا زندگی کا کوئی جذبہ انگیز پہلو ہو یا نہ ہو۔ اس کے دامن میں آکر چھپ گئے ہیں۔ غرضیکہ موجودہ دور کی شاعری تفکر کی وہ لامحدود بساط ہے جس کے کنارے پھیل کر حدِ نگاہ سے آگے بڑھ گئے ہیں۔ تاہم باوجود اس وسعت رکشادگی کے وہ صفات جو شعر کی بقائے دوام کی ضامن ہیں اور جن سے انسانی ذہن کے نقوش نہ مٹنے والی رنگ آمیزی اخذ کرتے ہیں۔ وہی دو تابدار مشعلیں ہیں جو وقت کی بیرحم آندھیوں کے باوصف آج تک پورے استقلال سے روشن چلی آئی ہیں۔ اور جو زندگی کے تاریک راستوں میں آئندہ بھی روشنی پھیلاتی رہیں گی۔ یہ مشعلیں وہی ہیں جن کا میں اوپر ذکر کر آیا ہوں۔ یعنی بیان کا خلوص اور جذبات کی صداقت ——— خیال کا بڑے سے بڑا ادعا اپنی تشکیل کی ندرت اور تعمیر کی خوبصورتی کے باوجود جب تجربے کی خوردبین میں رکھا جاتا ہے تو اس کے اجزا کا کھوٹ بہت دیر تک چھپا نہیں رہ سکتا ؎

کمبر و دیر کی تعمیر کے جب پیچ کھلے
اک ترا ایک مرا تار گریباں نکلا

(عدم)

جوشؔ کا مندرجہ ذیل شعر بادی النظر میں پرواز خیال کا کتنا شگفتہ اور لطیف نمونہ معلوم ہوتا ہے ؎

آواز دو متاعِ دو عالم کو جوشؔ نے
قربان یک تبسمِ جانانہ کر دیا

لیکن اگر آپ تھوڑا سا غور اس کی معنوی حیثیت پر فرمائیں تو آپ کو بہت جلد معلوم ہو جائیگا کہ اس شعر کی مثال کاغذ کے اس خوبصورت اور نظر فریب پھول سے زیادہ نہیں جسکی ساخت میں نزہت و خوشبو کا ایک ریزہ بھی استعمال نہیں کیا گیا۔

موجودہ دور کی شاعری جسکو بعض خوش فہم حضرات "ترقی پسند شاعری" کے مقدس نام سے بھی یاد کرتے ہیں کثرتِ نگارشات کے لحاظ سے ایک وسیع الحجم ذخیرہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن جہاں تک شاعری کے حقیقی سرمایہ کا تعلق ہے۔ حقیقتِ حالات بہت امید افزا نظر نہیں آتی۔ بہت کم شاعر ایسے نظر آتے ہیں جن کو ہم حقیقی معنوں میں شاعر کہہ سکیں اور جن سے آئندہ کے متعلق صحیح طور پر کچھ توقعات وابستہ کر سکیں۔ ان شعرا کے نوجوان طبقہ میں سے حضرتِ الطاف مشہدی کا نام ایک انفرادی امتیاز لئے ہوئے نظر آتا ہے۔ الطاف صاحب فطرت کی طرف سے صحیح ملکۂ شعری لیکر آئے ہیں۔ اور اس صحیح ملکۂ شعری کے ساتھ جب ان کے اپنے طبعی رجحانات کی مجتہدانہ اور پُر زور رد شامل ہو جاتی ہے تو اس خلیب وطنیت اور ترجمانِ انسانیت کے سازِ فکر سے ایسے بیدار کُن نغمے مترشح ہوتے ہیں جن میں ایک عالمگیر انسانیت کا مذہب انگڑائی لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ الطاف صاحب فرماتے ہیں ؎

تھام لے موت کا دامن کہ رہِ مقصد سے
زندگی مشورہ دیتی ہے بھٹک جانے کا

صحتِ خیال اور استقلالِ مقصد کی اس سے زیادہ موثر اور زندہ تصویر مشکل سے کسی اور جگہ آپ کو نظر آئیگی۔ دُنیا کے حوصلہ شکن حوادث یا دنیا کی جھوٹی اور شعبدہ آمیز خوبصورتی سے خوفزدہ ہو کر ایک راہب کی طرح صحرا نشینی اختیار کر لینا صحتِ کردار کی کوئی اچھی مثال نہیں۔ اس شعر میں الطاف صاحب نے گمراہی کی نظر فریب اور خواب آور رنگ رلیوں سے عدم تعاون کا صحیح راستہ ہم کو دکھایا ہے۔ زندگی نام ہے ایک مستقل تجربے کا۔ بعض اوقات تجربے کی اس ہزار رنگ شاہراہ میں ایسے ایسے حسین اور دل آویز موڑ آجاتے ہیں کہ مسافر کے لئے قدم آگے بڑھانا دشوار ہو جاتا ہے۔ زندگی میں زندگی کے

مقصد سے قدم بھٹک جانا ایک نوع کی روحانی موت ہے۔ شاعر نے طنز کا ایک خفیف سا تازیانہ لگا کر احساس و نظر کی اونگھتی ہوئی قوتوں کو بیدار کر دیا ہے۔ مقصد سے معرا زندگی ایک بے وقار موت سے کم نہیں۔ اس لئے معاملہ جب یہاں تک آ پہنچے کہ زندگی خود رہِ مقصد سے بھٹکنے کی متمنی ہو تو موت سے الحاق کر لینا مقاصد انسانیت کے تحفظ کی ایک کامیاب کوشش ہے۔ شعر کی تعمیر صرف دو چار آسان اور سادہ الفاظ کی شرمندۂ احسان ہے۔ لیکن شاعر کی قدرتِ استعمال نے ان معمولی الفاظ کو معجزہ و الہام کے مرتبہ تک پہنچا دیا ہے۔

الطاف صاحب کے کلام میں جا بجا اُن کے شخصی کردار کے نقوش پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تکمیلِ فن کا یہ وہ مقام ہے جہاں فن کار کے تکلم کی ہر جنبش خود اعتمادی آئینہ دار ہوتی ہے۔ موسیقی کی فنی اصطلاح میں اس خوبی کو "ارثے دکھانا" کہتے ہیں جب تک ایک فن کار خود اعتمادی کی اس منزل تک نہیں پہنچتا۔ وہ نہ تو خود اپنی صورت اپنے افکار کے آئینے میں دیکھ سکتا ہے۔ نہ دوسرے اسکی شخصیت کا عرفان حاصل کر سکتے ہیں۔ فنی اصطلاحات کی پگڈنڈیاں تمام فن کاروں کے لئے یکساں حیثیت رکھتی ہیں۔ لیکن فن کار کی انفرادیت اس کی طرزِ رفتار سے ظاہر ہوتی ہے۔ الطاف صاحب کے کلام میں "انعکاس کردار" کا یہ پھیلاؤ کہیں کہیں اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ ان کی شاعرانہ شخصیت ان کی سماجی شخصیت سے علیحدہ نہیں کی جا سکتی ؎

نوا میں اور سماعت میں کوئی فرق نہیں
یہ کس مقامِ حسیں پر پہنچ گیا ہوں میں (قدم)

ذیل میں میں اُن کی نظموں سے کچھ اقتباسات درج کرتا ہوں جن میں موضوع و بیان کی وسعت و تنوع کے ساتھ ساتھ "کردار کی مرکزیت کا ایک گہرا رنگ حاوی ہے ؎

انتباہ

جس کا حاصل ہیں فقط چند گھٹی سی سانسیں
ایسے جینے کو میں ٹھکرا کے چلا جاؤں گا
نطق پر پہرے خیالات پہ تالے الطاف
وقت کے جبر کا غم کھا کے چلا جاؤں گا

وطن کی امانت

یہ آنکھوں میں پھیلے ہوئے سرخ ڈورے
یہ لبریز ساغر یہ رنگیں کٹورے
یہ ہنستے ہوئے نرم ہونٹوں کی باتیں
یہ نغموں میں کھوئی ہوئی مست راتیں
مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی
یہ پلکیں یہ پلکوں کی اوٹوں میں اک شے
یہ ہنسی یہ ہنسی کے ہونٹوں پہ اک شے
یہ بربط یہ نغموں کی شاداب بستی
تبسم کی چاندنی، ترنم کی مستی
مجھے ان سے کوئی لگاؤ نہیں ہے
وطن کی امانت ہے میری جوانی

زندگی کی بعض جذباتی کیفیتیں اس قسم کی ہوتی ہیں جن کو قید بیان میں لانا اُن کی حلاوت و لطافت کے گلے پر کُند چھری پھیرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا ٹکڑے کے مصرعہ اولیٰ میں "پلکوں کی اوٹوں میں اک شے" اسی قسم کی ایک محسوساتی کیفیت ہے جسکو شاعر نے ایسے خوبصورت کنایاتی پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ فصاحت و بلاغت کے کئی دفتر اس پر قربان کئے جا سکتے ہیں ؎

یہ پلکیں یہ پلکوں کی اوٹوں میں اک شے

عارفانہ تجاہل اور بالغانہ بے خبری الفاظ کے جامے میں اپنا پورا جوبن دکھا رہی ہے۔ صنعت تضاد شاعری کی دقیق ترین منزل ہے۔ یہ صنعت جس جامعیت اور بے تکلفی سے مندرجہ بالا مصرع میں در آئی ہے وہ کسی رسمی تعریف و تحسین کی محتاج نہیں۔ "پلکوں کی اوٹ" میں جو کیفیت شاعر کی قوتِ مشاہدہ نے ملاحظہ کی ہے وہ ایسی لطیف اور غیر معمولی کیفیت ہے کہ اسکے اظہار کیلئے شاعر موزوں الفاظ ڈھونڈنے سے قاصر نظر آتا ہے۔ لیکن اس عجز اظہار کے ردّعمل میں شاعر کا ذہن رسا اس طرح تڑپ اُٹھتا ہے کہ پامال مثالوں اور مستعمل تشبیہوں کا تنگ میدان اُس کے تخیل کی جولانی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اور مشاہدے کی گہرائی اسکی تلاش کو ایک ایسے اچھوتے تصور سے روشناس کراتی ہے جس میں صنعتِ تمثیل کا ہر حسن موجود ہے۔

اچھوت

وہ دیکھو اک کار کھڑی ہے چمکیلی چمکیلی
نرم گدیلے، رنگیں پردے لچکیلی چمکیلی

میری باہیں میری رانیں پتھریلی پتھریلی

"میری باہیں میری رانیں پتھریلی پتھریلی" یہ مصرعہ پڑھکر زندگی کی چلتی ہوئی نبض پر ایک لمحہ کے لئے فالج گر جاتا ہے۔ اس سے زیادہ اچھوت کے احساسات کی صحیح ترجمانی اور کیا ہو سکتی ہے ؎

مندر میں دیکھو ہر جانب رام تپسیا جاری
جھوم رہی ہے ہر ہر پیڑ پہ آشا کی پھلواری
میں ایشور بھگتی کو جاؤں کانپ اٹھیں سنساری

"میں ایشور بھگتی کو جاؤں کانپ اٹھیں سنساری" اس مصرعہ میں جھوٹے خداؤں اور مذہب کی کھوکھلی اور گھناؤنی رسموں کے خلاف ایک خاموش اور بصارت آموز احتجاج انسان کو دعوتِ تفکر دے رہا ہے۔ اسی نظم میں آگے چل کر ایک تڑپتا ہوا مصرعہ نظر سے گذرتا ہے ؎

ناچ رہی ہے میری آنتوں میں فاقوں کی رانی

اس مصرعہ میں شاعر نے سماج اور مذہب کی غلیظ ذہنیت کو ایک بھیانک اور خونیں حقیقت کا ایسا آئینہ دکھایا ہے جس پر نظر ڈالتے ہی سماج اور مذہب کا مجرم ضمیر خوفِ مکافات سے کانپ اٹھتا ہے ؎

پیاس لگے جب نرناری کو بھاگ کنوئیں پر جائیں
میٹھے جل کی شیتل دھارا سب کی پیاس بجھائیں
میرے چھو لینے سے جل بھی زہریلا ہو جائے

"میرے چھو لینے سے جل بھی زہریلا ہو جائے"۔ اس مصرعہ میں ایسی سنگین اور جابر چھپتی مذہب کے رہا ہے ٹھیکیداروں کے مضحکہ انگیز اعتقادات پر نظر آتی ہے کہ ایک صحیح الدماغ انسان خدا اور مذہب[1] کے تصور سے ہی بیزار و منحرف ہو جاتا ہے۔

بعض مقامات پر الفاظ نے زندگی کی تلخیوں کے سیاہ تار روانی دار رات کے سفید و سرخ ڈوروں کے ساتھ اس طرح بُن دیئے ہیں کہ زہراب و انگبین کی ایک مخلوط اور عجیب و غریب کیفیت لفظوں میں پیدا ہو گئی ہے۔ ان نظموں میں بھی شاعر کے جذبات کی سچائی اور اس کے مقصد کا استقلال جو اس کی سماجی شخصیت کے حقیقی اجزا ہیں ایک مرکزی نظام کی طرح روحِ مشترک بن کر پھیلے ہوئے ہیں۔

استفسار

آسماں آگ اگلتا ہے زمیں ہانپتی ہے
رات کے چہرے پہ وحشت کی سحر کانپتی ہے

بھوک بیباک نگاہوں سے ہمیں بھانپتی ہے
تم مگر میرے لئے عشق و وفا لائی ہو
سن کہے کیوں مری خلوت میں اتر آئی ہو

پونچھیاں چاٹتی ہیں جھوٹے کھلیانوں کا لہو
اشکِ خونیں سے ہیں لبریز خم و جام و سبو
عصمتیں پیٹ نے کر رکھی ہیں وقفِ من و تو
اور تم جشنِ مسرت کی خبر لائی ہو
بن کہے کیوں مری خلوت میں اتر آئی ہو

یہ سلگتے ہوئے آنسو یہ سسکتی آہیں
حسن کی گردنِ نازک میں ہوس کی باہیں
جھونپڑوں سے یہ محلات کو جاتی راہیں
کس ارادے سے مری روح پہ تم چھائی ہو
بن کہے کیوں مری خلوت میں اتر آئی ہو

ہوسِ جاہ جھکی پڑتی ہے ہمسایوں پہ
کس قدر بوجھ ہے گرتی ہوئی دیواروں پر
زندگی لوٹتی ہے ہونکتے انگاروں پہ
تم مگر حسن کو پھولوں میں بسا لائی ہو
بن کہے کیوں مری خلوت میں اتر آئی ہو

آؤ گر آہی گئی ہو تو کوئی کام کریں
مردہ اجسام میں اب خون نہیں آگ بھریں
نام و ناموس کو افلاک سے ہمدوش کریں
آج کھل جاؤ بڑی مدتیں شرمائی ہو
کیا ہی اچھا ہوا تم خود ہی چلی آئی ہو

مندرجہ بالا نظم پڑھکر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے اندھیری رات میں ایک زبردست آندھی چل رہی ہے۔ آندھی کے طوفان اور ہیبتناک اندھیرے میں انسانوں کی ایک بستی ہے جس میں چاروں طرف آگ سلگی ہوئی ہے اور مکانوں کے بام و در شعلوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ بستی کی گلیوں سے مظلوم انسانوں کی دہشت آلود چیخیں آسمان کی طرف بلند ہو رہی ہیں۔ اس بستی سے ایک نوجوان دوشیزہ سراسیمگی کے عالم میں بے یار و مددگار پناہ کی تلاش میں بھاگ نکلتی ہے۔ اور بستی کے باہر ایک میل کے فاصلے پر

[1] غالباً صحیح الدماغوں کو یہ معلوم تو ہوگا کہ ہر مذہب کے خدا نے چھوت چھات کا حکم نہیں دیا ہے (راحدی)

جہاں اس کا ایک آشنا شاعر رہتا ہے۔ آکر رک جاتی ہے۔ رکنے کے بعد فوراً ہی ہانپتی ہوئی بلا اجازت مکان کے ایک آراستہ اور روشن کمرے میں داخل ہو جاتی ہے۔ دوشیزہ کی مشکبار زلفوں میں نوشگفتہ کلیاں اٹکی ہوئی ہیں اور اُس کے گلے میں پھولوں کا ہار ہے۔ جو آتش زدہ بستی سے بھاگنے سے پہلے اس نے احساسِ شباب کے غیر شعوری اقتضات سے پہن رکھا تھا۔ آراستہ اور مصور کمرے کی رومان انگیز روشنی اور ایک نوجوان دوشیزہ کا فضاؤں میں ڈوبا ہوا ترغیب انگیز پیکر ــــــ ایسے موقع پر ایک نوجوان اور حساس شاعر کے ذہن کا رجوع نفسیاتی مقتضیات کے قانون کے مطابق کس خواہش کی طرف ہونا چاہیئے اِس کا اندازہ قارئین خود بخوبی کر سکتے ہیں۔ لیکن دوشیزہ کے خلافِ توقع وردو پر نظم کے ہیرو کے دل میں جو ردِ عمل پیدا ہوتا ہے اور اِس ردِ عمل کی تان جس اخلاقی گریز پر شاعر نے لاکر توڑی ہے اس سے شاعر کے بلند کردار اور اسکی صالح ذہنیت پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں الطاف کی شاعرانہ انفرادیت روشنی کے ایک مینار کی طرح ماحول افروز نظر آتی ہے۔

سماج کی اصلاح کا یہ نیم گرم لیکن ملائم جذبہ الطاف کے کلام میں رفتہ رفتہ تیز ہو کر کہیں کہیں اتنا آتشناک ہو جاتا ہے جیسے صبح کی نرم دھوپ آہستہ آہستہ حرارت دیتی ہوئی ایک التہاب انگیز دوپہر کے سانچے میں ڈھل جاتی ہے۔ جذبۂ اصلاح کا یہ وہ مقام ہے جہاں تخریب کے پردے سے "تعمیر" کے امکانات تخلیق کئے جاتے ہیں۔ ایک مکان کو آگ اس لئے لگائی جاتی ہے کہ اُس کے باقی ماندہ متعفن پلیگ کے ہلاکت انگیز جراثیم سے محفوظ رہ سکیں۔ ایک بیمار اور تھکا ہوا سماج جس کے اعصاب پر اصلاح کا کوئی ٹانک اثر انداز نہ ہو سکتا ہو۔ اسی طرح رُو بہ صحت ہو سکتا ہے کہ اُس کو بیخ و بنیاد سے اکھیڑ کر اس کی جگہ ایک تنومند اور تندرست نظام کی بنیاد رکھی جائے جتنے جبروت و جلال سے یہ آتشیں عنصر الطاف کے کلام میں نظر آتا ہے اسکی مثال بنگال کے قومی شاعر قاضی نذر الاسلام کے علاوہ کسی جگہ نہیں ملتی۔ ایک خوشگوار اتفاقی واقعیت جو اس سلسلے میں غیر معمولی دلچسپی کی حامل نظر آتی ہے۔ یہ ہے کہ قاضی نذر الاسلام و الطاف مشہدی میں نزدیک ترین ذہنی و صوری مشابہت کے علاوہ خطابتی تاثیر و گرفت کی ایک مکمل مماثلت پائی جاتی ہے۔ میں نے الطاف کو مشاعروں میں کلام پڑھتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے۔ ایک آتش بیان خطیب مینارہ ہدایت سے انسانوں کے ایک بے خبر انبوہ کثیر کو مستقبل کے انقلاب اور اُس کے نازک مسائل سے آگاہ کر رہا ہے۔ سننے والوں کی آنکھیں غیر معمولی طور پر چمکیں، ان کے سینوں کی دھڑکن تیز اور ان کے چہروں کا رنگ تپتے ہوئے تانبے کی طرح سُرخ ہو جاتا ہے۔ اقتباسات ملاحظہ فرمائیے ؎

پگڈنڈی

سونے چاندی کے بچھو بیٹھے ہیں تاک لگائے
کب کوئی انجان مسافر اس رستے پر آئے
زہر ان کا بھٹکے راہی کو موت کی نیند سُلائے
ناداری کے جبڑوں میں دم توڑے وہ دُکھیارا
اَن دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

رینگ رہے ہیں دھرتی کے سینے پہ خونی سائے
انگڑائی لیتا ہے ذرے ذرے میں اندیائے
بگڑے موسم میں منزل تک کس سے جایا جائے
کرودھ کپٹ کی زہری ناگن اور انسان بچارا
اَن دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

موڑوں سے بھرپور ہے رستہ ہر موڑ ایک خرابی
قدم قدم پر رنگیں دھوکے ڈگر ڈگر بے تابی
آشاؤں کا زندہ نعشیں۔ چنتا مست شرابی
ڈوب چلا ہے غم کے بادل میں جیون کا تارا
اَن دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

جی کہتا ہے اس پگڈنڈی کو ہموار بنا دوں
تاریکی کو روشن کر دوں، جلتے دیپ بجھا دوں
پستی کو دوں عرش کی رفعت، عرش کو فرش بنا دوں
خواب سے چونکے غافل انساں جاگے عالم سارا
اَن دیکھی پگڈنڈی ہے اور طوفانی اندھیارا

بھور

پورب سے اگنی دیوی نے دیپک راگ الاپا
کنگلوں نے مایا نگری پر مل کے مارا چھاپا
نرمل کرنوں نے اندھیالے کی گردن کو ناپا
مسکاتی ہی بیٹھے کی تیت پر اب ماتا بیر

مہانوں میں مرنے کی ہر من میں ہیں آشائیں
چھائی ہیں آکاش پہ دہکی دہکی سرخ گھٹائیں

...دت سے افلاس کا مارا انساں یوں ٹکرایا
...پ اُٹھے آکاش نواسی اور سورج تھرّایا
...انوں کی سانسیں اُکھڑیں، ظلم کا منہ کُملایا

...ت کی زد میں بہنے والے جیون لے کر آئے
...نیا کے اَن داتا نکلے پھر دُنیا پر چھائے
...ہ بچالوں کا کھیس بدل کر دولت سے ٹکرائے
شریانوں میں لے کر اُٹھے بھڑ بھڑ کرتی آگ
آزادی کے نام پہ اُڑتا ہے کوٹھے سے کاگ

مندرجہ بالا اشعار میں ایک بے رحم اور جلاد سماج کی بوسیدہ ...ہڈیاں تڑک تڑک کر جلتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اور مظلوم انسانوں کی کچلی ہوئی تمنّاؤں کے لوٹتے ہوئے ستارے آخری بار متحد ہو کر جبر و استبداد کے ...سورج کی گردن مروڑتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ردّعمل کے اس سخت گیر قانون کی آندھی کو دُنیا کی کون سی طاقت روک سکتی ہے ؎

وہ عالم کے اجزا پریشان ہو کر
وہ عالم کو ترتیب میں لا رہا ہوں (عازم)

فنّی اعتبار کی رُو سے بھی الطاف صاحب کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ ...جذبات انگیز جذبات کا تحرک۔ چمکتی ہوئی تشبیہوں کی چکا چوند، موضوعات ...زندگی بخش شگفتگی اور زبان و بیان کی نزاکت و حلاوت سے اُن کا ...کلام بھرا پڑا ہے۔ اور اپنے انفرادی امتیاز کا عَلَم بلند کئے ہوئے ہے۔ الطاف ...کی نظم "دو موڑ" سے کچھ اشعار مثال کے طور پہ درج کرتا ہوں۔

دو موڑ

...تیرے چاند کی گاتی ہوئی سیمیں قاشیں
اُف مگر بھوک کی روندی ہوئی زندہ لاشیں
تیری آنکھوں میں چھلکتے ہوئے سپنوں کا شباب
آہ بازار میں بکتی ہوئی عصمت کی شراب

تیری انگڑائی میں بیتاب سے میخانے چند
اپنا ایمان وہی اسلاف کے افسانے چند
ایک مدہوش ترنّم تری آواز میں ہے
اپنا انجام ابھی منزلِ آغاز میں ہے
ریشمیں گول حسیں، نرم، گلابی باہیں
ہم پہ مسدود ہیں جینے کی مگر کیوں راہیں
کتنے لمبے تری پلکوں کے حسیں سائے ہیں
ہم کہاں ظلم کی وادی میں اُتر آئے ہیں
تیری رعنائی جواں طنز بنی جاتی ہے
میری حالت پہ مرے دل کو ہنسی آتی ہے

افکار کے رومانی سانچوں میں بھی شاعرانہ پیمبری کا گہرا رنگ سمویا ہوا ہے۔ جو راحت اور فرض کے مختلف العمل رجحانات میں ایک سپاہی کی طرح انتباہ کی برہنہ تلوار لئے ہوئے کھڑا نظر آتا ہے۔ الطاف صاحب اپنے فکر کی گمپڈنڈی پر جس احتیاط سے بچ بچ کر جا رہے ہیں۔ اور جس خلوص و استقلال سے اُن کا قلم مذہبِ انسانیت کا پرچار کر رہا ہے۔ وہ آگے چل کر اُن کی شخصیت کی بہت سی چھپی ہوئی گہرائیوں کو آشکار کرنے والے ہیں۔

رُباعی

کچھ بلبل و غنچے کی زبانی دیدے
کچھ عہدِ گذشتہ کی نشانی دیدے
مانا کہ ہے تکلیف سراسر لیکن
اِک بار مجھے اور جوانی دیدے

(سحر بیدی)

شعر

ایک رنگین اور جامع تبصرہ

(از جناب جلالی شاہجہانپوری)

تعریف شعر

علوم و فنون کی ترقی کے ساتھ ان کی تعریفات میں بھی مختلف نظریئے اور اصطلاحات پیدا ہو جاتی ہیں۔ مگر سب کا مطمح نظر اور منتہائے مقصود ایک ہی ہوتا ہے۔ لیکن الفاظ کے الٹ پھیر اور طرز بیان کے اختلافات سے بظاہر اشتباہ کی کیفیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ دنیا کا کوئی مسلمہ اور کوئی فن اس لفظی تضاد و تخالف سے خالی نہیں۔ مگر معانی و مفاہیم اور نتائج کے اعتبار سے کسی طرح تضاد نہیں۔ یہی حال "شعر" کا بھی ہے۔ اس کی تعریف میں بھی اختلاف لفظی ہر موقع پر نظر آتا ہے بلکہ بعض مواقع پر تو یہ تضاد الفاظ کے دائرہ سے گذر کر معانی و نتائج پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔

شاعری ایک فطری عطیہ کا دوسرا نام ہے۔ یہ وہ جوہر ہے جو ایک انسان کو اسکی پیدائش کے ساتھ قدرت کی جانب سے عطا کیا جاتا ہے۔ شاعری چونکہ عبارت ہے قلب میں احساسات اور قوت ممیزہ کے موجود ہونے کا اور ہر قلب کی گہرائی میں فطرت کا یہ بیش بہا عطیہ بلاوہ تمکن ہے۔ جب نوع انسانی کا کوئی فرد اس قوت ممیزہ سے محروم نہیں تو لازمی طور پر اس صغریٰ اور کبریٰ کی ترتیب سے یہی نتیجہ مرتب ہوتا ہے کہ ہر انسان فطری طور پر پیدائشی شاعر ہوتا ہے اور تمام ... ہیں جو ایک عرفی شاعر کے لئے لابدی ہیں ہر شخص اپنے ساتھ لاتا ہے۔ لہذا جب تک دنیا میں احساس و ادراک کا وجود باقی ہے اُس وقت تک ہر انسان کو خواہ وہ کسی خطۂ ارضی کا رہنے والا ہو اصل معنی میں شاعر کہا جاسکتا ہے۔

اس غیر عرفی تعریف پر یہ اعتراض کیا جاسکتا ہے کہ "جب ہر شخص بلا تخصیص علم و جہل فطری طور پر شاعر پیدا ہوا ہے تو دریں صورت ہر شخص کو شاعر کیوں نہیں کہا جاسکتا"۔ سو اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں شاعری نام ہے ایک تلاطم انگیز کیف اور جذبات کے پیدا ہونے کا۔ اور دنیا کا کوئی انسان جس کے سینہ میں دل موجود ہے اس نوع کے جذبات سے خالی نہیں۔ ہر شخص بلا کسی ... و تمیز کے ان جذبات کو ادا کرتا ہے۔ گاؤں کا ایک جاہل کسان ان جذبات کو اپنی عقل و فراست کی وسعت تک ادا کرتا ہے۔ اور ذکی و فہیم انسان اول الذکر کے مقابلہ میں زیادہ خوشنما اور موثر انداز میں ان جذبات باطنیہ کو ظاہر کرتا ہے۔ اس عالم رنگ و بو کے پیش آنے والے جذبات کے پیدائش میں عالم و جاہل، متمدن و غیر متمدن میں کوئی تفاوت نہیں۔ ہاں اظہار بیان اور طرز ادا میں علم و جہل کی نسبت سے ضرور امتیاز پایا جاتا ہے۔ پس اس تفصیل کی ترتیب کے بعد بھی یہی نتیجہ مستنبط ہوتا ہے کہ "نوع انسانی کا ہر فرد بلا کسی تخصیص کے شاعرانہ صلاحیت کا مالک ہے۔" ہاں! اگر آپ کے دماغ میں شاعر اس معروضہ ہستی کا نام ہے "جو دل میں پیدا ہونے والے جذبات کو نپے تلے الفاظ اور ردیف و قافیہ کی پابندیوں میں جکڑے ہوئے طریقوں سے بیان کرتا ہے" تو یہ اغراض کسی حد تک درست ہو سکتا ہے۔ لیکن حقیقت میں شاعری نام ہے پیدا ہونے والے کیف اور جذبات کو سادہ مگر موثر انداز سے بیان کر دینے کا۔ اگر اس دنیا میں ہر شخص علم اور تعلیم سے آراستہ ہو جائے اور ان چند قواعد و ضوابط سے بھی واقف ہو جائے تو پھر ہر شخص ان تلاطم انگیز جذبات کو مخصوص انداز میں بیان کرنے کی صلاحیت رکھ سکتا ہے۔ لیکن جذبات کی پیدائش میں کوئی فرق نہیں ہوگا۔

اس دعویٰ کی دلیل میں کہ "شاعری ردیف و قافیہ کے قیود کے ساتھ موزوں کلام کا نام نہیں ہے" حضرت حسان بن ثابت کے صغیر السن بچے کے بھڑ کے کاٹنے کا واقعہ کافی ہے۔ اس قصہ کی تلخیص یہ ہے کہ حضرت حسان کے سامنے اُن کا چھوٹا بچہ روتا ہوا آیا کہ مجھ کو ... جانور نے کاٹ کھایا ہے۔ حسان نے جانور کا نام پوچھا۔ وہ نام سے ناواقف تھا۔ حسان نے کہا "اچھا صورت کیا تھی؟" بچہ نے کہا "کانہ ملتف بردی حبرۃ" یعنی گویا یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دو مخطط چادروں میں لپٹا ہوا ہے۔" چونکہ بھڑ کے بدن پر رنگین دھاریاں ہوتی ہیں اس لئے اُس نے مخطط چادر سے تشبیہ دی۔ حسان اُچھل پڑے اور خوشی کے جوش میں کہا "واللہ صار ابنی الشاعر" یعنی خدا کی قسم میرا بیٹا شاعر ہو گیا۔ صغیر السن بچہ کا اس فقرہ میں شاعرانہ تعریفات کی موزونیت کا گمان بھی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن انداز بیان اور تشبیہی پہلو کی بیساختہ ندرت نے حضرت حسان کو "صار ابنی الشاعر" کہلوانے پر مجبور کر دیا۔ اس تمثیلی قصہ سے بھی یہ حقیقت اپنی جگہ پہ بدیہی طور پر ہویدا ہو جاتی ہے کہ فطرت نے شاعرانہ خصوصیات ہر کہہ و مہ اور ہر خاص و عام کے جوف دماغ میں ودیعت کی ہیں۔

نظامی عروضی کے نزدیک بھی تخیل کی جولانیوں اور قوت احساس کی ... کاریوں کا دوسرا نام شاعری ہے۔ موصوف کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ "شاعری اسکا نام ہے کہ مقدمات موہومہ کی ترتیب سے اچھی چیز بدنما اور بُری چیز خوشنما ثابت کی جائے۔ جس سے محبت و غضب کی قوتیں مشتعل ہو جائیں۔" ظاہر ہے کہ ...

... دونوں اپنی اپنی فکر و دانش کی تفاوت کی نسبت سے معقدات موہومہ کو ترتیب ... محاسن و معائب اور معائب کو محاسن کی صورت میں پیش کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں پس اس ترتیب سے بھی بدیہی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ ہر انسان بلا کسی تخصیص کے شاعرانہ طبیعت کا مالک ہے۔

اس دنیائے رنگ و بو میں ایک شخص بھی ایسا نہیں مل سکتا جو جذبات و احساسات کی حسین و جمیل اور فردوس منظر عروس کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہو۔ اور اُن چیزوں کو جو عروس جذبات کو جوش و انگیخت میں لاتی ہیں ادبی اصطلاح میں شعر کے پاکیزہ نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب یہ چیزیں اور اُن کے ... نوع انسانی کے ہر فرد میں یکساں طور پر نمو پاتے رہتے ہیں تو اس کلیہ کی ... صورت میں ہر شخص کے اندر شاعرانہ جراثیم موجود ہیں۔ اب اگر وہ ان جراثیم ... عائد کردہ قیود کے اندر خوشنما طریقے سے ظاہر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے تو ... شخص کو عرف عام میں شاعر کے مقدس نام سے پکارا جاتا ہے۔ لیکن جہاں تک ... جذبات کی تخلیق اور نمو کا تعلق ہے اس کے اعتبار سے اصطلاحی شاعر اور ... سب برابر ہیں۔

رنج و غم کی صوبت آفرینیوں، وصل و شباب کی لذت کوشیوں، بادِ بہاری کی ... انگیزیوں، گل بداماں گلستان کی رنگینیوں اور صبح و مسا کی دلآویزیوں کو معمور ... کا دوسرا نام شعر ہے اور اس میں رنگ آمیزی کرنے والے کو شاعر کے مبارک نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جب شاعری عبارت ہوئی اس نوع کی رنگ آمیزی اور جذبات ... سے تو ظاہر ہے کہ اس قسم کی جذبات بیانی اور رنگ آمیزی پر ہر شخص بلفرق مراتب ... بلا کسی تخصیص کے قادر ہے۔ اس استدلال سے بھی یہی حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ جہاں ... شاعرانہ احساسات و جذبات کا تعلق ہے فطرت نے کسی کو اس سے محروم نہیں کیا ہے۔

ہمارے پڑھے لکھے گھرانوں میں آج تک اس شخص کو جو اپنے خیالات مافی الضمیر کو دل پسند اور دلکش انداز میں بیان کر لیتا ہے اور جس کی باتوں میں کیف بخش چاشنی ہوتی ہے، شاعر کہا جاتا ہے اور اُن خیالات کو شعر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

بات اصل یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ بزرگوں نے شعر و شاعری کی وہی تعریف کی تھی جو ادب و شعر کی دقیق کتابوں میں درج ہے اور اب جن کی طرف عنان توجہ منعطف کرنا بھی تضیع اوقات کی صورت رکھتا ہے۔ آج عرف عام میں شعر و شاعری کی جو محدود تعریف تعریف مروج ہو گئی ہے وہ ان کے خیالات کی ہرگز آئینہ دار نہیں۔ ہمارے تعلیم یافتہ گھرانوں میں شعر و شاعری کے معنی میں آج جس وسعتِ خیال اور کشادگیٔ نظر سے کام لیا جا رہا ہے حقیقت میں یہ وسعت انہیں بزرگوں کے خیالات کا سچا عکس ہے۔

شعر کی اس وسیع المعنی تعریف پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ جب شعر و شاعری کی تعریف میں وسعت ٹھیری تو پھر لکھنؤ کے ایک طرحدار مگر شوخ گفتار چرب زبان اور فتنہ و رآغوش کے کیف بخش انداز بیان۔ نسانہ عجائب اور چہار درویش کی مقفیٰ و مسجع عبارت اور میر و انیس کے الہامات شعری میں امتیاز ناممکن ہے اور اسی طرح ایک فلسفی کے طائر تخیل کی بلند پروازیاں، بزرگان دین کی معجز بیانیاں لعنۃ جگر اور سوختہ سامان عاشقوں کی دلدوز اور جگر خراش آہ و زاریاں بھی اپنی جگہ پر مکمل شعر ہیں۔ کیونکہ یہ بھی جذبات و احساسات ہیں جو ان کے دلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

سو اس کا کھلا ہوا اگر مختصر جواب یہ ہے کہ شعر و شاعری کی اصطلاحی تعریف سے ہٹ کر پیار مقصد دماغ کی عام شاعرانہ صلاحیت سے ہے۔ یہ صلاحیت چیزے دیگر ہے اور شعر کی اصطلاحی تعریف اپنی جگہ پر اور چیز ہے۔ اگر عام دماغوں کو شاعرانہ صلاحیتوں کا مالک گردان لیا جائے تو اس سے شعر کا معیار نہ تو بام فلک سے حضیض نثری میں گر جاتا ہے اور نہ عروس شعر کے حسین خد و خال اور جمیل نقش و نگار میں کسی بد نمائی کے انداز پیدا ہو سکتے ہیں۔ اگر فلسفی کے تخیلات اور بزرگان دین کے الہامات کو زمرۂ شعر میں شمار کر لیا جائے تو اس میں کون سا تعارض پیدا ہو جاتا ہے کیونکہ شعر بجائے خود ایک الہام ہے، ایک اثر ہے جو واردات قلبی کی صورت میں دل پر مرتب ہوتا رہتا ہے۔ اور جو الہام نہیں وہ شعر نہیں بلکہ ردیف و قافیہ کی ایک بے معنی سی ترکیب ہے۔

شاعر مصور فطرت، مفسر فطرت اور سر بر فطرت کہلاتا ہے اور فطرت کا سچا ترجمان بھی اسی کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ خدا کی سچی عظمت و جلالت، اس کی صنعت کاریوں اور اس کے جمالیاتی ذوق خود نمائی کی خدا کے محبوب پیغمبروں کے بعد جو ہستی ترجمانی کرتی ہے وہ شاعر ہے۔ تو پھر اس کے واردات قلبی کو الہامات کے سوا اور کس چیز سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

حقیقت میں نفسیات کا جہاں تک تعلق ہے کوئی انسان اس شاعرانہ جذبے سے کبھی اور کسی صورت میں عاری نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہی وہ پاکیزہ اور مقدس جذبہ ہے جس کے ماتحت دنیا کی چہل، بہار آفرینی، طرب انگیزی، اختراع پسندی اور رومانیت کی رنگینی، غرضکہ دنیا کی ساری دلچسپیاں اور رنگینیاں اسی رومان پرور جذبہ کی منت کش ہیں۔ اگر آج اس حیات پرور اور مقدس جذبہ سے انسانی زندگی عاری ہو جائے تو پھر زندگی زندہ دلی کے نام کے بجائے مُردہ دلی کا نام ہوگا۔ انسان تو اشرف المخلوقات کے معزز و مقدس خطاب سے نوازا ہوا ہے جانور جن کے اندر شعوری احساس کا عنصر تک نہیں پایا جاتا اُن میں بھی یہ جذبہ فطری طور پر پوری تابناکی کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ رقص طاؤس اور ترانۂ عندلیب صدائے

بے ہنگام نہیں بلکہ طاری ہونے والے کیف اور جذبہ کے علامات ہیں۔ جو دلکش مگر مختلف الصوت صورتوں میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔ نوعِ انسانی کے کسی فرد کے دل و دماغ پر جب اس جذبۂ صادقہ کے اثرات پوری طرح چھا جاتے ہیں تو وہ ان اثرات کی کیفیتِ باطنیہ کو الفاظ کے سانچے میں ادا کرتا ہے۔ اور حیوانات اس جذبہ کے اثرات کو حرکاتِ بدنیہ کی صورت میں ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً طاؤس اپنے مست کُن جذبہ کو رقص کی صورت میں ظاہر کرتا ہے۔ اور سانپ پھن پھیلا کر اور لہرا کر۔

انسان چونکہ افضل و اکمل بین المخلوق کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اس کو مرتبہ کے لحاظ سے مزید نعمتوں سے سرفراز کیا گیا ہے۔ یعنی اس کو بارگاہِ فطرت سے نطق کے ساتھ نغمہ کا ملکہ بھی عطا ہوا ہے۔ جب اس پر کیفیات و اثرات مرتب ہونا شروع ہوتے ہیں تو یہ گنگنانے لگتا ہے۔ اور جب یہ جذبہ اپنے پورے شباب پر آ جاتا ہے اور اس کی رنگینیاں انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جاتی ہیں تو انسان پر ایک قسم کی وجدانی کیفیت اور رقصانی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اور آخر میں عالمِ رنگ و بو کی رنگینیوں میں گم ہو کر تھوڑی دیر کے لئے بیگانۂ عقل و ہوش ہو جاتا ہے اور اس سب کیف بخش مجموعہ کا دلکش و شیریں نام "شعر" ہے۔ اور یہ تمام اثرات و کیفیات ہر شخص پر بلا کسی تخصیص کے مختلف وقتوں میں مرتب ہوتی رہتی ہیں۔ لہذا اس بیّن دلیل سے بھی یہ مسئلہ صاف و روشن ہو جاتا ہے کہ دنیا کے ہر شخص میں مادۂ شعری دستِ فطرت نے ودیعت کیا ہے۔ لیکن ہم نے آسانی کیلئے اس شخص کو شاعر کہنا شروع کر دیا ہے جو خارجی اثرات سے پیدا ہونے والے جذبہ کو چند عروضی قیود کے ساتھ الفاظ کے ذریعہ ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

اس حقیقت کے ظاہر ہو جانے کے بعد کہ فطرت نے ہر انسان کو اس کے ماحول اور فضا کے اعتبار سے شاعر پیدا کیا ہے۔ یہ ظاہر کرنا ہے کہ شعر کی حقیقی تعریف کیا ہے۔ اور ایک شعر میں کتنی اور کس قسم کی خوبیاں ہونی چاہئیں۔ اور وہ کون سے معائب ہیں جو شعر کے خط و خال کو مسخ کر دیتے ہیں۔ ارسطو نے شعر کو مصوری اور نقاشی سے تشبیہ دی ہے۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ مصوری مادّی چیزوں کی موکشی کا نام ہے اور شاعری نام ہے جذبات و احساسات اور مادّیات دونوں کی مصوری کا۔

مصور اس دلدوز اور سینہ نگار صدمہ کی موکشی سے یکسر عاجز ہے جو جوان و صالح اولاد کے انتقال سے والدین کو ہوتا ہے۔ لیکن شاعر اس جگر پاش اور غمناک واقعہ کا اس ہوشربا انداز سے نقشہ کھینچ سکتا ہے کہ سننے والوں کے دل و جگر شق ہو جائیں۔ وہ الفاظ کی مناسب ترتیب بندش کی مضبوطی، اسلوبِ بیان کی ندرت اور معنی کی اثر انگیزی سے پوری دنیا کو ماتم کدہ یاس و حرماں بنا کر خون کے حنائی آنسوؤں سے دامن کو لالہ زار بنا سکتا ہے۔ چونکہ یہ واقعہ جذبات کی غیر مرئی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔ بنابریں اس کی موکشی مصور کی دسترس سے کلیۃً باہر ہے۔ ارسطو نے چونکہ محاکات کو عنصرِ شعری میں شمار کیا ہے اس لئے اس نے شعر کو مذکورہ فرق کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔

عام مصور باوصف اس ندرت اور کمال کے ادبی مصور کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ سینکڑوں کیا ہزاروں حالات و واردات ایسے ہیں جن کو شاعر محاکات کے پردے میں ایسے موثر اور دلنشین انداز میں بیان کر جاتا ہے کہ سننے والوں کے سامنے تمام واقعہ شئے مجسم بن کر آ جاتا ہے لیکن مصور ان واردات کی حدود تک رسائی بھی بمشکل تمام حاصل کر پاتا ہے۔ ایک باکمال مصور درد و غم، تکلیف و مصوبت کے آثار تصویر کے چہرے سے ظاہر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے مگر محبت کے ان غیر مرئی نقوش کو نہیں ظاہر کر سکتا جو عاشق کے دل میں بنتے بگڑتے رہتے ہیں۔

ارسطو کے اس قول کی تشریح حضرت سعدی کے اس مشہور شعر سے اچھی طرح سمجھ میں آ سکتی ہے ؎

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

سعدی نے اپنے اس شعر میں دمشق کی اس مشہور قحط سالی کا ذکر کیا ہے جس میں انسان کے عشق و محبت کے جذبات پر بھی افسردگی کا عالم چھا گیا تھا۔ اس مفہوم کا اگر مصور نقشہ کھینچنا چاہے تو کیونکر اور کیسے کامیاب ہو سکتا ہے سعدی کے اس شعر سے قطع نظر اردو شاعری میں بھی بہت سی ایسی مثالیں موجود ہیں جن کی تصویر کشی مصور کے دسترس سے کلیۃً باہر ہے لیکن شاعر کی قوتِ متخیلہ ان کا مکمل نقشہ ہماری نظروں کے سامنے کھینچ دیتی ہے۔ علامہ اقبال کا ایک شعر ہے ؎

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

مرحوم نے اس شعر میں جگنو کے چمکنے اور ماند پڑ جانے کا نقشہ کھینچا ہے۔ جگنو کو "چھوٹے سے چاند" سے تشبیہ دی ہے۔ لیکن مصور سے جگنو کی اس کیفیت کی تصویر تیار کرنے کو کہا جائے تو اس کو اس باب میں اپنے عجز کا اقرار کرنا پڑیگا۔ گہن سے نکلنے اور گہن میں آنے کی حالت بیک وقت ایک تصویر میں کیسے دکھلائی جا سکتی ہے لیکن شاعر نے پوری حالت اور مکمل کیفیت کو شئے مجسم کی صورت میں پیش کر دیا ہے۔

انیس ایک موقعہ پر گرمی کی شدت کی تصویر ایسے پُرشکوہ اور موثر الفاظ

کھینچتے ہیں کہ قاری وسامع دونوں کو گرمی محسوس ہونے لگتی ہے۔ ملاحظہ ہو ؎

گر آنکھ سے نکل کے ٹھیر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں

کیا مصور بھی اس غیر مرئی کیفیت کی تصویر اسی شان سے کھینچ سکتا ہے۔ جو اس شعر کی جان ہے۔

محبت اور عشق کی تصویر کشی مصور کی دسترس سے کوسوں دور ہے۔ وہ دیوانہ محبت کی تصویر اس طرح کھینچ سکتا ہے کہ گریبان چاک ہو، بال بکھرے ہوئے ہوں۔ صورت سے انتشار اور پریشانی برس رہی ہو آنکھیں حلقوں میں چلی گئی ہوں۔ چہرہ پر زردی چھائی ہو لیکن شاعر لفظوں کے ذریعہ سوز محبت کی تصویر کشی اس انداز سے کرتا ہے کہ اُس کی تمام خصوصیات نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ شیفتہ کا ایک مقطع ہے ؎

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینہ کے اندر لگی ہوئی

محبت کی اجتماعی کیفیات کی سچی مصوری اس شعر کے اندر موجود ہے۔ شاعر نے صرف الفاظ کی مناسب ترتیب سے غیر مرئی کیفیت کا مادی نقشہ نظروں کے سامنے پیش کر دیا ہے۔ لیکن مصور کی تمام دماغی صلاحیتیں اور آلات تصویر کشی اس میں کسی قسم کی گلکاریاں نہیں کرسکتے۔

انیس موصوف نے ایک اور شعر میں مناظر قدرت کے بیان میں ہوا کی فرحت انگیزی اور طرب ناکی کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ؎

نافے کھلے ہوئے ہیں گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

نسیم بہار کا گلوں سے مس ہونا اور اُس کے نتیجہ میں شمیم کے نافوں کا کھل جانا۔ ایک ایسا منظر ہے جس کی تصویر کشی کی مصور جرأت بھی نہیں کرسکتا لیکن شاعر نے اپنی قوت متخیلہ کے زور پر مستی کا عالم پیدا کر دیا ہے۔ شاعر اور مصور کی مشترک سرحد میر انیس کے ان دو مصرعوں سے بخوبی سمجھ میں آسکتا ہے موصوف نے دو نیزوں کے باہم ٹکرا جانے اور کمان سے نیزہ پھینکنے کی صورت کو شاعرانہ انداز سے مصور کیا ہے ؎

ع دو سانپ گتھ گئے تھے زبانیں نکال کے
ع گویا زباں نکالے ہوئے اژدہا چلا

ان دونوں مصرعوں کے مضامین اور اُن کی تمام خصوصیات مادیات و محسوسات سے متعلق ہیں۔ اس لئے ان مواقع پر شاعرانہ مصوری اور عام مصوری کی سرحدیں مشترک ہو جائیں گی۔ یعنی شاعر جس طرح ان مواقع پر کامیاب ہے مصور بھی ان مضامین کے باریک سے باریک نقاط کی مو کشی میں کامیاب ہوسکتا ہے۔

فردوسی نے بھی رستم اور اشکبوس کی معرکہ آرائی کا جو نقشہ کھینچا ہے اس میں بھی دونوں کی سرحدیں مشترک ہیں ؎

بمالید چاچی کماں را بدست
بچرم گوزن اندر آورد شست
ستوں کرد چپ را و خم کرد راست
خروش از خم چرخ چاچی بخاست
چو زد تیر بر سینۂ اشکبوس
سپہر آں زماں دست او داد بوس

فردوسی نے اس حالت کے بیان کا جو اسلوب اور انداز اختیار کیا ہے اُس کے اندر الفاظ کا جہاں تک تعلق ہے اُس میں فردوسی کو خاص کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ لیکن چونکہ یہ ایک ایسی حالت ہے جو اچھی طرح محسوس کی جاسکتی ہے اس لئے اس حالت کا نقشہ مصور بھی اسی خوبی اور دلکشی سے کھینچ سکتا ہے۔

ع دونوں کنوتیاں بھی کھڑے ہوکے مل گئیں

قاعدہ ہے کہ گھوڑا جب حد سے زائد تیز دوڑتا ہے تو اکثر اُسکی دونوں کنوتیاں کھڑی ہوکر مل جاتی ہیں۔ اور یہ حالت ایسی ہے کہ مصور اور شاعر دونوں اس کا صحیح نقشہ کھینچ سکتے ہیں۔ یا مثلاً جوانانِ اہل بیت کی سیر و خوش خرامی کے موقع پر انیس موصوف لکھتے ہیں ؎

زلفیں ہوا میں اُڑتی تھیں، ہاتھوں میں ہاتھ تھے
لڑکے بھی بند کھولے ہوئے ساتھ ساتھ تھے

ارسطو کی اس تعریف سے قطع نظر کرکے منطقی نقطۂ نگاہ سے اگر "شعر" پر نظر ڈالی جائے تو اس کی تعریف یوں کی جائیگی۔ "وہ کلام جو جذبات انسانی میں انگیخت و تحریک پیدا کرسکے اور اس کا تخاطب پوری دُنیا سے ہو"۔ مل (Mill) نے جو شعر کی تعریف کی ہے اُس کا مفہوم بھی منطقی تعریف سے ملتا جلتا ہے۔ لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس کا تخاطب شخص دیگر نہ ہو بلکہ خود اس کی اپنی ذات ہو۔ مل کی تخاطب ذاتی کی قید نہ صرف ایشیائی شاعری کی مضبوط اور دلکش عمارت کو منہدم کر دیتی ہے بلکہ مغربی شاعری کی منقش دیواریں بھی گر گر جاتی ہیں۔

یہ حقیقت اپنی جگہ پر سو فی صدی درست ہے کہ شاعر کو دوسروں پر

اثر انگیزی سے کچھ سروکار نہیں ہوتا وہ اُنہیں جذبات کی ترجمانی کرتا ہے جو اُس کے لوحِ دل پہ منعکس ہوتے ہیں۔ تکلیف و مسرت کی حالت میں جس طرح "آہ" بے ساختہ طور پہ نکل جاتی ہے بعینہ اسی انداز سے خارجی اثرات کے جذبات بھی الفاظ کے ساز میں زبان سے نکل جاتے ہیں۔ لیکن جب یہ جذبات الفاظ کے ترنم میں دوسرے کے کانوں میں گونجتے ہیں تو سامع کے دل پر بھی رقص کی سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس مفہوم کو یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ شاعر کا مخاطب نہ تو اپنی ذات سے ہوتا ہے اور نہ دوسرے کی ذات سے۔ بلکہ اسکی ہستی تو صرف واقعات و جذبات کی سچی ترجمانی ہوتی ہے۔ وہ خود بھی اپنے جذبات کے نشہ میں مست ہوتا ہے۔ اور دوسروں کو بھی اُسی نشہ سے مست و سرخوشی بنا دیتا ہے۔ گو فی حد ذاتہ اُس کا یہ مقصد اور مطمع نظر نہیں ہوتا لیکن اسکے دل کی آگ دوسرے دلوں میں سلگا دیتی ہے غرض حیثیت سے "شعر" اس کلام موزوں کو کہیں گے جو متکلم نے بالارادہ موزوں کیا ہو۔" حقیقت میں بالارادہ کی قید کسی نہج سے صحیح نہیں کیونکہ اس قید سے جذبات کی وسیع و عریض دُنیا میں تنگ دامانی کا غالب گمان پیدا ہو جاتا ہے۔ فرض کیجئے کہ کسی کے دل میں از خود اور بلا ارادہ شاعرانہ جذبات پیدا ہوئے اور اُس نے الفاظ کے ذریعہ ظاہر بھی کر دیئے مگر ان جذبات لطیفہ کو اس قید کی بنا پر شعر کے حسین و دلکش نام سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اُس نے بالارادہ ان کو موزوں نہیں کیا ہے۔

ایچ گورساں کہتا ہے کہ "شاعری رُوحانی اور ذہنیاتی شخصیت کے اختلاط کو الفاظ کے ذریعہ ظاہر کرنے کو کہتے ہیں۔" ہیزلیٹ کا خیال ہے کہ "شاعری جذبات اور تخیل کی زبان ہوتی ہے۔" ڈانٹے نے لکھا ہے کہ "شاعری اس طبع افسانے کو کہتے ہیں جو موسیقی کے ساتھ ترتیب دیا گیا ہو۔" شیلے کی رائے میں "شاعری ذہنیات کی ترجمان ہے۔ وہ تمام اشیا کو پسندیدہ اور محبوب بنا دیتی ہے۔" چارلس جیمس ناکس لکھتا ہے کہ "شاعری انسانی ذہنیت کی بہترین تشریح ہے۔ انسان کو سب سے اوّل اپنی دماغی قوت پر اُسی وقت اطمینان ہوگا جب اُس نے شعر کہنا اور اس سے متکیف ہونا شروع کیا تھا۔ بیکن کا خیال ہے کہ شاعری اشیاء کی ظاہری حالتوں کو دماغی افعال کے ساتھ ملا دیتی ہے۔" کارلائل کا قول ہے کہ "شاعری موسیقانہ خیالات کا نام ہے۔" بعض کے نزدیک "شعر نام ہے صرف واقعات اور مظاہر قدرت کی تصویر کشی کا۔" میکالے کا قول ہے کہ "شعر سے مُراد یہ ہے کہ الفاظ کو اس خوبی سے ترتیب دیا جائے کہ تخیل اس کی داد دے سکے۔ اس میں شاعر وہی کام الفاظ سے لیتا ہے جو نقاش رنگوں کی گوناں گوں آمیزش سے۔" آرنلڈ کی رائے میں "شعر زندگی کی تفسیر ہے۔ مگر صرف اس لحاظ سے حیات کی جو شعری صداقت اور شاعرانہ حسن کے کلیہ سے وابستہ ہے۔" ایمرسن شعر و شاعری کی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتا ہے کہ "شاعری کو معجزے سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ اعجاز ہی اعجاز ہے۔ تشبیہ دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مکھی پھولوں پر اُڑتی ہے اور اُن میں سے صرف رس اور خوشبو حاصل کرتی ہے۔ لیکن اس کے بعد وہ ایک نئی چیز پیدا کرتی ہے جس کو ہم شہد کہتے ہیں۔ ایک ماہر کیمیا آکسیجن اور ہائڈروجن کو ملانے کے بعد دوبارہ ہائڈروجن اور آکسیجن نہیں پیش کرتا بلکہ پانی۔ اسی طرح ایک شاعر لوگوں کی باتیں سُنتا اور فطرت کی تمام اشیاء کو دیکھتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ انہیں کو دوبارہ پیش کرے بلکہ اس لئے کہ ایک نئی اور شاندار چیز پیدا کرے۔ اشیاء کی روح کو ظاہر کرنے، مادی اجسام کو نظر انداز کرنے اور اس اصل الاصول شے کو جو اُن کو زندہ رکھتی ہے معلوم کرنے کی کوشش کو شاعری کہتے ہیں۔"

شاعری کی ایک حقیقت افروز تعریف کلدانی زرتشت کا وہ قدیم ترین جملہ ہے جس سے اس مسئلہ کی پوری کیفیت نمایاں ہو جاتی ہے کہ "شاعری ایک مستقل ترجمانی ہوتی ہے۔ جس کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ خدا اور مادہ کے درمیان گفتگو کرے۔ اجنبی اور غیر معمولی فطرتوں کو مانوس اور معمولی انداز سے پیش کرے اور غیر معروف چیزوں کو دُنیا کی معروف اشیاء کی فہرست میں شامل کر دے۔" اس تعریف کے تحت میں ہما اور آبِ حیات کو مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ دُنیا کا کوئی محقق و مفکر اس وقت تک ان چیزوں کا پتہ نہیں لگا سکا۔ لیکن یہ دونوں ناپید و مجہول چیزیں آج شاعری کی بدولت مع اپنی تمامی صفات کے وجودی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور ہم ان سے اسی نہج سے مانوس ہیں جس طرح دُنیا کی دوسری مشہور وجودی چیزوں سے متعارف ہیں۔

ایک اور مغربی مفکر کی رائے میں "ہر وہ چیز جو دل پر استعجاب و تحیر یا جوش و جذبہ کا عالم پیدا کر دے فی الحقیقت شعر ہے۔" اس نظریے کے ماتحت دُنیا کی ہر موثر چیز صرف شعری کیفیت اپنے اندر پنہاں نہیں رکھتی بلکہ فی نفسہ شعر ہے۔ اور اس سے بڑھکر یوں سمجھئے کہ یہ تمام عالم رنگ و بو ہمہ تن شعر و نغمہ ہے۔ بعض ماہرین نے شعر کی تعریف اس طرح کی ہے کہ "جو خیال ایک غیر معمولی الفاظ کے ذریعہ اس لئے ادا کیا جائے کہ سامع کا دل اس کو سُنکر خوش اور متاثر ہو جائے۔ اور وہ خیال خواہ نظم میں ہو یا نثر میں۔" اس تعریف کے مطابق ہر وہ خیال جس سے سامع اور مخاطب کے دل میں خوشی اور تاثر کی ایک لہر دوڑ جائے۔ شعر کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔

علامہ شبلی مرحوم نے اس سلسلہ میں ایک عجیب دلکش نکتہ پیدا کیا ہے چنانچہ موصوف کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ "ہر وہ چیز جو دل پر ایک تعجب انگیز کیفیت پیدا کرے وہ شعر ہے۔ خواہ وہ ایک لفظ ہو یا ایک ترکیب۔ مصرعہ ہو یا ایک مکمل نظم۔ کائنات کا ایک ذرہ ہو یا اس عالم رنگ و بو کا ایک غیر معمولی واقعہ۔ اور یہ تعجب انگیزی اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب لطیف احساسات دل کو ٹھیس پہنچے اور اعماق دل کے تاثرات دماغ میں جمع ہو کر الفاظ و تراکیب کی بندشوں، طرز ادا کی جدتوں، تشبیہ و استعارہ کی رنگینیوں، بحور و اوزان کی خلعت زیب تن کر کے ظاہر ہوں۔ اور سامع کو تھوڑی دیر کیلئے خود فراموشی کی حالت تک پہنچا دیں۔"

عربی انداز بیان میں شعر کی تعریف اس طرح کی جاتی ہے "قیاس مؤلف من المتخیلات الصادقۃ او الکاذبۃ المستحیلۃ او الممکنۃ المؤثرۃ فی النفس قبضاً و بسطاً وللنفس مطاوعۃ للتخیل کمطاوعتہ للتصدیق بل اشد منہ۔"

یعنی وہ ایک قیاس ہے تخیلات صادقہ یا ایسے خیالات* غیر ممکن الوقوع سے جو دل میں رنج و خوشی کی روح پھونک دیتے ہیں۔ اور ایسے تخیلات نفس پر حقائق سے زیادہ اثر انداز ہوتے ہیں۔"

غرض یہ ہے کہ ہر شخص نے اپنی بساط اور استعداد کے موافق اس میدان میں طبع آزمائی کی پوری کوشش کی اور اپنے مقصد و منشا کو سمجھانے کے لئے پورا زور قلم صرف کر دیا۔ لیکن اس طبع آزمائی اور قلم فرسائی کے باوجود ہنوز یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ واقعۃً شعر و شاعری کی صحیح تعریف کیا ہے۔ کسی نے اسے تاریخ اقوام کا ایک جزو بتایا ہے کسی نے ارتقائے دماغ کے افسانے کا ایک باب، کسی نے خود نوشت سوانح حیات کا ایک سلسلہ اور کسی نے زندگی کی تشریح۔ کسی نے اسے ایک مکمل آرٹ سمجھا ہے۔ کسی نے صرف ایک فن اور کسی نے "راز پس پردہ"۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ تمام تعریفیں بجائے خود منطقیانہ اور پیچیدہ تعریفیں ہیں۔ ان کے ذریعہ کسی خاص مفہوم تک رسائی نہیں ہو سکتی بلکہ عقل کی کشتی ایک قسم کے گرداب میں پھنس جاتی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کا تعلق جذبات و وجدان کی پرکیف اور بہار بداماں دنیا سے ہو اس کی منطقیانہ حیثیت سے جامع اور مانع تعریف نہیں کی جا سکتی۔ شعر کا تعلق چونکہ اسی سدا بہار دنیا سے ہے اس لئے اس کی بھی ایسی منطقی تعریف نہیں کی جا سکتی جو سامع کے دل کو پیام تسکین دے سکے۔ زیادہ سے زیادہ قوت متخیلہ کی موشگافیوں کے جوہر اور طائر خیال کی بلند پروازیوں کے نمونے دکھائے جا سکتے ہیں۔ لیکن ان منطقیانہ تعریفوں سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو شعر عبارت ہے قلب کی اس معنوی کیفیت کا جو فطرت کی جانب سے خود بخود پیدا ہوتی ہے اور کچھ عرصہ کے لئے انسانی قلب کو تمام واقعات سے بے نیاز کر کے انبساط و ترنم کی ایک حسین مگر غیر مرئی دنیا میں اس کو پہنچا دیتی ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ اس معنوی کیفیت کو عرف عام میں شعر کے مقدس نام سے موسوم نہیں کر سکتے۔ جب تک اس انبساط و ترنم کو موزوں الفاظ کا جامہ نہ پہنا لیا جائے۔ اب اس کے بعد شعر کی تعریف یوں کی جائے گی کہ "وہ کیفیات قلبی جو خوشنما مگر بامعنی الفاظ کے پردہ میں ظاہر کئے جائیں" اس تعریف کا تعلق بھی جذبات و وجدان کی رنگین و پرکیف اور بہار بداماں دنیا سے ہے۔ ادبی نقطۂ نگاہ سے اس کی جامع و مانع تعریف یہ ہو سکتی ہے کہ "جب دنیا ہے الفاظ اور جہان معانی اپنی وسعت و لطافت کو قائم رکھتے ہوئے ایک دوسرے میں "چوں بو بگلاب اندر" جذب ہو جائیں یا دونوں کی آمیزش سے دو مینا کے اس وصال کی طرح ہو جائے جس کو دیکھ کر یہ امتیاز مشکل ہو جائے کہ مے در مینا ہے یا مینا در مے۔ بس اسی موثر کیفیت کا دوسرا نام شعر ہے۔ اس باہمی آمیزش میں جس قدر یکسانیت و لطافت اور ندرت پیدا ہوتی جائیگی اسی قدر عروس شعر کے خد و خال میں کشش و کہربائیت کے سامان بھی زیادہ پیدا ہوتے جائیں گے۔

چند لمحے جامعہ میں

(از واحدی)

اللہ کے کسی نیک بندے کے متعلق روایت ہے کہ ایک عورت اپنے بچے کو لے کر ان کے پاس آئی اور بولی "حضرت! یہ گڑ بہت کھاتا ہے۔ دُعا فرمائیے کہ اس کا گڑ کھانا چھوٹ جائے۔" بزرگ موصوف نے کچھ دیر سوچا اور پھر کہا "اچھا مائی! سات دن بعد دُعا کروں گا۔" چنانچہ سات دن بعد وہ عورت پھر پہنچی اور بزرگ موصوف کو وعدہ یاد دلانے لگی۔ اُنہوں نے ہاتھ اُٹھائے۔ اور دُعا کی "بار الٰہا! اس بچے کا گڑ کھانا چھڑا دے۔" حاضرینِ مجلس نے بزرگ موصوف سے پوچھا "یہ کیا ماجرا ہے۔ دُعا کے لئے سات دن کا وقفہ کیوں دیا گیا تھا؟" بزرگ موصوف نے بتایا کہ "مجھے خود گڑ کھانے کا مرض تھا۔ سات دن میں میں نے آہستہ آہستہ گڑ کھانا کم کیا اور اس قابل ہوا کہ اللہ تعالےٰ سے دوسرے کے گڑ کم کھانے کی بابت عرض کر سکوں۔ میں خود دھڑلے سے گڑ کھاتا رہتا اور بچہ کا گڑ چھڑانے کی دعا مانگتا تو کس منہ سے مانگتا۔ میری زبان میں اثر کیسے آتا۔ لہٰذا میں نے عورت سے سات روز کی مہلت لی۔ اور سات روز میں اپنی عادت بدلنے میں کامیاب ہوگیا۔"

ڈاکٹر ذاکر حسین، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شیخ بھی ان لوگوں میں سے ہیں جو پہلے آپ عمل کرتے ہیں۔ اور پھر اوروں کو اپنے رنگ پہ لاتے ہیں۔ لوگوں میں سے کیا۔ بلکہ ایک ہی شخص ہیں جن کو اس زمانہ میں اتنی طاقت حاصل ہوگئی ہے کہ آنکھ ملاتے ہیں اور انسان کو اپنا جیسا بنا لیتے ہیں۔ جامعہ ملّیہ اسلامیہ کے سوا مسلمانوں کا کوئی ادارہ ایسا نہیں ہے جہاں ہزاروں روپیہ تنخواہ لینے والے حضرات پچاس پچاس روپے ماہوار میں گزر کر چکے ہیں۔ اور آج کی مہنگائی کے دور میں بھی یہاں کے پرنسپل کو شاید ڈیڑھ سو سے زیادہ نہیں دیئے جاتے۔ یہ سب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے ایثار کا ثمرہ ہے۔ کہ انہیں یورپ سے واپسی کے وقت یعنی تعلیم سے فارغ ہوتے ہی سرکاری اور غیر سرکاری کالج آٹھ سو اور سات سو کی آواز دے رہے تھے۔ مگر انہوں نے لیک نہ سُنی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پچاس روپے قبول کر لئے۔ اور وہ مثال قائم کی جس کا جواب مسلمانوں میں صدیوں سے مفقود تھا۔ آج جامعہ ملیہ اسلامیہ حقیقی تعلیمی ادارہ ہونے کے ساتھ جو خانقاہی شان بھی رکھتا ہے وہ سب ڈاکٹر صاحب کا طفیل ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ تحریک خلافت کی پیداوار اور تنہا یادگار ہے۔ مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ کے مقدس اور مُبارک ہاتھوں سے مولانا محمدؐ علی مرحوم اور دوسرے کانگریسی مسلمانوں نے بڑے ہنگامہ میں اسکی ابتدا کرائی۔ علی گڑھ مُسلم یونیورسٹی کو تھوڑا سا چرکا لگا کر۔ پھر حکیم اجمل خاں مرحوم اور ڈاکٹر انصاری مرحوم کے مشورہ سے اسے دلّی (قرولباغ) منتقل کیا گیا۔ اور شاید دو سال بعد ڈاکٹر صاحب نے اس سسکتے ہوئے ادارہ کو اپنے اہتمام میں لے لیا۔ اُس وقت جامعہ ملیہ اسلامیہ کی حالت یہ تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا فقرہ مجھے یاد ہے کہ میرا بنایا ہوا نصاب پڑھنے کے لئے جامعہ میں ایک لڑکا بھی رہ جائے گا تو میں اُسے دیوار کے سایہ اور سڑک کی روشنی میں بیٹھ کر پڑھاؤں گا۔ دیوار کے سایہ اور سڑک کی روشنی کی نوبت تو نہیں آئی۔ لیکن جامعہ کے ابتدائی دن بہت خراب چھتوں کے نیچے ضرور بیتے ہیں۔ یورپ کے علم دوست سیاح ڈاکٹر صاحب سے ملنے جاتے تو ان کے لئے کُرسی نہ ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب انہیں پلنگ پر بٹھاتے۔ آج خدا کے فضل سے جامعہ ملیہ اسلامیہ پروان چڑھ گیا ہے۔ آج جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پاس قرول باغ میں بھی نہایت اچھی عمارتیں ہیں۔ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نے ایک جنگل میں بھی منگل منا رکھا ہے۔ یہ جنگل کی آبادی صرف جامعہ اور اہلِ جامعہ پر مشتمل ہے۔ اس آبادی کا نام جامعہ نگر رکھا گیا ہے۔ ایک طرف جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی طرزِ تعمیر کا نمونہ پیش کر رہا ہے۔ اور دوسری طرف تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر پروفیسروں اور اُستادوں نے اپنے باپ دادا کی کمائی سے کھیت خرید خرید کر چھوٹے چھوٹے حسین بنگلے تعمیر کرائے ہیں۔ تیسری طرف ان اخلاص شعار اور ایثار پیشہ علما نے اپنی ابدی آرام گاہ کا انتظام کیا ہے جہاں پہلا مزار ڈاکٹر انصاری صاحب کا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی خصوصیت جس کے واسطے اسے شروع کیا گیا تھا۔ یہ ہے کہ یہاں تعلیم تو بنیادی اور جدید قسم کی ہی دی جاتی ہے۔ لیکن مقصد سرکاری دفتر کے کلرک تیار کرنا نہیں ہوتا بلکہ انسان اور مُسلمان بنانا ہوتا ہے۔ یہاں کی تعلیم سرکاری نصاب سے قطعی آزاد ہے۔ یہاں کا پڑھا ہوا نیشنل گورنمنٹ میں تو نوکری پاسکے گا۔ لیکن فی الحال اُسے سرکاری ملازمت کا تصور دماغ سے نکال دینا پڑتا ہے۔ بنیادی تعلیم کے ساتھ اُس کی دینی اور اخلاقی تربیت بھی کی جاتی ہے۔ کتابوں کے ذریعہ بھی اور ماحول کے ذریعہ بھی۔ یہاں کے طا

وہ بھیڑ سے آدمی دکھائی ہی نہیں دیتے ۔ اور یہاں کے طالب علم کو سوائے اوکھلا نہر کی ہوا کے اور کسی قسم کی ہوا نہیں لگتی ۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کو قائم ہوئے چوبیس سال ہو چکے ہیں ۔ مارچ ۴۶ء میں انشاء اللہ اسکی سلور جوبلی منائی جائے گی ۔ جوبلی منانے کے سلسلے میں ایک جلسہ کیا گیا تھا جس کی شرکت میں نے بھی کی تھی ۔ میں جامعہ نگر بارہا گیا ہوں ۔ اور جامعہ میرے لئے نیا نہیں ہے ۔ مگر اس دفعہ میں نے ذرا تفصیل سے کچھ چیزیں دیکھیں جن کے ذکر سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ جامعہ خاص تعلیم کے علاوہ اور کیا کیا کام کر رہا ہے ۔

اچھا ۔ فرض کر لیجیے کہ آپ جامعہ نگر میں ہیں اور میں آپ کو وہاں کی سیر کرا رہا ہوں ۔

تشریف لائیے ۔ مدرسہ ابتدائی میں چلیئے ۔ یہ پہلی سے چھٹی جماعت تک ہے ۔

(۱) ڈرائنگ کلاس ملاحظہ کیجیے

اس مدرسہ کی اقامت گاہ کی عمارت تو بن گئی ہے ۔ مگر خود مدرسہ کی عمارت ابھی عارضی ہے ۔ اسی عارضی عمارت میں یہ ڈرائنگ کلاس ہے ۔ بچوں کے کام کے نمونے دیکھیے ۔ اور مدارس کے مقابلوں میں اُن کے معیار کا اندازہ لگائیے ۔ بچوں کے کام میں آپ ہے ۔ تصویریں بنانے میں اُن پر پابندیاں نہیں لگائی جاتیں ۔ وہ اپنی طبیعت سے بھی تصویریں بناتے ہیں ۔

(۲) بچوں کا کتب خانہ ملاحظہ کیجیے ۔

سب بچوں کے مذاق کی کتابیں ہیں ۔

درجے

ہر ایک جماعت میں منصوبی طریقے (پروجیکٹ میتھڈ) سے کام لیا جاتا ہے ۔ یعنی بچے کوئی مقصد سامنے رکھکر لکھنے پڑھنے کا کام انجام دیتے ہیں ۔ جماعتوں میں اس کام سے متعلق تصویریں لگی ہوئی ہیں ۔ بچوں کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اپنی زبان، اپنی ترتیب میں کتابچے بھی جماعتوں میں نظر آتے ہیں ۔

(۳) بچوں کی باغبانی

لڑکوں نے زمین کا یہ حصہ اپنی باغبانی کے لئے مخصوص کر لیا ہے جس کا کام وہ خود ہی کرتے ہیں ۔ سبزیاں موسم کے لحاظ سے اُگاتے ہیں ۔ اس ضمن میں لکھنے پڑھنے کا بھی کام ہوتا ہے ۔ (پروجیکٹ طریقے سے)

(۴) بچوں کا خونچہ

اس دُکان میں تازہ پھلوں کی فروخت کا انتظام ہے ۔ دُکان کا کام بچے کرتے ہیں ۔

(۵) بچوں کا بنک

یہ اس مدرسہ کی ایک جدت ہے ۔ کلیۃً لڑکوں پر اعتبار کیا جاتا ہے ۔ رقم وصول کرنے اور ادا کرنے والے لڑکے ہی ہوتے ہیں ۔ منتظمین مدرسہ کا تجربہ یہ ہے کہ بچوں پر جتنا اعتبار کرو یہ اتنے ہی اسکے مستحق بن جاتے ہیں ۔ پندرہ سال سے بچوں کے بنک کا کاروبار چل رہا ہے ۔ مگر کوئی غبن دیکھنے میں نہ آیا ۔ اس بنک کی اپنی چیک بک ، پاس بک ، اپنے چھپے ہوئے رجسٹر ہیں ۔ یہ کام بھی تعلیمی اُصولوں پر ہوتا ہے ۔

(۶) بچوں کی ایک اور دُکان

بنک کی طرح اُن کی یہ اپنی ایک بڑی دُکان ہے ۔ جس میں کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان فروخت ہوتا ہے ۔

(۷) بچوں کے رسالے اور اخبارات

بڑوں کی نقل میں بچے اپنے رسالے اور اخبار نکالتے ہیں ۔ وہ کون سی نقل ہے جو یہ نہیں کرتے ہیں ۔

(۸) بچوں کی اقامت گاہیں

کیوں کمرے ہوادار اور صاف ستھرے ہیں یا نہیں ؟ مگر جگہ کی قلت کی وجہ سے محدود تعداد میں بچے لئے جاتے ہیں ۔ اُمید ہے کہ اس جوبلی کے موقعہ پر مسلمان اپنے بچوں کیلئے بہت کچھ کریں گے ۔

آئیے اب مدرسہ ثانوی دیکھیں ۔ یہ ساتویں سے دسویں جماعت تک ہے ۔

(۱) معمل حکمیات

یہ طرح طرح کے شربت ، یہ مچھر بچاؤ تیل ، یہ ویسلین ، یہ منجن وغیرہ سب طالب علموں نے تیار کئے ہیں ۔

(۲) ڈرائنگ کلاس

کہیئے ۔ نقشہ کشی کا معیار کتنا نمایاں نظر آ رہا تھا ۔ مثل سکولوں کے معیار کا خیال کیجیے ۔ اور یہاں کا سلیقہ ، ترتیب ، قسم قسم کے نمونے ملاحظہ فرمائیے ۔

(۳) بچوں کے رسالے

یہ ایک دیواری اخبار ہے ۔ یہ چھوٹے چھوٹے رسالے جماعت وار ہیں ۔

(۴) اُردو کلاس

انفرادی طریقۂ تعلیم سے کام لیا جاتا ہے۔ مشہور ادیبوں اور شاعروں کے کام پر بچوں کو خاص معلومات حاصل ہے۔ ان مصنفوں کے کام پر بچوں نے کتابچے لکھے ہیں۔

(۵) اقامت گاہ

ملاحظہ ہوں ہوادار کمرے سلیقہ اور ترتیب بھی ملاحظہ کیجیے۔

(۶) بڑا کتب خانہ

ہر منزل کے لئے الگ الگ کتب خانے ہیں لیکن یہ بڑا کتب خانہ ہے۔ ابھی اس کا اصلی حصہ عمارت کے نہ ہونے کی وجہ سے قرول باغ میں ہے۔ جامعہ نگر میں صرف ضروری حصہ ہے۔ ملک کے ہر حصہ سے رسائل اور اخبارات اس کیلئے آتے ہیں۔

(۷) مکتبہ جامعہ

عمارت کے نہ ہونے سے یہ بھی قرول باغ میں ہے۔ مگر جامعہ کی مطبوعات جامعہ نگر کے اس کمرہ میں سجی ہوئی ہیں۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ زندگی کے ہر شعبے پر کتابیں شائع کی جا رہی ہیں۔ ان کے پیش کرنے کا طریقہ کیسا اچھا ہے۔ بچوں کا لٹریچر خاص طور پر زیادہ چھپایا جا رہا ہے۔ اس طرف اور لوگوں کی اتنی توجہ نہیں ہے۔ یہ کام سب کی توجہ کا مستحق ہے۔

(۸) جامعہ سکاؤٹنگ

یہ جامعہ سکاؤٹنگ کے قواعد وضوابط اور مختلف چارٹ لگے ہوئے دیکھئے۔

غزل

(از جناب شفیع منصور صاحب ایم اے)

مرا جذبِ دروں ہی خود مری مشکل نہ بن جائے
کہیں سارا نظامِ کائنات اک دل نہ بن جائے

میں اس انداز سے آوارۂ کوئے محبت ہوں
مری آوارگی ہی عشق کا حاصل نہ بن جائے

اُلجھ کر رہ نہ جائے چاند تاروں میں نظر میری
کہیں گردِ رہِ منزل مری منزل نہ بن جائے

مجھے آغوشِ طوفاں میں سکوں محسوس ہوتا ہے
الٰہی! بحرِ ہستی کا یہی ساحل نہ بن جائے

سمجھتے ہیں یہی سب ان کا لطفِ خاص ہے مجھ پر
یہ میری بیخودی، ہنگامۂ محفل نہ بن جائے

وفورِ شوق سے بس اس طرح محوِ تماشا ہوں
مرا ذوقِ نظر ہی پردۂ محمل نہ بن جائے

(ادبِ لطیف)

اے چرخِ نیلوفری!

(از جناب صلاح الدین قریشی)

اے چرخِ نیلوفری! اے دارِ فضائے بسیط!! تو لا محدود ہے۔ اے بیشۂ لا نہایت! تو قدامت کے کوہِ بلند سے پھوٹ کر نکلا ہے۔ تیری ابتداء انتہا ازل اور ابد کو محیط ہے۔ اے چیستانِ فطرت! تو عقولِ انسانی کیلئے ایک عقدۂ لاینحل ہے۔ تو فہمِ بشری کی انتہائی پرواز سے بھی زیادہ بلند و برتر ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں تو مادی ہے۔ تیرا ہیولیٰ اجزائے فنا سے مرکب ہے۔ فنا و بقا کی کشمکش تجھے بھی درپیش ہے۔ کیا یہ سب کچھ صحیح ہے؟

دورِ جدید کا انسان جس کی پروازِ تخیل ایتھر کے سینے کو چیرتی ہوئی تیری بلندیوں پر پرفشانی کرتی ہے۔ جس کا طائرِ عقل عقاب کی طرح بلند پروازی سے نہیں تھکتا۔ اپنے اس انکشاف پر نازاں ہے کہ تو بے حقیقت ہے۔ تو نظرِ انسانی کیلئے فریب اور حدِ نظر پر چمکنے والا ایک سراب ہے۔ تو اعترافِ عجز ہے نگاہِ بشری کا۔ بس! اور کچھ نہیں!!

کیا یہ حقیقت ہے؟ بتا اے سرچشمۂ فطرت! اے فلکِ مینائی!!

لاتعداد اسرار و رموز ہیں ناموسِ فطرت کے جو تیری نیلگوں سطح پر بکھرے پڑے ہیں۔ بے شمار مہرے ہیں استادِ ازل کے جو تیری بساط پر منتشر ہیں۔ —— یہ کواکب و انجم، یہ مہر و ماہ، یہ سیارہ و ثوابت —— یہ سب راز ہیں فطرتِ ازلی کے جو تیرے سینے میں جھلکتے ہیں۔ جو اس بحرِ ناپیدا کنار میں طوفان زدہ کشتیوں کی طرح کبھی ڈوبتے ہیں کبھی ابھرتے ہیں۔

قدرت نے اپنے غیر فانی زیوروں سے تجھے آراستہ کیا ہے۔ اے عروسِ فطرت! اے دوشیزۂ ازل!! تیری جبینِ ناز پر مہرِ تاباں کا جھومر آویزاں ہے۔ ماہِ درخشاں کی آرسی تیرے ہاتھوں اور ستاروں کی افشاں تیری پیشانی پر جگمگاتی ہے۔ کہکشاں کا نورانی ہار تیرے سینے پر نور افشانی کر رہا ہے اور تیرا شباب ایک معصوم دوشیزہ کی طرح فطرت کی آغوش میں اٹکھیلیاں کرتا ہے۔ پروان چڑھتا ہے۔ ایک سدابہار پودے کی طرح —— ناآشنا ہے تیرا حسن زوال کی پستیوں سے۔ ناواقف ہے تیری جوانی پژمردگی کی ٹھوکروں سے ——!

صبح جب تیرے رخسار پر غازۂ شفق سے گلاب کے پھول کھل جاتے ہیں۔ ستارے یکے بعد دیگرے پٹے ہوئے مہروں کی طرح بساطِ فلک سے غائب ہوتے جاتے ہیں۔ اور پھر افقِ بعید سے نورانی تحریریں ابھرتی ہیں۔ اور حدِ نظر پر کچھ مبہم سے خطوط ضوفشانی کرتے نظر آتے ہیں۔ تب میری نگاہیں ان طیورِ آوارہ کو اپنے دام میں پھنسانا چاہتی ہیں۔ اور میری عقل اس بادِ دوراں کو اپنے قفس میں مقید کرنا چاہتی ہے۔ لیکن! آہ بے بس ہے تخیلِ انسانی! بے بضاعت ہے فہمِ بشری!!

پھر آہستہ آہستہ نور کی دنیا آباد ہوتی جاتی ہے۔ تیری کشادہ پیشانی سے نور کے چشمے ابلنے لگتے ہیں۔ آفتاب کی عالمگیر شعاعیں شہابِ ثاقب کی طرح فضائے بسیط سے گزر کر اس عالمِ رنگ و بو کو حیات بخشتی ہیں۔ نسیمِ سحری تیرا زندگی بخش پیام ذراتِ کائنات کے کانوں میں کہتی پھرتی ہے جس کو سن کر ہر شے مسکرا دیتی ہے۔ اس تبسم میں ایک زندگی ہوتی ہے بے چین۔ ایک جوش ہوتا ہے مضطرب —— اس طرح سحر کا تبسم پھولوں کو جنم دیتا ہے۔ شاخوں کی مسکراہٹ جوشِ نمو کا باعث ہوتی ہے اور قالبِ انسانی کی شگفتگی عمل کو وجود میں لاتی ہے —— اور یوں ہر سمت متبسمانہ حرکات اور شگفتہ اعمال کی رنگینیاں تصویرِ کائنات کو اور بھی زیادہ دلکش بنا دیتی ہیں۔

دن بھر تیرا خطِ شفاف سینہ ایک نیک سیرت انسان کے دل کی طرح چمکتا رہتا ہے —— پاک و صاف اس پاکباز فلسفی کے دماغ کی طرح، بے عیب ایک فطری شاعر کے تخیل کی مانند —— اور کشتیِ آفتاب پیہم اپنا سفر طے کرتی ہوئی جب منجدھار میں پہنچتی ہے تو اس وقت تیرا جاہ و جلال نصف النہار پر ہوتا ہے۔ نگاہیں خیرہ ہوتی ہیں۔ اس دم تیری سطحِ نیلوفری سے جگمگانے لگتا ہے۔ انگشتریِ فطرت کا یہ نیلم اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ۔

اور شام کے وقت جب تیرے رخسار شفق کی سرخیوں سے دہک اٹھتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ختم نہ ہونے والے سفر کی ایک منزل کو کامیابی کے ساتھ طے کر لینے کی خوشی میں تیرا خون تیزی سے گردش کرنے لگا ہے۔ اس گھڑی لالہ زارِ شفق میں بہار کی دیوی مسکراتی نظر آتی ہے اور شگفتہ پھول ہر سمت اس کے فردوسی تبسم کو ہمیشہ کیلئے اپنی روح میں محفوظ کرنے کے لئے اپنی اپنی شاخوں پر سمٹ کر پنکھڑیوں کے نازک پردے کھینچ لیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ سیاہی شفق کی سرخی میں گھلنی شروع ہو جاتی ہے۔ افقِ مغرب پر زہرہ

اپنے بربطِ سیمیں پر نورانی نغمے چھیڑ دیتی ہے۔ ستارے آہستہ آہستہ گوشوں سے نمودار ہوتے ہیں۔ اور ان نغموں کو سُننے کے لئے زیادہ سے زیادہ قریب ہونے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

وہ سامنے اُفق کی گہرائیوں سے تاریکیوں کا سیلاب اُمڈا چلا آرہا ہے۔ اب فضائے بسیط میں نور و ظلمت کی کشمکش ہوگی۔ حق و باطل کا ہنگامہ بپا ہوگا —— اور یہ ایک بہت پُرانی جنگ ہے —— یزداں و اہرمن کی آویزش کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اے پُرانے آسمان! نہ تیرے لئے اور نہ انسان کے لئے —— !

ابتدائے آفرینش سے یہ ڈرامہ تیری اسٹیج پر کھیلا جارہا ہے اے فلکِ پیر! —— ہمیشہ ہلال نور کی کشتی کھیتا ہوا تیری افق سے بلند ہوتا ہے اور روزانہ اس کی ضوریزیاں بڑھتی جاتی ہیں۔ چمکتی ہوئی شعاعیں اپنے دھاردار تیروں سے تاریکیوں کے سینے کو چاک کرکے ہر طرف اپنا تسلط جماتی جاتی ہیں۔ اور آخر ایک رات نورانی قوتیں شباب پر ہوتی ہیں اور افواج ظلمت پسپا ہوکر روپوش ہوتی جاتی ہیں —— اس کے بعد روشنی آہستہ آہستہ گھٹتی اور اندھیرا بڑھتا جاتا ہے۔ اور یہ چکر اسی طرح چلتا رہتا ہے —— ہماری زمین پر بھی یہی ہوتا ہے۔ اے چرخِ نیلی فام! —— یہ دُنیا ایک عرصے تک حقائق کی روشنی میں ارتقائی منازل طے کرتی رہتی ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ وہم و گمان کی تاریکی اس عالم کو اپنے سیاہ کفن میں لپیٹ لیتی ہے اور جب انسانیت اس اندھے کنوئیں میں گر پڑتی ہے تو پھر کوئی نیا چاند طلوع ہوتا ہے۔ اور لوگوں کو گمنامی کے غار سے نکال کر ترقی کے کہکشاں کی مانند چمکتے ہوئے راستے کی طرف رہنمائی کرتا ہے —— اور پھر انسانیت پورے جوش کے ساتھ سمندروں اور پہاڑوں کو روندتی ہوئی آسمانی بلندیوں پر نظر جمائے تہذیب و تمدّن کے اعلےٰ ترین مراحل طے کرتی رہتی ہے۔ اس کے بعد پھر دورِ تنزل شروع ہوتا ہے۔ جو انسان کو جہالت کی پستیوں میں لا ڈالتا ہے ——

اور یہ تصادم یوں ہی جاری رہتا ہے —— اے چرخِ مینا رنگ! تیری سطح پر نور ظلمت کا! —— اور ہماری زمین پر یزداں و اہرمن کا —— !!

غزل

(از جناب نعمان تاثیر)

رُخ سے پردہ ہٹا دیا تو نے ۔۔۔ رُوح کو جگمگا دیا تو نے
دِل دردآشنا دیا تو نے ۔۔۔ خواہشوں سے سوا دیا تو نے
بیکسی تیرا دم غنیمت ہے ۔۔۔ مجھکو جینا سِکھا دیا تو نے
میں، کہ جز تیرے کچھ بھی یاد نہیں ۔۔۔ تو، کہ مجھکو بُھلا دیا تو نے
اپنے انجام پر ہنسی کلیاں ۔۔۔ جب ذرا مُسکرا دیا تو نے
خواہشِ زندگی نے کروٹ لی ۔۔۔ اے خلش وہ مزا دیا تو نے
رُوح بھی رقص میں ہے اے ساقی ۔۔۔ آج یہ کیا پلا دیا تو نے
وہی آنسو تھا تیرے غم کا امیں ۔۔۔ آنکھ سے جو گرا دیا تو نے
میں تو اک مجرمِ محبّت تھا ۔۔۔ کیوں نہ مجھکو بُھلا دیا تو نے
جبکہ کچھ تیرے بس کی بات نہ تھی ۔۔۔ دردِ دل کیوں بڑھا دیا تو نے
انکی آنکھیں بھی آج بھر آئیں ۔۔۔ بے کسی کیا بنا دیا تو نے
غم دیا وہ بھی جاوداں نہ رہا ۔۔۔ اے خدا مجھکو کیا دیا تو نے
اب تصوّر کی ہائے بات گئی ۔۔۔ کیوں یہ جلوہ دکھا دیا تو نے
کِھل گئیں گُلستاں کی سب کلیاں ۔۔۔ بس جہاں مُسکرا دیا تو نے

نہیں تاثیر سے جو وابستہ
کیوں وہ دستِ دُعا دیا تو نے

تماشے

(از جناب محمد امین شرقپوری)

وہ ناچ رہی تھی۔ ڈفلی کی آواز پر اس کے ننھے ننھے پاؤں چل رہے تھے۔ معمولی صدری اور آدھا لہنگا پہنے۔ بالکل بندریا معلوم دے رہی تھی۔ ننھی سی۔ کتنا بے رحم تھا اُس کا باپ۔ اتنی چھوٹی لڑکی کو نچا رہا تھا۔ ہو سکتا ہے پیٹ نے اُسے بے رحم بنا دیا ہو۔ لڑکی کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے۔ شاید وہ تھک گئی تھی۔ مگر اس کا باپ اُسے نچا رہا تھا۔ بڑھتے ہوئے مجمع کو دیکھکر۔ پھیلی ہوئی میلی چادر پر پیسے تڑ تڑ گر رہے تھے۔ بڈھے کے ہاتھ ڈفلی پر تیزی سے چل رہے تھے زبان کلمۂ تحسین بلند کر رہی تھی۔

پھر یکایک لڑکی بیٹھ گئی۔ جیسے وہ تھک کر چور ہو گئی تھی۔ بڈھے کی زبان پلٹ گئی "اری ابھی سے تھک گئی۔ بہت تھوڑے پیسے آئے ہیں۔ اور ناچ۔" اسکے بدلے ہوئے تیور دیکھکر لڑکی کھڑی ہو گئی۔ مری مری چال سے اس کے پاؤں اُٹھنے لگے۔ گھنگرو اکھڑی اکھڑی تان سے بجنے لگے۔ گھنگرو! جن کی بندش نے اسکی پنڈلیوں پر سیاہ نشان چھوڑ دیئے تھے۔ کبھی نہ مٹنے والے نشان۔

"کیسا اچھا ناچتی ہے۔"

"بڑی ہوگی تو ستم ڈھائے گی۔"

"ناک نقشہ اچھا ہے۔"

بندریا سی لڑکی مختلف نگاہوں کا مرکز بنی ہوئی تھیں۔ لوگ ابھی سے اُسے عورت سمجھ رہے تھے۔ اور شاید صرف اسی جذبہ کے تحت جیب سے پیسے اُگل رہے تھے۔ حالانکہ وہ چھوٹی لڑکی ناچ کیا جانے۔ پاؤں کی اُلٹی سیدھی چاپ گھنگروؤں کی جھنکار۔ ڈفلی کی آواز۔ لڑکی لڑکھڑا کر گر پڑی۔

"آج کیا ہو گیا ہے تجھے۔" بڈھا چونک پڑا۔ اس کے ہاتھ رک گئے۔ لڑکی کا سانس پھول رہا تھا تھکا ہوا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا شاید پہلے سے اور بھیانک بن گیا تھا۔ مگر وہ بے رحم بڈھا برابر اُسے کچھ کہے دے رہا تھا۔ اس کی نظریں اُن ہاتھوں کا جائزہ لے رہی تھیں جو ہنوز جیبوں سے باہر تھے۔ اور لوگ تماشہ کے شوقین منتظر تھے کہ ابھی یہ اُٹھ بیٹھے گی۔ اس کے پیر چلیں گے۔ اور وہ کتنے خوش ہوں گے۔ اس بندریا کا ناچ دیکھکر اُن کی چند لمحوں کی خوشی کی قیمت ایک لڑکی، جسے شاید دو وقت پیٹ بھر کھانا بھی نصیب نہ ہوتا ہوگا۔ حیوانوں کی طرح قلابازیاں کھاتی تھی۔ ڈفلی کی آواز پر۔

"نہیں اُٹھے گی۔" بڈھا اُس کے قریب آکر بولا۔ لڑکی کے ننھے پھڑپھڑاتے بڈھے نے ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ لڑکی نے مجمع پر ایک رحم طلب نگاہ ڈالی۔ جیسے اس کی آنکھیں کہہ رہی ہوں۔ مجھ پر ترس کھاؤ۔ مگر وہاں کتنے ایسے تھے۔ وہ تو ناچ دیکھنے آئے تھے۔ ایک لڑکی کا ناچ جو کل عورت ہونے والی تھی۔ جب ناچ کے ساتھ ساتھ وہ اسکی جوانی کے دام بھی لگا سکیں گے۔

میں تماشے سے جھٹکتا ہوا چلا گیا۔ جیسے میں یہ سب نہیں دیکھ سکتا تھا۔ معصومیت کا خون۔ انسانیت کا نیلام۔ زبان کھولتا بھی تو کتنے میرا ساتھ دیتے۔

"اب رحم آتا ہے تو دیدو نا سو پچاس بڈھے کو۔"

"پھر یہ لونڈیا کو نچانا چھوڑ دے گا۔"

میرے کان گونجنے لگے۔ میں جانتا تھا۔ سو پچاس کیا۔ بڑی رقم لے کر بھی شاید یہ بڈھا نہیں مانے گا۔ بندریا نچانے والا بڈھا۔

میں ہجوم کو دیکھکر رک گیا۔ نغمے میں کشش تھی۔ لوگ کھنچے چلے آ رہے تھے۔ مجھے اُسے پہچاننے میں ذرا بھی تو دقت نہ ہوئی۔ وہی دُبلی پتلی باہیں۔ زرد چہرہ، جس پر جوانی آئی مگر سہمی ہوئی سی۔ پیروں میں گھنگرو بندھے ہوئے، بدن پر میلا سا جمپر۔ معمولی گھیرے کی لنگی سی ساڑی، بالوں میں چمک۔ جو چیز اس میں نئی تھی وہ موسیقی تھی جس میں وہ کافی طاق معلوم ہو رہی تھی۔ ناچ میں بھی ایک ہم آہنگی آگئی تھی۔ ہاتھوں اور آنکھوں میں اشارے پیدا ہو گئے تھے اور ان سب سے بڑھکر یہ کہ وہ اب جوان تھی۔ نغمہ، حُسن، جوانی، تینوں کے سنگم نے ہر طرف ایک آگ سی لگا دی تھی۔ پیسہ کے بجائے اب اُسے دو آنے چار آنے مل رہے تھے وہ ایک ایک کے آگے سے ناچتی ہوئی گذر رہی تھی۔ اپنے مظاہرے کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے کیلئے یا مجمع کی تسکین کے لئے۔ نہ جانے کتنے دل سینوں میں دھڑک رہے تھے۔ اس کی ایک ایک جنبش پر، ایک ایک اشارے پر۔ ایک ایک بول پر۔ کوئی روپیہ دکھا کر اُسے اپنے پاس بلانے کی کوشش کرتا۔ کوئی ہاتھ میں چند سکے جھنجھنا کر اسکی توجہ کو کھینچنا چاہتا۔ کوئی اُس کے گائے ہوئے بول گنگنا رہا تھا۔ بعض منچلے ننگے لفظوں میں اُسے پکار رہے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر سب کو دیکھ رہی تھی۔ ناچ رہی تھی، گا رہی تھی۔ میٹھے بول کے فضا میں رس گھول رہی تھی۔ گیتوں سے بے چینی کی لہریں دوڑا رہی تھی۔ گھنگروؤں کی جھنکار سے۔ اپنے فن کی کتنی ماہر ہو گئی تھی اور چالاک بھی جو اس کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کرتا پھرتی سے آگے

بڑھ جاتی۔

کتنی بھوکی نظریں اسے دیکھ رہی تھیں۔ جیسے عورت کو انہوں نے آج ہی دیکھا تھا۔ کبھی کسی کو گاتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ ناچتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ کتنے ایسے تھے جو اپنی عمر بھر کی کمائی اس کے ایک ایک بول پر لٹانے کیلئے آمادہ تھے جیسے وہ کوئی نعمت تھی یا ایسی نعمت جو قسمت سے زیادہ پیسے سے ہاتھ آتی ہے۔ ان میں ایسے بھی تھے جو ناچنے گانے والی کے نام پر لعنت بھیجا کرتے تھے۔ مگر اس وقت انکی حالت اس افعی کی سی تھی جو بین کی آواز پا کر ڈسنا بھول جاتا ہے۔ کتنے ایسے تھے جو غربت کا رونا روتے ہیں۔ مگر اس وقت نہ جانے پیسے کہاں سے آ گئے تھے ان کے پاس۔ اور ایسے بھی تھے جو بیجا صرف کے مخالف تھے۔ غالباً چند لمحوں کے تعیش کیلئے ان کا اصول ساتھ چھوڑ گیا تھا ان کا۔ میری ہر پھر کر نظریں عورت پر جم جاتیں۔ پسینہ کی شدت سے اس کے میلے کچیلے کپڑے تعفن پیدا کر رہے تھے۔ اس کے باوجود وہ دلکشی کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ جسے وہ ظالم بڈھا اس دنیا میں کھینچ لایا تھا۔ اس کا لگایا ہوا پودا آج پیڑ بن کر جھوم رہا تھا۔ اب اس کی لونڈیا کمائی کا مکمل ذریعہ بن گئی تھی۔ وہ خود نہ جانے کہاں گم ہو گیا تھا۔ بہت ممکن ہے مر گیا ہو یا بڑھاپے میں کسی کونے میں پڑا پڑا ایڑیاں رگڑ رہا ہو۔ پیسہ پیسہ کے لئے بندریا نچانے والا کاش اب اس کے پاس ہوتا۔ اسے کتنی خوشی ہوتی کہ لڑکی اب کتنی کمائی کر رہی ہے۔ اسکے دکھائے ہوئے راستے پر کس تیزی سے گامزن ہے۔ کبھی ناچتے ناچتے اس کے پاؤں اکڑ جاتے تھے۔ مگر اب جوانی نے ان میں ایک ان تھک قوت بھر دی ہے۔ اور وہ نہ جانے کتنے گھنٹے ناچ سکتی ہے اس کے پاؤں آہنی پنجے بن گئے ہیں۔ ٹانگوں میں استقامت آ گئی ہے۔

میں نے دیکھا گھنگرو باندھنے کے نشان اور گہرے ہو گئے تھے۔ اسکی پنڈلیوں کا وہ حصہ جیسے جل گیا ہو۔ دائمی نشان ثبت تھے۔ غلامی کی مہروں نے اسے عام عورتوں سے کس قدر مختلف کر دیا تھا۔ وہ کس قدر پیٹ کی تابع ہو چکی تھی۔ بھرے مجمع میں نسوانیت کا نیلام کر رہی تھی۔ ممکن ہے آپ اسے مورد الزام نہ ٹھیرائیں۔ اسکے ادا و غمزہ کو فن موسیقی اور رقص کا ایک جزو قرار دیں۔ مگر میں تو انہیں عورت کی کھلی توہین اور انسانیت کی تذلیل کہونگا۔ بھرے مجمع میں ایک عورت کا یوں کولہے مٹکا مٹکا کر داد تحسین لینا ذلت نہیں تو اور کیا ہے۔ حصول روزی کیلئے انسان کا تیرگی میں بھٹکنا تمدن کے منافی تخلیق کی کھلی توہین ہے۔ پیٹ کے سوال نے اسے کس قدر بے حس بنا دیا تھا۔ وہ تماشہ بنی ہوئی تھی۔ ہوس کی زنجیروں نے اسے جکڑا ہوا تھا اور وہ مجمع جو اسکی زنجیروں کو مضبوط سے مضبوط تر بنا رہا تھا شاید یکسر ان احساسات سے محروم ہو چکا تھا کہ عورت سے وہ ناچنے پر مجبور کر رہے تھے، وہ پاکیزہ ہستی ہے جس نے انہیں جنم دیا ہے۔ گھڑی دو گھڑی کے تعیش کیلئے وہ اپنا قیمتی سرمایہ کھو رہے تھے۔

لطف اندوز ہو رہے تھے۔ میں بھی ان میں شریک تھا۔ جرم کا ارتکاب کر رہا تھا۔ خود کو کوس رہا تھا۔ مجھے خود سے نفرت ہو رہی تھی۔ اور نہ جانے کیا کیا خیالات میرے ذہن میں آ رہے تھے۔ جنہیں میں بھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے دلکش نغموں میں گھنگروؤں کی جھنکار میں تعفن زدہ نقاب میں ڈوبا کھڑا تھا۔ سب کے باوجود میں خود کو الگ نہ کر سکا۔ آلائشوں کے اس مرکز سے نہ ہٹ سکا۔ گناہ کی رو میں بہنے کے بعد شاید ہر شخص کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔

کیا آپ نے کبھی بوسیدہ اور ٹوٹے ہوئے ساز کے نغمے سنے ہیں! اس کے کمزور بیٹھے ہوئے گلے سے نغمے کٹ کٹ کر نکل رہے تھے۔ گھٹنوں سے اونچا اٹھا ہوا لہنگا گاڑھے کی میلی صدری۔ میلا کچیلا گز بھر کا سر پر چیتھڑا۔ جھکی ہوئی کمر۔ وہ کتنی جلدی بڑھیا بن گئی تھی۔ میں چلتے چلتے رک گیا۔ سوکھی پنڈلیوں پر گھنگروؤں کے سیاہ نشان کالے ڈورے کی طرح چمک رہے تھے۔ وقت نے قبل از وقت اسے مرجھا کر رکھ دیا تھا۔ کتنے برس ہوئے جب میں نے اسے پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔ بندریا سی لڑکی، بڈھے کی ڈفلی پر ناچنے والی، پھر اسکی جوانی، جب وہ جوان سازندوں کے ساتھ اپنے ناچ گانے سے لوگوں کے دل لبھا رہی تھی۔ اور آج ٹوٹے پھوٹے بولوں سے راہ گیروں سے پیسہ مانگ رہی تھی۔ کتنے گذرنے والوں نے اسے پیسہ دیا تھا۔ وہ ایک ایک سے التجا کرتی تھی [illegible] پیٹ پر ہاتھ مار کر مخاطب کر رہی تھی۔ لوگ اس پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈالتے اور آگے بڑھ جاتے۔ اب ان کی دریا دلی کہاں کھو گئی تھی۔ شاید اس کے پاس اب جوانی نہ تھی۔ پیروں میں گھنگرو نہ تھے۔ آواز میں لوچ نہ تھا۔ وہ اس کے پاس کھڑے کیوں ہوتے۔ کوئی بھی جیب میں ہاتھ ڈال کر یوں نہ کہتا کہ قریب آؤ۔ تو پیسے دیں۔ کوئی [illegible] ہوئی چیز سنا دو۔ گھنگرو بجا کر دکھا دو۔ ان میں سے اکثر ایسے بھی تھے جو اس کی [illegible] دیکھ چکے تھے۔ اسی چوراہے پر، جہاں وہ ایک دن بجلیاں گرا رہی تھی۔ اسی چوراہے پر اس کی جوانی کھوئی تھی۔ اور شاید آج وہ وہاں کھڑی اپنی لٹی ہوئی جوانی کو ڈھونڈ رہی تھی۔ اپنے کھوئے ہوئے نغموں کو تلاش کر رہی تھی۔ پیروں کی چاپ [illegible]

ارے تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ میرا ہاتھ پکڑنے کیلئے بے چین ہوتے تھے [illegible] وہی تو ہوں۔ اتنی جلدی بھول گئے مجھے۔ مرد کتنی جلد بھول جاتا ہے۔ بیتی ہوئی [illegible] کو، گذری ہوئی گھڑیوں کو، جوانی اب بھی ٹوٹ رہی ہے مجھ پر۔ میں [illegible] سے مجھے دیکھو۔ ڈر رہے ہو۔ بوڑھی ہو گئی ہوں اس لئے؟ مجھے ان [illegible] والے تم ہی تو ہو۔ میری جوانی چھین کر کتنے کٹھور بن گئے ہو [illegible] بڑے بھولے ہو نا! لو میں آج پھر گاتی ہوں۔ ناچتی ہوں۔ دیکھتی ہوں [illegible] کیسے پیسے نہیں اگلتیں۔ وہ پھر بری لیکر گانے لگی۔ جوانی کے [illegible]

تے ہے تھے۔ ایک ہنستا ہوا لڑکا بے تحاشا نکل گیا۔ بڑھیا پاگل ہو گئی ہے۔ جیسے
کہہ رہا ہو۔ بیچاری لوگ ناما، دماغ چل گیا ہے اس کا۔ بڑھاپے سے عقل ماری گئی
ہے اسکی۔ اس کے پیر اب بھی تال پر اٹھ رہے تھے۔ گیت اب بھی گا رہی تھی۔ مگر کتنی
بے معنی تھی اس کی ہر حرکت۔ کتنے روکھے تھے اس کے گیت۔ کتنی مہمل تھی پیر کی ہر چاپ
وہ بالکل پاگل معلوم ہو رہی تھی۔ یہ سب پاگل پن ہی تو تھا اس کا۔ کھوئی ہوئی جوانی کے
گیت گانا۔ بیتے ہوئے شباب کو پکار پکار کر بلانا۔ روٹھی ہوئی جوانی کو منانا۔ کھوئی
ہوئی جوانی کیا واپس لوٹ سکتی۔ شباب کے کان تو بڑھاپے کی طرف سے بہرے ہوتے
ہیں۔ اور یہ روٹھی ہوئی جوانیاں کیوں اسکی طرف توجہ دینے لگیں۔ شاید وہ نہیں جانتی تھی
عورت کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا میرے سامنے تھا۔ گلی کے لونڈے شور مچاتے ہوئے
لگے۔ بڑھیا ناچ رہی ہے! وہ دیکھو پیڑ کے نیچے۔ گا بھی تو رہی ہے۔ آؤ ناچ
دیکھیں —!

"پیسے بھی لوگے ہو۔" یکایک وہ چونک کر بولی

"پیسے"! ایک منہ چڑا کر بولا۔

"بائیسکوپ دکھا رہی ہے جو پیسے لے گی"! ایک منچلا اچھل کر بولا۔
لونڈوں نے تالی پیٹ دی۔ اور جیسے وہ سمجھی ہو کہ ڈھولک پر ہاتھ
مار دیا ہے کسی نے۔ بڑھیا پاگلوں کی طرح اچھل پڑی۔ اس کے مرجھائے ہوئے
پیر زمین پر پڑ رہے تھے۔ اونچا لہنگا گھوم رہا تھا۔ کتنے شریر تھے لونڈے ایک بڑھیا کو نچا
رہے تھے۔ ہو سکتا ہے پیٹ نے اسے مجبور کر دیا ہو مگر وہاں پیٹ کا سامان کہاں تھا۔ چاروں
طرف سے خالی تالیوں کی آواز گونج رہی تھی۔

(از جناب صباؔ جے پوری)

غزل

دردِ منزل دل بنایا جائے گا — عشق کے قابل بنایا جائے گا
کیوں نہ اونچا اب غبارِ قیس ہو — پردۂ محمل بنایا جائے گا
موت کو جب زندگی دی جائے گی — بحر کو ساحل بنایا جائے گا
یوں پلاتے ہیں ذرا سی شیخ کو — رونقِ محفل بنایا جائے گا
موسمِ گل کو بھی توبہ کے لئے — خنجرِ قاتل بنایا جائے گا
دل سے وہ پیکاں ہلا کر دیکھ لو — جس کو میرا دل بنایا جائے گا
دلفریبی دے رہا ہے دہر کو — کیا مجھے غافل بنایا جائے گا
آپ بن جائیں گے پھر کون و مکاں — جب ہمارا دل بنایا جائے گا

تیری صورت ہی سے ظاہر ہے صباؔ
عاشقِ کامل بنایا جائے گا

چوراہا

(از جناب منصور ناہیدی)

"رکشا حضور ـــــ چوک ـــ ڈاک خانہ ـــــ بنیس پلٹی
کلکٹر صاحب کا دفتر ـــــ کہاں چلئے گا ؟"

میرا چوراہے پر کھڑا ہوا تھا۔ شہر کا یہ مخصوص چوراہا دفتر کے بابوؤں کے واسطے ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ چوراہا ریلوے جنکشن کی طرح یکوں اور تانگوں کا جنکشن ہے۔ یہاں سے مختلف دفاتر کو مختلف راستے جاتے ہیں۔ یہ جسم کے پھیپھڑوں کی طرح ہے جہاں سے مختلف اعضا میں خون رگوں کے ذریعہ دوڑا کرتا ہے۔ اس جگہ نو اور دس کے درمیان مجمع لگنا شروع ہو جاتا ہے۔ کوئی ناک صاف کرتا ہوا چلا آرہا ہے۔ کوئی پان چباتا ہوا، جو منہ سے بہتا ہوتا ہے اور داڑھی مونچھ کو شل خضاب سیراب کرتا ہوتا ہے۔ کوئی نہایت سنجیدہ خانگی مشکلات کی گتھیاں سلجھاتا آہستہ آہستہ آتا ہوتا ہے کسی کے بشرے سے فکر فردا کی جھلکیاں چوہد کی داڑھی میں تنکا کی طرح ظاہر ہوتی ہیں۔ بہت دور کے چلے ہوئے بیچارے یہاں آکر دم لیتے ہیں۔ اور پھر ایک عجیب طرح سے ریڈیو پروگرام کی طرح کھانسی کا پروگرام شروع ہو جاتا ہے۔ جس کی ہم آہنگی رات کے بھونکتے ہوئے کتوں سے مشابہ ہوتی ہے۔ بلغم کا سفید سفید ڈھیر لگ جاتا ہے جس پر مکھیاں نغمہ سنجی کیا کرتی ہیں۔ اور پھر جراثیم نہایت آزادی سے اس بلغم کے مرگھٹ سے اُڑ کر اپنی نسل کو بڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ہیلتھ ڈیپارٹمنٹ کی بے توجہی اور کاہلی کیلئے ایک چیلنج ہوتا ہے شام کی دھندلی سیاہ روشنی میں جس طرح چڑیاں یکجا جمع ہو کر چیختی ہیں اُس طرح یہاں پر اس وقت ایک عجیب طرح کا شور و غل مچ جاتا ہے۔ یکے اور تانگے والے کھڑے ہو ہو کر زور سے نعرے لگاتے ہیں۔

"بابو جی! ادھر آیئے ـــــ چلئے دو آنے ہی دیجئے گا۔"

"ایک سواری چوک"

"چل رے بڑھا گھوڑی۔"

اور پھر تھوڑے سے بچے ہوئے وقت میں بابو لوگ بھی باتیں کرتے ہیں

"صاحب آج دورے پر جا رہے ہیں۔ کام ہلکا پڑ جائے گا۔"

"ہمارے پاس تو غیر متعلقہ فائلیں بہت پڑے ہیں۔"

"وہ چوڑی، اور آیا تھا اس کا کیا ہوا ؟"

میں اس چوراہے پر روزانہ یکے کی تلاش میں کھڑا رہتا ہوں۔ کبھی کبھی گھنٹوں کھڑے کھڑے میری ٹانگیں شل ہو جاتی ہیں۔ تیز دھوپ میں سر پھٹا جاتا ہے۔ دماغ گراموفون ریکارڈ کی طرح ناچنے لگتا ہے۔ آنکھوں کے سامنے بادلوں کی طرح چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ناچتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اکثر پسینے سے اتنا شرابور ہو جاتا ہوں کہ میرے کپڑے نم پڑ جاتے ہیں اور پیشانی پر موتی کے قطروں کو بار بار پونچھتا ہوں مگر میں جبراً قہراً کھڑا رہتا ہوں۔ کوئی سستا یکہ نہیں ملتا۔ اور پھر میں میونسپلٹی کا ایک کلرک۔ گرانی کا یہ عالم ہے کہ چہرے سے تہی دستی آشکارا ہوتی ہے۔ اور کسی ماہ بے اعتدالی ہو گئی یعنی میں یکہ پہ نہ گیا بلکہ تانگہ پر گیا تو اکثر ماہ کی اخیر تاریخوں میں "ترض مقراض محبت" کے مقولے کو عملی جامہ پہنانا اور ڈھائی میل تپتی ہوئی دھوپ میں پیدل گھسٹتے ہوئے جانا پڑتا ہے۔

آج میری طرف ایک نوجوان رکشا والا پُر حسرت نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ اسکی خشک شاخوں کی طرح انگلیوں سے گھونگرو بج رہے تھے جس سے نکلتی ہوئی آواز کا ایک ایک شعر یا دعا کے اُمید پر مچل رہا تھا۔ اس کی یہ عمر اور رکشا کھینچنے کا جانفشاں کام! شباب اندر ہی اندر پھیپھڑوں کا خون چوس رہا تھا۔ اسکی جوانی جانفشانی کی رعنائیوں میں گم رکشا کی دوشیزہ سے کھیل رہی تھی۔ اس کا زردی مائل دہشت خیز چہرہ۔ مرجھائی ہوئی پنکھڑیوں کی طرح خشک ہونٹ۔ سوکھی نارنگی کی طرح پچکے ہوئے رخسار اور خاک آلودہ آنکھوں کی پلکوں کو دیکھکر میرا جذبۂ ترحم پسیج گیا۔ میرے ضمیر نے رکشا پر بیٹھنے سے تپتی ہوئی دھوپ میں انتظار کرنے کو ترجیح دی۔ اسکی جسمانی حالت پر ایک باطنی انکار پیدا ہو گیا۔

"نہیں بھائی! میں رکشے پر نہیں جاؤں گا۔"

اُس کے امید سے چمکتے ہوئے چہرے پر حزن و ملال کی بے رونق جھلک دوڑ گئی۔ اس کی ساری توقعات پر ایک بے درد انکار کے سامنے بکھر گئیں اُس کی آرزوؤں کی کونپلیں مرجھا گئیں۔ جواب تک یاس کی تراوٹ سے شاداب تھیں۔ کچھ دیر تک مجھے مایوس کن نظروں سے کھڑا دیکھتا رہا اور پھر گھونگروؤں کو بجاتا ہوا آہستہ آہستہ سڑک کے دوسرے کنارے پر کھڑا ہو گیا جہاں سے وہ یکہ اور تانگے والوں کو رشک آمیز نظروں سے گھور رہا تھا۔ اسکی گھونگروؤں کی آواز جسکی اوٹ میں ایک دلگداز ترنم پنہاں تھا میرے دل میں تیر کی طرح چبھ گیا اور میں نے چونک کر بینک کے گھنٹہ گھر کی طرف دیکھا "ادھو بونے دس" میری

دامن سے نکلا۔ اور ایسا محسوس ہوا جیسے گھڑی کی سوئیاں میرے دل میں پیوست ہوگئیں۔ ایک آدھ تکیہ والا ابھی کھڑا تھا۔

"کیا لوگے بھائی" میں نے انتہائی انکساری سے اپنی مجبوری کو چھپاتے ہوئے کہا۔

"چار آنے"

"چار آنے!" میں نے حیرت سے دہراتے ہوئے کہا۔

"چھن چھن رکشا حضور!" اس لڑکے نے گھونگرو بجاتے ہوئے کہا میرے حیرت زدہ لہجہ پر شاید میری توجہ مبذول کرنے کو اس نے گھونگرو بجایا یا میری بے کسی کی حالت پر یہ ایک میٹھا طنز تھا!

"اور کیا بابو جی! سب تکے جا چکے ہیں" تکے والے نے کسی قدر کج ادائی سے کہا۔

میں ایک دم پریشان سا ہوگیا۔ میری تھرتھراتی نظریں کبھی گھڑی کا جائزہ لیتیں اور کبھی تکوں کا۔ اور میرے بدن میں ایک عجیب قسم کی جھنجھناہٹ پیدا ہو جاتی۔ اور میں پھر گھبرا کر رکشے والے کو دیکھتا۔

وقت ۔ صاحب ۔ دفتر ۔ پیسہ ۔ رکشا والا میرے دماغ کے اندر بجلی کے پنکھے کے بازوؤں کی طرح نہایت تیزی سے گھوم رہے تھے۔ میرے دماغ میں ہیجانی تحریکات کا دورہ شروع ہوگیا اور ایسا معلوم ہوتا کہ یہ سب مجھے گیدڑ کی طرح نوچ کر کھا جائیں گے۔ میری سانسیں قدرے تیز چلنے لگیں پسینے کی چھوٹی چھوٹی بوندیں شبنم کی طرح میرے منہ پر ابھر آئیں۔ وقت میرا تمسخر اڑاتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ گھنٹہ گھر کی دس آوازیں ٹن ٹن کرکے رک گئیں۔ جنکی ٹن ٹن سے میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ گھنٹہ گھر میرا دشمن ہے۔ اس کو شاید مجھ سے کوئی مخالفت ہے۔ اس میں ہمدردی نہیں۔ اس کو میری بیچارگی کا خیال نہیں۔ کیا وقت کسی کا ساتھی ہوتا ہے؟ میں سوچ رہا تھا۔ اف رے گھنٹہ گھر تو بے رحم ہے۔ تیری سوئیاں، تیرے گول اور کٹے پھٹے چہرہ پر کولہو کے بیل کی طرح گھوم رہی ہیں۔ جو گھوم رہی ہیں اور گھومتی رہیں گی۔ تیری آنکھوں پہ وقت کی پٹیاں بندھی ہوئی ہیں اور تو اندھا دھند بے جان گنتیوں کے ساتھ گردش کیا کرتی ہے۔ مگر تیری ٹک ٹک کی آواز میں ایک عجیب رمز پنہاں ہے تیرے بجتے ہوئے گھنٹوں میں عبرت، نصیحت اور وقت کی قیمت پوشیدہ ہے۔

میرے دل میں خیالات قلابازیاں کھاتے رہے اور اس بنک کے گھنٹہ گھر سے کراہیت سی معلوم ہونے لگی۔ میری نگاہیں گھڑی کے لٹکتے ہوئے شانوں کی طرح کبھی گھنٹہ گھر پر پڑتیں اور کبھی تکے والوں کی طرف گھوم جاتیں۔ اور میں اپنے رومال سے نکلتے ہوئے پسینے کو گھبرا کر خشک کر لیتا۔

رکشا والا اب بھی مجھے کھڑا ہوا گھور رہا تھا۔ اسکی نگاہیں میرے ڈرتے ہوئے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوگئیں۔ اور میری نظر کے سامنے انسانی عمارتیں تکے تانگے سب ناچنے لگے۔

"آیئے! اچھا تین آنے دیجئے گا۔" تکے والے نے کچھ وقفہ کے بعد لاپرواہی سے کہا۔

"چھن چھن" رکشا والے نے بجاتے ہوئے کہا "حضور مجھے دو ہی آنے دیجئے گا۔"

دونوں کے لہجوں میں ایک عجیب فرق تھا۔ تکے والے کی آواز میں لاپرواہی تھی اور اس میں خوف اور بے بسی۔ میرا دل ایک دم وقت سے مغلوب ہوکر رکشا والے کی بیکسی پر بھر آیا۔

"اچھا چل بھائی رکشے والے! جلدی لے چل۔ دس بج گئے ہیں۔" میں نے انتہائی مجبوری سے کہا۔

شکم زدہ کے لبوں پر تبسم کھیل رہا تھا۔ اور وہ گھونگرو بجاتا ہوا میری طرف تیزی سے لپکا۔

وہ مجھے گھسیٹتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ سڑکیں گذرتی چلی جا رہی تھیں۔ گھنٹہ گھر سے اپنا رد دستی بجکر پانچ دکھلا رہا تھا۔ اور میں بیٹھا ہوا خیالوں میں گم تھا۔ وہ کتنی محنت سے گھسیٹ رہا تھا اور میں کتنے آرام سے بیٹھا تھا۔ کتنی دشوار ہے اسکی زندگی! میں سوچ رہا تھا۔ مگر اس کو چند پیسوں کی توانائی گھسیٹے لئے جا رہی تھی۔ میری اور اسکی زندگی میں کیا فرق ہے؟ وہ بھی انسان اور میں بھی! میں ــــ ایک بابو دن بھر دفتر میں کاغذوں سے جھک مارتا ہوں۔ کبھی عاجز ہوکر ٹیک دیتا ہوں اور پھر عاجز ہوکر کاغذوں پر قلم ہیمائی کرنے لگتا ہوں۔ ہزاروں کی ناک اور بھوں چڑھتے ہوئے دیکھتا ہوں۔ باوجود انتہائی جدوجہد کے "بیڈ ورک" کی شکایتی بھی پاتا ہوں۔ صبح کو چولہے پر ایک مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اور شام کو تھکا ماندہ مویشی کی طرح گھر لوٹتا ہوں۔ پھر؟ بابو اور رکشے والے کی زندگی میں کچھ فرق نہیں۔ یک گونہ یکسانیت ہے۔ وہ جسمانی کام کرتا ہے اور میں جسمانی اور دماغی دونوں۔ اسکی امیدیں صرف حال سے وابستہ ہیں مگر میری مستقبل سے۔ لیکن بابو اپنی "پوزیشن" کا خیال کرکے اپنی تکلیفات کو چھپاتا ہے اور وہ صعوبتوں کو اظہار کرنا بہتر سمجھتا ہے۔ میری ــــ بابو اور رکشے والے کی زندگی میں کوئی زیادہ فرق نہیں ــ

میں ــــ ... بابو ـــــ رکشا والا ۔

میں نے اپنے کو اتنا زیادہ پست تصور کر کے اپنے وجود کو ایک کیڑے کی ہستی سے کم نہ سمجھا ۔

باوجود سرپٹ چال کے میں نے جیسے ہی دفتر میں قدم رکھا ہے ۔ ٹھیک ساڑھے دس کے ایک ٹن نے میرا استقبال کیا ۔ اس گھنٹہ کی آواز شاید دفتر میں سب سے تیز اور طنزیہ مجھ کو ہی معلوم ہوئی ۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے زور سے میرے دل پہ گھونسا مار دیا ہو ۔ پسینے کا سیلاب میرے بدن پر امنڈ رہا تھا ۔ تھکن کی دیوانی سی کیفیت طاری تھی ۔ سیڑھیوں پر جھومتا جھومتا چڑھا اور کرسی پہ جا کر دم لیا ۔ بجلی کے پنکھے تیزی سے گھوم رہے تھے ۔ قلم کی سرسراہٹ کمرے میں مبہم سنائی دے رہی تھی ۔ یہ امر یقینی تھا کہ صاحب کے ہاں سے ضرور میرا سمن آئیگا ۔ میرا پسینہ سارا خشک ہو چکا تھا ۔ ایک پر کیف اور لطیف قسم کی سستی مجھ پر طاری تھی ۔ صاحب نے مجھے بلوایا ۔ اور محض اتنا کہا کہ میں آدھ گھنٹہ دیر سے کیوں آیا ۔ اور آیندہ سے خیال رکھا کروں ۔ میں نے چولہے کی آپ بیتی کا خلاصہ نہایت ہی خلوص سے اعتراف کے لہجہ میں کہہ دیا ۔

کاش کہ میں حقیقت نہ بیان کرتا تو بہتر تھا ۔ میرے سچ کو انہوں نے محض فریب دہی پہ محمول کیا اور بکواس سمجھتے ہوئے ناک بھوں چڑھا لیا ۔

آج پھر میرے ضمیر کا امتحان تھا ۔ میں پھر آج چوراہے پر دفتر جانے کیلئے کھڑا تھا ۔ آج پھر میرے جذبۂ ترحم کی ترازو میں مفلسی اور ہمدردی کے باٹ سے میری خود انکاری کی سچائی کی تل رہی تھی ۔ کل خود انکاری کا پلڑا اونچا ہو گیا تھا اور مفلسی اور ہمدردی کا نیچا !

آج میری نظریں گھنٹہ گھر پہ بار بار پڑ رہی تھیں اور مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ میری کل کی گذری ہوئی مصیبت پہ ہنس رہا ہے ۔ اور کہہ رہا ہے کہ تو نے میری طرف توجہ نہیں کی ۔ مفلسی اور بے کسی پہ ہمدرد بنا ۔ اور تجھے پشیمان ہونا پڑا ۔ میرا دماغ اس احساس پہ چکرانے لگا ۔ اور میں سوچنے لگا کہ کیا میں نے اسکی حالت پر رحم کھایا اور مجھے پشیمان ہونا پڑا ۔ مجھے قطعی پشیمان ہونا نہیں پڑا ۔ میں اپنے دل کے آگے مجبور ہوں ۔ میں خود انکاری کے تحت میں مغلوب ہوں ۔ میں اپنے ضمیر کے ہاتھوں عاجز ہوں مجھے اسکی زبوں حالی پہ ترس بھی آتا ہے ۔ مگر پھر اسکو گھسیٹتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا ۔

ناگہاں سامنے سے وہ ہی لڑکا رکشا چلاتا ہوا گذرا جس پر ایک نوجوان لڑکی برقعہ پہنے سمٹی ہوئی بیٹھی تھی ۔

ظاہراً وہ غریب معلوم ہوتا ہی تھا ۔ بدن پہ نہایت کثیف اور جگہ جگہ سے پھٹا ہوا کرتا ۔ اور صرف بنیان سے نکلا ہوا باہر دکھائی دے رہا تھا ۔ گرد سے اٹے صاف پیروں میں پھٹی ہوئی جوتیاں تھیں ۔ مرمریں پاؤں اس کی خوبصورتی کے آئینہ دار تھے ۔

رکشا والا میری طرف مسکراتا ہوا گذر گیا ۔ گویا اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ پہنچا آؤں تو آپ کو لے چلوں ۔

میں بس کے انتظار میں دیر تک کھڑا رہا ۔ اور ڈر رہا تھا کہ کہیں رکشے والا نہ آ جائے اور مجھے ایک کشمکش و پیچ میں مبتلا کر دے ۔ ایک طرف اسکی مفلسی اور دوسری طرف اسکی جسمانی حالت مجھے پریشان بنا دیتی ہے ۔ جب گھوڑے یکوں اور تانگوں سے ناامید ہو جاتا ہوں تب میں مجبوراً رکشے پہ بیٹھتا ہوں ۔ میں ایک یکے والے سے دام ٹھیرا رہا تھا کہ چھن چھن کرتا ہوا وہ آگیا ۔

" آیئے بابو جی ۔ " اُس نے کہا

" نہیں ـــ میں رکشے پر نہیں جاؤنگا ۔ " میں نے کہا ۔

" بابو جی کیوں ؟ میں تو صرف دو ہی آنے لیتا ہوں ۔ "

" دو آنے کا سوال نہیں ۔ میں رکشے پر نہیں بیٹھتا ۔ میں تم لوگوں کو بیل اور گھوڑے کی طرح گھسیٹتا ہوا نہیں دیکھ سکتا ۔ "

" مگر آپ ہی لوگ نہ بیٹھیں تو ہم غریب مر جائیں ۔ " اُس نے درد بھرے لہجہ میں کہا ۔

غریب کا لفظ سنکر میرے بدن میں ایک سنسنی پھیل گئی ۔ دل پہ مفلسی کی چوٹ لگ گئی ۔ اور میں رکشے پر اس خیال سے بیٹھ گیا کہ میں اسکی مدد کر رہا ہوں ۔

آج وہ کل کی طرح افسردہ نہ تھا ۔ بلکہ کسی قدر خوش تھا ۔ اور رکشا نہایت تیزی سے چلا رہا تھا ۔ لیکن جلد ہی اس کی سانسیں تیزی سے چلنے لگیں ۔ میں سوچنے لگا کہ میرا دل اتنا کمزور کیوں ہے ۔ اسکی حالت پر رحم بھی آتا ہے اور پھر اس کو ہانپتے ہوئے دیکھکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں ایک انسان پر ظلم کر رہا ہوں ۔ کیا واقعی یہ ظلم ہے ؟ زمانہ ترقی کی گود میں کھیل رہا ہے اور تہذیب اپنے شباب پہ ہے ۔ مگر تف ہے ایسی تہذیب اور ترقی پر جس میں انسان ـــ اشرف المخلوقات جانور بن گیا ہے ۔

" اور تم اتنی جلدی اُس تنہا لڑکی کو کہاں پہنچا آئے ۔ " میں نے تصورات کے ماحول سے اپنے کو نکالتے ہوئے دریافت کیا ۔

" وہ میری بہن ہے ۔ " اُس نے ہانپتے ہوئے مسکرا کر جواب دیا ۔

"نہیں ؟" میں نے حیرت سے کہا۔ "کہاں لے گئے تھے ؟"

"ہوٹل !" اُس نے آنکھ پھاڑتے ہوئے کہا۔

"کیوں ؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں ؟ میں نہیں جانتا۔" اُس نے انتہائی دردناک طرز میں کہا وہ زور زور سے اب ہانپ رہا تھا۔ ناک کے نتھنے پانی کے بلبلے کی طرح متحرک تھے۔

"ہوٹل میں وہ کام کرتی ہے ؟" میں نے تشویش کے لہجہ میں کہا۔

"نہیں عصمت !" اُس نے اٹکتے ہوئے کہا۔

"عصمت !!" میں نے کہا۔

"جی ہاں"۔ اُس نے کہا۔ شاید اُسے وہاں پیسے ملتے ہیں۔"

اور اُسکی آنکھیں نم ہوگئیں۔ بے رونق آنکھوں میں بے پناہ رعب اور جذبہ کھیل رہا تھا۔ اس کی آنکھیں پھٹی پڑ رہی تھیں۔ جیسے اُس کا معدوم سا جذبہ انفرادیت بھڑک اُٹھا ہو۔ احساسِ برتری کی کرن اُس کے دل میں پھوٹی پڑ رہی تھی۔ اس نے اپنی شخصیت کا احساس کیا کہ وہ بھی انسان ہے اور جس طرح دوسرے انسان آزاد اور خوشحال ہیں وہ بھی ہے۔ اس وقت اس کا تخیل ہوٹل کے گرد منڈلا رہا تھا۔ اس کے چشمِ تصور کے سامنے اسکی جوان بہن اور اس کا شباب اور ہوٹل کے منیجر کے اندوہناک قہقہے پھر رہے تھے اور اسکی سانس سرعت سے چلنے لگی۔

"مفلس جوانیاں کیڑے کی طرح پیٹ کی سوکھی انتڑیوں کی خلش دور کرنے کو مکڑی کے جالے میں جاتی ہیں۔ جہاں وہ بری طرح پھنس کر رہ جاتی ہیں عصمت مفلسی کی آڑ میں چھپ جاتی ہے اور پھر مفلس جوانیوں کا ایک قسم کا نیلام ہوتا ہے۔ وہ جالے کے اندر پھڑ پھڑاتی ہیں ان کا دم گھٹا جاتا ہے۔ آبرو اور عفت کی روح بدن سے نکل جاتی ہے اور گوشت کا خشکار رہتا ہے۔ اور پھر گرم گرم پیسے نرم نرم ہاتھوں پر رکھ دیئے جاتے ہیں۔ یہ ہے اُن کی آبرو کی قیمت ! ایک دم رکشے والا نہایت تیزی سے دوڑنے لگا۔ اسکی آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ وہ سڑکوں اور انسانوں کو بالکل بھول گیا تھا۔ اس کے خیالوں میں صرف اس کی بہن ناچ رہی تھی۔

"لڑکے ! رکشا آہستہ چلاؤ "۔ میں نے اُس کو تیز دوڑتے ہوئے دیکھ کر زور سے کہا۔

"نہیں بابوجی ! مجھے جلدی سے ابھی اپنی بہن کو لانا ہے۔" اُس نے [illegible] کہا۔

"رکشا اُلٹ جائیگا۔" میں نے چیخ کر کہا۔ "لڑکے تجھے کیا ہوگیا ؟"

اُس کے پیر لڑکھڑانے لگے۔

"لڑکے ——— !"

اور اس کے پیر آخری بار لڑکھڑائے اور وہ نیم بیہوش ہوکر زمین پر گر پڑا۔ میں لڑھک کر گھٹنے کے بل زور سے گرا۔ دو زخمیوں کے گرد ایک تماشائی مجمع لگ گیا ——— اور میں لنگڑاتا ہوا دفتر پہنچا۔ اس وقت ساڑھے دس بج چکے تھے ——— اور پھر صاحب ——— رجسٹر میں میرے نام کے آگے کراس کا نشان لگا تھا ——— اور میں سوچ رہا تھا کہ زندگی کے چوراہے پر سے ایک راستہ اختیار کرنا بڑا مشکل ہے ÷

گواہی

(از جناب کنول)

احسن اپنے گواہوں کے نہ آنے کی وجہ سے مقدمہ کی تاریخ بڑھانے کی مہلت کی درخواست کے متعلق بار لائبریری میں اطمینان سے بیٹھا ہوا وکیل سے باتیں کر رہا تھا کہ اس کا کارپرداز گھبرایا ہوا پہنچا۔ کہ اس کے گواہوں کی پکار ہو گئی ہے۔ حاکم نے مہلت کی درخواست نامنظور کر دی۔ گواہ حاضر نہ ہونگے تو مقدمہ خارج کر دیا جائیگا۔ احسن کی پریشانی دیکھکر اس کے وکیل نے کہا گھبرانے کی کیا بات ہے۔ گواہی دینے والوں کی یہاں کمی نہیں۔ فن گواہی کے مشہور ماہر اور پیشہ ور گواہوں کے استاد میر کلو صاحب بلائے گئے۔

وکیل صاحب نے احسن سے پانچ روپے لیکر اُن کے حوالے کئے اور ساتھ لئے ہوئے اجلاس پہنچ گئے۔ میر صاحب حاکم کو سلام کر کے کٹہرے میں جا کھڑے ہوئے۔ احسن متحیر تھا کہ مقدمہ کی حالت سے میر صاحب مطلق واقف نہیں۔ مدعا علیہ کون ہے؟ کیا نام ہے؟ کتنی رقم کا دعویٰ ہے؟ نہ کچھ اُن کو بتلایا گیا نہ اظہار کی تعلیم دی گئی۔ آخر یہ کیا اظہار کریں گے؟ سمجھا کہ مقدمہ چوپٹ ہوا۔

فریق مخالف کے وکیل کو معلوم ہو چکا تھا کہ احسن کا گواہ کوئی نہیں آیا ہے۔ میر کلو کو کٹہرے میں کھڑا دیکھکر اور خوش ہوا کہ یہ بھاڑے کا ٹٹو کہاں تک چلے گا۔

اگرچہ جیف کے سوالات سے مقدمہ کی نوعیت کا میر صاحب نے کچھ اندازہ لگایا۔ اور یہ بھی سمجھ لیا کہ احسان علی خاں مقروض کا انتقال ہو گیا ہے۔ اب بحیثیت وارث کے ان کے بیٹے شاہد خاں پر یہ نالش دائر کی گئی ہے لیکن احسان علی خاں جنہوں نے تمسک لکھا تھا ان کی شکل وصورت، وضع قطع اور عمر سے واقف نہ ہونے کی وجہ سے ذرا سوچ میں پڑ گئے کہ مخالف وکیل نے ایک دم جرح کے سوالات کی بوچھاڑ شروع کر دی۔

میر صاحب دروغ حلفی کے جرم میں ایک بار سزا پا چکے تھے اس لئے پہلا سوال اُن سے یہی کیا گیا۔

وکیل :- میر صاحب: آپ کبھی جیل کی سیر کر آئے ہیں؟

میر صاحب :- آج کل کون سا ملک کا سچا خادم ہے جو جیل نہ ہو آیا ہو۔

وکیل :- آپ کو ملک کی کس خدمت کے صلہ میں یہ فخر حاصل کرنے کا موقعہ ملا ہے۔

میر صاحب :- وہی قانون شکنی۔

وکیل :- کس قانون کے توڑنے کی خدمت آپ نے اپنے ذمہ لی تھی۔

میر صاحب :- گاندھی جی نے نمک کے قانون کو توڑنے کا بیڑا اٹھایا تھا۔ بعض لیڈروں نے قانون جنگلات کی خلاف ورزی کو اپنے ذمہ لیا۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ ضرورت قانون شہادت کی اصلاح کی ہے۔ اس لئے قانون شکنی کے لئے میں نے اسی کو منتخب کیا۔

وکیل :- (حاکم کو مخاطب کر کے) حضور! یہ دروغ حلفی کے جرم میں سزا پا چکے ہیں۔ مگر اپنی زبان سے صرف اقرار کرنا نہیں چاہتے تھے۔

حاکم :- تو آپ اُس فیصلہ کی نقل داخل کر سکتے ہیں اور دوسرا سوال کیجیے۔

وکیل :- کیوں میر صاحب! احسان علی خاں مرحوم کو آپ جانتے ہیں؟

میر صاحب :- اے حضور! جاننے کی ایک ہی کہی۔ خدا مرحوم کو جنت نصیب کرے۔ ہم دونوں ایک جان دو قالب تھے۔ نہ مجھے اُن کے بغیر آرام نہ اُن کو میرے بغیر دیکھے چین۔

وکیل :- اُن کی عمر کتنی تھی؟

میر صاحب :- یہی پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھی۔

وکیل :- پچاس اور ساٹھ کے درمیان کہنے سے کام نہیں چلے گا صاف کہئے بوڑھے تھے یا جوان؟

میر صاحب :- عمر کے لحاظ سے تو بہت زیادہ بوڑھے نہ تھے۔ مگر اکثر بیمار رہنے کی وجہ سے بوڑھے معلوم ہوتے تھے۔

وکیل :- بال سفید تھے یا سیاہ؟

میر صاحب :- نزلہ کی وجہ سے بال سفید ہو گئے۔ لیکن جب خضاب لگاتے تھے تو جوان معلوم ہوتے تھے۔

وکیل :- رنگ گورا تھا یا کالا؟

میر صاحب :- نہایت ہی گورے چٹے تھے۔ لیکن وہی بیماری کی وجہ سے رنگ کچھ سانولا ہو گیا تھا۔

وکیل :۔ لانبے تھے یا ناٹے ؟

میر صاحب :۔ تھے تو لانبے۔ مگر کمر کے جھک جانے کی وجہ سے ناٹے معلوم ہوتے تھے۔

وکیل :۔ (جھلا کر) سوال کا صاف جواب کیوں نہیں دیتے۔ یہ کیا کہ لانبے تھے اور ناٹے بھی۔ گورے بھی تھے اور سانولے بھی۔ بال سفید بھی تھے اور سیاہ بھی۔ اس سے حلیہ کا صحیح اندازہ لگ سکتا ہے ؟

میر صاحب :۔ جناب خفا ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ایک دو روز کی ملاقات ہوتی تو البتہ اسی وقت کی خاص وضع صورت کو بیان کرتا۔ برسوں رات دن کا ساتھ رہا۔ جن مختلف حالتوں میں میں نے اُن کو دیکھا صاف صاف کہدیا۔

وکیل :۔ اچھا۔ احسان علی مرحوم ڈاڑھی رکھتے تھے یا نہیں ؟

میر صاحب :۔ وہ عجیب آزاد وضع اور رندانہ مشرب کے آدمی تھے۔ جی میں آیا تو کبھی چاروں ابرو کا صفایا کر دیتے تھے۔ اور کبھی ڈاڑھی بڑھائی تو خواجہ خضر کو بھی مات کر دیتے تھے۔

وکیل :۔ زیادہ فضول بولنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے پوچھا تھا کہ ڈاڑھی رکھتے تھے یا نہیں۔ صرف ہاں یا نہیں۔ اس کے علاوہ کچھ زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں۔ دنیا بھر کے قصے سے ہمیں مطلب کیا۔

میر صاحب :۔ بہتر۔ آئندہ سے "ہاں یا نہیں" دو لفظوں میں جواب دونگا۔

وکیل :۔ احسان علی خاں مرحوم رہتے کہاں تھے ؟

میر صاحب :۔ جی ہاں !

وکیل :۔ یہ جی ہاں کیا ؟ میں پوچھتا ہوں کہ کہاں رہتے تھے ؟ تو آپ فرماتے ہیں "جی ہاں"۔ یہ اس سوال کا جواب ہوا ؟

میر صاحب :۔ جناب ہی نے فرمایا تھا کہ جواب میں "ہاں یا نہ" کہو۔

وکیل :۔ لاحول ولا قوۃ۔ عجیب سمجھ ہے۔ میرا اس سے یہ مطلب نہیں۔ وہ شہر میں رہتے تھے یا دیہات میں ؟

میر صاحب :۔ دونوں جگہ۔ کبھی شہر میں، کبھی دیہات میں۔

وکیل :۔ دیہات میں اُن کا مکان کس رُخ کا ہے۔ آپ تو وہاں جاتے ہونگے۔

میر صاحب :۔ جی ہاں۔ برابر دیہات میں جایا کرتا تھا۔

وکیل :۔ اصلی سوال تو آپ کھا گئے۔ دیہات میں رہنے کو میں نہیں پوچھتا۔ اس کا جواب دیجے کہ وہاں مکان کس رُخ کا ہے ؟

میر صاحب :۔ (اتنی دیر میں جواب سوجھ گیا) شہر میں رہنے والوں کا دیہات میں اکثر بیتر بہک جاتا ہے۔ جب میں گیا سمت کا مجھے کبھی پتہ نہ لگا۔

وکیل :۔ یہ روپے کس کام کے لئے انہوں نے لئے تھے ؟

میر صاحب :۔ ضرورت کے لئے۔

وکیل :۔ کون سی ضرورت ؟ کیا کوئی خاص ضرورت آپڑی تھی جو بغیر قرض لئے کام نہ چلا۔

میر صاحب :۔ وہ نہایت ہی اولوالعزم انسان تھے۔ خاص اور عام دونوں ضرورتیں اُن کے لئے ایک تھیں۔ اپنے پاس دو چار ہزار روپیہ رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔

وکیل :۔ کب اُنہوں نے روپے لئے ؟

میر صاحب :۔ جب ضرورت پڑی۔

وکیل :۔ کتنے دن ہوئے ؟

میر صاحب :۔ تین سو ساٹھ دنوں کا ایک سال ہوتا ہے۔ اب حساب کرنا اور جوڑ کے سب بتانا اور سب ملا کر بتانا کہ کتنے دن ہوئے تو ذرا مشکل ہے۔

وکیل :۔ دنوں کو جوڑ کر بتانے کو میں نہیں کہتا۔ یہ بتلایئے کہ کتنے سال ہوئے ؟

میر صاحب :۔ حضرت ! پڑھنا چھوڑے ہوئے زمانہ ہوگیا۔ تمسک کی مرقومہ تاریخ کو دیکھکر آپ بھی جوڑ سکتے ہیں کہ کتنے سال ہوئے۔

وکیل :۔ تو صاف کہیے کہ ہمیں یاد نہیں۔ حساب کے بھولنے یا یاد رکھنے کا سوال نہیں۔ تمسک کب لکھا گیا تھا۔ کتنا زمانہ ہوا ؟ یاد ہے یا نہیں ؟

میر صاحب :۔ زمانہ کو جو آپ پوچھتے ہیں تو جہاں تک مجھے یاد آتا ہے اُنہوں نے اپنی زندگی کے زمانے ہی میں قرض لیا تھا۔

وکیل صاحب اس اول فول جواب سے سمجھ گئے کہ مقدمہ کی بابت یہ حضرت کچھ بھی نہیں جانتے۔ صرف دفع الوقتی کر رہے ہیں۔ لیکن غصہ تو اس کا تھا کہ اور باتوں کے جاننے کا کیا ذکر مدعا علیہ کی صورت تک نہیں دیکھی اور برسوں کی ملاقات کیا، بلکہ رات دن ساتھ رہنے کا دعوی کیا جا رہا ہے پھر بھی کہیں گرفت میں نہیں آتے۔ آخر سوچ کر ایسا سوال کیا جس سے وکیل صاحب کو یقین تھا کہ واقفیت اور دوستی کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔

وکیل: بتا دیجئے میر صاحب! احسان علی خاں مرحوم کی آپ سے دلی دوستی تھی۔ برسوں ایک ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ہے۔ ان کا خط تو آپ ضرور پہچانتے ہوں گے؟

میر صاحب: یہی تو ایک کمال مرحوم میں تھا جس پر وہ فخر کیا کرتے تھے وہ نہایت ہی خوش نویس اور ہفت قلم تھے۔ ہمیشہ مختلف خطوں سے لکھا کرتے تھے۔ خط پر انکو ایسا اختیار تھا کہ ان کا خط اپنے دوسرے خط سے کبھی ملتا ہی نہیں تھا۔

اس جواب کے بعد وکیل صاحب نے سپر رکھدی۔ دو بجے سے مقدمہ شروع ہوا تھا۔ چار بجنے میں چار ہی منٹ باقی رہ گئے تھے۔

حاکم نے مسکراکر وکیل صاحب سے پوچھا "اور کچھ پوچھنا ہے؟"

وکیل صاحب نے کہا۔ "جی نہیں۔" لیکن یکایک ایک بات یاد آگئی۔

حاکم سے کہا "حضور! صرف ایک سوال کرکے جرح ختم کردیتا ہوں۔ مسل کے کاغذات میں ایک جگہ احسان علی خاں مرحوم کے مرض الموت کا ضمناً تذکرہ تھا۔ اسکو دماغ میں رکھکر وکیل صاحب نے سوال کیا۔

وکیل: میر صاحب! یہ تو بتلایئے کہ احسان علی خاں مرحوم مرے کس بیماری سے؟

میر صاحب: جناب کیا پوچھتے ہیں۔ بس موت کی بیماری تھی۔

چار بج چکے تھے۔ اجلاس برخاست ہوا۔ احسن کو دوسرے روز اپنے گواہوں کو لانے کیلئے موقعہ مل گیا۔ اور یہ صرف میر صاحب کی بدولت ہوا۔ اس روز سے ہر شخص کو یقین ہوگیا کہ گواہوں کے سچے ہونے سے زیادہ ذہین اور حاضر جواب ہونے کی ضرورت ہے۔

غزل

(استادِ سخن تاج الشعرا فصیح العصر حضرت نوح ناروی)

پہلے اُن کی طرف نگاہ کروں
تھام کر دل پھر آہ آہ کروں

دن ہو یا رات آہ آہ کروں
چاند سورج کو میں گواہ کروں

ناوکِ ناز آنے والا ہے
جگر و دل کو فرشِ راہ کروں

آپ کے واہ واہ کرنے کا
ہے یہ مطلب کہ آہ آہ کروں

رحمتِ حق کو جس سے جوش آئے
کیوں نہ ایسا کوئی گواہ کروں

اس طرح گھر بنا ہے پہلو میں
تیر پر دل کا اشتباہ کروں

رازِ الفت چھپے چھپے نہ چھپے
قصد ہوتا ہے آہ آہ کروں

حضرتِ دل بھی مل گئے اُن سے
اور پیدا کوئی گواہ کروں

خانۂ دل میں آپ رہتے ہیں
کس طرح میں اسے تباہ کروں

اُس کے جلوے کا دیکھنا معلوم
پہلے اپنی طرف نگاہ کروں

آرزوئیں مری نکل جائیں
اس قدر اُن کے دل میں راہ کروں

کوئے جاناں میں بھی جگہ نہ ملی
اپنی ہستی کہاں تباہ کروں

زور سے سانس لے نہیں سکتا
چپکے چپکے ہی دل میں راہ کروں

کاش مجھکو ملائے خاک میں عشق
ذرہ ذرہ کو میں گواہ کروں

ایک بار اُن کو دیکھنا کیسا
دوسری تیسری نگاہ کروں

عشق کیا مجھ کو حکم دیتا ہے
نہ کروں میں کہ آہ آہ کروں

تم کہاں، وہ کہاں، یہ حسن کہاں
کیوں نہ تردید مہر و ماہ کروں

منزلِ عشق اُنہیں نہیں معلوم
خضر کو خاک رو براہ کروں

کیا تعجب جو باز پرس نہ ہو
عفو سے پوچھ کر گناہ کروں

نوح طوفانِ بحرِ عشق اُٹھا
کشتیِ دل کو میں تباہ کروں

از جناب کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی سحرؔ بی۔ سی۔ ایس

رُباعی

خاموش ہوں سنتا ہوں نہ کچھ کہتا ہوں — مجبور کہ مختار ہوں خوش رہتا ہوں
لیکن ہے ستم یہ کہ تمہارے ہاتھوں — ناکردہ گناہوں کی سزا سہتا ہوں

غزل

کیا حاجت بادہ خواری کی کیا مطلب ہے میخانے سے
او مست نظر والے ساقی دو گھونٹ اسی پیمانے سے
کچھ شمع ہی پر موقوف نہیں، قائم نہیں کچھ پروانے سے
جب حُسن و محبت مل جائیں بن جاتے ہیں افسانے سے
یوں کعبے پر ایمان تو تھا اور اب بھی ہے، ڈرتے یوں تھے
کیا جا کر مُنہ دکھلائیں گے لوٹے گر ہم بتخانے سے
نیت تیری برحق لیکن اے چارہ گر بس رہنے دے
کچھ ایسے زخم بھی ہوتے ہیں جو چھیڑتے ہیں بھر جانے سے
شکوے تیرے بیجا نہ سہی پر دل میں سحرؔ تو سوچ ذرا
اس سے پاتک گلشن کو کیا نسبت ہے ویرانے سے

کلامِ نخشب

(جناب نخشب جارچوی)

آہیں نہ بھریں شکوے نہ کئے، کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا — اس پر بھی محبت چھپ نہ سکی جب تیرا کسی نے نام لیا
ہم دل کو پکڑ کر بیٹھ گئے ہاتھوں سے کلیجہ تھام لیا

پوچھا جو کسی نے حال تو ہم کچھ کہہ نہ سکے کچھ کہہ بھی گئے — روکے تو بہت آنسو لیکن کچھ رک بھی گئے کچھ بہہ بھی گئے
افسانہ کہا اور لب نہ ہلا اشکوں سے زباں کا کام لیا

اس مست گھٹا کے سائے میں جذبات کا دامن پھیلا کر — ہاتھوں میں یہ گردن ڈھلکا کر کچھ گھبرا کر کچھ شرما کر
یہ آپ نے کس کا ذکر کیا یہ آپ نے کس کا نام لیا

مخمور ادائیں مست نظر آنکھیں ہیں چھلکتے پیمانے — ہم بھید یہ اب تک پا نہ سکے وہ اپنے ہیں یا بیگانے
کچھ دیکھ کے ارماں مچلتے تھے کچھ دیکھ کے دل کو تھام لیا

روکے سے بھلا کیا دل رکتا، دنیا کو تڑپ کر تڑپاتا — سچ پوچھئے وہ تو خیر ہوئی محفل میں تماشا بن جاتا
کچھ آپ ادائیں روک گئے کچھ ضبط سے ہم نے کام لیا

گو لاکھ تمہارے ظلم سہے پر آنکھ سے آنسو بہہ نہ سکا — بیمارِ محبت اے نخشب کچھ اور تو منہ سے کہہ نہ سکا
اک لمبی سی ٹھنڈی سانس بھری چپکے سے کسی کا نام لیا

"تم نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی"

(از جناب اسرار الحق مجازؔ بی۔ اے۔ علیگ)

(۱)

بس، یہ چھیڑے نہ تری چشمِ عنایت مجھکو
یاد ہے تیرے تبسم کی شرارت مجھکو
اب جوانی کو ہے اک شوخ جوانی کی تلاش
اب محبت ہی سے کرنی ہے محبت مجھکو

ایضاً

میں وفاکوش بھی ہوں، وعدہ فراموش بھی ہوں
اِس دورنگی پہ ندامت تو نہیں ہے مجھکو
تیرے پہلو کی ضرورت تو رہی ہے بے شک
تیری "دولت" کی ضرورت تو نہیں ہے مجھکو

(۲)

نہ ہم آہنگِ مسیحا نہ حریفِ جبریل
تیرا شاعر کہ ہے زندانیٔ گیسوئے جمیل
کس کی آنکھوں میں یہ غلطاں ہے جوانی کی شراب
کھول دی آہ یہ کس نے مئے گلگوں کی سبیل

ایضاً

عالمِ یاس میں کیا چیز ہے اک ساغرِ مے
دشتِ ظلمات میں جس طرح خضرؑ کی قندیل
کتنی دشوار ہے پیرانِ حرم کی منزل
اِس طرف فتنۂ ابلیس، اُدھر ربِّ جلیل

(۳)

میں محمدؐ کا طرفدار، وہ عیسیٰؑ کی کنیز
میں ہوں قرآن کا شیدا، وہ فدائے انجیل
کس طرف جائے کہاں جائے بتا دو کوئی
زلفِ پُرخم کا گرفتار نگاہوں کا قتیل

ایضاً

اُف یہ طوفانِ نشاط اور مری طبع حزیں
آہ یہ یورشِ ناز اور میں مجروح و علیل
آہ وہ ہوش کا عالم وہ غموں کا طوفاں
اُف یہ مستی کہ ہے پھر ہوش میں آنے کی دلیل

غزل

(از جناب آغا سرخوش قزلباش دہلوی)

کچھ ضدوں کو رنگ دیکر شکلِ انساں کر دیا
دل لگی کی دل لگی احسان کا احساں کر دیا

یوں اکارت مقصدِ تخلیقِ انساں کر دیا
اپنے دل کے راز کو مٹی میں پنہاں کر دیا

بوئے گل، رنگِ شفق، نورِ سحر، عکسِ قمر
تو نے اپنے کو بہر صورت نمایاں کر دیا

یہ سمجھکر بھی کہ انساں میں ہے عزمِ جستجو
تو نے اپنا راز اپنے آپ عریاں کر دیا

دوسروں کو کیا وہ خود کو بھی سمجھ سکتا نہیں
وہم میں اتنا مقید ذہنِ انساں کر دیا

بیخودی ہی زندگی کا راز تھی بادِ سحر!
کھول کر غنچے کی آنکھیں کیوں پریشاں کر دیا

عبد اور معبود میں یہ فرق ہے بندہ نواز
اُس نے ہر شے کو چھپایا میں نے عریاں کر دیا

ہم کو سرخوش واسطہ بھی اب نہیں اُن سے مگر
آج اس ٹھنڈی ہوا نے دل پریشاں کر دیا

سپاہی

(از جناب سعید احمد ملک)

مجھ کو بے رحم موت آئے اگر
ہند کی سرزمیں سے دور ——— کہیں!
خوش ہو تو جاں کہ ہو گیا حاصل
فخرِ ہندی کا اس زمیں کو بھی
کیونکہ پیوند کر دیا میں نے
اپنی ادنیٰ سی خاک سے اس کو

جس جگہ یہ سپوت مدفن ہو
وہ زمیں تو ہے قابلِ تکریم
خاک ہے اس سپوت کی جس نے
نام ہندی کا کر دیا روشن ———
ہند کی خاک کا وہ پتلا تھا
خاورِ ہند کی رو پہلی کرنوں کا
جس نے زریں لباس پہنا تھا
جس پہ لالہ و سوسنی ——— اب بھی
اپنی خوشبو نثار کرتے ہیں

غزل

(از جناب مجید احمد مجید ناروی نبیسہ حضرت نوح ناروی)

کاشانۂ دل کیوں مرا آباد نہیں ہے
معلوم ہوا وہ ستم ایجاد نہیں ہے

یہ کیوں کہوں گلزار میں صیاد نہیں ہے
آزار سے تنکا کوئی آزاد نہیں ہے

مائل بہ کرم وہ ستم ایجاد نہیں ہے
امید کی دنیا مری آباد نہیں ہے

برباد محبت کو ہو کیا فکر زمانہ
کچھ حسن پرستی میں اسے یاد نہیں ہے

دیکھے تو کوئی اس ستم ایجاد کی باتیں
بیداد کو کہتا ہے کہ بیداد نہیں ہے

سب جھیل گیا ظلم و ستم چاہنے والا
اب اس کی زباں پر تری فریاد نہیں ہے

پروانہ ہو یا شمع ہو جلنے سے انہیں کام
اس شوخ کی محفل میں کوئی شاد نہیں ہے

آرام طرب عیش کا گزرا ہوا عالم
وہ بھول گیا ہے ہمیں اب یاد نہیں ہے

خاموش رہا داورِ محشر بھی تو سن کر
اے شکوۂ بیداد تری داد نہیں ہے

سن کر وہ مرا قصۂ غم کہتے ہیں مجھ سے
کیا اور کوئی بات تجھے یاد نہیں ہے

نکلا ستم و جور کا ان کے یہ نتیجہ
پہلو میں مرے اب دلِ ناشاد نہیں ہے

پاتا ہے جگہ اہلِ جنوں کے کفِ پا میں
کانٹا کوئی اب دشت کا برباد نہیں ہے

اللہ رے دیوانگیٔ عشق و محبت
کچھ دشت نوردی کے سوا یاد نہیں ہے

کرتے ہیں مجید آہ محبت میں شب و روز
یہ تیرے سوا اور کی بیداد نہیں ہے

شکستوں کا آئینہ

(از جناب صباؔ متھراوی فاضل ادب)

دل کی لگی سکون نہ پائے تو کیا کروں — چشمِ کرم بھی آگ لگائے تو کیا کروں
مانا کہ بھولنا ہے ترا مصلحت مگر — وحشت تری ہی شکل دکھائے تو کیا کروں
سنتا ہوں تم سکونِ مزاجِ حیات ہو — تم سے بھی دل سکون نہ پائے تو کیا کروں
سجدے تو مضطرب ہیں جبینِ نیاز میں — اپنی ہی شکل سامنے آئے تو کیا کروں
فی نفسہٖ تو غم ہے شکستوں کا آئینہ — یہ رونقِ حیات بڑھائے تو کیا کروں
ظالم تری نظر لیے کافر تری نظر — دل کو بنا بنا کے مٹائے تو کیا کروں
سو حسن جس نے پائے ہیں میری نگاہ سے — وہ بھی اگر نگاہ بچائے تو کیا کروں
تیرا وہ راز کون و مکاں کی اساسِ خاص — بے اختیار لب پہ جو آئے تو کیا کروں
آواز جس کی عشق کو سننا گناہ ہے — وہ ساز دل پہ گیت سے گائے تو کیا کروں
ہاں دردِ زندگی کی تڑپ عشرتوں کی روح — کم بخت دل کو راس نہ آئے تو کیا کروں
یہ جانتا ہوں تیز ہے تلوار وقت کی — دل زخم کھا کے ہوش میں آئے تو کیا کروں
خود ہی بھنور ہوں اور ہوں خود کشتیٔ مراد — یہ تہہ جو ناخدا بھی نہ پائے تو کیا کروں
راہِ وفا کی منزلیں اللہ کی پناہ — خضرِ طریق ٹھوکریں کھائے تو کیا کروں
وہ منتظر کھڑے ہیں قیامت بنے ہوئے — ذوقِ طلب ہی اُن کو چھپائے تو کیا کروں

پس ماندگی کا غم ہے مجھے بھی مگر صباؔ
مجھکو مرا نصیب بڑھائے تو کیا کروں

عندلیبِ شکستہ پر

شریمتی سروجنی نائیڈو کی ایک نظم کا ترجمہ

(از جناب حامد علی خاں صاحب)

سوال

شبِ طویلِ غم گئی مسرتوں کی نو ہوئی
افق چمک اٹھی ہے اور نمودِ صبح نو ہوئی
رگوں میں خون پھر گیا، حیات گرم رو ہوئی، نمودِ صبح نو ہوئی
نمودِ صبح نو ہوئی اُمید جلوہ گر ہوئی
مسرتوں کے گُل کھلے نسیم باخبر ہوئی
بہار آگئی ہے پھر، خوشی پیام بر ہوئی۔ اُمید جلوہ گر ہوئی
اُمید جلوہ گر ہوئی نئی زمیں نیا وطن
مگر شکستہ پر ہے تو اے عندلیب نغمہ زن
اے عندلیبِ نغمہ زن، عروس بن گیا چمن، مگر شکستہ پر ہے تو

جواب

وہ روز و شب بدل گئے
خزاں کے دن نکل گئے
خوشی کا دور آگیا
زمانہ اور آگیا
تو پھر میں بے بصر ہوں کیا شکستہ اس قدر ہوں کیا!
کہ نغمہ زن نہ ہو سکوں کہ جان و دل نہ کھو سکوں
خوشی سے خوں نہ رو سکوں
جگر میں پھانس ہے تو کیا بہار جلوہ گر تو ہے!
میں نامرادِ غم سہی اُمید بارور تو ہے!
شکستہ ہے تو کیا ہوا اُڑے گا یہ کہ پر تو ہے!
یہی شکستہ پر مرا سوئے بہار لے چلا
تو دیکھنا یہی مجھے فلک کے پار لے چلا

چٹانیں

(صہبا لکھنوی)

یہ عقیدوں کی طرح سخت چٹانوں کا وجود!
اور مظالم کی طرح آہنی کڑیوں کا رواج!!
اور زنداں کی طرح تیرہ و تاریک سماج!!
یہ چٹانوں کی طرح سخت عقیدوں کا جمود!
یہ عقیدوں کی طرح سخت چٹانوں کا وجود!

نوعِ انساں جسے کہتے ہیں وہ ہے صدیوں کا خواب!!
جس کی فطرت میں سموئی گئی روحِ بے تاب!!
جس کے ہاتھوں ہوئی تقویمِ عذاب اور ثواب!!
یہ چٹانوں کی طرح سخت عقیدوں کا جمود!
یہ عقیدوں کی طرح سخت چٹانوں کا وجود!

یہ امارت کے شکنجوں میں غلامی کا وقار!!
اور یہ پتھریلی قباؤں پہ نگوں کی پکار!!
ہانپتے ذرّوں سے لپٹا ہوا کھیتی کا غبار!!
جیسے دوپہر کے سورج سے چھٹے ذکی کار!!
یہ چٹانوں کی طرح سخت عقیدوں کا جمود!
یہ عقیدوں کی طرح سخت چٹانوں کا وجود!

امتیازِ من و تو رفعت و پستی کا فریب!!
یہ جھجکتی ہوئی، ڈرتی ہوئی ہستی کا فریب!!
ساغرِ زر میں بہکتی ہوئی مستی کا فریب!!
یہ چٹانوں کی طرح سخت عقیدوں کا جمود!
یہ عقیدوں کی طرح سخت چٹانوں کا وجود!

اُف! یہ چپ چاپ اندھیروں میں جوانی کے گناہ!!
اور ہنگاموں میں ناموس کی بے نام کراہ!!
یہ چٹانوں کی طرح سخت عقیدوں کا جمود!

شب پردہ کار ہے، جشنِ نالِ ہستی!!!
رفعتِ بام تمہارا ہے نشانِ پستی!!!

حقائق

از
محترمہ ساجدہ بنت دانش
شاہجہاں پوری

شاعری کیا ہے رُوح و دل کا پیام — آپ بیتی کا اک انوکھا نام
پھر ہوا دل گرفتۂ آلام — ذوقِ صبر و رضا نہ ہو بدنام
میری تکمیلِ ضبط کی خاطر — غم نے بھیجا ہے ایک تازہ پیام
دل اس انداز سے تڑپ اُٹھا — محوِ حیرت ہوئے خواص و عوام
آپ کے نام کے بھرم نے فقط — دل کا ہونے دیا نہ کام تمام
میری ہستی کا رنگ ہی ہے جُدا — درد دیتا ہے بھر کے جام پہ جام
اب زمان و مکاں کی قید کہاں — غرقِ حیرت ہوئے ہیں صبح و شام
نذرِ طوفاں کیا "سفینۂ کرم" — ہے ستم مجھ سے پوچھنا انجام
غمِ دُنیا بنا غمِ محبوب — رفتہ رفتہ ہوا ہے پُختہ خام
عشق ہے اور سیرِ جلوۂ دل — دیدۂ بوالہوس رہینِ بام
گو چمن ہو رہا تھا رشکِ ختن — ہو سکا مطمئن نہ دل کا مشام
جب سے مفقود دردمند ہوئے — اُڑ گئی لذتِ تعود و قیام
آستانِ مشیتِ حق پر — میرے سر کا ہے دیدنی ابرام

عہدِ حاضر میں کیوں نہ ہو ممتاز
صدق آموز ساجدہ کا کلام

جانیوالے سے

از محترمہ نظیر جہاں نازؔ
شاہجہانپوری

میرا دل میرا جگر میری نظر لیتا جا
چشم بے تاب کے تابندہ گہر لیتا جا
میرے نالے یہ بہ ہنگام سحر لیتا جا
عشق کا سوز محبت کا اثر لیتا جا

حسن گو مائل گفتار نہ ہوگا نہ سہی
ابر الطاف گہر بار نہ ہوگا نہ سہی
مجھکو حاصل ترا دیدار نہ ہوگا نہ سہی
جذبۂ دل مری مشتاق نظر لیتا جا

تو جو جاتا ہے تو جا اتنا بتا دے مجھکو
جاکے واپس بھی تو آئیگا جتا دے مجھکو
ہاں سبق ضبط و سکوں کا تو سکھا دے مجھکو
جا خوشی سے تو مگر سوز جگر لیتا جا

آتش غم سے جو دل جلتا ہے جل جانے دے
آرزو دل کو تو سینے میں مچل جانے دے
آہ جو منہ سے نکلتی ہے نکل جانے دے
ہو مبارک تجھے یہ عزم سفر لیتا جا

مجھکو معلوم ہے تو لوٹ کے آئیگا نہیں
تیرا دیدار مقدر یہ دکھائے گا نہیں
آسماں اب مجھے دنیا میں ہنسائیگا نہیں
چشم بے تاب مرا دیدۂ تر لیتا جا

پھر نہ ہم ہونگے نہ یہ حسرت و ارماں ہونگے
نہ شب غم ہی نہ یہ سوختہ ساماں ہونگے
ہاں جو ہونگے وہ چراغ سر داماں ہونگے
آ تجھے جاتے ہیں الفت کے خبر لیتا جا

خیر جس جا بھی رہے چین سے ہو شاد رہے
گلشن دہر میں اے دوست تو آباد رہے
بیکس و غمگین مجسم شرر آباد رہے
جا دعاؤں کے مرے نازؔ اثر لیتا جا

تجلیات

(از محترمہ آر۔ کے۔ درخشاں بجنوری)

جنوں مجھ کو کدھرے کر چلا ہے
نہ ساتھی ہے نہ کوئی رہنما ہے

بہت دشوار ہے راہ محبت
تو اس سے کیوں گذرنا چاہتا ہے

مسرت قرب سے ہوتی ہے اسکے
انہیں معنوں میں وہ جانِ وفا ہے

کھلی ہے آستاں کی آج قسمت
جبینِ شوق نے سجدہ کیا ہے

مرے ذوقِ تصوّر کا یہ عالم
نہ ملنے پر بھی تجھ سے آشنا ہے

تری چشم کرم نے آج ہمدم
جہاں میں انقلاب نو کیا ہے

وہ اپنے حسن بے پایاں کو لیکر
جہانِ عشق میں کوسے چلا ہے

درخشاں ضوفگن ہے بزم عالم
کسی کا نور سا پھیلا ہوا ہے

ہندستانی فلمی صنعت کا معیار

شروع شروع میں فلمیں زیادہ تر مار دھاڑ سے بھرپور ہوا کرتی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ صنعت کا آغاز تھا۔ لوگ ایسی ہی تصویریں پسند کرتے تھے۔ اس وقت ملک میں تعلیم کا بھی اتنا دور دورہ نہیں تھا۔ پچھلے دس سال میں ہندستان نے تعلیم میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ جوں جوں تعلیم بڑھتی گئی تعلیم یافتہ طبقہ مار دھاڑ قسم کی تصویروں سے نفرت کرنے لگے۔ عوام کا مذاق بالکل بدل چکا تھا۔ لوگ نیا خیال، نیا چہرہ چاہتے تھے۔ چند ایک ہوشمند اور تعلیم یافتہ لوگوں نے عوام کے مذاق کو سمجھا اور نیو تھیٹرز۔ پربھات۔ بمبئی ٹاکیز جیسی فلم ساز کمپنیوں کا وجود عمل میں آیا۔ نیو تھیٹرز نے دیوداس۔ پریذیڈنٹ۔ ودیاپتی۔ مکتی۔ زندگی۔ اور پربھات نے امرت منتھن۔ امر جیوتی۔ پڑوسی۔ نیا زمانہ۔ آدمی۔ میرا لڑکا۔ اور بمبئی ٹاکیز نے اچھوت کنیا۔ وچن۔ گنگن۔ بندھن جیسی تصویریں پیش کرکے فلمی صنعت میں زبردست انقلاب پیدا کر دیا۔ اب تک جو نئی کمپنیاں وجود میں آئی تھیں۔ اُن کا مقصد معیاری اور عوام کی فلاح وبہبودی کے لئے تصویریں تیار کرنے کا تھا۔ مگر ملک میں ایسے لوگ بھی موجود تھے جنہوں نے روپیہ کمانے کی غرض سے ایسی ایسی تصویریں پیش کرنی شروع کر دیں جو محض تفریحی تھیں۔ اور بعض بعض میں تو مذاق کا درجہ اتنا گرا دیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی پود جس میں تصویر کے معیار کو پرکھنے کی صلاحیت نہیں تھی اپنانا شروع کر دیا۔ اس کے ساتھ جاہل طبقے نے بھی تعاون کیا۔ اور ایک ایسا وقت آگیا جب پربھات کی "آدمی" جیسی تصویر میجسٹک سنیما میں تین ہفتہ کے بعد مالکان کو تبدیل کرنی پڑی (گو اب یہ حالت نہیں ہے) تو نتیجہ یہ ہوا کہ عوام صرف تفریحی تصویریں پسند کرنے لگے۔ اس وقت اچھی سے اچھی معیاری تصویر دو ہفتہ زیادہ سے زیادہ چار ہفتہ چلنے کے بعد بدل جاتی تھی۔ عوام کی ذہنیت کو بدلنے والی گھٹیا قسم کی تصویریں تیار کرنے والے وہ لوگ تھے جو اس صنعت میں محض روپیہ کمانے کی غرض سے شریک ہوئے تھے۔ تعلیم یافتہ طبقہ اس بات کو اچھی طرح محسوس کر رہا تھا مگر اُسے پریس کا تعاون حاصل نہیں تھا۔ چند سچے اور دردمند لوگ میدانِ صحافت میں موجود تھے۔ انہوں نے پریس کو ایک جا کیا۔ ایک یونین قائم کی اور ایسے پروڈیوسروں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور ایسی معیار سے گری ہوئی تصویروں کی مخالفت کی۔ کچھ پبلک کی طرف سے بھی تعاون ہوا۔ اور ایسی مخرب الاخلاق تصویروں کی گت بننے لگی۔ اس وقت یہ حالت ہے۔ اگر ایسی تصویروں میں موسیقی خاص ہو جب ورنہ اس قسم کی تصویر ایک دو ہفتہ کے بعد ڈسٹری بیوٹر کے دفتر میں جانے کی تیاریاں کرنی شروع کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر آشیرواد۔ مینا۔ کالجین جیسی تصویریں ایک ہفتہ چلنے کے بعد بدل دی گئیں۔

اس وقت فلم انڈسٹری میں ایس۔ کرجی۔ وی۔ شانتارام۔ محبوب۔ کاردار۔ فضل برادرز۔ رام نیئے۔ بیم چند۔ بروا۔ دیوکی بوس۔ بھنت دیسائی۔ سہراب مودی۔ ڈبلیو، زیڈ احمد۔ نجم نقوی اور آچاریہ جیسے تعلیم یافتہ۔ لائق اور تجربہ کار لوگ موجود ہیں۔ ان لوگوں کا فرض ہے کہ انڈسٹری کی رہنمائی کریں۔ اور اس قسم کی تصویریں تیار کریں جو سراسر تفریحی ہونے کی بجائے تعلیمی اور معیاری ہوں۔ بے تکی کہانی، لغو اور گھٹیا قسم کے گانوں سے مبرا فلمیں پیش کریں۔ اب جنگ کے زمانے میں ہر شخص کی آمدنی بڑھی ہوئی ہے۔ خاص کر چھوٹے طبقہ کی جو جنگ سے قبل آٹھ آنے کما یا کرتا تھا اب چار روپے کما رہا ہے یہ حالت ہے کہ ایک تصویر کو دوبارہ سہ بارہ دیکھتا ہے۔ پروڈیوسر یہ جانتا ہے کہ میں کسی قسم کی لغو تصویر تیار کر دوں۔ چلے گی تو ضرور۔ عوام کے اخلاق پر کچھ اثر پڑے، اُس کی بلا سے۔ اُسے تو روپیہ کمانے سے مطلب ہے۔ ایسے نفع خوروں کو خیال کرنا چاہیئے کہ وقتی طور پر اپنی جیبوں کو گرم کرکے آنے والی نسلوں کے ساتھ ظلم کر رہے ہیں۔ ایسے نفع خوروں سے

جو ملکی صنعت کو نقصان پہنچ رہا ہے اُس سے بچانے کے لئے حکومت کا فرض ہے کہ ایک ایسا بورڈ قائم کرے جس کا یہ کام ہو کہ لائیسنس دینے سے قبل تصویر کی کہانی بغور دیکھے۔ اس میں کوئی ایسا پہلو نہ ہو جس سے اخلاق پر برا اثر پڑے۔ ایسا بورڈ قائم ہو جانے کی صورت میں ایسے نفع خوروں کو لائیسنس ملنے تو کم ہو جائیں گے۔ مگر ساتھ ساتھ چور بازاری (بلیک مارکیٹ) بڑھ جانے کا بھی خطرہ ہے۔ کیونکہ کیا پبلک اور کیا حکومت ہر جگہ راشی لوگ موجود ہوتے ہیں۔ تو ایسے عناصر کی نگرانی کیلئے اور عملہ مقرر کرنا چاہیئے جس کا یہ کام ہو کہ یہ خیال رکھے کہ بورڈ میں چور بازاری نہ ہو سکے۔

اس صورت میں ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ ہندستانی فلموں کا معیار کافی بلند ہو جائے گا۔ عوام کی ذہنیت جو موجودہ گھٹیا قسم کی تصویروں کو دیکھ دیکھ کر بگڑ چکی ہے پھر سے ٹھیک ہو جائے گی۔ جہاں حکومت کا یہ فرض ہے وہاں بڑے بڑے فلم ساز مثلاً دی شالیمار۔ زیڈ احمد۔ ایس مکرجی محبوب سہراب مودی۔ کاردار۔ فضلی برادرز جیسے لوگوں کا فرض ہے کہ اپنے اداروں میں تعلیم یافتہ لوگ رکھیں۔ گانے اور مکالمے لکھنے کیلئے ملک کے اچھے اچھے ادیبوں اور شاعروں کی خدمات حاصل کریں۔ تاکہ ملک کی زبان ایک عام فہم ہو جائے۔ اور موجودہ خودغرضوں نے جو زبان کو کھچڑی بنا رکھا ہے اس سے نجات مل جائے۔ اگر راج کمل کلا مندر۔ فضلی برادرز۔ بمبئی ٹاکیز۔ نیو تھیٹرز لمیٹڈ۔ محبوب پروڈکشنز۔ شالیمار پکچرز۔ سنٹرل سٹوڈیوز منروا مودی ٹون۔ فلمستان لمیٹڈ اور کاردار پروڈکشنز یہ طے کریں کہ ہر وہ تصویر جو اُن کے ادارے سے نکلے گی۔ کہانی، زبان اور گانوں کے لحاظ سے معیاری ہوگی تو کوئی وجہ نہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ کے اندر ہندستان کی تیار کی ہوئی تصویریں غیر ممالک میں نمائش کے لئے نہ جانے لگیں۔

حکومت اور پروڈیوسروں کے علاوہ پبلک کا بھی فرض ہے کہ ایسی گری ہوئی تصویریں تیار کرنے والوں کی حوصلہ افزائی نہ کریں۔ بلکہ ایسی تصویروں کا بائیکاٹ کریں۔ تاکہ ڈسٹری بیوٹر اور پروڈیوسر دونوں کی آنکھیں کھلیں۔

جب پبلک کی طرف سے ایسی تصویروں کا بائیکاٹ کیا جائیگا اور ایسی تصویریں ناکام ہونگی اور نفع خور کو بار بار نقصان اٹھانا پڑیگا تو یا تو وہ ایسی گری ہوئی تصویریں تیار کرنی بند کردیگا۔ یا اپنے معیار کو بلند کریگا۔

مرارجی پکچرز کی [illegible] مشہور [illegible] کرشن ارجن [illegible] سے پہلی دنیا کے شہرت یافتہ پلیٹ کار موہن سنہا نے فلم بند کیا ہے۔ کرشن ارجن یدھ مذہبی تصویر ہے اور پہلے زمانہ کی شان شوکت کا آئینہ ہے۔ اس میں شاندار سین سینریاں۔ جنگ و جدال کے صحیح نظارے سکھیوں کے ناچ۔ اور روح پرور موسیقی پیش کی گئی ہے۔ یہ تصویر میسرز نرنجن ٹاکیز کے ذریعہ شمالی ہندستان میں دکھائی جائیگی۔ نرنجن ٹاکیز بالکل نیا ادارہ ہے مگر اس کا انتظام مسٹر جگت نراین اروڑہ جیسے کہنہ مشق اُستادوں کے ہاتھ میں ہے۔ مسٹر اروڑہ فلمی دنیا میں کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ یہ ان ہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ کرشن ارجن یدھ بیک وقت جوبلی ٹاکیز دہلی۔ نگار لاہور اور [illegible] کانپور میں عنقریب پیش کر دیا جائیگا۔

"کرشن ارجن یدھ" میں پرتھوی راج۔ ساہو مودک بشو بھاسا مرتھ رتن بائی۔ ترلوک کپور۔ کنہیا لال۔ مینکا جیسے اداکاروں نے کام کیا ہے۔

کرشن موویٹون کا نغمات۔ مزاح اور موسیقی سے بھرپور شاہکار "پریت" جمعہ ۲۰ جولائی سے جگت سنیما میں نمائش کیلئے پیش کر دیا جائیگا۔

"پریت" میں سنیہہ پربھا ایک عرصے کے بعد پھر پردہ فلم پر آئی ہے اس سے قبل یہ "پنر ملن"۔ "پردیسی" اور "پیا ملن" جیسی تصویروں میں کام کر چکی ہے۔ اسکے علاوہ نسیم۔ پہاڑی سانیال۔ چندر موہن۔ سورن لتا نے لاجواب کام کیا ہے۔

شالیمار پکچرز کی تیسری لاجواب تصویر "من کی جیت" کمار ٹاکیز میں سلور جوبلی ہفتہ میں داخل ہو رہی ہے۔ دہلی کے علاوہ لاہور میں پہلے جسونت سنیما اس کے بعد نادلٹی ٹاکیز اس کے شہر کے سب سے بہترین سنیما ہال نشاط میں سلور جوبلی منا کر ۲۶ ویں متواتر ہفتہ میں داخل ہو چکی ہے۔ "من کی جیت" شالیمار پکچرز کی پہلی تصویر ہے جسے اس قدر کامیابی اور مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ ڈبلیو۔ زیڈ احمد ایک تعلیم یافتہ ترقی پسند اور روشن دماغ انسان ہیں من کی جیت کی کہانی مسٹر احمد خود کی لکھی ہوئی ہے۔ نغمات اور مکالمات کیلئے مسٹر احمد نے ملک کے سب سے بڑے شاعر جناب جوش ملیح آبادی اور سب سے اعلیٰ ترقی پسند ادیب مسٹر کرشن چندر ایم اے کی خدمات حاصل کیں من کی جیت میں نینا۔ شیام۔ پرکاش۔ تیواڑی۔ راجکماری شکلا۔ سرج بورکر اور گیتا نظامی نے کام کیا ہے۔ ہر اداکار کا انتخاب نہایت موزوں ہے۔

موجودہ تصاویر پر تبصرہ

فلمی خبریں

رتن

جناپ پروڈکشنز کا رومان، مزاح اور موسیقی سے بھرپور شاہکار گذشتہ دس ہفتوں سے ناولٹی سنیما میں عوام کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ "رتن" جیمنی دیوان کی پہلی پیشکش ہے۔ یہ تصویر کاردار کی مہربانی سے کاردار اسٹوڈیوز بمبئی میں تیار ہوئی ہے۔ ایم صادق اصلی۔ اور نوشاد علی کاردار کی خاص عنایت سے اس میں شامل ہوئے ہیں۔ "رتن" میں وہی پرانا خیال پیش کیا گیا ہے کہ دو دل بچپن میں ایک دوسرے کا بن جانے کا تصور باندھتے ہیں۔ مگر عالم شباب پر پہنچنے پر باد مخالف کے جھونکے انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دیتے ہیں۔ گوری کی ایک بڈھے سے شادی ہو جاتی ہے۔ اور گوبند زندگی سے ناامید ہو کر گھر سے غائب ہو جاتا ہے۔ گوری کو جب خبر ہوتی ہے تو گوبند سے ملنے کے لئے اپنی پرانی ملاقات کی جگہ پر آ کر اپنی خاص بولی میں آواز دیتی ہے۔ اور گوبند جو جنگلوں میں چھپا پھرتا ہے۔ آواز سنکر آ جاتا ہے۔ دو ٹوٹے ہوئے دل ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ گوبند زہر والا پان کھا لیتا ہے اور جان دیدیتا ہے۔ اتنے میں گوبند کا باپ آ جاتا ہے اور غصہ میں گوری کا گلا گھونٹتا ہے کہ تم نے میرے لڑکے کی جان لی ہے۔ گوری وہاں سے بھاگ کر سسرال جاتی ہے۔ سسرال پہنچنے سے پیشتر دکھوں میں ہی اپنی جان دیدیتی ہے۔ گوری کا پارٹ سورن لتا نے ادا کیا ہے۔ جو کافی اچھا ہے۔ گوبند کا کردار کرن دیوان ٹھیک طرح ادا نہیں کر سکا۔ کیونکہ ہیرو کے رول کیلئے مردانہ صفت کا انسان ہونا چاہیئے۔ مگر کرن دیوان بالکل برعکس ہے۔ اسکی غلط انتخاب کی وجہ سے زیادہ چمک نہیں سکا۔ بلکہ جگہ جگہ نہایت بھونڈی اداکاری کی ہے گلاب، منجولا۔ بدری پرشاد اور راج کماری شکلا کی اداکاری اپنی اپنی جگہ اچھی ہے۔ گانے اور مکالمے مدھوک کے ہیں۔ موسیقی نوشاد علی کی ہے جو یقیناً قابل تعریف ہے۔ طرزیں نئی اور نہایت سریلی ہیں۔ تمام گانے بہت اچھے ہیں۔ خاص طور پر "انکھیاں سے انکھیاں ملاکر" "جیا بھر ماکر" "چلے نہیں جانا" "البیلا" گلی کوچوں میں بچوں اور بڑوں سب کی زبان پر ہے۔ ہدایات ایم. صادق کی ہیں۔ تصویر کی موسیقی اچھی ہونے کی وجہ سے کافی مقبول ہے اُمید ہے ابھی کافی دنوں نمائش جاری رہے گی۔ مکالمے موزوں اور صاف ستھرے ہیں +

کادمبری

نکستی کا تیار کردہ "کادمبری" گذشتہ سات ہفتوں سے جگت سنیما میں دکھایا جا رہا ہے۔ کادمبری راجہ ہرش کے شاعر دربار "بانا بھٹ" کا دماغی تخیل ہے۔ اور چاند کی محبوبہ کادمبری کی سچی محبت کی ناقابل فراموش داستان محبت ہے۔ اس میں دو حسین رقاصاؤں کی محبت اور عورت کا وہ معیار حسن جس نے دیوتاؤں تک کو غلام بنا دیا اور شراب محبت کے وہ جام جو گندھرب کی دوشیزہ رقاصاؤں نے جنت کے اچھلتے ہوئے فوارہ کے سایہ میں اپنے محبوبوں کو پلائے۔ اور خود ہستی کا زبردست اثر جس نے انسان کو فرشتہ اور فرشتہ کو انسان بنا دیا پیش کیا گیا ہے۔ کادمبری ایک کلاسیکل تصویر ہے۔ کادمبری کا کردار شانتا آپٹے نے ادا کیا ہے اسکے ساتھ ونن مالا ہے اور مردانہ رول پہاڑی سانیال اور ہرنشی نے ادا کیا ہے۔ جیون کی اداکاری بھی اچھی ہے۔ مذہبی تصویر ہونے کی وجہ سے زبان ٹھیٹھ ہندی ہے۔ جسے عوام سمجھنے میں ذرے دقت محسوس کرتے ہیں۔ مناظر نہایت دلفریب پیش کئے گئے ہیں۔ عکاسی، صدابندی اور موسیقی بہت اچھی ہے۔ جگہ جگہ دلکش رنگین رقص دکھائے گئے ہیں۔ جو قابل تعریف ہیں۔ ہدایات نند لال جسونت لال کی ہیں ❊

چاند

پربھات کے "چاند" کو رٹز سنیما میں نمائش کیلئے پیش کر دیا گیا ہے بیگم پارہ پہلی مرتبہ پردۂ فلم پر آئی ہے اور وہ بھی ایک سکھ کی سیدھی لڑکی بن کر۔ "چاند" ایک عامیانہ قسم کی پروپیگنڈہ تصویر ہے۔ پریم ادیب نے بہت بن کر اداکاری کی ہے۔ بالک رام کا کام بہت اچھا ہے۔ خاص طور پر اسکا "تایا ہو اگا"۔ "دونوں کو دنیا ملنے نہیں دیتی" بہت مقبول ہوا ہے۔ "چاند" کے مکالمے اور گانے قمر جلال آبادی کے ہیں۔ اور ہدایات کشیپ کی ہیں۔ ستارہ اور سپرو کا کام بھی اچھا ہے۔ عکاسی اور صدابندی حسب معمول ہے۔

چاند میں "پربھات" اور بیگم پارہ کی کشش ہے جس کی وجہ سے سینما کی کھڑکیوں پر کھیل شروع ہونے سے کافی دیر قبل بھیڑ لگ جاتی ہے۔ میسرز ستارہ فلمز نے "چاند" کی نشر و اشاعت خاص محنت سے کی ہے جو قابل داد ہے۔

راج کمل کلامندر

دی شانتارام کی بین الاقوامی شہرت حاصل کرنے والی تصویر "ڈاکٹر کوٹنس" بڑی تیزی کے ساتھ تیار ہو رہی ہے۔ راج کمل سٹوڈیو میں سیٹ پر جانے کی سخت ممانعت ہے۔ پچھلے دنوں جس وقت ڈاکٹر کوٹنس کا اپنی والدہ سے الوداع ہونے کا منظر فلمبند کیا گیا تو سیٹ پر جو کارکن موجود تھے ان کا بیان ہے کہ اس قدر منظر قدرتی اور جذباتی تھا کہ شانتارام بھی منظر کے فلم بند ہو جانے کے دو گھنٹہ بعد تک روتے رہے۔ ڈاکٹر کوٹنس کا کردار مسٹر شانتارام خود ادا کر رہے ہیں۔ اور ڈاکٹر کی والدہ کا کردار پرتیما دیوی کے سپرد ہے۔ اور جے شری ایک چینی دوشیزہ کے روپ میں پیش ہو رہی ہیں۔ مسٹر شانتارام کو لہاپور سے چند بیرونی مناظر فلم بند کرنے کے بعد واپس بمبئی آ گئے ہیں۔ اور اندرونی فلم بندی شروع کر دی ہے۔ ڈاکٹر کوٹنس کی کہانی خواجہ احمد عباس کے One who did not come back سے اخذ کی گئی ہے۔ راج کمل کلامندر ان دنوں چینی کلامندر معلوم ہو رہا ہے۔ کیونکہ اب چین کے مناظر کی بھی فلم بندی ہو رہی ہے۔ اس وجہ سے وہاں کے لوگوں کے لباس کے مطابق اداکار لباس پہنے پھرتے نظر آتے ہیں۔ امید ہے یہ تصویر ستمبر کے آخر تک ختم ہو جائے گی۔ شانتارام پہلی مرتبہ اپنی تصویر میں اتنا اہم رول ادا کر رہے ہیں۔ اور اسے کامیاب بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر کوٹنس مسٹر شانتارام کی خواہشات کے مطابق کامیاب ہو گی۔ ہندوستان میں اچھی سے اچھی تصویر بھی نشر و اشاعت کم ہونے کی وجہ سے ناکام ہو جاتی ہے۔ مسٹر شانتارام جہاں اتنی محنت اور کوشش کر کے تصویر تیار کر رہے ہیں۔ وہاں انہیں ذرا نشر و اشاعت کی طرف بھی دھیان دینا چاہیئے۔ تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مسٹر شانتارام کی محنتوں پر نشر و اشاعت کی کمی کی وجہ سے پانی پھر جائے۔

کاردار پروڈکشنز

"سنیاسی" عالمگیر کے نئے بعد سے کاردار نے ہمیشہ ہر تصویر میں نئی چیز پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ "سنیاسی" کی کہانی بالکل نئی قسم کی ہے۔ اس میں نسیم غلام محمد۔ امیر۔ نسیم ثانی۔ معرا ور شیام کمار نے کام کیا ہے۔ ہدایت کاردار خود کی ہے۔

شاہجہاں کی تیاریاں بڑے زور شور سے ہو رہی ہیں۔ ان دنوں کاردار شاہجہاں کو کامیاب بنانے کے لئے اپنا تمام وقت صرف کر رہے ہیں اداکاروں کا انتخاب زیر غور ہے۔ اس ہفتہ کے آخر تک اعلان ہو جائیگا شاہجہاں کے گانے اور مکالمے کمال امروہوی نے لکھے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ شاہجہاں کی کہانی اچھوتے انداز سے لکھی گئی ہے۔ اس سے قبل اس قسم کی کہانی پردۂ فلم پر کبھی پیش نہیں کی گئی ہے۔

گیت قریب الاختتام ہے۔ گیت ایک پروپیگنڈہ تصویر ہے جس میں قحط کے مسئلہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چونکہ اس وقت اس مسئلہ کو بڑی اہمیت دی جا رہی ہے۔ اس وجہ سے گیت بروقت تصویر ہوگی۔ اور عوام میں مقبول ہو گی۔ "گیت" میں ساہو مودک۔ نرملا۔ شاکر۔ اے شاہ۔ امیر علی۔ چند آبائی۔ دریا۔ شرما۔ سید احمد اور علاء الدین نے کام کیا ہے اسے کاردار کے لفٹننٹ جنرل سنی نے فلم بند کیا ہے۔

منروا مووی ٹون

ایک دن کا سلطان نہایت سرعت کے ساتھ تکمیل کے مراحل طے کر رہا ہے۔ مہتاب اور واسطی نہایت اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ہدایات سہراب مودی خود کی ہیں۔

سنٹرل سٹوڈیوز

ساتھی اور شمع قریب الاختتام ہیں۔ دونوں تصویروں میں مہتاب اور واسطی کام کر رہے ہیں۔ "ساتھی" سہراب مودی کی مدد سے مہتاب پیش کر رہی ہیں۔ اس سے پیشتر مہتاب صرف اداکارہ تھی۔ مگر اب پروڈیوسر بھی بن گئی ہے "شمع" ایس فضلی کے زیر ہدایت تیار ہو رہی ہے۔

یتیم جوبلی ٹاکیز میں دکھایا جا رہا ہے۔ یعقوب کا بیان ہے کہ یتیم اسکی زندگی کی احسن تصویر ہے۔ اسے ضیا سرحدی نے تیار کیا ہے۔ اس میں یعقوب۔ چندر پربھا۔ اودے کمار نے کام کیا ہے۔

محبوب پروڈکشنز

ہمایوں بمبئی میں نمائش کے لئے پیش کر دیا گیا ہے۔ جہاں اسے غیر معمولی کامیابی حاصل ہو رہی ہے۔ "ہمایوں" کا دہلی میں بڑی بے چینی سے انتظار کیا جا رہا ہے

میسرز منوہرمن پکچرز کے پاس اشتہارات اور مزید تفصیلات آگئی ہیں اور نشرواشاعت شروع کر دی گئی ہے۔ عنقریب کسی اچھے سینما میں نمائش شروع ہو جائیگی۔ "ہمایوں" میں اشوک کمار۔ وینا۔ نرگس۔ چندر موہن۔ شاہ نواز اور مجید نے کام کیا ہے۔ کہانی آغا جانی کاشمیری۔ گانے پروفیسر رفعت مراد آبادی۔ عکاسی فریدوں ایرانی اور موسیقی ماسٹر غلام حیدر کی ہے ہدایات محبوب اعظم خود کی ہیں۔

ایک اور تصویر کے لئے رنگینی کی خدمات حاصل کر لی گئی ہیں۔ دیگر اداکاروں کا انتخاب زیر غور ہے۔ عنقریب تصویر اور دیگر اداکاران کا اعلان کر دیا جائے گا۔

فیمس پکچرز "پھول" بمبئی میں پیش کر دیا گیا ہے۔ آمدہ اطلاعات تسلی بخش ہیں۔ "پھول" [illegible] سالہ کے [illegible] کی پہلی تصویر ہے۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ بہترین اصلاحی تصویر ہے۔ "پھول" میں پرتھوی راج۔ ثریا۔ وینا۔ یعقوب۔ ایم اسمٰعیل۔ کے این سنگھ۔ درگا کھوٹے نے کام کیا ہے۔ کہانی۔ مکالمے کمال امروہوی کے ہیں۔ موسیقی ماسٹر غلام حیدر کی ہے۔ "پھول" کے لئے لاہور کے کیپیٹل سینما نے ایک لاکھ روپیہ پیش کیا ہے۔ ان اطلاعات کے پیش نظر اندازہ لگایا جا رہا ہے کہ "پھول" لاجواب تصویر ہوگی۔ آئندہ تصویر کا نام ہے "فرعون" فرعون مصر کا نہایت مغرور حکمران تھا۔ جو اپنے آپ کو خدا کہا کرتا تھا۔ اس کے ظلم و ستم کی انتہا نہ تھی۔ اداکاران کا انتخاب زیر غور ہے۔ فی الحال غلام محمد کا نام سننے میں آیا ہے۔ اگر ہیروئن کا انتخاب نورجہاں کا ہوا تو لازمی طور پر شوکت حسین کی ہدایت میں تیار ہوگی۔ ورنہ یوسف "آئینہ" کے شہرت یافتہ فریدوں "کو ڈائریکٹ" کرے گا۔ تیار کوئی شخص بھی کرے مگر کارکنان کمپنی کو چاہیئے کہ اداکاران کے انتخاب میں نہایت عقلمندی سے کام لیں۔ اور ہدایات کسی ایسے ڈائریکٹر کے سپرد کریں جس کی علمی معلومات کافی وسیع ہوں۔ کیونکہ اس مضمون میں کافی گنجائش ہے۔ بجائے اسے تفریحی تصویر بنانے کے نہایت اہم قومی پیغام عوام کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔

اسٹینڈرڈ پکچرز جاگیردار کولہاپور سے بیرم خاں کے بیرونی مناظر فلما کر واپس بمبئی آگئے ہیں۔ اب نہایت تیزی کے ساتھ اندرونی مناظر فلم بند ہو رہے ہیں۔ "بیرم خاں" "اکبر اعظم" کا اتالیق تھا۔ یہ امر باعث خوشی ہے کہ اتنے بڑے آدمی کی زندگی کی کہانی [illegible] شجاع جیسے لائق اور قابل انسان نے تحریر کی ہے۔ اور نہیں امید ہے کہ اسے سراسر تفریحی نہیں بنا دیا ہوگا۔ بلکہ اس عظیم المرتبت شخصیت کے خیالات کو درست طریقہ سے پیش کیا ہوگا۔ مکالموں میں کمال امروہوی نے جان ڈال دی ہے۔ موسیقی ماسٹر غلام حیدر نے پیش کی ہے۔ اداکاروں میں مہتاب۔ جاگیردار۔ غلام محمد۔ ڈیوڈ۔ سریش اور شاہ نواز جیسے ستارے کام کر رہے ہیں۔

پنچولی آرٹ پکچرز "کیسے کہوں" ایک سوشل فلم نمائش کیلئے تیار ہے۔ اس میں پران، نجم، راگنی۔ اختر اور اقبال نے کام کیا ہے۔ ہدایت موتی گڈوانی کی ہے۔

[illegible] دوسرے "دھمکی" نامی تصویر کو سرعت تمام ختم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ "دھمکی" سید امتیاز علی تاج کی اپنی پہلی پیشکش ہے۔ اس کی کہانی، مکالمے اور منظرنامہ تاج نے خود لکھے ہیں۔ پنچولی کا پورا عملہ تاج کی مدد کے لئے تیار ہے۔ اور تاج کی کوشش ہے کہ "دھمکی" ایک بہترین تصویر ثابت ہو۔ "دھمکی" میں الناصر۔ راگنی۔ سمرتی اور مینا نے کام کیا ہے۔

"شیریں فرہاد" ہر جگہ کامیابی کے ساتھ چل رہی ہے۔ لاہور اور بمبئی میں کافی مقبول ہو رہی ہے۔

رام نرائن دوبے "پگڈنڈی" کی تیاریوں میں مشغول تھے۔ دو تصویروں کی کہانی لکھی جا چکی ہے۔ عنقریب نام کا اعلان کر دیا جائے گا۔

ایسٹرن پکچرز "زینت" نمائش کیلئے بالکل تیار ہے۔ "زینت" ایک بلند پایہ سوشل تصویر ہے۔ شوکت حسین نے قہقہوں کے سمندر، آنسوؤں کی گھٹائیں اور کہکشاں کی رنگینی کو ایک جا کر دیا ہے۔ کہانی و مکالمے وجاہت مرزا چنگیزی اور گانے ماہر القادری اور انجم پیلی بھیتی کے ہیں۔

معلوم ہوا ہے کہ پچھلے دنوں کسی مقامی مشاعرے میں نخشب جارچوی نے اپنی کچھ غزلیات پڑھیں۔ اس مشاعرے میں شوکت حسین بھی موجود تھے۔ انہیں یہ غزلیں بہت پسند آئیں اور انہوں نے معقول رقم دیکر انہیں خرید لیا۔ اور "زینت" میں ان غزلوں کا اضافہ کر دیا ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ "زینت" کی موسیقی "خاندان" اور "دوست" سے کسی حالت میں کم نہیں ہوگی۔ میر صاحب اور حفیظ خاں نے کئی اور سریلی طرزیں پیش کی ہیں۔ اداکاروں میں نورجہاں کے علاوہ یعقوب۔ ہیرو۔ کرن دیوان۔ شاہ نواز۔ سلیم رضا۔ جگو اور مجید نے کام کیا ہے۔

رنجیت فلم کمپنی
"شبنم" - "چاند چکوری" - "دھنا بھگت" اور "ممتاز" نمائش کیلئے تیار ہے۔ "بھرتی ہری" بمبئی میں نمائش کے لئے پیش کردیا گیا ہے۔ "بھرتی ہری" میں ممتاز شانتی اور سریندر نے کام کیا ہے۔ "ممتاز" جس کی کہانی منشی دل لکھنوی اور گلنے ولی صاحب کے ہیں۔ اور ہدایات کیدار شرما کی ہیں۔ نادلٹی سنیما کا آئندہ پروگرام ہے۔

فضلی برادرز
"دل" قریب الاختتام ہے "عصمت" ہر جگہ کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ دہلی میں لکھنؤ ٹاکیز کا آئندہ پروگرام ہے۔ "عصمت" میں مہتاب۔ نرگس۔ سندر بکر۔ غوری اور بدھو اڈوانی نے کام کیا ہے "عصمت" میں پردہ کے مسئلہ پر بحث کی گئی ہے۔ غوری کا یہ مزاحیہ جملہ کہ "پہلے بیوی شوہر کا انتظار کرتی تھی اور اب شوہر کو بیوی کا انتظار کرنا پڑ رہا ہے۔" سنکر آپ لوٹ پوٹ ہو جائیں گے۔ ہدایات فضلی کی ہیں ؞

سن رائز پکچرز
"ماں باپ" اور "گھر سنسار" کے شہرت یافتہ ڈبا سس "گھر" نامی تصویر تیار کر رہے ہیں۔ "گھر" میں نواب۔ جمنا اور یعقوب نے کام کیا ہے۔

شوری پکچرز
شالیمار نمائش کیلئے تیار ہے "شالیمار" میں بیگم پارہ منورما۔ چندر موہن۔ پرمیلا۔ الناصر اور مجنوں نے کام کیا ہے۔

اب شوری "عمر خیام" کی تیاریوں میں مشغول ہیں۔ کاغذی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اور اداکاران کا انتخاب بھی زیر غور ہے۔

نیو انڈیا پکچرز
ڈاکٹر ٹیگور کے ناول گورا سے اخذ کی ہوئی کہانی "پہچان" کو ہندستان کے مایۂ ناز ہدایت کار بروا فلم بند کر رہے ہیں۔ "مہمان" کی موسیقی کمل داس گپتا کی ہے۔ اداکاروں کا اعلان نہیں ہوا۔

پربھات فلم کمپنی
"چاند" جسکا ایک عرصے انتظار تھا۔ دہلی میں نمائش شروع ہوگئی۔ چاند میں بیگم پارہ۔ پریم ادیب۔ ستارہ سیرو۔ اور بالا رام نے کام کیا ہے۔

"ہم ایک ہیں" نمائش کیلئے تیار ہے۔ ان کے زیر تکمیل تصویر "لکھا رتی" قریب الاختتام ہے۔

آچاریہ آرٹ پروڈکشنز
این۔ آر۔ آچاریہ اس سے قبل کنگن۔ بندھن کنوارا باپ اور آگے قدم جیسی کامیاب تصویریں پیش کر چکے ہیں۔ زیر تکمیل فلم کا نام ہے "شطرنج"۔ شطرنج میں لیلا چٹنس۔ کرشنا کمار۔ بابا برجی اور سنیترا جیسے اداکاروں نے کام کیا ہے۔ ہدایات آچاریہ خود کی ہیں۔

وشنو سینے ٹون
"مہاکوی کالی داس" نمائش کیلئے تیار ہے۔ بمبئی میں کافی سے زیادہ کامیابی حاصل کر چکا ہے۔ "کالی داس" میں پہاڑی سانیال۔ ونمالا۔ سنیہہ پربھا۔ پردھان۔ الیاس اور ڈیوڈ نے کام کیا ہے۔

فلم انڈیا کے ایڈیٹر مسٹر بابو راؤ پٹیل کی "درو پدی" بمبئی میں ناکامی کا منہ دیکھکر شمالی ہندستان میں نمائش کے خواب دیکھ رہی ہے۔ "درو پدی" میں مسٹر پٹیل کی منظور نظر و سکریٹری مس سوشیلا رانی یا بالفاظ دیگر تعلیم یافتہ ایکٹرس نے درو پدی کا پارٹ ادا کیا ہے۔ دیکھیں کتنا عرصہ ڈبوں میں بند رہنے کے بعد یہ تصویر فلم "نکھٹو" کی طرح بردہ فلم پر کتنے دنوں کیلئے پیش ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ "ڈیو کنیا" ایک کلاسیکل تصویر نہایت سرعت کے ساتھ فلم بند ہو رہی ہے۔

نیو تھیٹرز
"وصیت نامہ" اور "ہمراہی" قریب الاختتام ہیں۔ عنقریب ہندستان کے بڑے بڑے شہروں میں نمائش شروع ہو جائیگی وصیت نامہ میں بھارتی۔ اشیت برن۔ سمترا اور آہین چودھری نے کام کیا ہے۔

سڑک پر چلتے چلتے

سڑک پر دو آدمی آپس میں موجودہ فلموں پر بات چیت کرتے ہوئے جا رہے تھے۔ ایک بولا "یار معلوم نہیں اب دہلی کی پبلک کا مذاق کیسا ہو گیا ہے ٹریجڈی فلمیں بہت مقبول ہو رہی ہیں۔ دیکھو کمار میں "من کی جیت"۔ نادلٹی میں "رتن" کھتہ میں "جیون" تینوں تصویریں ٹریجڈی ہیں۔ تھیٹر کا یہ عالم ہے کہ ذرا دیر سے پہنچے اور ناکام ہو کر واپس آنا پڑا"۔ دوسرا بولا "ہاں یار۔ بات تو یہی ہے حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو ٹریجڈی میں ہی مزا ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی کی بذات خود ٹریجڈی ہے"۔

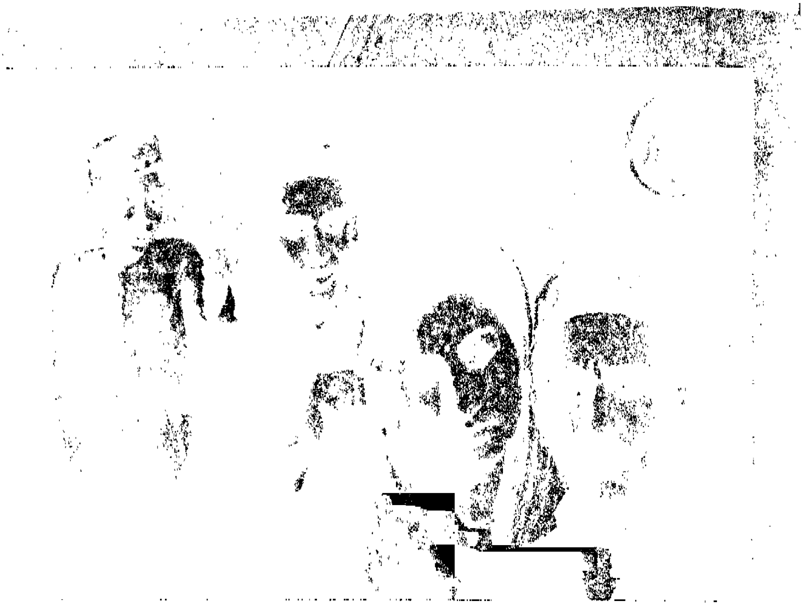
ابھی یہ بات کر ہی رہے تھے کہ سڑک پر سے ایک ٹانگے والا بلند آواز سے یہ گاتا ہوا گزرا "مورے جوبنا کا دیکھو ابھار پاپی۔ جوبنا کا دیکھو ابھار" اس کے پیچھے پیچھے دوسرا ٹھیلے والا گاتا ہوا جا رہا تھا "اکھیوں سے اکھیاں ملا کے جیا بھرما کے چلے نہیں جانا"۔ اس کے فوراً بعد ایک رکشا والا یہ گنگناتا ہوا سنائی دیا "چھوڑ چلے پردیس پریتم پیارا۔ اب دنیا میں کون ہمارا"۔ ان سب کو سن کر میں فوراً سمجھ گیا کہ "رتن" - "من کی جیت" اور "جیون" کی کامیابی اور مقبولیت کا کیا راز ہے ؞

کفایت شعاری سے قلتوں کو رفع کیجئے!

غریبوں کی مدد کرنے کیلئے آج کل ہم سب سے بہت سی چیزوں کے استعمال میں کمی کر دینی چاہیئے۔ اگر آپ چیزیں کم صرف کرینگے تو یہ اُن لوگوں کیلئے زیادہ مقدار میں مہیا ہو سکیں جنہیں واقعی انکی شدید ضرورت ہے۔ آپ رفو کی ہوئی قمیص اور پیوند لگا ہوا جوتا پہن کر بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ ان دنوں سادگی پسندی اور جزرسی عین رواداری اور حُب الوطنی کا ثبوت ہے۔ اس سے ایک فائدہ اور بھی ہے پُرانی چیزوں سے کام چلائیے اور ہر چیز کے استعمال کے معنی ہیں زائد بچت۔ قیمتیں گھٹیں گی تو آپکے پاس خرچ کرنے کیلئے زیادہ روپے موجود ہونگے مرمت کرا کے کام چلائیے جب کبھی آپ سادگی اور کفایت سے کام لیں تو آپکا روپیہ بچتا ہے۔ اِس طرح روزانہ تھوڑی بہت کفایت برت کر آپ ہفتوں، مہینوں میں کافی روپیہ بچا سکتے ہیں۔ اور آج کل جزرسی سے کام لینا آپ کا فرض ہے۔ کیونکہ ضروری سامان کی کمی ہے۔ اگر آپ ضرورت سے زیادہ خرید لیں گے تو غریبوں کو میسر نہیں آسکتا۔ کفایت شعاری کو اپنا فرض سمجھکر اپنے ملک کی مدد کریں۔ اور خود بھی مالی فائدہ اُٹھائیں۔

کفایت شعاری سے قلتوں کو رفع کیجئے۔

قومی جنگی محاذ کی پُر زور قومی درخواست



"پربھات" کے فلم "چاند" کی چار خاص اداکار



"راجہ بھرتری" فلم میں ممتاز شانتی

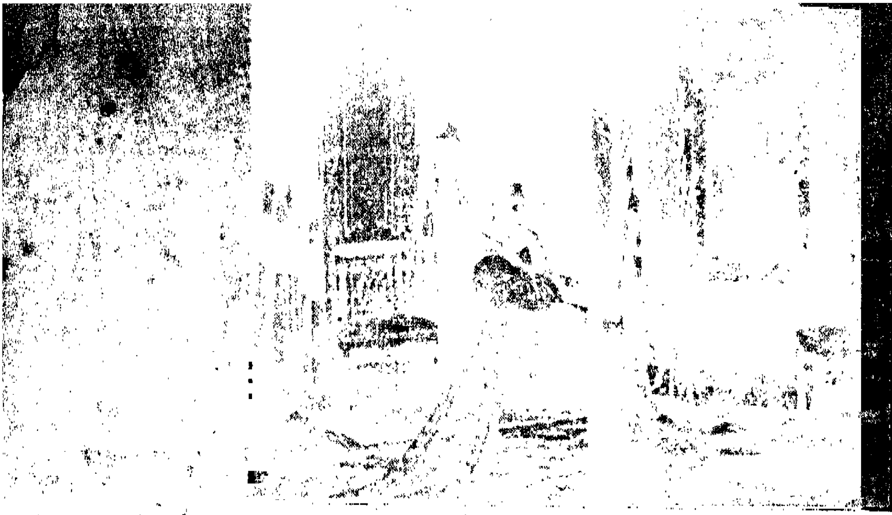
THE ADEEB

DELHI.

1. It is a purely literary monthly Magazine of high standing.
2. It is published regularly on the tenth of each month
3. Annual subscription of the Adeeb is Rs. 10/- only; single copy Rupee one.
4. The Adeeb is posted with great care but if you don't get a copy by the 15th. please write to the office at once. If available, an extra copy will be sent to you again. Complaints received after the 18th will not be attended to.
5. All communications should be addressed to the Editor.
6. Free or sample copies of the Adeeb are not sent. For a sample copy always send the necessary stamps in advance.
7. Contributions not published in the Adeeb can be returned on receipt of the necessary stamps.
8. Always send extra stamps for a reply.
9. The Adeeb is not issued for less than a year.

Printed at Dayals' Printing Press, Chandni Chowk, Delhi
Edited by Fazl-ud-din Ahmed M.A. and M. L. Wahidi & Published from the office of the Adeeb, Chandni Mahal, Delhi.





فلم 'شالیمار' میں چندر موہن



نینا - فلم ''من کی جیت'' میں



... سالانہ ... روپے علاوہ محصول ڈاک

قیمت فی کاپی ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ادیب

ایڈیٹرز:- سید محمد ارتضی واحدی — فصیح الدین احمد ایم، اے

جلد ۹ | اگست ۱۹[illegible]ء | نمبر ۲

فہرست مضامین

(فصیح الدین احمد پبلشر نے دیال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر دفتر "ادیب" چاندنی چوک دہلی سے شائع کیا)

نئی کتابیں

(از فصیح الدین احمد ایم، اے)

شب تاب مصنفہ اسرار الحق مجاز بی، اے (علیگ)
شائع کردہ ہندستانی پبلشرز ۔ دلّی
قیمت دو رُوپے (عـ۲)

جن حضرات نے مجاز صاحب سے ذاتی ملاقات کی مسرت حاصل نہیں کی ہے ۔ اور وہ صرف ریڈیو اور رسائل کی معرفت اُن کے کلام اور اُن کی ادبی شخصیت سے واقف ہیں ان میں سے بہتوں کو نہایت آسانی کے ساتھ یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ اس کلام کا مصنّف ایک جواں ہمت اور غیر معمولی حد تک شوخ وطرار ، اور کسی حد تک گستاخ سا بے باک نوجوان شاعر ہے لیکن جو لوگ ان کی خاندانی روایات اور ان کے ادبی وعلمی ارتقاء سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں اور سمجھتے بھی ہیں کہ ؎

کئی معشوق ہیں اِس پردۂ زنگاری میں

زیر نظر کتاب ان کا تیسرا مجموعہ کلام ہے جو اپنی تمام امکانی حسن و جمال کے ساتھ اس وقت عوام وخواص کی نظر کے سامنے ہیں ۔ مجاز کو محض اشتراکی شاعر سمجھ لینا ایک خطرناک ادبی مغالطہ ہوگا ۔ اس کے آرٹ ، اسکی تکنیک اس کی شعری لطافت ، اس کے خناؔئی دفور ، اس کی رنگینی اور شوخی کی جڑیں اس خاک پاک میں بہت دُور تک تلاش کرنی پڑیں گی ۔ ہوسکتا ہے کہ ہندستان کے علاوہ سمرقند و بخارا اور پھر شیراز واصفہان تک کے "شانے" اس کے شعر میں رقص فرما نظر آئیں ۔ اس کی اشتراکیت ایک قسم کی جمالی اشتراکیت ہے ۔ اس کی سرمایہ داری میں **Dianas** کی وحشتناکی اور اس کی محبوبہ مریم کی جمالی لطافت ، اس کے محبوب میں ترکِ شیراز کی رعنائیاں ، اس کے رقیب میں بلاکتِ ازلی کی دردانگیزیاں اس کے ناصح میں شدت پسند ملاؤں کی سادہ لوحیاں اور پاکبازیاں ، اس کی "پجارن" میں کم سنی کی سادگی اور اس کی "خاتونِ مشرق" میں ایک ملکوتی جمال اپنے پُورے وقار اور اپنی پُوری عظمت کے ساتھ نور افشاں ہے۔

وہ بلاشبہ اس دور کے ترقی پسند شعراء میں بہت کافی محبوب ومقبول شاعر ہے ۔ اس کی نظم "نورا" "نرس" ایک کاشناتی شوخی ورعنائی کی حامل ہے ۔ اس کی شعری قبولیت کے ثبوت میں خود شاعر کی معزز ترین خاتون ؟ کا ایک جملہ نقل کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا ۔ کہ مجاز مسلم خواتین کا پہلا صحت مند اور تندرست شاعر ہے ! وہ غالباً تخیلی طور پر امرؤالقیس اور حافظ کی خشک وشاداب وادیوں کے درمیان کوئی نئی وادی تلاش کر رہا ہے ۔ ہماری دُعا ہے کہ اس کا یہ خواب پُورا ہو۔

زیر نظر کتاب میں گروپ شن کا تخیل ، کرنل فیض اور سید سجاد ظہیر جنرل سکریٹری آل انڈیا ترقی پسند مصنّفین کی تقریظیں بھی اپنی مخصوص بصارت رکھتی ہیں ۔ ہمیں یہ سنکر مزید مسرت ہوئی کہ اُن کے اشعار کا دیگر مختلف زبانوں میں بھی ترجمہ ہو رہا ہے ؏

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

شیخ چلی نے لائبریری بنائی

(از حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب مدظلہٗ)

آج ہماری چھوٹی بیوی نے کہا۔ "تم نے وعدہ کیا تھا کہ تم میرے نام "سلیقہ بیگم لائبریری" دہلی میں قائم کروگے۔ مگر ایک برس ہوگیا۔ پھر تم نے کبھی لائبریری کا نام بھی نہیں لیا۔" ہم نے کہا "تم جانتی ہو کہ ہم ساری دُنیا کے لیڈر ہیں۔ ہم کو اس ایک سال میں امریکہ جانا پڑا۔ روس جانا پڑا۔ برلن جانا پڑا۔ اور پھر ہندستان کے بیشمار کام بھی ہمارے ذمہ ہیں۔ دلّی کے نہاری والوں کی، حلوائیوں کی، کبابیوں کی، شربت والوں کی دُکانوں کی صفائی کا انتظام بھی ہم ہی نے کیا۔ اور یہ بھی تم جانتی ہو کہ جب ہماری پالیسی کے موافق شملہ کانفرنس ختم ہوگئی تو ہم نے اس خوشی میں پتنگ بازی کے پانچ پیچ لڑائے۔

پہلا پیچ وائسرائے سے ہوا۔ دوسرا پیچ گاندھی جی سے ہوا۔ تیسرا پیچ مولانا ابو الکلام آزاد سے ہوا۔ چوتھا پیچ پنڈت جواہر لال نہرو سے ہوا اور پانچواں آخری پیچ مسٹر جناح سے ہوا۔ اور اس کے بعد ہی ہم کو لندن جانا پڑا۔ اور ہم نے مسٹر ایمرے اور مسٹر چرچل کے مخالفوں کو لفظاً، معناً، اشارتاً، کنایتاً اور سب طرح مدد دی۔ اگرچہ مسٹر چرچل برلن سے ہمارے نام ٹیلیفون بھیجتے رہے اور ہوٹل والا دوڑ دوڑ کر ہمارے پاس آتا تھا کہ مسٹر چرچل ٹیلیفون پر ہیں اور آپ کو سلام دیتے ہیں۔ مگر ہم نے ہر دفعہ یہی کہا: "آئی کین ناٹ کم" ہم نہیں آسکتے کیونکہ ہمارا لیبر پارٹی سے سمجھوتہ ہوگیا ہے۔

مسٹر ایمرے بھی ہمارے پاس آئے اور کہا۔ میرے لڑکے کو حوالات میں بند کر رکھا ہے۔ میں وزیر ہندستان ہوں۔ ذرا پارلیمنٹ کے ممبروں سے سفارش کر دیجیے کہ وہ اس کو رہا کر دیں۔ ہم نے مسٹر ایمرے سے بھی کہدیا "نو۔ نو"۔ ایسا نہیں ہوسکتا۔ تم نے ہندستان کیلئے کچھ نہیں کیا۔ ہم تمہارے بیٹے کے لئے کچھ نہیں کریں گے۔

آخر ہم کامیاب ہوئے یعنی ہم نے لیبر پارٹی کو کامیاب کرادیا۔ اور مسٹر چرچل اور مسٹر ایمرے ہاتھ ملتے رہ گئے۔ اور ہم لندن سے دلّی میں واپس آگئے۔ مگر پیاری! یقین ماننا جب تک ہم لندن میں رہے ہم کو اپنی چاروں بیویاں یاد آتی رہیں۔" یہ سُنکر چھوٹی بیوی نے کہا۔ "بالکل غلط ہے۔ تم ہندستانی ہو اور لندن جاکر کوئی ہندستانی بھی اپنی بیوی کو یاد نہیں رکھتا۔ مگر تم ان بے تعلق باتوں میں لائبریری کی بات کو نہ ٹالو۔ میں تو تم سے لائبریری بنوا کر رہوں گی۔ اور میں نے آج سویرے بڑی بیوی سے بھی کہدیا ہے اور منجھلی سے بھی اور سنجھلی سے بھی۔ کہ اگر شیخ صاحب نے "سلیقہ بیگم لائبریری" نہ بنوائی تو آج سے میں روٹی کے ساتھ سالن کھانا چھوڑ دونگی۔ روکھی روٹی کھایا کرونگی۔"

چھوٹی بیوی کی یہ بات سُنکر ہم کو ہنسی آگئی۔ اور ہم نے کہا۔ اگر تم چاروں دال سالن کھانا چھوڑ دو تو ہمیں بہت فائدہ ہو۔ ساڑھے چار روپے سیر کا گھی خریدنا پڑتا ہے۔ ڈیڑھ روپے سیر کا گوشت خریدنا پڑتا ہے۔

چھوٹی بیوی نے بات کاٹ کر کہا "بس بس زیادہ باتیں نہ بناؤ۔ ابھی بیٹھو اور لائبریری قائم کرنے کا تخمینہ لکھواؤ۔" اور کچھ اس طرح چھوٹی بیوی نے یہ بات کہی کہ ہمارا دل موم کی طرح پگھل گیا۔ اور ہم میز کے سامنے کرسی پر جا بیٹھے اور سلیقہ بیگم سے کہا۔ لاؤ قلم دوات اور کاغذ لاؤ۔ اور لکھو جو کچھ کہ ہم لکھواتے ہیں۔ چھوٹی بیوی فلسکیپ کاغذ اور چینی قلم لیکر آگئیں اور ہمارے سامنے میز پر لکھنا شروع کیا۔

ہم نے یہ عبارت لکھوانی شروع کی۔

اما بعد۔ یہ پروگرام ہے قیام کا واسطے سلیقہ بیگم لائبریری دہلی کے۔ جو قائم کی جائیگی۔ ہماری چھوٹی بیوی سلیقہ بیگم کے نام نامی اور اسم گرامی پر۔ اور ہوں گی اس لائبریری میں کتابیں زبان عربی کی۔ اور زبان سنسکرت کی۔ اور زبان ژند کی جو بولی جاتی تھی ایران میں آج سے پانچ ہزار برس پہلے۔

سلیقہ بیگم اتنی عبارت لکھنے کے بعد کہا "اے واہ! سبحان اللہ!! یہ ہندستان ہے یا عرب؟ یہاں عربی زبان کی کتابیں کون پڑھے گا۔ اور سنسکرت زبان کون پڑھے گا؟ اور ژند زبان کون پڑھے گا؟" ہم نے کہا لائبریری کی کتابیں پڑھنے کے لئے نہیں ہوتیں۔ دیکھنے کیلئے ہوتی ہیں۔ اور اس لئے ہوتی ہیں کہ اخباروں میں یہ خبر چھاپی جائے کہ فلاں لائبریری میں ایسی نایاب اور پرانی کتابیں موجود ہیں۔ جن کے پڑھنے والے اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں یعنی مرچکے ہیں۔"

یہ بات سُنکر سلیقہ بیگم آپے سے باہر ہوگئیں اور اُنہوں نے کاغذ اُٹھا کر ہمارے اوپر پھینک دیا اور کہا۔ "صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تم کو لائبریری بنانی نہیں ہے۔ میں تو اپنی لائبریری میں فقط ایسی کتابیں جمع کرنی چاہتی ہوں جو عورتوں کے لئے مخصوص ہوں اور اُردو زبان میں ہوں۔"

ہم نے کہا "عورتیں تو آج کل ناول چاہتی ہیں۔ پُرانے قصّے کہانی کی کتابوں سے اُن کو نفرت ہوگئی ہے۔ یا تعویذ گنڈوں کی کتابیں چاہتی ہیں۔ یا سینما کے گانوں کی کتابیں چاہتی ہیں۔ اور ہم عورتوں کے اس شوق کے بہت سے پُرانے حالات بھی جانتے ہیں۔ جب ہم اکبر بادشاہ کے مصاحب تھے تو ایک دن اکبر بادشاہ کی بیگم سلیمہ سلطان نے پیغام بھیجا کہ "بیتال پچیسی" کہانی کا جو ترجمہ مُلّا عبدالقادر بدایونی کر رہے تھے اس کو میں پڑھنا چاہتی ہوں"۔ اکبر بادشاہ نے ہم سے کہا۔ "ابھی ابوالفضل اور فیضی کے پاس جاؤ اور پوچھو کہ ہم نے بدایوں والے جوان کو بیتال پچیسی کا ترجمہ کرنے کا حکم دیا تھا۔ وہ ترجمہ پُورا ہوگیا ہو تو ابھی سلیمہ سلطان بیگم کے پاس بھیج دیا جائے"۔ ہم نے اکبر بادشاہ سے کہا۔ "مُلّا عبدالقادر بدایونی کو حضور نے ہزار بیگھے زمین عطا فرمائی تھی۔ وہ اپنے گھر چھٹی لیکر گیا ہوا ہے"۔

ہماری بات پُوری نہ ہونے پائی تھی کہ ابوالفضل اور فیضی بھی وہاں آگئے۔ بادشاہ نے ان دونوں سے مُلّا عبدالقادر بدایونی کا حال پوچھا۔ اُن دونوں نے کہا اُس نے چھ مہینے کی رُخصت لی تھی۔ اب ایک سال ہوگیا کہ وہ نہیں آیا۔ شاید بیمار ہوگیا ہوگا"۔ بادشاہ نے حکم دیا "ہزار بیگھے زمین جو ہم نے دی تھی خالصہ کر دی جائے۔ اور حکم بھیجا جائے کہ وہ فوراً حاضر ہو"۔

اس کے بعد بادشاہ نے فرمایا "بیتال پچیسی" کا ترجمہ پُورا ہوگیا ہو تو کتب خانے سے سلیمہ سلطان بیگم کو بھجوا دو"۔ ابوالفضل نے فیضی کو اشارہ کیا۔ اور فیضی کتب خانے میں چلے گئے۔ مگر ہم نے بادشاہ سلامت سے کہا "بیتال پچیسی میں خلافِ عقل کہانیاں ہیں وہ کتاب شاہی بیگمات کے قابل نہیں ہے"۔ بادشاہ نے فرمایا "عورتوں کو ایسی ہی کتابیں اچھی معلوم ہوتی ہیں جو خلافِ عقل ہوں"۔

ہم نے بادشاہ سے کہا "تو کیا بیتال پچیسی لکھنے والے نے یہ کتاب اسی لئے خلافِ عقل لکھی تھی کہ کم عقل عورتیں اسکو پڑھا کریں؟ بادشاہ نے ہماری بات کا جواب نہ دیا۔ تو ہم نے پھر کہا۔ "مُلّا عبدالقادر بدایونی کہتا تھا کہ ہندوؤں کی جتنی کتابوں کا ترجمہ بادشاہ نے مجھ سے کرایا ہے اُن سب میں خلافِ عقل باتیں ہیں۔ اور میں روزانہ ترجمے کا کام ختم کرنے کے بعد گیارہ دفعہ لاحول پڑھتا ہوں اور توبہ کرتا ہوں کہ نوکری کے لئے ایسی خرافات کتابوں کا ترجمہ کرنا پڑتا ہے۔"

ہماری یہ بات سُنکر بادشاہ کو غصّہ آگیا اور اُنہوں نے ہم سے کہا "ہمارے سامنے سے دُور ہوجا۔ کیا واہیات باتیں بکتا ہے۔" ہم نے دو قدم پیچھے ہٹ کر کہا "حکم کی تعمیل کر دی گئی"۔

ہم بادشاہ [illegible] کہ ہم [illegible] کے عادی [illegible] ہیں"۔ بادشاہ نے کہا "بد بخت [illegible] نہیں چاہتے"۔ ہم نے کہا "مگر ہم حضور کی صحبت [illegible] نہیں رہ سکتے"۔ بادشاہ نے کہا "تیرے مر جانے سے ہم کو خوشی ہوگی"۔ ہم نے کہا "ہم اس بات کا یقین نہیں کر سکتے کیونکہ جب ہماری چار بیویاں بیوہ ہو جائیں گی تو حضور کو اُن کے کھانے کپڑے کا فکر کرنا پڑیگا۔ اور فکر ایسی چیز ہے جو انسان کی خوشدلی کو برباد کر دیتا ہے۔ یہ دیکھئے ابوالفضل سامنے کھڑے ہیں۔ ان کو کھانے کا بہت شوق ہے۔ اور بینگن کا بھرتہ ان کو بہت بھاتا ہے۔ حالانکہ بینگن سے زیادہ کوئی بُری ترکاری نہیں ہوتی"۔ بادشاہ کو ہنسی آگئی اور اُنہوں نے کہا "تُو جھوٹا ہے۔ بینگن بہت اچھی ترکاری ہوتی ہے"۔ ہم نے کہا "ہاں حضور بیتال پچیسی میں لکھا ہے کہ بینگن کھانے سے عقل بہت بڑھ جاتی ہے۔ اگر حضور اجازت دیں تو آج میں ابوالفضل کے ساتھ جاکر بینگن کا بھرتہ کھاؤں۔ اور پھر اپنی عقل کو تول کر دیکھوں کہ وہ کچھ بڑھی ہے یا نہیں بڑھی؟" بادشاہ نے بات کاٹ کر کہا "مُلّا تیرا ایک کان کیا ہوا؟" ہم نے کہا "چتوڑ گڑھ کی لڑائی میں جب ہم حضور کے پاس کھڑے تھے۔ ایک گولی ہمارے کان پر لگی تھی۔ اور اس سے ہمارا ایک کان اُڑ گیا تھا۔ اور پھر حضور نے ہمارے کان کے بدلے چتوڑ گڑھ کی فوج کے سپہ سالار کو خاص اپنی گولی سے اُڑا دیا تھا۔ حضور ہم وہ کان نمک لگاکر اپنے ساتھ لے آئے تھے اور اُمیدوار ہیں کہ حضور کے حکم سے اس کان کا مقبرہ بنوا دیا جائے۔"

سلیقہ بیگم کچھ دیر تو ہماری باتیں سُنتی رہیں پھر خفا ہوکر کہا "تم کو اللہ کی سنوار۔ تمہاری بات ہے کہ شیطان کی آنت ہے۔ صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ تم سلیقہ بیگم لائبریری نہیں بناؤ گے"۔ ہم نے جلدی سے اپنے دونوں کان ہاتھوں سے پکڑے اور کہا ہماری توبہ ہے۔ تم عورت ذات ہو جس سے ہم پیدا ہوئے۔ اور ہمارے باپ دادا پیدا ہوئے۔ اور سارے جہان کے بادشاہ اور پیر و پیغمبر پیدا ہوئے۔ اب تمہیں بتاؤ کہ تم کیسی لائبریری بنانی چاہتی ہو؟"

سلیقہ بیگم نے جواب دیا۔ "ایسی لائبریری چاہتی ہوں کہ اُردو زبان کی وہ سب کتابیں جو عورتوں کی نسبت لکھی گئی ہیں ایک جگہ جمع ہو جائیں۔" ہم نے کہا "اگر بس اتنی ہی لائبریری چاہتی ہو تو اُس کے لئے تین فٹ کی الماری کافی ہوگی۔ کیونکہ اُردو زبان میں عورتوں کی نسبت کتابیں سو دو سو سے زیادہ نہیں ہیں"۔

ہماری یہ بات سُنکر چھوٹی بیوی نے کہا "بشیم بشیم"۔ ہم نے کہا "اس نام کی کوئی کتاب ہم نے نہیں سُنی"۔ چھوٹی بیوی نے کہا "میں یہ کہتی ہوں کہ

مردوں کو شرمانا چاہیئے کہ انہوں نے ہم عورتوں کے واسطے کتابیں نہیں لکھیں۔

ہم نے کہا "عورتوں کے لئے کتابوں کی ضرورت ہی کیا ہے؟ ہر عورت کی صورت ایک کتاب ہوتی ہے کہ مرد اُس کے پڑھے بغیر خوش نہیں رہ سکتے۔ کیا تم نے نہیں سُنا سب شاعر حسن کی تعریف کرتے ہیں تو محبوب کے چہرے کو کتابی چہرہ لکھتے ہیں۔

چھوٹی بیوی نے کہا۔ "یا اللہ! تم نے تو مجھے دیوانہ بنا دیا ہے۔ بے سرو پا باتیں کئے جاتے ہو۔" ہم نے کہا "عربی زبان میں ایک کتاب چھپی ہے جس کی بارہ جلدیں ہیں۔ اور ان بارہ جلدوں کا اتنا بوجھ ہے کہ اگر تم اُن کو اُٹھاؤ تو تمہارا کامنی سا بدن پھولوں کی ٹہنی کی طرح لچک جائے۔"

ہماری بیوی یہ بات سُنکر شرما گئیں اور انہوں نے نظریں جھکالیں۔ اور پوچھا اُن بارہ جلدوں میں کیا لکھا ہے؟ ہم نے کہا "کانگریس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد نے وہ بارہ جلدیں حفظ یاد کر رکھی ہیں۔ ہم ایک دن ان کی دعوت کریں گے اور اپنے گھر میں لائیں گے اُن سے پوچھ لینا۔ ہم تو فقط اتنا جانتے ہیں کہ اِس فہرست میں ہر علم و فن کی کتابوں کا حال درج ہے۔ کتاب کے شروع میں جو عبارت ہے وہ نقل کی ہے۔ آخر میں جو عبارت ہے وہ نقل کی ہے۔ اور اندر جو مضمون ہے اُس کا خلاصہ درج کیا ہے۔ اور مصنف کا حال اور پیدا ہونے اور مرنے کی تاریخ لکھی ہے۔ جو اِس فہرست کو یاد کر لیتا ہے وہ بڑا عالم مشہور ہو جاتا ہے۔"

سلیقہ بیگم نے کہا "میں مردوں کی اُن سب لائبریریوں کو ناپسند کرتی ہوں جن کے ہاں ہزاروں کتابیں الماریوں میں بھری رکھی رہتی ہیں اور دو چار آدمیوں کے سوا کوئی اُن کو نہیں پڑھتا۔ میں تو ایسی لائبریری چاہتی ہوں جہاں کم از کم روزانہ سو عورتیں آیا کریں۔ اور ہر مضمون کی سو سو کتابیں میری لائبریری میں ہوں۔ اور ہر کتاب کے پڑھنے کے دن مقرر کر دیئے جائیں کہ ایک دن میں ایک مضمون کی سو کتابیں سو عورتیں پڑھ لیں۔ اور ایک دن میں ختم نہ ہوں تو دو دن میں، تین دن میں، چار دن میں۔ غرض جتنے دنوں میں پڑھی جا سکیں پڑھ لیں۔ مثلاً بوستان خیال کی جلدیں ہیں، یا داستان امیر حمزہ کی جلدیں ہیں۔ کہ یہ کئی کئی مہینے میں ایک ایک جلد پڑھی جاسکے گی۔ علم و عقل کی فضول کتابیں مردوں کو مبارک۔ ہم تو جی بہلانے کی کتابیں پڑھیں گے۔

ہم نے کہا۔ "ماں باپ نے تمہارا نام سلیقہ بیگم رکھا ہے۔ اپنی لائبریری میں سلیقہ پیدا کرنے کی کتابیں بھی رکھنا۔" چھوٹی بیوی نے کہا "ماں باپ نے سلیقہ بیگم نام رکھا۔ خدا اُن کو جنت نصیب کرے۔ اور تم سے میری شادی کی۔ خدا اُن سے اِس گناہ کی پوچھ گچھ نہ کرے۔"

یہ سُنکر ہم کو غصہ آگیا۔ اور ہم کرسی سے کھڑے ہوگئے۔ اور ہم نے کہا "کیا تمہارے ماں باپ نے تمہاری ہم سے شادی کر کے گناہ کیا؟"

چھوٹی بیوی ہمارا غصہ دیکھکر ڈر گئیں اور اُنہوں نے کہا۔ "میرا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم سے شادی کرنا گناہ تھا۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ کسی ایسے گھر میں میری شادی کرتے جہاں میں روزانہ بوستان خیال پڑھ سکتی۔ داستان امیر حمزہ پڑھ سکتی۔ سنیما جا سکتی۔ زنانہ کلب میں جا سکتی اور راتوں کی دعوتوں میں مردوں کے ساتھ ناچنے کی اجازت بھی مجھے ہوتی۔ اور میرا شوہر میرے لئے سلیقہ بیگم لائبریری بھی قائم کر دیتا۔"

ہمارا غصہ ذرا دھیما ہوا اور ہم پھر بیٹھ گئے۔ اور ہم نے تمام ہندوستان کے کتاب فروشوں کے نام ایک گشتی فرمان جاری کیا۔ جس کا مضمون یہ تھا:۔

اما بعد۔ ہرگاہ کہ ہماری چھوٹی بیوی سلیقہ بیگم ہندوستان کے پایۂ تخت دلی میں ایک ایسی اُردو لائبریری بنانی چاہتی ہیں جس میں اُردو کی صرف ایسی نظم و نثر کی کتابیں ہوں جن کا تعلق عورتوں سے ہو یا جن کو عورتیں پسند کر سکتی ہوں۔ مگر اُن میں عشق بازی کا ذکر نہ ہو۔ تو وہ ہم کو اطلاع بھیجدیں تاکہ ہم اُن کو بذریعہ وی پی منگالیں یا نقد قیمت بھیج کر خرید لیں۔ والسلام

باقی یہاں خیریت ہے اور خیریت آپ سب کتاب فروشوں کی اور کاپی نویسوں کی اور چھاپنے والوں کی نیک مطلوب ہے۔

راقم یعنی لکھنے والا فقیر حقیر

شیخ علی المکتب ابوالظرافت دہلوی کان اللہ لہ'

چھوٹی بیوی پھر بگڑ کر بولیں "جس نظم میں اور جس نثر میں عشق بازی کا ذکر نہ ہو وہ پڑھنے کے قابل نہیں ہے۔ اور جس دل میں محبت کا درد نہ ہو وہ دل نہیں۔ سانس لیتا ہوا پتھر ہے۔ اور جس خیال میں اُلفت کی پھانس نہ ہو وہ خیال نہیں جھاڑ کی لکڑیوں کا جنجال ہے۔"

ہم کو چھوٹی بیوی کی یہ بات بہت زیادہ ناگوار ہوئی اور ہم نے نہایت غصے کے لہجہ میں گرج کر کہا "شٹ اَپ! خاموش! خبردار۔ جو اس سے آگے کوئی لفظ کہا۔ ہماری لائبریری میں عشق بازی کی کوئی کتاب نہیں ہوگی۔"

چھوٹی بیوی کی رنگت زرد ہوگئی۔ اور بڑی بیوی اور منجھلی بیوی اور سنجھلی بیوی جو بہت دیر سے چپ چاپ بیٹھی ہم دونوں کی باتیں سُن رہی تھیں

وہ ہمارے بدلے ہوئے تیور دیکھکر سہم گئیں - اور ان تینوں نے ایک زبان ہوکر کہا - سچ ہے شوہر بیویوں کا مجازی خدا ہوتا ہے - تم جو کچھ کہتے ہو ہمارا اُس پر ایمان ہے۔"

چھوٹی بیوی نے کہا - میں بھی اپنی بات سے پشیمان ہوں - میری لائبریری میں جیسی کتابیں تم پسند کروگے مجھے بھی وہی پسند ہونگی۔"

بس یہ تھا آج کا حال۔ اب ہم اکتوبر ۱۹۴۳ء تک یعنی اگست اور ستمبر کے دو مہینوں میں سلیقہ بیگم لائبریری کی کتابیں جمع کرکے الماریوں میں سجادیں گے۔ اور پھر تمام دہلی کی ہندو مسلمان عورتوں کو جمع کرکے اس لائبریری کا اس طرح افتتاح کرینگے کہ پہلے چاندی کا ایک قفل لگادیں گے پھر اُس کی کنجی قفل میں لگادیں گے اور کنجی میں ہزار گز کا ایک ڈورا باندھ دینگے اور اس ڈورے کو سب عورتیں پکڑلیں گی اور ہم قفل کے پاس کھڑے ہوکر کہینگے اما بعد - اے ماؤں ! اے بہنوں ! اے بیویوں ! اے بیٹیوں ! اے خالاؤں ! اے چچیوں ! اے ممانیوں ! اے سمدھنوں ! اے سالیوں ! اے ساسوں ! ہماری چھوٹی بیوی سلیقہ بیگم نے تم سب کے لئے یہ لائبریری قائم کی ہے - اور ہم تم سب کے ہاتھوں سے اس لائبریری کو کھولنا چاہتے ہیں۔ تم سب اپنے اپنے گھونگھٹ نکال لو - اور اپنے ہاتھوں پر اپنے دوپٹوں کو لپیٹ لو تاکہ ہم تمہارے ہاتھوں کی مہندی نہ دیکھ سکیں - اور تمہارے ہاتھوں کے انگوٹھی چھلوں پر بھی ہماری نگاہ نہ پڑسکے - اور پھر تم ایک ہاتھ سے ڈورا پکڑلو اور ایک ہاتھ اونچا اٹھالو تاکہ ہم سمجھ لیں اور ہم کو یقین آجائے کہ تم سب استریوں اور ماتاؤں اور پتریوں کی کثرت رائے اس لائبریری کے حق میں ہے - اور بقول ہماری چھوٹی بیوی کے اس لائبریری کے نفے دَر میں ہے تو ہم تم سب کے نا چیز نائب اور قائم مقام بن کر یہ قفل کھول دیں گے - یہ قفل چاندی کا ہے اور اس کی کنجی بھی چاندی کی ہے - اور یہ دونوں چیزیں تم سب کا حق ہیں - ہم ان دونوں کو فروخت کرکے حلوہ پکائیں گے اور اُس حلوے پر اُن سب عورتوں کی نیاز دلوائیں گے جو اس دنیا سے سدھار گئی ہیں - اور جنہوں نے تم کو پیدا کرکے ہم مردوں کے گھروں کو آباد کیا ہے -

غزل

(حضرت بہزاد لکھنوی)

مرے چمن میں غموں کی بہار کیوں نہ رہی
عجیب شے تھی شبِ انتظار کیوں نہ رہی

جھکی جھکی نظر آتی ہے چشمِ جلوہ طلب
نظر کو حسرتِ دیدارِ یار کیوں نہ رہی

ہیں ماند ماند سے تارے بھی اور ذرّے بھی
وہ دلفریبیِ لیل و نہار کیوں نہ رہی

نہ لب پہ نعرۂ مستانہ ہے نہ نالۂ شوق
وہ مستیِ دلِ دیوانہ وار کیوں نہ رہی

کہاں گیا مرا ذوقِ سجود و شوقِ طلب
وہ بندگیِ درو بامِ یار کیوں نہ رہی

سکوں بلا ہے تو بہزاد سوچتا ہوں میں
کہ مجھ پہ رحمتِ پروردگار کیوں نہ رہی

۸۷

مرزا چپاتی کا ایک شعر

(از واحدی)

دلی میں ٹنگش کے کمرے کے عین سامنے ایک صاحب کی کنکوؤں، پتنگوں اور تکلوں کی دکان تھی۔ یہ صاحب کنکوے، پتنگیں اور تکلیں بناتے بھی خوب تھے اور اڑاتے بھی خوب تھے۔ کنکوے، پتنگیں اور تکلیں بیچتے بھی تھے اور اڑانی بھی سکھاتے تھے۔ اسی پر اُن کی گزر اوقات تھی۔ اکیلا دم تھا۔ اُلٹی سیدھی نہیں تھا کچھ اوقات کے ساتھ زندگی گذارتے تھے۔ چار مہینے (جاڑے کے) ٹنگش کے کمرے کی دکان پر۔ چار مہینے (گرمی گرمی) اجمیر شریف میں۔ اور چار مہینے (برسات برسات) قطب صاحب میں۔ جہاں جاتے یہی کنکوے۔ پتنگیں۔ اور تکلیں بنانے، بیچنے، اڑانے اور سکھانے کا شغل رہتا۔ دوسرا شغل اور شوق شعر کہنے، شعر سننے اور شعر سمجھنے کا تھا۔ یہ بالکل بے پڑھے لکھے تھے شعر کہتے اور کسی آتے جاتے سے فرماتے "میاں ذرا لینا یہ قلم دوات، کاغذ ایک شعر گھسیٹتے جاؤ" اتنے میں دوسرا شعر ہوگیا۔ اسی طرح کسی دوسرے سے لکھوا لیا۔ غزل پوری کرالی تو حفاظت سے رکھدی۔ بہتیری غزلیں تو شعر نقل کرنے والے ہضم کرگئے یا اپنی بنا بیٹھے۔ تاہم سنا ہے اس پر بھی مرتے وقت خاصا بڑا دیوان چھوڑا تھا۔ کام ہی دو تھے۔ کنکوے بنانے کا اور غزلیں کہنے کا۔ بے پڑھے لکھے ہونے کے ساتھ توتلے بھی تھے۔ اور بوڑھے بھی۔ ۱۸۵۷ء سے بہت پہلے کی پیدائش۔ لوگ اُن کا اس لئے لحاظ کرتے تھے کہ ان کا شجرہ بغیر شک اور شبہ کے اکبر ثانی یعنی ابو ظفر بہادر شاہ (آخری مغل بادشاہ) سے ملتا تھا۔ وہ مشاعروں میں جاتے تو اُنہیں ممتاز جگہ دی جاتی۔ اور شعر پڑھتے تو تتلانے اور ہکلانے پر کوئی نہ ہنستا۔ کسی کے چہرے پر مسکراہٹ بھی دیکھ لیتے تو تیموری خون جوش کھا جاتا۔ بگڑ کر اٹھ کھڑے ہوتے۔ اُن کا نام مجھے یاد نہیں۔ اور نہ معلوم کرنے کی طرف طبیعت مائل ہے۔ اب بھی بہت سے دیکھنے والے نکل آئیں گے پہچان جائیں گے۔ عرف مرزا فرزد تھا۔ جسے وہ خود "مرزا فرزد" کہا کرتے تھے۔ لیکن عام طور پر مرزا چپاتی کے عرف کے ساتھ معروف تھے۔ خدا ہی کو علم ہے۔ مرزا چپاتی کیا گھر تھا اور اس کا شان نزول کیا تھا۔ مجھے

مشاعروں میں جانے کا کبھی لپکا نہیں پڑا۔ ایک دفعہ پنڈت امرناتھ صاحب ساحر نے پنشن لے کر جب پہلا مشاعرہ کیا ہے تو ان کے ہاں گیا تھا۔ میری جوتیاں غائب ہوگئیں اور میں نے مشاعروں کی شرکت سے توبہ کرلی۔ اصل حقیقت تو یہ ہے کہ بے ذوق اور بے کیف آدمی ہوں۔ کسی بات کا بھی لپکا نہیں پڑا۔ البتہ اتفاق سے حضرت خواجہ نظام الدین اولیاءؒ اور حضرت امیر خسروؒ کے عرسوں میں جانے کی عادت کسی نہ کسی وجہ سے ہوگئی ہے۔ یہ وہی عرس ہیں جنہیں دلی والے بڑی سترہویں اور چھوٹی سترہویں کہتے ہیں۔ پینتالیس سال متواتر ان عرسوں میں حاضر ہوا ہوں۔ اب بڑھاپے نے یا نوکری کی پابندی نے وہ وضع بھی چھڑا دی۔ عرسوں میں سب کچھ ہوا کرتا ہے۔ قرآن خوانی بھی۔ ذکر و شغل بھی قوالی بھی۔ بازاری عورتوں کے ناچ گانے بھی۔ میلے تماشے بھی۔ یہاں تک کہ مشاعرے بھی۔ جس طرح مردوں کی قوالی اور عورتوں کے ناچ گانے جگہ جگہ ہوتے ہیں اسی طرح مشاعرے بھی جگہ جگہ ہوتے ہیں۔ چند شاعر یہاں بیٹھ گئے۔ چند شاعر وہاں بیٹھ گئے۔ جہاں شاعر بیٹھ گئے وہیں مشاعرہ ہونے لگا ـــــ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ سے کچھ فاصلہ پر شہنشاہ ہمایوں کا مقبرہ ہے۔ سترہویں کا میلہ درگاہ شریف سے لے کر مقبرے تک پھیل جاتا ہے۔ مقبرے سے بالکل ہی متصل حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا رہنے کا مکان اور خانقاہ ہے گویا اس جگہ سے لیکر جہاں بعد وصال حضرت آرام فرما ہیں اُس جگہ تک جہاں زمانۂ حیات میں تشریف رکھتے تھے۔ عرس کے مناسب و نامناسب مراسم ہوتے رہتے ہیں۔ اسی خانقاہ کے ایک کمرے میں جو کبھی حضرتؒ کا کتب خانہ تھا۔ آج سے تیس پینتیس بلکہ چالیس سال پہلے ایک سترہویں کے موقع پر مشاعرہ ہو رہا تھا۔ میں بھی پھرتا پھراتا وہاں پہنچ گیا۔ اس وقت مرزا چپاتی غزل پڑھ رہے تھے۔ غزل تو کیا یاد رہتی۔ لیکن غزل کا ایک شعر ایسا تھا جو بھلائے نہیں بھولتا۔ پہلے اُن ہی کی زبانی سن لیجیے۔ توتلی زبان سے پڑھ رہے تھے ؎

میں تمر دُھتاتے ہوتے دھنم تلا ہی تھا
تچھ رحم آگیا مرے پرور دوار تو

اب صاف کرکے لکھتا ہوں۔ پڑھئے۔ شاید پسند آئے۔ اپنا اپنا مذاق ہے۔ مجھے تو یہ شعر اتنا پسند ہے کہ میں نے اپنے ایک دوست کو دیا کہ میری قبر کا کتبہ میری زندگی ہی میں بنوا دو۔ اور اس پر یہ شعر لکھوا دو۔ وہ کتبہ بنوا کر نہیں دیتے اور مجھے بنوانے کی

فرصت نہیں یا زیادہ رغبت نہیں۔ مرنے کے بعد کے لئے وصیت کرتا ہوں۔ کسی کو توفیق ہو تو پوری کردے۔ ورنہ یہ سب ظاہرداری کی باتیں ہیں۔ کتبہ دتبہ میں کیا رکھا ہے۔ خیر شعر سن لیجیے۔ فرماتے

غزل

(از جناب سید شفیق حسین آغب لکھنوی)

نتیجہ یہ ملا مجھ کو فغاں سے
کہ آخر ہاتھ دھویا آشیاں سے

نہ تھی اُمید ہم کو باغباں سے
نکالے گا عداوت آشیاں سے

لگاوٹ، سادگی و پاسداری
میں دھوکا کھا گیا اُسکے بیاں سے

سلا کر آسماں نے میری قسمت
اُڑا دی نیند چشمِ باغباں سے

زمانہ بھر کی تکلیفوں سے چھوٹے
قفس بہتر رہا کچھ آشیاں سے

جو وعدہ تم کو کرنا ہے تو کرلو
ملا کر آنکھ، "ہاں" کہدو زباں سے

اگر عمرِ خضر بھی بخش دے تو
تو اُلفت اور بڑھ جائے جہاں سے

ابھی راغب کے دم سے ہے وگرنہ
محبت اُٹھ گئی ہندوستاں سے

ہیں ۵

میں سر جھکا کے بیٹھا جہنم جا رہی تھا
کچھ وہم آ گیا مرے پہلو دگار کو

دوکانِ حماقت

(از جناب ڈی، پی بھٹناگر کشتہ)

گیا تھا میں بازار اک روز کشتہ
مری چشمِ دانا نے یہ نظارہ دیکھا
بھرے تھے دُکانوں میں مُرغِ خوش الحاں
سبھی آدمی کی غذا کا تھے ساماں
حماقت کی گلیوں میں تھیں یہ دُکانیں
یہیں بک رہی تھیں غریبوں کی جانیں

تصوّر میں پھر میں نے منظر یہ دیکھا
کہ گیہوں کے دانوں کو گھُن کھا رہا تھا
کوئی بھی بہم تھا نہ ساماں غذا کا
نہ مُرغِ خوش الحاں، نہ گیہوں کا دانا
تھی برباد و ویراں دُکانِ حماقت
بہت بھوک سے زار و حیراں تھی خلقت
یہ اس کی حماقت کا گویا بدل تھا
نہ باقی رہا آج منظر جو کل تھا

مفسّرِ غم فانی بدایونی

(از جناب فاروق محشر بدایونی)

بدایوں کی خاک کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ یہ ہمیشہ سے شیدائیان علم و ادب کا گہوارہ رہی ہے۔ بے شمار ہستیاں یہاں سے آفتاب بن کر چمکیں اور اپنی یاد کے لا فانی نقوش چھوڑ کر زمین کا پیوند ہو گئیں۔ حضرت فانی مرحوم کا شمار بھی ایسی ہی ہستیوں میں سے ہے۔

فانی کی شاعری اور زندگی کچھ جدا جدا چیزیں نہیں۔ مرحوم کو ابتدائے عمری سے کن کشِ غم اور مشکلاتِ روزگار کا سامنا کرنا پڑا اسی عجیب ماحول نے ان کے ذوقِ غم پسندی کو اس حد تک پہنچا دیا جہاں سے تفریحات اور دلچسپیوں کا میدان تنگ و تاریک نظر آتا ہے۔ اور دل تمنائے حیات سے زیادہ انتظارِ مرگ میں تسکین محسوس کرتا ہے۔ اب آپ دیکھئے کہ ان کی شاعری پر ان کی زندگی کا کتنا اثر ہے۔ التفات کی عینک لگا کر اگر آپ کلامِ فانی پر نظر ڈالیں گے تو یہی فیصلہ کر سکیں گے کہ فانی ہی وہ شاعر تھا جس نے اپنی زندگی کی تلخ شرابِ کو شاعری کے رنگین پیمانے میں ڈھال دیا ہے اور اسی امتزاج نے فانی کو ایک حقیقی شاعر بنا دیا۔ اس نے ہماری آنکھوں کو بھی وہی غمناک عالم دکھا دیا جہاں ؂

ہر نفس آہ اور انفاس پہ جینے کا مدار
زندگی آہِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں

اب دیکھنا یہ ہے کہ کن حادثات نے فانی کے نفس نفس کو آہِ مسلسل سے بدل دیا کہ ان کی ہر آواز شکستِ دل کا پتہ دیتی ہے۔ آئیے یہ غم داندوہ کی داستان خود انہیں کی زبان سے پردۂ اشعار میں سنئے اور ان کے جوشِ غم کا اندازہ کیجیے ؂

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

ہر لمحۂ حیات ہے بیگانۂ حیات　　　فانی حیات ہی سے عبارت عدم نہ ہو

اے بجھا جس پہ سیرِ نشیمن کا پڑ گیا　　　کیوں آسمان و باغ ہی سارا اُجڑ گیا

مجھ کو مرے نصیب نے روزِ ازل نہ کیا دیا　　　دولتِ دو جہان دی اک دلِ مبتلا دیا

تو آج مرگِ فانی بیکس سے مٹ گئی　　　وہ اک خلش جو خاطرِ اہلِ وطن میں تھی

فانی بدایوں کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ مرحوم کے والد ماجد پولیس انسپکٹر تھے۔ جس کے گھر میں آنکھ کھولی تھی وہاں آرام و آسائش کا ہر سامان مہیا تھا۔ زمین اور زر و مال کثیر اُن کا آبائی ورثہ تھے۔ مکان جس میں رہتے تھے شیش محل کے نام سے مشہور تھا جس کی بلند دیواریں اور وسیع صحن آج بھی اپنے شاندار ماضی کا مرثیہ زبانِ حال سے پڑھتے ہیں۔ یہ شیش محل کیا ہے۔ ایک قلعہ ہے جو کئی سو گز زمین کو اپنی پناہ میں لئے ہوئے ہے۔ یہی وہ عمارت ہے جس کی تنہائیوں میں آج تک ایک دُکھے ہوئے دل کی صدائیں اور جاگی ہوئی آنکھوں کے گرم آنسو جذب ہیں۔ بیچارگی و مجبوری کی وہ اندوہناک ساعت بھی کیا ہوگی جب گھر کی چار دیواری میں عافیت نہ پاکر غم نصیب شاعر کے حساس دل سے یہ دعا فریاد بن کر بابِ اثر تک پہنچی ہوگی کہ ؂

اپنے دیوانے پہ اتمامِ کرم کر یا رب　　　در و دیوار دئیے اب انہیں ویرانی دے

بدایوں کی ایک معتبر ہستی سے معلوم ہوا کہ اس شعر میں ایک خاص واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ ایک دن شام کا وقت تھا فانی کو دیکھا گیا وہ بے حد پریشانی کے عالم میں گھر کے صحن میں ٹہل رہے تھے۔ چہرے پر صد درجہ کی اداسی کے آثار نمایاں تھے۔ اور آنکھوں میں بھی آنسو ڈبڈبا رہے تھے۔ بہت ادب سے جب دریافت کیا گیا۔ "آج قبلہ اتنے پریشان کیوں ہیں؟ خیریت تو ہے۔" جواباً مرحوم نے فرمایا کہ بھئی اب یہ گھر مجھے کاٹے کھاتا ہے۔ شعر کہہ کر دل بہلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک شعر کہہ لیا ہے۔ پھر مرحوم نے بجید مایوسانہ لہجے میں اوپر کا شعر پڑھا۔ جو صاحب اُن سے ملنے گئے تھے انہوں نے بتایا کہ اس وقت مجھے یہ محسوس ہوا جیسے میں دُنیا میں نہیں ہوں ——— یہ وہ زمانہ تھا جب فانی مرحوم سے رفتہ رفتہ دُنیا کی ہر مسرت کنارہ کر رہی تھی۔ عزیز بچھڑ چکے تھے۔ دولت کی دیوی اپنا جلوہ دکھا کر روپوش ہو چکی تھی۔ گاؤں سے قبضہ اٹھ چکا تھا اور اب گھر کی باری تھی۔

فانی کو روپیہ پیسے کی ہوس نہ تھی۔ وضعداری کا یہ عالم تھا جو احباب ملنے آتے تھے اُن کی خاطر خواہ تواضع کرتے۔ جتنی آمدنی تھی اُس سے زیادہ خرچ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت جلد غربت چھا گئی۔

فانی نے اوّل اوّل مشن سکول بدایوں میں آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اس طالب علمانہ زندگی کے دور میں جب زندگی اس رنگین ماحول میں کھلتی ہوئی

...نا ہی پہلا جھی تھی نزدیکی منزل سے — کشتی کو تلاش جل ٹکرا گئی ساحل سے

اُس کی نظر کلیوں کے تبسم پر پڑنے سے پہلے انجام تبسم پر پڑتی ہے
...ر چمن کی پتی پتی کو اس کی آواز اُس آنے والے انقلاب سے باخبر کر دیتی ہے
...ب بادِ خزاں کے سموم جھونکے عروس بہار کی تمام نزاکتوں کو تاراج و برباد کر دیتے
...یں۔ پھولوں کی پنکھڑیاں کُملا کر زرد پڑ جاتی ہیں اور ہوا میں منتشر ہو کر فنا ہو جاتی
...یں۔ معصوم کلیوں کا دل بھی یہ آواز سُن کر عبرت حاصل کرتا ہے ؎

...بہار لائی ہے پیامِ انقلابِ بہار — سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرانے کو

زندگی کی دو روزہ مسرت اس دل کے لئے کیا تسلی بخش ہوتی جس پر
کائنات زندگی کی ساری حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکار تھی۔ اس نے ثابت
کر کے دکھا دیا کہ زندگی پھولوں کی سیجوں میں نہیں بلکہ حقیقی زندگی خارزارِ دہر سے گزر
گزر کر فنا کے حجلۂ عافیت میں ابدی سکون و راحت کا نام ہے۔ اُس کی خاطر حسرت نواز کو
ایسے ہی عالم کی تلاش تھی اور اس شعبدہ زارِ ہستی میں جہاں مسلسل ناکامیوں کی
بدولت اُس کی ساری تمناؤں کا خون ہو چکا تھا۔ وہ کیا سکون کا سانس لیتا جبکہ ؎

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری اُمیدیں ٹوٹ گئیں دل بیٹھ گیا جی چھوٹ گیا

فانی کی مقبولیت کا ایک راز یہ بھی ہے کہ اُس نے آپ بیتی کو جگ بیتی
بنا دیا۔ اُس کا دل کائنات کے مصائب و آلام کا بارِ عظیم شانوں پر اُٹھائے تھا پھر
اُس کی آہ و ارشکست دل میں عالمگیر جاذبیت اور کشش کیونکر نہ ہوتی۔ اشعار کے
پردے میں واقعات زندگی کی صحیح اور مکمل ترجمانی کرنا فانی ہی کے بس کا کام تھا اور
اسی کمال نے اس کو فی الحقیقت مُفسرِ غم بنا دیا۔

موجودہ دور میں ترقی کی بڑھتی ہوئی وبا شاعری کی محبوب ترین صنف
غزل کے حق میں بے حد ہلاکت ناک ثابت ہو رہی ہے اور اس کے حسین خد و خال کو اس
بے رحمی کے ساتھ جدید ادب کے نام لیوا بگاڑنے کی کوشش میں ہمہ وقت مبتلا ہیں
ان کا بس نہیں کہ غریب اُردو کے اس کہنہ پھل پھول دار درخت کو جڑ سے اُکھاڑ دیں
مگر اس کے دیرینہ محسنوں نے خونِ جگر سے سینچ کر اس کو تناور بنایا ہے اب شاید
رہتی دُنیا تک غزل کا وجود نہ مٹ سکے گا۔ اس صنف کو فروغ دینے والے نونہال آج
بھی کمر ہمت کس کر اسی میدان میں گامزن ہیں۔ ان نوجوانوں میں تابش دہلوی شکیل
بدایونی۔ مجروح سلطان پوری۔ خمار بارہ بنکوی وغیرہ آسمان شاعری کے وہ روشن
ستارے ہیں جو عجب نہیں کہ فانی۔ جگر۔ اصغر اور حسرت بن کر غزل کو چار چاند لگا دیں۔
... فانی کو کہتے ہیں کہ وہ ایک مایوس شاعر تھا اس لئے اُس

برائے زندگی کے پہلو ... فانی ... ؎

زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں — ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ غم ہی وہ شے ہے وہ خوشی
میں نام کو بھی نہیں۔ غزل کے شعر کی یہی خوبی ہے کہ وہ دل کو چھو جائے اور ہمیشہ
کے لئے ذہن نشین ہو کر رہ جائے۔ اس اعتبار سے فانی ہی ایک میاب غزل گو تھا
فانی اور جگر کی شاعری کو اگر ایک ہی کسوٹی پر لا کر دیکھا جائے تو دونوں
میں بعد المشرقین نظر آئے گا۔ دونوں کا زاویہ نگاہ مختلف اور دونوں زندگی کی
تصویر کو مختلف رُخ سے دیکھتے ہیں۔ فانی کی شاعری کی بنیاد صرف غم پر ہے اور
جگر کی شاعری رندی و سرمستی پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے نشہ و سرمستی ایسی چیزیں ہیں
جن کی بقا کا مدار مختصر گھڑیوں پر ہے۔ نشہ خمار بن کر اُتر بھی سکتا ہے لیکن فانی
کی شاعری "یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اُتار دے" اور اپنے اس دعویٰ کی
دلیل میں میں فانی ہی کا یہ شعر پیش کر سکتا ہوں ؎

غم بھی گذشتنی ہے خوشی بھی گذشتنی — کر غم کو اختیار کہ گزرے کہ غم نہ ہو

بقول ساغر نظامی

"مسرت کی تمناؤں سے کھیلنا ہرگز دانشمندی نہیں۔ حیات کی پہلی اور
آخری تمنا خوشی سہی۔ مگر خوشی ہے کیا؟ محض ایک موج، صرف ایک حرکت۔ فقط
ایک مسلسل مطالبہ اور "الم"۔ الم مسرت کے مقابلہ میں ذی مقدار بھی ہے اور پائدار
بھی۔ مسرت کی تھاہ ہے۔ مگر غم کی تھاہ نہیں۔ لامحدود شے محدود سے بہرحال
افضل ہے۔" (اقتباس از زندگی میری نظر میں)

فانی کے یہاں تبسم کی جھلک بھی نہیں۔ مگر جگر کی شاعری میں اکثر فانی
کی آہیں بھی در آتی ہیں۔ زندگی کے اس سفر میں آخر جگر کی نگاہ بھی حقیقت کی
منزل پا لیتی ہے اور اس مقام پر جگر فانی کے دوش بدوش آہ بلب نظر
آتے ہیں ؎

احباب مجھ سے قطع تعلق کریں جگر — اب آفتابِ زیست لبِ بام آ گیا

جگر کے اکثر اشعار فانی ہی کے تخیل کی ہم آہنگی کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ؎

بوئے خزاں سے مست ہیں یاد ہمیں بہار کیا — ہم تو چمن پرست ہیں پھول کہاں کے خار کیا
(فانی)

گلشن پرست ہوں مجھے گل ہی نہیں عزیز — کانٹوں سے بھی نباہ کئے جا رہا ہوں میں
(جگر)

جس طرح فانی نے چند الفاظ و تراکیب کو اس قدر اپنا لیا ہے کہ اکثر

بے الفاظ ملتے ہیں۔ فانیؔ کے محبوب ترین الفاظ و تراکیب یہ ہیں:-
"یادش بخیر۔ چشمِ بد دور۔ جان سے دور۔ اللہ"
جگرؔ کے کلام میں یہ الفاظ زیادہ آتے ہیں:-
اللہ اللہ۔ معاذ اللہ۔ توبہ وغیرہ وغیرہ
اشعار ملاحظہ ہوں۔

(فانیؔ)

دلِ بیتاب کو پیغامِ سکوں ہے فانیؔ　　چشمِ بد دور غمِ حوصلہ فرسا اپنا

کیا انھیں اندازۂ ضبطِ محبت ہو گیا　　چشمِ بد دور اب ستم حد سے سوا کیوں ہو گئے

اب انھیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے　　چشمِ بد دور دلہن بن کے شباب آتا ہے

پی تھی وہ پی ازل میں کہ اُتری نہ حشر تک　　یادش بخیر دل بھی عجب بادہ نوش تھا

یادِ فانیؔ بخیر کیوں اے موت　　اُٹھ رہا ہے یہ شورِ ماتم کیا؟

دل کی مفارقت کو کہاں تک نہ روئیے　　اللہ ایک عمر کا ساتھی بچھڑ گیا

میری نظر کی آڑ میں اُن کا ظہور تھا　　اللہ اُن کے نور کا پردہ بھی نور تھا

گُل میں وہ اب نہیں ہے جو عالم تھا خار کا　　اللہ کیا ہُوا وہ زمانہ بہار کا

کہتے ہیں کیا ہی مزے کا ہے فسانہ فانیؔ　　آپ کی جان سے دور آپ کے مر جانے کا

(جگرؔ)

اللہ اللہ میں بھی کیا نازک دماغِ عشق ہوں　　نکہتِ گُل بھی ہے وجہِ دردِ سر میرے لئے

کیا طریقہ ہے یہ صیاد کا اللہ اللہ　　ایک کو قید کیا ایک کو آزاد کیا

جُرمِ مجبوریٔ بے تاب الٰہی توبہ　　یہ بھی اک بے ادبی تھی کہ تجھے یاد کیا

کرشمہ سازیٔ حسنِ ازل ارے توبہ　　آئینہ مجھ کو دکھا کے لوٹ لیا

جلوۂ ذات اے معاذ اللہ　　تابِ آئینۂ صفات گئی

معاذ اللہ اُن کا کیفِ رعنائی معاذ اللہ　　اثر کا مُنہ چڑھاتی ہیں جو آہیں بے اثر ہو کر

جگرؔ کی بادہ کشی ان دنوں معاذ اللہ　　جب آپ دیکھیں گے غرقِ شراب دیکھیں گے

فانیؔ کے کلام میں بھی غلطیاں ہیں مگر اُن پر محاسن غالب آ جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے جگرؔ صاحب اپنی فنی لغزشیں خود تسلیم کرتے ہیں۔ دیوانِ شکیل کے مقدمہ میں ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں۔

"میرے لئے شعر ہمیشہ اوّلین و آخرین کوشش انفرادیت کے ساتھ ساتھ صرف شعر کی اصلی لطافت و پاکیزگی شعریت و نغمگی رہتی ہے۔ سُنتے وقت معمولی معمولی سی لفظی خامیوں کا احساس تک نہیں ہوتا بشرطیکہ شعر کا باطنی رُخ نہایت درجہ حسین و جمیل ہو۔"

"زبان کے متعلق خود میرا نظریہ یہ ہے کہ میں "زبان" کو لباس اور "معنویت" کو محبوب تصور کرتا ہوں اور میرے نزدیک حسین وہی ہے جو پھٹا پُرانا میلا کچیلا لباس پہن کر خود لباس کو بھی حسین بنا دے۔ نہ یہ کہ خود محتاجِ زیبائش و آرائش ہو۔"

اس وقت میں نفسِ مضمون سے دور ہو کر اس بحث کو زیادہ طویل بنانا نہیں چاہتا۔ بسبیلِ تذکرہ فانیؔ اور جگرؔ کا موازنہ مختصراً کر دیا گیا ہے۔ ورنہ یہ بحث ہی دوسری ہے جس کے لئے وقت اور فرصت چاہیئے۔

الفاظ کا برمحل استعمال۔ اسلوبِ بیان۔ تراکیب کی حسین بندشیں۔ تخیل آفرینی۔ غرضیکہ عروسِ سخن کو مکمل طور پر آراستہ پیراستہ اگر دیکھنا ہے تو مرحوم کا دیوان دیکھیے تو آخر میں کچھ اشعار درج کئے جاتے ہیں جن میں فانیؔ کی زندگی کا پرتو نمایاں طور پر جھلکتا ہے۔ اور بہ اعتبارِ محاسنِ شعری آپ اپنا جواب ہیں:-

برق کو اس سے غرض کیا رہ گیا کیا جل گیا
جل گیا جو کچھ تھا خرمن میں مری تقدیر کا

تمہیں کس دل سے اپنی جان کہئے　　وفا اُس نے تو کی اور عمر بھر کی

فانیؔ دوائے دردِ جگر زہر تو نہیں　　کیوں ہاتھ کانپتا ہے مرے چارہ ساز کا

مانا حجابِ دید مری بے خودی ہوئی　　تم وجہِ بیخودی نہیں یہ ایک ہی ہوئی

شاید میں درخورِ نگہِ گرم بھی نہیں　　بجلی چمک رہی ہے مرے آشیاں سے دور

کس صبح کے فتنے کا ماتم ہے کہ فانیؔ　　روتی ہے گلے مل کے سحر شمعِ سحر سے

رہ جائے کیوں فنا کا ہنگامہ نامکمل　　کچھ میری زندگی سے لے لیجئے بلائیں

ہمیں ابھی ترے اشعار یاد ہیں فانیؔ　　ترا نشاں نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا

وغیرہ وغیرہ

اردو افسانہ اور شاعری کے رجحانات +

(۱) ٹوٹے ہوئے دل ۔ رام پرتاپ بہادر ۔ ہندستانی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد
(۲) اوراق گل ۔ مترجمہ ضمیر احمد ہاشمی ۔ پی، سی، ایس، رام پور
(۳) وسعتیں ۔ سلام مچھلی شہری ۔ مکتبہ اردو لاہور

اردو میں افسانہ اب ایک مستقل صنف ادب ہوگیا ہے۔ ہمارے موجودہ لٹریچر کا کچھ بہترین حصہ افسانوی ادب ہی میں ملیگا۔ افسانوں کے موضوع جنسیات، سیاسیات، سماجی خلفشار، سرمایہ و محنت کی کشمکش وغیرہ ہیں جنسے زندگی کا براہ راست تعلق ہے اور جنکا زندگی پر گہرا اثر پڑتا ہے۔ ہمارے افسانہ نگاروں نے جنگ کا اثر بھی شاعروں سے زیادہ نہیں تو کم قبول نہیں کیا۔ لیکن ہمارے یہاں روسی یا چینی جنگی افسانوی ادب کا پرتو نہیں ملتا۔ چونکہ جو حالات روس اور چین میں رونما ہوئے اُن سے ہم دوچار نہیں ہوئے اس لئے ہمارے یہاں افسانہ زیادہ تر انگریزی اصولوں پر گامزن ہے۔ مثال کے طور پر کرشن چندر کا افسانہ " بالکونی " جو ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا کرسٹوفر ایشروڈ کے افسانہ "نوکس" کے طور پر ڈھالا گیا معلوم ہوتا ہے جو تقریباً نو سال پہلے شائع ہوا تھا۔ "نیو رائٹنگ" کے ایڈیٹر جان لیہمن کا خیال ہے کہ جنگ نے انگلستان کے افسانوی ادب پر کوئی قابل ذکر اثر نہیں ڈالا۔ یہ ہی حال ہمارے یہاں ہے۔ اگرچہ بھوک بیکاری اور اشیاء کی گرانی اور کمیابی کی طرف افسانہ نگاروں نے توجہ کی ہے لیکن ایسے افسانے کم ہیں۔ ان میں بعض افسانے ادبی حیثیت سے اتنے بلند پایہ نہیں چونکہ یہ افسانے ایک خاص ہیجان کے تحت اور زیادہ تر جلدی میں لکھے گئے ہیں ان میں وہ ادبی خوبیاں نہیں ہیں جو ہمارے بہترین افسانوں میں ملیں گی۔ پھر بھی ہمارے افسانوی ادب میں ان افسانوں سے قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔

رام پرتاپ بہادر کے بارہ افسانوں کا ایک مجموعہ "ٹوٹے ہوئے دل" کے نام سے ہندستانی پبلشنگ ہاؤس الہ آباد سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں ایک طرف تو پریم چند کا پرتو ملتا ہے اور دوسری طرف افسانہ نگار نے موجودہ دور کے اثرات کو اپنے افسانوں میں بڑی خوبی سے سمویا ہے۔ جہاں رام پرتاپ بہادر دیہاتی زندگی کی تصویر کھینچتے ہیں [illegible] ہیں۔ "گاؤں کی لڑکی" اس قسم کی ایک کہانی ہے جس میں [illegible] کے ساتھ ساتھ گاؤں کے ایک غریب کسان کی زندگی کی عکاسی کی ہے۔ دوسرا افسانہ "زرینہ" اگر ناول ہوتا تو شاید اور بھی کامیاب ہوتا۔ اس میں محبت کی استوار محبت کو جس دلدوز انداز میں بیان کیا گیا ہے اس کی مثال رام پرتاپ بہادر کے یہاں بھی کسی اور افسانہ میں نہیں ملتی۔ ایک اور کہانی میں جس کا عنوان "نام" ہے جنسیات کے اقتصادی پہلو پر روشنی ڈالتے ہوئے افسانہ نگار نے بتلایا ہے کہ طبقاتی کشمکش میں متوسط طبقہ نیست و نابود ہوکر رہ جائیگا۔ افسانہ نگار کی آنکھ سے سماج کا کوئی ناسور چھپا ہوا نہیں۔ "پنچھڑی" اور "ٹوٹے ہوئے دل" میں انہوں نے سماج کی حالت کا خاکہ کھینچا ہے۔ غربت، ناسمجھی، تعلیم کا فقدان، گانجے چرس اور افیون کی برکتیں۔ ان سب پر نظر ڈالی ہے۔ بعض کہانیوں میں افسانوی عنصر کم اور خاکہ کا عنصر زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ بعض افسانے انگریزی کی کلاسک اسٹوریز کی یاد دلاتے ہیں۔ "زندگی جلوہیں" میں ایک Realistic touch ہے جس کا اظہار آخر میں اس طرح ہوا ہے کہ "ہم سبھی چھوٹے بڑے گئے ہیں اور باوجود ایک دوسرے کی خوشی یا ناخوشی کے ایک دوسرے کو منہ میں دبائے پھرتے ہیں۔" "شاہجہاں کے خواب" میں امارت اور غربت کے دو مرقعے پیش کئے ہیں۔ یہ سب افسانے پڑھنے کے قابل ہیں۔ لیکن کنایاتی صناعی کا ایک بہترین نمونہ وہ افسانہ ہے جس کا عنوان ہے "کہیں نزلس ہیں"۔ اسکو پڑھتے وقت جرمنی کی ۱۹۴۲ء کی کشمکش کہ وہ مشرق کی طرف بڑھے یا مغرب کی طرف۔ ذہن میں رکھنی لازمی ہے۔

رام پرتاپ بہادر کی زبان میں یکسانیت نہیں۔ کہیں زبان بہت عمدہ ہے کہیں معمولی اور کہیں بالکل بے تکی۔ ہندی کے الفاظ جو عام طور پر اردو میں استعمال نہیں ہوتے کافی استعمال کئے گئے ہیں۔ اس کی وجہ شاید یہ بھی ہو کہ یہ افسانے ہندی میں اس سے قبل شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب کے شروع کے سولہ صفحوں اور آخر کے تیس صفحوں میں مصنف نے اردو ہندی کے متعلق بہت دلچسپ بحث کی ہے جس کو پڑھکر اُن کے غیر جانبدارانہ رویّہ کا ثبوت ملتا ہے۔

بزم سخن رام پور نے مختلف شعرا کو مختلف اوقات میں رام پور مدعو کیا۔ ان کا کلام سنا اور اب ایک مجموعہ "اوراق گل" کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس میں ۲۵ شعرا کے مختصر حالات زندگی، عکس خط، شبیہ اور چیدہ کلام یکجا کئے گئے ہیں۔ حسرت، آثر، صفی، سائل و جلیل رام پور نہ آسکے۔ باقی جو بیس شعرا نے بزم سخن کو اپنے کلام سے محظوظ و مستفید ہونے کا موقعہ دیا ان میں ایک طرف آرزو لکھنوی، آنند انصاری مرحوم، بیخود دہلوی، تابش لکھنوی، ساحر دہلوی، [illegible]

+ باجازت آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ

اور ادھر سیماب اکبر آبادی اور حسرت موہانی ہیں اور ایک طرف آرزو صہبائی ، احسان دانش، اختر شیرانی، جگر مرادآبادی، آرزو صدیقی ۔ رضا لکھنوی و ساغر نظامی نظر آتے ہیں۔ دربار رامپور سے مرزا غالب بھی فیضیاب ہوئے۔ ان کے بعد داغ امیر و تسلیم اور جلال پر یہ کرم رہا اور عہد موجودہ میں شعرا کی قدردانی کی یہ مجموعہ بین دلیل ہے۔

اس مجموعہ کے لئے ہر شاعر سے مندرجہ ذیل سوالات بھی کئے گئے تھے۔

(۱) شاعر کے نزدیک شاعری کا کون سا پہلو اہم ہے ؟ انفرادی، معاشرتی یا روحانی

(۲) شاعر کی نظر میں اردو ادب کی خدمت کس نہج سے ہونا چاہئیے ؟

(۳) شاعر کی نظر میں ہندی، سنسکرت وغیرہ کے الفاظ کا شمول کس حد تک مناسب ہے ؟

(۴) شعر کے لئے ردیف و قافیہ کی پابندی کہاں تک ضروری ہے ؟

(۵) دوسرے شعرا کے چند منتخب اور پسندیدہ اشعار کون سے ہیں ؟

(۶) نظم اور غزل میں کس کو بہتر استاد مانتے ہیں ؟

زیادہ تر شعرا نے ان سوالات کے جوابات دئیے ہیں۔ بعض نے سب سوالوں کے جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ لیکن یہ سب جوابات تشنہ ہیں اور وضاحت چاہتے ہیں۔ جس کی جگہ اس مجموعہ میں مشکل ہی سے نکل سکتی تھی۔ بہرحال ان جوابات سے شعرا کے رجحانات کا پتہ ضرور چلتا ہے۔ مجموعہ شاعروں کی تصویروں سے مزین ہے۔ بعض تصاویر خاص طور پر اس مجموعہ کیلئے لی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض اوپر کو ابھری ابھری معلوم ہوتی ہیں جس کی ذمہ داری آرٹسٹ پر ہے۔

انتخاب سلیقہ اور کاوش سے کیا گیا ہے۔ جگر مرادآبادی ۔ حسرت موہانی اور احسان دانش کا انتخاب بہت خوب ہے۔ حفیظ کے گیت ان کی غزلوں سے زیادہ اچھے ہیں۔ اس لئے ایک دو گیت اور ہوتے تو مضائقہ نہ تھا۔ جوش کے انتخاب میں اُن کی نئی چیزوں کو شاید نہیں دیکھا گیا۔ کیونکہ صرف ایسی نظمیں غزلیں اور قطعات اس مجموعہ میں شامل ہیں جو جوش کے مشرب رندانہ کی نمائندگی کرتے ہیں لیکن ان کے انقلابی مسلک پر روشنی نہیں ڈالتے۔ ایک لحاظ سے یہ انتخاب جوش کے بہترین کلام کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔ کیونکہ جوش جہاں اقبال کے زیر اثر انقلابی شاعری کی طرف قدم اُٹھاتے ہیں تو ان کے کلام میں شاعرانہ لطافتیں کم اور خطابت زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔

اول اول اقبال پر رجعت پسندی اور نسائیت کے لیبل لگانا چند خود ساختہ ترقی پسندوں کا خاص مشغلہ تھا۔ "بال جبریل" کو انہوں نے اس کتاب کے شائع ہونے پر کسی خاص احترام سے نہیں دیکھا بلکہ اسی رعونت اور تنگ نظری کی بنا پر جوش کو اقبال کے مقابلہ میں نقیب انقلاب بنا کر کھڑا کر دیا۔ اس سلسلہ میں جوش کا یہ کہنا کہ وہ نظم میں نظیر اور اقبال کو استاد مانتے ہیں ان کے ذہنی توازن کی دلیل ہے ویسے بھی وہ خود ساختہ ترقی پسند ادیب جو فسطائی قطعیت کے ساتھ ادب اور زندگی کے اصولوں پر رائے زنی کرتے تھے اور اقبال کو ایک عہد رفتہ کا شاعر بتلاتے تھے جس کی شاعری اور جس کا پیام عہد حاضرہ کے لئے کوئی قابل قدر چیز نہ تھی۔ اب رفتہ رفتہ اپنی رائے بدل رہے ہیں اور اقبال کو ترقی پسندی کا امام ماننے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

پوری کتاب آرٹ پیپر پر چھپی ہے۔ لیکن اپنے ظاہری حسن کے علاوہ ایک اور لحاظ سے یہ مجموعہ قابل قدر ہے۔ موجودہ دور کے شعرا کے رجحانات اس انتخاب میں نمایاں طور پر ظاہر ہوتے ہیں۔ نئے اور پرانے شاعر سب ہی نے اردو کے پھولوں کی آبیاری کی ہے۔ اس میں ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک ہیں۔ عہد حاضر میں ساحر کی سادگی و روانی۔ فراق کے کلام کا تخیلی پہلو اور کیفی دہلوی کی رومانی اور اخلاقی شاعری قابل توجہ ہیں۔ مثال کے طور پر ساحر کا یہ شعر ؎

کوئی حرم سے ، دیر سے منسوب ہے کوئی
اک رہ گیا ہوں میں کہ تمہارا کہیں جسے

صفی کے اس شعر کے ہم مرتبہ ہے ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا
ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

ساحر اپنی پیرانہ سالی میں بھی جس جوش و خلوص کے ساتھ مشاعرہ کرتے تھے وہ آپ اپنی نظیر تھا۔ آداب محفل کا بہت خیال رکھتے اور حاضرین پر ان کی بزرگانہ محبت کا بڑا اثر پڑتا۔ مبتدیوں کی ہمت افزائی کرتے، استادوں کے سامنے مبتدیوں کی طرح بیٹھتے۔ افسوس وہ اب ہماری محفلوں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو چکے اور راجہ نریندر ناتھ بھی جو انکے یہاں اگر دہلی ہوتے تھے تو مشاعرہ کی صدارت کیا کرتے تھے۔

آزاد انصاری اور آرزو سادگی و پرکاری۔ آثر صہبائی کی چاشنی غم احسان دانش کی گلکاری۔ اختر شیرانی کی نغمگی۔ جگر کی سرشاری، جوش کی صناعی۔ حسرت کی رنگ آفرینی۔ حفیظ کے گیتوں کی چاشنی۔ سیماب اور صفی کی پختگی۔ نوح اور وحشت کی شوخی۔ سائل کی لطافت زبان۔ اثر کی فراوانی جذبات کون سی چیز ایسی ہے جس کے بغیر اردو شاعری اپنا رنگ روپ قائم

رکھ سکتی ہے۔

نوح اور سائل۔ ثاقب اور بیخود۔ آرزو و جلیل۔ غزل کے اُستاد ہیں۔ اُنھوں نے زبان کے سانچے بنائے۔ ان سانچوں میں نازک ترین احساسات کو بیان کیا۔ حسرت اور جگر نے زبان کو لطافتوں اور رنگینیوں سے مالا مال کیا۔ جوش نے ایک رمز رندی سنایا۔ حفیظ نے سریلے گیت گائے۔ احسان نے غمِ زندگی کی نقاشی کی۔ ان سب رجحانات کو ہم اس مجموعہ کے آئینہ میں دیکھ سکتے ہیں۔

سلام مچھلی شہری ہمارے ایک نوجوان شاعر ہیں۔ ان کا ایک مجموعہ کلام "میرے نغمے" کے نام سے لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے۔ دوسرا مجموعہ اب مکتبہ اُردو لاہور سے شائع ہوا ہے [اس کو پچھلے مجموعہ کا تتمہ سمجھنا چاہیے کیونکہ پچھلے مجموعہ کے دو حصے تھے۔ ایک "پھول" اور دوسرا "انگارے" پھول والا حصہ شائع ہو گیا۔ لیکن انگارے والا حصہ ایک مبہم اعلان کے ساتھ کہ "سب کچھ ہو جانے اور پروف دیکھ لینے کے بعد ہمیں اچانک معلوم ہوا کہ کتاب نہیں شائع ہو سکتی"۔ شائع نہیں کیا گیا۔ "انگارے" والے حصہ کی ۹۲ صفحے کی فہرست "میرے نغمے" میں ملی ہوئی ہے۔ "دستیں" ۱۱۸ صفحے کی کتاب ہے اور پہلی نظم صفحہ ۹ پر ملتی ہے۔ اس میں ہاجرہ سے شہر لکھنؤ۔ شرک بن رہی ہے۔ "وہی مجھے وہ نظم لکھنی ہے" وہ نظمیں ہیں جو "میرے نغمے" کی فہرست میں شامل ہیں۔ اور مختلف رسالوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ معلوم نہیں پھر کیا امر "میرے نغمے" میں ان کی اشاعت ذکر کرنے کا باعث ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس اعلان کے وقت "کہ جیسے ہی ادب اور آرٹ کو زبان کھولنے کی اجازت ملی، ہم سلام مچھلی شہری کے تمام کلام کا مجموعہ شاندار طور پر پیش کریں گے"۔ درحقیقت دوسری کتاب کا خاکہ پیش نظر تھا۔ ورنہ سمجھ میں نہیں آتا کہ جو چیز ۱۹۴۰ء یا ۱۹۴۱ء میں شائع نہیں ہو سکتی تھی وہ ۱۹۴۴ء یا ۱۹۴۵ء میں کس طرح شائع ہو سکی۔ جبکہ جنگ برابر جاری ہے۔ اور ہندوستان پر اس کا اثر پہلے سے زیادہ پڑ رہا ہے۔ یہ "انگارے" ہماری نظروں سے رسائل میں گذر چکے ہیں۔ ہم سمجھا کہ انکی اشاعت کتابی صورت میں اس وجہ سے نہ ہو سکی کہ انقلابی نظمیں ہیں اصلیت سے دور ہوگا۔ نہ جانے کتنا انقلابی ادب اس جنگ کے دوران میں شائع ہوا اور ہو رہا ہے۔ مدنی ادب اور روسی ادیبوں سے جس طرح ہم ان دنوں بہرہ یاب ہوئے اس سے قبل نہیں ہوئے تھے۔ "سرخ سویرا" اور "جھنکار" جیسے مجموعے حال ہی میں شائع ہوئے ہیں]

سلام صاحب کی کتاب کو میں نے اوّل سے آخر تک پڑھا۔ اس کے بعد اپنے چند احباب سے جو خود بھی ترقی پسند شاعر، مصنف یا نقاد ہیں تبادلۂ خیال کیا جس سے مجھے معلوم ہوا کہ جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ چنداں غلط نہیں۔ یعنی سلام صاحب کی زیادہ تر نظموں میں نہ تو تعین مقصد ہے۔ نہ روانی ہے۔ نہ وہ گداز جو شاعری کی جان ہے۔ نہ ان کو ابھی الفاظ پر مکمل قدرت حاصل ہے۔ نہ وہ اپنا مطلب بہتر واضح طور پر بیان کر سکتے ہیں۔ نہ آرٹ ہے۔ نہ ایسے خیالات ہیں جنکا شاعری کے ذریعہ عوام تک پہنچانا ضروری ہو۔ مثال کے طور پر لیجیے۔ اُنھوں نے "ادب برائے حیات" اور "ادب برائے ادب" پر بحث سنی۔ اور فوراً ایک قطعہ لکھ ڈالا جس کی سرخی ہے "نقادوں سے"۔ اگرچہ قطعہ میں صرف "ناقدِ زبان و ادب" سے ہی تخاطب ہے لیکن اس قطعہ میں سوائے اس اعلان کے کہ

تو پھر ادب میں ابھی انقلاب کی خاطر کہاں ہے فرصتِ پابندیِ قیود و نکات

جس کو اُنھوں نے اپنی بے رنگ نظموں کیلئے اعلان جواز سمجھ لیا اور کچھ نہیں۔ ترقی پسند نقاد خود اس نظریہ کی تردید کر چکے ہیں۔ ادب میں انقلاب کے لئے زنگ آلود یا کچے ہتھیار استعمال نہیں کئے جا سکتے۔

اس مجموعہ میں بعض نظمیں مثلاً "مجھے وہ نظم لکھنی ہے"۔ "سات رنگ" "پناہ" اچھی نظمیں ہیں۔ اور اگر ایسی ہی نظمیں اور ہوتیں تو ہمارے نوجوان شعرا میں سلام کا پایہ بہت بلند ہوتا۔ لیکن ایسی نظمیں بھی ہیں جیسے "مال روڈ لکھنؤ" اور "مشکی برج لکھنؤ" جو بالکل سطحی ہیں اور کسی مبتدی کی کوشش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔

سلام پر موجودہ شاعروں میں میراجی اور فیض کا اثر پڑا ہے لیکن اُن کے یہاں میراجی کا ابہام بھی نہیں جو شعر کی کمزوریوں پر نقاب ڈال سکے نہ فیض کی رفعت تخیل ہے۔ اُن کی نظم "زرد چراغ" جو اس شعر سے شروع ہوتی ہے:

گُل کر دو پھینک دو پہلے ہی سے یہ زرد چراغ
آج ہی عیش کے لمحات فسردہ کیوں ہیں

جس میں فیض کا انداز جھلکتا ہے۔ آگے چل کر ایسے چشمہ کی طرح جو صحرا میں خشک ہو جائے مدھم ہو کر ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح "اندیشہ" جو میراجی کے مبہم انداز میں لکھی گئی ہے۔ میراجی کی زیادہ تر نظموں کی طرح سلیقہ ہی گورکھ دھندے میں کھو جاتی ہے۔ احسان دانش کے رنگ میں غمگین زندگی کی نقاشی ایک نظم میں کی گئی ہے۔ جس کا عنوان ہے "ہاجرہ سے" اس میں وہ انگارے تو نہیں دہکتے جو احسان کی شاعرانہ نقاشی کو روشن کرتے ہیں لیکن چنگاریاں ضرور سلگتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ زندگی کے تند و تیز دھارا کو

[ ] یہ حصہ نشر کے بعد اضافہ کیا گیا ہے۔

اتنی فرصت کہاں کہ بقول سلام صاحب" جہان کے ظلم فضا آلام" کے تبدیل ہونے کا انتظار کر سکے۔

تکنیک کے بھی سلام نے تجربے کئے ہیں۔ اس میں وہ بالکل ناکامیاب بھی نہیں۔ لیکن اُن کے یہاں وہ ناپختگی کا احساس ضرور ہے۔ کہاں ناشند کا زور بیان اور شوکت الفاظ اور کہاں سلام کی "بنگال کی رقاصہ" والی نظم جو بالکل بے آب اور پھیکی ہے۔

سلام Catchwords اور Slogan کے شاعر ہیں یہی ان کے کلام میں جہاں جہاں ناپختگی نظر آتی ہے اس کی ذمہ دار ہے۔ وہ ان نعروں کو سمجھنے بھی نہیں پاتے کہ نظم لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسی نظمیں پیش کرتے ہیں جو نامکمل ہوتی ہیں۔ جن میں سطحی تخیل کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ جس میں شاعری کا رچاؤ نہیں ہوتا۔ "ادب برائے حیات" میں تو خاص طور پر دہی دلکشی ہونی چاہیے۔ جو "حیات نو" کے تخیل میں ہے۔ سلام کی نظموں میں جدید رجحانات کا پرتو ملتا ہے۔ لیکن انہیں ابھی آرٹ اور سکے پروپگنڈے میں تمیز کرنا سیکھنا ہے تاکہ ان کی نظموں میں کھردرے پن کے بجائے دلکشی اور سطحی جذبات کے بجائے گہرائی پیدا ہو سکے۔

سلام کی شاعری تجرباتی شاعری ہے۔ اس مجموعہ کے شائع ہونے کے بعد ان کی چند اور نظمیں ادھر اُدھر چھپی ہیں۔ یہ نظمیں رعنائی تخیل اور لطافت زبان کے لحاظ سے اس مجموعہ کی بہت سی نظموں سے بلند ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو نظمیں انہوں نے غور و خوض سے کہی ہیں وہ کامیاب ہیں۔ ان کے ہم پلہ شاعروں کے کلام سے موازنہ کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلام کا کلام اپنے گروپ کے شاعروں میں کسی اور شاعر کے کلام سے کم درجہ نہیں رکھتا۔ غور و فکر کی مدد سے ان کی شخصیت کے نقوش زیادہ اجاگر ہو سکیں گے۔ اور ان کی نظموں میں زیادہ شیرینی، گداز اور اثر آفرینی پیدا ہو سکے گی۔ (منشور از نشرگاہ لکھنؤ)

عراقی و مغربی

(از پروفیسر یوگ دھیا صاحب آہوجہ ایم۔ اے)

شیخ فخر الدین عراقی[1] کا زمانہ تیرہویں صدی عیسوی کا آخری حصہ ہے۔ شیخ محمد شیریں مغربی[2] کا دور اُن سے لگ بھگ ایک صدی بعد کا ہے۔ ان دونوں صوفی شعراء کے کلام کا پہلو بہ پہلو مطالعہ ایران کی شاعری، بالخصوص صوفیانہ شاعری کا ایک اہم باب ہے۔

شیخ مغربی کے کلام کا مطالعہ یہ واضح کرتا ہے کہ شیخ عراقی کے اشعار اس زمانے میں کس قدر ہر دلعزیز ہو چکے تھے۔ اس کے ساتھ ہی شیخ مغربی کی شاعری پر شیخ عراقی کے کلام کا اثر بھی نمایاں ہے۔ وزن اور بحر میں مغربی کی کچھ غزلیات عراقی کی غزلیات سے متحد البحر ہیں۔ الفاظ کی بندش اور ترکیب کی رو سے مغربی کے اشعار بہت مقامات پر عراقی کے مرہونِ منت نظر آتے ہیں۔ خیالات اور جذبات میں بھی مغربی کے کلام پر عراقی کے خیالات اور جذبات کے تاثرات عیاں ہیں۔

متحد البحر غزلیات

مغربی کے کلام میں اُن کی کچھ غزلیات شیخ عراقی کی لکھی ہوئی کچھ ہر دلعزیز اور مقبول غزلیات کی زمین میں لکھی ہوئی ہیں۔ ان دونوں شعراء کی کچھ ایک غزلیات کے مطلعے درج ذیل ہیں:-

(i) عراقی:- چنیں کہ حال من اینست در خرابات است
می مغانہ مرا بہتر از مناجات است

مغربی:- دلی کہ آئینہ روی شاہد ذات است
بروں ز عالم نفی و جہان اثبات است

(ii) عراقی:- عراقی بار دگر توبہ بشکست
ز جام عشق شد شیدا و سرمست

مغربی:- چناں مستم چناں مستم چناں مست
کہ نہ پائے دانم از سر نہ سر از دست[3]

(iii) عراقی:- تماشا میکند هر دم دلم در باغ رخسارش
بکام دل ہمی نوشد مئے لعل شکر بارش

مغربی:- دلا گر دیدہ داری بیا بکشا بدیدارش
ز رخسار بہ پیدا ہاں ہمی خوبی رخسارش

(iv) عراقی:- دلے کہ آتش شوق تو اش بسوزد پاک
ز بیم آتش دوزخ کجا شود غمناک

ولہ:- بیا کہ خانۂ دل پاک کردم از خاشاک
درین خرابہ تو خود کی قدم نہی خاشاک

مغربی:- بیا کہ کردہ ام از نقش غیر آئینہ پاک
کہ تا تو چہرۂ خود را بہ دیدگی ادراک

ولہ:- تو ئی خلاصۂ ارکان انجم و افلاک
ولی چہ سود کہ خود را نمی کنی ادراک

(v) عراقی:- گرچہ ز جہاں ہمہ ی نداریم
ہم سر بجہاں فرو نیاریم

مغربی:- ما مست و خراب چشم یاریم
آشفتۂ زلف آں نگاریم

(vi) عراقی:- درین رہ گر بترک سر بگوئی
بہ بینی کانچہ می جوئی خود اوئی

مغربی:- سبو بشکن کہ آبی نے سبوئے
ز خود بگذر کہ دریائے نہ جوئے

(vii) عراقی:- تا چند ملق باشیم بہ روئے ہر نگاری
چوں بشنویم عاشق بر چہرۂ تو باری

مغربی:- دارد نشان یارم ہر دلبری و یاری
بینم جمال رویش از روئے ہر نگاری

(viii) عراقی:- بشرابہ تلندہ بزن از حریف باقی
کہ دراز و دور دیدم رہ کوئے پارسائی

مغربی:- صنما نقاب از رخ زہم ۔۔۔ رد نمی کشائی
زکہ رخ نہفتہ داری ز چہ رو ۔۔۔

(ix) عراقی:- از کرم در من بیچارہ نگر ۔۔۔
کہ ندارم بجز از لطف تو ۔۔۔

مغربی:- آنکہ جاں یابیم ز انفاس خوش ۔۔۔
چونکہ کس محرم او نیست ۔۔۔

---

[1] المتوفی سنہ ۶۸۶ھ مطابق سنہ ۱۲۹۷ء

[2] المتوفی سنہ ۸۰۹ھ مطابق سنہ ۱۴۰۷ء

[3] دیوان مغربی۔ مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۳۰۵ھ۔ صفحہ ۱۴

بندش الفاظ دونوں شعرا کے کلام میں مختصر ترکیبیں اور الفاظ کی بندشیں، شیخ عراقی کے اشعار کی اثر اندازی کو نمایاں کرتی ہیں اور بعض مقامات میں ظاہر ہوتا ہے کہ مختلف ترکیبوں میں شیخ مغربی کے اشعار نے براہ راست شیخ عراقی کے اشعار سے تاثرات حاصل کئے ہیں۔ الفاظ اور طرز ادا کے لحاظ سے مندرجہ ذیل اشعار توجہ کے قابل ہیں۔

عراقی کی ایک مشہور غزل کا شعر ہے ؎

در صفت که منم از شراب عشق خراب　　مرا چه جائے کرامات نام یا ننگ است

عراقی کے پہلے مصرعہ کی جھلک مغربی کے اس شعر میں ہے ؎

در آن صفت که منم مست ساقی باقی　　عجب که باز شناسم شراب راز شراب

یا عراقی کا ایک شعر ہے ؎

چنان ز تن چنان که ندانم که من منم　　نے پائی دانم از سر و نی راحت از خدا

اور مغربی لکھتے ہیں ؎

چنان مستم چنان مستم چنان مست　　که نی پائے دانم از سر، سر از دست

عراقی ایک جگہ تحریر کرتے ہیں ؎

بگرد خود برآ یکبار آخر　　بگرد جملہ عالم چند پوئے

الفاظ کا معمولی سا تغیر ہے۔ مغربی لکھتے ہیں ؎

سفر اندر خود سفر کن　　بگرد عالم اندر چند پوئے

اسی طرح عراقی کا ایک شعر ہے ؎

ز پا گلیمت شستہ گردد　　اگر یکبار دست از خود بشوئی

مغربی لکھتے ہیں ؎

برست اے مغربی از خواب وصلش　　بیابی تا که دست از خود بشوئی

اسی طرح عراقی کا ایک شعر ہے ؎

جمالت خار نیست حسن خوباں　　مسکیں کسی کز آن گل تا نیش شود بخاری

اور مغربی لکھتے ہیں ؎

گلشن خاری ست ہر دو عالم　　تو کی رسی بگلشن تا نگذری ز خاری

مشترکہ جذبات کا بیان ویسے بھی صوفیائے کرام کے مضامین کی سرحدیں عام طور پر ایک دوسرے کے نزدیک ہی ہوتی ہیں۔ شیخ عراقی اور مغربی دونوں کا شمار صوفی شعرا کے زمرہ میں ہے۔ خیالات کے بیان اور جذبات ان میں بہت یگانگت پاتے ہیں۔ حقائق معرفت کو ادا کرتے کئی صورتوں میں عراقی اور مغربی نے ایک جیسی بندشیں اور تشبیہیں استعمال کی ہیں۔ اسکے ساتھ ہی شیخ مغربی کے بعض اشعار میں شیخ عراقی کے خیالات اور جذبات کی جھلک ظاہر ہے۔

وحدت وجود اور کثرت صفات کے بارے میں شیخ عراقی لکھتے ہیں ؎

جملہ یک نور است لیکن رنگ ہائے مختلف　　اختلافے در میان این و آن انداختہ

اور مغربی کا ایک شعر ہے ؎

بادہ بے رنگ است لیکن رنگہائے مختلف　　می شود ظاہر ز داز اختلاف جام و کاس

انسان اس ذات واحد کی صفات کثیرہ کا مظہر ہے۔ اس خیال کو عراقی نے یوں پیش کیا ہے ؎

جام گیتی نمائے او مائیم　　کہ بما ہر چہ بود پیدا شد

مغربی نے یہ خیال یوں بیان کیا ہے ؎

ما جام جہاں نمائے ذاتیم　　ما مظہر جملۂ صفاتیم

یہی مضمون عراقی نے ایک اور جگہ بیان کیا ہے ؎

مرا بینی و بستی نود بیارائی　　ز بہر آنکہ بمن حسن خود کنی ادراک

مغربی کے ہاں یہی مضمون یوں ادا ہوا ہے ؎

منم که آئینہ دارم از دو کون تمام　　تو می که کردہ خود را در و تمام ادراک

عراقی نے [illegible] الفاظ کے لباس میں حقیقت کا سبق دیا ہے کہ پہلے کوئی چیز کھوئی جاتی ہے تب ہی اس کی کھوج ہو سکتی ہے ؎

نخستین گم کنند آنگاہ جویند　　تو گم ناکردہ چیزے از کہ جوئی

مغربی نے یہ مضمون ان الفاظ میں ادا کیا ہے ؎

ز خود او را طلب ہرگز نکردی　　اگرچہ سالہا در جستجوئی
کرا می بینی از خود می نپرسی　　کرا گم کردہ آخر نگوئی

صوفی سالک کی اصلی بقا فنا فی المحبوب ہوتا ہے۔ اس خیال کو شیخ عراقی نے بھی اور شیخ مغربی نے بھی "سایہ و آفتاب" یا ذرہ و مہر کی تشبیہ میں ادا کیا ہے۔

سایہ و آفتاب

عراقی:۔　چوں سایہ بہ آفتاب پیوست
　　　از ظلمت بود خود برآسود

مغربی:۔　مغربی تا شب ہستی تو باقی ماند
　　　نور خورشید من از مشرق جاں بر ناید

عراقی　کی خانۂ من خراب گردد
　　　تا مہر برآید از در و بام

مغربی　آفتاب رخت چو تابان گشت
　　　منہزم شد ز نور او ظلمات

ذرہ و مہر

شیخ عراقی لکھتے ہیں ؎

چوں بدیدم آفتابِ رخش | از طرب ذرہ وار بر جستیم
آفتاب اندرونِ خانۂ ما | در بدر می ردم ذرہ مثال
ذرہ بودیم آفتاب شدیم | از عراقی چو مہر بگسستیم
در سایہ محو دل عراقی | کاں ذرہ بہ آفتاب پیوست
چوں پیشِ آفتاب شوم محو ذرہ وار | منذ در باسلسم ارزا انا الشمس مزنم

شیخ مغربی کے اشعار ہیں ؎

ہم ذرہ بہ مہر گشت موجود | ہم مہر بذرہ گشت پیدا
از ظہور آفتاب روی او | گشتہ ظاہر جملہ ذرات کون
تا مہر تو دیدیم ز ذرات گذشتیم | از جملہ صفات ازپی آں ذات گذشتیم
شدہ ز دوری خورشید مغربی حقیر | چنانکہ ذرۂ سرگشتہ در ہوا ماندہ
در مہر رسیم مغربی دار | اے دوست دمے کہ ذرہ داریم

عراقی کے اشعار میں جو خیال ابہام و اختصار میں ادا ہوا ہے بعض اوقات ویسا ہی خیال مغربی کے کلام میں تفصیل و وضاحت سے بیان ہوا ہے۔

عراقی کا ایک شعر ہے ؎

چو بر زبان عراقی حدیث عشق رود | برو مگیر کہ اں دم نہ آید دست زباں

مغربی لکھتے ہیں ؎

از زبانِ مغربی یار می گوید سخن | مدتے باشد کہ او شد از سخن گفتن خموش

شاہد مطلق کو دیکھنے کیلئے آنکھوں میں نور بھی اس کا چاہیئے عراقی لکھتے ہیں ؎

بخود طلبت تو یافتم جمال ترا | بہ آفتاب تواں یافت کآفتاب کجاست

مغربی کا ایک شعر ہے ؎

دیدہ دام کہم از دل بدوست نگرم | زانکہ شائستۂ دیدار تو جنود نظرم

شیخ عراقی جب ملتان میں شیخ بہاؤ الدین زکریا کی خدمت میں [illegible] عراقی [illegible] کیلئے بھایا شیخ عراقی نے ریاضت کے گیارہویں دن [illegible] ہیں ؎

[illegible] مستی عاقی دام کردند
[illegible] عشق نام کردند
[illegible] نام کردند

غزل لکھی۔ اگرچہ ردیف اور قافیہ [illegible] عراقی [illegible] غزل کا تتبع نہیں کہہ سکتے۔ لیکن اشعار سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان پر عراقی کی غزل کا عکس ہے۔ اور مغربی کا مقطع اس حقیقت کو اور بھی نمایاں طور پر واضح کرتا ہے۔ غزل کے کچھ اشعار یہ ہیں ؎

زقدرت سرو بستاں آفریدند | زرویت ماہ تاباں آفریدند
برائے عاشقاں از مہرِ رویش | ہزاراں درد و درماں آفریدند
چو خود خوردند بادہ مغربی را | چرا سرمست و حیراں آفریدند

ویسے بھی شیخ مغربی کے کلام کے مطالعے سے یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ وہ شیخ عراقی کے کلام سے کماحقہٗ واقف تھے۔ عراقی کی ایک مشہور و مقبول غزل کا مطلع ہے ؎

پسر ارہ قلندر بزن ار حریفِ مائی
کہ دراز و دور دیدم رہ کوئے پارسائی

ظاہر ہے کہ شیخ مغربی کے مدِنظر یہی مطلع ہے جب وہ لکھتے ہیں ؎

مشنو حدیثِ آں کس کہ بہ عشوہ گفت با تو
پسر ارہ قلندر بزن از حریف مائی

شیخ مغربی کے قلم کو شیخ عراقی کے مقام تصوف کا پورا احترام ہے۔ اسی غزل میں شیخ مغربی کا ایک شعر ہے۔

نہ شود کسے عراقی بہ حقائق عراقی
نہ شود کسے سنائی بہ معارف سنائی

ایک اور مقام پر شیخ مغربی لکھتے ہیں ؎

از موجِ او شدہ است عراقی و مغربی
وز جوش او سنائی و عطار آمدہ

پانی

(از واحدی)

پانی اُن تین چیزوں میں سے ایک ہے جن پر زندگی کا دار مدار ہے۔ اوّل نمبر ہوا کا ہے۔ ہوا لمحہ بھر نہ ملے تو سب جاندار مر جائیں۔ دوسرا نمبر پانی کا ہے۔ اور تیسرا نمبر غذا کا ہے۔ غذا چھوڑ کر انسان اگر چالیس دن جی سکتا ہے تو پانی چھوڑ کر شاید چالیس گھنٹے۔ پانی غذا کے مقابلہ میں آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے اس لئے پانی کی اہمیت ہمارے دلوں کے اندر کم ہے۔ حالانکہ پانی کا آسانی سے حاصل ہونا ہی پانی کی اہمیت کی دلیل ہے۔ ہوا پانی سے بھی زیادہ آسانی سے مل جاتی ہے۔ یعنی بالکل مُفت۔ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے۔

زندگی کے لئے جو چیز جتنی ضروری ہے اتنی ہی اُس کی افراط ہے اور پیدا کرنے والے اور پالنے والے خدا نے اس کا فیضان عام کر دیا ہے۔

تمہارے گھر میں پانی کے ساتھ بے پرواہی برتی جاتی ہے تو گھر والوں سے کہو کہ پانی کی ناقدری نہ کریں۔ آؤ۔ اب تمہیں گھر کے اہتمام کے بعد یہ بتائیں کہ گاؤں، قصبوں اور شہروں کے واسطے پانی کا اہتمام کیونکر کیا جاتا ہے۔ یہ تمہارے نلوں اور کلسوں میں پانی کہاں سے آ جاتا ہے؟

جس طرح خدا نے ہمارے تمہارے لئے ہوا بنائی ہے۔ اسی طرح پانی کا بندوبست بھی کیا ہے۔ سمندروں کو تم جانتے ہو۔ یہ پانی کے خدائی خزانے ہیں۔ جو دنیا کے مختلف حصوں میں محفوظ ہیں۔ اور ساری دُنیا کو پانی انہی سمندروں سے پہنچتا ہے۔ سمندروں کے پانی کو سورج کی گرمی سے کھولایا جاتا ہے اور پھر پانی کے بخارات ہوا میں اُٹھتے ہیں جنہیں بادل کہتے ہیں۔ ہوا ان بادلوں کو چاروں طرف پھیلا دیتی ہے۔ بادل برستے ہیں اور بادلوں سے برسے ہوئے پانی نے ہی کہیں ندی اور دریا کی شکل اختیار کر لی ہے۔ کہیں کنوئیں کی شکل اور کہیں آبشار کی شکل۔

پانی یا سمندروں میں ہے یا سمندروں سے اُٹھے ہوئے بادلوں میں۔ پانی کے ملنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ پہلے جب انسانوں کی تعداد اتنی نہیں تھی جتنی اب ہے اور جب انسان گھنا بسا ہوا نہیں رہتا تھا اور جب دھواں اُڑانے والی چیزوں کا رواج نہیں تھا تو لوگ بادلوں سے برسے ہوئے پانی کو پیا کرتے تھے۔ اس پانی کو چھتوں پر اور گڑھوں میں طریقہ طریقہ سے جمع کر لیتے تھے اور پیتے رہتے تھے۔ برسے ہوئے پانی میں کیڑا اندر تو نہیں پڑتا اور اُسے اُس زمانہ میں فلٹر کرنے کی ہرگز ضرورت نہیں تھی۔ لیکن اب انسانی آبادی کے اوپر کی فضا اس قدر گندہ رہتی ہے کہ اس فضا سے گزرے ہوئے پانی کو اچھا نہیں قرار دیا جا سکتا۔ تہذیب و تمدن سے دُور جنگلوں اور پہاڑوں میں برسا ہوا پانی آج بھی اچھا ہوتا ہے۔ لیکن بڑے بڑے شہروں میں جو پانی برستا ہے وہ ایسا پاک صاف نہیں ہوتا کہ اسکی تعریف کی جا سکے۔ تم کہو گے کہ زمین تک پہنچتے پہنچتے پانی فقط فضا کی خرابیوں سے خراب ہو جاتا ہے تو زمین میں گھس کر اور زمین میں جذب ہو کر تو اُسے زیادہ بگڑ جانا چاہیئے۔ پھر لوگ زمینیں کھود کھود کر کنوئیں کیوں تیار کرتے ہیں۔ اور کنوؤں کا پانی کیوں پیتے ہیں۔ سُنو! یہ پانی زمین میں گھستے ہی فلٹر ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ بیشک۔ انسان نے فضا کو گندہ کر دیا تو زمین پر اُس کے مُبارک قدموں کا کیا کم اثر ہوگا۔ برسات کا پانی اس زمین میں بھی جذب ہوتا ہے جہاں غلاظتیں ڈالی جاتی ہیں۔ اور اس زمین میں بھی جذب ہوتا ہے جو ڈلاؤ یا ڈمپنگ گراونڈ تو نہیں ہیں تاہم انسان کی موجودگی اسے قطعی پاک صاف بھی نہیں رہنے دیتی۔ لیکن اس زمین میں بھی جذب ہوتا ہے جو انسانی آبادی سے کسی قدر بچی ہوئی ہے۔ پھر زمین کی اندرونی حالت بھی الگ الگ ہے کہیں وہ تہہ جس پر پانی جا کر رُک جاتا ہے۔ سطح زمین سے دس فٹ نیچی ہوتی ہے۔ دس فٹ کا سفر اور اوپر کی زمین کا سفر پانی کو کافی فلٹر نہیں کر سکتا۔ لیکن کہیں پانی پچاس اور سو فٹ پر رُکتا ہے اور کہیں دو سو اور تین سو فٹ پر رُکتا ہے۔ دو سو اور تین سو فٹ نیچے کا پانی برمے سے نکالا جاتا ہے۔ لوگ برمے زیادہ نیچے اُترنے سے گھبراتے ہیں۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ پانی جتنا دُور جا کر نکلتا ہے اُتنا ہی فلٹرڈ ہوتا ہے اور اس میں اتنی دُور جاتے جاتے اکثر ایسی چیزیں بھی شامل ہو جاتی ہیں جو اُسے نہایت صحت بخش بنا دیتی ہیں۔ پہاڑی چشموں کا بھی یہی حال ہے۔ اگر برسات کا پانی اُونچے پہاڑ پر برس کر بہتا ہوا خوب نیچے آ گیا اور راستہ میں وہ معدنیات وغیرہ کو چھو چھو کر گذرا تو اُسے پی کر اور اس سے نہا کر بیمار اچھے ہو سکتے ہیں۔ لیکن ہر چشمہ پر بھی اعتبار کرنا مشکل ہے۔ نیز پہاڑوں پر گنجان آبادیوں کی گنجائش نہیں ہوا کرتی اور گنجان آبادیاں جہاں بستی ہیں وہ زمین عموماً کنوئیں کھودنے کے لائق نہیں رہتی اور ہے بھی تو اتنی تعداد میں کنوئیں کھودے یا برمے کے ذریعہ تیار نہیں کئے جا سکتے۔ کہ لاکھوں آدمیوں کی ضرورت پوری ہو جائے۔

لہٰذا تم اگر کسی پہاڑ کے رہنے والے ہو تو تمہارے ہاں تو ضرور چشمہ کا پانی آتا ہوگا۔ اور تم اگر گاؤں، قصبے یا چھوٹے سے شہر کے رہنے والے ہو تو

تمہارے ہاں کنویں کا پانی آنا چاہیئے۔ اور تم اگر دلی یا دلی سے ملتے جلتے شہر کے رہنے والے ہو تو تمہارے ہاں دریا کا پانی آتا ہے۔

دلی والے دریائے جمنا کا پانی پیتے ہیں۔ دریا بڑے بڑے چشموں سے نکلتے ہیں۔ پہاڑوں پر برسا ہوا اور پہاڑوں میں سے گزرا ہوا پانی نہایت عمدہ ہونا چاہیئے لیکن سیکڑوں میل کی مسافت طے کرکے جمنا کا جو پانی دلی پہنچتا ہے اس میں نہ معلوم کیا کیا الابلا مل جاتی ہوگی اور کیسے کیسے زہریلے اور مہلک کیڑے پیدا ہو جاتے ہوں گے۔ اس واسطے میونسپل کمیٹی دہلی نے یہ کیا ہے کہ دلی سے پانچ چھ میل فاصلہ پر دریائے جمنا کے کنارے ایک گاؤں ہے وزیر آباد۔ وہاں دریا کا پانی روکنے کا انتظام کر دیا ہے۔ اس طرح کہ دریا کا بند باندھ دیا ہے اور ایک طرف نشیب بڑھا دیا ہے کہ پانی مطابق ضرورت مقدار میں اس نشیب کے اندر جمع ہو جائے۔ اور پمپ لگا دیا ہے جو پانی کو نشیب سے کھینچ کھینچ کر بڑے بڑے پختہ نالوں کے ذریعہ ایک دوسرے گاؤں چندراول میں پہنچا دیتا ہے۔ چندراول دلی سے ڈھائی تین میل دور ہے۔ چندراول میں میونسپل کمیٹی نے بہت سے بڑے لمبے چوڑے اور گہرے حوض بنائے ہیں اور نالیوں کے ذریعے ایک حوض سے دوسرے حوض میں پانی جاتا رہتا ہے۔ وزیر آباد سے چندراول تک آنے کا راستہ بھی چکر دار ہے اور چندراول کے حوضوں کے درمیان کی نالیاں بھی دانستہ پھیر دے دیکر بنائی گئی ہیں۔ کافی کوڑا کرکٹ تو ان چکروں اور ہیر پھیر میں آگے بڑھنے سے رہ جاتا ہے پھر یہاں پانی کی رفتار سست کر دی جاتی ہے۔ یہ سست رفتاری بھی کوڑے کرکٹ کو ٹھہرا لیتی ہے۔

دوسرے تیسرے حوض کی درمیانی نالیوں میں امونیم پرکلورائڈ ایک دوا ہوتی ہے۔ اس کے ڈھیمے رکھ دیتے ہیں۔ اس دوا پر سے پانی گذرتا ہے اور صاف ہوتا جاتا ہے۔ تیسرے حوض میں پانی کا میل کچیل سب بیٹھ جاتا ہے۔ اور چوتھے حوض میں پہنچ کر پانی موتی جیسا چمکدار ہو جاتا ہے۔ اسکے بعد یہ پانی ایک مشین میں سے نکالا جاتا ہے جس کا نام پٹرسن فلٹر ہے۔ اس مشین کے ایک حصہ میں کوئلہ کی راکھ ہوتی ہے اور دوسرے حصہ میں دریا کا موٹا ریت ہوتا ہے اور تیسرے حصہ میں دریا کا مہین ریت۔

تحقیق ہوا ہے کہ دریا کے مہین ریت کے دو ذرے جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ان کی گولائی کے درمیان اوپر نیچے جو خلا رہ جاتا ہے وہاں خدا تعالیٰ ایک کیڑا پیدا کر دیتا ہے جو دریا کے پانی کے تمام مہلک کیڑوں کو کھا جاتا ہے اور ان کیڑوں کو کھا کر فضلہ خارج کرتا ہے تو خود بھی مر جاتا ہے۔ مشین کے اس حصہ سے گذر کر پانی پینے کے قابل ہو جاتا ہے۔

خاص خاص چشموں اور خاص خاص کنوؤں کے سوا جمنا کے پانی سے بہتر پانی نہیں مل سکتا۔ جمنا کے اصلی پانی سے گنگا کا اصلی پانی اچھا ہوتا ہے۔ تو گنگا کا ان طریقوں سے تیار کیا ہوا پانی بفضلہ اللہ بہتر ہوگا۔ لیکن عام چشموں اور معمولی کنووں سے جمنا کا تیار کیا ہوا پانی فائق ہے۔

مشہور شاعر حضرت اکبر الہ آبادی نے فرمایا تھا کہ ؎

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا — حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے — شاہ ایڈورڈ کی دہائی ہے

محض وہ تاثرات تھے جو ایک تبدیلی اور ایک انقلاب کو دیکھ کر حضرت اکبر پر طاری ہوئے تھے ورنہ آج تو کوشش کی جا رہی ہے کہ انگریزی چھوڑ اردو کا بھی ٹائپ بن جائے اور ہندوستان کی دوسری سب زبانوں کے تو ٹائپ بن بھی چکے۔

علیٰ ہذا پائپ کے پانی کو بھی اب اطمینان۔ اعتماد اور بھروسہ کا پانی مانا جاتا ہے۔

خیر۔ چندراول سے بڑے بڑے لوہے کے نلوں کے ذریعہ پانی شہر دہلی کے دو رخ دو حوض بنے ہوئے ہیں ان میں آ جاتا ہے۔ ایک حوض فتح گڈھ پر ہے اور ایک جھنڈے والا میں ہے۔ چندراول کے کارخانہ کا نام واٹر ورکس ہے۔ یہ بنایا میونسپل کمیٹی دہلی نے تھا۔ اور میونسپل کمیٹی نے اسے مدتوں چلایا بھی۔ لیکن جب نئی دلی بسی تو گورنمنٹ نے لے لیا اور اب واٹر ورکس سے میونسپل کمیٹی کا بس اتنا واسطہ ہے کہ اس کی منتظمہ جماعت میں چار ممبر میونسپل کمیٹی دہلی کے بھی ہوتے ہیں اور میونسپل کمیٹی کے انجنیئر صاحب کو بھی مشورہ میں شریک کیا جاتا ہے۔

میونسپل کمیٹی کا انتظام اس وقت فتح گڈھ اور جھنڈے والا کے حوضوں سے شروع ہوتا ہے۔ میونسپل کمیٹی حوضوں پر سوا دو آنے فی ہزار گیلن کے نرخ سے پانی خریدتی ہے اور تمہارے گھر میں نل ہے تو تمہارے گھر میں اور تمہارے گھر میں نل نہیں ہے تو تمہارے گھر کے قریب سو پچاس گز کے اندر بازار تک یا گلی تک پانی پہنچا دیتی ہے۔ گھر کے نلوں سے گھر والے یا گھروں کے نوکر چاکر پانی بھر لیتے ہیں۔ اور کوچہ و بازار کے نلوں سے پانی سقے اور کہار لاتے ہیں۔ اور غریب غربا خود بھی لے آتے ہیں۔ کوچہ و بازار کے نلوں سے جو پانی لیا جاتا ہے اس کا میونسپل کمیٹی ایک پیسہ نہیں لیتی۔ جو خرچ ہوتا ہے وہ سقوں اور کہاروں کی پاؤ کی ڈھوائی پر خرچ ہوتا ہے۔ ہاں گھروں کے چھوٹے سائز کے نلوں سے عموماً ایک سے تین ٹونٹیوں تک ڈھائی روپے ماہوار لئے جاتے ہیں اور تین کے بعد کی ٹونٹیوں سے ۸ ر فی ٹونٹی۔

بلحاظ ضرورت کے گھریلو نلوں کے پانی کی قیمت ناپ کرلی جاتی ہے۔ دہلی کی آبادی اب بہت بڑھ گئی ہے اور کوچہ و بازار کے نلوں اور گھروں کے نلوں میں پانی صرف خرچ نہیں ہوتا بلکہ ضائع بھی جاتا ہے۔ اس لئے میونسپل کمیٹی کو پانی کی مد میں ناقابل برداشت نقصان ہورہا ہے۔ نیز لوگوں کو پانی انصاف کے ساتھ نہیں ملتا۔ گزشتہ سال میونسپل کمیٹی دہلی نے جتنا پانی واٹر ورکس سے خریدا اور جو سارے شہر پر خرچ ہوا اُس کا حساب لگایا گیا ہے۔ روزانہ فی کس ۲۲ گیلن پانی خرچ نکلتا ہے یعنی ایک مشک سے کچھ زیادہ ایک شخص نے خرچ کیا۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص روز ایک مشک استعمال نہیں کرتا۔ کسی نے پاؤ مشک استعمال کیا اور کسی نے پونے دو مشک اور دام دینے پڑے سب کو برابر۔ لہذا کمیٹی نے یہ علاج تجویز کیا ہے کہ چھوٹے نلوں پر بھی میٹر لگا دے اور کوچہ و بازار کے نلوں کی بھی میٹر لگا کر نگرانی کرے اس سے توقع ہے کہ کمیٹی بھی نقصان سے بچ جائے گی۔ اور لوگوں کے ساتھ انصاف بھی ہوسکے گا۔

(منشور از نشرگاہ دہلی)

تخلیقات

(از جناب عبداللہ مضطر گجراتی)

...قفس سے آشیاں پیدا کریں
بربطِ کہنہ سے نغماتِ جواں پیدا کریں

...کے پیمانوں سے چھلکا کر شرابِ آتشیں
نسل پروردہ فضا میں مستیاں پیدا کریں

...کے داغوں کو کریں گرم آتشِ احساس سے
ان اندھیروں میں نئی صبحِ بیکراں پیدا کریں

...دماغِ آفرینش پر ہیں ابتک گراں
آج ان سانسوں سے برقِ بے اماں پیدا کریں

داستانِ زندگی رنگین ہوہی جائے گی
آپ پہلے چشمِ خونابہ فشاں پیدا کریں

زندگی اک معصیت ہے بے نیازِ کفر و دیں
کیا ضرورت ہے کہ سجدے آستاں پیدا کریں

راہرو باقی نہیں جادہ تو باقی ہے ہنوز
پھر غبارِ کارواں سے کارواں پیدا کریں

...سلامت ہے تو پھر کیوں حسن کو تکلیف دیں
لاؤ ہم خود ہی جوابِ بتاں پیدا کریں

نقش بن بنکر بگڑ جاتے ہیں سطحِ خاک پر
... کجا آخر سراغِ کارواں پیدا کریں

حسن ہو نغمہ سرا یا عشق سازِ مستقل
امتزاجِ ساز و نغمہ سے جہاں پیدا کریں

یہ ہی پروانوں کی خاکستر یہ دیوانوں کی خاک
اب کھلا اس سے ربطِ جسم و جاں پیدا کریں

بے نشانی جبکہ ٹھیری منتہائے کائنات
کیا مقام اپنا بتائیں کیا نشاں پیدا کریں

خوب رسوائی مسلّم لیکن اسکا کیا علاج
ہے غمِ دل کا تقاضا رازداں پیدا کریں

بلندی بھی مری ہمت کو بس آنے لگی
اُس سے کہدو اب کوئی اور آسماں پیدا کریں

ہم کبھی مضطر نہ اظہارِ تمنا کرسکے
اب ارادہ ہے کہ اپنا ترجماں پیدا کریں

غزل

(از جناب درد سعیدی صاحب)

جرمِ خزاں تھا اور نہ قصورِ بہار تھا
خود اپنا آشیانہ ہی ناپائیدار تھا

یا مجھ سے تیری بزم ہی بیگانہ وار تھی
یا میں ہی تیری بزم سے بیگانہ وار تھا

جب تک ترا ستم نہ گوارا ہوا مجھے
تیرا کرم بھی میرے لئے ناگوار تھا

آنکھوں میں اب وہ اشک ہی بنکر سرشکِ غم
لب پہ کبھی جو خندۂ بے اختیار تھا

پیدا اسی نظر میں ہوئی اب یگانگی
جس میں کہ التفات بھی بیگانہ وار تھا

جب تک تمہیں بنا نہ سکا مرکزِ خیال
ہر وقت ذہن و فکر پہ اک انتشار تھا

اب بھی نہ اپنا درد کوئی غمگسار ہے
اور اس سے قبل بھی نہ کوئی غمگسار تھا

دوستی انگریزی آئینہ میں

(از جناب انجام کاشمیری)

---

1. He makes no friend who never made a foe. (Tennyson)

۱۔ ترجمہ۔ جس نے کسی کو اپنا دشمن نہ بنایا وہ کسی کو اپنا دوست نہیں بناتا۔

2. A friend is easier last faund (Praverb)

۲۔ ترجمہ۔ ایک دوست کو کھو دینا پانے کی بہ نسبت بہت آسان ہے۔

3. Friendly caunsels cuts off many foes. (Shakespeare)

۳۔ ترجمہ۔ دوستانہ صلاح مشورے بہت سے دشمنوں سے نجات دلاتے ہیں۔

4. Distance sometimes endears friendship, and absence sweet-cuth it (Howell)

۴۔ ترجمہ۔ بعض وقت دوری محبت کو اور مضبوط اور دیرپا کرتی ہے۔ اور جدائی اسے خوشگوار بناتی ہے۔

5. A woman can die for her friend as well as any Roman Knight. (Jeremy Taylor)

۵۔ ترجمہ۔ ایک عورت اپنے محبوب کے لئے ایک رومن ہیرو کی طرح اپنی جان قربان کرسکتی ہے۔

6. A friendship that makes the least noise is very often the most useful, for wich reason I [illegible] to yealous one. (Addison)

۶۔ ترجمہ۔ وہ دوستی جو خاموش اور بے تکلف قسم کی ہے اکثر بہت کارآمد ثابت ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے میں ایک خاموش قسم کے دوست کو ایک سرگرم اور جذباتی دوست پر ترجیح دینا چاہتا ہوں۔

7. we may have many acquaintances but we can have few friends. (Johnson)

۷۔ ترجمہ۔ ہمیں اس دنیا میں بہت سے ملاقاتی اور واقف کار ملیں گے لیکن دوست بہت کم ہونگے۔

8. Friedship is often destroyed by opposition of interest (The Idler)

۸۔ ترجمہ۔ دوستی اکثر ناموافق طبیعت اور ہم خیال نہ ہونے کے سبب کھو دی جاتی ہے۔

9. Love is the marrow of friendship, and letters are the elixir of love. (Howell)

۹۔ ترجمہ۔ محبت دوستی کا جوہر ہے اور خطوط رشتۂ الفت کو مضبوط اور ابدی یعنی غیرفانی بنانے کا کیمیا ہے۔

10. Friendship is full of dregs. (Shakespeare)

۱۰۔ ترجمہ۔ محبت میں ہر طرح کی تکلیف اور مصیبتیں بھری پڑی ہیں

11. Every thing is right is war, love, and politics. (Shakespeare)

۱۱۔ ترجمہ۔ محبت، جنگ وجدل اور سیاست میں سب کچھ جائز ہے

12. Friendship Continually demands sacrifice. (Friswell)

۱۲۔ ترجمہ۔ محبت میں لگاتار قربانیوں کی ضرورت ہے۔

13. what is mine, even to my life, is hers I love, but the secret of my friend is not mine (Sir Phillip Sidney)

۱۳۔ ترجمہ۔ میرے پاس ایک بات ہے جو کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ میری زندگی
بھی اسی کی ہے جسے میں چاہتا ہوں۔ مگر میرا تجربہ کہ راز میرے
نہیں ہے۔

14. Women like princes, find few real friends. (Lyttelton)

۱۴۔ ترجمہ۔ عورتیں امیروں اور شہزادوں کی مانند ہی ہیں کیونکہ ان
کے پاس دولت ہے تو انہیں کو بہت کم سچے دوست ملتے ہیں
(کیونکہ دولت والوں کے دل میں سچی محبت نہیں ہوتی)۔

15. Friendship is a sheltering tree. (S.T. Cobridge)

۱۵۔ ترجمہ۔ دوستی ایک ایسا درخت ہے جس کے نیچے پناہ ملتی ہے۔

16. If we look for a perfect friend in the world, we are like to die friendless. (Mason)

۱۶۔ ترجمہ۔ اگر ہم ایک مکمل اور صحیح معنوں میں اس دنیا میں دوست کی تلاش
کریں تو وہ نہ ملے گا اور ہم بغیر دوست کے ہی مرنا پسند کرینگے۔

17. They are rich who had friends. (Proverb)

۱۷۔ وہی لوگ امیر ہیں یا کہلا سکتے ہیں جن کے پاس واقعی دوست ہیں۔

18. He who hath many friends, hath none. (Aristotle)

۱۸۔ ترجمہ۔ جن کے بے انتہا دوست ہوتے ہیں دراصل ان کے پاس
کوئی دوست نہیں۔

19. Friendship is the jewel of human life (Lilly)

۱۹۔ ترجمہ۔ دوستی انسانی زندگی کا بہترین موتی ہے۔

20. The greatest medicine is a true friend. (Sir wm Temple)

۲۰۔ ترجمہ۔ سب سے زیادہ موثر دوا ایک سچا دوست ہی ہو سکتا ہے۔

21. True affection never fails (Anjum Kashmiri)

۲۱۔ ترجمہ۔ سچی محبت کبھی ناکامیاب نہیں رہتی۔

22. Friendship, like a bird, has two wings. (Proverb)

۲۲۔ ترجمہ۔ ایک چڑیا کی طرح محبت کے بھی دو بازو ہوتے ہیں (محاورہ)

23. Deeds are love, and not fine speeches. (Spainish Proverb)

۲۳۔ ترجمہ۔ محبت کر کے ثابت کی جاتی ہے نہ کہ لمبی اور موثر تقریروں سے

24. I love a friend that frank and just, To whom a tale I can entrust, But when a man's to slander given, from such a friend protect me, Heaven. (Anon)

۲۴۔ ترجمہ۔ میں اس دوست کو پسند کرتا ہوں جو صاف گو اور منصف
مزاج ہے اور جس پر میں بھروسہ کر سکتا ہوں۔ مگر اے خدا مجھے
ایک جھوٹے اور بے وفا دوست سے بچا، جو سوائے مکر و فریب
کے اور کچھ نہ کر سکے۔

25. Youth fades, love draops, the leaves of friendship fall;
A mathers secret hope outlives them all.

۲۵۔ ترجمہ۔ جوانی فانی ہوتی ہے۔ محبت بھی گھٹ سکتی ہے۔ دوستی کے
درخت پر بھی خزاں کا اثر ہو سکتا ہے مگر ایک ماں کی مامتا اور
محبت ان سبھوں کے برعکس ہے۔ وہ ایک سدا بہار پودا ہے
جو ہمیشہ یکساں رہے گا (یعنی ماں کی محبت ایک انمول موتی ہے)

26. Animals are such agreeable friends they ask no questions, they pass no criticism. (George Eliot)

۲۶۔ ترجمہ۔ حیوانات سب سے اچھے اور قابل اعتبار دوست ہیں۔ کیونکہ نہ تو
وہ کسی بات میں دخل دیتے ہیں اور نہ ہی ہم پر تنقید کرتے ہیں
بلکہ وفاداری سے ساتھ دیتے ہیں۔

27. Friendship is a dis-interested commerce between equals. (Goldsmith)

۲۷۔ ترجمہ۔ محبت دو ہستیوں کے درمیان ایک ایسا سودا ہے جس میں نفع نقصان کا کچھ خیال نہیں کیا جاتا۔

28. Friendship is the great chain of human society, and interconrse of letters is one of the chiefest links of that chain. (J. Howell)

۲۸۔ ترجمہ۔ محبت انسان کی سوسائٹی کا سب سے اہم اور مضبوط زنجیر ہے اور خط و خاص اور اہم کڑی ہے جو اس زنجیر کو باہم جکڑ کر رکھتی ہے۔

29. It is one of the senerest tests of friendship to tell your friend of his faults. (Beecher)

۲۹۔ ترجمہ۔ اپنے دوست پر اُس کے عیب ظاہر کرنا سب سے اہم اور مشکل کام ہے۔

30. Friendship needs a delicate handling. (Black)

۳۰۔ ترجمہ۔ محبت ایک بہت ہی نازک رشتہ ہے اس لئے اسے بہت نرمی اور سلیقہ کے ساتھ استعمال کرنا چاہیئے ؎

نازک ہے بہت شیشۂ الفت یہ رہے یاد
ٹوٹے نہ کہیں دیکھنا یہ تارِ محبت (زنگار صبح تمیز)

31. To lose a friend is the greatest of all losses. (Latin)

۳۱۔ ترجمہ۔ دُنیا کا سب سے بڑا نقصان کرنا ایک دوست کو گنوانا ہے

32. Every one wishes to have a friend, but never traubles himself to be One (Proverb French)

۳۲۔ ترجمہ۔ ہر ایک شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اُسے ایک سچا دوست ملے۔ مگر خود سچا دوست بننے کی کوئی بھی تکلیف گوارا نہیں کرتا۔

33. A reconciled friend is a double foe. (Proverb Spain)

۳۳۔ ترجمہ۔ [illegible] دوست ایک بہت زبردست دشمن کہلاتا ہے۔

34. Friendship is composed of a single soul inhabiting two bodies (Aristotle)

۳۴۔ ترجمہ۔ محبت ایک جان اور دو قالب کا نام ہے۔

35. Friendship ought to be in-mortal, but enmities mortal. (Proverb)

۳۵۔ ترجمہ۔ محبت کو غیر فانی ہونا چاہیئے مگر دشمنی کو نہیں۔

36. The friendship of a man of a woman is blended with a tenderness wich he never feels for one of his own sex even where love is in no degree concerned (Gregory)

۳۶۔ ترجمہ۔ ایک مرد کی دوستی ایک عورت کے ساتھ بہت نازک اور پُر خلوص ہوتی ہے اور اتنی اسکو ہم جنس یعنی ایک مرد کو ایک مرد سے نہیں ہو سکتی۔ یہاں محبت کی کوئی انتہا نہیں ہوتی اور اس دوستی کے ساتھ محبت بھی ہوتی ہے۔

37. A friend loveth at all times. (Solomon)

۳۷۔ ترجمہ۔ ایک دوست ہر حال میں دوست رہتا ہے چاہے بُرے دن ہی کیوں نہ ہوں (اور یہ ایک سچے دوست کی پہچان ہے)

38. Golden friendship is not a common thing to be picked up in the street (Black)

۳۸۔ ترجمہ۔ سچی محبت ایک عام شے نہیں جو ہر کوئی پا سکے۔

39. That friendship will not contenue to the end that is begun for an end (Quarles)

۳۹۔ ترجمہ۔ وہ محبت اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتی جو کسی خاص بنیاد لالچ کی خاطر کی گئی ہے۔

40. My treasures are my friends.
(Constantius)

۴۰۔ ترجمہ ۔ میرے دوست ہی میری دولت ہے۔ یا میرے دوست ہی میرے خزانے ہیں۔

41. The envious jealous man can never be a friend. (Black)

۴۱۔ ترجمہ ۔ وہ شخص جس میں رشک و حسد کوٹ کوٹ کر بھرا ہو۔ وہ کبھی کسی کا دوست نہیں ہو سکتا۔

42. We must be able to love our friends with all their faults.
(Nepaleon)

۴۲۔ ترجمہ ۔ ہم لوگوں کو اپنے دوستوں سے ان کی ہر برائی کو نظر انداز کر کے دیوانہ وار محبت کرنی چاہیئے

43. He that doeth a base thing in zeal for his friend, burns the golden thread that ties their hearts together. (Jerray Taylor)

۴۳۔ ترجمہ ۔ وہ شخص جو کسی جذبہ کے ماتحت جوش میں آکر جلد بازی میں اگر کوئی برائی کر بیٹھتا ہے تو وہ اس ریشم کے سنہری تار کو جلا ڈالتا ہے جو ان کے دلوں کو باہم جکڑ کر رکھتا ہے۔

44. Friendship is made fast by interwoven benifits.
(Sir Phillip Sidney)

۴۴۔ ترجمہ ۔ دوستی کو گہری بنانے کے لئے تعلقات اچھے اور گہرے ہوں۔

45. Friendship is the noblest and happiest of affection when real and built on a solid foundation.
(Chapone)

۴۵۔ ترجمہ ۔ اگر دوستی کی بنیاد ٹھوس اور اصلیت پر رکھی جائے تو بہترین اور سب سے زیادہ خوشی دینے والی شے ہے۔

46. In real friendship there is always the knitting of saul to saul, the exchange of heart for heart. (Stalker)

۴۶۔ ترجمہ ۔ سچی اور پرخلوص دوستی میں ہمیشہ روح کے ساتھ روح کا ملاپ ہوتا ہے۔ اور دل کے بدلے دل بدلا جاتا ہے۔

47. Friends meet to part, love laughs at faith, true foes once met are joind till death (Byron)

۴۷۔ ترجمہ ۔ دوست خوشیاں منانے کیلئے ملتے ہیں۔ محبت وفا پر ہنستی ہے۔ مگر دشمن ایک بار دشمن بن کر دم آخر تک دشمنی نبھاتا ہے۔

48. A friend, but he who's found a friend in thee. all like the purchase, few the price will pay, And this makes friends, such miracles below. (Young)

۴۸۔ ترجمہ ۔ ہر انسان کیلئے ایک دوست ہونا چاہیئے۔ لیکن ایسا جو سچے دل سے ملے۔ ہر کوئی محبت کا سودا کرنا چاہتا ہے۔ مگر ان میں سے بہت کم اس کی اصلی قیمت ادا کرے گا اور یہی وہ عجیب و غریب بات ہے جو دوستوں کی قدر گھٹا دیتی ہے۔

49. Friendship requires much intercourse between the friends, otherwise it can neither be born nor subsist.
(Francis de Sales)

۴۹۔ ترجمہ ۔ دوستی چاہتی ہے کہ دوست یکجا رہیں اور ملاپ بار بار سے زیادہ ہو۔ ورنہ محبت کی آگ ویسے لگائی جائیگی اور نہ ہی دل سے نکالی جائیگی۔ غالبؔ نے یہی خیال اس شعر میں قلمبند کیا ہے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالبؔ ، کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے

50. Faithful are the wounds of a friend
(Solomon)

۵۰۔ ترجمہ ۔ دوستی کے داغ یا داغ محبت بہت ہی وفادار ہوتے ہیں جو کہ دم ملنے کا رکھتے ہیں

روشنی

(از واحدی)

جانتے ہو انسان اور حیوان میں کیا فرق ہے؟ انسان کو دوسرے حیوانوں سے اُونچا کرنے والی چیز کیا ہے؟ سنو! وہ چیز اس کی سیکھنے کی صلاحیت ہے۔ انسان علم حاصل کرنے اور علم کو بڑھانے کی قابلیت رکھتا ہے۔ حیوان بچپن سے بڑھاپے تک یکساں رہتا ہے۔ اور انسان بچپن میں حیوان سے بہت پیچھے ہوتا ہے۔ پیچھے کیا، کچھ ہوتا ہی نہیں بس گوشت کا ایک لوتھڑا ہوتا ہے۔ لیکن بڑھاپے تک پہنچتے پہنچتے وہ ریلیں دوڑاتا ہے۔ جہاز چلاتا ہے ہوا میں اُڑتا ہے۔ گراموفون ایجاد کرتا ہے۔ ریڈیو بناتا ہے۔

ایسا بھی زمانہ گزر چکا ہے کہ انسان آخر عمر تک حیوانوں کی سی زندگی بسر کرتا تھا۔ ننگا پھرتا تھا۔ بے پکی غذائیں کھاتا تھا اور گڑھوں کا پانی پیتا تھا۔ مگر جس طرح انسان کا بچہ آہستہ آہستہ ترقی کرتا جاتا ہے اسی طرح انسان کی نوع یعنی انسانوں کی پوری جماعت نے بھی دھیرے دھیرے قدم اُٹھانا شروع کیا۔ اور نوع انسان آہستہ آہستہ ترقی کر کر کے اور دھیرے دھیرے قدم اُٹھا اُٹھا کر ہی آج اس شان کو پہنچ گئی ہے جو تمہارے سامنے ہے۔ اور دوسرے حیوان وہیں کے وہیں ہیں۔ اور ابھی تو انسان خدا جانے اور کتنا اُونچا جائے گا۔

انسان کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ وہ کائنات کو یعنی دُنیا کی ہر ہر چیز کو۔ ہر ہر بات کو اور ہر ہر حرکت کو کھلی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور اس سے کچھ سیکھتا ہے۔ اس سے کچھ حاصل کرتا ہے۔ اور اس سے کچھ نتیجہ نکالتا ہے۔

روشنی بھی حضرت انسان نے اپنی اسی صلاحیت کے طفیل پائی ہے۔

ننگے پھرنے والے انسان کو روشنی کی ضرورت نہیں تھی۔ کچے پھل، ترکاری اور گھاس پات کھانے والا انسان روشنی سے بے نیاز تھا۔ تھوڑے سے لوگ تھے۔ زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے میں رہتے تھے۔ جیسے تم بچپن میں سمجھتے ہو گے کہ جس شہر، قصبہ یا گاؤں میں تمہارا گھر ہے یہی دُنیا ہے۔ ویسے ہی یہ تھوڑے سے لوگ زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے کو دُنیا سمجھے ہوئے تھے۔ کہیں جانا نہیں، کہیں آنا نہیں۔ جہاں رات ہو گئی پڑ رہے۔ جہاں دن نکلا چلنا پھرنا شروع کر دیا۔ سردی لگی بھٹ میں گھس گئے۔ سانپ نے کاٹ لیا مر گئے۔ شیر نے پھاڑ کھایا۔ اس کی غذا بن گئے۔ شیر اور سانپ کا مقابلہ بھی کیا۔ دونوں سے جیتے بھی لیکن ساتھ کے ساتھ دماغ نے سوچنا شروع کیا کہ ان روز روز کے جھگڑوں سے نجات ملنی چاہیئے نباتات نے آواز دی۔ میں تمہاری مدد کروں گی۔ جمادات بولی میں خدمت کو حاضر ہوں۔ کسی جانور کی لکڑی سے خبر لی۔ کسی جانور کو پتھر کا نشانہ بنایا۔ اور کہہ دیا جانور تم نے ہماری قدر نہ جانی۔ اب ہم تم سے الگ رہیں گے۔ اور تم کو اپنے پاس رکھیں گے تو غلام بنا کر رکھیں گے۔

جانوروں میں سے حضرت انسان پہلے تو دن کو سورج کی روشنی انہیں راستہ دکھا رہی تھی۔ اور رات کو چاند کی روشنی۔ اور چاند نہ نکلتا تو تاروں کی روشنی اُن کے لئے بہت تھی۔ اب وہ بھٹوں سے دور تھے۔ اور سردی انہیں ستاتی تھی کہ جمادات و نباتات نے پھر اپنی اپنی خدمات پیش کیں۔ دو پتھروں کو ایک دوسرے پر ملنے کا کھیل کھیلنے لگے۔ اُن میں سے آگ نکلی اور نزدیک پڑے ہوئے پھونس میں لگ گئی۔

حضرت انسان کی جان میں جان آئی۔ بدن کو سینک پہنچی۔ اب تو ایک کام کا کھیل مل گیا۔ لکڑی اور پتھر کی مدد سے درندوں کو دن میں بھگا دیتے تھے۔ رات میں ابھی مشکل پڑتی تھی۔ الاؤ کی روشنی سے حضرت انسان کے ہاں دن ہو گیا اور درندے خود ہی ڈر کے مارے بھاگنے لگے۔

آسمانی روشنیوں کے بعد یہ پہلی روشنی تھی جو انسان نے ایجاد کی۔ یہ روشنی کا کام بھی دیتی تھی۔ جسم کو گرم رکھنے کا بھی اور بالآخر کھانے پکانے کا کام بھی دینے لگی۔ لیکن لمبا زمانہ گزرنے پر بنولے کی روشنی شروع ہو گئی۔ بنولوں کو مٹی کے دیئے میں ڈال دو اور اُن کے بیچ میں ایک روئی کی بتی رکھ دو۔ جس کا سرا دیئے سے باہر نکلا ہوا ہو۔ اُس سرے کو آگ لگا دو۔ بس روشنی ہو جائے گی۔ بنولے کی روشنی کے بعد کڑوے تیل اور ارنڈی کے تیل کا نمبر آیا۔ کڑوا تیل خوب چلا۔ یہ بھی مٹی کے دیئے میں بھر دیا جاتا تھا اور روئی کی بتی کے ذریعہ روشنی دیتا تھا۔ لکڑی یا بانس کے سرے پر روئی باندھ کر اور اس پر کڑوا تیل چھڑک کر بھی جلایا کرتے تھے۔ یہ مشعل کہلاتی تھی۔ مشعلوں کو مختلف وضع کا بنایا جاتا تھا۔ مثلاً لکڑی یا بانس کے سرے پر پیتل کی پانچ خولدار انگلیاں سی لگا دیں اور ان انگلیوں کے خول میں بتیاں ٹھونس دیں۔ اسے پنجی کی روشنی کہتے تھے یہ مشعلیں وہ کام دیا کرتی تھیں جو آج کل گیس کے ہنڈے دیتے ہیں۔

امیر گھروں میں کڑوے تیل کی روشنی کیلئے فتیل سوز رہتے تھے۔ فتیل سوز

اب بھی تانبے پیتل کے برتن بیچنے والوں کے ہاں ملتے ہیں۔ یہ پیتل کے ہوتے ہیں نیچے ایک گول تھالی ہوتی ہے اور تھالی کے بیچم بیچ میں ایک لمبا سا منارہ کھڑا کر دیا جاتا ہے۔ اور اس منارے کے سر پر ڈبیے کی شکل کا ایک یا دو تین دیے بلتے جاتے ہیں۔ خیر۔ کڑوے تیل کا دور بھی گذر گیا اور مٹی کا تیل آیا۔ مٹی کا تیل اول اول ٹین کی ڈبیوں میں جلا۔ پھر لالٹینوں میں۔ اور پھر لیمپوں میں۔ لیمپ اور لالٹین اب گیس کی بھی نکلی ہیں۔ لیکن گیس مٹی کے تیل کی جگہ نہ لے سکا۔ مٹی کے تیل کی جگہ بجلی نے لی۔

بجلی کی روشنی کے ذکر سے پہلے مجھے ایک اور روشنی کا بھی ذکر کرنا ہے جس سے میں بھول گیا تھا۔ کڑوے تیل اور ارنڈی کے تیل کے دور میں امیروں اور بادشاہوں کے ہاں موم اور کافوری شمعیں جلا کرتی تھیں۔ موم کی بتیاں تو تم نے دیکھی ہونگی۔ موم کی بتیاں لگانے کیلئے خوبصورت خوبصورت جھاڑ فانوس اور لیمپ ہوتے تھے۔

اچھا تم نے زمین کی روشنی اور آسمان کی روشنی کی بابت کافی سُن لیا تھا۔ اب خاص میونسپل کمیٹیوں کی روشنی کی بابت سُنو۔ ہاں آسمان و زمین لمحہ بھر کے لئے کبھی کبھی بجلی کی چمک سے بھی روشن ہو جایا کرتے ہیں۔ اور اسی چمک سے انسان نے بجلی کی روشنی کا خیال لیا ہے۔

میونسپل کمیٹیاں جہاں اپنے اپنے شہر کے اور بہت سے انتظامات کرتی ہیں۔ وہاں اُن کے ذمہ شہر کی روشنی کا انتظام بھی ہوتا ہے۔

میں تمہیں دہلی میونسپل کمیٹی کی روشنی کا حال بتاتا ہوں۔

دلی کی میونسپل کمیٹی ۱۸۶۳ء سے قائم ہے۔ جو دلی والے ۱۸۶۳ء سے پہلے مر چکے تھے وہ آج زندہ ہو کر دلی کو دیکھیں تو صرف روشنی کی چکا چوند انہیں دوبارہ مار ڈالنے کو نہ سہی تو اندھا یا دیوانہ کر دینے کو کافی ہے۔ اتنی روشنی اور ایسی روشنی کیا معنی۔ اُنہوں نے کبھی تصور بھی نہ کیا ہوگا کہ گلی کوچوں میں وہ بغیر مٹی کے تیل کی ڈبیہ ہاتھ میں لئے رات کے وقت نکل سکیں گے۔ مجھے اپنا بچپن یاد ہے ۱۹۰۲ء اور ۱۹۰۳ء میں رات کو گھر سے نکلتے ڈر لگتا تھا۔ اور کبھی ہم دو چار مل کر رات کے تین بجے تھیٹر سے آتے تھے تو بڑی سڑکوں پر بہت دور دور مٹی کے تیل کی لالٹینیں ہمیں ملتی تھیں۔ لیکن گلیوں میں اللہ کا نام تھا۔ گلیوں میں اندھیرا پڑا رہتا تھا۔ اور اندھیرے میں آدمی کی آہٹ پا کر کتے بھونکتے تھے اور کاٹ بھی لیتے تھے۔ اب یہ کیفیت ہے کہ گھر سے نکل کر نہیں، بلکہ دلی کے ہر طرف کی نئی نئی آبادیوں سے نکل کر آپ میلوں چلے جائیے بجلی کی روشنی آپ کا ساتھ دیگی۔

میونسپل کمیٹی کے قیام سے پہلے انگریزوں کا کامل تسلط ہو جانے کے بعد یا انگریزوں اور مغلوں کی ملی جلی حکومت کے زمانہ میں یا شاہجہاں کے عہد سے بہادر شاہ کے عہد تک دلی کے بازاروں اور گلیوں میں باقاعدہ روشنی نہیں ہوا کرتی تھی۔ دیوالی، دسہرہ، میلوں ٹھیلوں اور شاہی جشنوں وغیرہ کے موقعوں پر چراغاں کیا جاتا تھا اور بس۔

دلی کی فصیل ثابت تھی۔ اس کے دروازے بند ہو جاتے تھے۔ اور فصیل کے اندر کوئی داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ رات اُن دنوں رات ہوتی تھی۔ رات کو دن نہیں بنایا جاتا تھا۔ رات آئی اور خلقت گھروں میں چلی گئی۔ زیادہ سے زیادہ دکانیں بند ہونے تک جاگ رہتی تھی۔ اُدھر دکانیں بند ہوئیں اور اِدھر کچھ پہلے ہی شہر پناہ کے دروازے بھڑے۔ البتہ درگاہ حضرت نظام الدین اولیاء کے قریب باہر کے مسافروں کا آخری پڑاؤ تھا۔ وہاں سے اگر کوئی ایسے وقت چل دیتا کہ فصیل کے دروازے بند ہوتے ہوتے پہنچ جائے تو اُسے راستہ بھر نور کی روشنی ملتی تھی۔ راستہ میں جگہ جگہ نیچے نیچے منارے بنے ہوئے تھے۔ اُن پر طشتریوں میں نور جلتے تھے اور مسافر کی رہنمائی کرتے تھے۔

شہر کے اندر میونسپل کمیٹی نے روشنی کا انتظام شروع کیا تو کہتے ہیں چند روز یہاں بھی نولوں اور کڑوے تیل کی روشنی ہوئی۔ مگر میں اس کی تصدیق نہیں کر سکتا۔ میں نے تو مٹی کے تیل کی روشنی دیکھی ہے جو بجلی کی روشنی آنے کے بعد رفتہ رفتہ حال میں ختم ہوئی ہے۔ اور اب بھی قرول باغ میں موجود ہے۔ اور شاید شہر میں بھی کہیں کہیں ہے۔

مٹی کے تیل کی لالٹینیں اول اول چاندنی چوک میں لگائی گئی تھیں پھر دوسرے بڑے بڑے بازاروں میں لگیں۔ پھر چھوٹے چھوٹے بازاروں میں۔ پھر جب سڑکوں پر اسی ترتیب بجلی آئی تو مٹی کے تیل کی لالٹینیں گلیوں میں پہنچ گئیں بجلی کی روشنی کی ابتداء ۱۹۰۵ء میں ہوئی تھی اور ۱۹۱۰ء سے پہلے کیا۔ بہت بعد تک گلیوں میں مٹی کے تیل کی بھی روشنی نہیں ہوتی تھی۔

بجلی کی روشنی آئی تو کمیٹی گھر اور کمیٹی گھر کے اردگرد کے چاندنی چوک کو اس سے زینت دی گئی۔ جس قسم کے بجلی کے لیمپ یہاں پہلے پہل لگائے گئے تھے وہ اب کہیں استعمال نہیں ہوتے۔ اُن کی روشنی نہایت تیز ہوتی تھی۔ لیکن ناگوار تیز۔ نگاہ اس پر جا کر تکلیف محسوس کرتی تھی اور اس میں بجلی بھی زیادہ خرچ ہوتی تھی۔ اس لئے انہیں جلد ترک کر دیا گیا۔ یہ لیمپ Arch lamps کہلاتے تھے گھروں اور دکانوں میں بجلی پہنچی ہے تو ان لیمپوں کا رواج جاتا رہا Arch lamps کی جگہ Carbon lamps نے لی۔ Arch lamps سے Carbon lamps کی روشنی اچھی تھی۔ یہ بجلی بھی کم خرچ کرتے تھے

لیکن Tungsten philament lamps
نے Carbon lamps کو بھی غائب کر دیا۔ Archelamps
اور Carbon lamps کی روشنی سُرخ تھی۔ Tungsten
Philament lamps نے سفید روشنی دی اور بجلی کا خرچ
اور گھٹا دیا۔

اب بھی Tungsten philament lamps جلتے
ہیں یہ کم قیمت ہوتے ہیں اور ٹوٹتے دیر میں ہیں۔ لیکن Gas filled
lamps ان پر فوقیت لے گئے۔ گیس بھرے ہونے کے سبب ان کی روشنی
خوب سفید اور صاف شفاف ہوتی ہے اور بجلی ان میں بہت ہی کم خرچ ہوتی ہے
البتہ مہنگے ہیں۔ Gasfilled lamps کی ایک قسم Coiled
coil ہے جو عام gasfilled lamps سے بھی بیس فی صدی کم
بجلی خرچ کرتی ہے۔ اور اب دلی کے بازاروں میں اور گلی کوچوں میں Coiled coil
lamps جل رہے ہیں۔ سوائے چاندنی چوک اور فیض بازار کے۔ چاندنی چوک میں
Mercury Vapour lamps ہیں جن کی روشنی
بہت نفیس ہے۔ اور بجلی ان میں Coiled coil lamps سے بھی
کم خرچ ہوتی ہے۔ لیکن ان کے لگانے پر شاہانہ خرچ آتا ہے۔ Mercury
Vapour lamps دُنیا بھر میں ایسی ہی جگہ لگائے جاتے ہیں جیسے
دلی میں چاندنی چوک ہے۔ یعنی کاروباری مرکزوں میں یا پبلک سیرگاہوں میں لگائے جاتے
ہیں۔ جیسے دلی میں اڈورڈ پارک ہے۔ اڈورڈ پارک میں یہ لیمپ لگ گئے ہیں۔
فیض بازار میں Sodium Vapour lamps
جلتے ہیں۔ اس لیمپ کے بھی ابتدائی اخراجات زیادہ ہوتے ہیں۔ اور بجلی یہ
Mercury vapour lamps کی مثل کم خرچ کرتا ہے۔
روشنی اسکی بدصورت ہوتی ہے۔ اور اپنے نیچے سے گذرنے والے کی صورت کو مُردوں
جیسی بنا دیتی ہے۔ لیکن ایسی سڑکوں پر جہاں برابر موٹریں دوڑتی ہوں یہی روشنی کی
جاتی ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ کیسی ہی آندھی چلے، مینہ برسے، کہر پڑے
اسکی روشنی ماند نہیں پڑتی۔ دلی میں روشنی کو اور ترقی ہوگی۔ بجلی کا نرخ آٹھ آنے
یونٹ سے ساڑھے تین آنے یونٹ تک آچکا ہے۔ اور اور گھٹنے کی اُمید ہے۔
شاید چھ پیسے یا دو آنے ہو جائے اور کمیٹی کو تین پیسے ملنے لگے۔ پھر دلی کی راتیں
واقعی دن ہو جائیں گی اور امیروں اور اوسط درجہ کے لوگوں سے بڑھکر بھڑبھونجے کی
دکان اور پسنہاری کے مکان تک بجلی جلنے لگے گی۔

بجلی اب پانی سے تیار کی جاتی ہے اور دو پیسے یونٹ سے کم
اسکی تیاری میں لاگت آتی ہے۔

(منقولہ از نشرگاہ دہلی)

غزل

(جناب حرماں خیرآبادی)

اُوج پر جب بہار ہوتی ہے
تو لطافت بھی بار ہوتی ہے

حسرتِ دل بھی پھانس ہے کوئی؟
چھیڑ سی بار بار ہوتی ہے!

جب جفائیں تمام ہوتی ہیں
تب وفا اُستوار ہوتی ہے

بزمِ فطرت کی ہر حسیں صورت
عشق کا شاہکار ہوتی ہے

غم کے لمحوں کی ایک اک تفصیل
جانِ صد اختصار ہوتی ہے

کیا کہیں! وہ نگاہ ملتے ہی
کوئی شے دل کے پار ہوتی ہے

مُنہ کو لگتا ہے جب مزا سم کا
انگبیں ناگوار ہوتی ہے

کیا ستم ہے، کہ غم کی ساعت بھی
زندگی میں شمار ہوتی ہے

ہائے کیا رنگِ ہجر ہے حرماں
آہ وجہِ قرار ہوتی ہے

امانت لکھنوی

(از جناب ساغر جلیلی بی، اے)

راجہ اندر اور اُسکی پریوں کی مشہور داستان "اندر سبھا" کو کون نہیں جانتا۔ اس ہندی ڈرامے کو جس شاعر نے اردو جاننے والوں کے سامنے پیش کیا وہ امانت لکھنوی تھے۔ آج کی صحبت میں ہم اُنہی کی شاعری پر کچھ روشنی ڈالیں گے۔

سید آغا حسن امانت ۱۲۳۱ھ میں (یعنی آج سے تقریباً ایک سو تینتیس ۱۳۳ سال پیشتر) لکھنؤ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائے سن میں فارسی اور عربی کی تعلیم حاصل کی۔ اور پندرہ برس کی عمر میں شاعری کا آغاز کیا۔ پہلے پہل دو سلام لکھے اور اپنے والد کی معیت میں دلگیر لکھنوی کے پاس زانوئے تلمذ تہہ کرنے کیلئے گئے۔ دلگیر نے کلام پسند کیا۔ اور تخلص امانت تجویز کر کے اپنے شاگردوں میں شامل کر لیا۔

دلگیر سے اصلاح لیتے ہوئے کچھ زیادہ مدت نہیں گزری تھی کہ طبیعت کا رجحان غزل گوئی کی طرف ہو گیا۔ اور سلام کہنا بند کر دیا پہلی غزل لکھی اور اُستاد کے پاس اصلاح لینے کیلئے حاضر ہوئے۔ دلگیر نے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ میں تو صرف سلام گو ہوں۔ غزل گو نہیں۔ البتہ تمہاری غزل ایک دوست کو دکھا دونگا۔ جو اس میدان کے شہسوار ہیں۔ مگر امانت خفا ہو کر واپس چلے آئے اور پھر آخر عمر تک کسی سے اصلاح نہ لی۔

بیس برس کی عمر تھی کہ سخت علیل ہوئے اور قوت گویائی بند ہو گئی۔ لیکن شاعری خوب چمکی۔ اور لکھنؤ کے مشاہیر شعراء میں شمار ہونے لگا۔ طبیعت بحر زخار کی مانند رواں تھی۔ جو آبدار موتیوں کی طرح اشعار اُگل رہی تھی۔ اور شعر و ادب کا خزانہ مالا مال ہو رہا تھا۔ اس زمانے میں جو غزلیں اُنہوں نے کہیں اُن میں اپنی بے زبانی کا اظہار بھی کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بے زبانی ہیں امانت کی ہیں وہ گل ریزیاں
ناطقہ ہو بند اے دلِ بلبلِ ناشاد کا

امانت دم بدم شمع لحد خاموش ہوتی ہے
ہوئے پر بھی اثر باقی ہے تیری بے زبانی کا

جہاں میں نظم سے روشن ہے حال امانت کا
قلم رواں نہیں، گویا ہے یہ زباں میری

انہی دنوں میرزا ہمایوں بخت کی اُستادی کا فخر حاصل ہوا اور شاہی وظیفہ مقرر ہو گیا۔ ہمایوں بخت اُستاد کی بہت عزت کرتے تھے۔ یہاں تک کہ اُنہوں نے اُستاد کا دیوان بھی مرتب کیا۔ مگر بعد ازاں وہ اس طرح تلف ہوا کہ اس میں سے ایک غزل بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ اس کے ایک عرصہ بعد یعنی ۱۲۶۹ھ میں خود امانت نے اپنا دوسرا دیوان "گلدستۂ امانت" کے نام سے مرتب کیا۔ اور امانت کی وفات کے بیس سال بعد تیسرا دیوان "خزائن الفصاحت" کے نام سے اُن کے فرزند سید حسین لطافت لکھنوی نے شائع کیا۔ "خزائن الفصاحت" سے دیوان کی تاریخ طباعت ۱۲۹۱ھ بھی نکلتی ہے۔ اور ہمارا یہ مقالہ اسی دیوان کو دیکھکر لکھا گیا ہے۔

امانت شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے۔ اور پنجتن سے والہانہ عقیدت تھی۔ غزلیات میں بعض جگہ اپنے مذہبی عقائد کا اظہار کیا ہے ؎

امانت پنجتن کی پیروی کرنا مقدم ہے
سوا اسکے نہیں کوئی وسیلہ روز محشر کا

لیں گے نام علیؑ امانت ہم
جب فرشتوں سے گفتگو ہوگی

اسد اللہ کا ہوں لب کا امانت مداح
مدحِ کیلئے ہر شعر مرا ضیغم ہے

۱۲۶۰ھ میں ائمہ کے روضوں کی زیارت کیلئے عراق تشریف لے گئے۔ اور وہاں عجز و انکسار کے ساتھ دُعائیں مانگیں۔ اسے قدرتی حکمت کہیئے یا ائمہ کی کرامت کہ ان کی قوت گویائی بحال ہو گئی۔ اس سے ان کا مذہبی عقیدہ اور مضبوط ہو گیا۔ لیکن اس واقعہ نے ہم سے غزل گو امانت چھین لیا۔ کیونکہ ان کی طبیعت مرثیہ گوئی کی طرف مائل ہو گئی۔

چالیس سال کی عمر تھی کہ مرض استسقا میں مبتلا ہو کر اس دُنیا سے ہمیشہ کیلئے رخصت ہو گئے۔ دنیائے ادب میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی۔ مشہور شعرا اسیر لکھنوی، میرزا عشق، میرزا اوج وغیرہ نے وفات کے قطعات تاریخ لکھے۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ معاصر اساتذہ کے دلوں میں ان کی کتنی قدر و منزلت تھی۔

امانت کے کلام میں شوخی اور سلاست بہت ہے اور اس کے ساتھ تشبیہات اور استعارات ملکر سونے پر سہاگے کا کام کر جاتے ہیں۔ محبوب کے بالوں میں گلال نظر آتا ہے تو فرماتے ہیں ؎

زلفِ جاناں پہ آ رہا ہے خیال　　سنبلستاں میں سرخ بادل ہے

مرنے کے بعد بھی زلفِ جاناں کی یاد نہیں جاتی۔ اس مضمون کو کس خوبی سے ادا کرتے ہیں ؎

گور میں آنکھوں کو حسنِ زلفِ جاناں یاد ہے
عین غفلت میں بھی یہ خواب پریشاں یاد ہے

چند اور اشعار ملاحظہ طلب ہیں ؎

دانت اس کے ستاروں کے، مرہ تو کے ہیں ابرو
خورشید کے رخسار میں ما بقا ہے کمر کا

شمع جب لائی زباں پہ قضیہ روئے صبح
پھر ہر اک پروانے کا برگِ گلِ تر میں ہوا

سادہ رویوں کو دیا ہے حسن نے کیسا فروغ
صبح کے چہرے پہ کیا زیبا ہے خالِ آفتاب

امانت نے بعض پامال مضمونوں کو نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ باندھا ہے۔ دیکھئے آنسوؤں کی روانی کو کس نازک خیال کے ساتھ ادا کرتے ہیں ؎

آنسو رواں ہیں زلفِ سیہ کے خیال میں
موتی پرو رہا ہوں ترے بال بال میں

آنسوؤں کو موتیوں سے تشبیہ دیکر انہیں محبوب کے بال بال میں پرونا صرف امانت ہی کا حصہ ہے۔ پیری کے ایام میں جوانی کے زخم یاد آجاتے ہیں۔ تو یوں فرماتے ہیں ؎

پیری میں جلاتا ہے مجھے داغِ جوانی
کیا جوش پہ ہے آتشِ گل فصلِ خزاں میں

آپ نے ناتوانی کی بابت کئی مضامین ملاحظہ کئے ہونگے۔ ان کا بھی ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

ناتواں وہ ہوں کہ میں اکثر دمِ سیرِ چمن
دامِ موجِ نکہتِ گل میں اُلجھ کر گر پڑا

ایک جگہ کہتے ہیں ؎

اللہ رے ہجومِ گل و جوششِ بہار
ملتا نہیں چمن میں مرا آشیاں مجھے

بہار کا جوبن اور شوق کی وارفتگی۔ ایسے عالم میں اپنے آشیاں کا پتہ نہ ملنا جنونِ عشق کی انتہا ظاہر کرتا ہے۔

چند اور اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

اندیشۂ خزاں سے عشق کا ہے داغ میں
بلبل کے منہ پہ دے کوئی چھینٹا گلاب کا

یار تو آیا نہ وعدے پر کبھی یاں تا بمرگ
اے اجل بتلا ترا وعدہ وفا کیونکر ہوا

جنبشِ بادِ صبا نے کر دیا بے آبرو
دامنِ گل سے ہر اک شبنم کا گوہر گر پڑا

خون آنکھوں سے رواں، بہر رُخِ رنگیں ہوا
ہجر میں اپنا گریباں دامنِ گلچیں ہوا

چڑھا جو بام پہ قاتل سحر کو تیغ بکف
اُتر گئی سپرِ آفتاب میں تلوار

ان میں سے آخری شعر کس قدر زوردار ہے "تیغ بکف" اور "سپرِ آفتاب" کیسے پُرشکوہ الفاظ ہیں ؎

چڑھا جو بام پہ قاتل سحر کو تیغ بکف
اُتر گئی سپرِ آفتاب میں تلوار!

امانت کے کلام میں محاکات کا عنصر بھی کافی موجود ہے۔ لیلیٰ کی سواری قیس کے قریب سے اُڑتی ہوئی گزر جاتی ہے تو قیس کی کیا حالت ہوتی ہے ؎

اُڑ گیا ناقۂ لیلیٰ جو ہوا کی مانند　　قیس نے پاس سے دیکھا سوئے محمل کیا کیا

میخانے میں محبوب اچانک آجاتا ہے تو اہلِ خانہ کی لغزشیں قابلِ دید ہوتی ہیں ؎

یار کے آتے ہی میخانے میں ہلچل پڑ گئی　　میں گرا ساقی پہ، ساقی محتسب پر گر پڑا

ایک جگہ زلفوں کے ساتھ ہوا کی چھیڑ خانی کا نقشہ کھینچا ہے ؎

زلف آ پڑتی ہے بل کھا کھا کے روئے یار پر
چوٹ چلتی ہے بہم شام و سحر سے دیکھنا

عشق کے ساتھ رقابت لازمی چیز ہے۔ امانت کی ہر غزل [illegible] ت کے مضامین موجود ہیں۔ چند ایک سن لیجیے ؎

مجھ کو لیجے نزع میں اُس کو رقیب　　مر جائیے، نہ غیر کا احسان لیجیے

ہاں کسی غیر سے کرنا سخن کلام   آج اے غنچہ دہن بات ہماری رکھنا

مر نہ گئے گیا وہ امانت سے رُوٹھ کر   دم ہائے کیوں نہ خانۂ تن سے نکل گیا

نیا افسانہ سُنتے ہو ہمارے سامنے   کیا تکلف ہے کہانی میں جو قصہ بڑھ گیا

میں ہوا یار سے میرا جب غیر نے   دفعتاً گھبرا کے بولا، کیا ہوا؟ کیونکر ہوا؟

جلاتے ہو مجھے، اغیار کا رکھتے ہو دل ٹھنڈا

کہیں برقِ غضب ہو تم، کہیں بارانِ رحمت ہو

عشق کی استقامت کی بابت کہتے ہیں ؎

خاموش ہجرِ یار میں جلتا ہوں رات بھر   میں شمع ساں زبان ہلاؤں مجال کیا؟

روشن یوں کیا جو حوادث نے کیا گرد نہ   مر کر بھی گُل ہوا نہ چراغ آفتاب کا

حافظ شیرازیؒ کا مشہور عالم شعر ہے ؎

آسماں بارِ امانت نتوانست کشید!

قرعۂ فال بنامِ منِ دیوانہ زدند!

امانت نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے ؎

کون تھا بارِ غمِ عشق اُٹھانے والا   مجھ کو پیدا جو نہ کرتا، تو خدا کیا کرتا

اسی زمین میں ایک اور شعر ہے ؎

ناوکِ گرم سے اک دن نہ کھلا غنچۂ دل   جھونکا صرصر کا بھلا کارِ صبا کیا کرتا

یاس اور قنوط غزل کی جان ہوتی ہے۔ امانت کی غزلوں میں بھی یہ رنگ جھلکتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

ہو گیا حسرتِ پرواز میں دل ٹکڑے ٹکڑے   ہم نے دیکھا جو قفس کو تو فلک یاد آیا
ہو گئی قطع اسیری میں اُمیدِ پرواز   اُڑ گئے ہوش جو پر کاٹنے صیاد آیا

دل آفت زدہ اپنا نہ اپنے سے ہوا خالی   نیا پیدا ہوا ناسور، گر زخمِ کہن بگڑا

یار تو آیا نہ وعدے پر کبھی یاں تا بمرگ   اے اجل بتلا، ترا وعدہ وفا کیونکر ہوا

شراب و رباب کے چند مضامین ملاحظہ فرمایئے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

ہو جائے محتسب کی جو شمعِ حیات گُل   میخانے میں چراغ جلاؤں شراب کا

دیکھا آپ نے محتسب کی موت پر کتنی خوشی منانا چاہتے ہیں۔ اور اس خوشی میں چراغاں کرنے کیلئے تیل کی بجائے گھی نہیں شراب کا استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ کیسا اچھوتا خیال ہے۔

چند اور اشعار سُنیئے ؎

رکھتا ہوں باندھ باندھ کے اسباب میکشی   شیشہ کمر میں رہتا ہے، پیمانہ دوش پر

میں ہوں وہ رند اگر دیر و حرم میں جاؤں   گبر آنکھوں پہ بٹھائیں تو مسلماں سر پر

کھینچیں یہ ہم نے بادہ کشی سے ندامتیں   شیشوں میں جا بجا ہے عرقِ انفعال ہے

ان خصوصیات کے علاوہ امانت کے کلام میں فلسفہ اور اخلاق کے مضامین بھی بکثرت موجود ہیں۔ "ہمہ اوست" کا مضمون یوں ادا کرتے ہیں ؎

شعلۂ حُسن سے ہے جلوۂ قدرت کا ظہور   جو بُتوں کو نہ کہے نورِ خدا، ناری ہے

تماشا گاہِ عالم میں مجھے حیرت کا عالم ہے   ہزار آئینۂ دل میں وہی بس ایک صورت ہے

اہلِ ہُنر کی بے قدری اور دنیاوی تکالیف کی بابت فرماتے ہیں ؎

باغِ جہاں میں رنج ہے ثمرہ ریاض کا   پتھر برستے ہیں شجرِ باردار پر!

اُردو کے قدیم اساتذہ میں سے جن شعراء نے رباعی میں اظہارِ خیالات کیا ہے۔ انہوں نے اس صنف کو عموماً فلسفہ اور اخلاق کے مضامین کے لئے مختص رکھا ہے۔ امانت کی رباعیات میں بھی یہی رنگ غالب ہے کہتے ہیں ؎

گر عجز اگر عاقل و فرزانہ ہے   دانائی پہ بھولا ہے تو دیوانہ ہے
تسبیح کے دانوں پہ نظر کرنا واں   گردش میں گرفتار ہے جو دانہ ہے

ذی علم ہوا کر صاحبِ صدر ہوا   سر جس نے اُٹھایا وہی بے قدر ہوا
تحصیلِ کمال کی تواضع ہے دلیل   گردن جو مہِ نو کی جھکی، بدر ہوا

بے وجہ غرور کام نادی کا ہے   اندیشہ سدا ذلت و خواری کا ہے
ذرہ بھی ملا لیتا ہے خورشید سے آنکھ   کیا رتبہ جہاں میں خاکساری کا ہے

ان تمام خصوصیات کا ہونا اس بات کی دلیل نہیں کہ امانت کے کلام میں کوئی عیب موجود نہیں۔ دیوان کی ورق گردانی کیجیے تو نظر آئیگا کہ لکھنؤ کے بعض قدیم شعرا کی طرح ان کی غزلیات میں بھی کمر، دہن اور ہجر وغیرہ کے مبتذل اور پست مضامین موجود ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کے اشعار کو لے لیجیے۔ جن میں وصالِ محبوب کی بابت

کچھ عریاں خیالات کا اظہار کیا ہے ؎

شبِ وصال میں ازبسکہ تھا رقیب کا خوف ہوا ذرا کہیں کھٹکا، تو دل مرا کھٹکا

ہاتھ میں کیونکر آئیگی دمِ وصل کمرِ یار مثلِ مُو ہو گی!

دونوں اشعار مبتذل ہیں۔ سوائے اس کے کہ پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں صنعتِ تجنیس کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ ان اشعار میں اور کوئی خوبی نہیں۔

اسی طرح کمر کی بابت بالکل بے معنیٰ اشعار موجود ہیں۔ جن کا ماحصل صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محبوب کی کمر بالکل بال جیسی باریک ہے۔ اور اس کے ساتھ زلف پیچ لڑ رہی ہے ؎

لٹک وز میاں کی نزاکت میں پڑا بل زلفوں سے اُلجھا ہی پڑا مُونے کمر کا!

پہلوئے دلدار سے لپٹی ہے ناگن کی طرح پیچ کرتا زلف کا مُونے کمر سے دیکھنا

محفل میں محبوب کا ہاتھ عاشق کے زانو پر لگ جاتا ہے تو اس کی حالت قابلِ دید ہوتی ہے۔ دیکھئے کیسی رال ٹپکائی ہے ؎

رکھ دیا ہے کبھی زانو پہ جو اُس شوخ نے ہاتھ
ہاتھ پھیلائے ہیں میں نے سرِ محفل کیا کیا

ایک جگہ مبالغہ میں حد سے زیادہ بڑھ گئے ہیں۔ محبوب عاشق کے زانو پر سر رکھے لیٹا ہوا ہے اور وہ اٹھنا چاہتا ہے۔ لیکن اسے دھمکا دیا جاتا ہے کہ اگر تمہاری گردن ذرا بھی سرکی تو میرا دم نکل جائیگا۔ آج تک کسی کا دم اتنی سی بات پر تو نہیں نکلا ؎

زیست منظور ہے میری تو یونہی لیٹے رہو دم نکل جائیگا زانو سے جو سرکی گردن

محبوب کے رخساروں پر سبزے کا آغاز ہوتا ہے تو اسے کیسے قبیح انداز میں بیان کرتے ہیں ؎

حُسن افروز افزوں نے کانٹوں پر گھسیٹا یار کو
سبزۂ عارض بڑھا ایسا کہ جنگل ہو گیا

رقابت کے بعض مضامین میں بھی یہی رنگ موجود ہے۔ مثلاً ؎

مر جائے ایک دم میں لہو تھوک کر رقیب مُنہ میں ہمارے مُنہ سے جو اک پان لیجئے

دیکھا رقیب کو تپ و لرزہ میں مبتلا آج اپنے دل کا دو دیکھو، نکلا بخار کچھ

پہلا شعر کیسا رکیک ہے۔ نفسِ مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ عاشق اور معشوق دونوں بازاری طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جن کے نزدیک ایک دوسرے کے منہ سے جھوٹا پان لینا باعثِ فخر خیال کیا جاتا ہے۔

دوسرے شعر میں رقیب بیمار ہے تو خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ ایسے خیالات کو نظم کرنا محض تضیعِ اوقات ہے۔

دو تین اور اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

باغ میں جاتی ہے اس گل کی سواری اندنوں دم چڑھ جائے پھرتی ہے بادِ بہاری اِن دنوں

غیر نے جیسے ہی اُس گل کو پنہائی پوشاک دل ہی جامے سے وہ باہر کبھی کہتے ہیں

ثبات تھا جو نہ منظور بحرِ عالم میں خدا نے روح کے بدلے مجھے حباب دیا

یہ تینوں اشعار بے معنی سے ہیں۔ پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ میں "دم چڑھ جائے پھرنا" بالکل غلط محاورہ استعمال کیا گیا ہے۔ دم تو اس وقت چڑھتا ہے جب کمزور آدمی دوڑ دھوپ کرے۔ یا تندرست آدمی بلندی پر چڑھے۔ یہاں معلوم نہیں ہوتا کہ دوسرے مصرعہ سے شاعر کا مفہوم کیا ہے۔

دوسرا شعر معلوم ہوتا ہے کہ فقط "جامے سے باہر ہونا" کا محاورہ نظم کرنے کیلئے لکھا گیا ہے۔ نیز "وہ باہر" کی بجائے "اس طرح کہنا چاہیئے تھا۔

اسی طرح تیسرے شعر میں یہ کہنا کہ "خدا نے مجھے روح کے بدلے حباب دیا" بالکل بے معنی چیز ہے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا تھا کہ "خدا نے مجھے زندگی حباب کی مانند عطا کی ہے" لیکن قافیہ اور ردیف کی پابندی کے باعث وہ اصل مقصد سے بھٹک گیا۔ اور شعر کا ستیاناس کر دیا۔

بہرحال اوپر کی سطور میں امانت کے کلام کے محاسن اور نقائص بخوبی واضح کر دیئے گئے ہیں۔ ہر تصویر کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ اور اگر صرف ایک ہی رُخ کو پیش کیا جائے تو اُس کے حُسن و قبح کا صحیح اندازہ لگانا مشکل بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے۔ اسی نظریئے کے تحت ہم نے امانت کے تغزل کی خوبیاں اور اسقام پہلو بہ پہلو بیان کر دیئے ہیں۔ اب قارئین کی دلچسپی کے لئے آخری تحفے کے طور پر امانت کی ایک پُرلطف ساونی غزل کے چند اشعار پیش کیئے جاتے ہیں ؎

دیکھئے انکھوں سے کس کس کی برستا ہے لہو یار ہاتھوں میں لگاتا ہے حنا ساون کی
ایک عقدہ نہیں تھمتی ہے جھڑی اشکوں کی لگ گئی کیا مری آنکھوں کو ہوا ساون کی
ہجر ساقی میں رُلاتا ہے ہمیں ابرِ سیاہ غم و اندوہ بڑھاتی ہے گھٹا ساون کی

اے امانت یہ نکالی ہے زمیں تو نے نئی
پہلے بھی کس کی غزل تیرے سوا ساون کی

خلیل جبران کا فلسفۂ محبت

(از محترمہ حمیدہ سلطانہ بیگم صاحبہ)

آئیے آپ کا تعارف میں مشرق کے ایسے شاعر سے کراؤں جس کی شاعری پیغامبری کا جزو اعظم کہی جا سکتی ہے۔ جس کے اقوال زریں صحیفۂ دل پر لکھ لینے کے قابل ہیں۔ یہ شاعر "خلیل جبران" ہے جو ۱۸۸۳ء میں لبنان میں پیدا ہوا۔

لبنان کی مقدس سرزمین نے خدا کے بھیجے ہوئے پیغامبروں کا روحانی پیغام سنا۔ اس کے ذرے ذرے سے الوہیت اور تقدس کے جذبات اب تک موجزن ہیں۔ خلیل جبران اسی مقدس سرزمین کی آغوش میں پلا۔ انہیں سرمدی ہواؤں میں اس نے سانس لیا۔

اس کا روحانی فلسفہ سراپا آرٹ پر مبنی ہے۔ وہ ہمیں شعر و ادب کی ایسی رنگین اور عطر بیز وادیوں میں لے جاتا ہے اور زندگی کے تلخ اور شپ مردہ کن حقائق کو ایسے رنگین پردوں میں پوشیدہ کر کے ہمارے سامنے لاتا ہے کہ ہماری روحیں ان کو دیکھ کر شاداب ہو جاتی ہیں۔

"خلیل کا حسن عالمگیر حسن ہے اور اس کا عشق قبر کی منزل کے بعد انسان کی رہنمائی کرتا ہے"۔ زندگی کی تکالیف کس قدر اذیت دہ ہوتی ہیں

"مر مر کے جینا جی جی کے مرنا"

لیکن خلیل جبران کے حسین تصورات آنکھوں سے دیکھنے کے بعد انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ مایوسیاں اور تکالیف کس قدر حسین اور مسرت انگیز ہو جاتی ہیں۔ اس کا سینہ روحانی الہامات کا سرچشمہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ ایسی الہامی شاعری کسی معمولی انسان کے تفکر کا نتیجہ نہیں ہو سکتی۔ اس کی فکری عظمتیں اس قدر بلند ہیں کہ معمولی انسانوں کے دماغ اس کی تصانیف کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔

وہ زندگی کے رموز و اسرار سے اس قدر واقف ہے کہ زندگی کی ہر حقیقت اس کے سامنے بے نقاب ہے۔

ایک مغربی اُستاد لکھتا ہے:۔

"میرا خیال ہے کہ ٹیگور کی گیتانجلی کے بعد میں نے مشرق کی طرف سے ایسے حسین نغمے گاتے کسی کو نہیں سنا۔ صدیوں کے بعد اس قسم کی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ جب میں نے خلیل جبران کے حسین تصورات اور دلکش فلسفے کا مطالعہ کیا تو مجھ پر سقراط کے اس فلسفہ کی اہمیت بے نقاب ہوئی کہ "حسن تخیل حسین صورتوں کی بہ نسبت زیادہ مسحور کن ہوتا ہے"۔"

خلیل جبران فلسفی شاعر جس کو عام طور پر لوگ تنہائی پسند دیوانہ سمجھتے تھے جو ویرانوں اور پہاڑوں میں تنہا پھرتا رہتا تھا۔ چھ سال تک اس نے کسی سے بات نہ کی۔ نہ شہر میں آیا۔ کہا جاتا ہے "مسائل حیات" اس عظیم مفکر کی اس طویل خموشی کا نتیجہ ہے۔

خلیل کی شہرت صرف لبنان کی پہاڑیوں یا شام کے میدانوں تک محدود نہیں بلکہ اس کی دلربا و منظر انگیز شاعری کی مہک دنیا کے تمام ممالک میں تقریباً پہنچ چکی ہے۔ "اس کی تصانیف کا ترجمہ تقریباً بیس زبانوں میں کیا جا چکا ہے"۔ خلیل نے اپنی عمر کے آخری بیس سال امریکہ میں بسر کئے۔ اور اس دوران میں اس نے عربی چھوڑ کر انگریزی زبان میں کتابیں لکھیں۔

نقادانِ ادب کی رائے میں "مسائل حیات" خلیل جبران کا شاہکار ہے۔ فلسفہ و تصوف و شاعری کا ایک دلکش امتزاج اس کتاب کے علاوہ اور کہیں اس حسن کے ساتھ ملنا مشکل ہے۔

"یہ اس کی غیر فانی تصنیف ہے"۔ جس کے متعلق وہ خود لکھتا ہے۔

مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کبھی بھی "پیغمبر" کے بغیر کوئی سانس نہیں لیا۔ لبنان کی پہاڑیوں پر مجھے اس کتاب کا الہام ہوا اور میں اسی دن سے یہی سمجھتا تھا کہ یہ میری زندگی کا بہترین حصہ ہے۔ شائع ہونے سے پہلے چار سال تک یہ مسودہ میں نے اپنے پاس رکھا کیونکہ میں اس بات کو پایۂ تکمیل کو پہنچا دینا چاہتا تھا کہ اس کتاب کا ہر لفظ میری زندگی کا بہترین لفظ ہے۔

خلیل ایک زبردست ادیب اچھا شاعر ہی نہیں ایک بلند پایہ مصور بھی تھا۔ یورپ کے تمام بڑے شہروں میں اس کی تصویروں کی نمائش ہو چکی ہے۔ زندگی کا تصور اس سے بہتر کوئی مصور نقاد دیر میں ادا کر سکا۔

میں خلیل کی اس اہم تصنیف "مسائل حیات" سے محبت جیسے اہم موضوع پر اس کے زریں خیالات نقل کرنے کا فخر حاصل کر رہی ہوں۔

محبت

عارفہ نے کہا:۔

تمہیں محبت کی باریکیوں سے روشناس کر!

اُس نے اپنا سر اُٹھایا اور ہجوم پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔

اور اُن سب پر سکوت طاری ہوگیا۔

اُس نے جلال آمیز آواز میں کہا۔

جب محبت تم کو اپنی طرف بُلائے۔

تو تم اُس کا تعاقب کرو۔

خواہ راستے میں ناقابلِ عبور دریا اور بھیانک جنگل ہی کیوں نہ حائل ہو۔

اور جب وہ تمہیں اپنے آغوش میں لینے کے لئے بازو پھیلا دے تو تم اپنا وجود اُس کے سپرد کردو۔

ممکن ہے کہ وہ تلوار جو اُس کے پہلو میں پوشیدہ ہے تمہیں گھائل کردے۔

اور جب وہ تم سے مخاطب ہو تو اسکی باتوں پر یقین کرو۔

خواہ اس کی آواز تمہارے خوابوں اور تصورات کی دُنیا کو پریشان ہی کردے۔ جس طرح شمالی جھکڑ گلستان کو برباد کرڈالتا ہے۔

اس حقیقت کو فراموش نہ کرو کہ محبت اگر مالکِ تاج و تخت بناتی ہے تو دار پر بھی کھنچوا سکتی ہے۔

تمہارے چمنستانِ روح کی نشو و نما کے لئے وہ بیکار شاخوں کی کانٹ چھانٹ بھی کرتی ہے۔

اور جب وہ تمہاری آلفتوں کو طے کرتی ہوئی تمہارے شجرِ حیات کی اُس شاخ پر بوسہ دیتی ہے جو آفتاب کی مرمریں شعاعوں میں کانپ رہی ہوتی ہے تو اُس کے ساتھ ہی وہ اس درخت کی اُن جڑوں کو بھی متزلزل کردیتی ہے جو زمین میں دُور تک پھیلی ہوئی ہوتی ہیں۔

وہ اجناس کے پولوں اور گٹھلیوں کے انبار کی طرح تمہیں اپنے دامن میں سمیٹ لیتی ہے۔

تمہیں عریاں کرنے کے لئے اس طرح جھاڑتی ہے جس طرح بھُس سے غلہ علیحدہ کرنے کے لئے خشک پودوں کو پھٹکا جاتا ہے۔

اور تمہیں جلا ڈالنے کے لئے پیس ڈالتی ہے۔

پھر تمہارے مغز کو کھاتی ہے۔ تاکہ پندار سے خالی ہوجائے اور تمہاری رُوح کو ہوس کے زہر سے آلودہ نہیں ہونے دیتی۔ محبت کا اصل مقام وہ معصوم دل ہیں جو لوث سے خالی ہیں۔ سچی محبت کو ہوس کار دل نظریں فنا کردیتی ہیں۔ اور تم محبت کی کسوٹی پر اُس وقت تک پورے نہیں اُتر سکتے جب تک خود کو محبت کے سپرد نہ کردو۔ سود و زیاں کا خیال چھوڑ کر محبت کی پیکر (؟) تم کو لافانی شہرت کا تاج عطا کریگی۔ بشرطیکہ حرص و ہوس کا اس پر سایہ نہ ہو۔

اِنکارِ مُحبّت

(از محترمہ نکہت نسیم)

انکارِ محبت کا یقیں آئے تو کیسے
کوئی دلِ مجبور کو سمجھائے تو کیسے

کیا تجھکو وفاؤں کا مری پاس نہ ہوگا
فطرت کے اشاروں کا بھی احساس نہ ہوگا

جب ابر کے پردوں میں کھنک اُٹھینگے ساغر
جب آنکھ سے گزریگا جنوں خیز سا منظر

جب وادیِ کہسار کی بدمست ہوائیں
جھرنوں کے ترانوں پہ کوئی راگ بجائیں

جب کلیوں کے ہونٹوں پہ مچلتا ہو تبسم
رگ رگ سے فضاؤں کی ٹپکتا ہو ترنم

اِک حد میں ڈوبی ہوئی لے دُور سے آئے
جب چاندنی راتوں میں کوئی ساز بجائے

خاموش زباں سے کوئی افسانہ سا کہہ جائے
معصوم نگاہوں سے کوئی دیکھ کے رہ جائے

نظروں کے دھندلکے میں اُبھرنے لگیں تارے
گمنام خلاؤں سے کوئی تجھ کو پکارے

اس وقت اگر آنکھ نہ بھر آئے تو جانوں
نشتر سا اِک دل میں اُتر جائے تو جانوں

بنی اُمیہ کا زوال اور اُسکے بنیادی اسباب

(واقعات کی روشنی میں حقیقی اسباب کا تجزیہ)

(از محترمہ وجاہت فاطمہ شاہجہانپوری)

"انسانی زندگی میں دو ایسے واقعات ہیں جن کا بالکل ٹھیک وقت ہم نہیں بتا سکتے۔ ان میں سے ایک کا تعلق فردی زندگی سے ہے۔ دوسرا جس کا تعلق قومی زندگی سے ہے۔ تنزل یا زوال ہے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ فلاں قوم کا زوال کس تاریخ سے شروع ہوا۔ سب کو اسکی خبر اس وقت ہوتی ہے جب وہ زور پکڑ جاتا ہے۔"[۱]

اموی سلطنت کے زوال کی بھی کوئی تاریخ مقرر نہیں کی جا سکتی۔ ان تخریبی عناصر کی کشمکش شدت سے جاری تھی۔ جو مستقبل میں بنی اُمیہ کی بربادی کے سبب ہوئے۔

بنی اُمیہ کے زوال کا سب سے اہم سبب یہ تھا کہ فرمانروا اپنی زندگی میں دو دو بلکہ اس سے بھی زائد اپنے جانشین مقرر کر دیتا تھا۔ مستقبل میں اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ان جانشینوں میں ایک دوسرے کے خلاف سازشیں شروع ہو جاتی تھیں۔ اور دوسرے تیسرے نمبر کا جانشین اپنے راستے سے اپنے رقیبوں کو ہٹانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھتا تھا۔ ان عداوتوں کا دائرہ صرف خاندان شاہی تک محدود نہیں رہتا تھا۔ بلکہ گورنروں اور فوج کے افسروں تک جن میں ان جانشینوں سے کوئی چپقلش یا دشمنی ہوتی تھی، وسیع تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ مختلف پارٹیاں بن جاتی تھیں۔ اور ہر پارٹی اپنے آدمی کی حمایت کرتی تھی۔

سب سے پہلے یہ طریقہ مروان حکم نے جاری کیا تھا۔ اُس نے اپنے دونوں بیٹوں عبدالملک اور عبدالعزیز کو یکے بعد دیگرے جانشین قرار دیا تھا۔ اور جابیہ کے مقام پر اس کی بیعت جس شرط پر کی گئی تھی اُس کی اُس نے خلاف ورزی کی۔ اس مقام پر اس کی بیعت اس شرط پر کی گئی تھی کہ حسب ترتیب اس کے جانشین خالد بن ولید اور عمر بن سعید ہوں گے۔ عہد کی خلاف ورزی کا انجام یہ ہوا کہ عمر بن سعید نے عبدالملک کے خلاف بغاوت کردی۔ اور جب عبدالملک نے اس کا کام تمام کر دیا تو مختلف قبائل میں اس کے خلاف ایک شدید دشمنی پیدا ہو گئی۔

عبدالملک بن مروان نے معاہدہ کی خلاف ورزی میں اپنے باپ کی جانشینی کا صحیح حق ادا کیا اور اپنے بھائی عبدالعزیز کو ولیعہدی سے معزول کر کے اپنے دونوں بیٹوں ولید اور سلیمان کو اپنا جانشین مقرر کرنے کا ارادہ کیا۔ خوش قسمتی سے عبدالعزیز کی وفات ہو گئی تھی۔ اس لئے اختلافات پڑنے نہیں پائے تھا اور اس نے اپنے بیٹے ولید اور سلیمان کو اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ ولید بن عبدالملک جب خلیفہ ہوا تو اُس نے اپنے بھائی سلیمان کو معزول کر دیا اور اپنے بیٹے عبدالعزیز کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔ اور اس کی بیعت کے متعلق اپنے گورنروں کو لکھ دیا۔ حجاج بن یوسف نے گورنر عراق اور قتیبہ بن مسلم گورنر خراسان اور محمد بن قاسم گورنر سندھ نے اُس کے فرمان کا خیر مقدم کیا۔ ولید نے اس دور کے مشہور شعراء کو بہت سا مال و دولت عطا کیا اور انہیں اشارہ کیا کہ وہ عبدالعزیز کی مدح و ستائش میں نظمیں لکھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ولید اور سلیمان میں شدید عداوت پیدا ہو گئی۔ ولید کی موت کے بعد جب سلیمان خلیفہ ہوا تو اُس نے ان تمام لوگوں کے خلاف شدید کارروائیاں شروع کیں۔ جنہوں نے اس کے خلاف کام کیا تھا۔

چنانچہ سلیمان نے بڑے بڑے جنرلوں اور گورنروں سے جن کے متعلق اسے ذرا بھی شبہ ہوا کہ انہوں نے اُس کے خلاف کارروائیاں کی تھیں۔ اُن سے شدید انتقام لیا۔ خوش قسمتی سے حجاج بن یوسف ولید کے زمانہ ہی میں مر گیا تھا تاہم سلیمان نے اس کے پورے خاندان سے انتقام لیا۔ اور یزید بن مہلب (جو حجاج کا سخت مخالف تھا) اور صالح بن عبدالرحمٰن کو مقرر کیا کہ وہ حجاج کے خاندان کو عبرت انگیز سزائیں دیں۔ اسی طرح سلیمان نے محمد بن قاسم اور قتیبہ بن مسلم کو حسرت ناک طریقہ سے مروا ڈالا۔ شاہی خاندان اور حکمران افراد کی باہمی مخالفتوں کا یہ ایک اجمالی خاکہ ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کا شیرازہ کس بُری طرح منتشر ہو چکا تھا۔

حقیقت کا ظاہر ہونا قبائل عرب میں عصبیت کی شمع اگرچہ یزید بن معاویہ کی وفات کے بعد پیدا ہو گئی تھی۔ مگر وہ اتنی قوی اور مستحکم نہ تھی کہ بنی اُمیہ کی حکومت کا تختہ اُلٹ دیتی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی وفات تک عصبیت کی اسپرٹ کسی قدر کمزور رہی۔ مگر اُن کی وفات کے بعد عصبیت کا جذبہ بیدار ہو گیا۔ جس نے بنی اُمیہ کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ اور ان کے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی۔

---

[۱] خالدہ ادیب خانم۔

حضرت عمر بن عبد العزیز کی وفات کے بعد جب یزید بن عبد الملک خلیفہ ہوا تو اُس کے زمانے میں ایک زبردست فتنہ اُٹھا جس نے بنی اُمیہ کی بنیادیں ہلا دیں۔ یہ فتنہ شمالی عربوں اور جنوبی عربوں یا دوسرے الفاظ میں مضریوں اور یمنیوں کی قبائلی عصبیت کا نتیجہ تھا۔ اور چونکہ خلیفہ شمالی عربوں کے قبائل سے تعلق رکھتا تھا۔ اس لئے اُسے بھی اس فتنہ میں شریک ہونا پڑا۔ یہ فتنہ یزید بن مہلب کے فتنہ کے نام سے مشہور ہے۔ جو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے قید خانہ سے یزید بن عبد الملک کے ڈر سے بصرہ بھاگ گیا تھا۔

مورخین کا اس بات میں اختلاف ہے کہ یزید بن عبد الملک اور یزید بن مہلب کی باہمی عداوت کا کیا سبب تھا۔

طبری اور ابن اثیر کا خیال ہے کہ یزید بن ابی مہلب نے حجاج کے خاندان کو جہاں یزید بن عبد الملک کی سسرال تھی سلیمان کے اشارہ سے سخت سزائیں دی تھیں۔ کیونکہ حجاج بن یوسف کی بھتیجی ام حجاج کی شادی یزید بن عبد الملک سے ہوئی تھی۔ یزید بن مہلب نے اُسے گرفتار کر لیا تھا اور جب یزید بن عبد الملک نے سفارش کی تو اُس نے رد کر دیا۔

ابن مہلب قید خانہ سے بھاگ کر بصرہ پہنچا۔ جہاں اُس کے خاندان والوں نے اور عراق کے بہت سے یمنی قبائل نے اس کا ساتھ دیا۔ اور ان کی مدد سے اس نے بصرہ اور اس کے آس پاس کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اور روز بروز اس نے اپنی طاقت کو بڑھانا شروع کیا اور چند روز میں ایک لاکھ کی تعداد میں فوج جمع کر لی یہ خطرہ بنی اُمیہ کی حکومت کو تہدید کرنے لگا۔ اور یزید بن عبد الملک نے ایک جرار لشکر اپنے بھائی مسلمہ کی قیادت میں بھیجا۔ عقر (بصرہ کے علاقہ میں) کے مقام پر دونوں کا مقابلہ ہوا اور آٹھ روز تک لڑائی جاری رہی۔ اس میں یزید بن مہلب مارا گیا۔

اس کے بعد مہلب بن ابی صفرہ کے خاندان کے افراد کو چن چن کر مار ڈالا گیا ان پر کسی قسم کا رحم نہیں کیا گیا۔ یہ بیان کرنے کی غالباً ضرورت نہیں کہ مہلب بن ابی صفرہ کا خاندان بنی امیہ کی حکومت میں اثر و اقتدار، علم و شرافت اور غیر معمولی سخاوت کے لحاظ سے وہی حیثیت رکھتا تھا جو عباسیہ کے زمانہ میں برامکہ کی تھی۔ یمنی قبائل کے لئے وہ فخر و سربلندی کا باعث تھے۔ اسی وجہ سے اس کی فوج میں یمنی قبائل کا عنصر بہت زیادہ تھا۔ جب یزید بن مہلب مارا گیا تو تمام یمنی قبائل بنی اُمیہ کی حکومت کے خلاف [illegible] ہو گئے۔ [illegible] حکومت کے خلاف [illegible] کرنے لگے۔ [illegible] اُمیہ کے [illegible] اس کے برعکس کیا۔

[illegible] کے درمیان اختلافات کی خلیج وسیع ہوتی گئی جو بنی اُمیہ کی تباہی کا سبب بنی۔

اس واقعہ کے بعد ہی سے یزید عبد الملک نے مضریوں کا ساتھ دیا چنانچہ مشرقی دولت بنی اُمیہ کا گورنر اپنے بھائی مسلمہ کو بنایا۔ اس کے بعد عمر بن ہبیرہ کو گورنر مقرر کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت کی مشرقی پر مضری قبائل چھا گئے اور یمنیوں کا عنصر قریب قریب بالکل ختم ہو گیا۔

یزید کی وفات کے بعد جب ہشام بن عبد الملک خلیفہ ہوا تو اُس نے دیکھا کہ مضریوں کا اقتدار حکومت بہت چھا گیا ہے۔ کہیں یہ بنی اُمیہ کی تباہی کا سبب نہ ہو۔ اس لئے اس نے مضریوں کا اثر گھٹانے اور یمنیوں کو ابھارنے کی پالیسی اختیار کی۔ چنانچہ مضری گورنروں کو معزول کر دیا گیا اور اُن کی جگہ یمنی گورنروں کو دی گئی۔ چنانچہ خالد بن عبداللہ مضری عراق کا اور اس کا بھائی اسد خراسان کا گورنر مقرر کیا گیا۔ ان دونوں کی وجہ سے یمنیوں کا اقتدار بڑھنا شروع ہوا اور انہوں نے اپنے قبائل کو ابھارنے اور اپنے حریف مضریوں کو گرانے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا۔

ہشام بن عبد الملک اپنی اس پالیسی پر کچھ زیادہ مدت تک قائم نہیں رہا اور جب اُس نے دیکھا کہ یمنیوں کا اثر بہت بڑھ گیا ہے تو وہ مضریوں کی طرف مائل ہو گیا۔ چنانچہ یوسف بن عمر کو عراق کا اور نصر بن سیار کو خراسان کا گورنر مقرر کیا۔ اسی طرح اندلس میں یمنی گورنروں کی جگہ مضری گورنر مقرر کر دیا گیا۔ اور ان گورنروں نے خالد بن عبداللہ (یمنیوں کا لیڈر، سابق گورنر) کے ساتھ جو سختیاں کیں اس سے چشم پوشی کی۔ مضریوں نے جب خالد بن عبداللہ کو قتل کر دیا تو یمنیوں کے لئے یہ واقعہ ناقابل برداشت تھا۔ وہ ابھی مہلب بن ابی صفرہ کے خاندان سے دردناک استیصال کو نہیں بھولے تھے کہ ان کا ایک محبوب لیڈر اور قتل کیا گیا۔ خالد کے قتل کے بعد ولید بن یزید نے مضریوں کی حمایت کی کیونکہ اس کی ماں مضری تھی اور یمنی عنصر کو دبانے کی کوشش کی۔ اس کی وجہ سے غیظ و غضب کے جذبات یمنیوں کے دل میں ولید کی طرف سے پیدا ہو گئے۔ اور وہ اس کے خلاف سازشیں اور بغاوتیں کرنے لگے۔ شعراء نے اُمویوں اور ولید کے خلاف پروپیگنڈا شروع کیا اور رائے عامہ کو اُس کے خلاف کر دیا۔ یمنیوں نے یہ موقع غنیمت دیکھا اور اس کے خلاف بغاوت کر دی اور اس کے حریف یزید بن ولید بن عبد الملک کے حامی بن گئے۔ جو متواضع اور منکسر مزاج مشہور تھا۔ اور اس کے ساتھ مل کر ولید پر چڑھائی کر دی۔ ولید مارا گیا اور یزید بن ولید کی بیعت کر لی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہی خاندان میں شدید اختلافات پیدا ہو گیا۔ اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔

یزید بن عبد الملک کی پالیسی یہ تھی کہ اُس نے یمنیوں کو ابھارا [illegible]

مغربیوں کو دبا یا ۔ یمنیوں نے اپنے رقیب مضریوں سے سخت انتقام لینا شروع کئے ۔ یزید بن ولید کی چشم پوشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مضریوں نے حمص میں بغاوت کردی ۔ اسی طرح فلسطین ۔ اُردن اور دوسرے مقامات پر بھی مضریوں نے بغاوت کردی ۔ ان بغاوتوں کے لیڈر شاہی خاندان کے افراد تھے ۔ یزید بن ولید نے یمنیوں کی مدد سے ان تمام بغاوتوں کا استیصال کردیا اور ان کے لیڈروں اور حامیوں کو جیلوں میں سڑا دیا ۔

چھ مہینہ حکومت کرنے کے بعد یزید بن ولید کی وفات ہوگئی ۔ اس کی جگہ اس کا بھائی ابراہیم تخت نشین ہوا ۔ یہ بالکل نااہل شخص تھا ۔ تھوڑی ہی مدت میں مروان بن محمد الجزرُ امیہ کے گورنر نے آگے آ کر تخت خلافت پر قبضہ کرلیا ۔ مروان نے اپنے پیش رو خلیفہ کی پالیسی اختیار کی اور مضریوں کی حمایت کی اور مضری گورنر مقرر کئے ۔ اور اُن کے حریف یمنیوں کو سخت ایذائیں دینی شروع کیں ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حمص میں یمنیوں نے بغاوت کردی ۔ اس طرح یزید بن خالد القسری نے دمشق میں بغاوت کردی ۔ اور بہت سے یمنی قبائل نے اس کی حمایت کی ۔ مروان نے اُس کے خلاف ایک لشکر بھیجا جس نے اسے شکست دی اور اسی میں یزید بن خالد مارا گیا ۔ اس طرح فلسطین کے یمنیوں کی بغاوت بھی مروان نے فرو کی ۔ چند روز کے بعد سلیمان ابن ہشام نے شام میں خلافت کا دعویٰ کیا ۔ شامیوں اور یمنیوں نے اس کی حمایت کی ۔ مروان نے اس شورش کا طویل جنگوں کے بعد خاتمہ کیا ۔ سلیمان عراق بھاگ گیا ۔ اور خوارج کے ساتھ ملکر مروان کے خلاف سازشیں کرنے لگا ۔ عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز بھی اس کے ساتھ مل گئے ۔

اس تمام عصبیت اور باہمی اختلاف کا نتیجہ یہ ہوا کہ بنی آمیہ کی بربادی چند روز کے بعد عمل میں آئی ۔

۳ ۔ بنی امیہ کے زوال کا ایک سبب یہ تھا کہ بعض خلفاء عیش و عشرت میں مبتلا ہوگئے تھے چنانچہ یزید بن معاویہ کو شراب و کباب اور دوسری دلچسپیوں سے فرصت نہ ملتی تھی ۔ یہی حال یزید بن عبدالملک کا تھا ۔ اُسے بھی عیش و عشرت اور دوسری بد معاشیوں سے فرصت نہ تھی کہ امورِ سلطنت کی طرف توجہ کرتا ۔

۴ ۔ **امویوں کا نسلی تعصب** ۔ بنی اُمیہ کی حکومت خالص عربوں کی حکومت تھی ۔ وہ عربوں کو شرف و عزت میں تمام دُنیا سے ممتاز سمجھتے تھے اور اپنے مقابلہ میں ایرانیوں اور دوسرے غیر عربوں کو کچھ نہ سمجھتے تھے ۔ اُنہوں نے سیاسی معاشی اور تمدنی حقوق سے غیر عربوں کو محروم کر رکھا تھا اور انہیں نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عبدالملک بن مروان کے زمانے میں ایرانیوں نے بغاوت کردی جسے حجاج بن یوسف نے نہایت سفاکی سے فرو کیا تھا ۔

ایرانی ان باتوں کی وجہ سے مدت سے بنی اُمیہ کے خلاف سازشیں کر رہے تھے اور ان کی حکومت کا تختہ اُلٹ دینے کی فکر میں تھے ۔ چنانچہ وہ کبھی خارجیوں کے ساتھ شریک ہوجاتے تھے ۔ کبھی اور دوسرے باغیوں کا ساتھ دیتے تھے ۔ مثلاً عبدالرحمٰن بن اشعث کے فتنہ میں برابر کے شریک تھے ۔ جب یزید بن مہلب نے بغاوت کی تھی تو ان کا بھی ان ایرانیوں نے ساتھ دیا تھا ۔ جب عباسیوں کے مبلغین ، عباسیوں کے قیام حکومت کیلئے کوشش کر رہے تھے اس وقت بھی ان لوگوں نے ان کی دعوت پر لبیک کہا تھا ۔ اور جب شیعوں نے اپنی تحریک شروع کی اس وقت بھی وہ اُن کے ساتھ شریک ہوگئے ۔ مقصد ان تمام حرکتوں سے یہ تھا کہ بنی اُمیہ کی حکومت کو تہ و بالا کردیں تاکہ اپنے حقوق کو حاصل کرسکیں ۔ عباسیوں کے لیڈروں نے اس جذبہ کو اچھی طرح محسوس کرلیا ۔ اور نہایت آسانی کے ساتھ اپنا آلۂ کار بنالیا تھا ۔

۵ ۔ **مذہبی اور سیاسی تحریکیں** ۔ بنی اُمیہ نے اپنی حکومت شامیوں کی مدد سے قائم کی تھی ۔ دوسرے الفاظ میں امیر معاویہ کی حکومت کے قیام کا مطلب یہ تھا کہ شامیوں کو عراقیوں پر فتح حاصل ہوئی ۔ یہی وجہ ہے کہ بنی اُمیہ نے اپنا دارالخلافہ کوفہ کی جگہ دمشق کو مقرر کیا ۔ ولہوزن (Wellhosen) کے الفاظ میں یہ امویوں کی سب سے بڑی سیاسی غلطی تھی ۔ ان کے زوال میں اس کا بہت بڑا دخل ہے ۔ کیونکہ عراق میں عربوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہاں کٹر قسم کے مذہبی لوگ رہتے تھے ۔ مذہب کا احساس بہت زیادہ تھا اور وہاں کے علماء فقہاء اور صحابہ امویوں کی حکومت کو ساسانی شہنشاہی کی ایک بگڑی ہوئی شکل سمجھتے تھے ۔ جسے اسلامی حکومت سے کوئی واسطہ نہ تھا ۔ اس لئے اس سے بیزار تھے ۔

خوارج ۔ خارجیوں نے ذاتی عداوت کی بنا پر امویوں کے خلاف سر اُٹھایا تھا ۔ اموی فرمانرواؤں نے اُن کا نہایت سختی کے ساتھ استیصال کیا تھا ۔ اس باہم آویزش سے امویوں کے خلاف ایک زبردست خلیج حائل ہوگئی تھی

شیعہ ۔ یہ خلافت کا مستحق صرف حضرت علیؓ کے گھرانے کو سمجھتے تھے اور اموی فرمانرواؤں کو ایک غاصب سے زیادہ حیثیت نہ دیتے تھے ۔ واقعہ کربلا کے بعد یہ امویوں کے خلاف عملی سیاست میں حصہ لینے لگے تھے ۔ اور ان کے خلاف سازشیں کرتے تھے ۔ ایرانیوں نے کچھ امویوں سے ذاتی عداوت کی بنا پر اور کچھ اس بنا پر کہ وہ امام حسینؓ سے صہر کا رشتہ رکھتے تھے ان کا ساتھ دیا ۔ مروان بن محمد کا زمانہ فتنوں اور شورشوں سے معمور تھا ۔ اس زمانہ میں شیعہ نہایت آزادی سے اپنے خیالات اور عقائد کی تبلیغ کرنے لگے ۔ مہدی کا عقیدہ

بھی اسی وقت ظہور میں آیا جسے بنی اُمیہ کے زوال میں بہت بڑا دخل ہے۔

الجزیرہ، فلسطین، حضرموت اور یمن میں خوارج بھی کثرت سے پھیل گئے اور بنی اُمیہ کے خلاف بیٹے عامہ کو بھڑکانے لگے۔ ابھی ان فتنوں نے دم نہ لیا تھا کہ بنی عباسیہ کی دعوت کا آغاز ہوگیا۔ اس سازش کا انکشاف ایک خط کے ذریعہ ہوا۔ جو مروان بن محمد نے پکڑا تھا۔ یہ خط ابراہیم امام (حضرت عباس کے خاندان کے ایک فرد) نے ابی سلمہ خلان کے نام بھیجا تھا۔ جو اُن کی طرف سے عراق میں عباسیوں کی حکومت کے قیام کیلئے زمین تیار کررہا تھا۔ مروان نے ابراہیم امام کو گرفتار کرکے قتل کرا دیا۔ ابراہیم نے مرتے وقت اپنے اہل خاندان کو کوفہ چلے جانے کا مشورہ دیا اور اپنا جانشین اپنے بھائی ابوالعباس اور ابوجعفر کو علی الترتیب مقرر کردیا۔ عباسیوں نے اپنی دعوت کا مرکز بلاد خراسان کو بنالیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ بنی اُمیہ کے مرکز خلافت دمشق سے بہت دور تھے۔ دوسرے وہاں کے لوگ خصوصیت کے ساتھ بنی اُمیہ کے گورنروں سے بیزار اور اُن کی غلامی کا جُوا اتار سکنے کے موقع کے منتظر تھے۔

ابومسلم خراسانی نے اپنی سیاست کاری اور غیر معمولی تدبر سے اُن ممالک کے قبائل عربیہ میں اختلافات پیدا کردیا۔ جب اسے اطمینان ہوگیا کہ یہ عرب اب ایک مرکز پر کسی حالت میں جمع نہیں ہوسکتے تو نصر بن سیار (بنی امیہ کا ان بلاد میں گورنر تھا) پر یورش کردی اور اسے شکست دی۔ یہاں سے اُس نے عراق کا رُخ کیا۔ اور کوفہ میں داخل ہوگیا۔ اور وہاں ابوالعباس سفاح کی خلافت کا اعلان کردیا۔ سفاح نے اپنے چچا عبداللہ بن علی کو مروان بن محمد پر چڑھائی کرنے کیلئے روانہ کیا۔ اور مروان سے ضفاف زاب (عراق میں ایک دریا) کے مقام پر اس کا مقابلہ ہوا۔ مروان بھاگ کھڑا ہوا۔ عبداللہ بن علی نے فسطاط تک اس کا پیچھا کیا۔ اس جگہ اس نے اپنے بھائی صالح بن علی کو فوج کی کمان سپرد کردی۔ جس نے فیوم کے ایک گاؤں بوصیر کے مقام پر مروان کو قتل کردیا۔ اور اس کا سر کاٹ کر کوفہ میں سفاح کے پاس بھیج دیا۔ مروان کی شکست کے بعد سیاہ علم (عباسیوں کا جھنڈا) دمشق کے قلعوں پر لہرانے لگا۔ یہ ۱۳۲ھ کا عروج و زوال ہے۔

بنی اُمیہ کی حکومت سو برس سے زیادہ نہیں رہی۔ گویا وہ دُنیا کی بزم حکومت میں ایک بھولے بھٹکے مسافر کی طرح آ نکلے اور تھوڑی بہت دیر بیٹھ کر چلے گئے۔

آثارِ جنوں

(از جناب قیسی رام پوری)

بیانِ شوق نہ دانستہ ام کہ تا چنداست
ہمیں قدر کہ دلم سخت آرزو منداست

مدت سے سوچ رہا تھا کہ تم کو خط لکھوں۔ سوچ کیا رہا تھا بلکہ لکھ رہا تھا۔ تمہارے جوابات آتے رہتے تھے۔ میں خط لکھتا رہتا ––– جوابات آتے رہتے۔ حتیٰ کہ اس مکتوبی مضراب پر جوابی زخمہ کا ایک تسلسل قائم ہوگیا۔ اور اس سے ایک مسلسل نغمہ اس طرح بلند ہونے لگا جس طرح ستار کا ہر تار ایک طویل گیت بن جاتا ہے۔ اس گیت کو میں سنتا رہا اور تم نے بھی سنا ہوگا۔

کچھ عرصہ بعد مکاتیب بے ربط ہونے لگے گو وحشت یہ اس رابطہ کو ختم نہ کرسکے۔ جو قلم سے اٹھ کر دو دلوں پر چھا چکا تھا۔ لیکن جب تکلف برطرف ہونے کے بعد اندازِ جنوں دکھانے کا زمانہ آیا تو تم ایکا ایکی خاموش ہو گئیں۔ مجھے اندیشہ ہوا کہ تم پھر بیمار نہ پڑ گئی ہو۔ آنے والے واقعات اپنا سایہ ڈالنے لگتے ہیں۔ اندیشہ صحیح نکلا۔ تم سخت بیمار تھیں۔ میں نے پہلے اپنے تردد کا اور بعد کو دعاؤں کا تحفہ بھیجا۔ تردد مجھے مزید متفکر کرنے کے لئے راہ میں پھیلا رہ گیا۔ مگر میری دعائیں آسمان پر جا کر تمہارے واسطے صحت چھین لائیں۔ قدرت کے ہاں شاید بخششوں کا باقاعدہ ریکارڈ نہیں رکھا جاتا ہے۔ وہاں سے بیک وقت دو متضاد چیزیں ٹپکیں صحت تمہاری طرف بہہ گئی، غمِ حیات مجھ پہ انڈیل دیا گیا۔ اب میں حیاتِ غم میں جینے کا مزا پا رہا ہوں۔ تمہارے باب میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کہ میرا تماشہ دیکھنے کو زندہ ہو زندہ رہنا پسند کرتی ہو یا زندہ رہنے کی خاطر

بارہا تم کو گھاس کے سبز تختہ پر بیٹھنے یا لیٹنے کا اتفاق ہوا ہوگا اور تم نے اکثر نازک نازک گھاس کی ہری ہری پتیاں (توڑ) لی ہوں گی۔ پھر کبھی اس پر ناخن سے کچوکے دیئے ہوں گے۔ کبھی ویسے ہی منہ میں اس کو رکھ لیا ہوگا۔ دانتوں کے نیچے دبایا ہوگا اور بلا ذرا بھی توجہ صرف کئے اس کو آخر میں مسل کر پھینک دیا ہوگا۔ یہ انسان کے غافل دماغ کی فطری ظالمانہ لہر ہے۔ یہ بے توجہی، یہ کھویا ہوا پن دنیا میں نہ معلوم کتنوں کو مار کر رکھ دیتا ہے۔ ہر جگہ یہی ہو رہا ہے۔ ہر شخص یہی کر رہا ہے۔ انتہا یہ کہ انتہائی اذیت رسیدہ انسان بھی جب چپ ہوتا ہے تو بے خیالی اس کو بھی ضرر رسانی عام تاخت کی طرف لے جاتی ہے۔ اور وہ بھی اپنے سے بہت ضعیف "موجودات" کے لئے ہلاکو ثابت ہوتا رہتا ہے۔

میں تم کو اپنے باب میں کہ ظالم سمجھتا ہوں یا نہیں۔ اس کا اعلان کہیں تمہیں نادم نہ کردے۔ اس لئے چپ ہوں۔ ہاں! لیکن اپنے کو تختۂ گیاہ ضرور تصور کرتا ہوں جس کی پتیاں نوچی جارہی ہیں اور نوش لب –––

میں لکھتے لکھتے رک گیا۔ پیشانی پہ پسینے کی نمی تھی اور دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی جس کو سگریٹ کے کش نے تیز تر کر دیا تھا۔ گاؤ تکیہ بھی کوئی ایسا ارادہ رکھتا ہے جس پر آ کر وہ جسم کو تکلیف پہنچانے لگتا ہے۔ میں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا اور ہتھیلیوں کو رگڑ کر پسینے کی نمی مٹانے لگا۔ اتنے میں دروازہ کھلا اور جن کو میں اپنے پاس آنے سے کبھی نہیں روک سکتا وہ آ گئے۔

"ابھی لکھی چند ہی سطریں ہیں لیکن شکل وحشیوں کی سی بن گئی ہے۔"
ایک نے کاغذ سامنے سے جھپٹ کر کہا۔

"کوئی افسانہ ہے؟" دوسرے نے بھی گردن ٹیڑھی کر کے پڑھتے ہوئے پوچھا۔

"کسی ناول کی تمہید معلوم ہوتی ہے؟" پہلا مطالعہ کرتا ہوا بولا۔
دونوں آپس میں اس طرح ایک دوسرے سے سوال جواب کر رہے تھے جیسے کمرے میں صرف وہ دو ہی تھے۔ اور یہ تحریر وہاں ان کو پڑی مل گئی ہے۔ جس پر رائے زنی ہو رہی ہے۔

"ہونہہ۔ صداقت پیدا کرنے کے جنون میں تحریر کے اندر حقیقت بھرنے کی کوشش کی ہے آپ نے۔" ایک صاحب نے فرمایا۔

"شہ۔ جیسے کوئی اعتبار کر ہی لے گا۔ جیسے لوگ مان ہی تو لیں گے کہ اس تحریر میں کوئی اصلیت ہے۔" دوسرے نے ذرہ نوازی فرمائی۔

"میاں وہ کیوں نہیں لکھتے جو خود محسوس کرتے ہو۔ ان رٹی قافیوں میں کیا رکھا ہے۔" پھر بہت قریبی عزیز نے جرأت افزائی کی۔

"یہ لوگ اور اپنے محسوسات پیش کریں! قیامت نہ آجائے۔" دوسرا نکیر بولا۔

"خود فریبی کی انتہا ہے۔"

"خط کہیں اس قدر منظوم قسم کے ہوا کرتے ہیں اور اتنے بے کیف۔"

"جی! اور ایسے غیر حقیقی۔ لطف یہ کہ حیلہ کیا گیا ہے کسی محبوب کو لکھنے

سکا۔ انہوں نے تحریر کو پھینک دیا۔

"باغ نہیں چلو گے ؟"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"جہنم میں جاؤ۔" بیشے غیر مودبانہ طور پر انہوں نے زور سے دروازہ بند کیا اور ہنستے ہوئے بھاگ گئے۔

بچی کچی پتیاں ان لوگوں نے نوچ ڈالیں تھیں۔ کیا تمام انسان نیند میں چلتے پھرتے ہیں۔ اور یہ خط ؟ کتنا بے کیف، کیسا غیر حقیقی اور کس قدر بدمزہ ہے۔ یہ خط ہے بھی ؟ خط ہوتا تو میں اس کے متعلق خط ہونے کا اعتماد زائل نہ کرتا مگر یہ خط تھا۔ میں نے خط کی طرح اس کو شروع کیا تھا۔ اور اسکے حروف میں خط ہی کی آواز تھی۔ سامنے لیکن کون تھا ؟ کس کو سامنے رکھکر لکھ گیا تھا یہ ؟ اوہ کسی کو بھی نہیں۔ اوہ کسی کو بھی نہیں۔ میرے دل نے ضدّی دار بچے کی طرح روتے ہوئے کہا۔

میں نے جھپٹ کر اس خط یا حیلۂ خط کو اٹھا لیا اور پھاڑ کر پرزے پرزے کر ڈالا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ میرے سامنے اسی مضمون کے صفحے کے صفحے پھیلے ہوئے ہیں۔ میں ان کو دیوانہ وار پھاڑ رہا ہوں۔ اور وہ طلسمی انداز میں ایک ایک پرزے کے ہزار ہزار خط بنتے چلے جا رہے ہیں۔

میری نظریں خلا میں کھو گئیں۔ دوات منہ کھولے مجھے نگلنے کو دوڑی، قلم سنان بنکر میرے پہلو میں آ اڑا۔ خلا کا اندھیرا کفر کی طرح مجھ پر چھانے لگا اور کمرے میں گرد کے ناچتے ہوئے تمام ذرات زبان بن کر مجھ سے سوال کرنے لگے

"بتا تیرا مخاطب کون تھا ؟"

راز بڑی قیمت پا چکا تھا اور ہر لمحہ اس کا مول بڑھتا جا رہا تھا۔ جس قدر میری جان سستی ہوتی جا رہی تھی اسی قدر راز کی قیمت بڑھتی جا رہی تھی۔ میں نے چیخ کر کہا "کوئی نہیں ——— میرا مخاطب کوئی نہ تھا ——— سب تھے۔ ایک تھا، میں خود ہی تھا۔ انسان کو سب سے زیادہ اپنی ہی ذات سے محبت ہوتی ہے۔"

"کافر" کمرے میں ایک گونج سی پیدا ہوئی۔

جب ہیجان کا عالم کم ہوا تو میں نے اپنے کو اسی پھٹے ہوئے کاغذ کے پرزوں کو چنتے ہوئے پایا۔ ان میں سے بہت سے پرزے میرے آنسوؤں کی بوندوں سے تر تھے۔ اور ان پر کے حروف دھل چکے تھے۔ میں ان کو محبت سے جمع کرنے لگا۔ یہ جگر لخت لخت تھا۔ دعوتِ مژگاں پا چکا تھا اور میں اپنی انتہائی تکان سے تازہ دم ہو کر یعنی دم صرف کر کے دوسرا خط لکھ رہا تھا۔ کس کو ؟ یہ نہیں بتاؤں گا۔ ناممکن ہے کہ اگر پتا چل گیا تب بھی خود اپنا اعلان کرنے پر مجبور نہ ہو جائے۔ مگر یہ خط اس کی آخری پتی ہوگی۔ اس کے بعد میں نہ ہونگا اور نہ شاید وہ! یہ نیند میں چلنے پھرنے والے انسان ہمیں کچلتے ہوئے نکل جائیں گے۔

کیا خط ہوتا ہے اور اس کا انجام!

نغمۂ زندگی

(از جناب نفضلی صاحب)

جذبات جو اشعار کے سانچے میں ڈھلے ہیں
برسوں مری آغوشِ تخیل میں پلے ہیں

یوں راہِ طلب میں نظر آتے ہیں ستارے
جیسے کہ چراغِ رہِ مطلوب جلے ہیں

پانی پہ جو تھے ان کو تو ہر ایک نے دیکھا
کچھ ان کی خبر بھی ہے جو موجوں کے تلے ہیں

اے موجِ بلا! سہل نہیں ہم سے الجھنا
ہم وہ ہیں کہ آغوشِ حوادث میں پلے ہیں

نفضلی بھی ہے اوروں کی طرح کیوں یہ سمجھئے
کچھ لوگ برے گر ہیں تو کچھ لوگ بھلے ہیں

کنول

(از محترمہ اختر جہاں بیگم صاحبہ)

مجھے بچپن میں دو چیزیں بےحد پیاری تھیں۔ کنول کے پھول اور ریحانہ! چاندنی میں خوابیدہ کنول دیکھکر مجھے ریحانہ کی آنکھیں یاد آ جاتیں۔ اور جب ریحانہ کی آنکھیں دیکھتا تو خوابیدہ کنول! ــــــ بعض دفعہ تو مجھے خواہ مخواہ وحشت سی ہو جاتی اور یہ عجیب سا خیال بے طرح پریشان کرنے لگتا کہ اگر ریحانہ میری بہن نہ ہوتی تو میں کیا کرتا؟ میرے کھیلوں کا ساتھی کون ہوتا؟ کیا میرے کان "بھیا" کے سننے سے محروم رہ جاتے!؟ بھلا ایسا ہوتا ہی کیوں؟ میں خود ہی مطمئن ہو جاتا۔

ان دنوں مجھے کیسے پیارے پیارے خواب نظر آیا کرتے تھے۔ کبھی دیکھتا جیسے میرے اردگرد اوپر نیچے کنول ہی کنول کھلے ہوئے ہیں۔ جھلملاتے تارے ننھے ننھے کنول بن کر آسمان کی نیلگوں لہروں میں ہلکورے کھانے لگتے۔ فضائیں بھی کنول کی طرح ریشمی محسوس ہونے لگتیں۔ پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے کنول ایک دوسرے میں ضم ہو جاتے۔ اور ایک لمحے کے لئے تمام کائنات بڑا سا کنول بن کر رہ جاتی ــــــ پھر آہستہ آہستہ یہ محسوسات میرے لبوں پر مسکراہٹ بن کر سمٹ آتے۔ مسکراہٹ کا ہلکا سا لمس خواب کا شیرازہ موتیوں کی طرح بکھیر دیتا۔

میں آنکھیں ملتا ہوا نانی اماں کے پاس آتا۔ میں اور ریحانہ اپنے اپنے خواب سناتے۔ ریحانہ کے عجیب عجیب خواب سن کر تو نانی اماں بھی ہنس دیا کرتی تھیں۔ کبھی کہتی "میں نے اللہ میاں کو خواب میں دیکھا ان کے چاروں طرف آدمیوں کا جمگھٹ لگا ہوا تھا۔ مجھے تو یہ دیکھکر بڑا تعجب ہوا کہ اللہ میاں انگریزوں سے انگریزی میں بات چیت کر رہے تھے۔ کیا اللہ میاں انگریزی بھی جانتے ہیں نانی اماں؟ بہشت بھی! اور اللہ میاں نے مجھے بہت سے اچھے اچھے کھلونے دیئے۔ اب پہاڑ کیا ــــــ اور ــــــ کہاں گئے میرے کھلونے؟ اوں ــــ" ریحانہ نے ادھر ادھر کھلونوں کی تلاش شروع کر دی۔ وہ تو خواب ہی میں رہ گئے بلی!" میرا کنولوں کا خواب سن کر نانی اماں بولیں "تم بڑے شاعر بنو گے۔" شاعر کون ہوتے ہیں نانی اماں؟" "ایسے ہی ہوتے ہیں بیٹا! ــــــ ہر چیز کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں۔ اپنے خیالات کو مترنم الفاظ میں ڈھال لیتے شاعر کی طبیعت بہت حساس ہوتی ہے۔" نانی اماں بہت دیر تک مجھے شاعر کے متعلق بتاتی رہیں۔ اس دن کے بعد سے ہر خاموش شخص میری نظر میں شاعر تھا۔ مجھے خود بھی محسوس ہوتا کہ جیسے میں بھی سچ مچ شاعر بنتا جا رہا ہوں۔ ہر وقت چپ چاپ بیٹھکر خواہ مخواہ سوچنے کی کوشش کرتا۔ کوئی آواز دیتا سنی ان سنی کر دیتا۔ آخر ایک دن ریحانہ نے مجھے سمجھایا "بھئی اگر ایسے ہی شاعر بننے کا شوق ہے تو بڑے ہو کر بن جانا۔ ابھی سے اس قدر خاموش نہیں رہنا چاہئے ــــــ" پھر متفکرانہ لہجہ میں بولی "سنا ہے شاعر تو کبھی کبھی کپڑے پھاڑ کر جنگل کو نکل جاتے ہیں۔ اور ان کا گریبان تو ہر وقت چاک ہی رہتا ہے" "سب ہی ایسے ہوتے ہیں کیا؟" "یہ تو اپنی طبیعت پر منحصر ہوگا۔ بھئی مجھے تو ویسے بھی گریبان کھلا رکھنے کی عادت نہیں ہے۔ اگر گریبان چاک رکھنا ہی شاعر کیلئے لازمی ہے تو ہم باز آئے!" "ہاں جی چھوڑو خواہ مخواہ کی علت!" ریحانہ کے سمجھانے سے میں نے شاعری کا خیال چھوڑ دیا۔

ایک دن میں اور ریحانہ سکول سے ساتھ ساتھ آ رہے تھے۔ یکایک مجھے خیال آیا کہ میں ریحانہ سے کسی قدر لمبا ہو گیا ہوں۔ گھر آ کر نانی اماں سے پوچھا تو انہوں نے بھی تائید کی "اب بھائی جان کہا کرو ہمیں تمہیں!" "تم بھی ہمیں باجی کہا کرو۔" "اونہہ تم کہاں سے بن گئیں باجی! ــــــ" "ہم بھی بھائی جان نہیں کہیں گے!" "جاؤ ہم نہیں بولتے تم سے!" میں نے منہ پھلا لیا۔ "اچھا بابا ــ محترمی جناب قبلہ و کعبہ برخوردار بھائی جان!!" "شاباش برخوردار بہ" "تو پھر تسلیم ہے ــ ہے نا؟" "ہمیں تو بھائی جان سے بھیا زیادہ بھلا معلوم ہوتا ہے۔"

اسی طرح رفتہ رفتہ بچپن کی شبنمی دنیا چہچہوں میں لپٹی ہوئی صبح کی طرح ہم سے دور ہوتی گئی۔ چاند سے "ماموں" کا زبردستی کا رشتہ۔ پریوں کے سنہری پر۔ بادلوں کے دلکش گیت پیچھے پیچھے آ رہے تھے۔ زندگی کے افق پر دوسری شعاع طلوع ہوئی۔ اور اسی پرانی دنیا نے از سر نو مسکرا کر ہمیں خوش آمدید کہا۔ اب نانی اماں کی کہانیاں ہمارے لئے غیر دلچسپ ہوتی جا رہی تھیں۔ پہلے کی طرح کہانیوں کے لئے ان کی خوشامد بھی نہیں کرتے تھے۔ سکول سے آنے کے بعد دوسری ضروریات سے فارغ ہو کر ناول وغیرہ پڑھتا رہتا اور ریحانہ اپنے محبوب شغل پینٹنگ میں مصروف ہو جاتی۔ میٹرک کرنے کے بعد ہمیں حصول تعلیم کے لئے دوسرے شہر بھیج دیا گیا۔

میں اور ریحانہ زندگی کے قدم ساتھ ساتھ بڑھاتے رہے۔ ان دنوں مجھے اکثر اس شاہراہ کا خیال آتا۔ جو ہم سے ہمیں علیحدہ علیحدہ راہیں اختیار کرنی

تھیں۔ یہ سوچتے ہوئے مجھے ایک لمحے کے لئے ایسا محسوس ہوتا جیسے زندگی کی راہ پر میرے اکیلے قدم بوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ میں ہڑبڑا کر اس مجسم خیال سے اپنا دامن چھڑا لیتا۔ اور میری نظریں غیر ارادی طور پر ریحانہ کو ڈھونڈھنے لگتیں ایسا معلوم ہوتا جیسے ریحانہ مجھ سے لمحہ بہ لمحہ دور ہوتی جا رہی ——— کالج میں ذرا دیر ہوئی ادھ میں گھبرا کر تلاش میں نکلا۔ اس کو افسردہ دیکھکر میرا دل بیٹھ جاتا۔ کالج سے واپسی میں دعائیں کرتا آتا کہ خدا کرے گھر جا کر ریحانہ کو شگفتہ دیکھوں۔

ایک دن ریحانہ کو ہنسانے کیلئے کالج سے بہت سارے لطیفے جمع کر کے اُچھلتا کودتا گھر آیا۔ میز پر کتابیں رکھتے ہوئے میری نظریں ایک سفید لفافے پر پڑیں۔ طرز تحریر آپا میاں کی تھی۔ میں نے حیران ہو کر جلدی سے لفافہ چاک کیا۔ لکھا تھا۔

نسیم میاں!

تم نے بچپن میں اپنی نانی اماں سے تو بہت سی کہانیاں سُنی ہونگی۔ آج مجھ سے بھی ایک کہانی سُنو۔ تقریباً سترہ اٹھارہ سال کا ذکر ہے۔ ان دنوں ہم یوپی کے ایک قصبہ میں مقیم تھے۔ ایک دن میرے پاس ایک سوکھا سہما سا مفلوک الحال شخص آیا۔ (جس کی گود میں دو تین سال کا معصوم بچہ بھی تھا) اور ملازمت کی درخواست کی۔ وہ شخص بوسیدہ لباس میں بھی صورت سے کسی شریف خاندان کا فرد معلوم ہوتا تھا۔ میں نے بلا پس و پیش اُسے اپنے یہاں ملازم رکھ لیا۔ ابھی اُسے ملازم ہوئے ایک ماہ بھی نہ گذرا تھا کہ قصبہ میں کالرہ پھیلا۔ دن بھر میں سینکڑوں اموات ہوتی تھیں۔

ایک رات تمہاری امّی نے مجھے جگایا وہ بہت گھبرائی ہوئی تھیں۔ اُنہوں نے بتایا کہ نئے ملازم کو اچانک شدید قسم کا کالرہ ہوگیا ہے۔ میں فوراً مریض کے پاس آیا۔ ڈاکٹر کے چہرے پر مایوسی دیکھکر میرا دل بیٹھ گیا۔ حالت تشویشناک تھی۔ صبح ہوتے ہوتے اور بگڑ گئی۔ انتقال سے کچھ دیر پہلے اُس نے مجھے اپنے پاس بُلایا اور اُکھڑے ہوئے سانسوں کو مجتمع کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولا۔ "میں یوپی کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔ مفلسی کے ہاتھوں اور رشتہ داروں سے بددل ہو کر گھر سے نکل کھڑا ہوا تھا۔ یہ بچہ جس کی ماں اسے دو سال کا چھوڑ کر مر گئی تھی خدا کے سپرد ہے۔ اگر اس کی پرورش کی طرف سے اطمینان ہوتا تو میرے آخری سانس آسانی سے ختم ہو جاتے!" میں نے فوراً بچے کو گود میں اُٹھا لیا اور اُس کے سر پر ہاتھ رکھکر بولا۔ "تم اطمینان رکھو۔ میں تمہارے بچے کو اپنی ریحانہ کی طرح پرورش کروں گا۔" اس نے مجھے تشکر آمیز نظروں سے دیکھا۔ زبان بند ہو چکی تھی۔ ایک بار بچے کی پیشانی کو اپنے سرد ہونٹوں سے چھو کر ہمیشہ کے لئے

آنکھیں بند کرلیں ——— نسیم (بچے کا نام) ——— نسیم [illegible] سا لگا۔ "میں وہی نسیم ہوں!" سینے میں جذبات کا طوفان برپا تھا لیکن آنکھیں برابر تحریر پر پھسل رہی تھیں۔ "چونکو نہیں۔ تمہیں مجھ سے شکایت ہوگی کہ اس راز کو ایک طویل عرصہ میں کیوں چھپائے رکھا۔ میں تمہیں یک لخت اتنی بڑی خوشی دینا چاہتا تھا ——— کیا تم نہیں چاہتے ریحانہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے۔ میری آرزو ہے کہ تم اور ریحانہ میری اور اپنی امّی کی دعاؤں کے سایے میں ایک دوسرے کے شریک زندگی بن کر رہو ———" "نہیں! نہیں میں تمہارا بھائی ہوں ریحانہ!! صرف بھائی! میں قریب قریب چیخ پڑا جیسے یہ حقیقت خود سے بھی چھپانا چاہتا تھا ——— ابھی سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ ریحانہ کے قدموں کی آہٹ ہوئی۔ میں نے جلدی سے لفافہ میز کی دراز میں رکھ دیا اور اخبار اُٹھا کر صوفہ پر نیم دراز ہوگیا۔ "بھیا" ریحانہ نے اس طرح پکارا جیسے یہ میٹھا لفظ کہنے کے لئے بڑی دیر سے ترس رہی تھی۔ "تم آگئیں ریحانہ؟" میں نے یونہی اخبار میں منہ چھپائے پوچھا۔ "جی ہاں میرا تو خیال یہی ہے کہ میں آگئی ہوں"۔ ریحانہ نے ہلکی سی کھلکھلاہٹ سے شرارتاً کہا۔ "کیا مل گیا ہے آج بہت خوش نظر آرہی ہو۔" میں زبردستی بول رہا تھا۔

"بھیا! تمہیں یہ تو معلوم ہے کہ ہمارے کالج میں اُردو ہفتہ منایا جا رہا ہے آج مشاعرہ تھا۔ بڑا لطف آیا۔ لڑکیوں کی شرارت پر رہ رہ کے ہنسی آرہی ہے۔"

"اچھا تو شرارت کر رہی ہونگی کیوں آخر؟" میں نے بے دلی سے پوچھا۔

"ہوا یہ کہ ہال کی سب کرسیاں تو دوسری خواتین سے بھر چکی تھیں۔ ہم لڑکیوں کو سب سے پیچھے یعنی سٹیج سے تقریباً سو گز کے فاصلہ پر جگہ ملی۔ جہاں سے "داد" دینا تو درکنار بعض مرتبہ تو اشعار اُدھر ہی واہ واہ سُبحان اللہ کے شور میں گم ہو کر رہ جاتے تھے۔ خوش قسمتی سے ایک آدھ شعر سمجھ میں آجاتا تو شریر فرزانہ بنچ پر کھڑی ہو کر چلاتی۔ "محترمہ اجازت دیجئے کہ اس شعر کی داد سٹیج پر آکر دوں" میں بار بار اُسے بٹھا رہی تھی۔ ایک دفعہ تو جز بز ہو کر بولی۔ "آپ بھی سراسر بے انصافی ہے! اے خدا ہم داد بھی نہیں دے سکتے"۔ پھر لگیں زور زور سے گانے "میرے حال پر بے بسی رو رہی ہے۔" میں نے مُنہ پر ہاتھ رکھکر بمشکل خاموش کیا۔ اس کی دیکھا دیکھی اور لڑکیوں نے بھی بغاوت شروع کردی۔ جہاں واہ واہ کا شور بلند ہوتا اور سب لڑکیاں دھڑا دھڑ بنچ پیٹنے لگیں۔ پھر تو وہ ہنگامہ برپا ہوتا کہ خدا کی پناہ ——— رینا بنگالی لڑکی کو تو آپ جانتے ہیں نا۔ جسے اُردو بولنے کا بہت شوق ہے۔ اور بدقسمتی سے اسے اُردو کا صرف ایک لفظ "درست" آگیا ہے بس محل بے محل "درست" کا استعمال کیا کرتی ہے۔ یہاں تک کہ کالج

ہیں اس کا نام "مس درست" مشہور ہو گیا ہے۔ تو جناب وہ بھی مشاعرے میں تشریف لائی تھیں۔ حالانکہ مشاعرہ اُن کے لئے بھینس کے سامنے بین بجانا کے مصداق ہے۔ لیکن شریک ضرور ہوئیں۔ ہم سب تو کسی نہ کسی طرح داد و تحسین سامعین تک پہنچا رہے تھے۔ ریحانہ خاموش تھیں۔ اور پریشان بھی کہ وہ کس طرح اس ہنگامہ میں شرکت کرے۔ آخر ایک شعر پر جو بے طرح طوفان بے تمیزی مچا تو وہ بھی ایڑی چوٹی کا زور لگا کر پکار اٹھیں "درست !!!" پھر کیا تھا ثریا نے کاغذ میں ایک پیسہ لپیٹ کر سٹیج پر تاک پھینکا۔ اور چلا کر بولی محترمہ "درست" کی پڑیا زینا کی طرف سے ہے !!!"

ریحانہ بے تحاشہ ہنس رہی تھی۔ میں بھی اس کی ہنسی میں برابر کا شریک تھا۔ یکایک مجھے اپنی افسردگی یاد آگئی۔ میں چپ چاپ ریحانہ کے ہونٹ ہلتے دیکھ رہا تھا۔ وہ مجھے بہت دیر تک لطیفے سناتی رہی۔ اتنے میں اس کی سہیلی آگئی۔ اور وہ مجھے اخبار پڑھتے دیکھکر سہیلی کے ساتھ باہر چلی گئی۔

اُسی دن شام کو میں اپنے کمرے میں تھکا تھکا خود سے روٹھا ہوا سا بیٹھا تھا کہ اتنے میں ریحانہ آگئی۔ بالکل خاموش۔ سفید لباس میں سمٹی سمٹائی پریشان بال مغموم چہرہ — میں گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا "ریحانہ !"— "بھیا" اُس کے ہونٹ جیسے لرز کے رہ گئے۔" — "ایک بات پوچھنے آئی ہوں۔" "پوچھو" میں نے افسردہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "تم مجھ سے میرے بھیا کو چھین تو نہ لوگے ؟" ریحانہ کی پلکوں میں دو شفاف قطرے موتیوں کی طرح اٹکے ہوئے تھے۔ "کیا کہہ رہی ہو ریحانہ ؟" ریحانہ مسکرادی "بھیا ! یہ میٹھا لفظ گم نہ ہو جائے — کیا تم بچپن سے اب تک کی بے لوث محبت کو الوداع کہہ دوگے ؟" — "نہیں ریحانہ — ہرگز نہیں !" میں صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ ریحانہ کا چہرہ دمک اٹھا۔ "میرے بھیا !" — ریحانہ نے جذبات انگیز لہجہ میں آہستہ سے کہا اور چند لمحے کھڑی رہی — "بس یہی پوچھنے آئی تھی" — ریحانہ نے شگفتہ لہجے میں کہا اور ہلکے پھلکے قدم اٹھاتی چلی گئی۔

اور دوسرے دن امّی اور ابا میاں نے ہمارے آخری فیصلے (جو اُن کی آرزوؤں کا خون تھا) کو تعجب سے سُنا ہوگا۔ بہت دیر تک حیران رہے ہونگے۔ لیکن انہوں نے کچھ کہا نہیں — دو تین بعد پتہ چلا کہ ریحانہ کی نسبت اشفاق سے ٹھیر گئی ہے۔ جو اُس کا چچازاد بھائی تھا۔

اس کے بعد میں ریحانہ سے نہ مل سکا۔ مجھے اُس کمرے کا رُخ کرتے ہوئے ڈر سا لگتا۔ کہیں میری برادرانہ محبت کا نازک آبگینہ ریحانہ کی نظروں کی زد میں آکر چور چور نہ ہو جائے۔ میرا جی چاہتا اس آبگینے کو لے کر ریحانہ کی نظروں کی حدود سے دُور نکل جاؤں — اس عرصہ میں ریحانہ نے مجھے کئی مرتبہ بُلایا۔ خود بھی میرے پاس آنا چاہا لیکن میں اُس کے آنے سے پہلے ہی اِدھر اُدھر ٹل جاتا۔

آج ریحانہ کی شادی تھی۔ میرے بند کمرے میں قہقہوں اور چہل پہل کی آوازیں ہلکے ہلکے جھونکوں کی طرح ٹکرا رہی تھیں۔ ریحانہ مجھے صبح سے کئی بار بلا چکی تھی۔ لیکن میں "ابھی آتا ہوں" کہکر ٹال دیتا تھا۔ آخر وداع کا وقت آگیا۔ جانا ضروری تھا۔ ابھی میں وہاں جانے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر ہی رہا تھا کہ اچانک ریشمی کپڑوں کی سرسراہٹ اور خوشبو کی بھینی بھینی لپٹوں نے مجھے دروازے کی طرف متوجہ کر لیا۔ جہاں ریحانہ عروسی ملبوس میں کھڑی تھی۔

"ریحانہ !" میرے سینے سے ایک گہرا سانس اس نام میں سمٹ کر اُبھرا۔ "بھیا" کانوں میں اس کی ٹھنڈی ٹھنڈی بوندیں ٹپک پڑیں ریحانہ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی میرے قریب آگئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر مسکراہٹ۔ اس حسین امتزاج کو دیکھکر لہروں میں ڈبڈباتا ہوا ابتدائی تاریخوں کا لکیر سا چاند یاد آگیا۔

"یہ کنول نہیں — ایک بہن کی محبت ہے بھیا !" ریحانہ نے اپنے عروسی ہاتھوں سے کنول کا ادھ کھلا پھول میری طرف بڑھایا۔

"بہن کی محبت —!" میں نے کپکپاتے ہاتھوں میں کنول تھام لیا۔

"مجھے مسکرا کر الوداع کرو بھیا — !" ریحانہ نے تھرائی ہوئی آواز سے کہا۔

"خدا حافظ !" میں نے مسکرا دیا۔

ریحانہ کی آنکھوں کے پردوں سے آنسو چھلک جانے کے لئے مچل رہے تھے۔ وہ تیزی سے مڑی اور گلابی آنچل میں خوشبوئیں سمیٹ کر چلی گئی —

مچھیرا

(از فیروز الدین احمد)

ہمارے اس ننھے سے مضمون نگار کی عمر آٹھ سال ہے اس نے یہ کہانی کسی کتاب میں پڑھی تھی اور اس کو اپنی زبان میں ادیب کے نونہال پڑھنے والوں کیلئے لکھا ہے۔

(فصیح الدین احمد)

پرانے زمانے کا ذکر ہے کہ ایک مچھیرا رہتا تھا۔ اس غریب کے تین بچے اور بیوی تھی۔ ایک دن اس نے دریا میں جال ڈالا تو جال ٹوٹ گیا۔ دوسرے دن بھی جال ٹوٹ گیا۔ تیسرے دن جو اس نے جال ڈالا تو ایک لوٹا نکلا۔ مچھیرا بہت خوش ہوا اور جلدی سے اسے کھولا۔ لوٹے کے اندر سے بہت سا دھواں نکلا۔ مچھیرے نے اسکو بڑی مشکل سے سمیٹا۔ جوں ہی اس نے دھوئیں کو سمیٹا ایک دم دیو نکلا۔ دیو نے گرج کر کہا تیرے سر پر موت منڈلا رہی ہوگی جو تو نے مجھے کھولا۔ مچھیرے نے کہا۔ بھئی نیکی کا بدلہ کیا برائی ہی ہوتا ہے۔ دیو نے کہا۔ میں جن ہوں۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے مجھے لوٹے میں قید کر دیا۔ میں نے وعدہ کیا تھا کہ اس سال اگر کسی نے مجھے نکالا تو میں اسے امیر بنا دوں گا۔ لیکن اس سال کسی نے مجھے نہیں نکالا۔ پھر میں نے وعدہ کیا کہ جو اس سے پہلے یعنی اس سال سے پہلے جس سال تو نے مجھے نکالا ہے نکالے گا اسے میں بادشاہ بنا دوں گا۔ لیکن اس سال بھی کسی نے مجھے نہیں نکالا۔ آخر کار میں نے وعدہ کیا کہ جو اس سال مجھے نکالے گا اسے میں مار ڈالونگا۔ چنانچہ اسی سال تو نے مجھے نکالا۔ مچھیرے نے کہا۔ بھئی مجھے تو سخت حیرت ہوتی ہے کہ تو اس لوٹے کے اندر کیسے چلا گیا۔ جن اسی وقت لوٹے کے اندر گھس گیا اور مچھیرے نے لوٹے کا ڈھکنا بند کر دیا۔

جب مچھیرے نے جن کو لوٹے میں بند کر دیا تو مچھیرا بہت خوش ہوا۔ لیکن جن بہت رنجیدہ ہوا۔ وہ بہت قسمیں کھانے لگا۔ آخر جب جن نے بہت کہا اور قسمیں کھائیں تو مچھیرے نے لوٹا کھول دیا۔ جن اسکو ایک تالاب پہ لے گیا۔ مچھیرے نے دیکھا کہ اس میں رنگ برنگی مچھلیاں ہیں۔ کوئی سبز ہے تو کوئی لال۔ کوئی ہری تو کوئی پیلی۔ غرضکہ دنیا بھر کی لال زرد ہری سبز پیلی تھیں۔ جن نے وہ مچھلیاں مچھیرے کو دکھائیں اور کہا دن بھر میں ایک دفعہ جال ڈالنا۔ کبھی دو دفعہ نہیں ڈالنا۔ نہیں تو دھوکا کھاؤ گے۔ دوسرے دن مچھیرے نے تالاب میں جال ڈالا۔ اور رنگ برنگی مچھلیاں لیکر بادشاہ کے دربار میں حاضر ہوا۔ بادشاہ بہت خوش ہوا اور بہت کچھ انعام دیکر رخصت کیا۔ مچھیرا خوش خوش اپنے گھر آیا۔ بادشاہ نے اپنی باورچن سے کہا کہ آج یہ مچھلیاں پکاؤ ہم کھائیں گے۔ باورچن پکا رہی تھی تو دیوار پھٹ گئی اور ایک جوان لڑکی نمودار ہوئی۔ اس نے باورچن سے پوچھا تم میرا حکم مانو گی؟ اُنہوں نے کہا۔ ہم تمہارا حکم نہیں مانیں گے۔ اس نے تمام مچھلیوں کو آگ میں پھینک دیا۔ باورچن نے سارا حال وزیر کو کہہ سنایا وزیر نے بادشاہ سے کہا۔ بادشاہ نے بھی یہ حال دیکھا۔ بعد حکم دیا کہ مچھیرے کو حاضر کیا جائے۔ جب مچھیرا آیا تو بادشاہ نے پوچھا۔ تم مچھلیاں کہاں سے لاتے ہو اس نے تالاب کا پتہ ونشان بتا دیا۔ بادشاہ نے سواری کا حکم دیا۔ جب وہ تالاب پر پہنچے تو بادشاہ کے مصاحب بھی ساتھ جانے کیلئے تیار ہو گئے۔ بادشاہ نے کہا تم مت آؤ میں جلد واپس آؤنگا۔ بادشاہ نے ایک بہت بڑا عظیم الشان محل دیکھا۔ جہاں چاندی اور سونے کے پترے دیواروں پر پڑے ہیں۔ اور بعض جگہ لال سبز اور زرد تصویریں بنی ہوئی تھیں۔ لیکن آدم زاد کا پتہ تک نہ تھا۔ محل اتنا اچھا تھا کہ بادشاہ حیران ہو گیا۔ ہزاروں چیزیں وہاں تھیں۔ بادشاہ نے آہ کی آواز سنی۔ بادشاہ اس آواز کی طرف چلا۔ بہت دور چلنے کے بعد بادشاہ نے ایک شہزادہ دیکھا۔ بادشاہ نے پوچھا تمہارے اوپر کیا بیتی جو تم آہ کی صدا نکالتے ہو میں جہاں تک ہوگا تمہاری مدد کرونگا۔ شہزادہ نے یوں اپنی کہانی سنائی۔ میرا باپ ایک بہت بڑا بادشاہ تھا۔ میرے باپ نے ایک خوبصورت شہزادی سے میری شادی کر دی۔ لیکن افسوس وہ ایک جادوگرنی تھی۔ ایک دن میں نے پانی پینے کیلئے مانگا۔ میں نے دیکھا وہ پانی پر کچھ پڑھ رہی ہے۔ اس نے مجھے پانی دیا۔ میں تو دیکھ چکا تھا۔ آنکھ بچا کر میں نے تمام پانی پھینک دیا اور اسکے پیچھے چلا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ وہ ایک حبشی غلام کے پاس گئی۔ وہ اس سے جادو سیکھ رہی تھی۔ مجھکو اس پر اور حبشی غلام پر بہت غصہ آیا اور میں نے حبشی غلام کی آدھی گردن اڑا دی۔ اب وہ حبشی غلام کا علاج کرتی ہے۔ اور جادو کے زور سے میری فوج کو مچھلیاں بنا دیا اور مجھکو اس حالت میں یہاں چھوڑ دیا ہے۔ اب وہ حبشی غلام کیلئے دوا لینے گئی ہے۔

بادشاہ نے جب یہ حقیقت سنی تو اسکو جادوگرنی پر بہت غصہ آیا۔ اور اس نے قول دیا کہ اگر میں نے اسکو نہیں مارا تو میں بھی بادشاہ نہیں۔ چنانچہ بادشاہ حبشی غلام کے مکان پر پہنچا اور اس کی بقیہ گردن اڑا دی۔ اور اس کو دفن کر دیا۔ اور غلام کے بچھونے پر لیٹ گیا۔ جادوگرنی کا معمول تھا کہ شہزادے کے ایک کسا

توڑنے لگاتی تھی۔ آج بھی اس نے شہزادہ کے ایک موٹا سا ٹکڑا کاٹ لیا۔ پھر وہ بادشاہ کے پلنگ کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ تم تو ہر وقت اداس رہتے ہو۔ بادشاہ نے کہا کہ شہزادہ تو قید میں رہو۔ اور اس کی ٹانگیں جو تم نے پتھر کی بنا رکھی ہیں اب گوشت کی بنا دو۔ جادوگرنی نے کہا جی میں نے اسکی ٹانگیں گوشت کی بنا دیں۔ اب تم مجھ سے خوش ہو۔ بادشاہ نے کہا۔ ہاں۔ اب میں تم سے بہت خوش ہوں۔ اب تم مجھے اپنی میٹھی میٹھی بولی سناؤ۔ جادوگرنی نے جونہی چادر کھولا۔ بادشاہ نے فوراً تلوار سے اسکی گردن اڑا ڈالی۔ جب بادشاہ شہزادے کے محل پر پہنچا تو شہزادے نے کہا کہ میں آپ کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں۔ بادشاہ نے کہا۔ اس میں شکریہ کی کیا بات ہے۔ انسان کو چاہیئے کہ اگر دوسرا انسان مصیبت میں ہو تو اسکی ضرور مدد کرنا چاہیئے۔ یعنی تمہاری بیوی نے تمہارے ساتھ ایک غلام کی حیثیت میں اتنی تکلیف اٹھائی۔ لیکن افسوس کہ جب بیوی نے اپنے شوہر کا کہنا ماننا شروع کیا تو میاں تماشائی بن گئے۔

یہ ہے ایک مختصر سی کہانی

دعوتِ نوی

(از جناب صبا متھراوی فاضل ادب)

یا مٹا دو آرزوؤں کا قیام — یا بنالو میری حسرت کو امام
یا محبت کا نہ لو دنیا میں نام — یا سمجھ لو ہر نشاطِ دل حرام
یا تو دل سے آرزوئیں چھین لو — یا سکونِ آرزو کا دو پیام
یا مرے جذبات غم کر دو فنا — یا کرو خود پر بھی ہر عشرت حرام
یا بنا دو زندگی کو زندگی — یا مٹا دو زندگی کا ہر نظام
یا زبانِ خامشی سمجھا کرو — یا محبت کو بھی دو اذنِ کلام
یا اٹھا دو یہ حجابِ آرزو — یا مرا دل ہی نہ لو چھپ چھپ کے نام
یا بنا دو میرے دل کو کام کا — یا نہ رکھو میرے دل سے کوئی کام
یا مٹا دو میری خودداری کا زعم — یا بدل دو حسن خانے کا نظام
یا دلِ دانا سے سیکھو آگہی — یا اٹھا ڈالو محبت کا یہ دام
یا مٹا دو بے وقاری کا خیال — یا جوانی کو سکھا دو احترام
یا تو آدابِ محبت سیکھ لو — یا محبت کا نہ لو بھولے سے نام
یا شرابی مجھ کو کہنا چھوڑ دو — یا نہ گردش میں رکھو آنکھوں کے جام
یا تو کر لو صاف اقرارِ وفا — یا کرو پورا ستم کا اہتمام
یا بتا دو اپنے دل کی آرزو — یا سنو آ کر مرے دل کا پیام
یا تو دیدو نامرادی کو فروغ — یا تمنائیں مٹا ڈالو تمام
یا سنوار دو زندگی کی ہر سحر — یا بنا دو مستقل اک غم کی شام

یا صبا کو دوست کہنا چھوڑ دو
یا کرو پھر دل سے اس کا احترام

غزل

(از جناب نواب جعفر علی خاں صاحب اثرؔ)

رہزنی ہے کہ دلربائی ہے — لُٹ گئے، لُٹ گئے، دُہائی ہے
تیرے کشتوں کے مُنہ جب آئی ہے — موت نے خود شکست کھائی ہے
آرزو کو ذرا جو دخل ہوا — عاشقی پھر نہیں، گدائی ہے
اب جو لب پر ہے اک تبسّم سا — پردہ دارِ غمِ جُدائی ہے
ناز کیسا، غرور ہے زیبا — دولتِ عشق ہاتھ آئی ہے
اے گرفتارِ عشرتِ فانی — موت ہستی کی رونمائی ہے
ہم بھی اک دن تھے شادماں، یعنی — بھولی اک بات یاد آئی ہے
حالِ وارفتگانِ شوق نہ پوچھ — اپنی دُنیا الگ بسائی ہے
قہر تھا میرا مُسکرا دینا — میل کے بعد پھر لڑائی ہے
سُننے والا کوئی نہیں ملتا — جب کہانی مزے پر آئی ہے

اب وہ خود داریاں کہاں ہیں اثرؔ
تُم نے یہ شکل کیا بنائی ہے

غزل

(از جناب الطاف مشہدی)

بکھرنے لگیں گیسوؤں کی گھٹائیں نگاہوں سے کہہ دو شرابیں لٹائیں
لبوں پر ہوں رقصاں تبسم کی صبحیں شبابوں میں انگڑائیاں گنگنائیں
کھلیں مست جھونکوں میں خوابوں کے جادو مناظر کوئی رس بھرا گیت گائیں
ہراک گام پر میکدے کھل رہے ہوں فسانے ہراک موڑ پر مسکرائیں
دریچوں سے شادابیاں جھانکتی ہوں در و بام دیتے ہوں رنگیں صدائیں
میسّر ہوں ہنگامِ بادہ پرستی مہکتے ہوئے آنچلوں کی ہوائیں
فضاؤں میں ناچیں ترنم کی پریاں ترنم میں شیرینیاں سرسرائیں
گلستاں اگلتی ہوں بدمستیوں میں مہکتے ہوئے گیسوؤں کی گھٹائیں
نشیلے نشیلے ترانوں کے شیشے گریں دستِ قدرت سے اور ٹوٹ جائیں
لچکتی ہوئی نرم باہوں کے ہالے جھجکتی ہوئی گردنوں کو بلائیں

یہ موسم ہو الطاف اور ہم سمٹ کر
صراحی کی آغوش میں ڈوب جائیں

غزل

(از جناب علامہ آرزو لکھنوی)

خیال میں بھی اگر وہ ستم شعار آیا
تو غمزہ تانے ہوئے اک اپنی کٹار آیا

جنونِ شوق کہاں طولِ انتظار کہاں
اجل کو رات میں سو مرتبہ پکار آیا

تسلیِ دلِ مایوس ہو تو کیونکر ہو
خود اُس نے وعدہ کیا اور نہ اعتبار آیا

کہاں تکدّرِ خاطر کہاں رضا جوئی
جھٹک دیا وہیں دامن جہاں غبار آیا

یہ اشتعال گنہ کیا گناہ سے کم ہے
چڑھائی آپ نے تیوری تو مجھکو پیار آیا

مزاج پوچھنے والے تجھے خدا رکھے
لگا دیا وہیں چرکا جہاں قرار آیا

سے بن نہیں سکتا کوئی کسی کا غلام
اُمنگیں جب میں بھری تھیں وہ دل ہی ہار آیا

نہ پوچھ فرق گریبان و دامن اے ہمدم
جو آیا ہاتھ میں ہو ہو کے تار تار آیا

نشیلی آنکھ کی نیند آرزو ارے توبہ
کچھ اور بڑھ گئی مستی جہاں خمار آیا

اگر ترا گذرے بر مقامِ ما اُفتد!

(از جناب ساغر جیلی بی، اے)

(موسمِ برشگال کی ایک سُہانی رات میں)

یہ برشگال کا موسم، یہ رُت طرب آلود! — یہ بھیگی بھیگی فضاؤں سے مستیوں کی نمود
چمن چمن پہ ہے طاری سرورِ شعر و شباب — ہے جوئبار کی لہروں میں نغمۂ داوُد
فلک پہ جھوم رہی ہیں گھٹائیں تیرہ و تار — ہوائیں پھرتی ہیں لبریز بُوئے عنبر و عود
ہر ایک گام پہ ہے گرم بزمِ رقص و نشاط — زمیں کی سطح سے تا اوجِ آسمانِ کبود
رواں دواں ہے رگِ زندگی میں رُوحِ شباب — جبینِ دہر سے ہیں محو، نقش ہائے جمود

مگر — یہ جشنِ طرب کچھ نہیں ہے تیرے بغیر
یہ برشگال ہے بے کیف، یہ سماں بے سُود

ترے نفس سے تھی وابستہ گرمیٔ محفل — تری نگاہ سے تھی اس چمن کی بست و کشود
تری جبیں سے تھی ضوریز کائناتِ وفا — تھا وجہ زینتِ ایوانِ شوق تیرا وجود
مگر چہ حیف! کہ تو تاکنوں نیآمدہ! — بگو بگو، کہ ہمیں عہدِ اُلفتِ تو بُود

بگو، بگو، کہ چساں رُوح را قرار آید! — کہ یادِ تو زِ دِلم صبر و ہوش را بہ رُبُود
بیا — کہ نیست مرا تابِ انتظار، بیا! — بیا — کہ جوشِ جنونم شُد است لامحدود
بیا! بیا!! کہ دماغِ وفا پریشان است — ہمی تلاش کنم بُوے زُلفِ مُشک آلود
بیا — کہ ساغرِ شوقم ز مدّتے خالیست — مرا دو جُرعہ بدہ — از نگاہِ مے آلود

خوش آں زماں کہ کُنی باز جلوہ فرمائی
خوش آں زماں کہ شوی رونقِ جہانِ شہود

رُباعیات

(از خان صاحب جناب حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبر آبادی)

:(۱):

اللہ سے ہو جائے جو سودا، بہتر
اچھا، بہت اچھا، بہت اچھا، بہتر
دینے کے لئے کافی ہے ٹکڑا ماہر
لینے کے لئے نامِ خدا بہتر

:(۲):

کرنا ہے تو کر کام خدا کا ہر دم
رکھ سامنے پیغام خدا کا ہر دم
اے بوالہوس دہر! ہوس ہے بیکار
لینا ہے تو لے نام خدا کا ہر دم

:(۳):

مطلب یہ نہیں ہے کوئی دُنیا دیدے
منشا یہ نہیں دھن سبھی گھر کا دیدے
دینا ہے اگر نامِ خدا پر ماہر
ٹکڑا ابھی بہت ہے جو ٹکڑا دیدے

:(۴):

انساں کی نہیں کوئی حقیقت سُن لے
کام آئیگی دُنیا کی نہ دولت سُن لے
اے پیکرِ خاکی! رہے عقبیٰ کا خیال
ہیں کان، تو ماہر کی نصیحت سُن لے

تمہیں کون یاد آ گیا کچھ تو بولو!

(از جناب محمد حسن صفدر ایم ، اے)

کیوں رخسار دہکے ہیں نظریں جھکی ہیں
یہ کس کی نگاہیں اثر کر گئی ہیں
گھٹائیں یہ بے وقت کیسے اٹھی ہیں
کیوں ساون سے پہلے برسنے لگی ہیں
تمہیں کون یاد آ گیا کچھ تو بولو

کبھی گنگنانا ، کبھی مسکرانا
خود ہی خود سے شرما کے نظریں چرانا
کبھی دیکھنا غور سے ایک جانب
کبھی اپنی انگلی میں آنچل پھرانا
تمہیں کون یاد آ گیا کچھ تو بولو

سنا ہے تمہیں میں نے کچھ بات کرتے
اسی چھٹے پڑنے سے اک راز کہتے
یہی نہ کہ "آ جاؤ! اتنا نہ چھیڑو
بہت عمر گذری ستم سہتے سہتے"
تمہیں کون آ گیا کچھ تو بولو

یہ کیوں ہونٹ کانپے، یہ کیوں تارے ٹوٹے
یہ کیوں ہچکیاں بندھ گئیں روتے روتے
اڑی رخ کی رنگت ، نڈھال ہو گئی ہو
یہ کس سے خفا ہو گئیں بیٹھے بیٹھے
تمہیں کون یاد آ گیا کچھ تو بولو

ابھی کھانا کھاتی تھیں ، کیوں ہاتھ روکا
کسی نے نہ گھورا تمہیں اور نہ ٹوکا
سمجھ میں نہیں آتا کیوں اٹھ گئی ہو
قسم لے لو گر منہ سے کچھ بھی ہو نکلا
تمہیں کون یاد آ گیا کچھ تو بولو

ابھی بیٹھی تم ہم سے کچھ کہہ رہی تھیں
یہی جب کہ تم یاں سے شرما گئی تھیں
ادھوری تھی بات اور تم سوچتی تھیں
کسی کے تصور میں تم کھو گئی تھیں
تمہیں کون یاد آ گیا کچھ تو بولو

گزرتی ہیں اختر شماری میں راتیں
ہوا کرتی ہیں آپ ہی آپ باتیں
اشاروں سے کس کو بلاتی ہو آخر
بھلا دل کی ہم کیسے یوں بات جانیں
تمہیں کون یاد آ گیا کچھ تو بولو

تمہیں میں نے دیکھا ہے سوداسا اٹھتے
اور اٹھ کر شب تار میں پھر ٹہلتے
کسی کو ہر اک سمت جا جا کے تکتے
ہر اک گام پر رک کے سرد آہیں بھرتے
تمہیں کون یاد آ گیا کچھ تو بولو

یہ بہکی سی باتیں ، یہ بھٹکی سی نظریں
یہ اترا سا چہرہ ، یہ بکھری سی زلفیں
قدم لڑکھڑائے جبیں پر پسینہ
تمہیں کچھ بھی" یہ ہم تو ہرگز نہ مانیں
تمہیں کون یاد آ گیا کچھ تو بولو

یہ کوئل جو کوکی تو کیوں تم نے گھورا
یہ کیوں بدلی رنگت یہ کیوں دل مسوسا
یہ تم کیوں ٹھٹک کر کھڑی ہو گئیں یوں
یہ کیا تم نے دیکھا ، یہ آخر ہوا کیا؟
تمہیں کون یاد آ گیا کچھ تو بولو

جو تم کو کسی سرد جھونکے نے چھیڑا
تمہاری رضائی کو سوتے میں کھینچا
تو کیوں کلبلائیں کسے تم نے ڈھونڈا
یہ ہاتھوں کو یوں کس کی جانب بڑھایا
تمہیں کون یاد آ گیا کچھ تو بولو

کسی نے ستایا ہو اس کو ستائیں
کسی نے جلایا ہو اس کو جلائیں
خدارا بتاؤ یہ کیا ماجرا ہے؟
یہ کیوں رخ پہ چھائی ہیں غم کی گھٹائیں
تمہیں کون یاد آ گیا کچھ تو بولو

ساحل پہ یہ اُڑتے ہوئے رنگین دوپٹے
یا عشق کے ایوان پہ محبت کے پھریرے

رنگین دوپٹے

از
جناب کامل رشید صاحب

لکھا ہے کسی شوخ نے عنوانِ محبت
یا عشق کی وادی میں ہے اعلانِ محبت

فردوس کی رنگین گھٹاؤں کے یہ پارے
اُڑتے ہوئے آگئے ہیں سمندر کے کنارے

دھانی کوئی، ٹوٹی کوئی اور کوئی گلابی
عنابی کوئی، اودے کوئی، کوئی شہابی

یہ رنگ دل افروز یہ کھلتی ہوئی دھاری
کیسر کے حسیں کھیت کی شاداب کیاری

آنکھوں میں ہیں چھلکے ہوئے گلرنگ پیالے
یہ چاند کے ہالے ہیں کہ گلزار کے لالے

سلمیٰ کی اُمنگیں ہیں زلیخا کی جوانی
تہذیب نے بخشی ہے محبت کی نشانی

عذرا کہیں لیلا کہیں شیریں نظر آئی
افلاک سے یا قوس و قزح چھنڈیاں لائی

بیتاب اُمنگوں کے چھپانے کے قرینے
جذبات کے طوفان کے خوش رنگ سفینے

دوتی ہے جوانی تو یہ دیتے ہیں سہارے
دامن میں چھپا لیتے ہیں اشکوں کے ستارے

ہیں مصحفِ رنگین گُلِ نورس کے ورق کے
خوش رنگ شگوفے ہیں یہ دامانِ شفق کے

غنچوں کے فسانے ہیں نظارے ہیں چمن کے
آنچل ہیں کسی شوخ کے گھونگٹ ہیں دلہن کے

ہیں مشرقی تہذیب کے گاڑے ہوئے جھنڈے
ساحل پہ یہ اُڑتے ہوئے رنگین دوپٹے

قسم رنگین افق میں خون سے ملبوس کرنوں کی
قسم صحرا میں خوش رہتے ہوئے آزاد ہرنوں کی

قسم اُس ذات کی جب رو کے کوئی کراہتا ہے
تصور میں کسی کے قدم پر آنسو بہاتا ہے

قسم ہے مامتا کی درد سے بھرپور آہوں کی
قسم ماں کے گلے گھٹتی ہوئی معصوم باہوں کی

قسم اس بینوا و فاقہ کش مظلوم بیوہ کی
ہے جسکے دامنِ صد چاک میں اشکوں کی نشانی

قسم ان چیختے بچوں کی جو بھوکوں سے مرتے ہیں
کہ جن کو دیکھ کر ماؤں کے سینے آہ بھرتے ہیں

قسم مظلوم آنکھوں کی کہ جو گوہر اُگلتی ہیں
کہ جن میں حسرت و مایوسیاں آ کر کے پلتی ہیں

قسم اس نازنیں لڑکی کی جو [illegible] ہے
دفورِ یاس سے خاموش جو آنسو بہاتی ہے

قسم [illegible] کی
مگر اپنے لئے روٹی سے بھی محروم جانوں کی

قسم [illegible] ہے
جو دل اس کا غم و اندوہ کے گھیرے میں گھرتا ہے

[illegible] پر
یا ناداری میں ہیں مجبور جو عصمت فروشی پر

[illegible] کی
قسم ہے بھوک سے مرتے ہوئے ہندی کسانوں کی

[illegible] کیا کفن کے چیتھڑے لوں گا
[illegible] کفن کے چیتھڑوں گا

مادر و بچہ

(از محترمہ ساجدہ بنت دانش شاہجہانپوری)

(یہ نظم اپنے بچے عرفان میاں کے مستقبل کو مدنظر رکھ کر لکھی گئی ہے)

تو اس ظلمت کدہ میں اُٹھ چراغِ مصطفےٰ لے کر
مرے "عرفان" روحانی فضائے دلکش لے کر

(۱)

یہاں گندم نمائی جو فروشی پیشۂ انساں
نظر آتا ہے رقصاں ہر قدم پر اس جگہ شیطاں
حقیقت پاش ہو تو ایک الہامی صدا لے کر

(۲)

یہاں خونِ برادر سے ہیں اکثر کھیلتے ہولی
یہاں قلبِ وفا پہ مارتے ہیں تاک کر گولی
دعا ہے تو اُٹھے اک صورتِ وحشت رُبا لے کر

(۳)

مری طفلی رہی ماتم کنانِ آغوشِ مادر کی
جوانی زخم خوردہ اُف جوانِ مرگِ برادر کی
شکستِ دل کی جانب بڑھ سکونِ مومیا لے کر

(۴)

نقوشِ آدمیت سے کتابِ قلب بیگانہ
نشانِ سجدۂ ظاہر کا ہے ہر لب پہ افسانہ
عمل پیرا ہو روحِ پاکِ قلبِ بے ریا لے کر

(۵)

تراشے جا رہے ہیں مکر و جور و بے حسی کے بت
ہے خواہاں غزنوی کی ان دنوں یہ سومناتی رت
کھڑا ہو تیشۂ پاکیزۂ صدق و صفا لے کر

(۶)

سفینہ پر سفینہ نذرِ طوفاں تو تم ہے
یہ گورستاں مقامِ نغمۂ جاں پرورِ تم ہے
تو اے عیسیٰ نفس اُٹھ ساحلِ دل کی ہوا لے کر

(۷)

حقیقت کے دہن پر آہ لگا ہے آج کل تالا
شرابِ خانۂ خیام کا ہر فرد متوالا
کھڑا ہو بزمِ خوابیدہ میں تو بانگِ درا لے کر

(۸)

زمینِ شرق کی کایا ترے دم سے پلٹ جائے
یہ سب گرد و غبارِ نکبت و ادبار چھٹ جائے
سخن پرداز ہو تو قلبِ اربابِ وفا لے کر

بہار آرہی ہے

(از محترمہ گوہر اقبال حور)

(۱)

بہار آرہی ہے، بہار آرہی ہے، نیا رنگ ہر سمت برسا رہی ہے
کہ سنسار پر چھائی سی جا رہی ہے
رسیلی گھٹا ہے
ہوائیں نشیلی
سنہری فضا ہے
زمیں ہے رنگیلی
ہر اک پھول سے رنگ چھلکا رہی ہے
بہار آرہی ہے، بہار آرہی ہے، نیا رنگ ہر سمت برسا رہی ہے
کہ سنسار پر چھائی سی جا رہی ہے

(۲)

بہار آرہی ہے، بہار آرہی ہے، عروسِ چمن گیت یہ گا رہی ہے
کہ سنسار پر چھائی سی جا رہی ہے
لطیف اور ہلکے
وہ نکھرے ہوئے سے
ہواؤں کے جھونکے
وہ بھیگے ہوئے سے
یہ نشہ میں ڈوبی صدا آرہی ہے
بہار آرہی ہے، بہار آرہی ہے، عروسِ چمن گیت یہ گا رہی ہے
کہ سنسار پر چھائی سی جا رہی ہے

(۳)

بہار آرہی ہے، بہار آرہی ہے، پپیہے کی آواز لہرا رہی ہے
کہ سنسار پر چھائی سی جا رہی ہے
یہ کوئل کے نغمے
شرربار و غمگیں
یہ آموں کے پتے
جنوں خیز و رنگیں
بہار اُن کی کوئل کو تڑپا رہی ہے
بہار آرہی ہے، بہار آرہی ہے، پپیہے کی آواز لہرا رہی ہے
کہ سنسار پر چھائی سی جا رہی ہے

(۴)

بہار آرہی ہے، بہار آرہی ہے، نگاہِ محبت کو ترسا رہی ہے
کہ سنسار پر چھائی سی جا رہی ہے
چھپتے ہیں تارے
برستے ہیں جگنو
فضاؤں میں کتنے
چمکتے ہیں جگنو
نظر دور تک تیرتی جا رہی ہے
بہار آرہی ہے، بہار آرہی ہے، نگاہِ محبت کو ترسا رہی ہے
کہ سنسار پر چھائی سی جا رہی ہے

(۵)

بہار آرہی ہے، بہار آرہی ہے، محبت نے دو دل پہ ستم ڈھا رہی ہے
کہ سنسار پر چھائی سی جا رہی ہے
یہ پتوں کی شوخی
یہ رنگینیٔ گل
یہ پھولوں کی بستی
یہ غمناک بلبل
محبت کی آگ گل عطر کا رہی ہے
بہار آرہی ہے، بہار آرہی ہے، محبت نے دو دل پہ ستم ڈھا رہی ہے
کہ سنسار پر چھائی سی جا رہی ہے

(۶)

بہار آرہی ہے، بہار آرہی ہے، مسرت ہر اک دل کو گرما رہی ہے
کہ سنسار پر چھائی سی جا رہی ہے
نیا دورِ ہستی
نئی کائناتیں
لیے زندگی کی
جنوں خیز باتیں
کہ غم بن کے مجھ پر خوشی چھا رہی ہے
بہار آرہی ہے، بہار آرہی ہے، مسرت ہر اک دل کو گرما رہی ہے
کہ سنسار پر چھائی سی جا رہی ہے

(۷)

بہار آرہی ہے، بہار آرہی ہے، یہ دل پر مرے تیر برسا رہی ہے
کہ سنسار پر چھائی سی جا رہی ہے
میں اس قصرِ غم سے
کہیں دور جاؤں
قفس کے ستم سے
رہائی تو پاؤں
مری روح غمناک گھبرا رہی ہے
بہار آرہی ہے، بہار آرہی ہے، یہ دل پر مرے تیر برسا رہی ہے
کہ سنسار پر چھائی سی جا رہی ہے

فلمی خبریں

مظہر آرٹ پروڈکشنز "پہلی نظر" قریب الاختتام ہے۔ "پہلی نظر" ایک مسلم اسلامی تصویر ہے۔ اس میں موتی لال، مظہر خاں، منور سلطانہ، وینا نے کام کیا ہے۔ اسے مظہر خاں پیش کر رہے ہیں۔ موسیقی فیروز نظامی بی اے اور ہدایات مظہر خاں خود کی ہیں۔

اس کے علاوہ مظہر خاں رننگ پروڈکشنز کے نام سے ایک اور تصویر "دولتی دنیا" کے نام سے پیش کر رہے ہیں۔ "دولتی دنیا" میں مظہر خاں، منور سلطانہ، اشرف خاں، بالک رام اور منی کام کر رہے ہیں۔ ہدایات اسلم نوری کی ہیں۔

لکھمیداس آنند پروڈکشنز "کرشن لیلا" تکمیل کے مراحل سرعت کے ساتھ طے کر رہی ہے۔ "کرشن لیلا" ودیاپتی کے پروڈیوسر لکھمیداس آنند کی پیشکش ہے۔ ہندوستان کی کوئل کانن بالا رادھا کا کردار ادا کر رہی ہے۔ ہدایات دیوکی بوس کی ہیں۔ آرٹ ڈائرکٹر چارو رائے اور موسیقی "جواب" کے شہرت یافتہ کمل داس گپتا کی ہے۔

آرٹ فلمز "تکرار" نامی تصویر زیر تکمیل ہے۔ "تکرار" میں جمنا، نواب، مولینا، "انتظار" اور "بیگم" کی شہرت یافتہ اور بنگال کی مشہور رقاصہ آرونا پیش ہو رہی ہے۔ اس کی موسیقی ساچن داس اور ہدایات ستیین گپتا کی ہیں۔

ایشیاٹک پکچرز "چاند تارا" نمائش کیلئے تیار ہے۔ "چاند تارا" میں چارلی، سورن لتا نے کام کیا ہے۔ اسکے علاوہ "پنہاری" ایک ٹیپ اور رومانی تصویر تیار ہو چکی ہے۔ "پنہاری" میں سریندر، شانتا آپٹے نے کام کیا ہے۔ ہدایات دادا گنجال "مدر انڈیا" کے شہرت یافتہ کی ہیں۔

کیرتی پکچرز کالی داس کا رومان سے لبریز شاہکار "میگھ دوت" ہندوستان کے مایۂ ناز ہدایت کار دیوکی بوس فلم بند کر رہے ہیں۔ "میگھ دوت" کالیداس کے مشہور ڈراموں میں سے ہے۔ جس کا ترجمہ دنیا کی کئی زبانوں میں ہو چکا ہے اور بہترین ادبی ڈرامہ تسلیم کیا جا چکا ہے۔ "میگھ دوت" میں لیلا دیسائی

ستیا ہودل، ... ، آغا جان، کسم، ولیش پانڈے، شیو داس لی جیسے اداکار کام کر رہے ہیں۔ موسیقی کمل داس گپتا کی ہے۔

پرفلا پکچرز "بڑی ماں" کی نمائش لاہور اور بمبئی میں شروع ہو چکی ہے اور "سبھدرا" زیر تکمیل ہے۔ "سبھدرا" میں شانتا آپٹے، ایشور لال، میناکشی، یسا لوتی اور پریم ادیب کام کر رہے ہیں۔ "سبھدرا" کی ہدایات وناٹک کی ہیں۔ موسیقی کے۔ دتا کی ہے۔

شالیمار پکچرز "من کی جیت" لاہور اور دہلی میں سلور جوبلی منا چکا ہے۔ اس کے علاوہ جہاں کہیں نمائش ہوئی ہے کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کئے ہیں۔ "غلامی" تیار ہو چکا ہے اور نمائش کیلئے تیار ہے۔ اس میں رینوکا دیوی اور مسعود، بھیرو نے کام کیا ہے۔ آئندہ پروگرام میں "شری کرشن بھگوان" اور "میرا بائی" شامل ہیں۔

جینت پکچرز "انسان" منروا ٹاکیز میں دکھایا جا رہا ہے۔ "آکاش دیپ" نمائش کیلئے تیار ہے۔ اور "اروشی" زیر تکمیل ہے۔ "اروشی" اس ماہ کے آخر تک تیار ہو جائے گا۔

پہلے بین الاقوامی شہرت کی مالکہ سادھنا بوس ہیروئن کا پارٹ ادا کر رہی تھی۔ مگر کارکنان کمپنی سے اندرونی جھگڑے کی بنا پر علیحدگی اختیار کرنی پڑی۔ اب سادھنا بوس کی جگہ ثریا کو ہیروئن کا پارٹ دیا گیا ہے۔

شوری پکچرز "شالیمار" نمائش کیلئے تیار ہے۔ "رت رنگیلی" بھی تیار ہو چکا ہے۔ اس میں منورما، مجنوں اور الناصر نے کام کیا ہے۔ اسکی کہانی بھی آئی ایس جوہر کی ہے۔ گانے عزیز کاشمیری اور موسیقی لچھی رام اور پریم گمنک کی ہے

"عمر خیام" کی کاغذی تیاریاں مکمل ہو چکی ہیں۔ فلمبندی عنقریب شروع ہو جائیگی۔ روپ کے شوری ہالی وڈ جانے کیلئے انگلستان روانہ ہو گئے ہیں۔

رنجیت فلم کمپنی "ممتاز محل"، "بھنورا"، "شبنم"، "چاند چکوری"، "راجہ بھرتری" اور "کارواں" نمائش کیلئے تیار ہے۔ لاہور بمبئی اور دیگر بڑے بڑے مقامات تک ان کی نمائش شروع ہو چکی ہے۔ دہلی میں عنقریب ان کی نمائش شروع ہو جائیگی۔

معلوم ہوا ہے کہ مشہور فلم ایکٹریس وینا کا رنجیت سے طویل عرصہ کے لئے معاہدہ ہو گیا ہے۔ خورشید کا معاہدہ ختم ہو گیا ہے۔ اور ممتاز شانتی موجودہ معاہدہ ختم ہو جانے کے بعد رنجیت سے الگ ہو جائینگی۔

ہند پکچرز بمبئی "لیلیٰ مجنوں" منروا سینما بمبئی میں ہاؤس کی شدت کے

باوجود کامیابی کے ساتھ چل رہا ہے۔ روزانہ کھیل شروع ہونے کے وقت ہال تماشائیوں سے بھر جاتا ہے۔ سورن لتا نے لیلیٰ اور نذیر نے مجنوں کا پارٹ ادا کیا ہے۔ جو بیحد کامیاب رہا ہے۔ لیلےٰ مجنوں کی ہدایات منیر اور نذیر کی ہیں اداکاروں میں ایم اسماعیل۔ انیتا شرما اور گوپ کے نام قابل ذکر ہیں۔

وامق عذرا دنیا کا مشہور ترین رومان ہدایت کار نذیر فلمبند کر رہے ہیں۔ "وامق عذرا" کی کہانی اور مکالمے منشی دل لکھنوی نے لکھے ہیں۔ گانے تنویر نقوی کے ہیں۔ اس کے علاوہ ہدایت کار نذیر یادگار نامی تصویر تیار کر رہے ہیں۔ اس کی کہانی اور مکالمے بھی منشی دل نے ہی لکھے ہیں اور گانے تنویر نقوی کے ہی ہیں۔

اکال پروڈکشنز لاہور کا یہ نیا فلمی ادارہ نہایت سرعت اور برق رفتاری کے ساتھ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی داستان حیات کو فلمبند کرنے کے انتظامات کر رہا ہے۔ کہانی مکالمے اور گانے مکمل ہو چکے ہیں۔ اداکاروں کا انتخاب زیر غور ہے۔ فلمبندی عنقریب شروع ہو جائیگی۔ معلوم ہوا ہے کہ کئی سکھ نوجوانوں نے اپنے فوٹو میسرز اکال پروڈکشنز کے پاس بھیجے ہیں کہ انہیں راجہ رنجیت سنگھ میں اداکاری کے جوہر دکھانے کا موقع دیا جائے۔ اس خبر سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دوسری قوموں کی طرح میں فلم لائن کی دلچسپی کافی بڑھ چکی ہے۔

ڈی آر۔ ڈی پروڈکشنز "آئینہ" نمائش کیلئے تیار ہے۔ آئینہ میں حسن بانو۔ یعقوب نے کام کیا ہے ہدایات یوسف کی ہیں۔ "نیک پروین" تکمیل کے مراحل سرعت سے طے کر رہی ہے۔ "نیک پروین" میں راگنی۔ الیاس۔ یعقوب۔ شاکر۔ مرزا مشرف۔ ریحان۔ اسمٰعیل اور سید احمد کام کرتے ہیں۔ ہدایات ایس ایم یوسف ہی کی ہیں۔

فلمی دنیا میں سانحہ

یہ خبر فلمی حلقوں میں نہایت رنج وغم کے ساتھ سنی جائیگی۔ کہ گذشتہ ماہ پربھات فلم کمپنی کے حصہ دار مسٹر داملے کا انتقال ہوگیا ہے۔ مسٹر داملے کے انتقال سے فلمی صنعت کو جو نقصان پہنچا ہے اسے پورا ہونے کیلئے بہت وقت چاہیئے مسٹر داملے فلم تکنیک کے ماہرین میں سے تھے۔ پربھات میں اس وقت پرانے آدمیوں میں سے سید فتح لال اور مسٹر داملے ہی پربھات میں موجود تھے۔ ہمیں مسٹر داملے کے بیوی بچوں اور سید فتح لال سے دلی ہمدردی ہے۔

فلم کنٹرول آرڈر منسوخ حکومت ہند نے فیصلہ کیا ہے کہ فلم کنٹرول آرڈر جو گذشتہ جولائی سے جاری ہوا تھا ۵ ار دسمبر تک منسوخ کر دیا جائیگا۔ اگر ذخیرہ خاطر خواہ ہوا تو ۱۵ دسمبر سے پیشتر بھی یہ آرڈر منسوخ ہو جائیگا۔

مدعی لاکھ برا چاہے تو کیا ہوتا ہے ✲ وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے

محبوب پروڈکشنز کا لاثانی ولافانی تاریخی شاہکار



ہدایات:-
محبوب بطن محبوب

افسانہ:-
نصیر واقف
مراد آبادی

موسیقی
موسیقار اعظم
ماسٹر غلام حیدر

منظرنامہ و مکالمے
آغا جانی کاشمیری

اداکاران
اشوک کمار
وینا
چندر موہن
نرگس
مجید کے این سنگھ
یوسف آفندی مختر شیرازی

راجپوت کمار کی آن بان
مسلمان مغل شہنشاہ ہمایوں کی اسلامی شان

تاریخ ہند کا ناقابل فراموش اور جذبات سے لبریز واقعہ

امپیریل بمبئی میں گذشتہ چودہ ہفتوں سے تہلکہ مچا رکھا ہے

آپ کے شہر کے ہر دلعزیز سینما میں
بہت جلد آرہا ہے

جاری کردہ:
منور بجن پکچرز۔ دہلی۔ لاہور۔ کراچی

اپنے ملک کو غیروں کے غلبے سے بچانے کیلئے جس نے سر دھڑ کی بازی لگا دی

پرکاش پکچرز کا جذبۂ حب الوطنی سے بھرپور

ملک قوم اور رعایا کے دکھ کو اپنا دکھ خیال کرنے والے شہنشاہ کی داستانِ حیات

وکرمادتیہ

ہدایات:- وجے بھٹ

موسیقی:- شنکر راؤ ویاس

آرٹ:- کانو دیسائی

پرتھوی راج

رتن مالا

بابو راؤ پینڈھارکر

رنجنا

پریم ادیب

رٹز سنیما میں جمعہ ۱۰ اگست سے تہلکہ مچا رکھا ہے

جاری کردہ: ڈیسائی اینڈ کمپنی - دہلی و لاہور

سچی محبت کی لافانی اور لافانی یادگار
جو
رہتی دنیا تک یادگار رہے گی

مسلم کمپنی
کی یادگار
تاریخی پیشکش

شہنشاہ شاہجہاں اکبر
کی
محبت کا غیر فانی کارنامہ

ممتاز محل

افسانہ: منشی دل لکھنوی

ہدایت کار:- کیدار شرما

نغمات:- ولی صاحب

اداکاران

خورشید بانو — چندر موہن — یعقوب — بجن — آر ملا

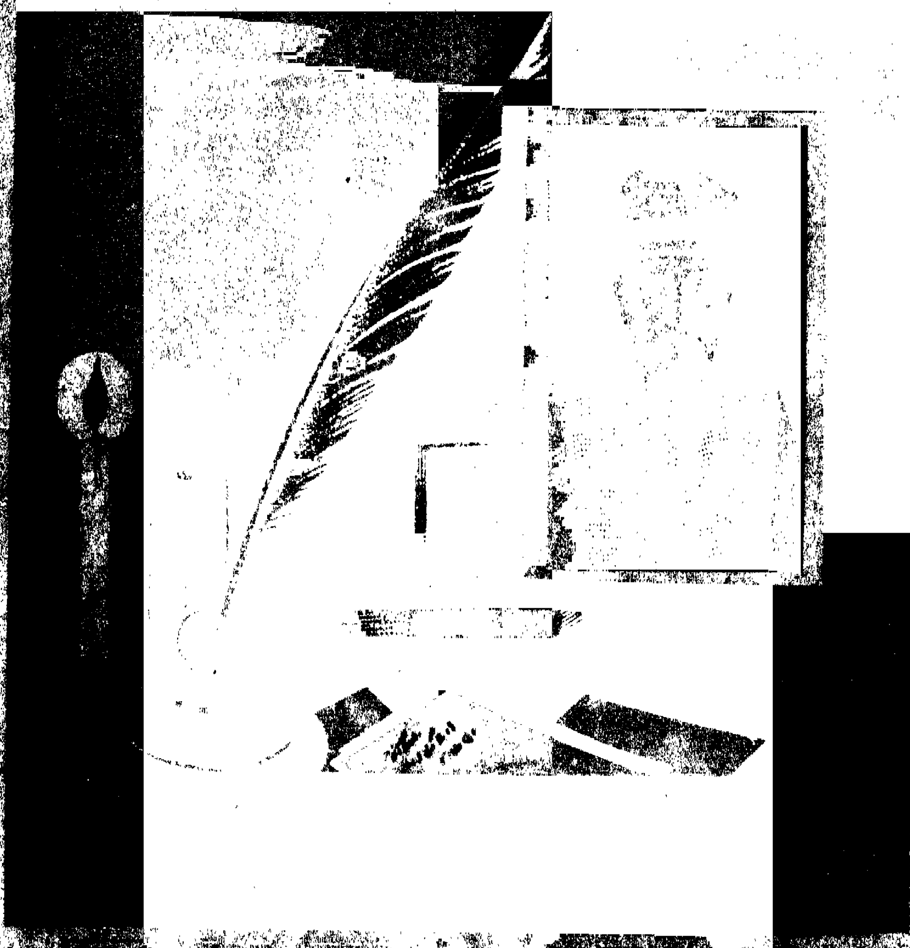
جگت سنیما کا
آئندہ پروگرام

تقسیم کنندگان:
دہلی تھیٹرز بیورو چاندنی چوک دہلی۔ لاہور کراچی

THE ADEEB DELHI

ماہنامہ ادیب

(دہلی)





فلم ''دھمکی'' کا ایک سین



ممتاز شانتی اور ایشور لال
فلم ''چاند چکوری'' میں



کنہیا لال اور چارلی فلم ''اس پار'' میں



''وشوامتر'' میں رتن مالا

صلی دلّی والوں کا ایک نمونہ دُنیا سے اُٹھ گیا!!

(از فصیح الدین احمد):

دُنیائے ادب میں یہ خبر بڑے رنج اور افسوس کے ساتھ
سُنے گی کہ دہلی کے مشہور و معروف شاعر جناب نواب
الدین احمد صاحب سائل دہلوی نے ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ء کو
ل کو لبیک کہا۔ اِنّا لِلّٰہِ وَ اِنّا اِلیہِ راجعون۔

زمانہ ماضی قریب میں اساتذۂ دہلی میں چار ہستیاں بہت
رکی ہیں۔ جن میں سے اب صرف وحید الدین صاحب بیخودؔ دہلوی
ہیں (اور ہماری دُعا ہے کہ خدا ان کو زندہ سلامت رکھے)

میں نے نواب صاحب کو پہلی بار ۱۹۲۱ء میں دیکھا تھا۔
د صاحب حج بیت اللہ سے واپس آئے تھے تو ایک
ہ ان کو خیر مقدم کہنے کے لئے مٹیا محل میں منعقد ہوا تھا۔
مہینہ تھا، سردی کڑاکے کی پڑ رہی تھی، مگر آدمیوں کا
دحام تھا کہ مکان کا چپّہ چپّہ بھرا ہوا تھا۔ لوگ صحن
بالآخر ڈیوڑھی تک میں مشاعرہ سننے کے لئے کھڑے
تھے۔ مشاعرہ نو بجے شب کو شروع ہوا اور صبح کو چار
ہوا۔ مصرعِ طرح یہ تھا ؎

"ٹیڑھی زمیں ہے شعر بھی بلدار چاہیئے"

غزل سائل صاحب مرحوم کی تھی۔ مجھے وہ ترنم ریز
تک یاد ہے۔ محفل میں ہر مصرعے پر چاروں طرف
سین و آفریں کے نعرے بلند ہوتے تھے۔ اور سائل
مسکرا کر "دوبارہ عطا ہو" کے تقاضوں سے مسرور
ز اور سکرر پڑھتے جاتے تھے۔

اس کے بعد مجھے نواب صاحب کو پھر قریب سے دیکھنے
ق اُس وقت ہوا جب میں ہارڈنگ لائبریری کا سکریٹری
ہوا۔ لائبریری میں ہر سال آل انڈیا مشاعرہ ہوا
کرتا تھا۔ ۱۹۴۰ء میں دہلی کے ٹاؤن ہال میں ہارڈنگ
لائبریری کے مشاعرے کی تیسری نشست سہ پہر کو
ہو رہی تھی۔ سارا ہال آدمیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔
دہلی کے چیف کمشنر اور دیگر حکام بھی موجود تھے۔ مشاعرہ
کے صدر، سر تیج بہادر سپرو تھے کہ اتنے میں مجھے اطلاع ملی
کہ نواب صاحب رکشا میں تشریف لائے ہیں۔ میں استقبال
کے لئے ہال سے باہر لپکا۔ نواب صاحب نے مسکرا کر کہا "تیری
بات کیونکر ٹال دیتا۔ چار و ناچار آنا ہی پڑا۔" نواب صاحب
مفلوج ہو چکے تھے۔ ٹانگیں کام نہ دیتی تھیں۔ پاؤں متورم تھے۔ ہاتھوں
میں رعشہ تھا۔ بینائی کم ہو چکی تھی۔ غرض ڈنڈا ڈولی کر کے
اُنہیں رکشا سے اُتار گیا اور ایک کرسی پر بٹھا کر اُن کو
ٹاؤن ہال میں لے گئے۔ وہ صرف چند منٹ مشاعرہ میں ٹھیرے۔
اور چند شعر سُنا کر واپس چلے گئے۔ لوگ مزید کلام کیلئے التجائیں
کرتے رہ گئے

اس کے بعد بھی گرمی ہو یا جاڑا سائل صاحب روز رکشا میں
بیٹھے کمپنی باغ سے گذرا کرتے تھے۔ کبھی میں دیکھ لیتا تو سلام
کرنے باہر جا کھڑا ہوتا۔ کبھی وہ خود رکشا لائبریری کے
قریب لے آتے۔ اور دو ایک شعر سُنا کر چلے جاتے۔
میں نے کئی بار اُن کی خدمت میں عرض کی کہ نواب صاحب!
اگر اجازت ہو تو آپ کے کلام کو شائع کرنے کا بندوبست
کیا جائے۔ مگر ہر بار اُن کا جواب یہی ہوتا ہے کہ "میں نے
اپنا کلام اپنی بیوی کے نام ہبہ کر دیا ہے اسکے متعلق اُنہی سے بات کرو۔"
نواب صاحب کی بیگم صاحبہ حضرت داغؔ کی صاحبزادی تھیں حضرت
داغؔ ہی سے نواب صاحب کو شرفِ تلمذ حاصل تھا۔

ایک ضروری اعلان

"ادیب" کے ناظرین اور مضمون نگاروں کی خدمت میں مجھے دو باتیں عرض کرنی ہیں۔ ایک یہ کہ "ادیب" کے لئے جو مضامین ہمیں دستیاب ہوتے ہیں اُن کی وصولیابی کی رسید دفتر سے حتی الامکان جلدی ارسال کر دی جاتی ہے۔ مگر ایسے مضامین جو کسی وجہ سے "ادیب" میں شائع نہیں ہو سکتے کچھ عرصہ کے لئے ایک الگ فائل میں محفوظ رکھے جاتے ہیں۔ اور اگر اُن کو واپس طلب کیا جاتا ہے تو واپس کر دیئے جاتے ہیں۔ ورنہ کچھ عرصہ کے بعد ضائع کر دیئے جاتے ہیں۔

دوسری بات یہ عرض کرنی ہے کہ "ادیب" اُن مضامین۔ افسانوں اور نظموں کے لئے نذرانہ بھی پیش کرتا ہے جو "ادیب" کی فرمائش پر کسی خاص موضوع یا عنوان پر لکھوائی جاتی ہیں۔ عنوان یا موضوع کا انتخاب خود اڈیٹر پر ہوتا ہے۔ لیکن جو خود نوشت مضامین یا افسانے یا نظمیں وغیرہ آتی ہیں اُن کے لئے کوئی معاوضہ بجز شکریہ کے پیش نہیں کیا جاتا۔ چند ایسی مثالیں موجود ہیں کہ مضامین یا افسانے شائع ہونے کے بعد اُن کا "مناسب" یا "موزوں" معاوضہ طلب کیا گیا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم ایسے مطالبات پورے کرنے سے قاصر ہیں۔

نیاز مند

فصیح الدین

چندہ سالانہ دس روپے علاوہ محصول ڈاک
قیمت فی کاپی:- ایک روپیہ علاوہ محصول ڈاک

ادیب

ایڈیٹرز:-
سید محمد ارتضیٰ واحدی ـــــ فصیح الدین احمد ایم، اے

جلد ۱۹ | ستمبر و اکتوبر ۱۹۴۵ء | نمبر ۵ و ۶

فہرست مضامین

سالنامے اور نئی کتابیں

:: (از فصیح الدین احمد) ::

(۱) نئی زندگی زیر ادارت مسٹر انیس الرحمن الہ آباد سے شائع ہوتا ہے۔ اسکا ایک خاص نمبر سان فرانسسکو نمبر ستمبر ۱۹۴۵ء کے عنوان سے شائع ہوا ہے جسکی قیمت ایک روپیہ ہے۔ اس نمبر کے صفحات ۹۶ ہیں۔ یہ نمبر چار ابواب پر منقسم ہے۔ پہلے باب میں رفتار عالم۔ دوسرے باب میں بین الاقوامی تنظیم تیسرے باب میں سان فرانسسکو کانفرنس۔ چوتھے باب میں نظام عالم اور ہندوستان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "نئی زندگی" میں زندگی کے نئے پہلوؤں پر نئے زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اسکے مضامین سیاسی اور تعمیری ہوتے ہیں اور ملک کی مقتدر ہستیاں اسکی معاون اور مددگار ہیں۔ اور مفکر اہل قلم اس میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

"نئی زندگی" ماہناموں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

(۲) آخری کہانی از نسیم انہونوی۔ شائع کردہ یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ۔ قیمت عہ مجلد صفحات ۱۶۰۔ یہ ایک مختصر مگر دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے بلکہ اگر اسکو کہانیوں کا مجموعہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ کہانیاں بڑے لطیف پیرائے میں بیان کی گئی ہیں۔

(۳) افسانۂ زریں مترجمہ اسماء طیب حسین۔ شائع کردہ اردو اکاڈیمی لاہور قیمت عہ مجلد۔ ہم مترجمہ کو انکے نقش اول پر مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے ایک مشہور ناول نویس کی مشہور کتاب کا ترجمہ اس قدر برجستہ اور سلیس زبان میں کیا ہے کہ پڑھنے والا کتاب شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے دم نہیں لیتا۔ حالانکہ عام طور پر ترجمہ میں کسی مضمون یا نظم یا کتاب کی خصوصیات قائم نہیں رہتیں جو مضمون نگار، شاعر یا ناول نویس نمایاں طور پر پیش کرنا چاہتا ہے۔

فن افسانہ نگاری ایک ایسا فن ہے جسے شاید پانچ فی صدی اردو افسانہ نگار بھی کامیابی کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے۔ لیکن ایسی صورت میں دوسری زبانوں سے دلچسپ اور کامیاب افسانوں کو اگر ضرورت ہو تو تھوڑے سے بہت پس منظر کی تبدیلی کے ساتھ اردو زبان میں ڈھالا جا سکتا ہے۔

(۴) ادب پارے زیر نظر کتاب مسٹر ضیاء الاسلام پی۔ سی ایس کی ان تقاریر کا مجموعہ ہے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً دہلی اور لکھنؤ ریڈیو سٹیشنوں سے براڈکاسٹ کی تھیں۔ اب ان تقاریر کو ایک جگہ جمع کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا ہے۔ مضامین میں خاص طور پر قابل ذکر یہ ہیں۔ "اقبال کے کنارے (۲) اصغر گونڈوی (۳) جگر مرادآبادی (۴) عمر خیام ایک غم پسند شاعر (۵) احسان دانش

ان مقالوں میں ضیاء الاسلام صاحب نے شاعروں کی زندگی پر نہیں بلکہ ان کے کلام پر مختصر تنقیدی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے طرز تحریر میں ایک خاص رنگ پایا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیالات کا ایک ہجوم سر پر سوار ہے۔ جس کے اظہار کے لئے ان کی قلم بیتابانہ صفحۂ قرطاس کو سیاہ کرتی چلی جاتی ہے۔ جرنلزم کی زندگی سے مانوس رہنے کی وجہ سے زبان شستہ اور صاف ہے۔ جو فقرہ قلم سے نکلتا ہے جچا تلا ہوتا ہے۔ وہ ایک وکیل کی طرح اپنے مطمح نظر کو پورے زور شور سے سامعین اور قارئین کے سامنے مدلل پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ اور صرف اسی وقت دم لیتے ہیں۔ جب انہیں یقین ہو جاتا ہے کہ جو نقش وہ بٹھانا چاہتے تھے۔ پتھر کی لکیر بن گیا ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ سرکاری ملازمت نے ایک ذہین، لائق اور تجربہ کار انشاء پرداز کو اردو ادب سے چھین لیا۔ لیکن اسکے باوجود لمحات فرصت میں اردو ادب کی جو خدمت ممکن ہے نہایت مستعدی کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔

(۵) کروٹ از مسٹر سعادت حسن منٹو۔ منٹو کا نام ڈرامہ نویسوں اور افسانہ نگاروں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ منٹو کی ڈرامہ نگاری اور افسانہ نگاری مسلم ہے۔ مگر ساتھ ہی ان کی بیباکی، شوخی اور چلبلاہٹ اور ضد بھی ضرب المثل ہو گئی ہے۔ جس طرح آج کل بعض افسانہ نویسوں میں "تحلیل اور تجزیہ" کا دور ہے اسی طرح لوگوں کا خیال ہے کہ منٹو کو Sex میں شغف حاصل ہے کہ ان کا کوئی افسانہ بغیر Sex کے کامیاب نہیں ہو سکتا۔ منٹو اپنے کرداروں کے دل کی دھڑکن اور دماغ کے خیالات کی تحلیل پر قانع نہیں ہوتے بلکہ ان کے لباس کے اندر گھس کر ان کے گوشت اور پوست سے محظوظ ہوتے ہیں۔ مگر زیر نظر مجموعہ میں منٹو نے نہایت "احتیاط" سے کام لیا ہے اور نفسیاتی تجزیہ کو ایک محدود دائرہ میں متعین کر دیا ہے۔

یہ منٹو کے گیارہ دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے جو ریڈیو کے لئے رکھے گئے اور بعد میں کتابی شکل میں اردو اکاڈیمی لاہور سے شائع ہوئے قیمت دو روپے آٹھ آنے (باقی)

ہماری بولی اور زبان

(از جناب پرنسپل مشتاق احمد رضا زاہدی)

اپنا مافی الضمیر دوسرے تک پہنچانے کیلئے یا اشارے کرنے پڑتے ہیں یا حسات ہلانی پڑتی ہے۔ زبان ہلانے سے منہ سے کچھ لفظ نکلتے ہیں اور ان لفظوں کو ملا کر کلمہ بنایا جاتا ہے۔ جسے ہندستانی میں بولی کہتے ہیں۔ انسان مدتوں اس بولی سے کام چلاتا رہا۔ پھر تحریر یا لکھنے کا فن ایجاد ہوا۔ بولی کے ذریعہ ہم اپنے دل کا حال دوسرے کے کان تک پہنچا کر اس کو اپنے مطلب سے آگاہ کرتے تھے لیکن تحریر سے ہم نے اپنا مافی الضمیر دوسرے شخص کی آنکھوں کے ذریعہ اس تک پہنچایا یعنی اس نے ہماری تحریر دیکھی اور پڑھی۔ اب دوسرے تک خیال پہنچانے کے دو طریق ہو گئے۔ ایک کو بولی کہتے ہیں مگر دوسرے کو بولی نہیں کہہ سکتے۔ زبان کا لفظ دونوں پر حاوی ہوتا ہے یعنی تحریری اور تقریری دونوں طریق کو زبان بولتے ہیں۔ شروع شروع میں تقریری اور تحریری زبان ایک ہی تھی مگر رفتہ رفتہ ان دونوں زبانوں میں فرق آنے لگا۔ تقریری زبان میں الفاظ کی تعداد بہت کم تھی مگر تحریری زبان میں بہت سے نئے لفظ آنے شروع ہو گئے۔ اس لئے ان کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ پڑھے لکھے لوگوں کی بولی بھی تحریری زبان سے ملتی جلتی رہی۔ اور اس بولی کو تہذیب یافتہ بولی سمجھا گیا اور جو جاہل بھی مہذب صحبت میں بیٹھتے تھے وہ بھی طبقہ شرفا میں شمار ہونے کی خاطر تحریری بولی استعمال کرنے لگے۔ غیر تعلیم یافتہ طبقے کی بولی میں کوئی فرق نہ آیا۔ انسانوں کی طرح زبان بھی بچپن، شباب اور بڑھاپے کے دور میں سے گزرتی اور تبدیلیاں اختیار کرتی رہی۔ اور جس طرح ایک بچے کے اصلی خط و خال بڑھاپے تک یکساں رہتے ہیں لیکن اس کا چہرہ طفولیت میں کچھ ہوتا ہے، شباب میں اور ہوتا ہے اور بڑھاپے میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اکثر بچپنے کی صورت سے بڑھاپے کی صورت اتنی بدل جاتی ہے کہ وہ شکل پہچانی ہی نہیں جاتی۔ اسی طرح ابتدائی زبان اور آخری زمانے کی زبان میں بسا اوقات اتنا زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے کہ ابتدائی زبان آخری عہد کے لوگوں کی اپنی سمجھ میں بھی نہیں آتی حالانکہ اسی بیج سے پودا پیدا ہوا تھا اسی بیج کا یہ درخت ہے۔ زبان کے ارتقا کے بامدرج ہر ملک و قوم والوں کے لئے لابد ہیں۔ اور جس طرح بڑھاپے کے بعد موت آ جاتی ہے اسی طرح زبان بھی ایک دن مردہ کہلائی جانے لگتی ہے چنانچہ لاطینی زبان مردہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے کیونکہ یہ زبان اب کہیں نہیں بولی جاتی صرف کتابوں ہی میں یہ زبان باقی رہ گئی ہے، شرقی زبانوں میں سنسکرت مردہ زبان ہے۔ حالانکہ اس زبان کی اولاد اور اولاد در اولاد [illegible] کے بڑے حصے پر پھیلی ہوئی ہے اور آرین نسل کی زبان سے مشہور ہے۔

ہم اگر عرب ہیں تو ہماری زبان عربی کہلائیگی۔ اگر ایرانی ہیں تو فارسی کہلائیگی۔ اگر ہندستانی ہیں تو ہندی کہلائے گی۔ لیکن ایک مدت تک ہندستان میں ہر علاقے کی اپنی اپنی زبان رہی اور سارے ہندستان کو ایک زبان کی [illegible] ہی نہ پڑی۔ کیونکہ اس وسیع ملک میں لاتعداد راج تھے۔ یہ زبانیں [illegible] اپنے صوبے یا علاقے کے نام سے مشہور ہوئیں۔ بنگال کی بولی بنگالی، [illegible] گجراتی اودھ کی برج بھاشا، سندھ کی سندھی کہلائی جاتی ہیں۔ [illegible] باشندگان ہند کی نہیں ہے۔ اس بولی کا بیج آریہ حملہ آوروں [illegible] اصلی باشندے آریہ قوم کے ظلم و ستم سے یا ختم ہو گئے یا بھاگ کر پہاڑوں اور غیر زرخیز علاقوں میں جا چھپے۔ آریاؤں کی دست برد سے جنوبی ہند [illegible] رہا۔ اس لئے قدیم ہند کی بولی صرف پہاڑی علاقوں اور دکن ہی میں باقی رہ گئی ہے۔ شمالی ہند میں آریاؤں کی بولی ہی استعمال ہوتی رہی۔ تحریری زبان کو آریہ "سنسکرت" کہتے تھے یہ زبان صرف برہمن قوم ہی جانتی تھی۔ جس کا پیشہ دین کی تعلیم دینا تھا۔ اس لئے سنسکرت زیادہ تر دینی زبان ہی رہی۔ بولنے کی زبان کو آریہ "پراکرت" کہتے تھے۔ پراکرت میں بنگالی گجراتی [illegible] برج بھاشا سب شمالی ہند کی زبانیں آ گئیں۔ ان زبانوں میں قدیم ہند کی بولی کے لفظ آریاؤں کی بولی سے مل گئے۔ اور غیر ملک والے ان سب زبانوں کو ایک لفظ ہندی سے تعبیر کرتے رہے۔ چنانچہ جب مسلمانوں نے ہندستان پر قبضہ کر کے اسکو اپنا وطن بنا لیا تو وہ یہاں کی زبان کو ہندی [illegible] کہنے [illegible] مسلمان یہاں بستے ہوئے آئے۔ پہلے اہل عرب نے سندھ پر قبضہ جمایا اور دو سو برس تک اس ملک پر قابض رہے۔ انکی زبان عربی تھی۔ یہ [illegible] بڑے منصف مزاج خوش خلق اور بے تعصب تھے۔ چنانچہ یہ اپنے زمانہ قیام میں اہل سندھ سے خوب گھل مل گئے اور سندھی زبان میں لاتعداد عربی کے الفاظ چھوڑ گئے۔ سندھی الف بے تے بھی عربی خط میں لکھی جاتی ہے۔ ابتدائی سندھی اور موجودہ سندھی میں بہت تفاوت ہے۔ لیکن

سالنامے اور نئی کتابیں

(از فصیح الدین احمد) :

(۱) نئی زندگی زیر ادارت مسٹر انیس الرحمٰن الٰہ آباد سے شائع ہوتا ہے۔ اسکا ایک خاص نمبر سان فرانسسکو نمبر ۱۹۴۵ء کے عنوان سے شائع ہوا ہے جسکی قیمت ایک روپیہ ہے۔ اس نمبر کے صفحات ۹۶ ہیں۔ یہ نمبر چار ابواب پر منقسم ہے۔ پہلے باب میں رفتار عالم (دوسرے) باب میں بین الاقوامی تنظیم۔ تیسرے باب میں سان فرانسسکو کانفرنس۔ چوتھے باب میں نظام عالم اور ہندستان خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "نئی زندگی" میں زندگی کے نئے پہلوؤں پر نئے زاویہ نگاہ سے روشنی ڈالی جاتی ہے۔ اسکے مضامین سیاسی اور تعمیری ہوتے ہیں اور ملک کی متعدد ہستیاں اسکی معاون اور مددگار ہیں۔ اور مفکر اہل قلم اس میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔

"نئی زندگی" ماہناموں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔

(۲) آخری کہانی از نسیم انہونوی۔ شائع کردہ یونائیٹڈ انڈیا پریس لکھنؤ۔ قیمت ۱۲؍ مجلد صفحات ۱۶۰۔ یہ ایک مختصر مگر دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے بلکہ اگر اسکو کہانیوں کا مجموعہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ کہانیاں بڑے سلیقے پیرائے میں بیان کی گئی ہیں۔

(۳) افسانۂ زریں مترجمہ اسما د طیب حسین۔ شائع کردہ اردو اکاڈیمی لاہور قیمت ۱۲؍ مجلد۔ ہم مترجمہ کو انکے نقش اول پر مبارکباد دیتے ہیں کہ انہوں نے ایک عکس ناول نویس کی مشہور کتاب کا ترجمہ اس قدر برجستہ اور سلیس زبان میں کیا ہے کہ پڑھنے والا کتاب شروع کرنے کے بعد بغیر ختم کئے دم نہیں لیتا۔ حالانکہ عام طور پر ترجمہ میں کسی مضمون یا نظم یا کتاب کی خصوصیات قائم نہیں رہتیں ... [illegible] ... پیش کرنا چاہتا ہے۔

[illegible] نگاری ایک ایسا فن ہے جسے شاید پانچ فی صدی اردو افسانہ نگار بھی کامیابی کے ساتھ پیش نہیں کر سکتے۔ لیکن ایسی صورت میں ... [illegible] ... اگر ... [illegible]

نے وقتاً فوقتاً دہلی اور لکھنؤ ریڈیو اسٹیشنوں سے براڈکاسٹ کی تھیں۔ اب ان تقاریر کو ایک جگہ جمع کر کے کتابی شکل میں شائع کردیا ہے۔ مضامین میں خاص طور پر قابل ذکر یہ ہیں۔ "اقبال کے کنارے" (۲) اصغر گونڈوی (۳) جگر مرادآبادی (۴) عمر خیام ایک غم پسند شاعر (۵) احسان دانش

ان مقالوں میں ضیاء الاسلام صاحب نے شاعروں کی زندگی پر نہیں بلکہ ان کے کلام پر مختصر تنقیدی روشنی ڈالی ہے۔ ان کے طرز تحریر میں ایک خاص رنگ پایا جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خیالات کا ایک ہجوم ہے جو ہموار ہے۔ جس کے اظہار کے لئے ان کی قلم بیتابانہ صفحۂ قرطاس کو سیاہ کرتی چلی جاتی ہے۔ جرنلزم کی زندگی سے مانوس رہنے کی وجہ سے زبان شستہ اور صاف ہے۔ جو فقرہ قلم سے نکلتا ہے جچا تلا ہوتا ہے۔ وہ ایک وکیل کی طرح اپنے مطمح نظر کو پورے زور شور سے سامعین اور قارئین کے سامنے مدلل پیرائے میں پیش کرتے ہیں۔ اور صرف اُسی وقت دم لیتے ہیں۔ جب اُنہیں یقین ہو جاتا ہے کہ جو نقش وہ جمانا چاہتے تھے۔ پتھر کی لکیر بن گیا ہے۔

ہمیں افسوس ہے کہ سرکاری ملازمت نے ایک ذہین، لائق اور تجربہ کار انشاء پرداز کو اردو ادب سے چھین لیا۔ لیکن اسکے باوجود لمحات فرصت میں اردو ادب کی جو خدمت ممکن ہے نہایت مستعدی کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔

(۵) کروٹ از مسٹر سادت حسین منٹو۔ منٹو کا نام ڈرامہ نویس اور افسانہ نگاروں میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ منٹو کی ڈرامہ نگاری اور افسانہ نگاری مسلّمہ ہے۔ مگر ساتھ ہی اُن کی بیباکی، شوخی اور چلبلاہٹ اور ضد بھی ضرب المثل ہوگئی ہے۔ جس طرح آج کل بعض افسانہ نویسوں میں "تحلیل اور تجزیہ" کا دور ہے اسی طرح لوگوں کا خیال ہے کہ منٹو کو Sex میں خصوصیت حاصل ہے کہ ان کا کوئی افسانہ بغیر Sex کے کامیاب نہیں ہوسکتا۔ منٹو اپنے کرداروں کے دل کی دھڑکن اور دماغ کے خیالات کی تحلیل پر قانع نہیں رہتے بلکہ ان کے لباس کے اندر گھس کر اُن کے گوشت اور پوست سے محظوظ ہوتے ہیں۔ مگر زیر نظر مجموعہ میں منٹو نے نہایت "احتیاط" سے کام لیا ہے اور نفسیاتی تجزیہ کو ایک محدود دائرہ میں متعین کردیا ہے۔

... [illegible] ... دلچسپ افسانوں کا مجموعہ ہے جو ریڈیو کے لئے لکھے گئے ... [illegible] ... کتابی شکل میں اردو اکاڈیمی لاہور سے شائع ... [illegible]

قیمت ... [illegible]

ہماری بولی اور زبان

(از جناب پرنسپل مشتاق احمد صاحب زاہدی)

اپنا مافی الضمیر دوسرے تک پہنچانے کیلئے یا اشارے کرنے پڑتے ہیں یا حرکات ہلانی پڑتی ہے۔ زبان ہلانے سے منہ سے کچھ لفظ نکلتے ہیں اور ان لفظوں کو ملا کر کلمہ بنایا جاتا ہے۔ جسے ہندوستانی میں بولی کہتے ہیں۔ انسان مدتوں اس بولی سے کام چلاتا رہا۔ پھر تحریر یا لکھنے کا فن ایجاد ہوا۔ بولی کے ذریعہ ہم اپنے دل کا حال دوسرے کے کان تک پہنچا کر اس کو اپنے مطلب سے آگاہ کرتے تھے لیکن تحریر سے ہم نے اپنا مافی الضمیر دوسرے شخص کی آنکھوں کے ذریعہ اس تک پہنچایا یعنی اس نے ہماری تحریر دیکھی اور پڑھی۔ اب دوسرے تک خیال پہنچانے کے دو طریق ہو گئے۔ ایک کو بولی کہتے ہیں مگر دوسرے کو بولی نہیں کہہ سکتے۔ زبان کا لفظ دونوں پر حاوی ہوتا ہے یعنی تحریری اور تقریری دونوں طریق کو زبان بولتے ہیں۔ شروع شروع میں تقریری اور تحریری زبان ایک ہی تھی مگر رفتہ رفتہ ان دونوں زبانوں میں فرق آنے لگا۔ تقریری زبان میں الفاظ کی تعداد بہت کم تھی مگر تحریری زبان میں بہت سے نئے لفظ آنے شروع ہو گئے۔ اس لئے ان کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ پڑھے لکھے لوگوں کی بولی بھی تحریری زبان سے ملتی جلتی رہی۔ اور اس بولی کو تہذیب یافتہ بولی سمجھا گیا اور جو جاہل بھی مہذب صحبت میں بیٹھتے تھے وہ بھی طبقہ شرفا میں شمار ہونے کی خاطر تحریری بولی استعمال کرنے لگے۔ غیر تعلیم یافتہ طبقے کی بولی میں کوئی فرق نہ آیا۔ انسانوں کی طرح زبان بھی بچپن، شباب اور بڑھاپے کے دور میں سے گذرتی اور تبدیلیاں اختیار کرتی رہی۔ اور جس طرح ایک بچے کے اصل خط و خال بڑھاپے تک یکساں رہتے ہیں لیکن اس کا چہرہ طفولیت میں کچھ ہوتا ہے، شباب میں اور ہوتا ہے اور بڑھاپے میں کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ اکثر بچپنے کی صورت سے بڑھاپے کی صورت اتنی بدل جاتی ہے کہ وہ شکل پہچانی ہی نہیں جاتی۔ اسی طرح ابتدائی زبان اور آخری زمانے کی زبان میں بسا اوقات اتنا زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے کہ ابتدائی زبان آخری عہد کے لوگوں کی بالکل سمجھ میں نہیں آتی حالانکہ اس بیج سے پودا پیدا ہوا تھا اسی بیج کا یہ درخت ہے۔ زبان کے ارتقاء کے یہ مدارج ہر ملک و قوم والوں کے لئے لابد ہیں۔ اور جس طرح بڑھاپے کے بعد موت آ جاتی ہے اسی طرح زبان بھی ایک دن مردہ کہلائی جانے لگتی ہے چنانچہ لاطینی زبان مردہ زبانوں میں شمار ہوتی ہے کیونکہ یہ زبان اب کہیں نہیں بولی جاتی صرف کتابوں ہی میں یہ زبان باقی رہ گئی ہے۔ مشرقی زبانوں میں سنسکرت مردہ زبان ہے۔ حالانکہ اس زبان کی اولاد اور اولاد در اولاد [illegible] کے بڑے حصے پر پھیلی ہوئی ہے اور آرین نسل کی زبان سے مشہور ہے۔

ہم اگر عرب ہیں تو ہماری زبان عربی کہلائیگی۔ اگر ایرانی ہیں تو فارسی کہلائیگی۔ اگر ہندوستانی ہیں تو ہندی کہلائے گی۔ لیکن ایک مدت تک ہندوستان میں ہر علاقے کی اپنی اپنی زبان رہی اور سارے ہندوستان کو ایک زبان کی ضرورت ہی نہ پڑی۔ کیونکہ اس وسیع ملک میں لاتعداد راج تھے۔ یہ زبانیں اپنے اپنے صوبے یا علاقے کے نام سے مشہور ہوئیں۔ بنگال کی بولی بنگالی، گجرات کی گجراتی، اودھ کی برج بھاشا، سندھ کی سندھی کہلائی جاتی ہیں۔ [illegible] باشندگان ہند کی نہیں ہے۔ اس بولی کا بیج آریہ حملہ آوروں [illegible] اصلی باشندے آریہ قوم کے ظلم و ستم سے یا ختم ہو گئے یا بھاگ کر پہاڑوں اور غیر زرخیز علاقوں میں جا چھپے۔ آریاؤں کی دست برد سے جنوبی ہند [illegible] رہا۔ اس لئے قدیم ہند کی بولی صرف پہاڑی علاقوں اور دکن ہی میں باقی رہ گئی ہے۔ شمالی ہند میں آریاؤں کی بولی ہی استعمال ہوتی رہی۔ تحریری زبان کو آریہ سنسکرت کہتے تھے یہ زبان صرف برہمن قوم ہی جانتی تھی جس کا پیشہ دین کی تعلیم دینا تھا۔ اس لئے سنسکرت زیادہ تر دینی زبان ہی رہی۔ بولنے کی زبان کو آریہ "پراکرت" کہتے تھے۔ یہ پراکرت ہی بنگالی گجراتی [illegible]رج بھاشا سب شمالی ہند کی زبانیں آ گئیں۔ ان زبانوں میں قدیم ہند کی بولی کے لفظ آریاؤں کی بولی سے مل گئے۔ اور غیر ملک والے ان سب زبانوں کو ایک لفظ ہندی سے تعبیر کرتے رہے۔ چنانچہ جب مسلمانوں نے ہندوستان پر قبضہ کر کے اسکو اپنا وطن بنا لیا تو وہ یہاں کی زبان کو ہندی ہی کہتے [illegible] مسلمان [illegible] بستے ہوئے آ گئے۔ پہلے اہل عرب نے سندھ پر قبضہ جمایا اور دو سو برس تک اس ملک پر قابض رہے ان کی زبان عربی تھی۔ [illegible] بڑے منصف۔ فراخ حوصلہ اور بے تعصب تھے۔ چنانچہ پہلے زمانہ قیام میں اہل سندھ سے خوب گھل مل گئے اور سندھی زبان میں لاتعداد عربی کے الفاظ چھوڑ گئے۔ سندھی الف بے تے بھی عربی خط میں لکھی جاتی ہے۔ ابتدائی سندھی اور موجودہ سندھی میں بہت تفاوت ہے۔ لیکن

لیکن اسی سلسلے میں یہ امر قابلِ غور ہے کہ الفاظ کے ترک کرنے میں کوئی بالائی جبر یا تشدد نہیں چاہیئے۔ یہ کام لوگوں کی مرضی پر چھوڑنا زیادہ کارگر ہوتا ہے اور ہر ملک میں اس سے قبل زبان کی تبدیلی خود بخود ہوتی رہی ہے۔ ہمارے ملک میں بدنصیبی سے فرقہ وارانہ مقابلے و کشمکش نے زبان کو بھی نہ چھوڑا۔ جب خدا کا بنایا ہوا پانی ہندو پانی اور مسلمانی پانی ہو گیا تو زبان تو پھر آدمی کی بنائی ہوئی ہے۔ مسلمان زبان اور ہندو زبان علیحدہ علیحدہ ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اور تعجب کیوں ہو جب یہ واقعہ ہے کہ مسلمان زبان عربی ہے کیونکہ اسلام کی بنا قرآن شریف پر ہے۔ اور قرآن شریف عربی زبان میں ہے اور قرآن شریف کو مسلمان اللہ کی زبان کہتے ہیں لہٰذا عربی آلہی زبان ہوئی۔ اسی طرح ہندو زبان سنسکرت ہے کیونکہ ہندوؤں کی مقدس کتابیں اور تمام مذہبی تعلیم سنسکرت میں ہوئی۔ ایران کی زبان فارسی ہے۔ ایران میں جب اسلام پھیلا تو ایرانیوں نے عربی مقدس کتب کا ترجمہ فارسی میں کر لیا۔ اس طرح مسلمانوں کی نگاہ میں فارسی کو بھی تقدس حاصل ہو گیا۔ اس کے علاوہ فارسی اسلامی شاہنشاہیت کے زمانے میں بین الاقوامی زبان بن گئی تھی۔ غرضیکہ خواہ مسلمانوں کی مادری زبان کچھ ہی ہو وہ فارسی کو ہی مسلمان زبان تصور کرتے ہیں۔ لیکن آج کل کے ہندوستان میں اُردو کو بھی بعض مسلمانوں نے متبنّیٰ کر لیا ہے یعنی وہ اسکو مسلمان زبان کی حیثیت سے مقدس سمجھتے ہیں۔ اردو میں کاٹ چھانٹ کرنا اس ذہنیت کے مسلمانوں کے احساس کو اتنی ہی اذیت پہنچاتا ہے جتنا کہ پرانے خیال کے ہندو کو بعض درختوں کی کاٹ چھانٹ کرنا۔ اُن کی نگاہ میں اُردو میں فارسی عربی الفاظ خارج کر دینا اور ہندی الفاظ کو قائم رکھنا مسلمانوں کو کفر کی طرف لے جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر الفاظ خیالات کے ترجمان ہیں تو ہندی الفاظ ہندو خیالات کے ترجمان ہونگے اور اُن کے استعمال سے ہماری ذہنیت پر مضر اثر پڑیگا۔ خاصکر اس حالت میں کہ ہمارے اسلامی خیالات کے ترجمان عربی اور فارسی کے الفاظ زبان سے خارج کر دیئے گئے ہوں۔ ان حالات میں الفاظ کی کانٹ چھانٹ کتنی ہی خلوصِ نیت سے کی جائے لیکن فرقہ وارانہ تعصب کے دور میں ایسا کرنا خالی از مشکلات نہ ہوگا۔

غور کرنے کی یہ بات ہے کہ کیا متبنّیٰ اصلی اولاد کی جگہ لے سکتا ہے کیا اُردو مسلمانوں کیلئے مقدس زبان ہے؟ یہ بھی سوال ہو سکتا ہے کہ کیا اُردو خاص مسلمانوں ہی کی زبان ہے؟ کیا ہندوؤں کا اس سے کچھ تعلق نہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ اگر مسلمان ہندوستان کو فتح نہ کرتے تو اُردو زبان کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ مگر اُردو کی جتنی ضرورت مسلمانوں کو تھی اس سے زیادہ اسلام کی تھی۔ کیونکہ مسلمان فاتح تھے۔ مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ فاتح کچھ عرصہ تک ۔ جس طرح آج کل یورپ اور امریکہ کا فاتح اپنی زبان دوسروں پر ٹھونستا ہے کہ مدرسوں میں ساری پڑھائی سرکاری زبان میں ہوگی۔ اور خود دیسی زبان نہ سیکھتے جیسے آج کل انگریز دیسی زبان سے بے نیاز ہیں۔ مگر وہ تو ہندباشی ہو گئے تھے انہوں نے تو اس ملک کو اپنا وطن بنا لیا تھا۔ انہوں نے یہیں شادیاں کر لیں۔ اُن کو یہاں کی زبان سے کچھ عداوت نہ تھی۔ وہ ہندی یا سنسکرت کا سیکھنا کفر نہ سمجھتے تھے۔ جتنے یہاں کے لفظوں سے اُن کا کام نکلتا تھا اُتنے لفظ وہ سیکھ لیتے تھے۔ اُن کی اولاد اُن سے زیادہ لفظ سیکھ لیتی تھی۔ لیکن اپنی زبان کے لفظ وہ چھوڑ سکتے تھے نہ اُن کی اولاد۔ یہی کیفیت اہلِ ہند کی تھی۔ وہ بھی مسلمان حکمرانوں کو اپنا سمجھنے لگے تھے اور جہاں تک ہو سکتا تھا اُن کی زبان کے لفظ اپنی زبان میں ملا لیتے تھے تاکہ کام نکلے۔ ظاہر ہے کہ ہندوؤں کی بولی میں فارسی عربی کم اور ہندی سنسکرت کے لفظ زیادہ ہوتے تھے مسلمانوں کی زبان میں اسکے برعکس۔ چنانچہ دو بولیاں ہو گئیں، ایک ہندوؤں کی اُردو، ایک مسلمانوں کی۔ جو اس وقت تک چلی آ رہی ہیں۔ پڑھے لکھے ہندوؤں کا ذکر نہیں ہے۔ ان کی اور مسلمانوں کی زبان میں بہت ہی کم فرق ہے۔ پنڈت مدن موہن مالوی صاحب اور نہرو خاندان کا ہر فرد شستہ پہلے قسم کی وہ اردو بولتے ہیں جس میں فارسی عربی کے الفاظ ہوتے ہیں۔ گو مالوی جی نے ہندی کی حمایت کے سلسلے میں اپنی زبان بدل دی۔ تھوڑا بہت فرق نہ صرف ہندو مسلمانوں کی اُردو میں ہونا لازمی ہے۔ بلکہ ہر صوبے اور ضلع کے خود مسلمان مسلمان کی بولی میں فرق پایا جاتا ہے۔ تحریری زبان میں یہ فرق اقلیت کے آخر درجے تک پہنچ جاتا ہے۔ تعمیرِ اُردو کی تعمیر میں دونوں کی ضرورت برابر تھی۔ دونوں نے برابر کا حصہ لیا اس لئے دونوں اسکو اپنی زبان کہنے کے حقدار ہیں۔ یہ درست ہے کہ یہ دلیل شمالی ہند ہی کے لئے صحیح ہے۔ مدراس، بنگال سندھ وغیرہ میں اُردو کچھ بولی اور بہت کچھ سمجھی جاتی ہے۔ مگر صرف شہروں اور تعلیم یافتہ طبقے میں۔ ان علاقوں کے ایسے مسلمان بکثرت نکلیں گے۔ جو شہروں سے دور جو صرف اپنے علاقے کی زبان ہی بول سکتے ہیں۔ اگر اُردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے تو بنگال، مدراس، سندھ اور دیگر صوبہ جات کے مسلمانوں نے اس زبان کو کیوں چھوڑ دیا۔ اسلام بحیثیت ایک مذہب کے تمام دُنیا میں پھیلا اور اس نے چند احکام امر اور نہی کے دیکر ہر ملک والے کو آزادی دی کہ وہ ان احکام کی پابندی کرتے ہوئے اپنی

زبان، اپنے رسوم، اپنا لباس، اپنی خوراک اور اپنی معیشت جو مسلمان ہونے سے پہلے تھی قائم رکھیں۔ اسلامی احکام کا تعلق روحانی اصلاح اور اخلاقی تعلیم سے ہے۔ اسلام نے جو چیزیں حرام کر دیں بس ان سے ہر مسلمان کو احتراز کرنا لازمی ہے۔ ان حالات میں جو زبان بھی مسلمان لوگ بولتے ہوں خواہ چینی ہو یا ترکی، اسلام کو اس سے غرض نہیں ہے۔ اگر اسلام کی کوئی زبان ہے تو وہ قرآن شریف کی زبان ہے

آج کل تو نہ مسلمانوں کا راج ہے نہ ہندوؤں کا۔ ایک غیر قوم کی حکومت ہے جو دونوں کے مذہبی معاملات میں دخل نہیں دیتی۔ اس لئے ہر شخص اپنی اپنی ڈفلی اور اپنا اپنا راگ کا مصداق ہو رہا ہے۔ لیکن جب مسلمانوں کی حکومت تھی اور شریعت کی پابندی لازمی تھی اور کوئی غیر شرعی عمل مسلمان نہیں کر سکتے تھے۔ اُس وقت ان کے لئے بالکل ممکن تھا کہ اگر اردو اسلامی زبان ہوتی تو اسکی پابندی ہر مسلمان پر لازمی کر دیتے۔ مگر اردو تو اُردو اسلام نے تو عربی کی بھی پابندی عائد نہیں کی۔ پھر یہ زبانوں کا جھگڑا کیسا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ اسلامی حکومت نے اُردو کی صرف قدر افزائی ہی کی کبھی اسکو سرکاری زبان ہونے کا فخر نصیب ہونے دیا۔ اور ایک عرصہ مدید تک اُردو علمی لحاظ سے محض شاعری ہی کی زبان رہی۔ مسلمانوں کی کتابیں فارسی میں لکھی جاتی تھیں۔ عربی کتب کے ترجمے بھی فارسی میں ہوتے رہے۔ حتیٰ کہ قرآن شریف کا ترجمہ بھی فارسی میں ہوا۔ اور جب پہلی دفعہ ایک مولوی صاحب نے اُردو میں قرآن شریف کا ترجمہ کیا تو مفتیوں نے اس کے خلاف فتویٰ دیا۔ اور علماء میں بہت ہیجان پھیلا اور اس حرکت کو بدعت سے بدتر سمجھا گیا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ایسا ہر ملک میں ہوا ہے۔ چنانچہ انجیل اطالینی زبان میں استعمال ہوتی رہی اور جب اس کے کچھ حصے بعض من چلے مصلحان نے انگریزی میں کر کے تقسیم کئے تو بڑی شورش ہوئی اور حکومت کو ترجمہ کرنے والوں کے خلاف سخت کارروائی کرنی پڑی۔ لیکن قرآن شریف کے اُردو میں ترجمہ ہونیکی مخالفت سے یہ قطعاً ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلامی حکومت کے مسلمان اُردو کو مسلمانوں کی زبان نہ سمجھتے تھے بلکہ ہندوؤں کی زبان سمجھتے تھے۔ ورنہ اس ترجمے پر اعتراض کیوں کیا جاتا۔ اُردو کو مسلمانوں کی حکومت کے آخری دور تک کوئی شخص علمی زبان نہ سمجھتا تھا۔ جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ اُس زمانے کے مدارس میں اُردو کی تعلیم مطلقاً نہ ہوتی تھی۔ چنانچہ جب انگریزوں کا قبضہ پنجاب پر ہو گیا تو وہاں کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ اور ڈاکٹر ارنلڈ کو ڈائرکٹر تعلیمات مقرر کیا گیا۔ جنہوں نے اپنی پہلی رپورٹ ۱۸۵۶ء میں مرتب کی۔ اس رپورٹ کو جب راقم الحروف نے پڑھا تو انگریزی تعلیم کی سرکاری پالیسی کا پہلی دفعہ انکشاف ہوا۔ صاحب موصوف نے دو امور پر بحث کی تھی۔ ایک یہ کہ مدرسوں کے معائنے کے بعد آپ پر یہ روشن ہوا کہ ہندو مسلمان دونوں کے بچے بکثرت مسجدوں اور پاٹھ شالاؤں میں پڑھتے تھے۔ اور انگریزی یعنی سرکاری مدارس میں بہت کم تعداد میں داخل ہوتے تھے۔ دوسرے یہ کہ جب وہ داخل ہونے آتے تھے تو اُردو پڑھنے سے انکار کرتے تھے۔ صاحب موصوف نے جب والدین سے اس کی وجہ دریافت کی تو اُنہوں نے جواب دیا کہ فارسی عربی سنسکرت تو علم ہیں۔ اُردو کوئی علم نہیں۔ اس کے پڑھنے سے کیا فائدہ۔ اس پر رائے زنی فرماتے ہوئے ڈاکٹر ارنلڈ صاحب ان ہندوؤں کی نادانی پر اظہار تاسف کرتے ہیں۔ جو مسلمانوں کی مسجدوں میں مسلمانوں کی زبان میں اپنے بچوں کو تعلیم دلواتے ہیں۔ اور ایسے نادان ہیں کہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ وہ اپنے بچوں کو مسلمانوں کے علوم سکھا کر اُن کی عاقبت خراب کر رہے ہیں۔ دوسرا افسوس اُن کو یہ ہوا کہ باوجود ہر قسم کی کوشش کے اُردو مدارس میں طلباء داخل ہونے سے کتراتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے سامنے تعلیمی پالیسی یہ تھی کہ فارسی عربی و سنسکرت کی تعلیم کی بجائے اُردو کی تعلیم کو قائم کیا جائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مشرقی تعلیم کا جو روحانی فیض اور اخلاقی اثر اہل ہند پر پڑ رہا ہے اُس سے وہ محروم ہو جائینگے۔ اور جو بے تعصبی اور یکجہتی ایک قسم کی اور یکجا تعلیم حاصل کرنے سے ہندو مسلمانوں میں پیدا ہو چکی ہے اس میں فرق پڑ جائے۔ یہ تعلیمی پالیسی خواہ ڈاکٹر ارنلڈ کے دماغ سوزی کا نتیجہ ہو یا گورنر جنرل کی کونسل کی سیاسی مصلحت کا، مگر یہ واقعہ ہے کہ فارسی، عربی، سنسکرت کی تعلیم رفتہ رفتہ بے معنی ثابت کر دی گئی۔ اور مسلمانوں اور ہندوؤں کی درسگاہیں بالکل علیحدہ علیحدہ قائم ہو گئیں حتیٰ کہ ان کی یونیورسٹی بھی اپنی اپنی علیحدہ ہو گئیں۔ اور اُردو کی تعلیم مدارس حتیٰ کہ کالج تک میں ضروری سمجھی گئی۔ غرضیکہ اُردو کی جو خدمت گورنمنٹ ہند نے کی ہے یہاں تک کہ اسکو سرکاری زبان بھی تسلیم کر لیا گیا وہ خدمت ہندوستان کی اسلامی گورنمنٹ نے کبھی نہیں کی۔ اس لئے اُردو کو مستحکم کرنے میں گورنمنٹ ہند کا ہندو مسلمانوں دونوں سے زیادہ حصہ ہے۔ اور اگر گورنمنٹ ہند کو اُردو کو جاری کرنے کا اور ہندوستان کی مشترکہ زبان بنانے کا دعویدار تسلیم کیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اور اگر کسی اَن گورنمنٹ کی طرف سے اُردو کے خلاف کوئی رویہ کہیں اختیار کیا گیا ہے تو وہ بھی عین مصلحت ہے کہ اب اُردو کی وہ ضرورت نہیں رہی۔ اور جو کام اس سے نکالنا تھا وہ نکل چکا۔ غرضیکہ مندرجہ بالا بیان

سے یہ صاف ظاہر ہے کہ اُردو اسلامی زبان ہے نہ اس کو کوئی تقدس حاصل ہے اور نہ فقط مسلمان اس کے بانی ہیں بلکہ ہندوؤں کے علاوہ ان کے ساتھ حکومت ہند بھی اُردو کو اپنا کہنے کی حقدار ہے۔ اور یہ زبان تینوں کی مشترکہ کوشش سے ارتقاء کے موجودہ دور تک پہنچی ہے۔

اب اگر یہ مان لیا جاوے کہ اُردو کسی خاص مذہب یا فرقے کی زبان نہیں بلکہ سارے ہندوستان کی ایک ایسی زبان ہے جو علمی لحاظ سے سب دیسی مروجہ زبانوں سے زیادہ پرورش یافتہ اور تیار شدہ ہے۔ اور اب ایسی تیار ہو گئی ہے کہ اس بوجھ کی آسانی سے متحمل ہو سکتی ہے جو ایک مہذب زبان کے لئے برداشت کرنا لابد ہے۔ وہی زبان علمی زبان کہلانے کی مستحق ہو سکتی ہے۔ جس کے الفاظ کا ذخیرہ اس قابل ہو کہ وہ ہر قسم کے خیالات کا اظہار نہ صرف بآسانی بلکہ زور کے ساتھ کر سکے۔ ہندوستان کی تمام زبانوں کے لٹریچر کا اگر موازنہ کیا جاوے تو باوجود اس سر توڑ کوشش کے جو گزشتہ پچاس سال سے ہندی کے لئے کی گئی ہے اُردو کا پلہ سب سے بھاری رہیگا اور عوام میں اُردو کی مقبولیت نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ ہندوؤں میں بھی مشاعروں کے مجمع سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں ہوئے کہ اُردو میں اب ترقی کی گنجائش نہیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ اُردو کے الفاظ کا ذخیرہ اس قدر کافی ہے کہ وہ ایک ملک کی مروجہ زبان بننے کی پوری پوری اہمیت رکھتی ہے زبان کسی ایک شخص کے بنائے سے نہ بنتی ہے نہ کسی کے مٹائے سے مٹ سکتی ہے۔ یہ تو ایک ملک کے باشندوں نے مل کر بنائی ہے وہی اپنی پسند و ناپسند سے اس کے ذخیرے میں کمی و بیشی کرنے کے حقدار ہیں اور ضروریات خود بخود ان کو زبان میں اصلاح کرنے کے لئے نامعلوم طریقے پر مجبور کرتی ہیں۔ زبان کس طرح بنتی اور اصلاح پذیر ہوتی ہے اس کا حال ہر ملک کی زبان کی تاریخ سے مل سکتا ہے۔ زبان بننے کے عام اصول یہ ہیں کہ الفاظ کا ذخیرہ مختلف ذرائع سے وصول ہوتا رہتا ہے۔ کچھ الفاظ گھڑے جاتے ہیں کچھ الفاظ دوسری زبانوں سے لیکر اپنے کر لئے جاتے ہیں۔ جو الفاظ گھڑے جاتے ہیں ان کا موجد اکثر ایک واحد شخص ہوتا ہے۔ اور سب سے پہلے وہ اس لفظ کو معرض ظہور میں لاتا ہے۔ یعنی اپنے کلام میں اس طرح استعمال کرتا ہے کہ اس کا مفہوم سمجھ میں آ جائے لیکن وہ لفظ اس وقت تک زبان کا حصہ نہیں بنتا جب تک کہ وہ لفظ مقبول خلائق نہ ہو جائے۔ ایسے گھڑے ہوئے بہت سے لفظ تھوڑے دن چلتے ہیں اور اگر ان کو مقبول عام ہونے کا شرف حاصل نہیں ہوتا تو وہ خود بخود متروک ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر مقبول ہو جاویں تو خود بخود زبان میں داخل ہو جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے

[illegible]
کے ... میں داخل ہونے کے لئے کسی جبر و تشدد کا کام نہیں ہے۔ ہر ز...
میں خود بخود تبدیلی ہوتی ہے جسکو اصلاح کہا جاتا ہے۔ اُردو میں بھی تما...
تغیر ہوا ہے۔ دکنی کی زبان کو آج کل کی زبان سے ملائیے کتنا فرق ہوگا۔ تاریخ اُردو کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ کس طرح اُردو زبان... دور میں سے گذری اور کتنے لفظ متروک ہوئے اور کتنے لفظوں کے معنی ... فرق آگیا۔ یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ موجودہ اُردو میں انگریزی زبان... الفاظ تو کثرت سے نہیں آئے۔ گو بہت سے موجود ہیں۔ لیکن مغربی خیال ترجمانی میں ایجاد بندہ کی بہت کچھ کارفرمائی ہو رہی ہے چنانچہ نئے ادب حامی مغربی خیالات کو نئے ادب میں داخل کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور... اظہار کے لئے لفظوں کو نئے نئے معنی پہنائے جاتے ہیں طرز ادا بھی ... سے خالی نہیں۔ نئے نئے جملے ایجاد ہو رہے ہیں۔ غرضکہ فی زمانہ اُردو ز... میں ایک عجیب ہیجان ہے گویا کہ ایک نئے دور کی طیاری ہے۔ مگر ز... کبھی مشین کی بنائی ہوئی مقبول نہیں ہو سکتی۔ نیا ادب اپنا تخمین ہے ... لے رہا ہے۔ یہ دور ختم ہو جانے پر معلوم ہوگا کہ نئے ادب کے کتنے ... اور کتنے فقرے زبان زد خلائق ہوئے۔ جو زبان لوگ منظور کرلیں وہی مستند ہو جاتی ہے۔ اُردو میں بھی یہی ہو رہا ہے اور یہی ہوگا۔ ... زبان کے پرستار بھی اپنی کوشش کرلیں۔ کوشش کرنا اصلاح پسند... کام ہے۔ اس کی کامیابی یا ناکامی زبان بولنے والوں اور استعمال کر... والوں کی پسند یا ناپسند پر ہے۔ اور اس کے لئے وقت چاہیئے۔

زبان کا ذخیرہ درختوں کے ذخیرے کی طرح ہوتا ہے جہاں ... سے ہر قسم کے درخت اور پودے ہوتے ہیں۔ اس ذخیرے کی اندھیری گنجان آبادی کو دیکھکر دہشت ہوتی ہے۔ لیکن اس وحشت کا نتیجہ ہونا چاہیئے کہ درختوں کی چھٹائی اس طرح کر دی جائے کہ ذخیرے میں ... ہو جائے۔ یہ تو جیسا ہے ویسا ہی رہے گا۔ اب یہ مالی کا کام ہے کہ وہ باغ کو خوبصورت بنانے کے لئے کون کون سے پودے پسند کرتا ہے۔ ا... مالی ایک قسم کے پودے پسند کرتا ہے باقی کو بیکار سمجھتا ہے۔ مگر وہ بیکار کسی دوسرے مالی کے لئے وہ پودے نہایت ضروری ثابت ہونگے۔ اسی طرح زبان کے لفظی ذخیرے میں ہر قسم کے لاتعداد لفظ موجود ہونے چاہئیں ادیبوں کا کام ہے کہ وہ اپنی پسند کے موافق اس ذخیرے میں سے جو لفظ پسند کا چاہیں نکال کر استعمال کریں۔ لیکن یہ حق کسی کو حاصل نہیں ہے ...

اس ذریعے سے صرف اپنی ہی پسند کے لفظ رکھکے باقی کا خاتمہ کردے اس سے زبان کی قوت اور اہمیت کا بھی خاتمہ ہو جائیگا۔ جس طرح قومیں قوت کے بل پر عروج حاصل کرتی ہیں اور غارت ہونے سے محفوظ رہتی ہیں اسی طرح زبان بھی اپنی قوت ہی کی بدولت نام حاصل کر سکتی ہے۔ اور اپنی زندگی کو طویل کر سکتی ہے۔

سب سے بہتر اور قوی زبان وہی ہے جس میں الفاظ کی اس قدر فراوانی ہو جائے کہ ایک معنی کے اظہار کے لئے کئی کئی لفظ ہوں۔ یعنی جس میں مترادفات کی بھرمار ہو۔ ایسی زبان والوں کو نہ صرف اپنے خیال کے اظہار کرنے میں ہی سہولیت رہتی ہے کہ ایک لفظ نہ یاد آیا تو دوسرا لفظ فوراً استعمال کر دیا بلکہ ایک ہی خیال کو کئی طرح سے اور مختلف لفظوں میں بیان کرنے سے کلام میں زور آجاتا ہے اور وہ خیال سامعین کی سمجھ میں اس طرح آجاتا ہے کہ وہ کبھی اسے بھولتے ہی نہیں۔ فصاحت و بلاغت کا محض یہی گر ہے کہ لفظوں کے صحیح اور موثر ترتیب و استعمال سے سامعین کو مسحور کر لیں۔ اور زبان میں مترادفات کی کثرت اسی طرح ہو سکتی ہے کہ کسی غیر ملکی مسافر کیلئے کوئی روک نہ ہو اور جب وہ آجائے تو اسکو بے تعصبی کے ساتھ اپنا بنا لیا جائے۔ کون سی زبان ہے جس میں غیر ملکی لفظ یا مترادفات نہیں ہیں۔ انگریزی میں بہت کچھ تبدیلی ہوئی ہے اور بہت غیر ملکی الفاظ اپنی عمر پوری کر چکے۔ لیکن پھر بھی بہت سے مترادفات ایسے ملیں گے جو فرانس، ہالینڈ، سویڈن، جرمنی یا روم سے آئے ہوئے ہیں۔ لفظوں کا مطالعہ اس قدر دلچسپ اور مفید ہے کہ اس کے بعد لفظوں سے اس قدر محبت ہو جاتی ہے کہ ناکارہ سے ناکارہ لفظ کو بھی کسی نہ کسی خیال سے قائم رکھنے ہی کو جی چاہتا ہے۔

اس سلسلے میں لفظوں کی زندگی پر تھوڑی سی روشنی ڈالنی خالی از دلچسپی نہ ہوگی۔ لفظ بھی انسانوں کی طرح اپنا وطن اور خاندان رکھتے ہیں۔ بعض لفظ نجیب ہوتے ہیں۔ بعض میں میل ہو جاتا ہے۔ لفظوں کی شکل سے انکا وطن معلوم ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک ہی معنی کے دو لفظ یا تین لفظ ہیں جیسے ابا۔ والد۔ پتا۔ پدر۔ ابا عربی ابو سے ہے۔ والد بھی عربی ہے۔ پتا اور پدر سنسکرت سے نکلے ہیں۔ اگر زبان میں یہ چاروں لفظ رہیں تو زبان کی قوت قائم رہتی ہے اور کسی کا کوئی ہرج نہیں۔ جو شخص چاہے عربی کا لفظ استعمال کرے جو چاہے فارسی یا سنسکرت کا۔ سنتے سنتے ہر شخص بغیر مدرسے میں پڑھنے کے چاروں لفظوں کا مالک ہو جائے گا۔

لفظوں کا مرتبہ بھی ہوتا ہے اور شاہی قوم کے الفاظ کو زیادہ عزت حاصل ہے۔ مثلاً باپ کے مقابلے میں والد کو زیادہ عزت ہے۔ عموماً لوگ بری چیز کا نام بھی شاہی زبان میں دیکر اس کے عیب کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً رنڈی یا بازاری عورت کو طوائف یا عصمت فروش کہتے ہیں۔ رنڈی ہندی لفظ ہے اس کے معنی محض عورت کے ہیں۔ چنانچہ فسانۂ عجائب میں اکثر یہ لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ مگر گردش زمانہ سے اب اس کے معنی بہت خراب ہو گئے ہیں۔ اسی معنی کا ایک اور ہندی لفظ ہے کنچنی۔ کنچن کے ہندی معنی ہیں زر کے۔ کنچنی یعنی وہ عورت جو زر پر اپنی عصمت کو نثار کردے۔ عربی میں ایسی عورت کو "بنت الہوا" یعنی ہوس کی بیٹی کہتے ہیں۔ اس پیشے کی عورتوں میں رام جنی کے لفظ کو زیادہ عزت حاصل ہے۔ حالانکہ معنی اس لفظ کے صاف ہیں کہ بے باپ کی اولاد۔ مسمات۔ مستورات۔ عورت۔ خانم بیگم۔ یہ سب لفظ ہم معنی ہیں۔ مگر ان میں کچھ نہ کچھ فرق ضرور ہے۔ مسمات گھٹیا و ذلیل درجے کی عورت کے لئے استعمال کیا جاتا ہے جیسے کسی عورت کو دیکھکر سوال کیا جائے کہ یہ کون مسمات ہیں؟ اسی طرح گنوار شخص اپنی بیوی کو سادگی کے ساتھ عورت کہتا ہے۔ عزت دینے کیلئے بیوی کی بجائے زوجہ، اہلیہ، اہل خانہ کہا جاتا ہے۔ یہ سب پرانے شاہی الفاظ ہیں۔ بیگم اور خانم ہم معنی ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ بیگم بیگ کی تانیث ہے اور خانم خاں کی۔ ہندوستان میں چونکہ مغلوں کا راج رہا اس لئے خانم کے مقابلے میں بیگم کو زیادہ عزت ہے۔ اب چونکہ انگریزی حکومت ہے اس لئے مسز اور وائف کا لفظ زیادہ عزت دار سمجھا جاتا ہے۔ ترکی زبان میں خانم کو خانوم کہتے ہیں اور یہ عزت دار عورت کا خطاب ہے۔ لفظوں میں سیاست۔ مذہب۔ اخلاق اقتصادیات و معیشت سب پنہاں ہوتی ہیں۔ نادر گردی، سکھاشاہی، مغلائی تینوں لفظ ہم معنی ہیں۔ جن سے نادر شاہ، سکھوں اور مغلوں کے راج پر روشنی پڑتی ہے۔ مغلائی کا لفظ دکن میں استعمال ہوتا ہے۔

بعض لفظ بے عزت ہو گئے ہیں جیسے لاحول دلا یا لاحول بھیجنا۔ لاحول ولاقوت الا باللہ مسلمانوں کے لئے ایک سہارا تھا کہ وہ خدا کے سوا کسی غیر قوت سے نہ ڈرتے تھے۔ اس کلمہ کے معنی ہیں کہ اللہ کی قوت کے سوا کسی سے نہ ڈرو۔ یعنی شیطان کے جب وسوسے آویں تو لاحول ولاقوت کہکر اپنی اخلاقی قوت کو بڑھاؤ۔ مگر اب لاحول کے معنی لعنت کے ہو گئے ہیں۔ اسی طرح حضرت و پیر و مرشد کی مٹی خراب ہوئی ہے۔ یعنی جب یہ کہا جائے کہ فلاں شخص بڑے حضرت یا ذات شریف یا پیر و مرشد ہیں تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ بڑے چالاک ہیں۔ اسی طرح کنہیا کا نام اب ایک فضول خرچ عیش پسند شخص کے متعلق استعمال ہوتا ہے۔ ازبک ایک بہادر پہاڑی قوم ہے بابر کو چونکہ اس قوم نے مار کر فرغانے سے بھگا دیا تو اس کی اولاد ازبک کو بڑا ذلیل

سمجھنے لگے اور ازبک کے معنی گنوار، بدتمیز اور احمق کے ہو گئے۔ بعض معمولی لفظوں کو غیر معمولی عزت حاصل ہو جاتی ہے۔ جیسے لفظ معراج یا براق۔ ہندستان میں آنے سے قبل ایرانی مسلمان ہندو کو چور سمجھتے تھے، کافر بے دین سمجھتے تھے۔ بت کو توڑ ڈالتے تھے۔ جب ہندستان فتح کر لیا اور یہاں آن بسے تو ہندو کافر وبت معشوق کے ہم معنی ہو گئے۔ شاہجہانی عمارت کے معنی وسیع و پختہ دیرپا عمارت کے ہیں اس سے شاہجہاں کے شوق پر روشنی پڑتی ہے۔ اورنگ زیبی وہ پھوڑا ہے جو ایک دفعہ چمٹ جائے تو پھر چھوٹتا ہی نہیں۔ اس سے اورنگ زیب کے عزم بالجزم کا حال معلوم ہوتا ہے۔ جہانگیری سے نورجہاں کو سزا دیئے جانے کا واقعہ معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر ایک دفعہ دربار کر رہا تھا اور حسب دستور نورجہاں پردے کے پیچھے بیٹھی تھی۔ جہانگیر نے کسی قصور پر اسکے بھائی کو سزا کا حکم دیا تو نورجہاں نے ایک دو ہتڑ بادشاہ کو رسید کیا کہ میرے بھائی کے ساتھ یہ سلوک۔ بادشاہ نے فوراً حکم دیا کہ یہ عورت ہم کو انصاف سے روکتی ہے اس کے ہاتھ قلم کر دیئے جائیں۔ حکم کی تعمیل لازمی تھی مگر صرف اتنا ہوا کہ چاقو سے ہاتھوں پر ایسا نشان کر دیا جس سے خون جھلک آئے اور سونے کا پترہ اس پر چڑھا دیا جس میں چھید تھے۔ یہ سونے کا پترہ بعد میں زیور بن گیا۔

لفظوں سے تجارت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے۔ جیسے دیبائے روم۔ شمشیر ہندی۔ کاٹھیاواڑی گھوڑے۔ ناگوری بیل۔ بعض لفظوں سے شاعری ٹپکتی ہے۔ جیسے سورج مکھی کا پھول۔ ہمالیہ یعنی برف سے لدی ہوئی جگہ۔ پٹ بیجنا۔ چھوئی موئی۔ گنگا جمنی وغیرہ وغیرہ۔

بعض لفظ ایسے اردو میں مستعمل ہیں جو فارسی کے ہیں مگر سخت سے سخت اردو کا دشمن بھی ان کو خوشی سے استعمال کرتا ہے۔ اور شاید نکالنے کا خیال بھی نہیں کرتا۔ مثلاً بہت سی مٹھائیوں کے نام جیسے قلاقند۔ برفی (مثل برف) رس گلہ۔ جلیبی جو اصل میں زلیبی تھا۔ لڈو جو اصل میں لدو ہے جس کے معنے گولے کے ہیں۔ لوزات وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح بعض پھل اور میوے ہیں جو باہر سے آئے ہیں۔ مثلاً انگور، انار، بادام، پستے، کشمکش وغیرہ آلو کو بمبئی میں بٹاٹا کہتے ہیں۔ انگریزی میں پوٹیٹو۔ اصل میں یہ امریکہ سے آیا جہاں اسے بٹاٹا کہتے ہیں۔ اسی طرح موسمبی ایک موزمبیق (افریقہ) کی نارنگی ہے پپیتا کو امریکہ سے آیا ہوا ہے۔ مگر اب ہندو مسلمان سب ان چیزوں کو استعمال کرتے کرتے ان کے ایسے عادی ہو گئے ہیں کہ ان سے نہ نفرت ہے نہ ان کو ہندستان سے نکالنے کا خیال آتا ہے۔ تو پھر کیا وجہ ہے کہ ان غیر ملکی الفاظ کو جنھیں ہم ہندو مسلمان سینکڑوں برس سے استعمال کرتے چلے آئے ہیں اور اب ان کے عادی ہو گئے ہیں، ہماری زبان سے نکال دیا جائے۔ البتہ نئے الفاظ کو خواہ مخواہ زبان میں نہ لایا جائے۔ لیکن اس کا فیصلہ خود بولنے والے کر لیا کرتے ہیں کہ لفظ پسند آیا تو رواج پا گیا ورنہ غائب ہو گیا۔ رہا زبان کا نام۔ اب اسے ہندی کہو ریختہ کہو۔ اردو کہو ہندستانی کچھ کہو۔ مگر جب تک ضروریات باہمی موجود ہیں۔ یہ زبان ہماری زبان رہیگی اور کوئی اسکو مٹا نہیں سکتا۔ ہاں اسکی صورت بگاڑی جا سکتی ہے اور اسے کمزور کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس سے کسی کو کیا ملے گا۔ رہا سکرپٹ کا سوال تو بچوں کے لئے کوئی چیز مشکل نہیں البتہ بڑے طوطوں کے لئے رعایت کرنی پڑے گی۔

سُنو!

(از محترمہ حجاب عبدالرحمٰن عباسی)

تم کو کہانی اپنی سُناؤں اگر سُنو
حالِ دلِ شکستہ بتاؤں اگر سُنو
مدت سے ہے بجھی ہوئی اُمید کی شمع
پھر اک نیا چراغ جلاؤں اگر سُنو
منت کشِ بہار بنوں ایک بار پھر
پھولوں سے اپنی بزم سجاؤں اگر سُنو
ہو جائیں ختم سلسلے یہ آلام روزگار
دُنیائے دل میں پھر سے بساؤں اگر سُنو
رہتا ہو عطر بیز جو تاروں کی چھاؤں میں
اُس راستے سے تم کو بُلاؤں اگر سُنو
روتی رہوں، سُنو نہ حدیثِ حجاب اگر
یوں ہی تمام عمر میں گاؤں اگر سُنو

شہروں میں حفظانِ صحت کا انتظام

(از واحدی)

میونسپلٹیاں جو جو کام انجام دیتی ہیں اُن کی فہرست بنائی جائے تو خاصی لمبی فہرست بن سکتی ہے۔ مگر سب کاموں سے زیادہ بڑا اور اہم کام میونسپل کمیٹیوں کا شہروں میں حفظان صحت کا انتظام ہے۔ بلکہ میں تو کہونگا کہ حفظان صحت اصل مقصود ہے اور باقی کام قریباً حفظان صحت ہی کے حصول کی خاطر کئے جاتے ہیں۔

پرائمری تعلیم میونسپل کمیٹیاں اس لئے دیتی ہیں کہ ناخواندہ کی نسبت خواندہ کسی نہ کسی قدر حفظان صحت کا خیال کریگا۔

مکان بنانے والوں کے ساتھ چھت کی اونچائی۔ صحن کی کشادگی۔ گلی کی چوڑائی وغیرہ کی پابندیاں بواسطہ لگائی جاتی ہیں کہ ایسے مکانوں میں رہنے سے صحت خراب نہیں ہوتی۔

ٹیکس بھی یہ سوچ کر لگائے جاتے ہیں کہ روپیہ آئیگا تو سڑک پکی کرینگے اور پھر خاک اڑنی موقوف ہوجائیگی۔ نالیاں اور نالے بنائیں گے جن کے ذریعہ گندا پانی نکل جائیگا اور شہر میں بہتا بہتا نہ پھریگا۔

خاک اُڑنے اور کیچڑ رہنے سے بیماری پھیلتی ہے۔

اسی طرح میونسپل کمیٹیوں کے اور کارناموں پر غور کرتے چلے جائیے۔ معلوم ہوگا گویا حفظان صحت مرکز ہے اور اُس کے گرد میونسپل کمیٹیوں کی ہر قسم کی آمدنی اور میونسپل کمیٹیوں کے ہر قسم کے خرچ چکر کاٹ رہے ہیں۔ حقیقۃً زندگی سے سارے میلے ہوا کرتے ہیں۔ زندگی نہیں تو کچھ نہیں۔ اور زندگی صحت و تندرستی کا نام ہے۔

بڑے بڑے شہروں کی میونسپل کمیٹیاں حفظان صحت کا اہتمام کیونکر کرتی ہیں اور کیا کیا اہتمام کرتی ہیں۔ لیجئے آپ میونسپل کمیٹی دہلی کی مثال سے سمجھئے۔ دہلی کی میونسپل کمیٹی نے حفظان صحت کا مستقل محکمہ قائم کر رکھا ہے۔ یہ ایک اعلےٰ درجہ کے ڈاکٹر کے سپرد ہے جو ہیلتھ افسر کہلاتا ہے۔

گھروں کی صفائی گھر والے خود کراتے ہیں لیکن میونسپل کمیٹی دہلی نے حالات کا لحاظ رکھکر صفائی کا ایک معیار قرار دیدیا ہے۔ اس کے مطابق وہ گھر والوں سے گھروں کی صفائی کا مطالبہ کرتی رہتی ہے۔

پُرانی مثل ہے "محتسب را درون خانہ چہ کار" اپنے گھر میں کوئی کچھ کیا کرے کسی کو پوچھ گچھ کا حق نہیں ہے۔ لیکن میونسپل کمیٹی کہتی ہے کہ گھروں میں اول تو آپ ہی کو خود کشی کیوں کرنے دی جائے۔ دوسرے آپ کو کیا حق ہے کہ اپنا گھر گندا رکھکر پڑوسی کو بیمار ڈال دیں۔ آپ کی وجہ سے پڑوسی غریب کیوں مرے۔

گھر کے لئے میونسپل کمیٹی دہلی کا قانون ہے کہ اتنی زمین پر بنایا جائے تو اس کا اتنا حصہ صحن کے واسطے چھوٹے اور اتنے پر عمارت بنے۔ چھت اس قدر بلند ہو۔ دیواروں میں اتنے روشندان ہوں۔ گھر یک منزلہ ہے تو گلی یا سڑک اتنی رہنی چاہیئے۔ دو منزلہ ہے تو اتنی۔ سہ منزلہ ہے تو اتنی۔ پھر کئی کئی خاندان ایک گھر میں بسیں تو تعداد مقرر ہے کہ اتنی زمین پر اتنے آدمی بس سکتے ہیں۔

غرض جہانتک کاغذی کارروائی کا تعلق ہے روشنی اور ہوا لینے پر میونسپل کمیٹی دہلی نے ہر دہلی والے کو مجبور کر دیا ہے

گھروں کے استعمال شدہ اور گندے پانی کا گلیوں اور سڑکوں تک پہنچانا بھی گھر والوں کا فرض ہے۔

گھروں میں کیچڑ ہو یا گھروں کے بیتخلانے سڑیں تو گھر والے پکڑے جاسکتے ہیں۔ مگر گھر سے نکلتے ہی میونسپل کمیٹی کی عملداری شروع ہوجاتی ہے۔ شہر میں جگہ جگہ غلاظت کے ڈلاؤ ہیں۔ حلال خوریاں گھروں کی غلاظت اور گھروں کا کوڑا کرکٹ وہاں سے جاکر ڈال دیتی ہیں اور وہاں سے میونسپل کمیٹی کی بیل گاڑیاں اور موٹر لاریاں یہ غلاظت وغیرہ فراشخانہ کے پاس اسی کام کے لئے ریلوے ٹرین کھڑی رہتی ہے اُس میں جا ڈالتی ہیں اور ٹرین اُسے دہلی سے دور پھینک آتی ہے۔ گلی اور سڑکوں کا کوڑا کرکٹ ٹین کے ٹبوں میں پڑتا ہے۔ ٹین کے ٹب سینکڑوں تو میونسپل کمیٹی رکھواتی ہے اور سینکڑوں اُن دُکانداروں کو رکھنے پڑتے ہیں جن کی دُکان کے آگے کوڑا کرکٹ ہونا لازمی ہے۔ جیسے حلوائی کہ لوگ ان کی دکانوں پر کھڑے ہوکر دودھ پیتے ہیں اور حلوہ کھاتے ہیں۔ اور آبخورے اور پتے حلوائی کے ٹب میں پھینک دیتے ہیں۔ آبخورے اور پتے بکھرے بکھرے نہیں پھرتے۔ ان تمام ٹبوں کا اندوختہ بھی غلاظت کی ٹرین پر بھیجا جاتا ہے۔ گھروں کا استعمال شدہ اور گندا پانی کھلی نالیوں اور بند نالوں کے ذریعہ شہر سے باہر بہت فاصلہ پر جاکر چھوڑا جاتا ہے۔

محلوں اور بازاروں میں دہلی میونسپل کمیٹی نے پانی کے پاخانے اور پانی کے پبلک پیشاب خانے بنائے ہیں تاکہ گندگی کے آثار گادوں کی

کی مانند دہلی میں جگہ جگہ نظر نہ آئیں۔

دہلی چھ مربع میل میں آباد ہے اور اس کی مردم شماری پونے چار لاکھ ہے۔ نئی دہلی اور نوٹیفائڈ ایریا اس ذکر میں شامل نہیں ہیں۔

دہلی کے چھ مربع میل رقبہ کو حفظانِ صحت کی غرض سے سولہ علاقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور پھر ان سولہ علاقوں کے چالیس حصے کر دئیے ہیں۔ اس ایک حصہ کا ایک ایک داروغہ صفائی ذمہ دار ہے۔ جس کے نیچے بہت سے مہتر گلیوں اور سڑکوں پر جھاڑو دیتے ہیں اور گندگی کے ڈلاؤ اور کوڑے کرکٹ کے ٹب صاف کرتے ہیں۔ اور بہت سے مہتر اور سقّے نالیاں دھلاتے ہیں۔ چھ سینیٹری انسپکٹر ان داروغاؤں کی نگرانی پر تعینات ہیں۔ اور دو چیف سینیٹری انسپکٹر آدھے آدھے شہر کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ چیف سینیٹری انسپکٹر کے اوپر اسسٹنٹ ہیلتھ افسر ہے اور پھر ہیلتھ افسر۔

دہلی کا محکمہ حفظانِ صحت کوشش کر رہا ہے کہ جلد از جلد دہلی کے زیادہ سے زیادہ گھروں میں پانی کے بیت الخلاء (؟) ہو جائیں تاکہ غلاظت کے ڈلاؤ ٹوٹ سکیں اور حلال خوریاں جو چوری چھپے ان کوڑے کرکٹ کے ٹبوں میں غلاظت ڈال دیتی ہیں۔ ان کے جرم میں کمی آئے۔

غلاظت کے ڈلاؤ شہروں میں گاڑوں کی کوٹھریوں جیسے نہیں ہوتے لیکن شہروں کے لئے سب سے بڑی مصیبت یہی ہیں اور حلال خوریوں نے ٹبوں کو ڈلاؤ کی طرح استعمال کر کر کے اس مصیبت کو اور بڑھا دیا ہے۔

دہلی کے سارے گھر پانی کے بیت الخلاء (؟) بنا لیں تو ایک مصیبت کا خاتمہ ہو جائے۔ صرف کوڑا کرکٹ رہے، سو اسے موٹر لاریاں جھٹ پٹ لے جا سکتی ہیں۔ اور شہر چوبیس گھنٹے پاک صاف اور صاف شفاف رہ سکتا ہے۔

گھروں کی اور گلیوں کی اور سڑکوں کی اور بازاروں کی صفائی کے بعد محکمہ حفظانِ صحت گھروں میں آنے والی کھانے پینے کی چیزوں کا خیال کرتا ہے کہ وہ مضرِ صحت نہ ہوں۔

گھی۔ دودھ۔ مٹھائیاں۔ پھل۔ ترکاری۔ گوشت۔ انڈے۔ مچھلی نل کا پانی۔ سوڈا، لیمن اور بھوجنالوں، ڈھابوں اور نانبائیوں کے ہاں کے کھانے سب دیکھے جاتے ہیں۔

ایک لیبوریٹری ہے جہاں دودھ کی دکانوں سے دودھ۔ گھی کی دکانوں سے گھی۔ محلہ محلہ سے نل کا پانی۔ واٹر فیکٹریوں سے بوتلوں کا پانی نمونۃً لیا جاتا ہے اور اس کا امتحان ہوتا ہے۔ پھل، ترکاری، مٹھائیاں، انڈے، مچھلی جہاں سڑے گلے ملتے ہیں وہیں ضائع کر دئیے جاتے ہیں۔

گوشت کی اچھائی برائی کا مذبح خانوں ہی میں اندازہ لگا لیا جاتا ہے۔ اور دکانوں پر گوشت جب آتا ہے جب کمیٹی کا ڈاکٹر اس پر مہر ثبت کر دیتا ہے۔

بو دار اشیاء کی دکانیں اور دھواں اڑانے والے کارخانے آبادی کے کناروں پر سرکائے جاتے ہیں۔

چوہے پکڑنے اور کتے مارنے کا بھی میونسپل کمیٹی دہلی نے زبردست اہتمام کر رکھا ہے۔ چوہوں سے طاعون پھیل جانے کا اندیشہ رہتا ہے اور کتے کے کاٹنے سے بعض اوقات آدمی کو بڑے بڑے نقصان پہنچ جاتے ہیں۔

کتے کے کاٹے کا علاج کرنے کے لئے دہلی میں ایک شفاخانہ بھی ہے
چیچک کا ٹیکہ ہر شخص کے ضرور لگایا جاتا ہے۔ اور دوسرے ٹیکوں کا بھی انتظام ہے۔

ہاں دہلی میونسپل کمیٹی میں ایک لیڈی اسسٹنٹ ہیلتھ افسر بھی ہے۔ جس کے ماتحت زچاؤں اور بچوں کی صحت درست رکھنے کیلئے شہر کی مختلف آبادیوں میں گیارہ سینٹر ہیں۔ جہاں ہیلتھ وزیٹرز۔ نرسیں اور دائیاں ہر وقت خدمت کو موجود ملتی ہیں۔

جن دودھ پینے والے بچوں کی مائیں مر جاتی ہیں یا جن کی مائیں کسی متعدی مرض میں مبتلا ہوتی ہیں ان کی تندرستی بچانے کا بھی میونسپل کمیٹی دہلی نے چھوٹے سے پیمانے پر کام شروع کیا ہے۔ اور فی الحال دس سینٹروں میں سے ایک سینٹر میں اُن کے رہنے کیلئے مکان کا کچھ حصہ وقف کر دیا ہے۔ بچے اگر امیروں کے آتے ہیں تو ان سے خرچ لیا جاتا ہے۔ اور غریبوں کے آتے ہیں تو اُنہیں ایک پیسہ بھی نہیں دینا پڑتا۔

بچہ خانے کے علاوہ میونسپل کمیٹی دہلی زچہ خانہ بھی کھولنے والی ہے زچہ خانے کے کھلنے سے زچگی کے وقت کے خطرات سے عورتیں حتی الامکان نجات پائیں گی۔

درماندہ لوگوں کے بچوں کو پرائمری سکولوں میں دودھ وغیرہ دیا جاتا ہے۔ اس سے اُن کی صحت پر اچھا اثر پڑ رہا ہے۔ تمام پرائمری سکولوں کے طلباء کا چلتا ہوا سا طبی معائنہ بھی ہوا کرتا ہے۔ میونسپل کمیٹی دہلی نے حال ہی طے کیا ہے کہ یہ معائنہ آئندہ کامل توجہ سے اور بڑے پیمانے پر ہو۔

گندی سندی آبادیوں اور گنجی پیچ آبادیوں کی اصلاح کا فرض Improvement Trust ادا کر رہا ہے۔ لیکن میونسپل کمیٹی بھی کئی آبادیاں درست کر چکی ہے۔ اور اب بھی کسی نہ کسی قدر کرتی ہے شہر کا رقبہ بڑھا بڑھا کر لوگوں کو دور دور پھیلایا جا رہا ہے۔ مزدور پیشہ طبقہ

کے لئے پہلے سے بہتر مکانات ملنے کی صورتیں پیدا کی جا رہی ہیں۔ میونسپل کمیٹی دہلی نے امپرومنٹ ٹرسٹ کو بعض ایسی سڑکیں نکالنے کا مشورہ دیا ہے کہ ان سے بھی شہر کھلا کھلا ہو جائے گا۔

یہ سب صورتیں شہر والوں کی صحت درست رکھنے کی خاطر کی جا رہی ہیں۔ مگر ہندستان کے کسی شہر میں شہر والوں کو اپنی اور اپنے پڑوسیوں کی اور اپنے ہم وطنوں کی صحت کا خود اتنا فکر نہیں ہے جتنا شہر والوں کو ہونا چاہیئے اور جب تک شہر والے یہ فکر نہ کریں گے، میونسپل کمیٹیاں قانون اور قاعدہ کا زور کہاں کہاں دکھا سکتی ہیں۔ ہر روز دیکھا جاتا ہے کہ ادھر کمیٹی کا مہتر گلی کی جھاڑو دیکر ہٹا اور ادھر کسی نے آموں کی گٹھلیاں ڈالیں۔ کسی نے ترکاری کے چھلکے اور کسی نے رات کی باسی دال۔

گھر بناتے وقت تعلیم یافتہ سے تعلیم یافتہ اور دولتمند سے دولتمند شہری یہ چاہتا ہے کہ اُسے قانونوں اور قاعدوں سے مستثنیٰ کر کے خودکشی کرنے یا دوسروں کو مارنے کا لائسنس دیدیا جائے۔

پانی کے پیچا نے بنانے سے بڑے بڑے مالدار کرایہ خوار گھبرا تے ہیں۔ گندی سیندی حالت میں اور گھچ پیچ رہ کر مرنا قبول ہے۔ لیکن کبھی گھچ پچ آبادی کو کھلا کھلا کرنے کا خیال کسی میونسپل کمیٹی کو آ جائے تو میونسپل کمیٹی کے ممبرل کا گلا گھونٹنے کے لئے خلقت ٹوٹ پڑتی ہے۔

دہلی کا دریبہ والا علاقہ تعلیم یافتہ اور دولتمندوں کا علاقہ ہے وہاں پچھلے سال صرف گھچ پچ آبادی کی وجہ سے دہلی کے نیض بازار والے کھلے کھلے علاقہ کی نسبت تگنی موتیں ہوئیں۔ مگر دریبہ کے کسی کوچے کو کشادہ کرنے یا دریبہ میں سے کسی سڑک کے نکلنے کا وقت آنے دیجے اور دیکھئے کیسا شور مچتا ہے۔

گھی، دودھ اور پھل، ترکاری کی دکانوں پر میونسپل کمیٹی کی وردی اور چپراس کے بغیر کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تم خراب چیزیں بیچ رہے ہو۔ خود خریدار دکاندار کی مدد کو آستینیں چڑھا لیتے ہیں۔ خریدار ہی زہر کھانے کو تیار رہے تو دکاندار کیسے امرت بیچ سکتا ہے۔

لوگ صحت کی نعمت سے بچنے کے لئے خوشامدیں بھی کرتے ہیں اور رشوتیں بھی دیتے ہیں۔

تاہم ایک نہ ایک دن۔ اُمید ہے کہ ہندستان کے شہریوں ہی کو نہیں، قصباتیوں اور دیہاتیوں کو بھی اتنا احساس ہو جائیگا کہ وہ حفظان صحت کے محکموں کا ہاتھ بٹائیں گے۔

اپنے اپنے گھروں کے ہیلتھ افسر تو تم آج ہی سے بن جاؤ۔ گھر میں کوئی حرکت حفظان صحت کے خلاف دیکھو تو اُسے روکو، اپنے ہاتھ سے دور کر سکتے ہو تو اُسے اپنے ہاتھ سے دور کرو۔ گھروں میں پینے کے پانی کی پاکیزگی بہت ضروری چیز ہے۔ گھی، دودھ خالص میسّر آنا دشوار ہو گیا ہے۔ لیکن سب اتفاق کر لیں کہ لیں گے تو اصلی گھی، دودھ لیں گے۔ ورنہ نہیں لیں گے۔ تو پھر خالص گھی دودھ ملے گا اور ضرور ملے گا۔ بازار میں وہی شے بکتی ہے جس کی مانگ ہوتی ہے۔

گھروں کے اندر استعمال شدہ اور گندا پانی ہرگز نہ رُکنا چاہیئے اور ایک ایک قطرہ اس کا باہر کمیٹی کی نالی یا نالے میں چلا جانا چاہیئے۔

گھروں میں کھڑکیاں اور روشندان پھڑوا کر قدرتی روشنی اور قدرتی ہوا جتنی حاصل کر سکتے ہو حاصل کرو۔

گھر کے کمرے دالان ایک دن صاف نہ ہوں تو مضائقہ نہیں ہے۔

گھروں کے بیت الخلاء دن میں دو تین وقت دھلنے چاہیئں۔ حلال خوری کو اُجرت دینے میں کنجوسی کرنا اپنے اوپر آپ ظلم کرنا ہے۔

ایک ایک گھر اور ایک ایک دُکان اپنی اپنی جگہ ٹھیک ہو جائے تو بس پھر سارا شہر ٹھیک ہے۔

گھروں اور دکانوں کے مجموعے ہی کو تو شہر کہتے ہیں۔

گھر اور دکانیں ہوا دار ہیں تو گویا شہر کا شہر ہوا دار ہے۔

شہر کو ٹھیک کرنے میں پورے شہر کو حصہ لینا چاہیئے۔ اور حصہ رس شہر کے لئے کچھ قربان کر کے حصہ لینا چاہیئے۔ حصہ رس اس کا فائدہ تو ملے گا۔

میونسپل کمیٹیوں کے تنخواہ دار ملازم شہروں کو اتنا عمدہ نہیں بنا سکتے جتنا شہروں کے نوجوان والنٹیروں کی طرح کام کر کے بنا سکتے ہیں۔

جس قوم میں قوم کی قوم فوج ہوتی ہے جنگ میں وہی جیتا کرتی ہے۔

(منشور از نشرگاہ دہلی)
دسمبر ۱۹۳۸ء

مولانا شبلی اور انکی سیرت نگاری

(از جناب علیم اللہ صاحب صدیقی جامعی)

علامہ شبلی کا زمانۂ حیات ۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک رہا۔ دوسرے الفاظ میں ہندستان کے قہر و غضب ۱۸۵۷ء میں اُن کی پیدائش ہوئی۔ ۱۹۱۴ء میں جب مغرب میں جنگ عظیم کا ہنگامہ برپا تھا۔ انہوں نے وفات پائی زندگی کے اس سفر میں علامہ شبلی بھی دوسرے مصنفوں کی طرح معاشرتی احول اور خارجی حالات سے متاثر ہوئے۔ پھر انہیں حیات کو زبان قلم سے بیان کر دیا۔

اس تمہید کے بعد ہم علامہ شبلی کے معاشرتی ماحول اور اس کے اثرات کا سرسری جائزہ لیتے ہیں۔

علامہ شبلی کی ابتدا یہ تھی کہ انہیں غیر مقلدوں کی تردید سے زیادہ دنیا میں کوئی دلچسپ مشغلہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ انتہا یہ تھی کہ ادب، تاریخ فلسفہ اور علم کلام میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے۔ عروج و کمال کی یہ منزل کیونکر طے ہوئی؟ سنئے!

۱۸۸۲ء میں علامہ شبلی اپنے بھائی مہدی کو کالج میں داخل کرانے کے لئے علی گڑھ گئے۔ یہاں سرسید مرحوم سے ملاقات ہوئی۔ دونوں کی طبیعتیں ایک دوسرے سے مانوس نکلیں۔ سرسید مرحوم نے کالج کی پروفیسری پیش کی، جو قبول کر لی گئی۔ یہ واقعہ شبلی کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب کی تمہید ہوا اور سرسید مرحوم نے ان میں مغرب کے طلسمی اثرات قبول کرنے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت پیدا کر دی۔ اور یورپ کی علمی خدمات اسلامی علوم و فنون کی قدردانی اور نادر کتب کی نشر و اشاعت نے اُن کے دل میں "مشرق و مغرب کے امتزاج" کی آرزو پیدا کر دی۔ ان کی تمام تالیفات (اُس وقت سے تا دمِ مرگ) اسی آرزو کی مظہر ہیں۔

۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے "الفاروق" کے لئے ذخیرۂ معلومات فراہم کرنے اور بعض نادر کتب کا سراغ لگانے کی غرض سے روم، مصر اور شام کا سفر کیا۔ اس سفر نے اس انفعالی جذبہ کو اور تیز کر دیا، جو سرسید مرحوم کی صحبت کا مرہون تھا۔ اب تنگ خیالی کی جگہ پورے طور سے وسعت ذہنی نے لے لی تھی۔

علامہ شبلی کی ذہنی تربیت اور رُجحان میں مصر ایک نمایاں درجہ رکھتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مغرب کے علوم سے واقفیت کا مصر ایک اہم ذریعہ بنا اور انگریزی کی بہت سی کتابیں عربی کے توسط سے ہندستان پہنچیں اور شبلی مرحوم نے ان کے مطالب سے استفادہ کیا۔ کارلائل کی تالیف اور "ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ" عربی میں ترجمہ ہو کر ہندستان پہنچا تو شبلی مرحوم نے اس کا مطالعہ کیا اور اس سے استفادہ بھی کیا۔ ایک خط میں تحریر کرتے ہیں۔

"کارلائل کی کتاب کا عربی میں ترجمہ ہو گیا ہے۔ اچھا ترجمہ کیا ہے۔ میرے کام کی چیز ہے۔"

مکاتیب شبلی جلد ۱ ص ۲۱۱

اسی طرح مصر سے   کا ترجمہ ہو کر آتا ہے تو شبلی مرحوم نہایت شوق سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ علامہ فرید وجدی نے قدیم و جدید فلسفہ کی تطبیق میں مصر سے ایک پرچہ جاری کیا تھا۔ شبلی مرحوم اس کا برابر مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ اس کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"ماہوار نکلتا ہے۔ زور کا پرچہ ہے اور واقعی عمدہ ہے۔ اڈیٹر فرینچ اور جرمن زبان کا ماہر ہے۔"

مکاتیب شبلی جلد ا ص ۱۴۹

مصر سے اس تعلق کا شبلی مرحوم پر یہ اثر پڑا:۔

(۱) یورپ کا لٹریچر شبلی مرحوم کے مطالعہ میں آیا اور انہوں نے یورپ کے اصول علمی کے بارے میں رائے قائم کی۔

(۲) علمی زاویۂ نگاہ میں مبصرانہ کیفیت پیدا ہوئی۔ جو مطالعہ کی وسعت کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے

(۳) معیار تحقیق بلند ہوا۔

(۴) سیاسی حسیات جو اُن کی اکثر تصانیف کی رُوح ہیں۔ اور زیادہ بیدار ہوئیں۔

مغربی تحقیقات سے اتنی دلچسپی تھی کہ علامہ شبلی نے مصر کے مغربی لٹریچر پر کبھی اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ وہ ہمیشہ اپنی تصانیف کے سلسلہ میں اپنے انگریزی داں دوستوں، عزیزوں اور شاگردوں سے بھی امداد لیا کرتے تھے۔ کسی کو لکھا "فارسی شاعری میں تخیل کی چند مثالیں حسب خیالات یورپ لکھ بھیجو"۔ عبدالماجد صاحب بی اے دریاآبادی سے نیتور، دلہاوزن، نولدیکی اور فارسٹر کی تحقیقات اور

کتابوں کا خلاصہ ، لکھتے ہیں۔ شیخ عبدالقادر صاحب ایم ، اے (انفنسٹن کالج بمبئی) کو ایک خط میں تحریر کرتے ہیں۔

"مذہبیہ یا اخلاقی شاعری پر انگریزی کا نمونہ چاہتا ہوں۔"

اسی طرح حمید الدین صاحب فراہی بی ، اے مرحوم ، سید نواب علی صاحب ایم ، اے ۔ ایم مہدی حسن مرحوم وغیرہ سے وہ پوری پوری امداد لیا کرتے تھے اور انہیں اس میں کوئی تکلف نہ ہوتا تھا ۔

میرا مقصد اس تمام تفصیل سے یہ ہے کہ علامہ شبلی کی تصانیف مشرق و مغرب کے سرمایہ کا نچوڑ ہوتی تھیں ۔ اور وہ کسی تالیف پر قلم اٹھانے سے قبل مشرق و مغرب کے علمی ذخیروں سے استفادہ کرتے ۔ اُن کے بنیادی اصول سمجھنے کی کوشش کرتے ۔ اس کے بعد ان کی ناقدانہ بصیرت نہایت پاکیزہ اور سلیس زبان میں اس کا مرقع کھینچ دیتی تھی ۔

نثر کی خصوصیات

علامہ شبلی کی نثر کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں آزاد (مولانا محمد حسین) کی شوخیٔ تحریر ، حالی کی سادہ بیانی اور نذیر احمد کی روزمرہ کا عنصر پایا جاتا ہے ۔ وہ نہ اتنی رنگین ہے کہ شاعری کے دائرہ کے اندر ہی اچھی معلوم ہو ، نہ اتنی ہلکی کہ علمی اور مذہبی مضامین کو اس کا جامہ پہنتے شرم آئے ۔ اور نہ اتنی پھیکی ہے کہ پڑھنے والے پر کوئی خاص اثر پیدا نہ کرے ۔ بلکہ اس کا خمیر اعتدال سے اٹھا ہے ۔ اسی لئے اسے شاعری کے نازک اور لطیف خیالات ادا کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاسکتا ہے ۔ علمی ، مذہبی اور فلسفیانہ مضامین بھی موثر پیرایہ میں بیان کئے جاسکتے ہیں ۔ اور یہ کہنا غالباً حقیقت پر مبنی ہوگا کہ

"غالب زندہ ہوتے تو شبلی کو اپنی "مدعائے خاصہ" کی داد
ملتی۔ جس نے ایک نوخیز بازاری یعنی کل کی چھوکری کو جس پر
انگلیاں اٹھتی تھیں ، آج اس قابل کر دیا کہ وہ اپنی بڑی بوڑھیوں
اور ثقہ بہنوں یعنی دنیا کی علمی زبانوں سے آنکھیں ملا سکتی ہے ۔"

افادات مہدی ص ۱۰۳

میرے اس دعویٰ کی تصدیق ذیل کے چند اقتباسات سے کی جاسکتی ہے ۔ اس کے بعد یہ بیان کرنے کی مزید ضرورت نہ ہوگی کہ ان کی یہ نثر بلاغت کے انتہائی نقطۂ نظر پر ہر جگہ دکھائی دیتی ہے ۔

شاعری کے ارتقاء کو قوم کی مادی ترقی سے تشبیہ دیتے ہیں ۔

"ابتدا میں رہنے سہنے کے لئے پھونس کے جھونپڑے اور خس پوش کچی دیواریں بنائی جاتی ہیں پھر پختہ عمارتیں بنتی ہیں پھر ان میں مختلف حصے ، شہ نشین ، دالان ، صحنچیاں ، بالا خانے قائم کئے جاتے ہیں ۔ کمرے فرش فروش سے سجائے جاتے ہیں ۔ جھاڑ فانوس ، دیوارگیریاں لگائے جاتے ہیں تاہم اعتدال سے آگے نہیں بڑھتے ۔ پھر سنگ مرمر کی عمارتیں بنتی شروع ہوتی ہیں ۔ جواہرات کی پچی کاری ہوتی ہے ۔ در و دیوار پر طلائی نقش و نگار بنتے ہیں ۔ اطلس و کمخواب کا فرش بچھتا ہے ۔ دروازوں پر گوہر نگار پردے آویزاں کرتے ہیں ۔ کافوری شمعیں جلاتے ہیں ۔ یہ ترقی کا آخری درجہ ہے ۔ جس کے بعد تنزل شروع ہوتا ہے ۔ اور قوم تباہ ہوجاتی ہے ۔"

شعر العجم حصہ ۴ ص ۱۱۷

روزمرہ کی گفتگو اور خطوط میں اسے دیکھئے :۔

"مدت سے قدمبوسی نہیں ہوئی اور جی بہت چاہتا ہے میرا تو آنا نہیں ہوسکتا اس لئے اُمید کرتا ہوں کہ آپ ہی قدم رنجہ فرمائیں ۔ ۱۱ دسمبر سے یہاں نہایت عمدہ جلسہ اور سیر بھی ہونگی اور ۱۹ دسمبر تک کالج ایک تماشا گاہ بنا رہے گا ۔"

مکاتیب شبلی جلد ۱ ص ۲۱

زہرہ بیگم فیضی (عطیہ بیگم فیضی کی بڑی بہن) کو ایک خط میں اُنکی والدہ کی تعزیت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں ۔

"خاتون محترم !

نمی دانم حدیث نامہ چوں است
ہمیں دانم کہ عنوانش بہ خوں است

جو حادثہ پیش آیا ، اس کے متعلق کیا کوئی لکھ سکتا اور کیا کہہ سکتا ہے ۔ صبر کی تلقین کرنا آسان ہے لیکن کیا کوئی صبر کی تلقین کرنے والا خود بھی ایسے موقعہ پر صبر کر سکتا ہے ۔"

خطوط شبلی ص ۱۱۶ (عورتوں کے نام)

عطیہ بیگم کے نام علامہ شبلی نے جو خطوط لکھے وہ اُردو ادب کی جان ہیں ۔ سلاست اور روانی ملاحظہ ہو ۔

اہلاً و سہلاً

عزیزی !

ایک بے ریا دل، ایک مخلص دل، و فا شعار دل کی طرف سے سفر سے مراجعت کی مبارکباد قبول کرو۔ میری زندگی کا یہ سخت افسوسناک واقعہ ہے کہ یہ مبارکباد میرے لب کے بجائے زبان قلم ادا کرتی ہے۔"

خطوط شبلی بنام عطیہ بیگم ص ۵۲

"عطیہ! تم سے زیادہ مجھے خوشی ہوگی اگر میں کوئی کتاب تمہارے نام سے معنون کر سکوں۔ یہ وقت ضرور آئیگا۔ لیکن کب آئیگا۔ اس کا فیصلہ آج نہیں کر سکتا۔"

خطوط مذکورہ ص ۶۸

عزیزی! حیاک اللہ

آپ بھی عجیب باتیں کہتی ہیں۔ یہاں سب لوگ کہتے ہیں کہ ڈاک جنجیرہ (عطیہ کی قیام گاہ) کی بند ہو جاتی ہے اور کئی مہینے تک بند رہتی ہے۔ اور آپ فرماتی ہیں کہ جنجیرہ آؤ۔ اور جب چاہو واپس جاؤ۔"

خطوط مذکور ص ۷۵

عطیہ کی شادی ہونے والی ہے۔ مولانا کو اطلاع دی گئی۔ اسے کس لطیف پیرایہ میں ظاہر کرتے ہیں۔

"ایک دوست نے ایک اور خبر سنائی۔ لیکن وہ تم سے پوچھنے کی بات نہیں۔"

خطوط مذکورہ ص ۷۹

تاریخی۔ علمی اور فلسفیانہ مضامین میں بھی ان کی نثر کا پایہ کتنا بلند رہتا ہے اور خشک سے خشک مضمون کو بھی کتنے دلچسپ پیرایہ میں وہ بیان کر دیتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:-

"سعد نے یہ دیکھکر کہ ہاتھی جس طرف کا رُخ کرتے ہیں دل کا دل پھٹ جاتا ہے، ضخم و سلم وغیرہ کو جو پارسی تھے اور مسلمان ہو گئے تھے بلا کر پوچھا کہ اس بلائے سیاہ کا کیا علاج ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان کی سونڈ اور آنکھیں بیکار کر دی جائیں۔ تمام غول میں دو ہاتھی نہایت مہیب اور کوہ پیکر اور گویا کل ہاتھیوں کے سردار تھے۔ الخ"

الفاروق ص ۹۰

"دنیا میں جس قدر حکمراں گذرے ہیں ہر ایک کی تہ میں کوئی نہ کوئی مشہور مدبر یا سپہ سالار مخفی تھا۔ . . . . . اگر اتفاق سے وہ مدبر یا سپہ سالار دفعتہً . . . . . فتوحات بھی رک گئیں یا نظام حکومت کا ڈھانچہ بگڑ گیا۔ سکندر ہر موقع پر ارسطو کی ہدایتوں کا سہارا لیکر چلتا تھا اکبر کے پردے میں ابوالفضل اور ٹوڈرمل کام کرتے تھے۔ عباسیہ کی عظمت و شان برامکہ کے دم سے تھی۔ لیکن حضرت عمرؓ کو صرف اپنے دست و بازو کا بل تھا الخ"

الفاروق ص ۲۴۴

اخلاق کی بلندی اور تہذیب نفس کا کیا طریقہ ہو۔ اسے فلسفیانہ انداز سے کتنی پاکیزگی اور اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

"تہذیب نفس کا سب سے زیادہ صحیح، سب سے زیادہ کامل، سب سے زیادہ عملی طریقہ یہ ہے کہ نہ زبان سے کچھ کہا جائے، نہ تحریری نقوش پیش کئے جائیں۔ نہ جبر و زور سے کام لیا جائے۔ بلکہ فضائل کا ایک پیکر مجسم سامنے . . . . آجائے۔ جو خود سراپا آئینۂ عمل ہو جس کی ہر جنبش لب ہزاروں تصنیفات کا کام دے اور جس کا ایک ایک اشارہ اوامر سلطانی بن جائے۔ دنیا میں آج اخلاق کا جو سرمایہ ہے سب انہی نفوس قدسیہ کا پرتو ہے۔ دیگر اور اسباب صرف ایوان تمدن کے نقش و نگار ہیں۔"

سیرت النبی ج ا ص ا

ان اقتباسات سے یہ بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی کی نثر نگاری نمایاں طور سے ترقی پذیر رہی۔ المامون، الفاروق، شعر العجم اور سیرت النبی اس کی مجسم دلیل ہیں۔

سیرت نگاری

علامہ شبلی سیرت نگاری (Biograohy) میں مغربی معیار کو ہمیشہ پیش نظر رکھتے تھے اور خصوصیت کے ساتھ ان کا دل و دماغ اس سے بیحد مرعوب تھا۔ اسی لئے ان کی سیرت نگاری ان کے ہمعصر مصنفوں سے جداگانہ حیثیت رکھتی ہے۔ اور وہ ان پر شدید نکتہ چینی کیا کرتے تھے۔ مغربی نقطۂ نظر سے سیرت نگاری کا معیار کیا ہے؟ اس کا جواب انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں یوں دیا گیا ہے:-

Biogrophy is a faithful portra-it of a soul in its adventures through life.

یعنی یہ کہ انسانی موضوع کی ہو بہو تصویر ہو۔ جو مکمل ہونے کے علاوہ حقیقت پر مبنی ہو۔ اور تمام تصویر کشی میں منتہائے نظر صرف صداقت کی ترجمانی ہو۔ پھر اس کیلئے

ضروری ہے کہ مظاہر کی نقاشی کے ساتھ ساتھ موضوع کی اندرونی شخصیت اور انفرادیت بھی پوری صفائی کے ساتھ نمایاں کی جائے۔

مغربی نقطۂ نظر سے ایک سیرت نگار کے لئے یہ بھی ضروری امور ہیں کہ تصادم آرا کے وقت اخلاقی جرات کا ثبوت دیتا ہو۔ اور بیرونی اثرات سے بالکل متاثر نہ ہوتا ہو۔ موضوع کے معائب اور کمزوریاں دکھانے میں اسی طرح واقعیت کا خیال رکھے جس طرح محاسن کے بیان میں۔ موضوع کی شخصیت کی تصویر کشی میں ذاتی رجحان کو دخل نہ دیتا ہو۔ اور جذباتی، سیاسی اور مذہبی محرکات سے وہ ہیرو کو واقعہ اور حقیقت کے خلاف نمایاں نہ کرے۔ اور سب سے آخری چیز یہ ہے کہ سیرت نگار سے اسلوب بیان، ترتیب اور واقعات کے حسن انتخاب سے ایک ادبی شاہکار بنائے۔

مولانا شبلی کی سیرت نگاری اس معیار پر قریباً پوری اترتی ہے۔

چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

ولادت محمدی کا منظر بیان کرتے ہیں:۔

"........ آج کی رات ایوانِ کسریٰ کے چودہ کنگرے گر گئے۔ آتش کدۂ فارس بجھ گیا۔ دریائے ساوہ خشک ہو گیا۔ ..... ایوان کسریٰ نہیں بلکہ شان عجم، شوکت روم، اوج چین کے قصر ہائے فلک بوس گر پڑے۔ آتش فارس نہیں بلکہ جحیم شر، آتش کدۂ کفر، آذر کدۂ گمرہی سرد ہو کر رہ گئے۔ صنم خانوں میں خاک اڑنے لگی۔ بت کدے خاک میں مل گئے۔ شیرازۂ مجوسیت بکھر گیا۔ نصرانیت کے اوراق خزاں دیدہ ایک ایک کر کے جھڑ گئے۔ توحید کا غلغلہ اٹھا۔ چمنستان سعادت میں بہار آ گئی۔ آفتاب ہدایت کی شعاعیں ہر طرف پھیل گئیں۔ اخلاق انسانی کا آئینہ پرتو قدس سے چمک اٹھا۔ ....

...... یعنی یتیم عبد اللہ، جگر گوشۂ آمنہ، شاہ حرم، حکمرانِ عرب، فرماں روائے عالم، شہنشاہ کونین، عالم قدس سے عالم امکان میں تشریف فرمائے عزت و اجلال ہوا۔ اللّٰھم صل علی الخ"

سیرت النبی جلد ا صـــ ۱۲۳

بلاغت کا یہ انتہائی کمال خیال کیا جاتا ہے کہ کسی واقعہ کے منظر کو ایسے الفاظ اور ایسے پیرایہ میں بیان کیا جائے کہ یہ خیال ہونے لگے بیان کرنے والا بذات خود موجود تھا۔ شبلی مرحوم ایسے مناظر کی تصویر کشی میں کتنے کامیاب نظر آتے ہیں، اس کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے کیا جا سکتا ہے:

(حضرت اسمٰعیلؑ کے ذبح کا واقعہ)

"اب ایک طرف (۹۰) نود سالہ پیر ضعیف ہے جس کو دعا ہائے سحر کے بعد خاندان نبوت کا چشم و چراغ ملا ہوا تھا۔ جس کو وہ تمام دنیا سے زیادہ محبوب رکھتا تھا۔ اب اسی محبوب کے قتل کے لئے اس کی آستینیں چڑھ چکی ہیں۔ اور ہاتھ میں چھری ہے۔

دوسری طرف نوجوان بیٹا ہے۔ جس نے بچپن سے آج تک باپ کی محبت آمیز نگاہوں کی گود میں پرورش پائی ہے۔ اور اب باپ ہی کا مہر بر در ہاتھ اس کا قاتل نظر آتا ہے۔ ملائکہ قدسی فضا ہائے آسمانی، عالم کائنات یہ حیرت انگیز تماشا دیکھ رہے ہیں۔ اور انگشت بدنداں ہیں کہ دفعتہً عالم قدس سے آواز آتی ہے کہ یا ابراہیم قد صدقت الرویاء الخ (ابراہیم! تو نے خواب سچ کر دکھایا)

طفیان ناز ہیں کہ جگر گوشۂ خلیل
در زیر تیغ رفت و شہیدش نمی کنند"

سیرت النبی جلد ا صـــ ۱۱۵

ان اقتباسات کے بعد مجھے اپنے دعویٰ کے لئے مزید دلیل بیان کرنے کی غالباً احتیاج نہیں ہے۔


شیخ مینا
شہنشاہ اکبر کے دربار کا مشہور سرجن
شیخ مینا" اس زمانے کا سب سے بڑا سرجن تسلیم کیا جاتا تھا اور اُسنے جراحی کمالات سے اکبری دور کے
تمام اطبا پر فوقیت حاصل کرلی تھی۔ عہدِ مغلیہ کا یہ سرجن زخموں کا علاج کس اصول پر کرتا
تھا اور گہرے گہرے زخموں پر عمل جراحی کرنیکے بعد ٹانکے لگاکر انھیں کیونکر جلد اچھا
کردیتا تھا اس کا جواب صرف "ہمدرد مرہم" کا تجربہ کرنے پر مل سکتا ہے جو سڑے ہوئے
گہرے زخموں، چوٹ، موچ، ناصور، ہر قسم کے درد، آگ، کھولتے پانی سے جلنا،
مہاسوں اور دوسرے ناگہانی حادثوں کا کامیاب ترین علاج ہے۔
خالص نباتی تیلوں سے بنایا ہوا ہمدرد مرہم
اپنے گھر میں ضرور رکھیے قیمت فی ڈبیہ ۱۲ر
HAMDARD OINTMENT
HEALING SOOTHING
آپکے شہر میں ہر جگہ ملتا ہے
اگر اتفاق سے آپکے شہر میں نہ ملے تو ایک ڈبیہ کی قیمت اور ڈاک کے لیے منی آرڈر بھیجکر ہمدرد دواخانہ دہلی سے بذریعہ پارسل منگالیجے

۱۸۵۷ء کے قبل

عیسائیت اور اسلام

(از جناب منشی مہیش پرشاد صاحب پروفیسر ہندو یونیورسٹی بنارس)

تاریخ سے عیاں ہے کہ انیسویں صدی عیسوی کے شروع سے ہی انگریز لوگ اس کوشش میں تھے کہ تمام ہندستان سیاسی حیثیت سے اُن کے زیر اثر ہو جائے۔ لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریز لوگ سیاسی حیثیت سے جتنے کوشاں تھے اُس سے کہیں زیادہ عیسائی لوگ اس امر کے لئے سرگرم تھے کہ تمام ہندستان عیسائیت کے رنگ میں رنگ جائے۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ اس کام میں صرف انگریز عیسائی ہی مستعد نہ تھے بلکہ جرمن، فرانسیسی اور اٹالین وغیرہ بھی تندہی کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔

ہندستان کا اسلام اس وقت مذہبی حیثیت سے اصلاح کا محتاج تھا۔ اس باب میں بنگال کے حاجی شریعت اللہ، رائے بریلی کے مولانا سید احمد۔ دلی کے مولانا سید محمد اسمٰعیل شہید، علی گڈھ کے سر سید احمد خاں اور دار العلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم ایسے حضرات کی گراں بہا خدمات سے تواریخ کے اوراق مالامال رہیں گے۔ ایسی حالت میں عیسائیوں نے موقع کو غنیمت سمجھا اور دل و جان سے اپنے نصب العین کی تکمیل میں لگے رہے۔

ایک عیسائی مصنف کا خیال ہے کہ انیسویں صدی عیسوی حقیقت میں مشن کی صدی تھی۔ کیونکہ اس صدی میں عیسائیوں کی جانب سے غیر معمولی سرگرمیاں ظہور میں آئی تھیں۔ ہندستان میں اس وقت ہندوؤں کی مذہبی حالت ناگفتہ بہ تھی۔ اسلام اصلاح کا محتاج ضرور تھا مگر اس میں مذہبی بیداری بھی تھی۔ اہل اسلام کو عیسائیت کے زیر اثر کرنا معمولی کام نہ تھا۔ تاہم عیسائیت کی جانب سے غیر معمولی کوشش اہل اسلام کے لئے ہوئیں۔

یہ امر توضیح کا محتاج نہیں کہ انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں ہندستان میں آمد و رفت کے ذرائع ایسے نہ تھے جیسے کہ آج کل ۱۹۴۵ء میں ہیں۔ تاہم انواع و اقسام کے مصائب برداشت کر کے بیشمار عیسائی ہندستان کے مختلف

مقامات پر پہنچے۔ ہنری مارٹن [illegible] ایک جرمن عیسائی اہل اسلام میں کام کرنے کی غرض سے ہی ۱۸۰۶ء میں کلکتہ میں آیا۔ کچھ عرصہ بعد دانا پور میں مقیم ہوا اور پھر کانپور میں پہنچا۔ لیکن صحت کی خرابی کی وجہ سے ۱۸۱۰ء میں ہی وہ کلکتہ میں واپس پہنچا۔ اور جنوری ۱۸۱۱ء میں اُس نے ہندستان چھوڑا۔ ایران کے راستے سے اپنے وطن، لوٹ ہی واپس پہنچنے کا تہیہ کیا مگر وطن پہنچنے سے پہلے ہی راہی عدم ہوا۔ اس جانباز کے نام پر ہنری مارٹن مدرسہ اسلامیات قائم کیا گیا ہے جو آج کل شہر علی گڈھ کے بنا دیوی نامی مقام میں ہے۔ اہل اسلام کے متعلق مشنریوں کو اس میں تعلیم دی جاتی ہے۔ اس مدرسہ کے متعلق ایک عمدہ کتب خانہ بھی ہے جس میں اہل اسلام کے متعلق عمدہ عمدہ کتب خصوصیت کے ساتھ ہیں۔ اس کتب خانے کی بدولت میری معلومات میں بھی اچھا خاصہ اضافہ ہوا ہے۔ ہنری مارٹن نے تو ہندستان کے مشرقی حصے میں کام شروع کیا تھا لیکن مغربی علاقے میں جس کی وجہ سے کام کی ابتدا ہوئی تھی وہ ڈاکٹر جان ولسن تھا۔ جس کے نام پر بمبئی میں ولسن کالج قائم ہے۔ یہ مشنری ۱۸۲۹ء میں بمبئی میں اُترا تھا۔ ۱۸۳۱ء میں اس ڈاکٹر کی طرف سے پارسیوں اور مسلمانوں کے سامنے ایک سوال جواب کے لئے رکھا گیا۔

۱۸۳۱ء کے آس پاس مسلمانوں میں مذہبی جوش کچھ کم نہ تھا۔ جس کے ثبوت میں اس جہاد کا ہی ذکر کر دینا کافی ہے جو مسلمانوں کی بدولت سکھوں کے خلاف ہندستان کے شمالی و مغربی سرحد میں ہوا تھا اور جس میں علمائے کرام بھی کام آئے تھے۔ پس یہ امر کیونکر ممکن تھا کہ کسی مسلمان کی طرف سے ڈاکٹر صاحب کے جواب میں کچھ نہ لکھا جاتا۔ حاجی محمد اصفہانی نام کے ایک صاحب کے ساتھ خط و کتابت ہوئی اور حاجی صاحب کی جانب سے "ذبح الہزل" نام کی ایک کتاب فارسی میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب کس سن میں چھپی تھی۔ کس پریس میں چھپی تھی۔ کتنی بڑی تھی؟ اس قسم کی باتوں کو میں ابھی تک نہیں جان سکا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی طرف سے اس کے جواب میں جو کتاب ۱۸۳۶ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ حاجی صاحب کی کتاب ۱۸۳۶ء یا اس سن سے کچھ پہلے ہی شائع ہوئی ہوگی۔

جناب ڈاکٹر صاحب کی طرف سے حاجی صاحب کے جواب میں جو کتاب فارسی میں شائع ہوئی ہے اُس کا وہ اڈیشن میری نظر سے گذرا ہے جو ۱۸۳۶ء کا شائع شدہ ہے۔ یہ اڈیشن "ردیہ دین مسلمانی" کے نام سے دو ہزار کی تعداد میں ٹریکٹ بک سوسائٹی بمبئی سے نکلا ہے۔ ساڑھے آٹھ و ساڑھے پانچ

ہیں ایک سو بارہ (۱۱۲) صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے چند عنوانات یہ ہیں:۔

(۱) در بیان طلاق کہ در مسلین مروج است۔

(۲) در اختلاف اقوال قرآن۔

(۳) در کیفیت قرآن

مذکورہ بالا دونوں عیسائیوں کے سوا جس کا نام خصوصیت کے ساتھ ہے، وہ جرمنی کا عیسائی فنڈر ہے۔ ۱۸۴۰ء میں کلکتہ میں پہنچا اس لی ہندوستان میں آگرہ کی اہمیت بہت زیادہ تھی۔ وہاں ۱۸۱۱ء عیسائی مشنری پہنچ گئے تھے۔ اور انہوں نے آہستہ آہستہ خوب ترقی رہ میں کی تھی۔ پس فنڈر صاحب آگرہ میں مقیم ہوئے۔ ان کی تین کتابیں زیادہ مشہور ہیں۔

(۱) "میزان الحق"۔ یہ کتاب پہلے پہل ۱۸۳۵ء میں قلعہ شوشی نام کے کسی ں ہندوستان سے باہر شائع ہوئی تھی۔ ۱۸۴۳ء میں اس کا اردو ترجمہ مرزا پور کے آرفن پریس سے شائع ہوا تھا۔ ۱۸۵۰ء میں سکندرہ سے ڈیشن اردو میں نکلا تھا۔ اردو کے سوا عربی و انگریزی میں بھی اس جے ضرور شائع ہوئے ہیں۔ اس میں عیسائیوں کی کتابوں کے اصلی ہونے ہے۔ بائبل کی خاص تعلیمات کا بیان ہے۔ اور قرآن شریف کے لند ہونے کے دعاوی کی تردید ہے وغیرہ وغیرہ۔

(۲) "طریق الحیات"۔ اس میں گناہ اور اس کی ماہیت و نتائج ن ہے۔ بعدہ نجات کے طریقے کی تشریح ہے۔ اس کتاب کا ایک ڈیشن مطبوعہ امریکن مشن پریس لدھیانہ ۱۸۷۵ء میری نظر سے گذرا پہلے پہل یہ کتاب کہاں چھپی تھی؟ کس سن میں چھپی تھی کس زبان ں تھی؟ اس قسم کی باتیں ابھی میں جان ہی نہیں سکا۔

(۳) "مفتاح اسرار"۔ اس میں مسیح کے اعلیٰ مرتبہ کا ذکر ہے تثلیث اور معجزات کا ذکر ہے۔ ۱۸۴۰ء کا ایک فارسی اڈیشن مطبوعہ میری نظر سے گذرا ہے۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ ضرور ہو چکا ہے ۱۹۱۲ء کا اڈیشن میری نظر سے گذر چکا ہے۔

ان کتابوں کی وجہ سے اہلِ اسلام میں بڑی ہلچل مچی۔ عیسائیت ید اور اسلام کی تائید میں کئی حضرات نے کم و بیش لکھا۔ چنانچہ اس کتابیں خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر یہ ہیں:۔

"صولت ضیغم"۔ اس کے مصنف اسن تصنیف اور مطبع وغیرہ کی مجھے ابھی تک کچھ علم نہیں ہو سکا۔ البتہ یہ معلوم ہوا ہے کہ شمالی ہند

میں کافی عرصہ تک اس کتاب کی دھوم رہی ہے۔

"کتاب استفسار"۔ ۱۲۶۱ھ (۱۸۴۵ء) میں محمدی پریس آگرہ سے چھپ کر شائع ہوئی۔ اس کے مصنف آگرہ کے کوئی صاحب مولوی سید آلِ حسن تھے جو مذہبی معاملات میں اچھی واقفیت کے مالک تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائی لوگ ایک ورق یا دو ورق کے کاغذوں پر عیسائیت کی تائید اور اسلام کی تردید میں کچھ چھپوا کر لوگوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ چنانچہ اس قسم کے کاغذات کا جواب سید صاحب نے کتاب کی صورت میں دیا۔

"کشف الاستار"۔ نام کی کتاب مولوی محمد ہادی لکھنوی نے "مفتاح الاسرار" کی باتوں کے جواب میں لکھی جو ۱۸۴۵ء یا ۱۸۴۶ء میں شائع ہوئی تھی۔

ہاں اس ضمن میں سب سے زیادہ کوششیں مولانا رحمت اللہ کیرانوی و اُن کے عزیز شاگرد و رفقاء ڈاکٹر وزیر خاں وغیرہ کی ہمیشہ قابلِ یادگار رہیں گی۔ ضلع مظفر نگر کے قصبہ کیرانہ میں مولوی صاحب ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے تھے۔ عربی و فارسی میں تعلیم حاصل کر کے دلی میں ایک جگہ ملازمت کی۔ کچھ عرصہ بعد ملازمت ترک کر کے جامع مسجد دلی میں درس دینا شروع کیا۔ اور بہت جلد آپ کی شہرت چاروں طرف پھیل گئی۔ آپ نے دینِ اسلام کی بہت زیادہ خدمات کیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مکہ شریف پہنچے۔ اپنے علم و فضل کے باعث وہاں بھی بہت جلد ایک نامور عالم تسلیم کئے گئے۔ تین مرتبہ قسطنطنیہ جانے کا اتفاق ہوا۔ ٹرکی کے سلطان عبد الحمید خاں (دوم) نے تقریباً تین سو روپیہ ماہوار کی پنشن مقرر کر دی تھی۔ علمی و دینی مشاغل میں تمام عمر گزار دی ۱۸۹۱ء میں انتقال کیا۔ اور مکہ شریف میں مدفون ہوئے۔

ڈاکٹر وزیر خاں جناب مولانا کے شاگرد رشید تھے۔ مولانا کے ہمراہ مکہ شریف میں بھی پہنچے تھے۔ اور زیادہ باتیں ان کے متعلق مجھے معلوم نہیں ہوئیں۔ جنوری ۱۸۵۴ء (آگرہ) میں جناب مولانا صاحب نے کئی عیسائی صاحبوں سے کچھ بات چیت کی۔ اس کی تدوین جناب ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ ہوئی اور وہ کتابی صورت میں تقریر و گفتگو کے نام سے اردو میں شائع ہوئی۔

۱۰ و ۱۱ اپریل ۱۸۵۴ء کو مولانا رحمت اللہ صاحب و پادری فنڈر صاحب کے درمیان آگرہ میں زبردست مباحثہ ہوا۔ اس

میں بہت سے سرکاری عملے بھی موجود تھے۔ یہ مباحثہ مسلمانوں کی کوشش سے "پہلا حصہ مباحثہ مذہبی" کے نام سے محلہ چیلی اینٹ آگرہ سے شائع ہوا ہے۔ لیکن خیال رہے کہ عیسائیوں کی جانب سے یہ مباحثہ سکندرہ (متصل آگرہ) سے بھی شائع ہو چکا ہے۔

"البحث الشریعت فی اثبات النسخ والتحریف" کے نام سے فارسی میں ایک کتاب دلی کے فخر المطابع نامی پریس کی شائع شدہ ۱۲۷۰ھ (۱۸۵۴ء) ہے۔ ان مطبوعات کے سوا نیز چند دیگر مطبوعات کا پتہ چلتا ہے۔ جن میں مسلمانوں و عیسائیوں سے تعلق رکھنے والی باتیں ہیں۔ اور مولانا رحمت اللہ صاحب کی ان تصانیف کا بھی پتہ چلا ہے:-

(۱) ازالۃ الاوہام
(۲) ابطال التثلیث
(۳) استبشار
(۴) اعجاز عیسوی
(۵) ازالۃ الشکوک
(۶) معدل اعوجاج المیزان
(۷) اظہار الحق

ان میں سے آخری کتاب عربی میں ہے اور اس کا ایک اڈیشن مطبوعہ مصر ۱۳۱۷ھ (۱۸۹۹ء) میری نظر سے گزرا ہے۔ اس کی تصنیف کا زمانہ نہیں معلوم ہو سکا۔ باقی دیگر کتب ۱۸۵۴ء کے آس پاس کی تصانیف و مطبوعات ہیں۔

القصہ ۱۸۴۵ء کے آس پاس سے عیسائیوں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی سرگرمی آپس میں بہت زیادہ رہی۔ اور اس سلسلہ میں ان دو باتوں کا بتلانا بھی ضروری ہے کہ جو کچھ اوپر بتلایا گیا ہے وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے سے پہلے کا ہے اور یہ کہ مذکورہ بالا کیفیت صرف ان عیسائیوں کے ساتھ وابستہ ہے جو پروٹسٹنٹ کہے جاتے ہیں۔

مشعل راہ میری نظر میں

(جوش ملیح آبادی)

محتسب جارچوی ایک خوش طبع اور خوش فکر نوجوان ہیں۔ انکی شاعری بھی ان کی طرح جوان ہے۔ انکے بیان میں تازگی اور لہجہ میں شیرینی کا عنصر بہت خوبی کے ساتھ سمویا ہوا ہے۔ انکی عشقیہ شاعری سے معلوم ہوتا ہے کہ دیگر غزل گویوں کی طرح انکا عشق روایتی اور انکا محبوب رومانی نہیں۔ بلکہ یہ اس وادی سے گذرے اور اسکے طوفانوں سے خود کھیلتے ہیں۔ یہی حال انکی مناظر پرستی کا ہے۔ انہوں نے گھر کی چار دیواری میں بیٹھکر باغوں جنگلوں اور کہساروں پر خامہ فرسائی نہیں کی ہے بلکہ کھلی ہواؤں میں سیر کر کے حسن قدرت کا مطالعہ کیا ہے جسکے ابھرے ہوئے نقوش نظروں کو ٹھیرا کر دماغ کو متوجہ کر لیتے ہیں۔ انکی شاعری انکے ذہنی ارتقا اور بلوغ کی گواہی دے رہی ہیں۔ اور اسی پاکیزہ و صالح علامت پر میں انہیں مبارکباد دیتا ہوں۔

زندگی میری نظر میں

(از ابوالاثر جناب حفیظ جالندھری)

"لایف اینڈ آئی سی اِٹ"۔ یہ عنوان مجھے اظہار خیالات کے لئے دیا گیا ہے۔ میں انگریزی نہیں پڑھا۔ تاہم اتنا جانتا ہوں کہ اس کا لفظی ترجمہ ہے "زندگی جیسے کہ میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں"۔ یا "زندگی جیسی کچھ کہ وہ مجھے نظر آرہی ہے"۔ رسالہ "آواز" نے اس کا ترجمہ "زندگی میری نظر میں" کیا ہے۔ اور بقول "آواز" مجھے آج پندرہ منٹ کے اندر یہ بتانا ہے کہ میں اپنے ذاتی مشاہدے، تجربے اور غور و فکر کے بعد زندگی کے بارے میں کس نتیجے پر پہنچا ہوں۔ اور زندگی کے متعلق میرا نقطۂ نظر کیا ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ میں نے اپنے لئے کون سا فلسفۂ حیات مخصوص کر لیا ہے۔

زندگی ــــــ میرا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ۔ مشاہدے اور تجربے کے دوران میں غور و فکر۔ پھر غور و فکر کا نتیجہ۔ ایک مخصوص فلسفۂ حیات ایک خاص نقطۂ نظر۔

اللہ اللہ! ایک سادہ سے عنوان کے ساتھ کتنی الجھنیں ہیں اور کیوں نہ ہوں۔ زندگی ہے کیا۔ کبھی نہ سلجھنے والی ایک الجھن ــــــ

عنوان قائم کرنے والے اور اس پر مجھے اظہار خیالات کی دعوت دینے والے کی ستم ظریفی قابل داد ہے۔ اس نے ایک ہی فقرے میں عمر بھر کی کسر نکال دی ہے۔ حفیظ صاحب بڑے شاعر بنتے تھے۔ نظمیں، گیت، غزلیں، ترانے لکھتے اور سناتے تھے۔ عوام الناس کو بیوقوف بناتے تھے۔ آج ان کا بھی امتحان لے ڈالا گیا ہے ؎

ہم سے چوری کو سرِ زلفِ یار میں جاتے تھے یہ
حضرتِ دل اے ظفر اچھا ہوا پکڑے گئے

جیسے زندگی خود ایک امتحان ہے۔ زندگی کے متعلق بات چیت کرنا بھی کچھ کم نہیں۔ اب کھل جائیگا کہ ہم نے زندگی کو دیکھا بھی ہے؟ زندگی سے معاملہ بھی کیا ہے؟ یا ہم محض طوطے ہیں کہ قفس کے پنجرے میں زندگی زندگی رٹ رہے ہیں۔ فیل ہو گئے تو جہنم واصل۔ پاس ہو گئے تو اتنا بڑا بہشت کہ ہمارے نقطۂ نظر کو حفیظ کا فلسفۂ حیات قرار دیا جائیگا۔ توبہ! توبہ!! ؎

روزہ رکھوں نماز پڑھوں حج ادا کروں
اللہ یہ ثواب بھی ہے کس عذاب میں

ہو سکتا تھا کہ میں نثر میں بات چیت کو گھٹیا اور غیر شاعرانہ قرار دیکر آئی بلا سر سے ٹال دیتا۔ اور شاید مجھے ایسا کرنے کا اختیار بھی تھا۔ اور میرے لئے مناسب بھی یہی تھا کہ میرے دل کا معاملہ شعروں کے انتخاب تک ہی محدود رہتا۔ لیکن اپنے اختیار اور انکار کے لئے معقول وجہ کے باوجود مجبور ہوں اور یہ مجبوری کشاں کشاں میکروفون کے سامنے لے آئی۔ مزہ یہ ہے کہ مجبوری ظاہر کرنے کے لئے بھی نہ اجازت ہے نہ فرصت۔ بس یہی ہے "میری نظر میں زندگی" "مجبوری" اختیار کئے ہوتے ہوئے "مجبوری"

ایک کام ہم کرنا نہیں چاہتے یا ہمیں بقائمی ہوش و حواس یہ کام کرنا نہیں چاہئے۔ لیکن ہم یہ کام کرتے ہیں۔ کرتے کیا ہیں ہمیں کرنا پڑتا ہے۔ کیوں کرنا پڑتا ہے۔ یہ بحث الگ ہے۔ اس وقت گفتگو تو زندگی کی صورت حالات سے ہے مثال کے طور پر اس واقعہ کو دیکھئے یعنی میں ابھی ابھی زندگی کے بارے میں جو کہنا تھا کہہ چکا ہوں۔ میں بتا چکا ہوں کہ زندگی میری نظر میں "الجھن" ہے۔ "امتحان" ہے اور "مجبوری" ہے۔ "زندگی مجھے کیسی نظر آتی ہے؟" اس سوال کا جواب دے چکا ہوں۔ اور میرے خیال میں یہ جواب کافی ہے۔ اب میں چاہتا ہوں اور مناسب بھی یہی ہے کہ چپ ہو جاؤں۔ نہ اپنے تئیں زیادہ ہلکان کروں نہ آپ کا وقت ضائع کروں۔ لیکن مجھ پر پابندی عائد ہے۔ اس لئے اگر اپنا ارادہ استعمال کروں اور وقت مقررہ سے پہلے میکروفون سے ہٹ جاؤں تو آپ بھی بُرا مانیں گے اور مجھے میکروفون پر لانے والے بھی اسے معاہدے کی خلاف ورزی گردانیں گے۔ مجرم قرار دیں گے۔

ہمیں اسی طرح جیسے کوئی "زندہ دل صاحب ذوق" زندگی کی الجھنوں مجبوریوں اور امتحانوں کو ایک ہی جواب میں ختم کر ڈالے تو دُنیا اُسے خودکشی کہتی ہے اور دین اُسے تفریں کرتا ہے۔

اور چونکہ میں ابھی تک دُنیا اور دین دونوں کا پابند ہوں۔ لہٰذا مجھے پورے پندرہ منٹ تک آپ کا دماغ چاٹنا ہوگا اور اپنا تالو خشک کرنا ہے۔ اگرچہ سوال کا جواب دیا جا چکا ہے۔ لیکن میں مجبور ہوں کہ جواب دیتا چلا جاؤں اس وقت تک بولتا رہوں جب تک خاموش ہو جانے کا اشارہ نہیں ہو جاتا۔ اسی طرح کہ میں زندگی کو دیکھ چکا۔ زندگی سے معاملہ کر چکا۔ میرا امتحان ہو چکا۔ اور اب مجھے ختم ہو جانا چاہئے۔ لیکن میں پابند ہوں دین اور دنیا کی طرف سے

ایسی رہی کہ اس وقت تک الجھنوں میں پھنسا رہوں گا۔ اس وقت تک امتحان دیا جاؤں گا اور یہ مجبوری کا معاملہ کرتا جاؤں گا جب تک عزرائیل شرع جھنڈی لیکر تشریف نہیں لے آتے ؎

میری مجبوریاں کیا پوچھتے ہو
کہ جینے کے لئے مجبور ہوں میں

یہ ہے میرا مشاہدۂ حیات۔ میرا تجربہ اور میرا نقطۂ نظر۔

زندگی مجھے اخلاقی پابندیوں اور مذہب کی روایتی زنجیروں میں جکڑی ہوئی نظر آرہی ہے۔ مذہب مجھے گھیرتا ہے اور اخلاق مجھے پابند کرتا ہے کہ میں اپنی ذمہ داریوں پر کامل یقین رکھوں۔ اور خدائی قانون اور ملک کے رسم و رواج کی پیروی کروں۔ بظاہر یہ سیدھا راستہ ہے اس میں کوئی پیچ نہیں۔

لیکن الجھن ڈالنے والے بخت اور اتفاق ہیں۔ بخت کہو یا اتفاق۔ بات ایک ہی ہے۔ تقدیر پیشا کردہ ہو یا تدبیر کردہ، ہوتا وہی ہے جو ہم نہیں چاہتے یا وہ چاہتے ہیں تو ہونے سے مطمئن نہیں ہوتے۔ بعض تدبیر کرنیوالے کہتے ہیں ہم تقدیر سے لڑتے ہیں۔ اور میں کہتا ہوں ؎

ہر ایک قدم پہ ہے جہاں خندۂ تقدیر
تدبیر گذرتی ہے اسی راہ گذر سے

تقدیر سے لڑنا کیسا۔ ذرا سی مخالفت بھی ممکن نہیں۔ کبھی ان ہونی ہوتی نہیں اور ہونی ہو کے رہتی ہے۔

میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ جو شخص بھی اپنی ذمہ داریوں پر کامل یقین رکھتا ہے اور خدائی قانون اور ملک کے رسم و رواج کو پابندی کیساتھ نباہنا چاہتا ہے زمانہ اس کا بہت کم ساتھ دیتا ہے۔ شریف ایماندار اور دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنے والے انسان سے میں نے ہمیشہ برا سلوک ہوتے دیکھا ہے۔ پھر کیا اس سلوک کے بعد وہ شخص جس کی فطرت میں شرافت اور ایمانداری اور دوسروں کے حقوق کو ملحوظ رکھنے کا جذبہ ہے غیر شریف، بے ایمان حق شکن بن جائے۔

لوگ کیسے دھکے دیتے ہیں اسکو رسوا کرتے ہیں، اور کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ اسکی دلآزاری کرتے ہیں۔ اس لئے کہ جن لوگوں کے حقوق کو وہ ملحوظ رکھتا ہے، جس خدائی قانون کا وہ پیرو رہنا چاہتا ہے، اور جن ذمہ داریوں کو پورا کرنا وہ اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے۔ اکثریت اس قانون سے منحرف ہے۔ ان ذمہ داریوں میں یقین نہیں رکھتی۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد نہ جانے کیوں بہت زیادہ ہے جو وہ سہولت کی [illegible] حق خیال کرتے ہیں جو صرف اپنا کام کانٹا سیدھا کرتے ہیں۔ جن کو نہ صرف اپنے اس حلوے مانڈے سے غرض ہے جو ان کے دسترخوان پر پہلے سے موجود ہے بلکہ دوسروں کے سامنے سے دال روٹی بھی اٹھا لینے کے لئے تیار ہیں۔ لہٰذا جو شخص انکو اپنے مذموم ارادوں میں حائل نظر آتا ہے یا جس کی روش ان کی اپنی چال سے مختلف نظر آتی ہے اس سے پرسرِ پیکار اکثریت کا دستور عام ہے۔ ہر فرد کو بدکار کہتا ہے۔ رعانستا [illegible] ہے۔ جماعتیں جماعتوں کو کچل دیتی ہیں۔ اور مذاہب کر قانون سے انحراف کا ایسا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ زمین و آسمان کے درمیان انہی کی بے ہنگم صدا گونجنے لگتی ہے۔

ایک شریف آدمی جسکا عزم بلند ہے اور ارادے نیک، جس کا شیوہ اپنا اور دوسروں کا حق ملحوظ رکھنا اور اسکی حفاظت کرنا ہے۔ اس کو خود غرضوں کے انبوہ اور بھیڑ میں سے گذرنا اور راستہ نکالنا ہوتا ہے۔ یہ بھیڑ اس پر لپکتی ہے۔ اسے دھکیلتی ہے اور جب وہ دھکے کھاتا ہوا راستے سے دور جا پڑتا ہے تو اس پر راہ روی اور گمراہی کا فتویٰ صادر کرتی ہے۔ حالانکہ وہ اپنی مرضی سے قانون اور اخلاق کے راستے سے دور نہیں گیا۔ بلکہ اسے تو بدحال کر کے ڈال دیا گیا ہے۔ وہاں اگر وہ مرجاتا ہے تو اکثر اوقات یہی اکثریت کی بھیڑ اسکی سفید سفید قبر بناتی ہے۔ چہ چراغی لینے کے لئے اس کی مجاور بن جاتی ہے۔

یہ ہے زندگی اور زندگی کی صورت۔ اور یہ ہے وہ چٹان جو زندگی کی راہ میں زندگی خود حائل کرتی ہے۔

یہ میرا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ سوال یہی تھا نا کہ زندگی مجھے کیسی نظر آرہی ہے؟ یعنی پوچھا یہ گیا ہے کہ زندگی کی صورت کیا ہے؟ یہ نہیں پوچھا گیا کہ زندگی کے معنی کیا ہیں؟

میں نے صورت بیان کردی ہے یعنی جیسی تھی۔ مجھے زندگی اپنی ذمہ داریوں پہ یقین رکھتی ہوئی ملک کے رسم و رواج اور خدائی قانون کی پیروی کرتی نظر آتی ہے اس جگہ۔ وہ زندگی ہی تو ہے جو راستے میں حائل ہے مجھے زندگی دوسروں کو کھلاتی پلاتی اور پرورش کرتی بھی نظر آتی ہے۔ اور زندگی ہی کو دیکھتا رہتا ہوں کہ پرورش کرنے والوں اور جن کی پرورش ہو رہی ہے ان سب کو کھا لیتی ہے۔ زندگی ہی تو ہے جو خود بنتی اور دوسری زندگیوں کو بناتی ہے۔ اور زندگی ہی بنے ہوئے اور بنتے ہوؤں کو ڈھاتی، اجاڑتی، توڑتی پھوڑتی اور نیست و نابود کرتی ہے۔

یہ صورت انسانی زندگی ہی کی نہیں۔ زمین و آسمان اور زمین آسمان کے اندر جو کچھ ہے اس میں یہی کچھ ہوتا نظر آرہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسانوں میں حائل ہونے والے، توڑنے پھوڑنے۔ جھنجھوڑنے جھنجھوڑنے والے جنگل کے شیروں، چیتوں، ہاتھیوں، ہوا کے عقابوں اور شکروں سے زیادہ ہیں فضا میں آندھیاں بھی کبھی کبھی چلتی ہیں۔ زمین پر بجلیاں کبھی کبھی گرتی ہیں۔ باز، شکرے اور شیر چیتے جھنڈ کے جھنڈ نہیں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو بڑی مچھلیاں کھاتی ہیں لیکن مار کر ذخیرے نہیں رکھتیں۔ الّا انسان کہ یہ گراتا ہے۔ مارتا ہے۔ کھاتا کم ہے اور ذخیرہ زیادہ کرتا ہے۔ بہر ایں ہمہ زندگی کی صورت یہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ مجھ پر اس کا جواب فرض نہیں کیونکہ اس کا جواب صورت سے نہیں معنی سے متعلق ہے۔ اور زندگی کے معنی مجھ سے پوچھے نہیں گئے۔ "کیا ہو رہا ہے؟" میں نے عرض کر دیا۔ "کیوں ہو رہا ہے؟" یہ ایک سوال ہے۔ جس کا تسلی بخش جواب میں دے سکتا ہوں۔ میں نے یہ جواب مدتوں پہلے سوچ رکھا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرے اس جواب سے آپ مطمئن بھی ہو جائیں گے۔ اور مجھ سے پورا پورا اتفاق بھی کرینگے۔ کیونکہ یہ جواب میری زندگی کی تحقیقات کا نچوڑ ہے۔ اور بھی ایک ایسی بات ہے جو میں زندگی بھر کے غور و فکر کے بعد معلوم کر سکا ہوں۔ علاوہ ازیں یہ ایک ایسی بات ہے جسے بیان کرنے کی جرأت کوئی نہیں کرتا۔

زندگی کی یہ صورت کیوں ہے؟ خود زندگی کیوں ہے؟ زندگی کے معنی، زندگی کا مقصود، زندگی کی علت و غایت یہ سب صورتیں ایک ہی سوال کی ہیں۔ اور یہ ایک ایسا سوال ہے کہ اگر ہر وہ شخص جس کا شمار زندوں میں ہے اس کا جواب دریافت کرلے تو گویا اُسے زندگی مل گئی۔

میں آپ کو یہ زندگی دے سکتا ہوں۔ تعجب ہے کہ آپ مجھ سے یہ سوال کیوں نہیں کرتے۔ خیر کیا ہوا۔ زندگی کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ بہت سی باتیں دریافت نہیں کی جاتیں۔ لیکن بیان کرنے والا بہتوں کا بھلا کرنے کیلئے انہیں بیان کر دیتا ہے۔ لہٰذا میں آج اعلان کرتا ہوں کہ میں نے ریڈیو کی ایجاد سے بہت پہلے اس مسئلہ کو حل کر لیا تھا۔ اور میں اس حل کو خلق خدا کے فائدے کے لئے مشتہر کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے بہت غور و فکر کیا ہے اور ایک نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں۔ اور دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ زندگی کے معنی اور مقصود جو کچھ بھی ہوں۔

مجھے معلوم نہیں۔ میں نہیں جانتا۔ میں نہیں جان سکا۔ میری تمنا ہے کہ اس جواب پر ہر شخص کو اتفاق کر لینا چاہیئے۔ میرا یہ انکشاف ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ظاہر کر دینا زندہ دُنیا کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ اور مجھے معلوم ہے کہ زندگی پر اظہار خیال کے لئے دعوت دینے والوں کو بھی اس جواب سے ایک گونہ اطمینان ہو جائیگا کہ آخر حفیظ نے اعتراف کر ہی لیا کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔ وہ کچھ نہیں جانتا۔ وہ کچھ نہیں جان سکا۔

ایک اور بات اسی ضمن میں سن لیجے۔ بہت کام آئیگی۔ یہ بات بھی میں نے اپنی ذاتی تحقیقات سے معلوم کرلی ہے کہ زندگی کی علت اور مقصود معلوم کرنے کے لئے ہمیں اپنا دماغ پریشان نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں اسی پر اکتفا کر لینا چاہیئے کہ "ہم ہیں"۔ "ہم کیوں ہیں؟" یہ نہیں پوچھنا چاہیئے ؎

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را

اب رہ گیا یہ کہ زندگی کی جو صورت میں نے اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر بیان کی ہے وہ صورت اصلی ہے یا میری نظر کا دھوکا۔ میرا خیال ہے کہ میری بیان کردہ صورت پر آپ میں سے کوئی بھی مجھ سے اتفاق نہ کریگا۔ کیونکہ یہ معاملہ اپنے اپنے تجربہ اور مشاہدے کا ہے۔ زندگی سے ہر کوئی اپنا خصوصی معاملہ رکھتا ہے۔ یعنی آپ، میں اور وہ سب جو زندگی کے دعویدار ہیں۔ ایک مشہور کہانی کے اندھے ہیں۔ جو اندھے جو ہاتھی دیکھنے گئے تھے۔ اور ان میں سے ہر ایک ہاتھی کی صورت بیان کرتا تھا اور اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر ہر اندھا حق پر ہونے کا دعویدار تھا۔

لہٰذا اگر میں یہ کہوں کہ زندگی ایک گول لچکی۔ لٹکتی ہوئی سکڑتی ہوئی۔ لپکتی ہوئی۔ اُٹھتی ہوئی اور لپٹتی ہوئی سونڈ ہے تو آپ میں سے کوئی صاحب خم ٹھونک کر آدھمکیں گے اور دعوے کے ساتھ اپنا تجربہ و مشاہدہ بیان فرمائیں گے "جی نہیں۔ سونڈ کہاں۔ زندگی تو چھاج کی طرح پھٹکتا ہوا ایک کان ہے"۔ دوسرے صاحب کہیں گے "نہیں جناب! زندگی تو ایک موٹی سی ٹانگ ہے جو پیل پائے کی طرح کھڑی رہتی ہے اور جسے میں کبھی اسکی جگہ سے ہلا نہیں سکا"۔ ایک تیسرے صاحب آئیں گے اور کہیں گے "زندگی نہ تو سونڈ ہے نہ کان ہے، نہ ٹانگ بلکہ وہ تو لمبے لمبے نوکدار دانت ہیں جن پر سونے کے کڑے چڑھے ہیں میں نے خود ان دانتوں کا مشاہدہ اور تجربہ کیا ہے"۔

اس کے بعد نقاد صاحب تشریف لائیں گے۔ سب سے پہلا اک...

ایسی ہیں کہ اس وقت تک [illegible] پیسا رہوں [illegible] وقت تک [illegible] دبا جاؤں گا اور یہ مجبوری کا معاملہ کرتا جاؤں گا جب تک عزرائیل شرنج جھنڈی لیکر تشریف نہیں لے آتے ؎

میری مجبوریاں کیا پوچھتے ہو
کہ جینے کے لیے مجبور ہوں میں

یہ ہے میرا مشاہدۂ حیات - میرا تجربہ اور میرا نقطۂ نظر۔

زندگی مجھے اخلاقی پابندیوں اور مذہب کی روایتی زنجیروں میں جکڑی ہوئی نظر آرہی ہے ۔ مذہب مجھے گھیرتا ہے اور اخلاق مجھے پابند کرتا ہے کہ میں اپنی ذمہ داریوں پر کامل یقین رکھوں ۔ اور خدائی قانون اور ملک کے رسم ورواج کی پیروی کروں ۔ بظاہر یہ سیدھا راستہ ہے اس میں کوئی پیچ نہیں ۔

لیکن الجھن ڈالنے والے بخت اور اتفاق ہیں ۔ بخت کہو یا اتفاق ۔ بات ایک ہی ہے ۔ تقدیر یہ ہے کہ شاکر رہو یا تدبیر کرو ۔ ہوتا وہی ہے جو ہم نہیں چاہتے اور چاہتے ہیں تو ہونے سے مطمئن نہیں ہوتے ۔ بعض "تدبیر کرنیوالے" کہتے ہیں ہم تقدیر سے لڑتے ہیں ۔ اور میں کہتا ہوں ؎

ہر ایک قدم پہ ہے جہاں خندہ تقدیر
تدبیر گذرتی ہے اسی راہ گذر سے

تقدیر سے لڑنا کیسا ۔ ذرا سی مخالفت بھی ممکن نہیں ۔ کبھی ان ہونی ہوتی نہیں اور ہونی ہو کے رہتی ہے ۔

میرا مشاہدہ اور تجربہ یہ ہے کہ جو شخص بھی اپنی ذمہ داریوں پر کامل یقین رکھتا ہے اور خدائی قانون اور ملک کے رسم ورواج کو پابندی کے ساتھ نباہنا چاہتا ہے زمانہ اس کا بہت کم ساتھ دیتا ہے ۔ شریف ایماندار اور دوسروں کے حقوق کا خیال رکھنے والے انسان سے میں نے ہمیشہ برا سلوک ہوتے دیکھا ہے ۔ پھر کیا اس سلوک کے بعد وہ شخص جس کی فطرت میں شرافت اور ایمانداری اور دوسروں کے حقوق کو ملحوظ رکھنے کا جذبہ ہے غیر شریف، بے ایمان حق شکن بن جائے ۔

لوگ کیسے دھکے دیتے ہیں اسکو رسوا کرتے ہیں ۔ اسے کو بیوقوف سمجھتے ہیں ۔ اسکی دل آزاری کرتے ہیں ۔ اس لئے کہ جن لوگوں کے حقوق کو وہ ملحوظ رکھتا ہے، جس خدائی قانون کا وہ پیرو رہنا چاہتا ہے ، اور جن ذمہ داریوں کو پورا کرنا وہ اپنا اخلاقی فرض سمجھتا ہے ۔ اکثریت اس قانون سے منحرف ہے ۔ ان ذمہ داریوں میں یقین نہیں رکھتی ۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد نہ جانے کیوں بہت [illegible] خیال کرتے ہیں جو صرف اپنا کام کا لوسیدھا سمجھتے ہیں ۔ جن کو نہ صرف اپنے اس حلوے مانڈے سے غرض ہے جو ان کے دسترخوان پر پہلے سے موجود ہے بلکہ دوسروں کے سامنے سے دال روٹی بھی اٹھا لینے کے لئے تیار ہیں ۔ یہ عام شخص انکو اپنے لزوم اور ارادوں میں حائل نظر آتا ہے یا جس کی روٹی ان کی اپنی چال سے مختلف نظر آتی ہے اس سے بد سلوکی اکثریت کا دستور عام ہے ۔ فرد فرد کو دکھ دیتا ہے ۔ رعانستا ٹھانستا ہے ۔ جماعتیں جماعتوں کو کچل دیتی ہیں ۔ اور مزا یہ ہے کہ قانون سے انحراف کا ایسا ڈھنڈورا پیٹتے ہیں کہ زمین و آسمان کے درمیان انہی کی بے ہنگم صدا گونجنے لگتی ہے ۔

ایک شریف آدمی جسکا عزم بلند ہے اور ارادے نیک ۔ جس کا شیوہ اپنا اور دوسروں کا حق ملحوظ رکھنا اور اسکی حفاظت کرنا ہے ۔ اسی کو خود غرضوں کے انبوہ اور بھیڑ میں سے گذرنا اور راستہ نکالنا ہوتا ہے ۔ یہ بھیڑ اس پر لپکتی ہے ۔ اسے دھکیلتی ہے اور جب وہ دھکے کھاتا ہوا راستے سے دور جا پڑتا ہے تو اس پر بے راہ روی اور گمراہی کا فتویٰ صادر کرتی ہے ۔ حالانکہ وہ اپنی مرضی سے قانون اور اخلاق کے راستے سے دور نہیں گیا ۔ بلکہ اسے کو نڈھال کرکے ڈال دیا گیا ہے ۔ وہاں اگر وہ مر جاتا ہے تو اکثر اوقات یہی اکثریت کی بھیڑ اسکی سفید سفید قبر بناتی ہے ۔ جو چراغ جلنے کے لئے اس کی مجاور بن جاتی ہے ۔

یہ ہے زندگی اور زندگی کی صورت ۔ اور یہ ہے وہ چٹان جو زندگی کی راہ میں زندگی خود حائل کرتی ہے ۔

یہ میرا ذاتی مشاہدہ اور تجربہ ہے ۔ سوال یہی تھا نا کہ زندگی مجھے کیسی نظر آرہی ہے ؟ یعنی پوچھا یہ گیا ہے کہ زندگی کی صورت کیا ہے ؟ یہ نہیں پوچھا گیا کہ زندگی کے معنی کیا ہیں ؟

میں نے صورت بیان کردی ہے یعنی جیسی جگہ مجھے زندگی اپنی ذمہ داریوں پہ یقین رکھتی ہوئی ملک کے رسم ورواج اور خدائی قانون کی پیروی کرتی نظر آتی ہے اس جگہ وہ زندگی ہی تو ہے جو راستے میں حائل ہے مجھے زندگی دوسروں کو کھلاتی پلاتی اور پرورش کرتی بھی نظر آتی ہے ۔ اور زندگی ہی کو دیکھتا رہتا ہوں کہ پرورش کرنے والوں اور جن کی پرورش ہو رہی ہے ان سب کو کھا لیتی ہے ۔ زندگی ہی تو ہے جو خود بنتی اور دوسری زندگیوں کو بناتی ہے ۔ اور زندگی ہی بنے ہوئے اور بنتے ہوؤں کو ڈھاتی ، اجاڑتی ، توڑتی پھوڑتی اور نیست و نابود کرتی ہے ۔

یہ صورت انسانی زندگی ہی کی نہیں۔ زمین و آسمان اور زمین آسمان کے اندر جو کچھ ہے اس میں یہی کچھ ہوتا نظر آرہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ انسانوں میں حائل ہونے والے، توڑتے پھوڑتے۔ جھنجھوڑتے جھنجھوڑنے والے جنگل کے شیروں، چیتوں، ہاتھیوں، ہوا کے عقابوں اور شکروں سے زیادہ ہیں فضا میں آندھیاں کبھی کبھی چلتی ہیں۔ زمین پر بجلیاں کبھی کبھی گرتی ہیں۔ باز، شکرے اور شیر چیتے جھنڈ کے جھنڈ نہیں ہیں۔ چھوٹی چھوٹی مچھلیوں کو بڑی مچھلیاں کھاتی ہیں لیکن مار کر ذخیرے نہیں رکھتیں۔ الا انسان کہ یہ گراتا ہے۔ مارتا ہے۔ کھاتا کم ہے اور ذخیرہ زیادہ کرتا ہے۔ بہر ایں ہمہ زندگی کی صورت یہی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسا کون ہے۔ مجھ پر اس کا جواب فرض نہیں کیونکہ اس کا جواب صورت سے نہیں معنی سے متعلق ہے۔ اور زندگی کے معنی مجھ سے پوچھے نہیں گئے۔ "کیا ہو رہا ہے؟" میں نے عرض کر دیا۔ "کیوں ہو رہا ہے؟" یہ ایک سوال ہے۔ جس کا تسلی بخش جواب میں دے سکتا ہوں۔ میں نے یہ جواب مدتوں پہلے سوچ رکھا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ میرے اس جواب سے آپ مطمئن بھی ہو جائیں گے۔ اور مجھ سے پورا پورا اتفاق بھی کرینگے۔ کیونکہ یہ جواب میری زندگی کی تحقیقات کا نچوڑ ہے۔ اور بھی ایک ایسی بات ہے جو میں زندگی بھر کے غور و فکر کے بعد معلوم کر سکا ہوں۔ علاوہ ازیں یہ ایک ایسی بات ہے جسے بیان کرنے کی جرأت کوئی نہیں کرتا۔

زندگی کی یہ صورت کیوں ہے؟ خود زندگی کیوں ہے؟ زندگی کے معنی، زندگی کا مقصود، زندگی کی علت و غایت یہ سب صورتیں ایک ہی سوال کی ہیں۔ اور یہ ایک ایسا سوال ہے کہ اگر ہر وہ شخص جس کا شمار زندوں میں ہے اس کا جواب دریافت کرلے تو گویا اُسے زندگی مل گئی۔

میں آپ کو یہ زندگی دے سکتا ہوں۔ تعجب ہے کہ آپ مجھ سے یہ سوال کیوں نہیں کرتے۔ خیر کیا ہوا۔ زندگی کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ بہت سی باتیں دریافت نہیں کی جاتیں۔ لیکن بیان کرنے والا بھتوں کا بھلا کرنے کیلئے انہیں بیان کر دیتا ہے۔ لہذا میں آج اعلان کرتا ہوں کہ میں نے ریڈیو کی ایجاد سے بہت پہلے اس مسئلہ کو حل کر لیا تھا۔ اور میں اس حل کو خلق خدا کے فائدے کے لئے مشتہر کر دینا چاہتا ہوں۔ میں نے بہت غور و فکر کیا ہے اور ایک نتیجہ پر پہنچ چکا ہوں۔ اور وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ زندگی کے معنی اور مقصود جو کچھ بھی ہوں۔

مجھے معلوم نہیں۔ میں نہیں جانتا۔ میں نہیں جان سکا۔ میری تمنا ہے کہ اس جواب پر ہر شخص کو اتفاق کر لینا چاہیئے۔ میرا یہ انکشاف ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ظاہر کر دینا زندہ دُنیا کی سب سے بڑی خدمت ہے۔ اور مجھے معلوم ہے کہ زندگی پر اظہارِ خیال کے لئے دعوت دینے والوں کو بھی اس جواب سے ایک گونہ اطمینان ہو جائیگا کہ آخر حفیظ نے اعتراف کر ہی لیا کہ اسے کچھ معلوم نہیں۔ وہ کچھ نہیں جانتا۔ وہ کچھ نہیں جان سکا۔

ایک اور بات اسی ضمن میں سن لیجیے۔ بہت کام آئیگی۔ یہ بات بھی میں نے اپنی ذاتی تحقیقات سے معلوم کر لی ہے کہ زندگی کی علت اور مقصود معلوم کرنے کے لئے ہمیں اپنا دماغ پریشان نہیں کرنا چاہیئے۔ ہمیں اسی پر اکتفا کر لینا چاہیئے کہ "ہم ہیں"۔ "ہم کیوں ہیں؟" یہ نہیں پوچھنا چاہیئے ؎

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معما را

اب رہ گیا یہ کہ زندگی کی جو صورت میں نے اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر بیان کی ہے وہ صورت اصلی ہے یا میری نظر کا دھوکا۔ میرا خیال ہے کہ میری بیان کردہ صورت پر آپ میں سے کوئی بھی مجھ سے اتفاق نہ کریگا۔ کیونکہ یہ معاملہ اپنے اپنے تجربہ اور مشاہدے کا ہے۔ زندگی سے ہر کوئی اپنا خصوصی معاملہ رکھتا ہے۔ یعنی آپ، میں اور وہ سب جو زندگی کے دعویدار ہیں۔ ایک مشہور کہانی کے اندھے ہیں۔ جو اندھے جو ہاتھی دیکھنے گئے تھے۔ اور ان میں سے ہر ایک ہاتھی کی صورت بیان کرتا تھا اور اپنے مشاہدے اور تجربے کی بنا پر ہر اندھا حق پر ہونے کا دعویدار تھا۔

لہذا اگر میں یہ کہوں کہ زندگی ایک گول لچکیلی۔ لٹکتی ہوئی سکڑتی ہوئی۔ لچکتی ہوئی۔ اُٹھتی ہوئی اور لپٹتی ہوئی سونڈ ہے تو آپ میں سے کوئی صاحب خم ٹھونک کر آدھمکیں گے اور دعوے کے ساتھ اپنا تجربہ و مشاہدہ بیان فرمائیں گے "جی نہیں۔ سونڈ کہاں۔ زندگی تو چھاج کی طرح پھٹکتا ہوا ایک کان ہے۔" دوسرے صاحب کہیں گے "نہیں جناب! زندگی تو ایک موٹی سی ٹانگ ہے جو پیل پائے کی طرح کھڑی رہتی ہے اور جسے میں کبھی اسکی جگہ سے ہلا نہیں سکا۔" ایک تیسرے صاحب آئیں گے اور کہیں گے "زندگی نہ تو سونڈ ہے نہ کان ہے، نہ ٹانگ بلکہ وہ تو لمبے لمبے نوکدار دانت ہیں جن پر سونے کے کڑے چڑھے ہیں میں نے خود ان دانتوں کا مشاہدہ اور تجربہ کیا ہے۔"

اس کے بعد نقاد صاحب تشریف لائیں گے بسبب ... [illegible]

بھیل پڑ جائیں گے۔ پھر ایک عالمانہ چھپی کہیں گے۔ اور فرمائیں گے یہ سب بیانات گمراہ کن ہیں۔ زندگی نہ تو سونڈ ہے نہ کان، نہ ٹانگ، نہ دانت۔ اس قسم کے جانور کا نشان صفحۂ ہستی پہ نہیں ہے۔ زندگی تو عبارت ایک بہت بڑے فیل خانے سے ہے۔ جس کا دروازہ بہت اونچا ہے۔ اور اس میں زندگی بری بری دھت کرتی ہے

اور جب کبھی میں نے جھانک کر دیکھا ہے۔ کھائے ہوئے اور ان کھائے ہوئے گنّوں کے ڈھیر روندتی ہوئی گھاس کے انبار اور تودار فضلہ بکھرا نظر آیا ہے۔ اور یہی ہے زندگی۔

نقاد صاحب یہ بات ایسے زور سے اور تحکمانہ ادا فرمائیں گے کہ سب انکا منہ تکنے اور رضامندی سے دانت نکالنے لگیں گے۔ واہ رے زندگی۔

منشور از نشرگاہ دہلی

غزل

(جناب عبدالکریم ثمر)

شائستۂ غرور بھی رسوا ہوا تو کیا
اے انقلاب تو اگر ایسا ہوا تو کیا

وارفتگیٔ شوق میں منزل کی ہے نمود
واماندگی میں ذرہ بھی صحرا ہوا تو کیا

میرے بھی درد کا نہیں پیدا کہیں جواب
تیرا اگر جواب نہ پیدا ہوا تو کیا

اُن سے عزیز تر مجھے اُن کا خیال تھا
پھر دردِ دل کا راز نہ افشا ہوا تو کیا

اُن کی تو آنکھ تر بھی نہیں میری موت پر
ماتم گسارِ خونِ تمنا ہوا تو کیا

زاہد کمالِ زہد ہے خود ہی مرا نیاز
ابلیس کا مجھے نہ جو سجدا ہوا تو کیا

میری طرف بھی دیکھ لے تیرے کرم کی خیر
گستاخ میرا حسنِ تقاضا ہوا تو کیا

دنیا کو ہے ضرورتِ چوبِ کلیم پھر
تیری نگہ میں جلوۂ سینا ہوا تو کیا

یہ کم نہیں کہ میں ہوا تقدیر آزما
قطرہ نہ اپنی موج میں دریا ہوا تو کیا

رعنائیٔ خیال نے پیدا کیا مجھے
رنگینیٔ بیاں سے میں رسوا ہوا تو کیا

میری نوا ہے قدسیوں کا درس آخری
محفل میں اے ثمر نہ میں گویا ہوا تو کیا

جنگ اور سائنس

(جناب ساغر جلیلی بی ، اے)

یکم ستمبر ۱۹۳۹ء کا دن کس قدر بدشگون اور منحوس تھا۔ جس نے دنیا کے امن و امان کو تہ و بالا کر ڈالا اور پس ماندہ اور نہتی قوموں کی آزادی کو کچل کر رکھ دیا۔ یہ وہی دن ہے۔ جبکہ ہٹلر نے بدنصیب پولینڈ پر حملہ کر کے ایک ایسی ہولناک اور تباہ کن جنگ کا آغاز کیا جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے مل سکے گی۔ آغاز عالم سے لیکر آج تک دنیا کے ہر حصہ میں ملک گیری کی ہوس باہمی جنگ وجدل کا باعث بنتی چلی آئی ہے۔ لیکن پرانے وقتوں میں جو لڑائیاں ہوا کرتی تھیں وہ صرف فریقین کی سپاہ کے مابین ہوتی تھیں۔ اسلحہ اور توپ خانے استعمال کئے جاتے تھے تو عموماً غنیم کی افواج کو سراسیمہ و پریشان کرنے کے لئے۔ اگر جنگ نے طوالت اختیار کرلی تو دارالخلافہ کا محاصرہ ہوگیا۔ آخر جب وسائل خوراک و آب ختم ہو گئے تو محاصرین نے ہتھیار ڈال دیئے۔ صلح ہوئی، اور چلو جنگ ختم۔ یہ تھا قدیم زمانے کی جنگ کا دستور۔

لیکن آج کل کی جنگ تو بمب، راکٹ، آبدوز جہاز، زہریلی گیس، ٹینک، پیراشوٹ وغیرہ کی جنگ ہے سپاہیوں کی جنگ نہیں۔ جب اور جہاں چاہو تباہی مچادو۔ فوج اور رعایا کا امتیاز نہیں۔ مذہبی، تاریخی، قومی، تعلیمی، شاہی عمارات کا لحاظ نہیں۔ ادھر بمبار طیارے آئے اور پل کی پل میں راکھ کا ڈھیر لگا کر چلے گئے۔ معصوم بچوں اور بیکس مستورات کی لاشوں کے پشتوں کے پشتے لگ جائیں تو دشمن کی بلا سے۔ کون ہے باز پرس کرنے والا۔

۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم دنیا کیلئے اس قدر خطرناک اور مہلک ثابت نہیں ہوئی تھی جس قدر حال کی جنگ۔ گذشتہ جنگ میں اس قدر تباہی انگیز ہتھیار اور آلات استعمال نہیں کئے گئے تھے جس قدر اس جنگ میں کئے گئے ہیں۔ وہ جنگ زیادہ تر مغربی ممالک تک محدود رہی تھی۔ لیکن اس جنگ کی لپیٹ میں مغرب و مشرق کی تقریباً تمام اقوام آگئیں۔

اس جنگ میں اگر کسی چیز نے سطح ارض کو تباہی کا پیش خیمہ بنایا ہے تو وہ سائنس کی ایجادات کا بے پناہ استعمال ہے۔ اس صدی میں سائنس نے جو قابل قدر چیزیں ہمارے سامنے پیش کی ہیں ان کی برکتوں اور فوائد سے کون انکار کرسکتا ہے۔ لیکن ایجاد وہی اچھی جو صرف عامۃ الناس کے مفاد کے لئے استعمال ہو۔ جب اسے اقوام عالم کی تباہی کیلئے ایجاد اور استعمال کیا گیا تو موجد اور ایجاد دونوں لعنت کے مستحق۔ اس جنگ کے سوانح پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ ۱۹۱۹ء سے لیکر آج تک سائنس نے کس قدر ہلاکت آفرین آلات اہل عالم کے سامنے پیش کئے ہیں۔ مغربی اقوام نے پچیس چھبیس سال کا عرصہ انہی ایجادات کے تجربات میں تو صرف کیا ہے۔ پھر دنیا میں تباہی نہ آتی تو اور کیا آنا تھا۔ غور کیجئے۔ انیسویں صدی کے آخر میں دنیا بھر میں لوہے کی برآمد صرف پانچ کروڑ ٹن تھی۔ اور اب اس سے دو چند ہو چکی ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس قدر متنوع مشینیں استعمال ہوئی ہیں جن کی مثال اس سے پیشتر کبھی نہیں مل سکتی۔ نپولین نے بھی مشینوں کا استعمال کیا تھا اور یورپ کے انہی علاقوں میں ہنگامہ بپا ہوا تھا جو اس جنگ کی زد میں آئے۔ مگر اس زمانے میں یورپ میں لوہے کی برآمد صرف چند لاکھ ٹن تک محدود تھی۔ اور موٹر کا وجود تو بالکل عنقا تھا۔

جیسا کہ گذشتہ جنگ سے پیشتر ملاحظہ کیا گیا تھا اس جنگ سے بھی کچھ عرصہ پہلے مغربی اقوام سخت کرب و ابتلا کی حالت میں گرفتار تھیں۔ فاشزم اور نازی ازم کی شر انگیز تحریکیں اپنی انتہا تک پہنچ چکی تھیں جرمن اور اطالوی لوگ دیگر اقوام کو سخت حقارت اور نفرت سے دیکھتے تھے۔ ان کے ذہن میں فقط ایک خیال، صرف ایک سودا سمایا ہوا تھا، اور وہ تھا یورپ اور اردگرد کی ولایات پر قابض ہونے کا۔ اور وہاں اپنی تحریکوں کو نشر کرنے پر برطانوی اور دیگر مغربی ارباب اقتدار نے ہزار کوشش کی کہ یہ چنگاری سلگ اٹھنے سے پیشتر ہی دب جائے۔ مشاورت کی مجالس منعقد کی گئیں۔ عام لوگوں نے تقریر و تحریر کے ذرائع سے احتجاج کی آوازیں بلند کیں۔ مگر بے شود۔ ڈکٹیٹرشپ کا سر نخوت امن کی تدابیر کے سامنے نہ جھک سکا۔ یورپ کی حالت اس ناسور کی سی تھی جو جسم کے اندر ہی اندر پک رہا ہو اور کھال سے باہر نکلکر پھٹنے کیلئے تیار ہو۔ ایسی حالت میں صرف جراح کا نشتر ہی کارآمد ثابت ہوا کرتا ہے۔ یہ نشتر ہٹلر اور مسولینی نے مہیا کر دیا۔ اور ناسور کا مواد عرصۂ عالم میں تعفن پھیلا کر ٹھنڈا ہوا۔

اب ذرا ان لوازمات کا تجزیہ کیجئے۔ جو اس جنگ میں خود سر حکومتوں کے تکبر اور نخوت کی زیادتی کا موجب ثابت ہوئے اور جنہوں نے ان ممالک کی ہوس گیری کو اس قدر آتش زیر پا کر دیا کہ وہ نتائج و عواقب سے

بے خبر ہو کر اس ہولناک آتشیں طوفان میں کود پڑے۔ مندرجہ ذیل اعداد و شمار پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوگا کہ مختلف ممالک میں بجلی کی پیداوار جو صنعتی اداروں کے ارتقاء کیلئے سب سے اہم جزو خیال کی جاتی ہے گزشتہ برسوں میں کس سرعت سے بڑھی۔

نام ممالک	پیداوار بابت ۱۹۱۳ء	پیداوار بابت ۱۹۳۷ء
جرمنی	۷ .... کلوواٹ	۴۹ .... کلوواٹ
اضلاع متحدہ امریکہ	۱۴ .... "	۱۳۰ .... "
انگلستان	۲۵ .... "	۲۹ .... "
روس	۲ .... "	۴ .... "
فرانس (بابت ۱۹۲۵ء)	۱ .... "	۲۵ .... "

اور اگر تمام دنیا کی مجموعی پیداوار کو لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ۱۹۲۹ء میں تمام روئے زمین پر بجلی کی کرنٹ ۲۰۰ ہزار ملین کلوواٹ تیار ہوئی تھی لیکن ۱۹۳۷ء میں یہ مقدار اس سے تقریباً دو چند ہو گئی۔

اب ذرا پٹرول کے کرشمے بھی ملاحظہ کیجئے۔ ۱۸۵۹ء میں اضلاع متحدہ امریکہ میں صرف ۲۰ ہزار گیلن پٹرول برآمد ہوتا تھا۔ ۱۹۳۷ء میں یہ برآمد ایک سو ستائیس کروڑ نوے لاکھ بیرل تک پہنچ گئی (ایک بیرل = ۴۲ گیلن) اب یہ عالم ہے کہ اضلاع متحدہ کی صرف ایک ریاست ٹیکساس (Texas) دنیا بھر کے پٹرول کا ایک چوتھائی حصہ مہیا کرتی ہے۔ اور یہ مقدار روس اور وانیزویلا کے پٹرول کی مجموعی تعداد کے برابر ہے۔ اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ آج سے بیس سال پیشتر اسی ٹیکساس میں پٹرول معمولی مقدار میں برآمد ہوتا تھا۔ اضلاع متحدہ امریکہ آج کل اس قدر تیل مہیا کرتا ہے جو دنیا بھر کی برآمد کے دو تہائی حصہ سے بھی زیادہ ہے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ علمی اور مشینی انقلابات کے پہلو بہ پہلو اقتصادی اور خلقی انقلابات بھی رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ۱۸۰۰ء میں اضلاع متحدہ امریکہ کی آبادی صرف چالیس لاکھ کے لگ بھگ تھی۔ اور اب وہاں کی آبادی چودہ کروڑ نفوس سے متجاوز ہو چکی ہے۔ روس کی آبادی ۱۸۰۰ء میں تیرہ کروڑ نوے لاکھ تھی اور اس وقت اکیس کروڑ تیس لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔ یہی حال وہاں کی کوئلہ کی برآمد ہے۔ ۱۹۳۷ء میں روس کی کانیں تین کروڑ ٹن کوئلہ بہم پہنچاتی تھیں اور اس وقت یہ برآمد سولہ کروڑ چالیس لاکھ تک پہنچ چکی ہے۔

مندرجہ بالا اعداد و شمار کے پیش نظر یہ تعجب کی بات نہیں جو مغربی ممالک میں انجن، موٹر اور ہوائی جہاز تیار کرنے کے کارخانے اجرام فلکی کی تعداد میں بڑھ گئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہمیں موجودہ صنعتی اور مشینی انقلابات نے اشیاء کو بڑی بڑی تعداد میں دیکھنے اور سننے کا عادی بنا دیا ہے۔ سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد تو ایک حقیر چیز شمار کی جاتی ہے اب ہم لاکھوں اور کروڑوں کی بابت سوچتے اور باتیں کرتے ہیں۔ اور یہ صرف سرمایہ کی افراط اور جنگ کے کارنامے ہیں۔ گزشتہ چار سال کے عرصہ میں اضلاع متحدہ امریکہ نے ایک لاکھ سے زیادہ طیارے تیار کئے۔ ۱۹۳۹ء میں اس ملک کے بحری جہازوں کا مجموعی وزن ساڑھے تین لاکھ ٹن کے قریب تھا اور ۱۹۴۳ء میں یہ وزن ایک کروڑ نوے لاکھ ٹن تک تجاوز کر گیا تھا۔

جنگ کے ہولناک اثرات کے باوجود صنعتی ادارے اور کارخانے غیر معمولی تعداد میں بڑھتے رہے۔ پیہم ہوائی حملوں کے باوجود برطانیہ نے جنگی آلات کی تیاری میں قابل تحسین استقامت اور سرعت دکھلائی۔ روس نے تباہی اور بربادی کے نرغے میں مبتلا ہوتے ہوئے بھی کئی کارخانے یوکرین سے ہٹا کر یورال میں منتقل کر دیئے۔ جہاں اب تک ٹینک اور ہوائی جہاز غیر معمولی تعداد میں تیار ہوتے رہے۔ اضلاع متحدہ امریکہ نے موجودہ اقتصادی مشکلات کے دور میں بھی مستقل تین لاکھ طیاروں کا بیڑہ تیار رکھنے کا عزم کر لیا ہے۔ اور توقع کی جاتی ہے کہ وہاں ۱۹۵۰ء تک فضائی آمد و رفت کا ایسا منظم سلسلہ قائم ہو جائیگا کہ ہر سال تقریباً دو کروڑ اشخاص ہوائی جہاز کا سفر اختیار کر سکیں گے۔ اور اس قدر طاقت اور وسعت کے طیارے تیار کئے جائیں گے جو دو سو مسافروں کو بیک وقت اٹھا کر تین سو پچاس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوائی سفر کرنے کے قابل ہونگے۔

یہی حالات مغربی دنیا کے دیگر حصوں میں وقوع پذیر ہونے والے ہیں۔ انسان پر مشین کا غلبہ روز بروز زیادہ سے زیادہ ہوتا جا رہا ہے اور انسان کی وقعت کم ہوتی جا رہی ہے۔ اس روز افزوں مشینی ارتقاء کا انجام یہ ہوگا کہ اب اگر تیسری جنگ عظیم وجود میں آئی تو وہ اس جنگ کی آوردہ تباہی سے ہزار گنا زیادہ خطرات کی حامل ہوگی۔

لیکن اب جبکہ جنگ ختم ہو چکی ہے اور امن و آشتی قائم کرنے کے وسائل کی جستجو ہو رہی ہے یورپ کے مفکرین کا فرض ہے کہ دنیا کو آئندہ تباہی سے محفوظ رکھنے کیلئے مناسب انتظامات ابھی سے شروع کر دیں۔

سائنس کے ارتقاء سے روحانی ارتقاء کا نقدان ہو چکا ہے۔ اور اب یورپ کی حالت اس برہمن کی سی ہے جس نے ایک اسیر شیر کو پنجرے سے رہا کر دیا

ذخیرہ کیسے ہی کمانے کے درپے ہو گیا تھا۔ اگر برہمن کی مدد کے لئے ایک گیدڑ وقت پر نہ آ پہنچتا تو برہمن جان سے ہاتھ دھو چکا ہوتا۔ کیا یورپ کو اس شیر سے ——— مشینوں کے تسلط سے بچانے کے لئے کوئی طاقت موجود نہیں۔ بمب، طیارے، ٹینک ——— یہ وہ الفاظ ہیں جو اس وقت مغرب اور مشرق بعید کے جنگ زدہ، نڈھال ملکوں کے زخموں پر نمک کا کام کر رہے ہیں۔ فرانس، اٹلی، جرمنی، پولینڈ ——— ایسے متمدن ممالک کی شاداب سیرگاہیں، رومان خیز مناظر، اور عظیم الشان عمارات محض افسانہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ شاہی محلات کا تجمل اور تعلیمی و قومی اداروں کی رونق، خس و خاشاک میں مل چکے ہیں۔ بھوک کا دیوتا چاروں طرف منڈلا رہا ہے۔ تن بدن ڈھانکنے کے لئے کپڑا نایاب ہے۔ بلیک مارکیٹ ہر طرف اقتدار پر ہے۔ یورپ کو اس وقت اُن مفکر سیاستدانوں کی ضرورت ہے۔ جو موجودہ صنعتی نظام کو، ان مشینی اداروں کو ——— طور پر اپنے مضبوط ہاتھوں کی گرفت میں لیکر ایسے نظام کی تدوین کریں جو اہلِ عالم کو مشینوں کا محکوم بنانے کے بجائے انہیں حیطۂ ضبط میں لے آئے۔

اگر مغرب کی سرزمین سٹالن، چرچل اور روزویلٹ ایسی باکمال شخصیتیں پیدا کر سکتی ہے۔ جو دنیا کو فاشزم اور نازی ازم کی بلاؤں سے نجات دینے میں کامیاب ہو سکتی ہیں۔ تو کیا وہاں ایسے قابل اور دوراندیش سیاستدان پیدا نہیں ہو سکتے جو آئندہ کی تباہی کے ذرائع کو ہمیشہ کیلئے مسدود کریں۔ اور اہلِ مغرب ——— بلکہ اہلِ عالم کیلئے ایسا منظم اور ٹھوس لائحہ عمل تیار کریں جو دنیا کو مادی ترقیوں کے پہلو بہ پہلو روحانی اور اخلاقی قدروں سے بھی آگاہ کرنے کا ذمہ دار ثابت ہو۔ ہماری نظریں مسٹر ایٹلی، سٹالن، اور ٹرومین کی طرف لگی ہوئی ہیں۔

(گیت)

کس نے بجائی بانسری!

از جناب ساغرؔ جلیلی بی۔ اے

من کی تمام کائنات! — سپنوں کی رَو میں غرق تھی
کس نے اِسے جگا دیا؟ — چھیڑ کے مست راگنی
چونک پڑی ہے پھر اُمنگ ——— کس نے بجائی بانسری!
جاگ اُٹھا ہے انگ انگ!

رین اندھیر تھا یہاں — جیوتی کہاں سے آ گئی؟
بجلی چمک کے میگھ سے — بستی کو جگمگا گئی!
جھوم اُٹھے ہیں سنگ و خشت ——— کس نے بجائی بانسری؟
جاگ اُٹھا ہے انگ انگ!

ٹیس کی تیز لہر سی — میری رگوں میں چھا گئی
جیسے پون کی سرد رَو — کلیوں کے دل ہلا گئی!
چھوٹ گیا من کا ساتھ سنگ ——— کس نے بجائی بانسری؟
جاگ اُٹھا ہے انگ انگ!

دُکھ کی گھڑی سُلگ پڑی — کون اِسے بجھا سکے؟
من ہے پرانا باؤلا! — راہ پہ کون لا سکے؟
اس کی ہے نت نئی ترنگ ——— کس نے بجائی بانسری؟
جاگ اُٹھا ہے انگ انگ!

جگر مرادآبادی اور نیاز فتحپوری

(از جناب سراج لکھنوی)

ماہ بماہ علمیہ کا مقدس عنوان ایک مولویانہ انداز کی صورت میں آج کل رسالہ "نگار" کا طرۂ امتیاز بنا ہوا ہے۔ اور اسی مستقل سُرخی کے تحت میں مولانا نیاز کی ادبی تنقیدیں ماہ بماہ شائع ہوتی رہتی ہیں۔ تنقید نگاری کے متعلق ایک عام خیال یہ ہے کہ یہ بڑی مشکل چیز ہے۔ بات تو ٹھیک ہے مگر ہمارے ملک کے ماہرین فن اور مشہور بالغ النظر ادباء اس دشواری کو آسان بنا سکتے ہیں۔ دنیائے ادب کی بڑھتی ہوئی آبادی میں اب نقاد حضرات کی کمی نہیں۔ حضرت نیاز میرے خیال سے قابلِ مبارکباد ہیں کہ اُنہوں نے "نگار" کے قیمتی صفحے اس دلچسپ اور مفید بحث کیلئے وقف کر دیئے ہیں۔ محض اچھی نظموں کی اشاعت اُردو ادب کی حقیقی خدمت نہیں۔

اس قسم کی تنقیدیں حسب ذیل وجوہ کی بنا پر معرض بحث میں آتی ہیں۔ یا تو خالص ادبی خدمت مدنظر ہوتی ہے یا ذاتی بغض و عناد اس کا سبب بن جاتا ہے یا کوئی انتقامی جذبہ پیش نظر ہوتا ہے یا پھر کبھی کبھی محض تفریح اس چھیڑ چھاڑ کا باعث ہوتی ہے۔ بہر حال کوئی صورت بھی ہو اس کار خیر میں حصول ثواب ضرور ہے۔ میرا مدعا یہ ہے کہ ادب کی خدمت بہر طور ہو جاتی ہے۔ سوال و جواب میں بہت سے نکتے حل ہو جاتے ہیں۔ اگر اعتراضات صحیح ہیں تو عیوب کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ اگر غلط ہیں تو جوابی مقالے ادبی دُنیا کیلئے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ حضرت نیاز کے یہ ادبی کارنامے خالص ادبی خدمت کے علمبردار ہیں یا کسی جذبہ کے ماتحت سپردِ قلم ہوئے ہیں۔ چونکہ اُن کے خلاف کوئی بیّن ثبوت موجود نہیں، اس لئے ان کی نیت پر حملہ کرنا مناسب نہیں۔ بہر حال ایک چیز جب منظرِ عام پر آ گئی تو اس کے متعلق اظہارِ خیال کا حق ہر شخص کو حاصل ہے۔ چنانچہ اس عام دعوت سے فائدہ اُٹھا کر میں بحیثیت مجیب کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

مدعی ۱۹۴۵ء کا "نگار" پیش نظر ہے۔ حضرت جگر مرادآبادی کی غزل پر حضرت نیاز نے جو تنقید و تبصرہ فرمایا ہے اُسے میں اپنی ناچیز رائے کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

جگر کی غزل کا مطلع ہے ؎

[illegible] آ ہی گیا
رخصت اے دیر و حرم دل کا مقام آ ہی گیا

اس مطلع کو جناب نیاز نے پسند فرمایا ہے۔ مجھے بھی اُن کی رائے سے اتفاق ہے۔

دوسرا مطلع ہے ؎

منتظر کچھ رند تھے جن کے وہ جام آ ہی گیا
ہاں ش اے گردوں کہ وقتِ انتقام آ ہی گیا

اعتراض دوسرا شعر بھی صاف ہے لیکن مفہوم اور انداز بیان فرسودہ اور پامال ہیں۔ اس مضمون کو حافظ اور غالب جس رندانہ جوش کے ساتھ ادا کر گئے ہیں اس میں اضافہ ممکن نہ تھا۔ حافظ کہتا ہے ؎

بیا تا گل برافشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرح نو در اندازیم
اگر غم لشکر انگیزد کہ خونِ عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

غالب کہتا ہے ؎

بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم
قضا بہ گردشِ رطلِ گراں بگردانیم

جگر نے بھی لفظ "ہاش" کے استعمال سے کچھ جوش پیدا کرنا چاہا ہے لیکن یہ للکار امیر حمزہ کی نہیں بلکہ عمر و عیار کی سی ہے۔ علاوہ اس کے پہلے مصرعہ میں "کچھ" کا لفظ صرف مصرعہ کا وزن پورا کرنے کیلئے لایا گیا ہے جس نے مفہوم کی وسعت کو تنگ کر دیا۔ یہ خصوصیت کہ جام ہاتھ میں آیا اور گردوں یا زمانہ سے انتقام کیلئے آمادہ ہو گئے، تمام رندوں کی شان ہو چاہیئے۔ لیکن جگر نے "کچھ" کا اضافہ کر کے اس عمومیت میں تخصیص پیدا کر دی جس نے لطف کم کر دیا۔

جواب اس مطلع کو فرسودہ اور پامال بتایا گیا ہے۔ یہ محض نیاز کی رائے ہے جس سے بہت کم لوگوں کو اتفاق ہو گا۔ انفرادی رائے اور ناپسندیدگی بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے بہت مشکوک ہوا کرتی ہے۔ حافظ اور غالب کے اشعار سے اوّل تو جگر کو اپنے اس شعر کا مقابلہ کرنا مقصود نہیں۔ اس کے علاوہ ان شعروں اور جگر کے شعر میں ہم آہنگی نہیں۔ حافظ کے اس شعر "بیا تا گل ــــ الخ" کی تخئیل اور اس کا موضوع صرف اس قدر ہے کہ وہ معشوق کو ترغیب اور تحریص اپنے پاس آنے کی دیتا ہے، اس صورت سے کہ آسمان کو مسلمہ طور پر تمام عالم نے انواع و اقسام کے مصائب کا موجب کہا ہے لہذا مشترکہ دشمن کی تخریب کیلئے فریقین آمادہ ہو جائیں گے۔

دوسرا شعر حافظ کا "اگر غم لشکر ___ الخ" کا حاصل شعر یہ ہے یعنی اگر غم ہماری جان لینے کے پیچھے پڑا تو ہم اور ساقی دونوں متحد ہو کر اسکو (غم کو) بیخ و بنیاد سے مستاصل کر دینگے۔

تیسرا شعر غالب کا "بیا کہ قاعدہ ___ الخ" کا مفہوم بھی تقریباً وہی ہے جو حافظ کا۔ اس میں بھی معشوق کو آنے کی دعوت دی گئی ہے۔

برخلاف ان تینوں اشعار کے جگر کے شعر کا موضوع اور اسکی تخئیل کی بنیاد یہ کہاں جاتا ہے جس پرت عرنے یہ نتیجہ مرتب کیا ہے کہ جو جو کلفتیں آسمان پہنچا چکا ہے اُس کا بدلہ لینے کا وقت آگیا ہے۔ اہل نظر حضرات ملاحظہ فرمائیں کہ جگر کے شعر اور حضرت نیاز کے پیش کردہ اشعار میں اتنے کا تفاوت کہاں تک ہے۔

یہ تسلیم ہے کہ لفظ "باش" سے غالب نے جوش پیدا کرنا چاہا مگر حضرت نیاز کی افراسیابی تنقید اس جوش کا کوئی اثر قبول کرنے میں اپنی سبکی محسوس کرتی ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ یہ تنقید مانع سبب ہے جبکہ سپرد قلم ہوئی یا ملکۂ حیرت کے دربار میں۔ کیا نیاز صاحب کی نظر میں لفظ "باش" نے اپنی اہمیت اور زور اس لئے زائل کر دیا کہ اسکا استعمال طلسم ہوشربا میں ایک حریف کی زبان سے دوسرے کے مقابلہ میں اکثر کیا گیا ہے۔ جہاں تک لٹریچر کا تعلق ہے "طلسم ہوشربا" تو ایسی کتاب ہے جس کے تصدق میں بہت سے دیہاتی زبان داں اور ادیب بن گئے۔ ہر لفظ اپنے محل پر صرف ہو کر اپنے معنی روشن اور واضح کرتا ہے۔ یہ جگر ایسے شاعر کی رندانہ رجز خوانی ہے جو نعرہ گردوں شگاف بنکر جذباتی دنیا کو ہلائے دے رہی ہے۔ اس جگہ پر لفظ "باش" میں بلا کا جوش ہے جو طوفانی اثر سے لبریز ہے۔ جگر نے مصرعۂ ثانی میں اس لفظ کو صرف کر کے اردو ادب میں خوشگوار اضافہ کیا ہے۔

اس کے علاوہ لفظ "کچھ" کے متعلق بھی مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ عشق و ہوس میں کچھ امتیاز ہونا چاہیئے۔ ہر رند جگر کی نظر میں ان خصوصیات کا حامل نہیں جسکے مدعی خود جگر ہیں۔ ہر صاحب نظر موسیٰ نہیں ہوا کرتا۔ اور اس بنا پر عمومیت سے تخصیص کا درجہ بلند تر ہے جس نے لطف شعر کو دوبالا کر دیا۔ میرے خیال میں اس شعر پر حضرت نیاز کی تنقید اس قابل ہے کہ بہ حفاظت تمام عمر و عیار کی زنبیل میں رکھ دی جائے۔

تیسرا شعر ہے ؎

اللہ اللہ یہ مرے ترک و طلب کی وسعتیں
دفعتہً رفتہ سامنے حسن تمام آ ہی گیا

اس شعر کو پڑھکر صاحبانِ نظر پہلی ہی نظر میں اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ "ترک وطلب" میں حرف عطف کا درمیانی اضافہ سہو القلم کاتب ہے۔ مگر حضرت نیاز نے بجائے "ترکِ طلب" کے "ترک وطلب" پر اپنی تنقیدی بنیاد قائم کر دی۔ شعر کو غلط بھی بتایا اور خدا جانے کیا کیا فرما گئے۔ مگر اپنا اور ناظرین کرام کا تھوڑا سا وقت ضائع کرنے کے بعد پھر خود ہی ہوش میں آ گئے۔ اور آخر میں فرماتے ہیں "اگر ترک وطلب کے درمیان حرف عطف کو دور کر دیا جائے تو بیشک مفہوم پیدا ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے حرف عطف کاتب کی غلطی ہو۔" آخری جملے میں کاتب کی غلطی کو نیاز صاحب امکانی غلطی قرار دیتے ہیں۔ یہ عقیدے کی کمزوری ہے جو یقین میں شبہ کو دخل دیا جا رہا ہے۔

چوتھا شعر ہے ؎

ہر نگہ پہ بندشیں اک اک نفس کی پرسشیں
ہوشیار اے عشق، وہ نازک مقام آ ہی گیا

اعتراض: پرسش کا استعمال صحیح نہیں۔ پرسش اور پرسہ فارسی میں عیادت اور تعزیت کیلئے استعمال ہوتا ہے نہ کہ باز پرس کیلئے۔ لیکن چونکہ اردو میں پرسش، باز پرس کے معنی میں استعمال ہوتا ہے اس لئے کوئی حرج نہیں۔ تاہم مصرعہ کے دونوں ٹکڑے متوازن نہیں۔ "اک اک نفس" کے ساتھ "ہر ہر نگہ" ہونا چاہیئے تھا یا پھر "اک اک" کو دور کر کے مصرعہ یوں کہنا چاہیئے ؎

ہر نظر پہ بندشیں ہیں ہر نفس کی پرسشیں

جواب: لفظ "پرسش" پر نیاز صاحب نے اعتراض فرما کر خود ہی اپنا اعتراض رد بھی کر دیا۔ یہ تسلیم کر کے کہ اردو میں "پرسش"، "باز پرس" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ یہ متضاد کاوشیں سمجھ میں نہ آئیں۔ کیا مالہ و ماعلیہ کی رعایت مقصود ہے۔ میرے خیال میں تو یہ تضیع اوقات کی دوسری مثال ہے۔ مگر اس سب سے قطع نظر کیجیے۔ پہلا اعتراض بھی غلط ہے۔ میں فارسی کا یہ شعر پیش کرتا ہوں جو مجھے یاد آ گیا۔

روز محشر کہ جانگداز بود
اولیں پرسش نماز بود

اس شعر میں لفظ "پرسش" کے معنی "باز پرس" کے ہیں یا کچھ اور۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یہ شعر ذرا نمازی قسم کا ہے مگر اسے کیا کیا جائے کہ مشہور ہے حضرت نیاز نے اس شعر پر اپنی تنقید کی بنا صرف لغت کے مطالعہ تک محدود رکھی ہے۔

اب رہا مصرعہ کے دونوں ٹکڑوں کا توازن تو جگر کے پاس شعر کہتے وقت کوئی ترازو یا کانٹا نہ تھا۔ مولانا نیاز کی اصلاح بادی النظر میں قابل قبول ہے مگر اس اصلاح کی ضرورت ہی کیا۔ "ہر نظر" اور "اک اک نفس" ان دونوں ٹکڑوں میں "ہر" اور "اک اک" دونوں میں عمومیت ہے۔ شاعر ایک ہی معنی کے دو لفظ صرف کرنا چاہتا ہے۔ زبان کے تنگ کرنے کا مشورہ کیوں دیا جا رہا ہے۔ جگر کے مصرعہ میں کوئی زبان و محاورہ کا سقم یا عیب نظر نہیں آتا۔ مصرعہ صاف اور رواں ہے۔ کوئی جھول نہیں۔ یہ تنقیدی استری بلا ضرورت ہے۔ صحت زبان اور محاورہ کی ضروری پابندی یقینی قابل لحاظ ہے مگر نشست

الفاظ پر غیر ضروری بندشیں عاید کرنا اور باز پرس کرنا نقد و تبصرہ کی توہین ہے۔

پانچواں شعر ہے ؎

التفاتِ چشمِ ساقی کی سبک تابی نہ پوچھ
میں یہ سمجھا جیسے مجھ تک دورِ جام آ ہی گیا

اعتراض پانچواں شعر مفہوم کے لحاظ سے بہت اچھا ہے۔ لیکن اس میں "سبک تابی" کا استعمال محلِ نظر ہے۔ "تاب" کے معنی ہیں "روشنی، گرمی، صبر تپش" اور "سبک" کے معنی ہیں "ہلکا، جلد، شتاب" اور ان معنی کو پیشِ نظر رکھکر جگر صاحب نے "سبک تابی" ہلکی روشنی یا ہلکی گرمی کے مفہوم میں استعمال کیا ہے ـــــ "سبک تاب" اگر التفات کی صفت قرار دی جائے تو اس کا مفہوم ہوگا۔ جلد ختم ہونے والا التفات"۔ یہ شعر کے مفہوم کے لحاظ سے نامناسب نہیں۔ چونکہ دوسرے مصرعہ میں "جیسے" کا لفظ استعمال ہوا ہے اس لئے التفاتِ چشمِ ساقی کی تعبیر کچھ اس طرح ہونا چاہیئے کہ ہلکا سا فریب اس سے ظاہر ہو۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ اس مصرعہ کو یوں ہونا چاہیئے ؎

التفاتِ چشمِ ساقی کے کرشمے کچھ نہ پوچھ

اس طرح یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ شاعر کا یہ سمجھنا کہ "مجھ تک دورِ جام آ ہی گیا" صرف ایک کیفیت تھی نہ کہ واقعی شراب کی پیشکش۔

جواب نیاز صاحب نے "سبک تابی" کی ترکیب کی صحت یا عدمِ صحت کے متعلق کچھ ارشاد نہیں فرمایا۔ اس لئے مجھے بھی کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ مفہومِ شعر جو پیش کیا ہے اُس سے مجھے اتفاق ہے مگر جو فائدہ "کرشمے" سے اُٹھایا جارہا ہے وہی "سبک تابی" سے بھی حاصل ہو سکتا ہے۔ دوسرے مصرعہ میں "جیسے" کا لفظ بانگِ دہل کہہ رہا ہے کہ حقیقتِ شے سے انکار ہے۔ یعنی درحاصل جام سامنے نہ ہوا یا ملکا ایسا محسوس یا معلوم ہوا۔ اور یہ بھی لفظ "کرشمہ" کے مرہونِ منت ہیں۔ اگر "التفاتِ چشمِ ساقی" تیز رو، زیادہ روشن یا مستقل ہوتا تو فریبِ حُسن مکمل ہو جاتا۔ اور عاشق کی فریب خوردہ نگاہیں اسے حقیقت سے تعبیر کرتیں۔ روشنی ہلکی تھی، لطیف تھی، اس لئے صرف ایک تمثیلی کیفیت محسوس ہوئی۔ اب رہا "کرشمے" اور "سبک تابی" کا فرق، تو "کرشمے" کا لفظ منجھا ہوا ہے اور سامنے کا ہے۔ جو فی زمانہ ہر مبتدی کی میراث ہے۔ جگر نے عام سطح سے ہٹ کر ذرا جدت کے ساتھ یہ نیا لفظ صرف کیا ہے۔

چھٹا شعر ہے ؎

عشق کو تھا کب سے اپنی خشک دامانی کا رنج
ناگہاں آنکھوں کو اشکوں کا سلام آ ہی گیا

اعتراض چھٹے شعر کے دوسرے مصرعہ میں لفظ "سلام" بالکل بے محل ہے۔ اس کی جگہ "پیام" کہنا زیادہ مناسب ہے۔

جواب "سلام" بے محل کیوں ہے اس کی کوئی وجہ نیاز صاحب نے بیان نہیں فرمائی۔ بظاہر اصلاح خوبصورت ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں خود بھی اس کرشمہ ساز حسین فریب میں مبتلا ہو کر تھوڑی دیر کے لئے جناب نیاز کا ہمخیال ہو گیا تھا۔ مگر اس خیال سے کہ جگر ایسے شاعر نے "پیام" سے بیگانگی کیوں برتی۔ یہ لفظ تو بہت متعارف ہے، میں نے شعر پر غور کرنا شروع کیا اور جب معنی سمجھ میں آگئے تو جناب نیاز کو سات سلام کرنے کو جی چاہتا ہے۔ نیاز صاحب ملاحظہ فرمائیں "پیام" میں "سلام" موجود نہیں۔ مگر "سلام" میں "پیام" بذاتِ خود شریک اور اس کا جزو مشترک ہے، لہذا لفظ "سلام" کا استعمال پیامی ضرورت کی خانہ پُری بھی کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ "سلام" میں ایک لطیف طنز ہے جو پیام کو نصیب نہیں نیاز صاحب نے صرف فصاحت کو ترجیح دی اور بلاغت کو قطعی نظر انداز کر دیا۔ وہ بلاغت کیا ہے؟ میں عرض کرتا ہوں۔ "پیام" دوسرے کے ذریعہ سے بھیجا جاتا ہے "پیام" بھیجنے والا خود پیامبر نہیں ہوتا۔ لیکن "سلام" علی العموم خود کیا جاتا ہے۔ یعنی سلام کے ساتھ سلام کرنے والے کی موجودگی ثابت ہوتی ہے۔ اشکوں نے اگر آنکھوں کو پیام بھیجا ہے تو آنکھوں میں اشکوں کی موجودگی اور آنکھوں کا تر ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ اور ایسی صورت میں خشک دامانی کے رنج کا عملی حیثیت سے دفعیہ ناممکن ہے مگر سلام میں پیام کے ساتھ ساتھ اشکوں کی موجودگی کا ثبوت بھی فراہم کیا گیا ہے اور اسی کا نام بلاغت ہے۔

ساتواں شعر مقطع ہے ؎

بے جگر سُونا پڑا تھا مدتوں سے میکدہ
پھر وہ دریا نوش رندِ تشنہ کام آ ہی گیا

اعتراض مقطع اچھا ہے لیکن اس پر جگر نے یہ فٹ نوٹ لکھکر کہ میکدہ سے مراد اُن کے پیر مُرشد کا آستانہ ہے نشہ کرکرا کر دیا۔

جواب سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ تنقید مذہبی ہے اخلاقی، ادبی ہے یا معاشرتی مقطع کا اچھا ہونا تسلیم ہے۔ مگر فٹ نوٹ سے شکوہ پیدا ہو گیا۔ غالباً پیری اور مُریدی کے مسلک سے اختلاف ہے۔ یہ ایک مذہبی موضوع ہے اور صوفیانہ مبحث۔ اس کے متعلق ایک علیحدہ مضمون حوالہ قلم کرنا چاہیئے۔ جو حضرات اس کے اہل ہونگے اس کا جواب دیں گے۔ مگر نیاز صاحب کی شکایت بہت آسانی سے دفع ہو سکتی ہے۔ سینٹے کے ایک موٹے قلم کو خوب گہری سیاہ رنگ کی روشنائی میں ڈبو کر اس فٹ نوٹ کو بے دھڑک کاٹ دیں۔ نتیجہ میں ایک صحیح سالم مقطع ہاتھ لگے گا۔ جو اتفاق سے اچھا ہے۔ اس مقطع پر نیاز صاحب

صاحب کی تنقید بغیر ساز کی قوالی معلوم ہوتی ہے جو کیسر بے کیف ہے۔

آخر میں ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں۔ یہ "نشہ کرکرا ہوگیا" کہاں کی زبان یا محاورہ ہے۔ "نشہ ہرن ہوگیا" بولتے ہیں۔ "نشہ کرکرا ہوگیا" نہیں کہا جاتا بلکہ "مزا کرکرا ہوگیا" کہا یا بولا جاتا ہے۔ کوئی اہل زبان یا زبان داں ادیب عالم مستی میں بھی "نشہ کرکرا ہوگیا" نہ کبھی بولے گا نہ لکھے گا۔ اگر مناسب سمجھئے تو اصلاح فرمائیے۔

نقوشِ ماضی

(از واحدی)

میونسپل کمیٹی دہلی کا میں بارہ سال ممبر رہا۔ مجھے روزنامچہ لکھنے کی عادت نہیں ہے۔ لیکن میونسپل کمیٹی کے بارہ سالہ تجربات اتفاق سے روزنامچہ کی طرح قلمبند ہو گئے۔ ان بارہ سال کے اندر میں نے جو جو کچھ دیکھا۔ بارہ سال سے پہلے کے چھیالیس سال میں نہیں دیکھا تھا۔ ممبری چھوڑ دینے کے بعد بھی تجربہ بڑھنے کی زندگی ختم نہیں ہوئی ہے۔ ساڑھے ڈیڑھ سال سے راشننگ کا ایک کام اپنے ذمے لیا ہے نا۔ لوگوں سے واسطہ تو تھوڑا بہت ہمیشہ ہی پڑتا تھا اخباروں اور رسالوں کی وجہ سے۔ مگر میونسپل کمیٹی کا ممبر بن جانے کے بعد میں لوگوں میں بالکل گھر سا گیا۔ اور اب اس سے بھی زیادہ گھرا ہوا ہوں۔ تجربہ لوگوں سے واسطہ رکھنے ہی سے بڑھتا ہے۔ کتاب تجربات میں دس بیس سطروں کا روز اضافہ ہو جاتا ہے۔ بارہ سال کی یادداشتیں اتنی کافی ہیں کہ اگر چوبیس گھنٹے میں دو گھنٹے لکھنے کے لئے مل جایا کریں تو پانچ سال تک کسی اور عنوان کے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ مگر اول تو پانچ سال کا جینا مشکل ہے اور پھر دوسرے مضامین سے دماغ کو خالی کر لینا بھی بس کی بات نہیں۔ بہرحال کبھی کبھی نقوشِ ماضی کے ماتحت قصص پارینہ کو دہراؤں گا۔ صرف میونسپل کمیٹی کے قصص کو۔ راشننگ کے دور کے قصص دہرانے کا ابھی وقت نہیں آیا۔ آج ”انسان پر انسان کی بیداد“ کا ایک قصہ عرض ہے۔

ایک بیگم صاحبہ، جن کی دلی کے کئی بڑے بڑے خاندانوں سے رشتہ داری ہے، تشریف لائیں۔ فرمایا ”حلال خوری نے ستا رکھا ہے کئی دقت سے کمانے نہیں آئی۔ گھر سڑ رہا ہے۔ پیخانہ بہاتے بہاتے تھک گئی۔“ میں نے کہا ”یہ آپ نے کیا کیا۔ پیخانہ بہانا نہیں چاہیئے۔ یہ جرم ہے۔“ بولیں ”خوب! آپ سے ایسی اُمید نہ تھی کہ آپ بھی اُلٹا الزام دینے لگیں گے۔ کمیٹی گئی تو سکرٹری نے دو گھنٹے ڈیوڑھی میں انتظار کرا کر جواب دے دیا کہ تمہیں ہیلتھ افسر کے پاس جانا چاہیئے۔ ہیلتھ افسر کے ہاں گئی۔[1] تو ہیلتھ افسر نے کہا کہ ہے ڈولی کمرہ میں لے آؤ۔ جب میرے دروازے پر گیا تھا اور میں نے منتیں کی تھیں کہ اندر آ کر پیخانہ کی حالت دیکھ لو، تو کہہ دیا کہ گھر میں تم اکیلی ہو۔ میں اندر نہیں آ سکتا۔ اب کہتا ہے کہ کمرہ میں آ کر بات کرو۔ وہ مجھ اکیلی کے گھر میں نہیں گھسا تو میں اکیلی اس کے کمرہ میں کیوں جاتی۔ میں نے انکار کر دیا اور کہلا بھیجا کہ یہ یہ پریشانی ہے۔ اسے دُور کرو۔ اس کے جواب میں چھپا ہوا ایک پُرزہ بھیج دیا۔ لیجئے یہ ہے۔ ذرا پڑھئے کیا لکھا ہے؟“

میں نے کہا ”پڑھنے کی ضرورت نہیں۔ اس میں لکھا ہوگا کہ اپنے گھر اور گھر کے پیخانے وغیرہ کو صاف رکھنا گھر والوں کا فرض ہے۔ گھر کی حلال خوری گھر والوں کی نوکر ہوتی ہے۔ کمیٹی کی نوکر نہیں ہوتی۔ گھر والے اپنی حلال خوری سے اُسی طرح کام لیں جس طرح کھانا پکانے والی ماما سے لیتے ہیں۔ کبھی بگڑ کر۔ کبھی چمکار کر۔ کبھی انعام اکرام دیکر۔ حلال خوری غریب کی اوقات کیا۔ اُجرت میں چند پیسوں کا اضافہ کر دیجئے اور ذرا میٹھی زبان سے بول لیجئے۔ وہ آپ کی لونڈی بن جائے گی۔“

کہنے لگیں۔ ”نہیں۔ نہیں۔ یہ نہیں لکھا۔ میرے فلاں عزیز آنریری مجسٹریٹ ہیں۔ اُنہوں ہی نے مجھے یہاں بھیجا ہے۔ ان سے میں نے پڑھوایا تھا۔ آپ پڑھئے تو سہی۔“

میں نے کہا ”اچھا یہ لکھا ہے کہ آپ کا پاخانہ صاف نہ ہوگا تو آپ پر مقدمہ چلایا جائیگا۔“ ایک دم چیخیں ”جی یہ لکھا ہے۔ اس کا ناس جائے۔ ہم پر مقدمہ چلائیگا۔ اب آپ اس موذی کو ٹھیک کیجئے۔“

میں نے کہا ”خیر مقدمہ کیا چلے گا۔ لیکن آپ نے میری بات پوری نہیں سُنی۔ میں یہی کہہ رہا تھا کہ حلال خوری سے کام لینا آپ کا کام ہے۔ پاخانہ اس حد تک خراب رہے کہ اس سے گھر والوں اور پڑوسیوں کی صحت پر اثر پڑے تو کمیٹی مقدمہ قائم کر دیتی ہے۔ حلال خوریوں کی شکایت کرنے والوں کے لئے یہ جواب چھپوا کر رکھ لیا گیا ہے۔ مجھے اس کا مضمون معلوم ہے۔ میرا پڑھا ہوا ہے۔ آپ غور کیجئے۔ کل آپ کی ماما کھانا پکانا چھوڑ دے تو کیا اسکی بھی شکایت آپ کمیٹی کے افسروں یا کمیٹی کے ممبروں سے کرتی پھرینگی۔ آپ کو اس طرح مارا مارا پھرنا زیب نہیں دیتا۔ میں آپ کو جان گیا۔ آپ کے والد کی خدمت میں مجھے نیاز حاصل تھا۔ آپ کے شوہر

---

[1] بیگم صاحبہ انسپکٹر کو ہیلتھ افسر سمجھی تھیں۔

شاید میرے ہم جماعت تھے۔ آپ کے فلاں عزیز میرے دوست ہیں اور فلاں عزیز واقف۔ شکایت کرنی تھی تو آپ کے شوہر کرتے۔ ایسے خاندان کی بیوی کا کمیٹی تک پہنچ جانا مجھے پسند نہیں آیا۔"

کہنے لگیں "شوہر اس جوگے ہوتے تو اچھے دن نہ ہوتے۔ انہوں نے ہی تو لٹیا ڈبو رکھی ہے۔ ورنہ میں در در کی ٹھوکریں کیوں کھاتی۔ خیر، غرض آپ کا مشورہ یہ ہے کہ میں حلال خوری کی خوشامد کروں۔ اس سے معافی مانگوں۔ اس کے آگے ناک رگڑوں۔ اس کے آگے ناک سے لکیریں کھینچوں۔"

میں نے کہا "ہرگز نہیں بوا۔ میرا مشورہ یہ نہیں ہے۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ حلال خوری کے ساتھ اچھا برتاؤ کیجیے۔" کہنے لگیں "آپ کو وحی آئی ہے کہ میں حلال خوری سے برا برتاؤ کرتی ہوں۔"

میں نے کہا "وحی تو اب آنی بند ہوگئی۔ اندازہ سے کہہ دیا۔ دوسرے مہمانوں کو بھی کمینوں سے سخت برتاؤ کرتے دیکھا ہے۔ آپ بڑے خاندان کی عورت ہیں۔ نیز اس وقت کا آپ کا غصہ دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ غالباً حلال خوری کی کوئی گستاخی برداشت نہیں ہوئی ہوگی۔ بہرحال اگر آپ نے سخت برتاؤ نہیں کیا اور زیادتی سراسر حلال خوری کی ہے تو اسے سزا دلوائیے۔ اپنے مجسٹریٹ بھائی سے کہیے۔ کسی وکیل کو وارث کر دیجیے وہ آپ کی طرف سے حلال خوری پر مقدمہ چلا دے گا۔"

چنانچہ یہ مشورہ قبول ہوگیا۔ اور مجسٹریٹ بھائی نے بھی مدد کا بیڑا اٹھایا۔ میری قسمت ملاحظہ ہو۔ جن مجسٹریٹ کے ہاں مقدمہ دائر ہوا، انہوں نے کمیٹی ممبر علاقہ ہونے کے خیال سے میرے ہی پاس تحقیقات کے لئے بھیج دیا۔ اب مجھے بیگم صاحبہ اور حلال خوری دونوں سے سوال کرنے پڑے۔ حلال خوری نے بیگم صاحبہ کے منہ در منہ کہا کہ "میاں! ان کی اور باتوں کو جانے دیجیے۔ جس دن میں نے ان کے ہاں کا کام چھوڑا ہے۔ اور پھر آپ کا حکم پہنچنے پر دوبارہ شروع کیا ہے، ٹھیک اس دن کی بات سناتی ہوں۔ میری ایک بغل میں ٹوکرا تھا اور ایک بغل میں یہ ننھی سی جان۔ گھر میں گھسی تو انہوں نے مجھے لکڑی سے مروڑ ڈالا ——— خیر میں صبر شکر کرتی بچے کو صحن میں بٹھا پیخانہ کمانے چلی۔ جھکی ہوئی پیخانہ کما رہی تھی کہ پیچھے سے ایسی لات ماری کہ میں اوندھے منہ کھڈی میں گری۔ اور لت پت ہوگئی۔ بس میاں۔ آپ ہی سوچیے اس کے بعد میں کیا کرتی۔ آپ کی بات ٹال نہ سکتی تھی جو دوبارہ بیگم صاحبہ کی خدمت کو پہنچ گئی۔ ورنہ عہد تو یہ کیا تھا کہ بھوکی مر جاؤں گی لیکن اس دہلیز پر قدم نہ دھروں گی۔"

مختصر یہ ہے کہ میں نے تحقیقاتی رپورٹ بھیج دی اور مجسٹریٹ صاحب نے بیگم صاحبہ کا دعویٰ خارج کر دیا۔ ادھر معلوم ہوا کہ واقعی کمیٹی نے بھی ساتھ کے ساتھ پیخانہ گندا رکھنے کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اس میں بیگم صاحبہ کو بیس روپے جرمانے کے بھرنے پڑ گئے۔

سنا ہے ان بیگم صاحبہ کو لیڈری کا بھی شوق ہے۔ عورتوں کی مظلومیت اور بے بسی پر پردہ باغوں میں بہت بولتی رہتی ہیں۔ لیکن صرف اس مظلومیت اور بے بسی پر جو مردوں کے مقابلہ میں ہے۔ عورت عورت پر ظلم کرے تو یہ ان کے نزدیک غالباً (بلکہ عملاً) قابل اعتراض نہیں۔

مولٰنا سید سلیمان ندوی

اور ان کی تحریر کی خصوصیات

(از جناب خلیل صدیقی صاحب ام اے)

اُردو کے عناصر خمسہ نے اسے علمی و ادبی زبان بنا دیا ورنہ اس کے دامن میں دواوین، افسانوں اور مذہبی رسالوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور اگر کچھ تھا بھی تو نہ ہونے کے برابر۔ ان محسنین اُردو کی تصانیف اور ان کے فیضان صحبت کی بدولت ملک میں ایسی ہستیاں نظر آتی ہیں جو زبان و ادب کی گرانقدر خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ان ہی مقتدر ہستیوں میں سے ایک ہستی سید سلیمان ندوی کے نام سے مشہور ہے۔

بقول پروفیسر حامد حسن قادری "عصر حاضر میں بے شمار مصنفین نظر آتے ہیں لیکن جو لوگ فطری صلاحیت اور ذوقِ سلیم کے ساتھ ذہنی تربیت اور علمی تحقیق سے مستفیض ہیں وہی ٹھوس اور اصلی کام کر رہے ہیں۔ باقی جہانِ علم و ادب کے حشرات الارض ہیں۔ اور ہر زمانے سے زیادہ ہمارے زمانے میں ہیں۔" یہی جہانِ علم و ادب کے "حشرات الارض" جو ہر قابل" بننے سے پہلے شہرت کے متمنی ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ادبی فضا کو مسموم ہی نہیں کرتے بلکہ عوام کے مذاق کو پست تر بناتے رہتے ہیں۔ زمانے کی چابکدستیاں دیکھئے کہ بلند پایہ ادیبوں کے علی الرغم ان کی قدر و منزلت بھی خوب ہوتی ہے۔ سستے قسم کے ادب کے مقابلے پر ٹھوس علمی و ادبی کارناموں کی منزلت کما حقہ نہیں ہوتی۔ نا اہل دان طبقہ کا یہ حوصلہ شکن رجحان ادیبوں کو اپنے معیار سے پستی کی طرف آنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ ایسے ادیب شاذ و نادر نظر آتے ہیں جن کے پیش نظر یہ بات نہیں ہوتی کہ زمانہ کیا چاہتا ہے بلکہ جن کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ زمانے کے سامنے ایسے امور پیش کریں جن کی ضرورت ہے۔ چاہے نہیں نا قدردانی کی شکایت ہی کیوں نہ ہو۔ مستقل مزاجی سے اپنے فرض کی ادائیگی میں منہمک ہیں۔ سید سلیمان ندوی کا شمار اسی قسم کے معدودے چند ادیبوں میں ہے جنہیں اپنی ذمہ داری کا احساس ہے اور جو زبان و ادب کی بے لوث خدمت کے لئے منتہائے کمال پر پہنچنا ضروری سمجھتے ہیں۔

سید صاحب دیسنہ ضلع پٹنہ میں پیدا ہوئے۔ "ہوش و تمیز کی آنکھیں علم و ادب کے گہوارے لکھنؤ میں کھولیں۔ اسی کی آب و ہوا میں علمی و ادبی نشو و نما پائی۔" اُردو کے عناصر خمسہ کے رکنِ اعظم علامہ شبلی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ندوۃ العلما کا علمی و اسلامی ماحول اور علامہ شبلی کا فیضانِ صحبت ذوقِ سلیم کے لئے سونے پر سہاگہ ثابت ہوا۔ حقیقت یہ ہے کہ "علامہ شبلی نے ایک زندگی کھو کر اپنے شاگردوں میں بہت سی زندگیاں پالیں۔" ان کے تلامذہ ان کے ذوقِ نگار اور جذبۂ عمل کے آئینہ دار ہیں۔ لیکن سید سلیمان اپنے استاد سے دیگر تلامذہ کے بہ نسبت قریب تر ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی کی روح سید صاحب کے جسم میں حلول کر گئی ہے۔ سید صاحب ان کے صحیح جانشین ہیں۔ ان کی سرکردگی میں دارالمصنفین اعظم گڈھ اُردو کی گراں بہا خدمات انجام دے رہا ہے۔ اور ایک وقیع ماہنامہ "معارف" کے ذریعہ ہر ماہ علم و ادب میں قابل قدر اضافہ کر رہا ہے۔ حسن انتظام کا یہ عالم ہے کہ اس نازک دور میں بھی، جبکہ پرانے رسائل بھی اپنے معیار کو قائم نہ رکھ سکے، "معارف" اسی آب و تاب، ضخامت و معیار کے ساتھ جاری ہے جس طرح جنگ سے پہلے تھا۔ یہی نہیں بلکہ دارالمصنفین کے تربیت یافتہ ادیبوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

سید صاحب کی مشہور تصانیف حسب ذیل ہیں:—

ارض القرآن۔ عربوں کی جہاز رانی۔ سیرت عائشہؓ۔ حیاتِ مالکؒ۔ سیرت النبیؐ۔ خیام۔ حیاتِ شبلی۔

ان کی تقاریر، خطبات اور مقالات کے مجموعے یہ ہیں:—

عرب و ہند کے تعلقات۔ نقوشِ سلیمانی۔ خطبات مدراس۔

ارض القرآن میں ان اقوام کے حالات اور جغرافیائی کوائف نہایت جامع اور محققانہ طور پر بیان کئے گئے ہیں جن کا ذکر قرآن پاک میں کیا گیا ہے۔ ایسی بصیرت افروز کتاب اُردو کا تو ذکر ہی کیا عربی میں بھی نہیں تصنیف کی گئی۔ اس کا عربی ترجمہ ہو چکا ہے۔ مصر، عراق اور عرب میں نہایت مقبول ہے۔ نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی نے بھی ان اقوام کے حالات اور اس وقت کے جغرافیہ کا بیان لکھا ہے لیکن وہ اتنا جامع نہیں۔

"خیام" کو جو مقبولیت یورپ میں حاصل ہے کسی اور خطہ میں نہیں لیکن

اہلِ یورپ بھی "خیام" کے متعلق اتنی جامع اور وقیع کتاب نہیں پیش کر سکے۔ جس تحقیق کے ساتھ سید صاحب نے "خیام" پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالی ہے اس طرح کسی اور شاعر کے متعلق کسی مبصر یا محقق نے اُردو زبان میں کوئی تصنیف یا تالیف نہیں پیش کی۔ "خیام" سید صاحب کا شاہکار ہے۔ ایسی تصنیف بہت کم منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہے۔ یہی ایک تصنیف سید صاحب کو زندہ جاوید بنانے کے لئے کافی ہے۔

"حیاتِ شبلی" جدید ترین تالیف ہے۔ علامہ شبلی کی سوانح۔ اُن کے علمی، ادبی کارنامے، مسلمانوں کی سیاسی و تمدنی تاریخ نہایت جامع طور پر تحریر کی ہے۔ سیرت نگاری میں عدیم المثال کتاب ہے۔ اس کے مقابلہ پر مولانا حالی کی "حیاتِ جاوید" بھی نہیں جچتی۔

"سیرۃ النبیؐ" کا بقیہ حصہ سید صاحب نے اسی شان و شوکت سے تحریر کیا ہے جس شان کے ساتھ علامہ شبلی نے ابتدا کی تھی۔ سید صاحب کی شہرت کا سنگِ بنیاد کہا جا سکتا ہے۔

"عرب و ہند کے تعلقات"۔ ظہورِ اسلام کے قبل عربوں اور ہندوستان کے تعلقات کو بالتفصیل محققانہ طور پر بیان فرمایا ہے۔ ضمنی طور پر بعض الفاظ کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالی ہے جن سے عرب و ہند کے تعلقات کی وضاحت ہوتی ہے۔ ہندوستانی اکیڈمی کے سالانہ اجلاس کے خطبوں کا مجموعہ ہے۔ زبان و پیرایہ نہایت دلچسپ ہیں۔ ہندی میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے۔

"نقوشِ سلیمانی"۔ سید صاحب نے زبان و ادب کے متعلق جتنی تقریریں کی ہیں، اس مجموعے میں شامل ہیں۔ ان کے علاوہ چند مقالات اور مقدمے اس میں شامل کر لئے گئے ہیں۔ زبانِ اُردو کی تخلیق و ارتقا نہایت تحقیق و وضاحت کے ساتھ بیان کی ہے۔ اتنی جامعیت کے ساتھ اُردو کی تاریخ اس سے پہلے نہیں لکھی گئی تھی۔ زیادہ تر خطبات زبان کے متعلق ہیں۔ اُردو ادب کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ "بعض پرانے الفاظ کی نئی تحقیق" لسانیت اضافہ ہے۔ زبان اور معنی دونوں اعتبار سے۔

مذہب، سوانح و سیر، جغرافیہ، زبان و ادب سید صاحب کے خاص موضوعات ہیں لیکن فطری میلان مذہب کی طرف زیادہ ہے۔

سید سلیمان ندوی انشا پرداز بھی ہیں مقولات نگار بھی، مبصر بھی اور مورخ بھی۔ سیرت نگاری میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ اور مذہبی مباحث پر بھی انہیں کامل دسترس حاصل ہے۔ انہیں کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ وہ آزاد کی طرح انشا پردازی کی دھن میں آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش نہیں کرتے یا مِن گرامعت افسانے نہیں سنانے لگتے۔ نہ ہی وہ ڈپٹی نذیر احمد کی طرح زبان کی شستگی کی فکر میں قابلِ اعتراض جملے لکھ جاتے ہیں۔ نہ تو وہ حالی کی طرح سیرت نگاری کے ہو کر رہ جاتے ہیں اور نہ شبلی کی طرح خشک مورخ بنتے ہیں۔ اگر سر سید کے معقولات اور استدلال، نذیر احمد کی شستہ عبارت، آزاد کی انشا پردازی، حالی کی سوانح نگاری، شبلی کی تاریخ نویسی کو یکجا دیکھنا ہو تو سید سلیمان ندوی کی تحریریں پڑھئے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُردو کے عناصر خمسہ نے ایک ہی پیکر میں جنم لیا اور وہ پیکر سید سلیمان ندوی کے نام سے موسوم ہوا۔ اُردو زبان کی تاریخ۔ اس کی ہمہ گیری کے ذرائع کی تجاویز، استدلال، الفاظ کی تحقیق اور دیگر علمی سرگرمیاں ان کی محققانہ قابلیت، ان کے ذوقِ فکر اور جذبۂ عمل پر دال ہیں۔ وہ اُردو کے معدودے چند ماہرین لسانیات میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ زبانِ اُردو پر ان کے خطبات نہایت بصیرت افروز ہیں۔ مولوی عبدالحق کی طرح وہ بھی اُردو کا پرانا نام "ہندستانی" مروج کرنا چاہتے ہیں تاکہ جو ابنائے وطن اُردو کو صرف نام کی وجہ سے بدیسی سمجھ کر دور بھاگتے ہیں۔ اسے اختیار کرنے پر مائل ہوں اور اس طرح متحدہ قومیت کی بنیاد پڑ جائے جس پر ملک کی آزادی کا انحصار ہے۔ دراصل یہ تجویز سید صاحب ہی نے پہلی بار انجمن اُردوئے معلّیٰ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سالانہ اجلاس میں ۱۹۳۳ء میں پیش کی تھی۔ فی زمانہ اکثر ادیبوں میں ہٹ دھرمی کا مادہ پایا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے سید صاحب اپنی غلطیاں (جو شاذ و نادر ان سے سرزد ہوتی ہیں) تسلیم کر لیتے ہیں اور معترض کے مشکور ہو کر تصحیح فرما لیتے ہیں۔ "سیرۃ النبیؐ" کے بعض مقامات اس پر شاہد ہیں۔

ابتدا میں سید صاحب کی زبان مولانا ابوالکلام آزاد کی طرح عالمانہ رنگ لئے ہوئے تھی۔ رفتہ رفتہ بہت تبدیلی ہوئی۔ اسلوبِ بیان دلکش اور موثر ہے۔ وسعتِ تحقیق اور قوتِ استدلال سے مضمون کو دلفریب اور موثر بنا دیتے ہیں۔ زبان سلیس اور بامحاورہ ہوتی ہے۔ غیر مروج عربی فارسی الفاظ سے عبارت کو ادق نہیں بناتے۔ اکثر موقعوں پر ان کی سلاست اور شستگی پر مولوی عبدالحق کی کوثر سے دُھلی ہوئی زبان کا دھوکا ہوتا ہے۔ وہی چھوٹے چھوٹے جملے، سیدھے سادے الفاظ، وہی سلیس عبارت، فصاحت و روانی خشک سے خشک مضمون کو بھی اس طرح قلمبند فرماتے ہیں کہ اس میں دلکشی اور دلآویزی پیدا ہو جاتی ہے۔ ان کے اسلوب کی ہمواری اور متانت ہر موضوع پر پوری قدرت رکھتی ہے۔ کہیں کہیں تمثیلات کے

پہلوؤں میں مانی الضمیر اس طرح کہہ جاتے ہیں کہ سامع کے دل میں اتر جاتا ہے۔ اگرچہ وہ عام جلسوں میں روانی کے ساتھ تقریر نہیں فرماتے تاہم وہ بحیثیت ایک خطیب و مقرر امتیازی شان کے مالک ہیں۔ انکی تقریروں میں اتنی برجستگی ہوتی ہے کہ ہر فقرہ خوبی و فصاحت کی ایک صاف و شفاف سلسبیل ہے۔ نہ پیچیدگی ہے نہ اشکال۔ نہ تعقید ہے اور نہ ثقل ترکیب۔ ساتھ ہی ساتھ فصاحت و بلاغت کی یہ جوئے رواں استدلال کی بھی حامل ہوتی ہے۔ اگرچہ کہیں کہیں ان کے دلائل نتیجہ خیز نہیں ہوتے ان کی تحریروں میں علامہ شبلی کی جھلک سی ضرور پائی جاتی ہے۔ تاہم ایک حد تک وہ مخصوص طرز کے مالک سمجھے جاسکتے ہیں۔ ان کی زبان وہ "ہندستانی" ہے ہندستان کے طول و عرض کی مشترک زبان کہی جاسکتی ہے۔

مولانا سلیمان کے مقدمات میں بہت حد تک "ہیرو پرستی" کا جذبہ کارفرما ہے۔ وہ اپنے "ہیرو" کے روشن پہلو کو اجاگر کرتے وقت اس کے معائب کو بھول جاتے ہیں۔ یہ شاید ایشیائی تہذیب کا اثر ہو کیونکہ مروت اور پاس خاطر انسان کے عیوب پر نظر نہیں کرنے دیتے۔ مثال کے طور پر "شعلۂ طور" کے مقدمہ ہی کو لیجیے۔ فرماتے ہیں کہ "جگر کی شاعری میں نہ زلف ہے نہ شانہ .... نہ ہوس بالائے بام.... نہ اس کے محبوب کے ہاتھوں میں قصاب کی چھری ہے۔ اور نہ اسکے کوچے میں شہداء کے دل و جگر کی پچکاریاں ہیں۔" حالانکہ "شعلہ طور" کے متعدد اشعار ایسے ہیں جن سے اسکی تردید ہوتی ہے مثلاً ؎

قتل گہ میں آج ہولی ہے جگر چل رہی ہیں خون کی پچکاریاں

مژدہ اے شوقِ شہادت اوج پہ تقدیر ہے
آج دستِ ناز میں نازک سی اک شمشیر ہے

اس موضوع پر پروفیسر عندلیب شادانی "دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی" کے تحت مفصل تنقید کر چکے ہیں۔

سید صاحب "سیرت النبیؐ" میں کہیں کہیں موضوع سے ہٹ گئے ہیں اور فقہ و فلسفۂ مذہب میں الجھ گئے ہیں۔ اگرچہ یہ فی نفسہ قابل قدر ہے لیکن اس سے سیرت کی حیثیت ثانوی ہو کر رہ جاتی ہے اس سلسلے میں "سیرت النبی" کے تکملہ پر حضرت نیاز فتحپوری تنقید کر چکے ہیں۔ لیکن یہ تنقید تنقیص کی حد تک پہنچ گئی ہے۔

بعض مقدموں میں سید سلیمان ندوی تنقید نگار نظر آتے ہیں۔ اردو شاعری پر تنقید اور نوخیز شعرا کو صاحب شعور بنانے کی ان کی نقادانہ حیثیت کو واضح کرتے ہیں۔ "خمستان" اور "خیابان" کے مقدمے مثالاً پیش کیے جاسکتے ہیں۔

دامانِ نگہ تنگ و گلِ حسنِ تو بسیار
گلچینِ بہارِ تو ز داماں گلہ دارد

اصغر ہائی سکول گونڈہ

یہ خبر تعلیمی اداروں سے دلچسپی رکھنے والے حلقوں میں یقیناً باعث مسرت ہوگی کہ شہر گونڈہ میں جہاں ایک عرصہ سے تعلیمی اداروں کی کمی محسوس کی جا رہی تھی۔ حضرت اصغر گونڈوی مرحوم کی یادگار میں ایک ہائی سکول قائم کیا گیا ہے۔ اس وقت اس سکول میں انگریزی کے ساتویں درجے تک تعلیم کا انتظام کیا گیا ہے۔

ہم امید کرتے ہیں کہ مستقبل قریب میں دسویں جماعت تک کامیابی کے ساتھ تعلیم کا انتظام کیا جاسکے گا جس کے لیے محبان تعلیم کے مشورہ اور اعانت کی ضرورت ہے۔ ان حضرات سے جو حضرت اصغر گونڈوی مرحوم کی شخصیت سے آشنا اور ان کے ادبی کارناموں سے واقف ہیں خاص طور پر امید کی جاتی ہے کہ وہ اس یادگار کو زیادہ سے زیادہ کامیاب بنانے میں میرا ہاتھ بٹائیں گے۔

جگر مرادآبادی

آہ! نواب سائل مرحوم

(از محترمہ حمیدہ سلطان بیگم صاحبہ)

نواب سراج الدین احمد خاں سائل نواب شہاب الدین خاں ثاقب کے تیسرے صاحبزادے اور نواب ضیا الدین احمد خاں نیر رخشاں کے چہیتے پوتے تھے۔

وہ کافوری شمعیں جن سے دلی کا ایوان اُردو روشن تھا ایک ایک کرکے بجھتی جاتی ہیں۔ جن دلی والوں کے دم سے دلی دلی تھی وہ رفتہ رفتہ ختم ہو رہے ہیں۔ دلی کا سنگھار یہ تھے۔ ان کے دم سے اس کا بناؤ تھا۔ اس کی بہاروں پر اب خزاں آچکی ہے

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر
اب انہیں ڈھونڈ چراغ رُخ زیبا لے کر

خلقت کے ہجوم، خوبصورت پارک، سربفلک عمارتوں سے دلی کی آن بان قائم نہیں رہ سکتی۔ یہ مادی ترقیاں اس کے مردہ جسم کو زندگی نہیں بخش سکتیں۔ آہ دلی مرحوم!!

شمع شبستان ضیائی یعنی نواب معظم زمانی بیگم صاحبہ بنت نواب ضیا الدین احمد خاں نے ۱۹ ارمئی ۱۹۴۵ء کو جہان فانی سے کوچ کیا۔ نواب سائل جو دو سال سے علیل تھے، چاہنے والی پھوپی کی وفات سے بہت غمگین ہو گئے۔ دن بدن اُن کی حالت بگڑتی گئی۔ اور آخر ۱۵ستمبر کی صبح کو کاشانۂ نیر کا یہ ٹمٹماتا ہوا چراغ بھی بجھ گیا۔ ان کے عالم شباب کے دیکھنے والے بہت کم اب زندہ ہونگے۔ ترنم سے شعر پڑھنا پہلے نواب سائل ہی نے شروع کیا۔ ان کے دلپذیر ترنم میں لہروں کی سی کیفیت ہوتی تھی اور کچھ پڑھنے کا انداز ایسا دلربا تھا کہ پوری محفل مست و بیخود ہو کر جھوم جاتی تھی۔ ان کی ذاتی وجاہت اُن کی حسین، باشوکت صورت پھر اُن کی جھوما دینے والی شاعری۔ قدرت نے بڑی فیاضی سے حُسن شعر و نغمہ کو ایک انسان کی ذات میں جمع کر دیا تھا۔ جوانی میں وہ خود مجسّم شعر تھے۔ یہ تو سنی ہوئی باتیں ہیں۔ میں نے تو بڑھاپا دیکھا۔ لیکن بڑھاپے میں بھی ان کی آواز میں کھنک، لہجے میں لوچ، اور ترنم میں ایسی موسیقی پائی جو آپ جوانوں کو بھی نصیب نہیں۔ سفید انگرکھے، چوگوشیہ سیاہ مخمل کی ٹوپی میں اس بڑھاپے میں بھی وہ بہت بھلے لگتے تھے۔

میری والدہ صاحبہ کے وہ ماموں زاد بھائی تھے۔ لیکن چونکہ والدہ اُن سے بہت چھوٹی تھیں اس لئے اُنہیں بہت چاہتے تھے۔ ان کے ناز اُٹھاتے۔ اکثر ان کی فرمائش پر اشعار سناتے تھے۔ والدہ صاحبہ کے کہنے پر اُنہوں نے ایک مثنوی "نور جہاں عالمگیر" بھی لکھی۔

سائل مرحوم داغ کے شاگرد تھے جس کا ذکر اکثر اُنہوں نے اپنے شعروں میں کیا ہے۔ ان کی متبنّی بیٹی سے اُنہوں نے عقد کیا تھا۔ اس لئے لازمی طور پر داغ کا اثر اُن کی شاعری میں تھا۔ لیکن وہ شگفتگی، متانت بیان اور پُرکاری بھی اُن کے اشعار میں پائی جاتی تھی جو حضرت غالب کے خوانِ کرم کے ریزہ چینوں کا حصہ ہے۔ اُس کے ساتھ داغ کی شوخیٔ بیان، برجستہ محاوروں کا استعمال اور روزمرّہ نے مل کر سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اس وقت اُن کے کاموں پر تنقید کا وقت نہیں۔ اُن کی وفات کا غم جو نہ صرف ہمارا ایک بڑا خاندانی حادثہ ہے بلکہ دُنیائے ادب کا بھی حادثہ ہے۔ دل کو تہ و بالا کئے ہوئے ہے۔ نواب سائل کا بچپن ناز و نعم میں گزرا۔ جاہ و حشم کی گود میں اُنہوں نے آنکھ کھولی۔ اور دولت و اقبال کے سایے میں بڑھے۔ گو اُن کے والد نواب شہاب الدین خاں ثاقب مرحوم عالم شباب میں ہی چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑ کر انتقال کر گئے تھے۔ لیکن چاہنے والے دادا نواب نیر رخشاں مرحوم کا سایہ سر پر موجود تھا۔ انہوں نے ان کو تمام علوم و فنون میں طاق کر دیا۔ نواب سائل اپنے دادا کے چہیتے پوتے تھے۔

والدہ صاحبہ فرماتی ہیں کہ نانا جان اکثر سنجھلے بھائی سے شاہنامہ فردوسی سُنتے تھے۔ اور اُن کے دلپذیر ترنم پر گھنٹوں وجد کرتے تھے۔

نواب سائل کا بچپن ہی ناز و نعم میں نہیں پروان چڑھا اُن کی جوانی بھی اللوں تللوں میں گزری۔ لیکن بڑھاپے نے آتے ہی مصائب کے پہاڑ اُن پر توڑ دیئے۔ پہلے بڑے بھائی کی وفات کے بعد خاندانی مناقشات سے اُن کو دو چار ہونا پڑا۔ اس کے بعد

حیدر آباد میں اُن کے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی اور وہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے۔ جوان بیٹی کی موت نے اس پر اور چرکا دیا اور اس کے ایک سال بعد ہی محبوب جواں مرگ بیٹے کے غم نے تو اُن کو بالکل نیم جان کر دیا۔ پے در پے صدمات و حادثات نے اُن کی زندگی کو موت سے بدتر کر دیا اور انواع اقسام کے امراض نے جینا وبال کر دیا تھا۔ آخر میں ہچکی کا نامراد مرض ہو گیا تھا۔ اور وہ جان ہی لے کر گیا۔

نواب سائل کی موت نہ صرف خاندان لوہارو کے لئے ایک حادثۂ جانکاہ ہے بلکہ اس غم میں سارے دلّی والے شریک ہیں۔ اور دُنیائے ادب اس حادثہ پر جتنا بھی ماتم کرے بجا ہے۔

چراغِ محبت

(از محترمہ گوہر اقبال حور زبیری)

اے بادِ حوادث!! میرا رستہ چھوڑ دے۔

آہ! میرے خانۂ دل کی پُر مسرت شمع چپ ہو چکی ہے۔

صرف ایک چراغ۔

صبح کے جھلملاتے ہوئے تارے کی طرح، جو دامنِ اُفق میں پڑا فنا کے ہیبت ناک اثر سے لرزتا رہتا ہے۔ صرف ایک چراغ سرِ منزل ٹمٹما رہا ہے۔

آہ! چراغِ محبت!!

اے بادِ حوادث! کیا تو اسے بھی سرد کر دینا چاہتی ہے؟

تو آخر، میری رہگذر پر اس تندی کے ساتھ کیوں آتی ہے کہ زندگی کے تمام اوراق پریشان ہونے لگتے ہیں۔

میں بار بار سمیٹتی ہوں، اور تو اس چھیڑ سے باز نہیں آتی۔

تیرے تیز وحشی جھونکے، میری رُوح کے کمزور بازوؤں کو جھنجوڑ ڈالتے ہیں، یہاں تک کہ وہ گرنے لگتی ہے۔ میں اُسے پھر اُٹھا لیتی ہوں، سنبھال لیتی ہوں۔

منزل کی طلب میں۔

آہ! چراغِ محبت مجھے بُلا رہا ہے۔

تو مجھے کیوں نہیں جانے دیتی؟ میرے سفر میں کیوں رخنہ ڈالتی ہے؟

ہٹ جا! میری راہ سے ہٹ جا!! مجھے چلا جانے دے، میری رُوح تھک گئی ہے۔

کہیں وہ تیرے مسلسل جھٹکوں کی برداشت نہ لا کر ان اندھیروں میں نہ گر پڑے۔ اور ——

اور چراغِ محبت انتظار سے تھک کر اپنی آنکھیں بند کر لے

آہ! وہ دُھندلا سا چراغ، میری محبت، میری زندگی کا چراغ

اے بادِ حوادث! میرا رستہ چھوڑ دے کہ ابھی چراغِ محبت سرِ منزل ٹمٹما رہا ہے۔

نوائے مسلسل

از جناب فرید جاوید

جنوں نے چھیڑ دی شاید حدیثِ رندانہ　　مچل رہی ہے رگ و پے میں روحِ میخانہ

بسی ہوئی ہے فضاؤں میں مستقل مستی　　نہ میکدہ ہے نہ ساقی نہ مے نہ پیمانہ

نگاہ کھیل رہی ہے اک اور عالم سے　　نگاہ میں ہے یہ عالم تمام افسانہ

ندیم تجھکو مرا احترام لازم ہے　　مرا شعار محبت ہے بے نیازانہ

اُبھارتا ہوں وہ جذبہ کہ دلبری آ جائے　　سنوارتا ہوں خد و خالِ حسنِ جانانہ

نہ دیکھ یوں مری جانب لگی اس آنکھوں سے　　گزارنی ہے تجھے زندگی جداگانہ

نزولِ رحمتِ پروردگار ہے جاوید

غزل سرا ہے سرِ شام کون دیوانہ؟

تمدّن کی ترقی کیلئے مخلوط تعلیم ضروری

(از جناب مرزا داؤد بیگ صاحب بی اے۔ ایس ٹی)

بادی النظر میں یہ بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اگر ذرا غور کیا جاوے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کہا جائے کہ مجذوب کے لئے عقل سلیم۔ تمدّن کے معنی بنی نوع انسان کا من حیث الجماعت اکٹھے رہنا۔ امداد اور استمداد کے زرّیں اصول پر کاربند رہ کر تحفظ اور امن کے ساتھ شاہراہ ترقی پر گامزن ہونا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ سوسائٹی کے افراد ایک دوسرے کو جانیں۔ اُن کی ضروریات سے واقف ہوں اور اُن کی ذہنی اور جسمانی ترقی کے لئے کوئی لائحہ عمل تجویز کریں جو قانون فطرت کے عین مطابق ہو۔ گذشتہ تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ جن اقوام و ملل نے مختلف اوقات میں ترقی کی ہے وہ علم و عرفان میں بھی پوری طرح سے بہرہ ور تھیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ گذشتہ زمانے میں یونانی تمدن میں اپنے وقت کی اقوام سے آگے بڑھے ہوئے تھے تو علم و حکمت میں بھی دوسری قوموں کیلئے مشعلِ راہ تھے۔ بابل کے لوگ اگر مدنیت میں دوسری قوموں پر فضیلت رکھتے تھے تو انہیں ہنر و علم میں بھی دوسری اقوام سے برتری حاصل تھی۔ یہ بدیہی امر ہے کہ سوسائٹی کے افراد جس قدر علم میں آگے ہونگے اُسی قدر وہ تمدّن میں بھی ترقی یاب ہونگے۔

تعلیم کا مقصد نو واردانِ کون و مکان کو اُن کی آئندہ ترقی کے لئے تیار کرنا ہے۔ انکو آنے والی زندگی کی تکالیف اور مصائب اور نبرد آزمائی کیلئے مسلح کرنا ہے۔ اُن کو ایسی تعلیم و تربیت دینی ہے کہ وہ تلاش معاش کرتے ہوئے کامیابی سے زندگی بسر کریں۔ اور اس طرح سے ایک کامیاب شہری بنیں۔ جوں جوں وہ منازل زندگی میں ترقی پذیر ہونگے اُن کی معاش کے راستے الگ الگ ہوتے جائیں گے۔ اسی لئے ایام طفولیت میں اُن کو الگ الگ تعلیم دینی چاہیئے۔ ایک آہنگر کے لئے زرگری کی تعلیم بے فائدہ ہوگی۔ ایک انجینئر کے لئے علم طب بالکل ناکارہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس مرد و عورت کی زندگی کے راستے جُدا ہیں۔ ایک کو مردانہ وار صفات کے ساتھ نہایت مستقل مزاجی، اولوالعزمی اور پامردی کے ساتھ زندگی کے کٹھن راستے کو طے کرنا ہے۔ اُسے نہایت جانفشانی اور عرق ریزی کے ساتھ دوسروں کے بوجھ اپنی ناتواں گردن پر اُٹھا کر منزلِ مقصود پر پہنچانا ہے۔ دوسرے کو اپنے حُسن و جمال اور سعی عمل کے زور سے مردوں کے قوائے مضمحل میں نئی روح پھونکنی ہے۔ زندگی کے منازل میں مرد کے ڈگمگاتے ہوئے قدموں کو سہارا دینا ہے۔ اس کا یہ بھی فرض ہے کہ نونہالانِ چمن کی (جن پر آئندہ زندگی میں گلشن کی بہار اور خوبصورتی منحصر ہے) ایک ذکی باغبان کی طرح آبیاری کرے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں سے مرد اور عورت کے دو مختلف راستے نکلتے ہیں۔ بلاشبہ یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض دفعہ عورت کسی ایک شعبۂ زندگی میں مرد سے گوئے سبقت لے گئی ہے۔ مگر یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے ٹینس لان میں مس فلوری ماسٹر جان کو ناکامی کا منہ دکھائے۔ مگر یہ یاد رہے کہ جو ہستی نظر اپنی چستی اور پھرتی کے ساتھ مرد کو شکست دیتی ہے وہ بس منظر تیر مژگاں سے مرد کے دل کو گھائل کر کے زنجیر زلف سے پابجولاں بارگاہِ حُسن میں سجدہ ریز ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ کون جانتا ہے کہ خلوت گاہِ محبت میں حُسن و عشق میں کیا کیا بے باکیاں ہوتی ہونگی۔ اصلیت یہ ہے کہ فطرت نے مرد و عورت کو جُدا جُدا قسم کے جسمانی قوے عطا کئے ہیں ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند

عورت کی اصلی جگہ ٹینس لان نہیں بلکہ اس کا مقام حفظِ منزل ہے۔ اور اس قانون کو توڑنا فطرت کی بغاوت کے مترادف ہے۔

جب یہ ثابت ہو چکا کہ کاروبارِ زندگی میں مرد و عورت کو مختلف منصب عطا کئے گئے ہیں۔ دونوں کے فرائض علیحدہ علیحدہ ہیں۔ تو دونوں کی تعلیم و تربیت بھی علیحدہ علیحدہ ہونی چاہیئے۔ یہ کیسے ممکن ہے جبکہ دونوں کو زندگی میں جُدا جُدا فرائض انجام دینے ہیں تو انہیں ایک ہی طرح کی تعلیم دی جائے؟ مخلوط تعلیم کا مطلب اگر یہ ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک ہی اُستاد سے دونوں علم اخذ کریں تو یہ تعلیم ہر حال میں ایک فریق کے لئے بیکار ہوگی۔ دونوں کو آنے والے فرائض سے سُبکدوش ہونے کے لئے مختلف تعلیم کی ضرورت ہے۔ تو اس کیلئے ہمیں مختلف مدرسوں اور کالجوں کو معرضِ وجود میں لانا ضروری ہے۔ جو چیز ناگزیر ہے اور کسی طرح پس پشت نہیں ڈالی جاسکتی اس پر عمل پیرا ہونا ہی بہتر ہے۔ حقائق سے آنکھیں میچ لینا اقوام کی زندگی میں نہایت خطرناک ہوا کرتا ہے۔

زن و مرد کا اکٹھے کالجوں اور سکولوں میں تعلیم پانا اخلاق کے لحاظ سے بھی

چنداں مفید نہیں۔ انجام سے بے بہرہ۔ جذبات میں بہہ جانیوالے نوجوان طلبا اور طالبات کا ایک ہی جگہ اکٹھے ہونا نہایت قبیح امر ہے۔ اس عمر میں جذبات اشتعال انگیز، ولولے فتنہ خیز اور اعمال نادور اندیش عموماً ہوتے ہیں۔ یہ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ متضاد اجناس کا باہمی ارتباط کیا کیا رنگ نہ لائیگا۔ نسوانی حسن نوخیز جوانی کیلئے مقناطیس ہے۔ اس میں قوت ارادی کو بالکل کوئی دخل نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ پتھر کے دل کا نوجوان شعلۂ حسن کے سامنے موم کی طرح پگھل کر رہ جائے۔ یہ اختلاط آب و آتش کا اجتماع ہے جس میں دونوں کی فلاح و بہبود عنقا ہے۔

یہ بات کہ مرد کو کسی پری چہرہ کی صحبت میں اپنے جذبات پر قابو رکھنے کی عادت ڈالنا مخلوط تعلیم سے حاصل ہوجائے گی بے معنی سی ہے۔ متضاد خاصیتیں دیرینہ صحبت سے بھی نہیں بدل سکتیں۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کی فطرت بدل جائے۔ اس بات کے دعویدار ممالک یورپ کے تمدن پر غائر نگاہ ڈالنی چاہیے۔ وہاں کے تمدن کے ایوان نے کیا کیا گل کھلائے۔ نیم عریاں [illegible] کا منظر عام پر آنا کس کو معلوم نہیں۔ پس پردہ جو افعال ان سے سرزد ہوتے ہیں اُن کا پوشیدہ رکھنا ہی بہتر ہوگا۔ مخلوط تعلیم کا تجربہ ان ممالک میں خوب ہوچکا ہے۔

تمدن کی بنیاد پاکیزگی اخلاق پر ہونی چاہیے۔ جو تمدن پاکیزگی اخلاق کا حامل نہیں وہ سراپا غلط ہے اور اس کی ترقی ہمیشہ غلط ہوگی ؎

خشتِ اول چوں نہد معمار کج
تا ثریا مے رود دیوار کج

نیم برہنہ عورتوں کا منظر عام پر آنا نہایت ناروا ہے۔ اور یہی تہذیب تمدن کے خوشنما لیکن بے خوشبو پھول ہیں جن کے متعلق علامہ اقبالؒ فرما گئے ؎

تہذیب یورپ اپنے خنجر سے آپ خودکشی کریگی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

پس و پیش

احساس کی پلکوں پہ لرزتے ہیں ستارے
میں عزم کا ایوان سجاؤں نہ سجاؤں؟

پاتال میں آہوں کی صدا گونج رہی ہے
میں تیغِ شرربار اٹھاؤں نہ اٹھاؤں؟

سرمائے کے ہاتھوں میں ہے افلاس کا خنجر
اک نعرۂ بیباک لگاؤں نہ لگاؤں؟

صدیوں کا یہ ناسور یہ رِستا ہوا ناسور
میں نشترِ سفّاک چلاؤں نہ چلاؤں؟

پھنکار رہی ہے غم و آلام کی ناگن
میں ایک قدم اور بڑھاؤں نہ بڑھاؤں؟

کب سے ہیں نگوں سر مرے اجداد کی روحیں
میں داغِ غلامی کو مٹاؤں نہ مٹاؤں؟

ماحول کے ہر زخم سے پیدا ہے تعفن
میں صدقۂ فردوس سناؤں نہ سناؤں؟

خاموش نگاہیں نگراں ہیں مری جانب
میں عصمتِ ناموس بچاؤں نہ بچاؤں؟

دیوانہ تبسم ہے بغاوت کے لبوں پر
میں اپنی امیدوں کو ہنساؤں نہ ہنساؤں؟

کچھ کر کے رہے گی مری آشفتہ نوائی
یہ راز زمانے کو بتاؤں نہ بتاؤں؟

از
جناب نور بجنوری

ادب چیلنے

کارڈنیل نیومین

(جناب ریورینڈ ہنری سٹرام کے قلم سے)

میں یہ مضمون اُس کمرہ میں بیٹھا لکھ رہا ہوں جس میں کارڈنیل نیومین [illegible] سے اپنی وفات تک رہتے رہے۔ اور اس میز پر جس پر وہ مضمون [illegible] تھے۔ میرے بالکل سامنے ان کی ایک عکسی تصویر آویزاں ہے [illegible] میں دکھایا گیا ہے کہ وہ ایک مضمون کا مسودہ ہاتھ میں لئے اس میز کے سامنے بیٹھے ہیں۔ یہ تصویر [illegible] سے زیادہ بعد کی نہیں۔ لوگوں کی عقیدت [illegible] سے یہ کمرہ ہمیشہ اس حالت میں رکھا جائے گا جس میں وہ [illegible] تھا۔ جب وہ اپنی آخری مختصر بیماری کے بعد اس دنیا سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔

ہر طرف ان کی معمولی چیزیں مثلاً چاقو، چند پیپرویٹ [illegible] وغیرہ پڑے [illegible] تھے۔ سامنے خطوں کا ایک بنڈل اور حوالے (ریفرنس) کی کتابوں کی [illegible] سی الماری رکھی ہے۔ بائیں طرف دیوار کو ایک بڑی الماری نے چھپا رکھا [illegible] میں ان کے کاغذات کا ذخیرہ ہے۔ جواب فائلوں میں رکھ دیئے گئے ہیں [illegible] کس ترتیب کر لیا گیا ہے ——— مضمونوں کے مسودے۔ ڈائریاں [illegible] اور مضامین کے کٹنگ (تراشے) رکھے ہوئے ہیں جو ان کی ساری [illegible] اور خزانہ ہے۔ دائیں طرف اور پیچھے اونچی اونچی الماریاں [illegible] بہت سی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ میز کے آگے لکڑی کے تختوں کی دیوار [illegible] کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ انہوں نے دوسری طرف کے [illegible] میں ایک گرجا میں تبدیل کر دیا تھا۔ اور یہاں وہ ہر صبح [illegible] رسم ادا کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ بہت زیادہ بوڑھے ہو جا[illegible] سے اس قابل نہ رہے۔

یہ کمرہ تاریک ہے اور اس میں سامان کم ہے مگر اس کی حیثیت تاریخی ہے۔ [illegible] ایک بڑے پادری کی یاد تازہ ہوتی ہے جو عیسائیوں کے ایک [illegible] کے رہنما اور رومن کارڈنیل تھے اور جو سینٹ فلپ ہنری کے قول کے مطابق یہاں مدت تک اپنی روحانی تبلیغ میں مصروف رہے۔ انہوں نے اس مکان کو تقریباً سو سال پہلے بنایا تھا اور اس کا ہر حصّہ اور ہر ایک گوشہ ان سے نسبت رکھتا ہے۔ ان کے کمرہ سے چند گز کے فاصلہ پر غلام گردش کے اس طرف گرجا ہے۔ جہاں وہ عشائے ربانی کی متبرک رسم ادا کرتے تھے اور اس کے بازو میں کتب خانہ کا زینہ ہے۔ جس کا ڈیزائن اور ترتیب خود انہوں نے تجویز کی تھی۔ اس کتب خانہ کی الماریوں میں آبائے کلیسا کے متعلق کتابیں، دینیات [illegible] اور تاریخ کی کتابیں رکھی ہیں جو انہوں نے جوانی سے لیکر بڑھاپے تک جمع کی تھیں اور یہ کتب خانہ ایسا ہے کہ اسے گبن اپنی کتاب زوال سلطنت روما لکھنے کے لئے استعمال کر سکتا تھا۔

[illegible] کے نیچے طعام خانہ میں ایک میز رکھی ہے۔ جس پر وہ کھانا کھایا کرتے تھے۔ تربیت کے تفریحی کمرہ میں ایک کرسی رکھی ہے جس پر وہ شام کے وقت کھانے کے بعد فرقے کے آدمیوں کے ساتھ بیٹھتے تھے۔

پادریوں کے کمرے اور سکرٹی (گرجا کے کپڑے اور برتن رکھنے کی جگہ) میں ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اعلان اور ہدایتیں اب بھی لٹک رہی ہیں مگر ان کے حروف مدھم پڑ گئے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود یہاں موجود [illegible] جو لوگ ان کا [illegible] پڑھتے ہیں انہیں ایسا احساس ہوتا ہے کہ وہ ان [illegible] ان کی [illegible] اور رقت انگیز آواز سن رہے ہیں اور ان کے [illegible] چہرے کو دیکھ رہے ہیں۔ جس پر جھریاں پڑی ہوئی ہیں اور جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان کی آنکھ نظر سے اوجھل حقیقتوں کو دیکھ رہی ہے۔

یہ بات بالکل قدرتی اور تقریباً لازمی ہے کہ ہم لوگ یعنی اس فرقہ کے موجودہ آدمی جن کی تربیت ایسے اشخاص نے کی ہے جو انہیں ان کی زندگی میں دیکھ چکے ہیں ——— اپنے فاؤنڈر اور فادر، جان ہنری نیومین کو احترام کے ساتھ یاد رکھیں۔ یہ مکان مقدس روایات کا حامل ہے۔ اس کے بہت سے اسباب ہیں جن سے لوگ اچھی طرح واقف ہیں۔ [illegible] ہوئی نادر سینٹ فلپ ہنری [illegible] سے دوسرے درجہ پر سمجھتا ہے۔

یہ صورت حال اعتراضات سے بالاتر ہے۔ ہم ان سے ذاتی اور نجی عقیدت رکھتے ہیں کیونکہ ہم پر ان کے بہت سے احسانات ہیں اور ہم انکے ساتھ بہت سے واسطے رکھتے ہیں۔ ایک بڑا سوال یہ ہے کہ ان کی لیاقت اور ذہانت کی وجہ سے رومن کیتھولک مذہب کو وہ کون سے فائدے حاصل

ہوئے جن کی وجہ سے وہ دنیا کے احترام کے مستحق ہیں۔ وہ ۹ اکتوبر ۱۸۴۵ء کو کلیسائی مقام میں داخل ہوئے جس کی ہم اس سال صد سالہ سالگرہ منا رہے ہیں۔ اسے کیوں ایک اہم واقعہ سمجھا جائے۔

نیومین نہایت ممتاز تھے مگر وہ کلیسا میں کوئی سرکاری حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ شروع سے آخر تک برطانیہ کے ایک قصبہ میں ایک چھوٹی مذہبی جماعت کے رہنما رہے۔ لیکن حالات کے تقاضے سے یا اپنی ذاتی ترجیح کی وجہ سے برطانیہ کے کلیسائی معاملات کے ہنگاموں سے الگ رہے۔

وہ ان معاملات سے اس قدر الگ تھلگ رہتے تھے کہ ۱۸۶۳ء میں ایک خط میں انہوں نے لکھا کہ "میں لوگوں سے عجیب و غریب طریقہ سے منقطع ہوگیا ہوں۔ اس وجہ سے میں نہیں جانتا کہ کیا کام ہو رہا ہے۔ کیا ہونا چاہیئے اور اسے کون کر رہا ہے"۔ جب انہیں ڈبلن کونسل میں شرکت کی دعوت دی گئی تو انہوں نے اسے بھی رد کر دیا۔ اور کہا کہ میں اپنی قابلیتوں اور کامیابیوں کے لحاظ سے اپنے کو اس قابل نہیں سمجھتا کہ کسی بڑے مذہبی مقصد کو ترقی دے سکوں۔ چنانچہ ہنری بریمینڈ نے جو فرانسیسی تھے اور نیومین سے عقیدت رکھتے تھے کہا کہ "وہ بہت بڑے راہب تھے اور انہوں نے اپنی مرضی سے فقیری اختیار کی تھی۔"

نیومین کو جو اثر حاصل تھا وہ ان کے مرتبہ کی وجہ سے نہ تھا بلکہ ان کی شخصیت کی وجہ سے تھا اور ان کی لکھی ہوئی کتابوں کے ذریعہ لوگوں پر ان کی شخصیت کا اثر پڑا۔ وہ اعلیٰ درجہ کے صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ اور ان کی تحریریں انگریزی نثر میں ایک خزانہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ مگر اس کے باوجود وہ ان کی قدر و قیمت کا گھٹا کر اندازہ لگاتے تھے۔ انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ ان کے کسی موضوعات پر کتابیں لکھنے پر اعتراض نہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے ۱۸۶۵ء میں کہا تھا مجھے اس بات کا ہمیشہ افسوس رہا ہے کہ میں نے نہایت کثیر موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں کیونکہ اس طرح سطحیت پیدا ہو جاتی ہے۔

بات یہ ہے کہ انہوں نے اپنی کتابوں کے لئے کوئی منصوبہ بندی نہیں کی اور انہیں اپنی مرضی سے منتخب نہیں کیا۔ بلکہ اپنے فرائض اور حالات کے تقاضے کے مطابق کتابیں لکھیں۔ اس وجہ سے وہ وقتی کتابیں ہیں (جیسی کہ انگریزی کی اکثر کتابیں ہیں) یا آزمائشی۔ وہ اپنے انکسار کی وجہ سے یہ سمجھتے تھے کہ انہیں آزمائشی ہی ہونا چاہیئے۔ ان کی وہ کتابیں نہایت زبردست ہیں۔ مگر انہیں بھی مضامین کہا گیا ہے۔

جو لوگ خاص موضوعات پر کتابیں لکھتے ہیں ان پر انہیں رشک آتا

تھا۔ کیونکہ یہ لوگ اپنے موضوع کے متعلق قابل اطمینان طریقہ سے ساری باتیں پورے طور پر معلوم کر سکتے ہیں۔ شاید یہ درست ہو مگر ہم ان کی ان کتابوں کو الگ کر کے ان کی جگہ اپنے پاس چند علمی ایسی کتابیں نہیں رکھ سکتے جو اب تقریباً لازمی طور پر پرانی ہو گئی ہیں۔

لیکن پوپ لیو سیزدہم نے کارڈینل نینا کے ذریعہ جو خط بھیجا تھا اس میں انہوں نے نیومین کو کارڈینل کا اعلیٰ منصب عطا کرنے کی خواہش کا اعلان کیا تھا۔ اور اسکی وجہ یہ بتائی تھی کہ نیومین ذہین، پارسا اور جوشیلے ہیں اور "ہولی سی" کے وفادار ہیں۔

نیومین نے ۱۲ مئی ۱۸۷۹ء میں بلکینیو میں جو تقریر کی اس میں انہوں نے اپنی زندگی کا اعلیٰ مقصد یہ بتایا کہ "مذہب میں آزادی کے جذبہ کی مخالفت کی جائے"۔ یعنی ایسے معاملات میں خیال آرائی کی مخالفت کی جائے جن میں انسانی دماغ غور کر کے کوئی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ ان کے خیال میں ان معاملات میں ابتدائی اصول شامل ہیں اور ان میں سب سے زیادہ مقدس اور اہم وحی کے حقائق ہیں۔ اور وحی کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کا کلام رسول پر نازل ہوتا ہے۔

لڑکپن میں نیومین کے ذہن میں جو اصول بیٹھ گئے تھے۔ اس کے نقوش کبھی مدھم یا زائل نہیں ہوئے۔ آکسفورڈ میں انہیں لبرل پارٹی کے مقابلہ میں کام کرنا پڑا۔ ٹریکٹیرین تحریک کے ماتحت وحی کے حقائق کا اعلان ان لوگوں کے مقابلہ میں کیا گیا ہے جو ان کے متعلق شبہ رکھتے تھے یا ان کی قدر و قیمت گھٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ لبرل پارٹی ہی نے انہیں آکسفورڈ سے نکال دیا۔

تھوڑے عرصے کے بعد لبرل تحریک الحاد کا ایک بڑا فتنہ بن گئی۔ ہر جگہ اسکی ایک ہی حیثیت تھی۔ مگر ایک ملک کے بہ نسبت دوسرے ملک میں اس کے مظاہرے کی شدت میں تھوڑا بہت فرق تھا۔ نیومین ابتدا ہی سے اس تحریک کو "اصولی مذہب" کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے اور وہ اس تحریک کی مخالفت اور اصول کی حمایت کے سلسلہ میں اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔

انہوں نے انگلستان کے کیتھولک آدمیوں کی ذمہ داریوں کا احساس دلایا۔ اور ترغیب دی کہ وہ فکر و نظر کی ترقی کے ساتھ ساتھ چلیں۔ انہوں نے ۱۸۵۱ء میں ایک لیکچر میں کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ عام لوگ اپنے مذہب سے واقف ہو جائیں جو اپنی حیثیت کو سمجھیں۔ جو یہ سمجھیں کہ ان کے پاس کیا چیز

ہے اور کیا نہیں ہے۔ جو اپنے مذہب سے اتنی اچھی واقفیت رکھتے ہوں کہ اسکی وضاحت کر سکیں۔ اور جنہیں تاریخ کا اتنا علم ہو کہ اپنے مذہب کا دفاع کر سکیں۔ میں چاہتا ہوں کہ عام آدمی اچھی واقفیت رکھتے ہوں ــــ آپ اپنے علم کو وسعت دیں۔ استدلال کی قوت بڑھائیں چیزوں کا صحیح طور پر مشاہدہ کریں۔ یہ سمجھیں کہ ایک حقیقت کا دوسری حقیقت کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ عقیدہ اور عقلیت کے درمیان کیا تعلق ہے۔ کیتھولک مذہب کی بنیاد اور اصول کیا ہیں۔ اگر آپ ان موضوعات سے واقفیت حاصل کرلیں تو آپ کی مذہبیت میں کوئی خرابی واقع نہیں ہوگی بشرطیکہ آپ کو اس بات پر اعتقاد ہو کہ آسمان پر خدا موجود ہے۔ اور آپ کی روحوں سے حساب لیا جائے گا اور انہیں نجات حاصل کرنی ہوگی۔

مگر انگلستان ان کے نصب العینوں پر پورا نہیں اترا۔ انہوں نے ۱۸۶۳ء میں ایک یادداشت میں شکایت کی کہ انگلستان کے کیتھولک آدمی اپنے نابینا ہونے کی وجہ سے یہ نہیں دیکھ سکتے کہ وہ نابینا ہیں۔ اس وجہ سے ان کا خیال ہے کہ کیتھولکوں کی حالت اور مرتبہ کی ترقی دینے کیلئے کیتھولکوں کی حیثیت کی استدلالی بنیاد اور فلسفہ اور موجودہ زمانہ کی خصوصیت کے باہمی تعلق کا احتیاط سے جائزہ لینا ان میں آیا وہ معقول خیالات پیدا کرنا اور ان کے دماغ کو روشن کرنا مختصر یہ کہ انہیں تعلیم دینا فضول مشغلہ ہے بلکہ توہین ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پاس ٹھوس دلائل کی کمی ہے۔ اب شروع سے آخر تک میرا کام یہ ہے کہ تعلیم ان وسیع معنوں میں دی جائے۔"

چونکہ انہوں نے برابر اس قسم کے خیالات ظاہر کئے اس لئے بعض حلقوں میں ان پر طرح طرح کے تصورات کئے گئے۔ زیادہ تعلیم یافتہ کیتھولکوں کی کم عزت کی جاتی تھی۔ اس وجہ سے انہوں نے ۱۸۶۲ء میں لکھا ــــ میں محسوس کرتا ہوں کہ اعلیٰ حلقوں میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کلیسا پادریوں اور غریبوں پر مشتمل ہے۔ اور تعلیم یافتہ حصہ کے مردوں اور عورتوں کو ایک سخت بار سمجھا جاتا ہے۔ اور یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہی لوگ بدعتیں پھیلاتے ہیں اور وہ کیتھولک جماعت سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے۔ اس لئے اگر ممکن ہو تو انہیں تباہ کرا دیا جائے۔ اس طرح بڑا فائدہ حاصل ہوگا۔ اس نظریہ کے خلاف ان کی یہ پختہ رائے تھی کہ تعلیم یافتہ لوگوں سے انہیں کے مفاد کی خاطر نرمی کا برتاؤ کیا جائے اور ان کا احترام کیا جائے۔ نیز ان سے مصالحت کی جائے کیونکہ دوسرے طبقوں پر ان کا اثر ہے۔ ہم لوگ جنہیں نیا دور دیکھنے کا موقعہ ملا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیومین اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ تعلیمی ترقی کے حامی تھے۔

ان دو باتوں کا موجودہ کیتھولک مذہب پر بہت اثر پڑا ہے۔ اسی وجہ سے وہ ہمارے احترام کے مستحق ہیں۔ انہیں اپنی بڑھی ہوئی روحانیت کی وجہ سے ان باتوں کا احساس ہوا تھا۔ ایک غیر کیتھولک شخص نے جو ان سے کبھی کبھی ملتا تھا ان کے متعلق لکھا ہے: "وہ خدائی روشنی سے زیادہ قریب تھے اور یہ قربت بہت کم آدمیوں کو حاصل ہوتی ہے۔ نیز انہیں اس روشنی سے فیض حاصل تھا۔" اس سلسلہ میں فادر اگنیشس رائڈر کی تصدیق خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ ان کے ماتحت بچپن سے کام کرتے تھے اور ۴۰ سال تک کام کرتے رہے تھے۔ انہوں نے بھی اسی قسم کی رائے ظاہر کی ہے لیکن زیادہ موثر اور واضح پیرائے میں۔ "نیومین کی باتوں سے ہمیشہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خدائے بزرگ کو حاضر و ناظر سمجھتے ہوئے باتیں کر رہے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی باتیں لازمی طور پر موثر ہوتی تھیں۔ وہ دوسرے لوگوں کے خلاف بچوں کو نرمی سے سمجھاتے تھے اور ان کے رفیقانہ انداز سے بچوں پر ان کی بات کا جلد گہرا اثر ہوتا تھا۔

ہنری بریمنڈ نیومین کی عمدہ گفتگو خاص طنز اور عمدہ نثر نگاری سے اتنے متاثر نہیں جتنے وہ ان کی کتابوں کے کرداروں سے متاثر ہیں۔ اور انہیں کے ذریعہ بریمنڈ نیومین کو حقیقی طور پر سمجھا ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا کہ نیومین کی خداداد قابلیتوں اور ذاتی خوبیوں کے علاوہ اس بات کا ان کے اہل وطن پر زیادہ اثر ہوتا تھا کہ وہ ہر وقت خدا کو حاضر و ناظر محسوس کرتے تھے۔ اس وجہ سے کیتھولک اور پروٹسٹنٹ لوگوں دونوں پر ــــ مسلک کے امتیاز کے بغیر ــــ ایسا گہرا اثر پڑا جیسا انگلستان میں کسی دوسرے پادری کا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

بے لفن

(از جناب ڈی، پی، بھٹناگر گستہ - دہرہ دون)

نردھن نے جب اس سنسار میں جنم لیا اُس وقت اس کا باپ جو چند سال پیشتر اچھا خاصا زمیندار تھا، محض ایک غریب اور بے حیثیت کسان رہ گیا تھا. اس کا تمام سرمایہ مقدمہ بازی کی نذر ہو چکا تھا۔ نردھن اپنے والد کی ڈھلتی جوانی کا ثمر تھا۔ کنگالی اور مفلسی، تنگدستی اور زبوں حالی کے ایام میں پیدا ہونے کی وجہ سے ہی شاید اس کا نام نردھن رکھ دیا گیا تھا، اور شومی قسمت سے اس غریب نے اپنے والد کے اعمال کا خمیازہ تا زیست بھگتا۔ ماں کی آغوش سے لیکر اپنی تمام زندگی بھر بیچارے نے خوش حالی اور فارغ البالی کا منہ نہ دیکھا۔ اس کے سر سے جب اس کے والد کا سایہ اُٹھا تو اُس کے سر پہ اُس کے والد کے قرض کی گٹھڑی رکھ دی گئی۔ ترکہ میں اسے پانچ بیگھے زمین اور تین بھینسیں ملیں۔ اس کی چھوٹی سی گرہستی خود اسکی ذات اُس کی ماں اور بیوی پر مشتمل تھی۔ گرہستی کا بار زیادہ نہ ہونے پر بھی اسکی جوانی میں گھن لگ گیا تھا۔ قرض کی ادائیگی کی فکر باپ کے مرتے ہی اس کی گرہ بندھ گئی۔ بھینسیں [illegible] شروع شروع میں بھینسوں کے چرانے کا کام [illegible] نردھن کے پاس زمین [illegible] کاشت کیلئے کافی [illegible] دونوں چیزیں عاریتاً لے لیتا اور اس طرح گاؤں والوں [illegible]

دن اُڑنے والے پنچھی سے بھی زیادہ سبک رفتار ہوتے ہیں۔ ایک تیز رو دریا کی طرح گذرتا چلا جاتا ہے۔ کئی سال بیت گئے۔ نردھن اب ایک لڑکے کا باپ بن چکا تھا۔ بچے کا نام دھنپت رکھا گیا۔ شاید یہ سوچ کر کہ اچھے نام کا انسان کی زندگی پر اچھا اثر پڑتا ہے۔ اس کا لڑکا بھی اس نام کے اثر سے پرورش پاکر شاید خوش حال بن سکے۔ اور اس غریبی اور افلاس کا جس کا وہ خود شکار بنا رہا ہے کسی نہ کسی طرح تدارک کر سکے۔ دھنو کی ہر ممکن ناز و نعم سے پرورش ہونے لگی۔ نردھن کی یہی خواہش رہتی کہ دھنپت کو غریبی کا احساس نہ ہو۔ مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ ہر گھڑی غربت کی فضا میں سانس لیکر بھی کون خود کو اس کے اثر سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔

دھنپت اسی مسموم فضا میں پلنے لگا۔ جب وہ سات برس کا ہوا تو اس کو گاؤں کے مدرسے میں داخل کرا دیا گیا۔ دھنو ذہین ثابت ہوا اور سکول میعاد سے پیشتر ہی فراغت حاصل کرنے کی کوشش میں منہمک رہنے لگا۔ ایک دن اس نے اپنے والد سے کہا۔ "بابو! پنڈت جی نے چونی منگائی ہے۔ بادشاہ کی جوبلی منائی جائیگی۔ درجہ کے مطابق ہر ایک لڑکے سے چار چار آنے، دو دو آنے چندہ لیا جائے گا۔"

"جوبلی کیا ہوتی ہے بیٹا؟" نردھن نے پیار سے دھنپت کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے دریافت کیا۔

"ہمارے بادشاہ جارج پنجم کو راج کرتے پچیس[25] برس ہو گئے ہیں۔" دھنو نے سنجیدگی سے کہا۔ "پنڈت جی کہتے تھے کہ یہ بادشاہ کی پچیسویں سالگرہ ہے۔ سالگرہ جانتے ہو بابو؟ جنم دن کو کہتے ہیں۔"

نردھن من ہی من میں ہنسا۔ خوش ہو کر بولا۔ "ہاں بیٹا جنم دن تو ہوں۔ کل جب تم مدرسے جاؤ تو چونی لیتے جانا۔"

چمپا کہیں گھر کے کام کاج میں مصروف تھی۔ وہ سامنے آئی تو نردھن نے ہنستے ہوئے کہا۔ "کل دھنو کو چونی دیدینا۔ پنڈت جی نے منگائی ہے۔ بادشاہ کا جنم دن ہے۔"

چمپا نے چڑ کر کہا۔ "بادشاہ کا جنم دن کیا غریبوں سے خیرات لیکر منایا جاتا ہے۔ تم نے ابھی اس روز ہی وہ کہانی سنائی تھی۔ مہاراجہ [illegible] کی کہ وہ ہر سال جنم دن کرتے تھے تو سارا دھن غریبوں کو، سادھو سنتوں کو بانٹتے تھے۔ ان [illegible] اور کپڑا بانٹتے تھے خیرات کرتے تھے۔"

نردھن پھر ہنسا۔ [illegible] سارے بادشاہ اکبر، جہانگیر [illegible] جانے کون کون سبھی اپنے جنم دن [illegible] کرتے تھے۔"

"ہاں بابو! ہماری ایک کتاب میں [illegible] لکھا ہے کہ وہ ہر سال اپنا سارا دھن غریبوں اور سادھو [illegible] میں بڑا بھاری میلہ لگتا تھا۔" دھنو نے اپنی علمی قابلیت کا [illegible] کی بات ہے۔" نردھن [illegible]

"بابو!" دھنپت نے نردھن کو مخاطب کیا [illegible] جی دلی جائیں گے۔ کہتے تھے وہاں آتش بازی چھوٹے گی۔ شہر [illegible] جانے کیا کیا کھیل تماشے ہونگے۔ چلوگے تم بھی؟ [illegible] نے بہ منت کہا۔

نردھن نے چمپا کی طرف دیکھا۔ وہ دھنّو کے اس منّت آمیز انداز گفتگو سے محظوظ ہو رہی تھی۔ اس کی نظروں میں مُسکراہٹ تھی۔ نردھن سے نظریں ملتے ہی وہ مُسکرا دی۔ بولی۔ "چلے جاؤ۔ تم تو گھر سے نکلنا جانتے ہی نہیں۔ چار کوس دلّی ہے ساری عمر بیت گئی، آج تک اتنا بڑا شہر نہیں دیکھا۔ نہ جانے کیسا جی ہے تمہارا۔"

"بس تجھے تو بات بنانے کیلئے کوئی بہانہ چاہیئے۔ دلّی دیکھے بغیر ہمارا کون سا کام اٹکا پڑا ہے۔ تو کیا جانے کہ شہر والے کیسے حجرت (حضرت) ہوتے ہیں۔ اور گاؤں والوں کو تو سنا ہے میری طرح اُلّو بناتے ہیں۔ پھر کیا کرنا ہے شہر جاکر۔ اور دلّی کے گرہ کٹ تو دُور دور مشہور ہیں۔"

"بس تو، گرہ کٹوں کے ڈر سے کوئی شہر ہی نہ جائے"۔ چمپا نے بگڑ کر کہا۔ "اور کوئی گاؤں والا جاتا تھوڑے ہی ہے۔ ایسے اُلّو یوں ہی تھوڑے بنتے ہیں۔ ایک دفعہ جاکر دیکھو تو سہی۔ میں مرد ہوتی تو اب تک ساری دنیا کا چکر کاٹ آتی۔" اور یہ کہکر باپ اور بیٹے کو وہیں صحن میں چھوڑ کر تیز روی سے اندر چلی گئی۔

چمپا کی طعنہ زنی سے مجبور ہوکر نردھن، دھنپت کو لیکر اگلے روز سویرے گاؤں کے مدرسے کے پنڈت اور دو ایک اور ساتھیوں کے ہمراہ دلّی کے لئے روانہ ہوا۔ غروبِ آفتاب سے پیشتر ہی یہ لوگ شہر میں پہنچ گئے۔ اور گھومتے پھرتے جب بازار میں پہنچے تو دکانوں کی سج دھج اور جیتی بھاڑ اور لوگوں کا ہجوم غفیر دیکھکر نردھن کی آنکھیں کھلنے سی لگیں۔ دھنپت کی نگاہیں اس نمائش گاہ میں چاروں طرف گھوم رہی تھیں اور وہ من ہی من میں خوش ہو رہا تھا۔ شاہراہوں پر ایک سمت سے دوسری سمت تک رنگ برنگی جھنڈیاں لٹکائی گئی تھیں اور بڑی بڑی دکانوں اور خاص خاص عمارتوں پر بڑے بڑے یونین جیک لہرا رہے تھے۔ دکانوں کی رونق اور جگمگاہٹ کو دوبالا کرنے کے لئے لاتعداد چھوٹے چھوٹے مختلف رنگ کے بجلی کے قمقمے لگائے گئے تھے۔ آفتاب غروب ہوتے ہی تمام بازار ایک سرے سے دوسرے سرے تک بجلی کی روشنی سے جگمگ جگمگ کرنے لگا۔ گاؤں کا یہ چھوٹا سا قافلہ جب گھنٹہ گھر پہنچا تو چند لڑکے ان کے پاس آئے۔ ہر ایک چھوٹے چھوٹے تھیلے لئے ہوئے تھا۔ اور ہر ایک کے ہاتھ میں کاغذ کے چھوٹے چھوٹے یونین جیک تھے۔

"چودھری لوگو! ایک ایک جھنڈی خرید و۔ صرف دو آنے کی ہے۔ بادشاہ کی جوبلی ہے ہم سب کو آج کچھ نہ کچھ دینا چاہیئے۔" ایک لڑکے نے نردھن اور اسکے ہر ایک ساتھی کو ایک ایک جھنڈی دیتے ہوئے کہا۔

نردھن ہونقوں کی طرح اپنے ساتھیوں کا منہ تکنے لگا۔ اس لڑکے کی چرب زبانی نے گویا ان سب کے منہ پر قفل لگا دیا۔

"لاؤ۔ لاؤ۔ دونی نکالو!" لڑکے نے مکر رار عب انداز میں کہا۔

"زبردستی تھوڑے ہی ہے کوئی۔" پنڈت جی نے ہمت کرکے کہا۔

"ارے بھئی تبھی تو سب لوگ گاؤں والوں کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ لڑکے نے طنزاً کہا۔

"ہمارا مطلب ہے کہ گاؤں والے یعنی کہ گاؤں والے بیچارے بڑے اچھے ہوتے ہیں۔ بڑے سیدھے سادے۔ ان بیچاروں سے جس بات کیلئے کہو بغیر حیل و حجت مان جاتے ہیں۔ یہ تو شہر والے ہی بال کی کھال نکالتے ہیں۔" دوسرے لڑکے نے اپنے ساتھی کی بات سنبھالتے ہوئے کہا۔ "ایک دونی کیا بڑی بات ہے۔ دے بھی ڈالو چودھری لوگو۔"

اور ہر شخص نے چپکے سے ایک ایک دونی نکال کر لڑکے کے ہاتھ پر رکھدی۔ دھنّو جھنڈی لیکر خوش ہوا۔ اس نے اس کی سوئی اپنے کوٹ کے کالر میں لگائی اور بار بار اسکی خوبصورتی دیکھکر محظوظ ہونے لگا۔

"باپو! خوب بڑی کپڑے کی جھنڈی کا تو کوٹ بن جائے"۔ دھنّو نے متبسّم انداز سے نردھن کی طرف دیکھتے ہوئے بچپن کی معصومیت کا اظہار کیا۔ "بڑا اچھا لگے۔ کیوں باپو؟"

"ذرا سے کاغذ کے ٹکڑے کیلئے تو دونّی زبردستی ٹھگ کر لیگئے یہ شہری لونڈے۔ اور جو کہیں بڑی جھنڈی ہوتی اور وہ بھی کپڑے کی، دیوالہ نکل جاتا۔ کیوں پنڈت جی؟" نردھن نے ساتھی پنڈت جی کو مخاطب کرتے ہوئے دھنّو کی بات کا جواب دیا۔

پنڈت جی کہنے لگے "شہر کی زندگی اور گاؤں کے رہن سہن میں بڑا فرق ہے چودھری! ایسے ہی یہاں کے لوگوں میں۔ شہر کے لوگ بڑے چالاک اور مطلبی ہوتے ہیں۔ گاؤں والے سیدھے۔ جو ایک دوسرے سے محبت اور ہمدردی ہوتی ہے شہر والوں کے دل تو اس سے بالکل خالی ہوتے ہیں۔ شہر میں ایمانداری کم ہوتی ہے، ٹھگ ودیا اور بے ایمانی زیادہ۔"

"تو پنڈت جی نمسکار کرو ایسے شہر کو!" نردھن نے طنزیہ ہنس کر کہا "برتن میں سے ایک یا دو چاول دیکھکر ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ بھات کچا ہے یا پک گیا۔ ان لونڈوں کی کترنی سی زبان دیکھکر ہی میں تو حیران رہ گیا۔ اچھا تو پنڈت جی تمہیں اس شہر کا تجربہ ہے۔ کہیں سے دھنّو اور اُسکی ماں کیلئے تھوڑی سی مٹھائی دلا دو۔ پھر میں تو گھر چلا۔ تم بھی چاہو تو چلنا۔ نہیں تو جیسی تمہاری اچھا۔"

اور پھر حسبِ ضرورت چیزیں خرید کر نردھن نے گاؤں کا رخ کیا۔

اس واقعہ کو کئی سال بیت گئے۔ اس دوران میں نردھن نے قسمت کی گئی

چوٹیں کھائیں۔ اس کا [illegible] کئی ماہ بیمار رہ کر اس مرتبو لوک سے چھٹکارا پا گئی۔ ایک بھینس چوری چلی گئی۔ ان سب سے بڑی چوٹ اُسے دھنو کی متواتر بیماری نے پہنچائی۔

دھنو اب پندرہ سولہ برس کا تندرست لڑکا تھا۔ قصبے کے انگریزی سکول میں وہ تعلیم پا رہا تھا۔ نردھن کسی نہ کسی طرح اسکی تعلیم کے اخراجات برداشت کر رہا تھا۔ اچانک ملک میں ایک عجیب انقلابی تحریک کا آغاز ہوا۔ اکثر شہر اور قصبوں میں سرکاری دفتروں اور خاص خاص انسٹی ٹیوٹ کی عالیشان عمارتیں نذر آتش کر دی گئیں۔ اس تحریک میں ملک کے بوڑھے جوان اور لڑکے سبھی شامل سمجھے گئے۔ قصوروار اور بے قصور جو بھی شبہ میں پھنسے جھٹ گرفتار کر لیا گیا۔ نہ معلوم کتنے موت کے گھاٹ اتر گئے۔ کتنے قید خانوں میں ٹھونس دیئے گئے۔ دھنو بھی انہیں میں ایک تھا۔ نردھن نے اسکی رہائی کیلئے اپنا تمام سرمایہ اور تمام کوششیں صرف کر دیں آخرکار کئی ماہ کے بعد جب اس کی بے گناہی ثابت ہوئی تو وہ رہا کر دیا گیا۔ مگر جب وہ قید سے باہر آیا تو وہ ایک ایسے مجرم کی طرح دکھائی دیتا تھا جسکو خوب زدوکوب کیا گیا ہو اور جس سے کڑی مشقت لی گئی ہو۔

دھنو کی صحت خراب ہو گئی تھی اور اُسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا۔ نردھن دل مسوس کر رہ گیا۔ اسکی اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔

دھنو ہر سال اپنی ذہانت کا ثبوت دے رہا تھا۔ نردھن کو پوری امید تھی کہ وہ ضرور اُسکو غریبی اور نردھنتا کے عذاب سے چھٹکارا دلائے گا۔ مگر بیچارے کے نصیب میں دکھ [illegible] گھنے کے سوائے اور کچھ نہ تھا۔ دولت بھی امیروں کے ہی گھر جاتی ہے [illegible] غریب کے جھونپڑے میں نہیں۔ دھنو کی بیماری [illegible] نردھن کی غریبی۔ اس میدان میں وہ اب کئی بار دلی گیا۔ حکیموں اور [illegible] ڈاکٹروں کی موٹی موٹی فیسیں بھی برداشت کیں مگر کوئی سود مند [illegible] نکلا۔ ہر تیسرے چوتھے نردھن کو دوا لانے کیلئے دلی دوڑنا پڑتا۔ متواتر دوڑ دھوپ کی وجہ سے بیچارے کا بدن تھکان سے چور چور ہو رہا تھا۔ مگر مجبور تھا۔ نہ اس کا کوئی یار تھا نہ مددگار۔

اس بار جب وہ دلی گیا تو اُس نے دیکھا کہ اس شہر کو عروس نو بنایا جا رہا ہے۔ لمبی چوڑی سڑکوں پر ہر دو جانب چھوٹے چھوٹے رنگین بجلی کے قمقمے لٹکائے جا رہے ہیں۔ جو روشن ہوتے ہی کسی حسینہ کی موتیوں سے بھری ہوئی مانگ کی طرح نظر آنے لگیں گے۔ نردھن کو چند سال پیشتر کا وہ وقت جب وہ بادشاہ کی جوبلی کے موقعہ پر دلی آیا تھا، یاد آ گیا، اس وقت بھی شہر کو یوں ہی سجایا گیا تھا۔ لیکن اس وقت اس کا بچہ دھنو بھی اس کے ہمراہ تھا۔ وہ اس وقت تندرست تھا۔ وہ شہر کی رونق دیکھکر کتنا خوش ہوا تھا۔ اور آج وہ موت کی گود میں لیٹا ہے۔ محض ایک پنجر ہڈیوں کا ڈھانچہ جسکی زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ ابھی ہے ابھی نہیں۔ ہے بھگوان رکھیا (رکشا) کرو ——— اُس کے قدم تیز ہونے لگے وہ چاہتا تھا کہ ہوا میں اُڑ کر ڈاکٹر کی دکان پر پہنچ جائے اور جلد از جلد دوا لیکر اس آراستہ دوزخ سے جہاں انسان کو سونے چاندی کے ٹکڑوں کے کسی سے محبت نہیں کسی سے ہمدردی نہیں۔ جہاں کے انسان نما درندے غریبوں کی غریبی کا علم رکھتے ہوئے جان بوجھکر اُن کی سوکھی ہوئی ہڈیوں میں سے خون نچوڑتے ہیں۔ جن کے پہلو میں دل کی بجائے کوئی نہایت ہی گندی اور تعفن سے بھری ہوئی شے ہے۔ باہر نکل جائے۔ یہ سنسار کیا دھنوانوں کے لئے ہی ہے۔ نردھن کیلئے یہاں کوئی گنجائش نہیں۔ یہاں دیا دھرم کچھ نہیں رہا۔ دھنو بیماری سے مر رہا ہے۔ میں اور چمپا بھوک سے مر رہے ہیں۔ کسی کے بدن پر ثابت کپڑا نہیں۔ چیتھڑے بھی ایسے نہیں جن سے بدن ڈھکا جا سکے مگر کیا کیا جائے۔ اپنا نصیب بُرا نہ ہوتا تو غریب ہی کیوں ہوتے ———

دل میں جذبات کا طوفان لئے نردھن ڈاکٹر کی دکان پر پہنچ گیا اور جلدی سے دوا بنوا کر چلا۔ راہ میں ایک مقام پر اُس نے دیکھا بہت سے کنگلے، فقیر، ننگے، بھوکے جمع ہیں۔ اور اُن کو کھانا تقسیم کیا جا رہا ہے۔ اور وہ لوگ بھوکے کتوں کی طرح اس پر جھپٹ رہے ہیں اور اسی وحشیانہ طریقہ سے کھا رہے ہیں۔ نردھن ایک طرف کھڑا ہو کر یہ تماشہ دیکھنے لگا۔ پوریاں اور مٹھائیاں تقسیم ہوتے دیکھکر نردھن کے بھوکے پیٹ کی جوالا بھڑکنے لگی۔ اُس نے دو روز سے آدھے پیٹ بھی نہ کھایا تھا بھوک نے اُس کے پاؤں میں زنجیر ڈال دی۔ وہ وہیں کھڑا رہا۔

وہ دو قدم بڑھکر بھیک مانگ سکتا تھا مگر اس کو یہ گوارا نہ ہوا۔ [illegible] چلنے کے لئے قدم بڑھائے، اتنے ہی میں کسی سرکاری کارکن نے اسکو ٹوکا۔ "لے تو یہ کھانا لو!" نردھن حیرت سے اسکی طرف دیکھنے لگا۔

"ارے دیکھتے کیا ہو؟ پیٹ میں آتش قل ہو اللہ پڑھ رہی [illegible] نخرے ایسے دکھاتے ہو جیسے کوئی بڑے بھاری زمیندار ہو۔ آج کل کے [illegible] کے بھی مزاج بڑھ گئے ہیں۔" سرکاری کارکن نے نردھن کی بے رُخی [illegible] کر کہا۔

"سرکار! زمیندار تو تھے ہم۔ اب اگر زمیندار نہیں رہے تو کیا [illegible] ہو گئے ہیں؟" یہ کہکر نردھن آگے بڑھا۔ کچھ دور گیا تھا کہ اُس کی [illegible] عمارتوں اور اُن کے پھاٹک پر آویزاں بڑے بڑے جھنڈوں پر پڑی [illegible] میں نہ جانے کیسا ہیجان سا پیدا ہوا۔ وہ آگے بڑھا اور ایک پاگل کی سی [illegible] ساتھ اُس نے جلدی سے دو تین جھنڈیاں اُتار لیں اور بھاگا۔ مگر غریب [illegible] نہ بھاگ سکا۔ پکڑ لیا گیا۔ پولیس کانسٹبل نے جھنڈے چھین کر اسکی گردن [illegible]

ہتھکڑی کس کہاں ہے۔ اور پکڑ کر لے چلا۔ نردھن نے زور زور سے گڑگڑانا اور رونا شروع کیا۔ "حضور! ہماری استری کے بدن پر کپڑا نہیں ہے۔ میرے بدن پر نہیں۔ لڑکا موت کے منہ میں ہے۔ ہمارے پاس کھانے کو نہیں۔ پہننے کو نہیں۔ یہ کپڑے بیکار لٹکے دیکھے، حضور یہی سوچ کر میں نے اتار لئے کہ ہمارے بدن ڈھکنے کے کام آجائیں گے۔"

نردھن کی چیخ پکار سن کر ایک مجمع اکٹھا ہو گیا تھا۔ اس کی سادہ لوحی۔ طرز گفتگو اس کی خراب و خستہ حالت اور اداس چہرہ کی شیشی دیکھ کر اور اس کے بیان کو قابل اعتبار سمجھ کر لوگوں نے اسکو پولیس کی گرفت سے رہا کرا دیا۔ لیکن اتنی توفیق کسی کو نہیں ہوئی کہ دو پیسے پیسے اور کپڑے لتے سے اسکی کچھ امداد کر دیتا۔ زبانی ہمدردی سے اس کے آنسو ضرور پونچھ گئے۔ دھیرے دھیرے مجمع کم ہونے لگا۔ "جاؤ۔ جاؤ۔ اپنے گھر جاؤ۔ آئندہ ایسی غلطی نہ کرنا" کہتے ہوئے ایک ایک کر کے لوگ چلتے بنے۔

نردھن کچھ دیر تنہا کھڑا رہا، جیسے دنیا کے سلوک کا جائزہ لے رہا ہو۔ پھر اپنے چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ حقارت آمیز اور نفرت بھری۔ اور پھر زمین پر تھوکا گویا وہ تمام دنیا کی پیشانی پر، اس کے منہ پر تھوک کر اس کے سلوک بیجا کا انتقام لینا چاہتا ہو۔ اور پھر زخم خوردہ ہرن کی طرح جو ہر شخص کو شکاری سمجھ کر ادھر ادھر لڑکھڑاتا ہوا بھاگتا ہے۔ نردھن اپنے شکستہ اور نحیف جسم کا بار اپنی ٹانگوں پر اٹھائے اپنے گاؤں کو تیزی سے چل دیا۔ اور جب وہاں پہنچا تو کافی رات ہو گئی تھی۔ پورنما ہونے کا چاند ام اتی پر آہستہ آہستہ چڑھ رہا تھا۔ آسمان صاف نہ تھا۔ ہلکے غبار سے چاند اور اسکی روشنی دونوں میں ہی پھیکا پن سا آگیا تھا۔ جیسے کسی نازنین پر ڈھلکے کی حالت آ چلی۔

نردھن نے جب گھر میں قدم رکھا تو نہ جانے کیوں اس پر موت کے سناٹے کا سا عالم طاری ہونے لگا۔ ایک طرف سے کھسر پھسر کی سی آواز آرہی تھی جیسے شمشان میں بھوت بول رہے ہوں۔ صحن میں پہنچا تو گھر میں اندھیرا دیکھا۔ صحن میں ہلکی پھیکی چاندنی کا مدھم سا اجالا ہو رہا تھا۔ ایک طرف طاق میں مٹی کے تیل کی ڈبیہ رکھی تھی۔ مگر وہ بھی تیل ختم ہو جانے کی وجہ سے نہ جانے کب کی بجھ گئی تھی۔

"نردھن آگئے بھیا!" ایک طرف بیٹھے ہوئے چند لوگوں میں سے کسی نے کہا۔ "تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔ بڑی دیر ہوگئی دھنو بچارا ——"

"دھنو آ!" نردھن کے منہ سے چیخ نکلی اور وہ پاگل کی طرح اندر کی طرف دوڑا۔

"صبر کرو نردھن!" ایک شخص نے کہا۔ "کہیں سے اب کفن دفن کا انتظام کرو۔ ہم تو بہت جگہ تلاش کر آئے۔ کہیں ملا ہی نہیں۔ مگر نردھن کو ان باتوں کے سننے کا ہوش نہ تھا۔ وہ کوٹھڑی تک پہنچا تو روشن دان میں سے اندر آنے والی چاند کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ دھنو کا پنجرا اور بے جان جسم زمین پر پڑا ہے۔ اور چمپا اس کے نزدیک ہی بے ہوش پڑی ہے۔ نردھن کا سر چکرا گیا اور آندھی کی زد میں آئے ہوئے درخت کی طرح لڑکھڑا کر وہ بھی وہیں گر پڑا۔

سانچہ

(از جناب علیم نصابی بی اے علیگ)

تارے آسمانی نیلاہٹوں پر بکھرے ہوئے تھے۔
پتلی سڑک پر اونٹ گاڑی چاند کی ہلکی ٹھنڈی شعاعوں میں نہائی ہوئی آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ شیام گاڑی کی چھت پر بیٹھا آلبا کی پہاڑیوں کا دلکش سلسلہ ـــــ چھوٹی بڑی پہاڑیوں کی نقرئی چوٹیوں کو بغور دیکھ رہا تھا۔ ہوا کے نیم خوشگوار جھونکے چاندنی میں ڈوبے ہوئے درختوں میں سے گزر کر کچھ اس قسم کی آوازیں پیدا کر رہے تھے جیسے کائنات کے کھوکھلے قہقہوں کی آوازیں ـــــ رنج والم کی صدائیں ـــــ ان میں پہاڑیاں [illegible] کبھی کبھی بوڑھے پالو کی ٹخ ٹخ کی آواز سے گاڑی ذرا [illegible] تیز آتی تھی۔ مگر کچھ دیر بعد پھر پہلے کی طرح آہستہ ہو جاتی۔

چھایا ـــــ کیلاش ـــــ ونتی تینوں پڑے سو رہے تھے۔ صرف شیام ہی جاگ رہا تھا۔ اس کا دماغ اس وقت خیالات کے وسیع سمندر میں تیر رہا تھا۔ اُسے یاد تھا کہ جوانی میں چھایا اور کیلاش کے چہرے خوشیوں سے ابھرے رہتے تھے۔ مگر اب تو ان کے چہروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ زندگی کی بہار اور رنگین دور سے گزر چکے ہیں۔ دیکھتے ہیں تو وہ مر چکے تھے۔ زندگی کی مسرتیں ان سے روپوش ہو چکی تھیں۔ مگر پھر بھی وہ جوان تھے۔ شیام سوچنے لگا کہ جوانی بعض اوقات لوٹ بھی تو آتی ہے۔ انسان خواہ کتنا ہی بوڑھا کیوں نہ ہو پھر بھی وہ جوان بننے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ اپنے خدوخال میں وہی روپ وہی رنگ محسوس کرتا ہے جو ایک ابھری ہوئی جوانی میں موجود ہوتے ہیں۔ اور بڑھاپا تو ایک ایسا مقام ہے جہاں سے انسان پلٹ کر دیکھے تو جوانی ـــــ ناکام امیدوں کا ایک ڈھانچہ اور ناتمام آرزوؤں کی ایک تڑپتی ہوئی لاش کی طرح نظر آتی ہے۔ بڑھاپا تو ایک پرسکون منزل ہے ـــــ ایک اونچی زیارت گاہ ـــــ آسمانی دامن سے ملی ہوئی ـــــ

وہ ان خیالات سے اکتا کر ناچتی ہوئی چاندنی کو بغور دیکھنے لگا۔ جو درختوں کے پتوں سے گزر کر گاڑی کے ارد گرد پھیلی ہوئی تھی۔ بوڑھا پالو تاریکی کا حقہ [illegible] درختوں کی چوٹیاں ایک ہلکے لطیف غبار میں ڈھکی ہوئی تھیں۔

شیام کا ذہن اس وقت آلبا کی پہاڑیوں کی طرح بلندی پر پرواز کرنے لگا۔ وہ پورے چار سال بعد رام پور جا رہا تھا۔ شاید وہ اب بھی رام پور جانے پر راضی نہ ہوتا۔ لیکن ونتی اور ماں کے اصرار پر مجبوراً اسے ان کے ساتھ جانا پڑا۔ اس وقت ونتی کے الفاظ ـــــ "شیام ـــ چلے بھی چلو" اُس کے کانوں میں گونجنے لگے اور اُسے خیال آیا کہ ماں نے چلتے وقت اسے کہا تھا ـــــ "شیام ـــ ونتی اب بڑی ہو گئی ہے۔ رام پور جا کر اس سے زیادہ مت بولنا۔ وہاں کے لوگ کیا خیال کریں گے۔ بیٹے ذرا دھیان رکھنا"۔ دراصل ونتی اس کے بچپن کی ساتھی تھی اس کی ماں ہر سال امیر پور سے رام پور تبدیلی آب و ہوا کے لئے جاتی تھی۔ اور وہ گھنٹوں ونتی کے ساتھ کھیلتا تھا۔ اور پھر ماضی کے دلفریب واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے تھرکنے لگے۔ کیلاش اور چھایا کا جب نیا نیا بیاہ ہوا تھا تو ونتی اور شیام چھوٹے چھوٹے تھے۔ رام پور کا چھوٹا سا قصبہ سج کر بہت خوبصورت معلوم ہو رہا تھا بازاروں میں خوب چہل پہل تھی۔ بچوں نے چیخ چیخ کر سارے مکان کو سر پر اٹھا لیا تھا۔ سارا دن برات کی سیر کرتے۔ چند مخصوص لڑکے جمع ہوئے اور یہ طے کیا کہ رات کو جب سو جائیں تو شیام اور ونتی کا بھی اسی طرح بیاہ کیا جائے۔ اور پھر چھپر کا بڑھا درخت اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگا جس کے نیچے وہ اور ونتی دولہا دلہن بنے تھے۔ گاؤں کا ایک لڑکا پنڈت بنا تھا۔ اور ایک چھوٹے سے ہولی کنڈ میں اس نقلی پنڈت نے دونوں کے دوپٹے باندھ کر ان کو ایک دوسرے کا شریک حیات بنا دیا تھا۔ اس کھیل کے ختم ہونے پر جب شیام اور ونتی گھر پہنچے تھے تو سب لوگ جاگ اُٹھے تھے۔ کیلاش شیام کو ونتی کے ساتھ دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا تھا اور اسکی گردن پر چانٹا مارتے ہوئے کہا تھا ـــــ "یہ لاڈو کا ـــــ ہمیشہ لونڈیوں کے ساتھ کھیلتا ہے"۔ شیام سوچنے لگا کہ بچپن میں انسانی خیالات کتنے معصوم اور بے ضرر ہوتے تھے۔

گاڑی کچی سڑک پر اسی طرح آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ پالو کے منہ سے کبھی سرد اور خاموش آہیں نکل جاتی تھیں۔ اس وقت شیام کے کانوں میں پانی کا ہلکا ہلکا شور گونجنے لگا۔ اس نے پہاڑی چشمے دیکھے تھے۔ مگر چاندنی میں نہیں ـــــ اور نہ اس نے بہتے ہوئے چشموں کی آوازیں چاندنی میں سنی تھیں پانی کے لطیف شور نے اس کے احساس کو بیدار کر دیا۔ اس کی روح میں ایک دلکش نغمہ پیدا کر دیا۔ جو ہر گھڑی اسکی قلب کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا گاڑی جوں جوں آگے بڑھتی گئی چشمے کا شور اس کے کانوں میں تیز ہوتا گیا۔ اور پھر وہ آسمان کی لامحدود وسعتوں میں تیرنے لگا ـــــ چاندنی رات ـــــ چشمے کا شور ـــــ اور انسانی احساس کو جگانے والا ماحول ـــــ اُسے یاد آیا کہ جب وہ کا

میں پڑھتا تھا تو اسکی ہم جماعت کوئی لڑکی تھی۔ کیا نام تھا ـــــ کچھ ایسا ہی بھلا سا نام تھا ۔ وہ اپنے دماغ پر زور ڈالنے لگا۔ اُسکی زبان پر وہ لفظ آ آ کر رُک رہا تھا۔ لیکن آخر اسکے لب بے اختیار ہلے ـــــ "ریکھا" ـــــ ہاں ہاں ریکھا ہی ـــــ" وہ کہنے لگا۔ لیکن وہ دنتی سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ نہ معلوم دنتی میں کیا کشش تھی۔ کیا خاص بات تھی کہ دنتی اُسے پسند تھی۔ ورنہ ایمان کی بات تھی کہ وہ کالج کی لڑکی دنتی سے کہیں زیادہ خوبصورت تھی۔ مگر شیام حُسن کا قائل نہ تھا۔ جوانی میں ہر عورت حسین ہوتی ہے۔ اپنی جگہ پر ـــــ اور حُسن و جوانی، جوانی اور محبت کس قدر گہرا تعلق ہے ان میں ـــــ جوانی کا خیال آتے ہی اُس کے دماغ میں محبت کا لفظ چکر کاٹنے لگا۔ اس نے پہلی بار آج اس لفظ پر غور کیا ـــــ محبت ـــــ یہی نہ دل کے احساسات اور جذبات۔ ایک دریا جو کبھی متحرک اور کبھی ساکن۔ اور اُسے یاد آیا کہ دنیا کے تین بڑے آرٹسٹ تھے۔ ریفیل ـــــ اینجلو ـــــ اور اُٹھارویں صدی کا لیونارڈو ـــــ لیونارڈو اپنے فن میں ان سب سے اونچا تھا۔ لیکن محبت نے اس کا آرٹ۔ اُس کی جوانی بُری طرح پامال کر دی۔ اگر اسکی محبوبہ محبت کا جواب ایک پُر زور طریقے سے دیتی تو شاید وہ کسی اونچے مرتبہ پر پہنچ جاتا۔ مگر اس کا آرٹ برباد ہو گیا۔ اسکی اُمیدیں برف کے ایک بڑے تودے کی طرح پگھل گئیں۔ اور اس کا نوجوان دل اُس کی تاب نہ لا کر بیٹھ گیا ـــــ "آہ۔ محبت" وہ کہنے لگا۔ اس وقت اس کی نگاہیں آلپا کی پہاڑیوں پر جم گئیں۔ کچی سڑک ختم ہو رہی تھی اور پام پور کا راستہ اب پہاڑیوں کو کاٹ کر بنایا گیا تھا۔ سڑک کے کنارے بیشمار جھونپڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ جن میں پہاڑی مزدور مقیم تھے۔ گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی۔ اونٹوں کے پاؤں اس دل سے بھی کہیں زیادہ تیز اُٹھنے لگے جو پہلی بار محبوب کے سامنے بیتابی سے دھڑکتا ہے۔ پہاڑوں کے نزدیک آتے ہی پانی کا شور اُس کے کانوں میں زیادہ تیز ہو گیا۔ شیام دنتی کے چہرے کو تکنے لگا جس میں اسکی جوانی ہچکولے کھا رہی تھی۔ اس کا دل آج پہلی بار دنتی کو آغوش میں لینے کے لئے بیقرار تھا۔ اُس کے ہونٹوں نے آہستہ سے "دنتی" کو پکارا۔ مگر پھر وہ سہم کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا چھایا اور کیلاش اسی طرح سو رہے تھے۔ شاید دنتی خوابوں کے شبستانوں میں اپنے محبوب سے مل رہی تھی۔ شیام نے بڑھکر اس کا ہاتھ اُٹھا لیا۔ اور دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتا رہا جس میں اسکی مستقبل قریب میں آنے والی آرزوئیں جھلک رہی تھیں اس وقت فضا میں کسی پرندے کی ناخوشگوار چیخ تیرنے لگی۔ شیام نے لاشعوری طور سے دنتی کا ہاتھ چھوڑ دیا جو کہ ایک ہلکی لطیف آواز پیدا کر کے اس گاڑی کے چھت پر ٹھہر گیا۔ دنتی نے گھبرا کر اپنی آنکھیں کھولیں اور اپنی کہنیوں کا سہارا لیتی ہوئی بولی "تم نے مجھکو پکارا تھا۔ ـــــ شیام" شیام کو احساس ہوا کہ شاید دنتی کی قلب کی دھڑکنوں نے پیغام رسانی کا کام کیا ہے۔ اور اُس نے جواب میں اپنا سر ہلا دیا جیسے آج ایک مدت کے بعد اُس نے پیار بھرے لہجے میں اسکو پکارا تھا۔ پھر اس کے کانوں میں وہ گیت گونجنے لگا جو دنتی نے اسکے ساتھ ایک شام محلّے کے بچوں کے ساتھ گایا تھا ـــــ "میرا ہاتھ پکڑ کر ساجن ـــــ دُور کہیں لے چل" اس کا جی چاہا کہ وہ دنتی کو لیکر کہیں نکل جائے۔ ان درختوں کو چیر کر وہ چشمے کے کنارے پہنچ جائے جس کی لطیف اور خوشگوار آواز اب بھی اسکے کان سن رہے تھے۔ وہاں بیٹھکر وہ اُسے اپنے سینے سے چمٹا لے۔ دنتی چپ ہے اور پھر اس سے جدا نہ ہو۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ چٹان پر بیٹھا جذبات کی اُٹھتی ہوئی لہروں کو بغور دیکھ رہا ہے۔ جو ہر دفعہ اُسے مغلوب اور اس کے احساسات کو کچل دینا چاہتی ہیں۔ اس نے دنتی کا چہرہ اپنے سینے پر رکھ لیا اور اسکی کنپٹیوں کو سہلاتے ہوئے کہا ـــــ "تم مجھ سے محبت کرتی ہو نا دنتی" مگر وہ دیر تک دنتی کو اپنی آغوش میں نہ رکھ سکا۔ کیونکہ گاڑی ٹھہر چکی تھی۔ اور بوڑھے پالو کی بلند آواز نے چھایا اور کیلاش کو جگا دیا تھا۔ وہ سب اُتر کر آگ کے الاؤ کے گرد بیٹھ گئے۔ شیام پالو سے بخوبی واقف تھا۔ اب سے نہیں بلکہ بچپن سے۔ اُس نے کبھی اُس کا چہرہ افسردگی سے خالی نہیں دیکھا تھا۔ شاید پالو کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تھی۔ وہ بعض اوقات سوچتا بھی تھا کہ آخر دنیا میں اور لوگ بھی ہیں۔ جو ہر وقت خوش رہتے ہیں۔ ہنستے ہیں۔ پھر آخر یہ کیوں اتنا خاموش رہتا ہے ـــــ شاید اس لئے کہ یہ غریب ہے ـــــ نہیں غریب لوگ بھی بسا اوقات خوش رہتے ہیں۔ اب بھی شیام الاؤ کی سُرخ روشنی میں پالو کے چہرے میں کتنی ہی رنج و الم کی زندگیاں کھوئی ہوئی دیکھ رہا تھا۔ اور پھر شیام نے پالو سے محبت بھرے لہجے میں پوچھا ـ "پالو ـــــ اچھے تو ہو؟" پالو کچھ دیر تو خاموش رہا اور پھر ایک ٹھنڈا سانس لیکر بولا ـــــ میرے اچھے یا بُرے ہونے سے کیا ـــــ دُنیا کی وہی چال ہے ـــــ وہی رفتار ہے ـــــ خواہ یہ بُری ہو یا بھلی۔ ہم سب اس کے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں اور بس ـــــ" یہ کہکر وہ رُک گیا اور سب کے چہروں کو تکنے لگا۔ جیسے سب کے سب زمانے سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ ہر ایک کی زندگی وقت کے ساتھ پرواز کر رہی ہے۔ مگر اس کے جسم میں ایک باغیانہ رُوح پرورش پا کر اب عروج کے مدارج میں قدم رکھ چکی ہے اور وہ موجودہ زندگی سے بغاوت کرنی چاہتا ہے ـــــ اس وقت دور آسمان پر چاند سپید سپید بادلوں کے سمندر میں ڈوب گیا اور کسی درخت پر کوئی پرندہ

اپنا سر پتوں میں چھپائے کوئی نغمہ الاپ رہا تھا۔ شیام سوچنے لگا کہ واقعی زندگی اب وہ نہیں رہی جو صدیوں پہلے تھی۔ اب تو انسان ہر وقت نت نئی چیزیں معلوم کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ بھلا ایسی چیزوں سے کیا فائدہ جو ذرا بھی انسان کو زندگی کے اہم مسائل کے حل کرنے میں مدد نہ دیں ——— اور پھر اس نے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ جہاں بادل اب بھی اسی طرح چاند کو اپنی اجلی سفید چادر میں چھپائے ہوئے تھے۔ شیام کا دل کہہ رہا تھا کہ یہ بادل یقیناً اس دُنیا سے پیغام لائے ہیں جو دُور نیلے سمندروں سے پرے واقع ہے ——— جہاں قدرت کی دلنواز اور حسین مسکراہٹیں ——— شباب کی جھلکیاں ——— کتنا دہ وادیاں ——— بلندی سے گرتے ہوئے آبشاریں ——— جھرنوں کی موسیقی ——— راحت و سکون کی حسین دیویاں اس کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہ بھی ایک روز ایسی جگہ چلا جائے گا۔ اس زندگی سے وہ کوسوں دُور بھاگ جانا چاہتا ہے جہاں سے اس دُنیا کی آواز تک سنائی نہ دے سکے۔ اور ایسے آرام پرور ماحول سے کون لوٹ کر واپس آسکتا ہے۔

الاؤ کے شعلے اس وقت زور سے بھڑکنے لگے ——— شیام نے دیکھا کہ دنتی کے علاوہ سب نیند کی گھنی چھاؤں میں سستا رہے تھے۔ شیام دنتی کے ساتھ پہاڑیوں پر چہل قدمی کے لئے نکل گیا۔ اس وقت آسمان بادلوں سے خالی تھا۔ اور چاند چیڑ کے چھوٹے درخت کی ایک ٹہنی میں سے کچھ اس طرح نظر آرہا تھا جیسے کوئی پرندہ اُڑنے کیلئے بیقرار ہو ——— شیام اور دنتی آج پہلی بار اس حسین ماحول میں پہلو بہ پہلو چل رہے تھے۔ شیام سوچ رہا تھا ——— کاش کسی جھیل کے وسط میں کوئی محل ہو ——— دنتی ہو اور وہ ——— جھیل کے کنارے درختوں پر کوئی بلبلیں بولے ——— وہ سر جوڑ کر بیٹھ جائیں۔ اُنکے نغمے سُنیں اور اُن کی تعریف کریں۔ اور اسے احساس ہوا کہ محبت میں انسانی تخیل آسمانی وسعتوں سے بھی کہیں زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ کچھ دُور چل کر وہ ایک چٹان پر بیٹھ گئے۔ شیام نے محبت کے شدید احساس سے مغلوب ہو کر دنتی کے دونوں ہاتھ اپنی گردن کے گرد ڈالتے ہوئے کہا ——— "دنتی! ——— یہ چاند تارے آج ہمیں شرمندہ کر رہے ہیں۔" دنتی نے یہ سُنکر اپنی گردن نیچے جھکا لی۔ جیسے واقعی وہ اس بات پر نادم ہے اور پھر سنجیدگی سے بولی ——— میں خود جانتی ہوں ——— شیام ——— کافی مدت کے بعد آج یہ حسین رات ہمیں میسر ہوئی ہے۔ چاند کے لبوں پر مسکراہٹ ناچ رہی ہے۔ تارے ایک پھیکی سی ہنسی ہنس رہے ہیں۔ فضا میں نغموں سے معمور ہیں۔ پہاڑوں کی اُداس چوٹیاں ہمیں دیکھ رہی ہیں۔ ہمارے جذبات چاندنی کے گہوارے میں جھول رہے ہیں۔ مگر یہ رنگین لمحات زندگی کی وسیع فضاؤں میں بہت جلد کھو جائیں گے ——— یہ کہکر دنتی نے اپنی باہوں کا حلقہ شیام کی کمر کے گرد اور بھی تنگ کر دیا۔ عین اسی وقت دُور پہاڑی ٹٹوؤں کی ٹاپوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور ساتھ ساتھ ان کے گلوں کی گھنٹیوں نے فضا میں ایک ہلکا سا نغمہ پیدا کر دیا۔ دنتی اور شیام بھی تھوڑی دُور جا کر اس چھوٹے سے قافلے میں شامل ہو گئے جو بام پور جا رہا تھا۔

اور دوسرے دن جب آسمان ستاروں سے خالی ہو گیا ——— سورج مغربی کوہستانی گھاٹیوں سے نکلنے لگا، وہ بام پور پہنچ گئے۔ شیام کو اب قصبہ میں نئے اور ترقی یافتہ چہرے نظر آرہے تھے۔ اسکی غیر موجودگی میں نہ معلوم کتنے لوگ کتنے اور مستقل طریقے سے آباد ہو گئے۔ دلما کے آبشار سے بجلی پیدا کر کے قصبہ تک پہنچائی گئی تھی۔ بات دراصل یہ تھی کہ جب سے انگریز پہاڑی مقامات پر رہنے لگے تھے بام پور کے بسنے والوں نے اُن کے آرام کی ہر چیز مہیا کر دی تھی۔ قصبہ میں ایک دو ہائی سکول بھی کھول دیئے گئے تھے جن میں لڑکے لڑکیاں ساتھ تعلیم پاتے تھے۔ لوگوں کو سیاست سے بھی کافی دلچسپی ہو گئی تھی۔ شیام ان خیالات میں اس قدر اُلجھا ہوا تھا کہ اُسے وقت اور کیلاش کا مطلق احساس نہ رہا تھا۔ اور پھر وہ چونک پڑا جب نمی اس سے آکر لپٹ کر بولی ——— "بھیا ——— تم آگئے"۔ منی بھی اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی ——— اب تو ہمارے ہاں بجلی لگ گئی ہے ——— بھیا! اور چچی کے کمرے میں تو اب پھیر پھیر کرتا ہوا پنکھا چلتا ہے ——— شیام یہ سُنکر آگے بڑھ گیا چچی دروازے پر کھڑی مسکرا رہی تھی اور شیام کے قریب آتے ہی بولیں ——— "بہت دنوں میں آئے شیام!" شیام نے جھک کر چچی کے پیر چھوتے ہوئے کہا۔ "فرصت کہاں سے لاتا ——— چچی ——— اب آیا کروں گا ——— تعلیم سے فارغ ہوا ہوں ———" "اور تم نے یہ بھی سُنا" چچی نے اس کو پیروں سے اُٹھاتے ہوئے کہا ——— "رتنا کی سگائی دو تین روز میں ہونے والی ہے" اور یہ کہکر چچی نے رتنا کو آواز دی اور اس کو دیکھکر بولیں ——— "انہیں پہچانتی ہے رتنا؟" رتنا نے شیام کے چہرے کو بغور دیکھا اور کچھ دیر بعد بولی ——— "شیام ——— معاف کرنا میں تم کو نہ پہچان سکی تھی۔ تم تو وہی ہو ——— ہمارے بچپن کے ساتھی۔" شیام ذرا سنجیدگی سے مسکرا کر اندر چلا گیا۔ اور کچھ دیر آرام کرنے کے لئے وہ کمرے میں جا لیٹا۔ باہر آنگن میں کچھ لوگ بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور بچے بے تحاشا چیخ رہے تھے۔ شیام کی آنکھوں کے سامنے بچپنے کا ایک ایک واقعہ پھرنے لگا۔ رتنا اس کی بچپن کی ساتھی تھی۔ مگر اب تو وہ جوان ہو چکی تھی۔ اُس کے حُسن میں اب ایک غیر معمولی اضافہ ہو گیا تھا ——— لیکن وہ زیادہ دیر تک نہ سوچ سکا کہ باہر چچی نے اُس کو کھانے کے واسطے بلا لیا

———

کھانے سے فارغ ہو کر شیام باہر چلا گیا۔ جہاں کیلاش کے دوست ایک چارپائی پر بیٹھے بیلا کھیلا تاش کھیل رہے تھے۔ کیلاش نے اپنے سب دوستوں سے تعارف کرایا۔ شیام کو ملاقاتیوں میں سے صرف تین آدمی پسند آئے۔ ایک تو بیلا صاحب تھے ذرا بھاری بھر کم سے آدمی ـــــ اُبھرے ہوئے رخسار اور ناک ایسے اُبھرے چہرے پر بالکل چوڑے کاغذ پر ایک مکھی کی طرح نظر آتی ہے۔ تاش کے بے حد شوقین۔ برج کے دلدادہ اور ہاں سگریٹ صرف دوستوں کی محفل ہی تک محدود تھا۔ باہر وہ کبھی اپنے پیسے سے سگریٹ نہیں پیتے تھے۔ شیام نے بیلا کی باتوں سے اندازہ لگایا کہ وہ جوان ہو کر بھی بچوں جیسی باتیں کرتا ہے۔ دراصل بات بھی یہ تھی کہ بیلا بچپن سے اب تک گھر کی چار دیواری میں رہا تھا۔ دوسرے شخص شیرا تھے۔ جو ذرا جسمانی طور سے مضبوط تھے۔ اور کیوں نہ ہوتے۔ روٹی بھی تو اسی بات کی کھاتے تھے۔ شیام کو دیکھ کر بولے ـــــ کے سال تک پہاڑی علاقہ سے باہر رہے ؟ ـــــ "یہی تین چار سال تک ـ" شیام بولا۔ "مگر صاحب صحت تو آپ کی بہت گر گئی ہے ـ" اُس نے شیام کے جسم کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ـــــ " ہم نے گورے دیکھے ہیں ولایت کے ـــــ بڑے تگڑے ہوتے ہیں۔ چہرے پر خون الگ جھلکتا ہے۔ اور ہم لوگ بھی اُنکی برابری نہیں کر سکتے اچھا بدن بھی اس وقت بنتا ہے جب کچھ کھانے کو ملے ـــــ یہاں دیکھئے والد نے تین مکان چھوڑے تھے۔ کام کاج کچھ کرتا نہ تھا بس بدن بنانے کی فکر میں رہتا تھا۔ ان مکانوں میں سے ایک باقی ہے دو قرق ہو گئے ـــــ اتنا پیسہ نہ تھا کہ بیک وقت دودھ والے اور دیگر دکانداروں کا حساب چکاتا۔ انہوں نے میری جائداد تو دیکھ ہی رکھی تھی۔ سوچتے ہونگے سب اُگلوا لیا جائے گا۔ اور وہی ہوا جسکی لوگ اُمیدیں لگائے بیٹھے تھے۔ میرے ساتھی کہتے تھے۔ "اے شیرا ! یہ سب اکڑ کڑ نکل جائیگی۔ مگر میں اس کان سنتا اور اس کان اُڑا دیتا۔ دو مکانوں کے جانے سے کچھ اس قدر ملال ہوا کہ بیمار پڑ گیا اور اب وہ جوش و خروش نہیں ملتا ہے ـــــ جی ـــــ دیکھئے ایک مکان باقی ہے۔ کیا ہوتا ہے ـــــ" ملاقاتیوں میں تیسرے ایک سیاسی لیڈر رہتے تھے۔ اس وقت ان کا شمار رام پور کے سرکردہ لیڈروں میں سے تھا۔ بس ان کا اوڑھنا بچھونا سیاست ہی تھی۔ جب کسی سے ملتے دوران گفتگو میں کہیں نہ کہیں سیاست کو ضرور لے بیٹھتے تھے۔ رام پور میں جلسے ہوتے تو سب میں پہلے موجود۔ مگر لوگ ان پر بڑے بڑے فقرے کستے تھے۔ ایک کہتا ـــــ کیوں بے دشنا ! آخر چندوں پر گزارہ ہو رہا ہے ـــــ ہاتھ پاؤں نہیں مارے جاتے کہ چار پیسے کمائے ـــــ" اور یہ بیچارے اپنی جگہ پر بیٹھے بیچ و تاب کھاتے تھے ـــــ شیام کو ذرا پڑھا لکھا دیکھ کر بولے ـــــ

"کچھ آپ کی درسگاہ میں بھی آزادی کا چرچا ہے ـ ؟" شیام بولا " بہت تھوڑا ـ بس نہ ہونے کے برابر ہی سمجھئے " ـ دشنا نے اپنی تیوری پر بل لاتے ہوئے کہا ـــــ ہاں جی آج کل کے لوگ غلامی کو مطلق محسوس نہیں کرتے ـ والدین کو چاہیئے کہ وہ بچوں کو حقیقت سے آگاہ کریں۔ شروع ہی سے ان کے خمیر میں یہ بات ڈال دیں کہ غلامی لعنت ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ کرے کون ؟" شیرا جھٹ بول اُٹھا ـ "کیوں بے دشنا ! کیا تجھکو تیرے والدین نے سیاسی باتیں سکھائی تھیں ؟" ـــــ پہلے تو دشنا ذرا جھکرایا ـ پھر تیزی سے بولا ـــــ دیکھ بے شیرا ! تو ہمیشہ اوندھی بولتا ہے۔ میرے پاس ایسی واہیات باتوں کے جواب نہیں " ـــــ اور یہ سنکر ساری محفل ہنسی کے مارے لوٹ پوٹ ہو گئی ـ

دوسرے دن شیام گریوہ کی گھاٹی کی طرف چلا گیا۔ جہاں آلو نامی آبشار کافی بلندی سے گرتا تھا۔ گریوہ کی گھاٹی رام پور سے کچھ فاصلے پر واقع تھی۔ آلو کا پانی پہاڑوں سے گر کر گھاٹی میں ایک ندی کی صورت میں بہتا تھا۔ گھاٹی کے دوسرے کنارے گریوہ کی چھوٹی سی بستی تھی۔ پانی کی فراوانی سے صرف درختوں کے جھنڈ کے سوا اور کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ چاندنی راتوں میں گریوہ کے مناظر بہت ہی دلفریب نظر آتے تھے۔ آبشار کی دلربا آواز ـــــ گھاٹی کے درختوں کا سبزاؤ کا لا رنگ اور پھر اوپر پہاڑوں کی بلند و بالا چوٹیاں ـــــ یہ سب ایک بڑی سنہری ناؤ کی طرح چاند کی بہتی کرنوں پر تیرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ شیام کی نظریں پہاڑ کے گہرے نیلے پتھروں سے پھسل کر ایک دوشیزہ پر جم گئیں جو کوئی پہاڑی گیت زیر لب گنگناتی دلکش انداز میں پگڈنڈی پر چل رہی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ دوشیزہ شیام کے قریب آ گئی ـــــ اور ذرا شوخی سے بولی ـــــ "کس غرض سے آئے ہو ـــــ راہی ؟" ـــــ "فطرت کی عریانی دیکھنے کو ـ" شیام نے ذرا سنجیدگی سے کہا ـــــ اور یہ سنکر اس نے شیام کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور دوسری کے درخت کے نیچے لے گئی۔ وہاں شیام کو ایک بڑے پتھر پر بٹھا کر وہ درخت کے بڑے تنے میں گھس گئی جو اندر سے ایک چھوٹے کمرے کی صورت میں کٹا ہوا تھا۔ کچھ لمحہ بعد وہ شیام کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ اور اپنی انگلیوں کو دیکھتے ہوئے بولی ـــــ "مجھے آدی کہتے ہیں ـــــ راہی ـــــ میں یہاں عرصہ سے رہتی ہوں ـــــ گریوہ میں میرے عزیز بھی ہیں لیکن میں وہاں رہنا نہیں چاہتی۔ مجھے اس درخت سے ـــــ جسکے نیچے تم بیٹھے ہو نا ـــــ بہت محبت ہے۔ اب میں یہیں رہتی ہوں۔ چرواہوں کے گیت ـــــ بلبل کا مترنم نغمہ ـــــ اس آبشار کا دلکش نغمہ ـــــ میری رُوح کو بہت پسند ہے۔ لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں۔ لیکن تم ہی

بتا کر رہی! میں اُن کو کیا جواب دوں کہ میری روح کو یہاں کس قدر اطمینان نصیب
ہوتی ہے۔ صبح شام کی رعنائیاں ـــ شب کی خاموشیاں ـــ اور سامنے والی بستی
کے ٹمٹماتے ہوئے دیئے ـــ میری خوابوں کی دنیا میں ایک رسیلا گیت گاتے ہیں۔
دراصل میں بادلوں کی آغوش اور گرتے ہوئے آبشار کے چمکیلے پانی کی آواز
سن کر اپنی تکلیف، درد، موت، جدائی سب کو بھلا جاتی ہوں۔ اور اپنے آپ کو
ایک ایسے جزیرے میں خیال کرتی ہوں جہاں سنسان دلدل میں حیوان اور انسان سب
بے ہوش ہو کر شکر اور چین کی نیند سوتے ہیں۔ اور جب صبح آفتاب کی کرنیں سیدھی
پڑتی ہیں تو میں اُٹھ جاتی ہوں اور آسمان پر نگاہ ڈالتی ہوں جہاں نمودار شب
ہوتا ہے تارے ٹمٹماتے ٹمٹماتے مدھم پڑ جاتے ہیں اور سورج آسمانی کناروں کو
چوم رہا ہوتا ہے۔ میری غذا ان سیب اور خوبانی کے درختوں تک ہی محدود ہے۔
مگر بسا اوقات گاؤں کی لڑکیاں اچھے اچھے کھانے پکا کر لاتی ہیں ہم سب کھاتے
ہیں اور پھر سیر کو نکل جاتے ہیں۔ مگر اب تو پہاڑی باشندوں کی زندگیاں بدلتی
جا رہی ہیں۔ دریا کے آبشار سے بجلی پیدا کر کے قصبے میں پہنچائی گئی ہے۔ مجھے
ڈر ہے کہ کہیں یہ آبشار بھی اسکی نذر نہ ہو جائے۔ میں تم کو دیکھ رہی تھی کہ شاید تم
بھی ہم سے قدرت کا حسن چھیننے آئے ہو۔ مجھے اس آبشار سے بہت ـــ محبت ہے۔
زمانے کے لوگوں نے مجھ سے منہ موڑ لیا مگر یہ اب تک مجھ کو اپنے سائے میں لئے ہوئے ہے۔
بس اب میں جاتی ہوں۔ ان درختوں کے پیچھے جو تم جھرمٹ دیکھ رہے ہو نا ـــ
وہاں میری سہیلیاں ہیں۔ چاندنی راتوں میں ہم سب مل کر خوب خوشیاں مناتے ہیں۔"
یہ کہہ کر وہ شیام کے پاس سے اٹھی اور سامنے درختوں کے جھنڈ میں
چھلانگ لگاتی ہوئی غائب ہو گئی۔ شیام کو محسوس ہوا کہ موجودہ زندگی کچھ تلخ اور
بے معنی سی ہو گئی ہے۔ کاش اس دنیا میں آدمی کے ہم خیال پیدا ہو جائیں تو زندگی
کے کیسے سمندر میں ایک بار پھر خوشیوں اور راحتوں کی لہریں موجزن ہو جائیں گی۔
اور وہ ان ہی خیالات میں الجھ کر گھر کی جانب چل کھڑا ہوا۔
کچھ دنوں بعد رتنا کے بیاہ کا دن آ گیا۔ گھر کو نئی نئی چیزوں سے
آراستہ کیا گیا۔ آس پاس کے درختوں پر بجلی کے قمقمے آویزاں کرائے۔ ان کے
سبز پتے بجلی کی روشنی میں چمکنے لگے۔ شیام کی چچی اور چچا کا گھر بہت خوب بن سنور رہی
تھیں۔ باہر آنگن میں سب عورتیں بیٹھی تھیں اور گھر کے لوگ بالائی منزل پر بیٹھے
نیچے عورتوں کے لباس کا جائزہ لے رہے تھے۔ رتنی بھی آج اچھے کپڑوں میں ملبوس
رتنا کے پاس بیٹھی تھی۔ وہ کچھ اس انداز میں بیٹھی سوچ رہی تھی جیسے کوئی خوابوں اور
محبت کے شبستانوں میں بیٹھا اپنی خیال پرستیوں کو زندگی کی تلخیاں اور حیات کی
ناقابل برداشت تلخیوں سے دو گھڑی کے لئے نجات دلانا چاہتا ہو۔ مگر اس کے پاس بیٹھی

ہوئی عورتیں تو اس وقت [illegible] تھیں ـــ
بچے دلچسپ مشاغل میں گھر کے باہر کھیل رہے تھے اور ان کی آوازیں گھر کی بالائی منزل
تک سنائی دے رہی تھیں۔ شیام نے ان کی آوازوں سے اکتا کر اپنے کانوں پر
ہاتھ رکھ لیا۔ سامنے کرشن بیٹھا اپنے دوستوں کو ایسے جزیروں کی کہانیاں سنا
رہا تھا جہاں کے بسنے والوں تک ابھی آدمیت نہیں پہنچی ہے۔ ان باتوں سے
شیام کے احساس کو ایک بار پھر ٹھیس لگا دی۔ ایسا راستہ جو جزیروں تک
پہنچاتا ہے ضرور خوبصورت ہوگا۔ وہ آخر یہی راستہ ایک پرسکون زندگی کے
لئے ہے۔ جو شہروں سے دور کھلی ہوا اور درختوں کے سائے میں جزیروں کو چلا جاتا
نیچے آنگن میں اس وقت لڑکیاں زور زور سے گانے لگیں۔ اور ڈھولک
زور زور سے بجنے لگا۔ شیام کے کانوں کو یہ گیت بالکل لغو معلوم ہو رہے تھے
جو بچیاں کہہ رہی تھیں۔
"لُٹ ـــ وہ رگھو کی بہو نہیں آئی۔"
کوئی عورت جواب میں بولی ـــ "نہ جی ـــ شادی کے پہلے اسکی
آنکھ کچھ اور ہی ہو گئی ہیں۔ ساری رات تو میاں بیوی باتیں کرتے ہیں۔ اور
صبح کو دیر تک سوتے رہتے ہیں۔ نئی نئی شادی کے سہاگ تو ایسے ہی ہوا
کرتے ہیں۔"
"مگر جی ـــ" چچی کی آواز پھر بلند ہوئی۔ "ہمارا جب جی
بیاہ ہوا تھا تو ہم بھی ساری ساری رات باتیں کرتے تھے لیکن صبح مارے شرم کے
جلد اُٹھ جاتے تھے۔ آج کل کی لڑکیاں کسی کو اپنا بڑا ہی نہیں مانتیں۔"
اور پھر ان کی آوازیں ہوا میں تحلیل ہو گئیں۔ لڑکیاں گیت گا
رہی تھیں۔ کرشن اور اسکے ساتھی ان کو دیکھنے میں مصروف تھے۔ شیام چارپائی
پر لیٹ گیا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور سونے کی کوشش بے سود کی۔
کیونکہ گیتوں کی مسلسل آوازیں اسکی نیند میں خلل انداز ہو رہی تھیں۔ مگر
لیٹا رہا اور آخرکار اسکی آنکھیں نیند کے نرم جھونکوں میں بند ہو گئیں ـــ
لیکن نصف شب گزرنے پر اسکی آنکھ کھل گئی۔ کسی نامعلوم وجہ سے۔ جس کا
بھی احساس تھا۔ نیچے آنگن میں سب عورتیں سو چکی تھیں۔ اور اب بالکل خاموشی
وہ کھڑا ہو گیا اور چپ چاپ عورتوں کو لانگتا پھلانگتا گھر سے باہر آ گیا۔ اور
آبشار کی طرف چل دیا۔ رات سنسان اور خاموش تھی۔ اور ماحول اداس
غمگین ـــ چاند چمک رہا تھا اور تارے رخسار فلک پر ڈھلکے ہوئے آنسوؤں کی
طرح چمک رہے تھے۔ مگر شیام کے نزدیک اُن کی روشنی میں ایک عام مایوسی
چھائی ہوئی تھی۔ کائنات کی آوازیں خاموش تھیں۔ وہ سوچنے لگا آخر دنیا

سوہنیں آج کہاں غائب ہوگئیں۔ کہاں چھپ گئیں۔ تنہائی میں اس کا تخیل ایک پیرا اور گھٹے ہوئے مقام کی طرف لے جا رہا تھا۔ آگے چاند بے ضیا نظر آ رہا تھا۔ ہر سبز درخت اور زعفران کے سبزہ زار آج بالکل ویران نظر آ رہے تھے۔ کلیاں آنکھیں بند کئے ہواؤں میں سسکیاں بھر رہی تھیں۔ اور ہر طرف —— تنہائی —— اداسی —— ویرانی —— اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا اُسے احساس ہوا کہ یہ آج ضرور ساکت ہو جائے گا۔ اس کا تخیل خزاں کے سوکھے پتوں کی طرح ہواؤں میں اُڑ رہا تھا۔ اور پھر وہ پہاڑیوں پہ بھاگنے لگا ——

دور —— پہاڑوں کا دلفریب سلسلہ دکھائی دے رہا تھا۔ سخت پہاڑ —— غیر متحرک —— انسانی حیات بھی آج سرمایہ داروں کے ہاتھوں مقید ہے۔ مگر اب تو شجرِ حیات سوکھ چکا ہے۔ اور اُسکی شاخیں فنا کا گیت الاپ رہی ہیں —— وہ بھاگ رہا تھا اور اُس کے پاؤں آڑے ترچھے پتھروں پہ کہیں کے کہیں پڑ رہے تھے۔ جوں جوں وہ پہاڑوں کے قریب آتا گیا اُس کے کانوں میں آبشار کا شور گونجنے لگا۔ چاند کی چمکیلی کرنیں اس کے تمام جسم پہ ناچ رہی تھیں۔ درختوں پہ بلبل تھک کر سو چکی تھی۔ مگر اس کا احساس بیدار تھا۔ اس کی روح میں اب بھی گرتے ہوئے آبشار کا نغمہ بلند ہو رہا تھا —— اب اس کا دل ٹھیر ٹھیر کر چلنے لگا —— مگر کان وہی خیال انگیز، لطیف و خوشگوار پانی کا موثر شور سُن رہے تھے —— اور وہ بے تحاشا پہاڑیوں پہ بھاگ رہا تھا —— فضا میں کسی پرندے کی ناخوشگوار چیخ پھر تیرنے لگی جو ایک بار اُس نے پہلے بھی سُنی تھی۔ وہ ٹھیر گیا۔ اور اُس نے ماحول پہ ایک نگاہ ڈالی —— دور کہیں سڑک پہ کوئی گاڑی آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ اس کو احساس ہوا جیسے گاڑی کے پھرتے ہوئے پہیئے ایک ایسا بلند نغمہ پیدا کر رہے ہیں جو تاروں تک پہنچ رہا ہے —— اور تاروں کا خیال آتے ہی اُس نے آسمان کی طرف نگاہ اُٹھائی جہاں —— آسمانی نیلاہٹوں پہ تارے اب بھی بکھرے ہوئے تھے۔

جامعہ جوبلی

برادران دہلی!

آپ میں سے اکثر حضرات کو یاد ہوگا کہ ۱۹۲۵ء میں تعلیمی رضاکاروں کی ایک چھوٹی سی جماعت علی گڑھ سے دہلی آئی تھی کہ اس شہر کو مرکز بنا کر تعلیمی اصلاح و ترقی کی ایک نئی تحریک شروع کرے۔ اس نے دہلی کا انتخاب اس وجہ سے نہیں کیا تھا کہ یہ ہندستان کا سیاسی دارالحکومت ہے بلکہ اس لئے کہ یہ ساڑھے چھ سو سال تک ملک کا تہذیبی اور علمی دارالحکومت رہ چکا ہے اور اس کی آب و ہوا میں علم پروری کی تاثیر ہے۔ اس نے یہ قدم حکومت کی سرپرستی کی اُمید پہ نہیں اُٹھایا تھا بلکہ اہل دہلی کی مدد اور بھروسہ پہ۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ حُسن ظن حق بجانب ثابت ہوا۔ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کی تحریک دہلی کے آغوشِ محبت میں پرورش پا کر پروان چڑھی۔

جامعہ کی سلور جوبلی کے موقعہ پہ میں یہ چاہتا تھا کہ نئے کاموں کیلئے سرمایہ جمع کرنے کی جد و جہد دہلی سے شروع ہو لیکن ہمدردان بمبئی کا اصرار تھا کہ اپریل سے جون تک کا زمانہ بمبئی میں کام کرنے کیلئے زیادہ مناسب ہے اسلئے مجبوراً وہیں سے ابتدا کی گئی۔ اہل بمبئی نے میری توقع سے زیادہ دریا دلی دکھائی اس کے عطیات کی میزان سوا دو لاکھ تک پہنچ گئی ہے۔ اور ابھی اور بڑھ رہی ہے۔ بمبئی کے کام سے فراغت پاتے ہی دہلی آ گیا ہوں اور اب یہاں کی مہم شروع کر رہا ہوں۔

جامعہ نے جوبلی کے موقعہ پر کئی منصوبے باندھے ہیں اور ان کو شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ مثلاً ارادہ ہے کہ علوم اسلامی کا ایک تحقیقاتی ادارہ "بیت الحکمت" کے نام سے قائم کیا جائے۔ ایک کتب خانہ کا قیام عمل میں آئے جس میں اسلام اور ہندستان سے متعلق تمام ضروری کتب کا ذخیرہ ہو۔ اعلیٰ پیمانہ پہ ایک صنعتی مدرسہ کا کام شروع کیا جائے اور ایک لڑکیوں کے مدرسے کی بنا ڈالی جائے۔ ان نئے اداروں کی عمارت کے علاوہ جامعہ کی نو آبادی کیلئے ایک جامع مسجد کی تعمیر نیز ایک شفاخانہ کا قیام از بس ضروری ہے۔ ان سب کاموں کیلئے اہل ملک سے دس لاکھ کی اپیل کی ہے بمبئی والوں نے تقریباً ڈھائی لاکھ دئیے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ دہلی والے بھی اپنا حق ادا کریں گے۔

(ڈاکٹر) ذاکر حسین

شیخ الجامعہ

۲۵-۷-۳۰

کو داغ دار بنانا نہیں چاہتا۔"

سعیدہ اس گفتگو سے بہت جُز بُز ہوئی۔ جیسے اُس پر سعید کی محبت کے فریب کا راز کھل گیا ہے۔ وہ غصہ سے تلملا اُٹھی اور بولی۔

"توبہ! آئے تم حقیقت کے انکشاف پر اعتراف کرنا۔ تم کسی سٹیج پر اداکاری میں مصروف نہیں ہو۔ جو واقعیت کے خلاف سوچے سمجھے بغیر کہے جا رہے ہو۔ میں نے تمہارے سامنے اپنی زندگی اور موت کا سوال پیش کیا ہے میں آج اس کا آخری فیصلہ چاہتی ہوں۔ یہ تو ثابت ہو گیا کہ تم مجھ سے شادی کرنے پر بالکل آمادہ نہ تھے شادی جو ہمارے دائمی قرب کا واحد ذریعہ تھی۔ اس لئے کہ ایک مفلس گھر کی لڑکی سے شادی کر کے خاندان کی ناک کٹ جاتی۔ تم وراثت سے عاق کر دئیے جاتے۔ جائداد سے محروم رہ جاتے۔ اقران و امثال میں سُبکی ہوتی۔ جیسے میں بازاری عورت ہوں۔ کوئی عصمت فروش طوائف ہوں۔ ——— کیوں ٹھیک ہے نا؟ اب میرے سامنے اپنی لچر اور پوچ مصلحتوں پر محبت کی پاکیزگی اور اسکی فلسفیانہ توجیہات پیش کر کے پردہ ڈال رہے ہو۔ تم نے سعید! عورت کی فطرت کا مطالعہ نہیں کیا۔ عورت محبت کرنا جانتی ہے وہ اس میں کسی فریب کو گوارا نہیں کرتی۔ وہ اپنے اندر دو امتیازی اوصاف ضرور رکھتی ہے جنہیں اپنے عمل سے ظاہر کرتے ہوئے نہیں جھجکتی۔ یہ اوصاف کیا ہیں؟ اعتماد اور ایثار ——— اور یہی محبت کرنے والی عورت کا زیورِ حسن ہیں ——— باقی رہا محبت اور غایت محبت، تم اس کی حقیقت سے بے بہرہ ہو۔ سنو! محبت ملاقاتوں کے تواتر سے پیدا ہوتی ہے۔ کسی اچھی چیز کے حصول کو عقل معلوم ہو حاصل کرنے میں جو کشمکش پیدا ہوتی ہے اُسے محبت کہتے ہیں۔ قلبی اشتراک جو انسان کے اپنے بس کی بات نہیں، جب پیدا ہو جاتا ہے اور ہم کسی سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ مگر کچھ دیر بعد ہم پر معاشرتی اور سماجی پابندیاں عائد کر دی جاتی ہیں۔ مزید ملاقاتوں کا تواتر ٹوٹ جاتا ہے۔ جو ہمیں سخت ناگوار گذرتا ہے۔ ایسی حالت میں محبت کی غایت و منشا یہ ہوتی ہے کہ ملاقاتوں کا وہی سلسلہ پھر شروع ہو جائے۔ بلکہ وہ ہستی جسے ہم چاہتے ہیں ہمیشہ ہماری نگاہوں کے سامنے رہے۔ سائے کی طرح ساتھ رہے۔ کوئی لمحہ اس کے دیکھے بغیر نہ گذرے اگر یہ آرزو پوری ہو جائے تو ہم کامیاب محبت ہیں۔ ورنہ خلش میں اضافہ ہو جاتا ہے اضطراب و بیقراری بڑھتی ہے۔ یہاں سے عشق کی سرحد شروع ہوتی ہے اور پھر جب آئندہ ملنے کی تمام توقعات ختم ہو جاتی ہیں تو عشق کا جلال شروع ہوتا ہے جو ماہ و تو کے امتیاز کو اُٹھا کر ہمیں وحشت و جنون کی سرحد پر لا کھڑا کرتا ہے ایسی حالت میں ذلت و رسوائی کا خیال نہیں رہتا۔ محبوب کی یاد پرستش کے درجے تک پہنچ جاتی ہے۔ اسی کا نتیجہ سب سے کہتے پھرتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ جیسے بھی ہو ہم محبوب کو حاصل کر لیں۔ گویا عشق و محبت میں محبوب کا وصل ہی اصل مدعا ہوتا ہے۔ تمہارے اس خیال کو میں کیونکر باور کر لوں کہ محبوبہ کو رفیقۂ حیات بنانے کے بعد محبت ختم ہو جاتی ہے ——— یہ غلط ہے۔"

سعید نے اُسی انداز میں جواب دیا۔

"محبت ——— جب تک اُسے نفسانی خواہش سے مبرا نہ کیا جائے پاکیزہ نہیں رہ سکتی۔ محبت کی غایت وصال ہے۔ مان لیا ایسا ہی ہے لیکن میں یہ پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وصال سے تمہارا مطلب کیا ہے؟ وصال کو محض قرب کہنا میرے خیال میں ٹھیک نہیں۔ اکثر محبوب کے پاس ہوتے ہوئے بھی طبیعت بے چین رہ سکتی ہے۔ اور وصال کا مطلب حصولِ دیدار بھی نہیں ہو سکتا۔ اگر ایسا ہو تو ہم محبوب کی تصویر سے خود کو تسکین دے سکتے ہیں۔ وصال تو محض ایک نفسانی جذبہ ہے۔ گویا محبت تمہاری نفسانی خواہش پر ایک چادر ہے ———"

سعیدہ نے بے چین اور مایوس مگر منتقمانہ انداز میں کہا:۔

"تم جو کچھ بھی کہہ رہے ہو دلی واردات کے خلاف اور واقعیت و حقیقت کے بالکل برعکس۔ تم اپنی ریاکاری پر پردہ ڈال کر اپنے زہد و تقویٰ کی وکالت کر رہے ہو۔ تمہیں اگر سچی محبت کا دعویٰ ہے اور تم محبت کی غایت و مقصد کو خوب پہچانتے ہو تو کیوں نہیں مجنوں کی طرح کسی بیابان کے ذرّوں کی تشنگی بجھانے کے لئے اپنے پاؤں کے آبلوں کی سبیلیں لگاتے پھرتے۔ کائنات اپنے دامن میں سینکڑوں جنون پرور بیابان رکھتی ہے۔ جس میں ہزاروں جنون پیشہ دیوانے آباد ہیں۔ اگر تم ان کی آبادی میں اضافہ کر دو گے تو اس فعل سے موجودہ تمدنی دُنیا کو کوئی نقصان نہ ہو گا۔ لیلےٰ مرے یا جئے مجنوں کو اپنے جنون سے مطلب ہے۔"

سعید نے جھنجلا کر جواب دیا۔

"خیر تم مجھ سے ایسی توقع نہ رکھو۔ میں محبت کو عقل کی متابعت میں رکھنے کا قائل ہوں۔ محبت آدمی کو دیوانہ نہیں بنایا کرتی۔"

سعیدہ بولی

"ممکن ہے یہ صحیح ہو۔ لیکن تمہاری آج کی باتوں سے یہ معلوم ہو گیا تمہیں مجھ سے محبت نہ تھی۔ تمہارے سب مواعید ایسے عالیشان محل تھے جن کی بنیاد بہتے ہوئے پانی پر رکھی گئی تھی۔"

یہاں تک کہہ چکنے کے بعد جو کچھ سعیدہ نے کہا سعید کا نوں تک۔

تی تھی۔ شاید وہ رو رہی تھی۔ چند لمحہ سکوت کے بعد سعیدہ کی آواز
ند ہوئی، وہ کہہ رہی تھی:
"آہ! بیکس پرند کو خدا نے جب بال و پر عطا کئے تو اس نے آشیانہ
تعمیر کرنے کے لئے تنکا تنکا اکٹھا کیا۔ جب آشیانہ مکمل ہوگیا تو وہ شاخ ہی
ٹ گئی جس پر آشیانے کی بنیاد رکھی گئی تھی ؎

وہ شاخ ہی نہ رہی جس پہ آشیانہ تھا

جاڑوں کی کپکپا دینے والی سردیوں سے بچنے کیلئے میں نے آگ روشن کی
مجھے علم نہ تھا کہ یہی آگ مجھے جلا کر راکھ کر دیگی۔ یہی آگ میری چتا
ن جائے گی۔"

(۴)

اس کے بعد دیر تک سسکیوں کی آواز میرے کانوں میں آتی رہی۔
میں نے ڈائری کو بند کیا اور ارادہ کر لیا کہ اوپر پہنچ کر سعیدہ کو سمجھاؤں
کہ وہ ایک نوجوان لڑکی کے مخلصانہ جذبات کا احترام کرے۔ کہیں ایسا نہ ہو
وہ اسکی محبت سے مایوس ہوکر خودکشی کرلے۔ سعیدہ بالکل مغلوب الجذبات
تھی۔ وہ اپنے ارادے میں آزاد ہوتی جا رہی تھی ایسے موقعہ پر انسانی زندگی کے
تحفظ وبقا اور فرائض کا احساس کرتے ہوئے میرا خیال تھا کہ میں سعیدہ کو مجبور
کروں کہ وہ سعیدہ کو خودکشی ایسے مذموم فعل سے باز رکھے اور مناکحت کے
ذریعے اسے اپنی پناہ میں لے۔ میں یہ سوچ کر اوپر پہنچا، مگر وہاں کچھ نہ تھا۔ میں
نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مجھے کہیں کوئی انسانی سایہ نظر نہ آیا۔ شاید وہ
ہمیشہ کیلئے ایک دوسرے سے جدا ہو چکے تھے۔ وہ چلے گئے۔ رات بھیگ چکی تھی
پھر وہاں سے سیدھا اپنے مستقر پر پہنچا۔ اور بستر پر دراز ہوکر دیر تک
اس رومان پر غور کرتا رہا۔ کشمیر کی فرحت بخش فضاؤں میں کتنے رومان دفن
ہیں؟ یہ کوئی نہیں جانتا — عطر آگیں ہواؤں میں کتنی آہیں جذب ہیں!
یہ کسی کو معلوم نہیں۔ شالامار کے سبزۂ زمردیں پر کتنے آنسو شبنم کی طرح
ڈھلک رہے ہیں؟ اس راز سے کوئی واقف نہیں۔ یہ تھی کشمیر میں میری
پہلی شام۔ جو سعیدہ کے لئے "شامِ تمنا" ثابت ہوئی اور میرے
لئے درسِ عبرت!

اس کے بعد میں کبھی شالامار باغ میں شام کو نہیں گیا۔ مبادا
کوئی دوسرا رومان خود میری "شامِ تمنا" بن جائے۔

رقصِ حیات

(از جناب سعید احمد ملک)

دُور اس محفلِ ہستی سے بھی دُور
چند بوسیدہ سے میناروں کی شان
اور
شاہانِ سلف کی شوکت
کسی بڑھیا کے جنازے کی طرح
خاک کی تہ میں سمٹتی ہی چلی جاتی ہے

شعبدہ باز مری نظروں سے
یہ اُجڑتی ہوئی بستی دیکھو
جس میں چند ایک اپاہج ہیں مقیم
رات کے دھندلکے میں بوم کی منحوس صدا
جنہیں بیداری کا دیتی ہے پیام
اور یہ
خدمتِ انسانی سے بیگانہ نحیف
مفلس و بے کس و قلاش و گدا
عالمِ مدہوشی میں
اسی دنیا کے اُجڑنے کا سماں دیکھتے ہیں
اور پھر
دُور
اس محفلِ ہستی سے بھی دُور
چند بوسیدہ سے میناروں کے
آخری آثار نظر آتے ہیں

ہمارا محلّہ

(ازجناب تصدیق سہاوری)

نئے مکان میں آتے ہی محلہ والوں نے سوالات شروع کر دیئے۔

"شادی ہوئی ہے یا نہیں؟"

"کہاں کے رہنے والے ہو؟"

"کس محکمہ میں ملازم ہو؟"

"تنخواہ کیا ملتی ہے؟"

"ماں باپ زندہ ہیں؟"

ہر نئے کرایہ دار کو پہلے سوال کا جواب ذرا سوچ سمجھ کر دینا چاہیئے۔ اگر چوک ہو گئی تو مکان کے ساتھ ساتھ آپ کو ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ ہم جانتے تھے کہ محلہ والوں کو کس طرح سے رام کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ ہمارے منحنی جسم، مسکین صورت اور چال ڈھال سے ہماری شرافت کا اندازہ کر چکے تھے۔ پھر بھی ہم نے اُن کے ہر سوال کا جواب نہایت معقول دیا۔ شادی کے متعلق ہم نے عرض کیا کہ شادی تو ہو چکی مگر افسوس! بیوی ہمیشہ کیلئے داغ مفارقت دے گئی۔ ظاہر ہے کہ اس سے ہمارا مطلب ہمیں بیوی نہ ملنے کا شکوہ کرنا تھا۔ اب اگر محلہ کے سادہ لوح حضرات ہماری بیوی کو اِس جہانِ فانی سے منتقل کر دیں تو ہمارے پاس اسکا کیا علاج۔

محلہ کے بڑے بوڑھوں کو جہاں نوجوانوں کی لغزشیں ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ وہاں اُن کی شادی کی فکر بھی ستاتی رہتی ہے۔ شادی کا مسئلہ بزرگوں کی گفتگو کا اہم مسئلہ ہے۔ وہ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا جوڑ ملایا کرتے ہیں۔ اُن کی نظر میں ہمارا رنڈوا ہو جانا ہماری بدنصیبی کی علامت تھی۔ اور ہر بدنصیب شخص قریباً شریف ہوتا ہے۔ اور شریف آدمی کو محلہ میں رہنے کی اجازت ہے۔

ہمارے محلے میں متوسط طبقہ کے لوگ تھے۔ کارخانوں میں کام کرنے والے یا دفتروں کے بابو۔ ان میں بے فکرے بھی تھے۔ لاابالی بھی تھے۔ پڑھے لکھے بھی تھے اور جاہل بھی تھے۔ دن کو اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے تھے۔ رات کو تاش شطرنج ہوتی یا کبڈی کھیلی جاتی۔ ایک طرف مسجد تھی اور ایک طرف مندر۔ مسجد کے قریب مسلمانوں کی آبادی زیادہ تھی اور مندر کے پاس ہندوؤں کی اکثریت تھی۔

ایک شخص [illegible] ہے [illegible] سے [illegible] ہمارے محلہ میں ہیگل ہی سمجھا جاتا ہے۔ کوئی شخص اپنے محلہ میں کوئی خطا نہیں بخش سکتا۔ دوسرے محلہ کا شیطان اپنے محلہ کا فرشتہ ہوتا ہے۔

ہمارے محلہ میں ایک ریٹائرڈ تحصیلدار صاحب نے مکان بنایا تھا۔ جب سے وہ محلے میں آئے تھے مسجد کے قریب والی بستی میں جان سی پڑ گئی تھی۔ مسجد میں بھی نئے لوٹے نظر آتے تھے۔ دریاں بھی نئی تھیں۔ چندہ کی فراہمی کی بھی کوشش شروع ہو گئی تھی۔ تحصیلدار صاحب بہت بزرگ صورت تھے۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھتے، تسبیح کا بھی دور رہتا۔ دیکھا گیا ہے کہ سرکاری خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد انسان خدا کی خدمت کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ تحصیلدار صاحب کی نشست گاہ جمیع مسلمانانِ محلہ کیلئے پبلک ہال کا کام دیتی تھی۔

ہمارے محلے میں ہندو مسلمانوں کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے۔ ہندو اپنے مسلمان دوستوں کے لئے متھرا سے پیڑے لاتے اور مسلمان اُن کے لئے اجمیر سے تبرک لاتے تھے۔ آپس میں عورتوں کا خانگی لین دین یعنی آٹا، چاول، دال وغیرہ اُدھار سدھے پر چلتا تھا۔

ہم نے اپنے محلہ کے نوجوانوں کو جنہیں پارکوں اور سنیماؤں میں صنفِ نازک پر آوازے کستے سنا تھا اور سڑکوں پر عورتوں کے تانگے کے پیچھے سائیکل دوڑاتے دیکھا تھا۔ اپنے محلہ میں قطعی سعادت مندانہ طریقہ پر گردن جھکائے پایا۔ دو ایک خفیہ وارداتیں مستثنیات میں آ جاتی ہیں اور یہ صرف اس لئے کہ جوانی بہت سرکش ہوتی ہے۔ ان نوجوانوں میں تحصیلدار صاحب کے بڑے صاحبزادے اچھن میاں ذرا دو جوتے آگے تھے۔ صبح کو محلے کے نکڑ پر لڑکیوں کو سکول کے راستے میں اکثر گھورتے پائے گئے۔ اور جب ہم نے اچانک سوال کیا کہ میاں یہاں کیا کرتے ہو؟" تو ہمیشہ آئیں بائیں شائیں کے سوائے کوئی جواب نہ دے سکے۔

ہم ان اچھن میاں سے جلد ہی واقف ہو گئے۔ بات یہ ہوئی کہ آپ کبوتر بازی میں طاق تھے۔ پرلے ہے کہ کبوتر بہک کر دوسرے لوگوں کی منڈیر یا دیوار پہ بیٹھے گا۔ آپ کا کبوتر اکثر دوسرے گھروں میں بسیرا لیتا اور آپ ہمیشہ اُس کی تلاش میں سرگرداں نظر آتے۔ ایسا ہی ایک حادثہ ہماری ملاقات کا باعث ہوا۔ ہم نے اندازہ کیا کہ ان کی عمر بائیس سال سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ مزید تحقیق کرنے پر پتہ چلا کہ تعلیم انگریزی کی تیسری کتاب تک ہے۔ مگر ٹائی اور پتلون قطعی جدید فیشن کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ اور اس کے علاوہ بھی بہت سی خوبیاں ہیں۔ محلے میں ہمارے ایسے ہی یار تھے — اور وہ تھے اچھن میاں — ان سے

نصیبے جو ہفتہ ملاقات ہوتی تھی۔ جب ملاقات ہوتی تھی تو باتیں کرنے کا حصہ ان کا ہوتا تھا اور سننے کا ہمارا۔ کبوتروں سے سلسلہ شروع ہوتا۔ پتنگ، مرغ، بٹیر، کشتی، بنوٹ سے ہوتے ہوئے بازی پر سے منتقل ہوتا ہوا عشق و محبت کی داستان پر ختم ہو جاتا۔ کبھی دن اچھن میاں کسی عشقیہ افسانہ کو المیہ بنا دیتے اور کسی دن طربیہ۔ طربیہ کے بعد وہ مسکراتے تھے اور المیہ کے بعد ٹھنڈی ٹھنڈی سانسیں اور چند آہیں کھینچتے اور پھر یہ مصرعہ گنگناتے ؎

کس سر کا ڈھیری بے زبانی دیکھتے جاؤ

ہمارے محلے کے مندر میں کتھا ہوئی۔ رنگ برنگ کی جھنڈیاں لگائی گئیں۔ غرضکہ کئی دن تک خوب چہل پہل رہی۔ ایک دن ہم نے سنا کر مسجد میں وعظ ہو رہا ہے۔ جب ہم اپنے گھر کے صحن میں چاروں خانے چت پڑے رمی کو برا بھلا کہہ رہے تھے تو ہم نے سنا کہ "دین خطرے میں ہے۔" صبح کو اچھن میاں ہمارے نکلنے سے پیشتر ہی آ گئے اور بولے۔

"سنا صاحب رات کا وعظ؟"

"ہاں سنا۔"

"کیا سنا؟"

"خطرہ دین میں ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یہی ——— دین خطرہ میں ہے۔"

اس کے بعد اسلام کی زبوں حالی کا ذکر شروع کر دیا اور ہوتے ہوتے محلے کی ایک لڑکی کے حسن کی تعریف پر تان ٹوٹی۔

"بہت خوبصورت ہے شوبھا!" اچھن میاں نے فرمایا۔

"کون شوبھا؟" ہم نے پوچھا۔

"وہ پتلی پتلی ناگن سی لڑکی۔"

"کون سی لڑکی؟"

"ابے بھئی وہی لڑکی جو صبح کو کالج جاتی ہے ——— کس قدر لچک ہے ظالم کی کمر میں۔ آنکھوں میں جادو ہے۔ ہونٹوں میں شہد ہے ——— ہائے بہت خوبصورت ہے وہ ظالم ———" ہمیں جھنجوڑ کر کہا۔

"ہم نے تو دیکھی نہیں۔ کیسے کہدیں کہ خوبصورت ہے!"

"کل دکھا دوں گا۔ اگر دیکھتے ہی زبان نہ چاٹنے لگو تو میرا ذمہ!"

"نہیں بھیا ——— میں نہ دیکھوں گا۔"

"اہم ——— واہ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔"

شہر میں میونسپلٹی کے انتخابات کا زور بندھا۔ ہمارے محلے سے تحصیلدار صاحب کھڑے ہوئے۔ قوم کی خدمت کرتے کرتے پنشن لی تھی، قوم ہی کی خدمت کرتے کرتے زندگی ختم کرنا چاہتے تھے۔ تاکہ دین و دنیا دونوں میں سرخرو ہوں۔ تحصیلدار صاحب کے کھڑے ہوتے ہی اُن کی نشست گاہ کے مجمع میں بھی اضافہ ہو گیا۔ ملک کی سیاست پر روشنی بھی ڈالی جاتی اور کامیابی کیلئے دعائیں بھی مانگی جاتیں۔ اب محلے میں جلسے بھی ہونے لگے تھے۔ گاندھی جی کی جے اور قائد اعظم زندہ باد کے نعرے بھی سنائی دیتے تھے۔ ہمارے محلے میں ان دنوں ہر شخص چوکنا سا نظر آتا۔

ایک دن ہم نے اچھن میاں کو دیکھا کہ آسمان کو کھڑے تاک رہے ہیں جیسے علم نجوم کا کوئی بڑا مسئلہ حل کر رہے ہوں۔

"اجی حضرت!"

"ہونہہ ——— ذرا ٹھہرو۔"

"یہ کیا ہو رہا ہے؟"

"کبوتر کا اڑان دیکھ رہا ہوں۔ صبح سے اڑ رہا ہے کہیں ہٹ نہ جائے نیا پٹھا ہے نا۔"

"کبوتری دکھاؤ۔ اتر آئے گا۔" ہم نے مشورہ دیا۔

"کبوتری صبح سے چھتری پر بیٹھی ہے۔"

اور پھر اچھن میاں ہمارے ساتھ چل دیئے۔ ہم نے پوچھا "تحصیلدار صاحب ممبری کیلئے کھڑے ہو گئے۔"

"انہیں تو ایسی ہی سوجھتی ہے۔ آج کل ممبری کی چڑھائی ہے۔"

"یہ تو ملک و قوم کی خدمت ہے۔"

"خواہ مخواہ دردِ سر مول لیتے ہیں۔"

"کیوں؟" ہم نے سوال کیا۔

"یہ تو سرپھروں کا کام ہے۔ بڑھاپا آ گیا۔ بیٹھ کے اللہ اللہ کریں۔"

"ہوں ——— ٹھیک کہتے ہو اچھن میاں ——— مگر ———"

"مگر کچھ نہیں ———" انہوں نے بات کاٹ کر کہا۔ "آج کی نئی بات سنو! شوبھا صبح کالج جا رہی تھی۔ میں نے بڑی ہمت کی۔ ایک کنکری کھینچ کر ماری۔ بس کنکری لگتے ہی ظالم نے کیسی تیکھی چتونوں سے دیکھا کہ یاروں کے کلیجے پر چھری چل گئی ؎

کیا چیز تھی، کیا چیز ہے ظالم کی نظر بھی"

"پھر اب کیا خیال ہے؟" ہم نے پوچھا۔

"اب خیال کیا ہے۔ اُنگلی پکڑتے پکڑتے کلائی بھی پکڑلی جائے گی۔"

"محلّہ میں ایسی بات تو ٹھیک نہیں۔"

"ارے چھوڑو یار ــــــ"

"میرا خیال ہے ــــ" ہم نے مُنہ بنا کر کہا۔

"تم تو دُھونی رما کر بیٹھ جاؤ ــــ تمہیں کیا معلوم۔"

"شاید ــــ محلّہ میں آج تک ایسی بات نہ ہوئی ہوگی۔"

"واہ! کل ہی کی بات ہے۔ نظیر نے ایک لڑکی کو خط بھیجا ہے۔"

"نظیر کون؟"

"تار بابو کا لڑکا۔"

"ہاں تو تحصیلدار صاحب آج کل میری ــــــ"

"پھر وہی نا" اچھن میاں بول اُٹھے۔ "واللہ شوبھا کو دیکھو تو سب کچھ بھول جاؤ ــــ جنّت کی حُور ہے حُور! مجھے دیکھتے ہی چہرہ کا رنگ گلابی ہو جاتا ہے بس قیامت ہی تو آجاتی ہے اُس وقت ــــ اب تو راتوں کو کئی کئی دفعہ خواب میں اُسے دیکھتا ہوں۔"

"کہیں مجنوں نہ بن جانا۔" ہماری ہنسی نکل گئی۔

"مجنوں ــــ اب مجنوں سے کیا کم ہوں۔ اس کی ایک نگاہ غلط انداز پہ جان و دل صدقہ کر سکتا ہوں (متاثر ہو کر) کاش! شوبھا ایک دفعہ پیار بھری نظروں سے دیکھ لے۔ قسم ہے شوبھا کے حسن کی۔ ساری دُنیا اس پہ سے نچھاور کردوں۔"

"مگر وہ تو ہندو ہے جناب!" ہم نے کہا۔

"واہ یہ کیا بات ہوئی۔ کتنی حماقت کی بات ہے۔ عشق میں کیا مذہب و ذہب۔"

"خالی عشق کیا۔ جب عشق کامیاب ہو گیا تو پھر کیا کروگے؟"

"کامیاب ــــ ہائے کامیابی کہاں ــــ اس کا دل تو پتھر کا ہے (اعتماد کے ساتھ) ہم بھی سچ کہتے ہیں کہ جان دیدینگے ورنہ شوبھا کے رُخ روشن سے اپنے دل کے سیہ خانہ کو روشن کر کے رہیں گے۔"

"اچھن میاں تم تو شاعر بھی ہو!"

"ہاں یار ایک دفعہ اور عشق ہو گیا تھا۔ اُس وقت فرقت کی گھڑیاں کاٹنے کیلئے شاعری شروع کی تھی۔ ایک اُستاد بھی بنائے تھے۔"

"اب شعر نہیں کہتے؟" ہم نے پوچھا۔

"اب ذرا شعر ٹھیک نہیں بنتے۔ اگر شوبھا کا عشق ترقی کر گیا تو پھر کسی کو اُستاد بنانا پڑے گا۔"

"ہم ہی جو حاضر ہیں۔"

"تم شعر کہہ لیتے ہو۔"

"اجی شعر میں کیا ہے۔ شعر ہر شخص گڑھ سکتا ہے۔"

"تو پھر ٹھیک ہے۔ کل میرے اُستاد بن جانا۔ پاؤ بھر پیڑے کافی ہونگے؟" اچھن میاں نے ہم سے پوچھا۔

"نہیں صاحب! سوا سیر پیڑے اور سوا روپیہ فاتحہ کے لئے۔"

"منظور ہے۔"

اچھن میاں سے کئی روز تک ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک دن ہم جو رات کو محلّہ میں داخل ہوئے تو چار چار چھ چھ کی ٹولیاں کھڑی کھُسر پھُسر کر رہی تھیں۔

ہم نے ایک صاحب سے پوچھا "کیا بات ہوئی؟"

"کچھ بھی نہیں۔" "کچھ تو ضرور ہوا؟"

"کیا بتائیں ــــ اچھن میاں پہ بے وجہ تہمت لگاتے ہیں۔ کتنا سیدھا لڑکا ہے ــــ" "کیا ہوا؟"

"وہ شوبھا جو ڈاک بابو کی لڑکی ہے وہ کہتی ہے کہ اچھن میاں نے اس کی کلائی پکڑلی۔"

ہم اپنے گھر چلے آئے۔ صبح کو جب تحصیلدار صاحب کے مکان کے قریب سے گذرے تو ایک مجمع کو کھڑا پایا۔ اور جب مندر کے قریب پہنچے تو ایک گروہ کو چیختے سنا۔ ہم سُنتے چلے گئے۔ حسبِ حال رات کو گلیوں کے مختصر راستے طے کرتے ہوئے ہم اپنے محلّہ میں واپس گئے تو ایک سپاہی زادے نے ہماری گدّی پکڑلی۔

"کدھر جاتا ہے منے!"

"کیوں؟" ہم نے اکڑ کر کہا۔

"دیکھتا نہیں بلوہ ہوگیا!"

"کہاں؟" ہم نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا۔

"بس محلّہ میں، جہاں تو جا رہا ہے۔" سپاہی زادے نے فرمایا!

"اجی جھوٹ کیوں کہتے ہو یار۔ یہ محلّہ تو بڑا اچھا ہے۔"

"اچھا بک بک مت کر۔ بھاگنا ہے تو بھاگ جا۔ ورنہ بھیج دونگا حوالات میں۔"

داروغہ جی نے ہمیں دھکا دیکر گلی سے باہر نکال دیا۔

اب ہمارے محلّہ میں اکثر بلوہ ہوجاتا ہے!

ہم کسی دوسرے محلّے میں مکان لیں گے!!

روٹی

(از جناب عزیز اثری)

وہ روٹی کھاتے کھاتے دفعتاً چونک پڑا۔ کیونکہ ڈھنڈورہ پیٹنے والے ڈھول کی چوٹیں متواتر اسکے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ پھر "سُنئے جناب والا! کیا کہتا ہے منادی والا"۔ اور اُس نے مُڑکر منادی والے کے سیاہ چہرے کو گھورا اور اُس کے دونوں ہاتھوں میں اشتہارات کا پلندہ سا دیکھکر اعلان سُننے لگا۔ "آج شام کو سات بجے ڈپٹی کمشنر صاحب بہادر کے حکم کے مطابق وار فنڈ کے سلسلے میں شوکت ہال میں ایک بے نظیر ناچ ہوگا۔ تمام شہر والوں کو اپنی اپنی دکانیں اور کاروبار بند کرکے وہاں پہنچ جانا چاہیئے۔ شرح ٹکٹ دس روپے آٹھ آنے۔ پانچ روپے اور تین روپے ہے۔ شراب پی کر آنے والا اور دنگا فساد کرنے والا حوالۂ پولیس کیا جائیگا"۔ اور پھر ڈھول پر چوٹ پڑی۔ اور اعلان کرنے والا آگے بڑھتے بڑھتے ایک اشتہار اُس کے سامنے ہوٹل کی جھولتی ہوئی کھانے کی میز پر پھینک گیا۔

اُس نے نوالہ توڑنے سے پہلے اشتہار پر نظر ڈالی۔ پنجاب کی مشہور رقاصہ انوری کا زندہ ناچ۔ جنگی امداد کیلئے اور اُس نے سب سے نچلے درجے کی شرح ٹکٹ کو غور سے پڑھا۔ تین روپے۔ اور پھر اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں پانچ روپے کے تہہ کئے ہوئے نوٹ کا خیال کرکے تھوڑا سا مُسکرا دیا۔

اُسے ملازمت کے سلسلہ میں اس معمولی سے شہر میں آئے ہوئے آج دسواں روز تھا۔ جب سے وہ یہاں آیا تھا ہر روز صبح شام اسی ہوٹل میں کھانا کھاتا تھا۔ تین دن تک اُسے وہاں سے اُدھار روٹی کھانا پڑی۔ اور آج ایک جگہ سے پانچ روپے حاصل کر لینے کے بعد اُس نے ارادہ کرلیا تھا کہ کھانے کا تمام پچھلا حساب بے باق کریگا۔ اُس نے سوچا کہ تین دن کے کھانے کے دام دو روپے بنتے ہیں۔ اس طرح تین روپے وہ آسانی سے ناچ پر صرف کرسکتا ہے۔ اس نے اپنا تمام بچپن اور جوانی کی عمر کا ابتدائی حصّہ لاہور جیسے بارونق اور ہزاروں قسم کی دلچسپیاں لیئے ہوئے شہر میں بسر کیا تھا۔ وہاں وہ ہر وقت سینما، ناچ، تھیٹر اور کئی مختلف تفریحات سے لُطف اندوز ہوتا رہتا تھا۔ اور اُسکی طبیعت میں یہ مشاغل اور تفریحیں اس قدر رچ گئی تھیں کہ اُن کے بغیر اُسے اپنی زندگی نہ صرف پھیکی بلکہ بے سُود محسوس ہوتی تھی۔ اور اس قصبہ نما شہر میں آکر تو وہ یوں سمجھنے لگا تھا جیسے اُسے رُوحانی جنت کی خوشگوار وادیوں سے اُٹھا کر جہنم کے شعلوں میں پٹک دیا گیا ہو۔ ملازمت کے تفکرات۔ عزیزوں اور دوستوں سے بچھڑنے کا صدمہ۔ اور اس کا موجودہ اونگھتا ہوا سا ماحول اس کے دل و ذہن کو کچلے دیتا تھا۔ وقت کے آہنی سرد ہاتھ اُسکے جیتے جاگتے جذبات کا گلا گھونٹ رہے تھے۔

اُس نے ہوٹل کے غلیظ کپڑوں اور بکھرے ہوئے خشک بالوں والے چھوٹے سے ملازم لڑکے کو پانی کا گلاس لانے کے لئے آواز دی اور سوچنے لگا کہ خواہ کچھ بھی ہو وہ آج ناچ ضرور دیکھے گا۔ آخر ہر شخص کو اپنی خواہش کی تسکین ڈھونڈنے کا فطری حق حاصل ہے۔ پھر وہ کیوں اپنی اس خواہش کو دبا دے؟ اور خواہشات تو دبانے سے اور بھی اُبھرتی ہیں۔ اور اگر شدید خواہشات کو پورا نہ ہونے دیا جائے تو پھر انسان یا تو دائمی بیمار ہو جاتا ہے یا پاگل ——

وہ سوچ رہا تھا کہ مذہب —— قانون اور نظام وقت نے انسان کو اپنی خواہشوں کی تکمیل کیلئے روک کیوں رکھا ہے؟ سینما نہ جاؤ —— ناچ نہ دیکھو —— گانا نہ سُنو —— زندہ نہ رہو —— دل، جسم، ذہن سب کو آہنی بوجھل زنجیروں نے جکڑ رکھا ہے۔ غم اور دُکھ سے کراہتا ہوا انسان اگر شراب نوشی میں تسکین پاتا ہے۔ بلاتی ہی سہی۔ تو اُسے گناہ کیوں سمجھا جائے؟ اور اگر رنج اور دُکھ کی فراوانی اور معاشی مصائب سے تنگ آکر کوئی شخص خودکشی کرے تو وہ بھی گناہ۔ زندہ رہنا گناہ، مرنا گناہ —— کیوں فطرت انسان کو اُسکی اپنی زندگی اور موت کے متعلق آزادی نہیں دے دیتی؟ اُسے زندگی دیتی ہے اپنی مرضی سے۔ اسے زندگی بسر کرنے پر مجبور کرتی ہے نہایت سخت اور جابرانہ احکام کے ماتحت۔ اُسے مارتی ہے جب چاہے۔ اتنے جبر —— اتنی پابندی اور ان سب قیود کا مقصد ——؟

اُس نے میز پر دھرے ہوئے پانی کے گلاس کو اُٹھایا اور ایک ہی گھونٹ پی کر سامنے دیکھنے لگا۔ ایک لمبا تڑنگا پولیس کا سپاہی وردی پہنے مونچھوں پر تاؤ دیتا اور اپنے رُعب کے زعم میں ضرورت سے زیادہ اکڑتا ہوا ہوٹل کی طرف آرہا تھا۔ اُس نے آتے ہی اپنی سُرخ پگڑی سر سے اُتار کر ہوٹل کی لڑکھڑاتی ہوئی لمبی میز پر دھر دی۔ پھر کمر کی پیٹی کھول کر ہوٹل والے سے مخاطب ہوا —— "سنا پہلوان کیا پکا ہے آج؟" اور کسی جواب کی ضرورت محسوس کئے بغیر جلدی سے پکے ہوئے گوشت کے ایک دیگچے میں سے ایک بوٹی اُٹھا کر منہ میں ڈال لی۔ اور پھر اپنی اُنگلیاں چاٹتا ہوا اپنی میز کے سامنے پڑی ہوئی ایک کمزور سی بنچ پر بیٹھ گیا۔ ہوٹل والا بے بسی بھرے غصّے کی نظروں سے اُسے گھور کر پاس ہی چولہے کے قریب بیٹھے ہوئے غلیظ ملازم لڑکے پر برس پڑا "نمک حرام تمام دن بیکار بیٹھا رہتا ہے۔ ابھی تک [illegible]

دھوئے۔" اور بے چارہ لڑکا تھر تھر کانپنے لگا۔ اس نے لڑکے کو رحم بھری نظروں سے دیکھا۔ پھر غصے میں آئے ہوئے ہوٹل کے مالک اور سپاہی کو جو بڑی بے پروائی کے انداز میں سامنے کی دکان پر بیٹھے ہوئے حلوائی سے باتیں کرنے لگا۔ حلوائی اس سے پوچھ رہا تھا۔ "کیوں حولدار جی! یہ زندہ ناچ کس لئے ہو رہا ہے؟"

"ارے ماجھے! تم تو نرے بدھو ہو ـــ یہ بھی پتہ نہیں۔ آج تو تمہارے شہر کی قسمت جاگ اٹھی ہے کہ یہاں انوری جیسی ـــــــ" اس نے بائیں آنکھ میچ کر ہنستے ہوئے کہا۔ "رقاصہ آ رہی ہے ـــ ہاں ـــ زندہ ناچ ہوگا۔ صاحب بہادر کو دعائیں دو کہ انہوں نے وار فنڈ کیلئے یہ زندہ ناچ یہاں کرایا ہے۔"

"لیکن ـــ سنتری جی! یہ وار پھنڈ کیا ہوتا ہے"؟ نزدیک ہی بازار میں بیٹھے ہوئے ایک چمار نے ایک ٹوٹے ہوئے جوتے کی سلائی کو ختم کر کے پوچھا۔

"وار فنڈ ـــ اس کا مطلب ہے جنگ کے لئے امداد کے طور پر روپیہ ـــ" سپاہی نے جواب دیا۔

اور پھر حلوائی بولا۔ "پر میں کہتا ہوں حولدار جی! سرکار کے پاس تو خزانے بھرے پڑے ہیں پھر جنگ کیلئے یہ روپیہ کیوں اکٹھا ہو رہا ہے۔؟"

"ارے میں نے کہا تھا نا ابھی کہ تم نرے بدھو ہو ـــ تمہاری عقل دودھ کی کڑاہی میں شاید جل گئی ہے۔ بدھو! سرکار کے خزانے اسکی رعایا کیلئے ہوتے ہیں اور رعایا کی حفاظت کیلئے فوج رکھی جاتی ہے۔ دیکھا نا ابھی ہماری حفاظت کرنے والی فوجوں نے جاپانی نکٹوں کے دانت کس طرح کھٹے کر دیئے ہیں۔ یہ فوج ملک اور رعایا کی حفاظت کیلئے ہوتی ہے۔ اس لئے فوج کو رعایا اور ملک ہی کا روپیہ امداد کے طور پر ملنا چاہیئے۔ سرکار کا روپیہ نہیں ـــــــ"

اس نے اپنے سامنے پڑی ہوئی ایک روٹی کو ہاتھ لگایا۔ وہ ٹھنڈی ہو کر سوکھ چکی تھی۔ اس نے لقمہ توڑتے ہوئے سوچا کاش! وہ پڑھ لکھ کر "بابو" بننے کی بجائے ایک اجڈ اور گنوار ہی ہوتا۔ اس صورت میں وہ پولیس میں بھرتی ہو کر سپاہی بن جاتا۔ لمبی لمبی اور اکڑی ہوئی مونچھیں رکھ لیتا اور ان کو تاؤ دیتا ہوا رعب ڈالنے کی خاطر کسی نانبائی کا بے تکلفی سے گوشت نگل لیتا۔ اور نانبائی اپنا غصہ نکالنے کیلئے کسی میلے لڑکے کو جھڑکنے اور گالیاں دینے لگتا۔ لیکن وہ بڑے مزے اور پر رعب انداز سے حلوائی اور دوسرے دکانداروں پر اہم سیاسی انکشاف کیا کرتا "وار فنڈ ـــ جنگی امداد کیلئے روپے کی فراہمی کو کہتے ہیں۔ کیونکہ فوجیں رعایا کی خاطر اسکی بہتری اور حفاظت کیلئے لڑتی ہیں۔ اس لئے رعایا ہی کا روپیہ انہیں ملنا چاہیئے، نہ کہ سرکار کا۔" اور وہ سوچنے لگا کہ شاید رعایا کو فوجوں کو اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ بادشاہوں کو۔ رعایا کو صرف ـــ آسودگی ـــ امن اور روٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ کھیل اور فرق سلطنت کی نہیں ـــــ

اور اب اسے محسوس ہوا جیسے اسکی بھوک بالکل نام سے ڈال گئی ہے۔ بھنے ہوئے گوشت اور سوکھی ہوئی روٹی کو دیکھ کر آہستہ آہستہ غائب ہو گئی ہے۔ اور ایک سرد آہ اس کے حلق میں سے رینگ کر ہوٹل کی کثیف فضا میں پھیل گئی۔ اس نے ہوٹل والے کی آواز کو سنا جو دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے نوجوں کو بلا کر کہہ رہا تھا۔ "گرامیں! روٹی کھاؤ گے؟ چائے پیو گے؟ یہ بڑا عمدہ ہوٹل ہے آؤ ـــ آؤ ـــ بیٹھو۔" اور سپاہی اور حلوائی میں ابھی تک باتیں ہو رہی تھیں۔ ہوٹل کے پہلو میں دکان پر بیٹھے ہوئے ایک بوڑھے پنساری نے حقے کا کش لے کر دھواں منہ سے چھوڑنے کے بعد کہا۔ "بابا ـــ یہ سب مایا کے کھیل ہیں ـــ یہ ناچ۔ گانے۔ سنیما سب کچھ مایا کے کھیل ہیں ـــ مایا کے کھیل ـــــ"

اور وہ سوچنے لگا کہ بوڑھے نے کتنی سچی بات کہی ہے۔ "دنیا میں سب لوگ دولت کے کھلونے سے کھیل رہے ہیں ـــ گول گول کھلونوں سے ـــ مایا ـــ دولت ـــ روپیہ ـــ گول گول چاندی کا روپیہ ـــ ساری دنیا اسی کے گرد گھومتی ہے۔ روپیہ بھی گول ہے۔ زمین بھی گول اور روٹی بھی گول ہے۔ گول زمین سورج کے گرد نہیں، روٹی کے گرد گھومتی ہے۔ اور اس کا خیال دنیا کی موجودہ عالمگیر جنگ کی طرف دوڑ گیا۔ یہ سب بڑے بڑے ڈکٹیٹر۔ صدر۔ بادشاہ گول زمین ہی کے گرد چکر کاٹ رہے ہیں۔ ہٹلر۔ سٹالن۔ روزویلٹ و دیگر ملکوں کے حکمراں اور ان کے تباہ کن آلات۔ بحری۔ ہوائی جہاز۔ ٹینک۔ ایٹم بم سب گدھوں کی طرح ملکوں یعنی زمین کے گرد منڈلا رہے ہیں۔ گھوم رہے ہیں۔ اس گول زمین کے گرد جو گول روٹی کے گرد گھومتی ہے۔ اور روٹی جو بڑی تیزی سے گول روپے کے گرد چکر کاٹ رہی ہے ـــــــ!

اس نے جلدی جلدی دو ایک نوالے منہ میں ڈالے اور باقی سوکھی ہوئی روٹی کو چھوڑ ہوٹل والے کا حساب چکا کر یوں کھنکارتا ہوا باہر نکلا جیسے روٹی اسکے پیٹ میں جانے کی بجائے گلے ہی میں اٹک کر رہ گئی ہو۔ باہر نکلتے ہی ایک بوڑھی بھکارن نہایت غلیظ دامن پھیلائے اس کے خیر مقدم کو بڑھی۔ لیکن اس وقت اس کے پاس صرف تین روپے رہ گئے تھے۔ جو اس نے ناچ کیلئے محفوظ کر رکھے تھے۔ وہ ابھی ان روپوں کے متعلق کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ سپاہی کی آواز اس کے کانوں میں آئی۔ جو بھکارن سے کہہ رہا تھا۔ "اری! جوانی میں تو معلوم نہیں کس کس شہر میں خیرات کرتی رہی ہے۔ اب بوڑھی ہو کر ہم سے خیرات مانگنے آ گئی ہے۔ اگر ہم سے بھیک ہی مانگنا تھا تو جوانی میں آئی ہوتی۔" اور بھکارن چپکے سے وہاں سے چل کر آگے بازار کی طرف بڑھ گئی۔ اور سپاہی۔ حلوائی اور نانبائی کا مشترکہ قہقہہ دیر تک اس کا تعاقب کرتا رہا۔

تمام تک وہ ناچ دیکھنے کی خوشی ہی سے اپنے آپ کو بہلاتا رہا۔ اور
سے ایک گھنٹہ پہلے وہ شوکت ہال کی طرف ہولیا۔ وہاں انسانوں کا
جم غفیر اور بے پناہ رش دیکھ کر ہونچکا سا رہ گیا۔ اتنے چھوٹے معمولی شہر میں اتنی
ادمی! یہ سب لوگ کہاں سے پڑے تھے؟ اُن میں سے اکثر گنوار اور جاہل
تھے جو بڑے مزے لے لے کر ناچنے والی کے جسمانی لوچ کی تعریفیں کر رہے تھے۔
ٹ حاصل کرنے کی کھڑکی پر اس قدر دھکم دھکا اور کبھی کبھی دھینگا مشتی بھی ہو رہی
تھی۔ گویا زندگی اور موت کی کشمکش ہو رہی ہو۔ اُس نے نہایت دقت اور دشواری
تین روپے میں سب سے نچلے درجہ کا ٹکٹ حاصل کیا۔ اور اپنے بدن یا شاید
ہڈیوں کو سہلاتا ہوا اندر ہال کے ایک کونے میں جگہ پاکر جا بیٹھا۔ اس کی نگاہیں
لی کے لمبوں سے منور سٹیج کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ ہال تالیوں اور سیٹیوں کے
ور سے گونج رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انسان "زندگی زندہ دلی کا نام ہے"
پوری طرح اور شدت سے عمل کر رہے ہیں۔ یہاں انسانی زندگی کا یہ روشن پہلو
بہت ہی نمایاں نظر آتا تھا۔ ہر شخص خصوصاً نچلے درجوں میں بیٹھے ہوئے لوگ تو
سیٹیوں اور تالیوں کے شور سے ہال کی چھت کو اُڑا دینے پر تُلے ہوئے نظر آتے تھے۔
لیکن منور سٹیج اور آرکیسٹرا بجانے والوں کے قریب ہی بیٹھے ہوئے ڈی سی
صاحب اُن کی طرف دیکھتے تھے تو نہ جانے اُن سب لوگوں کی اُس ساری زندہ دلی کا
نشہ کہاں ہرن ہو جاتا تھا۔ وہ سہم سے جاتے تھے۔ اور اس طرح سارے ہال پر
سکوت اور سناٹا سا چھا جاتا۔

ناچ شروع ہونے سے پہلے کچھ دیر تک مختلف گیتوں کے ریکارڈ بجتے رہے
پھر آرکیسٹرا بجنے لگا کئی قسم کے ساز ایک ہی سُر ایک ہی تال پر۔ نہایت سُریلا اور
مسحور موسیقی۔ اسی دوران میں انوری سٹیج کے ایک پہلو سے تھرکتی ہوئی نکلی۔
ناچ شروع ہو گیا۔ سب لوگ ہمہ تن گوش اور سراپا چشم بن گئے۔ وہ بھی اپنے تمام
غم و فکر۔ ملازمت کے تفکرات کو بھول کر ناچ میں کھو گیا۔ آرکیسٹرا بج رہا تھا۔ رقص ہو
رہا تھا۔ چھن۔ چھن۔ چھنا چھن ـــ حسین اور جوان رقاصہ۔ دلکش اور رُوح
پرور موسیقی ـــ مسرت کا ایک دریا اُمنڈ آیا۔ اور وہ اسکی لہروں میں ہولے ہولے
بہنے لگا۔ انوری کے جسم کا ہر حصہ تھرک رہا تھا۔ انگ انگ ناچ رہا تھا۔ اور اسکی
روح کا ہر تار بجنے لگا۔ دل و ذہن گویا وجد میں آ گئے۔ وہ ایک ابدی طلسم میں
بندھا جا رہا تھا۔ اور رقاصہ ناچتی ناچتی مُسکرا بھی رہی تھی۔ اور وہ یوں محسوس کرنے
لگتا تھا کہ گویا وہ رقاصہ ہی نہیں ساقی بھی بن گئی ہے۔ اور مسرت اور بے فکری کی جاں
بخش شراب اُس کی رُوح اور ذہن میں انڈیل رہی ہے۔ کبھی کبھی تماشائیوں کی
تالیوں سے سیٹیوں اور آوازوں کا شور اُسے محویت سے چونکا بھی دیتا لیکن وہ پھر

رقص و سرور کے دریا میں غرق ہو جاتا۔

اور ایسے ہی بیٹھے بیٹھے دفعتاً اُسے بھوک محسوس ہونے لگی۔ اُس نے
اس احساس کو دبا دینا چاہا۔ لیکن اُسے کامیابی نہ ہوئی۔ اُس نے سٹیج کی طرف اور
بھی زیادہ توجہ سے دیکھنا شروع کیا۔ آرکیسٹرا بدستور بج رہا تھا۔ ناچ اسی طرح
ہو رہا تھا۔ چھن چھن چھن۔ چھنا چھن چھن۔ لیکن اُسے کچھ بیزاری سی محسوس ہونے لگی وہ
خود کو ناچ اور موسیقی کی رو میں بہا دینا چاہتا تھا۔ بھوک کے خیال نے اُسے تھام لیا۔
وہ رقاصہ کی رومانی تھپکیاں لے لیکر سونا چاہتا تھا۔ حقیقت نے اُسے جھنجوڑ کر جگا دیا۔
اور معلوم نہیں رقاصہ کو مُسکراتے دیکھ کر کیوں اُسے گمان ہونے لگا کہ یہ مسکراہٹ صرف نام کی
ہے ـــ اوپری اوپری سی ـــ ناچ ـــ گانا اور جاں بخش مسکراہٹ یہ تو
آزادی اور خوشی کی فضاؤں ہی میں اپنا صحیح اثر اور اعجاز پیدا کرتے ہیں۔ ممکن ہے کہ
رقاصہ کو آج کوئی ذاتی اور دلی صدمہ پہنچا ہو۔ لیکن وہ ناچنے اور سب سے بڑھکر
ستم یہ کہ مُسکرانے پر مجبور ہے۔ اسکے بغیر اس کا رقص بے سُود ہے۔ اور اسے محسوس
ہونے لگا کہ وہ خواہ مخواہ مُسکرانے کی کوشش کر رہی ہے۔ حالانکہ اسکے چہرے کا اُتار
چڑھاؤ صاف بتا رہا ہے کہ وہ اپنی مرضی اپنی خواہش سے ناچ نہیں رہی۔ بلکہ اپنی
رُوح اور ضمیر پر چھریاں چلا رہی ہے اسکی زخمی رُوح سسک رہی ہے۔ اور وہ
اس کا گلا دبائے جا رہی ہے۔ ایسا کرنے پر مجبور ہے ـــ ناچنے پر ـــ
خود نہیں ناچ نہیں رہی ـــ روپیہ اُسے نچا رہا ہے ـ جھنکارتا ہوا ـــ
زنجیروں کی طرح جھنکارتا ہوا گول گول روپیہ ـــ جس کے گرد گول گول روٹی
گھومتی ہے ـــ اور روٹی جس کے گرد یہ ساری زمین ـــ گول زمین چکر
کاٹ رہی ہے۔

اور آج اُس کے لئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ وہ اُس ہال سے باہر نکل کر جہاں
متواتر دو گھنٹے تک وہ ناچ دیکھتا رہا، اپنا بوجھل ٹوٹتا ہوا ذہن لئے ہوئے جا رہا
تھا۔ بوجھل ذہن اور پیٹ؟ پیٹ میں گویا ایک آگ سی دہک رہی تھی۔ بھوک
کی آگ۔ اُسے بڑی شدت سے بھوک لگ رہی تھی۔ لیکن روٹی کھاتے کیسے؟
وہ تین روپے ناچ کی نذر ہو چکے تھے اور اب کہیں سے اُدھار ملنے کی اُمید نہ تھی
اور ہوٹل والے سے پھر اُدھار پر کھانا کھا کر وہ اپنی غیرت اور خودداری کو ٹھیس
نہیں لگانا چاہتا تھا۔ وہ سوچتے سوچتے گھر کی طرف جا رہا تھا۔ شاید انسان جب
بھوکا ہوتا ہے تو اُس کا ذہن زیادہ حساس اور فلسفیانہ سا ہو جاتا ہے۔ وہ بہت
کچھ سوچ رہا تھا۔ کاش! آج وہ ناچ نہ دیکھتا اور ناچ دیکھکر بھی اُس نے کیا
حاصل کیا؟ کیا دیکھا؟ بھوکے لوگوں کی خالی خولی سیٹیاں اور تالیاں اور پھر اس تمام
شور یا طوفان کا ڈی سی صاحب کی ایک نظر ہی سے فرو ہو جانا۔ فن کار کی مجبوری۔

ناچنے پر مجبور رقاصہ جو کہ روپے کیلئے ناچتی اور پیٹ کی خاطر مسکراتی ہے لیکن خالی پیٹ سے انسان مسکرا بھی تو نہیں سکتا۔ اور اس نے بھی مسکرانے کی کوشش کی، لیکن مسکرا نہ سکا۔ اس کے پیٹ میں ہولناک آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ اس آگ کو کیونکر بجھائے، بھوک کو کیسے مٹائے۔ بھوک تو روٹی ہی سے مٹ سکتی ہے۔ اور روٹی روپے کے گرد گھومتی ہے ——— گول گول روپے کے گرد ———

وہ ہوٹل کے سامنے سے ہو کر گذرا۔ ہوٹل والا جلتے ہوئے لیمپ کے نیچے ایک میلا سا تولیہ کندھے پر ڈالے اپنی جگہ بیٹھا ہوا دیگچے میں سے گوشت نکال نکال کر تھالیوں میں ڈال رہا تھا۔ غلیظ لڑکا گاہکوں کے سامنے دھر رہا تھا۔ روٹیاں، گرم گرم ——— گول گول روٹیاں ——— اس کے جسم اور روح کا ذرہ ذرہ پکارنے لگا۔ اس کے قریب سے تین چار مدراسی فوجی سپاہی اپنے وزنی بوٹوں کو زمین پر ٹھکتے گذر رہے تھے۔ انہیں دیکھکر اسے خیال آیا کہ اس کے وہ تین روپے بھی اپنے ہی فوجی بھائیوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے وار فنڈ میں جائیں گے۔ جنگ کے لئے امدادی چندہ ——— اس کے وہ روپے اپنے ملک اور قوم کی خاطر ظالم فسطائیوں سے لڑتے ہوئے سپاہیوں کے کام آئیں گے۔ اور اسے لوبیس کے اکڑی ہوئی مونچھوں والے سپاہی کی وہ بات یاد آ گئی "فوج رعایا ——— ہمارا خاتمہ کر رہی ہے۔ ہماری حفاظت۔ ہمارے بچاؤ کے لئے ———" اس نے سوچا کہ ان روپوں سے جنگی اسلحہ جات بنیں گے۔ ٹینک۔ ہوائی جہاز جو ہمارے ملک کے گرد ہماری حفاظت کیلئے چکر لگائیں گے۔ اور جاپانیوں پر بم برسا کر ہمارے مقدس وطن کو ان کے ناپاک ہاتھوں سے یقیناً بچالیں گے۔ یہ سوچ کر اسے قدرے تسکین سی ہوئی۔ لیکن جلد ہی یہ تسکین اسکی دہکتی ہوئی بھوک کی لپیٹ میں آ گئی۔ ملک یقیناً دشمنوں سے محفوظ رہے گا۔ اتحادی بہت جلد دنیا میں امن و آشتی قائم کریں گے۔ ہر قوم کو آزادی ——— پوری آزادی مل جائیگی ——— لیکن بھوک ———

——— اس نے پھر ہوٹل کی طرف نظر دوڑائی۔ نانبائی سامنے سے گذرتے ہوئے نوجیوں کو پکار پکار کر کہہ رہا تھا "گرائیں! روٹی کھاؤ گے، چائے پیو گے؟ بڑا اچھا ہوٹل ہے۔ آؤ ——— آؤ ——— بیٹھو" اس نے ہوٹل پر سے نظریں ہٹالیں۔ اور جلدی جلدی گھر پہنچ کر چارپائی پر لیٹ گیا۔

لیکن بھوکے انسان سے تو نیند بھی نفرت کرتی ہے۔ اسے آج اس حقیقت کا بھی شدید احساس اور تلخ تجربہ ہوا۔ وہ بار بار سوچ رہا تھا کہ روٹی کیسے حاصل کرے، وہ کیوں ناچ دیکھنے گیا۔ جہاں وہ ذہنی آسودگی حاصل کرنے کی بجائے اور بھی زیادہ الجھنوں میں گرفتار ہو گیا۔ پھر اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کی بھوک بہت بڑھ گئی ہے ——— ناقابل برداشت حد تک ——— وہ اپنی بے بسی، مجبوری پر چلا اٹھا۔

——— روٹی ——— روٹی ——— لیکن روٹی کہاں سے ملے، روٹی تو روپے کے گرد ——— گول گول روپے کے گرد گھومتی ہے۔ اور تین گول روپے وہ مردہ ناچ کی نذر کر چکا تھا۔ وہ ناامیدی کے بھیانک سمندر میں غوطے کھانے لگا اور پھر ——— دو آنسو اس کی آنکھوں میں سے پھوٹ کر رخساروں پر بہنے لگے۔ ایک لمحہ کیلئے اسے اپنے ان آنسوؤں کی سطح پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھیلتے پھیلتے ایک ہال کی صورت بن گئی جس کے سامنے ایک منور سٹیج ابھر آیا۔ سٹیج کے پہلو سے ایک رقاصہ موسیقی کی آواز پر تھرکتی ہوئی نمودار ہوئی ——— وہ ناچنے لگی۔ چھن چھن۔ چھنا چھن۔ زندہ نہیں ——— مردہ ناچ۔ وہ مسکرا رہی تھی ——— بہ مجبوری ——— زہر میں بجھی ہوئی مسکراہٹ۔ لوگ چیخ رہے تھے ——— سیٹیاں بجا بجا کر اور تالیاں پیٹ پیٹ کر اپنی بے کسی اور بھوک کا ڈھنڈورہ پیٹ رہے تھے ——— اور پس منظر میں "کوئی" کھڑا یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر قہقہے لگا رہا تھا ——— قہقہے۔

اور دوسرے لمحے وہ چارپائی پر کروٹیں لے لیکر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا ——— !!

چوٹیں

(ایک اسکیچ)

(از جناب انتصار نیوتنوی)

سڑک سے ملے ہوئے مکان میں شادی بیاہ کے باجوں کی آواز آتی ہے جس طرح عموماً باراتوں میں بجا کرتے ہیں۔ بارات کا جشن آہستہ آہستہ مکان کے قریب سے گذرتا ہے۔ باجوں کے ساتھ مختلف قسم کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔

نجمہ:۔ (دوڑ کر کھڑکی کے پاس جاتی ہے) دیکھئے کس کی بارات جا رہی ہے آیئے! آہا ہا کیسی دھوم دھام کی بارات ہے۔ آیئے!

راشد:۔ ہوں۔ ہوں۔

نجمہ:۔ (اشتیاق کے ساتھ) میں کہتی ہوں آپ عجیب انسان ہیں۔ دیکھئے نا آکر۔ جلدی آیئے۔ نکل جائیگی بارات۔

راشد:۔ عجیب مصیبت ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ میں بھی تمہارے بارات دیکھوں۔ تم دیکھ تو رہی ہو، بس دیکھے جاؤ۔ میں نے بہت سی باراتیں دیکھی ہیں۔

نجمہ:۔ مگر ایسی بارات نہ دیکھی ہوگی۔ آپ کو خدا کی قسم آیئے! آیئے!!

راشد:۔ میں کام کر رہا ہوں۔

نجمہ:۔ (فائل کو راشد کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے) ہر وقت کام ہی کام۔ رات دن فائل میں لپٹے رہنا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ چلئے دیکھئے اُٹھ کے۔

راشد:۔ یعنی کیا مصیبت ہے صاحب (اُٹھکر جاتا ہے) بس یہی بارات ہے؟ کیا دیکھوں اِس بارات میں؟

نجمہ:۔ اتنی چیزیں ہیں۔ آپ کو کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ یہ دیکھئے آگے آگے دولہا جا رہا ہے۔ اس کے پیچھے دُلہن کا ڈولا ہے۔ براتی ساتھ ہیں۔ جہیز دیکھئے۔ مسہریاں، فرنیچر، برتن، ٹرنک۔ وہ دیکھئے ٹوکرے میں کتنا بڑا پاندان رکھا ہے۔

راشد:۔ جی ہاں! یہ پاندان خاص چیز ہے۔ اس میں آدمی بند کئے جائینگے۔ اور یا پھر کسی پنساری کی دُکان کھولی جائے گی۔ اور اسے کسی تمبولی کی دُکان ہی کیوں نہ کہا جائے جس طرح سڑکوں کے کنارے عموماً لوگ کھول لیتے ہیں۔

(بارات دھیرے دھیرے دُور ہوتی جاتی ہے)

نجمہ:۔ (ہنس کر) واقعی بہت بڑا پاندان ہے۔ لڑکی والوں نے دل کھولکر دیا۔ ہونگے کوئی بہت بڑے رئیس۔

راشد:۔ دینے والے نے لڑکی دیدی۔ یہ کیا کوئی کم ریاست ہے؟

نجمہ:۔ لڑکی تو سب ہی دیتے ہیں۔

راشد:۔ جہیز بھی سب دیتے ہیں۔

نجمہ:۔ مگر ایسا جہیز۔

راشد:۔ ایسا دیسا کیا۔ اتنا بڑا پاندان نہیں دیتے۔ یہ آخر پاندان ضرورت سے زیادہ بڑا کیوں دیا جاتا ہے۔

نجمہ:۔ آپ پاندان کے پیچھے کیوں پڑ گئے۔ ہر چیز بڑی اور آجاگر دی جاتی ہے۔ چل تو رہے ہیں آپ دیکھئے گا ظاہرہ کو کتنا بڑا پاندان دیا جا رہا ہے۔ تین مرتبہ امی جان نے پھروایا ہے جب کہیں جاکر اتنا بڑا پاندان ملا۔ میرے خیال میں اس پاندان سے وہ کچھ ہی چھوٹا ہوگا۔

راشد:۔ کیا کرتے ہیں تمہارے بہنوئی؟

نجمہ:۔ سنتی ہوں گھر کے زمیندار ہیں۔

راشد:۔ ہوں۔ اور کچھ نہیں کرتے؟

نجمہ:۔ اور کیا کرتے؟

راشد:۔ یہی کچھ تجارت وغیرہ۔

نجمہ:۔ کاہے کی تجارت؟ غلہ کی۔

راشد:۔ فائدہ تو آج کل پان کی تجارت میں بہت ہے۔ وہ جو اتنا بڑا پاندان ملے گا.........

نجمہ:۔ (جھجک کر) اچھا — یہ پاندان پر چوٹیں ہو رہی ہیں۔ دیکھ لیجئے گا اگر یقین نہیں آتا۔ آج بدھ ہوگیا۔ جمعرات، جمعہ، سنیچر تین دن بیچ میں ہیں۔ اتوار کو بارات آئے گی — اور ہاں! رخصت مل گئی آپ کو۔ پرسوں تک جانا ضروری ہے۔ چل تو رہے ہیں آپ شادی میں۔

راشد:۔ شادی میں کیا خاک چل رہا ہوں۔ تم کام تو کرنے نہیں دیتیں۔ ذرا فائل لیکر بیٹھا اور تم نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ بھلا مجھے اس قسم کی بارات دکھانے کا کونسا تُک تھا۔ مجھے ایک دن کی رخصت اس شرط پر ملی ہے کہ

ناچنے پر مجبور رقاصہ جو کہ روپے کیلئے ناچتی اور پیٹ کی خاطر مسکراتی ہے لیکن خالی پیٹ سے انسان مسکرا بھی تو نہیں سکتا ۔ اور اس نے بھی مسکرانے کی کوشش کی ، لیکن مسکرا نہ سکا ۔ اس کے پیٹ میں ہولناک آگ بھڑک رہی تھی ۔ وہ اس آگ کو کیسے بجھائے ، بھوک کو کیسے مٹائے ۔ بھوک تو روٹی ہی سے مٹ سکتی ہے ، اور روٹی روپے کے گرد گھومتی ہے —— گول گول روپے کے گرد ——

وہ ہوٹل کے سامنے سے ہو کر گذرا ۔ ہوٹل والا جلتے ہوئے لیمپ کے نیچے ایک میلا سا تولیہ کندھے پر ڈالے اپنی جگہ بیٹھا ہوا دیگچے میں سے گوشت نکال نکال کر تھالیوں میں ڈال رہا تھا ۔ غلیظ لڑکا گاہکوں کے سامنے دھر رہا تھا ۔ روٹیاں ، گرم گرم —— گول گول روٹیاں —— اس کے جسم اور روح کا ذرہ ذرہ پکارنے لگا ۔

اس کے قریب سے تین چار مدراسی فوجی سپاہی اپنے وزنی بوٹوں کو زمین پر ٹھیکتے گذر رہے تھے ۔ انہیں دیکھ کر اسے خیال آیا کہ اس کے وہ تین روپے بھی اپنے ہی فوجی بھائیوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے وار فنڈ میں جائیں گے ۔ جنگ کے لئے امدادی چندہ — اس کے وہ روپے اپنے ملک اور قوم کی خاطر ظالم فسطائیوں سے لڑتے ہوئے سپاہیوں کے کام آئیں گے ۔ اور اسے بولیس کے اکڑی ہوئی مونچھوں والے سپاہی کی وہ بات یاد آگئی "فوج رعایا —— ہماری حفاظت کر رہی ہے ۔ ہماری حفاظت ۔ ہمارے بچاؤ کے لئے — " اور اس نے سوچا کہ ان روپوں سے جنگی اسلحہ جات بنیں گے ۔ ٹینک ۔ ہوائی جہاز جو ہمارے ملک کے گرد ہماری حفاظت کیلئے چکر لگائیں گے ۔ اور جاپانیوں پر بم برسا برسا کر ہمارے مقدس وطن کو ان کے ناپاک ہاتھوں سے یقیناً بچالیں گے ۔ یہ سوچ کر اسے قدرے تسکین سی ہوئی ۔ لیکن جلد ہی یہ تسکین اسکی دہکتی ہوئی بھوک کی لپیٹ میں آگئی ۔ ملک یقیناً دشمنوں سے محفوظ رہے گا ۔ اتحادی بہت جلد دنیا میں امن و آشتی قائم کر دینگے ۔ ہر قوم کو آزادی —— پوری آزادی مل جائیگی —— لیکن بھوک ——

—— اس نے پھر ہوٹل کی طرف نظر دوڑائی ۔ نانبائی سامنے سے گذرتے ہوئے فوجیوں کو پکار پکار کر کہہ رہا تھا "گرائیں ! روٹی کھاؤ گے ، چائے پیو گے ؟ بڑا اچھا ہوٹل ہے ۔ آؤ —— آؤ —— بیٹھو" اس نے ہوٹل پر سے نظریں ہٹالیں ۔ اور جلدی جلدی گھر پہنچ کر چارپائی پر لیٹ گیا ۔

لیکن بھوکے انسان سے تو نیند بھی نفرت کرتی ہے ۔ اسے آج اس حقیقت کا بھی شدید احساس اور تلخ تجربہ ہوا ۔ وہ بار بار سوچ رہا تھا کہ روٹی کیسے حاصل کرے ، وہ کیوں ناچ دیکھنے گیا ۔ جہاں وہ ذہنی آسودگی حاصل کرنے کی بجائے اور بھی زیادہ الجھنوں میں گرفتار ہو گیا ۔ پھر اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کی بھوک بہت بڑھ گئی ہے —— ناقابلِ برداشت حد تک —— وہ اپنی بے بسی ، مجبوری پر چلا اٹھا ۔

—— روٹی —— روٹی —— لیکن روٹی کہاں سے ملے ، روٹی تو روپے کے گرد —— گول گول روپے کے گرد گھومتی ہے ۔ اور تین گول روپے وہ زندہ ناچ کی نذر کر چکا تھا ۔ وہ ناامیدی کے بھیانک سمندر میں غوطے کھانے لگا اور پھر —— دو آنسو اس کی آنکھوں میں سے پھوٹ کر رخساروں پر رینگنے لگے ۔ ایک لمحہ کیلئے اسے اپنے ان آنسوؤں کی سطح پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھیلتے پھیلتے ایک ہال کی صورت بن گئی جس کے سامنے ایک منور سٹیج ابھر آیا ۔ سٹیج کے پہلو سے ایک رقاصہ موسیقی کی آواز پر تھرکتی ہوئی نمودار ہوئی —— وہ ناچنے لگی ۔ چھن چھن ۔ چھنا چھن ۔ زندہ نہیں —— مردہ ناچ ۔ وہ مسکرا رہی تھی —— بہ مجبوری —— زہر میں بجھی ہوئی مسکراہٹ ۔ لوگ چیخ رہے تھے —— سیٹیاں بجا بجا کر اور تالیاں پیٹ پیٹ کر اپنی بے کسی اور بھوک کا ڈھنڈورہ پیٹ رہے تھے —— اور پس منظر میں "کوئی" کھڑا یہ سب کچھ دیکھ دیکھ کر قہقہے لگا رہا تھا —— قہقہے ۔

اور دوسرے لمحے وہ چارپائی پر کروٹیں لے لیکر سونے کی ناکام کوشش کرنے لگا —— !!

(ایک اسکیچ)

چوٹیں

(از جناب انتصار نیوتنوی)

سڑک سے ملے ہوئے مکان میں شادی بیاہ کے باجوں کی آواز آتی ہے جس طرح عموماً باراتوں میں بجا کرتے ہیں۔ بارات کا جشن آہستہ آہستہ مکان کے قریب سے گذرتا ہے۔ باجوں کے ساتھ مختلف قسم کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔

نجمہ :۔ (دوڑ کر کھڑکی کے پاس جاتی ہے) دیکھئے کس کی بارات جارہی ہے آئیے! آہا ہا کیسی دھوم دھام کی بارات ہے۔ آئیے!

راشد :۔ ہوں۔ ہوں۔

نجمہ :۔ (اشتیاق کے ساتھ) میں کہتی ہوں آپ عجیب انسان ہیں۔ دیکھئے نا آکر۔ جلدی آئیے۔ نکل جائیگی بارات۔

راشد :۔ عجب مصیبت ہے۔ کیا یہ ضروری ہے کہ میں بھی تمہارے بارات دیکھوں۔ تم دیکھ تو رہی ہو بس دیکھے جاؤ۔ میں نے بہت سی باراتیں دیکھی ہیں۔

نجمہ :۔ مگر ایسی بارات نہ دیکھی ہوگی۔ آپ کو خدا کی قسم آئیے! آئیے!!

راشد :۔ میں کام کر رہا ہوں۔

نجمہ :۔ (فائل کو راشد کے ہاتھ سے چھینتے ہوئے) ہر وقت کام ہی کام۔ رات دن فائل میں لپٹے رہنا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ چلئے دیکھئے اُٹھ کے۔

راشد :۔ یعنی کیا مصیبت ہے صاحب (اُٹھکر جاتا ہے) بس یہی بارات ہے؟ کیا دیکھوں اس بارات میں؟

نجمہ :۔ اتنی چیزیں ہیں۔ آپ کو کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ یہ دیکھئے آگے آگے دولھا جارہا ہے۔ اس کے پیچھے دُلہن کا ڈولا ہے۔ براتی ساتھ ہیں۔ جہیز دیکھئے۔ مسہریاں، فرنیچر، برتن، ٹرنک۔ وہ دیکھئے ٹوکرے میں کتنا بڑا پاندان رکھا ہے۔

راشد :۔ جی ہاں! یہ پاندان خاص چیز ہے۔ اس میں آدمی بند کئے جائینگے۔ اور یا پھر کسی پنساری کی دُکان کھولی جائے گی۔ اور اسے کسی تمبولی کی دُکان ہی کیوں نہ کہا جائے جس طرح سڑکوں کے کنارے عموماً لوگ کھول لیتے ہیں۔

(بارات دھیرے دھیرے دُور ہوتی جاتی ہے)

نجمہ :۔ (ہنس کر) واقعی بہت بڑا پاندان ہے۔ لڑکی والوں نے دل کھولکر دیا۔ ہونگے کوئی بہت بڑے رئیس۔

راشد :۔ دینے والے نے لڑکی دیدی۔ یہ کیا کوئی کم ریاست ہے؟

نجمہ :۔ لڑکی تو سب ہی دیتے ہیں۔

راشد :۔ جہیز بھی سب دیتے ہیں۔

نجمہ :۔ مگر ایسا جہیز۔

راشد :۔ ایسا ویسا کیا۔ اتنا بڑا پاندان نہیں دیتے۔ یہ آخر پاندان ضرورت سے زیادہ بڑا کیوں دیا جاتا ہے۔

نجمہ :۔ آپ پاندان کے پیچھے کیوں پڑ گئے۔ ہر چیز بڑی اور آجاگر دی جاتی ہے۔ چل تو رہے ہیں آپ۔ دیکھئے گا طاہرہ کو کتنا بڑا پاندان دیا جارہا ہے۔ تین مرتبہ امی جان نے پھیر وایا ہے تب کہیں جاکر اتنا بڑا پاندان ملا۔ میرے خیال میں اس پاندان سے وہ کچھ ہی چھوٹا ہوگا۔

راشد :۔ کیا کرتے ہیں تمہارے بہنوئی؟

نجمہ :۔ سُنتی ہوں گھر کے زمیندار ہیں۔

راشد :۔ ہوں۔ اور کچھ نہیں کرتے؟

نجمہ :۔ اور کیا کرتے؟

راشد :۔ یہی کچھ تجارت وغیرہ۔

نجمہ :۔ کاہے کی تجارت؟ غلّہ کی۔

راشد :۔ فائدہ تو آج کل پان کی تجارت میں بہت ہے۔ وہ جو اتنا بڑا پاندان ملے گا.......

نجمہ :۔ (جھینپکر) اچھا ——— یہ پاندان پہ چوٹیں ہو رہی ہیں۔ دیکھ لیجیے گا اگر یقین نہیں آتا۔ آج بدھ ہو گیا۔ جمعرات، جمعہ، سنیچر تین دن بیچ میں ہیں۔ اتوار کو بارات آئے گی ——— اور ہاں! رخصت مل گئی آپ کو۔ پرسوں تک جانا ضروری ہے۔ چل تو رہے ہیں آپ شادی میں۔

راشد :۔ شادی میں کیا خاک چل رہا ہوں۔ تم کام تو کرنے نہیں دیتیں۔ ذرا فائل لیکر بیٹھا اور تم نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ بھلا مجھے اس قسم کی بارات دکھانے کا کونسا تک تھا۔ مجھے ایک دن کی رخصت اس شرط پر ملی ہے کہ

آج جانے سے پہلے ساری فائلیں مکمل کر دوں۔ آپ چاپ خاموشی سے بیٹھو تو میں اپنا کام کروں۔

نجمہ :۔ بہتر۔ مگر ایک شرط ہے۔ ذرا دیر میں وہ چمپئی رنگ کی ساڑی لا دیجئے گا۔ اور اسی رنگ کا ایک بلاؤز۔

راشد :۔ ہوں ـــــ اچھا اب چپ رہو تو میں اپنا کام کروں۔

(تھوڑی دیر تک خاموشی رہتی ہے)

(دروازہ پر دستک ہوتی ہے)

نجمہ :۔ کون ہے؟

آواز :۔ راشد صاحب!

راشد :۔ (چپکے سے) کہہ دو دفتر گئے ہیں۔

نجمہ :۔ دفتر گئے ہیں۔

آواز :۔ میں دفتر ہی سے آرہا ہوں صاحب۔ چپراسی ہوں۔

نجمہ :۔ کیا۔ کام کیا ہے۔

چپراسی :۔ بڑے صاحب بلا رہے ہیں۔ بہت ضروری کام ہے۔ کہا ہے بغیر لے ہوئے نہ چلے جائیں۔

نجمہ :۔ مگر وہ تو ـــــــ

راشد :۔ نہیں نہیں ـــــ میں موجود ہوں (دروازہ پر جاکر) کیوں کیا کام ہے۔ خیریت؟

چپراسی :۔ بڑے صاحب بلا رہے ہیں۔

راشد :۔ کیوں ـــ؟ کیا کہتے تھے بڑے صاحب؟

چپراسی :۔ بس اتنا ہی کہا ہے کہ راشد صاحب کو بلا لاؤ۔

راشد :۔ اور کچھ نہیں کہا۔ آخر کس سلسلہ میں بلا رہے ہیں؟

چپراسی :۔ آپ اتنا گھبرا کیوں گئے کس کام سے بلا رہے ہیں؟

راشد :۔ ارے بھائی بڑی مشکل سے صرف آج کی رخصت منظور ہوئی ہے۔ کہیں کوئی اڑنگا نہ لگ جائے۔ میں تو اس وقت بیٹھا ہوا انہیں کا کام کر رہا تھا۔ خیر۔ تو کیا ابھی چلوں؟

چپراسی :۔ جی ہاں۔ کہا ہے کہ اپنے ساتھ لے کے آنا۔

راشد :۔ تم تو یار عجیب باتیں کر رہے ہو۔ پہلے کہا کہ بڑے صاحب نے بلایا ہے۔ پھر کہنے لگے کہ یہ بھی کہا ہے کہ اپنے ساتھ لے کے آنا۔ آخر معاملہ کیا ہے؟

چپراسی :۔ اجی بلایا ہے صاحب۔ اور میں نے کیا کہا۔ اگر آپ نہ چلیں تو جواب

راشد :۔ نہیں بھائی میں چل رہا ہوں۔ ذرا سوچو تو بھلا کچھ اور بھی کہا ہے بڑے صاحب نے؟

چپراسی :۔ اور کچھ تو نہیں کہا۔

راشد :۔ (نجمہ سے) اچھا میں ابھی آیا۔ بڑے صاحب نے کسی ضروری کام سے بلایا ہوگا۔ تم جب تک سامان وغیرہ ٹھیک سے کرو۔ گاڑی میں تو فی الحال دو گھنٹہ کی دیر ہے۔ میں ابھی آیا۔ ابھی۔ ابھی (آواز فیڈ آؤٹ ہو جاتی ہے)

(جاتا ہے)

راشد :۔ میں آسکتا ہوں؟

بڑے صاحب :۔ Come in آپ ابھی گئے نہیں؟

راشد :۔ جی بس جا ہی رہا ہوں۔

بڑے صاحب :۔ یہ فلاں فلاں فائلیں کہاں ہیں؟ دیکھئے میں نے اس کاغذ پر نوٹ کر دی ہیں۔

راشد :۔ یہ دو فائلیں تو میرے پاس ہیں۔ باقی سب یہیں ہیں

بڑے صاحب :۔ اور وہ دو فائلیں آپ کے پاس کیوں ہیں؟ اگر ان کی ضرورت پڑی۔

راشد :۔ وہ نامکمل ہیں۔

بڑے صاحب :۔ تو پھر جانے سے پہلے انہیں مکمل کیجئے۔ باقی فائلیں میری میز پر رکھ دیجئے۔

راشد :۔ بہت اچھا۔ (کاغذوں کی الٹ پلٹ) اوہو! یہ فائل بھی نامکمل ہے۔ اب بھلا یہ تین تین فائلیں کس طرح مکمل ہونگی۔ اب کیا ہو ـــــ؟ (بڑے صاحب سے) میری ایک درخواست ہے آپ سے۔ میں ساری فائلیں گھر سے مکمل کر کے لاؤنگا۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔

بڑے صاحب :۔ مگر اس میں فرق نہ پڑے۔

راشد :۔ جی نہیں۔ اب مجھے اجازت ہے! میری گاڑی چھوٹنے میں صرف ایک گھنٹہ ہے۔

بڑے صاحب :۔ Go ـــــــــــــ (وقفہ)

نجمہ :۔ یہ کیا۔ اتنی بہت سی فائلیں اپنے ساتھ لے آئے۔

راشد :۔ ایسے بہت سستا چھوٹا۔ بڑے اس وقت مہربان تھے۔ کہنے لگے ساری فائلیں گھر سے مکمل کرتے لانا۔ ورنہ رخصت منسوخ کر دیتے۔

نجمہ :۔ مگر آپ شادی میں چل رہے ہیں آپکو اتنی فرصت ملیگی کہ آپ ان فائلوں کو مکمل کریں۔

راشد :۔ کیا کیا جائے وقت نکالنا ہی پڑیگا۔ حالانکہ وقت اتنا تنگ ہے کہ شادی ہی طاہرہ کی رخصت میں شریک ہونے کا موقع ملے۔ بارات یقیناً آچکی ہوگی جس وقت ہم لوگ پہنچیں گے لوگ رخصتی کی تیاریوں میں مصروف ہو نگے۔ اور میں جاتے ہی اپنے کام میں لگ جاؤں گا۔ اچھا جلدی کرو۔ گاڑی میں صرف آدھا گھنٹہ باقی ہے۔ میں جب تک اپنے کپڑے بدل لوں۔ (کپڑے بدلتے میں جیب سے کنجی بجنے کی آواز آتی ہے) ادھر مر گیا ہے موت۔ کنجی دینا ہی بھول گیا۔ سارے کاغذات الماری میں بند ہیں۔ اگر کسی ضروری کاغذ کی طلبی ہوئی تو برخاست کر دیا جاؤں گا۔ اچھا تم ٹھیرو۔ میں دوڑ کر کنجی دے آؤں (گھبراہٹ میں) عجب پریشانی ہے۔ ہاں تانگہ بھی واپسی میں لیتا آؤں گا۔ (بھاگتا ہے)

(پھولی ہوئی سانسوں کی آواز آتی ہے)

راشد :۔ میں آسکتا ہوں؟

بڑے صاحب :۔ Yes.

راشد :۔ یہ کنجیاں دینا بھول گیا تھا۔ گڈ نون سر۔

(پھر پھولی ہوئی سانسوں کی آوازیں آتی ہیں)

نجمہ :۔ تانگہ لے آئے؟

راشد :۔ (پھولی ہوئی سانس سے) لے آیا۔ چلو جلدی کرو۔ یہ فائلوں کا پلندہ باندھ لینا۔ قلمدان۔ یہ رولر۔ تھوڑے سے ٹیگس اور یہ بلاٹنگ۔ سب ایک ہی میں لپیٹ لو۔ چلو جلدی کرو۔ ورنہ گاڑی نہ ملے گی۔

نجمہ :۔ اور میری ساڑی، جس کا وعدہ آپ نے کیا تھا؟

راشد :۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ اب نہ وقت ہے نہ روپیہ۔ چلو جلدی کرو۔ ارے تانگے والے! یہ سامان اٹھا لے جانا۔

(سامان رکھا جاتا ہے۔ تانگہ چل دیتا ہے۔ تھوڑی دیر میں ریل کے پہیوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ پھر یہ آواز آہستہ آہستہ شہنائی کی آواز میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

نجمہ :۔ ایسے جانے سے کیا فائدہ۔ شاید رخصتی بھی نہ ملے۔ گھر کی شادی میں کہیں اس طرح شریک ہوتا ہے کوئی۔

راشد :۔ پھر آخر کیا کرتے، پہلے سے رخصت نہ ملی۔ ایک دن بلکہ چند گھنٹوں کی رخصت میں اتنے بہت سارے کام۔ انسان کتنی پابندیوں میں مجبوری کے ساتھ جکڑا ہوا ہے۔

نجمہ :۔ کیا منہ لے کے جائیں گے۔ طاہرہ کے لئے کوئی تحفہ بھی نہ خرید سکے۔ کیا کہیں گے لوگ۔

راشد :۔ جو اب تک کہتے آئے ہیں۔ بے بس، غریب، مفلس، مگر تم تو کہتی تھیں کہ امی جان سے بات بنا دینگی۔ انہیں ہماری حالت کا اندازہ خوب ہے۔

راشد :۔ سامان اترو۔ اترو۔ یہاں سے دوسری گاڑی پر واپس چلیں گے۔ وہ فائلوں کا بنڈل اتار لینا۔

نجمہ :۔ اس وقت طاہرہ کی رخصتی ہو رہی ہوگی۔ بابل گایا جا رہا ہوگا۔ طاہرہ ڈولے میں بیٹھی ہوگی۔ آگے آگے دولہا ہوگا۔ پیچھے پیچھے شہنائی بج رہی ہوگی۔ براتی ساتھ ہو نگے سارا جہیز سب کے سروں پر رکھا ہوا بستی کا گشت کر رہا ہوگا۔ کسی مضبوط آدمی کے سر پر بڑا سا پاندان ہوگا۔

راشد :۔ ہم ہونگے، ہمارے پیچھے ہماری فائلیں۔ ادھر ادھر قلم۔ پنسل دوات ٹیگس کسی اجڑے ہوئے جہیز کی طرح بکھرے پڑے ہونگے بلکہ یہ ساری چیزیں دفتر بھر کا گشت کر رہی ہونگی۔

نجمہ :۔ آخر یہ اتنی موٹی فائلیں کیسی ہیں؟

راشد :۔ ریکارڈ رکھنے کیلئے سال سے دفتروں کی زینت ہیں۔ اسکے علاوہ بڑے صاحب کا حکم۔

نجمہ :۔ بڑے صاحب کیا کرتے ہیں؟

راشد :۔ عہدہ دار ہیں۔ بڑی بھاری تنخواہ پاتے ہیں۔

نجمہ :۔ اور کچھ نہیں کرتے؟

راشد :۔ اور کیا کرتے؟

نجمہ :۔ یہی کچھ تجارت وغیرہ۔

راشد :۔ کاہے کی؟

نجمہ :۔ فائدہ تو آج کل کاغذ کی تجارت میں بہت ہے۔ یہ جو آپکو بڑی بڑی فائلیں ملی ہیں نا

راشد :۔ (ہنس کر) اچھا۔ یہ میری فائل پر چوٹیں ہو رہی ہیں۔

نجمہ :۔ (رو کر) جی نہیں۔ یہ میرے دل کی چوٹیں ہو رہی ہیں۔ دل کی [illegible] لہجہ میں

یہ ساری فائلیں ردی کاغذ ہیں۔ انہیں جلد برباد کر دو۔ [illegible]

(سسکیوں اور رونے کی آواز)

(منقول از نشرگاہ لکھنؤ)

(بچوں کا صفحہ)

شہزادہ عزیز

(از فیروز الدین احمد)
(جسے اپنے لفظوں میں ادا کیا گیا ہے)

بہت پرانے زمانے کا ذکر ہے کہ ایک بادشاہ تھا۔ ویسے تو خدا نے اُسے بہت کچھ دے رکھا تھا لیکن اسکے ہاں اولاد نہیں تھی۔ آخر ایک دن اُس کی یہ تمنا بھی پوری ہوگئی۔ اور ایک خوبصورت چاند سا بیٹا پیدا ہوا۔ بادشاہ نے اُس کا نام شہزادہ عزیز رکھا۔ شہزادہ بہت ناز و نعم سے پلنے لگا۔ ایک دفعہ بادشاہ شکار کھیلنے گیا۔ بادشاہ نے ایک بہت ہی خوبصورت خرگوش دیکھا اور اُس کے پیچھے شکاری کتے دوڑا دیئے۔ خرگوش بھاگ کر بادشاہ کی گود میں آ بیٹھا۔ بادشاہ نے اُسے چمکارا اور محل میں لے آیا۔ اور خاص اپنے کمرے میں رکھا۔ وہ بہت خوش تھا۔ بادشاہ ابھی سونے نہ پایا تھا کہ ایک آواز آئی "اے رحم دل بادشاہ! بیشک تم رحم کے پتلے ہو۔ میں تم سے بہت خوش ہوں۔ شاباش!!" بادشاہ نے جو آنکھیں کھول کر دیکھا تو خرگوش نہیں تھا۔ اور سامنے ایک پری کھڑی ہوئی تھی۔ اُس نے پری سے پوچھا "اے نیک بخت عورت تم کون ہو؟" پری نے کہا "اے رحم دل بادشاہ میں پری ہوں۔ میں نے تمہاری رحم دلی کے قصے بہت سُنے تھے۔ آخر ایک دن میرے دل میں بھی اُمنگ ہوئی کہ دیکھوں تم کیسے رحم دل ہو۔ اس لئے میں نے اپنی شکل ایک خرگوش جیسی بنالی۔ اور تمہاری شکارگاہ میں آئی۔ اور جب میں نے تم کو ایسا رحم دل دیکھا تو میں تم سے بہت خوش ہوئی۔ تم اپنی کوئی خواہش بتاؤ۔ میں اُسے ضرور پورا کرونگی۔" بادشاہ نے کہا "میرا ایک بیٹا ہے لیکن وہ بہت ضدی۔ میں چاہتا ہوں کہ تم اُسے فرمانبردار بیٹا بنا دو۔" پری نے کہا "یہ تو اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ ہاں اگر اُس نے میری ایک بات مانی تو وہ بالکل ٹھیک ہو جائیگا۔" بادشاہ نے کہا "اچھا"۔

جب بادشاہ مرگیا تو اس کا بیٹا شہزادہ عزیز تخت پر بیٹھا ایک دن پری شہزادے عزیز کے پاس آئی اور تمام کہانی سُنائی۔ پھر کہا کہ اگر تمہارا دل چاہے تو تم میرا کہنا مانو اور اگر دل نہ چاہے تو نہ مانو۔" شہزادہ نے کہا آپ یہ کہکر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ بھلا ایسا ہو سکتا ہے کہ میں آپ کا کہنا نہ مانوں۔ فرمایئے کیا حکم ہے؟" پری نے شہزادے کو ہیرے کی ایک انگوٹھی دی اور کہا کہ تم کوئی بُری حرکت کروگے تو یہ تمہاری اُنگلی میں چبھے گی۔ تم جھٹ سمجھ جانا اور وہ کام چھوڑ دینا۔"

پری تو یہ کہکر چلی گئی۔ اب سُنئے! شہزادہ اپنی رعایا پر بہت مہربان تھا۔ وہ رعایا کو اپنی اولاد کے برابر سمجھنے لگا۔ ایک دن شہزادہ کسی بات پر نوکروں پر خفا ہوا۔ ایک دم انگوٹھی اسکے ہاتھ میں چبھی۔ لیکن شہزادہ نے کچھ پرواہ نہ کی۔ پھر شہزادہ جب اپنے کمرے میں جانے لگا تو اُسکا پیارا کتا خوش ہو کر اُسکی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ شہزادہ کو غصہ کا بھوت تو سوار تھا ہی، اُس نے کتے کے ایک لات ماری —— انگوٹھی اسکے ہاتھ میں پھر چبھی۔ لیکن جب بھی شہزادہ نے کچھ پرواہ نہ کی اور اُس ہیرے کی انگوٹھی کو اُتار کر رکھ دیا۔ اور دوسری ہیرے کی انگوٹھی پہن لی۔ اب شہزادہ عزیز خوب شراب پینے لگا۔ اُس کا اُستاد اس کو شراب اور جوا کھیلنے سے منع کرتا تھا اُس نے (شہزادہ نے) فوج کا ایک دستہ اُس کو پکڑنے کیلئے بھیجا۔ جب شہزادہ اپنے کمرے میں جانے لگا تو اس کمرے کی تمام دیواریں ہلنے لگیں۔ اور تھوڑی دیر میں وہی پری نمودار ہوئی اور کہا "اے عزیز! تم نے میرا کہنا نہ مانا! اچھا۔ اب ہم بھی تم کو پورے طور پر سزا دینگے۔" یہ کہکر پری نے کچھ پڑھا۔ شہزادہ عزیز شیر بن گیا۔ اور پری کے پیچھے غراتا ہوا بھاگا۔ لیکن پری ایک تالاب میں کود کر غائب ہوگئی۔ ایک دن شہزادہ عزیز جنگل میں چلا جا رہا تھا کہ اس کو کچھ گیہوں کے دانے پڑے دکھائی دیئے۔ شہزادہ کو بھوک لگ رہی تھی وہ جھٹ گیہوں کھانے لگا۔ دراصل وہ جال تھا شکاریوں نے جھٹ جال بند کر لیا۔

اب شہزادے کی حالت سُنئے۔ لوگوں نے شہزادہ کے اُستاد کو تخت پر بٹھا دیا۔ لوگ نعرے لگا رہے تھے کہ خدا نے ہم کو ایک ظالم بادشاہ سے نجات دی۔ اور آپ کو ہمارا بادشاہ بنایا"۔ عزیز کے اُستاد نے سب کو چُپ ہونے کا حکم دیا۔ جب سب لوگ چُپ ہو گئے تو عزیز کے اُستاد نے ایک تقریر کی کہ بھائیو! عزیز آپ کا بادشاہ ہے۔ اور مجھکو ایک پری نے خبر دی ہے کہ وہ اب تھوڑے ہی دنوں میں رحم دل ہو کر آئیگا۔

شکاری شیر کو پکڑ کر عزیز کے اُستاد کے پاس لے گئے۔ اُستاد نے اُس کو بارہ ہزار روپے میں خرید لیا۔ ایک دن وہ داروغہ کے پاؤں سے لپٹ گیا۔ اسی وقت شہزادہ کتا بن گیا۔ داروغہ نے اس کو کتا دیکھکر مار کر چھوڑ دیا۔ ایک دن شہزادہ جنگل میں چلا جا رہا تھا اُس نے

…ھا کہ ایک شیر بکری کو کھانا چاہتا ہے شہزادہ نے شیر کو مار ڈالا۔ اُسی …ت شہزادہ ایک خوبصورت کبوتر بن گیا۔ ایک لڑکی اسی خوفناک جنگل …ے پھول چننے آیا کرتی تھی۔ اس نے شہزادہ کو پکڑ لیا اور پال لیا۔ …ب دن شہزادے نے دیکھا کہ ایک کمرے میں ایک چڑیا کا بچہ بھوک …ے مارے تڑپ رہا ہے۔ شہزادے کے منہ میں کچھ گیہوں کے دانے تھے شہزادے نے وہ دانے اس کے منہ میں ڈال دیئے۔ سکینہ بھی اس کو ڈھونڈتی ڈھونڈتی یہاں آنکلی اور اسی وقت پری آئی اور اس نے شہزادے کو کبوتر سے آدمی بنادیا۔

پھر پری نے دونوں کا نکاح کر دیا۔ دونوں اپنے شہر میں پہنچے شہزادہ عزیز تخت پر بیٹھ گیا۔ یہ ہے ایک مختصر سا افسانہ

غزل

(از جناب عبدالباری آسی)

…زل کے دن سے ہیں اہلِ محبت نوحہ خواں اب تک — …ا اپنی جگہ پر ہیں زمین و آسماں اب تک
…ہے معمورِ انقلابوں سے فضائے گلستاں اب تک — کچھ اُجڑے کچھ جلے پھر بن رہے ہیں آشیاں اب تک
…رارِ آتش کدے ٹھنڈے ہوئے اطرافِ عالم میں — مگر ہے شعلہ زن دل میں ہی برقِ طپاں اب تک
…ین کوچۂ قاتل سے اے حشر اُٹھ کے آیا ہوں — مری آنکھوں میں ہے کیفیتِ خوابِ گراں اب تک
…ید کامیابی کو بھی ناکامی سمجھتا ہوں — مسلط ہیں اُجالے پر مرے تاریکیاں اب تک
…حر کو ڈھونڈتا ہوں مستیاں دورِ شبانہ کی — …یا تھی نہ کہ بیٹھے … کہاں اب تک
…بھی اک شمع اُمیدِ وفا میں نے جلائی تھی — …تی شیہ پر چلی آتی ہیں لاکھوں آندھیاں اب تک
…وہ اُمیدِ مستقبل کے دل میں موجزن طوفاں — اُدھر لاکھوں سوالوں پر … ہاں اب تک
…نے کدھر اب جذبۂ توفیق لے جائے — کھڑا ہوں منتظر دیر و حرم کے درمیاں اب تک
…ناز سے کس نے درِ دل پر قدم رکھا — فضا میں گونجتے ہیں نغمۂ فردوسیاں اب تک
…لے گلستاں دیکھ لے داغِ جگر میرے — یہ وہ گل ہے جنہیں چھو بھی نہیں پائی خزاں اب تک
…ہے نہ شمعیں ہیں نہ کوئی سننے والا ہے — مگر ہم ہیں کہ بیٹھے کہہ رہے ہیں داستاں اب تک

نہیں یہ غم کہ چھینے اس نے جذباتِ شباب آسی
بڑا افسوس تو یہ ہے کہ دنیا ہے جواں اب تک

غزل

(حضرت بیخود دہلوی)

بے بادہ پئے نشہ سے سرشار نہ ہوجائے
زاہد کہیں مستِ مئے پندار نہ ہوجائے

ہر شے کی حقیقت سے خبردار نہ ہوجائے
انسان کہیں محرمِ اسرار نہ ہوجائے

بے وجہ عقوبت کا سزاوار نہ ہوجائے
انساں کہیں ناکردہ گنہگار نہ ہوجائے

پھر عشق کہیں طالبِ دیدار نہ ہوجائے
پھر حُسن بھی آمادۂ اظہار نہ ہوجائے

پھر حُسن کا سودا سرِ بازار نہ ہوجائے
دُنیا مرے یوسف کی خریدار نہ ہوجائے

انجامِ محبت سے خبردار نہ ہوجائے
دل ترکِ رہِ عشق پہ تیار نہ ہوجائے

برپا کُن محشر تری رفتار نہ ہوجائے
تخلیق کہیں صور کی جھنکار نہ ہوجائے

پندار کی لعنت میں گرفتار نہ ہوجائے
تو ترکِ گنہ کرکے گنہگار نہ ہوجائے

دل جور کا خوگر ہے تو اندیشہ ہے مجھکو
وہ ترکِ جفا کرکے جفاکار نہ ہوجائے

اس اشک کی کیا حُسن کی نظروں میں ہو وقعت
جو آنکھ سے گِر کر دُرِ شہوار نہ ہوجائے

سرگشتۂ تہذیبِ نوی ہو کے کہیں تو
مشرق کی روایات سے بیزار نہ ہوجائے

اصنام تراشی بعوضِ بُت شکنی کے
اے مُسلمِ ہندی ترا کردار نہ ہوجائے

ہے زندگی دُشوار تو آسان ہے کتنی
آسان جو ہوجائے تو دُشوار نہ ہوجائے

ہنگامۂ تخلیق میں تو جذب ہوئے جا
جب تک کہ ہر اک شے سے نمودار نہ ہوجائے

تنقید نہ کر ہیئتِ تخلیق پر اس کی
تخریبِ دو عالم پہ وہ تیار نہ ہوجائے

تعمیر سے تخریب ہے، تخریب سے تعمیر
اس راز سے معمار خبردار نہ ہوجائے

رنگینی و نیرنگ کے اس دور میں بیخود
پوشاکِ حرم بھی کہیں گلکار نہ ہوجائے

طوفانِ نوح

(ناخدائے سخن تاج الشعراء فصیح العصر حضرت نوح ناروی)

کیا اُن کے تلون سے ہو محفل طرب انگیز
پہلے بنشیں کہتے ہیں، پھر کہتے ہیں برخیز

پھر موسمِ گل میں ہو وہی شکل دل آویز
خالی نہ رہے ساغر و مینا سے کوئی میز

ہر ناز بھی سفاک، ہر انداز بھی خوں ریز
دو چار تو کیا حُسن میں ہیں سیکڑوں چنگیز

پھولوں کو نہیں قطرۂ شبنم سے سروکار
آنکھیں ہیں مری صحنِ گلستاں میں گہر ریز

پیدا ہو مرے دل میں نہ کیوں اور بھی ہیجان
ایک ایک ادا آپ کی ہے ولولہ انگیز

باتوں ہی سے بسمل مجھے کر دیں گے کسی روز
ہے صورتِ شمشیر حسینوں کی زباں تیز

مر جائیں گے بے اُن کے مریضانِ غمِ عشق
دم پر جو بنا دے وہ ہے کس کام کا پرہیز

ڈرتا ہوں نہ انفاس کے پردے کہیں جل جائیں
دل ہے جو شرر گیر تو ہے عشق شرر ریز

انجامِ محبت نے کیا سب کو خبردار
فرہاد تو فرہاد ہے، پرویز تو پرویز

گردن مری قائم نہیں رہنے کی بہر طور
کمزور ترے ہاتھ ہیں، لیکن ہے چھری تیز

میں غم بھی اُٹھا کر نہیں ہوتا کبھی مغموم
جو کام خدا کا ہے وہ ہے مصلحت انگیز

ڈھائے گی نیا قہر تری شوخیِ رفتار
کہتی ہے دمِ سیر قیامت سے کہ برخیز

ممکن نہیں میری نگہِ شوق ٹھہر جائے
جلوہ ہے ضیا پاش، ضیا بار، ضیا ریز

ملنا بھی گلے سے تو وہی صورتِ شمشیر
اللہ رے بے درد کا لطفِ ستم آمیز

کیوں خاک نہ اربابِ وفا کی رہے برباد
دُنیائے غمِ عشق میں چلتی ہے ہوا تیز

اِن مختصر الفاظ میں ہے عشق کی تعریف
تکلیفِ سکوں خیز، نشاطِ الم انگیز

پوچھے کوئی شیریں سے کد و کاوشِ فرہاد
فرہاد سے سمجھے کوئی بے مہریِ پرویز

دونوں کو تری شوخ نظر کر گئی مجروح
ایسا کوئی ناوک نہیں دل دوز و جگر بیز

وہ شوخ بھی کہتا ہے رہو نوح سے ہشیار
طوفان اُٹھانے میں یہ حضرت ہیں بڑے تیز

رباعیات

رُوپ

(از جناب پروفیسر فراق صاحب گورکھپوری ایم۔ اے)

خوشبو کا دھواں، یہ بھیگا بھیگا ہوا نور
جھرمٹ میں گیسوؤں کے جیسے رُخِ حور
لو دیتا ہے رات کے دُھندلکے میں بدن
یا رودِ چمن میں جل رہا ہے کافور

اُٹھنے میں ہمالیہ کی گھٹاؤں کا اُبھار
اندازِ نشست چڑھتی ندی کا اُتار
رفتار میں مدبھری ہواؤں کی سنک
گفتار میں شبنم کی رسیلی جھنکار

گھنگھور اور مست کالی زُلفوں کی گھٹا
اُچھلا اُچھلا جنون صحرا صحرا
بھرپور شباب، لڑکھڑاتی ہوئی چال
اُٹھتی ہوئی موجِ حسن دریا دریا

شبنم سے یہ شعلوں کی جبیں دُھلتی ہے
کرنوں سے یہ کلیوں کی گرہ کُھلتی ہے
یہ رنگ، یہ رس، یہ مُسکراتا ہوا جسم
یا نور کی موجوں میں شفق گُھلتی ہے

نکھری ہے سرا اپنی جگمگاہٹ چھُولے
بیخود رُوح نمو کہ سینہ جھُولے
خلوت گہِ ناز میں سرکتا ملبوس
زرّیں کمر اور جگمگاتے کُولے[1]

---

[1] فراق گورکھپوری کی جمالیاتی یا سنگھار رس کی رباعیوں کے اس مجموعے کا ایک ورق جو سنگم پبلشنگ ہاؤس الہ آباد سے شائع ہو رہا ہے۔

چلے گئے

از جناب سروش عسکری طباطبائی

آغوشِ انتظار میں آ کر چلے گئے
دنیائے اعتبار کو ڈھا کر چلے گئے

دل اور نظر کی پیاس بجھا کر چلے گئے
تن من میں ایک آگ لگا کر چلے گئے

میرے جنوں کی تاب نہ لا کر چلے گئے
نمناک انکھڑیوں کو جھکا کر چلے گئے

روئے تمہیں پہ ڈالے ہوئے مقنعِ سیاہ
بدلی میں ایک چاند چھپا کر چلے گئے

کیونکر کٹیں پہاڑ سے اب یہ سیاہ دن
راتوں کو تابناک بنا کر چلے گئے

سینے میں ایک حشر کی بنیاد ڈال دی
تمکین کی بساط اٹھا کر چلے گئے

ہر شعبۂ حیات سے بیگانہ کر دیا
عقل و نظر پہ دام بچھا کر چلے گئے

رسوائے اضطرابِ مسلسل بنا دیا
پندارِ ضبطِ عشق مٹا کر چلے گئے

ہلچل ہے اب بھی روح میں جسکے نشید سے
وہ نغمۂ لطیف سنا کر چلے گئے

اڑ جائے جن کے ذکر سے چشمِ فلک کی نیند
وہ خوابِ دل فروز دکھا کر چلے گئے

تلچھٹ ہے جسکی ساغرِ خورشید و ماہ میں
ہونٹوں سے وہ شراب پلا کر چلے گئے

شورش کدہ حیات کا سنسان کر دیا
تنہائیوں میں دھوم مچا کر چلے گئے

سانسوں میں آ رہی ہے ابھی تک قدم کی چاپ
سینے کی دھڑکنوں میں سما کر چلے گئے

اِک بار جھنجھنا اٹھے سب زندگی کے تار
ایسی بھی اِک نگاہ ملا کر چلے گئے

جس سمت آنکھ اٹھائیے اک کمی سی ہے
ہر جزوِ کائنات پہ چھا کر چلے گئے

ہر لذتِ حیات سے محروم کر دیا
احساس کا چراغ بجھا کر چلے گئے

اوراک سے لطافتِ تمیز چھین لی
قیدِ حیات و مرگ اٹھا کر چلے گئے

سادہ ورق بنا دیا دفترِ خیال کا
دنیا و دیں کے نقش مٹا کر چلے گئے

اب اور کچھ انہیں کے سوا سوجھتا نہیں
نظروں سے ہر حجاب اٹھا کر چلے گئے

اپنے صنم کدے کو بصد نازِ کافری
کعبۂ دلِ سروش کا ڈھا کر چلے گئے

غزل

(خان صاحب جناب حکیم محمود علی خاں صاحب ماہر اکبر آبادی)

یہ تاثیرِ آہ و فغاں دیکھتا ہوں
ستم گار کو مہرباں دیکھتا ہوں

تری یاد سے دل ہے آباد میرا
تجھے ہر نفس میں، رواں دیکھتا ہوں

یہی حاصلِ لطفِ عمرِ ابد ہے
ترے درد کو جاوداں دیکھتا ہوں

یہ کیا تیری بے مہریاں رنگ لائیں
خدائی کو نا مہرباں دیکھتا ہوں

فریبِ نظر ہے یہ حسنِ گلستاں
بہاروں میں رنگِ خزاں دیکھتا ہوں

تجلّی محبّت کی شاید جلا دے
وہ پردہ جسے درمیاں دیکھتا ہوں

فریبِ محبّت کے پردے میں ماہرؔ
زمانے کی بے مہریاں دیکھتا ہوں

مزاحیہ غزل

از جناب ایس سریہ صاحب بی ایس سی

تلاشِ حق میں کچھ حاصل نہیں یکسوئیِ دل سے — حقیقی روشنی لے لو ضمیر فیشن ایبل سے — 1. Fashionable.

اطبا ہو گئے لاچار نبضِ بعج بسمل سے — فضائے زندگی سدھری نہ منضج سے نہ مسہل سے

سوادِ چشمِ مضطر نے بنائی ابر ہے کاذب — لپ اسٹک لے اڑی سرخی دہانِ زخمِ بسمل سے — 2. Lip stick.

سنا ہے قیس کو بھی طور کا جلوہ نظر آیا — بلیک آؤٹ میں لیلیٰ جو جھانکی اپنے محمل سے — 3. Black-out.

کہاں پہنچائیگا یارب، یہ شوقِ آتشِ سوزاں — نشیمن پھونک کر پھرتے ہیں ہم آلو خصائل سے

کجا بو، داغہائے معصیت تک صاف ہو جائیں — عزیزو غسلِ میت چاہیے مجھکو فنائل سے — 4. Phenyl.

عجب گردش میں رکھتا ہے مرا ذوقِ سنیمائی — ستاروں کی ہوس میں ہم رہوں ہیں ماہِ کامل سے — 5. Film stars

چھپا دی کوٹ پتلون نے مری بے مائیگی ساری — پتہ چلتا کہاں ہے حال کا بیہودہ لیبل سے — 6. Label.

ہزاروں میکدوں کی آبرو پر حرف لاتی ہے — صدا پیدا جو ہوتی ہے شکستِ شیشۂ دل سے

گراں تھا بارِ احسانِ ناخدا کا طبعِ نازک پر — ڈبو دی اپنی کشتی ہم نے خود ٹکرا کے ساحل سے

مری جانِ حزیں کا حال، قصہ مختصر یہ ہے — رہی مشکل میں، ہے مشکل میں، اور نکلیگی مشکل سے

یہ کس کا خونِ ناحق ہے، یہ کیسا خونِ ناحق ہے — ٹپکتا ہے لہو اب تک زبانِ زخمِ بسمل سے

خیال آتے ہی چشمِ بتاں نے کر دیا تفتہ — نکلتی مشک کی خوشبو رہیگی نافۂ دل سے

7. Speech. زمانے میں جنہیں اک زعم تھا اسپیچ بازی پر — دمِ آخر وہ کہکر رہ گئے دو اک سلیبل سے — 8. Syllable.

اچھا ہوں مطلق زیرِ بارِ میتِ عصیاں — سفر ملکِ عدم کا ہے جو راہ موٹرایبل سے — 9. Motorable.

حساب آتا نہ تھا جنکو، وہ حوروں میں بھی جا بیٹھے — ریاضی داں رہے محشر میں لپٹے لوگ ٹیبل سے — 10. log table.

11. High Power bulb. لگانا ہائی پاور بلب، یارو میری تربت پر — جلیگی شمعِ ایماں اب نہ کیروسین آئل سے — 12. Kerosene oil.

مری تاریکیِ قسمت کا حاصل بھی رہا اچھا — بلیک آؤٹ میں نکلیں گے کیونکر وہ مرے دل سے

13. Mussoorie hill station. مسوری پر سرِ سیر آ رہے ہیں ٹھنڈی ہواؤں میں — مزے اب یاد آتے ہیں نکلکر چارلی ول سے — 14. Charli ville, best hotel in Mussoorie.

غزل

(سراج الشعراء حضرت سراج لکھنوی)

اے برق کاش آگ لگے تیری چال میں — اک روح تھی ہر آئینے پائمال میں
ہم اپنے حال میں ہیں تو دل اپنے حال میں — آنکھوں میں اشک ہیں تری تصویر خیال میں
جنبش ہے کسکے پردۂ حسن و جمال میں — اک برق سی جو کوندی ہے خیال میں
ہر زخم دل ہے عہد محبت کی یادگار — جی چاہتا ہے دیر لگے اندمال میں
وہ بے خبر ہے کہ ڈھونڈنا تیرا تو درکنار — خود کھویا جا رہا ہوں ہجوم خیال میں
کچھ اور مانگنا مرے مشرب میں کفر ہے — لا اپنا ہاتھ دے مرے دست سوال میں
ان آنسوؤں میں رنگ تبسم بھی گھول دے — ظالم کوئی مزا بھی تو آئے ملال میں
اس دل میں آہ تیری سمائی نہ ہو سکی — دنیا سمٹ کے آگئی میرے خیال میں
آواز دے کہاں ہے نشاط مآل — ہوں مبتلا ازل سے غم لازوال میں
ظالم یہاں بھی آکے چلاتا ہے اپنا حکم — میری جگہ نہیں مری بزم خیال میں
ہاں تمکو بھول جانیکی کوشش کرینگے ہم — تم سے بھی ہوسکے تو نہ آنا خیال میں
سامان صد حیات اسی محویت میں ہے — یہ دم نکل رہا ہے کسی کے خیال میں
آئینہ کیا جو گرد کدورت میں دفن ہو — اب منہ نہ دیکھئے دل حسرت مآل میں

تہمت جنوں کی مجھکو گوارا مگر سراج
وہ عشق کیا رہے جو حد اعتدال میں

غزل

(جناب کنور مہندر سنگھ صاحب بیدی سحرؔ پی، سی، ایس)

عشق نے ہر کسی کو مارا ہے — کچھ مداوا نہ کوئی چارا ہے
موت آجائے تو ملول نہ ہو — بحرِ غم کا یہی کنارا ہے
بارہا آپ کے تصوّر میں — وقت گذرا ہوا گذارا ہے
اس اچٹتی نگاہ کے قرباں — ڈوبتے کو تجھے ابھارا ہے
دل تو ہم نے دیا قصور اس میں — کچھ تمہارا ہے کچھ ہمارا ہے
قہر جب تک ترا قبول نہ ہو — لطف بھی تیرا ناگوارا ہے

یہ ہوا یہ گھٹا یہ ابر سحرؔ
کوئی سمجھے تو اک اشارا ہے

خبر نہیں ہے کیا تمہیں؟

(از محترمہ گوہر اقبال حور زبیری)

خبر نہیں ہے کیا تمہیں بہار آ گئی ہے پھر؟
وہ بن کے ابرِ مے فشاں جہاں پہ چھا گئی ہے پھر؟

ترانے بلبلوں کے دردِ عشق سے بھرے ہوئے
پیام ہائے سحر زا نہیں ہیں کیا بہار کے؟

حسین سبزہ زار، یہ نکھار برگ و بار کا
یہ راگنی میں ڈوب کر خرام جوئے بار کا

یہ پھول رنگ رنگ کے روش روش کھلے ہوئے
ستارے سبز پتّیوں میں جیسے ہوں جڑے ہوئے

فضا کے راستوں میں جگنوؤں کی زر فشانیاں
گھٹا کی سیاہ دیویوں کی یہ گہر فشانیاں

یہ رقص ننھی ننّھی تیتریوں کا کیفِ حُسن سے
کہ جیسے برگِ گُل ہوا میں ہر طرف بکھر گئے

دھنک یہ آسمان پر کہ ہے نشاطِ ہر نظر
کہو، یہ سب نہیں ہیں کیا، بہار کے پیامبر

مئے بہار جامِ گل میں کیا نہیں ہے جلوہ گر؟
بہار آ گئی ہے پھر، تمہیں یہ کیوں نہیں خبر؟

میں جانتی ہوں، تم کو علم ہے بہار آ گئی
جہانِ رنگ و بُو لئے چمن چمن وہ چھا گئی

مگر تمہیں یہ خوف ہے، میں سازِ غم نہ چھیڑ دوں
تمہاری محفلِ طرب سے اُٹھ نہ جائے پھر سکوں

کہیں تمہیں جگا نہ دوں میں اپنے پریم راگ سے
کنول تمہارے دل کا جل اُٹھے کہیں اس آگ سے

اِسی لئے اب اس قدر خموش ہو رہے ہو تم
سمجھ لوں میں نہ جانے کب سے یوں ہی سو رہے ہو تم

فلمستان

موجودہ فلمیں اور شعرائے کرام

از جناب عزیز سورتی

ناطق فلموں کی ابتدا سے اردو ہندی کے ادیبوں اور شاعروں کا فلم کمپنیوں میں شروع ہوگیا ہے۔ خاموش فلموں کے زمانے میں ایکٹر یس، ڈائرکٹر، کیمرہ مین اور بعض دوسرے عملہ کی ضرورت تھی۔ لیکن بولتی یں میں علاوہ مندرجہ بالا افراد کے ریکارڈسٹ، مکالمہ نویس، شاعر اور یقی ڈائرکٹر کی ضرورت پیدا ہوگئی اور حقیقت یہ ہے کہ ان سب کی اہمیت انکار نہیں کیا جاسکتا۔ صنعت فلم سازی کو فروغ دینے میں بلاشبہ آج کل عروں کا پلہ بہت بھاری ہے۔ ایک ہندستانی فلم کی کامیابی کا پچاس فی صدی دارومدار اس کی موسیقی پر ہے۔ اور اسی وجہ سے ہر دل عزیز شاعروں اور یبوں کی مانگ فلم مارکیٹ میں تیزی سے بڑھ رہی ہے۔

شروع شروع میں پروڈیوسر اور ڈائرکٹر شاعروں اور ادیبوں طرف سے بے پرواہ رہے۔ انہیں اس امر کا احساس نہ ہوا کہ آخر کار ہمیں ان افراد کی امداد اور رہنمائی ناگزیر ہوگی۔ اس وقت تو معمولی منشیوں اور پنڈتوں اوٹ پٹانگ گیت لکھوائے جاتے تھے۔ علی الخصوص بمبئی ٹاکیز میں مسٹر شیپ اور نیو تھیٹرز میں کیدار شرما فلمی گیت لکھنے میں مشہور ہوگئے لیکن بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مشہور ادیبوں اور شاعروں کی خدمات حاصل نے میں پہل بمبئی ٹاکیز اور مسٹر پردیپ نے کی۔ مسٹر پردیپ نے ایک دور کی ابتدا کی اور ان کے رسیلے گیت پبلک کی زبان پر چڑھ گئے۔ ان کے بیت "کنگن" سے شروع ہو کر "قسمت" تک پہنچے۔ پرکاش اور بہت سے مشہور فلمی اداروں سے ناکامیابی اور مایوسی ملنے پر بھی مسٹر پردیپ کو یہ عروج حاصل کرنے میں ہمانسو رائے کی ذات کو بہت بڑا دخل ہے۔

رفتہ رفتہ پروڈیوسروں کی آنکھیں کھلیں اور ادیبوں اور شاعروں کا داخلہ فلمی اداروں میں شروع ہوگیا۔ اور اس طرح بہت سے نامی ادیب اور شاعر فلمی دنیا میں آگئے۔

لیکن خاص قابل توجہ سوال یہ ہے کہ یہی ادیب اور شاعر جو آسمان علم و ادب کے ستارے ہیں۔ ان کی چمک دنیائے فلم میں آکر ماند کیوں پڑگئی؟ ایک بڑے طبقہ کا خیال تھا کہ ان لوگوں کی شمولیت سے فلموں کا معیار بلند ہو جائے گا۔ لیکن بجائے بلندی کے پستی کی طرف کیوں جا رہا ہے؟

اس کی خاص وجہ تو یہ ہے کہ ان لوگوں کو فلم کے متعلق پوری طرح واقف نہیں کیا جاتا۔ یا پھر ڈائرکٹر عام مقبولیت کی خاطر ان سے بازاری گیت لکھواتے ہیں۔ اور اس طرح وہ خود اپنی ساکھ اور شہرت پر ضرب کاری لگاتے ہیں۔ اس قسم کے ہلکے بازاری گیت لکھنے کے لئے یہ لوگ صرف اس وجہ سے تیار ہو جاتے ہیں کہ ان کی دماغی کاوشوں کے صلہ میں جو رقم انہیں مل سکتی ہے اس سے دس بیس گنا زیادہ روپیہ فلم ساز کمپنیاں ادا کرتی ہیں۔ مسٹر پردیپ کو اگر ایک فلم کے گیت لکھنے کا معاوضہ دس ہزار روپیہ ملتا ہے تو اس سے شاعر کی شان اور اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ شاعروں کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اصل مقصد سے ہٹ کر محض پروڈیوسروں اور ڈائرکٹروں کے اشاروں اور مرضی پر چلنا دنیائے ادب و شعر کے خلاف کھلی بغاوت ہے۔

"نل دمینتی" کے گیت لکھنے والے سومترانندن پنت "لکشمن" یا "من کی جیت" کے شاعر حضرت جوش ملیح آبادی اسی زد میں آجاتے ہیں۔ اور اپنی راہ سے ہٹ جاتے ہیں جس کیلئے خود وہ اور پروڈیوسر ذمہ دار ہیں۔ ضرورت تو یہ ہے کہ شاعر اپنے معیار کے مطابق لکھیں اور پروڈیوسر انکی شہرت اور عزت کے لحاظ سے مناسب موقعہ محل پر ان گیتوں کو شامل کرلیں۔

اسی طرح اگر شاعر اپنی شان سے گرنا نہیں چاہتے تو وہ روپیہ کی نسبت اپنے فن کے پابند رہیں۔ ساتھ ہی ساتھ پروڈیوسروں اور ڈائرکٹروں کا بھی فرض ہے کہ وہ بازاری مذاق کی پرواہ نہ کریں اور حتی الامکان اعلےٰ فلمیں پیش کرنے میں ادیبوں اور شاعروں سے فنی خدمات حاصل کریں۔

فلمی دُنیا کا انقلاب

(از جناب عزیز سوقی)

۱۹۴۲ء سے قبل فلمی دُنیا کی یہ حالت تھی کہ سینکڑوں فلم کمپنیاں کھلتی تھیں اور بغیر فلم تیار کئے موت کی آغوش میں پہنچ جاتی تھیں۔ اور بیچارے فلم سازی کے شوقین سرمایہ داروں کی تلاش میں ناکام ہو کر تھک کر بیٹھ جاتے تھے۔ اس کے بعد جب جنگ کی بدولت سرمایہ داروں کی دولت میں اضافہ ہوا اور کاروباری امور پر مختلف قسم کی سرکاری پابندیاں عائد کر دی گئیں تو سرمایہ داروں کی توجہ فلم سازی کی طرف مبذول ہوئی۔ سرمایہ داروں کا فلم سازی کی طرف متوجہ ہونا تھا کہ فلمی دُنیا بھی بلیک مارکیٹ میں تبدیل ہو گئی۔

چنانچہ جب حکومت کو یہ اطلاع ملی کہ خام فلموں کی قیمت بلیک مارکیٹ میں بیس گنی ہو گئی ہے تو اس طرف توجہ دی اور فلم کی بلیک مارکیٹ کو ختم کر دیا۔ لیکن ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ یار لوگوں نے نئی ترکیب سوچی اور لائسنسوں کی بلیک مارکیٹ چلا دی۔ کہا جاتا ہے کہ بلیک مارکیٹ میں لائسنس کی قیمت دو لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔

آرٹسٹوں نے جب یہ دیکھا کہ لائسنس کی قیمت دو لاکھ ہو گئی ہے تو اُنہوں نے بھی اپنا بھاؤ بے تحاشا بڑھا دیا اور اتنا بڑھایا کہ خود ان کے وہم و گمان نے بھی کبھی یہ اندازہ نہیں کیا تھا کہ ان کی زندگی میں ایک ایسا زریں دور آنے والا ہے۔

مختصر یہ کہ دوران جنگ میں صنعت فلم سازی خالص طلب زر کا ذریعہ بن گئی۔ فلم سازوں نے ذلیل سے ذلیل تصویر پیش کرنے کے باوجود دونوں ہاتھوں سے خوب دولت بٹوری۔ لیکن اب حکومت نے یہ اعلان کر دیا ہے کہ ۱۹۴۵ء کے اختتام کے ساتھ ہی فلم سازی پر عائد شدہ پابندیوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔

اِس اعلان نے فلم انڈسٹری میں تہلکہ برپا کر دیا ہے۔ خصوصاً ان لوگوں کے تو یہ خبر سُنکر حواس اُڑ گئے جو بلیک مارکیٹ چلا رہے تھے یا بلیک مارکیٹ کے دلال تھے۔ نیز وہ لوگ بھی حواس باختہ نظر آرہے ہیں جو فلمی کاروبار کو صرف اور خالص طلب منفعت کا ذریعہ بنائے ہوئے تھے اور کسی نہ کسی عنوان سے کثیر دولت حاصل کر رہے تھے۔

ظاہر ہے کہ اب اختتام جنگ کے بعد قدرتی طور پر پھیلا ہوا روپیہ سمٹتا جائے گا۔ روپیہ کی قیمت روز بروز بڑھے گی اور سرمایہ دار ہر قدم پھونک پھونک کر رکھیں گے۔ محتاط ہونگے۔ آمدنیاں کم ہو جائینگی۔ معمولی تصویریں جو سلور، گولڈن، ڈائمنڈ اور نہ جانے کیا کیا جوبلیاں مناتی تھیں اب دو تین ہفتے بھی مشکل سے چل سکے گی۔ اور سال بھر میں صرف بہترین ———— دو چار تصویروں کی سلور جوبلی ہو سکے گی ورنہ وہ بھی نہیں۔ کیونکہ ایک طرف لوگوں کی آمدنی کم ہو جائیگی اور دوسری طرف شہر کی آبادی بھی گھٹے گی۔ اس طرح یقیناً تھیٹروں کی رونق خود بخود کم ہوتی جائیگی۔ چنانچہ جب تصاویر کی آمدنی کم ہو گی تو لاگت بھی کم کر دی جائیگی اور اتنی کم کہ لاکھوں سے گھٹ کر ہزاروں پر پہنچ جائے گی۔ ایسی صورت میں یا تو وہ آرٹسٹ جو مُنہ پھاڑ کر معاوضہ طلب کرتے ہیں یا تو فلم انڈسٹری کو خیرآباد کہہ دینگے ورنہ روپے کی بجائے پیسوں پر کام کرنے کیلئے تیار ہو جائیں گے۔

مختصر یہ کہ ۱۹۴۶ء فلمی دنیا کا انقلابی سال ہوگا۔ ممکن ہے کہ ابتدائی فلموں پر بھی طلب منفعت کی خواہش غالب رہے اور یقیناً رہیگی۔ البتہ تجربات فلم سازوں کو بہت جلد خواب غفلت سے بیدار کر دیں گے اور اپنی تصاویر سے لاکھوں روپے پیدا کرنے والے فلم ساز مجبور ہونگے کہ وہ بہتر سے بہتر تصویر بنائیں تاکہ ان کو کم از کم ہزاروں تو مل جائیں۔

سردست فلم سازوں کا جو ہنگامی پروگرام سُنا جا رہا ہے وہ قطعی ہنگامی ہے اور جسے اُن کے ذوق فلم سازی کی تبدیلی بھی کہا جا سکتا ہے مگر یہ بھی یقین ہے کہ یہ حالت دیرپا ثابت نہیں ہو سکے گی۔ اور حالات جلد ہی رو بہ اصلاح ہو جائیں گے۔

بہرصورت ہم اُن لوگوں کو مبارکباد دیتے ہیں جو مدت سے فلم سازی پر عائد شدہ پابندیوں کے منسوخ ہونے کا انتظار کر رہے تھے اور ساتھ ہی ان سے مخلصانہ طور پر اپیل کرتے ہیں کہ وہ فلم انڈسٹری میں شامل ہونے کے بعد ایسی تصاویر تیار کریں جس پر ملک و قوم کو بجا طور پر فخر ہو سکے۔

ہندستانی فلمساز متوجہ ہوں!

دوسری عالمگیر جنگ ختم ہو چکی ہے۔ جنگ کی وجہ سے ہر چیز کے ام چڑھے ہوئے تھے۔ لوگوں کی آمدنی بھی بڑھی ہوئی تھی۔ ہر شخص کے پاس وپیہ تھا۔ اور فرصت کے وقت میں تفریح کرنی چاہتا تھا۔ اب بیکاری کا دور رہ شروع ہوگا۔ لوگوں کی آمدنی کم ہوگی۔ پہلے جس شخص کی چار روپیہ روزانہ مدنی تھی، ایک روپیہ رہ جائیگی۔ پہلے جو روپیہ عیش و تفریح پر صرف کرتا تھا، ہیں کریگا۔ جنگ کے زمانہ میں ہندستانی تصویروں کے معیار کو جتنا گرایا گیا ہے نا ید کبھی بھی اتنا نہیں گرایا جائیگا۔ فلمی صنعت پر زیادہ تر سرمایہ داروں کا بضہ ہے اور سرمایہ دار کی ذہنیت روپیہ کمانے کے سوا کچھ نہیں۔ روپیہ کا لالچ تنا برا ہے کہ ملک و قوم کسی کا بھی خیال نہیں رہتا۔ روپیہ کے لالچ میں آکر انسان لمفروشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ یہ وبا صرف ہندستان میں ہی نہیں۔ یورپ ں بھی ہے۔ خود انگریزوں میں "لارڈ ہاہا" نے جرمنوں سے روپیہ لیکر انگلستان لخلاف پروپیگنڈا کرنا شروع کر دیا اور سرمایہ دار تو خیر پیدائشی روپیہ کا لالچی وتا ہے۔ سرمایہ داروں کو اس بات کا علم تھا کہ جنگ میں لوگوں نے کافی روپیہ کمایا ہے۔ اور روپیہ آجانے کے بعد تفریح اور عیش و عشرت سے بچکر نکلنا بہت مشکل ہے۔ سنیما تفریح کا ایک جزو بن چکا ہے اور زیادہ تر لوگ تمام کو اپنا وقت سنیما ہال میں ہی گذارتے ہیں۔ یہ بحث نہیں ہے کہ تصویر کیسی ہے۔ مطلب تو قت گذارنے سے ہے۔ اب چونکہ شہر میں سنیما ہال گنے چنے ہیں اور آبادی یادہ ہے۔ اس لئے ہر ہفتہ ہر سنیما کا ایک پکچر ضرور پر ہو جاتا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ ایک تصویر جو جنگ سے قبل چار ہفتہ یا آٹھ ہفتہ چلا کرتی تھی، پندرہ میس ہفتے چلنے لگی۔ پہلے جسکی آمدنی چالیس ہزار ہوتی تھی اب اسّی ہزار اور ایک لاکھ لک ہونے لگی۔ ڈسٹری بیوٹر ہر قیمت پر تصویر کو خریدنے کیلئے تیار ہو گیا۔ ہندستان میں فلمسازوں کی تعداد گنی چنی ہے اس وجہ سے فلمساز منمانی قیمتوں کا مطالبہ کرنے لگے۔ اور چنانچہ ان کی مرضی کے مطابق روپیہ بھی ملنے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر فلمساز اس کوشش میں مصروف نظر آنے لگا کہ جلد از جلد تصویر تیار کر کے مارکیٹ میں بھیجے۔ اداکار جنکی تعداد بھی گنی چنی ہے، نخرے کرنے لگے۔ جنگ سے قبل جن کو چند سو روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی، ملازمت چھوڑ کر آزادانہ طور پر کمپنیوں سے کنٹریکٹ کرنے لگے۔ اور ان کی قیمت ہزاروں تک پہنچ گئی۔ بعض نے اتنی ترقی کی کہ ان کی قیمت لاکھوں تک پہنچ گئی۔ اسکا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر اداکار ایک وقت میں چار چار بلکہ آٹھ آٹھ تصویروں میں ایک وقت کام کرنے لگا۔ یہ قدرتی چیز ہے جب ایک اداکار کو دن میں چار جگہ جاکر کام کرتا ہو تو اس کا دھیان ٹھیک طور پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور اب وہ اداکاری کرنے کی بجائے وقت پورا کرنے کی کوشش کرنے لگا جس کی وجہ سے سٹریل اور گھٹیا قسم کی تصویریں آنے لگیں۔ اور ہماری تصویروں کا معیار اتنا گر گیا جسکی انتہا نہیں۔ اس بات کی سرمایہ دار کو کیا پرواہ۔ اس کی تو تصویر چل رہی ہے۔ روپیہ آرہا ہے، اس کی بلا سے۔

یہ تو تھا جنگ کا زمانہ، مگر اب جنگ بند ہو چکی ہے۔ اب لوگوں کی آمدنی نہیں رہی۔ جو جنگ کے زمانہ میں تھی۔ اور اب اس طرح ایک ہی سنیما ہال پر تصویر جم کر نہیں رہ جائیگی۔ اب وہی تصویر عوام میں مقبول ہوگی جو کسی مقصد سے تیار کی گئی ہوگی۔ اب "یتیم"۔ "اندھیرا" "آتشیں دار" اور "سنجوگ" جیسی تصویریں نہیں چلیں گی۔ اگر اس قسم کی تصویریں اب مارکیٹ میں آئیں گی تو نمائش ہونے سے قبل رخصتی کا انتظام کر کے آئیں گی۔

غیر ممالک کے لوگ جہاں کہیں بھی جاتے ہیں وہاں جاکر ملک کی تجارت کو فروغ دینے کے ذرائع پر غور کرتے ہیں۔ جنگ کے دوران میں جو امریکن فوجی ہندستان آئے تھے تو ان لوگوں نے خوب اچھی طرح محسوس کیا کہ ان کے ملک کی طرح ہندستان میں بھی فلمی صنعت مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔ چنانچہ انہیں میں سے بعض نے اپنے ملک والوں کو رائے دی کہ اگر امریکہ والے ہندستان میں فلم لائن کو فروغ دیں تو بہت کامیاب ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ امریکہ کے بڑے بڑے فلمی تاجروں نے ایک پروگرام تیار کیا ہے کہ پہلے ہندستان کے ہر بڑے شہر میں سنیما ہال کھولے جائیں۔ اس طرح سے ملک میں بہترین سنیماؤں کا جال بچھا دیا جائے۔ اس کے بعد اپنے ملک کی بہترین رنگین و دوسری تصویروں

کو ہندستانی زبانوں میں تبدیل کر کے نمائش کیلئے پیش کیا جاتے گیا مرتو مسلہ ہے کہ امریکی فلمساز ہندستان سے بدرجہا بہتر تصویریں تیار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا اداکاری، عکاسی اور تکنیک کا معیار بہت بلند ہے۔ اس وجہ سے اگر امریکی تصویریں ہماری زبان میں تیار ہو کر آنے لگیں تو موجودہ دور کی ہندستانی فلمیں ان کے مقابلہ میں حقیر ہونگی۔ اور لازمی ناکام ہونگی۔

اسی وجہ سے ہندستانی فلمسازوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ انہیں اب گھٹیا قسم کی فضول اور لغو تصویریں تیار کرنی بند کر دینی چاہئیں۔ جو تصویر بھی تیار ہو اس کے تحت میں کچھ نہ کچھ مقصد قومی ہونا چاہیئے۔ تاکہ آئندہ آنیوالی نسلیں انہیں دیکھیں اور سبق حاصل کریں۔ جس طرح روسیوں نے فلموں کے ذریعہ عوام کو جگایا۔ اور اپنے ملک کی حفاظت کیلئے سب کو ایک جگہ کیا۔ اسی طرح ہماری تصویریں اتحاد کا پیغام لے کر ہر دو قوم پر پیش ہوں۔ ہندو مسلم اور ہندی اُردو کے جھگڑوں کو ختم کر کے ملک کو آزادی کی راہ بتائیں۔

اگر ہندستانی فلمساز سچے دل سے یہ تہیہ کر لیں کہ جو تصویر بھی تیار ہوگی وہ ہندستان کی آزادی اور سوئے ہوئے لوگوں کو جگانے کے لئے تیار ہوگی۔ اور آپس کے جھگڑوں کو ختم کرنے کے لئے ہوگی تو وہ دن دُور نہیں جب آزاد ہندستان میں آزاد تصویریں چلا کریں گی۔

نہ سمجھوگے تو مٹ جاؤگے اے ہندستان والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

کشمیری گیٹ سے اُردو پارک تک

دہلی میں ان دنوں بہت اچھی تصویریں چل رہی ہیں۔ آیئے کشمیری گیٹ سے شروع کرتے ہیں۔ اور شہر کا چکر لگاتے ہوئے جامع مسجد تک چلتے ہیں۔

رٹز سنیما میں گذشتہ چھ ہفتوں سے پرکاش پکچرز کی لاجواب جذبۂ حب الوطنی سے بھرپور تصویر وکرمادتیہ دکھائی جا رہی ہے۔ بکرماجیت سوریہ خاندان کا مشہور شہنشاہ تھا۔ اس نے آپس کی خانہ جنگی کو ختم کر کے ایک مضبوط مرکزی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ پرکاش پکچرز نے نہایت خوب طریقے سے بکرماجیت کی زندگی کو پیش کیا ہے۔ بکرماجیت کا پارٹ مشہور کیریکٹر ایکٹر پرتھوی راج نے ادا کیا ہے۔ کالی داس پریم ادیب ہے۔ اور بکرماجیت کا وزیر اعظم ایشور لال بنیاد ثابت کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ رتن مالا اور انجنا نے کام کیا ہے۔ سب اداکار اپنی جگہ خوب ہے۔ تصویر نہایت کامیاب ہے۔

منروا سنیما میں فیمس فلمز کی مسلم معاشرتی تصویر **پھول** دکھائی جا رہی ہے۔ "پھول" پہلی تصویر ہے جس میں ایک درجن سے زائد چوٹی کے اداکاروں نے بیک وقت کام کیا ہے۔ "پھول" کی کہانی خالص اسلامی ماحول کو پیش کرتی ہے۔ ایک زمانے میں جو ہندستانی ڈاکٹروں کا وفد ترک مجروحوں کی مدد کے لئے ترکی گیا تھا، اس سے تعلق رکھتی ہے۔ پرتھوی راج کا کام بطور ڈاکٹر سلیم کے خوب ہے۔ مظہر خاں کی اداکاری قابل تعریف ہے۔ درگا کھوٹے ایک خاص انداز سے پیش ہوئی ہے۔ ستارہ ترکی رقاصہ کے روپ میں خوب ہے۔ واسطی اپنے رہی بگڑے ہوئے رئیس کے رنگ میں آئے ہیں۔ یعقوب بھی خوب رہے ہیں۔ اسماعیل کو ترکی حکیم کا معمولی سا کام ملا ہے۔ وجید بھی حکیم جی ہیں۔ جلو کی اداکاری قدرتی اور جذباتی ہے۔ وینا بہت خوب رہی ہے۔ ثریا ایک ہندو سہیلی کے رول میں اچھی رہی ہے۔ موسیقی غلام حیدر کی ہے۔ ہدایات آصف کی ہیں۔ کہانی نگار کے شہرت یافتہ کمال امروہوی نے لکھی ہے۔ تصویر کافی مقبولیت حاصل کر رہی ہے۔

ناولٹی سنیما میں **رتن** ۲۱ ہفتوں سے متواتر دکھایا جا رہا ہے۔ "رتن" کی موسیقی نے دہلی والوں کو بالکل دیوانہ بنا رکھا ہے۔ جس کو دیکھو "رتن" کے گانے گنگناتا ہوا جا رہا ہے۔ ریڈیو پر، مائکروفون پر جدھر دیکھو "رتن" کے گانے بج رہے ہیں۔ غرضیکہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے تمام دہلی میں "رتن" والوں ہی کی اجارہ داری ہے۔ امید ہے "رتن" سلور جوبلی منائے گا۔

دہلی ٹاکیز میں کاردار پروڈکشنز کا تیار کردہ گیت چل رہا ہے
گیت میں نرگا اور ساہو مودک نے کام کیا ہے۔ اسے کاردار کے
دوسرے ضعیف ٹیلیس یو۔ شی نے تیار کیا ہے۔ مگر رتن کے مقابلے
میں ٹھیر نہیں سکتا ہے۔ خیر کوشش جاری رکھئے۔ ہمت سے کام لے
ایک دن ایم صادق کے پایہ کو پہنچ جائیگا۔

میجسٹک سنیما میں سال رواں کی بہترین تصویر ہمایوں،
جس کا ایک عرصہ سے انتظار تھا، نمائش ہو رہی ہے۔ "ہمایوں" پہلی تصویر
ہے جس کے لئے اتنی بے چینی سے انتظار کیا گیا ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ
چند خود غرضوں نے جن کو اشتہار نہ ملے یا اشتہار کی قیمت ان کی مرضی
کے مطابق نہ مل سکی "ہمایوں" کی مخالفت میں صفحے کے صفحے سیاہ کر ڈالے
اور یہاں تک کہہ دیا کہ محبوب ان پڑھ ہیں۔ ان کی تاریخی معلومات کم ہیں۔
اس وجہ سے "ہمایوں" تاریخی نقطہ نگاہ سے غلط ہے۔ آج تصویر دہلی
میں چل رہی ہے۔ دیکھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ خود غرضوں نے بلا وجہ
"ہمایوں" کی مخالفت کی۔ اور محبوب پر یہ اتہام لگائے کہ وہ ان پڑھ ہے۔
اور تاریخی اعتبار سے "ہمایوں" کی کہانی غلط ہے۔ اب وہ لوگ جواب دیں کہ
محبوب نے کون سی تاریخی غلطی کی ہے۔ "ہمایوں" میں مغل اور اسلامی شان
ہندو مسلم رواداری کو برقرار رکھا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ راجپوتی آن کو بھی
قائم رکھا ہے۔ مغل مسلمانوں کے ہندستان پر قبضہ کرنے کی نیت کو واضح
طور پر ظاہر کیا ہے ———— کہ ہم تمہارے
ملک پر حکومت ہی کرنے کی غرض سے نہیں آئے ہیں بلکہ اس ملک کو اپنا
ملک بنا کر رہیں گے۔ اور تمہارے مذہب، تمہاری تہذیب اور زبان کو بدلنے
نہیں آئے ہیں۔" یہ تھا وہ ارادہ جسے دل میں لے کر مغل اس ملک پر حملہ
آور ہوئے تھے۔ محبوب نے ایک بہترین تصویر تیار کر کے ملک کے سامنے
ایک فاتح اور بہادر قوم کے صحیح ارادے کو پیش کیا ہے۔ جس کے لئے
قوم اس کی ممنون ہے۔

"ہمایوں" میں بابری شان کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ
ساتھ راجپوتی آن [illegible] لحاظ سے ایک کامیاب
تصویر ہے [illegible] ہے۔ مکالمے بہت جاندار
ہیں۔ سین سینریاں اور جنگی مناظر بہت خوب ہیں۔ عکاسی کے بہترین
نمونے جگہ جگہ پیش کئے گئے ہیں۔ [illegible] کہانی کے مطابق بہت اچھی
ہے۔ شاہ نواز کی اداکاری لاجواب ہے [illegible] کمار۔ وینا۔ نرگس۔
کے۔ این سنگھ۔ یوسف آفندی۔ مجید۔ چندر موہن نے اپنے اپنے
کردار بہت خوب نبھائے ہیں۔

"ہمایوں" واقعی ایسی تصویر ہے جسے ہم سال رواں کی بہترین
تصویر کہہ سکتے ہیں۔

موتی ٹاکیز میں **مہارتھی کرن** دکھایا جا رہا ہے۔ "مہارتھی
کرن" مہابھارت کی جنگ سے متعلق ہے۔ اس میں پرتھوی راج۔
سولن لتا۔ ساہو مودک۔ درگا کھوٹے نے کام کیا ہے۔

اردو پارک کے متصل جگت سنیما میں رنجیت فلم کمپنی کا تیار
کردہ تاریخی شاہکار **ممتاز محل** دکھایا جا رہا ہے۔ ممتاز
شاہجہاں کی چہیتی بیوی تھی۔ ان دونوں کی محبت رہتی دنیا تک یادگار
رہے گی۔ تاج محل کو دیکھنے کے لئے جو شخص آگرے جائیگا۔ ان دونوں
کی محبت کو ضرور سراہے گا۔

بمبئی میں آتشزدگی

گذشتہ ماہ پیراماؤنٹ فلم کے دفتر واقع ہارڈ اسٹیٹ
میں آگ لگ گئی۔ اٹھارہ جانیں ضائع ہو گئیں۔ اور کئی لاکھ روپے کی
مالیت کی فلموں کا نقصان ہوا۔

لاہور میں آتشزدگی

میسرز موتی محل تھیٹرز کے دفتر میں آگ لگ جانے سے فرم کا
بنگالی منیجر اور اس کے خاندان کے لوگ جل کر مر گئے۔ تمام عمارت جل کر
خاک ہو گئی۔ اور کئی لاکھ روپے کی فلموں کا نقصان ہو گیا۔

اس سے قبل دہلی میں میسرز ستارہ فلمز چاندنی چوک کے
دفتر میں بھی آگ لگ گئی تھی۔

یہ جگہ جگہ آتش زدگی نہایت خطرناک ہے۔ اسوقت تک کئی
جانوں کا نقصان ہو چکا ہے۔ اس کے لئے ایک تحقیقاتی کمیشن بیٹھنا
چاہیئے۔ اور پولیس کو باقاعدہ تحقیقات کرنی چاہیئے۔ اور اس کے تدارک کی
تدابیر سوچنی چاہیئے۔ اگر یہ آتشزدگی کی وبا زور پکڑ گئی تو نہ معلوم کتنی اور
جانوں کا نقصان ہوگا۔

کیا آپ جانتے ہیں؟

کہ

ہر چیز کے دام حکومت ہند کے محکمہ سول سپلائیز نے مقرر کر دیئے ہیں مال خریدنے سے پیشتر نرخ مقررہ کی فہرست دیکھیئے۔ مقررہ قیمت سے زیادہ رقم ادا نہ کیجئے۔ مال خریدنے کے بعد کیش میمو یعنی رسید ضرور لیجئے۔ زیادہ رقم وصول کرنے والوں کی شکایت قریبی سول سپلائیز کے دفتر میں کیجئے تاکہ زیادہ رقم وصول کرنے والے کو مجوزہ سزا دی جائے۔ اس طرح حکومت کی مدد کیجئے۔ تاکہ **بلیک مارکیٹ** کا خاتمہ ہو جائے۔ اس میں آپ ہی لوگوں کا فا

جاری کردہ: **فیلڈ پبلسٹی**

ہندی الاصل بولا جاتا ہے لکھا ہوتا ہے دلی ہوتا ہے جو نشاطِ دلِ خدا ہوتا ہے

دہلی کے بچے بچے کی زبان پر محبوب زندہ باد کے نعرے :

معہ اہل و عیال و احباب دیکھکر اپنی خواب آلود دُنیائے جذبات کو بیدار کیجئے

راجپوت کماری کی آن اور مغل
شہنشاہ ہمایوں کی اسلامی شان

بہن کے لیے بھائی کی قربانی
بیٹے کے لئے باپ کی قربانی

تاریخ ہند کا ناقابل فراموش اور
جذبات سے لبریز زریں ورق

محبوب پروڈکشنز کا لاثانی و
لافانی تاریخی شاہکار

ہمایوں

موسیقی
غلام حیدر

ہدایات :-
محبوب

اداکاران :-
اشوک کمار۔ وینا۔ چندر موہن۔ نرگس۔ مجید۔ کے۔ این سنگھ۔ یوسف آفندی وغیرہ

[illegible] ملاحظہ فرمائیے

جاری کردہ :
منور تجن پکچرز۔ دہلی، لاہور، کراچی



راجہ بھرتری
موسیقار: کھیم چند پرکاش
پروڈیوسر: پی۔بی۔زویری
ولی صاحب
ہدایات: چترسبھج دوشی
سریندر
ممتاز شانتی
ارون
سلوچنا چٹرجی
جاری کردہ

جمنا پروڈکشنز کا موسیقی نواز دلفریب شاہکار

رتن

موسیقی ایسی دلفریب جسے سنتے ہی
وجد طاری ہو جاتا ہے

ایسی لاجواب موسیقی جسنے
دلی والوں کو دیوانہ بنا رکھا ہے

اداکاران :-
سورن لتا - کرن دیوان - واسطی
منجولا - گلاب - باری پرشاد
راج کماری وغیرہ

موسیقی :- نوشاد علی
ہدایات :- ایم صادق

جاری کردہ :- باسدیو پکچرز - چاندنی چوک - دہلی

والی سینیما
دہلی کے علاوہ
لاہور، امرتسر، کانپور
وغیرہ میں
سلور جوبلی
منانے کی تیاریاں
کر رہا ہے

سن آرٹ پکچرز کی انوکھی مذاحیہ تصویر جسکے ایک ایک منظر میں مچلتی ہوئی آرزوئیں نظر آئیں گی

سورن لتا کے روح پرور
گانے سنکر آپ تمام تصویروں
کو بھول جائیں گے

اداکاران :-
چارلی - کنھیالال -
سورن لتا - چندر موہن
ایشور لال
وغیرہ

چارلی اور کنھیالال کی مزاحیہ
اداکاریاں

چندر موہن کا
کمال فن

ہدایات :-
لوہار
بی - ایس - نیتی

جلد ہی ...

چاندنی چوک دہلی

اب

اپنی زبان میں ملاحظہ فرمایئے

اور بار پاتے، بنگالی زبان کی سال عال

کی تسلیم شدہ بہترین تصویر

وقت کی اہم پکار

بنگال کا قحط

ہمراہی

نیو تھیٹرز لمیٹڈ

کلکتہ کا جدید شاہکار

ہدایات

موسیقی

بورال

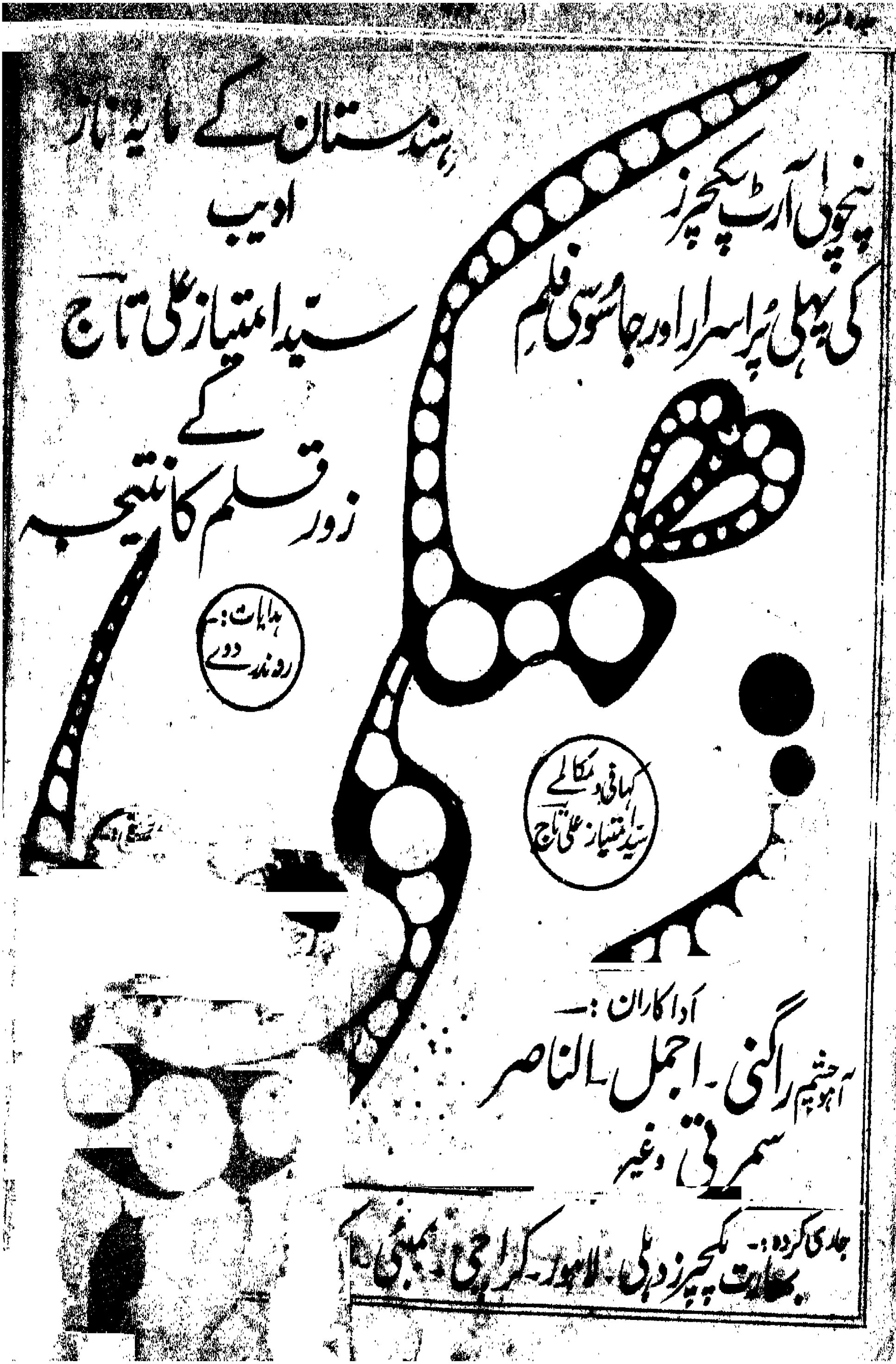
اداکاران

بناتا بوس - رادھا موہن - ہیرالال -

سکتی دھارا - ٹنڈن - پریتی دھارا -

راج لکشمی وغیرہ

جاری کردہ:- جگت ٹاکیز فلم تقسیم کنندگان


پنچولی آرٹ پکچرز
کی پہلی پُراسرار اور جاسوسی فلم
کہانی مکالمے
سید امتیاز علی تاج
ہندستان کے مایہ ناز
ادیب
سید امتیاز علی تاج
کے
زورِ قلم کا نتیجہ
ہدایات:- روندرے دوے
اداکاران:-
آہو چشم راگنی۔ اجمل۔ الناصر
سمرتی وغیرہ
جاری کردہ:- بھارت پکچرز دہلی۔ لاہور۔ کراچی۔ بمبئی

پنچولی آرٹ پکچرز پیش کرتے ہیں

کیسے کہوں

رومان

سنسنی خیز ڈرامہ

جذبات

سرحد کے دلفریب منظر

اداکاران

جاگیردار - راگنی - نجم الحسن - اختری - اجمل - جی، این بٹ، درگا موٹا - پران وغیرہ

موسیقی پنڈت گوبند رام

جاری کردہ

چاندنی چوک دہلی - کراچی بمبئی کلکتہ

اب جنگ ختم ہو چکی ہے!

جنگ کے زمانے میں ہر چیز کے دام چڑھے ہوئے تھے۔ اب رفتہ رفتہ چیزوں کے دام کم ہونگے۔ اس وجہ سے جواہرات، زمین، عمارات اور دوسری خام یا صنعتی اشیاء خرید کر اپنا روپیہ خطرے میں نہ ڈالیئے۔ کیونکہ ان کی قیمتیں لازمی طور پر گھٹیں گی۔ مندرجہ ذیل مدوں میں روپیہ لگانا فائدہ مند بھی ہے اور محفوظ بھی رہے گا۔

روپیہ بچائیے

- ★ بیمہ پالیسی
- ★ امداد باہمی کی انجمنیں
- ★ بنک کا سیونگ کھاتہ
- ★ ڈاک خانہ کا سیونگ کھاتہ
- ★ سرکاری قرضے
- ★ نیشنل سیونگ سرٹیفکیٹ